علیہ الصلوٰۃ والسلام

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی

اپنی تحریروں کی رُو سے

جلد اوّل

نام کتاب: حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام
(جلد اوّل، دوئم)
تعداد: 2000
طبع: دوم
سنِ اشاعت: اگست 2004ء
شائع کردہ: نظارت نشر و اشاعت صدر انجمن احمدیہ قادیان-143516
مطبع: پرنٹ ویل، امرتسر

ISBN-81-7912-063-5

Title: "*Hazrat Mirza Ghulam Ahmad Qadiani a.s.*"
(Vol. I,II)
IInd Edition, Published in Aug. 2004
Published by: Nazarat Nashr-o-Isha'at,
Sadr Anjuman Ahmadiyya,
Qadian-143516, Distt. Gurdaspur,
Punjab (INDIA)
Printed at: 146, Printwell, Focal Point
Amritsar

"چند روز کا ذکر ہے کہ اِس عاجز نے اِس طرف توجّہ کی کہ کیا اِس حدیث کا جو اَلْاٰیَاتُ بَعْدَ الْمِأتَیْنِ ہے ایک یہ بھی منشاء ہے کہ تیرھویں صدی کے اواخر میں مسیح موعود کا ظہور ہوگا اور کیا اِس حدیث کے مفہوم میں بھی یہ عاجز داخل ہے تو مجھے کشفی طور پر اِس مندرجہ ذیل نام کے اعدادِ حروف کی طرف توجّہ دلائی گئی کہ دیکھ یہی مسیح ہے کہ جو تیرھویں صدی کے پُورے ہونے پر ظاہر ہونے والا تھا۔ پہلے سے یہی تاریخ ہم نے نام میں مقرر کر رکھی تھی اور وہ یہ نام ہے

غلام احمد قادیانی

۱۳۰۰

اِس نام کے عدد پُورے تیرہ سَو ۱۳۰۰ ہیں اور اِس قصبہ قادیان میں بجُز اِس عاجز کے اَور کِسی شخص کا غلام احمد نام نہیں۔ بلکہ میرے دل میں ڈالا گیا ہے کہ اِس وقت بجُز اِس عاجز کے تمام دُنیا میں غلام احمد قادیانی کسی کا بھی نام نہیں۔"

پیش لفظ

سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت، آپ کا عشقِ رسول، محبتِ اسلام کو اگر کوئی حقیقی رنگ میں جاننا چاہتا ہو تو آپ کی کتب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ آپ کی سیرت کے ہر پہلو کا مطالعہ کرنا جو کہ آپ کی تمام کتب میں پھیلا ہوا ہے ہر شخص کے لیے ممکن نہیں۔ محترم سیّد داؤد احمد صاحب مرحوم آف ربوہ نے بڑی محنت کے ساتھ تمام کتب کا مطالعہ کر کے مختلف عناوین کے تحت آپ کی سیرت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ کتاب جہاں آپ کی سیرت کے حسین پہلوؤں کو بیان کرتی ہے وہاں آپکے معجزات اور پیشگوئیوں کو بھی پیش کرتی ہے۔

اس کتاب کو نظارت اشاعت ربوہ نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ہندوستان کے احمدی بھی اس کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس مطالبہ کے پیشِ نظر نظارت نشر و اشاعت قادیان سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی اجازت سے اِس کو ایک جلد میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب طالبانِ حق کی تشنگی دور کرے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کی اشاعت کو ہر لحاظ سے بابرکت کرے۔ آمین

ناظر نشر و اشاعت قادیان

بحضور

سیّد المطہّرین امام الطیّبین فخر المرسلین خاتم النّبیّین
سرورِ کائنات فخرِ موجودات محبوبِ حضرتِ احدیت حضرت

محمد مصطفیٰ

صلّی اللّٰہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلّم

اس التجا کے ساتھ

اُنْظُرْ اِلَیَّ بِرَحْمَۃٍ وَّ تَحَنُّنٍ   یَا سَیِّدِیْ أَنَا أَحْقَرُ الْغِلْمَانِ
یَا حِبِّ إِنَّکَ قَدْ دَخَلْتَ مَحَبَّۃً   فِیْ مُھْجَتِیْ وَ مَدَارِکِیْ وَجَنَانِیْ
جِسْمِیْ یَطِیْرُ إِلَیْکَ مِنْ شَوْقٍ عَلَا   یَا لَیْتَ کَانَتْ قُوَّۃُ الطَّیْرَانِ

غلام ابنِ غلام ابنِ غلام

فہرست مضامین

حصّہ اوّل

باب اوّل : ذاتی اور خاندانی حالات ۱
باب دوم : دعویٰ ۱۳
مقام ۱۴
بعثت کا مقصد ۶۳
تبلیغ اور ایک پاک جماعت کا قیام اور ان کو نصائح ۸۱
باب سوم : تعلیم و عقائد ۱۷۹
اصولی عقائد ۱۸۱
اسلام ۱۹۳
اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ و عزّ اسمہٗ ۲۱۷
وحی، الہام، کشوف اور رؤیا ۳۲۳
سیّد المطہّرین خاتم النّبیّین حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم ۳۹۹
قرآن مجید ۴۹۵
حدیث و سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ۵۹۱
ملائکۃ اللہ ۵۹۹
دُعا ۶۳۱

حصّہ دوم

توبہ و استغفار ۶۶۳
نجات ۶۷۳
بعث بعد الموت ۷۰۵
بہشت و دوزخ ۷۱۷
مقصدِ پیدائش ۷۴۱
انسان کی طبعی، اَخلاقی اور رُوحانی حالتیں ۷۴۹
ایمان، یقین اور معرفت ۷۷۷
جذب و سلوک ۸۲۳
انبیاء کی ضرورت ۸۲۵
اِسلام میں نبوّت ۸۳۴
حضرت مسیح ناصری علیہ السّلام اور نزولِ مسیح ۸۶۱
المسیح الدجّال ۹۴۲
ذوالقرنین ۹۵۳
یاجوج ماجوج ۹۶۱
اُمّ الالسنہ ۹۶۵
ارکانِ اسلام ۹۸۷
جہاد بالسّیف ۱۰۰۴
قضاء و قدر ۱۰۱۴
تقوٰی ۱۰۲۱
تکبّر ۱۰۲۶

بدظنی ۱۰۳۱
اِس دُنیا میں عذاب ۱۰۳۳
عورت ۱۰۴۲
پَردہ ۱۰۵۲
تربیتِ اولاد ۱۰۵۷
رُوح ۱۰۵۸
باب چہارم : باربار دعوتِ مقابلہ ۱۰۸۱
باب پنجم : مُعجزات، نشانات اور پیشگوئیاں ۱۱۶۵
شادی اور اولادِ صالحہ ۱۱۹۱
جلسۂ اعظم مذاہب ۱۲۰۰
عبداللہ آتھم ۱۲۰۳
لیکھرام ۱۲۰۶
طاعون ۱۲۱۵
فتحِ عظیم ۱۲۳۰
غیر معمولی نصرت اور شہرت ۱۲۳۴
زلازل اور جنگیں ۱۲۴۶
سلطان القلم ۱۲۵۵
خطبہ الہامیہ ۱۲۵۷
متفرق نشانات ۱۲۵۸
باب ششم : انجامِ سلسلہ ۱۲۹۳

تعارف

کِسی شخص کا یہ دعویٰ کرنا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے اور اُس نے مجھے اپنا برگزیدہ مامور ٹھہرایا ہے اور مجھے علمِ لدُنّی سے سرفراز فرمایا ہے اور مجھے تمام دُنیا پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ مَیں اس کی طرف سے رسول ہو کر تمام مخلوق کو اس کی طرف بُلاؤں اِتنا غیر معمولی اور جُرأت مندانہ دعویٰ ہے کہ کوئی عقلمند انسان اِس سے عدمِ توجّہی نہیں برت سکتا۔ دُنیا کی اَدنیٰ اَدنیٰ حکومتیں جب کسی کو اپنا نمائندہ یا سفیر بنا کر کسی دوسرے ملک کو بھیجتی ہیں تو بڑی بڑی جابر حکومتیں بھی اس کی بات سُننے اور اس کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کجا یہ کہ تمام کائنات کے خالق و مالک کی طرف سے جس کی مُٹھی میں یہ سارا جہان ہے۔ جو ہر چیز کو نیست سے ہست میں لایا اور جب چاہے اسے ایک طرفۃُ العین میں پھر ہستی سے نیستی کی طرف لوٹا سکتا ہے آنے والے پیغامبر سے لاپرواہی اور عدمِ توجّہی کا حق جائز سمجھا جائے۔

جو شخص خدا تعالیٰ کی ہستی کا قائل نہیں ہے وہ بھی یہ موقف اختیار نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی عقل مجبور کرتی ہے کہ جس طرح وہ اَور دُنیوی صداقتوں کے پیش کرنے والوں کے دعاوی کی چھان بین کرتا ہے اسی طرح وہ مدعیٔ ماموریت کے دعویٰ کی بھی پُوری سنجیدگی سے چھان بین کرے اور اس کے پیش کردہ دلائل کو زیرِ غور لائے پھر اگر اس کی سمجھ میں آ جائے تو قبول کرے ورنہ رَدّ کر دے لیکن وہ یہ موقف تو کِسی طرح بھی اختیار نہیں کر سکتا کہ مجھے ان دعاوی پر غور کرنے یا اس کی جانچ پڑتال کرنے کی سِرے سے ضرورت ہی نہیں۔

اور جو شخص کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ ہے اور خدا تعالیٰ کی ہستی کا قائل ہے اور یقین رکھتا ہے کہ ازمنۂ سابقہ میں وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ اپنے پیغامبر مبعوث کرتا رہا ہے۔ اس کی مقدّس کتابیں اُسے بتاتی ہیں کہ جب سے یہ دُنیا پیدا ہوئی ہے یا دُنیا کی تاریخ محفوظ ہے واقعی اللہ تعالیٰ کے ہزاروں ہزار ایسے مامور اِس دُنیا میں آئے جن کا مقصد خالق اور مخلوق کے رشتہ کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنا تھا وہ تو کِسی طرح بھی ایسے مدعی سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ بعث بعد الموت کا عقیدہ ہر مذہب میں پایا جاتا ہے اور ہر مذہبی آدمی یقین رکھتا ہے کہ اُسے

ایک نہ ایک دِن مَوت ضرور آنی ہے اور مَرنے کے ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوگا اور پھر اسے اِس بات کا جواب دینا ہوگا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے مامور کی آواز کا کیا جواب دیا۔ اِسلام میں تو اِس پر خاص زور دیا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں فتنۃ القبر کا تفصیلی ذکر ہے۔ جب قبر میں منافق سے سوال کیا جائے گا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے تو وہ جواب میں کہے گا "لَا اَدْرِیْ سَمِعْتُ النَّاسَ یَقُوْلُوْنَ شَیْئًا فَقُلْتُہٗ" یعنی میری ذاتی تحقیق تو کوئی نہیں ہے البتہ لوگوں سے بہت سی باتیں سُنی تھیں جو کچھ لوگ سُنی سُنائی کہتے رہے مَیں بھی کہتا رہا۔ اور یہ جواب ہرگز قابلِ قبول نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ ہر شخص پر یہ واجب قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایسے مدّعی کے دعوٰی کی بذاتِ خود چھان بین کرے اور پھر دیانتداری سے کِسی نتیجہ پر پہنچے "عدم مصروفیت" کا بہانہ کسی کام نہیں آئے گا۔

ہمارے اِس زمانہ میں بھی ایک مدّعیٔ ماموریت کی صدا پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں قادیان سے بلند ہوئی ہے جس نے اعلان کیا :-

> "مَیں نے بار بار بیان کر دیا ہے کہ یہ کلام جو مَیں سُناتا ہوں یہ قطعی اور یقینی طور پر خدا کا کلام ہے جیسا کہ قرآن اور توریت خدا کا کلام ہے اور مَیں خدا کا ظلّی اور بروزی طور پر نبی ہوں اور ہر ایک مسلمان کو دینی امور میں میری اطاعت واجب ہے اور مسیح موعود ماننا واجب ہے اور ہر ایک جس کو میری تبلیغ پہنچ گئی ہے گو وہ مسلمان ہے مگر مجھے اپنا حَکَم نہیں ٹھہراتا اور نہ مجھے مسیح موعود مانتا ہے اور نہ میری وحی کو خدا کی طرف سے جانتا ہے وہ آسمان پر قابلِ مواخذہ ہے کیونکہ جس امر کو اس نے وقت پر قبول کرنا تھا اس کو رَدّ کر دیا۔"

یہ دعوٰی اِتنا بڑا دعوٰی ہے کہ خواہ کوئی شخص کیسے ہی خیالات کیوں نہ رکھتا ہو دہریہ ہو۔ یہودی ہو۔ عیسائی ہو۔ ہندو ہو یا اَور کسی مذہب کا پَیرو ہو اِس دعوٰی سے آنکھیں بند کر لینے کا حق نہیں رکھتا کیونکہ اگر یہ دعوٰی سچا نکلا تو مالکِ یوم الدّین کے مواخذہ سے رہائی کیسے ہوگی ؟

حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے اپنے اِس دعوٰی کی تشہیر اور تبلیغ کے مفوضہ فرض کو ادا کرنے کے لئے جہاں سینکڑوں اشتہار شائع کئے اور ہزاروں خطوط لکھے وہاں اسّی کے قریب مستقل تصانیف بھی شائع کیں۔ بہت سے لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمارے

پاس اتنا وقت نہیں کہ یہ کتب پڑھ سکیں اِسی قِسم کے لوگوں کے لئے یہ تالیف مرتّب کی گئی ہے تاکہ وہ تھوڑے سے وقت میں حضرت مرزا صاحبؑ ہی کی زبانی معلوم کر سکیں کہ آپ کے ذاتی سوانح کیا ہیں ؟ آپؑ کا دعوٰی کیا ہے ؟ اس کے دلائل اور براہین کیا ہیں ؟ آپ اپنا کیا مقام بتاتے ہیں؟ آپ کی تعلیم کیا ہے ؟ آپ نے اپنے ماننے والوں کو کیا نصائح فرمائیں ؟ آپ کے مخالفین کا سلوک کیا تھا اور آپ کی طرف سے کیا رَدِّ عمل ظاہر ہُوا ؟ اور پھر یہ کہ آپ نے اپنے سِلسلہ کے انجام کے بارے میں کیا پیشگوئیاں کیں ؟ —— آئندہ صفحات میں آپ اِن سب باتوں کا جواب حضرت مرزا صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ کریں گے۔

اِس تالیف میں صرف حضرت مرزا صاحبؑ کے اقتباسات ہی ہیں اپنی طرف سے کوئی مضمون نویسی یا حاشیہ آرائی نہیں کی گئی اور ہر اقتباس کے نیچے آپ کی اصل کتاب کا حوالہ درج کر دیا گیا ہے جن دوستوں کو آپ کی کتب دیکھنے کا اِتفاق نہیں ہُوا ان کی خدمت میں عرض ہے کہ حقیقی لُطف اصل کتب دیکھنے ہی سے حاصل ہوگا یہ اقتباسات تو صرف نمونہ کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں۔

یاد رہے کہ صرف عناوین جو فہرست میں بھی درج کئے گئے ہیں مَیں نے اپنی طرف سے قائم کئے ہیں لیکن یہ بھی دراصل حضور ہی کی تحریروں سے منتخب شدہ ہیں۔

یہ وضاحت شاید ضروری نہیں کہ عناوین والے صفحات پر اُوپر یا نیچے جو مختصر سے اقتباس دیئے گئے ہیں وہ بھی مِن وعَن حضور ہی کے الفاظ ہیں اور اُس باب کے مضمون کو بطور خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

یہ بات بیان کرنا نہایت ضروری ہے کہ مختلف الموضوع کتب میں سے عنوان وار اقتباسات نکالنا آسان کام نہیں ہے اس سے مفہوم خبط ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید، اِن تینوں کے بارے میں آپ کی تحریریں اِس طرح پیوستہ ہیں کہ تینوں کے لئے علیحدہ علیحدہ اقتباس نکالنا سخت مشکل ہے بہر حال کوشش کی گئی ہے کہ حوالے جوڑتے ہوئے یا درمیان سے مضمون چھوڑتے ہوئے ترتیب اور تسلسل قائم رہے اور مفہوم خبط نہ ہو۔ اگر کہیں پیچیدگی یا اُلجھن پیدا ہو یا مضمون ناتمام معلوم ہو تو میری سمجھ کا قصور ہوگا اصل کتاب دیکھنے سے اُلجھن فوراً دُور ہو جائے گی۔

حوالہ جات کے بارے میں عرض ہے کہ جِلد گیارہ تک کی کتب کے حوالے تو رُوحانی خزائن والے ایڈیشن سے دیئے گئے ہیں باقی ان ایڈیشنوں میں سے ہیں جو مجھے میسّر تھے۔ اگر باوجود

تلاش کے کوئی حوالہ نہ ملے تو خاکسار تلاش کر کے دینے کا ذمہ دار ہے انشاء اللہ ایسا کوئی حوالہ نہیں ہوگا جو سرے سے اس کتاب میں ہی موجود نہ ہو۔

کتابت کی اغلاط کس کتاب میں نہیں ہوتیں ایڈیشن در ایڈیشن اور نقل در نقل میں تو مزید بڑھ جاتی ہیں ان کی درستی بعد ہی میں کی جا سکتی ہے۔

میرا دِل اپنی رفیقۂ حیات کے لئے ممنونیّت کے جذبات سے لبریز ہے جنہوں نے اقتباسات کی تلاش، نقل، تصحیح اور پھر کاپی پڑھنے میں مسلسل بڑے حوصلے اور محنت سے میرا ہاتھ بٹایا فَجَزَاھَا اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔

والسّلام
خاکسار مؤلّف
سیّد داؤد احمد
ربوہ

○

پہلی دفعہ یہ کتاب ایک جلد میں اَلْجَمْعِیَّۃُ الْعِلْمِیَّۃُ لِلْجَامِعَۃِ الْاَحْمَدِیَّۃِ ربوہ کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔

بابِ اوّل

ذاتی اور خاندانی حالات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

ہمارا شجرۂ نسب اس طرح پر ہے۔ میرا نام غلام احمد ابن مرزا غلام مرتضیٰ صاحب ابن مرزا عطا محمد صاحب ابن مرزا گل محمد صاحب ابن مرزا فیض محمد صاحب ابن مرزا محمد قائم صاحب ابن مرزا محمد اسلم صاحب ابن مرزا محمد دلاور صاحب ابن مرزا الٰہ دین صاحب ابن مرزا جعفر بیگ صاحب ابن مرزا محمد بیگ صاحب ابن مرزا عبد الباقی صاحب ابن مرزا محمد سلطان صاحب ابن مرزا ہادی بیگ صاحب مورثِ اعلیٰ۔

(کتاب البریہ حاشیہ در حاشیہ ص ۱۴۲)

میرے سوانح اس طرح پر ہیں کہ میرا نام غلام احمد میرے والد صاحبؒ کا نام غلام مرتضیٰ اور دادا صاحب کا نام عطا محمد اور میرے پردادا صاحب کا نام گل محمد تھا۔ اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ہماری قوم مغل برلاس ہے اور میرے بزرگوں کے پُرانے کاغذات سے جواب تک محفوظ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس ملک میں سمرقند سے آئے تھے اور اُن کے ساتھ قریبًا دو سو آدمی اُن کے توابع اور خدّام اور اہل و عیال میں سے تھے۔ اور وہ ایک معزز رئیس کی حیثیت سے اس ملک میں داخل ہوئے اور اس قصبہ کی جگہ میں جو اُس وقت ایک جنگل پڑا ہُوا تھا جو لاہور سے تخمینًا بفاصلہ پچاس کوس بگوشۂ شمال مشرق واقع ہے فرو کش ہو گئے۔ جس کو انہوں نے آباد کر کے اس کا نام اسلام پور رکھا جو پیچھے سے اسلام پور قاضی ماجھی کے نام سے مشہور ہُوا اور رفتہ رفتہ اسلام پور کا لفظ لوگوں کو بھُول گیا اور قاضی ماجھی کی جگہ پر قاضی رہا اور پھر آخر قادی بنا۔ اور پھر اس سے بگڑ کر قادیان بن گیا۔ اور قاضی ماجھی کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ علاقہ جس کا طولانی حصّہ قریبًا ساٹھ کوس ہے ان دنوں میں سب کا سب ماجھہ کہلاتا تھا غالبًا اسی وجہ سے اس کا نام ماجھہ تھا کہ اس ملک میں بھینسیں بکثرت ہوتی تھیں اور ماجھ زبان ہندی میں بھینس کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ ہمارے بزرگوں کو علاوہ دیہات جاگیرداری کے اس تمام علاقہ کی حکومت بھی ملی تھی اس لئے قاضی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیوں اور کس وجہ سے ہمارے بزرگ سمرقند سے اس ملک میں آئے مگر کاغذات سے یہ پتہ ملتا ہے کہ اس ملک میں بھی وہ معزز امراء اور خاندان والیانِ ملک میں سے تھے اور انہیں کسی قومی خصومت اور تفرقہ کی وجہ سے اس ملک کو چھوڑنا پڑا۔ پھر اس ملک میں آکر بادشاہِ وقت کی طرف سے بہت سے

دیہات بطور جاگیر اُن کو ملے۔ چنانچہ اسی نواح میں ایک مستقل ریاست اُن کی ہو گئی۔

سکھوں کے ابتدائی زمانہ میں میرے پردادا صاحب میرزا گل محمدؐ ایک نامور اور مشہور رئیس اس نواح کے تھے جن کے پاس اس وقت ۸۵ گاؤں تھے اور بہت سے گاؤں سکھوں کے متواتر حملوں کی وجہ سے اُن کے قبضہ سے نکل گئے تاہم اُن کی جوانمردی اور فیاضی کی یہ حالت تھی کہ اس قدر قلیل میں سے بھی کئی گاؤں انہوں نے مروّت کے طور پر بعض تفرقہ زدہ مسلمان رئیسوں کو دے دیئے تھے جو اب تک اُن کے پاس ہیں۔ غرض وہ اس طوائف الملوکی کے زمانہ میں اپنے نواح میں ایک خود مختار رئیس تھے۔ ہمیشہ قریب پانسو آدمی کے یعنی کبھی کم اور کبھی زیادہ اُن کے دسترخوان پر روٹی کھاتے تھے۔ اور ایک سو کے قریب علماء اور صلحاء اور حافظ قرآن شریف کے اُن کے پاس رہتے تھے جن کے کافی وظیفے مقرر تھے۔ اور اُن کے دربار میں اکثر قال اللہ و قال الرسولؐ کا ذکر بہت ہوتا تھا۔ اور تمام ملازمین اور متعلقین میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو تارک نماز ہو۔ یہاں تک کہ چکّی پیسنے والی عورتیں بھی پنجوقتہ نماز اور تہجد پڑھتی تھیں۔ اور گرد و نواح کے معزز مسلمان جو اکثر افغان تھے قادیان کو جو اس وقت اسلام پور کہلاتا تھا مکّہ کہتے تھے۔ کیونکہ اس پُر آشوب زمانے میں ہر ایک مسلمان کے لئے یہ قصبہ مبارکہ پناہ کی جگہ تھی اور دوسری اکثر جگہ میں کفر اور فسق اور ظلم نظر آتا تھا۔ اور قادیان میں اسلام اور تقوٰی اور طہارت اور عدالت کی خوشبو آتی تھی۔ میں نے خود اس زمانہ میں سے قریب زمانہ پانے والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اس قدر قادیان کی عمدہ حالت بیان کرتے تھے کہ گویا وہ اس زمانہ میں ایک باغ تھا جس میں حامیانِ دین اور صلحاء اور علماء اور نہایت شریف اور جوانمرد آدمیوں کے صدہا پودے پائے جاتے تھے۔ اور اس نواح میں یہ واقعات نہایت مشہور ہیں کہ میرزا گل محمدؐ صاحب مرحوم مشائخ وقت کے بزرگ لوگوں میں سے اور صاحبِ خوارق اور کرامات تھے جن کی صحبت میں رہنے کے لئے بہت سے اہل اللہ اور صلحاء اور فضلاء قادیان میں جمع ہو گئے تھے۔ اور عجیب تر یہ کہ کئی کرامات اُنکی ایسی مشہور ہیں جن کی نسبت ایک گروہ کثیر مخالفین دین کا بھی گواہی دیتا رہا ہے۔ غرض وہ علاوہ ریاست اور امارت کے اپنی دیانت اور تقوٰی اور مردانہ ہمت اور اولوالعزمی اور حمایتِ دین اور ہمدردی مسلمانوں کی صفت میں نہایت مشہور تھے۔ اور اُن کی مجلس میں بیٹھنے والے سب کے سب متقی اور نیک چلن اور اسلامی غیرت رکھنے والے اور فسق و فجور سے دُور رہنے والے اور بہادر اور بارعب آدمی تھے۔ چنانچہ میں نے کئی دفعہ اپنے والد صاحب مرحوم سے سُنا ہے کہ اس زمانہ میں ایک دفعہ ایک وزیر سلطنت مغلیہ کا قادیان میں آیا جو غیاث الدولہ کے نام سے مشہور تھا اور اس نے میرزا گل محمدؐ صاحب

کے مدبّرانہ طریق اور بیدار مغزی اور ہمت اور اولوالعزمی اور استقلال اور عقل اور فہم اور حمایتِ اسلام اور جوشِ نصرتِ دین اور تقویٰ اور طہارت اور دربار کے وقار کو دیکھا اور ان کے اس مختصر دربار کو نہایت متین اور عقلمند اور نیک چلن اور بہادر مردوں سے پُر پایا۔ تب وہ چشم پُرآب ہو کر بولا کہ اگر مجھے پہلے خبر ہوتی کہ اس جنگل میں خاندان مغلیہ میں سے ایسا مرد موجود ہے جس میں صفاتِ ضروریہ سلطنت کے پائے جاتے ہیں تو میں اسلامی سلطنت کے محفوظ رکھنے کے لئے کوشش کرتا کہ ایّام کسل اور نالیاقتی اور بدوضعی ملوکِ چغتائیہ میں اسی کو تختِ دہلی پر بٹھایا جائے۔

اس جگہ اس بات کا لکھنا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ میرے پردادا صاحب موصوف یعنی میرزا گُل محمد نے ہچکی کی بیماری سے جس کے ساتھ اَور عوارض بھی تھے وفات پائی تھی۔ بیماری کے غلبہ کے وقت اطباء نے اتفاق کر کے کہا کہ اس مرض کے لئے اگر چند روز شراب کو استعمال کرایا جائے تو غالباً اس سے فائدہ ہوگا مگر جرأت نہیں رکھتے تھے کہ اُن کی خدمت میں عرض کریں۔ آخر بعض نے اُن میں سے ایک نرم تقریر میں عرض کر دیا۔ تب انہوں نے کہا کہ اگر خدا تعالیٰ کو شفا دینا منظور ہو تو اس کی پیدا کردہ اَور بھی بہت سی دوائیں ہیں۔ مَیں نہیں چاہتا کہ اس پلید چیز کو استعمال کروں اور مَیں خدا کے قضا و قدر پر راضی ہوں۔ آخر چند روز کے بعد اسی مرض سے انتقال فرما گئے۔ موت تو مقدّر تھی۔ مگر یہ اُن کا طریق تقویٰ ہمیشہ کے لئے یادگار رہا کہ موت کو شراب پر اختیار کر لیا۔ موت سے بچنے کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ لیکن انہوں نے معصیت کرنے سے موت کو بہتر سمجھا! افسوس ان بعض نوجوانوں اور امیروں اور رئیسوں کی حالت پر کہ اس چند روزہ زندگی میں اپنے خدا اور اس کے احکام سے بکلّی لاپرواہ ہو کر اور خدا تعالیٰ سے سارے علاقے توڑ کر دل کھول کر ارتکابِ معصیت کرتے ہیں اور شراب کو پانی کی طرح پیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی زندگی کو نہایت پلید اور ناپاک کر کے اور عمرِ طبعی سے بھی محروم رہ کر اور بعض ہولناک عوارض میں مبتلا ہو کر جلد تر مر جاتے ہیں اور آئندہ نسلوں کے لئے نہایت خبیث نمونہ چھوڑ جاتے ہیں۔

اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب میرے پردادا صاحب فوت ہوئے تو بجائے اُن کے میرے دادا صاحب یعنی مرزا عطا محمد فرزند رشید ان کے گدی نشین ہوئے۔ اُن کے وقت میں خدا تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت سے لڑائی میں سکھ غالب آئے۔ دادا صاحب مرحوم نے اپنی ریاست کی حفاظت کیلئے بہت تدبیریں کیں مگر جبکہ قضا و قدر اُن کے ارادہ کے موافق نہ تھی اس لئے ناکام رہے اور کوئی تدبیر پیش نہ گئی اور روز بروز سکھ لوگ ہماری ریاست کے دیہات پر قبضہ کرتے گئے یہاں تک

کہ دادا صاحب مرحوم کے پاس صرف ایک قادیان رہ گئی اور قادیان اس وقت ایک قلعہ کی صورت پر قصبہ تھا اور اس کے چار برج تھے اور برجوں میں فوج کے آدمی رہتے تھے۔ اور چند توپیں تھیں۔ اور فصیل بائیس فٹ کے قریب اونچی اور اس قدر چوڑی تھی کہ تین چھکڑے آسانی سے ایک دوسرے کے مقابل اس پر جا سکتے تھے۔ اور ایسا ہوا کہ ایک گروہ سکھوں کا جو رام گڑھیہ کہلاتا تھا اوّل فریب کی راہ سے اجازت لیکر قادیان میں داخل ہوا اور پھر قبضہ کر لیا۔ اس وقت ہمارے بزرگوں پر بڑی تباہی آئی اور اسرائیلی قوم کی طرح وہ اسیروں کی مانند پکڑے گئے اور ان کے مال و متاع سب لوٹی گئی۔ کئی مسجدیں اور عمدہ عمدہ مکانات مسمار کئے گئے اور جہالت اور تعصب سے باغوں کو کاٹ دیا گیا اور بعض مسجدیں جن میں سے اب تک ایک مسجد سکھوں کے قبضہ میں ہے دھرم سالہ یعنی سکھوں کا معبد بنایا گیا۔ اس دن ہمارے بزرگوں کا ایک کتب خانہ بھی جلایا گیا جس میں سے پانسو نسخہ قرآن شریف کا قلمی تھا جو نہایت بے ادبی سے جلایا گیا۔ اور آخر سکھوں نے کچھ سوچ کر ہمارے بزرگوں کو نکل جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ تمام مرد و زن چھکڑوں میں بٹھا کر نکالے گئے اور وہ پنجاب کی ایک ریاست میں پناہ گزیں ہوئے۔ تھوڑے عرصہ بعد ان ہی دشمنوں کے منصوبے سے میرے دادا صاحب کو زہر دی گئی۔ پھر رنجیت سنگھ کی سلطنت کے آخری زمانہ میں میرے والد صاحب مرحوم میرزا غلام مرتضیٰ قادیان میں واپس آئے۔ اور مرزا صاحب موصوف کو اپنے والد صاحب کے دیہات میں سے پانچ گاؤں واپس ملے کیونکہ اس عرصہ میں رنجیت سنگھ نے دوسری اکثر چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو دبا کر ایک بڑی ریاست اپنی بنالی تھی۔ سو ہمارے تمام دیہات بھی رنجیت سنگھ کے قبضہ میں آ گئے تھے۔ اور لاہور سے لے کر پشاور تک اور دوسری طرف لودھیانہ تک اس کی ملک داری کا سلسلہ پھیل گیا تھا۔ غرض ہماری پرانی ریاست خاک میں مل کر آخر پانچ گاؤں ہاتھ میں رہ گئے تھے پھر بھی بلحاظ پرانے خاندان کے میرے والد صاحب مرزا غلام مرتضیٰ اس نواح میں ایک مشہور رئیس تھے .... چنانچہ مسٹر لیپل گریفن صاحب نے بھی اپنی کتاب تاریخ رئیسان پنجاب میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ غرض وہ حکام کی نظر میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ اور بسا اوقات ان کی دلجوئی کے لئے حکام وقت۔ ڈپٹی کمشنر۔ کمشنر ان کے مکان پر آکر ان کی ملاقات کرتے تھے۔ یہ مختصر میرے خاندان کا حال ہے۔ میں ضروری نہیں دیکھتا کہ اس کو بہت طول دوں۔

اب میرے ذاتی سوانح یہ ہیں کہ میری پیدائش سنہ ۱۸۳۹ء یا سنہ ۱۸۴۰ء میں سکھوں کے آخری وقت میں ہوئی ہے۔ اور میں سنہ ۱۸۵۷ء میں سولہ برس کا یا سترھویں برس میں تھا اور ابھی ریش و بروت

کا آغاز نہیں تھا۔ میری پیدائش سے پہلے میرے والد صاحب نے بڑے بڑے مصائب دیکھے۔ ایک دفعہ ہندوستان کا پیادہ پا سیر بھی کیا۔ لیکن میری پیدائش کے دنوں میں اُن کی تنگی کا زمانہ فراخی کی طرف بدل گیا تھا۔ اور یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ مَیں نے ان کے مصائب کے زمانہ سے کچھ بھی حصّہ نہیں لیا۔ اور نہ اپنے دوسرے بزرگوں کی ریاست اور ملک داری سے کچھ حصّہ پایا۔ بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح جن کے ہاتھ میں صرف نام کی شہزادگی بوجہ داؤد کی نسل سے ہونے کے تھی۔ اور ملک داری کے اسباب سب کچھ کھو بیٹھے تھے ایسا ہی میرے لئے بھی بلفقتن یہ بات حاصل ہے کہ ایسے رئیسوں اور ملک داروں کی اولاد میں سے ہوں۔ شاید یہ اس لئے ہوا کہ یہ مشابہت بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پوری ہو۔ اگرچہ مَیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میرے لئے سر رکھنے کی جگہ نہیں مگر تاہم مَیں جانتا ہوں کہ وہ تمام صف ہمارے اجداد کی ریاست اور ملک داری کی لپیٹی گئی اور وہ سلسلہ ہمارے وقت میں آکر بالکل ختم ہو گیا۔ اور ایسا ہوا تاکہ خدا تعالیٰ نیا سلسلہ قائم کرے جیسا کہ براہین احمدیہ میں اس سبحانہٗ کی طرف سے یہ الہام ہے۔

”سبحان اللّٰہ تبارک وتعالیٰ زاد مجدک ینقطع اٰباءک ویبدء منک۔“

یعنی خدا جو بہت برکتوں والا اور بلند اور پاک ہے اُس نے تیری بزرگی کو تیرے خاندان کی نسبت زیادہ کیا۔ اب سے تیرے آباء کا ذکر قطع کیا جائیگا اور خدا تجھ سے شروع کرے گا۔ اور ایسا ہی اس نے مجھے بشارت دی کہ:۔

”مَیں تجھے برکت دوں گا اور بہت برکت دونگا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈینگے“

پھر میں پہلے سلسلہ کی طرف عود کر کے لکھتا ہوں کہ بچپن کے زمانہ میں میری تعلیم اس طرح پر ہوئی کہ جب میں چھ سات سال کا تھا تو ایک فارسی خوان معلّم میرے لئے نوکر رکھا گیا جنہوں نے قرآن شریف اور چند فارسی کتابیں پڑھائیں۔ اور اُس بزرگ کا نام فضل الٰہی تھا۔ اور جب میری عمر قریباً دس برس کے ہوئی تو ایک عربی خوان مولوی صاحب میری تربیت کے لئے مقرر کئے گئے جن کا نام فضل احمد تھا۔ مَیں خیال کرتا ہوں کہ چونکہ میری تعلیم خدا تعالیٰ کے فضل کی ایک ابتدائی تخم ریزی تھی اسلئے ان استادوں کے نام کا پہلا لفظ بھی فضل ہی تھا۔ مولوی صاحب موصوف جو ایک دیندار اور بزرگوار آدمی تھے وہ بہت توجہ اور محنت سے پڑھاتے رہے اور مَیں نے صرف کی بعض کتابیں اور کچھ قواعد نحو اُن سے پڑھے۔ اور بعد اس کے جب مَیں سترہ یا اٹھارہ سال کا ہوا تو ایک اور مولوی صاحب سے چند سال پڑھنے کا اتفاق ہوا اِن کا نام گل علی شاہ تھا۔ ان کو بھی میرے والد صاحب نے

نوکر رکھ کر قادیان میں پڑھانے کے لئے مقرر کیا تھا اور ان آخر الذکر مولوی صاحب سے میں نے نحو اور منطق اور حکمت وغیرہ علومِ مروّجہ کو جہاں تک خدا تعالیٰ نے چاہا حاصل کیا اور بعض طبابت کی کتابیں میں نے اپنے والد صاحب سے پڑھیں اور وہ فن طبابت میں بڑے حاذق طبیب تھے۔ اور اُن دنوں میں مجھے کتابوں کے دیکھنے کی طرف اس قدر توجہ تھی کہ گویا میں دنیا میں نہ تھا۔ میرے والد صاحب مجھے بار بار یہی ہدایت کرتے تھے کہ کتابوں کا مطالعہ کم کرنا چاہیئے کیونکہ وہ نہایت ہمدردی سے ڈرتے تھے کہ صحت میں فرق نہ آوے اور نیز اُن کا یہ بھی مطلب تھا کہ میں اس شغل سے الگ ہو کر اُن کے غموم وہموم میں شریک ہو جاؤں۔ آخر ایسا ہی ہوا۔ میرے والد صاحب اپنے بعض آباؤ اجداد کے دیہات کو دوبارہ لینے کے لئے انگریزی عدالتوں میں مقدمات کر رہے تھے۔ انہوں نے ان ہی مقدمات میں مجھے بھی لگایا۔ اور ایک زمانہ دراز تک میں ان کاموں میں مشغول رہا۔ مجھے افسوس ہے کہ بہت سا وقتِ عزیز میرا ان بے ہودہ جھگڑوں میں ضائع گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی والد صاحب موصوف نے زمینداری امور کی نگرانی میں مجھے لگا دیا۔ میں اس طبیعت اور فطرت کا آدمی نہیں تھا۔ اس لئے اکثر والد صاحب کی ناراضگی کا نشانہ رہتا رہا۔ ان کی ہمدردی اور مہربانی میرے پر نہایت درجہ پر تھی مگر وہ چاہتے تھے کہ دنیاداروں کی طرح مجھے رُو بہ خلق بنا دیں اور میری طبیعت اس طریق سے سخت بیزار تھی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب کمشنر نے قادیان میں آنا چاہا۔ میرے والد صاحب نے بار بار مجھ کو کہا کہ اُن کی پیشوائی کے لئے دو تین کوس جانا چاہیئے مگر میری طبیعت نے نہایت کراہت کی اور میں بیمار بھی تھا اس لئے نہ جا سکا۔ پس یہ امر بھی ان کی ناراضگی کا موجب ہوا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ میں دنیوی امور میں ہر دم غرق رہوں جو مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے نیک نیتی سے نہ دنیا کے لئے بلکہ محض ثوابِ اطاعت حاصل کرنے کے لئے اپنے والد صاحب کی خدمت میں اپنے تئیں محو کر دیا تھا اور اُن کیلئے دُعا میں بھی مشغول رہتا تھا۔ اور مجھے دلی یقین سے برٌّ بالوالدین جانتے تھے اور بسا اوقات کہا کرتے تھے کہ ”میں صرف ترحّم کے طور پر اپنے اس بیٹے کو دنیا کے امور کی طرف توجہ دلاتا ہوں ورنہ میں جانتا ہوں کہ جس طرف اس کی توجہ ہے یعنی دین کی طرف صحیح اور سچ بات یہی ہے ہم تو اپنی عمر ضائع کر رہے ہیں۔“ ایسا ہی ان کے زیرِ سایہ ہونے کے ایّام میں چند سال تک میری عمر کراہتِ طبع کے ساتھ انگریزی ملازمت میں بسر ہوئی۔ آخر چونکہ میرا جدا رہنا میرے والد صاحب پر بہت گراں تھا اس لئے اُن کے حکم سے جو عین میری منشاء کے موافق تھا میں نے استعفاء دے کر اپنے تئیں اس نوکری سے جو میری طبیعت کے مخالف تھی سبکدوش کر دیا۔ اور پھر والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس

تجربہ سے مجھے معلوم ہؤا کہ اکثر نوکری پیشہ نہایت گندی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہونگے جو پورے طور پر صوم وصلوٰۃ کے پابند ہوں اور جو ان ناجائز حظوظ سے اپنے تئیں بچا سکیں جو ابتلاء کے طور پر ان کو پیش آتے رہتے ہیں۔ مَیں ہمیشہ اُن کے مُنّہ دیکھ کر حیران رہا۔ اور اکثر کو ایسا پایا کہ ان کی تمام دلی خواہشیں مال ومتاع تک خواہ حلال کی وجہ سے ہو یا حرام کے ذریعہ سے محدود تھیں اور بہتوں کی دن رات کی کوششیں صرف اسی مختصر زندگی کی دنیوی ترقی کے لئے مصروف پائیں۔ مَیں نے ملازمت پیشہ لوگوں کی جماعت میں بہت کم ایسے لوگ پائے کہ جو محض خدا تعالیٰ کی عظمت کو یاد کر کے اخلاق فاضلہ حلم اور کرم اور عفت اور تواضع اور انکسار اور خاکساری اور ہمدردیٔ مخلوق اور پاک باطنی اور اکل حلال اور صدق مقال اور پرہیزگاری کی صفت اپنے اندر رکھتے ہوں بلکہ بہتوں کو تکبّر اور بدچلنی اور لاپروائی دین اور طرح طرح کے اخلاق رذیلہ میں شیطان کے بھائی پایا۔ اور چونکہ خدا تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ ہر ایک قسم اور ہر ایک نوع کے انسانوں کا مجھے تجربہ حاصل ہو اسلئے ہر ایک صحبت میں مجھے رہنا پڑا۔ اور بقول صاحبِ مثنوی رومی وہ تمام ایّام سخت کراہت اور درد کے ساتھ مَیں نے بسر کئے ؎

من بہر جمعیتے نالاں شدم   جفت خوش حالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من   وز درون من نجست اسرار من

حضرت والد صاحب مرحوم کی خدمت میں پھر حاضر ہؤا تو بدستور انہی زمینداری کے کاموں میں مصروف ہوگیا مگر اکثر حصہ وقت کا قرآن شریف کے تدبّر اور تفسیروں اور حدیثوں کے دیکھنے میں صرف ہوتا تھا اور بسا اوقات حضرت والد صاحب کو وہ کتابیں سُنایا بھی کرتا تھا اور میرے والد صاحب اپنی ناکامیوں کی وجہ سے اکثر مغموم اور مہموم رہتے تھے۔ انہوں نے پیروی مقدمات میں ستّر ہزار روپیہ کے قریب خرچ کیا تھا جس کا انجام آخر ناکامی تھی۔ کیونکہ ہمارے بزرگوں کے دیہات مدت سے ہمارے قبضہ سے نکل چکے تھے اور اُن کا واپس آنا ایک خیالِ خام تھا اسی نامرادی کی وجہ سے حضرت والد صاحب مرحوم ایک نہایت عمیق گرداب غم اور حزن اور اضطراب میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اور مجھے ان حالات کو دیکھ کر ایک پاک تبدیلی پیدا کرنے کا موقعہ حاصل ہوتا تھا۔ کیونکہ حضرت والد صاحب کی تلخ زندگی کا نقشہ مجھے اس بے لوث زندگی کا سبق دیتا تھا جو دنیوی کدورتوں سے پاک ہے۔ اگرچہ حضرت مرزا صاحب کے چند دیہات ملکیت باقی تھے اور سرکار انگریزی کی طرف سے کچھ انعام بھی سالانہ مقرر تھا اور ایّام ملازمت کی پنشن بھی تھی مگر جو

کچھ وہ دیکھ چکے تھے اس لحاظ سے وہ سب کچھ ہیچ تھا۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ مغموم و محزون رہتے تھے۔ اور بارہا کہتے تھے کہ جس قدر میں نے اس پلید دنیا کے لئے سعی کی ہے اگر میں وہ سعی دین کے لئے کرتا تو شاید آج قطب وقت یا غوث وقت ہوتا۔ اور اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

عمر بگذشت و نماندست جز ایامے چند   بہ کہ در یاد کسے صبح کنم شامے چند

اور میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ وہ ایک اپنا بنایا ہوا شعر رقت کے ساتھ پڑھتے تھے اور وہ یہ ہے ؎

از در تو اے کس ہر بیکسے   نیست امیدم کہ روم نا امید

اور کبھی درد دل سے یہ شعر اپنا پڑھا کرتے تھے ؎

بآب دیدۂ عشاق و خاکپائے کسے   مرا دلے ست کہ در خوں تپد بجائے کسے

حضرت عزت جل شانہٗ کے سامنے خالی ہاتھ جانے کی حسرت روز بروز آخری عمر میں اُن پر غلبہ کرتی گئی تھی۔ بارہا افسوس سے کہا کرتے تھے کہ دنیا کے بیہودہ خرخشوں کے لئے میں نے اپنی عمر ناحق ضائع کر دی۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب نے یہ خواب بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ایک بڑی شان کے ساتھ میرے مکان کی طرف چلے آتے ہیں جیسا کہ ایک عظیم الشان بادشاہ آتا ہے تو میں اس وقت آپ کی طرف پیشوائی کے لئے دوڑا۔ جب قریب پہنچا تو میں نے سوچا کہ کچھ نذر پیش کرنی چاہیئے یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا جس میں صرف ایک روپیہ تھا۔ اور جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی کھوٹا ہے یہ دیکھ کر میں چشم پُر آب ہو گیا۔ اور پھر آنکھ کھل گئی۔ اور پھر آپ ہی تعبیر فرمانے لگے کہ دنیا داری کے ساتھ خدا اور رسول کی محبت ایک کھوٹے روپیہ کی طرح ہے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ میری طرح میرے والد صاحب کا بھی آخری حصہ زندگی کا مصیبت اور غم و حزن میں ہی گذرا۔ اور جہاں ہاتھ ڈالا آخر ناکامی تھی۔ اور اپنے والد صاحب یعنی میرے پردادا صاحب کا ایک شعر بھی سُنایا کرتے تھے جس کا ایک مصرعہ راقم کو بھول گیا ہے اور دوسرا یہ ہے کہ۔ ؏

”کہ جب تدبیر کرتا ہوں تو پھر تقدیر ہنستی ہے“

اور یہ غم اور درد اُن کا پیرانہ سالی میں بہت بڑھ گیا تھا۔ اسی خیال سے قریباً چھ ماہ پہلے حضرت والد صاحب نے اس قصبہ کے وسط میں ایک مسجد تعمیر کی جو اس جگہ کی جامع مسجد ہے اور وصیت کی کہ مسجد کے ایک گوشہ میں میری قبر ہو تا خدائے عزّ و جلّ کا نام میرے کان میں پڑتا رہے کیا عجب کہ یہی ذریعہ مغفرت ہو۔ چنانچہ جس دن مسجد کی عمارت بہمہ وجوہ مکمل ہو گئی اور شاید فرش کی چند اینٹیں باقی تھیں کہ حضرت والد صاحب صرف چند روز بیمار رہ کر مرض پیچش سے فوت ہو گئے

اور اس مسجد کے اسی گوشہ میں جہاں انہوں نے کھڑے ہو کر نشان کیا تھا دفن کئے گئے۔ اللّٰھم ارحمه وادخله الجنة۔ آمین۔ قریباً اسّی یا پچاسی برس کے عمر پائی۔

ان کی یہ حسرت کی باتیں کہ مَیں نے کیوں دنیا کے لئے وقت عزیز کھویا اب تک میرے دل پر دردناک اثر ڈال رہی ہیں اور مَیں جانتا ہوں کہ ہر ایک شخص جو دنیا کا طالب ہوگا آخر اس حسرت کو ساتھ لے جائیگا۔ جس نے سمجھنا ہو سمجھے۔ میری عمر قریباً چونتیس یا پینتیس برس کے ہوگی جب حضرت والد صاحب کا انتقال ہوا۔ مجھے ایک خواب میں بتایا گیا تھا کہ اب ان کے انتقال کا وقت قریب ہے۔ مَیں اس وقت لاہور میں تھا جب مجھے یہ خواب آیا تھا۔ تب میں جلدی سے قادیان پہنچا اور ان کو مرض زحیر میں مبتلا پایا۔ لیکن یہ امید ہرگز نہ تھی کہ وہ دوسرے دن میرے آنے سے فوت ہو جائیں گے کیونکہ مرض کی شدت کم ہو گئی تھی۔ اور وہ بڑے استقلال سے بیٹھے رہتے تھے۔ دوسرے دن شدت دوپہر کے وقت ہم سب عزیز ان کی خدمت میں حاضر تھے کہ مرزا صاحب نے مہربانی سے مجھے فرمایا کہ اس وقت تم ذرا آرام کر لو کیونکہ جون کا مہینہ تھا اور گرمی سخت پڑتی تھی۔ مَیں آرام کے لئے ایک چوبارہ میں چلا گیا اور ایک نوکر پَیر دبانے لگا کہ اتنے میں تھوڑی سی غنودگی ہو کر مجھے الہام ہوا "والسماء والطارق یعنی قسم ہے آسمان کی جو قضاء و قدر کا مبدء ہے اور قسم ہے اس حادثہ کی جو آج آفتاب کے غروب کے بعد نازل ہوگا۔ اور مجھے سمجھایا گیا کہ یہ الہام بطور عزا پُرسی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور حادثہ یہ ہے کہ آج ہی تمہارا والد آفتاب کے غروب کے بعد فوت ہو جائے گا۔" سبحان اللہ! کیا شان خداوندِ عظیم ہے کہ ایک شخص جو اپنی عمر ضائع ہونے پر حسرت کرتا ہوا فوت ہوا ہے اُس کی وفات کو عزا پرسی کے طور پر بیان فرماتا ہے۔ اس بات سے اکثر لوگ تعجب کرینگے کہ خدا تعالیٰ کی عزا پُرسی کیا معنی رکھتی ہے۔ مگر یاد رہے کہ حضرت عزّت جلّ شانہٗ جب کسی کو رحمت سے دیکھتا ہے تو ایک دوست کی طرح ایسے معاملات اس سے کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ہنسنا بھی جو حدیثوں میں آیا ہے انہی معنوں کے لحاظ سے ہے۔

اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب مجھے حضرت والد صاحب مرحوم کی وفات کی نسبت اللہ جلّ شانہٗ کی طرف سے یہ الہام ہوا جو مَیں نے ابھی ذکر کیا ہے تو بشریت کی وجہ سے مجھے خیال آیا کہ بعض وجوہ آمدن حضرت والد صاحب کی زندگی سے وابستہ ہیں پھر نہ معلوم کیا کیا ابتلا ہمیں پیش آئیگا۔ تب اُسی وقت یہ دوسرا الہام ہوا:۔

"الیس اللہ بکافٍ عبدہٗ"

یعنی کیا خدا اپنے بندے کو کافی نہیں ہے؟ اور اس الہام نے عجیب سکینت اور اطمینان بخشا اور فولادی میخ کی طرح میرے دل میں دھنس گیا۔ پس مجھے اس خدائے عزّوجلّ کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس نے اپنے اس مبشرانہ الہام کو ایسے طور سے مجھے سچا کرکے دکھلایا کہ میرے خیال اور گمان میں بھی نہ تھا۔ میرا وہ ایسا متکفل ہوا کہ کبھی کسی کا باپ ہرگز ایسا متکفل نہیں ہوگا۔ میرے پر اس کے وہ متواتر احسان ہوئے کہ بالکل محال ہے کہ میں ان کا شمار کرسکوں اور میرے والد صاحب اُسی دن بعد غروب آفتاب فوت ہوگئے - یہ ایک پہلا دن تھا جو میں نے بذریعہ خدا کے الہام کے ایسا رحمت کا نشان دیکھا جس کی نسبت میں خیال نہیں کر سکتا کہ میری زندگی میں کبھی منقطع ہو۔ میں نے اس الہام کو انہی دنوں میں ایک نگینہ میں کھدوا کر اُس کی انگشتری بنائی جو بڑی حفاظت سے اب تک رکھی ہوئی ہے۔ غرض میری زندگی قریب قریب چالیس برس کے زیر سایہ والد بزرگوار کے گذری۔ ایک طرف اُن کا دنیا سے اٹھایا جانا تھا اور ایک طرف بڑے زور شور سے سلسلہ مکالماتِ الٰہیہ کا مجھ سے شروع ہوا۔

(کتاب البریہ صفحہ ۱۶۲ - ۱۹۵ حاشیہ)

باب دوم

دعویٰ

ا ۔ مقام
ب ۔ بعثت کا مقصد
ج ۔ تبلیغ اور اپنی جماعت کو نصائح

"مسیح جو آنے والا تھا یہی ہے چاہو تو قبول کرو۔ جس کسی کے کان سُننے کے ہوں سُنے۔ یہ خدا تعالیٰ کا کام ہے اور لوگوں کی نظروں میں عجیب!"

مقام

"امروز قوم من نشناسد مقامِ من
روزے بگریہ یاد کند وقت خوشترم"

خداوند کریم نے اُسی رسول مقبولؐ کی متابعت اور محبت کی برکت سے اور اپنے پاک کلام کی پیروی کی تاثیر سے اس خاکسار کو اپنے مخاطبات سے خاص کیا ہے۔ اور علوم لدُنّیہ سے سرفراز فرمایا ہے۔ اور بہت سے اسرار مخفیہ سے اطلاع بخشی ہے اور بہت سے حقائق اور معارف سے اس ناچیز کے سینہ کو پُر کر دیا ہے اور بارہا بتلا دیا ہے کہ یہ سب عطیات اور عنایات اور یہ سب تفضّلات اور احسانات اور یہ سب تلطّفات اور توجہات اور یہ سب انعامات اور تائیدات اور یہ سب مکالمات اور مخاطبات بیُمن متابعت و محبت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

جمالِ ہمنشین در من اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(براہین احمدیہ ص ۶۲۳ حاشیہ ۱۱)

مَیں خدا تعالیٰ کے ان تمام الہامات پر جو مجھے ہو رہے ہیں ایسا ہی ایمان رکھتا ہوں جیسا کہ توریت اور انجیل اور قرآن مقدس پر ایمان رکھتا ہوں۔ اور میں اس خدا کو جانتا اور پہچانتا ہوں۔ ...... سو مَیں اس وحی پاک سے ایسا ہی کامل حصہ رکھتا ہوں جیسا کہ خدا تعالیٰ کے کامل قرب کی حالت میں انسان رکھ سکتا ہے۔ جب انسان ایک پُرجوش محبت کی آگ میں ڈالا جاتا ہے جیسا کہ تمام نبی ڈالے گئے تو پھر اس کی وحی کے ساتھ اضغاث احلام نہیں رہتے بلکہ جیسا کہ خشک گھاس تنور میں جل جاتا ہے ویسا ہی وہ تمام اوہام اور نفسانی خیالات جل جاتے ہیں۔ اور خالص خدا کی وحی رہ جاتی ہے۔ اور یہ وحی صرف انہی کو ملتی ہے جو دنیا میں کمال صفا۔ محبت اور محویت کی وجہ سے نبیوں کے رنگ میں ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۰۴ اٹھارویں سطر میں یہ الہام میری نسبت ہے "جری اللّٰہ فی حلل الانبیاء" یعنی خدا کا فرستادہ نبیوں کے حلّہ میں۔ سو مَیں شکّی اور ظنّی الہام کے ساتھ نہیں بھیجا گیا بلکہ یقینی اور قطعی وحی کے ساتھ بھیجا گیا ہوں ...... مجھے اس خدا کی قسم ہے کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ مجھے دلائل قاطعہ سے یہ علم دیا گیا ہے اور ہر ایک وقت میں دیا جاتا ہے کہ جو کچھ مجھے القاء ہوتا ہے اور جو وحی میرے پر نازل ہوتی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے نہ شیطان کی طرف سے۔ مَیں اس پر ایسا ہی یقین رکھتا ہوں جیسا کہ آفتاب اور ماہتاب کے وجود پر۔ یا جیسا کہ اس بات پر کہ

دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ ہاں جب میں اپنی طرف سے کوئی اجتہاد کروں یا اپنی طرف سے کوئی الہام کے معنے کروں تو ممکن ہے کہ کبھی اس معنی میں غلطی بھی کھاؤں۔ مگر میں اس غلطی پر قائم نہیں رکھا جاتا۔ اور خدا کی رحمت جلد تر مجھے حقیقی انکشاف کی راہ دکھا دیتی ہے اور میری رُوح فرشتوں کی گود میں پرورش پاتی ہے۔

(تبلیغ رسالت ہشتم ص۶۴-۶۵)

وجذبنی ربّی الیہ واحسن مثوٰی واسبغ عَلَیَّ من نعماء الدین

اور میرے رب نے اپنی طرف مجھے کھینچ لیا اور مجھے نیک جگہ دی۔ اور اپنی نعمتوں کو مجھ پر کامل کیا۔

ونادنی من تدنسات الدنیا الی حظیرۃ قدسہ واعطانی ما اعطانی

اور مجھے دنیا کی آلودگیوں اور مکروہات سے نکال کر اپنی مقدس جگہ میں لے آیا اور مجھے اُس نے دیا جو کچھ دیا۔

وجعلنی من الملھمین المحدثین۔ فما کان عندی من مال الدنیا وخیلھا

اور مجھے ملہموں اور محدثوں میں سے کر دیا۔ سو میرے پاس دنیا کا مال اور دنیا کے گھوڑے اور دنیا کے سوا

وافراسھا غیر انی اعطیت جیاد الاقلام ورزقت جواھر الکلام

تو نہیں تھے بجز اس کے کہ عمدہ گھوڑے قلموں کے مجھ کو عطا کئے گئے اور کلام کے جواہر مجھ کو دیئے گئے

واعطیت من نور یؤمننی العثار ویبین لی الآثار۔ فھذا الدولۃ

اور وہ نور مجھ کو عطا ہوا جو مجھے لغزش سے بچاتا اور راست روی کے آثار مجھ پر ظاہر کرتا ہے۔ بس اس الٰہی

الالٰھیۃ السماویّۃ وقد أغنتنی وجبرت عیلتی وأضاءتنی ونورت

اور آسمانی دولت نے مجھے غنی کر دیا اور میرے افلاس کا تدارک کیا اور مجھے روشن کیا۔ اور میری

لیلتی وادخلتنی فی المنعمین۔

رات کو منور کر دیا اور مجھے منعموں میں داخل کیا

(نور الحق حصّہ اوّل ص۲۸)

مَیں وہ پانی ہوں کہ آیا آسماں سے وقت پر

مَیں وہ ہوں نورِ خدا جس سے ہُوا دن آشکار

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۱۵)

مَیں کچھ بیان نہیں کر سکتا کہ میرا کونسا عمل تھا جس کی وجہ سے یہ عنایت الٰہی شامل حال ہوئی صرف اپنے اندر یہ احساس کرتا ہوں کہ فطرتاً میرے دل کو خدا تعالیٰ کی طرف وفاداری کے ساتھ ایک

کشش ہے جو کسی چیز کے روکنے سے رُک نہیں سکتی۔ سو یہ اسی کی عنایت ہے۔ میں نے کبھی ریاضات شاقہ بھی نہیں کیں اور نہ زمانہ حال کے بعض صوفیوں کی طرح مجاہدات شدیدہ میں اپنے نفس کو ڈالا اور نہ گوشہ گزینی کے التزام سے کوئی چلّہ کشی کی۔ اور نہ خلاف سنت کوئی ایسا عمل رہبانیت کیا جس پر خدا تعالیٰ کے کلام کو اعتراض ہو بلکہ میں ہمیشہ ایسے فقیروں اور بدعت شعار لوگوں سے بیزار رہا جو انواع و اقسام کے بدعات میں مبتلا ہیں۔ ہاں حضرت والد صاحب کے زمانہ میں ہی جب کہ ان کا زمانہ وفات بہت نزدیک تھا ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک بزرگ معمّر پاک صورت مجھ کو خواب میں دکھائی دیا اور اُس نے یہ ذکر کرکے کہ "کسی قدر روزے انوارِ سماوی کی پیشوائی کے لئے رکھنا سنّتِ خاندانِ نبوت ہے" اِس بات کی طرف اشارہ کیا کہ میں اِس سنّتِ اہلِ بیت رسالت کو بجا لاؤں۔ سو میں نے کچھ مدت تک التزام صوم کو مناسب سمجھا۔ مگر ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اِس امر کو مخفی طور پر بجا لانا بہتر ہے۔ پس میں نے یہ طریق اختیار کیا کہ گھر سے مردانہ نشست گاہ میں اپنا کھانا منگواتا اور پھر وہ کھانا پوشیدہ طور پر بعض یتیم بچّوں کو جن کو میں نے پہلے سے تجویز کرکے وقت پر حاضری کے لئے تاکید کر دی تھی دے دیتا۔ اور اس طرح تمام دن روزہ میں گذارتا اور بجز خدا تعالیٰ کے ان روزوں کی کسی کو خبر نہ تھی۔ پھر دو تین ہفتہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ایسے روزوں سے جو ایک وقت میں پیٹ بھر کر روٹی کھا لیتا ہوں مجھے کچھ بھی تکلیف نہیں بہتر ہے کہ کسی قدر کھانے کو کم کروں۔ سو میں اُس روز سے کھانے کو کم کرتا گیا یہانتک کہ میں تمام رات دن میں صرف ایک روٹی پر کفایت کرتا تھا۔ اور اسی طرح میں کھانے کو کم کرتا گیا یہاں تک کہ شاید صرف چند تولہ روٹی میں سے آٹھ پہر کے بعد میری غذا تھی۔ غالباً آٹھ یا نو ماہ تک میں نے ایسا ہی کیا اور باوجود اس قدر قلّتِ غذا کے کہ دو تین ماہ کا بچہ بھی اس پر صبر نہیں کر سکتا خدا تعالیٰ نے مجھے ہر ایک بلا اور آفت سے محفوظ رکھا۔ اور اس قسم کے روزہ کے عجائبات میں سے جو میرے تجربہ میں آئے وہ لطیف مکاشفات ہیں جو اس زمانہ میں میرے پر کھلے۔ چنانچہ بعض گذشتہ نبیوں کی ملاقاتیں ہوئیں۔ اور جو اعلیٰ طبقہ کے اولیاء اس امت میں گذر چکے ہیں اُن سے ملاقات ہوئی۔ ایک دفعہ عین بیداری کی حالت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معہ حسنین و علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دیکھا اور یہ خواب نہ تھی بلکہ ایک بیداری کی قسم تھی۔ غرض اسی طرح کئی مقدس لوگوں کی ملاقاتیں ہوئیں۔ جن کا ذکر کرنا موجب تطویل ہے اور علاوہ اس کے انوارِ روحانی تمثیلی طور پر برنگ ستون سبز و سُرخ ایسے دلکش و دلستان طور پر

نظر آتے تھے جن کا بیان کرنا بالکل طاقتِ تحریر سے باہر ہے۔ وہ نورانی ستون جو سیدھے آسمان کی طرف گئے ہوئے تھے جن میں سے بعض چمکدار سفید اور بعض سبز اور بعض سُرخ تھے اُن کو دل سے ایسا تعلق تھا کہ ان کو دیکھ کر دل کو نہایت سرور پہنچتا تھا۔ اور دنیا میں کوئی بھی ایسی لذّت نہیں ہوگی جیسا کہ ان کو دیکھ کر دل اور رُوح کو لذّت آتی تھی۔ میرے خیال میں ہے کہ وہ ستون خدا اور بندہ کی محبت کی ترکیب سے ایک تمثیلی صورت میں ظاہر کئے گئے تھے یعنی وہ ایک نور تھا جو دل سے نکلا اور دوسرا وہ نور تھا جو اوپر سے نازل ہؤا اور دونوں کے ملنے سے ایک ستون کی صورت پیدا ہوگئی۔ یہ رُوحانی امور ہیں کہ دنیا ان کو نہیں پہچان سکتی۔ کیونکہ وہ دنیا کی آنکھوں سے بہت دُور ہیں۔ لیکن دنیا میں ایسے بھی ہیں جن کو اِن امور سے خبر ملتی ہے۔

غرض اس مدت تک روزہ رکھنے سے جو میرے پر عجائبات ظاہر ہوئے وہ انواع اقسام کے مکاشفات تھے۔ ایک اور فائدہ مجھے یہ حاصل ہؤا کہ مَیں نے ان مجاہدات کے بعد اپنے نفس کو ایسا پایا کہ مَیں وقتِ ضرورت فاقہ کشی پر زیادہ سے زیادہ صبر کر سکتا ہوں۔ مَیں نے کئی دفعہ خیال کیا کہ اگر ایک موٹا آدمی جو علاوہ فربہی کے پہلوان بھی ہو میرے ساتھ فاقہ کشی کے لئے مجبور کیا جائے تو قبل اس کے کہ مجھے کھانے کے لئے اضطرار ہو وہ فوت ہو جائے۔ اس سے مجھے یہ بھی ثبوت ملا کہ انسان کسی حد تک فاقہ کشی میں ترقی کر سکتا ہے اور جب تک کسی کا جسم ایسا سختی کش نہ ہو جائے میرا یقین ہے کہ ایسا تنعّم پسند روحانی منازل کے لائق نہیں ہو سکتا۔ لیکن مَیں ہر ایک کو یہ صلاح نہیں دیتا کہ ایسا کرے اور نہ مَیں نے اپنی مرضی سے ایسا کیا۔ مَیں نے کئی جاہل درویش ایسے بھی دیکھے ہیں جنہوں نے شدید ریاضتیں اختیار کیں اور آخر یبوست دماغ سے وہ مجنون ہو گئے اور بقیہ عمر اُن کی دیوانہ پن میں گذری یا دوسرے امراض سل اور دق وغیرہ میں مبتلا ہو گئے۔ انسانوں کے دماغی قویٰ ایک طرز کے نہیں ہیں پس ایسے اشخاص جن کے فطرتًا قویٰ ضعیف ہیں اُن کو کسی قسم کا جسمانی مجاہدہ موافق نہیں پڑ سکتا۔ اور جلد تر کسی خطرناک بیماری میں پڑ جاتے ہیں۔ سو بہتر ہے کہ انسان اپنی نفس کی تجویز سے اپنے تئیں مجاہدہ شدیدہ میں نہ ڈالے اور دین العجائز اختیار رکھے۔ ہاں اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی الہام ہو اور شریعتِ غرّا اسلام سے منافی نہ ہو تو اس کو بجا لانا ضروری ہے۔ لیکن آجکل کے اکثر نادان فقیر جو مجاہدات سکھلاتے ہیں اُن کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ پس ان سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

یاد رہے کہ مَیں نے کشف صریح کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ سے اطلاع پا کر جسمانی سختی کشی کا حصہ آٹھ یا نو ماہ تک لیا۔ اور بھوک اور پیاس کا مزہ چکھا اور پھر اس طریق کو علی الدوام بجا لانا چھوڑ دیا۔

اور کبھی کبھی اس کو اختیار بھی کیا۔ یہ تو سب کچھ ہوا لیکن روحانی سختی کشی کا حصہ ہنوز باقی تھا۔ سو وہ حصہ ان دنوں میں مجھے اپنی قوم کے مولویوں کی بد زبانی اور بدگوئی اور تکفیر اور توہین اور ایسا ہی دوسرے جہلاء کے دشنام اور دل آزاری سے مل گیا۔ اور جس قدر یہ حصہ بھی مجھے ملا میری رائے ہے کہ تیرہ سو برس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کم کسی کو ملا ہو گا۔ میرے لئے تکفیر کے فتوے تیار ہو کر مجھے تمام مشرکوں اور عیسائیوں اور دہریوں سے بدتر ٹھہرایا گیا اور قوم کے سفہاء نے اپنے اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ سے مجھے وہ گالیاں دیں کہ اب تک مجھے کسی دوسرے کے سوانح میں ان کی نظیر نہیں ملی۔ سو میں اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں کہ دونوں قسم کی سختی سے میرا امتحان کیا گیا۔ (کتاب البریہ حاشیہ صفحہ ۱۹۵-۲۰۱)

خدا تعالیٰ اس بات کو جانتا ہے اور وہ ہر ایک امر پر بہتر گواہ ہے کہ وہ چیز جو اس کی راہ میں مجھے سب سے پہلے دی گئی وہ **قلب سلیم** تھا یعنی ایسا دل کہ حقیقی تعلّق اس کا بجز خدائے عزّوجلّ کے کسی چیز کے ساتھ نہ تھا۔ میں کسی زمانہ میں جوان تھا اور اب بوڑھا ہوا مگر میں نے کسی حصّہ عمر میں بجز خدائے عزّوجلّ کسی کے ساتھ اپنا حقیقی تعلّق نہ پایا .... اور اس تپش محبت کی وجہ سے میں ہرگز کسی ایسے مذہب پر راضی نہیں ہوا جس کے عقائد خدا تعالیٰ کی عظمت اور وحدانیت کے برخلاف تھے یا کسی قسم کی توہین کو مستلزم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی مذہب مجھے پسند نہ آیا کیونکہ اس کے ہر ایک قدم میں خدائے عزّوجلّ کی توہین ہے ....

اسی طرح ہندو مذہب جس کی ایک شاخ آریہ مذہب ہے وہ سچائی کی حالت سے بالکل گرا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک اس جہان کا ذرّہ ذرّہ قدیم ہے جن کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں۔ پس ہندوؤں کو اس خدا پر ایمان نہیں جس کے بغیر کوئی چیز ظہور میں نہیں آئی اور جس کے بغیر کوئی چیز قائم نہیں رہ سکتی .... غرض میں نے خوب غور سے دیکھا کہ یہ دونوں مذاہب راستبازی کے مخالف ہیں اور خدا تعالیٰ کی راہ میں جس قدر ان مذاہب میں روکیں اور نومیدی پائی جاتی ہے میں سب کو اس رسالہ میں لکھ نہیں سکتا صرف بطور خلاصہ لکھتا ہوں کہ وہ خدا جس کو پاک روحیں تلاش کرتی ہیں اور جس کو پانے سے انسان اسی زندگی میں نجات پا سکتا ہے اور اس پر انوار الٰہی کے دروازے کھل سکتے ہیں اور اس کی کامل معرفت کے ذریعہ سے کامل محبت پیدا ہو سکتی ہے اُس خدا کی طرف یہ دونوں مذہب رہبری نہیں کرتے اور ہلاکت کے گڑھے میں ڈالتے ہیں۔ ایسا ہی ان کے مشابہ دنیا میں اور مذاہب بھی پائے جاتے ہیں مگر یہ سب مذاہب خدائے واحد لاشریک

تک نہیں پہنچا سکتے اور طالب کو تاریکی میں چھوڑتے ہیں۔

یہ وہ تمام مذاہب ہیں جن میں غور کرنے کے لئے مَیں نے ایک بڑا حصہ عمر کا خرچ کیا۔ اور نہایت دیانت اور تدبّر سے ان کے اصولوں میں غور کی مگر سب کو حق سے دُور اور مہجور پایا۔ ہاں یہ مبارک مذہب جس کا نام اسلام ہے وہی ایک مذہب ہے جو خدا تعالیٰ تک پہنچاتا ہے اور وہی ایک مذہب ہے جو انسانی فطرت کے پاک تقاضوں کو پورا کرنے والا ہے ....

..... اسلام کا خدا کسی پر اپنے فیض کا دروازہ بند نہیں کرتا بلکہ اپنے دونوں ہاتھوں سے بُلا رہا ہے، کہ میری طرف آؤ۔ اور جو لوگ پورے زور سے اس کی طرف دوڑتے ہیں اُن کے لئے دروازہ کھولا جاتا ہے۔

سو مَیں نے خدا کے فضل سے نہ اپنے کسی ہنر سے اس نعمت سے کامل حصّہ پایا ہے جو مجھ سے پہلے نبیوں اور رسولوں اور خدا کے برگزیدوں کو دی گئی تھی۔ اور میرے لئے اس نعمت کا پانا ممکن نہ تھا اگر مَیں اپنے سید و مولیٰ فخر الانبیاء اور خیر الوریٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہوں کی پیروی نہ کرتا۔ سو مَیں نے جو کچھ پایا اس پیروی سے پایا اور مَیں اپنے سچے اور کامل علم سے جانتا ہوں کہ کوئی انسان بجز پیروی اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ معرفت کاملہ کا حصّہ پا سکتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص۵۷ تا ۶۲)

بعض نادانوں کا یہ خیال کہ گویا مَیں نے افترا کے طور پر الہام کا دعویٰ کیا ہے غلط ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ کام اس قادر خدا کا ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور اس جہان کو بنایا ہے جس زمانے میں لوگوں کا ایمان خدا پر کم ہو جاتا ہے اس وقت میرے جیسا ایک انسان پیدا کیا جاتا ہے اور خدا اس سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے اپنے عجائب کام دکھلاتا ہے۔ یہاں تک لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ خدا ہے۔ مَیں عام اطلاع دیتا ہوں کہ کوئی انسان خواہ ایشیائی ہو خواہ یورپین اگر میری صحبت میں رہے تو وہ ضرور کچھ عرصہ کے بعد میری ان باتوں کی سچائی معلوم کرے گا۔

(اشتہار ص۱۶۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۹۷ء مندرجہ کتاب البریہ)

جب تیرھویں صدی کا آخیر ہوا اور چودھویں صدی کا ظہور ہونے لگا تو خدا تعالیٰ نے الہام کے ذریعہ سے مجھے خبر دی کہ تو اس صدی کا مجدد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ الہام ہوا کہ:۔

"اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ اٰبَاءُھُمْ
وَلِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ۔ قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ"

یعنی خدا تعالیٰ نے تجھے قرآن سکھلایا اور اُس کے صحیح معنے تیرے پر کھول دیئے۔ یہ اس لئے ہُوا کہ تا تو لوگوں کو بد انجام سے ڈرا دے کہ جو باعث پُشت در پُشت کی غفلت اور نہ متنبہ کئے جانے کے غلطیوں میں پڑ گئے۔ اور تا اُن مجرموں کی راہ کھل جائے کہ جو ہدایت پہنچنے کے بعد بھی راہِ راست کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔ ان کو کہدے کہ مَیں مامور من اللہ اور اوّل المومنین ہوں۔

(کتاب البریہ حاشیہ ص۲۰۱)

امابعد واضح ہو کہ موافق اس سنّت غیر متبدلہ کے ہر یک غلبہ تاریکی کے وقت خدا تعالےٰ اِس امتِ مرحومہ کی تائید کے لئے توجہ فرماتا ہے اور مصلحت عامہ کے لئے کسی اپنے بندہ کو خاص کر کے تجدید دین متین کے لئے مامور فرما دیتا ہے۔ یہ عاجز بھی اس صدی کے سر پر خدا تعالیٰ کی طرف سے مجدّد کا خطاب پا کر مبعوث ہُوا۔ اور جس نوع اور قسم کے فتنے دنیا میں پھیل رہے تھے اُن کے رفع اور دفع اور قلع قمع کے لئے وہ علوم اور وسائل اس عاجز کو عطا کئے گئے کہ جب تک خاص عنایت الٰہی ان کو عطا نہ کرے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتے۔

(کراماتُ الصادقین ص۳)

جب خدا تعالیٰ نے زمانہ کی موجودہ حالت کو دیکھکر اور زمین کو طرح طرح کے فسق اور معصیت اور گمراہی سے بھرا ہُوا پا کر مجھے تبلیغ حق اور اصلاح کے لئے مامور فرمایا اور یہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ .... اِس دنیا کے لوگ تیرھویں صدی ہجری کو ختم کر کے چودھویں صدی کے سر پر پہنچ گئے تھے تب مَیں نے اس حکم کی پابندی سے عام لوگوں میں بذریعہ تحریری اشتہارات اور تقریروں کے یہ ندا کرنی شروع کی کہ اس صدی کے سر پر جو خدا کی طرف سے تجدید دین کے لئے آنے والا تھا وہ مَیں ہی ہوں تا وہ ایمان جو زمین پر سے اُٹھ گیا ہے اُس کو دوبارہ قائم کروں اور خدا سے قوت پا کر اسی کے ہاتھ کی کشش سے دنیا کو صلاح اور تقویٰ اور راستبازی کی طرف کھینچوں۔ اور اُن کی اعتقادی اور عملی غلطیوں کو دور کروں اور پھر جب اس پر چند سال گذرے تو بذریعہ وحی الٰہی میرے پر بتصریح کھولا گیا کہ وہ مسیح جو اُمت کے لئے ابتداء سے موعود تھا اور وہ آخری مہدی جو تنزل اسلام کے وقت اور گمراہی کے پھیلنے کے زمانہ میں براہِ راست خدا سے ہدایت پانے والا اور اس آسمانی مائدہ کو نئے سرے انسانوں کو آگے پیش کرنے والا تقدیر الٰہی میں مقرر کیا گیا تھا جس کی بشارت آج سے تیرہ سو برس پہلے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دی تھی وہ مَیں ہی ہوں اور مکالماتِ الٰہیہ اور مخاطباتِ رحمانیہ

اس صفائی اور تواتر سے اس بارے میں ہوئے کہ شک و شبہ کی جگہ نہ رہی۔ ہر ایک وحی جو ہوتی ایک فولادی میخ کی طرح دل میں دھنستی تھی اور یہ تمام مکالماتِ الٰہیہ ایسی عظیم الشان پیشگوئیوں سے بھرے ہوئے تھے کہ روز روشن کی طرح وہ پوری ہوتی تھیں۔ اور اُن کے تواتر اور کثرت اور اعجازی طاقتوں کے کرشمہ نے مجھے اس بات کے اقرار کے لئے مجبور کیا کہ یہ اُسی وحدہٗ لاشریک خدا کا کلام ہے جس کا کلام قرآن شریف ہے۔ اور میں اس جگہ توریت اور انجیل کا نام نہیں لیتا کیونکہ توریت اور انجیل تحریف کرنے والوں کے ہاتھوں سے اس قدر محرّف و مبدّل ہوگئی ہیں کہ اب ان کتابوں کو خدا کا کلام نہیں کہہ سکتے۔ غرض وہ خدا کی وحی جو میرے پر نازل ہوئی ایسی یقینی اور قطعی ہے کہ جس کے ذریعہ سے میں نے اپنے خدا کو پایا اور وہ وحی نہ صرف آسمانی نشانوں کے ذریعہ مرتبہ حق الیقین تک پہنچی بلکہ ہر ایک حصّہ اس کا جب خدا تعالیٰ کے کلام قرآن شریف پر پیش کیا گیا تو اس کے مطابق ثابت ہوا اور اس کی تصدیق کے لئے بارش کی طرح نشانِ آسمانی برسے۔

(تذکرۃ الشہادتین ص۱،۲)

بخدمت امراء و رئیسان و منعمان ذی مقدرت و والیان ارباب حکومت و منزلت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - نحمدہٗ و نصلّی علی رسولہ الکریم

اے بزرگانِ اسلام! خدا تعالیٰ آپ لوگوں کے دلوں میں تمام فرقوں سے بڑھ کر نیک ارادے پیدا کرے اور اس نازک وقت میں آپ لوگوں کو اپنے پیارے دین کا سچا خادم بناوے۔ میں اس وقت محض للہ اس ضروری امر سے اطلاع دیتا ہوں کہ مجھے خدا تعالیٰ نے اس چودھویں صدی کے سر پر اپنی طرف سے **مامور** کر کے دینِ متین اسلام کی تجدید اور تائید کے لئے بھیجا ہے تاکہ میں اس پُر آشوب زمانہ میں قرآن کی خوبیاں اور حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمتیں ظاہر کروں اور ان تمام دشمنوں کو جو اسلام پر حملہ کر رہے ہیں ان نوروں اور برکات اور خوارق اور علومِ لدنّیہ کی مدد سے جواب دوں جو مجھ کو عطا کئے گئے ہیں۔

(برکات الدعاء ص۲۴)

اور مصنف کو اس بات کا بھی علم دیا گیا ہے کہ وہ **مجدّدِ وقت** ہے اور روحانی طور پر اُس کے کمالات مسیح بن مریم کے کمالات سے مشابہ ہیں اور ایک کو دوسرے سے بشدّت مناسبت و مشابہت ہے۔ اور اس کو خواص انبیاء و رسل کے نمونہ پر محض بہ برکت متابعت حضرت

خیر البشر افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم ان بہتوں پر اکابر اولیاء سے نفیلت دی گئی ہے کہ جو اس سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اور اس کے قدم پر چلنا موجب نجات و سعادت و برکت اور اس کے برخلاف چلنا موجب بُعد و حرمان ہے۔

(اشتہار منسلکہ آئینۂ کمالاتِ اسلام ص۶۵۷)

ایک مرتبہ الہام ہوا جس کے معنے یہ تھے کہ ملاء اعلیٰ کے لوگ خصومت میں ہیں۔ یعنی ارادۂ الٰہی احیائے دین کے لئے جوش میں ہے لیکن ہنوز ملاء اعلیٰ پر شخص مُحیی کی تعین ظاہر نہیں ہوئی اس لئے وہ اختلاف میں ہے۔ اس اثناء میں خواب میں دیکھا کہ لوگ ایک مُحیی کو تلاش کرتے پھرتے ہیں اور ایک شخص اس عاجز کے سامنے آیا۔ اور اشارہ سے اُس نے کہا۔

"ھٰذا رجلٌ یحب رسول اللّٰہ"

یعنی یہ وہ آدمی ہے جو رسول اللہ سے محبت رکھتا ہے۔ اور اس قول سے یہ مطلب تھا کہ شرطِ اعظم اس عہدہ کی محبتِ رسولؐ ہے سو اس شخص میں متحقق ہے۔

(براہین احمدیہ ص۵۰۶ حاشیہ در حاشیہ ۳)

یہ زمانہ جس میں ہم ہیں یہ وہی زمانہ ہے جس میں دشمنوں کی طرف سے ہر یک قسم کی بدزبانی کمال تک پہنچ گئی ہے اور بدگوئی اور عیب گیری اور افترا پردازی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب اس سے بڑھ کر ممکن نہیں اور ساتھ اس کے مسلمانوں کی اندرونی حالت بھی نہایت خطرناک ہوگئی ہے۔ صدہا بدعات اور انواع و اقسام کے شرک اور الحاد اور انکار ظہور میں آرہے ہیں۔ اسلئے قطعی یقینی طور پر اب یہ وہی زمانہ ہے جس میں پیشگوئی مطہرک من الذین کے مطابق عظیم الشان مصلح پیدا ہو۔ سو الحمد للہ کہ وہ **مَیں ہوں**۔

(تریاق القلوب ص۱۴۳ حاشیہ ایڈیشن اوّل)

مَیں ہر ایک مسلمان کی خدمت میں نصیحتاً کہتا ہوں کہ اسلام کے لئے جاگو کہ اسلام سخت فتنہ میں پڑا ہے۔ اس کی مدد کرو کہ اب یہ غریب ہے۔ اور مَیں اس لئے آیا ہوں اور مجھے خدا تعالیٰ نے علم قرآن بخشا ہے اور حقائق معارف اپنی کتاب کے میرے پر کھولے ہیں اور خوارق مجھے عطا کئے ہیں سو میری طرف آؤ تا اس نعمت سے تم بھی حصّہ پاؤ۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ مَیں خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ کیا ضرور نہ تھا کہ ایسی عظیم الفتن صدی کے سر پر جس کی کھلی کھلی آفات ہیں ایک مجدّد کھلے کھلے دعویٰ کے ساتھ آتا۔ سو عنقریب میرے کاموں کے ساتھ تم مجھے شناخت کرو گے۔ ہر ایک جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا اس وقت کے علماء کی ناسمجھی

اس کی سدّراہ ہوئی۔ آخر جب وہ پہچانا گیا تو اپنے کاموں سے پہچانا گیا کہ تلخ درخت شیریں پھل نہیں لاسکتا اور خدا غیر کو وہ برکتیں نہیں دیتا جو خاصوں کو دی جاتی ہیں۔ اے لوگو! اسلام نہایت ضعیف ہوگیا ہے اور اعدائے دین کا چاروں طرف سے محاصرہ ہے۔ اور تین ہزار سے زیادہ مجموعہ اعتراضات کا ہوگیا ہے۔ ایسے وقت میں ہمدردی سے اپنا ایمان دکھاؤ۔ اور مردانِ خدا میں جگہ پاؤ۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

(برکات الدعاء ص ۳۶-۳۷)

اس زمانہ کے مجدّد کا نام مسیح موعود رکھنا اس مصلحت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ اس مجدّد کا عظیم الشان کام عیسائیت کا غلبہ توڑنا اور ان کے حملوں کو دفع کرنا اور ان کے فلسفہ کو جو مخالفِ قرآن ہے دلائل قویہ کے ساتھ توڑنا اور ان پر اسلام کی حجت پوری کرنا ہے کیونکہ سب سے بڑی آفت اس زمانہ میں اسلام کے لئے جو بغیر تائید الٰہی دُور نہیں ہوسکتی عیسائیوں کے فلسفیانہ حملے اور مذہبی نکتہ چینیاں ہیں جن کے دُور کرنے کے لئے ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی آوے

(آئینہ کمالات اسلام ص ۳۴۱)

مسلمانوں اور عیسائیوں کا کسی قدر اختلاف کے ساتھ یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم اسی عنصری وجود سے آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں اور پھر وہ کسی زمانہ میں آسمان سے اُتریں گے۔ میں اس خیال کا غلط ہونا اپنے اسی رسالہ میں لکھ چکا ہوں اور نیز یہ بھی بیان کرچکا ہوں کہ اس نزول سے مراد درحقیقت مسیح بن مریم کا نزول نہیں بلکہ استعارہ کے طور پر ایک **مثیلِ مسیح** کے آنے کی خبر دی گئی ہے جسکا مصداق حسب اعلام و الہام الٰہی یہی عاجز ہے۔

(توضیح مرام ص ۱)

مَیں ان تمام امور پر ایمان رکھتا ہوں جو قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ میں درج ہیں اور مجھے مسیح ابن مریم ہونے کا دعویٰ نہیں اور نہ میں تناسخ کا قائل ہوں بلکہ مجھے تو فقط مثیلِ مسیح ہونے کا دعویٰ ہے۔ جس طرح محدثیت نبوت سے مشابہ ہے ویسا ہی میری روحانی حالت مسیح ابن مریم کی روحانی حالت سے اشد درجہ کی مشابہت رکھتی ہے۔ غرض مَیں ایک مسلمان ہوں ایھا المسلمون انا منکم و امامکم منکم بامر اللّٰہ تعالیٰ۔ خلاصہ کلام یہ کہ مَیں محدث اللہ ہوں اور مامور من اللہ ہوں اور باینہمہ مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہوں جو صدی چہاردہم کے لئے مسیح ابن مریم کی خصلت اور رنگ میں مجدد دین ہو کر ربّ السمٰوٰت والارض کی طرف سے آیا ہوں۔ مَیں مفتری نہیں ہوں وقد خاب من افتریٰ۔ خدا تعالیٰ نے دنیا پر نظر کی اور اس کو ظلمت میں پایا اور مصلحتِ عباد کیلئے اپنے عاجز بندہ کو خاص کر دیا۔ کیا تمہیں اس سے کچھ تعجب ہے کہ وعدہ کے موافق صدی کے سر پر ایک مجدد بھیجا گیا اور جس نبی کے رنگ میں چاہا خدا تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا۔ کیا ضرور نہ تھا کہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی

پوری ہو تو؟ بھائیو! میں مصلح ہوں بدعتی نہیں اور معاذ اللہ میں کسی بدعت کے پھیلانے کیلئے نہیں آیا حق کے اظہار کے لئے آیا ہوں اور ہر ایک بات جس کا اثر اور نشان قرآن اور حدیث میں پایا نہ جائے اس کے برخلاف ہو وہ میرے نزدیک الحاد اور بے ایمانی ہے۔ مگر ایسے لوگ تھوڑے ہیں جو کلام الٰہی کی تہ تک پہنچتے اور ربّانی پیشگوئیوں کے باریک بھیدوں کو سمجھتے ہیں۔ میں نے دین میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں کی۔ بھائیو! میرا وہی دین ہے جو تمہارا دین ہے۔ اور وہی رسول کریم میرا مقتداء ہے جو تمہارا مقتدا ہے۔ اور وہی قرآن شریف میرا ہادی ہے اور میرا پیارا اور میری دستاویز ہے جس کا ماننا تم پر بھی فرض ہے۔ ہاں یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ میں حضرت مسیح ابن مریم کو فوت شدہ اور داخلِ موتیٰ یقین رکھتا ہوں اور جو آنے والے مسیح کے بارے میں پیشگوئی ہے وہ اپنے حق میں یقینی اور قطعی طور پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ لیکن اے بھائیو! یہ اعتقاد میں اپنی طرف سے اور اپنے خیال سے نہیں رکھتا بلکہ خداوند کریم جلّ شانہٗ نے اپنے الہام و کلام کے ذریعہ سے مجھے اطلاع دے دی ہے کہ مسیح ابن مریم کے نام پر آنے والا تو ہی ہے اور مجھ پر قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کے وہ دلائل یقینی کھول دیئے ہیں جن سے بتمام یقین وقطع حضرت عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کا فوت ہو جانا ثابت ہوتا ہے۔ اور مجھے اس قادر مطلق نے بار بار اپنے کلام خاص سے مشرف اور مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ آخری زمانہ کی یہودیت دُور کرنے کیلئے تجھے عیسیٰ ابن مریم کے رنگ اور کمال میں بھیجا گیا ہے۔ سو میں استعارہ کے طور پر ابن مریم موعود ہوں جس کا یہودیت کے زمانہ اور تنصّر کے غلبہ میں آنے کا وعدہ تھا جو غربت اور روحانی قوت اور روحانی اسلحہ کے ساتھ ظاہر ہوا۔

(تبلیغ رسالت جلد دوم ص۲۱)

جب تم مسیح کا مُردوں میں داخل ہونا ثابت کر دو گے تو اس دن تم سمجھ لو کہ آج عیسائی مذہب دنیا سے رخصت ہوا۔ یقیناً سمجھو کہ جب تک ان کا خدا فوت نہ ہو ان کا مذہب بھی فوت نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری تمام بحثیں اُن کے ساتھ عبث ہیں۔ ان کے مذہب کا ایک ہی ستون ہے اور وہ یہ ہے کہ ابھی تک مسیح ابن مریم آسمان پر زندہ بیٹھا ہے۔ اس ستون کو پاش پاش کرو پھر نظر اٹھا کر دیکھو کہ عیسائی مذہب دنیا میں کہاں ہے۔ چونکہ خدا تعالیٰ بھی یہ چاہتا ہے کہ اس ستون کو ریزہ ریزہ کر کے اور یورپ اور ایشیا میں توحید کی ہوا چلا دے۔ اسی لئے اُس نے مجھے بھیجا اور میرے پر اپنے خاص الہام سے ظاہر کیا کہ مسیح ابن مریم فوت ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس کا الہام یہ ہے کہ مسیح ابن مریم رسول اللہ فوت ہو چکا ہے اور اس کے رنگ میں ہو کر وعدہ کے موافق تو آیا ہے۔ وکان وعد اللہ مفعولاً۔ انت معی وانت علی الحق المبین۔ وانت معینٌ

و مصیب للحق۔

مَیں نے اس کتاب میں نہایت زبردست ثبوتوں سے مسیح کا فوت ہو جانا اور اموات میں داخل ہونا ثابت کر دیا ہے اور مَیں نے بداہت کی حد تک اس بات کو پہنچا دیا ہے کہ مسیح زندہ ہو کر جسم عنصری کے ساتھ ہرگز آسمان کی طرف اُٹھایا نہیں گیا بلکہ اور نبیوں کی موت کی طرح اس پر بھی موت آئی اور دائمی طور پر وہ اس جہان سے رخصت ہوا۔ اگر کوئی مسیح کا ہی پرستار ہے تو سمجھ لے کہ وہ مر گیا اور مرنے والوں کی جماعت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو گیا۔ سو تم تائیدِ حق کے لئے اِس کتاب سے فائدہ اُٹھاؤ۔ اور سرگرمی کے ساتھ پادریوں کے مقابل پر کھڑے ہو جاؤ۔ چاہیئے کہ یہی ایک مسئلہ ہمیشہ تمہارے زیر توجہ اور پورا بھروسہ کرنے کے لائق ہو جو درحقیقت مسیح ابن مریم فوت شدہ گروہ میں داخل ہے۔

(ازالہ اوہام صـــ ۳۰۲)

یہ برگزیدہ نبیؐ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے اور اس کے ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے خدا نے یہ بنیاد ڈالی ہے کہ اس کے افاضہ تشریعی اور روحانی کو **قیامت تک** جاری رکھا۔ اور آخر کار اس کی روحانی فیض رسانی سے اِس **مسیح موعود** کو دنیا میں بھیجا جس کا آنا **اسلامی عمارت کی تکمیل** کیلئے ضروری تھا۔ کیونکہ ضرور تھا کہ یہ دنیا ختم نہ ہو جب تک کہ محمدی سلسلہ کے لئے ایک **مسیح** روحانی رنگ کا نہ دیا جاتا جیسا کہ موسوی سِلسلہ کے لئے دیا گیا تھا اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم۔ موسیٰ نے وہ متاع پائے جس کو قرونِ اولیٰ کھو چکے تھے۔ اور حضرت **محمد** صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ متاع پائے جس کو موسیٰ کا سِلسلہ کھو چکا تھا۔ اب محمدی سِلسلہ موسوی سِلسلہ کے قائم مقام ہے مگر شان میں ہزارہا درجہ بڑھ کر۔ مثیلِ موسیٰ موسیٰ سے بڑھکر اور مثیل ابن مریم ابن مریم سے بڑھکر۔ اور وہ مسیح موعود نہ صرف مدت کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چودھویں صدی میں ظاہر ہوا جیسا کہ مسیح ابن مریم موسیٰ کے بعد چودھویں صدی میں ظاہر ہوا تھا بلکہ وہ ایسے وقت میں آیا جب کہ مسلمانوں کا وہی حال تھا جیسا کہ مسیح ابن مریم کے ظہور کے وقت یہودیوں کا حال تھا۔ **سو وہ مَیں ہی ہوں**۔ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ نادان ہے وہ جو اس سے لڑے۔ اور جاہل ہے وہ جو اس کے مقابل پر یہ اعتراض کرے کہ یوں نہیں بلکہ یُوں چاہیئے تھا اور اُس نے مجھے چمکتے ہوئے نشانوں کے ساتھ بھیجا ہے جو دس ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔

(کشتی نوح صـــ ۱۳-۱۴)

اگر یہ استفسار ہو کہ جس خاصیت اور قوتِ روحانی میں یہ عاجز اور مسیح بن مریم مشابہت رکھتے

ہیں۔ وہ کیا شئے ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک مجموعی خاصیت ہے جو ہم دونوں کے روحانی قویٰ میں ایک خاص طور پر رکھی گئی ہے جس کے سلسلہ کی ایک طرف نیچے کو اور ایک طرف اوپر کو جاتی ہے نیچے کی طرف سے مراد وہ اعلیٰ درجہ کی دلسوزی اور غم خواری خلق اللہ ہے جو داعی الی اللہ اور اس کے مستعد شاگردوں میں ایک نہایت مضبوط تعلق اور جوڑ بخش کر نورانی قوت کو جو داعی الی اللہ کے نفس پاک میں موجود ہے ان تمام سر سبز شاخوں میں پھیلاتی ہے۔ اوپر کی طرف سے مراد وہ اعلیٰ درجہ کی محبت قوی ایمان سے ملی ہوئی ہے جو اوّل بندہ کے دل میں بارادۂ الٰہی پیدا ہو کر ربّ قدیر کی محبت کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور پھر ان دونوں محبتوں کے ملنے سے جو درحقیقت نر اور مادہ کا حکم رکھتی ہیں ایک مستحکم رشتہ اور ایک شدید مواصلت خالق اور مخلوق میں پیدا ہو کر الٰہی محبت کی چمکنے والی آگ سے جو مخلوق کی ہیزم مثال محبت کو پکڑ لیتی ہے ایک تیسری چیز پیدا ہو جاتی ہے جس کا نام رُوح القدس ہے۔

(توضیح مرام ص ۱۱)

خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں مگر مسیح ایک اَور بھی ہے جو اس وقت بول رہا ہے۔ خدا کی غیرت دکھلا رہی ہے کہ اس کا کوئی ثانی نہیں مگر **انسان کا ثانی** موجود ہے۔ اُس نے **مجھے بھیجا** تا میں اندھوں کو آنکھیں دوں۔ جو نہ چند سال سے بلکہ **انیس سو** ۱۹۰۰ برس سے برابر اندھے چلے آتے ہیں۔

(الاشتہار مستیقنًا بوحی اللہ القہار ص ۲)

اِس زمانہ میں گندی تحریروں کے ذریعہ سے اس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی توہین کی گئی ہے کہ کبھی کسی زمانے میں کسی نبی کی توہین نہیں ہوئی۔ . . . . اور درحقیقت یہ ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ شیطان اپنے تمام ذرّیات کے ساتھ ناخنوں تک زور لگا رہا ہے کہ اسلام کو نابود کر دیا جائے۔ اور چونکہ بلاشبہ سچائی کا جھوٹ کے ساتھ یہ **آخری جنگ** ہے۔ اس لئے یہ زمانہ بھی اس بات کا حق رکھتا تھا کہ اس کی اصلاح کے لئے کوئی خدا کا مامور آوے۔ پس وہ **مسیح موعود ہے جو موجود ہے**۔ اور زمانہ حق رکھتا تھا کہ اس نازک وقت میں آسمانی نشانوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کی دنیا پر **حجّت** پوری ہو۔ سو **آسمانی نشان** ظاہر ہو رہے ہیں اور آسمان جوش میں ہے کہ اس قدر آسمانی نشان ظاہر کرے کہ اسلام کی **فتح کا نقّارہ** ہر ایک ملک میں اور ہر یک حصہ دنیا میں بج جائے۔ اے قادر خدا! تُو جلد وہ دن لا کہ جس فیصلہ کا تُو نے ارادہ کیا ہے وہ ظاہر ہو جائے اور دنیا میں **تیرا جلال** چمکے اور تیرے دین اور تیرے **رسول کی فتح** ہو۔ آمین ثم آمین۔

(چشمۂ معرفت ص ۸۶-۸۷)

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں اخلاقی قوتوں کی تربیت کروں۔ چونکہ یہ سارا سلسلہ اور ساری کارروائی مسیحی رنگ اپنے اندر رکھتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے میرا نام مسیح موعود رکھا۔ اب جبکہ مَیں نے اس حد تک بات کو پہنچایا ہے تو مَیں مانتا ہوں کہ مسیحی بھی میرے مخالف ہونگے لیکن میں کسی کی مخالفت سے کب ڈر سکتا ہوں جب کہ خدا نے مجھے مامور کرکے بھیجا ہے۔ اگر یہ دعویٰ میری اپنی تراشی ہوئی بات ہوتی تو مجھے ایک ادنیٰ سی مخالفت بھی تھکا کر بٹھا دیتی۔ مگر یہ میرے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے ہر سلیم الفطرت کو جس طرح وہ چاہے سمجھانے کیلئے میں تیار ہوں اور اُسکی تسلّی کے لئے ہر جائز اور مسنون راہ میں اختیار کر سکتا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جس کے لئے مسلمان اپنے اعتقاد کے موافق اور عیسائی اپنے خیال پر منتظر تھے۔ یہی وہ وقت تھا جس کا وعدہ تھا۔ اب آنے والا آ گیا۔ خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔ خدا تعالیٰ اپنے بھیجے ہوئے لوگوں کی تائید میں زبردست نشان ظاہر کیا کرتا ہے اور دلوں کو منوا دیتا ہے۔ جو کچھ مسیح موعود کیلئے مقدّر تھا وہ ہو گیا۔ اب کوئی مانے نہ مانے مسیح موعود آ گیا اور **وہ مَیں ہوں۔**

(ملفوظات جلد دوم ص۲۸۵)

مَیں نہیں چاہتا کہ ایک بُت کی طرح میری پوجا کی جائے۔ مَیں صرف اس خدا کا جلال چاہتا ہوں جس کی طرف سے مَیں مامور ہوں۔ جو شخص مجھے بے عزّتی سے دیکھتا ہے وہ اس خدا کو بے عزّتی سے دیکھتا ہے جس نے مجھے مامور کیا ہے۔ اور جو مجھے قبول کرتا ہے وہ اس خدا کو قبول کرتا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ انسان میں اس سے زیادہ کوئی خوبی نہیں کہ تقویٰ کی راہ کو اختیار کرکے مامور من اللہ کی لڑائی سے پرہیز کرے اور اس شخص کی جلدی سے تکذیب نہ کرے جو کہتا ہے کہ مَیں مامور من اللہ ہوں اور محض تجدید دین کے لئے صدی کے سر پر بھیجا گیا ہوں۔ ایک متقی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اس چودھویں صدی کے سر پر جس میں ہزاروں حملے اسلام پر ہوئے ایک ایسے مجدد کی ضرورت تھی کہ اسلام کی حقیقت ثابت کرے۔ ہاں اس مجدّد کا نام اس لئے مسیح ابن مریم رکھا گیا کہ وہ کسر صلیب کے لئے آیا ہے اور خدا اس وقت چاہتا ہے کہ جیسا کہ مسیح کو پہلے زمانہ میں **یہودیوں کی صلیب سے** نجات دی تھی اب **عیسائیوں کی صلیب** سے بھی اس کو نجات دے۔ چونکہ عیسائیوں نے انسان کو خدا بنانے کے لئے بہت کچھ افترا کیا ہے اس لئے خدا کی غیرت نے چاہا کہ مسیح کے نام پر ہی ایک شخص کو مامور کرکے اس افترا کو نیست و نابود کرے۔ یہ خدا کا کام ہے اور ان لوگوں کی نظر میں عجیب۔

(انجام آتھم ص ۳۲۰-۳۲۱)

چونکہ میں مسیح موعود ہوں اور خدا نے عام طور پر میرے لئے آسمان سے نشان ظاہر کئے ہیں

پس جس شخص پر میرے مسیح موعود ہونے کے بارہ میں خدا کے نزدیک اتمام حجت ہو چکا ہے۔ اور میرے دعویٰ پر وہ اطلاع پا چکا ہے وہ قابلِ مواخذہ ہوگا۔ کیونکہ خدا کے فرستادوں سے دانستہ مُنہ پھیرنا ایسا امر نہیں ہے کہ اس پر کوئی گرفت نہ ہو۔ اس گناہ کا دادخواہ میں نہیں ہوں۔ بلکہ ایک ہی ہے جس کی تائید کے لئے میں بھیجا گیا۔ یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جو شخص مجھے نہیں مانتا وہ میرا نہیں بلکہ اس کا نافرمان ہے جس نے میرے آنے کی پیشگوئی کی۔

ایسا ہی عقیدہ میرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بارہ میں بھی یہی ہے کہ جس شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچ چکی ہے اور وہ آپ کی بعثت سے مطلع ہو چکا ہے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارہ میں اس پر اتمام حجت ہو چکا ہے وہ اگر کفر پر مر گیا تو ہمیشہ کی جہنم کا سزاوار ہوگا۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۷۸-۱۷۹)

اگرچہ خدا تعالیٰ نے براہین احمدیہ میں میرا نام عیسیٰ رکھا اور یہ بھی مجھے فرمایا کہ تیرے آنے کی خبر خدا اور رسول نے دی تھی۔ مگر چونکہ ایک گروہ مسلمانوں کا اس اعتقاد پر جما ہُوا تھا اور میرا بھی یہی اعتقاد تھا کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر سے نازل ہونگے اس لئے مَیں نے خدا کی وحی کو ظاہر پر حمل کرنا نہ چاہا بلکہ اس وحی کی تاویل کی اور اپنا اعتقاد وہی رکھا جو تمام مسلمانوں کا تھا اور اسی کو براہین احمدیہ میں شائع کیا۔ لیکن بعد اس کے اس بارہ میں بارش کی طرح وحی الٰہی نازل ہوئی کہ وہ مسیح موعود جو آنیوالا تھا تو ہی ہے اور ساتھ اس کے صدہا نشان ظہور میں آئے۔ اور زمین و آسمان دونوں میری تصدیق کیلئے کھڑے ہوگئے۔ اور خدا کے چمکتے ہوئے نشان میرے پر جبر کر کے مجھے اس طرف لے آئے کہ آخری زمانہ میں مسیح آنے والا میں ہی ہوں۔ ورنہ میرا اعتقاد تو وہی تھا جو مَیں نے براہین احمدیہ میں لکھ دیا تھا۔ اور پھر مَیں نے اس پر کفایت نہ کر کے اس وحی کو قرآن شریف پر عرض کیا تو آیات قطعیۃ الدلالت سے ثابت ہُوا کہ درحقیقت مسیح ابن مریم فوت ہوگیا ہے اور آخری خلیفہ مسیح موعود کے نام پر اسی اُمّت میں سے آئیگا۔ اور جیسا کہ جب دن چڑھ جاتا ہے تو کوئی تاریکی باقی نہیں رہتی اسی طرح صدہا نشانوں اور آسمانی شہادتوں اور قرآن شریف کی قطعیۃ الدلالت آیات اور نصوص صریحہ حدیثیہ نے مجھے اس بات کے لئے مجبور کر دیا کہ مَیں اپنے تئیں مسیح موعود مان لوں۔ میرے لئے یہ کافی تھا کہ وہ میرے پر خوش ہو۔ مجھے اس بات کی ہرگز تمنّا نہ تھی۔ میں پوشیدگی کے حجرہ میں تھا اور کوئی مجھے نہیں جانتا تھا اور نہ مجھے یہ خواہش تھی کہ کوئی مجھے شناخت کرے۔ اس نے گوشۂ تنہائی سے مجھے جبراً نکالا۔ میں نے چاہا کہ میں پوشیدہ رہوں اور پوشیدہ مَروں۔ مگر اس نے کہا کہ مَیں تجھے تمام دنیا میں عزّت کے ساتھ

شہرت دونگا پس یہ اس خدا سے پوچھو کہ ایسا تو نے کیوں کیا؟ میرا اس میں کیا قصور ہے۔ اِسی طرح اوائل میں میرا یہی عقیدہ تھا کہ مجھ کو مسیح ابن مریم سے کیا نسبت ہے وہ نبی ہے اور خدا کے بزرگ مقربین میں سے ہے اور اگر کوئی امر میری فضیلت کی نسبت ظاہر ہوتا تو مَیں اس کو جُزئی فضیلت قرار دیتا تھا مگر بعد میں جو خدا تعالیٰ کی وحی بارش کی طرح میرے پر نازل ہوئی اُس نے مجھے اس عقیدہ پر قائم نہ رہنے دیا اور صریح طور پر نبی کا خطاب مجھے دیا گیا مگر اس طرح سے کہ ایک پہلو سے نبی اور ایک پہلو سے اُمتی۔ اور جیسا کہ مَیں نے نمونہ کے طور پر بعض عبارتیں خدا تعالیٰ کی وحی کی اس رسالہ میں بھی لکھی ہیں ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح ابن مریم کے مقابل پر خدا تعالیٰ میری نسبت کیا فرماتا ہے۔ مَیں خدا تعالیٰ کی تئیس ۲۳ برس کی متواتر وحی کو کیونکر ردّ کر سکتا ہوں۔ مَیں اس کی اس پاک وحی پر ایسا ہی ایمان لاتا ہوں جیسا کہ اُن تمام خدا کی وحیوں پر ایمان لاتا ہوں جو مجھ سے پہلے ہو چکی ہیں۔ اور مَیں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ مسیح ابن مریم آخری خلیفہ موسیٰ علیہ السلام کا ہے۔ اور مَیں آخری خلیفہ اس نبی کا ہوں جو خیر الرسل ہے اس لئے خدا نے چاہا کہ مجھے اس سے کم نہ رکھے۔ مَیں خوب جانتا ہوں کہ یہ الفاظ میرے ان لوگوں کو گوارا نہ ہونگے جن کے دلوں میں حضرت مسیح کی محبت پرستش کی حد تک پہنچ گئی ہے مگر میں اُن کی پروا نہیں کرتا۔ مَیں کیا کروں کس طرح خدا کے حکم کو چھوڑ سکتا ہوں اور کس طرح اس روشنی سے جو مجھے دی گئی تاریکی میں آ سکتا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری کلام میں کچھ تناقض نہیں۔ مَیں تو خدا تعالیٰ کی وحی کا پیروی کرنے والا ہوں۔ جب تک مجھے اس سے علم نہ ہوا مَیں وہی کہتا رہا جو اوائل میں مَیں نے کہا۔ اور جب مجھ کو اس کی طرف سے علم ہوا تو میں نے اس کے مخالف کہا۔ مَیں انسان ہوں مجھے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں۔ بات یہی ہے جو شخص چاہے قبول کرے یا نہ کرے۔ مَیں نہیں جانتا کہ خدا نے ایسا کیوں کیا۔ ہاں میں اس قدر جانتا ہوں کہ آسمان پر خدا تعالےٰ کی غیرت عیسائیوں کے مقابل پر بڑا جوش مار رہی ہے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے مخالف وہ توہین کے الفاظ استعمال کئے ہیں کہ قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں۔ پس خدا دکھلاتا ہے کہ اس رسول کے ادنیٰ خادم اسرائیلی مسیح ابن مریم سے بڑھ کر ہیں جس شخص کو اس فقرہ سے غیظ و غضب ہو اس کو اختیار ہے کہ وہ اپنے غیظ سے مر جائے مگر خدا نے جو چاہا ہے کیا۔ اور خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کیا انسان کا مقدور ہے کہ وہ اعتراض کرے کہ ایسا تو نے کیوں کیا؟

(حقیقۃ الوحی ص ۱۴۹-۱۵۰)

مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر مسیح ابن مریم میرے زمانہ میں ہوتا تو وہ کام جو میں کر سکتا ہوں وہ ہرگز نہ کر سکتا۔ اور وہ نشان جو مجھ سے ظاہر ہو رہے ہیں وہ ہرگز دکھلا نہ سکتا اور خدا کا فضل اپنے سے زیادہ مجھ پر پاتا۔ جبکہ میں ایسا ہوں تو سوچو کہ کیا مرتبہ ہے **اس پاک رسول کا جس کی غلامی کی طرف میں منسوب کیا گیا۔** ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

(کشتی نوح ص۸)

اور حضرت عیسٰی کے نام پر اس عاجز کے آنے کا سِرّ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اس عیسائی فتنہ کے وقت میں یہ فتنہ حضرت مسیح کو دکھایا۔ یعنی ان کو آسمان پر اس فتنہ کی اطلاع دے دی کہ تیری قوم اور تیری امت نے اس طوفان کو برپا کیا ہے۔ تب وہ اپنی قوم کی خرابی کو کمال فساد پر دیکھ کر نزول کے لئے بیقرار ہوا۔ اور اس کی رُوح سخت جنبش میں آئی اور اُس نے زمین پر اپنی ارادات کا ایک مظہر چاہا۔ تب خدا تعالیٰ نے اس وعدہ کے موافق جو کیا گیا تھا مسیح کی روحانیت اور اس کے جوش کو ایک جوہرِ قابل میں نازل کیا۔ سو ان معنوں کر کے وہ آسمان سے اُترا۔ اُسی کے موافق جو ایلیا نبی یوحنا کے رنگ میں اُترا تھا۔

(آئینہ کمالات اسلام ص۲۶۸-۲۶۹ حاشیہ)

جیسا کہ وہ نبی شہزادہ دنیا میں غربت اور مسکینی سے آیا۔ اور غربت اور مسکینی اور حلم کا دنیا کو نمونہ دکھلایا۔ اس زمانے میں خدا نے چاہا کہ اس کے نمونے پر مجھے بھی جو امیری اور حکومت کے خاندان سے ہوں اور ظاہری طور پر بھی اس شہزادہ نبی اللہ کے حالات سے مشابہت رکھتا ہوں۔ ان لوگوں میں کھڑا کرے جو ملکوتی اخلاق سے بہت دُور جا پڑے ہیں۔ سو اس نمونے پر میرے لئے خدا نے یہی چاہا کہ میں غربت اور مسکینی سے دنیا میں رہوں۔ خدا کے کلام میں قدیم سے وعدہ تھا کہ ایسا انسان دنیا میں پیدا ہو۔ اسی لحاظ سے خدا نے میرا نام مسیح موعود رکھا۔ یعنی ایک شخص جو عیسٰی مسیح کے اخلاق کے ساتھ ہمرنگ ہے۔

(کشف الغطاء ص۱۱ ایڈیشن اول)

مبارک وہ جس نے مجھے پہچانا۔ میں خدا کی سب راہوں میں سے آخری راہ ہوں اور میں اس کے سب نوروں میں سے آخری نور ہوں۔ بدقسمت ہے وہ جو مجھے چھوڑتا ہے کیونکہ میرے بغیر سب تاریکی ہے۔

(کشتیٔ نوح ص۵۶)

اس عاجز پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ خاکسار اپنی غربت اور انکسار اور توکل اور ایثار اور آیات اور انوار کے رو سے مسیح کی پہلی زندگی کا نمونہ ہے۔ اور اس عاجز کی فطرت اور مسیح کی فطرت باہم نہایت ہی مشابہ واقع ہوئی ہے گویا ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے یا ایک ہی درخت کے دو پھل ہیں اور بحدی اتحاد ہے کہ نظر کشفی میں نہایت ہی باریک امتیاز ہے۔ اور نیز ظاہری طور پر بھی ایک مشابہت ہے اور وہ یوں کہ مسیح ایک کامل اور عظیم الشان نبی یعنی موسیٰ کا تابع اور خادم دین تھا۔ اور اس کی انجیل توریت کی فرع ہے۔ اور یہ عاجز بھی اس جلیل الشان نبی کے احقر خادمین میں سے ہے کہ جو سید الرسل اور سب رسولوں کا سرتاج ہے۔ اگر وہ حامد ہیں تو وہ احمد ہے۔ اگر وہ محمود ہیں تو وہ محمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

(براہین احمدیہ ص ۵۷۱ - ۵۷۲ حاشیہ در حاشیہ ۳)

عیسائیوں نے شور مچا رکھا تھا کہ مسیح بھی اپنے قرب اور وجاہت کی رُو سے واحد لاشریک ہے۔ اب خدا تبلاتا ہے کہ دیکھو میں اس کا ثانی پیدا کرونگا جو اس سے بھی بہتر ہے۔ جو غلام احمد ہے۔ یعنی احمد کا غلام ؎

زندگی بخش جام احمدؐ ہے - کیا پیارا نام احمدؐ ہے
لاکھ ہوں انبیاء مگر بخدا - سب سے بڑھ کر مقام احمدؐ ہے
باغِ احمدؐ سے ہم نے پھل کھایا - میرا بستاں کلام احمدؐ ہے
ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑو - اس سے بہتر غلام احمدؐ ہے

یہ باتیں شاعرانہ نہیں بلکہ واقعی ہیں۔ اور اگر تجربہ کے رو سے خدا کی تائید مسیح ابن مریم سے بڑھ کر میرے ساتھ نہ ہو تو میں جھوٹا ہوں۔ خدا نے ایسا کیا نہ میرے لئے بلکہ اپنے نبی مظلوم کے لئے۔

(دافع البلاء فی معیار اہل الاصطفاء ص ۲۰-۲۱)

آنے والے کا نام جو مہدی رکھا گیا سو اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ آنے والا علم دین خدا سے ہی حاصل کرے گا۔ اور قرآن اور حدیث میں کسی استاد کا شاگرد نہیں ہوگا۔ سو میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ میرا حال یہی حال ہے۔ کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ میں نے کسی انسان سے قرآن یا حدیث یا تفسیر کا ایک سبق بھی پڑھا ہے۔ یا کسی مفسر یا محدث کی شاگردی اختیار کی ہے۔ پس یہی مہدویت ہے جو نبوتِ محمدیہ کے منہاج پر مجھے حاصل ہوئی ہے۔ اور اسرار دین بلا واسطہ میرے پر کھولے گئے۔

(ایام الصلح ص ۱۵۳)

سوال:۔ مسیح ابن مریم نے تو بہت سے معجزات سے اپنے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ آپ نے کیا ثبوت دیا؟ کیا کوئی مُردہ زندہ کر دیا یا کوئی مادرزاد اندھا آپ سے اچھا ہُوا؟ اگر ہم فرض بھی کریں کہ آپ مثیلِ مسیح ہیں تو ہمیں آپ کے وجود سے کیا فائدہ ہُوا؟

اما الجواب:۔ پس واضح ہو کہ انجیل کو پڑھ کر دیکھ لو کہ یہی اعتراض ہمیشہ مسیح پر رہا کہ اُس نے کوئی معجزہ تو دکھایا ہی نہیں یہ کیسا مسیح ہے۔ کیونکہ ایسا مُردہ کوئی زندہ نہ ہُوا کہ بولتا اور اُس جہان کا سب حال سُناتا اور وارثوں کو نصیحت کرتا کہ مَیں تو دوزخ میں سے آیا ہوں۔ تم جلد ایمان لے آؤ۔ اگر مسیح صاف طور پر یہودیوں کے باپ دادے زندہ کر کے دکھا دیتا اور ان سے گواہی دلواتا تو بھلا کس کو انکار کی مجال تھی؟ غرض پیغمبروں نے نشان تو دکھائے مگر پھر بھی بے ایمانوں سے مخفی رہے۔ ایسا ہی یہ عاجز بھی خالی نہیں آیا بلکہ مُردوں کے زندہ ہونے کے لئے بہت سا آبِ حیات خدا تعالیٰ نے اس عاجز کو بھی دیا ہے۔ بے شک جو شخص اِس میں سے پیئے گا زندہ ہو جائیگا۔ بلاشبہ مَیں اقرار کرتا ہوں کہ اگر میرے کلام سے مُردے زندہ نہ ہوں اور اندھے آنکھیں نہ کھولیں اور مجذوم صاف نہ ہوں تو مَیں خدا تعالےٰ کی طرف سے نہیں آیا۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے اپنے پاک کلام میں میری طرف اشارہ کر کے فرمایا ہے:۔

> نبی ناصری کے نمونہ پر اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بندگانِ خدا کو بہت صاف کر رہا ہے اس سے زیادہ کہ کبھی جسمانی بیماریوں کو صاف کیا گیا ہو۔

یقیناً سمجھو کہ روحانی حیات کا تخم ایک رائی کے بیج کی طرح بویا گیا ہے۔ مگر قریب ہے ہاں بہت قریب ہے کہ ایک بڑا درخت ہو کر نظر آئیگا۔ جسمانی خیالات کا انسان جسمانی باتوں کو پسند کرتا ہے اور اُن کو بڑی چیز سمجھتا ہے مگر جس کو کچھ روحانیت سے حصہ دیا گیا ہے وہ رُوحانی زندگی کا طالب ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے راستباز بندے دنیا میں اس لئے نہیں آتے کہ لوگوں کو تماشے دکھلائیں۔ بلکہ اصل مطلب اُن کا جذب الی اللہ ہوتا ہے۔ اور آخرکار وہ اسی قوتِ قدسیہ کی وجہ سے شناخت کئے جاتے ہیں۔ وہ نور جو اُن کے اندر قوتِ جذب رکھتا ہے اگرچہ کوئی شخص امتحان کے طور سے اس کو دیکھ نہیں سکتا بلکہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ مگر وہ نور آپ ہی ایک ایسی جماعت کو اپنی طرف کھینچ کر جو کھینچے جانے کے لائق ہے اپنا خارق عادت اثر ظاہر کر دیتا ہے

(۱) خدائے تعالیٰ کے خاص دوستوں کی یہ علامتیں ہیں کہ ایک خاص محبت اُن کو عطا کی جاتی ہے جس کا اندازہ کرنا اس جہان کے لوگوں کا کام نہیں۔

(۲) ان کے دلوں پر ایک خوف بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ دقائق اطاعت کی رعایت

رکھتے ہیں تا ایسا نہ ہو کہ یارِ قدیم آزردہ ہو جائے ۔

(۳) اُن کو خارق عادت استقامت دی جاتی ہے کہ اپنے وقت پر دیکھنے والوں کو حیران کر دیتی ہے ۔

(۴) جب ان کو کوئی بہت ستاتا ہے اور باز نہیں آتا تو اُن کے لئے غضب اس ذاتِ قوی کا جو اُن کا متولّی ہے یک دفعہ بھڑکتا ہے ۔

(۵) جب ان سے کوئی بہت دوستی کرتا ہے اور سچی وفاداری اور اخلاص کے ساتھ اُن کی راہ میں فدا ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے ۔ اور اس پر ایک خاص رحمت نازل کرتا ہے ۔

(۶) اُن کی دعائیں بہ نسبت اَوروں کے بہت زیادہ قبول ہوتی ہیں ۔ یہاں تک کہ وہ شمار نہیں کر سکتے کہ کس قدر قبول ہوئیں ۔

(۷) اُن پر اکثر اسرارِ غیب ظاہر کئے جاتے ہیں ۔ اور وہ باتیں جو ابھی ظہور میں نہیں آئیں ۔ اُن پر کھولی جاتی ہیں ۔ اگرچہ اور مومنوں کو بھی سچی خوابیں اور سچے مکاشفات معلوم ہو جاتے ہیں مگر یہ لوگ تمام دنیا سے نمبر اوّل پر ہوتے ہیں ۔

(۸) خدائے تعالیٰ خاص طور پر اُن کا متولّی ہو جاتا ہے ۔ اور جس طرح اپنے بچوں کی کوئی پرورش کرتا ہے اس سے بھی زیادہ نگاہِ رحمت ان پر رکھتا ہے ۔

(۹) جب اُن پر کوئی بڑی مصیبت کا وقت آتا ہے تو اس وقت دو طور میں سے ایک طور کا اُن سے معاملہ ہوتا ہے ۔ یا خارق عادت طور پر اس مصیبت سے رہائی دی جاتی ہے اور یا ایک ایسا صبرِ جمیل عطا کیا جاتا ہے جس میں لذّت اور سرور اور ذوق ہو ۔

(۱۰) اُن کی اخلاقی حالت ایک ایسے اعلیٰ درجہ کی کی جاتی ہے جو تکبّر اور نخوت اور کمینگی اور خود پسندی اور ریاکاری اور حسد اور بخل اور تنگ دلی سب دُور کی جاتی ہے اور انشراح صدر اور بشاشت عطا کی جاتی ہے ۔

(۱۱) اُن کی توکّل نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے اور اس کے ثمرات ظاہر ہوتے رہتے ہیں ۔

(۱۲) اُن کو اعمال صالحہ کے بجا لانے کی قوت دی جاتی ہے جو دوسرے اُن میں کمزور ہوتے ہیں ۔

(۱۳) اُن میں ہمدردی خلق اللہ کا مادہ بہت بڑھایا جاتا ہے اور بغیر توقع کسی اجر اور بغیر خیال کسی ثواب کے انتہائی درجہ کا جوش اُن میں خلق اللہ کی بھلائی کے لئے ہوتا ہے ۔ اور خود بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اس قدر جوش کس غرض سے ہے کیونکہ یہ امر فطرتی ہوتا ہے ۔

(۱۴) خدا تعالیٰ کے ساتھ ان لوگوں کو نہایت کامل وفاداری کا تعلق ہوتا ہے اور ایک عجیب ہستی

جانفشانی کی اُن کے اندر ہوتی ہے۔ اور اُن کی رُوح کو خدائے تعالیٰ کی رُوح کے ساتھ وفاداری کا ایک راز ہوتا ہے جس کو کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ اس لئے حضرتِ احدیت میں اُن کا ایک مرتبہ ہوتا ہے جس کو خلقت نہیں پہچانتی۔ وہ چیز جو خاص طور پر اُن میں زیادہ ہے اور جو سرچشمہ تمام برکات کا ہے اور جس کی وجہ سے یہ ڈوبتے ہوئے پھر نکل آتے ہیں اور موت تک پہنچ کر پھر زندہ ہو جاتے ہیں اور ذلّتیں اٹھا کر پھر تاجِ عزّت دکھا دیتے ہیں۔ اور مہجور اور اکیلے ہو کر پھر ناگہاں ایک جماعت کے ساتھ نظر آتے ہیں وہ یہی رازِ وفاداری ہے جس کے رشتۂ محکم کو نہ تلواریں قطع کر سکتی ہیں اور نہ دنیا کا کوئی بلوہ اور خوف اور مفسدہ اسکو ڈھیلا کر سکتا ہے۔ السلام علیہم من اللّٰہ وملائکتہ ومن الصلحاء اجمعین۔

(۱۵) پندرھویں علامت اُن کی علمِ قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم کے معارف اور حقائق و لطائف جس قدر ان لوگوں کو دیئے جاتے ہیں دوسرے لوگوں کو ہرگز نہیں دیئے جاتے۔ یہ لوگ وہی مطہّرون ہیں جن کے حق میں اللہ جلّشانہٗ فرماتا ہے۔ لا یمسہٗ الّا المطھّرون۔

(۱۶) ان کی تقریر و تحریر میں اللہ جلّشانہٗ ایک تاثیر رکھ دیتا ہے جو علماء ظاہری کی تحریروں و تقریروں سے نرالی ہوتی ہے۔ اور اس میں ایک ہیبت اور عظمت پائی جاتی ہے۔ اور بشرطیکہ حجاب نہ ہو دلوں کو پکڑ لیتی ہے۔

(۱۷) ان میں ایک ہیبت بھی ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کی ہیبت سے رنگین ہوتی ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ ایک خاص طور پر اُن کے ساتھ ہوتا ہے اور اُن کے چہروں پر عشقِ الٰہی کا ایک نور ہوتا ہے۔ جو شخص اُس کو دیکھ لے اُس پر نارِ جہنم حرام کی جاتی ہے۔ اُن سے ذنب اور خطا بھی صادر ہو سکتا ہے مگر اُن کے دلوں میں ایک آگ ہوتی ہے جو ذنب اور خطا کو بھسم کر دیتی ہے۔ اور اُن کی خطا ٹھہرنے والی چیز نہیں بلکہ اس چیز کی مانند ہے جو ایک تیز چلنے والے پانی میں بہتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ سو ان کا نکتہ چین ہمیشہ ٹھوکر کھاتا ہے۔

(۱۸) خدائے تعالیٰ ان کو ضائع نہیں کرتا اور ذلّت اور خواری کی مار اُن پر نہیں مارتا۔ کیونکہ وہ اس کے عزیز اور اس کے ہاتھ کے پودے ہیں۔ اُن کو اس لئے بلندی سے نہیں گراتا کہ تا ہلاک کرے بلکہ اس لئے گراتا ہے کہ تا اُن کا خارقِ عادت طور پر بچ جانا دکھاوے۔ اُن کو اس لئے آگ میں دھکا نہیں دیتا تا اُن کو جلا کر خاکستر کر دیوے بلکہ اس لئے دھکا دیتا ہے تا لوگ دیکھ لیویں کہ پہلے تو آگ تھی مگر اب کیسا خوشنما گلزار ہے۔

(۱۹) اُن کو موت نہیں دیتا جب تک وہ کام پورا نہ ہو جائے جس کے لئے وہ بھیجے گئے ہیں۔ اور جب تک پاک دلوں میں اُن کی قبولیت نہ پھیل جائے۔ تب تک البتہ سفرِ آخرت اُن کو پیش نہیں آتا۔

(۲۰) ان کے آثارِ خیر باقی رکھے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کئی پشتوں تک اُن کی اولاد اور اُن کے جانی دوستوں کی اولاد پر خاص طور پر نظرِ رحمت رکھتا ہے اور ان کا نام دنیا سے نہیں مٹاتا۔

یہ آثار اولیاء الرحمٰن ہیں۔ اور ہر ایک قسم اُن میں سے اپنے وقت پر جب ظاہر ہوتی ہے تو بھاری کرامت کی طرح جلوہ دکھاتی ہے۔ مگر اس کا ظاہر کرنا خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہوتا ہے۔

اب یہ عاجز بحکم واما بنعمت ربک فحدث (الضحیٰ) اس بات کے اظہار میں کچھ مضائقہ نہیں دیکھتا کہ خداوند کریم و رحیم نے محض فضل و کرم سے ان تمام امور سے اس عاجز کو حصہ وافر دیا ہے۔ اور اس ناکارہ کو خالی ہاتھ نہیں بھیجا۔ اور نہ بغیر نشانوں کے مامور کیا بلکہ یہ تمام نشان دیئے ہیں جو ظاہر ہو رہے ہیں اور ہونگے۔ اور خدا تعالیٰ جب تک کھلے طور پر حجت قائم نہ کرلے تب تک ان نشانوں کو ظاہر کرتا جائیگا اور یہ جو کہا کہ تمہارے وجود سے ہمیں کیا فائدہ؟ تو اس کے جواب میں یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص مامور ہو کر آسمان سے آتا ہے اس کے وجود سے علیٰ حسب مراتب سب کو بلکہ تمام دنیا کو فائدہ ہوتا ہے۔ اور درحقیقت وہ ایک روحانی آفتاب نکلتا ہے جس کی کم و بیش دُور دُور تک روشنی پہنچتی ہے۔ اور جیسی آفتاب کی مختلف تاثیریں حیوانات و نباتات و جمادات اور ہر ایک قسم کے جسم پر پڑ رہی ہیں اور بہت کم لوگ ہیں جو ان تاثیروں پر باستیفا علم رکھتے ہیں۔ اسی طرح وہ شخص جو مامور ہو کر آتا ہے تمام طبائع اور اطراف و اکنافِ عالم پر اس کی تاثیریں پڑتی ہیں اور جبھی سے کہ اس کا پُر رحمت تعیّن آسمان پر ظاہر ہوتا ہے آفتاب کی کرنوں کی طرح فرشتے آسمان سے نازل ہونے شروع ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے دُور دُور کناروں تک جو لوگ راستبازی کی استعداد رکھتے ہیں اُن کو سچائی کی طرف قدم اٹھانے کی قوت دیتے ہیں۔ اور پھر خود بخود نیک نہاد لوگوں کی طبیعتیں سچ کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں۔ سو یہ سب اس ربّانی آدمی کی صداقت کے نشان ہوتے ہیں جس کے عہدِ ظہور میں آسمانی قوتیں تیز کی جاتی ہیں۔ سچی وحی کا خدا تعالیٰ نے یہی نشان دیا ہے کہ جب وہ نازل ہوتی ہے تو ملائک بھی اس کے ساتھ ضرور اُترتے ہیں۔ اور دنیا دن بدن راستی کی طرف پلٹا کھاتی جاتی ہے۔ سو یہ عام علامت اس مامور کی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔ اور خاص علامتیں وہ ہیں جو ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔

(ازالہ اوہام حصّہ دوم ص۲۳۴)

مسیح موعود کا دعویٰ اگر اپنے ساتھ ایسے لوازم رکھتا جن سے شریعت کے احکام اور عقائد پر کچھ مخالفانہ اثر پہنچتا تو بے شک ایک ہولناک بات تھی۔ لیکن دیکھنا چاہیئے کہ میں نے اس دعویٰ کے ساتھ کس اسلامی حقیقت کو منقلب کر دیا ہے؟ کونسے احکام اسلام میں سے ایک ذرّہ بھی کم یا زیادہ کر دیا ہے؟ ہاں ایک پیشگوئی کے وہ معنے کئے گئے ہیں جو خدا تعالےٰ نے اپنے وقت پر مجھ پر کھولے ہیں اور قرآن کریم ان معنوں کی صحت کے لئے گواہ ہے اور احادیثِ صحیحہ بھی ان کی شہادت دیتی ہیں۔ پھر نہ معلوم کہ اسقدر کیوں شور و غوغا ہے؟

ہاں طالب حق ایک سوال بھی اسجگہ کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسیح موعود کا دعویٰ تسلیم کرنے کے لئے کونسے قرائن موجود ہیں۔ کیونکہ کسی مدعی کی صداقت ماننے کے لئے قرائن تو چاہیئے بخصوصًا آجکل کے زمانہ میں جو مکر اور فریب اور بد دیانتی سے بھرا ہوا ہے اور دعاوی باطلہ کا بازار گرم ہے۔

اس سوال کے جواب میں مجھے یہ کہنا کافی ہے کہ مندرجہ ذیل امور طالبِ حق کے لئے بطور علامات اور قرائن کے ہیں:-

(۱) اوّل وہ پیشگوئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جو تواتر معنوی تک پہنچ گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہر یک صدی کے سر پر وہ ایسے شخص کو مبعوث کرے گا جو دین کو پھر تازہ کر دے گا۔ اور اس کی کمزوریوں کو دُور کر کے پھر اپنی اصلی طاقت اور قوت پر اس کو لے آوے گا۔ اس پیشگوئی کی رو سے ضرور تھا کہ کوئی شخص اس چودھویں صدی پر بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوتا۔ اور موجودہ خرابیوں کی اصلاح کے لئے پیشقدمی دکھلاتا۔ سو یہ عاجز عین وقت پر مامور ہوا۔ اس سے پہلے صدہا اولیاء نے اپنے الہام سے گواہی دی تھی کہ چودھویں صدی کا مجدد مسیح موعود ہو گا۔ اور احادیثِ صحیحہ نبویہ پکار پکار کر کہتی ہیں کہ تیرھویں صدی کے بعد ظہور مسیح ہے۔ پس کیا اس عاجز کا یہ دعویٰ اس وقت عین اپنے محل اور اپنے وقت پر نہیں ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ فرمودہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم خطا جاوے۔ میں نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اگر فرض کیا جاوے کہ چودھویں صدی کے سر پر مسیح موعود پیدا نہیں ہوا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی پیشگوئیاں خطا جاتی ہیں اور صدہا بزرگوار صاحب الہام جھوٹے ٹھہرتے ہیں۔

(۲) اس بات کو بھی سوچنا چاہیئے کہ جب علماء سے یہ سوال کیا جائے کہ چودھویں صدی کا مجدّد ہونے کے لئے بجز اس احقر کے اور کس نے دعویٰ کیا ہے اور کس نے منجانب اللہ آنے کی خبر دی ہے اور ملہم اور مامور ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو اس کے جواب میں وہ بالکل خاموش ہیں اور کسی شخص کو پیش

نہیں کر سکتے جس نے ایسا دعویٰ کیا ہو . . . .

(۳) تیسری علامت اس عاجز کے صدق کی یہ ہے کہ بعض اہل اللہ نے اس عاجز سے بہت سے سال پہلے اس عاجز کے آنے کی خبر دی ہے۔ یہاں تک کہ نام اور سکونت اور عمر کا حال بتصریح بتلایا ہے۔ جیسا کہ نشانِ آسمانی میں لکھ چکا ہوں۔

(۴) چوتھی علامت اس عاجز کے صدق کی یہ ہے کہ اس عاجز نے بارہ ہزار کے قریب خط اور اشتہار الہامی برکات کے مقابلہ کے لئے مذاہب غیر کی طرف روانہ کئے۔ بالخصوص پادریوں میں سے شاید ایک بھی نامی پادری یورپ اور امریکہ اور ہندوستان میں باقی نہیں رہا ہو گا جس کی طرف خط رجسٹری کر کے نہ بھیجا ہو۔ مگر سب پر حق کا رعب چھا گیا۔ اب جو ہماری قوم کے ملّا مولوی لوگ اس دعوت میں نکتہ چینی کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ ان کی دروغگوئی اور نجاست خواری ہے۔ مجھے یہ قطعی طور پر بشارت دی گئی ہے کہ اگر کوئی مخالف دین میرے سامنے مقابلہ کے لئے آئیگا تو میں اس پر غالب رہوں گا اور وہ ذلیل ہو گا . . . .

(۵) پانچویں علامت اس عاجز کے صدق کی یہ ہے کہ مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ میں ان مسلمانوں پر بھی اپنے کشفی اور الہامی علوم میں غالب ہوں۔ ان کے ملہموں کو چاہیئے کہ میرے مقابلہ پر آویں پھر اگر تائیدِ الٰہی میں اور فیضِ سماوی میں اور آسمانی نشانوں میں مجھ پر غالب ہو جائیں تو جس کارد سے چاہیں مجھے ذبح کر دیں مجھے منظور ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صـ ۳۴۰-۳۴۸)

میں دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جو نیچر اور صحیفۂ قدرت کے پیرو بننا چاہتے ہوں اُن کے لئے خدا تعالیٰ نے یہ نہایت عمدہ موقع دیا ہے کہ وہ میرے دعویٰ کو قبول کریں کیونکہ وہ لوگ ان مشکلات میں گرفتار نہیں ہیں جن میں ہمارے دوسرے مخالف گرفتار ہیں۔ کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے۔ اور پھر ساتھ اس کے انہیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ مسیح موعود کی نسبت جو پیشگوئی احادیث میں موجود ہے وہ متواترات میں سے ہے جن سے انکار کرنا کسی عقلمند کا کام نہیں۔ پس اس صورت میں یہ بات ضروری طور پر انہیں قبول کرنی پڑتی ہے کہ آنے والا مسیح اسی اُمت میں سے ہو گا۔ البتہ یہ سوال کرنا ان کا حق ہے کہ ہم کیونکر یہ دعویٰ مسیح موعود ہونے کا قبول کریں؟ اور اس پر دلیل کیا ہے کہ وہ مسیح موعود تم ہی ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس زمانہ جس ملک اور جس قصبہ میں مسیح موعود کا ظاہر ہونا قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہوتا ہے

اور جن افعال خاصہ کو مسیح کے وجود کی علّتِ غائی ٹھہرایا گیا ہے۔ اور جن حوادثِ ارضی و سماوی کو مسیح موعود کے ظاہر ہونے کی علامات بیان فرمایا گیا ہے اور جن علوم اور معارف کو مسیح موعود کا خاصہ ٹھہرایا گیا ہے وہ سب باتیں اللہ تعالےٰ نے مجھ میں اور میرے زمانہ میں اور میرے ملک میں جمع کر دی ہیں اور پھر زیادہ تر اطمینان کے لئے آسمانی تائیدات میرے شامل حال کی ہیں ؎

چوں مرا حکم از پئے قوم مسیحی دادہ اند - مصلحت را ابن مریم نام من بنہادہ اند
آسماں بارد نشاں الوقت می گوید زمیں - ایں دو شاہد از پئے تصدیق من استادہ اند

اب تفصیل اس کی یہ ہے کہ اشارات نص قرآنی سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰ ہیں اور آپ کا سلسلۂ خلافت حضرت موسیٰ کے سلسلۂ خلافت سے بالکل مشابہ ہے اور جس طرح حضرت موسیٰ کو وعدہ دیا گیا تھا کہ آخری زمانہ میں یعنی جبکہ سلسلہ اسرائیلی نبوت کا انتہا تک پہنچ جائیگا اور بنی اسرائیل کئی فرقے ہو جائیں گے۔ اور ایک دوسرے کی تکذیب کرے گا۔ یہاں تک کہ بعض بعض کو کافر کہیں گے تب اللہ تعالےٰ ایک خلیفہ حامی دینِ موسیٰ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کرے گا اور وہ بنی اسرائیل کی مختلف بھیڑوں کو اپنے پاس اکٹھی کریگا اور بھیڑیے اور بکری کو ایک جگہ جمع کر دیگا۔ اور سب قوموں کے لئے ایک حَکم بن کر اندرونی اختلاف کو درمیان سے اُٹھا دے گا۔ اور بغض اور کینوں کو دُور کر دے گا۔

یہی وعدہ قرآن میں بھی دیا گیا تھا جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ اٰخرین منھم لما یلحقوا بھم۔ اور حدیثوں میں اِس کی بہت تفصیل ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ یہ امت بھی اِسی قدر فرقے ہو جائینگے جس قدر کہ یہود کے فرقے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی تکذیب اور تکفیر کرے گا۔ اور یہ سب لوگ عناد اور بغض باہمی میں ترقی کرینگے۔ اس وقت کہ مسیح موعود حَکم ہو کر دنیا میں آوے۔ اور جب وہ حَکم ہو کر آئے گا تو بغض اور شحناء کو دُور کر دیگا۔ اور اُس کے زمانہ میں بھیڑیا اور بکری ایک جگہ جمع ہو جائینگے۔ چنانچہ یہ بات تمام تاریخ جاننے والوں کو معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسے ہی وقت میں آئے تھے کہ جب اسرائیلی قوموں میں بڑا تفرقہ پیدا ہو گیا تھا اور ایک دوسرے کے مکفر اور مکذب ہو گئے تھے۔ یہ عاجز بھی ایسے وقت میں آیا ہے کہ جب اندرونی اختلافات انتہا تک پہنچ گئے۔ اور ایک فرقہ دوسرے کو کافر بنانے لگا۔ اس تفرقہ کے وقت میں امتِ محمدیہ کو ایک حَکَم کی ضرورت تھی۔ سو خدا نے مجھے حَکَم کر کے بھیجا ہے۔

(کتاب البریہ حاشیہ صہ ۲۵۴-۲۵۸)

میری حیثیت ایک معمولی مولوی کی حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ سُننِ انبیاء کی سی حیثیت ہے۔ مجھے ایک **سماوی آدمی** مانو۔ پھر یہ سارے جھگڑے اور تمام نزاعیں جو مسلمانوں میں پڑی ہوئی ہیں ایک دم میں طے ہو سکتی ہیں۔ جو خدا کی طرف سے **مامور** ہو کر حَکم بن کر آیا ہے جو معنے قرآن شریف کے وہ کرے گا وہی **صحیح** ہونگے۔ اور جس حدیث کو وہ **صحیح** قرار دے گا وہی **صحیح** حدیث ہوگی۔

(ملفوظات جلد دوم ص۱۴۰)

واضح ہو کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ جو شخص اپنے زمانہ کے امام کو شناخت نہ کرے اُس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے .... سو بموجب اِس نبوی وصیت کے ضروری ہوا کہ ہر ایک حق کا طالب امام صادق کی تلاش میں لگا رہے .... اب ایک ضروری سوال یہ ہے کہ امام الزمان کس کو کہتے ہیں اور اس کی علامات کیا ہیں اور اُس کو دوسرے ملہموں اور خواب بینوں اور اہل کشف پر ترجیح کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ **امام الزمان** اُس شخص کا نام ہے کہ جس شخص کی رُوحانی تربیت کا خدا تعالیٰ متولی ہو کر اُس کی فطرت میں ایک ایسی امامت کی روشنی رکھ دیتا ہے کہ وہ سارے جہان کے معقولیوں اور فلسفیوں سے ہر ایک رنگ میں مباحثہ کر کے ان کو مغلوب کر لیتا ہے۔ وہ ہر ایک قسم کے دقیق در دقیق اعتراضات کا خدا سے قوت پا کر ایسی عمدگی سے جواب دیتا ہے کہ آخر ماننا پڑتا ہے کہ اس کی فطرت دنیا کی اصلاح کا پورا سامان لے کر اِس مسافر خانہ میں آئی ہے۔ اس لئے اس کو کسی دشمن کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں پڑتا۔ وہ روحانی طور پر **محمدی فوجوں کا سپہ سالار** ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر دین کی دوبارہ فتح کرے اور وہ تمام لوگ جو اس کے جھنڈے کے نیچے آتے ہیں اُن کو بھی اعلیٰ درجہ کے قویٰ بخشے جاتے ہیں۔ اور وہ تمام شرائط جو اصلاح کے لئے ضروری ہوتے ہیں اور وہ تمام علوم جو اعتراضات کے اٹھانے اور اسلامی خوبیوں کے بیان کرنے کے لئے ضروری ہیں اس کو عطا کئے جاتے ہیں۔

(ضرورۃ الامام ص۲-۷)

یہ سوال باقی رہا کہ اس زمانہ میں امام الزمان کون ہے جس کی پیروی تمام مسلمانوں اور زاہدوں اور خواب بینوں اور ملہموں کو کرنی خدا تعالیٰ کی طرف سے فرض قرار دیا گیا ہے۔ سو مَیں اس وقت بے دھڑک کہتا ہوں کہ خدا کے فضل اور عنایت سے وہ **امام الزمان مَیں ہوں** اور مجھ میں خدا تعالیٰ نے وہ تمام علامتیں اور شرطیں جمع کی ہیں اور اس صدی کے سر پر مجھے مبعوث فرمایا ہے

...... یاد رہے کہ امام الزمان کے لفظ میں نبی۔ رسول۔ محدث۔ مجدد سب داخل ہیں۔ مگر جو لوگ ارشاد اور ہدایت خلق اللہ کے لئے مامور نہیں ہوئے اور نہ وہ کمالات اُن کو دیئے گئے گو وہ ولی ہوں یا ابدال ہوں امام الزمان نہیں کہلا سکتے۔

(ضرورۃ الامام ص۲۴)

چونکہ یہ عاجز راستی اور سچائی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اس لئے تم صداقت کے نشان ہر ایک طرف سے پاؤ گے۔ وہ وقت دُور نہیں بلکہ بہت قریب ہے کہ جب تم فرشتوں کی فوجیں آسمان سے اُترتی اور ایشیا اور یورپ اور امریکہ کے دلوں پر نازل ہوتی دیکھو گے۔ یہ تم قرآن شریف سے معلوم کر چکے ہو کہ خلیفۃ اللہ کے نزول کے ساتھ فرشتوں کا نازل ہونا ضروری ہے تا دلوں کو حق کی طرف پھیریں۔ سو تم اس نشان کے منتظر رہو۔ اگر فرشتوں کا نزول نہ ہؤا اور ان کے اُترنے کی نمایاں تاثیریں تم نے دنیا میں نہ دیکھیں اور حق کی طرف دلوں کی جنبش کو معمول سے زیادہ نہ پایا تو تم نے یہ سمجھنا کہ آسمان سے کوئی نازل نہیں ہؤا۔ لیکن اگر یہ سب باتیں ظہور میں آگئیں تو تم انکار سے باز آؤ۔ تا تم خدا تعالےٰ کے نزدیک ایک سرکش قوم نہ ٹھہرو۔

(فتح اسلام ص۱۳ حاشیہ)

پس مَیں جبکہ اِس مدت تک ڈیڑھ سو پیشگوئی کے قریب خدا کی طرف سے پاکر بچشمِ خود دیکھ چکا ہوں کہ صاف طور پر پوری ہو گئیں تو مَیں اپنی نسبت نبی یا رسول کے نام سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں اور جبکہ خدا تعالےٰ نے یہ نام میرے رکھے ہیں تو مَیں کیونکر رد کر دوں یا اس کے سوا کسی دوسرے سے ڈروں۔ مجھے اس خدا کی قسم ہے جس نے مجھے بھیجا ہے اور جس پر افترا کرنا لعنتیوں کا کام ہے کہ اُس نے مسیح موعود بنا کر مجھے بھیجا ہے۔ اور مَیں جیسا کہ قرآن شریف کی آیات پر ایمان رکھتا ہوں ایسا ہی بغیر فرق ایک ذرہ کے خدا کی اس کھلی کھلی وحی پر ایمان لاتا ہوں جو مجھے ہوئی۔ جس کی سچائی اس کے متواتر نشانوں سے مجھ پر کھل گئی ہے اور مَیں بیت اللہ میں کھڑے ہو کر یہ قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوتی ہے وہ اسی خدا کا کلام ہے۔ جس نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا کلام نازل کیا تھا۔ میرے لئے زمین نے بھی گواہی دی اور آسمان نے بھی۔ اِس طرح میرے لئے آسمان بھی بولا اور زمین بھی کہ مَیں **خلیفۃ اللہ** ہوں۔ مگر پیشگوئیوں کے مطابق ضرور تھا کہ انکار بھی کیا جاتا۔ اس لئے جن کے دلوں پر پردے ہیں وہ قبول نہیں کرتے۔ مَیں جانتا ہوں کہ خدا ضرور میری تائید کرے گا جیسا کہ

وہ ہمیشہ اپنے رسولوں کی تائید کرتا رہا ہے۔ کوئی نہیں جو میرے مقابل پر ٹھہر سکے۔

(ایک غلطی کا ازالہ ص۷-۸)

چونکہ مَیں ایک ایسے نبی کا تابع ہوں جو انسانیت کے تمام کمالات کا جامع تھا اور اُس کی شریعت اکمل اور اتم تھی اور تمام دنیا کی اصلاح کے لئے تھی اس لئے مجھے وہ قوتیں عنایت کی گئیں جو تمام دنیا کی اصلاح کے لئے ضروری تھیں تو پھر اِس امر میں کیا شک ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو وہ فطرتی طاقتیں نہیں دی گئیں جو مجھے دی گئیں۔ کیونکہ وہ ایک خاص قوم کے لئے آئے تھے۔ اور اگر وہ میری جگہ ہوتے تو اپنی اس فطرت کی وجہ سے وہ کام انجام نہ دے سکتے جو خدا کی عنایت نے مجھے انجام دینے کی قوت دی۔ وھٰذا تحدیث نعمۃ اللّٰہ ولا فخر۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہمارے نبی صلے اللّٰہ علیہ وسلم کی جگہ آتے تو اس کام کو انجام نہ دے سکتے اور اگر قرآن شریف کی جگہ توریت نازل ہوتی تو اس کام کو ہرگز انجام نہ دے سکتی جو قرآن شریف نے دیا۔ انسانی مراتب پردۂ غیب میں ہیں۔ اِس بات میں بگڑنا اور مُنہ بنانا اچھا نہیں۔ کیا جس قادر مطلق نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا وہ ایسا ہی ایک اور انسان یا اس سے بہتر پیدا نہیں کر سکتا؟ اگر قرآن شریف کی کسی آیت سے ثابت ہوتا ہے تو وہ آیت پیش کرنی چاہیئے سخت مردود وہ شخص ہوگا جو قرآنی آیت سے انکار کرے۔ ورنہ مَیں اس پاک وحی کے مخالف کیونکر خلاف واقعہ کہہ سکتا ہوں جو قریبًا تیئیس[۲۳] برس سے مجھ کو تسلّی دے رہی ہے اور ہزارہا خدا کی گواہیاں اور فوق العادت نشان اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ خدا تعالیٰ کے کام مصلحت اور حکمت سے خالی نہیں۔ اُس نے دیکھا کہ ایک شخص کو محض بے وجہ خدا بنایا گیا ہے جس کی چالیس کروڑ آدمی پرستش کر رہے ہیں۔ تب اُس نے مجھے ایسے زمانہ میں بھیجا کہ جب اس عقیدہ پر غلو انتہا تک پہنچ گیا تھا۔ اور تمام نبیوں کے نام میرے نام رکھے مگر مسیح ابن مریم کے نام سے خاص طور پر مجھے مخصوص کر کے وہ میرے پر رحمت اور عنایت کی گئی جو اس پر نہیں کی گئی تا لوگ سمجھیں کہ فضل خدا کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اگر مَیں اپنی طرف سے یہ باتیں کرتا ہوں تو جھوٹا ہوں۔ لیکن اگر خدا میری نسبت اپنے نشانوں کے ساتھ گواہی دیتا ہے۔ تو میری تکذیب تقویٰ کے برخلاف ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۵۳-۱۵۴)

خدا تعالیٰ کے الہام اور وحی سے کہتا ہوں **وہ جو آنے والا تھا وہ مَیں ہوں**۔ قدیم سے خدا تعالیٰ نے منہاج نبوت پر جو طریق ثبوت کا رکھا ہوا ہے وہ مجھ سے جس کا جی چاہے لے لے۔

(ملفوظات جلد چہارم ص۳۹)

مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں اپنے خدائے پاک کے یقینی اور قطعی مکالمہ سے مشرف ہوں اور قریباً ہر روز مشرف ہوتا ہوں اور وہ خدا جس کو یسوع مسیح کہتا ہے کہ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اُس نے مجھے نہیں چھوڑا۔ اور مسیح کی طرح میرے پر بھی بہت حملے ہوئے مگر ہر ایک حملہ میں دشمن ناکام رہے۔ اور مجھے پھانسی دینے کے لئے منصوبہ کیا گیا۔ مگر میں مسیح کی طرح صلیب پر نہیں چڑھا بلکہ ہر ایک بلا کے وقت میرے خدا نے مجھے بچایا اور میرے لئے اس نے بڑے بڑے معجزات دکھلائے اور بڑے بڑے قوی ہاتھ دکھلائے۔ اور ہزارہا نشانوں سے اُس نے مجھ پر ثابت کر دیا کہ خدا وہی خدا ہے جس نے قرآن کو نازل کیا اور جس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔ اور میں عیسیٰ مسیح کی ہرگز ان امور میں اپنے پر کوئی زیادت نہیں دیکھتا یعنی جیسے اُس پر خدا کا کلام نازل ہوا ایسا ہی مجھ پر بھی ہوا اور جیسے اُس کی نسبت معجزات منسوب کئے جاتے ہیں میں یقینی طور پر اُن معجزات کا مصداق اپنے نفس کو دیکھتا ہوں بلکہ اُن سے زیادہ۔ اور یہ تمام شرف مجھے صرف ایک نبی کی پیروی سے ملا ہے جس کے مدارج اور مراتب سے دنیا بے خبر ہے یعنی
سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ عجیب ظلم ہے کہ جاہل اور نادان لوگ کہتے ہیں کہ عیسیٰ آسمان پر زندہ ہے حالانکہ زندہ ہونے کے علامات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پاتا ہوں۔ وہ خدا جس کو دنیا نہیں جانتی ہم نے اس خدا کو اس نبی کے ذریعہ سے دیکھ لیا۔ اور وہ وحیٔ الٰہی کا دروازہ جو دوسری قوموں پر بند ہے ہمارے پر محض اس نبی کی برکت سے کھولا گیا اور وہ معجزات جو غیر قومیں صرف قصّوں اور کہانیوں کے طور پر بیان کرتی ہیں ہم نے اس نبیؐ کے ذریعہ سے وہ معجزات بھی دیکھ لئے۔ اور ہم نے اس نبی کا وہ مرتبہ پایا جس کے آگے کوئی مرتبہ نہیں۔ مگر تعجب کہ دنیا اس سے بے خبر ہے۔ مجھے کہتے ہیں کہ مسیح موعود ہونے کا کیوں دعویٰ کیا؟ مگر میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اس نبیؐ کی کامل پیروی سے ایک شخص عیسیٰ سے بڑھ کر بھی ہو سکتا ہے۔ اندھے کہتے ہیں یہ کفر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تم خود ایمان سے بے نصیب ہو۔ پھر کیا جانتے ہو کہ کفر کیا چیز ہے؟ کفر خود تمہارے اندر ہے۔ اگر تم جانتے کہ اس آیت کے کیا معنے ہیں کہ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم تو ایسا کفر منہ پر نہ لاتے۔ خدا تو تمہیں یہ ترغیب دیتا ہے کہ تم اس رسولؐ کی کامل پیروی کی برکت سے تمام رسولوں کے متفرق کمالات اپنے اندر جمع کر سکتے ہو۔ اور تم صرف ایک نبی کے کمالات حاصل کرنا کفر جانتے ہو۔ (چشمہ مسیحی ص ۲۷-۲۸)

میں اسی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جیسا کہ اُس نے ابراہیمؑ سے مکالمہ مخاطبہ کیا اور پھر اسحٰقؑ سے اور اسمٰعیلؑ سے اور یعقوبؑ سے اور یوسفؑ سے اور موسیٰؑ سے اور مسیحؑ ابن مریم سے اور سب کے بعد ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہمکلام ہوا کہ آپ پر سب سے زیادہ روشن اور پاک وحی نازل کی ایسا ہی اُس نے مجھے بھی اپنے مکالمہ مخاطبہ کا شرف بخشا۔ مگر یہ شرف مجھے محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے حاصل ہوا۔ اگر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت نہ ہوتا اور آپ کی پیروی نہ کرتا تو اگر دنیا کے تمام پہاڑوں کے برابر میرے اعمال ہوتے تو پھر بھی میں کبھی یہ شرف مکالمہ مخاطبہ ہرگز نہ پاتا کیونکہ اب بجز محمدی نبوت کے سب نبوتیں بند ہیں۔ شریعت والا نبی کوئی نہیں آسکتا اور بغیر شریعت کے نبی ہو سکتا ہے مگر وہی جو پہلے امتی ہو پس اس بنا پر میں اُمتی بھی ہوں اور نبی بھی۔ اور میری نبوّت یعنی مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ظلّ ہے اور بجز اس کے میری نبوت کچھ بھی نہیں۔ وہی نبوتِ محمدیہ ہے جو مجھ میں ظاہر ہوئی۔

(تجلّیاتِ الٰہیہ ص ۲۴)

میں نے بار بار بیان کر دیا ہے کہ یہ کلام جو میں سنتا ہوں یہ قطعی اور یقینی طور پر خدا کا کلام ہے جیسا کہ قرآن اور توریت خدا کا کلام ہے اور میں خدا کا ظلّی اور بروزی طور پر نبی ہوں۔ اور ہر ایک مسلمان کو دینی امور میں میری اطاعت واجب ہے اور مسیح موعود ماننا واجب ہے اور ہر ایک جس کو میری تبلیغ پہنچ گئی ہے گو وہ مسلمان ہے مگر مجھے اپنا حَکَم نہیں ٹھہراتا اور نہ مجھے مسیح موعود مانتا ہے اور نہ میری وحی کو خدا کی طرف سے جانتا ہے وہ آسمان پر قابلِ مواخذہ ہے کیونکہ جس امر کو اس نے اپنے وقت پر قبول کرنا تھا اُس کو ردّ کر دیا۔ میں صرف یہ نہیں کہتا کہ میں اگر جھوٹا ہوتا تو ہلاک کیا جاتا بلکہ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور داودؑ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرح میں سچّا ہوں اور میری تصدیق کے لئے خدا نے دس ہزار سے بھی زیادہ نشان دکھلائے ہیں قرآن نے میری گواہی دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گواہی دی ہے۔

(تحفۃ الندوۃ ص ۴)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ قیامت تک ممتد ہے اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اس لئے خدا نے یہ نہ چاہا کہ وحدت اقوامی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی کمال تک پہنچ جائے۔ کیونکہ یہ صورت آپؐ کے زمانے کے خاتمہ پر دلالت کرتی تھی یعنی شبہ گذرتا تھا کہ

آپ کا زمانہ وہیں تک ختم ہو گیا۔ کیونکہ جو آخری کام تھا وہ اس زمانہ میں انجام تک پہنچ گیا۔ اسلئے خدا نے تکمیل اس فعل کی جو تمام قومیں ایک قوم کی طرح بن جائیں اور ایک ہی مذہب پر ہو جائیں زمانہ محمدی کے آخری حصہ پر ڈال دی جو قرب قیامت کا زمانہ ہے۔ اور اس کی تکمیل کے لئے اسی اُمت میں سے ایک نائب مقرر کیا جو **مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے اور اس کا نام خاتم الخلفاء ہے** پس زمانہ محمدی کے سر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس کے آخر میں مسیح موعود ہے۔ اور ضرور تھا کہ یہ سلسلہ دنیا کا منقطع نہ ہو جب تک کہ وہ پیدا نہ ہولے کیونکہ وحدت اقوامی کی خدمت اس نائب النبوۃ کے عہد سے وابستہ کی گئی ہے۔ اور اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ ہے:-

هو الذی ارسل رسوله بالهدٰی ودین الحق لیظهره علی الدین کلّه

یعنی خدا وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ایک کامل ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا اس کو ہر ایک قسم کے دین پر غالب کر دے یعنی ایک عالمگیر غلبہ اس کو عطا کرے .... اس آیت کی نسبت ان سب متقدمین کا اتفاق ہے جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں کہ یہ عالمگیر غلبہ مسیح موعود کے وقت میں ظہور میں آئے گا۔

(چشمۂ معرفت ص۸۲-۸۳)

مَیں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اُسی نے مجھے بھیجا ہے۔ اور اسی نے میرا نام نبی رکھا ہے اور اُسی نے مجھے مسیح موعود کے نام سے پکارا ہے۔ اور اُس نے میری تصدیق کے لئے بڑے بڑے نشان ظاہر کئے ہیں۔ جو تین لاکھ تک پہنچتے ہیں۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص۶۸)

مجھے خدا تعالیٰ نے میری وحی میں بار بار اُمتی کر کے بھی پکارا ہے اور نبی کر کے بھی پکارا ہے۔ اور ان دونوں ناموں کے سننے سے میرے دل میں نہایت لذّت پیدا ہوتی ہے۔ اور مَیں شکر کرتا ہوں کہ اس مرکب نام سے مجھے عزت دی گئی ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۸۴)

اسی طرح خدا تعالیٰ کی طرف سے دو نام مَیں نے پائے ایک میرا نام اُمتی رکھا گیا جیسا کہ میرے نام غلام احمدؐ سے ظاہر ہے۔ دوسرے میرا نام ظلی طور پر نبی رکھا گیا۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے حصص سابقہ براہین احمدیہ میں میرا نام احمد رکھا اور اس نام سے بار بار مجھ کو پکارا اور یہ اسی بات کی طرف اشارہ تھا کہ مَیں ظلی طور پر نبی ہوں۔ پس میں اُمتی بھی ہوں اور ظلی طور پر نبی بھی ہوں۔ اسی کی طرف وہ

وحی الٰہی بھی اشارہ کرتی ہے جو حصص سابقہ براہین احمدیہ میں ہے ۔ کلّ برکة من محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتبارک من علّم و تعلّم ۔ یعنی ہر ایک برکت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے ۔ پس بہت برکت والا وہ انسان ہے جس نے تعلیم کی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر بعد اس کے بہت برکت والا وہ ہے جس نے تعلیم پائی یعنی یہ عاجز ۔ پس اتباعِ کامل کی وجہ سے میرا نام امتی ہوا اور پورا عکس نبوت حاصل کرنے سے میرا نام نبی ہو گیا ۔ پس اس طرح پر مجھے دو نام حاصل ہوئے ۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۸۸-۱۸۹)

جس جس جگہ میں نے نبوت یا رسالت سے انکار کیا ہے صرف ان معنوں سے کیا ہے کہ میں مستقل طور پر کوئی شریعت لانے والا نہیں ہوں اور نہ ہی مستقل طور پر نبی ہوں مگر ان معنوں سے کہ میں نے اپنے رسول مقتدا سے باطنی فیوض حاصل کر کے اور اپنے لئے اس کا نام پا کر اس کے واسطہ سے خدا کی طرف سے علمِ غیب پایا ہے رسول اور نبی ہوں مگر بغیر کسی جدید شریعت کے ۔ اِس طور کا نبی کہلانے سے میں نے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ انہی معنوں سے خدا نے مجھے نبی اور رسول کر کے پکارا ہے ۔ سو اب بھی میں اِن معنوں سے نبی اور رسول ہونے سے انکار نہیں کرتا ۔ اور میرا یہ قول ؎

”من نیستم رسول و نیاوردہ ام کتاب“

اس کے معنے صرف اس قدر ہیں کہ میں صاحب شریعت نہیں ہوں ۔ ہاں یہ بات بھی ضرور یاد رکھنی چاہیئے اور ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ میں باوجود نبی اور رسول کے لفظ سے پکارے جانے کے خدا کی طرف سے اطلاع دیا گیا ہوں کہ یہ تمام فیوض بلاواسطہ میرے پر نہیں ہیں بلکہ آسمان پر ایک وجود ہے جس کا روحانی افاضہ میرے شاملِ حال ہے یعنی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اس واسطہ کو ملحوظ رکھ کر اور اس میں ہو کر اور اس کے نام محمد اور احمد سے مسمّٰی ہو کر میں رسول بھی ہوں اور نبی بھی ہوں ۔ یعنی بھیجا گیا بھی اور خدا سے غیب کی خبریں پانے والا بھی ۔ اور اس طور سے خاتم النبیین کی مہر محفوظ رہی ۔ کیونکہ میں نے انعکاسی اور ظلّی طور پر محبت کے آئینہ کے ذریعہ سے وہی نام پایا ۔ اگر کوئی شخص اس وحیٔ الٰہی پر ناراض ہو کہ کیوں خدا تعالیٰ نے میرا نام نبی اور رسول رکھا ہے تو یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ میرے نبی اور رسول ہونے سے خدا کی مُہر نہیں ٹوٹتی ۔

(ایک غلطی کا ازالہ صفحہ ۸-۹)

آج سے چھبیس برس پہلے میرا نام براہین احمدیہ میں **محمد** اور **احمد** رکھا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز مجھے قرار دیا ہے ۔ اسی وجہ سے براہین احمدیہ میں لوگوں کو مخاطب کر کے فرما دیا ہے ۔ قل

ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ۔ اور نیز فرمایا۔ کل برکۃ من محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم فتبارک من علّم و تعلّم۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ کس طرح معلوم ہُوا کہ حدیث لوکان الایمان معلّقاً بالثریّا لنالہ رجلٌ من فارس اس عاجز کے حق میں ہے اور کیوں جائز نہیں امت محمدیہ میں سے کسی اَور کے حق میں ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ براہین احمدیہ میں بار بار اس حدیث کا مصداق وحی الٰہی نے مجھے ٹھیرایا ہے۔ اور بتصریح بیان فرمایا کہ وہ میرے حق میں ہے اور مَیں خدا تعالیٰ کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے جو میرے پر نازل ہُوا۔ و من ینکر بہ فلیبارز للمباھلۃ ولعنۃ اللّٰہ علیٰ من کذب الحق او افتریٰ علیٰ حضرۃ العزّۃ۔ اور یہ دعویٰ امتِ محمدیہ میں سے آج تک کسی اَور نے ہرگز نہیں کیا کہ خدا تعالیٰ نے میرا یہ نام رکھا ہے اور خدا تعالیٰ کی وحی سے صرف میں اس نام کا مستحق ہوں۔ اور یہ کہنا کہ نبوت کا دعویٰ کیا ہے کس قدر جہالت کس قدر حماقت اور کس قدر حق سے خروج ہے۔ اے نادانو! میری مراد نبوت سے یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللّٰہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے مقابل پر کھڑا ہو کر نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں یا کوئی نئی شریعت لایا ہوں۔ صرف مراد میری نبوت سے کثرت مکالمت و مخاطبت الٰہیہ ہے جو آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی اتباع سے حاصل ہے۔ سو مکالمہ مخاطبہ کے آپ لوگ بھی قائل ہیں۔ پس یہ صرف لفظی نزاع ہوئی۔ یعنی آپ لوگ جس امر کا نام مکالمہ و مخاطبہ رکھتے ہیں مَیں اس کی کثرت کا نام بموجب حکم الٰہی نبوت رکھتا ہوں۔ ولکلّ ان یصطلح۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۶۴-۶۸)

و انّی علیٰ مقام الختم من الولایۃ کما کان سیدالمصطفیٰ علیٰ مقام الختم من النّبوّۃ و انہ خاتم الانبیاء و انا خاتم الاولیاء لا ولیّ بعدی الّا الذی ھو منی و علیٰ عھدی۔ و انّی اُرسِلْت من ربّی بکلّ قوۃ و برکۃ و عزّۃ۔ وانّ قدمی ھٰذہٖ علیٰ منارۃٍ ختم علیھا کل رفعۃ۔

(خطبہ الہامیہ ص ۳۵)

مَیں وہی ہوں جس کا خدا نے وعدہ کیا تھا۔ ہاں! مَیں وہی ہوں جس کا سارے نبیوں کی زبان پر وعدہ ہُوا۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۶۵)

خدا تعالیٰ نے میرا نام عیسیٰ ہی نہیں رکھا بلکہ ابتداء سے انتہا تک جسقدر انبیاء علیہم السلام کے نام تھے وہ سب میرے نام رکھ دیئے ہیں۔ چنانچہ براہین احمدیہ حصص سابقہ میں میرا نام آدم رکھا جیسا کہ اللّٰہ تعالیٰ فرماتا ہے اردت ان استخلف فخلقت ادم ......

اسی طرح براہین احمدیہ کے حصص سابقہ میں خدا تعالیٰ نے میرا نام نوح بھی رکھا اور میری نسبت فرمایا ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انھم مغرقون .... اور مجھے خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ اصنع الفلک باعیننا و وحینا۔ ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللّٰہ ید اللّٰہ فوق ایدیھم

اسی طرح براہین احمدیہ کے حصص سابقہ میں میرا نام ابراہیم بھی رکھا گیا۔ جیسا کہ فرمایا۔ سلام علیک یا ابراھیم یعنی اے ابراہیم تجھ پر سلام۔ ابراہیم علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے بہت برکتیں دی تھیں اور وہ ہمیشہ دشمنوں کے ہاتھ سے سلامت رہا۔ پس میرا نام ابراہیم رکھ کر خدا تعالیٰ یہ اشارہ کرتا ہے کہ ایسا ہی اس ابراہیم کو برکتیں دی جائیں گی اور مخالف اس کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکیں گے ....

اسی طرح براہین احمدیہ کے حصص سابقہ میں میرا نام یوسف بھی رکھا گیا ...... اور ایسا ہی براہین احمدیہ کے حصص سابقہ میں میرا نام موسیٰ رکھا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تلطف بالناس و ترحم علیھم وانت فیھم بمنزلۃ موسیٰ واصبر علی ما یقولون ......

اسی طرح خدا نے براہین احمدیہ حصص سابقہ میں میرا نام داؤد بھی رکھا جس کی تفصیل عنقریب اپنے موقعہ پر آئیگی۔ ایسا ہی براہین احمدیہ کے حصص سابقہ میں خدا تعالیٰ نے میرا نام سلیمان بھی رکھا اور اس کی تفصیل بھی عنقریب آئیگی۔ ایسا ہی براہین احمدیہ کے حصص سابقہ میں خدا تعالیٰ نے میرا نام احمد اور محمد بھی رکھا اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم نبوۃ ہیں ویسا ہی یہ عاجز خاتم ولایت ہے۔ اور بعد اس کے میری نسبت براہین احمدیہ کے حصص سابقہ میں یہ بھی فرمایا جری اللّٰہ فی حلل الانبیاء۔ یعنی رسول خدا تمام نبیوں کے پیرایوں میں۔ اس وحی الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ آدم سے لیکر آخیر تک جس قدر انبیاء علیہم السلام خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں آئے ہیں خواہ وہ اسرائیلی ہیں یا غیر اسرائیلی ان سب کے خاص واقعات یا خاص صفات میں سے اس عاجز کو کچھ حصہ دیا گیا ہے۔ اور ایک بھی نبی ایسا نہیں گذرا جس کے خواص یا واقعات میں سے اس عاجز کو حصہ نہیں دیا گیا۔ ہر ایک نبی کی فطرت کا نقش میری فطرت میں ہے۔ اسی پر خدا نے مجھے اطلاع دی ....

اس زمانہ میں خدا نے چاہا کہ جسقدر نیک اور راستباز مقدس نبی گذر چکے ہیں ایک ہی شخص کے وجود میں ان کے نمونے ظاہر کئے جاویں۔ سو وہ میں ہوں ....

اسی طرح خدا تعالیٰ نے میرا نام ذوالقرنین بھی رکھا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی میری نسبت یہ وحی مقدس کہ جری اللّٰہ فی حلل الانبیاء جس کے یہ معنے ہیں کہ خدا کا رسول تمام نبیوں کے پیرایوں میں

یہ چاہتی ہے کہ مجھ میں ذوالقرنین کی بھی صفات ہوں کیونکہ سورہ کہف سے ثابت ہے کہ ذوالقرنین بھی صاحب وحی تھا۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۸۹-۹۰)

خدا نے جو ہر ایک کام نرمی سے کرتا ہے اس زمانے کے لئے سب سے پہلے میرا نام عیسیٰ ابن مریم رکھا کیونکہ ضرور تھا کہ مَیں ابتدائی زمانہ میں ابن مریم کی طرح قوم کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھاؤں اور کافر اور ملعون اور دجّال کہلاؤں اور عدالتوں میں کھینچا جاؤں۔ سو میرے لئے ابن مریم ہونا پہلا زینہ تھا مگر خدا کے دفتر میں صرف عیسیٰ بن مریم کے نام سے موسوم نہیں بلکہ اَور بھی میرے نام ہیں جو آج سے ۲۶ چھبیس برس پہلے خدا تعالیٰ نے براہین احمدیہ میں میرے ہاتھ سے لکھا دیئے ہیں۔ اور دنیا میں کوئی نبی نہیں گذرا جس کا نام مجھے نہیں دیا گیا۔ سو جیسا کہ براہین احمدیہ میں خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ مَیں آدم ہوں۔ مَیں نوح ہوں۔ مَیں ابراہیم ہوں۔ مَیں اسحاق ہوں۔ میں یعقوب ہوں۔ مَیں اسمٰعیل ہوں۔ مَیں موسیٰ ہوں میں داؤد ہوں۔ مَیں عیسیٰ بن مریم ہوں۔ مَیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یعنی بروزی طور پر جیسا کہ خدا نے اس کتاب میں یہ سب نام مجھے دیئے اور میری نسبت جری اللّٰہ فی حلل الانبیاء یعنی خدا کا رسول نبیوں کے پیرایوں میں۔ سو ضرور ہے کہ ہر ایک نبی کی شان مجھ میں پائی جاوے۔ اور ہر ایک نبی کی ایک صفت کا میرے ذریعہ سے ظہور ہو مگر خدا نے یہی پسند کیا کہ سب سے پہلے ابن مریم کے صفات مجھ میں ظاہر کرے۔ سو مَیں نے اپنی قوم سے وہ سب دکھ اُٹھائے جو ابن مریم نے یہود سے اُٹھائے۔ بلکہ تمام قوموں سے اٹھائے۔ یہ سب کچھ ہُوا مگر پھر خدا نے کسر صلیب کے لئے میرا نام مسیح قائم رکھا تا جس صلیب نے مسیح کو توڑا تھا اور اس کو زخمی کیا تھا دوسرے وقت میں مسیح اس کو توڑے۔ مگر آسمانی نشانوں کے ساتھ نہ انسانی ہاتھوں کے ساتھ۔ کیونکہ خدا کے نبی مغلوب نہیں رہ سکتے۔ سو سنہ عیسوی کی بیسویں صدی میں پھر خدا نے ارادہ فرمایا کہ صلیب کو مسیح کے ہاتھ سے مغلوب کرے۔ لیکن جیسا کہ مَیں ابھی بیان کر چکا ہوں مجھے اور نام بھی دیئے گئے ہیں۔ اور ہر ایک نبی کا مجھے نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ جو ملک ہند میں کرشن نام ایک نبی گذرا ہے جس کو رُدّر گوپال بھی کہتے ہیں (یعنی فنا کرنے والا اور پرورش کرنے والا) اس کا نام بھی مجھے دیا گیا ہے۔ پس جیسا کہ آریہ قوم کے لوگ کرشن کے ظہور کا ان دنوں میں انتظار کرتے ہیں وہ کرشن مَیں ہی ہوں۔ اور یہ دعوےٰ صرف میری طرف سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے بار بار میرے پر ظاہر کیا ہے کہ جو کرشن آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا وہ تو ہی ہے۔ آریوں کا بادشاہ .... آریہ ورت کے محقق پنڈت بھی کرشن اوتار کا زمانہ

یہی قرار دیتے ہیں اور اس زمانے میں اس کے آنے کے منتظر ہیں۔ گو وہ لوگ ابھی مجھ کو شناخت نہیں کرتے مگر وہ زمانہ آتا ہے بلکہ قریب ہے کہ مجھے شناخت کریں گے کیونکہ خدا کا ہاتھ انہیں دکھائیگا کہ آنے والا یہی ہے۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۸۴-۸۷)

خدا تعالیٰ نے کشفی حالت میں بارہا مجھے اس بات پر اطلاع دی ہے کہ آریہ قوم میں کرشن نام جو ایک شخص گذرا ہے۔ وہ . . . برگزیدوں اور اپنے وقت کے نبیوں میں سے تھا۔ اور ہندوؤں میں اوتار کا لفظ درحقیقت نبی کے ہم معنے ہے۔ اور ہندوؤں کی کتابوں میں ایک پیشگوئی ہے اور وہ یہ کہ آخری زمانہ میں ایک اوتار آئیگا جو کرشن کے صفات پر ہوگا اور اس کا بروز ہوگا۔ اور میرے پر ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ مَیں ہوں۔ کرشن کی دو صفت ہیں۔ ایک رُدّر یعنی درندوں اور سؤروں کو قتل کرنے والا یعنی دلائل اور نشانوں سے۔ دوسرے گوپال یعنی گائیوں کو پالنے والا یعنی اپنے انفاس سے نیکوں کا مددگار۔ اور یہ دونوں صفتیں مسیح موعود کی صفتیں ہیں اور یہی دونوں صفتیں خدا تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ ص ۲۱۶ حاشیہ)

مَیں ان گناہوں کے دور کرنے کے لئے جن سے زمین پُر ہوگئی ہے جیسا کہ مسیح ابن مریم کے رنگ میں ہوں ایسا ہی راجہ کرشن کے رنگ میں بھی ہوں جو ہندو مذہب کے تمام اوتاروں میں سے ایک بڑا اوتار تھا۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ روحانی حقیقت کی رُو سے مَیں وہی ہوں۔ یہ میرے خیال اور قیاس سے نہیں بلکہ وہ خدا جو زمین اور آسمان کا خدا ہے اس نے میرے پر ظاہر کیا ہے اور نہ ایک دفعہ بلکہ کئی دفعہ مجھے بتایا ہے کہ تو ہندوؤں کے لئے کرشن اور مسلمانوں اور عیسائیوں کیلئے مسیح موعود ہے۔

(لیکچر سیالکوٹ ص ۳۲ طبع اوّل)

قد انبأنی ربّی اننی کسفینۃ نوح للخلق فمن اتانی ودخل فی البیعۃ۔ فقد نجا من الضیعۃ۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۴۸۶)

واِنّی انا الخضر فی بعض صفاتی لا تُحاطُ اَسرارِی۔

(کاپی الہامات ص ۳۹ قلمی حضرت مسیح موعود علیہ السلام)

خدائے حکیم علیم نے وضع دنیا دوری رکھی ہے۔ یعنی بعض نفوس بعض کے مشابہ ہوتے ہیں۔ نیک نیکوں کے مشابہ اور بد بدوں کے مشابہ مگر بایں ہمہ یہ امر مخفی ہوتا ہے اور زور شور سے ظاہر نہیں ہوتا

لیکن آخری زمانہ کے لئے خدا نے مقرر کیا ہُوا تھا کہ وہ ایک عام رجعت کا زمانہ ہوگا تا یہ امت مرحومہ دوسری اُمتوں سے کسی بات میں کم نہ ہو۔ پس اس نے مجھے پیدا کر کے ہر ایک گذشتہ نبی سے مجھے اُس نے تشبیہ دی کہ وہی میرا نام رکھ دیا۔ چنانچہ آدم ابراہیم نوح موسیٰ داؤد سلیمان یوسف یحییٰ عیسیٰ وغیرہ تمام نام براہین احمدیہ میں میرے رکھے گئے۔ اور اس صورت میں گویا تمام انبیاء گذشتہ اس امت میں دوبارہ پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ سب کے آخر مسیح ہو گیا اور جو میرے مخالف تھے ان کا نام عیسائی اور یہودی اور مشرک رکھا گیا۔ چنانچہ قرآن شریف میں اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين۔

(نزول المسیح ص۴ حاشیہ)

میرا انکار میرا انکار نہیں بلکہ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار ہے۔ کیونکہ جو میری تکذیب کرتا ہے وہ میری تکذیب سے پہلے معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کو جھوٹا ٹھہرا لیتا ہے ......

مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ الحمد سے لے کر والناس تک سارا قرآن چھوڑنا پڑے گا۔ پھر سوچو کہ کیا میری تکذیب کوئی آسان امر ہے۔ یہ مَیں از خود نہیں کہتا خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حق یہی ہے کہ جو مجھے چھوڑے گا اور میری تکذیب کرے گا۔ وہ زبان سے نہ کرے مگر عمل سے اُس نے سارے قرآن کی تکذیب کر دی اور خدا کو چھوڑ دیا۔

(ملفوظات جلد چہارم ص۱۴)

جن ناپاک طبع لوگوں نے تکفیر پر کمر باندھی ہے ان کے مقابل پر ایسے لوگ بھی ہیں جن کو عالم رؤیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عاجز کی نسبت دریافت کیا اور آپ نے فرمایا کہ وہ شخص درحقیقت منجانب اللہ ہے اور اپنے دعویٰ میں صادق ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی بہت سی شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں جس شخص کو اس تحقیق کا شوق ہے وہ ہم سے اس بات کا ثبوت لے سکتا ہے۔

(ضمیمہ انجام آتھم ص۳۴۳)

مجھے اس خدا کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ مجھے قرآن کے حقائق اور معارف کے سمجھنے میں ہر ایک رُوح پر غلبہ دیا گیا ہے۔ اور اگر کوئی مولوی میرے مقابل پر آتا جیسا کہ مَیں نے قرآنی تفسیر کے لئے بار بار ان کو بلایا تو خدا اس کو ذلیل و شرمندہ کرتا سو فہم قرآن،

جو مجھ کو عطا کیا گیا یہ اللہ جلّ شانہٗ کا ایک نشان ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ عنقریب دنیا دیکھے گی کہ میں اس بیان میں سچا ہوں۔

(سراج منیر ص۴۱)

خدا نے یہی ارادہ کیا ہے کہ جو مسلمانوں میں سے مجھ سے علیحدہ رہے گا۔ وہ کاٹا جائے گا۔ بادشاہ ہو یا غیر بادشاہ۔

(تذکرہ ص۳۰۷)

خدا تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے اور خدا کے نزدیک قابلِ مواخذہ ہے۔

(تذکرہ ص۶۰۰)

مَیں حضرت قُدس کا باغ ہوں۔ جو مجھے کاٹنے کا ارادہ کرے گا وہ خود کاٹا جائیگا مخالف روسیاہ ہوگا اور منکر شرمسار۔

(نشانِ آسمانی ص۳۷)

پس پھر میں کھول کر کہتا ہوں کہ میری تکذیب آسان امر نہیں۔ مجھے کافر کہنے سے پہلے خود کافر بننا ہوگا۔ مجھے بے دین اور گمراہ کہنے میں دیر ہوگی مگر پہلے اپنی گمراہی اور روسیاہی کو مان لینا پڑے گا۔ مجھے قرآن و حدیث کو چھوڑنے والا کہنے کے لئے پہلے خود قرآن اور حدیث کو چھوڑ دینا پڑیگا اور پھر بھی وہی چھوڑے گا۔ مَیں قرآن و حدیث کا مصدّق و مصداق ہوں گمراہ نہیں بلکہ مہدی ہوں۔ مَیں کافر نہیں بلکہ اَنَا اَوّلُ المومنین کا مصداقِ صحیح ہوں اور جو کچھ مَیں کہتا ہوں خدا نے مجھ پر ظاہر کیا کہ یہ سچ ہے۔ جس کو خدا پر یقین ہے وہ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق مانتا ہے اُس کے لئے یہی حجت کافی ہے کہ میرے مُنہ سے سُنکر خاموش ہو جائے لیکن جو دلیر اور بے باک ہے اس کا کیا علاج؟ خدا خود اس کو سمجھائے گا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ خدا کے واسطے اس امر پر غور کریں اور اپنے دوستوں کو بھی وصیّت کریں کہ وہ میرے معاملہ میں جلدی سے کام نہ لیں۔ بلکہ نیک نیتی اور خالی الذہن ہو کر سوچیں۔

(ملفوظات جلد چہارم ص۱۶)

ایک دفعہ کشفی رنگ میں مَیں نے دیکھا کہ مَیں نے نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کیا۔ اور پھر مَیں نے کہا کہ آؤ اب انسان کو پیدا کریں۔ اِس پر نادان مولویوں نے شور مچایا کہ دیکھو اب اس شخص نے خدائی کا

دعویٰ کیا حالانکہ اس کشف سے یہ مطلب تھا کہ خدا میرے ہاتھ پر ایک ایسی تبدیلی پیدا کرے گا کہ گویا آسمان اور زمین نئے ہو جائیں گے اور حقیقی انسان پیدا ہونگے ۔

(چشمۂ مسیحی حاشیہ ص۶۰ ۔ طبع اول ص۵۸)

اس زمانہ میں جس طرح خدائے تعالیٰ قریب ہو کر ظاہر ہو رہا ہے اور صدہا امور غیب اپنے بندہ پر کھول رہا ہے اس زمانہ کی گذشتہ زمانوں میں بہت ہی کم مثال ملے گی۔ لوگ عنقریب دیکھ لیں گے کہ اس زمانے میں خدائے تعالیٰ کا چہرہ ظاہر ہو گا گویا وہ آسمان سے اترے گا۔ اس نے بہت مدت تک اپنے تئیں چھپائے رکھا اور انکار کیا گیا اور چُپ رہا لیکن وہ اب نہیں چھپائے گا اور دنیا اس کی قدرت کے وہ نمونے دیکھے گی کہ کبھی ان کے باپ دادوں نے نہیں دیکھے تھے ۔ یہ اس لئے ہو گا کہ زمین بگڑ گئی اور آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے پر لوگوں کا ایمان نہیں رہا۔ ہونٹوں پر اس کا ذکر ہے لیکن دل اس سے پھر گئے ہیں اس لئے خدا نے کہا کہ اب میں نیا آسمان اور نئی زمین بناؤں گا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ زمین مر گئی۔ یعنی زمینی لوگوں کے دل سخت ہو گئے گویا مر گئے کیونکہ خدا کا چہرہ اُن سے چھپ گیا۔ اور گذشتہ آسمانی نشان سب بطور قصوں کے ہو گئے ۔ سو خدا نے ارادہ کیا کہ وہ نئی زمین اور نیا آسمان بناوے ۔ وہ کیا ہے نیا آسمان؟ اور کیا ہے نئی زمین؟ نئی زمین وہ پاک دل ہیں جن کو خدا اپنے ہاتھ سے تیار کر رہا ہے جو خدا سے ظاہر ہوئے اور خدا اُن سے ظاہر ہو گا۔ اور نیا آسمان وہ نشان ہیں جو اس کے بندے کے ہاتھ سے اُسی کے اذن سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ دنیا نے خدا کی اس نئی تجلّی سے دشمنی کی۔ ان کے ہاتھ میں بجز قصوں کے اور کچھ نہیں اور ان کا خدا ان کے اپنے ہی تصورات ہیں۔ دل ٹھٹھرے ہیں اور ہمتیں تھکی ہوئی ہیں اور آنکھوں پر پردے ہیں۔

(کشتیٔ نوح ص۱۰-۱۱)

(۱) خدا نے مجھے قرآنی معارف بخشے ہیں۔
(۲) خدا نے مجھے قرآن کی زبان میں اعجاز عطا فرمایا ہے۔
(۳) خدا نے میری دعاؤں میں سب سے بڑھ کر قبولیت رکھی ہے۔
(۴) خدا نے مجھے آسمانی نشان دیئے ہیں۔
(۵) خدا نے مجھے زمین سے نشان دیئے ہیں۔
(۶) خدا نے مجھے وعدہ دے رکھا ہے کہ تجھ سے ہر ایک مقابلہ کرنے والا مغلوب ہو گا۔
(۷) خدا نے مجھے بشارت دی ہے کہ تیرے پیرو ہمیشہ اپنے دلائل صدق میں غالب رہیں گے

اور دنیا میں اکثر وہ اور اُن کی نسل بڑی بڑی عزتیں پائیں گے۔ تا اُن پر ثابت ہو کہ جو خدا کی طرف سے آتا ہے وہ کچھ نقصان نہیں اُٹھاتا۔

(۸) خدا نے مجھے وعدہ دے رکھا ہے کہ قیامت تک اور جب تک کہ دنیا کا سلسلہ منقطع ہو جائے میں تیری برکات ظاہر کرتا رہونگا۔ یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔

(۹) خدا نے آج سے بیس برس پہلے مجھے بشارت دی ہے کہ تیرا انکار کیا جائیگا اور لوگ تجھے قبول نہیں کرینگے پر مَیں تجھے قبول کروں گا اور بڑے زور آور حملوں سے تیری سچائی ظاہر کرونگا۔

(۱۰) اور خدا نے مجھے وعدہ دیا ہے کہ تیری برکات کا دوبارہ نور ظاہر کرنے کے لئے تجھ سے ہی اور تیری ہی نسل میں سے ایک شخص کھڑا کیا جائیگا جس میں مَیں رُوح القدس کی برکات پھونکوں گا۔ وہ پاک باطن اور خدا سے نہایت پاک تعلق رکھنے والا ہوگا اور مظہر الحق والعلاء ہوگا۔ گویا خدا آسمان سے نازل ہُوا۔ وتلك عشرة كاملة۔ دیکھو وہ زمانہ چلا آتا ہے بلکہ قریب ہے، کہ خدا اس سلسلہ کی دنیا میں بڑی قبولیت پھیلائیگا اور یہ سلسلہ مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب میں پھیلیگا اور دنیا میں اسلام سے مراد یہی سلسلہ ہوگا۔ یہ باتیں انسان کی باتیں نہیں۔ یہ اس خدا کی وحی ہے جس کے آگے کوئی بات انہونی نہیں۔

(تحفۂ گولڑویہ صفحہ ۹۰)

یہ عاجز اپنے ذاتی تجربہ سے بیان کرتا ہے کہ فی الحقیقت سورۂ فاتحہ مظہر انوار الٰہی ہے۔ اس قدر عجائبات اس سورۃ کے پڑھنے کے وقت دیکھے گئے ہیں کہ جن سے خدا کے پاک کلام کا قدر و منزلت معلوم ہوتا ہے۔ اِس سورۂ مبارکہ کی برکت سے اور اس کی تلاوت کے التزام سے کشف مغیبات اس درجہ تک پہنچ گیا کہ صدہا اخبار غیبیہ قبل از وقوع منکشف ہوئیں اور ہر ایک مشکل کے وقت اس کے پڑھنے کی حالت میں عجیب طور پر رفع حجاب کیا گیا۔ اور قریب تین ہزار کے کشف صحیح اور رؤیائے صادقہ یاد ہے کہ جو اب تک اس عاجز سے ظہور میں آچکے۔ اور صبح صادق کے کھلنے کی طرح پوری بھی ہو چکی ہیں اور دو سو جگہ سے زیادہ قبولیت دعا کے آثار نمایاں ایسے نازک موقعوں پر دیکھے گئے جن میں بظاہر کوئی صورت مشکل کشائی کی نظر نہیں آتی تھی۔ اور اسی طرح کشف قبور اور دوسرے انواع و اقسام کے عجائبات اس صورت کے التزام ورد سے ایسے ظہور پکڑتے گئے کہ اگر ایک ادنیٰ بہرہ ان میں سے کسی پادری یا پنڈت کے دل پر پڑ جائے تو یکدفعہ حبّ دنیا سے قطع تعلق کر کے اسلام کے قبول کرنے کے لئے مرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اسی طرح بذریعہ الہامات صادقہ کے جو پیشگوئیاں اس عاجز پر ظاہر ہوتی رہی ہیں جن میں سے بعض پیشگوئیاں مخالفوں کے سامنے پوری ہوگئی ہیں اور پوری ہوتی جاتی ہیں اس قدر ہیں کہ اس عاجز کے خیال میں دو انجیلوں کی

ضخامت سے کم نہیں۔

(براہین احمدیہ ص۵۲۰ حاشیہ ۱۱)

وانّی انا موت الزور وحرز المذعور۔ وانا حربة المولی الرحمٰن۔ وحجة اللّٰه الدیّان۔ وانا النهار والشمس والسبیل۔ وفی نفسی تحقّقت الاقاویل۔ وبی بطلت الاباطیل۔ وانا الواصف والموصوف۔ انا ساق اللّٰه المکشوف۔ وانا قدم الرسولؐ التی تحشر علیها الاموات۔ وتُمحٰی بها الضلالات۔

(لجة النّور ص۱۳۱)

مَیں اپنے نفس پر اتنا قابو رکھتا ہوں اور خدا تعالےٰ نے میرے نفس کو ایسا مسلمان بنایا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سال بھر میرے سامنے میرے نفس کو گندی سے گندی گالی دیتا رہے آخر وہی شرمندہ ہوگا اور اسے اقرار کرنا پڑے گا کہ وہ میرے پاؤں جگہ سے اکھاڑ نہ سکا۔

(ملفوظات جلد اوّل ص۴۳۶)

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تفہیم الٰہی میرے شامل حال ہے اور وہ عزّ اسمہٗ جس وقت چاہتا ہے بعض معارف قرآنی میرے پر کھولتا ہے اور اصل منشاء بعض آیات کا معہ ان کے ثبوت کے میرے پر ظاہر فرماتا ہے اور میخ آہنی کی طرح میرے دل کے اندر داخل کر دیتا ہے۔ اب میں اس خدا داد نعمت کو کیونکر چھوڑ دوں۔ اور جو فیض بارش کی طرح میرے پر ہو رہا ہے کیونکر اس سے انکار کر دوں!

(الحق مباحثہ لدھیانہ ص۱۹)

”ید بیضا کہ با او تابندہ - باز با ذوالفقار مے بینم“

یعنی اس کا وہ روشن ہاتھ جو اتمام حجت کی رُو سے تلوار کی طرح چمکتا ہے پھر مَیں اُسکو ذوالفقار کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ یعنی ایک زمانہ ذوالفقار کا تو وہ گذر گیا کہ جب ذوالفقار علی کرم اللہ وجہٗ کے ہاتھ میں تھی مگر خدا تعالیٰ پھر ذوالفقار اس امام کو دے دیگا۔ اس طرح پر کہ اس کا چمکنے والا ہاتھ وہ کام کرے گا جو پہلے زمانہ میں ذوالفقار کرتی تھی۔ سو وہ ہاتھ ایسا ہوگا کہ گویا وہ ذوالفقار علی کرم اللہ وجہٗ ہے جو پھر ظاہر ہو گئی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ امام سلطان القلم ہوگا۔ اور اُس کی قلم ذوالفقار کا کام دے گی۔ یہ پیشگوئی بعینہٖ اس عاجز کے اس الہام کا ترجمہ ہے جو اس وقت سے دس برس پہلے براہین احمدیہ میں چھپ چکا ہے۔ اور وہ یہ ہے کتاب الولی ذوالفقار العلی۔ یعنی کتاب اس ولی کی ذوالفقار علی کی ہے۔ یہ اس عاجز کی طرف اشارہ ہے۔ اسی بنا پر بارہا اس عاجز کا نام

مکاشفات میں غازی دکھا گیا۔

(نشان آسمانی ص۱۵)

اگر میں خود دعویٰ کرتا ہوں تو بے شک مجھے جھوٹا سمجھو۔ لیکن اگر خدا کا پاک نبی اپنی پیشگوئیوں کے ذریعہ سے میری گواہی دیتا ہے اور خود میرا خدا میرے لئے نشان دکھلاتا ہے تو اپنے نفسوں پر ظلم مت کرو۔ یہ مت کہو کہ ہم مسلمان ہیں ہمیں کسی مسیح وغیرہ کے قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ جو مجھے قبول کرتا ہے وہ اسے قبول کرتا ہے جس نے میرے لئے آج سے تیرہ سو برس پہلے لکھا ہے اور میرے وقت اور زمانہ اور میرے کام کے نشان بتلائے ہیں اور جو مجھے رد کرتا ہے وہ اسے ردّ کرتا ہے جس نے حکم دیا ہے کہ اسے مانو۔

(ایام الصلح ص۹۳)

حدیثوں کو پڑھو کہ وہ آخری زمانہ میں آنے والا اور اُس زمانہ میں آنے والا کہ جب قریش سے بادشاہی جاتی رہیگی اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک تفرقہ اور پریشانی میں پڑی ہوئی ہوگی زمیندار ہی ہوگا اور مجھ کو خدا تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ میں ہوں۔ احادیثِ نبویہ میں صاف لکھا ہے کہ آخری زمانہ میں ایک مؤید دین و ملّت پیدا ہوگا اور اس کی یہ علامت ہوگی کہ وہ حارث ہوگا یعنی زمیندار ہوگا۔ اسجگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہر ایک مسلمان کو چاہیئے کہ اس کو قبول کرے اور اُسکی مدد کرے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۲۰۳)

جو شخص مجھے قبول کرتا ہے وہ تمام انبیاء اور اُن کے معجزات کو بھی نئے سرے قبول کرتا ہے۔ اور جو شخص مجھے قبول نہیں کرتا اس کا پہلا ایمان بھی کبھی قائم نہیں رہیگا۔ کیونکہ اس کے پاس نرے قصّے ہیں نہ مشاہدات۔ خدا تعالیٰ کا آئینہ میں ہوں۔ جو شخص میرے پاس آئیگا اور مجھے قبول کریگا وہ نئے سرے اُس خدا کو دیکھ لیگا جس کی نسبت دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں صرف قصّے باقی ہیں۔ میں اس خدا پر ایمان لایا ہوں جس کو میرے منکر نہیں پہچانتے اور میں سچ سچ کہتا ہوں کہ جس پر وہ ایمان لاتے ہیں اُن کے وہ خیالی بُت ہیں نہ خدا۔ اسی وجہ سے وہ بُت اُن کی کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ اُن کو کچھ قوت نہیں دے سکتے اُن میں کوئی پاک تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے کوئی تائیدی نشان نہیں دکھلا سکتے۔

(نزول المسیح ص۸۴-۸۵)

اِس تاریکی کے زمانہ کا نور میں ہی ہوں جو شخص میری پیروی کرتا ہے وہ ان گڑھوں اور خندقوں سے بچایا جائیگا جو شیطان نے تاریکی میں چلنے والوں کے لئے تیار کئے ہیں مجھے اس نے بھیجا ہے کہ تا میں

امن اور حلم کے ساتھ دنیا کو سچے خدا کی طرف رہبری کروں۔ اور اسلام میں اخلاقی حالتوں کو دوبارہ قائم کردوں۔ اور مجھے اس نے حق کے طالبوں کی تسلّی پانے کے لئے آسمانی نشان بھی عطا فرمائے ہیں۔ اور میری تائید میں اپنے عجیب کام دکھلائے ہیں۔ اور غیب کی باتیں اور آئندہ کے بھید جو خدا تعالیٰ کی پاک کتابوں کے رُو سے صادق کی شناخت کیلئے اصل معیار ہے میرے پر کھولے ہیں۔ اور پاک معارف اور علوم مجھے عطا فرمائے ہیں۔ اس لئے اُن رُوحوں نے مجھ سے دشمنی کی جو سچائی کو نہیں چاہتیں اور تاریکی سے خوش ہیں۔ مگر مَیں نے چاہا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے نوع انسان کی ہمدردی کروں۔

(مسیح ہندوستان میں ص۱۱)

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جو خواہ مخواہ بلا کسی قسم کے استحقاق کے اپنے تئیں محامد مناقب اور صفاتِ محمودہ سے موصوف کرنا چاہتے ہیں۔ گویا وہ یہ چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی کبریائی کی چادر آپ اوڑھ لیں۔ ایسے لوگ لعنتی ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو طبعًا ہر قسم کی مدح و ثنا اور منقبت سے نفرت اور کراہت کرتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنے اختیار پر چھوڑ دیئے جاویں تو دل سے پسند کرتے ہیں کہ گوشہ گمنامی میں زندگی گذار دیں۔ مگر خدا تعالیٰ اپنے مصالح اور باریک حکمتوں کی بنا پر ان کی تعریف اور تحمید کرتا ہے اور درحقیقت ہونا بھی اسی طرح چاہیئے۔ کیونکہ جن لوگوں کو وہ مامور کرکے بھیجتا ہے اُن کی ماموریت سے اُن کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ اس کی حمد و ثنا اور جلال دنیا میں ظاہر ہو۔ اگر ان ماموروں کی نسبت وہ یہ کہے کہ فلاں مامور جسے مَیں نے مبعوث کیا ہے ایسا نکمّا۔ بزدل۔ نالائق۔ کمینہ۔ سفلہ اور ہر قسم کے فضائل سے عاری اور بیگانہ ہے تو کیا خدا تعالیٰ کی اس کے ذریعہ سے کوئی صفت قائم ہو سکیگی؟ حقیقت میں خدا کا انکی تمجید اور مدارج اور فضائل بیان کرنا اپنے ہی جلال اور عظمت کی تمہید کے لئے ہوتا ہے۔ وہ تو اپنے نفس سے بالکل خالی ہوتے ہیں اور ہر قسم کے مدح اور ذم سے بے پروا ہوتے ہیں۔ چنانچہ سالہا سال اس سے پہلے جبکہ نہ کوئی مقابلہ تھا نہ گرد و پیش میں کوئی مجمع تھا نہ یہ مجلس اور اس کی کوئی تمہید تھی اور نہ دنیا میں کوئی شہرت تھی خدا تعالیٰ نے براہین احمدیہ میں میری نسبت یہ فرمایا کہ

یحمدك الله من عرشه۔ نحمدك و نصلّی۔ کنتم خیر امّة اخرجت للناس وافتخارًا للمؤمنین۔ یا احمد فاضت الرّحمة علٰی شفتیك انّك باعیننا۔ یرفع الله ذکرك ویتمّ نعمته علیك فی الدنیا والاٰخرة۔ یا احمدی انت مرادی ومعی غرست کرامتك بیدی۔ یا احمد یتمّ اسمك ولا یتمّ اسمی۔ بورکت یا احمد

وکان ما بارك الله فيك حقًا فيك۔ شانك عجيب واجرك قريب۔ انی جاعلك للناس امامًا۔ انت وجيه فی حضرتی۔ اخترتك لنفسی۔ الارض والسماء معك كما هو معی وسرّك سرّی۔ انت منی بمنزلة توحيدی وتفريدی۔ سبحان الله تبارك وتعالٰی زاد مجدك۔ سلامٌ عليك جعلت مباركًا۔ وانی فضّلتك علٰی العالمين۔ ولقد كرّمنا بنی اٰدم وفضّلنا بعضهم علٰی بعض۔ دنٰی فتدلّٰی فكان قاب قوسين او ادنٰی۔ وانّ عليك رحمتی فی الدنيا والدين۔ والقيت عليك محبّة منی ولتصنع علٰی عينی۔ يحمدك الله ويمشی اليك۔ خلق اٰدم فاكرمه جری الله فی حلل الانبياء۔ انت معی وانا معك۔ خلقت لك ليلًا ونهارًا۔ اعمل ما شئت قد غفرتُ لك۔ انت منّی بمنزلة لا يعلمها الخلق۔ ويعصمك الله ولو لم يعصمك الناس يعصمك الله۔ انت المسيح الذی لا يضاع وقته۔ كمثلك درّ لا يضاع۔ انت الشيخ المسيح وانی معك ومع انصارك۔ وانت اسمی الاعلٰی وانت منّی بمنزلة توحيدی وتفريدی وانت منّی بمنزلة المحبوبين۔ عليك بركاتٌ وسلامٌ۔ سلامٌ قولًا من ربّ رحيم۔ مظهر الحي۔ وانت منی مبدء الامر وما ينطق عن الهوٰی ان هو الا وحیٌ يوحٰی۔

میں اپنے قلب کو دیکھ کر یقین کرتا ہوں کہ کل انبیاء علیہم السلام ہر قسم کی تعریف اور مدح وثناء سے کراہت کرتے تھے۔ مگر جو کچھ خدا تعالیٰ نے ان کے حق میں بیان فرمایا ہے اور میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ الفاظ میرے الفاظ نہیں خدا تعالیٰ کے الفاظ ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ خدا تعالیٰ کی عزت اور جلال اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور عظمت اور جلال کو خاک میں ملا دیا گیا ہے اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت حسینؓ کے حق میں ایسا غلو اور اطرا کیا گیا کہ اس سے خدا کا عرش کانپتا ہے۔

اب جب کہ کروڑہا آدمی حضرت عیسیٰ کی مدح وثنا سے گمراہ ہو چکے ہیں اور ایسا ہی بے انتہا مخلوق حضرت حسینؓ کی نسبت غلو اور اطرا کر کے ہلاک ہو چکی ہے تو خدا کی مصلحت اور غیرت اس وقت یہی چاہتی ہے کہ وہ تمام عزتوں کے کپڑے جو بے جا طور پر ان کو پہنائے گئے تھے اُن سے اتار کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور خدا تعالیٰ کو پہنائے جاویں۔ پس ہماری نسبت یہ کلمات درحقیقت خدا تعالیٰ کی اپنی عزت کے اظہار اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے اظہار کے لئے ہیں۔

میں حلفاً کہتا ہوں کہ میرے دل میں اصلی اور حقیقی جوش یہی ہے کہ تمام محامد اور مناقب .....

.... اور تمام صفاتِ جمیلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کر دیں۔ میری تمام تر خوشی اسی میں ہے اور میری بعثت کی اصل غرض یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی توحید اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عزت دنیا میں قائم ہو۔ میں یقیناً جانتا ہوں کہ میری نسبت جس قدر تعریفی کلمات اور تمجیدی باتیں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں یہ بھی درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف راجع ہیں اس لئے کہ میں آپ ہی کا غلام ہوں اور آپ ہی کے مشکوٰۃ نبوت سے نور حاصل کرنے والا ہوں۔ اور مستقل طور پر ہمارا کچھ بھی نہیں۔ اسی سبب سے میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی شخص آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ دعویٰ کرے کہ میں مستقل طور پر بلا استفاضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مامور ہوں اور خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہوں تو وہ مردود اور مخذول ہے۔ خدا تعالیٰ کی ابدی مُہر لگ چکی ہے اس بات پر کہ کوئی شخص وصول الی اللہ کے دروازے سے آ نہیں سکتا بجز اتباع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۲۸۴-۲۸۷)

اِن دونوں منصبوں کا مدعی مَیں ہوں جو تم میں اِس وقت پچیس سال سے موجود ہوں پس میرے بعد کس کا انتظار کرو گے؟ ان تمام علامتوں کا مصداق تو وہ ہے جو ان نشانوں کے ظہور کے وقت موجود ہے۔ نہ وہ کہ جس کا ابھی دنیا میں نام و نشان نہیں۔ یہ عجیب سخت دلی ہے جو سمجھ میں نہیں آتی جب کہ میرے دعویٰ کے ساتھ سب نشان ظاہر ہو چکے اور میری مخالفت میں کوششیں بھی ہو کر ان میں نامرادی اور ناکامی رہی مگر پھر بھی انتظار کسی اَور کی ہے؟ ہاں یہ سچ ہے کہ مَیں جسمانی طور پر آسمان سے اُترا ہوں اور نہ مَیں دنیا میں جنگ اور خونریزی کرنے کے لئے آیا ہوں بلکہ صلح کے لئے آیا ہوں مگر مَیں خدا کی طرف سے ہوں۔ مَیں یہ پیشگوئی کرتا ہوں کہ میرے بعد قیامت تک کوئی ایسا مہدی نہیں آئیگا جو جنگ اور خونریزی سے دنیا میں ہنگامہ برپا کرے اور خدا کی طرف سے ہو۔ اور نہ کوئی ایسا مسیح آئیگا جو کسی وقت آسمان سے اتریگا۔ اِن دونوں سے ہاتھ دھو لو۔ یہ سب حسرتیں ہیں جو اس زمانہ کے تمام لوگ قبر میں لے جائیں گے۔ نہ کوئی مسیح اُترے گا اور نہ کوئی خونی مہدی ظاہر ہوگا۔ جو شخص آنا تھا وہ آچکا وہ مَیں ہی ہوں جس سے خدا کا وعدہ پورا ہُوا۔ جو شخص مجھے قبول نہیں کرتا وہ خدا سے لڑتا ہے کہ تو نے کیوں ایسا کیا۔

(تبلیغ رسالت جلد دہم ص ۷۷-۷۸)

کیوں عجب کرتے ہو گر مَیں آگیا ہو کر مسیح　　　خود مسیحائی کا دم بھرتی ہے یہ بادِ بہار
آسماں پر دعوتِ حق کیلئے اِک جوش ہے　　　ہو رہا ہے نیک طبعوں پر فرشتوں کا اُتار

آرہا ہے اس طرف احرارِ یورپ کا مزاج   نبض پھر چلنے لگی مُردوں کی ناگہ زندہ وار
کہتے ہیں تثلیث کو اب اہلِ دانش الوداع   پھر ہوئے ہیں چشمۂ توحید پر از جاں نثار
باغ میں ملّت کے ہے کوئی گلِ رعنا کھلا   آئی ہے بادِ صبا گلزار سے مستانہ وار
آرہی ہے اب تو خوشبو میرے یوسف کی مجھے   گو کہو دیوانہ میں کرتا ہوں اُس کا انتظار
اسمعوا صوت السماء جاء المسیح جاء المسیح   نیز بشنو از زمیں آمد امام کامگار
آسماں بارد نشان الوقت مے گوید زمیں   ایں دو شاہد از پئے من نعرہ زن چوں بیقرار
اب اِسی گلشن میں لوگو راحت و آرام ہے   وقت ہے جلد آؤ اے آوارگانِ دشتِ خار
اِک زماں کے بعد اب آئی ہے یہ ٹھنڈی ہوا   پھر خدا جانے کہ کب آئیں یہ دن اور یہ بہار
غیر کیا جانے کہ دلبر سے ہمیں کیا جوڑ ہے   وہ ہمارا ہو گیا اس کے ہوئے ہم جاں نثار
مَیں کبھی آدم کبھی موسیٰ کبھی یعقوب ہوں   نیز ابراہیم ہوں نسلیں ہیں میری بے شمار
اِک شجر ہوں جس کو داؤدی صفت کے پھل لگے   مَیں ہُوا داؤد اور جالوت ہے میرا شکار
پر مسیحا بن کے مَیں بھی دیکھتا روئے صلیب   گر نہ ہوتا نام احمد جس پہ میرا سب مدار
(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۱۰۱-۱۰۳)

مجھ کو کیا ملکوں سے میرا ملک ہے سب سے جُدا   مجھ کو کیا تاجوں سے میرا تاج ہے رضوانِ یار
ہم تو بستے ہیں فلک پر اس زمیں کو کیا کریں   آسماں پر رہنے والوں کو زمیں سے کیا نقار
روضۂ آدم کہ تھا وہ نامکمل اب تلک   میرے آنے سے ہُوا کامل بجملہ برگ و بار
وہ خزائن جو ہزاروں سال سے مدفون تھے   اب مَیں دیتا ہوں اگر کوئی ملے امیدوار

(براہین احمدیہ حصہ پنجم)

کیا شک ہے ماننے میں تمہیں اس مسیح کے   جس کی مماثلت کو خدا نے بنا دیا
حاذق طبیب پاتے ہیں تم سے یہی خطاب   خوبوں کو بھی تو تم نے مسیحا بنا دیا

(درثمین)

یہ سراسر فضل و احساں ہے کہ مَیں آیا پسند   ورنہ درگاہ میں تری کچھ کم نہ تھے خدمت گزار
دوستی کا دم جو بھرتے تھے وہ سب دشمن ہوئے   پر نہ چھوڑا ساتھ تُو نے اے مرے حاجت برار
اے میرے یارِ یگانہ اے مری جاں کی پناہ   بس ہے تو میرے لئے مجھ کو نہیں تجھ بن بکار
مَیں تو مر کر خاک ہوتا گر نہ ہوتا تیرا لطف   پھر خدا جانے کہاں یہ پھینک دی جاتی غبار

اے خدا ہو تیری راہ میں میرا جسم و جان و دل — مَیں نہیں پاتا کہ تجھ سا کوئی کرتا ہو پیار
ابتدا سے تیرے ہی سایہ میں میرے دن کٹے — گود میں تیری رہا مَیں مثلِ طفلِ شیر خوار
نسلِ انساں میں نہیں دیکھی وفا جو تجھ میں ہے — تیرے بن دیکھا نہیں کوئی بھی یارِ غمگسار
لوگ کہتے ہیں کہ نالائق نہیں ہوتا قبول — مَیں تو نالائق بھی ہو کر پا گیا درگہ میں بار
اس قدر مجھ پر ہوئیں تیری عنایات و کرم — جن کا مشکل ہے کہ تا روزِ قیامت ہو شمار
اِس میں میرا جُرم کیا جب مجھ کو یہ فرماں مِلا — کون ہوں تا رَدّ کروں حکمِ شہِ ذی الاقتدار
اب تو جو فرماں مِلا اُس کا ادا کرنا ہے کام — گرچہ مَیں ہوں بس ضعیف و ناتوان و دلفگار

(براہین احمدیہ حصہ پنجم)

بعثت کا مقصد

"میں یقین رکھتا ہوں کہ جو صبر اور صدق دل سے
میرے پیچھے آتا ہے وہ ہلاک نہ کیا جاوے گا۔ بلکہ
وہ اس زندگی سے حصہ لیگا جس کو کبھی فنا نہیں۔"

انبیاء علیہم السلام کے دنیا میں آنے کی سب سے بڑی غرض اور ان کی تعلیم اور تبلیغ کا عظیم الشان مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ کو شناخت کریں اور اس زندگی سے جو انہیں جہنم اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور جس کو گناہ آلود زندگی کہتے ہیں نجات پائیں۔ حقیقت میں یہی بڑا بھاری مقصد اُن کے آگے ہوتا ہے۔ پس اس وقت بھی جو خدا تعالیٰ نے ایک سلسلہ قائم کیا ہے۔ اور اُس نے مجھے مبعوث فرمایا ہے تو میرے آنے کی غرض بھی وہی مشترک غرض ہے جو سب نبیوں کی تھی یعنی مَیں بتانا چاہتا ہوں کہ خدا کیا ہے؛ بلکہ دکھانا چاہتا ہوں اور گناہ سے بچنے کی راہ کی طرف راہبری کرتا ہوں۔

(ملفوظات جلد سوم ص۱۱)

جب دنیا میں کوئی امام الزمان آتا ہے تو ہزارہا انوار اس کے ساتھ آتے ہیں اور آسمان میں ایک صورت انبساطی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور انتشار روحانیت اور نورانیت ہو کر نیک استعدادیں جاگ اٹھتی ہیں۔ پس جو شخص الہام کی استعداد رکھتا ہے اس کو سلسلہ الہام شروع ہو جاتا ہے اور جو شخص فکر اور غور کے ذریعہ سے دینی تفقہ کی استعداد رکھتا ہے اس کے تدبّر اور سوچنے کی قوت کو زیادہ کیا جاتا ہے۔ اور جس کو عبادات کی طرف رغبت ہو اس کو تعبد اور پرستش میں لذت عطا کی جاتی ہے اور جو شخص غیر قوموں کے ساتھ مباحثات کرتا ہے اس کو استدلال اور اتمام حجّت کی طاقت بخشی جاتی ہے۔ اور یہ تمام باتیں درحقیقت اِسی انتشار روحانیت کا نتیجہ ہوتا ہے جو امام الزمان کے ساتھ آسمان سے اُترتی اور ہر ایک مستعد دل پر نازل ہوتی ہے۔ اور یہ ایک عام قانون اور سُنّت الٰہی ہے جو ہمیں قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی رہنمائی سے معلوم ہوا اور ذاتی تجارب نے اس کا مشاہدہ کرایا ہے۔ مگر مسیح موعود کے زمانے کو اِس سے بھی بڑھ کر ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ پہلے نبیوں کی کتابوں اور احادیث نبویہ میں لکھا ہے کہ مسیح موعود کے ظہور کے وقت یہ انتشارِ نورانیت اس حد تک ہوگا کہ عورتوں کو بھی الہام شروع ہو جائیگا اور نابالغ بچے نبوت کرینگے۔ اور عوام الناس رُوح القدس سے بولیں گے۔ اور یہ سب کچھ مسیح موعود کی روحانیت کا پرتوہ ہوگا۔

جیسا کہ دیوار پر آفتاب کا سایہ پڑتا ہے تو دیوار منور ہو جاتی ہے اور اگر چونہ اور قلعی سے سفید کی گئی ہو تو پھر تو اَور بھی زیادہ چمکتی ہے۔ اور اگر اس میں آئینے نصب کئے گئے ہوں تو ان کی روشنی اس قدر بڑھتی ہے کہ آنکھ کو تاب نہیں رہتی۔ مگر دیوار دعویٰ نہیں کر سکتی کہ یہ سب کچھ ذاتی طور پر مجھ میں ہے۔ کیونکہ سورج کے غروب کے بعد پھر اس روشنی کا نام و نشان نہیں رہتا۔ پس ایسا ہی تمام الہامی انوار

امام الزمان کے انوار کا انعکاس ہوتا ہے۔

(ضرورۃ الامام صـ۴-۵)

مَیں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تا ایمانوں کو قوی کروں اور خدا تعالیٰ کا وجود لوگوں پر ثابت کر کے دکھلاؤں۔ کیونکہ ہر ایک قوم کی ایمانی حالتیں نہایت کمزور ہو گئی ہیں اور عالم آخرت صرف ایک افسانہ سمجھا جاتا ہے اور ہر ایک انسان اپنی عملی حالت سے بتا رہا ہے کہ وہ جیسا کہ یقین دنیا اور دنیا کی جاہ و مراتب پر رکھتا ہے اور جیسا کہ اُس کو بھروسہ دنیوی اسباب پر ہے یہ یقین اور بھروسہ ہرگز اس کو خدا تعالیٰ اور عالم آخرت پر نہیں۔ زبانوں پر بہت کچھ ہے مگر دلوں میں دنیا کی محبت کا غلبہ ہے۔ حضرت مسیح نے اِسی حالت میں یہود کو پایا تھا۔ اور جیسا کہ ضعف ایمان کا خاصہ ہے یہود کی اخلاقی حالت بھی بہت خراب ہو گئی تھی اور خدا کی محبت ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اب میرے زمانہ میں بھی یہی حالت ہے۔ سو میں بھیجا گیا ہوں کہ تا سچائی اور ایمان کا زمانہ پھر آئے اور دلوں میں تقویٰ پیدا ہو۔ سو یہی افعال میرے وجود کی علّت غائی ہیں۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ پھر آسمان زمین سے نزدیک ہو گا بعد اس کے کہ بہت دُور ہو گیا تھا۔ سو مَیں ان ہی باتوں کا مجدّد ہوں۔ اور یہی کام ہیں جن کے لئے مَیں بھیجا گیا ہوں۔

(کتاب البریہ صـ۲۹۳-۲۹۴)

اب اتمام حجت کے لئے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے موافق جو ابھی مَیں نے ذکر کیا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اس زمانے کو تاریک پا کر اور دنیا کو غفلت اور کفر اور شرک میں غرق دیکھ کر اور ایمان اور صدق اور تقویٰ اور راستبازی کو زائل ہوتے ہوئے مشاہدہ کر کے مجھے بھیجا ہے تا کہ وہ دوبارہ دنیا میں علمی اور عملی اور اخلاقی اور ایمانی سچائی کو قائم کرے اور تا اسلام کو ان لوگوں کے حملوں سے بچائے جو فلسفیت اور نیچریت اور اباحت اور شرک اور دہریت کے لباس میں اس الٰہی باغ کو کچھ نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔

(آئینہ کمالات اسلام صـ۲۵۱)

وہ کام جس کے لئے خدا نے مجھے مامور فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ خدا میں اور اس کی مخلوق کے رشتہ میں جو کدورت واقع ہو گئی ہے اس کو دُور کر کے محبت اور اخلاص کے تعلق کو دوبارہ قائم کروں۔ اور سچائی کے اظہار سے مذہبی جنگوں کا خاتمہ کر کے صلح کی بنیاد ڈالوں۔ اور وہ دینی سچائیاں جو دنیا کی آنکھ سے مخفی ہو گئی ہیں ان کو ظاہر کر دوں۔ اور وہ روحانیت جو نفسانی تاریکیوں کے نیچے دب گئی ہے اس کا نمونہ دکھلاؤں۔ اور خدا کی طاقتیں جو انسان کے اندر داخل ہو کر توجہ یا دعا کے ذریعہ نمودار ہوتی ہیں

حال کے ذریعہ سے نہ محض قال سے اُن کی کیفیت بیان کروں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ خالص اور چمکتی ہوئی توحید جو ہر ایک قسم کے شرک کی آمیزش سے خالی ہے جو اب نابود ہو چکی ہے اس کا دوبارہ قوم میں دائمی پودا لگا دوں۔ اور یہ سب کچھ میری قوت سے نہیں ہوگا بلکہ اس خدا کی طاقت سے ہوگا جو آسمان اور زمین کا خدا ہے۔

(لیکچر لاہور ص۴۷)

خدا نے مجھے دنیا میں اس لئے بھیجا کہ تا میں حلم اور خلق اور نرمی سے گم گشتہ لوگوں کو خدا اور اس کی پاک ہدایتوں کی طرف کھینچوں اور وہ نور جو مجھے دیا گیا ہے اس کی روشنی سے لوگوں کو راہ راست پر چلاؤں۔ انسان کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسے دلائل اُس کو ملیں جن کے رو سے اس کو یقین آجائے کہ خدا ہے۔ کیونکہ ایک بڑا حصہ دنیا کا اسی راہ سے ہلاک ہو رہا ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی الہامی ہدایتوں پر ایمان نہیں ہے۔ اور خدا کی ہستی کے ماننے کے لئے اس سے زیادہ صاف اور قریب الفہم اور کوئی راہ نہیں کہ وہ غیب کی باتیں اور پوشیدہ واقعات اور آئندہ زمانہ کی خبریں اپنے خاص لوگوں کو بتلاتا ہے اور وہ نہاں در نہاں اسرار جن کا دریافت کرنا انسانی طاقتوں سے بالاتر ہے اپنے مقربوں پر ظاہر کر دیتا ہے۔ کیونکہ انسان کے لئے کوئی راہ نہیں جس کے ذریعہ سے آئندہ زمانہ کی ایسی پوشیدہ اور انسانی طاقتوں سے بالاتر خبریں اس کو مل سکیں۔ اور بلاشبہ یہ بات سچ ہے کہ غیب کے واقعات اور غیب کی خبریں بالخصوص جن کے ساتھ قدرت اور حکم ہے ایسے امور ہیں جن کے حاصل کرنے پر کسی طور سے انسانی طاقت خود بخود قادر نہیں ہو سکتی۔ سو خدا نے میرے پر یہ احسان کیا ہے جو اس نے تمام دنیا میں سے مجھے اس بات کے لئے منتخب کیا ہے کہ تا وہ اپنے نشانوں سے گمراہ لوگوں کو راہ پر لادے۔

لیکن چونکہ خدا تعالیٰ نے آسمان سے دیکھا ہے کہ عیسائی مذہب کے حامی اور پیرو یعنی پادری سچائی سے بہت دُور جا پڑے ہیں اور وہ ایک ایسی قوم ہے کہ نہ صرف آپ صراط مستقیم کو کھو بیٹھے ہیں بلکہ ہزارہا کوس تک خشکی تری کا سفر کر کے یہ چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اپنے جیسا کریں۔ وہ نہیں جانتے کہ حقیقی خدا کون ہے۔ بلکہ اُن کا خدا انہی کی ایک ایجاد ہے۔ اسلئے خدا کے اس رحم نے جو انسانوں کے لئے وہ رکھتا ہے تقاضا کیا کہ اپنے بندوں کو ان کے دام تزویر سے چھڑائے اسلئے اس نے اپنے اس مسیح کو بھیجا تا وہ دلائل کے حربہ سے اس صلیب کو توڑے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بدن کو توڑا تھا اور زخمی کیا تھا۔

(تریاق القلوب ص۱۳-۱۴)

یہ عاجز تو محض اسی غرض کے لئے بھیجا گیا ہے کہ تا یہ پیغام خلق اللہ کو پہنچا دے کہ دنیا کے مذاہبِ موجودہ

میں سے وہ مذہب حق پر اور خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہے جو قرآن کریم لایا ہے۔ اور دار النجات میں داخل ہونے کے لئے دروازہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔

(حجۃ الاسلام ص ۱۲-۱۳)

اگر تم ایماندار ہو تو شکر کرو اور شکر کے سجدات بجا لاؤ۔ کہ وہ زمانہ جس کا انتظار کرتے کرتے تمہارے بزرگ آباء گذر گئے اور بے شمار روحیں اس کے شوق میں ہی سفر کر گئیں وہ وقت تم نے پا لیا۔ اب اس کی قدر کرنا یا نہ کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں اس کو بار بار بیان کرونگا اور اس کے اظہار سے میں رُک نہیں سکتا کہ میں وہی ہوں جو وقت پر اصلاح خلق کے لئے بھیجا گیا تا دین کو تازہ طور پر دلوں میں قائم کر دیا جائے۔ میں اسی طرح بھیجا گیا ہوں جس طرح وہ شخص بعد کلیم اللہ مردِ خدا کے بھیجا گیا تھا جس کی روح ہیروڈیس کے عہد حکومت میں بہت تکلیفوں کے بعد آسمان کی طرف اٹھائی گئی۔ سو جب دوسرا کلیم اللہ جو حقیقت میں سب سے پہلا اور سید الانبیاء ہے دوسرے فرعون کی سرکوبی کے لئے آیا جس کے حق میں ہے۔ انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھداً علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً۔ تو اس کو بھی جو اپنی کارروائیوں میں کلیم اوّل کا مثیل مگر رتبہ میں اُس سے بزرگ تر ہے ایک مثیلِ مسیح کا وعدہ دیا گیا۔ اور وہ مثیلِ مسیح قوت اور طبع اور خاصیت مسیح ابن مریم کی پاکر اُسی زمانے کی مانند اور اسی مدّت کے قریب جو کلیم اوّل کے زمانہ سے مسیح ابن مریم کے زمانے تک تھی یعنی چودھویں صدی میں آسمان سے اُترا۔ اور وہ اترنا روحانی طور پر تھا جیسا کہ مکمل لوگوں کا صعود کے بعد خلق اللہ کی اصلاح کے لئے نزول ہوتا ہے اور سب باتوں میں اسی زمانے کے ہم شکل زمانے میں اترا جو مسیح ابن مریم کے اُترنے کا زمانہ تھا تا سمجھنے والوں کے لئے نشان ہو۔ پس ہر ایک کو چاہیئے کہ اس سے انکار کرنے میں جلدی نہ کرے تا خدا تعالیٰ سے لڑنے والا نہ ٹھیرے۔ دنیا کے لوگ جو تاریک خیال اور پُرانے تصورات پر جمے ہوئے ہیں وہ اس کو قبول نہیں کرینگے مگر عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے جو اُنکی غلطی ان پر ظاہر کر دیگا۔ "دنیا میں ایک نذیر آیا۔ پر دنیا نے اُسے قبول نہ کیا۔ لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔"

یہ انسان کی بات نہیں خدا تعالیٰ کا الہام اور رب جلیل کا کلام ہے۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ حملوں کے دن نزدیک ہیں۔ مگر یہ حملے تیغ و تبر سے نہیں ہونگے اور تلواروں اور بندوقوں کی حاجت نہیں پڑے گی بلکہ روحانی اسلحہ کے ساتھ خدا تعالیٰ کی مدد اُترے گی۔ اور یہودیوں سے سخت لڑائی ہوگی۔ وہ کون ہیں؟ اِس زمانے کے ظاہر پرست لوگ جنہوں نے بالاتفاق یہودیوں کے قدم پر قدم رکھا ہے۔ اُن سب کو آسمانی سیف اللہ

دو ٹکڑے کریگی۔ اور یہودیت کی خصلت مٹا دی جائیگی۔ اور ہر ایک حق پوش دجال دنیا پرست یک چشم جو دین کی آنکھ نہیں رکھتا حجّت قاطعہ کی تلوار سے قتل کیا جائیگا۔ اور سچائی کی فتح ہوگی۔ اور اسلام کے لئے پھر اُس تازگی اور روشنی کا دن آئیگا جو پہلے وقتوں میں آچکا ہے اور وہ آفتاب اپنے پورے کمال کے ساتھ پھر چڑھے گا جیسا کہ پہلے چڑھ چکا ہے۔ لیکن ابھی ایسا نہیں۔ ضرور ہے کہ آسمان اسے چڑھنے سے روکے رہے جب تک کہ محنت اور جانفشانی سے ہمارے جگر خون نہ ہو جائیں اور ہم سارے آراموں کو اس کے ظہور کے لئے نہ کھو دیں۔ اور اعزاز اسلام کے لئے ساری ذلتیں قبول نہ کریں۔ اسلام کا زندہ ہونا ہم سے ایک فدیہ مانگتا ہے۔ وہ کیا ہے؟ ہمارا اسی راہ میں مرنا یہی موت ہے جس پر اسلام کی زندگی مسلمانوں کی زندگی اور زندہ خدا کی تجلی موقوف ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کا دوسرے لفظوں میں نام اسلام ہے۔ اسی اسلام کا زندہ کرنا خدا تعالیٰ اب چاہتا ہے۔ اور ضرور تھا کہ وہ اس مہم عظیم کے روبراہ کرنے کے لئے ایک عظیم الشان کارخانہ جو ہر ایک پہلو سے مؤثر ہو اپنی طرف سے قائم کرتا۔ سو اس حکیم و قدیر نے اس عاجز کو اصلاح خلق کے لئے بھیجکر ایسا ہی کیا۔ اور دنیا کو حق اور راستی کی طرف کھینچنے کے لئے کئی شاخوں پر امر تائید حق اور اشاعت اسلام کو منقسم کر دیا۔ چنانچہ منجملہ ان شاخوں کے ایک شاخ تالیف و تصنیف کا سلسلہ ہے جس کا اہتمام اس عاجز کے سپرد کیا گیا اور وہ معارف و دقائق سکھلائے گئے جو انسان کی طاقت سے نہیں بلکہ صرف خدا تعالےٰ کی طاقت سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اور انسانی تکلّف سے نہیں بلکہ رُوح القدس کی تعلیم سے مشکلات حل کر دیئے گئے۔

دوسری شاخ اس کارخانہ کی اشتہارات کا جاری کرنے کا سلسلہ ہے جو بحکم الٰہی اتمام حجّت کی غرض سے جاری ہے۔ اور اب تک بیس ہزار سے کچھ زیادہ اشتہارات اسلامی حجتوں کو غیر قوموں پر پورا کرنے کے لئے شائع ہو چکے ہیں۔ اور آئندہ ضرورت کے وقتوں میں ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔

تیسری شاخ اس کارخانہ کی واردین اور صادرین اور حق کی تلاش کے لئے سفر کرنے والے اور دیگر اغراض متفرقہ سے آنے والے ہیں جو اس آسمانی کارخانے کی خبر پا کر اپنی اپنی نیتوں کی تحریک سے ملاقات کے لئے آتے رہتے ہیں . . . .

چوتھی شاخ اس کارخانہ کی وہ مکتوبات ہیں جو حق کے طالبوں یا مخالفوں کی طرف سے لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ اب تک عرصہ مذکورہ بالا میں نوّے ہزار سے بھی کچھ زیادہ خط آئے ہونگے جن کا جواب لکھا گیا . . . . ہر ایک مہینے میں غالباً تین سو سے سات سو یا ہزار تک خطوط کی آمد و رفت کی نوبت پہنچتی ہے۔

پانچویں شاخ اس کارخانہ کی جو خدا تعالیٰ نے اپنی خاص وحی اور الہام سے قائم کی مریدوں اور بیعت کرنے والوں کا سلسلہ ہے۔ چنانچہ اس نے اس سلسلہ کے قائم کرنے کے وقت مجھے فرمایا کہ زمین میں طوفانِ ضلالت برپا ہے۔ تُو اس طوفان کے وقت میں یہ کشتی تیار کر۔ جو شخص اس کشتی میں سوار ہو گا وہ غرق ہونے سے نجات پا جائیگا۔ اور جو انکار میں رہیگا اس کے لئے موت درپیش ہے۔ اور فرمایا کہ جو شخص تیرے ہاتھ میں ہاتھ دے گا اُس نے تیرے ہاتھ میں نہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہاتھ دیا۔ اور اُس خداوند خدا نے مجھے بشارت دی کہ مَیں تجھے وفات دونگا اور اپنی طرف اُٹھاؤں گا مگر تیرے سچے متبعین اور محبین قیامت کے دن تک رہیں گے اور ہمیشہ منکرین پر انہیں غلبہ رہے گا۔

(فتح اسلام صـ۲۵)

بیس برس کا عرصہ ہُوا ہے کہ مجھے یہ الہام ہُوا:۔

"قل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقًا۔ كل بركة من محمّد صلى الله عليه وسلم فتبارك من علّم وتعلّم۔ قل ان افتريته فعليّ اجرامي۔ هو الذى ارسل رسوله بالهدٰى ودين الحق ليظهرهٗ على الدين كله لا مبدّل لكلمات الله۔ ظُلموا وان الله على نصرهم لقدير۔ بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیان بر منار بلند تر محکم افتاد۔ پاک محمّد مصطفیٰ نبیوں کا سردار۔ خدا تیرے سب کام درست کر دیگا۔ اور تیری ساری مُرادیں تجھے دیگا۔ رب الافواج اس طرف توجہ کریگا۔ اس نشان کا مدعا یہ ہے کہ قرآن شریف خدا کی کتاب اور میرے مُنہ کی باتیں ہیں۔ جنابِ الٰہی کے احسانات کا دروازہ کھلا ہے اور اس کی پاک رحمتیں اس طرح متوجہ ہیں۔ وہ دن آتے ہیں کہ خدا تمہاری مدد کریگا۔ وہ خدا جو ذوالجلال اور زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے ...."

ان تمام الہامات میں یہ پیشگوئی تھی کہ خدا تعالیٰ میرے ہاتھ سے اور میرے ہی ذریعہ سے دین اسلام کی سچائی اور تمام مخالف دینوں کا باطل ہونا ثابت کر دیگا۔ سو آج وہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ کیونکہ میرے مقابل پر کسی مخالف کو تاب و تواں نہیں کہ اپنے دین کی سچائی ثابت کر سکے میرے ہاتھ سے آسمانی نشان ظاہر ہو رہے ہیں۔ اور میرے قلم سے قرآنی حقائق اور معارف چمک رہے ہیں۔ اُٹھو اور تمام دنیا میں تلاش کرو کہ کیا کوئی عیسائیوں میں سے یا سکھوں میں سے یا یہودیوں میں سے یا کسی اور فرقہ میں سے کوئی ایسا ہے کہ آسمانی نشانوں کے دکھلانے اور معارف اور حقائق کے بیان کرنے میں میرا

مقابلہ کر سکے۔ میں وہی ہوں جس کی نسبت یہ حدیث صحاح میں موجود ہے کہ اس کے عہد میں تمام ملتیں ہلاک ہو جائیں گی مگر اسلام کہ وہ ایسا چمکے گا جو درمیانی زمانوں میں کبھی نہیں چمکا ہو گا۔

(تریاق القلوب صـ۱۲۰-۱۲۲)

خداوند تعالیٰ نے اس احقر العباد کو اس زمانے میں پیدا کر کے اور صدہا نشان آسمانی اور خوارق غیبی اور معارف وحقائق مرحمت فرما کر اور صدہا دلائل عقلیہ قطعیہ پر علم بخش کر یہ ارادہ فرمایا ہے کہ تا تعلیماتِ حقّہ قرآنی کو ہر قوم اور ہر ملک میں شائع اور رائج فرماوے اور اپنی حجت اُن پر پوری کرے۔ اور اسی ارادہ کی وجہ سے خداوند کریم نے اس عاجز کو یہ توفیق دی کہ اتماماً للحجّۃ دس ہزار روپیہ کا اشتہار کتاب کے ساتھ شامل کیا گیا۔ اور دشمنوں اور مخالفوں کی شہادت سے آسمانی نشان پیش کئے گئے۔ اور ان کے معاوضہ اور مقابلہ کے لئے تمام مخالفین کو مخاطب کیا گیا تا کوئی دقیقہ اتمام حجت کا باقی نہ رہے اور ہر ایک مخالف اپنے مغلوب اور لاجواب ہونے کا آپ گواہ ہو جائے۔ غرض خداوند کریم نے جو اسباب اور وسائل اشاعت دین کے اور دلائل اور براہین اتمام حجت کے محض اپنے فضل و کرم سے اس عاجز کو عطا فرمائے ہیں وہ امم سابقہ میں سے آج تک کسی کو عطا نہیں فرمائے۔ اور جو کچھ اس بارہ میں توفیقاتِ غیبیہ اس عاجز کو دی گئی ہیں وہ اُن میں سے کسی کو نہیں دی گئیں۔ ذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔ سو چونکہ خداوند کریم نے اسباب خاصّہ سے اس عاجز کو مخصوص کیا ہے اور ایسے زمانہ میں اس خاکسار کو پیدا کیا ہے۔ جو اتمامِ خدمت تبلیغ کے لئے نہایت ہی معین و مددگار ہے۔ اس لئے اُس نے اپنے تفضلات و عنایات سے یہ خوشخبری بھی دی ہے کہ روز ازل سے یہی قرار یافتہ ہے کہ آیت کریمہ مذکرہ بالا اور نیز آیت واللّٰہ متمّ نورہٖ کا روحانی طور پر مصداق یہ عاجز ہے اور خدائے تعالیٰ ان دلائل و براہین کو اِن سب باتوں کو کہ جو اس عاجز نے مخالفوں کے لئے لکھے ہیں خود مخالفوں تک پہنچا دیگا۔ اور ان کا عاجز اور لاجواب اور مغلوب ہونا دنیا میں ظاہر کر کے مفہوم آیت مذکرہ بالا کا پورا کر دیگا فالحمد للّٰہِ علیٰ ذالک۔

(براہین احمدیہ صـ۵۷۴-۵۷۵ حاشیہ در حاشیہ ۳)

مَیں اسجگہ کچھ گذشتہ قصّوں کو بیان نہیں کرتا بلکہ مَیں وہی باتیں کرتا ہوں جن کا مجھے ذاتی علم ہے۔ مَیں نے قرآن شریف میں ایک زبردست طاقت پائی ہے مَیں نے آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی پیروی میں ایک عجیب خاصیت دیکھی ہے جو کسی مذہب میں وہ خاصیت اور طاقت نہیں۔ اور وہ یہ کہ سچا پیرو اس کا مقاماتِ ولایت تک پہنچ جاتا ہے۔ خدا اس کو نہ صرف اپنے قول سے

مشرف کرتا ہے بلکہ اپنے فعل سے اس کو دکھلاتا ہے کہ میں وہی خدا ہوں جس نے زمین و آسمان پیدا کیا تب اس کا ایمان بلندی میں دُور دُور کے ستاروں سے بھی آگے گذر جاتا ہے۔ چنانچہ میں اس امر میں صاحب مشاہدہ ہوں۔ خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے اور ایک لاکھ سے بھی زیادہ میرے ہاتھ پر اس نے نشان دکھلائے ہیں۔ سو اگرچہ میں دنیا کے تمام نبیوں کا ادب کرتا ہوں اور ان کی کتابوں کا بھی ادب کرتا ہوں مگر زندہ دین صرف اسلام کو ہی مانتا ہوں کیونکہ اس کے ذریعہ سے میرے پر خدا ظاہر ہوا۔ جس شخص کو میرے اس بیان میں شک ہو اس کو چاہیئے کہ ان باتوں کی تحقیق کے لئے کم سے کم دو ماہ کے لئے میرے پاس آجائے۔ میں اس کے تمام اخراجات کا جو اس کے لئے کافی ہو سکتے ہیں اس مدت تک متکفّل رہوں گا۔ میرے نزدیک مذہب وہی ہے جو زندہ مذہب ہو اور زندہ اور تازہ قدرتوں کے نظارہ سے خدا کو دکھلادے۔ ورنہ صرف دعویٰ صحت مذہب ہیچ اور بلا دلیل ہے۔

(مضمون جلسہ لاہور ص۴۰ منسلکہ چشمۂ معرفت)

اگرچہ میں نے اپنی بہت سی کتابوں میں اس بات کی تشریح کر دی ہے کہ میری طرف سے یہ دعویٰ کہ میں عیسیٰ مسیح ہوں اور نیز محمد مہدی ہوں اس خیال پر مبنی نہیں ہے کہ میں درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں اور نیز درحقیقت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ مگر پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے غور سے میری کتابیں نہیں دیکھیں اس شبہ میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ گویا میں نے تناسخ کے طور پر اس دعوے کو پیش کیا ہے اور گویا میں اس بات کا مدعی ہوں کہ سچ مچ ان دو بزرگ نبیوں کی روحیں میرے اندر حلول کر گئی ہیں۔ لیکن واقعی امر ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ آخری زمانہ کی نسبت پہلے نبیوں نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ وہ ایک ایسا زمانہ ہوگا کہ جو دو قسم کے ظلم سے بھر جائیگا۔ ایک ظلم مخلوق کے حقوق کی نسبت ہوگا اور دوسرا ظلم خالق کے حقوق کی نسبت۔

مخلوق کے حقوق کی نسبت یہ ظلم ہوگا کہ جہاد کا نام رکھکر نوع انسان کی خونریزیاں ہوں گی۔ یہاں تک کہ جو شخص ایک بے گناہ کو قتل کرے گا۔ وہ خیال کرے گا کہ گویا وہ ایسی خونریزی سے ایک ثواب عظیم حاصل کرتا ہے اور اس کے سوا اور بھی کئی قسم کی ایذائیں محض دینی غیرت کے بہانہ پر نوع انسان کو پہنچائی جائیں گی . . . .

اور دوسری قسم ظلم کی جو خالق کی نسبت ہے وہ اس زمانہ کے عیسائیوں کا عقیدہ ہے جو خالق کی نسبت کمال غلوّ تک پہنچ گیا ہے۔ اس میں تو کچھ شک نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے ایک بزرگ نبی ہیں اور بلاشبہ عیسیٰ مسیح خدا کا پیارا خدا کا برگزیدہ اور دنیا کا نور اور ہدایت کا آفتاب

اور جناب الٰہی کا مقرب اور اس کے تخت کے نزدیک مقام رکھتا ہے۔ اور کروڑہا انسان جو اس سے سچی محبت رکھتے ہیں اور اس کی وصیتوں پر چلتے ہیں اور اس کی ہدایت کے کاربند ہیں وہ جہنم سے نجات پائیں گے لیکن باایں یہ سخت غلطی اور کفر ہے کہ اس برگزیدہ کو خدا بنایا جائے .... اصل بات یہ ہے کہ جب رُوحانی اور آسمانی باتیں عوام کے ہاتھ میں آتی ہیں تو وہ ان کی جڑ تک پہنچ نہیں سکتے۔ آخر کچھ بگاڑ اور کچھ مجاز کو حقیقت پر حمل کر کے سخت غلطی اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سو اسی غلطی میں آجکل کے علماءِ مسیحی بھی گرفتار ہیں اور اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ کسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنا دیا جائے۔ سو یہ حق تلفی خالق کی ہے اور اسی حق کے قائم کرنے کے لئے اور توحید کی عظمت دلوں میں بٹھانے کے لئے ایک بزرگ نبی ملک عرب میں گذرا ہے جس کا نام مُحمّد اور احمد تھا۔ خدا کے اُس پر بے شمار سلام ہوں۔ شریعت دو حصوں پر منقسم تھی۔ بڑا حصہ یہ تھا لا الٰہ الّا اللّٰہ یعنی توحید۔ اور دوسرا حصہ یہ کہ ہمدردی نوعِ انسان کرو اور ان کے لئے وہ چاہو جو اپنے لئے۔ سو ان دونوں حصّوں میں سے حضرت مسیح نے ہمدردی نوعِ انسان پر زور دیا۔ کیونکہ وہ زمانہ اسی زور کو چاہتا تھا۔ دوسرا حصّہ جو بڑا حصہ ہے یعنی لا الٰہ الّا اللّٰہ جو خدا کی عظمت اور توحید کا سرچشمہ ہے اُس پر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے زور دیا کیونکہ وہ زمانہ اسی قسم کے زور کو چاہتا تھا۔ پھر بعد اس کے ہمارا زمانہ آیا جس میں اب ہم ہیں۔ اس زمانہ میں یہ دونوں قسم کی خرابیاں کمال درجہ تک پہنچ گئی تھیں۔ یعنی حقوقِ عباد کا تلف کرنا اور بے گناہ بندوں کا خون کرنا مسلمانوں کے عقیدہ میں داخل ہو گیا تھا۔ اور اس غلط عقیدہ کی وجہ سے ہزارہا بے گناہوں کو وحشیوں نے تہ تیغ کر دیا تھا۔ اور پھر دوسری طرف حقوقِ خالق کا تلف کرنا بھی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ اور عیسائی عقیدہ میں داخل ہو گیا تھا ....

سو اس وقت خدا نے جیسا کہ حقوقِ عباد کے تلف کے لحاظ سے میرا نام مسیح رکھا اور مجھے خُو اور بُو اور رنگ اور روپ کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ مسیح کا اوتار کر کے بھیجا ایسا ہی اُس نے حقوقِ خالق کے تلف کے لحاظ سے میرا نام محمد اور احمد رکھا۔ اور مجھے توحید پھیلانے کے لئے تمام خُو اور بُو اور رنگ اور روپ اور جامہ محمدی پہنا کر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا اوتار بنا دیا۔ سو میں ان معنوں کر کے عیسیٰ مسیح بھی ہوں اور محمد مہدی بھی۔ مسیح ایک لقب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا جس کے معنے ہیں خدا کو چھونے والا اور خدائی انعام میں سے کچھ لینے والا اور اس کا خلیفہ اور صدق اور راستبازی کو اختیار کرنے والا۔ اور مہدی ایک لقب ہے جو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ جس کے معنے ہیں کہ فطرتاً ہدایت یافتہ اور تمام ہدایتوں کا وارث اور اسم ہادی کے پورے عکس کا حامل

سو خدا تعالیٰ کے فضل اور رحمت نے اس زمانہ میں ان دونوں لقبوں کا مجھے وارث بنادیا ۔ اور یہ دونوں لقب میرے وجود میں اکٹھے کر دیئے ۔ سو میں اِن معنوں کے رو سے عیسیٰ مسیح بھی ہوں اور محمد مہدی بھی ۔ اور یہ وہ طریق ظہور ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں بروز کہتے ہیں ۔ سو مجھے دو بروز عطا ہوئے ہیں ۔ بروز عیسیٰؑ اور بروز محمدؐ ۔ غرض میرا وجود ان دونوں نبیوں کے وجود سے بروزی طور پر ایک معجون مرکب ہے ۔ عیسیٰ مسیح ہونے کی حیثیت سے میرا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو وحشیانہ حملوں اور خونریزیوں سے روک دوں جیساکہ حدیثوں میں صریح طور سے وارد ہو چکا ہے کہ جب مسیح دوبارہ دنیا میں آئیگا تو تمام دینی جنگوں کا خاتمہ کر دے گا ۔ سو ایسا ہی ہوتا جاتا ہے ....

اور محمد مہدی ہونے کی حیثیت سے میرا کام یہ ہے کہ آسمانی نشانوں کے ساتھ خدائی توحید کو دنیا میں دوبارہ قائم کروں کیونکہ ہمارے سید و مولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض آسمانی نشان دکھلا کر خدائی عظمت اور طاقت اور قدرت عرب کے بُت پرستوں کے دلوں میں قائم کی تھی سو ایسا ہی مجھے رُوح القدس سے مدد دی گئی ہے ۔

(ضمیمہ رسالہ جہاد صـ۱۸)

تکمیلِ اشاعتِ ہدایت کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اتمامِ نعمت اور اکمال الدین ہوا تو اس کی دو صورتیں ہیں ۔ اوّل تکمیل ہدایت ۔ دوسری تکمیل اشاعتِ ہدایت ۔ تکمیل ہدایت من کل الوجوہ آپ کی آمد اوّل سے ہوئی اور تکمیل اشاعتِ ہدایت آپ کی آمد ثانی سے ہوئی کیونکہ سورۃ جمعہ میں جو آخرین منھم والی آیت آپ کے فیض اور تعلیم سے ایک اور قوم کے تیار کرنے کی ہدایت کرتی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ایک بعثت اَور ہے اور یہ بعثت بروزی رنگ میں ہے جو اِس وقت ہو رہی ہے ۔ پس یہ وقت تکمیلِ اشاعتِ ہدایت کا ہے ۔

(ملفوظات جلد چہارم صـ۱۰)

سو اس عاجز کو اور بزرگوں کی فطرتی مشابہت سے علاوہ جس کی تفصیل براہین احمدیہ میں بہ بسط تمام مندرج ہے حضرت مسیح کی فطرت سے ایک خاص مشابہت ہے اور اسی فطرتی مشابہت کی وجہ سے مسیح کے نام پر یہ عاجز بھیجا گیا ۔ تا صلیبی اعتقاد کو پاش پاش کر دیا جائے ۔ سو میں صلیب کے توڑنے اور خنزیروں کے قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں ۔ میں آسمان سے اُترا ہوں اُن پاک فرشتوں کے ساتھ جو میرے دائیں بائیں تھے جن کو میرا خدا جو میرے ساتھ ہے میرے کام کے پورا کرنے کے لئے ہر ایک مستعد دل میں داخل کرے گا بلکہ کر رہا ہے اور اگر میں چپ بھی رہوں اور میری قلم لکھنے سے رُکی بھی رہے

تب بھی وہ فرشتے جو میرے ساتھ اُترے ہیں اپنا کام بند نہیں کر سکتے۔ اور اُن کے ہاتھ میں بڑی بڑی گرزیں ہیں جو صلیب توڑنے اور مخلوق پرستی کے ہیکل کچلنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔

(فتح اسلام صلا حاشیہ)

اِس زمانے کے عیسائیوں پر گواہی دینے کے لئے خدا تعالیٰ نے مجھے کھڑا کیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تا میں لوگوں پر ظاہر کر دوں کہ ابن مریم کو خدا ٹھیرانا ایک باطل اور کفر کی راہ ہے اور مجھے اس نے اپنے مکالمات اور مخاطبات سے مشرف فرمایا ہے۔ اور مجھے اس نے بہت سے نشانوں کے ساتھ بھیجا ہے اور میری تائید میں اُس نے بہت سے خوارق ظاہر فرمائے ہیں اور درحقیقت اس کے فضل و کرم سے ہماری مجلس خدا نما مجلس ہے جو شخص اس مجلس میں صحت نیت اور پاک ارادہ اور مستقیم جستجو سے ایک مدت تک رہے تو میں یقین کرتا ہوں کہ اگر وہ دہریہ بھی ہو تو آخر خدا تعالیٰ پر ایمان لاوے گا اور ایک عیسائی جس کو خدا تعالیٰ کا خوف ہو اور جو سچے خدا کی تلاش اور بھوک اور پیاس رکھتا ہو اس کو لازم ہے کہ بیہودہ قصے اور کہانیاں ہاتھ سے پھینک دے اور چشم دید ثبوتوں کا طالب بن کر ایک مدت تک میری صحبت میں رہے پھر دیکھے کہ وہ خدا جو زمین و آسمان کا مالک ہے کس طرح اپنے آسمانی نشان اُس پر ظاہر کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں جو درحقیقت خدا کو ڈھونڈنے والے اور اس تک پہنچنے کے لئے دن رات سرگردان ہیں۔

(کتاب البریہ صہ۵۵)

چونکہ میں تثلیث کی خرابیوں کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہوں اس لئے یہ دردناک نظارہ کہ ایسے لوگ دنیا میں چالیس کروڑ سے بھی کچھ زیادہ پائے جاتے ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا سمجھ رکھا ہے میرے دل پر اس قدر صدمہ پہنچاتا رہا ہے کہ میں گمان نہیں کر سکتا کہ مجھ پر میری تمام زندگی میں اس سے بڑھ کر کوئی غم گذرا ہو۔ بلکہ اگر ہم و غم سے مرنا میرے لئے ممکن ہوتا تو یہ غم مجھے ہلاک کر دیتا کہ کیوں یہ لوگ خدائے واحد لاشریک کو چھوڑ کر ایک عاجز انسان کی پرستش کر رہے ہیں۔ اور کیوں یہ لوگ اس نبی پر ایمان نہیں لاتے جو سچی ہدایت اور راہ راست لے کر دنیا میں آیا ہے۔ ہر ایک وقت مجھے یہ اندیشہ رہا ہے کہ اس غم کے صدمات سے میں ہلاک نہ ہو جاؤں .... اور میرا اس درد سے یہ حال ہے کہ اگر دوسرے لوگ بہشت چاہتے ہیں تو میرا بہشت یہی ہے کہ میں اپنی زندگی میں اِس شرک سے انسانوں کو رہائی پاتے اور خدا کا جلال ظاہر ہوتے دیکھ لوں اور میری رُوح ہر وقت دعا کرتی ہے کہ اے خدا! اگر میں تیری طرف سے ہوں اور اگر تیرے فضل کا سایہ میرے ساتھ ہے تو مجھے

یہ دن دکھلا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے سر سے یہ تہمت اٹھادی جائے کہ گویا نعوذ باللہ انہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ ایک زمانہ گذر گیا کہ میرے پنجوقت کی یہی دعائیں ہیں کہ خدا ان لوگوں کو آنکھ بخشے اور وہ اس کی وحدانیت پر ایمان لاویں اور اس کے رسول کو شناخت کرلیں اور تثلیث کے اعتقاد سے توبہ کریں۔

(تبلیغ رسالت جلد ششم صفحہ ۷۱-۷۲)

مسیح موعود کے وجود کی علتِ غائی احادیثِ نبویہ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ عیسائی قوم کے دجل کو دُور کرے گا۔ اور ان کے صلیبی خیالات کو پاش پاش کرکے دکھلا دے گا۔ چنانچہ یہ امر میرے ہاتھ پر خدا تعالیٰ نے ایسا انجام دیا کہ عیسائی مذہب کے اصول کا خاتمہ کر دیا۔ مَیں نے خدا تعالیٰ سے بصیرت کاملہ پاکر ثابت کر دیا کہ وہ لعنتی موت کہ جو نعوذ باللہ حضرت مسیح کی طرف منسوب کی جاتی ہے جس پر تمام مدار صلیبی نجات کا ہے وہ کسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی۔ اور کسی طرح لعنت کا مفہوم کسی راستباز پر صادق نہیں آ سکتا۔ چنانچہ فرقۂ پادریان اس جدید طرز کے سوال سے جو حقیقت میں اُن کے مذہب کو پاش پاش کرتا ہے ایسے لاجواب ہو گئے کہ جن جن لوگوں نے اس تحقیق پر اطلاع پائی ہے وہ سمجھ گئے ہیں کہ اس اعلیٰ درجہ کی تحقیق نے صلیبی مذہب کو توڑ دیا ہے بعض پادریوں کے خطوط سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اس فیصلہ کرنے والی تحقیق سے نہایت درجہ ڈر گئے ہیں۔ اور وہ سمجھ گئے ہیں کہ اس سے ضرور صلیبی مذہب کی بنیاد گرے گی اور اس کا گرنا نہایت ہولناک ہوگا۔

(کتاب البریہ حاشیہ صفحہ ۲۶۲)

جیسا کہ ہم نے اس فارسی قصیدہ میں جو اوپر لکھا گیا ہے یہ بتلایا ہے کہ خدا کے کامل مامورین کی علامتوں میں سے ایک یہ علامت ہے کہ اُن سے آسمانی نشان ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ہم اس جگہ ہزار ہزار شکر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ وہ تمام علامتیں اِس بندۂ حضرتِ احدیت میں پوری ہوئی اس زمانہ میں پادریوں کا متعصب فرقہ جو سراسر حق پوشی کی راہ سے کہا کرتا تھا کہ گویا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معجزہ ظہور میں نہیں آیا ان کو خدا تعالیٰ نے سخت شرمندہ کرنے والا جواب دیا اور کھلے کھلے نشان اس اپنے بندہ کی تائید میں ظاہر فرمائے۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ انجیل کے واعظ بازاروں اور گلیوں اور کوچوں میں نہایت دریدہ دہانی سے اور سراسر افترا سے ہمارے سید و مولیٰ خاتم الانبیاء اور افضل الرسل والاصفیاء اور سید المعصومین والاتقیاء حضرت محبوب جناب احدیت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ قابلِ شرم جھوٹ بولا کرتے تھے کہ گویا آنجناب سے کوئی پیشگوئی یا معجزہ ظہور میں نہیں آیا۔ اور اب یہ زمانہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے علاوہ

ان ہزارہا معجزات کے جو ہمارے سرور و مولیٰ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن شریف اور احادیث میں اس کثرت سے مذکور ہیں جو اعلیٰ درجہ کے تواتر پر ہیں تازہ بتازہ صدہا نشان ایسے ظاہر فرمائے کہ کسی مخالف و منکر کو اُن کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ ہم نہایت نرمی اور انکسار سے ہر ایک عیسائی صاحب اور دوسرے مخالفوں کو کہتے رہے ہیں اور اب بھی کہتے ہیں کہ درحقیقت یہ بات سچ ہے کہ ہر ایک مذہب جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو کر اپنی سچائی پر قائم ہوتا ہے اُس کے لئے ضرور ہے کہ اُس میں ایسے انسان پیدا ہوتے رہیں کہ جو اپنے پیشوا اور ہادی اور رسول کے نائب ہو کر یہ ثابت کریں کہ وہ نبی اپنی روحانی برکات کے لحاظ سے زندہ ہے فوت نہیں ہوُا۔ کیونکہ ضرور ہے کہ وہ نبی جس کی پیروی کی جائے جس کو شفیع اور منجّی سمجھا جائے وہ اپنے روحانی برکات کے لحاظ سے ہمیشہ زندہ ہو اور عزّت اور رفعت اور جلال کے آسمان پر اپنے چمکتے ہوئے چہرہ کے ساتھ ایسا بدیہی طور پر مقیم ہو۔ اور خدائے ازلی ابدی حیّ و قیّوم ذوالاقتدار کے دائیں طرف بیٹھنا اُس کا ایسے پُر زور الٰہی نوروں سے ثابت ہو کہ اس سے کامل محبت رکھنا اور اس کی کامل پیروی کرنا لازمی طور پر اس نتیجہ کو پیدا کرتا ہو کہ پیروی کرنے والا رُوح القدس اور آسمانی برکات کا انعام پائے۔ اور اپنے پیارے نبی کے نوروں سے نور حاصل کر کے اپنے زمانہ کی تاریکی کو دُور کرے۔ اور مستعد لوگوں کو خدا کی ہستی پر وہ پختہ اور کامل اور درخشاں اور تاباں یقین بخشے جس سے گناہ کی تمام خواہشیں اور سفلی زندگی کے تمام جذبات جل جاتے ہیں۔ یہی ثبوت اس بات کا ہے کہ وہ نبی زندہ اور آسمان پر ہے۔ سو ہم اپنے خدائے پاک ذوالجلال کا کیا شکر کریں کہ اسی نے اپنے پیارے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور پیروی کی توفیق دے کر اور پھر اسی محبت اور پیروی کے روحانی فیضوں سے جو سچے تقویٰ اور سچے آسمانی نشان ہیں کامل حصہ عطا فرما کر ہم پر ثابت کر دیا کہ وہ ہمارا پیارا برگزیدہ نبی فوت نہیں ہوُا بلکہ وہ بلند تر آسمان پر اپنے ملیک مقتدر کے دائیں طرف بزرگی اور جلال کے تخت پر بیٹھا ہے۔

اللّٰھم صلّ علیہ و بارک وسلم۔ ان اللّٰہ و ملائکتہ یصلّون علی النّبی
یا ایھا الذین اٰمنوا صلّوا علیہ وسلّموا تسلیمًا۔

(تریاق القلوب ص۸ـ۱۰)

سو اسی بنا پر یہ عاجز اس سلسلہ کے قائم رکھنے کے لئے مامور کیا گیا ہے اور چاہتا ہے کہ صحبت میں رہنے والوں کا سلسلہ اور بھی زیادہ وسعت سے بڑھا دیا جائے اور ایسے لوگ دن رات صحبت میں رہیں کہ جو ایمان اور محبت اور یقین کے بڑھانے کے لئے شوق رکھتے ہوں اور ان پر وہ انوار ظاہر ہوں کہ جو اس عاجز پر ظاہر کئے گئے ہیں۔ اور وہ ذوق ان کو عطا ہوُا ہو جو اس عاجز کو عطا

کیا گیا ہے۔ تا اسلام کی روشنی عام طور پر دنیا میں پھیل جائے۔ اور حقارت اور ذلّت کا سیہ داغ مسلمانوں کی پیشانی سے دھویا جائے۔ اسی کی بشارت دے کر خداوند نے مجھے بھیجا۔ اور کہا کہ

"بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید۔ و پائے محمدیاں برمنار بلند تر محکم افتاد۔"

(فتح اسلام ص ۲۲-۲۳)

خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان تمام روحوں کو جو زمین کی متفرق آبادیوں میں آباد ہیں کیا یورپ اور کیا ایشیا۔ ان سب کو جو نیک فطرت رکھتے ہیں توحید کی طرف کھینچے اور اپنے بندوں کو دین واحد پر جمع کرے۔ یہی خدا تعالیٰ کا مقصد ہے جس کے لئے میں دنیا میں بھیجا گیا ہوں۔ سو تم اس مقصد کی پیروی کرو مگر نرمی اور اخلاق اور دعاؤں پر زور دینے سے۔ اور جب تک کوئی خدا سے رُوح القدس پا کر کھڑا نہ ہو سب میرے بعد مِل کر کام کرو۔

(الوصیة ص ۱۰-۱۱)

اِس وقت جو ضرورت ہے وہ یقیناً سمجھ لو سیف کی نہیں بلکہ قلم کی ہے۔ ہمارے مخالفین نے اسلام پر جو شبہات وارد کئے ہیں۔ اور مختلف سائینسوں اور مکاید کی رو سے اللہ تعالیٰ کے سچے مذہب پر حملہ کرنا چاہا ہے۔ اس نے مجھے متوجہ کیا ہے کہ مَیں قلمی اسلحہ پہن کر اس سائنس اور علمی ترقی کے میدانِ کارزار میں اتروں اور اسلام کی روحانی شجاعت اور باطنی قوت کا کرشمہ بھی دکھلاؤں۔ مَیں کب اس میدان کے قابل ہو سکتا تھا یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اس کی بے حد عنایت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میرے جیسے عاجز انسان کے ہاتھ سے اس کے دین کی عزّت ظاہر ہو۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۵۷)

دعوت حق

قل ان کان للرحمٰن ولدٌ فانا اوّل العابدین۔

یہ اشتہار پادری صاحبوں کی خدمت میں نہایت عجز اور ادب اور انکسار سے لکھا جاتا ہے کہ اگر یہ سچ ہوتا کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام درحقیقت خدا کا فرزند ہوتا یا خدا ہوتا تو سب سے پہلے مَیں اس کی پرستش کرتا اور مَیں تمام ملک میں اُس کی خدائی کی اشاعت کرتا اور اگرچہ مَیں دکھ اُٹھاتا اور مارا جاتا۔ اور قتل کیا جاتا اور اس کی راہ میں ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا تب بھی میں اس دعوت اور منادی سے باز نہ آتا۔ لیکن اے عزیزو! خدا تم پر رحم کرے اور تمہاری آنکھیں کھولے حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں وہ صرف ایک نبی ہے۔ ایک ذرّہ اس سے زیادہ نہیں۔ اور بخدا مَیں وہ سچی محبت اس سے رکھتا ہوں جو تمہیں

ہرگز نہیں ۔ اور جس نور کے ساتھ میں اسے شناخت کرتا ہوں تم ہرگز اسے شناخت نہیں کر سکتے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ خدا کا ایک پیارا اور برگزیدہ نبی تھا اور ان میں سے تھا جن پر ایک خاص فضل ہوتا ہے اور جو خدا کے ہاتھ سے پاک کئے جاتے ہیں مگر خدا نہیں تھا ۔ اور نہ خدا کا بیٹا تھا ۔ میں نے یہ باتیں اپنی طرف سے نہیں کیں بلکہ وہ خدا جو زمین و آسمان کا خالق ہے میرے پر ظاہر ہوا اور اُسی نے اِس آخری زمانہ کے لئے مجھے مسیح موعود کیا ۔ اس نے مجھے بتلایا کہ سچ یہی ہے کہ یسوع ابن مریم نہ خدا ہے نہ خدا کا بیٹا ہے ۔ اور اُس نے میرے ساتھ ہمکلام ہو کر مجھے بتلایا کہ وہ نبی جس نے قرآن پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف بُلایا وہ سچا نبی ہے ۔ اور وہی ہے جس کے قدموں کے نیچے نجات ہے اور بجز اس کی متابعت کے ہرگز ہرگز کسی کو کوئی نُور حاصل نہیں ہوگا ۔ اور جب میرے خدا نے اس نبی کی وقعت اور قدر اور عظمت میرے پر ظاہر کی تو میں کانپ اُٹھا اور میرے بدن پر لرزہ پڑ گیا ۔ کیونکہ جیسا کہ حضرت عیسیٰ مسیح کی تعریف میں لوگ حد سے بڑھ گئے یہاں تک کہ ان کو خدا بنا دیا اسی طرح اس مقدس نبیؐ کا لوگوں نے قدر شناخت نہیں کیا جیسا کہ حق شناخت کرنے کا تھا اور جیسا کہ چاہیئے لوگوں کو ابتک اُس کی عظمتیں معلوم نہیں ۔ وہی ایک نبی ہے جس نے توحید کا تخم ایسے طور پر بویا جو آج تک ضائع نہیں ہوا ۔ وہی ایک نبی ہے جو ایسے وقت میں آیا جب تمام دنیا بگڑ گئی تھی اور ایسے وقت میں گیا جب ایک سمندر کی طرح توحید کو دنیا میں پھیلا گیا ۔ اور وہی ایک نبی ہے جس کے لئے ہر ایک زمانہ میں خدا اپنی غیرت دکھلاتا رہا ہے اور اس کی تصدیق اور تائید کے لئے ہزارہا معجزات ظاہر کرتا رہا ۔ اسی طرح اس زمانہ میں بھی اس پاک نبی کی بہت توہین کی گئی اس لئے خدا کی غیرت نے جوش مارا اور سب گذشتہ زمانوں سے زیادہ جوش مارا اور مجھے اس نے مسیح موعود کر کے بھیجا تا کہ میں اُس کی نبوت کے لئے تمام دنیا میں گواہی دوں ۔ اگر میں بے دلیل یہ دعویٰ کرتا ہوں تو جھوٹا ہوں لیکن اگر خدا اپنے نشانوں کے ساتھ اس طور پر میری گواہی دیتا ہے کہ اس زمانہ میں مشرق سے مغرب تک اور شمال سے لیکر جنوب تک اس کی نظیر نہیں تو انصاف اور خدا ترسی کا مقتضا یہی ہے کہ مجھے میری اس تمام تعلیم کے ساتھ قبول کریں ۔ خدا نے میرے لئے وہ نشان دکھائے کہ اگر وہ ان اُمتوں کے وقت نشان دکھلائے جاتے جو پانی اور آگ اور ہوا سے ہلاک کی گئیں تو وہ ہلاک نہ ہوتیں مگر اس زمانے کے لوگوں کو میں کس سے تشبیہہ دوں وہ اس بدقسمت کی طرح ہیں جس کی آنکھیں بھی ہیں پر دیکھتا نہیں اور کان بھی ہیں پر سنتا نہیں اور عقل بھی ہے پر سمجھتا نہیں ۔ میں اُن کے لئے روتا ہوں اور وہ مجھ پر ہنستے ہیں اور میں ان کو زندگانی کا پانی دیتا ہوں اور وہ مجھ پر آگ برساتے ہیں ۔ خدا میرے پر نہ صرف اپنے قول سے

ظاہر ہوا ہے بلکہ اپنے فعل کے ساتھ بھی اس نے میرے پر تجلّی کی اور میرے لئے وہ کام دکھلائے اور دکھلائے گا کہ جب تک کسی پر خدا کا خاص فضل نہ ہو اس کے لئے یہ کام دکھلائے نہیں جاتے۔ لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا لیکن خدا نے مجھے قبول کیا۔ کون ہے جو ان نشانوں کے دکھلانے میں میرے مقابل پر آسکتا ہے۔ مَیں ظاہر ہوا ہوں تا خدا میرے ذریعہ سے ظاہر ہو۔ وہ ایک مخفی خزانے کی طرح تھا مگر اب اُس نے مجھے بھیجکر ارادہ کیا کہ تمام دہریوں اور بے ایمانوں کا مُنّہ بند کرے جو کہتے ہیں کہ خدا نہیں۔ مگر اے عزیزو! تم جو خدا کی طلب میں لگے ہوئے ہو۔ مَیں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ سچّا خدا وہی ہے جس نے **قرآن** نازل کیا۔ وہی ہے جس نے میرے پر تجلّی کی اور جو ہر دم میرے ساتھ ہے۔

(اشتہار منسلکہ حقیقۃ الوحی ص ۶۱۷)

”الذین یبایعونک انّما یبایعون اللّٰہ ید اللّٰہ فوق ایدیھم“
(الہام الٰہی)

تبلیغ
اور
ایک پاک جماعت کا قیام
اور اُن کو
نصائح

”اِس زمانہ کا حصنِ حصین مَیں ہوں“

اے ناظرین! عافاکم اللہ فی الدنیا والدین۔ آج یہ عاجز ایک مدت مدید کے بعد اس الٰہی کارخانہ کے بارے میں جو خدا تعالیٰ نے دین اسلام کی حمایت کیلئے میرے سپرد کیا ہے ایک ضروری مضمون کی طرف آپ لوگوں کو توجہ دلاتا ہے۔ اور میں اس مضمون میں جہاں تک خدا تعالیٰ نے اپنی طرف سے مجھے تقریر کرنے کا مادہ بخشا ہے اس سلسلہ کی عظمت اور اس کارخانہ کی نصرت کی ضرورت آپ صاحبوں پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں تا وہ حق تبلیغ جو مجھ پر واجب ہے اُس سے میں سبکدوش ہو جاؤں۔ پس اس مضمون کے بیان کرنے میں مجھے اس سے کچھ غرض نہیں کہ اس تحریر کا دلوں پر کیا اثر پڑے گا۔ صرف غرض یہ ہے کہ جو بات مجھ پر فرض ہے اور جو پیغام پہنچانا میرے پر قرضۂ لازمہ کی طرح ہے وہ جیسا کہ چاہیئے مجھ سے ادا ہو جائے خواہ لوگ اس کو بسمعِ رضا سُنیں اور خواہ کراہت اور قبض کی نظر سے دیکھیں اور خواہ میری نسبت نیک گمان رکھیں اور یا بدظنّی کو اپنے دلوں میں جگہ دیں۔ واُفوّض امری الی اللّٰہ واللّٰہ بصیر بالعباد۔

اب میں ذیل میں وہ مضمون جس کا اوپر وعدہ دیا ہے لکھتا ہوں :۔

اے حق کے طالبو اور اسلام کے سچّے محبّو! آپ لوگوں پر واضح ہے کہ یہ زمانہ جس میں ہم لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں یہ ایک ایسا تاریک زمانہ ہے کہ کیا ایمانی اور کیا عملی جس قدر امور ہیں سب میں سخت فساد واقع ہو گیا ہے اور ایک تیز آندھی ضلالت اور گمراہی کی ہر طرف سے چل رہی ہے۔ وہ چیز جس کو ایمان کہتے ہیں اس کی جگہ چند لفظوں نے لے لی ہے جن کا محض زبان سے اقرار کیا جاتا ہے اور وہ امور جن کا نام **اعمالِ صالحہ** ہے اُن کا مصداق چند رسوم یا اسراف اور ریا کاری کے کام سمجھے گئے ہیں اور جو حقیقی نیکی ہے اس سے بکلی بے خبری ہے۔ اس زمانہ کا فلسفہ اور طبیعی بھی رُوحانی صلاحیت کا سخت مخالف پڑا ہے۔ اُسکے جذبات اُس کے جاننے والوں پر نہایت بد اثر کرنے والے اور ظلمت کی طرف کھینچنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ وہ زہریلے مواد کو حرکت دیتے اور سوئے ہوئے شیطان کو جگا دیتے ہیں۔ اِن علوم میں دخل رکھنے والے دینی امور میں اکثر ایسی بدعقیدگی پیدا کر لیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں اور صوم و صلوٰۃ وغیرہ کے عبادت کے طریقوں کو تحقیر اور استہزار کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کے دلوں میں خدا تعالیٰ کے وجود کی بھی کچھ وقعت عظمت نہیں۔ بلکہ اکثر اُن میں سے الحاد کے رنگ میں رنگین اور دہریت کے رگ و ریشہ سے پُر اور مسلمانوں کی اولاد کہلا کر پھر دشمن دین ہیں۔ جو لوگ کالجوں میں پڑھتے ہیں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہنوز وہ اپنے علوم ضروریہ کی تحصیل سے فارغ نہیں ہوتے کہ دین اور دین کی ہمدردی سے پہلے ہی فارغ اور مستعفی ہو چکتے ہیں۔ یہ میں نے

صرف **ایک شاخ** کا ذکر کیا ہے جو حال کے زمانہ میں ضلالت کے پھلوں سے لدی ہوئی ہے۔ مگر اس کے سوا صدہا اور شاخیں بھی ہیں جو اس سے کم نہیں! عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ دنیا سے امانت اور دیانت ایسی اُٹھ گئی ہے کہ گویا بکلّی مفقود ہو گئی ہے۔ دنیا کمانے کے لئے مکر اور فریب حد سے زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ جو شخص سب سے زیادہ شریر ہو وہی سب سے زیادہ لائق سمجھا جاتا ہے۔ طرح طرح کی ناراستی۔ بددیانتی۔ حرامکاری۔ دغابازی۔ دروغگوئی اور نہایت درجہ کی روبہ بازی اور لالچ سے بھرے ہوئے منصوبے اور بدذاتی سے بھری ہوئی خصلتیں پھیلتی جاتی ہیں اور نہایت بے رحمی سے ملے ہوئے کینے اور جھگڑے ترقی پر ہیں اور جذباتِ بہیمیہ اور سبعیہ کا ایک طوفان اُٹھا ہوا ہے۔ اور جس قدر لوگ ان علوم اور قوانینِ مروّجہ میں چست و چالاک ہوتے جاتے ہیں اُسی قدر نیک گوہری اور نیک کرداری کی طبعی خصلتیں اور حیا اور شرم اور خدا ترسی اور دیانت کی فطرتی خاصیتیں اُن میں کم ہوتی جاتی ہیں۔

عیسائیوں کی تعلیم بھی سچائی اور ایمانداری کے اُڑانے کے لئے کئی قسم کی سرنگیں طیّار کر رہی ہے اور عیسائی لوگ اسلام کے مٹا دینے کے لئے جھوٹ اور بناوٹ کی تمام باریک باتوں کو نہایت درجہ کی جانکاہی سے پیدا کر کے ہر ایک رہزنی کے موقعہ اور محل پر کام میں لا رہے ہیں اور بہکانے کے نئے نئے نسخے اور گمراہ کرنیکی جدید جدید صورتیں تراشی جاتی ہیں۔ اور اس **انسانِ کامل** کی سخت توہین کر رہے ہیں جو تمام مقدسوں کا فخر اور تمام مقربوں کا سرتاج اور تمام بزرگ رسولوں کا سردار تھا۔ یہاں تک کہ ناٹک کے تماشائیوں میں نہایت شیطنت کے ساتھ **اسلام اور ہادیٔ پاک اسلام** کی بُرے بُرے پیرائیوں میں تصویریں دکھلائی جاتی ہیں اور سوانگ نکالے جاتے ہیں اور ایسی افترائی تہمتیں تھیئٹر کے ذریعہ سے پھیلائی جاتی ہیں جن میں اسلام اور نبیٔ پاکؐ کی عزت کو خاک میں ملا دینے کے لئے پوری حرامزدگی خرچ کی گئی ہے۔

اب اے مسلمانو! سُنو! اور غور سے سُنو! کہ اسلام کی پاک تاثیروں کو روکنے کے لئے جسقدر پیچیدہ افترا اس عیسائی قوم میں استعمال کئے گئے اور پُرمکر حیلے کام میں لائے گئے اور اُن کے پھیلانے میں جان توڑ کر اور مال کو پانی کی طرح بہا کر کوششیں کی گئیں یہاں تک کہ نہایت شرمناک ذریعے بھی جن کی تصریح سے اس مضمون کو منزہ رکھنا بہتر ہے اسی راہ میں ختم کئے گئے۔ یہ کرسچن قوموں اور تثلیث کے حامیوں کی جانب سے وہ ساحرانہ کارروائیاں ہیں کہ جب تک اُن کے اس سحر کے مقابل پر خدا تعالیٰ وہ پُرزور ہاتھ نہ دکھاوے جو معجزہ کی قدرت اپنے اندر رکھتا ہو اور اس معجزہ سے اس طلسم سحر کو پاش پاش نہ کرے تب تک اس جادوئے فرنگ سے سادہ لوح دلوں کو مخلصی حاصل ہونا بالکل قیاس اور گمان سے باہر ہے۔ سو خدا تعالیٰ نے اس جادو کے باطل کرنے کے لئے اس زمانہ کے سچے مسلمانوں کو یہ معجزہ دیا کہ

اپنے بندہ کو اپنے الہام اور کلام اور اپنی برکاتِ خاصہ سے مشرف کر کے اور اپنی راہ کے باریک علوم سے بہرۂ کامل بخش کر مخالفین کے مقابل پر بھیجا اور بہت سے آسمانی تحائف اور علوی عجائبات اور روحانی معارف و دقائق ساتھ دیئے تا اس آسمانی پتھر کے ذریعہ سے وہ موم کا بُت توڑ دیا جائے جو سحرِ فرنگ نے طیّار کیا ہے۔ سو اے مسلمانو! اس عاجز کا ظہور ساحرانہ تاریکیوں کے اٹھانے کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک معجزہ ہے۔ کیا ضرور نہیں تھا کہ سحر کے مقابل پر معجزہ بھی دنیا میں آتا۔ کیا تمہاری نظروں میں یہ بات عجیب اور انہونی ہے کہ خدا تعالیٰ نہایت درجہ کے مکروں کے مقابلہ پر جو سحر کی حقیقت تک پہنچ گئے ہیں ایک ایسی حقانی چمکار دکھاوے جو معجزہ کا اثر رکھتی ہو۔

(فتح اسلام ص ۳-۷)

اسجگہ میں بعض ان لوگوں کا وسوسہ بھی دُور کرنا چاہتا ہوں جو ذی مقدرت لوگ ہیں اور اپنے تئیں بڑا فیاض اور دین کی راہ میں فدا شدہ خیال کرتے ہیں لیکن اپنے مالوں کو محل پر خرچ کرنے سے بکلّی منحرف ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہم کسی صادق مؤید من اللہ کا زمانہ پاتے جو دین کی تائید کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوتا تو ہم اس کی نصرت کی راہ میں ایسے جھکتے کہ قربان ہی ہو جاتے۔ مگر کیا کریں ہر طرف فریب اور مکر کا بازار گرم ہے۔ مگر اے لوگو! تم پر واضح رہے کہ دین کی تائید کے لئے ایک شخص بھیجا گیا لیکن تم نے اسے شناخت نہیں کیا۔ وہ تمہارے درمیان ہے اور یہی ہے جو بول رہا ہے پر تمہاری آنکھوں پر بھاری پردے ہیں۔ اگر تمہارے دل سچائی کے طلبگار ہوں تو جو شخص خدا تعالیٰ کے ہمکلام ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس کا آزمانا بہت سہل ہے۔ اُس کی خدمت میں آؤ۔ اس کی صحبت میں دو تین ہفتے رہو۔ تا اگر خدا تعالیٰ چاہے تو اُن برکات کی بارشیں جو اُس پر ہو رہی ہیں اور وہ حقانی وحی کے انوار جو اس پر اُتر رہے ہیں اُن میں سے تم بچشمِ خود دیکھ لو۔ جو ڈھونڈتا ہے وہی پاتا ہے جو کھٹکھٹاتا ہے اسی کے لئے کھولا جاتا ہے۔ اگر تم آنکھیں بند کر کے اور اندھیری کوٹھڑی میں چھپ کر یہ کہو کہ آفتاب کہاں ہے تو یہ تمہاری عبث شکایت ہے۔ اے نادان! اپنی کوٹھڑی کے کواڑ کھول اور اپنی آنکھوں پر سے پردہ اُٹھا۔ تا تجھے آفتاب نہ صرف نظر آوے بلکہ اپنی روشنی سے تجھے منور بھی کرے۔

بعض کہتے ہیں کہ انجمنیں قائم کرنا اور مدارس کھولنا ہی تائیدِ دین کے لئے کافی ہے۔ مگر وہ نہیں سمجھتے کہ دین کس چیز کا نام ہے اور اس ہماری ہستی کی انتہائی اغراض کیا ہیں اور کیونکر اور کن راہوں سے وہ اغراض حاصل ہو سکتے ہیں۔ سو انہیں جاننا چاہیئے کہ انتہائی غرض اس زندگی کی خدا تعالیٰ سے وہ سچا اور یقینی پیوند حاصل کرنا ہے جو تعلقاتِ نفسانیہ سے چھڑا کر نجات کے سرچشمہ تک پہنچاتا ہے۔ سو اس یقین کامل کی راہیں انسانی بناوٹوں اور تدبیروں سے ہرگز کھل نہیں سکتیں۔ اور انسانوں کا گھڑا ہوا فلسفہ اسجگہ کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا

بلکہ یہ روشنی ہمیشہ خدا تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے ذریعہ سے ظلمت کے وقت میں آسمان سے نازل کرتا ہے۔ اور جو آسمان سے اُترا وہی آسمان کی طرف لے جاتا ہے۔ سو اے وے لوگو! جو ظلمت کے گڑھے میں دبے ہوئے اور شکوک شبہات کے پنجہ میں اسیر اور نفسانی جذبات کے غلام ہو صرف اسمی اور رسمی اسلام پر ناز مت کرو اور اپنی سچی رفاہیت اور اپنی حقیقی بہبودی اور اپنی آخری کامیابی انہی تدبیروں میں نہ سمجھو جو حال کی انجمنوں اور مدارس کے ذریعہ سے کی جاتی ہیں۔ یہ اشغال بنیادی طور پر فائدہ بخش تو ہیں اور ترقیات کا پہلا زینہ متصور ہو سکتے ہیں مگر اصل مدعا سے بہت دُور ہیں۔ شاید ان تدبیروں سے دماغی چالاکیاں پیدا ہوں یا طبیعت میں پُرفنی اور ذہن میں تیزی اور خشک منطق کی مشق حاصل ہو جائے یا عالمیت اور فاضلیت کا خطاب حاصل کر لیا جائے اور شاید مدت دراز کی تحصیل علمی کے بعد اصل مقصود کے کچھ ممد بھی ہو سکیں۔ مگر تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ سو جاگو اور ہوشیار ہو جاؤ ایسا نہ ہو کہ ٹھوکر کھاؤ۔ مبادا سفر آخرت ایسی صورت میں پیش آوے جو درحقیقت الحاد اور بے ایمانی کی صورت ہو۔ یقیناً سمجھو کہ فلاحِ عاقبت کی امیدوں کا تمام مدار وانحصار ان رسمی علوم کی تحصیل پر ہرگز نہیں ہو سکتا اور اس آسمانی نور کے اُترنے کی ضرورت ہے جو شکوک وشبہات کی آلائشوں کو دُور کرتا اور ہوا وہوس کی آگ کو بُجھاتا اور خدا تعالیٰ کی سچی محبت اور سچے عشق اور سچی اطاعت کی طرف کھینچتا ہے

اگر تم اپنی کانشنس سے سوال کرو تو یہی جواب پاؤ گے کہ وہ سچی تسلّی اور سچا اطمینان کہ جو ایک دم میں رُوحانی تبدیلی کا موجب ہوتا ہے وہ ابھی تک تم کو حاصل نہیں۔ پس کمال افسوس کی جگہ ہے کہ جس قدر تم رسمی باتوں اور رسمی علوم کی اشاعت کے لئے جوش رکھتے ہو اس کا عشر عشیر بھی آسمانی سلسلہ کی طرف تمہارا خیال نہیں۔ تمہاری زندگی اکثر ایسے کاموں کے لئے وقف ہو رہی ہے کہ اوّل تو وہ کام کسی قسم کا دین سے علاقہ ہی نہیں رکھتے اور اگر ہے بھی تو وہ علاقہ ایک ادنیٰ درجہ کا اور اصل مدعا سے بہت پیچھے رہا ہوا ہے۔

اگر تم میں وہ حواس ہوں اور وہ عقل جو ضروری مطلب پر جا ٹھیرتی ہے تو تم ہرگز آرام نہ کرو جب تک وہ اصل مطلب تمہیں حاصل نہ ہو جائے۔ اے لوگو! تم اپنے سچے خداوند خدا اپنے حقیقی خالق اپنے واقعی معبود کی شناخت اور محبت اور اطاعت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔ پس جب تک یہ امر جو تمہاری خلقت کی علّتِ غائی ہے بیّن طور پر تم میں ظاہر نہ ہو تب تک تم اپنی حقیقی نجات سے بہت دُور ہو اگر تم انصاف سے بات کرو تو تم اپنی اندرونی حالت پر آپ ہی گواہ ہو سکتے ہو کہ بجائے خدا پرستی کے ہر دم دنیا پرستی کا ایک قوی ہیکل بُت تمہارے دل کے سامنے ہے جس کو تم ایک ایک سیکنڈ میں ہزار ہزار سجدہ کر رہے ہو اور تمہارے تمام اوقات عزیز دنیا کی جق جق بک بک میں ایسے مستغرق ہو رہے ہیں کہ تمہیں دوسری طرف

نظر اُٹھانے کی فرصت نہیں۔ کبھی تمہیں یاد بھی ہے کہ انجام اس ہستی کا کیا ہے! کہاں ہے تم میں انصاف! کہاں ہے تم میں امانت! کہاں ہے تم میں وہ راستبازی اور خدا ترسی اور دیانت داری اور فروتنی جس کی طرف تمہیں قرآن بلاتا ہے نہیں کبھی بھولے بسرے برسوں میں بھی تو یاد نہیں آتا کہ ہمارا کوئی خدا بھی ہے۔ کبھی تمہارے دل میں نہیں گذرتا کہ اُس کے کیا کیا حقوق تم پر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تم نے کوئی غرض کوئی واسطہ کوئی تعلق اُس قیوم حقیقی سے رکھا ہوا ہی نہیں۔ اور اس کا نام تک لینا تم پر مشکل ہے۔ اب چالاکی سے تم لڑو گے کہ ایسا ہرگز نہیں لیکن خدا تعالیٰ کا قانونِ قدرت تمہیں شرمندہ کرتا ہے جبکہ وہ تمہیں جتلاتا ہے کہ ایمانداروں کی نشانیاں تم میں نہیں۔ اگرچہ تم اپنی دنیوی فکروں اور سوچوں میں بڑے زور سے اپنی دانشمندی اور متانت رائے کے مدعی ہو۔ مگر تمہاری لیاقت تمہاری نکتہ رسی تمہاری دُور اندیشی صرف دنیا کے کناروں تک ختم ہو جاتی ہے۔ اور تم اپنی اس عقل کے ذریعہ سے اُس دوسرے عالم کا ایک ذرہ سا گوشہ بھی نہیں دیکھ سکتے جس کی سکونت ابدی کے لئے تمہاری روحیں پیدا کی گئی ہیں۔ تم دنیا کی زندگی پر ایسے مطمئن بیٹھے ہو جیسے کوئی شخص ایک چیز ہمیشہ رہنے والی پر مطمئن ہوتا ہے۔ مگر وہ دوسرا عالم جس کی خوشیاں سچے اطمینان کے لائق اور دائمی ہیں۔ وہ ساری عمر میں ایک مرتبہ بھی تمہیں یاد نہیں آتا۔ کیا بدقسمتی ہے کہ ایک بڑے امر اہم سے تم قطعاً غافل اور آنکھیں بند کئے بیٹھے ہو اور جو گزشتنی گزاشتنی امور ہیں اُن کی ہوس میں دن رات سرپٹ دوڑ رہے ہو۔ تمہیں خوب خبر ہے کہ بلاشبہ وہ وقت تم پر آنے والا ہے جو ایک دم میں تمہاری زندگی اور تمہاری ساری آرزوؤں کا خاتمہ کر دیگا۔ مگر یہ عجیب شقاوت ہے کہ باوجود اس علم کے پھر اپنے تمام اوقات دنیا طلبی میں ہی برباد کر رہے ہو۔ اور دنیا طلبی بھی صرف وسائل جائزہ تک محدود نہیں بلکہ تمام ناجائز وسیلے جھوٹ اور دغا سے لیکر ناحق کے خون تک تم نے حلال کر رکھے ہیں۔ اور ان تمام شرمناک جرائم کے ساتھ جو تم میں پھیلے ہوئے ہیں کہتے ہو کہ آسمانی نور اور آسمانی سلسلہ کی ہمیں ضرورت نہیں بلکہ اس سے سخت عداوت رکھتے ہو۔ اور تم نے خدا تعالیٰ کے آسمانی سلسلہ کو بہت ہلکا سمجھ رکھا ہے یہاں تک کہ اس کے ذکر کرنے میں بھی تمہاری زبانیں کراہت سے بھرے ہوئے الفاظ کے ساتھ اور بڑی رعونت اور ناک چڑھانے کی حالت میں ہجو کا حق ادا کرتی ہیں۔ اور تم بار بار کہتے ہو کہ ہمیں کیونکر یقین آوے کہ یہ سلسلہ منجانب اللہ ہے۔ میں ابھی اس کا جواب دے چکا ہوں کہ اس درخت کو اُس کے پھلوں سے اور اس نیّر کو اس کی روشنی سے شناخت کرو گے۔ میں نے ایک دفعہ یہ پیغام تمہیں پہنچا دیا، اب تمہارے اختیار میں ہے کہ اس کو قبول کرو یا نہ کرو اور میری باتوں کو یاد رکھو یا لوحِ حافظہ سے بھلا دو۔

جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارو ٭ یاد آئینگے تمہیں میرے سخن میرے بعد

خاتمہ مشتمل بر مرثیہ تفرقہ حالتِ اسلام

مے سزد گر خوں ببارد دیدۂ ہر اہلِ دیں - بر پریشاں حالیٔ اسلام قحط المسلمیں
دینِ حق را گردشِ آمد صعبناک سہمگیں - سخت شورے او فتاد اندر جہاں از کفر و کیں
آنکہ نفسِ اوست از ہر خیر و خوبی بے نصیب - مے تراشد عیبہا در ذات خیر المرسلیں
آں کہ در زندان ناپاکی ست محبوس و اسیر - ہست در شانِ امام پاکبازاں نکتہ چیں
تیر بر معصوم مے بارد خبیثے بد گہر - آسماں را مے سزد گر سنگ بارد بر زمیں
پیش چشمانِ شما اسلام در خاک اوفتاد - چیست عذرے پیش حق اے مجمع المتنعمیں
ہر طرف کفر است جوشاں ہمچو افواجِ یزید - دین حق بیمار و بے کس ہمچو زین العابدیں
مردم ذی مقدرت مشغول عشرت ہائے خویش - خُرم و خنداں نشستہ با بتانِ نازنیں
عالماں را روز و شب باہم فساد از جوشِ نفس - زاہداں غافل سراسر از ضرورت ہائے دیں
ہر کسے از بہرِ نفسِ دون خود طرفے گرفت - طرفِ دیں خالی شدد ہر دشمنے جست از کمیں

(فتح اسلام ص ۴۱-۴۵)

ایسا ہی یہ عاجز بھی اِسی کام کے لئے بھیجا گیا ہے کہ تا قرآن شریف کے احکام بہ وضاحت بیان کر دیوے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مسیح موسیٰ کو دیا گیا تھا اور یہ مسیح مثیلِ موسیٰ کو عطا کیا گیا۔ سو یہ تمام مشابہت تو ثابت ہے اور مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ مسیح کے ہاتھ سے زندہ ہونے والے مر گئے مگر جو شخص میرے ہاتھ سے جام پیئے گا جو مجھے دیا گیا ہے وہ ہرگز نہیں مرے گا۔ وہ زندگی بخش باتیں جو مَیں کہتا ہوں اور وہ حکمت جو میرے مُنہ سے نکلتی ہے اگر کوئی اَور بھی اس کی مانند کہہ سکتا ہے تو سمجھو کہ مَیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں آیا۔ لیکن اگر یہ حکمت اور معرفت جو مُردہ دلوں کے لئے آبِ حیات کا حکم رکھتی ہے دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی تو تمہارے پاس اس جرم کا کوئی عذر نہیں کہ تم نے اس سرچشمہ سے انکار کیا جو آسمان پر کھولا گیا۔ زمین پر اس کو کوئی بند نہیں کر سکتا۔ سو تم مقابلہ کے لیے جلدی نہ کرو اور دیدہ و دانستہ اس الزام کے نیچے اپنے تئیں داخل نہ کرو جو خدائے تعالیٰ فرماتا ہے لاتقف ما لیس لک به علم انّ السمع والبصر والفؤاد کلّ اولٰئک کان عنه مسئولًا۔ بدظنی اور بدگمانی میں حد سے زیادہ مت بڑھو ایسا نہ ہو کہ تم اپنی باتوں سے پکڑے جاؤ اور پھر اس دکھ کے مقام میں تمہیں یہ کہنا پڑے کہ ما لنا لا نرٰی رجالًا کنا نعدھم من الاشرار .... اے مسلمانو! اگر تم سچے دل سے حضرت خداوند تعالیٰ اور اس کے مقدس رسول علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہو اور نصرت الٰہی کے

منتظر ہو تو یقیناً سمجھو کہ نصرت کا وقت آگیا۔ اور یہ کاروبار انسان کی طرف سے نہیں اور نہ کسی انسانی منصوبہ نے اِس کی بنا ڈالی۔ بلکہ یہ وہی صبح صادق ظہور پذیر ہوگئی ہے جس کی پاک نوشتوں میں پہلے سے خبر دی گئی تھی۔ خدائے تعالیٰ نے بڑی ضرورت کے وقت تمہیں یاد کیا۔ قریب تھا کہ تم کسی مہلک گڑھے میں جا پڑتے مگر اُس کے باشفقت ہاتھ نے جلدی سے تمہیں اُٹھا لیا۔ سو شکر کرو اور خوشی سے اُچھلو جو آج تمہاری تازگی کا دن آگیا۔ خدا تعالیٰ اپنے دین کے باغ کو جس کے راستبازوں کے خونوں سے آبپاشی ہوئی تھی کبھی ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ غیر قوموں کے مذاہب کی طرح اسلام بھی ایک پُرانے قصوں کا ذخیرہ ہو جس میں موجودہ برکت کچھ بھی نہ ہو۔ وہ ظلمت کے کامل غلبہ کے وقت اپنی طرف سے نور پہنچاتا ہے۔ کیا اندھیری رات کے بعد نئے چاند کے چڑھنے کی انتظار نہیں ہوتی؟ کیا تم سلخ کی رات کو جو ظلمت کی آخری رات ہے دیکھکر حکم نہیں کرتے کہ کل نیا چاند نکلنے والا ہے۔ افسوس کہ تم اس دنیا کے ظاہری قانونِ قدرت کو تو خوب سمجھتے ہو مگر اس روحانی قانونِ فطرت سے جو اسی کا ہمشکل ہے بکلّی بے خبر ہو۔

اے نفسانی مولویو! اور خشک زاہدو! تم پر افسوس کہ تم آسمانی دروازوں کا کُھلنا چاہتے ہی نہیں بلکہ چاہتے ہو کہ ہمیشہ بند ہی رہیں اور تم پیر مغاں بنے رہو۔ اپنے دلوں پر نظر ڈالو اور اپنے اندر کو ٹٹولو۔ کیا تمہاری زندگی دنیا پرستی سے منزہ ہے؟ کیا تمہارے دلوں پر وہ زنگار نہیں جس کی وجہ سے تم ایک تاریکی میں پڑے ہو؟ کیا تم ان فقیہوں اور فریسیوں سے کچھ کم ہو جو حضرت مسیح کے وقت میں دن رات نفس پرستی میں لگے ہوئے تھے؟ پھر کیا یہ سچ نہیں کہ تم مثیلِ مسیح کے لئے مسیحی مشابہت کا ایک گونہ سامان اپنے ہاتھ سے پیش کر رہے ہو تا خدائے تعالیٰ کی حجت ہر یک طور سے تم پر وارد ہو۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ ایک کافر کا مومن ہو جانا تمہارے ایمان لانے سے زیادہ تر آسان ہے۔ بہت سے لوگ مشرق اور مغرب سے آئینگے اور اس خوانِ نعمت سے حصّہ لیں گے لیکن تم اسی زنگ کی حالت میں ہی مروگے۔ کاش تم نے کچھ سوچا ہوتا!

(ازالہ اوہام حصہ اوّل ص ۳-۵)

کیا ابھی اس آخری مصیبت کا وہ وقت نہیں آیا جو اسلام کے لئے دنیا کے آخری دنوں میں مقدر تھا؟ کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور زمانہ بھی آنے والا ہے جو قرآن کریم اور احادیث کی رُو سے ان موجودہ فتنوں سے کچھ زیادہ فتنے رکھتا ہوگا؟ سو بھائیو! تم اپنے نفسوں پر ظلم مت کرو اور خوب سوچ لو کہ وقت آگیا اور بیرونی اور اندرونی فتنے انتہا کو پہنچ گئے۔ اگر تم ان

تمام فتنوں کو ایک پلّہ میزان میں رکھو اور دوسرے پلّہ کے لئے تمام حدیثوں اور سارے قرآن کریم میں تلاش کرو تو ان کے برابر کیا ان کا ہزارم حصہ بھی وہ فتنے قرآن اور حدیث کی رو سے ثابت نہیں ہونگے۔ پس وہ کونسا فساد کا زمانہ اور کس بڑے دجّال کا وقت ہے جو اس زمانہ کے بعد آئیگا۔ اور فتنہ اندازی کی رو سے اس سے بدتر ہوگا۔ کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ ان فتنوں سے بڑھ کر قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں ایسے اور فتنوں کا پتہ ملتا ہے جن کا اب نام ونشان نہیں۔ یقیناً یاد رکھو کہ اگر تم ان فتنوں کی نظیر تلاش کرنے کیلئے کوشش کرو یہاں تک کہ اس کوشش میں مر بھی جاؤ تب بھی قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے ہرگز ثابت نہیں ہوگا کہ کبھی کسی زمانہ میں ان موجودہ فتنوں سے بڑھ کر کوئی اور فتنے بھی آنے والے ہیں۔

صاحبو! یہاں وہ دجّالیتیں پھیل رہی ہیں جو تمہارے فرضی دجّال کے باپ کو بھی یاد نہیں ہونگی یہ کارروائیاں خلق اللہ کے اغوا کے لئے ہزارہا پہلو سے جاری کی گئی ہیں جن کے لکھنے کے لئے بھی ایک دفتر چاہیئے اور ان میں مخالفین کو کامیابی بھی اس اعلیٰ درجہ کی ہوئی ہے کہ دلوں کو ہلا دیا ہے۔ اور ان کے مکروں نے عام طور پر دلوں پر سخت اثر ڈالا ہے۔ اور ان کی طبیعی اور فلسفہ ایسی شوخی اور بے باکی کا تخم پھیلا دیا ہے کہ گویا ہر ایک شخص ان کے فلسفہ دانوں میں سے انا الرّب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ پس جاگو اور اٹھو اور دیکھو یہ کیسا وقت آگیا اور سوچو کہ یہ موجودہ خیالات توحید محض کے کس قدر مخالف ہیں یہاں تک کہ خدا کی قدرت کا خیال بھی ایک بڑی نادانی کا طریق سمجھا جاتا ہے۔ اور تقدیر کے لفظ کو مُنہ پر لانے والا بڑا بیوقوف کہلاتا ہے۔ اور فلسفی دماغ کے آدمی دہریت کو پھیلاتے جاتے ہیں۔ اور اس فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ تمام کُل الوہیت کی کسی طرح ہمارے ہاتھ میں ہی آجاوے۔ ہم ہی جب چاہیں وباؤں کو دُور کر دیں۔ موتوں کو ٹال دیں۔ اور جب چاہیں بارش برسا دیں۔ کھیتی اُگالیں۔ اور کوئی چیز ہمارے قبضۂ قدرت سے باہر نہ ہو۔ سوچو کہ اس زمانہ میں ان بے راہیوں کا کچھ انتہا بھی ہے۔ ان آفات نے اسلام کے دونوں بازوؤں پر تبر رکھ دیا ہے۔

اے سونے والو بیدار ہو جاؤ۔ اے غافلو اُٹھ بیٹھو کہ ایک انقلاب عظیم کا وقت آگیا۔ یہ رونے کا وقت ہے نہ سونے کا اور تضرع کا وقت ہے نہ ٹھٹھے کا اور ہنسی اور تکفیر بازی کا۔ دُعا کرو کہ خداوند کریم تمہیں آنکھیں بخشے تا تم موجودہ ظلمت کو بھی بتمام وکمال دیکھ لو اور نیز اس نور کو بھی جو رحمتِ الٰہیہ نے اس ظلمت کو مٹانے کے لئے تیار کیا ہے۔ پچھلی راتوں کو اُٹھو اور خدا تعالیٰ سے رو رو کر ہدایت چاہو اور ناحق حقانی سلسلہ کے مٹانے کیلئے بد دعائیں مت کرو اور نہ منصوبے سوچو۔ خدا تعالیٰ تمہاری غفلت اور بھول کے ارادوں کی پیروی نہیں کرتا۔ وہ تمہارے دماغوں اور دلوں کی بیوقوفیاں تم پر ظاہر کرے گا۔

اور اپنے بندہ کا مددگار ہوگا۔ اور اس درخت کو کبھی نہیں کاٹے گا جس کو اُس نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے کیا کوئی تم میں سے اپنے اس پودہ کو کاٹ سکتا ہے جس کے پھل لانے کی اس کو توقع ہے۔ پھر وہ جو دانا وبینا اور ارحم الراحمین ہے وہ کیوں اپنے اس پودہ کو کاٹے جس کے پھلوں کے مبارک دنوں کی وہ انتظار کر رہا ہے۔ جبکہ تم انسان ہو کر ایسا کام کرنا نہیں چاہتے۔ پھر وہ جو عالم الغیب ہے جو ہر ایک دل کی تہ تک پہنچا ہوا ہے کیوں ایسا کام کرے گا۔ پس تم خوب یاد رکھو کہ تم اس لڑائی میں اپنے ہی اعضاء پر تلواریں مار رہے ہو۔ سو تم ناحق آگ میں ہاتھ مت ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آگ بھڑکے اور تمہارے ہاتھ کو بھسم کر ڈالے۔ یقیناً سمجھو کہ اگر یہ کام انسان کا ہوتا تو بہتیرے اس کے نابود کرنے والے پیدا ہو جاتے اور نیز یہ اس اپنی عمر تک بھی ہرگز نہ پہنچتا جو بارہ برس کی مدت اور بلوغ کی عمر ہے۔ کیا تمہاری نظر میں کبھی کوئی ایسا مفتری گذرا ہے کہ جس نے خدا تعالیٰ پر افترا کر کے کہ وہ مجھ سے ہمکلام ہے پھر اس مدّتِ مدید کے سلامتی کو پا لیا ہو۔ افسوس کہ تم کچھ بھی نہیں سوچتے اور قرآن کریم کی ان آیتوں کو یاد نہیں کرتے جو خود نبی کریمؐ کی نسبت اللہ جلّشانہٗ فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تو ایک ذرّہ مجھ پر افترا کرتا تو مَیں تیری رگِ جان کاٹ دیتا۔ پس نبی کریمؐ سے زیادہ تر کون عزیز ہے کہ جو اتنا بڑا افترا کر کے اب تک بچا رہے بلکہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے مالا مال بھی ہو۔ سو بھائیو! نفسانیت سے باز آؤ اور جو باتیں خدا تعالیٰ کے علم سے خاص ہیں اُن میں حد سے بڑھ کر ضد مت کرو اور عادت کے سلسلہ کو توڑ کر اور ایک نئے انسان بن کر تقویٰ کی راہوں میں قدم رکھو تا تم پر رحم ہو اور خدا تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دیوے سو ڈرو اور باز آ جاؤ۔ کیا تم میں ایک بھی رشید نہیں؟ وان لم تنتھوا فسوف یأتی اللّٰہ بنصرۃ من عندہ وینصر عبدہ ویمزّق اعداءہ ولا تضرّونہ شیئًا۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۲-۵۵)

اے وے لوگو! جو نیکی اور راستبازی کے لئے بلائے گئے ہو۔ تم یقیناً سمجھو کہ خدا کی کشش اس وقت تم میں پیدا ہوگی اور اسی وقت تم گناہ کے مکروہ داغ سے پاک کئے جاؤ گے جب کہ تمہارے دل یقین سے بھر جائیں گے۔ شائد تم کہو گے کہ ہمیں یقین حاصل ہے۔ سو یاد رہے کہ یہ تمہیں دھوکا لگا ہوا ہے۔ یقین تمہیں ہرگز حاصل نہیں کیونکہ اس کے لوازم حاصل نہیں۔ وجہ یہ کہ تم گناہ سے باز نہیں آتے۔ تم ایسا قدم آگے نہیں اٹھاتے جو اٹھانا چاہیئے۔ تم ایسے طور سے نہیں ڈرتے جو ڈرنا چاہیئے۔ خود سوچ لو کہ جس کو یقین ہے کہ فلاں سوراخ میں سانپ ہے وہ اس سوراخ میں کب ہاتھ ڈالتا ہے۔ اور جس کو یقین ہے کہ اس کے کھانے میں زہر ہے وہ اس کھانے کو کب کھاتا ہے۔ اور جو یقینی طور پر دیکھ رہا ہے کہ اس

فلاں بن میں ایک ہزار خونخوار شیر ہے اس کا قدم کیونکر بے احتیاطی اور غفلت سے اس بن کی طرف اُٹھ سکتا ہے۔ سو تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں اور تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں کیونکر گناہ پر دلیری کر سکتی ہیں اگر تمہیں خدا اور جزا سزا پر یقین ہے۔ گناہ یقین پر غالب نہیں ہو سکتا۔ اور جبکہ تم ایک بھسم کرنے اور کھا جانیوالی آگ کو دیکھ رہے ہو تو کیونکر اُس آگ میں اپنے تئیں ڈال سکتے ہو۔ اور یقین کی دیواریں آسمان تک ہیں۔ شیطان اُن پر چڑھ نہیں سکتا۔ ہر ایک جو پاک ہوا وہ یقین سے پاک ہوا یقین دُکھ اُٹھانیکی قوت دیتا ہے۔ یہانتک کہ بادشاہ کو تخت سے اُتارتا ہے اور فقیری جامہ پہناتا ہے۔ یقین ہر ایک دکھ کو سہل کر دیتا ہے۔ یقین خدا کو دکھاتا ہے۔ ہر ایک کفارہ جھوٹا ہے اور ہر ایک فدیہ باطل ہے اور ہر ایک پاکیزگی یقین کی راہ سے آتی ہے۔ وہ چیز جو گناہ سے چھڑاتی ہے اور خدا تک پہنچاتی اور فرشتوں سے بھی صدق اور ثبات میں آگے بڑھا دیتی ہے وہ یقین ہے ہر ایک مذہب جو یقین کا سامان پیش نہیں کرتا وہ جھوٹا ہے۔ ہر ایک مذہب جو یقینی وسائل سے خدا کو دکھا نہیں سکتا وہ جھوٹا ہے۔ ہر ایک مذہب جس میں بجز پُرانے قصوں کے اَور کچھ نہیں وہ جھوٹا ہے۔ خدا جیسے پہلے تھا وہ اب بھی ہے اور اس کی قدرتیں جیسی پہلے تھیں وہ اب بھی ہیں۔ اور اس کا نشان دکھلانے پر جیسا کہ پہلے اقتدار تھا وہ اب بھی ہے۔ پھر تم کیوں صرف قصّوں پر راضی ہوتے ہو۔ وہ مذہب ہلاک شدہ ہے جس کے معجزات صرف قصّے ہیں جس کی پیشگوئیاں صرف قصّے ہیں۔ اور وہ جماعت ہلاک شدہ ہے جس پر خدا نازل نہیں ہوا۔ اور جو یقین کے ذریعہ سے خدا کے ہاتھ سے پاک نہیں ہوئی۔

(کشتی نوح ص ۸۵-۸۶)

اسجگہ یہ بھی بطور تبلیغ کے لکھتا ہوں کہ حق کے طالب جو مؤاخذہ الٰہی سے ڈرتے ہیں وہ بلا تحقیق اس زمانہ کے مولویوں کے پیچھے نہ چلیں۔ اور آخری زمانہ کے مولویوں سے جیسا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا ہے ویسا ہی ڈرتے رہیں اور اُن کے فتووں کو دیکھکر حیران نہ ہو جاویں کیونکہ یہ فتوے کوئی نئی بات نہیں۔ اور اگر اس عاجز پر شک ہو اور وہ دعویٰ جو اس عاجز نے کیا ہے اس کی صحت کی نسبت دل میں شبہ ہو تو مَیں ایک آسان صورت رفع شک کی بتلاتا ہوں جس سے ایک طالب صادق انشاءاللہ مطمئن ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اوّل توبہ نصوح کر کے رات کے وقت دو رکعت نماز پڑھیں جس کی پہلی رکعت میں سورۃ یٰسین اور دوسری رکعت میں اکیس ۲۱ مرتبہ سورۃ اخلاص ہو اور پھر بعد اس کے تین سو مرتبہ درود شریف اور تین سو مرتبہ استغفار پڑھ کر خدا تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ اے قادر کریم تو پوشیدہ حالات کو جانتا ہے اور ہم نہیں جانتے اور مقبول اور مردود اور مفتری اور صادق تیری نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ پس ہم عاجزی سے تیری جناب میں التجا کرتے ہیں کہ اس شخص کا تیرے نزدیک کہ جو مسیح موعود

موعود اور مہدی اور مجدّد الوقت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کیا حال ہے۔ کیا صادق ہے یا کاذب اور مقبول ہے یا مردود۔ اپنے فضل سے یہ حال رؤیا یا کشف یا الہام سے ہم پر ظاہر فرما۔ تا اگر مردود ہے تو اس کے قبول کرنے سے ہم گمراہ نہ ہوں۔ اور اگر مقبول ہے اور تیری طرف سے ہے تو اس کے انکار اور اس کی اہانت سے ہم ہلاک نہ ہو جائیں۔ ہمیں ہر ایک قسم کے فتنہ سے بچا کہ ہر ایک قوت تجھ کو ہی ہے۔ آمین یہ استخارہ کم سے کم دو ہفتہ کریں لیکن اپنے نفس سے خالی ہو کر۔ کیونکہ جو شخص پہلے ہی بُغض سے بھرا ہُوا ہے اور بدظنّی اُس پر غالب آ گئی ہے اگر وہ خواب میں اُس شخص کا حال دریافت کرنا چاہے جس کو وہ بہت بُرا جانتا ہے تو شیطان آتا ہے اور موافق اس ظلمت کے جو اس کے دل میں ہے اور پُرظلمت خیالات اپنی طرف سے اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ پس اس کا پچھلا حال پہلے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ سو اگر تو خدا تعالیٰ سے کوئی خبر دریافت کرنا چاہے تو اپنے سینے کو بکلّی بُغض اور عناد سے دھو ڈال اور اپنے تئیں بکلّی خالی النفس کرکے اور دونوں پہلوؤں بُغض اور محبت سے الگ ہو کر اس سے ہدایت کی روشنی مانگ کہ وہ ضرور اپنے وعدہ کے موافق اپنی طرف سے روشنی نازل کرے گا جس پر نفسانی اوہام کا کوئی دُخان نہیں ہوگا۔ سو اے حق کے طالبو! ان مولویوں کی باتوں سے فتنہ میں مت پڑو۔ اُٹھو اور کچھ مجاہدہ کرکے اس قوی اور قدیر اور علیم اور ہادیٔ مطلق سے مدد چاہو۔ اور دیکھو کہ اب میں نے یہ روحانی تبلیغ بھی کر دی ہے۔ آئندہ تمہیں اختیار ہے۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

المبلغ غلام احمد عفی عنہ

(نشان آسمانی ص ۴۰-۴۱)

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے اس سلسلہ کو بے ثبوت نہیں چھوڑے گا۔ وہ خود فرماتا ہے جو براہین احمدیہ میں درج ہے کہ "دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اس کو قبول نہ کیا۔ لیکن خدا اُسے قبول کریگا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دیگا۔" جن لوگوں نے انکار کیا اور جو انکار کے لئے مستعد ہیں اُن کے لئے ذلّت اور خواری مقدّر ہے۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر یہ انسان کا افترا ہوتا تو کب کا ضائع ہو جاتا کیونکہ خدا تعالیٰ مفتری کا ایسا دشمن ہے کہ دنیا میں ایسا کسی کا دشمن نہیں۔ وہ بیوقوف یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ کیا یہ استقامت اور جرأت کسی کذّاب میں ہو سکتی ہے؟ وہ نادان یہ بھی نہیں جانتے کہ جو شخص ایک غیبی پناہ سے بول رہا ہے وہی اس بات سے مخصوص ہے کہ اس کے کلام میں شوکت اور ہیبت ہو۔ اور یہ اُس کا جگر اور دل ہوتا ہے کہ ایک فرد تمام جہان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ یقیناً منتظر رہو کہ وہ دن

آتے ہیں بلکہ نزدیک ہیں کہ دشمن روسیہ ہوگا اور دوست نہایت ہی بشّاش ہونگے۔ کون ہے دوست؟ وہی جس نے نشان دیکھنے سے پہلے مجھے قبول کیا اور جس نے اپنی جان اور مال اور عزت کو ایسا فدا کر دیا ہے کہ گویا اس نے ہزارہا نشان دیکھ لئے ہیں۔ سو یہی میری جماعت ہے اور یہی میرے ہیں جنہوں نے مجھے اکیلا پایا اور میری مدد کی۔ اور مجھے غمگین دیکھا اور میرے غمخوار ہوئے اور ناشناسا ہو کر پھر آشناؤں کا سا ادب بجا لائے۔ خدا تعالیٰ کی اُن پر رحمت ہو۔ اگر نشانوں کے دیکھنے کے بعد کوئی کھلی صداقت کو مان لے گا تو مجھے کیا اور اس کو اجر کیا اور حضرت عزت میں اس کی عزت کیا۔ مجھے درحقیقت انہوں نے ہی قبول کیا ہے جنہوں نے دقیق نظر سے مجھ کو دیکھا اور فراست سے میری باتوں کو وزن کیا اور میرے حالات کو جانچا اور میرے کلام کو سُنا اور اس میں غور کی تب اسی قدر قرائن سے خدا تعالیٰ نے اُن کے سینوں کو کھول دیا۔ اور میرے ساتھ ہو گئے۔ میرے ساتھ وہی ہے جو میری مرضی کے لئے اپنی مرضی کو چھوڑتا ہے اور اپنے نفس کے ترک اور اخذ کے لئے مجھے حَکَم بناتا ہے اور میری راہ پر چلتا ہے اور اطاعت میں فانی ہے اور انانیت کی جلد سے باہر آگیا ہے۔ مجھے آہ کھینچ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کھلے نشانوں کے طالب وہ تحسین کے لائق خطاب اور عزت کے لائق مرتبے میرے خداوند کی جناب میں نہیں پا سکتے جو ان راستبازوں کو ملیں گے جنہوں نے چھپے ہوئے بھید کو پہچان لیا۔ اور جو اللہ جلّشانہٗ کی چادر کے تحت میں ایک چھپا ہوا بندہ تھا اس کی خوشبو ان کو آگئی۔ انسان کا اس میں کیا کمال ہے کہ مثلاً ایک شہزادہ کو اپنی فوج اور جاہ و جلال میں دیکھ کر پھر اس کو سلام کرے باکمال وہ آدمی ہے جو گداؤں کے پیرایہ میں اس کو پاوے اور شناخت کر لیوے۔ مگر میرے اختیار میں نہیں کہ یہ زیرکی کسی کو دوں۔ ایک ہی ہے جو دیتا ہے وہ جس کو عزیز رکھتا ہے ایمانی فراست اس کو عطا کرتا ہے۔ انہی باتوں سے ہدایت پانے والے ہدایت پاتے ہیں اور یہی باتیں اُن کے لئے جن کے دلوں میں کجی ہے زیادہ تر کجی کا موجب ہو جاتی ہیں۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۳۴۹-۳۵۰)

میرے ساتھ آپ کا مقابلہ تقویٰ سے بعید ہے کیونکہ آپ لوگوں کی دستاویز صرف وہ حدیثیں ہیں جن میں کچھ موضوع اور کچھ ضعیف اور کچھ ان میں سے ایسی ہیں جن کے معنے آپ لوگ سمجھتے نہیں۔ مگر آپ کے مقابل پر میرا دعویٰ علیٰ وجہ البصیرت ہے اور جس وحی نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں اور آنے والا مسیح موعود یہی عاجز ہے اس پر میں ایسا ہی ایمان رکھتا ہوں۔ جیسا کہ میں قرآن شریف پر ایمان رکھتا ہوں اور یہ ایمان صرف حسنِ اعتقاد سے نہیں بلکہ وحیٔ الٰہی کی

روشنی نے جو آفتاب کی طرح میرے پر چمکی ہے یہ ایمان مجھے عطا فرمایا ہے۔ جس یقین کو خدا نے خارق عادت نشانوں کے تواتر اور معارفِ یقینیہ کی کثرت سے اور ہر روزہ یقینی مکالمہ اور مخاطبہ سے انتہا تک پہنچایا ہے اس کو مَیں کیونکر اپنے دل میں سے باہر نکال دوں؟ کیا مَیں اس نعمت معرفت اور علم صحیح کو ردّ کر دوں جو مجھ کو دیا گیا ہے؟ یا وہ آسمانی نشان جو مجھے دکھائے جاتے ہیں مَیں اُن سے مُنہ پھیر لوں یا مَیں اپنے آقا اور اپنے مالک کے حکم سے سرکش ہو جاؤں۔ کیا کروں مجھے ایسی حالت سے ہزار دفعہ مرنا بہتر ہے کہ وہ جو اپنے حسن و جمال کے ساتھ میرے پر ظاہر ہوا ہے مَیں اُس سے برگشتہ ہو جاؤں۔ یہ دنیا کی زندگی کب تک اور یہ دنیا کے لوگ مجھ سے کیا وفاداری کرینگے تا مَیں اُن کے لئے اُس یارِ عزیز کو چھوڑ دوں۔ مَیں خوب جانتا ہوں کہ میرے مخالفوں کے ہاتھ میں محض ایک پوست ہے جس میں کیڑا لگ گیا ہے۔ وہ مجھے کہتے ہیں کہ مَیں مغز کو چھوڑ دوں اور ایسے پوست کو مَیں بھی اختیار کر لوں۔ مجھے ڈراتے ہیں اور دھمکیاں دیتے ہیں لیکن مجھے اسی عزیز کی قسم ہے جس کو مَیں نے شناخت کر لیا ہے کہ مَیں ان لوگوں کی دھمکیوں کو کچھ بھی چیز نہیں سمجھتا۔ مجھے اس کے ساتھ غم بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ دوسرے کے ساتھ خوشی ہو۔ مجھے اس کے ساتھ موت بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ اس کو چھوڑ کر لمبی عمر ہو۔ جس طرح آپ لوگ دن کو دیکھ کر اس کو رات نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح وہ نور جو مجھ کو دکھایا گیا مَیں اس کو تاریکی نہیں خیال کر سکتا۔ اور جبکہ آپ اپنے ان عقائد کو چھوڑ نہیں سکتے جو صرف شکوک اور توہمات کا مجموعہ ہے تو مَیں کیونکر اُس راہ کو چھوڑ سکتا ہوں جس پر ہزار آفتاب چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا مَیں مجنون یا دیوانہ ہوں کہ اس حالت میں جبکہ خدا تعالیٰ نے مجھے روشن نشانوں کے ساتھ حق دکھا دیا ہے۔ پھر بھی مَیں حق کو قبول نہ کروں۔ مَیں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہزارہا نشان میرے اطمینان کے لئے میرے پر ظاہر ہوئے ہیں جن میں سے بعض کو مَیں نے لوگوں کو بتایا اور بعض کو بتایا بھی نہیں۔ اور مَیں نے دیکھا کہ یہ نشان خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور کوئی دوسرا بجز اس وحدہ لاشریک کے اُن پر قادر نہیں۔ اور مجھ کو ماسوا اس کے علمِ قرآن دیا گیا اور احادیث کے صحیح معنے میرے پر کھولے گئے۔ پھر مَیں ایسی روشن راہ کو چھوڑ کر ہلاکت کی راہ کیوں اختیار کروں؟ جو کچھ مَیں کہتا ہوں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں اور جو کچھ آپ لوگ کہتے ہیں وہ صرف ظنّ ہے۔ انّ الظنّ لا یغنی من الحق شیئًا۔ اور اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ جیسے ایک اندھا ایک اونچی نیچی زمین میں تاریکی میں چلتا ہے اور نہیں جانتا کہ کہاں قدم پڑتا ہے۔ سو مَیں اس روشنی کو چھوڑ کر جو مجھ کو دی گئی ہے تاریکی کو کیونکر لے لوں جبکہ مَیں دیکھتا ہوں

کہ خدا میری دُعائیں سُنتا اور بڑے بڑے نشان میرے لئے ظاہر کرتا اور مجھ سے ہمکلام ہوتا اور اپنے غیب کے اسرار پر مجھے اطلاع دیتا ہے اور دشمنوں کے مقابل پر اپنے قوی ہاتھ کے ساتھ میری مدد کرتا ہے اور ہر میدان میں مجھے فتح بخشتا ہے اور قرآن شریف کے معارف اور حقائق کا مجھے علم دیتا ہے تو مَیں ایسے قادر اور غالب خدا کو چھوڑ کر اس کی جگہ کس کو قبول کر لوں ۔

مَیں اپنے پورے یقین سے جانتا ہوں کہ خدا وہی قادر خدا ہے جس نے میرے پر تجلی فرمائی اور اپنے وجود سے اور اپنے کلام اور اپنے کام سے مجھے اطلاع دی ۔ اور مَیں یقین رکھتا ہوں کہ وہ قدرتیں جو مَیں اس سے دیکھتا ہوں اور وہ علم غیب جو میرے پر ظاہر کرتا ہے ۔ اور وہ قوی ہاتھ جس سے مَیں ہر خطرناک موقعہ پر مدد پاتا ہوں وہ اسی کامل اور سچے خدا کی صفات ہیں جس نے آدمؑ کو پیدا کیا اور جو نوحؑ پر ظاہر ہوا اور طوفان کا معجزہ دکھلایا ۔ وہ وہی ہے جس نے موسیٰ کو مدد دی جبکہ فرعون اس کو ہلاک کرنے کو تھا ۔ وہ وہی ہے جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سید الرسل کو کافروں اور مشرکوں کے منصوبوں سے بچا کر فتح کامل عطا فرمائی ۔ اسی نے اس آخری زمانہ میں میرے پر تجلّی فرمائی ۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۱۲۹-۱۳۱)

حقیقی نور کیا ہے ؟ وہ جو تسلّی بخش نشانوں کے رنگ میں آسمان سے اُترتا اور دلوں کو سکینت اور اطمینان بخشتا ہے ۔ اُس نور کی ہر ایک نجات کے خواہشمند کو ضرورت ہے ۔ کیونکہ جس کو شبہات سے نجات نہیں اس کو عذاب سے بھی نجات نہیں ۔ جو شخص اس دنیا میں خدا کے دیکھنے میں بے نصیب ہے وہ قیامت میں بھی تاریکی میں گرے گا ۔ خدا کا قول ہے :۔

من کان فی ھٰذہ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی

اور خدا نے اپنی کتاب میں بہت جگہ اشارہ فرمایا ہے کہ مَیں اپنے ڈھونڈنے والوں کے دل نشان سے منور کروں گا یہاں تک کہ وہ خدا کو دیکھینگے اور مَیں اپنی عظمت انہیں دکھلاؤں گا ۔ یہاں تک کہ سب عظمتیں اُن کی نگاہ میں ہیچ ہو جائیں گی ۔ یہی باتیں ہیں جو مَیں نے براہ راست خدا کے مکالمات سے بھی سُنیں ۔ پس میری رُوح بول اُٹھی کہ خدا تک پہنچنے کی یہی راہ ہے اور گناہ پر غالب آنے کا یہی طریق ہے حقیقت تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم حقیقت پر قدم ماریں ۔ فرضی تجویزیں اور خیالی منصوبے ہمیں کام نہیں دے سکتے ۔ ہم اس بات کے گواہ ہیں اور تمام دنیا کے سامنے اس شہادت کو ادا کرتے ہیں کہ ہم نے اس حقیقت کو جو خدا تک پہنچاتی ہے قرآن سے پایا ۔ ہم نے اُس خدا کی آواز سُنی اور اُس کے پُر زور بازو کے نشان دیکھے جس نے قرآن کو بھیجا ۔ سو ہم یقین لائے کہ وہی سچّا خدا اور تمام جہانوں کا مالک ہے ہمارا دل

اس یقین سے ایسا پُر ہے جیسا کہ سمندر کی زمین پانی سے۔ سو ہم بصیرت کی راہ سے اُس دین اور اُس روشنی کی طرف ہر ایک کو بلاتے ہیں۔ ہم نے اس نورِ حقیقی کو پایا جس کے ساتھ سب ظلماتی پردے اُٹھ جاتے ہیں اور غیر اللہ سے درحقیقت دل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہی ایک راہ ہے جس سے انسان نفسانی جذبات اور ظلمات سے ایسے باہر آ جاتا ہے جیسے سانپ اپنی کینچلی سے۔

(کتاب البریہ ص ۶۵)

آج مَیں نے اتمام حجت کے لئے یہ ارادہ کیا ہے کہ مخالفین اور منکرین کی دعوت میں چالیس اشتہار شائع کروں تا قیامت کو میری طرف سے حضرتِ احدیت میں یہ حجّت ہو کہ مَیں جس امر کے لئے بھیجا گیا تھا اس کو مَیں نے پورا کیا۔ سو اب میں بکمال ادب و انکسار حضرات علماءِ مسلمانان و علماءِ عیسائیان و پنڈتان ہندوان و آریان یہ اشتہار بھیجتا ہوں اور اطلاع دیتا ہوں کہ مَیں اخلاقی و اعتقادی و ایمانی کمزوریوں اور غلطیوں کی اصلاح کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہوں اور میرا قدم حضرت عیسٰے علیہ السلام کے قدم پر ہے انہی معنوں سے میں مسیح موعود کہلاتا ہوں۔ کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ محض فوق العادت نشانوں اور پاک تعلیم کے ذریعہ سے سچائی کو دنیا میں پھیلا دُوں۔ مَیں اس بات کا مخالف ہوں کہ دین کے لئے تلوار اٹھائی جائے اور مذہب کے لئے خدا کے بندوں کے خون کئے جائیں۔ اور مَیں مامور ہوں کہ جہانتک مجھ سے ہو سکے ان تمام غلطیوں کو مسلمانوں سے دُور کر دوں اور پاک اخلاق اور بُردباری اور حلم اور انصاف اور راستبازی کی راہوں کی طرف اُن کو بُلاؤں۔ مَیں تمام مسلمانوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں اور آریوں پر یہ بات ظاہر کرتا ہوں کہ دنیا میں کوئی میرا دشمن نہیں ہے۔ مَیں بنی نوع سے ایسی محبت کرتا ہوں کہ جیسے والدہ مہربان اپنے بچوں سے بلکہ اس سے بڑھکر۔ مَیں صرف ان باطل عقائد کا دشمن ہوں جن سے سچائی کا خون ہوتا ہے۔ انسان کی ہمدردی میرا فرض ہے۔ اور جھوٹ اور شرک اور ظلم اور ہر ایک بدعملی اور ناانصافی اور بداخلاقی سے بیزاری میرا اصول۔

میری ہمدردی کے جوش کا اصل محرک یہ ہے کہ مَیں نے ایک سونے کی کان نکالی ہے۔ اور مجھے جواہرات کے معدن پر اطلاع ہوئی ہے۔ اور مجھے خوش قسمتی سے ایک چمکتا ہوا اور بے بہا ہیرا اس کان سے ملا ہے اور اس کی اس قدر قیمت ہے کہ اگر مَیں اپنے ان تمام بنی نوع بھائیوں میں وہ قیمت تقسیم کروں تو سب کے سب اس شخص سے زیادہ دولتمند ہو جائیں گے جس کے پاس آج دنیا میں سب سے بڑھ کر سونا چاندی ہے۔ وہ ہیرا کیا ہے؟ سچّا خدا۔ اور اس کو حاصل کرنا یہ ہے کہ اس کو پہچاننا۔ اور سچا ایمان اس پر لانا۔ اور سچی محبت کے ساتھ اُس سے تعلق پیدا کرنا اور سچی برکات اُس سے پانا۔

پس اس قدر دولت پا کر سخت ظلم ہے کہ مَیں بنی نوع کو اُس سے محروم رکھوں اور وہ بھوکے مریں اور مَیں عیش کروں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہیں ہوگا۔ میرا دل ان کے فقر و فاقہ کو دیکھ کر کباب ہو جاتا ہے۔ ان کی تاریکی اور تنگ گذرانی پر میری جان گھٹتی جاتی ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ آسمانی مال سے ان کے گھر بھر جائیں۔ اور سچائی اور یقین کے جواہر ان کو اتنے ملیں کہ اُن کے دامنِ استعداد پُر ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ ہر ایک چیز اپنی نوع سے محبت کرتی ہے یہاں تک کہ چیونٹیاں بھی اگر کوئی خود غرضی حائل نہ ہو۔ پس جو شخص کہ خدا تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے اس کا فرض ہے کہ سب سے زیادہ محبت کرے سو مَیں نوع انسان سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ ہاں اُن کی بدعملیوں اور ہر ایک قسم کے ظلم اور فسق اور بغاوت کا دشمن ہوں کسی کی ذات کا دشمن نہیں۔ اس لئے وہ خزانہ جو مجھے ملا ہے جو بہشت کے تمام خزانوں اور نعمتوں کی کنجی ہے وہ جوشِ محبت سے نوع انسان کے سامنے پیش کرتا ہوں اور یہ امر کہ وہ مال جو مجھے ملا ہے وہ حقیقت میں از قسم ہیرا اور سونا اور چاندی ہے۔ کوئی کھوٹی چیزیں نہیں ہیں بڑی آسانی سے دریافت ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ان تمام دارہم اور دینار اور جواہرات پر سلطانی سکّہ کا نشان ہے۔ یعنی وہ آسمانی گواہیاں میرے پاس ہیں جو کسی دوسرے کے پاس نہیں ہیں۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ تمام دینوں میں سے دین اسلام ہی سچا ہے۔ مجھے فرمایا گیا ہے کہ تمام ہدایتوں میں سے صرف قرآنی ہدایت ہی صحت کے کامل درجہ پر اور انسانی ملاوٹوں سے پاک ہے۔ مجھے سمجھایا گیا ہے کہ تمام رسولوں میں سے کامل تعلیم دینے والا اور اعلیٰ درجہ کی پاک اور پُرحکمت تعلیم دینے والا اور انسانی کمالات کا اپنی زندگی کے ذریعہ سے اعلیٰ نمونہ دکھلانے والا صرف حضرت سیدنا و مولانا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور مجھے خدا تعالیٰ کی پاک اور مطہّر وحی سے اطلاع دی گئی ہے کہ مَیں اس کی طرف سے مسیح موعود اور مہدی معہود اور اندرونی اور بیرونی اختلافات کا حَکَم ہوں۔ یہ جو میرا نام مسیح اور مہدی رکھا گیا ان دونوں ناموں سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے مشرف فرمایا۔ اور پھر خدا نے اپنے بلا واسطہ مکالمہ سے یہی میرا نام رکھا۔ اور پھر زمانہ کی حالت موجودہ نے تقاضا کیا کہ یہی میرا نام ہو۔ غرض میرے ان ناموں پر یہ تین گواہ ہیں۔ میرا خدا جو آسمان اور زمین کا مالک ہے مَیں اس کو گواہ رکھ کر کہتا ہوں کہ میں اس کی طرف سے ہوں اور وہ اپنے نشانوں سے میری گواہی دیتا ہے۔ اگر آسمانی نشانوں میں کوئی میرا مقابلہ کر سکے تو مَیں جھوٹا ہوں۔ اگر دعاؤں کے قبول ہونے میں کوئی میرے برابر اُتر سکے تو مَیں جھوٹا ہوں اگر قرآن کے نکات اور معارف بیان کرنے میں کوئی میرا ہم پلّہ ٹھیر سکے تو مَیں جھوٹا ہوں۔ اگر غیب کی پوشیدہ باتیں اور اسرار جو خدا کی اقتداری قوت کے ساتھ پیش از وقت مجھ سے ظاہر ہوتے ہیں اُن میں

کوئی میری برابری کر سکے تو مَیں خدا کی طرف سے نہیں ہوں۔

اب کہاں ہیں وہ پادری صاحبان جو کہتے تھے کہ نعوذ باللہ حضرت سیدنا وسیدالوریٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی پیشگوئی یا اور کوئی امر خارق عادت ظہور میں نہیں آیا۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ زمین پر وہ ایک ہی انسان کامل گذرا ہے جس کی پیشگوئیاں اور دعائیں قبول ہونا اور دوسرے خوارق ظہور میں آنا ایک ایسا امر ہے جو اب تک امت کے سچے پیروؤں کے ذریعہ سے دریا کی طرح موجیں مار رہا ہے بجز اسلام وہ مذہب کہاں اور کدھر ہے جو یہ خصلت اور طاقت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور وہ لوگ کہاں ہیں اور کس ملک میں رہتے ہیں جو اسلامی برکات اور نشانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر انسان ہر ایسے مذہب کا پیرو ہو جس میں آسمانی رُوح کی کوئی ملاوٹ نہیں تو وہ اپنے ایمان کو ضائع کرتا ہے۔ مذہب وہی مذہب ہے جو زندہ مذہب ہو اور زندگی کی رُوح اپنے اندر رکھتا ہو۔ اور زندہ خدا سے ملاتا ہو۔ اور مَیں صرف یہی دعویٰ نہیں کرتا کہ خدا تعالیٰ کی پاک وحی سے غیب کی باتیں میرے پر کھلتی ہیں اور خارق عادت امر ظاہر ہوتے ہیں بلکہ یہ بھی کہتا ہوں کہ جو شخص دل کو پاک کرکے اور خدا اور رسول پر سچی محبت رکھ کر میری پیروی کرے گا وہ بھی خدا تعالیٰ سے یہ نعمت پائے گا۔ مگر یاد رکھو کہ تمام مخالفوں کے لئے یہ دروازہ بند ہے اور اگر دروازہ بند نہیں ہے تو کوئی آسمانی نشانوں میں مجھ سے مقابلہ کرے۔ اور یاد رکھیں کہ ہرگز نہیں کر سکیں گے پس یہ اسلامی حقیقت اور میری حقانیت کی ایک زندہ دلیل ہے ....

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ۲۳ جولائی ۱۹۰۰ء
المشتہر مرزا غلام احمد مسیح موعود از قادیان۔

(اربعین ص۱)

توبہ کرو اور خدا سے ڈرو اور حد سے مت بڑھو۔ اگر دل سخت نہیں ہو گئے تو اس قدر کیوں دلیری ہے؟ کہ خواہ نخواہ ایسے شخص کو کافر بنایا جاتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقی معنوں کی رُو سے خاتم الانبیاء سمجھتا ہے اور قرآن کو خاتم الکتب تسلیم کرتا ہے۔ تمام نبیوں پر ایمان لاتا ہے اور اہل قبلہ ہے اور شریعت کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھتا ہے۔

اے مفتری لوگو! مَیں نے کسی نبی کی توہین نہیں کی۔ مَیں نے کسی عقیدۂ صحیحہ کے برخلاف نہیں کہا۔ پر اگر تم خود نہ سمجھو تو مَیں کیا کروں۔ تم تو قائل ہو کہ جزئی فضیلت ایک ادنیٰ شہید کو ایک بڑے نبی پر ہو سکتی ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ مَیں خدا کا فضل اپنے پر مسیح سے کم نہیں دیکھتا مگر یہ کفر نہیں۔ یہ خدا کے نعمت کا شکر ہے۔ تم خدا کے اسرار کو نہیں جانتے اس لئے کفر سمجھتے ہو۔ اُس کو کیا کہو گے جو کہہ گیا

ھو افضل من بعض الانبیاء۔ اگر مَیں تمہاری نظر میں کافر ہوں تو بس ایسا ہی کافر جیسا کہ ابن مریمؑ یہودی فقیہوں کی نظر میں کافر تھا۔ میرے پاس خدا کے فضل کی اس سے بڑھ کر باتیں ہیں۔ مگر تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ خوب یاد رکھو کہ مجھ کو کافر کہنا آسان نہیں۔ تم نے ایک بھاری بوجھ سر پر اٹھایا ہے۔ اور تم سے ان سب باتوں کا جواب پوچھا جائے گا!!!

اے بدقسمت لوگو! تم کہاں گرے۔ کونسی چھپی ہوئی بداعمالیاں تھیں جو نہیں پیش آگئیں۔ اگر تم میں ایک ذرہ بھی نیکی ہوتی تو خدا تمہیں ضائع نہ کرتا۔ ابھی کچھ تھوڑا وقت ہے اور بہت سا ثواب کھو چکے ہو باز آجاؤ۔ کیا خدا سے اس بیوقوف کی طرح لڑائی کرو گے جو زوردار کے آگے سے نہیں ہٹ جاتا۔ یہانتک کہ مار سے پیسا جاتا اور کچلا جاتا ہے اور آخر ہڈیاں چور چور ہو کر اور مُردہ سا بنکر زمین پر گر پڑتا ہے۔ یہودیوں نے لڑائی سے کیا لیا اور تم کیا لوگے؟ ھٰذا و بعد الموت نحن نخاصم۔ بہت کچھ صوفیوں نے بھی انسانی کمالات کا اقرار کیا تھا کہ کہاں تک انسان پہنچتا ہے۔ آج وہ بھی سو گئے۔ اے عقلمندو! میرے کاموں سے مجھے پہچانو۔ اگر مجھ سے وہ کام اور وہ نشان ظاہر نہیں ہوتے جو خدا کے تائید یافتہ سے ظاہر ہونے چاہئیں تو تم مجھے مت قبول کرو۔ لیکن اگر ظاہر ہوتے ہیں تو اپنے تئیں دانستہ ہلاکت کے گڑھے میں مت ڈالو۔ بدظنیاں چھوڑو۔ بدگمانیوں سے باز آجاؤ کہ ایک پاک کی توہین کی وجہ سے آسمان سُرخ ہو رہا ہے اور تم نہیں دیکھتے۔ اور فرشتوں کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے اور تمہیں نظر نہیں آتا۔ خدا اپنے جلال میں ہے اور در و دیوار لرزہ میں۔ کہاں ہے وہ عقل جو سمجھ سکتی ہے کہاں ہیں وہ آنکھیں جو وقتوں کو پہچانتی ہیں۔ آسمان پر ایک حکم لکھا گیا۔ کیا تم اس سے ناراض ہو؟ کیا تم ربّ العزت سے پُوچھو گے کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اے نادان انسان! باز آجا کہ صاعقہ کے سامنے کھڑا ہونا تیرے لئے اچھا نہیں۔

(سراج منیر ص۶-۷)

اے عزیزو! اے پیارو!! کوئی انسان خدا کے ارادوں میں اُس سے لڑائی نہیں کر سکتا۔ یقیناً سمجھ لو کہ کامل علم کا ذریعہ خدائے تعالیٰ کا الہام ہے جو خدائے تعالیٰ کے پاک نبیوں کو ملا۔ پھر بعد اس کے اُس خدا نے جو دریائے فیض ہے یہ ہرگز نہ چاہا کہ آئندہ اس الہام کو مُہر لگا دے اور اس طرح پر دنیا کو تباہ کرے بلکہ اس کے الہام اور مکالمے اور مخاطبے کے ہمیشہ دروازے کھلے ہیں۔ ہاں اُن کو اُن کی راہوں سے ڈھونڈو تب وہ آسمان سے تمہیں ملیں گے۔ وہ زندگی کا پانی آسمان سے آیا۔ اور اپنے مناسب مقام پر ٹھہرا۔ اب تمہیں کیا کرنا چاہیئے تا تم اس پانی کو پی سکو۔ یہی کرنا چاہیئے کہ

افتاں و خیزاں اُس چشمہ تک پہنچو۔ پھر اپنا مُنہ اس چشمہ کے آگے رکھ دو تا اس زندگی کے پانی سے سیراب ہو جاؤ۔ انسان کی تمام سعادت اسی میں ہے کہ جہاں روشنی کا پتہ لگے اُسی طرف دوڑے اور جہاں اُس گم گشتہ دوست کا نشان پیدا ہو اُسی راہ کو اختیار کرے۔ دیکھتے ہو کہ ہمیشہ آسمان سے روشنی اُترتی اور زمین پر پڑتی ہے۔ اسی طرح ہدایت کا سچا نور آسمان سے ہی اُترتا ہے۔ انسان کی اپنی ہی باتیں اور اپنی ہی اٹکلیں سچا گیان اس کو نہیں بخش سکتیں کیا تم خدا کو بغیر خدا کی تجلّی کے پا سکتے ہو کیا تم بغیر اس آسمانی روشنی کے اندھیرے میں دیکھ سکتے ہو؟ اگر دیکھ سکتے ہو تو شاید اس جگہ بھی دیکھ لو۔ مگر ہماری آنکھیں گو بینا ہوں تاہم آسمانی روشنی کی محتاج ہیں۔ اور ہمارے کان گو شنوا ہوں تاہم اس ہوا کے حاجت مند ہیں جو خدا کی طرف سے چلتی ہے۔ وہ خدا سچّا خدا نہیں ہے جو خاموش ہے اور سارا مدار ہماری اٹکلوں پر ہے۔ بلکہ کامل اور زندہ خدا وہ ہے جو آپ اپنے وجود کا پتہ دیتا رہا ہے اور اب بھی اُس نے یہی چاہا کہ آپ اپنے وجود کا پتہ دیوے۔ آسمانی کھڑکیاں کھلنے کو ہیں۔ عنقریب صبح صادق ہونے والی ہے۔ مبارک وہ جو اُٹھ بیٹھیں اور اب سچے خدا کو ڈھونڈیں۔ وہی خدا جس پر کوئی گردش اور مصیبت نہیں آتی جس کے جلال کی چمک پر کبھی حادثہ نہیں پڑتا۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝

یعنی خدا ہی ہے جو ہر دم آسمان کا نور اور زمین کا نور ہے۔ اُس سے ہر ایک جگہ روشنی پڑتی ہے۔ آفتاب کا وہی آفتاب ہے۔ زمین کے تمام جانداروں کی وہی جان ہے۔ سچا زندہ خدا وہی ہے۔ مبارک وہ جو اس کو قبول کرے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۱۲۹-۱۳۰)

اے امیرو اور بادشاہو! اور دولتمندو!! آپ لوگوں میں ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جو خدا سے ڈرتے اور اُس کی تمام راہوں میں راستباز ہیں۔ اکثر ایسے ہیں کہ دنیا کے ملک اور دنیا کے املاک سے دل لگاتے ہیں۔ اور پھر اُسی میں عمر بسر کر لیتے ہیں اور موت کو یاد نہیں رکھتے۔ ہر ایک امیر جو نماز نہیں پڑھتا اور خدا سے لاپروا ہے اُس کے تمام نوکر چاکروں کا گناہ اس کی گردن پر ہے۔ ہر ایک امیر جو شراب پیتا ہے اُس کی گردن پر ان لوگوں کا بھی گناہ ہے جو اس کے ماتحت ہو کر شراب میں شریک ہیں۔

اے عقلمندو! یہ دنیا ہمیشہ کی جگہ نہیں۔ تم سنبھل جاؤ۔ تم ہر ایک بے اعتدالی کو چھوڑ دو۔ ہر ایک نشہ کی چیز کو ترک کرو۔ انسان کو تباہ کرنے والی صرف شراب ہی نہیں بلکہ افیون گانجہ چرس بھنگ تاڑی اور ہر ایک نشہ جو ہمیشہ کے لئے عادت کر لیا جاتا ہے وہ دماغ کو خراب کرتا اور آخر ہلاک کرتا ہے۔

سو تم اس سے بچو۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تم کیوں ان چیزوں کو استعمال کرتے ہو جن کی شامت سے ہر ایک سال ہزارہا تمہارے جیسے نشہ کے عادی اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ اور آخرت کا عذاب الگ ہے۔ پرہیزگار انسان بن جاؤ تا تمہاری عمریں زیادہ ہوں اور تم خدا سے برکت پاؤ۔ حد سے زیادہ عیاشی میں بسر کرنا لعنتی زندگی ہے۔ حد سے زیادہ بدخلق اور بے مہر ہونا لعنتی زندگی ہے۔ حد سے زیادہ خدا یا اس کے بندوں کی ہمدردی سے لاپروا ہونا لعنتی زندگی ہے۔ ہر ایک امیر خدا کے حقوق اور انسانوں کے حقوق سے ایسا ہی پوچھا جائیگا جیسا کہ ایک فقیر بلکہ اس سے زیادہ۔ پس کیا ہی بدقسمت وہ شخص ہے جو اس مختصر زندگی پر بھروسہ کرکے بکلّی خدا سے مُنہ پھیر لیتا ہے اور خدا کے حرام کو ایسی بے باکی سے استعمال کرتا ہے کہ گویا وہ حرام اس کے لئے حلال ہے۔ غصہ کی حالت میں دیوانوں کی طرح کسی کو گالی کسی کو زخمی اور کسی کو قتل کرنے کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ اور شہوات کے جوش میں بے حیائی کے طریقوں کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔ سو وہ سچی خوشحالی کو نہیں پائیگا یہاں تک کہ مرے گا۔ اے عزیزو! تم تھوڑے دنوں کے لئے اس دنیا میں آئے ہو اور وہ بھی بہت کچھ گذر چکے۔ سو اپنے مولا کو ناراض مت کرو۔ ایک انسانی گورنمنٹ جو تم سے زبردست ہو اگر تم سے ناراض ہو تو وہ تمہیں تباہ کر سکتی ہے۔ پس تم سوچ لو کہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی سے کیونکر تم بچ سکتے ہو۔ اگر تم خدا کی آنکھوں کے آگے متقی ٹھہر جاؤ تو تمہیں کوئی بھی تباہ نہیں کر سکتا اور وہ خود تمہاری حفاظت کرے گا اور دشمن جو تمہاری جان کے درپے ہے تم پر قابو نہیں پائیگا ورنہ تمہاری جان کا کوئی حافظ نہیں اور تم دشمنوں سے ڈر کر یا اور آفات میں مبتلا ہو کر بے قراری سے زندگی بسر کرو گے اور تمہاری عمر کے آخری دن بڑے غم اور غصہ کے ساتھ گذریں گے۔ خدا اُن لوگوں کی پناہ ہو جاتا ہے جو اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ سو خدا کی طرف آ جاؤ اور ہر ایک مخالفت اس کی چھوڑ دو اور اس کے فرائض میں سستی نہ کرو اور اُس کے بندوں پر زبان سے یا ہاتھ سے ظلم مت کرو۔ اور آسمانی قہر سے ڈرتے رہو کہ یہی راہِ نجات ہے۔

(کشتیٔ نوح ص ۸۹-۹۲)

انسان خدا کی پرستش کا دعویٰ کرتا ہے مگر کیا پرستش صرف بہت سے سجدوں اور رکوع اور قیام سے ہو سکتی ہے یا بہت مرتبہ تسبیح کے دانے پھیرنے والے پرستارِ الٰہی کہلا سکتے ہیں؟ بلکہ پرستش اس سے ہو سکتی ہے جس کو خدا کی محبت اس درجہ پر اپنی طرف کھینچے کہ اس کا اپنا وجود درمیان سے اُٹھ جائے۔ اوّل خدا کی ہستی پر پورا یقین ہو اور پھر خدا کے حسن و احسان پر پوری اطلاع ہو۔ اور پھر اس محبت کا تعلق ایسا ہو کہ سوزشِ محبت ہر وقت سینہ میں موجود ہو۔ اور یہ حالت ہر ایک دم چہرہ پر ظاہر ہو اور خدا کی عظمت دل میں ایسی ہو کہ تمام دنیا اس کی ہستی کے آگے مُردہ متصور ہو اور ہر ایک خوف اُسی کی ذات سے

وابستہ ہو۔ اور اس کی درد میں لذّت ہو۔ اور اُس کی خلوت میں راحت ہو اور اس کے بغیر دل کو کسی کے ساتھ قرار نہ ہو۔ اگر ایسی حالت ہو جائے تو اس کا نام پرستش ہے۔ مگر یہ حالت بجز خدا تعالیٰ کی خاص مدد کے کیونکر پیدا ہو۔ اِسی لئے خدا تعالیٰ نے یہ دُعا سکھلائی ایاک نعبد و ایاک نستعین یعنی ہم تیری پرستش تو کرتے ہیں۔ مگر کہاں حق پرستش ادا کر سکتے ہیں جب تک تیری طرف سے خاص مدد نہ ہو۔ خدا کو اپنا حقیقی محبوب قرار دے کر اُس کی پرستش کرنا یہی ولایت ہے جس کے آگے کوئی درجہ نہیں۔ مگر یہ درجہ بغیر اس کی مدد کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے حاصل ہونے کی یہ نشانی ہے کہ خدا کی عظمت دل میں بیٹھ جائے اور خدا کی محبت دل میں بیٹھ جائے۔ اور دل اس پر توکل کرے اور اُسی کو پسند کرے اور ہر چیز پر اس کو اختیار کرے اور اپنی زندگی کا مقصد اُسی کی یاد کو سمجھے اور اگر ابراہیمؑ کی طرح اپنے ہاتھ سے اپنی عزیز اولاد کو ذبح کرنے کا حکم ہو یا اپنے تئیں آگ میں ڈالنے کا اشارہ ہو تو ایسے سخت احکام کو بھی محبت کے جوش سے بجا لائے اور رضاجوئی اپنے آقا کریم میں اس حد تک کوشش کرے کہ اس کی اطاعت میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ یہ بہت تنگ دروازہ ہے اور یہ شربت بہت ہی تلخ شربت ہے۔ تھوڑے لوگ ہیں جو اس دروازہ میں داخل ہوتے ہیں اور اس شربت کو پیتے ہیں۔ زنا سے بچنا کوئی بڑی بات نہیں اور کسی کو ناحق قتل نہ کرنا بڑا کام نہیں۔ اور جھوٹی گواہی نہ دینا کوئی بڑا ہنر نہیں مگر ہر ایک چیز پر خدا کو اختیار کر لینا اور اس کی سچی محبت اور سچے جوش سے دنیا کی تمام تلخیوں کو اختیار کرنا بلکہ اپنے ہاتھ سے تلخیاں پیدا کر لینا یہ وہ مرتبہ ہے کہ بجز صدیقوں کے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ عبادت ہے جس کے ادا کرنے کے لئے انسان مامور ہے اور جو شخص یہ عبادت بجا لاتا ہے تب تو اس کے اس فعل پر خدا کی طرف سے بھی ایک فعل مترتب ہوتا ہے جس کا نام انعام ہے۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے یعنی یہ دعا سکھلاتا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم یعنی اے خدا ہمیں اپنی سیدھی راہ دکھلا۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا اور اپنی خاص عنایت سے مخصوص فرمایا۔ حضرتِ احدیت میں یہ قاعدہ ہے کہ جب خدمت مقبول ہو جاتی ہے تو اُس پر ضرور کوئی انعام مترتب ہوتا ہے۔ چنانچہ خوارق اور نشان جن کی دوسرے لوگ نظیر پیش نہیں کر سکتے یہ بھی خدا تعالیٰ کے انعام ہیں۔ جو خاص بندوں پر ہوتے ہیں ؎

اے گرفتارِ ہوا در ہمہ اوقات حیات ۔ باچنیں نفسِ سیہ چوں رسدت دعوئے
گر تو آں صدق بورزی کہ بورزید کلیم
عجبے نیست اگر غرق شود فرعونے

(حقیقۃ الوحی صـ ۵۱ - ۵۲)

خدا تعالیٰ نے زمانے کی موجودہ حالت دیکھکر اور زمین کو طرح طرح کے فسق اور معصیت اور گمراہی سے بھرا ہؤا پاکر مجھے تبلیغ حق اور اصلاح کے لئے مامور فرمایا۔ اور یہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ اس دنیا کے لوگ تیرھویں صدی ہجری کو ختم کرکے چودھویں صدی کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ تب مَیں نے اس حکم کی پابندی سے عام لوگوں میں بذریعہ تحریری اشتہارات و تقریروں کے یہ ندا کرنی شروع کی کہ اس صدی کے سر پر جو خدا کی طرف سے تجدید دین کے لئے آنے والا تھا وہ مَیں ہی ہوں تا وہ ایمان جو زمین پر سے اُٹھ گیا ہے اس کو دوبارہ قائم کر دوں۔ اور خدا سے قوت پاکر اُسی کے ہاتھ کی کشش سے دنیا کو اصلاح اور تقویٰ اور راستبازی کی طرف کھینچوں اور ان کی اعتقادی اور عملی غلطیوں کو دُور کر دوں اور پھر جب اس پر چند سال گذرے تو بذریعہ وحی الٰہی میرے پر بتصریح کھولا گیا کہ وہ مسیح جو اس امّت کے لئے ابتداء سے موعود تھا اور وہ آخری مہدی جو تنزل اسلام کے وقت اور گمراہی کے پھیلنے کے زمانہ میں براہ راست خدا سے ہدایت پانے والا اور آسمانی مائدہ کو نئے سرے انسانوں کے آگے پیش کرنے والا تقدیر الٰہی میں مقرر کیا گیا تھا۔ جس کی بشارت آج سے تیرہ سو برس پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی وہ مَیں ہی ہوں اور مکالمات الٰہیہ اور مخاطبات روحانیہ اس صفائی اور تواتر سے اس بارے میں ہوئے کہ شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی۔ ہر ایک وحی جو ہوتی ایک فولادی میخ کی طرح دل میں دھنستی تھی۔ اور یہ تمام مکالماتِ الٰہیہ ایسی عظیم الشان پیشگوئیوں سے بھرے ہوئے تھے کہ روز روشن کی طرح پوری ہوتی تھیں اور ان کے تواتر اور کثرت اور اعجازی طاقتوں کے کرشمہ نے مجھے اس بات کے اقرار کے لئے مجبور کیا کہ یہ اُسی وحدہٗ لاشریک کا کلام ہے جس کا کلام قرآن شریف ہے۔

(تذکرۃ الشہادتین ص۱-۲ طبع اوّل)

ہم نے حضرت مسیح کی موت اور ان کے رفع روحانی کو ثابت کر دیا ہے۔ فماذا بعد الحق الّا الضلال۔

اب موتِ مسیح کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مسیح موعود کا اسی امت میں سے آنا کن نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ اور دیگر قرائن سے ثابت ہے۔ سو وہ دلائل ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں غور سے سُنو شائد خدائے رحیم ہدایت کرے۔

منجملہ ان دلائل کے جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں جو آنے والا مسیح جس کا اس امت کیلئے وعدہ دیا گیا ہے وہ اسی امت میں سے ایک شخص ہوگا۔ بخاری اور مسلم کی وہ حدیث جس میں امامکم منکم اور امّکم منکم لکھا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ وہ تمہارا امام ہوگا اور تم ہی میں سے ہوگا چونکہ یہ حدیث آنے والے عیسٰی کی نسبت ہے اور اس کی تعریف میں اس حدیث میں حَکَمؔ اور عدل

کا لفظ بطور صفت موجود ہے جو اس فقرہ سے پہلے ہے اس لئے امام کا لفظ بھی اس کے حق میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ اسجگہ منکم کے لفظ سے صحابہ کو خطاب کیا گیا ہے اور وہی مخاطب تھے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے تو کسی نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اس سے منکم کے لفظ سے کوئی ایسا شخص مراد ہے جو خدا تعالیٰ کے علم میں قائم مقام صحابہ ہے اور وہ وہی ہے جس کو اس آیت مفصلہ ذیل میں قائم مقام صحابہ کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ واٰخرین منہم لما یلحقوا بھم۔ کیونکہ اس آیت نے ظاہر کیا ہے کہ وہ رسول کی روحانیت سے تربیت یافتہ ہے۔ اور اسی معنے کی رو سے صحابہ میں داخل ہے اور اس آیت کی تشریح میں یہ حدیث ہے۔ لو کان الایمان معلّقًا بالثریا لنالہ رجل من فارس اور چونکہ اس فارسی شخص کی طرف وہ صفت منسوب کی گئی ہے جو مسیح موعود اور مہدی سے مخصوص ہے۔ یعنی زمین جو ایمان اور توحید سے خالی ہو کر ظلم سے بھر گئی ہے پھر اس کو عدل سے پُر کرنا۔ لہذا یہی شخص مہدی اور مسیح موعود ہے اور وہ مَیں ہوں۔ اور جس طرح دوسرے مدعی مہدیت کے وقت میں کسوف خسوف رمضان میں آسمان پر نہیں ہوُا ایسا ہی تیرہ سو برس کے عرصہ میں کسی نے خدا تعالیٰ کے الہام سے علم پاکر یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اِس پیشگوئی لنالہ رجل من فارس کا مصداق میں ہوں

(تحفہ گولڑویہ ص ٢٧-٢٨)

ازانجملہ ان دلائل کے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح موعود اسی امت میں سے ہوگا قرآن شریف کی یہ آیت ہے۔ کنتم خیر امّۃ اخرجت للناس۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ تم بہترین امت ہو جو اسلئے نکالی گئی ہو کہ تا تم تمام دجالوں اور دجال معہود کا فتنہ فرو کرکے اور اُن کے شر کو دفع کرکے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچاؤ۔ ....

یاد رہے کہ ہر ایک اُمت سے ایک خدمت دینی لی جاتی ہے اور ایک قسم کے دشمن کے ساتھ اس کا مقابلہ پڑتا ہے۔ سو مقدر تھا کہ اس امت کا دجال کے ساتھ مقابلہ پڑے گا جیسا کہ حدیث نافع بن عتبہ سے مسلم میں صاف لکھا ہے کہ تم دجال کے ساتھ لڑوگے اور فتح پاؤ گے۔ اگرچہ صحابہ دجّال کے ساتھ نہیں لڑے مگر حسب منطوق اٰخرین منہم مسیح موعود اور اس کے گروہ کو صحابہ قرار دیا۔ اب دیکھو اس حدیث میں بھی لڑنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو (جو امت ہیں) قرار دیا اور یہ نہ کہا کہ مسیح بنی اسرائیلی لڑے گا۔ اور نزول کا لفظ محض اجلال اور اکرام کے لئے ہے اور اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چونکہ اس پُر فساد زمانہ میں ایمان ثریّا پر چلا جائیگا اور تمام پیری مریدی اور شاگردی استادی اور افادہ استفادہ معرض زوال میں آجائیگا اس لئے آسمان کا خدا ایک شخص کو

اپنے ہاتھ سے تربیت دیکر بغیر توسط زمینی سلسلوں کے زمین پر بھیجیگا جیسے کہ بارش آسمان سے بغیر توسط انسانی ہاتھوں کے نازل ہوتی ہے۔

اور منجملہ دلائل قویّہ قطعیہ کے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو مسیح موعود اسی امتِ محمدیہ میں سے ہوگا قرآن شریف کی یہ آیت ہے۔ وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم یعنی خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کیلئے جو ایماندار ہیں اور نیک کام کرتے ہیں وعدہ فرمایا ہے جو ان کو زمین پر انہی خلیفوں کی مانند جو اُن سے پہلے گذر چکے ہیں خلیفے مقرر فرمائیگا۔ اس آیت میں پہلے خلیفوں سے مراد حضرت موسیٰؑ کی امت میں خلیفے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی شریعت کو قائم کرنے کے لئے پے در پے بھیجا تھا۔ اور خاص کر کسی صدی کو ایسے خلیفوں سے جو دین موسوی کے مجدّد تھے خالی نہیں جانے دیا تھا۔ اور قرآن شریف نے ایسے خلیفوں کا شمار کر کے ظاہر فرمایا ہے کہ وہ بارہ ہیں اور تیرھواں حضرت عیسٰی علیہ السلام ہیں جو موسوی شریعت کا مسیح موعود ہے اور اس مماثلت کے لحاظ سے جو آیت ممدوحہ میں کما کے لفظ سے مستنبط ہوتی ہے ضروری تھا کہ محمدی خلیفوں کو موسوی خلیفوں سے مشابہت اور مماثلت ہو۔ سو اسی مشابہت کے ثابت اور متحقق کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں بارہ موسوی خلیفوں کا ذکر فرمایا جن میں سے ہر ایک حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے تھا اور تیرھواں حضرت عیسٰی علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو موسےٰ کی قوم کا خاتم الانبیاء تھا۔ مگر در حقیقت موسیٰؑ کی قوم میں سے نہیں تھا۔ اور پھر خدا نے محمدی سلسلہ کے خلیفوں کو موسوی سلسلہ کے خلیفوں سے مشابہت دے کر صاف طور پر سمجھا دیا کہ اس سلسلہ کے آخر میں بھی ایک مسیح ہے اور درمیان میں بارہ خلیفے ہیں تا موسوی سلسلہ کے مقابل پر اسجگہ بھی چودہ ۱۴ کا وعدہ پورا ہو۔ ایسا ہی سلسلہ محمدی خلافت کے مسیح موعود کو چودھویں صدی کے سر پر پیدا کیا۔ کیونکہ موسوی سلسلہ کا مسیح موعود بھی ظاہر نہیں ہوا تھا جب تک کہ سن موسوی کے حساب سے چودھویں صدی نے ظہور نہیں کیا تھا۔ ایسا کیا گیا تا دونوں مسیحوں کا مبدءِ سلسلہ سے فاصلہ باہم مشابہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اگر در حقیقت وہی عیسٰی علیہ السلام ہے جو دوبارہ آنے والا ہے تو اس سے قرآن شریف کی تکذیب لازم آتی ہے۔ کیونکہ قرآن شریف جیسا کہ کما کے لفظ سے مستنبط ہوتا ہے دونوں سلسلوں کے تمام خلیفوں کو من وجہٍ مغائر قرار دیتا ہے۔ اور یہ ایک نصّ قطعی ہے کہ اگر ایک دنیا اس کے مخالف اکٹھی ہو جائے تب بھی وہ اس نصّ واضح کو ردّ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ جب پہلے سلسلہ کا عین ہی نازل ہو گیا تو وہ مغائرت فوت ہو گئی اور لفظ کما کا مفہوم باطل ہو گیا۔ پس اس صورت میں

تکذیب قرآن شریف لازم ہوئی۔ وھذا باطلٌ وکل ما یستلزم الباطل فھو الباطل۔ یاد رہے کہ قرآن شریف نے آیت کما استخلف الذین من قبلھم میں وہی کما استعمال کیا ہے جو آیت کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً میں ہے۔

(تحفہ گولڑویہ ص ۳۳-۴۰)

ایسا ہی قرآن شریف کی رو سے سلسلۂ محمدیہ سلسلۂ موسویہ سے ہر ایک نیکی اور بدی میں مشابہت رکھتا ہے۔ اسی کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے کہ ایک جگہ یہود کے حق میں لکھا ہے فینظر کیف تعملون۔ دوسری جگہ مسلمانوں کے حق میں لکھا ہے لننظر کیف تعملون۔ ان دونوں آیتوں کے یہ معنے ہیں کہ خدا تمہیں خلافت و حکومت عطا کرکے پھر دیکھیگا کہ تم راستبازی پر قائم رہتے ہو یا نہیں۔ ان آیتوں میں جو الفاظ یہود کے لئے استعمال کئے ہیں وہی مسلمانوں کے لئے یعنی ایک ہی آیت کے نیچے ان دونوں کو رکھا ہے۔ پس ان آیتوں سے بڑھ کر اس بات کیلئے اور کونسا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خدا نے بعض مسلمانوں کو یہود قرار دے دیا ہے اور صاف اشارہ کر دیا ہے کہ جن بدیوں کے یہود مرتکب ہوئے تھے یعنی علماء ان کے۔ اس امت کے علماء بھی انہی بدیوں کے مرتکب ہونگے اور اسی مفہوم کی طرف آیت غیر المغضوب علیھم میں بھی اشارہ ہے کیونکہ اس آیت میں باتفاق کل مفسرین مغضوب علیھم سے مراد وہ یہود ہیں جن پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کی وجہ سے غضب نازل ہوا تھا۔ اور احادیث صحیحہ میں مغضوب علیھم سے مراد وہ یہود ہیں جو موردِ غضبِ الٰہی دنیا میں ہی ہوگئے تھے اور قرآن شریف یہ بھی گواہی دیتا ہے کہ یہود کو مغضوب علیھم ٹھہرانے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر لعنت جاری ہوئی تھی۔ پس یقینی اور قطعی طور پر مغضوب علیھم سے مراد وہ یہود ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر ہلاک کرنا چاہا تھا۔ اب خدا تعالیٰ کا یہ دُعا سکھلانا کہ خدایا ایسا کر کہ ہم وہی یہودی نہ بن جائیں جنہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کرنا چاہا تھا صاف بتلا رہا ہے کہ امت محمدیہ میں بھی ایک عیسیٰ پیدا ہونے والا ہے ورنہ اس دُعا کی کیا ضرورت تھی؟ اور نیز جبکہ آیات مذکورہ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں بعض علماء مسلمان بالکل علماء یہود سے مشابہ ہو جائینگے اور یہود بن جائیں گے۔ پھر یہ کہنا کہ ان یہودیوں کی اصلاح کے لئے اسرائیلی عیسیٰ آسمان سے نازل ہوگا بالکل غیر معقول بات ہے۔ کیونکہ اوّل تو باہر سے ایک نبی آنے سے مُہرِ ختم نبوت ٹوٹتی ہے اور قرآن شریف صاف طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء ٹھہراتا ہے۔ ماسوا اس کے قرآن شریف کے رُو سے یہ امت خیر الامم کہلاتی ہے پس اس کی اس سے زیادہ بے عزتی

اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یہودی بننے کے لئے تو یہ امت ہو مگر عیسیٰ باہر سے آوے۔ اگر یہ سچ ہے کہ کسی زمانہ میں اکثر علماء اس امت کے یہودی بن جائینگے یعنی یہود خصلت ہو جائینگے تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ ان یہود کو درست کرنے کے لئے عیسیٰ باہر سے نہیں آئیگا بلکہ جیسا کہ بعض افراد کا نام یہود رکھا گیا ایسا ہی اس کے مقابل پر ایک فرد کا نام عیسیٰ رکھا جائیگا۔ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ قرآن اور حدیث دونوں نے بعض افراد اس امت کا نام یہود رکھا ہے جیسا کہ آیت غیر المغضوب علیہم سے بھی ظاہر ہے کیونکہ اگر بعض افراد اس امت کے یہودی بننے والے نہ ہوتے تو دعا مذکورہ بالا ہرگز نہ سکھلائی جاتی۔ جب سے دنیا میں خدا کی کتابیں آئی ہیں۔ خدا کا اُن میں یہی محاورہ ہے کہ جب کسی قوم کو ایک بات سے منع کرتا ہے کہ مثلاً تم زنا نہ کرو۔ یا چوری نہ کرو یا یہودی نہ بنو تو اس سے منع کرنے کے اندر یہ پیشگوئی مخفی ہوتی ہے کہ بعض اُن میں سے ارتکاب ان جرائم کا کرینگے۔ دنیا میں کوئی شخص ایسی نظیر پیش نہیں کر سکتا کہ ایک جماعت یا ایک قوم کو خدا تعالیٰ نے کسی ناکردنی کام سے منع کیا ہو تو پھر وہ سب کے سب اس کام سے باز رہے ہوں۔ بلکہ ضرور بعض اس کام کے مرتکب ہو جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے توریت میں یہودیوں کو یہ حکم دیا کہ تم توریت کی تحریف نہ کرنا۔ سو اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض یہود نے توریت کی تحریف کی۔ مگر قرآن شریف میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو کہیں حکم نہیں دیا کہ تم نے قرآن شریف کی تحریف نہ کرنا بلکہ یہ فرمایا کہ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون۔ یعنی ہم نے ہی قرآن شریف کو اتارا اور ہم ہی اس کی محافظت کرینگے۔ اسی وجہ سے قرآن شریف تحریف سے محفوظ رہا۔ غرض یہ قطعی اور یقینی مسلّم سنّت الٰہیہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کسی کتاب میں کسی قوم یا جماعت کو ایک بُرے کام سے منع کرتا ہے یا نیک کام کے لئے حکم فرماتا ہے تو اس کے علم قدیم میں یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس کے حکم کی مخالفت بھی کرینگے۔ پس خدا تعالیٰ کا سورۂ فاتحہ میں فرمانا کہ تم دعا کیا کرو کہ تم یہودی نہ بن جاؤ جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینا چاہا تھا جس سے دنیا میں ہی ان پر عذاب الٰہی کی مار پڑی۔ اس سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے علم میں یہ مقدر تھا کہ بعض افراد اس امت کے جو علماء امت کہلائینگے اپنی شرارتوں اور تکذیب مسیح وقت کی وجہ سے یہودیوں کا جامہ پہن لیں گے ورنہ ایک لغو دعا سکھلانے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ علماء اس امت کے اس طرح کے یہودی نہیں بن سکتے کہ وہ اسرائیل کے خاندان میں سے بن جائیں۔ اور پھر اس عیسیٰ بن مریم کو جو مدت سے اس دنیا سے گذر چکا ہے سولی دینا چاہیں۔ کیونکہ اب اس زمانہ نہ وہ یہودی اس زمین پر موجود ہیں نہ وہ عیسیٰ موجود ہے۔ پس ظاہر ہے کہ اس آیت میں ایک آئندہ واقعہ

کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بتلانا منظور ہے کہ اس امت میں عیسیٰ مسیح کے رنگ میں آخری زمانہ میں ایک شخص مبعوث ہوگا۔ اور اس کے وقت کے بعض علماء اسلام ان یہودی علماء کی طرح اُسکو دُکھ دینگے جو عیسیٰ علیہ السلام کو دُکھ دیتے تھے اور ان کی شان میں بدگوئی کرینگے بلکہ احادیث صحیحہ سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہودی بننے کے یہ معنے ہیں کہ یہودیوں کے بداخلاق اور بدعادات علمائے اسلام میں پیدا ہو جائینگی اور گو بظاہر مسلمان کہلائیں گے مگر اُن کے دل مسخ ہو کر اُن یہودیوں کے رنگ سے رنگین ہو جائینگے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دُکھ دیکر موردِ غضب الٰہی ہوئے تھے۔ پس جبکہ یہودی یہی لوگ بنیں گے جو مسلمان کہلاتے ہیں تو کیا یہ اس امت مرحومہ کی بے عزّتی نہیں کہ یہودی بننے کے لئے تو یہ مقرر کئے جائیں مگر مسیح جو ان یہودیوں کو درست کرے گا وہ باہر سے آوے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جو شخص قرآن شریف کو ایک تقویٰ اور ایمان اور انصاف اور تدبّر کی نظر سے دیکھیگا اُس پر روز روشن کی طرح کھل جائیگا کہ خداوند قادر کریم نے اس امت محمدیہ کو موسوی امت کے بالکل بالمقابل پیدا کیا ہے۔ ان کی اچھی باتوں کے بالمقابل اچھی باتیں دی ہیں اور ان کی بُری باتوں کے مقابل پر بُری باتیں۔ اس امت میں بعض ایسے ہیں جو انبیاء بنی اسرائیل سے مشابہت رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو مغضوب علیہم سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گھر ہے جس کے عمدہ عمدہ آراستہ کمرے موجود ہیں جو عالیشان اور مہذب لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہیں اور جس کے بعض حصّے میں پاخانے بھی ہیں اور بدررو بھی۔ اور گھر کے مالک نے چاہا کہ اس محل کے مقابل پر ایک اَور محل بناوے کہ تا جو جو سامان اس پہلے محل میں تھا اس میں بھی موجود ہو۔ سو یہ دوسرا محل اسلام کا محل ہے اور پہلا محل موسوی سلسلہ کا محل تھا۔ یہ دوسرا محل پہلے محل کا کسی بات میں محتاج نہیں۔ قرآن شریف توریت کا محتاج نہیں یہ امت کسی اسرائیلی نبی کی محتاج نہیں۔ ہر ایک کامل جو اس بات کے لئے آتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے پرورش پاتا ہے اور اس کی وحی محمدی وحی کی ظلّ ہے۔ یہی ایک نکتہ ہے جو سمجھنے کے لائق ہے۔ افسوس ہمارے مخالف جو حضرت عیسیٰ کو دوبارہ لاتے ہیں نہیں سمجھتے کہ مطلب تو یہ ہے کہ اسلام کو فخر مشابہت حاصل ہو۔ نہ یہ کہ ذلّت کہ کوئی اسرائیلی نبی آوے تا اُمت اصلاح پاوے۔

(تذکرۃ الشہادتین ص۱۰-۱۵)

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ آیا یہ امر ثابت ہے یا نہیں کہ آنے والا مسیح موعود اسی زمانہ میں آنا چاہیئے جس میں ہم ہیں۔ سو دلائل مفصلہ ذیل سے صاف طور پر کھل گیا ہے کہ ضرور ہے کہ وہ اسی زمانہ میں آوے۔

(۱) اوّل دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہلاتی ہے لکھا ہے کہ

مسیح موعود کسر صلیب کے لئے آئیگا اور ایسے وقت میں آئیگا کہ جب ملک میں ہر ایک پہلو بے اعتدالیاں قول اور فعل میں پھیلی ہوئی ہونگی۔ سو اب اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے غور سے بھی دیکھنے کی حاجت نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ عیسائیت کا اثر لاکھوں انسانوں کے دِلوں پر پڑ گیا ہے اور ملک اباحت کی تعلیموں سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ صدہا آدمی ہر ایک خاندان میں سے نہ صرف دین اسلام سے ہی مرتد ہو گئے ہیں بلکہ جناب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن بھی ہو گئے ہیں اور اب تک صدہا کتابیں دین اسلام کے ردّ میں تالیف ہو چکی ہیں۔ اور اکثر وہ کتابیں توہین اور گالیوں سے پُر ہیں اور اس مصیبت کے وقت جب ہم گذشتہ زمانہ کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک قطعی فیصلہ کے طور پر یہ رائے ظاہر کرنا پڑتی ہے کہ تیرہ سو برس کی بارہ صدیوں میں سے کوئی بھی ایسی صدی اسلام کے مضر نہیں گذری کہ جیسے تیرھویں صدی گذری ہے اور یا جو اب گذر رہی ہے۔ لہذا عقلِ سلیم اس بات کی ضرورت کو مانتی ہے کہ ایسے پُر خطر زمانہ کے لئے جس میں عام طور پر زمین میں بہت جوش مخالفت کا پھوٹ پڑا ہے اور مسلمانوں کی اندرونی زندگی بھی ناگفتہ بہ حالت تک پہنچ گئی ہے۔ کوئی مصلح صلیبی فتنوں کا فرو کرنے والا اور اندرونی حالت کو پاک کرنے والا پیدا ہو۔ اور تیرھویں صدی کے پورے سو برس کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ ان زہریلی ہواؤں کی اصلاح جو بڑے زور شور سے چل رہی ہیں۔ اور عام وبار کی طرح ہر ایک شہر اور گاؤں سے کچھ کچھ اپنے قبضہ میں لا رہی ہیں۔ ہر ایک معمولی طاقت کا کام نہیں کیونکہ یہ مخالفانہ تاثیرات اور ذخیرۂ اعتراضات خود ایک معمولی طاقت نہیں بلکہ زمین نے اپنے وقت پر ایک جوش مارا ہے اور اپنے تمام زہروں کو بڑی قوت کے ساتھ اُگلا ہے اس لئے اِس زہر کی مدافعت کے لئے آسمانی طاقت کی ضرورت ہے کیونکہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے سو اس دلیل سے روشن ہو گیا کہ یہی زمانہ مسیح موعود کے ظہور کا زمانہ ہے ....

(۲) دوسری دلیل وہ بعض احادیث اور کشوف اولیاء کرام و علمائے عظام ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مسیح موعود مہدی معہود چودھویں صدی کے سر پر ظاہر ہوگا۔ چنانچہ حدیث الآیات بعد المائتین کی تشریح بہت سے متقدمین اور متاخرین نے یہی کی ہے جو مائتین کے لفظ سے وہ مائتین مراد ہیں جو الف کے بعد ہیں یعنی ہزار کے بعد۔ اس طرح پر معنے اس حدیث کے یہ ہوئے کہ مہدی اور مسیح کی پیدائش جو آیاتِ کبریٰ میں سے ہے تیرھویں صدی میں ہوگی۔ اور چودھویں صدی میں اس کا ظہور ہوگا۔ یہی معنے محققین اور علماء نے کئے ہیں اور انہی قرائن سے انہوں نے حکم کیا ہے کہ مہدی معہود کا تیرھویں صدی میں پیدا ہو جانا ضروری ہے تا چودھویں کے سر پر ظاہر

ہو سکے۔ چنانچہ اس بنا پر اور نیز کئی اور قرائن کی رو سے بھی مولوی نواب صدیق حسن صاحب مرحوم اپنی کتاب حجج الکرامہ میں لکھتے ہیں کہ میں بلحاظ قرائن قویّہ گمان کرتا ہوں کہ چودھویں صدی کے سر پر مہدئ معہود کا ظہور ہوگا۔ ......

دار قطنی کی ایک حدیث بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مہدی موعود چودھویں صدی کے سر پر ظاہر ہوگا۔ وہ حدیث یہ ہے کہ اِنّ لمھدینا اٰیتین الخ ترجمہ تمام حدیث کا یہ ہے کہ ہمارے مہدی کے لئے دو نشان ہیں۔ جب سے زمین و آسمان کی بنیاد ڈالی گئی وہ نشان کسی مامور اور مرسل اور نبی کے لئے ظہور میں نہیں آئے۔ اور وہ نشان یہ ہیں کہ چاند کا اپنی مقررہ راتوں میں سے پہلی رات میں اور سورج کا اپنے مقررہ دنوں میں سے بیچ کے دن میں رمضان کا مہینہ میں گرہن ہوگا۔ یعنی انہی دنوں میں جبکہ مہدی اپنا دعویٰ دنیا کے سامنے پیش کرے گا اور دنیا اس کو قبول نہیں کریگی۔ آسمان پر اُس کی تصدیق کے لئے نشان ظاہر ہوگا۔ اور وہ یہ کہ مقررہ تاریخوں میں جیسا کہ حدیث مذکورہ میں درج ہیں سورج چاند کا رمضان کے مہینہ میں جو نزولِ کلام الٰہی کا مہینہ ہے گرہن ہوگا۔ اور ظلمت کے دکھلانے سے خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ اشارہ ہوگا کہ زمین پر ظلم کیا گیا اور جو خدا کی طرف سے تھا اُسے مفتری سمجھا گیا۔ اب اس حدیث سے صاف طور پر چودھویں صدی متعین ہوتی ہے کیونکہ کسوف و خسوف جو مہدی کا زمانہ تبلاتا ہے اور مکذبین کے سامنے نشان پیش کرتا ہے وہ چودھویں صدی میں ہی ہُوا ہے۔

(تحفہ گولڑویہ ص ۴۱ - ۴۵)

چوتھا امر اس بات کا ثابت کرنا ہے کہ وہ مسیح موعود جس کا آنا چودھویں صدی کے سر پر مقدّر تھا وہ مَیں ہی ہوں۔ سو اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ میرے ہی دعوے کے وقت میں آسمان پر خسوف کسوف ہُوا ہے اور میرے ہی دعویٰ کے وقت میں صلیبی فتنے پیدا ہوئے اور میرے ہی ہاتھ پر خدا نے اس بات کا ثبوت دیا کہ مسیح موعود اس امت میں سے ہونا چاہیئے اور مجھے خدا نے اپنی طرف سے قوت دی کہ میرے مقابل پر مباحثہ کے وقت کوئی پادری نہیں ٹھہر سکتا اور میرا رعب عیسائی علماء پر خدا نے ڈال دیا ہے کہ ان کو طاقت نہیں رہی کہ کہ میرے مقابلہ پر آسکیں۔ چونکہ خدا نے مجھے رُوح القدس سے تائید بخشی ہے اور اپنا فرشتہ میرے ساتھ کیا ہے اس لئے کوئی پادری میرے مقابل پر آ ہی نہیں سکتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی معجزہ ظاہر ہُوا کوئی پیشگوئی ظہور میں نہیں آئی۔ اور اب بلائے جاتے ہیں پر نہیں آتے۔ اِس کا یہی سبب ہے کہ ان کے دلوں میں خدا نے ڈال دیا ہے کہ اس شخص کے مقابل پر ہمیں بجز

شکست کے اور کچھ نہیں۔ دیکھو ایسے وقت میں جب حضرت مسیح کے خدا بنانے پر سخت غلو کیا جاتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو روح القدس کی تائید سے خالی خیال کرتے تھے اور معجزات اور پیشگوئیوں سے انکار تھا ایسے وقت میں پادریوں کے مقابل پر کون کھڑا ہوا؟ کس کی تائید میں خدا تعالیٰ نے بڑے بڑے معجزے دکھلائے؟ کتاب تریاق القلوب کو پڑھو اور پھر انصاف سے کہو کہ اگرچہ صدہا باتیں قصوں کے رنگ میں بیان کی جاتی ہیں مگر یہ نشان اور پیشگوئیاں جو رؤیت کی شہادت سے ثابت ہیں جن کے بچشم خود دیکھنے والے اب تک لاکھوں انسان دنیا میں موجود ہیں یہ کس سے ظہور میں آئے۔ کون ہے جو ہر ایک نئی صبح کو مخالفین کو مجرم کر رہا ہے کہ آؤ! اگر تم میں روح القدس سے کچھ قوت ہے تو میرا مقابلہ کرو؟ عیسائیوں اور ہندوؤں اور آریوں میں کون ہے جو اس وقت میرے سامنے کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نشان ظاہر نہیں ہوا؟ سو یہ خدا کی حجت ہے جو پوری ہوئی۔ سچائی سے انکار کرنا طریق دیانت اور ایمان نہیں ہے۔ بلاشبہ ہر ایک قوم پر اللہ کی حجت پوری ہو گئی ہے۔ آسمان کے نیچے اب کوئی نہیں کہ جو روح القدس کی تائید میں میرا مقابلہ کر سکے۔

(تحفہ گولڑویہ ص ۵۷-۶۱)

منجملہ ان دلائل کے جو میرے مسیح موعود ہونے پر دلالت کرتے ہیں وہ ذاتی نشانیاں ہیں جو مسیح موعود کی نسبت بیان فرمائی گئی ہیں۔ اور اُن میں سے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ مسیح موعود کیلئے ضروری ہے کہ وہ آخری زمانہ میں پیدا ہو جیسا کہ یہ حدیث ہے یکون فی اٰخر الزمان عند تظاھر من الفتن وانقطاع من الزمان۔ اور اس بات کے ثبوت کے لئے کہ درحقیقت یہ آخری زمانہ ہے جس میں مسیح ظاہر ہونا چاہیئے دو طور سے دلائل موجود ہیں۔ (۱) اوّل وہ آیات قرآنیہ اور آثارِ نبویہ جو قیامت کے قرب پر دلالت کرتے ہیں اور پورے ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ خسوف کسوف کا ایک ہی مہینے میں یعنی رمضان میں ہونا جس کی تصریح آیت وجمع الشمس والقمر میں کی گئی ہے۔ اور اونٹوں کی سواری موقوف ہو جانا جس کی تشریح آیت واذا العشار عطّلت سے ظاہر ہے اور ملک میں نہروں کا بکثرت نکلنا جیسا کہ آیت واذا البحار فجرت سے ظاہر ہے۔ اور ستاروں کا متواتر ٹوٹنا جیسا کہ آیت واذا الکواکب انتثرت سے ظاہر ہے اور قحط پڑنا اور وبا پڑنا اور امساک باراں ہونا جیسا کہ آیت اذا السماء انفطرت سے منکشف ہے اور سخت قسم کا کسوف شمس واقع ہونا جس سے تاریکی پھیل جائے جیسا کہ آیت اذا الشمس کورت سے ظاہر ہے اور پہاڑوں کو اپنی جگہ سے اٹھا دینا جیسا کہ آیت واذا الجبال سیّرت سے سمجھا جاتا ہے

اور لوگ وحشی اور اراذل اور اسلامی شرافت سے بے بہرہ ہیں اُن کا اقبال چمک اٹھنا جیسا کہ آیت واذا الوحوش حشرت سے مترشح ہو رہا ہے اور تمام دنیا میں تعلقات اور ملاقاتوں کا سلسلہ گرم ہو جانا اور سفر کے ذریعہ سے ایک کا دوسرے کو ملنا سہل ہو جانا۔ جیسا کہ بدیہی طور پر آیت واذا النفوس زوجت سمجھا جاتا ہے۔ اور کتابوں اور رسالوں اور خطوط کا ملکوں میں شائع ہونا جیسا کہ آیت واذا الصحف نشرت سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اور علماء کی باطنی حالت کا جو نجوم اسلام ہیں مکدّر ہو جانا۔ جیسا کہ واذا النجوم انکدرت سے صاف معلوم ہوتا ہے اور بدعتوں اور ضلالتوں اور ہر قسم کے فسق و فجور کا پھیل جانا جیسا کہ آیت اذا السماء انشقّت سے مفہوم ہوتا ہے، یہ تمام علامتیں قرب قیامت کی ظاہر ہو چلی ہیں اور دنیا پر ایک انقلاب عظیم آگیا ......

پھر ماسوا اس کے سورۂ مرسلات میں ایک آیت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرب قیامت کی ایک بھاری علامت یہ ہے کہ ایسا شخص پیدا ہو جس سے رسولوں کی حد بست ہو جائے۔ یعنی سلسلہ استخلاف محمدیہ کا آخری خلیفہ جس کا نام مسیح موعود اور مہدی معہود ہے ظاہر ہو جائے اور وہ آیت یہ ہے واذا الرّسل اقّتت۔ یعنی وہ آخری زمانہ جس سے رسولوں کے عدد کی تعیین ہو جائیگی۔ یعنی آخری خلیفہ کے ظہور سے قضا و قدر کا اندازہ جو مرسلین کی تعداد کی نسبت مخفی تھا ظہور میں آجائیگا۔ یہ آیت بھی اس بات پر نصّ صریح ہے کہ مسیح موعود اسی امت میں سے ہوگا۔

(تحفۂ گولڑویہ ص ۱۴۶-۱۴۸)

سولہ خصوصیتیں ہیں جو موسوی سلسلہ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام میں رکھی گئی تھیں۔ پھر جبکہ خدا تعالیٰ نے موسوی سلسلہ کو ہلاک کر کے محمدی سلسلہ قائم کیا اور جیسا کہ نبیوں کے صحیفوں میں وعدہ دیا گیا تھا تو اس حکیم و علیم نے چاہا کہ اس سلسلہ کے اوّل اور آخر دونوں میں مشابہت تامہ پیدا کرے تو پہلے اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر مثیل موسیٰ قرار دیا جیسا کہ آیت انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھدا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولاً سے ظاہر ہے .... مگر ضروری تھا کہ سلسلہ محمدی کے آخری خلیفہ میں بھی سلسلہ موسویہ کے آخری خلیفہ سے مشابہت ہو تا خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ سلسلہ محمدیہ باعتبار امام سلسلہ اور خلفاء سلسلہ کے سلسلہ موسویہ سے مشابہت ہے ٹھیک ہو۔ اور ہمیشہ مشابہت اول اور آخر میں دیکھی جاتی ہے اور درمیانی زمانہ جو ایک طویل مدت ہوتی ہے گنجائش نہیں رکھتا کہ

پوری پوری نظر سے اس کو جانچا جائے۔ مگر اوّل اور آخر کی مشابہت سے یہ قیاس پیدا ہو جاتا ہے کہ درمیان میں بھی ضرور مشابہت ہو گی گو نظر عقلی اس کی پوری پڑتال سے قاصر ہے۔ اور ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں مذہبی پہلو کے رو سے سولہ خصوصیتیں تھیں جن کا اسلام کے آخری خلیفہ میں پایا جانا ضروری ہے تا اس میں اور حضرت عیسیٰؑ میں مشابہت تامہ ثابت ہو۔ پس اوّل موعود ہونے کی خصوصیت ہے۔ اسلام میں اگرچہ ہزارہا ولی اور اہل اللہ گذرے ہیں مگر اُن میں کوئی موعود نہ تھا لیکن وہ جو مسیح کے نام پر آنے والا تھا وہ موعود تھا۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کوئی نبی موعود نہ تھا۔ صرف مسیح موعود تھا۔

دوم خصوصیت سلطنت کے برباد ہو چکنے کی ہے۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ جیسا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم سے کچھ دن پہلے اس ملک سے اسرائیلی سلطنت جاتی رہی تھی ایسا ہی اس آخری مسیح کی پیدائش سے پہلے اسلامی سلطنت بباعث طرح طرح کی بدچلنیوں کے ملک ہندوستان سے اٹھ گئی تھی۔ اور انگریزی سلطنت اس کی جگہ قائم ہو گئی تھی۔

سوم خصوصیت جو پہلے مسیح میں پائی گئی وہ یہ ہے کہ اُس کے وقت میں یہود لوگ بہت سے فرقوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ اور بالطبع ایک حَکَمْ کے محتاج تھے تا ان میں فیصلہ کرے۔ ایسا ہی آخری مسیح کے وقت میں مسلمانوں میں کثرت سے فرقے پھیل گئے تھے۔

چہارم خصوصیت جو پہلے مسیح میں تھی وہ یہ ہے کہ وہ جہاد کے لئے مامور نہ تھا۔ ایسا ہی آخری مسیح جہاد کے لئے مامور نہیں ہے۔ اور کیونکر مامور ہو زمانہ کی رفتار نے قوم کو متنبہ کر دیا ہے کہ تلوار سے کوئی دل تسلّی نہیں پا سکتا اور اب مذہبی امور کے لئے کوئی مہذب تلوار نہیں اُٹھاتا۔ ......

پنجم خصوصیت جو پہلے مسیح میں تھی وہ یہ ہے کہ اُس کے زمانہ میں یہودیوں کا چال چلن بگڑ گیا تھا بالخصوص اکثر اُن کے علماء کہلاتے تھے وہ سخت مکّار اور دنیا پرست اور دنیا کے لالچوں میں اور دنیوی عزتوں کی خواہش میں غرق ہو گئے تھے۔ ایسا ہی آخری مسیح کے وقت میں عام لوگوں اور اکثر علمائے اسلام کی حالت ہو رہی ہے مفصل لکھنے کی کچھ حاجت نہیں۔

چھٹی خصوصیت یعنی یہ کہ حضرت مسیح قیصر روم کے ماتحت مبعوث ہوئے تھے۔ سو اس خصوصیت میں آخری مسیح کا بھی اشتراک ہے۔ کیونکہ میں بھی قیصر کی عملداری کے ماتحت مبعوث ہوا ہوں۔ یہ قیصر اس قیصر سے بہتر ہے جو مسیح کے وقت میں تھا۔ ....

ساتویں خصوصیت یہ کہ مذہب عیسائی آخر قیصری قوم میں گھس گیا۔ سو اس خصوصیت میں

بھی اس آخری مسیح کا اشتراک ہے۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ یورپ اور امریکہ میں میرے دعویٰ اور دلائل کو بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے۔ اور ان لوگوں نے خود بخود صدہا اخبار میں میرے دعوے اور دلائل کو شائع کیا ہے۔ اور میری تائید اور تصدیق میں ایسے الفاظ لکھے ہیں کہ ایک عیسائی کے قلم سے ایسے الفاظ نکلنا مشکل ہے۔ یہاں تک کہ بعض نے صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے کہ یہ شخص سچا معلوم ہوتا ہے .....

آٹھویں خصوصیت مسیح میں یہ تھی کہ اس وقت میں ایک ستارہ نکلا تھا۔ اس خصوصیت میں بھی آخری مسیح بننے میں شریک کیا گیا ہوں کیونکہ وہی ستارہ جو مسیح کے وقت میں نکلا تھا وہ دوبارہ میرے وقت میں نکلا ہے۔ اس بات کی انگریزی اخباروں نے بھی تصدیق کی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ مسیح کے ظہور کا وقت نزدیک ہے۔

نویں خصوصیت یسوع مسیح میں یہ تھی کہ جب اس کو صلیب پر چڑھایا تو سورج کو گرہن لگا تھا۔ سو اس واقعہ میں بھی خدا نے مجھے شریک کیا۔ کیونکہ جب میری تکذیب کی گئی تو اس کے بعد نہ صرف سورج بلکہ چاند کو بھی ایک ہی مہینہ میں جو رمضان کا مہینہ تھا گرہن لگا تھا۔ اور نہ ایک دفعہ بلکہ حدیث کے مطابق دو دفعہ یہ واقعہ ہوا۔ اور ان دونوں گرہنوں کی انجیلوں میں بھی خبر دی گئی ہے اور قرآن شریف میں بھی یہ خبر ہے اور حدیثوں میں بھی جیسا کہ دار قطنی میں۔

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ یسوع مسیح کو دُکھ دینے کے بعد یہودیوں میں سخت طاعون پھیلی تھی سو میرے وقت میں بھی سخت طاعون پھیل گئی۔

گیارھویں خصوصیت یسوع مسیح میں یہ تھی کہ یہودیوں کے علماء نے کوشش کی کہ وہ باغی قرار پاوے اور اُس پر مقدمہ بنایا گیا اور زور لگایا گیا کہ اس کو سزائے موت دی جاوے۔ سو اس قسم کے مقدموں میں بھی قضاء و قدر الٰہی نے مجھے شریک کر دیا کہ ایک خون کا مقدمہ مجھ پر بنایا گیا۔ اور اسی کے ضمن میں مجھے باغی بنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ وہی مقدمہ ہے جس میں فریق ثانی کی طرف سے مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب بٹالوی گواہ بن کر آئے تھے۔

بارھویں خصوصیت یسوع مسیح میں یہ تھی کہ جب وہ صلیب پر چڑھایا گیا تو اس کے ساتھ ایک چور بھی صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ سو اس واقعہ میں بھی میں شریک کیا گیا ہوں۔ کیونکہ جس دن مجھ کو خون کے مقدمے سے خدا تعالیٰ نے رہائی بخشی اور اس پیشگوئی کے موافق جو میں خدا سے وحی پا کر صدہا لوگوں میں شائع کر چکا تھا مجھ کو بری فرمایا۔ اُس دن میرے ساتھ ایک عیسائی چور بھی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ چور عیسائیوں کی مقدس جماعت مکتی فوج میں سے تھا جس نے کچھ روپیہ چُرا لیا تھا

اس چور کو تین مہینے کی سزا ملی۔ پہلے مسیح کے رفیق چور کی طرح سزائے موت اس کو نہیں ہوئی۔

تیرھویں خصوصیت مسیح میں یہ تھی کہ جب وہ پیلاطوس گورنر کے سامنے پیش کیا گیا اور سزائے موت کی درخواست کی گئی تو پیلاطوس نے کہا کہ مَیں اس کا کوئی گناہ نہیں پاتا جس سے یہ سزا دوں۔ ایسا ہی کپتان ڈگلس صاحب ضلع مجسٹریٹ نے میرے ایک سوال کے جواب میں مجھ کو کہا کہ مَیں آپ پر کوئی الزام نہیں لگاتا۔ میرے خیال میں ہے کہ کپتان ڈگلس اپنی استقامت اور عادلانہ شجاعت میں پیلاطوس سے بہت بڑھکر تھا۔ کیونکہ پیلاطوس نے آخر کار بُزدلی دکھائی اور یہودیوں کے شریر مولویوں سے ڈر گیا مگر ڈگلس ہرگز نہ ڈرا . . . . یہ نیک اخلاق اس ہمارے وقت کے پیلاطوس کے ہمیشہ ہمیں اور ہماری جماعت کو یاد رہیں گے اور دُنیا کے آخیر تک اس کا نام عزّت سے لیا جائیگا۔

چودھویں خصوصیت یسوع مسیح میں یہ تھی کہ وہ باپ کے نہ ہونے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں سے نہ تھا مگر باایں ہمہ موسوی سلسلہ کا آخری پیغمبر تھا جو موسیٰ کے بعد چودھویں صدی میں پیدا ہوُا۔ ایسا ہی مَیں بھی خاندان قریش میں سے نہیں ہوں اور چودھویں صدی میں مبعوث ہوُا ہوں اور سب سے آخر ہوں۔

پندرھویں خصوصیت حضرت مسیح میں یہ تھی کہ اُن کے عہد میں دنیا کی وضع جدید ہوگئی تھی۔ سڑکیں ایجاد ہوگئی تھیں۔ ڈاک کا عمدہ انتظام ہوگیا تھا۔ فوجی انتظام میں بہت صلاحیت پیدا ہوگئی تھی۔ اور مسافروں کے آرام کے لئے بہت کچھ باتیں ایجادیں ہوگئی تھیں۔ اور پہلے کی نسبت قانون معدلت نہایت صاف ہوگیا تھا۔ ایسا ہی میرے وقت میں دنیا کے آرام کے اسباب بہت ترقی کر گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ریل کی سواری پیدا ہوگئی جس کی خبر قرآن شریف میں پائی جاتی ہے۔ باقی امور کو پڑھنے والا خود سمجھ لے۔

سولھویں خصوصیت حضرت مسیح میں یہ تھی کہ بن باپ ہونے کی وجہ سے حضرت آدم سے وہ مشابہ تھے۔ ایسا ہی میں بھی توام پیدا ہونے کی وجہ سے حضرت آدم سے مشابہ ہوں۔ اور اس قول کے مطابق جو حضرت محی الدین ابن عربی لکھتے ہیں کہ خاتم الخلفاء صینی الاصل ہوگا یعنی مغلوں میں سے اور وہ جوڑا یعنی توام پیدا ہوگا۔ پہلے لڑکی نکلے گی بعد اسکے وہ پیدا ہوگا ایک ہی وقت میں۔ اسی طرح میری پیدائش ہوئی۔ اور جمعہ کی صبح کو بطور توام میں پیدا ہوُا۔ اوّل لڑکی اور بعدہٗ مَیں پیدا ہوُا۔ نہ معلوم یہ پیشگوئی کہاں سے ابن عربی صاحب نے لی تھی جو پوری ہوگئی۔ اُنکی کتابوں میں اب تک یہ پیشگوئی موجود ہے۔

یہ سولہ مشابہتیں ہیں جو مجھ میں اور مسیح میں ہیں ۔ اب ظاہر ہے کہ اگر یہ کاروبار انسان کا ہوتا تو مجھ میں اور مسیح ابن مریم میں اس قدر مشابہت ہرگز نہ ہوتی ۔ یوں تو تکذیب کرنا قدیم سے ان لوگوں کا کام ہے جن کے حصہ میں سعادت نہیں مگر اس زمانہ کے مولویوں کی تکذیب عجیب ہے ۔ میں وہ شخص ہوں جو عین وقت پر ظاہر ہوا جس کے لئے آسمان پر رمضان کے مہینہ میں چاند اور سورج کو قرآن اور حدیث اور انجیل اور دوسرے نبیوں کی خبروں کے مطابق گرہن لگا ۔ اور میں وہ شخص ہوں جس کے زمانہ میں تمام نبیوں کی خبر اور قرآن مجید کی خبر کے موافق اس ملک میں خارق عادت طور پر طاعون پھیل گئی ۔ اور میں وہ شخص ہوں جو حدیث صحیح کے مطابق اس کے زمانہ میں حج روکا گیا ۔ اور میں وہ شخص ہوں جس کے عہد میں وہ ستارہ نکلا جو مسیح ابن مریم کے وقت میں نکلا تھا ۔ اور میں وہ شخص ہوں جس کے زمانہ میں اس ملک میں ریل جاری ہو کر اونٹ بے کار کئے گئے اور عنقریب وہ وقت آتا ہے بلکہ بہت نزدیک ہے جبکہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ریل جاری ہو کر وہ تمام اونٹ بے کار ہو جائیں گے ۔ جو تیرہ سو برس سے متواتر یہ سفر مبارک کرتے تھے ۔ تب اس وقت ان اونٹوں کی نسبت وہ حدیث جو صحیح مسلم میں موجود ہے صادق آئیگی یعنی یہ کہ لیترکن القلاص فلا یسعیٰ علیہا ۔ یعنی مسیح کے وقت میں اونٹ بے کار کئے جائیں گے اور کوئی اُن پر سفر نہیں کرے گا ۔ ایسا ہی میں وہ شخص ہوں جس کے ہاتھ پر صدہا نشان ظاہر ہوئے ۔ کیا زمین پر کوئی ایسا انسان زندہ ہے کہ جو نشان نمائی میں میرا مقابلہ کرکے مجھ پر غالب آسکے ۔ مجھے اُس خدا کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اب تک دو لاکھ سے زیادہ میرے ہاتھ پر نشان ظاہر ہو چکے ہیں اور شائد دس ہزار کے قریب یا اس سے زیادہ لوگوں نے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپ نے میری تصدیق کی ۔ اور اس ملک میں جو بعض نامی اہلِ کشف تھے جن کا تین تین چار چار لاکھ مرید تھا اُن کو خواب میں دکھلایا گیا کہ یہ انسان خدا کی طرف سے ہے ....

اب باوجود ان تمام شہادتوں اور معجزات اور زبردست نشانوں کے مولوی لوگ میری تکذیب کرتے ہیں اور ضرور تھا کہ ایسا ہی کرتے تا پیشگوئی آیت غیرالمغضوب علیہم پوری ہو جاتی ۔ یاد رہے کہ اصل جڑ اس مخالفت کی ایک حماقت ہے اور وہ یہ کہ مولوی لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ان کے پاس رطب و یابس کا ذخیرہ ہے وہ سب علامتیں مسیح موعود میں ثابت ہونی چاہئیں ۔ اور ایسے مدعی مسیحیت یا مہدویت کو ہرگز نہیں ماننا چاہیئے کہ ان کی تمام حدیثوں میں سے گو ایک حدیث اس پر صادق نہ آوے ۔ حالانکہ قدیم سے یہ امر غیر ممکن چلا آیا ہے ۔ یہود نے جو جو علامتیں

حضرت عیسیٰ کے لئے اپنی کتابوں میں تراش رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ پھر انہی بدبخت لوگوں نے ہمارے سیّد و مولیٰ محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو جو علامتیں تراشی تھیں اور مشہور کر رکھی تھیں وہ بھی بہت ہی کم پوری ہوئیں۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ آخری نبی بنی اسرائیل سے ہو گا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسماعیل میں سے پیدا ہوئے۔ اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو تورات میں لکھ دیتا کہ اس نبی کا نام محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ہو گا اور باپ کا نام عبداللہ اور دادا کا نام عبدالمطلب اور مکّہ میں پیدا ہو گا اور مدینہ اس کی ہجرت گاہ ہو گی۔ مگر خدا تعالےٰ نے یہ نہ لکھا۔ کیونکہ ایسی پیشگوئیوں میں کچھ امتحان بھی منظور ہوتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مسیح موعود کے لئے پہلے سے خبر دی گئی ہے کہ وہ اسلام کے مختلف فرقوں کیلئے بطور حَکَمْ کے آئیگا۔ اب ظاہر ہے کہ ہر ایک فرقہ کی جدا جدا حدیثیں ہیں۔ پس یہ کیونکر ممکن ہو کہ سب کے خیالات کی وہ تصدیق کرے۔ اگر اہلحدیث کی تصدیق کرے تو حنفی ناراض ہوں گے۔ اگر حنفیوں کی تصدیق کرے تو شافعی بگڑ جائیں گے۔ اور شیعہ جدا یہ اصول ٹھیرائیں گے کہ اُن کے عقیدہ کے موافق وہ ظاہر ہو۔ اس صورت میں وہ کیونکر سب کو خوش کر سکتا ہے۔ علاوہ اس کے خود حَکَمْ کا لفظ چاہتا ہے کہ وہ ایسے وقت آئیگا کہ جب تمام فرقے کچھ نہ کچھ حق سے دُور جا پڑینگے۔

اس صورت میں اپنی اپنی حدیثوں کے ساتھ اس کو آزمانا سخت غلطی ہے بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو نشان اور قرار دادہ علامتیں اس کے وقت میں ظاہر ہو جائیں اُن سے فائدہ اٹھائیں اور باقی کو موضوع اور انسانی افتراء سمجھیں۔ یہی قاعدہ ان نیک بخت یہودیوں نے برتا جو مسلمان ہو گئے تھے۔ کیونکہ جو جو باتیں مقرر کردہ احادیثِ یہود وقوع میں آگئیں اور آنحضرتؐ پر صادق آگئیں اُن حدیثوں کو انہوں نے صحیح سمجھا اور جو پوری نہ ہوئیں اُن کو موضوع قرار دیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو پھر نہ حضرت عیسیٰ کی نبوت یہودیوں کے نزدیک ثابت ہو سکتی۔ نہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت۔ جو لوگ مسلمان ہوئے تھے انہیں یہود کی صدہا جھوٹی حدیثوں کو چھوڑنا پڑا جب انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف بعض علامات قرار دادہ پوری ہو گئیں اور ایک طرف تائیداتِ الٰہیہ کا خدا کے رسول میں ایک دریا جاری ہے تو انہوں نے اُن حدیثوں سے فائدہ اٹھایا جو پوری ہو گئیں۔ اگر ایسا نہ کرتے تو ایک شخص بھی اُن میں سے مسلمان نہ ہو سکتا۔ ....

اب رہا میرا دعویٰ! سو میرے دعویٰ کے ساتھ اس قدر دلائل ہیں کہ کوئی انسان نرا بے حیا نہ ہو تو اس کے لئے اس سے چارہ نہیں ہے کہ میرے دعویٰ کو اسی طرح مان لے جیسا کہ اس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو مانا ہے۔ کیا یہ دلائل میرے دعویٰ کے ثبوت کیلئے کم ہیں کہ

میری نسبت قرآن نے اس قدر پورے پورے قرائن اور علامات کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ ایک طور سے میرا نام بتلا دیا ہے اور حدیثوں میں کدعہ کے لفظ سے میرے گاؤں کا نام موجود ہے اور حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس مسیح موعود کی تیرھویں صدی میں پیدائش ہوگی اور چودھویں صدی میں اس کا ظہور ہوگا۔ اور صحیح بخاری میں میرا تمام حلیہ لکھا ہے۔ اور پہلے مسیح کی نسبت جو بڑا مرکز مشرق یعنی بلند قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ مسیح موعود دمشق سے مشرق کی طرف ظاہر ہوگا۔ سو قادیان دمشق سے مشرق کی طرف ہے۔ اور پھر دعویٰ کے وقت میں اور لوگوں کی تکذیب کے دنوں میں آسمان پر رمضان کے مہینے میں کسوف خسوف ہونا۔ زمین پر طاعون کا پھیلنا۔ حدیث اور قرآن کے مطابق ریل کی سواری پیدا ہو جانا۔ اونٹ بے کار ہو جانے۔ حج روکا جانا۔ صلیب کے غلبہ کا وقت ہونا میرے ہاتھ پر صدہا نشانوں کا ظاہر ہونا۔ نبیوں کے مقرر کردہ وقت مسیح موعود کے لئے یہی وقت ہونا صدی کے سر پر میرا مبعوث ہونا۔ ہزارہا نیک لوگوں کا میری تصدیق کے لئے خوابیں دیکھنا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف کا یہ فرمانا کہ وہ مسیح موعود میری اُمت میں سے پیدا ہوگا اور خدا تعالیٰ کی تائیدات کا میرے شامل حال ہونا۔ اور ہزارہا لوگوں کا دو لاکھ کے قریب میرے ہاتھ پر بیعت کرکے راستبازی اور پاک دلی اختیار کرنا اور میرے وقت میں عیسائی مذہب میں ایک عام تزلزل پڑنا یہاں تک کہ تثلیث کی طلسم کا برف کی طرح گداز ہونا شروع ہو جانا اور میرے وقت میں مسلمانوں کا بہت فرقوں میں منقسم ہو کر تنزل کی حالت میں ہونا اور طرح طرح کی بدعات اور شرک اور میخواری اور حرامکاری اور خیانت اور دروغگوئی دنیا میں شائع ہو کر ایک عام تغیر دنیا میں پیدا ہو جانا۔ اور ہر ایک پہلو سے انقلاب عظیم اس عالم میں پیدا ہو جانا۔ اور ہر ایک دانشمند کی شہادت سے دنیا کا ایک مصلح کا محتاج ہونا۔ اور میرے مقابلہ سے خواہ اعجازی کلام میں خواہ آسمانی نشانوں سے تمام لوگوں کا عاجز آجانا اور میری تائید میں خدا تعالیٰ کی [illegible] کھلی پیشگوئیاں پوری ہونا یہ تمام نشان اور علامات اور قرائن ایک خدا ترس کے لئے میرے قبول کرنے کے لئے کافی ہیں۔

(تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۲۹ - ۳۹ طبع اول)

اگر یہ عاجز مسیح موعود ہونے کے دعوے میں غلطی پر ہے تو آپ لوگ کچھ کوشش کریں کہ مسیح موعود جو آپ کے خیال میں ہے انہی دنوں میں آسمان سے اُتر آوے۔ کیونکہ میں تو اس وقت موجود ہوں مگر جس کے انتظار میں آپ لوگ ہیں وہ موجود نہیں اور میرے دعویٰ کا ٹوٹنا صرف اسی صورت میں متصور ہے کہ

اب وہ آسمان سے اُتر ہی آوے تا میں ملزم ٹھیر سکوں۔ آپ لوگ اگر سچ پر ہیں تو سب مل کر دُعا کریں۔ کہ مسیح ابن مریم جلد آسمان سے اُترتے دکھائی دیں۔ اگر آپ حق پر ہیں تو یہ دُعا قبول ہو جائیگی کیونکہ اہل حق کی دُعا مبطلین کے مقابل پر مقبول ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن آپ یقیناً سمجھیں کہ یہ دُعا ہرگز قبول نہیں ہوگی کیونکہ آپ غلطی پر ہیں۔ مسیح تو آچکا لیکن آپ نے اس کو شناخت نہیں کیا۔ اب یہ اُمید موہوم آپ کی ہرگز پوری نہیں ہوگی۔ یہ زمانہ گذر جائیگا اور کوئی ان میں سے مسیح کو اُترتے نہیں دیکھے گا۔

(ازالہ اوہام ص۹)

یاد رہے کہ **جو شخص اُترنے والا تھا وہ عین وقت پر اُتر آیا۔ اور آج تمام نوشتے پورے ہوگئے** تمام نبیوں کی کتابیں اسی زمانے کا حوالہ دیتی ہیں .... اب ان تمام نشانوں کے بعد جو **مجھے** ردّ کرتا ہے وہ **مجھے** نہیں **بلکہ** تمام نبیوں کو ردّ کرتا ہے اور خدا تعالیٰ سے جنگ کر رہا ہے **اگر وہ پیدا نہ ہوتا تو اس کے لئے بہتر تھا۔**

(تذکرۃ الشہادتین ص۲۲ طبع اوّل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلّی

پنجاب اور ہندوستان کے مشائخ اور صلحاء اور اہل اللہ باصفا
سے حضرت عزت اللہ جلّ شانہٗ کی قسم دے کر ایک
درخواست

اے بزرگانِ دین! وعباد اللہ الصالحین! میں اس وقت اللہ جلّ شانہٗ کی قسم دیکر ایک ایسی درخواست آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس پر توجہ کرنا آپ صاحبوں پر رفع فتنہ وفساد کے لئے فرض ہے کیونکہ آپ لوگ فراست اور بصیرت رکھتے ہیں۔ اور نہ صرف اٹکل سے بلکہ نور اللہ سے دیکھتے ہیں اور اگرچہ ایسے ضروری امر میں جس میں تمام مسلمانوں کی ہمدردی ہے اور اسلام کے ایک بڑے بھاری تفرقہ کو مٹانا ہے قسم کی کچھ بھی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ بعض صاحب ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اپنے بعض مصالح کی وجہ سے خاموش رہنا پسند کرتے ہیں کہ خیال کرتے ہیں سچی شہادت میں عام لوگوں کی ناراضگی متصوّر ہے۔ اور جھوٹ بولنے میں معصیت ہے۔ اور نہیں سمجھتے کہ اخفاء شہادت بھی ایک معصیت ہے ان لوگوں کو توجہ دلانے کے لئے قسم دینے کی ضرورت پڑی۔

اے بندگانِ دین! وہ امر جس کے لئے آپ صاحبوں کو اللہ جلّ شانہٗ کی قسم دے کر اس کے کرنے کیلئے آپ کو مجبور کرتا ہوں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے عین ضلالت اور فتنہ کے وقت میں اس عاجز کو **چودھویں صدی** کے سر پر اصلاح خلق کے لئے **مجدّد** کر کے بھیجا۔ اور چونکہ اس صدی کا بھارا فتنہ جس نے اسلام کو نقصان پہنچایا تھا عیسائی پادریوں کا فتنہ تھا اس لئے خدا تعالےٰ نے اس عاجز کا نام **مسیح موعود** رکھا .... اور اس عاجز کو چودھویں صدی کے سر پر بھیجا۔ اور وہ آسمانی حربہ مجھے عطا کیا جس سے مَیں صلیبی مذہب کو توڑ سکوں۔ مگر افسوس کہ اس ملک کے کوتہ اندیش علماء نے مجھے قبول نہیں کیا اور نہایت بیہودہ عذرات پیش کئے جن کو ہر ایک پہلو سے توڑا گیا۔ .... اور میرے بیان کے صدق پر اللہ جلّ شانہٗ نے کئی طرح کے نشان ظاہر فرمائے اور چاند سورج کو میری تصدیق کے لئے خسوف کسوف کی حالت میں رمضان میں جمع کیا اور مخالفین سے کشتی کی طرح مقابلہ کرا کے آخر ہر ایک میدان میں اعجازی طور پر مجھے فتح دی اور دوسرے بہت سے نشان دکھلائے جن کی تفصیل رسالہ سراج منیر اور دوسرے رسالوں میں درج ہے۔ لیکن باوجود نصوصِ قرآنیہ و حدیثیہ و شواہد عقلیہ و آیاتِ سماویہ پھر بھی ظالم طبع مخالف اپنے ظلم سے باز نہ آئے اور طرح طرح کے افتراؤں سے مدد لے کر محض ظلم کے رو سے تکذیب کر رہے ہیں۔ لہٰذا اب مجھے اتمام حجت کے لئے ایک اَور تجویز خیال میں آئی ہے۔ اور امید رکھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ اس میں برکت ڈالدے اور یہ تفرقہ جس نے ہزارہا مسلمانوں میں سخت عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے رو باصلاح ہو جائے۔

اور وہ یہ ہے

کہ پنجاب اور ہندوستان کے تمام مشائخ اور فقراء اور صلحاء اور مردانِ باصفا کی خدمت میں اللہ جلّ شانہٗ کی قسم دے کر التجا کی جائے کہ وہ میرے بارے میں اور میرے دعوے کے بارے میں دُعا اور تضرع اور استخارہ سے جناب الٰہی میں توجہ کریں۔ پھر اگر اُن کے الہامات اور کشوف اور رؤیاء صادقہ سے جو حلفاً شائع کریں کثرت اس طرف نکلے کہ گویا یہ عاجز کذّاب اور مفتری ہے تو بیشک تمام لوگ مجھے مردود اور مخذول اور ملعون اور مفتری اور کذاب خیال کر لیں اور جس قدر چاہیں لعنتیں بھیجیں اُن کو کچھ بھی گناہ نہیں ہوگا۔ اور اس صورت میں ہر ایک ایماندار کو لازم ہوگا کہ مجھ سے پرہیز کرے۔ اور اس تجویز سے بہت آسانی کے ساتھ مجھ پر اور میری جماعت پر وبال آجائیگا۔ لیکن اگر کشوف اور الہامات اور رؤیا صادقہ کی کثرت اس طرف ہو کہ یہ عاجز من جانب اللہ اور اپنے دعویٰ میں

سچا ہے تو پھر ہر ایک خدا ترس پر لازم ہوگا کہ میری پیروی کرے اور تکفیر اور تکذیب سے باز آوے ظاہر ہے کہ ہر ایک شخص کو آخر ایک دن مرنا ہے۔ پس اگر حق کے قبول کرنے کے لئے اس دنیا میں کوئی ذلّت بھی پیش آوے تو وہ آخرت کی ذلّت سے بہتر ہے لہٰذا میں تمام مشائخ اور فقراء اور صلحاء پنجاب اور ہندوستان کو اللہ جلّ شانہٗ کی قسم دیتا ہوں جس کے نام پر گردن رکھ دینا سچے دینداروں کا کام ہے کہ وہ میرے بارے میں جناب الٰہی میں کم سے کم اکیس روز توجہ کریں۔ یعنی اس صورت میں کہ اکیس روز سے پہلے کچھ معلوم نہ ہو سکے اور خدا سے انکشاف اس حقیقت کا چاہیں کہ میں کون ہوں؟ آیا کذّاب ہوں یا من جانب اللہ۔ میں بار بار بزرگانِ دین کی خدمت میں اللہ جلّ شانہٗ کی قسم دے کر یہ سوال کرتا ہوں کہ ضرور اکیس۲۱ روز تک اگر اس کے پہلے معلوم نہ ہو سکے اس تفرقہ کے دُور کرنے کے لئے دُعا اور توجہ کریں۔ میں یقیناً جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی قسم سُنکر پھر التفات نہ کرنا راستبازوں کا کام نہیں۔ اور میں جانتا ہوں کہ اس قسم کو سُن کر ہر ایک پاک دل اور خدا تعالیٰ کی عظمت سے ڈرنے والا ضرور توجہ کرے گا۔ پھر ایسی الہامی شہادتوں کے جمع ہونے کے بعد جس طرف کثرت ہوگی وہ امر من جانب اللہ سمجھا جاوے گا۔ اگر میں حقیقت میں کذّاب اور دجّال ہوں تو اس اُمت پر بڑی مصیبت ہے کہ ایسی ضرورت کے وقت میں اور فتنوں اور بدعات اور مفاسد کے طوفان کے زمانہ میں بجائے ایک مصلح اور مجدّد کے چودھویں صدی کے سر پر دجّال پیدا ہوا۔ یاد رہے کہ ایسا ہر ایک شخص جس کی نسبت ایک جماعت اہلِ بصیرت مسلمانوں کی صلاح اور تقویٰ اور پاک دلی کا ظن رکھتی ہے۔ وہ اس اشتہار میں میرا مخاطب ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ جو صلحاء شہرت کے لحاظ سے کم درجہ ہیں میں اُن کو کم نہیں دیکھتا ممکن ہے کہ وہ شہرت یافتہ لوگوں سے خدا تعالیٰ کی نظر میں زیادہ اچھے ہوں۔ اسی طرح میں صالحہ عفیفہ عورتوں کو بھی مردوں کی نسبت تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ممکن ہے کہ بعض شہرت یافتہ صالح مَردوں سے بھی اچھی ہوں لیکن ہر ایک صاحب جو میری نسبت کوئی رؤیا یا کشف یا الہام لکھیں اُن پر ضروری طور پر واجب ہوگا کہ وہ حلفاً اپنی دستخطی تحریر سے مجھ کو اطلاع دیں تا ایسی تحریریں ایک جگہ جمع ہوتی جائیں اور پھر حق کے طالبوں کے لئے شائع کی جائیں۔ اس تجویز سے انشاء اللہ بندگانِ خدا کو بہت فائدہ ہوگا اور مسلمانوں کے دل کثرتِ شواہد سے ایک طرف تسلّی پا کر فتنہ سے نجات پا جائیں گے۔ اور اَور آثارِ نبویہ میں بھی اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اوّل مہدیٔ آخر الزمان کی تکفیر کی جائیگی اور لوگ اس سے دشمنی کرینگے اور نہایت درجہ کی بدگوئی سے پیش آئیں گے اور آخر خدا تعالیٰ کے نیک بندوں کو اس کی سچائی کی نسبت بذریعہ رؤیا و الہام وغیرہ

اطلاع دی جائیگی ۔ اور دوسرے آسمانی نشان بھی ظاہر ہونگے ۔ تب علماءِ وقت طوعًا وکرہًا اس کو قبول کرینگے ۔ سو اے عزیزو اور بزرگو! برائے خدا عالم الغیب کی طرف توجہ کرو ۔ آپ لوگوں کو اللہ جلّ شانہٗ کی قسم ہے کہ میرے سوال کو مان لو ۔ اس قدیر ذوالجلال کی تمہیں سوگند ہے کہ اس عاجز کی یہ درخواست ردّ مت کرو ۔

عزیزان مے دہم صدبار سوگند
بروئے عضرتِ داوار سوگند
کہ در کارم جواب از حق بجوئید
بہ محبوب دلِ ابرار سوگند!

ھٰذا ما اردنا لازالۃ الدّجٰی ۔ والسلام علٰی من اتبع الھدٰی ۔

الملتمس خاکسار میرزا غلام احمد از قادیان

ضلع گورداسپور پنجاب ۔ ۱۵ر جولائی ۱۸۹۷ء

(تبلیغ رسالت جلد ششم صفحہ ۱۴۴-۱۵۱)

واضح ہو کہ یہ بات نہایت صاف اور روشن ہے کہ جنہوں نے اس عاجز کا مسیح موعود ہونا مان لیا ہے وہ لوگ ہر ایک خطرہ کی حالت سے محفوظ اور معصوم ہیں ۔ اور کئی طرح کے ثواب اور اجر اور قوتِ ایمانی کے وہ مستحق ٹھیر گئے ہیں ۔

اوّل یہ کہ انہوں نے اپنے بھائی پر حسنِ ظنّ کیا ہے ۔ اور اس کو مفتری یا کذّاب نہیں ٹھیرایا اور اس کی نسبت کسی طرح کے شکوک فاسدہ کو دل میں جگہ نہیں دی اور اس وجہ سے اس ثواب کا انہیں استحقاق حاصل ہوا کہ جو بھائی پر نیک ظن رکھنے کی حالت میں ملتا ہے ۔

دوسری یہ کہ وہ حق کے قبول کرنے کے وقت کسی ملامت کنندہ کی ملامت سے نہیں ڈرے اور نہ نفسانی جذبات اُن پر غالب ہو سکے اس وجہ سے وہ ثواب کے مستحق ٹھیر گئے کہ انہوں نے دعوتِ حق کو پا کر ایک ربّانی مناد کی آواز کو سُنکر پیغام کو قبول کر لیا ۔ اور کسی طرح کی روک سے نہیں رُک سکے ۔

تیسری یہ کہ پیشگوئی کے مصداق پر ایمان لانے کی وجہ سے وہ ان تمام وساوس سے مخلصی پا گئے ۔ کہ جو انتظار کرتے کرتے ایک دن پیدا ہو جاتے ہیں ۔ اور آخر یاس کی حالت میں ایمان دُور ہو جانے کا موجب ٹھیرتے ہیں ۔ اور ان سعید لوگوں نے نہ صرف خطرات مذکورہ بالا سے مخلصی پائی بلکہ خدا تعالٰی کا ایک نشان اور اس کے نبی کی پیشگوئی اپنی زندگی میں پوری ہوتی دیکھ کر ایمانی قوت میں بہت ترقی

کر گئے ۔ اور ان کے سماعی ایمان پر ایک معرفت کا رنگ آگیا ۔ اب وہ ان تمام حیرتوں سے چھوٹ گئے جو ان پیشگوئیوں کے بارے میں دلوں میں پیدا ہوا کرتی ہیں جو پوری ہونے میں نہیں آتیں ۔

چوتھی یہ کہ خدائے تعالیٰ کے بھیجے ہوئے بندہ پر ایمان لاکر اس سخط اور غضب الٰہی سے بچ گئے جو ان نافرمانوں پر ہوتا ہے کہ جن کے حصّہ میں بجز تکذیب و انکار کے اَور کچھ نہیں ۔

پانچویں یہ کہ وہ ان فیوض و برکات کے مستحق ٹھہر گئے جو ان مخلص لوگوں پر نازل ہوتے ہیں جو حسنِ ظن سے اس شخص کو قبول کر لیتے ہیں کہ جو خدائے تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے ۔

یہ تو وہ فوائد ہیں کہ جو انشاء اللہ الکریم ان سعید لوگوں کو بفضلہ تعالیٰ ملیں گے جنہوں نے اِس عاجز کو قبول کر لیا ہے ۔ لیکن جو لوگ قبول نہیں کرتے وہ اُن تمام سعادتوں سے محروم ہیں ۔ اور اُن کا یہ وہم بھی لغو ہے کہ قبول کرنے کی حالت میں نقصانِ دین کا اندیشہ ہے ۔ مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ نقصان دین کس وجہ سے ہو سکتا ہے ۔ نقصان تو اس صورت میں ہوتا کہ اگر یہ عاجز برخلاف تعلیم اسلام کے کسی اور نئی تعلیم پر چلنے کے لئے انہیں مجبور کرتا ۔ مثلاً کسی حلال چیز کو حرام یا حرام کو حلال بتلاتا یا ان ایمانی عقائد میں جو نجات کے لئے ضروری ہیں کچھ فرق ڈالتا یا یہ کہ صوم و صلوٰۃ و حج و زکوٰۃ وغیرہ اعمال شرعیہ میں کچھ بڑھاتا یا گھٹا دیتا ۔ مثلاً پانچوقت کی نماز کی جگہ دس وقت کی نماز کر دیتا یا دو وقت ہی رہنے دیتا ۔ یا ایک مہینہ کی جگہ دو مہینے کے روزے فرض کر دیتا یا اس سے کم کی طرف توجہ دلاتا ۔ تو بے شک سراسر نقصان بلکہ کفر و خسران تھا ۔ لیکن جس حالت میں یہ عاجز بار بار یہی کہتا ہے کہ اے بھائیو ! مَیں کوئی نیا دین یا نئی تعلیم لے کر نہیں آیا ۔ بلکہ مَیں بھی تم میں سے اور تمہاری طرح ایک مسلمان ہوں اور ہم مسلمانوں کے لئے بجز قرآن شریف کے اور کوئی دوسری کتاب نہیں جس پر عمل کریں یا عمل کرنے کے لئے دوسروں کو ہدایت دیں اور بجز جناب ختم المرسلین احمد عربی صلعم کے اَور کوئی ہمارے لئے ہادی اور مقتدا نہیں جس کی پیروی ہم کریں یا دوسروں سے کرانا چاہیں تو پھر ایک متدیّن مسلمان کے لئے میرے اس دعویٰ پر ایمان لانا جس کی الہام الٰہی پر بنا ہے کونسی اندیشہ کی جگہ ہے ۔ بفرضِ محال اگر میرا یہ کشف اور الہام غلط ہے اور جو کچھ مجھے حکم ہو رہا ہے اس کے سمجھنے میں مَیں نے دھوکہ کھایا ہے تو ماننے والے کا اس میں ہرج ہی کیا ہے ۔ کیا اس نے کوئی ایسی بات مان لی ہے جس کی وجہ سے اس کے دین میں کوئی رخنہ پیدا ہو سکتا ہے ۔ اگر ہماری زندگی میں سچ مچ حضرت مسیح ابن مریم ہی آسمان سے اُتر آئے تو دل ما شاد و چشم ما روشن ۔ ہم اور ہمارا گروہ سب سے پہلے ان کو قبول کرے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ورنہ دوسری صورت میں ایمان سلامت

رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ اگر آخیر زندگی تک کوئی آدمی آسمان سے اُترتا انہیں دکھائی نہ دیا بلکہ اپنی ہی تیاری آسمان کی طرف جانے کی ٹھہر گئی تو ظاہر ہے کہ کیا کیا شکوک و شبہات ساتھ لے جائیں گے۔ اور نبیٔ صادق کی پیشگوئی کے بارہ میں کیا کیا وساوس دل میں پڑیں گے۔ اور قریب ہے کہ کوئی ایسا وسوسہ پڑ جائے کہ جس کے ساتھ ایمان ہی برباد ہو۔ کیونکہ یہ وقت انجیل اور احادیث کے ارشادات کے مطابق وہی وقت ہے جس میں مسیح اُترنا چاہیئے۔ اسی وجہ سے سلف صالح میں سے بہت سے صاحب مکاشفات مسیح کے آنے کا وقت چودھویں صدی کا شروع سال بتا گئے ہیں۔

(ازالہ اوہام ص ۸۶ - ۸۸)

کیا وہ جو خدا کی طرف سے ہے لوگوں کی بدگوئی اور سخت عداوت سے ضائع ہو سکتا ہے ؟

تا دلِ مردِ خدا نامد بدرد
ہیچ قومے را خدا رُسوا نکرد

یہ کچھ قضا و قدر کی بات ہے کہ بد اندیش لوگوں کو اپنے پوشیدہ کینوں کے ظاہر کرنے کیلئے کوئی نہ کوئی بہانہ ہاتھ آجاتا ہے۔ چنانچہ آجکل ہمارے مخالفوں کو گالیاں دینے کے لئے یہ نیا بہانہ ہاتھ آگیا ہے کہ انہوں نے ہمارے ایک اشتہار کے اُلٹے معنے کرکے یہ مشہور کر دیا ہے کہ گویا ہم سلطانِ روم اور اس کی سلطنت اور دولت کے سخت مخالف ہیں اور اس کا زوال چاہتے ہیں۔ اور انگریزوں کی حد سے زیادہ خوشامد کرتے ہیں اور انگریزی سلطنت کی دولت اور اقبال کے لئے دُعائیں کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب اور ہندوستان کے اکثر حصّوں میں بعض پُر افترا اشتہاروں کے ذریعہ سے یہ خیال بہت پھیلایا گیا ہے اور عوام کو دھوکا دینے کے لئے ہمارے اشتہار کی بعض عبارتیں محرّف اور مبدّل کر کے لکھی گئی ہیں اور اس طرح پر بے وقوفوں کے دلوں کو جوش دلانے اور اُبھارنے کے لئے کارروائی کی گئی ہے۔ اور ہم اگرچہ جعلسازوں اور دروغگوؤں کا مُنہ تو بند نہیں کرسکتے اور نہ اُن کی بدزبانی اور گالیوں اور ڈوموں کی طرح تمسخر اور ٹھٹھے کا مقابلہ کرسکتے ہیں تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ظالمانہ بدزبانی کو خدا تعالیٰ کی غیرت کے حوالے کرکے اُن کے اصل مدعا کو جو دھوکا دہی ہے نادانوں پر اثر ڈالنے سے روکا جائے۔ پس اِسی غرض سے یہ اشتہار شائع کیا جاتا ہے۔

ہر ایک مسلمان عقلمند بھلا مانس نیک فطرت جو اپنی شرافت سے سچی بات کو قبول کرنے کیلئے تیار ہوتا ہے اس بات کو متوجہ ہو کر سُنے کہ ہم کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کلمہ گو سے بھی کینہ نہیں رکھتے چہ جائیکہ ایسے شخص سے کینہ ہو جس کی ظلّ حمایت میں کروڑہا اہل قبلہ زندگی بسر کرتے ہیں اور جس کی حفاظت کے نیچے خدا تعالے نے اپنے مقدس مکانوں کو سپرد کر رکھا ہے۔ سلطان کی شخصی حالت اور اس کی ذاتیات کے متعلق نہ ہم نے کبھی کوئی بحث کی اور نہ اب ہے۔ بلکہ اللہ جلّ شانہٗ جانتا ہے کہ ہمیں اس موجودہ سلطان کے بارے میں اُس کے باپ دادے کی نسبت زیادہ حسن ظن ہے۔ ہاں ہم نے گذشتہ اشتہارات میں ترکی گورنمنٹ پر بلحاظ اس کے بعض عظیم الدخل اور خراب اندرون ارکان اور عمائد اور وزراء کے نہ بلحاظ سلطان کی ذاتیات کے ضرور اُس خداداد نور اور فراست اور الہام کی تحریک سے جو ہمیں عطا ہوا ہے چند ایسی باتیں لکھی ہیں جو خود ان کے مفہوم کے خوفناک اثر سے ہمارے دل پر ایک عجیب رِقّت اور درد طاری ہوتی ہے۔ سو ہماری وہ تحریر جیسا کہ گندے خیال والے سمجھتے ہیں کسی نفسانی جوش پر مبنی نہ تھی بلکہ اس روشنی کے چشمہ سے نکلی تھی جو رحمتِ الٰہی نے ہمیں بخشا ہے۔ اگر ہمارے تنگ ظرف مخالف بدظنّی پر سرنگوں نہ ہوتے تو سلطان کی حقیقی خیر خواہی اس میں نہ تھی کہ وہ چوہڑوں اور چماروں کی طرح گالیوں پر کمر باندھتے بلکہ چاہیئے تھا کہ آیت ولا تقف ما لیس لک بہ علم پر عمل کر کے اور نیز آیت انّ بعض الظنّ اثم کو یاد کر کے سلطان کی خیر خواہی اس میں دیکھتے کہ اس کے لئے صدق دل سے دُعا کرتے۔ میرے اشتہار کا بجز اس کے کیا مطلب تھا کہ رومی لوگ تقویٰ اور طہارت اختیار کریں کیونکہ آسمانی قضاء قدر اور عذاب سماوی کے روکنے کے لئے تقویٰ اور توبہ اور اعمالِ صالحہ جیسی اور کوئی چیز قوی تر نہیں۔ مگر سلطان کے نادان خیر خواہوں نے بجائے اس کے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اور بعضوں نے کہا کہ کیا سارے گناہ سلطان پر ٹوٹ پڑے اور یورپ مقدس اور پاک ہے جس کے عذاب کے لئے کوئی پیشگوئی نہیں کی جاتی۔ مگر وہ نادان نہیں سمجھتے کہ سنّت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ کفّار کے فسق و فجور اور بُت پرستی اور انسان پرستی کی سزا دینے کے لئے خدا تعالیٰ نے ایک دوسرا عالم رکھا ہوا ہے جو مرنے کے بعد پیش آئیگا۔ اور ایسی قوموں کو جو خدا پر ایمان نہیں رکھتیں اسی دنیا میں موردِ عذاب کرنا خدا تعالیٰ کی عادت نہیں ہے۔ بجز اس صورت کے کہ وہ لوگ اپنے گناہ میں حد سے زیادہ تجاوز کریں اور خدا کی نظر میں سخت ظالم اور موذی اور مفسد ٹھہر جائیں۔ جیسا کہ قومِ نوح اور قومِ لوط اور قوم فرعون وغیرہ مفسد قومیں متواتر بے باکیاں کر کے مستوجب سزا ہو گئی تھیں۔ لیکن خدا تعالیٰ مسلمانوں کی بیباکی کی سزا کو

دوسرے جہان پر نہیں چھوڑتا بلکہ مسلمانوں کو ادنیٰ ادنیٰ قصور کے وقت اِسی دنیا میں تنبیہہ کی جاتی ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے آگے اُن بچوں کی طرح ہیں جن کی والدہ ہر دم جھڑکیاں دے کر انہیں ادب سکھاتی ہے اور خدا تعالیٰ اپنی محبت سے چاہتا ہے کہ وہ اس ناپائیدار دنیا سے پاک ہو کر جاویں یہی باتیں تھیں کہ مَیں نے نیک نیتی سے سفیرِ روم پر ظاہر کی تھیں مگر افسوس کہ بیوقوف مسلمانوں نے ان باتوں کو اَور طرف کھینچ لیا ۔ ان نادانوں کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک حاذق ڈاکٹر کہ جو تشخیصِ امراض اور قواعدِ حفظِ ماتقدم کو بخوبی جانتا ہے وہ کسی شخص کی نسبت کمال نیک نیتی سے یہ رائے ظاہر کرے کہ اس کے پیٹ میں ایک قسم کی رسولی نے بڑھنا شروع کر دیا ہے اور اگر ابھی وہ رسولی کاٹی نہ جائے تو ایک عرصہ کے بعد اس شخص کی زندگی اس کے لئے وبال ہو جائے گی تب اس بیمار کے وارث اس بات کو سُن کر اُس ڈاکٹر پر سخت ناراض ہوں لور اس ڈاکٹر کے قتل کر دینے کے درپے ہو جائیں مگر رسولی کا کچھ بھی فکر نہ کریں یہاں تک کہ وہ رسولی بڑھے اور پھولے لور تمام پیٹ میں پھیل جائے ۔ لور اس بیچارے بیمار کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے ۔ سو یہی مثال ان لوگوں کی ہے جو اپنی دانست میں سلطان کے خیر خواہ کہلاتے ہیں ۔

پھر یہ بھی سوچو کہ جس حالت میں مَیں وہ شخص ہوں جو اس مسیح موعود ہونیکا دعویٰ رکھتا ہوں جس کی نسبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے کہ " وہ تمہارا امام اور خلیفہ ہے اور اُس پر خدا اور اس کے نبی کا سلام ہے اور اُس کا دشمن لعنتی اور اس کا دوست خدا کا دوست ہے اور وہ تمام دنیا کے لئے حَکَم ہو کر آئیگا اور اپنے تمام قول اور فعل میں عادل ہوگا " تو کیا یہ تقویٰ کا طریق تھا کہ میرے دعویٰ کو سُنکر اور میرے نشانوں کو دیکھکر اور میرے ثبوتوں کا مشاہدہ کر کے مجھے یہ صلہ دیتے کہ گندی گالیاں اور ٹھٹھے اور ہنسی سے پیش آتے ؟ کیا نشان ظاہر نہیں ہوئے ؟ کیا آسمانی تائیدیں ظہور میں نہیں آئیں ؟ کیا اُن سب وقتوں اور موسموں کا پتہ نہیں لگ گیا جو احادیث اور آثار میں بیان کی گئی تھیں ؟ تو پھر اس قدر کیوں بیباکی دکھلائی گئی ؟ ہاں اگر میرے دعویٰ میں اب بھی شک تھا یا میرے دلائل اور نشانوں میں کچھ شبہ تھا تو غربت اور نیک نیتی اور خدا ترسی سے اُس شبہ کو دُور کرایا ہوتا مگر انہوں نے بجائے تحقیق اور تفتیش کے اسقدر گالیاں اور لعنتیں بھیجیں کہ شیعوں کو بھی پیچھے ڈال دیا ۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ جو کچھ مَیں نے رومی سلطنت کے اندرونی نظام کی نسبت بیان کیا وہ دراصل صحیح ہو ۔ اور ترکی گورنمنٹ کے شیرازہ میں ایسے دھاگے بھی ہوں جو وقت پر ٹوٹنے والے اور غداری سرشت

ظاہر کرنے والے ہوں۔

پھر ماسوا اس کے میرے مخالف اپنے دلوں میں آپ ہی سوچیں کہ اگر مَیں درحقیقت وہی مسیح موعود ہوں جس کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک بازو قرار دیا ہے اور جس کو سلام بھیجا ہے اور جس کا نام حَکَمْ اور عدل اور امام اور خلیفۃ اللہ رکھا ہے تو کیا ایسے شخص پر ایک معمولی بادشاہ کیلئے لعنتیں بھیجنا، اُس کو گالیاں دینا جائز تھا؟ ذرا اپنے جوش کو تھام کے سوچیں نہ میرے لئے بلکہ اللہ اور رسول کے لئے کہ کیا ایسے مدعی کے ساتھ ایسا کرنا روا تھا؟ مَیں زیادہ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ میرا مقدمہ تم سب کے ساتھ آسمان پر ہے۔ اگر مَیں وہی ہوں جس کا وعدہ نبیؐ کے پاک لبوں نے دیا تھا تو تم نے نہ میرا بلکہ خدا کا گناہ کیا ہے۔ اور اگر پہلے سے آثار صحیحہ میں یہ وارد نہ ہوتا کہ اس کو دُکھ دیا جائیگا اور اس پر لعنتیں بھیجی جائیں گی تو تم لوگوں کی مجال نہ تھی جو تم مجھے وہ دُکھ دیتے جو تم نے دیا۔ پر ضرور تھا کہ وہ سب نوشتے پورے ہوں جو خدا کی طرف سے لکھے گئے تھے اور اب تک تمہیں ملزم کرنے کے لئے تمہاری کتابوں میں موجود ہیں جن کو تم زبان سے پڑھتے اور پھر تکفیر اور لعنت کرکے مُہر لگا دیتے ہو کہ وہ بدعلماء اور ان کے دوست جو مہدی کی تکفیر کرینگے اور مسیح سے مقابلہ سے پیش آئیں گے وہ تم ہی ہو۔

مَیں نے بار بار کہا کہ آؤ اپنے شکوک مٹا لو۔ پر کوئی نہیں آیا۔ مَیں نے فیصلہ کے لئے ہر ایک کو بلایا پر کسی نے اس طرف رُخ نہیں کیا۔ مَیں نے کہا کہ تم استخارہ کرو اور رو رو کر خدا تعالیٰ سے چاہو کہ وہ تم پر حقیقت کھولے پر تم نے کچھ نہ کیا اور تکذیب سے بھی باز نہ آئے۔ خدا نے میری نسبت سچ کہا کہ "دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔" کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص درحقیقت سچا ہو اور ضائع کیا جائے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص خدا کی طرف سے ہو اور برباد ہو جائے۔ پس اے لوگو! تم خدا سے مت لڑو۔ یہ وہ کام ہے جو خدا تمہارے لئے اور تمہارے ایمان کے لئے کرنا چاہتا ہے اس کے مزاحم مت ہو۔ اگر تم بجلی کے سامنے کھڑے ہو سکتے ہو مگر خدا کے سامنے تمہیں ہرگز طاقت نہیں۔ اگر یہ کاروبار انسان کی طرف سے ہوتا تو تمہارے حملوں کی کچھ بھی حاجت نہ تھی خدا اس کے نیست و نابود کرنے کے لئے خود کافی تھا۔ افسوس کہ آسمان گواہی دے رہا ہے اور تم نہیں سُنتے اور زمین "ضرورت ضرورت" بیان کر رہی ہے اور تم نہیں دیکھتے! اے بدبخت قوم! اُٹھ اور دیکھ کہ اس مصیبت کے وقت میں

جو اسلام پیروں کے نیچے کچلا گیا اور مجرموں کی طرح بے عزت کیا گیا۔ وہ جھوٹوں میں شمار کیا گیا۔ وہ ناپاکوں میں لکھا گیا۔ تو کیا خدا کی غیرت ایسے وقت میں جوش نہ مارتی۔ اب سمجھ کہ آسمان جھکتا چلا آتا ہے۔ اور وہ دن نزدیک ہیں کہ ہر ایک کان کو انا الموجود کی آواز آئے۔ ہم نے کفار سے بہت کچھ دیکھا۔ اب خدا بھی کچھ دکھلانا چاہتا ہے۔ سو اب تم دیدہ و دانستہ اپنے تئیں موردِ غضب مت بناؤ۔ کیا صدی کا سر تم نے نہیں دیکھا جس پر چودہ برس اور بھی گذر گئے؟ کیا خسوف کسوف رمضان میں تمہاری آنکھوں کے سامنے نہیں ہوا؟ کیا ستارہ ذوالسنین کے طلوع کی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی؟ کیا تمہیں اس ہولناک زلزلہ کی کچھ خبر نہیں جو مسیح کی پیشگوئی کے مطابق ان ہی دنوں میں وقوع میں آیا اور بہت سی بستیوں کو برباد کر گیا۔ اور خبر دی گئی تھی کہ اسی کے متصل مسیح بھی آئے گا؟ کیا تم نے آتھم کی نسبت وہ نشان نہیں دیکھا جو ہمارے سیّد و مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق ظہور میں آیا جس کی خبر سترہ برس پہلے کتاب براہین احمدیہ میں دی گئی تھی؟ کیا لیکھرام کی نسبت پیشگوئی اب تک تم نے نہیں سنی؟ کیا کبھی اس سے پہلے کسی نے دیکھا تھا کہ پہلوانوں کی کشتی کی طرح مقابلہ ہو کر اور لاکھوں انسانوں میں شہرت پاکر اور صدہا اشتہارات اور رسائل میں چھپ کر ایسا کھلا کھلا نشان ظاہر ہوا ہو جیسا کہ لیکھرام کی نسبت ظاہر ہوا؟ کیا تمہیں خدا سے کچھ بھی شرم نہیں آتی جس نے تمہاری تیرھویں صدی کے غم اور صدمے دیکھ کر چودھویں صدی کے آتے ہی تمہاری تائید کی؟ کیا ضرور نہ تھا کہ خدا کے وعدے عین وقت میں پورے ہوتے؟ بتلاؤ کہ ان سب نشانوں کو دیکھ کر پھر تمہیں کیا ہو گیا؟ کس چیز نے تمہارے دلوں پر مُہر لگا دی۔ اے کج دل قوم! خدا تیری ہر ایک تسلّی کر سکتا ہے۔ اگر تیرے دل میں صفائی ہو خدا تجھے کھینچ سکتا ہے اگر تو کھینچے جانے کے لئے تیار ہو۔ دیکھو یہ کیسا وقت ہے۔ کیسی ضرورتیں ہیں جو اسلام کو پیش آگئیں۔ کیا تمہارا دل گواہی نہیں دیتا کہ یہ وقت خدا کے رحم کا وقت ہے! آسمان پر بنی آدم کی ہدایت کے لئے ایک جوش ہے اور توحید کا مقدمہ حضرتِ احدیت کی پیشی میں ہے۔ مگر اس زمانہ کے اندھے اب تک بے خبر ہیں۔ آسمانی سلسلہ کی اُن کی نظر میں کچھ بھی عزت نہیں۔ کاش اُن کی آنکھیں کھلیں اور دیکھیں کہ کس کس قسم کے نشان اُتر رہے ہیں اور آسمانی تائید ہو رہی ہے اور نور پھیلتا جاتا ہے۔ مبارک وہ جو اُس کو پاتے ہیں۔

(کتاب البریہ صہ ۳۲۵ تا ۳۳۱)

الوصیّت

قال اللہ عزّوجلّ قُل ما یعبؤا بکم ربّی لولا دعاؤُکم

یعنی ان کو کہہ دے کہ میرا خدا تمہاری پروا کیا رکھتا ہے اگر تم بندگی نہ کرو اور دعاؤں میں مشغول نہ رہو

دوستو! خدا تعالیٰ آپ لوگوں کے حال پر رحم کرے۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ مَیں نے آج سے قریبًا نو ماہ پہلے الحکم اور البدر میں جو قادیان سے اخباریں نکلتی ہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے اطلاع پاکر یہ وحی الٰہی شائع کرائی تھی کہ عفت الدّیار محلّھا و مقامھا۔ یعنی یہ ملک عذاب الٰہی سے مٹ جانے کو ہے۔ نہ مستقل سکونت امن کی جگہ رہے گی اور نہ عارضی سکونت امن کی جگہ۔ یعنی طاعون کی وبا ہر جگہ عام طور پر پڑے گی اور سخت پڑے گی .... اب مَیں دیکھتا ہوں کہ وہ وقت بہت قریب آگیا ہے۔ مَیں نے اس وقت جو آدھی رات کے بعد چار بج چکے ہیں بطور کشف دیکھا ہے کہ دردناک موتوں سے عجیب طرح پر شورِ قیامت برپا ہے۔ میرے منہ پر یہ الہام الٰہی تھا کہ موتا موتی لگ رہی ہے کہ مَیں بیدار ہوگیا۔ اور اس وقت جو ابھی کچھ حصّہ رات کا باقی ہے مَیں نے یہ اشتہار لکھنا شروع کیا۔ دوستو! اُٹھو اور ہوشیار ہو جاؤ کہ اِس زمانہ کی نسل کے لئے نہایت مصیبت کا وقت آگیا ہے۔ اب اس دریا سے پار ہونے کے لئے بجز تقویٰ کے اور کوئی کشتی نہیں۔ مومن خوف کے وقت خدا کی طرف جھکتا ہے کہ بغیر اس کے کوئی امن نہیں۔ اب دُکھ اٹھاکر اور سوز و گداز اختیار کرکے اپنا کفارہ آپ دو۔ اور راستی میں محو ہوکر اپنی قربانی آپ ادا کرو۔ اور تقویٰ کی راہ میں پورے زور سے کام لے کر اپنا بوجھ آپ اٹھاؤ کہ ہمارا خدا بڑا رحیم و کریم ہے کہ رونے والوں پر اس کا غصّہ تھم جاتا ہے۔ مگر وہی جو قبل از وقت روتے ہیں۔ نہ مُردوں کی لاشوں کو دیکھکر۔ وہ خوف کرنے والوں کے سر پر سے عذاب کی پیشگوئی ٹال سکتا ہے، ...... سو نیکی کرو اور خدا کے رحم کے امیدوار ہو جاؤ۔ خدا تعالیٰ کی طرف پوری قوت کے ساتھ حرکت کرو۔ اور اگر یہ نہیں تو بیمار کی طرح افتاں خیزاں اس کی رضا کے دروازے تک اپنے تئیں پہنچاؤ۔ اور اگر یہ بھی نہیں تو مُردہ کی طرح اپنے اٹھائے جانے کا ذریعہ صدقہ خیرات کی راہ سے پیدا کرو۔ نہایت تنگی کے دن ہیں۔ اور آسمان پر خدا کا غضب بھڑک رہا ہے۔ آج محض زبانی لاف و گزاف سے تم پار نہیں ہو سکتے۔ ایسی حالت بناؤ اور ایسی تبدیلی اپنے اندر پیدا کرو اور ایسے تقویٰ کی راہ پر قدم مارو کہ وہ رحیم و کریم خوش ہو جائے۔ اپنی خلوت گاہوں کو ذکر الٰہی کی جگہ بناؤ۔ اپنے دلوں پر سے ناپاکیوں کے زنگ دُور کرو۔ بے جا کینوں اور بخلوں اور بدزبانیوں سے پرہیز کرو۔ اور قبل اس کے

کہ وہ وقت آوے کہ انسانوں کو دیوانہ سا بنا دے بے قراری کی دعاؤں سے خود دیوانے بن جاؤ۔ عجب بدبخت وہ لوگ ہیں کہ جو مذہب صرف اس بات کا نام رکھتے ہیں کہ محض زبان کی چالاکیوں پر سلدا دار و مدار ہو۔ اور دل سیاہ اور ناپاک اور دنیا کا کیڑا ہو۔ پس اگر تم اپنی خیر چاہتے ہو تو ایسے مت بنو۔ عجب بدقسمت وہ شخص ہے کہ جو اپنے نفس امّارہ کی طرف ایک نظر بھی اٹھا کر نہیں دیکھتا اور بدبودار تعصّب سے دوسروں کو بدزبانی سے پکارتا ہے۔ پس ایسے شخص پر ہلاکت کی راہ کھلی ہے۔ سو تقویٰ سے پورا حصہ لو اور خدا ترسی کا کامل وزن اختیار کرو۔ اور دعاؤں میں لگے رہو تا تم پر رحم ہو۔۔۔۔۔
دیکھو میں اس وقت اپنا فرض ادا کر چکا اور قبل اس کے کہ تنگی آوے میں نے اطلاع دیدی ہے۔

(تبلیغ رسالت جلد دہم ص۴-۵)

چونکہ میرا کام دعوت اور تبلیغ ہے۔ اس لئے میں دوبارہ ظاہر کرتا ہوں اور میں قسم حضرت احدیت جلّ شانہٗ کی کھا کر کہتا ہوں کہ میرے پر خدا نے اپنی وحی کے ذریعہ سے ظاہر فرمایا ہے کہ میرا غضب زمین پر بھڑکا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اکثر لوگ معصیّت اور دنیا پرستی میں ایسے غرق ہو گئے ہیں کہ خدائے تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں رہا۔ اور وہ جو اس کی طرف سے اصلاح خلق کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اُس سے ٹھٹھا کیا جاتا ہے۔ اور یہ ٹھٹھا اور لعن طعن حد سے گذر گیا ہے۔ پس خدا فرماتا ہے کہ میں ان سے جنگ کرونگا اور میرے وہ حملے ان پر ہوں گے جو ان کے خیال و گمان میں نہیں۔ کیونکہ انہوں نے جھوٹ سے اس قدر دوستی کی کہ سچائی کو اپنے پاؤں کے نیچے پامال کرنا چاہا۔ پس خدا فرماتا ہے کہ میں نے اب ارادہ کیا ہے کہ اپنے غریب گروہ کو ان درندوں کے حملوں سے بچاؤں اور سچائی کی حمایت میں کئی نشان ظاہر کروں۔ اور وہ فرماتا ہے کہ "دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اُس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔"

(تبلیغ رسالت جلد دہم ص۵-۶)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ نیکی کر کے اپنے تئیں بچا لو قبل اس کے کہ جو وہ ہولناک دن آوے جو ایک دم میں تباہ کر دے گا۔ اور فرماتا ہے کہ خدا ان کے ساتھ ہے جو نیکی کرتے ہیں اور بدی سے بچتے ہیں۔ اور پھر اُس نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ میرا فضل تیرے نزدیک آ گیا۔ یعنی وہ وقت آ گیا کہ تو کامل طور پر شناخت کیا جاوے۔ حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا۔
حاصل مطلب یہ ہے کہ جو کچھ نشان ظاہر ہُوا اور ہو گا اس سے یہ غرض ہے کہ لوگ بدی سے

باز آویں اور اس خدا کے فرستادہ کو جو اُن کے درمیان ہے شناخت کریں۔ پس اے عزیزو! جلد ہر ایک بدی سے پرہیز کرو کہ پکڑے جانے کا دن نزدیک ہے۔ ہر ایک جو شرک کو نہیں چھوڑتا وہ پکڑا جائے گا۔ ہر ایک جو فسق و فجور میں مبتلا ہے وہ پکڑا جائیگا۔ ہر ایک جو دنیا پرستی میں حد سے گذر گیا ہے اور دنیا کے غموں میں مبتلا ہے وہ پکڑا جائیگا۔ ہر ایک جو خدا کے وجود سے منکر ہے وہ پکڑا جائے گا۔ ہر ایک جو خدا کے مقدس نبیوں اور رسولوں اور مرسلوں کو بدزبانی سے یاد کرتا ہے اور باز نہیں آتا وہ پکڑا جائے گا۔ دیکھو! آج میں نے بتلا دیا۔ زمین بھی سنتی ہے اور آسمان بھی۔ کہ ہر ایک جو راستی کو چھوڑ کر شرارتوں پر آمادہ ہوگا اور ہر ایک جو زمین کو اپنی بدیوں سے ناپاک کرے گا پکڑا جائے گا۔ خدا فرماتا ہے کہ قریب ہے جو میرا قہر زمین پر اُترے کیونکہ زمین پاپ اور گناہ سے بھر گئی ہے۔ پس اُٹھو! اور ہوشیار ہو جاؤ کہ وہ آخری وقت قریب ہے جس کی پہلے نبیوں نے بھی خبر دی تھی۔ مجھے اُس ذات کی قسم ہے جس نے مجھے بھیجا کہ یہ سب باتیں اس کی طرف سے ہیں میری طرف سے نہیں ہیں۔ کاش! یہ باتیں نیک ظنّی سے دیکھی جاویں۔ کاش! میں ان کی نظر میں کاذب نہ ٹھہرتا تا دنیا ہلاکت سے بچ جاتی۔ یہ میری تحریر معمولی تحریر نہیں دلی ہمدردی سے بھرے ہوئے نعرے ہیں۔ اگر اپنے اندر تبدیلی کرو گے اور ہر ایک بدی سے اپنے تئیں بچا لو گے تو بچ جاؤ گے کیونکہ خدا حلیم ہے جیسا کہ وہ قہار بھی ہے۔ اور تم سے ایک حصّہ بھی اصلاح پذیر ہوگا تب بھی رحم کیا جائے گا ورنہ وہ دن آتا ہے کہ انسانوں کو دیوانہ کر دے گا۔ نادان بدقسمت کہیگا کہ یہ باتیں جھوٹ ہیں۔ ہائے! وہ کیوں اس قدر سوتا ہے آفتاب تو نکلنے کو ہے۔

(تبلیغ رسالت جلد دہم ص ۸۰-۸۱)

۹ر اپریل ۱۹۰۵ء کو پھر خدا تعالیٰ نے مجھے ایک سخت زلزلہ کی خبر دی ہے جو نمونہ قیامت اور ہوش رُبا ہوگا۔ چونکہ دو مرتبہ مکرّر طور پر اس علیم مطلق نے اس آئندہ واقعہ پر مجھے مطلع فرمایا ہے، اسلئے میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ عظیم الشان حادثہ جو محشر کے حادثہ کو یاد دلا دیگا دُور نہیں ہے۔ مجھے خدائے عزّ وجلّ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ دونوں زلزلے تیری سچائی ظاہر کرنے کے لئے دو نشان ہیں۔ اُنہی نشانوں کی طرح جو موسیٰ نے فرعون کے سامنے دکھلائے تھے۔ اور اس نشان کی طرح جو نوح نے اپنی قوم کو دکھلایا تھا۔ اور یاد رہے کہ ان نشانوں کے بعد ابھی بس نہیں ہے بلکہ کئی نشان ایک دوسرے کے بعد ظاہر ہوتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ انسان کی آنکھ کھلیگی اور حیرت زدہ ہو کر کہیگا کہ یہ کیا ہوا چاہتا ہے۔ ہر ایک دن سخت اور پہلے سے بدتر آئیگا۔ خدا فرماتا ہے کہ میں

حیرت ناک کام دکھلاؤنگا۔ اور بس نہیں کرونگا جب تک کہ لوگ اپنے دلوں کی اصلاح نہ کرلیں اور جس طرح یوسف نبی کے وقت میں ہُوا کہ سخت کال پڑا یہاں تک کہ کھانے کیلئے درختوں کے پتّے بھی نہ رہے اسی طرح ایک آفت کا سامنا موجود ہوگا۔ اور جیسا کہ یوسف نے اناج کے ذخیرے سے لوگوں کی جان بچائی اسی طرح جان بچانے کے لئے خدا نے اس جگہ بھی مجھے ایک روحانی غذا کا مہتمم بنایا ہے جو شخص اس غذا کو سچے دل سے پورے وزن کے ساتھ کھائیگا مَیں یقین رکھتا ہوں کہ ضرور اس پر رحم کیا جائے گا۔

(تبلیغ رسالت جلد دہم صفحہ ۸۳-۸۴)

آج ۲۹ر اپریل ۱۹۰۵ء کو پھر خدا تعالیٰ نے مجھے دوسری مرتبہ کے زلزلہ شدیدہ کی نسبت اطلاع دی ہے۔ سو مَیں محض ہمدردی مخلوق کے لئے عام طور پر تمام دنیا کو اطلاع دیتا ہوں کہ یہ بات آسمان پر قرار پا چکی ہے کہ ایک شدید آفت سخت تباہی ڈالنے والی دنیا پر آوے گی جس کا نام خدا تعالیٰ نے بار بار زلزلہ رکھا ہے۔ مَیں نہیں جانتا کہ وہ قریب ہے یا کچھ دنوں کے بعد خدا تعالیٰ اس کو ظاہر فرماوے گا۔ مگر بار بار خبر دینے سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ بہت دُور نہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی خبر اور اُس کی خاص وحی ہے جو عالم الاسرار ہے۔ اس کے مقابل پر جو لوگ یہ شائع کر رہے ہیں کہ ایسا کوئی سخت زلزلہ آنے والا نہیں ہے وہ اگر منجم ہیں یا کسی اور علمی طریق سے اٹکلیں دوڑاتے ہیں وہ سب جھوٹے ہیں اور لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ سچ ہے اور بالکل سچ ہے کہ وہ زلزلہ اس ملک پر آنے والا ہے جو پہلے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی دل میں گزرا۔ بجز توبہ اور دل کے پاک کرنے کے کوئی اس کا علاج نہیں۔ کوئی ہے جو ہماری اس بات پر ایمان لائے؟ اور کوئی ہے جو اس آواز کو دل لگا کر سُنے؟ یہ بھی ملک کی بدقسمتی ہے جو خدا کے کلام کو ٹھٹھے اور ہنسی سے دیکھتے ہیں اور اُن کے دل ڈرتے نہیں۔ خدا فرماتا ہے کہ مَیں چُھپ کر آؤں گا۔ مَیں اپنی فوجوں کے ساتھ اُس وقت آؤں گا کہ کسی کو گمان بھی نہ ہوگا کہ ایسا حادثہ ہونے والا ہے۔ غالباً وہ صبح کا وقت ہوگا یا کچھ حصہ رات میں سے۔ یا ایسا وقت ہوگا جو اس سے قریب ہے۔ پس اے عزیزو! تم جو خدا تعالیٰ کی وحی پر ایمان لاتے ہو ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے توبہ کے جامہ کو خوب پاک اور صاف کرو کہ خدا تعالیٰ کا غضب آسمان پر بھڑکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کو اپنا چہرہ دکھاوے۔ بجز توبہ کے کوئی پناہ نہیں۔ ہلاک ہو گئے وہ لوگ جنکا کام ٹھٹھا اور ہنسی ہے۔ جو گناہ اور معصیت سے باز نہیں آتے اور اُن کی مجلسیں ناپاکی اور غفلت سے بھری ہوئی ہیں اور اُن کی زبانیں مُردار سے بدتر ہیں۔

وہ بار بار کی شوخیوں سے خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتے ہیں۔ وہ دلوں کے اندھے ہیں اور خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ اس روز میں اُن پر رحم کرونگا جن کے دل مجھ سے ترساں اور ہراساں ہیں۔ جو نہ بدی کرتے ہیں اور نہ بدی کی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں۔ اور خدا نے یہ بھی فرمایا کہ اس روز تیرے لئے فتح نمایاں ظاہر ہوگی۔ کیونکہ خدا اس روز سب کچھ دکھلائیگا جو قبل از وقت دنیا کو سُنایا گیا۔ خوش قسمت وہ جو اب بھی سمجھ جائے۔ . . . .

المشتہر میرزا غلام احمدؐ قادیانی

(تبلیغ رسالت جلد دہم صـــ ۹۳-۹۴)

اے عزیزو! آپ لوگوں نے اس زلزلہ کو دیکھ لیا ہو گا جو ۲۸ فروری ۱۹۰۶ء کو رات کو ایک بجے کے بعد آیا تھا۔ یہ وہی زلزلہ تھا جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے اپنی وحی میں فرمایا تھا۔ ”**پھر بہار آئی خدا کی بات پھر پوری ہوئی**“ . . . . سو یہ وہ زلزلہ تھا جس کا موسم بہار میں آنا خدا تعالےٰ کی وحی کے مطابق ضرور تھا سو آگیا اور ممکن ہے کہ وہ **موعود زلزلہ قیامت** کا نمونہ بھی موسم بہار میں ہی آوے اس لئے میں مکرّر اطلاع دیتا ہوں اور متنبہ کرتا ہوں کہ جہاں تک میرا خیال ہے وہ دن دُور نہیں ہے۔ توبہ کرو اور پاک اور کامل ایمان اپنے دلوں میں پیدا کرو اور ٹھٹھا کرنے والوں کی مجلسوں میں مت بیٹھو تا تم پر رحم ہو۔ یہ مت خیال کرو کہ ہم اس سلسلہ میں داخل ہیں۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ ہر ایک جو بچایا جائیگا اپنے کامل ایمان سے بچایا جائیگا۔ کیا تم ایک دانہ سے سیر ہو سکتے ہو؟ یا ایک قطرہ پانی کا تمہاری پیاس بُجھا سکتا ہے؟ اسی طرح ناقص ایمان تمہاری رُوح کو کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا۔ آسمان پر وہی مومن لکھے جاتے ہیں جو وفاداری سے اور صدق سے اور کامل استقامت سے اور فی الحقیقت خدا کو سب چیز پر مقدّم رکھنے سے اپنے ایمان پر مہر لگاتے ہیں۔ میں سخت دردمند ہوں کہ میں کیا کروں اور کس طرح اِن باتوں کو تمہارے دل میں داخل کردوں اور کس طرح تمہارے دلوں میں ہاتھ ڈال کر گند نکال دوں۔ ہمارا خدا نہایت کریم و رحیم اور وفادار خدا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کوئی حصہ خیانت اپنے دل میں رکھتا ہے اور عملی طور پر اپنا پورا صدق نہیں دکھلاتا تو وہ خدا کے غضب سے بچ نہیں سکتا۔ سو تم اگر پوشیدہ بیج خیانت کا اپنے اندر رکھتے ہو تو تمہاری خوشی عبث ہے۔ اور میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ تم بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی پکڑے جاؤ گے جو خدا تعالیٰ کی نظر کے سامنے نفرتی کام کرتے ہیں۔ بلکہ خدا تمہیں پہلے ہلاک کرے گا۔ اور بعد میں ان کو۔ تمہیں آرام کی زندگی دھوکا نہ دے کہ بے آرامی کے دن نزدیک ہیں اور ابتداء سے

جو کچھ خدا تعالیٰ کے پاک نبی کہتے آئے ہیں وہ سب اِن دنوں میں پورا ہوگا۔ کیا خوش نصیب وہ شخص ہے جو میری بات پر ایمان لاوے اور اپنے اندر تبدیلی پیدا کرے۔

(تبلیغ رسالت جلد دہم ص۱۰۶-۱۰۷)

مَیں آپ کو اطلاع دیتا ہوں اور بشارت پہنچاتا ہوں کہ اسی ناخدا نے جو آسمان اور زمین کا خدا ہے زمین کے طوفان زدوں کی فریاد سُن لی اور جیسا کہ اُس نے اپنی پاک کلام میں طوفان کے وقت اپنے جہاز کو بچانے کا وعدہ کیا ہُوا تھا وہ وعدہ پورا کیا۔ اور اپنے ایک بندہ کو یعنی اس عاجز کو جو بول رہا ہے اپنی طرف سے مامور کر کے وہ تدبیریں سمجھا دیں جو طوفان پر غالب آویں اور مال و متاع کے صندوقوں کو دریا میں پھینکنے کی حاجت نہ پڑے۔ اب قریب ہے جو آسمان سے یہ آواز آوے قیل یا ارض ابلعی ماءک ویا سماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر واستوت علی الجودی مگر ابھی تو طوفان زور میں ہے۔ اسی طوفان کے وقت خدا تعالےٰ نے اس عاجز کو مامور کیا اور فرمایا۔ واصنع الفلک باعیننا ووحینا۔ یعنی تو ہمارے حکم سے ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی تیار کر۔ اس کشتی کو اس طوفان سے کچھ خطرہ نہ ہوگا۔ اور خدائے تعالیٰ کا ہاتھ اس پر ہوگا۔ سو وہ خالص اسلام کی کشتی یہی ہے جس پر سوار ہونے کے لئے مَیں لوگوں کو بلاتا ہوں۔ اگر آپ جاگتے ہو تو اُٹھو اور اس کشتی میں جلد سوار ہو جاؤ کہ طوفان زمین پر سخت جوش کر رہا ہے اور ہریک جان خطرہ میں ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۲۶۱-۲۶۲ حاشیہ)

تبلیغ

مَیں اسجگہ ایک اور پیغام بھی خلق اللہ کو عموماً اور اپنے بھائی مسلمانوں کو خصوصاً پہنچاتا ہوں۔ کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ حق کے طالب ہیں وہ سچا ایمان اور سچی ایمانی پاکیزگی اور محبت مولیٰ کا راہ سیکھنے کے لئے اور گندی زیست اور کاہلانہ اور غدّارانہ زندگی کے چھوڑنے کے لئے مجھ سے بیعت کریں۔ پس جو لوگ اپنے نفسوں میں کسی قدر یہ طاقت پاتے ہیں انہیں لازم ہے کہ میری طرف آویں کہ مَیں ان کا غمخوار ہونگا۔ اور ان کا بار ہلکا کرنے کے لئے کوشش کرونگا۔ اور خدا تعالےٰ میری دعا اور میری توجہ میں اُن کے لئے برکت دیگا بشرطیکہ وہ ربّانی شرائط پر چلنے کیلئے بدل و جان تیار ہونگے۔ یہ ربّانی حکم ہے جو آج مَیں نے پہنچا دیا۔ اس بارہ میں عربی الہام یہ ہے:۔ "اذا عزمت فتوکّل علی اللّٰہ۔ واصنع الفلک باعیننا ووحینا۔ الذین یبایعونک انما یبایعون اللّٰہ ید اللّٰہ فوق ایدیھم۔"

والسلام علی من اتبع الھدیٰ یکم دسمبر ۱۸۸۸ء

المبلغ خاکسار غلام احمد عفی عنہ (سبز اشتہار ص۲۴)

رہی حقیقت بیعت کی۔ سو وہ یہ ہے کہ بیعت کا لفظ بیع سے مشتق ہے اور بیع اس باہمی رضامندی کے معاملہ کو کہتے ہیں جس میں ایک چیز دوسری چیز کے عوض میں دی جاتی ہے۔ سو بیعت سے غرض یہ ہے کہ بیعت کرنے والا اپنے نفس کو مع اس کے تمام لوازم کے ایک رہبر کے ہاتھ میں اس غرض سے بیچے کہ تا اس کے عوض میں وہ معارفِ حقّہ اور برکاتِ کاملہ حاصل کرے جو موجب معرفت اور نجات اور رضامندی باری تعالیٰ ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بیعت سے صرف توبہ منظور نہیں کیونکہ ایسی توبہ تو انسان بطور خود بھی کر سکتا ہے بلکہ وہ معارف و برکات اور نشان مقصود ہیں جو حقیقی توبہ کی طرف کھینچتے ہیں۔ بیعت سے اصل مدعا یہ ہے کہ اپنے نفس کو اپنے رہبر کی غلامی میں دیکر وہ علوم اور معارف اور برکات اس کے عوض میں لیوے جن سے ایمان قوی ہو اور معرفت بڑھے اور خدا تعالیٰ سے صاف تعلق پیدا ہو اور اس طرح دنیوی جہنم سے رہا ہو کر آخرت کے دوزخ سے مخلصی نصیب ہو اور دنیوی نابینائی سے شفا پا کر آخرت کی نابینائی سے بھی امن حاصل ہو۔

(ضرورت الامام ص ۲۷)

تکمیل تبلیغ

مضمون تبلیغ جو اس عاجز نے اشتہار یکم دسمبر ۱۸۸۸ء میں شائع کیا ہے جس میں بیعت کے لئے حق کے طالبوں کو بلایا ہے اس کی مجمل شرائط کی تشریح یہ ہے :۔

اوّل بیعت کنندہ سچے دل سے عہد اس بات کا کرے کہ آئندہ اس وقت تک کہ قبر میں داخل ہو جائے شرک سے مجتنب رہے گا۔

دوم یہ کہ جھوٹ اور زنا اور بدنظری اور ہر یک فسق اور فجور اور ظلم اور خیانت اور فساد اور بغاوت کے طریقوں سے بچتا رہے گا۔ اور نفسانی جوشوں کے وقت ان کا مغلوب نہیں ہوگا اگرچہ کیسا ہی جذبہ پیش آوے۔

سوم یہ کہ بلا ناغہ پنجوقتہ نماز موافق حکم خدا اور رسولؐ کے ادا کرتا رہے گا۔ حتی الوسع نماز تہجد کے پڑھنے اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے اور ہر روز اپنے گناہوں کی معافی مانگنے اور استغفار کرنے میں مداومت اختیار کریگا۔ اور دلی محبت سے خدا تعالیٰ کے احسانوں کو یاد کر کے اس کی حمد اور تعریف کو اپنا ہر روزہ ورد بنائیگا۔

چہارم یہ کہ عام خلق اللہ کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اپنے نفسانی جوشوں سے کسی نوع کی ناجائز تکلیف نہیں دیگا۔ نہ زبان سے نہ ہاتھ سے نہ کسی اور طرح سے۔

پنجم یہ کہ ہر حال رنج اور راحت اور عُسر اور یُسر اور نعمت اور بلا میں خدا تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کریگا اور بہر حالت راضی بقضا ہو گا اور ہر یک ذلّت اور دُکھ کے قبول کرنے کے لئے اس کی راہ میں طیار رہیگا اور کسی مصیبت کے وارد ہونے پر اس سے مُنہ نہیں پھیرے گا بلکہ آگے قدم بڑھائیگا۔

ششم یہ کہ اتباعِ رسم اور متابعت ہوا و ہوس سے باز آ جائیگا اور قرآن شریف کی حکومت کو بکلّی اپنے سر پر قبول کریگا اور قال اللہ اور قال الرسول کو اپنی ہر یک راہ میں دستور العمل قرار دے گا۔

ہفتم یہ کہ تکبّر اور نخوت کو بکلّی چھوڑ دے گا اور فروتنی اور عاجزی اور خوش خلقی اور حلیمی اور مسکینی سے زندگی بسر کرے گا۔

ہشتم یہ کہ دین اور دین کی عزت اور ہمدردی اسلام کو اپنی جان اور اپنے مال اور اپنی عزت اور اپنی اولاد اور اپنے ہر ایک عزیز سے زیادہ تر عزیز سمجھے گا۔

نہم یہ کہ عام خلق اللہ کی ہمدردی میں محض للہ مشغول رہے گا اور جہاں تک بس چل سکتا ہے اپنی خداداد طاقتوں اور نعمتوں سے بنی نوع کو فائدہ پہنچائیگا۔

دہم یہ کہ اس عاجز سے عقدِ اخوت محض للہ باقرار طاعت در معروف باندھ کر اس پر تا وقتِ مرگ قائم رہے گا۔ اور اس عقدِ اخوت میں ایسا اعلیٰ درجہ کا ہو گا کہ اس کی نظیر دنیوی رشتوں اور تعلقوں اور تمام خادمانہ حالتوں میں پائی نہ جاتی ہو۔

یہ وہ شرائط ہیں جو بیعت کرنے والوں کے لئے ضروری ہیں .... جو لوگ اس ابتلاء کی حالت میں اس دعوتِ بیعت کو قبول کر کے اس سلسلۂ مبارکہ میں داخل ہو جائیں وہ ہماری جماعت سمجھے جائیں اور وہ ہمارے خالص دوست متصوّر ہوں اور وہی ہیں جن کے حق میں خدا تعالیٰ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ میں انہیں اُن کے غیروں پر قیامت تک فوقیت دونگا اور برکت اور رحمت اُن کے شامل حال رہے گی اور مجھے فرمایا کہ تو میری اجازت سے اور میری آنکھوں کے روبرو یہ کشتی تیار کر۔ جو لوگ تجھ سے بیعت کرینگے خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہو گا۔ اور فرمایا کہ خدا تعالیٰ کے حضور میں اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ حاضر ہو جاؤ اور اپنے رب کریم کو اکیلا مت چھوڑو۔ جو شخص اُسے اکیلا چھوڑتا ہے وہ اکیلا چھوڑا جائے گا۔

سو حسب فرمودہ ایزدی بیعت کا عام اشتہار دیا جاتا ہے اور متحملین شرائط متذکرہ بالا کو عام اجازت ہے کہ بعد ادائے استخارہ مسنونہ اس عاجز کے پاس بیعت کرنے کیلئے آویں۔ خدا تعالیٰ ان کا مددگار ہو اور ان کی زندگی میں پاک تبدیلی پیدا کرے اور ان کو سچائی اور پاکیزگی اور محبت اور

روشن ضمیری کی رُوح بخشے آمین ثم آمین ۔ واٰخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

المبلغ خاکسار احقر عباد اللہ غلام احمد
از قادیان ضلع گورداسپورہ پنجاب

(تبلیغ رسالت جلد اول ص۱۴۶-۱۵۰)

اگر کوئی عمدًا ان شرائط کی خلاف ورزی کرے جو اشتہار ۱۲ جنوری ۱۸۸۹ء میں مندرج ہیں اور اپنی بے باکانہ حرکت سے باز نہ آوے تو وہ اس سلسلہ سے خارج شمار کیا جاوے گا۔ یہ سلسلۂ بیعت محض بمراد فراہمی طائفہ متقین یعنی تقویٰ شعار لوگوں کی جماعت کے جمع کرنے کے لئے ہے تا ایسے متقیوں کا ایک بھاری گروہ دنیا پر اپنا نیک اثر ڈالے ۔ اور ان کا اتفاق اسلام کے لئے برکت وعظمت ونتائج خیر کا موجب ہو اور وہ ببرکت کلمہ وحدہٗ پر متفق ہونے کے اسلام کی پاک اور مقدس خدمات میں جلد کام آسکیں اور ایک کاہل اور بخیل اور بے مصرف مسلمان نہ ہوں اور نہ نالائق لوگوں کی طرح جنہوں نے اپنے تفرقہ اور ناانصافی کی وجہ سے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے ۔ اور اس کے خوبصورت چہرہ کو اپنی فاسقانہ حالتوں سے داغ لگا دیا ہے اور نہ ایسے غافل درویشوں اور گوشہ گزینوں کی طرح جن کو اسلامی ضرورتوں کی کچھ بھی خبر نہیں اور اپنے بھائیوں کی ہمدردی سے کچھ غرض نہیں ۔ اور بنی نوع کی بھلائی کے لئے کچھ جوش نہیں بلکہ وہ ایسے قوم کے ہمدرد ہوں کہ غریبوں کی پناہ ہو جائیں یتیموں کے لئے بطور باپوں کے بن جائیں اور اسلامی کاموں کے انجام دینے کے لئے عاشق زار کی طرح فدا ہونے کو تیار ہوں ۔ اور تمام تر کوشش اس بات کے لئے کریں کہ اُن کی عام برکات دنیا میں پھیلیں اور محبت الٰہی اور ہمدردی بندگان خدا کا پاک چشمہ ہر یک دل سے نکل کر ایک جگہ اکٹھا ہو کر ایک دریا کی صورت میں بہتا ہُوا نظر آوے ۔ خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ محض اپنے فضل اور کرامت خاص سے اس عاجز کی دُعاؤں اور اس ناچیز کی توجہ کو اُن کی پاک استعدادوں کے ظہور و بروز کا وسیلہ ٹھہراوے اور اس قدوس جلیل الذات نے مجھے جوش بخشا ہے تا میں ان طالبوں کی تربیت باطنی میں مصروف ہو جاؤں ۔ اور ان کی آلودگی کے ازالہ کے لئے رات دن کوشش کرتا رہوں اور ان کے لئے وہ نور مانگوں جس سے انسان نفس اور شیطان کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے اور بالطبع خدا تعالیٰ کی راہوں سے محبت کرنے لگتا ہے ۔ اور ان کے لئے وہ روح القدس طلب کروں جو ربوبیت تامہ اور عبودیت خالصہ کے جوڑ سے پیدا ہوتی ہے اور رُوح خبیث کی تکفیر سے ان کی نجات چاہوں کہ جو نفس امّارہ اور شیطان کے تعلقِ شدید سے جنم لیتی ہے ۔ سو میں بتوفیقہ تعالیٰ کاہل اور سست نہیں رہوں گا

اور اپنے دوستوں کی اصلاح طلبی سے جنہوں نے اِس سلسلہ میں داخل ہونا بصدق قدم اختیار کر لیا ہے غافل نہیں ہونگا بلکہ ان کی زندگی کے لئے موت تک دریغ نہیں کرونگا۔ اور ان کے لئے خدا تعالیٰ سے وہ روحانی طاقت چاہوں گا جس کا اثر برقی مادہ کی طرح اُن کے تمام وجود میں دوڑ جائے۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ ان کے لئے جو داخلِ سلسلہ ہو کر صبر سے منتظر رہیں گے ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس گروہ کو اپنا جلال ظاہر کرنے کے لئے اور اپنی قدرت دکھانے کے لئے پیدا کرنا اور پھر ترقی دینا چاہا ہے تا دنیا میں محبت الٰہی اور توبہ نصوح اور پاکیزگی اور حقیقی نیکی اور امن اور صلاحیت اور بنی نوع کی ہمدردی کو پھیلاوے۔ سو یہ گروہ اس کا ایک خالص ہو گا اور وہ انہیں آپ اپنی رُوح سے قوت دیگا اور انہیں گندی زیست سے صاف کریگا اور ان کی زندگی میں ایک پاک تبدیلی بخشے گا۔ وہ جیسا کہ اس نے اپنی پاک پیشگوئیوں میں وعدہ فرمایا ہے کہ اس گروہ کو بہت بڑھائیگا اور ہزارہا صادقین کو اس میں داخل کرے گا۔ وہ خود اس کی آبپاشی کرے گا اور اس کو نشوونما دیگا یہاں تک کہ ان کی کثرت اور برکت نظروں میں عجیب ہو جائیگی۔ اور وہ اس چراغ کی طرح جو اونچی جگہ رکھا جاتا ہے دنیا کے چاروں طرف اپنی روشنی کو پھیلائیں گے۔ اور اسلامی برکات کے لئے بطور نمونہ ٹھیرینگے۔ وہ اس سلسلہ کے کامل متبعین کو ہر یک قسم کی برکت میں دوسرے سلسلہ والوں پر غلبہ دے گا۔ اور ہمیشہ قیامت تک اُن میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جن کو قبولیت اور نصرت دی جائیگی۔ اس رب جلیل نے یہی چاہا ہے۔ وہ قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ہر یک طاقت اور قدرت اسی کو ہے۔ فالحمد لہ اوّلًا و اٰخرًا وظاھرًا و باطنًا اسلمنا لہ ھو مولٰنا فی الدنیا والاٰخرۃ نعم المولٰی و نعم النصیر۔

خاکسار غلام احمد لودھیانہ ۴ مارچ ۱۸۸۹ء

(ازالہ اوہام صفحہ ۴۶۰)

عزیزاں بے خلوص و صدق نکشایند راہے را ۔ مصفا قطرہُ باید کہ تا گوہر شود پیدا

اے میرے دوستو! جو میرے سلسلۂ بیعت میں داخل ہو خدا ہمیں اور تمہیں ان باتوں کی توفیق دے جن سے وہ راضی ہو جائے۔ آج تم تھوڑے ہو اور تحقیر کی نظر سے دیکھے گئے ہو۔ اور ایک ابتلاء کا وقت تم پر ہے۔ اسی سنت اللہ کے موافق جو قدیم سے جاری ہے ہر ایک طرف سے کوشش ہوگی کہ تم ٹھوکر کھاؤ۔ اور تم ہر طرح سے ستائے جاؤ گے اور طرح طرح کی باتیں تمہیں سننی پڑیں گی۔ اور ہر یک جو تمہیں زبان یا ہاتھ سے دُکھ دیگا۔ اور خیال کرے گا کہ اسلام کی حمایت کر رہا ہے اور کچھ

آسمانی ابتلاء بھی تم پر آئیں گے تا تم ہر طرح سے آزمائے جاؤ۔ سو تم اس وقت سن رکھو کہ تمہارے فتحمند اور غالب ہو جانے کی یہ راہ نہیں کہ تم اپنی خشک منطق سے کام لو یا تمسخر کے مقابل پر تمسخر کی باتیں کرو یا گالی کے مقابل پر گالی دو۔ کیونکہ اگر تم نے یہی راہیں اختیار کیں تو تمہارے دل سخت ہو جائیں گے اور تم میں صرف باتیں ہی باتیں ہونگی جن سے خدا تعالیٰ نفرت کرتا ہے اور کراہت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ سو تم ایسا نہ کرو کہ اپنے پر دو لعنتیں جمع کر لو۔ ایک خلقت کی اور دوسری خدا کی بھی۔

یقیناً یاد رکھو کہ لوگوں کی لعنت اگر خدا تعالیٰ کی لعنت ساتھ نہ ہو کچھ بھی چیز نہیں۔ اگر خدا ہمیں نابود نہ کرنا چاہے تو ہم کسی سے نابود نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر وہی ہمارا دشمن ہو جائے تو کوئی ہمیں پناہ نہیں دے سکتا۔ ہم کیونکر خدا تعالےٰ کو راضی کریں اور کیونکر وہ ہمارے ساتھ ہو اس کا اُس نے بار بار مجھے یہی جواب دیا ہے کہ تقویٰ سے۔ سو اے میرے پیارے بھائیو! کوشش کرو تا متقی بن جاؤ۔ بغیر عمل کے سب باتیں ہیچ ہیں اور بغیر اخلاص کے کوئی عمل مقبول نہیں۔ سو تقویٰ یہی ہے کہ ان تمام نقصانوں سے بچ کر خدا تعالیٰ کی طرف قدم اٹھاؤ اور پرہیزگاری کی باریک راہوں کی رعایت رکھو۔ سب سے اوّل اپنے دلوں میں انکسار اور صفائی اور اخلاص پیدا کرو اور سچ مچ دلوں کے حلیم اور سلیم اور غریب بن جاؤ کہ ہر یک خیر اور شر کا بیج پہلے دل میں ہی پیدا ہوتا ہے۔ اگر تیرا دل شر سے خالی ہے تو تیری زبان بھی شر سے خالی ہو گی۔ اور ایسا ہی تیری آنکھ اور تیرے سارے اعضاء۔ ہر یک نور یا اندھیرا پہلے دل میں ہی پیدا ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ تمام بدن پر محیط ہو جاتا ہے۔ سو اپنے دلوں کو ہر دم ٹٹولتے رہو۔ اور جیسا پان کھانے والا اپنے پانوں کو پھیرتا رہتا ہے اور ردّی ٹکڑے کو کاٹتا ہے اور باہر پھینکتا ہے۔ اسی طرح تم بھی اپنے دلوں کے مخفی خیالات اور مخفی عادات اور مخفی جذبات اور مخفی ملکات کو اپنی نظر کے سامنے پھیرتے رہو اور جس خیال یا عادت یا ملکہ کو ردّی پاؤ اس کو کاٹ کر باہر پھینکو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے سارے دل کو ناپاک کر دیوے اور پھر تم کاٹے جاؤ۔

پھر بعد اس کے کوشش کرو اور نیز خدا تعالےٰ سے قوت اور ہمت مانگو کہ تمہارے دلوں کے پاک ارادے اور پاک خیالات اور پاک جذبات اور پاک خواہشیں تمہارے اعضاء اور تمہارے تمام قویٰ کے ذریعہ سے ظہور پذیر اور تکمیل پذیر ہوں تا تمہاری نیکیاں کمال تک پہنچیں کیونکہ جو بات دل سے نکلے اور دل تک ہی محدود رہے وہ تمہیں کسی مرتبہ تک نہیں پہنچا سکتی۔ خدا تعالیٰ کی عظمت

اپنے دلوں میں بٹھاؤ۔ اور اس کے جلال کو اپنی آنکھ کے سامنے رکھو اور یاد رکھو کہ قرآن کریم میں پانسو کے قریب حکم ہیں اور اُس نے تمہارے ہر ایک عضو اور ہر ایک قوت اور ہر ایک وضع اور ہر ایک حالت اور ہر ایک عمر اور ہر ایک مرتبہ فہم اور مرتبہ فطرت اور مرتبہ سلوک اور مرتبہ انفراد اور اجتماع کے لحاظ سے ایک نورانی دعوت تمہاری کی ہے۔ سو تم اس دعوت کو شکر کے ساتھ قبول کرو اور جسقدر کھانے تمہارے لئے تیار کئے گئے ہیں وہ سارے کھاؤ اور سب سے فائدہ حاصل کرو۔ جو شخص ان سب حکموں میں سے ایک کو بھی ٹالتا ہے مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ عدالت کے دن مؤاخذہ کے لائق ہوگا۔ اگر نجات چاہتے ہو تو دین العجائز اختیار کرو اور مسکینی سے قرآن کریم کا جُوا اپنی گردنوں پر اٹھاؤ کہ شریر ہلاک ہوگا اور سرکش جہنم میں گرایا جائے گا۔ پر جو غریبی سے گردن جھکاتا ہے وہ موت سے بچ جائیگا۔ دنیا کی خوشحالی کی شرطوں سے خدا تعالیٰ کی عبادت مت کرو کہ ایسے خیال کے لئے گڑھا درپیش ہے بلکہ تم اس لئے اس کی پرستش کرو کہ وہ پرستش ایک حق خالق کا تم پر ہے۔ چاہیئے پرستش ہی تمہاری زندگی ہو جائے اور تمہاری نیکیوں کی فقط یہی غرض ہو کہ وہ محبوب حقیقی اور محسن حقیقی راضی ہو جاوے کیونکہ جو اس سے کمتر خیال ہے وہ ٹھوکر کی جگہ ہے۔

خدا بڑی دولت ہے اس کے پانے کے لئے مصیبتوں کیلئے تیار ہو جاؤ۔ وہ بڑی مراد ہے اُس کے حاصل کرنے کیلئے جانوں کو فدا کرو۔ عزیزو! خدا تعالےٰ کے حکموں کو بے قدری سے نہ دیکھو۔ موجودہ فلسفہ کی زہر تم پر اثر نہ کرے۔ ایک بچے کی طرح بن کر اس کے حکموں کے نیچے چلو۔ نماز پڑھو نماز پڑھو۔ کہ وہ تمام سعادتوں کی کُنجی ہے۔ اور جب تو نماز کے لئے کھڑا ہو تو ایسا نہ کر کہ گویا تو ایک رسم ادا کر رہا ہے بلکہ نماز سے پہلے جیسے ظاہر وضو کرتے ہو ایسا ہی ایک باطنی وضو بھی کرو اور اپنے اعضاء کو غیر اللہ کے خیال سے دھو ڈالو۔ تب ان دونوں وضوؤں کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور نماز میں بہت دُعا کرو اور رونا اور گڑگڑانا اپنی عادت کرو تا تم پر رحم کیا جائے۔

سچائی اختیار کرو سچائی اختیار کرو کہ وہ دیکھ رہا ہے کہ تمہارے دل کیسے ہیں۔ کیا انسان اُسکو بھی دھوکا دے سکتا ہے؟ کیا اُس کے آگے بھی مکاریاں پیش جاتی ہیں؟ نہایت بدبخت آدمی اپنے فاسقانہ افعال اس حد تک پہنچاتا ہے کہ گویا خدا نہیں۔ تب وہ بہت جلد ہلاک کیا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کو اس کی کچھ بھی پروا نہیں ہوتی۔

عزیزو! اِس دنیا کی مجرّد منطق ایک شیطان ہے۔ اور اس دنیا کا خالی فلسفہ ایک ابلیس ہے جو ایمانی نور کو نہایت درجہ گھٹا دیتا ہے۔ اور بے باکیاں پیدا کرتا ہے اور قریب قریب دہریت کے

پہنچاتا ہے۔ سو تم اس سے اپنے تئیں بچاؤ اور ایسا دل پیدا کرو جو غریب اور مسکین ہو اور بغیر چون و چرا کے حکموں کو ماننے والے ہو جاؤ جیسا کہ بچہ اپنی والدہ کی باتوں کو مانتا ہے۔

قرآن کریم کی تعلیمیں تقویٰ کے اعلےٰ درجہ تک پہنچانا چاہتی ہیں ان کی طرف کان دھرو اور ان کے موافق اپنے تئیں بناؤ۔

قرآن شریف انجیل کی طرح تمہیں صرف یہی نہیں کہتا کہ نامحرم عورتوں یا ایسوں کو جو عورتوں کی طرح محل شہوت ہو سکتی ہے شہوت کی نظر سے مت دیکھو بلکہ اس کی کامل تعلیم کا منشا یہ ہے کہ تو بغیر ضرورت نامحرم کی طرف نظر مت اُٹھا۔ نہ شہوت سے اور نہ بغیر شہوت بلکہ چاہیئے کہ تو آنکھیں بند کر کے اپنے تئیں ٹھوکر سے بچاوے تا تیری دلی پاکیزگی میں کچھ فرق نہ آوے۔ سو تم اپنے مولیٰ کے اس حکم کو خوب یاد رکھو اور آنکھوں کے زنا سے اپنے تئیں بچاؤ اور اس ذات کے غضب سے ڈرو جس کا غضب ایک دم میں ہلاک کر سکتا ہے۔ قرآن شریف یہ بھی فرماتا ہے کہ تو اپنے کانوں کو بھی نامحرم عورتوں کے ذکر سے بچا اور ایسا ہی ہر ایک ناجائز ذکر سے۔

مجھے اس وقت اس نصیحت کی حاجت نہیں کہ تم خون نہ کرو۔ کیونکہ بجز نہایت شریر کے آدمی کون ناحق کے خون کی طرف قدم اٹھاتا ہے مگر مَیں کہتا ہوں کہ ناانصافی پر ضد کر کے سچائی کا خون نہ کرو۔ حق کو قبول کر لو اگرچہ ایک بچہ سے۔ اور اگر مخالف کی طرف سے حق پاؤ تو پھر فی الفور اپنی خشک منطق چھوڑ دو۔ سچ پر ٹھہر جاؤ اور سچی گواہی دو۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور۔ یعنی بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹ سے بھی کہ وہ بُت سے کم نہیں۔ جو چیز قبلہ حق سے تمہارا منہ پھیرتی ہے وہی تمہاری راہ میں بُت ہے۔ سچی گواہی دو۔ اگرچہ تمہارے باپوں یا بھائیوں یا دوستوں پر ہو۔ چاہیئے کہ کوئی عداوت بھی تمہیں انصاف سے مانع نہ ہو۔

باہم بخل اور کینہ اور حسد اور بغض اور بے مہری چھوڑ دو اور ایک ہو جاؤ۔ قرآن شریف کے بڑے حکم دو ہی ہیں ایک توحید و محبت و اطاعت باری عزّ اسمہٗ دوسری ہمدردی اپنے بھائیوں اور بنی نوع کی۔

(ازالہ اوہام ص ۴۴۶ - ۴۵۰)

میری تمام جماعت جو اس جگہ حاضر ہیں یا اپنے مقامات میں بود و باش رکھتے ہیں اس وصیت کو توجہ سے سنیں کہ وہ جو اس سلسلہ میں داخل ہو کر میرے ساتھ تعلق ارادت اور مریدی کا رکھتے ہیں

اس سے غرض یہ ہے کہ تا وہ نیک چلنی اور نیک بختی اور تقویٰ کے اعلےٰ درجہ تک پہنچ جائیں اور کوئی فساد اور شرارت اور بدچلنی ان کے نزدیک نہ آسکے ۔ وہ پنجوقت نماز جماعت کے پابند ہوں ۔ وہ جھوٹ نہ بولیں ۔ وہ کسی کو زبان سے ایذا نہ دیں ۔ وہ کسی قسم کی بدکاری کے مرتکب نہ ہوں ۔ اور کسی شرارت اور ظلم اور فساد اور فتنہ کا خیال بھی دل میں نہ لاویں ۔ غرض ہر ایک قسم کے معاصی اور جرائم اور ناکردنی اور ناگفتنی اور تمام نفسانی جذبات اور بے جا حرکات سے مجتنب رہیں اور خدا تعالیٰ کے پاک دل اور بے شر اور غریب مزاج بندے ہو جائیں اور کوئی زہریلا خمیر ان کے وجود میں نہ رہے گورنمنٹ برطانیہ جس نے زیر سایہ اُن کے مال اور جانیں اور آبروئیں محفوظ ہیں بصدق دل اس کے وفادار تابعدار رہیں ۔ اور تمام انسانوں کی ہمدردی ان کا اصول ہو اور خدا تعالیٰ سے ڈریں ۔ اور اپنی زبانوں اور اپنے ہاتھوں اور اپنے دل کے خیالات کو ہر ایک ناپاک اور فساد انگیز طریقوں اور خیانتوں سے بچاویں ۔ اور پنجوقتہ نماز کو نہایت التزام سے قائم رکھیں ۔ اور ظلم اور تعدی اور غبن اور رشوت اور اتلاف حقوق اور بے جا طرفداری سے باز رہیں ۔ اور کسی بد صحبت میں نہ بیٹھیں اور اگر بعد میں ثابت ہو کہ ایک شخص جو ان کے ساتھ آمد و رفت رکھتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے احکام کا پابند نہیں ہے یا اس گورنمنٹ محسنہ کا خیر خواہ نہیں ہے یا حقوق العباد کی کچھ پروا نہیں رکھتا اور یا ظالم طبع اور شریر مزاج اور بدچلن آدمی ہے اور یا یہ کہ جس شخص سے تمہیں تعلق بیعت یا ارادت ہے اس کی نسبت ناحق اور بے وجہ بدگوئی اور زبان درازی اور بد زبانی اور بہتان اور افترا کی عادت جاری رکھ کر خدا تعالیٰ کے بندوں کو دھوکہ دینا چاہتا ہے تو تم پر لازم ہوگا کہ اس بدی کو اپنے درمیان سے دور کرو اور ایسے انسان سے پرہیز کرو جو خطرناک ہے اور چاہیئے کہ کسی مذہب اور کسی قوم اور کسی گروہ کے آدمی کو نقصان رسانی کا ارادہ مت کرو اور ہر ایک کے لئے سچے ناصح بنو اور چاہیئے کہ شریروں اور بدمعاشوں اور مفسدوں اور بدچلنوں کو ہرگز تمہاری مجلس میں گذر نہ ہو اور نہ تمہارے مکانوں میں رہ سکیں کہ وہ کسی وقت تمہاری ٹھوکر کا موجب ہونگے ۔

یہ وہ امور اور وہ شرائط ہیں جو میں ابتدا سے کہتا چلا آیا ہوں ۔ میری جماعت میں سے ہر ایک فرد پر لازم ہوگا کہ ان تمام وصیتوں کے کاربند ہوں ۔ اور چاہیئے کہ تمہاری مجلسوں میں کوئی ناپاکی اور ٹھٹھے اور ہنسی کا مشغلہ نہ ہو ۔ اور نیک دل اور پاک طبع اور پاک خیال ہو کر زمین پر چلو اور یاد رکھو ۔ ہر ایک شر مقابلہ کے لائق نہیں اس لئے لازم ہے کہ اکثر اوقات

عفو اور درگذر کی عادت ڈالو اور صبر اور حلم سے کام لو۔ اور کسی پر ناجائز طریق سے حملہ نہ کرو اور جذبات نفس کو دبائے رکھو۔ اور اگر کوئی بحث کرو یا کوئی مذہبی گفتگو ہو تو نرم الفاظ اور مہذبانہ طریق سے کرو۔ اور اگر کوئی جہالت سے پیش آوے تو سلام کہہ کر ایسی مجلس سے جلد اُٹھ جاؤ۔ اگر تم ستائے جاؤ اور گالیاں دیئے جاؤ اور تمہارے حق میں بُرے بُرے لفظ کہے جائیں تو ہوشیار رہو کہ سفاہت کا سفاہت کے ساتھ تمہارا مقابلہ نہ ہو ورنہ تم بھی ویسے ہی ٹھہرو گے جیسا کہ وہ ہیں۔ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہیں ایک ایسی جماعت بنادے کہ تم تمام دنیا کے لئے نیکی اور راستبازی کا نمونہ ٹھہرو۔ سو اپنے درمیان سے ایسے شخص کو جلد نکالو جو بدی اور شرارت اور فتنہ انگیزی اور بدنفسی کا نمونہ ہے۔ جو شخص ہماری جماعت میں غربت اور نیکی اور پرہیزگاری اور حلم اور نرم زبانی اور نیک مزاجی اور نیک چلنی کے ساتھ رہ نہیں سکتا وہ جلد ہم سے جُدا ہو جائے کیونکہ ہمارا خدا نہیں چاہتا کہ ایسا شخص ہم میں رہے اور یقیناً وہ بدبختی میں مریگا کیونکہ اس نے نیک راہ کو اختیار نہ کیا۔ سو تم ہوشیار ہو جاؤ اور واقعی نیک دل اور غریب مزاج اور راستباز بن جاؤ۔ تم پنجوقتہ نماز اور اخلاقی حالت سے شناخت کئے جاؤ گے۔ اور جس میں بدی کا بیج ہے وہ اس نصیحت پر قائم نہیں رہ سکے گا۔

چاہیئے کہ تمہارے دل فریب سے پاک اور تمہارے ہاتھ ظلم سے بری اور تمہاری آنکھیں ناپاکی سے منزہ ہوں اور تمہارے اندر بجز راستی اور ہمدردی خلائق کے اور کچھ نہ ہو۔ میرے دوست جو میرے پاس قادیان میں رہتے ہیں۔ مَیں اُمید رکھتا ہوں کہ وہ اپنے تمام انسانی قویٰ میں اعلیٰ نمونہ دکھائینگے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ اس نیک جماعت میں کبھی کوئی ایسا آدمی مل کر رہے جس کے حالات مشتبہ ہوں یا جس کے چال چلن پر کسی قسم کا اعتراض ہو سکے یا اس کی طبیعت میں کسی قسم کی مفسدہ پردازی ہو یا کسی اور قسم کی ناپاکی اُس میں پائی جائے۔ لہٰذا ہم پر یہ واجب اور فرض ہوگا کہ اگر ہم کسی کی نسبت کوئی شکایت سُنیں گے کہ وہ خدا تعالیٰ کے فرائض کو عمداً ضائع کرتا ہے یا کسی ٹھٹھے اور بیہودگی کی مجلس میں بیٹھتا ہے یا کسی اور قسم کی بدچلنی اس میں ہے تو وہ فی الفور اپنی جماعت سے الگ کر دیا جائیگا۔ اور پھر وہ ہمارے ساتھ اور ہمارے دوستوں کے ساتھ نہیں رہ سکیگا . . . . اصل بات یہ ہے کہ ایک کھیت جو محنت سے تیار کیا جاتا اور پکایا جاتا ہے اس کے ساتھ خراب بُوٹیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو کاٹنے اور جلانے کے لائق ہوتی ہیں۔ ایسا ہی قانون قدرت چلا آیا ہے جس سے ہماری جماعت باہر نہیں ہو سکتی اور مَیں جانتا ہوں کہ وہ لوگ جو حقیقی طور پر میری جماعت میں داخل ہیں اُن کے دل خدا تعالیٰ نے ایسے رکھے ہیں کہ وہ طبعاً بدی سے متنفر اور نیکی سے پیار کرتے ہیں اور مَیں امید رکھتا ہوں کہ وہ اپنی زندگی کا بہت اچھا نمونہ لوگوں کے لئے ظاہر کریں گے۔

(تبلیغ رسالت جلد ہفتم صفحہ ۴۲-۴۵)

دنیا جائے گزشتنی گذاشتنی ہے۔ اور جب انسان ایک ضروری وقت میں ایک نیک کام کے بجا لانے میں پوری کوشش نہیں کرتا تو پھر وہ گیا ہوا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ اور خود میں دیکھتا ہوں کہ بہت سا حصہ عمر کا گذار چکا ہوں۔ اور الہام الٰہی اور قیاس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ باقی ماندہ تھوڑا سا حصہ ہے۔ **پس جو کوئی میری موجودگی اور میری زندگی میں میری منشاء کے مطابق میری اغراض میں مدد دیگا میں امید رکھتا ہوں کہ وہ قیامت میں بھی میرے ساتھ ہوگا۔** اور جو شخص ایسی ضروری مہمات میں مال خرچ کرے گا۔ میں اُمید نہیں رکھتا کہ اس مال کے خرچ سے اُس کے مال میں کچھ کمی آجائیگی۔ بلکہ اس کے مال میں برکت ہوگی۔ پس چاہیئے کہ خدا تعالیٰ پر توکل کر کے پورے اخلاص اور جوش اور ہمت سے کام لیں کہ یہی وقت خدمت گذاری کا ہے۔ پھر بعد اس کے **وہ وقت آتا ہے کہ ایک سونے کا پہاڑ بھی اس راہ میں خرچ کریں تو اس وقت کے ایک پیسہ کے برابر نہیں ہوگا۔ یہ ایک ایسا مبارک وقت ہے کہ تم میں وہ خدا کا فرستادہ موجود ہے جس کا صدہا سال سے اُمتیں انتظار کر رہی تھیں** اور ہر روز خدا تعالے کی تازہ وحی تازہ بشارتوں سے بھری ہوئی نازل ہو رہی ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے متواتر ظاہر کر دیا ہے کہ واقعی اور قطعی طور پر وہی شخص اس جماعت میں داخل سمجھا جائیگا کہ اپنے عزیز مال کو اس راہ میں خرچ کرے گا .... یہ مت خیال کرو کہ مال تمہاری کوشش سے آتا ہے بلکہ خدا تعالے کی طرف سے آتا ہے۔ اور یہ مت خیال کرو کہ تم کوئی حصہ مال کا دے کر یا کسی اور رنگ سے کوئی خدمت بجا لا کر خدا تعالے اور اس کے فرستادہ پر کچھ احسان کرتے ہو **بلکہ یہ اس کا احسان ہے کہ تمہیں اِس خدمت کے لئے بلاتا ہے** اور میں سچ کہتا ہوں کہ اگر تم سب کے سب مجھے چھوڑ دو۔ اور خدمت اور امداد سے پہلو تہی کرو تو وہ ایک قوم پیدا کر دیگا کہ اس کی خدمت بجا لائے گی۔ تم یقیناً سمجھو کہ یہ کام آسمان سے ہے اور تمہاری خدمت صرف تمہاری بھلائی کے لئے ہے۔ پس ایسا نہ ہو کہ تم دل میں تکبّر کرو۔ اور یا یہ خیال کرو کہ ہم خدمت مالی یا کسی قسم کی خدمت کرتے ہیں۔ میں بار بار تمہیں کہتا ہوں کہ خدا تمہاری خدمتوں کا ذرا محتاج نہیں ہاں تم پر یہ اس کا فضل ہے کہ تم کو خدمت کا موقع دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے کہ بمقام گورداسپور مجھ کو الہام ہوا تھا کہ لا الٰہ الّا انا فاتخذنی وکیلا۔ یعنی میں ہی ہوں کہ ہر ایک کام میں کارساز ہوں۔ پس تو مجھکو ہی وکیل یعنی کارساز سمجھ لے اور دوسروں کا اپنے کاموں میں کچھ بھی دخل نہ سمجھ۔ جب یہ الہام مجھ کو ہوا تو میرے دل پر ایک لرزہ پڑا اور مجھے خیال آیا کہ میری جماعت ابھی اس لائق نہیں کہ خدا تعالیٰ ان کا نام بھی لے اور مجھے

اس سے زیادہ کوئی حسرت نہیں کہ مَیں فوت ہو جاؤں اور جماعت کو ایسی ناتمام اور خام حالت میں چھوڑ جاؤں۔ مَیں یقیناً سمجھتا ہوں کہ بخل اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے .... مَیں تم میں بہت دیر تک نہیں رہونگا اور وہ وقت چلا آتا ہے کہ تم پھر مجھے نہیں دیکھو گے۔ اور بہتوں کو حسرت ہوگی کہ کاش ہم نے نظر کے سامنے کوئی قابل قدر کام کیا ہوتا۔ سو اس وقت ان حسرات کا جلد تدارک کرو۔ جس طرح پہلے نبی رسول اپنی امت میں نہیں رہے مَیں بھی نہیں رہوں گا۔ سو اس وقت کا قدر کرو۔ اور **اگر تم اس قدر خدمت بجا لاؤ کہ اپنی غیر منقولہ جائدادوں کو اس راہ میں بیچ دو پھر بھی ادب سے دُور ہوگا کہ تم خیال کرو کہ ہم نے کوئی خدمت کی ہے**۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اس وقت رحمتِ الٰہی اس دین کی تائید میں جوش میں ہے اور اس کے فرشتے دلوں پر نازل ہو رہے ہیں ہر ایک عقل اور فہم کی بات جو تمہارے دل میں ہے وہ تمہاری طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ آسمان سے عجیب سلسلۂ انوار جاری اور نازل ہو رہا ہے۔ پس مَیں بار بار کہتا ہوں کہ خدمت میں جان توڑ کر کوشش کرو مگر دل میں مت لاؤ کہ ہم نے کچھ کیا ہے اگر تم ایسا کرو گے ہلاک ہو جاؤ گے۔ یہ تمام خیالات ادب سے دُور ہیں۔ اور جس قدر بے ادب جلد تر ہلاک ہو جاتا ہے۔ ایسا جلد کوئی ہلاک نہیں ہوتا۔

(تبلیغ رسالت جلد دہم ص ۵۴ - ۵۶)

واضح رہے کہ صرف زبان سے بیعت کا اقرار کرنا کچھ چیز نہیں ہے جب تک دل کی عزیمت سے اس پر پورا پورا عمل نہ ہو پس جو شخص میری تعلیم پر پورا پورا عمل کرتا ہے وہ اس میرے گھر میں داخل ہو جاتا ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ کے کلام میں یہ وعدہ ہے "انّی احافظ کلّ من فی الدار" یعنی ہر ایک جو میرے گھر کی چار دیواری کے اندر ہے مَیں اُس کو بچاؤں گا۔ اسجگہ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہی لوگ میرے گھر کے اندر ہیں جو میرے اس خاک وخشت کے گھر میں بود و باش رکھتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو میری پوری پوری پیروی کرتے ہیں میرے روحانی گھر میں داخل ہیں۔ پیروی کرنے کیلئے یہ باتیں ہیں کہ وہ یقین کریں کہ ان کا ایک قادر اور قیوم اور خالق الکل خدا ہے جو اپنی صفات میں ازلی ابدی اور غیر متغیّر ہے۔ نہ وہ کسی کا بیٹا ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔ وہ دُکھ اُٹھانے اور صلیب پر چڑھنے اور مرنے سے پاک ہے۔ وہ ایسا ہے کہ باوجود دُور ہونے کے نزدیک ہے اور باوجود نزدیک ہونے کے وہ دُور ہے اور باوجود ایک ہونے کے اس کی تجلّیات الگ الگ ہیں۔ انسان کی طرف سے جب ایک نئے رنگ کی تبدیلی ظہور میں آوے تو اس کے لئے وہ ایک نیا خدا بن جاتا ہے۔ اور

ایک نئی تجلّی کے ساتھ اس سے معاملہ کرتا ہے۔ اور انسان بقدر اپنی تبدیلی کے خدا میں بھی تبدیلی دیکھتا ہے مگر یہ نہیں کہ خدا میں کچھ تغیر آجاتا ہے بلکہ وہ ازل سے غیر متغیر اور کمال تام رکھتا ہے لیکن انسانی تغیرات کے وقت جب نیکی کی طرف انسان کے تغیر ہوتے ہیں تو خدا بھی ایک نئی تجلّی سے اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور ہر ایک ترقی یافتہ حالت کے وقت جو انسان سے ظہور میں آتی ہے خدا تعالیٰ کی قادرانہ تجلّی بھی ایک ترقی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ وہ خارق عادت قدرت اسی جگہ دکھلاتا ہے جہاں خارق عادت تبدیلی ظاہر ہوتی ہے۔ خوارق اور معجزات کی یہی جڑ ہے۔ یہ خدا ہے جو ہمارے سلسلہ کی شرط ہے اس پر ایمان لاؤ اور اپنے نفس پر اور اپنے آراموں پر اور اپنے کل تعلّقات پر اس کو مقدم رکھو اور عملی طور پر بہادری کے ساتھ اس کی راہ میں صدق و وفا دکھلاؤ۔ دنیا اپنے اسباب اور اپنے عزیزوں پر اس کو مقدم نہیں رکھتی مگر تم اس کو مقدم رکھو تا تم آسمان پر اُس کی جماعت لکھے جاؤ رحمت کے نشان دکھلانا قدیم سے خدا کی عادت ہے مگر تم اس حالت میں اس عادت سے حصہ لے سکتے ہو کہ تم میں اور اس میں کچھ جدائی نہ رہے اور تمہاری مرضی اس کی مرضی اور تمہاری خواہش اُس کی خواہشیں ہو جائیں۔ اور تمہارا سر ہر ایک وقت اور ہر ایک حالت مرادیابی اور نامرادی میں اُس کے آستانہ پر پڑا رہے تا جو چاہے سو کرے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم میں وہ خدا ظاہر ہوگا جس نے مدت سے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے۔ کیا کوئی تم میں ہے جو اس پر عمل کرے اور اس کی رضا کا طالب ہو جائے اور اس کی قضاء و قدر پر ناراض نہ ہو۔ سو تم مصیبت کو دیکھ کر اور بھی قدم آگے رکھو کہ یہ تمہاری ترقی کا ذریعہ ہے اور اُس کی توحید زمین پر پھیلانے کے لئے اپنی تمام طاقت سے کوشش کرو اور اس کے بندوں پر رحم کرو اور اُن پر زبان یا ہاتھ یا کسی تدبیر سے ظلم نہ کرو اور مخلوق کی بھلائی کے لئے کوشش کرتے رہو۔ اور کسی پر تکبّر نہ کرو گو اپنا ماتحت ہو اور کسی کو گالی مت دو گو وہ گالی دیتا ہو۔ غریب اور حلیم اور نیک نیت اور مخلوق کے ہمدرد بن جاؤ تا قبول کئے جاؤ۔

بہت ہیں جو حلم ظاہر کرتے ہیں مگر وہ اندر سے بھیڑیے ہیں۔ بہت ہیں جو اوپر سے صاف ہیں مگر اندر سے سانپ ہیں۔ سو تم اس کی جناب میں قبول نہیں ہو سکتے جب تک ظاہر و باطن ایک نہ ہو۔ بڑے ہو کر چھوٹوں پر رحم کرو نہ ان کی تحقیر۔ عالم ہو کر نادانوں کو نصیحت کرو نہ خودنمائی سے اُن کی تذلیل۔ اور امیر ہو کر غریبوں کی خدمت کرو نہ خودپسندی سے اُن پر تکبّر۔ ہلاکت کی راہوں سے ڈرو۔ خدا سے ڈرتے رہو اور تقویٰ اختیار کرو اور مخلوق کی پرستش نہ کرو اور اپنے مولیٰ کی طرف منقطع ہو جاؤ۔ اور دنیا سے دل برداشتہ رہو۔ اور اُسی کے ہو جاؤ اور اُسی کیلئے زندگی بسر کرو۔ اور اس کیلئے ہر ایک ناپاکی

اور گناہ سے نفرت کرو کیونکہ وہ پاک ہے۔ چاہیئے کہ ہر ایک صبح تمہارے لئے گواہی دے کہ تم نے تقویٰ سے رات بسر کی۔ اور ہر ایک شام تمہارے لئے گواہی دے کہ تم نے ڈرتے ڈرتے دن بسر کیا۔ دنیا کی لعنتوں سے مت ڈرو کہ وہ دھوئیں کی طرح دیکھتے دیکھتے غائب ہو جاتی ہیں۔ اور وہ دن کو رات نہیں کر سکتیں بلکہ تم خدا کی لعنت سے ڈرو جو آسمان سے نازل ہوتی اور جس پر پڑتی ہے اُس کی دونوں جہانوں میں بیخ کنی کر جاتی ہے۔ تم ریاکاری کے ساتھ اپنے تئیں بچا نہیں سکتے کیونکہ وہ خدا جو تمہارا خدا ہے اُس کی انسان کے پاتال تک نظر ہے۔ کیا تم اس کو دھوکا دے سکتے ہو؟ پس تم سیدھے ہو جاؤ۔ اور صاف ہو جاؤ اور پاک ہو جاؤ اور کھرے ہو جاؤ۔ اگر ایک ذرّہ تیرگی تم میں باقی ہے تو وہ تمہاری ساری روشنی کو دُور کر دیگی۔ اور اگر تمہارے کسی پہلو میں تکبّر ہے یا ریا ہے یا خود پسندی ہے یا کسل ہے تو تم ایسی چیز نہیں ہو کہ جو قبول کے لائق ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تم صرف چند باتوں کو لے کر اپنے تئیں دھوکہ دو کہ جو کچھ ہم نے کرنا تھا کر لیا ہے۔ کیونکہ خدا چاہتا ہے کہ تمہاری ہستی پر پورا پورا انقلاب آوے اور وہ تم سے ایک موت مانگتا ہے جس کے بعد وہ تمہیں زندہ کرے گا۔ تم آپس میں جلد صلح کرو۔ اور اپنے بھائیوں کے گناہ بخشو کیونکہ شریر ہے وہ انسان کہ جو اپنے بھائی کے ساتھ صلح پر راضی نہیں وہ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ وہ تفرقہ ڈالتا ہے۔ تم اپنی نفسانیت ہر پہلو سے چھوڑ دو اور باہمی ناراضگی جانے دو اور سچے ہو کر جھوٹے کی طرح تذلّل کرو تا تم بخشے جاؤ۔ نفسانیت کی فربہی چھوڑ دو کہ جس دروازہ کے لئے تم بلائے گئے ہو اس میں سے ایک فربہ انسان داخل نہیں ہو سکتا۔ کیا ہی بدقسمت وہ شخص ہے جو ان باتوں کو نہیں مانتا جو خدا کے مُنہ سے نکلیں اور مَیں نے بیان کیں۔ تم اگر چاہتے ہو کہ آسمان پر تم سے خدا راضی ہو تو تم باہم ایسے ایک ہو جاؤ جیسے ایک پیٹ میں سے دو بھائی۔ تم میں سے زیادہ بزرگ وہی ہے جو زیادہ اپنے بھائی کے گناہ بخشتا ہے اور بدبخت ہے وہ جو ضد کرتا ہے اور نہیں بخشتا سو اس کا مجھ میں حصّہ نہیں۔ خدا کی لعنت سے بہت خائف رہو کہ وہ قدّوس اور غیّور ہے۔ بدکار خدا کا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ متکبّر اس کا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ ظالم اس کا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ خائن اس کا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ اور ہر ایک جو اس کے نام کے لئے غیرت مند نہیں اُس کا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ جو دنیا پر کُتّوں یا چیونٹیوں یا گِدّھوں کی طرح گرتے ہیں اور دنیا سے آرام یافتہ ہیں وہ اس کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔ ہر ایک ناپاک آنکھ اُس سے دُور ہے۔ ہر ایک ناپاک دل اُس سے بے خبر ہے وہ جو اس کے لئے آگ میں ہے وہ آگ سے نجات دیا جائیگا۔ وہ جو اُس کیلئے روتا ہے وہ ہنسیگا۔ وہ جو اس کے لئے دنیا سے توڑتا ہے وہ اُس کو ملے گا۔ تم سچے دل سے اور پورے

صدق سے اور سرگرمی کے قدم سے خدا کے دوست بنو تا وہ بھی تمہارا دوست بن جائے۔ تم ماتحتوں پر اور اپنی بیویوں پر اور اپنے غریب بھائیوں پر رحم کرو تا آسمان پر تم پر بھی رحم ہو۔ تم سچ مچ اُس کے ہو جاؤ تا وہ بھی تمہارا ہو جاوے۔ دنیا ہزاروں بلاؤں کی جگہ ہے جن میں سے ایک طاعون بھی ہے سو تم خدا سے صدق کے ساتھ پنجہ مارو تا وہ یہ بلائیں تم سے دُور رکھے۔ کوئی آفت زمین پر پیدا نہیں ہوتی جب تک آسمان سے حکم نہ ہو اور کوئی آفت دور نہیں ہوتی جب تک آسمان سے رحم نازل نہ ہو۔ سو تمہاری عقلمندی اسی میں ہے کہ تم جڑ کو پکڑو نہ شاخ کو۔ تمہیں دوا اور تدبیر سے ممانعت نہیں ہے مگر اُن پر بھروسہ کرنے سے ممانعت ہے اور آخر وہی ہوگا جو خدا کا ارادہ ہوگا۔ اگر کوئی طاقت رکھے تو توکّل کا مقام ہر ایک مقام سے بڑھ کر ہے۔

اور تمہارے لئے ایک ضروری تعلیم یہ ہے کہ قرآن شریف کو مہجور کی طرح نہ چھوڑ دو کہ تمہاری اِسی میں زندگی ہے۔ جو لوگ قرآن کو عزّت دینگے وہ آسمان پر عزّت پائیں گے۔ جو لوگ ہر ایک حدیث اور ہر ایک قول پر قرآن کو مقدّم رکھیں گے اُن کو آسمان پر مقدّم رکھا جائیگا۔ نوع انسان کے لئے روئے زمین پر اب کوئی کتاب نہیں مگر قرآن۔ اور تمام آدم زادوں کے لئے اب کوئی رسول اور شفیع نہیں مگر **محمد مصطفٰے** صلی اللہ علیہ وسلم۔ سو تم کوشش کرو کہ سچی محبت اس جاہ و جلال کے نبی کے ساتھ رکھو۔ اور اس کے غیر کو اس پر کسی نوع کی بڑائی مت دو تا آسمان پر تم نجات یافتہ لکھے جاؤ۔ اور یاد رکھو کہ نجات وہ چیز نہیں جو مرنے کے بعد ظاہر ہوگی بلکہ حقیقی نجات وہ ہے کہ اسی دنیا میں اپنی روشنی دکھلاتی ہے۔ **نجات یافتہ** کون ہے؟ وہ جو یقین رکھتا ہے جو خدا سچ ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اور تمام مخلوق میں درمیانی **شفیع** ہے اور آسمان کے نیچے نہ اس کے ہم مرتبہ کوئی اور رسول ہے اور نہ **قرآن کے ہم مرتبہ** کوئی اور کتاب ہے اور کسی کے لئے خدا نے نہ چاہا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے مگر یہ برگزیدہ نبی ہمیشہ کے لئے زندہ ہے۔

(کشتی نوحؑ ص۱۵۔۲۰)

اِن سب باتوں کے بعد پھر میں کہتا ہوں کہ یہ مت خیال کرو کہ ہم نے ظاہری طور پر بیعت کر لی ہے۔ ظاہر کچھ چیز نہیں خدا تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے اور اسی کے موافق تم سے معاملہ کریگا دیکھو میں یہ کہہ کر فرض تبلیغ سے سبکدوش ہوتا ہوں کہ گناہ ایک زہر ہے اس کو مت کھاؤ۔ خدا کی نافرمانی ایک گندی موت ہے اس سے بچو۔ دعا کرو تا تمہیں طاقت ملے۔ جو شخص دُعا کے وقت خدا کو ہر ایک بات پر قادر نہیں سمجھتا بجز وعدہ کی مستثنیات کے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔

جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہیں چھوڑتا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ جو شخص دنیا کے لالچ میں پھنسا ہوا ہے اور آخرت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ جو شخص درحقیقت دین کو دنیا پر مقدم نہیں رکھتا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ جو شخص پورے طور پر ہر ایک بدی سے اور ہر ایک بدعملی سے یعنی شراب سے قمار بازی سے۔ بدنظری سے اور خیانت سے رشوت سے اور ہر ایک ناجائز تصرف سے توبہ نہیں کرتا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ جو شخص پنجگانہ نماز کا التزام نہیں کرتا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ جو شخص دعا میں لگا نہیں رہتا اور انکسار سے خدا کو یاد نہیں کرتا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ جو شخص بدرفیق کو نہیں چھوڑتا جو اُس پر بد اثر ڈالتا ہے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ جو شخص اپنے ماں باپ کی عزت نہیں کرتا اور امور معروفہ میں جو خلافِ قرآن نہیں ہیں ان کی بات کو نہیں مانتا اور ان کی تعہّد خدمت سے لاپروا ہے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے جو شخص اپنی اہلیہ اور اس کے اقارب سے نرمی اور احسان کے ساتھ معاشرت نہیں کرتا۔ وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ جو شخص اپنے ہمسایہ کو ادنیٰ ادنیٰ خیر سے بھی محروم رکھتا ہے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے جو شخص نہیں چاہتا کہ اپنے قصوروار کا گناہ بخشے اور کینہ پرور آدمی ہے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ ہر ایک مرد جو بیوی سے یا بیوی خاوند سے خیانت سے پیش آتی ہے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ جو شخص اس عہد کو جو اس نے بیعت کے وقت کیا تھا کسی پہلو سے توڑتا ہے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ جو شخص مجھے فی الواقعہ مسیح موعود و مہدی معہود نہیں سمجھتا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے اور جو شخص امورِ معروفہ میں میری اطاعت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ اور جو شخص مخالفوں کی جماعت میں بیٹھتا ہے اور ہاں میں ہاں ملاتا ہے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ ہر ایک زانی۔ فاسق۔ شرابی۔ خونی۔ چور۔ قمار باز۔ خائن۔ مرتشی۔ غاصب۔ ظالم۔ دروغگو۔ جعلساز اور اُن کا ہمنشین اپنے بھائیوں اور بہنوں پر تہمتیں لگانے والا جو اپنے افعالِ شنیعہ سے توبہ نہیں کرتا اور خراب مجلسوں کو نہیں چھوڑتا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔

یہ سب زہریں ہیں۔ تم ان زہروں کو کھا کر کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ اور تاریکی اور روشنی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ ہر ایک جو پیچ در پیچ طبیعت رکھتا ہے اور خدا کے ساتھ صاف نہیں ہے وہ اس برکت کو ہرگز نہیں پا سکتا جو صاف دلوں کو ملتی ہے۔ کیا ہی خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو اپنے دلوں کو صاف کرتے ہیں اور اپنے دلوں کو ہر ایک آلودگی سے پاک کر لیتے ہیں اور اپنے خدا سے

وفاداری کا عہد باندھتے ہیں کیونکہ وہ ہرگز ضائع نہیں کئے جائیں گے۔ ممکن نہیں کہ خدا ان کو رسوا کرے کیونکہ وہ خدا کے ہیں اور خدا ان کا۔ وہ ہر ایک بلا کے وقت بچائے جائیں گے۔ احمق ہے وہ دشمن جو ان کا قصد کرے کیونکہ وہ خدا کی گود میں ہیں اور خدا ان کی حمایت میں۔ کون خدا پر ایمان لایا؟ صرف وہی جو ایسے ہیں۔ ایسا ہی وہ شخص بھی احمق ہے جو ایک بے باک گنہگار اور بد باطن اور شریر النفس کے فکر میں ہے کیونکہ وہ خود ہلاک ہوگا جب سے خدا نے زمین آسمان کو بنایا کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا کہ اس نے نیکوں کو تباہ اور ہلاک اور نیست و نابود کر دیا ہو۔ بلکہ وہ ان کے لئے بڑے بڑے کام دکھلاتا رہا ہے اور اب بھی دکھلائیگا وہ خدا نہایت وفادار خدا ہے اور وفاداروں کے لئے اس کے عجیب کام ظاہر ہوتے ہیں۔ دنیا چاہتی ہے کہ اُن کو کھا جائے اور ہر ایک دشمن اُن پر دانت پیستا ہے مگر وہ جو ان کا دوست ہے ہر ایک ہلاکت کی جگہ سے ان کو بچاتا ہے اور ہر ایک میدان میں ان کو فتح بخشتا ہے۔ کیا ہی نیک طالع وہ شخص ہے جو اُس خدا کا دامن نہ چھوڑے۔ ہم اس پر ایمان لائے۔ ہم نے اس کو شناخت کیا۔ تمام دنیا کا وہی خدا ہے جس نے میرے پر وحی نازل کی۔ جس نے میرے لئے زبردست نشان دکھلائے جس نے مجھے اس زمانے کے لئے مسیح موعود کر کے بھیجا۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں نہ آسمان میں نہ زمین میں۔ جو شخص اس پر ایمان نہیں لاتا وہ سعادت سے محروم اور خذلان میں گرفتار ہے۔ ہم نے اپنے خدا کی آفتاب کی طرح روشن وحی پائی۔ ہم نے اُسے دیکھ لیا کہ دنیا کا وہی خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ کیا ہی قادر اور قیوم خدا ہے جس کو ہم نے پایا۔ کیا ہی زبردست قدرتوں کا مالک ہے جس کو ہم نے دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس کے آگے کوئی بات اَن ہونی نہیں۔ مگر وہی جو اس کی کتاب اور وعدہ کے برخلاف ہے۔ سو جب تم دعا کرو تو اُن جاہل نیچریوں کی طرح نہ کرو جو اپنے ہی خیال سے ایک قانونِ قدرت بنا بیٹھے ہیں جس پر خدا کی کتاب کی مُہر نہیں کیونکہ وہ مردود ہیں۔ اُن کی دعائیں ہرگز قبول نہیں ہونگی۔ وہ اندھے ہیں نہ سوجاکھے۔ وہ مُردے ہیں نہ زندے۔ خدا کے سامنے اپنا تراشیدہ قانون پیش کرتے ہیں۔ اور اُس کی بے انتہا قدرتوں کی حد بست ٹھہراتے ہیں اور اس کو کمزور سمجھتے ہیں۔ سو اُن سے ایسا ہی معاملہ کیا جائیگا جیسا کہ اُن کی حالت ہے۔ لیکن جب تو دُعا کے لئے کھڑا ہو تو تجھے لازم ہے کہ یہ یقین رکھے کہ تیرا خدا ہر ایک چیز پر قادر ہے تب تیری دعا منظور ہوگی اور تو خدا کی قدرت کے عجائبات دیکھیگا جو ہم نے دیکھے ہیں۔ اور ہماری گواہی رؤیت سے ہے نہ بطور قصہ کے۔

(کشتی نوحؑ ص ۲۶-۲۹)

اگر تم خدا کے ہو جاؤ گے تو یقیناً سمجھو کہ خدا تمہارا ہی ہے۔ تم سوئے ہوئے ہو گے اور خدا تعالیٰ

تمہارے لئے جاگے گا۔ تم دشمن سے غافل ہو گے اور خدا اُسے دیکھیگا اور اس کے منصوبے کو توڑے گا تم ابھی تک نہیں جانتے کہ تمہارے خدا میں کیا کیا قدرتیں ہیں۔ اور اگر تم جانتے تو تم پر کوئی ایسا دن نہ آتا کہ تم دنیا کے لئے سخت غمگین ہو جاتے۔ ایک شخص جو ایک خزانہ اپنے پاس رکھتا ہے کیا وہ ایک پیسہ کے ضائع ہونے سے روتا ہے اور چیخیں مارتا ہے اور ہلاک ہونے لگتا ہے؟ پھر اگر تم کو اس خزانہ کی اطلاع ہوتی کہ خدا تمہارا ہر ایک حاجت کے وقت کام آنے والا ہے تو تم دنیا کے لئے ایسے بےخود کیوں ہوتے؟ **خدا ایک پیارا خزانہ ہے** اس کی قدر کرو کہ وہ تمہارے ہر ایک قدم میں تمہارا مددگار ہے۔ تم بغیر اس کے کچھ بھی نہیں۔ اور نہ تمہارے اسباب اور تدبیریں کچھ چیز ہیں۔ غیر قوموں کی تقلید نہ کرو کہ وہ بکلّی اسباب پر گر گئی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہیں حدِ اعتدال تک رعایتِ اسباب سے منع نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے منع کرتا ہوں کہ غیر قوموں کی طرح نرے اسباب کے بندے ہو جاؤ اور اس خدا کو فراموش کر دو جو اسباب کو بھی وہی مہیّا کرتا ہے۔ اگر تمہیں آنکھ ہو تو تمہیں نظر آجائے کہ خدا ہی خدا ہے اور سب ہیچ ہے۔ تم نہ ہاتھ لمبا کر سکتے ہو اور نہ اکٹھا کر سکتے ہو مگر اُس کے اذن سے۔ ایک مُردہ اس پر ہنسی کرے گا مگر کاش اگر وہ مر جاتا تو اس ہنسی سے اس کے لئے بہتر تھا۔ خبردار! تم غیر قوموں کو دیکھ کر اُن کی ریس مت کرو کہ انہوں نے دنیا کے منصوبوں میں بہت ترقی کر لی ہے آؤ ہم بھی انہی کے قدم پر چلیں۔ سنو اور سمجھو کہ وہ اُس خدا سے سخت بیگانہ اور غافل ہیں جو تمہیں اپنی طرف بلاتا ہے۔ اُن کا خدا کیا چیز ہے؟ صرف ایک عاجز انسان۔ اس لئے وہ غفلت میں چھوڑے گئے ہیں۔ تمہیں دنیا کے کسب اور حرفت سے نہیں روکتا مگر تم ان لوگوں کے پیرو مت بنو جنہوں نے سب کچھ دنیا کو ہی سمجھ رکھا ہے۔ چاہیئے کہ تمہارے ہر ایک کام میں خواہ دنیا کا ہو خواہ دین کا خدا سے طاقت اور توفیق مانگنے کا سلسلہ جاری رہے۔ لیکن نہ صرف خشک ہونٹوں سے بلکہ چاہیئے کہ تمہارا سچ مچ یہ عقیدہ ہو کہ ہر ایک برکت آسمان سے ہی اُترتی ہے۔ تم راستباز اس وقت بنو گے جب کہ تم ایسے ہو جاؤ کہ ہر ایک کام کے وقت ہر ایک مشکل کے وقت قبل اسکے جو تم کوئی تدبیر کرو اپنا دروازہ بند کرو اور خدا کے آستانہ پر گرو کہ ہمیں یہ مشکل پیش ہے اپنے فضل سے مشکل کشائی فرما تب رُوح القدس تمہاری مدد کرے گی۔ اور غیب سے کوئی راہ تمہارے لئے کھولی جائے گی۔ اپنی جانوں پر رحم کرو اور جو لوگ خدا سے بکلّی علاقہ توڑ چکے ہیں اور ہمہ تن اسباب پر گر گئے ہیں یہاں تک کہ طاقت مانگنے کے لئے وہ مُنّہ سے انشاء اللہ بھی نہیں نکالتے اُن کے پیرو مت بن جاؤ۔ خدا تمہاری آنکھیں کھولے تا تمہیں معلوم ہو کہ تمہارا خدا تمہاری تمام تدابیر کا شہتیر ہے

اگر شہتیر گر جائے تو کیا کڑیاں اپنی چھت پر قائم رہ سکتی ہیں؟ نہیں بلکہ یک دفعہ گرینگی اور احتمال ہے کہ ان سے کئی خون بھی ہو جائیں۔ اسی طرح تمہاری تدابیر بغیر خدا کی مدد کے قائم نہیں رہ سکتیں۔ اگر تم اس سے مدد نہیں مانگو گے اور اس سے طاقت مانگنا اپنا اصول نہیں ٹھہراؤ گے تو تمہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ آخر بڑی حسرت سے مرو گے۔ یہ مت خیال کرو کہ پھر دوسری قومیں کیونکر کامیاب ہو رہی ہیں حالانکہ وہ اس خدا کو جانتی بھی نہیں جو تمہارا کامل اور قادر خدا ہے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ خدا کو چھوڑنے کی وجہ سے دنیا کے امتحان میں ڈالی گئی ہیں۔ خدا کا امتحان کبھی اس رنگ میں ہوتا ہے کہ جو شخص اُسے چھوڑتا اور دنیا کی مستیوں اور لذّتوں سے دل لگاتا ہے اور دنیا کی دولتوں کا خواہشمند ہوتا ہے تو دنیا کے دروازے اُس پر کھولے جاتے ہیں اور دین کے رو سے وہ نرا مفلس اور ننگا ہوتا ہے۔ اور آخر دنیا کے خیالات میں ہی مرتا اور ابدی جہنم میں ڈالا جاتا ہے۔ اور کبھی اس رنگ میں بھی امتحان ہوتا ہے کہ دنیا سے بھی نامراد رکھا جاتا ہے۔ مگر مؤخر الذکر امتحان ایسا خطرناک نہیں جیسا کہ پہلا۔ کیونکہ پہلے امتحان والا زیادہ مغرور ہوتا ہے۔ بہرحال یہ دونوں طریق مغضوب علیہم ہیں۔ سچی خوشحالی کا سرچشمہ خدا ہے۔ پس جبکہ اس حیّ و قیوّم خدا سے یہ لوگ بے خبر ہیں بلکہ لاپروا ہیں اور اس سے منہ پھیر رہے ہیں تو سچی خوشحالی ان کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ مبارک ہو اس انسان کو جو اس راز کو سمجھ لے۔ اور ہلاک ہو گیا وہ شخص جس نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ اسی طرح تمہیں چاہیئے کہ اس دنیا کے فلسفیوں کی پیروی مت کرو اور ان کو عزّت کی نگاہ سے مت دیکھو کہ یہ سب نادانیاں ہیں۔ سچا فلسفہ وہ ہے جو خدا نے تمہیں اپنے کلام میں سکھلایا ہے۔ ہلاک ہو گئے وہ لوگ جو اس دنیوی فلسفہ کے عاشق ہیں۔ اور کامیاب ہیں وہ لوگ جنہوں نے سچے علم اور فلسفہ کو خدا کی کتاب میں ڈھونڈا۔ نادانی کی راہیں کیوں اختیار کرتے ہو؟ کیا تم خدا کو وہ باتیں سکھلاؤ گے جو اُسے معلوم نہیں؟ کیا تم اندھوں کے پیچھے دوڑتے ہو کہ وہ تمہیں راہ دکھلاویں؟ اے نادانو! وہ جو خود اندھا ہے وہ تمہیں کیا راہ دکھائے گا؟ بلکہ سچّا فلسفہ رُوح القدس سے حاصل ہوتا ہے جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ تم رُوح کے وسیلہ سے اُن پاک علوم تک پہنچائے جاؤ گے جن تک غیروں کی رسائی نہیں۔ اگر صدق سے مانگو تو آخر تم اُسے پاؤ گے تب سمجھو گے کہ یہی علم ہے جو دل کو تازگی اور زندگی بخشتا ہے اور یقین کے مینار تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ جو خود مُردار خوار ہے وہ کہاں سے تمہارے لئے پاک غذا لائیگا؟ وہ جو خود اندھا ہے وہ کیونکر تمہیں دکھاوے گا؟ ہر ایک پاک حکمت آسمان سے آتی ہے پس تم زمینی لوگوں سے کیا ڈھونڈتے ہو؟

جن کی روحیں آسمان کی طرف جاتی ہیں وہی حکمت کے وارث ہیں۔ جن کو خود تسلّی نہیں وہ کیونکر نہیں تسلّی دے سکتے ہیں۔ مگر پہلے دلی پاکیزگی ضروری ہے۔ پہلے صدق و صفا ضروری ہے پھر بعد اس کے یہ سب کچھ نہیں ملیگا۔

(کشتی نوح ص۳۰-۳۲)

اب تم خود یہ سوچ لو اور اپنے دلوں میں فیصلہ کرلو کہ کیا تم نے میرے ہاتھ پر جو بیعت کی ہے اور مجھے مسیح موعود حَکَمْ عدل مانا ہے تو اس کے ماننے کے بعد میرے کسی فیصلہ یا فعل پر اگر دل میں کوئی کدورت یا رنج آتا ہے تو اپنے ایمان کا فکر کرو۔ وہ ایمان جو خدشات اور توہمات سے بھرا ہوُا ہے کوئی نیک نتیجہ پیدا کرنے والا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر تم نے سچے دل سے تسلیم کرلیا ہے کہ مسیح موعود واقعی حَکَمْ ہے تو پھر اس کے حُکم اور فعل کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دو۔ اور اس کے فیصلوں کو عزّت کی نگاہ سے دیکھو تا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک باتوں کی عزّت اور عظمت کرنیوالے ٹھہرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کافی ہے۔ وہ تسلّی دیتے ہیں کہ وہ تمہارا امام ہوگا۔ وہ حَکَم عدل ہوگا اگر اس پر تسلّی نہیں ہوئی تو پھر کب ہوگی۔

(ملفوظات جلد سوم ص۴۳)

تمام مخلصین داخلین سلسلہ بیعت اس عاجز پر ظاہر ہو کہ بیعت کرنے سے غرض یہ ہے تا دنیا کی محبت ٹھنڈی ہو اور اپنے مولیٰ کریم اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دل پر غالب آجائے اور ایسی حالتِ انقطاع پیدا ہوجائے جس سے سفرِ آخرت مکروہ معلوم نہ ہو۔ لیکن اس غرض کے حصول کے لئے صحبت میں رہنا اور ایک حصّہ اپنی عمر کا اس راہ میں خرچ کرنا ضروری ہے تا اگر خدائے تعالیٰ چاہے تو کسی برہانِ یقینی کے مشاہدہ سے کمزوری اور ضعف اور کسل دُور ہو اور یقین کامل پیدا ہو کر ذوق اور شوق اور ولولۂ عشق پیدا ہوجائے۔ سو اس بات کے لئے ہمیشہ فکر رکھنا چاہیئے اور دعا کرنا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ یہ توفیق بخشے۔ اور جب تک یہ توفیق حاصل نہ ہو کبھی کبھی ضرور ملنا چاہیئے کیونکہ سلسلہ بیعت میں داخل ہوکر پھر ملاقات کی پروا نہ رکھنا ایسی بیعت سراسر بے برکت اور صرف ایک رسم کے طور پر ہوگی۔

(اطلاع منسلکہ آسمانی فیصلہ)

قلبِ انسانی بھی حجرِ اسود کی طرح ہے اور اس کا سینہ بیت اللہ سے مشابہت رکھتا ہے ماسوی اللہ کے خیالات وہ بُت ہیں جو اس کعبہ میں رکھے گئے ہیں۔ مکّہ معظمہ کے بتوں کا قلع قمع

اُس وقت ہُوا تھا جبکہ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم دس ہزار قدوسیوں کی جماعت کے ساتھ وہاں جا پڑے تھے اور مکّہ فتح ہو گیا تھا۔ .... پس ماسوی اللہ کے بتوں کی شکست اور استیصال کے لئے ضروری ہے کہ ان پر اسی طرح چڑھائی کی جائے۔ .... غرض اس خانہ کو بتوں سے پاک وصاف کرنے کے لئے ایک جہاد کی ضرورت ہے اور اس جہاد کی راہ مَیں تمہیں بتاتا ہوں۔ اور یقین دلاتا ہوں اگر تم اس پر عمل کرو گے تو ان بتوں کو توڑ ڈالو گے اور یہ راہ میں اپنی خود تراشیدہ نہیں بتاتا بلکہ خدا نے مجھے مامور کیا ہے کہ مَیں بتاؤں۔ اور وہ راہ کیا ہے؟ میری پیروی کرو اور میرے پیچھے چلے آؤ۔ یہ آواز نئی آواز نہیں ہے۔ مکّہ کو بتوں سے پاک کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کہا تھا قل ان کنتم تحبّون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ۔ اسی طرح پر اگر تم میری پیروی کرو گے تو اپنے اندر کے بتوں کو توڑ ڈالنے کے لئے قابل ہو جاؤ گے اور اس طرح پر سینہ کو جو طرح طرح کے بتوں سے بھرا پڑا ہے پاک کرنے کے لائق ہو جاؤ گے۔ تزکیہ نفس کے لئے چلّہ کشیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے چلّہ کشیاں نہیں کی تھیں۔ ارّہ اور نفی اثبات وغیرہ کے ذکر نہیں کئے تھے بلکہ اُن کے پاس ایک اور ہی چیز تھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں محو تھے۔ جو نور آپؐ میں تھا وہ اُس اطاعت کی نالی میں سے ہو کر صحابہ کے قلب پر گرتا اور ماسوی اللہ کے خیالات کو پاش پاش کرتا جاتا تھا۔ تاریکی کے بجائے ان سینوں میں نور بھرا جاتا تھا۔ اس وقت بھی خوب یاد رکھو وہی حالت ہے۔ جب تک کہ وہ نور جو خدا کی نالی میں سے آتا ہے تمہارے قلب پر نہیں گرتا تزکیہ نفس نہیں ہو سکتا۔ انسان کا سینہ مہبط الانوار ہے اور اسی وجہ سے وہ بیت اللہ کہلاتا ہے۔ بڑا کام یہی ہے کہ اس میں جو بُت ہیں وہ توڑے جائیں اور اللہ ہی اللہ رہ جائے۔

(ملفوظات جلد اول صفحہ ۱۷۹-۱۸۰)

اگرچہ ہمارا گروہ ابھی بکثرت دنیا میں نہیں پھیلا لیکن پشاور سے لیکر بمبئی اور کلکتہ اور حیدرآباد دکن اور بعض دیار عرب تک ہمارے پیرو دنیا میں پھیل گئے۔ پہلے یہ گروہ پنجاب میں بڑھتا پھولتا گیا اور اب مَیں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے اکثر حصّوں میں ترقی کر رہا ہے۔ ہمارے گروہ میں عوام کم اور خواص زیادہ ہیں .... اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدرت نے مولویوں کو اُنکے ارادوں سے نامراد رکھ کر ہماری جماعت کو فوق العادت ترقی دی ہے اور دے رہا ہے۔ وہ لوگ جو در حقیقت پارسا طبع اور خدا ترس اور نوع انسان سے ہمدردی کرنے والے اور دین کی ترقی کیلئے

بدل و جان کوشش کرنے والے اور خدا تعالیٰ کی عظمت کو دل میں بٹھانے والے اور عقلمند اور ذی فہم اور اولوالعزم اور خدا اور رسول سے سچی محبت رکھنے والے ہیں وہ اس جماعت میں بکثرت پائے جائینگے میں دیکھتا ہوں کہ خداوند کریم اس بات کا ارادہ کر رہا ہے کہ اس جماعت کو بڑھا دے اور برکت دے اور زمین کے کناروں تک سعادت مند انسانوں کو کھینچ کر داخل کرے۔

(کتاب البریہ ص ۲۰۴-۲۰۵ حاشیہ)

سوچ کر دیکھو کہ تیرہ سو برس میں ایسا زمانہ منہاج نبوت کا اور کس نے پایا؟ اس زمانہ میں جس میں ہماری جماعت پیدا کی گئی ہے کئی وجوہ سے اس جماعت کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشابہت ہے وہ معجزات اور نشانوں کو دیکھتے ہیں جیسا کہ صحابہ نے دیکھا۔ وہ خدا تعالیٰ کے نشانوں اور تازہ بتازہ تائیدات سے نور اور یقین پاتے ہیں جیسا کہ صحابہ نے پایا۔ وہ خدا کی راہ میں لوگوں کے ٹھٹھے اور ہنسی اور لعن طعن اور طرح طرح کی دل آزاری اور قطع رحم وغیرہ کا صدمہ اٹھا رہے ہیں جیسا کہ صحابہ نے اٹھایا۔ وہ خدا کے کھلے کھلے نشانوں اور آسمانی مددوں اور حکمت کی تعلیم سے پاک زندگی حاصل کرتے جاتے ہیں جیسا کہ صحابہ نے حاصل کی۔ بہتیرے اُن میں سے ہیں کہ نمازوں میں روتے اور سجدہ گاہوں کو آنسوؤں سے تر کرتے ہیں جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم روتے تھے۔ بہتیرے ان میں سے ایسے ہیں جن کو سچی خوابیں آتی ہیں اور الہام الٰہی سے مشرف ہوتے ہیں جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہوتے تھے۔ بہتیرے ان میں ایسے ہیں کہ اپنے محنت سے کمائے ہوئے مالوں کو محض خدا تعالیٰ کی مرضات کے لئے ہمارے سلسلہ میں خرچ کرتے ہیں جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم خرچ کرتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ کئی پاؤ گے کہ جو موت کو یاد رکھتے اور دلوں کے نرم اور سچی تقویٰ پر قدم مار رہے ہیں جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت تھی۔ وہ خدا کا گروہ ہے جن کو خدا آپ سنبھال رہا ہے اور دن بدن ان کے دلوں کو پاک کر رہا ہے اور ان کے سینوں کو ایمانی حکمتوں سے بھر رہا ہے اور آسمانی نشانوں سے ان کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے جیسا کہ صحابہؓ کو کھینچتا تھا۔ غرض اس جماعت میں وہ ساری علامتیں پائی جاتی ہیں۔ جو اٰخرین منھم کے لفظ سے مفہوم ہو رہی ہیں اور ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ کا فرمودہ ایک دن پورا ہوتا۔

(ایام الصلح ص ۷۲-۷۳)

وہ خدا جو آنکھوں سے پوشیدہ مگر سب چیزوں سے زیادہ چمک رہا ہے جس کے جلال سے فرشتے بھی ڈرتے ہیں وہ شوخی اور چالاکی کو پسند نہیں کرتا اور ڈرنے والوں پر رحم کرتا ہے جو

اس سے ڈرو اور ہر ایک بات سمجھ کر کہو۔ تم اس کی جماعت ہو جن کو اُس نے نیکی کا نمونہ دکھانے کیلئے چنا ہے۔ سو جو شخص بدی نہیں چھوڑتا اور اس کے لب جھوٹ سے اور اس کا دل ناپاک خیالات سے پرہیز نہیں کرتا وہ اس جماعت سے کاٹا جائیگا۔ اے خدا کے بندو! دلوں کو صاف کرو اور اپنے اندرونوں کو دھو ڈالو۔ تم نفاق اور دورنگی سے ہر ایک کو راضی کر سکتے ہو مگر خدا کو اس خصلت سے غضب میں لاؤ گے۔ اپنی جانوں پر رحم کرو اور اپنی ذریّت کو ہلاکت سے بچاؤ۔ کبھی ممکن ہی نہیں کہ خدا تم سے راضی ہو۔ حالانکہ تمہارے دل میں اس سے زیادہ کوئی اور عزیز بھی ہے اس کی راہ میں فدا ہو جاؤ۔ اور اس کے لئے محو ہو جاؤ اور ہمہ تن اس کے ہو جاؤ۔ اگر چاہتے ہو کہ اسی دنیا میں خدا کو دیکھ لو۔

(راز حقیقت ص ۴-۵)

خدا تعالیٰ نے جو اس جماعت کو بنانا چاہا ہے تو اس سے یہی غرض رکھی ہے کہ وہ حقیقی معرفت جو دنیا سے مفقود ہوگئی تھی اور وہ حقیقی تقویٰ و طہارت جو اس زمانہ میں پائے نہیں جاتے تھے دوبارہ اُسے قائم کرے۔ عام طور پر تکبّر دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ علماء اپنے علم کی شیخی اور تکبّر میں گرفتار ہیں فقراء کو دیکھو تو ان کی حالت اور ہی قسم کی ہو رہی ہے۔ ان کو اصلاحِ نفس سے کوئی بھی غرض نہیں جس قدر مجاہدے اور ریاضتیں ان لوگوں نے خود تجویز کئے ہوئے ہیں وہ سب گمراہی اور بدعات ہیں اور صرف لفظ ہی لفظ اور جسم ہی جسم ہیں۔ روحانیت کا نام و نشان اُن میں نہیں۔ اس لئے ان کے مجاہدے اور ریاضتیں بھی کچھ اور ہی قسم کے ہیں۔ جیسے ذکر ارّہ وغیرہ جن کا پتہ چشمۂ نبوت سے قطعًا نہیں چلتا۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ نفس کو پاک کرنے کی طرف ان کی توجہ ہی نہیں۔ اور نہ یہ ان کے مصنوعی مجاہدے دل کو پاک کر سکتے ہیں اور نہ کوئی حقیقی نورِ معرفت کا اُن سے حاصل ہو سکتا ہے۔ پس یہ زمانہ اس اصلی تقویٰ و طہارت سے اس وقت بالکل خالی پڑا تھا۔ طریقِ نبوی کو جو پاک ہونے کا ذریعہ تھا بالکل ترک کر دیا گیا۔ اب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ عہدِ نبوت اِس زمانے میں دوبارہ آوے اور وہی تقویٰ طہارت پھر قائم ہو جاوے۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ کی غرض اس جماعت سے یہ ہے کہ گم شدہ معرفت کو دوبارہ دنیا میں اس جماعت کے ذریعہ قائم کر دے۔

(تقریرین ص ۲۱-۲۲)

اے لوگو! خدا سے ڈرو اور درحقیقت اس سے صلح کر لو اور سچ مچ صلاحیت کا جامہ پہن لو اور چاہیئے کہ ہر ایک شرارت تم سے دُور ہو جائے۔ خدا میں بے انتہا عجیب قدرتیں ہیں۔ خدا میں

بے انتہا طاقتیں ہیں۔ خدا میں بے انتہا رحم اور فضل ہے۔ وہی ہے جو ایک ہولناک سیلاب کو ایک دم میں خشک کر سکتا ہے۔ وہی ہے جو مہلک بلاؤں کو ایک ہی ارادے سے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر دُور پھینک دیتا ہے۔ مگر اس کی یہ عجیب قدرتیں انہی پر کھلتی ہیں جو اُس کے ہی ہو جاتے ہیں اور وہی یہ خوارق دیکھتے ہیں جو اس کے لئے اپنے اندر ایک پاک تبدیلی کرتے ہیں اور اس کے آستانے پر گرتے ہیں۔ اور اس قطرے کی طرح جس سے موتی بنتا ہے صاف ہو جاتے ہیں۔ اور محبت اور صدق اور صفا کی سوزش سے پگھل کر اس کی طرف بہنے لگتے ہیں۔ تب وہ مصیبتوں میں اُن کی خبر لیتا ہے اور عجیب طور پر دشمنوں کی سازشوں اور منصوبوں سے انہیں بچا لیتا ہے اور ذلّت کے مقاموں سے انہیں محفوظ رکھتا ہے۔ وہ ان کا متولّی اور متعہّد ہو جاتا ہے۔ وہ ان مشکلات میں جبکہ کوئی انسان کام نہیں آ سکتا ان کی مدد کرتا ہے اور اس کی فوجیں ان کی حمایت کیلئے آتی ہیں۔ کس قدر شکر کا مقام ہے کہ ہمارا خدا کریم اور قادر خدا ہے۔ کیا تم ایسے عزیز کو چھوڑ دو گے؟ کیا اپنے نفس ناپاک کے لئے اس کی حدود کو توڑ دو گے؟ ہمارے لئے اس کی رضا مندی میں مرنا ناپاک زندگی سے بہتر ہے۔

(ایام الصلح ص ۱۰۵)

اے میرے عزیزو! میرے پیارو!! میرے درختِ وجود کی سرسبز شاخو!!! جو خدا تعالیٰ کی رحمت سے جو تم پر ہے میرے سلسلہ بعیت میں داخل ہو اور اپنی زندگی۔ اپنا آرام۔ اپنا مال اس راہ میں فدا کر رہے ہو۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ مَیں جو کچھ کہوں تم اسے قبول کرنا اپنی سعادت سمجھو گے۔ اور جہاں تک تمہاری طاقت ہے دریغ نہیں کرو گے لیکن میں اس خدمت کے لئے معیّن طور پر اپنی زبان سے تم پر کچھ فرض نہیں کر سکتا تاکہ تمہاری خدمتیں نہ میرے کہنے کی مجبوری سے بلکہ اپنی خوشی سے ہوں۔ میرا دوست کون ہے؟ اور میرا عزیز کون؟ وہی جو مجھے پہچانتا ہے۔ مجھے کون پہچانتا ہے؟ صرف وہی جو مجھ پر یقین رکھتا ہے کہ مَیں بھیجا گیا ہوں اور مجھے اس طرح قبول کرتا ہے جس طرح وہ لوگ قبول کئے جاتے ہیں جو بھیجے گئے ہوں۔ دنیا مجھے قبول نہیں کر سکتی کیونکہ مَیں دنیا سے نہیں ہوں مگر جن کی فطرت کو اس عالم کا حصّہ دیا گیا ہے وہ مجھے قبول کرتے ہیں اور کرینگے۔ جو مجھے چھوڑتا ہے وہ اس کو چھوڑتا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ اور مجھ سے پیوند کرتا ہے وہ اس سے کرتا ہے جس کی طرف سے مَیں آیا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ایک چراغ ہے۔ جو شخص میرے پاس آتا ہے ضرور وہ اس روشنی سے حصہ لیگا۔ مگر جو شخص وہم اور بدگمانی سے دُور بھاگتا ہے وہ ظلمت میں ڈال دیا جائے گا۔ اس زمانے کا حصن حصین مَیں ہوں۔ جو مجھ میں داخل ہوتا ہے وہ چوروں

قزّاقوں اور درندوں سے اپنی جان بچائے گا۔ مگر جو شخص میری دیواروں سے دُور رہنا چاہتا ہے۔ ہر طرف سے اس کو موت درپیش ہے اور اس کی لاش بھی سلامت نہیں رہیگی۔ مجھ میں کون داخل ہوتا ہے؟ وہی جو بدی کو چھوڑتا ہے اور نیکی کو اختیار کرتا ہے۔ اور کجی کو چھوڑتا ہے اور راستی پر قدم مارتا ہے اور شیطان کی غلامی سے آزاد ہوتا اور خدا تعالیٰ کا ایک بندۂ مطیع بن جاتا ہے۔ ہر ایک جو ایسا کرتا ہے وہ مجھ میں ہے اور مَیں اُس میں ہوں۔ مگر ایسا کرنے پر فقط وہی قادر ہوتا ہے جس کو خدا تعالیٰ نفسِ مزکّی کے سایہ میں ڈال دیتا ہے۔ تب وہ اس کے نفس کی دوزخ کے اندر اپنا پَیر رکھ دیتا ہے تو وہ ایسا ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ گویا اس میں کبھی آگ نہیں تھی۔ تب وہ ترقی پر ترقی کرتا ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کی رُوح اس میں سکونت کرتی ہے اور ایک تجلّی خاص کے ساتھ ربّ العالمین کا استویٰ اُس کے دل پر ہوتا ہے۔ تب پُرانی انسانیت اس کی جل کر ایک نئی اور پاک انسانیت اس کو عطا کی جاتی ہے اور خدا تعالیٰ بھی ایک نیا خدا ہو کر نئے اور خاص طور پر اس سے تعلّق پکڑتا ہے اور بہشتی زندگی کا تمام پاک سامان اسی عالم میں اس کو مل جاتا ہے۔

(فتح اسلام ص۳۴-۳۵ حاشیہ)

اے میری جماعت خدا تعالیٰ آپ لوگوں کے ساتھ ہو۔ وہ قادر کریم آپ لوگوں کو سفرِ آخرت کے لئے ایسا تیار کرے جیساکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تیار کئے گئے تھے۔ خوب یاد رکھو کہ دنیا کچھ چیز نہیں ہے۔ لعنتی ہے وہ زندگی جو محض دنیا کے لئے ہے۔ اور بدقسمت ہے وہ جس کا تمام ہم وغم دنیا کے لئے ہے۔ ایسا انسان اگر میری جماعت میں ہے تو وہ عبث طور میری جماعت میں اپنے تئیں داخل کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس خشک ٹہنی کی طرح ہے جو پھل نہیں لائے گی۔

اے سعادت مند لوگو! تم زور کے ساتھ اس تعلیم میں داخل ہو جو تمہاری نجات کے لئے مجھے دی گئی ہے۔ تم خدا کو واحد لاشریک سمجھو۔ اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو نہ آسمان میں سے نہ زمین میں سے۔ خدا اسباب کے استعمال سے تمہیں منع نہیں کرتا۔ لیکن جو شخص خدا کو چھوڑ کر اسباب پر ہی بھروسہ کرتا ہے وہ مُشرک ہے۔ قدیم سے خدا کہتا چلا آیا ہے کہ پاک دل بننے کے سوا نجات نہیں۔ سو تم پاک دل بن جاؤ اور نفسانی کینوں اور غصّوں سے الگ ہو جاؤ۔ انسان کے نفس امارہ میں کئی قسم کی پلیدیاں ہوتی ہیں مگر سب سے زیادہ تکبّر کی پلیدی ہے۔ اگر تکبّر نہ ہوتا تو کوئی شخص کافر نہ رہتا۔ سو تم دل کے مسکین بن جاؤ۔ عام طور پر بنی نوع کی ہمدردی کرو۔ جبکہ تم انہیں بہشت دلانے کے لئے وعظ کرتے ہو۔ سو یہ وعظ تمہارا

کب صحیح ہو سکتا ہے اگر تم اس چند روزہ دنیا میں اُن کی بدخواہی کرو۔ خدا تعالیٰ کے فرائض کو دلی خوف سے بجا لاؤ کہ تم ان سے پوچھے جاؤ گے۔ نمازوں میں بہت دُعا کرو کہ تا تمہیں خدا اپنی طرف کھینچے اور تمہارے دلوں کو صاف کرے۔ کیونکہ انسان کمزور ہے۔ ہر ایک بدی جو دُور ہوتی ہے وہ خدا تعالیٰ کی قوت سے دُور ہوتی ہے۔ اور جب تک انسان خدا سے قوت نہ پاوے کسی بدی کے دُور کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ اسلام صرف یہ نہیں کہ رسم کے طور پر اپنے تئیں کلمہ گو کہلاؤ بلکہ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ تمہاری روحیں خدا تعالیٰ کے آستانے پر گر جائیں اور خدا اور اس کے احکام ہر ایک پہلو کے رُو سے تمہاری دنیا پر تمہیں مقدم ہو جائیں۔

(تذکرۃ الشہادتین ص ۶۱-۶۲ طبع اوّل)

میری طرف سے اپنی جماعت کو بار بار وہی نصیحت ہے جو کہ میں پہلے بھی کئی دفعہ اس جگہ اور دوسرے مقامات میں کر چکا ہوں کہ انسان کی عمر تھوڑی اور ناپائیدار ہے اس کا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ اور عظیم الشان کام درپیش ہے اس لئے کوشش کرنی چاہیئے کہ خاتمہ بالخیر ہو جاوے۔

خاتمہ بالخیر ایک ایسی بات ہے کہ جس کے حاصل کرنے کے لئے راستہ میں بہت سے کانٹے ہیں۔ جب انسان دنیا میں آتا ہے تو اس کا اوّل حصہ عمر کا تو بے ہوشی میں گذر جاتا ہے۔ کیونکہ بچہ ہوتا ہے اور اس کو کسی قسم کا علم ہرگز نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب ہوش سنبھالتا ہے تو اس پر دوسرا زمانہ آتا ہے کہ اگرچہ اس زمانے میں بچوں جیسی بے ہوشی تو نہیں ہوتی مگر جوانی کی مستی اور نفسِ امّارہ کے جذبات اور غلبہ کی ایک بیہوشی ضرور ہوتی ہے جو اس ہوش کے دنوں میں بھی بیہوشی پیدا کر دیتی ہے اور کچھ ایسا از خود رفتہ ہو جاتا ہے کہ گویا بے ہوش ہی ہے۔ پس دو زمانے تو اس طرح مارے جاتے ہیں۔ پھر تیسرا زمانہ آتا ہے جو کہ پیرانہ سالی کا زمانہ ہوتا ہے کہ علم کے بعد پھر لاعلم ہو جاتا ہے۔ حواس اور دوسرے قویٰ میں فتور آنے لگتا ہے یہ پیرانہ سالی کا زمانہ ہے۔ بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ پیرانہ سالی میں قدم رکھتے ہی اُن میں آثار جنون کے شروع ہو جاتے ہیں اور حواس باختہ اور مخبوط الحواس نظر آتے ہیں اور بچپن کے سے خواص اُن میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے بہت سے خاندان ہیں کہ اُن میں ۶۰ یا ۷۰ سال کے بعد انسان کے حواس بے کار ہو جاتے ہیں۔ غرض اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی قویٰ کی کمزوری اور طاقتوں کے ضائع ہو جانے سے انسان ہوش میں بے ہوش ہو جاتا ہے اور ضعف اور تکاسل اپنا اثر کرنے لگتا ہے۔ انسان کی عمر کی تقسیم انہی تین زمانوں پر ہے اور تینوں ہی خطرات اور مشکلات میں ہیں۔ پس اب دیکھ لو اور خوب غور کرو کہ انسان کو خاتمہ بالخیر کے لئے کسقدر مشکلات کا سامنا ہے۔

(تقریریں ص ۱-۲)

جیسا کہ میں پہلے کئی مرتبہ بیان کر چکا ہوں ضروری ہے کہ انسان دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو گناہ کے گڑھے میں نہ ڈالے ورنہ وہ ضرور ہلاک ہوگا۔ کیونکہ جو شخص دیدہ دانستہ زہر کھاتا ہے یا کنوئیں میں گرتا ہے۔ وہ نہ دنیا کے نزدیک قابلِ رحم ٹھہر سکتا ہے نہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک۔ اس لئے یہ ضروری اور بہت ضروری ہے خصوصًا ہماری جماعت کے لئے (جس کو اللہ تعالیٰ نے نمونہ کے طور پر انتخاب کیا ہے وہ چاہتا ہے آئیوالی نسلوں کے لئے یہ جماعت ایک نمونہ ٹھہرے) کہ جہاں تک ممکن ہو بد صحبتوں اور بد رفیقوں اور دوستوں سے پرہیز کرے جو اس کی روحانیت پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو نیکی کی طرف لگائے اور اپنے ہر ایک فعل اور حرکت و سکون میں نگاہ رکھے کہ وہ اس کے ذریعہ سے دوسروں کے لئے ایک ہدایت کا نمونہ قائم کرتا ہے یا کہ نہیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے واسطے جہاں تک تدبیر کا حق ہے تدبیر کرنی چاہیئے اور کوئی دقیقہ تدبیر کا فروگذاشت نہیں کرنا چاہیئے کہ جس سے بُری صحبت اور بد مجلس اور خراب عادت سے اپنے آپ کو بچاوے۔ یاد رکھو تقویٰ اور نیکی کے حصول کے لئے تدابیر میں لگے رہنا بھی ایک مخفی عبادت ہے اِس کو حقیر مت سمجھو جب انسان اس کوشش میں لگا رہتا ہے تو سنت اللہ یہی ہے کہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی راہ کھول دی جاتی ہے جو بدیوں سے بچنے کی راہ ہے۔ لیکن جو شخص بدیوں سے بچنے کی اور نیکی کو عمل میں لانے کی تدبیر نہیں کرتا سمجھو کہ وہ بدیوں پر راضی ہو گیا۔ ایسے آدمی سے اللہ تعالےٰ الگ ہو جاتا ہے۔ پھر بدی کا چھوڑنا بھی اُسے ناممکن ہو جاتا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ جب انسان نفس امّارہ کے پنجے میں گرفتار ہونے کے باوجود بھی تدبیروں میں لگا رہتا ہے تو اس کا نفس امّارہ خدا تعالیٰ کے فضل و رحم سے امّارگی سے نکل کر لوّامہ ہو جاتا ہے اور ایسی قابل قدر تبدیلی پا لیتا ہے کہ یا تو وہ امّارہ تھا جو لعنت کے قابل تھا یا اب اُس کو یہ شرف حاصل ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی اس کی قسم کھاتا ہے۔

(تقریریں ص۵-۶)

سو اے وے تمام لوگو! جو اپنے تئیں میری جماعت شمار کرتے ہو آسمان پر تم اُسوقت میری جماعت شمار کئے جاؤ گے۔ جب سچ مچ تقویٰ کی راہوں پر قدم مارو گے سو اپنی پنجوقتہ نمازوں کو ایسے خوف اور حضور سے ادا کرو کہ گویا تم خدا تعالےٰ کو دیکھتے ہو۔ اور اپنے روزوں کو خدا کے لئے صدق کے ساتھ پورے کرو۔ ہر ایک جو زکوٰۃ کے لائق ہے وہ زکوٰۃ دے۔ اور جس پر حج فرض ہو چکا ہے اور کوئی مانع نہیں وہ حج کرے۔ نیکی کو سنوار کر ادا کرو اور بدی کو

بیزار ہو کر ترک کرو۔ یقیناً یاد رکھو کہ کوئی عمل خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتا جو تقویٰ سے خالی ہو۔ ہر ایک نیکی کی جڑ تقویٰ ہے۔ جس عمل میں یہ جڑ ضائع نہیں ہوگی وہ عمل بھی ضائع نہیں ہوگا۔ ضرور ہے کہ انواعِ رنج و مصیبت سے تمہارا امتحان بھی ہو جیسا کہ پہلے مومنوں کے امتحان ہوئے۔ سو خبردار رہو ایسا نہ ہو کہ ٹھوکر کھاؤ۔ زمین تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی اگر تمہارا آسمان سے پختہ تعلّق ہے۔ جب کبھی تم اپنا نقصان کرو گے تو اپنے ہاتھوں سے نہ دشمن کے ہاتھوں سے۔ اگر تمہاری زمینی عزت ساری جاتی رہے تو خدا تمہیں ایک لازوال عزت آسمان پر دے گا سو تم اسکو مت چھوڑو۔ اور ضرور ہے کہ تم دکھ دیئے جاؤ اور اپنی کئی امیدوں سے بے نصیب کئے جاؤ۔ سو ان صورتوں سے تم دلگیر مت ہو کیونکہ تمہارا خدا تمہیں آزماتا ہے کہ تم اس کی راہ میں ثابت قدم ہو یا نہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ آسمان پر فرشتے بھی تمہاری تعریف کریں تو تم ماریں کھاؤ اور خوش رہو اور گالیاں سُنو اور شکر کرو۔ اور ناکامیاں دیکھو اور پیوند مت توڑو۔ تم خدا کی آخری جماعت ہو سو وہ نیک عمل دکھلاؤ جو اپنے کمال میں انتہائی درجہ پر ہو۔ ہر ایک جو تم میں سُست ہو جائیگا وہ ایک گندی چیز کی طرح جماعت سے باہر پھینک دیا جائیگا۔ اور حسرت سے مریگا اور خدا کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ دیکھو مَیں بہت خوشی سے خبر دیتا ہوں کہ تمہارا خدا درحقیقت موجود ہے۔ اگرچہ سب اسی کی مخلوق ہے لیکن وہ اس شخص کو چن لیتا ہے جو اُس کو چُنتا ہے۔ وہ اُس کے پاس آجاتا ہے جو اُس کے پاس جاتا ہے۔ جو اس کو عزّت دیتا ہے وہ اُسکو بھی عزت دیتا ہے۔

تم اپنے دلوں کو سیدھے کر کے اور زبانوں اور آنکھوں اور کانوں کو پاک کر کے اس کی طرف آجاؤ کہ وہ تمہیں قبول کرے گا۔ عقیدہ کے رو سے جو خدا تم سے چاہتا ہے وہ یہی ہے کہ خدا ایک اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کا نبی ہے اور وہ خاتم الانبیاء ہے اور سب سے بڑھ کر ہے۔ اب اس کے بعد کوئی نبی نہیں مگر وہی جس پر بروزی طور سے محمدیت کی چادر پہنائی گئی کیونکہ خادم اپنے مخدوم سے جدا نہیں اور نہ شاخ اپنی بیخ سے جُدا ہے۔

(کشتی نوحؑ ص ۲۱-۲۳)

حقیقی مسلمان اللہ تعالےٰ سے پیار کرتا ہے۔ یہ کہکر اور مان کر کہ وہ میرا محبوب و مولیٰ پیدا کرنے والا اور محسن ہے اس لئے اس کے آستانہ پر سر رکھ دیتا ہے۔ سچے مسلمان کو اگر کہا جاوے کہ ان اعمال کی پاداش میں کچھ بھی نہیں ملے گا اور نہ بہشت ہے اور نہ دوزخ ہے اور نہ آرام ہیں اور نہ لذات ہیں تو وہ اپنے اعمال صالحہ اور محبت الٰہی کو ہرگز ہرگز چھوڑ

نہیں سکتا کیونکہ اس کی عبادات اور خدا تعالیٰ سے تعلّق اور اس کی فرمانبرداری اور اطاعت میں نفا کسی پاداش یا اجر کی بناء اور امید پر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود کو ایسی چیز سمجھتا ہے کہ وہ حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی کی شناخت اور اس کی محبت اور اطاعت کیلئے بنائی گئی ہے اور کوئی غرض اور مقصد اس کا ہے ہی نہیں اسی لئے وہ اپنی خدا داد قوتوں کو جب ان اغراض اور مقاصد میں صرف کرتا ہے تو اس کو اپنے محبوب حقیقی ہی کا چہرہ نظر آتا ہے۔ بہشت و دوزخ پر اس کی اصلاً نظر نہیں ہوتی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے اس امر کا یقین دلایا جاوے کہ خدا تعالیٰ سے محبت کرنے اور اس کی اطاعت میں سخت سے سخت سزا دی جائیگی تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری فطرت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ان تکلیفوں اور بلاؤں کو ایک لذّت اور محبت کے جوش اور شوق کے ساتھ برداشت کرنے کو تیار ہے اور باوجود ایسے یقین کے جو عذاب اور دُکھ کی صورت میں دلایا جاوے کبھی خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری سے ایک قدم باہر نکلنے کو ہزار بلکہ لاانتہا موت سے بڑھ کر اور دکھوں اور مصائب کا مجموعہ قرار دیتی ہے ۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۱۸۲-۱۸۳)

ہماری جماعت کو واجب ہے کہ اب تقویٰ سے کام لے اور اولیاء بننے کی کوشش کرے۔ اس وقت زمینی اسباب کچھ کام نہ آوے گا اور نہ منصوبہ اور حجت بازی کام آئیگی۔ دنیا سے کیا دل لگانا ہے اور اس پر کیا بھروسہ کرنا ہے .. یہی امر غنیمت ہے کہ خدا تعالیٰ سے صلح کی جاوے اور اس کا یہی وقت ہے ان کو یہی فائدہ اٹھانا چاہیئے کہ خدا سے اسی کے ذریعہ سے صلح کر لیں۔ بہت مرضیں ایسی ہوتی ہیں کہ دلّالہ کا کام کرتی ہیں اور انسان کو خدا سے ملا دیتی ہیں خاص ہماری جماعت کو اس وقت وہ تبدیلی یک مرتبہ ہی کرنی چاہیئے جو کہ اس نے دس برس میں کرنی تھی۔ اور کوئی جگہ نہیں ہے جہاں ان کو پناہ مل سکتی ہے۔ اگر وہ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرکے دعائیں کریں تو ان کو بشارتیں بھی ہو جائینگی۔ صحابہ پر جیسے سکینت اتری تھی ویسے ان پر اُترے گی۔ صحابہ کو انجام تو معلوم نہ ہوتا تھا کہ کیا ہو گا۔ مگر دل میں یہ تسلّی ہو جاتی تھی کہ خدا تعالیٰ ہمیں ضائع نہ کرے گا۔ دراصل سکینت اسی تسلّی کا نام ہے۔ جیسے میں اگر طاعون زدہ ہو جاؤں اور گلے تک میری جان آ جائے تو مجھے ہرگز یہ وہم نہیں ہو گا کہ میں ضائع ہو جاؤں گا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ صرف وہی تعلّق جو میرا خدا کے ساتھ ہے وہ بہت قوی ہے انسان کے لئے ٹھیک ہونے کا یہ مفت کا موقعہ ہے۔ راتوں کو جاگو۔ دعائیں کرو۔ آرام کرو (لیکن) جو کسل اور سستی کرتا ہے وہ اپنے گھر والوں اور اولاد پر ظلم کرتا ہے کیونکہ وہ تو مثل جڑ کے ہے اور اہل و عیال اُس کی شاخیں ہیں۔ تھوڑے ابتلا کا ہونا ضروری ہے۔ جیسے لکھا ہے۔ اُحسب الناس ان

یُترکوا ان یقولوا اٰمنّا وھم لا یفتنون ۔ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف تو مکّہ میں فتح کی خبریں دی جاتی تھیں اور ایک طرف اُن کی جان کی بھی خیر نظر نہ آتی تھی ۔ اگر نبوت کا دل نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا ۔ یہ اسی دل کا حوصلہ تھا ۔ بعض ابتلاء صرف تبدیلی کے واسطے ہوتے ہیں ۔ عملی نمونے ایسے اعلیٰ درجہ کے ہوں کہ اُن سے تبدیلیاں ہوں ۔ اور ایسی تبدیلی ہو کہ خود انسان محسوس کرے کہ اب مَیں وہ نہیں ہوں جو کہ پہلے تھا بلکہ مَیں ایک اور انسان ہوں ۔ اس وقت خدا تعالےٰ کو راضی کرو حتّٰی کہ تم کو بشارتیں ہوں ۔ کل لکھتے ہوئے ایک پُرانا الہام نظر پڑا ۔ آیّام غضب اللہ غضبت غضب شدید ننجی اھل السعادۃ ۔ یہاں اہلِ سعادت سے مراد وہ شخص ہے جو عملی طور پر صدق دکھلاتا ہے ۔ خالی زبان تک ایمان کا ہونا کوئی فائدہ نہیں دیتا ۔ جیسے صحابہ نے صدق دکھلایا کہ ہتھیلی پر جانیں رکھ لیں اور بال بچوں تک کو قربان کیا ۔ مگر ہم آج ایک شخص کو اگر کہیں کہ سو کوس چلا جا تو وہ عذر کرتا ہے حتّٰی کہ آبرو عزّت کا معاملہ پیش کرتا ہے اور کاروبار کا ذکر کرتا ہے کہ کسی طرح جانے سے رہ جائے مگر انہوں (صحابہ) نے جان ۔ مال ۔ آبرو ۔ عزّت سب کچھ خاک میں ملا دیا ۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر فلاں فلاں آفت آئی ۔ حالانکہ ہم نے بیعت کی تھی ۔ مگر ہم نے بار بار جماعت کو کہا ہے کہ نِری بیعت اور صرف زبان سے ماننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔ چاہیئے کہ خدا میں گداز ہو کر ایک نیا وجود بن جائے ۔ سارا قرآن دیکھو کہ کہیں بھی صرف اٰمنوا نہیں لکھا ہے ہر جگہ عمل صالح کا ساتھ ہی ذکر ہے ۔ غرضیکہ خدا ایک موت چاہتا ہے اور میرا تجربہ ہے کہ خدا مومن پر دو موتیں ہرگز جمع نہیں کرتا کہ ایک موت تو اُس کی خدا کے واسطے ہو اور دوسری دنیا کی لعن طعن کے واسطے ۔ ایسے نازک وقت میں چاہیئے کہ جماعت سمجھ جائے اور ایک تیر کی طرح سیدھی ہو جائے ۔ اگر ہزاروں آدمی بھی طاعون سے مر جائیں تو مَیں ہرگز خدا کو ملزم نہ کروں گا اور یہی کہونگا کہ انہوں نے احسان کا پہلو چھوڑ دیا ۔ انّ اللہ لا یضیع اجر المحسنین

(ملفوظات جلد چہارم صـ ۲۷۹-۲۸۱)

اور چاہیئے کہ تم بھی ہمدردی اور اپنے نفسوں کے پاک کرنے سے رُوح القدس سے حصّہ لو کہ بجز رُوح القدس کے حقیقی تقویٰ حاصل نہیں ہو سکتی ۔ اور نفسانی جذبات کو بکلّی چھوڑ کر خدا کی رضا کے لئے وہ راہ اختیار کرو جو اس سے زیادہ کوئی راہ تنگ نہ ہو ۔ دنیا کی لذتوں پر فریفتہ مت ہو کہ وہ خدا سے جُدا کرتی ہیں ۔ اور خدا کے لئے تلخی کی زندگی اختیار کرو ۔ وہ درد جس سے خدا راضی ہو اس لذت سے بہتر ہے جس سے خدا ناراض ہو جائے ۔ اور وہ شکست جس سے خدا راضی ہو اس فتح سے بہتر ہے جو موجبِ غضبِ الٰہی ہو ۔ اس محبت کو چھوڑ دو جو خدا کے غضب کے قریب کرے ۔ اگر تم صاف دل

ہو کر اس کی طرف آجاؤ تو ہر ایک راہ میں وہ تمہاری مدد کرے گا اور کوئی دشمن تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ خدا کی رضا کو تم کسی طرح پا ہی نہیں سکتے جب تک تم اپنی رضا چھوڑ کر اپنی لذّات چھوڑ کر اپنی عزّت چھوڑ کر اپنا مال چھوڑ کر اپنی جان چھوڑ کر اس کی راہ میں وہ تلخی نہ اٹھاؤ جو موت کا نظارہ تمہارے سامنے پیش کرتی ہے۔ لیکن اگر تم تلخی اٹھا لوگے تو ایک پیارے بچے کی طرح خدا کی گود میں آجاؤ گے۔ اور تم اُن راستبازوں کے وارث کئے جاؤ گے جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اور ہر ایک نعمت کے دروازے تم پر کھولے جائیں گے۔ لیکن تھوڑے ہیں جو ایسے ہیں۔ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تقوٰی ایک ایسا درخت ہے جس کو دل میں لگانا چاہیئے۔ وہی پانی جس سے تقوٰی پرورش پاتی ہے تمام باغ کو سیراب کر دیتا ہے۔ تقوٰی ایک ایسی جڑھ ہے کہ اگر وہ نہیں تو سب کچھ ہیچ ہے اور اگر وہ باقی رہے تو سب کچھ باقی ہے۔ انسان کو اس فضولی سے کیا فائدہ جو زبان سے خدا طلبی کا دعوٰی کرتا ہے لیکن قدم صدق نہیں رکھتا۔ دیکھو مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ آدمی ہلاک شدہ ہے جو دین کے ساتھ کچھ دنیا کی ملونی رکھتا ہے اور اس نفس سے جہنم بہت قریب ہے جس کے تمام ارادے خدا کے لئے نہیں ہیں بلکہ کچھ خدا کے لئے اور کچھ دُنیا کے لئے۔ پس اگر تم دنیا کی ایک ذرّہ بھی ملونی اپنے اغراض میں رکھتے ہو تو تمہاری تمام عبادتیں عبث ہیں۔ اس صورت میں تم خدا کی پیروی نہیں کرتے بلکہ شیطان کی پیروی کرتے ہو۔ تم ہرگز توقع نہ کرو کہ ایسی حالت میں خدا تمہاری مدد کرے گا۔ بلکہ تم اس حالت میں زمین کے کیڑے ہو اور تھوڑے ہی دنوں تک تم اس طرح ہلاک ہو جاؤ گے جس طرح کہ کیڑے ہلاک ہوتے ہیں اور تم میں خدا نہیں ہوگا بلکہ تمہیں ہلاک کر کے خدا خوش ہوگا۔ لیکن اگر تم اپنے نفس سے درحقیقت مر جاؤ گے تب تم خدا میں ظاہر ہو جاؤ گے اور خدا تمہارے ساتھ ہوگا۔ اور وہ گھر بابرکت ہوگا جس میں تم رہتے ہوگے اور ان دیواروں پر خدا کی رحمت نازل ہوگی جو تمہارے گھر کی دیواریں ہیں۔ اور وہ شہر بابرکت ہوگا جہاں ایسا آدمی رہتا ہوگا۔ اگر تمہاری زندگی اور تمہاری موت اور تمہاری ہر ایک حرکت اور تمہاری نرمی اور گرمی محض خدا کے لئے ہو جائیگی اور ہر ایک تلخی اور مصیبت کے وقت تم خدا کا امتحان نہیں کرو گے اور تعلّق کو نہیں توڑو گے بلکہ آگے قدم بڑھاؤ گے تو مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ تم خدا کی ایک خاص قوم ہو جاؤ گے۔ تم بھی انسان ہو جیسا کہ مَیں انسان ہوں اور وہی میرا خدا تمہارا خدا ہے۔ پس اپنی پاک قوتوں کو ضائع مت کرو۔ اگر تم پورے طور پر خدا کی طرف جھکو گے تو دیکھو مَیں خدا کے منشاء کے موافق تمہیں کہتا ہوں کہ تم خدا کی ایک قوم برگزیدہ ہو جاؤ گے۔ خدا کی عظمت اپنے دلوں میں بٹھاؤ اور اس کی توحید کا اقرار نہ صرف زبان سے بلکہ عملی طور پر کرو تا خدا بھی عملی طور پر اپنا لطف و احسان تم پر ظاہر کرے۔

کینہ وری سے پرہیز کرو اور بنی نوع سے سچی ہمدردی کے ساتھ پیش آؤ۔ ہر ایک راہ نیکی کی اختیار کرو نہ معلوم کس راہ سے تم قبول کئے جاؤ۔

تمہیں خوشخبری ہو کہ قرب پانے کا میدان خالی ہے۔ ہر ایک قوم دنیا سے پیار کر رہی ہے اور وہ بات جس سے خدا راضی ہو اس کی طرف دنیا کو توجہ نہیں۔ وہ لوگ جو پورے زور سے اس دروازے میں داخل ہونا چاہتے ہیں اُن کے لئے موقعہ ہے کہ اپنے جوہر دکھلائیں اور خدا سے خاص انعام پاویں۔

(الوصیت ص ۱۱-۱۳)

یاد رکھو کہ سچے اور پاک اخلاق راستبازوں کا معجزہ ہے جن میں کوئی غیر شریک نہیں۔ کیونکہ وہ جو خدا میں محو نہیں ہوتے وہ اوپر سے قوت نہیں پاتے اس لئے ان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ پاک اخلاق حاصل کر سکیں۔ سو تم اپنے خدا سے صاف ربط پیدا کرو۔ ٹھٹھا۔ ہنسی۔ کینہ وری۔ گندہ زبانی۔ لالچ۔ جھوٹ۔ بدکاری۔ بدنظری۔ بدخیالی۔ دنیا پرستی۔ تکبّر۔ غرور۔ خودپسندی۔ شرارت۔ کج بحثی سب چھوڑ دو۔ پھر یہ سب کچھ تمہیں آسمان سے ملے گا۔ جب تک وہ طاقت بالا جو تمہیں اوپر کی طرف کھینچ کر لے جائے تمہارے شامل حال نہ ہو اور رُوح القدس جو زندگی بخشتا ہے تم میں داخل نہ ہو تب تک تم بہت ہی کمزور اور تاریکی میں پڑے ہوئے ہو بلکہ ایک مُردہ ہو جس میں جان نہیں۔ اس حالت میں نہ تو تم کسی مصیبت کا مقابلہ کر سکتے ہو۔ نہ اقبال اور دولتمندی کی حالت میں کبر اور غرور سے بچ سکتے ہو اور ہر ایک پہلو سے تم شیطان اور نفس کے مغلوب ہو۔ سو تمہارا علاج تو درحقیقت ایک ہی ہے کہ رُوح القدس جو خاص خدا کے ہاتھ سے اُترتی ہے تمہارا مُنہ نیکی اور راستبازی کی طرف پھیر دے۔ تم ابناء السماء بنو۔ نہ ابناء الارض۔ اور روشنی کے وارث بنو نہ تاریکی کے عاشق تا تم شیطان کی گذرگاہوں سے امن میں آجاؤ۔ کیونکہ شیطان کو ہمیشہ رات سے غرض ہے دن سے کچھ غرض نہیں کیونکہ وہ پُرانا چور ہے جو تاریکی میں قدم رکھتا ہے۔

(کشتی نوحؑ ص ۶۰-۶۱)

اے عزیزو! تم نے وہ وقت پایا ہے جس کی بشارت تمام نبیوں نے دی ہے اور اس شخص کو یعنی مسیح موعود کو تم نے دیکھ لیا جس کے دیکھنے کے لئے بہت سے پیغمبروں نے بھی خواہش کی تھی۔ اس لئے اب اپنے ایمانوں کو خوب مضبوط کرو اور اپنی راہیں درست کرو اور اپنے دلوں کو پاک کرو اور اپنے مولیٰ کو راضی کرو۔ دوستو! تم اس مسافرخانہ میں محض چند روز کے لئے ہو۔ اپنے اصلی گھروں کو یاد کرو

تم دیکھتے ہو کہ ہر ایک سال کوئی نہ کوئی دوست تم سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی تم بھی کسی سال اپنے دوستوں کو داغ جدائی دے جاؤ گے۔ سو ہوشیار ہو جاؤ۔ اور اس پُر آشوب زمانہ کی زہر تم میں اثر نہ کرے۔ اپنی اخلاقی حالتوں کو بہت صاف کرو۔ کینہ اور بُغض اور نخوت سے پاک ہو جاؤ۔ اور اخلاقی معجزات دنیا کو دکھلاؤ۔

(اربعین ۴ ص ۱۴-۱۵)

یقیناً یاد رکھو کہ مومن متقی کے دل میں شر نہیں ہوتا۔ مومن جس قدر متقی ہوتا جاتا ہے اُسی قدر وہ کسی کی نسبت سزا اور ایذا کو پسند نہیں کرتا۔ مسلمان کبھی کینہ ور نہیں ہو سکتا۔ ہاں دوسری قومیں ایسی کینہ پرور ہوتی ہیں کہ اُن کے دل سے دوسرے کی بات کینہ کی کبھی نہیں جاتی۔ اور بدلہ لینے کے لئے ہمیشہ کوشش میں لگے رہتے ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مخالفوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ کوئی دکھ اور تکلیف جو وہ پہنچا سکتے تھے انہوں نے پہنچایا ہے۔ لیکن پھر بھی اُنکی ہزاروں خطائیں بخشنے کو ہم اب بھی تیار ہیں۔ پس تم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو یاد رکھو کہ تم ہر شخص سے خواہ وہ کسی مذہب کا ہو ہمدردی کرو۔ اور بلا تمیز مذہب و قوم ہر ایک سے نیکی کرو۔

(تقریریں ص ۲۹)

ہمارا یہ اصول ہے کہ کل بنی نوع کی ہمدردی کرو۔ اگر ایک شخص ایک ہمسایہ ہندو کو دیکھتا ہے کہ اس کے گھر میں آگ لگ گئی اور یہ نہیں اُٹھتا کہ تا آگ بجھانے میں مدد دے تو میں سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ مجھ سے نہیں ہے۔ اگر ایک شخص ہمارے مریدوں میں سے دیکھتا ہے کہ ایک عیسائی کو کوئی قتل کرتا ہے اور وہ اس کے چھڑانے کے لئے مدد نہیں کرتا تو میں تمہیں بالکل درست کہتا ہوں کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ . . . . میں حلفاً کہتا ہوں اور سچ کہتا ہوں کہ مجھے کسی قوم سے دشمنی نہیں۔ ہاں جہاں تک ممکن ہے اُن کے عقائد کی اصلاح چاہتا ہوں۔ اور اگر کوئی گالیاں دے تو ہمارا شکوہ خدا کی جناب میں ہے نہ کسی اور عدالت میں اور باایں ہمہ نوع انسان کی ہمدردی ہمارا حق ہے۔

(سراج منیر ص ۲۸)

اور میں اس وقت اپنی جماعت کو جو مجھے مسیح موعود مانتی ہے خاص طور پر سمجھاتا ہوں کہ وہ ہمیشہ ان ناپاک عادتوں سے پرہیز کریں۔ مجھے خدا نے جو مسیح موعود کر کے بھیجا ہے اور حضرت مسیح ابن مریم کا جامہ مجھے پہنا دیا ہے اس لئے میں نصیحت کرتا ہوں کہ شر سے پرہیز کرو اور نوع انسان

کے ساتھ حقِ ہمدردی بجا لاؤ۔ اپنے دلوں کو بغضوں اور کینوں سے پاک کرو کہ اس عادت سے تم فرشتوں کی طرح ہو جاؤ گے۔ کیا ہی گندہ اور ناپاک وہ مذہب ہے جس میں انسان کی ہمدردی نہیں۔ اور کیا ہی ناپاک وہ راہ ہے جو نفسانی بغض کے کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ سو تم جو میرے ساتھ ہو ایسے مت ہو تم سوچو کہ مذہب سے حاصل کیا ہے۔ کیا یہی کہ ہر وقت مردم آزاری تمہارا شیوہ ہو؟ نہیں بلکہ مذہب اس زندگی کے حاصل کرنے کے لئے ہے جو خدا میں ہے۔ اور وہ زندگی نہ کسی کو حاصل ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی بجز اس کے کہ خدائی صفات انسان کے اندر داخل ہو جائیں۔ خدا کے لئے سب پر رحم کرو تا آسمان سے تم پر رحم ہو۔ آؤ میں تمہیں ایک ایسی راہ سکھاتا ہوں جس سے تمہارا نور تمام نوروں پر غالب رہے اور وہ یہ ہے کہ تم تمام سفلی کینوں اور حسدوں کو چھوڑ دو اور ہمدرد نوع انسان ہو جاؤ اور خدا میں کھوئے جاؤ اور اس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی صفائی حاصل کرو کہ یہی وہ طریق ہے جس سے کرامتیں صادر ہوتی ہیں۔ اور دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اور فرشتے مدد کے لئے اُترتے ہیں۔ مگر یہ ایک دن کا کام نہیں۔ ترقی کرو۔ ترقی کرو اس دھوبی سے سبق سیکھو جو کپڑوں کو اوّل بھٹی میں جوش دیتا ہے اور دیئے جاتا ہے یہاں تک کہ آخر آگ کی تاثیریں تمام میل اور چرک کو کپڑوں سے علیحدہ کر دیتی ہیں۔ تب صبح اُٹھتا ہے اور پانی پر پہنچتا ہے اور پانی میں کپڑوں کو تر کرتا ہے اور بار بار پتھروں پر مارتا ہے۔ تب وہ میل جو کپڑوں کے اندر تھی اور اُن کا جزو بن گئی تھی کچھ آگ سے صدمات اُٹھا کر اور کچھ پانی میں دھوبی کے بازو سے مار کھا کر یکدفعہ جُدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ کپڑے ایسے سفید ہو جاتے ہیں جیسے ابتداء میں تھے۔ یہی انسانی نفس کے سفید ہونے کی تدبیر ہے۔ اور تمہاری ساری نجات اس سفیدی پر موقوف ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ قد افلح من زکّٰھا۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ص۱۳-۱۴)

ہر وقت جب تک انسان خدا تعالیٰ سے اپنا معاملہ صاف نہ رکھے اور ان ہر دو حقوق کی پوری تکمیل نہ کرے بات نہیں بنتی جیسا کہ میں نے کہا ہے حقوق بھی دو قسم کے ہیں۔ **حقوق اللہ** دوسرے **حقوق العباد** اور حقوق عباد بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو دینی بھائی ہو گئے ہیں خواہ وہ بھائی ہے یا باپ ہے یا بیٹا۔ مگر ان سب میں ایک دینی اخوت ہے اور ایک عام بنی نوع انسان سے سچی ہمدردی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سب سے بڑا حق یہی ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور یہ عبادت کسی غرض ذاتی پر مبنی نہ ہو بلکہ اگر دوزخ اور بہشت نہ بھی ہوں تب بھی اُس کی عبادت کی جاوے اور اس ذاتی محبت میں جو مخلوق کو اپنے خالق سے ہونی چاہیئے کوئی فرق نہ آوے۔ اِس لئے

ان حقوق میں دوزخ اور بہشت کا سوال نہیں ہونا چاہیئے۔

بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی میں میرا یہ مذہب ہے کہ جب تک دشمن کے لئے دُعا نہ کی جاوے پورے طور پر سینہ صاف نہیں ہوتا۔ ادعونی استجب لکم میں اللہ تعالیٰ نے قید نہیں لگائی کہ دشمن کے لئے دُعا کرو تو قبول نہیں کرونگا۔ بلکہ میرا تو یہ مذہب ہے کہ دشمن کیلئے دعا کرنا یہ بھی سنتِ نبویؐ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی سے مسلمان ہوئے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم آپ کے لئے اکثر دُعا کیا کرتے تھے۔ اس لئے بخل کے ساتھ ذاتی دشمنی نہیں کرنی چاہیئے اور حقیقۃً موذی نہیں ہونا چاہیئے۔ شکر کی بات ہے کہ ہمیں اپنا کوئی دشمن نظر نہیں آتا جس کے واسطے دو تین مرتبہ دُعا نہ کی ہو ایک بھی ایسا نہیں۔ اور یہی میں تمہیں کہتا ہوں اور سکھاتا ہوں۔ خدا تعالیٰ اس سے کہ کسی کو حقیقی طور پر ایذا پہنچائی جاوے اور ناحق بخل کی راہ سے دشمنی کی جاوے ایسا ہی بیزار ہے جیسے وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس کے ساتھ ملایا جاوے۔ ایک جگہ وہ فصل نہیں چاہتا اور ایک جگہ وصل نہیں چاہتا۔ یعنی بنی نوع انسان کا باہمی فصل اور اپنا کسی غیر کے ساتھ وصل۔ اور یہ وہی راہ ہے کہ منکروں کے واسطے بھی دعا کی جاوے۔ اس سے سینہ صاف اور انشراح پیدا ہوتا ہے۔ اور ہمت بلند ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک ہماری جماعت یہ رنگ اختیار نہیں کرتی اُس میں اور اُس کے غیر میں پھر کوئی امتیاز نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ ضروری امر ہے کہ جو شخص ایک کے ساتھ دین کی راہ سے دوستی کرتا ہے اور اس کے عزیزوں سے کوئی ادنیٰ درجہ کا ہے تو اس کے ساتھ نہایت رفق اور ملائمت کے ساتھ پیش آنا چاہیئے اور اُن سے محبت کرنی چاہیئے کیونکہ خدا کی یہ شان ہے۔ ؏

بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

پس تم جو میرے ساتھ تعلّق رکھتے ہو تمہیں چاہیئے کہ تم ایسی قوم بنو جس کی نسبت آیا ہے فانّھم قوم لا یشقٰی جلیسھم یعنی وہ ایسی قوم ہے کہ ان کا ہم جلیس بدبخت نہیں ہوتا۔ یہ خلاصہ ہے ایسی تعلیم کا جو تخلّقوا باخلاق اللہ میں پیش کی گئی ہے۔

(ملفوظات جلد سوم صفحہ ۹۶-۹۷)

واضح ہو کہ آج آریہ سماج قادیان کی طرف سے میری نظر سے ایک اشتہار گذرا جس پر ۸ فروری ۱۹۰۳ء تاریخ لکھی ہے اور مطبع چشمہ نور پریس امرتسر میں چھپا ہے۔ جس کا عنوان اشتہار پر یہ لکھا ہے۔ "کادیانی پوپ کے چیلوں کی ایک ڈینگ کا جواب" ۔ اس اشتہار میں ہمارے سیّد و مولیٰ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت اور میری نسبت اور میرے معزز احباب جماعت

کی نسبت اس قدر سخت الفاظ اور گالیاں استعمال کی ہیں کہ بظاہر یہی دل چاہتا تھا کہ ایسے لوگوں کو مخاطب نہ کیا جاوے۔ مگر خدا تعالےٰ نے اپنی وحیٔ خاص سے مجھے مخاطب کرکے فرمایا کہ اس تحریر کا جواب لکھ اور مَیں جواب دینے میں تیرے ساتھ ہوں۔ تب مجھے اس مبشر وحی سے بہت خوشی پہنچی کہ جواب دینے میں مَیں اکیلا نہیں۔ سو مَیں اپنے خدا سے قوت پاکر اٹھا اور اُس کی رُوح کی تائید سے مَیں نے اس رسالہ کو لکھا۔ اور جیسا کہ خدا نے مجھے تائید دی۔ مَیں نے یہی چاہا کہ ان تمام گالیوں کو جو میرے نبیؐ مطاع کو اور مجھے دی گئیں نظر انداز کرکے نرمی سے جواب لکھوں اور پھر یہ کاروبار خدا تعالیٰ کے سپرد کردوں۔

مگر قبل اس کے کہ مَیں اشتہار کا جواب لکھوں اپنی جماعت کے لوگوں کو نصیحتاً کہتا ہوں کہ جو کچھ اس اشتہار کے لکھنے والوں اور اُن کی جماعت نے محض دل دُکھانے اور توہین کی نیت سے ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت اعتراضات کے پیرایہ میں سخت الفاظ لکھے ہیں یا میری نسبت مال خور اور ٹھگ اور کاذب اور نمک حرام کے لفظ کو استعمال میں لائے ہیں اور مجھے لوگوں کا دغا بازی سے مال کھانے والا قرار دیا ہے اور یا جو خود میری جماعت کی نسبت سؤر اور کتّے اور مردار خوار اور گدھے اور بندر وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور ملیچھ ان کا نام رکھا ہے ان تمام دُکھ دینے والے الفاظ پر وہ صبر کریں اور مَیں اس جوش اور اشتعال طبع کو خوب جانتا ہوں کہ جو انسان کو اس حالت میں پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ نہ صرف اس کو گالیاں دی جاتی ہیں بلکہ اس کے رسول اور پیشوا اور امام کو توہین اور تحقیر کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے اور سخت اور غضب پیدا کرنے والے الفاظ سنائے جاتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر تم ان گالیوں اور بدزبانیوں پر صبر نہ کرو تو پھر تم میں اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق ہوگا؟ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ تمہارے ساتھ ہوئی اور پہلے کسی سے نہیں ہوئی ہر ایک سچا سلسلہ جو دنیا میں قائم ہُوا ضرور دنیا نے اس سے دشمنی کی ہے۔ سو چونکہ تم سچائی کے وارث ہو ضرور ہے کہ تم سے بھی دشمنی کریں۔ سو خبردار رہو۔ نفسانیت تم پر غالب نہ آوے۔ ہر ایک سختی کو برداشت کرو۔ ہر ایک گالی کا نرمی سے جواب دو۔ تا آسمان پر تمہارے لئے اجر لکھا جاوے

تمہیں چاہیئے کہ آریوں کے رشیوں اور بزرگوں کی نسبت ہرگز سختی کے الفاظ استعمال نہ کرو تا وہ بھی خدائے قدوس اور اس کے رسولؐ پاک کو گالیاں نہ دیں کیونکہ ان کو معرفت نہیں دی گئی اسلئے وہ نہیں جانتے کہ کس کو گالیاں دیتے ہیں۔ یاد رکھو کہ ہر ایک جو نفسانی جوشوں کا تابع ہے ممکن نہیں کہ اس کے لبوں سے حکمت اور معرفت کی بات نکل سکے بلکہ ہر ایک قول اس کا فساد کے

کیڑوں کا ایک انڈہ ہوتا ہے بجز اس کے اور کچھ نہیں۔ پس اگر تم رُوح القدس کی تعلیم سے بولنا چاہتے ہو تو تمام نفسانی جوش اور نفسانی غضب اپنے اندر سے باہر نکال دو۔ تب پاک معرفت کے بھید تمہارے ہونٹوں پر جاری ہونگے۔ اور آسمان پر تم دنیا کے لئے ایک مفید چیز سمجھے جاؤ گے اور تمہاری عمریں بڑھائی جائینگی۔ تمسخر سے بات نہ کرو اور ٹھٹھے سے کام نہ لو۔ اور چاہیئے کہ سفلہ پن اور اوباش پن کا تمہارے کلام میں کچھ رنگ نہ ہو تا حکمت کا چشمہ تم پر کھلے۔ حکمت کی باتیں دلوں کو فتح کرتی ہیں۔ لیکن تمسخر اور سفاہت کی باتیں فساد پیدا کرتی ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکے سچی باتوں کو نرمی کے لباس میں بتاؤ تا سامعین کے لئے موجب ملال نہ ہوں۔ جو شخص حقیقت کو نہیں سوچتا اور نفس سرکش کا بندہ ہو کر بدزبانی کرتا ہے اور شرارت کے منصوبے جوڑتا ہے وہ ناپاک ہے۔ اس کو کبھی خدا کی طرف راہ نہیں ملتی اور نہ کبھی حکمت اور حق کی بات اس کے مُنہ پر جاری ہوتی ہے۔ پس اگر تم چاہتے ہو کہ خدا کی راہیں تم پر کھلیں تو نفسانی جوشوں سے دُور رہو اور کھیل بازی کے طور پر بحثیں مت کرو کہ یہ کچھ چیز نہیں اور وقت ضائع کرنا ہے۔ بدی کا جواب بدی کے ساتھ مت دو نہ قول سے نہ فعل سے تا خدا تمہاری حمایت کرے۔ اور چاہیئے کہ دردمند دل کے ساتھ سچائی کو لوگوں کے سامنے پیش کرو نہ ٹھٹھے اور ہنسی سے۔ کیونکہ مُردہ ہے وہ دل جو ٹھٹھا اور ہنسی اپنا طریق رکھتا ہے۔ اور ناپاک ہے وہ نفس جو حکمت اور سچائی کے طریق کو نہ آپ اختیار کرتا ہے نہ دوسرے کو اختیار کرنے دیتا ہے سو تم اگر پاک علم کے وارث بننا چاہتے ہو تو نفسانی جوش سے کوئی بات مُنہ سے مت نکالو کہ ایسی بات حکمت اور معرفت سے خالی ہوگی۔ اور سفلہ اور کمینہ لوگوں اور اوباشوں کی طرح نہ چاہو کہ دشمن کو خواہ نخواہ ہتک آمیز اور تمسخر کا جواب دیا جاوے بلکہ دل کی راستی سے سچا اور پُر حکمت جواب دو تا تم آسمانی اسرار کے وارث ٹھہرو۔

(نسیم دعوت ص۳-۵)

تم خوش ہو اور خوشی سے اُچھلو کہ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ اگر تم صدق اور ایمان پر قائم رہو گے تو فرشتے تمہیں تعلیم دینگے۔ اور آسمانی سکینت تم پر اُترے گی اور رُوح القدس سے مدد دیئے جاؤ گے۔ اور خدا ہر ایک قدم میں تمہارے ساتھ ہوگا اور کوئی تم پر غالب نہیں ہو سکیگا۔ خدا کے فضل کی صبر سے انتظار کرو۔ گالیاں سنو اور چپ رہو۔ ماریں کھاؤ اور صبر کرو۔ اور حتّی المقدور بدی کے مقابلہ سے پرہیز کرو تا آسمان پر تمہاری مقبولیت لکھی جاوے۔ یقیناً یاد رکھو کہ جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں اور دل اُن کے خدا کے خوف سے پگھل جاتے ہیں انہیں کے ساتھ خدا ہوتا ہے۔ اور وہ ان کے دشمنوں کا دشمن ہو جاتا ہے۔ دنیا صادق کو نہیں دیکھتی پر خدا جو علیم و خبیر ہے وہ صادق کو دیکھ لیتا ہے پس اپنے ہاتھ سے اس کو بچاتا ہے۔

کیا وہ شخص جو سچے دل سے تم سے پیار کرتا ہے اور سچ مچ تمہارے لئے مرنے کو بھی تیار ہوتا ہے اور تمہارے منشا کے موافق تمہاری اطاعت کرتا ہے۔ اور تمہارے لئے سب کو چھوڑتا ہے کیا تم اس سے پیار نہیں کرتے؟ اور کیا تم اس کو سب سے عزیز نہیں سمجھتے؟ پس جبکہ تم انسان ہو کر پیار کے بدلہ میں پیار کرتے ہو پھر کیونکر خدا نہیں کرے گا۔ خدا خوب جانتا ہے کہ واقعی اس کا وفادار دوست کون ہے اور کون غدّار اور دنیا کو مقدم رکھنے والا ہے۔ سو تم اگر ایسے وفادار ہو جاؤ گے تو تم میں اور تمہارے غیروں میں خدا کا ہاتھ ایک فرق قائم کرکے دکھلائیگا۔

(تذکرۃ الشہادتین ص۶۶ طبع اوّل)

مَیں اسجگہ اس بات کا اظہار بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ جسقدر لوگ میرے سلسلہ بیعت میں داخل ہیں وہ سب کے سب ابھی اس بات کے لائق نہیں کہ مَیں ان کی نسبت کوئی عمدہ رائے ظاہر کر سکوں بلکہ بعض خشک ٹہنیوں کی طرح نظر آتے ہیں جن کو میرا خداوند جو میرا متولی ہے مجھ سے کاٹ کر جلنے والی لکڑیوں میں پھینک دے گا۔ بعض ایسے بھی ہیں کہ اوّل اُن میں دلسوزی اور اخلاص بھی تھا۔ مگر اب اُن پر سخت قبض وارد ہے اور اخلاص کی سرگرمی اور مریدانہ محبت کی نورانیت باقی نہیں رہی بلکہ صرف بلعم کی طرح مکاریاں باقی رہ گئی ہیں۔ اور بوسیدہ دانت کی طرح اب بجز اس کے کسی کام کے نہیں کہ مُنہ سے اُکھاڑ کر پَیروں کے نیچے ڈال دیئے جائیں۔ وہ تھک گئے اور درماندہ ہو گئے اور نابکار دنیا نے اپنے دام تزویر کے نیچے انہیں دبا لیا۔ سو مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ عنقریب مجھ سے کاٹ دیئے جائیں گے بجز اس شخص کے کہ خدا تعالیٰ کا فضل نئے سرے اس کا ہاتھ پکڑ لیوے۔ ایسے بھی بہت ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے مجھے دیا ہے اور وہ میرے درختِ وجود کی سرسبز شاخیں ہیں۔

(فتح اسلام ص۴۰)

یہ عاجز اگرچہ ایسے کامل دوستوں کے وجود سے خدا تعالیٰ کا شکر کرتا ہے لیکن باوجود اس کے یہ بھی ایمان ہے کہ اگرچہ ایک فرد بھی ساتھ نہ رہے اور سب چھوڑ چھاڑ کر اپنا اپنا راہ لیں تب بھی مجھے کچھ خوف نہیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہے۔ اگر مَیں پیسا جاؤں اور کچلا جاؤں اور ایک ذرّے سے بھی حقیر تر ہو جاؤں اور ہر ایک طرف سے ایذا اور گالی اور لعنت دیکھوں تب بھی مَیں آخر فتحیاب ہونگا۔ مجھکو کوئی نہیں جانتا مگر وہ میرے ساتھ ہے۔ مَیں ہرگز ضائع نہیں ہو سکتا دشمنوں کی کوششیں عبث ہیں اور حاسدوں کے منصوبے لاحاصل ہیں۔

اے نادانو اور اندھو! مجھ سے پہلے کون صادق ضائع ہوا جو مَیں ضائع ہو جاؤں گا کِس سچّے

وفادار کو خدا نے ذلّت کے ساتھ ہلاک کر دیا جو مجھے ہلاک کریگا۔ یقیناً یاد رکھو اور کان کھول کر سنو کہ میری روح ہلاک ہونے والی رُوح نہیں اور میری سرشت میں ناکامی کا خمیر نہیں۔ مجھے وہ ہمت اور صدق بخشا گیا ہے جس کے آگے پہاڑ ہیچ ہیں۔ مَیں کسی کی پروا نہیں رکھتا۔ مَیں اکیلا تھا اور اکیلا رہنے پر ناراض نہیں۔ کیا خدا مجھے چھوڑ دے گا؟ کبھی نہیں چھوڑے گا۔ کیا وہ مجھے ضائع کر دے گا؟ کبھی نہیں ضائع کریگا۔ دشمن ذلیل ہونگے اور حاسد شرمندہ اور خدا اپنے بندہ کو ہر میدان میں فتح دے گا۔ مَیں اس کے ساتھ اور وہ میرے ساتھ ہے۔ کوئی چیز ہمارا پیوند توڑ نہیں سکتی۔ اور مجھے اس کی عزت اور جلال کی قسم ہے کہ مجھے دنیا اور آخرت میں اس سے زیادہ کوئی چیز بھی پیاری نہیں کہ اس کے دین کی عظمت ظاہر ہو۔ اس کا جلال چمکے۔ اور اس کا بول بالا ہو۔ کسی ابتلاء سے اس کے فضل کے ساتھ مجھے خوف نہیں اگرچہ ایک ابتلاء نہیں کروڑ ابتلاء ہوں۔ ابتلاؤں کے میدان میں اور دکھوں کے جنگل میں مجھے طاقت دی گئی ہے۔

؎ من نہ آنستم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آں منم کاندر میاں خاک و خوں بینی سرے

پس اگر کوئی میرے قدم پر چلنا نہیں چاہتا تو مجھ سے الگ ہو جائے۔ مجھے کیا معلوم ہے کہ ابھی کون کون سے ہولناک اور پُرخار بادیہ درپیش ہیں جن کو مَیں نے طے کرنا ہے۔ پس جن لوگوں کے نازک پَیر ہیں وہ کیوں میرے ساتھ مصیبت اٹھاتے ہیں۔ جو میرے ہیں وہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتے نہ مصیبت سے نہ لوگوں کے سب وشتم سے نہ آسمانی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے۔ اور جو میرے نہیں وہ عبث دوستی کا دم مارتے ہیں کیونکہ وہ عنقریب الگ کئے جائیں گے اور ان کا پچھلا حال ان کے پہلے سے بدتر ہوگا۔ کیا ہم زلزلوں سے ڈر سکتے ہیں؟ کیا ہم خدا تعالیٰ کی راہ میں ابتلاؤں سے خوفناک ہو جائیں گے؟ کیا ہم اپنے پیارے خدا کی کسی آزمائش سے جدا ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ مگر محض اس کے فضل اور رحمت سے پس جو جُدا ہونے والے ہیں جُدا ہو جائیں اُن کو وداع کا سلام۔ لیکن یاد رکھیں کہ بدظنّی اور قطع تعلق کے بعد اگر پھر کسی وقت جھکیں تو اس جھکنے کی عنداللہ ایسی عزّت نہیں ہوگی جو وفادار لوگ عزّت پاتے ہیں۔ کیونکہ بدظنّی اور غدّاری کا داغ بہت ہی بڑا داغ ہے ؎

اکنوں ہزار عذر بیاری گناہ را   مرشوئے کردہ را نبود زیب دختری

(انوار الاسلام صـ۲۳)

مَیں تو بہت دُعا کرتا ہوں کہ میری سب جماعت ان لوگوں میں ہو جائے جو خدا تعالےٰ سے ڈرتے ہیں اور نماز پر قائم رہتے ہیں۔ اور رات کو اُٹھ کر زمین پر گرتے ہیں اور روتے ہیں اور خدا کے فرائض کو

ضائع نہیں کرتے اور بخیل اور ممسک اور غافل اور دنیا کے کیڑے نہیں ہیں۔ اور میں امید رکھتا ہوں کہ یہ میری دعائیں خدا تعالیٰ قبول کرے گا اور مجھے دکھائے گا کہ اپنے پیچھے میں ایسے لوگوں کو چھوڑتا ہوں۔ لیکن وہ لوگ جن کی آنکھیں زنا کرتی ہیں اور جن کے دل پاخانہ سے بدتر ہیں اور جن کو مرنا ہرگز یاد نہیں ہے۔ میں اور میرا خدا اُن سے بیزار ہے۔ میں بہت خوش ہونگا اگر ایسے لوگ اس پیوند کو قطع کر لیں کیونکہ خدا اس جماعت کو ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جس کے نمونہ سے لوگوں کو خدا یاد آوے۔ اور جو تقویٰ اور طہارت کے اوّل درجہ پر قائم ہوں۔ اور جنہوں نے درحقیقت دین کو دنیا پر مقدم رکھ لیا ہو۔ لیکن وہ مفسد لوگ جو میرے ہاتھ کے نیچے ہاتھ رکھ کر اور یہ کہکر کہ ہم نے دین کو دنیا پر مقدم کیا پھر وہ اپنے گھروں میں جا کر ایسے مفاسد میں مشغول ہو جاتے ہیں کہ صرف دنیا ہی دنیا اُن کے دلوں میں ہوتی ہے۔ نہ ان کی نظر پاک ہے۔ نہ ان کا دل پاک ہے اور نہ ان کے ہاتھوں سے کوئی نیکی ہوتی ہے اور نہ ان کے پَیر کسی نیک کام کے لئے حرکت کرتے ہیں۔ اور وہ اس چوہے کی طرح ہیں جو تاریکی میں ہی پرورش پاتا ہے اور اُس میں رہتا ہے اور اُسی میں مرتا ہے۔ وہ آسمان پر ہمارے سلسلہ میں سے کاٹے گئے ہیں۔ وہ عبث کہتے ہیں کہ ہم اس جماعت میں داخل ہیں کیونکہ آسمان پر وہ داخل نہیں سمجھے جاتے۔ جو شخص میری اس وصیت کو نہیں مانتا کہ درحقیقت وہ دین کو دنیا پر مقدم کرے اور درحقیقت ایک پاک انقلاب اس کی ہستی پر آجائے اور درحقیقت وہ پاک دل اور پاک ارادہ ہو جائے اور پلیدی اور حرامکاری کا تمام چولہ اپنے بدن پر سے پھینک دے اور نوع انسان کا ہمدرد اور خدا کا سچا تابعدار ہو جائے اور اپنی تمام خود روی کو الوداع کہہ کر میرے پیچھے ہو لے۔ میں اُس شخص کو اس کتے سے مشابہت دیتا ہوں جو ایسی جگہ سے الگ نہیں ہوتا جہاں مردار پھینکا جاتا ہے اور جہاں سڑے گلے مُردوں کی لاشیں ہوتی ہیں۔ کیا میں اس بات کا محتاج ہوں کہ وہ لوگ زبان سے میرے ساتھ ہوں اور اس طرح پر دیکھنے کے لئے ایک جماعت ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر تمام لوگ مجھے چھوڑ دیں اور ایک بھی میرے ساتھ نہ رہے۔ تو میرا خدا میرے لئے ایک اَور قوم پیدا کرے گا جو صدق اور وفا میں ان سے بہتر ہوگی۔ یہ آسمانی کشش کام کر رہی ہے جو نیک دل لوگ میری طرف دوڑتے ہیں۔ کوئی نہیں جو آسمانی کشش کو روک سکے۔ بعض لوگ خدا سے زیادہ اپنے مکر اور فریب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ شائد ان کے دلوں میں یہ بات پوشیدہ ہو کہ نبوتیں اور رسالتیں سب انسانی مکر ہیں اور اتفاقی طور پر شہرتیں اور قبولیتیں ہو جاتی ہیں۔ اس خیال سے کوئی خیال پلید تر نہیں اور ایسے انسان کو اُس خدا پر ایمان نہیں جس کے ارادہ کے بغیر ایک پتّہ بھی گر نہیں سکتا۔ لعنتی ہیں ایسے دل

اور ملعون ہیں ایسی طبیعتیں ۔ خدا ان کو ذلّت سے مارے گا کیونکہ وہ خدا کے کارخانہ کے دشمن ہیں ۔ ایسے لوگ درحقیقت دہریہ اور خبیث باطن ہوتے ہیں ۔ وہ جہنّمی زندگی کے دن گذارتے ہیں اور مرنے کے بعد بجز جہنّم کی آگ کے اُن کے حصّے میں کچھ نہیں ۔

(تبلیغ رسالت جلد دہم صـــ ۶۱-۶۲)

مَیں خود جو اس راہ کا پورا تجربہ کار ہوں اور محض اللہ تعالےٰ کے فضل اور فیض سے مَیں نے اِس ملامت اور لذّت سے حظّ اٹھایا ہے یہی آرزو رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں زندگی وقف کرنے کیلئے اگر مر کے پھر زندہ ہوں اور پھر مروں اور زندہ ہوں تو ہر بار میرا شوق ایک لذّت کے ساتھ بڑھتا ہی جاوے ۔

پس مَیں چونکہ خود تجربہ کار ہوں اور تجربہ کر چکا ہوں اور اس وقف کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے اگر مجھے یہ بھی کہہ دیا جاوے کہ اس وقف میں کوئی ثواب اور فائدہ نہیں ہے بلکہ تکلیف اور دُکھ ہوگا تب بھی مَیں اسلام کی خدمت سے رُک نہیں سکتا ۔ اس لئے مَیں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنی جماعت کو وصیت کردں ۔ اور یہ بات پہنچا دوں ۔ آئندہ ہر ایک کا اختیار ہے کہ وہ اسے سُنے یا نہ سُنے کہ اگر کوئی نجات چاہتا ہے اور حیاتِ طیبہ یا ابدی زندگی کا طلبگار ہے تو وہ اللہ کے لئے اپنی زندگی وقف کرے اور ہر ایک اس کوشش اور فکر میں لگ جاوے کہ وہ اس درجہ اور مرتبہ کو حاصل کرے کہ کہہ سکے کہ میری زندگی ، میری موت ، میری قربانیاں میری نمازیں اللہ ہی کے لئے ہیں ۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی طرح اس کی رُوح بول اٹھے اسلمت لربّ العالمین ۔ جب تک انسان خدا میں کھویا نہیں جاتا ۔ خدا میں ہو کر نہیں مرتا وہ نئی زندگی پا نہیں سکتا ۔

پس تم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو تم دیکھتے ہو کہ خدا کے لئے زندگی کا وقف مَیں اپنی زندگی کی اصل غرض سمجھتا ہوں ۔ پھر تم اپنے اندر دیکھو کہ تم میں سے کتنے ہیں جو میرے اس فعل کو اپنے لئے پسند کرتے اور خدا کے لئے زندگی وقف کرنے کو عزیز رکھتے ہیں ۔

(ملفوظات جلد دوم صـــ ۹۹-۱۰۰)

وہ نام جو اس سلسلہ کے لئے موزون ہے جس کو ہم اپنے لئے اور اپنی جماعت کیلئے پسند کرتے ہیں وہ نام **مسلمان فرقہ احمدیہ** ہے اور جائز ہے کہ اس کو **احمدی مذہب کے مسلمان** کے نام سے بھی پکاریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس فرقہ کا نام مسلمان فرقہ احمدیہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے دو نام تھے ۔ ایک **محمد** صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرا **احمد** صلے اللہ علیہ وسلم ۔ اور اس میں یہ مخفی پیشگوئی تھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان دشمنوں کو

تلوار کے ساتھ سزا دینگے جنہوں نے تلوار کے ساتھ اسلام پر حملہ کیا اور صدہا مسلمانوں کو قتل کیا۔ لیکن اسم احمد جمالی نام تھا جس سے یہ مطلب تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں آشتی اور صلح پھیلائینگے سو خدا نے ان دو ناموں کی اس طرح پر تقسیم کی کہ اوّل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مکّہ کی زندگی میں اسم احمد کا ظہور تھا۔ اور ہر طرح سے صبر اور شکیبائی کی تعلیم تھی اور پھر مدینہ کی زندگی میں اسم محمد کا ظہور ہُوا اور مخالفوں کی سرکوبی خدا کی حکمت اور مصلحت نے ضروری سمجھی۔ لیکن یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ آخری زمانہ میں پھر اسم احمد ظہور کرے گا اور ایسا شخص ظاہر ہوگا جس کے ذریعہ سے احمدی صفات یعنی جمالی صفات ظہور میں آئینگی۔ اور تمام لڑائیوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ پس اسی وجہ سے مناسب معلوم ہُوا کہ اس فرقہ کا نام فرقہ احمدیہ رکھا جائے۔ تا اس نام کو سُنتے ہی ہر ایک شخص سمجھ لے کہ یہ فرقہ دنیا میں آشتی اور صلح پھیلانے آیا ہے اور جنگ اور لڑائی سے اس فرقہ کا کچھ سروکار نہیں۔

(تبلیغ رسالت جلد نہم ص۹۰-۹۱)

لوگوں نے جو اپنے نام حنفی شافعی وغیرہ رکھے ہیں یہ سب بدعت ہیں۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ہی نام تھے محمد اور احمد صلے اللہ علیہ وسلم .... حضرت موسیٰؑ نے آنحضرتؐ کا نام محمد بتلایا صلی اللہ علیہ وسلم۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ خود بھی جلالی رنگ میں تھے۔ اور حضرت عیسیٰؑ نے آپ کا نام احمد بتلایا کیونکہ وہ خود بھی ہمیشہ جمالی رنگ میں تھے۔ اب چونکہ ہمارا سلسلہ بھی جمالی رنگ میں ہے اسواسطے اس کا نام احمدی ہُوا۔

(ملفوظات جلد دوم ص۲۰۸)

بحث کرنے والوں کے لئے یہ بہتر طریق ہوگا کہ کسی مذہب پر بیہودہ طور پر اعتراض نہ کریں بلکہ اُن کی مسلّم اور معتبر کتابوں کی رو سے ادب کے ساتھ اپنے شبہات پیش کریں اور ٹھٹھے اور ہنسی اور توہین سے اپنے تئیں بچاویں اور مباحثات میں حکیمانہ طرز اختیار کریں۔ اور ایسے اعتراض بھی نہ کریں جو ان کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں .... غرض ایسے اعتراض جن میں معقول تقریر کے ساتھ کسی فرقہ کے عقائد کی غلطی کا اظہار ہو ہر ایک محقق کا حق ہے جو نرمی اور ادب کے ساتھ پیش کرے۔ اور حتی الوسع یہ کوشش ہو کہ وہ تمام اعتراضات علمی رنگ میں ہوں تا لوگوں کو اُن سے فائدہ پہنچ سکے۔ اور کوئی مفسدہ اور اشتعال پیدا نہ ہو۔

(اشتہار واجب الاظہار مندرجہ کتاب البریہ ص۱۵)

مَیں ان مولویوں کو غلطی پر جانتا ہوں جو علوم جدیدہ کی تعلیم کے مخالف ہیں۔ وہ دراصل

اپنی غلطی اور کمزوری کو چھپانے کیلئے ایسا کرتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ علوم جدیدہ کی تحقیقات اسلام سے بدظن اور گمراہ کردیتی ہے اور وہ یہ قرار دیئے بیٹھے ہیں کہ گویا عقل اور سائنس اسلام سے بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ چونکہ خود فلسفہ کی کمزوریوں کو ظاہر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اس لئے اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے یہ بات تراشتے ہیں کہ علوم جدیدہ کا پڑھنا ہی جائز نہیں۔ اُن کی رُوح فلسفہ سے کانپتی ہے اور نئی تحقیقات کے سامنے سجدہ کرتی ہے۔ مگر وہ سچا فلسفہ اُن کو نہیں ملا جو الہام الٰہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جو قرآن کریم میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ ان کو اور صرف اُنہی کو دیا جاتا ہے جو نہایت تذلّل اور نیستی سے اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کے دروازے پر پھینک دیتے ہیں۔ جن کے دل اور دماغ سے متکبّرانہ خیالات کا تعفّن نکل جاتا ہے اور جو اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے گڑگڑا کر سچی عبودیت کا اقرار کرتے ہیں۔

پس ضرورت ہے کہ آجکل دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی غرض سے علوم جدیدہ حاصل کرو اور بڑے جدوجہد سے حاصل کرو۔ لیکن مجھے یہ بھی تجربہ ہے جو بطور انتباہ بیان کردینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ ان علوم ہی میں یکطرفہ پڑ گئے اور ایسے محو اور منہمک ہوئے کہ کسی اہل دل اور اہل ذکر کے پاس بیٹھنے کا ان کو موقعہ نہ ملا اور وہ خود اپنے اندر الٰہی نور نہ رکھتے تھے وہ عموماً ٹھوکر کھا گئے اور اسلام سے دُور جا پڑے۔ اور بجائے اس کے کہ ان علوم کو اسلام کے تابع کرتے اُلٹا اسلام کو علوم کے ماتحت کرنے کی بے سود کوشش کرکے اپنے زعم میں دینی اور قومی خدمات کے متکفّل بن گئے۔ مگر یاد رکھو کہ یہ کام وہی کرسکتا ہے یعنی دینی خدمت وہی بجا لاسکتا ہے جو آسمانی روشنی اپنے اندر رکھتا ہو۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۶۵-۶۶)

میں یہ بھی اپنی جماعت کو نصیحت کرنی چاہتا ہوں کہ وہ عربی سیکھیں۔ کیونکہ عربی کی تعلیم کے بدوں قرآن کریم کا مزا نہیں آتا۔ پس ترجمہ پڑھنے کے لئے ضروری اور مناسب ہے کہ تھوڑا تھوڑا عربی زبان کو سیکھنے کی کوشش کریں۔ آجکل تو آسان آسان طریق عربی پڑھنے کے نکل آئے ہیں۔ قرآن شریف کا پڑھنا جبکہ ہر مسلمان کا فرض ہے تو کیا اس کے معنے یہ ہیں کہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش نہ کی جاوے اور ساری عمر انگریزی اور دوسری زبانوں کے حاصل کرنے میں کھودی جاوے۔

(ملفوظات جلد اول ص ۲۸۵)

میں بڑی تاکید سے اپنی جماعت کو جہاں کہیں وہ ہیں منع کرتا ہوں کہ وہ کسی قسم کا مباحثہ

مقابلہ اور مجادلہ نہ کریں۔ اگر کہیں کسی کو کوئی درشت اور ناملائم بات سننے کا اتفاق ہو تو اعراض کرے میں بڑے وثوق اور سچے ایمان سے کہتا ہوں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہماری تائید میں آسمان پر خاص تیاری ہو رہی ہے۔ ہماری طرف سے ہر پہلو کے لحاظ سے لوگوں پر حجت پوری ہو چکی ہے۔ اس لئے اب خدا تعالیٰ نے اپنی طرف سے اس کارروائی کے کرنے کا ارادہ فرمایا ہے جو وہ اپنی سنّت قدیم کے موافق اتمام حجت کے بعد کیا کرتا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ اگر ہماری جماعت کے لوگ بدزبانیوں اور فضول بحثوں سے باز نہ آئیں گے تو ایسا نہ ہو کہ آسمانی کارروائی میں کوئی تاخیر اور روک پیدا ہو جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ ہمیشہ اس کا عتاب ان لوگوں پر ہوتا ہے جن پر اسکے فضل اور عطایات بے شمار ہوں۔ اور جنہیں وہ اپنے نشانات دکھا چکا ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتا کہ انہیں عتاب یا خطاب یا ملامت کرے جن کے خلاف اس کا آخری فیصلہ نافذ ہونا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے۔ فاصبر کما صبر اولوا العزم۔ ولا تستعجل لھم اور فرماتا ہے ولا تکن کصاحب الحوت اور فان استطعت ان تبتغی نفقًا فی الارض الآیۃ۔ یہ حجت آمیز عتاب اس بات پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت جلد فیصلہ کفار کے حق میں چاہتے تھے مگر خدا تعالےٰ اپنے مصالح اور سنن کے لحاظ سے بڑے توقف اور حلم کے ساتھ کام کرتا ہے۔ لیکن آخر کار آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ایسا کچلا اور پیسا کہ اُن کا نام ونشان مٹا دیا۔ اسی طرح پر ممکن ہے کہ ہماری جماعت کے بعض لوگ طرح طرح کی گالیاں۔ افتراء پردازیاں اور بدزبانیاں خدا تعالےٰ کے سچے سلسلے کی نسبت سُن کر اضطراب اور استعجال میں پڑیں مگر انہیں خدا تعالیٰ کی اس سنّت کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برتی گئی ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔ اس لئے میں پھر اور بار بار بتاکید حکم کرتا ہوں کہ جنگ وجدال کے مجمعوں تحریکوں اور تقریبوں سے کنارہ کشی کرو۔ اس لئے کہ جو کام تم کرنا چاہتے ہو یعنی دشمنوں پر حجت پوری کرنا وہ اب خدا تعالےٰ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

تمہارا کام اب یہ ہونا چاہیئے کہ دعاؤں اور استغفار اور عبادت الٰہی اور تزکیہ وتصفیہ نفس میں مشغول ہو جاؤ۔ اس طرح اپنے تئیں مستحق بناؤ۔ خدا تعالیٰ کی ان عنایات اور توجہات کا جن کا اس نے وعدہ فرمایا ہے اگرچہ خدا تعالیٰ کے میرے ساتھ بڑے بڑے وعدے اور پیشگوئیاں ہیں جن کی نسبت یقین ہے کہ وہ پوری ہونگی مگر تم خواہ نخواہ اُن پر مغرور نہ ہو جاؤ ہر قسم کے حسد کینہ بغض غیبت اور کبر اور رعونت اور فسق وفجور کی ظاہری اور باطنی راہوں

اور کسل اور غفلت سے بچو۔ اور خوب یاد رکھو کہ انجام کار ہمیشہ متقیوں کا ہوتا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ والعاقبة عند ربك للمتقين ۔ اسلئے متقی بننے کی فکر کرو۔

(ملفوظات جلد سوم صفحہ ۲۸۲-۲۸۳)

اِک نہ اِک دن پیش ہوگا تو فنا کے سامنے ؎ چل نہیں سکتی کسی کی کچھ قضا کے سامنے
چھوڑنی ہوگی تجھے دنیائے فانی ایک دن ؎ ہر کوئی مجبور ہے حکم خدا کے سامنے
مستقل رہنا ہے لازم اے بشر تجھ کو سدا ؎ رنج و غم یاس و الم فکر و بلا کے سامنے
بارگاہِ ایزدی سے تو نہ یوں مایوس ہو ؎ مشکلیں کیا چیز ہیں مشکل کشا کے سامنے
حاجتیں پوری کریں گے کیا تیری عاجز بشر ؎ کر بیاں سب حاجتیں حاجت روا کے سامنے
چاہیئے تجھ کو مٹانا قلب سے نقشِ دوئی ؎ سر جھکا بس مالک ارض و سما کے سامنے
چاہیئے نفرت بدی سے اور نیکی سے پیار ؎ ایک دن جانا ہے تجھ کو بھی خدا کے سامنے

راستی کے سامنے کب جھوٹ پھلتا ہے بھلا
قدر کیا پتھر کی لعلِ بے بہا کے سامنے

(درثمین)

باب سوم

تعلیم و عقائد

”مجھے بتلایا گیا ہے کہ تمام دینوں میں سے دین اسلام ہی سچّا ہے۔ مجھے فرمایا گیا ہے کہ تمام ہدایتوں میں سے صرف قرآنی ہدایت ہی صحت کے کامل درجہ پر انسانی ملاوٹوں سے پاک ہے۔ مجھے سمجھایا گیا ہے کہ تمام رسولوں میں سے کامل تعلیم دینے والا اور اعلیٰ درجہ کی پاک اور پُرحکمت تعلیم دینے والا اور انسانی کمالات کا اپنی زندگی کے ذریعہ سے اعلیٰ نمونہ دکھلانے والا صرف حضرت سیّدنا و مولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔“

اصولی عقائد

"انسان کے وجود کی اصل غرض معرفت باری تعالیٰ ہے۔"

زعشاقِ فرقاں و پیغمبریم ٭ بدیں آمدیم و بدیں بگذریم

ہمارے مذہب کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ ہمارا اعتقاد جو ہم اس دنیوی زندگی میں رکھتے ہیں جس کے ساتھ ہم بفضل و توفیق باری تعالیٰ اس عالم گذران سے کوچ کریں گے یہ ہے کہ حضرت سیدنا و مولانا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین و خیر المرسلین ہیں جن کے ہاتھ سے اکمال دین ہو چکا اور وہ نعمت بمرتبہ اتمام پہنچ چکی جس کے ذریعہ سے انسان راہ راست کو اختیار کر کے خدائے تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ اور ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتب سماوی ہے اور ایک شعشہ یا نقطہ اس کی شرائع اور حدود اور احکام اور اوامر سے زیادہ نہیں ہو سکتا اور نہ کم ہو سکتا ہے۔ اور اب کوئی ایسی وحی یا ایسا الہام منجانب اللہ نہیں ہو سکتا جو احکام فرقانی کی ترمیم یا تنسیخ یا کسی ایک حکم کے تبدیل و تغییر کر سکتا ہو۔ اگر کوئی ایسا خیال کرے تو وہ ہمارے نزدیک جماعت مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر ہے اور ہمارا اس بات پر بھی ایمان ہے کہ ادنیٰ درجہ صراط مستقیم کا بھی بغیر اتباع ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہرگز انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا چہ جائے کہ راہ راست کے اعلیٰ مدارج بجز اقتدا اس امام الرسل کے حاصل ہو سکیں۔ کوئی مرتبہ شرف و کمال کا اور کوئی مقام عزت و قرب کا بجز سچی اور کامل متابعت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم ہرگز حاصل کر ہی نہیں سکتے۔ ہمیں جو کچھ ملتا ہے ظلی اور طفیلی طور پر ملتا ہے۔ اور ہم اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ جو راستباز اور کامل لوگ شرف صحبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہو کر تکمیل منازل سلوک کر چکے ہیں اُن کے کمالات کی نسبت بھی ہمارے کمالات اگر ہمیں حاصل ہوں بطور ظل کے واقع ہیں اور ان میں بعض ایسے جزئی فضائل ہیں جو اب ہمیں کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۶۹-۷۰)

جن پانچ چیزوں پر اسلام کی بناء رکھی گئی ہے وہ ہمارا عقیدہ ہے اور جس خدا کی کلام یعنی قرآن کو پنجہ مارنا حکم ہے ہم اس کو پنجہ مار رہے ہیں۔ اور فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح ہماری زبان پر حسبنا کتاب اللہ ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح اختلاف اور تناقض کے وقت جب حدیث اور قرآن میں پیدا ہو قرآن کو ہم ترجیح دیتے ہیں۔ بالخصوص قصوں میں جو بالاتفاق نسخ کے لائق بھی نہیں ہیں۔ اور

ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔ اور ہم ایمان لاتے ہیں کہ ملائک حق اور حشر اجساد حق اور روز حساب حق اور جنّت حق اور جہنم حق ہے۔ اور ہم ایمان لاتے ہیں کہ جو کچھ اللہ جل شانہٗ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے اور جو کچھ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہ سب بلحاظ بیان مذکورہ بالا حق ہے۔ اور ہم ایمان لاتے ہیں کہ جو شخص اس شریعت اسلام میں سے ایک ذرّہ کم کرے یا ایک ذرّہ زیادہ کرے یا ترک فرائض اور اباحت کی بنیاد ڈالے وہ بے ایمان اور اسلام سے برگشتہ ہے۔ اور ہم اپنی جماعت کو نصیحت کرتے ہیں۔ کہ وہ سچے دل سے اس کلمہ طیبہ پر ایمان رکھیں کہ لا الٰہ الّا اللہ محمّد رسول اللہ ۔ اور اسی پر مریں۔ اور تمام انبیاء اور تمام کتابیں جن کی سچائی قرآن شریف سے ثابت ہے ان سب پر ایمان لاویں اور صوم اور صلوٰۃ اور زکوٰۃ اور حج اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ تمام فرائض کو فرائض سمجھ کر اور تمام منہیات کو منہیات سمجھ کر ٹھیک ٹھیک اسلام پر کاربند ہوں۔ غرض وہ تمام امور جن پر سلف صالحین کو اعتقادی اور عملی طور پر اجماع تھا۔ اور وہ امور جو اہل سنت کی اجماعی رائے سے اسلام کہلاتے ہیں ان سب کا ماننا فرض ہے۔ اور ہم آسمان اور زمین کو اس بات پر گواہ کرتے ہیں کہ یہی ہمارا مذہب ہے۔

(ایام الصلح ص۸۶-۸۷ طبع اوّل)

"مجھے اللہ جل شانہ کی قسم ہے کہ میں کافر نہیں۔ لا الٰہ الّا اللہ محمّد رسول اللہ میرا عقیدہ ہے۔ اور لکن رسول اللہ وخاتم النبیّین پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت میرا ایمان ہے۔ میں اپنے اس بیان کی صحت پر اس قدر قسمیں کھاتا ہوں جسقدر خدا تعالیٰ کے پاک نام ہیں اور جس قدر قرآن کریم کے حرف ہیں۔ اور جسقدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا تعالیٰ کے نزدیک کمالات ہیں۔ کوئی عقیدہ میرا اللہ اور رسول کے فرمودہ کے برخلاف نہیں۔ اور جو کوئی ایسا خیال کرتا ہے خود اس کی غلط فہمی ہے۔ اور جو شخص مجھے اب بھی کافر سمجھتا ہے اور تکفیر سے باز نہیں آتا وہ یقیناً یاد رکھے کہ مرنے بعد اس کو پوچھا جائیگا۔ میں اللہ جلّ شانہٗ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا خدا اور رسول پر وہ یقین ہے کہ اگر اس زمانہ کے تمام ایمانوں کو ترازو کے ایک پلّہ میں رکھا جائے اور میرا ایمان دوسرے پلّہ میں تو بفضلہ تعالیٰ یہی پلّہ بھاری ہوگا۔

(کرامات الصادقین ص۲۵)

میں اپنی تعلیم کو قریباً اُنیس برس سے شائع کر رہا ہوں ۔ . . . . اس تعلیم کا خلاصہ یہی ہے کہ خدا کو واحد لاشریک سمجھو اور خدا کے بندوں سے ہمدردی اختیار کرو۔ اور نیک چلن اور نیک خیال انسان

بن جاؤ - ایسے ہو جاؤ کہ کوئی فساد اور شرارت تمہارے دل کے نزدیک نہ آسکے - جھوٹ مت بولو - افترا مت کرو اور زبان اور ہاتھ سے کسی کو ایذا مت دو - اور ہر ایک قسم کے گناہ سے بچتے رہو - اور نفسانی جذبات سے اپنے تئیں روکے رکھو - کوشش کرو کہ تا تم پاک دل اور بے شر ہو جاؤ - وہ گورنمنٹ یعنی گورنمنٹ برطانیہ جس کے زیر سایہ تمہارے مال اور آبروئیں اور جانیں محفوظ ہیں بصدق اس کے وفادار تابعدار رہو - اور چاہیئے کہ تمام انسانوں کی ہمدردی تمہارا اصول ہو - اور اپنے ہاتھوں اور اپنی زبانوں اور اپنے دل کے خیالات کو ہر ایک ناپاک منصوبہ اور فساد انگیز طریقوں اور خیانتوں سے بچاؤ - خدا سے ڈرو اور پاک دلی سے اس کی پرستش کرو - اور ظلم اور تعدی اور غبن اور رشوت اور حق تلفی اور بے جا طرفداری سے باز رہو اور بد صحبت سے پرہیز کرو - اور آنکھوں کو بدنگاہوں سے بچاؤ اور کانوں کو غیبت سننے سے محفوظ رکھو اور کسی مذہب اور کسی قوم اور کسی گروہ کے آدمی کو بدی اور نقصان رسانی کا ارادہ مت کرو - اور ہر ایک کے لئے سچے ناصح بنو - اور چاہیئے کہ فساد انگیز لوگوں اور شریر اور بدمعاشوں اور بدچلنوں کو ہرگز تمہاری مجلس میں گذر نہ ہو - ہر ایک بدی سے بچو اور ہر ایک نیکی کے حاصل کرنے کے لئے کوشش کرو - اور چاہیئے کہ تمہارے دل فریب سے پاک اور تمہارے ہاتھ ظلم سے بری اور تمہاری آنکھیں ناپاکی سے منزہ ہوں - اور تم میں کبھی بدی اور بغاوت کا منصوبہ نہ ہونے پاوے - اور چاہیئے کہ تم اس خدا کے پہچاننے کے لئے بہت کوشش کرو جس کا پانا عین نجات اور جس کا ملنا عین رستگاری ہے - وہ خدا اسی پر ظاہر ہوتا ہے جو دل کی سچائی اور محبت سے اس کو ڈھونڈتا ہے وہ اسی پر تجلّی فرماتا ہے جو اسی کا ہو جاتا ہے - وہ دل جو پاک ہیں وہ اس کا تخت گاہ ہیں اور وہ زبانیں جو جھوٹ اور گالی اور یاوہ گوئی سے منزہ ہیں وہ اس کی وحی کی جگہ ہیں - اور ہر ایک جو اس کی رضا میں فنا ہوتا ہے اس کی اعجازی قدرت کا مظہر ہو جاتا ہے -

(کشف الغطاء ص ۸-۹ طبع اوّل)

یاد رہے کہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ آخری کتاب اور آخری شریعت قرآن ہے اور بعد اس کے قیامت تک ان معنوں سے کوئی نبی نہیں ہے جو صاحب شریعت ہو - یا بلا واسطہ متابعت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم وحی پا سکتا ہو - بلکہ قیامت تک یہ دروازہ بند ہے - اور متابعت نبویؐ سے نعمتِ وحی حاصل کرنے کیلئے قیامت تک دروازے کھلے ہیں - وہ وحی جو اتباع کا نتیجہ ہے کبھی منقطع نہیں ہوگی مگر نبوت شریعت والی یا نبوت مستقلہ منقطع ہو چکی ہے ولا سبیل الیہا الی یوم القیامۃ - ومن قال انی لست من امّۃ محمّد صلی اللہ علیہ وسلم و ادعیٰ انّہ نبی صاحب الشریعۃ او من دون الشریعۃ

ولیس من الامۃ فمثلہ کمثل رجل غمرہ السیل المنہمر فالقاہ وراءہ ولم یخادمہ حتّٰی مات۔

اِس کی تفصیل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جس جگہ یہ وعدہ فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اسی جگہ یہ اشارہ بھی فرما دیا ہے کہ آنجناب اپنی روحانیت کی رو سے اُن صلحاء کے حق میں باپ کے حکم میں ہیں جن کی بذریعہ متابعت تکمیل نفوس کی جاتی ہے اور وحی الٰہی اور شرف مکالمات کا اُن کو بخشا جاتا ہے۔ جیسا کہ وہ جلّ شانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔

ما کان محمّدا ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النّبیّین۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں مگر وہ رسول اللہ ہے۔ اور خاتم الانبیاء ہے۔ اب ظاہر ہے کہ لکن کا لفظ زبان عرب میں استدراک کے لئے آتا ہے یعنی تدارک مافات کے لئے۔ سو اس آیت کے پہلے حصہ میں جو امر فوت شدہ قرار دیا گیا تھا یعنی جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نفی کی گئی تھی وہ جسمانی طور سے کسی مرد کا باپ ہونا تھا سو لکن کے لفظ کے ساتھ ایسے فوت شدہ امر کا اس طرح تدارک کیا گیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء ٹھہرایا گیا جس کے یہ معنے ہیں کہ آپ کے بعد براہ راست فیوض نبوت منقطع ہو گئے اور اب کمال نبوت صرف اسی شخص کو ملے گا جو اپنے اعمال پر اتباعِ نبوی کی مُہر رکھتا ہوگا اور اسطرح پر وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا بیٹا اور آپ کا وارث ہوگا۔ غرض اس آیت میں ایک طور سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے باپ ہونے کی نفی کی گئی اور دوسرے طور سے باپ ہونے کا اثبات بھی کیا گیا تا وہ اعتراض جس کا ذکر آیت انّ شانئك ھو الابتر میں ہے دُور کیا جائے۔ ماحصل اِس آیت کا یہ ہُوا کہ نبوت گو بغیر شریعت ہو اس طرح پر تو منقطع ہے کہ کوئی شخص براہ راست مقامِ نبوت حاصل کر سکے۔ لیکن اس طرح پر ممتنع نہیں کہ وہ نبوت چراغ نبوت محمدیہ سے مکتسب اور مستفاض ہو۔ یعنی ایسا صاحب کمال ایک جہت سے تو اُمتی ہو اور دوسری جہت سے بوجہ اکتساب انوار محمدیہ نبوت کے کمالات بھی اپنے اندر رکھتا ہو۔ اور اگر اس طور سے بھی تکمیل نفوسِ مستعدہ اُمت کی نفی کی جائے تو اس سے نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں طور سے ابتر ٹھہرتے ہیں نہ جسمانی طور پر کوئی فرزند نہ روحانی طور پر کوئی فرزند۔ اور معترض سچا ٹھیرتا ہے جو آنحضرت صلعم کا نام ابتر رکھتا ہے۔

(ریویو بر مباحثہ بٹالوی وچکڑالوی ص ۱۲–۱۴)

اِس عاجز نے کبھی اور کسی وقت حقیقی طور پر نبوت یا رسالت کا دعویٰ نہیں کیا اور غیر حقیقی طور پر کسی لفظ کو استعمال کرنا اور لغت کے عام معنوں کے لحاظ سے اس کو بول چال میں لانا مستلزم کفر نہیں مگر میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ اِس میں عام مسلمانوں کو دھوکا لگ جانے کا احتمال ہے۔ لیکن وہ مکالمات اور مخاطبات جو اللہ جلّ شانہٗ کی طرف سے مجھ کو ملے ہیں جن میں یہ لفظ نبوت اور رسالت کا بکثرت آیا ہے اُن کو میں بوجہ مامور ہونے کے مخفی نہیں رکھ سکتا۔ لیکن بار بار کہتا ہوں کہ ان الہامات میں جو لفظ مرسل یا رسول یا نبی کا میری نسبت آیا ہے وہ اپنے حقیقی معنوں پر مستعمل نہیں ہے اور اصل حقیقت جس کی میں علیٰ رؤس الاشہاد گواہی دیتا ہوں یہی ہے جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔ نہ کوئی پُرانا اور نہ کوئی نیا۔ ومن قال بعد رسولنا وسیدنا انّی نبی او رسول علیٰ وجه الحقیقة والافتراء وترك القرآن واحكام الشریعة الغرّاء فهو كافر كذّاب۔

غرض ہمارا مذہب یہی ہے کہ جو شخص حقیقی طور پر نبوت کا دعویٰ کرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ فیوض سے اپنے تئیں الگ کر کے اور اس پاک سرچشمہ سے جُدا ہو کر آپ ہی براہ راست نبی اللہ بننا چاہتا ہے تو وہ ملحد بے دین ہے۔ اور غالباً ایسا شخص اپنا کوئی نیا کلمہ بنائے گا۔ اور عبادات میں کوئی نئی طرز پیدا کرے گا۔ اور احکام میں کچھ تغیّر و تبدل کر دیگا۔ پس بلاشبہ وہ مسیلمہ کذّاب کا بھائی ہے اور اس کے کافر ہونے میں کچھ شک نہیں۔ ایسے خبیث کی نسبت کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ وہ قرآن شریف کو مانتا ہے۔

لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسا کہ ابھی ہم نے بیان کیا ہے بعض اوقات خدا تعالےٰ کے الہامات میں ایسے الفاظ استعارہ اور مجاز کے طور پر اس کے بعض اولیاء کی نسبت استعمال ہو جاتے ہیں اور وہ حقیقت پر محمول نہیں ہوتے۔ سارا جھگڑا یہ ہے جس کو نادان متعصب اَور طرف کھینچ کر لے گئے ہیں۔ آنے والے مسیح موعود کا نام جو صحیح مسلم وغیرہ میں زبانِ مقدس حضرت نبویؐ سے نبی اللہ نکلا ہے وہ انہی مجازی معنوں کی رو سے ہے جو صوفیاء کرام کی کتابوں میں مسلّم اور ایک معمولی محاورہ مکالماتِ الٰہیہ کا ہے ورنہ خاتم الانبیاء کے بعد نبی کیسا؟

(انجام آتھم ص ۲۷-۲۸ حاشیہ)

ہم تو رکھتے ہیں مسلمانوں کا دیں - دل سے ہیں خدّام ختم المرسلیں
شرک اور بدعت سے ہم بیزار ہیں - خاکِ راہِ احمدؐ مختار ہیں

سارے حکموں پر ہمیں ایمان ہے جان و دل اس راہ پر قربان ہے
دے چکے دل اب تنِ خاکی رہا - ہے یہی خواہش کہ ہو وہ بھی فدا

(ازالہ اوہام ص ۴۱۴)

خدا نے مجھے اطلاع دی ہے کہ دنیا میں جسقدر نبیوں کی معرفت مذہب پھیل گئے ہیں اور استحکام پکڑ گئے ہیں اور ایک حصّہ دنیا پر محیط ہو گئے ہیں اور ایک عمر پا گئے ہیں اور ایک زمانہ اُن پر گذر گیا ہے اُن میں سے کوئی مذہب بھی اپنی اصلیت کی رو سے جھوٹا نہیں ۔ اور نہ اُن نبیوں میں سے کوئی نبی جھوٹا ہے ۔ کیونکہ خدا کی سنّت ابتداء سے اسی طرح پر واقع ہے کہ وہ ایسے نبی کے مذہب کو جو خدا پر افتراء کرتا ہے اور خدا کی طرف سے نہیں آیا بلکہ دلیری سے اپنی طرف سے باتیں بناتا ہے کبھی سرسبز ہونے نہیں دیتا ۔ اور ایسا شخص جو کہتا ہے کہ مَیں خدا کی طرف سے ہوں حالانکہ خدا خوب جانتا ہے کہ وہ اس کی طرف سے نہیں ہے ۔ خدا اُس بے باک کو ہلاک کرتا ہے اور اس کا تمام کاروبار درہم برہم کیا جاتا ہے اور اُس کی تمام جماعت متفرق کی جاتی ہے اور اُسکا پچھلا حال پہلے سے بدتر ہوتا ہے کیونکہ اس نے خدا پر جھوٹ بولا اور دلیری سے خدا پر افتراء کیا ۔ پس خدا اس کو وہ عظمت نہیں دیتا جو راستبازوں کو دی جاتی ہے اور نہ وہ قبولیت اور استحکام بخشتا ہے جو صادق نبیوں کے لئے مقرر ہے ۔

(تحفہ قیصریہ ص ۳ طبع اوّل)

یہ اصول نہایت پیارا اور امن بخش اور صلحکاری کی بنیاد ڈالنے والا اور اخلاقی حالتوں کو مدد دینے والا ہے کہ ہم ان تمام نبیوں کو سچا سمجھ لیں جو دنیا میں آئے ۔ خواہ ہند میں ظاہر ہوئے یا فارس میں یا چین میں یا کسی اور ملک میں ۔ اور خدا نے کروڑہا دلوں میں اُن کی عزت اور عظمت بٹھا دی ۔ اور ان کے مذہب کی جڑ قائم کر دی ۔ اور کئی صدیوں تک وہ مذہب چلا آیا ۔ یہی اصول ہے جو قرآن نے ہمیں سکھلایا ۔ اسی اصول کے لحاظ سے ہم ہر ایک مذہب کے پیشوا کو جن کی سوانح اس تعریف کے نیچے آ گئی ہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں گو وہ ہندوؤں کے مذہب کے پیشوا ہوں یا فارسیوں کے مذہب کے یا چینیوں کے مذہب کے یا یہودیوں کے مذہب کے یا عیسائیوں کے مذہب کے ۔ مگر افسوس کہ ہمارے مخالف ہم سے یہ برتاؤ نہیں کر سکتے ۔ اور خدا کا یہ پاک اور غیر متبدل قانون اُن کو یاد نہیں کہ وہ جھوٹے نبی کو وہ برکت اور عزت نہیں دیتا جو سچے کو دیتا ہے اور جھوٹے نبی کا مذہب جڑ نہیں پکڑتا اور نہ عمر پاتا ہے ۔ جیسا کہ سچے کا جڑ پکڑتا ہے اور عمر پاتا ہے ۔ پس ایسے عقیدہ والے لوگ جو قوموں کے

نبیوں کو کاذب قرار دے کر بُرا کہتے رہتے ہیں ہمیشہ صلحکاری اور امن کے دشمن ہوتے ہیں۔ کیونکہ قوموں کے بزرگوں کو گالیاں نکالنا اس سے بڑھ کر فتنہ انگیز اور کوئی بات نہیں۔ بسا اوقات انسان مرنا بھی پسند کرتا ہے مگر نہیں چاہتا کہ اس کے پیشوا کو بُرا کہا جائے۔ اگر ہمیں کسی مذہب کی تعلیم پر اعتراض ہو تو ہمیں نہیں چاہیئے کہ اس مذہب کے نبی کی عزت پر حملہ کریں اور نہ یہ کہ اس کو بُرے الفاظ سے یاد کریں بلکہ چاہیئے کہ صرف اس قوم کے موجودہ دستور العمل پر اعتراض کریں۔ اور یقین رکھیں کہ وہ نبی جو خدا تعالیٰ کی طرف سے کروڑہا انسانوں میں عزت پا گیا اور صدہا برسوں سے اس کی قبولیت چلی آتی ہے یہی پختہ دلیل اس کے منجانب اللہ ہونے کی ہے۔ اگر وہ خدا کا مقبول نہ ہوتا تو اس قدر عزت نہ پاتا۔ مفتری کو عزت دینا اور کروڑہا بندوں میں اس کے مذہب کو پھیلانا اور زمانۂ دراز تک اُس کے مفتریانہ مذہب کو محفوظ رکھنا خدا کی عادت نہیں ہے۔ سو جو مذہب دنیا میں پھیل جائے اور جم جائے اور عزت و عمر پا جائے وہ اپنی اصلیت کی رُو سے ہرگز جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

(تحفۂ قیصریہ صـ۶ـ طبع اوّل)

یہ بات فی الواقع صحیح اور درست ہے کہ ابتدائے آفرینش میں بھی ایک الہامی کتاب نوع انسان کو ملی تھی مگر وہ وید ہرگز نہیں ہے اور موجودہ وید کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا اس پاک ذات کی توہین ہے۔

(چشمۂ معرفت صـ۶۶ـ)

موجودہ وید بلاشبہ ایک گمراہ کرنے والی کتاب ہے جس میں پرمیشر کا بھی پتہ نہیں لگتا اور اس قدر مخلوق چیزوں کی اس میں پرستش کی تعلیم ہے کہ گویا وہ مخلوق پرستی کی ایک دوکان ہے۔ پس جس جگہ ہم وید پر کوئی حملہ کرتے ہیں یا اس کی تکذیب کے دلائل پیش کرتے ہیں اسجگہ یہی موجودہ وید مراد ہے جو سراسر محرّف و مبدّل ہے۔ نہ وہ اصل وید کہ جو کسی زمانہ میں خدا کی طرف سے آیا تھا۔ اور ہم خدا کی تمام کتابوں پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ایسا ہی اس وید پر جو کسی زمانے میں ملک ہند کے کسی نبی پر نازل ہوا ہو گا۔ مگر موجودہ وید کی نسبت ہم اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جس قدر گندے فرقے مخلوق پرستوں کے اس ملک میں پھیلے ہوئے ہیں یہ سب وید کی ہی مہربانی ہے۔

(چشمۂ معرفت صـ۱۰۹ـ)

واضح ہو کہ راجہ کرشن جیسا کہ میرے پر ظاہر کیا گیا ہے درحقیقت ایک ایسا کامل انسان تھا جس کی نظیر ہندوؤں کے کسی رشی اور اوتار میں نہیں پائی جاتی۔ اور اپنے وقت کا اوتار یعنی نبی تھا۔

جس پر خدا کی طرف سے رُوح القدس اُترتا تھا۔ وہ خدا کی طرف سے فتحمند اور با اقبال تھا۔ جس نے آریہ ورت کی زمین کو پاپ سے صاف کیا۔ وہ اپنے زمانہ کا درحقیقت نبی تھا جس کی تعلیم کو پیچھے سے بہت باتوں میں بگاڑ دیا گیا۔ وہ خدا کی محبت سے پُر تھا۔ اور نیکی سے دوستی اور شر سے دشمنی رکھتا تھا۔ خدا کا وعدہ تھا کہ آخری زمانے میں اس کا بروز یعنی اوتار پیدا کرے۔ سو یہ وعدہ میرے ظہور سے پورا ہوا۔ مجھے منجملہ اور الہاموں کے اپنی نسبت ایک یہ بھی الہام ہوا تھا کہ:—

"ہے کرشن رُودّر گوپال تیری مہما گیتا میں لکھی گئی ہے۔"

سو مَیں کرشن سے محبّت کرتا ہوں کیونکہ مَیں اس کا مظہر ہوں۔

(لیکچر سیالکوٹ ص۳۳ طبع اوّل)

ایک نبی کی سچائی تین طریقوں سے پہچانی جاتی ہے۔ اوّل عقل سے یعنی دیکھنا چاہیئے کہ جس وقت وہ نبی یا رسول آیا ہے عقل سلیم گواہی دیتی ہے یا نہیں کہ اس وقت اس کے آنے کی ضرورت بھی تھی یا نہیں۔ اور انسانوں کی حالت موجودہ چاہتی تھی یا نہیں کہ ایسے وقت میں کوئی مصلح پیدا ہو۔ **دوسرے** پہلے نبیوں کی پیشگوئی یعنی دیکھنا چاہیئے کہ پہلے کسی نبی نے اُس کے حق میں یا اس کے زمانے میں کسی کے ظاہر ہونے کی پیشگوئی کی ہے یا نہیں۔ **تیسرے** نصرتِ الٰہی اور تائید آسمانی۔ یعنی دیکھنا چاہیئے کہ اس کے شاملِ حال کوئی تائید آسمانی بھی ہے یا نہیں۔ یہ تین علامتیں سچے مامور من اللہ کی شناخت کے لئے قدیم سے مقرر ہیں۔ اب اے دوستو: خدا نے تم پر رحم کرکے یہ تینوں علامتیں میری تصدیق کے لئے ایک ہی جگہ جمع کر دی ہیں۔ اب چاہو تم قبول کرو یا نہ کرو۔

(لیکچر سیالکوٹ ص۴۹ طبع اوّل)

اتمام حجت کا علم محض خدا تعالیٰ کو ہے ہاں عقل اس بات کو چاہتی ہے کہ چونکہ لوگ مختلف استعداد اور مختلف فہم پر مجبول ہیں اس لئے اتمام حجت بھی صرف ایک ہی طرز سے نہیں ہوگا۔ پس جو لوگ بوجہ علمی استعداد کے خدا کی براہین اور نشانوں اور دین کی خوبیوں کو بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور شناخت کر سکتے ہیں۔ وہ اگر خدا کے رسول سے انکار کریں تو وہ کفر کے اوّل درجہ پر ہونگے۔ اور جو لوگ اس قدر فہم اور علم نہیں رکھتے مگر خدا کے نزدیک اُن پر بھی اُن کے فہم کے مطابق حجت پوری ہو چکی ہے۔ اُن سے بھی رسول کے انکار کا مؤاخذہ ہوگا مگر بہ نسبت پہلے منکرین کے کم۔ بہرحال کسی کے کفر اور اس پر اتمام حجت کے بارے میں فرد فرد کا حال دریافت کرنا ہمارا کام نہیں ہے یہ اس کا کام ہے جو عالم الغیب ہے۔ ہم اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے نزدیک جس پر اتمام حجت ہو چکا ہے اور خدا کے نزدیک جو منکر

ٹھہر چکا ہے وہ مؤاخذہ کے لائق ہوگا۔ ہاں چونکہ شریعت کی بنیاد ظاہر پر ہے اس لئے ہم منکر کو مومن نہیں کہہ سکتے۔ اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مؤاخذہ سے بری ہے۔ اور کافر منکر کو ہی کہتے ہیں کیونکہ کافر کا لفظ مومن کے مقابل پر ہے۔ اور کفر دو قسم پر ہے۔

(اوّل) ایک یہ کفر کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہیں مانتا۔ (دوم) دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول نے تاکید کی ہے۔ اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے پس اسلئے کہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے کافر ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔ کیونکہ جو شخص باوجود شناخت کر لینے کے خدا اور رسول کے حکم کو نہیں مانتا وہ بموجب نصوص صریحہ قرآن اور حدیث کے خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا۔ اور اس میں شک نہیں کہ جس پر خدا تعالیٰ کے نزدیک اول قسم کفر یا دوسری قسم کفر کی نسبت اتمام حجت ہو چکا ہے وہ قیامت کے دن مؤاخذہ کے لائق ہوگا۔ اور جس پر خدا کے نزدیک اتمام حجت نہیں ہوا اور وہ مکذب اور منکر ہے تو گو شریعت نے (جس کی بنا ظاہر پر ہے) اس کا نام بھی کافر ہی رکھا ہے اور ہم بھی اس کو باتباع شریعت کافر کے نام سے ہی پکارتے ہیں مگر پھر بھی وہ خدا کے نزدیک بموجب آیت لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا قابلِ مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ ہاں ہم اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ ہم اس کی نسبت نجات کا حکم دیں۔ اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے ہمیں اس میں دخل نہیں اور جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں یہ علم محض خدا تعالیٰ کو ہے کہ اس کے نزدیک باوجود دلائل عقلیہ اور نقلیہ اور عمدہ تعلیم اور آسمانی نشانوں کے کسی پر ابھی تک اتمام حجت نہیں ہوا ہمیں دعویٰ سے کہنا نہیں چاہیئے کہ فلاں شخص پر اتمام حجت نہیں ہوا۔ ہمیں کسی کے باطن کا علم نہیں ہے اور چونکہ ہر ایک پہلو کے دلائل پیش کرنے اور نشانوں کے دکھلانے سے خدا تعالےٰ کے ہر ایک رسول کا یہی ارادہ رہا ہے کہ وہ اپنی حجت لوگوں پر پوری کرے۔ اور اس بارے میں خدا بھی اس کا مؤید رہا ہے۔ اس لئے جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مجھ پر حجت پوری نہیں ہوئی وہ اپنے انکار کا ذمہ وار آپ ہے اور اس بات کا بار ثبوت اُسی کی گردن پر ہے اور وہی اس بات کا جواب دہ ہوگا کہ باوجود دلائل عقلیہ اور نقلیہ اور عمدہ تعلیم اور آسمانی نشانوں اور ہر ایک قسم کی رہنمائی کے کیوں اس پر حجت پوری نہیں ہوئی۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۷۹ - ۱۸۰)

یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اپنے دعویٰ کے انکار کرنے والے کو کافر کہنا یہ صرف اُن

نبیوں کی شان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت اور احکام جدیدہ لاتے ہیں لیکن صاحب شریعت کے ماسوا جس قدر ملہم اور محدّث ہیں گو وہ کیسی ہی جناب الٰہی میں اعلیٰ شان رکھتے ہوں اور خلعت مکالمہ الٰہیہ سے سرفراز ہوں اُن کے انکار سے کوئی کافر نہیں بن جاتا۔ ہاں بدقسمت منکر جو اُن مقربان الٰہی کا انکار کرتا ہے۔ وہ اپنے انکار کی شامت سے دن بدن سخت دل ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ نور ایمان اس کے اندر سے مفقود ہو جاتا ہے۔ اور یہی احادیث نبویہ سے مستنبط ہوتا ہے۔ کہ انکار اولیاء اور اُن سے دشمنی رکھنا اوّل انسان کو غفلت اور دنیا پرستی میں ڈالتا ہے اور پھر اعمال حسنہ اور افعال صدق اور اخلاص کی اُن سے توفیق چھین لیتا ہے اور پھر آخر سلب ایمان کا موجب ہو کر دینداری کی اصل حقیقت اور مغز سے اُن کو بے نصیب اور بے بہرہ کر دیتا ہے۔ اور یہی معنے ہیں اس حدیث کے کہ "مَن عاد ولیًّا لی فقد اٰذنتہٗ للحرب" یعنی جو میرے ولی کا دشمن بنتا ہے تو میں اس کو کہتا ہوں کہ بس اب میری لڑائی کے لئے تیار ہو جا۔ اگرچہ اوائل عداوت میں خداوند کریم و رحیم کے آگے ایسے لوگوں کی طرف سے کسی قدر عدم معرفت کا عذر ہو سکتا ہے، لیکن جب اس ولی اللہ کی تائید میں چاروں طرف سے نشان ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور نور قلب اُس کو شناخت کر لیتا ہے اور اس کی قبولیت کی شہادت آسمان اور زمین دونوں کی طرف سے بآواز بلند کانوں میں سُنائی دیتی ہے تو نعوذ باللہ اس حالت میں جو شخص عداوت اور عناد سے باز نہیں آتا اور طریق تقویٰ کو بکلّی الوداع کہہ کر دل کو سخت کر لیتا ہے اور عناد اور دشمنی سے ہر وقت درپئے ایذاء رہتا ہے تو اس حالت میں وہ حدیث مذکورہ بالا کے ماتحت آجاتا ہے۔ خدا تعالیٰ بڑا کریم و رحیم ہے وہ انسان کو جلد نہیں پکڑتا لیکن جب انسان ناانصافی اور ظلم کرتا کرتا حد سے گذر جاتا ہے اور بہرحال اس عمارت کو گرانا چاہتا ہے۔ اور اس باغ کو جلانا چاہتا ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا ہے تو اس صورت میں قدیم سے اور جب سے سلسلۂ نبوت کی بنیاد پڑی ہے عادۃ اللہ یہی ہے کہ وہ ایسے مفسد کا دشمن ہو جاتا ہے اور سب سے پہلے دولت ایمان اُن سے چھین لیتا ہے۔ تب بلعم کی طرح صرف لفّاظی اور زبانی قیل و قال اس کے پاس رہ جاتی ہے جو نیک بندوں کی خدا تعالیٰ کی طرف نسبت اُنس اور شوق اور ذوق اور محبت اور تبتّل اور تقویٰ کی ہوتی ہے وہ اس سے کھوئی جاتی ہے۔ اور وہ خود محسوس کرتا ہے کہ ایّام موجودہ سے دس سال پہلے جو کچھ اس کو رقّت اور انشراح اور بسط اور خدا کی طرف جھکنے اور دنیا اور اہل دنیا سے بیزاری کی حالت دل میں موجود تھی اور جس طرح سچے زہد کی چمک اس کو آگاہ کرتی تھی کہ وہ خدا کے عباد صالحین میں سے ہو سکتا ہے اب وہ چمک بکلّی اس کے اندر سے جاتی رہی ہے اور دنیا طلبی کی ایک آگ اس کے اندر بھڑک اُٹھتی ہے۔ اور انکار اہل اللہ کی شامت سے اس کو یہ بھی خیال نہیں آتا کہ جس زمانہ میں

اُس کے خیال نیک اور پاک اور زاہدانہ تھے اب اس زمانے کی نسبت اس کی عمر بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ غرض اُس کو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ مجھکو کیا ہو گیا اور دنیا طلبی میں گرا جاتا ہے اور دنیا کی جاہ ڈھونڈتا ہے حالانکہ موت کے قریب ہوتا ہے۔ غرض اسی طرح ایمان کا نور اس کے دل سے چھین لیتے ہیں اور اولیاء اللہ کی عداوت سے دوسرا سبب سلب ایمان کا یہ بھی ہو جاتا ہے کہ وہ اس ولی اللہ کی ہر حالت میں مخالفت کرتا رہتا ہے جو سرچشمۂ نبوت سے پانی پیتا ہے جس کو سچائی پر قائم کیا جاتا ہے۔ سو چونکہ اس کی عادت ہو جاتی ہے کہ خواہ نخواہ ہر ایک ایسی سچائی کو ردّ کر دیتا ہے جو اس ولی کے مُنہ سے نکلتی ہے اور جسقدر اس کی تائید میں نشان ظاہر ہوتے ہیں یہ خیال کر لیتا ہے کہ ایسا ہونا جھوٹوں سے ممکن ہے اسلئے رفتہ رفتہ سلسلۂ نبوت بھی اُس پر مشتبہ ہو جاتا ہے۔ لہذا انجام کار اس مخالفت کے پردہ میں اس کی ایمانی عمارت کی اینٹیں گرنی شروع ہو جاتی ہیں یہاں تک کسی دن کسی ایسے عظیم الشان مسئلہ کی مخالفت یا نشان کا انکار کر بیٹھتا ہے جس سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ ہاں اگر کسی کا کوئی سابق نیک عمل ہو جو حضرت احدیت میں محفوظ ہو تو ممکن ہے کہ آخر کار عنایت ازلی اس کو تھام لے اور وہ رات کو یا دن کو یکدفعہ اپنی حالت کا مطالعہ کرے یا بعض ایسے امور اس کی آنکھ روشن کرنے کے لئے پیدا ہو جائیں جن سے یکدفعہ وہ خواب غفلت سے جاگ اٹھے۔ وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

(تریاق القلوب ص ۲۵۸-۲۶۱ حاشیہ)

ابتداء سے میرا یہی مذہب ہے کہ میرے دعویٰ کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر یا دجّال نہیں ہو سکتا۔ ضال اور جادۂ صواب سے منحرف ضرور ہو گا اور مَیں اس کا نام بے ایمان نہیں رکھتا۔ ہاں مَیں ایسے سب لوگوں کو ضال اور جادۂ صدق و صواب سے دُور سمجھتا ہوں جو ان سچائیوں سے انکار کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے میرے پر کھولی ہیں۔ مَیں بلاشبہ ایسے ہر ایک آدمی کو ضلالت کی آلودگی سے مبتلا سمجھتا ہوں جو حق اور راستی سے منحرف ہے۔ لیکن مَیں کسی کلمہ گو کا نام کافر نہیں رکھتا جب تک کہ وہ میری تکفیر اور تکذیب کر کے اپنے تئیں خود کافر نہ بنا لیوے۔ سو اس معاملہ میں ہمیشہ سے سبقت میرے مخالفوں کی طرف سے ہے کہ انہوں نے مجھ کو کافر کہا۔ میرے لئے فتویٰ تیار کیا۔ مَیں نے سبقت کر کے اُن کے لئے کوئی فتویٰ تیار نہیں کیا۔ اور اس بات کا وہ خود اقرار کر سکتے ہیں کہ اگر مَیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان ہوں تو مجھ کو کافر بنانے سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ اُن پر یہی ہے کہ وہ خود کافر ہیں۔ سو مَیں ان کو کافر نہیں کہتا بلکہ وہ مجھ کو کافر کہکر خود فتویٰ نبوی کے نیچے آتے ہیں۔ (تریاق القلوب ص ۲۵۸-۲۶۰)

"اسلام چیز کیا ہے خدا کیلئے فنا
ترکِ رضائے خویش پئے مرضیٔ خدا"

سچّا اور زندہ مذہب

اسلام

میں دیکھتا ہوں کہ اسلام کے ماننے سے نور کے چشمے میرے اندر بہ رہے ہیں۔"

واضح رہے کہ مذہب کے اختیار کرنے سے اصل غرض یہ ہے کہ تا وہ خدا جو سرچشمہ نجات کا ہے اس پر ایسا کامل یقین آجائے کہ گویا اس کو آنکھ سے دیکھ لیا جائے کیونکہ گناہ کی خبیث رُوح انسان کو ہلاک کرنا چاہتی ہے اور انسان گناہ کی مہلک زہر سے کسی طرح بچ نہیں سکتا جب تک اُس کو اس کامل اور زندہ خدا پر پورا یقین نہ ہو اور جب تک معلوم نہ ہو کہ وہ خدا ہے جو مجرم کو سزا دیتا ہے اور راستباز کو ہمیشہ کی خوشی پہنچاتا ہے۔ یہ عام طور پر ہر روز دیکھا جاتا ہے کہ جب کسی چیز کے مہلک ہونے پر کسی کو یقین آجائے تو پھر وہ شخص اس چیز کے نزدیک نہیں جاتا۔ مثلاً کوئی شخص عمداً زہر نہیں کھاتا۔ کوئی شخص شیر خونخوار کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا اور کوئی شخص عمداً سانپ کے سوراخ میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ پھر عمداً گناہ کیوں کرتا ہے۔ اس کا یہی باعث ہے کہ وہ یقین اس کو حاصل نہیں جو ان دوسری چیزوں پر حاصل ہے۔ پس سب سے مقدم انسان کا یہ فرض ہے کہ خدا پر یقین حاصل کرے۔ اور اس مذہب کو اختیار کرے جس کے ذریعہ سے یقین حاصل ہو سکتا ہے تا وہ خدا سے ڈرے اور گناہ سے بچے۔ مگر ایسا یقین حاصل کیونکر ہو؟ کیا یہ صرف قصّوں کہانیوں سے حاصل ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا یہ محض عقل کے ظنّی دلائل سے میسّر آسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس واضح ہوا کہ یقین کے حاصل ہونے کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے مکالمہ کے ذریعہ سے اس کے خارق عادت نشان دیکھے اور بار بار کے تجربہ سے اس کی جبروت اور قدرت پر یقین کرے۔ یا ایسے شخص کی صحبت میں رہے جو اس درجہ تک پہنچ گیا ہے۔

(نسیم دعوت ص ۸۱-۸۲)

مذہب سے غرض کیا ہے! بس یہی کہ خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات کاملہ پر یقینی طور پر ایمان حاصل ہو کر نفسانی جذبات سے انسان نجات پا جاوے اور خدا تعالیٰ سے ذاتی محبت پیدا ہو کیونکہ درحقیقت وہی بہشت ہے جو عالم آخرت میں طرح طرح کے پیرائیوں میں ظاہر ہو گا۔ اور حقیقی خدا سے بے خبر رہنا اور اس سے دُور رہنا اور سچی محبت اس سے نہ رکھنا درحقیقت یہی جہنم ہے جو عالم آخرت میں انواع واقسام کے رنگوں میں ظاہر ہو گا۔ اور اصل مقصود اس راہ میں یہ ہے کہ اس کو خدا کی ہستی پر پورا یقین حاصل ہو اور پھر پوری محبت ہو۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ کونسا

مذہب اور کونسی کتاب ہے جس کے ذریعہ سے یہ غرض حاصل ہوسکتی ہے۔ انجیل تو صاف جواب دیتی ہے کہ مکالمہ اور مخاطبہ کا دروازہ بند ہے اور یقین کرنے کی راہیں مسدود ہیں۔ اور جو کچھ ہُوا وہ پہلے ہوچکا اور آگے کچھ نہیں .... ہم ایسے مذہب کو کیا کریں جو مُردہ مذہب ہے۔ ہم ایسی کتاب سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو مُردہ کتاب ہے۔ اور ہمیں ایسا خدا کیا فیض پہنچا سکتا ہے جو مُردہ خدا ہے۔

(چشمۂ مسیحی ص ۲۰-۲۳ طبع اوّل)

کسی مذہب کے قبول کرنے سے غرض یہ ہے کہ وہ طریق اختیار کیا جائے جس سے خدائے غنی مطلق جو مخلوق اور مخلوق کی عبادت سے بکلّی بے نیاز ہے راضی ہو جائے۔ اور اس فیوض رحمت اُترنے شروع ہوجائیں جن سے اندرونی آلائشیں دُور ہو کر صحن سینہ یقین اور معرفت سے پُر ہو جائے سو یہ تدبیر اپنی فکر سے پیدا کرنا انسان کا کام نہیں تھا۔ اس لئے اللہ جلّشانہٗ نے اپنے وجود اور اپنے عجائبات قدرت خالقیت یعنی ارواح و اجسام و ملائک و دوزخ و بہشت و بعث و حشر و رسالت و دیگر تمام اسرار مبدء و معاد کو یکساں طور پر پردۂ غیب میں رکھ کر اور کچھ کچھ قیاسی یا امکانی طور پر عقل کو اس کوچہ میں گذ بھی دے کر غرض کچھ دکھلا کر اور کچھ چھپا کر بندوں کو ان سب باتوں پر ایمان لانے کے لئے مامور کیا۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۳۳)

سچا مذہب شناخت کرنے کے لئے صرف تین باتوں کا دیکھنا ضروری ہے۔ (۱) اوّل یہ کہ اس مذہب میں خدا کی نسبت کیا تعلیم ہے۔ یعنی اس کی توحید اور قدرت اور علم اور کمال اور عظمت اور سزا اور رحمت اور دیگر لوازم اور خواص الوہیت کی نسبت کیا بیان کیا ہے ......

(۲) دوسرے طالب حق کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس مذہب میں جس کو وہ پسند کرے اس کے نفس کے بارہ میں اور ایسا ہی عام طور پر انسانی چال چلن کے بارہ میں کیا تعلیم ہے۔ کیا کوئی ایسی تعلیم تو نہیں جو انسانی حقوق کے باہمی رشتہ کو توڑتی ہو یا انسان کو دیّوثی کی طرف کھینچتی ہو۔ یا دیّوثی امور کو مستلزم ہو اور فطرتی حیا اور شرم کی مخالف ہو۔ اور نہ کوئی ایسی تعلیم ہو کہ جو خدا کے عام قانون قدرت کے مخالف پڑی ہو۔ اور نہ کوئی ایسی تعلیم ہو جس کی پابندی غیر ممکن یا منتج خطرات ہو۔ اور نہ کوئی ضروری تعلیم جو مفاسد کے روکنے کے لئے اہم ہے ترک کی گئی ہو۔ اور نیز یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کیا وہ تعلیم ایسے احکام سکھلاتی ہے یا نہیں کہ جو خدا کو عظیم الشان محسن قرار دے کر رشتۂ محبت اُس سے محکم کرتے ہوں اور تاریکی کے نور کی طرف لے جاتے ہوں اور غفلت سے حضور اور یاد داشت کی طرف کھینچتے ہوں۔

(۳) تیسرے طالب حق کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مذہب کو پسند کرے جس کا خدا ایک فرضی خدا نہ ہو جو محض قصّوں اور کہانیوں کے سہارے سے مانا گیا ہو۔ اور ایسا نہ ہو کہ صرف ایک مُردہ سے مشابہت رکھتا ہو۔ کیونکہ اگر ایک مذہب کا خدا صرف ایک مُردہ سے مشابہ ہے جس کا قبول کرنا محض اپنی خوش عقیدگی کی وجہ سے ہے نہ اس وجہ سے کہ اُس نے اپنے تئیں آپ ظاہر کیا ہے تو ایسے خدا کا ماننا گویا اُس پر احسان کرنا ہے۔ اور جس خدا کی طاقتیں کچھ محسوس نہ ہوں اور اپنے زندہ ہونے کے علامات وہ آپ ظاہر نہ کرے اُس پر ایمان لانا بے فائدہ ہے۔

(نسیم دعوت ص ۱۳-۱۴)

وہ مذہب جو محض خدا کی طرف سے ہے اُس کے ثبوت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ منجانب اللہ ہونے کے نشان اور خدائی مُہر اپنے ساتھ رکھتا ہو تا معلوم ہو کہ وہ خاص خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے ہے۔ سو یہ مذہب اسلام ہے۔ وہ خدا جو پوشیدہ اور نہاں در نہاں ہے اسی مذہب کے ذریعہ سے اُس کا پتہ لگتا ہے اور اسی مذہب کے حقیقی پیروؤں پر وہ ظاہر ہوتا ہے۔ جو درحقیقت سچا مذہب ہے۔ سچے مذہب پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اور خدا اس کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے کہ میں موجود ہوں۔ جن مذاہب کی محض قصّوں پر بنا ہے وہ بت پرستی سے کم نہیں۔ اُن مذاہب میں کوئی سچائی کی رُوح نہیں ہے۔ اگر خدا اب بھی زندہ ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ اور اگر وہ اب بھی بولتا ہے اور سُنتا ہے جیسا کہ پہلے تھا تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ وہ اس زمانہ میں ایسا چُپ ہو جائے کہ گویا موجود نہیں۔ اگر وہ اس زمانے میں بولتا نہیں تو یقیناً وہ اب سُنتا بھی نہیں۔ گویا اب کچھ بھی نہیں۔ سو سچا وہی مذہب ہے کہ جو اس زمانہ میں بھی خدا کا سُننا اور بولنا دونوں ثابت کرتا ہے۔ غرض سچے مذہب میں خدا تعالیٰ اپنے مکالمہ مخاطبہ سے اپنے وجود کی آپ خبر دیتا ہے۔ خدا شناسی ایک نہایت مشکل کام ہے۔ دنیا کے حکیموں اور فلاسفروں کا کام نہیں ہے جو خدا کا پتہ لگا دیں۔ کیونکہ زمین و آسمان کو دیکھ کر صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس ترکیب محکم اور ابلغ کا کوئی صانع ہونا چاہیئے۔ مگر یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ فی الحقیقت وہ صانع موجود بھی ہے۔ اور ہونا چاہیئے اور ہے میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ پس اِس وجود کا واقعی طور پر پتہ دینے والا صرف قرآن شریف ہے جو صرف خدا شناسی کی تاکید نہیں کرتا بلکہ آپ دکھلا دیتا ہے۔ اور کوئی کتاب آسمان کے نیچے ایسی نہیں کہ اس پوشیدہ وجود کا پتہ دے۔

(چشمۂ مسیحی ص ۱۹-۲۰)

یاد رہے کہ محض خشک جھگڑے اور سبّ وشتم اور سخت گوئی اور بد زبانی جو نفسانیت کی بنا پر مذہب کے نام پر ظاہر کی جاتی ہے اور اپنی اندرونی بدکاریوں کو دُور نہیں کیا جاتا اور اس محبوب حقیقی سے سچّا تعلق پیدا نہیں کیا جاتا اور ایک فریق دوسرے فریق پر نہ انسانیت سے بلکہ کتّوں کی طرح حملہ کرتا ہے اور مذہبی حمایت کی اوٹ میں ہر ایک قسم کی نفسانی بدذاتی دکھلاتا ہے کہ یہ گندہ طریق جو سراسر استخوان ہے اس لائق نہیں کہ اس کا نام مذہب رکھا جائے۔ افسوس ایسے لوگ نہیں جانتے کہ ہم دنیا میں کیوں آئے اور اصل اور بڑا مقصود ہمارا اس مختصر زندگی سے کیا ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ اندھے اور ناپاک فطرت رہ کر صرف متعصبانہ جذبات کا نام مذہب رکھتے ہیں۔ اور ایسے فرضی خدا کی حمایت میں دنیا میں بداخلاقی دکھلاتے اور زبان درازیاں کرتے ہیں جس کے وجود کا اُن کے پاس کچھ بھی ثبوت نہیں۔ وہ مذہب کس کام کا مذہب ہے جو زندہ خدا کا پرستار نہیں بلکہ ایسا خدا ایک مُردے کا جنازہ ہے۔ وہ صرف دوسروں کے سہارے سے چل رہا ہے۔ سہارا الگ ہُوا اور وہ زمین پر گرا۔ ایسے مذہب سے اگر ان کو کچھ حاصل ہے تو صرف تعصب اور حقیقی خدا ترسی اور نوع انسان کی سچی ہمدردی جو افضل خصائل ہے بالکل ان کی فطرت سے مفقود ہو جاتی ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۹)

یاد رہے کہ کسی مذہب کی سچائی ثابت کرنے کے لئے یعنی اس بات کے ثبوت کے لئے کہ وہ مذہب منجانب اللہ ہے دو قسم کی فتح کا اُس میں پایا جانا ضروری ہے۔ **اوّل** یہ کہ وہ مذہب اپنے عقائد اور اپنی تعلیم اور اپنے احکام کی رو سے ایسا جامع اور اکمل اور اتم اور نقص سے دُور ہو کہ اس سے بڑھ کر عقل تجویز نہ کر سکے اور کوئی نقص اور کمی اُس میں دکھلائی نہ دے اور اس کمال میں وہ ہر ایک مذہب کو فتح کرنے والا ہو۔ یعنی ان خوبیوں میں کوئی مذہب اس کے برابر نہ ہو۔ جیسا کہ یہ دعویٰ قرآن شریف نے آپ کیا ہے کہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا۔ یعنی آج میں نے تمہارے لئے اپنا دین کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کیا۔ اور مَیں نے پسند کیا کہ اسلام تمہارا مذہب ہو۔ یعنی وہ حقیقت جو اسلام کے لفظ میں پائی جاتی ہے جس کی تشریح خود خدا تعالےٰ نے اسلام کے لفظ کے بارہ میں بیان کی ہے اس حقیقت پر تم قائم ہو جاؤ۔ اس آیت میں صریح یہ بیان ہے کہ قرآن شریف نے ہی کامل تعلیم عطا کی ہے اور **قرآن شریف** کا ہی ایسا زمانہ تھا جس میں کامل تعلیم عطا کی جاتی۔ پس یہ دعویٰ کامل تعلیم کا جو قرآن شریف نے کیا یہ اس کا **حق** تھا۔ اس کے سوا کسی

آسمانی کتاب نے ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ جیسا کہ دیکھنے والوں پر ظاہر ہے کہ توریت اور انجیل دونوں اس دعوے سے دست بردار ہیں۔ کیونکہ توریت میں خدا تعالیٰ کا یہ قول موجود ہے کہ میں تمہارے بھائیوں میں سے ایک نبی قائم کرونگا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو شخص اس کے کلام کو نہ سُنیگا میں اس سے مطالبہ کرونگا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اگر آئندہ زمانہ کی ضرورتوں کی رو سے توریت کا سُننا کافی ہوتا تو کچھ ضرورت نہ تھی کہ کوئی اور نبی آتا اور مؤاخذہ الٰہیہ سے مخلصی پانا اس کلام کے سُننے پر موقوف ہوتا جو اس پر نازل ہوتا۔ ایسا ہی انجیل نے کسی مقام میں دعویٰ نہیں کیا کہ انجیل کی تعلیم کامل اور جامع ہے بلکہ صاف اور کھلا کھلا اقرار کیا ہے کہ اور بہت سی باتیں قابلِ بیان تھیں مگر تم برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب فارقلیط آئیگا تو وہ سب کچھ بیان کرے گا۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی توریت کو ناقص تسلیم کر کے آنے والے نبی کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنی تعلیم کا نامکمل ہونا قبول کر کے یہ عذر پیش کر دیا کہ ابھی کامل تعلیم بیان کرنے کا وقت نہیں ہے لیکن جب فارقلیط آئیگا تو وہ کامل تعلیم بیان کرے گا۔ مگر قرآن شریف نے توریت اور انجیل کی طرح کسی دوسرے کا حوالہ نہیں دیا بلکہ اپنی کامل تعلیم کا تمام دنیا میں اعلان کر دیا۔ اور فرمایا کہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً .... پس اسلام کی سچائی ثابت کرنے کے لئے یہ ایک بڑی دلیل ہے کہ وہ تعلیم کی رُو سے ہر ایک مذہب کو فتح کرنیوالا ہے اور کامل تعلیم کے لحاظ سے کوئی مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

دوسری قسم فتح کی جو اسلام میں پائی جاتی ہے جس میں کوئی مذہب اس کا شریک نہیں۔ اور جو اس کی سچائی پر کامل طور پر مہر لگاتی ہے اُس کی زندہ برکات اور معجزات ہیں جن سے دوسرے مذاہب بکلی محروم ہیں۔ یہ ایسے کامل نشان ہیں کہ ان کے ذریعہ سے نہ صرف اسلام دوسرے مذاہب پر فتح پاتا ہے بلکہ اپنی کامل روشنی دکھلا کر دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یاد رہے کہ پہلی دلیل اسلام کی سچائی کی جو ابھی ہم لکھ چکے ہیں یعنی کامل تعلیم وہ درحقیقت اس بات کے سمجھنے کے لئے کہ مذہب اسلام منجانب اللہ ہے ایک کھلی کھلی دلیل نہیں ہے کیونکہ ایک متعصب منکر جس کی نظر باریک بین نہیں ہے کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ ایک کامل تعلیم بھی ہو اور پھر خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہو۔ پس اگرچہ یہ دلیل ایک دانا طالب حق کو بہت سے شکوک سے مخلصی دے کر یقین کے نزدیک کر دیتی ہے لیکن تاہم جب تک دوسری دلیل مذکورہ بالا اس کے ساتھ منضم اور پیوستہ

نہ ہو کمال یقین کے مینار تک نہیں پہنچا سکتی - اور ان دونوں دلیلوں کے اجتماع سے سچے مذہب کی روشنی کمال تک پہنچ جاتی ہے - اور اگرچہ سچا مذہب ہزارہا آثار اور انوار اپنے اندر رکھتا ہے لیکن یہ دونوں دلیلیں بغیر حاجت کسی اَور دلیل کے طالب حق کے دل کو یقین کے پانی سے سیراب کر دیتی ہیں - اور مکذّبوں پر پورے طور پر اتمام حجّت کرتی ہیں - اس لئے ان دو قسم کی دلیلوں کے موجود ہونے کے بعد کسی اَور دلیل کی حاجت نہیں رہتی - اور مَیں نے پہلے ارادہ کیا تھا کہ اثباتِ حقیّت اسلام کے لئے تین سَو دلیل براہین احمدیہ میں لکھوں - لیکن جب مَیں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ یہ دو قسم کے دلائل ہزارہا نشانوں کے قائم مقام ہیں - پس خدا نے میرے دل کو اس ارادہ سے پھیر دیا -

(دیباچہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۲-۵)

”خدا نے اپنے رسول نبیٔ کریمؐ کی اتمام حجّت میں کسر نہیں رکھی - وہ ایک آفتاب کی طرح آیا اور ہر ایک پہلو سے اپنی روشنی ظاہر کی - پس جو شخص اس آفتاب حقیقی سے مُنہ پھیرتا ہے اس کی خیر نہیں - ہم اس کو نیک نیت نہیں کہہ سکتے - کیا جو شخص مجذوم ہے اور جذام نے اس کے اعضاء کھا لئے ہیں وہ کہہ سکتا ہے کہ مَیں مجذوم نہیں یا مجھے علاج کی حاجت نہیں - اور اگر کہے تو کیا ہم اُس کو نیک نیت کہہ سکتے ہیں - ماسوا اس کے اگر فرض کے طور پر کوئی ایسا شخص دنیا میں ہو کہ باوجود پوری نیک نیتی اور ایسی پوری پوری کوشش کے کہ جیسا کہ وہ دنیا کے حصول کے لئے کرتا ہے اسلام کی سچائی تک پہنچ نہیں سکا تو اس کا حساب خدا کے پاس ہے - مگر ہم نے اپنی تمام عمر میں ایسا کوئی آدمی دیکھا نہیں اس لئے ہم اس بات کو قطعًا محال جانتے ہیں کہ کوئی شخص عقل اور انصاف کی رو سے کسی دوسرے مذہب کو اسلام پر ترجیح دے سکے - نادان اور جاہل لوگ نفس امّارہ کی تعلیم سے ایک بات سیکھ لیتے ہیں کہ صرف توحید کافی ہے - نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی ضرورت نہیں - مگر یاد رہے کہ توحید کی ماں نبی ہی ہوتا ہے جس سے توحید پیدا ہوتی ہے اور خدا کے وجود کا اس سے پتہ لگتا ہے اور خدا تعالےٰ سے زیادہ اتمام حجّت کون جانتا ہے - اس نے اپنے نبی کریمؐ کی سچائی ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کو نشانوں سے بھر دیا ہے - اور اب اس زمانہ میں بھی خدا نے اس ناچیز خادم کو بھیجکر ہزارہا نشان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لئے ظاہر فرمائے ہیں جو بارش کی طرح برس رہے ہیں - تو پھر اتمام حجّت میں کونسی کسر باقی ہے - جس شخص کو مخالفت کرنے کی عقل ہے وہ کیوں موافقت کی راہ کو سوچ نہیں سکتا؟ اور جو رات کو دیکھتا ہے کیوں اُس کو روزِ روشن میں نظر نہیں آتا؟ حالانکہ تکذیب کی راہوں کی نسبت تصدیق کی راہ بہت سہل ہے

ہاں جو شخص مسلوب العقل کی طرح ہے اور انسانی قوتوں سے کم حصہ رکھتا ہے اس کا حساب خدا کی سپرد کرنا چاہیئے۔ اس کے بارہ میں ہم کلام نہیں کر سکتے وہ اُن انسانوں کی طرح ہے جو خورد سالی اور بچپن میں مر جاتے ہیں مگر ایک شریر مکذب یہ عذر نہیں کر سکتا کہ مَیں نیک نیتی سے تکذیب کرتا ہوں۔ دیکھنا چاہیئے کہ اُس کے حواس اِس لائق ہیں یا نہیں کہ مسئلہ توحید و رسالت کو سمجھ سکے۔ اگر معلوم ہوتا ہے کہ سمجھ سکتا ہے مگر شرارت سے تکذیب کرتا ہے تو وہ کیونکر معذور رہ سکتا ہے۔ اگر کوئی آفتاب کی روشنی کو دیکھ کر یہ کہے کہ دن نہیں بلکہ رات ہے تو کیا ہم اس کو معذور سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ دانستہ کج بحثی کرتے ہیں اور اسلام کے دلائل کو توڑ نہیں سکتے کیا ہم خیال کر سکتے ہیں کہ وہ معذور ہیں۔ اور اسلام تو ایک زندہ مذہب ہے۔ جو شخص زندہ اور مُردہ میں فرق کر سکتا ہے وہ کیوں اسلام کو ترک کرتا اور مردہ مذہب کو قبول کرتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۷۵-۱۷۶)

مَیں جب خدا کے پاک کلام پر غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کیونکر اس نے اپنی تعلیموں میں انسان کو اس کی طبعی حالتوں کی اصلاح کے قواعد عطا فرما کر پھر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف کھینچا ہے اور اعلیٰ درجے کی رُوحانی حالت تک پہنچانا چاہا ہے تو مجھے یہ پُر معرفت قاعدہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوّل خدا نے یہ چاہا ہے کہ انسان کو نشست برخاست اور کھانے پینے اور بات چیت اور تمام اقسام معاشرت کے طریق سکھلا کر اس کو وحشیانہ طریقوں سے نجات دیوے اور حیوانات کی مشابہت سے تمیز کلّی بخش کر ایک ادنیٰ درجہ کی اخلاقی حالت جس کو ادب اور شائستگی کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں سکھلا دے۔ پھر انسان کی نیچرل عادات کو جن کو دوسرے لفظوں میں اخلاقِ رذیلہ کہہ سکتے ہیں اعتدال پر لا دے تا وہ اعتدال پا کر اخلاقِ فاضلہ کے رنگ میں آجائیں۔ مگر یہ دونوں طریقے دراصل ایک ہی ہیں۔ کیونکہ طبعی حالتوں کی اصلاح کے متعلق ہیں۔ صرف ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کے فرق نے ان کو دو قسم بنا دیا ہے۔ اور اس حکیم مطلق نے اخلاق کے نظام کو ایسے طور سے پیش کیا ہے کہ جس سے انسان ادنیٰ خُلق سے اعلیٰ خلق تک ترقی کر سکے۔ اور پھر تیسرا مرحلہ ترقیات کا یہ رکھا ہے کہ انسان اپنے خالق حقیقی کی محبت اور رضا میں محو ہو جائے اور سب وجود اس کا خدا کے لئے ہو جائے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس کو یاد دلانے کے لئے مسلمانوں کے دین کا نام اسلام رکھا کیونکہ اسلام اس بات کو کہتے ہیں کہ کلّی خدا کے لئے ہو جانا۔ اور اپنا کچھ باقی نہ رکھنا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۱۰)

یہ خیال ایک سخت نادانی ہے کہ دین صرف ان چند بے سر و پا باتوں کا نام ہے جو انجیل میں درج ہیں بلکہ وہ تمام امور جو تکمیل انسانیت کے لئے ضروری ہیں دین میں داخل ہیں۔ جو باتیں انسان کو وحشیانہ حالت سے پھیر کر حقیقی انسانیت سکھلاتی یا عام انسانیت کو ترقی دے کر حکیمانہ زندگی کی طرف منتقل کرتی ہیں اور یا حکیمانہ زندگی سے ترقی دے کر فنا فی اللہ کی حالت تک پہنچاتی ہیں انہی باتوں کا نام دوسرے لفظوں میں دین ہے۔

(کتاب البریہ ص۸۹)

اِس میں کچھ بھی شک نہیں کہ انجیل انسانیت کے درخت کی پورے طور پر آبپاشی نہیں کر سکتی۔ ہم اس مسافر خانہ میں بہت سے قویٰ کے ساتھ بھیجے گئے ہیں۔ اور ہر ایک قوت چاہتی ہے کہ اپنے موقعہ پر اس کو استعمال کیا جائے۔ اور انجیل صرف ایک ہی قوت حلم اور نرمی پر زور مار رہی ہے۔ حلم اور عفو درحقیقت بعض مواضع میں اچھی ہے لیکن بعض دوسرے مواضع میں سمّ قاتل کی تاثیر رکھتی ہے ہماری یہ تمدنی زندگی کہ مختلف طبائع کے اختلاط پر موقوف ہے بلاشبہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنے تمام قویٰ کو محل بینی اور موقعہ شناسی سے استعمال کیا کریں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ اگرچہ بعض جگہ ہم عفو اور درگذر کر کے اس شخص کو فائدہ روحانی اور جسمانی پہنچاتے ہیں جس نے ہمیں کوئی آزار پہنچایا ہے لیکن بعض دوسری جگہ ایسی بھی ہیں جو اسجگہ ہم اس خصلت کو استعمال کرنے سے شخص مجرم کو اور بھی مفسدانہ حرکات پر دلیر کرتے ہیں۔

ہماری روحانی زندگی کی طرز ہماری جسمانی زندگی کی طرز سے نہایت مشابہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ ایک ہی مزاج اور طبیعت کی اغذیہ اور ادویہ پر زور مارنے سے ہماری صحت بحال نہیں رہ سکتی۔ اگر ہم دس یا بیس روز متواتر ٹھنڈی ہی چیزوں کے کھانے پر ہی زور دیں اور گرم غذاؤں کا کھانا حرام کی طرح اپنے نفس پر کر دیں تو ہم جلد تر کسی سرد بیماری میں جیسے فالج اور لقوہ اور رعشہ اور صرع وغیرہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور ایسا ہی اگر ہم متواتر گرم غذاؤں پر زور دیں یہاں تک کہ پانی بھی گرم کر کے ہی پیا کریں تو بلاشبہ کسی مرض حار میں گرفتار ہو جائیں گے۔ سوچ کر دیکھو کہ ہم اپنی جسمانی تمدن میں کیسے گرم اور سرد اور نرم اور سخت اور حرکت اور سکون کی رعایت رکھتے ہیں اور کیسی یہ رعایت ہماری صحتِ بدنی کیلئے ضروری پڑی ہوئی ہے۔ پس یہی قاعدہ صحتِ روحانی کے لئے برتنا چاہیئے۔ خدا نے کسی بری قوت کو ہمیں نہیں دیا۔ اور درحقیقت کوئی بھی قوت بری نہیں صرف اس کی بد استعمالی بری ہے مثلاً تم دیکھتے ہو کہ حسد نہایت ہی بری چیز ہے لیکن اگر ہم اس

اس قوت کو بُرے طور پر استعمال نہ کریں تو یہ صرف اس رشک کے رنگ میں آجاتی ہے جس کو عربی میں غبطہ کہتے ہیں یعنی کسی کی اچھی حالت دیکھکر خواہش کرنا کہ میری بھی اچھی حالت ہو جائے۔ اور یہ خصلت اخلاقِ فاضلہ میں سے ہے۔ اسی طرح تمام اخلاقِ ذمیمہ کا حال ہے کہ وہ ہماری ہی بد استعمالی یا افراط اور تفریط سے بدنما ہو جاتی ہے۔ اور موقعہ پر استعمال کرنے اور حدِ اعتدال پر لانے سے وہی اخلاقِ ذمیمہ اخلاقِ فاضلہ کہلاتے ہیں۔

پس یہ کس قدر غلطی ہے کہ انسانیت کے درخت کی تمام ضروری شاخیں کاٹ کر صرف ایک ہی شاخ صبر اور عفو پر زور دیا جائے۔ اسی وجہ سے یہ تعلیم چل نہیں سکی اور آخر عیسائی سلاطین کو جرائم پیشہ کی سزا کے لئے قوانین اپنی طرف سے تیار کرنے پڑے۔ غرض انجیل موجودہ ہرگز نفوسِ انسانیہ کی تکمیل نہیں کرسکتی۔ اور جس طرح آفتاب کے نکلنے سے ستارے مضمحل ہوتے جاتے ہیں یہاں تک آنکھوں سے غائب ہو جاتے ہیں یہی حالت انجیل کی قرآن شریف کے مقابل پر ہے۔

(کتاب البریہ ص ۶۶-۶۷)

دنیا کے مذاہب پر اگر نظر کی جاوے تو معلوم ہوگا کہ بجز اسلام ہر ایک مذہب اپنے اندر کوئی نہ کوئی غلطی رکھتا ہے۔ اور یہ اس لئے نہیں کہ درحقیقت وہ تمام مذاہب ابتداء سے جھوٹے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ اسلام کے ظہور کے بعد خدا نے ان مذاہب کی تائید چھوڑ دی اور وہ ایسے باغ کی طرح ہو گئے جس کا کوئی باغبان نہیں اور جس کی آبپاشی اور صفائی کے لئے کوئی انتظام نہیں۔ اس لئے رفتہ رفتہ اُن میں خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ تمام پھلدار درخت خشک ہو گئے اور اُن کی جگہ کانٹے اور خراب بوٹیاں پھیل گئیں اور روحانیت جو مذہب کی جڑ ہوتی ہے وہ بالکل جاتی رہی اور صرف خشک الفاظ ہاتھ میں رہ گئے۔ مگر خدا نے اسلام کے ساتھ ایسا نہ کیا اور چونکہ وہ چاہتا تھا کہ یہ باغ ہمیشہ سرسبز رہے اس لئے اُس نے ہر ایک صدی پر اس باغ کی نئے سرے آبپاشی کی اور اس کو خشک ہونے سے بچایا۔ اگرچہ ہر صدی کے سر پر جب کبھی کوئی بندہ خدا اصلاح کے لئے قائم ہوا جاہل لوگ اس کا مقابلہ کرتے رہے اور ان کو سخت ناگوار گذرا کہ کسی ایسی غلطی کی اصلاح ہو جو ان کے رسم اور عادت میں داخل ہو چکی ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اپنی سنّت کو نہ چھوڑا یہاں تک کہ اس آخری زمانہ میں جو ہدایت اور ضلالت کا آخری جنگ ہے۔ خدا نے چودھویں صدی اور الفِ آخر کے سر پر مسلمانوں کو غفلت میں پاکر پھر اپنے عہد کو یاد کیا اور دین اسلام کی تجدید فرمائی۔ مگر دوسرے دینوں کو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ تجدید

کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ سب مذہب مرگئے۔ اُن میں روحانیت باقی نہ رہی اور بہت سی غلطیاں اُن میں ایسی جم گئیں کہ جیسے بہت مستعمل کپڑا پر جو کبھی دھویا نہ جائے میل جم جاتی ہے اور ایسے انسانوں نے جن کو روحانیت سے کچھ بہرہ نہ تھا اور جن کے نفس امّارہ سفلی زندگی کی آلائشوں سے پاک نہ تھے اپنی نفسانی خواہشوں کے مطابق ان مذاہب کے اندر بے جا دخل دیکر ایسی صورت اُن کی بگاڑ دی کہ اب وہ کچھ اَور ہی چیز ہیں۔ مثلاً عیسائیت کے مذہب کو دیکھو کہ وہ ابتداء میں کیسے پاک اصول پر مبنی تھا۔ اور جس تعلیم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے پیش کیا تھا اگرچہ وہ تعلیم قرآنی تعلیم کے مقابل پر ناقص تھی کیونکہ ابھی کامل تعلیم کا وقت نہیں آیا تھا اور کمزور استعدادیں اس لائق بھی نہ تھیں تاہم وہ تعلیم اپنے وقت کے مناسب حال نہایت عمدہ تعلیم تھی۔ وہ اُسی خدا کی طرف رہنمائی کرتی تھی جس کی طرف توریت نے رہنمائی کی لیکن حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد مسیحیوں کا خدا ایک اَور خدا ہو گیا جس کا توریت کی تعلیم میں کچھ بھی ذکر نہیں اور نہ بنی اسرائیل کو اس کی کچھ بھی خبر ہے۔ اس نئے خدا پر ایمان لانے سے تمام سلسلہ توریت کا اُلٹ گیا اور گناہوں سے حقیقی نجات اور پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے جو ہدایتیں توریت میں تھیں وہ سب درہم برہم ہو گئیں اور تمام مدار گناہ سے پاک ہونے کا اس اقرار پر آگیا کہ حضرت مسیح نے دنیا کو نجات دینے کے لئے خود صلیب قبول کی۔ اور وہ خدا ہی تھے۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ توریت کے اَور کئی ابدی احکام توڑ دیئے گئے۔ اور عیسائی مذہب میں ایک ایسی تبدیلی واقع ہوئی کہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام خود بھی دوبارہ تشریف لے آویں تو وہ اس مذہب کو شناخت نہ کرسکیں۔ نہایت حیرت کا مقام ہے کہ جن لوگوں کو تورات کی پابندی کی سخت تاکید تھی انہوں نے یک لخت تورات کے احکام کو توڑ دیا۔ مثلاً انجیل میں کہیں حکم نہیں کہ تورات میں تو سؤر حرام ہے اور مَیں تم پر حلال کرتا ہوں۔ اور توریت میں تو ختنہ کی تاکید ہے اور مَیں ختنہ کا حکم منسوخ کرتا ہوں۔ پھر کب جائز تھا کہ جو باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مُنہ سے نہیں نکلیں وہ مذہب کے اندر داخل کر دی جائیں۔ لیکن چونکہ ضرور تھا کہ خدا ایک **عالمگیر مذہب** یعنی **اسلام** دنیا میں قائم کرے اسلئے عیسائیت کا بگڑنا اسلام کے ظہور کے لئے بطور ایک علامت کے تھا۔ یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ اسلام کے ظہور سے پہلے ہندو مذہب بھی بگڑ چکا تھا اور تمام ہندوستان میں عام طور پر بت پرستی رائج ہو چکی تھی۔ اور اسی بگاڑ کے یہ آثارِ باقیہ ہیں کہ وہ خدا جو اپنی صفات کے استعمال میں کسی مادہ کا محتاج نہیں اب

آریہ صاحبوں کی نظر میں وہ پیدائش مخلوقات میں ضرور مادہ کا محتاج ہے۔ اِس فاسد عقیدہ سے ان کو ایک دوسرا فاسد عقیدہ بھی جو شرک سے بھرا ہُوا ہے قبول کرنا پڑا یعنی یہ کہ تمام ذرّاتِ عالم اور تمام ارواح قدیم اور انادی ہیں۔ مگر افسوس کہ اگر وہ ایک نظرِ غائر خدا کی صفات پر ڈالتے تو ایسا کبھی نہ کہہ سکتے۔ کیونکہ اگر خدا پیدا کرنے کی صفت میں جو اس کی ذات میں قدیم سے ہے انسان کی طرح کسی مادہ کا محتاج ہے تو کیا وجہ کہ وہ اپنی صفت شنوائی اور بینائی وغیرہ میں انسان کی طرح کسی مادہ کا محتاج نہیں۔ انسان بغیر توسط ہوا کے کچھ سن نہیں سکتا اور بغیر توسط روشنی کے کچھ دیکھ نہیں سکتا پس کیا پرمیشر بھی ایسی کمزوری اپنے اندر رکھتا ہے؟ اور وہ بھی سننے اور دیکھنے کے لئے ہوا اور روشنی کا محتاج ہے؟ پس اگر وہ ہوا اور روشنی کا محتاج نہیں تو یقیناً سمجھو کہ وہ صفت پیدا کرنے میں بھی کسی مادہ کا محتاج نہیں۔ یہ منطق سراسر جھوٹ ہے کہ خدا اپنی صفات کے اظہار میں کسی مادہ کا محتاج ہے۔ انسانی صفات کا خدا پر قیاس کرنا کہ نیستی سے ہستی نہیں ہو سکتی اور انسانی کمزوریوں کو خدا پر جمانا بڑی غلطی ہے۔ انسان کی ہستی محدود اور خدا کی ہستی غیر محدود ہے۔ پس وہ اپنی ہستی کی قوت سے ایک اور ہستی پیدا کر لیتا ہے۔ یہی تو خدائی ہے۔ اور وہ اپنی کسی صفت میں مادہ کا محتاج نہیں ورنہ وہ خدا نہ ہُوا۔ کیا اس کے کاموں میں کوئی روک آسکتی ہے؟ اور اگر مثلاً چاہے کہ ایک دم میں زمین و آسمان پیدا کر دے تو کیا وہ پیدا نہیں کر سکتا۔ ہندوؤں میں جو لوگ علم کے ساتھ روحانیت کا بھی حصہ رکھتے تھے اور نری خشک منطق میں گرفتار نہ تھے کبھی ان کا یہ عقیدہ نہیں ہُوا جو آجکل پرمیشر کی نسبت آریہ صاحبان نے پیش کیا ہے۔ یہ سراسر عدمِ روحانیت کا نتیجہ ہے۔

غرض یہ تمام بگاڑ کہ ان مذاہب میں پیدا ہو گئے جن میں بعض ذکر کے بھی قابل نہیں۔ اور جو وہ انسانی پاکیزگی کے بھی مخالف ہیں۔ اور یہ تمام علامتیں ضرورتِ اسلام کے لئے تھیں۔ ایک عقلمند کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اسلام سے کچھ دن پہلے تمام مذاہب بگڑ چکے تھے اور روحانیت کو کھو چکے تھے۔ پس ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اظہارِ سچائی کے لئے ایک **مجدّدِ اعظم** تھے جو گم گشتہ سچائی کو دوبارہ دنیا میں لائے۔ اس فخر میں ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی بھی نبی شریک نہیں کہ آپ نے تمام دنیا کو ایک تاریکی میں پایا۔ اور پھر آپ کے ظہور سے وہ تاریکی نور سے بدل گئی۔

(لیکچر سیالکوٹ ص ۱-۳)

اب قبل اس کے جو ہم دوسری بحثوں کی طرف توجہ کریں اس بحث کا لکھنا نہایت ضروری ہے جو دین اسلام کی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت تک پہنچنے کے وسائل کیا ہیں اور اس حقیقت پر پابند ہونے کے ثمرات کیا ہیں؟ کیونکہ بہت سے اسرار دقیقہ کا سمجھنا اس بات پر موقوف ہے کہ پہلے **حقیقت اسلام** اور پھر اس **حقیقت کے وسائل** اور پھر اس کے **ثمرات** بخوبی ذہن نشین ہو جائیں اور ہمارے اندرونی مخالفوں کے لئے یہ بات نہایت فائدہ مند ہوگی کہ وہ حقیقت اسلام اور اس کے ابحاث متعلقہ کو توجہ سے پڑھیں کیونکہ جن شکوک و شبہات میں وہ مبتلا ہیں اکثر وہ ایسے ہیں کہ فقط اسی وجہ سے دل میں پیدا ہوئے ہیں کہ اسلام کی اتم اور اکمل حقیقت اور اس کے وسائل و ثمرات پر غور نہیں کی گئی .... ایسا ہی مخالفین مذہب کو بھی ان حقائق کے بیان کرنے سے بہت فائدہ ہوگا اور اس مقام سے سمجھ سکتے ہیں کہ **مذہب** کیا چیز ہے اور اس کی سچائی کے نشان کیا ہیں۔

اب واضح ہو کہ لغت عرب میں **اسلام** اس کو کہتے ہیں کہ بطور پیشگوئی ایک چیز کا مول دیا جائے اور یا یہ کہ کسی کو اپنا کام سونپیں اور یا یہ کہ **صلح کے طالب** ہوں اور یا یہ کہ کسی امر یا خصومت کو چھوڑ دیں۔

اور اصطلاحی معنے اسلام کے وہ ہیں جو اس آیت کریمہ میں اس کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ بلیٰ من اسلم وجہہٗ للہ وھو محسنٌ فلہ اجرہٗ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ یعنی مسلمان وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام وجود کو سونپ دیوے یعنی اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے ارادوں کی پیروی کے لئے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وقف کر دیوے اور پھر نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لئے قائم ہو جائے۔ اور اپنے وجود کی تمام عملی طاقتیں اس کی راہ میں لگا دیوے۔ مطلب یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر محض خدا تعالیٰ کا ہو جاوے۔

اعتقادی طور پر اس طرح سے کہ اپنے تمام وجود کو درحقیقت ایک ایسی چیز سمجھ لے جو خدا تعالیٰ کی شناخت اور اس کی اطاعت اور اس کے عشق اور محبت اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔

اور عملی طور پر اس طرح سے کہ خالصاً للہ حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوت اور ہر یک خداداد توفیق سے وابستہ ہیں بجا لاوے مگر ایسے ذوق شوق و حضور سے کہ گویا وہ اپنی

فرمانبرداری کے آئینہ میں اپنے معبودِ حقیقی کے چہرہ کو دیکھ رہا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۵۷-۵۸)

اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی گردن خدا کے آگے قربانی کے بکرے کی طرح رکھ دینا۔ اور اپنے تمام ارادوں سے کھوئے جانا اور خدا کے ارادہ اور رضا میں محو ہو جانا۔ اور خدا میں گم ہو کر ایک موت اپنے پر وارد کر لینا۔ اور اس کی محبت ذاتی سے پورا رنگ حاصل کر کے محض محبت کے جوش سے اس کی اطاعت کرنا نہ کسی اور بنا پر۔ اور ایسی آنکھیں حاصل کرنا جو محض اس کے ساتھ دیکھتی ہوں اور ایسے کان حاصل کرنا جو محض اس کے ساتھ سنتے ہوں۔ اور ایسا دل پیدا کرنا جو سراسر اس کی طرف جھکا ہوا ہو۔ اور ایسی زبان حاصل کرنا جو اس کے بلائے بولتی ہو۔ یہ وہ مقام ہے جس پر تمام سلوک ختم ہو جاتے ہیں۔ اور انسانی قوٰی اپنے ذمہ کا تمام کام کر چکتے ہیں۔ اور پورے طور پر انسان کی نفسانیت پر موت وارد ہو جاتی ہے۔ تب خدا تعالیٰ کی رحمت اپنے زندہ کلام اور چمکتے ہوئے نوروں کے ساتھ دوبارہ اس کو زندگی بخشتی ہے اور وہ خدا کے لذیذ کلام سے مشرف ہوتا ہے اور وہ دقیق در دقیق نور جس کو عقلیں دریافت نہیں کر سکتیں اور آنکھیں اس کی کنہ تک نہیں پہنچتیں وہ خود انسان کے دل سے نزدیک ہو جاتا ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے نحن اقرب الیہ من حبل الورید یعنی ہم اس کی شاہ رگ سے بھی زیادہ اس سے نزدیک ہیں۔ پس ایسا ہی وہ اپنے قرب سے فانی انسان کو مشرف کرتا ہے۔ تب وہ وقت آتا ہے کہ نابینائی دور ہو کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور انسان اپنے خدا کو ان نئی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اس کی آواز سنتا ہے اور اس کی نور کی چادر کے اندر اپنے تئیں لپٹا ہوا پاتا ہے۔ تب مذہب کی غرض ختم ہو جاتی ہے اور انسان اپنے خدا کے مشاہدہ سے سفلی زندگی کا گندا چولا اپنے وجود پر سے پھینک دیتا ہے اور ایک نور کا پیراہن لیتا ہے اور نہ صرف وعدہ کے طور پر اور نہ فقط آخرت کے انتظار میں خدا کے دیدار اور بہشت کا منتظر رہتا ہے۔ بلکہ اسی جگہ اور اسی دنیا میں دیدار اور گفتار اور جنت کی نعمتوں کو پا لیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- ان الذین قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الّا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون۔ یعنی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا خدا وہ خدا ہے جو جامع صفاتِ کاملہ ہے جس کی ذات اور صفات میں اور کوئی شریک نہیں۔ اور یہ کہہ کر پھر وہ

استقامت اختیار کرتے ہیں اور کتنے ہی زلزلے آویں اور بلائیں نازل ہوں اور موت کا سامنا ہو اُن کے ایمان اور صدق میں فرق نہیں آتا۔ اُن پر فرشتے اُترتے ہیں اور خدا ان سے ہمکلام ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ تم بلاؤں سے اور خوفناک دشمنوں سے مت ڈرو۔ اور نہ گذشتہ مصیبتوں سے غمگین ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور میں اسی دنیا میں تمہیں بہشت دیتا ہوں جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا تھا پس تم اس سے خوش ہو۔ اب واضح ہو کہ یہ باتیں بغیر شہادت کے نہیں اور یہ ایسے وعدے نہیں کہ جو پورے نہیں ہوئے بلکہ ہزاروں اہل دل مذہب اسلام میں اس روحانی بہشت کا مزا چکھ چکے ہیں۔ درحقیقت اسلام وہ مذہب ہے جس کے سچے پیروؤں کو خدا تعالیٰ نے تمام گذشتہ راستبازوں کا وارث ٹھیرایا ہے اور ان کی متفرق نعمتیں اس امت مرحومہ کو عطا کر دی ہیں۔

(لیکچر لاہور صفحہ ٢٠-٢٢)

اسلام کی حقیقت تب کسی میں متحقق ہو سکتی ہے کہ جب اس کا وجود مع اپنی باطنی و ظاہری قویٰ کے محض خدا تعالیٰ کے لئے اور اس کی راہ میں وقف ہو جائے اور جو امانتیں اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں پھر اسی معطی حقیقی کو واپس دی جائیں۔ اور نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ عمل کے آئینے میں بھی اپنے اسلام اور اس کی حقیقت کاملہ کی ساری شکل دکھلائی جاوے۔ یعنی شخص مدعیٔ اسلام یہ بات ثابت کر دیوے کہ اس کے ہاتھ اور پیر اور دل اور دماغ اور اس کی عقل اور اس کا فہم اور اس کا غضب اور اس کا رحم اور اس کا حلم اور اس کا علم اور اس کی تمام روحانی اور جسمانی قوتیں اور اس کی عزت اور اس کا مال اور اس کا آرام اور سرور اور جو کچھ اس کا سر کے بالوں سے پیروں کے ناخنوں تک باعتبار ظاہر و باطن کے ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نیّات اور اس کے دل کے خطرات اور اس کے نفس کے جذبات سب خدا تعالیٰ کے ایسے تابع ہو گئے ہیں کہ جیسے ایک شخص کے اعضاء اس شخص کے تابع ہوتے ہیں۔ غرض یہ ثابت ہو جائے کہ صدق قدم اس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ جو کچھ اس کا ہے وہ اس کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہو گیا ہے اور تمام اعضاء اور قویٰ الٰہی خدمت میں ایسے لگ گئے ہیں کہ گویا وہ جوارح الحق ہیں۔

اور ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات بھی صاف اور بدیہی طور پر ظاہر ہو رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں زندگی کا وقف کرنا جو حقیقت اسلام ہے دو قسم پر ہے۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کو ہی اپنا معبود اور مقصود اور محبوب ٹھہرایا جاوے اور اس کی عبادت اور

محبت اور خوف اور رجا میں کوئی دوسرا شریک باقی نہ رہے اور اس کی تقدیس اور تسبیح اور عبادت اور تمام عبودیت کے آداب اور احکام اور اوامر اور حدود اور آسمانی قضا و قدر کے امور بدل و جان قبول کئے جاویں۔ اور نہایت نیستی اور تذلّل سے ان سب حکموں اور حدّوں اور قانونوں اور تقدیروں کو بارادت تامہ سر پر اٹھا لیا جاوے اور نیز وہ تمام پاک صداقتیں اور پاک معارف جو اس کی وسیع قدرتوں کی معرفت کا ذریعہ اور اس کی ملکوت اور سلطنت کے علو مرتبہ کو معلوم کرنے کے لئے ایک واسطہ اور اُس کے آلاء اور نعماء کو پہچاننے کے لئے ایک قوی رہبر ہیں بخوبی معلوم کر لی جائیں۔

دوسری قسم اللہ تعالیٰ کی راہ میں زندگی وقف کرنے کی یہ ہے کہ اس کے بندوں کی خدمت اور ہمدردی اور چارہ جوئی اور بار برداری اور سچی غمخواری میں اپنی زندگی وقف کر دی جاوے۔ دوسروں کو آرام پہنچانے کے لئے دُکھ اٹھاویں۔ اور دوسروں کی راحت کے لئے اپنے پر رنج گوارا کر لیں۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ **اسلام کی حقیقت** نہایت ہی اعلیٰ ہے اور کوئی انسان کبھی اس شریف لقب اہل اسلام سے حقیقی طور پر ملقّب نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنا سارا وجود مع اس کی تمام قوتوں اور خواہشوں اور ارادوں کے حوالہ بخدا نہ کر دیوے اور اپنی انانیت سے مع اس کے جمیع لوازم کے ہاتھ اٹھا کر اس کی راہ میں نہ لگ جاوے۔ پس حقیقی طور پر اس وقت کسی کو مسلمان کہا جائیگا جب اس کی غافلانہ زندگی پر ایک سخت انقلاب وارد ہو کر اس کے نفس امّارہ کا نقش ہستی مع اس کے تمام جذبات کے یکدفعہ مٹ جائے اور پھر اس موت کے بعد محسن للّٰہ ہونے کے لئے نئی زندگی اس میں پیدا ہو جائے اور وہ ایسی پاک زندگی ہو جو اس میں بجز طاعت خالق اور ہمدردیٔ مخلوق کے اور کچھ بھی نہ ہو۔

خالق کی طاعت اس طرح سے کہ اسکی عزّت و جلال اور یگانگت ظاہر کرنے کیلئے بے عزّتی اور ذلّت قبول کرنے کیلئے مستعد ہو۔ اور اسکی وحدانیت کا نام زندہ کرنے کیلئے ہزاروں موتوں کو قبول کرنے کے لئے طیار ہو اور اس کی فرمانبرداری میں ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو بخوشی خاطر کاٹ سکے اور اس کے احکام کی عظمت کا پیار اور اس کی رضاجوئی کی پیاس گناہ سے ایسی نفرت دلاوے کہ گویا وہ کھا جانے والی ایک آگ ہے یا ہلاک کرنے والی ایک زہر ہے یا بھسم کر دینے والی ایک بجلی ہے جس سے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ بھاگنا چاہیئے۔ غرض اس کی مرضی ماننے کے لئے اپنے نفس کی سب مرضیات چھوڑ دے اور اس کے پیوند کے لئے جان کا زخموں سے مجروح ہونا قبول کر لے اور اس کے تعلق کا ثبوت دینے کے لئے سب نفسانی تعلقات توڑ دے۔

اور خلق کی خدمت اِس طرح سے کہ جس قدر خلقت کی حاجات ہیں اور جس قدر مختلف وجوہ اور طرق کی راہ سے قسّام ازل نے بعض کو بعض کا محتاج کر رکھا ہے ان تمام امور میں محض لِلّٰہ اپنی حقیقی اور بے غرضانہ اور سچی ہمدردی سے جو اپنے وجود سے صادر ہو سکتی ہے اُن کو نفع پہنچاوے اور ہر ایک مدد کے محتاج کو اپنی خدا داد قوت سے مدد دے اور اُن کی دنیا و آخرت دونوں کی اصلاح کیلئے زور لگاوے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۵۹-۶۲)

اب ہم کسی قدر اس بات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے ثمرات کیا ہیں؟ سو واضح ہو کہ جب کوئی اپنے مولیٰ کا سچا طالب کامل طور پر اسلام پر قائم ہو جائے اور نہ کسی تکلّف اور بناوٹ سے بلکہ طبعی طور پر خدا تعالیٰ کی راہوں میں ہر ایک قوت اس کے کام میں لگ جائے تو آخری نتیجہ اُس کی اس حالت کا یہ ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ہدایت کی اعلیٰ تجلّیات تمام حُجب سے مبرّا ہو کر اُس کی طرف رُخ کرتی ہیں۔ اور طرح طرح کی برکات اُس پر نازل ہوتی ہیں اور وہ احکام اور وہ عقائد جو محض ایمان اور سماع کے طور پر قبول کئے گئے تھے۔ اب بذریعہ مکاشفاتِ صحیحہ اور الہاماتِ یقینیہ قطعیہ مشہود اور محسوس طور پر کھولے جاتے ہیں۔ اور مغلقات شرع اور دین کے اَور اسرار سربستہ ملّتِ حنیفیہ کے اس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور ملکوت الٰہی کا اس کو سیر کرایا جاتا ہے تا وہ یقین اور معرفت میں مرتبہ کامل حاصل کرے اور اس کی زبان اور اس کے بیان اور تمام افعال اور اقوال اور حرکات و سکنات میں ایک برکت رکھی جاتی ہے اور ایک فوق العادت شجاعت اور استقامت اور ہمّت اس کو عطا کی جاتی ہے اور شرح صدر کا ایک اعلیٰ مقام اس کو عنایت کیا جاتا ہے اور بشریت کے حجابوں کی تنگ دلی اور خست اور بخل اور بار بار کی لغزش اور تنگ چشمی اور غلامی شہوات اور ردارت اخلاق اور ہر ایک قسم کی نفسانی تاریکی بکلّی اس سے دُور کر کے اُس کی جگہ ربّانی اخلاق کا نور بھر دیا جاتا ہے۔ تب وہ بکلّی مبدّل ہو کر ایک نئی پیدائش کا پیرایہ پہن لیتا ہے اور خدائے تعالیٰ سے سُنتا اور خدائے تعالےٰ سے دیکھتا اور خدائے تعالےٰ کے ساتھ حرکت کرتا اور خدا تعالےٰ کے ساتھ ٹھہرتا ہے اور اُس کا غضب خدائے تعالیٰ کا غضب اور اس کا رحم خدائے تعالیٰ کا رحم ہو جاتا ہے۔ اور اس درجہ میں اُس کی دُعائیں بطور اصطفاء کے منظور ہوتی ہیں نہ بطور ابتلاء کے۔ اور وہ زمین پر حجت اللّٰہ اور امان اللّٰہ ہوتا ہے اور آسمان پر اس کے وجود سے خوشی کی جاتی ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ عطیّہ جو اس کو عطا ہوتا ہے مکالمات الٰہیہ اور مخاطبات حضرتِ یزدانی ہیں جو بغیر شک اور شبہ اور کسی غبار کے چاند کے نور کی طرح اُس کے

دل پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اور ایک شدید الاثر لذّت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور طمانیت اور تسلّی اور سکینت بخشتے ہیں۔ اور اس کلام اور الہام میں فرق یہ ہے کہ الہام کا چشمہ تو گویا ہر وقت مقرب لوگوں میں بہتا ہے اور وہ رُوح القدس کے بلائے بولتے اور رُوح القدس کے دکھائے دیکھتے اور رُوح القدس کے سُنائے سُنتے اور ان کے تمام ارادے رُوح القدس کے نفخ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ بات سچ اور بالکل سچ ہے کہ وہ ظلّی طور پر اس آیت کا مصداق ہوتے ہیں وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الّا وحی یوحیٰ لیکن مکالمہ الٰہیہ ایک الگ امر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وحی متلوّ کی طرح خدا تعالیٰ کا کلام اُن پر نازل ہوتا ہے اور وہ اپنے سوالات کا خدائے تعالیٰ سے ایسا جواب پاتے ہیں کہ جیسا ایک دوست دوست کو جواب دیتا ہے۔ اور اس کلام کی اگر ہم تعریف کریں تو صرف اس قدر کر سکتے ہیں کہ وہ اللہ جلّ شانہٗ کی ایک تجلّی خاص کا نام ہے جو بذریعہ اس کے مقرّب فرشتہ کے ظہور میں آتی ہے اور اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ تا دعا کے قبول ہونے سے اطلاع دی جائے یا کوئی نئی اور مخفی بات بتائی جائے یا آئندہ کی خبروں پر آگاہی دی جائے۔ یا کسی امر میں خدا تعالیٰ کی مرضی اور عدم مرضی پر مطلع کیا جائے یا کسی اور قسم کے واقعات میں یقین اور معرفت کے مرتبہ تک پہنچایا جائے۔ بہرحال یہ وحی ایک الٰہی آواز ہے جو معرفت اور اطمینان سے رنگین کرنے کے لئے منجانب اللہ پیرایہ مکالمہ و مخاطبہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور اس سے بڑھ اس کی کیفیت بیان کرنا غیر ممکن ہے کہ وہ صرف الٰہی تحریک اور ربّانی نفخ سے بغیر کسی قسم کے فکر اور تدبّر اور خوض اور غور اور اپنے نفس کے دخل کے خدائے تعالیٰ کی طرف سے ایک قدرتی ندا ہے جو لذیذ اور پُر برکت الفاظ میں محسوس ہوتی ہے اور اپنے اندر ایک ربّانی تجلّی اور الٰہی صولت رکھتی ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۲۲۶-۲۳۳)

مَیں صرف اسلام کو سچا مذہب سمجھتا ہوں اور دوسرے مذاہب کو باطل اور سراسر دروغ کا پتلا خیال کرتا ہوں اور مَیں دیکھتا ہوں کہ اسلام کے ماننے سے نور کے چشمے میرے اندر بہہ رہے ہیں اور محض محبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے وہ اعلیٰ مرتبہ مکالمہ الٰہیہ اور اجابت دُعاؤں کا مجھے حاصل ہوا ہے جو کہ بجز سچے نبی کے پَیرو کے اَور کسی کو حاصل نہیں ہو سکیگا اور اگر ہندو اور عیسائی وغیرہ اپنے باطل معبودوں سے دُعا کرتے کرتے مر بھی جائیں تب بھی ان کو وہ مرتبہ مل نہیں سکتا اور وہ کلامِ الٰہی جو دوسرے ظنّی طور پر اس کو مانتے ہیں مَیں اُس کو سُن رہا ہوں اور مجھے دکھلایا اور تبلایا گیا اور سمجھایا گیا ہے کہ دنیا میں فقط اسلام ہی حق ہے اور میرے پر ظاہر کیا گیا

کہ یہ سب کچھ بہ برکت پیروی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تجھ کو ملا ہے اور جو کچھ ملا ہے اُس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں کیونکہ وہ باطل پر ہیں ۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۲۷۵ - ۲۷۶)

ہزار ہزار شکر اس خداوند کریم کا ہے جس نے ایسا مذہب ہمیں عنایت فرمایا جو خدادانی اور خداترسی کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی نظیر کبھی اور کسی زمانہ میں نہیں پائی گئی ۔ اور ہزارہا درود اُس نبیٔ معصوم پر جس کے وسیلہ سے ہم اس پاک مذہب میں داخل ہوئے اور ہزارہا رحمتیں نبی کریمؐ کے اصحاب پر ہوں جنہوں نے اپنے خونوں سے اس باغ کی آبپاشی کی ۔

اسلام ایک ایسا بابرکت اور خدانما مذہب ہے کہ اگر کوئی شخص سچّے طور پر اس کی پابندی اختیار کرے اور اُن تعلیموں اور ہدایتوں اور وصیتوں پر کاربند ہو جائے جو خدا تعالیٰ کے پاک کلام قرآن شریف میں مندرج ہیں تو وہ اسی جہان میں خدا کو دیکھ لے گا ۔ وہ خدا جو دنیا کی نظر سے ہزاروں پردوں میں ہے اس کی شناخت کے لئے بجز قرآنی تعلیم کے اَور کوئی بھی ذریعہ نہیں ۔ قرآن شریف معقولی رنگ میں اور آسمانی نشانوں کے رنگ میں نہایت سہل اور آسان طریق سے خدا تعالےٰ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اس میں ایک برکت اور قوتِ جاذبہ ہے جو خدا کے طالب کو دم بدم خدا کی طرف کھینچتی اور روشنی اور سکینت اور اطمینان بخشتی ہے اور قرآن شریف پر سچا ایمان لانے والا صرف فلسفیوں کی طرح یہ ظنّ نہیں رکھتا کہ اس پُرحکمت عالم کا بنانے والا کوئی ہونا چاہیئے بلکہ وہ ایک ذاتی بصیرت حاصل کرکے اور ایک پاک رؤیت سے مشرف ہو کر یقین کی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے کہ فی الواقع وہ صانع موجود ہے ۔ اور اس پاک کلام کی روشنی حاصل کرنے والا محض خشک معقولیوں کی طرح یہ گمان نہیں رکھتا کہ خدا واحد لاشریک ہے بلکہ صدہا چمکتے ہوئے نشانوں کے ساتھ جو اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلمت سے نکالتے ہیں واقعی طور پر مشاہدہ کر لیتا ہے کہ درحقیقت ذات اور صفات میں خدا کا کوئی بھی شریک نہیں ۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ وہ عملی طور پر دنیا کو دکھا دیتا ہے کہ وہ ایسا ہی خدا کو سمجھتا ہے ۔ اور وحدتِ الٰہی کی عظمت ایسی اُس کے دل میں سما جاتی ہے کہ وہ الٰہی ارادہ کے آگے تمام دنیا کو ایک مرے ہوئے کیڑے کی طرح بلکہ مطلق لاشیٔ اور سراسر کالعدم سمجھتا ہے ۔

(براہین احمدیہ حصّہ پنجم ص ۱۶-۱۷)

سچے مذہب کا خدا ایسا مطابق عقل اور نور فطرت چاہیئے کہ جس کا وجود اُن لوگوں پر بھی

حجت ہو سکے جو عقل تو رکھتے ہیں مگر ان کو کتاب نہیں ملی۔ غرض وہ خدا ایسا ہونا چاہیئے جس میں کسی زبردستی اور بناوٹ کی بُو نہ پائی جائے۔ سو یاد رہے کہ یہ کمال اس خدا میں ہے جو قرآن شریف نے پیش کیا ہے۔ اور تمام دنیا کے مذہب والوں نے یا تو اصل خدا کو بالکل چھوڑ دیا ہے جیسا کہ عیسائی اور یا ناواجب صفات اور اخلاقِ ذمیمہ اس کی طرف منسوب کرا دیئے ہیں جیسا کہ یہودی۔ اور یا واجب صفات سے اس کو علیحدہ کر دیا ہے جیسا کہ مشرکین اور آریہ۔ مگر اسلام کا خدا وہی سچّا خدا ہے جو آئینۂ قانونِ قدرت اور صحیفۂ فطرت سے نظر آ رہا ہے۔ اسلام نے کوئی نیا خدا پیش نہیں کیا بلکہ وہی خدا پیش کیا ہے جو انسان کا نورِ قلب اور انسان کا کانشنس اور زمین و آسمان پیش کر رہا ہے۔ اور دوسری علامت سچے مذہب کی یہ ہے کہ مُردہ مذہب نہ ہو۔ بلکہ جن برکتوں اور عظمتوں کی ابتداء میں اس میں تخم ریزی کی گئی تھی وہ تمام برکتیں اور عظمتیں نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے اس میں آخر دنیا تک موجود ہیں تا موجودہ نشان گذشتہ نشانوں کے لئے مصدّق ہو کر اس سچائی کے نور کو قصّہ کے رنگ میں نہ ہونے دیں۔ سو میں ایک مدت دراز سے لکھ رہا ہوں کہ جس نبوت کا ہمارے سیّد و مولیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا تھا اور جو دلائل آسمانی نشانوں کے آنجنابؐ نے پیش کئے تھے وہ اب تک موجود ہیں اور پیروی کرنے والوں کو ملتے ہیں تا وہ معرفت کے مقام تک پہنچ جائیں۔ اور زندہ خدا کو براہ راست دیکھ لیں۔ مگر جن نشانوں کو یسوع کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اُن کا دنیا میں نام و نشان نہیں صرف قصے ہیں۔ لہٰذا یہ مُردہ پرستی کا مذہب اپنے مُردہ معبود کی طرح مُردہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک سچائی کا بیان صرف قصّوں تک کفایت نہیں کر سکتا۔ کونسی قوم دنیا میں ہے جن کے پاس کراماتوں اور معجزوں کے قصّے نہیں۔ پس یہ اسلام ہی کا خاصہ ہے کہ وہ صرف قصّوں کی ناقص اور ناتمام تسلّی پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ڈھونڈنے والوں کو زندہ نشانوں سے اطمینان بخشتا ہے۔ اور اس شخص کو جو طالبِ حق ہو اس کو چاہیئے کہ صرف بیہودہ مُردہ پرستی پر کفایت نہ کرے بلکہ نہایت ضروری ہے کہ محض ذلیل قصّوں پر سرنگوں نہ ہو۔ ہم دنیا کے بازار میں اچھی چیزوں کے خریدنے کے لئے آئے ہیں ہمیں نہیں چاہیئے کہ کوئی مغشوش چیز خرید کر نقد ایمان ضائع کریں۔ زندہ مذہب وہ ہے جس کے ذریعہ سے زندہ خدا ملے۔ زندہ خدا وہ ہے جو ہمیں بلاواسطہ مُلہَم کر سکے اور کم سے کم یہ کہ ہم بلاواسطہ مُلہَم کو دیکھ سکیں۔ سو میں تمام دنیا کو خوشخبری دیتا ہوں کہ یہ زندہ خدا اسلام کا خدا ہے۔ وہ مُردے ہیں نہ خدا جن سے اب کوئی ہمکلام نہیں ہو سکتا۔ اس کے نشان نہیں دیکھ سکتا۔ سو

جس کا خدا مُردہ ہے وہ اُس کو ہر میدان میں شرمندہ کرتا ہے۔ اور ہر میدان میں اُس کو ذلیل کرتا ہے اور کہیں اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ اس اشتہار کے دینے سے اصل غرض یہی ہے کہ جس مذہب میں سچائی ہے وہ کبھی اپنا رنگ نہیں بدل سکتی۔ جیسے اوّل ہے ویسے ہی آخر ہے۔ سچا مذہب کبھی خشک قصّہ نہیں بن سکتا۔ سو اسلام سچّا ہے۔ مَیں ہر ایک کو کیا عیسائی کیا آریہ کیا یہودی اور کیا برہمو اس سچائی کے دکھلانے کے لئے بُلاتا ہوں۔ کیا کوئی ہے جو زندہ خدا کا طالب ہے ہم مُردوں کی پرستش نہیں کرتے۔ ہمارا زندہ خدا ہے۔ وہ ہماری مدد کرتا ہے وہ اپنے الہام اور کلام اور آسمانی نشانوں سے ہمیں مدد دیتا ہے۔ اگر دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک کوئی عیسائی طالب حق ہے تو ہمارے زندہ خدا اور اپنے مُردہ خدا کا مقابلہ کرکے دیکھ لے۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اِس باہم امتحان کے لئے چالیس دن کافی ہیں۔

(تبلیغ رسالت جلد ششم صفحہ ۱۳-۱۵)

وہ اسلام جس کی خوبیاں ہم بیان کر چکے ہیں وہ ایسی چیز نہیں ہے جس کے ثبوت کے لئے ہم صرف گذشتہ کا حوالہ دیں۔ اور محض قبروں کے نشان دکھلائیں۔ اسلام مردہ مذہب نہیں تا یہ کہا جائے کہ اسکی سب برکات پیچھے رہ گئی ہیں اور آگے خاتمہ ہے۔ اسلام میں بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کی برکات ہمیشہ اس کے ساتھ ہیں۔ اور وہ صرف گذشتہ قصوں کا سبق نہیں دیتا بلکہ موجودہ برکات پیش کرتا ہے۔ دنیا کو برکات اور آسمانی نشانوں کی ہمیشہ ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے تھی اور اب نہیں ہے۔ ضعیف اور عاجز انسان جو اندھے کی طرح پیدا ہوتا ہے اِس بات کا محتاج ہے کہ آسمانی بادشاہت کا اس کو کچھ پتہ لگے اور وہ خدا جس کے وجود پر ایمان ہے اُس کی ہستی اور قدرت کے کچھ آثار بھی ظاہر ہوں۔ پہلے زمانہ کے نشان دوسرے زمانہ کیلئے کافی نہیں ہو سکتے کیونکہ خبر معائنہ کی مانند نہیں ہو سکتی اور امتدادِ زمانہ سے خبریں ایک قصّہ کے رنگ میں ہو جاتی ہیں۔ ہر یک نئی صدی جو آتی ہے تو گویا ایک نئی دنیا شروع ہوتی ہے اِس لئے اسلام کا خدا جو سچّا خدا ہے ہر یک نئی دنیا کے لئے نئے نشان دکھلاتا ہے اور ہر یک صدی کے سر پر اور خاص کر ایسی صدی کے سر پر جو ایمان اور دیانت سے دُور پڑ گئی ہے اور بہت سی تاریکیاں اپنے اندر رکھتی ہے ایک قائم مقام نبی کا پیدا کر دیتا ہے جس کے آئینۂ فطرت میں نبی کی شکل ظاہر ہوتی ہے اور وہ قائم مقام نبی متبوع کے کمالات کو اپنے وجود کے توسط سے لوگوں کو دکھلاتا ہے اور تمام مخالفوں کو سچائی اور حقیقت نمائی اور پردہ دری کے رُو سے ملزم کرتا ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۲۳۵-۲۳۷)

سچے مذہب کی یہی نشانی ہے کہ اِس مذہب کی تعلیم سے ایسے راستباز پیدا ہوتے رہیں جو محدّث کے مرتبہ تک پہنچ جائیں جن سے خدا تعالیٰ آمنے سامنے کلام کرے ۔ اور اسلام کی حقیقت اور حقانیت کی اوّل نشانی یہی ہے کہ اس میں ہمیشہ ایسے راستباز جن سے خدا تعالیٰ ہم کلام ہو پیدا ہوتے ہیں ۔ تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا ۔ سو یہی معیار حقیقی سچے اور زندہ اور مقبول مذہب کی ہے ۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہ نور صرف اسلام میں ہے ۔ عیسائی مذہب اس روشنی سے بے نصیب ہے ۔

(حجۃ الاسلام ص۳)

ہم یقینی اور قطعی طور پر ہر ایک طالب حق کو ثبوت دے سکتے ہیں کہ ہمارے سیّد و مولیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے آج تک ہر ایک صدی میں ایسے باخدا لوگ ہوتے رہے ہیں جن کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ غیر قوموں کو آسمانی نشان دکھلا کر ان کو ہدایت دیتا رہا ہے ۔ جیسا کہ سید عبدالقادر جیلانی اور ابوالحسن خرقانی اور ابویزید بسطامی اور جنید بغدادی اور محی الدین ابن العربی ۔ اور ذوالنون مصری اور معین الدین چشتی اجمیری اور قطب الدین بختیار کاکی ۔ اور فرید الدین پاکپٹنی اور نظام الدین دہلوی ۔ اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ احمد سرہندی رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ اسلام میں گذرے ہیں اور ان لوگوں کا ہزارہا تک عدد پہنچا ہے اور اس قدر ان لوگوں کے خوارق علماء اور فضلاء کی کتابوں میں منقول ہیں کہ ایک متعصب کو باوجود سخت تعصب کے آخر ماننا پڑتا ہے کہ یہ لوگ صاحب خوارق و کرامات تھے ۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ میں نے نہایت صحیح تحقیقات سے دریافت کیا ہے کہ جہاں تک بنی آدم کے سلسلہ کا پتہ لگتا ہے سب پر غور کرنے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر اسلام میں اسلام کی تائید میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی گواہی میں آسمانی نشان بذریعہ اس امت کے اولیاء کے ظاہر ہوئے اور ہو رہے ہیں اُن کی نظیر دوسرے مذاہب میں ہرگز نہیں ۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی ترقی آسمانی نشانوں کے ذریعہ سے ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور اس کے بے شمار انوار اور برکات نے خدا تعالیٰ کو قریب کر کے دکھلا دیا ہے ۔ یقیناً سمجھو کہ اسلام اپنے آسمانی نشانوں کی وجہ سے کسی زمانہ کے آگے شرمندہ نہیں ۔ ابھی اپنے زمانہ کو دیکھو جس میں اگر تم چاہو تو اسلام کے لئے رؤیت کی گواہی دے سکتے ہو ۔ تم سچ سچ کہو کہ کیا اس زمانہ میں تم نے اسلام کے نشان نہیں دیکھے ؟ پھر بتلاؤ کہ دنیا میں اور کونسا مذہب ہے کہ یہ گواہیاں نقد موجود رکھتا ہے ؟ یہی باتیں تو ہیں کہ جن سے پادری صاحبوں کی کمر ٹوٹ گئی ۔ جس شخص کو وہ خدا بناتے ہیں اس کی تائید میں بجز چند بے سرو پا قصوں اور جھوٹی روایتوں کے اُن کے ہاتھ میں

کچھ نہیں۔ اور جس پاک نبیؐ کی وہ تکذیب کرتے ہیں اُس کی سچائی کے نشان اس زمانہ میں بھی بارش کی طرح برس رہے ہیں۔ ڈھونڈنے والوں کے لئے اب بھی نشانوں کے دروازے کھلے ہیں جیسا کہ پہلے کھلے تھے۔ اور سچائی کے بھوکوں کے لئے اب بھی خوان نعمت موجود ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ زندہ مذہب وہی ہوتا ہے جس پر ہمیشہ کے لئے زندہ خدا کا ہاتھ ہو۔ سو وہ اسلام ہے۔

(کتاب البریہ ص۹۱-۹۲)

اگر کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ دنیا میں صدہا جھوٹے مذہب ہیں جو ہزاروں برسوں سے چلے آتے ہیں حالانکہ ابتداء اُن کی کسی افتراء سے ہوگی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ افتراء سے مراد ہمارے کلام میں وہ افتراء ہے کہ کوئی شخص عمدًا اپنی طرف سے بعض کلمات تراش کر یا ایک کتاب بنا کر پھر یہ دعویٰ کرے کہ یہ باتیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اس نے مجھے الہام کیا ہے اور ان باتوں کے بارے میں میرے پر اُس کی وحی نازل ہے۔ حالانکہ کوئی وحی نازل نہیں ہوئی۔ سو ہم نہایت کامل تحقیقات سے کہتے ہیں کہ ایسا افتراء کبھی کسی زمانہ میں چل نہیں سکا۔ اور خدا کی پاک کتاب صاف گواہی دیتی ہے کہ خدا تعالےٰ پر افتراء کرنے والے جلد ہلاک کئے گئے ہیں۔ اور ہم لکھ چکے ہیں کہ توریت بھی یہی گواہی دیتی ہے اور انجیل بھی اور فرقان مجید بھی۔ ہاں جسقدر دنیا میں جھوٹے مذاہب نظر آتے ہیں۔ جیسے ہندوؤں اور پارسیوں کا مذہب، اُن کی نسبت یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ کسی جھوٹے پیغمبر کا سلسلہ چلا آتا ہے۔ بلکہ اصل حقیقت ان میں یہ ہے کہ خود لوگ غلطیوں میں پڑتے پڑتے ایسے عقائد کے پابند ہوگئے ہیں۔ دنیا میں تم کوئی ایسی کتاب دکھا نہیں سکتے جس میں صاف اور بے تناقض لفظوں میں کھلا کھلا یہ دعویٰ ہو کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ حالانکہ اصل میں وہ خدا کی کتاب نہ ہو بلکہ کسی مفتری کا افتراء ہو۔ اور ایک قوم اس کو عزت کے ساتھ مانتی چلی آئی ہو۔ ہاں ممکن ہے کہ خدا کی کتاب کے اُلٹے معنے کئے گئے ہوں جس حالت میں انسانی گورنمنٹ ایسے شخص کو نہایت غیرت مندی کے ساتھ پکڑتی ہے کہ جھوٹے طور ملازمت سرکاری ہونے کا دعویٰ کرے تو خدا جو اپنے جلال اور ملکوت کے لئے غیرت رکھتا ہے کیوں جھوٹے مدعی کو نہ پکڑلے۔

(انجام آتھم ص۶۳ نوٹ)

اللہ تعالیٰ

جلّ شانہٗ و عزّ اسمہٗ

”یہ دولت لینے کے لائق ہے اگرچہ جان دینے سے ملے۔“

وہ خدا جو تمام نبیوں پر ظاہر ہوتا رہا اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ پر بمقام طور ظاہر ہوا اور حضرت مسیح پر شعیر کے پہاڑ پر طلوع فرمایا اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر فاران کے پہاڑ پر چمکا وہی قادر قدوس خدا میرے پر تجلّی فرما ہوا ہے۔ اُس نے مجھ سے باتیں کیں اور مجھے فرمایا کہ وہ اعلیٰ وجود جس کی پرستش کے لئے تمام نبی بھیجے گئے مَیں ہوں۔ مَیں اکیلا خالق اور مالک ہوں اور کوئی میرا شریک نہیں۔ اور مَیں پیدا ہونے اور مرنے سے پاک ہوں۔

(ضمیمہ رسالہ جہاد صـ۸)

وہ پاک زندگی جو گناہ سے بچ کر ملتی ہے وہ ایک لعلِ تاباں ہے جو کسی کے پاس نہیں ہاں خدا تعالیٰ نے وہ لعلِ تاباں مجھے دیا ہے اور مجھے اُس نے مامور کیا ہے کہ مَیں دنیا کو اس لعلِ تاباں کے حصول کی راہ بتا دوں۔ اس راہ پر چل کر مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص یقیناً یقیناً اس کو حاصل کرے گا اور وہ ذریعہ اور وہ راہ جس سے یہ ملتا ہے ایک ہی ہے جس کو خدا کی سچی معرفت کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ مسئلہ بڑا مشکل اور نازک مسئلہ ہے۔ کیونکہ ایک مشکل امر پر موقوف ہے۔ فلاسفر جیسا کہ مَیں نے پہلے کہا ہے آسمان اور زمین کو دیکھکر اور دوسرے مصنوعات کی ترتیب ابلغ و محکم پر نظر کر کے صرف اتنا بتاتا ہے کہ کوئی صانع ہونا چاہیئے مگر مَیں اس سے بلند تر مقام پر لے جاتا ہوں اور اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ خدا ہے۔

(ملفوظات جلد سوم صـ۱۶)

ہمارا بہشت ہمارا خدا ہے۔ ہماری اعلیٰ لذّات ہمارے خدا میں ہیں کیونکہ ہم نے اس کو دیکھا اور ہر ایک خوبصورتی اس میں پائی۔ یہ دولت لینے کے لائق ہے اگرچہ جان دینے سے ملے اور یہ لعل خریدنے کے لائق ہے اگرچہ تمام وجود کھونے سے حاصل ہو۔ اے محرومو! اِس چشمہ کی طرف دوڑو کہ وہ تمہیں سیراب کرے گا۔ یہ زندگی کا چشمہ ہے جو تمہیں بچائے گا۔ میں کیا کروں اور کس طرح اس خوشخبری کو دلوں میں بٹھا دوں۔ کس دف سے بازاروں میں منادی کروں کہ تمہارا یہ خدا ہے تا لوگ سُن لیں اور کس دوا سے مَیں علاج کروں تا سُننے کے لئے لوگوں کے کان کھلیں۔

(کشتیٔ نوح صـ۳)

خدا زمین و آسمان کا نور ہے۔ یعنی ہر ایک نور جو بلندی اور پستی میں نظر آتا ہے خواہ وہ ارواح میں ہے خواہ اجسام میں اور خواہ ذاتی ہے اور خواہ عرضی۔ اور خواہ ظاہری ہے اور خواہ باطنی اور خواہ ذہنی ہے اور خواہ خارجی اُسی کے فیض کا عطیّہ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ربّ العالمین کا فیضِ عام ہر چیز پر محیط ہو رہا ہے۔ اور کوئی اس کے فیض سے خالی نہیں۔ وہی تمام فیوض کا مبدء ہے اور تمام انوار کا علّت العلل اور تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ اُسی کی ہستی حقیقی تمام عالم کی قیّوم اور تمام زیر و زبر کی پناہ ہے۔ وہی ہے جس نے ہر ایک چیز کو ظلمت خانہ عدم سے باہر نکالا اور خلعتِ وجود بخشا۔ بجز اس کے کوئی ایسا وجود نہیں ہے کہ جو فی حدّ ذاتہٖ واجب اور قدیم ہو۔ یا اس سے مستفیض نہ ہو بلکہ خاک اور افلاک اور انسان اور حیوان اور حجر اور شجر اور روح اور جسم سب اُسی کے فیضان سے وجود پذیر ہیں۔

(براہین احمدیہ ص۱۸۱ حاشیہ)

اسلام کا خدا وہی سچا خدا ہے جو آئینہ قانونِ قدرت اور صحیفۂ فطرت سے نظر آ رہا ہے۔ اسلام نے کوئی نیا خدا پیش نہیں کیا بلکہ وہی خدا پیش کیا ہے جو انسان کا نورِ قلب اور انسان کا کانشنس اور زمین و آسمان پیش کر رہا ہے۔

(تبلیغ رسالت جلد ششم ص۱۵)

اس قادر اور سچے اور کامل خدا کو ہماری رُوح اور ہمارا ذرّہ ذرّہ وجود کا سجدہ کرتا ہے جس کے ہاتھ سے ہر ایک رُوح اور ہر ایک ذرّہ مخلوقات کا مع اپنی تمام قوتوں کے ظہور پذیر ہُوا۔ اور جس کے وجود سے ہر ایک وجود قائم ہے۔ اور کوئی چیز نہ اس کے علم سے باہر ہے اور نہ اس کے تصرف سے۔ نہ اس کے خلق سے۔ اور ہزاروں درود اور سلام اور رحمتیں اور برکتیں اس پاک نبی محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوں جس کے ذریعہ سے ہم نے وہ زندہ خدا پایا جو آپ کلام کر کے اپنی ہستی کا آپ ہمیں نشان دیتا ہے۔ اور آپ فوق العادت نشان دکھلا کر اپنی قدیم اور کامل طاقتوں اور قوتوں کا ہم کو چمکنے والا چہرہ دکھاتا ہے۔ سو ہم نے ایسے رسول کو پایا جس نے خدا کو ہمیں دکھلایا۔ اور ایسے خدا کو پایا جس نے اپنی کامل طاقت سے ہر ایک چیز کو بنایا۔ اس کی قدرت کیا ہی عظمت اپنے اندر رکھتی ہے جس کے بغیر کسی چیز نے نقش وجود نہیں پکڑا۔ اور جس کے سہارے کے بغیر کوئی چیز قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ ہمارا سچّا خدا بے شمار برکتوں والا ہے اور بے شمار قدرتوں والا اور بے شمار حسن والا احسان والا اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ (نسیم دعوت ص۳)

خدا کی ذات غیب الغیب اور وراء الوراء اور نہایت مخفی واقع ہوئی ہے جس کو عقولِ انسانیہ محض اپنی طاقت سے دریافت نہیں کر سکتیں اور کوئی برہان عقلی اُس کے وجود پر قطعی دلیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عقل کی دوڑ اور سعی صرف اس حد تک ہے کہ اس عالم کی صنعتوں پر نظر کر کے صانع کی ضرورت محسوس کرے۔ مگر ضرورت کا محسوس کرنا اور شے ہے۔ اور اس درجہ عین الیقین تک پہنچانا کہ جس خدا کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے وہ درحقیقت موجود بھی ہے یہ اَور بات ہے۔ اور چونکہ عقل کا طریق ناقص اور ناتمام اور مشتبہ ہے اس لئے ہر ایک فلسفی محض عقل کے ذریعہ سے خدا کو شناخت نہیں کر سکتا۔ بلکہ اکثر ایسے لوگ جو محض عقل کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کا پتہ لگانا چاہتے ہیں آخر کار دہریہ بن جاتے ہیں۔ اور مصنوعات زمین و آسمان پر غور کرنا کچھ بھی اُن کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اور خدا تعالیٰ کے کاملوں پر ٹھٹھا اور ہنسی کرتے ہیں اور اُن کی یہ حجّت ہے کہ دنیا میں ہزارہا ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن کے وجود کا ہم کوئی فائدہ نہیں دیکھتے۔ اور جن میں ہماری عقلی تحقیق سے کوئی ایسی صنعت ثابت نہیں ہوتی جو صانع پر دلالت کرے بلکہ محض لغو اور باطل طور پر ان چیزوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ افسوس وہ نادان نہیں جانتے کہ عدمِ علم سے عدمِ شئ لازم نہیں آتا۔ اس قسم کے لوگ کئی لاکھ اس زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔ جو اپنے تئیں اوّل درجہ کے عقلمند اور فلسفی سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے وجود سے سخت منکر ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی عقلی دلیل زبردست ان کو ملتی تو وہ خدا تعالیٰ کے وجود کا انکار نہ کرتے اور اگر وجود باری جلّ شانہٗ پر کوئی برہان یقینی عقلی اُن کو ملزم کرتی تو وہ سخت بے حیائی اور ٹھٹھے اور ہنسی کے ساتھ خدا تعالےٰ کے وجود سے منکر نہ ہو جاتے۔ پس کوئی شخص فلسفیوں کی کشتی پر بیٹھ کر طوفان شبہات سے نجات نہیں پا سکتا بلکہ ضرور غرق ہو گا۔ اور ہرگز ہرگز شربتِ توحید خالص اس کو میسّر نہیں آئیگا۔ اب سوچو کہ یہ خیال کس قدر باطل اور بدبودار ہے کہ بغیر وسیلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے توحید میسّر آ سکتی ہے۔ اور اس سے انسان نجات پا سکتا ہے۔ اے نادانو! جب تک خدا کی ہستی پر یقین کامل نہ ہو اُس کی توحید پر کیونکر یقین ہو سکے۔ پس یقیناً سمجھو کہ توحید یقینی محض نبی کے ذریعہ سے ہی مل سکتی ہے جیسا کہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے عرب کے دہریوں اور بد مذہبوں کو ہزارہا آسمانی نشان دکھلا کر خدا تعالےٰ کے وجود کا قائل کر دیا اور اب تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سچی اور کامل پیروی کرنیوالے اُن نشانوں کو دہریوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بات یہی سچ ہے کہ جب تک زندہ خدا کی زندہ طاقتیں انسان مشاہدہ نہیں کرتا شیطان اس کے دل میں سے نہیں نکلتا اور نہ سچی توحید اُس کے دل میں داخل ہوتی ہے اور نہ یقینی طور پر خدا کی ہستی کا قائل ہو سکتا ہے اور یہ پاک اور کامل توحید

صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہی ملتی ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۱۷ - ۱۱۸)

یاد رکھو کہ انسان کی ہرگز یہ طاقت نہیں ہے کہ ان تمام دقیق در دقیق خدا کے کاموں کو دریافت کر سکے بلکہ خدا کے کام عقل اور فہم اور قیاس سے برتر ہیں۔ اور انسان کو صرف اپنے اس قدر علم پر مغرور نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کو کسی حد تک سلسلہ علل و معلولات کا معلوم ہو گیا ہے کیونکہ انسان کا وہ علم نہایت ہی محدود ہے۔ جیسا کہ سمندر کے ایک قطرہ میں سے کروڑم حصہ قطرہ کا۔ اور حق بات یہ ہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ خود ناپیدا کنار ہے ایسا ہی اس کے کام بھی ناپیدا کنار ہیں۔ اور اس کے ہر ایک کام کی اصلیت تک پہنچنا انسانی طاقت سے برتر اور بلند تر ہے۔ ہاں ہم اس کی صفات قدیمہ پر نظر کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ خدا تعالیٰ کی صفات کبھی معطل نہیں رہتیں اس لئے خدا تعالےٰ کی مخلوق میں قدامت نوعی پائی جاتی ہے یعنی مخلوق کی انواع میں سے کوئی نہ کوئی نوع قدیم سے موجود چلی آئی ہے۔ مگر شخصی قدامت باطل ہے۔ اور باوجود اس کے خدا کی صفت افناء اور اہلاک بھی ہمیشہ اپنا کام کرتی چلی آتی ہے وہ بھی کبھی معطّل نہیں ہوئی۔ اور اگرچہ نادان فلاسفروں نے بہت ہی زور لگایا کہ زمین و آسمان کے اجرام و اجسام کی پیدائش کو اپنے سائنس یعنی طبعی قواعد کے اندر داخل کر لیں اور ہر ایک پیدائش کے اسباب قائم کریں مگر سچ یہی ہے کہ وہ اس میں ناکام و نامراد رہے ہیں۔ اور جو کچھ ذخیرہ اپنی طبعی تحقیقات کا انہوں نے جمع کیا ہے وہ بالکل ناتمام اور ناکمل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی اپنے خیالات پر قائم نہیں رہ سکے اور ہمیشہ ان کے خود تراشیدہ خیالات میں تغیر تبدل ہوتا رہا ہے اور معلوم نہیں کہ آگے کس قدر ہوگا۔ اور چونکہ ان کی تحقیقاتوں کی یہ حالت ہے کہ تمام مدار ان کا صرف اپنی عقل اور قیاس پر ہے اور خدا سے کوئی مدد اُن کو نہیں ملتی اس لئے وہ تاریکی سے باہر نہیں آ سکتے۔ اور درحقیقت کوئی شخص خدا کو شناخت نہیں کر سکتا جب تک اس حد تک اسکی معرفت نہ پہنچ جائے کہ وہ اس بات کو سمجھ لے کہ خدا کے بے شمار کام ایسے ہیں کہ جو انسانی طاقت اور عقل اور فہم سے بالاتر اور بلند تر ہیں اور اس مرتبہ معرفت سے پہلے یا تو انسان محض دہریہ ہوتا ہے اور خدا کے وجود پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور یا اگر خدا کو مانتا ہے تو صرف اس خدا کو مانتا ہے کہ جو اس کے خود تراشیدہ دلائل کا ایک نتیجہ ہے نہ اس خدا کو جو اپنی تجلّی سے اپنے تئیں آپ ظاہر کرتا ہے اور جس کی قدرتوں کے اسرار اس قدر ہیں کہ انسانی عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ جب سے خدا نے مجھے یہ علم دیا ہے کہ خدا کی قدرتیں عجیب در عجیب اور عمیق در عمیق اور

وراء الوراء لایدرک ہیں تب سے میں نے ان لوگوں کو جو فلسفی کہلاتے ہیں پکے کافر سمجھتا ہوں اور چھپے ہوئے دہریہ خیال کرتا ہوں۔ میرا خود ذاتی مشاہدہ ہے کہ کئی عجائب قدرتیں خدا تعالےٰ کی ایسے طور پر میرے دیکھنے میں آئی ہیں کہ بجز اس کے کہ اُن کو نیستی سے ہستی کہیں اور کوئی نام ان کا ہم رکھ نہیں سکتے۔ جیسا کہ ان نشانوں کی بعض مثالیں بعض موقعہ پر میں نے لکھ دی ہیں۔ جس نے یہ کرشمۂ قدرت نہیں دیکھا اُس نے کیا دیکھا؟ ہم ایسے خدا کو نہیں مانتے جس کی قدرتیں صرف ہماری عقل اور قیاس تک محدود ہیں۔ اور آگے کچھ نہیں۔ بلکہ ہم اس خدا کو مانتے ہیں جس کی قدرتیں اس کی ذات کی طرح غیر محدود اور ناپیدا کنار اور غیر متناہی ہیں۔

(چشمۂ معرفت ص ۲۶۸-۲۶۹)

قرآن شریف میں ایسی تعلیمیں ہیں کہ جو خدا کو پیارا بنانے کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔ کہیں اس کے حسن و جمال کو دکھاتی ہیں اور کہیں اُس کے احسانوں کو یاد دلاتی ہیں کیونکہ کسی کی محبت یا تو حسن کے ذریعہ سے دل میں بیٹھتی ہے اور یا احسان کے ذریعہ سے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ خدا اپنی تمام خوبیوں کے لحاظ سے واحد لاشریک ہے۔ کوئی بھی اس میں نقص نہیں۔ وہ مجمع ہے تمام صفات کاملہ کا اور مظہر ہے تمام پاک قدرتوں کا اور مبداء ہے تمام مخلوق کا اور سرچشمہ ہے تمام فیضوں کا اور مالک ہے تمام جزا سزا کا اور مرجع ہے تمام امور کا۔ اور نزدیک ہے باوجود دُوری کے اور دُور ہے باوجود نزدیکی کے۔ وہ سب سے اوپر ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ اس کے نیچے کوئی اَور بھی ہے۔ اور وہ سب چیزوں سے زیادہ پوشیدہ ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ اس سے کوئی زیادہ ظاہر ہے۔ وہ زندہ ہے اپنی ذات سے اور ہر ایک چیز اس کے ساتھ زندہ ہے۔ وہ قائم ہے اپنی ذات سے اور ہر ایک چیز اس کے ساتھ قائم ہے۔ اُس نے ہر ایک چیز کو اُٹھا رکھا ہے اور کوئی چیز نہیں جس نے اُس کو اُٹھا رکھا ہو۔ کوئی چیز نہیں جو اس کے بغیر خود بخود پیدا ہوئی ہے۔ یا اس کے بغیر خود بخود جی سکتی ہے۔ وہ ہر ایک چیز پر محیط ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ کیسا احاطہ ہے۔ وہ آسمان اور زمین کی ہر یک چیز کا نور ہے اور ہر یک نور اُسی کے ہاتھ سے چمکا اور اُسی کی ذات کا پرتوہ ہے۔ وہ تمام عالموں کا پروردگار ہے۔ کوئی رُوح نہیں جو اس سے پرورش نہ پاتی ہو اور خود بخود ہو۔ کسی رُوح کی کوئی قوت نہیں جو اُس سے نہ ملی ہو اور خود بخود ہو۔ اور اُس کی رحمتیں دو قسم کی ہیں (۱) ایک وہ جو بغیر سبقت عمل کسی عامل کے قدیم سے ظہور پذیر ہیں۔ جیسا کہ زمین اور آسمان اور سورج اور چاند اور ستارے اور پانی اور آگ اور ہوا اور تمام ذرّات اس عالم کے جو ہمارے آرام کیلئے بنائے گئے

ایسا ہی جن جن چیزوں کی ہمیں ضرورت تھی وہ تمام چیزیں ہماری پیدائش سے پہلے ہی ہمارے لئے مہیّا کی گئیں اور یہ سب اُس وقت کیا گیا جب کہ ہم خود بخود موجود نہ تھے۔ نہ ہمارا کوئی عمل تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سورج میرے عمل کی وجہ سے پیدا کیا گیا یا زمین میرے کسی شدھ کرم کے سبب سے بنائی گئی۔ غرض یہ وہ رحمت ہے جو انسان اور اس کے عملوں سے پہلے ظاہر ہو چکی ہے جو کسی کے عمل کا نتیجہ نہیں۔ (۲) دوسری رحمت وہ ہے جو اعمال پر مترتب ہوتی ہے اور اس کی تصریح کی کچھ ضرورت نہیں۔ ایسا ہی قرآن شریف میں وارد ہے کہ خدا کی ذات ہریک عیب سے پاک ہے اور ہر ایک نقصان سے مبرّا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ انسان بھی اس کی تعلیم کی پیروی کر کے عیبوں سے پاک ہو۔ اور وہ فرماتا ہے۔ من کان فی ھٰذہٖ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی۔ یعنی جو شخص اس دنیا میں اندھا رہیگا اور اس ذاتِ بے چون کا اس کو دیدار نہیں ہوگا وہ مرنے کے بعد بھی اندھا ہی ہوگا اور تاریکی اُس سے جُدا نہیں ہوگی کیونکہ خدا کے دیکھنے کے لئے اسی دنیا میں حواس ملتے ہیں۔ اور جو شخص ان حواس کو دنیا سے ساتھ نہیں لے جائیگا۔ وہ آخرت میں بھی خدا کو دیکھ نہیں سکیگا۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے صاف سمجھا دیا ہے کہ وہ انسان سے کس ترقی کا طالب ہے۔ اور انسان اس کی تعلیم کی پیروی سے کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ قرآن شریف میں اس تعلیم کو پیش کرتا ہے جس کے ذریعہ سے اور جس پر عمل کرنے سے اسی دنیا میں دیدار الٰہی میسّر آسکتا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ فَمَن کان یرجوا لقاء ربّہٖ فلیعمل عملاً صالحًا ولا یشرک بعبادۃ ربّہٖ احدًا۔ یعنی جو شخص چاہتا ہے کہ اسی دنیا میں اس خدا کا دیدار نصیب ہو جائے جو حقیقی خدا اور پیدا کنندہ ہے پس چاہیئے کہ وہ ایسے نیک عمل کرے جن میں کسی قسم کا فساد نہ ہو۔ یعنی عمل اس کے نہ لوگوں کے دکھلانے کے لئے ہوں۔ نہ ان کی وجہ سے دل میں تکبّر پیدا ہو کہ میں ایسا ہوں ایسا ہوں۔ اور نہ وہ عمل ناقص اور نا تمام ہوں اور نہ اُن میں کوئی ایسی بدبُو ہو جو محبت ذاتی کے برخلاف ہو بلکہ چاہیئے کہ صدق اور وفاداری سے بھرے ہوئے ہوں۔ اور ساتھ اس کے یہ بھی چاہیئے کہ ہر ایک قسم کے شرک سے پرہیز ہو۔ نہ سورج نہ چاند نہ آسمان کے ستارے۔ نہ ہوا نہ آگ نہ پانی۔ نہ کوئی اور زمین کی چیز معبود ٹھہرائی جائے۔ اور نہ دنیا کے اسباب کو ایسی عزت دی جائے اور ایسا اُن پر بھروسہ کیا جائے کہ گویا وہ خدا کے شریک ہیں اور نہ اپنی ہمّت اور کوشش کو کچھ چیز سمجھا جائے کہ یہ بھی شرک کی قسموں میں سے ایک قسم ہے بلکہ سب کچھ کر کے یہ سمجھا جائے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اور نہ اپنے علم پر کوئی غرور کیا جائے

اور نہ اپنے عمل پر کوئی ناز۔ بلکہ اپنے تئیں فی الحقیقت جاہل سمجھیں اور کاہل سمجھیں اور خدا تعالیٰ کے آستانہ پر ہر ایک وقت رُوح گری رہے اور دعاؤں کے ساتھ اُس کے فیض کو اپنی طرف کھینچا جائے۔ اور اس شخص کی طرح ہو جائیں کہ جو سخت پیاسا اور بے دست و پا بھی ہے اور اُس کے سامنے ایک چشمہ نمودار ہوا ہے نہایت صافی اور شیریں۔ پس اُس نے افتاں و خیزاں بہرحال اپنے تئیں اس چشمہ تک پہنچا دیا اور اپنی لبوں کو اس چشمہ پر رکھ دیا اور علیحدہ نہ ہوا جب تک سیراب نہ ہوا اور پھر قرآن میں ہمارا خدا اپنی خوبیوں کے بارے میں فرماتا ہے۔ قل ھو اللّٰہ احد۔ اللّٰہ الصمد۔ لم یلد ولم یولد۔ ولم یکن لہ کفوًا احد۔ یعنی تمہارا خدا وہ خدا ہے جو اپنے ذات اور صفات میں واحد ہے۔ نہ کوئی ذات اُس کی ذات جیسی ازلی اور ابدی یعنی انادی اور اکال ہے۔ نہ کسی چیز کے صفات اس کی صفات کے مانند ہیں۔ انسان کا علم کسی معلّم کا محتاج ہے اور پھر محدود ہے۔ مگر اس کا علم کسی معلّم کا محتاج نہیں اور بایں ہمہ غیر محدود ہے۔ انسان کی شنوائی ہوا کی محتاج ہے اور محدود ہے مگر خدا کی شنوائی ذاتی طاقت سے ہے اور محدود نہیں۔ اور انسان کی بینائی سورج یا کسی دوسری روشنی کی محتاج ہے اور پھر محدود ہے۔ مگر خدا کی بینائی ذاتی روشنی سے ہے اور غیر محدود ہے۔ ایسا ہی انسان کی پیدا کرنے کی قدرت کسی مادہ کی محتاج ہے۔ اور نیز وقت کی محتاج اور پھر محدود ہے لیکن خدا کی پیدا کرنے کی قدرت نہ کسی مادہ کی محتاج ہے نہ کسی وقت کی محتاج اور غیر محدود ہے کیونکہ اس کی تمام صفات بے مثل و مانند ہیں اور جیسے کہ اس کی کوئی مثل نہیں اس کی صفات کی بھی کوئی مثل نہیں۔ اگر ایک صفت میں وہ ناقص ہو تو پھر تمام صفات میں ناقص ہوگا۔ اسلئے اس کی توحید قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اپنی ذات کی طرح اپنے تمام صفات میں بے مثل و مانند نہ ہو۔ پھر اس سے آگے آیت ممدوحہ بالا کے یہ معنے ہیں کہ خدا نہ کسی کا بیٹا ہے نہ کوئی اس کا بیٹا ہے۔ کیونکہ وہ غنی بالذات ہے۔ اس کو نہ باپ کی حاجت ہے اور نہ بیٹے کی۔ یہ توحید ہے جو قرآن شریف نے سکھلائی ہے جو مدارِ ایمان ہے۔

(لیکچر لاہور صـ ۹-۱۳)

خدا نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا کہ میں اپنی جماعت کو اطلاع دوں کہ جو لوگ ایمان لائے ایسا ایمان جو اس کے ساتھ دنیا کی ملونی نہیں اور وہ ایمان نفاق یا بزدلی سے آلودہ نہیں اور وہ ایمان اطاعت کے کسی درجہ سے محروم نہیں۔ ایسے لوگ خدا کے پسندیدہ لوگ ہیں اور خدا فرماتا ہے کہ وہی ہیں جن کا قدم صدق کا قدم ہے۔

اے سُننے والو! سُنو! کہ خدا تم سے کیا چاہتا ہے۔ بس یہی کہ تم اُسی کے ہو جاؤ۔ اُسکے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرو نہ آسمان میں نہ زمین میں۔ ہمارا خدا وہ خدا ہے جو اب بھی زندہ ہے جیسا کہ پہلے زندہ تھا۔ اور اب بھی وہ بولتا ہے جیسا کہ پہلے بولتا تھا۔ اور اب بھی وہ سُنتا ہے جیسا کہ پہلے سُنتا تھا۔ یہ خیال خام ہے کہ اس زمانہ میں وہ سُنتا تو ہے مگر بولتا نہیں۔ بلکہ وہ سُنتا اور بولتا بھی ہے۔ اُس کی تمام صفات ازلی ابدی ہیں۔ کوئی صفت بھی معطّل نہیں اور نہ کبھی ہوگی۔ وہ وہی واحد لاشریک ہے جس کا کوئی بیٹا نہیں اور جس کی کوئی بیوی نہیں۔ وہ وہی بے مثل ہے جس کا کوئی ثانی نہیں اور جس کی طرح کوئی فرد کسی خاص صفت سے مخصوص نہیں اور جس کا کوئی ہمتا نہیں جس کا کوئی ہم صفات نہیں۔ اور جس کی کوئی طاقت کم نہیں۔ وہ قریب ہے باوجود دُور ہونے کے اور دُور ہے باوجود نزدیک ہونے کے۔ وہ تمثّل کے طور پر اہل کشف پر اپنے تئیں ظاہر کر سکتا ہے مگر اس کے لئے نہ کوئی جسم ہے اور نہ کوئی شکل ہے۔ اور وہ سب سے اوپر ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ اس کے نیچے کوئی اَور بھی ہے اور وہ عرش پر ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ زمین پر نہیں۔ وہ مجمع ہے تمام صفات کاملہ کا اور مظہر ہے تمام محامدِ حقّہ کا اور سرچشمہ ہے تمام خوبیوں کا اور جامع ہے تمام طاقتوں کا اور مبدء ہے تمام فیضوں کا اور مرجع ہے ہر ایک شَے کا۔ اور مالک ہے ہر ایک مُلک کا اور متّصف ہے ہر ایک کمال سے اور منزّہ ہے ہر ایک عیب اور ضعف سے۔ اور مخصوص ہے اس امر میں کہ زمین والے اور آسمان والے اسی کی عبادت کریں اور اس کے آگے کوئی بات بھی اَن ہونی نہیں۔ اور تمام روح اور اس کی طاقتیں اور تمام ذرّات اور ان کی طاقتیں اُسی کی پیدائش ہیں۔ اس کے بغیر کوئی چیز ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی طاقتوں اور اپنی قدرتوں اور اپنے نشانوں سے اپنے تئیں آپ ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کو اُسی کے ذریعہ سے ہم پا سکتے ہیں۔ اور وہ راستبازوں پر ہمیشہ اپنا وجود ظاہر کرتا رہتا ہے اور اپنی قدرتیں ان کو دکھلاتا ہے۔ اسی سے وہ شناخت کیا جاتا اور اُسی سے اس کی پسندیدہ راہ شناخت کی جاتی ہے۔

وہ دیکھتا ہے بغیر جسمانی آنکھوں کے۔ اور سُنتا ہے بغیر جسمانی کانوں کے اور بولتا ہے بغیر جسمانی زبان کے۔ اِسی طرح نیستی سے ہستی کرنا اس کا کام ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ خواب کے نظارہ میں بغیر کسی مادہ کے ایک عالم پیدا کر دیتا ہے۔ اور ہر ایک فانی اور معدوم کو موجود دکھلا دیتا ہے۔ پس اسی طرح اس کی تمام قدرتیں ہیں۔ نادان ہے وہ جو اس کی قدرتوں سے انکار کرے۔ اندھا ہے وہ جو اس کی عمیق طاقتوں سے بے خبر ہے۔ وہ سب کچھ کرتا ہے اور کر سکتا ہے

بغیر ان امور کے جو اُس کی شان کے مخالف ہیں یا اس کے مواعید کے برخلاف ہیں ۔ اور وہ واحد ہے اپنی ذات میں اور صفات میں اور افعال میں اور قدرتوں میں ۔ اور اس تک پہنچنے کے لئے تمام دروازے بند ہیں مگر ایک دروازہ جو فرقان مجید نے کھولا ہے۔

(الوصیت ص ۱۴-۱۷)

الحمد للہ ۔ تمام محامد اس ذاتِ معبود برحق مستجمع جمیع صفات کاملہ کو ثابت ہیں جس کا نام اللہ ہے ۔ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ قرآن شریف کی اصطلاح میں اللہ اس ذات کامل کا نام ہے کہ جو معبود برحق اور مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ اور تمام رذائل سے منزّہ اور واحد لاشریک اور مبدء جمیع فیوض ہے ۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے اپنے کلام پاک قرآن شریف میں اپنے نام اللہ کو تمام دوسرے اسماء و صفات کا موصوف ٹھہرایا ہے ۔ اور کسی جگہ کسی دوسرے اسم کو یہ رُتبہ نہیں دیا ۔ پس اللہ کے اسم کو بوجہ موصوفیّتِ تامہ ان تمام صفتوں پر دلالت ہے جن کا وہ موصوف ہے ۔ اور چونکہ وہ جمیع اسماء اور صفات کا موصوف ہے اس لئے اس کا مفہوم یہ ہُوا کہ وہ جمیع صفاتِ کاملہ پر مشتمل ہے ۔ پس خلاصہ مطلب الحمد للہ کا یہ نکلا کہ تمام اقسام حمد کے کیا باعتبار ظاہر کے اور کیا باعتبار باطن کے اور کیا باعتبار ذاتی کمالات کے اور کیا باعتبار قدرتی عجائبات کے اللہ سے مخصوص ہیں ۔ اور اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ۔ اور نیز جس قدر محامد صحیحہ اور کمالاتِ تامہ کو عقل کسی عاقل کی سوچ سکتی ہے یا فکر کسی متفکّر کا ذہن میں لا سکتا ہے وہ سب خوبیاں اللہ تعالیٰ میں موجود ہیں اور کوئی ایسی خوبی نہیں کہ عقل اس خوبی کے امکان پر شہادت دے مگر اللہ تعالیٰ بدقسمت انسان کی طرح اُس خوبی سے محروم ہو ۔ بلکہ کسی عاقل کی عقل ایسی خوبی پیش ہی نہیں کر سکتی کہ جو خدا میں نہ پائی جائے جہاں تک انسان زیادہ سے زیادہ خوبیاں سوچ سکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہیں ۔ اور اس کو اپنی ذات اور صفات اور محامد میں من کل الوجوہ کمال حاصل ہے اور رذائل سے بکلّی منزّہ ہے ۔ اب دیکھو یہ ایسی صداقت ہے جس سے سچا اور جھوٹا مذہب ظاہر ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ تمام مذہبوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بجز اسلام دنیا میں کوئی بھی ایسا مذہب نہیں ہے کہ جو خدائے تعالیٰ کو جمیع رذائل سے منزّہ اور تمام محامد کاملہ سے متصف سمجھتا ہو ۔ عام ہندو اپنے دیوتاؤں کو کارخانہ ربوبیت میں شریک سمجھتے ہیں اور خدا کے کاموں میں ان کو مستقل طور پر دخیل قرار دیتے ہیں بلکہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ خدا کے ارادوں کو بدلنے والے اور اس کی تقدیروں کو زیر و زبر کرنے والے ہیں اور نیز ہندو لوگ کئی انسانوں اور دوسرے جانوروں کی نسبت بلکہ بعض ناپاک اور

نجاست خوار حیوانات یعنی خنزیر وغیرہ کی نسبت یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی زمانہ میں اُن کا پرمیشر ایسی ایسی جونوں میں تولّد پاکر ان تمام آلائشوں اور آلودگیوں سے ملوّث ہوتا رہا ہے کہ جو ان چیزوں کے عائدِ حال ہیں اور نیز اور چیزوں کی طرح بھوک اور پیاس اور درد اور دکھ اور خوف اور غم اور بیماری اور موت اور ذلّت اور رسوائی اور عاجزی اور ناتوانی کی آفات میں گرفتار ہوتا رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمام اعتقادات خدائے تعالیٰ کی خوبیوں میں بٹہ لگاتے ہیں۔ اور اس کے ازلی اور ابدی جاہ وجلال کو گھٹاتے ہیں۔ اور آریہ سماج والے جو اُن کے مہذب بھائی نکلے ہیں جنکا یہ گمان ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک وید کی لکیر پر چلتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کو خالقیت سے ہی جواب دیتے ہیں۔ اور تمام رُوحوں کو اُس کی ذات کامل کی طرح غیر مخلوق اور واجب الوجود اور موجود بوجودِ حقیقی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ عقلِ سلیم خدا تعالیٰ کی نسبت صریح یہ نقص سمجھتی ہے کہ وہ دنیا کا مالک کہلا کر پھر کسی چیز کا ربّ اور خالق نہ ہو اور دنیا کی زندگی اس کے سہارے سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی وجوب کی رُو سے ہو۔ اور جب عقلِ سلیم کے آگے یہ دونوں سوال پیش کئے جائیں کہ آیا خداوند قادرِ مطلق کے محامدِ تامہ کے لئے یہ بات اصلح اور انسب ہے کہ وہ آپ ہی اپنی قدرت کاملہ سے تمام موجودات کو منصّہ ظہور میں لا کر ان سب کا رب اور خالق ہو اور تمام کائنات کا سِلسلہ اسی کی ربوبیت تک ختم ہوتا ہو اور خالقیت کی صفت اور قدرت اُس کی ذاتِ کامل میں موجود ہو اور پیدائش اور موت کے نقصان سے پاک ہو یا یہ باتیں اُس کی شان کے لائق ہیں کہ جسقدر مخلوقات اس کے قبضۂ تصرّف میں ہیں یہ چیزیں اس کی مخلوق نہیں ہیں اور نہ اس کے سہارے سے اپنا وجود رکھتی ہیں اور نہ اپنے وجود اور بقا میں اس کی محتاج ہیں اور نہ وہ اُن کا خالق اور ربّ ہے اور نہ خالقیت کی صفت اور قدرت اُس میں پائی جاتی ہے اور نہ پیدائش اور موت کے نقصان سے پاک ہے تو ہرگز عقل یہ فتویٰ نہیں دیتی کہ وہ جو دنیا کا مالک ہے۔ وہ دنیا کا پیدا کنندہ نہیں اور ہزاروں پُرحکمت صفتیں کہ جو رُوحوں اور جسموں میں پائی جاتی ہیں وہ خود بخود ہیں اور ان کا بنانے والا کوئی نہیں اور خدا جو ان سب چیزوں کا مالک کہلاتا ہے وہ فرضی طور پر مالک ہے۔ اور نہ یہ فتویٰ دیتی ہے کہ اُس کو پیدا کرنے سے عاجز سمجھا جاوے یا ناطاقت اور ناقص ٹھہرایا جاوے یا پلیدی اور نجاست خواری کی نالائق اور قبیح علامت کو اس کی طرف منسوب کیا جاوے یا موت اور درد اور دکھ اور بے علمی اور جہالت کو اُس پر روا رکھا جاوے۔ بلکہ صاف یہ شہادت دیتی ہے کہ خدائے تعالیٰ ان تمام رذیلتوں اور نقصانوں سے پاک ہونا چاہیئے اور اُس میں کمالِ تام چاہیئے۔ اور کمالِ تام قدرتِ تام سے مشروط ہے اور جب خدائے تعالیٰ میں قدرتِ تام نہ رہی اور نہ وہ کسی دوسری چیز کو پیدا کر سکا اور نہ اپنی ذات کو ہر ایک قسم کے نقصان

اور عیب سے بچا سکا تو اُس میں کمالِ تام بھی نہ رہا۔ اور جب کمالِ تام نہ رہا تو محامدِ کاملہ سے وہ بے نصیب رہا۔

یہ ہندوؤں اور آریوں کا حال ہے اور جو کچھ عیسائی لوگ خدا تعالیٰ کا جلال ظاہر کر رہے ہیں وہ ایک ایسا امر ہے کہ صرف ایک ہی سوال سے دانا انسان سمجھ سکتا ہے۔ یعنی اگر کسی دانا سے پُوچھا جائے کہ کیا اس کی ذات کامل اور قدیم اور غنی اور بے نیاز کی نسبت جائز ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ اپنے تمام عظیم الشان کاموں میں جو قدیم سے وہ کرتا رہا ہے آپ ہی کافی ہو آپ ہی بغیر حاجت کسی باپ یا بیٹے کے تمام دنیا کو پیدا کیا ہو اور آپ ہی تمام روحوں اور جسموں کو وہ قوتیں بخشی ہوں جن کی انہیں حاجت ہے اور آپ ہی تمام کائنات کا حافظ اور قیوم اور مدبّر ہو بلکہ ان کے وجود سے پہلے جو کچھ اُن کو زندگی کے لئے درکار تھا وہ سب اپنی صفت رحمانیت سے ظہور میں لایا اور بغیر انتظار عمل کسی عامل کے سورج اور چاند اور بے شمار ستارے اور زمین اور ہزارہا نعمتیں جو زمین پر پائی جاتی ہیں محض اپنے فضل وکرم سے انسانوں کے لئے پیدا کی ہوں اور ان سب کاموں میں کسی بیٹے کا محتاج نہ ہُوا ہو لیکن پھر وہی کامل خدا آخری زمانہ میں اپنا تمام جلال اور اقتدار کالعدم کر کے مغفرت اور نجات دینے کے لئے بیٹے کا محتاج ہو جائے اور پھر بیٹا بھی ایسا ناقص بیٹا جس کو باپ سے کچھ بھی مناسبت نہیں جس نے باپ کی طرح نہ کوئی گوشہ آسمان کا اور نہ کوئی قطعہ زمین کا پیدا کیا جس سے اس کی اُلوہیت ثابت ہو بلکہ مرقس کے ۸ باب ۱۲ آیت میں اس کی عاجزانہ حالت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اُس نے اپنے دل سے آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں۔ مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائیگا۔ اور اس کے مصلوب ہونے کے وقت بھی یہودیوں نے کہا کہ اگر وہ اب ہمارے روبرو زندہ ہو جائے تو ہم ایمان لائیں گے۔ لیکن اس نے اُن کو زندہ ہو کر نہ دکھلایا۔ اور اپنی خدائی اور قدرت کاملہ کا ایک ذرّہ ثبوت نہ دیا۔ اور اگر بعض معجزات بھی دکھلائے تو وہ دکھلائے کہ اُس سے پہلے اَور نبی بکثرت دکھلا چکے تھے۔ بلکہ اُسی زمانہ میں ایک حوض کے پانی سے بھی ایسے ہی عجائبات ظہور میں آتے تھے (دیکھو باب پنجم انجیل یوحنا) غرض وہ اپنے خدا ہونے کا کوئی نشان دکھلا نہ سکا۔ جیسا کہ آیت مذکورہ بالا میں خود اس کا اقرار موجود ہے بلکہ ایک ضعیفہ عاجزہ کے پیٹ سے تولد پا کر (بقول عیسائیوں) وہ ذلّت اور رسوائی اور ناتوانی اور خواری عمر بھر دیکھی کہ جو انسانوں میں سے وہ انسان دیکھتے ہیں کہ جو بدقسمت اور بے نصیب کہلاتے ہیں۔ اور پھر مدت تک ظلمت خانہ رحم میں قید رہ کر اور اُس ناپاک راہ سے کہ جو پیشاب کی بدررو ہے پیدا ہو کر ہر ایک قسم کی آلودہ حالت

کو اپنے اوپر وارد کر لیا اور بشری آلودگیوں اور نقصانوں میں سے کوئی ایسی آلودگی باقی نہ رہی جس سے وہ بیٹا باپ کا بدنام کنندہ ملوّث نہ ہو۔ اور پھر اس نے اپنی جہالت اور بے علمی اور بے قدرتی اور نیز اپنے نیک نہ ہونے کا اپنی کتاب میں آپ ہی اقرار کر لیا۔ اور پھر درصورتیکہ وہ عاجز بندہ کہ خواہ نخواہ خدا کا بیٹا قرار دیا گیا بعض بزرگ نبیوں سے فضائل علمی اور عملی میں کم بھی تھا اور اُسکی تعلیم بھی ایک ناقص تعلیم تھی کہ جو موسیٰؑ کی شریعت کی ایک فرع تھی تو پھر کیونکر جائز ہے کہ خداوند قادرِ مطلق اور ازلی اور ابدی پر یہ بہتان باندھا جاوے کہ وہ ہمیشہ اپنی ذات میں کامل اور غنی اور قادرِ مطلق رہ کر آخرکار ایسے ناقص بیٹے کا محتاج ہو گیا اور اپنے سارے جلال اور بزرگی کو بیکبارگی کھو دیا۔ میں ہرگز باور نہیں کرتا کہ کوئی دانا اس ذاتِ کامل کی نسبت کہ جو مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ ہے ایسی ایسی ذلّتیں جائز رکھے۔

(براہین احمدیہ صـ ۴۱۳ - ۴۱۹ حاشیہ ۱۱)

یہ بات بغیر کسی بحث کے قبول کرنے کے لائق ہے کہ وہ سچّا اور کامل خدا جس پر ایمان لانا ہر ایک بندہ کا فرض ہے وہ رب العالمین ہے۔ اور اس کی ربوبیت کسی خاص قوم تک محدود نہیں اور نہ کسی خاص زمانہ تک اور نہ کسی خاص ملک تک بلکہ وہ سب قوموں کا رب ہے اور تمام زمانوں کا ربّ ہے اور تمام مکانوں کا ربّ ہے۔ اور تمام ملکوں کا وہی رب ہے اور تمام فیضوں کا وہی سرچشمہ ہے اور ہر ایک جسمانی اور روحانی طاقت اُسی سے ہے اور اُسی سے تمام موجودات پرورش پاتی ہے اور ہر ایک وجود کا وہی سہارا ہے۔

خدا کا فیض عام ہے جو تمام قوموں اور تمام ملکوں اور تمام زمانوں پر محیط ہو رہا ہے۔ یہ اسلئے ہوُا کہ تا کہ کسی قوم کو شکایت کرنے کا موقعہ نہ ملے اور یہ نہ کہیں کہ خدا نے فلاں فلاں قوم پر احسان کیا مگر ہم پر نہ کیا۔ یا فلاں قوم کو اس کی طرف سے کتاب ملی تا وہ اس سے ہدایت پاویں مگر ہم کو نہ ملی۔ یا فلاں زمانہ میں وہ اپنی وحی اور الہام اور معجزات کے ساتھ ظاہر ہوُا مگر ہمارے زمانہ میں مخفی رہا۔ پس اس نے عام فیض دکھلا کر ان تمام اعتراضات کو دفع کر دیا اور اپنے ایسے وسیع اخلاق دکھلائے کہ کسی قوم کو اپنے جسمانی اور روحانی فیضوں سے محروم نہیں رکھا۔ اور نہ کسی زمانے کو بے نصیب ٹھیرایا۔

(پیغام صلح صـ ۱۰ - ۱۱)

اے خدا اے کارساز و عیب پوش و کردگار ؛؛ اے مرے پیارے مرے محسن مرے پروردگار

کس طرح تیرا کروں اے ذوالمنن شکر و سپاس ؛ وہ زباں لاؤں کہاں سے جس سے ہو یہ کاروبار
یہ سراسر فضل و احساں ہے کہ میں آیا پسند ؛ ورنہ درگہ میں تری کچھ کم نہ تھے خدمتگزار
دوستی کا دم جو بھرتے تھے وہ سب دشمن ہوئے ؛ پر نہ چھوڑا ساتھ تو نے اے میرے حاجت برار
اے میرے یارِ یگانہ اے مری جاں کی پناہ ؛ بس ہے تو میرے لئے مجھ کو نہیں تجھ بن بکار
میں تو مر کر خاک ہوتا گر نہ ہوتا تیرا لطف ؛ پھر خدا جانے کہاں یہ پھینک دی جاتی غبار
اے فدا ہو تیری رہ میں میرا جسم و جان و دل ؛ میں نہیں پاتا کہ تجھ سا کوئی کرتا ہو پیار
ابتدا سے تیرے ہی سایہ میں میرے دن کٹے ؛ گود میں تیری رہا میں مثلِ طفلِ شیر خوار
نسلِ انساں میں نہیں دیکھی وفا جو تجھ میں ہے ؛ تیرے بن دیکھا نہیں کوئی بھی یارِ غمگسار
لوگ کہتے ہیں کہ نالائق نہیں ہوتا قبول ؛ میں تو نالائق بھی ہو کر پا گیا درگہ میں بار
اس قدر مجھ پر ہوئیں تیری عنایات و کرم ؛ جن کا مشکل ہے کہ تا روزِ قیامت ہو شمار

(براہین احمدیہ حصّہ پنجم ص۹۷)

خدا تعالےٰ نے عاجز انسانوں کو اپنی کامل معرفت کا علم دینے کے لئے اپنی صفات کو قرآن شریف میں دو رنگ پر ظاہر کیا ہے۔ (۱) اوّل اس طور پر بیان کیا ہے جس سے اس کی صفات استعارہ کے طریق پر مخلوق کی صفات کی ہمشکل ہیں۔ جیساکہ وہ کریم رحیم ہے۔ محسن ہے اور وہ غضب بھی رکھتا ہے اور اس میں محبت بھی ہے۔ اور اس کے ہاتھ بھی ہیں اور اس کی آنکھیں بھی ہیں اور اس کی ساقیں بھی ہیں اور اس کے کان بھی ہیں۔ اور نیز یہ کہ قدیم سے سلسلہ مخلوق کا اس کے ساتھ چلا آیا ہے مگر کسی چیز کو اس کے مقابل پر قدامتِ شخصی نہیں ہاں قدامت نوعی ہے اور وہ بھی خدا کی صفت خلق کے لئے ایک لازمی امر نہیں کیونکہ جیساکہ تخلّق یعنی پیدا کرنا اس کی صفات میں سے ہے ایسا ہی کبھی اور کسی زمانہ میں تجلّیٔ وحدت اور تجرّد اس کی صفات میں سے ہے اور کسی صفت کے لئے تعطّل دائمی جائز نہیں ہاں تعطّل میعادی جائز ہے،

غرض چونکہ خدا نے انسان کو پیدا کرکے اپنی ان تشبیہی صفات کو اس پر ظاہر کیا جن صفات کے ساتھ انسان بظاہر شراکت رکھتا ہے۔ جیسے خالق ہونا۔ کیونکہ انسان بھی اپنی حد تک بعض چیزوں کا خالق یعنی موجد ہے۔ ایسا ہی انسان کو کریم بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی حد تک کرم کی صفت بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور اسی طرح انسان کو رحیم بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی حد تک قوتِ رحم بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور قوّتِ غضب بھی اس میں ہے۔ اور ایسا ہی آنکھ کان وغیرہ سب انسان میں موجود ہیں۔ پس ان تشبیہی صفات سے کسی کے دل میں شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ گویا انسان ان صفات میں

خدا سے مشابہہ ہے اور خدا انسان سے مشابہہ ہے اس لئے خدا نے ان صفات کے مقابل پر قرآن شریف میں اپنی تنزیہی صفات کا بھی ذکر کر دیا۔ یعنی ایسی صفات کا ذکر کیا جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی ذات اور صفات میں کچھ بھی شراکت انسان کے ساتھ نہیں اور نہ انسان کو اس کے ساتھ کچھ مشارکت ہے۔ نہ اُس کا خلق یعنی پیدا کرنا انسان کی خلق کی طرح ہے۔ نہ اس کا رحم انسان کے رحم کی طرح ہے۔ نہ اس کا غضب انسان کے غضب کی طرح ہے۔ نہ اس کی محبت انسان کی محبت کی طرح ہے۔ نہ وہ انسان کی طرح کسی مکان کا محتاج ہے۔

اور یہ ذکر یعنی خدا کا اپنی صفات میں انسان سے بالکل علیحدہ ہونا قرآن شریف کی کئی آیات میں تصریح کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ایک یہ آیت ہے۔ لیس کمثلہٖ شیءٌ وھو السمیع البصیر۔ یعنی کوئی چیز اپنی ذات اور صفات میں خدا کی شریک نہیں اور وہ سُننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اور پھر ایک جگہ فرمایا۔ اللّٰہ لا الٰہ الّا ھو الحیّ القیّوم ج لا تأخذہٗ سنۃ ولا نوم لہٗ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض من ذا الذی یشفع عندہٗ الّا باذنہٖ۔ یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم ولا یحیطون بشیءٍ من علمہٖ الّا بما شآء وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض ولا یؤدہٗ حفظھما وھو العلی العظیم۔ ترجمہ: حقیقی وجود اور حقیقی بقا اور تمام صفات حقیقیہ خاص خدا کے لئے اور کوئی ان میں اس کا شریک نہیں۔ وہی بذاتہٖ زندہ ہے اور باقی تمام زندے اُس کے ذریعے سے ہیں۔ اور وہ اپنی ذات سے آپ قائم ہے اور باقی تمام چیزوں کا قیام اس کے سہارے سے ہے اور جیسا کہ موت اس پر جائز نہیں ایسا ہی ادنیٰ درجہ کا تعطّل حواس بھی جو نیند اور اونگھ سے ہے وہ بھی اس پر جائز نہیں مگر دوسروں پر جیسا کہ موت وارد ہوتی ہے نیند اور اونگھ بھی وارد ہوتی ہے۔ جو کچھ تم زمین میں دیکھتے ہو یا آسمان میں وہ سب اُسی کا ہے اور اُسی سے ظہور پذیر اور قیام پذیر ہے۔ کون ہے جو بغیر اس کے حکم کے اس کے آگے شفاعت کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے جو لوگوں کے آگے ہے اور جو پیچھے ہے یعنی اس کا علم حاضر اور غائب پر محیط ہے۔ اور کوئی اس کے علم کا کچھ بھی احاطہ نہیں کر سکتا لیکن جس قدر وہ چاہے۔ اس کی قدرت اور علم کا تمام زمین و آسمان پر تسلّط ہے۔ وہ سب کو اٹھائے ہوئے ہے۔ یہ نہیں کہ کسی چیز نے اس کو اٹھا رکھا ہے۔ اور وہ آسمان اور زمین اور ان کی تمام چیزوں کے اٹھانے سے تھکتا نہیں اور وہ اس بات سے بزرگتر ہے کہ ضعف و ناتوانی اور کم قدرتی اس کی طرف منسوب کی جائے۔

اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے۔ ان ربکم اللّٰہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی

ستّۃ ایّام ثم استوٰی علی العرش (ترجمہ) تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر اس نے عرش پر قرار پکڑا۔ یعنی اُس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کر کے اور تشبیہی صفات کا ظہور فرما کر پھر تنزیہی صفات کے ثابت کرنے کے لئے مقام تنزہ اور تجرد کی طرف رُخ کیا جو وراء الورا مقام اور مخلوق کے قرب و جوار سے دُور تر ہے۔ وہی بلند تر مقام ہے جس کو عرش کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ پہلے تو تمام مخلوق حیّز عدم میں تھی اور خدا تعالیٰ وراء الوراء مقام میں اپنی تجلّیات ظاہر کر رہا تھا جس کا نام عرش ہے۔ یعنی وہ مقام جو ہر ایک عالم سے بلند تر اور برتر ہے اور اُسی کا ظہور اور پرتو تھا۔ اور اس کی ذات کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کیا۔ اور جب مخلوق ظاہر ہوئی تو پھر اس نے اپنے تئیں مخفی کر لیا اور چاہا کہ وہ اِن مصنوعات کے ذریعہ سے شناخت کیا جائے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ دائمی طور پر تعطّل صفاتِ الٰہیہ کبھی نہیں ہوتا اور بجز خدا کے کسی چیز کے لئے قدامت شخصی تو نہیں مگر قدامتِ نوعی ضروری ہے اور خدا کی کسی صفت کے لئے تعطّل دائمی تو نہیں مگر تعطّل میعادی کا ہونا ضروری ہے۔ اور چونکہ صفت ایجاد اور صفت افنا باہم متضاد ہیں اس لئے جب افنا کی صفت کا ایک کامل دَور آ جاتا ہے تو صفت ایجاد کی ایک میعاد تک معطّل رہتی ہے۔ غرض ابتداء میں خدا کی صفت وحدت کا دَور تھا۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس دَور نے کتنی دفعہ ظہور کیا۔ بلکہ یہ دَور قدیم اور غیر متناہی ہے۔ بہر حال صفت وحدت کے دَور کو دوسری صفات پر تقدّم زمانی ہے۔ پس اِسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں خدا اکیلا تھا اور اس کے ساتھ کوئی نہ تھا اور پھر خدا نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کیا۔ اور اسی تعلّق کی وجہ سے اس نے اپنے یہ اسماء ظاہر کئے کہ وہ کریم اور رحیم ہے اور غفور اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ مگر جو شخص گناہ پر اصرار کرے اور باز نہ آوے اس کو وہ بے سزا نہیں چھوڑتا۔ اور اُس نے اپنا یہ اسم بھی ظاہر کیا کہ وہ توبہ کرنے والوں سے پیار کرتا ہے اور اس کا غضب صرف انہی لوگوں پر بھڑکتا ہے جو ظلم اور شرارت اور معصیت سے باز نہیں آتے ....

...... اُس کی تمام صفات اس کی ذات کے مناسب حال ہیں۔ انسان کی صفات کی مانند نہیں۔ اور اس کی آنکھ وغیرہ جسم اور جسمانی نہیں اور اس کی کسی صفت کو انسان کی کسی صفت سے مشابہت نہیں۔ مثلاً انسان اپنے غضب کے وقت پہلے غضب کی تکلیف آپ اُٹھاتا ہے اور جوش و غضب میں فوراً اس کا سرور دُور ہو کر ایک جلن سی اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور

ایک مادہ سوداوی اُس کے دماغ میں چڑھ جاتا ہے اور ایک تغیر اس کی حالت میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر خدا ان تغیرات سے پاک ہے۔ اور اس کا غضب ان معنوں سے ہے کہ وہ اس شخص سے جو شرارت سے باز نہ آوے اپنا سایۂ حمایت اٹھا لیتا ہے اور اپنے قدیم قانون قدرت کے موافق اس سے ایسا معاملہ کرتا ہے جیسا کہ ایک غضبناک انسان کرتا ہے۔ لہذا استعارہ کے رنگ میں وہ معاملہ اس کا غضب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی اس کی محبت انسان کی محبت کی طرح نہیں کیونکہ انسان غلبۂ محبت میں بھی دُکھ اٹھاتا ہے اور محبوب کے علیحدہ اور جُدا ہونے سے اس کی جان کو تکلیف پہنچتی ہے مگر خدا ان تکالیف سے پاک ہے۔ ایسا ہی اس کا قرب بھی انسان کے قرب کی طرح نہیں کیونکہ انسان جب ایک کے قریب ہوتا ہے تو اپنے پہلے مرکز کو چھوڑ دیتا ہے۔ مگر وہ باوجود قریب ہونے کے دُور ہوتا ہے اور باوجود دُور ہونے کے قریب ہوتا ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی ہر ایک صفت انسانی صفات سے الگ ہے اور صرف اشتراک لفظی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ اسی لئے خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ لیس کمثلہ شیءٌ یعنی کوئی چیز اپنی ذات یا صفات میں خدا تعالیٰ کے برابر نہیں۔

(چشمۂ معرفت ص ۲۶۰-۲۶۴)

خدا کبھی معطّل نہیں ہوگا۔ ہمیشہ خالق۔ ہمیشہ رازق۔ ہمیشہ رب۔ ہمیشہ رحمان۔ ہمیشہ رحیم ہے اور رہیگا۔ میرے نزدیک ایسے عظیم الشان جبروت والے کی نسبت بحث کرنا گناہ میں داخل ہے خدا نے کوئی چیز منوانی نہیں چاہی جس کا نمونہ یہاں نہیں دیا۔

(ملفوظات جلد چہارم ص ۳۴۷)

یاد رہے کہ جس طرح ستارے ہمیشہ نوبت بہ نوبت طلوع کرتے رہتے ہیں اسی طرح خدا کے صفات بھی طلوع کرتے رہتے ہیں۔ کبھی انسان خدا کے صفاتِ جلالیہ اور استغنائے ذاتی کے پرتوہ کے نیچے ہوتا ہے۔ اور کبھی صفاتِ جمالیہ کا پرتوہ اس پر پڑتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُلَّ یومٍ ھو فی شانٍ۔ پس یہ سخت نادانی کا خیال ہے کہ ایسا گمان کیا جائے کہ بعد اس کے کہ مجرم لوگ دوزخ میں ڈالے جائیں گے پھر صفاتِ کرم اور رحم ہمیشہ کیلئے معطّل ہو جائیں گی اور کبھی ان کی تجلّی نہیں ہوگی۔ کیونکہ صفاتِ الٰہیہ کا تعطّل ممتنع ہے بلکہ حقیقی صفت خدا تعالیٰ کی محبت اور رحم ہے اور وہی ام الصفات ہے اور وہی کبھی انسانی اصلاح کے لئے صفاتِ جلالیہ اور غضبیہ کے رنگ میں جوش مارتی ہے اور جب اصلاح ہو جاتی ہے تو محبت اپنے رنگ میں ظاہر ہو جاتی ہے

اور پھر بطور موہبت ہمیشہ کے لئے رہتی ہے۔ خدا ایک چڑچڑا انسان کی طرح نہیں ہے جو خواہ نخواہ عذاب دینے کا شائق ہو۔ اور وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ اپنے پر آپ ظلم کرتے ہیں۔ اس کی محبت میں تمام نجات اور اس کو چھوڑنے میں تمام عذاب ہے۔

(چشمۂ مسیحی ص ۵۱ - ۵۲)

جاننا چاہیئے کہ جس خدا کی طرف ہمیں قرآن شریف نے بلایا ہے اُس کی اُس نے یہ صفات لکھی ہیں:۔ ھو اللّٰہ الذی لا اِلٰہ الّا ھو۔ عالم الغیب والشھادۃ ھو الرحمٰن الرحیم۔ مالك یوم الدین۔ الملك القدّوس السلام المؤمن المھیمن العزیز الجبّار المتکبّر۔ ھو اللّٰہ الخالق الباریٔ المصوّر لہ الاسماء الحسنٰی۔ یسبّح لہ ما فی السمٰوٰت والارض وھو العزیز الحکیم۔ علی کلّ شیءٍ قدیر۔ ربّ العالمین۔ الرحمٰن الرحیم۔ مالك یوم الدین۔ اجیب دعوۃ الدّاع اذا دعان۔ الحیّ القیّوم قل ھو اللّٰہ احد۔ اللّٰہ الصمد۔ لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوًا احد۔

یعنی وہ خدا جو واحد لاشریک ہے جس کے سوا کوئی بھی پرستش اور فرمانبرداری کے لائق نہیں۔ یہ اس لئے فرمایا کہ اگر وہ لاشریک نہ ہو تو شائد اس کی طاقت پر دشمن کی طاقت غالب آجائے۔ اس صورت میں خدائی معرض خطرہ میں رہے گی۔ اور یہ جو فرمایا کہ اس کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں اس سے یہ مطلب ہے کہ وہ ایسا کامل خدا ہے جس کی صفات اور خوبیاں اور کمالات ایسے اعلیٰ اور بلند ہیں کہ اگر موجودات میں سے بوجہ صفات کاملہ کے ایک خدا انتخاب کرنا چاہیں یا دل میں عمدہ سے عمدہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خدا کی صفات فرض کریں تو وہ سب سے اعلیٰ جس سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ نہیں ہوسکتا وہی خدا ہے جس کی پرستش میں ادنیٰ کو شریک کرنا ظلم ہے۔ پھر فرمایا کہ عالم الغیب ہے۔ یعنی اپنی ذات کو آپ ہی جانتا ہے۔ اس کی ذات پر کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ ہم آفتاب اور ماہتاب اور ہر ایک مخلوق کا سراپا دیکھ سکتے ہیں مگر خدا کا سراپا دیکھنے سے قاصر ہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ عالم الشہادۃ ہے۔ یعنی کوئی چیز اس کی نظر سے پردہ میں نہیں ہے۔ یہ جائز نہیں کہ وہ خدا کہلا کر پھر علم اشیاء سے غافل ہو۔ وہ اس عالم کے ذرّہ ذرّہ پر اپنی نظر رکھتا ہے لیکن انسان نہیں رکھ سکتا وہ جانتا ہے کہ کب اس نظام کو توڑ دے گا اور قیامت برپا کر دے گا۔ اور اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ایسا کب ہوگا۔ سو وہی خدا ہے جو ان تمام وقتوں کو جانتا ہے۔ پھر فرمایا۔ ھو الرحمٰن۔ یعنی وہ جانداروں کی ہستی اور ان کے اعمال سے پہلے محض اپنے لطف سے نہ کسی

غرض سے اور نہ کسی عمل کے پاداش میں اُن کے لئے سامان راحت میسّر کرتا ہے۔ جیسا کہ آفتاب اور زمین اور دوسری تمام چیزوں کو ہمارے وجود اور ہمارے اعمال کے وجود سے پہلے ہمارے لئے بنا دیا۔ اس عطیّہ کا نام خدا کی کتاب میں رحمانیت ہے اور اس کام کے لحاظ سے خدا تعالیٰ رحمٰن کہلاتا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ الرحیم یعنی وہ خدا نیک عملوں کی نیک تر جزا دیتا ہے اور کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اور اس کام کے لحاظ سے رحیم کہلاتا ہے۔ اور یہ صفت رحیمیت کے نام سے موسوم ہے۔ اور پھر فرمایا مالک یوم الدین۔ یعنی وہ خدا ہر ایک کی جزا اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ اس کا کوئی ایسا کارپرداز نہیں جس کو اس نے زمین و آسمان کی حکومت سونپ دی ہو۔ اور آپ الگ ہو بیٹھا ہو۔ اور آپ کچھ نہ کرتا ہو۔ وہی کارپرداز سب کچھ جزا سزا دیتا ہو یا آئندہ دینے والا ہو۔ اور پھر فرمایا۔ الملک القدوس۔ یعنی وہ خدا بادشاہ ہے جس پر کوئی داغ عیب نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی بادشاہت عیب سے خالی نہیں۔ اگر مثلاً تمام رعیّت جلاوطن ہو کر دوسرے ملک کی طرف بھاگ جاوے تو پھر بادشاہی قائم نہیں رہ سکتی۔ یا اگر مثلاً تمام رعیت قحط زدہ ہو جائے تو پھر خراج شاہی کہاں سے آئے۔ اور اگر رعیّت کے لوگ اس سے بحث شروع کر دیں کہ تجھ میں ہم سے زیادہ کیا ہے تو وہ کونسی لیاقت اپنی ثابت کرے۔ پس خدا تعالیٰ کی بادشاہی ایسی نہیں ہے۔ وہ ایک دم میں تمام ملک کو فنا کر کے اور مخلوقات پیدا کر سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا خالق اور قادر نہ ہوتا تو پھر بجز ظلم کے اس کی بادشاہت چل نہ سکتی کیونکہ وہ دنیا کو ایک مرتبہ معافی اور نجات دے کر پھر دوسری دنیا کہاں سے لاتا۔ کیا نجات یافتہ لوگوں کو دنیا میں بھیجنے کے لئے پھر پکڑتا اور ظلم کی راہ سے اپنی معافی اور نجات دہی کو واپس لیتا۔ تو اس صورت میں اس کی خدائی میں فرق آتا۔ اور دنیا کے بادشاہوں کی طرح داغدار بادشاہ ہوتا۔ جو دنیا کے لئے قانون بناتے ہیں۔ بات بات پر بگڑتے ہیں اور اپنی خود غرضی کے وقتوں پر جب دیکھتے ہیں کہ ظلم کے بغیر چارہ نہیں تو ظلم کو شیر مادر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً قانون شاہی جائز رکھتا ہے کہ ایک جہاز کو بچانے کے لئے ایک کشتی کے سواروں کو تباہی میں ڈال دیا جائے اور ہلاک کیا جائے مگر خدا کو یہ اضطرار پیش نہیں آنا چاہیئے۔ پس اگر خدا پورا قادر اور عدم سے پیدا کرنے والا نہ ہوتا تو وہ یا تو کمزور راجوں کی طرح قدرت کی جگہ ظلم سے کام لیتا اور یا عادل بن کر خدائی کو ہی الوداع کہتا۔ بلکہ خدا کا جہاز تمام قدرتوں کے ساتھ سچے انصاف پر چل رہا ہے۔ پھر فرمایا۔ السّلام۔ یعنی وہ خدا جو تمام عیبوں اور مصائب اور سختیوں سے محفوظ ہے بلکہ سلامتی دینے والا ہے۔ اس کے معنے بھی ظاہر ہیں۔ کیونکہ اگر وہ آپ ہی مصیبتوں میں پڑتا۔ لوگوں کے ہاتھ سے مارا جاتا اور اپنے ارادوں میں ناکام رہتا تو اس کے بدنمونے کو دیکھ کر

کس طرح دل تسلّی پکڑتے کہ ایسا خدا ہمیں ضرور مصیبتوں سے چھڑا دیگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ باطل معبودوں کے بارہ میں فرماتا ہے۔ ان الذین تدعون من دون اللّٰہ لن یخلقوا ذبابًا ولو اجتمعوا لہ۔ وان یسلبھم الذّباب شیئًا لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب والمطلوب۔ ما قدروا اللّٰہ حق قدرہٖ ان اللّٰہ لقوی عزیز۔ جن لوگوں کو تم خدا بنائے بیٹھے ہو وہ تو ایسے ہیں کہ اگر سب مِل کر ایک مکھّی پیدا کرنا چاہیں تو کبھی پیدا نہ کرسکیں۔ اگرچہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں بلکہ اگر مکھّی اُن کی چیز چھین کر لے جائے تو انہیں طاقت نہیں ہوگی کہ وہ مکھّی سے چیز واپس لے سکیں اُن کے پرستار عقل کے کمزور اور وہ طاقت کے کمزور ہیں۔ کیا خدا ایسے ہُوا کرتے ہیں؟ خدا تو وہ ہے کہ سب قوتوں والوں سے زیادہ قوت والا اور سب پر غالب آنے والا ہے۔ نہ اس کو کوئی پکڑ سکے اور نہ مار سکے۔ ایسی غلطیوں میں جو لوگ پڑتے ہیں وہ خدا کی قدر نہیں پہچانتے اور نہیں جانتے خدا کیسا ہونا چاہیئے۔ اور پھر فرمایا کہ خدا امن کا بخشنے والا اور اپنے کمالات اور توحید پر دلائل قائم کرنیوالا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچے خدا کا ماننے والا کسی مجلس میں شرمندہ نہیں ہوسکتا اور نہ خدا کے سامنے شرمندہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے پاس زبردست دلائل ہوتے ہیں۔ لیکن بناوٹی خدا کا ماننے والا بڑی مصیبت میں ہوتا ہے۔ وہ بجائے دلائل بیان کرنے کے ہر ایک بے ہودہ بات کو راز میں داخل کرتا ہے تا ہنسی نہ ہو۔ اور ثابت شدہ غلطیوں کو چھپانا چاہتا ہے۔

اور پھر فرمایا کہ المہیمن العزیز الجبّار المتکبر۔ یعنی وہ سب کا محافظ ہے اور سب پر غالب اور بگڑے ہوئے کا بنانے والا اور اس کی ذات نہایت ہی مستغنی ہے۔ اور فرمایا:۔ ھو اللّٰہ الخالق البارئ المصوّر لہ الاسماء الحسنیٰ یعنی وہ ایسا خدا ہے کہ جسموں کا پیدا کرنے والا اور روحوں کا بھی پیدا کرنے والا۔ رحم میں تصویر کھینچنے والا ہے۔ تمام نیک نام جہاں تک خیال میں آسکیں سب اُسی کے نام ہیں۔ اور پھر فرمایا۔ یسبّح لہ ما فی السمٰوٰت والارض وھو العزیز الحکیم یعنی آسمان کے لوگ بھی اس کے نام کو پاکی سے یاد کرتے ہیں اور زمین کے لوگ بھی۔ اس آیت میں اشارہ فرمایا کہ آسمانی اجرام میں آبادی ہے اور وہ لوگ بھی پابند خدا کی ہدایتوں کے ہیں اور پھر فرمایا۔ علیٰ کلّ شیءٍ قدیر۔ یعنی خدا بڑا قادر ہے۔ یہ پرستاروں کے لئے تسلّی ہے۔ کیونکہ اگر خدا عاجز ہو اور قادر نہ ہو تو ایسے خدا سے کیا اُمید رکھیں۔ اور پھر فرمایا۔ رب العالمین۔ الرحمٰن الرحیم ملٰک یوم الدین۔ اجیب دعوۃ الدّاع اذا دعان۔ یعنی وہی خدا ہے جو تمام عالموں کا پرورش کرنے والا۔ رحمٰن رحیم اور جزا کے دن کا آپ مالک ہے اس اختیار کو کسی کے ہاتھ میں

نہیں دیا۔ ہر ایک پکارنے والے کی پکار کو سُننے والا اور جواب دینے والا۔ یعنی دعاؤں کا قبول کرنے والا۔ اور پھر فرمایا۔ الحیّ القیّوم۔ یعنی ہمیشہ رہنے والا اور تمام جانوں کی جان اور سب کے وجود کا سہارا۔ یہ اس لئے کہا کہ وہ ازلی ابدی نہ ہو تو اس کی زندگی کے بارے میں بھی دھڑکا رہیگا۔ شائد ہم سے پہلے فوت نہ ہو جائے۔ اور پھر فرمایا کہ وہ خدا اکیلا خدا ہے۔ نہ وہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا بیٹا۔ اور نہ کوئی اُس کے برابر اور نہ کوئی اس کا ہم جنس۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۵۸ - ۶۲)

خدا تعالیٰ کی چار اعلیٰ درجہ کی صفتیں ہیں جو ام الصفات ہیں۔ اور ہر ایک صفت ہماری بشریت سے ایک امر مانگتی ہے۔ اور وہ چار صفتیں یہ ہیں۔ ربوبیّت۔ رحمانیّت۔ رحیمیّت۔ مالکیّت یوم الدین

(۱) **ربوبیّت** اپنے فیضان کے لئے عدم محض یا مشابہ بالعدم کو چاہتی ہے اور تمام انواع مخلوق کی جاندار ہوں یا غیر جاندار اسی سے پیرایۂ وجود پہنتے ہیں۔

(۲) **رحمانیت** اپنے فیضان کے لئے صرف عدم کو ہی چاہتی ہے یعنی اس عدم محض کو جس کے وقت میں وجود کا کوئی اثر اور ظہور نہ ہو اور صرف جانداروں سے تعلق رکھتی ہے اور چیزوں سے نہیں۔

(۳) **رحیمیت** اپنے فیضان کے لئے موجود ذوالعقل کے مُنہ سے نیستی اور عدم کا اقرار چاہتی ہے اور صرف نوع انسان سے تعلق رکھتی ہے۔

(۴) **مالکیت یوم الدّین** اپنے فیضان کے لئے فقیرانہ تضرع اور الحاح کو چاہتی ہے۔ اور صرف ان انسانوں سے تعلق رکھتی ہے جو گداؤں کی طرح حضرتِ احدیت کے آستانہ پر گرتے ہیں اور فیض پانے کے لئے دامنِ اخلاص پھیلاتے ہیں اور سچ مچ اپنے تئیں تہیدست پا کر خدا تعالےٰ کی مالکیت پر ایمان لاتے ہیں۔

یہ چار الٰہی صفتیں ہیں جو دنیا میں کام کر رہی ہیں اور ان میں سے جو رحیمیت کی صفت ہے وہ دُعا کی تحریک کرتی ہے۔ اور مالکیت کی صفت خوف اور قلق کی آگ سے گداز کر کے سچّا خشوع اور خضوع پیدا کرتی ہے کیونکہ اس صفت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ مالک جزا ہے کسی کا حق نہیں جو دعویٰ سے کچھ طلب کرے اور مغفرت اور نجات محض فضل پر ہے۔

(ایّام الصلح ص ۱۳ - ۱۴)

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالےٰ نے اپنی چار صفتیں بیان فرمائی ہیں۔ یعنی ربّ العالمین۔ رحمٰن۔ رحیم مالک یوم الدّین۔ اور ان ہر چہار صفتوں میں سے ربّ العالمین کو سب سے مقدّم رکھا اور پھر بعد اسکے

صفت رحمٰن کو ذکر کیا۔ پھر صفت رحیم کو بیان فرمایا۔ پھر سب سے آخیر صفت مالک یوم الدین کو لائے۔ پس سمجھنا چاہیئے کہ یہ ترتیب خدا تعالیٰ نے کیوں اختیار کی؟ اس میں نکتہ یہ ہے کہ ان صفاتِ اربعہ کی ترتیب طبعی یہی ہے اور اپنی واقعی صورت میں اسی ترتیب سے یہ صفتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا پر خدا کا چار طور پر فیضان پایا جاتا ہے جو غور کرنے سے ہر ایک عاقل اس کو سمجھ سکتا ہے۔ پہلا فیضان **فیضانِ اعمّ** ہے۔ یہ وہ فیضانِ مطلق ہے کہ جو بلا تمیز ذی رُوح وغیر ذی رُوح افلاک سے لے کر خاک تک تمام چیزوں پر علی الاتصال جاری ہے اور ہر ایک چیز کا عدم سے صورت وجود پکڑنا اور پھر وجود کا حدّ کمال تک پہنچنا اسی فیضان کے ذریعہ سے ہے۔ اور کوئی چیز جاندار ہو یا غیر جاندار اس سے باہر نہیں۔ اسی سے وجود تمام ارواح و اجسام ظہور پذیر ہُوا اور ہوتا ہے اور ہر ایک چیز نے پرورش پائی اور پاتی ہے۔ یہی فیضان تمام کائنات کی جان ہے۔ اگر ایک لمحہ منقطع ہو جائے تو تمام عالم نابود ہو جائے اور اگر نہ ہوتا تو مخلوقات میں سے کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کا نام قرآن شریف میں **ربوبیت** ہے اور اسی کی رو سے خدا کا نام ربّ العالمین ہے جیسا کہ اس نے دوسری جگہ بھی فرمایا ہے وھو ربّ کل شیءٍ الجزو نمبر ۸۔ یعنی خدا ہر ایک چیز کا رب ہے اور کوئی چیز عالم کی چیزوں میں سے اس کی ربوبیت میں سے باہر نہیں۔ سو خدا نے سورۃ فاتحہ میں سب صفاتِ فیضانی میں سے پہلے صفت ربّ العالمین کو بیان فرمایا۔ اور کہا الحمد للّٰہ ربّ العالمین۔ یہ اس لئے کہا کہ سب فیضانی صفتوں میں سے تقدم طبعی صفت ربوبیت کو حاصل ہے یعنی ظہور کے رُو سے بھی صفت مقدم الظہور اور تمام صفات فیضانی سے اعمّ ہے۔ کیونکہ ہر ایک چیز پر خواہ جاندار ہو خواہ غیر جاندار مشتمل ہے۔

پھر دوسرا قسم فیضان کا جو دوسرے مرتبہ پر واقعہ ہے **فیضانِ عام** ہے۔ اِس میں اور فیضِ اعمّ میں یہ فرق ہے کہ فیضان اعمّ تو ایک عام ربوبیت ہے جس کے ذریعہ سے کل کائنات کا ظہور اور وجود ہے اور یہ فیضان جس کا نام فیضانِ عام ہے۔ یہ ایک خاص عنایت ازلیہ ہے جو جانداروں کے حال پر مبذول ہے۔ یعنی ذی رُوح چیزوں کی طرف حضرت باری کی جو ایک خاص توجہ ہے۔ اس کا نام فیضان عام ہے اور اس فیضان کی یہ تعریف ہے کہ یہ بلا استحقاق اور بغیر اس کے کہ کسی کا کچھ حق ہو سب ذی رُوحوں پر حسب حاجت ان کے جاری ہے۔ کسی کے عمل کا پاداش نہیں اور اسی فیضان کی برکت سے ہر ایک جاندار جیتا جاگتا کھاتا پیتا اور آفات سے محفوظ اور ضروریات سے متمتع نظر آتا ہے۔ اور ہر ایک ذی رُوح کے لئے تمام اسباب زندگی کے

جو اس کے لئے یا اُس کے نوع کے بقا کے لئے مطلوب ہیں میسّر نظر آتے ہیں۔ اور یہ سب آثار اُسی فیضان کے ہیں کہ جو کچھ رُوحوں کو جسمانی تربیت کے لئے درکار ہے سب کچھ دیا گیا ہے۔ اور ایسا ہی جن روحوں کو علاوہ جسمانی تربیت کے روحانی تربیت کی بھی ضرورت ہے یعنی روحانی ترقی کی استعداد رکھتے ہیں اُن کے لئے قدیم سے عین ضرورتوں کے وقتوں میں کلام الٰہی نازل ہوتا رہا ہے غرض اسی فیضانِ رحمانیت کے ذریعہ سے انسان اپنی کروڑہا ضروریات پر کامیاب ہے۔ سکونت کے لئے سطح زمین۔ روشنی کے لئے چاند اور سورج۔ دم لینے کے لئے ہوا۔ پینے کے لئے پانی۔ کھانے کے لئے انواع و اقسام کے رزق اور علاج امراض کے لئے لاکھوں طرح کی ادویہ۔ اور پوشاک کے لئے طرح طرح کی پوشیدنی چیزیں اور ہدایت پانے کے لئے صحف ربّانی موجود ہیں۔ اور کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ تمام چیزیں میرے عملوں کی برکت سے پیدا ہو گئی ہیں اور میں نے ہی کسی پہلے جنم میں کوئی نیک عمل کیا تھا جس کی پاداش میں یہ بے شمار نعمتیں خدا نے بنی آدم کو عنایت کیں۔ پس ثابت ہے کہ یہ فیضان جو ہزارہا طور پر ذی روحوں کے آرام کے لئے ظہور پذیر ہو رہا ہے یہ عطیہ بلا استحقاق ہے جو کسی عمل کے عوض میں نہیں فقط ربّانی رحمت کا ایک جوش ہے تا ہر ایک جاندار فطرتی مطلوب کو پہنچ جائے اور جو کچھ اس کی فطرت میں حاجتیں ڈالی گئیں وہ پوری ہو جائیں پس اس فیضان میں عنایت ازلیہ کا کام یہ ہے کہ انسان اور جمیع حیوانات کی ضروریات کا تعہد کرے اور اُن کی بائیست اور نابائیست کی خبر رکھے تا وہ ضائع نہ ہو جائیں اور ان کی استعدادیں حیّز کتمان میں نہ رہیں۔ اور اس صفت فیضانی کا خدائے تعالیٰ کی ذات میں پایا جانا قانون قدرت کے ملاحظہ سے نہایت بدیہی طور پر ثابت ہو رہا ہے کیونکہ کسی عاقل کو اس میں کلام نہیں کہ جو کچھ چاند اور سورج اور زمین اور عناصر وغیرہ ضروریات دنیا میں پائی جاتی ہیں جن پر تمام ذی روحوں کی زندگی کا مدار ہے اِسی فیضان کے اثر سے ظہور پذیر ہیں۔ اور ہر ایک متنفس بلا تمیز انسان و حیوان و مومن و کافر و نیک و بد حسب حاجت اپنے ان فیوض مذکورہ بالا سے مستفیض ہو رہا ہے اور کوئی ذی روح اس سے محروم نہیں۔ اور اس فیضان کا نام قرآن شریف میں رحمانیت ہے اور اسی کے رُو سے خدا کا نام سورۂ فاتحہ میں صفت ربّ العالمین کے بعد رحمٰن آیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے الحمد للّٰہ ربّ العالمین۔ الرحمٰن۔ اسی صفت کی طرف قرآن شریف کے کئی ایک اور مقامات میں بھی اشارہ فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ ہے۔ و اذا قیل لھم اسجدوا للرحمٰن ہ قالوا وما الرحمٰن ط أنسجد لما تأمرنا و

زادھم نفورًا ؕ تبارک الذی جعل فی السماء بروجًا وجعل فیھا سراجًا وقمرًا منیرًا۔ وھو الذی جعل الیل والنھار خلفۃً لمن اراد ان یذّکّر او اراد شکورًا ۔ وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونًا وّ اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلامًا۔ یعنی جب کافروں اور بے دینوں اور دہریوں کو کہا جاتا ہے کہ تم رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ رحمٰن کے نام سے متنفّر ہو کر بطور انکار سوال کرتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے ؟ (پھر بطور جواب فرمایا) رحمٰن وہ ذات کثیر البرکت اور مصدرِ خیراتِ دائمی ہے جس نے آسمان میں بُرج بنائے۔ برجوں میں آفتاب اور چاند کو رکھا جو کہ عامہ مخلوقات کو بغیر تفریق کافر و مومن کے روشنی پہنچاتے ہیں اُسی رحمٰن نے تمہارے لئے یعنی تمام بنی آدم کے لئے دن اور رات بنائے جو کہ ایک دوسرے کے بعد دورہ کرتے رہتے ہیں۔ تا جو شخص طالب معرفت ہو وہ ان دقائق حکمت سے فائدہ اٹھاوے اور جہل اور غفلت کے پردہ سے خلاصی پاوے ۔ اور جو شخص شکر نعمت کرنے پر مستعد ہو وہ شکر کرے۔ رحمٰن کے حقیقی پرستار وہ لوگ ہیں کہ جو زمین پر بُردباری سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ اُن سے سخت کلامی سے پیش آئیں تو سلامتی اور رحمت کے لفظوں سے ان کا معاوضہ کرتے ہیں یعنی بجائے سختی کے نرمی اور بجائے گالی کے دُعا دیتے ہیں اور تشبہ باخلاق رحمانی کرتے ہیں کیونکہ رحمٰن بھی بغیر تفریق نیک و بد کے اپنے سب بندوں کو سورج اور چاند اور زمین اور دوسری بے شمار نعمتوں سے فائدہ پہنچاتا ہے ۔ پس ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے اچھی طرح کھول دیا کہ رحمٰن کا لفظ ان معنوں کر کے خدا پر بولا جاتا ہے کہ اس کی رحمت وسیع عام طور پر ہر ایک بُرے بھلے پر محیط ہو رہی ہے ۔ جیسا ایک جگہ اور بھی اسی رحمت عام کی طرف اشارہ فرمایا ہے ۔ عذابی اصیب بہ من اشاء ورحمتی وسعت کلّ شیء ۔ یعنی میں اپنا عذاب جس کو لائق اس کے دیکھتا ہوں پہنچاتا ہوں اور میری رحمت نے ہر ایک چیز کو گھیر رکھا ہے ۔ اور پھر ایک اور موقع پر فرمایا قل من یکلؤکم بالیل والنھار من الرحمٰن ۔ یعنی ان کافروں اور نافرمانوں کو کہہ کہ اگر خدا میں صفت رحمانیت کی نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ تم اس کے عذاب سے محفوظ رہ سکتے ۔ یعنی اس کی رحمانیت کا اثر ہے کہ وہ کافروں اور بے ایمانوں کو مہلت دیتا ہے اور جلد تر نہیں پکڑتا ۔ پھر ایک اور جگہ اسی رحمانیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے ۔ اولم یروا الی الطّیر فوقھم صٰفّٰت و یقبضن ما یمسکھن الّا الرحمٰن ۔ الجزو نمبر ۲۹ ۔ یعنی کیا ان لوگوں نے اپنے سروں پر پرندوں کو اُڑتے ہوئے نہیں دیکھا کہ کبھی وہ بازو کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹ لیتے ہیں

رحمٰن ہی ہے کہ اُن کو گرنے سے تھام رکھتا ہے۔ یعنی فیضانِ رحمانیت ایسا تمام ذی رُوحوں پر محیط ہو رہا ہے کہ پرندے بھی جو ایک پیسہ کے دو تین مل سکتے ہیں وہ بھی اس فیضان کے وسیع دریا میں خوشی اور سرور سے تیر رہے ہیں۔ اور چونکہ ربوبیت کے بعد اسی فیضان کا مرتبہ ہے اس جہت سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں رب العالمین کی صفت بیان فرما کر پھر اس کے رحمٰن ہونے کی صفت بیان فرمائی تا ترتیبِ طبعی ان کی ملحوظ رہے۔

تیسری قسم فیضان کی **فیضانِ خاص** ہے۔ اس میں اور فیضان عام میں یہ فرق ہے کہ فیضان عام میں مستفیض پر لازم نہیں کہ حصولِ فیض کے لئے اپنی حالت کو نیک بنا دے اور اپنے نفس کو حجبِ ظلمانیہ سے باہر نکالے یا کسی قسم کا مجاہدہ اور کوشش کرے۔ بلکہ اس فیضان میں جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں خدا تعالیٰ آپ ہی ہر ایک ذی رُوح کو اُس کی ضروریات جن کا وہ حسب فطرت محتاج ہے عنایت فرماتا ہے اور بن مانگے اور بغیر کسی کوشش کے مہیا کر دیتا ہے لیکن فیضانِ خاص میں جہد اور کوشش اور تزکیہ قلب اور دُعا اور تضرّع اور توجّہ الی اللہ اور دوسرا ہر طرح کا مجاہدہ جیسا کہ موقعہ ہو شرط ہے۔ اور اس فیضان کو وہی پاتا ہے جو ڈھونڈتا ہے۔ اور اُسی پر وارد ہوتا ہے جو اس کے لئے محنت کرتا ہے۔ اور اس فیضان کا وجود بھی ملاحظہ قانون قدرت سے ثابت ہے کیونکہ یہ بات نہایت بدیہی ہے کہ خدا کی راہ میں سعی کرنے والے اور غافل رہنے والے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ بلاشبہ جو لوگ دل کی سچائی سے خدا کی راہ میں کوشش کرتے ہیں اور ہر ایک تاریکی اور فساد سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں ایک خاص رحمت ان کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ اس فیضان کے رُو سے خدا تعالیٰ کا نام قرآن شریف میں رحیم ہے اور یہ مرتبہ صفت رحیمیت کا بوجہ خاص ہونے اور مشروط بشرائط ہونے کے مرتبۂ صفت رحمانیت سے مؤخر ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اوّل صفت رحمانیت ظہور میں آئی ہے۔ پھر بعد اس کے صفت رحیمیت ظہور پذیر ہوئی۔ پس اسی ترتیبِ طبعی کے لحاظ سے سورۃ فاتحہ میں صفت رحیمیت کو صفت رحمانیت کے بعد میں ذکر فرمایا اور کہا۔ الرحمٰن الرحیم۔ اور صفت رحیمیت کے بیان میں کئی مقامات قرآن شریف میں ذکر موجود ہے۔ جیسا ایک جگہ فرمایا ہے۔ وکان بالمؤمنین رحیمًا۔ یعنی خدا کی رحیمیت صرف ایمان داروں سے خاص ہے جس سے کافر کو یعنی بے ایمان اور سرکش کو حصّہ نہیں۔

اس جگہ دیکھنا چاہیئے کہ خدا نے کیسی صفت رحیمیت کو مومن کے ساتھ خاص کر دیا۔ لیکن رحمانیت کو کسی جگہ مؤمنین کے ساتھ خاص نہیں کیا اور کسی جگہ یہ نہیں فرمایا کہ کان بالمؤمنین رحمانًا۔

بلکہ جو مومنین سے رحمت خاص متعلق ہے ہر جگہ اس کو رحیمیت کی صفت سے ذکر کیا ہے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا ہے۔ ان رحمۃ اللّٰہ قریب من المحسنین۔ یعنی رحیمیت الٰہی انہی لوگوں سے قریب ہے جو نیکوکار ہیں۔ پھر ایک اور جگہ فرمایا ہے۔ ان الذین اٰمنوا والذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللّٰہ اولٰئک یرجون رحمۃ اللّٰہ واللّٰہ غفورٌ رحیمٌ ؁ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور خدا کے لئے وطنوں سے یا نفس پرستیوں سے جدائی اختیار کی اور خدا کی راہ میں کوشش کی وہ خدا کی رحیمیت کے امیدوار ہیں اور خدا غفور اور رحیم ہے۔ یعنی اس کا فیضان رحیمیت ضرور اُن لوگوں کے شامل حال ہو جاتا ہے کہ جو اس کے مستحق ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس نے اس کو طلب کیا اور نہ پایا۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد ؁ اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

چوتھا قسم فیضان کا **فیضانِ اخص** ہے۔ یہ وہ فیضان ہے کہ جو صرف محنت اور سعی پر مترتب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ظہور اور بروز کے لئے اول شرط یہ ہے کہ یہ عالم اسباب کہ جو ایک تنگ و تاریک جگہ ہے بکلّی معدوم اور منہدم ہو جائے۔ اور قدرت کاملہ حضرت احدیت کے بغیر آمیزش اسباب معتادہ کے برہنہ طور پر اپنا کامل چمکارا دکھلاوے۔ کیونکہ اس آخری فیضان میں کہ جو تمام فیوض کا خاتمہ ہے جو کچھ پہلے فیضانوں کی نسبت عند العقل زیادتی اور کمالیت متصور ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ فیضان نہایت منکشف اور صاف طور پر ہو اور کوئی اشتباہ اور اخفا اور نقص باقی نہ رہے۔ یعنی نہ مفیض کے بالارادہ فیضان میں کوئی شبہ رہ جائے اور نہ فیضان کے حقیقی فیضان اور رحمت خالصہ اور کاملہ ہونے میں کچھ جائے کلام ہو بلکہ جس مالک قدیم کی طرف سے فیض ہوا ہے اس کی فیاضی اور جزا دہی روز روشن کی طرح کھل جائے۔ اور شخص فیضیاب کو بطور حق الیقین یہ امر مشہود اور محسوس ہو کہ حقیقت میں وہ مالک الملک ہی اپنے ارادہ اور توجہ اور قدرت خاص سے ایک نعمت عظمیٰ اور لذت کبریٰ اس کو عطا کر رہا ہے۔ اور حقیقت میں اس کو اپنے **اعمال صالحہ** کی ایک کامل اور دائمی جزا کہ جو نہایت اصفیٰ اور نہایت اعلیٰ اور نہایت مرغوب اور نہایت محبوب ہے مل رہی ہے۔ کسی قسم کا امتحان اور ابتلا نہیں ہے۔ اور ایسے فیضان اکمل اور اتم اور اصفیٰ اور اعلیٰ اور اجلیٰ سے متمتع ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ بندہ اس عالم ناقص اور مکدّر اور کثیف اور تنگ اور منقبض اور ناپائیدار مشتبہ الحال سے دوسرے عالم کی طرف انتقال کرے۔ کیونکہ یہ فیضان **تجلّیات عظمیٰ** کا مظہر ہے جس میں شرط ہے کہ محسنِ حقیقی کا جمال بطور عریاں اور بمرتبہ حق الیقین مشہود ہو اور کوئی مرتبہ شہود اور ظہور اور یقین کا باقی نہ رہ جائے۔ اور کوئی پردہ اسباب معتادہ کا درمیان نہ ہو۔ اور ہر ایک دقیقہ معرفتِ تامہ کا مکمن قوت سے

حیّزِ فعل میں آجائے اور نیز فیضان بھی ایسا منکشف اور معلوم الحقیقت ہو کہ اُس کی نسبت آپ خدا نے یہ ظاہر کر دیا ہو کہ وہ ہر ایک امتحان اور ابتلاء کی کدورت سے پاک ہے اور نیز اس فیضان میں وہ اعلیٰ اور اکمل درجہ کی لذتیں ہوں جن کی پاک اور کامل کیفیت انسان کے دل اور رُوح اور ظاہر اور باطن اور جسم اور جان اور ہر ایک روحانی اور بدنی قوت پر ایسا اکمل اور ابقیٰ احاطہ رکھتی ہو کہ جس پر عقلاً اور خیالاً اور وہماً زیادت متصوّر نہ ہو۔ اور یہ عالم کہ جو ناقص الحقیقت اور مکدّر الصورت اور ہالکۃ الذات اور مشتبہ الکیفیت اور ضیق الظرف ہے ان تجلّیات عظمیٰ اور انوار اصفیٰ اور عطیّات دائمی کی برداشت نہیں کر سکتا۔ اور وہ اشعہ تامہ کاملہ دائمہ اس میں سما نہیں سکتے۔ بلکہ اس کے ظہور کے لئے ایک دوسرا عالم درکار ہے۔ جو اسباب معتادہ کی ظلمت سے بکلّی پاک اور منزہ اور ذات واحد قہّار کی اقتدار کامل اور خالص کا مظہر ہے۔ ہاں اس فیضانِ اخصّ سے ان کامل انسانوں کو اسی زندگی میں کچھ حظ پہنچتا ہے کہ جو سچائی کی راہ پر کامل طور پر قدم مارتے ہیں۔ اور اپنے نفس کے ارادوں اور خواہشوں سے الگ ہو کر بکلّی خدا کی طرف جھک جاتے ہیں۔ کیونکہ مرنے سے پہلے مرتے ہیں اور اگرچہ بظاہر صورت اِس عالم میں ہیں لیکن درحقیقت وہ دوسرے عالم میں سکونت رکھتے ہیں۔ پس چونکہ وہ اپنے دل کو اس دنیا کے اسباب سے منقطع کر لیتے ہیں اور عاداتِ بشریت کو توڑ کر اور بیکبارگی غیر اللہ سے منہ پھیر کر وہ طریق جو خارق عادت ہے اختیار کر لیتے ہیں اس لئے خداوند کریم بھی اُن کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہے اور بطور خارق عادت ان پر اپنے وہ انوار خاصہ ظاہر کرتا ہے کہ جو دوسروں پر بجز موت کے ظاہر نہیں ہو سکتے۔ غرض بباعث امور متذکرہ بالا وہ اس عالم میں بھی فیضانِ اخصّ کے نور سے کچھ حصہ پا لیتے ہیں۔ اور یہ فیضان ہر ایک فیض سے خاص تر اور خاتمہ تمام فیضانوں کا ہے اور اسکو پانے والا سعادتِ عظمیٰ کو پہنچ جاتا ہے اور خوشحالی دائمی کو پا لیتا ہے کہ جو تمام خوشیوں کا سرچشمہ ہے اور جو شخص اس سے محروم رہا وہ ہمیشہ کے دوزخ میں پڑا۔ اس فیضان کے رُو سے خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں اپنا نام مالک یوم الدّین بیان فرمایا ہے۔ دین کے لفظ پر الف لام لانے سے یہ غرض ہے کہ تا یہ معنے ظاہر ہوں کہ جزا سے مراد وہ کامل جزا ہے جس کی تفصیل فرقان مجید میں مندرج ہے۔ اور وہ کامل جزا بجز تجلّی مالکیت تامہ کے کہ جو ہمدم بنیان اسباب کو مستلزم ہے ظہور میں نہیں آ سکتی۔ چنانچہ اسی کی طرف دوسری جگہ بھی اشارہ فرما کر کہا ہے لمن الملک الیوم للہ الواحد القہّار۔ یعنی اس دن ربوبیت الٰہیہ بغیر توسط اسباب عادیہ کے اپنی تجلّی آپ دکھلائیگی اور یہی مشہود اور محسوس ہو گا کہ بجز قوت عظمیٰ اور قدرت کاملہ حضرت باری تعالیٰ کے اور سب ہیچ ہیں

تب سارا آرام و سرور اور سب جزا اور پاداش بنظرِ صاف و صریح خدائی کی طرف سے دکھلائی دے گا اور کوئی پردہ اور حجاب درمیان میں نہیں رہے گا اور کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہیگی۔ تب جنہوں نے اس کے لئے اپنے تئیں منقطع کر لیا تھا وہ اپنے تئیں ایک کامل سعادت میں دیکھیں گے کہ جو ان کے جسم اور جان اور ظاہر اور باطن پر محیط ہو جائیگی۔ اور کوئی حصہ وجود ان کے کا ایسا نہیں ہوگا کہ جو اس سعادت عظمیٰ کے پانے سے بے نصیب رہا ہو۔ اور اسجگہ مالکِ یوم الدین کے لفظ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس روز راحت یا عذاب اور لذّت یا درد جو کچھ بھی بنی آدم کو پہنچیگا اس کا اصل موجب خدائے تعالیٰ کی ذات ہوگی۔ اور مالک امر مجازات کا حقیقی طور پر وہی ہوگا۔ یعنی اس کا وصل یا فصل سعادت ابدی یا شقاوت ابدی کا موجب ٹھہرے گا۔ اس طرح پر کہ جو لوگ اس کی ذات پر ایمان لائے تھے۔ اور توحید اختیار کی تھی اور اس کی خالص محبت سے اپنے دلوں کو رنگین کر لیا تھا اُن پر انوارِ رحمت اُس ذاتِ کامل کے صاف اور آشکارا طور پر نازل ہونگے اور جن کو ایمان اور محبتِ الٰہیہ حاصل نہیں ہوئی وہ اس لذّت اور راحت سے محروم رہیں گے اور عذاب الیم میں مبتلا ہو جائیں گے۔

یہ فیوضِ اربعہ ہیں جن کو ہم نے تفصیل وار لکھ دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ صفت رحمٰن کو صفت رحیم پر مقدّم رکھنا نہایت ضروری اور مقتضائے بلاغت کاملہ ہے۔ کیونکہ صحیفۂ قدرت پر جب نظر ڈالی جائے تو پہلے پہل خدائے تعالیٰ کی عام ربوبیت پر نظر پڑتی ہے۔ پھر اس کی رحمانیت پر۔ پھر اس کی رحیمیت پر۔ پھر اُس کے مالکِ یوم الدین ہونے پر۔ اور کمال بلاغت اسی کا نام ہے کہ جو صحیفۂ فطرت میں ترتیب ہو وہی ترتیب صحیفۂ الہام میں بھی ملحوظ رہے۔ کیونکہ کلام میں ترتیب قدرتی کا منقلب کرنا گویا قانون قدرت کو منقلب کرنا ہے۔ اور نظام طبعی کو اُلٹا دینا ہے۔ کلام بلیغ کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ نظام کلام کا نظام طبعی کے ایسا مطابق ہو کہ گویا اُسی کی عکسی تصویر ہو اور جو امر طبعًا اور وقوعًا مقدّم ہو اس کو وضعًا بھی مقدّم رکھا جائے۔ سو آیت موصوفہ میں یہ اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے کہ باوجود کمال فصاحت اور خوش بیانی کے واقعی ترتیب کا نقشہ کھینچ کر دکھلا دیا ہے اور وہی طرزِ بیان اختیار کی ہے جو کہ ہر ایک صاحب نظر کو نظام عالم میں بدیہی طور پر نظر آ رہی ہے کیا یہ نہایت سیدھا راستہ نہیں ہے کہ جس ترتیب سے نعماء الٰہی صحیفۂ فطرت میں واقعہ ہیں اُسی ترتیب سے صحیفۂ الہام میں بھی واقع ہوں۔ سو ایسی عمدہ اور پُر حکمت ترتیب پر اعتراض کرنا حقیقت میں اُنہی اندھوں کا کام ہے جن کی بصیرت اور بصارت دونوں یکبارگی جاتی رہی ہیں ؎

چشم بداندیش کہ برکندہ باد　　عیب نماید ہنرش در نظر

اب ہم پھر تقریر کو دوہرا کر اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے سورۃ ممدوحہ میں ربّ العالمین کی صفت سے لے کر مالک یوم الدین تک بیان فرمایا ہے یہ حسب تصریحات قرآن شریف چار عالی شان صداقتیں ہیں جن کا اس جگہ کھول کر بیان کرنا قرین مصلحت ہے۔ **پہلی صداقت** یہ کہ خدائے تعالیٰ ربّ العالمین ہے۔ یعنی عالم کے اشیاء میں سے جو کچھ موجود ہے سب کا ربّ اور مالک خدا ہے۔ اور جو کچھ عالم میں نمودار ہو چکا ہے اور دیکھا جاتا ہے یا ٹٹولا جاتا ہے یا عقل اس پر محیط ہو سکتی ہے وہ سب چیزیں مخلوق ہی ہیں اور ہستی حقیقی بجز ایک ذات حضرت باری تعالےٰ کے اور کسی چیز کے لئے حاصل نہیں۔ غرض عالم بجمیع اجزائہٖ مخلوق اور خدا کی پیدائش ہے۔ اور کوئی چیز اجزائے عالم میں سے ایسی نہیں کہ جو خدا کی پیدائش نہ ہو۔ اور خدائے تعالیٰ اپنی ربوبیّت تامّہ کے ساتھ عالم کے ذرّہ ذرّہ پر متصرّف اور حکمران ہے اور اس کی ربوبیّت ہر وقت کام میں لگی ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ دنیا کو بنا کر اس کے انتظام سے الگ ہو بیٹھا ہے اور اسے نیچر کے قاعدہ کے ایسا سپرد کیا ہے کہ خود کسی کام میں دخل بھی نہیں دیتا۔ اور جیسے کوئی کل بعد بنائے جانے کے پھر بنانے والے سے بے علاقہ ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی مصنوعات صانع حقیقی سے بے علاقہ ہیں بلکہ وہ ربّ العالمین اپنی ربوبیّت تامّہ کی آبپاشی ہر وقت برابر تمام عالم پر کر رہا ہے اور اس کی ربوبیت کا مینہ بالاتصال تمام عالم پر نازل ہو رہا ہے اور کوئی ایسا وقت نہیں کہ اس کے رشحِ فیض سے خالی ہو۔ بلکہ عالم کے بنانے کے بعد بھی اس مبدء فیوض کی فی الحقیقت بلا ایک ذرّہ تفاوت کے ایسی ہی حاجت ہے کہ گویا ابھی تک اس نے کچھ بھی نہیں بنایا۔ اور جیسا دنیا اپنے وجود اور نمود کے لئے اس کی ربوبیت کی محتاج تھی ایسا ہی اپنے بقا اور قیام کے لئے اس کی ربوبیت کی حاجت مند ہے۔ وہی ہے جو ہر دم دنیا کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اور دنیا کا ہر ذرّہ اسی سے تر و تازہ ہے۔ اور وہ اپنی مرضی اور ارادہ کے موافق ہر چیز کی ربوبیت کر رہا ہے۔ یہ نہیں کہ بلا ارادہ کسی شے کے ربوبیت کا موجب ہو۔ غرض آیات قرآنی کی رُو سے جن کا خلاصہ ہم بیان کر رہے ہیں اس صداقت کا یہ منشاء ہے کہ ہر ایک چیز کہ جو عالم میں پائی جاتی ہے وہ مخلوق ہے اور اپنے تمام کمالات اور تمام حالات اور اپنے تمام اوقات میں خدائے تعالیٰ کی ربوبیت کی محتاج ہے اور کوئی روحانی یا جسمانی ایسا کمال نہیں ہے جس کو کوئی مخلوق خود بخود اور بغیر ارادہ خاص اس متصرّفِ مطلق حاصل کر سکتا ہو۔ اور نیز حسب توضیح اسی کلام پاک کے اس صداقت اور ایسا ہی دوسری صداقتوں میں یہ معنے بھی ملحوظ ہیں کہ ربّ العالمین وغیرہ صفتیں جو خدائے تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں یہ اسی کی ذات واحد لاشریک

سے خاص ہیں۔ اور دوسرا کوئی ان میں شریک نہیں جیسا کہ اس سورة کے پہلے فقرہ میں یعنی الحمد للہ میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ تمام محامد خدا ہی سے خاص ہیں۔

دوسری صداقت رحمٰن ہے۔ کہ جو بعد رب العالمین بیان فرمایا گیا۔ اور رحمٰن کے معنے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں یہ ہیں کہ جسقدر جاندار ہیں خواہ ذی شعور اور خواہ غیر ذی شعور اور خواہ نیک اور خواہ بد اُن سب کے قیام اور بقاء وجود اور بقائے نوع کے لئے انکی تکمیل کے لئے خدا تعالےٰ نے اپنی رحمت عامہ کے رُو سے ہر ایک قسم کے اسباب مطلوبہ میسّر کر دیئے ہیں اور ہمیشہ میسّر کرتا رہتا ہے۔ اور یہ عطیّہ محض ہے کہ جو کسی عامل کے عمل پر موقوف نہیں۔

تیسری صداقت رحیم ہے کہ جو بعد رحمٰن کے مذکور ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ سعی کرنے والوں کی سعی پر بمقتضائے رحمت خاصہ ثمرات حسنہ مترتب کرتا ہے۔ توبہ کرنے والوں کے گناہ بخشتا ہے۔ مانگنے والوں کو دیتا ہے۔ کھٹکھٹانے والوں کے لئے کھولتا ہے۔

چوتھی صداقت جو سورة فاتحہ میں مندرج ہے مالک یوم الدین ہے۔ یعنی باکمال و کامل جزا سزا کہ جو ہر ایک قسم کے امتحان و ابتلاء اور توسطِ اسباب غفلت افزا سے منزہ ہے اور ہر ایک کدورت اور کثافت اور شک اور شبہ اور نقصان سے پاک ہے اور تجلّیات عظمیٰ کا مظہر ہے اس کا مالک بھی وہی اللہ قادر مطلق ہے۔ اور وہ اس بات سے ہرگز عاجز نہیں کہ اپنی کامل جزا کو جو دن کی طرح روشن ہے ظہور میں لاوے۔ اور اس صداقت عظمیٰ کے ظاہر کرنے سے حضرتِ احدیت کا یہ مطلب ہے کہ تا ہر ایک نفس پر بطور حق الیقین امور مفصّلہ ذیل کھل جائیں۔

اوّل یہ امر کہ جزا سزا ایک واقعی اور یقینی امر ہے کہ جو مالکِ حقیقی کی طرف سے اور اُسی کے ارادۂ خاص سے بندوں پر وارد ہوتا ہے۔ اور ایسا کھل جانا دنیا میں ممکن نہیں کیونکہ اِس عالم میں یہ بات عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی کہ جو کچھ خیر و شر و راحت و رنج پہنچ رہا ہے وہ کیوں پہنچ رہا ہے اور کس کے حکم اور اختیار سے پہنچ رہا ہے۔ اور کسی کو ان میں سے یہ آواز نہیں آتی کہ وہ اپنی جزا پا رہا ہے اور کسی پر بطور مشہود و محسوس منکشف نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ بھگت رہا ہے حقیقت میں وہ اس کے عملوں کا بدلہ ہے۔

دوسرے اس صداقت میں اس امر کا کھلنا مطلوب ہے کہ اسباب عادیہ کچھ چیز نہیں ہیں اور فاعلِ حقیقی خدا ہے اور وہی ایک ذات عظمیٰ ہے کہ جو جمیع فیوض کا مبدء اور ہر ایک جزا سزا کا مالک ہے۔

تیسرے اس صداقت میں اس بات کا ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ سعادتِ عظمیٰ اور شقاوتِ عظمیٰ کیا چیز ہے۔ یعنی سعادتِ عظمیٰ وہ فوزِ عظیم کی حالت ہے کہ جب نور اور سرور اور لذت اور راحت انسان کے تمام ظاہر و باطن اور تن اور جان پر محیط ہو جائے اور کوئی عضو اور قوت اس سے باہر نہ رہے۔ اور شقاوتِ عظمیٰ وہ عذاب الیم ہے کہ جو بباعث نافرمانی اور ناپاکی اور بُعد اور مہجوری کے دلوں سے مشتعل ہو کر بدنوں پر مستولی ہو جائے۔ اور تمام وجود فی النار و السقر معلوم ہو۔ اور یہ تجلیاتِ عظمیٰ اس عالم میں ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ اس تنگ اور منقبض اور مکدّر عالم کو جو رُوپوشِ اسباب ہو کر ایک ناقص حالت میں پڑا ہے اِن کے ظہور کی برداشت نہیں۔ بلکہ اس عالم پر ابتلاء اور آزمائش غالب ہے۔ اور اس کی راحت اور رنج دونوں ناپائیدار اور ناقص ہیں۔ اور نیز اس عالم میں جو کچھ انسان پر وارد ہوتا ہے وہ زیرِ پردہ اسباب ہے جس سے مالک الجزاء کا چہرہ محجوب اور مکتوم ہو رہا ہے اس لئے یہ خالص اور کامل اور منکشف طور پر یوم الجزاء نہیں ہو سکتا بلکہ خالص اور کامل اور منکشف طور پر یوم الدین یعنی یوم الجزاء وہ عالم ہوگا کہ جو اس عالم کے ختم ہونے کے بعد آویگا۔ اور وہی عالمِ تجلیاتِ عظمیٰ کا مظہر اور جلال اور جمال کے پوری ظہور کی جگہ ہے۔ اور چونکہ یہ عالم دنیوی اپنی اصل وضع کی رُو سے دار الجزاء نہیں بلکہ دار الابتلاء ہے اسلئے جو کچھ عُسر و یُسر و راحت و تکلیف اور غم اور خوشی اس عالم میں لوگوں پر وارد ہوتی ہے اُس کو خدائے تعالیٰ کے لطف یا قہر پر دلالتِ قطعی نہیں۔ مثلاً کسی کا دولت مند ہو جانا اس بات پر دلالتِ قطعی نہیں کہ خدائے تعالیٰ اس پر خوش ہے اور نہ کسی کا مفلس اور نادار ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ اُس پر ناراض ہے۔ بلکہ یہ دونوں بطور ابتلاء کے ہیں تا دولتمند کو اس کی دولت میں اور مفلس کو اُس کی مفلسی میں جانچا جائے۔ یہ چار صداقتیں ہیں جن کا قرآن شریف میں مفصّل بیان موجود ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۴۲۲ - ۴۳۹ حاشیہ ۱۱)

یہ بات بہ بداہت ثابت ہے کہ عالم کے اشیاء میں سے ہر ایک موجود جو نظر آتا ہے اُسکا وجود اور قیام نظراً علیٰ ذاتہٖ ضروری نہیں۔ مثلاً زمین کروی الشکل ہے اور قطر اس کا بعض کے گمان کے موافق تخمیناً چار ہزار کوس پختہ ہے مگر اس بات پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی کہ کیوں یہی شکل اور یہی مقدار اس کے لئے ضروری ہے۔ اور کیوں جائز نہیں کہ اس سے زیادہ یا اس سے کم ہو یا برخلاف شکل حاصل کے کسی اور شکل سے متشکّل ہو۔ اور جب اسپر کوئی دلیل قائم نہ ہوئی تو یہ شکل اور مقدار جس کے مجموعہ کا نام وجود ہے زمین کے لئے ضروری نہ ہُوا اور علیٰ ہذا القیاس عالم کی تمام اشیاء

کا وجود اور قیام غیر ضروری ٹھہرا۔ اور صرف یہی بات نہیں کہ وجود ہر ایک ممکن کا نظراً علیٰ ذاتہ غیر ضروری ہے بلکہ بعض صورتیں ایسی نظر آتی ہیں کہ اکثر چیزوں کے معدوم ہونے کے اسباب بھی قائم ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ چیزیں معدوم نہیں ہوتیں۔ مثلاً باوجود اس کے کہ سخت سخت قحط اور وباء پڑتی ہیں مگر پھر بھی ابتدائے زمانہ سے تخم ہر ایک چیز کا بچتا چلا آیا ہے۔ حالانکہ عند العقل جائز بلکہ واجب تھا کہ ہزارہا شدائد اور حوادث میں سے جو ابتداء سے دنیا پر نازل ہوتی رہیں کبھی کسی دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ شدّتِ قحط کے وقت غلّہ جو کہ خوراک انسان کی ہے بالکل مفقود ہو جاتا یا کوئی اور قسم غلّہ کی مفقود ہو جاتی۔ یا کبھی شدّت وباء کے وقت نوع انسان کا نام ونشان باقی نہ رہتا یا کوئی اور انواع حیوانات میں سے مفقود ہو جاتے یا کبھی اتفاقی طور پر سورج یا چاند کی کل بگڑ جاتی یا دوسری بیشمار چیزوں سے جو عالم کی درستی نظام کے لئے ضروری ہیں کسی چیز کے وجود میں خلل راہ پایا جاتا۔ کیونکہ کروڑہا چیزوں کا اختلال اور فساد سے سالم رہنا اور کبھی اُن پر آفت نازل نہ ہونا قیاس سے بعید ہے۔ پس جو چیزیں نہ ضروری الوجود ہیں نہ ضروری القیام بلکہ ان کا کبھی نہ کبھی بگڑ جانا ان کے باقی رہنے سے زیادہ تر قرین قیاس ہے۔ ان پر کبھی زوال نہ آنا اور احسن طور پر بہ ترتیب محکم اور بترکیب ابلغ ان کا وجود اور قیام پا جانا اور کروڑہا ضروریاتِ عالم میں سے کبھی کسی چیز کا مفقود نہ ہونا صریح اس بات پر نشان ہے کہ ان سب کے لئے ایک محیی اور محافظ اور قیّوم ہے جو جامع صفات کاملہ یعنی مدبّر اور حکیم اور رحمان اور رحیم اور اپنی ذات میں ازلی ابدی اور ہر ایک نقصان سے پاک ہے جس پر کبھی موت اور فنا طاری نہیں ہوتی بلکہ اونگھ اور نیند سے بھی جو فی الجملہ موت سے مشابہ ہے پاک ہے۔ سو وہی ذات جامع صفاتِ کاملہ ہے جس نے اس عالم امکانی کو برعایت کمال حکمت وموزونیت وجود عطا کیا اور ہستی کو نیستی پر ترجیح بخشی اور وہی بوجہ اپنی کمالیت اور خالقیت اور ربوبیت اور قیّومیت کے مستحقِ عبادت ہے۔ یہاں تک تو ترجمہ اس آیت کا ہوا اللّٰہ لا الٰہ الّا ھو الحیّ القیّوم لا تأخذہ سنۃٌ ولا نوم۔ لہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض۔ اب بنظرِ انصاف دیکھنا چاہیئے کہ کس بلاغت اور لطافت اور متانت اور حکمت سے اس آیت میں وجودِ صانع عالم پر دلیل بیان فرمائی ہے اور کسقدر تھوڑے لفظوں میں معانی کثیرہ اور لطائفِ حکمیہ کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے اور ما فی السمٰوٰت وما فی الارض کے لئے ایسی محکم دلیل سے وجود ایک خالقِ کامل الصفات کا ثابت کر دکھایا ہے جس کے کامل اور محیط بیان کے برابر کسی حکیم نے آج تک کوئی تقریر بیان نہیں کی بلکہ حکماء ناقص الفہم نے ارواح اور اجسام کو حادث بھی نہیں سمجھا اور اس رازِ دقیق سے بے خبر رہے

کہ حیاتِ حقیقی اور ہستی حقیقی اور قیام حقیقی صرف خدا ہی کے لئے مسلّم ہے۔ یہ عمیق معرفت اسی آیت سے انسان کو حاصل ہوتی ہے جس میں خدا نے فرمایا کہ حقیقی طور پر زندگی اور بقاءِ زندگی صرف اللہ کے لئے حاصل ہے جو جامع صفاتِ کاملہ ہے۔ اس کے بغیر کسی دوسری چیز کو وجود حقیقی اور قیام حقیقی حاصل نہیں۔ اور اسی بات کو صانع عالم کی ضرورت کے لئے دلیل ٹھہرایا اور فرمایا۔ لہٗ مافی السمٰوٰت وما فی الارض۔ یعنی جبکہ عالم کے لئے نہ حیات حقیقی حاصل ہے نہ قیام حقیقی تو بالضرور اس کو ایک علّتِ موجبہ کی حاجت ہے جس کے ذریعہ سے اس کو حیات اور قیام حاصل ہوا اور ضرور ہے کہ ایسی علّتِ موجبہ جامع صفات کاملہ اور مدبّر بالارادہ اور حکیم اور عالم الغیب ہو سو وہی اللہ ہے۔ کیونکہ اللہ بموجب اصطلاح قرآن شریف کے اس ذات کا نام ہے جو مستجمع کمالاتِ تامہ ہے۔ اسی وجہ سے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کے اسم کو جمیع صفات کاملہ کا موصوف ٹھہرایا ہے اور جا بجا فرمایا ہے کہ اللہ وہ ہے جو کہ ربّ العالمین ہے۔ رحمٰن ہے۔ رحیم ہے مدبّر بالارادہ ہے حکیم ہے۔ عالم الغیب ہے قادر مطلق ہے۔ ازلی ابدی ہے وغیرہ وغیرہ۔ سو یہ قرآن شریف کی ایک اصطلاح ٹھہر گئی ہے کہ اللہ ایک ذات جامع جمیع صفات کاملہ کا نام ہے۔ اسی جہت سے اس آیت کے سر پر بھی اللہ کا اسم لائے اور فرمایا اللّٰہ لا الٰہ الا ھو الحیّ القیّوم۔ یعنی اس عالم بے ثبات کا قیّوم ذات جامع الکمالات ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ عالم جس ترکیب محکم اور ترتیب ابلغ سے موجود اور مترتب ہے اس کیلئے یہ گمان کرنا باطل ہے کہ انہی چیزوں میں سے بعض چیزیں بعض کے لئے علّتِ موجبہ ہو سکتی ہیں۔ بلکہ اس حکیمانہ کام کیلئے جو اسرارِ حکمت سے بھرا ہوا ہے ایک ایسے صانع کی ضرورت ہے جو اپنی ذات میں مدبّر بالارادہ اور حکیم اور علیم اور رحیم اور غیر فانی اور تمام صفاتِ کاملہ سے متّصف ہو۔ سو وہی اللہ ہے جس کو اپنی ذات میں کمال تام حاصل ہے۔ پھر بعد ثبوت وجود صانع عالم کے طالب حق کو اس بات کا سمجھنا ضروری تھا کہ وہ صانع ہر ایک طور کی شرکت سے پاک ہے۔ سو اس طرف اشارہ فرمایا قل ھو اللّٰہ احد۔ اللّٰہ الصمد۔ الخ۔ اس اقل عبارت کو جو بقدر ایک سطر بھی نہیں دیکھنا چاہیئے کہ کس لطافت اور عمدگی سے ہر ایک قسم کی شراکت سے وجودِ حضرت باری کا منزہ ہونا بیان فرمایا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ شرکت از روئے حصر عقلی چار قسم پر ہے۔ کبھی شرکت عدد میں ہوتی ہے کبھی مرتبہ میں اور کبھی نسب میں اور کبھی فعل اور تاثیر میں۔ سو اس سورۃ میں ان چاروں قسموں شرکت سے خدا کا پاک ہونا بیان فرمایا ہے اور کھول کر بتلا دیا کہ وہ اپنے عدد میں ایک ہے۔ دو باتیں

نہیں۔ اور وہ صمد ہے یعنی اپنے مرتبہ وجوب اور محتاج الیہ ہونے میں منفرد اور یگانہ ہے اور بجز اس کے تمام چیزیں ممکن الوجود اور ہالک الذات ہیں جو اس کی طرف ہر دم محتاج ہیں۔ اور وہ لَمْ یَلِدْ ہے یعنی اُس کا کوئی بیٹا نہیں تا بوجہ بیٹا ہونے کے اس کا شریک ٹھہر جائے۔ اور وہ لَمْ یُوْلَدْ ہے۔ یعنی اس کا کوئی باپ نہیں تا بوجہ باپ ہونے کے اس کا کوئی شریک بن جائے۔ اور وہ لم یکن لہ کفوًا ہے۔ یعنی اس کے کاموں میں کوئی اس سے برابری کرنے والا نہیں تا باعتبار فعل کے اس کا کوئی شریک قرار پاوے۔ سو اس طور سے ظاہر فرما دیا کہ خدائے تعالیٰ چاروں قسم کی شرکت سے پاک اور منزّہ ہے۔ اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ پھر بعد اس کے اُس کے وحدہٗ لاشریک ہونے پر ایک عقلی دلیل بیان فرمائی اور کہا۔ لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ وَمَا کَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ الخ یعنی اگر زمین اور آسمان میں بجز اس ایک ذات جامع صفاتِ کاملہ کے کوئی اور بھی خدا ہوتا تو وہ دونوں بگڑ جاتے۔ کیونکہ ضرور تھا کہ کبھی وہ جماعت خداؤں کی ایک دوسرے کے برخلاف کام کرتے پس اسی پھوٹ اور اختلاف سے عالم میں فساد راہ پاتا۔ اور نیز اگر الگ الگ خالق ہوتے تو ہر واحد اُن میں سے اپنی ہی مخلوق کی بھلائی چاہتا۔ اور اُن کے آرام کے لئے دوسروں کا برباد کرنا روا رکھتا پس یہ بھی موجب فساد عالم ٹھہرتا۔ یہاں تک تو دلیل لمّی سے خدا کا واحد لاشریک ہونا ثابت کیا۔ پھر بعد اس کے خدا کے وحدہٗ لاشریک ہونے پر دلیل انّی بیان فرمائی اور کہا۔ قل ادعوا الذین زعمتم من دونہ فلا یملکون کشف الضرّ عنکم ولا تحویلا الخ۔ یعنی مشرکین اور منکرین وجود حضرت باری کو کہہ کہ اگر خدا کے کارخانہ میں کوئی اور لوگ بھی شریک ہیں یا اسباب موجودہ ہی کافی ہیں تو اس وقت کہ تم اسلام کے دلائل حقیّت اور اس کی شوکت اور قوت کے مقابلہ پر مقہور ہو رہے ہو ان اپنے شرکاء کو مدد کے لئے بلاؤ۔ اور یاد رکھو وہ ہرگز تمہاری مشکل کشائی نہ کرینگے اور نہ بلا کو تمہارے سر پر سے ٹال سکیں گے۔ اے رسول! ان مشرکین کو کہہ کہ تم اپنے شرکاء کو جن کی پرستش کرتے ہو۔ میرے مقابلہ پر بلاؤ۔ اور جو تدبیر میرے مغلوب کرنے کے لئے کر سکتے ہو۔ وہ سب تدبیریں کرو۔ اور مجھے ذرا مہلت مت دو۔ اور یہ بات سمجھ رکھو کہ میرا حامی اور ناصر اور کارساز وہ خدا ہے جس نے قرآن کو نازل کیا ہے اور وہ اپنے سچے اور صالح رسولوں کی آپ کارسازی کرتا ہے مگر جن چیزوں کو تم لوگ اپنی مدد کے لئے پکارتے ہو وہ ممکن نہیں ہے جو تمہاری مدد کر سکیں۔ اور نہ کچھ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ پھر بعد اس کے خدا کا ہر ایک نقصان اور عیب سے پاک ہونا قانون قدرت کے رُو سے ثابت کیا اور فرمایا۔ تسبّح لہ السمٰوٰت

السبع والارض ومن فیھنّ الخ ۔ یعنی ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے خدا کی تقدیس کرتے ہیں اور کوئی چیز نہیں جو اُس کی تقدیس نہیں کرتی ۔ پر تم اُن کی تقدیسوں کو سمجھتے نہیں ۔ یعنی زمین و آسمان پر نظر غور کرنے سے خدا کا کامل اور مقدس ہونا اور بیٹوں اور شریکوں سے پاک ہونا ثابت ہو رہا ہے ۔ مگر ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں ۔ پھر بعد اس کے جزدی طور پر مخلوق پرستوں کو ملزم کیا اور اُن کا خطا پر ہونا ظاہر فرمایا اور کہا قالوا اتخذ اللّٰہ ولدًا سبحٰنہٗ ھو الغنیّ الخ ۔ یعنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا بیٹا رکھتا ہے ۔ حالانکہ بیٹے کا محتاج ہونا ایک نقصان ہے اور خدا ہر ایک نقصان سے پاک ہے وہ تو غنی اور بے نیاز ہے جس کو کسی کی حاجت نہیں ۔ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے سب اُسی کا ہے ۔ کیا تم خدا پر ایسا بہتان لگاتے ہو جس کی تائید میں تمہارے پاس کسی نوع کا علم نہیں ۔ خدا کیوں بیٹوں کا محتاج ہونے لگا ۔ وہ کامل ہے اور فرائض الوہیت کے ادا کرنے کے لئے وہی اکیلا کافی ہے اور کسی اور منصوبہ کی حاجت نہیں ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا بیٹیاں رکھتا ہے ۔ حالانکہ وہ ان سب نقصانوں سے پاک ہے ۔ کیا تمہارے لئے بیٹے اور اس کے لئے بیٹیاں ؟ یہ تو ٹھیک ٹھیک تقسیم نہ ہوئی ۔ اے لوگو ! تم اس خدائے واحد لاشریک کی پرستش کرو جس نے تم کو اور تمہارے باپ دادوں کو پیدا کیا ۔ چاہیئے کہ تم اس قادرِ توانا سے ڈرو جس نے زمین کو تمہارے لئے بچھونا اور آسمان کو تمہارے لئے چھت بنایا ۔ اور آسمان سے پانی اُتار کر طرح طرح کے رزق تمہارے لئے پھلوں میں سے پیدا کئے ۔ سو تم دیدہ و دانستہ انہیں چیزوں کو خدا کا شریک مت ٹھہراؤ جو تمہارے فائدہ کے لئے بنائی گئی ہیں ۔ خدا ایک ہے جس کا کوئی شریک نہیں ۔ وہی آسمان میں خدا ہے اور وہی زمین میں خدا ۔ وہی اوّل ہے اور وہی آخر ۔ وہی ظاہر ہے وہی باطن ۔ آنکھیں اُس کی کُنہ دریافت کرنے سے عاجز ہیں اور اس کو آنکھوں کی کُنہ معلوم ہے ۔ وہ سب کا خالق ہے اور کوئی چیز اس کی مانند نہیں ۔ اور اُس کے خالق ہونے پر یہ دلیل واضح ہے کہ ہر ایک چیز کو ایک اندازہ مقررہ میں محصور اور محدود پیدا کیا ہے ۔ جس سے وجود اس ایک حاصر اور محدّد کا ثابت ہوتا ہے ۔ اس کے لئے تمام محامد ثابت ہیں ۔ اور دنیا اور آخرت میں وہی منعم حقیقی ہے ۔ اور اسی کے ہاتھ میں ہر ایک حکم ہے اور وہی تمام چیزوں کا مرجع و مآب ہے ۔ خدا ہر ایک گناہ کو بخش دے گا جس کے لئے چاہیگا ۔ پر شرک کو ہرگز نہیں بخشیگا ۔ سو جو شخص خدا تعالیٰ کی ملاقات کا طالب ہے اُسے لازم ہے کہ ایسا عمل اختیار کرے جس میں کسی نوع کا فساد نہ ہو اور کسی چیز کو خدا کی بندگی میں شریک نہ کرے ۔ تو خدا کے ساتھ کسی دوسری چیز کو ہرگز شریک مت ٹھہراؤ ۔ خدا کا شریک ٹھہرانا سخت ظلم ہے ۔ تو بجز خدا کے کسی اور سے مُرادیں مت

مانگ۔ سب ہلاک ہو جائیں گے۔ ایک اسی کی ذات باقی رہ جاوے گی۔ اُسی کے ہاتھ میں حکم ہے۔ اور وہی تمہارا مرجع ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۴۹۳ - ۴۹۹ حاشیہ درحاشیہ نمبر ۳)

خدا کا قانونِ قدرت اور صحیفۂ فطرت جس کا سلسلہ قدیم سے اور انسان کی بنیاد کے وقت سے چلا آتا ہے۔ وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ خدا کے ساتھ تعلّق شدید پیدا ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے احسان اور حسن سے تمتع اٹھایا ہو۔ اور ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ احسان سے مراد خدا تعالیٰ کے اخلاقی نمونے ہیں جو کسی انسان نے اپنی ذات کی نسبت بچشم خود دیکھے ہوں۔ مثلاً بے کسی اور عاجزی اور کمزوری اور یتیمی کے وقت میں خدا اس کا متولی ہوا ہو۔ اور حاجتوں اور ضرورتوں کے وقت میں خدا نے خود اس کی حاجت براری کی ہو۔ اور سخت اور کمر شکن غموں کے وقت میں خدا نے خود اس کی مدد کی ہو اور خدا طلبی کے وقت میں بغیر توسط کسی مرشد اور ہادی کے خود خدا نے اس کی رہنمائی کی ہو۔ اور حسن سے مراد بھی خدا تعالیٰ کی وہی صفاتِ حسنہ ہیں جو احسان کے رنگ میں ملاحظہ ہوتی ہیں۔ مثلاً خدا کی قدرتِ کاملہ اور رفق اور وہ لطف اور وہ ربوبیت اور وہ رحم جو خدا میں پایا جاتا ہے اور وہ عام ربوبیت اس کی جو مشاہدہ ہو رہی ہے اور وہ عام نعمتیں اس کی جو انسانوں کے آرام کے لئے بکثرت موجود ہیں۔ اور وہ علم اس کا جس کو انسان نبیوں کے ذریعہ سے حاصل کرتا اور اس کے ذریعہ سے موت اور تباہی سے بچتا ہے۔ اور اس کی یہ صفت کہ وہ بیقراروں اور درماندوں کی دُعائیں قبول کرتا ہے۔ اور اُسکی یہ خوبی کہ جو لوگ اس کی طرف جھکتے ہیں وہ اُن سے زیادہ ان کی طرف جھکتا ہے یہ تمام صفات خدا کی اس کے حسن میں داخل ہیں۔ اور پھر وہی صفات ہیں کہ جب ایک شخص خاص طور پر اُن سے فیضیاب بھی ہو جاتا ہے تو وہ اس کی نسبت احسان بھی کہلاتی ہیں گو دوسرے کی نسبت فقط حسن میں داخل ہیں۔ اور جو شخص خدا تعالیٰ کی ان صفات کو جو درحقیقت اس کا حسن اور جمال ہے احسان کے رنگ میں بھی دیکھ لیتا ہے تو اس کا ایمان نہایت درجہ قوی ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی طرف ایسا کھینچا جاتا ہے جیسا کہ ایک لوہا آہن ربا کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ اس کی محبت خدا سے بہت بڑھ جاتی ہے اور اس کا بھروسہ خدا پر بہت قوی ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ وہ اس بات کو آزما لیتا ہے کہ اس کی تمام بھلائی خدا میں ہے اس لئے اُس کی اُمیدیں خدا پر نہایت مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اور وہ طبعاً نہ کسی تکلّف اور بناوٹ سے خدا کی طرف جھکا رہتا ہے اور اپنے تئیں ہر دم خدا سے مدد پانے کا محتاج دیکھتا ہے اور اس کی ان صفاتِ کاملہ کے تصوّر سے یقین رکھتا ہے کہ وہ ضرور

کامیاب ہوگا کیونکہ خدا کے فیض اور کرم اور جُود کے بہت سے نمونے اس کا چشم دید مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی دُعائیں قوت اور یقین کے چشمہ سے نکلتی ہیں اور اس کا عقدِ ہمت نہایت مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے اور آخر کار بمشاہدہ آلاء اور نعماء الٰہی کے نورِ یقین بہت زور کے ساتھ اس کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور اس کی ہستی بکلّی جل جاتی ہے۔ اور بباعث کثرت تصور عظمت اور قدرتِ الٰہی کے اُس کا دل خدا کا گھر ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح انسان کی رُوح اس کے زندہ ہونے کی حالت میں کبھی اُس کے جسم سے جدا نہیں ہوتی اسی طرح خدائے قادر ذوالجلال کی طرف سے جو یقین اس کے اندر داخل ہُوا ہے وہ کبھی اس سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ اور ہر وقت پاک رُوح اس کے اندر جوش مارتی رہتی ہے اور اسی پاک رُوح کی تعلیم سے وہ بولتا ہے اور حقائق اور معارف اس کے اندر سے نکلتے ہیں اور خدائے ذوالعزّت والجبروت کا خیمہ ہر وقت اس کے دل میں لگا رہتا ہے اور یقین اور صدق اور محبت کی لذت ہر وقت پانی کی طرح اس کے اندر بہتی رہتی ہے جس کی آبپاشی سے ہر ایک عضو اس کا سیراب نظر آتا ہے۔ آنکھوں میں ایک جُدا سیرابی مشہود ہوتی ہے۔ پیشانی پر الگ ایک نور اُس سیرابی کا لہراتا دکھائی دیتا ہے۔ اور چہرہ پر محبت الٰہی کی ایک بارش برستی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور زبان بھی اس نور کی سیرابی سے پورا حصہ لیتی ہے۔ اسی طرح تمام اعضاء پر ایک ایسی شگفتگی نظر آتی ہے جیسا کہ ابر بہار کے برسنے کے بعد موسم بہار میں ایک دلکش تازگی درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں اور پھولوں اور پھلوں میں محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جس شخص میں یہ رُوح نہیں اُتری اور یہ سیرابی اس کو حاصل نہیں۔ اس کا تمام جسم مردار کی طرح ہوتا ہے اور یہ سیرابی اور تازگی اور شگفتگی جس کی قلم تشریح نہیں کر سکتی یہ اُس مردار دل کو مل ہی نہیں سکتی جس کو نورِ یقین کے چشمے نے شاداب نہیں کیا بلکہ ایک طرح کی سڑی ہوئی بدبو اس سے آتی ہے۔ مگر وہ شخص جس کو نور دیا گیا ہے اور جس کے اندر یہ چشمہ پھوٹ نکلا ہے اس کی علامات میں سے یہ ایک علامت ہے کہ اس کا جی ہر وقت یہی چاہتا ہے کہ ہر ایک بات میں اور ہر ایک قول میں اور ہر ایک فعل میں خدا سے قوت پاوے۔ اسی میں اس کی لذت ہوتی ہے اور اسی میں اس کی راحت ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔

(ریویو آف ریلیجنز اردو جلد اول ص ۱۸۹)

کامل تعریف دو قسم کی خوبیوں کے لئے ہوتی ہے۔ ایک کمالِ حسن اور ایک کمال احسان۔ اور اگر کسی میں دونوں خوبیاں جمع ہوں تو پھر اس کے لئے دل فدا اور شیدا ہو جاتا ہے۔ اور قرآن شریف کا بڑا مطلب یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی دونوں قسم کی خوبیاں حق کے طالبوں پر ظاہر کرے۔ تا اُس

بے مثل و مانند ذات کی طرف لوگ کھینچے جاویں۔ اور رُوح کے جوش اور کشش سے اس کی بندگی کریں۔ اِس لئے پہلی سورۃ میں ہی یہ نہایت لطیف نقشہ دکھلانا چاہا ہے کہ وہ خدا جس کی طرف قرآن بلاتا ہے وہ کیسی خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔ سو اسی غرض سے اس سورۃ کو الحمد للّٰہ سے شروع کیا گیا جس کے یہ معنے ہیں کہ سب تعریفیں اس کی ذات کے لئے لائق ہیں جس کا نام اللّٰہ ہے۔ اور قرآن کی اصطلاح کی رُو سے اللّٰہ اس ذات کا نام ہے جس کی تمام خوبیاں حسن و احسان کے کمال کے نقطہ پر پہنچی ہوئی ہوں۔ اور کوئی منقصت اس کی ذات میں نہ ہو۔ قرآن شریف میں تمام صفات کا موصوف صرف اللّٰہ کے اسم کو ہی ٹھہرایا ہے تا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اللّٰہ کا اسم تب متحقق ہوتا ہے کہ جب تمام صفات کاملہ اس میں پائی جاویں۔ پس جبکہ ہر ایک قسم کی خوبی اس میں پائی گئی تو حسن اس کا ظاہر ہے۔ اسی حسن کے لحاظ سے قرآن شریف میں اللّٰہ تعالیٰ کا نام نور ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔ اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض۔ یعنی اللّٰہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نور ہے۔ اور ہر ایک نور اُسی کے نور کا پرتوہ ہے۔

اور احسان کی خوبیاں اللّٰہ تعالیٰ میں بہت ہیں۔ جن میں سے چار بطور اصل الاصول ہیں۔ اور اُن کی ترتیب طبعی کے لحاظ سے پہلی خوبی وہ ہے جس کو سورۂ فاتحہ میں رب العالمین کے فقرہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ربوبیت یعنی پیدا کرنا اور کمال مطلوب تک پہنچانا تمام عالموں میں جاری و ساری ہے۔ یعنی عالم سماوی اور عالم ارضی اور عالمِ اجسام اور عالمِ ارواح اور عالم جواہر اور عالم اعراض اور عالم حیوانات اور عالم نباتات اور عالم جمادات اور دوسرے تمام قسم کے عالم اس کی ربوبیت سے پرورش پا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ خود انسان پر ابتداء نطفہ ہونے کی حالت سے یا اس سے پہلے بھی جو جو عالم موت تک یا دوسری زندگی کے زمانہ تک آتے ہیں۔ وہ سب چشمہ ربوبیت سے فیض یافتہ ہیں۔ پس ربوبیتِ الٰہی بوجہ اس کے وہ تمام ارواح و اجسام و حیوانات و نباتات و جمادات وغیرہ پر مشتمل ہے فیضانِ اعم سے موسوم ہے کیونکہ ہر ایک موجود اس سے فیض پاتا ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہر ایک چیز وجود پذیر ہے۔ ہاں البتہ ربوبیتِ الٰہی اگرچہ ہر ایک موجود کی موجد اور ہر ایک ظہور پذیر چیز کی مربّی ہے لیکن بحیثیت احسان کے سب سے زیادہ فائدہ اس کا انسان کو پہنچتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی تمام مخلوقات سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس لئے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ تمہارا خدا رب العالمین ہے تا انسان کی امید زیادہ ہو اور یقین کرے کہ ہمارے فائدہ کے لئے خدا تعالیٰ کی قدرتیں وسیع ہیں اور

طرح طرح کے عالم اسباب ظہور میں لا سکتا ہے۔ دوسری خوبی خدا تعالیٰ کی جو دوسرے درجے کا احسان ہے جس کو فیضانِ عام سے موسوم کر سکتے ہیں رحمانیت ہے جس کو سورۃ فاتحہ میں الرحمٰن کے فقرہ میں بیان کیا گیا ہے اور قرآن شریف کی اصطلاح کی رو سے خدا تعالیٰ کا نام رحمٰن اس وجہ سے ہے کہ اس نے ہر ایک جاندار کو جن میں انسان بھی داخل ہے اس کے مناسب حال صورت اور سیرت بخشی یعنی جس طرز کی زندگی اس کے لئے ارادہ کی گئی اس زندگی کے مناسب حال جن قوتوں اور طاقتوں کی ضرورت تھی یا جس قسم کی بناوٹ جسم اور اعضاء کی حاجت تھی وہ سب اس کو عطا کئے اور پھر اس کی بقاء کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اس کے لئے مہیا کیں۔ پرندوں کیلئے پرندوں کے مناسب حال اور چرندوں کے لئے چرندوں کے مناسب حال اور انسان کے لئے انسان کے مناسب حال طاقتیں عنایت کیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ ان چیزوں کے وجود سے ہزارہا برس پہلے بوجہ اپنی صفت رحمانیت کے اجرام سماوی و ارضی کو پیدا کیا تا وہ ان چیزوں کے وجود کی محافظ ہوں۔ پس اس تحقیق سے ثابت ہوا کہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت میں کسی کے عمل کا دخل نہیں بلکہ وہ رحمت محض ہے جس کی بنیاد ان چیزوں کے وجود سے پہلے ڈالی گئی۔ ہاں انسان کو خدا تعالیٰ کی رحمانیت سے سب سے زیادہ حصّہ ہے کیونکہ ہر ایک چیز اس کی کامیابی کے لئے قربان ہو رہی ہے۔ اس لئے انسان کو یاد دلایا گیا کہ تمہارا خدا رحمٰن ہے۔ تیسری خوبی خدا تعالیٰ کی جو تیسرے درجے کا احسان ہے رحیمیت ہے۔ جس کو سورۃ فاتحہ میں الرحیم کے فقرہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور قرآن شریف کے اصطلاح کے رو سے خدا تعالیٰ رحیم اس حالت میں کہلاتا ہے جبکہ لوگوں کی دُعا اور تضرّع اور اعمال صالحہ کو قبول فرما کر آفات اور بلاؤں اور تضییع اعمال سے اُن کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ احسان دوسرے لفظوں میں فیض خاص سے موسوم ہے اور صرف انسان کی نوع سے مخصوص ہے۔ دوسری چیزوں کو خدا نے دُعا اور تضرّع اور اعمالِ صالحہ کا ملکہ نہیں دیا مگر انسان کو دیا ہے۔ انسان حیوان ناطق ہے اور اپنے نطق کے ساتھ بھی خدا تعالیٰ کا فیض پا سکتا ہے۔ دوسری چیزوں کو نطق عطا نہیں ہُوا۔ پس اس جگہ سے ظاہر ہے کہ انسان کا دُعا کرنا اُس کی انسانیت کا ایک خاصہ ہے جو اس کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔ اور جس طرح خدا تعالیٰ کی صفات ربوبیت اور رحمانیت سے فیض حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح صفت رحیمیت سے بھی ایک فیض حاصل ہوتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ ربوبیت اور رحمانیت کی صفتیں دُعا کو نہیں چاہتیں کیونکہ وہ دونوں صفات انسان سے خصوصیت نہیں رکھتیں اور تمام پرند چرند کو اپنے فیض سے مستفیض کر رہی ہیں بلکہ صفت ربوبیت تو تمام حیوانات اور نباتات اور جمادات

اور اجرام ارضی اور سماوی کو فیض رسان ہے اور کوئی چیز اس کے فیض سے باہر نہیں برخلاف صفت رحیمیت کے کہ وہ انسان کے لئے ایک خلعتِ خاصہ ہے اور اگر انسان ہو کر اس صفت سے فائدہ نہ اٹھاوے تو گویا انسان حیوانات بلکہ جمادات کے برابر ہے جبکہ خدا تعالیٰ نے فیض رسانی کی چار صفت اپنی ذات میں رکھی ہیں۔ اور رحیمیت کو جو انسان کی دعا کو چاہتی ہے خاص انسان کیلئے مقرر فرمایا ہے پس اس سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ میں ایک قسم کا وہ فیض ہے جو دُعا کرنے سے وابستہ ہے اور بغیر دُعا کے کسی طرح مل نہیں سکتا۔ یہ سنّت اللہ اور قانونِ الٰہی ہے جس میں تخلّف جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اُمتوں کے لئے دُعائیں مانگتے رہے۔ توریت میں دیکھو کہ کتنی دفعہ بنی اسرائیل خدا تعالیٰ کو ناراض کرکے عذاب کے قریب پہنچ گئے اور پھر کیونکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور تضرّع اور سجدہ سے وہ عذاب ٹل گیا حالانکہ بار بار وعدہ بھی ہوتا رہا کہ مَیں ان کو ہلاک کرونگا۔

اب ان تمام واقعات سے ظاہر ہے کہ دُعا محض لغو امر نہیں۔ اور نہ صرف ایسی عبادت جس پر کسی قسم کا فیض نازل نہیں ہوتا۔ یہ ان لوگوں کے خیال ہیں کہ جو خدا تعالیٰ کا وہ قدر نہیں کرتے جو حق قدر کرنے کا ہے اور نہ خدا کی کلام کو نظرِ عمیق سے سوچتے ہیں اور نہ قانونِ قدرت پر نظر ڈالتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دُعا پر ضرور فیض نازل ہوتا ہے جو ہمیں نجات بخشتا ہے اسی کا نام فیضِ رحیمیت ہے جس سے انسان ترقی کرتا جاتا ہے۔ اسی فیض سے انسان ولایت کے مقامات تک پہنچتا ہے اور خدا تعالیٰ پر ایسا یقین لاتا ہے کہ گویا آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ مسئلہ شفاعت بھی صفت رحیمیت کی بناء پر ہے۔ خدا تعالیٰ کی رحیمیت نے ہی تقاضا کیا کہ اچھے آدمی بُرے آدمیوں کی شفاعت کریں۔

چوتھا احسان خدا تعالیٰ کا جو قسم چہارم کی خوبی ہے جس کو فیضان اخصّ سے موسوم کر سکتے ہیں مالکیت یوم الدین ہے جس کو سورۃ فاتحہ میں فقرہ مالک یوم الدین میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اور اس میں اور صفت رحیمیت میں یہ فرق ہے کہ رحیمیت میں دعا اور عبادت کے ذریعہ سے کامیابی کا استحقاق قائم ہوتا ہے اور صفت مالک یوم الدین کے ذریعہ وہ ثمرہ عطا کیا جاتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے انسان گورنمنٹ کا ایک قانون یاد کرنے میں محنت اور جد و جہد کرکے امتحان دے اور پھر اس میں پاس ہو جائے۔ پس رحیمیت کے اثر سے کسی کامیابی کے لئے استحقاق پیدا ہو جانا پاس ہو جانے سے مشابہ ہے۔ اور ہر وہ چیز یا

وہ مرتبہ میسّر آجاتا جس کے لئے پیاس ہوا تھا اِس حالت سے مشابہ انسان کے فیض پانے کی وہ حالت ہے جو پرتَوہ صفت مالک یوم الدین سے حاصل ہوتی ہے ۔ ان دونوں صفتوں رحیمیت اور مالکیت یوم الدین میں یہ اشارہ ہے کہ فیض رحیمیت خدا تعالیٰ کے رحم سے حاصل ہوتا ہے اور فیض مالکیت یوم الدین خدا تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے ۔ اور مالکیت یوم الدین اگرچہ وسیع اور کامل طور پر عالم معاد میں متجلّی ہوگی مگر اس عالم میں بھی اس عالم کے دائرہ کے موافق یہ چاروں صفتیں تجلّی کر رہی ہیں ۔

(ایّام الصلح صفحہ ۱۷ ـ ۲۱)

خدا تعالیٰ دنیا میں تین قسم کے کام کیا کرتا ہے (۱) خدائی کی حیثیت سے (۲) دوسری دوست کی حیثیت سے (۳) تیسرے دشمن کی حیثیت سے ۔ جو کام عام مخلوقات سے ہوتے ہیں وہ محض خدائی حیثیت سے ہوتے ہیں ۔ اور جو کام محبّین اور محبوبین سے ہوتے ہیں وہ نہ صرف خدائی حیثیت سے بلکہ دوستی کی حیثیت کا رنگ ان پر غالب ہوتا ہے ۔ اور صریح دنیا کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا اس شخص کی دوستانہ طور پر حمایت کر رہا ہے ۔ اور جو کام دشمنوں کی حیثیت سے ہوتے ہیں ۔ اُن کے ساتھ ایک موذی عذاب ہوتا ہے اور ایسے نشان ظاہر ہوتے ہیں جن سے صریح دکھائی دیتا ہے کہ خدا تعالےٰ اس قوم یا اس شخص سے دشمنی کر رہا ہے ۔ اور خدا جو اپنے دوست کے ساتھ کبھی یہ معاملہ کرتا ہے جو تمام دنیا کو اس کا دشمن بنا دیتا ہے ۔ اور کچھ مدت کے لئے ان کی زبانوں یا اُن کے ہاتھوں کو اُس پر مسلّط کر دیتا ہے ۔ یہ اسلئے خدائے غیور نہیں کرتا کہ اس اپنے دوست کو ہلاک کرنا چاہتا ہے یا بے عزت اور ذلیل کرنا چاہتا ہے بلکہ اس لئے کرتا ہے کہ تا دنیا کو اپنے نشان دکھاوے اور تا شوخ دیدہ مخالفوں کو معلوم ہو کہ انہوں نے دشمنی میں ناخنوں تک زور لگا کر نقصان کیا پہنچایا ۔

(نزول المسیح صفحہ ۱۳۹ ـ ۱۴۰)

قرآن شریف میں اللہ تعالےٰ کے اسماء مفعول کے لفظ میں نہیں جیسے قدّوس تو ہے مگر معصوم نہیں لکھا ۔ کیونکہ پھر بچانے والا اَور ہوگا ۔

(ملفوظات جلد چہارم صفحہ ۱۱۹)

ہمارا خدا ہر ایک چیز پر قادر ہے ۔ جھوٹے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ نہ اس نے رُوح پیدا کی اور نہ ذرّاتِ اجسام ۔ وہ خدا سے غافل ہیں ۔ ہم ہر روز اُس کی نئی

پیدائش دیکھتے ہیں اور ترقیات سے نئی نئی رُوح وہ ہم میں پھونکتا ہے۔ اگر وہ نیست سے ہست کرنے والا نہ ہوتا تو ہم تو زندہ ہی مر جاتے۔ عجیب ہے وہ خدا جو ہمارا خدا ہے۔ کون ہے جو اس کی مانند ہے؟ اور عجیب ہیں اس کے کام۔ کون ہے جس کے کام اس کی مانند ہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔

(نسیم دعوت ص۶۹-۷۰)

درحقیقت نفی صفات الٰہی کی کرنا اور خدائے تعالیٰ کو قادرانہ تصرّف سے معطّل سمجھنا ہی اصل موجب دیوتا پرستی اور تناسخ کا ہے کیونکہ جبکہ خدائے تعالیٰ اپنے مدبّرانہ کاموں سے معطل خیال کیا گیا تو حاجت براری کے لئے دیوتے گھڑے گئے۔ اور تقدیری تغیرات اور انقلابات کو گذشتہ عملوں کا نتیجہ ٹھیرایا گیا۔ سو اس ایک ہی خیال سے یہ دونوں خرابیاں پیدا ہوگئیں یعنی اواگون اور دیوتا پرستی۔

(شحنۂ حق ص۸۱)

قدرت سے اپنی ذات کا دیتا ہے حق ثبوت ⁂ اُس بے نشاں کی چہرہ نمائی یہی تو ہے
جس بات کو کہے کہ کرونگا یہ مَیں ضرور ⁂ ٹلتی نہیں وہ بات خدائی یہی تو ہے

(درثمین ص۱۰)

ہمارے خدا میں بے شمار عجائبات ہیں مگر وہی دیکھتے ہیں جو صدق اور وفا سے اُس کے ہو گئے ہیں وہ غیروں پر جو اس کی قدرت پر یقین نہیں رکھتے اور اس کے صادق و وفادار نہیں وہ عجائبات ظاہر نہیں کرتا۔ کیا ہی بدبخت وہ انسان ہے جس کو اب تک یہ پتہ نہیں کہ اُس کا ایک خدا ہے جو ہر ایک چیز پر قادر ہے۔

(کشتی نوح ص۱۹)

اُس کی قدرتیں غیر محدود ہیں اور اس کے عجائب کام ناپیدا کنار ہیں۔ اور وہ اپنے خاص بندوں کے لئے اپنا قانون بھی بدل لیتا ہے مگر وہ بدلنا بھی اس کے قانون میں ہی داخل ہے۔ جب ایک شخص اس کے آستانے پر ایک نئی رُوح لے کر حاضر ہوتا ہے اور اپنے اندر ایک خاص تبدیلی محض اس کی رضامندی کے لئے پیدا کر لیتا ہے تب خدا بھی اس کے لئے ایک تبدیلی پیدا کر لیتا ہے کہ گویا اس بندے پر جو خدا ظاہر ہوا ہے وہ اَور ہی خدا ہے نہ وہ خدا جس کو عام لوگ جانتے ہیں۔ وہ ایسے آدمی کے مقابل پر جس کا ایمان کمزور ہے کمزور کی طرح ظاہر ہوتا ہے لیکن جو اس کی جناب میں ایک نہایت قوی ایمان کے ساتھ آتا ہے وہ اس کو دکھلا دیتا ہے کہ تیری مدد کے لئے مَیں بھی قوی ہوں۔ اسی طرح انسانی تبدیلیوں کے مقابل پر اس کی صفات میں بھی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ جو شخص

ایمانی حالت میں ایسا مفقود الطاقت ہے کہ گویا میّت ہے۔ خدا بھی اس کی تائید اور نصرت سے دستکش ہو کر ایسا خاموش ہو جاتا ہے کہ گویا نعوذ باللہ وہ مر گیا ہے۔ مگر یہ تمام تبدیلیاں وہ اپنے قانون کے اندر اپنے تقدس کے موافق کرتا ہے۔ اور چونکہ کوئی شخص اس کے قانون کی حد بست نہیں کر سکتا اس لئے جلدی سے بغیر کسی قطعی دلیل کے جو روشن اور بدیہی ہو یہ اعتراض کرنا کہ فلاں امر قانونِ قدرت کے مخالف ہے محض حماقت ہے کیونکہ جس چیز کی ابھی حد بست نہیں ہوئی اور نہ اس پر کوئی قطعی دلیل قائم ہے اس کی نسبت کون رائے زنی کر سکتا ہے؟

(چشمۂ معرفت ص۹۶-۹۷)

اگر خدا کو قادر نہ مانا جاوے تو پھر اس سے ساری اُمیدیں باطل ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ہماری دعاؤں کی قبولیت اس بات پر موقوف ہے کہ خدا تعالےٰ جب چاہے ذرّات اجسام میں یا ارواح میں وہ قوتیں پیدا کر دے جو اُن میں موجود نہ ہوں۔ مثلاً ہم ایک بیمار کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ اور بظاہر مرنے والے آثار اس میں ہوتے ہیں۔ تب ہماری درخواست ہوتی ہے کہ خدا اس کے ذرّاتِ جسم میں ایک ایسی قوت پیدا کر دے جو اس کے وجود کو موت سے بچا لے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر وہ دُعا قبول ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات اول ہمیں علم دیا جاتا ہے کہ یہ شخص مرنے کو ہے اور اس کی زندگی کی قوتوں کا خاتمہ ہے۔ لیکن جب دعا بہت کی جاتی ہے اور انتہا تک پہنچ جاتی ہے اور شدت دعا اور قلق اور کرب سے ہماری حالت ایک موت کی سی ہو جاتی ہے تب ہمیں خدا سے وحی ہوتی ہے کہ اس شخص میں زندگی کی طاقتیں پھر پیدا کی گئیں۔ تب وہ یکدفعہ صحت کے آثار ظاہر کرنے لگتا ہے۔ گویا مردہ سے زندہ ہو گیا۔ ایسا ہی مجھے یاد ہے کہ جب مَیں نے طاعون کے وقت میں دُعا کی کہ اے خدائے قادر! ہمیں اس بلا سے بچا اور ہمارے جسم میں وہ ایک تریاقی خاصیت پیدا کر دے جس سے ہم طاعون کے زہر سے بچ جائیں۔ تب وہ خاصیت خدا نے ہم میں پیدا کر دی اور فرمایا کہ مَیں طاعون کی موت سے نہیں بچاؤں گا۔ اور فرمایا کہ تیرے گھر کی چار دیواری کے لوگ جو تکبّر نہیں کرتے یعنی خدا کی اطاعت سے سرکش نہیں اور پرہیزگار ہیں مَیں اُن سب کو بچاؤں گا۔ اور نیز میں قادیان کو طاعون کے سخت غلبہ اور عام ہلاکت سے محفوظ رکھوں گا۔ یعنی وہ سخت تباہی جو دوسرے دیہات کو فنا کر دے گی اس قدر قادیان میں تباہی نہیں ہوگی۔ سو ہم نے دیکھا۔ اور خدا تعالےٰ کی ان تمام باتوں کو مشاہدہ کیا۔ پس ہمارا خدا یہی خدا ہے جو نئی نئی قوتیں اور گُن اور خاصیتیں ذرّاتِ عالم میں پیدا کرتا ہے - - - - - - - - - - - - ہم نے اس کامل خدا سے

خبر پاکر ٹیکہ کے انسانی حیلہ سے دست کشی کی اور بہت سے لوگ ٹیکہ کرانے والے اس جہان سے گذر گئے اور ہم اب تک خدا تعالیٰ کے فضل سے زندہ موجود ہیں۔ پس اسی طرح خدا تعالیٰ ذرّات پیدا کرتا ہے جس طرح اس نے ہمارے لئے ہمارے جسم میں تریاقی ذرّات پیدا کر دیئے۔ اور اسی طرح وہ خدا رُوح پیدا کرتا ہے جس طرح مجھ میں اُس نے وہ پاک رُوح پھونک دی جس سے مَیں زندہ ہو گیا۔ ہم صرف اس بات کے محتاج نہیں کہ وہ رُوح پیدا کرکے ہمارے جسم کو زندہ کرے بلکہ خود ہماری رُوح بھی ایک اور رُوح کی محتاج ہے جس سے وہ مُردہ رُوح زندہ ہو۔ پس ان دونوں روحوں کو خدا ہی پیدا کرتا ہے جس نے اس راز کو نہیں سمجھا وہ خدا کی قدرتوں سے بے خبر اور خدا سے غافل ہے۔

(نسیم دعوت ص ۲۸-۲۹)

خدا تعالیٰ کی خدائی اور الوہیت اس کی قدرت غیر محدودہ اور اسرار نا معدودہ سے وابستہ ہے جس کو قانون کے طور پر کسی حد کے اندر گھیر لینا انسان کا کام نہیں ہے۔ خداشناسی کے لئے یہ بڑا بھاری بنیادی مسئلہ ہے کہ خدائے ذوالجلال کی قدرتیں اور حکمتیں بے انتہا ہیں۔ اس مسئلہ کی حقیقت سمجھنے اور اس پر عمیق غور کرنے سے سب الجھاؤ اور پیچ خیالات کا رفع ہو جاتا ہے اور سیدھا راہ حق شناسی اور حق پرستی کا نظر آنے لگتا ہے۔ ہم اس جگہ اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ خدائے تعالیٰ ہمیشہ اپنی ازلی ابدی صفات کے موافق کام کرتا ہے اور اگر ہم دوسرے لفظوں میں انہی ازلی ابدی صفات پر چلنے کا نام قانون الٰہی رکھیں تو بیجا نہیں مگر ہمارا کلام اور بحث اس میں ہے کہ وہ آثار صفات ازلی ابدی یا یوں کہو کہ وہ قانون قدیم الٰہی محدود یا معدود کیوں مانا جائے۔ ہاں بے شک یہ تو ہم مانتے ہیں اور مان لینا چاہیئے کہ جو کچھ صفتیں جناب الٰہی کی ذات میں موجود ہیں انہیں صفاتِ غیر محدود کے آثار اپنے اپنے وقتوں میں ظہور میں آتے ہیں نہ کوئی امر اُن کا غیر۔ اور وہ صفات ہریک مخلوق ارضی و سماوی پر مؤثر ہو رہی ہیں۔ اور انہی آثار الصفات کا نام سنّت اللہ یا قانون قدرت ہے۔ مگر چونکہ خدائے تعالیٰ معہ اپنی صفات کاملہ کے غیر محدود اور غیر متناہی ہے اس لئے ہماری بڑی نادانی ہو گی اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ اس کے آثار الصفات یعنی قوانین قدرت باندازہ ہمارے تجربہ یا فہم یا مشاہدہ کے ہیں اس سے بڑھکر نہیں۔ آجکل کے فلسفی الطبع لوگوں کی یہ بڑی بھاری غلطی ہے کہ اوّل وہ قانونِ قدرت کو ایسا سمجھ بیٹھے ہیں جس کی من کل الوجوہ حد بست ہو چکی ہے اور پھر بعد اس کے جو امر نیا پیش آئے اس کو ہرگز نہیں مانتے۔ اور ظاہر ہے کہ اس خیال کی بناء راستی پر نہیں ہے۔ اور اگر یہی سچ ہوتا تو پھر کسی نئی بات کے ماننے کے لئے کوئی سبیل باقی نہ رہتا۔ اور امور جدیدہ کا دریافت کرنا غیر ممکن ہو جاتا۔ کیونکہ اس صورت میں ہریک نیا فعل

بصورت نقص قوانین طبعی نظر آئیگا۔ اور اس کے ترک کرنے سے ناحق ایک جدید صداقت کو ترک کرنا پڑے گا . . . . اگر کوئی صفحات تاریخ زمانہ میں واقعات سوانحعمری حکماء پر غور کرے تو اس کو معلوم ہو جائیگا کہ اُن کے خیالات کی ٹرین کتنی مختلف سڑکوں یا یہ کہ کس قدر متناقض چالوں پر چلی ہے اور کیسے داغ خجالت اور ندامت کے ساتھ ایک رائے کو دوسری رائے سے تبدیل کرتے آئے ہیں اور کیونکر انہوں نے ایک مدت دراز تک کسی بات کا انکار کرکے اور قانون قدرت سے اس کو باہر سمجھ کر آخر نہایت متندمانہ حالت میں اسی بات کو قبول کر لیا۔ سو اس تبدیل آراء کا سبب بجز اس کے اور کیا تھا یہی تو تھا کہ جو کچھ انہوں نے سمجھ رکھا تھا وہ ایک ظنّی بات تھی جس کی مشاہدات جدیدہ نے تکذیب کی۔ سو جن شکلوں اور حالتوں میں وہ مشاہدات جدیدہ جلوہ گر ہوئے انہی کے موافق اُنکی راؤں کی پٹڑی بدلتی اور الٹتی پلٹتی رہی۔ اور جدھر تجارب جدیدہ کا رُخ پلٹتا رہا اُدھر ہی ان کے خیالات کی ہوائیں پلٹا کھاتی رہیں۔ غرض فلسفیوں کے خیالات کی لگام ہمیشہ امور جدیدۃ الظہور کے ہاتھ میں رہی ہے اور اب بھی بہت کچھ اُن کی نظروں سے چھپا ہُوا ہے جس کی نسبت اُمید کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ ٹھوکریں کھا کھا کر اور طرح طرح کی رسوائیاں اٹھا اٹھا کر کسی نہ کسی وقت قبول کریں گے۔ کیونکہ قوانین قدرت انسانی عقل کے دفتر میں ابھی تک ایسے مضبوط نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں جن پر نظر کر کے نئی تحقیقاتوں سے نومیدی ہو۔ کیا کوئی عقلمند خیال کر سکتا ہے کہ انسان دنیا کے مکتب خانہ میں باوجود اپنی اس قدر عمر قلیل کے تحصیل اسرار ازلی ابدی سے بکلی فراغت پا چکا ہے۔ اور اب اس کا تجربہ عجائبات الٰہیہ پر ایسا محیط ہو گیا ہے کہ جو کچھ اس کے تجربہ سے باہر ہو وہ فی الحقیقت خدا تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ ایسا خیال بجز ایک بے شرم اور ابلہ آدمی کے کوئی دانشمند نہیں کر سکتا۔ فلاسفروں میں سے جو واقعی نیک دانا اور سچے روحانی آدمی گذرے ہیں انہوں نے خود تسلیم کر لیا کہ ہمارے خیالات جو محدود اور منقبض ہیں خدا اور اس کے بے انتہا بھیدوں اور حکمتوں کی شناخت کا ذریعہ نہیں ہو سکتے . . . .

. . . . . . یہ نہایت محقق صداقت ہے کہ ہر یک چیز اپنے اندر ایک ایسی خاصیت رکھتی ہے جس سے وہ خدائے تعالیٰ کی غیر متناہی قدرتوں سے اثر پذیر ہوتی رہی۔ سو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواص اشیاء ختم نہیں ہو سکتیں گو ہم ان پر اطلاع پائیں یا نہ پائیں۔ اگر ایک دانہ خشخاش کے خواص تحقیق کرنے کے لئے تمام فلاسفر اوّلین و آخرین قیامت تک اپنی دماغی قوتیں خرچ کریں تو کوئی عقلمند ہرگز باور نہیں کر سکتا کہ وہ ان خواص پر احاطۂ تام کر لیں۔ سو یہ خیال کہ اجرام علوی یا اجسام سفلی

کے خواص جسقدر بذریعہ علم ہیئت یا طبعی دریافت ہو چکے ہیں اُسی قدر پر ختم ہیں۔ اِس سے زیادہ کوئی بے سمجھی کی بات نہیں۔

اب خلاصہ اس تمام مقدمہ کا یہ ہے کہ قانون قدرت کوئی ایسی شے نہیں ہے کہ ایک حقیقت ثابت شدہ کے آگے ٹھہر سکے۔ کیونکہ قانون قدرت خدائے تعالیٰ کے ان افعال سے مراد ہے جو قدرتی طور پر ظہور میں آئے یا آئندہ آئیں گے۔ لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ قدرتوں کے دکھلانے سے تھک نہیں گیا ہے۔ اور نہ یہ کہ اب قدرت نمائی سے بے زور ہو گیا ہے یا سو گیا ہے یا کسی طرف کو کھسک گیا ہے یا کسی خارجی قاسر سے مجبور کیا گیا ہے اور مجبوراً آئندہ کے عجائب کاموں سے دستکش ہو گیا ہے اور ہمارے لئے وہی چند صدیوں کی کارگذاری (یا اس سے کچھ زیادہ سمجھ لو) چھوڑ گیا ہے۔ اس لئے ساری عقلمندی اور حکمت اور فلسفیت اور ادب اور تعلیم اسی میں ہے کہ ہم چند موجودہ مشہودہ قدرتوں کو جن میں ابھی صدہا طور کا اجمال باقی ہیں مجموعۂ قوانین قدرت خیال نہ کر بیٹھیں اور اس پر نادان لوگوں کی طرح ضد نہ کریں کہ ہمارے مشاہدات سے خدائے تعالیٰ کا فعل ہرگز تجاوز نہیں کر سکتا .... میں سوچ میں ہوں کہ کیونکر ایسی چیزیں کامل اور قطعی طور پر مقیاس الصداقت یا میزان الحق ٹھہر سکتے ہیں جن کے اپنے ہی پورے طور کے انکشاف میں ابھی بہت سی منازل باقی ہیں اور اس پیچ در پیچ معما نے یہاں تک حکماء کو حیران اور سرگردان کر رکھا ہے کہ بعض اُن میں سے حقائق اشیاء کے منکر ہی ہو گئے (منکرین حقائق کا وہی گروہ ہے جس کو سوفسطائی کہتے ہیں) اور بعض اُن میں سے یہ بھی کہہ گئے کہ اگرچہ خواص اشیاء ثابت ہیں تاہم دائمی طور پر ان کا ثبوت نہیں پایا جاتا۔ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ مگر ممکن ہے کہ کسی ارضی یا سماوی تاثیر سے کوئی چشمہ پانی کا اس خاصیت سے باہر آ جائے۔ آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے۔ مگر ممکن ہے کہ ایک آگ بعض موجبات اندرونی یا بیرونی سے اس خاصیت کو ظاہر نہ کر سکے۔ کیونکہ ایسی عجائب باتیں ہمیشہ ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ حکماء کا یہ بھی قول ہے کہ بعض تاثیراتِ ارضی یا سماوی ہزاروں بلکہ لاکھوں برسوں کے بعد ظہور میں آتی ہیں جو ناواقف اور بے خبر لوگوں کو بطور خارق عادت معلوم دیتی ہیں اور کبھی کبھی کسی کسی زمانہ میں ایسا ہوتا رہتا ہے اور کچھ عجائبات آسمان میں یا زمین میں ظاہر ہوتے ہیں جو بڑے بڑے فیلسوفوں کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔ اور پھر فلسفی لوگ اُن کے قطعی ثبوت اور مشاہدہ سے خیرہ اور متندم ہو کر کچھ نہ کچھ تکلفات کر کے طبعی یا ہیئت میں اُن کو گھسیڑ دیتے ہیں تا ان کے قانون قدرت میں کچھ فرق نہ آجائے۔ ایسا ہی یہ لوگ ادھر کے ادھر لگا کر اور نئی باتوں کو کسی علمی قاعدہ میں جبراً دھنسا کر گزارہ کر لیتے ہیں۔ جب تک پردار مچھلی نہیں دیکھی گئی۔ تب تک کوئی فلسفی اس کا قائل نہ تھا۔ اور جب تک

متواتر دُم کے کٹنے سے دُم کٹے کتّے پیدا نہ ہونے لگے تب تک اس خاصیت کا کوئی فلاسفر اقراری نہ ہُوا اور جب تک بعض زمینوں میں کسی سخت زلزلہ کی وجہ سے کوئی ایسی آگ نہ نکلی کہ وہ پتھروں کو پگھلا دیتی تھی مگر لکڑی کو جلا نہیں سکتی تھی تو تب تک فلسفی لوگ ایسی خاصیت کا آگ میں ہونا خلاف قانون قدرت سمجھتے رہے۔ جب تک اسپی ریٹر کا آلہ نہیں نکلا تھا کس فلسفی کو معلوم تھا کہ عمل ٹرنسفیوزن آف بلڈ (یعنی ایک انسان کا خون دوسرے انسان میں داخل کرنا) قانون فطرت میں داخل ہے؟ بھلا اس فلاسفر کا نام لینا چاہیئے جو الیکٹرک مشین یعنی بجلی کی کل نکلنے سے پہلے اس بجلی لگانے کے عمل کا قائل تھا؟ . . . .

علامہ شارح قانون جو طبیب حاذق اور بڑا بھاری فلسفی ہے ایک جگہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے جو یونانیوں میں یہ قصے بہت مشہور ہیں جو بعض عورتوں کو جو اپنے وقت میں عفیفہ اور صالحہ تھیں بغیر صحبت مرد کے حمل ہو کر اولاد ہوئی۔ اور پھر علّامہ موصوف بطور رائے کے لکھتا ہے کہ یہ سب قصّے افترا پر محمول نہیں ہو سکتے کیونکہ بغیر کسی اصل صحیح کے مختلف افراد اور مہذب قوموں میں ایسے دعاوی ہرگز فروغ نہیں پا سکتے . . . . ان سب قصّوں کی نسبت گو کسی منکر کی کیسی ہی رائے ہو مگر صرف ان کے نادر الوقوع ہونے کی وجہ سے وہ سب کی سب ردّ نہیں کی جا سکتی اور ان کے ابطال پر کوئی دلیل فلسفی قائم نہیں ہو سکتی . . . . اور علّامہ موصوف نے اسی مقام میں ایک تقریر نہایت ہی عمدہ لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ سب انسان ایک نوع میں ہونے کی وجہ سے باہم مناسب الطبع واقعہ ہیں مگر پھر بھی اُن میں سے بعض کو نادر طور پر کبھی کبھی کسی کسی زمانہ میں خاص خاص طاقتیں یا کسی اعلیٰ درجہ کی قوتیں عطا ہوتی ہیں جو عام طور پر دوسروں میں نہیں پائی جاتیں جیسے مشاہدہ سے ثابت ہُوا ہے کہ بعض نے حال کے زمانہ میں تین سو برس سے زیادہ عمر پائی جو بطور خارق عادت ہے اور بعض کی قوت حافظہ یا قوتِ نظر ایسے کمال درجہ کو پہنچی ہے جو اس کی نظیر نہیں پائی گئی اور اس قسم کے لوگ بہت نادر الوجود ہوتے ہیں جو صدہا یا ہزاروں برسوں کے بعد کوئی فرد ان میں سے ظہور میں آتا ہے اور چونکہ عوام الناس کی نظر اکثر امور کثیر الوقوع اور متواتر الظہور پر ہُوا کرتی ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی نگاہ میں جو باتیں کثیر الوقوع اور متواتر الظہور ہوں وہ بطور قاعدہ یا قانون قدرت کے مانی جاتی ہیں۔ اور انہی کی سچائی پر انہیں اعتماد ہوتا ہے۔ اس لئے دوسرے امور جو نادر الوقوع ہوتے ہیں وہ بمقابل امور کثیر الوقوع کے نہایت مضمحل اور مشتبہ بلکہ باطل کے رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے عوام کیا بلکہ خواص کو بھی اُن کے وجود میں شکوک اور شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ سو بڑی غلطی جو حکماء کو پیش آتی ہے اور

بڑی بھاری ٹھوکر جو اُن کو آگے قدم رکھنے سے روکتی ہے یہ ہے کہ وہ امورِ کثیر الوقوع کے لحاظ سے نادر الوقوع کی تحقیق کے درپے نہیں ہوتے اور جو کچھ اُن کے آثار چلے آتے ہیں اُن کو صرف قصّے اور کہانیاں خیال کرکے اپنے سر پر سے ٹال دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ قدیم سے عادت اللہ ہے جو امورِ کثیر الوقوع کے ساتھ نادر الوقوع عجائبات بھی کبھی کبھی ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ اس کی نظیریں بہت ہیں جن کا لکھنا موجب تطویل ہے۔ اور حکیم بقراط نے اپنی ایک طبّی کتاب میں چند چشم دید بیماروں کا بھی حال لکھا ہے جو قواعدِ طبّی اور تجربۂ اطباء کی رو سے وہ ہرگز قابلِ علاج نہیں تھے مگر ان بیماروں نے عجیب طور پر شفا پائی جس کی نسبت اُن کا خیال ہے کہ یہ شفا بعض نادر تاثیرات ارضی یا سماوی سے ہے۔ اسجگہ ہم اس قدر اور لکھنا چاہتے ہیں کہ یہ بات صرف نوعِ انسان میں محدود نہیں کہ کثیر الوقوع اور نادر الوقوع خواص کا اس میں سلسلہ چلا آتا ہے بلکہ اگر غور سے دیکھیں تو یہ دوہرا سلسلہ ہر یک نوع میں پایا جاتا ہے مثلاً نباتات میں سے آک کے درخت کو دیکھو کہ کیسا تلخ اور زہرناک ہوتا ہے مگر کبھی مدتوں اور برسوں کے بعد ایک قسم کی نباتات اس میں پیدا ہو جاتی ہے جو نہایت شیریں اور لذیذ ہوتی ہے۔ اب جس شخص نے اس نبات کو کبھی نہ دیکھا ہو اور معمولی قدیمی تلخی کو دیکھتا آیا ہو بے شک وہ اس نبات کو ایک امرِ طبعی کی نقیض سمجھیگا۔ ایسا ہی بعض دوسری نوع کی چیزوں میں بھی مُدد مداز عرصہ کے بعد کوئی نہ کوئی خاصہ نادر ظہور میں آجاتا ہے۔ کچھ تھوڑا عرصہ گذرا ہے کہ مظفر گڑھ میں ایک ایسا بکرا پیدا ہوا کہ جو بکریوں کی طرح دودھ دیتا تھا۔ جب اس کا شہر میں بہت چرچا پھیلا تو میکالف صاحب ڈپٹی کمشنر مظفر گڑھ کو بھی اطلاع ہوئی تو انہوں نے یہ ایک عجیب امر قانونِ قدرت کے برخلاف سمجھکر وہ بکرا اپنے روبرو منگوایا۔ چنانچہ وہ بکرا جب اُن کے روبرو دوہا گیا تو شاید قریب ڈیڑھ سیر دودھ کے اُس نے دیا .... اس کے بعد تین معتبر اور ثقہ اور معزز آدمی نے میرے پاس بیان کیا کہ ہم نے بچشم خود چند مردوں کو عورتوں کی طرح دودھ دیتے دیکھا ہے .... ایسا ہی بعض لوگوں کا تجربہ ہے کہ کبھی ریشم کے کیڑے کی مادہ بے نر کے انڈے دے دیتی ہیں۔ اور اُن میں سے بچے نکلتے ہیں۔ بعض نے یہ بھی دیکھا کہ چوہا مٹی خشک سے پیدا ہوا جس کا آدھا دھڑ تو مٹی تھا اور آدھا چوہا بن گیا۔ حکیم فاضل قرشی یا شاید علامہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بیمار ہم نے دیکھا جس کا کان ماؤف ہو کر بہرہ ہو گیا تھا۔ پھر کان کے نیچے ایک ناسور سا پیدا ہو گیا جو آخر وہ سوراخ سے ہو گئے۔ اس سوراخ کی راہ سے وہ برابر سُن لیتا تھا گویا خدا نے اس کے لئے دوسرا کان عطا کیا .... جالینوس سے سوال کیا گیا کہ

کیا انسان آنکھوں کی راہ سے سن سکتا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ ہنوز تجربہ شہادت نہیں دیتا لیکن ممکن ہے کہ کوئی ایسی مشارکت کانوں اور آنکھوں کی مخفی ہو جو کسی ہاتھ کے عمل سے یا کسی سماوی موجب سے ظہور پذیر ہو کر اس خاصیت کے ظہور کا موجب ہو جائے۔ کیونکہ ابھی علم استدراک خواص مختتم نہیں۔ ڈاکٹر برنی آر نے اپنے سفرنامہ کشمیر میں پیر پنجال کی چڑھائی کی تقریب بیان پر بطور ایک عجیب حکایت کے لکھا ہے جو ترجمہ کتاب مذکورہ کے صفحہ ۸۰ میں درج ہے کہ ایک جگہ پتھروں کے ہلانے جلانے سے ہم کو ایک بڑا سیاہ بچھو نظر پڑا۔ جس کو ایک نوجوان مغل نے جو میری جان پہچان والوں میں سے تھا اٹھا کر اپنی مٹھی میں دبا لیا اور پھر میرے نوکر کے اور میرے ہاتھ میں دیدیا۔ مگر اس نے ہم میں سے کسی کو بھی نہ کاٹا۔ اس نوجوان سوار نے اس کا باعث یہ بیان کیا کہ میں نے اس پر قرآن کی ایک آیت پڑھ کر پھونک دی ہے اور اس عمل سے اکثر بچھوؤں کو پکڑ لیتا ہوں۔ اور صاحب کتاب فتوحات و فصوص جو ایک بڑا بھاری نامی فاضل اور علوم فلسفہ و تصوف میں بڑا ماہر ہے۔ وہ اپنی کتاب فتوحات میں لکھتا ہے کہ ہمارے مکان پر ایک فلسفی اور کسی دوسرے کی خاصیت احراق آگ میں کچھ بحث ہو کر اس دوسرے شخص نے یہ عجیب بات دکھلائی کہ فلسفی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کوئلوں کی آگ میں جو ہمارے سامنے مجمر میں پڑی تھی ڈال دیا اور کچھ عرصہ اپنا اور فلسفی کا ہاتھ آگ پر رہنے دیا مگر آگ نے ان دونوں ہاتھوں میں سے کسی پر ایک ذرا بھی اثر نہ کیا۔ اور راقم اس رسالہ نے ایک درویش کو دیکھا کہ وہ سخت گرمی کے موسم میں یہ آیت قرآنی پڑھ کر واذا بطشتم بطشتم جبّارین زنبور کو پکڑ لیتا تھا اور اس کی نیش زنی سے بکلّی محفوظ رہتا تھا۔ اور خود اس راقم کے تجربہ میں بعض تاثیرات عجیبہ آیت قرآنی کی آچکی ہیں جن سے عجائبات قدرت حضرت باری جلّشانہ معلوم ہوتے ہیں۔ غرض یہ عجائب خانہ دنیا کا بے شمار عجائبات سے بھرا ہوا ہے۔ جو دانا اور شریف حکیم گذرے ہیں انہوں نے اپنی چند معدود معلومات پر ہرگز ناز نہیں کیا اور وہ اس بات کو بہت بے شرمی اور گستاخی سمجھتے رہے ہیں کہ اپنے محدود تجربہ کا نام خدا تعالیٰ کا قانون قدرت رکھیں . . . . کیا جس نے یہ پُر بہار آسمان جو مہر و ماہ اور ستاروں کے چراغوں سے سج رہا ہے اور یہ رشک گلزار زمین جو رنگا رنگ مخلوقات سے آباد ہو رہی ہے بغیر ایک ذرّہ مشقت اٹھانے کے صرف اپنے ارادہ سے پیدا کر دیا اس کی قدرتوں کا کوئی انتہا پا سکتا ہے؟

(سرمہ چشم آریہ ص ۴۲-۵۵)

یہ ایک سرّ ربوبیت ہے جو کلمات اللہ سے مخلوقاتِ الٰہی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو اپنی اپنی سمجھ کے موافق ہریک شخص ذہن نشین کر سکتا ہے۔ چاہے اس طرح سمجھ لے کہ مخلوقات کلماتِ الٰہی کے اظلال و آثار ہیں یا ایسا سمجھ سکتا ہے کہ خود کلماتِ الٰہی ہی ہیں جو بقدرتِ الٰہی مخلوقیت کے رنگ میں آ جاتے ہیں۔ کلام الٰہی کی عبارت ان دونوں معنوں کے سمجھنے کے لئے وسیع ہے۔ اور بعض مواضع قرآن کی ظاہری عبارت میں مخلوقات کا نام کلمات اللہ رکھا گیا ہے جو تجلّیاتِ ربوبیت ہیں بقدرتِ الٰہی لوازم و خواص جدیدہ حاصل کر کے حدوث کے کامل رنگ سے رنگین ہو گئے۔ اور درحقیقت یہ ایک سرّ اُن اسرار خالقیت میں سے ہے جو عقل کے چرخ پر چڑھا کر اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتے اور عوام کے لئے سیدھا راہ سمجھنے کا یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کرنا چاہا وہ ہو گیا اور سب کچھ اسی کا پیدا کردہ اور اُسی کی مخلوق اور اُسی کے دست قدرت سے نکلا ہوا ہے۔ لیکن عارفوں پر کشفی طور سے بعد مجاہدات یہ کیفیت حدوث کھل جاتی ہے اور نظر کشفی میں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام ارواح و اجسام کلمات اللہ ہی ہیں۔ جو حکمت کاملہ الٰہی پیرایہ حدوث و مخلوقیت سے متلبس ہو گئے ہیں۔ مگر اصل محکم جس پر قدم مارنا اور قائم رہنا ضروری ہے یہ ہے کہ اِن کشفیات و معقولات سے قدر مشترک لیا جائے۔ یعنی یہ کہ خدائے تعالیٰ ہریک چیز کا خالق اور محدث ہے اور کوئی چیز کیا ارواح اور کیا اجسام بغیر اس کے ظہور پذیر نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ کلام الٰہی کی عبارت اس جگہ درحقیقت ذوالوجوہ ہے اور جس قدر قطع اور یقین کے طور پر قرآن شریف ہدایت کرتا ہے وہ یہی ہے کہ ہریک چیز خدائے تعالیٰ سے ظہور پذیر و وجود پذیر ہوئی ہے اور کوئی چیز بغیر اس کے پیدا نہیں ہوئی۔ اور نہ خود بخود ہے۔ سو اس قدر اعتقاد ابتدائی حالت کے لئے کافی ہے۔ پھر آگے معرفت کے میدانوں میں سیر کرنا جس کو نصیب ہو گا اس پر بعد مجاہدات خود وہ کیفیت کھل جائیگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۱۲۵-۱۲۷ حاشیہ)

اسجگہ اس نکتہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ خدائے تعالیٰ جو علّت العلل ہے جس کے وجود کے ساتھ تمام وجودوں کا سلسلہ وابستہ ہے جب وہ کبھی مربیانہ یا قاہرانہ طور پر کوئی جنبش اور حرکت ارادی کسی امر کے پیدا کرنے کے لئے کرتا ہے تو وہ حرکت اگر اتم اور اکمل طور پر ہو تو جمیع موجودات کی حرکت کو مستلزم ہوتی ہے۔ اور اگر بعض شیون کے لحاظ سے یعنی جزئی حرکت ہو تو اُسی کے موافق عالم کے بعض اجزاء میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خدائے عزّ و جلّ کے ساتھ

اُس کی تمام مخلوقات اور جمیع عالموں کا جو علاقہ ہے وہ اُس علاقہ سے مشابہ ہے جو جسم کو جان سے ہوتا ہے اور جیسے جسم کے تمام اعضاء رُوح کے ارادوں کے تابع ہوتے ہیں اور جس طرف رُوح جھکتی ہے اُسی طرف وہ جھک جاتے ہیں۔ یہی نسبت خدائے تعالیٰ اور اس کی مخلوقات میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ مَیں صاحبِ فصوص کی طرح حضرت واجب الوجود کی نسبت یہ تو نہیں کہتا کہ خلق الاشیاء و ھو عینھا مگر یہ ضرور کہتا ہوں خلق الاشیاء وھو کعینھا۔ ھٰذا العالم کصرحٍ ممرّدٍ من قواریر۔ ما الطاقت العظمیٰ یجری تحتھا ویفعل ما یرید یخیّل فی عیونٍ قاصرۃ کانّھا ھو۔ یحسبون الشمس والقمر والنجوم مؤثرات بذاتھا ولا مؤثر الّا ھو۔

حکیم مطلق نے میرے پر یہ راز سربستہ کھول دیا ہے کہ یہ تمام عالم معہ اپنے جمیع اجزاء کے اس علت العلل کے کاموں اور ارادوں کی انجام دہی کے لئے سچ مچ اس اعضاء کی طرح واقع ہے جو خودبخود قائم نہیں بلکہ ہر وقت اس رُوح اعظم سے قوت پاتا ہے۔ جیسے جسم کی تمام قوتیں جان کی طفیل سے ہی ہوتی ہیں اور یہ عالم جو اس وجود اعظم کے لئے قائم مقام اعضاء کا ہے۔ بعض چیزیں اس میں ایسی ہیں کہ گویا اس کے چہرے کا نور ہیں جو ظاہری یا باطنی طور پر اس کے ارادوں کے موافق روشنی کا کام دیتی ہیں۔ اور بعض ایسی چیزیں ہیں کہ گویا اس کے ہاتھ ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں کہ گویا اُس کے پَیر ہیں اور بعض اس کے سانس کی طرح ہیں۔ غرض یہ مجموعۂ عالم خدائے تعالیٰ کے لئے بطور ایک اندام کے واقع ہے۔ اور تمام آب و تاب اس اندام کی اور ساری زندگی اس کی اُسی رُوح اعظم سے ہے جو اس کی قیّوم ہے۔ اور جو کچھ اس قیّوم کی ذات میں ارادی حرکت پیدا ہوتی ہے وہی حرکت اُس اندام کے کل اعضاء یا بعض میں جیسا کہ اُس قیّوم کی ذات کا تقاضا ہو پیدا ہو جاتی ہے۔

اِس بیان مذکورہ بالا کی تصویر دکھلانے کے لئے تخیلی طور پر ہم فرض کر سکتے ہیں کہ قیّوم العالمین ایک ایسا وجود اعظم ہے جس کے لئے بے شمار ہاتھ بے شمار پَیر اور ہر ایک عضو اس کثرت سے ہے کہ تعداد سے خارج اور لا انتہا عرض اور طول رکھتا ہے اور تندوی کی طرح اس وجود اعظم کی تاریں بھی ہیں جو صفحۂ ہستی کے تمام کناروں تک پھیل رہی ہیں اور کشش کا کام دے رہی ہیں یہ وہی اعضاء ہیں جن کا دوسرے لفظوں میں عالم نام ہے۔ جب قیّوم عالم کوئی حرکت جُزوی یا کُلّی کرے گا تو اس کی حرکت کے ساتھ اس کے اعضاء میں حرکت پیدا ہو جانا ایک لازمی امر ہوگا اور وہ اپنے تمام ارادوں کو انہیں اعضاء کے ذریعہ سے ظہور میں لائے گا نہ کسی اور طرح سے۔ پس یہی ایک عام فہم مثال اس روحانی امر کی ہے کہ جو کہا گیا ہے کہ مخلوقات کی ہریک جزو خدا تعالیٰ کے ارادوں کی تابع

اور اُس کے مقاصد مخفیہ کو اپنے خادمانہ چہرہ میں ظاہر کر رہی ہے۔ اور کمال درجہ کی اطاعت سے اُس کے ارادوں کی راہ میں محو ہو رہی ہے۔ اور یہ اطاعت اس قسم کی ہرگز نہیں ہے جس کی صرف حکومت اور زبردستی پر بنا ہو بلکہ ہریک چیز کو خدائے تعالیٰ کی طرف ایک مقناطیسی کشش پائی جاتی ہے اور ہریک ذرّہ ایسا بالطبع اس کی طرف جھکا ہوا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک وجود کے متفرق اعضاء اُس وجود کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس درحقیقت یہی سچ ہے اور بالکل سچ ہے کہ یہ تمام عالم اُس وجود اعظم کے لئے بطور اعضاء کے واقعہ ہے اور اُسی وجہ سے وہ **قیوم العالمین** کہلاتا ہے۔ کیونکہ جیسی جان اپنے بدن کی قیوم ہوتی ہے ایسا ہی وہ تمام مخلوقات کا قیوم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نظام عالم کا بالکل بگڑ جاتا۔

ہریک ارادہ اس قیوم کا خواہ وہ ظاہری ہے یا باطنی۔ دینی ہے یا دنیوی اسی مخلوقات کے توسط سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور کوئی ایسا ارادہ نہیں کہ بغیر ان وسائط کے زمین پر ظاہر ہوتا ہو۔ یہی قدیمی قانون قدرت ہے کہ جو ابتداء سے بندھا ہوا چلا آتا ہے۔

(توضیح مرام صفحہ ۴۰-۴۲)

اس میں کلام کی جگہ نہیں کہ جو کچھ اجرام فلکی اور عناصر میں جسمانی اور فانی طور پر صفات پائی جاتی ہیں وہ روحانی اور ابدی طور پر خدا تعالیٰ میں موجود ہیں۔ اور خدا تعالیٰ نے یہ بھی ہم پر کھول دیا ہے کہ سورج وغیرہ بذات خود کچھ چیز نہیں ہیں۔ یہ اسی کی طاقت زبردست ہے جو پردہ میں ہر ایک کام کر رہی ہے۔ وہی ہے جو چاند کو پردہ پوش اپنی ذات کا بنا کر اندھیری راتوں کو روشنی بخشتا ہے۔ جیسا کہ وہ تاریک دلوں میں خود داخل ہو کر اُن کو منوّر کر دیتا ہے اور آپ انسان کے اندر بولتا ہے۔ وہی ہے جو اپنی طاقتوں پر سورج کا پردہ ڈال کر دن کو ایک عظیم الشان روشنی کا مظہر بنا دیتا ہے اور مختلف فصلوں میں مختلف اپنے کام ظاہر کرتا ہے۔ اُسی کی طاقت آسمان سے برستی ہے جو مینہ کہلاتی ہے۔ اور خشک زمین کو سرسبز کر دیتی ہے اور پیاسوں کو سیراب کر دیتی ہے۔ اُسی کی طاقت آگ میں ہو کر جلاتی ہے۔ اور ہوا میں ہو کر دم کو تازہ کرتی ہے اور پھولوں کو شگفتہ کرتی اور بادلوں کو اُٹھاتی اور آواز کو کانوں تک پہنچاتی ہے۔ یہ اُسی کی طاقت کہ زمین کی شکل میں مجسّم ہو کر نوع انسان اور حیوانات کو اپنی پشت پر اٹھا رہی ہے۔ مگر کیا یہ چیزیں خدا ہیں؟ نہیں بلکہ مخلوق۔ مگر ان کے اجرام میں خدا کی طاقت ایسے طور سے پیوست ہو رہی ہے کہ جیسے قلم کے ساتھ ہاتھ ملا ہوا ہے۔ اگرچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قلم لکھتی ہے مگر قلم نہیں لکھتی بلکہ ہاتھ لکھتا ہے۔ یا

مثلاً ایک لوہے کا ٹکڑا جو آگ میں پڑ کر آگ کی شکل میں بن گیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جلاتا ہے اور روشنی بھی دیتا ہے۔ مگر دراصل وہ صفات اس کی نہیں بلکہ آگ کی ہیں۔ اسی طرح تحقیق کی نظر سے یہ بھی سچ ہے کہ جس قدر اجرام فلکی و عناصر ارضی بلکہ ذرّہ ذرّہ عالم سفلی اور علوی کا مشہود اور محسوس ہے یہ سب باعتبار اپنی مختلف خاصیتوں کے جو اُن میں پائی جاتی ہیں خدا کے نام ہیں اور خدا کی صفات ہیں۔ اور خدا کی طاقت ہے جو ان کے اندر پوشیدہ طور پر جلوہ گر ہے۔ اور یہ سب ابتداء میں اسی کے کلمے تھے جو اس کی قدرت نے ان کو مختلف رنگوں میں ظاہر کر دیا۔ نادان سوال کرے گا کہ خدا کے کلمے کیونکر مجسم ہوئے۔ کیا خدا اُن کے علیحدہ ہونے سے کم ہو گیا۔ مگر اس کو سوچنا چاہیئے کہ آفتاب سے جو ایک آتشی شیشی آگ حاصل کرتی ہے وہ آگ آفتاب میں کچھ کم نہیں کرتی۔ ایسا ہی جو کچھ چاند کی تاثیر سے پھلوں میں فربہی آتی ہے وہ چاند کو دُبلا نہیں کر دیتی۔ یہی خدا کی معرفت کا ایک بھید ہے اور تمام روحانی امور کا مرکز ہے کہ خدا کے کلمات سے ہی دنیا کی پیدائش ہے۔

(نسیم دعوت ص۵۸-۶۰)

جب میں ان بڑے بڑے اجرام کو دیکھتا ہوں اور اُن کی عظمت اور عجائبات پر غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ صرف ارادۂ الٰہی سے اور اس کے اشارہ سے ہی سب کچھ ہو گیا تو میری رُوح بے اختیار بول اُٹھتی ہے کہ اے ہمارے قادر خدا تو کیا ہی بزرگ قدرتوں والا ہے۔ تیرے کام کیسے عجیب اور وراء العقل ہیں۔ نادان ہے وہ جو تیری قدرتوں کا انکار کرے اور احمق ہے وہ جو تیری نسبت یہ اعتراض پیش کرے کہ اُس نے اِن چیزوں کو کس مادہ سے بنایا؟

(نسیم دعوت ص۶۰ حاشیہ)

خدا تعالیٰ جو ہمارا خدا کہلاتا ہے اُس کی خُدائی کی اصل حقیقت یہی ہے کہ وہ ایک مبدء فیض وجود ہے جس کے ہاتھ سے وہ سب وجودوں کا نمود ہے۔ اُسی سے اس کا استحقاق معبودیت پیدا ہوتا ہے اور اسی سے ہم بخوشی دل قبول کرتے ہیں کہ اس کا ہمارے بدن ودل و جان پر قبضہ استحقاقی قبضہ ہے۔ کیونکہ ہم کچھ بھی نہ تھے اسی نے ہم کو وجود بخشا۔ پس جس نے عدم سے ہمیں موجود کیا وہ کامل استحقاق سے ہمارا مالک ہے۔

(شحنۂ حق ص۱۰۲)

اصل بات یہ ہے کہ خدا کی قدرت میں جو ایک خصوصیت ہے جس سے وہ خدا کہلاتا ہے وہ روحانی اور جسمانی قوتوں کے پیدا کرنے کی خاصیت ہے۔ مثلاً جانداروں کے جسم کو جو اُس نے

آنکھیں عطا کی ہیں اس کام میں اس کا اصل کمال یہ نہیں ہے کہ اُس نے یہ آنکھیں بنائیں۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ اُس نے ذرّاتِ جسم میں پہلے سے یہ پوشیدہ طاقتیں پیدا کر رکھی تھیں جن میں بینائی کا نور ہو سکے۔ پس اگر وہ طاقتیں خود بخود ہیں تو پھر خدا کچھ بھی چیز نہیں۔ کیونکہ بقول شخصیکہ "گھی سنوارے سالنا بڑی بہو کا نام" اُس بینائی کو وہ طاقتیں پیدا کرتی ہیں خدا کو اُس میں کچھ دخل نہیں۔ اور اگر ذرّاتِ عالم میں وہ طاقتیں نہ ہوتیں تو خدائی بے کار رہ جاتی۔ پس ظاہر ہے کہ خدائی کا تمام مدار اس پر ہے کہ اُس نے رُوحوں اور ذرّات عالم کی تمام قوتیں خود پیدا کی ہیں اور کرتا ہے اور خود اُن میں طرح طرح کے خواص رکھے ہیں اور رکھتا ہے۔ پس وہی خواص جوڑنے کے وقت اپنا کرشمہ دکھلاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے خدا کے ساتھ کوئی موجد برابر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ گو کوئی شخص ریل کا موجد ہو یا تار کا یا فوٹو گراف کا یا پریس کا یا کسی اَور صنعت کا اس کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ ان قوتوں کا موجد نہیں جن قوتوں کے استعمال سے وہ کسی صنعت کو تیار کرتا ہے۔ بلکہ یہ تمام موجد بنی بنائی قوتوں سے کام لیتے ہیں جیسا کہ انجن چلانے میں بھاپ کی طاقتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ پس فرق یہی ہے کہ خدا نے عنصر وغیرہ میں یہ طاقتیں خود پیدا کی ہیں۔ مگر یہ لوگ خود طاقتیں اور قوتیں پیدا نہیں کر سکتے۔ پس جب تک خدا کو ذرّات عالم اور ارواح کی تمام قوتوں کا موجد نہ ٹھہرایا جائے تب تک خدائی اُس کی ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی اور اس صورت میں اس کا درجہ ایک معمار یا نجّار یا حدّاد یا گلگو سے ہرگز زیادہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک بدیہی بات ہے جو ردّ کے قابل نہیں۔

(نسیم دعوت ص ۲۲-۲۳)

ہم اپنے کامل ایمان اور پوری معرفت سے یہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ اصول آریہ سماجیوں کا ہرگز درست نہیں کہ ارواح اور ذرّات اپنی تمام قوتوں کے ساتھ قدیم اور انادی اور غیر مخلوق ہیں۔ اس سے تمام وہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے جو خدا میں اور اس کے بندوں میں ہے۔ یہ ایک نیا اور مکروہ مذہب ہے جو پنڈت دیانند نے پیش کیا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وید سے کہاں تک اس مذہب کا تعلق ہے لیکن ہم اس پر بحث کرتے ہیں کہ یہ اصول جو آریہ سماجیوں نے اپنے ہاتھ سے شائع کیا ہے یہ عقلِ سلیم کے نزدیک کامل معرفت اور کامل غور اور کامل سوچ کے بعد ہرگز درست نہیں سناتن دھرم کا اصول جو اس کے مقابل پر پڑا ہوا ہے اس کو اگر ویدانت کے بے جا مبالغہ نے بدشکل کر دیا ہے اور ویدانتوں کی افراط نے بہت سے اعتراضات کا موقعہ دے دیا ہے تاہم اس میں

سچائی کی ایک چمک ہے۔ اگر اس عقیدے کو نعوذ باللہ سے الگ کر دیا جائے تو ماحصل اس کا یہی ہوتا ہے کہ ہر ایک چیز پرمیشر کے ہی ہاتھ سے نکلی ہے۔ پس اس صورت میں تمام شبہات دُور ہو جاتے ہیں اور ماننا پڑتا ہے کہ بموجب اصول سناتن دھرم کے وید کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ تمام ارواح اور ذرّات اجسام اور انکی قوتیں اور طاقتیں اور گُن اور خاصیتیں خدا کی طرف سے ہیں۔

(نسیم دعوت ص ۲۵-۲۶)

قرآن شریف نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ انسان مع اپنی رُوح اور تمام قوتوں اور ذرّہ ذرّہ وجود کے خدا کی مخلوق ہے جس کو اُس نے پیدا کیا۔ لہذا قرآن شریف کی تعلیم کی رُو سے ہم خدا تعالیٰ کے خالص مِلک ہیں اور اس پر ہمارا کوئی بھی حق نہیں جس کا ہم اُس سے مطالبہ کریں۔ یا جس کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے وہ ملزم ٹھہر سکے۔ اس لئے ہم اپنے مقابل پر خدا کا نام منصف نہیں رکھ سکتے بلکہ ہم بالکل تہی دست ہونے کی وجہ سے اُس کا نام رحیم رکھتے ہیں۔ غرض منصف کہنے کے اندر یہ شرارت مخفی ہے کہ گویا ہم اس کے مقابل پر کوئی حقوق رکھتے ہیں۔ اور اس حق کو ادا نہ کرنے کی صورت میں اس کو حق تلفی کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔

(چشمۂ معرفت ص ۲۸)

لیکن قرآن شریف نے وید کی طرح بے وجہ اور محض زبردستی کے طور پر اللہ جلّ شانہٗ کو تمام ارواح اور ہر ایک ذرّہ ذرّہ اجسام کا مالک نہیں ٹھہرایا۔ بلکہ اُس کی ایک وجہ بیان کی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ له ملك السمٰوٰت والارض۔ خلق كلّ شيءٍ فقدّره تقديرًا (ترجمہ) یعنی زمین اور آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے سب خدا تعالیٰ کی ملکیت ہے کیونکہ وہ سب چیزیں اس نے پیدا کی ہیں۔ اور پھر ہر ایک مخلوق کی طاقت اور کام کی ایک حد مقرر کر دی ہے تا محدود چیزیں ایک محدّد پر دلالت کریں جو خدا تعالیٰ ہے۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ جیسا کہ اجسام اپنے اپنے حدود میں مقید ہیں اور اس حد سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ارواح بھی مقید ہیں اور اپنی مقررہ طاقتوں سے زیادہ کوئی طاقت پیدا نہیں کر سکتے۔ اب پہلے ہم اجسام کے محدود ہونے کے بارہ میں بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ مثلاً چاند ایک مہینہ میں اپنا دورہ ختم کر لیتا ہے یعنی انتیس یا تیس دن تک مگر سورج تین سو چونسٹھ ۳۶۴ دن میں اپنے دورہ کو پورا کرتا ہے۔ اور سورج کو یہ طاقت نہیں ہے کہ اپنے دورہ کو اس قدر کم کر دے جیسا کہ چاند کے دورہ کا مقدار ہے۔ اور نہ چاند کی یہ طاقت ہے کہ اس قدر اپنے دورہ کے دن بڑھا دے کہ جسقدر سورج کے لئے دن مقرر ہیں۔ اور اگر تمام دنیا

اس بات کے لئے اتفاق بھی کر لے کہ ان دونوں نیروں کے دَوروں میں کچھ کمی بیشی کر دیں تو یہ ہرگز اُن کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ اور نہ خود سورج اور چاند میں یہ طاقت ہے کہ اپنے اپنے دوروں میں کچھ تغیر، تبدل کر ڈالیں۔

پس وہ ذات جس نے ان ستاروں کو اپنی اپنی حدّ پر ٹھہرا رکھا ہے۔ یعنی جو ان کا محدّد اور حد باندھنے والا ہے وہی خدا ہے۔ ایسا ہی انسان کے جسم اور ہاتھی کے جسم میں بڑا فرق ہے۔ اگر تمام ڈاکٹر اس بات کے لئے اکٹھے ہوں کہ انسان اپنی جسمانی طاقتوں اور جسم کی ضخامت میں ہاتھی کے برابر ہو جاوے تو یہ اُن کے لئے غیر ممکن ہے۔ اور اگر یہ چاہیں کہ ہاتھی محض انسان کے قد تک محدود رہے تو یہ بھی اُن کے لئے غیر ممکن ہے۔ پس اس جگہ بھی ایک تحدید ہے یعنی حد باندھنا۔ جیساکہ سورج اور چاند میں ایک تحدید ہے اور وہی تحدید ایک محدّد یعنی حد باندھنے والے پر دلالت کرتی ہے یعنی اس ذات پر دلالت کرتی ہے جس نے ہاتھی کو وہ مقدار بخشا اور انسان کیلئے وہ مقدار مقرر کیا۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو ان تمام جسمانی چیزوں میں عجیب طور سے خدا تعالیٰ کا ایک پوشیدہ تصرّف نظر آتا ہے۔ اور عجیب طور پر اس کی حد بندی مشاہدہ ہوتی ہے۔ ان کیڑوں کی مقدار سے لے کر جو بغیر دوربین کے دکھائی نہیں دے سکتے ان بڑی بڑی مچھلیوں کی مقدار تک جو ایک بڑے جہاز کو بھی چھوٹے سے لقمے کی طرح نگل سکتی ہیں حیوانی اجسام میں ایک عجیب نظارہ حد بندی کا نظر آتا ہے۔ کوئی جانور اپنے جسم کی رُو سے اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتا ایسا ہی وہ تمام ستارے جو آسمان پر نظر آتے ہیں اپنی اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتے۔ پس یہ حد بندی دلالت کر رہی ہے کہ در پردہ کوئی حد باندھنے والا ہے۔ یہی معنے اس مذکورہ بالا آیت کے ہیں کہ خلق کلّ شیءٍ فقدّرہٗ تقدیرًا۔

اب واضح ہو کہ جیساکہ یہ حد بندی اجسام میں پائی جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ حد بندی ارواح میں بھی ثابت ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ جسقدر انسانی رُوح اپنے کمالات ظاہر کر سکتا ہے۔ یا یوں کہو کہ جس قدر کمالات کی طرف ترقی کر سکتا ہے وہ کمالات ایک ہاتھی کی رُوح کو باوجود ضخیم اور جسیم ہونے کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ہر ایک حیوان کی رُوح بلحاظ اپنی قوتوں اور طاقتوں کے اپنے نوع کے دائرہ کے اندر محدود ہے اور وہی کمالات حاصل کر سکتے ہیں کہ جو اس کے نوع کے لئے مقرر اور مقدّر ہیں۔ پس جس طرح اجسام کی حد بندی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اُن کا کوئی حد باندھنے والا اور خالق ہے۔ اسی طرح ارواح کی طاقتوں کی

حدبندی اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ ان کا بھی کوئی خالق اور حد باندھنے والا ہے ۔

(چشمۂ معرفت ص۹-۱۱)

اگر دل میں یہ وہم گذرتا ہو کہ خدا نے مختلف طبائع کیوں پیدا کیں ۔ اور کیوں سب کو ایسی قوتیں عنایت نہ فرمائیں جن سے وہ معرفتِ کاملہ اور محبتِ کاملہ کے درجے تک پہنچ جاتے ۔ تو یہ سوال بھی خدا کے کاموں میں ایک فضول دخل ہے جو ہرگز جائز نہیں ۔ ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ تمام مخلوقات کو ایک ہی درجے پر رکھنا اور سب کو اعلیٰ کمالات کی قوتیں بخشنا خدا پر حق واجب نہیں ۔ یہ تو صرف اس کا فضل ہے ۔ اسے اختیار ہے جس پر چاہے کرے اور جس پر چاہے نہ کرے۔ مثلاً تم کو خدا نے آدمی بنایا اور گدھے کو آدمی نہ بنایا ۔ تم کو عقل دی اور اس کو نہ دی یا تمہارے لئے علم حاصل ہوا اور اس کو نہ ہوا ۔ یہ سب مالک کی مرضی کی بات ہے کوئی ایسا حق نہیں کہ تمہارا تھا اور اُس کا نہ تھا ۔ غرض جس حالت میں خدا کی مخلوقات میں صریح تفاوتِ مراتب پایا جاتا ہے جس کے تسلیم کرنے سے کسی عاقل کو چارہ نہیں تو کیا مالک با اختیار کے سامنے ایسی مخلوقات جن کا موجود ہونے میں بھی کوئی حق نہیں چہ جائیکہ بڑا بننے میں کوئی حق ہو کچھ دم مار سکتی ہے ۔ خدائے تعالےٰ کا بندوں کو خلعتِ وجود بخشنا ایک عطا اور احسان ہے اور ظاہر ہے کہ مُعطی اور مُحسن اپنی عطا اور احسان میں کمی بیشی کا اختیار رکھتا ہے ۔ اور اگر اس کو کم دینے کا اختیار نہ ہو تو پھر زیادہ دینے کا بھی اختیار نہ ہو ۔ تو اس صورت میں وہ مالکانہ اختیارات کے نافذ کرنے سے بالکل قاصر رہ جائے ۔ اور خود ظاہر ہے کہ اگر مخلوق کا خالق پر خواہ نخواہ کوئی حق قرار دیا جائے تو اس سے تسلسل لازم آتا ہے کیونکہ جس درجے پر خالق کسی مخلوق کو بنائیگا اسی درجے پر وہ مخلوق کہہ سکتا ہے کہ میرا حق اس سے زیادہ ہے ۔ اور چونکہ خدائے تعالیٰ غیر متناہی مراتب پر بنا سکتا ہے ۔ اور اس کی لا انتہا قدرت کے آگے صرف آدمی بنانے پر فضیلت پیدائش ختم نہیں تو اس صورت میں سلسلۂ سوالاتِ مخلوق کبھی ختم نہ ہوگا اور ہر ایک مرتبۂ پیدائش پر الیٰ غیر النّہایت اس کو اپنے حق کے مطالبہ کا استحقاق حاصل ہوگا اور یہی تسلسل ہے ۔

ہاں اگر یہ جستجو ہے کہ اس تفاوتِ مراتب رکھنے میں حکمت کیا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس بارے میں قرآن شریف نے تین حکمتیں بیان فرمائی ہیں ۔ جو عند العقل نہایت بدیہی اور روشن ہیں جس سے کوئی عاقل انکار نہیں کر سکتا ۔ اور وہ بہ تفصیل ذیل ہیں :۔

اوّل یہ کہ تا مہمّاتِ دنیا یعنی امورِ معاشرت باحسن وجہ صورت پذیر ہوں جیسا فرمایا ہے

وقالوا لولا نزّل ھٰذا القراٰن علیٰ رجل من القریتین عظیم۔ أھم یقسمون رحمت ربّک۔ نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیٰوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضًا سخریًّا۔ ورحمت ربک خیر مما یجمعون الجزو نمبر ۲۵۔ یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکّہ اور طائف کے بڑے بڑے مال داروں اور رئیسوں میں سے کسی بھاری رئیس اور دولتمند پر کیوں نازل نہ ہُوا تا اس کی رئیسانہ شان کے شایاں ہوتا۔ اور نیز اس کے رعب اور سیاست اور مال خرچ کرنے سے جلد تر دین پھیل جاتا۔ ایک غریب آدمی جس کے پاس دنیا کی جائیدادوں سے کچھ بھی نہیں کیوں اس عہدے سے ممتاز کیا گیا؟ (پھر آگے بطور جواب فرمایا) أھم یقسمون رحمة ربّک۔ کیا قسّام ازل کی رحمتوں کا تقسیم کرنا ان کا اختیار ہے۔ یعنی یہ خداوند حکیم مطلق کا فعل ہے کہ بعضوں کی استعدادیں اور ہمتیں پست رکھیں اور وہ زخارف دنیا میں پھنسے رہے۔ اور رئیس اور امیر اور دولتمند کہلانے پر پھولتے رہے اور اصل مقصود کو بھول گئے اور بعض کو فضائل روحانیت اور کمالات قدسیہ عنایت فرمائے اور وہ اس محبوبِ حقیقی کی محبت میں محو ہو کر مقرب بن گئے اور مقبولانِ حضرت احدیّت ہو گئے۔ (پھر بعد اس کے اس حکمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو اس اختلافِ استعدادات اور تباین خیالات میں مخفی ہے) نحن قسمنا بینھم معیشتھم الخ یعنی ہم نے اس لئے بعض کو دولتمند اور بعض کو درویش اور بعض کو لطیف طبع اور بعض کو کثیف طبع اور بعض طبیعتوں کو کسی پیشہ کی طرف مائل اور بعض کو کسی پیشہ کی طرف مائل رکھا ہے تا اُنکو یہ آسانی پیدا ہو جائے کہ بعض کے لئے بعض کاربرار اور خادم ہوں اور صرف ایک پر بھار نہ پڑے۔ اور اس طور پر مہمّات بنی آدم بآسانی تمام چلتے رہیں۔ اور پھر فرمایا کہ اس سلسلہ میں دنیا کے مال ومتاع کی نسبت خدا کی کتاب کا وجود زیادہ تر نفع رساں ہے۔ یہ ایک لطیف اشارہ ہے جو ضرورتِ الہام کی طرف فرمایا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے اور بجز ایک دوسرے کی مدد کے کوئی امر اس کا انجام پذیر نہیں ہوسکتا۔ مثلاً ایک روٹی کو دیکھیے جس پر زندگانی کا مدار ہے۔ اس کے تیار ہونے کے لئے کس قدر تمدّن وتعاون درکار ہے۔ زراعت کے تردّد سے لے کر اس وقت تک کہ روٹی پک کر کھانے کے لائق ہو جائے بیسیوں پیشہ وروں کی اعانت کی ضرورت ہے۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ عام امورِ معاشرت میں کس قدر تعاون اور باہمی مدد کی ضرورت ہو گی۔ اسی ضرورت کے انصرام کے لئے حکیم مطلق نے بنی آدم کو مختلف طبیعتوں اور استعدادوں پر پیدا کیا تا ہر ایک شخص اپنی استعداد اور میلِ طبع کے موافق کسی کام میں بہ طیب خاطر مصروف ہو

کوئی کھیتی کرے۔ کوئی آلات زراعت بنا دے۔ کوئی آٹا پیسے۔ کوئی پانی لا دے۔ کوئی روٹی پکا دے کوئی سوت کاتے۔ کوئی کپڑا بنے۔ کوئی دوکان کھولے۔ کوئی تجارت کا اسباب لادے۔ کوئی نوکری کرے اور اس طرح پر ایک دوسرے کے معاون بن جاویں۔ اور بعض کو بعض مدد پہنچاتے رہیں پس جب ایک دوسرے کی معاونت ضروری ہوئی تو ان کا ایک دوسرے سے معاملہ پڑنا بھی ضروری ہو گیا۔ اور جب معاملہ اور معاوضہ میں پڑ گئے اور اس پر غفلت بھی جو استغراقِ امور دنیا کا خاصہ ہے عائدِ حال ہو گئی تو اُن کے لئے ایک ایسے قانونِ عدل کی ضرورت پڑی جو اُن کو ظلم اور تعدّی اور بغض اور فساد اور غفلت من اللہ سے روکتا رہے تا نظامِ عالم میں ابتری واقع نہ ہو۔ کیونکہ معاش و معاد کا تمام مدار انصاف اور خدا شناسی پر ہے۔ اور التزام انصاف و خدا ترسی ایک قانون پر موقوف ہے جس میں دقائق معدلت و حقائق معرفت الٰہی بدرستی تمام درج ہوں اور سہواً یا عمداً کسی نوع کا ظلم یا کسی نوع کی غلطی نہ پائی جاوے۔ اور ایسا قانون اسی کی طرف سے صادر ہو سکتا ہے جس کی ذات سہو و خطا و ظلم و تعدی سے بکلّی پاک ہو۔ اور نیز اپنی ذات میں واجب الانقیاد اور واجب التعظیم بھی ہو۔ کیونکہ گو کوئی قانون عمدہ ہو مگر قانون کا جاری کرنے والا اگر ایسا نہ ہو جس کو باعتبار مرتبہ اپنے کسی کے سب پر فوقیت اور حکمرانی کا حق ہو یا اگر ایسا نہ ہو جس کا وجود لوگوں کی نظر میں ہر ایک طور کے ظلم و خبث اور خطا اور غلطی سے پاک ہو تو ایسا قانون اوّل تو چل ہی نہیں سکتا۔ اور اگر کچھ دن چلے بھی تو چند ہی روز میں طرح طرح کے مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور بجائے خیر کے شر کا موجب ہو جاتا ہے۔ ان تمام وجوہ سے کتاب الٰہی کی حاجت ہوئی کیونکہ ساری نیک صفتیں اور ہر ایک طور کی کمالیت و خوبی صرف خدا ہی کی کتاب میں پائی جاتی ہے۔ وبس۔

دوم حکمت تفاوتِ مراتب رکھنے میں یہ ہے کہ نیک اور پاک لوگوں کی خوبی ظاہر ہو۔ کیونکہ ہر ایک خوبی مقابلہ ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا ہے۔ اِنّا جعلنا ما علی الارض زینةً لّھا لنبلوھم ایّھم احسن عملًا۔ الجزو نمبر ۱۵۔ یعنی ہم نے ہر ایک چیز کو جو زمین پر ہے زمین کی زینت بنا دیا ہے۔ تا جو لوگ صالح آدمی ہیں بمقابلہ بُرے آدمیوں کے اُن کی صلاحیت آشکارا ہو جائے۔ اور کثیف کے دیکھنے سے لطیف کی لطافت کھل جائے۔ کیونکہ ضِد کی حقیقت ضِد ہی سے شناخت کی جاتی ہے اور نیکوں کا قدر و منزلت بدوں ہی سے معلوم ہوتا ہے۔

سوم حکمت تفاوتِ مراتب رکھنے میں انواع و اقسام کی قدرتوں کا ظاہر کرنا۔ اور اپنی عظمت کی طرف توجہ دلانا ہے۔ جیسے فرمایا۔ مالکم لا ترجون للّٰہ وقارًا۔ وقد خلقکم اطوارًا۔ نمبر۲۹۔ یعنی تم کو کیا ہو گیا کہ تم خدا کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے۔ حالانکہ اُس نے اپنی عظمت ظاہر کرنے کے لئے تم کو مختلف صورتوں اور سیرتوں پر پیدا کیا یعنی اختلافِ استعدادات وطبائع اسی غرض سے حکیم مطلق نے کیا تا اُس کی عظمت و قدرت شناخت کی جائے۔ جیسا دوسری جگہ بھی فرمایا ہے۔ واللّٰہ خلق کلّ دآبّۃٍ مّن مّآءٍ فمنھم من یمشی علٰی بطنہٖ ومنھم من یمشی علٰی رجلین۔ ومنھم من یمشی علٰی اربعٍ ط یخلق اللّٰہ مایشآء ط ان اللّٰہ علٰی کلّ شیءٍ قدیر۔ الجزو نمبر۱۸۔ یعنی خدا نے ہر ایک جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ سو بعض جاندار پیٹ پر چلتے ہیں۔ اور بعض دو پاؤں پر۔ بعض چار پاؤں پر۔ خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے یہ مختلف چیزیں اس لئے بنائیں کہ تا مختلف قدرتیں اس کی ظاہر ہوں۔ غرض اختلافِ طبائع جو فطرتِ مخلوقات میں واقع ہے اس میں حکمتِ الٰہیہ انہیں امورِ ثلاثہ میں منحصر ہے جن کو خدائے تعالیٰ نے آیاتِ ممدوحہ میں بیان کر دیا۔ فتدبّر

(براہین احمدیہ ص۱۹۳-۱۹۷ حاشیہ ۱۱)

پنڈت دیانند کی ستیارتھ پرکاش اردو کے ص۵۰۱ میں لکھا ہے کہ پرمیشر کسی کا گناہ بخش نہیں سکتا۔ ایسا کرے تو بے انصاف ٹھہرتا ہے۔ پس اس نے مان لیا ہے کہ پرمیشر محض ایک جج کی طرح ہے مالکانہ حیثیت اس کو حاصل نہیں۔ ایسا ہی پنڈت دیانند نے اپنی کتاب ترجمہ شدہ کے صفحہ ۵۰۱ میں لکھا ہے کہ پرمیشر محدود افعال کا ثمرہ غیر محدود نہیں دے سکتا۔ پس ظاہر ہے کہ اگر وہ مالکانہ اختیار رکھتا ہے تو محدود خدمت کے عوض میں غیر محدود ثمرہ دینے کا اس میں کیا حرج ہے۔ کیونکہ مالک کے کاموں کے ساتھ انصاف کا کچھ تعلق نہیں۔ ہم بھی اگر کسی مال کے مالک ہو کر سوالیوں کو کچھ دینا چاہیں تو کسی سوالی کا حق نہیں کہ یہ شکایت کرے کہ فلاں شخص کو زیادہ دیا اور مجھے کم دیا۔ اسی طرح کسی بندہ کا خدا تعالیٰ کے مقابل پر حق نہیں کہ اس سے انصاف کا مطالبہ کرے۔ کیونکہ جس حالت میں جو کچھ بندہ ہے وہ سب کچھ خدا ہے تو نہ تو یہ بندہ کا حق ہے کہ انصاف کی رو سے اس سے فیصلہ چاہے اور نہ خدا کی یہ شان ہے کہ اپنی مخلوق کا یہ مرتبہ تسلیم کرلے کہ وہ لوگ اس سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے لئے مجاز ہیں۔ پس درحقیقت جو کچھ خدا تعالیٰ

بندہ کو اس کے اعمال کی جزائیں دیتا ہے وہ اس کا محض انعام واکرام ہے۔ ورنہ اعمال کچھ چیز نہیں بغیر خدا کی تائید اور فضل کے اعمال کب ہو سکتے ہیں۔ پھر ماسوا اس کے جب ہم خدا کے قانونِ قدرت کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے جو کچھ اپنے بندوں کے لئے مہیا کیا ہے یا کرتا ہے وہ دو قسم کی بخشش ہے۔

ایک تو اس کے وہ انعام واکرام ہیں جو انسانوں کے وجود سے بھی پہلے ہیں اور ایک ذرّہ انسانوں کے عمل کا اُن میں دخل نہیں جیسا کہ اس نے انسانوں کے آرام کے لئے سورج چاند ستارے زمین پانی ہوا آگ وغیرہ چیزیں پیدا کی ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ ان چیزوں کو انسانوں کے وجود اور اُن کے عملوں پر تقدم ہے۔ اور انسان کا وجود اُن کے وجود کے بعد ہے۔ یہ خدا تعالےٰ کی وہ رحمت کی قسم ہے جس کو قرآنی اصطلاح کی رو سے رحمانیت کہتے ہیں۔ یعنی ایسی جود و عطا جو بندہ کے اعمال کی پاداش میں نہیں بلکہ محض فضل کی راہ سے ہے۔

دوسری قسم رحمت کی وہ ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں رحیمیت کہتے ہیں۔ یعنی وہ انعام اکرام جو بنام نہاد پاداش اعمال حسنہ انسان کو عطا ہوتا ہے۔ پس جس خدا نے اپنی فیاضانہ مالکیت کا وہ نمونہ دکھلایا کہ عاجز بندوں کے لئے زمین و آسمان اور چاند سورج وغیرہ بنا دیئے اس وقت میں جبکہ بندوں اور اُن کے اعمال کا نام و نشان نہ تھا کیا اس کی نسبت یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ بندوں کا مدیون ہو کر صرف اُن کے حقوق ادا کرتا ہے اس سے آگے بڑھ کر نہیں! کیا بندوں کا کوئی حق تھا کہ وہ اُن کے لئے زمین و آسمان بناتا اور ہزاروں چمکتے ہوئے اجرام آسمان پر اور ہزارہا آرام اور راحت کی چیزیں زمین پر مہیّا کرتا۔ پس اُس فیاضِ مطلق کو محض ایک جج کی طرح فقط انصاف کرنے والا قرار دینا اور اس کے مالکانہ مرتبہ اور شان سے انکار کرنا کس قدر کفرانِ نعمت ہے۔

(چشمہ معرفت ص ۱۸-۲۰)

یاد رہے کہ مالک ایک ایسا لفظ ہے جس کے مقابل پر تمام حقوق مسلوب ہو جاتے ہیں۔ اور کامل طور پر اطلاق اس لفظ کا صرف خدا پر ہی آتا ہے کیونکہ کامل مالک وہی ہے۔ جو شخص کسی کو اپنی جان وغیرہ کا مالک ٹھہراتا ہے تو وہ اقرار کرتا ہے کہ اپنی جان اور مال وغیرہ پر میرا کوئی حق نہیں اور میرا کچھ بھی نہیں سب مالک کا ہے اس صورت میں اپنے مالک کو یہ کہنا اس کے لئے ناجائز ہے ہو جاتا ہے کہ فلاں مالی یا جانی معاملہ میں میرے ساتھ انصاف کر۔ کیونکہ انصاف حق کو چاہتا،

اور وہ اپنے حقوق سے دستبردار ہو چکا ہے۔ اسی طرح انسان نے جو اپنے مالک حقیقی کے مقابل پر اپنا نام بندہ رکھایا اور انا للہ وانا الیہ راجعون کا اقرار کیا۔ یعنی ہمارا مال۔ جان۔ بدن۔ اولاد سب خدا کی ملک ہے تو اس اقرار کے بعد اس کا کوئی حق نہ رہا جس کا وہ خدا سے مطالبہ کرے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ جو درحقیقت عارف ہیں باوجود صدہا مجاہدات اور عبادات اور خیرات کے اپنے تئیں خدا تعالیٰ کے رحم پر چھوڑتے ہیں اور اپنے اعمال کو کچھ بھی چیز نہیں سمجھتے اور کوئی دعویٰ نہیں کرتے کہ ہمارا کوئی حق ہے یا ہم کوئی حق بجا لائے ہیں۔ کیونکہ درحقیقت نیک وہی ہے جس کی توفیق سے کوئی انسان نیکی کر سکتا ہے اور وہ صرف خدا ہے۔ پس انسان کسی اپنی ذاتی لیاقت اور ہنر کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے انصاف کا مطالبہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ قرآن شریف کی رو سے خدا کے کام سب مالکانہ ہیں جس طرح وہ کبھی گناہ کی سزا دیتا ہے ایسا ہی وہ کبھی گناہ کو بخش بھی دیتا ہے یعنی دونوں پہلوؤں پر اس کی قدرت نافذ ہے۔ جیسا کہ مقتضائے مالکیت ہونا چاہیئے اور اگر وہ ہمیشہ گناہ کی سزا دے تو پھر انسان کا کیا ٹھکانہ ہے بلکہ اکثر وہ گناہ بخش دیتا ہے اور تنبیہ کی غرض سے کسی گناہ کی سزا بھی دیتا ہے۔ تا غافل انسان متنبہ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جیسا کہ قرآن شریف میں یہ آیت ہے ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر۔ دیکھو سورۃ الشوریٰ (ترجمہ) اور جو کچھ تمہیں کچھ مصیبت پہنچتی ہے پس تمہاری بداعمالی کے سبب سے ہے اور خدا بہت سے گناہ بخش دیتا ہے اور کسی گناہ کی سزا دیتا ہے۔ اور پھر اسی سورۃ میں یہ آیت بھی ہے۔ وھو الذی یقبل التوبۃ عن عبادہ و یعفوا عن السیّاٰت۔ یعنی تمہارا خدا وہ خدا ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی بدیاں اُنکو معاف کر دیتا ہے۔ کسی کو یہ دھوکا نہ لگے کہ قرآن شریف میں یہ آیت بھی ہے۔ و من یعمل مثقال ذرّۃ شرًّا یرہٗ۔ یعنی جو شخص ایک ذرّہ بھی شرارت کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا پس یاد رہے کہ اس میں اور دوسری آیات میں کچھ تناقض نہیں۔ کیونکہ اس شرّ سے وہ شرّ مراد ہے جس پر انسان اصرار کرے اور اس کے ارتکاب سے باز نہ آوے اور توبہ نہ کرے۔ اسی غرض سے اس جگہ شرّ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نہ ذنب کا تا معلوم ہو کہ اسجگہ کوئی شرارت کا فعل مراد ہے جس سے شریر آدمی باز آنا نہیں چاہتا۔ ورنہ سارا قرآن شریف اس بارہ میں بھرا پڑا ہے کہ ندامت اور توبہ اور ترک اصرار اور استغفار سے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے

ان اللّٰہ یحب التوّابین ویحبّ المتطهّرین۔ یعنی اللّٰہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔ اور نیز ان لوگوں سے پیار کرتا ہے کہ جو اس بات پر زور لگاتے ہیں کہ کسی طرح گناہ سے پاک ہو جائیں۔ غرض ہر ایک بدی کی سزا دینا خدا تعالےٰ کے اخلاق عفو اور درگذر کے برخلاف ہے کیونکہ وہ مالک ہے نہ صرف ایک مجسٹریٹ کی طرح جیسا کہ اُس نے قرآن شریف کی پہلی سورۃ میں ہی اپنا نام مالک رکھا ہے۔ اور فرمایا ہے۔ مالک یوم الدین۔ یعنی خدا جزا سزا دینے کا مالک ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی مالک مالک نہیں کہلا سکتا جب تک دونوں پہلوؤں پر اس کو اختیار نہ ہو۔ یعنی چاہے تو پکڑے اور چاہے تو چھوڑ دے۔

(چشمۂ معرفت ص ۱۵-۱۶)

پھر ہم اصل بحث کی طرف رجوع کرکے لکھتے ہیں کہ آریوں کے اصول کی رُو سے اُن کے پرمیشر کا نام مالک ٹھہر نہیں سکتا۔ کیونکہ جو اس کے پاس ہے وہ قدرت نہیں رکھتا کہ بغیر کسی کے حق واجب کے اس کو بطور اکرام انعام کچھ دے سکے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص کسی مال کا مالک ہوتا ہے وہ اختیار رکھتا ہے کہ جسقدر اپنے پاس سے چاہے کسی کو دے دے۔ مگر پرمیشر کی نسبت آریوں کا یہ اصول ہے کہ نہ وہ گناہ بخش سکتا ہے اور نہ جود و عطا کے طور پر کسی کو کچھ دے سکتا ہے اور اگر وہ ایسا کرے تو اس سے بے انصافی لازم آتی ہے۔ لہٰذا تناسخ کے ماننے والے کسی طرح کہہ نہیں سکتے کہ پرمیشر مخلوقات کا مالک ہے۔ یہ تو ہم کئی دفعہ لکھ چکے ہیں کہ مالک کی نسبت انصاف کی پابندی کی شرط لگانا بالکل بے جا ہے۔ ہاں ہم مالک کی صفاتِ حسنہ میں سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ رحیم ہے وہ جوّاد ہے وہ فیاض ہے وہ گناہ بخشنے والا ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے زر خرید غلاموں اور گھوڑوں اور گائیوں کی نسبت منصف مزاج ہے کیونکہ انصاف کا لفظ وہاں بولا جاتا ہے جبکہ دونوں طرف ایک قسم کی آزادی حاصل ہو۔ مثلاً ہم مجازی سلاطین کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ وہ منصف ہیں اور رعایا کے ساتھ انصاف کا سلوک کرتے ہیں۔ اور جبتک رعایا اُن کی اطاعت کرے اُن پر بھی انصاف کا قانون یہ واجب کرتا ہے کہ وہ بھی رعایا کی اطاعت اور خراج گذاری کے عوض میں اُن کے مال و جان کی پوری نگہبانی کریں اور ضرورتوں کے وقت اپنے مال سے اُنکی مدد کریں۔ پس ایک پہلو سے سلاطین رعایا پر حکم چلاتے ہیں۔ اور دوسرے پہلو سے رعیت سلاطین پر حکم چلاتی ہے۔ اور جب تک یہ دونوں پہلو اعتدال سے چلتے ہیں تب تک اس ملک میں امن رہتا ہے اور جب کوئی بے اعتدالی رعایا کی طرف سے یا بادشاہوں کی طرف سے ظہور میں آتی ہے تبھی ملک میں سے امن اُٹھ جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہم بادشاہوں کو حقیقی طور پر مالک نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کو رعایا کے ساتھ اور رعایا کو اُن کے ساتھ انصاف کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ مگر ہم خدا کو

اُس کی مالکیت کے لحاظ سے رحیم تو کہہ سکتے ہیں مگر منصف نہیں کہہ سکتے۔ کوئی شخص مملوک ہو کر مالک سے انصاف کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ ہاں تضرّع اور انکسار سے رحم کی درخواست کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے تمام قرآن شریف میں اپنا نام منصف نہیں رکھا۔ کیونکہ انصاف دو طرفہ برابری اور مساوات کو چاہتا ہے۔ ہاں اس طرح پر خدا تعالیٰ منصف ہے کہ بندوں کے باہمی حقوق میں انصاف کرتا ہے۔ لیکن اس طرح منصف نہیں کہ کوئی بندہ شریک کی طرح اُس سے کوئی حق طلب کر سکے کیونکہ بندہ خدا کی مِلک ہے۔ اور اس کو اختیار ہے کہ اپنی مِلک کے ساتھ جس طرح چاہے معاملہ کرے جس کو چاہے بادشاہ بنا دے جس کو چاہے فقیر بنا دے۔ اور جس کو چاہے چھوٹی عمر میں وفات دے اور جس کو چاہے لمبی عمر عطا کرے۔ اور ہم بھی تو جب کسی مال کے مالک ہوتے ہیں تو اس کی نسبت پوری آزادی رکھتے ہیں ہاں خدا رحیم ہے بلکہ ارحم الراحمین ہے۔ وہ اپنے رحم کے تقاضا سے نہ کسی انصاف کی پابندی سے اپنی مخلوقات کی پرورش کرتا ہے۔ کیونکہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ مالک کا مفہوم منصف کے مفہوم سے بالکل ضد پڑا ہُوا ہے۔ جبکہ ہم اس کے پیدا کردہ ہیں تو ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم اس سے انصاف کا مطالبہ کریں۔ ہاں نہایت عاجزی سے اس کے رحم کی ضرور درخواست کرتے ہیں۔ اور اس بندہ کی نہایت بدذاتی ہے جو خدا سے اُس کے کاروبار کے متعلق جو اس بندہ کی نسبت خدا تعالیٰ کرتا ہے انصاف کا مطالبہ کرے۔ جبکہ انسانی فطرت کا سب تار و پود خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور تمام قویٰ روحانی جسمانی اُسی کی عطا کردہ ہیں اور اُسی کی توفیق اور تائید سے ہر ایک اچھا عمل ظہور میں آ سکتا ہے تو اپنے اعمال پر بھروسہ کر کے اُس سے انصاف کا مطالبہ کرنا سخت بے ایمانی اور جہالت ہے۔ اور ایسی تعلیم کو ہم وِدّیا کی تعلیم نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ تعلیم سچے گیان سے بالکل محروم اور سراسر حماقت سے بھری ہوئی تعلیم ہے سو ہمیں خدا تعالےٰ نے اپنی پاک کتاب میں جو قرآن شریف ہے یہی سکھایا ہے کہ بندہ کے مقابل پر خدا کا نام منصف رکھنا نہ صرف گناہ بلکہ کفر صریح ہے۔

(چشمۂ معرفت ص۲۴-۲۶)

یہ وسوسہ کہ عدل اور رحم دونوں خدا تعالیٰ کی ذات میں جمع نہیں ہو سکتے کیونکہ عدل کا تقاضا ہے کہ سزا دی جائے اور رحم کا تقاضا ہے کہ درگذر کی جائے۔ یہ ایک ایسا دھوکا ہے کہ جس میں قلّتِ تدبر سے کوتہ اندیش عیسائی گرفتار ہیں۔ وہ غور نہیں کرتے کہ خدا تعالیٰ کا عدل بھی تو ایک رحم ہے۔ وجہ یہ کہ وہ سراسر انسانوں کے فائدہ کے لئے ہے۔ مثلاً اگر خدا تعالیٰ ایک خونی کی نسبت باعتبار اپنے عدل کے حکم فرماتا ہے کہ وہ مارا جائے۔ تو اس سے اس کی الوہیت کو کچھ فائدہ نہیں بلکہ اسلئے چاہتا ہے

کہ تا نوع انسان ایک دوسرے کو مار کر نابود نہ ہو جائیں۔ یہ نوع انسان کے حق میں رحم ہے اور یہ تمام حقوق عباد خدا تعالےٰ نے اِسی لئے قائم کئے ہیں کہ تا امن قائم رہے۔ اور ہر ایک گروہ دوسرے گروہ پر ظلم کر کے دنیا میں فساد نہ ڈالیں۔ سو وہ تمام حقوق اور سزائیں جو مال اور جان اور آبرو کے متعلق ہیں درحقیقت نوع انسان کے لئے ایک رحم ہے .... پس عدل اور رحم میں کوئی جھگڑا نہیں گویا وہ دو نہریں ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر چل رہی ہیں۔ ایک نہر دوسرے کی ہرگز مزاحم نہیں ہے۔ دنیا کی سلطنتوں میں بھی یہی دیکھتے ہیں کہ جرائم پیشہ کو سزا ملتی ہے۔ لیکن جو لوگ اچھے کاموں سے گورنمنٹ کو خوش کرتے ہیں وہ مورد انعام و اکرام ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالےٰ کی اصل صفت رحم ہے اور عدل عقل اور قانون عطا کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں وہ بھی ایک رحم ہے جو اَور رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب کسی انسان کو عقل عطا ہوتی ہے اور بذریعہ عقل وہ خدا تعالیٰ کے حدود اور قوانین سے واقف ہوتا ہے تب اس حالت میں وہ عدل کے مؤاخذہ کے نیچے آتا ہے۔ لیکن رحم کے لئے عقل اور قانون کی شرط نہیں۔ اور چونکہ خدا تعالیٰ نے رحم کر کے انسانوں کو سب سے زیادہ فضیلت دینی چاہی اس لئے انسانوں کے لئے عدل کے قواعد اور حدود مرتب کئے۔ سو عدل اور رحم میں تناقض سمجھنا جہالت ہے۔

(کتاب البریہ ص ۴۳-۴)

یہ ایک نہایت باریک صداقت ہے کہ علم باری تعالیٰ جس کی کاملیت کی وجہ سے وہ ذرّہ ذرّہ کے ظاہر و باطن پر اطلاع رکھتا ہے کیونکر اور کس طور سے ہے۔ اگرچہ اس کی اصل کیفیت پر کوئی عقل محیط نہیں ہو سکتی مگر پھر بھی اتنا کہنا سراسر سچائی پر مبنی ہے کہ وہ تمام علم کے قسموں میں سے جو ذہن میں آسکتے ہیں اشد و اقویٰ و اتم و اکمل قسم ہے۔ جب ہم اپنے حصول علم کے طریقوں کو دیکھتے ہیں اور اس کے اقسام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اپنے سب معمولی علموں میں سے بڑا اور یقینی اور قطعی علم وہی معلوم ہوتا ہے جو ہم کو اپنی ہستی کی نسبت ہے۔ کیونکہ ہم اور ایسا ہی ہر ایک انسان کسی حالت میں اپنی ہستی کو فراموش نہیں کر سکتا اور نہ اس میں کوئی شک کر سکتا ہے۔ سو جہاں تک ہماری عقل کی رسائی ہے ہم اس قسم کے علم کو اشد و اقویٰ و اتم و اکمل پاتے ہیں۔ اور یہ بات ہم سراسر خدائے تعالیٰ کی ذات کامل سے بعید دیکھتے ہیں کہ جو اس درجہ اَور اس قسم کے علم سے اس کا علم اپنے بندوں کے بارہ میں کمتر ہو۔ کیونکہ یہ بڑے نقص کی بات ہے کہ جو اعلیٰ قسم علم کے ذہن میں آسکتی ہے وہ خدائے تعالیٰ میں نہ پائی جائے۔ اور اعتراض ہو سکتا ہے کہ کس وجہ سے خدائے تعالیٰ کا علم اعلیٰ درجہ کے علم سے

متنزل رہا۔ آیا اس کے اپنے ہی ارادہ سے یا کسی قاسر کے قسر سے۔ اگر کہو کہ اس کے اپنے ہی ارادہ سے تو یہ جائز نہیں کیونکہ کوئی شخص اپنے لئے بالارادہ نقصان روا نہیں رکھتا تو پھر کیونکر خدائے تعالیٰ جو بذاتِ خود کمالات کو دوست رکھتا ہے ایسے ایسے نقصان اپنی نسبت روا رکھے۔ اور اگر کہو کہ کسی قاسر کے قسر سے یہ نقصان اس کو پیش آیا۔ تو چاہیئے کہ ایسا قاسر اپنی طاقتوں اور قوتوں میں خدائے تعالیٰ پر غالب ہو۔ تا وہ زیادت قوت کی وجہ سے اس کو اس کے ارادوں سے روک سکے اور یہ خود ممتنع اور محال ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ پر اور کوئی قاسر نہیں جس کی مزاحمت سے اس کو کوئی مجبوری پیش آوے۔ پس ثابت ہوا کہ ضرور خدائے تعالیٰ کا علم کامل تام ہے۔ اور پہلے ہم ابھی ثابت کر چکے ہیں کہ علم کی تمام قسموں میں سے کامل و تام وہ علم ہے کہ جو ایسا ہو کہ جیسے ایک انسان کو اپنی ہستی کی نسبت علم ہوتا ہے۔ سو ماننا پڑا کہ خدائے تعالیٰ کا علم اپنی مخلوقات کے بارہ میں اسی علم کی مانند اور اس کے مشابہ ہے گو ہم اس کی اصل کیفیت پر محیط نہیں ہو سکتے لیکن ہم اپنی عقل سے جس کی رو سے ہم مکلّف ہیں یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بڑا قطعی اور یقینی علم یہی ہے جو عالم اور معلوم میں کسی نوع کا بُعد اور حجاب نہ ہو۔ سو وہ قسم علم کی یہی ہے۔ اور جس طرح ایک انسان کو اپنی ہستی پر مطلع ہونے کے لئے کسی دوسرے وسائل کی ضرورت نہیں بلکہ جاندار ہونا اور اپنے تئیں جاندار سمجھنا دونوں باتیں باہم ایسی قریب واقعہ ہیں کہ ان میں ایک بال کا فرق نہیں۔ سو ایسا ہی جمیع موجودات کے بارہ میں خدا تعالےٰ کا علم ہونا ضروری ہے۔ یعنی اسجگہ بھی عالم اور معلوم میں ایک ذرّہ فرق اور فاصلہ نہیں چاہیئے۔

اور یہ اعلیٰ درجہ کا علم جو باری تعالےٰ کو اپنے تحقّق الوہیت کے لئے اس کی ضرورت ہے اس حالت میں اس کے لئے مسلّم ہو سکتا ہے جب پہلے اُس کی نسبت یہ مان لیا جائے کہ اس میں اور اس کے معلومات میں اس قدر قرب اور تعلّق واقع ہے جس سے بڑھ کر تجویز کرنا ممکن ہی نہیں۔ اور یہ کامل تعلّق معلومات سے اس صورت میں اس کو ہو سکتا ہے کہ جب عالم کی سب چیزیں جو اسکی معلومات ہیں اس کے دست قدرت سے نکلی ہوں اور اس کی پیدا کردہ اور مخلوق ہوں اور اُس کی ہستی سے اُن کی ہستی ہو۔ یعنی جب ایسی صورت ہو کہ موجود حقیقی وہی ایک ہو اور دوسرے سب وجود اس سے پیدا ہوئے ہوں۔ اور اس کے ساتھ قائم ہوں۔ یعنی پیدا ہو کر بھی اپنے وجود میں اس سے بے نیاز اور اس سے الگ نہ ہوں بلکہ درحقیقت سب چیزوں کے پیدا ہونے کے بعد بھی زندہ حقیقی وہی ہو۔ اور دوسری ہر ایک زندگی اس سے پیدا ہوئی ہو۔ اور اس کے ساتھ قائم ہو۔ اور بے قید حقیقی وہی ایک ہو اور دوسری سب چیزیں کیا ارواح اور کیا اجسام اُس کی لگائی ہوئی

قیدوں میں مقید اور اس کے ہاتھ کے بندوں سے بندھے ہوئے اور اسکی مقرر کردہ حدوں میں محدود ہوں اور وہ ہر چیز پر محیط ہو اور دوسری سب چیزیں اس کی ربوبیت کے نیچے احاطہ کی گئی ہوں اور کوئی چیز ایسی نہ ہو جو اس کے ہاتھ سے نکلی نہ ہو۔ اور اس کی ربوبیت کا اس پر احاطہ نہ ہو۔ یا اُس کے سہارے سے وہ چیز قائم نہ ہو۔ غرض اگر ایسی صورت ہو تب خدائے تعالیٰ کا تعلّق تام جو علم تام کے لئے شرط ہے اپنے معلومات سے ہوگا۔ اِسی تعلق تام کی طرف اللہ تعالےٰ نے ایک جگہ قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے۔ جیسے وہ فرماتا ہے۔ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید یعنی ہم انسان کی جان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ تر نزدیک ہیں۔ اور ایسا ہی اس نے قرآن شریف میں ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔ ھوالحیّ القیّوم۔ یعنی حقیقی حیات اسی کو ہے اور دوسری سب چیزیں اس سے پیدا اور اُسی کے ساتھ زندہ ہیں۔ یعنی درحقیقت سب جانوں کی جان اور سب طاقتوں کی طاقت وہی ہے۔ . . . .

اگر رُوح کو مخلوق اور حادث تسلیم نہ کیا جائے تو اس بات کے تسلیم کرنے کے لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک بے تعلق شخص جو فرضی طور پر پرمیشر کے نام سے موسوم ہے رُوح کی حقیقت سے کچھ اطلاع رکھتا ہے۔ اور اس کا علم اس کی تہ تک پہنچا ہُوا ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی چیز کی نسبت پورا پورا علم رکھتا ہے تو البتہ اس کے بنانے پر بھی قادر ہوتا ہے۔ اور اگر قادر نہیں ہو سکتا تو اس کے علم میں ضرور کوئی نہ کوئی نقص ہوتا ہے۔ اور اگر پورا علم نہ ہو تو قطع نظر بنانے سے متشابہ چیزوں میں باہم امتیاز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ سو اگر خدائے تعالیٰ خالق الاشیاء نہیں تو اس میں صرف یہی نقص نہیں ہے کہ اس صورت میں وہ ناقص العلم ٹھہرا بلکہ اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ کروڑہا رُوحوں کے امتیاز اور تمیز اور شناخت میں روز بروز دھوکے بھی کھایا کرے اور بسا اوقات زیدؔ کی رُوح کو بکرؔ کی رُوح سمجھ بیٹھے۔ کیونکہ ادھورے علم کو ایسے دھوکے ضرور لگ جایا کرتے ہیں۔ اور اگر کہو کہ نہیں لگتے تو اس پر کوئی دلیل پیش کرنی چاہیئے۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۱۷۳ - ۱۷۸ حاشیہ)

شاید کسی دل کو اسجگہ یہ وسوسہ پکڑے کہ کسی شے پر پورا پورا علمی احاطہ ہونے سے وہ شے مخلوق ہو جاتی ہے۔ تو علم حق سبحانہٗ تعالیٰ جو اپنی ذات سے متعلّق ہے وہ بھی بہرحال کامل ہے۔ تو کیا خدائے تعالیٰ اپنی ذات کا آپ خالق ہے یا اپنی مثل بنانے پر قادر ہے؟ اس میں اعتراض کے پہلے ٹکڑے کا تو یہ جواب ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ اپنے وجود کا آپ خالق ہو تو اس سے لازم آتا ہے کہ

اپنے وجود سے پہلے موجود ہو۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی شے اپنے وجود سے پہلے موجود نہیں ہو سکتی - ورنہ تقدم الشیء علیٰ نفسہٖ لازم آتا ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ جو اپنی ذات کا علم کامل رکھتا ہے تو اسجگہ عالم اور علم اور معلوم ایک ہی شے ہے جس میں علیحدگی اور دوئی کی گنجائش نہیں۔ تو پھر اسجگہ وہ الگ چیز کونسی ہے جس کو مخلوق ٹھہرایا جائے۔ سو ذاتی علم خدائے تعالیٰ کا جو اس کی ذات سے تعلق رکھتا ہے دوسری چیزوں پر اس کا قیاس نہیں کر سکتے۔ غرض علم ذاتی باری تعالیٰ میں جو اس کی ذات سے متعلق ہے عالم اپنے معلوم سے کوئی الگ چیز نہیں ہے تا ایک خالق اور ایک مخلوق قرار دیا جائے۔ ہاں اس کے وجود میں بجائے مخلوق کہنے کے یہ کہنا چاہیئے کہ وہ وجود کسی دوسرے کی طرف سے مخلوق نہیں بلکہ ازلی ابدی طور پر اپنی طرف سے آپ ہی ظہور پذیر ہے اور خدا ہونے کے بھی یہی معنے ہیں کہ خود آئندہ ہے۔

دوسرا ٹکڑا اعتراض کا کہ تقریر مذکورہ بالا سے خدائے تعالیٰ کا اپنی مثل بنانے پر قادر ہونا لازم آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قدرتِ الٰہی صرف اُن چیزوں کی طرف رجوع کرتی ہے جو اُس کی صفات ازلیہ ابدیہ کی منافی اور مخالف نہ ہوں۔ بے شک یہ بات تو صحیح اور ہر طرح سے مدلّل اور معقول ہے کہ جس چیز کا علم خدائے تعالیٰ کو کامل ہو اس چیز کو اگر چاہے تو پیدا بھی کر سکتا ہے لیکن یہ بات ہرگز صحیح اور ضروری نہیں کہ جن باتوں کو کرنے پر وہ قادر ہو اُن سب باتوں کو بلالحاظ اپنی صفات کمالیہ کے کرکے بھی دکھا دے بلکہ وہ اپنی ہر ایک قدرت کے اجراء اور نفاذ میں اپنی صفات کمالیہ کا ضرور لحاظ رکھتا ہے کہ آیا وہ امر جس کو وہ اپنی قدرت سے کرنا چاہتا ہے اُسکی صفات کاملہ سے منافی و مبائن تو نہیں۔ مثلاً وہ قادر ہے کہ ایک بڑے پرہیزگار صالح کو دوزخ کی آگ میں جلا دے۔ لیکن اس کے رحم اور عدل اور مجازات کی صفت اس بات کی منافی پڑی ہوئی ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اس لئے وہ ایسا کام کبھی نہیں کرتا۔ ایسا ہی اس کی قدرت اس طرف میں رجوع نہیں کرتی کہ وہ اپنے تئیں ہلاک کرے۔ کیونکہ یہ فعل اس کی صفت حیاتِ ازلی کے منافی ہے۔ پس اسی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنے جیسا خدا بھی نہیں بناتا کیونکہ اُس کی صفت احدیت اور بے مثل اور بے مانند ہونے کی جو ازلی ابدی طور پر اس میں پائی جاتی ہے اس طرف توجہ کرنے سے اس کو روکتی ہے۔ پس ذرہ آنکھ کھول کر سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک کام کرنے سے عاجز ہونا اَور بات ہے۔ لیکن باوجود قدرت کے بلحاظ صفات کمالیہ امر منافی صفات کی طرف توجہ نہ کرنا یہ اَور بات ہے۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۸۲ - ۱۸۵ حاشیہ)

اپنے ذاتی اقتدار اور اپنی ذاتی خاصیت سے عالم الغیب ہونا خدا تعالیٰ کی ذات کا ہی خاصہ ہے۔ قدیم سے اہلِ حق حضرات واجب الوجود کے علم غیب کی نسبت وجوب ذاتی کا عقیدہ رکھتے ہیں اور دوسرے تمام ممکنات کی نسبت امتناع ذاتی اور امکان بالواجب عزّ اسمہٗ کا عقیدہ ہے یعنی یہ عقیدہ کہ خدا تعالیٰ کی ذات کے لئے عالم الغیب ہونا واجب ہے اور اس کے ہویت حقّہ کی یہ ذاتی خصوصیت ہے کہ عالم الغیب ہو۔ مگر ممکنات جو ہالکۃ الذات اور باطلۃ الحقیقت ہیں اس صفت میں اور ایسا ہی دوسری صفات میں شراکت بحضرت باری عزّ اسمہٗ جائز نہیں۔ اور جیسا ذات کی رو سے شریک الباری ممتنع ہے ایسا ہی صفات کی رو سے بھی ممتنع ہے۔ پس ممکنات کے لئے نظراً علیٰ ذاتہم عالم الغیب ہونا ممتنعات میں سے ہے۔ خواہ نبی ہوں یا محدث ہوں یا ولی ہوں۔ ہاں الہام الٰہی سے اسرار غیبیہ کو معلوم کرنا یہ ہمیشہ خاص اور برگزیدہ کو حصہ ملتا رہا ہے۔ اور اب بھی ملتا ہے جس کو ہم صرف تابعین آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم میں پاتے ہیں۔

(تصدیق النبی صـ ۲۶-۲۷)

ہمارا زندہ حیّ وقیّوم خدا ہم سے انسان کی طرح باتیں کرتا ہے۔ ہم ایک بات پوچھتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں تو وہ قدرت کے بھرے ہوئے الفاظ کے ساتھ جواب دیتا ہے۔ اگر یہ سلسلہ ہزار مرتبہ تک بھی جاری رہے تب بھی وہ جواب دینے سے اعراض نہیں کرتا۔ وہ اپنے کلام میں عجیب در عجیب غیب کی باتیں ظاہر کرتا ہے اور خارق عادت قدرتوں کے نظارے دکھلاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ یقین کرا دیتا ہے کہ وہ وہی ہے جس کو خدا کہنا چاہیئے۔ دعائیں قبول کرتا ہے اور قبول کرنے کی اطلاع دیتا ہے۔ وہ بڑی بڑی مشکلات حل کرتا ہے اور جو مردوں کی طرح بیمار ہوں اُن کو بھی کثرتِ دُعا سے زندہ کر دیتا ہے۔ اور یہ سب ارادے اپنے قبل از وقت اپنے کلام سے بتلا دیتا ہے۔ خدا وہی خدا ہے جو ہمارا خدا ہے۔ وہ اپنے کلام سے جو آئندہ کے واقعات پر مشتمل ہوتا ہے ہم پر ثابت کرتا ہے کہ زمین و آسمان کا وہی خدا ہے۔ وہی ہے جس نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ مَیں تجھے طاعون کی موت سے بچاؤں گا اور نیز ان سب کو جو تیرے گھر میں نیکی اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں بچاؤں گا۔ اس زمانے میں کون ہے جس نے میرے سوا ایسا الہام شائع کیا اور اپنے نفس اور اپنی بیوی اور اپنے بچوں اور دوسرے نیک انسانوں کے لئے جو اس کی چار دیواری کے اندر رہتے ہیں خدا کی ذمہ واری ظاہر کی۔

(نسیم دعوت صـ ۸۲)

منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے جو اس کی فطرت کو لازم پڑی ہوئی ہیں ایک برتر ہستی کی تلاش ہے جس کے لئے اندر ہی اندر انسان کے دل میں ایک کشش موجود ہے اور اس تلاش کا اثر اسی وقت سے محسوس ہونے لگتا ہے جب کہ بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے۔ کیونکہ بچہ پیدا ہوتے ہی پہلے روحانی خاصیت اپنی جو دکھاتا ہے وہ یہی ہے کہ ماں کی طرف جھکا جاتا ہے اور طبعًا ماں کی محبت رکھتا ہے۔ اور پھر جیسے جیسے حواس اس کے کھلتے جاتے ہیں اور شگوفہ فطرت اس کا کھلتا جاتا ہے یہ کشش محبت جو اس کے اندر چھپی ہوئی تھی اپنا رنگ و روپ نمایاں طور پر دکھاتی چلی جاتی ہے پھر تو یہ ہوتا ہے کہ بجز اپنی ماں کی گود کے کسی جگہ آرام نہیں پاتا۔ اور پورا آرام اس کا اسی کے کنارِ عاطفت میں ہوتا ہے۔ اور اگر ماں سے علیحدہ کر دیا جائے اور دُور ڈال دیا جائے تو تمام عیش اس کا تلخ ہو جاتا ہے اور اگرچہ اس کے آگے نعمتوں کا ایک ڈھیر ڈال دیا جائے تب بھی وہ اپنی سچی خوشحالی ماں کی گود میں ہی دیکھتا ہے۔ اور اس کے بغیر کسی طرح آرام نہیں پاتا۔ سو وہ کششِ محبت جو اس کو اپنی ماں کی طرف پیدا ہوتی ہے وہ کیا چیز ہے؟

درحقیقت یہ **وہی کشش** ہے جو معبودِ حقیقی کے لئے بچہ کی فطرت میں رکھی گئی ہے بلکہ ہر ایک جگہ جو انسان تعلق محبت پیدا کرتا ہے درحقیقت وہی کشش کام کر رہی ہے۔ اور ہر ایک جگہ جو یہ **عاشقانہ جوش** دکھلاتا ہے۔ درحقیقت اسی محبت کا وہ ایک عکس ہے۔ گویا دوسری چیزوں کو اٹھا اٹھا کر ایک گم شدہ چیز کو تلاش کر رہا ہے۔ جس کا اب نام بھول گیا ہے۔ سو انسان کا مال یا اولاد یا بیوی سے محبت کرنا یا کسی خوش آواز کے گیت کی طرف اسکی رُوح کا کھینچے جانا درحقیقت اسی **گمشدہ محبوب** کی تلاش ہے۔ اور چونکہ انسان اس دقیق در دقیق ہستی کو جو آگ کی طرح ہر ایک میں مخفی اور سب پر پوشیدہ ہے اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا اور نہ اپنی ناتمام عقل سے اس کو پا سکتا ہے۔ اس لئے اس کی معرفت کے بارے میں انسان کو بڑی بڑی غلطیاں لگی ہیں۔ اور سہو کاریوں سے اس کا حق دوسرے کو دیا گیا ہے۔ خدا نے قرآن شریف میں یہ خوب مثال دی ہے کہ دنیا ایک ایسے شیش محل کی طرح ہے جس کی زمین کا فرش نہایت مصفٰی شیشوں سے کیا گیا ہے اور پھر ان شیشوں کے نیچے پانی چھوڑا گیا۔ جو نہایت تیزی سے چل رہا ہے۔ اب ہر ایک نظر جو شیشوں پر پڑتی ہے وہ اپنی غلطی سے ان شیشوں کو بھی پانی سمجھ لیتی ہے۔ اور پھر انسان ان شیشوں پر چلنے سے ایسا ڈرتا ہے جیسا کہ پانی سے ڈرنا چاہیئے۔ حالانکہ وہ درحقیقت شیشے ہیں مگر صاف اور شفاف۔ سو یہ

بڑے بڑے اجرام جو نظر آتے ہیں جیسے آفتاب اور ماہتاب وغیرہ یہ وہی صاف شیشے ہیں جن کی غلطی سے پرستش کی گئی۔ اور ان کے نیچے ایک اعلیٰ طاقت کام کر رہی ہے جو ان شیشوں کے پردہ میں پانی کی طرح بڑی تیزی سے چل رہی ہے اور مخلوق پرستوں کی نظر کی یہ غلطی ہے کہ انہی شیشوں کی طرف اس کام کو منسوب کر رہے ہیں جو ان کے نیچے کی طاقت دکھلا رہی ہے۔ یہی تفسیر اس آیت کریمہ کی ہے۔ اِنّہ صرحٌ ممرّدٌ من قواریر۔

غرض چونکہ خدا تعالیٰ کی ذات باوجود نہایت روشن ہونے کے پھر بھی نہایت مخفی ہوئی ہے اس لئے اس کی شناخت کے لئے صرف یہ نظام جسمانی جو ہماری نظروں کے سامنے ہے کافی نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ ایسے نظام پر مدار رکھنے والے باوجودیکہ اس ترتیب ابلغ اور محکم کو جو صدہا عجائبات پر مشتمل ہے نہایت غور کی نظر سے دیکھتے رہے۔ بلکہ ہیئت اور طبعی اور فلسفہ میں وہ مہارتیں پیدا کیں کہ گویا زمین و آسمان کے اندر دھنس گئے۔ مگر پھر بھی شکوک و شبہات کی تاریکی سے نجات نہ پا سکے اور اکثر اُن کے طرح طرح کی خطاؤں میں مبتلا ہو گئے اور بے ہودہ اوہام میں پڑ کر کہیں کے کہیں چلے گئے۔ اور اگر ان کو اس صانع کے وجود کی طرف کچھ خیال بھی آیا تو بس اسی قدر کہ اعلیٰ اور عمدہ نظام کو دیکھ کر یہ اُن کے دل میں پڑا کہ اس عظیم الشان سلسلہ کا جو پُرحکمت نظام اپنے ساتھ رکھتا ہے کوئی پیدا کرنے والا ضرور چاہیئے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال ناتمام اور یہ معرفت ناقص ہے۔ کیونکہ یہ کہنا کہ اس سلسلہ کے لئے ایک خدا کی ضرورت ہے اس دوسرے کلام سے ہرگز مساوی نہیں کہ وہ خدا درحقیقت ہے بھی۔ غرض یہ اُن کی صرف قیاسی معرفت تھی۔ جو دل کو اطمینان اور سکینت نہیں بخش سکتی اور نہ شکوک کو بکلی دل سے اٹھا سکتی ہے اور نہ یہ ایسا پیالہ ہے جس سے وہ پیاس معرفت تامہ کی بجھ سکے جو انسان کی فطرت کو لگائی گئی۔ بلکہ ایسی معرفت ناقصہ نہایت پُرخطر ہوتی ہے۔ کیونکہ بہت شور ڈالنے کے بعد پھر آخر ہیچ اور نتیجہ ندارد ہے۔

غرض جب تک خود خدا تعالیٰ اپنے موجود ہونے کو اپنے کلام سے ظاہر نہ کرے جیسا کہ اُس نے اپنے کلام سے ظاہر کیا تب تک صرف کام کا ملاحظہ تسلّی بخش نہیں ہے۔ مثلاً اگر ہم ایک ایسی کوٹھڑی کو دیکھیں جس میں یہ بات عجیب ہو کہ اندر سے کنڈیاں لگائی گئی ہیں تو اس فعل سے ہم ضرور اوّل یہ خیال کریں گے کہ کوئی انسان اندر ہے جس نے اندر سے زنجیر کو لگایا ہے۔ کیونکہ باہر سے اندر کی زنجیروں کو لگانا غیر ممکن ہے۔ لیکن جب مدت تک

بلکہ برسوں تک باوجود بار بار آواز دینے کے اس انسان کی طرف سے کوئی آواز نہ آوے تو آخر یہ رائے ہماری کہ کوئی اندر ہے بدل جائیگی اور یہ خیال کرینگے کہ اندر کوئی نہیں بلکہ کسی حکمت عملی سے اندر کی کنڈیاں لگائی گئی ہیں۔ یہی حال ان فلاسفروں کا ہے جنہوں نے صرف فعل کے مشاہدہ پہ اپنی معرفت کو ختم کر دیا ہے۔ یہ بڑی غلطی ہے جو خدا کو ایک مُردہ کی طرح سمجھا جائے جس کو قبر سے نکالنا صرف انسان کا کام ہے۔ اگر خدا ایسا ہے جو صرف انسانی کوشش نے اُس کا پتہ لگایا ہے تو ایسے خدا کی نسبت ہماری سب اُمیدیں عبث ہیں۔ بلکہ خدا تو وہی ہے جو ہمیشہ سے اور قدیم سے آپ اَنَا الموجود کہکر لوگوں کو اپنی طرف بلاتا رہا ہے۔ یہ بڑی گستاخی ہوگی کہ ہم ایسا خیال کریں کہ اس کی معرفت میں انسان کا احسان اس پہ ہے۔ اور اگر فلاسفر نہ ہوتے تو گویا وہ گم کا گم ہی رہتا۔ اور یہ کہنا کہ خدا کیونکر بول سکتا ہے۔ کیا اس کی زبان ہے؟ یہ بھی ایک بڑی بے باکی ہے۔ کیا اُس نے جسمانی ہاتھوں کے بغیر تمام آسمانی اجرام اور زمین کو نہیں بنایا۔ کیا وہ جسمانی آنکھوں کے بغیر تمام دنیا کو نہیں دیکھتا۔ کیا وہ جسمانی کانوں کے بغیر ہماری آوازیں نہیں سُنتا۔ پس کیا ضروری نہ تھا کہ اسی طرح وہ کلام بھی کرے۔ یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے کہ خدا کا کلام کرنا آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گیا ہے۔ ہم اس کے کلام اور مخاطبات پر کسی زمانہ تک مہر نہیں لگاتے۔ بے شک وہ اب بھی ڈھونڈنے والوں کو الہامی چشمہ سے مالا مال کرنے کو تیار ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ اور اب بھی اس کے فیضان ایسے دروازے کھلے ہیں جیسے کہ پہلے تھے۔ ہاں ضرورتوں کے ختم ہونے پر شریعتیں اور حدود ختم ہوگئیں اور تمام رسالتیں اور نبوتیں اپنے آخری نقطہ پر آکر جو ہمارے سید و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود تھا کمال کو پہنچ گئیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۴۹-۵۳)

حقیقی خدا دانی تمام اسی میں منحصر ہے کہ اُس زندہ خدا تک رسائی ہو جائے کہ جو اپنے مقرب انسانوں سے نہایت صفائی سے ہمکلام ہوتا ہے اور اپنی پُر شوکت اور لذیذ کلام سے اُنکو تسلّی اور سکینت بخشتا ہے۔ اور جس طرح ایک انسان دوسرے انسان سے بولتا ہے۔ ایسا ہی یقینی طور پر جو بکلّی شک اور شبہ سے پاک ہے اُن سے باتیں کرتا ہے۔ اُن کی بات سُنتا ہے۔ اور اُن کا جواب دیتا ہے اور اُن کی دعاؤں کو سُنکر دُعا کے قبول کرنے سے ان کو اطلاع بخشتا ہے اور ایک طرف لذیذ اور پُر شوکت قول سے اور دوسری طرف معجزانہ فعل سے اور اپنے قوی اور زبردست نشانوں سے اُن پر ثابت کر دیتا ہے کہ مَیں ہی خدا ہوں۔ وہ اوّل پیشگوئی

کے طور پر اُن سے اپنی حمایت اور نصرت اور خاص طور کی دستگیری کے وعدے کرتا ہے اور پھر دوسری طرف اپنے وعدوں کی عظمت بڑھانے کے لئے ایک دنیا کو اُن کے مخالف کر دیتا ہے۔ اور وہ لوگ اپنی تمام طاقت اور تمام مکر و فریب اور ہر ایک قسم کے منصوبوں سے کوشش کرتے ہیں کہ خدا کے اُن وعدوں کو ٹال دیں جو اس کے اُن مقبول بندوں کو حمایت اور نصرت اور غلبہ کے بارے میں ہیں۔ اور خدا ان تمام کوششوں کو برباد کرتا ہے۔ وہ شرارت کی تخم ریزی کرتے ہیں اور خدا اس کی جڑ باہر پھینکتا ہے۔ وہ آگ لگاتے ہیں اور خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔ وہ ناخنوں تک زور لگاتے ہیں۔ آخر خدا اُن کے منصوبوں کو اُنہی پر اُلٹا کر مارتا ہے۔ خدا کے مقبول اور راستباز نہایت سیدھے اور سادہ طبع اور خدا تعالیٰ کے سامنے اُن بچوں کی طرح ہوتے ہیں جو ماں کی گود میں ہوں۔ اور دنیا اُن سے دشمنی کرتی ہے کیونکہ وہ دنیا میں سے نہیں ہوتے۔ اور طرح طرح کے مکر اور فریب اُن کی بیخکنی کے لئے کئے جاتے ہیں۔ قومیں اُن کے ایذاء دینے کے لئے متفق ہو جاتی ہیں۔ اور تمام نااہل لوگ ایک ہی کمان سے ان کی طرف تیر چلاتے ہیں اور طرح کے افتراء اور تہمتیں لگائی جاتی ہیں تاکہ کسی طرح وہ ہلاک ہو جائیں اور ان کا نشان نہ رہے مگر آخر خدا تعالیٰ اپنی باتوں کو پوری کر کے دکھلا دیتا ہے۔ اسی طرح اُن کی زندگی میں یہ معاملہ اُن سے جاری رہتا ہے کہ ایک طرف وہ مکالمات صحیحہ واضح یقینیہ سے مشرف کئے جاتے ہیں اور امورِ غیبیہ جن کا علم انسانوں کی طاقت سے باہر ہے اُن پر خدائے کریم و قدیر اپنے صریح کلام کے ذریعہ سے منکشف کرتا رہتا ہے اور دوسری طرف معجزانہ افعال سے جو اُن اقوال کو سچ کر کے دکھلاتے ہیں اُن کے یقین کو نورٌ علیٰ نور کیا جاتا ہے اور جسقدر انسان کی طبیعت تقاضا کرتی ہے کہ خدا کی یقینی شناخت کے لئے اس قدر معرفت چاہیئے وہ معرفت قولی اور فعلی تجلّی سے پوری کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک ذرّہ کے برابر بھی تاریکی درمیان میں نہیں رہتی۔ یہ خدا ہے جس کے ان قولی فعلی تجلّیات کے بعد جو ہزاروں انعامات اپنے اندر رکھتی ہے اور نہایت قوی اثر دل پر کرتی ہے انسان کو زندہ ایمان نصیب ہوتا ہے اور ایک سچّا اور پاک تعلّق خدا سے ہو کر نفسانی غلاظتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ اور تمام کمزوریاں دُور ہو کر آسمانی روشنی کی تیز شعاعوں سے اندرونی تاریکی الوداع ہوتی ہے۔ اور ایک عجیب تبدیلی ظہور میں آتی ہے۔ پس جو مذہب اس خدا کو جس کا ان صفات سے متصف ہونا ثابت ہے پیش نہیں کرتا اور ایمان کو صرف گذشتہ قصوں کہانیوں اور ایسی باتوں تک محدود رکھتا ہے جو دیکھنے اور کہنے میں نہیں آئی ہیں وہ مذہب ہرگز سچا مذہب نہیں ہے۔ اور ایسے فرضی خدا کی

پیروی ایسی ہے کہ جیسے ایک مردہ سے توقع رکھنا کہ وہ زندوں جیسے کام کریگا - ایسے خدا کا ہونا نہ ہونا برابر ہے جو ہمیشہ تازہ طور پر اپنے وجود کو آپ ثابت نہیں کرتا گویا وہ ایک بُت ہے جو نہ بولتا ہے اور نہ سُنتا ہے اور نہ سوال کا جواب دیتا ہے - اور نہ اپنی قادرانہ قوت کو ایسے طور پر دکھا سکتا ہے جو ایک پکّا دہریہ بھی اس میں شک نہ کر سکے -

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صـ۲۱-۲۳)

وسوسہ ہشتم - انسان کو خدا کا ہمکلام تجویز کرنا ادب سے دُور ہے - فانی کو ذاتِ ازلی ابدی سے کیا نسبت - اور مشتِ خاک کو نورِ وجوب سے کیا مشابہت ؟

جواب - یہ وہم بھی سراسر بے اصل اور پوچ ہے - اور اس کے قلع قمع کے لئے انسان کو اسی بات کا سمجھنا کافی ہے کہ جس کریم اور رحمٰن نے افرادِ کاملہ بنی آدم کے دل میں اپنی معرفت کے لئے بے انتہا جوش ڈال دیا اور ایسا اپنی محبت اور اپنی اُنس اور اپنے شوق کی طرف کھینچا کہ وہ بالکل اپنی ہستی سے کھوئے گئے تو اس صورت میں یہ تجویز کرنا کہ خدا ان کا ہمکلام ہونا نہیں چاہتا اس قول کے مساوی ہے کہ گویا اُن کا تمام عشق اور محبت ہی عبث ہے اور اُن کے سارے جوش یکطرفہ خیالات ہیں - لیکن خیال کرنا چاہیئے کہ ایسا خیال کس قدر بیہودہ ہے - کیا جس نے انسان کو اپنے تقرب کی استعداد بخشی اور اپنی محبت اور عشق کے جذبات سے بیقرار کر دیا اس کے کلام کے فیضان سے اس کا طالب محروم رہ سکتا ہے ؟ کیا یہ صحیح ہے کہ خدا کا عشق اور خدا کی محبت اور خدا کے لئے بے خود اور محو ہو جانا یہ سب ممکن اور جائز ہے اور خدا کی شان میں کچھ خارج نہیں - مگر اپنے محبّ صادق کے دل پر خدا کا الہام نازل ہونا غیر ممکن اور ناجائز ہے اور خدا کی شان میں خارج ہے - انسان کا خدا کی محبت کے بے انتہا دریا میں ڈوبنا اور پھر کسی مقام میں بس نہ کرنا اس بات پر شہادت قاطع ہے کہ اس کی عجیب الخلقت رُوح خدا کی معرفت کیلئے بنائی گئی ہے پس جو چیز خدا کی معرفت کیلئے بنائی گئی ہے اگر اس کو وسیلہ معرفت کامل کا جو الہام ہے عطا نہ ہو تو یہ کہنا پڑیگا کہ خدا نے اس کو اپنی معرفت کیلئے نہیں بنایا - حالانکہ اس بات سے برہمو سماج والوں کو بھی انکار نہیں کہ انسان سلیم الفطرت کی رُوح خدا کی معرفت کی بھوکی اور پیاسی ہے - پس اب ان کو آپ ہی سمجھنا چاہیئے کہ جس حالت میں انسان صحیح الفطرت خود فطرتاً خدا کی معرفت کا طالب ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ معرفت الہٰی کا ذریعۂ کامل بجز الہام الہٰی اور کوئی دوسرا امر نہیں تو اس صورت میں اگر وہ معرفت کامل کا ذریعہ غیر ممکن الحصول بلکہ اس کا تلاش کرنا دُور از ادب ہے تو خدا کی حکمت پر

بڑا اعتراض ہوگا کہ اُس نے انسان کو اپنی معرفت کے لئے جوش تو دیا پر ذریعۂ معرفت عطا نہ کیا۔ گویا جس قدر بھوک تھی اُس قدر روٹی دینا نہ چاہا۔ اور جس قدر پیاس لگا دی اس قدر پانی دینا منظور نہ ہوا۔ مگر دانشمند لوگ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ ایسا خیال سراسر خدا کی عظیم الشان رحمتوں کی ناقدر شناسی ہے۔ جس حکیم مطلق نے انسان کی ساری سعادت اس میں رکھی ہے کہ وہ اِسی دنیا میں الوہیت کی شعاعوں کو کامل طور پر دیکھے تا اس زبردست کشش سے خدا کی طرف کھینچا جائے۔ پھر ایسے کریم اور رحیم کی نسبت یہ گمان کرنا کہ وہ انسان کو اپنی سعادتِ مطلوبہ اور اپنے مرتبۂ فطرتیہ تک پہنچانا نہیں چاہتا یہ حضراتِ برہمو کی عجب عقلمندی ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۲۲۲-۲۲۵ حاشیہ ع ۱۱)

خدا نے انسانوں میں جس مطلب کا ارادہ کیا ہے پہلے سے اس مطلب کی تکمیل کے لئے تمام قوتیں خود پیدا کر رکھی ہیں۔ مثلاً انسان کی رُوحوں میں ایک قوتِ عشقی موجود ہے۔ اور گو کوئی انسان اپنی غلطی سے دوسرے سے محبت کرے اور اپنے عشق کا محل کسی اَور کو ٹھیرا دے۔ لیکن عقلِ سلیم بڑی آسانی سے سمجھ سکتی ہے کہ یہ قوتِ عشقی اس لئے رُوح میں رکھی گئی ہے کہ تا وہ اپنے محبوبِ حقیقی سے جو اس کا خدا ہے اپنے سارے دل اور ساری طاقت اور سارے جوش سے پیار کرے۔

پس کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ قوتِ عشقی جو انسانی رُوح میں موجود ہے جس کی موجیں ناپیدا کنار ہیں اور جس کے کمال تموّج کے وقت انسان اپنی جان سے بھی دستبردار ہونے کو تیار ہوتا ہے یہ خود بخود رُوح میں قدیم سے ہے ہرگز نہیں۔ اگر خدا نے انسان اور اپنی ذات میں عاشقانہ رشتہ قائم کرنے کے لئے رُوح میں قوتِ عشقی پیدا کر کے یہ رشتہ آپ پیدا نہیں کیا تو گویا یہ امر اتفاقی ہے کہ پرمیشر کی خوش قسمتی سے روحوں میں قوتِ عشقی پائی گئی اور اگر اس کے مخالف کوئی اتفاق ہوتا یعنی قوتِ عشقی روحوں میں نہ پائی جاتی تو کبھی لوگوں کو پرمیشر کی طرف خیال بھی نہ آتا۔ اور نہ پرمیشر اِس میں کوئی تدبیر کر سکتا۔ کیونکہ نیستی سے ہستی نہیں ہو سکتی لیکن ساتھ ہی اس بات کو بھی سوچنا چاہیئے کہ پرمیشر کا بھگتی اور عبادت اور نیک اعمال کے لئے مؤاخذہ کرنا اِس بات پر دلیل ہے کہ اُس نے خود محبت اور اطاعت کی قوتیں انسان کی رُوح کے اندر رکھی ہیں۔ لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ انسان جس میں خود اُس نے یہ قوتیں رکھی ہیں اس کی محبت اور اطاعت میں محو ہو جائے ورنہ پرمیشر میں یہ خواہش پیدا کیوں ہوئی کہ لوگ اس سے محبّت کریں۔ اور اس کی اطاعت کریں اور اس کی مرضی کے موافق رفتار اور گفتار بناویں۔

(نسیم دعوت ص ۲۴)

قد افلح من زکّٰها

کوئی اُس پاک سے جو دل لگاوے ٭ کرے پاک آپ کو تب اُسکو پاوے

یہ تو ہر ایک قوم کا دعوٰی ہے کہ بہتیرے ہم میں ایسے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں۔ مگر ثبوت طلب یہ بات ہے کہ خدا تعالیٰ بھی اُن سے محبت رکھتا ہے یا نہیں۔ اور خدا تعالےٰ کی محبت یہ ہے کہ پہلے تو اُن کے دلوں پر سے پردہ اٹھاوے جس پردہ کی وجہ سے اچھی طرح انسان خدا تعالیٰ کے وجود پر یقین نہیں رکھتا۔ اور ایک دھندلی سی اور تاریک معرفت کے ساتھ اس کے وجود کا قائل ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات امتحان کے وقت اس کے وجود سے ہی انکار کر بیٹھتا ہے۔ اور یہ پردہ اٹھایا جانا بجز مکالمہ الٰہیہ کے اور کسی صورت سے میسر نہیں آسکتا۔ پس انسان حقیقی معرفت کے چشمہ میں اس دن غوطہ مارتا ہے جس دن خدا تعالیٰ اسکو مخاطب کر کے انا الموجود کی اسکو آپ بشارت دیتا ہے۔ تب انسان کی معرفت صرف اپنے قیاسی ڈھکوسلے یا محض منقولی خیالات تک محدود نہیں رہتی بلکہ خدا تعالیٰ سے ایسا قریب ہو جاتا ہے کہ گویا اسکو دیکھتا ہے اور یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ خدا تعالیٰ پر کامل ایمان اُسی دن انسان کو نصیب ہوتا ہے کہ جب اللہ جلشانہٗ اپنے وجود سے آپ خبر دیتا ہے۔ اور پھر دوسری علامت خدا تعالیٰ کی محبت کی یہ ہے کہ اپنے پیارے بندوں کو صرف اپنے وجود کی خبر ہی نہیں دیتا بلکہ اپنی رحمت اور فضل کے آثار بھی خاص طور پر اُن پر ظاہر کرتا ہے اور وہ اس طرح پر کہ اُن کی دُعائیں جو ظاہری امیدوں سے زیادہ ہوں قبول فرما کر اپنے الہام اور کلام کے ذریعہ سے اُن کو اطلاع دے دیتا ہے۔ تب اُن کے دل تسلی پکڑ جاتے ہیں۔ کہ یہ ہمارا قادر خدا ہے جو ہماری دُعائیں سُنتا اور ہم کو اطلاع دیتا اور مشکلات سے ہمیں نجات بخشتا ہے۔ اُسی روز سے نجات کا مسئلہ بھی سمجھ آتا ہے اور خدا تعالےٰ کے وجود کا بھی پتہ لگتا ہے۔ اگرچہ جگانے اور متنبہ کرنے کے لئے کبھی کبھی غیروں کو بھی سچی خواب آ سکتی ہے۔ مگر اس طریق کا مرتبہ اور شان اور رنگ اَور ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا مکالمہ ہے جو خاص مقربوں سے ہی ہوتا ہے اور جب مقرب انسان دعا کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اپنی خدائی کے جلال کے ساتھ اس پر تجلی فرماتا ہے اور اپنی رُوح اس پر نازل کرتا ہے اور اپنی محبت سے بھرے ہوئے لفظوں کے ساتھ اس کو قبول دعا کی بشارت دیتا ہے اور جس کسی سے یہ مکالمہ کثرت سے وقوع ہوتا ہے اُس کو نبی یا محدّث کہتے ہیں۔

(حجۃ الاسلام صـ۳۰۲)

یاد رہے کہ بندہ تو حسن معاملہ دکھلا کر اپنے صدق سے بھری ہوئی محبت ظاہر کرتا ہے۔ مگر

خدا تعالیٰ اس کے مقابلہ پر حد ہی کر دیتا ہے۔ اس کی تیز رفتار کے مقابل پر برق کی طرح اس کی طرف دوڑتا چلا آتا ہے۔ اور زمین اور آسمان سے اس کے لئے نشان ظاہر کرتا ہے اور اس کے دوستوں کا دوست اور اس کے دشمنوں کا دشمن بن جاتا ہے اور اگر پچاس کروڑ انسان بھی اس کی مخالفت پر کھڑا ہو تو اُن کو ایسا ذلیل اور بے دست و پا کر دیتا ہے جیسا کہ ایک مرا ہوا کیڑا اور محض ایک شخص کی خاطر کے لئے ایک دنیا کو ہلاک کر دیتا ہے اور اپنی زمین و آسمان کو اس کے خادم بنا دیتا ہے۔ اور اس کی کلام میں برکت ڈال دیتا ہے۔ اور اس کی تمام در و دیوار پر نور کی بارش کرتا ہے اور اس کی پوشاک میں اور اس کی خوراک میں اور اس مٹی میں بھی جس پر اس کا قدم پڑتا ہے ایک برکت رکھ دیتا ہے اور اس کو نامراد ہلاک نہیں کرتا۔ اور ہر ایک اعتراض جو اُس پر ہو اس کا آپ جواب دیتا ہے۔ وہ اُس کی آنکھیں ہو جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے کان ہو جاتا ہے جن سے وہ سُنتا ہے اور اس کی زبان ہو جاتا ہے جس سے بولتا ہے اور اس کے پاؤں ہو جاتا ہے جن سے چلتا ہے اور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہے جن سے وہ دشمنوں پر حملہ کرتا ہے۔ وہ اس کے دشمنوں کے مقابلے پر آپ نکلتا ہے۔ اور شریروں پر جو اس کو دُکھ دیتے ہیں آپ تلوار کھینچتا ہے اور ہر میدان میں اس کو فتح دیتا ہے اور اپنی قضاء و قدر کے پوشیدہ راز اس کو بتلاتا ہے۔ غرض پہلا خریدار اس کے روحانی حسن و جمال کا جو حسن معاملہ اور محبتِ ذاتیہ کے بعد پیدا ہوتا ہے خدا ہی ہے۔ پس کیا ہی بدقسمت وہ لوگ ہیں جو ایسا زمانہ پاویں اور ایسا سورج ان پر طلوع کرے اور وہ تاریکی میں بیٹھے رہیں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۶۵-۶۶)

روحانی قالب کے کامل ہونے کے بعد محبت ذاتیہ الٰہیہ کا شعلہ انسان کے دل پر ایک رُوح کی طرح پڑتا ہے اور دائمی حضور کی حالت اس کو بخش دیتا ہے۔ کمال کو پہنچتا ہے اور تب ہی روحانی حسن اپنا پورا جلوہ دکھاتا ہے۔ لیکن یہ حسن جو روحانی حسن ہے جس کو حسن معاملہ کے ساتھ موسوم کر سکتے ہیں یہ وہ حسن ہے جو اپنی قوی کششوں کے ساتھ حسن بشرہ سے بہت بڑھ کر ہے کیونکہ حسن بشرہ صرف ایک یا دو شخص کے فانی عشق کا موجب ہوگا جو جلد زوال پذیر ہو جائیگا اور اس کی کشش نہایت کمزور ہوگی۔ لیکن وہ روحانی حسن جس کو حسن معاملہ سے موسوم کیا گیا ہے وہ اپنی کششوں میں ایسا سخت اور زبردست ہے کہ ایک دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور زمین و آسمان کا ذرّہ ذرّہ اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ اور قبولیت دُعا کی بھی درحقیقت فلاسفی یہی ہے کہ جب ایسا روحانی حسن والا انسان جس میں محبتِ الٰہیہ کی رُوح داخل ہو جاتی ہے جب کسی غیر ممکن اور نہایت مشکل امر

کے لئے دعا کرتا ہے اور اس دعا پر پورا پورا زور دیتا ہے تو چونکہ وہ اپنی ذات میں حسن روحانی رکھتا ہے اس لئے خدا تعالیٰ کے امر اور اذن سے اس عالم کا ذرہ ذرّہ اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ پس ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جو اس کی کامیابی کیلئے کافی ہوں۔ تجربہ اور خدا تعالیٰ کی پاک کتاب سے ثابت ہے کہ دنیا کے ہر ایک ذرہ کو طبعاً ایسے شخص کے ساتھ ایک عشق ہوتا ہے اور اس کی دُعائیں ان تمام ذرّات کو ایسا اپنی طرف کھینچتی ہیں جیسا کہ آہن رُبا لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پس غیر معمولی باتیں جن کا ذکر کسی علم طبعی اور فلسفہ میں نہیں اس کشش کی باعث ظاہر ہو جاتی ہیں اور وہ کشش طبعی ہوتی ہے۔ جب سے کہ صانع مطلق نے عالم اجسام کو ذرّات سے ترکیب دی ہے ہر ایک ذرّے میں وہ کشش رکھی ہے اور ہر ایک ذرّہ روحانی حسن کا عاشق صادق ہے۔ اور ایسا ہی ہر ایک سعید رُوح بھی کیونکہ وہ حسن تجلّی گاہ حق ہے۔ وہی حسن تھا جس کے لئے فرمایا اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ۔ اور اب بھی بہتیرے ابلیس ہیں جو اس حُسن کو شناخت نہیں کرتے۔ مگر وہ حُسن بڑے بڑے کام دکھلاتا رہا ہے۔

نوح میں وہی حسن تھا جس کی پاس خاطر حضرت عزّت جلّ شانہٗ کو منظور ہوئی اور تمام منکروں کو پانی کے عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ پھر اس کے بعد موسٰی بھی وہی حسن روحانی لے کر آیا جس نے چند روز تکلیفیں اٹھا کر آخر فرعون کا بیڑا غرق کیا۔ پھر سب کے بعد سید الانبیاء و خیر الورٰی مولانا و سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم ایک عظیم الشان روحانی حسن لیکر آئے جس کی تعریف میں یہی آیتِ کریمہ کافی ہے۔ دنٰی فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنٰی۔ یعنی وہ نبی جناب الٰہی کے بہت نزدیک چلا گیا۔ اور پھر مخلوق کی طرف جھکا اور اس طرح پر دونوں حقوق کو جو حق اللہ اور حق العباد ہے ادا کر دیا اور دونوں قسم کا حسن روحانی ظاہر کیا۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم ص ۶۱-۶۲)

اسی مضمون میں جو جلسہ میں پڑھا گیا مضمون کے پڑھنے والے نے یہ بیان کیا کہ پرمیشر غضب اور کینہ اور بغض اور حسد سے الگ ہے۔ شائد اس تقریر سے اس کا یہ مطلب ہے کہ قرآن شریف میں خدا تعالےٰ کی نسبت غضب کا لفظ آیا ہے تو گویا وہ اپنے اس مضمون میں قرآن شریف کے مقابل پر وید کو اس تعلیم سے مبرّا کرتا ہے کہ خدا غضب بھی کیا کرتا ہے۔ مگر یہ اس کی سراسر غلطی ہے۔ یاد رہے کہ قرآن شریف میں کسی بے جا اور ظالمانہ غضب کی طرف خدا تعالیٰ کو منسوب نہیں کیا گیا بلکہ مطلب صرف

اس قدر ہے کہ بوجہ نہایت پاکیزگی اور تقدس کے خدا تعالےٰ میں ہمرنگ غضب ایک صفت ہے اور وہ صفت تقاضا کرتی ہے کہ نافرمان کو جو سرکشی سے باز نہیں آتا اس کی سزا دی جائے۔ اور ایک دوسری صفت ہمرنگ محبت ہے اور وہ تقاضا کرتی ہے کہ فرمانبردار کو اس کی اطاعت کی جزا دی جائے۔ پس سمجھانے کے لئے پہلی صفت کا نام غضب اور دوسری صفت کا نام محبت رکھا گیا ہے۔ لیکن نہ وہ غضب انسانی غضب کی طرح ہے اور نہ وہ محبت انسانی محبت کی طرح جیسا کہ خود اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے۔ لیس کمثلہ شیءٌ یعنی خدا کی ذات اور صفات کی مانند کوئی چیز نہیں۔ بھلا ہم پوچھتے ہیں کہ آریوں کے وید کی رو سے ان کا پرمیشر کیوں گنہگاروں کو سزا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ انسانی جون سے بہت نیچے پھینک کر کتا۔ سؤر۔ بندر بلّا بنا دیتا ہے۔ آخر اس میں ایک ایسی صفت ماننی پڑتی ہے کہ جو اس فعل کے لئے وہ محرک ہو جاتی ہے۔ اسی صفت کا نام قرآن شریف میں غضب ہے . . . . اگر اُس میں اس قسم کی صفت موجود نہیں کہ وہ تقاضا کرتی ہے کہ پرمیشر گنہگاروں کو سزا دے تو پھر کیوں پرمیشر کی طبیعت سزا دینے کی طرف متوجہ ہوتی ہے! آخر اس میں ایک صفت ہے جو بدلہ دینے کے لئے توجہ دلاتی ہے۔ پس اسی صفت کا نام غضب ہے۔ لیکن وہ غضب نہ انسان کے غضب کی مانند ہے بلکہ خدا کی شان کے مانند۔ اسی غضب کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے . . . . جب وہ ایک اچھے عمل کرنے والے پر اپنا انعام اکرام وارد کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اُس نے اس سے محبت کی۔ اور جب وہ ایک بُرا عمل کرنے والے کو سزا دیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اُس نے اُس پر غضب کیا۔ غرض جیسا کہ ویدوں میں غضب کا ذکر ہے ایسا ہی قرآن شریف میں بھی ذکر ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ ویدوں نے خدا کے غضب کو اس حد تک پہنچا دیا کہ یہ تجویز کیا کہ وہ شدت غضب کی وجہ سے انسانوں کو گناہ کی وجہ سے کیڑے مکوڑے بنا دیتا ہے۔ مگر قرآن شریف نے خدا تعالیٰ کے غضب کو اس حد تک نہیں پہنچایا بلکہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ خدا باوجود سزا دینے کے پھر بھی انسان کو انسان ہی رکھتا ہے کسی اَور جون میں نہیں ڈالتا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی رو سے خدا تعالیٰ کی محبت اور رحمت اس کے غضب سے بڑھ کر ہے۔ اور وید کے رو سے گنہگاروں کی سزا ناپیدا کنار ہے اور پرمیشر میں غضب ہی غضب ہے رحمت کا نام و نشان نہیں۔ مگر قرآن شریف سے صریح معلوم ہوتا ہے کہ انجام کار دوزخیوں پر ایسا زمانہ آوے گا کہ خدا سب پر رحم فرمائے گا۔

(چشمۂ معرفت ص ۲۸-۴۲)

انجیل میں ہے کہ تم اس طرح دُعا کرو کہ اے ہمارے باپ کہ جو آسمان پر ہے۔ تیرے نام کی تقدیس ہو۔ تیری بادشاہت آوے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر آوے۔ ہماری روزانہ روٹی آج ہمیں بخش۔ اور جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو بخشتے ہیں تو اپنے قرض کو ہمیں بخش اور ہمیں آزمائش میں نہ ڈال بلکہ برائی سے بچا کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے ہی ہیں۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ یہ نہیں کہ زمین تقدیس سے خالی ہے بلکہ زمین پر بھی خدا کی تقدیس ہو رہی ہے نہ صرف آسمان پر جیسا کہ وہ فرماتا ہے وان من شیءٍ الّا یسبّح بحمدہٖ۔ یسبّح للّٰہ ما فی السّمٰوٰت وما فی الارض یعنی ذرّہ ذرّہ زمین کا اور آسمان کا خدا کی تحمید اور تقدیس کر رہا ہے اور جو کچھ اُن میں ہے وہ تحمید اور تقدیس میں مشغول ہے۔ پہاڑ اس کے ذکر میں مشغول ہیں۔ دریا اس کے ذکر میں مشغول ہیں۔ درخت اس کے ذکر میں مشغول ہیں اور بہت سے راستباز اس کے ذکر میں مشغول ہیں۔ اور جو شخص دل اور زبان کے ساتھ اس کے ذکر میں مشغول نہیں اور خدا کے آگے فروتنی نہیں کرتا اس سے طرح طرح کے شکنجوں اور عذابوں سے قضاء و قدر الٰہی فروتنی کرا رہی ہے۔ اور جو کچھ فرشتوں کے بارے میں خدا کی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ نہایت درجہ اطاعت کر رہے ہیں یہی تعریف زمین کے پات پات اور ذرّہ ذرّہ کی نسبت قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہر ایک چیز اس کی اطاعت کر رہی ہے۔ ایک پتہ بھی بجز اس کے امر کے گر نہیں سکتا اور بجز اس کے حکم کے نہ کوئی دوا شفا دے سکتی ہے اور نہ کوئی غذا موافق ہو سکتی ہے۔ اور ہر ایک چیز غایت درجہ کے تذلّل اور عبودیت سے خدا کے آستانہ پر گری ہوئی ہے اور اس کی فرمانبرداری میں مستغرق ہے۔ پہاڑوں اور زمین کا ذرّہ ذرّہ اور دریاؤں اور سمندروں کا قطرہ قطرہ اور درختوں اور بوٹیوں کا پات پات اور ہر ایک جز اُن کا اور انسان اور حیوانات کے کل ذرّات خدا کو پہچانتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی تحمید اور تقدیس میں مشغول ہیں اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یسبّح للّٰہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض۔ یعنی جیسے آسمان پر ہر ایک چیز خدا کی تسبیح و تقدیس کر رہی ہے ویسے زمین پر بھی ہر ایک چیز اس کی تسبیح و تقدیس کرتی ہے۔ پس کیا زمین پر خدا کی تحمید و تقدیس نہیں ہوتی؟ ایسا کلمہ ایک کامل عارف کے مُنہ سے نہیں نکل سکتا۔ بلکہ زمین کی چیزوں میں سے کوئی چیز تو شریعت کے احکام کی اطاعت کر رہی ہے اور کوئی چیز قضا و قدر کے احکام کے تابع ہے اور کوئی دونوں کی اطاعت میں کمربستہ ہے۔ کیا بادل اور کیا ہوا کیا آگ کیا زمین سب خدا کی اطاعت اور تقدیس میں محو ہیں۔ اگر کوئی انسان الٰہی شریعت کے احکام کا سرکش ہے تو الٰہی قضا و قدر کے حکم کا تابع ہے۔ ان دونوں حکومتوں سے باہر کوئی نہیں۔ کسی نہ کسی آسمانی حکومت کا

جُدا ہر ایک کی گردن پر ہے۔ ہاں البتہ انسانی دلوں کی اصلاح اور فساد کے لحاظ سے غفلت اور ذکر الٰہی نوبت بہ نوبت زمین پر اپنا غلبہ کرتے ہیں مگر بغیر خدا کی حکمت اور مصلحت کے یہ مدّ و جزر خود بخود نہیں ہوتے۔ خدا نے چاہا کہ زمین پر ایسا ہو سو ہو گیا۔ سو ہدایت اور ضلالت کا دَور بھی دن رات کے دَور کی طرح خدا کے قانون اور اذن کے موافق چل رہا ہے نہ خود بخود۔ باوجود اس کے ہر ایک چیز اس کی آواز سُنتی ہے اور اس کی پاکی بیان کرتی ہے۔ مگر انجیل کہتی ہے کہ زمین خدا کی تقدیس سے خالی ہے۔ اس کا سبب اس انجیلی دُعا کے اگلے فقرے میں بطور اشارہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ابھی اس میں خدا کی بادشاہت نہیں آئی۔ اس لئے حکومت نہ ہونے کی وجہ سے نہ کسی اور وجہ سے خدا کی مرضی ایسے طور سے زمین پر نافذ نہیں ہو سکی جیسا کہ آسمان پر نافذ ہے۔ مگر قرآن کی تعلیم سراسر اس کے برخلاف ہے۔ وہ تو صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ کوئی چور۔ خونی۔ زانی۔ کافر فاسق۔ سرکش۔ جرائم پیشہ کسی قسم کی بدی زمین پر نہیں کر سکتا جب تک کہ آسمان پر سے اس کو اختیار نہ دیا جائے۔ پس کیونکر کہا جائے کہ آسمانی بادشاہت زمین پر نہیں۔ کیا کوئی مخالف قبضہ زمین پر خدا کے احکام جاری ہونے سے مزاحم ہے۔ سبحان اللہ! ایسا ہرگز نہیں بلکہ خدا نے خود آسمان پر فرشتوں کے لئے جدا قانون بنایا اور زمین پر انسانوں کے لئے جُدا۔ اور خدا نے اپنی آسمانی بادشاہت میں فرشتوں کو کوئی اختیار نہیں دیا۔ بلکہ ان کی فطرت میں ہی اطاعت کا مادہ رکھ دیا ہے وہ مخالفت کر ہی نہیں سکتے۔ اور سہو اور نسیان ان پر وارد نہیں ہو سکتا۔ لیکن انسانی فطرت کو قبول اور عدم قبول کا اختیار دیا گیا ہے۔ اور چونکہ یہ اختیار اوپر سے دیا گیا ہے اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ فاسق انسان کے وجود سے خدا کی بادشاہت زمین سے جاتی رہی بلکہ ہر رنگ میں خدا کی بادشاہت ہے۔ ہاں صرف قانون دو ہیں ایک آسمانی فرشتوں کے لئے قضاء و قدر کا قانون ہے کہ وہ بدی کر ہی نہیں سکتے اور ایک زمین پر انسانوں کے لئے خدا کے قضاء و قدر کے متعلق ہے اور وہ یہ کہ آسمان سے انکو بدی کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ مگر جب خدا سے طاقت طلب کریں یعنی استغفار کریں تو رُوح القدس کی تائید سے ان کی کمزوری دُور ہو سکتی ہے اور وہ گناہ کے ارتکاب سے بچ سکتے ہیں جیسا کہ خدا کے نبی اور رسول بچتے ہیں۔ اور اگر ایسے لوگ ہیں کہ گنہگار ہو چکے ہیں تو استغفار ان کو یہ فائدہ پہنچاتا ہے کہ گناہ کے نتائج سے یعنی عذاب سے بچائے جاتے ہیں۔ کیونکہ نور کے آنے سے ظلمت باقی نہیں رہ سکتی۔ اور جرائم پیشہ جو استغفار نہیں کرتے یعنی خدا سے طاقت نہیں مانگتے وہ اپنے جرائم کی سزا پاتے رہتے ہیں۔ دیکھو آجکل طاعون

بھی بطور سزا کے زمین پر اترتی ہے اور خدا کے سرکش اس سے ہلاک ہوتے جاتے ہیں۔ پھر کیونکر کہا جائے کہ خدا کی بادشاہت زمین پر نہیں۔ یہ خیال مت کرو کہ اگر زمین پر خدا کی بادشاہت ہے تو پھر لوگوں سے جرائم کیوں ظہور میں آتے ہیں۔ کیونکہ جرائم بھی خدا کے قضاء و قدر کے نیچے ہیں۔ سو اگرچہ وہ لوگ قانون شریعت سے باہر ہو جاتے ہیں مگر قانون تکوین یعنی قضاء و قدر سے وہ باہر نہیں ہو سکتے۔ پس کیونکر کہا جائے کہ جرائم پیشہ لوگ الٰہی سلطنت کا جُوا اپنی گردن پر نہیں رکھتے .....

...... اگر خدا کا قانون ابھی سخت ہو جائے اور ہر یک زنا کرنے والے پر بجلی گرے اور ہر ایک چور کو یہ بیماری پیدا ہو کہ ہاتھ گل سڑ کر گر جائیں اور ہر یک سرکش خدا کا منکر اس کے دین کا منکر طاعون سے مرے تو ایک ہفتہ گذرنے سے پہلے ہی تمام دنیا راستبازی اور نیک بختی کی چادر پہن سکتی ہے پس خدا کی زمین پر بادشاہت تو ہے لیکن آسمانی قانون کی نرمی نے اس قدر آزادی دے رکھی ہے کہ جرائم پیشہ جلدی نہیں پکڑے جاتے۔ ہاں سزائیں بھی ملتی رہتی ہیں۔ زلزلے آتے ہیں۔ بجلیاں گرتی ہیں۔ کوہ آتش فشاں آتش بازی کی طرح مشتعل ہو کر ہزاروں جانوں کا نقصان کرتے جاتے ہیں۔ جہاز غرق ہوتے ہیں۔ ریل گاڑیوں کے ذریعہ سے صدہا جانیں تلف ہوتی ہیں۔ طوفان آتے ہیں مکانات گرتے ہیں۔ سانپ کاٹتے ہیں۔ درندے پھاڑتے ہیں۔ وبائیں پڑتی ہیں۔ اور فنا کرنے کا نہ ایک دروازہ بلکہ ہزارہا دروازے کھلے ہیں جو مجرمین کی پاداش کے لئے خدا کے قانون قدرت نے مقرر کر رکھے ہیں پھر کیونکر کہا جائے کہ خدا کی زمین پر بادشاہت نہیں۔ سچ یہی ہے کہ بادشاہت تو ہے۔ ہر ایک مجرم کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں اور پاؤں میں زنجیریں ہیں۔ مگر حکمت الٰہی نے اس قدر اپنے قانون کو نرم کر دیا ہے کہ وہ ہتھکڑیاں اور وہ زنجیریں فی الفور اپنا اثر نہیں دکھاتی ہیں۔ اور آخر اگر انسان باز نہ آوے تو دائمی جہنم تک پہنچاتی ہیں اور اس عذاب میں ڈالتی ہیں جس سے ایک مجرم نہ زندہ رہے اور نہ مرے۔

غرض قانون دو ہیں۔ ایک وہ قانون جو فرشتوں کے متعلق ہے یعنی یہ کہ وہ محض اطاعت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور اُن کی اطاعت محض فطرت روشن کا ایک خاصہ ہے۔ وہ گناہ نہیں کر سکتے مگر نیکی میں ترقی بھی نہیں کر سکتے۔ (۲) دوسرا قانون وہ ہے جو انسانوں کے متعلق ہے۔ یعنی یہ کہ انسانوں کی فطرت میں یہ رکھا گیا ہے کہ وہ گنہ کر سکتے ہیں۔ مگر نیکی میں ترقی بھی کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں فطرتی قانون غیر متبدل ہیں اور جیسا کہ فرشتہ انسان نہیں بن سکتا ایسا ہی انسان بھی فرشتہ نہیں ہو سکتا ہے یہ دونوں قانون بدل نہیں سکتے۔ ازلی اور اٹل ہیں۔

اس لئے آسمان کا قانون زمین پر نہیں آسکتا۔ اور نہ زمین کا قانون فرشتوں کے متعلق ہو سکتا ہے۔ انسانی خطاکاریاں اگر توبہ کے ساتھ ختم ہوں تو وہ انسان کو فرشتوں سے بہت اچھا بنا سکتی ہیں۔ کیونکہ فرشتوں میں ترقی کا مادہ نہیں انسان کے گناہ توبہ سے بخشے جاتے ہیں۔ اور حکمت الٰہی نے بعض افراد میں سلسلہ خطاکاریوں کا باقی رکھا ہے تا وہ گناہ کرکے اپنی کمزوری پر اطلاع پاویں اور پھر توبہ کرکے بخشے جاویں۔ یہی قانون ہے جو انسان کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور اسی کو انسانوں کی فطرت چاہتی ہے۔ سہو و نسیان انسانی فطرت کا خاصہ ہے فرشتہ کا خاصہ نہیں پھر وہ قانون جو فرشتوں کے متعلق ہے انسانوں میں کیونکر نافذ ہو سکے۔ یہ خطا کی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف کمزوری منسوب کی جائے۔ صرف قانون کے نتائج ہیں جو زمین پر جاری ہو رہے ہیں نعوذ باللہ کیا خدا ایسا کمزور ہے جس کی بادشاہت اور قدرت اور جلال صرف آسمان تک ہی محدود ہے یا زمین کا کوئی اَور خدا ہے جو زمین پر مخالفانہ قبضہ رکھتا ہے۔ اور عیسائیوں کو اس بات پر زور دینا اچھا نہیں کہ صرف آسمان میں ہی خدا کی بادشاہت ہے جو ابھی زمین پر نہیں آئی۔ کیونکہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ آسمان کچھ چیز نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جبکہ آسمان کچھ چیز نہیں جس پر خدا کی بادشاہت ہو اور زمین پر ابھی خدا کی بادشاہت آئی نہیں تو گویا خدا کی بادشاہت کسی جگہ بھی نہیں۔ ماسوا اس کے ہم خدا کی زمینی بادشاہت کو بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔ اُس کے قانون کے موافق ہماری عمریں ختم ہو جاتی ہیں اور ہماری حالتیں بدلتی رہتی ہیں اور صدہا رنگ کے راحت اور رنج ہم دیکھتے ہیں۔ ہزارہا لوگ خدا کے حکم سے مرتے ہیں اور ہزارہا پیدا ہوتے ہیں دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ نشان ظاہر ہوتے ہیں۔ زمین ہزارہا قسم کے نباتات اور پھل اور پھول اسکے حکم سے پیدا کرتی ہے تو کیا یہ سب کچھ خدا کی بادشاہت کے بغیر ہو رہا ہے بلکہ آسمانی اجرام تو ایک ہی صورت اور منوال پر چلے آتے ہیں۔ اور ان میں تغیر و تبدیل جس سے ایک مغیّر مبدل کا پتہ ملتا ہو کچھ محسوس نہیں ہوتی۔ مگر زمین ہزارہا تغیّرات اور انقلابات اور تبدّلات کا نشانہ ہو رہی ہے۔ ہر روز کروڑہا انسان دنیا سے گزرتے ہیں اور کروڑہا پیدا ہوتے ہیں اور ہر ایک پہلو اور ہر ایک طور سے ایک مقتدر صانع کا تصرف محسوس ہو رہا ہے تو کیا ابھی تک خدا کی بادشاہت زمین پر نہیں۔ اور انجیل نے اس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی کہ کیوں ابھی تک خدا کی بادشاہت زمین پر نہیں آئی۔ البتہ مسیح کا باغ میں اپنے بچ جانے کے لئے ساری رات دعا کرنا اور دُعا قبول بھی ہو جانا جیسا کہ عبرانیاں ۵ آیت ۷ میں لکھا ہے۔ مگر پھر بھی خدا کا اس کے چھڑانے پر قادر نہ ہونا یہ

بزعم عیسائیاں ایک دلیل ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں خدا کی بادشاہت زمین پر نہیں تھی۔ مگر ہم نے اس سے بڑھ کر ابتلاء دیکھے ہیں اور اُن سے نجات پائی ہے ہم کیونکر خدا کی بادشاہت کا انکار کر سکتے ہیں۔ کیا وہ خون کا مقدمہ جو میرے قتل کرنے کے لئے مارٹن کلارک کی طرف سے عدالت کپتان ڈگلس میں پیش ہؤا تھا وہ اس مقدمہ سے کچھ خفیف تھا جو محض مذہبی اختلاف کی وجہ سے نہ کسی خون کے اتہام سے یہودیوں کی طرف سے عدالت پیلاطوس میں دائر کیا گیا تھا۔ مگر چونکہ خدا زمین کا بھی بادشاہ ہے جیسا کہ آسمان کا اس لئے اس نے اس مقدمہ کی پہلے سے مجھے خبر دیدی کہ یہ ابتلاء آنے والا ہے۔ اور پھر خبر دے دی کہ مَیں تم کو بری کروں گا اور وہ خبر صدہا انسانوں کو قبل از وقت سنائی گئی۔ اور آخر مجھے بری کیا گیا۔ پس یہ خدا کی بادشاہت تھی جس نے اس مقدمہ سے مجھے بچا لیا جو مسلمانوں اور ہندوؤں اور عیسائیوں کے اتفاق سے مجھ پر کھڑا کیا گیا تھا ایسا ہی نہ ایک دفعہ بلکہ بیسیوں دفعہ مَیں نے خدا کی بادشاہت کو زمین پر دیکھا اور مجھے خدا کی اس آیت پر ایمان لانا پڑا کہ لہ ملک السمٰوٰت والارض یعنی زمین پر بھی خدا کی بادشاہت ہے اور آسمان پر بھی۔ اور پھر اس آیت پر ایمان لانا پڑا کہ انّما امرہٗ اذا اراد شیئًا ان یقول لہ کن فیکون یعنی تمام زمین و آسمان اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ جب ایک کام کو چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو فی الفور وہ کام ہو جاتا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے واللّٰہ غالب علٰی امرہٖ ولٰکنّ اکثر الناس لا یعلمون۔ یعنی خدا اپنے ارادہ پر غالب ہے مگر اکثر لوگ خدا کے قہر اور جبروت سے بے خبر ہیں۔

غرض یہ تو انجیل کی دُعا ہے جو انسانوں کو خدا کی رحمت سے نومید کرتی ہے اور اس کی ربوبیت اور افاضہ اور جزا سزا سے عیسائیوں کو بے باک کرتی ہے اور اس کو زمین پر مدد دینے کے قابل نہیں جانتی جب تک کہ اس کی بادشاہت زمین پر نہ آوے۔ لیکن اس کے مقابل پر جو دُعا خدا نے مسلمانوں کو قرآن میں سکھلائی ہے وہ اس بات کو پیش کرتی ہے کہ زمین پر خدا مسلوب السلطنت لوگوں کی طرح بے کار نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلۂ ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت اور مجازات زمین پر جاری ہے اور وہ اپنے عابدوں کو مدد دینے کی طاقت رکھتا ہے اور مجرموں کو اپنے غضب سے ہلاک کر سکتا ہے۔ وہ دعا یہ ہے۔

الحمد للّٰہ رب العالمین۔ الرحمٰن الرحیم۔ مالک یوم الدین۔ ایّاک نعبد وایّاک نستعین۔ اھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیھم

غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین ۔ آمین

ترجمہ :۔ وہ خدا ہی ہے جو تمام تعریفوں کا مستحق ہے ۔ یعنی اس کی بادشاہت میں کوئی نقص نہیں ۔ اور اس کی خوبیوں کے لئے کوئی ایسی حالت منتظرہ باقی نہیں جو آج نہیں مگر کل حاصل ہوگی اور اس کی بادشاہت کے لوازم میں کوئی چیز بے کار نہیں ۔ تمام عالموں کی پرورش کر رہا ہے ۔ بغیر عوض اعمال کے رحمت کرتا ہے اور نیز بعوض اعمال رحمت کرتا ہے ۔ جزا سزا وقت مقررہ پر دیتا ہے ۔ اس کی ہم عبادت کرتے ہیں اور اسی سے ہم مدد چاہتے ہیں ۔ اور دعا کرتے ہیں کہ ہمیں تمام نعمتوں کی راہیں دکھلا اور غضب کی راہوں اور ضلالت کی راہوں سے دُور رکھ ۔

یہ دُعا جو سورۃ فاتحہ میں ہے انجیل کی دُعا سے بالکل نقیض ہے کیونکہ انجیل میں زمین پر خدا کی موجودہ بادشاہت ہونے سے انکار کیا گیا ہے ۔ پس انجیل کے رو سے نہ زمین پر خدا کی ربوبیت کچھ کام کر رہی ہے نہ رحمانیت نہ رحیمیت نہ قدرت جزا سزا کیونکہ ابھی زمین پر خدا کی بادشاہت نہیں آئی ۔ مگر سورۃ فاتحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر خدا کی بادشاہت موجود ہے ۔ اس لئے سورۃ فاتحہ میں تمام لوازم بادشاہت کے بیان کئے گئے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ میں یہ صفات ہونی چاہئیں کہ وہ لوگوں کی پرورش پر قدرت رکھتا ہو ۔ سو سورۃ فاتحہ میں ربّ العالمین کے لفظ سے اس صفت کو ثابت کیا گیا ہے ۔ پھر دوسری صفت بادشاہ کی یہ چاہیئے کہ جو کچھ اس کی رعایا کو اپنی آبادی کے لئے ضروری سامان کی حاجت ہے ۔ وہ بغیر عوض ان کی خدمات کے خود رحم خسروانہ سے بجا لاوے سو الرحمٰن کے لفظ سے اس صفت کو ثابت کر دیا ہے ۔ تیسری صفت بادشاہ میں یہ چاہیئے کہ جن کاموں کو اپنی کوشش سے رعایا انجام تک نہ پہنچا سکے ان کے انجام کے لئے مناسب طور پر مدد دے ۔ سو الرحیم کے لفظ سے اس صفت کو ثابت کیا ہے ۔ چوتھی صفت بادشاہ میں یہ چاہیئے کہ جزا و سزا پر قادر ہو تا سیاست مدنی کے کام میں خلل نہ پڑے ۔ سو مالک یوم الدین کے لفظ سے اس صفت کو ظاہر کر دیا ہے ۔ خلاصہ کلام یہ کہ سورۃ موصوفہ بالا نے تمام وہ لوازم بادشاہت پیش کئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین پر خدا کی بادشاہت اور بادشاہی تصرفات موجود ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سُنو اور سمجھو کہ بڑی معرفت یہی ہے کہ زمین کا ذرّہ ذرّہ بھی ایسا ہی خدا کے قبضہ اقتدار میں ہے جیسا کہ آسمان کا ذرّہ ذرّہ خدا کی بادشاہت میں ہے ۔ اور جیسا کہ آسمان پر ایک عظیم الشان تجلّی ہے زمین پر بھی ایک عظیم الشان تجلّی ہے بلکہ آسمان کی تجلّی تو ایک ایمانی امر ہے ۔ عام انسان نہ آسمان پر گئے نہ اس کا مشاہدہ کیا

مگر زمین پر جو خدا کی بادشاہت کی تجلّی ہے وہ تو صریح ہر ایک شخص کو آنکھوں سے نظر آرہی ہے۔ ہر ایک انسان خواہ کیسا ہی دولت مند ہو اپنی خواہش کے مخالف موت کا پیالہ پیتا ہے۔ پس دیکھو اس شاہ حقیقی کے حکم کی کیسی زمین پر تجلّی ہے کہ جب حکم آجاتا ہے تو کوئی اپنی موت کو ایک سیکنڈ بھی روک نہیں سکتا۔ ہر ایک خبیث اور ناقابلِ علاج مرض جب دامن گیر ہوتی ہے تو کوئی طبیب ڈاکٹر اس کو دُور نہیں کر سکتا۔ پس غور کرو یہ کیسی خدا کی بادشاہت کی زمین پر تجلّی ہے جو اس کے حکم ردّ نہیں ہو سکتے۔ پھر کیونکر کہا جائے کہ زمین پر خدا کی بادشاہت نہیں بلکہ آئندہ کسی زمانہ میں آئیگی۔ دیکھو اسی زمانہ میں خدا کے آسمانی حکم نے طاعون کے ساتھ زمین کو ہلا دیا تا اس کے مسیح موعود کے لئے ایک نشان ہو۔ پس کون ہے جو اس کی مرضی کے سوا اس کو دُور کر سکے۔ پس کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ ابھی زمین پر خدا کی بادشاہت نہیں۔ ہاں ایک بدکار قیدیوں کی طرح اس کی زمین میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ کبھی نہ مرے لیکن خدا کی سچی بادشاہت اس کو ہلاک کر دیتی ہے اور وہ آخر پنجۂ ملک الموت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ پھر کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تک خدا کی زمین پر بادشاہت نہیں۔ دیکھو زمین پر ہر روز خدا کے حکم سے ایک ساعت میں کروڑہا انسان مر جاتے ہیں اور کروڑہا اس کے ارادہ سے پیدا ہو جاتے ہیں اور کروڑہا اُس کی مرضی سے فقیر سے امیر اور امیر سے فقیر ہو جاتے ہیں۔ پھر کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تک زمین پر خدا کی بادشاہت نہیں۔ آسمان پر تو فرشتے رہتے ہیں مگر زمین پر آدمی بھی ہیں اور فرشتے بھی خدا کے کارکن ہیں اور اس کی سلطنت کے خادم ہیں جو انسانوں کے مختلف کاموں کے محافظ چھوڑے گئے ہیں۔ اور وہ ہر وقت خدا کی اطاعت کرتے ہیں اور اپنی رپورٹیں بھیجتے رہتے ہیں۔ پس کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ زمین پر خدا کی بادشاہت نہیں۔ بلکہ خدا سب سے زیادہ اپنی زمینی بادشاہت سے پہچانا گیا۔ کیونکہ ہر ایک شخص خیال کرتا ہے کہ آسمان کا راز مخفی اور غیر مشہود ہے۔ بلکہ حال کے زمانہ میں قریبًا تمام عیسائی اور ان کے فلاسفر آسمانوں کے وجود کے قائل نہیں جن پر خدا کی بادشاہت کا انجیلوں میں سارا دارومدار رکھا گیا ہے مگر زمین تو فی الواقع ایک کرّہ ہمارے پاؤں کے نیچے ہے۔ اور ہزارہا قضاء و قدر کے امور اس پر ظاہر ہو رہے ہیں جو خود سمجھ آتا ہے کہ یہ سب کچھ تغیّر و تبدّل اور حدوث اور فنا کسی خاص مالک کے حکم سے ہو رہا ہے پھر کیونکر کہا جائے کہ زمین پر ابھی خدا کی بادشاہت نہیں ......

ہمارے خدائے عزّوجلّ نے سورۃ فاتحہ میں نہ آسمان کا نام لیا نہ زمین کا۔ اور

یہ کہہ کر حقیقت سے ہمیں خبر دیدی کہ وہ رب العالمین ہے۔ یعنی جہاں تک آبادیاں ہیں اور جہاں تک کسی قسم کی مخلوق کا وجود موجود ہے۔ خواہ اجسام خواہ ارواح ان سب کا پیدا کرنیوالا اور پرورش کرنے والا خدا ہے جو ہر وقت ان کی پرورش کرتا ہے اور ان کے مناسب حال انکا انتظام کر رہا ہے۔ اور تمام عالموں پر ہر وقت ہر دم اس کا سلسلۂ ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیّت اور جزا سزا کا جاری ہے۔ اور یاد رہے کہ سورۃ فاتحہ میں فقرہ **مالک یوم الدین** سے صرف یہ مراد نہیں کہ قیامت کو جزا سزا ہوگی بلکہ قرآن شریف میں بار بار اور صاف صاف بیان کیا گیا ہے کہ قیامت تو مجازات کبریٰ کا وقت ہے۔ مگر ایک قسم کی مجازات اسی دنیا میں شروع ہو جاتی ہے جس کی طرف آیت یجعل لکم فرقانًا اشارہ کرتی ہے۔

(کشتی نوح ص۴۳ - ۵۶)

واضح ہو کہ قرآن شریف کی تعلیم کی رُو سے خدا جیسا کہ آسمان پر ہے زمین پر بھی ہے۔ جیسا کہ اُس نے فرمایا ہے۔ ھوالذی فی السماء الٰہٌ وفی الارض الٰہٌ یعنی زمین میں وہی خدا ہے اور وہی آسمان میں خدا۔ اور فرمایا کہ کسی پوشیدہ مشورہ میں تین آدمی نہیں ہوتے جن کے ساتھ چوتھا خدا نہیں ہوتا۔ اور فرمایا کہ وہ غیر محدود ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں لکھا ہے لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار۔ یعنی آنکھیں اس کے انتہا کو نہیں پا سکتیں اور وہ آنکھوں کے انتہا تک پہنچتا ہے۔ ایسا ہی خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید یعنی ہم انسان کی شاہ رگ سے بھی زیادہ اس سے نزدیک ہیں۔ اور یہ بھی ایک جگہ فرمایا کہ خدا ہر ایک چیز پر محیط ہے اور یہ بھی فرمایا کہ ان اللّٰہ یحول بین المرء وقلبہ یعنی خدا وہ ہے جو انسان اور اُس کے دل میں حائل ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض یعنی خدا وہ ہے جو زمین و آسمان میں اسی کے چہرہ کی چمک ہے۔ اور اس کے بغیر سب تاریکی ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ کل من علیھا فانٍ ویبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام یعنی ہر ایک وجود ہلاک ہونے والا اور تغیّر پذیر ہے اور وہ جو باقی رہنے والا ہے وہی خدا ہے۔ یعنی ہر ایک چیز فنا کو قبول کرتی ہے اور تغیّر قبول کرتی ہے۔ مگر انسانی فطرت اس بات کے ماننے کے لئے مجبور ہے کہ اس تمام عالم ارضی و سماوی میں ایک ایسی ذات بھی ہے کہ جب سب پر فنا اور تغیّر وارد ہو اس پر تغیّر اور فنا وارد نہیں ہوگی۔ وہ اپنے حال پر باقی رہتا ہے وہی خدا ہے لیکن چونکہ زمین پر گناہ اور معصیت اور ناپاک کام بھی ظاہر ہوتے ہیں اور خدا کو صرف زمین تک محدود رکھنے والے آخر کار بُت پرست

اور مخلوق پرست ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ تمام ہندو ہو گئے۔ اس لئے قرآن شریف میں ایک طرف تو یہ بیان کیا کہ خدا کا اپنی مخلوق سے شدید تعلق ہے اور وہ ہر ایک جان کی جان ہے۔ اور ہر ایک ہستی اُس کے سہارے سے ہے پھر دوسری طرف اس غلطی سے محفوظ رکھنے کے لئے کہ تا اس کے تعلق سے جو انسان کے ساتھ ہے کوئی شخص انسان کو اس کا عین ہی نہ سمجھ بیٹھے جیسا کہ ویدانت والے سمجھتے ہیں۔ یہ بھی فرما دیا کہ وہ سب سے برتر اور تمام مخلوقات سے وراء الوراء مقام پر ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں **عرش** کہتے ہیں۔ اور عرش کوئی مخلوق چیز نہیں ہے۔ صرف وراء الوراء مرتبہ کا نام ہے۔ نہ یہ کہ کوئی ایسا تخت ہے جس پر خدا تعالیٰ کو انسان کی طرح بیٹھا ہوا تصوّر کیا جائے۔ بلکہ جو مخلوق سے بہت وراء اور منزّہ اور تقدس کا مقام ہے اس کو عرش کہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ سب کے ساتھ خالقیت اور مخلوقیت کا تعلّق قائم کر کے پھر عرش پر قائم ہو گیا یعنی تمام تعلقات کے بعد الگ کا الگ رہا اور مخلوق کے ساتھ مخلوط نہیں ہوا۔

غرض خدا کا انسان کے ساتھ ہونا اور ہر ایک چیز پر محیط ہونا یہ خدا کی تشبیہی صفت ہے۔ اور خدا نے قرآن شریف میں اس لئے اس صفت کا ذکر کیا ہے کہ تا وہ انسان پر اپنا قرب ثابت کرے۔ اور خدا کا تمام مخلوقات سے وراء الوراء ہونا اور سب سے برتر اور اعلیٰ اور دُور تر ہونا اور اس تنزّہ اور تقدّس کے مقام پر ہونا جو مخلوقیت سے دُور ہے جو عرش کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس صفت کا نام تنزیہی صفت ہے۔ اور خدا نے قرآن شریف میں اس لئے اس صفت کا ذکر کیا تا وہ اس سے اپنی توحید اور اپنا وحدہٗ لاشریک ہونا اور مخلوق کی صفات سے اپنی ذات کا منزّہ ہونا ثابت کرے۔ دوسری قوموں نے خدا تعالیٰ کی ذات کی نسبت یا تو تنزیہی صفت اختیار کی ہے یعنی نرگن کے نام سے پکارا ہے اور یا اس کو سرگن مان کر ایسی تشبیہہ قرار دی ہے کہ گویا وہ عین مخلوقات ہے اور ان دونوں صفات کو جمع نہیں کیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں ان دونوں صفات کے آئینہ میں اپنا چہرہ دکھلایا ہے اور یہی **کمال توحید** ہے۔

(چشمۂ معرفت ص ۸۹-۹۱)

مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ عرش کوئی جسمانی اور مخلوق چیز ہے جس پر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ تمام قرآن شریف کو اوّل سے آخر تک پڑھو اس میں ہرگز نہیں پاؤ گے کہ عرش بھی کوئی چیز محدود اور مخلوق ہے۔ خدا نے بار بار قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ ہر ایک چیز جو کوئی وجود رکھتی ہے اس کا میں ہی پیدا کرنے والا ہوں۔ میں ہی زمین و آسمان اور روحوں اور اُن کی تمام قوتوں کا خالق ہوں

میں اپنی ذات میں آپ قائم ہوں ۔ اور ہر ایک چیز میرے ساتھ قائم ہے ۔ ہر ایک ذرہ اور ہر ایک چیز جو موجود ہے وہ میری ہی پیدائش ہے مگر کہیں نہیں فرمایا کہ عرش بھی کوئی جسمانی چیز ہے جس کا میں پیدا کرنے والا ہوں ۔ .... قرآن شریف میں لفظ عرش کا جہاں جہاں استعمال ہوا ہے اُس سے مراد خدا کی عظمت اور جبروت اور بلندی ہے ۔ اسی وجہ سے اس کو مخلوق چیزوں میں داخل نہیں کیا ۔ اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور جبروت کے مظہر چار ہیں ۔ جو وید کے رُو سے چار دیوتے کہلاتے ہیں مگر قرآنی اصطلاح کے رُو سے اُن کا نام فرشتے بھی ہے ۔

(نسیم دعوت ص ۸۶-۸۹)

عرش سے مراد قرآن شریف میں وہ مقام ہے جو تشبیہی مرتبہ سے بالاتر اور ہر ایک عالم سے برتر اور نہاں در نہاں اور تقدس اور تنزّہ کا مقام ہے ۔ وہ کوئی ایسی جگہ نہیں کہ پتھر یا اینٹ یا کسی اور چیز سے بنائی گئی ہو ۔ اور خدا اُس پر بیٹھا ہوا ہے ۔ اِس لئے عرش کو غیر مخلوق کہتے ہیں ۔ اور خدا تعالیٰ جیسا کہ یہ فرماتا ہے کہ کبھی وہ مومن کے دل پر اپنی تجلی کرتا ہے ایسا ہی وہ فرماتا ہے کہ عرش پر اُسکی تجلّی ہوتی ہے اور صاف طور پر فرماتا ہے کہ ہر ایک چیز کو میں نے اٹھایا ہوا ہے ۔ یہ کہیں نہیں کہا کہ کسی چیز نے مجھے بھی اٹھایا ہوا ہے ۔ اور عرش جو ہر ایک عالم سے برتر مقام ہے وہ اُس کی تنزیہی صفت کا مظہر ہے ۔ اور ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ ازل سے اور قدیم سے خدا میں دو صفتیں ہیں ۔ ایک صفت تشبیہی دوسری صفت تنزیہی اور چونکہ خدا کے کلام میں دونوں صفات کا بیان کرنا ضروری تھا یعنی ایک تشبیہی صفت اور دوسری تنزیہی صفت ۔ اِس لئے خدا نے تشبیہی صفات کے اظہار کے لئے اپنے ہاتھ ۔ آنکھ ۔ محبت ۔ غضب وغیرہ صفات قرآن شریف میں بیان فرمائے ۔ اور پھر جبکہ احتمال تشبیہہ کا پیدا ہوا تو بعض جگہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ کہہ دیا اور بعض جگہ ثُمَّ استوٰی علی العرش کہہ دیا ۔ جیسا کہ سورۃ رعد جزو نمبر ۱۳ میں بھی یہ آیت ہے ۔ اللہ الذی رفع السمٰوٰت بغیر عمدٍ ترونھا ثمّ استوٰی علی العرش ۔ (ترجمہ) تمہارا خدا وہ خدا ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اور پھر اُس نے عرش پر قرار پکڑا ۔ اس آیت کے ظاہری معنے کی رو سے اسجگہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے خدا کا عرش پر قرار نہ تھا ؟ اس کا یہی جواب ہے کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے بلکہ وراء الورا ہونے کی ایک حالت ہے جو اس کی صفت ہے ۔ پس جبکہ خدا نے زمین و آسمان اور ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور ظلّی طور پر اپنے نور سے سورج چاند اور ستاروں کو نور بخشا اور انسان کو بھی استعارہ کے طور پر اپنی شکل پر پیدا کیا اور اپنے اخلاقِ کریمہ اُس میں پھونک دیئے تو

اِس طور سے خدا نے اپنے لئے ایک تشبیہ قائم کی۔ مگر چونکہ وہ ہر ایک تشبیہ سے پاک ہے اسلئے عرش پر قرار پکڑنے سے اپنے تنزّہ کا ذکر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ سب کچھ پیدا کر کے پھر مخلوق کا عین نہیں ہے۔ بلکہ سب سے الگ اور وراء الوراء مقام پر ہے۔

(چشمۂ معرفت ص ۲۶۴-۲۶۶)

ایک اَور اعتراض مخالف لوگ پیش کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ قرآن شریف کے بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائینگے جس سے اشارۃ النص کے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں چار فرشتے عرش کو اٹھاتے ہیں۔ اور اب اسجگہ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ تو اس بات سے پاک اور برتر ہے کہ کوئی اُس کے عرش کو اٹھا وے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابھی تم سُن چکے ہو کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے جو اٹھائی جائے یا اٹھانے کے لائق ہو بلکہ صرف تنزہ اور تقدس کے مقام کا نام عرش ہے۔ اِسی لئے اس کو غیر مخلوق کہتے ہیں۔ ورنہ ایک مجسم چیز خدا کی خالقیت سے کیونکر باہر رہ سکتی ہے۔ اور عرش کی نسبت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب استعارات ہیں۔ پس اس سے ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ایسا اعتراض محض حماقت ہے۔

اب ہم فرشتوں کے اٹھانے کا اصل نکتہ ناظرین کو سُناتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے تنزہ کے مقام یعنی اس مقام میں جبکہ اس کی صفت تنزہ اس کی تمام صفات کو روپوش کر کے اس کو وراء الوراء اور نہاں در نہاں کر دیتی ہے جس مقام کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں عرش ہے تب خدا عقولِ انسانیہ سے بالاتر ہو جاتا ہے اور عقل کو طاقت نہیں رہتی کہ اسکو دریافت کر سکے تب اس کی چار صفتیں جن کو چار فرشتوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جو دنیا میں ظاہر ہو چکی ہیں اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہیں۔

(۱) اوّل ربوبیت جس کے ذریعہ سے وہ انسان کی روحانی اور جسمانی تکمیل کرتا ہے۔ چنانچہ رُوح اور جسم کا ظہور ربوبیت کے تقاضا سے ہے۔ اور اسی طرح خدا کا کلام نازل ہونا اور اس کے خارق عادت نشان ظہور میں آنا ربوبیت کے تقاضا سے ہے۔

(۲) دوم خدا کی رحمانیت جو ظہور میں آچکی ہے یعنی جو کچھ اس نے بغیر پاداش اعمال بیشمار نعمتیں انسان کے لئے میسر کی ہیں۔ یہ صفت بھی اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے۔

(۳) تیسری خدا کی رحیمیت ہے اور وہ یہ کہ نیک عمل کرنے والوں کو اوّل تو صفت رحمانیت کے تقاضا سے نیک اعمال کی طاقتیں بخشتا ہے اور پھر صفت رحیمیت کے تقاضا سے نیک اعمال

اُن سے ظہور میں لاتا ہے اور اس طرح پر ان کو آفات سے بچاتا ہے۔ اور یہ صفت بھی اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے۔

(۴) چوتھی صفت مالکِ یوم الدین ہے۔ یہ بھی اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے۔

یہ چاروں صفتیں ہیں جو اس کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ یعنی اس کے پوشیدہ وجود کا اِن صفات کے ذریعہ سے اِس دنیا میں پتہ لگتا ہے۔ اور یہ معرفت عالم آخرت میں دوچند ہو جائیگی گویا بجائے چار کے آٹھ فرشتے ہو جائیں گے۔

(چشمۂ معرفت ص ۲۶۶-۲۶۷)

توحید ایک نور ہے جو آفاقی اور انفسی معبودوں کی نفی کے بعد دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور وجود کے ذرّہ ذرّہ میں سرائت کر جاتا ہے۔ پس وہ بجز خدا اور اس کے رسول کے ذریعہ کے محض اپنی طاقت سے کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔ انسان کا فقط یہ کام ہے کہ اپنی خودی پر موت وارد کرے اور اس شیطانی نخوت کو چھوڑ دے کہ مَیں علوم میں پرورش یافتہ ہوں اور ایک جاہل کی طرح اپنے تئیں تصوّر کرے اور دُعا میں لگا رہے۔ تب توحید کا نور خدا کی طرف سے اس پر نازل ہوگا اور ایک نئی زندگی اس کو بخشیگا۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۴۴)

پس چونکہ قدیم سے اور جب سے کہ دنیا پیدا ہوئی ہے **خدا کا شناخت کرنا** نبی کے شناخت کرنے سے وابستہ ہے۔ اس لئے یہ خود غیر ممکن اور محال ہے کہ بجز ذریعۂ نبی کے توحید مِل سکے۔ نبی خدا کی صورت دیکھنے کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسی آئینہ کے ذریعہ سے خدا کا چہرہ نظر آتا ہے جب خدا تعالےٰ اپنے تئیں دنیا پر ظاہر کرنا چاہتا ہے تو نبی کو جو اس کی قدرتوں کا مظہر ہے دنیا میں بھیجتا ہے اور اپنی وحی اس پر نازل کرتا ہے اور اپنی ربوبیت کی طاقتیں اس کے ذریعہ سے دکھلاتا ہے۔ تب دنیا کو پتہ لگتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ پس جن لوگوں کا وجود ضروری طور پر خدا کے قدیم قانون ازلی کے رو سے خدا شناسی کے لئے ذریعہ مقرر ہو چکا ہے اُن پر ایمان لانا توحید کی ایک جزو ہے اور بجز اس ایمان کے توحید کامل نہیں ہو سکتی کیونکہ ممکن نہیں کہ آسمانی نشانوں اور قدرت نما عجائبات کے جو نبی دکھلاتے ہیں اور معرفت تک پہنچاتے ہیں وہ خالص توحید جو چشمۂ یقین کامل سے پیدا ہوتی ہے میسر آ سکے۔ وہی ایک قوم ہے جو خدا نما ہے جن کے ذریعہ سے وہ خدا

جس کا وجود دقیق در دقیق اور مخفی در مخفی اور غیب الغیب ہے ظاہر ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ سے وہ کنزِ مخفی جس کا نام خدا ہے نبیوں کے ذریعہ سے ہی شناخت کیا گیا ہے۔ ورنہ وہ توحید جو خدا کے نزدیک توحید کہلاتی ہے جس پر عملی رنگ کامل طور پر چڑھا ہوتا ہے اس کا حاصل ہونا بغیر ذریعہ نبی کے جیسا کہ خلاف عقل ہے ویسا ہی خلاف تجارب سالکین ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۱۲-۱۱۳)

یاد رہے کہ حقیقی توحید جس کا اقرار خدا ہم سے چاہتا ہے اور جس کے اقرار سے نجات وابستہ ہے یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنی ذات میں ہر ایک شریک سے خواہ بُت ہو خواہ انسان ہو خواہ سورج ہو یا چاند ہو یا اپنا نفس یا اپنی تدبیر اور مکر و فریب ہو منزہ سمجھنا اور اس کے مقابل پر کوئی قادر تجویز نہ کرنا۔ کوئی رازق نہ ماننا۔ کوئی معزّ اور مذلّ خیال نہ کرنا۔ کوئی ناصر اور مددگار قرار نہ دینا اور دوسرے یہ کہ اپنی محبت اُسی سے خاص کرنا۔ اپنی عبادت اُسی سے خاص کرنا۔ اپنا تذلّل اُسی سے خاص کرنا۔ اپنی اُمیدیں اُسی سے خاص کرنا۔ اپنا خوف اُسی سے خاص کرنا۔ پس کوئی توحید بغیر ان تین قسم کی تخصیص کے کامل نہیں ہو سکتی۔ اوّل ذات کے لحاظ سے توحید۔ یعنی یہ کہ اس کے وجود کے مقابل پر تمام موجودات کو معدوم کی طرح سمجھنا اور تمام کو ہالکۃ الذات اور باطلۃ الحقیقت خیال کرنا۔ دوم صفات کے لحاظ سے توحید۔ یعنی یہ کہ ربوبیت اور الوہیت کی صفات بجُز ذاتِ باری کسی میں قرار نہ دینا اور جو بظاہر ربّ الانواع یا فیض رساں نظر آتے ہیں یہ اُسی کے ہاتھ کا ایک نظام یقین کرنا۔ تیسرے اپنی محبت اور صدق اور صفا کے لحاظ سے توحید۔ یعنی محبت وغیرہ شعارِ عبودیت میں دوسرے کو خدا تعالیٰ کا شریک نہ گرداننا اور اُسی میں کھوئے جانا۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص ۲۳-۲۴)

آجکل توحید اور ہستی الٰہی پر بہت زور آور حملے ہو رہے ہیں۔ عیسائیوں نے بھی بہت کچھ زور مارا اور لکھا ہے لیکن جو کچھ کہا اور لکھا وہ اسلام کے خدا کی بابت ہی لکھا ہے نہ کہ ایک مُردہ مصلوب اور عاجز خدا کی بابت۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر قلم اٹھائیگا اس کو آخر کار اُسی خدا کی طرف آنا پڑے گا جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ صحیفۂ فطرت کے ایک ایک پتّے میں اس کا پتہ ملتا ہے۔ اور بالطبع انسان اُسی خدا کا نقش اپنے اندر رکھتا ہے۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۷۹)

حضرات عیسائی خوب یاد رکھیں کہ مسیح علیہ السلام کا نمونہ قیامت ہونا سرمو ثابت نہیں ہوا۔ نہ عیسائی جی اُٹھے بلکہ مردہ اور سب مردوں سے اوّل درجہ پر اور تنگ و تاریک قبروں میں پڑے ہوئے ہیں اور شرک کے گڑھے میں گرے ہوئے ہیں۔ نہ ایمانی رُوح اُن میں ہے نہ ایمانی رُوح کی برکت۔ بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ توحید کا جو مخلوق پرستی سے پرہیز کرنا ہے وہ بھی اِن کو نصیب نہیں ہوا۔ اور ایک اپنے جیسے عاجز اور ناتوان کو خالق سمجھ کر اس کی پرستش کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ توحید کے تین درجے ہیں۔ سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنے جیسی مخلوق کی پرستش نہ کریں۔ نہ پتھر کی۔ نہ آگ کی۔ نہ آدمی کی۔ نہ کسی ستارہ کی۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسباب پر بھی ایسے نہ گریں کہ گویا ایک قسم کا اُن کو ربوبیت کے کارخانہ میں مستقل دخل قرار دیں۔ بلکہ ہمیشہ مسبّب پر نظر رہے نہ اسباب پر۔ تیسرا درجہ توحید کا یہ ہے کہ تجلّیاتِ الٰہیہ کا کامل مشاہدہ کرکے ہر یک غیر کے وجود کو کالعدم قرار دیں اور ایسا ہی اپنے وجود کو بھی۔ غرض ہر یک چیز نظر میں فانی دکھائی دے بجز اللہ تعالیٰ کی ذات کامل الصفات کے۔ یہی روحانی زندگی ہے کہ یہ مراتب ثلاثہ توحید کے حاصل ہو جائیں۔ اب غور کرکے دیکھ لو کہ رُوحانی زندگی کے تمام جاودانی چشمے محض حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی طفیل دنیا میں آئے ہیں۔ یہی اُمت ہے کہ اگرچہ نبی تو نہیں مگر نبیوں کی مانند خدا تعالیٰ سے ہمکلام ہو جاتی ہے۔ اور اگرچہ رسول نہیں مگر رسولوں کی مانند خدا تعالےٰ کے روشن نشان اس کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے ہیں اور روحانی زندگی کے دریا اس میں بہتے ہیں اور کوئی نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ کوئی ہے کہ جو برکات اور نشانوں کے دکھلانے کے لئے مقابل میں کھڑا ہو کر ہمارے اِس دعویٰ کا جواب دے!!!

(آئینہ کمالات اسلام ص ۲۲۳-۲۲۴)

افسوس ہے کہ مجھے وہ لفظ نہیں ملے جس میں غیر اللہ کی طرف رجوع کرنے کی برائیاں بیان کر سکوں۔ لوگوں کے پاس جا کر منت خوشامد کرتے ہیں۔ یہ بات خدا تعالیٰ کی غیرت کو جوش میں لاتی ہے۔ کیونکہ یہ تو لوگوں کی نماز ہے۔ پس وہ اس سے ہٹتا اور اسے دُور پھینک دیتا ہے مَیں موٹے الفاظ میں اس کو بیان کرتا ہوں۔ گو یہ امر اس طرح پر نہیں ہے۔ مگر سمجھ میں خوب آسکتا ہے کہ جیسے ایک مرد غیور کی غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ وہ اپنی بیوی کو کسی غیر کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہوئے دیکھ سکے۔ اور جس طرح پر وہ مرد ایسی حالت میں اس نابکار عورت کو واجب القتل سمجھتا بلکہ بسا اوقات ایسی وارداتیں ہو جاتی ہیں ایسا ہی جوش اور غیرتِ الوہیت

کا ہے۔ عبودیت اور دُعا خاص اُسی ذات کے مدِّمقابل ہیں۔ وہ پسند نہیں کر سکتا کہ کسی اَور کو معبود قرار دیا جائے یا پکارا جاوے۔ پس خوب یاد رکھو! اور پھر یاد رکھو!! کہ غیر اللہ کی طرف جُھکنا خدا سے کاٹنا ہے۔ نماز اور توحید کچھ ہی کہو۔ کیونکہ توحید کے عملی اقرار کا نام ہی نماز ہے، اس وقت بے برکت اور بے سود ہوتی ہے جب اس میں نیستی اور تذلّل کی رُوح اور حنیف دل نہ ہو!!!

(ملفوظات جلد اوّل صفحہ ۱۶۰-۱۶۱)

شرک کی کئی قسم ہیں۔ ایک تو وہ موٹا اور صریح شرک ہے جس میں ہندو عیسائی یہود اور دوسرے بت پرست لوگ گرفتار ہیں۔ جس میں کسی انسان یا پتھر یا اور بے جان چیزوں یا قوتوں یا خیالی دیویوں اور دیوتاؤں کو خدا بنا لیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ شرک ابھی تک دنیا میں موجود ہے۔ لیکن یہ زمانہ روشنی اور تعلیم کا کچھ ایسا زمانہ ہے کہ عقلیں اس قسم کے شرک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگ گئی ہیں۔ یہ جُدا امر ہے کہ وہ قومی مذہب کی حیثیت سے بظاہر ان بے ہودگیوں کا اقرار کریں لیکن دراصل بالطبع لوگ ان سے متنفّر ہوتے جاتے ہیں۔ مگر ایک اور قسم کا شرک ہے جو مخفی طور پر زہر کی طرح اثر کر رہا ہے اور وہ اس زمانے میں بہت بڑھتا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ پر بھروسہ اور اعتماد بالکل نہیں رہا۔

ہم یہ ہرگز نہیں کہتے اور نہ ہمارا یہ مذہب ہے کہ اسباب کی رعایت بالکل نہ کی جاوے کیونکہ خدا تعالےٰ نے رعایت اسباب کی ترغیب دی ہے۔ اور اس حد تک جہاں تک یہ رعایت ضروری ہے۔ اگر رعایت اسباب نہ کی جاوے تو انسانی قوتوں کی بے حرمتی کرنا اور خدا تعالےٰ کے عظیم الشان فعل کی توہین کرنا ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں جبکہ بالکل رعایت اسباب کی نہ کی جاوے ضروری ہوگا کہ تمام قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہیں بالکل بے کار چھوڑ دیا جاوے اور ان سے کام نہ لیا جاوے۔ اور ان سے کام نہ لینا اور ان کو بے کار چھوڑ دینا خدا تعالےٰ کے فعل کو لغو اور عبث قرار دینا ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔ پس ہمارا یہ منشاء اور مذہب ہرگز نہیں کہ اسباب کی رعایت بالکل ہی نہ کی جاوے بلکہ رعایت اسباب اپنی حد تک ضروری ہے آخرت کے لئے بھی اسباب ہی ہیں۔ خدا تعالےٰ کے احکام کی بجا آوری اور بدیوں سے بچنا اور دوسری نیکیوں کو اختیار کرنا اس لئے ہے کہ اس عالم اور دوسرے عالم میں سکھ ملے۔ تو گویا یہ نیکیاں اسباب کے قائم مقام ہیں۔ اسی طرح پر یہ خدا تعالیٰ نے منع نہیں کیا کہ دنیوی ضرورتوں

کے پورا کرنے کے لئے اسباب کو اختیار کیا جاوے۔ نوکری والا نوکری کرے۔ زمیندار اپنی زمینداری کے کاموں میں رہے۔ مزدور مزدوریاں کریں تا وہ اپنے عیال و اطفال اور دوسرے متعلقین اور اپنے نفس کے حقوق کو ادا کر سکیں۔ پس ایک جائز حد تک یہ سب درست ہے۔ اور اس کو منع نہیں کیا جاتا۔ لیکن جب انسان حد سے تجاوز کر کے اسباب ہی پر پورا بھروسہ کرے اور سارا دارومدار اسباب پر ہی جا ٹھہرے تو یہ وہ شرک ہے جو انسان کو اس کے اصل مقصد سے دور پھینک دیتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر فلاں سبب نہ ہوتا تو میں بھوکا مرجاتا۔ یا اگر یہ جائیداد یا فلاں کام نہ ہوتا تو میرا بُرا حال ہو جاتا۔ فلاں دوست نہ ہوتا تو تکلیف ہوتی۔ یہ امور اس قسم کے ہیں کہ خدا تعالیٰ ان کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ جائیداد یا اور اسباب و احباب پر اس قدر بھروسہ کیا جائے کہ خدا تعالےٰ سے بکلی دُور جا پڑے۔ یہ خطرناک شرک ہے جو قرآن شریف کی تعلیم کے صریح خلاف ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وفی السماء رزقکم وما توعدون۔ اور فرمایا ومن یتوکّل علی اللّٰہ فھو حسبہٗ اور فرمایا من یتق اللّٰہ یجعل لّہٗ مخرجًا ویرزقہٗ من حیث لا یحتسب۔ اور فرمایا۔ وھو یتولّی الصالحین۔ قرآن شریف اس قسم کی آیتوں سے بھرا پڑا ہے کہ وہ متقیوں کا متولی اور متکفل ہوتا ہے۔ تو پھر جب انسان اسباب پر تکیہ اور توکّل کرتا ہے۔ تو گویا خدا تعالیٰ کی ان صفات سے حصہ دیتا ہے اور ایک اَور خدا اپنے لئے ان اسباب کا تجویز کرتا ہے۔ چونکہ وہ ایک پہلو کی طرف جھکتا ہے۔ اس سے شرک کی طرف گویا قدم اٹھاتا ہے۔ جو لوگ حکام کی طرف جُھکے ہوئے ہیں اور اُن سے انعام یا خطاب پاتے ہیں۔ اُن کے دل میں ان کی عظمت خدا کی سی عظمت داخل ہو جاتی ہے وہ ان کے پرستار ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ایک امر ہے جو توحید کا استیصال کرتا ہے اور انسان کو اس کے اصل مرکز سے ہٹا کر دُور پھینک دیتا ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ اسباب اور توحید میں تناقض نہ ہونے پاوے بلکہ ہر ایک اپنے اپنے مقام پر رہے۔ اور مآل کار توحید پر جا ٹھہرے۔ وہ انسان کو یہ سکھانا چاہتے ہیں کہ ساری عزتیں۔ سارے آرام اور حاجات برآری کا متکفل خدا ہی ہے۔ پس اگر اس کے مقابل میں کسی اَور کو بھی قائم کیا جاوے تو صاف ظاہر ہے کہ دو ضدّوں کے تقابل سے ایک ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس لئے مقدم خدا تعالیٰ کی توحید ہو۔ رعایت اسباب کی جاوے۔ اسباب کو خدا نہ بنایا جاوے۔ اسی توحید سے ایک محبت خدا تعالیٰ سے پیدا ہوتی ہے جبکہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ نفع و نقصان اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ محسن حقیقی وہی ہے۔ ذرّہ ذرّہ اُسی سے ہے کوئی دوسرا درمیان نہیں آتا۔ جب انسان

اس پاک حالت کو حاصل کرے تو وہ موحّد کہلاتا ہے۔ غرض ایک حالت توحید کی یہ ہے انسان پتھروں یا انسانوں یا اَور کسی چیز کو خدا نہ بنائے بلکہ ان کو خدا بنانے سے بیزاری اور نفرت ظاہر کرے۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ رعایتِ اسباب سے نہ گذرے۔ تیسری قسم یہ ہے کہ اپنے نفس اور وجود کے اغراض کو بھی درمیان سے اٹھا دیا جائے اور اس کی نفی کی جائے۔ بسا اوقات انسان کے زیرِ نظر اپنی خوبی اور طاقت بھی ہوتی ہے کہ فلاں نیکی مَیں نے اپنی طاقت سے کی ہے۔ انسان اپنی طاقت پر ایسا بھروسہ کرتا ہے کہ ہر کام کو اپنی ہی قوت سے منسوب کرتا ہے۔ انسان موحّد تب ہوتا ہے جب اپنی طاقتوں کی بھی نفی کر دے۔

(ملفوظات جلد سوم صـ ۷۹ - ۸۲)

عیسائی صاحبوں کا یہ اعتقاد ہے کہ جو لوگ تثلیث کا عقیدہ اور یسوع کا کفارہ نہیں مانتے وہ ہمیشہ کے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ . . . . غیر محدود خدا کو تین اقنوم میں یا چار اقنوم میں محدود کرنا اور پھر ہر ایک اقنوم کو کامل بھی سمجھنا اور ترکیب کا محتاج بھی اور پھر خدا پر یہ روا رکھنا کہ وہ ابتدا میں کلمہ تھا۔ پھر وہی کلمہ جو خدا تھا مریم کے پیٹ میں پڑا اور اس کے خون سے مجسّم ہُوا اور معمول راہ سے پیدا ہُوا اور سارے دُکھ خسرہ چیچک دانتوں کی تکلیف جو انسان کو ہوتی ہیں سب اٹھائی۔ آخر کو جوان ہو کر پکڑا گیا اور صلیب پر چڑھایا گیا۔ یہ نہایت گندہ شرک ہے۔ جس میں انسان کو خدا ٹھہرایا گیا ہے خدا اس سے پاک ہے کہ وہ کسی کے پیٹ میں پڑے اور مجسّم ہو۔ اور دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو۔ انسانی فطرت اس کو قبول نہیں کر سکتی کہ خدا پر ایسے دُکھ کی مار اور یہ مصیبتیں پڑیں۔ اور وہ جو تمام عظمتوں کا مالک اور تمام عزّتوں کا سرچشمہ ہے اپنے لئے یہ تمام ذلّتیں روا رکھے۔ عیسائی اس بات کو مانتے ہیں کہ خدا کی اس رسوائی کا یہ پہلا ہی موقعہ ہے اور اس سے پہلے اس قسم کی ذلّتیں خدا نے کبھی نہیں اٹھائیں کبھی یہ امر وقوع میں نہیں آیا کہ خدا بھی انسان کی طرح عورت کے رحم میں نطفہ میں مخلوط ہو کر قرار پکڑ گیا ہو۔ جب سے لوگوں نے خدا کا نام سُنا کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ وہ بھی انسان کی طرح کسی عورت کے پیٹ سے پیدا ہُوا ہو۔ یہ تمام وہ باتیں ہیں جن کا عیسائیوں کو خود اقرار ہے اور اس بات کا بھی اقرار ہے کہ گو پہلے یہ تین اقنوم تین جسم علیحدہ علیحدہ نہیں رکھتے تھے مگر اس خاص زمانہ سے جس کو اب ۱۸۹۶ برس جاتا ہے تینوں اقنوم کے لئے تین علیحدہ علیحدہ جسم مقرر ہو گئے۔ باپ کی وہ شکل ہے جو آدم کی۔ کیونکہ اس نے آدم کو اپنی شکل پر بنایا دیکھو توریت پیدائش باب ۱ آیت ۲۷۔ اور

بیٹا یسوع کی شکل پر مجسّم ہوا۔ دیکھو یوحنا باب ۱ آیت ۱۔ اور رُوح القدس کبوتر کی شکل پر متشکّل ہوا۔ دیکھو متی باب ۳ آیت ۱۶ ....

یہ تینوں مجسم خدا عیسائیوں کے زعم میں ہمیشہ کے لئے مجسّم اور ہمیشہ کے لئے علیحدہ علیحدہ وجود رکھتے ہیں۔ اور پھر بھی یہ تینوں مل کر ایک خدا ہے۔ لیکن اگر کوئی بتلا سکتا ہے تو ہمیں بتلاوے کہ باوجود اس دائمی تجسّم اور تغیّر کے یہ تینوں ایک کیونکر ہیں۔ بھلا ہمیں کوئی ڈاکٹر مارٹن کلارک اور پادری عماد الدین اور پادری ٹھاکر داس کو باوجود ان کے علیحدہ علیحدہ جسم کے ایک کر کے تو دکھلاوے ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر تینوں کو کوٹ کر بھی بعض کا گوشت بعض کے ساتھ ملا دیا جاوے پھر بھی جن کو خدا نے تین بنایا تھا ہرگز ایک نہیں ہو سکیں گے۔ پھر جبکہ اس فانی جسم کے حیوان باوجود امکانِ تحلیل کے اور تفرقِ جسم کے ایک نہیں ہو سکتے پھر ایسے تین مجسّم جن میں بموجب عقیدہ عیسائیاں تحلیل اور تفریق جائز نہیں کیونکر ایک ہو سکتے ہیں؟

یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ عیسائیوں کے یہ تین خدا بطور تین ممبر کمیٹی کے ہیں اور بزعم انکے تینوں کی اتفاق رائے سے ہر ایک حکم نافذ ہوتا ہے یا کثرت رائے پر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ گویا خدا کا کارخانہ بھی جمہوری سلطنت ہے۔ اور گویا اُن کے گاڈ صاحب کو بھی شخصی سلطنت کی لیاقت نہیں۔ تمام مدار کونسل پر ہے۔

غرض عیسائیوں کا یہ مرکب خدا ہے جس نے دیکھنا ہو دیکھ لے۔

(انجام آتھم ص ۳۴ - ۳۶)

عیسائی مذہب توحید سے تہی دست اور محروم ہے۔ بلکہ ان لوگوں نے سچے خدا سے مُنہ پھیر کر ایک نیا خدا اپنے لئے بنایا ہے۔ جو ایک اسرائیلی عورت کا بیٹا ہے۔ مگر کیا یہ نیا خدا ان کا قادر ہے جیسا کہ اصلی خدا قادر ہے؟ اس بات کے فیصلہ کے لئے خود اس کی سرگذشت گواہ ہے۔ کیونکہ اگر وہ قادر ہوتا تو یہودیوں کے ہاتھ سے ماریں نہ کھاتا۔ رومی سلطنت کی حوالات میں نہ دیا جاتا۔ اور صلیب پر کھینچا نہ جاتا۔ اور جب یہودیوں نے کہا تھا کہ صلیب پر سے خود بخود اُتر آ تو ہم ابھی ایمان لے آئیں گے۔ اُسی وقت اُتر آتا۔ لیکن اس نے کسی موقعہ پر اپنی قدرت نہیں دکھلائی رہے اُس کے معجزات سو واضح ہو کہ اُس کے معجزات دوسرے اکثر نبیوں کی نسبت بہت ہی کم ہیں۔ مثلاً اگر کوئی عیسائی ایلیا نبی کے معجزات سے جو بائیبل میں مفصّل مذکور ہیں جن میں سے مُردوں کا زندہ کرنا بھی ہے مسیح ابن مریم کے معجزات سے مقابلہ کرے تو اس کو ضرور اقرار

کرنا پڑے گا کہ ایلیا نبی کے معجزات شان اور شوکت اور کثرت میں مسیح ابن مریم کے معجزات سے بہت بڑھ کر ہیں۔ ہاں انجیلوں میں بار بار اس معجزہ کا ذکر ہے کہ یسوع مسیح مصروعون یعنی مرگی زدہ لوگوں میں سے جن نکالا کرتا تھا۔ اور یہ بڑا معجزہ اس کا شمار کیا گیا ہے۔ جو محققین کے نزدیک ایک ہنسی کی جگہ ہے آجکل کی تحقیقات سے ثابت ہے کہ مرض صرع ضعف دماغ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یا بعض اوقات کوئی رسولی دماغ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بعض دفعہ کسی اور مرض کا یہ عرض ہوتی ہے لیکن ان تمام محققین نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس مرض کا سبب جن بھی ہوا کرتے ہیں ....

مسیح کے کسی معجزہ یا طرز ولادت میں کوئی ایسا اعجوبہ نہیں کہ وہ اس کی خدائی پر دلالت کرے۔ اسی امر کی طرف اشارہ کرنے کیلئے خدا تعالےٰ نے مسیح کی ولادت کے ذکر کے ساتھ یحییٰ کی ولادت کا ذکر کر دیا تا معلوم کہ جیسا کہ یحییٰ کی خارق عادت ولادت ان کو انسان ہونے سے باہر نہیں لے جاتی۔ ایسا ہی مسیح ابن مریم کی ولادت اس کو خدا نہیں بناتی ....

مسیح ہرگز کسی بات پر قادر نہیں تھا۔ صرف ایک عاجز انسان تھا۔ اور انسانی ضعف اور لاعلمی اپنے اندر رکھتا تھا۔ اور انجیل سے ظاہر ہے کہ اس کو غیب کا علم ہرگز نہیں تھا کیونکہ وہ ایک انجیر کے درخت کی طرف پھل کھانے گیا۔ اور اُس کو معلوم نہ ہوا کہ اُس پر کوئی پھل نہیں ہے اور وہ خود اقرار کرتا ہے کہ قیامت کی خبر مجھے معلوم نہیں۔ پس اگر وہ خدا ہوتا تو ضرور قیامت کا علم اس کو ہونا چاہیئے تھا۔ اسی طرح کوئی صفت الوہیت اس میں موجود نہیں تھی اور کوئی ایسی بات اس میں نہیں تھی کہ دوسروں میں نہ پائی جائے۔ عیسائیوں کو اقرار ہے کہ وہ مر بھی گیا۔ پس کیسا بدقسمت وہ فرقہ ہے جس کا خدا مر جائے۔ یہ کہنا کہ پھر وہ زندہ ہو گیا تھا کوئی تسلّی کی بات نہیں۔ جس نے مر کر ثابت کر دیا کہ وہ مر بھی سکتا ہے اُس کی زندگی کا کیا اعتبار؟

(نسیم دعوت ص ۱۷-۲۱)

ایسا خدا کس کام کا جو ایک انسان کی طرح جو بڈھا ہو کر بعض قوی اُس کے بیکار ہو جاتے ہیں امتداد زمانہ کی وجہ سے بعض قوی اُس کے بھی بیکار ہو گئے۔ اور نیز ایسا خدا کس کام کا کہ جبتک ٹکٹکی سے باندھ کر اُسکو کوڑے نہ لگیں اور اس کے مُنہ پر نہ تھوکا جائے اور چند روز اُسکو حوالات میں نہ رکھا جائے اور آخر اُسکو صلیب پر نہ کھینچا جائے تب تک وہ اپنے بندوں کے گناہ نہیں بخش سکتا۔ ہم تو ایسے خدا سے سخت بیزار ہیں جس پر ایک ذلیل قوم یہودیوں کی جو اپنی حکومت کھو بیٹھی تھی غالب آ گئی۔ ہم اس خدا کو سچّا خدا جانتے ہیں جس نے ایک مکہ کے غریب بے کس کو اپنا نبی بنا کر اپنی قدرت اور غلبہ کا جلوہ اسی زمانہ میں تمام جہانوں کو دکھایا۔

یہاں تک کہ جب شاہ ایران نے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کے لئے اپنے سپاہی بھیجے۔ تو اُس قادر خدا نے اپنے رسول کو فرمایا کہ سپاہیوں کو کہدے کہ آج رات کو میرے خدا نے تمہارے خداوند کو قتل کر دیا ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ ایک طرف ایک شخص خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اور آخیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گورنمنٹ رومی کا ایک سپاہی اس کو گرفتار کرکے ایک دو گھنٹہ میں جیل خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ اور تمام رات کی دُعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔ اور دوسری طرف وہ مرد ہے کہ صرف رسالت کا دعویٰ کرتا ہے اور خدا اس کے مقابل پر بادشاہوں کو ہلاک کرتا ہے۔ یہ مقولہ طالبِ حق کے لئے نہایت نافع ہے کہ:- **یار غالب شو کہ تا غالب شوی**۔ ہم ایسے مذہب کو کیا کریں جو مُردہ مذہب ہے۔ ہم اس کتاب سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو مُردہ کتاب ہے۔ اور ہمیں ایسا خدا کیا فیض پہنچا سکتا ہے جو مُردہ خدا ہے۔

(چشمہ مسیحی ص۲۱-۲۲ طبع اوّل)

جس بات کی طرف وہ بُلاتے ہیں وہ نہایت ذلیل خیال اور قابلِ شرم عقیدہ ہے۔ کیا یہ بات عند العقل قبول کرنے کے لائق ہے کہ ایک عاجز مخلوق جو تمام لوازم انسانیت کے اپنے اندر رکھتا ہے خدا کہلاوے؟ کیا عقل اس بات کو مان سکتی ہے کہ مخلوق اپنے خالق کو کوڑے مارے اور خدا کے بندے اپنے قادر خدا کے مُنہ پر تھوکیں اور اُس کو پکڑیں اور اُس کو سولی دیں۔ اور وہ خدا ہو کر اُن کے مقابلہ سے عاجز ہو؟ کیا یہ بات کسی کو سمجھ آسکتی ہے کہ ایک شخص خدا کہلا کر تمام رات دُعا کرے اور پھر اُس کی دُعا قبول نہ ہو؟ کیا کوئی دل اس بات پر اطمینان پکڑ سکتا ہے کہ خدا بھی عاجز بچوں کی طرح نو مہینے پیٹ میں رہے اور خونِ حیض کھاوے اور آخر چیختا ہُوا ہُوا عورتوں کی شرمگاہ سے پیدا ہو؟ کیا کوئی عقلمند اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ خدا بیشمار اور بے انداز زمانہ کے بعد مجسم ہو جائے۔ اور ایک ٹکڑا اس کا انسان کی صورت سے بنے۔ اور دوسرا کبوتر کی۔ اور یہ جسم ہمیشہ کے لئے اُن کے گلے کا ہار ہو جائے۔

(کتاب البریہ ص۸۶-۸۷)

کس قدر ظاہر ہے نور اس مبداء الانوار کا ∴ بن رہا ہے سارا عالم آئینہ ابصار کا
چاند کو کل دیکھ کر میں سخت بیکل ہو گیا ∴ کیونکہ کچھ کچھ تھا نشاں اس میں جمال یار کا
اس بہارِ حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے ∴ مت کرو کچھ ذکر ہم سے ترک یا تاتار کا
ہے عجب جلوہ تری قدرت کا پیارے ہر طرف ∴ جس طرف دیکھیں وہی راہ ہے تیرے دیدار کا

چشمۂ خورشید میں موجیں تری مشہود ہیں ؛ ہر ستارے میں تماشہ ہے تیری چمکار کا
تُونے خود روحوں پہ اپنے ہاتھ سے چھڑکا نمک ؛ اِس سے ہے شورِ محبت عاشقانِ زار کا
کیا عجب تو نے ہر اک ذرّے میں رکھے ہیں خواص ؛ کون پڑھ سکتا ہے سارا دفتر ان اسرار کا
تیری قدرت کا کوئی بھی انتہا پاتا نہیں ؛ کس سے کھل سکتا ہے پیچ اس عقدۂ دشوار کا
خوبروؤں میں ملاحت ہے ترے اس حُسن کی ؛ ہر گل و گلشن میں ہے رنگ اس تری گلزار کا
چشمِ مستِ ہر حسیں ہر دم دکھاتی ہے تجھے ؛ ہاتھ ہے تیری طرف ہر گیسوئے خمدار کا
آنکھ کے اندھوں کو حائل ہو گئے سو سو حجاب ؛ ورنہ تھا قبلہ ترا رُخ کافر و دیندار کا
ہیں تری پیاری نگاہیں دلبرا اک تیغِ تیز ؛ جن سے کٹ جاتا ہے سب جھگڑا غمِ اغیار کا
تیرے ملنے کے لئے ہم مل گئے ہیں خاک میں ؛ تا مگر درماں ہو کچھ اس ہجر کے آزار کا
ایک دم بھی کل نہیں پڑتی مجھے تیرے سوا ؛ جان گھٹی جاتی ہے جیسے دل گھٹے بیمار کا
شور کیسا ہے تیرے کوچہ میں لے جلدی خبر
خوں نہ ہو جائے کسی دیوانہ مجنوں وار کا

(سرمہ چشم آریہ ص۴)

جو ہمارا تھا وہ اب دلبر کا سارا ہو گیا ؛ آج ہم دلبر کے اور دلبر ہمارا ہو گیا
شکر للہ مل گیا ہم کو وہ لعلِ بے بدل ؛ کیا ہُوا گر قوم کا دل سنگِ خارا ہو گیا

(ازالہ اوہام ص۳۵۸)

حمد و ثنا اُسی کو جو ذات جاودانی ؛ ہمسر نہیں ہے اس کا کوئی نہ کوئی ثانی
باقی وہی ہمیشہ غیر اُس کے سب ہیں فانی ؛ غیروں سے دل لگانا جھوٹی ہے سب کہانی
سب غیر ہیں وہی ہے اِک دل کا یار جانی
دل میں مرے یہی ہے سبحان من یرانی
ہے پاک پاک قدرت عظمت ہے، اس کی عظمت ؛ لرزاں ہیں اہل قربت کرّوبیوں پہ ہیبت
ہے عام اس کی رحمت کیونکر ہو شکرِ نعمت ؛ ہم سب ہیں اُس کی صنعت اُس سے کرو محبت
غیروں سے کرنا اُلفت کب چاہے اُس کی غیرت
یہ روز کر مبارک سبحان من یرانی
جو کچھ ہمیں ہے راحت سب اُسکی جود و منت ؛ اُس سے ہے دل کی بیعت دل میں ہے اسکی عظمت

بہتر ہے اس کی طاعت طاعت میں ہے، سعادت
یہ روز کر مبارک سبحان من یرانی

سب کا وہی سہارا رحمت ہے آشکارا ؛ ہم کو وہی پیارا دلبر وہی ہمارا
اُس بن نہیں گذارا غیر اس کے جھوٹ سارا
یہ روز کر مبارک سبحان من یرانی

یارب ہے تیرا احساں میں تیرے در پہ قرباں ؛ تو نے دیا ہے ایماں تو ہر زماں نگہباں
تیرا کرم ہے ہر آں تو ہے رحیم و رحماں
یہ روز کر مبارک سبحان من یرانی

کیونکر ہو شکر تیرا تیرا ہے جو ہے میرا ؛ تُو نے ہر اک کرم سے گھر بھر دیا ہے میرا
جب تیرا نور آیا جاتا رہا اندھیرا
یہ روز کر مبارک سبحان من یرانی

(محمود کی آمین ص۴)

جگر کا ٹکڑا مبارک احمد جو پاک شکل اور پاک خُو تھا ؛ وہ آج ہم سے جُدا ہُوا ہے ہمارے دل کو حزیں بنا کر
کہا کہ آئی ہے نیند مجھ کو یہی تھا آخر کا قول لیکن ؛ کچھ ایسے سوئے کہ پھر نہ جاگے تھکے بھی ہم پھر جگا جگا کر
برس تھے آٹھ اور کچھ مہینے کہ جب خدا نے اُسے بلایا ؛ بُلانیوالا ہے سب سے پیارا اُسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

(لوح مزار مرزا مبارک احمد)

وہ دیکھتا ہے غیروں سے کیوں دل لگاتے ہو ؛ جو کچھ بتوں میں پاتے ہو اُس میں وہ کیا نہیں
سورج پہ غور کر کے نہ پائی وہ روشنی ؛ جب چاند کو بھی دیکھا تو اس یار سا نہیں
واحد ہے لاشریک ہے اور لازوال ہے ؛ سب موت کا شکار ہیں اُسکو فنا نہیں
سب خیر ہے اِسی میں کہ اس سے لگاؤ دل ؛ ڈھونڈو اُسی کو یارو بُتوں میں وفا نہیں
اس جائے پُر عذاب سے کیوں دل لگاتے ہو ؛ دوزخ ہے یہ مقام یہ بُستاں سرا نہیں

(تشحیذ الاذہان ماہ دسمبر ۱۹۰۸ء)

تجھے سب زور و قدرت ہے خدایا ! ؛ تجھے پایا ہر اک مطلب کو پایا
ہر اک عاشق نے ہے اِک بُت بنایا ؛ ہمارے دل میں یہ دلبر سمایا
وہی آرام جاں اور دل کو بھایا ! ؛ وہی جس کو کہیں ربّ البرایا

ہوا ظاہر وہ مجھ پہ بالایادی
فسبحان الذی اخزی الاعادی

مجھے اس یار سے پیوند جاں ہے ٭ وہی جنّت وہی دارالاماں ہے
بیاں اس کا کروں طاقت کہاں ہے ٭ محبت کا تو اِک دریا رواں ہے
یہ کیا احساں ہیں تیرے میرے ہادی
فسبحان الذی اخزی الاعادی
تری نعمت کی کچھ قلّت نہیں ہے ٭ تہی اس سے کوئی ساعت نہیں ہے
شمارِ فضل اور رحمت نہیں ہے ٭ مجھے اب شکر کی طاقت نہیں ہے
یہ کیا احساں ترے ہیں میرے ہادی
فسبحان الذی اخزی الاعادی
ترے کوچہ میں کن راہوں سے آؤں ٭ وہ خدمت کیا ہے جس سے تجھکو پاؤں
محبت ہے کہ جس سے کھینچا جاؤں ٭ خدائی ہے خودی جس سے مٹاؤں
محبت چیز کیا، کِس کو بتاؤں ٭ وفا کیا راز ہے کِس کو سناؤں
مَیں اس آندھی کو اب کیونکر چھپاؤں ٭ یہی بہتر کہ خاک اپنی اڑاؤں
کہاں ہم اور کہاں دنیائے مادی
فسبحان الذی اخزی الاعادی

(درثمین صـ۴۹)

حمد و شکر آں خدائے کردگار ٭ کز وجودش ہر وجودے آشکار
ایں جہاں آئینہ دارِ روئے او ٭ ذرّہ ذرّہ رہ نماید سوئے او
کرد در آئینہ ارض و سما ٭ آں رُخِ بے مثلِ خود جلوہ نما
ہر گیاہے عارفِ بنگاہ او ٭ دست ہر شاخے نماید راہ او
نور مہر و مہ ز فیض نور اوست ٭ ہر ظہورے تابع منشور اوست
ہر سرے سرّے ز خلوت گاہ او ٭ ہر قدم جوید درِ با جاہ او
مطلب ہر دل جمالِ روئے اوست ٭ گمرہے گر ہست بہر کوئے اوست
مہر و ماہ و انجم و خاک آفرید ٭ صد ہزاراں کرد صنعتہا پدید

ایں ہمہ صُنعش کتاب کار اوست ٭ بے نہایت اندریں اسرار اوست
ایں کتابے پیش چشم ما نہاد ٭ تا ازو راہِ ہدیٰ داریم یاد
تا شناسی آں خدائے پاک را ٭ کو نماند خاکیان و خاک را
تا شود معیار بہر وحی دوست ٭ تا شناسی از ہزاراں آنچہ زوست
تا خیانت را نماند ہیچ را ٭ تا جدا گردد سفیدی از سیاہ
پس ہماں شد آنچہ آں دادار خواست ٭ کارِ دستش شاہدِ گفتار خاست
مشرکاں دانچہ پوزشش مے کنند ٭ ایں گواہاں تیر دوزش مے کنند
گر بگوئی غیر را رحماں خدا ٭ تف زند بر روئے تو ارض و سما
در تراشی بہر آں یکتا پسر ٭ بر تو بارد لعنت زیر و زبر
با زبان حال گوید ایں جہاں ٭ کاں خدا فرد است و قیوم و یگاں
نے پدر دارد نہ فرزند و نہ زن ٭ نے مبدل شد ز ایّام کہن
یک دمے گر رشح فیضش کم شود ٭ ایں ہمہ خلق و جہاں برہم شود
یک نظر قانون قدرت را ببیں ٭ تا شناسی شان ربّ العالمیں

(ضیاء الحق ص۳)

اے خالق ارض و سما بر من در رحمت کشا ٭ دانی تو آں دردِ مرا کز دیگراں پنہاں کنم
از بس لطیفی دلبرا در ہر رگ و تارم درا ٭ تا چوں بجود یابم ترا دل خوشتر از بستاں کنم
در سرکشی اے پاک خو جاں بر کنم در ہجر تو ٭ زانساں ہمے گریم کز و یک عالمے گریاں کنم
خواہی بقہرم کن جدا خواہی بلطفم رو نما ٭ خواہی بکش یا کن رہا کے ترکِ آں داماں کنم

(براہین احمدیہ ص۵۹۱ حاشیہ در حاشیہ م۳)

اے خدا اے چارۂ آزار ما ٭ اے علاجِ گریہ ہائے زار ما
اے تو مرہم بخش جانِ ریش ما ٭ اے تو دلدار دلِ غم کیش ما
از کرم برداشتی ہر بار ما ٭ واز تو ہر بار و بر اشجار ما
حافظ و ستاری از جود و کرم ٭ بیکساں را یاری از لطف اتم
بندۂ درماندہ باشد دل طپاں ٭ ناگہاں درماں برآرے از میاں
عاجزے را ظلمتے گیرد براہ ٭ ناگہاں آری برو صد مہر و ماہ
حسن و خلق دلبری بر تو تمام ٭ صحبتے بعد از لقائے تو حرام

آں خردمندے کہ او دیوانہ است   شمع بزم است آنکہ او پروانہ است
ہر کہ عشقت در دل و جانش فتد   ناگہاں جانے در ایمانش فتد
عشق تو گردد عیاں بر روئے او   بوئے تو آید ز بام کوئے او
صد ہزاراں نعمتش بخشی ز جود   مہر و مہ را پیشش آری در سجود
خود نشینی از پئے تائید او   روئے تو یار او فتد از دید او
بس نمایاں کارہا کاندر جہاں   مے نمائی بہر اکرامش عیاں
خود کنی و خود کنانے کار را   خود دہی رونق تو آں بازار را
خاک را در یک دمے چیزے کنی   کز ظہور خلق گیرد روشنی
برکسے چوں مہربانی مے کنی   از زمینی آسمانی مے کنی

(براہین احمدیہ ص۶۰۴ حاشیہ در حاشیہ ص۳)

محبت تو دوائے ہزار بیماری است   بروئے تو کہ رہائی دریں گرفتاری است
پناہ روئے تو جستن نہ طور مستان است   کہ آمدن بہ پناہت کمال ہشیاری است
متاع مہرِ رُخ تو نہاں نخواہم داشت   کہ خفیہ داشتنِ عشق تو زِ غداری است
براں سرم کہ سر و جاں فدائے تو بکنم   کہ جاں بیار سپردن حقیقت یاری است

(آئینہ کمالات اسلام ص۱)

سخن نزدم مراں از شہریارے   کہ ہستم بر درے اُمّید وارے
خداوندے کہ جاں بخشِ جہان است   بدیع و خالق و پروردگارے
کریم و قادر و مشکل کشائے   رحیم و محسن و حاجت برآرے
فتادم بر درش زیر آنکہ گویند   بر آید در جہاں کارے ز کارے
چو آں یارِ وفادار آیدم یاد   فراموشم شود ہر خویش و یارے
بغیر او چساں بندم دل خویش   کہ بے رُویش نمے آید قرارے
دلم در سینۂ ریشم مجوئید   کہ بستیمش بدامانِ نگارے
دلِ من دلبرے را تخت گاہے   سرِ من در رہِ یارے نثارے
چگویم فضلِ او بر من چگون است   کہ فضلِ اوست ناپیدا کنارے
عنایت ہائے او را چوں شمارم   کہ لطفِ اوست بیروں از شمارے

مرا کاریست با آں دِلستانے ÷ ندارد کس خبر زاں کاروبارے
بنالم بر درش زانساں کہ نالد ÷ بوقتِ وضعِ حملے باردارے
مرا با عشقِ او وقتے ست مامور ÷ چہ خوش وقتے چہ خرّم روزگارے
ثناہا گویمت اے گلشنِ یار ÷ کہ فارغ کردی از باغ و بہارے
(حجّۃ اللہ ص ۱)

چہ شیریں منظرے اے دلستانم ÷ چہ شیریں خصلتے اے جانِ جانم
چو دیدم روئے تو دل در تو بستم ÷ نماندہ غیرِ تو اندر جہانم
تواں برداشتن دست از دو عالم ÷ مگر ہجرت بسوزد استخوانم
در آتش تن بآسانی تواں داد ÷ ز ہجرت جاں رود با صد فغانم
(حقیقۃ الوحی ص ۳۴۲)

اے یارِ ازل بس است روئے تو مرا ÷ بہتر ز ہزار خلد کوئے تو مرا
از مصلحتے دگر طرف بینم لیک ÷ ہر لحظہ نگاہ ہست سوئے تو مرا
بر عزّتِ من اگر کسے حملہ کند ÷ صبر است طریق ہمچو خوئے تو مرا
من چیستم و چہ عزّتم ہست مگر ÷ جنگ است ز بہرِ آبروئے تو مرا
(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم ص ۱)

وحی - الہام
کشوف اور رؤیا

> "میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ ہر یک دروازہ بند ہو جاتا ہے مگر رُوح القدس کے اُترنے کا کبھی دروازہ بند نہیں ہوتا۔ تم اپنے دلوں کے دروازے کھول دو تا وہ اُن میں داخل ہو۔"

کوئی قانون عاصم ہمارے پاس ایسا نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ سے ہم لزوماً غلطی سے بچ سکیں۔ یہی باعث ہے کہ جن حکیموں نے قواعد منطق کے بنائے اور مسائل مناظرہ کے ایجاد کئے اور دلائل فلسفہ کے گھڑے وہ بھی غلطیوں میں ڈوبتے رہے اور صدہا طور کے باطل خیال اور جھوٹا فلسفہ اور نکمّی باتیں اپنی نادانی کے یادگار میں چھوڑ گئے۔ پس اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اپنی ہی تحقیقات سے جمیع امور حقّہ اور عقائد صحیحہ پر پہنچ جانا اور کہیں غلطی نہ کرنا ایک محال عادی ہے۔ کیونکہ آج تک ہم نے کوئی فرد بشر ایسا نہیں دیکھا اور نہ سُنا اور نہ کسی تاریخی کتاب میں لکھا ہُوا پایا کہ جو اپنی تمام نظر اور فکر میں سہو اور خطا سے معصوم ہو پس بذریعہ قیاس استقرائی کے یہ صحیح اور سچّا نتیجہ نکلتا ہے کہ وجود ایسے اشخاص کا کہ جنہوں نے صرف قانون قدرت میں فکر اور غور کر کے اور اپنے ذخیرۂ کانشنس کو واقعات عالم سے مطابقت دیکر اپنی تحقیقات کو ایسے اعلیٰ پایۂ صداقت پر پہنچا دیا ہو کہ جس میں غلطی کا نکلنا غیر ممکن ہو خود عادتاً غیر ممکن ہے۔

.... صاف ظاہر ہے کہ جس حالت میں نہ خود انسان اپنے علم اور واقفیت سے غلطی سے بچ سکے اور نہ خدا (جو رحیم اور کریم اور ہر ایک سہو و خطا سے مبرّا اور ہر امر کی اصل حقیقت پر واقف ہے) بذریعہ اپنے سچے الہام کے اپنے بندوں کی مدد کرے تو پھر ہم عاجز بندے کیونکر ظلمات جہل اور خطا سے باہر آویں اور کیونکر آفات شک و شبہ سے نجات پاویں۔ لہٰذا میں مستحکم رائے سے یہ بات ظاہر کرتا ہوں کہ مقتضاء حکمت اور رحمت اور بندہ پروری اُس قادر مطلق کا یہی ہے کہ وقتاً فوقتاً جب مصلحت دیکھے ایسے لوگوں کو پیدا کرتا رہے کہ عقائد حقّہ کے جاننے اور اخلاقِ صحیحہ کے معلوم کرنے میں خدا کی طرف سے الہام پائیں اور تفہیم تعلیم کا ملکہ وہبی رکھیں تاکہ نفوس بشریہ کہ سچی ہدایت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اپنی سعادت مطلوبہ سے محروم نہ رہیں۔

(پُرانی تحریریں ص ۲۰-۲۱)

خدائے تعالیٰ نے اپنے عجیب عالم کو تین حصہ پر تقسیم کر رکھا ہے۔ (۱) عالم ظاہر جو آنکھوں اور کانوں اور دیگر حواس ظاہری کے ذریعہ اور آلات خارجی کے توسل سے محسوس

ہو سکتا ہے۔ (۲) **عالم باطن** جو عقل اور قیاس کے ذریعہ سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔

(۳) **عالم باطن در باطن** جو ایسا نازک اور لایدرک و فوق الخیالات عالم ہے جو تھوڑے ہیں جو اس سے خبر رکھتے ہیں۔ وہ عالم غیب محض ہے جس تک پہنچنے کے لئے عقلوں کو طاقت نہیں دی گئی مگر ظنّ محض۔ اور اس عالم پر کشف اور وحی اور الہام کے ذریعہ سے اطلاع ملتی ہے نہ اَور کسی ذریعہ سے۔ اور جیسی عادت اللہ بدیہی طور پر ثابت اور متحقق ہے کہ اُس نے ان دُو پہلے عالموں کے دریافت کرنے کے لئے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے انسان کو طرح طرح کے حواس اور قوتیں عنایت کی ہیں اسی طرح اس تیسرے عالم کے دریافت کرنے کے لئے بھی اس فیّاض مطلق نے انسان کے لئے ایک ذریعہ رکھا ہے اور وہ ذریعہ وحی اور الہام اور کشف ہے جو کسی زمانہ میں بکلّی بند اور موقوف نہیں رہ سکتا بلکہ اس کے شرائط بجا لانے والے ہمیشہ اس کو پاتے رہے ہیں اور ہمیشہ پاتے رہیں گے۔ چونکہ انسان ترقیات غیر محدودہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور خدا تعالےٰ بھی عیب بخل و امساک سے بکلّی پاک ہے پس اس قوی دلیل سے ایسا خیال بڑا ناپاک خیال ہے جو یہ سمجھا جائے جو خدائے تعالیٰ نے انسان کے دل میں تینوں عالموں کے اسرار معلوم کرنے کا شوق ڈال کر پھر تیسرے عالم کے وسائل وصول سے بکلّی اسکو محروم رکھا ہے۔ پس یہ وہ دلیل ہے جس سے دانشمند لوگ دائمی طور پر الہام اور کشف کی ضرورت کو یقین کر لیتے ہیں۔ اور آریوں کی طرح چار رشیوں پر الہام کو ختم نہیں کرتے جن کی مانند کوئی پانچواں اس کمال تک پہنچنا اُن کی نظر عجیب میں ممکن ہی نہیں بلکہ عقلمند لوگ خدا تعالیٰ کے فیّاض مطلق ہونے پر ایمان لا کر الہامی دروازوں کو ہمیشہ کھلا سمجھتے ہیں۔ اور کسی ولایت اور ملک سے اسے مخصوص نہیں رکھتے۔ ہاں اس صراط مستقیم سے مخصوص رکھتے ہیں جس پر ٹھیک ٹھیک چلنے سے یہ برکات حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہریک چیز کے حصول کے لئے یہ لازم پڑا ہوا ہے کہ انہی قواعد اور طریقوں پر عمل کیا جائے جن کی پابندی سے وہ چیز مل سکتی ہے۔ غرض عقلمند لوگ عالم کشف کے عجائبات سے انکار نہیں کرتے بلکہ انہیں ماننا پڑتا ہے کہ جس جوّاد مطلق نے عالم اوّل کے ادنیٰ ادنیٰ امور کے دریافت کرنے کے لئے انسان کو حواس اور طاقتیں عنایت کی ہیں وہ تیسرے عالم کے معظم اور عالیشان امور کے دریافت سے جس سے حقیقی اور کامل تعلّق خدا تعالےٰ سے پیدا ہوتا ہے اور سچّی اور یقینی معرفت حاصل ہو کر اسی دنیا میں انوارِ نجات نمایاں ہو جاتے ہیں کیوں انسان کو محروم رکھتا بے شک یہ طریق بھی دوسرے

دونوں طریقوں کی طرح کھلا ہوا ہے۔ اور صادق لوگ بڑے زور سے اس پر قدم مارتے ہیں۔ اور اس کو پاتے ہیں۔ اور اس کے ثمرات حاصل کرتے ہیں۔ عجائبات اس عالم ثالث کے بے انتہا ہیں۔ اور اس کے مقابل پر دوسرے عالم ایسے ہیں جیسے آفتاب کے مقابل پر ایک دانہ خشخاش۔ اِس بات پر زور لگانا کہ اس عالم کے اسرار عقلی طاقت سے بکلّی منکشف ہو جائیں یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک انسان آنکھوں کو بند کر کے مثلاً اس بات پر زور لگائے کہ وہ قابلِ رُؤیت چیزوں کو قوّت شامّہ کے ذریعہ سے دیکھ لے۔ بلکہ عجائبات عالم باطن در باطن سے عقل ایسی حیران ہے کہ کچھ دم نہیں مار سکتی کہ یہ کیا بھید ہے۔ رُوحوں کی پیدائش پر انسان کیوں تعجب کرے اِسی دنیا میں صاحب کشف پر ایسے ایسے اسرار ظاہر ہوتے ہیں کہ اُن کی کُنہ کو سمجھنے میں بکلّی عقل عاجز رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات صاحب کشف صدہا کوسوں کے فاصلہ سے باوجود حائل ہونے بے شمار حجابوں کے ایک چیز کو صاف صاف دیکھ لیتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات عین بیداری میں باذنہ تعالیٰ اس کی آواز بھی سُن لیتا ہے۔ اور اِس سے زیادہ تر تعجب کی یہ بات ہے کہ بعض اوقات وہ شخص بھی اس کی آواز سُن لیتا ہے جس کی صورت اُس پر منکشف ہوتی ہے بعض اوقات صاحب کشف اپنے عالم کشف میں جو بیداری سے نہایت مشابہ ہے ارواحِ گذشتہ سے ملاقات کرتا ہے اور عام طور پر ملاقات ہر یک نیک بخت رُوح یا بدبخت رُوح کے کشف قبور کے طور پر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ خود اِس میں مؤلف رسالہ ہذا صاحب تجربہ ہے۔ اور یہ امر ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کی بیخ کنی کرنے والا ہے۔ اور سب سے تعجب کا یہ مقام ہے کہ بعض اوقات صاحب کشف اپنی توجہ اور قوتِ تاثیر سے ایک دوسرے شخص پر باوجود صدہا کوس کے فاصلہ کے باذنہ تعالیٰ عالم بیداری میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا وجود عنصری اپنے مقام سے جنبش نہیں کرتا۔ اور عقل کے زور سے ایک چیز کا دو جگہ ہونا محال ہے۔ سو وہ محال اس عالم ثالث میں ممکن الوقوع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح صدہا عجائبات کو عارف بچشم خود دیکھتا ہے۔ اور ان کور باطنوں کے انکار سے تعجب پر تعجب کرتا ہے جو اس عالم ثالث کے عجائبات سے قطعاً منکر ہیں۔ راقم رسالہ ہذا نے اِس عالم ثالث کے عجائبات اور نادر مکاشفات کو قریب پانچہزار کے بچشم خود دیکھا اور اپنے ذاتی تجربہ سے مشاہدہ کیا اور اپنے نفس پر انہیں وارد ہوتے پایا ہے۔ اگر ان سب کی تفصیل لکھی جائے تو ایک بڑی بھاری کتاب تالیف ہو سکتی ہے۔ ان سب عجائبات

میں سے ایک بڑی عجیب بات یہ ثابت ہوئی ہے کہ بعض کشفی امور جن کا خارج میں نام و نشان نہیں محض قدرت غیبی سے وجود خارجی پکڑ لیتے ہیں۔ اگرچہ صاحب فتوحات و فصوص و دیگر اکابر متصوفین نے اس بارے میں بہت سے اپنے خود گذشت قصّے اپنی تالیفات میں لکھے ہیں لیکن چونکہ دید و شنید میں فرق ہے اس لئے مجرّد ان قصّوں کی سماعت سے ہم کو وہ کیفیت یقینی حاصل نہیں ہو سکتی تھی جو اپنے ذاتی مشاہدہ سے حاصل ہوئی۔ ایک مرتبہ مجھے یاد ہے کہ مَیں نے عالم کشف میں دیکھا کہ بعض احکام قضاء و قدر مَیں نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں کہ آئندہ زمانہ میں ایسا ہو گا۔ اور پھر اس کو دستخط کرانے کے لئے خداوند قادر مطلق جلّ شانہٗ کے سامنے پیش کیا ہے (اور یاد رکھنا چاہیئے کہ مکاشفات اور رؤیا صالحہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض صفاتِ جمالیہ یا جلالیہ الٰہیہ انسان کی شکل پر متمثّل ہو کر صاحب کشف کو نظر آجاتے ہیں اور مجازی طور پر وہ یہی خیال کرتا ہے کہ وہی خداوند قادرِ مطلق ہے۔ اور یہ امر ارباب کشوف میں شائع و متعارف و معلوم الحقیقت ہے جس سے کوئی صاحب کشف انکار نہیں کر سکتا) غرض وہی صفت جمالی جو بعالم کشف قوتِ متخیلہ کے آگے ایسی دکھلائی دی تھی جو خداوند قادر مطلق ہے۔ اس ذاتِ بیچوں و بے چگون کے آگے وہ کتاب قضاء و قدر پیش کی گئی اور اُس نے جو ایک حاکم کی شکل پر متمثّل تھا اپنے قلم کو سُرخی کی دوات میں ڈبو کر اوّل اس سُرخی کو اس عاجز کی طرف چھڑکا اور بقیّہ سُرخی کا قلم کے مُنہ میں رہ گیا اس سے اس کتاب پر دستخط کر دیئے۔ اور ساتھ ہی وہ حالتِ کشفیہ دُور ہو گئی اور آنکھ کھول کر جب خارج میں دیکھا تو کئی قطرات سُرخی کے تازہ بتازہ کپڑوں پر پڑے چنانچہ ایک صاحب عبداللہ نام جو سنور ریاست پٹیالہ کے رہنے والے تھے اور اس وقت اس عاجز کے پاس نزدیک ہو کر بیٹھے ہوئے تھے دو یا تین قطرہ سُرخی کے اُن کی ٹوپی پر پڑے۔ پس وہ سُرخی جو ایک امر کشفی تھا وجود خارجی پکڑ کر نظر آ گئی۔ اسی طرح اور کئی مکاشفات ہیں جن کا لکھنا موجب تطویل ہے مشاہدہ کیا گیا ہے اور اپنے ذاتی تجارب سے ثابت ہو گیا جو بلاشبہ امور کشفیہ کبھی کبھی باذنہٖ تعالیٰ وجود خارجی پکڑ لیتے ہیں۔ یہ امور عقل کے ذریعہ سے ہرگز ذہن نشین نہیں ہو سکتے۔ بلکہ جو شخص عقل کے گھمنڈ اور غرور میں پھنسا ہؤا ہے وہ ایسی باتوں کو سُنتا ہے نہایت تکبّر سے کہیگا کہ یہ سراسر امر محال اور خیالِ باطل ہے۔ اور ایسا کہنے والا یا تو دروغ گو ہے یا دیوانہ یا اس کو سادہ لوحی کی وجہ سے

دھوکہ لگا ہے اور بباعث نقصان تحقیق بات کی تہ تک پہنچنے سے محروم رہ گیا ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان عقلمندوں کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ امور جن کی صداقت پر ہزارہا عارف اور راستباز اپنے ذاتی تجارب سے شہادتیں دے گئے ہیں اور اب بھی دیتے ہیں اور صحبت گزین پر ثابت کر دینے کے لئے بفضلہ تعالیٰ اپنی ذمہ داری لیتے ہیں کیا وہ ایسے خفیف امور ہیں جو صرف منکرانہ زبان ہلانے سے باطل ہو سکتے ہیں۔ اور حق بات تو یہ ہے کہ عالم کشف کے عجائبات تو ایک طرف رہے جو عالم عقل ہے یعنی جس عالم تک عقل کی رسائی ہونا ممکن ہے اس عالم کا بھی ابھی تک عقل نے تصفیہ نہیں کیا اور لاکھوں اسرارِ الٰہی پردۂ غیب میں دبے پڑے ہیں جن کی عقلمندوں کو ہوا تک نہیں پہنچی۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲۷۔۱۳۲ حاشیہ)

خدائے تعالیٰ نے جیسے انسان کی فطرت میں مبادی امور کے کسی قدر سمجھنے کے لئے ایک عقلی قوت رکھی ہے اسی طرح انسان میں کشف اور الہام کے پانے کی بھی ایک قوت مخفی ہے۔ جب عقل انسانی اپنی حد مقررہ تک چل کر آگے قدم رکھنے سے رہ جاتی ہے تو اس جگہ خدا تعالے اپنے صادق اور وفادار بندوں کے کمال عرفان اور یقین تک پہنچانے کی غرض سے الہام اور کشف سے دستگیری فرماتا ہے۔ اور جو منزلیں بذریعہ عقل طے کرنے سے رہ گئی تھیں اب وہ بذریعہ کشف اور الہام طے ہو جاتی ہیں۔ اور سالکین مرتبہ عین الیقین بلکہ حق الیقین تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی سنت اللہ اور عادت اللہ ہے جس کی راہنمائی کے لئے تمام پاک نبی دنیا میں آئے ہیں اور جس پر چلنے کے بغیر کوئی شخص سچی اور کامل معرفت تک نہیں پہنچا۔ مگر کم بخت خشک فلسفی کو کچھ ایسی جلدی ہوتی ہے کہ وہ یہی چاہتا ہے کہ جو کچھ کھلنا ہے وہ عقلی مرتبہ پر ہی کھل جائے اور نہیں جانتا کہ عقل انسانی اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی اور نہ طاقت سے آگے قدم رکھ سکتی ہے اور نہ اس بات کی طرف فکر دوڑاتا ہے کہ خدا تعالے نے انسان کو اس کے کمالات مطلوبہ تک پہنچانے کیلئے صرف جوہر عقل ہی عطا نہیں کیا بلکہ کشف اور الہام پانے کی قوت بھی اُس کی فطرت میں رکھی ہے سو جو کچھ خدائے تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے وسائل خداشناسی انسان کی سرشت کو عطا کئے ہیں ان وسائل میں سے صرف ایک ابتدائی اور ادنیٰ درجہ کے وسیلہ کو استعمال میں لانا اور باقی وسائل خداشناسی سے بکلّی بے خبر رہنا بڑی بھاری بدنصیبی ہے۔ اور ان قوتوں کو ہمیشہ بیکار رکھ کر ضائع کر دینا اور ان سے فائدہ نہ اُٹھانا پرلے درجہ کی بے سمجھی ہے۔ سو ایسا شخص سچا فلسفی ہرگز نہیں ہو سکتا

کہ جو کشف اور الہام پانے کی قوت کو معطل اور بے کار چھوڑتا ہے بلکہ اس سے انکار کرتا ہے حالانکہ ہزاروں مقدسوں کی شہادت سے کشف اور الہام کا پایا جانا بپایۂ ثبوت پہنچ چکا ہے اور تمام سچے عارف اسی طریق سے معرفت کاملہ تک پہنچے ہیں۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۳۹-۴۲)

بعض خشک ملّاؤں کو یہاں تک انکار میں غلوّ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ مکالماتِ الٰہیہ کا دروازہ ہی بند ہے اور اس بدقسمت امت کے یہ نصیب ہی نہیں کہ یہ نعمت حاصل کر کے اپنے ایمان کو کامل کرے اور پھر کشش ایمانی سے اعمالِ صالح کو بجا لاوے۔

ایسے خیالات کا یہ جواب ہے کہ اگر یہ امت درحقیقت ایسی ہی بدبخت اور اندھی اور شرّالامم ہے تو خدا نے کیوں اس کا نام خیرالامم رکھا بلکہ سچ بات یہ ہے کہ وہی لوگ احمق اور نادان ہیں کہ جو ایسے خیالات رکھتے ہیں ورنہ جس طرح خدا تعالیٰ نے اس اُمت کو وہ دعا سکھلائی ہے جو سورۃ فاتحہ میں ہے ساتھ ہی اُس نے یہ ارادہ بھی فرمایا ہے کہ اس امت کو وہ نعمت عطا بھی کرے جو نبیوں کو دی گئی تھی یعنی مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ جو سرچشمہ تمام نعمتوں کا ہے۔ کیا خدا تعالیٰ نے وہ دُعا سکھلا کر صرف دھوکہ ہی دیا ہے اور ایسی ناکارہ اور ذلیل اُمت میں کیا خیر ہو سکتی ہے جو بنی اسرائیل کی عورتوں سے بھی گئی گذری ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی ماں اور حضرت عیسیٰؑ کی ماں دونوں عورتیں تھیں اور بقول ہمارے مخالفین کے نبیّہ نہیں تھیں تاہم خدا تعالیٰ کے یقینی مکالمات اور مخاطبات اُن کو نصیب تھے اور اب اگر اِس امت کا ایک شخص اس قدر طہارت نفس میں کامل ہو کہ ابراہیم کا دل پیدا کر لے اور اتنا خدا تعالیٰ کا تابعدار ہو جو تمام نفسانی چولہ پھینک دے اور اتنا خدا تعالیٰ کی محبت میں محو ہو کہ اپنے وجود سے فنا ہو جائے تب بھی وہ باوجود اس قدر تبدیلی کے موسیٰؑ کی ماں کی طرح بھی وحیٔ الٰہی نہیں پا سکتا۔ کیا کوئی عقلمند خدا تعالیٰ کی طرف ایسا بخل منسوب کر سکتا ہے؟ اب ہم بجز اِس کے کیا کہیں کہ لعنت اللہ علی الکاذبین۔

اصل بات یہ ہے کہ جب ایسے لوگ سراسر دنیا کے کیڑے ہو گئے اور اسلام کا شعار صرف پگڑی اور ڈاڑھی اور ختنہ اور زبان کے چند اقرار اور رسمی نماز روزہ رہ گیا تو خدا تعالیٰ نے اُن کے دلوں کو مسخ کر دیا اور ہزارہا تاریکی کے پردے آنکھوں کے آگے آ گئے اور دل مر گئے اور کوئی زندہ نمونہ روحانی حیات کا اُن کے ہاتھ میں نہ رہا ناچار ان کو مکالماتِ الٰہیہ

سے انکار کرنا پڑا۔ اور یہ انکار درحقیقت اسلام سے انکار ہے۔ لیکن چونکہ دل مر چکے ہیں اِس لئے یہ لوگ محسوس نہیں کرتے کہ ہم کس حالت میں پڑے ہیں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۱۴۲-۱۴۳)

اے مسلمانو! ہوشیار ہو جاؤ کہ ایسا خیال سراسر جہالت اور نادانی ہے۔ اگر اسلام ایسا ہی مُردہ مذہب ہے تو کس قوم کو تم اس کی طرف دعوت کر سکتے ہو؟ کیا اِس مذہب کی لاش تم جاپان لے جاؤ گے یا یورپ کے سامنے پیش کرو گے۔ اور ایسا کون بے وقوف ہے جو ایسے مردہ مذہب پر عاشق ہو جائے گا۔ جو بمقابلہ گذشتہ مذہبوں کے ہر ایک برکت اور روحانیت سے بے نصیب ہے۔ گذشتہ مذہبوں میں عورتوں کو بھی الہام ہوا جیسا کہ موسیٰؑ کی ماں اور مریم کو مگر تم مرد ہو کر ان عورتوں کے برابر بھی نہیں۔ بلکہ اے نادانو! اور آنکھوں کے اندھو!! ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور ہمارے سید و مولیٰ (اس پر ہزار سلام) اپنے افاضہ کی رو سے تمام انبیاء سے سبقت لے گئے ہیں۔ کیونکہ گذشتہ نبیوں کا افاضہ ایک حد تک آکر ختم ہو گیا۔ اور اب وہ قومیں اور وہ مذہب مردے ہیں۔ کوئی اُن میں زندگی نہیں۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا روحانی فیضان قیامت تک جاری ہے۔ اسی لئے باوجود آپ کے اس فیضان کے اس اُمت کے لئے ضروری نہیں کہ کوئی مسیح باہر سے آوے بلکہ آپ کے سایہ میں پرورش پانا ایک ادنیٰ انسان کو مسیح بنا سکتا ہے جیسا کہ اُس نے اس عاجز کو بنایا۔

(چشمۂ مسیحی ص ۵۷)

یہ دعویٰ ہمارا بالکل صحیح اور نہایت صفائی سے ثابت ہے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے سے طالب صادق الہام الٰہی پا سکتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو اس پر تجربہ ذاتی شاہد ہے ماسوائے اسکے ہر یک عاقل سمجھ سکتا ہے کہ اِس دنیا میں اس سے بڑھ کر اور کوئی معرفت الٰہی کا اعلیٰ رتبہ نہیں ہے کہ انسان اپنے رب کریم جلّ شانہٗ سے ہمکلام ہو جائے۔ یہی درجہ ہے جس سے روحیں تسلّی پاتی ہیں اور سب شکوک و شبہات دُور ہو جاتے ہیں۔ اور اسی درجۂ صافیہ پر پہنچ کر انسان اس دقیقۂ معرفت کو پا لیتا ہے جس کی تحصیل کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے اور دراصل نجات کی کنجی اور ہستی موہوم کا عقدہ کشا یہی درجہ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے اور کھل جاتا ہے کہ خالقِ حقیقی کو اپنی ضعیف مخلوق سے کس قدر قرب واقع ہے۔ اس درجہ تک پہنچنے کی خبر ہمیں اسی نور نے دی ہے جس کا نام قرآن ہے۔ وہ نور صاف عام طور پر بشارت دیتا ہے کہ

الہام کا چشمہ کبھی بند نہیں ہو سکتا۔ جب کوئی مشرق کا رہنے والا یا مغرب کا باشندہ دلی صفائی سے خدائے تعالیٰ کو ڈھونڈے گا اور اس سے پوری پوری صلح کر لیگا اور درمیان سے حجاب اٹھائیگا تو ضرور اُسے پائے گا۔ اور جب واقعی اور سچے اور کامل طور پر پائیگا تو ضرور خدا اس سے ہمکلام ہوگا۔ مگر ویدوں نے انسان کے اس درجہ تک پہنچنے سے انکار کیا ہے اور صرف چار رشیوں تک جو ویدوں کے مصنف ہیں (بقول آریہ سماج والوں کے) اس درجہ کو محدود رکھا ہے۔ یہ ویدوں کی ایسی ہی غلطی ہے جیسے اور بڑی بڑی غلطیوں سے وہ پُر ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ سب بنی آدم متحد الفطرت ہیں اور جو بات ایک آدمی کے لئے ممکن ہے وہ سب کے لئے ممکن ہے اور جو قرب و معرفت ایک فردِ بشر کے لئے جائز ہے وہ سب کے لئے جائز ہے کیونکہ وہ سب اصل طینت میں ایک ہی جوہر سے ہیں۔ ہاں کمالات میں کمی بیشی ہے۔ مگر جنس کمالات میں سرے سے جواب تو نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا شخص ہو کہ اس میں تحصیل کمالاتِ انسانی کے ایک ذرہ بھی استعداد نہ ہو تو وہ خود انسان ہی نہیں ہو سکتا۔ غرض تھوڑے بہت کا تو انسانی استعدادوں میں فرق ضرور ہوتا ہے مگر انسان ہو کر یکلخت فقدانِ استعداد نہیں ہو سکتا۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۱۹۱-۱۹۲)

وہ خدا جو کریم و رحیم ہے جیسا کہ اس نے انسانی فطرت کو اپنی کامل معرفت کی بھوک اور پیاس لگا دی ہے ایسا ہی اس نے اس معرفت کاملہ تک پہنچانے کے لئے انسانی فطرت کو دو قسم کے قویٰ عنایت فرمائے ہیں۔ ایک معقولی قوتیں جن کا منبع دماغ ہے اور ایک روحانی قوتیں جن کا منبع دل ہے۔ اور جن کی صفائی دل کی صفائی پر موقوف ہے۔ اور جن باتوں کی معقولی قوتیں کامل طور پر دریافت نہیں کر سکتیں روحانی قوتیں اُن کی حقیقت تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور روحانی قوتیں صرف انفعالی طاقت اپنے اندر رکھتی ہیں یعنی ایسی صفائی پیدا کرنا کہ مبدءِ فیض کے فیوض اُن میں منعکس ہو سکیں۔ سو اُن کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ حصولِ فیض کے لئے مستعد ہوں اور حجاب اور روک درمیان نہ ہو تا خدا تعالےٰ سے معرفتِ کاملہ کا فیض پا سکیں۔ اور صرف اس حد تک ان کی شناخت محدود نہ ہو کہ اس عالمِ پُر حکمت کا کوئی صانع ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس صانع سے شرف مکالمہ مخاطبہ کامل طور پر پا کر اور بلا واسطہ اس کے بزرگ نشان دیکھکر اس کا چہرہ دیکھ لیں۔ اور یقین کی آنکھ سے

مشاہدہ کریں کہ فی الحقیقت وہ صانع موجود ہے۔ لیکن چونکہ اکثر انسانی فطرتیں حجاب سے خالی نہیں اور دنیا کی محبت اور دنیا کی لالچ اور تکبّر اور نخوت اور عُجب اور ریاء کاری اور نفس پرستی اور دوسرے اخلاقی رذائل اور حقوق اللہ اور حقوق عباد کی بجا آوری میں عمداً قصور اور تساہل اور شرائط صدق و ثبات اور دقائق محبت اور وفا سے عمداً انحراف۔ اور خدا تعالےٰ سے عمداً قطع تعلق اکثر طبائع میں پایا جاتا ہے اس لئے وہ طبیعتیں باعث طرح طرح کے حجابوں اور پردوں اور روکوں کے اور نفسانی خواہشوں اور شہوات کے اس لائق نہیں کہ قابل قدر فیضان مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ کا اُن پر نازل ہو جس میں قبولیت کے انوار کا کوئی حصّہ ہو۔ ہاں عنایت ازلی نے جو انسانی فطرت کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تخم ریزی کے طور پر اکثر انسانی افراد میں یہ عادت اپنی جاری کر رکھی ہے کہ کبھی کبھی سچی خوابیں یا سچے الہام ہو جاتے ہیں تا وہ معلوم کر سکیں کہ اُن کے لئے آگے قدم رکھنے کے لئے ایک راہ کھلی ہے۔ لیکن ان کی خوابوں اور الہاموں میں خدا کی قبولیت اور محبت اور فضل کے کچھ آثار نہیں ہوتے اور نہ ایسے لوگ نفسانی نجاستوں سے پاک ہوتے ہیں۔ اور خوابیں محض اس لئے آتی ہیں کہ تا اُن پر خدا کے پاک نبیوں پر ایمان لانے کے لئے ایک حجّت ہو۔ کیونکہ اگر وہ سچی خوابوں اور سچے الہامات کی حقیقت سمجھنے سے قطعاً محروم ہوں اور اس بارے میں کوئی ایسا علم جس کو علم الیقین کہنا چاہیئے اُن کو حاصل نہ ہو تو خدا تعالیٰ کے سامنے اُن کا عذر ہو سکتا ہے کہ وہ نبوت کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے تھے کیونکہ اس کوچہ سے بکلی ناآشنا تھے۔ اور وہ کہہ سکتے ہیں کہ نبوت کی حقیقت سے ہم محض بے خبر تھے اور اس کے سمجھنے کے لئے ہماری فطرت کو کوئی نمونہ نہیں دیا گیا تھا پس ہم اس مخفی حقیقت کو کیونکر سمجھ سکتے۔ اس لئے سنت اللہ قدیم سے اور جب سے دنیا کی بناء ڈالی گئی اس طرح پر جاری ہے کہ نمونہ کے طور پر عام لوگوں کو قطع نظر اس سے کہ وہ نیک ہوں یا بد ہوں۔ اور صالح ہوں یا فاسق ہوں۔ اور مذہب میں سچے ہوں یا جھوٹا مذہب رکھتے ہوں کسی قدر سچی خوابیں دکھلائی جاتی ہیں یا سچے الہام بھی دیئے جاتے ہیں تا ان کا قیاس اور گمان جو محض نقل اور سماع سے حاصل ہے علم الیقین تک پہنچ جائے تا روحانی ترقی کے لئے اُن کے ہاتھ میں کوئی نمونہ ہو۔ اور حکیم مطلق نے اس مدعا کے پورا کرنے کے لئے انسانی دماغ کی بناوٹ ہی ایسی رکھی ہے اور ایسے روحانی قویٰ اس کو دیئے ہیں کہ وہ بعض سچی خوابیں دیکھ سکتا ہے اور بعض سچے الہام پا سکتا ہے۔ مگر وہ سچی خوابیں اور سچے الہام کسی وجاہت اور بزرگی پر

دلالت نہیں کرتے بلکہ وہ محض نمونہ کے طور پر ترقی کے لئے ایک راہیں ہوتی ہیں۔

(حقیقۃ الوحی ص ۶-۸)

جاننا چاہیئے کہ دلیل دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک لمّی۔ اور لمّی دلیل اس کو کہتے ہیں کہ کہ دلیل سے مدلول کا پتہ لگائیں۔ جیسا کہ ہم نے ایک جگہ دھوآں دیکھا تو اس سے ہم نے آگ کا پتہ لگا لیا۔ اور دوسری دلیل کی قسم انّی ہے۔ اور انّی اس کو کہتے ہیں کہ مدلول سے ہم دلیل کی طرف انتقال کریں۔ جیسا کہ ہم نے ایک شخص کو شدید تپ میں مبتلا پایا۔ تو ہمیں یقین ہوا کہ اس میں ایک تیز صفرا موجود ہے جس سے تپ چڑھ گیا۔ سو اس جگہ ہم انشاء اللہ تعالیٰ دونوں قسم کی دلیلیں پیش کریں گے۔

سو پہلے ہم لمّی دلیل ضرورت الہام کے لئے پیش کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ انسان کے جسم کا جسمانی اور روحانی نظام ایک ہی قانون قدرت کے ماتحت ہے پس اگر ہم انسان کے جسمانی حالات پر نظر ڈال کر دیکھیں تو ظاہر ہوگا کہ خداوند کریم نے جس قدر انسان کے جسم کو خواہشیں لگا دی ہیں اُن کے پورا کرنے کے لئے بھی سامان مہیّا کئے ہیں۔ چنانچہ انسان کا جسم بباعث بھوک کے اناج کا محتاج تھا سو اس کے لئے طرح طرح کی غذائیں پیدا کی ہیں ایسا ہی انسان بباعث پیاس کے پانی کا محتاج تھا۔ سو اس کے لئے کنوئیں اور چشمے اور نہریں پیدا کر دیئے ہیں۔ اِسی طرح انسان اپنی بصارت سے کام لینے کے لئے آفتاب یا کسی اور روشنی کا محتاج تھا سو اس کے لئے خدا نے آسمان پر سورج اور زمین پر دوسری اقسام کی روشنی پیدا کر دی ہے اور انسان اس ضرورت کے لئے کہ سانس لے اور نیز اس ضرورت کے لئے کہ کسی دوسرے کی آواز کو سُن سکے ہوا کا محتاج تھا سو اس کے لئے خدا نے ہوا پیدا کر دی۔ ایسا ہی انسان بقائے نسل کے لئے اپنے جوڑے کا محتاج تھا سو خدا نے مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد پیدا کر دیا ہے۔ غرض خدا تعالیٰ نے جو جو خواہشیں انسانی جسم کو لگا دی ہیں اُن کیلئے تمام سامان بھی پیدا کر دیا ہے۔ پس اب سوچنا چاہیئے کہ جبکہ انسانی جسم کو باوجود اس کے فانی ہونے کے تمام اس کی خواہشوں کا سامان دیا گیا ہے۔ تو انسان کی رُوح کو جو دائمی اور ابدی محبت اور معرفت اور عبادت کے لئے پیدا کی گئی ہے کس قدر اس کی پاک خواہشوں کے سامان دیئے گئے ہونگے۔ سو وہی سامان **خدا کی وحی** ہے اور اس کے تازہ نشان ہیں جو ناقص العلم انسان کو یقین تام تک پہنچاتے ہیں۔ خدا نے جیسا کہ جسم کو اس کی خواہشوں کا سامان دیا

ایسا ہی رُوح کو بھی اُس کی خواہشوں کا سامان دیا تا جسمانی اور روحانی نظام دونوں باہم مطابق ہوں۔ . . . .

یہ دلیل جو لمّی ہے پوری نہیں ہو سکتی جب تک اُس کے ساتھ انّی دلیل نہ ہو۔ یعنی جب تک تازہ نمونہ الہام کا نہ دیکھا جائے۔ بلاشبہ ضرورت کا محسوس کرنا اور چیز ہے اور پھر اس ضرورت کو حاصل بھی کر لینا یہ اَور امر ہے . . . . تم دیکھتے ہو کہ اِس زمانے میں تمہارے جسم کے لئے غذا اور پانی دونوں موجود ہیں یہ نہیں کہ فقط کسی پہلے زمانے میں تھیں اور اب نہیں ہیں۔ مگر جب الہام اور وحی کا ذکر آتا ہے تو پھر تم کسی ایسے پہلے زمانے کا حوالہ دیتے ہو جس پر کروڑ ہا برس گذر چکے ہیں مگر موجود کچھ نہیں دکھلا سکتے پھر خدا کا جسمانی اور روحانی قانونِ قدرت باہم مطابق کیونکر ہؤا۔ ذرا ٹھیر کر سوچو۔ یونہی جلدی سے جواب مت دو۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ جسمانی خواہشوں کے سامان تو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہیں مگر رُوحانی خواہشوں کے سامان تمہارے ہاتھ میں موجود نہیں بلکہ صرف قصّے تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ جو بودے اور باسی ہو چکے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ اس زمانے تک تمہارے جسمانی چشمے بند نہیں ہوئے جن کا تم پانی کر پیاس کی جلن اور سوزش کو دُور کرتے ہو۔ اور نہ جسمانی کھیتوں کی زمین ناقابلِ زراعت ہو گئی ہے جن کے اناج سے تم دو وقت پیٹ بھرتے ہو مگر وہ روحانی چشمے اب کہاں ہیں۔ جو الہام الٰہی کا تازہ پانی پلا کر پیاس کی سوزش کو دُور کرتے تھے اور اب وہ روحانی اناج بھی تمہارے پاس نہیں ہے جس کو کھا کر تمہاری رُوح زندہ رہ سکتی تھی۔ اب تم گویا ایک جنگل ہو جس میں نہ اناج ہے نہ پانی ہے۔

(چشمۂ معرفت ص۵۵-۵۸)

ہے غضب کہتے ہیں اب وحیِ خدا مفقود ہے ٭ اب قیامت تک ہے اس اُمّت کا قصّوں پر مدار
یہ عقیدہ برخلافِ گفتۂ دادار ہے ٭ پر اتارے کون برسوں کا گلے سے اپنے ہار
وہ خدا اب بھی بناتا ہے جسے چاہے کلیم ٭ اب بھی اس سے بولتا ہے جس سے وہ کرتا ہے پیار
گوہرِ وحیِ خدا کیوں توڑتا ہے ہوش کر! ٭ اِک یہی دیں کے لئے ہے جائے عزّ و افتخار
یہ وہ گُل ہے جس کا ثانی باغ میں کوئی نہیں ٭ یہ وہ خوشبو ہے کہ قرباں اس پہ ہو مُشکِ تتار
یہ وہ ہے مفتاح جس سے آسماں کے در کھلیں ٭ یہ وہ آئینہ ہے جس سے دیکھ لیں روئے نگار
بس یہی ہتھیار ہے جس سے ہماری فتح ہے ٭ بس یہی اِک قصر ہے جو عافیت کا ہے حصار

ہے خدادانی کا آلہ بھی یہی اسلام میں ؛ محض قصّوں سے نہ ہو کوئی بشر طوفاں سے پار
ہے یہی وحیٔ خدا عرفانِ مولیٰ کا نشاں ؛ جس کو یہ کامل ملے اس کو ملے یہ دوستدار
واہ رے باغِ محبت موت جس کی رہ گذر ؛ وصلِ یار اس کا ثمر پر اردگرد اسکے ہیں خار

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۰۷)

الہام ایک القاء غیبی ہے کہ جس کا حصول کسی طرح کی سوچ اور تردّد اور تفکّر اور تدبّر پر موقوف نہیں ہوتا اور ایک واضح اور منکشف احساس ہے کہ جیسے سامع کو متکلّم ہے یا مضروب کو ضارب سے یا ملموس کو لامس سے ہو محسوس ہوتا ہے۔ اور اس سے نفس کو مثل حرکاتِ فکریّہ کے کوئی الم رُوحانی نہیں پہنچتا بلکہ جیسے عاشق اپنے معشوق کی رویت سے بلا تکلّف انشراح اور انبساط پاتا ہے۔ ویسا ہی رُوح کو الہام سے ایک ازلی اور قدیمی رابطہ ہے کہ جس سے رُوح لذت اٹھاتا ہے۔ غرض یہ ایک منجانب اللہ اعلام لذیذ ہے جس کو **نفث فی الروع** اور **وحی** بھی کہتے ہیں۔

(پُرانی تحریریں ص۲۰)

یاد رہے کہ الہام کے لفظ سے اس جگہ یہ مراد نہیں ہے کہ سوچ اور فکر کی کوئی بات دل میں پڑ جائے۔ جیسا کہ جب شاعر شعر کے بنانے میں کوشش کرتا ہے یا ایک مصرع بنا کر دوسرا سوچتا رہتا ہے تو دوسرا مصرع دل میں پڑتا ہے۔ سو یہ دل میں پڑ جانا الہام نہیں ہے۔ بلکہ یہ خدا کے قانون قدرت کے موافق اپنے فکر اور سوچ کا ایک نتیجہ ہے۔ جو شخص اچھی باتیں سوچتا ہے یا بُری باتوں کے لئے فکر کرتا ہے۔ اُس کی تلاش کے موافق کوئی بات ضرور اس کے دل میں پڑ جاتی ہے۔ ایک شخص مثلاً نیک اور راستباز آدمی ہے جو سچائی کی حمایت میں چند شعر بناتا ہے اور دوسرا شخص جو ایک گندہ اور پلید آدمی ہے اپنے شعروں میں جھوٹ کی حمایت کرتا ہے اور راستبازوں کو گالیاں نکالتا ہے تو بلاشبہ یہ دونوں کچھ نہ کچھ شعر بنالیں گے بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ وہ راستبازوں کا دشمن جو جھوٹ کی حمایت کرتا ہے بباعث دائمی مشق کے اس کا شعر عمدہ ہو۔ سو اگر صرف دل میں پڑ جانے کا نام الہام ہے تو پھر ایک بدمعاش شاعر جو راست بازی اور راستبازوں کا دشمن اور ہمیشہ حق کی مخالفت کے لئے قدم اٹھاتا ہے اور افتراؤں سے کام لیتا ہے خدا کا ملہم کہلائیگا۔ دنیا میں ناولوں وغیرہ میں جادو بیانیاں پائی جاتی ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ اس طرح سراسر باطل مگر مسلسل مضمون لوگوں کے دلوں میں پڑتے ہیں کیا ہم ان کو الہام کہہ سکتے ہیں؟ بلکہ اگر الہام

صرف دل میں بعض باتیں پڑ جانے کا نام ہے تو ایک چور بھی ملہم کہلا سکتا ہے کیونکہ وہ بسا اوقات فکر کر کے اچھے اچھے طریق نقب زنی کے نکال لیتا ہے۔ اور عمدہ عمدہ تدبیریں ڈاکہ مارنے اور خون ناحق کرنے کی اس کے دل میں گذر جاتی ہیں تو کیا لائق ہے کہ ہم ان تمام ناپاک طریقوں کا نام الہام رکھ دیں! ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ لوگوں کا خیال ہے جن کو اب تک سچے خدا کی خبر نہیں جو آپ خاص مکالمہ سے دلوں کو تسلّی دیتا اور ناواقفوں کو روحانی علوم سے معرفت بخشتا ہے۔

الہام کیا چیز ہے؟ وہ پاک اور قادر خدا کا ایک برگزیدہ بندہ کے ساتھ یا اس کے ساتھ جس کو برگزیدہ کرنا چاہتا ہے **ایک زندہ اور با قدرت کلام کے ساتھ مکالمہ اور مخاطبہ** ہے۔ سو جب یہ مکالمہ اور مخاطبہ کافی اور تسلّی بخش سلسلہ کے ساتھ شروع ہو جائے اور اس میں خیالات فاسدہ کی تاریکی نہ ہو اور نہ غیر مکتفی اور چند بے سرو پا لفظ ہوں۔ اور کلام لذیذ اور پُر حکمت اور پُر شوکت ہو تو وہ خدا کا کلام ہے جس سے وہ اپنے بندے کو تسلّی دینا چاہتا ہے۔ اور اپنے تئیں اُس پر ظاہر کرتا ہے۔ ہاں کبھی ایک کلام محض امتحان کے طور پر ہوتا ہے اور پورا اور با برکت سامان ساتھ نہیں رکھتا۔ اس میں خدائے تعالیٰ کے بندہ کو اُسکی ابتدائی حالت میں آزمایا جاتا ہے تا وہ ایک ذرّہ الہام کا مزہ چکھ کر پھر واقعی طور پر اپنا حال و قال سچے ملہموں کی طرح بنا دے یا ٹھوکر کھاوے۔ پس اگر وہ حقیقی راستبازی صدیقوں کی طرح اختیار نہیں کرتا تو اس نعمت کے کمال سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور صرف بے ہودہ لاف زنی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کروڑہا نیک بندوں کو الہام ہوتا رہا ہے مگر اُن کا مرتبہ خدا کے نزدیک ایک درجہ کا نہیں بلکہ خدا کے پاک نبی جو پہلے درجہ پر کمال صفائی سے خدا کا الہام پانے والے ہیں وہ بھی مرتبہ میں برابر نہیں۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے:-

تلک الرّسل فضّلنا بعضھم علٰی بعضٍ

یعنی بعض نبیوں کو بعض نبیوں پر فضیلت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ الہام محض فضل ہے اور فضیلت کے وجود میں اس کو دخل نہیں۔ بلکہ فضیلت اس صدق اور اخلاص اور وفاداری کی قدر پر ہے جس کو خدا جانتا ہے۔ ہاں الہام بھی اگر اپنی بابرکت شرائط کے ساتھ ہو تو وہ بھی ان کا ایک پھل ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر اس رنگ میں الہام ہو کہ بندہ سوال کرتا ہے اور خدا اس کا جواب دیتا ہے۔ اس طرح ایک ترتیب کے ساتھ سوال و جواب ہو

نور الٰہی شوکت اور نور الہام میں پایا جائے اور علوم غیب یا معارف صحیحہ پر مشتمل ہو تو وہ خدا کا الہام ہے۔ خدا کے الہام میں یہ ضروری ہے کہ جس طرح ایک دوست دوسرے دوست سے مل کر باہم ہمکلام ہوتا ہے اسی طرح رب اور اس کے بندہ میں ہمکلامی واقع ہو۔ اور جب یہ کسی امر میں سوال کرے تو اس کے جواب میں ایک کلام لذیذ فصیح خدائے تعالیٰ کی طرف سے سُنے جس میں اپنے نفس اور فکر اور غور کا کچھ بھی دخل نہ ہو اور وہ مکالمہ اور مخاطبہ اس کے لئے موہبت ہو جائے تو وہ خدا کا کلام ہے۔ اور ایسا بندہ خدا کی جناب میں عزیز ہے۔ مگر یہ درجہ کہ الہام بطور موہبت ہو اور زندہ اور پاک الہام کا سلسلہ اپنے بندہ سے خدا کو حاصل ہو اور صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ ہو یہ کسی کو نہیں ملتا بجز ان لوگوں کے جو ایمان اور اخلاص اور اعمال صالحہ میں ترقی کریں اور نیز اس چیز میں جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے۔ سچا اور پاک الہام الوہیت کے بڑے بڑے کرشمے دکھلاتا ہے۔ بارہا ایک نہایت چمکدار نور پیدا ہوتا ہے اور ساتھ اس کے پُرشوکت اور ایک چمکدار الہام آتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ملہم اس ذات سے باتیں کرتا ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ دنیا میں خدا کا دیدار یہی ہے کہ خدا سے باتیں کرے مگر اس ہمارے بیان میں انسان کی وہ حالت داخل نہیں ہے جو کسی کی زبان پر بے ٹھکانہ کوئی لفظ یا فقرہ یا شعر جاری ہو اور ساتھ اس کے کوئی مکالمہ یا مخاطبہ نہ ہو بلکہ ایسا شخص خدا کے امتحان میں گرفتار ہے کیونکہ خدا اس طریق سے بھی سُست اور غافل بندوں کو آزماتا ہے کہ کبھی کوئی فقرہ یا عبارت کسی کے دل پر یا زبان پر جاری کی جاتی ہے اور وہ شخص اندھے کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہیں جانتا کہ وہ عبارت کہاں سے آئی خدا سے یا شیطان سے۔ سو ایسے فقرات سے استغفار لازم ہے۔ لیکن اگر ایک صالح اور نیک بندہ کو بے حجاب مکالمہ الٰہیہ شروع ہو جائے اور مخاطبہ اور مکالمہ کے طور پر ایک کلام روشن۔ لذیذ۔ پُرمعنی۔ پُرحکمت پوری شوکت کے ساتھ سُنائی دے اور کم سے کم بارہا اس کو ایسا اتفاق ہوا ہو کہ خدا میں اور اُس میں عین بیداری میں دس مرتبہ سوال و جواب ہوا ہو۔ اُس نے سوال کیا اور خدا نے جواب دیا پھر اُسی وقت عین بیداری میں اُس نے کوئی اور عرض کی اور خدا نے اس کا بھی جواب دیا۔ پھر گذارش عاجزانہ کی خدا نے اس کا جواب بھی عطا فرمایا۔ ایسا ہی دس مرتبہ تک خدا میں اور اُس میں باتیں ہوتی رہیں اور خدا نے بارہا ان مکالمات میں اس کی دعائیں منظور کیں ہوں عمدہ عمدہ معارف پر اس کو اطلاع دی ہو۔ آنے والے واقعات کی اس کو خبر دی ہو اور اپنے برہنہ مکالمہ سے بار بار کے

سوال و جواب میں اس کو مشرف کیا ہو تو ایسے شخص کو خدائے تعالیٰ کا بہت شکر کرنا چاہیئے ۔ اور سب سے زیادہ خدا کی راہ میں فدا ہونا چاہیئے ۔ کیونکہ خدا نے محض اپنے کرم سے اپنے تمام بندوں میں سے اُسے چُن لیا ۔ اور ان صدیقوں کا اس کو وارث بنا دیا جو اُس سے پہلے گذر چکے ہیں ۔ یہ نعمت نہایت ہی نادر الوقوع ہے ۔ اور خوش قسمتی کی بات ہے جس کو ملی ۔ اس کے بعد جو کچھ ہے وہ ہیچ ہے ۔ اس مرتبہ اور مقام کے لوگ اسلام میں ہمیشہ ہوتے رہے ہیں ۔ اور ایک اسلام ہی ہے جس میں خدا بندہ سے قریب ہو کر اس سے باتیں کرتا ہے ۔ وہ اس کے اندر بولتا ہے اور اس کے دل میں اپنا تخت بناتا اور اس کے اندر سے اُسے آسمان کی طرف کھینچتا ہے اور اس کو وہ سب نعمتیں عطا فرماتا ہے جو پہلوں کو دی گئیں ۔ افسوس اندھی دنیا نہیں جانتی کہ انسان نزدیک ہوتا ہوتا کہاں تک پہنچ جاتا ہے ۔ وہ آپ تو قدم نہیں اُٹھاتے اور جو قدم اُٹھائے تو یا تو اُس کو کافر ٹھیرایا جاتا ہے اور یا اُس کو معبود ٹھیرا کر خدا کی جگہ دی جاتی ہے ۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۱۲۳ - ۱۲۷)

رہی یہ بات کہ الہام بے اصل اور بے سود اور بے حقیقت چیز ہے جس کا ضرر اس کے نفع سے بڑھ کر ہے ۔ سو جاننا چاہیئے کہ ایسی باتیں وہی شخص کرے گا جس نے کبھی اس شراب طہور کا مزا نہیں چکھا اور نہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ سچا ایمان اس کو حاصل ہو ۔ بلکہ رسم اور عادت پر خوش ہے اور کبھی نظر اس طرف اٹھا کر نہیں دیکھتا کہ مجھے خداوند کریم پر یقین کہاں تک حاصل ہے اور میری معرفت کا درجہ کس حد تک ہے اور مجھے کیا کرنا چاہیئے کہ تا میری اندرونی کمزوریاں دُور ہوں اور میرے اخلاق اور اعمال اور ارادہ میں ایک زندہ تبدیلی پیدا ہو جائے اور مجھے وہ عشق اور محبت حاصل ہو جائے جس کی وجہ سے میں بآسانی سفر آخرت کر سکوں اور مجھ میں ایک نہایت عمدہ قابل ترقی مادہ پیدا ہو جائے ۔

بے شک یہ بات سب کے فہم میں آ سکتی ہے کہ انسان اپنی اس غافلانہ زندگی میں جو ہر دم تحت الثریٰ کی طرف کھینچ رہی ہے اور علاوہ اس کے تعلقات زن و فرزند اور ننگ و ناموس کے بوجھل اور بھاری پتّھر کی طرح ہر لحظہ نیچے کی طرف لے جا رہے ہیں ایک بالائی طاقت کا ضرور محتاج ہے جو اس کو سچی بینائی اور سچّا کشف بخش کر خدا تعالیٰ کے جمال باکمال کا مشتاق بنا دیوے ۔ سو جاننا چاہیئے کہ وہ بالائی طاقت الہام رّبانی ہے جو عین دُکھ کے وقت میں سرور پہنچاتا ہے ۔ اور مصائب کے ٹیلوں اور پہاڑوں کے نیچے بڑے آرام اور لذّت کے ساتھ

کھڑا کر دیتا ہے اور دقیق در دقیق وجود جس نے عقلی طاقتوں کو خیرہ کر رکھا ہے اور تمام حکیموں کی عقل اور دانش کو سکتہ میں ڈال دیا ہے وہ الہام ہی کے ذریعہ سے کچھ اپنا پتہ دیتا ہے اور **انا الموجود** کہکر سالکوں کے دلوں کو تسلّی بخشتا ہے اور سکینت نازل کرتا ہے۔ اور انتہائی وصول کی ٹھنڈی ہوا سے جان پژمردہ کو تازگی بخشتا ہے۔ یہ بات تو سچ ہے کہ قرآن کریم ہدایت دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر قرآن کریم جس کو ہدایت کے چشمہ تک پہنچاتا ہے اُس میں پہلی علامت یہی پیدا ہو جاتی ہے کہ مکالمہ طیّبہ الٰہیہ اُس سے شروع ہو جاتا ہے جس سے نہایت درجہ کی انکشافی معرفت اور چشم دید برکت و نورانیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ عرفان حاصل ہونا شروع ہو جاتا ہے جو مجرّد تقلیدی اٹکلوں یا عقلی ڈھکوسلوں سے ہرگز نہیں مل سکتا کیونکہ تقلیدی علوم محدود اور مشتبہ ہیں اور عقلی خیالات ناقص و ناتمام ہیں اور ہمیں ضرور حاجت ہے کہ براہ راست اپنے عرفان کی توسیع کریں۔ کیونکہ جس قدر ہمارا عرفان ہوگا اُسی قدر ہمیں ولولہ اور شوق جوش مارے گا۔ کیا ہمیں باوجود ناقص عرفان کے کامل ولولہ اور شوق کی کچھ توقع ہے؟ نہیں کچھ بھی نہیں۔ سو حیرت اور تعجب ہے کہ وہ لوگ کیسے بدفہم ہیں جو ایسے ذریعۂ کاملہ وصول حق سے اپنے تئیں مستغنی سمجھتے ہیں جس سے روحانی زندگی وابستہ ہے

یاد رکھنا چاہیئے کہ روحانی علوم اور روحانی معارف صرف بذریعہ الہامات و مکاشفات ہی ملتے ہیں۔ اور جب تک ہم وہ درجہ روشنی کا نہ پالیں تب تک ہماری انسانیت کسی حقیقی معرفت یا حقیقی کمال سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی ....

ہم ایک بڑے بھاری مطلب کے لئے جو حقیقی معرفت ہے پیدا کئے گئے ہیں اور وہی معرفت ہماری نجات کا مدار بھی ہے جو ہر ایک خبیث اور مغشوش طریق سے ہمیں آزادی بخش کر ایک پاک اور شفاف دریا کے کنارے پر ہمارا مُنہ رکھ دیتی ہے اور وہ صرف **بذریعہ الہام الٰہی** ہمیں ملتی ہے۔ جب ہم اپنے نفس سے بکلّی فنا ہو کر دردمند دل کے ساتھ لایدرک وجود میں ایک گہرا غوطہ مارتے ہیں تو ہماری بشریت الوہیت کے دریا میں پڑنے سے عندالعود کچھ آثار و انوار اس عالم کے ساتھ لے آتی ہے۔ سو جس چیز کو اس دنیا کے لوگ بنظر حقارت دیکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی ایک چیز ہے جو مدت کے جُدا شدہ کو ایک دم میں اپنے محبوب سے ملاتی ہے وہی ہے جس سے عشاق الٰہی تسلّی پاتے ہیں اور طرح طرح کی نفسانی قیدوں سے بیک بار اپنا پَیر باہر نکال لیتی ہے۔ جب تک وہ سچی روشنی دلوں پر نازل نہ ہو ہرگز ممکن ہی نہیں

کہ کوئی دل منور ہو سکے۔ غرض انسانی عقل کی ناقابلیت اور رسمی علوم کی محدودیت ضرورت الہام پر شہادت دے رہی ہے۔

(ازالہ اوہام ص ۲۲۶ - ۲۲۹)

وسوسۂ نہم۔ یہ اعتقاد کہ خدا آسمان سے اپنا کلام نازل کرتا ہے یہ بالکل درست نہیں کیونکہ قوانینِ نیچریہ اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ اور کوئی آواز اوپر سے نیچے کو آتی ہم کبھی نہیں سُنتے۔ بلکہ الہام صرف اُن خیالات کا نام ہے کہ جو فکر اور نظر کے استعمال سے عقلمند لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ و بس۔

جواب:- جو صداقت بجائے خود ثابت ہے اور جس کو بے شمار صاحبِ معرفت لوگوں نے بچشمِ خود مشاہدہ کر لیا ہے اور جس کا ثبوت ہر زمانہ میں طالبِ حق کو مل سکتا ہے اگر اس سے کوئی ایسا انسان منکر ہو کہ جو روحانی بصیرت سے بے بہرہ ہے یا اگر اُسکی تصدیق سے کسی محجوب القلب کا فکر قاصر اور علمِ ناقص ناکام رہے تو اُس صداقت کا کچھ بھی نقصان نہیں اور نہ وہ ایسے لوگوں کے بک بک کرنے سے قوانینِ قدرتیہ سے باہر ہو سکتی ہے۔ مثلاً تم سوچو کہ اگر کوئی اس قوت جاذبہ سے جو مقناطیس میں ہے بے خبر ہو۔ اور اُس نے کبھی مقناطیس دیکھا ہی نہ ہو اور یہ دعویٰ کرے کہ مقناطیس ایک پتھر ہے اور جہاں تک قوانینِ قدرتیہ کا مجھے علم ہے۔ اِس طور کی کشش کو مَیں نے کبھی کسی پتھر میں مشاہدہ نہیں کیا اس لئے میری رائے میں جو مقناطیس کی نسبت ایک خاصیت جذب خیال کی گئی ہے وہ غلط ہے کیونکہ قوانینِ نیچریہ کے برخلاف ہے تو کیا اس کی اس فضول گوئی سے مقناطیس کی ایک متحقق خاصیت غیر معتبر اور مشکوک ہو جائیگی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ایسے نادان کی ان فضول باتوں سے اگر کچھ ثابت بھی ہو گا تو یہی ثابت ہو گا کہ وہ سخت درجہ کا احمق اور جاہل ہے کہ جو اپنے عدمِ علم کو عدمِ شے پر دلیل ٹھہراتا ہے اور ہزارہا صاحبِ تجربہ لوگوں کی شہادت کو قبول نہیں کرتا۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکے کہ قوانینِ قدرتیہ کے لئے یہ بھی شرط ہو کہ ہر ایک فردِ بشر عام طور پر خود ان کو آزما لیوے۔ خدا نے نوعِ انسان کو ظاہری باطنی قوتوں میں متفاوت پیدا کیا ہے۔ مثلاً بعض کی قوتِ باصرہ نہایت تیز ہے۔ بعض ضعیف البصر ہیں۔ بعض بعض اندھے بھی ہیں۔ جو ضعیف البصر ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ تیز بصارت والوں نے دُور سے کسی باریک چیز کو مثلاً ہلال کو دیکھ لیا تو وہ انکار نہیں کرتے بلکہ انکار کرنا اپنی ذلت اور پردہ دری کا موجب سمجھتے ہیں۔ اور اندھے بیچارے تو ایسے معاملہ میں دم بھی نہیں مارتے۔ اِسی طرح جن کی قوتِ شامہ مفقود ہے وہ

صدہا ثقہ اور راستگو لوگوں کی زبانی خوشبو بدبو کی خبریں جب سُنتے ہیں تو یقین کر لیتے ہیں۔ اور ذرہ شک نہیں کرتے اور خوب جانتے ہیں کہ اس قدر لوگ جھوٹ نہیں بولتے ضرور سچے ہیں اور بلاشبہ ہماری قوت شامہ ندارد ہے کہ جو ہم ان مشمومات کے دریافت کرنے سے محروم ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس باطنی استعدادوں میں بھی بنی آدم مختلف ہیں۔ بعض ادنیٰ ہیں اور حُجب نفسانی میں محجوب ہیں۔ اور بعض قدیم سے ایسے نفوس عالیہ اور صافیہ ہوتے چلے آئے ہیں کہ جو خدا سے الہام پاتے رہے ہیں۔ اور ادنیٰ فطرت کے لوگ جو محجوب النفس ہیں اُن کا نفوس عالیہ لطیفہ کے خصائص ذاتیہ سے انکار کرنا ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی اندھا یا ضعیف البصر صاحب بصارت قویّہ کے مرئیات سے انکار کرے۔ یا جیسا ایک اخشم آدمی جس کی قوتِ بویائی ابتدا پیدائش سے ہی باطل ہو صاحب قوت شامہ کے مشمومات سے منکر ہو۔

اور پھر منکر کے ملزم کرنے کے لئے بھی جو ظاہری طور پر تدابیر ہیں وہی باطنی طور پر بھی تدابیر موجود ہیں۔ مثلاً جس کی قوتِ شامہ کا مفقود ہونا بعلّتِ مولودی ہے اگر وہ خوشبو بدبُو کے وجود سے منکر ہو بیٹھے اور جس قدر لوگ صاحب قوتِ شامہ ہیں سب کو دروغگو یا وہمی قرار دے تو اس کو یُوں سمجھا سکتے ہیں کہ اُس کو یہ کہا جائے کہ وہ بہت سی چیزوں مثلاً پارچات میں سے بعض پر عطر مل کر اور بعض کو خالی رکھ کر صاحب قوت شامہ کا امتحان کرلے تا تکرار تجربہ سے اس کو اس بات پر یقین ہو جائے کہ قوت شامہ کا وجود بھی واقعی اور حقیقی ہے اور ایسے لوگ فی الحقیقت پائے جاتے ہیں کہ جو معطّر اور غیر معطّر میں فرق کر لیتے ہیں۔ ایسا ہی تکرارِ تجربہ سے الہام کا وجود طالبِ حق پر ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب صاحب الہام پر وہ امورِ غیبیہ اور دقائقِ مخفیہ منکشف ہوتے ہیں کہ جو مجرّدِ عقل سے منکشف نہیں ہو سکتے۔ اور کتابِ الہامی ان عجائبات پر مشتمل ہوتی ہے جن پر کوئی دوسری کتاب مشتمل نہیں ہوتی، تو طالبِ حق اسی دلیل سے سمجھ لیتا ہے کہ الہام الٰہی ایک متحقق الوجود صداقت ہے۔ اور اگر نفوس صافیہ میں سے ہو تو خود ٹھیک ٹھیک راہ راست پر چلنے سے کسی قدر بہ حیثیت نورانیت قلب اپنے کے الہام الٰہی کو اولیاء اللہ کی طرح پا بھی لیتا ہے جس سے وحی رسالت پر بطور حق الیقین اس کو علم حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طالبِ حق کے لئے کہ جو اسلام کے قبول کرنے پر دلی سچائی اور روحانی صدق اور خالص اطاعت سے رغبت ظاہر کرے ہم ہی اس طور پر تسلّی دینے کا ذمہ اٹھاتے ہیں۔ وان کان احد فی شکٍّ من قولی فلیرجع الینا بصدق

القدیر۔ واللہ علیٰ ما نقول قدیر۔ وھو فی کل امر نصیر۔

اور یہ خیال کرنا کہ جو جو دقائق فکر اور نظر کے استعمال سے لوگوں پر کھلتے ہیں وہی الہام ہیں بجز ان کے کوئی شے الہام نہیں۔ یہ بھی ایک ایسا وہم ہے جس کا موجب صرف کور باطنی اور بے خبری ہے۔ اگر انسانی خیالات ہی خدا کا الہام ہوتے تو انسان بھی خدا کی طرح بذریعہ اپنے فکر اور نظر کے اُمورِ غیبیہ کو معلوم کر سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ گو انسان کیسا ہی دانا ہو مگر وہ فکر کر کے کوئی امر غیب بتلا نہیں سکتا اور کوئی نشان طاقت الوہیت کا ظاہر نہیں کر سکتا۔ اور خدا کی قدرتِ خاصہ کی کوئی علامت اُس کے کلام میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اگر وہ فکر کرتا کرتا مر بھی جائے تب بھی ان پوشیدہ باتوں کو معلوم نہیں کر سکتا کہ جو اس کی عقل اور نظر اور حواس سے وراء الوراء ہیں۔ اور نہ اس کا کلام ایسا عالی ہوتا ہے کہ جس کے مقابلہ سے انسانی قوتیں عاجز ہوں۔ پس اس وجہ سے عاقل کو یقین کرنے کے لئے وجوہ کافی ہیں کہ جو کچھ انسان اپنی فکر اور نظر سے بھلے یا بُرے خیالات پیدا کرتا ہے وہ خدا کا کلام نہیں بن سکتے۔ اگر وہ خدا کا کلام ہوتا تو انسان پر سارے غیب کے دروازے کھل جاتے اور وہ امور بیان کر سکتا جن کا بیان کرنا الوہیت کی قوت پر موقوف ہے۔ کیونکہ خدا کے کام اور کلام میں خدائی کے تجلّیات کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی کے دل میں یہ شبہ گذرے کہ نیک اور بد تدبیریں اور ہر ایک شر و خیر کے متعلق باریک حکمتیں اور طرح طرح کے مکر و فریب کی باتیں کہ جو فکر اور نظر کے وقت انسان کے دل میں پڑ جاتی ہیں وہ کس کی طرف سے اور کہاں سے پڑتی ہیں اور کیونکر سوچتے سوچتے یک دفعہ مطلب کی بات سُوجھ جاتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام خیالات خَلق اللّٰہ ہیں اَمر اللّٰہ نہیں۔ اور اس جگہ خَلق اور اَمر میں ایک لطیف فرق ہے۔ خَلق تو خدا کے اس فعل سے مراد ہے کہ جب خدائے تعالیٰ عالم کی کسی چیز کو بتوسطِ اسباب پیدا کر کے بوجہ علتِ العلل ہونے کے اپنی طرف اس کو منسوب کرے۔ اور اَمر وہ ہے جو بلا توسط اسباب خالص خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو۔ اور کسی سبب کی اس سے آمیزش نہ ہو۔ پس کلامِ الٰہی جو اُس قادر مطلق کی طرف سے نازل ہوتا ہے اس کا نزول عالَم امر سے ہے نہ عالم خَلق سے۔ اور دوسرے جو جو خیالات انسانوں کے دلوں میں بوقت نظر و فکر اٹھا کرتے ہیں وہ تمامہا عالم خلق سے ہیں کہ جن میں قدرتِ الٰہیہ زیر پردہ اسباب و قویٰ متصرف ہوتی ہے اور ان کی نسبت بسطِ کلام یوں ہے کہ خدا نے انسان کو اس عالمِ اسباب میں طرح طرح کی قوتوں اور طاقتوں کے ساتھ

پیدا کرکے اُن کی فطرت کو ایک ایسے قانونِ قدرت پر مبنی کر دیا ہے یعنی ان کی پیدائش میں کچھ اس قسم کی خاصیت رکھدی ہے کہ جب وہ کسی بھلے یا بُرے کام میں اپنی فکر کو متحرک کریں تو اُسی کے مناسب انکو تدبیریں سُوجھ جایا کریں۔ جیسے ظاہری قوتوں اور حواسوں میں انسان کے لئے یہ قانونِ قدرت رکھا گیا ہے کہ جب وہ اپنی آنکھ کھولے تو کچھ نہ کچھ دیکھ لیتا ہے اور جب اپنے کانوں کو کسی آواز کی طرف لگاوے تو کچھ نہ کچھ سُن لیتا ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی نیک یا بد کام میں کوئی کامیابی کا راستہ سوچتا ہے تو کوئی نہ کوئی تدبیر سُوجھ ہی جاتی ہے۔ صالح آدمی نیک راہ میں فکر کرکے نیک باتیں نکالتا ہے اور چور نقب زنی کے باب میں فکر کرکے کوئی عمدہ طریق نقب زنی کا ایجاد کرتا ہے۔ غرض جس طرح بدی کے بارے میں انسان کو بڑے بڑے عمیق اور نازک بدی کے خیال سُوجھ جاتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اُسی قوت کو جب انسان نیک راہ میں استعمال کرتا ہے تو نیکی کے عمدہ خیال بھی سوجھ جاتے ہیں۔ اور جس طرح بد خیالات کو کیسے ہی عمیق اور دقیق اور جادو اثر کیوں نہ ہوں خدا کا کلام نہیں ہو سکتے ایسا ہی انسان کے خود تراشیدہ خیالات جن کو وہ اپنے زعم میں نیک سمجھتا ہے کلام الٰہی نہیں ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ نیکوں کو نیک علتیں یا چوروں اور ڈاکوؤں اور خونیوں اور زانیوں اور جعلسازوں کو فکر اور نظر کے بعد بُری تدبیریں سوجھتی ہیں وہ فطرتی آثار اور خواص ہیں۔ اور بوجہ علّت العلل ہونے حضرت باری کے اُن کو خلق اللہ کہا جاتا ہے نہ امر اللہ۔ وہ انسان کے لئے ایسے ہی فطرتی خواص ہیں جیسے نباتات کے لئے قوتِ اسہال یا قوتِ قبض یا دوسری قوتیں فطرتی خواص ہیں۔ غرض جیسا اور چیزوں میں حکیم مطلق نے طرح طرح کے خواص رکھے ہیں ایسا ہی انسان کی قوت متفکرہ میں یہ خاصہ رکھا ہے کہ جس نیک یا بد میں انسان اس سے مدد لینا چاہتا ہے اُسی قسم کی اُس سے مدد ملتی ہے۔ ایک شاعر کسی کی ہجو میں شعر بناتا ہے اس کو فکر کرنے سے ہجو کے شعر سوجھتے جاتے ہیں۔ دوسرا شاعر اُسی شخص کی تعریف کرنی چاہتا ہے اس کو تعریف کا ہی مضمون سُوجھتا ہے۔ سو اس قسم کے خیالات نیک اور بد خدا کی خاص مرضی کا آئینہ نہیں ہو سکتے۔ اور نہ اُس کا کام اور کلام کہلا سکتے ہیں۔ خدا کا پاک کلام وہ کلام ہے کہ جو انسانی قویٰ سے بکلّی برتر و اعلیٰ ہے۔ اور کمالیت اور قدرت اور تقدّس سے بھرا ہوا ہے جس کے ظہور و بروز کے لئے اوّل شرط یہی ہے کہ بشری قوتیں بکلّی معطّل اور بے کار ہوں۔ نہ فکر ہو نہ نظر ہو بلکہ انسان مثل میّت کے ہو۔ اور سب اسباب منقطع ہوں۔ اور خدا جس کا وجود واقعی اور حقیقی ہے

آپ اپنے کلام کو اپنے خاص ارادہ سے کسی کے دل پر نازل کرے۔ پس سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح آفتاب کی روشنی صرف آسمان سے آتی ہے آنکھ کے اندر سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح نورِ الہام کا بھی خاص خدا کی طرف سے اور اس کے ارادہ سے نازل ہوتا ہے۔ یونہی اندر سے جوش نہیں مارتا۔ جبکہ خدا فی الواقعہ موجود ہے اور فی الواقعہ وہ دیکھتا سُنتا اور جانتا کلام کرتا ہے تو پھر اُس کا کلام اُسی حیّ و قیّوم کی طرف سے نازل ہونا چاہیئے نہ یہ کہ انسان کے اپنے ہی خیالات خدا کا کلام بن جائیں۔ ہمارے اندر سے وہی خیالات بھلے یا بُرے جوش مارتے ہیں کہ جو ہمارے اندازۂ فطرت کے مطابق ہمارے اندر سمائے ہوئے ہیں۔ مگر خدا کے بے انتہا علم اور بے شمار حکمتیں ہمارے دل میں کیونکر سما سکیں۔ اس سے زیادہ تر اور کیا کفر ہوگا کہ انسان ایسا خیال کرے کہ جس قدر خدا کے پاس خزائن علم و حکمت اور اسرار غیب ہیں وہ سب ہمارے ہی دل میں موجود ہیں اور ہمارے ہی دل سے جوش مارتے ہیں۔ پس دوسرے لفظوں میں اس کا خلاصہ تو یہی ہوا کہ حقیقت میں ہم ہی خدا ہیں اور بجز ہمارے اور کوئی ذات قائم بنفسہٖ اور متّصف بصفاتہٖ موجود نہیں جس کو خدا کہا جائے۔ کیونکہ اگر فی الواقعہ خدا موجود ہے اور اس کے علوم غیر متناہی اُسی سے خاص ہیں جن کا پیمانہ ہمارا دل نہیں ہو سکتا تو اس صورت میں کس قدر یہ قول غلط اور بے ہودہ ہے کہ خدا کے بے انتہا علوم ہمارے ہی دل میں بھرے پڑے ہیں اور خدا کے تمام خزائن حکمت ہمارے ہی قلب میں سما رہے ہیں۔ گویا خدا کا علم اسی قدر ہے جس قدر ہمارے دل میں موجود ہے۔ پس خیال کرو کہ اگر یہ خدائی کا دعویٰ نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کا دل خدا کے جمیع کمالات کا جامع ہو جائے؟ کیا یہ جائز ہے کہ ایک ذرہ امکان آفتاب وجوب بن جائے؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ ہم پہلے ابھی لکھ چکے ہیں کہ الوہیت کے خواص جیسے علم غیب اور احاطۂ دقائق حکمیہ اور دوسرے قدرتی نشان انسان سے ہرگز ظہور پذیر نہیں ہو سکتے۔ اور خدا کا کلام وہ ہے جس میں خدا کی عظمت، خدا کی قدرت، خدا کی برکت خدا کی حکمت، خدا کی بے نظیری پائی جاوے۔ سو وہ تمام شرائط قرآن شریف میں ہیں۔ جیسے انشاء اللہ ثبوت اس کا اپنے موقعہ پر ہوگا۔ پس اگر اب بھی برہمو سماج والوں کو ایسے الہام کے وجود سے انکار ہو کہ جو امورِ غیبیہ اور دوسرے امور قدرتیہ پر مشتمل ہو تو اُن کو اپنی آنکھ کھولنے کے لئے قرآن شریف کو بغور تمام دیکھنا چاہیئے تا انہیں معلوم ہو کہ کیسے اس کلام پاک میں ایک دریا اخبارِ غیب کا اور نیز اُن تمام امور قدرتیہ کا کہ جو انسانی

طاقتوں سے باہر ہیں بہ رہا ہے۔ اور اگر بوجہ قلّتِ بصیرت و بصارت ان فضائلِ قرآنیہ کو خود بخود معلوم نہ کر سکیں تو ہماری اس کتاب کو ذرا آنکھ کھول کر پڑھیں تا وہ خزائن اُمورِ غیبیہ و اسرار قدرتیہ کہ جو قرآن شریف میں بھرے پڑے ہیں بطور مشتے نمونہ از خروارے اُن کو معلوم ہو جائیں۔ اور یہ بھی ان کو معلوم رہے کہ تحقق وجود الہام ربّانی کے لئے کہ جو خاص خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ اور اُمورِ غیبیہ پر مشتمل ہوتا ہے ایک اور بھی راستہ کھلا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ اُمتِ محمدیہ میں کہ جو سچے دین پر ثابت اور قائم ہیں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا کرتا ہے کہ جو خدا کی طرف سے ملہم ہو کر ایسے اُمورِ غیبیہ بتلاتے ہیں جن کا بتلانا بجز خدائے واحد لاشریک کے کسی کے اختیار میں نہیں۔ اور خداوند تعالیٰ اس پاک الہام کو اُنہی ایمانداروں کو عطا کرتا ہے جو سچے دل سے قرآن شریف کو خدا کا کلام جانتے ہیں اور صدق اور اخلاص سے اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچّا اور کامل پیغمبر اور سب پیغمبروں سے افضل اور اعلیٰ اور بہتر اور خاتم الرسل اور اپنا ہادی اور رہبر سمجھتے ہیں دوسروں کو یہ الہام یعنی یہودیوں عیسائیوں آریوں اور برہمیوں وغیرہ کو ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمیشہ قرآن شریف کے کامل تابعین کو ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ اور گو وحی رسالت بجہت عدم ضرورت منقطع ہے لیکن یہ الہام کہ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے با اخلاص خادموں کو ہوتا ہے یہ کسی زمانہ میں منقطع نہیں ہوگا۔ اور یہ الہام وحی رسالت پر ایک عظیم الشان ثبوت ہے جس کے سامنے ہر ایک منکر و مخالفِ اسلام ذلیل اور رُسوا ہے۔ اور چونکہ یہ مبارک الہام اپنی تمام برکت اور عزّت اور عظمت اور جلال کے ساتھ صرف اُن عزّت دار بندوں میں پایا جاتا ہے کہ جو اُمتِ محمدیہ میں داخل ہیں۔ اور خدّام آنحضرتِ والا جاہ ہیں۔ دوسرے کسی فرقہ میں یہ نور کامل کہ جو تقرّب اور قبولیت اور خوشنودیٔ حضرتِ عزّت کی بشارتیں بخشتا ہے ہرگز پایا نہیں جاتا۔ اس لئے وجود اس مبارک الہام کا صرف نفسِ الہام کی حقانیت کو ثابت نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ دنیا میں مقبول اور مستقیم دین پر جو فرقہ ہے وہ فقط اہلِ اسلام ہی کا فرقہ ہے اور باقی سب لوگ باطل پرست اور کجرو اور موردِ غضبِ الٰہی ہیں۔ نادان لوگ میری اس بات کو سنتے ہی طرح طرح کی باتیں بنائیں گے اور انکار سے سر ہلائیں گے یا احمقوں اور شریروں کی طرح ٹھٹھا کرینگے مگر اُن کو سمجھنا چاہیئے کہ خواہ نخواہ انکار اور ہنسی سے پیش آنا شریف النفس اور طالب الحق انسانوں کا کام نہیں بلکہ اُن خبیث الطینت اور شریر النفس لوگوں کا کام ہے جن کو خدا اور راستی سے

غرض نہیں۔ دنیا میں ہزارہا چیزوں میں ایسے خواص ہیں کہ جو عقلی طور پر سمجھے نہیں جاتے صرف تجربہ سے انسان ان کو سمجھتا ہے۔ اسی وجہ سے عام طور پر تمام عقلمندوں کا یہی قاعدہ ہے کہ جب تکرار تجربہ سے کسی چیز کی خاصیت ظاہر ہو جاتی ہے تو پھر اس خاصیّت کے تحقّق وجود میں کسی عاقل کو شک باقی نہیں رہتا۔ اور آزمانے کے بعد وہی شخص شک کرتا ہے جو نرا گدھا ہے۔ مثلاً تربد میں جو قوت اسہال ہے یا مقناطیس میں جو قوتِ جذب ہے اگرچہ اس بات پر کوئی دلیل قائم نہیں کہ کیوں ان میں یہ قوتیں ہیں۔ لیکن جب تکرارِ تجربہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ ضرور ان چیزوں میں یہ قوتیں پائی جاتی ہیں تو گو اُن کی کیفیت وجود پر عقلی طور پر کوئی دلیل قائم نہ ہو لیکن بضرورت شہادت قاطعہ تجربہ اور امتحان کے ہر ایک عاقل کو ماننا پڑتا ہے کہ فی الحقیقت تربد میں قوت اسہال ہے اور مقناطیس میں خاصۂ جذب موجود ہے۔ اور اگر کوئی ان کے وجود سے اِس بنا پر انکار کرے کہ عقلی طور پر مجھ کو کوئی دلیل نہیں ملتی تو ایسے شخص کو ہر ایک دانا پاگل اور دیوانہ جانتا ہے اور سودائی اور مسلوب العقل قرار دیتا ہے۔ سو اب ہم برہمو لوگوں اور دوسرے مخالفین کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے الہام کی نسبت بیان کیا ہے یعنی یہ کہ وہ اب بھی امت محمدیہ کے کامل افراد میں پایا جاتا ہے اور انہی سے مخصوص ہے۔ ان کے غیر میں ہرگز پایا نہیں جاتا۔ یہ بیان ہمارا بلا ثبوت نہیں بلکہ جیسا بذریعہ تجربہ ہزارہا صداقتیں دریافت ہو رہی ہیں ایسا ہی یہ بھی تجربہ اور امتحان سے ہر ایک طالب پر ظاہر ہو سکتا ہے اور اگر کسی کو طلب حق ہو تو اسکا ثابت کر دکھانا بھی ہمارا ہی ذمہ ہے۔ بشرطیکہ کوئی برہمو یا اَور کوئی منکر دین اسلام کا طالبِ حق بن کر اور بصدقِ دل دین اسلام قبول کرنے کا وعدہ تحریری مشتہر کر کے اخلاص اور نیک نیتی اور اطاعت سے رجوع کرے۔ فان تولّوا فانّ اللّٰہ علیمٌ بالمفسدین۔ بعض لوگ یہ وہم بھی پیش کرتے ہیں کہ جس حالت میں امورِ غیبیہ کے بتلانے والے دنیا میں کئی فرقے پائے جاتے ہیں کہ جو کبھی نہ کبھی اَور کچھ نہ کچھ بتلا دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات کسی قدر ان کا مقولہ بھی سچ ہو رہتا ہے۔ جیسے منجم طبیب قیافہ دان کاہن رمّال جفری فال بین اور بعض بعض مجانین اور حال کے زمانہ میں مسمریزم کے بعض امور ان سے مکشوف ہوتے رہے ہیں تو پھر اُمور غیبیہ الہام کی حقانیت پر کیونکر حجّت قاطع ہونگے۔ اس کے جواب میں سمجھنا چاہیئے کہ یہ تمام فرقے جن کا اوپر ذکر ہوا صرف ظن اور تخمین بلکہ وہم پرستی سے باتیں کرتے ہیں یقینی علم ان کو ہرگز نہیں ہوتا اور نہ ان کا ایسا دعویٰ ہوتا ہے۔ اور بعض حوادث کونیّہ سے جو یہ لوگ اطلاع دیتے ہیں تو

اُن کی پیشگوئیوں کا ماخذ صرف علامات و اسبابِ ظنّیہ ہوتے ہیں۔ جنہوں نے قطع اور یقین کے مرتبہ سے مس بھی نہیں کیا ہوتا۔ اور احتمالِ تلبیس اور اشتباہ اور خطا کا اُن سے مرتفع نہیں ہوتا۔ بلکہ اکثر ان کی خبریں سراسر بے اصل اور بے بنیاد اور دروغ محض نکلتی ہیں۔ اور باوصف اِس کذب فاش اور خلاف واقعہ نکلنے کے اُن کی پیشگوئیوں میں عزت اور قبولیت اور منصوریت اور کامیابی کے انوار پائے نہیں جاتے۔ اور ایسے خبریں بتانے والے اپنی ذاتی حالت میں اکثر افلاس زدہ اور بدنصیب اور بدبخت اور بے عزّت اور دون ہمت اور دنی النفس اور ناکام اور نامراد ہی نظر آتے ہیں۔ اور امورِ غیبیّہ کو اپنی حسب مراد ہرگز نہیں کر سکتے بلکہ اُن کے حالات پر خدا کے قہر کی علامات نمودار ہوتی ہیں اور خدا کی طرف سے کوئی برکت اور عزّت اور نصرت اُن کے شامل حال نہیں ہوتی۔ مگر انبیاء اور اولیاء صرف نجومیوں کی طرح امورِ غیبیّہ کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ خدا کے کامل فضل اور بزرگ رحمت سے کہ جو ہر دم اُن کے شاملِ حال ہوتی ہے ایسی اعلیٰ پیشگوئیاں بتلاتے ہیں جن میں انوارِ قبولیت اور عزّت کے آفتاب کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جو عزّت اور نصرت کی بشارت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ نہ نحوست اور نکبت پر۔ قرآن کریم کی پیشگوئیوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہو کہ وہ نجومیوں وغیرہ درماندہ لوگوں کی طرح ہرگز نہیں۔ بلکہ اُن میں صریح ایک اقتدار اور جلال جوش مارتا ہوا نظر آتا ہے اور اس میں تمام پیشگوئیوں کا یہی طریق اور طرز ہے کہ اپنی عزّت اور دشمن کی ذلّت اور اپنا اقبال اور دشمن کا ادبار اور اپنی کامیابی اور دشمن کی ناکامی اور اپنی فتح اور دشمن کی شکست اور اپنی ہمیشہ کی سرسبزی اور دشمن کی تباہی ظاہر کی ہے۔ کیا اس قسم کی پیشگوئیاں کوئی نجومی بھی کر سکتا ہے یا کسی رمّال یا مسمریزم کے ذریعہ سے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ہمیشہ اپنی ہی خیر ظاہر کرنا اور مخالف کا زوال اور وبال جتلانا۔ اور جو بات مخالف مُنہ پر لاوے اُسی کو توڑنا اور جو بات اپنے مطلب کی ہو اُس کے ہو جانے کا وعدہ کرنا یہ تو صریح خدائی ہے انسان کا کام نہیں۔

(براہین احمدیہ ص۲۲۲ - ۲۳۲ حاشیہ ۱۱)

انسان باوجودیکہ ہزارہا برسوں سے اپنے علوم طبعیہ اور ریاضیہ کے ذریعہ سے خدا کی قدرتوں کے دریافت کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کر رہا ہے۔ مگر ابھی تک اس قدر اسکے معلومات میں کمی ہے کہ اس کو نامراد اور ناکام ہی کہنا چاہیئے۔ صدہا اسرارِ غیبیہ اہل کشف اور

اہلِ مکالمہ الٰہیہ پر کھلتے ہیں اور ہزارہا راستباز ان کے گواہ ہیں۔ مگر فلسفی لوگ اب تک انکے منکر ہیں۔ جیساکہ فلسفی لوگ تمام مدار ادراکِ معقولات اور تدبّر اور تفکّر کا دماغ پر رکھتے ہیں مگر اہلِ کشف نے اپنی صحیح رویت اور روحانی تجارب کے ساتھ معلوم کیا ہے کہ انسانی عقل اور معرفت کا سرچشمہ دل ہے۔ جیساکہ مَیں پینتیس۳۵ برس سے اس بات کا مشاہدہ کر رہا ہوں کہ خدا کا الہام جو معارفِ روحانیہ اور علومِ غیبیہ کا ذخیرہ ہے دل پر ہی نازل ہوتا ہے بسا اوقات ایک ایسی آواز سے دل کا سرچشمۂ علوم ہونا کھل جاتا ہے کہ وہ آواز دل پر اس طور سے بشدّت پڑتی ہے کہ جیسے ایک ڈول زور کے ساتھ ایک ایسے کنوئیں میں پھینکا جاتا ہے جو پانی سے بھرا ہوا ہے۔ تب وہ دل کا پانی جوش مار کر ایک غنچہ کی شکل میں سربستہ اوپر کو آتا ہے اور دماغ کے قریب ہو کر پھول کی طرح کھل جاتا ہے اور اس میں سے ایک کلام پیدا ہوتا ہے وہی خدا کا کلام ہے۔ پس ان تجاربِ صحیحۂ روحانیہ سے ثابت ہے کہ دماغ کو علوم اور معارف سے کچھ تعلّق نہیں۔ ہاں اگر دماغ صحیح واقعہ ہو اور اس میں کوئی آفت نہ ہو تو دل کے علومِ مخفیہ سے مستفیض ہوتا ہے۔ اور دماغ چونکہ منبت اعصاب ہے اس لئے وہ ایسی کل کی طرح ہے جو پانی کو کنوئیں سے کھینچ سکتی ہے۔ اور دل وہ کنوآں ہے جو علومِ مخفیہ کا سرچشمہ ہے۔ یہ وہ راز ہے جو اہلِ حق نے مکاشفاتِ صحیحہ کے ذریعہ سے معلوم کیا ہے جس میں مَیں خود صاحبِ تجربہ ہوں۔

(چشمۂ معرفت صـ ۲۷۰-۲۷۱)

یہ عاجز قریباً گیارہ برس سے شرفِ مکالمہ الٰہیہ سے مشرف ہے اور اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ وحی درحقیقت آسمان سے ہی نازل ہوتی ہے۔ وحی کی مثال اگر دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کے ساتھ دی جائے تو شائد کسی قدر تار برقی سے مشابہ ہے جو اپنے ہر ایک تغیّر کی آپ خبر دیتی ہے۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ اس وحی کے وقت جو برنگِ وحیٔ ولایت میرے پر نازل ہوتی ہے ایک خارجی اور شدید الاثر تصرف کا احساس ہوتا ہے اور بعض دفعہ یہ تصرّف ایسا قوی ہوتا ہے کہ مجھ کو اپنے انوار میں ایسا دبا لیتا ہے کہ مَیں دیکھتا ہوں کہ مَیں اس کی طرف ایسا کھینچا گیا ہوں کہ میری کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس تصرف میں کھلا اور روشن کلام سنتا ہوں۔ بعض وقت ملائکہ کو دیکھتا ہوں اور سچائی میں جو اثر اور ہیبت ہوتی ہے مشاہدہ کرتا ہوں اور وہ کلام بسا اوقات غیب کی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ایسا تصرّف

اور اخذ خارجی ہوتا ہے جس سے خدا تعالیٰ کا ثبوت ملتا ہے۔ اب اِس سے انکار کرنا ایک کھُلی صداقت کا خون کرنا ہے۔

(برکات الدعا ص۲۶)

مجھے اُس جلّ شانہٗ کی قسم ہے کہ یہ بات واقعی صحیح ہے کہ وحی آسمان سے دل پر ایسی گرتی ہے جیسے کہ آفتاب کی شعاع دیوار پر۔ مَیں ہر روز دیکھتا ہوں کہ جب مکالمہ الٰہیہ کا وقت آتا ہے تو اوّل ایک دفعہ مجھ پر ایک ربودگی طاری ہوتی ہے تب مَیں ایک تبدیل یافتہ چیز کی مانند ہوجاتا ہوں اور میری حِس اور میرا ادراک اور ہوش گو بگفتن باقی ہوتا ہے مگر اس وقت مَیں پاتا ہوں کہ گویا ایک وجود شدید الطاقت نے میرے تمام وجود کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔ اور اس وقت احساس کرتا ہوں کہ میری ہستی کی تمام رگیں اُس کے ہاتھ میں ہیں۔ اور جو کچھ میرا ہے اب وہ میرا نہیں بلکہ اس کا ہے۔ جب یہ حالت ہوجاتی ہے تو اس وقت سب سے پہلے خدا تعالیٰ دل کے خیالات کو میری نظر کے سامنے پیش کرتا ہے جن پر اپنے کلام کی شعاع ڈالنا اس کو منظور ہوتا ہے۔ تب ایک عجیب کیفیت سے وہ خیالات یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے آتے ہیں۔ اور ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک خیال مثلاً زید کی نسبت دل میں آیا کہ وہ فلاں مرض سے صحتیاب ہوگا یا نہ ہوگا تو جھٹ اس پر ایک ٹکڑا کلام الٰہی کا ایک شعاع کی طرح گرتا ہے اور بسا اوقات اس کے گرنے کے ساتھ تمام بدن ہل جاتا ہے۔ پھر وہ مقدمہ طے ہوکر دوسرا خیال سامنے آتا ہے۔ اِدھر وہ خیال نظر کے سامنے کھڑا ہوا اور اُدھر ساتھ ہی ایک ٹکڑا الہام کا اُس پر گرا۔ جیسا کہ ایک تیرانداز ہر یک شکار کے نکلنے پر تیر مارتا جاتا ہے اور عین اُس وقت میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ خیالات کا ہمارے ملکۂ فطرت سے پیدا ہوتا ہے اور کلام جو اس پر گرتا ہے وہ اوپر سے نازل ہوتا ہے۔ اگرچہ شعراء وغیرہ کو بھی سوچنے کے بعد القاء ہوتا ہے مگر اُس وحی کو اس سے مناسبت دینا سخت بے تمیزی ہے کیونکہ وہ القاء خوض اور فکر کا ایک نتیجہ ہوتا ہے اور ہوش و حواس کی قائمی اور انسانیت کی حد میں ہونے کی حالت میں ظہور کرتا ہے۔ لیکن یہ القاء صرف اس وقت ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے تمام وجود کے ساتھ خدا تعالیٰ کے تصرف میں آجاتا ہے اور اپنا ہوش اور اپنا خوض کسی طور سے اس میں دخل نہیں رکھتا۔ اُس وقت زبان ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا یہ اپنی زبان نہیں اور ایک دوسری زبردست طاقت اس سے کام لے رہی ہے۔ اور یہ صورت جو مَیں نے بیان کی ہے اس سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ فطرتی سلسلہ کیا چیز ہے اور آسمان سے کیا نازل ہوتا ہے۔

(برکات الدعا ص۲۲ حاشیہ)

مکالمہ الٰہیہ کے وقت میں جو انسان کو ایک قسم کی نیند اور غنودگی آتی ہے جس غنودگی کی حالت میں خدا کا کلام دل پر نازل ہوتا ہے وہ غنودگی اسباب مادیّہ کی حکومت اور تاثیر سے بالکل باہر ہے اور اس جگہ طبعی کے تمام اسباب اور علل معطّل اور بے کار رہ جاتے ہیں۔ مثلاً جب ایک صادق انسان جس کا درحقیقت خدا تعالےٰ سے محبت اور وفا کا تعلق ہے اپنے اس جوش تعلّق میں اپنے رب کریم سے کسی حاجت کے متعلق کوئی سوال کرتا ہے تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ ابھی اسی دُعا میں مشغول ہوتا ہے کہ ناگاہ ایک غنودگی اُس پر طاری ہوجاتی ہے اور ساتھ ہی آنکھ کھل جاتی ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس سوال کا جواب اس غنودگی کے پردہ میں نہایت فصیح بلیغ الفاظ میں اس کو مل جاتا ہے۔ وہ الفاظ اپنے اندر ایک شوکت اور لذت رکھتے ہیں۔ اور اُن میں الوہیت کی طاقت اور قوت چمکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور میخ آہنی کی طرح دل کے اندر دھنس جاتے ہیں۔ اور وہ الہامات اکثر غیب پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک سوال کے بعد وہ صادق بندہ اُسی پہلے سوال کے متعلق کچھ اور عرض کرنا چاہتا ہے یا کوئی نیا سوال کرتا ہے تو پھر غنودگی اُس پر طاری ہوجاتی ہے اور ایک سیکنڈ تک یا اُس سے بھی کم تر حالت میں وہ غنودگی کھل جاتی ہے اور اُس میں سے پھر ایک پاک کلام نکلتا ہے جیسے ایک میوہ کے غلاف میں سے اس کا مغز نکلتا ہے جو نہایت لذیذ اور پُرشوکت ہوتا ہے۔ اِسی طرح وہ خدا جو نہایت کریم اور رحیم اور اخلاق میں سب سے بڑھا ہوُا ہے ہر ایک سوال کا جواب دیتا ہے۔ اور جواب دینے میں نفرت اور بیزاری ظاہر نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ اگر ساٹھ ۶۰ یا ستّر ۷۰ یا سَو ۱۰۰ دفعہ سوال کیا جائے تو اس کا جواب اسی صورت اور اِسی پیرایہ میں دیتا ہے۔ یعنی ہر ایک سوال کے وقت ایک خفیف سی غنودگی وارد حال ہو جاتی ہے اور کبھی ایک بھاری ربودگی اور غنودگی طاری حال ہوجاتی ہے۔ کہ گویا انسان ایک غشی کی حالت میں پڑ گیا ہے۔ اور اکثر عظیم الشان امور میں اس قسم کی وحی ہوتی ہے اور یہ وحی کی تمام قسموں میں برتر و اعلیٰ ہے۔ پس ایسے حالات میں جو سوال اور دُعا کے وقت لحظہ بہ لحظہ پر غنودگی طاری ہوتی ہے اور اس غنودگی کے پردہ میں وحی الٰہی نازل ہوتی ہے۔ اور یہ طرز غنودگی اسباب مادیّہ سے برتر ہے۔ اور جو کچھ طبعی والوں نے خواب کے متعلّق قانون قدرت سمجھ رکھا ہے۔ اُس کو پاش پاش کرتی ہے۔ ایسا ہی صدہا رُوحانی امور ہیں جو ظاہری فلسفہ والوں کے خیالات کو نہایت ذلیل ثابت کرتے ہیں بسا اوقا

انسان کشفی رنگ میں کئی ہزار کوس کی دُور کی چیزوں کو ایسے طور سے دیکھ لیتا ہے۔ گویا وہ اُس کی آنکھ کے سامنے ہیں اور بسا اوقات اُن روحوں سے جو فوت ہو چکے ہیں عین بیداری میں ملاقات کرتا ہے۔
(چشمۂ معرفت ص ۱۰۳-۱۰۴)

صورتِ اوّل الہام کی منجملہ اُن کئی صورتوں کے جن پر خدا نے مجھ کو اطلاع دی ہے یہ ہے کہ جب خداوند تعالیٰ کوئی امرِ غیبی اپنے بندے پر ظاہر کرنا چاہتا ہے تو کبھی نرمی سے اور کبھی سختی سے بعض کلمات زبان پر کچھ تھوڑی غنودگی کی حالت میں جاری کر دیتا ہے۔ اور جو کلمات سختی اور گرانی سے جاری ہوتے ہیں وہ ایسی پُر شدّت اور عنیف صورت میں زبان پر وارد ہوتے ہیں جیسے گڑے یعنی اولے بیکبارگی ایک سخت زمین پر گرتے ہیں یا جیسے تیز اور پُر زور رفتار میں گھوڑے کا سُم زمین پر پڑتا ہے۔ اور اس الہام میں ایک عجیب سرعت اور شدّت اور ہیبت ہوتی ہے جس سے تمام بدن متأثر ہو جاتا ہے۔ اور زبان ایسی تیزی اور بارُعب آواز میں خود بخود دوڑتی جاتی ہے کہ گویا وہ اپنی زبان ہی نہیں۔ اور ساتھ اس کے جو ایک تھوڑی سی غنودگی اور ربودگی ہوتی ہے وہ الہام کے تمام ہونے کے بعد فی الفور دُور ہو جاتی ہے اور جب تک کلماتِ الہام تمام نہ ہوں تب تک انسان ایک میّت کی طرح بے حس و حرکت پڑا ہوتا ہے۔ یہ الہام اکثر اُن صورتوں میں نازل ہوتا ہے کہ جب خداوند کریم و رحیم اپنی عین حکمت اور مصلحت سے کسی خاص دُعا کو منظور کرنا نہیں چاہتا یا کسی عرصہ تک توقف ڈالنا چاہتا ہے۔ یا کوئی اور خبر پہنچانا چاہتا ہے کہ جو بمقتضائے بشریت انسان کی طبیعت پر گراں گذرتی ہو۔ مثلاً جب انسان جلدی سے کسی امر کا حاصل کر لینا چاہتا ہو اور وہ حاصل ہونا حسب مصلحت ربّانی اس کے لئے مقدر نہ ہو یا توقف سے مقدر ہو اس قسم کے الہام بھی یعنی جو سخت اور گراں صورت کے الفاظ خدا کی طرف سے زبان پر جاری ہوتے ہیں بعض اوقات مجھ کو ہوتے رہے ہیں جس کا بیان کرنا موجب طوالت ہے مگر ایک مختصر فقرہ بطور نمونہ بیان کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ شائد تین سال کے قریب عرصہ گذرا ہوگا کہ مَیں نے اسی کتاب کے لئے دُعا کی کہ لوگ اس کی مدد کی طرف متوجہ ہوں تب یہی الہام شدید الکلمات جس کی مَیں نے ابھی تعریف کی ہے اِن لفظوں میں ہوا:-

” بالفعل نہیں “

اور یہ الہام جب اس خاکسار کو ہوا تو قریب دس یا پندرہ ہندو اور مسلمان لوگوں کے ہونگے کہ جو قادیان میں اب تک موجود ہیں جن کو اُسی وقت اس الہام سے خبر دی گئی۔ اور پھر اُسی کے مطابق

جیسے لوگوں کی طرف سے عدم توجہی رہی وہ حال بھی ان تمام صاحبوں کو بخوبی معلوم ہے۔

دوسری قسم الہام کی یعنی وہ قسم جس میں کچھ ملائمت سے کلمات زبان پر جاری ہوتے ہیں اس قسم میں اپنے ذاتی مشاہدات میں سے صرف اسقدر لکھنا کافی ہے کہ جب پہلے الہام کے بعد جس کو میں ابھی ذکر کر چکا ہوں ایک عرصہ گذر گیا اور لوگوں کی عدم توجہی سے طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں اور مشکل حد سے بڑھ گئی تو ایک دن قریب مغرب کے خداوند کریم نے یہ الہام کیا۔

"ھُزّ الیک بجذع النخلۃ تساقط علیک رطباً جنیاً۔"

سو میں نے سمجھ لیا کہ یہ تحریک اور ترغیب کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ وعدہ دیا گیا ہے کہ بذریعہ تحریک کے اس حصۂ کتاب کے لئے سرمایہ جمع ہوگا۔ اور اس کی خبر بھی بدستور کئی ہندو اور مسلمانوں کو دی گئی۔ اور اتفاقاً اُسی روز یا دوسرے روز حافظ ہدایت علی خاں صاحب کہ جو ان دنوں اس ضلع میں اکسٹرا اسسٹنٹ تھے قادیان میں آ گئے۔ اُن کو بھی اس الہام سے اطلاع دی گئی۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ اسی ہفتے میں میں نے آپ کے دوست مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب کو بھی اس الہام سے اطلاع دی تھی۔ اب خلاصہ کلام یہ کہ اس الہام کے بعد حسب الارشاد حضرت احدیت کسی قدر تحریک کی تو تحریک کرنے کے بعد لاہور۔ پشاور۔ راولپنڈی کوٹلہ مالیر اور چند دوسرے مقاموں سے جس قدر اور جہاں سے خدا نے چاہا اس حصّہ کے لئے جو چھپنا تھا مدد پہنچ گئی۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

(براہین احمدیہ ص ۲۳۸-۲۴۱ حاشیہ در حاشیہ ۱)

صورت دوم الہام کی جس کا میں باعتبار کثرت عجائبات کے کامل الہام نام رکھتا ہوں یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ بندہ کو کسی امر غیبی پر بعد دعا اس بندہ کے یا خود بخود مطلع کرنا چاہتا ہے تو ایک دفعہ ایک بے ہوشی اور ربودگی اس پر طاری کر دیتا ہے جس سے وہ بالکل اپنی ہستی سے کھویا جاتا ہے۔ اور ایسا اس بے خودی اور ربودگی اور بے ہوشی میں ڈوبتا ہے جیسے کوئی پانی میں غوطہ مارتا ہے اور نیچے پانی کے چلا جاتا ہے۔ غرض جب بندہ اس حالت ربودگی سے کہ جو غوطہ سے بہت ہی مشابہ ہے باہر آتا ہے تو اپنے اندر میں کچھ ایسا مشاہدہ کرتا ہے جیسے ایک گونج پڑی ہوئی ہوتی ہے اور جب وہ گونج کچھ فرو ہوتی ہے تو ناگہاں اُسکو اپنے اندر سے ایک موزوں اور لطیف اور لذیذ کلام محسوس ہو جاتی ہے اور یہ غوطہ ربودگی کا ایک نہایت عجیب امر ہے جس کے عجائبات بیان کرنے کے لئے الفاظ کفایت نہیں کرتے۔ یہی

حالت ہے جس سے ایک دریا معرفت کا انسان پر کھل جاتا ہے۔ کیونکہ جب بار بار دُعا کرنے کے وقت خداوند تعالیٰ اس حالت غوطہ اور ربودگی کو اپنے بندہ پر وارد کر کے اس کی ہر ایک دُعا کا اس کو ایک لطیف اور لذیذ کلام میں جواب دیتا ہے اور ہر ایک استفسار کی حالت میں وہ حقائق اس پر کھولتا ہے جن کا کھلنا انسان کی طاقت سے باہر ہے تو یہ امر اس کے لئے موجب مزید معرفت اور باعثِ عرفان کامل ہو جاتا ہے۔ بندہ کا دُعا کرنا اور خدا کا اپنی الوہیت کی تجلی سے ہر ایک دعا کا جواب دینا یہ ایک ایسا امر ہے کہ گویا اس عالم میں بندہ اپنے خدا کو دیکھ لیتا ہے اور دونوں عالم اس کے لئے بلا تفاوت یکساں ہو جاتے ہیں۔ جب بندہ اپنی کسی حاجت کے وقت بار بار اپنے مولیٰ کریم سے کوئی عقدہ پیش آمدہ دریافت کرتا ہے اور عرض حال کے بعد حضرت خداوند کریم سے جواب پاتا ہے اسی طرح کہ جیسے ایک انسان دوسرے انسان کی بات کا جواب دیتا ہے اور جواب ایسا ہوتا ہے کہ نہایت فصیح اور لطیف الفاظ میں بلکہ کبھی ایسی زبان میں ہوتا ہے کہ جس سے وہ بندہ ناآشنا محض ہے اور کبھی امور غیبیہ پر مشتمل ہوتا ہے کہ جو مخلوق کی طاقتوں سے باہر ہیں اور کبھی اس کے ذریعہ سے مواہب عظیمہ کی بشارت ملتی ہے اور منازلِ عالیہ کی خوشخبری سُنائی جاتی ہے۔ اور قرب حضرت باری کی مبارکبادی دی جاتی ہے۔ اور کبھی دنیوی برکتوں کے بارے میں پیشگوئی ہوتی ہے تو ان کلماتِ لطیفہ و بلیغہ کے سُننے سے کہ جو مخلوق کی قوتوں سے نہایت بلند اور اعلیٰ ہوتے ہیں جس قدر ذوق اور معرفت حاصل ہوتی ہے اس کو وہی بندہ جانتا ہے جس کو یہ نعمت عطا ہوتی ہے۔ فی الحقیقت وہ خدا کو ایسا ہی شناخت کر لیتا ہے جیسے کوئی شخص تم میں سے اپنے پکّے اور پُرانے دوست کو شناخت کرتا ہے۔ اور یہ الہام اکثر معظمات امور میں ہوتا ہے۔ کبھی اُس میں ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جن کے معنے لغت کی کتابیں دیکھکر کرنے پڑتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ یہ الہام کسی اجنبی زبان مثلاً انگریزی یا کسی ایسی دوسری زبان میں ہوا جس زبان سے ہم محض ناواقف ہیں۔

(براہین احمدیہ ص ۲۵۰-۲۵۴ حاشیہ درحاشیہ نمبر ۱)

صورت سوم الہام کی یہ ہے کہ نرم اور آہستہ طور پر انسان کے قلب پر القاء ہوتا ہے یعنی ایک مرتبہ دل میں کوئی کلمہ گذر جاتا ہے جس میں وہ عجائبات بہ تمام و کمال نہیں ہوتے کہ جو دوسری صورت میں بیان کئے گئے ہیں۔ بلکہ اس میں ربودگی اور غنودگی بھی شرط نہیں بسا اوقات عین بیداری میں ہو جاتا ہے اور اُس میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا غیب سے کسی نے وہ کلمہ

دل میں پھونک دیا ہے یا پھینک دیا ہے۔ انسان کسی قدر بیداری میں ایک استغراق اور محویت کی حالت میں ہوتا ہے اور کبھی بالکل بیدار ہوتا ہے کہ یکدفعہ دیکھتا ہے کہ ایک نو وارد کلام اُس کے سینہ میں داخل ہے۔ یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معاً وہ کلام دل میں داخل ہوتے ہی اپنی پُر زور روشنی ظاہر کر دیتا ہے اور انسان متنبّہ ہو جاتا ہے کہ خدا کی طرف سے یہ القاء ہے۔ اور صاحبِ ذوق کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تنفسی ہوا اندر جاتی ہے اور تمام دل وغیرہ اعضاء کو راحت پہنچاتی ہے ویسا ہی وہ الہام دل کو تسلّی اور سکینت اور آرام بخشتا ہے اور طبیعت مضطرب پر اُس کی خوشی اور خُنکی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ایک باریک بھید ہے جو عوام لوگوں سے پوشیدہ ہے۔ مگر عارف اور صاحب معرفت لوگ جن کو حضرت واہب حقیقی نے اسرار ربّانی میں صاحب تجربہ کر دیا ہے وہ اس کو خوب سمجھتے اور جانتے ہیں اور اس صورت کا الہام بھی اس عاجز کو بارہا ہُوا ہے جس کا لکھنا بالفعل ضروری نہیں۔

صورتِ چہارم الہام کی یہ ہے کہ رؤیا صادقہ میں کوئی امر خدائے تعالیٰ کی طرف سے منکشف ہو جاتا ہے یا کبھی کوئی فرشتہ انسان کی شکل میں متشکل ہو کر کوئی غیبی بات تبلاتا ہے یا کوئی تحریر کاغذ یا پتھر وغیرہ پر مشہود ہو جاتی ہے جس سے کچھ اسرار غیبیہ ظاہر ہوتے ہیں۔ وغیرہ من الصّور۔

(براہین احمدیہ ص ۲۶۳-۲۶۴ حاشیہ در حاشیہ ۱)

صورت پنجم الہام کی وہ ہے جس کا انسان کے قلب سے کچھ تعلق نہیں بلکہ ایک خارج سے آواز آتی ہے۔ اور یہ آواز ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ایک پردہ کے پیچھے سے کوئی آدمی بولتا ہے۔ مگر یہ آواز نہایت لذیذ اور شگفتہ اور کسی قدر سرعت کے ساتھ ہوتی ہے اور دل کو اس سے ایک لذّت پہنچتی ہے۔ انسان کسی قدر استغراق میں ہوتا ہے کہ یکدفعہ یہ آواز آ جاتی ہے اور آواز سُنکر وہ حیران رہ جاتا ہے کہ کہاں سے یہ آواز آئی اور کس نے مجھ سے یہ کلام کی۔ اور حیرت زدہ کی طرح آگے پیچھے دیکھتا ہے۔ پھر سمجھ جاتا ہے کہ کسی فرشتہ نے یہ آواز دی۔ اور یہ آواز خارجی اکثر اس حالت میں بطور بشارت ہوتی ہے کہ جب انسان کسی معاملے میں نہایت متفکّر اور مغموم ہوتا ہے یا کسی بدخبری کے سُننے سے کہ جو اصل میں محض دروغ تھی کوئی سخت اندیشہ اس کو دامنگیر ہو جاتا ہے۔ مگر صورت دوم کی طرح اس میں مکرّر دعاؤں پر اس آواز کا صادر ہونا مشہود نہیں ہوا۔ بلکہ ایک ہی دفعہ اُس وقت کہ جب خدائے تعالیٰ چاہتا ہے کوئی

فرشتہ غیب سے ناگہانی طور پر آواز کرتا ہے برخلاف صورت دوم کے کہ اُس میں اکثر کامل دعاؤں پر حضرت احدیت کی طرف سے جواب صادر ہونا مشہود ہُوا ہے اور خواہ سو مرتبہ دُعا اور سوال کرنے کا اتفاق ہو اس کا جواب سو مرتبہ ہی حضرت فیاض مطلق کی طرف سے صادر ہوسکتا ہے جیسا کہ متواتر تجربہ خود اس خاکسار کا اس بات کا شاہد ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۲۷۷-۲۷۸ حاشیہ در حاشیہ م ۱)

مَیں نے کئی دفعہ کشفی طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کو دیکھا ہے۔ اور بعض نبیوں سے بھی مَیں نے عین بیداری میں ملاقات کی ہے اور مَیں نے سیّد و مولیٰ اپنے امام نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کئی دفعہ عین بیداری میں دیکھا ہے اور باتیں کی ہیں۔ اور ایسی صاف بیداری سے دیکھا ہے جس کے ساتھ خواب یا غفلت کا نام و نشان نہ تھا۔ اور مَیں نے بعض اَور وفات یافتہ لوگوں سے بھی اُن کی قبر پر یا اور موقعہ پر عین بیداری میں ملاقات کی ہے اور اُن سے باتیں کی ہیں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اس طرح پر عین بیداری میں گذشتہ لوگوں کی ملاقات ہوجاتی ہے۔ اور نہ صرف ملاقات بلکہ گفتگو ہوتی ہے اور مصافحہ ہوتا ہے۔ اور اس بیداری اور روزمرّہ کی بیداری میں لوازمِ حواس میں کچھ بھی فرق نہیں ہوتا۔ دیکھا جاتا ہے کہ ہم اسی عالم میں ہیں اور یہی کان ہیں اور یہی آنکھیں ہیں اور یہی زبان ہے۔ مگر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم اَور ہے۔ دنیا اس قسم کی بیداری کو نہیں جانتی۔ کیونکہ دنیا غفلت کی زندگی میں پڑی ہے۔ یہ بیداری آسمان سے ملتی ہے۔ یہ ان کو دی جاتی ہے جن کو نئے حواس ملتے ہیں۔ یہ ایک صحیح بات ہے اور واقعات حقہ میں سے ہے۔

(مسیح ہندوستان میں ص ۲۴-۲۵)

صاحب الہام ہونے میں استعداد و قابلیت شرط ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس خدائے تعالیٰ کا پیغمبر بن جائے اور ہر ایک پر حقانی وحی نازل ہوجایا کرے۔ اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ ہی اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ ہے۔ واذا جاءتهم اٰية قالوا لن نؤمن حتّٰى نؤتٰى مثل مآ اوتي رسل الله - اللهُ اَعْلَمُ حيث يجعل رسالته الجزء نمبر ۸ یعنی جس وقت قرآن کی حقیّت ظاہر کرنے کے لئے کوئی نشانی کفار کو دکھلائی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ جب تک خود ہم پر ہی کتاب الٰہی نازل نہ ہو تب تک ہم ہرگز ایمان نہ لائینگے خدا خوب جانتا ہے کہ کس جگہ اور کس محل پر رسالت کو رکھنا چاہیئے یعنی قابل اور ناقابل اُسے

معلوم ہے اور اُسی پر فیضانِ الہام کرتا ہے کہ جو جوہرِ قابل ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حکیم مطلق نے افرادِ بشریہ کو بوجہ مصالحِ مختلفہ مختلف طوروں پر پیدا کیا ہے اور تمام بنی آدم کا سلسلۂ فطرت ایک ایسے خط سے مشابہ رکھا ہے جس کی ایک طرف نہایت ارتفاع پر واقع ہو اور دوسری طرف نہایت انخفاض پر۔ طرف ارتفاع میں وہ نفوس صافیہ ہیں جن کی استعدادیں حسب مراتب متفاوتہ کامل درجہ پر ہیں اور طرف انخفاض میں وہ نفوس ہیں جن کو اس سلسلہ میں ایسی پست جگہ ملی ہے کہ حیوانات لایعقل کے قریب قریب پہنچ گئے ہیں۔ اور درمیان میں وہ نفوس ہیں جو عقل وغیرہ میں درمیان کے درجہ میں ہیں۔ اور اس کے اثبات کے لئے مشاہدۂ افرادِ مختلفۃ الاستعداد کافی دلیل ہے کیونکہ کوئی عاقل اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ افرادِ بشریہ عقل کے رُو سے تقویٰ اور خدا ترسی کے لحاظ سے محبتِ الٰہیہ کی وجہ سے مختلف مدارج پر پڑی ہوئی ہیں۔ اور جس طرح قدرتی واقعات سے کوئی خوبصورت پیدا ہوتا ہے کوئی بدصورت کوئی سوجاکھا۔ کوئی اندھا۔ کوئی ضعیف البصر۔ کوئی قوی البصر۔ کوئی تام الخلقت۔ کوئی ناقص الخلقت اسی طرح قویٰ دماغیہ اور انوارِ قلبیہ کا تفاوتِ مراتب بھی مشہود اور محسوس ہے۔ ہاں یہ سچ بات ہے کہ ہر یک فردِ بشر بشرطیکہ نرا مخبط الحواس اور مسلوب العقل نہ ہو۔ عقل میں تقویٰ میں۔ محبتِ الٰہیہ میں ترقی کرسکتا ہے۔ مگر اس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ کوئی نفس اپنے دائرہ قابلیت سے زیادہ ہرگز ترقی نہیں کرسکتا۔

(براہین احمدیہ ص۱۷۱-۱۷۲ حاشیہ ۱۱)

طبائع انسانی جواہر کانی کی طرح مختلف الاقسام ہیں۔ بعض طبیعتیں چاندی کی طرح روشن اور صاف۔ بعض گندھک کی طرح بدبودار اور جلد بھڑکنے والی۔ بعض زیبق کی طرح بے ثبات اور بے قرار۔ بعض لوہے کی طرح سخت اور کثیف۔ اور جیسا یہ اختلاف الطبائع بدیہی الثبوت ہے ایسا ہی انتظام ربانی کے بھی موافق ہے کچھ بے قاعدہ بات نہیں۔ کوئی ایسا امر نہیں کہ قانونِ نظامِ عالم کے برخلاف ہو۔ بلکہ آسائش و آبادی عالم اسی پر موقوف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر تمام طبیعتیں ایک ہی مرتبۂ استعداد پر ہوتیں تو پھر مختلف طور کے کام (جو مختلف طور کی استعدادوں پر موقوف تھے) جن پر دنیا کی آبادی کا مدار تھا حیزِ التوا میں رہ جاتے۔ کیونکہ کثیف کاموں کے لئے وہ طبیعتیں مناسب حال ہیں جو کثیف ہیں۔ اور لطیف کاموں کے لئے وہ طبیعتیں مناسبت رکھتی ہیں جو لطیف ہیں۔ یونانی حکیموں نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے کہ جیسے

بعض انسان حیوانات کے قریب ہوتے ہیں۔ اسی طرح عقل تقاضا کرتی ہے کہ بعض انسان ایسے بھی ہوں جن کا جوہرِ نفس کمال صفوت اور لطافت پر واقع ہو تا جس طرح طبائع انسانی کا سلسلہ نیچے کی طرف اس قدر متنزل نظر آتا ہے کہ حیوانات سے جا کر اتصال پکڑ لیا ہے۔ اسی طرح اوپر کی طرف بھی ایسا متصاعد ہو کہ عالم اعلیٰ سے اتصال پکڑ لے۔

اب جبکہ ثابت ہو گیا کہ افرادِ بشریہ عقل میں قوئے اخلاقیہ میں۔ نورِ قلب میں متفاوت المراتب ہیں تو اسی سے وحیٔ ربانی کا بعض افرادِ بشریہ سے خاص ہونا یعنی ان سے جو من کل الوجوہ کامل ہیں بہ پایۂ ثبوت پہنچ گیا۔ کیونکہ یہ بات تو خود ہر ایک عاقل پر روشن ہے کہ ہر ایک نفس اپنی استعداد اور قابلیت کے موافق انوار الٰہیہ کو قبول کرتا ہے اس سے زیادہ نہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے آفتاب نہایت روشن مثال ہے۔ کیونکہ ہر چند آفتاب اپنی کرنیں چاروں طرف چھوڑ رہا ہے لیکن اس کی روشنی قبول کرنے میں ہر ایک مکان برابر نہیں۔ جس مکان کے دروازے بند ہیں اس میں کچھ روشنی نہیں پڑ سکتی۔ اور جس میں بمقابل آفتاب ایک چھوٹا سا روزنہ ہے اس میں روشنی تو پڑتی ہے مگر تھوڑی جو بکلّی ظلمت کو نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن وہ مکان جس کے دروازے بمقابل آفتاب سب کے سب کھلے ہیں اور دیواریں بھی کسی کثیف شے سے نہیں بلکہ نہایت مصفیٰ اور روشن شیشہ سے ہیں اس میں صرف یہی خوبی نہیں ہوگی کہ کامل طور پر روشنی قبول کرے گا بلکہ اپنی روشنی چاروں طرف پھیلا دے گا اور دوسروں تک پہنچا دے گا۔ یہی مثال مؤخر الذکر نفوسِ صافیہ انبیاء کے مطابق حال ہے یعنی جن نفوسِ مقدسہ کو خدا اپنی رسالت کے لئے چن لیتا ہے وہ بھی رفعِ حجب اور کمال صفوت میں اس شیش محل کی طرح ہوتے ہیں جس میں نہ کوئی کثافت ہے اور نہ کوئی حجاب باقی ہے پس ظاہر ہے کہ جن افرادِ بشریہ میں وہ کمال تام موجود نہیں ایسے لوگ کسی حالت میں مرتبۂ رسالت الٰہی نہیں پا سکتے بلکہ یہ مرتبہ قسامِ ازل سے اُنہی کو ملا ہوا ہے جن کے نفوسِ مقدسہ حُجبِ ظلمانی سے بکلّی پاک ہیں جن کو اغشیۂ جسمانی سے بغایت درجہ آزادگی ہے۔ جن کا تقدس تنزہ اُس درجہ پر ہے کہ جس کے آگے خیال کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ وہی نفوسِ تامہ کاملہ وسیلۂ ہدایت جمیع مخلوقات ہیں۔ اور جیسے حیات کا فیضان تمام اعضاء کو قلب کے ذریعہ سے ہوتا ہے ایسا ہی حکیم مطلق نے ہدایت کا فیضان اُنہیں کے ذریعہ سے مقرر کیا ہے کیونکہ وہ کامل مناسبت جو مفیض اور مستفیض میں چاہیئے وہ صرف انہیں کو عنایت کی گئی ہے۔ اور یہ ہرگز ممکن نہیں کہ

خداوند تعالیٰ جو نہایت تجرّد و تنزّہ میں ہے ایسے لوگوں پر افاضہ انوارِ وحیٔ مقدس اپنے کا کرے جن کی فطرت کے دائرہ کا اکثر حصّہ ظُلمانی اور دود آمیز ہے اور نیز نہایت تنگ اور منقبض اور جن کی طبائع خسیسہ کدوراتِ سفلیہ میں منغمس اور آلودہ ہیں اگر ہم اپنے تئیں آپ ہی دھوکہ نہ کھادیں تو بے شک ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ مبدءِ قدیم سے اتصالِ تام پانے کے لئے اور اس قدوسِ اعظم کا ہمکلام بننے کے لئے ایک ایسی خاص قابلیت اور نورانیت شرط ہے کہ جو اس مرتبۂ عظیم کی قدر اور شان کے لائق ہے۔ یہ بات ہرگز نہیں کہ ہر ایک شخص جو عین نقصان اور فرومائگی اور آلودگی کی حالت میں ہے اور صدہا حُجب ظلمانیہ میں محجوب ہے وہ باوصف اپنی پست فطرتی اور دون ہمّتی کے اس مرتبہ کو پا سکتا ہے۔ اِس بات سے کوئی دھوکہ نہ کھاوے کہ منجملہ اہل کتاب عیسائیوں کا یہ خیال ہے کہ انبیاء کے لئے جو وحی اللہ کے منزلِ علیہ ہیں تقدس اور تنزّہ اور عصمت اور کمال محبتِ الٰہیہ حاصل نہیں کیونکہ عیسائی لوگ اصولِ حقّہ کو کھو بیٹھے ہیں اور ساری صداقتیں صرف اس خیال پر قربان کر دی ہیں کہ کسی طرح حضرت مسیح خدا بن جائیں اور کفارہ کا مسئلہ جم جائے۔ سو چونکہ نبیوں کا معصوم اور مقدس ہونا اُن کی اس عمارت کو گراتا ہے جو وہ بنا رہے ہیں اس لئے ایک جھوٹ کی خاطر سے دوسرا جھوٹ بھی انہیں گھڑنا پڑا۔ اور ایک آنکھ کے مفقود ہونے سے دوسری بھی پھوڑنی پڑی۔ پس ناچار انہوں نے باطل سے پیار کر کے حق کو چھوڑ دیا۔ نبیوں کی اہانت روا رکھی۔ پاکوں کو ناپاک بنایا اور ان دلوں کو جو مہبطِ وحی تھے کثیف اور مکدّر قرار دیا تاکہ اُن کے مصنوعی خدا کی کچھ عظمت نہ گھٹ جائے یا منصوبۂ کفارہ میں کچھ فرق نہ آ جائے۔ اسی خود غرضی کے جوش سے انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اِس سے فقط نبیوں کی توہین نہیں ہوتی بلکہ خدا کی قدّوسی پر بھی حرف آتا ہے کیونکہ جس نے نعوذ باللہ ناپاکوں سے ربط ارتباط اور میل ملاپ رکھا۔ وہ آپ بھی کاہے کا پاک ہُوا۔

(براہین احمدیہ ص ۱۷۸ - ۱۸۰ حاشیہ در حاشیہ ۱۱)

نورِ وحی کے نازل ہونے کا یہی فلسفہ ہے کہ وہ نور پر ہی وارد ہوتا ہے تاریکی پر وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ فیضان کے لئے مناسبت شرط ہے اور تاریکی کو نور سے کچھ مناسبت نہیں بلکہ نور کو نور سے مناسبت ہے اور حکیم مطلق بغیر رعایت مناسبت کوئی کام نہیں کرتا۔ ایسا ہی فیضانِ نور میں بھی اس کا یہی قانون ہے کہ جس کے پاس کچھ نور ہے اُسی کو اَور نور بھی

دیا جاتا ہے۔ اور جس کے پاس کچھ نہیں اس کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ جو شخص آنکھوں کا نور رکھتا ہے وہی آفتاب کا نور پاتا ہے اور جس کے پاس آنکھوں کا نور نہیں وہ آفتاب کے نور سے بھی بے بہرہ رہتا ہے۔ اور جس کو فطرتی نور کم ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی کم ہی ملتا ہے اور جس کو فطرتی نور زیادہ ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی زیادہ ہی ملتا ہے۔ اور انبیاء منجملہ سلسلہ متفاوتہ فطرتِ انسانی کے وہ افرادِ عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نورِ باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نورِ مجسم ہو گئے ہیں۔ اسی جہت سے قرآن شریف میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا نام نور اور سراج منیر رکھا ہے۔ جیسے فرمایا ہے۔ قد جاءکم من اللہ نورٌ و کتٰب مّبین الجزو نمبر ۶۔ وداعیًا الی اللہ باذنہ وسراجًا منیرًا الجزو نمبر ۲۲۔ یہی حکمت ہے کہ نورِ وحی جس کے لئے نورِ فطرتی کا کامل اور عظیم الشان ہونا شرط ہے صرف انبیاء کو ملا اور اُنہی سے مخصوص ہوا۔ پس اس حجّت موجّہ سے کہ جو مثال مقدم الذکر میں اللہ تعالےٰ نے بیان فرمائی بطلان ان لوگوں کے قول کا ظاہر ہے جنہوں نے باوصف اس کے کہ فطرتی تفاوت مراتب کے قائل ہیں۔ پھر محض حُمق وجہالت کی راہ سے یہ خیال کر لیا ہے کہ جو نور افراد کامل الفطرت کو ملتا ہے وہی نور افراد ناقصہ کو بھی مل سکتا ہے۔ ان کو دیانت اور انصاف سے سوچنا چاہیئے کہ فیضانِ وحی کے بارے میں کس قدر غلطی میں وہ مبتلا ہو رہے ہیں۔ صریح دیکھتے ہیں کہ خدا کا قانونِ قدرت اُن کے خیال باطل کی تصدیق نہیں کرتا۔ پھر شدّت تعصّب و عناد سے اس خیال فاسد پر جمے بیٹھے ہیں۔ ایسا ہی عیسائی لوگ بھی نور کے فیضان کے لئے فطرتی نور کا شرط ہونا نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ جس دل پر نورِ وحی نازل ہو اس کے لئے اپنے کسی خاصۂ اندرونی میں نورانیت کی حالت ضروری نہیں۔ بلکہ اگر کوئی بجائے عقل سلیم کے کمال درجہ کا نادان اور سفیہ ہو اور بجائے صفت شجاعت کے کمال درجے کا بُزدل اور بجائے صفتِ سخاوت کے کمال درجے کا بخیل۔ بجائے صفتِ حمیّت کے کمال درجہ کا بے غیرت۔ اور بجائے صفتِ محبت الٰہیہ کے کمال درجہ کا محبّ دنیا۔ اور بجائے صفت زہد و ورع و امانت کے بڑا بھارا چور اور ڈاکو۔ اور بجائے صفت عفّت وحیا کے کمال درجے کا بے شرم اور شہوت پرست۔ اور بجائے صفتِ قناعت کے کمال درجے کا حریص اور لالچی۔ تو ایسا شخص بھی بقول حضرات عیسائیاں باوصف ایسی حالت خراب کے خدا کا نبی اور مقرب ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایک مسیح کو باہر نکال کر دوسرے تمام انبیاء جن کی نبوت کو بھی وہ مانتے ہیں اور ان کی الہامی کتابوں کو بھی مقدس کر کے پکارتے ہیں وہ

نعوذ باللہ بقول اُن کے ایسے ہی تھے اور کمالاتِ قدسیہ سے جو مستلزم عصمت و پاک دلی ہیں محروم تھے۔ عیسائیوں کی عقل اور خداشناسی پر بھی ہزار آفرین۔ کیا اچھا نورِ وحی کے نازل ہونے کا فلسفہ بیان کیا۔ مگر ایسے فلسفے کے تابع ہونے والے اور اس کو پسند کرنے والے وہی لوگ ہیں جو سخت ظلمت اور کور باطنی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ورنہ نُور کے فیض کے لئے نور کا ضروری ہونا ایسی بدیہی صداقت ہے کہ کوئی ضعیف العقل بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔

(براہین احمدیہ ص ۱۸۵-۱۸۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

یہ افسوس کا مقام ہے کہ اکثر لوگ ہر ایک بات جو غنودگی کی حالت میں ان کی زبان پر جاری ہوتی ہے خدا کا کلام قرار دیتے ہیں۔ اور اس طرح پر آیت کریمہ لا تقف ما لیس لك به علم کے نیچے اپنے تئیں داخل کردیتے ہیں۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر کوئی کلام زبان پر جاری ہو اور قال اللہ قال الرسول سے مخالف بھی نہ ہو تب بھی وہ خدا کا کلام نہیں کہلا سکتا جب تک خدا تعالیٰ کا فعل اس پر گواہی نہ دے۔ کیونکہ شیطان لعین جو انسان کا دشمن ہے جس طرح اور طریقوں سے انسان کو ہلاک کرنا چاہتا ہے اسی طرح اس مضلّ کا ایک یہ بھی طریق ہے کہ اپنے کلمات انسان کے دل میں ڈال کر اس کو یہ یقین دلاتا ہے کہ گویا وہ خدا کا کلام ہے اور آخر انجام ایسے شخص کا ہلاکت ہوتی ہے۔

پس جس پر کوئی کلام نازل ہو جب تک تین علامتیں اُس میں نہ پائی جائیں اُس کو خدا کا کلام کہنا اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

اوّل وہ کلام قرآن سے مخالف اور معارض نہ ہو۔ مگر یہ علامت بغیر تیسری علامت کے جو ذیل میں لکھی جائیگی ناقص ہے بلکہ اگر تیسری علامت نہ ہو تو محض اس علامت سے کچھ بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔

دوّم وہ کلام ایسے شخص پر نازل ہو جس کا تزکیہ نفس بخوبی ہو چکا ہو۔ اور وہ اُن فانیوں کی جماعت میں داخل ہو جو بکلّی جذباتِ نفسانیہ سے الگ ہو گئے ہیں۔ اور اُن کے نفس پر ایک ایسی موت وارد ہوگئی ہے جس کے ذریعہ سے وہ خدا سے قریب اور شیطان سے دُور جا پڑے ہیں۔ کیونکہ جو شخص جس کے قریب ہے اُس کی آواز سُنتا ہے۔ پس جو شیطان کے قریب ہے وہ شیطان کی آواز سُنتا ہے اور جو خدا سے قریب ہے وہ خدا کی آواز سُنتا ہے اور انتہائی کوشش انسان کی تزکیۂ نفس ہے۔ اور اس پر تمام سلوک ختم ہو جاتا ہے اور

دوسرے لفظوں میں یہ ایک موت ہے جو تمام اندرونی آلائشوں کو جلا دیتی ہے۔ پھر جب انسان اپنا سلوک ختم کر چکتا ہے تو تصرفاتِ الٰہیہ کی نوبت آتی ہے۔ تب خدا اپنے اس بندہ کو جو سلب جذباتِ نفسانیہ سے فنا کے درجہ تک پہنچ چکا ہے **معرفت** اور محبّت کی زندگی سے **دوبارہ زندہ** کرتا ہے۔ اور اپنے فوق العادت نشانوں سے **عجائباتِ رُوحانیہ** کی اُس کو سیر کراتا ہے۔ اور محبتِ ذاتیہ کی وراء الوراء کشش اُس کے دل میں بھر دیتا ہے جس کو دنیا سمجھ نہیں سکتی اس حالت میں کہا جاتا ہے کہ اس کو نئی حیات مل گئی جس کے بعد موت نہیں۔

پس یہ نئی حیات کامل معرفت اور کامل محبت سے ملتی ہے۔ اور کامل معرفت خدا کے فوق العادت نشانوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جب انسان اس حد تک پہنچ جاتا ہے تب اُسکو خدا کا سچا مکالمہ مخاطبہ نصیب ہوتا ہے۔ مگر یہ علامت بھی بغیر تیسرے درجے کی علامت کے قابلِ اطمینان نہیں۔ کیونکہ کامل تزکیہ ایک امر پوشیدہ ہے۔ اس لئے ہر ایک فضول گو ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔

تیسری علامت ملہم صادق کی یہ ہے کہ جس کلام کو وہ خدا کی طرف منسوب کرتا ہے خدا کے متواتر افعال اس پر گواہی دیں۔ یعنی اس قدر اس کی تائید میں نشانات ظاہر ہوں کہ عقل سلیم اس بات کو ممتنع سمجھے کہ باوجود اس قدر نشانوں کے پھر بھی وہ خدا کا کلام نہیں۔ اور یہ علامت درحقیقت تمام علامتوں سے بڑھ کر ہے .... یہ ایسی **کامل علامت** ہے جو کوئی اس کو توڑ نہیں سکتا۔ یہی علامت ہے جس سے خدا کے سچے نبی جھوٹوں پر غالب آتے رہے ہیں۔ کیونکہ جو شخص دعویٰ کرے کہ میرے پر خدا کا کلام نازل ہوتا ہے پھر اس کے ساتھ صدہا نشان ظاہر ہوں اور ہزاروں قسم کی تائید اور نصرتِ الٰہی شامل حال ہو اور اُس کے دشمنوں پر خدا کے کھلے کھلے حملے ہوں پھر کس کی مجال ہے کہ ایسے شخص کو جھوٹا کہہ سکے .... وہ لوگ جو خدا کے نزدیک ملہم اور مکلّم کہلاتے ہیں اور مکالمہ مخاطبہ کا شرف رکھتے ہیں اور دعوتِ خلق کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اُن کی تائید میں خدا تعالےٰ کے نشان بارش کی طرح برستے ہیں اور دنیا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور فعل الٰہی اپنی کثرت کے ساتھ گواہی دیتا ہے کہ جو کلام وہ پیش کرتے ہیں وہ کلام الٰہی ہے۔ اگر الہام کا دعویٰ کرنے والے اس علامت کو مدّنظر رکھتے تو وہ اس فتنہ سے بچ جاتے۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۹۸-۱۰۲)

واضح ہو کہ شیطانی الہامات ہونا حق ہے۔ اور بعض ناتمام سالک لوگوں کو ہُوا کرتے ہیں۔ اور حدیث النفس بھی ہوتی ہے جس کو اضغاث احلام کہتے ہیں۔ اور جو شخص اس سے انکار کرے وہ قرآن شریف کی مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ قرآن شریف کے بیان سے شیطانی الہام ثابت ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جب تک انسان کا تزکیہ نفس پورے اور کامل طور پر نہ ہو تب تک اس کو شیطانی الہام ہو سکتا ہے اور وہ آیت علیٰ کلّ افّاک اثیم کے نیچے آ سکتا ہے۔ مگر پاکوں کو شیطانی وسوسہ پر بلا توقف مطلع کیا جاتا ہے۔ افسوس کہ بعض پادری صاحبان نے اپنی تصنیفات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت اس واقعہ کی تفسیر میں کہ جب اُن کو ایک پہاڑی پر شیطان لے گیا اس قدر جرأت کی ہے کہ وہ لکھتے ہیں۔ یہ کوئی خارجی بات نہ تھی جس کو دنیا دیکھتی اور جس کو یہودی بھی مشاہدہ کرتے بلکہ یہ تین مرتبہ شیطانی الہام حضرت مسیح کو ہُوا تھا جس کو انہوں نے قبول نہ کیا۔ مگر انجیل کی ایسی تفسیر سُننے سے ہمارا تو بدن کانپتا ہے کہ مسیح اور پھر شیطانی الہام ....

...... پاکوں کے دل میں شیطانی خیال مستحکم نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی تیرتا ہُوا سرسری وسوسہ اُن کے دل کے نزدیک آ بھی جائے تو جلد تر وہ شیطانی خیال دُور اور دفع کیا جاتا ہے اور اُن کے پاک دامن پر کوئی داغ نہیں لگتا۔ قرآن کریم میں اس قسم کے وسوسہ کو جو ایک کم رنگ اور ناپختہ خیال سے مشابہ ہوتا ہے طائف کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور لغتِ عرب میں اس کا نام طائف اور طوف اور طیّف اور طیف بھی ہے۔ اور اس وسوسہ کا دل سے نہایت ہی کم تعلق ہوتا ہے گویا نہیں ہوتا یا یوں کہو کہ جیسا کہ دُور سے کسی درخت کا سایہ بہت ہی خفیف سا پڑتا ہے۔ ایسا ہی یہ وسوسہ ہوتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ شیطان لعین نے حضرت مسیح علیہ السلام کے دل میں اسی قسم کے خفیف وسوسہ کے ڈالنے کا ارادہ کیا ہو اور انہوں نے قوت نبوت سے اس وسوسہ کو دفع کر دیا ہو .... یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قوتِ نبوت اور نورِ حقیقت کے ساتھ شیطانی القا کو ہرگز ہرگز نزدیک آنے نہیں دیا اور اس کے ذب اور دفع میں فوراً مشغول ہو گئے اور جس طرح نور کے مقابل پر ظلمت ٹھہر نہیں سکتی اسی طرح شیطان اُن کے مقابل پر نہیں ٹھہر سکا۔ اور بھاگ گیا۔ یہی انّ عبادی لیس لک علیھم سلطان کے صحیح معنے ہیں کیونکہ شیطان کا سلطان یعنی تسلّط درحقیقت اُن پر ہے جو شیطانی وسوسہ اور الہام کو قبول کر لیتے ہیں۔

لیکن جو لوگ دُور سے نور کے تیر سے شیطان کو مجروح کرتے ہیں اور اُس کے مُنہ پر زجر اور توبیخ کا جوتا مارتے ہیں اور اپنے مُنہ سے وہ کچھ بکے جائے اس کی پیروی نہیں کرتے وہ شیطانی تسلّط سے مستثنیٰ ہیں مگر چونکہ ان کو خدا تعالیٰ ملکوت السمٰوٰت والارض دکھانا چاہتا ہے اور شیطان ملکوت الارض میں سے ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ مخلوقات کے مشاہدہ کا دائرہ پورا کرنے کے لئے اس عجیب الخلقت وجود کا چہرہ دیکھ لیں اور کلام سُن لیں جس کا نام شیطان ہے۔ اس سے اُن کے دامن تنزہ اور عصمت کو کوئی داغ نہیں لگتا۔ حضرت مسیح سے شیطان نے اپنے قدیم طریق وسوسہ اندازی کے طرز پر شرارت سے ایک درخواست کی تھی سو اُن کی پاک طبیعت نے فی الفور اس کو ردّ کیا اور قبول نہ کیا۔ اِس میں ان کی کوئی کسرِ شان نہیں۔ کیا بادشاہوں کے حضور میں کبھی بدمعاش کلام نہیں کرتے؟ سو ایسا ہی روحانی طور سے شیطان نے یسوع کے دل میں اپنا کلام ڈالا۔ یسوع نے اس شیطانی الہام کو قبول نہ کیا بلکہ ردّ کیا۔ سو یہ تو قابلِ تعریف بات ہوئی اس سے کوئی نکتہ چینی کرنا حماقت اور روحانی فلاسفی کی بےخبری ہے لیکن جیساکہ یسوع نے اپنے نور کے تازیانہ سے شیطانی خیال کو دفع کیا اور اس کے الہام کی پلیدی فی الفور ظاہر کر دی۔ ہر ایک زاہد اور صوفی کا یہ کام نہیں۔ سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ شیطانی الہام مجھے بھی ہوا تھا۔ شیطان نے کہا کہ اے عبد القادر تیری عبادتیں قبول ہوئیں اب جو کچھ دوسروں پر حرام ہے تیرے پر حلال اور نماز سے بھی اب تجھے فراغت ہے جو چاہے کر۔ تب مَیں نے کہا کہ اے شیطان دُور ہو۔ وہ باتیں میرے لئے کب روا ہو سکتی ہیں جو نبی علیہ السلام پر روا نہیں ہوئیں۔ تب شیطان مع اپنے سنہری تخت کے میری آنکھوں کے سامنے سے گم ہو گیا۔ اب جبکہ عبد القادر جیسے اہل اللہ اور مرد فرد کو شیطانی الہام ہوا تو دوسرے عامۃ الناس جنہوں نے ابھی اپنا سلوک بھی تمام نہیں کیا وہ کیونکر اس سے بچ سکتے ہیں۔ اور ان کو وہ نورانی آنکھیں کہاں حاصل ہیں تا سید عبد القادر اور حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح شیطانی الہام کو شناخت کر لیں۔ یاد رہے کہ وہ کاہن جو عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے بکثرت تھے۔ ان لوگوں کو بکثرت شیطانی الہام ہوتے تھے اور بعض وقت وہ پیشگوئیاں بھی الہام کے ذریعہ سے کیا کرتے تھے۔ اور تعجب یہ کہ اُن کی بعض پیشگوئیاں سچی بھی ہوتی تھیں چنانچہ اسلامی کتابیں ان قصوں سے بھری پڑی ہیں۔ پس جو شخص شیطانی الہام کا منکر ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی تمام تعلیموں کا

انکاری ہے اور نبوت کے تمام سلسلہ کا منکر ہے۔ بائیبل میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ چار سو نبی کو شیطانی الہام ہوا تھا اور انہوں نے الہام کے ذریعہ سے جو ایک سفید جن کا کرتب تھا ایک بادشاہ کی فتح کی پیشگوئی کی۔ آخر وہ بادشاہ بڑی ذلت سے اسی لڑائی میں مارا گیا۔ اور بڑی شکست ہوئی۔ اور ایک پیغمبر جس کو حضرت جبرائیل سے الہام ملا تھا اُس نے یہی خبر دی تھی کہ بادشاہ مارا جائے گا اور کتے اس کا گوشت کھائیں گے۔ اور بڑی شکست ہوگی سو یہ خبر سچی نکلی۔ مگر اس چار سو نبی کی پیشگوئی جھوٹی ظاہر ہوئی۔

اسجگہ طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ اس کثرت سے شیطانی الہام بھی ہوتے ہیں تو پھر الہام سے امان اٹھتا ہے اور کوئی الہام بھروسہ کے لائق نہیں ٹھہرتا کیونکہ احتمال ہے کہ شیطانی ہو۔ خاصکر جبکہ مسیح جیسے اولوالعزم نبی کو بھی یہی واقعہ پیش آیا تو پھر اس سے تو لوگوں کی کمر ٹوٹتی ہے۔ تو الہام کیا ایک بلا ہو جاتی ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بے دل ہونے کا کوئی محل نہیں۔ دنیا میں خدا تعالیٰ کا قانون قدرت ایسا ہی واقعہ ہوا ہے کہ ہر ایک عمدہ جوہر کے ساتھ مغشوش چیزیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ دیکھو ایک تو وہ موتی ہیں جو دریا سے نکلتے ہیں۔ دوسرے وہ سستے موتی ہیں جو لوگ آپ بنا کر بیچتے ہیں۔ اب اس خیال سے کہ دنیا میں جھوٹے موتی بھی ہیں سچے موتی کی خرید و فروخت بند نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ جوہری جن کو خدا تعالےٰ نے بصیرت دی ہے ایک ہی نظر سے پہچان جاتے ہیں کہ یہ سچا اور یہ جھوٹا ہے۔ سو الہامی جواہرات کا جوہری امام الزمان ہوتا ہے۔ اس کی صحبت میں رہ کر انسان جلد اصل اور مصنوعی میں فرق کر سکتا ہے۔ اے صوفیو! اور اس مہوتسی کے گرفتارو!! ذرا ہوش سنبھال کر اس اس راہ میں قدم رکھو اور خوب یاد رکھو کہ سچا الہام جو خالص خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے مندرجہ ذیل علامتیں اپنے ساتھ رکھتا ہے:۔

(۱) وہ اس حالت میں ہوتا ہے کہ جبکہ انسان کا دل آتش درد سے گداز ہو کر مصفا پانی کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف بہتا ہے۔ اسی طرف حدیث کا اشارہ ہے کہ قرآن غم کی حالت میں نازل ہوا۔ لہذا تم بھی اس کو غمناک دل کے ساتھ پڑھو۔

(۲) سچا الہام اپنے ساتھ ایک لذت اور سرور کی خاصیت لاتا ہے اور نامعلوم وجہ سے یقین بخشتا ہے اور ایک فولادی میخ کی طرح دل کے اندر دھنس جاتا ہے اور اس کی عبارت فصیح اور غلطی سے پاک ہوتی ہے۔

(۳) سچے الہام میں ایک شوکت اور بلندی ہوتی ہے اور دل پر اُس سے مضبوط ٹھوکر لگتی ہے۔ اور قوت اور رعبناک آواز کے ساتھ دل پر نازل ہوتا ہے۔ مگر جھوٹے الہام میں چوروں اور مخنثوں اور عورتوں کی سی دھیمی آواز ہوتی ہے۔ کیونکہ شیطان چور اور مخنث اور عورت ہے۔

(۴) سچا الہام خدا تعالیٰ کی طاقتوں کا اثر اپنے اندر رکھتا ہے اور ضرور ہے کہ اُس میں پیشگوئیاں بھی ہوں اور وہ پوری بھی ہو جائیں۔

(۵) سچا الہام انسان کو دن بدن نیک بناتا جاتا ہے اور اندرونی کثافتیں اور غلاظتیں پاک کرتا ہے اور اخلاقی حالتوں کو ترقی دیتا ہے۔

(۶) سچے الہام پر انسان کی تمام اندرونی قوتیں گواہ ہو جاتی ہیں اور ہر ایک قوت پر ایک نئی اور پاک روشنی پڑتی ہے اور انسان اپنے اندر ایک تبدیلی پاتا ہے۔ اور اس کی پہلی زندگی مر جاتی ہے اور نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اور وہ بنی نوع کی ایک عام ہمدردی کا ذریعہ ہوتا ہے۔

(۷) سچا الہام ایک ہی آواز پر ختم نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا کی آواز ایک سلسلہ رکھتی ہے۔ وہ نہایت ہی حلیم ہے جس کی طرف توجہ کرتا ہے اس سے مکالمت کرتا ہے اور سوالات کا جواب دیتا ہے۔ اور ایک ہی مکان اور ایک وقت میں انسان اپنے معروضات کا جواب پا سکتا ہے گو اس کے مکالمہ پر کبھی فترت کا زمانہ بھی آ جاتا ہے۔

(۸) سچے الہام کا انسان کبھی بزدل نہیں ہوتا اور کسی مدعیٔ الہام کے مقابلہ سے اگرچہ وہ کیسا ہی مخالف ہو نہیں ڈرتا۔ جانتا ہے کہ میرے ساتھ خدا ہے اور وہ اُسے ذلت کے ساتھ شکست دے گا۔

(۹) سچا الہام اکثر علوم اور معارف کے جاننے کا ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ خدا اپنے ملہم کو بے علم اور جاہل رکھنا نہیں چاہتا۔

(۱۰) سچے الہام کے ساتھ اور بھی بہت سی برکتیں ہوتی ہیں۔ اور کلیم اللہ کو غیب سے عزّت دی جاتی ہے اور رعب عطا کیا جاتا ہے۔

(ضرورۃ الامام ص ۱۳-۱۹)

مَیں جوان تھا اور اب بوڑھا ہو گیا مگر مَیں اپنے ابتدائی زمانہ سے ہی اس بات کا گواہ ہوں کہ وہ خدا جو ہمیشہ پوشیدہ چلا آیا ہے وہ اسلام کی پیروی سے اپنے تئیں ظاہر کرتا ہے۔ اگر کوئی قرآن شریف کی سچی پیروی کرے اور کتاب اللہ کے منشاء کے موافق اپنی اصلاح کی طرف مشغول ہو۔ اور

اپنی زندگی نہ دنیاداروں کے رنگ میں بلکہ خادم دین کے طور پر بنا دے اور اپنے تئیں خدا کی راہ میں وقف کر دے اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھے اور اپنی خودنمائی اور تکبّر اور عُجب سے پاک ہو اور خدا کے جلال اور عظمت کا ظہور چاہے نہ یہ کہ اپنا ظہور چاہے اور اس راہ میں خاک میں مل جائے تو آخری نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ مکالماتِ الٰہیہ عربی فصیح بلیغ میں اس سے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کلام لذیذ اور باشوکت ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ حدیث النفس نہیں ہوتا۔ حدیث النفس کا کلام آہستہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک مخنّث یا بیمار بولتا ہے۔ مگر خدا کا کلام پُرشوکت ہوتا ہے اور اکثر عربی زبان میں ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر آیات قرآنی میں ہوتا ہے اور جو کچھ ہمارے تجربہ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ اوّل دل پر اس کی سخت ضرب محسوس ہوتی ہے اور اس ضرب کے ساتھ ایک گونج پیدا ہوتی ہے اور پھر پھول کی طرح وہ شگفتہ ہو جاتا ہے۔ اور اس سے پاک اور لذیذ کلام نکلتا ہے اور وہ کلام اکثر امور غیبیہ پر مشتمل ہوتا ہے اور اپنے اندر ایک شوکت اور طاقت اور تاثیر رکھتا ہے اور ایک آہنی میخ کی طرح دل میں دھنس جاتا ہے۔ اور خدا کی خوشبو اس سے آتی ہے۔ یہ تمام لوازم اس لئے اس کے ساتھ لگائے گئے ہیں کہ بعض ناپاک طبع انسان شیطانی الہام بھی پاتے ہیں یا حدیث النفس کے فریب میں آجاتے ہیں۔ اس لئے خدا نے اپنے کلام کے ساتھ چمکتے ہوئے انوار رکھے ہیں تا دونوں میں فرق ظاہر ہو۔

(چشمۂ معرفت ص٣٠٠)

اکثر نادان لوگ شیطانی القا کو بھی خدا کا کلام سمجھنے لگتے ہیں اور ان کو شیطانی اور رحمانی الہام میں تمیز نہیں۔ پس یاد رہے کہ رحمانی الہام اور وحی کے لئے اوّل شرط یہ ہے کہ انسان محض خدا کا ہو جائے اور شیطان کا کوئی حصہ اُس میں نہ رہے۔ کیونکہ جہاں مُردار ہے ضرور ہے کہ وہاں کتّے بھی جمع ہو جائیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ھل أُنبّئکم علٰی من تنزّل الشیٰطین۔ تنزّل علٰی کلّ افّاکٍ أُثیم۔ مگر جس میں شیطان کا حصہ نہیں رہا۔ اور وہ سفلی زندگی سے ایسا دُور ہوا کہ گویا مر گیا اور راستباز وفادار بندہ بن گیا اور خدا کی طرف آگیا۔ اس پر شیطان حملہ نہیں کر سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ انّ عبادی لیس لک علیہم سلطانٌ۔ جو شیطان کے ہیں اور شیطان کی عادتیں اپنے اندر رکھتے ہیں انہی کی طرف شیطان دوڑتا ہے کیونکہ وہ شیطان کے شکار ہیں۔

اور نیز یاد رہے کہ خدا کے مکالمات ایک خاص برکت اور شوکت اور لذّت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور چونکہ خدا سمیع و علیم و رحیم ہے اس لئے وہ اپنے متقی اور راستباز اور وفادار بندوں کو اُن کے معروضات کا جواب دیتا ہے اور یہ سوال و جواب کئی گھنٹوں تک طول پکڑ سکتے ہیں۔ جب بندہ عجز و نیاز کے رنگ میں ایک سوال کرتا ہے تو اس کے بعد چند منٹ تک اس پر ایک ربودگی طاری ہو کر اس ربودگی کے پردہ میں اس کو جواب مل جاتا ہے۔ پھر بعد اس کے بندہ اگر کوئی سوال کرتا ہے تو پھر دیکھتے دیکھتے اس پر ایک اور ربودگی طاری ہو جاتی ہے اور بدستور اس کے پردہ میں جواب مل جاتا ہے۔ اور خدا ایسا کریم اور رحیم اور علیم ہے کہ اگر ہزار دفعہ بھی ایک بندہ کچھ سوالات کرے تو جواب مل جاتا ہے۔ مگر چونکہ خدا تعالیٰ بے نیاز بھی ہے اور حکمت اور مصلحت کی بھی رعایت رکھتا ہے اس لئے بعض سوالات کے جواب میں اظہار مطلوب نہیں کیا جاتا۔ اور یہ اگر پوچھا جاوے کہ کیونکر معلوم ہو کہ وہ جوابات خدا تعالےٰ کی طرف سے ہیں نہ شیطان کی طرف سے۔ اس کا جواب ہم ابھی دے چکے ہیں۔

ماسوا اس کے شیطان گونگا ہے۔ اپنی زبان میں فصاحت اور روانگی نہیں رکھتا۔ اور گونگے کی طرح وہ فصیح اور کثیر المقدار باتوں پر قادر نہیں ہو سکتا۔ صرف ایک بدبودار پیرایہ میں فقرہ دو فقرہ دل میں ڈال دیتا ہے۔ اس کو ازل سے یہ توفیق نہیں دی گئی کہ لذیذ اور باشوکت کلام کر سکے اور یا چند گھنٹہ تک سلسلہ کلام کا سوالات کے جواب دینے میں جاری رکھ سکے اور وہ بہرہ بھی ہے۔ ہر ایک سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ اور وہ عاجز بھی ہے اپنے الہامات میں کوئی قدرت اور اعلیٰ درجہ کی غیب گوئی کا نمونہ دکھلا نہیں سکتا۔ اور اُس کا گلا بھی بیٹھا ہوا ہے پُرشوکت اور بلند آواز سے بول نہیں سکتا۔ مخنثوں کی طرح آواز دھیمی ہے۔ انہیں علامات سے شیطانی وحی کو شناخت کرو گے۔ لیکن خدا تعالےٰ گونگے اور بہرے اور عاجز کی طرح نہیں۔ اور سُنتا ہے اور برابر جواب دیتا ہے۔ اور اس کے کلام میں شوکت اور ہیبت اور بلند آواز ہوتی ہے اور کلام پُراثر اور لذیذ ہوتا ہے اور شیطان کا کلام دھیما اور زنانہ اور مشتبہ رنگ میں ہوتا ہے اس میں ہیبت اور شوکت اور بلندی نہیں ہوتی۔ اور نہ وہ بہت دیر تک چل سکتا ہے گویا جلدی تھک جاتا ہے اور اس میں بھی کمزوری اور بُزدلی ٹپکتی ہے۔ مگر خدا کا کلام تھکنے والا نہیں ہوتا۔ اور ہر ایک قسم کی طاقت اپنے اندر رکھتا ہے اور بڑے بڑے غیبی امور اور اقتداری وعدوں پر مشتمل ہوتا ہے اور خدائی جلال اور عظمت اور قدرت اور قدوسی کی اس سے بُو آتی ہے اور شیطان

کے کلام میں یہ خاصیت نہیں ہوتی۔ اور نیز خدا تعالیٰ کا کلام ایک قوی تاثیر اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک میخ فولادی کی طرح دل میں دھنس جاتا ہے اور دل پر ایک پاک اثر کرتا ہے اور دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور جس پر نازل ہوتا ہے اُس کو مردِ میدان کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُس کو تیز تلوار کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا اس کو پھانسی دیا جاوے یا ہر ایک قسم کا دُکھ جو دنیا میں ممکن ہے پہنچایا جاوے اور ہر ایک قسم کی بے عزّتی اور توہین کی جائے یا آتش سوزاں میں بٹھایا جاوے یا جلایا جاوے وہ کبھی نہیں کہیگا کہ یہ خدا کا کلام نہیں جو میرے پر نازل ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا اس کو یقین کامل بخش دیتا ہے اور اپنے چہرہ کا عاشق کر دیتا ہے اور جان اور عزت اور مال اس کے نزدیک ایسا ہوتا ہے جیسا کہ ایک تنکا۔ وہ خدا کا دامن نہیں چھوڑتا اگرچہ تمام دنیا اس کو اپنے پیروں کے نیچے کچل ڈالے اور توکل اور شجاعت اور استقامت میں بے مثل ہوتا ہے۔ مگر شیطان سے الہام پانے والے یہ قوت نہیں پاتے۔ وہ بُزدل ہوتے ہیں کیونکہ شیطان بُزدل ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۳۸۔۱۴۰)

اب اگر یہ سوال ہو کہ جبکہ شیطان کے دخل سے بکلّی امن نہیں تو ہم کیونکہ اپنی خوابوں پر بھروسہ کریں کہ وہ رحمانی ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ ایک خواب کو ہم رحمانی سمجھیں اور دراصل وہ شیطانی ہو اور یا شیطانی خیال کریں اور دراصل وہ رحمانی ہو تو اس وہم کا جواب یہ ہے کہ رحمانی خواب اپنی شوکت اور برکت اور عظمت اور نورانیت سے خود معلوم ہو جاتی ہے۔ جو چیز پاک چشمہ سے نکلی ہے وہ پاکیزگی اور خوشبو اپنے اندر رکھتی ہے اور جو چیز ناپاک اور گندے پانی سے نکلی ہے اس کا گند اور اس کی بدبو فی الفور آ جاتی ہے۔ سچی خوابیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں۔ وہ ایک پاک پیغام کی طرح ہوتی ہیں جن کے ساتھ پریشان خیالات کا کوئی مجموعہ نہیں ہوتا۔ اور اپنے اندر ایک اثر ڈالنے والی قوت رکھتی ہیں اور دل اُن کی طرف کھینچے جاتے ہیں اور رُوح گواہی دیتی ہے کہ یہ منجانب اللہ ہے کیونکہ اس کی عظمت اور شوکت ایک فولادی میخ کی طرح دل کے اندر دھنس جاتی ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص سچی خواب دیکھتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کے کسی مجلسی کو بطور گواہ ٹھہرانے کے وہی خواب یا اس کے کوئی ہمشکل دکھلا دیتا ہے۔ تب اس خواب کو دوسرے کی خواب سے قوت مل جاتی ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۳۵۴)

بعض کوتہ فکر لوگ یہ وسوسہ پیش کرتے ہیں کہ الہام میں یہ خرابی اور نقص کہ وہ معرفت کاملہ تک پہنچنے سے کہ جو حیاتِ ابدی اور سعادتِ دائمی کے حصول کا مدار علیہ ہے مانع اور مزاحم ہے اور تقریر اس اعتراض کی یوں کرتے ہیں کہ الہام خیالات کی ترقی کو روکتا ہے اور تحقیقات کے سلسلہ کو آگے چلنے سے بند کرتا ہے۔ کیونکہ الہام کے پابند ہونے کی حالت میں ہر ایک بات میں یہی جواب کافی سمجھا جاتا ہے کہ یہ امر ہماری الہامی کتاب میں جائز یا ناجائز لکھا ہے۔ اور قوائے عقلیہ کو ایسا معطل اور بے کار چھوڑ دیتے ہیں کہ گویا خدا نے ان کو وہ قوتیں عطا ہی نہیں کیں۔ سو بالآخر عدم استعمال کے باعث سے وہ تمام قوتیں رفتہ رفتہ ضعیف بلکہ قریب قریب مفقود کے ہوتی جاتی ہیں۔ اور انسانی سرشت بالکل منقلب ہو کر حیوانات سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نفس انسانی کا عمدہ کمال کہ جو ترقی فی المعقولات ہے ناحق ضائع ہو جاتا ہے اور معرفت کاملہ کے حاصل کرنے سے انسان رُک جاتا ہے اور جس حیاتِ ابدی اور سعادت دائمی کے حصول کی انسان کو ضرورت ہے اس کے حصول سے الہامی کتابیں سدّراہ ہو جاتی ہیں۔

امّا الجواب ۔ واضح ہو کہ ایسا سمجھنا کہ گویا خُدا کی سچّی کتاب پر عمل کرنے سے قوائے عقلیہ کو بالکل بے کار چھوڑا جاتا ہے اور گویا الہام اور عقل ایک دوسرے کی نقیض اور ضدّ ہیں کہ جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں یہ برہمو لوگوں کی کمال درجہ کی بدفہمی اور بد اندیشی اور ہٹ دھرمی ہے۔ اور اس عجیب وہم کی عجیب طرح کی ترکیب ہے جس کے اجزاء میں سے کچھ تو جھوٹ اور کچھ تعصّب اور کچھ جہالت ہے۔ جھوٹ یہ کہ باوصف اس بات کے اُن کو بخوبی معلوم ہے کہ حقانی صداقتوں کی ترقی ہمیشہ اُنہیں لوگوں کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہے کہ جو الہام کے پابند ہوئے ہیں اور وحدانیت الٰہی کے اسرار دنیا میں پھیلانے والے وہی برگزیدہ لوگ ہیں کہ جو خدا کی کلام پر ایمان لائے مگر پھر عمدًا واقعۂ معلومہ کے برخلاف بیان کیا ہے۔ اور تعصّب یہ کہ اپنی بات کو خواہ نخواہ سرسبز کرنے کے لئے اس بدیہی صداقت کو چھپایا ہے کہ الٰہیات میں عقل مجرّد مرتبۂ یقین کامل تک نہیں پہنچا سکتی۔ اور جہالت یہ کہ الہام اور عقل کو دو امر متناقض سمجھ لیا ہے کہ جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اور الہام کو عقل کا مضرّ اور مخالف قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ خدشہ سراسر بے اصل ہے۔ ظاہر ہے کہ سچے الہام کا تابع عقلی تحقیقاتوں سے رُک نہیں سکتا بلکہ حقائق اشیاء کو معقول طور پر دیکھنے کے لئے الہام سے مدد پاتا ہے اور الہام کی حمایت اور اس کی روشنی کی برکت سے عقلی وجوہ میں کوئی دھوکا اُس کو پیش نہیں

آتا اور نا خطا کار عاقلوں کی طرح بے جا دلائل کے بنانے کی حاجت پڑتی ہے اور نہ کچھ تکلّف کرنا پڑتا ہے بلکہ جو ٹھیک ٹھیک عقلمندی کا راہ ہے وہی اُسکو نظر آجاتا ہے اور جو حقیقی سچائی ہے اُسی پر اُس کی نگاہ جا ٹھیرتی ہے۔ عقل کا کام یہ ہے کہ الہام کے واقعات کو قیاسی طور پر جلوہ دیتی ہے۔ اور الہام کا کام یہ کہ وہ عقل کو طرح طرح کی سرگردانی سے بچاتا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ عقل اور الہام میں کوئی جھگڑا نہیں۔ اور ایک دوسرے کا نقیض اور ضد نہیں۔ اور نہ الہام حقیقی یعنی قرآن شریف عقلی ترقیات کے لئے سنگ راہ ہے بلکہ عقل کو روشنی بخشنے والا اور اُس کا بزرگ معاون اور مددگار اور مربی ہے۔ اور جس طرح آفتاب کا قدر آنکھ ہی سے پیدا ہوتا ہے اور روزِ روشن کے فوائد اہل بصارت ہی پر ظاہر ہوتے ہیں اِسی طرح خدا کے کلام کا کامل طور پر انہیں کو قدر ہوتا ہے کہ جو اہل عقل ہیں۔ جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے آپ فرمایا ہے۔ وتلك الامثال نضربها للنّاس وما يعقلها الا العالمون۔ الجزو نمبر ۲۱۔ یعنی یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں پر ان کو معقول طور پر وہی سمجھتے ہیں کہ جو صاحب علم اور دانشمند ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جس طرح آنکھ کے نور کے فوائد صرف آفتاب ہی سے کھلتے ہیں اگر وہ نہ ہو تو پھر بینائی اور نابینائی میں کچھ فرق باقی نہیں رہتا۔ اِسی طرح بصیرت عقلی کی خوبیاں بھی الہام ہی سے کھلتی ہیں۔ کیونکہ وہ عقل کو ہزارہا طور کی سرگردانی سے بچا کر فکر کرنے کے لئے نزدیک کا راستہ بتلا دیتا ہے اور جس راہ پر چلنے سے جلد تر مطلب حاصل ہو جائے وہ راہ دکھلا دیتا ہے۔ اور ہر ایک عاقل خوب سمجھتا ہے کہ اگر کسی باب میں فکر کرنے کے وقت اس قدر مدد مل جائے کہ کسی خاص طریق پر راہِ راست اختیار کرنے کے لئے علم حاصل ہو جائے تو اس علم سے عقل کو بڑی مدد ملتی ہے اور بہت سے پراگندہ خیالوں اور ناحق کی دردسریوں سے نجات ہو جاتی ہے۔ الہام کے تابعین نہ صرف اپنے خیال سے عقل کے عمدہ جوہر کو پسند کرتے بلکہ خود الہام ہی اُن کو عقل کے پختہ کرنے کے لئے تاکید کرتا ہے۔ پس اُن کو عقلی ترقیات کے لئے دوہری کشش کھینچتی ہے۔ ایک تو فطرتی جوش جس سے بالطبع انسان ہر ایک چیز کی ماہیت اور حقیقت کو مدلّل اور عقلی طور پر جاننا چاہتا ہے۔ دوسری الہامی تاکیدیں کہ جو آتش شوق کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ چنانچہ جو لوگ قرآن شریف کو نظر سرسری سے بھی دیکھتے ہیں وہ بھی اس بدیہی امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس کلام مقدس میں فکر اور نظر کی مشق کے لئے بڑی بڑی تاکیدیں ہیں یہاں تک کہ مومنوں کی علامت ہی یہی ٹھیرا دی ہے کہ وہ ہمیشہ زمین اور آسمان کے عجائبات میں فکر کرتے رہتے ہیں اور قانون حکمتِ الٰہیہ کو سوچتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک جگہ قرآن شریف

میں فرمایا ہے۔ انّ فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الّیل والنہار لاٰیٰت لاولی الالباب۔ الذین یذکرون اللّٰہ قیامًا وقعودًا وعلیٰ جنوبھم ویتفکّرون فی خلق السمٰوٰت والارض۔ ربّنا ما خلقت ھٰذا باطلاً۔ یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے اختلاف میں دانشمندوں کے لئے صانع عالم کی ہستی اور قدرت پر کئی نشان ہیں۔ دانشمند وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جو خدا کو بیٹھے کھڑے اور پہلو پر پڑے ہونے کی حالت میں یاد کرتے رہتے ہیں اور زمین اور آسمان اور دوسری مخلوقات کی پیدائش میں تفکّر اور تدبّر کرتے رہتے ہیں اور اُن کے دل اور زبان پر یہ مناجات جاری رہتی ہے کہ اے ہمارے خداوند تُو نے ان چیزوں میں سے کسی چیز کو عبث اور بے ہودہ طور پر پیدا نہیں کیا بلکہ ہر ایک چیز تیری مخلوقات میں سے عجائبات قدرت اور حکمت سے بھری ہوئی ہے کہ جو تیری ذاتِ بابرکات پر دلالت کرتی ہے۔ ہاں دوسری الہامی کتابیں کہ جو محرّف اور مبدّل ہیں اُن میں نامعقول اور محال باتوں پر جمے رہنے کی تاکید پائی جاتی ہے جیسی عیسائیوں کی انجیل شریف۔ مگر یہ الہام کا قصور نہیں یہ بھی حقیقت میں عقل ناقص کا ہی قصور ہے۔ اگر باطل پرستوں کی عقل صحیح ہوتی اور حواس درست ہوتے تو وہ کاہے کو ایسی محرّف اور مبدّل کتابوں کی پیروی کرتے اور کیوں وہ غیر متغیر اور کامل اور قدیم خدا پر یہ آفات اور مصیبتیں جائز رکھتے کہ گویا وہ ایک عاجز بچہ ہو کر ناپاک غذا کھاتا رہا اور ناپاک جسم سے مجسّم ہوا اور ناپاک راہ سے نکلا اور دار الفنا میں آیا اور طرح طرح کے دُکھ اٹھا کر آخر بڑی بدبختی اور بدنصیبی اور ناکامی کی حالت میں ایلی ایلی کرتا مرگیا۔ آخر الہام ہی تھا جس نے اس غلطی کو بھی دُور کیا۔ سبحان اللّٰہ! کیا بزرگ اور دریائے رحمت وہ کلام ہے جس نے مخلوق پرستوں کو پھر توحید کی طرف کھینچا۔ واہ! کیا پیارا اور دلکش وہ نور ہے جو ایک عالم کو ظُلمت کدہ سے باہر لایا۔ اور بجز اس کے ہزارہا لوگ عقلمند کہلا کر اور فلاسفر بن کر اس غلطی اور اس قسم کی بے شمار غلطیوں میں ڈوبے رہے۔ اور جب تک قرآن شریف نہ آیا کسی حکیم نے زور شور سے اس اعتقاد باطل کا ردّ نہ لکھا اور نہ اس قوم تباہ شدہ کی اصلاح کی بلکہ خود حکماء اس قسم کے صدہا ناپاک عقیدوں میں آلودہ اور مبتلا تھے۔ جیسا پادری یوت صاحب لکھتے ہیں کہ حقیقت میں یہ عقیدہ تثلیث کا عیسائیوں نے افلاطون سے اخذ کیا ہے۔ اور اس احمق یونانی کی غلط بنیاد پر ایک دوسری غلط بنیاد رکھدی ہے۔ غرض خدا کا سچا اور کامل الہام عقل کا دشمن نہیں ہے بلکہ عقل ناقص نیم عاقلوں کی آپ دشمن ہے۔

جیسا ظاہر ہے کہ تریاق فی حدّ ذاتہٖ انسان کے بدن کے لئے کوئی بُری چیز نہیں ہے لیکن اگر کوئی اپنی کوتہ عقلی سے زہر کو تریاق سمجھ لے تو یہ خود اس کی عقل کا قصور ہے نہ تریاق کا۔ پس یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ وہم کہ ہر ایک امر کی تفتیش کے لئے الہامی کتاب کی طرف رجوع کرنا محل خطر ہے یہ سراسر حمق اور نادانی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں الہام عقل کے لئے ایک آئینہ حق نما ہے۔ اور اس کی سچائی پر بھی یہی دلیل اعظم ہے کہ وہ ایسے تمام امور سے بکلّی پاک ہے کہ جو خدا کی قدرت اور کمالیت اور قدوسی پر نظر کرنے کے بعد محال ثابت ہوں۔ بلکہ دقائق الہیات میں کہ جو نہایت مخفی اور عمیق ہیں عقل ضعیف انسانی کا وہی ایک ہادی اور رہبر ہے۔ پس ظاہر ہے کہ اس کی طرف رجوع کرنا عقل کو بے کار نہیں کرتا بلکہ عقل کو اُن باریک بھیدوں تک پہنچاتا ہے جن تک خود بخود پہنچنا عقل کے لئے سخت مشکل تھا۔ سو الہام حقیقی سے یعنی قرآن شریف سے عقل کو سراسر فائدہ اور نفع پہنچتا ہے نہ زیان اور نقصان۔ اور عقل بذریعہ الہام حقیقی خطرات سے بچ جاتی ہے نہ یہ کہ خطرات میں پڑتی ہے۔ کیونکہ یہ بات ہر ایک دانا کے نزدیک مسلّم بلکہ اجلیٰ بدیہیات ہے کہ محض تشخیص عقلی میں خطا اور غلطی ممکن ہے۔ لیکن عالم الغیب کی کلام میں خطا اور غلطی ممکن نہیں۔ پس اب تم آپ ہی ذرا منصف ہو کر سوچو کہ جس چیز کو کبھی کبھی سخت لغزشیں پیش آجاتی ہیں اگر اس کے ساتھ ایک ایسا رفیق ملایا گیا کہ جو اس کو لغزشوں سے بچاوے اور پاؤں پھسلنے کی جگہ سے سنبھال رکھے تو کیا اس کے لئے اچھا ہوا یا بُرا۔ اور کیا اس رفیق نے اس کو اپنے کمال مطلوب تک پہنچایا یا کمال مطلوب سے روک دیا؟ یہ کیسی کور باطنی ہے کہ معین اور مددگار کو مخالف اور مزاحم سمجھا جاوے اور مکمل اور متمم کو رہزن اور نقصان رساں قرار دیا جائے۔ آپ لوگ جب اپنے حواس میں قائم ہو کر اور طالب حق بن کر اس مسئلہ میں غور کرینگے تو آپ پر فی الفور واضح ہو جائیگا کہ خدا نے جو عقل کا رفیق الہام کو ٹھہرا دیا ہے یہ عقل کے حق میں کوئی ضرر کی بات نہیں کی۔ بلکہ اس کو سرگردان اور حیران پا کر حق شناسی کے لئے ایک یقینی آلہ عطا کیا ہے جس کی نشان دہی سے عقل کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ صدہا کج اور ناراست راہوں میں بھٹکنے پھرنے سے بچ جاتی ہے اور سرگشتہ اور آوارہ نہیں ہوتی۔ اور ہر طرف حیرانی سے بھٹکتی نہیں پھرتی بلکہ اصل مقصود کی خاص راہ کو پا لیتی ہے اور جو ٹھیک ٹھیک گوہر مراد کی جگہ ہے اس کو دیکھ لیتی ہے اور بے ہودہ جان کنی سے امن میں رہتی ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی

سچا مخبر کسی گمشدہ شخص کا بدرستی تمام پتہ لگا دیوے کہ وہ فلاں طرف گیا ہے اور فلاں شہر اور فلاں محلہ اور فلاں جگہ میں چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ ایسے مخبر پر جو کسی گمشدہ کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگا دیتا ہے اور اس تک پہنچنے کا سہل اور آسان راستہ بتلا دیتا ہے کوئی باعقل آدمی یہ اعتراض نہیں کرتا کہ وہ ہماری کارروائی کا حارج ہوا ہے بلکہ اس کے بغایت درجہ ممنون اور شکر گذار ہوتے ہیں کہ ہم بے خبر تھے اس نے خبر دی۔ اور ہم ہر طرف بھٹکتے پھرتے تھے اس نے خاص جگہ بتلا دی۔ اور ہم نری اٹکلیں دوڑاتے تھے اس نے یقین کا دروازہ ہم پر کھول دیا۔ ایسا ہی وہ لوگ جن کو خدا نے عقلِ سلیم بخشی ہے حقیقی الہام کے مرہونِ منّت اور ثنا خواں اور مدّاح ہیں اور بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ الہام حقیقی ان کو خیالات کی ترقی سے نہیں روکتا بلکہ خیالات کی سرگشتگی سے روکتا ہے اور انواع و اقسام کے پیچ در پیچ اور مشتبہ راہوں میں سے ایک خاص راہِ مقصود جتلا دیتا ہے جس پر قدم مارنا عقل کو نہایت آسان ہو جاتا ہے اور جو جو مشکلات انسان کو بباعث قلّتِ عمر اور قلّتِ طاقتِ علمی و کمیٔ بصیرت پیش آتی ہے ان سب سے خلاصی بخشتا ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۲۸۲ - ۲۹۹ حاشیہ ۱۱)

واضح ہو کہ اگرچہ یہ سچ بات ہے کہ عقل بھی خدا نے انسان کو ایک چراغ عطا کیا ہے کہ جس کی روشنی اس کو حق اور راستی کی طرف کھینچتی ہے اور کئی طرح کے شکوک اور شبہات سے بچاتی ہے اور انواع و اقسام کے بے بنیاد خیالوں اور بے جا وساوس کو دُور کرتی ہے نہایت مفید ہے بہت ضروری ہے بڑی نعمت ہے مگر پھر بھی باوجود ان سب باتوں اور ان تمام صفتوں کے اس میں یہ نقصان ہے کہ صرف وہی اکیلی معرفتِ حقائقِ اشیاء میں مرتبۂ یقین کامل تک نہیں پہنچا سکتی۔ کیونکہ مرتبہ یقین کامل کا یہ ہے کہ جیسا کہ حقائق اشیاء کے واقعہ میں موجود ہیں انسان کو بھی اُن پر ایسا ہی یقین آجائے کہ ہاں حقیقت میں موجود ہیں مگر مجرّد عقل انسان کو اس اعلیٰ درجہ یقین کا مالک نہیں بنا سکتی۔ کیونکہ غایت درجہ حکم عقل کا یہ ہے کہ وہ کسی شے کے موجود ہونے کی ضرورت کو ثابت کرے۔ جیسا کسی چیز کی نسبت یہ حکم دے کہ اس چیز کا ہونا ضروری ہے یا یہ چیز ہونی چاہیئے۔ مگر ایسا حکم ہرگز نہیں دے سکتی کہ واقعہ میں یہ چیز ہے بھی اور یہ پایہ یقین کامل کا کہ علم انسان کا کسی امر کی نسبت ہونا چاہیئے کے مرتبہ سے ترقی کر کے ہے کے مرتبہ تک پہنچ جائے تب حاصل ہوتا ہے کہ جب عقل کے ساتھ کوئی دوسرا ایسا

رفیق مل جاتا ہے کہ جو اُس کی قیاسی وجوہات کو تصدیق کر کے واقعاتِ مشہودہ کا لباس پہناتا ہے۔ یعنی جس امر کی نسبت عقل کہتی ہے کہ ہونا چاہیئے وہ رفیق اس امر کی نسبت یہ خبر دیتا ہے کہ واقعہ میں وہ امر موجود بھی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں عقل صرف ضرورتِ شے کو ثابت کرتی ہے خود شئے کو ثابت نہیں کر سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ کسی شے کی ضرورت کا ثابت ہونا امرِ دیگر ہے اور خود اُس شے کا ثابت ہو جانا امرِ دیگر۔ بہر حال عقل کے لئے ایک رفیق کی حاجت ہوئی کہ تا وہ رفیق عقل کے اس قیاسی اور ناقص قول کا کہ جو ہونا چاہیئے کے لفظ سے بولا جاتا ہے مشہودی اور کامل قول سے جو ہے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے جبر نقصان کرے اور واقعات سے جیسا کہ وہ نفس الامر میں واقعہ ہیں آگاہی بخشے۔ سو خدا نے جو بڑا ہی رحیم اور کریم ہے اور انسان کو مراتب قصوٰی یقین تک پہنچانا چاہتا ہے اس حاجت کو پوری کیا ہے اور عقل کے لئے کئی رفیق مقرر کر کے راستہ یقین کامل کا اس پر کھول دیا ہے تا نفس انسان کا کہ جس کی ساری سعادت اور نجات یقین کامل پر موقوف ہے اپنی سعادات مطلوبہ سے محروم نہ رہے اور ہونا چاہیئے کے نازک اور پُرخطر پل سے کہ عقل نے شکوک اور شبہات کے دریا پر باندھا ہے بہت جلد آگے عبور کر کے ہے کے قصرِ عالی جو دارالامن والاطمینان ہے داخل ہو جائے اور وہ رفیق عقل کے جو اس کے یار و مددگار ہیں ہر مقام اور موقعہ میں الگ الگ ہیں لیکن از روئے حصرِ عقلی تین سے زیادہ نہیں۔ اور ان تینوں کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ اگر حکم عقل کا دنیا کے محسوسات اور مشہودات سے متعلق ہو جو ہر روز دیکھے جاتے یا سُنے جاتے یا سونگھے جاتے یا ٹٹولے جاتے ہیں تو اس وقت رفیق اس کا جو اس کے حکم کو یقین کامل تک پہنچا دے مشاہدہ صحیحہ ہے کہ جس کا نام تجربہ ہے۔ اور اگر حکم عقل کا اُن حوادث و واقعات سے متعلق ہو جو مختلف ازمنہ اور امکنہ میں صدور پاتے رہے ہیں یا صدور پاتے ہیں تو اس وقت اس کا ایک اَور رفیق بنتا ہے کہ جس کا نام تواریخ اور اخبار اور خطوط اور مراسلات ہے اور وہ بھی تجربہ کی طرح عقل کی دُود آمیز روشنی کو ایسا مصفّٰی کر دیتا ہے کہ پھر اُس میں شک کرنا ایک حُمق اور جنون اور سودا ہوتا ہے۔ اور اگر حکم عقل کا اُن واقعات سے متعلق ہو جو ماوراء المحسوسات ہیں جن کو ہم نہ آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں اور نہ کان سے سُن سکتے ہیں اور نہ ہاتھ سے ٹٹول سکتے ہیں اور نہ اس دنیا کی تواریخ سے دریافت کر سکتے ہیں تو اس وقت اس کا ایک تیسرا رفیق بنتا ہے کہ جس کا نام الہام اور وحی ہے

اور قانون قدرت بھی یہی چاہتا ہے کہ جیسے پہلے دو مواضع میں عقل ناتمام کو دو رفیق میسّر آ گئے ہیں تیسرے موضع میں بھی میسّر آیا ہو۔ کیونکہ قوانینِ فطرتیہ میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص جبکہ خدا نے دنیا کے علوم اور فنون میں کہ جن کے نقصان اور سہو اور خطا میں چنداں حرج بھی نہیں انسان کو ناقص رکھنا نہیں چاہا تو اس صورت میں خدا کی نسبت یہ بڑی بدگمانی ہو گی جو ایسا خیال کیا جاوے جو اس نے ان امور کی معرفت تامہ کے بارے میں کہ جن پر کامل یقین رکھنا نجات اخروی کی شرط ہے اور جن کی نسبت شک رکھنے سے جہنم ابدی تیار ہے انسان کو ناقص رکھنا چاہا ہے اور اس کے علم اخروی کو صرف ایسے ایسے ناقص خیالات پر ختم کر دیا ہے کہ جن کی محض اٹکلوں پر ہی ساری بنیاد ہے اور ایسا ذریعہ اس کے لئے کوئی بھی مقرر نہیں کیا کہ جو شہادت واقعہ دے کر اس کے دل کو یہ تسلّی اور تشفی بخشے کہ وہ اصولِ نجات کہ جن کا ہونا عقل بطور قیاس اور اٹکل کے تجویز کرتی ہے وہ حقیقت میں موجود ہی ہیں اور جس ضرورت کو عقل قائم کرتی ہے وہ فرضی ضرورت نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی ضرورت ہے اب جبکہ یہ ثابت ہوا کہ الٰہیات میں یقین کامل صرف الہام ہی کے ذریعہ سے ملتا ہے اور انسان کو اپنی نجات کے لئے یقین کامل کی ضرورت ہے اور خود بغیر یقین کامل کے ایمان سلامت لے جانا مشکل۔ تو نتیجہ ظاہر ہے کہ انسان کو الہام کی ضرورت ہے۔

(براہین احمدیہ ص۷۸ - ۸۰ حاشیہ نمبر ۴)

اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ مجرّد عقلی خیالوں میں صرف اتنا ہی نقص نہیں کہ وہ مراتب یقینیہ سے قاصر ہیں اور دقائق الٰہیات کے مجموعہ پر قابض نہیں ہو سکتے بلکہ ایک یہ بھی نقص ہے کہ مجرّد عقلی تقریریں دلوں پر اثر کرنے میں بھی بغایت درجہ کمزور و بے جان ہیں اور کمزور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کسی کلام کا دل پر کارگر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس کلام کی سچائی سامع کے ذہن میں ایسی متحقق ہو کہ جس میں ایک ذرا پیچ کرنے کی گنجائش نہ ہو اور دلی یقین سے یہ بات دل میں بیٹھ جائے کہ جس واقعہ کی مجھ کو خبر دی گئی ہے اس میں غلطی کا امکان نہیں اور ابھی ظاہر ہو چکا ہے کہ مجرّد عقل یقین کامل تک پہنچا ہی نہیں سکتی۔ پس اس صورت میں یہ بات بدیہی ہے کہ وہ آثار کہ یقین کامل پر مترتب ہوتے ہیں اور وہ تاثیریں کہ جو یقینی کلام دلوں پر کرتی ہے جو مجرّد عقل سے ہرگز متوقع نہیں اور اس کا ثبوت روزمرّہ تجربہ سے ظاہر ہے مثلاً ایک شخص ایک دور دراز ولایت کا سیر کر کے آتا ہے تو جب اپنے وطن میں پہنچتا ہے

تو ہر ایک خویش و بیگانہ اس ولایت کی خبریں اُس سے دریافت کرتا ہے اور اُس کی چشم دید خبریں بشرطیکہ وہ دروغگوئی کی عادت سے متہم نہ ہو دلوں پر بہت اثر کرتی ہیں۔ اور بغیر کسی تردّد اور شک کے فی الواقعہ راست اور صحیح سمجھی جاتی ہیں۔ بالخصوص جب ایسا مخبر ہو کہ لوگوں کی نظر میں ایک بزرگوار اور صالح آدمی ہو۔ اس قدر تاثیر اس کی کلام میں کیوں ہوتی ہے اس لئے ہوتی ہے کہ اوّل اس کو ایک شریف اور راستباز تسلیم کر کے پھر اس کی نسبت یہ یقین کیا گیا ہے کہ وہ جو جو ان ملکوں کے واقعات بیان کرتا ہے اس کو اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو جو خبریں بتلاتا ہے وہ اس کا چشم دید ماجرا ہے۔ پس اسی باعث سے اس کی باتوں کا دلوں پر سخت اثر واقع ہوتا ہے۔ اور اس کے بیانات طبیعتوں میں ایسے جم جاتے ہیں کہ گویا ان واقعات کی تصویر نظر کے سامنے آموجود ہوتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات جب وہ اپنے سفر کی ایک رقّت آمیز حکایت سُناتا ہے یا کسی قوم کا درد انگیز قصہ بیان کرتا ہے تو سُنتے ہی وہ بات سامعین کے دل کو ایسا پکڑ لیتی ہے کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور ان کی ایک ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ گویا وہ موقعہ پر موجود ہیں اور اس واقعہ کو بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔ لیکن جو شخص اپنے گھر کی چار دیوار سے کبھی باہر نہیں نکلا نہ اس ملک میں کبھی گیا اور نہ دیکھنے والوں سے کبھی اس کا حال سُنا اگر وہ اُٹھ کر صرف اپنی اٹکل سے اس ملک کی خبریں بیان کرنے لگے تو اس کی بک بک سے خاک بھی تاثیر نہیں ہوتی۔ بلکہ لوگ اُسے کہتے ہیں کہ کیا تو پاگل اور دیوانہ ہے کہ ایسی باتیں بیان کرنے لگا کہ جو تیرے معائنہ اور تجربہ سے باہر ہیں اور تیرے ناقص علم سے بلند تر ہیں۔ اور اس پر ایسا ہی کہتے ہیں کہ جیسا ایک بزرگ نے کسی احمق کا قصّہ لکھا ہے کہ وہ ایک جگہ گیہوں کی روٹی کی بہت سی تعریفیں کر رہا تھا کہ وہ بہت ہی مزیدار ہوتی ہے اور جب پوچھا گیا کہ تو نے بھی کبھی کھائی ہے تو اس نے جواب دیا کہ مَیں نے کھائی تو کبھی نہیں پر میرے دادا جی بات کیا کرتے تھے کہ ایک دفعہ ہم نے کسی کو کھاتے دیکھا ہے۔

غرض جب تک کوئی سامعین کی نظر میں کسی واقعہ پر بکلّی محیط نہ ہو تب تک بجائے اس کے کہ اُس کا کلام دلوں پر کچھ اثر کرے خواہ نخواہ ٹھٹھا اور ہنسی کرانے کا موجب ٹھیرتا ہے یہی وجہ ہے کہ مجرّدِ عقلمندوں کی خشک تقریروں نے کسی کو عالم آخرت کی طرف یقینی طور پر متوجہ نہیں کیا اور لوگ یہی سمجھتے رہے کہ جیسا یہ لوگ صرف اٹکل سے باتیں کرتے ہیں علیٰ ہذا القیاس ہم بھی اُن کی رائے کے مخالف اٹکلیں دوڑا سکتے ہیں۔ نہ انہوں نے موقع پر

جاکر اصل حقیقت کو دیکھا نہ ہم نے ۔ اِسی باعث سے جب ایک طرف بعض عقلمندوں نے خدا کی ہستی پر رائے زنی کرنی شروع کی تو دوسرے عقلمندوں نے ان کے مخالف ہوکر دہریہ مذہب کی تائید میں کتابیں تصنیف کیں ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان عاقلوں کا فرقہ کہ جو خدا کی ہستی کے کسی قدر قائل تھے وہ بھی دہریہ پن کی رگ سے کبھی خالی نہیں ہُوا اور نہ اب خالی ہے ۔ انہی برہمو لوگوں کو دیکھو ۔ کب وہ خدا کو کامل صفتوں سے متصف سمجھتے ہیں ۔ کب ان کو اقرار ہے کہ خدا گونگا نہیں بلکہ اُس میں حقیقی طور پر صفت تکلّم بھی ہے جیسی ایک جیتے جاگتے میں ہونی چاہیئے ۔ کب وہ اس کو حقّانی طور پر پورا پورا مدبّر اور رزاق سمجھتے ہیں ۔ کب ان کو اس بات پر ایمان ہے کہ حقیقت میں خدا حیّ و قیّوم ہے اور اپنی آوازیں صادق دلوں تک پہنچا سکتا ہے ۔ بلکہ وہ تو اس کے وجود کو ایک موہومی اور مردہ سا خیال کرتے ہیں کہ جس کو عقل انسانی صرف اپنے ہی تصوّرات سے ایک فرضی طور پر ٹھیرا لیتی ہے اور اس طرف سے زندوں کی طرح کبھی آواز نہیں آتی ۔ گویا وہ خدا نہیں ایک بُت ہی ہے کہ جو کسی گوشہ میں پڑا ہے ۔ مَیں متعجب ہوں کہ ایسے کچے اور ضعیف خیالات سے کیونکر یہ لوگ خوش ہوئے بیٹھے ہیں ۔ اور ایسے خود تراشیدہ باتوں سے کن ثمرات کی توقع ہے ۔ کیوں سچے طالبوں کی طرح اس خدا کو نہیں ڈھونڈتے کہ جو قادر توانا اور جیتا جاگتا ہے اور اپنے وجود پر آپ اطلاع دینے کی قدرت رکھتا ہے اور اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ کی آواز سے مُردوں کو ایک دم میں زندہ کرسکتا ہے ۔ جب یہ لوگ خود جانتے ہیں کہ عقل کی روشنی دود آمیز ہے تو پھر کامل روشنی کے کیوں خواہاں نہیں ہوتے ۔ عجب احمق ہیں کہ اپنے مریض ہونے کے تو قائل ہیں پر علاج کا کچھ فکر نہیں ۔ ہائے افسوس ! کیوں ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں تا وہ حق الامر کو دیکھ لیں ۔ کیوں ان کے کانوں پر سے پردہ نہیں اُٹھتا تا کہ وہ حقانی آواز کو سُن لیں ۔ کیوں ان کے دل ایسے کجرو اور ان کی سمجھیں ایسی الٹی ہو گئیں کہ جو اعتراض حقیقت میں انہی پر وارد ہوتا تھا وہ الہام حقیقی کے تابعین پر کرنے لگے . . . .

اِس وہم کا ضمیمہ برہمو سماج والوں کا ایک اور وہم بھی ہے کہ الہام ایک قید ہے اور ہم ہر ایک قید سے آزاد ہیں ۔ یعنی ہم اچھے ہیں کیونکہ آزاد قیدی سے اچھا ہوتا ہے ۔ ہم اس نکتہ چینی کو مانتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ بلاشبہ الہام ایک قید ہے کہ جس کے بغیر سچی آزادی حاصل ہونا ممکن نہیں کیونکہ سچی آزادی وہ ہے جو انسان کو ہر ایک نوع کی غلطی اور

شکوک اور شبہات سے نجات ہو کر مرتبہ یقین کامل کا حاصل ہو جائے اور اپنے مولیٰ کریم کو اِسی دنیا میں دیکھ لے۔ سو جیسا کہ ہم اسی حاشیہ میں ثابت کر چکے ہیں یہ حقیقی آزادی دنیا میں کامل اور خدادوست مسلمانوں کو بذریعہ قرآن شریف حاصل ہے اور بجز ان کے کسی برہمو وغیرہ کو حاصل نہیں ۔۔ ....

اِسی وہم کا ضمیمہ برہمو سماج والوں کا ایک اَور مقولہ ہے کہ گویا انہوں نے اپنے اس قامت ناساز کو ایک دوسرے لباس میں ظاہر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ الہام کا تابع ہونا ایک حرکت خلاف وضعِ استقامت اور مبائن طریقِ فطرت ہے۔ کیونکہ ہر ایک امر کی حقیقت پر مطلع ہونے کے لئے صاف اور سیدھا راستہ کہ جس کو ہر ایک انسان کا نفسِ ناطقہ بمقتضائے اپنی فطرت کے چاہتا ہے یہی ہے کہ عقلی دلائل سے اس حقیقت کو کھولا جائے۔ جیسے مثلاً فعل سرقہ کے قبیح ہونے کے لئے حقیقی وجہ جس پر روحانی اطمینان موقوف ہے یہی ہے کہ وہ ایک ظلم اور تعدّی ہے کہ عندالعقل نامناسب اور ناجائز ہے۔ یہ وجہ نہیں ہے کہ جو کسی الہامی کتاب سے اس کا مرتکب ہونا گناہ لکھا ہے۔ یا مثلاً سم الفار جو ایک زہر ہے اُس کے کھانے کی مخالفت حقیقی طور پر اس بنا پر ہو سکتی ہے کہ وہ قاتل اور مہلک ہے نہ اس بنا پر کہ خدا کے کلام میں اس کے اکل و شرب سے نہی وارد ہے۔ پس ثابت ہے کہ واقعی اور حقیقی سچائی کی رہ نما صرف عقل ہے نہ الہام۔ لیکن اِن حضرات کو ابھی تک یہ خبر بھی نہیں کہ اس وہم کا تو اسی وقت قلع قمع ہو گیا کہ جب مضبوط اور قوی دلائل سے ان کی عقل کا خام اور ناتمام ہونا بپایۂ ثبوت پہنچ گیا۔ کیا یہ عقلمندی ہے کہ جس وسوسہ کو دلائل قویہ کے پُرزور لشکر نے پیس ڈالا ہے اُسی مُردہ خیال کو بے شرم آدمی کی طرح بار بار پیش کیا جائے۔ افسوس! افسوس!! ارے بابا کیا تم بارہا سُن نہیں چکے کہ گو حقائق اشیاء عقلی دلائل سے کسی قدر منکشف ہوتے ہیں مگر ایسا تو نہیں کہ تمام مراتبِ یقین کا استکمال عقل پر ہی موقوف ہے۔ آپ تو اپنی ہی مثال پیش کردہ سے ملزم ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ سم الفار کا قاتل اور مہلک ہونا مجرّد عقل کے ذریعہ سے بپایۂ ثبوت نہیں پہنچا بلکہ یقینی طور پر یہ خاصیت اس کی تب معلوم ہوئی جب عقل نے تجربہ صحیحہ کو اپنا رفیق بنا کر سم الفار کی خاصیت مخفیہ کو مشاہدہ کر لیا ہے۔ سو ہم بھی آپ کو یہی سمجھاتے ہیں کہ جیسی سم الفار کی خاصیت یقینی طور پر دریافت کرنے کے لئے عقل کو ایک دوسرے رفیق کی حاجت ہوئی یعنی تجربہ صحیحہ کی حاجت۔ ایسا ہی الٰہیات اور عالمِ معاد کے حقائق علیٰ وجہ الیقین

دریافت کرنے کے لئے عقل کو الہام الٰہی کی حاجت ہے۔ اور بغیر اس رفیق کے عقل کا کام علم دین میں چل نہیں سکتا۔ جیسے دوسرے علوم میں بغیر دوسرے رفیقوں کے عقل بے دست و پا اور ناقص اور ناتمام ہے۔ غرض عقل فی حدّ ذاتہٖ مستقل طور پر کسی کام کو یقینی طور پر انجام نہیں دے سکتی جب تک کوئی دوسرا رفیق اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ اور بغیر شمول رفیق کے ممکن نہیں کہ خطا اور غلطی سے محفوظ اور معصوم رہ سکے بالخصوص علم الٰہی میں جس کے تمام ابحاث کی کُنہ اور حقیقت اس عالم کی وراء الوراء ہے۔ اور جس کا کوئی نمونہ اس دنیا میں موجود نہیں۔ ان امور میں عقلِ ناقصِ انسانی غلطی سے تو کیا بچے گی کمال معرفت کے مرتبہ تک بھی نہیں پہنچا سکتی .... جو دقتیں اُس نادیدہ عالم کے واقعات میں پیش آتی ہیں اور جس طرح غیر مرئی اور غیب الغیب جہان کے تصوّر کرنے کے وقت میں حیرتیں رونما ہوتی ہیں اور نظر اور فکر کے آگے ایک دریا ناپیدا کنار دکھلائی دیتا ہے اسجگہ اس کا ہزارم حصہ بھی نہیں تو اس صورت میں اگر ہم صریحًا اور عمدًا بے راہی اختیار نہ کریں تو بلاشبہ اس اقرار کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ ہمیں اس عالم کے حالات اور واقعات ٹھیک ٹھیک معلوم کرنے کے لیۓ اور اُن پر یقین کامل لانے کی غرض سے دنیا کی نسبت صدہا درجہ زیادہ مؤرخوں اور واقعہ نگاروں اور تجربہ کاروں کی حاجت ہے۔ اور جبکہ اس عالم کا مؤرخ اور واقعہ نگار بجز خدا کی کلام کے اَور کوئی نہیں ہو سکتا اور ہمارے یقین کا جہاز بغیر وجود واقعہ نگار کے تباہ ہوا جاتا ہے۔ اور بادِ صرصر وساوس کے ایمان کی کشتی کو ورطۂ ہلاکت میں ڈالتی جاتی ہے تو اس صورت میں کون عاقل ہے کہ جو صرف عقل ناقص کی رہبری پر بھروسہ کر کے ایسے کلام کی ضرورت سے مُنہ پھیرے جس پر اُس کی جان کی سلامتی موقوف ہے اور جس کے مضامین صرف قیاسی اٹکلوں میں محدود نہیں بلکہ وہ عقلی دلائل کے علاوہ بحیثیت ایک مؤرخ صادق عالم ثانی کے واقعاتِ صحیحہ کی خبر بھی دیتا ہے اور چشم دید ماجرا بیان کرتا ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۳۰۵ - ۳۱۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

حضرات! تم خوب سوچ کر دیکھ لو کہ الہام کے بغیر نہ یقین کامل ممکن ہے نہ غلطی سے بچنا ممکن۔ نہ توحید خالص پر قائم ہونا ممکن۔ نہ جذبات نفسانیہ پر غالب آنا حیزِ امکان میں داخل ہے۔ وہ الہام ہی ہے جس کے ذریعہ سے خدا کی نسبت "ہے" کی دھوم مچی ہوئی ہے اور تمام دنیا ہست ہست کر کے اُس کو پکار رہی ہے وہ الہام ہی ہے جو ابتداء سے

دلوں میں جوش ڈالتا آیا کہ خدا موجود ہے ۔ وہی ہے جس سے پرستاروں کو پرستش کی لذّت آتی ہے ۔ ایمان داروں کو خدا کے وجود اور عالمِ آخرت پر تسلّی ملتی ہے ۔ وہی ہے جس سے کروڑہا عارفوں نے بڑی استقامت اور جوش محبتِ الٰہیہ سے اس مسافر خانہ کو چھوڑا ہے ۔ وہی ہے جس کی صداقت پر ہزارہا شہیدوں نے اپنے خون سے مہریں کر دیں ہاں وہی ہے جس کی قوتِ جاذبہ سے بادشاہوں نے فقر کا جامہ پہن لیا ۔ بڑے بڑے مالداروں نے دولتمندی پر درویشی اختیار کر لی ۔ اسی کی برکت سے لاکھوں امّی اور ناخواندہ اور بوڑھی عورتوں نے بڑے پُرجوش ایمان سے کوچ کیا ۔ وہی ایک کشتی ہے جس نے بارہا یہ کام کر دکھایا کہ بے شمار لوگوں کو ورطۂ مخلوق پرستی اور بدگمانی سے نکال کر ساحل توحید اور یقین کامل تک پہنچا دیا ۔ وہی آخری دم کا یار اور نازک وقت کا مددگار ہے ۔ لیکن فقط عقل کے پردے سے جس قدر دنیا کو ضرر پہنچا ہے وہ کچھ پوشیدہ نہیں ۔ بھلا تم آپ ہی بتلاؤ کس نے افلاطون اور اس کے توابع کو خدا کی خالقیت سے منکر بنایا ؟ کس نے جالینوس کو رُوحوں کے باقی رہنے اور جزا سزا کے بارے میں شک میں ڈال دیا ؟ کس نے تمام حکیموں کو خدا کے عالم بالجزئیات ہونے سے انکاری رکھا ۔ کس نے بڑے بڑے فلاسفروں سے بُت پرستی کرائی ؟ کس نے مُورتوں کے آگے مُرغوں اور دوسرے حیوانات کو ذبح کرایا ؟ کیا یہی عقل نہیں تھی جس کے ساتھ الہام نہ تھا ؟ اور یہ شبہ پیش کرنا کہ بہت سے لوگ الہام کے تابع ہو کر بھی مشرک بن گئے ۔ نئے نئے خدا بنا لئے درست نہیں کیونکہ یہ خدا کے سچے الہام کا قصور نہیں ۔ بلکہ ان لوگوں کا قصور ہے جنہوں نے سچ کے ساتھ جھوٹ ملا دیا اور خدا پرستی پر ہوا پرستی کو اختیار کر لیا ۔ پھر بھی الہام الٰہی اُن کے تدارک سے غافل نہیں رہا ۔ اُنکو فراموش نہیں کیا بلکہ جن جن باتوں میں وہ حق سے دُور پڑ گئے دوسرے الہام نے ان باتوں کی اصلاح کی ۔

(براہین احمدیہ ص۱۵۳ حاشیہ ۱۱)

ہاں سچ بات ہے کہ عقل بھی بے سود اور بے فائدہ نہیں اور ہم نے کب کہا ہے کہ بے فائدہ ہے ۔ مگر اس بدیہی صداقت کے ماننے سے ہم کس طرح بھاگ سکتے ہیں کہ مجرّد عقل اور قیاس کے ذریعہ سے ہمیں وہ کامل یقین کا سرمایہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ جو عقل اور الہام کے اشتمال سے حاصل ہوتا ہے اور نہ لغزشوں اور غلطیوں اور خطاؤں اور گمراہیوں اور خود پسندیوں اور خود بینیوں سے بچ سکتے ہیں ۔ اور نہ ہمارے خود تراشیدہ خیالات خدا کے پُرزور اور پُرجلال اور پُررعب حکم کی طرح جذباتِ نفسانی پر غالب آ سکتے ہیں اور نہ ہمارے

طبعزاد تصوّرات اور خشک تخیلات اور بے اصل توہّمات ہم کو وہ سرور اور خوشی اور تسلّی اور تشفی پہنچا سکتے ہیں کہ جو محبوب حقیقی کا دلآویز کلام پہنچاتا ہے تو پھر کیا ہم ایک اکیلی عقل کے پَیرو ہو کر اُن تمام نقصانوں اور زیانوں اور بدبختیوں اور بدنصیبیوں کو اپنے لئے قبول کریں۔ اور ہزارہا بلاؤں کا اپنے نفس پر دروازہ کھول دیں۔ عاقل انسان کسی طرح اس مہمل بات کو باور نہیں کرسکتا کہ جس نے کامل معرفت کی پیاس لگا دی ہے اُس نے پوری معرفت کا لبالب پیالہ دینے سے دریغ کیا ہے اور جس نے آپ ہی دلوں کو اپنی طرف کھینچا ہے اس نے حقیقی عرفان کے دروازے بند کر رکھے ہیں اور خداشناسی کے تمام مراتب کو صرف فرضی ضرورت کو پرخیال دوڑانے میں محدود کردیا ہے۔ کیا خدا نے انسان کو ایسا ہی بدبخت اور بے نصیب پیدا کیا ہے کہ جس کامل تسلّی کو خداشناسی کی راہ میں اس کی رُوح چاہتی ہے اور دل تڑپتا ہے اور جس کے حصول کا جوش اُسکی جان و جگر میں بھرا ہوا ہے اُس کے حصول سے اِس دُنیا میں اس کو بکلّی یاس اور ناامیدی ہے کیا تم ہزارہا لوگوں میں سے کوئی بھی ایسی رُوح نہیں کہ اس بات کو سمجھے کہ جو معرفت کے دروازے صرف خدا کے کھولنے سے کھلتے ہیں وہ انسانی قوتوں سے کھل نہیں سکتے۔ اور جو خدا کا آپ کہنا ہے کہ مَیں موجود ہوں اس سے انسانوں کے صرف قیاسی خیالات برابر نہیں ہوسکتے۔ بلاشبہ خدا کا اپنے وجود کی نسبت خبر دینا ایسا ہے کہ گویا خدا کو دکھلا دیتا ہے مگر صرف قیاسًا انسان کا کہنا ایسا نہیں ہے۔ اور جبکہ خدا کے کلام سے کہ جو اس کے وجود خاص پر دلالت کرتا ہے ہمارے عقلی خیالات کسی طرح برابر نہیں ہوسکتے تو پھر تکمیل یقین کے لئے کیوں اس کے کلام کی حاجت نہیں؟ کیا اس صریح تفاوت کو دیکھنا تمہارے دل کو ذرا بھی بیدار نہیں کرتا؟ کیا ہمارے کلام میں کوئی بھی ایسی بات نہیں کہ جو تمہارے دل پر مؤثر ہو؟ اے لوگو! اِس بات کے سمجھنے میں کچھ بھی دقّت نہیں کہ عقل انسانی مغیبات کے جاننے کا آلہ نہیں ہوسکتی۔ اور کون تم میں سے اس بات کا منکر ہوسکتا ہے کہ جو کچھ بعد فوت کے پیش آنے والا ہے وہ سب مغیبات میں ہی داخل ہے۔ مثلاً تم سوچو کہ کسی کو واقعی طور پر کیا خبر ہے کہ موت کے وقت کیونکر انسان کی جان نکلتی ہے اور کہاں جاتی ہے اور کون ہمراہ لے جاتا ہے اور کس مقام میں ٹھیرائی جاتی ہے اور پھر کیا کیا معاملہ اس پر گذرتا ہے؟ اِن سب باتوں میں عقل انسانی کیونکر قطعی فیصلہ کرسکے۔ قطعی طور پر تو انسان تب فیصلہ کرسکتا کہ جب ایک دو مرتبہ پہلے مرچکا ہوتا۔ اور وہ راہیں اُسے معلوم ہوتیں جن راہوں سے خدا تک پہنچتا تھا۔ اور وہ مقامات اُسے یاد ہوتے

جن میں ایک عرصے تک اس کی سکونت رہی تھی۔ مگر اب تو نِری اٹکلیں ہیں۔ گو ہزار احتمال نکالو موقعہ پر جا کر تو کسی عاقل نے نہ دیکھا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ایسے بے بنیاد خیالات سے آپ ہی تسلّی پکڑنا ایک طفل تسلّی ہے حقیقی تسلّی نہیں ہے۔ اگر تم محققانہ نگاہوں سے دیکھو تو آپ ہی شہادت دو کہ انسان کی عقل اور اس کا کانشنس ان سب امور کو علیٰ وجہ الیقین ہرگز دریافت نہیں کر سکتا۔ اور صحیفہ قدرت کا کوئی صفحہ ان اُمور پر یقینی دلالت نہیں کرتا۔ دُور دراز کی باتیں تو ایک طرف ہیں اوّل قدم میں ہی عقل کو حیرانی ہے کہ رُوح کیا چیز ہے اور کیونکر داخل ہوتی اور کیونکر نکلتی ہے۔ ظاہراً تو کچھ نکلتا نظر نہیں آتا اور نہ داخل ہوتا نظر آتا ہے۔ اور اگر کسی جاندار کو وقت نزع جان کے کسی شیشے میں بند کر دو تب بھی کوئی چیز نکلتی نظر نہیں آتی۔ اور اگر بند شیشہ کے اندر کسی مادہ میں کیڑے پڑ جائیں تو ان رُوحوں کے داخل ہونے کا بھی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتا۔ انڈے میں اس سے بھی زیادہ تعجب ہے۔ کس راہ سے رُوح پرواز کر کے آتی ہے۔ اور اگر بچہ اندر ہی مر جائے تو کس راہ سے نکل جاتی ہے؟ کیا کوئی عاقل اس معمّہ کو صرف اپنی ہی عقل کے زور سے کھول سکتا ہے؟ وہم جتنے چاہو دوڑاؤ مگر مجرّد عقل کے ذریعہ سے کوئی واقعی اور یقینی بات تو معلوم نہیں ہوتی۔ پھر جبکہ پہلے ہی قدم میں یہ حال ہے۔ تو پھر یہ ناقص عقل امورِ معاد میں قطعی طور پر کیا دریافت کریگی؟

(براہین احمدیہ ص ۳۱۴-۳۱۶ حاشیہ ۱۱)

اس حکیم مطلق نے انسان ضعیف البنیان کو اپنی ہی رائے اور قیاس پر چھوڑنا نہیں چاہا بلکہ جس طور کے واعظوں اور متکلموں سے اس کی تسلّی اور تشفّی ہو سکتی ہے اور اس کے جذباتِ نفسانی دَب سکتے ہیں اور اُس کی روحانی بیقراریاں دُور ہو سکتی ہیں وہ سب متکلم اس کے لئے پیدا کئے ہیں اور جس کلام سے اس کی امراض اور اعراض دُور ہو سکتی ہیں وہ کلام اس کے لئے مہیّا کیا ہے۔ یہ ثبوت ضرورتِ الہام کا کسی اور طرز سے نہیں بلکہ خدا کا ہی قانون قدرت اُسے ثابت کرتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ دنیا میں کروڑہا آدمی کہ جو معصیت میں غفلت میں گرفتار ہوتے ہیں ہمیشہ وہ دوسرے واعظ اور ناصح سے متأثر ہُوا کرتے ہیں اور ہر جگہ اپنا ہی علم اور اپنے ہی خیالات ہرگز کافی نہیں ہوتے اور ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ جس قدر متکلم کی ذاتی عظمت اور وقعت سامع کی نظر میں ثابت ہو اُسی قدر اُس کا کلام تسلّی اور تشفّی بخشتا ہے۔ اُسی شخص کا وعدہ موجب تسکینِ خاطر ہوتا ہے کہ جو سامع کی نظر میں صادق الوعد اور ایفائے وعدہ پر قادر بھی ہو۔ اس صورت میں کون اس بدیہی بات میں کلام سکتا ہے کہ امورِ معاد اور ماوراء المحسوسات میں اعلیٰ مرتبہ

تسلّی اور تشفی اور تسکینِ خاطر کا کہ جو جذباتِ نفسانی اور آلامِ رُوحانی کو دُور کرنے والا ہو صرف خدا کے کلام سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور قانونِ قدرت پر نظر ڈالنے سے اِس سے عمدہ تر موجب تسلّی و تشفی کا اور کوئی امر قرار نہیں پا سکتا۔ جب کوئی آدمی خدا کے کلام پر پورا پورا ایمان لاتا ہے اور کوئی اعراض صوری یا معنوی درمیان نہیں ہوتا تو خدا کا کلام اس کو بڑے بڑے گردابوں میں سے بچا لیتا ہے۔ اور سخت سخت جذباتِ نفسانی کا مقابلہ کرتا ہے اور بڑے بڑے پُر دہشت حادثو میں صبر بخشتا ہے۔ جب دانا انسان کی مشکل یا جذبۂ نفسانی کے وقت میں خدا کے کلام میں وعد اور وعید پاتا ہے یا کوئی دوسرا اُسے سمجھاتا ہے کہ خدا نے ایسا فرمایا ہے تو ایکبارگی اُس سے ایسا متأثر ہو جاتا ہے کہ توبہ پر توبہ کرتا ہے۔ انسان کو خدا کی طرف سے تسلّی پانے کی بڑی بڑی حاجتیں پڑتی ہیں۔ بسا اوقات وہ ایسی سخت مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ اگر خدا کا کلام آیا نہ ہوتا اور اُس کو اپنی اس بشارت سے مطلع نہ کرتا ولنبلونّکم بشيءٍ من الخوف والجوع ونقص مّن الاموال والانفس والثّمرات۔ وبشّر الصابرین۔ الّذین اذا اصابتھم مصیبۃٌ قالوا انّا لِلّٰہ وانّا الیہ راجعون۔ اولٰئک علیھم صلوات من ربّھم ورحمۃٌ واولٰئک ھم المھتدون۔ تو وہ بے حوصلہ ہو کر شائد خدا کے وجود سے ہی انکار کرتا اور یا ناامیدی کی حالت میں خدا سے بکلی رابطہ توڑ دیتا اور یا غموں کے صدمے سے ہلاک ہو جاتا۔ اِسی طرح جذبات نفسانی ایسے ہیں کہ جن کی کسر توڑ ان کے لئے خدا کے کلام کی ضرورت تھی اور قدم قدم میں انسان کو وہ امور پیش آتے ہیں جن کا تدارک صرف خدا کا کلام کر سکتا ہے۔ جب انسان خدا کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہے تو صدہا موانع اُس کو اس توجہ سے روکتے ہیں۔ کبھی اس دنیا کی لذّت یاد ہوتی ہے کبھی ہم مشربوں کی صحبت دامن کھینچتی ہے۔ کبھی اِس راہ کی تکالیف ڈراتی ہیں۔ کبھی قدیمی عادات اور ملکات راسخہ سنگ راہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ننگ کبھی نام کبھی ریاست کبھی حکومت اس راہ سے روکنا چاہتی ہے اور کبھی یہ سارے ایک لشکر کی طرح ایک جگہ فراہم ہو کر اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور اپنے فوائد نقد کی خوبیاں پیش کرتے ہیں پس ان کے اتفاق اور اژدہام میں ایک ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ خیالات خود تراشیدہ ان کی مدافعت نہیں کر سکتے بلکہ ایک دم بھی اُن کے مقابلہ پر ٹھہر نہیں سکتے۔ ایسے جنگ کے موقعہ میں خدا کے کلام کی پُر زور بندوقیں درکار ہیں کہ تا مخالف کی صف کو ایک ہی فیر میں اڑا دیں۔ کیا کوئی کام یک طرفہ بھی ہو سکتا ہے۔ پس یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا ایک پتھر کی طرح

ہمیشہ خاموش رہے اور بندہ وفاداری میں صدق میں صبر میں خود بخود بڑھتا جائے اور صرف یہی ایک خیال کہ آسمان اور زمین کا البتہ کوئی خالق ہوگا اُس کو ہمیشہ کی قوت دے کر عشق کے میدانوں میں آگے سے آگے کھینچتا چلا جائے۔ خیالی باتیں واقعی باتوں کی ہرگز قائم مقام نہیں ہوسکتیں۔ اور نہ کبھی ہوئیں۔ مثلاً ایک مفلس قرضدار نے کسی راستباز دولتمند سے وعدہ پایا ہے کہ عین وقت پر مَیں تیرا کل قرضہ ادا کر دونگا۔ اور دوسرا ایک اور مفلس قرضدار ہے اُس کو کسی نے اپنی زبان سے وعدہ نہیں دیا وہ اپنے ہی خیالات دوڑاتا ہے کہ شاید مجھ کو بھی وقت پر روپیہ مل جائے۔ کیا تسلّی پانے میں یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؛ ہرگز نہیں ہرگز نہیں یہ سب قوانین قدرت ہی ہیں۔ قوانین قدرت سے کونسی حقانی صداقت باہر ہے۔ پھر افسوس ان لوگوں پر کہ جو قوانینِ قدرت کی پابندی کا دعوٰی کرتے کرتے پھر انہیں توڑ کر دوسری طرف بھاگ گئے اور جو کچھ کہا تھا اُس کے برعکس عمل میں لائے۔

(براہین احمدیہ ص ۳۱۸-۳۲۰ حاشیہ ۱۱)

نہ معلوم آپ لوگوں کو کس نے بہکا دیا کہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ گویا عقل اور الہام میں کسی قدر باہم تناقض ہے جس کے باعث وہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ خدا تمہاری آنکھیں کھولے اور تمہارے دلوں کے پردے اُٹھا دے۔ کیا تم اس آسان بات کو سمجھ نہیں سکتے کہ جس حالت میں الہام کی طفیل سے عقل اپنے کمال کو پہنچتی ہے اپنی غلطیوں پر متنبہ ہوتی ہے اپنی راہِ مقصود کی سمتِ خاص کو دریافت کرلیتی ہے۔ آوارہ گردی اور سرگردانی سے چھوٹ جاتی ہے اور ناحق کی محنتوں اور بیہودہ مشقتوں اور بے فائدہ جان کنی سے رہائی پاتی ہے اور اپنے مشتبہ اور مظنون علم کو یقینی اور قطعی کرلیتی ہے اور مجرّد اٹکلوں سے آگے بڑھ کر واقعی وجود پر مطلع ہوجاتی ہے، تسلّی پکڑتی ہے آرام اور اطمینان پاتی ہے تو پھر اس صورت میں الہام اس کا محسن و مددگار اور مربّی ہُوا یا اس کا دشمن اور مخالف اور ضرر رساں ہوا۔ یہ کس قسم کا تعصب اور کس نوع کی نابینائی ہے کہ جو ہر ایک بزرگ مربّی کو جو صریح رہبری اور رہنمائی کا کام دے رہا ہے راہزن اور مزاحم تصوّر کیا جاتا ہے اور جو گڑھے سے باہر نکالتا ہے اس کو گڑھے کے اندر دھکیلنے والا سمجھ رہے ہیں۔ سارا جہان جانتا ہے اور تمام آنکھوں والے دیکھ رہے ہیں اور غور کرنے والی طبیعتیں مشاہدہ کر رہی ہیں کہ دنیا میں عقل کی خوبی اور عظمت کو ماننے والے لاکھوں ایسے ہوگذرے ہیں اور اب بھی ہیں کہ جو باوجود اس کے کہ عقل کے پیغمبر پر ایمان لائے

اور عاقل کہلائے اور عقل کو عمدہ چیز اور اپنا رہبر سمجھتے تھے مگر بایں ہمہ خدا کے وجود سے منکر ہی رہے اور منکر ہی مرے۔ لیکن ایسا آدمی کوئی تو دکھلاؤ کہ جو الہام پر ایمان لاکر پھر بھی خدا کے وجود سے انکاری رہا۔ پس جس حالت میں خدا پر محکم ایمان لانے کے لئے الہام ہی شرط ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جس جگہ شرط مفقود ہوگی اُس جگہ مشروط بھی ساتھ ہی مفقود ہوگا۔ سو اب بدیہی طور پر ثابت ہے کہ جو لوگ الہام سے منکر ہو بیٹھے ہیں انہوں نے دیدہ و دانستہ بے ایمانی کی راہوں سے پیار کیا ہے۔ اور دہریہ مذہب کے پھیلنے اور شائع ہو جانے کو روا رکھا ہے۔ یہ نادان نہیں سوچتے کہ جو وجود غیب الغیب ہے نہ دیکھنے میں آسکتا ہے نہ سونگھنے میں۔ نہ ٹٹولنے میں۔ اگر قوتِ سامعہ بھی اس ذات کامل کے کلام سے محروم اور بے خبر ہو تو پھر اس ناپیدا وجود پر کیونکر یقین آوے۔ اور اگر مصنوعات کے ملاحظہ سے صانع کا کچھ خیال بھی دل میں نہ آیا لیکن جب طالب حق نے مدت العمر کوشش کرکے نہ کبھی اس صانع کو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ کبھی اس کے کلام پر مطلع ہوا نہ کبھی اُس کی نسبت کوئی ایسا نشان پایا کہ جو جیتے جاگتے میں ہونا چاہیئے تو کیا آخر اس کو یہ وسوسہ نہیں گذرے گا کہ شائد میری فکر نے ایسے صانع کے قرار دینے میں غلطی کی ہو اور شائد دہریہ اور طبیعیہ ہی سچے ہوں کہ جو عالم کی بعض اجزاء کو بعض کا صانع قرار دیتے ہیں اور کسی دوسرے صانع کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مَیں جانتا ہوں کہ جب نرا عقل پرست اِس باب میں اپنے خیال کو آگے سے آگے دوڑائیگا تو وسوسہ مذکورہ ضرور اس کے دل کو پکڑ لے گا۔ کیونکہ ممکن نہیں کہ وہ خدا کے ذاتی نشان سے باوجود سخت جستجو اور تگاپو کے ناکام رہ کر پھر ایسے وساوس سے بچ جائے۔ وجہ یہ کہ انسان میں یہ فطرتی اور طبعی عادت ہے کہ جس چیز کے وجود کو قیاسی قرائن سے واجب اور ضروری سمجھے اور پھر باوجود نہایت تلاش اور پرلے درجہ کی جستجو کے خارج میں اس چیز کا کچھ پتہ نہ لگے تو اپنے قیاس کی صحت میں اس کو شک بلکہ انکار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس قیاس کے مخالف اور منافی سینکڑوں احتمال دل میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ بارہا ہم تم ایک مخفی امر کی نسبت قیاس دوڑایا کرتے ہیں کہ یوں ہوگا یا ووں ہوگا اور جب بات کھلتی ہے تو وہ اَور ہی ہوتی ہے۔ انہی روزمرّہ کے تجارب نے انسان کو یہ سبق دیا ہے کہ مجرد قیاسوں پر طمانیت کرکے بیٹھنا کمال نادانی ہے۔ غرض جب تک قیاس اٹکلوں کے ساتھ خبر واقعہ نہ ملے تب تک ساری نمائش عقل کی ایک سراب ہے اس سے زیادہ نہیں جس کا آخری نتیجہ دہریہ پن ہے

سو اگر دہریہ بننے کا ارادہ ہے تو تمہاری خوشی۔ ورنہ وساوس کے تند سیلاب سے کہ جو تم سے بہتر ہزارہا عقلمندوں کو اپنی ایک ہی موج سے تحت الثریٰ کی طرف لے گیا ہے صرف اسی حالت میں تم بچ سکتے ہو کہ جب عروہ وثقیٰ الہامِ حقیقی کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ ورنہ یہ تو ہرگز نہیں ہوگا کہ تم مجرّد خیالاتِ عقلیہ میں ترقی کرتے کرتے آخر خدا کو کسی جگہ بیٹھا ہوا دیکھ لوگے بلکہ تمہارے خیالات کی ترقی کا اگر کچھ انجام ہوگا تو بالآخر یہی انجام ہوگا کہ تم خدا کو بے نشان پاکر اور زندوں کی علامات سے خالی دیکھ کر اور اُس کے سُراغ لگانے سے عاجز اور درماندہ رہ کر اپنے دہریہ بھائیوں سے ہاتھ جا ملاؤ گے۔

(براہین احمدیہ صـ ۳۲۲ - ۳۲۴ حاشیہ ۱۱)

وسوسہ ششم ۔ معرفت کاملہ کا ذریعہ وہ چیز ہو سکتی ہے جو ہر وقت اور ہر زمانہ میں کھلے طور پر نظر آتی ہو۔ سو یہ صحیفۂ نیچر کی خاصیت ہے جو کبھی بند نہیں ہوتا اور ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور یہی رہبر ہونے کے لائق ہے۔ کیونکہ ایسی چیز کبھی رہنما نہیں ہو سکتی جس کا دروازہ اکثر اوقات بند رہتا ہو اور کسی خاص زمانہ میں کھلتا ہو۔

جواب ۔ صحیفۂ فطرت کو بمقابلہ کلام الٰہی کھلا ہوا خیال کرنا یہی آنکھوں کے بند ہونے کی نشانی ہے۔ جن کی بصیرت اور بصارت میں کچھ خلل نہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اسی کتاب کو کُھلے ہوئے کہا جاتا ہے جس کی تحریر صاف نظر آتی ہو جس کے پڑھنے میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہتا ہو۔ پر کون ثابت کر سکتا ہے کہ مجرد صحیفۂ قدرت پر نظر کرنے سے کبھی کسی کا اشتباہ دُور ہُوا؟ کس کو معلوم ہے کہ اس نیچری تحریر نے کبھی کسی کو منزل مقصود تک پہنچایا ہے؟ کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ مَیں نے صحیفۂ قدرت کے تمام دلالات کو بخوبی سمجھ لیا ہے؟ اگر یہ صحیفہ کھلا ہُوا ہوتا تو جو لوگ اسی پر بھروسہ کرتے تھے وہ کیوں ہزارہا غلطیوں میں ڈوبتے۔ کیوں اسی ایک صحیفہ کو پڑھ کر باہم اس قدر مختلف الرائے ہو جاتے کہ کوئی خدا کے وجود کا کسی قدر قائل اور کوئی سرے سے انکاری؟ ہم نے بفرضِ محال یہ بھی تسلیم کیا کہ جس نے اس صحیفہ کو پڑھ کر خدا کے وجود کو ضروری نہیں سمجھا وہ اس قدر عمر پالیگا کہ کبھی نہ کبھی اپنی غلطی پر متنبّہ ہو جائے گا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ اگر یہ صحیفہ کھلا ہُوا تھا تو اس کو دیکھ کر ایسی بڑی بڑی غلطیاں کیوں پڑ گئیں؟ کیا آپ کے نزدیک کھلی ہوئی کتاب اسی کو کہتے ہیں جس کو پڑھنے والے خدا کے وجود میں ہی اختلاف کریں اور بسم اللہ ہی غلط ہو۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اسی صحیفۂ فطرت کو پڑھ کر ہزارہا حکیم اور فلاسفر دہریے اور طبعی ہو کر

مرے یا بُتوں کے آگے ہاتھ جوڑتے رہے۔ اور وہی شخص اُن میں سے راہ راست پر آیا جو الہام الٰہی پر ایمان لایا۔ کیا اِس میں کچھ جھوٹ بھی ہے کہ فقط اس صحیفہ کے پڑھنے والے بڑے بڑے فیلسوف کہلا کر پھر خدا کے مدبّر بالارادہ اور عالم جزئیات ہونے سے منکر رہے اور انکار ہی کی حالت میں مر گئے۔ کیا خدا نے تم کو اِسقدر بھی سمجھ نہیں دی کہ جس خط کے مضمون کو مثلاً زید کچھ سمجھے اور بکر کچھ خیال کرے اور خالد ان دونوں کے برخلاف کچھ اور تصوّر کر بیٹھے تو خط کی تحریر کھلی ہوئی اور صاف نہیں کہلاتی بلکہ مشکوک اور مشتبہ اور مبہم کہلاتی ہے۔ یہ کوئی ایسی دقیق بات نہیں جس کے سمجھنے کے لئے باریک عقل درکار ہو بلکہ نہایت بدیہی صداقت ہے مگر ان کا کیا علاج جو سراسر تحکم کی راہ سے ظلمت کو نور اور نور کو ظلمت قرار دیں اور دن کو رات اور رات کو دن ٹھہرا دیں۔ ایک بچّہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ مطالب دلی کو پورا پورا بیان کرنے کیلئے یہی سیدھا راستہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے کہ بذریعہ قول واضح کے اپنا مافی الضمیر ظاہر کیا جائے کیونکہ دلی ارادوں کو ظاہر کرنے کے لئے صرف قوتِ نطقیہ آلہ ہے اِسی آلہ کے ذریعہ سے ایک انسان دوسرے انسان کے مافی القلب سے مطلع ہوتا ہے۔ اور ہر ایک امر جو اس آلہ کے ذریعہ سے سمجھایا نہ جائے وہ تفہیم کامل کے درجہ سے متنزل رہتا ہے۔ ہزارہا امور ایسے ہیں کہ اگر ہم اُن میں فطرتی دلالت سے مطلب نکالنا چاہیں تو یہ امر ہمارے لئے غیر ممکن ہو جاتا ہے اور اگر فکر بھی کریں تو غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ مثلاً ظاہر ہے کہ خدا نے آنکھ دیکھنے کے لئے بنائی ہے اور کان سُننے کے لئے پیدا کئے ہیں۔ زبان بولنے کے لئے عطا کی ہے۔ اِس قدر تو ہم نے اِن اعضاء کی فطرت پر نظر کر کے اور ان کے خواص کو سوچ کر معلوم کر لیا لیکن اگر ہم اِسی فطرتی دلالت پر کفایت کریں اور تصریحاتِ کلام الٰہی کی طرف متوجہ نہ ہوں تو بموجب دلالتِ فطرتی ہمارا یہ اصول ہونا چاہیئے کہ ہم جس چیز کو چاہیں بلا تفریق مواضع حِلّت و حرمت دیکھ لیا کریں۔ اور جو چاہیں سُن لیں۔ اور جو بات دل میں آوے بول اٹھیں۔ کیونکہ قانون فطرت ہم کو اس قدر سمجھاتا ہے کہ آنکھ دیکھنے کے لئے کان سُننے کے لئے زبان بولنے کے لئے مخلوق ہے اور ہم کو صریح اس دھوکے میں ڈالتا ہے کہ گویا ہم قوتِ بصارت اور قوتِ سمع اور قوتِ نطق کے استعمال کرنے میں بکلّی آزاد اور مطلق العنان ہیں۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اگر خدا کا کلام قانونِ قدرت کے اجمال کی تصریح نہ کرے اور اس کے ابہام کو اپنے بیان واضح اور کھلی ہوئی تقریر سے دور نہ فرماوے تو کس قدر خطرات ہیں جو محض قانون فطرت کا تابعدار ہو کر اُن میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

یہ خدا ہی کا کلام ہے جس نے اپنے کھلے ہوئے اور نہایت واضح بیان سے ہم کو ہمارے ہر ایک قول اور فعل اور حرکت اور سکون میں حدودِ معیّنہ مشخصّہ پر قائم کیا اور ادب انسانیت اور پاک روشنی کا طریقہ سکھلایا۔ وہی ہے جس نے آنکھ اور کان اور زبان وغیرہ اعضاء کی محافظت کے لئے بکمال تاکید فرمایا۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ الجزو نمبر ۱۸۔ یعنی مومنوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی آنکھوں کو کانوں اور ستر گاہوں کو نامحرموں سے بچاویں اور ہر ایک نادیدنی اور ناشنیدنی اور ناکردنی سے پرہیز کریں کہ یہ طریقہ اُن کی اندرونی پاکی کا موجب ہوگا۔ یعنی ان کے دل طرح طرح کے جذبات نفسانیہ سے محفوظ رہیں گے کیونکہ اکثر نفسانی جذبات کو حرکت دینے والے اور قوائے بہیمیّہ کو فتنہ میں ڈالنے والے یہی اعضاء ہیں۔ اب دیکھیئے کہ قرآن شریف نے نامحرموں سے بچنے کے لئے کیسی تاکید فرمائی اور کیسے کھول کر بیان کیا کہ ایمان دار لوگ اپنی آنکھوں اور کانوں اور ستر گاہوں کو ضبط میں رکھیں اور ناپاکی کے مواضع سے روکتے رہیں۔ اسی طرح زبان کو صدق و صواب پر قائم رکھنے کے لئے تاکید فرمائی اور کہا۔ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا الجزو نمبر ۲۲۔ یعنی وہ بات مُنہ پر لاؤ جو بالکل راست اور نہایت معقولیت میں ہو۔ اور لغو اور فضول اور جھوٹ کا اس میں سرِ مُو دخل نہ ہو۔ اور پھر جمیع اعضاء کی وضع استقامت پر چلانے کے لئے ایک ایسا کلمہ جامع اور پُر تہدید بطور تنبیہہ و انذار فرمایا جو غافلوں کو متنبّہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور کہا اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ الجزو نمبر ۱۵۔ یعنی کان اور آنکھ اور دل اور ایسا ہی تمام اعضاء اور قوتیں جو انسان میں موجود ہیں ان سب کے غیر محل استعمال کرنے سے باز پُرس ہوگی۔ اور ہر ایک کمی و بیشی اور افراط اور تفریط کے بارے میں سوال کیا جائیگا۔ اب دیکھو تمام اعضاء اور تمام قوتوں کو مجریٰ خیر اور صلاحیت پر چلانے کے لئے کس قدر تصریحات و تاکیدات خدا کے کلام میں موجود ہیں۔ اور کیسے ہر ایک عضو کو مرکزِ اعتدال اور خطِ استوا پر قائم رکھنے کے لئے بکمال وضاحت بیان فرمایا گیا ہے جس میں کسی نوع کا ابہام و اجمال باقی نہیں رہا۔ کیا یہ تصریح و تفصیل صحیفۂ قدرت کے کسی صفحہ کو پڑھ کر معلوم ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ سو اب تم آپ ہی سوچو کہ کھلا ہُوا اور واضح صحیفہ یہ ہے یا وہ۔ اور فطرتی دلالتوں کے مصالحہ اور حدود کو اُس نے بیان کیا یا اِس نے۔ اے حضرات! اگر اشارات سے کام نکلتا تو پھر انسان کو زبان کیوں دی جاتی؟ جس نے تم کو زبان دی کیا وہ آپ نطق پر قادر نہیں؟ جس نے تم کو بولنا سکھایا کیا وہ آپ بول نہیں سکتا؟ جس نے اپنے فعل میں یہ قدرت دکھلائی کہ اتنا بڑا عالم بغیر مدد کسی مادہ ہیولیٰ کے اور بغیر احتیاج

معماروں اور مزدوروں اور نجاروں کے بمجرد ارادہ سب کچھ بنا ڈالا کیا اُس کی نسبت یہ کہنا جائز ہے کہ وہ بات کرنے پر قادر نہیں؟ یا قادر تو ہے مگر بباعث بُخل کے اپنے کلام کے فیضان سے محروم رکھا؟ کیا درست ہے کہ قادرِ مطلق کی نسبت ایسا خیال کیا جائے کہ وہ اپنی طاقتوں میں حیوانات سے بھی فروتر ہے؟ کیونکہ ایک ادنیٰ جانور بذریعہ اپنی آواز کے دوسرے جانور کو یقینی طور پر اپنے وجود کی خبر دے سکتا ہے۔ ایک مکھی بھی اپنی طنین سے دوسری مکھیوں کو اپنے آنے سے آگاہ کر سکتی ہے پر نعوذ باللہ بقول تمہارے اُس قادر مطلق میں ایک مکھی جتنی بھی قدرت نہیں۔ پھر جب اُس کی نسبت تمہارا صاف بیان ہے کہ اُس کا مُنہ کبھی نہیں کھلا اور کبھی اس کو بولنے کی طاقت نہیں ہوئی تو تم کو تو یہ کہنا چاہیئے کہ وہ ادھورا اور ناقص ہے جس کی اور صفتیں تو معلوم ہوگئیں پر صفت گویائی کا کبھی پتہ نہ ملا۔ اُس کی نسبت تم کس مُنہ سے کہہ سکتے ہو کہ اُس نے کوئی کھلا ہوا صحیفہ جس میں اُس نے بخوبی اپنا مافی الضمیر ظاہر کر دیا ہو تم کو عطا کیا ہے۔ بلکہ تمہاری رائے کا تو خلاصہ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ سے رہنمائی میں کچھ نہیں ہو سکا تمہیں نے اپنی قابلیت اور لیاقت سے شناخت کر لیا۔ ماسوا اسکے الہامی تعلیم ان معنوں کو کر کے کھلی ہوئی ہے کہ اُس کا اثر عام طور پر تمام لوگوں کے دلوں پر پڑتا ہے اور ہر ایک کی طبیعت اس سے مستفیض ہوتی ہے اور مختلف اقسام کی فطرتیں اس سے نفع اٹھاتی ہیں اور ہر رنگ کے طالب کو اس سے مدد پہنچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بذریعہ کلام الٰہی بہت لوگ ہدایت یاب ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں اور بذریعہ مجرّد عقلی دلائل کے بہت ہی کم بلکہ کالعدم۔ اور قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ کیونکہ یہ بات نہایت ظاہر ہے کہ جو شخص بہ حیثیت مخبرِ صادق لوگوں کی نظر میں ثابت ہو کر واقعات معاد میں اپنا تجربہ اور امتحان اور ملاحظہ اور معائنہ بیان کرتا ہے اور ساتھ ہی دلائل عقلیہ بھی سمجھاتا ہے وہ حقیقت میں ایک دوہرا زور اپنے پاس رکھتا ہے۔ کیونکہ ایک تو اس کی نسبت یہ یقین کیا گیا ہے وہ واقعہ نفس الامر کا معائنہ کرنے والا اور سچائی کو بچشم خود دیکھنے والا ہے اور دوسرے وہ بطور معقول بھی سچائی کی روشنی کو دلائل واضحہ سے ظاہر کرتا ہے۔ پس ان دونوں ثبوتوں کے اشتمال سے ایک زبردست کشش اس کے وعظ اور نصیحت میں ہو جاتی ہے کہ جو بڑے بڑے سنگین دلوں کو کھینچ لاتی ہے اور ہر نوع کے نفس پر کارگر بھی پڑتی ہے کیونکہ اس کی بات میں مختلف طور کی تفہیم کی قدرت ہوتی ہے جس کے سمجھنے کے لئے ایک خاص لیاقت کے لوگ شرط نہیں ہیں بلکہ ہر ایک ادنےٰ و اعلےٰ و زیرک و غبی بجز ایسے شخص کے کہ جو بکلّی مسلوب العقل ہو۔ اس کی تقریروں کو سمجھ

سکتے ہیں اور وہ فوراً ہر ایک قسم کے آدمی کی اُسی پر تسلّی کر سکتا ہے کہ جس طور پر اس آدمی کی طبیعت واقعہ ہے یا جس درجہ پر اس کی استعداد پڑی ہوئی ہے۔ اس لئے کلام اُس کی خدا کی طرف خیالات کو کھینچنے میں اور دنیا کی محبت چھڑانے میں اور احوال الآخرت نقشِ دل کرنے میں بڑی وسیع قدرت رکھتی ہے اور اُن تنگ اور تاریک تصوّروں میں محدود نہیں ہوتی جن میں مجرّدِ عقل پرستوں کی باتیں محدود ہوتی ہیں۔ اِسی جہت سے اس کا اثر عام اور اس کا فائدہ تام ہوتا ہے۔ اور ہر ایک ظرف اپنی اپنی وسعت کے مطابق اس سے پُر ہو جاتا ہے۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ مقدس میں اشارہ فرمایا ہے۔ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا الجزو نمبر ۱۳۔ خدا نے آسمان سے پانی (اپنا کلام) اُتارا۔ سو اس پانی سے ہر ایک وادی اپنی قدر کے موافق بہ نکلی۔ یعنی ہر ایک کو اس میں سے اپنی طبیعت اور خیال اور لیاقت کے موافق حصّہ ملا طبائع عالیہ اسرارِ حکمیہ سے متمتّع ہوئیں اور جو اُن سے بھی اعلیٰ تھے انہوں نے ایک عجیب روشنی پائی کہ جو حدّ تحریر وتقریر سے خارج ہے اور جو کم درجہ پر تھے انہوں نے مخبر صادق کی عظمت اور کمالیتِ ذاتی کو دیکھ کر دلی اعتقاد سے اس کی خبروں پر یقین کر لیا اور اس طرح پر وہ بھی یقین کی کشتی میں بیٹھ کر ساحل نجات تک جا پہنچے۔ اور صرف وہی لوگ باہر رہ گئے جن کو خدا سے کچھ غرض نہ تھی اور فقط دنیا کے ہی کیڑے تھے۔ اور نیز قوتِ اثر پر نظر کرنے سے بھی طریق متابعتِ الہام کا نہایت کھلا ہُوا اور وسیع معلوم ہوتا ہے کیونکہ جاننے والے اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ تقریر میں اُسی قدر برکت اور جوش اور قوت اور عظمت اور دلکشی پیدا ہوتی ہے کہ جس قدر متکلّم کا قدم مدارجِ یقین اور اخلاص اور وفاداری کے اعلیٰ درجے پر پہنچا ہُوا ہوتا ہے۔ سو یہ کمالیت بھی اُسی شخص کی تقریر میں متحقّق ہو سکتی ہے کہ جس کو دوہرے طور پر معرفتِ الٰہی حاصل ہو۔ اور یہ خود ہر ایک عاقل پر روشن ہے کہ پُر جوش تقریر کہ جس پر ترتیبِ اثر موقوف ہے تب ہی انسان کے مُونہہ سے نکلتی ہے کہ جب دل اس کا یقین کے جوش سے پُر ہو اور وہی باتیں دلوں پر بیٹھتی ہیں جو کامل الیقین دلوں سے جوش مار کر نکلتی ہیں۔ پس اس جگہ بھی یہی ثابت ہُوا کہ باعتبار شدّتِ اثر بھی الہامی تربیت ہی مُتفتّح الابواب ہے۔ غرض باعتبار عمومیّت تاثیر اور باعتبار شدّت تاثیر فقط صحیفۂ وحی کا کھلا ہُوا ہونا بپایۂ ثبوت پہنچتا ہے وبس۔ اور یہ مسئلہ بدیہات سے کچھ کم نہیں ہے کہ خدا کے بندوں کو زیادہ تر نفع پہنچانے والا وہی شخص ہوتا ہے کہ جو الہام اور عقل کا جامع ہو اور اُس میں یہ لیاقت ہوتی ہے کہ ہر ایک طور کی طبیعت اور ہر قسم کی فطرت اُس سے مستفیض

ہو سکے۔ مگر جو شخص صرف براہینِ منطقیہ کے زور سے راہ راست کی طرف کھینچنا چاہتا ہے اگر اُسکی مغززنی پر کچھ ترتیب اثر بھی ہو تو صرف اُنہی خاص طبیعتوں پر ہوگا کہ جو بوجہ تعلیم یافتہ و لائق و فائق ہونے کے اس کی عمیق و دقیق باتوں کو سمجھتے ہیں۔ دوسرے تو ایسا دل و دماغ ہی نہیں رکھتے کہ جو اُس کی فلاسفری تقریر کو سمجھ سکیں۔ ناچار اس کے علم کا فیضان فقط اُنہیں قدر قلیل لوگوں میں محدود رہتا ہے کہ جو اس کی منطق سے واقف ہیں۔ اور اُنہیں اُس کا فائدہ پہنچتا ہے کہ جو اس کی طرح معقول بحثوں میں دخل رکھتے ہیں۔ اس امر کا ثبوت اُس حالت میں بوضاحتِ تمام ہو سکتا ہے کہ جب مجرّدِ عقل اور الہام حقیقی کی کارروائیوں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر وزن کیا جاوے۔ چنانچہ جن کو گذشتہ حکماء کے حالات سے اطلاع ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کیسے وہ لوگ اپنی تعلیم کی اشاعت عامہ سے ناکام رہے۔ اور کیونکر اُن کے منقبض اور ناتمام بیان نے عام دلوں پر مؤثر ہونے سے اپنی محرومی دکھلائی۔ اور پھر بمقابلہ اس حالتِ متنزلہ اُن کی کے قرآن شریف کی اعلیٰ درجے کی تاثیروں کو بھی دیکھیے کہ کس قوت سے اُس نے وحدانیتِ الٰہی کو اپنے سچے متبعین کے دلوں میں بھرا ہے اور کس عجیب طور سے اُس کی عالی شان تعلیموں نے صدہا سالوں کی عادات راسخہ اور ملکاتِ ردّیہ کا قلع و قمع کر کے اور ایسی رسومِ قدیمہ کو کہ جو طبیعتِ ثانی کی طرح ہو گئی تھیں دلوں کے رگ و ریشہ سے اٹھا کر وحدانیت الٰہی کا شربتِ عذب کروڑہا لوگوں کو پلا دیا ہے۔ وہی ہے جس نے اپنا کار نمایاں اور نہایت عمدہ اور دیرپا نتائج دکھلا کر اپنی بے نظیر تاثیر کی دوبدو شہادت سے بڑے بڑے معاندوں سے اپنی لاثانی فضیلتوں کا اقرار کرایا۔ یہاں تک کہ سخت بے ایمانوں اور سرکشوں کے دلوں پر بھی اس کا اس قدر اثر پڑا کہ جس کو انہوں نے قرآن شریف کی عظمتِ شان کا ایک ثبوت سمجھا اور بے ایمانی پر اصرار کرتے کرتے آخر اس قدر انہیں بھی کہنا پڑا کہ ان ھٰذا الّا سحرٌ مبین جزو نمبر ۲۳۔ ہاں وہی ہے جس کی زبردست کششوں نے ہزارہا درجہ عادت سے بڑھ کر ایسا خدا کی طرف خیال دلایا کہ لاکھوں خدا کے بندوں نے خدا کی وحدانیت پر اپنے خون سے مُہریں لگا دیں۔ ایسا ہی ہمیشہ سے بانیٔ کار اور ہادی اس کام کا الہام ہی چلا آیا ہے جس سے انسانی عقل نے نشو و نما پایا۔ ورنہ بڑے بڑے حکیموں اور عقلمندوں کے لئے بھی یہ بات سخت محال رہی ہے کہ اُن کو اُمور ماوراء المحسوسات کی ہر جزئی دریافت کرنے میں ایسا موقعہ ہمیشہ مل جائے کہ یہ بات معلوم کر سکیں کہ کس کس وضع اور خصوصیّت سے وہ جزئیات موجود ہیں اور جن کو طاقتِ بشری تک عقل حاصل ہی نہیں

باجہد اور کوشش کرنے کے سامان میسر نہیں آئے وہ تو اُن کی نسبت بھی زیادہ لاعلم اور بے خبر ہیں۔

پس اس بارے میں جو جو سہولتیں خدا کے سچے اور کامل الہام نے کہ جو قرآن شریف ہے عقل کو عطا کی ہیں۔ اور جن جن سرگردانیوں سے فکر اور نظر کو بچایا ہے۔ وہ ایک ایسا امر ہے کہ جس کا ہر ایک عاقل کو شکر کرنا لازم ہے۔ سو کیا اس اعتبار سے کہ ابتداء امر خداشناسی کی الہام ہی کے ذریعہ سے ہوئی ہے اور کیا اس وجہ سے کہ معرفت الٰہی کا ہمیشہ از سر نو زندہ ہونا الہام ہی کے ہاتھ سے ہوتا آیا ہے۔ اور کیا اس خیال سے کہ مشکلات راہ سے رہائی پانا الہام ہی کی امداد پر منحصر ہے۔ ہر عاقل کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ راہ جو نہایت صاف اور سیدھی اور ہمیشہ سے کھلی ہوئی اور مقصود تک پہنچاتی ہوئی چلی آئی ہے وہ وحیٔ ربّانی ہے۔ اور یہ سمجھنا کہ وہ کھلا ہوا صحیفہ نہیں محض لاطائل اور سراسر حُمق ہے۔ علاوہ برآں ہم پہلے اِس برہمو سماج والوں کی خداشناسی کے بارہ میں بہ تفصیل لکھ چکے ہیں کہ ایمان اُن کا جو صرف دلائل عقلیہ پر مبنی ہے ہونا چاہیئے کے مرتبہ تک محدود ہے اور مرتبہ کاملہ ہے کا انہیں نصیب نہیں۔ سو اس تحقیقات سے بھی یہی ثابت ہے کہ کھلا ہوا اور واضح راستہ معرفتِ الٰہی کا صرف بذریعہ کلام الٰہی ملتا ہے۔ اور کوئی ذریعہ اس کے وصول و حصول کا نہیں۔ ایک بچّہ نوزاد کو تعلیم سے محروم رکھ کر صرف صحیفۂ فطرت پر چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ وہ اس صحیفہ کے ذریعہ سے جس کو برہمو سماج والے کھلا ہوا خیال کر رہے ہیں کونسی معرفت حاصل کر لیتا ہے اور کس درجہ خداشناسی پر پہنچ جاتا ہے بہت سے تجارب سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اگر کوئی سماعی طور پر جس کا اصل الہام ہے خدا کے وجود سے اطلاع نہ پاوے تو پھر اُس کو کچھ پتہ نہیں لگتا کہ اس عالم کا کوئی صانع ہے یا نہیں۔ اور اگر کچھ صانع کی تلاش میں توجہ بھی کرے تو صرف بعض مخلوقات جیسے پانی۔ آگ۔ چاند سورج وغیرہ کو اپنی نظر میں خالق اور قابلِ پرستش قرار دے لیتا ہے۔ جیسا یہ امر جنگلی آدمیوں پر نظر کرنے سے ہمیشہ بہ پایۂ تصدیق پہنچتا رہا ہے۔ پس یہ الہام ہی کا فیض ہے جس کی برکتوں سے انسان نے اُس خدائے بے مثل و مانند کو اسی طرح پر شناخت کر لیا جیسا اس کی ذاتِ کامل و بے عیب کے لائق ہے۔ اور جو لوگ الہام سے بے خبر ہو گئے اور کوئی کتاب الہامی اُن میں موجود نہ رہی اور نہ کوئی ذریعہ الہام پر اطلاع پانے کا اُن کو میسّر آیا باوجود اس کے کہ آنکھیں بھی رکھتے تھے اور دل بھی۔ مگر کچھ بھی معرفتِ الٰہی اُن کو نصیب نہ ہوئی۔ بلکہ رفتہ رفتہ انسانیت سے بھی باہر ہو گئے اور قریب قریب حیواناتِ لایعقل کے پہنچ گئے اور صحیفۂ فطرت نے کچھ بھی اُنکو فائدہ نہ پہنچایا۔ پس ظاہر ہے کہ اگر وہ صحیفہ کھلا ہوا ہوتا تو اس سے جنگلی لوگ فائدہ اٹھا کر

معرفت اور خدا شناسی میں ان لوگوں کے برابر ہو جاتے جنہوں نے بذریعہ الہام الٰہی خدا شناسی میں ترقی کی۔ پس صحیفۂ فطرت کے بند ہونے میں اس سے زیادہ تر اور کیا ثبوت ہوگا کہ جس کسی کا کام صرف اسی صحیفہ سے پڑا اور الہام الٰہی کا اُس نے کبھی نام نہ سُنا۔ وہ خدا کی شناخت سے بالکل محروم بلکہ انسانیت کے آداب سے بھی دُور اور مہجور رہا۔ اور اگر صحیفۂ فطرت کے کھلے ہوئے ہونے سے یہ مطلب ہے کہ وہ جسمانی طور پر نظر آتا ہے تو یہ بے سود خیال ہے جس کو بحث ہذا سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ جس حالت میں کوئی شخص صرف اس صحیفۂ فطرت پر نظر کرکے کوئی فائدہ علمِ دین کا اٹھا نہیں سکتا اور جب تک الہام رہبری نہ کرے خدا کو پا نہیں سکتا تو پھر ہمیں اس سے کیا کہ کوئی چیز ہر وقت نظر آ رہی ہے یا نہیں۔

(براہین احمدیہ صہ ۱۹۷-۲۰۶ حاشیہ ۱۱)

تمام تواریخ دان بخوبی جانتے ہیں کہ ازمنہ سابقہ میں بھی جب کسی نے خدا کے نام اور اُس کی صفات کاملہ سے پوری پوری واقفیت حاصل کی تو الہام ہی کے ذریعہ سے کی۔ اور عقل کے ذریعہ سے کسی زمانہ میں بھی توحیدِ الٰہی شائع نہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جس جگہ الہام نہ پہنچا اس جگہ کے لوگ خدا کے نام سے بے خبر اور حیوانات کی طرح بے تمیز اور بے تہذیب رہے۔ کون کوئی ایسی کتاب ہمارے سامنے پیش کر سکتا ہے کہ جو ازمنۂ سابقہ میں سے کسی زمانہ میں علمِ الٰہی کے بیان میں تصنیف ہوئی ہو اور حقیقی سچائیوں پر مشتمل ہو جس میں مصنّف نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ اُس نے خدا شناسی کے مستقیم راہ کو بذریعہ الہام حاصل نہیں کیا اور نہ خدائے واحد کی ہستی پر بطور سماع اطلاع پائی ہے بلکہ خدا کا پتہ لگانے اور صفاتِ الٰہیہ کے جاننے اور معلوم کرنے میں صرف اپنی ہی عقل اور اپنے ہی فکر اور اپنی ہی ریاضت اور اپنی ہی عرقریزی سے مدد ملی ہے اور بلا تعلیم غیرے آپ ہی مسئلہ وحدانیتِ الٰہی کو معلوم کر لیا ہے اور خود بخود ذہن خدائے تعالیٰ کی سچی معرفت اور کامل شناسائی تک پہنچ گیا ہے۔ کون ہم کو ثابت کرکے دکھلا سکتا ہے کہ کوئی ایسا زمانہ بھی تھا کہ دنیا میں الہام الٰہی کا نام و نشان نہ تھا اور خدا کی مقدس کتابوں کا دروازہ بند تھا اور اس زمانہ کے لوگ محض صحیفۂ فطرت کے ذریعہ سے توحید اور خدا شناسی پر قائم تھے۔ کون کسی ایسے ملک کا نشان بتلا سکتا ہے جس کے باشندے الہام کے وجود سے محض بے خبر رہ کر پھر فقط عقل کے ذریعہ سے خدا تک پہنچ گئے اور صرف اپنی ہی فکر و نظر سے وحدانیتِ حضرت باری پر ایمان لے آئے۔

(براہین احمدیہ صہ ۲۰۹-۲۱۰ حاشیہ ۱۱)

یہ بات کہ کیوں توحیدِ خالص الہام الٰہی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اور کیوں الہام کا منکر شرک کی آلودگی سے پاک نہیں ہوتا خود توحید کی حقیقت پر نظر کرنے سے معلوم ہوسکتی ہے۔ کیونکہ توحید اس بات کا نام ہے کہ خدا کی ذات اور صفات کو شرکت بالغیر سے منزہ سمجھیں۔ اور جو کام اس کی قوت اور طاقت سے ہونا چاہیئے وہ کام دوسرے کی طاقت سے انجام پذیر ہو جانا روا نہ رکھیں اِسی توحید کے چھوڑنے سے آتش پرست۔ آفتاب پرست۔ بُت پرست وغیرہ وغیرہ مشرک کہلاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے بتوں اور دیوتاؤں سے ایسی ایسی مرادیں مانگتے ہیں جن کا عطا کرنا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ الہام سے انکاری ہیں وہ بھی بُت پرستوں کی طرح خدا کی صفتوں سے مخلوق کا متصف ہونا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور اس قادرِ مطلق کی طاقتوں کا بندوں میں پایا جانا مانتے ہیں کیونکہ ان کا یہ خیال ہے کہ ہم نے اپنی ہی عقل کے زور سے خدا کا پتہ لگایا ہے۔ اور ہمیں انسانوں کو ابتدا میں یہ خیال آیا تھا کہ کوئی خدا مقرر کرنا چاہیئے اور ہماری ہی کوششوں سے وہ گوشۂ گمنامی سے باہر نکلا۔ شناخت کیا گیا۔ معبودِ خلائق ہوا۔ قابلِ پرستش ٹھہرا۔ ورنہ پہلے اِسے کون جانتا تھا؟ اس کے وجود کی کسے خبر تھی؟ ہم عقلمند لوگ پیدا ہوئے تب اس کے بھی نصیب جاگے۔ کیا یہ اعتقاد بُت پرستوں کے اعتقاد سے کچھ کم ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا ہے کہ بُت پرست لوگ اَور اَور چیزوں کو اپنا منعم اور محسن قرار دیتے ہیں اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اپنی ہی دود آمیز عقل کو اپنا ہادی اور محسن جانتے ہیں بلکہ اگر غور کیجیئے تو بُت پرستوں سے بھی اُن کا پلّہ کچھ بھاری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگرچہ بُت پرست اِس بات کے تو قائل ہیں کہ خدا نے ہمارے دیوتاؤں کو بڑی بڑی طاقتیں دے رکھی ہیں اور وہ کچھ نذر نیاز لیکر اپنے پجاریوں کو مرادیں دے دیا کرتے ہیں۔ لیکن اب تک انہوں نے یہ رائے ظاہر نہیں کی کہ خدا کا پتہ اِنہیں دیوتاؤں نے لگایا ہے اور یہ نعمتِ عظمٰی وجودِ حضرتِ باری کی اُنہیں کے زورِ بازو سے معلوم ہوئی ہے۔ یہ بات تو اِنہی حضرات (منکرین الہام) کو سوجھی جنہوں نے خدا کو بھی اپنی ایجادات کی فہرست میں درج کر لیا اور بکمال خردماغی سے بلند آواز سے بول اُٹھے کہ خدا کی طرف سے انا الموجود ہونے کی کبھی آواز نہیں آئی یہ ہماری ہی بہادری ہے جنہوں نے خود بخود بغیر جتلائے بے تبلائے اسے معلوم کر لیا۔ وہ تو ایسا چُپ تھا جیسے کوئی سویا ہوا یا مرا ہوا ہوتا ہے۔ ہمیں نے فکر کرتے کرتے کھودتے کھودتے اُس کا کھوج لگایا گویا خدا کا احسان تو ان پر کیا ہوتا تھا ایک طور پر اُنہیں کا خدا پر احسان ہے کہ اِس بات کی

پختہ خبر ملنے کے بغیر کہ خدا بھی ہے اور اس امر کے یقین کامل ہونے کے بدوں کہ اس کی نافرمانی سے ایسا ایسا عذاب اور اس کی فرمانبرداری سے ایسا ایسا انعام مل رہیگا یونہی بے کہے کہلائے اور سنے سُنائے کے اس خدائے موہوم کی فرمانبرداری کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔ گویا آپ ہی پکایا اور آپ ہی کھایا۔ لیکن خدا ایسا کمزور اور ضعیف تھا کہ اُس سے اتنا نہ ہو سکا کہ اپنے وجود کی آپ خبر دیتا اور اپنے وعدوں کے بارے میں آپ تسلّی بخشتا۔ بلکہ وہ چھپا ہُوا تھا۔ انہوں نے ظاہر کیا۔ وہ گمنام تھا انہوں نے شہرت دی۔ وہ چپ تھا انہوں نے اس کا کام آپ کیا۔ گویا وہ تھوڑی سی مدت سے اپنی خدائی میں مشہور ہُوا ہے اور وہ بھی ان کی کوششوں سے۔ ہریک عاقل جانتا ہے کہ یہ قول بُت پرستوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیونکہ بُت پرست لوگ اپنے دیوتاؤں کو صرف اپنی نسبت مُحسن اور مُنعم قرار دیتے ہیں۔ لیکن منکرین الہام نے تو حدّ کر دی کہ اُن کے زعم میں ان کی دیوی کا (کہ عقل ہے) نہ فقط لوگوں پر بلکہ خدا پر بھی احسان ہے کہ جس کے ذریعہ سے (بقول ان کے) خدا نے شہرت پائی۔ اس صورت میں نہایت روشن ہے کہ الہام کے انکاری ہونے سے صرف اُن میں یہی فساد نہیں کہ خدا کے وجود پر مشتبہ اور مظنون طور پر ایمان لاتے ہیں اور طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہیں بلکہ یہ فساد بھی ہے کہ توحید کامل سے بھی محروم اور بے نصیب ہیں اور شرک سے آلودہ ہیں۔ کیونکہ شرک اور کیا ہوتا ہے۔ یہی تو شرک ہے کہ خدا کے احسانات اور انعامات کو دوسرے کی طرف سے سمجھا جاوے۔

(براہین احمدیہ ص ۱۵۵-۱۵۷ حاشیہ ۱۱)

آسمانی نشانوں سے حصّہ لینے والے تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ اوّل وہ جو کوئی ہنر اپنے اندر نہیں رکھتے اور کوئی تعلّق خدا تعالےٰ سے اُن کا نہیں ہوتا۔ صرف دماغی مناسبت کی وجہ سے اُن کو بعض سچی خوابیں آجاتی ہیں اور سچے کشف ظاہر ہو جاتے ہیں۔ جن میں کوئی مقبولیت اور محبوبیت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے اور ان سے کوئی فائدہ اُن کی ذات کو نہیں ہوتا۔ اور ہزاروں شریر اور بدچلن اور فاسق و فاجر ایسی بدبودار خوابوں اور الہاموں میں اُن کے شریک ہوتے ہیں۔

.... پھر دوسری قسم کے خواب بین یا ملہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا تعالےٰ سے کسی قدر تعلّق ہے مگر کامل تعلّق نہیں۔ ان لوگوں کی خوابوں یا الہاموں کی حالت اس جسمانی نظارہ سے مشابہ ہے جبکہ ایک شخص اندھیری رات اور شدید البرد رات میں دُور سے ایک آگ کی روشنی دیکھتا ہے۔ اس کے دیکھنے سے اتنا فائدہ تو اسے حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی راہ پر چلنے سے پرہیز کرتا ہے جس میں بہت سے

گڑھے اور کانٹے اور پتھر اور سانپ اور درندے ہیں۔ مگر اس قدر روشنی اس کو سردی اور ہلاکت سے بچا نہیں سکتی۔ پس اگر وہ آگ کے گرم حلقہ تک پہنچ نہ سکے تو وہ بھی ایسا ہی ہلاک ہو جاتا ہے جیسا کہ اندھیرے میں چلنے والا ہلاک ہو جاتا ہے۔

پھر تیسری قسم کے ملہم اور خواب بین وہ لوگ ہیں جن کے خوابوں اور الہاموں کی حالت اُس جسمانی نظارہ سے مشابہ ہے جبکہ ایک شخص اندھیری اور شدید البرد رات میں نہ صرف آگ کی کامل روشنی ہی پاتا ہے اور اُس میں چلتا ہے بلکہ اُس کے گرم حلقہ میں داخل ہو کر بکلی سردی کے ضرر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ تک وہ لوگ پہنچتے ہیں جو شہواتِ نفسانیہ کا چولہ آتشِ محبتِ الٰہی میں جلا دیتے ہیں۔ اور خدا کے لئے تلخی کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں جو آگے موت ہے اور دوڑ کر اس موت کو اپنے لئے پسند کر لیتے ہیں۔ وہ ہر ایک درد کو خدا کی راہ میں قبول کرتے ہیں۔ اور خدا کے لئے اپنے نفس کے دشمن ہو کر اور اُس کے برخلاف قدم رکھ کر ایسی طاقت ایمانی دکھلاتے ہیں کہ فرشتے بھی اُن کے اس ایمان سے حیرت اور تعجب میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ روحانی پہلوان ہوتے ہیں۔ اور شیطان کے تمام حملے اُن کی روحانی قوت کے آگے ہیچ ٹھہرتے ہیں۔ .... ہم اس مرتبہ ثالثہ کی جو اعلیٰ اور اکمل مرتبہ ہے اس طرح پر تصویر کھینچتے ہیں کہ وہ وحیٔ کامل جو اقسام ثلاثہ میں سے تیسری قسم کی وحی ہے جو کامل فرد پر نازل ہوتی ہے اُس کی یہ مثال ہے کہ جیسے سورج کی دھوپ اور شعاع ایک مصفّٰی آئینہ پر پڑتی ہے جو عین اس کے مقابل پر پڑا ہے۔ .... تب وہی شعاع ایک سے دہ چند ہو کر ظاہر ہوتی ہے جسے آنکھ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

پس اس طرح جب نفس تزکیہ یافتہ پر جو تمام کدورتوں سے پاک ہو جاتا ہے وحی نازل ہوتی ہے تو اس کا نور فوق العادت نمایاں ہوتا ہے اور اس نفس پر صفاتِ الٰہیہ کا انعکاس پورے طور پر ہو جاتا ہے اور پورے طور پر چہرۂ حضرتِ احدیت ظاہر ہوتا ہے ....

غرض وحیِ الٰہی کے انوار اکمل اور اتم طور پر وہی نفس قبول کرتا ہے جو اکمل اور اتم طور پر تزکیہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور صرف الہام اور خواب کا پانا کسی خوبی اور کمال پر دلالت نہیں کرتا جب تک کسی نفس کو بوجہ تزکیہ تام کے یہ انعکاسی حالت نصیب نہ ہو اور محبوبِ حقیقی چہرہ اس کے نفس میں نمودار نہ ہو جائے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۰ - ۲۱)

تین قسمیں خوابوں کی ہوتی ہیں۔ ایک نفسانی۔ ایک شیطانی۔ اور ایک رحمانی۔ نفسانی جیسے بلّی کو چھیچھڑوں کے خواب۔ شیطانی وہ جس میں ڈرانا یا دحشت ہو۔ رحمانی خواب خدا تعالےٰ کی طرف سے پیغام ہوتی ہیں۔ اور اُن کا ثبوت صرف تجربہ ہے۔ اور یہ خدا کی باتیں ہیں جو اس دُنیا سے بہت دُور تر ہیں۔ اگر ہم ان کے متعلق عقلی دلائل پر توجہ کریں تو نہ دوسرا اس کو سمجھ سکتا ہے نہ ہم سمجھا سکتے ہیں۔ یہ خدا تعالےٰ کی ہستی کے نشان ہیں جو غیب سے دل پر ڈالتا ہے۔ اور جب دیکھ لیتے ہیں کہ ایک بات بتلائی گئی اور وہ پوری ہوئی تو پھر اس پر خود ہی اعتبار ہو جاتا ہے۔ اِس عالم کے امور کا جو آلہ ہے وہ اسے شناخت نہیں کر سکتا۔ یہ روحانی امور ہیں اِن ہی سے ان کو پہچانا جائے تو سمجھ آئے۔ اور خواب اپنی صداقت پر آپ ہی گواہی دیتی ہیں۔

(ملفوظات جلد چہارم صـ ۳۶۸-۳۶۹)

کشف اور خواب بھی ہر ایک کے یکساں نہیں ہوتے۔ وہ کامل کشف جس کو قرآن شریف میں اظہار علی الغیب سے تعبیر کیا گیا ہے جو دائرہ کی طرح پورے طور پر مشتمل ہوتا ہے وہ ہر ایک کو عطا نہیں کیا جاتا صرف برگزیدوں کو دیا جاتا ہے۔ اور ناقص کا کشف اور الہام ناقص ہوتا ہے جو بالآخر ان کو شرمندہ کرتا ہے۔ اظہار علی الغیب کی حقیقت یہ ہے کہ جیسے کوئی اونچے مکان پر چڑھ کر اردگرد کی چیزوں کو دیکھتا ہے تو بلاشبہ آسانی سے ہر ایک چیز اس کو نظر آ سکتی ہے لیکن جو شخص نشیب کے مکان سے ایسی چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہے تو بہت سی چیزیں دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔ اور برگزیدوں سے خدا کی یہ عادت ہے کہ اُن کی نظر کو اونچے مکان تک لے جاتا ہے تب وہ آسانی سے ہر ایک چیز کو دیکھ سکتے ہیں اور انجام کی خبر دیتے ہیں۔ اور نشیب کا آدمی انجام کی خبر نہیں دے سکتا۔ اس لئے بلعم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پہچاننے میں دھوکہ کھایا اور اس کو اُن کا وہ عالی مرتبہ برگزیدگی کا معلوم نہ ہو سکا جس سے ڈر کر وہ ادب اختیار کرتا۔

(حقیقۃ المہدی صـ ۹)

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ وحی دو قسم کی ہے وحی الابتلاء اور وحی الاصطفاء۔ وحی الابتلاء بعض اوقات موجب ہلاکت ہو جاتی ہے جیسا کہ بلعم اسی وجہ سے ہلاک ہُوا۔ مگر صاحبِ وحی الاصطفاء کبھی ہلاک نہیں ہوتا۔ اور وحی الابتلاء بھی ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی بلکہ بعض انسانی طبیعتیں ایسی بھی ہیں جیسے جسمانی طور پر بہت سے لوگ گونگے اور بہرے اور اندھے پیدا ہوتے ہیں ایسا ہی

بعض کی روحانی قوتیں کالعدم ہوتی ہیں اور جیسے اندھے دوسروں کی رہنمائی سے اپنا گذارہ کرسکتے ہیں ایسا ہی یہ لوگ بھی کرتے ہیں۔

(حقیقۃ الوحی صہ ۹)

”كل بركة من محمد صلى الله عليه وسلم فتبارك من علّم وتعلّم“

(الہام الٰہی)

سیّدنا و سیّد المطہرین شفیع المذنبین خاتم النبیّین سرورِ کائنات فخرِ موجودات

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

(فداہٗ نفسی)

”بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم“

وہ اعلیٰ درجہ کا نور جو انسان کو دیا گیا یعنی انسان کامل کو وہ ملائک میں نہیں تھا۔ نجوم میں نہیں تھا۔ قمر میں نہیں تھا۔ آفتاب میں بھی نہیں تھا۔ وہ زمین کے سمندروں اور دریاؤں میں بھی نہیں تھا۔ وہ لعل اور یاقوت اور زمرّد اور الماس اور موتی میں بھی نہیں تھا۔ غرض وہ کسی چیز ارضی اور سماوی میں نہیں تھا۔ صرف انسان میں تھا یعنی انسان کامل میں جس کا اتمّ اور اکمل اور اعلیٰ اور ارفع فرد ہمارے **سیّد و مولیٰ سید الانبیاء سیّد الاحیاء محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں** ۔ سو وہ نور اس انسان کو دیا گیا اور حسب مراتب اُس کے تمام ہمرنگوں کو بھی یعنی ان لوگوں کو بھی جو کسی قدر وہی رنگ رکھتے ہیں .... اور یہ شان اعلیٰ اور اکمل اور اتم طور پر ہمارے سیّد ہمارے مولیٰ ہمارے ہادی نبی اُمّی صادق مصدوق **محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم** میں پائی جاتی تھی۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۶۰-۱۶۱)

مَیں ہمیشہ تعجب کی نگاہ سے دیکھتا ہوں کہ یہ عربی نبی جس کا نام **محمّد** ہے (ہزار ہزار درود اور سلام اس پر) یہ **کس عالی مرتبہ کا نبی** ہے اس کے عالی مقام کا انتہا معلوم نہیں ہو سکتا اور اس کی تاثیر قدسی کا اندازہ کرنا انسان کا کام نہیں۔ افسوس کہ جیسا حق شناخت کا ہے بجز اس کے مرتبہ کو شناخت نہیں کیا گیا۔ وہ **توحید** جو دنیا سے گم ہو چکی تھی وہی ایک پہلوان ہے جو دوبارہ اس کو دنیا میں لایا۔ اُس نے خدا سے انتہائی درجہ پر **محبت** کی اور انتہائی درجہ پر بنی نوع کی ہمدردی میں اس کی جان گداز ہوئی اِس لئے خدا نے جو اُس کے دل کے راز کا واقف تھا اُس کو **تمام انبیاء اور تمام اوّلین** اور **آخرین پر فضیلت بخشی** اور اُس کی مرادیں اس کی زندگی میں اُس کو دیں۔ وہی ہے جو سرچشمہ ہر ایک فیض کا ہے اور وہ شخص جو بغیر اقرار اور افاضہ اس کے کسی فضیلت کا دعویٰ کرتا ہے وہ انسان نہیں بلکہ **ذرّیتِ شیطان** ہے۔ کیونکہ ہر ایک فضیلت کی کنجی اس کو دی گئی ہے۔ اور ہر ایک معرفت کا خزانہ اُس کو عطا کیا گیا ہے۔ جو اُس کے ذریعہ سے نہیں پاتا وہ محروم ازلی ہے۔ ہم کیا چیز ہیں اور ہماری حقیقت کیا ہے۔ ہم کافر نعمت ہوں گے اگر اس بات کا اقرار نہ کریں کہ

توحید حقیقی ہم نے اس نبی کے ذریعہ سے پائی۔ زندہ خدا کی شناخت ہمیں اس کامل نبی کے ذریعہ سے اور اس کے نُور سے ملی اور خدا کے مکالمات اور مخاطبات کا شرف بھی جس سے ہم اس کا چہرہ دیکھتے ہیں اسی **بزرگ نبی** کے ذریعہ سے ہمیں میسّر آیا۔ اس آفتاب ہدایت کی شعاع دھوپ کی طرح ہم پر پڑتی ہے اور اُس وقت تک ہم منوّر رہ سکتے ہیں جب تک کہ ہم اس کے مقابل پر کھڑے ہیں۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۱۵-۱۱۶)

اے تمام وہ لوگو جو زمین پر رہتے ہو! اور اے تمام وہ انسانی روحو جو مشرق اور مغرب میں آباد ہو! مَیں پورے زور کے ساتھ آپ کو اس طرف دعوت کرتا ہوں کہ اب **زمین پر سچّا مذہب صرف اسلام ہے** اور **سچّا خدا بھی وہی خدا ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے** اور ہمیشہ کی روحانی زندگی والا نبی اور جلال اور تقدس کے تخت پر بیٹھنے والا **حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم** ہے جس کی روحانی زندگی اور پاک جلال کا ہمیں یہ ثبوت ملا ہے کہ اُسکی پیروی اور محبت سے ہم رُوح القدس اور خدا کے مکالمہ اور آسمانی نشانوں کے انعام پاتے ہیں۔

(تریاق القلوب ص۱۱)

وہ انسان جس نے اپنی ذات سے اپنی صفات سے اپنے افعال سے اپنے اعمال اور اپنے روحانی اور پاک قویٰ کے پُر زور دریا سے کمال تام کا نمونہ علماً و عملاً و صدقاً و ثباتاً دکھلایا اور انسان کامل کہلایا .... وہ انسان جو سب سے زیادہ کامل اور انسانِ کامل تھا اور کامل نبی تھا اور کامل برکتوں کے ساتھ آیا جس سے روحانی بعث اور حشر کی وجہ سے دنیا کی پہلی قیامت ظاہر ہوئی اور ایک عالم کا عالم مرا ہُوا اُس کے آنے سے زندہ ہوگیا۔ وہ مبارک نبی **حضرت خاتم الانبیاء امام الاصفیاء ختم المرسلین فخر النبیّین جناب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم** ہیں۔ اے ہمارے خدا! اس پیارے نبی پر وہ رحمت اور درود بھیج جو ابتداء دنیا سے تُو نے کسی پر نہ بھیجا ہو۔ اگر یہ عظیم الشان نبی دنیا میں نہ آتا تو پھر جس قدر چھوٹے چھوٹے نبی دنیا میں آئے جیسا کہ یونسؑ اور ایوبؑ اور مسیحؑ بن مریم اور ملاکیؑ اور یحییٰؑ اور زکریاؑ وغیرہ وغیرہ ان کی سچائی پر ہمارے پاس کوئی بھی دلیل نہیں تھی۔ اگرچہ سب مقرب اور وجیہہ اور خدا تعالےٰ کے پیارے تھے۔ یہ اس نبی کا احسان ہے کہ یہ لوگ بھی دنیا میں سچے سمجھے گئے۔ اللّٰھم صلّ وسلم و بارک علیہ و آلہٖ

واصحابہ اجمعین - واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین -

(اتمام الحجۃ صـ۳۶)

ہم جب انصاف کی نظر سے دیکھتے ہیں تو تمام سلسلۂ نبوت میں سے اعلیٰ درجہ کا جوانمرد نبی اور زندہ نبی اور خدا کا اعلیٰ درجہ کا پیارا نبی صرف ایک مرد کو جانتے ہیں یعنی وہی نبیوں کا سردار رسولوں کا فخر۔ تمام مرسلوں کا سرتاج جس کا نام محمد مصطفٰے و احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کے زیرسایہ دس دن چلنے سے وہ روشنی ملتی ہے جو پہلے اس سے ہزار برس تک نہیں مل سکتی تھی .... سو آخری وصیت یہی ہے کہ ہر ایک روشنی ہم نے رسول نبی اُمّی کی پیروی سے پائی ہے اور جو شخص پیروی کرے گا وہ بھی پائیگا - اور ایسی قبولیت اس کو ملے گی کہ کوئی بات اُس کے آگے اَنہونی نہیں رہے گی - **زندہ خدا** جو لوگوں سے پوشیدہ ہے اُس کا خدا ہوگا اور **جھوٹے خدا** سب اس کے پیروں کے نیچے کچلے اور روندے جائینگے - وہ ہر ایک جگہ مبارک ہوگا اور الٰہی توتیں اُس کے ساتھ ہونگی - والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ -

(سراج منیر صـ۸۲)

اب آسمان کے نیچے فقط ایک ہی نبی اور ایک ہی کتاب ہے یعنی حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم جو اعلیٰ و افضل سب نبیوں سے اور اتم و اکمل سب رسولوں سے اور خاتم الانبیاء اور خیر الناس ہیں جن کی پیروی سے خدائے تعالیٰ ملتا ہے اور ظلماتی پردے اُٹھتے ہیں اور اسی جہان میں سچی نجات کے آثار نمایاں ہوتے ہیں - اور قرآن شریف جو سچی اور کامل ہدایتوں اور تاثیروں پر مشتمل ہے جس کے ذریعہ سے حقّانی علوم اور معارف حاصل ہوتے ہیں اور بشری آلودگیوں سے دل پاک ہوتا ہے اور انسان جہل اور غفلت اور شبہات کے حجابوں سے نجات پاکر حق الیقین کے مقام تک پہنچ جاتا ہے -

(براہین احمدیہ صـ۵۲۵ حاشیہ درحاشیہ مـ۳)

دنیا میں کروڑہا ایسے پاک فطرت گذرے ہیں اور آگے بھی ہونگے - لیکن ہم نے سب سے بہتر اور سب سے اعلیٰ اور سب سے خوب تر اس مرد خدا کو پایا ہے جس کا نام ہے محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم - انّ اللہ وملائکتہ یصلّون علی النّبیّ - یاایھا الذین اٰمنوا صلّوا علیہ وسلّموا تسلیمًا ان قوموں کے بزرگوں کا ذکر تو جانے دو جن کا حال قرآن شریف میں تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا صرف ہم اُن نبیوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے - جیسے حضرت موسیٰ حضرت داؤد حضرت عیسٰی علیہم السلام اور دوسرے انبیاء - سو ہم خدا کی قسم کھا کر

کہتے ہیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں نہ آتے اور قرآن شریف نازل نہ ہوتا اور وہ برکات ہم بچشم خود نہ دیکھتے جو ہم نے دیکھ لئے تو ان تمام گذشتہ انبیاء کا صدق ہم پر مشتبہ رہ جاتا۔ کیونکہ صرف قصّوں سے کوئی حقیقت حاصل نہیں ہو سکتی اور ممکن ہے کہ وہ قصّے صحیح نہ ہوں اور ممکن ہے کہ وہ تمام معجزات جو اُن کی طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ سب مبالغات ہوں کیونکہ اب ان کا نام ونشان نہیں۔ بلکہ ان گذشتہ کتابوں سے تو خدا کا پتہ بھی نہیں لگتا اور یقیناً نہیں سمجھ سکتے کہ خدا بھی انسان سے ہم کلام ہوتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے یہ سب قصّے حقیقت کے رنگ میں آ گئے۔ اب نہ ہم قال کے طور پر بلکہ حال کے طور پر اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ مکالمہ الٰہیہ کیا چیز ہوتا ہے۔ اور خدا کے نشان کس طرح ظاہر ہوتے ہیں اور کس طرح دُعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے پایا۔ اور جو کچھ قصوں کے طور پر غیر قومیں بیان کرتی ہیں وہ سب کچھ ہم نے دیکھ لیا۔ پس ہم نے ایک ایسے نبی کا دامن پکڑا ہے جو خدا نما ہے۔ کسی نے یہ شعر بہت ہی اچھا کہا ہے ؎

محمّد عربی بادشاہ دوسرا ٭ کرے ہے رُوح قدس جس کے دَر کی دربانی
اسے خدا تو نہیں کہہ سکوں پہ کہتا ہوں ٭ کہ اس کے مرتبہ دانی میں ہے خدا دانی

ہم کس زبان سے خدا کا شکر کریں جس نے ایسے نبی کی پیروی ہمیں نصیب کی جو سعیدوں کی ارواح کے لئے آفتاب ہے جیسے اجسام کے لئے سورج۔ وہ اندھیرے کے وقت میں ظاہر ہُوا اور دنیا کو اپنی روشنی سے روشن کر دیا۔ وہ نہ تھکا نہ ماندہ ہُوا جب تک کہ عرب کے تمام حصہ کو شرک سے پاک نہ کر دیا۔ وہ اپنی سچائی کی آپ دلیل ہے کیونکہ اس کا نور ہر ایک زمانہ میں موجود ہے اور اس کی سچی پیروی انسان کو یوں پاک کرتی ہے کہ جیسا ایک صاف اور شفّاف دریا کا پانی میلے کپڑے کو۔ کون صدق دل سے ہمارے پاس آیا جس نے اس نور کا مشاہدہ نہ کیا اور کس نے صحت نیت سے اس دروازہ کو کھٹکھٹایا جو اس کے لئے کھولا نہ گیا۔ لیکن افسوس! کہ اکثر انسانوں کی یہی عادت ہے کہ وہ سفلی زندگی کو پسند کر لیتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ نور اُن کے اندر داخل ہو۔

(چشمۂ معرفت ص ۲۸۸)

قل ربّ زدنی علمًا۔ یعنی اے میرے رب تو مجھے اپنی عظمت اور معرفت شیون اور

صفات کا علم کامل بخشیں۔ اور پھر دوسری جگہ فرمایا۔ وبذالک اُمرتُ وانا اوّل المسلمین۔ ان دونوں آیتوں نے ملانے سے معلوم ہوا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو اوّل المسلمین ٹھہرے تو اس کا یہی باعث ہوا کہ اَوروں کی نسبت علوم معرفت الٰہی میں اعلم ہیں یعنی علم اُن کا معارفِ الٰہیہ کے بارے میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے ان کا اسلام بھی سب سے اعلیٰ ہے اور وہ اوّل المسلمین ہیں۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس زیادت علم کی طرف اس دوسری آیت میں بھی اشارہ ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ وعلّمک مالم تکن تعلم وکان فضل اللہ علیک عظیمًا۔ الجزو نمبر ۵۔ یعنی خدا تعالےٰ نے تجھ کو وہ علوم عطا کئے جو تو خود بخود نہیں جان سکتا تھا اور فضل الٰہی سے فیضان الٰہی سب سے زیادہ تیرے پر ہوا۔ یعنی تو معارفِ الٰہیہ اور اسرار اور علوم ربّانی میں سب سے بڑھ گیا اور خدا تعالےٰ نے اپنی معرفت کے عطر کے ساتھ سب سے زیادہ تجھے معطّر کیا۔ غرض علم اور معرفت کو خدا تعالےٰ نے حقیقت اسلامیہ کے حصول کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ اور اگرچہ حصول حقیقت اسلام کے وسائل اَور بھی ہیں جیسے صوم وصلوٰۃ اور دُعا اور تمام احکامِ الٰہی جو چھ سو سے بھی کچھ زیادہ ہیں لیکن علم عظمت و وحدانیت ذات اور معرفت شیون وصفات جلالی وجمالی حضرت باری عزّ اسمہٗ وسیلۃ الوسائل اور سب کا موقوف علیہ ہے کیونکہ جو شخص غافل دل اور معرفت الٰہی سے بکلّی بے نصیب ہے وہ کب توفیق پا سکتا ہے کہ صوم اور صلوٰۃ بجا لاوے یا دعا کرے یا اور خیرات کی طرف مشغول ہو۔ ان سب اعمال صالحہ کا محرک تو معرفت ہی ہے اور یہ تمام دوسرے وسائل اسی کے پیدا کردہ اور اُسی کے بنین وبنات ہیں۔ اور ابتدا اس معرفت کی پرتوہ اسم رحمانیت ہے نہ کسی عمل سے نہ کسی دعا سے بلکہ بلا علت فیضان سے صرف ایک موہبت ہے یھدی من یشاء ویضل من یشاء۔ مگر پھر یہ معرفت اعمال صالحہ اور حسن ایمان کے شمول سے زیادہ ہو جاتی یہاں تک کہ آخر الہام اور کلام الٰہی کے رنگ میں نزول پکڑ کر تمام صحنِ سینہ کو اس نور سے منور کر دیتی ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اور اس معرفتِ تامہ کے درجہ پر پہنچ کر اسلام صرف لفظی اسلام نہیں رہتا بلکہ وہ تمام حقیقت اس کی جو ہم بیان کر چکے ہیں حاصل ہو جاتی ہے اور انسانی رُوح نہایت انکسار سے حضرت احدیت میں اپنا سر رکھ دیتی ہے۔ تب دونوں طرف سے یہ آواز آتی ہے کہ جو میرا ہے سو تیرا ہے۔ یعنی بندے کی رُوح بھی بولتی ہے اور اقرار کرتی ہے کہ یا الٰہی! جو میرا ہے سو تیرا ہے۔ اور خدا تعالےٰ بھی بولتا ہے اور بشارت دیتا ہے کہ اے میرے بندے! جو کچھ زمین و آسمان وغیرہ میرے ساتھ ہے وہ سب تیرے ساتھ ہے۔ اس مرتبہ کی طرف

اشارہ اس آیت میں ہے۔ قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ انّ اللہ یغفر الذنوب جمیعًا۔ الجزو ۲۴۔ سورۃ الزمر۔ یعنی کہہ اے میرے غلامو! جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے کہ تم رحمت الٰہی سے ناامید مت ہو۔ خدا تعالےٰ سارے گناہ بخش دیگا۔ اب اس آیت میں بجائے قل یا عبادِ اللہ کے جس کے یہ معنے ہیں کہ کہہ اے خدا تعالےٰ کے بندو۔ یہ فرمایا کہ قل یا عبادی یعنی کہہ کہ اے میرے غلامو! اس طرز کے اختیار کرنے میں بھید یہی ہے کہ یہ آیت اس لئے نازل ہوئی ہے کہ تا خدا تعالیٰ بے انتہا رحمتوں کی بشارت دیوے اور جو لوگ کثرت گناہوں سے دل شکستہ ہیں ان کو تسکین بخشے۔ سو اللہ جلّ شانہ نے اس آیت میں چاہا کہ اپنی رحمتوں کا ایک نمونہ پیش کرے اور بندہ کو دکھلاوے کہ میں کہاں تک اپنے وفادار بندوں کو انعامات خاصہ سے مشرف کرتا ہوں۔ سو اُس نے قل یا عبادی کے لفظ سے یہ ظاہر کیا کہ دیکھو یہ میرا پیارا رسول دیکھو برگزیدہ بندہ کہ کمال طاعت سے کس درجہ تک پہنچا کہ اب جو کچھ میرا ہے وہ اس کا ہے۔ جو شخص نجات چاہتا ہے وہ اس کا غلام ہو جائے یعنی ایسا اس کی اطاعت میں محو ہو جائے کہ گویا اس کا غلام ہے۔ تب وہ گو کیسا ہی پہلے گنہگار تھا بخشا جائیگا۔ جاننا چاہیئے کہ عبد کا لفظ لغتِ عرب میں غلام کے معنوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے ولعبدٌ مؤمن خیرٌ من مشرکٍ۔ اور اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اپنی نجات چاہتا ہے وہ اس نبیؐ سے غلامی کی نسبت پیدا کرے۔ یعنی اس کے حکم سے باہر نہ جائے اور اس کے دامن طاعت سے اپنے تئیں وابستہ جانے جیسا کہ غلام جانتا ہے تب وہ نجات پائیگا۔ اس مقام میں ان کور باطن نام کے موحّدوں پر افسوس آتا ہے کہ جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے یہاں تک بغض رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ نام کہ غلام نبی۔ غلام رسول۔ غلام مصطفٰے۔ غلام احمد۔ غلام محمد شرک میں داخل ہیں۔ اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ مدار نجات یہی نام ہیں۔ اور چونکہ عبد کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ ہر ایک آزادگی اور خود روی سے باز آجائے اور پورا متبع اپنے مولیٰ کا ہو۔ اس لئے حق کے طالبوں کو یہ رغبت دی گئی کہ اگر نجات چاہتے ہیں تو یہ مفہوم اپنے اندر پیدا کریں۔ اور درحقیقت یہ آیت اور یہ دوسری آیت قل ان کنتم تحبّون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم از روئے مفہوم کے ایک ہی ہیں۔ کیونکہ کمال اتباع اس محویّت اور اطاعت تامہ کو مستلزم ہے جو عبد کے مفہوم میں پائی جاتی ہے۔ یہی سرّ ہے کہ جیسے پہلی

آیت میں مغفرت کا وعدہ بلکہ محبوب الٰہی بننے کی خوشخبری ہے۔ گویا یہ آیت کہ قل یا عبادی دوسرے لفظوں میں اس طرح پر ہے کہ قل یا متبعی یعنی اے میری پیروی کرنے والو! جو بکثرت گناہوں میں مبتلا ہو رہے ہو رحمت الٰہی سے نومید مت ہو کہ اللہ تعالےٰ ببرکت میری پیروی کے تمام گناہ بخش دیگا۔ اور اگر عباد سے صرف اللہ تعالےٰ کے بندے ہی مراد لئے جائیں تو معنے خراب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہرگز درست نہیں کہ خدا تعالےٰ بغیر تحقق شرطِ ایمان اور بغیر تحقق شرط پیروی تمام مشرکوں اور کافروں کو یونہی بخش دیوے۔ ایسے معنے تو نصوص بیّنہ قرآن سے صریح مخالف ہیں۔

اسجگہ یہ بھی یاد رہے کہ ماحصل اس آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ دل وجان سے تیرے یا رسول اللہ کے غلام بن جائیں گے اُن کو وہ نور ایمان اور محبت اور عشق بخشا جائے گا کہ جو اُن کو غیر اللہ سے رہائی دیگا اور وہ گناہوں سے نجات پا جائینگے اور اسی دنیا میں ایک پاک زندگی اُن کی عطا کی جائیگی۔ اور نفسانی جذبات کی تنگ وتاریک قبروں سے وہ نکالے جائیں گے اسی کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے۔ انا الحاشر الذی یحشر الناس علیٰ قدمی۔ یعنی مَیں وہ مردوں کو اٹھانے والا ہوں جس کے قدموں پر لوگ اٹھائے جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ قرآن کریم اس محاورہ سے بھرا پڑا ہے کہ دنیا مر چکی تھی اور خدا تعالیٰ نے اپنے اس نبی خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجکر نئے سرے دنیا کو زندہ کیا۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ اعلموا ان اللہ یحیي الارض بعد موتها۔ یعنی اس بات کو سُن رکھو کہ زمین کو اس کے مرنے کے بعد خدا تعالیٰ زندہ کرتا ہے۔ پھر اسی کے مطابق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں فرماتا ہے وایّدھم بروحٍ منہ یعنی ان کو رُوح القدس کے ساتھ مدد دی۔ اور رُوح القدس کی مدد یہ ہے کہ دلوں کو زندہ کرتا ہے اور روحانی موت سے نجات بخشتا ہے اور پاکیزہ قوتیں اور پاکیزہ حواس اور پاک علم عطا فرماتا ہے اور علومِ یقینیہ اور براہین قطعیہ سے خدا تعالیٰ کے مقام قرب تک پہنچا دیتا ہے . . . . اور یہ علوم جو مدارِ نجات ہیں یقینی اور قطعی طور بجز اس حیات کے حاصل نہیں ہو سکتے جو بتوسط رُوح القدس انسان کو ملتی ہے۔ اور قرآن کریم کا بڑے زور شور سے یہ دعویٰ ہے کہ وہ حیاتِ روحانی صرف متابعت اِس رسولِ کریمؐ سے ملتی ہے اور تمام وہ لوگ جو اس نبی کریمؐ کی متابعت سے سرکش ہیں وہ مُردے ہیں جن میں اس حیات کی رُوح نہیں ہے۔ اور حیات روحانی سے مراد انسان کے وہ علمی اور عملی قویٰ ہیں جو

رُوح القدس کی تائید سے زندہ ہو جاتے ہیں۔ اور قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ جن احکام پر اللہ جلّ شانہٗ انسان کو قائم کرنا چاہتا ہے وہ چھ۶۰۰ سو ہیں۔ ایسا ہی اس کے مقابل پر جبرائیل علیہ السلام کے پَر بھی چھ۶۰۰ سو ہیں۔ اور بیضۂ بشریت جب تک چھ سو حکم کو سر پر رکھ کر جبرائیل کے پَروں کے نیچے نہ آوے اُس میں فنا فی اللہ ہونے کا بچّہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور انسانی حقیقت اپنے اندر چھ سو بیضہ کی استعداد رکھتی ہے۔ پس جس شخص کا چھ سو بیضہ استعداد جبرائیل کے چھ سو پَر کے نیچے آگیا وہ انسان کامل اور یہ تَوَلُّد اس کا تولّد کامل اور یہ حیات حیاتِ کامل ہے۔ اور غور کی نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ بیضۂ بشریت کے روحانی بچّے جو رُوح القدس کی معرفت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی برکت سے پیدا ہوئے وہ اپنی کمیت اور کیفیت اور صورت اور نوع اور حالت میں تمام انبیاء کے بچوں سے اتم اور اکمل ہیں۔ اِسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ کنتم خیر امۃٍ اخرجت للنّاس۔ یعنی تم سب امتوں سے بہتر ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۱۸۶-۱۹۷)

دنیا میں ایک رسول آیا تاکہ ان بہروں کو کان بخشے کہ جو نہ صرف آج سے بلکہ صدہا سال سے بہرے ہیں۔ کون اندھا ہے اور کون بہرا؟ وہی جس نے توحید کو قبول نہیں کیا اور نہ اس رسول کو جس نے نئے سرے سے زمین پر توحید کو قائم کیا۔ وہی رسول جس نے وحشیوں کو انسان بنایا اور انسان سے بااخلاق انسان یعنی سچّے اور واقعی اخلاق کے مرکز اعتدال پر قائم کیا۔ اور پھر بااخلاق انسان سے **باخدا** ہونے کے **الٰہی رنگ** سے رنگین کیا۔ وہی رسول ہاں وہی آفتاب صداقت جس کے قدموں پر ہزاروں مردے شرک اور دہریت اور فسق اور فجور کے جی اُٹھے۔ اور عملی طور پر قیامت کا نمونہ دکھلایا۔ نہ یسوع کی طرح صرف لاف وگزاف جس نے مکّہ میں ظہور فرما کر شرک اور انسان پرستی کی بہت سی تاریکی کو مٹایا۔ ہاں دنیا کا **حقیقی نور** وہی تھا جس نے دنیا کو تاریکی میں پا کر فی الواقع وہ روشنی عطا کی کہ اندھیری رات کو دن بنا دیا۔ اُسکے پہلے دنیا کیا تھی اور پھر اس کے آنے کے بعد کیا ہوئی؟ یہ ایک ایسا سوال نہیں ہے جس کے جواب میں کچھ وقّت ہو۔ اگر ہم بے ایمانی کی راہ اختیار نہ کریں تو ہمارا کانشنس ضرور اس بات کے منوانے کے لئے ہمارا دامن پکڑے گا کہ اُس جنابؐ عالی سے پہلے خدا کی عظمت کو ہر ایک ملک کے لوگ بھول گئے تھے۔ اور اس سچے معبود کی عظمت اوتاروں اور پتھروں اور ستاروں

اور درختوں اور حیوانوں اور فانی انسانوں کو دی گئی تھی اور ذلیل مخلوق کو اُس ذوالجلال وقدوس کی جگہ پر بٹھایا تھا۔ اور یہ ایک سچا فیصلہ ہے کہ اگر یہ انسان اور حیوان اور درخت اور ستارے درحقیقت خدا ہی تھے جن میں سے ایک یسوع بھی تھا تو پھر اس رسول کی کچھ ضرورت نہ تھی لیکن اگر یہ چیزیں خدا نہیں تھیں تو وہ دعویٰ ایک عظیم الشان روشنی اپنے ساتھ رکھتا ہے جو **حضرت سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم** نے مکہ کے پہاڑ پر کیا تھا۔ وہ کیا دعویٰ تھا؟ وہ یہی تھا کہ آپ نے فرمایا۔ کہ خدا نے دنیا کو شرک کی سخت تاریکی میں پاکر اس تاریکی کو مٹانے کے لئے مجھے بھیج دیا۔ یہ صرف دعویٰ نہ تھا بلکہ اُس رسول مقبولؐ نے اس دعوے کو پورا کرکے دکھلا دیا۔ اگر کسی نبی کی فضیلت اُس کے ان کاموں سے ثابت ہو سکتی ہے جن سے بنی نوع کی سچی ہمدردی سب نبیوں سے بڑھ کر ظاہر ہو تو اے سب لوگو! اُٹھو اور گواہی دو کہ اِس صفت میں **محمدؐ** صلے اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں .... اندھے مخلوق پرستوں نے اس بزرگ رسولؐ کو شناخت نہیں کیا جس نے ہزاروں نمونے سچی ہمدردی کے دکھلائے۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ وہ وقت پہنچ گیا ہے کہ یہ پاک رسولؐ شناخت کیا جائے۔ چاہو تو میری بات لکھ رکھو کہ اب کے بعد وہ مُردہ پرستی روز بروز کم ہوگی یہاں تک کہ نابود ہو جائیگی۔ کیا انسان خدا کا مقابلہ کریگا؟ کیا ناچیز قطرہ خدا کے ارادوں کو ردّ کر دیگا؟ کیا فانی آدم زاد کے منصوبے الٰہی حکموں کو ذلیل کر دینگے؟ اے سننے والو! سُنو! اور اے سوچنے والو! سوچو اور یاد رکھو کہ حق ظاہر ہوگا۔ اور وہ جو سچّا نور ہے چمکیگا۔

(تبلیغ رسالت جلد ششم ص۹)

میرا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچے دل سے پیروی کرنا اور آپ سے محبت رکھنا انجام کار انسان کو خدا کا پیارا بنا دیتا ہے۔ اس طرح پر کہ خود اُس کے دل میں محبتِ الٰہی کی ایک سوزش پیدا کر دیتا ہے۔ تب ایسا شخص ہر ایک چیز سے دل برداشتہ ہو کر خدا کی طرف جھک جاتا ہے اور اس کا اُنس اور شوق صرف خدا تعالےٰ سے باقی رہ جاتا ہے۔ تب محبت الٰہی کی ایک خاص تجلّی اس پر پڑتی ہے اور اس کو ایک پورا رنگ عشق اور محبت کا دیکر قوی جذبہ کے ساتھ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ تب جذبات نفسانیہ پر وہ غالب آجاتا ہے۔ اور اس کی تائید اور نصرت میں ہر ایک پہلو سے خدا تعالیٰ کے خارق عادت افعال نشانوں کے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں۔

(حقیقۃ الوحی ص۶۵)

درود شریف کے طفیل .... میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فیوض عجیب نوری شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتے ہیں اور پھر وہاں جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں سے نکل کر ان کی لا انتہا نالیاں ہو جاتی ہیں اور بقدر حصّہ رسدی ہر حقدار کو پہنچتی ہیں۔ یقیناً کوئی فیض بدوں وساطت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ درود شریف کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس عرش کو حرکت دینا ہے جس سے یہ نور کی نالیاں نکلتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کا فیض اور فضل حاصل کرنا چاہتا ہے اُس کو لازم ہے کہ وہ کثرت سے درود شریف پڑھا کرے تاکہ اس فیض میں حرکت پیدا ہو۔

(الحکم مؤرخہ ۲۸ر فروری سنہ ۱۹۰۳ء ص۷)

ایک رات اس عاجز نے اس کثرت سے درود شریف پڑھا کہ دل و جان اس سے معطّر ہو گیا۔ اُس رات خواب میں دیکھا کہ فرشتے آب زلال کی شکل پر نور کی مشکیں اس عاجز کے مکان میں لئے آتے ہیں۔ اور ایک نے اُن میں سے کہا کہ یہ وہی برکات ہیں جو تُو نے محمّد کی طرف بھیجی تھیں صلی اللہ علیہ وسلم۔

(براہین احمدیہ ص۵۷۶ حاشیہ در حاشیہ ۳)

یہ وسوسہ دل میں نہیں لانا چاہیئے کہ کیونکر ایک ادنیٰ اُمّتی آں رسول مقبولؐ کے اسماء یا صفات یا محامد میں شریک ہو سکے۔ بلاشبہ یہ سچ بات ہے کہ حقیقی طور پر کوئی نبی بھی آنحضرتؐ کے کمالاتِ قدسیہ سے شریک مساوی نہیں ہو سکتا بلکہ تمام ملائکہ کو بھی اسجگہ برابری کا دم مارنے کی جگہ نہیں چہ جائیکہ کسی اَور کو آنحضرتؐ کے کمالات سے کچھ نسبت ہو۔ مگر اے طالب حق! ارشدک اللّٰہ تم متوجہ ہو کر اس بات کو سُنو کہ خداوند کریم نے اس غرض سے کہ تا ہمیشہ اس رسول مقبولؐ کی برکتیں ظاہر ہوتی اور تا ہمیشہ اس کے نور اور اس کی قبولیت کی کامل شعاعیں مخالفین کو ملزم اور لاجواب کرتی رہیں۔ اِس طرح پر اپنی کمال حکمت اور رحمت سے انتظام کر رکھا ہے کہ بعض افرادِ امتِ محمدیہ کہ جو کمال عاجزی اور تذلل سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی متابعت اختیار کرتے ہیں اور خاکساری کے آستانہ پر پڑ کر بالکل اپنے نفس سے گئے گذرے ہوتے ہیں خدا ان کو فانی اور ایک مصفیٰ شیشہ کی طرح پاکر اپنے رسول مقبولؐ کی برکتیں اُن کے وجود بے نمود کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے اور جو کچھ منجانب اللہ ان کی تعریف کی جاتی ہے یا کچھ آثار اور برکات اور آیات اُن سے ظہور پذیر ہوتی ہیں حقیقت میں مرجع تام ان تمام تعریفوں کا اور

مصدر کامل اِن تمام برکات کا رسول کریمؐ ہی ہوتا ہے۔ اور حقیقی اور کامل طور پر وہ تعریفیں اُسی کے لائق ہوتی ہیں۔ اور وہی ان کا مصداقِ اتم ہوتا ہے۔ مگر چونکہ متبع سُنن آں سرورِ کائناتؐ کا اپنے غایت اتباع کے جہت سے اس شخص نورانی کے لئے کہ جو وجود باجود حضرت نبویؐ ہے مثل ظل کے ٹھہر جاتا ہے۔ اس لئے جو کچھ اس شخص مقدس میں انوارِ الٰہیہ پیدا اور ہویدا ہیں اُس کے اِس ظل میں بھی نمایاں اور ظاہر ہوتے ہیں۔ اور سایہ میں اس تمام وضع اور انداز کا ظاہر ہونا کہ جو اس کے اصل میں ہے ایک ایسا امر ہے کہ جو کسی پر پوشیدہ نہیں۔ ہاں یہ سایہ اپنی ذات میں قائم نہیں اور حقیقی طور پر کوئی فضیلت اِس میں موجود نہیں بلکہ جو کچھ اس میں موجود ہے وہ اس کے شخص اصلی کی ایک تصویر ہے جو اس میں نمودار اور نمایاں ہے۔ پس لازم ہے کہ آپ یا کوئی دوسرے صاحب اس بات کو حالتِ نقصان خیال نہ کریں کہ کیوں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے انوارِ باطنی اُن کی امت کے کامل متبعین کو پہنچ جاتے ہیں۔ اور سمجھنا چاہیئے کہ اس انعکاس انوار سے کہ جو بطریقِ افاضۂ دائمی نفوسِ اُمت محمدیہ پر ہوتا ہے دو بزرگ امر پیدا ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بدرجہ غایت کمالیت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ جس چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو سکتا ہے اور ہمیشہ روشن ہوتا ہے وہ ایسے چراغ سے بہتر ہے جس سے دوسرا چراغ روشن نہ ہو سکے۔ دوسرے اس اُمت کی کمالیت اور دوسری اُمتوں پر اس کی فضیلت اس افاضۂ دائمی سے ثابت ہوتی ہے۔ اور حقیّت دین اسلام کا ثبوت ہمیشہ تروتازہ ہوتا رہتا ہے۔ صرف یہی بات نہیں ہوتی کہ گذشتہ زمانہ پر حوالہ دیا جائے۔ اور یہ ایک ایسا امر ہے کہ جس سے قرآن شریف کی حقانیت کے انوار آفتاب کی طرح ظاہر ہو جاتے ہیں اور دینِ اسلام کے مخالفوں پر حجّت اسلام پوری ہوتی ہے اور معاندینِ اسلام کی ذلّت اور رسوائی اور روسیاہی کامل طور پر کھل جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اسلام میں وہ برکتیں اور وہ نور دیکھتے ہیں جن کی نظیر کو وہ اپنی قوم کے پادریوں اور پنڈتوں وغیرہ میں ثابت نہیں کر سکتے۔
فتدبر ایہا الصادق فی الطلب ایدک اللہ فی طلبک ....

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی کسقدر شانِ بزرگ ہے اور اس آفتاب صداقت کی کیسی اعلیٰ درجہ پر روشن تاثیریں ہیں جس کا اتباع کسی کو مومن کامل بناتا ہے۔ کسی کو عارف کے درجے تک پہنچاتا ہے۔ کسی کو آیت اللہ اور حجّت اللہ کا مرتبہ عنایت فرماتا ہے اور محامدِ الٰہیہ کا مورد ٹھہراتا ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۲۵۸-۲۶۱ حاشیہ درحاشیہ نمبر ۱)

جب سے کہ آفتابِ صداقت ذاتِ بابرکات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں آیا۔ اُسی دم سے آج تک ہزارہا نفوس جو استعداد اور قابلیت رکھتے تھے متابعت کلامِ الٰہی اور اتباعِ رسولِ مقبولؐ سے مدارجِ عالیہ مذکورہ بالا تک پہنچ چکے ہیں اور پہنچتے جاتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ اس قدر اُن پر پے درپے اور علی الاتصال تلطّفات و تفضلات وارد کرتا ہے اور اپنی حمائتیں اور عنائتیں دکھلاتا ہے کہ صافی نگاہوں کی نظر میں ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ لوگ منظورانِ نظرِ احدیت سے ہیں۔ جن پر لطفِ ربّانی ایک عظیم الشان سایہ اور فضلِ یزدانی کا ایک جلیل القدر پیرایہ ہے اور دیکھنے والوں کو صریح دکھائی دیتا ہے کہ وہ انعاماتِ خارقِ عادت سے سرفراز ہیں اور کراماتِ عجیب و غریب سے ممتاز ہیں اور محبوبیت کے عطر سے معطّر ہیں۔ اور مقبولیت کے فخروں سے مفتخر ہیں۔ اور قادرِ مطلق کا نور اُن کی صحبت میں اُن کی توجہ میں اُن کی ہمت میں اُن کی دُعا میں اُن کی نظر میں اُن کے اخلاق میں اُن کی طرزِ معیشت میں اُن کی خوشنودی میں اُن کے غضب میں اُن کی رغبت میں۔ اُن کی نفرت میں اُن کی حرکت میں اُن کے سکون میں اُن کے نطق میں اُن کی خاموشی میں اُن کے ظاہر میں اُن کے باطن میں ایسا بھرا ہُوا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک لطیف اور مصفّا شیشہ ایک نہایت عمدہ عطر سے بھرا ہُوا ہوتا ہے۔ اور اُن کے فیضِ صحبت اور ارتباط اور محبت سے وہ باتیں حاصل ہوجاتی ہیں کہ جو ریاضاتِ شاقہ سے حاصل نہیں ہوسکتیں اور اُن کی نسبت ارادت اور عقیدت پیدا کرنے سے ایمانی حالت ایک دوسرا رنگ پیدا کرلیتی ہے اور نیک اخلاق کے ظاہر کرنے میں ایک طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور شوریدگی اور امّارگی نفس کی روبکمی ہونے لگتی ہے اور اطمینان اور حلاوت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور بقدر استعداد اور مناسبت ذوقِ ایمانی جوش مارتا ہے اور اُنس اور شوق ظاہر ہوتا ہے اور التذاذ بذکر اللہ بڑھتا ہے۔ اور اُن کی صحبت طویلہ سے بضرورت یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی ایمانی قوتوں میں اور اخلاقی حالتوں میں اور انقطاع عن الدنیا میں توجہ الی اللہ میں اور محبتِ الٰہیہ میں اور شفقت علی العباد میں اور وفا اور رضا اور استقامت میں اس عالی مرتبے پر ہیں جس کی نظیر دنیا میں نہیں دیکھی گئی۔ اور عقلِ سلیم فی الفور معلوم کرلیتی ہے کہ وہ بند اور زنجیر اُن کے پاؤں سے اتارے گئے ہیں جن میں دوسرے لوگ گرفتار ہیں اور وہ تنگی اور انقباض اُن کے سینہ سے دُور کیا گیا ہے جس کے باعث سے دوسرے لوگوں کے سینے منقبض اور کوفتہ خاطر ہیں۔ ایسا ہی وہ لوگ تحدیث اور مکالماتِ حضرتِ احدیت سے بکثرت مشرف ہوتے ہیں اور متواتر اور دائمی خطابات کے قابل

ٹھہر جاتے ہیں اور حق جلّ و علا اور اُس کے مستعد بندوں میں ارشاد اور ہدایت کے لئے واسطہ گردانے جاتے ہیں۔ اُن کی نورانیت دوسرے دلوں کو منور کر دیتی ہے۔ اور جیسے موسم بہار کے آنے سے نباتی قوتیں جوش زن ہو جاتی ہیں ایسا ہی ان کے ظہور سے فطرتی نور طبائع سلیمہ میں جوش مارتے ہیں اور خود بخود ہر ایک سعید کا دل یہی چاہتا ہے کہ اپنی سعادت مندی کی استعدادوں کو بکوشش تمام منصّۂ ظہور میں لاوے اور خواب غفلت کے پردوں سے خلاصی پاوے اور معصیت اور فسق و فجور کے داغوں سے اور جہالت اور بے خبری کی ظلمتوں سے نجات حاصل کرے۔ سو اُن کے مبارک عہد میں کچھ ایسی خاصیت ہوتی ہے اور کچھ اس قسم کا انتشار نورانیت ہو جاتا ہے کہ ہر ایک مومن اور طالب حق بقدر طاقتِ ایمانی اپنے نفس میں بغیر کسی ظاہری موجب کے انشراح اور شوق دینداری کا پاتا ہے اور ہمت کو زیادت اور قوت میں دیکھتا ہے۔ غرض اُن کے اس عطر لطیف سے جو اُنکو کامل متابعت کی برکت سے حاصل ہوا ہے ہر ایک مخلص کو بقدر اپنے اخلاص کے حظ پہنچتا ہے۔ ہاں جو لوگ شقی ازلی ہیں وہ اس سے کچھ حصّہ نہیں پاتے بلکہ اَور بھی عناد اور حسد اور شقاوت میں بڑھ کر ہاویہ جہنم میں گرتے ہیں۔ اِسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ختم اللّٰہ علیٰ قلوبھم۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۷ - ۵۱۰ حاشیہ درحاشیہ نمبر ۳)

ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ آفتاب کی طرح چمک رہا ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی جاودانی زندگی پر یہ بھی بڑی ایک بھاری دلیل ہے کہ حضرت ممدوح کا فیض جاودانی جاری ہے اور جو شخص اس زمانے میں بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے وہ بلاشبہ قبر میں سے اٹھایا جاتا ہے۔ اور ایک روحانی زندگی اس کو بخشی جاتی ہے۔ نہ صرف خیالی طور پر بلکہ آثار صحیحہ صادقہ اُس کے ظاہر ہوتے ہیں اور آسمانی مددیں اور سماوی برکتیں اور رُوح القدس کی خارق عادت تائیدیں اس کے شامل حال ہو جاتی ہیں اور وہ تمام دنیا کے انسانوں میں سے ایک منفرد انسان ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ اس سے ہمکلام ہوتا ہے اور اپنے اسرار خاصّہ اُس پر ظاہر کرتا ہے اور اپنے حقائق و معارف کھولتا ہے۔ اور اپنی محبت اور عنایت کے چمکتے ہوئے علامات اس میں نمودار کر دیتا ہے اور اپنی نصرتیں اُس پر اُتارتا ہے اور اپنی برکات اس میں رکھ دیتا ہے۔ اور اپنی ربوبیت کا آئینہ اُس کو بنا دیتا ہے۔ اُس کی زبان پر حکمت جاری ہوتی ہے اور اس کے دل سے نکاتِ لطیفہ کے چشمے نکلتے ہیں۔ اور پوشیدہ بھید اُس پر آشکار کئے جاتے ہیں

اور خدا تعالےٰ ایک عظیم الشان تجلّی اس پر فرماتا ہے اور اس سے نہایت قریب ہو جاتا ہے ۔ اور وہ اپنی استجابت دُعاؤں میں اور اپنی قبولیتوں میں اور فتح ابواب معرفت میں اور انکشاف اسرار غیبیہ میں اور نزول برکات میں سب سے اوپر اور سب پر غالب رہتا ہے ۔ چنانچہ اس عاجز نے خدا تعالےٰ سے مامور ہو کر اِنہیں امور کی نسبت اور اسی اتمام حجت کی غرض سے کئی ہزار رجسٹری شدہ خط ایشیا اور یورپ اور امریکہ کے نامی مخالفوں کی طرف روانہ کئے تھے تا اگر کسی کا یہ دعویٰ ہو کہ یہ رُوحانی حیات بجز اتباع خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی اور ذریعہ سے بھی مل سکتی ہے تو وہ اس عاجز کا مقابلہ کرے ۔ اور اگر یہ نہیں تو طالب حق بنکر یک طرفہ برکات اور آیات اور نشانوں کے مشاہدہ کے لئے حاضر آوے لیکن کسی نے صدق اور نیک نیتی سے اس طرف رُخ نہ کیا اور اپنی کنارہ کشی سے ثابت کر دیا کہ وہ سب تاریکی میں گرے ہوئے ہیں ۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۲۲۱-۲۲۲)

ہم یقیناً جانتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کا سب سے بڑا نبی اور سب سے زیادہ پیارا جناب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہے کیونکہ دوسرے نبیوں کی اُمتیں ایک تاریکی میں پڑی ہوئی ہیں ۔ اور صرف گذشتہ قصّے اور کہانیاں اُن کے پاس ہیں مگر یہ امت ہمیشہ خدا تعالیٰ سے تازہ بتازہ نشان پاتی ہے ۔ لہٰذا اس امت میں اکثر عارف ایسے پائے جاتے ہیں کہ جو خدا تعالےٰ پر اس درجہ کا یقین رکھتے ہیں کہ گویا اس کو دیکھتے ہیں ۔ اور دوسری قوموں کو خدا تعالےٰ کی نسبت یہ یقین نصیب نہیں ۔ لہٰذا ہماری رُوح سے یہ گواہی نکلتی ہے کہ سچا اور صحیح مذہب صرف اسلام ہے ۔ . . .
. . . . . . ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات صرف قصّوں کے رنگ میں نہیں ہیں بلکہ ہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر کے خود ان نشانوں کو پا لیتے ہیں ۔ لہٰذا معائنہ اور مشاہدہ کی برکت سے ہم حق الیقین تک پہنچ جاتے ہیں ۔ سو اس کامل اور مقدس نبیؐ کی کس قدر شان بزرگ ہے جس کی نبوّت ہمیشہ طالبوں کو تازہ ثبوت دکھلاتی رہتی ہے اور ہم متواتر نشانوں کی برکت سے اس کمال سے مراتب عالیہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ گویا خدا تعالےٰ کو ہم آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں ۔ پس مذہب اسے کہتے ہیں اور سچّا نبی اس کا نام ہے جس کی سچائی کی ہمیشہ تازہ بہار نظر آئے ۔ محض قصوں پر جن میں ہزاروں طرح کی کمی بیشی کا امکان ہے بھروسہ کر لینا عقلمندوں کا کام نہیں ہے ۔ دنیا میں صدہا لوگ خدا بنائے گئے اور صدہا پرانے افسانوں کے ذریعہ سے کراماتی کر کے مانے جاتے ہیں ۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ سچا کراماتی وہی ہے جس کی کرامات کا دریا

کبھی خشک نہ ہو۔ سو وہ شخص ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ خدا تعالےٰ نے ہر ایک زمانے میں اس کامل اور مقدس کے نشان دکھلانے کے لئے کسی نہ کسی کو بھیجا ہے۔ اور اس زمانے میں مسیح موعود کے نام سے مجھے بھیجا ہے۔ دیکھو آسمان سے نشان ظاہر ہو رہے ہیں۔ اور طرح طرح کے خوارق ظہور میں آرہے ہیں۔ اور ہر ایک حق کا طالب ہمارے پاس رہ کر نشانوں کو دیکھ سکتا ہے گو وہ عیسائی ہو یا یہودی یا آریہ۔ یہ سب برکات ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں ؎

محمدؐ است امام و چراغِ ہر دو جہاں ؛ محمدؐ است فروزندۂ زمین و زماں
خدا نگویمش از ترسِ حق مگر بخدا ؛ خدا نما است وجودش برائے عالمیاں

(کتاب البریہ ص۱۵۵-۱۵۷ حاشیہ)

روحانی زندگی کا ثبوت صرف ہمارے نبی علیہ السلام کی ذات بابرکات میں پایا جاتا ہے خدا کی ہزاروں رحمتیں اس کے شاملِ حال رہیں .... بے سود ہے وہ زندگی جو نفع رساں نہیں۔ اور لاحاصل ہے وہ بقا جس میں فیض نہیں۔ دنیا میں صرف دو زندگیاں قابلِ تعریف ہیں (۱) ایک وہ زندگی جو خود خدائے حیّ و قیوم مبداء فیض کی زندگی ہے۔ (۲) دوسری وہ زندگی جو فیض بخش اور خدا نما ہو۔ سو آؤ ہم دکھاتے ہیں کہ وہ زندگی صرف ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ جس پر ہر ایک زمانے میں آسمان گواہی دیتا رہا ہے اور اب بھی دیتا ہے اور یاد رکھو کہ جس میں فیّاضانہ زندگی نہیں وہ مُردہ ہے نہ زندہ اور مَیں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کا نام لے کر جھوٹ بولنا سخت بدذاتی ہے کہ خدا نے مجھے میرے بزرگ واجب الاطاعت سیّدنا محمدؐ صلے اللہ علیہ وسلم کی رُوحانی دائمی زندگی اور پورے جلال اور کمال کا یہ ثبوت دیا ہے کہ مَیں نے اس کی پیروی سے اور اُس کی محبت سے آسمانی نشانوں کو اپنے اوپر اُترتے ہوئے اور دل کو یقین کے نور سے پُر ہوتے ہوئے پایا۔ اور اس قدر نشان غیبی دیکھے کہ اُن کھلے کھلے نوروں کے ذریعہ سے مَیں نے اپنے خدا کو دیکھ لیا ہے۔

(تریاق القلوب ص۱۰-۱۱)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حالت جس قدر بعض مقامات پر فروتنی اور انکساری میں کمال پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اسی قدر آپ رُوح القدس کی

تائید اور روشنی سے مؤید اور منور ہیں ۔ جیسا کہ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عملی اور فعلی حالت سے دکھایا ہے ۔ یہاں تک کہ آپ کا انوار و برکات کا دائرہ اسقدر وسیع ہے کہ ابدالآباد تک اس کا نمونہ اور ظلّ نظر آتا ہے ۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی جو کچھ خدا تعالیٰ کا فیض اور فضل نازل ہو رہا ہے وہ آپ ہی کی اطاعت اور آپ ہی کی اتباع سے ملتا ہے ۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ کوئی شخص حقیقی نیکی کرنے والا اور خدا تعالیٰ کی رضا کو پانے والا نہیں ٹھہر سکتا اور ان انعام و برکات اور معارف اور حقائق اور کشوف سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا جو اعلےٰ درجہ کے تزکیہ نفس پر ملتے ہیں جب تک کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں کھویا نہ جائے اور اسکا ثبوت خود خدا تعالیٰ کے کلام سے ملتا ہے ۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ۔

اور خدا تعالیٰ کے اس دعویٰ کی عملی اور زندہ دلیل مَیں ہوں ۔ ان نشانات کے ساتھ جو خدا تعالےٰ کے محبوبوں اور ولیوں کے قرآن شریف میں مقرر ہیں مجھے شناخت کرو ۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۱۹۵ - ۱۹۶)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنا جس کے لوازم میں سے محبت اور تعظیم اور اطاعتِ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہے ۔ اس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ انسان خدا کا محبوب بن جاتا ہے اور اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں اور اگر کوئی گناہ کی زہر کھا چکا ہے تو محبت اور اطاعت اور پیروی کے تریاق سے اس زہر کا اثر جاتا رہتا ہے ۔ اور جس طرح بذریعہ دوا مرض سے ایک انسان پاک ہو سکتا ہے ایسا ہی ایک شخص گناہ سے پاک ہو جاتا ہے ۔ اور جس طرح نُور ظلمت کو دُور کرتا ہے اور تریاق زہر زائل کرتا ہے اور آگ جلاتی ہے ۔ ایسا ہی سچی اطاعت اور محبت کا اثر ہوتا ہے ۔ دیکھو آگ کیونکر ایک دم میں جلا دیتی ہے ۔ پس اسی طرح پرجوش نیکی جو محض خدا کا جلال ظاہر کرنے کے لئے کی جاتی ہے وہ گناہ کا خس و خاشاک بھسم کرنے کے لئے آگ کا حکم رکھتی ہے ۔ جب ایک انسان سچے دل سے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے اور آپ کی تمام عظمت اور بزرگی کو مان کر پورے صدق و صفا اور محبت اور اطاعت سے آپ کی پیروی کرتا ہے یہاں تک کہ کامل اطاعت کی وجہ سے فنا کے مقام تک پہنچ جاتا ہے تب س تعلق شدید کی وجہ سے جو آپکے ساتھ ہو جاتا ہے وہ الٰہی نور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترتا ہے اُس سے یہ شخص بھی حصّہ لیتا ہے ۔ تب چونکہ ظلمت اور نور کی باہم منافات ہے وہ ظلمت

جو اس کے اندر سے دُور ہونی شروع ہو جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ کوئی حصہ ظلمت کا اس کے اندر باقی نہیں رہتا ۔ اور پھر اس نور سے قوت پاکر اعلیٰ درجہ کی نیکیاں اُس سے ظاہر ہوتی ہیں ۔ اور اس کے ہر عضو میں سے محبت الٰہی کا نور چمک اُٹھتا ہے ۔ تب اندرونی ظلمت بکلی دُور ہو جاتی ہے اور علمی رنگ سے بھی اس میں نور پیدا ہو جاتا ہے اور عملی رنگ سے بھی نور پیدا ہو جاتا ہے ۔ آخر ان نوروں کے اجتماع سے گناہ کی تاریکی بھی اس کے دل سے کوچ کرتی ہے ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نور اور تاریکی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے لہذا ایمانی نور اور گناہ کی تاریکی بھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی ۔ اور اگر ایسے شخص سے اتفاقاً کوئی گناہ ظہور میں نہیں آیا تو اس کو اس اتباع سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ آئندہ گناہ کی طاقت اُس سے مسلوب ہو جاتی ہے اور نیکی کرنے کی طرف اس کو رغبت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ آپ قرآن شریف میں فرماتا ہے ۔ حبّب الیکم الایمان و زیّنہ فی قلوبکم وکرّہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان ۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ا ۵ صـ ۲۰۲)

جاننا چاہیئے کہ محبوبیت اور قبولیت اور ولایت حقّہ کا درجہ جس کے کسی قدر مختصر طور پر نشان بیان کر چکا ہوں یہ بجز اتباع آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا اور سچے متبع کے مقابل پر اگر کوئی عیسائی یا آریہ یا یہودی قبولیت کے آثار و انوار دکھلانا چاہے تو یہ اس کے لئے ہرگز ممکن نہ ہوگا اور نہایت صاف طریق امتحان کا یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان صالح کے مقابل پر جو سچا مسلمان اور سچائی سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا متبع ہو اور کوئی دوسرا شخص عیسائی وغیرہ معارضہ کے طور پر کھڑا ہو اور یہ کہے کہ جس قدر تجھ پر آسمان سے کوئی نشان ظاہر ہو گا یا جس قدر اسرار غیبیہ تجھ پر کھلیں گے یا جو کچھ قبولیت دعاؤں سے تجھے مدد دی جائے گی یا جس طور تیری عزت اور شرف کے اظہار کے لئے کوئی نمونہ قدرت ظاہر کیا جائیگا یا اگر انعامات خاصہ کا بطور پیشگوئی تجھے وعدہ دیا جائیگا ۔ یا اگر تیرے کسی موذی مخالف پر کسی تنبیہہ کے نزول کی خبر دی جائیگی تو ان سب باتوں میں جو کچھ تجھ سے ظہور میں آئے گا ۔ اور جو کچھ تو دکھلائے گا وہ میں بھی دکھلاؤں گا تو ایسا معارضہ کسی مخالف سے ہرگز ممکن نہیں اور ہرگز مقابل پر نہیں آئیں گے کیونکہ ان کے دل شہادت دے رہے ہیں کہ وہ کذّاب ہیں ۔ انہیں اُس سچے خدا سے کچھ بھی تعلق نہیں کہ جو راستبازوں کا مددگار اور صدیقوں کا دوستدار ہے ۔

(تصدیق النبیؐ صـ ۴۵ - ۴۶)

خدا کے رسول کو ماننا توحید کے ماننے کے لئے علّت موجبہ کی طرح ہے اور ان کے باہمی ایسے تعلقات ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے۔ اور جو شخص بغیر پیروی رسول کے توحید کا دعویٰ کرتا ہے اس کے پاس صرف ایک خشک ہڈی ہے جس میں مغز نہیں اور اس کے ہاتھ میں محض ایک مُردہ چراغ ہے جس میں روشنی نہیں ہے۔ اور ایسا شخص کہ جو یہ خیال کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کو واحد لاشریک جانتا ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانتا ہو وہ نجات پائے گا یقیناً سمجھو کہ اس کا دل مجذوم ہے اور وہ اندھا ہے اور اس کو توحید کی کچھ بھی خبر نہیں کہ کیا چیز ہے۔ اور ایسی توحید کے اقرار میں شیطان اس سے بہتر ہے۔ کیونکہ اگرچہ شیطان عاصی اور نافرمان ہے لیکن وہ اس بات پر تو یقین رکھتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ مگر اس شخص کو تو خدا پر یقین بھی نہیں۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۱۹)

اگر اس جگہ یہ استفسار ہو کہ اگر یہ درجہ اس عاجز اور مسیح کے لئے مسلّم ہے تو جناب سیّدنا و مولٰنا سیّد الکل و افضل الرسل خاتم النبیین محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے کونسا درجہ باقی ہے؟ سو واضح ہو کہ وہ ایک اعلیٰ مقام اور برتر مرتبہ ہے جو اس ذات کامل الصفات پر ختم ہو گیا ہے جس کی کیفیت کو پہنچنا بھی کسی دوسرے کا کام نہیں چہ جائیکہ وہ کسی اَور کو حاصل ہو سکے۔ ....

مراتب قرب و محبت باعتبار اپنے روحانی درجات کے تین قسم پر منقسم ہیں۔ سب سے ادنیٰ درجہ جو درحقیقت وہ بھی بڑا ہے یہ ہے کہ آتشِ محبت الٰہی لوحِ قلب انسان کو گرم تو کرے اور ممکن ہے کہ ایسا گرم کرے کہ بعض آگ کے کام اس محرور سے ہو سکیں لیکن یہ کسر باقی رہ جائے کہ اس متاثر میں آگ کی چمک پیدا نہ ہو۔ اس درجہ کی محبت پر جب خدا تعالیٰ کی محبت کا شعلہ واقع ہو تو اُس شعلہ سے جس قدر رُوح میں گرمی پیدا ہوتی ہے اس کو سکینت و اطمینان اور کبھی فرشتہ و ملک کے لفظ سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

دوسرا درجہ محبت کا وہ ہے جس میں دونوں محبتوں کے ملنے سے آتشِ محبت الٰہی لوحِ قلب انسان کو اس قدر گرم کرتی ہے کہ اُس میں آگ کی صورت پر ایک چمک پیدا ہو جاتی ہے لیکن اُس چمک میں کسی قسم کا اشتعال یا بھڑک نہیں ہوتی فقط ایک چمک ہوتی ہے جس کو رُوح القدس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تیسرا درجہ محبت کا وہ ہے جس میں ایک نہایت افروختہ شعلہ محبّت الٰہی کا انسانی محبت کے

مستعد فتیلہ پر پڑ کر اس کو افروختہ کر دیتا ہے اور اس کے تمام اجزاء اور تمام رگ و ریشہ پر استیلاء پکڑ کر اپنے وجود کا اتم اور اکمل مظہر اس کو بنا دیتا ہے۔ اور اس حالت میں آتش محبت الٰہی لوح قلب انسان کو نہ صرف ایک چمک بخشتی ہے بلکہ معاً اس چمک کے ساتھ تمام وجود بھڑک اٹھتا ہے اور اس کی لوئیں اور شعلے اردگرد کو روز روشن کی طرح روشن کر دیتے ہیں اور کسی قسم کی تاریکی باقی نہیں رہتی اور پورے طور پر اور تمام صفات کاملہ کے ساتھ وہ سارا وجود آگ ہی آگ ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت جو ایک آتش افروختہ کی صورت پر دونوں محبتوں کے جوڑنے سے پیدا ہو جاتی ہے اُس کو **رُوح امین** کے نام سے بولتے ہیں کیونکہ یہ ہر یک تاریکی سے امن بخشتی ہے اور ہر یک غبار سے خالی ہے اور اُس کا نام **شدید القویٰ** بھی ہے کیونکہ یہ اعلیٰ درجہ کی طاقتِ وحی ہے جس سے قوی تر وحی متصور نہیں اور اُس کا نام **ذوالافق الاعلیٰ** بھی ہے کیونکہ یہ وحی الٰہی کے انتہائی درجہ کی تجلّی ہے۔ اور اِس کو **رأیٰ ما رأیٰ** کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کیفیت کا اندازہ تمام مخلوقات کے قیاس اور گمان اور وہم سے باہر ہے۔ اور یہ کیفیت صرف دنیا میں ایک ہی انسان کو ملی ہے جو انسان کامل ہے جس پر تمام سلسلہ انسانیہ کا ختم ہو گیا ہے۔ اور دائرہ استعدادات بشریہ کا کمال کو پہنچا ہے اور وہ درحقیقت پیدائش الٰہی کے خط ممتد کی اعلیٰ طرف کا آخری نقطہ ہے جو ارتفاع کے تمام مراتب کا انتہا ہے۔ حکمتِ الٰہی کے ہاتھ نے ادنیٰ سے ادنیٰ خلقت سے اور اسفل سے اسفل مخلوق سے سلسلہ پیدائش کا شروع کر کے اس اعلیٰ درجہ کے نقطہ تک پہنچا دیا ہے جس کا نام دوسرے لفظوں میں **محمّد** ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ نہایت تعریف کیا گیا یعنی کمالاتِ تامہ کا مظہر۔ سو جیسا کہ فطرت کی رو سے اس نبی کا اعلیٰ اور ارفع مقام تھا ایسا ہی خارجی طور پر بھی اعلیٰ و ارفع مرتبہ وحی کا اُس کو عطا ہوا۔ اور اعلیٰ و ارفع مقام محبت کا ملا۔ یہ وہ مقام عالی ہے کہ مَیں اور مسیح دونوں اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کا نام مقامِ جمع اور مقام وحدتِ تامّہ ہے۔ پہلے نبیوں نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر دی ہے اسی پتہ و نشان پر خبر دی ہے۔ اور اسی مقام کی طرف اشارہ کیا ہے اور جیسا کہ مسیح اور اس عاجز کا مقام ایسا ہے کہ اس کو استعارہ کے طور پر **ابنیّت** کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں ایسا ہی یہ وہ عالی شان مقام ہے کہ گذشتہ نبیوں نے استعارہ کے طور پر صاحب مقام ہذا کے ظہور کو خدائے تعالیٰ کا ظہور قرار دے دیا اور اس کا آنا خدائے تعالیٰ کا آنا ٹھہرایا ہے۔

(توضیح مرام ص ۱۳-۱۵)

ہمارے سیّد و مولیٰ جناب مقدس خاتم الانبیاءؐ کی نسبت صرف مسیح نے ہی بیان نہیں کیا کہ آنجنابؐ کا دنیا میں تشریف لانا درحقیقت خدائے تعالیٰ کا ظہور فرمانا ہے بلکہ اس طرز کا کلام دوسرے نبیوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اپنی اپنی پیشگوئیوں میں بیان کیا ہے اور استعارہ کے طور پر آنجنابؐ کے ظہور کو خدا تعالیٰ کا ظہور قرار دیا ہے بلکہ بوجہ خدائی کے مظہر اتم ہونے کے آنجنابؐ کو خدا کر کے پکارا ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد کے زبور میں لکھا ہے۔ "تُو حسن میں بنی آدم سے کہیں زیادہ ہے۔ تیرے لبوں میں نعمت بنائی گئی اس لئے خدا نے تجھ کو ابد تک مبارک کیا (یعنی تو خاتم الانبیاء ٹھہرا) اے پہلوان تو جاہ و جلال سے اپنی تلوار حمائل کر کے اپنی ران پر لٹکا۔ امانت اور حلم اور عدالت پر اپنی بزرگواری اور اقبال مندی سے سوار ہو کر تیرا داہنا ہاتھ تجھے ہیبتناک کام دکھائے گا۔ بادشاہ کے دشمنوں کے دلوں میں تیرے تیر تیزی کرتے ہیں۔ لوگ تیرے سامنے گر جاتے ہیں۔ اے خدا تیرا تخت ابدالآباد ہے۔ تیری سلطنت کا عصا راستی کا عصا ہے۔ تُو نے صدق سے دوستی اور شر سے دشمنی کی ہے اسی لئے خدا نے جو تیرا خدا ہے خوشی کے روغن سے تیرے مصاحبوں سے زیادہ تجھے معطر کیا ہے۔" (دیکھو زبور ۴۵)

اب جاننا چاہیئے کہ زبور کا یہ فقرہ کہ "اے خدا تیرا تخت ابدالآباد ہے۔ تیری سلطنت کا عصا راستی کا عصا ہے۔" یہ محض بطور استعارہ ہے جس سے غرض یہ ہے کہ جو روحانی طور پر شان محمدیؐ ہے اُس کو ظاہر کر دیا جائے۔ پھر یسعیاہ نبی کی کتاب میں ایسا ہی لکھا ہے چنانچہ اس کی عبارت یہ ہے:۔

> "دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالونگا، میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے۔ مَیں نے اپنی رُوح اس پر رکھی۔ وہ قوموں پر راستی ظاہر کرے گا۔ وہ نہ چلّائے گا اور اپنی صدا بلند نہ کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سُنائیگا۔ وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑیگا اور سن کو جس سے دھوآں اُٹھتا ہے نہ بُجھائیگا جب تک کہ راستی کو امن کے ساتھ نہ ظاہر کرے۔ وہ نہ گھٹے گا نہ تھکے گا جب تک کہ راستی کو زمین پر قائم نہ کرے اور جزیرے اُس کی شریعت کے منتظر ہوویں .... خداوند خدا ایک بہادر کی مانند نکلیگا وہ جنگی مرد کی مانند اپنی غیرت کو اسکائے گا۔ الخ"

اب جاننا چاہیئے کہ یہ فقرہ کہ "خداوند خدا ایک بہادر کی مانند نکلیگا" یہ بھی بطور استعارہ کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پُرہیبت ظہور کا اظہار کر رہا ہے۔ دیکھو یسعیاہ نبی کی کتاب باب ۴۲۔ اور ایسا ہی اور کئی نبیوں نے بھی اس استعارہ کو اپنی پیشگوئیوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم

کی شان میں استعمال کیا ہے۔

(توضیح مرام ص۱۷-۱۹ حاشیہ)

مذہبی مسائل میں سے نجات اور شفاعت کا مسئلہ ایک ایسا عظیم الشان اور مدار اہمام مسئلہ ہے کہ مذہبی پابندی کے تمام اغراض اسی پر جاکر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور کسی مذہب کے صدق اور سچائی کے پرکھنے کے لئے وہی ایک ایسا صاف اور کھلا کھلا نشان ہے جس کے ذریعہ سے پوری تسلّی اور اطمینان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں مذہب درحقیقت سچا اور منجانب اللہ ہے۔ اور یہ بات بالکل راست اور درست ہے کہ جس مذہب نے اس مسئلہ کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا یا اپنے فرقہ میں نجات یافتہ لوگوں کے موجودہ نمونے کھلے کھلے امتیاز کے ساتھ دکھلا نہیں سکا اس مذہب کے باطل ہونے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں مگر جس مذہب نے کمال صحت سے نجات کی اصل حقیقت دکھلائی ہے۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ اپنے موجودہ زمانے میں ایسے انسان بھی پیش کئے ہیں جن میں کامل طور پر نجات کی رُوح پھونکی گئی ہے۔ اُس نے مہر لگا دی ہے کہ وہ سچا اور منجانب اللہ ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر ایک انسان طبعاً اپنے دل میں محسوس کرتا ہے کہ وہ صدہا طرح کی غفلتوں اور پردوں اور نفسانی حملوں اور لغزشوں اور کمزوریوں اور جہالتوں اور قدم قدم پر تاریکیوں اور ٹھوکروں اور مسلسل خطرات اور وساوس کی وجہ سے اور نیز دنیا کی انواع و اقسام کی آفتوں اور بلاؤں کے سبب سے ایک ایسے زبردست ہاتھ کا محتاج ہے جو اس کو ان تمام مکروہات سے بچا دے کیونکہ انسان اپنی فطرت میں ضعیف ہے، اور وہ کبھی ایک دم کیلئے بھی اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کر سکتا کہ وہ خود بخود نفسانی ظلمات سے باہر آسکتا ہے۔ یہ تو انسانی کانشنس کی شہادت ہے۔ اور ماسوا اسکے اگر غور اور فکر سے کام لیا جائے تو عقل سلیم بھی اس کو چاہتی ہے کہ نجات کے لئے شفیع کی ضرورت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نہایت درجہ تقدس اور تطہر کے مرتبہ پر ہے اور انسان نہایت درجہ ظلمت اور معصیت اور آلودگی کے گڑھے میں ہے اور بوجہ فقدان مناسبت اور مشابہت عام طبقہ انسانی گروہ کا اس لائق نہیں کہ وہ براہ راست خدا تعالےٰ سے فیض پاکر مرتبہ نجات کا حاصل کر لیں پس اس لئے حکمت اور رحمت الٰہی نے یہ تقاضا فرمایا کہ نوع انسان اور اللہ تعالیٰ میں بعض افراد کاملہ جو اپنی فطرت میں ایک خاص فضیلت رکھتے ہوں درمیان واسطہ ہوں۔ اور وہ اس قسم کے انسان ہوں جن کی فطرت نے کچھ حصّہ صفات لاہوتی سے لیا ہو اور کچھ حصّہ صفات ناسوتی سے۔ تا بباعث لاہوتی مناسبت کے خدا سے فیض حاصل کریں اور بباعث ناسوتی مناسبت کے اس فیض کو جو اوپر سے لیا ہے نیچے کو یعنی بنی نوع کو پہنچا دیں۔ اور یہ کہنا واقعی صحیح ہے کہ اس قسم کے

انسان بوجہ زیادت کمال لاہوتی اور ناسوتی کے دوسرے انسانوں سے ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ گویا یہ ایک مخلوق ہی الگ ہے۔ کیونکہ جس قدر ان لوگوں کو خدا کا جلال اور عظمت ظاہر کرنے کے لئے جوش دیا جاتا ہے۔ اور جس قدر ان کے دلوں میں وفاداری کا مادہ بھرا جاتا ہے اور پھر جس قدر بنی نوع کی ہمدردی کا جوش ان کو عطا کیا جاتا ہے وہ ایک ایسا امر فوق العادت ہے جو دوسرے کے لئے اُس کا تصوّر کرنا بھی مشکل۔ ہاں یہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ یہ تمام اشخاص ایک مرتبہ پر نہیں ہوتے بلکہ ان فطرتی فضائل میں کوئی اعلیٰ درجہ پر ہے کوئی اس سے کم اور کوئی اس سے کم۔

ایک سلیم العقل کا پاک کانشنس سمجھ سکتا ہے کہ شفاعت کا مسئلہ کوئی بناوٹی اور مصنوعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ خدا کے مقرر کردہ انتظام میں اندر سے اس کی نظیریں موجود ہیں۔ اور قانون قدرت میں اس کی شہادتیں صریح طور پر ملتی ہیں۔ اب شفاعت کی فلاسفی یوں سمجھنی چاہیئے کہ شفع لغت میں جُفت کو کہتے ہیں۔ پس شفاعت کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ضروری امر جو شفیع کی صفات میں سے ہوتا ہے یہ ہے کہ اس کو دوطرفہ اتحاد حاصل ہو۔ یعنی ایک طرف اُس کے نفس کو خدا تعالےٰ سے تعلّق شدید ہو ایسا کہ گویا وہ کمال اتحاد کے سبب حضرتِ احدیت کے لئے بطور جُفت اور پیوند کے ہو اور دوسری طرف اس کو مخلوق سے بھی شدید تعلّق ہو۔ گویا وہ اُن کے اعضاء کی ایک جزو ہو۔ پس شفاعت کا امر مترتب ہونے کے لئے درحقیقت یہی دو جز ہیں جن پر ترتب اثر موقوف ہے۔

یہی راز ہے جو حکمتِ الٰہیہ نے آدم کو ایسے طور سے بنایا کہ فطرت کی ابتدا سے ہی اُس کی سرشت میں دو قسم کے تعلّق قائم کر دیئے یعنی ایک تعلق تو خدا سے قائم کیا۔ جیسا کہ قرآن شریف میں فرمایا فاذا سوّیتہٗ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین یعنی جب میں اُسکو ٹھیک ٹھیک بنالوں اور میں اپنی رُوح اُس میں پھُونک دوں تو اے فرشتو اُسی وقت تم سجدہ میں گر جاؤ۔ مذکورہ بالا آیت سے صاف ثابت ہے کہ خدا نے آدم کو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اپنی رُوح پھُونک کر اُس کی فطرت کو اپنے ساتھ ایک تعلق قائم کرایا۔ سو یہ اِس لئے کیا گیا کہ تا انسان کو فطرتًا خدا سے تعلق پیدا ہو جائے۔ ایسا ہی دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ ان لوگوں سے بھی فطرتی تعلق ہو جو بنی نوع کہلائیں گے۔ کیونکہ جبکہ ان کا وجود آدم کی ہڈی میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہوگا تو وہ ضرور اس رُوح میں سے بھی حصّہ لیں گے جو آدم میں پھونکی گئی۔ پس اس لئے آدم طبعی طور پر اُن کا شفیع ٹھہرے گا کیونکہ بباعث نفخ رُوح جو راستبازی آدم کی فطرت کو دی گئی ہے ضرور ہے

کہ اُس کی راستبازی کا کچھ حصّہ اس شخص کو بھی ملے جو اس میں سے نکلا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ ہر ایک جانور کا بچہ اس کی صفات اور افعال میں سے حصّہ لیتا ہے اور دراصل شفاعت کی حقیقت بھی یہی ہے کہ فطرتی وارث اپنے مورث سے حصّہ لے کیونکہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ شفاعت کا لفظ شفع کے لفظ سے نکلا ہے جو زوج کو کہتے ہیں۔ پس جو شخص فطرتی طور پر ایک دوسرے شخص کا زوج ٹھہر جائیگا ضرور اُس کی صفات میں سے حصّہ لے گا۔

اِسی اصول پر تمام سلسلہ خلقی توارث کا جاری ہے۔ انسان کا بچہ انسانی قویٰ میں سے حصّہ لیتا ہے اور گھوڑے کا بچہ گھوڑے کے قویٰ سے حصہ لیتا ہے اور اس وراثت کا دوسرے لفظوں میں شفاعت سے فیضیاب ہوتا ہے کیونکہ جب شفاعت کی اصل شفع یعنی زوج ہے پس تمام مدار شفاعت سے فیض اُٹھانے کا اس بات پر ہے کہ جس شخص کی شفاعت سے آدمی مستفیض ہونا چاہتا ہے اُس سے فطرتی تعلّق اس کو حاصل ہوتا ہے تا جو کچھ اس کی فطرت کو دیا گیا ہے اسکی فطرت کو بھی وہی ملے۔ یہ تعلق جیسا کہ وہبی طور پر انسانی فطرت میں موجود ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی جز ہے ایسا ہی کسبی طور پر بھی یہ تعلّق زیادت پذیر ہے۔ یعنی جب ایک انسان یہ چاہتا ہے کہ جو فطرتی محبت اور فطرتی ہمدردی بنی نوع کی اس میں موجود ہے اس میں زیادت ہو تو بقدر دائرۂ فطرت اور مناسبت کے زیادت بھی ہو جاتی ہے۔ اِسی بنا پر قوتِ عشقی کا تموّج بھی ہے کہ ایک شخص ایک شخص سے اِس قدر محبت بڑھاتا ہے کہ بغیر اس کے دیکھنے کے آرام نہیں کر سکتا آخر اس کی شدّت محبت اس دوسرے شخص کے دل پر بھی اثر کرتی ہے اور جو شخص انتہا درجہ پر کسی سے محبت کرتا ہے۔ وہی شخص کامل طور پر اور سچّے طور پر اُس کی بھلائی بھی چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ امر بچّوں کی نسبت ان کی طرف سے مشہود اور محسوس ہے۔

پس اصل جڑ شفاعت کی یہی محبت ہے جب کہ اس کے ساتھ فطرتی تعلق بھی ہو کیونکہ بجز فطرتی تعلّق کے محبت کا کمال جو شرط شفاعت ہے غیر ممکن ہے۔ اس تعلّق کو انسانی فطرت میں داخل کرنے کے لئے حوّا کو علیحدہ پیدا نہ کیا بلکہ آدم کی پسلی ہی سے اسکو نکالا۔ جیسا کہ قرآن شریف میں فرمایا ہے وخلق منھا زوجھا یعنی آدم کے وجود میں سے ہی ہم نے اس کا جوڑا پیدا کیا جو **حوّا** ہے تا آدم کا تعلّق حوّا اور اس کی اولاد سے طبعی ہو نہ بناوٹی۔ یہ اس لئے کیا کہ تا آدم زادوں کے تعلق اور ہمدردی کو بقا ہو۔ کیونکہ طبعی تعلّق غیر منفک ہوتے ہیں مگر غیر طبعی تعلّق کے لئے بقا نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں وہ باہمی کشش نہیں ہے جو طبعی میں ہوتی ہے۔ غرض خدا نے

اس طرح ہر دونوں قسم کے تعلق جو آدم کے لئے خدا سے اور بنی نوع سے ہونے چاہیئے تھے طبعی طور پر پیدا کئے۔ پس اس تقریر سے صاف ظاہر ہے کہ کامل انسان جو شفیع ہونے کے لائق ہو وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے ان دونوں تعلقوں سے کامل حصّہ لیا ہو اور کوئی شخص بغیر ان ہر دو قسم کے کمال کے انسان کامل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آدم کے بعد بھی سنّت اللہ اسی طرح پر جاری ہوئی کہ کامل انسان کے لئے جو شفیع ہو سکتا ہے یہ دونوں تعلّق ضروری ٹھہرائے گئے۔ یعنی ایک یہ تعلق کہ اُن میں آسمانی رُوح پھونکی گئی اور خدا نے ایسا اُن سے اتصال کیا کہ گویا اُن میں اُتر آیا۔ اور دوسرے یہ کہ بنی نوع کی زوجیت کا وہ جوڑ جو حوّا اور آدم میں باہمی ہمدردی اور محبت کے ساتھ مستحکم کیا گیا تھا اُن میں سب سے زیادہ چمکایا گیا۔ اسی تحریک سے اُن کو بیویوں کی طرف بھی رغبت ہوئی۔ اور یہی ایک اوّل علامت اس بات کی ہے کہ ان میں بنی نوع کی ہمدردی کا مادہ ہے اور اس کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ خیرکم خیرکم لاھلہ یعنی تم میں سے سب سے زیادہ بنی نوع انسان کے ساتھ بھلائی کرنے والا وہی ہو سکتا ہے کہ پہلے اپنی بیوی کے ساتھ بھلائی کرے۔ مگر جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ ظلم اور شرارت کا برتاؤ رکھتا ہے ممکن نہیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ بھی بھلائی کر سکے کیونکہ خدا نے آدم کو پیدا کر کے سب سے پہلے آدم کی محبت کا مصداق اس کی بیوی کو ہی بنایا ہے۔ پس جو شخص اپنی بیوی سے محبت نہیں کرتا یا اس کی خود بیوی ہی نہیں وہ کامل انسان ہونے کے مرتبہ سے گرا ہؤا ہے اور شفاعت کی دو شرطوں میں سے ایک شرط اُس میں مفقود ہے۔ اس لئے اگر عصمت اُس میں پائی بھی جائے تب بھی وہ شفاعت کرنے کے لائق نہیں۔ لیکن جو شخص کوئی بیوی نکاح میں لاتا ہے۔ وہ اپنے لئے بنی نوع کی ہمدردی کی بنیاد ڈالتا ہے۔ کیونکہ ایک بیوی بہت سے رشتوں کا موجب ہو جاتی ہے اور بچّے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کی بیویاں آتی ہیں اور بچوں کی نانیاں اور بچوں کے ماموں وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور اس طرح پر ایسا شخص خواہ نخواہ محبت اور ہمدردی کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی اس عادت کا دائرہ وسیع ہو کر سب کو اپنی ہمدردی سے حصہ دیتا ہے۔ لیکن جو لوگ جوگیوں کی طرح نشوونما پاتے ہیں اُن کو اس عادت کے وسیع کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا اس لئے ان کے دل سخت اور خشک رہ جاتے ہیں۔

یہ امر ظاہر ہے کہ عصمت کو شفاعت سے کوئی تعلّق نہیں کیونکہ عصمت کا مفہوم صرف اس حد تک ہے کہ انسان گناہ سے بچے۔ اور گناہ کی یہ تعریف ہے کہ انسان خدا کے حکم کو عمداً توڑ کر

لائق سزا ٹھہرے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ عصمت اور شفاعت میں کوئی تلازم ذاتی نہیں کیونکہ تعریف مذکورہ بالا کے رو سے نابالغ بچے اور پیدائشی مجنون بھی معصوم ہیں۔ وجہ یہ کہ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ کوئی گناہ عمدًا کریں۔ اور نہ وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کسی فعل کے ارتکاب سے قابل سزا ٹھہرتے ہیں۔ پس بلاشبہ وہ حق رکھتے ہیں کہ ان کو معصوم کہا جائے۔ مگر کیا وہ یہ بھی حق رکھتے ہیں کہ وہ انسانوں کے شفیع ہوں اور منجی کہلائیں؟ پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ منجی ہونے اور معصوم ہونے میں کوئی تعلق نہیں۔ ....

شخص شفیع کے لئے جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا ہے ضروری ہے کہ خدا سے اس کو ایک ایسا گہرا تعلّق ہو کہ گویا خدا اُس کے دل میں اُترا ہوا ہو اور اسکی تمام انسانیت مر کر بال بال میں لاہوتی تجلّی پیدا ہو گئی ہو۔ اور اس کی رُوح پانی کی طرح گداز ہو کر خدا کی طرف بہ نکلی اور اس طرح پر قرب کے انتہائی نقطہ پر جا پہنچی ہو۔ اور اسی طرح شفیع کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس کے لئے وہ شفاعت کرنا چاہتا ہے اُس کی ہمدردی میں اس کا دل ہاتھ سے نکلا جاتا ہو ایسا کہ عنقریب اس پر غشی طاری ہو گی۔ اور گویا شدّتِ قلق سے اس کے اعضاء اُس سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں اور اُس کے حواس منتشر ہیں۔ اور اُس کی ہمدردی نے اُس کو اس مقام تک پہنچایا ہو کہ جو باپ سے بڑھکر اور ماں سے بڑھ کر اور ہر ایک غمخوار سے بڑھ کر ہے۔ پس جب یہ دونوں حالتیں اس میں پیدا ہو جائیں گی تو وہ ایسا ہو جائیگا کہ گویا وہ ایک طرف سے لاہوت کے مقام سے جفت ہے اور دوسری طرف ناسوت کے مقام سے جفت۔ تب دونوں پلّہ میزان کے اُس میں مساوی ہونگے۔ یعنی وہ مظہر لاہوت کامل بھی ہوگا اور مظہر ناسوت کامل بھی اور بطور برزخ دونوں حالتوں میں واقع ہوگا۔ اس طرح پر

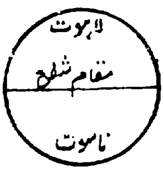

اِس مقام شفاعت کی طرف قرآن شریف میں اشارہ فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انسان کامل ہونے کی شان میں فرمایا ہے دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنٰی۔ یعنی یہ رسول خدا کی طرف چڑھا۔ اور جہاں تک امکان میں ہے خدا سے نزدیک ہوا۔ اور قرب کے تمام کمالات کو طے کیا اور لاہوتی مقام سے پورا حصہ لیا۔ اور پھر ناسوت کی طرف کامل رجوع کیا۔ یعنی عبودیت کے انتہائی نقطہ تک اپنے تئیں پہنچایا اور بشریت کے پاک لوازم یعنی بنی نوع کی ہمدردی اور محبت سے جو ناسوتی کمال کہلاتا ہے پورا حصہ لیا۔

لہذا ایک طرف خدا کی محبت میں اور دوسری طرف بنی نوع کی محبت میں کمال تام تک پہنچا ۔ پس چونکہ وہ کامل طور پر خدا سے قریب ہُوا اور پھر کامل طور پر بنی نوع سے قریب ہُوا ۔ اس لئے دونوں طرف کے مساوی قرب کی وجہ سے ایسا ہوگیا جیسا کہ دو قوسوں میں ایک خط ہوتا ہے ۔ لہذا وہ شرط جو شفاعت کے لئے ضروری ہے اس میں پائی گئی اور خدا نے اپنے کلام میں اس کے لئے گواہی دی کہ وہ اپنے بنی نوع میں اور اپنے خدا میں ایسے طور سے درمیان ہے جیسا کہ وتر دو قوسوں کے درمیان ہوتا ہے ۔

اور پھر ایک اور مقام میں آپ کے الٰہی قرب کی نسبت یوں فرمایا :۔ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ ربّ العالمین ۔ یعنی لوگوں کو اطلاع دیدے کہ میری یہ حالت ہے کہ مَیں اپنے وجود سے بالکل کھویا گیا ہوں ۔ میری تمام عبادتیں خدا کے لئے ہوگئی ہیں .... یہ آیت بتلا رہی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس قدر خدا میں گم اور محو ہو گئے تھے کہ آپ کی زندگی کے تمام انفاس اور آپ کی موت محض خدا تعالےٰ کے لئے ہوگئی تھی ۔ اور آپ کے وجود میں نفس اور مخلوق اور اسباب کا کچھ حصہ باقی نہیں رہا تھا اور آپ کی رُوح خدا کے آستانے پر ایسے اخلاص سے گری تھی کہ اس میں غیر کی ایک ذرّہ آمیزش نہیں رہی تھی ....

اور چونکہ خدا سے محبت کرنا اور اس کی محبت میں اعلیٰ مقامِ قرب تک پہنچنا ایک ایسا امر ہے جو کسی غیر کو اس پر اطلاع نہیں ہو سکتی اس لئے خدا تعالےٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے افعال ظاہر کئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درحقیقت تمام چیزوں پر خدا کو اختیار کر لیا تھا اور آپ کے ذرّہ ذرّہ اور رگ و ریشہ میں خدا کی محبت اور خدا کی عظمت ایسی رچی ہوئی تھی کہ گویا آپ کا وجود خدا کی تجلیات کے پورے مشاہدہ کے لئے ایک آئینہ کی طرح تھا ۔ خدا کی محبت کاملہ کے آثار جس قدر عقل سوچ سکتی ہے وہ تمام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم میں موجود تھے ۔

(ریویو آف ریلیجنز اردو جلد اول ص ۱۸۵-۱۸۷)

سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنے جیسا خدا کبھی نہیں بناتا کیونکہ اس کی صفت احدیت اور بے مثل اور مانند ہونے کی جو ازلی ابدی طور پر اس میں پائی جاتی ہے اس طرف توجہ کرنے سے اُس کو روکتی ہے ....

ہاں اِس طرح پر وہ اپنی ذات بے مثل و مانند کا نمونہ پیدا کرتا ہے کہ اپنی ذاتی خوبیاں

جن پر اس کا علم محیط ہے عکس کے طور پر بعض اپنی مخلوقات میں رکھ دیتا ہے۔ اور کمالات کا انتہائی درجہ جو حقیقی طور پر اس کو حاصل ہے ظلّی طور پر اس مخلوق کو بھی بخش دیتا ہے جیسا کہ اسی کی طرف قرآن شریف میں اشارہ بھی ہے وَ رفع بعضھم درجات۔ اس جگہ صاحب درجاتِ رفیعہ سے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم مراد ہیں جن کو ظلّی طور پر انتہائی درجہ کے کمالات جو کمالاتِ الوہیت کے اظلال و آثار ہیں بخشے گئے اور وہ خلافت حقّہ جس کے وجود کامل کے تحقق کے لئے سلسلہ بنی آدم کا قیام بلکہ ایجاد کل کائنات کا ہوا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وجودِ باجود سے اپنے مرتبۂ اتم و اکمل میں ظہور پذیر ہو کر آئینۂ خدا نما ہوئے۔ یہ بحث معارف الٰہیہ میں سے نہایت باریک بحث ہے اور ہمارے مخالفین جو ان نازک نکاتِ عرفانی سے بیگانہ اور اس کوچہ اسرار الوہیت سے ناآشنا محض ہیں وہ تعجب کرینگے کہ کیونکر کروڑہا اور بے شمار مخلوقات میں سے صرف ایک ہی شخص کو مرتبہ کاملہ خلافتِ تامہ حقّہ کا جو ظلّ مرتبہ الوہیت ہے حاصل ہو سکتا ہے۔ سو اگرچہ اس بحث کو طول دینے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن تاہم اس قدر بیان کر دینا طالب حق کے سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ عادت اللہ یا تم یوں ہی سمجھ لو کہ اس کا قانون قدرت جو اس کی صفت وحدت کے مناسب حال ہے یہی ہے کہ وہ بوجہ واحد ہونے کے اپنے افعالِ خالقیت میں رعایت وحدت کو دوست رکھتا ہے جو کچھ اُس نے پیدا کیا ہے اگر ہم اس سب کی طرف نظر غور سے دیکھیں تو ساری مخلوقات کو جو اس دستِ قدرت سے صادر ہوئی ہے ایک ایسے سلسلہ وحدانی اور باترتیب رشتہ میں منسلک پائیں گے کہ گویا وہ ایک خط مستقیم ممتد محدود ہے جس کی دونوں طرفوں میں سے ایک طرف ارتفاع اور دوسری طرف انخفاض ہے .... طرف ارتفاع کے آخیر نقطہ پر اس استعداد کا انسان ہوگا جو اپنی استعداد انسانی میں سب نوع انسان سے بڑھ کر ہے۔ اور طرف انخفاض میں وہ ناقص الاستعداد روح ہوگی جو اپنے غایت درجہ کے نقصان کی وجہ سے حیوانات لایعقل کے قریب قریب ہے۔ اور اگر سلسلہ جمادی کی طرف نظر ڈال کر دیکھیں تو اس قاعدہ کو اَور بھی اس سے تائید پہنچتی ہے۔ کیونکہ خدائے تعالےٰ نے چھوٹے سے چھوٹے جسم سے جو ایک ذرّہ ہے لیکر ایک بڑے سے بڑے جسم تک جو آفتاب ہے اپنی صفت خالقیت کو تمام کیا ہے اور بلاشبہ خدائے تعالیٰ نے اس جمادی سلسلہ میں آفتاب کو ایک ایسا عظیم الشان اور نافع اور ذی برکت وجود پیدا کیا ہے کہ طرف ارتفاع میں اس کے برابر کوئی دوسرا ایسا وجود نہیں ہے۔ سو اس سلسلہ کے ارتفاع اور انخفاض پر نظر ڈال کر جو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے روحانی سلسلہ جو اُسی ہاتھ سے نکلا ہے اور اسی عادت اللہ سے ظہور پذیر

ہُوا ہے خود بلا تامل سمجھ میں آتا ہے کہ وہ بھی بلا تفاوت اِسی طرح واقعہ ہے ۔ اور یہی ارتفاع انخفاض اس میں بھی موجود ہے ۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ کے کام یکرنگ اور یکساں ہیں اس لئے کہ وہ واحد ہے اور اپنے اصدار افعال میں وحدت کو دوست رکھتا ہے ۔ پریشانی اور اختلاف اس کے کاموں میں راہ نہیں پا سکتا ۔ اور خود یہ کیا ہی پیارا اور موزوں طریق معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کے کام باقاعدہ اور ایک ترتیب سے مرتب اور ایک سلک میں منسلک ہوں ۔

اب ہم جبکہ ہم نے ہر طرح سے ثبوت پاکر بلکہ بہ بداہت دیکھکر خدائے تعالیٰ کے اِس قانونِ قدرت کو مان لیا کہ اس کے تمام کام کیا روحانی اور کیا جسمانی پریشان اور مختلف طور پر نہیں ہیں جن میں یونہی گڈ بڈ پڑا ہو بلکہ ایک حکیمانہ ترتیب سے مرتب اور ایک ایسے باقاعدہ سلسلہ میں بندھے ہوئے ہیں جو ایک ادنیٰ درجہ سے شروع ہوکر انتہائی درجہ تک پہنچتا ہے اور یہی طریق وحدت اُسے محبوب بھی ہے تو اس قانون قدرت کے ماننے سے ہمیں یہ بھی ماننا پڑا کہ جیسے خدائے تعالیٰ نے جمادی سلسلہ میں ایک ذرّہ سے لے کر اس وجودِ اعظم تک یعنی آفتاب تک نوبت پہنچائی ہے جو ظاہری کمالات کا جامع ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی جسم جمادی نہیں ۔ ایسا ہی روحانی آفتاب بھی کوئی ہوگا جس کا وجود خطِ مستقیم مثالی میں ارتفاع کے آخیر نقطہ پر واقع ہو ۔ اب تفتیش اس بات کی کہ وہ انسان کامل جس کو روحانی آفتاب سے تعبیر کیا گیا ہے وہ کون ہے اور اُس کا کیا نام ہے؟ یہ ایسا کام نہیں ہے جس کا تصفیہ مجرّد عقل سے ہو سکے کیونکہ بجز خدائے تعالیٰ کے یہ امتیاز کس کو حاصل ہے اور کون مجرّد عقل سے ایسا کام کر سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کے کروڑہا اور بے شمار بندوں کو نظر کے سامنے رکھ کر اور اُن کی روحانی طاقتوں اور قوتوں کا موازنہ کر کے سب سے بڑے کو الگ کر کے دکھلا دے ۔ بلاشبہ عقلی طور پر کسی کو اس جگہ دم مارنے کی جگہ نہیں ہاں ایسے بلند اور عمیق دریافت کے لئے کتب الہامی ذریعہ ہیں جن میں خود خدائے تعالیٰ نے پیش از ظہور بلکہ ہزار ہا برس پہلے اس انسان کامل کا پتہ ونشان بیان کر دیا ہے ۔ پس جس شخص کے دل کو خدائے تعالیٰ اپنی توفیق خاص سے اس طرف ہدایت دے گا کہ وہ الہام اور وحی پر ایمان لاوے اور ان پیشگوئیوں پر غور کرے کہ بائیبل میں درج ہیں تو اُسے ضرور ماننا پڑے گا کہ وہ انسان کامل جو آفتاب روحانی ہے جس سے نقطۂ ارتفاع کا پورا ہُوا ہے اور جو دیوار نبوت کی آخری اینٹ ہے وہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں .... اور وجود خیرِ مجسّم جس کا نفسی نقطہ انتہائی درجۂ کمال ارتفاع پر واقع ہے یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اس کا مقام

معراج خارجی جو منتہائے مقامِ عروج (یعنی عرش ربّ العالمین ہے) تبلایا گیا ہے ۔ یہ درحقیقت اِسی انتہائی درجۂ کمال ارتفاع کی طرف اشارہ ہے جو اس وجود باجود کو حاصل ہے ۔ گویا جو کچھ اس وجود خیرِ مجسّم کو عالمِ قضاء و قدر میں حاصل تھا وہ عالمِ مثال میں مشہود و محسوس طور پر دکھایا گیا ۔ جیسا کہ اللہ تعالے اس نبیٔ کریم کی شانِ رفیع کے بارہ میں فرماتا ہے و رفع بعضھم درجات ۔ پس اس رفع درجات سے وہی انتہائی نقطہ درجہ ارتفاع مراد ہے جو ظاہری اور باطنی طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے اور یہ وجود باجود جو خیرِ مجسّم ہے مقربین کی تینوں قسموں سے اعلیٰ و اکمل ہے جو الوہیت کا مظہر اتم کہلاتا ہے ۔

جاننا چاہیئے کہ قرب الٰہی کی تین قسمیں تین قسم کی تشبیہہ پر موقوف ہیں جن کی تفصیل سے مراتبِ ثلاثہ قرب کی حقیقت معلوم ہوتی ہے ۔ اوّل قسم قرب کے خادم اور مخدوم کی تشبیہ سے مناسبت رکھتی ہے ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے والذین اٰمنوا اشدّ حبًّا للّٰہ یعنی مومن جن کو دوسرے لفظوں میں بندۂ فرمانبردار کہہ سکتے ہیں سب چیزوں سے زیادہ اپنے مولیٰ سے محبت رکھتے ہیں ۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جیسے ایک نوکر با اخلاص و باصفا و باوفا بوجہ مشاہدہ احسانات متواترہ و انعاماتِ متکاثرہ و کمالاتِ ذاتیہ اپنے آقا کی اِسقدر محبّت و اخلاص و یکرنگی میں ترقی کر جاتا ہے جو بوجہ ذاتی محبت کے جو اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اپنے آقا سے ہم طبیعت و ہم طریق ہو جاتا ہے اور اُس کی مرادات کا ایسا ہی طالب اور خواہاں ہوتا ہے جیسے آقا خود اپنی مرادات کا خواہاں ہے ۔ اِسی طرح بندۂ وفادار کی حالت اپنے مولیٰ کریم کے ساتھ ہوتی ہے ۔ یعنی وہ بھی اپنے خلوص اور صدق و صفا میں ترقی کرتا کرتا اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے وجود سے بکلّی محو و فنا ہو کر اپنے مولا کریم کے رنگ میں مل جاتا ہے ....

قرب کے دوسری قسم ولد اور والد کی تشبیہہ سے مناسبت رکھتی ہے ۔ جیسا کہ اللہ تعالے نے فرمایا ۔ فاذکروا اللّٰہ کذکرکم اٰباءکم او اشدّ ذکرًا ۔ یعنی اپنے اللہ جلّشانہٗ کو ایسے دلی جوش محبت سے یاد کرو جیسا باپوں کو یاد کیا جاتا ہے ۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ مخدوم اُس وقت باپ سے مشابہ ہو جاتا ہے جب محبت میں غایت درجہ شدّت واقع ہو جاتی ہے ۔ اور حبّ جو ہر یک کدورت اور غرض سے مصفا ہے دل کے تمام پردے چیر کر دل کی جڑ میں اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ گویا اُس کی جزء ہے ۔ تب جسقدر جوش محبت اور پیوند شدید اپنے محبوب سے ہے وہ سب حقیقت میں مادر زاد معلوم ہوتا ہے اور ایسا طبیعت سے ہم رنگ اور اس کی جزء ہو جاتا ہے

کہ سعی اور کوشش کا ذریعہ ہرگز یاد نہیں رہتا۔ اور جیسے بیٹے کو اپنے باپ کا وجود تصوّر کرنے سے ایک روحانی نسبت محسوس ہوتی ہے ایسا ہی اس کو بھی ہر وقت باطنی طور پر اس نسبت کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ اور جیسے بیٹا اپنے باپ کا حلیہ اور نقوش نمایاں طور پر اپنے چہرہ پر ظاہر رکھتا ہے اور اسی کی رفتار اور کردار اور خو اور بو بصفائی تمام اس میں پائی جاتی ہے علیٰ ہذا القیاس یہی حال اس میں ہوتا ہے ....

تیسرے قسم کا قرب ایک ہی شخص کی صورت اور اس کے عکس سے مشابہت رکھتا ہے۔ یعنی جیسے ایک شخص آئینہ صاف وسیع میں اپنی شکل دیکھتا ہے تو تمام شکل اس کی معہ اپنے تمام نقوش کے جو اس میں موجود ہیں عکسی طور پر اس آئینہ میں دکھائی دیتی ہے ایسا ہی اس قسمِ ثالث قرب میں تمام صفات الٰہیہ صاحب قرب کے وجود میں بہ تمامتر صفائی منعکس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ انعکاس ہریک قسم کی تشبیہہ سے جو پہلے اس سے بیان کیا گیا ہے اتم و اکمل ہے۔ کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ جیسے ایک شخص آئینہ صاف میں اپنا مونہہ دیکھکر اس شکل کو اپنی شکل کے مطابق پاتا ہے۔ وہ مطابقت اور مشابہت اسکی شکل سے نہ کسی غیر کو کسی حیلہ یا تکلّف سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ کسی فرزند میں ایسی ہو بہو مطابقت پائی جاتی ہے اور یہ مرتبہ کس کے لئے میسّر ہے اور کون اس کامل درجہ قرب سے موسوم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اسی کو میسّر آتا ہے کہ جو الوہیت اور عبودیت کے دونوں قوسوں کے بیچ میں کامل طور پر ہو کر دونوں قوسوں سے ایسا شدید تعلّق پکڑتا ہے کہ گویا ان دونوں کا عین ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو بکلّی درمیان سے اٹھا کر آئینہ صاف کا حکم پیدا کر لیتا ہے اور وہ آئینہ ذوجہتین ہونے کی وجہ سے ایک جہت سے صورتِ الٰہیہ بطور ظلّی حاصل کر لیتا ہے اور دوسری جہت سے وہ تمام فیض حسب استعداد و طبائع مختلفہ اپنے مقابلین کو پہنچاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، ثمّ دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنیٰ۔ پھر نزدیک ہوا (یعنی اللہ تعالیٰ سے) پھر نیچے کی طرف اُترا (یعنی مخلوق کی طرف تبلیغ احکام کے لئے نزول کیا) پس اسی جہت سے کہ وہ اوپر کی طرف صعود کر کے انتہائی درجہ قرب تام کو پہنچا اور اس میں اور حق میں کوئی حجاب نہ رہا اور پھر نیچے کی طرف اُس نے نزول کیا اور اس میں اور خلق میں کوئی حجاب نہ رہا۔ یعنی چونکہ وہ اپنے صعود اور نزول میں اتم و اکمل ہوا اور کمالات انتہائیہ تک پہنچ گیا اس لئے دو قوسوں کے بیچ میں یعنی وتر کی جگہ میں جو قطر دائرہ ہے اتم اور اکمل طور پر اس کا مقام ہوا۔ بلکہ وہ قوس

الوہیت اور قوس عبودیت کی طرف اس سے بھی زیادہ تر جو خیال و گمان و قیاس میں نہیں آسکتا نزدیک ہوا ۔ مثلاً صورت ان دو قوسوں کی یہ ہے :—

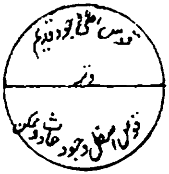

اِس شکل میں جو خطِ مرکز دائرہ کو قطع کرتا ہے یعنی جو قطر دائرہ ہے وہی قاب قوسین یعنی دونوں قوسوں کا وتر ہے ۔ جاننا چاہیئے کہ دونوں قسم کے وجود واجب اور ممکن کے ایک ایسے دائرے کی طرح ہیں کہ جو خط گذرندہ بر مرکز سے دو قوسوں پر منقسم ہو ۔ وہی خط جو قطر دائرہ ہے جس کو قرآن شریف میں قاب قوسین سے تعبیر کیا ہے اور عام بول چال علم ہندسہ میں اس کو وتر قوسین کہتے ہیں وہ ذات مفیض اور مستفیض میں بطور برزخ واقع ہے کہ جو اپنے اخص کمال میں جو انتہائی درجہ کمالات کا ہے نقطہ مرکز دائرہ سے جو وتر قوس کا درمیانی نقطہ ہے مشابہت رکھتا ہے ۔ یہی **نقطہ تمام کمالات انسان کامل کا دل** ہے جو قوس الوہیت و عبودیت کی طرف بخطوط مساویہ نسبت رکھتا ہے ۔ اور یہی نقطہ ارفع نقاط ان خطوط عمودیہ کا ہے جو محیط سے قطر دائرہ تک کھینچے جائیں ۔ اگرچہ وتر قوسیں اور بہت سے ایسے نقاط تالیف یافتہ ہیں جو درحقیقت کمالات روحانیہ صاحب وتر کے صور محسوسہ ہیں لیکن بجز ایک نقطہ مرکز کے اور جسقدر نقاط وتر ہیں ان میں دوسرے انبیاء و رسل و ارباب صدق و صفا بھی شریک ہیں اور نقطہ مرکز اس کمال کی صورت ہے کہ جو صاحب وتر کو بہ نسبت جمیع دوسرے کمالات کے اعلیٰ و ارفع و اخص و ممتاز طور پر حاصل ہے جس میں حقیقی طور پر مخلوق میں سے کوئی اس کا شریک نہیں ہاں اتباع و پیروی سے ظلی طور پر شریک ہو سکتا ہے ۔ اب جاننا چاہیئے کہ دراصل اس نقطہ وسطی کا نام **حقیقتِ محمدیہ** ہے جو اجمالی طور پر جمیع حقائق عالم کا منبع و اصل ہے ۔ اور درحقیقت اس ایک نقطہ سے خط وتر انبساط و امتداد پذیر ہوا ہے ۔ اور اس نقطہ کی روحانیت تمام خط وتر میں ایک ہویّت ساریہ ہے جس کا فیض اقدس اس سارے خط کو تعین بخش ہو گیا ہے عالم جس کو متصوّفین اسماء اللہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں ۔ اس کا اوّل و اعلیٰ مظہر جس سے وہ علےٰ وجہ التفصیل صدور پذیر ہوا ہے یہی نقطہ درمیانی ہے جس کو اصطلاحات اہل اللہ میں **نفسی نقطہ احمد مجتبیٰ و محمد مصطفےٰ** نام رکھتے ہیں اور فلاسفہ کی اصطلاحات میں **عقل اوّل** کے

نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ اور اس نقطہ کو دوسرے دتری نقاط کی طرف وہی نسبت ہے جو اسم اعظم کو دوسرے اسماء الٰہیہ کی طرف نسبت واقعہ ہے۔ غرض سرچشمہ رموز غیبی ومفتاح کنوز لاریبی اور انسان کامل دکھلانے کا آئینہ یہی نقطہ ہے اور تمام اسرار مبدء ومعاد کی علّتِ غائی اور ہریک زیر و بالا کی پیدائش کی لمیت یہی ہے جس کے تصوّر بالکنہ و تصور بالکنہ سے تمام عقول وافہام بشریّہ عاجز ہیں۔ اور جس طرح ہریک حیات خدائے تعالیٰ کی حیات سے مستفاض اور ہریک وجود اس کے وجود سے ظہور پذیر اور ہریک تعین اس کے تعین سے خلعت پوش ہے۔ ایسا ہی نقطۂ محمدیہ جمیع مراتب اکوان اور خطائرِ امکان میں باذنہٖ تعالیٰ حسب استعدادات مختلفہ وطبائع متفاوتہ مؤثر ہے۔ اور چونکہ یہ نقطہ جمیع مراتب الٰہیہ کا ظلّی طور پر اور جمیع مراتب کونیہ کا منبعی اور اصلی طور پر جامع بلکہ انہیں دونوں کا مجموعہ ہے اس لئے یہ ہریک مرتبہ کونیہ پر جو عقول ونفوس کلیّہ وجزئیہ ومراتب طبعیہ الیٰ آخر تنزلات وجود سے مراد ہے اجمالی طور پر احاطہ رکھتا ہے۔ ایسا ہی ظلّ الوہیت ہونے کی وجہ سے مرتبہ الٰہیہ سے اس کو ایسی مشابہت ہے جیسے آئینہ کے عکس کو اپنے اصل سے ہوتی ہے۔ اور امہات صفاتِ الٰہیہ یعنی حیات علم ارادہ قدرت سمع بصر کلام مع اپنے جمیع فروع کے اتم واکمل طور پر اس میں انعکاس پذیر ہیں۔ اس نقطہ مرکز کو جو برزخ بین اللہ و بین الخلق ہے یعنی نفسی نقطہ حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو مجرّد کلمۃ اللہ کے مفہوم تک محدود نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ مسیح کو اس نام سے محدود کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نقطہ محمدیہ ظلّی طور پر مستجمع جمیع مراتب الوہیت ہے۔ اسی وجہ سے تمثیلی بیان میں حضرت مسیح کو ابن سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بباعث اس نقصان کے جو ان میں باقی رہ گیا ہے کیونکہ حقیقت عیسویہ مظہر اتم صفات الوہیت نہیں بلکہ اس کی شاخوں سے ایک شاخ ہے۔ برخلاف حقیقت محمدیہ کے کہ وہ جمیع صفات الٰہیہ کا اتم واکمل مظہر ہے جس کا ثبوت عقلی ونقلی طور پر کمال درجہ پر پہنچ گیا ہے۔ سو اسی وجہ سے تمثیلی بیان میں ظلی طور پر خدائے ذوالجلال سے آنحضرتؐ کو آسمانی کتابوں میں تشبیہ دی گئی ہے جو ابن کے لئے بجائے اَبْ ہے۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم کا اضافی طور پر ناقص ہونا اور قرآنی تعلیموں کا سب الہامی تعلیموں سے اکمل واتم ہونا وہ بھی درحقیقت اسی بنا پر ہے۔ کیونکہ ناقص پر ناقص فیضان ہوتا ہے اور اکمل پر اکمل۔

اور جو تشبیہات قرآن شریف میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ظلی طور پر خداوند قادر مطلق سے دی گئی ہیں اُن میں سے ایک یہی آیت ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ

قاب قوسین او ادنٰی یعنی وہ (حضرت سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم) اپنی ترقیات کاملہ قرب کی وجہ سے دو قوسوں میں بطور وتر کے واقع ہے بلکہ اُس سے نزدیک تر۔ اب ظاہر ہے کہ وتر کی طرف اعلےٰ میں قوس الوہیت واقع ہے۔ سو جبکہ نفس پاک محمدی اپنے شدّت قرب اور نہایت درجہ صفائی کی وجہ سے وتر کی حد سے آگے بڑھا اور دریائے الوہیت سے نزدیک تر ہُوا تو اس ناپیدا کنار دریا میں جا پڑا اور الوہیت کے بحر اعظم میں ذرّہ بشریت گم ہو گیا۔ اور یہ بڑھنا نہ مستحدث اور جدید طور پر بلکہ وہ ازل سے بڑھا ہُوا تھا اور ظلّی اور مستعار طور پر اس بات کے لائق تھا کہ آسمانی صحیفے اور الہامی تحریریں اس کو مظہر اتم الوہیت قرار دیں اور آئینہ حق نما اس کو ٹھہرا دیں۔ پھر دوسری آیت قرآن شریف کی جس میں یہی تشبیہ نہایت اصفٰی و اجلٰی طور پر دی گئی ہے یہ ہے۔ انّ الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ۔ ید اللہ فوق ایدیھم۔ یعنی جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ہے جو ان کے ہاتھوں پر ہے۔ واضح ہو کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کیا کرتے تھے اور مردوں کے لئے یہی طریق بیعت کا ہے۔ سو اسجگہ اللہ تعالےٰ نے بطریق مجاز آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو اپنی ذاتِ اقدس ہی قرار دے دیا اور ان کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا۔ یہ کلمہ **مقام جمع** میں ہے۔ جو بوجہ نہایت قرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بولا گیا ہے۔ اور اس مرتبہ جمع کی طرف جو محبّت تامہ دو طرفہ پر موقوف ہے۔ اس آیت میں بھی اشارہ ہے۔ ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی۔ تُو نے نہیں چلایا خدا نے ہی چلایا جب کہ تو نے چلایا۔ ایسا ہی یہ اشارہ اس دوسری آیت میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قل یا عبادی الذین أسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ انّ اللہ یغفر الذنوب جمیعًا۔ یعنی ان کو کہدے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر اسراف کیا (یعنی ارتکاب کبائر کیا) تم خدا کی رحمت سے نومید مت ہو۔ وہ تمہارے سب گناہ بخشدیگا۔ اب ظاہر ہے کہ بنی آدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے تو نہیں ہیں۔ بلکہ سب نبی و غیر نبی خدا تعالےٰ کے بندے ہیں۔ لیکن چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے مولیٰ کریم سے قرب اتم یعنی تیسرے درجے کا قرب حاصل تھا۔ سو یہ سخن بھی مقام جمع سے سرزد ہُوا اور **مقام جمع** قاب قوسین کا مقام ہے جس کی تفاصیل کتب تصوف میں موجود ہے۔ ایسا ہی اللہ تعالےٰ نے مقام جمع

کے لحاظ سے کئی نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے رکھ دیئے ہیں جو خاص اُس کی صفتیں ہیں ۔ جیساکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا نام **محمّد** رکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ نہایت تعریف کیا گیا ۔ سو یہ غایت درجہ کی تعریف حقیقی طور پر خدا تعالیٰ کی شان کے لائق ہے ۔ مگر ظلّی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ۔ ایسا ہی قرآن شریف میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا نام **نور** جو دنیا کو روشن کرتا ہے اور **رحمت** جس نے عالم کو زوال سے بچایا ہوا ہے آیا ہے اور **رؤوف** اور **رحیم** جو خدا تعالےٰ کے نام ہیں ۔ ان ناموں سے بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پکارے گئے ہیں اور کئی مقام قرآن شریف میں اشارات اور تصریحات سے بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم **مظہر اتم الوہیت ہیں اور ان کا کلام خدا کا کلام اور ان کا ظہور خدا کا ظہور اور ان کا آنا خدا کا آنا ہے** ۔ چنانچہ قرآن شریف میں اس بارے میں ایک یہ آیت بھی ہے ۔ و قل جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا کہ حق آیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل نے بھاگنا ہی تھا ۔ حق سے مراد اس جگہ اللہ جلّ شانہٗ اور قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور باطل سے مراد شیطان اور شیطان کا گروہ اور شیطانی تعلیمیں ہیں ۔ سو دیکھو اپنے نام میں خدا تعالےٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو کیونکر شامل کر لیا اور آنحضرت کا ظہور فرمانا خدائے تعالیٰ کا ظہور فرمانا ہوا ۔ ایسا جلالی ظہور جس سے شیطان مع اپنے تمام لشکروں کے بھاگ گیا ۔ اور اس کی تعلیمیں ذلیل اور حقیر ہو گئیں ۔ اور اس کے گروہ کو بڑی بھاری شکست آئی ۔ اس جامعیت تامہ کی وجہ سے سورۃ آل عمران جزو تیسری میں مفصّل یہ بیان ہے کہ تمام نبیوں سے عہد و اقرار لیا گیا کہ تم پر واجب و لازم ہے کہ عظمت و جلالیّت شان ختم الرسل پر جو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ایمان لاؤ اور ان کی اس عظمت اور جلالیت کی اشاعت کرنے میں بدل وجان مدد کرو ۔ اسی وجہ سے حضرت آدم صفی اللہ سے لے کر تا حضرت مسیح کلمۃ اللہ جس قدر نبی و رسول گذرے ہیں وہ سب کی سب عظمت و جلالیّت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اقرار کرتے آئے ہیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توریت میں یہ بات کہہ کر کہ خدا سینا سے آیا اور سعیر سے طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے اُن پر چمکا صاف جتلا دیا کہ جلالیت الٰہی کا ظہور فاران پر آکر اپنے کمال کو پہنچ گیا ۔ اور آفتاب صداقت کی پوری پوری شعاعیں فاران پر ہی آکر ظہور پذیر ہوئیں ۔ اور وہی توریت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ فاران مکّہ معظمہ کا پہاڑ ہے ۔ جس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام جدّ امجد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سکونت پذیر ہوئی اور یہی بات

جغرافیہ کے نقشوں سے بپایۂ ثبوت پہنچتی ہے اور ہمارے مخالف بھی جانتے ہیں کہ مکّہ معظمہ میں سے بجز آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کوئی رسول نہیں اُٹھا۔ سو دیکھو حضرت موسیٰ سے کیسی صاف صاف شہادت دی گئی ہے کہ وہ آفتاب صداقت جو فاران کے پہاڑ سے ظہور پذیر ہوگا اُس کی شعاعیں سب سے زیادہ تیز ہیں اور سلسلۂ ترقیات نور صداقت اُسی کی ذات جامع بابرکات پر ختم ہے ....

اس تمام تقریر کا مدعا و خلاصہ یہ ہے کہ عند العقل قرب الٰہی کے مراتب تین قسم پر منقسم ہیں اور تیسرا مرتبہ قرب کا جو مظہر اتم الوہیت اور آئینہ خدا نما ہے حضرت سیّدنا و مولینا محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مسلّم ہے جس کی شعاعیں ہزارہا دلوں کو منور کر رہی ہیں۔ اور بے شمار سینوں کو اندرونی ظلمتوں سے پاک کر کے نور قدیم تک پہنچا رہے ہیں۔ وللہ در القائل ؎

محمد عربی بادشاہ ہر دو سرا ∴ کرے ہے رُوح قدس جس کے در کی دربانی
اسے خدا تو نہیں کہہ سکوں پہ کہتا ہوں ∴ کہ اس کے مرتبہ دانی میں ہے خدا دانی

کیا ہی خوش نصیب وہ آدمی ہے جس نے محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو پیشوائی کے لئے قبول کیا اور قرآن شریف کو رہنمائی کے لئے اختیار کر لیا۔ اللّٰھم صل علی سیدنا و مولٰینا محمّد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ الحمد للہ الذی ھدیٰ قلبنا لحبّہ و لحب رسولہ و جمیع عبادہ المقربین ؎

تا بر دلم نظر شد از مہر و ماہ مارا ∴ گردست سیم خالص قلب سیاہ مارا
لطف عمیم دلبر ہر دم مرا بخواند ∴ ہر چند می زنند ایں اغیار راہ مارا
در کوئے دلستانم چوں خاک کو شب روز ∴ دیگر نشاں چہ باشد اقبال و جاہِ مارا

(سرمہ چشم آریہ حاشیہ صفحہ ۱۸۵-۲۵۱)

قرآن شریف میں اس مسئلہ کو ایک عمدہ مثال میں بیان کیا ہے جو ذیل میں معہ ایک لطیف تحقیقات جو اس کی تفسیر سے متعلق اور بحث ہذا کی تکمیل کے لئے ضروری ہے لکھی جاتی ہے اور وہ یہ ہے:۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ الجزو نمبر ۱۸۔ خدا آسمان و زمین کا نور ہے یعنی ہر ایک نور جو بلندی اور پستی میں نظر آتا ہے

خواہ وہ ارواح میں ہے خواہ اجسام میں۔ اور خواہ ذاتی ہے اور خواہ عرضی۔ اور خواہ ظاہری ہے اور خواہ باطنی۔ اور خواہ ذہنی ہے خواہ خارجی اُسی کے فیض کا عطیہ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرتِ ربّ العالمین کا فیض عام ہر چیز پر محیط ہو رہا ہے اور کوئی اس کے فیض سے خالی نہیں۔ وہی تمام فیوض کا مبدء ہے اور تمام انوار کا علّت العلل اور تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ اُسی کی ہستی حقیقی تمام عالم کی قیوم اور تمام زیروزبر کی پناہ ہے۔ وہی ہے جس نے ہر ایک چیز کو ظلمت خانۂ عدم سے باہر نکالا اور خلعتِ وجود بخشا۔ بجز اس کے کوئی ایسا وجود نہیں ہے کہ جو فی حدِّ ذاتہٖ واجب اور قدیم ہو یا اس سے مستفیض نہ ہو بلکہ خاک اور افلاک اور انسان اور حیوان اور حجر اور شجر اور رُوح اور جسم سب اُسی کے فیضان سے وجود پذیر ہیں۔ یہ تو عام فیضان ہے جس کا بیان آیت اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض میں ظاہر فرمایا گیا۔ یہی فیضان ہے جس نے دائرہ کی طرح ہر ایک چیز پر احاطہ کر رکھا ہے۔ جس کے فائز ہونے کے لئے کوئی قابلیت شرط نہیں لیکن بمقابلہ اس کے ایک خاص فیضان بھی ہے جو مشروط بشرائط ہے اور اُنہیں افرادِ خاصہ پر فائض ہوتا ہے جن میں اس کے قبول کرنے کی قابلیت و استعداد موجود ہے۔ یعنی نفوس کاملہ انبیاء علیہم السلام پر جن میں سے افضل و اعلیٰ ذات جامع البرکات حضرت **محمد مصطفٰے** صلے اللّٰہ علیہ وسلم ہے دوسروں پر ہرگز نہیں ہوتا۔ اور چونکہ وہ فیضان ایک نہایت باریک صداقت ہے اور دقائق حکمیہ میں سے ایک دقیق مسئلہ ہے اس لئے خداوند تعالیٰ نے اوّل فیضانِ عام کو (جو بدیہی الظہور ہے) بیان کر کے پھر اس فیضانِ خاص کو بغرضِ اظہارِ کیفیت نورِ حضرت خاتم الانبیاء صلے اللّٰہ علیہ وسلم ایک مثال میں بیان فرمایا ہے کہ جو اس آیت سے شروع ہوتی ہے۔ مثل نورہٖ کمشکوٰۃٍ فیھا مصباح۔ اور بطور مثال اس لئے بیان کیا کہ تا اس دقیقہ نازک کے سمجھنے میں ابہام اور دقّت باقی نہ رہے کیونکہ معانی معقولہ کو صُورِ محسوسہ میں بیان کرنے سے ہر ایک غبی و بلید بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ بقیہ ترجمہ آیاتِ ممدوحہ یہ ہے۔ اُس نور کی مثال (فردِ کامل میں جو پیغمبر ہے) یہ ہے جیسے ایک طاق (یعنی سینۂ مشروح حضرت پیغمبر خدا صلی اللّٰہ علیہ وسلم) اور طاق میں ایک چراغ (یعنی وحی اللّٰہ) اور چراغ ایک شیشہ کی قندیل میں جو نہایت مصفّٰی ہے (یعنی نہایت پاک اور مقدس دل میں جو آنحضرت صلعم کا دل ہے کہ جو اپنی اصل فطرت میں شیشۂ سفید اور صافی کی طرح ہر ایک طور کی کثافت اور کدورت سے منزہ اور مطہّر ہے۔ اور تعلقاتِ ماسوی اللّٰہ سے بکلّی پاک ہے) اور شیشہ ایسا صاف کہ گویا اُن ستاروں میں سے ایک عظیم النّور ستارہ ہے جو کہ آسمان پر بڑی آب و تاب کے ساتھ چمکتے ہوئے نکلتے ہیں جن کو کوکب درّی کہتے ہیں (یعنی حضرت خاتم الانبیاء کا دل ایسا صاف کہ کوکب درّی کی طرح

نہایت منور اور درخشندہ جس کی اندرونی روشنی اس کے بیرونی قالب پر پانی کی طرح بہتی ہوئی نظر آتی ہے) وہ چراغ زیتون کے شجرہ مبارکہ سے (یعنی زیتون کے روغن سے) روشن کیا گیا ہے۔ (شجرۂ مبارکہ زیتون سے مراد وجود مبارک محمدی ہے کہ جو بوجہ نہایت جامعیت و کمال انواع و اقسام کی برکتوں کا مجموعہ ہے جس کا فیض کسی جہت و مکان و زمان سے مخصوص نہیں بلکہ تمام لوگوں کے لئے عام علیٰ سبیل الدوام ہے اور ہمیشہ جاری ہے کبھی منقطع نہیں ہوگا) اور شجرہ مبارکہ نہ شرقی ہے نہ غربی (یعنی طینت پاک محمدی میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ بلکہ نہایت توسط و اعتدال پر واقع ہے اور احسن تقویم پر مخلوق ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اس شجرۂ مبارکہ کے روغن سے جو چراغِ وحی روشن کیا گیا ہے سو روغن سے مراد عقلِ لطیف نورانی محمدی معہ جمیع اخلاق فاضلہ فطرتیہ ہے جو اس عقل کامل کے چشمہ صافی سے پروردہ ہیں۔ اور وحی کا چراغ لطائف محمدیہ سے روشن ہونا ان معنوں کرکے کہ ہے کہ ان لطائف قابلہ پر وحی کا فیضان ہوا۔ اور ظہور وحی کا موجب وہی ٹھہرے۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ فیضانِ وحی ان لطائف محمدیہ کے مطابق ہوا اور انہیں اعتدالات کے مناسب حال ظہور میں آیا کہ جو طینت محمدیہ میں موجود تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر ایک وحی نبیٔ منزل علیہ کی فطرت کے موافق نازل ہوتی ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزاج میں جلال اور غضب تھا۔ توریت بھی موسوی فطرت کے موافق ایک جلالی شریعت نازل ہوئی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے مزاج میں حلم اور نرمی تھی سو انجیل کی تعلیم بھی حلم اور نرمی پر مشتمل ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج بغایت درجہ وضع استقامت پر واقع تھا نہ ہر جگہ حلم پسند تھا اور نہ ہر مقام پر غضب مرغوب خاطر تھا۔ بلکہ حکیمانہ طور پر رعایتِ محل اور موقع کی ملحوظ طبیعت مبارک تھی سو قرآن شریف بھی اسی طرزِ موزون و معتدل پر نازل ہوا کہ جامع شدت و رحمت و ہیبت و شفقت و نرمی و درشتی ہے۔ سو اسجگہ اللہ تعالےٰ نے ظاہر فرمایا کہ چراغِ وحیٔ فرقان اس شجرۂ مبارکہ سے روشن کیا گیا ہے کہ نہ شرقی ہے نہ غربی۔ غرض طینتِ معتدلہ محمدیہ کے موافق نازل ہوا ہے جس میں نہ مزاج موسوی کی طرح درشتی ہے نہ مزاج عیسوی کی مانند نرمی بلکہ درشتی اور نرمی اور قہر اور لطف کا جامع ہے۔ اور مظہر کمال اعتدال اور جامع بین الجلال والجمال ہے۔ اور اخلاق معتدلہ فاضلہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کہ جو بمعیّتِ عقل لطیف روغن ظہور و روشنی وحی قرار پائی ہیں انکی نسبت ایک دوسرے مقام میں بھی اللہ تعالےٰ نے آنحضرتؐ کو مخاطب کرکے فرمایا ہے اور وہ یہ ہے۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ الجزو نمبر ۲۹۔ یعنی تو اے نبی ایک خلقِ عظیم پر مخلوق و مفطور ہے۔

یعنی اپنی ذات میں تمام مکارمِ اخلاق کا ایسا متمم و مکمل ہے کہ اس پر زیادت متصوّر نہیں۔ کیونکہ لفظ عظیم محاورہ عرب میں اس چیز کی صفت میں بولا جاتا ہے جس کو اپنا نوعی کمال پورا پورا حاصل ہو۔ مثلاً جب کہیں کہ یہ درخت عظیم ہے تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ جس قدر طول و عرض درخت میں ہو سکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ عظیم وہ چیز ہے جس کی عظمت اس حدّ تک پہنچ جائے کہ حیطۂ ادراک سے باہر ہو۔ اور خُلق کے لفظ سے قرآن شریف اور ایسا ہی دوسری کتب حکمیہ میں صرف تازہ روئی اور حسنِ اختلاط یا نرمی و تلطّف و ملائمت (جیسا عوام الناس خیال کرتے ہیں) مراد نہیں ہے بلکہ خَلق بفتح خا اور خُلق بضمّ خا دو لفظ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل واقعہ ہیں۔ خَلق بفتح خا سے مراد وہ صورت ظاہری ہے جو انسان کو حضرت واہب الصور کی طرف سے عطا ہوئی ہے جس صورت کے ساتھ وہ دوسرے حیوانات کی صورتوں سے ممیز ہے۔ اور خُلق بضم خا سے مراد وہ صورت باطنی یعنی خواص اندرونی ہیں جن کی رُو سے حقیقت انسانیہ حقیقت حیوانیہ سے امتیاز کلّی رکھتی ہے۔ پس جس قدر انسان میں من حیث الانسانیت اندرونی خواص پائے جاتے ہیں اور شجرۂ انسانیت کو نچوڑ کر نکل سکتے ہیں۔ جو کہ انسان اور حیوان میں من حیث الباطن مابہ الامتیاز ہیں ان سب کا نام خُلق ہے۔ اور چونکہ شجرۂ فطرت انسانی اصل میں توسط اور اعتدال پر واقعہ ہے اور ہر ایک افراط اور تفریط سے جو قوی حیوانیہ میں پایا جاتا ہے منزہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم الجزو نمبر ۳۰۔ اس لئے خُلق کے لفظ سے جو کسی مذمت کی قید کے بغیر بولا جائے ہمیشہ اخلاقِ فاضلہ مراد ہوتے ہیں۔ اور وہ اخلاقِ فاضلہ جو حقیقت انسانیہ ہے تمام وہ خواص اندرونی ہیں جو نفس ناطقہ انسان میں پائے جاتے ہیں۔ جیسے عقل ذکا۔ سُرعت فہم۔ صفائی ذہن۔ حُسن تحفظ۔ حسن تذکر۔ عفت۔ حیا۔ صبر۔ قناعت۔ زہد۔ تورع۔ جوانمردی۔ استقلال۔ عدل۔ امانت۔ صدق لہجہ۔ سخاوت فی محلّہ۔ ایثار فی محلّہ۔ کرم فی محلّہ۔ مروّت فی محلّہ۔ شجاعت فی محلّہ۔ علوِّ ہمت فی محلّہ۔ حلم فی محلّہ۔ تحمّل فی محلّہ۔ حمیّت فی محلّہ۔ تواضع فی محلّہ۔ ادب فی محلّہ۔ شفقت فی محلّہ۔ رأفت فی محلّہ۔ رحمت فی محلّہ۔ خوف الٰہی۔ محبت الٰہیہ۔ اُنس باللہ۔ انقطاع الی اللہ وغیرہ وغیرہ) اور تیل ایسا صاف اور لطیف کہ بن آگ ہی روشن ہونے پر آمادہ (یعنی عقل اور جمیع اخلاق فاضلہ اس نبی معصوم کے ایسے کمال موزونیت و لطافت و نورانیت پر واقعہ کہ الہام سے پہلے ہی خود بخود روشن ہونے پر مستعد تھے) نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ۔

نُور فائض ہُوا نور پر (یعنی جب کہ وجود مبارک حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم میں کئی نور جمع تھے سو اُن نوروں پر ایک اور نورِ آسمانی جو وحیٔ الٰہی ہے وارد ہو گیا اور اُس نور کے وارد ہونے سے وجودِ باجُود خاتم الانبیاء کا مجمع الانوار بن گیا۔

(براہین احمدیہ ص۱۸۱-۱۸۵ حاشیہ ۱۱)

معراج انقطاعِ تام تھا اور سرّ اس میں یہ تھا کہ تا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نقطۂ نفسی کو ظاہر کیا جائے۔ آسمان پر ہر ایک رُوح کے لئے ایک نقطہ ہوتا ہے اس سے آگے وہ نہیں جاتی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ نفسی عرش تھا۔ اور رفیق اعلیٰ کے معنے بھی خدا ہی کے ہیں۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اور کوئی معزز و مکرم نہیں ہے۔

(ملفوظات جلد دوم ص۱۳۶)

سیر معراج اس جسمِ کثیف کے ساتھ نہیں تھا بلکہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا کشف تھا جس کو درحقیقت بیداری کہنا چاہیئے۔ ایسے کشف کی حالت میں انسان ایک نوری جسم کے ساتھ حسب استعداد نفس ناطقہ اپنے کے آسمانوں کی سیر کر سکتا ہے۔ پس چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نفس ناطقہ کی اعلیٰ درجہ کی استعداد تھی اور انتہائی نقطہ تک پہنچی ہوئی تھی اس لئے آپ اپنی معراجی سیر میں معمورۂ عالم کے انتہائی نقطہ تک جو عرشِ عظیم سے تعبیر کیا جاتا ہے پہنچ گئے۔ سو درحقیقت یہ سیر کشفی تھا جو بیداری سے اشد درجہ پر مشابہ ہے بلکہ ایک قسم کی بیداری ہی ہے میں اس کا نام خواب ہرگز نہیں رکھتا اور نہ کشف کے ادنیٰ درجوں میں سے اس کو کہتا ہوں بلکہ یہ کشف کا بزرگ ترین مقام ہے جو درحقیقت بیداری بلکہ اس کثیف بیداری سے یہ حالت زیادہ اصفیٰ اور اجلیٰ ہوتی ہے اور اس قسم کے کشفوں میں مؤلف خود صاحبِ تجربہ ہے۔

(ازالہ اوہام ص۲۶ حاشیہ)

جس کامل انسان پر قرآن شریف نازل ہُوا اُس کی نظر محدود نہ تھی اور اس کی عام غمخواری اور ہمدردی میں کچھ قصور نہ تھا۔ بلکہ کیا باعتبار زمان اور کیا باعتبار مکان اُس کے نفس کے اندر کامل ہمدردی موجود تھی اس لئے قدرت کی تجلیات کا پورا اور کامل حصّہ اس کو ملا اور وہ خاتم الانبیاء بنے مگر ان معنوں سے نہیں کہ آئندہ اس سے کوئی روحانی فیض نہیں ملیگا بلکہ ان معنوں سے کہ وہ صاحبِ خاتم ہے بجز اُس کی مہر کے کوئی فیض کسی کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور اس کی امت کے لئے قیامت تک مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ کا دروازہ کبھی بند نہ ہوگا اور بجز اس کے کوئی نبی صاحبِ خاتم نہیں

ایک وہی ہے جس کی مُہر سے ایسی نبوت بھی مل سکتی ہے جس کے لئے اُمتی ہونا لازمی ہے۔ اور اُس کی ہمت اور ہمدردی نے امت کو ناقص حالت پر چھوڑنا نہیں چاہا اور اُن پر وحی کا دروازہ جو حصولِ معرفت کی اصل جڑ ہے بند رہنا گوارا نہیں کیا۔ ہاں اپنی ختمِ رسالت کا نشان قائم رکھنے کے لئے یہ چاہا کہ فیضِ وحی آپ کی پیروی کے وسیلہ سے ملے اور جو شخص اُمتی نہ ہو اُسپر پر وحی الٰہی کا دروازہ بند ہو۔ سو خدا نے ان معنوں سے آپ کو خاتم الانبیاء ٹھیرایا۔ لہٰذا قیامت تک یہ بات قائم ہوئی کہ جو شخص سچی پیروی سے اپنا اُمتی ہونا ثابت نہ کرے اور آپ کی متابعت میں اپنا تمام وجود محو نہ کرے ایسا انسان قیامت تک نہ کوئی کامل وحی پا سکتا ہے اور نہ کامل ملہم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مستقل نبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی ہے۔ مگر ظلی نبوت جس کے معنے ہیں کہ محض فیض محمدی سے وحی پانا وہ قیامت تک باقی رہیگی۔ تا انسانوں کی تکمیل کا دروازہ بند نہ ہو اور تا یہ نشان دنیا سے مٹ نہ جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمت نے قیامت تک یہی چاہا ہے کہ مکالمات اور مخاطبات الٰہیہ کے دروازے کھلے رہیں اور معرفت الٰہیہ جو مدارِ نجات ہے مفقود نہ ہو جائے۔

(حقیقۃ الوحی ص۲۷-۲۸)

مَیں بڑے یقین اور دعوےٰ سے کہتا ہوں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے وہ شخص جھوٹا اور مفتری ہے جو آپ کے خلاف کسی سلسلہ کو قائم کرتا ہے اور آپ کی نبوت سے الگ ہو کر کوئی صداقت پیش کرتا ہے اور چشمۂ نبوت کو چھوڑتا ہے۔ مَیں کھول کر کہتا ہوں کہ وہ شخص لعنتی ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا آپؐ کے بعد کسی اور کو نبی یقین کرتا ہے اور آپ کی ختم نبوت توڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسا نبی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد نہیں آ سکتا جس کے پاس مہر نبوت محمدی نہ ہو۔ ہمارے مخالف الرائے مسلمانوں نے یہی غلطی کھائی ہے کہ وہ ختم نبوت کو توڑ کر اسرائیلی نبی کو آسمان سے اُتارتے ہیں۔ اور مَیں یہ کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوتِ قدسی اور آپ کی ابدی نبوت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی آپ ہی کی تربیت اور تعلیم سے مسیح موعود آپ کی امت میں وہی مہر نبوت لیکر آتا ہے۔ اگر یہ عقیدہ کفر ہے تو مَیں اس کفر کو عزیز رکھتا ہوں لیکن یہ لوگ جن کی عقلیں تاریک ہو گئی ہیں جن کو نور نبوت سے حصّہ نہیں دیا گیا اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اور اس کو کفر قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ بات ہے جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا کمال اور آپ کی زندگی کا ثبوت ہوتا ہے۔

(الحکم ۱۰؍جون ۱۹۰۵ء ص۲)

تمام نبوتیں اور تمام کتابیں جو پہلے گذر چکیں اُن کی الگ طور پر پیروی کی حاجت نہیں رہی کیونکہ نبوت محمدیہ ان سب پر مشتمل اور حاوی ہے۔ اور بجز اس کے سب راہیں بند ہیں۔ تمام سچائیاں جو خدا تک پہنچاتی ہیں اسی کے اندر ہیں۔ نہ اس کے بعد کوئی نئی سچائی آئے گی اور نہ اس سے پہلے کوئی ایسی سچائی تھی جو اس میں موجود نہیں اس لئے اس نبوت پر تمام نبوتوں کا خاتمہ ہے اور ہونا چاہیئے تھا کیونکہ جس چیز کے لئے ایک آغاز ہے اس کے لئے ایک انجام بھی ہے۔ لیکن یہ نبوت محمدیہ اپنی ذاتی فیض رسانی سے قاصر نہیں بلکہ سب نبوتوں سے زیادہ اس میں فیض ہے اس نبوت کی پیروی خدا تک بہت سہل طریق سے پہنچا دیتی ہے اور اس کی پیروی سے خدا تعالےٰ کی محبت اور اس کے مکالمہ مخاطبہ کا اس سے بڑھ کر انعام مل سکتا ہے جو پہلے ملتا تھا۔ مگر اس کا کامل پیرو صرف نبی نہیں کہلا سکتا کیونکہ نبوت کاملہ تامہ محمدیہ کی اس میں ہتک ہے ہاں اُمتی اور نبی دونوں لفظ اجتماعی حالت میں اس پر صادق آ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں نبوت تامہ کاملہ محمدیہ کی ہتک نہیں بلکہ اس نبوت کی چمک اس فیضان سے زیادہ تر ظاہر ہوتی ہے۔

(الوصیت ص۱۷-۱۸)

ہم تو کہتے ہیں کہ کافر ہے وہ شخص جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے ذرہ بھر اِدھر اُدھر ہوتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے روگردانی کرنے والا ہی ہمارے نزدیک جب کافر ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال جو کوئی نئی شریعت لانے کا دعویٰ کرے یا قرآن اور سنتِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم میں تغیر و تبدل کرے یا کسی حکم کو منسوخ جانے۔ ہمارے نزدیک تو مومن وہی ہے جو قرآن شریف کی سچی پیروی کرے اور قرآن شریف ہی کو خاتم الکتب یقین کرے اور اس شریعت کو جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں لائے تھے اس کو ہمیشہ تک رہنے والا مانے اور اُس میں ایک ذرہ بھر اور ایک شعشہ بھی نہ بدلے اور اس کی اتباع میں فنا ہو کر اپنا آپ کھو دے اور اپنے وجود کا ہر ذرّہ اسی راہ میں لگائے۔ عملاً اور علماً اس کی شریعت کی مخالفت نہ کرے۔ تب پکّا مسلمان ہوتا ہے۔

(الحکم ۶؍مئی ۱۹۰۸ء ص۵)

اکثر نادان عیسائی مغفرت کی سچی حقیقت نہ دریافت کرنے کی وجہ سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ جو شخص مغفرت مانگے وہ فاسق اور گنہگار ہوتا ہے مگر مغفرت کے لفظ پر خوب غور کرنے کے بعد صاف طور پر سمجھ آ جاتا ہے کہ فاسق اور بدکار وہی ہے جو خدا تعالیٰ سے مغفرت نہیں مانگتا کیونکہ جبکہ ہر یک سچی پاکیزگی اُسی کی طرف سے ملتی ہے اور وہی نفسانی جذبات کے طوفانوں سے محفوظ

اور معصوم رکھتا ہے۔ تو پھر خدا تعالیٰ کے راستباز بندوں کا ہر یک طرفۃ العین میں یہی کام ہونا چاہیئے کہ وہ اس حافظ اور عاصمِ حقیقی سے مغفرت مانگا کریں۔ اگر ہم جسمانی عالم میں مغفرت کا کوئی نمونہ تلاش کریں تو ہمیں اس سے بڑھ کر اور کوئی مثال نہیں مل سکتی کہ مغفرت اس مضبوط اور ناقابل بند کی طرح ہے جو ایک طوفان اور سیلاب کے روکنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ پس چونکہ تمام زور تمام طاقتیں خدا تعالیٰ کے لئے مسلّم ہیں اور انسان جیسا کہ جسم کے رو سے کمزور ہے۔ رُوح کے رُو سے بھی ناتوان ہے اور اپنے شجرۂ پیدائش کے لئے ہر یک وقت اس لازوال ہستی سے آبپاشی چاہتا ہے جس کے فیض کے بغیر یہ جی ہی نہیں سکتا اس لئے استغفار مذکورہ معانی کے رُو سے اس کے لازم حال پڑا ہے اور جیسا کہ چاروں طرف درخت اپنی ٹہنیاں چھوڑتا ہے گویا اردگرد کے چشمہ کی طرف اپنے ہاتھوں کو پھیلاتا ہے کہ اے چشمہ میری مدد کر اور میری سرسبزی میں کمی نہ ہونے دے اور میرے پھلوں کا وقت ضائع ہونے سے بچا۔ یہی حال راستبازوں کا ہے۔ رُوحانی سرسبزی کے محفوظ اور سلامت رہنے کے لئے یا اس سرسبزی کی ترقیات کی غرض سے حقیقی زندگی کے چشمہ سے سلامتی کا پانی مانگنا یہی وہ امر ہے جس کو قرآن کریم دوسرے لفظوں میں استغفار کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ قرآن کو سوچو اور غور سے پڑھو استغفار کی اعلیٰ حقیقت پاؤ گے اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ مغفرت لُغت کی رُو سے ایسے ڈھانکنے کو کہتے ہیں جس سے کسی آفت سے بچنا مقصود ہے مثلاً پانی درختوں کے حق میں ایک مغفرت کرنے والا عنصر ہے یعنی اُن کے عیبوں کو ڈھانکتا ہے۔ یہ بات سوچ لو کہ اگر کسی باغ کو برس دو برس بالکل پانی نہ ملے تو اُس کی کیا شکل نکل آئیگی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ اُس کی خوبصورتی بالکل دُور ہو جائیگی اور سرسبزی اور خوشنمائی کا نام ونشان نہیں رہیگا اور وہ وقت پر کبھی پھل نہیں لائیگا اور اندر ہی اندر جل جائیگا اور پھول بھی نہیں آئیں گے بلکہ اس کے سرسبز اور نرم نرم لہلہاتے ہوئے پتّے چند روز میں ہی خشک ہو کر گر جائیں گے اور خشکی غالب ہو کر مجذوم کی طرح آہستہ آہستہ اس کے تمام اعضاء گِرنے شروع ہو جائینگے یہ تمام بلائیں کیوں اس پر نازل ہونگی؟ اس وجہ سے کہ وہ پانی جو اس کی زندگی کا مدار تھا اس نے اس کو سیراب نہیں کیا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ ۔ یعنی پاک کلمہ پاک درخت کی مانند ہے۔ پس جیسا کہ کوئی عمدہ اور شریف درخت بغیر پانی کے نشو ونما نہیں کر سکتا اسی طرح راستباز انسان کے کلماتِ طیّبہ جو اس کے مونہہ سے نکلتے ہیں

اپنی پوری سرسبزی دکھلا نہیں سکتے اور نہ نشو و نما کر سکتے ہیں جب تک وہ پاک چشمہ اُن کی جڑوں کو استغفار کے نالے میں بہہ کر تر نہ کرے۔ سو انسان کی رُوحانی زندگی استغفار سے ہے جس کے نالے میں ہو کر حقیقی چشمہ انسانیت کی جڑوں تک پہنچتا ہے اور خشک ہونے اور مرنے سے بچا لیتا ہے۔ جس مذہب میں اِس فلسفہ کا ذکر نہیں وہ مذہب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہرگز نہیں اور جس شخص نے نبی یا رسول یا راستباز یا پاک فطرت کہلا کر اس چشمہ سے مُنہ پھیرا ہے وہ ہرگز خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں۔ اور ایسا آدمی خدا تعالیٰ سے نہیں بلکہ شیطان سے نکلا ہے کیونکہ شیط مرنے کو کہتے ہیں۔ پس جس نے اپنے روحانی باغ کو سرسبز کرنے کے لئے اُس حقیقی چشمہ کو اپنی طرف کھینچنا نہیں چاہا اور استغفار کے نالے کو اس چشمہ سے لبالب نہیں کیا وہ شیطان ہے یعنی مرنے والا ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ کوئی سرسبز درخت بغیر پانی کے زندہ رہ سکے۔ ہر یک متکبّر جو اس زندگی کے چشمہ سے اپنے روحانی درخت کو سرسبز کرنا نہیں چاہتا وہ شیطان ہے اور شیطان کی طرح ہلاک ہوگا۔ کوئی راستباز نبی دنیا میں نہیں آیا جس نے استغفار کی حقیقت سے مُنہ پھیرا اور اس حقیقی چشمہ سے سرسبز ہونا نہ چاہا۔ ہاں سب سے زیادہ اس سرسبزی کو ہمارے سید و مولیٰ ختم المرسلین فخر الاولین والآخرین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگا اس لئے خدا نے اس کو اس کے تمام ہم منصبوں سے زیادہ سرسبز اور معطّر کیا۔

(نورالقرآن ۱ ص ۲۷ تا ۲۹)

آپؐ کے مبارک ناموں میں سرّ یہ ہے کہ **محمدؐ** اور **احمدؐ** جو دو نام ہیں اُن میں دو جُدا جُدا کمال ہیں۔ **محمدؐ** کا نام جلال اور کبریائی کو چاہتا ہے جو نہایت درجہ تعریف کیا گیا ہے اور اِس میں ایک معشوقانہ رنگ ہے کیونکہ معشوق کی تعریف کی جاتی ہے۔ پس اس میں جلالی رنگ ہونا ضروری ہے۔ مگر **احمدؐ** کا نام اپنے اندر عاشقانہ رنگ رکھتا ہے کیونکہ تعریف کرنا عاشق کا کام ہے وہ اپنے محبوب اور معشوق کی تعریف کرتا ہے۔ اس لئے جیسے **محمدؐ** محبوبانہ شان میں جلال اور کبریائی کو چاہتا ہے اسی طرح احمد عاشقانہ شان میں ہو کر غربت اور انکساری کو چاہتا ہے۔ اس میں ایک سرّ یہ تھا کہ آپؐ کی زندگی کی تقسیم دو حصوں پر کر دی گئی۔ ایک تو مکّی زندگی ہے جو ۱۳ برس کے زمانہ کی ہے اور دوسری وہ زندگی جو مدنی زندگی ہے اور وہ دس برس کی ہے۔ مکّہ کی زندگی میں اسم احمد کی تجلّی تھی۔ اس وقت آپؐ کی دن رات خدا تعالیٰ کے حضور گریہ و بکا اور طلبِ استعانت اور دعا میں گذرتی تھی اگر کوئی شخص آپ کی اِس زندگی کے بسر اوقات پر پوری اطلاع رکھتا ہو تو

اُسے معلوم ہو جائیگا کہ جو تضرّع اور زاری آپؐ نے اس مکّی زندگی میں کی ہے وہ کبھی کسی عاشق نے اپنے محبوب و معشوق کی تلاش میں کبھی نہیں کی اور نہ کر سکیگا۔ پھر آپؐ کی تضرع اپنے لئے نہ تھی بلکہ یہ تضرع دنیا کی حالت کی پوری واقفیت کی وجہ سے تھی۔ خدا پرستی کا نام و نشان چونکہ مٹ چکا تھا اور آپ کی رُوح اور خمیر میں اللہ تعالےٰ میں ایمان رکھ کر ایک لذت اور ایک سرور آچکا تھا اور فطرتاً دنیا کو اس لذت اور محبت سے سرشار کرنا چاہتے تھے۔ ادھر دنیا کی حالت کو دیکھتے تھے تو اُن کی استعدادیں اور فطرتیں عجیب طرز پر واقع ہو چکی تھیں اور بڑے مشکلات اور مصائب کا سامنا تھا۔ غرض دنیا کی اس حالت پر آپ گریہ و زاری کرتے تھے اور یہاں تک کرتے تھے کہ قریب تھا کہ جان نکل جاتی۔ اسی کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:- لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ یہ آپ کی متضرّعانہ زندگی تھی اور اسم احمدؐ کا ظہور تھا اُس وقت آپؐ ایک عظیم الشان توجہ میں پڑے ہوئے تھے۔ اس توجہ کا ظہور مدنی زندگی اور اسم محمدؐ کی تجلّی کے وقت ہُوا جیسا کہ اس آیت سے پتہ لگتا ہے۔ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ۔

(ملفوظات جلد دوم صفحہ ۱۲۸ - ۱۲۹)

جو شخص قرآن کریم کی اسالیب کلام کو بخوبی جانتا ہے اس پر یہ پوشیدہ نہیں کہ بعض اوقات وہ کریم و رحیم جلّ شانہٗ اپنی خواص عباد کے لئے ایسا لفظ استعمال کر دیتا ہے کہ بظاہر بدنما ہوتا ہے مگر معناً نہایت محمود اور تعریف کا کلمہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ نے اپنے نبیؐ کریم کے حق میں فرمایا۔ ووجدك ضالاً فهدىٰ۔ اب ظاہر ہے ضال کے معنے مشہور اور متعارف جو اہلِ لغت کے مُنہ پر چڑھے ہوئے ہیں گمراہ کے ہیں جس کے اعتبار سے آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے (اے رسول اللہ) تجھ کو گمراہ پایا اور ہدایت دی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی گمراہ نہیں ہوئے اور جو شخص مسلمان ہو کر یہ اعتقاد رکھے کہ کبھی آنحضرت صلعم نے اپنی عمر میں ضلالت کا عمل کیا تھا تو وہ کافر بے دین اور حدّ شرعی کے لائق ہے۔ بلکہ آیت کے اس جگہ وہ معنے لینے چاہئیں جو آیت کے سیاق اور سباق سے ملتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ اللہ جلّ شانہٗ نے پہلے آنحضرت صلعم کی نسبت فرمایا۔ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۔ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۔ یعنی خدا تعالےٰ نے تجھے یتیم اور بےکس پایا۔ اور اپنے پاس جگہ دی۔ اور تجھ کو ضال (یعنی عاشق وجہ اللہ) پایا پس اپنی طرف کھینچ لایا۔

اور تجھے درویش پایا پس غنی کر دیا۔

(آئینہ کمالات اسلام ص۱۷۰-۱۷۱)

حضرت موسیٰ بردباری اور حلم میں بنی اسرائیل کے تمام نبیوں سے سبقت لے گئے تھے اور بنی اسرائیل میں نہ مسیح اور نہ کوئی دوسرا نبی ایسا نہیں ہوا جو حضرت موسیٰ کے مرتبہ عالیہ تک پہنچ سکے۔ توریت سے ثابت ہے جو حضرت موسیٰ رفق اور حلم اور اخلاق فاضلہ میں سب اسرائیلی نبیوں سے بہتر اور فائق تر تھے۔ جیسا کہ گنتی باب دوازدہم آیت سوم توریت میں لکھا ہے کہ موسیٰ سارے لوگوں سے جو روئے زمین پر تھے زیادہ بردبار تھا۔ سو خدا نے توریت میں موسیٰ کی بُردباری کی ایسی تعریف کی جو بنی اسرائیل کے تمام نبیوں میں سے کسی کی تعریف میں یہ کلمات بیان نہیں فرمائے۔ ہاں جو اخلاقِ فاضلہ حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کا قرآن شریف میں ذکر ہے وہ حضرت موسیٰ سے ہزارہا درجہ بڑھ کر ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے فرما دیا ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم اُن اخلاقِ فاضلہ کا جامع ہے جو نبیوں میں متفرق طور پر پائے جاتے تھے اور نیز آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا ہے اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ تو خلق عظیم پر ہے۔ اور عظیم کے لفظ کے ساتھ جس چیز کی تعریف کی جائے وہ عرب کے محاورہ میں اُس چیز کی انتہائے کمال کی طرف اشارہ ہوتا ہے مثلاً اگر کہا جائے کہ یہ درخت عظیم ہے تو اس سے یہ مطلب ہو گا کہ جہاں تک درختوں کے لئے طول و عرض اور تناوری ممکن ہے وہ سب اس درخت میں حاصل ہے۔ ایسا ہی اس آیت کا مفہوم ہے کہ جہاں تک اخلاق فاضلہ و شمائل حسنہ نفس انسانی کو حاصل ہو سکتے ہیں وہ تمام اخلاق کاملہ تامّہ نفسِ محمدی میں موجود ہیں۔ سو یہ تعریف ایسی اعلےٰ درجے کی ہے جس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ اور اسی کی طرف اشارہ ہے جو دوسری جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا وکان فضل الله علیك عظیمًا۔ یعنی تیرے پر خدا کا سب سے زیادہ فضل ہے اور کوئی نبی تیرے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہی تعریف بطور پیشگوئی زبور باب ۴۵ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں موجود ہے جیسا کہ فرمایا کہ خدا نے جو تیرا خدا ہے خوشی کے روغن سے تیرے مصاحبوں سے تجھے زیادہ معطّر کیا۔

(براہین احمدیہ ص۵۸۳-۵۸۵ حاشیہ در حاشیہ ۳)

قرآن شریف سے ثابت ہے کہ ہر ایک نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں داخل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لتؤمننّ به ولتنصرنّه ۔ پس اسی طرح

تمام انبیاء علیہم السلام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہوئے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۱۳۳)

ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے نام اپنے اندر جمع رکھتے ہیں کیونکہ وہ وجود پاک جامع کمالات متفرقہ ہے۔ پس وہ موسیٰ بھی ہے اور عیسیٰ بھی اور آدمؑ بھی اور ابراہیمؑ بھی اور یوسفؑ بھی اور یعقوبؑ بھی۔ اِسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرماتا ہے فبھدٰھم اقتدہ یعنی اے رسول تو ان تمام ہدایات متفرقہ کو اپنے وجود میں جمع کر لے۔ جو ہر ایک نبی خاص طور پر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ پس اِس سے ثابت ہے کہ تمام انبیاء کی شانیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات میں شامل تھیں اور درحقیقت **محمدؐ** کا نام صلے اللہ علیہ وسلم اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ محمد کے یہ معنے ہیں کہ بغایت تعریف کیا گیا۔ اور غایت درجہ کی تعریف تبھی متصور ہو سکتی ہے کہ جب انبیاء کے تمام کمالاتِ متفرقہ اور صفاتِ خاصّہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم کی بہت سی آیتیں جن کا اِس وقت لکھنا موجب طوالت ہے اِسی پر دلالت کرتی بلکہ بصراحت بتلاتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک باعتبار اپنی صفات اور کمالات کے مجموعۂ انبیاء تھی۔ اور ہر ایک نبی نے اپنے وجود کے ساتھ مناسبت پاکر یہی خیال کیا کہ میرے نام پر وہ آنے والا ہے۔ اور قرآن کریم ایک جگہ فرماتا ہے کہ سب سے زیادہ ابراہیمؑ سے مناسبت رکھنے والا یہ نبی ہے۔ اور بخاری میں ایک حدیث ہے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری مسیح سے بشدت مناسبت ہے۔ اور اُس کے وجود سے میرا وجود ملا ہوا ہے۔ پس اس حدیث میں حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ کی تصدیق ہے کہ وہ نبی میرے نام پر آئیگا۔ سو ایسا ہی ہوا کہ ہمارا مسیح صلی اللہ علیہ وسلم جب آیا تو اُس نے مسیحِ ناصری کے ناتمام کاموں کو پورا کیا اور اس کی صداقت کے لئے گواہی دی۔ اور اُن تہمتوں سے اُسکو بری قرار دیا جو یہود اور نصاریٰ نے اس پر لگائی تھی اور مسیح کی رُوح کو خوشی پہنچائی۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۳۴۳)

وحی الٰہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں خدائے تعالیٰ کی صفات کمالیہ کا چہرہ حسب صفائی باطن نبی منزل علیہ کے نظر آتا ہے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پاک باطنی و انشراح صدری و عصمت و حیا و صدق و صفا و توکّل و وفا اور عشق الٰہی کے تمام لوازم میں سب انبیاء سے بڑھکر اور سب سے افضل و اعلیٰ و اکمل و ارفع و اجلیٰ و اصفیٰ تھے اس لئے خدائے جلّ شانہٗ نے ان کو

عطرِ کمالاتِ خاصّہ سے سب سے زیادہ معطّر کیا اور وہ سینہ و دل جو تمام اوّلین و آخرین کے سینہ و دل سے فراخ تر و پاک تر و معصوم تر و روشن تر و عاشق تر تھا وہ اسی لائق ٹھہرا کہ اس پر ایسی الٰہی وحی نازل ہو کہ جو تمام اوّلین و آخرین کی وحیوں سے اقویٰ و اکمل و ارفع و اتم ہو کر صفاتِ الٰہیہ کے دکھلانے کے لئے ایک نہایت صاف اور کشادہ اور وسیع آئینہ ہو۔ سو یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف ایسے کمالاتِ عالیہ رکھتا ہے جو اس کی تیز شعاعوں اور شوخ کرنوں کے آگے تمام صحفِ سابقہ کی چمک کالعدم ہو رہی ہے۔ کوئی ذہن ایسی صداقت نکال نہیں سکتا جو پہلے ہی سے اس میں درج نہ ہو۔ کوئی فکر ایسی برہان عقلی پیش نہیں کر سکتا جو پہلے ہی سے اس نے پیش نہ کی ہو۔ کوئی تقریر ایسا قوی اثر کسی دل پر ڈال نہیں سکتی جیسے قوی اور پُر برکت اثر لاکھوں دلوں پر وہ ڈالتا آیا ہے۔ وہ بلاشبہ صفات کمالیہ حق تعالیٰ کا ایک نہایت مصفّٰی آئینہ ہے جس میں سے وہ سب کچھ ملتا ہے جو ایک سالک کو مدارجِ عالیہ معرفت تک پہنچنے کے لئے درکار ہے۔

(سرمہ چشم آریہ صـــ ۲۳-۲۴ حاشیہ)

چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء اور سب رسولوں سے بہتر اور بزرگ تر تھے اور خدائے تعالیٰ کو منظور تھا کہ جیسے آنحضرتؐ اپنے ذاتی جوہر کے رُو سے فی الواقعہ سب انبیاء کے سردار ہیں ایسا ہی ظاہری خدمات کے رُو سے بھی ان کا سب سے فائق اور برتر ہونا دنیا پر ظاہر ہو اور روشن ہو جائے اسلئے خدائے تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو کافہ بنی آدم کے لئے عام رکھا تا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محنتیں اور کوششیں عام طور پر ظہور میں آویں۔ موسیٰؑ اور ابن مریم کی طرح ایک خاص قوم سے مخصوص نہ ہوں اور تا ہر یک طرف سے اور ہر یک گروہ اور قوم سے تکالیف شاقہ اٹھا کر اس اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہر جائیں جو دوسرے نبیوں کو نہیں ملے گا۔

(براہین احمدیہ صـــ ۶۳۱-۶۳۲)

میرا مذہب یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو الگ کیا جاتا اور کل نبی جو اُس وقت تک گذر چکے تھے سب کے سب اکٹھے ہو کر وہ کام اور وہ اصلاح کرنا چاہتے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کی ہرگز نہ کر سکتے۔ اُن میں وہ دل وہ قوت نہ تھی جو ہمارے نبی کو ملی تھی۔ اگر کوئی کہے کہ یہ نبیوں کی معاذ اللہ سوءِ ادبی ہے تو وہ نادان مجھ پر افترا کرے گا۔ مَیں نبیوں کی عزّت اور حرمت کرنا اپنے ایمان کا جزو سمجھتا ہوں لیکن **نبی کریمؐ کی فضیلت کل انبیاء پر میرے ایمان کا جزو اعظم ہے** اور میرے رگ و ریشہ میں ملی ہوئی بات ہے۔ یہ میرے اختیار میں نہیں کہ اس کو نکال دوں۔ بدنصیب

اور آنکھ نہ رکھنے والا مخالف جو چاہے سو کہے ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ کام کیا ہے جو نہ الگ الگ اور نہ مل مل کر کسی سے ہو سکتا تھا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

(ملفوظات جلد دوم ص ۱۷۴)

یہودیوں کی کتب مقدسہ میں نہایت صفائی سے بیان کیا گیا ہے کہ موسیٰ کی مانند ایک منجی ان کے لئے بھیجا جائیگا۔ یعنی وہ ایسے وقت میں آئیگا کہ جب قوم یہود فرعون کے زمانہ کی طرح سخت ذلّت اور دُکھ میں ہوگی اور پھر اس منجی پر ایمان لانے سے وہ تمام دکھوں اور ذلتوں سے رہائی پائینگے تو کچھ شک نہیں کہ جس کی طرف یہود کی ہر زمانہ میں آنکھیں لگی رہی ہیں وہ ہمارے سیّد و مولیٰ **محمد مصطفےٰ** صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے ذریعہ سے توریت کی پیشگوئی کمال وضاحت سے پوری ہوگئی۔ کیونکہ جب یہودی ایمان لائے تو اُن میں سے بڑے بڑے بادشاہ ہوئے۔ یہ اس بات پر دلیل واضح ہے کہ خدا تعالیٰ نے اسلام لانے سے ان کا گناہ بخشا اور اُن پر رحم کیا جیسا کہ توریت میں وعدہ تھا۔

(ایّام الصلح ص ۶۶-۶۹)

مسیح کو جو بزرگی ملی وہ بوجہ تابعداری حضرت **محمد مصطفےٰ** صلے اللہ علیہ وسلم کے ملی کیونکہ مسیح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی خبر دی گئی اور مسیح آنجناب پر ایمان لایا۔ اور بوجہ ایمان کے مسیح نے نجات پائی۔

(الحکم ۳۰ جون ۱۹۰۱ء ص ۳)

جب ہم حضرت مسیحؑ اور جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بات میں بھی مقابلہ کرتے ہیں کہ موجودہ گورنمنٹوں نے اُن کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور کس قدر اُن کے ربّانی رُعب یا الٰہی تائید نے اثر دکھایا تو ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ حضرت مسیحؑ میں بمقابلہ جناب مقدس نبوی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خدائی تو کیا نبوت کی شان بھی پائی نہیں جاتی۔ جناب مقدس نبویؐ کے جب بادشاہوں کے نام فرمان جاری ہوئے تو قیصر روم نے آہ کھینچ کر کہا کہ میں تو عیسائیوں کے پنجہ میں مبتلا ہوں۔ کاش اگر مجھے اسجگہ سے نکلنے کی گنجائش ہوتی تو میں اپنا فخر سمجھتا کہ خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ اور غلاموں کی طرح جناب مقدس کے پاؤں دھویا کروں۔ مگر ایک خبیث اور پلید دل بادشاہ کسریٰ ایران کے فرماں روا نے

غصہ میں آکر آپ کے پکڑنے کے لئے سپاہی بھیج دیئے۔ وہ شام کے قریب پہنچے اور کہا ہمیں گرفتاری کا حکم ہے۔ آپؐ نے اس بیہودہ بات سے اعراض کر کے فرمایا۔ تم اسلام قبول کرو۔ اُس وقت آپ صرف دو چار اصحاب کے ساتھ مسجد میں بیٹھے تھے مگر ربانی رُعب سے وہ دونوں بید کی طرح کانپ رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ ہمارے خداوند کے حکم یعنی گرفتاری کی نسبت جناب عالی کا کیا جواب ہے؟ کہ ہم جواب ہی لے جائیں۔ حضرت نبی اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا کل تمہیں جواب ملے گا۔ صبح کو جو وہ حاضر ہوئے تو آنجنابؐ نے فرمایا کہ وہ جسے تم خداوند خداوند کہتے ہو وہ خداوند نہیں ہے۔ خداوند وہ ہے جس پر موت اور فنا طاری نہیں ہوتی۔ مگر تمہارا خداوند آج رات کو مارا گیا۔ میرے سچے خداوند نے اُسی کے بیٹے شیرویہ کو اُس پر مسلّط کر دیا۔ سو وہ آج رات اُس کے ہاتھ سے قتل ہو گیا اور یہی جواب ہے۔ یہ بڑا معجزہ تھا۔ اس کو دیکھ کر اس ملک کے ہزارہا لوگ ایمان لائے کیونکہ اُسی رات درحقیقت خسرو پرویز یعنی کسریٰ مارا گیا تھا۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بیان انجیل کی بے سروپا اور بے اصل باتوں کی طرح نہیں بلکہ احادیث صحیحہ اور تاریخی ثبوت اور مخالفوں کے اقرار سے ثابت ہے۔ چنانچہ ڈیوین پورٹ صاحب بھی اس قصہ کو اپنی کتاب میں لکھتا ہے لیکن اُس وقت کے بادشاہوں کے سامنے حضرت مسیح کی جو عزت تھی وہ آپ پر پوشیدہ نہیں وہ اوراق شائد اب تک انجیل میں موجود ہونگے جن میں لکھا ہے کہ ہیرودیس نے حضرت مسیح کو مجرموں کی طرح پیلاطوس کی طرف چالان کیا۔ اور وہ ایک مدت تک شاہی حوالات میں رہے کچھ بھی خدائی پیش نہیں گئی۔ اور کسی بادشاہ نے یہ نہ کہا کہ میرا فخر ہوگا اگر میں اُس کی خدمت میں رہوں اور اس کے پاؤں دھویا کروں۔ بلکہ پیلاطوس نے یہودیوں کے حوالے کر دیا۔ کیا یہی خدائی تھی؟ عجیب مقابلہ ہے۔ دو شخصوں کو ایک ہی قسم کے واقعات پیش آئے اور دونوں نتیجہ میں ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ثابت ہوئے۔ ایک شخص کے گرفتار کرنے کو ایک متکبّر جبّار کا شیطان کے وسوسہ سے برانگیختہ ہونا اور خود آخر لعنتِ الٰہی میں گرفتار ہو کر اپنے بیٹے کے ہاتھ سے بڑی ذلّت کے ساتھ قتل کیا جانا۔ اور ایک دوسرا انسان ہے جسے قطع نظر اپنے اصلی دعووں کے غلوّ کرنے والوں نے آسمان پر چڑھا رکھا ہے سچ مچ گرفتار ہو جانا۔ چالان کیا جانا اور عجیب ہیئت کے ساتھ ظالم پولیس کی حوالات میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کیا جانا۔

(نور القرآن ۲ ص ۹-۱۱)

ایک وہ زمانہ تھا کہ انجیل کے واعظ بازاروں اور گلیوں اور کوچوں میں نہایت دریدہ دہانی سے اور سراسر افترا سے ہمارے سید مولیٰ خاتم الانبیاء اور افضل الرسل والاصفیاء اور سید المعصومین والاتقیاء حضرت محبوب جناب احدیت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ قابل شرم جھوٹ بولا کرتے تھے کہ گویا آنجناب سے کوئی پیشگوئی یا معجزہ ظہور میں نہیں آیا اور اب یہ زمانہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے علاوہ ان ہزارہا معجزات کے جو ہمارے سرور و مولیٰ شفیع المذنبین صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن شریف اور احادیث میں اس کثرت سے مذکور ہیں جو اعلیٰ درجہ کے تواتر پر ہیں۔ تازہ بتازہ صدہا نشان ایسے ظاہر فرمائے ہیں کہ کسی مخالف اور منکر کو اُن کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ ہم نہایت نرمی اور انکسار سے ہر ایک عیسائی صاحب اور دوسرے مخالفوں کو کہتے رہے ہیں اور اب بھی کہتے ہیں کہ درحقیقت یہ بات سچ ہے کہ ہر ایک مذہب جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو کر اپنی سچائی پر قائم ہوتا ہے اس کیلئے ضرور ہے کہ اُس میں ایسے انسان پیدا ہوتے رہیں کہ جو اپنے پیشوا اور ہادی اور رسول کے نائب ہو کر یہ ثابت کریں کہ وہ نبی اپنی روحانی برکات کے لحاظ سے زندہ ہے فوت نہیں ہوا کیونکہ ضرور ہے کہ وہ نبی جس کی پیروی کی جائے جس کو شفیع اور منجی سمجھا جائے وہ اپنی روحانی برکات کے لحاظ سے ہمیشہ زندہ ہو اور عزت اور رفعت اور جلال کے آسمان پر اپنے چمکتے ہوئے چہرہ کے ساتھ ایسا بدیہی طور پر مقیم ہو اور خدائے ازلی ابدی حیّ و قیوم ذو الاقتدار کے دائیں طرف بیٹھنا اُسکا ایسے پُرزور الٰہی نوروں سے ثابت ہو کہ اُس سے کامل محبت کرنا اور اُس کی کامل پیروی کرنا لازمی طور پر اس نتیجہ کو پیدا کرتا ہو کہ پیروی کرنے والا رُوح القدس اور آسمانی برکات کا انعام پائے اور اپنے پیارے نبی کے نوروں سے نور حاصل کرکے اپنے زمانہ کی تاریکی کو دُور کرے اور مستعد لوگوں کو خدا کی ہستی پر وہ پختہ اور کامل اور درخشاں اور تاباں یقین بخشے جس سے گناہ کی تمام خواہشیں اور سفلی زندگی کے تمام جذبات جل جاتے ہیں۔ یہی ثبوت اس بات کا ہے کہ وہ نبی زندہ اور آسمان پر ہے۔ سو ہم اپنے خدائے پاک و ذوالجلال کا کیا شکر کریں کہ اس نے اپنے پیارے نبی محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت اور پیروی کی توفیق دے کر اور پھر اس محبت اور پیروی کے رُوحانی فیضوں سے جو سچی تقویٰ اور سچے آسمانی نشان ہیں کامل حصہ عطا فرما کر ہم پر ثابت کر دیا کہ وہ ہمارا پیارا برگزیدہ نبی فوت نہیں ہوا بلکہ وہ بلند تر آسمان پر اپنے ملیک مقتدر کے دائیں طرف بزرگی اور جلال کے تخت پر بیٹھا ہے۔ اَللّٰھُمَّ صلّ علیہ و بارک و سلّم۔ ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النّبي یا ایھا الذین اٰمنوا صلّوا علیہ و سلّموا تسلیمًا۔ اب ہمیں کوئی

جواب دے کہ روئے زمین پر یہ زندگی کس نبی کے لئے بجز ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ثابت ہے؟ کیا حضرت موسیٰؑ کے لئے؟ ہرگز نہیں۔ کیا حضرت داؤدؑ کے لئے؟ ہرگز نہیں۔ کیا حضرت مسیح علیہ السلام کیلئے؟ ہرگز نہیں۔ کیا راجہ رامچندر یا راجہ کرشن کے لئے؟ ہرگز نہیں۔ کیا وید کے اُن رشیوں کے لئے جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے دلوں پر وید کا پرکاش ہوا تھا؟ ہرگز نہیں۔ جسمانی زندگی کا ذکر بے سود ہے۔ اور حقیقی اور روحانی فیض رساں زندگی وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی زندگی کے مشابہ ہوکر نور اور یقین کے کرشمے نازل کرتی ہو۔ ورنہ جسمانی وجود کے ساتھ ایک لمبی عمر پانا اگر فرض بھی کرلیں۔ اور فرض کے طور پر مان بھی لیں کہ ایسی عمر کسی کو دی گئی ہے تو کچھ بھی جائے فخر نہیں مصر کی بعض پُرانی عمارتیں ہزارہا برس سے چلی آتی ہیں اور بابل کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں جن میں اُلّو بولتے ہیں اور اس ملک میں اجودھیا اور بندرابن بھی پُرانے زمانے کی آبادیاں ہیں اور اٹلی اور یونان میں بھی ایسی قدیم عمارتیں پائی جاتی ہیں تو کیا اس جسمانی طور پر لمبی عمر پانے سے یہ تمام چیزیں اُس جلال اور بزرگی سے حصہ لے سکتی ہیں جو رُوحانی زندگی کی وجہ سے خدا کے مقدس لوگوں کو حاصل ہوتی ہے اب اس بات کا فیصلہ ہوگیا ہے کہ اس رُوحانی زندگی کا ثبوت صرف ہمارے نبی علیہ السلام کی ذات بابرکات میں پایا جاتا ہے۔ خدا کی ہزاروں رحمتیں اس کے شامل حال رہیں۔

(تریاق القلوب ص ۹-۱۰)

ہمارے سیّد و مولیٰ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے تین ہزار سے زیادہ معجزات ہوئے ہیں اور پیشگوئیوں کا تو شمار نہیں۔ مگر ہمیں ضرورت نہیں کہ ان گذشتہ معجزات کو پیش کریں بلکہ ایک عظیم الشان معجزہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ تمام نبیوں کی وحی منقطع ہوگئی اور معجزات نابود ہوگئے۔ اور اُن کی اُمت خالی اور تہی دست ہے صرف قصّے ان لوگوں کے ہاتھ میں رہ گئے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی منقطع نہیں ہوئی اور نہ معجزات منقطع ہوئے بلکہ ہمیشہ بذریعہ کاملین امت جو شرفِ اتباع سے مشرف ہیں ظہور میں آتے ہیں۔ اس وجہ سے مذہب اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور اس کا خدا زندہ خدا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی اس شہادت کے پیش کرنے کے لئے یہی بندۂ حضرت عزّت موجود ہے اور اب تک میرے ہاتھ پر ہزارہا نشان تصدیق رسول اللہ اور کتاب اللہ کے بارہ میں ظاہر ہوچکے ہیں اور خدا تعالےٰ کے پاک مکالمہ سے قریبًا ہر روز میں مشرف ہوتا ہوں۔

(چشمہ مسیحی ص ۱۸ طبع اوّل)

اِس درجہ لقاء میں بعض اوقات انسان سے ایسے امور صادر ہوتے ہیں جو بشریت کی

طاقتوں سے بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور الٰہی طاقت کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں جیسے ہمارے سیّد و مولیٰ سیّد الرسل حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر میں ایک سنگریزوں کی مٹھی کفار پر چلائی اور وہ مٹھی کسی دعا کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خود اپنی روحانی طاقت سے چلائی مگر اُس مٹھی نے خدائی طاقت دکھلائی اور مخالف کی فوج پر ایسا خارق عادت اس کا اثر پڑا کہ کوئی اُن میں سے ایسا نہ رہا کہ جس کی آنکھ پر اس کا اثر نہ پہنچا ہو۔ اور وہ سب اندھوں کی طرح ہو گئے اور ایسی سراسیمگی اور پریشانی اُن میں پیدا ہو گئی کہ مدہوشوں کی طرح بھاگنا شروع کیا۔ اِسی معجزہ کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے۔ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ یعنی جب تُو نے اُس مٹھی کو پھینکا وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا تعالیٰ نے پھینکا۔ یعنی درپردہ الٰہی طاقت کام کر گئی۔ انسانی طاقت کا یہ کام نہ تھا۔

اور ایسا ہی دوسرا معجزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو شق القمر ہے اسی الٰہی طاقت سے ظہور میں آیا تھا۔ کوئی دُعا اس کے ساتھ شامل نہ تھی کیونکہ وہ صرف انگلی کے اشارہ سے جو الٰہی طاقت سے بھری ہوئی تھی وقوع میں آگیا تھا۔ اور اس قسم کے اَور بھی بہت سے معجزات ہیں جو صرف ذاتی اقتدار کے طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دکھلائے جن کے ساتھ کوئی دعا نہ تھی کئی دفعہ تھوڑے سے پانی کو جو صرف ایک پیالہ میں تھا اپنی انگلیوں کو اُس پانی کے اندر داخل کرنے سے اس قدر زیادہ کر دیا کہ تمام لشکر اور اونٹوں اور گھوڑوں نے وہ پانی پیا اور پھر بھی وہ پانی ویسا ہی اپنی مقدار پر موجود تھا۔ اور کئی دفعہ دو چار روٹیوں پر ہاتھ رکھنے سے ہزارہا بھوکوں پیاسوں کا اُن سے شکم سیر کر دیا۔ اور بعض اوقات تھوڑے دودھ کو اپنے لبوں سے برکت دے کر ایک جماعت کا پیٹ اس سے بھر دیا۔ اور بعض اوقات شور آب کنوئیں میں اپنے مُنہ کا لعاب ڈال کر اس کو نہایت شیریں کر دیا۔ اور بعض اوقات سخت مجروحوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر ان کو اچھا کر دیا۔ اور بعض اوقات آنکھوں کو جن کے ڈیلے لڑائی کے کسی صدمہ سے باہر جا پڑے تھے اپنے ہاتھ کی برکت سے پھر درست کر دیا۔ ایسا ہی اَور بھی بہت سے کام اپنے ذاتی اقتدار سے کئے جن کے ساتھ ایک چھپی ہوئی الٰہی طاقت مخلوط تھی۔

حال کے برہمو اور فلسفی اور نیچری اگر ان معجزات سے انکار کریں تو وہ معذور ہیں کیونکہ وہ اس مرتبہ کو شناخت نہیں کر سکتے جس سے ظلّی طور پر الٰہی طاقت انسان کو ملتی ہے۔ پس اگر وہ ایسی باتوں پر ہنسیں تو وہ اپنے ہنسنے میں بھی معذور ہیں کیونکہ انہوں نے بجز طفلانہ حالت کے اور کسی درجہ رُوحانی بلوغ

کو طے نہیں کیا۔ اور نہ صرف اپنی حالتِ ناقص رکھتے ہیں بلکہ اس بات پر خوش ہیں کہ حالتِ ناقصہ میں مریں بھی۔

مگر زیادہ تر افسوس ان عیسائیوں پر ہے جو بعض خوارق اسی کے مشابہ مگر ان سے ادنیٰ حضرت مسیح میں سُن سُنا کر اُن کی الوہیت کی دلیل ٹھیرا بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت مسیح کا مردوں کا زندہ کرنا اور مفلوجوں اور مجذوموں کا اچھا کرنا اپنے اقتدار سے تھا کسی دُعا سے نہیں تھا اور یہ دلیل اس بات پر ہے کہ وہ حقیقی طور پر ابن اللہ بلکہ خدا تھا۔ لیکن افسوس کہ ان بیچاروں کو خبر نہیں کہ اگر انہی باتوں سے انسان خدا بن جاتا ہے تو اس خدائی کا زیادہ تر استحقاق ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے کیونکہ اس قسم کے اقتداری خوارق جسقدر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دکھلائے ہیں حضرت مسیح علیہ السلام ہرگز نہیں دکھلا سکے اور ہمارے ہادی مقتدا صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ اقتداری خوارق نہ صرف آپ ہی دکھلائے بلکہ ان خوارق کا ایک لمبا سلسلہ روزِ قیامت تک اپنی امت میں چھوڑ دیا جو ہمیشہ اور ہر زمانہ میں حسب ضرورت زمانہ ظہور میں آتا رہا ہے اور اس دنیا کے آخری دنوں تک اسی طرح ظاہر ہوتا رہیگا اور الٰہی طاقت کا پرتوہ جس قدر اس اُمت کی مقدس روحوں پر پڑا ہے اس کی نظیر دوسری اُمتوں میں ملنی مشکل ہے۔ پھر کس قدر بیوقوفی ہے کہ ان خارق عادت امور کی وجہ سے کسی کو خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیا جائے۔ اگر ایسے خوارق سے انسان خدا بن سکتا ہے تو پھر خداؤں کا کچھ انتہا بھی ہے؟

(آئینہ کمالات اسلام ص ۶۵-۶۷)

ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ شق القمر کا معجزہ اہل اسلام کی نظر میں ایسا امر نہیں ہے کہ جو مدار ثبوت اسلام اور دلیل اعظم حقانیتِ کلام اللہ کا ٹھہرایا گیا ہو۔ بلکہ ہزارہا شواہد اندرونی و بیرونی وصدہا معجزات و نشانوں میں سے یہ بھی ایک قدرتی نشان ہے جو تاریخی طور پر کافی ثبوت اپنے ساتھ رکھتا ہے جس کا ذکر آئندہ عنقریب آئیگا۔ سو اگر تمام کھلے کھلے ثبوتوں سے چشم پوشی کر کے فرض بھی کر لیں کہ یہ معجزہ ثابت نہیں ہے اور آیت کے اس طور پر معنے قرار دیں جس طور پر حال کے عیسائی و نیچری یا دوسرے منکرین خوارق کرتے ہیں .... تو اس عدم ثبوت کا اسلام پر کوئی بد اثر نہیں پہنچ سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ کلام الٰہی نے مسلمانوں کو دوسرے معجزات سے بکلّی بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ نہ صرف اعجاز بلکہ اپنی برکات و تنویرات کے رُو سے اعجاز آفرین بھی ہے فی الحقیقت قرآن شریف اپنی ذات میں ایسی صفاتِ کمالیہ رکھتا ہے جو اُس کو خارجیہ معجزات

کی کچھ بھی حاجت نہیں۔ خارجیہ معجزات کے ہونے سے اس میں کچھ زیادتی نہیں ہوتی اور نہ ہونے سے کوئی نقص عائد حال نہیں ہوتا۔ اِس کا بازارِ حُسن معجزاتِ خارجیہ کے زیور سے رونق پذیر نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں آپ ہی ہزارہا معجزات عجیبہ وغریبہ کا جامع ہے۔ جنکو ہریک زمانہ کے لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ نہ یہ کہ صرف گذشتہ کا حوالہ دیا جائے وہ ایسا ملیح الحسن محبوب ہے کہ ہریک چیز اس سے مل کر آرائش پکڑتی ہے اور وہ اپنی آرائش میں کسی کی آمیزش کا محتاج نہیں؎

ہمہ خوبانِ عالم را بزیور ہا بیارانید ⁂ تو سیمیں تن چناں خوبی کہ زیور ہا بیارائی

پھر ماسوا اس کے سمجھنا چاہیئے کہ جو لوگ شق القمر کے معجزہ پر حملہ کرتے ہیں اُن کے پاس صرف یہی ایک ہتھیار ہے اور وہ بھی ٹوٹا پھوٹا کہ شق القمر قوانین قدرتیہ کے برخلاف ہے، اسلئے مناسب معلوم ہوُا کہ اوّل ہم ان کے قانونِ قدرت کی کچھ تفتیش کرکے پھر وہ ثبوت تاریخی پیش کریں جو اس واقعہ کی صحت پر دلالت کرتے ہیں۔ سو جاننا چاہیئے کہ نیچر کے ماننے والے یعنی قانون قدرت کے پیرو کہلانے والے اس خیال پر زور دیتے ہیں کہ یہ بات بدیہی ہے کہ جہاں تک انسان اپنی عقلی قوتوں سے جان سکتا ہے وہ بجز قدرت اور قانون قدرت کے کچھ نہیں یعنی مصنوعات و موجودات مشہودہ موجودہ پر نظر کرنے سے چاروں طرف یہی نظر آتا ہے کہ ہر ایک چیز مادی یا غیر مادی جو ہم میں اور ہمارے اردگرد یا فوق و تحت میں موجود ہے وہ اپنے وجود اور قیام اور ترتب آثار میں ایک عجیب سلسلۂ انتظام سے وابستہ ہے جو ہمیشہ اُس کی ذات میں پایا جاتا ہے اور کبھی اس سے جُدا نہیں ہوتا۔ قدرت نے جس طرح پر جس کا ہونا بنا دیا بغیر خطا کے اسی طرح ہوتا ہے اور اسی طرح پر ہوگا۔ پس وہی سچ ہے اور اصول بھی وہی سچے ہیں جو اس کے مطابق ہیں۔

مَیں کہتا ہوں کہ بلاشبہ یہ سب سچ۔ مگر کیا اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ قدرتِ الٰہی کے طریقے اور اس کے قانون اسی حد تک ہیں جو ہمارے تجربہ اور مشاہدہ میں آچکے ہیں اس سے زیادہ نہیں؟ جس حالت میں الٰہی قدرتوں کو غیر محدود ماننا ایک ایسا ضروری مسئلہ ہے جو اس سے نظام کارخانۂ الوہیت وابستہ اور اس سے ترقیاتِ علمیہ کا ہمیشہ کے لئے دروازہ کھلا ہوُا ہے تو پھر کس قدر غلطی کی بات ہے کہ ہم یہ نکارہ حجت پیش کریں کہ جو امر ہماری سمجھ اور مشاہدہ سے باہر ہے وہ قانون قدرت سے بھی باہر ہے۔ بلکہ جس حالت میں ہم اپنے مُنہ سے اقرار کر چکے کہ قوانینِ قدرتیہ غیر متناہی اور غیر محدود ہیں تو پھر ہمارا یہ اصول ہونا چاہیئے کہ ہریک نئی بات جو ظہور میں آوے پہلے ہی اپنی عقل سے بالا تر دیکھکر

اُس کو ردّ نہ کریں بلکہ خوب متوجہ ہو کر اُس کے ثبوت یا عدم ثبوت کا حال جانچ لیں۔ اگر وہ ثابت ہو تو قانون قدرت کی فہرست میں اس کو بھی داخل کر لیں۔ اور اگر وہ ثابت نہ ہو تو صرف اتنا کہہ دیں کہ ثابت نہیں مگر اس بات کے کہنے کے ہم ہرگز مجاز نہیں ہونگے کہ وہ امر قانون قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ قانون قدرت سے باہر کسی چیز کو سمجھنے کے لئے ہمارے پر ضرور ہے کہ ہم ایک دائرہ کی طرح خدائے تعالیٰ کے تمام قوانین ازلی و ابدی پر محیط ہو جائیں اور بخوبی ہمارا فکر اس بات پر احاطۂ تام کرلے کہ خدائے تعالیٰ نے روز ازل سے آج تک کیا کیا قدرتیں ظاہر کیں اور آئندہ اپنے ابدی زمانہ میں کیا کیا قدرتیں ظاہر کرے گا .... بہر حال اگر ہم خدائے تعالیٰ کی قدرتوں کو غیر محدود مانتے ہیں تو یہ جنون اور دیوانگی ہے کہ اس کی قدرتوں پر احاطہ کرنے کی اُمید رکھیں۔ کیونکہ اگر وہ ہمارے مشاہدہ کے پیمانے میں محدود ہو سکیں تو پھر غیر محدود اور غیر متناہی کیونکر رہیں؟ اور اس صورت میں نہ صرف یہ نقص پیش آتا ہے کہ ہمارا فانی اور ناقص تجربہ خدائے ازلی و ابدی کی تمام قدرتوں کا حدبست کرنے والا ہوگا۔ بلکہ ایک بڑا بھاری نقص یہ بھی ہے کہ اُس کی قدرتوں نے محدود ہونے سے وہ خود بھی محدود ہو جائے گا۔ اور پھر یہ کہنا پڑے گا کہ جو کچھ خدائے تعالیٰ کی حقیقت اور کُنہ ہے ہم نے سب معلوم کر لی ہے اور اس کے گہراؤ اور تہ تک ہم پہنچ گئے ہیں۔ اور اس کلمہ میں جس قدر کفر اور بے ادبی اور بے ایمانی بھری ہوئی ہے وہ ظاہر ہے حاجت بیان نہیں۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۱۲-۱۷)

مَیں پوچھتا ہوں کہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جنہوں نے عام اور علانیہ طور پر یہ دعویٰ مشہور کر دیا تھا کہ میرے ہاتھ سے معجزہ شق القمر وقوع میں آگیا ہے اور کفار نے اس کو بچشم خود دیکھ بھی لیا ہے مگر اس کو جادو قرار دیا اپنے اس دعویٰ میں سچے نہیں تھے تو پھر کیوں مخالفین آنحضرتؐ جو اس زمانہ میں تھے جن کو یہ خبریں گویا نقّارہ کی آواز سے پہنچ چکی تھیں چُپ رہے اور کیوں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مؤاخذہ نہ کیا کہ آپ نے کب چاند کو دو ٹکڑے کر کے دکھایا اور کب ہم نے اس کو جادو کہا اور اس کے قبول سے مُنّہ پھیرا اور کیوں اپنے مرتے دم تک خاموشی اختیار کی اور مُنّہ بند رکھا یہاں تک کہ اس عالم سے گذر گئے؟ کیا ان کی یہ خاموشی جو اُن کی مخالفانہ حالت اور جوش مقابلہ کے بالکل برخلاف تھی اس بات کا یقین نہیں دلاتے کہ کوئی ایسی سخت روک تھی جس کی وجہ سے بول نہیں سکتے تھے۔ مگر بجز ظہور سچائی کے اور کونسی روک تھی؟ یہ معجزہ مکّہ میں ظہور میں آیا تھا۔ اور مسلمان ابھی بہت کمزور اور غریب اور عاجز تھے۔ پھر تعجب یہ کہ اُن کے بیٹوں یا پوتوں نے بھی

انکار میں کچھ زبان کشائی نہ کی حالانکہ اُن پر واجب و لازم تھا کہ اتنا بڑا دعویٰ اگر افترا محض تھا اور صدہا کوسوں میں مشہور ہو گیا تھا اُس ردّ میں کتابیں لکھتے اور دنیا میں شائع اور مشہور کرتے اور جبکہ ان لاکھوں آدمیوں عیسائیوں عربوں یہودیوں مجوسیوں وغیرہ میں سے ردّ لکھنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی اور جو لوگ مسلمان تھے وہ علانیہ ہزاروں آدمیوں کے روبرو چشم دید گواہی دیتے رہے جن کی شہادتیں آجتک اس زمانہ کی کتابوں میں مندرج پائی جاتی ہیں تو یہ صریح دلیل اس بات پر ہے کہ مخالفین ضرور شق القمر مشاہدہ کر چکے تھے اور ردّ لکھنے کیلئے کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ...... پھر ان سب باتوں کے بعد ہم یہ بھی لکھتے ہیں کہ شق القمر کے واقعہ پر ہندوؤں کی معتبر کتابوں میں بھی شہادت پائی جاتی ہے۔ مہابھارتہ کے دھرم پرب میں بیاس جی صاحب لکھتے ہیں کہ اُن کے زمانہ میں چاند دو ٹکڑے ہو کر پھر مل گیا تھا۔ اور وہ اس شق القمر کو اپنے بے ثبوت خیال سے بسوامتر کا معجزہ قرار دیتے تھے ...... معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی شہرت ہندوؤں میں مؤلف تاریخ فرشتہ کے وقت میں بھی بہت کچھ پھیلی ہوئی تھی کیونکہ اُس نے اپنی کتاب کے مقالہ یازدہم میں ہندوؤں سے یہ شہرت یافتہ نقل لے کر بیان کی ہے کہ شہر دھارکہ جو متصل دریائے پہنبل صوبہ مالوہ میں واقعہ ہے اب اِس کو شائد دھارانگری کہتے ہیں وہاں کا راجہ اپنے محل کی چھت پر بیٹھا تھا ایکبارگی اُس نے دیکھا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور پھر مل گیا اور بعد تفتیش اس راجہ پر کھل گیا کہ یہ نبی عربی صلے اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے تب وہ مسلمان ہو گیا۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۶۷-۶۹)

ہمارے سید و مولیٰ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جس قدر خدا تعالیٰ کی طرف سے نشان اور معجزات ملے وہ صرف اُس زمانے تک محدود نہ تھے بلکہ قیامت تک اُن کا سلسلہ جاری ہے اور پہلے زمانوں میں جو کوئی نبی ہوتا تھا وہ کسی گذشتہ نبی کی اُمت نہیں کہلاتا تھا گو اس کے دین کی نصرت کرتا تھا اور اس کو سچا جانتا تھا۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ایک خاص فخر دیا گیا ہے کہ وہ ان معنوں سے خاتم الانبیاء ہیں کہ ایک تو تمام کمالاتِ نبوت ان پر ختم ہیں اور دوسرے یہ کہ اُن کے بعد کوئی نئی شریعت لانے والا رسول نہیں اور نہ کوئی ایسا نبی ہے جو اُن کی اُمت سے باہر ہو۔ بلکہ ہر ایک کو جو شرفِ مکالمہ الٰہیہ ملتا ہے وہ اُنہی کے فیض اور اُن ہی کی وساطت سے ملتا ہے اور وہ اُمتی کہلاتا ہے نہ کوئی مستقل نبی۔ اور رجوع خلائق اور قبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج کم سے کم بیس کروڑ ہر طبقہ کے مسلمان آپ کی غلامی میں کمربستہ کھڑے ہیں اور جب سے خدا نے آپؐ کو

پیدا کیا ہے۔ بڑے بڑے زبردست بادشاہ جو ایک دنیا کو فتح کرنے والے تھے آپؐ کے قدموں پر ادنیٰ غلاموں کی طرح گرے رہے ہیں۔ اور اس وقت اسلامی بادشاہ بھی ذلیل چاکروں کی طرح آنجناب کی خدمت میں اپنے تئیں سمجھتے ہیں اور نام لینے سے تخت سے نیچے اُتر آتے ہیں۔

اب سوچنا چاہیئے کہ کیا یہ عزت کیا یہ شوکت کیا یہ اقبال کیا یہ جلال کیا یہ ہزاروں نشان آسمانی کیا یہ ہزاروں برکات ربّانی جھوٹے کو بھی مل سکتے ہیں؟ ہمیں بڑا فخر ہے کہ جس نبی علیہ السلام کا ہم نے دامن پکڑا ہے خدا کا اس پر بڑا ہی فضل ہے۔ وہ خدا تو نہیں مگر اس کے ذریعہ سے ہم نے خدا کو دیکھ لیا ہے۔ اُس کا مذہب جو ہمیں ملا ہے خدا کی طاقتوں کا آئینہ ہے۔ اگر اسلام نہ ہوتا تو اس زمانے میں اس بات کا سمجھنا محال تھا کہ نبوّت کیا چیز ہے؛ اور کیا معجزات بھی ممکنات میں سے ہیں؟ اور کیا وہ قانون قدرت میں داخل ہیں؟ اس عقدے کو اُسی نبی کے دائمی فیض نے حل کیا اور اُسی کے طفیل سے اب ہم دوسری قوموں کی طرح صرف قصّہ گو نہیں ہیں بلکہ خدا کا نور اور خدا کی آسمانی نصرت ہمارے شامل حال ہے۔ ہم کیا چیز ہیں جو اس شکر کو ادا کرسکیں کہ وہ خدا جو دوسروں پر مخفی ہے اور وہ پوشیدہ طاقت جو دوسروں سے نہاں در نہاں ہے، وہ ذوالجلال خدا محض اس نبی کریمؐ کے ذریعہ سے ہم پر ظاہر ہو گیا۔

(مضمون جلسہ لاہور منسلکہ چشمہ معرفت ص۱۸)

جس قدر معجزات کل نبیوں سے صادر ہوئے اُن کے ساتھ ہی اُن معجزات کا بھی خاتمہ ہو گیا مگر ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات ایسے ہیں کہ وہ ہر زمانے میں اور ہر وقت تازہ بتازہ اور زندہ موجود ہیں۔ ان معجزات کا زندہ ہونا اور ان پر موت کا ہاتھ نہ چلنا صاف طور پر اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی زندہ نبی ہیں اور حقیقی زندگی یہی ہے جو آپؐ کو عطا ہوئی ہے اور کسی دوسرے کو نہیں ملی۔ آپ کی تعلیم اس لئے زندہ تعلیم ہے کہ اُس کے ثمرات اور برکات اس وقت بھی ویسے ہی موجود ہیں جو آج سے تیرہ سو سال پیشتر موجود تھے دوسری کوئی تعلیم ہمارے سامنے اس وقت ایسی نہیں ہے جس پر عمل کرنے والا یہ دعوٰی کرسکے کہ اس کے ثمرات اور برکات اور فیوض سے مجھے حصہ دیا گیا ہے۔ اور میں ایک آیت اللہ ہو گیا ہوں۔ لیکن ہم خدا تعالٰے کے فضل و کرم سے قرآن شریف کی تعلیم کے ثمرات اور برکات کا نمونہ اب بھی موجود پاتے ہیں اور ان تمام آثار اور فیوض کو جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سچّی اتباع سے ملتے ہیں اب بھی پاتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالٰے نے اس سلسلہ کو اس لئے قائم کیا ہے تا وہ اسلام کی سچائی پر

زندہ گواہ ہو اور ثابت کرے کہ وہ برکات اور آثار اس وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع سے ظاہر ہوئے ہیں جو تیرہ سو برس پہلے ظاہر ہوئے تھے۔ چنانچہ صدہا نشان اِس وقت تک ظاہر ہو چکے ہیں۔ اور ہر قوم ہر مذہب کے سرگروہوں کو ہم نے دعوت کی ہے کہ وہ ہمارے مقابلہ میں آکر اپنی صداقت کا نشان دکھائیں مگر ایک بھی ایسا نہیں کہ جو اپنے مذہب کی سچائی کا کوئی نمونہ عملی طور پر دکھائے۔

(ملفوظات جلد سوم صـ ۳۷)

جسقدر خداوند قادرِ مطلق نے تمام دنیا کے مقابلہ پر تمام مخالفوں کے مقابلہ پر تمام دشمنوں کے مقابلہ پر تمام منکروں کے مقابلہ پر تمام دولتمندوں کے مقابلہ پر تمام زور آوروں کے مقابلہ پر تمام بادشاہوں کے مقابلہ پر تمام حکیموں کے مقابلہ پر تمام فلاسفروں کے مقابلہ پر تمام اہل مذہب کے مقابلہ پر ایک عاجز ناتوان بے زر بے زور ایک اُمّی ناخوان بے علم بے تربیت کو اپنی خداوندی کے کامل جلال سے کامیابی کے وعدے دیئے ہیں کیا کوئی ایمانداروں اور حق کے طالبوں میں سے شک کر سکتا ہے کہ یہ تمام مواعید کہ جو اپنے وقتوں پر پورے ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں یہ کسی انسان کا کام ہے۔ دیکھو ایک غریب اور تنہا اور مسکین نے اپنے دین کے پھیلنے کے اور اپنے مذہب کی جڑ پکڑنے کی اُس وقت خبر دی کہ جب اُس کے بجز چند بے سامان درویشوں کے اَور کچھ نہ تھا۔ اور تمام مسلمان صرف اس قدر تھے کہ ایک چھوٹے سے حجرہ میں سما سکتے تھے۔ اور انگلیوں پر نام بنام گنے جا سکتے تھے۔ جن کو گاؤں کے چند آدمی ہلاک کر سکتے تھے جن کا مقابلہ اُن لوگوں سے پڑا تھا کہ جو دنیا کے بادشاہ اور حکمران تھے۔ اور جن کو ان قوموں کے ساتھ سامنا پیش آیا تھا کہ جو باوجود کروڑوں مخلوقات ہونے کے ان کے ہلاک کرنے اور نیست و نابود کرنے پر متفق تھے۔ مگر اب دنیا کے کناروں تک نظر ڈال کر دیکھو کہ کیونکر خدا نے انہیں ناتوان اور قدر قلیل لوگوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔ اور کیونکر اُن کو طاقت اور دولت اور بادشاہت بخشدی اور کیونکر ہزارہا سال کی تخت نشینیوں کے تاج اور تخت اُن کے سپرد کئے گئے۔ ایک دن وہ تھا کہ وہ جماعت اتنی بھی نہیں تھی کہ جسقدر ایک گھر کے آدمی ہوتے ہیں اور اب وہی لوگ کئی کروڑ دنیا میں نظر آتے ہیں۔ خداوند نے کہا تھا کہ مَیں اپنے کلام کی آپ حفاظت کرونگا۔ اب دیکھو کیا یہ سچ ہے یا نہیں کہ وہی تعلیم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدائے تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ اُس کی کلام کے پہنچائی تھی وہ برابر اس کی کلام میں محفوظ چلی آتی ہے اور لاکھوں قرآن شریف کے حافظ ہیں

کہ جو قدیم سے چلے آتے ہیں۔ خدا نے کہا تھا کہ میری کتاب کا کوئی شخص حکمت میں۔ معرفت میں۔ بلاغت میں فصاحت میں۔ احاطۂ علوم ربّانیہ میں۔ بیانِ دلائل دینیہ میں مقابلہ نہیں کر سکیگا۔ سو دیکھو کسی سے مقابلہ نہیں ہو سکا۔ اور اگر کوئی اس سے منکر ہے تو اب کر کے دکھلا دے۔ اور جو کچھ ہم نے اس کتاب میں جس کے ساتھ دس ہزار روپے کا اشتہار بھی شامل ہے حقائق و دقائق و عجائبات قرآن شریف کے کہ جو انسانی طاقتوں سے باہر ہیں لکھے ہیں کسی دوسری کتاب میں سے پیش کرے۔ اور جب تک پیش نہ کرے تب تک صریح حجت خدا کی اُس پر وارد ہے۔ اور خدا نے کہا تھا کہ میں ارضِ شام کو عیسائیوں کے قبضہ میں سے نکال کر مسلمانوں کو اس زمین کا وارث کرونگا۔ سو دیکھو اب تک مسلمان ہی اس زمین کے وارث ہیں۔ اور یہ سب خبریں ایسی ہیں کہ جن کے ساتھ اقتدار اور قدرتِ الوہیت شامل ہے۔ یہ نہیں کہ نجومیوں کی طرح صرف ایسی ہی خبریں ہوں کہ زلزلے آوینگے۔ قحط پڑیں گے۔ قوم پر قوم چڑھائی کرے گی۔ وباء پھیلیگی۔ مری پڑے گی وغیرہ وغیرہ۔ اور بہ تبعیت خدا کے کلام کے اور اُسی کی تاثیر اور برکت سے وہ لوگ کہ جو قرآن شریف کا اتباع اختیار کرتے ہیں اور خدا کے رسول مقبول پر صدق دلی سے ایمان لاتے ہیں اور اُس سے محبت رکھتے ہیں اور اس کو تمام مخلوقات اور تمام نبیوں اور تمام رسولوں اور تمام مقدسوں اور تمام اُن چیزوں سے جو ظہور پذیر ہوئیں یا آئندہ ہوں بہتر اور پاک تر اور کامل تر اور افضل اور اعلےٰ سمجھتے ہیں وہ بھی اُن نعمتوں سے اب تک حصہ پاتے ہیں اور جو شربت موسیٰ اور مسیح کو پلایا گیا۔ وہی شربت نہایت کثرت سے نہایت لطافت سے نہایت لذّت سے پیتے ہیں اور پی رہے ہیں۔ اسرائیلی نور اُن میں روشن ہیں۔ بنی یعقوب کے پیغمبروں کی اُن میں برکتیں ہیں سبحان اللہ! ثم سبحان اللہ! حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کس شان کے نبی ہیں۔ اللہ اللہ! کیا عظیم الشان نور ہے جس کے ناچیز خادم جس کی ادنیٰ سے ادنیٰ امت جس کے احقر سے احقر چاکر مراتب مذکورہ بالا تک پہنچ جاتے ہیں۔ اللّٰھم صلّ علیٰ نبیّک وحبیبک سید الانبیاء و افضل الرسل وخیر المرسلین وخاتم النبیین محمّد و اٰلہٖ واصحابہ وبارک سلم۔

اِس زمانہ کے پادری اور پنڈت اور برہمو اور آریہ اور دوسرے مخالف چونک نہ اٹھیں کہ وہ برکتیں کہاں ہیں۔ وہ آسمانی نور کدھر ہیں جن میں اُمت مرحومہ حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے مسیح اور موسیٰ کی برکتوں میں شریک ہے اور اُن نوروں کی وارث ہے جن سے اور تمام قومیں اور تمام اہل مذاہب محروم اور بے نصیب ہیں۔ اِس وسوسہ کے دُور کرنے کے لئے بارہا ہم نے اِسی حاشیے میں لکھ دیا ہے کہ طالب حق کے لئے کہ جو اسلام کے فضائل خاصّہ دیکھ کر فی الفور مسلمان ہونے پر

مستعد ہے اس ثبوت دینے کے ہم آپ ہی ذمہ وار ہیں۔ اور حاشیہ در حاشیہ صورتِ دوم میں اسی کی طرف ہم نے صریح اشارہ کیا ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ جس جس طرح پر اپنی خداوندی طاقتوں اور فضلوں اور برکتوں کو مسلمانوں پر ظاہر کرتا ہے اُنہیں ربّانی مواعید اور بشارتوں میں سے کہ جو انسانی طاقتوں سے باہر ہیں کسی قدر حاشیہ ممدوحہ میں لکھ دیا ہے۔ پس اگر کوئی پادری یا پنڈت یا برہمو کہ جو اپنی کور باطنی سے منکر ہیں یا کوئی آریہ اور دوسرے فرقوں میں سے سچائی اور راستی سے خدا تعالیٰ کا طالب ہے تو اس پر لازم ہے کہ سچے طالبوں کی طرح اپنے تمام تکبّروں اور غروروں اور نفاقوں اور دنیا پرستیوں اور ضدوں اور خصومتوں سے بکلّی پاک ہو کر اور فقط حق کا خواہاں اور حق کا جویاں بن کر ایک مسکین اور عاجز اور ذلیل آدمی کی طرح سیدھا ہماری طرف چلا آوے اور پھر صبر اور برداشت اور اطاعت اور خلوص کو صادق لوگوں کی طرح اختیار کرے تا انشاء اللہ اپنے مطلب کو پاوے۔ اور اگر اب بھی کوئی مونہہ پھیرے تو وہ خود اپنی بے ایمانی پر آپ گواہ ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۲۵۶ - ۲۶۵ حاشیہ ۱۱)

قرآن شریف نے بہت زور شور سے اس دعویٰ کو پیش کیا ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے اور حضرت سیدنا و مولانا محمّد صلے اللہ علیہ وسلم اس کے سچے نبی اور رسول ہیں جن پر وہ پاک کلام اُترا ہے۔ چنانچہ یہ دعویٰ آیات مندرجہ ذیل میں بخوبی مصرّح و مندرج ہے:۔

(آل عمران ۲و۳و۴) الٓمّٓ ۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۔ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ۔ یعنی وہی اللہ ہے اُس کا کوئی ثانی نہیں۔ اُسی سے ہر ایک کی زندگی اور بقا ہے اُسی نے حق اور ضرورتِ حقّہ کے ساتھ تیرے پر کتاب اتاری۔ اور پھر فرمایا۔ يَآاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ ۔ (الجزء ۵ سورۃ النساء) یعنی اے لوگو! حق اور ضرورتِ حقّہ کے ساتھ تمہارے پاس یہ نبی آیا ہے۔ اور پھر فرمایا۔ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (الجزء ۱۵) یعنی ضرورتِ حقّہ کے ساتھ ہم نے اس کلام کو اتارا ہے اور ضرورتِ حقّہ کے ساتھ اُترا ہے۔ اور پھر فرمایا۔ يَآاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (الجزء ۶ سورۃ النساء) اے لوگو! تمہارے پاس یہ یقینی بُرہان پہنچی ہے اور ایک کھلا نور تمہاری طرف ہم نے اتارا ہے۔ اور پھر فرمایا۔ قُلْ يَآاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الجزء ۹) یعنی لوگوں کو کہدے کہ میں تم سب کی طرف پیغمبر ہو کر آیا ہوں۔ اور فرمایا۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ۔ (الجزو ۲۶) یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے اور اس کتاب پر ایمان لائے جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور وہی حق ہے خدا اُن کے گناہ دُور کرے گا اور اُن کے حال چال کو درست کر دیگا۔

ایسا ہی صدہا آیات اَور ہیں جن میں نہایت صفائی سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم خدا کا کلام اور حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے سچے نبی ہیں لیکن ہم بالفعل اسی قدر لکھنا مناسب و کافی دیکھتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اپنے مخالفوں کو یاد دلاتے ہیں کہ جس شدّ و مدّ سے قرآن شریف میں یہ دعویٰ موجود ہے کسی اَور کتاب میں ہرگز موجود نہیں۔ ہم نہایت مشتاق ہیں اگر آریہ اپنے ویدوں میں اتنا بھی ثابت کر دیں کہ اُن کے ہر چہار ویدوں نے الٰہی کلام ہونے کا دعویٰ کیا اَور بتصریح بتلایا کہ فلاں فلاں شخص پر فلاں زمانہ میں وہ اُترے ہیں۔ کتاب اللہ کے ثبوت کے لئے پہلا ضروری امر یہی ہے کہ وہ کتاب اپنے من جانب اللہ ہونے کی مدعی بھی ہو۔ کیونکہ جو کتاب اپنے من جانب اللہ ہونے کی طرف آپ کوئی اشارہ نہیں کرتی اس کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ایک مداخلت بے جا ہے۔

اب دوسرا امر قابل تذکرہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں صرف دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ اس دعویٰ کو نہایت مضبوط اور قوی دلیلوں کے ساتھ ثابت بھی کر دیا ہے اور ہم انشاء اللہ سلسلہ وار ان تمام دلائل کو لکھیں گے اور اُن میں سے پہلی دلیل ہم اسی مضمون میں تحریر کرتے ہیں تا حق کے طالب اوّل اِسی دلیل میں دوسری کتابوں کا قرآن کے ساتھ مقابلہ کریں اور نیز ہم ہر یک مخالف کو بھی بُلاتے ہیں کہ اگر یہ طریق ثبوت جس کا ایک کتاب میں پایا جانا اس کی سچائی پر بدیہی دلیل ہے اُن کی کتابوں اور نبیوں کی نسبت بھی پایا جاتا ہے تو وہ ضرور اپنے اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ سے پیش کریں۔ ورنہ ان کو اقرار کرنا پڑے گا کہ اُن کی کتابیں اس اعلیٰ درجہ کے ثبوت سے عاری اور بے نصیب ہیں۔ اور ہم نہایت یقین اور وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ طریق ثبوت ان کے مذہب میں ہرگز پایا نہیں جاتا۔ پس اگر ہم غلطی پر ہیں تو ہماری غلطی ثابت کریں۔ اور وہ پہلی دلیل جو قرآن شریف نے اپنے منجانب اللہ ہونے پر پیش کی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ عقل سلیم ایک سچی کتاب اور ایک سچے اور منجانب اللہ رسول کے ماننے کے لئے اِس بات کو نہایت بزرگ دلیل ٹھیراتی ہے کہ

اُن کا ظہور ایک ایسے وقت میں ہو جبکہ زمانہ تاریکی میں پڑا ہو اور لوگوں نے توحید کی جگہ شرک اور پاکیزگی کی جگہ فسق اور انصاف کی جگہ ظلم اور علم کی جگہ جہل اختیار کر لیا ہو اور ایک مصلح کی اشد ضرورت ہو۔ اور پھر ایسے وقت میں وہ رسول دنیا سے رخصت ہو جبکہ وہ اصلاح کا کام عمدہ طور سے کر چکا ہو۔ اور جب تک اس نے اصلاح نہ کی ہو دشمنوں سے محفوظ رکھا گیا ہو۔ اور نوکروں کی طرح حکم سے آیا ہو اور حکم سے واپس گیا ہو۔ غرضیکہ وہ ایسے وقت میں ظاہر ہو جبکہ وہ وقت بزبانِ حال پکار پکار کر کہہ رہا ہو کہ ایک آسمانی مصلح اور کتاب کا آنا ضروری ہے۔ اور پھر ایسے وقت میں الہامی پیشگوئی کے ذریعہ سے واپس بلایا جائے کہ جب اصلاح کے پودہ کو مستحکم کر چکا ہو۔ اور ایک عظیم الشان انقلاب ظہور میں آچکا ہو۔ اب ہم اس بات کو بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ یہ دلیل جس طرح قرآن اور ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہایت روشن چہرہ کے ساتھ جلوہ نما ہوئی ہے کسی اَور نبی اور کتاب کے حق میں ہرگز ظاہر نہیں ہوئی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ تھا کہ میں تمام قوموں کے لئے آیا ہوں۔ سو قرآن شریف نے تمام قوموں کو ملزم کیا ہے کہ وہ طرح طرح کے شرک اور فسق و فجور میں مبتلا ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی دریا بھی بگڑ گئے اور جنگل بھی بگڑ گئے اور پھر فرماتا ہے لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ یعنی ہم نے تجھے بھیجا تا کہ دنیا کی تمام قوموں کو ڈرا دے یعنی ان کو متنبہ کرے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور میں اپنی بدکاریوں اور عقیدوں کی وجہ سے سخت گنہگار ٹھیری ہیں۔

یاد رہے کہ جو اس آیت میں نذیر کا لفظ دنیا کے تمام فرقوں کے مقابل پر استعمال کیا گیا ہے جس کے معنے گنہگاروں اور بدکاروں کو ڈرانا ہے۔ اسی لفظ سے یقینی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن کا یہ دعویٰ تھا کہ تمام دنیا بگڑ گئی اور ہر ایک نے سچائی اور نیک بختی کا طریق چھوڑ دیا کیونکہ انذار کا محل فاسق اور مشرک اور بدکار ہی ہیں اور انذار اور ڈرانا مجرموں کی ہی تنبیہ کے لئے ہوتا ہے نہ نیک بختوں کے لئے۔ اس بات کو ہر ایک جانتا ہے کہ ہمیشہ سرکشوں اور بے ایمانوں کو ہی ڈرایا جاتا ہے اور سنّت اللہ اسی طرح پر ہے کہ نبی نیکوں کے لئے بشیر ہوتے ہیں۔ اور بدوں کے لئے نذیر۔ پھر جبکہ ایک نبی تمام دنیا کے لئے نذیر ہوا تو ماننا پڑا کہ تمام دنیا کو نبی کی وحی نے بداعمالیوں میں مبتلا قرار دیا ہے اور یہ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ نہ توریت نے موسیٰ کی نسبت کیا اور نہ انجیل نے عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی نسبت بلکہ صرف قرآن شریف

نے کیا۔ اور پھر فرمایا کہ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ یعنی تم اس نبی کے آنے سے پہلے دوزخ کے کنارہ پر پہنچ چکے تھے۔ اور عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی متنبہ کیا کہ تم نے اپنے دجل سے خدا کی کتابوں کو بدل دیا اور تم ہریک شرارت اور بدکاری میں تمام قوموں کے پیشرو ہو اور بُت پرستوں کو جابجا ملزم کیا کہ تم پتھروں اور انسانوں اور ستاروں اور عناصر کی پرستش کرتے ہو اور خالق حقیقی کو بھول گئے ہو۔ اور تم یتیموں کا مال کھاتے اور بچوں کو قتل کرتے اور شرکاء پر ظلم کرتے ہو۔ اور ہر ایک بات میں حدّ اعتدال سے گذر گئے ہو۔ اور فرمایا۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ یعنی یہ بات تمہیں معلوم رہے کہ زمین سب کی سب مرگئی تھی اب اُس کو خدا نئے سرے سے زندہ کرتا ہے۔ غرض تمام دنیا کو قرآن نے شرک اور فسق اور بُت پرستی کے الزام سے ملزم کیا جو ام الخبائث ہیں اور عیسائیوں اور یہودیوں کو دنیا کی تمام بدکاریوں کی جڑ ٹھیرایا اور ہریک قسم کی بدکاریاں اُن کی بیان کر دیں۔ اور ایک ایسا نقشہ کھینچ کر زمانہ موجودہ کا اعمال نامہ دکھلا دیا کہ جب سے دنیا کی بناء پڑی ہے بجز نوحؑ کے زمانہ کے اور اور کوئی زمانہ اُس زمانہ سے مشابہ نظر نہیں آتا۔ اور ہم نے اِسجگہ جس قدر آیات لکھ دی ہیں وہ اتمام حجت کے لئے اوّل درجہ پر کام دیتی ہیں۔ لہٰذا ہم نے طول کے خوف سے تمام آیات کو نہیں لکھا۔ ناظرین کو چاہیئے کہ قرآن شریف کو غور سے پڑھیں تا اُنہیں معلوم ہو کہ کس شدّ ومدّ اور کس قدر مؤثر کلام سے جابجا قرآن شریف بیان کر رہا ہے کہ تمام دنیا بگڑ گئی تمام دنیا مرگئی اور لوگ دوزخ کے گڑھے کے قریب پہنچ گئے۔ اور کیسے بار بار کہتا ہے کہ تمام دنیا کو ڈرا کہ وہ خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ یقیناً قرآن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شرک اور فسق اور بُت پرستی اور طرح طرح کے گناہوں میں سڑ گئی اور بدکاریوں کے عمیق کنوئیں میں ڈوب گئی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ انجیل میں بھی کسی قدر یہودیوں کی بدچلنیوں کا ذکر ہے لیکن مسیح نے کہیں یہ ذکر تو نہیں کیا کہ جس قدر دنیا کے صفحہ میں لوگ موجود ہیں جن کو عالمین کے نام سے نامزد کر سکتے ہیں کہ وہ بگڑ گئے مرگئے اور دنیا شرک اور بدکاریوں سے بھر گئی۔ اور نہ رسالت کا عام دعویٰ کیا۔ پس ظاہر ہے کہ یہودی ایک تھوڑی سی قوم تھی جو مسیح کے مخاطب تھی بلکہ وہی تھی جو مسیح کے نظر کے سامنے اور چند دیہات کے باشندے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے تو تمام زمین کے مرجانے کا ذکر کیا ہے۔ اور تمام قوموں کی بُری حالت کو وہ بتلاتا ہے کہ زمین ہر قسم کے گناہ سے مرگئی۔ یہودی تو نبیوں کی اولاد اور تورات کو اپنے اقرار سے مانتے تھے گو عمل سے

قاصر تھے لیکن قرآن کے زمانہ میں علاوہ فسق و فجور کے عقائد میں بھی فتور ہو گیا تھا۔ ہزارہا لوگ دہریہ تھے۔ ہزارہا وحی اور الہام سے منکر تھے اور ہر قسم کی بدکاریاں زمین پر پھیل گئی تھیں۔ اور دنیا میں اعتقادی اور عملی خرابیوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ ماسوا اس کے مسیح نے اپنی چھوٹی سی قوم یہودیوں کی بدچلنی کا کچھ ذکر تو کیا جس سے البتہ یہ خیال پیدا ہوا کہ اس وقت یہود کی ایک خاص قوم کو ایک مصلح کی ضرورت تھی۔ مگر جس دلیل کو ہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے منجانب اللہ ہونے کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا فساد عام کے وقت میں آنا اور کامل اصلاح کے بعد واپس بلائے جانا اور ان دونوں پہلوؤں کا قرآن شریف کا آپ کو پیش کرنا اور آپ کا دنیا کو اس کی طرف توجہ دلانا یہ ایک ایسا امر ہے کہ انجیل تو کیا بجز قرآن شریف کسی پہلی کتاب میں بھی نہیں پایا جاتا۔ قرآن شریف نے آپ یہ دلائل پیش کئے ہیں اور آپ فرما دیا ہے کہ اس کی سچائی ان دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوتی ہے یعنی ایک تو وہی جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایسے زمانہ میں ظہور فرمایا جبکہ زمانہ میں عام طور پر طرح طرح کی بدکاریاں اور بد اعتقادیاں پھیل گئی تھیں اور دنیا حق اور حقیقت اور توحید اور پاکیزگی سے بہت دور جا پڑی تھی اور قرآن شریف کے اس قول کی اس وقت تصدیق ہوتی ہے جبکہ ہریک قوم کی تاریخ اس زمانہ کے مطابق پڑھی جائے۔ کیونکہ ہریک قوم کے اقرار سے یہ شہادت پیدا ہوتی ہے کہ درحقیقت وہ ایسا پُرظلمت زمانہ تھا کہ ہریک قوم مخلوق پرستی کی طرف جھک گئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب قرآن نے تمام قوموں کو گمراہ اور بدکار قرار دیا تو کوئی اپنا بری ہونا ثابت نہ کر سکا۔ دیکھو اللہ تعالےٰ کیسے زور سے اہل کتاب کی بدیوں اور تمام دنیا کے مرجانے کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ۔ اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (سورۃ الحدید جزو ۲۷ رکوع ۱۸) یعنی مومنوں کو چاہیئے کہ اہل کتاب کی چال و چلن سے پرہیز کریں۔ ان کو اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔ پس ان پر ایک زمانہ گذر گیا سو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور اکثر ان میں سے فاسق اور بدکار ہی ہیں۔ یہ بات بھی جانو کہ زمین مر گئی تھی اور اب خدا نئے سرے سے زمین کو زندہ کر رہا ہے۔ یہ قرآن کی ضرورت اور سچائی کے نشان ہیں جو اس لئے بیان کئے گئے تاکہ تم نشانوں کو دریافت کر لو۔

اب سوچ کر دیکھو کہ یہ دلیل جو تمہارے سامنے پیش کی گئی ہے یہ ہم نے اپنے ذہن سے ایجاد نہیں کی بلکہ قرآن آپ ہی اس کو پیش کرتا ہے۔ اور دلیل کے دونوں حصّے بیان کرکے پھر آپ ہی فرماتا ہے قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ یعنی اس رسول اور اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے پر یہ بھی ایک نشان ہے جس کو ہم نے بیان کر دیا تاکہ تم سوچو اور سمجھو اور حقیقت تک پہنچ جاؤ۔

دوسرا پہلو اس دلیل کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں دُنیا سے اپنے مولیٰ کی طرف بلائے گئے جب کہ وہ اپنے کام کو پورے طور پر انجام دے چکے۔ اور یہ امر قرآن شریف سے بخوبی ثابت ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا یعنی آج مَیں نے قرآن کے اُتارنے اور تکمیلِ نفوس سے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے دینِ اسلام پسند کر لیا۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید جسقدر نازل ہونا تھا نازل ہو چکا اور مستعد دلوں میں نہایت عجیب اور حیرت انگیز تبدیلیاں کر چکا اور تربیت کو کمال تک پہنچا دیا۔ اور اپنی نعمت کو اُن پر پورا کر دیا۔ اور یہی دو رُکن ضروری ہیں جو ایک نبی کے آنے کی علّتِ غائی ہوتے ہیں۔ اب دیکھو یہ آیت کس زور و شور سے بتلا رہی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہرگز اس دنیا سے کوچ نہ کیا جب تک کہ دینِ اسلام کو تنزیلِ قرآن اور تکمیلِ نفوس کامل نہ کیا گیا۔ اور یہی ایک خاص علامت منجانب اللہ ہونے کی ہے جو کاذب کو ہرگز نہیں دی جاتی۔ بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی صادق نبی نے بھی اس اعلیٰ شان کے کمال کا نمونہ نہیں دکھلایا کہ ایک طرف کتاب اللہ بھی آرام اور امن کے ساتھ پوری ہو جائے اور دوسری طرف تکمیلِ نفوس بھی ہو۔ اور باایں ہمہ کفر کو ہر ایک پہلو سے شکست اور اسلام کو ہر ایک پہلو سے فتح ہو۔

اور پھر دوسری جگہ فرمایا کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ۔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔ یعنی جبکہ آنے والی مدد اور فتح آگئی جس کا وعدہ دیا گیا تھا اور تُو نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج دینِ اسلام میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ پس خدا کی حمد اور تسبیح کر۔ یعنی یہ کہہ کہ یہ جو ہوا مجھ سے نہیں بلکہ اس کے فضل اور کرم اور تائید سے ہے اور الوداعی استغفار کر کیونکہ وہ رحمت کے ساتھ

بہت ہی رجوع کرنے والا ہے۔ استغفار کی تعلیم جو نبیوں کو دی جاتی ہے اس کو عام لوگوں کے گناہ میں داخل کرنا عین حماقت ہے۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ لفظ اپنی نیستی اور تذلّل اور کمزوری کا اقرار اور مدد طلب کرنے کا متواضعانہ طریق ہے۔ چونکہ اس سورۃ میں فرمایا گیا ہے کہ جس کام کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے وہ پورا ہو گیا۔ یعنی یہ کہ ہزارہا لوگوں نے دین اسلام قبول کر لیا اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی طرف بھی اشارہ ہے چنانچہ اس کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک برس کے اندر فوت ہو گئے۔ پس ضرور تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس آیت کے نزول سے جیسا کہ خوش ہوئے تھے غمگین بھی ہوں۔ کیونکہ باغ تو لگایا گیا مگر ہمیشہ کی آب پاشی کا کیا انتظام ہوا؟ سو خدا تعالیٰ نے اسی غم کو دُور کرنے کے لیے استغفار کا حکم دیا۔ کیونکہ لُغت میں مغفرت ایسے ڈھانکنے کو کہتے ہیں جس سے انسان آفات سے محفوظ رہے اسی وجہ سے مغفر جو خود کے معنے رکھتا ہے اِسی میں سے نکالا گیا ہے۔ اور مغفرت مانگنے سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ جس بلا کا خوف ہے یا جس گناہ کا اندیشہ ہے خدا تعالیٰ اُس بلا یا اُس گناہ کو ظاہر ہونے سے روک دے اور ڈھانکے رکھے۔ سو اس استغفار کے ضمن میں یہ وعدہ دیا گیا کہ اِس دین کے لئے غم مت کھا۔ خدا تعالیٰ اس کو ضائع نہیں کرے گا اور ہمیشہ رحمت کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرتا رہیگا اور ان بلاؤں کو روک دیگا جو کسی ضعف کے وقت عائد حال ہو سکتی ہیں۔

(نورالقرآن ۱ صفحہ ۶-۷)

پھر ہم اپنے پہلے مقصد کی طرف عود کر کے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کریم کی حقانیت پر اس دلیل سے نہایت اعلیٰ و اجلیٰ ثبوت پیدا ہوتا ہے کہ آنجناب علیہ الصلوٰۃ والسّلام ایسے وقت میں دنیا میں بھیجے گئے کہ جب دنیا زبانِ حال سے ایک عظیم الشان مصلح کو مانگ رہی تھی۔ اور پھر نہ مرے اور نہ مارے گئے جب تک کہ راستی کو زمین پر قائم نہ کر دیا۔ جب نبوت کے ساتھ ظہور فرما ہوئے تو آتے ہی اپنی ضرورت دنیا پر ثابت کر دی۔ اور ہریک قوم کو اُن کے شرک اور ناراستی اور مفسدانہ حرکات پر ملزم کیا۔ جیسا کہ قرآن کریم اس سے بھرا ہُوا ہے۔ مثلاً اسی آیت کو سوچ کر دیکھو جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ یعنی وہ بہت ہی برکت والا ہے جس نے قرآن کو اپنے بندہ پر اس غرض سے اتارا جو تمام جہانوں کو ڈرانے والا ہو۔ یعنی

تا اُن کی بدراہی اور بدعقیدگی پر اُن کو متنبہ کرے۔ پس یہ آیت بصراحت اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن کا بھی دعویٰ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں تشریف لائے تھے جبکہ تمام دنیا اور تمام قومیں بگڑ چکی تھیں اور مخالف قوموں نے اِس دعویٰ کو نہ صرف اپنی خاموشی سے بلکہ اپنے اقراروں سے مان لیا ہے۔ پس اِس سے بداہت نتیجہ نکلا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم درحقیقت ایسے وقت میں آئے تھے جس وقت میں ایک سچے اور کامل نبی کو آنا چاہیئے۔ پھر جب ہم دوسرا پہلو دیکھتے ہیں کہ آنجناب صلعم کس وقت واپس بلائے گئے تو قرآن صاف اور صریح طور پر ہمیں خبر دیتا ہے کہ ایسے وقت میں بلانے کا حکم ہوا کہ جب اپنا کام پورا کر چکے تھے یعنی اس وقت کے بعد بلائے گئے جبکہ یہ آیت نازل ہو چکی کہ مسلمانوں کے لئے تعلیم کا مجموعہ کامل ہو گیا اور جو کچھ ضروریات دین میں نازل ہونا تھا وہ سب نازل ہو چکا۔ اور نہ صرف یہی بلکہ یہ بھی خبر دی گئی کہ خدا تعالیٰ کی تائیدیں بھی کمال کو پہنچ گئیں اور جوق درجوق لوگ دین اسلام میں داخل ہو گئے اور یہ آیتیں بھی نازل ہو گئیں کہ خدا تعالیٰ نے ایمان اور تقویٰ کو ان کے دلوں میں لکھ دیا اور فسق و فجور سے انہیں بیزار کر دیا اور پاک اور نیک اخلاق سے وہ متصف ہو گئے اور ایک بھاری تبدیلی اُن کے اخلاق اور چلن اور روح میں واقع ہو گئی تب ان تمام باتوں کے بعد سورۃ النصر نازل ہوئی جس کا ماحصل یہی ہے کہ نبوت کے تمام اغراض پورے ہو گئے اور اسلام دلوں پر فتحیاب ہو گیا۔ تب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عام طور پر اعلان دیدیا کہ یہ سورۃ میری وفات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بلکہ اس کے بعد حج کیا اور اس کا نام حجّۃ الوداع رکھا اور ہزارہا لوگوں کی حاضری میں ایک اونٹنی پر سوار ہو کر ایک لمبی تقریر کی اور کہا کہ سنو! اے خدا کے بندو! مجھے میرے رب کی طرف سے یہ حکم ملے تھے کہ تا میں یہ سب احکام تمہیں پہنچا دوں۔ پس کیا تم گواہی دے سکتے ہو کہ یہ سب باتیں مَیں نے تمہیں پہنچا دیں۔ تب ساری قوم نے بآواز بلند تصدیق کی کہ ہم تک یہ سب پیغام پہنچائے گئے۔ تب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اے خدا اِن باتوں کا گواہ رہ اور پھر فرمایا کہ یہ تمام تبلیغ اس لئے مکرر کی گئی کہ شاید آئندہ سال میں تمہارے ساتھ نہیں ہونگا۔ اور پھر دوسری مرتبہ تم مجھے اس جگہ نہیں پاؤ گے۔ تب مدینہ میں جا کر دوسرے سال میں فوت ہو گئے۔ اللّٰھم صل علیہ وبارک وسلم۔ درحقیقت یہ تمام اشارات قرآن سے ہی مستنبط ہوتے ہیں جس کی تصدیق اسلام کی متفقہ علیہ تاریخ

سے بہ تفصیل تمام ہوتی ہے۔

اب کیا دنیا میں کوئی عیسائی یا یہودی یا آریہ اپنے کسی ایسے مصلح کو بطور نظیر پیش کر سکتا ہے جس کا آنا ایک عام اور اشدّ ضرورت پر مبنی ہو اور جانا اس غرض کی تکمیل کے بعد ہو اور ان مخالفوں کو اپنی ناپاک حالت اور بدعملیوں کا خود اقرار ہو جن کی طرف وہ رسول بھیجا گیا ہو میں جانتا ہوں کہ یہ ثبوت بجز اسلام کے کسی کے پاس موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ صرف فرعون کی سرکوبی کے لئے اور اپنی قوم کو چھڑانے کے لئے اور نیز راہ راست دکھانے کے لئے آئے تھے۔ سارے جہان کے فساد یا عدم فساد کی اُن کو کچھ غرض نہ تھی۔ اور یہ تو سچ ہے کہ فرعون کے ہاتھوں سے انہوں نے اپنی قوم کو چھڑا دیا مگر شیطان کے ہاتھ سے چھڑا نہ سکے اور وعدہ کے ملک تک ان کو پہنچا نہ سکے۔ اور اُن کے ہاتھ سے بنی اسرائیل کو تزکیہ نفس نصیب نہیں ہوا اور بار بار نافرمانیاں کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ فوت ہو گئے۔ اور ان کا وہی حال تھا۔ اور حضرت مسیح کے حواریوں کی حالت خود انجیل سے ظاہر ہے۔ حاجت تصریح نہیں۔ اور یہ بات کہ یہودی جن کے لئے حضرت مسیح نبی ہو کر آئے تھے کس قدر ان کی زندگی میں ہدائت پذیر ہو گئے تھے یہ بھی ایک ایسا امر ہے کہ کسی پر پوشیدہ نہیں۔ بلکہ اگر حضرت مسیح کی نبوت کو اس معیار سے جانچا جائے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی نبوت اس معیار کی رُو سے کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتی۔

(نور القرآن ع۱ ص ۲۹ تا ۴۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس زمانہ میں مبعوث ہوئے تھے کہ جب تمام دنیا میں شرک اور گمراہی اور مخلوق پرستی پھیل چکی تھی اور تمام لوگوں نے اصول حقّہ کو چھوڑ دیا تھا اور صراط مستقیم کو بھول بھلا کر ہر یک فرقہ نے الگ الگ بدعتوں کا راستہ لے لیا تھا۔ عرب میں بُت پرستی کا نہایت زور تھا۔ فارس میں آتش پرستی کا بازار گرم تھا۔ ہند میں علاوہ بُت پرستی کے اَور صدہا طرح کی مخلوق پرستی پھیل گئی تھی۔ اور اُنہی دنوں میں کئی پوران اور پُستک کہ جن کے رُو سے بیسیوں خدا کے بندے خدا بنائے گئے اور اوتار پرستی کی بنیاد ڈالی گئی تصنیف ہو چکے تھے۔ اور بقول پادری بورٹ صاحب اور کئی فاضل انگریزوں کے اُن دنوں عیسائی مذہب سے زیادہ اَور کوئی مذہب خراب نہ تھا اور پادری لوگوں کی بدچلنی اور بداعتقادی سے مذہب عیسوی پر ایک سخت دھبہ لگ چکا تھا۔ اور مسیحی عقائد میں نہ ایک نہ دو بلکہ کئی چیزوں نے خدا کا منصب لے لیا تھا۔ پس

آنحضرتؐ کا ایسی عام گمراہی کے وقت میں مبعوث ہونا کہ جب خود حالت موجودہ زمانہ کی ایک بزرگ معالج اور مصلح کو چاہتی تھی اور ہدایت ربّانی کی کمال ضرورت تھی اور پھر ظہور فرما کر ایک عالم کو توحید اور اعمال صالحہ سے منوّر کرنا اور شرک اور مخلوق پرستی کا جو امّ الشرور ہے قلع قمع فرمانا اس بات پر صاف دلیل ہے کہ آنحضرتؐ خدا کے سچّے رسول اور سب رسولوں سے افضل تھے۔ سچّا ہونا ان کا تو اس بات سے ثابت ہے کہ اس عام ضلالت کے زمانہ میں قانون قدرت ایک سچے ہادی کا متقاضی تھا اور سنّتِ الٰہیہ ایک رہبرِ صادق کی مقتضی تھی۔ کیونکہ قانونِ قدیم حضرتِ ربّ العالمین کا یہی ہے کہ جب دنیا میں کسی نوع کی شدّت اور صعوبت اپنے انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو رحمتِ الٰہی اُس کے دُور کرنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ جیسے جب امساکِ باراں سے غایت درجہ کا قحط پڑ کر خلقت کا کام تمام ہونے لگتا ہے تو آخر خداوند کریم بارش کر دیتا ہے۔ اور جب وباء سے لاکھوں آدمی مرنے لگتے ہیں تو کوئی صورت اصلاح ہوا کی نکل آتی ہے یا کوئی دوا ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب کسی ظالم کے پنجہ میں کوئی قوم گرفتار ہوتی ہے تو آخر کوئی عادل اور فریادرس پیدا ہو جاتا ہے۔ پس ایسا ہی جب لوگ خدا کا راستہ بھول جاتے ہیں اور توحید اور حق پرستی کو چھوڑ دیتے ہیں تو خداوند تعالیٰ اپنی طرف سے کسی بندہ کو بصیرت کامل عطا فرما کر اور اپنے کلام اور الہام سے مشرف کر کے بنی آدم کی ہدایت کے لئے بھیجتا ہے کہ تا جس قدر بگاڑ ہو گیا ہے اُس کی اصلاح کرے۔ اس میں اصل حقیقت یہ ہے کہ پروردگار جو قیوم عالم کا ہے اور بقا اور وجود عالم کا اُس کے سہارے اور آسرے سے ہے کسی اپنی فیضان رسانی کی صفت کو خلقت سے دریغ نہیں کرتا اور نہ بے کار اور معطل چھوڑتا ہے بلکہ ہریک صفت اس کی اپنے موقعہ پر فی الفور ظاہر پذیر ہو جاتی ہے۔ پس جبکہ از روئے تجویز عقلی کے اس بات پر قطع واجب ہوا کہ ہریک آفت کا غلبہ توڑنے کے لئے خدا تعالیٰ کی وہ صفت جو اُس کے مقابل پڑی ہے ظہور کرتی ہے اور یہ بات تواریخ سے اور خود مخالفین کے اقرار سے اور خاص فرقان مجید کے بیانِ واضح سے ثابت ہو چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت میں یہ آفت غالب ہو رہی تھی کہ دنیا کی تمام قوموں نے سیدھا راستہ توحید اور اخلاص اور حق پرستی کا چھوڑ دیا تھا۔ اور نیز یہ بات بھی ہر ایک کو معلوم ہے کہ اس فساد موجودہ کے اصلاح کرنے والے اور ایک عالم کو ظلماتِ شرک اور مخلوق پرستی سے نکال کر توحید پر قائم کرنے والے صرف آنحضرتؐ ہی ہیں کوئی دوسرا نہیں تو ان سب مقدمات سے نتیجہ یہ نکلا کہ آنحضرتؐ خدا کی طرف سے سچے ہادی ہیں۔ چنانچہ اس دلیل کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں آپ

ارشاد فرمایا ہے اور وہ یہ ہے: ۔ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ۔ (سورۃ النحل الجزو ۱۴) ....

اب غور سے دیکھنا چاہیئے کہ وہ تینوں مقدمات متذکرہ بالا کہ جن سے ابھی ہم نے آنحضرتؐ کے سچے ہادی ہونے کا نتیجہ نکالا تھا کس خوبی اور لطافت سے آیات ممدوحہ بالا میں درج ہیں۔ اوّل گمراہوں کے دلوں کو جو صدہا سال کی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے زمین خشک اور مُردہ سے تشبیہ دیکر اور کلام الٰہی کو مینہہ کا پانی جو آسمان کی طرف سے آتا ہے ٹھیرا کر اس قانونِ قدیم کی طرف اشارہ فرمایا جو امساک باراں کی شدت کے وقت ہمیشہ رحمت الٰہی بنی آدم کو برباد ہونے سے بچا لیتی ہے اور یہ بات جتلا دی کہ یہ قانونِ قدرت صرف جسمانی پانی میں محدود نہیں بلکہ روحانی پانی بھی شدّت اور صعوبت کے وقت میں جو پھیل جانا عام گمراہی کا ہے ضرور نازل ہوتا ہے۔ اور اس جگہ بھی رحمتِ الٰہی آفتِ قلوب کا غلبہ توڑنے کے لئے ضرور ظہور کرتی ہے۔ اور پھر انہیں آیات میں یہ دوسری بات بھی بتلا دی کہ آنحضرتؐ کے ظہور سے پہلے تمام زمین گمراہ ہو چکی تھی۔ اور اسی طرح آخیر پہ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ان روحانی مُردوں کو اس کلام پاک نے زندہ کیا اور آخر یہ بات کہہ کر کہ اس میں اس کتاب کی صداقت کا نشان ہے۔ طالبینِ حق کو اس نتیجہ نکالنے کی طرف توجہ دلائی کہ فرقان مجید خدا کی کتاب ہے۔

اور جیسا کہ اس دلیل سے حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کا نبی صادق ہونا ثابت ہوتا ہے ایسا ہی اس سے آنحضرتؐ کا دوسرے نبیوں سے افضل ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ آنحضرتؐ کو تمام عالم کا مقابلہ کرنا پڑا اور جو کام حضرت ممدوحؑ کے سپرد ہوا وہ حقیقت میں ہزار دو ہزار نبی کا کام تھا۔

(براہین احمدیہ ص ۱۱۲-۱۱۶ حاشیہ ۱۰)

وہ زمانہ کہ جس میں آنحضرتؐ مبعوث ہوئے حقیقت میں ایسا زمانہ تھا کہ جسکی حالت موجودہ ایک بزرگ اور عظیم القدر مصلح ربّانی اور ہادیٔ آسمانی کی اشد محتاج تھی۔ اور جو تعلیم دی گئی وہ بھی واقعہ میں سچّی اور ایسی تھی کہ جس کی نہایت ضرورت تھی اور اُن تمام امور کی جامع تھی کہ

جس سے تمام ضرورتیں زمانہ کی پوری ہوتی تھیں اور پھر اس تعلیم نے اثر بھی ایسا کر دکھایا کہ لاکھوں دلوں کو حق اور راستی کی طرف کھینچ لائی اور لاکھوں سینوں پر لا الٰہ الّا اللہ کا نقش جما دیا اور جو نبوت کی علّتِ غائی ہوتی ہے یعنی تعلیم اصول نجات کے اس کو ایسا کمال تک پہنچایا جو کسی دوسرے نبی کے ہاتھ سے وہ کمال کسی زمانہ میں بہم نہیں پہنچا۔ تو ان واقعات پر نظر ڈالنے سے بلا اختیار یہ شہادت دل سے جوش مار کر نکلے گی کہ آنحضرتؐ ضرور خدا کی طرف سے سچّے ہادی ہیں۔ جو شخص تعصب اور ضدیت سے انکاری ہو اُس کی مرض تو لاعلاج ہے خواہ وہ خدا سے بھی منکر ہو جاتے ورنہ یہ سارے آثارِ صداقت جو آنحضرتؐ میں کامل طور پر جمع ہیں کسی اور نبی میں کوئی ایک تو ثابت کر کے دکھلا دے تا ہم بھی جانیں۔

(براہین احمدیہ صـ۱۱۲-۱۱۴)

ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اظہار سچّائی کے لئے ایک **مجدّد اعظم** تھے جو گم گشتہ سچائی کو دوبارہ دنیا میں لائے۔ اس فخر میں ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی بھی نبی شریک نہیں کہ آپ نے تمام دنیا کو ایک تاریکی میں پایا اور پھر آپ کے ظہور سے وہ تاریکی نور سے بدل گئی جس قوم میں آپ ظاہر ہوئے آپ فوت نہ ہوئے جب تک کہ اس تمام قوم نے شرک کا چولہ اتار کر توحید کا جامہ نہ پہن لیا۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ وہ لوگ اعلیٰ مراتب ایمان کو پہنچ گئے اور وہ کام صدق اور وفا اور یقین کے ان سے ظاہر ہوئے کہ جس کی نظیر دنیا کے کسی حصّہ میں پائی نہیں جاتی۔ یہ کامیابی اور اس قدر کامیابی کسی نبی کو بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نصیب نہیں ہوئی۔ یہی ایک بڑی دلیل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ہے کہ آپ ایک ایسے زمانہ میں مبعوث اور تشریف فرما ہوئے جبکہ زمانہ نہایت درجہ کی ظلمت میں پڑا ہوا تھا اور طبعاً ایک عظیم الشان مصلح کا خواستگار تھا۔ اور پھر آپ نے ایسے وقت میں دُنیا سے انتقال فرمایا جبکہ لاکھوں انسان شرک اور بُت پرستی کو چھوڑ کر توحید اور راہِ راست اختیار کر چکے تھے اور درحقیقت یہ کامل اصلاح آپ ہی سے مخصوص تھی کہ آپ نے ایک قوم وحشی سیرت اور بہائم خصلت کو انسانی عادات سکھائے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ بہائم کو انسان بنایا اور پھر انسانوں سے تعلیم یافتہ انسان بنایا۔ اور پھر تعلیم یافتہ انسانوں سے باخدا انسان بنایا اور روحانیت کی کیفیت ان میں پھُونک دی۔ اور سچے خدا کے ساتھ ان کا تعلق پیدا کر دیا۔ وہ خدا کی راہ میں بکریوں کی طرح ذبح کئے گئے اور چیونٹیوں کی طرح پیروں میں کچلے گئے مگر

ایمان کو ہاتھ سے نہ دیا بلکہ ہر ایک مصیبت میں آگے قدم بڑھایا۔ پس بلاشبہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم روحانیت قائم کرنے کے لحاظ سے آدمِ ثانی تھے بلکہ حقیقی آدم وہی تھے جن کے ذریعہ اور طفیل سے تمام انسانی فضائل کمال کو پہنچے اور تمام نیک قوتیں اپنے اپنے کام میں لگ گئیں۔ اور کوئی شاخ فطرتِ انسانی کی بے بار و بر نہ رہی اور ختم نبوت آپ پر نہ صرف آپ پر زمانہ کے تأخر کی وجہ سے ہوا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ تمام کمالاتِ نبوت آپ پر ختم ہو گئے اور چونکہ صفات الٰہیہ کے مظہر اتم تھے اس لئے آپ کی شریعت صفات جلالیہ و جمالیہ دونوں کی حامل تھی اور آپ کے دو نام محمد اور احمد صلے اللہ علیہ وسلم اسی غرض سے ہیں اور آپ کی نبوتِ عامہ میں کوئی حصہ بخل کا نہیں بلکہ وہ ابتدا سے تمام دنیا کے لئے ہے۔

(لیکچر سیالکوٹ صـ۲۷ طبع اوّل)

اصل حقیقت یہ ہے کہ سب نبیوں سے افضل وہ نبی ہے کہ جو دنیا کا مربّیِ اعظم ہے یعنی وہ شخص جس کے ہاتھ سے فساد اعظم دنیا کا اصلاح پذیر ہوا جس نے توحید گم گشتہ اور ناپدید شدہ کو پھر زمین میں قائم کیا۔ جس نے تمام مذاہب باطلہ کو حجت اور دلیل سے مغلوب کرکے ہر یک گمراہ کے شبہات مٹائے۔ جس نے ہر یک ملحد کے وسواس دور کئے اور سچا سامان نجات کا کہ جس کے لئے کسی بیگناہ کو پھانسی دینا ضروری نہیں اور خدا کو اپنی قدیمی اور اصلی جگہ سے کھسکا کر کسی عورت کے پیٹ میں ڈالنا کچھ حاجت نہیں اصول حقہ کی تعلیم سے از سر نو عطا فرمایا۔ پس اس دلیل سے اس کا فائدہ اور افاضہ سب سے زیادہ ہے اور اس کا درجہ اور رتبہ بھی سب سے زیادہ ہے۔ اب تواریخ بتلاتی ہے۔ کتاب آسمانی شاہد ہے اور جن کی آنکھیں ہیں وہ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ نبی جو بموجب اس قاعدہ کے سب نبیوں سے افضل ٹھیرتا ہے وہ حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

(براہین احمدیہ صـ۹۷ حاشیہ ۶)

خیال کرنا چاہیئے کہ کس استقلال سے آنحضرتؐ اپنے دعویٔ نبوت پر باوجود پیدا ہو جانے ہزاروں خطرات اور کھڑے ہو جانے لاکھوں معاندوں اور مزاحموں اور ڈرانے والوں کے اول سے آخر دم تک ثابت اور قائم رہے۔ برسوں تک وہ مصیبتیں دیکھیں اور وہ دکھ اٹھانے پڑے جو کامیابی سے بکلّی مایوس کرتے تھے اور روز بروز بڑھتے جاتے تھے کہ جن پر صبر کرنے سے کسی دنیوی مقصد کا حاصل ہو جانا وہم میں بھی نہیں گذرتا تھا۔ بلکہ نبوت کا دعویٰ کرنے سے از دست اپنی پہلی جمعیت کو بھی کھو بیٹھے اور ایک بات کہکر لاکھ تفرقہ خرید لیا۔ اور ہزاروں بلاؤں کو اپنے سر پر بلا لیا۔ وطن سے

نکالے گئے۔ قتل کے لئے تعاقب کئے گئے۔ گھر اور اسباب تباہ اور برباد ہو گیا۔ بارہا زہر دی گئی۔ اور جو خیر خواہ تھے وہ بدخواہ بن گئے اور جو دوست تھے وہ دشمنی کرنے لگے اور ایک زمانہ دراز تک وہ تلخیاں اٹھانی پڑیں کہ جن پر ثابت قدمی سے ٹھہرے رہنا کسی فریبی اور مکّار کا کام نہیں۔ اور پھر جب مدت مدید کے بعد غلبہ اسلام کا ہُوا تو ان دولت اور اقبال کے دنوں میں کوئی خزانہ اکٹھا نہ کیا۔ کوئی عمارت نہ بنائی۔ کوئی بارگہ تیار نہ ہوئی۔ کوئی سامانِ شاہانہ عیش و عشرت کا تجویز نہ کیا گیا۔ کوئی اور ذاتی نفع نہ اٹھایا بلکہ جو کچھ آیا وہ سب یتیموں اور مسکینوں اور بیوہ عورتوں اور مقروضوں کی خبر گیری میں خرچ ہوتا رہا۔ اور کبھی ایک وقت بھی سیر ہو کر نہ کھایا۔ اور پھر صاف گوئی اس قدر کہ توحید کا وعظ کر کے سب قوموں اور سارے فرقوں اور تمام جہاں کے لوگوں کو جو شرک میں ڈوبے ہوئے تھے مخالف بنا لیا۔ جو اپنے اور خویش تھے انکو بُت پرستی سے منع کر کے سب سے پہلے دشمن بنایا۔ یہودیوں سے بھی بات بگاڑ لی کیونکہ ان کو طرح طرح کی مخلوق پرستی اور پیر پرستی اور بداعمالیوں سے روکا حضرت مسیحؑ کی تکذیب اور توہین سے منع کیا۔ جس سے ان کا نہایت دل جل گیا۔ اور سخت عداوت پر آمادہ ہو گئے۔ اور ہر دم قتل کر دینے کی گھات میں رہنے لگے۔ اسی طرح عیسائیوں کو بھی خفا کر دیا گیا۔ کیونکہ جیسا کہ اُن کا اعتقاد تھا حضرت عیسیٰؑ کو نہ خدا نہ خدا کا بیٹا قرار دیا اور نہ ان کو پھانسی مل کر دوسروں کو بچانے والا تسلیم کیا۔ آتش پرست اور ستارہ پرست بھی ناراض ہو گئے۔ کیونکہ انکو بھی اُن کے دیوتوں کی پرستش سے ممانعت کی گئی۔ اور مدار نجات کا صرف توحید ٹھہرائی گئی۔ اب جائے انصاف ہے کہ کیا دنیا حاصل کرنے کی یہی تدبیر تھی؟

(براہین احمدیہ ص۱۰۸-۱۰۹)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجہ کے یک رنگ اور صاف باطن اور خدا کے لئے جاں باز اور خلقت کے بیم و امید سے بالکل مُنہ پھیرنے والے اور محض خدا پر توکل کرنے والے تھے کہ جنہوں نے خدا کی خواہش اور مرضی میں محو اور فنا ہو کر اس بات کی کچھ بھی پروا نہ کی کہ توحید کی منادی کرنے سے کیا کیا بلا میرے سر پر آوے گی۔ اور مشرکوں کے ہاتھ سے کیا کچھ دُکھ اور درد اُٹھانا ہو گا۔ بلکہ تمام شدتوں اور سختیوں اور مشکلوں کو اپنے نفس پر گوارا کر کے اپنے مولیٰ کا حکم بجا لائے اور جو جو شرط مجاہدہ اور وعظ اور نصیحت کی ہوتی ہے وہ سب پوری کی اور کسی ڈرانے والے کو کچھ حقیقت نہ سمجھا۔ ہم سچ سچ کہتے ہیں کہ تمام نبیوں کے واقعات میں ایسے مواضعات خطرات اور پھر کوئی ایسا خدا پر توکل کر کے کھلا کھلے شرک اور مخلوق پرستی سے منع کرنے والا اور اس قدر دشمن اور پھر کوئی ایسا ثابت قدم اور

استقلال کرنے والا ایک بھی ثابت نہیں۔

(براہین احمدیہ ص۱۱۱)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ زندگی جو مکّہ میں گذری اس میں جس قدر مصائب اور مشکلات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر آئیں ہم تو ان کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ دل کانپ اُٹھتا ہے جب اُن کا تصوّر کرتے ہیں۔ اِس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عالی حوصلگی فراخ دلی استقلال اور عزم و استقامت کا پتہ ملتا ہے۔ کیسا کوہ وقار انسان ہے کہ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹے پڑتے ہیں مگر اس کو ذرا بھی جنبش نہیں دے سکتے۔ وہ اپنے منصب کے ادا کرنے میں ایک لمحہ سُست اور غمگین نہیں ہُوا۔ وہ مشکلات اس کے ارادے کو تبدیل نہیں کر سکیں۔ بعض لوگ غلط فہمی سے کہہ اُٹھتے ہیں کہ آپ تو خدا کے حبیب مصطفٰے اور مجتبٰے تھے پھر یہ مصیبتیں اور مشکلات کیوں آئیں؟ مَیں کہتا ہوں کہ پانی کے لئے جب تک زمین کو نہ کھودا جاوے اس کا جگر نہ پھاڑا جاوے وہ کب نکل سکتا ہے۔ کتنے ہی گز گہرا زمین کو کھودتے چلے جائیں تب کہیں جا کر خوشگوار پانی نکلتا ہے جو مایۂ حیات ہوتا ہے۔ اِسی طرح وہ لذّت جو خدا تعالےٰ کی راہ میں استقلال اور ثباتِ قدم دکھانے سے نہیں ملتی جب تک ان مشکلات اور مصائب میں سے ہو کر انسان نہ گذرے۔ وہ لوگ جو اس کوچہ سے بے خبر ہیں وہ اِن مصائب کی لذّت سے کب آشنا ہو سکتے ہیں اور کب اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم ہے کہ جب آپ کو کوئی تکلیف پہنچتی تھی اندر سے ایک سرور اور لذّت کا چشمہ پُھوٹ نکلتا تھا۔ خدا تعالیٰ پر توکّل اس کی محبت اور نصرت پر ایمان پیدا ہوتا تھا۔

(ملفوظات جلد دوم ص۳۰۷)

کیا یہ حیرت انگیز ماجرا نہیں کہ ایک بے زر۔ بے زور۔ بے کس۔ اُمّی۔ یتیم۔ تنہا۔ غریب ایسے زمانہ میں کہ جس میں کہ ہر ایک قوم پوری پوری طاقت مالی اور فوجی اور علمی رکھتی تھی ایسی روشن تعلیم لایا کہ اپنی براہینِ قاطعہ اور حُجج واضحہ سے سب کی زبان بند کر دی۔ اور بڑے بڑے لوگوں کی جو حکیم بنے پھرتے تھے اور فیلسوف کہلاتے تھے فاش غلطیاں نکالیں اور پھر باوجود بے کسی اور غریبی کے زور بھی ایسا دکھایا کہ بادشاہوں کو تختوں سے گرا دیا اور انہیں تختوں پر غریبوں کو بٹھایا۔ اگر یہ خدائی تائید نہیں تھی تو اَور کیا تھی؟ کیا تمام دنیا پر عقل اور علم اور طاقت اور زور میں غالب آجانا بغیر تائیدِ الٰہی کے بھی پیدا ہُوا کرتا ہے؟ خیال کرنا چاہیئے کہ جب آنحضرتؐ نے پہلے پہل لوگوں میں منادی کی کہ مَیں نبی ہوں اُس وقت ان کے ہمراہ کون تھا اور کِس بادشاہ

کا خزانہ ان کے قبضے میں آگیا تھا کہ جس پر اعتماد کر کے ساری دنیا سے مقابلہ کرنے کی ٹھہر گئی؟ یا فوج اکٹھی کر لی تھی کہ جس پر بھروسہ کر کے تمام بادشاہوں کے حملوں سے امن ہو گیا تھا؟ ہمارے مخالف بھی جانتے ہیں کہ اُس وقت آنحضرتؐ زمین پر اکیلے اور بے کس اور بے سامان تھے۔ صرف اُن کے ساتھ خدا تھا جس نے ان کو ایک بڑے مطلب کے لئے پیدا کیا تھا۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۱۱۹-۱۲۰)

پانچ موقعے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے نہایت نازک پیش آئے تھے جن میں جان کا بچنا محالات سے معلوم ہوتا تھا۔ اگر آنجنابؐ درحقیقت خدا کے سچے رسول نہ ہوتے تو ضرور ہلاک کئے جاتے۔ ایک تو وہ موقعہ تھا جب کفار قریش نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کیا اور قسمیں کھالی تھیں کہ آج ہم ضرور قتل کرینگے۔ (۲) دوسرا موقعہ وہ تھا جبکہ کافر لوگ اُس غار پر معہ ایک گروہِ کثیر کے پہنچ گئے تھے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مع حضرت ابوبکرؓ کے چھپے ہوئے تھے۔ (۳) تیسرا وہ نازک موقعہ تھا جبکہ اُحد کی لڑائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے تھے اور کافروں نے آپ کے گرد محاصرہ کر لیا تھا۔ اور آپ پر بہت سی تلواریں چلائیں مگر کوئی کارگر نہ ہوئی۔ یہ ایک معجزہ تھا۔ (۴) چوتھا وہ موقعہ تھا جبکہ ایک یہودیہ نے آنجنابؐ کو گوشت میں زہر دے دی تھی اور وہ زہر بہت تیز اور مہلک تھی اور بہت وزن اُس کا دیا گیا تھا (۵) پانچواں وہ نہایت خطرناک موقع تھا جبکہ خسرو پرویز شاہ فارس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے مصمّم ارادہ کیا تھا اور گرفتار کرنے کے لئے اپنے سپاہی روانہ کئے تھے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان تمام پرخطر موقعوں سے نجات پانا اور ان تمام دشمنوں پر آخر کار غالب ہو جانا ایک بڑی زبردست دلیل اس بات پر ہے کہ درحقیقت آپؐ صادق تھے اور خدا آپؐ کے ساتھ تھا۔

(چشمۂ معرفت صفحہ ۲۵۲ حاشیہ)

انبیاء اور اولیاء کا وجود اس لئے ہوتا ہے کہ تا لوگ جمیع اخلاق میں اُن کی پیروی کریں۔ اور جن امور پر خدا نے ان کو استقامت بخشی ہے اُسی جادۂ استقامت پر سب حق کے طالب قدم ماریں اور یہ بات نہایت بدیہی ہے کہ اخلاق فاضلہ کسی انسان کے اس وقت بپایۂ ثبوت پہنچتے ہیں کہ جب اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوں اور اُسی وقت دلوں پر اُن کی تاثیریں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً عفو وہ معتبر اور قابل تعریف ہے جو قدرتِ انتقام کے وقت میں ہو۔ اور پرہیزگاری وہ قابل

اعتبار ہے کہ جو نفس پروری کی قدرت موجود ہوتے ہوئے پھر پرہیزگاری قائم رہے۔ غرض خدائے تعالیٰ کا ارادہ انبیاء اور اولیاء کی نسبت یہ ہوتا ہے کہ اُن کے ہر ایک قسم کے اخلاق ظاہر ہوں اور بہ پایۂ ثبوت پہنچ جائیں۔ سو خدائے تعالیٰ اس ارادہ کو پورا کرنے کے لئے ان کی نورانی عمر کو دو حصہ پر منقسم کر دیتا ہے۔ ایک حصہ تنگیوں اور مصیبتوں میں گذرتا ہے اور ہر طرح سے دُکھ دیئے جاتے ہیں اور ستائے جاتے ہیں تا وہ اعلیٰ اخلاق اُن کے ظاہر ہو جائیں کہ جو بجز سخت تر مصیبتوں کے ہرگز ظاہر اور ثابت نہیں ہو سکتے۔ اگر اُن پر وہ سخت تر مصیبتیں نازل نہ ہوں تو یہ کیونکر ثابت ہو کہ وہ ایک ایسی قوم ہے کہ مصیبتوں کے پڑنے سے اپنے مولیٰ سے بے وفائی نہیں کرتے بلکہ اَور بھی قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ اور خداوند کریم کا شکر کرتے ہیں کہ اُس نے سب کو چھوڑ کر انہیں پر نظرِ عنایت کی اور انہیں کو اس لائق سمجھا کہ اُس کے لئے اور اُس کی راہ میں ستائے جائیں۔ سو خدا تعالیٰ اُن پر مصیبتیں نازل کرتا ہے تا ان کا صبر ان کا صدق قدم اُن کی مردی ان کی استقامت ان کی وفاداری ان کی فتوت شعاری لوگوں پر ظاہر کر کے الاستقامۃ فوق الکرامۃ کا مصداق ان کو ٹھیرا دے۔ کیونکہ کامل صبر بجز کامل مصیبتوں کے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اور اعلیٰ درجے کی استقامت اور ثابت قدمی بجز اعلیٰ درجے کے زلزلے کے معلوم نہیں ہو سکتی اور یہ مصائب حقیقت میں انبیاء اور اولیاء کے لئے روحانی نعمتیں ہیں جن سے دنیا میں ان کے اخلاق فاضلہ جن میں وہ بے مثل و مانند ہیں ظاہر ہوتے ہیں اور آخرت میں ان کے درجات کی ترقی ہوتی ہے۔ اگر خدا ان پر یہ مصیبتیں نازل نہ کرتا تو یہ نعمتیں بھی ان کو حاصل نہ ہوتیں اور نہ عوام پر اُن کے شمائلِ حسنہ کما حقّہ کھلتے۔ بلکہ دوسرے لوگوں کی طرح اور ان کے مساوی ٹھیرتے۔ اور گو اپنی چند روزہ عمر کو کیسے ہی عشرت اور راحت میں بسر کرتے پر آخر ایک دن اس دار فانی سے گذر جاتے اور اس صورت میں نہ وہ عیش اور عشرت اُن کی باقی رہتی نہ آخرت کے درجات عالیہ حاصل ہوتے نہ دنیا میں اُن کی فتوت اور جواں مردی اور وفاداری اور شجاعت شہرۂ آفاق ہوتی جس سے وہ ایسے ارجمند ٹھیرے جن کا کوئی مانند نہیں اور ایسے یگانہ ٹھیرے جن کا کوئی ہم جنس نہیں اور ایسے فرد الفرد ٹھیرے جن کا کوئی ثانی نہیں اور ایسے غیب الغیب ٹھیرے جن کی کسی ادراک کی رسائی نہیں۔ اور ایسے کامل اور بہادر ٹھیرے کہ گویا ہزارہا شیر ایک قالب میں ہیں۔ اور ہزارہا پلنگ ایک بدن میں جن کی قوت اور طاقت سب کی نظروں سے بلند تر ہو گئی اور جو تقرب کے اعلیٰ درجات تک پہنچ گئی۔

اور دوسرا حصہ انبیاء اور اولیاء کی عمر کا فتح میں اقبال میں دولت میں بمرتبۂ کمال ہوتا ہے تا وہ اخلاق اُن کے ظاہر ہو جائیں کہ جن کے ظہور کے لئے فتحمند ہونا صاحب اقبال ہونا صاحب دولت ہونا صاحب اختیار ہونا صاحب اقتدار ہونا صاحب طاقت ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اپنے دُکھ دینے والوں کے گناہ بخشنا اور اپنے ستانے والوں سے درگذر کرنا اور اپنے دشمنوں سے پیار کرنا۔ اور اپنے بداندیشوں کی خیرخواہی بجا لانا۔ دولت سے دل نہ لگانا۔ دولت سے مغرور نہ ہونا۔ دولتمندی میں امساک اور بخل اختیار نہ کرنا اور کرم اور جود اور بخشش کا دروازہ کھولنا اور دولت کو ذریعہ نفس پروری نہ ٹھیرانا اور حکومت کو آلۂ ظلم و تعدی نہ بنانا یہ سب اخلاق ایسے ہیں کہ جن کے ثبوت کے لئے صاحب دولت اور صاحب طاقت ہونا شرط ہے اور اُسی وقت بپایۂ ثبوت پہنچتے ہیں کہ جب انسان کے لئے دولت و اقتدار دونوں میسّر ہوں۔ پس چونکہ بجز زمانۂ مصیبت و ادبار و زمانۂ دولت و اقتدار یہ دونوں قسم کے اخلاق ظاہر نہیں ہو سکتے اس لئے حکمتِ کاملہ ایزدی نے تقاضا کیا کہ انبیاء و اولیاء کو ان دونوں طور کی حالتوں سے کہ جو ہزارہا نعمتوں پر مشتمل ہیں متمتع کرے۔ لیکن ان دونوں حالتوں کا زمانۂ وقوع ہر ایک کے لئے ایک ترتیب پر نہیں ہوتا۔ بلکہ حکمت الٰہیہ بعض کے لئے زمانۂ امن و آسائش پہلے حصہ میں میسّر کر دیتی ہے اور زمانۂ تکالیف پیچھے سے اور بعض پر پہلے وقتوں میں تکالیف وارد ہوتی ہیں اور پھر آخر کار نصرتِ الٰہی شامل ہو جاتی ہے اور بعض میں یہ دونوں حالتیں مخفی ہوتی ہیں۔ اور بعض میں کامل درجہ پر ظہور و بروز پکڑتی ہیں۔ اور اس بارے میں سب سے اوّل قدم حضرت خاتم الرسل **محمد مصطفٰے** صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر کمال وضاحت سے یہ دونوں حالتیں وارد ہو گئیں۔ اور ایسی ترتیب سے آئیں کہ جس سے تمام اخلاقِ فاضلہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مثل آفتاب کے روشن ہو گئے اور مضمون اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کا بپایۂ ثابت پہنچ گیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا دونوں طور پر علیٰ وجہ الکمال ثابت ہونا تمام انبیاء کے اخلاق کو ثابت کرتا ہے کیونکہ آنجناب نے ان کی نبوت اور ان کی کتابوں کو تصدیق کیا اور ان کا مقرب اللہ ہونا ظاہر کر دیا ہے۔ پس اس تحقیق سے یہ اعتراض بھی بالکل دُور ہو گیا کہ جو مسیحؑ کے اخلاق کی نسبت دلوں میں گذر سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ اخلاق حضرت مسیح علیہ السلام دونوں قسم مذکورہ بالا پر علیٰ وجہ الکمال ثابت نہیں ہو سکتے بلکہ ایک قسم کی رو سے بھی ثابت نہیں ہیں۔ کیونکہ مسیح نے جو زمانہ مصیبتوں پر صبر کیا تو کمالیت اور صحت اس صبر کی تب بپایۂ صداقت پہنچ سکتی تھی کہ جب

مسیح اپنے تکلیف دہندوں پر اقتدار اور غلبہ پاکر اپنے موذیوں کے گناہ دلی صفائی سے بخش دیتا جیسا کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں اور دوسرے لوگوں پر بکلّی فتح پاکر اور ان کو اپنی تلوار کے نیچے رکھ کر پھر ان کا گناہ بخشدیا۔ اور صرف انہی چند لوگوں کو سزا دینے کے لئے حضرت احدیت کی طرف سے قطعی حکم وارد ہو چکا تھا اور بجز ان ازلی ملعونوں کے ہر ایک دشمن کا گناہ بخشدیا۔ اور فتح پاکر سب کو لا تثریب علیکم الیوم کہا۔ اور اسی عفو تقصیر کی وجہ سے کہ جو مخالفوں کی نظر میں ایک امر محال معلوم ہوتا تھا اور اپنی شرارتوں پر نظر کرنے سے وہ اپنے تئیں اپنے مخالف کے ہاتھ میں دیکھ کر مقتول خیال کرتے تھے ہزاروں انسانوں نے ایک ساعت میں دین اسلام قبول کر لیا۔ اور حقانی صبر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا کہ جو ایک زمانہ دراز تک آنجنابؐ نے اُن کی سخت سخت ایذاؤں پر کیا تھا آفتاب کی طرح اُن کے سامنے روشن ہو گیا۔ اور چونکہ فطرتاً یہ بات انسان کی عادت میں داخل ہے کہ اسی شخص کے صبر کی عظمت اور بزرگی انسان پر کامل طور پر روشن ہوتی ہے کہ جو بعد زمانہ آزارکشی کے اپنے عذاب دہندہ پر قدرت انتقام پاکر اس کے گناہ بخشدے۔ اسی وجہ سے مسیح کے اخلاق جو صبر اور حلم اور برداشت کے متعلق تھے بخوبی ثابت نہ ہوئے۔ اور یہ امر اچھی طرح نہ کھلا کہ مسیح کا صبر اور حلم اختیاری تھا یا اضطراری تھا۔ کیونکہ مسیح نے اقتدار اور طاقت کا زمانہ نہیں پایا تا دیکھا جاتا اس نے اپنے موذیوں کے گناہ کو عفو کیا یا انتقام لیا۔ برخلاف اخلاق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کہ وہ صدہا مواقع میں اچھی طرح کھل گئے۔ اور امتحان کئے گئے اور اُن کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہوگئی اور جو اخلاق کرم اور جود اور سخاوت اور ایثار اور فتوت اور شجاعت اور زہد اور قناعت اور اعراض عن الدنیا کے متعلق تھے وہ بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں ایسے روشن اور تاباں اور درخشاں ہوئے کہ مسیح کیا بلکہ دنیا میں آنحضرتؐ سے پہلے کوئی بھی ایسا نبی نہیں گذرا جس کے اخلاق ایسی وضاحت تامہ سے روشن ہو گئے ہوں۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے بے شمار خزائن کے دروازے آنحضرتؐ پر کھول دیئے سو آنجنابؐ نے اُن سب کو خدا کی راہ میں خرچ کیا اور کسی نوع کی تن پروری میں ایک حبّہ بھی خرچ نہ ہوا۔ نہ کوئی عمارت بنائی نہ کوئی بارگاہ تیار ہوئی بلکہ ایک چھوٹے سے کچے کوٹھے میں جس کو غریب لوگوں کے کوٹھوں پر کچھ بھی ترجیح نہ تھی اپنی ساری عمر بسر کی۔ بدی کرنیوالوں سے نیکی کرکے

دکھلائی اور وہ جو دل آزار تھے اُن کو اُن کی مصیبت کے وقت اپنے مال سے خوشی پہنچائی۔ سونے کیلئے اکثر زمین پر بستر اور رہنے کیلئے ایک چھوٹا سا جھونپڑا۔ اور کھانے کے لئے نانِ جو یا فاقہ اختیار کیا۔ دنیا کی دولتیں بکثرت اُن کو دی گئیں۔ پر آنحضرتؐ نے اپنے پاک ہاتھوں کو دنیا سے ذرا آلودہ نہ کیا اور ہمیشہ فقر کو تونگری پر اور مسکینی کو امیری پر اختیار رکھا اور اُس دن سے جو ظہور فرمایا تا اس دن تک جو اپنے رفیق اعلےٰ سے جا ملے بجز اپنے مولیٰ کریم کے کسی کو کچھ چیز نہ سمجھا۔ اور ہزاروں دشمنوں کے مقابلے پر معرکۂ جنگ میں کہ جہاں قتل کیا جانا یقینی امر تھا خالصًا خدا کے لئے کھڑے ہو کر اپنی شجاعت اور وفاداری اور ثابت قدمی دکھلائی۔ غرض جود اور سخاوت اور زہد اور قناعت اور مردی اور شجاعت اور محبت الٰہیہ کے متعلق جو جو اخلاق فاضلہ ہیں وہ بھی خداوند کریم نے حضرت خاتم الانبیاء میں ایسے ظاہر کئے کہ جن کی مثل نہ کبھی دنیا میں ظاہر ہوئی اور نہ آئندہ ظاہر ہوگی۔ لیکن حضرت مسیح علیہ السلام میں اس قسم کے اخلاق بھی اچھی طرح ثابت نہیں ہوئے کیونکہ یہ سب اخلاق بجز زمانۂ اقتدار اور دولت کے بہ پایۂ ثبوت نہیں پہنچ سکتے اور مسیح نے اقتدار اور دولت کا زمانہ نہیں پایا اس لئے دونوں قسم کے اخلاق اس کے زیر پردہ رہے اور جیسا کہ شرط ہی ظہور پذیر نہ ہوئی پس یہ اعتراض مذکورہ بالا جو مسیح کی ناقص حالت پر وارد ہوتا ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی کامل حالت سے بکلی مندفع ہو گیا کیونکہ وجودِ باجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ایک نبی کیلئے متمّم اور مکمّل ہے اور اس ذات عالی کے ذریعہ سے جو کچھ امر مسیح اور دوسرے نبیوں کا مشتبہ اور مخفی رہا تھا وہ چمک اٹھا اور خدا نے اس ذات مقدس پر اِنہی معنوں کر کے وحی اور رسالت کو ختم کیا کہ سب کمالات اس وجودِ باجود پر ختم ہو گئے۔ و ھٰذا فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

(براہین احمدیہ ص ۲۶۶-۲۸۲ حاشیہ ع ۱۱)

خدا تعالےٰ نے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سوانح کو دو حصّوں پر منقسم کر دیا۔ ایک حصّہ دُکھوں اور مصیبتوں اور تکلیفوں کا اور دوسرا حصّہ فتحیابی کا تا مصیبتوں کے وقت میں وہ خُلق ظاہر ہوں جو مصیبتوں کے وقت ظاہر ہوا کرتے ہیں اور فتح اور اقتدار کے وقت میں وہ خلق ثابت ہوں جو بغیر اقتدار کے ثابت نہیں ہوتے۔ سو ایسا ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دونوں قسم کے اخلاق دونوں زمانوں اور دونوں حالتوں کے

وارد ہونے سے کمال وضاحت سے ثابت ہو گئے۔ چنانچہ وہ مصیبتوں کا زمانہ جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تیرہ ۱۳ برس تک مکّہ معظمہ میں شامل حال رہا اس زمانہ کی سوانح پڑھنے سے نہایت واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ اخلاق جو مصیبتوں کے وقت کامل راستباز کو دکھلانے چاہئیں یعنی خدا پر توکل رکھنا اور جزع فزع سے کنارہ کرنا اور اپنے کام میں سُست نہ ہونا اور کسی کے رعب سے نہ ڈرنا ایسے طور پر دکھلا دیئے جو کفار ایسی استقامت دیکھ کر ایمان لائے اور شہادت دی کہ جب تک کسی کا پورا بھروسہ خدا پر نہ ہو تو اس استقامت اور اس طور سے دکھوں کی برداشت نہیں کر سکتا۔

اور پھر جب دوسرا زمانہ آیا یعنی فتح اور اقتدار اور ثروت کا زمانہ تو اس زمانہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق عفو اور سخاوت اور شجاعت کے ایسے کمال کے ساتھ صادر ہوئے جو ایک گروہ کثیر کفار کا انہی اخلاق کو دیکھکر ایمان لایا۔ دُکھ دینے والوں کو بخشا اور شہر سے نکالنے والوں کو امن دیا۔ اُن کے محتاجوں کو مال سے مالا مال کر دیا۔ اور قابو پاکر اپنے بڑے بڑے دشمنوں کو بخش دیا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے آپ کے اخلاق دیکھکر گواہی دی کہ جب تک خدا کی طرف سے اور حقیقتاً راستباز نہ ہو یہ اخلاق ہرگز دکھلا نہیں سکتا یہی وجہ ہے کہ آپ کے دشمنوں کے پُرانے کینے یکلخت دُور ہو گئے۔ آپ کا بڑا بھاری خلق جس کو آپؐ نے ثابت کر کے دکھلا دیا وہ خلق تھا جو قرآن شریف میں ذکر کر کے فرمایا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے:-

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

یعنی ان کو کہدے کہ میری عبادت اور میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا جینا خدا کی راہ میں ہے یعنی اس کا جلال ظاہر کرنے کے لئے اور نیز اس کے بندوں کے آرام دینے کے لئے ہے۔ تا میرے مرنے سے اُن کو زندگی حاصل ہو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صـ۱۳۳-۱۳۴)

سب عزّتوں سے بڑھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عزّت ہے جس کا کل اسلامی دنیا پر اثر ہے آپ ہی کی عزّت نے پھر دنیا کو زندہ کیا۔ عرب جس میں زنا۔ شراب۔ اور جنگ جوئی کے سوا کچھ رہا نہ تھا اور حقوق العباد کا خون ہو چکا تھا ہمدردی اور خیر خواہی نوع انسان کا نام ونشان تک مٹ چکا تھا اور نہ صرف حقوق العباد ہی تباہ ہو چکے تھے بلکہ حقوق اللہ پر اس سے زیادہ تاریکی چھا گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی صفات پتھروں، بوٹیوں اور ستاروں کو دی گئی تھیں۔ قسم قسم کا شرک پھیلا ہوا تھا۔

عاجز انسان اور انسان کی شرمگاہوں تک کی پوجا دنیا میں ہو رہی تھی۔ ایسی حالت مکروہ کا نقشہ اگر ذرا دیر کے لئے بھی ایک سلیم الفطرت انسان کے سامنے آ جاوے تو وہ ایک خطرناک ظلمت اور ظلم وجور کے بھیانک اور خوفناک نظارہ کو دیکھیگا۔ فالج ایک طرف گِرتا ہے مگر یہ فالج ایسا فالج تھا کہ دونوں طرف گِرا تھا۔ فساد کامل دنیا میں برپا ہو چکا تھا۔ نہ بحر میں امن و سلامتی تھی اور نہ برّ پُرسکون و راحت۔ اب اس تاریکی اور ہلاکت کے زمانہ میں ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہیں۔ آپؐ نے آکر کیسے کامل طور پر اِس میزان کے دونوں پہلو درست فرمائے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو اپنے اصل مرکز پر قائم کر دکھایا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی طاقت کا کمال اس وقت ذہن میں آ سکتا ہے جبکہ اس زمانے کی حالت پر نگاہ کی جاوے۔ مخالفوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے متبعین کو جس قدر تکالیف پہنچائیں اور اس کے بالمقابل آپ نے ایسی حالت میں جبکہ آپ کو پورا اقتدار اور اختیار حاصل تھا اُن سے جو کچھ سلوک کیا وہ آپ کے علوّ شان کو ظاہر کرتا ہے۔

ابوجہل اور اس کے دوسرے رفیقوں نے کونسی تکلیف تھی جو آپ کو آپ کے جاں نثار خادموں کو نہیں دی۔ غریب مسلمان عورتوں کو اونٹوں سے باندھ کر مخالف جہات میں دوڑایا اور وہ چیری جاتی تھیں محض اس گناہ پر کہ وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ پر کیوں قائل ہوئیں۔ مگر آپ نے اس کے مقابل صبر و برداشت سے کام لیا۔ اور جبکہ مکّہ فتح ہوا تو لا تثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف فرمایا یہ کس قدر اخلاقی کمال ہے جو کسی دوسرے نبی میں نہیں پایا جاتا۔ اللّٰھم صلّ علیٰ محمّد و علیٰ آل محمّد

(ملفوظات جلد دوم ص ۷۹-۸۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت نے اپنے رسول مقبولؐ کی راہ میں ایسا اتحاد اور ایسی روحانی یگانگت پیدا کر لی تھی کہ اسلامی اخوت کی رو سے سچ مچ عضوِ واحد کی طرح ہو گئی تھی اور ان کے روزانہ برتاؤ اور زندگی اور ظاہر و باطن میں انوارِ نبوت ایسے رچ گئے تھے کہ گویا وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عکسی تصویریں تھیں۔ سو یہ بھاری معجزہ اندرونی تبدیلی کا جس کے ذریعہ سے فحش بُت پرستی کرنے والے کامل خدا پرستی تک پہنچ گئے۔ اور ہر دم دنیا میں غرق رہنے والے محبوب حقیقی سے ایسا تعلّق پکڑ گئے کہ اس کی راہ میں پانی کی طرح اپنے خونوں کو بہا دیا۔ یہ دراصل ایک صادق اور کامل نبی کی صحبت میں مخلصانہ قدم سے عمر بسر کرنے کا نتیجہ تھا۔

(فتح اسلام ص ۲۱-۲۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک عظیم الشان کامیاب زندگی ہے۔ آپ کیا بلحاظ اپنے

اخلاقِ فاضلہ کے اور کیا بلحاظ اپنی قوتِ قدسی اور عقد ہمت کے اور کیا بلحاظ اپنی تعلیم کی خوبی اور تکمیل کے اور کیا بلحاظ اپنے کامل نمونہ اور دعاؤں کی قبولیت کے۔ غرض ہر طرح اور ہر پہلو میں چمکتے ہوئے شواہد اور آیات اپنے اندر رکھتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر ایک غبی سے غبی انسان بھی بشرطیکہ اس کے دل میں بے جا غصہ اور عداوت نہ ہو صاف طور پر مان لیتا ہے کہ آپ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کا کامل نمونہ اور کامل انسان ہیں۔

(الحکم ۱۰؍ اپریل ۱۹۰۲ء ص ۵)

وہ جو عرب کے بیابانی ملک میں ایک عجیب ماجرا گذرا کہ لاکھوں مردے تھوڑے دنوں میں زندہ ہو گئے اور پشتوں کے بگڑے ہوئے الٰہی رنگ پکڑ گئے اور آنکھوں کے اندھے بینا ہوئے۔ اور گونگوں کی زبان پر الٰہی معارف جاری ہوئے اور دنیا میں یک دفعہ ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ نہ پہلے اس سے کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا۔ کچھ جانتے ہو وہ کیا تھا؟ وہ ایک فانی فی اللہ کی اندھیری راتوں کی دُعائیں ہی تھیں جنہوں نے دنیا میں شور مچا دیا اور وہ عجائب باتیں دکھلائیں کہ جو اس اُمّی بے کس سے محالات کی طرح نظر آتی تھیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ بِعَدَدِ ھَمِّهٖ وَغَمِّهٖ وَحُزْنِهٖ لِھٰذِهِ الْاُمَّةِ وَاَنْزِلْ عَلَیْهِ اَنْوَارَ رَحْمَتِكَ اِلَی الْاَبَدِ۔

(برکات الدعاء ص ۱۰)

ابتدائے اسلام میں بھی جو کچھ ہوا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا نتیجہ تھا جو کہ مکہ کی گلیوں میں خدائے تعالیٰ کے آگے رو رو کر آپ نے مانگیں جس قدر عظیم الشان فتوحات ہوئیں کہ تمام دنیا کے رنگ ڈھنگ کو بدل دیا وہ سب آنحضرتؐ کی دعاؤں کا اثر تھا۔ ورنہ صحابہؓ کی قوت کا تو یہ حال تھا کہ جنگ بدر میں صحابہ کے پاس صرف تین تلواریں تھیں اور وہ بھی لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔

(الحکم ۱۷؍ ستمبر ۱۹۰۶ء ص ۴)

ہمارے سیّد و مولیٰ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اصلاح نہایت وسیع اور عام اور مسلّم الطوائف تھی اور یہ مرتبہ اصلاح کا کسی گذشتہ نبی کو نصیب نہیں ہوا۔ اور اگر کوئی عرب کی تاریخ کو آگے رکھ کر سوچے تو اسے معلوم ہوگا کہ اُس وقت کے بُت پرست اور عیسائی اور یہودی کیسے متعصب تھے۔ اور کیونکر ان کی اصلاح کی۔ صدہا سال سے نومیدی ہو چکی تھی۔ پھر نظر اُٹھا کر دیکھیے کہ قرآنی تعلیم

نے جو ان کے بالکل مخالف تھی کیسی نمایاں تاثیریں دکھلائیں اور کیسے ہریک بد اعتقاد اور ہریک بدکاری کا استیصال کیا۔ شراب کو جو ام الخبائث ہے دُور کیا۔ قمار بازی کی رسم کو موقوف کیا دختر کشی کا استیصال کیا اور جو انسانی رحم اور عدل اور پاکیزگی کے برخلاف عادات تھیں سب کی اصلاح کی۔ ہاں مجرموں نے اپنے جرموں کی سزائیں بھی پائیں۔ جن کے پانے کے وہ سزاوار تھے۔ پس اصلاح کا امر ایسا نہیں ہے جس سے کوئی انکار کر سکے۔

(نورالقرآن ۱ ص ۳۷ حاشیہ)

ہمارے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شہادت سے اَور کوئی بڑھ کر شہادت نہیں ہمارا تو اس بات کو سُنکر بدن کانپ جاتا ہے کہ جب ایک شخص کے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ پیش کیا جائے تو وہ اس کو قبول نہیں کرتا اور دوسری طرف بھکتا پھرتا ہے۔

(اتمام الحجۃ ص ۲۱)

مسلمان وہ قوم ہے جو اپنے نبی کریمؐ کی عزّت کے لئے جان دیتے ہیں اور وہ اس بے عزتی سے مرنا بہتر سمجھتے ہیں کہ ایسے شخصوں سے دلی صفائی کریں اور ان کے دوست بن جائیں جن کا کام دن رات یہ ہے کہ وہ ان کے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے ہیں اور اپنے رسالوں اور کتابوں اور اشتہاروں میں نہایت توہین سے ان کا نام لیتے ہیں اور نہایت گندے الفاظ سے اُن کو یاد کرتے ہیں۔ آپ یاد رکھیں کہ ایسے لوگ اپنی قوم کے بھی خیرخواہ نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اُن کی راہ میں کانٹے بوتے ہیں۔ اور مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر ہم جنگل کے سانپوں اور بیابانوں کے درندوں سے صلح کر لیں تو یہ ممکن ہے مگر ہم ایسے لوگوں سے صلح نہیں کر سکتے جو خدا کے پاک نبیوں کی شان میں بدگوئی سے باز نہیں آتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گالی اور بدزبانی میں ہی فتح ہے مگر ہر ایک فتح آسمان سے آتی ہے۔

(مضمون جلسہ لاہور منسلکہ چشمۂ معرفت ص ۱۴)

اس زمانہ میں جو کچھ دین اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی توہین کی گئی اور جسقدر شریعت ربّانی پر حملے ہوئے اور جس طور سے ارتداد اور الحاد کا دروازہ کھلا کیا اسکی نظیر کسی دوسرے زمانہ میں بھی مل سکتی ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس ملک ہند میں ایک لاکھ کے قریب لوگوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اور چھ کروڑ اور کسی قدر زیادہ اسلام کے مخالف کتابیں تالیف ہوئیں اور بڑے بڑے شریف خاندان کے لوگ اپنے پاک مذہب کو کھو بیٹھے یہاں تک کہ وہ جو آل رسول کہلاتے تھے وہ عیسائیت کا جامہ پہن کر دشمن رسولؐ بن گئے اور اس قدر بدگوئی اور

اہانت و دشنام دہی کی کتابیں نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کے حق میں چھاپی گئیں اور شائع کی گئیں کہ جن کے سُننے سے بدن پر لرزہ پڑتا ہے۔ اور دل رو رو کر یہ گواہی دیتا ہے کہ اگر یہ لوگ ہمارے بچوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے قتل کرتے اور ہمارے جانی اور دلی عزیزوں کو جو دنیا کے عزیز ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے اور ہمیں بڑی ذلت سے جان سے مارتے اور ہمارے تمام اموال پر قبضہ کر لیتے تو واللہ ثم واللہ ہمیں رنج نہ ہوتا۔ اور اس قدر کبھی دل نہ دُکھتا جو ان گالیوں اور اس توہین سے جو ہمارے رسول کریم کی کی گئی دُکھا۔

(آئینہ کمالات اسلام ص۵۱-۵۲)

یا عَیْنَ فیضِ اللہ و العرفانِ ٭ یسعٰی الیک الخلقُ کالظّمآنِ
یا بحرَ فضلِ المنعمِ المنّانِ ٭ تھوی الیک الزُّمر بالکیزانِ
یا شمس ملکِ الحسنِ والاحسانِ ٭ نوّرتَ وَجْہَ البرِّ و العُمرانِ
قومٌ رأوک وَاُمّۃ قد اُخبرت ٭ من ذٰلک البدر الذی اصبانِ
یبکُون من ذکر الجمال صبابۃً ٭ وتاَلُّماً من لوعۃِ الھجرانِ
وَأَرٰی القلوب لدی الحناجر کربۃً ٭ وأُرٰی الغروب تسیلھا العینانِ
یا من غدا فی نورہٖ و ضیائہ ٭ کالنَّیّرین ونُوّرَ الملوانِ
یا بدرنا یا اٰیۃ الرَّحمٰنِ ٭ أھدی الھداۃِ و اشجع الشجعانِ
اِنّی اری فی وجھک المتھلّلِ ٭ شأناً یفوق شمائل الانسانِ
سجعٌ کریمٌ باذلٌ خِلّ التُّقٰی ٭ خِرقٌ وّ فاق طَوَائفَ الفتیانِ
فاق الورٰی بکمالہ وجمالہ ٭ وجلالہ و جنانہ الرّیّانِ
لا شکّ ان محمداً خیر الورٰی ٭ رَیْقُ الکِرامِ و نخبۃ الاعیانِ
تمّت علیہ صِفَاتُ کُلّ مزیّۃٍ ٭ خُتِمَتْ بہٖ نعماء کلّ زمانِ
واللہ ان محمّداً کردافۃٍ ٭ وبہ الوُصُولُ بسُدّۃ السُلطانِ
ھو فخرُ کلّ مُطھّرٍ ومُقدّسٍ ٭ وبہ یُباھی العسکرُ الرّوحانی
ھو خیر کلّ مُقرّبٍ مُتقدّمٍ ٭ والفضل بالخیراتِ لا بزمانِ
والطّلّ قد یبدو اَمَامَ الوابلِ ٭ فالطّلّ طلٌّ لیس کالتّھتانِ
بطلٌ وحیدٌ لا تطیشُ سِھامُہٗ ٭ ذو مُصْمِیاتٍ موبقُ الشیطانِ

هُوَ جَنَّةٌ اِنّی اَرٰی اثمارہٗ ؎ وقطوفهٗ قد ذلّلت لِجَنَانِی
الفیتُهٗ بحر الحقائقِ والهدٰی ؎ و راُیتُهٗ کالدُّرِّ فِی اللّمعانِ
قد مات عیسٰی مُطْرِقًا و نَبِیُّنَا ؎ حَیٌّ وَّ رَبّی انّه وافانِی
واللّٰه انّی قد رأیتُ جَمَالَهٗ ؎ بعیون جسمی قَاعدًا بِمَکَانِی
ونبیُّنَا حَیٌّ و اِنّی شَاهِدٌ ؎ وقد اقتطفت قطائف اللُّقیانِ
و رأیتُ فِی ریعان عمری وجهَهٗ ؎ ثُمّ النّبیُّ بیقظتی لاقانِی
اِنّی لقد اُحییتُ من اِحْیَائه ؎ واهًا لِاِعْجَازٍ فما اَحْیَانِی
یا ربِّ صَلِّ علٰی نَبِیّکَ دائمًا ؎ فِی هٰذهِ الدنیا وَبَعْثٍ ثَانِی
یا سیّدی قد جئت بَابَك لاهفًا ؎ والقومُ بِالْاِکْفَارِ قد اٰذانِی
اُنظر اِلَیَّ برحمةٍ وَّ تحنُّنٍ ؎ یا سیّدی اَنَا اَحْقَرُ الغِلْمَانِی
یا حِبِّ اِنّك قد دَخَلْتَ محبّةً ؎ فی مُهْجَتِی و مدارِکی و جَنَانِ
من ذکر وجهك یا حدیقة بهجتی ؎ لَمْ اَخْلُ فی لحظٍ و لا فی آنِ
جسمی یطیر الیك من شوق علا ؎ یالیت کانت قوّة الطّیرانِ

(آئینہ کمالات اسلام صــــ ۵۹۴-۵۹۶)

یا قلبی اذکر احمدا   عین الهدٰی مفنی العدٰی
بدر منیر زاهر   فی کل وصف حُمِّدا
الظالمون بظلمهم   قد کذّبوه تمرُّدا
اُطْلُبْ نظیر کماله   فستندمنّ ملدّدا
نور من اللّٰه الذی   اَحیِ العُلوم تجدُّدا
جمعت مرابیع الهدٰی   فی وبله حین الندٰی
الیوم یسعی النکس ان   یطفی هداهُ و یُخمدا
یا قطر ساریة و غما   دٍ قد عصمت من الردا
انّا وجدناك الملا   ذ نبعد کهفٍ قد بدا
لا نتّقی نوبَ الزّ   مانِ ولا نخاف تهدُّدا
کم من مُنازعةٍ جرت   بینی و اقوام العدا

برّ اکریما محسنًا   بحر العطایا و الجدا
احسانه یُصبی القلو   بَ وحسنه یُروی الصدا
والحق لا یسعُ الورٰی   اِنکارہٗ لمّا بدا
مااِنْ رأینا مثلهٗ   لِلقائمین مُسهِّدا
المصطفٰی والمجتبٰی   والمقتدا والمجتدا
نَسِیَ الزمانُ رهامَه   من جود هٰذا المقتدا
واللّٰه یبدی نورہٗ   یومًا وان طال المدٰی
ربّیت اشجار الاسرةِ بالفیوض وترددا
لا نتّقی قوس الخطو   ب ولا نبالی مُرجدا
ونَمُدُّ فی اوقاتِ ا   فاتٍ الی المولٰی یدا
حتّی انثنیت مظفّرًا   ومُؤقرًا ومؤیّدا

لِلّٰهِ حمد ثم حمد قد عرفنا المقتدیٰ
یا صاح اِنّ اللّٰه قد ÷ اعطی لنا ھٰذا الجدا
أ تجول فی حوماتِ نفسک نارکًا سُننَ الہدیٰ
الیوم تکفرنی و تحسبنی شقیًّا ملحدًا

کادت تُصفّینی ملالاتٌ ÷ فادرکنی الہدیٰ
ھِیَ لیلۃُ القدرِ الّتی ÷ نعطی نعیمًا مُخلّدا
ھَلّا انتھجتَ محجۃ الاَحیاء ÷ یا صیدَ الردا
و تریٰ بوقتٍ بعدہ ÷ فی زیّ أحمدَ أحمدا

ہر طرف فکر کو دوڑا کے تھکایا ہم نے ÷ کوئی دیں دینِ محمدؐ سا نہ پایا ہم نے
کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلائے ÷ یہ ثمر باغِ محمدؐ سے ہی کھایا ہم نے
ہم نے اسلام کو خود تجربہ کرکے دیکھا ÷ نُور ہے نور اُٹھو دیکھو سُنایا ہم نے
آزمائش کے لئے کوئی نہ آیا ہرچند ÷ ہر مخالف کو مقابل پہ بُلایا ہم نے
آؤ لوگو! کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے ÷ لو تمہیں طورِ تسلّی کا بتایا ہم نے
آج ان نوروں کا اِک زور ہے اِس عاجز میں ÷ دل کو ان نوروں کا ہر رنگ دلایا ہم نے
جب سے یہ نور ملا نورِ پیمبر سے ہمیں ÷ ذات سے حق کی وجود اپنا ملایا ہم نے
مصطفیٰ پر ترا بے حد ہو سلام اور رحمت ÷ اُس سے یہ نور لیا بارِ خدایا ہم نے
ربط ہے جانِ محمدؐ سے مری جاں کو مدام ÷ دل کو وہ جام لبالب ہے پلایا ہم نے
ترے مُنہ کی ہی قسم میرے پیارے احمدؐ ÷ تیری خاطر سے یہ سب بار اٹھایا ہم نے
دلبرا! مجھ کو قسم ہے تری یکتائی کی ÷ آپ کو تیری محبّت میں بھلایا ہم نے

(درثمین ص۱۳)

کہتے ہیں یورپ کے ناداں یہ نبیؐ کامل نہیں ÷ وحشیوں میں دیں کا پھیلانا یہ کیا مشکل تھا کار
پر بنانا آدمی وحشی کو ہے اِک معجزہ ÷ معنیٔ رازِ نبوت ہے اِسی سے آشکار
نور لائے آسماں سے خود بھی وہ اِک نور تھے ÷ قوم وحشی میں اگر پیدا ہوئے کیا جائے عار
روشنی میں مہرِ تاباں کی بھلا کیا فرق ہو ÷ گرچہ نکلے روم کی سرحد سے یا از زنگ بار

(درثمین)

برتر گمان وہم سے احمدؐ شان ہے ÷ جس کا غلام دیکھو مسیح الزمان ہے

(حقیقۃ الوحی ص۲۷۴ حاشیہ)

وہ پیشوا ہمارا جس سے ہے نور سارا ؎ نام اُس کا ہے **محمدؐ** دلبر مرا یہی ہے
سب پاک ہیں پیمبر اک دوسرے سے بہتر ؎ لیک از خدائے برتر خیر الوریٰ یہی ہے
پہلوں سے خوب تر ہے خوبی میں اِک قمر ہے ؎ اس پہ ہر اک نظر ہے بدر الدجیٰ یہی ہے
پہلے تو رہ میں ہارے پار اس نے ہیں اتارے ؎ مَیں جاؤں اس کے وارے بس ناخدا یہی ہے
پردے جو تھے ہٹائے اندر کی راہ دکھائے ؎ دل یار سے ملائے وہ آشنا یہی ہے
وہ یارِ لامکانی وہ دلبرِ نہانی ؎ دیکھا ہے ہم نے اس سے بس رہنما یہی ہے
وہ آج شاہِ دیں ہے وہ تاجِ مرسلیں ہے ؎ وہ طیّب و امیں ہے اُس کی ثنا یہی ہے
حق سے جو حکم آئے سب اُس نے کر دکھائے ؎ جو راز تھے بتائے نعم العطاء یہی ہے
آنکھ اُس کی دُور بیں ہے دل یار سے قریں ہے ؎ ہاتھوں میں شمع دیں ہے عین الضیاء یہی ہے
جو رازِ دیں تھے بھارے اُس نے بتائے سارے ؎ دولت کا دینے والا فرمانروا یہی ہے
اُس نُور پر فدا ہوں اُس کا ہی مَیں ہُوا ہوں ؎ وہ ہے مَیں چیز کیا ہوں بس فیصلہ یہی ہے
وہ دلبرِ یگانہ عِلموں کا ہے خزانہ ؎ باقی ہے سب فسانہ سچ بے خطا یہی ہے
سب ہم نے اُس سے پایا شاہد ہے تو خدایا ؎ وہ جس نے حق دکھایا وہ مہ لقا یہی ہے
ہم تھے دلوں کے اندھے سَو سَو دلوں پہ پھندے ؎ پھر کھولے جس نے جندے وہ مجتبیٰ یہی ہے

(قادیان کے آریہ اور ہم صـ۴۸)

جان و دلم فدائے جمال **محمدؐ** است ؎ خاکم نثارِ کوچۂ آلِ **محمدؐ** است
دیدم بعینِ قلب و شنیدم بگوشِ ہوش ؎ در ہر مکاں ندائے جلالِ **محمدؐ** است
ایں چشمۂ رواں کہ بخلقِ خدا دہم ؎ یک قطرۂ ز بحرِ کمالِ **محمدؐ** است
ایں آتشم زآتش مہرِ محمدی است ؎ ویں آبِ من ز آبِ زلالِ **محمدؐ** است

(اشتہار ۲۰؍فروری ۱۸۸۶ء)

شانِ **احمدؐ** را کہ داند جُز خداوندِ کریم ؎ آنچناں از خود جدا شد کز میاں افتاد میم
زاں نمط شد محو دلبر کز کمالِ اتحاد ؎ پیکرِ او شد سراسر صورتِ ربِّ رحیم
بُوئے محبوبِ حقیقی مے دمد زاں روئے پاک ؎ ذاتِ حقانی صفاتش مظہرِ ذاتِ قدیم
گرچہ منسوبم کند کس سوئے الحاد و ضلال ؎ چوں دلِ احمد نمے بینم دگر عرشِ عظیم
منت ایزد را کہ من بر رغمِ اہلِ روزگار ؎ صد بلا را می خرم از ذوقِ آں عین النعیم

از عنایات خدا و از فضل آں دادار پاک ؛ دشمن فرعونیانم بہرِ عشق آں کلیم
آں مقام و رتبتِ خاصش کہ برمن شد عیاں ؛ گفتمے گردیدمے طبعی دریں راہے سلیم
در رہِ عشق **محمد** ایں سر و جانم رود ؛ ایں تمنا ایں دعا ایں در دلم عزم صمیم
(توضیح مرام ص۱۳)

در دلم جوشد ثنائے سرورے ؛ آنکہ در خوبی ندارد ہمسرے
آنکہ جانش عاشقِ یارِ ازل ؛ آنکہ رُوحش واصلِ آں دلبرے
آنکہ مجذوبِ عنایاتِ حق است ؛ ہمچو طفلے پروریدہ در برے
آنکہ در برّ و کرم بحرِ عظیم ؛ آنکہ در لطفِ اتم یکتا درے
آنکہ در جود و سخا ابرِ بہار ؛ آنکہ در فیض و عطا یک خاورے
آں رحیم و رحم حق را آیتے ؛ آں کریم و جودِ حق را مظہرے
آں رُخِ فرّخ کہ یک دیدار او ؛ زشت رو را میکند خوش منظرے
آں دلِ روشن کہ روشن کردہ است ؛ صد درونِ تیرہ را چوں اخترے
آں مبارک پے کہ آمد ذات او ؛ رحمتے زاں ذاتِ عالم پرورے
احمدِ آخر زماں کز نورِ او ؛ شد دلِ مردم زخور تاباں ترے
از بنی آدم فزوں تر در جمال ؛ وز لآلی پاک تر در گوہرے
بر لبش جاری ز حکمت چشمۂ ؛ در دلش پُر از معارف کوثرے
بہرِ حق داماں ز غیرش برفشاند ؛ ثانئ او نیست در بحر و برے
آں چراغش داد حق کش تا ابد ؛ نے خطر نے غم ز بادِ صرصرے
پہلوانِ حضرتِ ربِّ جلیل ؛ بر میاں بستہ ز شوکت خنجرے
تیرِ او تیزی بہر میداں نمود ؛ تیغِ او ہر جا نمودہ جوہرے
کرد ثابت بر جہاں عجزِ بُتاں ؛ وا نمودہ زور آں یک قادرے
تا نماند بے خبر از زورِ حق ؛ بُت ستا و بت پرست و بُت گرے
عاشقِ صدق و سداد و راستی ؛ دشمنِ کذب و فساد و ہر شرے
خواجۂ و مر عاجزاں را بندۂ ؛ بادشاہ و بے کساں را چاکرے
آں ترحمہا کہ خلق از وے بدید ؛ کس ندیدہ در جہاں از مادرے

از شراب شوقِ جاناں بےخودی ؛ در سرش بر خاک بنهاده سرے
روشنی از وے بهر قومے رسید ؛ نور او زخشید بر هر کشورے
آیت رحماں برائے هر بصیر ؛ حجت حق بهر هر دیده ورے
ناتواناں را برحمت دستگیر ؛ خسته جاناں را به شفقت غمخورے
حسن رویش به ز ماه و آفتاب ؛ خاک کویش به ز مشک و عنبرے
آفتاب و مه چه مے ماند بدو ؛ در دلش از نور حق صد نیّرے
یک نظر بهتر ز عمرِ جاوداں ؛ گر فتد کس را بر آں خوش پیکرے
منکه از حسنش همے دارم خبر ؛ جاں فشانم گر دهد دل دیگرے
یاد آں صورت مرا از خود برد ؛ هر زماں مستم کند از ساغرے
می پریدم سوئے کوئے او مدام ؛ من اگر می داشتم بال و پرے
لاله و ریحاں چه کار آید مرا ؛ من سرے دارم بآں روئے سرے
خوبیٔ او دامنِ دل می کشد ؛ موکشانم می برد زور آورے
دیده ام کو هست نورِ دیده ها ؛ در اثر مهرش چو مهرِ انورے
تافت آں روئے کزاں رو سر نتافت ؛ یافت آں درماں که بگزید آں درے
هر که بے او زد قدم در بحرِ دیں ؛ کرد در اول قدم گم معبرے
اُمّی و در علم و حکمت بےنظیر ؛ زیں چه باشد حجّتے روشن ترے
آں شرابِ معرفت دادش خدا ؛ کز شعاعش خیره شد هر اخترے
شد عیاں از وے علی الوجه الاتم ؛ جوهر انساں که بود آں مضمرے
ختم شد بر نفسِ پاکش هر کمال ؛ لاجرم شد ختم هر پیغمبرے
آفتابِ هر زمین و هر زماں ؛ رهبرِ هر اسود و هر احمرے
مجمع البحرین علم و معرفت ؛ جامع الاسمین ابر و خاورے
چشم من بسیار گردید و ندید ؛ چشمهٔ چوں دین او صافی ترے
سالکاں را نیست غیر از وے امام ؛ ره رواں را نیست جز وے رهبرے
جائے او جائیکه طیرِ قدس را ؛ سوزد از انوار آں بال و پرے
آں خداوندش بداد آں شرع و دیں ؛ کاں نگردد تا ابد متغیّرے

تافت اول بر دیار تازیاں ٭ تازیانش را شود درماں گرے
بعد ازاں آں نور دین و شرع پاک ٭ شد محیط عالمے چوں چنبرے
خلق را بخشید از حق کام جاں ٭ وا رہانیدہ ز کام اژدرے
یک طرف حیراں ازو شاہان وقت ٭ یک طرف مبہوت ہر دانشورے
نے بعلمش کس رسید و نے بزور ٭ در شکستہ کبر ہر متکبّرے
او چہ مے دارد بمدح کس نیاز ٭ مدح او خود فخر ہر مدحت گرے
ہست او در روضۂ قدس و جلال ٭ د از خیال مادحاں بالاترے
اے خدا بر وے سلام ما رساں ٭ ہم برا خوانش ز ہر پیغمبرے
ما ہمہ پیغمبراں را چاکریم ٭ ہمچو خاک اوفتادہ بر درے
ہر رسولے کو طریق حق نمود ٭ جان ما قرباں برآں حق پرورے
اے خداوندم بہ خیلِ انبیاء ٭ کش فرستادی بہ فضلِ وافرے
معرفت ہم دہ چو بخشیدی دلم ٭ مے بدہ زاں ساں کہ دادی ساغرے
اے خداوندم بنامِ مصطفیٰ ٭ کش شدے در ہر مقامے ناصرے
دستِ من گیر از رہِ لطف و کرم ٭ در مہمّم باش یار و یاورے
تکیہ بر زورِ تو دارم گرچہ من ٭ ہمچو خاکم بلکہ زاں ہم کمترے

(دیباچہ براہین احمدیہ ص۱۷)

آں شہِ عالم کہ نامش مصطفیٰ ٭ سیّد عشاق حق شمس الضحیٰ
آنکہ ہر نورے طفیلِ نورِ اوست ٭ آنکہ منظور خدا منظور اوست
آنکہ بہر زندگی آبِ رواں ٭ در معارف ہمچو بحرِ بیکراں
آنکہ بر صدق و کمالش در جہاں ٭ صد دلیل و حجّتِ روشن عیاں
آنکہ انوار خدا بر روئے او ٭ مظہرِ کارِ خدائی کوئے او
آنکہ جملہ انبیاء و راستاں ٭ خادمانش ہمچو خاک آستاں
آنکہ مہرش مے رساند تا سما ٭ میکند چوں ماہ تاباں در صفا
مے دہد فرعونیاں را ہر زماں ٭ چو یدِ بیضائے موسیٰ صد نشاں

(براہین احمدیہ ص۵-۶ حاشیہ)

چوں زمن آید ثنائے سرورِ عالی تبار ⁂ عاجز از مدحش زمین و آسمان و ہر دو دار
آں مقامِ قرب کو دارد بدلدارِ قدیم ⁂ کس نداند شان آں از واصلانِ کردگار
آں عنایت ہا کہ محبوبِ ازل دارد بدو ⁂ کس بخوابے ہم ندیدہ مثلِ آں اندر دیار
سرورِ خاصانِ حق شاہِ گروہِ عاشقاں ⁂ آنکہ روحش کرد طے ہر منزلِ وصلِ نگار
آں مبارک پے کہ آمد ذات با آیات او ⁂ رحمت زاں ذات عالم پرور و پروردگار
آں کہ دارد قربِ خاص اندر جنابِ پاکِ حق ⁂ آنکہ شان او نہ فہمد کس ز خاصان و کبار
احمدؐ آخر زماں کو اولیں را جائے فخر ⁂ آخریں را مقتدا و ملجا و کہف و حصار
ہست درگاہِ بزرگش کشتئ عالم پناہ ⁂ کس نہ گردد روزِ محشر جز پناہش رستگار
از ہمہ چیزے فزوں تر در ہمہ نوعِ کمال ⁂ آسمانہا پیشِ اوجِ ہمتِ او ذرہ وار
مظہرِ نورے کہ پنہاں بود از عہدِ ازل ⁂ مطلعِ شمسے کہ بود از ابتدا در استتار
صدرِ بزمِ آسمان و حجّۃ اللہ بر زمیں! ⁂ ذاتِ خالق را نشانے بس بزرگ و استوار
ہر رگ و تارِ وجودش خانۂ یارِ ازل ⁂ ہر دم و ہر ذرّہ اش پُر از جمالِ دوستدار
حسنِ روئے او بہ از صد آفتاب و ماہتاب ⁂ خاکِ کوئے او بہ از صد نافۂ مشکِ تتار
ہست او از عقل و فکر و وہمِ مردم دُور تر ⁂ کے مجالِ فکر تا آں بحرِ ناپیدا کنار
رُوحِ او در گفتنِ قولِ بلٰی اول کسے ⁂ آدمِ توحید و پیش از آدمش پیوندِ یار
جانِ خود دادن پئے خلقِ خدا در فطرتش ⁂ جاں نثارِ خستہ جاناں بیدلاں را غمگسار
اندراں وقتیکہ دنیا پُر ز شرک و کفر بود ⁂ ہیچ کس را خوں نہ شد دل جز دلِ آں شہریار
ہیچ کس از خبثِ شرک و رجسِ بُت آگہ نشد ⁂ ایں خبر شد جانِ احمد را کہ بود از عشق زار
کس چہ میداند کزاں نالہ ہا باشد خبر ⁂ کاں شفیع کرد از بہرِ جہاں در کُنجِ غار
من نمی دانم چہ دردے بود اندوہ و غمے ⁂ کاندراں غارے در آوردش حزین و دلفگار
نے ز تاریکی توحّشش نے ز تنہائی ہراس ⁂ نے ز مردن غم نہ خوفِ کژدمے نے بیمِ مار
کشتۂ قوم و فدائے خلق و قربانِ جہاں ⁂ نے بجسمِ خویش میلش نے بنفسِ خویش کار
نعرہ ہا پُر درد مے زد از پئے خلقِ خدا ⁂ شد تضرع کارِ او پیشِ خدا لیل و نہار
سخت شورے بر فلک او فتاد زاں عجز و دعا ⁂ قدسیاں را نیز شد چشم از غمِ آں اشکبار
آخر از عجز و مناجات و تضرّع کردنش ⁂ شد نگاہِ لطفِ حق بر عالمِ تاریک و تار

در جہاں از معصیت ہا بود طوفانِ عظیم ٭ بود خلق از شرک و عصیاں کور و کر در ہر دیار
ہمچو وقتِ نوحؑ دنیا بود پُر از ہر فساد ٭ ہیچ دل خالی نبود از ظلمتِ گرد و غبار
مر شیاطیں را تسلّط بود بر ہر روح و نفس ٭ پس تجلّی کرد بر رُوحِ محمدؐ کردگار
منت او بر ہمہ سُرخ و سیاہی ثابت است ٭ آنکہ بہرِ نوعِ انساں کرد جانِ خود نثار
یا نبی اللہ توئی خورشیدِ رہ ہائے ہدیٰ ٭ بے تو نا رد رو براہے عارفِ پرہیزگار
یا نبی اللہ لبِ تو چشمۂ جاں پرور است ٭ یا نبی اللہ توئی در راہ حق آموزگار
آں یکے جوید حدیثِ پاک تو از زید و عمرو ٭ واں دگر خود از دہانت بشنود بے انتظار
زندہ آں شخصے کہ نوشد جرعۂ از چشمہ ات ٭ زیرک آں مردیکہ کرد است اتباعت اختیار
عارفاں را منتہائے معرفت علمِ رخت ٭ صادقاں را منتہائے صدق بر عشقت قرار
بے تو ہرگز دولتِ عرفاں نمے یابد کسے ٭ گرچہ میرد در ریاضت ہا و جہدِ بے شمار
تکیہ بر اعمالِ خود بے عشقِ رویت ابلہی است ٭ غافل از رُویت نہ بیند روئے نیکی زینہار
در دمے حاصل شود نورے ز عشقِ روئے تو ٭ کاں نہ باشد سالکاں را حاصل اندر روزگار
از عجائب ہائے عالم ہرچہ محبوب و خوش است ٭ شانِ آں ہر چیز بینم در وجودت آشکار
خوشتر از دورانِ عشقِ تو نباشد ہیچ دَور ٭ خوبتر از وصف و مدحِ تو نباشد ہیچ کار
منکہ رہ بردم بخوبی ہائے بے پایانِ تو ٭ جاں گدازم بہرِ تو گر دیگرے خدمتگذار
ہر کسے اندر نمازِ خود دُعائے مے کند ٭ من دعاہائے برو بارِ تو اے باغ و بہار
یا نبی اللہ فدائے ہر سر موئے تو ام ٭ وقفِ راہِ تو کنم گر جاں دہندم صد ہزار
اتباع و عشقِ رُویت از رہِ تحقیق چیست ٭ کیمیائے ہر دلے اکسیرِ ہر جانِ فگار
دل اگر خوں نیست از بہرت چہ چیز است آں دلے ٭ ور نثارِ تو نگردد جاں کجا آید بکار
دل نمے ترسد بہرِ تو مرا از موت ہم ٭ پائیداری ہا ببیں خوش میروم تا پائے دار
راغب اندر رحمتت یا رحمۃ اللہ آمدیم ٭ اے کہ چوں ما بر درِ تو صد ہزار امیدوار
یا نبی اللہ نثارِ روئے محبوبِ تو ام ٭ وقفِ راہت کردہ ام ایں سر کہ بر دوش است بار
تا بمن نورِ رسولِ پاک را بنمودہ اند ٭ عشقِ او در دل ہمے جوشد چو آب از آبشار
آتشِ عشق از دمِ من ہمچو برقے مے جہد ٭ یک طرف اے ہمدمانِ خام از گرد و جوار
بر سر وجد است دل تا دید روئے او بخواب ٭ اے برآں زدۂ سرش جان و سر ردیم نثار

صد ہزاراں یوسفے بینم دریں چاہِ ذقن ؎ واں مسیحِ ناصری شد از دمِ او بے شمار
تاجدارِ ہفت کشور آفتابِ شرق و غرب ؎ بادشاہِ ملک و ملّت ملجاءِ ہر خاکسار
کامراں آں دل کہ زد در راہِ او از صدق گام ؎ نیک بخت آں سر کہ میدارد سرِ آں شہسوار
یا نبی اللہ جہاں تاریک شد از کفر و شرک ؎ وقت آں آمد کہ بنمائی رُخِ خورشید وار
بینم انوارِ خدا در روئے تو اے دلبرم ؎ مستِ عشقِ روئے تو بینم دلے ہر ہوشیار
اہلِ دل فہمند قدرت عارفاں دانند حال ؎ از دو چشمِ شپّراں پنہاں خورِ نصف النہار
ہر کسے دارد سرے با دلبرے اندر جہاں ؎ من فدائے روئے تو اے دلستانِ گلعذار
از ہمہ عالم دل اندر روئے خوبت بستہ ام ؎ بر وجودِ خویشتن کردم وجودت اختیار
زندگانی چیست جاں کردن براہِ تو فدا ؎ رستگاری چیست در بندِ تو بودن صید وار
تا وجودم ہست خواہد بود عشقت در دلم ؎ تا دلم دورانِ خوں دارد بر تو دار و مدار
یا رسول اللہ برویت عہد دارم استوار ؎ عشقِ تو دارم ازاں روزیکہ بودم شیر خوار
ہر قدم کاندر جنابِ حضرتِ بیچوں زدم ؎ دیدمت پنہاں معین و حامی و نصرت شعار
در دو عالم نسبتے دارم بتو از بس بزرگ ؎ پرورش دادی مرا خود ہمچو طفلے در کنار
یاد کن وقتیکہ در کشفم نمودی شکلِ خویش ؎ یاد کن ہم وقتِ دیگر کامدی مشتاق وار
یاد کن آں لطف و رحمتہا کہ بامن داشتی ؎ واں بشارتہا کہ میدادی مرا از کردگار
یاد کن وقتے چو بنمودی بہ بیداری مرا ؎ آں جمالے آں رُخے آں صورتے رشکِ بہار

آنچہ مارا از دو شیخِ شوخ آزارے رسید
یا رسول اللہ بپرس از عالمِ ذو الاقتدار

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۲۳)

عجب نوریست در جانِ محمدؐ ؎ عجب لعلیست در کانِ محمدؐ
ز ظلمتہا دلے آنگہ شود صاف ؎ کہ گردد از محبّانِ محمدؐ
عجب دارم دلِ آں ناکساں را ؎ کہ رو تابند از خوانِ محمدؐ
ندانم ہیچ نفسے در دو عالم ؎ کہ دارد شوکت و شانِ محمدؐ
خدا زاں سینہ بیزار است صد بار ؎ کہ ہست از کینہ دارانِ محمدؐ
خدا خود سوزد آں کرمِ دنی را ؎ کہ باشد از عدوّانِ محمدؐ

اگر خواہی نجات از مستیٔ نفس ؎ بیا در ذیلِ مستانِ محمدؐ
اگر خواہی کہ حق گوید ثنایت ؎ بشو از دل ثنا خوانِ محمدؐ
اگر خواہی دلیلے عاشقش باش ؎ محمدؐ ہست برہان محمدؐ
سرے دارم فدائے خاکِ احمدؐ ؎ دلم ہر وقت قربانِ محمدؐ
بگیسوئے رسول اللہ کہ ہستم ؎ نثارِ روئے تابانِ محمدؐ
دریں رہ گر کشندم ور بسوزند ؎ نتابم رو ز ایوانِ محمدؐ
بکارِ دیں نترسم از جہانے ؎ کہ دارم رنگِ ایمانِ محمدؐ
بسے سہلست از دنیا بریدن ؎ بیادِ حسن و احسانِ محمدؐ
فدا شد در رہش ہر ذرّۂ من ؎ کہ دیدم حسنِ پنہانِ محمدؐ
دگر استاد را نامے ندانم ؎ کہ خواندم در دبستان محمدؐ
بدیگر دلبرے کارے ندارم ؎ کہ ہستم کشتۂ آنِ محمدؐ
مرا آں گوشۂ چشمے بباید ؎ نہ خواہم جز گلستانِ محمدؐ
دلِ زارم بہ پہلویم مجوئید ؎ کہ بستیمش بدامانِ محمدؐ
من آں خوش مرغ از مرغانِ قدسم ؎ کہ دارد جا بہ بستانِ محمدؐ
تو جانِ ما منور کردی از عشق ؎ فدایت جانم اے جانِ محمدؐ
دریغا گر دہم صد جاں دریں راہ ؎ نباشد نیز شایانِ محمدؐ
چہ ہیبت ہا بدادند ایں جواں را ؎ کہ ناید کس بہ میدانِ محمدؐ
الا اے دشمنِ نادان و بے راہ ؎ بترس از تیغِ بُرّانِ محمدؐ
رہِ مولیٰ کہ گم کردند مردم ؎ بجو در آل و اعوانِ محمدؐ
الا اے منکر از شانِ محمدؐ ؎ ہم از نورِ نمایانِ محمدؐ

کرامت گرچہ بے نام و نشان است
بیا بنگر ز غلمانِ محمدؐ

(اشتہار ۲۰؍فروری ۱۸۹۳ء ص۱)

آں رسولے کش محمدؐ ہست نام ؎ دامنِ پاکش بدستِ ما مدام
مہرِ او با شیر شد اندر بدن ؎ جاں شد و با جاں بدر خواہد شدن

ہست او خیر الرسل خیر الانام ؛ ہر نبوت را برو شد اختتام
ما ازو نوشیم ہر آبے کہ ہست ؛ زو شدہ سیراب سیرابے کہ ہست
آنچہ ما را وحی و ایمائے بود ؛ آں نہ از خود از بجائے جاں بود
ما ازو یابیم ہر نور و کمال ؛ وصلِ دلدارِ ازل بے او محال
اقتدائے قول او در جانِ ماست
ہر چہ زو ثابت شود ایمانِ ماست

(سراج منیر ص۹۳)

”دل میں یہی ہے ہر دم تیرا صحیفہ چوموں
قرآں کے گرد گھوموں کعبہ مرا یہی ہے“

قرآن مجید

”قرآن جواہرات کی تھیلی ہے اور لوگ اس سے بے خبر ہیں۔“

ہم اِس بات کے گواہ ہیں اور تمام دنیا کے سامنے اِس شہادت کو ادا کرتے ہیں کہ ہم نے اِس حقیقت کو جو خدا تک پہنچاتی ہے قرآن سے پایا۔ ہم نے اُس خدا کی آواز سُنی۔ اور اس کے پُرزور بازو کے نشان دیکھے جس نے قرآن کو بھیجا۔ سو ہم یقین لائے کہ وہی سچّا خدا اور تمام جہانوں کا مالک ہے۔ ہمارا دل اس یقین سے ایسا پُر ہے جیسا کہ سمندر کی زمین پانی سے سو ہم بصیرت کی راہ سے اِس دین اور اس روشنی کی طرف ہر ایک کو بُلاتے ہیں۔ ہم نے اس نورِ حقیقی کو پایا جس کے ساتھ ظلمانی پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ اور غیر اللہ سے درحقیقت دل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہی ایک راہ ہے جس سے انسان نفسانی جذبات اور ظلمات سے ایسا باہر آجاتا ہے جیسا کہ سانپ اپنی کینچلی سے۔

(کتاب البریہ ص۶۵)

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر ایک چیز کی بڑی خوبی یہی سمجھی جائیگی کہ جس غرض کے پورا کرنے کیلئے وہ وضع کی گئی ہے اس غرض کو بوجہ احسن پوری کر سکے۔ مثلاً اگر کسی بیل کو قلبہ رانی کیلئے خریدا گیا ہے تو اُس بیل کی یہی خوبی دیکھی جائیگی کہ وہ بیل قلبہ رانی کے کام کو بوجہ احسن ادا کر سکے اسی طرح ظاہر ہے کہ اصلی غرض آسمانی کتاب کی یہی ہونی چاہیئے کہ اپنی پیروی کرنے والے کو اپنی تعلیم اور تاثیر اور قوتِ اصلاح اور اپنی روحانی خاصیت سے ہر ایک گناہ اور گندی زندگی سے چھڑا کر ایک پاک زندگی عطا فرماوے اور پھر پاک کرنے کے بعد خدا کی شناخت کیلئے ایک کامل بصیرت عطا کرے۔ اور اس ذات بے مثل کے ساتھ جو تمام خوشیوں کا سرچشمہ ہے محبت اور عشق کا تعلق بخشے۔ کیونکہ درحقیقت یہی محبت نجات کی جڑ ہے۔ اور یہی وہ بہشت ہے جس میں داخل ہونے کے بعد تمام کوفت اور تلخی اور رنج و عذاب دُور ہو جاتا ہے۔ اور بلاشبہ زندہ اور کامل کتاب الہامی وہی ہے جو طالب خدا کو اس مقصود تک پہنچا دے اور اس کو سفلی زندگی سے نجات دیکر اس محبوب حقیقی سے ملادے جس کا وصال عین نجات ہے اور تمام شکوک و شبہات سے مخلصی بخشکر ایسی کامل معرفت اس کو عطا کرے کہ گویا وہ اپنے خدا کو دیکھ لے اور خدا کے ساتھ ایسے مستحکم تعلقات اس کو بخشدے کہ وہ خدا کا

وفادار بندہ بن جائے اور خدا اس پر ایسا لطف و احسان کرے کہ اپنی انواع و اقسام کی نصرت اور مدد اور حمایت سے اس میں اور اُس کے غیر میں فرق کرکے دکھلائے اور اپنی معرفت کے دروازے اُس پر کھول دے۔ اور اگر کوئی کتاب اپنے اس فرض کو ادا نہ کرے جو اس کا اصلی فرض ہے اور دوسرے بیہودہ دعووں سے اپنی خوبی ثابت کرنا چاہے تو اس کی بھی یہی مثال ہے کہ ایک شخص مثلاً طبیب حاذق ہونے کا دعویٰ کرے اور جب کوئی بیمار اس کے سامنے پیش کیا جائے کہ اس کو اچھا کرکے دکھلاؤ تو وہ یہ جواب دے کہ میں اس کو اچھا تو نہیں کر سکتا لیکن مَیں کشتی کرنا خوب جانتا ہوں۔ یا یہ کہے کہ علم ہیئت اور فلسفہ میں مجھے بہت دخل ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی مسخرہ کہلائیگا اور عقلمندوں کے نزدیک قابلِ سرزنش ہوگا۔ خدا کی کتاب اور خدا کے رسول جو دنیا میں آتے ہیں بڑی غرض اُن کی یہی ہوتی ہے کہ دنیا کو پاپ اور گناہ کی زندگی سے چھڑا دیں اور خدا سے پاک تعلقات قائم کریں۔ اُن کی یہ غرض تو نہیں ہوتی کہ دنیا کے علوم ان کو سکھاویں اور دنیا کی ایجادوں سے اُن کو آگاہ کریں۔

غرض ایک عقلمند اور منصف مزاج آدمی کے نزدیک اس بات کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ خدا کی کتاب کا فرض یہی ہے کہ وہ خدا کو ملاوے اور خدا کی ہستی کے بارے میں یقین کے درجہ تک پہنچاوے اور خدا کی عظمت اور ہیبت دل میں بٹھا کر گناہ کے ارتکاب سے روک دے ورنہ ہم ایسی کتاب کو کیا کریں جو نہ دل کا گند دُور کر سکتی ہے اور نہ ایسی پاک اور کامل معرفت بخش سکتی ہے جو گناہ سے نفرت کرنے کا موجب ہو سکے۔ یاد رہے کہ گناہ کی رغبت کا جذام نہایت خطرناک جذام ہے اور یہ جذام کسی طرح دُور ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ خدا کی زندہ معرفت کی تجلیات اور اس کی ہیبت اور عظمت اور قدرت کے نشان بارش کی طرح وارد نہ ہوں اور جب تک کہ انسان خدا کو اُس کی مہیب طاقتوں کے ساتھ ایسا نزدیک نہ دیکھے جیسے وہ بکری کہ جب شیر کو دیکھتی ہے کہ صرف وہ اُس سے دو قدم کے فاصلے پر ہے۔ انسان کو یہ ضرورت ہے کہ وہ گناہ کے مہلک جذبات سے پاک ہو اور اِس قدر خدا کی عظمت اُس کے دل میں بیٹھ جائے کہ وہ بے اختیار کرنے والی نفسانی شہوات کی خواہش کہ جو بجلی کی طرح اُس پر گرتی اور اُس کے تقویٰ کے سرمایہ کو ایک دم میں جلا دیتی ہے وہ دُور ہو جاوے۔ مگر کیا وہ ناپاک جذبات کہ جو مرگی کی طرح بار بار پڑتے ہیں اور پرہیزگاری کے ہوش و حواس کو کھو دیتے ہیں وہ صرف اپنے ہی خود تراشیدہ پرمیشر کے تصوّر سے دُور ہو سکتے ہیں یا صرف اپنے ہی تجویز کردہ خیالات سے

دب سکتے ہیں اور یا کسی ایسے کفارہ سے رُک سکتے ہیں جس کا دُکھ اپنے نفس کو چھُوا بھی نہیں ہرگز نہیں۔ یہ بات معمولی نہیں بلکہ سب باتوں سے بڑھ کر عقلمند کے نزدیک غور کرنے کے لائق یہی بات ہے کہ وہ تباہی جو اس بے باکی اور بے تعلّقی کی وجہ سے پیش آنے والی ہے جس کی اصل جڑ گناہ اور معصیت ہے اس سے کیونکر محفوظ رہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان یقینی لذات کو محض ظنّی خیالات سے چھوڑ نہیں سکتا۔ ہاں ایک یقین دوسرے یقینی امر سے دست بردار کرا سکتا ہے۔ مثلاً ایک بن کے متعلق ایک یقین ہے کہ اس جگہ سے کئی ہرن ہم باآسانی پکڑ سکتے ہیں اور ہم اس یقین کی تحریک پر قدم اٹھانے کے لئے مستعد ہیں۔ مگر جب یہ دوسرا یقین ہو جائے گا کہ کہ وہاں پچاس شیر ببر بھی موجود ہیں اور ہزارہا خونخوار اژدہا بھی ہیں جو منہ کھولے بیٹھے ہیں تب ہم اس ارادہ سے دست کش ہو جائینگے۔ اسی طرح بغیر اس درجۂ یقین کے گناہ بھی دُور نہیں ہو سکتا لوہا لوہے سے ہی ٹوٹتا ہے۔ خدا کی عظمت اور ہیبت کا وہ یقین چاہیئے جو غفلت کے پردوں کو پاش پاش کر دے اور بدن پر ایک لرزہ ڈال دے اور موت کو قریب کر کے دکھلا دے اور ایسا خوف دل پر غالب کرے جس سے تمام تار و پود نفس امّارہ کے ٹوٹ جائیں۔ اور انسان ایک غیبی ہاتھ سے خدا کی طرف کھینچا جائے اور اُس کا دل اِس یقین سے بھر جائے کہ درحقیقت خدا موجود ہے جو بے باک مجرم کو بے سزا نہیں چھوڑتا۔ پس ایک حقیقی پاکیزگی کا طالب ایسی کتاب کو کیا کرے جس کے ذریعہ سے یہ ضرورت رفع نہ ہو سکے۔

اِس لئے مَیں ہر ایک پر یہ بات ظاہر کرتا ہوں کہ وہ کتاب جو ان ضرورتوں کو پورا کرتی ہے وہ قرآن شریف ہے اس کے ذریعہ سے خدا کی طرف انسان کو ایک کشش پیدا ہو جاتی ہے اور دنیا کی محبت سرد پڑ جاتی ہے۔ اور وہ خدا جو نہایت نہاں در نہاں ہے اُس کی پیروی سے آخر کار اپنے تئیں ظاہر کرتا ہے اور وہ قادر جس کی قدرتوں کو غیر قومیں نہیں جانتیں قرآن کی پیروی کرنے والے انسان کو خدا خود دکھا دیتا ہے اور عالمِ ملکوت کا اس کو سیر کراتا ہے اور اپنے انا الموجود ہونے کی آواز سے آپ اپنی ہستی کی اس کو خبر دیتا ہے۔ مگر وید میں یہ ہنر نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔ اور وید اس بوسیدہ گٹھڑی کی مانند ہے جس کا مالک مر جائے اور یا جس کی نسبت پتہ نہ لگے کہ یہ کس کی گٹھڑی ہے۔ جس پرمیشر کی طرف وید بلاتا ہے اس کا زندہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ وید اس بات پر کوئی دلیل قائم نہیں کرتا کہ اُس کا پرمیشر موجود بھی ہے۔ اور وید کی گمراہ کنندہ تعلیم نے اس بات میں بھی رخنہ ڈال دیا ہے کہ مصنوعات

سے صانع کا پتہ لگایا جائے کیونکہ اس کی تعلیم کی رُو سے ارواح اور پرمانو یعنی ذرّات سب قدیم اور غیر مخلوق ہیں۔ پس غیر مخلوق کے ذریعہ سے صانع کا کیونکر پتہ لگے۔ ایسا ہی وید کلام الٰہی کا دروازہ بند کرتا ہے اور خدا کے تازہ نشانوں کا منکر ہے۔ اور وید کی رو سے پرمیشر اپنے خاص بندوں کی تائید کے لئے کوئی ایسا نشان ظاہر نہیں کر سکتا کہ جو معمولی انسانوں کے علم اور تجربہ سے بڑھکر ہو۔ پس اگر وید کی نسبت بہت ہی حسن ظن کیا جائے تو اس قدر کہیں گے کہ وہ صرف معمولی سمجھ کے انسانوں کی طرح خدا کے وجود کا اقرار کرتا ہے اور خدا کی ہستی پر کوئی یقینی دلیل پیش نہیں کرتا غرض وید وہ معرفت عطا نہیں کر سکتا جو تازہ طور پر خدا کی طرف سے آتی ہے اور انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیتی ہے۔ مگر ہمارا مشاہدہ اور تجربہ اور اُن سب کا جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں اس بات کا گواہ ہے کہ قرآن شریف اپنی روحانی خاصیت اور اپنی ذاتی روشنی سے اپنے سچے پیرو کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور اس کے دل کو منور کرتا ہے اور پھر بڑے بڑے نشان دکھلا کر خدا سے ایسے تعلقات مستحکم بخش دیتا ہے کہ وہ ایسی تلوار سے بھی ٹوٹ نہیں سکتے جو ٹکڑہ ٹکڑہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ دل کی آنکھ کھولتا ہے اور گناہ کے گندے چشمہ کو بند کرتا ہے اور خدا کے لذیذ مکالمہ مخاطبہ سے شرف بخشتا ہے۔ اور علوم غیب عطا فرماتا ہے اور دُعا قبول کرنے پر اپنے کلام سے اطلاع دیتا ہے۔ اور ہر ایک جو اس شخص سے مقابلہ کرے جو قرآن شریف کا سچا پیرو ہے خدا اپنے ہیبت ناک نشانوں کے ساتھ اس پر ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ اس بندہ کے ساتھ ہے جو اس کے کلام کی پیروی کرتا ہے۔

(چشمۂ معرفت ص ۲۹۱-۲۹۵)

وہ خدا جس کے ملنے میں انسان کی نجات اور دائمی خوشحالی ہے وہ بجز قرآن شریف کی پیروی کے ہرگز نہیں مل سکتا۔ کاش جو مَیں نے دیکھا ہے لوگ دیکھیں اور جو مَیں نے سُنا ہے وہ سُنیں اور قصّوں کو چھوڑ دیں اور حقیقت کی طرف دوڑیں۔ وہ کامل علم کا ذریعہ جس سے خدا نظر آتا ہے وہ میل اتارنے والا پانی جس سے تمام شکوک دُور ہو جاتے ہیں۔ وہ آئینہ جس سے اُس برتر ہستی کا درشن ہو جاتا ہے خدا کا وہ مکالمہ اور مخاطبہ ہے جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ جس کی رُوح میں سچائی کی طلب ہے وہ اُٹھے اور تلاش کرے۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر رُوحوں میں سچی تلاش پیدا ہو اور دلوں میں سچی پیاس لگ جائے تو لوگ اس طریق کو ڈھونڈیں اور اس راہ کی تلاش میں لگیں۔ مگر یہ راہ کس طریق سے کھلے گی اور حجاب کس دُعا سے اُٹھیگا مَیں سب

طالبوں کو یقین دلاتا ہوں کہ صرف اسلام ہی ہے جو اس راہ کی خوشخبری دیتا ہے اور دوسری قومیں تو خدا کے الہام پر مدت سے مہر لگا چکی ہیں۔ سو یقیناً سمجھو کہ یہ خدا کی طرف سے مہر نہیں بلکہ محرومی کی وجہ سے انسان ایک حیلہ پیدا کر لیتا ہے اور یقیناً یہ سمجھو کہ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ہم بغیر آنکھوں کے دیکھ سکیں یا بغیر کانوں کے سن سکیں یا بغیر زبان کے بول سکیں اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ بغیر قرآن کے اس پیارے محبوب کا منہ دیکھ سکیں۔ مَیں جوان تھا اب بوڑھا ہوا مگر مَیں نے کوئی نہ پایا جس نے بغیر اس پاک چشمہ کے اس کھلی کھلی معرفت کا پیالہ پیا ہو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۱۲۸-۱۲۹)

سب سے سیدھی راہ اور بڑا ذریعہ جو انوارِ یقین اور تواتر سے بھرا ہوا اور ہماری روحانی بھلائی اور ترقی علمی کے لئے کامل رہنما ہے قرآن کریم ہے۔ جو تمام دنیا کے دینی نزاعوں کے فیصل کرنے کا متکفل ہو کر آیا ہے۔ جس کی آیت آیت اور لفظ لفظ ہزارہا طور کا تواتر اپنے ساتھ رکھتی ہے اور جس میں بہت سا آبِ حیات ہماری زندگی کے لئے بھرا ہوا ہے اور بہت سے نادر اور بیش قیمت جواہر اپنے اندر مخفی رکھتا ہے جو ہر روز ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ یہی ایک عمدہ محک ہے جس کے ذریعہ سے ہم راستی اور ناراستی میں فرق کر سکتے ہیں۔ یہی ایک روشن چراغ ہے جو عین سچائی کی راہیں دکھاتا ہے۔ بلاشبہ جن لوگوں کو راہِ راست سے مناسبت ہے اور ایک قسم کا رشتہ ہے اُن کا دل قرآن شریف کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ اور خدائے کریم نے اُن کے دل ہی اس طرح کے بنا رکھے ہیں کہ وہ عاشق کی طرح اپنے اس محبوب کی طرف جھکتے ہیں اور بغیر اس کے کسی جگہ قرار نہیں پکڑتے اور اس سے ایک صاف اور صریح بات سُن کر پھر کسی دوسرے کی نہیں سُنتے۔ اس کی ہر ایک صداقت کو خوشی سے اور دوڑ کر قبول کر لیتے ہیں اور آخر وہی ہے جو موجب اشراق اور روشن ضمیری کا ہو جاتا ہے اور عجیب در عجیب انکشافات کا ذریعہ ٹھہرتا ہے اور ہر ایک کو حسبِ استعداد معراج ترقی پر پہنچاتا ہے۔ راستبازوں کو قرآن کریم کے انوار کے نیچے چلنے کی ہمیشہ حاجت رہی ہے اور جب کبھی کسی حالتِ جدیدہ زمانہ نے اسلام کو کسی دوسرے مذہب کے ساتھ ٹکرا دیا ہے تو وہ تیز اور کارگر ہتھیار جو فی الفور کام آیا ہے قرآن کریم ہی ہے۔ ایسا ہی جب کہیں فلسفی خیالات مخالفانہ طور پر شائع ہوتے رہے تو اس خبیث پودہ کی بیخ کنی آخر قرآن کریم ہی نے کی اور ایسا اس کو حقیر اور ذلیل کر کے دکھلا دیا کہ ناظرین کے آگے آئینہ رکھدیا کہ سچا فلسفہ یہ ہے نہ وہ۔ حال کے زمانہ میں بھی جب

اول عیسائی واعظوں نے سر اُٹھایا اور بدفہم اور نادان لوگوں کو توحید سے کھینچ کر ایک عاجز بندہ کا پرستار بنانا چاہا اور اپنے مغشوش طریق کو سوفسطائی طریق سے آراستہ کرکے اُن کے آگے رکھ دیا اور ایک طوفان ملک ہند میں برپا کر دیا۔ آخر قرآن کریم ہی تھا جس نے انہیں پسپا کیا کہ اب وہ لوگ کسی باخبر آدمی کو مُنہ بھی نہیں دکھلا سکتے اور ان کے لمبے چوڑے عذرات کو یوں الگ کرکے رکھدیا جس طرح کوئی کاغذ کا تختہ لپیٹے۔

(ازالہ اوہام صـــ ۲۸۱-۲۸۲)

واللہ انّہ درۃ یتیمۃ ظاھرہٗ نورٌ و باطنہ نورٌ و فوقہٗ نورٌ و تحتہٗ نورٌ و فی کل لفظ نورٌ۔ جنۃ روحانیۃ ذلّلت قطوفھا تذلیلاً وتجری تحتھا الانھار۔ کل ثمرۃ السعادۃ توجد فیہ و کل قبس یقتبس منہ۔ و من دونہ خرط القتاد موارد فیضہ سایغۃ فطوبیٰ للشاربین وقد قذف فی قلبی انوار منہ۔ ما کان لی ان استحصلھا بطریق اٰخر۔ و واللہ **لو لا القراٰن** ما کان لی لطف حیاتی۔ رأیت حسنہ ازید من مائۃ الف یوسف۔ فملت الیہ اشد میلی و اشرب ھو فی قلبی۔ ھو ربّانی کما یربی الجنین۔ ولہ فی قلبی اثر عجیب وحسنہ یراودنی عن نفسی۔ و انّی اُدرکت بالکشف انّ حظیرۃ القدس تسقی بماء القراٰن وھو **بحر موّاج** من ماء الحیاۃ من شرب منہ فھو یحیٰ بل یکون من المحییین۔

(آئینہ کمالات اسلام صـــ ۵۴۵)

خاتم النبیین کا لفظ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بولا گیا ہے بجائے خود چاہتا ہے اور بالطبع اس لفظ میں یہ رکھا گیا ہے کہ وہ کتاب جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے وہ بھی خاتم الکتب ہو اور سارے کمالات اُس میں موجود ہوں اور حقیقت میں وہ کمالات اس میں موجود ہیں کیونکہ کلامِ الٰہی کے نزول کا قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ جس قدر قوت قدسی اور کمال باطنی اس شخص کا ہوتا ہے جس پر کلامِ الٰہی نازل ہوتا ہے اُسی قدر قوت اور شوکت اس کلام کی ہوتی ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی اور کمالِ باطنی چونکہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا تھا جس سے بڑھ کر کسی انسان کا نہ کبھی ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ اس لئے قرآن شریف بھی تمام پہلی کتابوں اور صحائف سے اس اعلیٰ مقام اور مرتبہ پر واقع ہوا ہے جہاں تک کوئی دوسرا کلام نہیں پہنچا کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی استعداد

اور قوتِ قدسی سب سے بڑھی ہوئی تھی اور تمام مقامات کمال آپؐ پر ختم ہو چکے تھے۔ اور آپ انتہائی نقطہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ اس مقام پر قرآن شریف جو آپ پر نازل ہوا کمال کو پہنچا ہوا ہے اور جیسے نبوت کے کمالات آپ پر ختم ہو گئے اسی طرح اعجاز کلام کے کمالات قرآن شریف پر ختم ہو گئے آپ **خاتم النّبیّین** ٹھہرے اور آپ کی کتاب **خاتم الکتب** ٹھہری۔ جس قدر مراتب اور وجوہ اعجاز کلام کے ہو سکتے ہیں اُن سب کے اعتبار سے آپ کی کتاب انتہائی نقطہ پر پہنچی ہوئی ہے۔ یعنی کیا باعتبار فصاحت و بلاغت۔ کیا باعتبار ترتیب مضامین۔ کیا باعتبار تعلیم۔ کیا باعتبار کمالاتِ تعلیم۔ کیا باعتبار ثمراتِ تعلیم۔ غرض جس پہلو سے دیکھو اُسی پہلو سے قرآن شریف کا کمال نظر آتا ہے اور اس کا اعجاز ثابت ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے کسی خاص امر کی نظیر نہیں مانگی بلکہ عام طور پر نظیر طلب کی ہے یعنی جس پہلو سے چاہو مقابلہ کرو۔ خواہ بلحاظ فصاحت و بلاغت۔ خواہ بلحاظ مطالب و مقاصد۔ خواہ بلحاظ تعلیم۔ خواہ بلحاظ پیشگوئیاں اور غیب کے جو قرآن شریف میں موجود ہیں۔ غرض کسی رنگ میں دیکھو یہ معجزہ ہے۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۳۶ - ۳۷)

قرآن شریف ایسا معجزہ ہے کہ نہ وہ اوّل مثل ہوا اور نہ آخر کبھی ہو گا۔ اُسکے فیوض و برکات کا در ہمیشہ جاری ہے اور وہ ہر زمانہ میں اسی طرح نمایاں اور درخشاں ہے جیسا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت تھا۔ علاوہ اس کے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر شخص کا کلام اُس کی ہمت کے موافق ہوتا ہے جس قدر اس کی ہمّت اور عزم اور مقاصد عالی ہونگے اس پایہ کا وہ کلام ہو گا۔ سو وحیٔ الٰہی میں بھی وہی رنگ ہو گا جس شخص کی طرف اُس کی وحی آتی ہے جس قدر ہمت بلند رکھنے والا وہ ہو گا اُسی پایہ کا کلام اُسے ملیگا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہمّت و استعداد اور عزم کا دائرہ چونکہ بہت ہی وسیع تھا اس لئے آپؐ کو جو کلام ملا وہ بھی اس پایہ اور رُتبہ کا ہے کہ دوسرا کوئی شخص اِس ہمّت اور حوصلہ کا کبھی پیدا نہ ہو گا۔ کیونکہ آپ کی دعوت کسی محدود وقت یا مخصوص قوم کے لئے نہ تھی۔ جیسے آپ سے پہلے نبیوں کی ہوتی تھی۔ بلکہ آپ کے لئے فرمایا گیا۔ قل ... اِنّی رسول اللہ الیکم جمیعًا اور ما ارسلنٰک الّا رحمۃ للعالمین ٥ جس شخص کی بعثت اور رسالت کا دائرہ اسقدر وسیع ہو اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ اِس وقت اگر کسی کو قرآن شریف کی کوئی آیت بھی الہام ہو تو ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ اس کے الہام میں اتنا دائرہ وسیع نہیں ہو گا جسقدر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا تھا اور ہے۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۵۷)

قرآن شریف میں جس قدر باریک صداقتیں علم دین کی اور علوم دقیقہ الٰہیات کے اور براہین قاطعہ اصول حقّہ کے معہ دیگر اسرار اور معارف کے مندرج ہیں اگرچہ وہ تمام فی حد ذاتہا ایسے ہیں کہ قوائے بشریہ ان کو بہ ہیئت مجموعی دریافت کرنے سے عاجز ہیں اور کسی عاقل کی عقل ان کے دریافت کرنے کے لئے بطور خود سبقت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ پہلے زمانوں پر نظر استقرائی ڈالنے سے ثابت ہو گیا ہے کہ کوئی حکیم یا فیلسوف ان علوم و معارف کا دریافت کرنیوالا نہیں گذرا۔ لیکن اس جگہ عجیب بر عجیب اَور بات ہے۔ یعنی یہ کہ وہ علوم اور معارف ایک ایسے اُمّی کو عطا کئے گئے کہ جو لکھنے پڑھنے سے ناآشنا محض تھا۔ جس نے عمر بھر کسی مکتب کی شکل نہیں دیکھی تھی اور نہ کسی کتاب کا کوئی حرف پڑھا تھا اور نہ کسی اہل علم یا حکیم کی صحبت میسّر آئی تھی۔ بلکہ تمام عمر جنگلیوں یا وحشیوں میں سکونت رہی انہیں میں پرورش پائی اور انہیں میں سے پیدا ہوئے اور انہیں کے ساتھ اختلاط رہا۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا امّی اور اَن پڑھ ہونا ایک ایسا بدیہی امر ہے کہ کوئی تاریخ دان اسلام کا اس سے بے خبر نہیں۔

(براہین احمدیہ ص ۵۲۹ - ۵۴۱)

جو چیز محض قدرت کاملہ خدائے تعالیٰ سے ظہور پذیر ہو خواہ وہ چیز اس کی مخلوقات میں سے کوئی مخلوق ہو اور خواہ وہ اس کی پاک کتابوں میں سے کوئی کتاب ہو جو لفظاً اور معناً اُسکی طرف سے صادر ہو اُس کا اس صفت سے متصف ہونا ضروری ہے کہ کوئی مخلوق اُس کی مثل بنانے پر قادر نہ ہو۔ اور یہ اصول عام جو ہر یک صادر من اللہ سے متعلق ہے دو طور سے ثابت ہوتا ہے۔ اوّل قیاس سے۔ کیونکہ از روئے قیاس صحیح و مستحکم کے خدا کا اپنی ذات اور صفات اور افعال میں واحد لاشریک ہونا ضروری ہے اور اس کی کوئی صنعت یا قول یا فعل میں شراکت مخلوق کی جائز نہیں۔ دلیل اس پر یہ ہے کہ اگر اس کی کسی صنعت یا قول یا فعل میں شراکت مخلوق کی جائز ہو تو البتہ پھر سب صفات اور افعال میں جائز ہو۔ اور اگر سب صفات اور افعال میں جائز ہو تو پھر کوئی دوسرا خدا بھی پیدا ہونا جائز ہو۔ کیونکہ جس چیز میں تمام صفات خدا کی پائی جائیں اُسی کا نام خدا ہے اور اگر کسی چیز میں بعض صفات باری تعالیٰ کی پائی جائیں تب بھی وہ بعض میں شریک باری تعالیٰ کے ہوئے اور شریک الباری بداہت عقل ممتنع ہے۔ پس اس دلیل سے ثابت ہے کہ خدا کا اپنی تمام صفات اور اقوال اور افعال میں واحد لاشریک ہونا ضروری ہے اور ذات اُس کی ان تمام نالائق امور سے منزہ ہے جو شریک الباری پیدا ہونے کی طرف منجر ہوں۔ دوسرے ثبوت

اس دعویٰ کا استقراء تام سے ہوتا ہے جو ان سب چیزوں پر جو صادر من اللہ ہیں نظر تدبّر کر کے بہ پایۂ صحت پہنچ گیا ہے۔ کیونکہ تمام جزئیات عالم جو خدا کی قدرت کاملہ سے ظہور پذیر ہیں جب ہم ہریک کو اُن میں سے عمیق نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اعلیٰ سے ادنیٰ تک بحدیکہ حقیر سے حقیر چیزوں کو جیسے مکھی اور مچھّر اور عنکبوت وغیرہ ہیں خیال میں لاتے ہیں تو ان میں سے کوئی بھی ایسی چیز ہم کو معلوم نہیں ہوتی جس کے بنانے پر انسان بھی قدرت رکھتا ہو۔ بلکہ ان چیزوں کی بناوٹ اور ترکیب پر غور کرنے سے ایسے عجائب کام دستِ قدرت کے ان کے جسم میں مشہود اور موجود پاتے ہیں جو صانع عالم کے وجود پر دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ ہیں۔ علاوہ ان سب دلائل کے یہ بات بھی ہرایک دانشمند پر روشن ہے کہ اگر یہ جائز ہوتا کہ جو چیزیں خدا کے دستِ قدرت سے ظہور پذیر ہیں اُن کے بنانے پر کوئی دوسرا شخص بھی قادر ہو سکتا تو کسی مصنوع کو اُس خالق حقیقی کے وجود پر دلالت کامل نہ رہتی اور امر معرفت صانع عالم کا بالکل مشتبہ ہو جاتا کیونکہ جب بعض ان اشیاء کو جو خدا تعالےٰ کی طرف سے صادر ہوئیں ہیں بجز خدا کے کوئی اَور بھی بنا سکتا ہے تو پھر اس بات پر کیا دلیل ہے جو کل اشیاء کوئی اَور نہیں بنا سکتا۔ اب جبکہ دلائل مستحکمہ سے ثابت ہو گیا کہ جو چیزیں خدا کی طرف سے ہیں اُن کا بے نظیر ہونا اور پھر ان کی بے نظیری اُن کے منجانب اللہ ہونے پر دلیل قاطع ہونا اُن کی صادر من اللہ ہونے کیلئے شرط ضروری ہے، تو اس تحقیق سے جھوٹ ان لوگوں کا صاف کھل گیا جن کی یہ رائے ہے کہ کلامِ الٰہی کا بےنظیر ہونا ضروری نہیں یا اس کے بے نظیر ہونے سے اس کا خدا کی طرف سے ہونا ثابت نہیں ہو سکتا . . . . پس اس تمام تحقیقات سے ظاہر ہے کہ بے نظیر ہونے کی حقیقت اور کیفیت ربّانی کام اور کلام سے مختص ہے۔ اور ہرایک دانشمند جانتا ہے کہ خدا کی خدائی ماننے کے لئے بڑا بھارا ذریعہ جو کہ عقل کے ہاتھ میں ہے وہ یہی ہے کہ ہرایک صادر من اللہ ایسی بے نظیری کے رتبہ پر ہے کہ اس صانع توحید کے وجود پر دلالت کامل کر رہا ہے اور اگر یہ ذریعہ نہ ہوتا تو پھر عقل کو خدا تک پہنچنے کا راستہ مسدود تھا۔

(براہین احمدیہ ص۱۳۹ - ۱۷۲)

قرآن شریف وہ کتاب ہے جس نے اپنی عظمتوں اپنی حکمتوں اپنی صداقتوں اپنی بلاغتوں اپنے لطائف ونکات اپنے انوار رُوحانی کا آپ دعویٰ کیا ہے اور اپنا بے نظیر ہونا آپ ظاہر فرما دیا ہے۔ یہ بات ہرگز نہیں کہ صرف مسلمانوں نے فقط اپنے خیال میں اُس کی خوبیوں کو قرار

دے دیا ہے بلکہ وہ تو خود اپنی خوبیوں اور اپنے کمالات کو بیان فرماتا ہے اور اپنا بے مثل و مانند ہونا تمام مخلوقات کے مقابلہ پر پیش کر رہا ہے اور بلند آواز ھل من معارض کا نقارہ بجا رہا ہے اور دقائق و حقائق اس کے صرف دو تین نہیں جس میں کوئی نادان شک بھی کرے بلکہ اس کے دقائق تو بحرِ زخّار کی طرح جوش مار رہے ہیں اور آسمان کے ستاروں کی طرح جہاں نظر ڈالو چمکتے نظر آتے ہیں۔ کوئی صداقت نہیں جو اس سے باہر ہو۔ کوئی حکمت نہیں جو اس کے محیطِ بیان سے رہ گئی ہو۔ کوئی نور نہیں جو اس کی متابعت سے نہ ملتا ہو۔ اور یہ باتیں بلا ثبوت نہیں۔ کوئی ایسا امر نہیں جو صرف زبان سے کہا جاتا ہے بلکہ یہ وہ متحقق اور بدیہی الثبوت صداقت ہے کہ جو تیرہ سو برس سے برابر اپنی روشنی دکھلاتی چلی آئی ہے۔ اور ہم نے بھی اس صداقت کو اپنی اس کتاب میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور دقائق اور معارفِ قرآنی کو اس قدر بیان کیا ہے کہ جو ایک طالب صادق کی تسلّی اور تشفی کے لئے بحرِ عظیم کی طرح جوش مار رہے ہیں۔

(براہین احمدیہ ص ۶۴۰-۶۴۳ حاشیہ ۱۱)

قرآن کریم کی شان بلند جو
اسی کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے

وکل العلم فی القرآن لکن ؎ تقاصر منه افہام الرجال

جاننا چاہیئے کہ اس زمانہ میں اسباب ضلالت میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر لوگوں کی نظر میں عظمت قرآن شریف کی باقی نہیں رہی۔ ایک گروہ مسلمانوں کا فلاسفہ ضالہ کا مقلد ہوگیا ہے کہ وہ ہر ایک امر کا عقل سے ہی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ اعلیٰ درجے کا حَکَم جو تصفیہ تنازعات کا انسان کو ملا ہے وہ عقل ہی ہے۔ ایسے ہی یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ وجود جبرائیل اور عزرائیل اور دیگر ملائکہ کرام جیسا کہ شریعت کی کتابوں میں لکھا ہے اور وجود جنت و جہنم جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے وہ تمام صداقتیں عقلی طور پر بپایۂ ثبوت نہیں پہنچتیں تو فی الفور اُن سے منکر ہو جاتے ہیں اور تاویلاتِ رکیکہ شروع کر دیتے ہیں کہ ملائک سے صرف قوتیں مراد ہیں اور وحیٔ رسالت صرف ایک ملکہ ہے اور جنّت اور جہنم صرف ایک روحانی راحت یا رنج کا نام ہے۔ اِن بیچاروں کو خبر نہیں کہ آلۂ دریافت مجہولات صرف عقل نہیں ہے و بس۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کی صداقتیں اور انتہائی مقام کے معارف تو وہی ہیں جو مبلغ عقل سے صدہا درجہ بلند تر ہیں جو بذریعہ مکاشفاتِ صحیحہ

ثابت ہوتی ہیں۔ اور اگر صداقتوں کا محک صرف عقل کو ہی ٹھیرایا جائے تو بڑے بڑے عجائبات کارخانہ الوہیت کے درپردۂ مستوری ومجہولی رہینگے اور سلسلہ معرفت کا محض ناتمام اور ناقص اور ادھورا رہ جائیگا اور کسی حالت میں انسان شکوک اور شبہات سے مخلصی نہیں پاسکیگا اور اس یکطرفہ معرفت کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ بوجہ نہ ثابت ہونے بالائی رہنمائی کے اور بباعث نہ معلوم ہونے تحریکات طاقتِ بالا کے خود اسی صانع کی ذات کے بارے میں طرح طرح کے وساوس دلوں میں پیدا ہو جائیں گے۔ سو ایسا خیال کہ خالق حقیقی کے تمام دقیق در دقیق بھیدوں کے سمجھنے کے لئے صرف عقل ہی کافی ہے کسقدر خام اور ناسعادتی پر دلالت کر رہا ہے۔

اور ان لوگوں کے مقابل پر دوسرا گروہ یہ ہے کہ جس نے عقل کو بکلّی معطل کی طرح چھوڑ دیا ہے اور ایسا ہی قرآن شریف کو بھی چھوڑ کر جو سرچشمہ تمام علوم الٰہیہ ہے صرف روایات واقوال بے سروپا کو مضبوط پکڑ لیا ہے۔ سو ہم ان دونوں گروہ کو اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کی عظمت ونورانیت کا قدر کریں اور اُس کے نور کی راہنمائی سے عقل کو بھی دخل دیں اور کسی غیر کا قول تو کیا چیز ہے اگر کوئی حدیث بھی قرآن کریم کے مخالف پاویں تو فی الفور اس کو چھوڑ دیں۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں آپ فرماتا ہے فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ یعنی قرآن کریم کے بعد کس حدیث پر ایمان لاؤ گے۔ اور ظاہر ہے کہ ہم مسلمانوں کے پاس وہ نصّ جو اول درجہ پر قطعی اور یقینی ہے قرآن کریم ہی ہے۔ اکثر احادیث اگر صحیح بھی ہوں تو مفید ظن ہیں۔ وان الظنّ لا یغنی من الحق شیئًا۔

مندرجہ ذیل صفات قرآن کریم کے غور سے پڑھو اور پھر انصافاً خود ہی کہو کہ کیا مناسب ہے کہ اس کلام کو چھوڑ کر کوئی اور ہادی یا حَکَم مقرر کیا جائے۔ اور وہ آیات یہ ہیں:۔

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ۔ اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ۔ وَاِنَّہٗ لَتَذْکِرَۃٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ وَاِنَّہٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ۔ حِکْمَۃٌ بَالِغَۃٌ۔ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ۔ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ۔ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ۔ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ۔ اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ۔ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَھُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْہِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃً لِّقَوْمٍ تُؤْمِنُوْنَ۔ فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ۔ لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ۔ ھٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ

هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ - فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ
قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔

یعنی یہ قرآن اس راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے جو نہایت سیدھی ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو پرستار ہیں حقیقی پرستش کی تعلیم ہے اور یہ اُن کے لئے جو متقی ہیں کمالات تقویٰ کے یاد دلانے والا ہے۔ یہ حکمت ہے جو کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور یہ یقینی سچائی ہے اور اس میں ہر یک چیز کا بیان ہے۔ یہ نور علیٰ نور اور سینوں کو شفا بخشنے والا ہے۔ رحمٰن نے قرآن کو سکھلایا ایسی کتاب نازل کی جو اپنی ذات میں حق ہے اور حق کے وزن کرنے کے لئے ایک ترازو ہے۔ وہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اجمالی ہدایتوں کی اس میں تشریح ہے۔ اور وہ اپنے دلائل کے ساتھ حق اور باطل میں فرق کرتا ہے۔ اور وہ قول فصل ہے اور شک و شبہ سے خالی ہے۔ ہم نے اس کو اس لئے تجھ پر اتارا ہے کہ تا امور متنازعہ فیہ کا اس سے فیصلہ کر دیں اور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا سامان تیار کر دیں۔ اس میں وہ تمام صداقتیں موجود ہیں جو پہلی کتابوں میں متفرق اور پراگندہ طور پر موجود تھیں ایک ذرّہ باطل کا اس میں دخل نہیں نہ آگے سے اور نہ پیچھے سے۔ یہ لوگوں کے لئے روشن دلیلیں ہیں اور جو یقین لانے والے ہوں اُن کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔ سو ایسی کونسی حدیث ہے جس پر تم اللہ اور اُس کی آیات کو چھوڑ کر ایمان لاؤ گے۔ اگر کوئی حدیث قرآن کریم سے مخالف ہو تو ہرگز نہیں ماننا چاہیئے بلکہ ردّ کر دینی چاہیئے۔ ہاں اگر کوئی حدیث بذریعہ تاویل قرآن کریم کے بیان سے مطابق آسکے مان لینا چاہیئے۔ پھر بعد اس کے ترجمہ بقیہ آیات کا یہ ہے کہ اِن کو کہدے کہ خدائے تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے یہ قرآن ایک بیش قیمت مال ہے سو اس کو تم خوشی سے قبول کرو۔ یہ ان مالوں سے اچھا ہے جو تم جمع کرتے ہو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم و حکمت کی مانند کوئی مال نہیں یہ وہی مال ہے جس کی نسبت پیشگوئی کے طور پر لکھا تھا کہ مسیح دنیا میں آکر اس مال کو اس قدر تقسیم کریگا کہ لوگ لیتے لیتے تھک جائیں گے۔ یہ نہیں کہ مسیح درم و دینار کو جو مصداق آیت انّما اموالکم واولادکم فتنۃ ہے جمع کریگا اور دانستہ ہر ایک کو مال کثیر دے کر فتنہ میں ڈال دیگا۔ مسیح کی پہلی فطرت کو بھی ایسے مال سے مناسبت نہیں۔ وہ خود انجیل میں بیان کر چکا ہے کہ مومن کا مال درم و دینار نہیں بلکہ جواہر حقائق و معارف اس کا مال ہیں۔ یہی مال انبیاء خدائے تعالیٰ سے پاتے ہیں اور اس کو تقسیم کرتے ہیں۔ اسی مال کی طرف اشارہ ہے کہ انما انا قاسم واللہ ھو المعطی۔ حدیثوں میں یہ بات بوضاحت لکھی گئی ہے۔

کہ مسیح موعود اس وقت دنیا میں آئیگا کہ جب علم قرآن زمین پر اُٹھ جائیگا اور جہل شیوع پا جائیگا یہ وہی زمانہ ہے جس کی طرف ایک حدیث میں یہ اشارہ ہے لو کان الایمان معلقاً عند الثریا لنالہ رجل من فارس۔ یہ وہ زمانہ ہے جو اس عاجز پر کشفی طور پر ظاہر ہوا جو کمال طغیان اس کا اس سنہ ہجری میں شروع ہوگا جو آیت انّا علیٰ ذھاب بہ لقادرون میں بحساب جمل مخفی ہے یعنی ۱۲۷۴ھ۔ اس مقام کو غور سے دیکھو اور جلدی سے نکل نہ جاؤ اور خدا سے دعا مانگو کہ وہ تمہارے سینوں کو کھول دے۔ آپ لوگ تھوڑے سے تامل کے ساتھ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ حدیثوں میں یہ وارد ہے کہ آخری زمانہ میں قرآن زمین سے اُٹھا لیا جائیگا اور علم قرآن مفقود ہو جائیگا۔ اور جہل پھیل جائے گا۔ اور ایمانی ذوق اور حلاوت دلوں سے دُور ہو جائیگی۔ پھر ان حدیثوں میں یہ حدیث بھی ہے کہ اگر ایمان ثریّا کے پاس بھی جا ٹھیریگا یعنی زمین پر اس کا نام ونشان نہیں رہے گا تو ایک آدمی فارسیوں میں سے اپنا ہاتھ پھیلائیگا اور وہیں ثریّا کے پاس سے اس کو لے لیگا۔ اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب جہل اور بے ایمانی اور ضلالت جو دوسری حدیثوں میں دخان کے ساتھ تعبیر کی گئی ہے دنیا میں پھیل جائیگی اور زمین میں حقیقی ایمان داری ایسی کم ہو جائیگی کہ گویا وہ آسمان پر اُٹھ گئی ہوگی اور قرآن کریم ایسا متروک ہو جائیگا کہ گویا وہ خدائے تعالیٰ کی طرف اُٹھایا گیا ہوگا تب ضرور ہے کہ فارس کی اصل سے ایک شخص پیدا ہو اور ایمان کو ثریّا سے لیکر پھر زمین پر نازل ہو۔ سو یقیناً سمجھو کہ نازل ہونے والا ابن مریم یہی ہے۔

(ازالہ اوہام ص ۳۵۴ - ۳۵۶)

مَیں جوان تھا اب بوڑھا ہو گیا اور اگر لوگ چاہیں تو گواہی دے سکتے ہیں کہ مَیں دنیا داری کے کاموں میں نہیں پڑا اور دینی شغل میں ہمیشہ میری دلچسپی رہی۔ مَیں نے اس کلام کو جسکا نام قرآن ہے نہایت درجہ تک پاک اور رُوحانی حکمت سے بھرا ہوا پایا۔ نہ وہ کسی انسان کو خدا بناتا اور نہ روحوں اور جسموں کو اس کی پیدائش سے باہر رکھ کر اس کی مذمت اور نندیا کرتا۔ اور وہ برکت جس کے لئے مذہب قبول کیا جاتا ہے اس کو یہ کلام آخر انسان کے دل پر وارد کر دیتا ہے اور خدا کے فضل کا اس کو مالک بنا دیتا ہے۔ پس کیونکر ہم روشنی پاکر پھر تاریکی میں آویں۔ اور آنکھیں پاکر پھر اندھے بن جاویں۔

(سناتن دھرم ص ۶-۷)

یہ امر ثابت شدہ ہے کہ قرآن شریف نے دین کے کامل کرنے کا حق ادا کر دیا۔ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینًا ۔ یعنی آج مَیں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے اور مَیں اسلام کو تمہارا دین مقرر کرکے خوش ہوا۔ سو قرآن شریف کے بعد کسی کتاب کو قدم رکھنے کی جگہ نہیں کیونکہ جس قدر انسان کی حاجت تھی وہ سب کچھ قرآن شریف بیان کر چکا ۔ اب صرف مکالماتِ الٰہیہ کا دروازہ کھلا ہے اور وہ بھی خود بخود نہیں بلکہ سچّے اور پاک مکالمات جو صریح اور کھلے طور پر نصرتِ الٰہی کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں اور بہت سے امورِ غیبیہ پر مشتمل ہوتے ہیں وہ بعد تزکیہ نفس محض پیروی قرآن شریف اور اتباع آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوتے ہیں۔

(چشمۂ معرفت مـ۴۲)

یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ایک الہام کے لئے وہ سنّت اللہ بطور امام اور مہیمن اور پیشرو کے ہے جو **قرآن کریم** میں وارد ہو چکی ہے۔ اور ممکن نہیں کہ کوئی الہام اس سنّت کو توڑ کر ظہور میں آوے کیونکہ اس سے پاک نوشتوں کا باطل ہونا لازم آتا ہے۔

(تبلیغ رسالت جلد سوم مـ۱۵۶)

جاننا چاہیئے کہ کھلا کھلا اعجاز قرآن شریف کا جو ہر ایک قوم اور ہر ایک اہل زبان پر روشن ہو سکتا ہے جس کو پیش کرکے ہم ہر ایک ملک کے آدمی کو خواہ ہندی ہو یا پارسی یا یورپین یا امریکن یا کسی اور ملک کا ہو ملزم و ساکت و لاجواب کر سکتے ہیں ۔ وہ غیر محدود معارف و حقائق و علوم حکمیہ قرآنیہ ہیں جو ہر زمانہ میں اس زمانہ کی حاجت کے موافق کھلتے جاتے ہیں اور ہر ایک زمانہ کے خیالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلّح سپاہیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ اگر قرآن شریف اپنے حقائق و دقائق کے لحاظ سے ایک محدود چیز ہوتی تو ہرگز وہ معجزہ تامہ نہیں ٹھیر سکتا تھا فقط بلاغت و فصاحت ایسا امر نہیں ہے جس کی اعجازی کیفیت ہر ایک خواندہ ناخواندہ کو معلوم ہو جائے ۔ کھلا کھلا اعجاز اس کا تو یہی ہے کہ وہ غیر محدود معارف و دقائق اپنے اندر رکھتا ہے۔ جو شخص قرآن شریف کے اس اعجاز کو نہیں مانتا وہ علم قرآن سے سخت بے نصیب ہے۔ و من لم یؤمن بذالک الاعجاز فواللہ ما قدر القراٰن حق قدرہٖ و ما عرف اللہ حق معرفتہٖ وما وقر الرسول حق توقیرہٖ

اے بندگانِ خدا! یقیناً یاد رکھو کہ قرآن شریف میں غیر محدود معارف و حقائق کا اعجاز

ایسا کامل اعجاز ہے جس نے ہر ایک زمانہ میں تلوار سے زیادہ کام کیا ہے۔ اور ہر یک زمانہ اپنی نئی حالت کے ساتھ جو کچھ شبہات پیش کرتا ہے یا جس قسم کے اعلیٰ معارف کا دعویٰ کرتا ہے اس کی پوری مدافعت اور پورا الزام اور پورا پورا مقابلہ قرآن شریف میں موجود ہے۔ کوئی شخص برہمو یا بدھ مذہب والا یا آریہ یا کسی اور رنگ کا فلسفی کوئی ایسی الٰہی صداقت نکال نہیں سکتا جو قرآن شریف میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ قرآن شریف کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ اور جس طرح صحیفۂ فطرت کے عجائب و غرائب خواص کسی پہلے زمانہ تک ختم نہیں ہو چکے بلکہ جدید در جدید پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ یہی حال اِن صحفِ مطہرہ کا ہے تا خدائے تعالےٰ کے قول اور فعل میں مطابقت ثابت ہو۔ اور میں اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ قرآن شریف کے عجائبات اکثر بذریعہ الہام میرے پر کھلتے رہتے ہیں اور اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ تفسیروں میں ان کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ مثلاً یہ جو اس عاجز پر کھلا ہے کہ ابتدائے خلقت آدم سے جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ بعثت تک مدت گذری تھی وہ تمام مدت مورٔ والعصر کے اعداد حروف میں بحساب قمری مندرج ہے یعنی چار ہزار ۴۷۴ سات سو چالیس۔ اب تبلاؤ کہ یہ دقائق قرآنیہ جس میں قرآن کریم کا اعجاز نمایاں ہے کس تفسیر میں لکھے ہیں۔ ایسا ہی خدا تعالےٰ نے میرے پر یہ نکتہ معارفِ قرآنیہ کا ظاہر کیا کہ انّا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر کے صرف یہی معنے نہیں کہ ایک بابرکت رات ہے جس میں قرآن شریف اُترا بلکہ باوجود ان معنوں کے جو بجائے خود صحیح ہیں اِس آیت کے بطن میں دوسرے معنے بھی ہیں جو رسالہ فتح اسلام میں درج کئے گئے ہیں۔ اب فرمائیے کہ یہ تمام معارفِ حقّہ کس تفسیر میں موجود ہیں؟ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ قرآن شریف کے ایک معنے کے ساتھ اگر دوسرے معنے بھی ہوں تو ان دونوں میں کوئی تناقض پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہدایتِ قرآنی میں کوئی نقص عائد حال ہوتا ہے بلکہ ایک نور کے ساتھ دوسرا نور مل کر عظمتِ فرقانی کی روشنی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اور چونکہ زمانہ غیر محدود انقلابات کی وجہ سے غیر محدود خیالات کا بالطبع محرّک ہے لہذا اس کا نئے پیرایہ میں ہو کر جلوہ گر ہونا یا نئے نئے علوم کو بمنصّہ ظہور لانا۔ نئے نئے بدعات اور محدثات کو کھلانا ایک ضروری امر اس کے لئے پڑا ہوا ہے۔ اب اس حالات میں ایسی کتاب جو خاتم الکتب ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اگر زمانہ کے ہر ایک رنگ کے ساتھ مناسب حال اس کا تدارک نہ کرے تو وہ ہرگز خاتم الکتب نہیں ٹھہر سکتی۔ اور اگر اس کتاب میں مخفی طور پر وہ سب سامان

موجود ہے جو ہریک حالتِ زمانہ کے لئے درکار ہے تو اس صورت میں ہمیں ماننا پڑے گا کہ قرآن بلاریب غیر محدود معارف پر مشتمل ہے اور ہریک زمانہ کی ضرورتِ لاحقہ کا کامل طور پر متکفل ہے۔

اب یہ بھی یاد رہے کہ عادت اللہ ہریک کامل ملہم کے ساتھ یہی رہی ہے کہ عجائبات مخفیہ فرقانی اس پر ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات ایک ملہم کے دل پر قرآن شریف کی آیت الہام کے طور پر القاء ہوتی ہے اور اصل معانی سے پھیر کر کوئی اور مقصود اس سے ہوتا ہے۔ جیساکہ مولوی عبداللہ صاحب مرحوم غزنوی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ مجھے ایک مرتبہ الہام ہوا۔ خلنا یا نار کونی بردًا وسلامًا مگر میں اس کے معنے نہ سمجھا۔ پھر الہام ہوا قلنا یا صبر کونی بردًا وسلامًا تب میں سمجھ گیا کہ نار سے مرادِ اسجگہ صبر ہے۔

(ازالہ اوہام ص ۱۵۵-۱۶۲)

یہی زمانہ ہے کہ جس میں ہزارہا قسم کے اعتراضات اور شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ اور انواع واقسام کے عقلی حملے اسلام پر کئے گئے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے وان من شیءٍ الّا عندنا خزائنہٗ وما ننزّلہٗ الّا بقدرٍ مّعلوم یعنی ہر ایک چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں مگر بقدر معلوم اور بقدر ضرورت ہم ان کو اتارتے ہیں۔ سو جسقدر معارف و حقائق بطون قرآن میں چھپے ہوئے ہیں جو ہر ایک قسم کے ادیان فلسفیہ وغیر فلسفیہ کو مقہور و مغلوب کرتے ہیں۔ ان کے ظہور کا زمانہ یہی تھا۔ کیونکہ وہ بجز تحریک پیش آمدہ کے ظاہر نہیں ہو سکتے تھے۔ سو اب مخالفانہ حملے جو نئے فلسفہ کی طرف سے ہوئے تو ان معارف کے ظاہر ہونے کا وقت آگیا اور ممکن نہیں تھا کہ بغیر اس کے کہ وہ معارف ظاہر ہوں اسلام تمام ادیان باطلہ پر فتح پا سکے کیونکہ سیفی فتح کچھ چیز نہیں اور چند روزہ اقبال کے دُور ہو جانے سے وہ فتح بھی معدوم ہو جاتی ہے۔ سچی اور حقیقی فتح وہ ہے جو معارف اور حقائق اور کامل صداقتوں کے لشکر کے ساتھ حاصل ہو۔ سو وہ یہ فتح ہے جو اب اسلام کو نصیب ہو رہی ہے۔ بلاشبہ یہ پیشگوئی اس زمانہ کے حق میں ہے۔ اور سلف صالح بھی ایسا ہی سمجھتے آئے ہیں۔ یہ زمانہ درحقیقت ایسا زمانہ ہے جو بالطبع تقاضا کر رہا ہے جو قرآن شریف ان تمام بطون کو ظاہر کرے جو اس کے اندر مخفی چلے آتے ہیں .... یہ بات ہر ایک فہیم کو جلدی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ کے کوئی مصنوع دقائق و غرائب خواص سے خالی نہیں۔ اور اگر ایک مکھی کے خواص و عجائبات کی قیامت تک تحقیق و تفتیش کرتے جائیں تو بھی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ تو اب سوچنا چاہیئے کہ کیا خواص و عجائبات قرآن کریم کے

اپنے قدر و انداز میں کتّھی جتنے نہیں؛ بلاشبہ وہ عجائبات تمام مخلوقات کے مجموعی عجائبات سے بہت بڑھ کر ہیں۔ اور ان کا انکار درحقیقت قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کا انکار ہے کیونکہ دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے صادر ہو اور اُس میں بے انتہا عجائبات نہ پائے جائیں۔ . . . . وہ نکات و حقائق جو معرفت کو زیادہ کرتے ہیں وہ ہمیشہ حسب ضرورت کھلتے رہتے ہیں۔ اور نئے نئے فسادوں کے وقت نئے نئے پُرحکمت معانی بمنصّۂ ظہور آتے رہتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کریم بذاتِ خود معجزہ ہے۔ اور بڑی بھاری وجہ اعجاز کی اُس میں یہ ہے کہ وہ جامع حقائق غیر متناہیہ ہے مگر بغیر وقت کے وہ ظاہر نہیں ہوتے۔ جیسے جیسے وقت کے مشکلات تقاضا کرتے ہیں وہ معارف خفیہ ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ دیکھو دنیوی علوم جو اکثر مخالف قرآن کریم اور غفلت میں ڈالنے والے کیسے آجکل ایک زور سے ترقی کر رہے ہیں۔ اور زمانہ اپنے علوم ریاضی اور طبعی اور فلسفہ کی تحقیقاتوں میں کیسی ایک عجیب طور کی تبدیلیاں دکھلا رہا ہے اور کیا ایسے نازک وقت میں ضرور نہ تھا کہ ایمانی اور عرفانی ترقیات کے لئے بھی دروازہ کھولا جاتا تا شرورِ محدثہ کی مدافعت کے لئے آسانی پیدا ہو جاتی۔ سو یقیناً سمجھو کہ وہ دروازہ کھولا گیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے ارادہ کر لیا ہے کہ تا قرآن کریم کے عجائبات مخفیہ اس دنیا کے متکبّر فلسفیوں پر ظاہر کرے۔ اب نیم ملاں دشمن اسلام اس ارادہ کو روک نہیں سکتے۔ اگر اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئینگے تو ہلاک کئے جائینگے اور قہری طمانچہ حضرتِ قہار کا ایسا لگیگا کہ خاک میں مل جائیں گے۔ اِن نادانوں کو حالتِ موجودہ پر بالکل نظر نہیں۔ چاہتے ہیں کہ قرآن کریم مغلوب اور کمزور اور ضعیف اور حقیر سا نظر آوے لیکن اب وہ ایک جنگی بہادر کی طرح نکلیگا۔ ہاں وہ ایک شیر کی طرح میدان میں آئیگا اور دنیا کے تمام فلسفہ کو کھا جائیگا اور اپنا غلبہ دکھائیگا اور لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ کی پیشگوئی پوری کر دے گا۔ اور پیشگوئی ولیمکّننّ لھم دینھم کو روحانی طور سے کمال تک پہنچائے گا۔ کیونکہ دین کا زمین پر بوجہ کمال قائم ہو جانا محض جبر و اکراہ سے ممکن نہیں۔ دین اسوقت زمین پر قائم ہوتا ہے کہ جب اس کے مقابل پر کوئی دین کھڑا نہ رہے اور تمام مخالف سپر ڈال دیں۔ سو اب وہی وقت آگیا۔ اب وہ وقت نادان مولویوں کے روکنے سے رُک نہیں سکتا۔ اب وہ ابن مریم جسکا رُوحانی باپ زمین پر بجز معلّم حقیقی کے کوئی نہیں جو اس وجہ سے آدم سے بھی مشابہت

رکھتا ہے بہت سا خزانہ قرآن کریم کا لوگوں میں تقسیم کرے گا۔ یہاں تک کہ لوگ قبول کرتے کرتے تھک جائیں گے۔ اور لا یقبلہٗ احد کا مصداق بن جائینگے اور ہر یک طبیعت اپنے ظرف کے مطابق پُر ہو جائیگی۔

(ازالہ اوہام ص ۳۶۴-۳۶۷)

پاک اور کامل تعلیم قرآن شریف کی ہے جو انسانی درخت کی ہر ایک شاخ کی پرورش کرتی ہے اور قرآن شریف صرف ایک پہلو پر زور نہیں ڈالتا بلکہ کبھی تو عفو اور درگذر کی تعلیم دیتا ہے مگر اس شرط سے کہ عفو کرنا قرین مصلحت ہو اور کبھی مناسب محل اور وقت کے مجرم کو سزا دینے کے لئے فرماتا ہے پس درحقیقت قرآن شریف خدا تعالیٰ کے اُس قانونِ قدرت کی تصویر ہے جو ہمیشہ نظر کے سامنے ہے۔ یہ بات نہایت معقول ہے کہ خدا کا قول اور فعل دونوں مطابق ہونے چاہئیں یعنی جس رنگ اور طرز پر دنیا میں خدا تعالیٰ کا فعل نظر آتا ہے ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ کی سچّی کتاب اپنے فعل کے مطابق تعلیم کرے۔ نہ یہ کہ فعل سے کچھ اور ظاہر ہو اور قول سے کچھ اور ظاہر ہو۔ خدا تعالیٰ کے فعل میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیشہ نرمی اور درگذر نہیں بلکہ وہ مجرموں کو طرح طرح کے عذابوں سے سزایاب بھی کرتا ہے۔ ایسے عذابوں کا پہلی کتابوں میں بھی ذکر ہے ہمارا خدا صرف حلیم خدا نہیں بلکہ وہ حکیم بھی ہے۔ اور اسکا قہر بھی عظیم ہے سچی کتاب وہ کتاب ہے جو اس کے قانونِ قدرت کے مطابق ہے اور سچّا قولِ الٰہی وہ ہے جو اس کے فعل کے مخالف نہیں۔ ہم نے کبھی مشاہدہ نہیں کیا کہ خدا نے اپنی مخلوق کے ساتھ ہمیشہ حلم اور درگذر کا معاملہ کیا ہو اور کوئی عذاب نہ آیا ہو۔ اب بھی ناپاک طبع لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے ایک عظیم الشان اور ہیبت ناک زلزلے کی خبر دے رکھی ہے جو اُن کو ہلاک کرے گا۔

(چشمۂ مسیحی ص ۱۲-۱۳ طبع اوّل)

ایک اور اعتراض تھا جو ہم نے عیسائیوں کی موجودہ انجیلوں پر کیا تھا جس کی وجہ سے پادری صاحبوں کو بہت شرمندگی اُٹھانی پڑی اور وہ یہ ہے کہ انجیل انسان کی تمام قوتوں کی مربّی نہیں ہوسکتی اور جو کچھ اُس میں کسی قدر اخلاقی حصّہ موجود ہے وہ بھی دراصل توریت کا انتخاب ہے۔ اس پر بعض عیسائیوں نے یہ اعتراض اٹھایا تھا کہ " خدا کی کتاب کے مناسب حال صرف اخلاقی حصہ ہوتا ہے اور سزا جزا کے قوانین خدا کی کتاب کے مناسب حال نہیں۔ کیونکہ جرائم کی سزائیں حالات متبدلہ کی مصلحت کی رُو سے ہونی چاہئیں اور وہ حالات غیر محدود ہیں

اِس لئے اُن کے لئے صرف ایک ہی قانونِ سزا ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ ہر ایک سزا جیسا کہ وقت تقاضا کرے اور مجرموں کی تنبیہ اور سرزنش کے لئے مفید پڑ سکے دینی چاہیئے لہذا ہمیشہ ایک ہی رنگ میں ان کا ہونا اصلاحِ خلائق کے لئے مفید نہیں ہوگا اور اِس طرح پر قوانینِ دیوانی اور فوجداری اور مالگذاری کو محدود کر دینا اسی بدنتیجہ کا موجب ہوگا کہ جو ایسی نئی صداقتوں کے وقت میں پیدا ہو سکتا ہے جو ان قوانین محدودہ سے باہر ہوں۔ مثلاً ایک ایسی جدید طرز کے امور تجارت پر مخالفانہ اثر کرے جو ایسے عام رواج پر مبنی ہوں جن سے اس گورنمنٹ میں کسی طرح گریز نہ ہو سکے اور یا کسی اور طرز کے جدید معاملات پر موثر ہو اور یا کسی اور تمدنی حالت پر اثر رکھتا ہو اور یا بدمعاشوں کے ایسے حالات راسخہ پر غیر مفید ثابت ہو جو ایک قسم کی سزا کی عادت پکڑ گئے ہوں یا اس سزا کے لائق نہ رہے ہوں۔" مگر میں کہتا ہوں کہ یہ خیالات ان لوگوں کے ہیں جنہوں نے کبھی تدبّر سے خدا کی کلام قرآن شریف کو نہیں پڑھا۔ اب میں حق کے طالبوں کو سمجھاتا ہوں کہ قرآن شریف میں ایسے احکام جو دیوانی اور فوجداری اور مال کے متعلق ہیں دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں سزا یا طریق انصاف کی تفصیل ہے۔ دوسرے وہ جن میں ان امور کو صرف قواعد کلیّہ کے طور پر لکھا ہے یا کسی خاص طریق کی تعیین نہیں کی۔ اور وہ احکام اس غرض سے ہیں کہ تا اگر کوئی نئی صورت پیدا ہو تو مجتہد کو کام آویں۔ مثلاً قرآن شریف میں ایک جگہ تو یہ ہے کہ دانت کے بدلے دانت۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ یہ تو تفصیل ہے۔ اور دوسری جگہ یہ اجمالی عبارت ہے کہ جزاؤا سیّئۃٍ سیّئۃٌ مّثلھا۔ پس جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجمالی عبارت توسیع قانون کے لئے بیان فرمائی گئی ہے کیونکہ بعض صورتیں ایسی ہیں کہ ان میں یہ قانون جاری نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک ایسا شخص کسی کا دانت توڑے کہ اُس کے مُنّہ میں دانت نہیں اور بباعث کبرسنی یا کسی اور سبب سے اُس کے دانت نکل گئے ہیں۔ تو دندان شکنی کی سزا میں ہم اُس کا دانت توڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ اس کے مُنّہ میں دانت ہی نہیں ایسا ہی اگر ایک اندھا کسی کی آنکھ پھوڑ دے تو ہم اس کی آنکھ نہیں پھوڑ سکتے کیونکہ اُسکی تو آنکھیں ہی نہیں۔ خلاصہ مطلب یہ کہ قرآن شریف نے ایسی صورتوں کو احکام میں داخل کرنے کے لئے اس قسم کے قواعد کلیہ بیان فرمائے ہیں۔ پس اس کے احکام اور قوانین پر کیونکر اعتراض ہو سکے اور اُس نے صرف یہی نہیں کہا بلکہ ایسے قواعد کلیہ بیان فرما کر ہر ایک کو اجتہاد اور استخراج اور استنباط کی ترغیب دی ہے۔ مگر افسوس کہ یہ ترغیب اور طرز تعلیم توریت میں نہیں پائی جاتی اور

انجیل تو اس کامل تعلیم سے بالکل محروم ہے۔ اور انجیل میں صرف چند اخلاق بیان کئے گئے ہیں اور وہ بھی کسی ضابطہ اور قانون کے سلسلہ میں منسلک نہیں ہیں۔ اور یاد رہے کہ عیسائیوں کا یہ بیان کہ انجیل نے قوانین کی باتوں کو انسانوں کی سمجھ پر چھوڑ دیا ہے جائے فخر نہیں بلکہ جائے انفعال اور ندامت ہے۔ کیونکہ ہر ایک امر جو قانونِ کلّی اور قواعد مرتبہ منتظمہ کے رنگ میں بیان نہ کیا جائے وہ امر گو کیسا ہی اپنے مفہوم کی رو سے نیک ہو بداستعمالی کی رو سے نہایت بد اور مکروہ ہو جاتا ہے۔

(کتاب البریہ ص۸۷-۸۸)

ہمارا خداوند کریم کہ جو دلوں کے پوشیدہ بھیدوں کو خوب جانتا ہے اِس بات پر گواہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ذرّہ کا ہزارم حصّہ بھی قرآن شریف کی تعلیم میں کچھ نقص نکال سکے یا بمقابلہ اس کے اپنی کسی کتاب کی ایک ذرّہ بھر کوئی ایسی خوبی ثابت کر سکے کہ جو قرآنی تعلیم کے برخلاف ہو اور اس سے بہتر ہو تو ہم سزائے موت بھی قبول کرنے کو تیار ہیں۔

(براہین احمدیہ ص۲۸۸ حاشیہ ۲)

آج روئے زمین پر سب الہامی کتابوں میں سے ایک فرقان مجید ہی ہے کہ جس کا کلامِ الٰہی ہونا دلائلِ قطعیہ سے ثابت ہے۔ جس کے اصول نجات کے بالکل راستی اور وضع فطرتی پر مبنی ہیں جس کے عقائد ایسے کامل اور مستحکم ہیں جو براہین قویہ ان کی صداقت پر شاہدِ ناطق ہیں۔ جس کے احکام حق محض پر قائم ہیں۔ جس کی تعلیمات ہر یک طرح کی آمیزشِ شرک اور بدعت اور مخلوق پرستی سے بکلّی پاک ہیں جس میں توحید اور تعظیمِ الٰہی اور کمالاتِ حضرتِ عزّت کے ظاہر کرنے کے لئے انتہا کا جوش ہے۔ جس میں یہ خوبی ہے کہ سراسر وحدانیت جناب الٰہی سے بھرا ہوا ہے اور کسی طرح کا دھبّہ نقصان اور عیب اور نالائق صفات کا ذات پاک حضرتِ باری پر نہیں لگاتا اور کسی اعتقاد کو زبردستی تسلیم نہیں کرانا چاہتا بلکہ جو تعلیم دیتا ہے۔ اس کی صداقت کی وجوہات پہلے دکھلا لیتا ہے۔ اور ہر ایک مطلب اور مدعا کو حجج اور براہین سے ثابت کرتا ہے اور ہر یک اصول کی حقّیت پر دلائل واضح بیان کر کے مرتبہ یقین کامل اور معرفتِ تام تک پہنچاتا ہے اور جو جو خرابیاں اور ناپاکیاں اور خلل اور فساد لوگوں کے عقائد اور اعمال اور اقوال اور افعال میں پڑے ہوئے ہیں ان تمام مفاسد کو روشن براہین سے دُور کرتا ہے اور وہ تمام آداب سکھاتا ہے کہ جن کا جاننا انسان کو انسان بننے کے لئے نہایت ضروری ہے اور ہر یک فساد کی اس زور سے مدافعت کرتا

ہے کہ جس زور سے وہ آجکل پھیلا ہُوا ہے۔ اُس کی تعلیم نہایت مستقیم اور قوی اور سلیم ہے گویا احکامِ قدرت کا ایک آئینہ ہے اور قانونِ فطرت کی ایک عکسی تصویر ہے اور بینائی دل اور بصیرتِ قلبی کیلئے ایک آفتاب چشم افروز ہے اور عقل کے اجمال کو تفصیل دینے والا اور اس کے نقصان کا جبر کرنیوالا ہے۔ لیکن دوسری کتابیں جو الہامی کہلاتی ہیں جب اُن کی حالت موجودہ کو دیکھا گیا تو بخوبی ثابت ہو گیا جو وہ سب کتابیں اِن صفاتِ کاملہ سے بالکل خالی اور عاری ہیں اور خدا کی ذات اور صفات کی نسبت طرح طرح کی بدگمانیاں اُن میں پائی جاتی ہیں۔ اور مقلد ان کتابوں کے عجیب عجیب عقائد کے پابند ہو رہے ہیں۔ کوئی فرقہ ان میں سے خدا کو خالق اور قادر ہونے سے جواب دے رہا ہے اور قدیم اور خود بخود ہونے میں اس کا بھائی اور حصہ دار بن بیٹھا ہے اور کوئی بتوں اور مورتوں اور دیوتوں کو اس کے کارخانہ میں دخیل اور اس کی سلطنت کا مدار المہام سمجھ رہا ہے۔ کوئی اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں اور پوتے اور پوتیاں تراش رہا ہے۔ اور کوئی خود اس کو مچھ اور کچھ کا جنم دے رہا ہے۔ غرض ایک دوسرے سے بڑھ کر اس ذات کامل کو ایسا خیال کر رہے ہیں کہ گویا وہ نہایت ہی بدنصیب ہے کہ جس کمال تام کو اس کے لئے عقل چاہتی تھی وہ اس کو میسّر نہ ہُوا۔ اب اے بھائیو! خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب مَیں نے ایسے ایسے باطل عقائد میں لوگوں کو مبتلا دیکھا اور اس درجہ کی گمراہی میں پایا کہ جس کو دیکھکر جی پگھل آیا اور دل اور بدن کانپ اُٹھا تو مَیں نے اُنکی رہنمائی کے لئے اس کتاب کا تالیف کرنا اپنے نفس پر ایک حق واجب اور دین لازم دیکھا جو بجز ادا کرنے کے ساقط نہ ہو گا۔

(براہین احمدیہ ص ۸۱ - ۸۳)

وہ براہین جو قرآن شریف کی حقّیت اور افضلیت پر بیرونی شہادتیں ہیں چار قسم پر ہیں ایک وہ جو امور محتاج الاصلاح سے ماخوذ ہیں۔ دوسری وہ جو امور محتاج التکمیل سے ماخوذ ہیں۔ تیسری وہ جو امور قدرتیہ سے ماخوذ ہیں۔ چوتھی وہ جو امورِ غیبیہ سے ماخوذ ہیں۔ لیکن وہ براہین جو قرآن شریف کی حقّیت اور افضلیت پر اندرونی شہادتیں ہیں وہ امور قدرتیہ ہی سے ماخوذ ہیں اور تعریف اقسام مذکورہ کی بہ تفصیل ذیل ہے:—

امور محتاج الاصلاح سے وہ امور کفر اور بے ایمانی اور شرک اور بدعملی کے مراد ہیں۔ جن کو بنی آدم نے بجائے عقائد حقہ اور اعمال صالحہ کے اختیار کر رکھا ہو اور جو عام طور پر دنیا میں پھیلنے کی وجہ سے اس لائق ہو گئے ہوں کہ عنایتِ ازلیہ ان کی اصلاح کی طرف توجہ کرے۔

امور محتاج التکمیل سے وہ امور تعلیمیہ مراد ہیں کہ جو کتب الٰہیہ میں ناقص طور پر پائے جاتے ہوں اور حالت کاملہ تعلیم پر نظر کرنے سے اُن کا ناقص اور ادھورا ہونا ثابت ہوتا ہو اور اِس وجہ سے وہ ایک ایسی کتاب الہامی کے محتاج ہوں جو اُن کو مرتبۂ کمال تک پہنچا دے۔

امور قدرتیہ دو طور پر ہیں۔

(۱) **بیرونی شہادتیں** ۔ اِن سے وہ امور مراد ہیں جو بغیر وسیلہ انسانی تدبیروں کے خدا کی طرف سے پیدا ہو جائیں اور ہر ایک ذرّۂ بے مقدار کو وہ شوکت و شان اور عظمت و بزرگی بخشیں جس کا حاصل ہونا عند العقل محالات عادیہ سے متصوّر ہو اور جس کی نظیر صفحۂ دنیا میں کہیں نہ پائی جاتی ہو۔

(۲) **اندرونی شہادتیں** ۔ ان سے وہ محاسن صوری اور معنوی کتاب الہامی کے مراد ہیں جن کا مقابلہ کرنے سے قویٰ بشریہ عاجز ہوں اور جو فی الواقعہ بے مثل و مانند ہو کر ایسے قادر یکتا پر دلالت کرتی ہوں کہ گویا آئینہ خدا نما ہوں۔

امور غیبیہ سے وہ امور مراد ہیں جو ایک ایسے شخص کی زبان سے نکلیں جس کی نسبت یقین کیا جائے کہ اِن امور کا بیان کرنا من کل الوجوہ اس کی طاقت سے باہر ہے۔ یعنی ان امور پر نظر کرنے اور اس شخص کے حال پر نظر کرنے سے یہ بات بہ بداہت واضح ہو کہ نہ وہ امور اس کے لئے حکم بدیہی اور مشہود کا رکھتے ہیں اور نہ بذریعہ نظر اور فکر کے اس کو حاصل ہو سکتے ہوں۔ اور نہ اُسکی نسبت عند العقل یہ گمان جائز ہے کہ اُس نے بذریعہ کسی دوسرے واقف کار کے ان امور کو حاصل کر لیا ہوگا۔ گو وہی امور کسی دوسرے شخص کی طاقت سے باہر نہ ہوں۔ پس اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ امور غیبیہ اضافی اور نسبتی امور ہیں۔ یعنی ایسے امور ہیں کہ جب بعض خاص اشخاص کی طرف سے اُن کو نسبت دی جاتی ہے تو اس قابل ہو جاتے ہیں کہ امورِ غیبیہ ہونے کا اُن پر اطلاق ہو اور پھر جب وہی امور بعض دیگر کی طرف منسوب کئے جائیں تو یہ قابلیت اُن میں متحقق نہیں ہوتی۔

(براہین احمدیہ صـ ۱۳۳-۱۳۵)

بعض معجزات اور پیشگوئیاں قرآن شریف کی ایسی ہیں کہ وہ ہمارے لئے بھی جو اس زمانہ میں مشہود و محسوس کا حکم رکھتی ہیں اور کوئی ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ یہ ہیں:-

(۱) عذابی نشان کا معجزہ جو اس وقت کے کفار کو دکھلایا گیا تھا یہ ہمارے لئے بھی فی الحقیقت ایسا ہی نشان ہے جسے چشم دید کہنا چاہیئے۔ وجہ یہ کہ یہ نہایت یقینی مقدمات کا ایک ضروری نتیجہ ہے جس سے کوئی موافق اور مخالف کسی صورت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اوّل یہ مقدمہ جو بطور بنیاد

معجزہ کے ہے نہایت بدیہی اور مسلّم الثبوت ہے کہ یہ عذابی نشان اس وقت مانگا گیا تھا کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور چند رفیق آنجناب کے مکّہ میں دعوت حق کی وجہ سے خود صدہا تکالیف اور دردوں اور دکھوں میں مبتلا تھے۔ اور وہ ایام دین اسلام کے لئے ایسے ضعف اور کمزوری کے دن تھے کہ خود کفار مکّہ ہنسی اور ٹھٹھے کی راہ سے مسلمانوں کو کہا کرتے تھے کہ اگر تم حق پر ہو تو اِس قدر عذاب اور مصیبت اور دکھ اور درد ہمارے ہاتھ سے تمہیں کیوں پہنچ رہا ہے اور وہ خدا جس پر تم بھروسہ کرتے ہو وہ کیوں تمہاری مدد نہیں کرتا اور کیوں تم اس قدر قلیل جماعت ہو جو عنقریب نابود ہونے والی ہے اور اگر تم سچے ہو تو کیوں ہم پر عذاب نازل نہیں ہوتا۔ اِن سوالات کے جواب میں جو کچھ کفار کو قرآن شریف کے متفرق مقامات میں ایسے زمانہ تنگی و تکالیف میں کہا گیا وہ دوسرا مقدمہ اس پیشگوئی کی عظمتِ شان سمجھنے کے لئے ہے کیونکہ وہ زمانہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ پر ایسا نازک زمانہ تھا کہ ہر وقت اپنی جان کا اندیشہ تھا۔ اور چاروں طرف ناکامی مُنہ دکھلا رہی تھی۔ سو ایسے زمانہ میں کفار کو اُن کے عذابی نشان مانگنے کے وقت صاف صاف طور پر یہ کہا گیا تھا کہ عنقریب تمہیں اسلام کی فتحمندی اور تمہارے سزایاب ہونے کا نشان دکھلایا جائیگا۔ اور اسلام جو اب ایک تخم کی طرح نظر آتا ہے کسی دن ایک بزرگ درخت کی مانند اپنے تئیں ظاہر کردیگا۔ اور وہ جو عذاب کا نشان مانگتے ہیں وہ تلوار کی دھار سے ایک دن قتل کئے جائینگے اور تمام جزیرہ عرب کفر اور کافروں سے صاف کیا جائیگا۔ اور تمام عرب کی حکومت مومنوں کے ہاتھ میں آجائیگی اور خدائے تعالیٰ دین اسلام کو عرب کے ملک میں ایسے طور سے جمادیگا کہ پھر بُت پرستی کبھی پیدا نہیں ہوگی۔ اور حالت موجودہ جو خوف کی حالت ہے بکلّی امن کے ساتھ بدل جائیگی۔ اور اسلام قوت پکڑے گا اور غالب ہوتا چلا جائیگا یہاں تک کہ دوسرے ملکوں پر اپنی فتح اور نصرت کا سایہ ڈالیگا۔ اور دور دور تک اُس کی فتوحات پھیل جائیں گی۔ اور ایک بڑی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔ جس کا آخیر دنیا تک زوال نہیں ہوگا۔

اب جو شخص پہلے اِن دونوں مقدمات پر نظر ڈال کر معلوم کرلیوے کہ وہ زمانہ جس میں یہ پیشگوئی کی گئی اسلام کے لئے کیسی تنگی اور ناکامی اور مصیبت کا زمانہ تھا اور جو پیشگوئی کی گئی وہ کسقدر حالت موجودہ سے مخالف اور خیال اور قیاس سے نہایت بعید بلکہ صریح محالاتِ عادیہ سے نظر آتی تھی۔ پھر بعد اس کے اسلام کی تاریخ پر جو دشمنوں اور دوستوں کے ہاتھ میں موجود ہے ایک منصفانہ نظر ڈالے کہ کیسی صفائی سے پیشگوئی پوری ہو گئی اور کس قدر دلوں پر ہیبت ناک اثر اسکا

پڑا۔ اور کیسے مشارق اور مغارب میں تمام تر قوت اور طاقت کے ساتھ اس کا ظہور ہوا۔ تو اس پیشگوئی کو یقینی اور قطعی طور پر چشم دید معجزہ قرار دے گا جس میں اس کو ایک ذرّہ بھی شک و شبہ نہیں ہوگا۔

پھر دوسرا معجزہ قرآن شریف کا جو ہمارے لئے حکم مشہود و محسوس کا رکھتا ہے وہ عجیب و غریب تبدیلیاں ہیں جو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ببرکت پیروی قرآن شریف و اثرِ صحبت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ظہور میں آئیں۔ جب ہم اس بات کو دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ مشرف باسلام ہونے سے پہلے کیسے اور کس طریق اور عادت کے آدمی تھے اور پھر بعد شرف صحبت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم و اتباع قرآن شریف کس رنگ میں آئے اور کیسے عقائد میں اخلاق میں چلن میں گفتار میں رفتار میں کردار میں اور اپنی جمیع عادات خبیثہ حالت سے منتقل ہوکر نہایت طیب اور پاک حالت میں داخل کئے گئے تو ہمیں اس تاثیر عظیم کو دیکھ کر جس نے اُن کے زنگ خوردہ وجودوں کو ایک عجیب تازگی بخشی اور روشنی اور چمک بخشدی تھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ تصرف ایک خارق عادت تصرف تھا جو خاص خدا تعالےٰ کے ہاتھ نے کیا .... یہ تبدیلی ایک خارق عادت تبدیلی ہے جسے معجزہ کہنا چاہیئے۔

پھر تیسرا معجزہ قرآن شریف کا جو ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے اُس کے حقائق و معارف و لطائف و نکات ہیں جو اس کی بلیغ و فصیح عبارات میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس معجزہ کو قرآن شریف میں بڑی شدّ و مدّ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ تمام جنّ و انس اکٹھے ہو کر اس کی نظیر بنانا چاہیں تو اُن کے لئے ممکن نہیں۔ یہ معجزہ اس دلیل سے ثابت اور متحقق الوجود ہے کہ اس زمانہ تک کہ تیرہ سو برس سے زیادہ گذر رہا ہے باوجودیکہ قرآن شریف کی منادی ہر ایک نواح میں ہو رہی ہے اور بڑے زور سے **هل من معارض** کا نقارہ بجایا جاتا ہے مگر کبھی کسی طرف سے آواز نہیں آئی۔ پس اس سے اس بات کا صریح ثبوت ملتا ہے کہ تمام انسانی قوتیں قرآن شریف کے مقابلہ و معارضہ سے عاجز ہیں۔ بلکہ اگر قرآن شریف کی صدہا خوبیوں میں سے صرف ایک خوبی کو پیش کرکے اُس کی نظیر مانگی جائے تو انسان ضعیف البنیان سے یہ بھی ناممکن ہے کہ اس کے ایک جزو کی نظیر پیش کر سکے۔ مثلاً قرآن شریف کی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی خوبی ہے کہ وہ تمام معارف دینیہ پر مشتمل ہے اور کوئی دینی سچائی جو حق اور حکمت سے تعلق رکھتی ہے ایسی نہیں جو قرآن شریف میں پائی نہ جاتی ہو مگر ایسا شخص کون ہے،

کہ کوئی دوسری کتاب ایسی دکھلائے جس میں یہ صفت موجود ہو اور اگر کسی کو اس بات میں شک ہو کہ قرآن شریف جامع تمام حقائق دینیہ ہے تو ایسا مشکک خواہ عیسائی ہو خواہ آریہ اور خواہ برہمو ہو خواہ دہریہ اپنی طرز اور طور پر امتحان کر کے اپنی تسلی کرا سکتا ہے اور ہم تسلی کر دینے کے ذمہ دار ہیں۔ بشرطیکہ کوئی طالب حق ہماری طرف رجوع کرے۔ بائیبل میں جسقدر پاک صداقتیں ہیں یا حکماء کی کتابوں میں جسقدر حق اور حکمت کی باتیں ہیں جن پر ہماری نظر پڑی ہے یا ہندوؤں کے وید وغیرہ میں جو اتفاقاً بعض سچائیاں درج ہوگئیں یا باقی رہ گئیں ہیں جنکو ہم نے دیکھا ہے یا صوفیاء کی صدہا کتابوں میں جو حکمت و معرفت کے نکتے ہیں جن پر ہمیں اطلاع ہوئی ہے ان سب کو ہم قرآن شریف میں پاتے ہیں۔ اور اس کامل استقراء سے جو تیس برس کے عرصہ سے نہایت عمیق اور محیط نظر کے ذریعہ سے ہم کو حاصل ہے نہایت قطع اور یقین سے ہم پر یہ بات کھل گئی ہے کہ کوئی روحانی صداقت جو تکمیل نفس اور دماغی اور دلی قوی کی تربیت کے لئے اثر رکھتی ہے ایسی نہیں ہے جو قرآن شریف میں درج نہ ہو اور یہ صرف ہمارا ہی تجربہ نہیں بلکہ یہی قرآن شریف کا دعویٰ بھی ہے جس کی آزمائش نہ فقط میں نے بلکہ ہزارہا علماء ابتداء سے کرتے آئے اور اس کی سچائی کی گواہی دیتے آئے ہیں۔

پھر چوتھا معجزہ قرآن شریف کا اس کی روحانی تاثیرات ہیں جو ہمیشہ اس میں محفوظ چلی آتی ہیں۔ یعنی یہ کہ اس کی پیروی کرنے والے قبولیت الٰہی کے مراتب کو پہنچتے ہیں اور مکالمات الٰہیہ سے مشرف کئے جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اُن کی دعاؤں کو سُنتا اور انہیں محبت اور رحمت کی راہ سے جواب دیتا ہے اور بعض اسرار غیبیہ پر نبیوں کی طرح ان کو مطلع فرماتا ہے اور اپنی تائید اور نصرت کے نشانوں سے دوسری مخلوقات سے انہیں ممتاز کرتا ہے۔ یہ بھی ایسا نشان ہے جو قیامت تک امتِ محمدیہ میں قائم رہیگا اور ہمیشہ ظاہر ہوتا چلا آیا ہے اور اب بھی موجود اور متحقق الوجود ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ اب بھی پائے جاتے ہیں کہ جن کو اللہ جلشانہٗ اپنی تائیداتِ خاصہ سے مؤید فرما کر الہاماتِ صحیحہ و صادقہ و مبشرات و مکاشفاتِ غیبیہ سے سرفراز فرماتا ہے۔

اب اے حق کے طالبو! اور سچے نشانوں کے بھوکو اور پیاسو!! انصاف سے دیکھو اور ذرا پاک نظر سے غور کرو کہ جن نشانوں کا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں ذکر کیا ہے کس اعلیٰ درجہ کے نشان ہیں اور کیسے ہر زمانہ کے لئے مشہود و محسوس کا حکم رکھتے ہیں۔ پہلے

نبیوں کے معجزات کا اب نام و نشان باقی نہیں صرف قصے ہیں خدا جانے ان کی اصلیت کہاں تک درست ہے۔

(تصدیق النبیؐ صہ ۲۰-۲۳)

معجزات اور خوارق قرآنی چار قسم پر ہیں۔ (۱) معجزات عقلیہ (۲) معجزات علمیہ (۳) معجزات برکات روحانیہ (۴) معجزات تصرفات خارجیہ۔

نمبر اول و دو و تین کے معجزات خواص ذاتیہ قرآن شریف میں سے ہیں اور نہایت عالیشان اور بدیہی الثبوت ہیں۔ جن کو ہریک زمانہ میں ہر یک شخص تازہ بتازہ طور پر چشم دید ماجرا کی طرح دریافت کر سکتا ہے۔ لیکن نمبر چار کے معجزات یعنی تصرفات خارجیہ یہ بیرونی خوارق ہیں جن کو قرآن شریف سے کچھ ذاتی تعلق نہیں۔ انہی میں سے معجزہ شق القمر بھی ہے۔ اصل خوبی اور حسن و جمال قرآن شریف کا پہلے تینوں قسم کے معجزات سے وابستہ ہے بلکہ ہر ایک کلام الٰہی کا یہی نشانِ اعظم ہے کہ یہ تینوں قسم کے معجزات کسی قدر اس میں پائے جائیں اور قرآن شریف میں تو یہ ہر سہ قسم کے اعجاز اعلیٰ و اکمل و اتم طور پر پائے جاتے ہیں۔ اور انہی کو قرآن شریف اپنی بے مثل و مانند ہونے کے اثبات میں بار بار پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۔ یعنی ان منکرین کو کہدے کہ اگر تمام جنّ و انس یعنی تمام مخلوقات اس بات پر متفق ہو جائے کہ اس قرآن کی کوئی مثل بنانی چاہیے تو وہ ہرگز اس بات پر نہیں قادر ہونگے کہ ایسی ہی کتاب اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کی جامع بنا سکیں اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔ اور پھر دوسرے مقام میں فرماتا ہے۔ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ .... اور پھر فرماتا ہے۔ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ .... اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ۔

.... لیکن بایں ہمہ تصرفات خارجیہ کے اعجاز بھی قرآن شریف میں بکثرت درج ہیں۔ اور اس قسم کے معجزات جمالِ قرآنی کے لئے بطور اس زیور کے ہیں جو خوبوں کو پہنایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ نفس خوبصورتی زیور کے محتاج نہیں گو اس سے حُسن کی

آب و تاب کسی قدر اور بڑھ جاتی ہے۔ اسجگہ واضح رہے کہ تصرفات خارجیہ کے معجزات قرآن شریف میں کئی نوع پر مندرج ہیں۔ ایک نوع تو یہی کہ جو دعائے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے خدا تعالیٰ نے آسمان پر اپنا قادرانہ تصرّف دکھلایا اور چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔ دوسرے وہ تصرف جو خدائے تعالےٰ نے جناب ممدوح کی دُعا سے زمین پر کیا اور ایک سخت قحط سات برس تک ڈالا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے ہڈیوں کو پیس کر کھایا۔ تیسرے وہ تصرف اعجازی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شرِ کفار سے محفوظ رکھنے کے لئے بروز ہجرت کیا گیا۔ یعنی جبکہ کفار مکّہ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ جلّ شانہٗ نے اپنے اس پاک نبی کو اس بد ارادہ کی خبر دیدی اور مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم فرمایا۔ اور پھر بفتح و نصرت واپس آنے کی بشارت دی۔ بدھ کا روز اور دوپہر کا وقت اور سخت گرمی کے دن تھے جب یہ ابتلاء منجانب اللہ ظاہر ہوا۔ اِس مصیبت کی حالت میں جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک ناگہانی طور پر اپنے قدیمی شہر کو چھوڑنے لگے اور مخالفین نے مار ڈالنے کی نیت سے چاروں طرف سے اس مبارک گھر کو گھیر لیا۔ تب ایک جانی عزیز جس کا وجود محبت اور ایمان سے خمیر کیا گیا تھا جانبازی کے طور پر آنحضرتؐ کے بستر پر باِرشاد نبوی اِس غرض سے مُنہ چھپا کر لیٹ رہا کہ تا مخالفوں کے جاسوس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نکل جانے کی کچھ تفتیش نہ کریں اور اس کو رسول اللہ سمجھ کر قتل کرنے کے لئے ٹھہرے رہیں ؎

کس بہرِ کسے سر ندہد جاں نفشاند ٭ عشق است کہ ایں کار بصد صدق کناند

سو جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اس وفادار اور جاں نثار عزیز کو اپنی جگہ چھوڑ کر چلے گئے تو آخر تفتیش کے بعد ان نالائق بدباطن لوگوں نے تعاقب کیا اور چاہا کہ راہ میں کسی جگہ پا کر قتل کر ڈالیں۔ اس وقت اور اس مصیبت کے سفر میں بجز ایک با اخلاص اور یکرنگ اور دلی دوست کے اور کوئی انسان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نہ تھا۔ ہاں ہر وقت اور نیز اس پُرخطر سفر میں وہ مولیٰ کریم ساتھ تھا جس نے اپنے اس کامل وفادار بندہ کو ایک عظیم الشان اصلاح کے لئے دنیا میں بھیجا تھا سو اس نے اپنے اس پیارے بندہ کو محفوظ رکھنے کے لئے بڑے بڑے عجائب تصرّف اس راہ میں دکھلائے جو اجمالی طور پر قرآن شریف میں مندرج ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جانتے وقت کسی

مخالف نے نہیں دیکھا۔ حالانکہ صبح کا وقت تھا اور تمام مخالفین آنحضرتؐ کے گھر کا محاصرہ کر رہے تھے۔ سو خدا تعالیٰ نے جیسا کہ سورۂ یٰسین میں اس کا ذکر کیا ہے ان سب اشقیاء کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور آنحضرتؐ اُن کے سروں پر خاک ڈال کر چلے گئے۔ ازانجملہ ایک یہ کہ اللہ جلّ شانہٗ نے اپنے نبیٔ معصوم کے محفوظ رکھنے کے لئے یہ امر خارق عادت دکھلایا کہ باوجودیکہ مخالفین اس غار تک پہنچ گئے تھے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم معہ اپنے رفیق کے مخفی تھے مگر وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہ سکے کیونکہ خدا تعالےٰ نے ایک کبوتر کا جوڑا بھیج دیا جس نے اُسی رات غار کے دروازہ پر آشیانہ بنا دیا اور انڈے بھی دیدیئے اور اسی طرح اذنِ الٰہی سے عنکبوت نے اس غار پر اپنا گھر بنا دیا۔ جس سے مخالف لوگ دھوکا میں پڑ کر ناکام واپس چلے گئے۔ ازانجملہ ایک یہ کہ ایک مخالف جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مدینہ کی راہ پر گھوڑا دوڑائے چلا جاتا تھا جب وہ اتفاقاً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچا تو جناب ممدوح کی بددعا سے اس کے گھوڑے کے چاروں سم زمین میں دھنس گئے اور وہ گر پڑا۔ اور پھر وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پناہ مانگ کر اور عفو تقصیر کرا کر واپس لوٹ آیا۔ چوتھی وہ تصرف اعجازی کہ جب دشمنوں نے اپنی ناکامی سے منفعل ہو کر لشکر کثیر کے ساتھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر چڑھائی کی تا مسلمانوں کو جو ابھی تھوڑے سے آدمی تھے نابود کر دیں اور دین اسلام کا نام و نشان مٹا دیں۔ تب اللہ جلّ شانہٗ نے جناب موصوف کے ایک مٹھی کنکروں کے چلانے سے مقام بدر میں دشمنوں میں ایک تہلکہ ڈال دیا اور اُن کے لشکر کو شکست فاش ہوئی اور خدائے تعالیٰ نے ان چند کنکریوں سے مخالفین کے بڑے بڑے سرداروں کو سراسیمہ اور اندھا اور پریشان کر کے وہیں رکھا اور اُن کی لاشیں انہی مقامات میں گرائیں جن کے پہلے ہی سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے الگ الگ نشان بتلا رکھے تھے۔ ایسا ہی اور کئی عجیب طور کے تائیدات و تصرفاتِ الٰہیہ کا (جو خارق عادت ہیں) قرآن شریف میں ذکر ہے جن کا ماحصل یہ ہے کہ کیونکر اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کو مسکینی اور غریبی اور یتیمی اور تنہائی اور بیکسی کی حالت میں مبعوث کر کے پھر ایک نہایت قلیل عرصہ میں جو تیس برس سے بھی کم تھا ایک عالم پر فتحیاب کیا۔ اور شہنشاہ قسطنطنیہ و بادشاہان دیار شام و مصر و ممالک مابین دجلہ و فرات وغیرہ پر غلبہ بخشا۔ اور اس تھوڑے ہی عرصہ میں فتوحات کو جزیرۂ عرب سے لے کر دریائے جیحون تک پھیلایا۔ اور ان ممالک کے اسلام قبول کرنے کی بطور پیشگوئی قرآن شریف

میں خبر دی۔ اس حالت بے سامانی اور پھر ایسی عجیب و غریب فتحوں پر نظر ڈال کر بڑے بڑے دانشمند اور فاضل انگریزوں نے بھی شہادت دی ہے کہ جس جلدی سے اسلامی سلطنت اور اسلام دنیا میں پھیلا ہے اس کی نظیر صفحۂ تواریخ دنیا میں کسی جگہ نہیں پائی جاتی۔ اور ظاہر ہے کہ جس امر کی کوئی نظیر نہ پائی جائے اسی کو دوسرے لفظوں میں خارق عادت بھی کہتے ہیں۔ غرض قرآن شریف میں تصرفات خارجیہ کا ذکر بھی بطور خارق عادت بہت جگہ آیا ہے۔ بلکہ ذرا نظر کھول کر دیکھو تو اس پاک کلام کا ہریک مقام تائیدات الٰہیہ کا نقّارہ بجا رہا ہے۔

(سرمہ چشم آریہ ص۱۲ - ۱۹ حاشیہ)

معرفتِ حقانی کے عطا کرنے کے لئے تین دروازے قرآن شریف میں کھلے ہوئے ہیں۔ ایکؔ عقلی یعنی خدائے تعالیٰ کی ہستی اور خالقیت اور اُس کی توحید اور قدرت اور رحم اور قیوّمی اور مجازات وغیرہ صفات کی شناخت کے لئے جہاں تک علوم عقلیہ کا تعلق ہے استدلالی طریق کو کامل طور پر استعمال کیا ہے اور اس استدلال کے ضمن میں صناعت منطق و علم بلاغت و فصاحت و علوم طبعی و طبابت و ہیئت و ہندسہ و دقائق فلسفیہ و طریقِ جدل و مناظرہ وغیرہ تمام علوم کو نہایت لطیف و موزون طور پر بیان کیا ہے جس سے اکثر دقیق مسائل کا پیچ کھلتا ہے۔ پس یہ طرز بیان فوق العادت ہے از قسم اعجاز عقلی ہے۔ کیونکہ بڑے بڑے فیلسوف جنہوں نے منطق کو ایجاد کیا اور فلاسفی کے قواعد مرتب کئے اور بہت کچھ طبعی اور ہیئت میں کوشش و مغز زنی کی وہ بباعثِ نقصانِ عقل اپنے ان علوم سے اپنے دین کو مدد نہیں دے سکے۔ اور نہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کر سکے۔ اور نہ اوروں کو فائدہ دینی پہنچا سکے۔ بلکہ اکثر اُن کے دہریہ اور ملحد اور ضعیف الایمان رہے اور جو بعض ان میں سے کسی قدر خدائے تعالیٰ پر ایمان لائے انہوں نے ضلالت کو صداقت کے ساتھ ملاکر اور خبیث کو طیب کے ساتھ مخلوط کر کے راہ راست کو چھوڑ دیا۔ پس یہ الٰہی عقل از قبیل خارق عادت ہے جس کے استدلال میں کوئی غلطی نہیں اور جس نے علوم مذکورہ سے ایک ایسی شائستہ خدمت لی ہے جو کبھی کسی انسان نے نہیں لی۔ اور اس کے ثبوت کے لئے یہی کافی ہے کہ دلائل وجودِ باری عزّ اسمہٗ اور اس کی توحید و خالقیت وغیرہ صفاتِ کمالیہ کے اثبات میں بیان قرآن شریف کا ایسا محیط و حاوی ہے جس سے بڑھ کر ممکن ہی نہیں کہ کوئی انسان کوئی جدید برہان پیش کر سکے اگر کسی کو شک ہو تو وہ چند دلائل عقلی متعلق اثبات ہستی باری عزّ اسمہٗ یا اس کی توحید یا اس کی خالقیت یا کسی دوسری الٰہی صفت کے متعلق بطور امتحان پیش کرے تا بالمقابل قرآن شریف

میں سے وہی دلائل یا ان سے بڑھ کر اُس کو دکھلائے جائیں۔ جس کے دکھلانے کے ہم آپ ہی ذمہ دار ہیں۔ غرض یہ دعویٰ اور یہ تعریف قرآنی لاف وگزاف نہیں بلکہ حقیقت میں حق ہے۔ اور کوئی شخص عقائدِ حقّہ کے اثبات میں کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کر سکتا جس کے پیش کرنے سے قرآن شریف غافل رہا ہو۔ قرآن شریف بآواز بلند بیسیوں جگہ اپنے احاطۂ تام کا دعویٰ کرتا ہے ......

دوسرا دروازہ معرفت الٰہی کا جو قرآن شریف میں نہایت وسیع طور پر کھلا ہوا ہے دقائقِ علمیہ ہیں جن کو بوجہ خارق عادت ہونے کے علمی اعجاز کہنا چاہیئے۔ وہ علوم کئی قسم کے ہیں۔ اوّل علم معارف دین یعنی جس قدر معارفِ عالیہ دین اور اس کی پاک صداقتیں ہیں اور جس قدر نکات و لطائفِ علم الٰہی ہیں جن کی اس دنیا میں تکمیل نفس کے لئے ضرورت ہے۔ ایسا ہی جس قدر نفسِ امّارہ کی بیماریاں اور اس کے جذبات اور اس کی دوری یا دائمی آفات ہیں یا جو کچھ ان کا علاج اور اصلاح کی تدبیریں ہیں اور جس قدر تزکیہ و تصفیہ نفس کے طریق ہیں اور جس قدر اخلاق فاضلہ کے انتہائی ظہور کی علامات و خواص و لوازم ہیں یہ سب کچھ باستیفائے تام فرقان مجید میں بھرا ہوا ہے۔ اور کوئی شخص ایسی صداقت یا ایسا نکتہ الٰہیہ یا ایسا طریق وصول الی اللہ یا کوئی ایسا نادر یا پاک طور مجاہدہ و پرستش الٰہی کا نکال نہیں سکتا جو اس پاک کلام میں درج نہ ہو۔ دوسرے علم خواص رُوح و علم نفس ہے جو ایسے احاطہ تام سے اس کلام معجز نظام میں اندراج پایا ہے کہ جس سے غور کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ بجز قادرِ مطلق کے کہ یہ کسی کا کام نہیں۔ تیسرے علم مبدء و معاد و دیگر علوم غیبیہ جو عالم الغیب کے کلام کا ایک لازمی خاصہ ہے جس سے دلوں کو تسلّی و تشفّی ملتی ہے اور غیب دانی خدائے قادر مطلق کی مشہودی طور پر ثابت و متحقق ہوتی ہے۔ یہ علم اس تفصیل اور کثرت سے قرآن شریف میں پایا جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی دوسری کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر علاوہ اس کے قرآن شریف نے تائید دین میں اَور اَور علوم سے بھی اعجازی طور پر خدمت لی ہے۔ اور منطق اور طبعی اور فلسفہ اور ہیئت اور علمِ نفس اور طبابت اور علم ہندسہ اور علم فصاحت و بلاغت وغیرہ علوم کے وسائل سے علم دین کا سمجھانا اور ذہن نشین کرنا یا اس کا تفہیم درجہ بدرجہ آسان کر دینا یا اس پر کوئی برہان قائم کرنا یا اس سے کسی نادان کا اعتراض اٹھانا مدّ نظر رکھا ہے۔ غرض طفیلی طور پر یہ سب علوم خدمتِ دین کے لئے بطور خارق عادت قرآن شریف میں اس عجیب طرز سے بھرے ہوئے ہیں جن سے ہر یک درجہ کا ذہن فائدہ اُٹھا سکتا ہے ....

تیسرا دروازہ معرفتِ الٰہی کا جو قرآن شریف میں اللہ جلّ شانہٗ نے اپنی عنایت خاص سے کھول رکھا ہے برکاتِ رُوحانیہ ہیں جس کو اعجازِ تاثیری کہنا چاہیئے۔ یہ بات کسی سمجھدار پر مخفی نہیں ہوگی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا زاد بوم ایک محدود جزیرہ نما ملک ہے جس کو عرب کہتے ہیں۔ جو دوسرے ملکوں سے ہمیشہ بے تعلق رہ کر گویا ایک گوشۂ تنہائی میں پڑا رہا۔ اِس ملک کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے بالکل وحشیانہ اور درندوں کی طرح زندگی بسر کرنا اور دین اور ایمان اور حق اللہ اور حق العباد سے بے خبر محض ہونا اور سینکڑوں برسوں سے بُت پرستی و دیگر ناپاک خیالات میں ڈوبے چلے آنا اور عیاشی اور بدمستی اور شراب خواری اور قمار بازی وغیرہ فسق کے طریقوں میں انتہائی درجہ تک پہنچ جانا اور چوری اور قزاقی اور خون ریزی اور دختر کشی اور یتیموں کا مال کھا جانے اور بیگانہ حقوق دبا لینے کو کچھ گناہ نہ سمجھنا۔ غرض ہریک طرح کی بُری حالت اور ہریک نوع کا اندھیرا اور ہر قسم کی ظلمت و غفلت عام طور پر تمام عربوں کے دلوں میں چھائی ہوئی ہونا ایک ایسا واقعہ مشہور ہے کہ کوئی متعصب مخالف بھی بشرطیکہ کچھ واقفیت رکھتا ہو اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور پھر یہ امر بھی ہریک منصف پر ظاہر ہے کہ وہی جاہل اور وحشی اور یاوہ اور ناپارسا طبع لوگ اسلام میں داخل ہونے اور قرآن کو قبول کرنے کے بعد کیسے ہو گئے۔ اور کیونکر تاثیرات کلام الٰہی اور صحبتِ نبی معصوم نے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں ان کے دلوں کو یکلخت ایسا مبدل کر دیا کہ وہ جہالت کے بعد معارف دینی سے مالا مال ہو گئے۔ اور محبت دنیا کے بعد الٰہی محبت میں ایسے کھوئے گئے کہ اپنے وطنوں اپنے مالوں اور اپنے عزیزوں اپنی عزتوں اپنی جان کے آراموں کو اللہ جلّ شانہٗ کے راضی کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ چنانچہ یہ دونوں سلسلے اُن کی پہلی حالت اور اس نئی زندگی کے جو بعد اسلام انہیں نصیب ہوئے قرآن شریف میں ایسی صفائی سے درج ہیں کہ ایک صالح اور نیک دل آدمی پڑھنے کے وقت بے اختیار چشم پُر آب ہو جاتا ہے۔ پس وہ کیا چیز تھی جو ان کو اتنی جلدی ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف کھینچ کر لے گئی۔ وہ دو ہی باتیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ نبی معصوم اپنی قوتِ قدسیہ میں نہایت ہی قوی الاثر تھا ایسا کہ نہ کبھی ہوا اور نہ ہو گا۔ دوسری خدائے قادر مطلق حیّ و قیّوم کی پاک کلام کی زبردست اور عجیب تاثیریں تھیں کہ جو ایک گروہ کثیر کو ہزاروں ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں۔ بلاشبہ یہ قرآنی تاثیریں خارق عادت ہیں کیونکہ کوئی دنیا میں بطور نظیر نہیں بتلا سکتا کہ کبھی کتاب نے ایسی تاثیر کی۔ کون اس

بات کا ثبوت دے سکتا ہے کہ کسی کتاب نے ایسی عجیب تبدیلی و اصلاح کی جیسی قرآن شریف نے کی.....

لاکھوں مقدسوں کا یہ تجربہ ہے کہ قرآن شریف کی اتباع سے برکات الٰہی دل پر نازل ہوتی ہیں اور ایک عجیب پیوند مولا کریم سے ہو جاتا ہے اور خدا تعالےٰ کے انوار اور الہام ان کے دلوں پر اُترتے ہیں اور معارف اور نکات ان کے مُنہ سے نکلتے ہیں۔ ایک قوی توکل انکو عطا ہوتی ہے اور ایک محکم یقین ان کو دیا جاتا ہے اور ایک لذیذ محبت الٰہی جو لذّتِ وصال سے پرورش یاب ہے اُن کے دلوں میں رکھی جاتی ہے۔ اگر اُن کے وجودوں کو ہاونِ مصائب میں پیسا جائے اور سخت شکنجوں میں دے کر نچوڑا جائے تو اُن کا عرق بجز حبّ الٰہی کے اور کچھ نہیں۔ دنیا اُن سے ناواقف اور وہ دنیا سے دُور تر اور بلند تر ہیں. خدا کے معاملات اُن سے خارق عادت ہیں۔ اُن پر ثابت ہوُا ہے کہ خدا ہے۔ اُنہی پر کھلا ہے کہ ایک ہے۔ وہ جب دعا کرتے ہیں تو وہ اُن کی سُنتا ہے۔ جب وہ پکارتے ہیں تو وہ انہیں جواب دیتا ہے۔ جب وہ پناہ چاہتے ہیں تو وہ اُن کی طرف دوڑتا ہے۔ وہ باپوں سے زیادہ اُن سے پیار کرتا ہے۔ اور ان کی درو دیوار پر برکتوں کی بارش برساتا ہے۔ پس وہ اس کی ظاہری و باطنی و روحانی وجسمانی تائیدوں سے شناخت کئے جاتے ہیں اور وہ ہر یک میدان میں اُن کی مدد کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے اور وہ اُن کا ہے۔ یہ باتیں بلا ثبوت نہیں۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۲۱۰-۲۴ حاشیہ)

بعض برہمو سماج والے یہ وسوسہ پیش کیا کرتے ہیں کہ اگر کامل معرفت قرآن پر ہی موقوف ہے تو پھر خدا نے اس کو تمام ملکوں میں اور تمام معمورات قدیم و جدید میں کیوں شائع نہ کیا۔ اور کیوں کروڑہا مخلوقات کو اپنی معرفت کاملہ اور اعتقاد صحیحہ سے محروم رکھا؟

جواب:- یہ وسوسہ بھی کوتہ اندیشی سے پیدا ہوُا ہے .... اگر آفتاب عالمتاب کی روشنی بعض امکنۂ ظلمانیہ تک نہیں پہنچی یا اگر بعض نے اُلّو کی طرح آفتاب کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں تو کیا اِس سے یہ لازم آجائیگا کہ آفتاب منجانب اللہ نہیں؟ اگر مینہ کسی زمین شور پر نہیں پڑا یا کوئی کلری زمین اس سے فیضیاب نہیں ہوئی تو کیا اِس سے وہ بارانِ رحمت انسان کا فعل خیال کیا جائیگا؟ ایسے اوہام دور کرنے کیلئے خدا تعالےٰ نے آپ ہی قرآن شریف میں بکمال وضاحت اس بات کو کھول دیا ہے کہ الہام الٰہی کی ہدایت ہر ایک طبیعت کے لئے نہیں بلکہ ان طبائع صافیہ کے لئے ہے جو صفت تقویٰ اور صلاحیت

سے متصف ہیں۔ وہی لوگ ہدایت کاملہ الہام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس سے منتفع ہوتے ہیں۔ اور ان تک الہام الٰہی بہر صورت پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ بعض آیات ان میں سے ذیل میں لکھی جاتی ہیں:—

الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔ (الجزو نمبر ۱)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۔ (الجزو نمبر ۲۸)

آیات مندرجہ بالا میں پہلے اس آیت پر یعنی الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ پر غور کرنا چاہیئے کہ کس لطافت اور خوبی اور رعایت ایجاز سے خدا تعالیٰ نے وسوسۂ مذکورہ کا جواب دیا ہے۔ اوّل قرآن شریف کے نزول کی **علّتِ فاعلی** بیان کی اور اسکی عظمت اور بزرگی کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا الٓمّٓ میں خدا ہوں جو سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ یعنی نازل کنندہ اس کتاب کا میں ہوں جو علیم و حکیم ہوں جس کے علم کے برابر کسی کا علم نہیں۔ پھر بعد اس کے **علّت مادی** قرآن کے بیان میں فرمائی اور اس کی عظمت کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ وہ کتاب ہے یعنی ایسی عظیم الشان اور عالی مرتبت کتاب ہے جس کی علّت مادی علم الٰہی ہے یعنی جس کی نسبت ثابت ہے کہ اس کا منبع اور چشمہ ذاتِ قدیم حضرتِ حکیم مطلق ہے۔ اسجگہ اللہ تعالیٰ نے وہ کا لفظ اختیار کرنے سے جو بُعد اور دُوری کے لئے آتا ہے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ کتاب اُس ذات عالی صفات کے علم سے ظہور پذیر ہے جو اپنی ذات میں بے مثل و مانند ہے جس کے علوم کاملہ و اسرار دقیقہ نظر انسانی کی حدّ جولان سے بہت بعید اور دُور ہیں۔

پھر بعد اس کے علّت صوری کا قابل تعریف ہونا ظاہر فرمایا اور کہا لَا رَیْبَ فِیْہِ یعنی قرآن اپنی ذات میں ایسی مدلّل و معقول پر واقع ہے کہ کسی نوع کی شک کرنے کی اس میں گنجائش نہیں۔ یعنی وہ دوسری کتابوں کی طرح بطور کتھا اور کہانی کے نہیں بلکہ ادلّہ یقینیہ و براہین قطعیہ پر مشتمل ہے اور اپنے مطالب پر حجج بیّنہ اور دلائل شافیہ بیان کرتا ہے اور فی نفسہٖ ایک معجزہ ہے جو شکوک اور شبہات کے دُور کرنے میں سیف قاطع کا حکم رکھتا ہے اور خداشناسی کے بارے میں صرف ہونا چاہیئے کے ظنّی مرتبے میں نہیں چھوڑتا بلکہ ہے کے یقینی اور قطعی مرتبے تک پہنچاتا ہے۔ یہ تو عللِ ثلاثہ کی عظمت کا بیان فرمایا۔ اور پھر باوجود عظیم الشان ہونے ان ہر سہ علّتوں کے جن کو تاثیر اور اصلاح میں دخلِ عظیم ہے علّت رابعہ یعنی علّت غائی نزولِ قرآن شریف کو جو رہنمائی اور ہدایت ہے صرف متقین میں منحصر کر دیا اور فرمایا۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ یعنی یہ کتاب صرف ان جواہر قابلہ کی ہدایت کے لئے نازل کی گئی ہے جو بوجہ پاک باطنی و عقل سلیم و فہم مستقیم و شوق طلب حق و نیت صحیح انجام کار درجۂ ایمان و خداشناسی و تقوائے کامل پر پہنچ جائیں گے۔ یعنی جن کو خدا اپنے علم قدیم سے جانتا ہے کہ ان کی فطرت اس ہدایت کے مناسب حال واقعہ ہے اور وہ معارف حقانی میں ترقی کر سکتے ہیں وہ بالآخر اس کتاب سے ہدایت پا جائیں گے اور بہرحال یہ کتاب ان کو پہنچ رہیگی۔ اور قبل اس کے جو وہ مریں خدا اُن کو راہ راست پر آنے کی توفیق دیدیگا۔ اب دیکھو اس خدائے تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ جو لوگ خدائے تعالیٰ کے علم میں ہدایت پانے کے لائق ہیں اور اپنی اصل فطرت میں صفت تقویٰ سے متصف ہیں وہ ضرور ہدایت پا جائیں گے۔ اور پھر ان آیات میں جو اس آیت کے بعد میں لکھی گئی ہیں اس کی زیادہ تر تفصیل کر دی اور فرمایا کہ جس قدر لوگ (خدا کے علم میں) ایمان لانے والے ہیں وہ اگرچہ ہنوز مسلمانوں میں شامل نہیں ہوئے پر آہستہ آہستہ سب شامل ہو جائیں گے۔ اور وہی لوگ باہر رہ جائیں گے جن کو خدا خوب جانتا ہے کہ طریقہ حقّۂ اسلام قبول نہیں کرینگے۔ اور گو ان کو نصیحت کی جائے یا نہ کی جائے ایمان نہیں لائیں گے یا مراتب کاملہ تقویٰ و معرفت تک نہیں پہنچینگے۔ غرض ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے کھول کر بتلا دیا کہ ہدایت قرآنی سے صرف متقی منتفع ہو سکتے ہیں جن کی اصل فطرت میں غلبہ کسی ظلمتِ نفسانی کا نہیں۔ ....

اور اگر یہ کہو کہ جن تک کتاب الہامی نہیں پہنچی اُن کی نجات کا کیا حال ہے؟ اِس کا

یہ جواب ہے کہ اگر ایسے لوگ بالکل وحشی اور عقل انسانی سے بے بہرہ ہیں تو وہ ہر ایک باز پُرس سے بری اور مرفوع القلم ہیں اور مجانین اور مسلوب الحواسوں کا حکم رکھتے ہیں۔ لیکن جن میں کسی قدر عقل اور ہوش ہے اُن سے بقدر عقل اُن کی محاسبہ ہوگا۔

(براہین احمدیہ ص۱۸۸-۱۹۳ حاشیہ ۱۱)

جو کچھ قرآن شریف نے توحید کا تخم بلاد عرب۔ فارس۔ مصر۔ شام۔ ہند۔ چین۔ افغانستان۔ کشمیر وغیرہ کے بلاد میں بو دیا ہے اور اکثر بلاد سے بت پرستی اور دیگر اقسام کی مخلوق پرستی کا تخم جڑ سے اکھاڑ دیا ہے یہ ایک ایسی کارروائی ہے کہ اس کی نظیر کسی زمانے میں نہیں پائی جاتی۔ مگر بمقابل اس کے جب ہم وید کی طرف دیکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ آریہ ورت کی بھی اصلاح نہیں کر سکا۔

(چشمہ معرفت ص۶۹)

تم ہوشیار رہو اور خدا کی تعلیم اور قرآن کی ہدایت کے برخلاف ایک قدم بھی نہ اٹھاؤ۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ جو شخص قرآن کے سات سو حکم میں سے ایک چھوٹے سے حکم کو بھی ٹالتا ہے وہ نجات کا دروازہ اپنے ہاتھ سے اپنے پر بند کرتا ہے حقیقی اور کامل نجات کی راہیں قرآن نے کھولیں اور باقی سب اُس کے ظل تھے۔ سو تم قرآن کو تدبّر سے پڑھو اور اس سے بہت ہی پیار کرو ایسا پیار کہ تم نے کسی سے نہ کیا ہو۔ کیونکہ جیسا کہ خدا نے مخاطب کر کے فرمایا کہ الخير كلّه في القرآن تمام قسم کی بھلائیاں قرآن ہی میں ہیں۔ یہی بات سچ ہے۔ افسوس ان لوگوں پر جو کسی اور چیز کو اس پر مقدم رکھتے ہیں تمہاری تمام فلاح اور نجات کا سرچشمہ قرآن ہے۔ کوئی بھی تمہاری ایسی دینی ضرورت نہیں جو قرآن میں نہیں پائی جاتی۔ تمہارے ایمان کا مصدق یا مکذّب قیامت کے دن قرآن ہے۔ اور بجز قرآن کے آسمان کے نیچے اور کوئی کتاب نہیں جو بلاواسطہ قرآن تمہیں نجات دے سکے۔ خدا نے تم پر بہت احسان کیا ہے جو قرآن جیسی کتاب تمہیں عنایت کی۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ کتاب جو تم پر پڑھی گئی اگر عیسائیوں پر پڑھی جاتی تو وہ ہلاک نہ ہوتے اور یہ نعمت ہدایت جو تمہیں دی گئی اگر بجائے توریت کے یہودیوں کو دی جاتی تو بعض فرقے اُن کے قیامت سے منکر نہ ہوتے پس اس نعمت کی قدر کرو جو تمہیں دی گئی۔ یہ نہایت پیاری نعمت ہے۔ یہ بڑی دولت ہے۔ اگر قرآن نہ آتا تو تمام دنیا ایک گندے مضغہ کی طرح تھی۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کے مقابل پر تمام ہدایتیں ہیچ ہیں

(کشتیٔ نوح ص۳۶-۳۷)

قرآن مجید باوجود ان تمام کمالاتِ بلاغت و فصاحت و احاطۂ حکمت و معرفت ایک رُوحانی

تاثیر اپنی ذاتِ بابرکات میں ایسی رکھتا ہے کہ اس کا سچا اتباع انسان کو مستقیم الحال اور منور الباطن اور منشرح الصدر اور مقبول الٰہی اور قابلِ خطاب حضرتِ عزّت بنا دیتا ہے اور اس میں وہ انوار پیدا کرتا ہے اور وہ فیوضِ غیبی اور تائیدات لاریبی اس کے شاملِ حال کر دیتا ہے کہ جو اغیار میں ہرگز نہیں پائی جاتیں۔ اور حضرتِ احدیت کی طرف سے وہ لذیذ اور دل آرام کلام اُس پر نازل ہوتا ہے جس سے اُس پر دم بدم کھلتا جاتا ہے کہ فرقان مجید کی سچی متابعت سے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی پیروی سے اُن مقامات تک پہنچایا گیا ہے کہ جو محبوبانِ الٰہی کے لئے خاص ہیں اور اُن ربّانی خوشنودیوں اور مہربانیوں سے بہرہ یاب ہو گیا ہے جن سے وہ کامل ایمان دار بہرہ یاب تھے جو اس سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اور نہ صرف مقال کے طور پر بلکہ حال کے طور پر بھی ان تمام نعمتوں کا ایک صافی چشمہ اپنے پُرصدق دل میں بہتا ہوا دیکھتا ہے۔ اور ایک ایسی کیفیت تعلّق باللہ کی اپنے منشرح سینے میں مشاہدہ کرتا ہے جس کو نہ الفاظ کے ذریعہ اور نہ کسی مثال کے پیرائے میں بیان کر سکتا ہے۔ اور انوارِ الٰہی کو اپنے نفس پر بارش کی طرح برستے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور وہ انوار کبھی اخبارِ غیبیہ کے رنگ میں اور کبھی علوم و معارف کی صورت میں اور کبھی اخلاقِ فاضلہ کے پیرائے کی صورت میں اس پر اپنا پرتوہ ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ تاثیرات فرقان مجید کی سلسلہ وار چلی آتی ہیں۔ اور جب سے کہ آفتابِ صداقت ذاتِ بابرکات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں آیا اُسی دم سے آج تک ہزارہا نفوس جو استعداد اور قابلیت رکھتے تھے متابعت کلامِ الٰہی اور اتباع رسول مقبولؐ سے مدارجِ عالیہ مذکورہ بالا تک پہنچ چکے ہیں اور پہنچتے جاتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ اس قدر اُن پر پے در پے اور علی الاتصال تلطّفات اور تفضّلات وارد کرتا ہے اور اپنی حمایتیں اور عنایتیں دکھلاتا ہے کہ صافی نگاہوں کی نظر میں ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ منظورانِ نظر احدیت سے ہیں جن پر لطفِ ربّانی کا ایک عظیم الشان سایہ اور فضلِ یزدانی کا ایک جلیل القدر پیرایہ ہے اور دیکھنے والوں کو صریح دکھائی دیتا ہے کہ وہ انعامات خارق عادت سے سرفراز ہیں اور کرامات عجیب اور غریب سے ممتاز ہیں۔ اور محبوبیت کے عطر سے معطّر ہیں اور مقبولیت کے فخروں سے مفتخر ہیں اور قادرِ مطلق کا نور اُن کی صحبت میں ان کی توجّہ میں اُن کی ہمّت میں اُن کی دُعا میں اُن کی نظر میں اُن کے اخلاق میں اُن کی طرزِ معیشت میں اُنکی خوشنودی میں اُن کے غضب میں اُن کی رغبت میں اُن کی نفرت میں اُن کی حرکت میں اُن کے سکون میں اُن کے نُطق میں اُن کی خاموشی میں اُن کے ظاہر میں اُن کے باطن میں ایسا بھرا ہُوا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک لطیف اور مصفّا شیشہ ایک نہایت عمدہ عطر سے بھرا ہُوا ہوتا ہے

اور اُن کے فیضِ صحبت اور ارتباط اور محبت سے وہ باتیں حاصل ہو جاتی ہیں کہ جو ریاضت شاقہ سے حاصل نہیں ہو سکتیں اور اُن کی نسبت ارادت اور عقیدت پیدا کرنے سے ایمانی حالت ایک دوسرا رنگ پیدا کر لیتی ہے اور نیک اخلاق کے ظاہر کرنے میں ایک طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور شوریدگی اور اتمارگی نفس کی روبکمی ہونے لگتی ہے اور اطمینان اور حلاوت پیدا ہوتی جاتی ہے اور بقدر استعداد اور مناسبتِ ذوقِ ایمانی جوش مارتا ہے اور انس اور شوق ظاہر ہوتا ہے اور التذاذ بذکر اللّٰہ بڑھتا ہے اور اُن کی صحبت طویلہ سے بضرورت یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی ایمانی قوتوں میں اور اخلاقی حالتوں میں اور انقطاع عن الدنیا میں اور توجّہ الی اللّٰہ میں اور محبّت الٰہیہ میں اور شفقت علی العباد میں اور وفا اور رضا اور استقامت میں اس عالی مرتبہ پر ہیں جس کی نظیر دنیا میں نہیں دیکھی گئی۔ اور عقلِ سلیم فی الفور معلوم کر لیتی ہے کہ وہ بند اور زنجیر اُن کے پاؤں سے اتارے گئے ہیں جن میں دوسرے لوگ گرفتار ہیں۔ اور وہ تنگی اور انقباض اُن کے سینے سے دُور کیا گیا ہے جس کے باعث سے دوسرے لوگوں کے سینے منقبض اور کوفتہ خاطر ہیں۔ ایسا ہی وہ لوگ تحدیث اور مکالمات حضرت احدیت سے بکثرت مشرف ہوتے ہیں۔ اور متواتر اور دائمی خطابات کے قابل ٹھیر جاتے ہیں۔ اور حق جلّ وعلا اور اس کے مستعد بندوں میں ارشاد اور ہدایت کے لئے واسطہ گردانے جاتے ہیں۔ اُن کی نورانیت دوسرے دلوں کو منور کر دیتی ہے۔ اور جیسے موسم بہار کے آنے سے نباتی قوتیں جوش زن ہو جاتی ہیں ایسا ہی اُن کے ظہور سے فطرتی نور طبائعِ سلیمہ میں جوش مارتے ہیں اور خود بخود ہر ایک سعید کا دل یہی چاہتا ہے کہ اپنی سعادتمندی کی استعدادوں کو بکوشش تمام منصّۂ ظہور میں لاوے اور خواب غفلت کے پردوں سے خلاصی پاوے اور معصیت اور فسق و فجور کے داغوں سے اور جہالت اور بے خبری کی ظلمتوں سے نجات حاصل کرے۔ سو ان کے مبارک عہد میں کچھ ایسی خاصیت ہوتی ہے اور کچھ اس قسم کا انتشارِ نورانیت ہو جاتا ہے کہ ہر ایک مومن اور طالبِ حق بقدر طاقتِ ایمانی اپنے نفس میں بغیر کسی ظاہری موجب کے انشراح اور شوق دینداری کا پاتا ہے اور ہمت کو زیادت اور قوت میں دیکھتا ہے۔ غرض ان کے اس عطرِ لطیف سے جو ان کو کامل متابعت کی برکت سے حاصل ہوا ہے ہر ایک مخلص کو بقدر اپنے اخلاص کے حظ پہنچتا ہے۔ ہاں جو لوگ شقیِّ ازلی ہیں وہ اس سے کچھ حصہ نہیں پاتے بلکہ اور بھی عناد اور حسد اور شقاوت میں بڑھ کر ہاویہ جہنم میں گرتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللّٰہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:- ختم اللّٰہ علیٰ قلوبھم ۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۶ - ۵۱۰ حاشیہ در حاشیہ ۳)

متبعین **قرآن شریف** کو جو انعامات ملتے ہیں اور جو مواہبِ خاصّہ ان کے نصیب ہوتے ہیں اگرچہ وہ بیان اور تقریر سے خارج ہیں۔ مگر اُن میں سے کئی ایک ایسے انعاماتِ عظیمہ ہیں جنکو بجگہ مفصّل طور پر بغرض ہدایت طالبین بطور نمونہ لکھنا قرینِ مصلحت ہے۔ چنانچہ وہ ذیل میں لکھے جاتے ہیں:۔

ازاں جملہ **علوم و معارف** ہیں جو کامل متبعین کو خوانِ نعمت فرقانیہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ جب انسان فرقان مجید کی سچی متابعت اختیار کرتا ہے اور اپنے نفس کو اس کے امر و نہی کے بکلّی حوالہ کر دیتا ہے اور کامل محبت اور اخلاص سے اس کی ہدایتوں میں غور کرتا ہے۔ اور کوئی اعراض صوری و معنوی باقی نہیں رہتا۔ تب اس کی نظر اور فکر کو حضرت فیاض مطلق کی طرف سے ایک نور عطا کیا جاتا ہے اور ایک لطیفِ عقل اس کو بخشی جاتی ہے جس سے عجیب و غریب لطائف اور نکات علم الٰہی کے جو کلام الٰہی میں پوشیدہ ہیں اُس پر کھلتے ہیں اور ابرِ نیساں کے رنگ میں معارف دقیقہ اس کے دل پر برستے ہیں۔ وہی معارف دقیقہ ہیں جن کو فرقان مجید میں حکمت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ یعنی خدا جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے۔ اور جس کو حکمت دی گئی اُس کو خیر کثیر دی گئی ہے۔ یعنی حکمت خیر کثیر پر مشتمل ہے اور جس نے حکمت پائی اُس نے خیر کثیر کو پالیا۔ سو یہ علوم و معارف جو دوسرے لفظوں میں حکمت کے نام سے موسوم ہیں یہ خیر کثیر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بحرِ محیط کے رنگ میں ہیں جو کلام الٰہی کے تابعین کو دیئے جاتے ہیں اور ان کے فکر اور نظر میں ایک ایسی برکت رکھی جاتی ہے جو اعلےٰ درجہ کے حقائقِ حقّہ اُن کے نفس آئینہ صفت پر منعکس ہوتے رہتے ہیں اور کامل صداقتیں اُن پر منکشف ہوتی رہتی ہیں اور تائیدات الٰہیہ ہر ایک تحقیق اور تدقیق کے وقت کچھ ایسا سامان اُن کے لئے میسّر کر دیتی ہیں جس سے بیان اُن کا ادھورا اور ناقص نہیں رہتا اور نہ کچھ غلطی واقع ہوتی ہے۔ سو جو جو علوم و معارف و دقائق حقائق و لطائف و نکات و ادلّہ و براہین ان کو سوجھتے ہیں وہ اپنی کمیّت اور کیفیت میں ایسے مرتبۂ کاملہ پر واقعہ ہوتے ہیں کہ جو خارق عادت ہے اور جس کا موازنہ اور مقابلہ دوسرے لوگوں سے ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ اپنے آپ ہی نہیں بلکہ تفہیم غیبی اور تائیدی صمدی اُن کی پیش رو ہوتی ہے اور اُسی تفہیم کی طاقت سے وہ اسرار و انوارِ قرآنی اُن پر کھلتے ہیں کہ جو صرف عقل کی دُود آمیز روشنی سے کھل نہیں سکتے۔ اور یہ علوم و معارف جو اُن کو عطا ہوتے ہیں جن سے

ذات اور صفاتِ الٰہی کے متعلق اور عالمِ معاد کی نسبت لطیف اور باریک باتیں اور نہایت عمیق حقیقتیں ان پر ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ ایک رُوحانی خوارق ہیں کہ جو بالغ نظروں کی نگاہوں میں جسمانی خوارق سے اعلیٰ اور الطف ہیں۔ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ عارفین اور اہل اللہ کا قدر و منزلت دانشمندوں کی نظر میں انہیں خوارق سے معلوم ہوتا ہے۔ اور وہی خوارق اُن کی منزلتِ عالیہ کی زینت اور آرائش اور اُن کے چہرۂ صلاحیت کی زیبائی اور خوبصورتی ہیں۔ کیونکہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ علوم و معارفِ حقہ کی ہیبت سب سے زیادہ اس پر اثر ڈالتی ہے اور صداقت اور معرفت ہریک چیز سے زیادہ اس کو پیاری ہے۔ اور اگر ایک زاہد عابد ایسا فرض کیا جائے کہ صاحبِ مکاشفات ہے اور اخبارِ غیبیہ بھی اُسے معلوم ہوتے ہیں اور ریاضاتِ شاقہ بھی بجا لاتا ہے اور کئی اَور قسم کے خوارق بھی اُس سے ظہور میں آتے ہیں۔ مگر علمِ الٰہی کے بارہ میں سخت جاہل ہے یہاں تک کہ حق اور باطل میں تمیز ہی نہیں کر سکتا بلکہ خیالاتِ فاسدہ میں گرفتار اور عقائدِ غیر صحیحہ میں مبتلا ہے۔ ہرایک بات میں خام اور ہرایک رائے میں فاش غلطی کرتا ہے تو ایسا شخص طبائعِ سلیمہ کی نظر میں نہایت حقیر اور ذلیل معلوم ہوگا۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ جس شخص سے دانا انسان کو جہالت کی بدبُو آتی ہے اور کوئی احمقانہ کلمہ اُس کے مُنہ سے سُن لیتا ہے تو فی الفور اس کی طرف سے دل متنفّر ہو جاتا ہے اور پھر وہ شخص عاقل کی نظر میں کسی طور سے قابلِ تعظیم نہیں ٹھہر سکتا اور گو کیسا ہی زاہد عابد کیوں نہ ہو کچھ حقیر سا معلوم ہوتا ہے۔ پس انسان کی اس فطرتی عادت سے ظاہر ہے کہ خوارق رُوحانی یعنی علوم و معارف اُس کی نظر میں اہل اللہ کے لئے شرط لازمی اور اکابرِ دین کی شناخت کے لئے علاماتِ خاصہ اور ضروریہ ہیں پس یہ علامتیں **فرقان شریف** کی کامل تابعین کو اکمل اور اتم طور پر عطا ہوتی ہیں اور باوجودیکہ ان میں سے اکثروں کی سرشت پر اُمّیت غالب ہوتی ہے اور علوم رسمیہ کو باستیفا حاصل نہیں کیا ہوتا۔ لیکن نکات اور لطائف اور علمِ الٰہی میں اس قدر اپنے ہمعصروں سے سبقت لے جاتے ہیں کہ بسا اوقات بڑے بڑے مخالف اُن کی تقریروں کو سُنکر یا اُن کی تحریروں کو پڑھکر اور دریائے حیرت میں پڑ کر بلا اختیار بول اُٹھتے ہیں کہ ان کے علوم و معارف ایک دوسرے عالم سے ہیں جو تائیداتِ الٰہی کے رنگ خاص سے رنگین ہیں اور اس کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ اگر کوئی منکر بطور مقابلہ کے الٰہیات کے مباحث میں سے کسی بحث میں اُن کی محققانہ اور عارفانہ تقریروں کے ساتھ کسی تقریر کا مقابلہ کرنا چاہے تو اخیر پر بشرطِ انصاف و دیانت

اس کو اقرار کرنا پڑیگا کہ صداقتِ حقّہ اسی تقریر میں تھی جو اُن کے مُنہ سے نکلی تھی۔ اور جیسے جیسے بحث عمیق ہوتی جائیگی بہت سے لطیف اور دقیق براہین ایسے نکلتے آئیں گے جن سے روز روشن کی طرح ان کا سچّا ہونا کھلتا جائیگا۔ چنانچہ ہر ایک طالب حق پر اس کا ثبوت ظاہر کرنے کے لئے ہم آپ ہی ذمہ دار ہیں۔

ازاں جملہ ایک **عصمت** بھی ہے جس کو حفظِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ عصمت بھی فرقان مجید کے کامل تابعین کو بطور خارق عادت عطا ہوتی ہے اور اسجگہ عصمت سے مراد ہماری یہ ہے کہ وہ ایسی نالائق اور مذموم عادات اور خیالات اور اخلاق اور افعال سے محفوظ رکھے جاتے ہیں جن میں دوسرے لوگ دن رات آلودہ اور ملوّث نظر آتے ہیں۔ اور اگر کوئی لغزش بھی ہو جائے تو رحمتِ الٰہیہ جلد تر ان کا تدارک کر لیتی ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ عصمت کا مقام نہایت نازک اور نفسِ امّارہ کے مقتضیات سے نہایت دُور پڑا ہوُا ہے جس کا حاصل ہونا بجز توجہ خاص الٰہی کے ممکن نہیں۔ مثلاً اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ وہ صرف ایک کذب اور دروغگوئی کی عادت سے اپنے جمیع معاملات اور بیانات اور حرفوں اور پیشوں میں قطعی طور پر باز رہے تو یہ اس کے لئے مشکل اور ممتنع ہو جاتا ہے۔ بلکہ اگر اس کام کے کرنے کے لئے کوشش اور سعی بھی کرے تو اس قدر موانع اور عوائق اس کو پیش آتے ہیں کہ بالآخر خود اس کا یہ اصول ہو جاتا ہے کہ دنیا داری میں جھوٹ اور خلاف گوئی سے پرہیز کرنا ناممکن ہے۔ مگر ان سعید لوگوں کے لئے کہ جو سچّی محبّت اور پُرجوش ارادت سے فرقان مجید کی ہدایتوں پر چلنا چاہتے ہیں صرف یہی امر آسان نہیں کیا جاتا کہ وہ دروغگوئی کی قبیح عادت سے باز رہیں بلکہ وہ ہر ناکردنی اور ناگفتنی کے چھوڑنے پر قادرِ مطلق سے توفیق پاتے ہیں اور خدائے تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے ایسی تقریباتِ شنیعہ سے اُن کو محفوظ رکھتا ہے جن سے وہ ہلاک کے ورطہ میں پڑیں۔ کیونکہ وہ دنیا کا نور ہوتے ہیں اور ان کی سلامتی میں دنیا کی سلامتی اور اُن کی ہلاکت میں دنیا کی ہلاکت ہوتی ہے۔ اسی جہت سے وہ اپنے ہر ایک خیال اور علم اور فہم اور غضب اور شہوت اور خوف اور طمع اور تنگی اور فراخی اور خوشی اور غمی اور عُسر اور یُسر میں تمام نالائق باتوں اور فاسد خیالوں اور نادرست علموں اور ناجائز عملوں اور بیجا فہموں اور ہر یک افراط و تفریط نفسانی سے بچائے جاتے ہیں اور کسی مذموم بات پر ٹھہرنا نہیں پاتے۔ کیونکہ خود خداوند کریم اُنکی تربیت کا متکفل ہوتا ہے اور جس شاخ کو ان کے شجرۂ طیبہ میں خشک دیکھتا ہے اس کو فی الفور اپنے

مربیانہ ہاتھ سے کاٹ ڈالتا ہے اور حمایتِ الٰہی ہر دم اور ہر لحظہ ان کی نگرانی کرتی رہتی ہے اور یہ نعمت محفوظیت کی جو اُن کو عطا ہوتی ہے۔ یہ بھی بغیر ثبوت نہیں بلکہ زیرک انسان کسی قدر صحبت سے اپنی پوری تسلّی سے اس کو معلوم کر سکتا ہے۔

ازانجملہ ایک مقام **توکّل** ہے جس پر نہایت مضبوطی سے اُن کو قائم کیا جاتا ہے اور ان کے غیر کو وہ چشمۂ صافی ہرگز میسّر نہیں آ سکتا بلکہ انہیں کے لئے وہ خوشگوار اور موافق کیا جاتا ہے اور نورِ معرفت ایسا ان کو تھامے رہتا ہے کہ وہ بسا اوقات طرح طرح کی بے سامانی میں ہو کر اور اسبابِ عادیہ سے بکلّی اپنے تئیں دُور پا کر پھر بھی ایسی بشاشت اور انشراحِ خاطر سے زندگی بسر کرتے ہیں اور ایسی خوشحالی سے دنوں کو کاٹتے ہیں کہ گویا اُن کے پاس ہزارہا خزائن ہیں۔ اُن کے چہروں پر تونگری کی تازگی نظر آتی ہے اور صاحبِ دولت ہونے کی مستقل مزاجی دکھائی دیتی ہے۔ اور تنگیوں کی حالت میں بکمال کشادہ دلی اور یقینِ کامل اپنے مولیٰ کریم پہ بھروسہ رکھتے ہیں۔ سیرتِ ایثار ان کا مشرب ہوتا ہے۔ اور خدمتِ خلق ان کی عادت ہوتی ہے اور کبھی انقباض ان کی حالت میں راہ نہیں پاتا۔ اگرچہ سارا جہان ان کا عیال ہو جائے۔ اور فی الحقیقت خدا تعالیٰ کی ستّاری مستوجبِ شکر ہے جو ہر جگہ اُن کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اور قبل اس کے جو کوئی آفت فوق الطاقت نازل ہو ان کو دامنِ عاطفت میں لے لیتی ہے کیونکہ اُن کے تمام کاموں کا خدا متولّی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس نے آپ ہی فرمایا ہے وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ لیکن دوسروں کو دنیاداری کے دلآزار اسباب میں چھوڑا جاتا ہے۔ اور وہ خارق عادت سیرت جو خاص ان لوگوں کے ساتھ ظاہر کی جاتی ہے کسی دوسرے کے ساتھ ظاہر نہیں کی جاتی۔ اور یہ خاصہ ان کا بھی صحبت سے بہت جلد ثابت ہو سکتا ہے۔

ازانجملہ ایک مقام **محبتِ ذاتی** کا ہے جس پر قرآن شریف کے کامل متبعین کو قائم کیا جاتا ہے۔ اور اُن کے رگ و ریشہ میں اس قدر محبتِ الٰہیہ تاثیر کر جاتی ہے کہ انکے وجود کی حقیقت بلکہ ان کی جان کی جان ہو جاتی ہے اور محبوبِ حقیقی سے ایک عجیب طرح کا پیار اُن کے دلوں میں جوش مارتا ہے اور ایک خارق عادت اُنس اور شوق ان کے قلوبِ صافیہ پر مستولی ہو جاتا ہے کہ جو غیر سے بکلّی منقطع اور گسستہ کر دیتا ہے اور آتشِ عشقِ الٰہی ایسی افروختہ ہوتی ہے کہ جو ہم صحبت لوگوں کو اوقاتِ خاصہ میں بدیہی طور پر مشہود اور محسوس ہوتی ہے بلکہ اگر محبّانِ صادق اس جوشِ محبت کو کسی حیلہ اور تدبیر سے پوشیدہ رکھنا بھی چاہیں

تو یہ ان کے لئے غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ جیسے عشاقِ مجازی کے لئے بھی یہ بات غیر ممکن ہے کہ وہ اپنے محبوب کی محبت کو جس کے دیکھنے کے لئے دن رات مرتے ہیں اپنے رفیقوں اور ہم صحبتوں سے چھپائے رکھیں۔ بلکہ وہ عشق جو ان کے کلام اور اُن کی صورت اور ان کی آنکھ اور ان کی وضع اور ان کی فطرت میں گھس گیا ہے اور اُن کے بال بال سے مترشح ہو رہا ہے وہ اُن کے چھپانے سے ہرگز چھپ ہی نہیں سکتا۔ اور ہزار چھپائیں کوئی نہ کوئی نشان اس کا نمودار ہو جاتا ہے۔ اور سب سے بزرگ تر اُن کے صدق قدم کا نشان یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب حقیقی کو ہر یک چیز پر اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر آلام اُسکی طرف سے پہنچیں تو محبت ذاتی کے غلبہ سے برنگِ انعام اُن کو مشاہدہ کرتے ہیں اور عذاب کو شربتِ عَذب کی طرح سمجھتے ہیں۔ کسی تلوار کی تیز دھار اُن میں اور اُن کے محبوب میں جدائی نہیں ڈال سکتی۔ اور کوئی بلیّہ عظمیٰ اُن کو اپنے اس پیارے کی یاد داشت سے روک نہیں سکتی۔ اسی کو اپنی جان سمجھتے ہیں اور اسی کی محبت میں لذات پاتے اور اُسی کی ہستی کو ہستی خیال کرتے ہیں اور اُسی کے ذکر کو اپنی زندگی کا ماحصل قرار دیتے ہیں۔ اگر چاہتے ہیں تو اُسی کو اگر آرام پاتے ہیں تو اُسی سے۔ تمام عالم میں اسی کو رکھتے ہیں اور اُسی کے ہو رہتے ہیں۔ اُسی کے لئے جیتے ہیں اُسی کے لئے مرتے ہیں۔ عالم میں رہ کر پھر بے عالم ہیں۔ اور باخود ہو کر پھر بے خود ہیں۔ نہ عزت سے کام رکھتے ہیں نہ نام سے نہ اپنی جان سے نہ اپنے آرام سے بلکہ سب کچھ ایک کے لئے کھو بیٹھتے ہیں اور ایک کے پانے کے لئے سب کچھ دے ڈالتے ہیں۔ لایُدرک آتش سے جلتے جاتے ہیں اور کچھ بیان نہیں کر سکتے کہ کیوں جلتے ہیں۔ اور تفہیم اور تفہّم سے صُمٌّ بُکمٌ ہوتے ہیں اور ہر یک مصیبت اور ہر یک رسوائی کے سہنے کو تیار رہتے ہیں اور اُس سے لذت پاتے ہیں ؎

عشق است کہ برخاک مذلّت غلطاند ؎ عشق است کہ بر آتش سوزاں بنشاند
کس بہر کسے سر ندہد جاں نہ فشاند ؎ عشق است کہ ایں کار بصد صدق کناند

ازانجملہ **اخلاقِ فاضلہ** ہیں۔ جیسے سخاوت۔ شجاعت۔ ایثار۔ علوّ ہمّت۔ وفور شفقت حلم۔ حیا۔ مودت۔ یہ تمام اخلاق بھی بوجہ احسن اور انسب انہیں سے صادر ہوتے ہیں اور وہی لوگ بیمن متابعت قرآن شریف وفاداری سے اخیر عمر تک ہر یک حالت میں انکو بخوبی و شائستگی انجام دیتے ہیں اور کوئی انقباض خاطر انکو ایسا پیش نہیں آتا کہ جو اخلاق حسنہ کی کما ینبغی صادر ہونے سے ان کو روک سکے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ خوبی علمی

با عملی یا اخلاقی انسان سے صادر ہو سکتی ہے وہ صرف انسانی طاقتوں سے صادر نہیں ہو سکتی بلکہ اصل موجب اسکے صدور کا فضلِ الٰہی ہے۔ پس چونکہ یہ لوگ سب سے زیادہ موردِ فضلِ الٰہی ہوتے ہیں اس لئے خود خداوند کریم اپنے تفضلات لا متناہی سے تمام خوبیوں سے اُن کو متمتع کرتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ حقیقی طور پر بجز خدا تعالیٰ کے اور کوئی نیک نہیں۔ تمام اخلاق فاضلہ اور تمام نیکیاں اُسی کے لئے مسلّم ہیں۔ پھر جسقدر کوئی اپنے نفس اور ارادت سے فانی ہو کر اس ذاتِ خیر محض کا قرب حاصل کرتا ہے اُسی قدر اخلاقِ الٰہیہ اس کے نفس پر منعکس ہوتی ہیں۔ پس بندہ کو جو جو خوبیاں اور سچی تہذیب حاصل ہوتی ہے وہ خدا ہی کے قرب سے حاصل ہوتی ہے اور ایسا ہی چاہیئے تھا کیونکہ مخلوق فی ذاتہٖ کچھ چیز نہیں ہے۔ سو اخلاق فاضلہ الٰہیہ کا انعکاس انہیں کے دلوں پر ہوتا ہے کہ جو لوگ قرآن شریف کا کامل اتباع اختیار کرتے ہیں اور تجربہ صحیحہ بتلا سکتا ہے کہ جس مشرب صافی اور روحانی ذوق اور محبت کے بھرے ہوئے جوش سے اخلاق فاضلہ اُن سے صادر ہوتے ہیں اس کی نظیر دنیا میں نہیں پائی جاتی اگرچہ مُنہ سے ہر یک شخص دعویٰ کر سکتا ہے۔ اور لاف و گزاف کے طور پر ہر یک کی زبان چل سکتی ہے مگر جو تجربہ صحیحہ کا تنگ دروازہ ہے اُس دروازہ سے سلامت نکلنے والے یہی لوگ ہیں۔ اور دوسرے لوگ اگر کچھ اخلاقِ فاضلہ ظاہر کرتے بھی ہیں تو تکلّف اور تصنع سے ظاہر کرتے ہیں اور اپنی آلودگیوں کو پوشیدہ رکھ کر اور اپنی بیماریوں کو چھپا کر اپنی جھوٹی تہذیب دکھلاتے ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ امتحانوں میں اُن کی قلعی کھل جاتی ہے اور تکلّف اور تصنع اخلاق فاضلہ کے ادا کرنے میں اکثر وہ اس لئے کرتے ہیں کہ اپنی دُنیا اور معاشرت کا حسن انتظام وہ اسی میں دیکھتے ہیں۔ اور اگر اپنی اندرونی آلائشوں کی ہر جگہ پیروی کریں تو پھر مہمّات معاشرت میں خلل پڑتا ہے۔ اور اگرچہ بقدر استعداد فطرتی کے کچھ تخم اخلاق کا اُن میں بھی ہوتا ہے مگر وہ اکثر نفسانی خواہشوں کے کانٹوں کے نیچے دبا رہتا ہے اور بغیر آمیزش اغراض نفسانی کے خالصاً لِلّٰہ ظاہر نہیں ہوتا چہ جائیکہ اپنے کمال کو پہنچے۔ اور خالصاً لِلّٰہ اُنہیں میں وہ تخم کمال کو پہنچتا ہے کہ جو خدا کے ہو رہتے ہیں اور جن کے نفوس کو خدائے تعالیٰ غیریت کی لوث سے بکلّی خالی پاکر خود اپنے پاک اخلاق سے بھر دیتا ہے اور اُن کے دلوں میں وہ اخلاق ایسے پیارے کر دیتا ہے جیسے وہ اس کو آپ پیارے ہیں۔ پس وہ لوگ فانی ہونے کی وجہ سے تخلق باخلاق اللہ کا ایسا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں کہ گویا وہ خدا کا ایک آلہ ہو جاتے ہیں جس کی توسط سے وہ اپنے اخلاق ظاہر کرتا ہے اور اُن کو بھوکے اور پیاسے پاکر وہ آبِ زلال ان کو اپنے اُس خاص چشمہ سے

پلاتا ہے جس میں کسی مخلوق کو علی وجہ الاصالت اس کے ساتھ شرکت نہیں۔

اور منجملہ اُن عطیات کے ایک کمالِ عظیم جو قرآن شریف کے کامل تابعین کو دیا جاتا ہے **عبودیت** ہے۔ یعنی وہ باوجود بہت سے کمالات کے ہر وقت نقصان ذاتی اپنا پیش نظر رکھتے ہیں اور بشہود کبریائی حضرت باری تعالیٰ ہمیشہ تذلّل اور نیستی اور انکسار میں رہتے ہیں۔ اور اپنی اصل حقیقت ذلت اور مفلسی اور ناداری اور پُر تقصیری اور خطاداری سمجھتے ہیں۔ اور ان تمام کمالات کو جو ان کو دیئے گئے ہیں اس عارضی روشنی کی مانند سمجھتے ہیں جو کسی وقت آفتاب کی طرف سے دیوار پر پڑتی ہے جس کو حقیقی طور پر دیوار سے کچھ بھی علاقہ نہیں ہوتا اور لباس مستعار کی طرح معرضِ زوال میں ہوتی ہے۔ پس وہ تمام خیر و خوبی خدا ہی میں محصور رکھتے ہیں اور تمام نیکیوں کا چشمہ اُسی کی ذات کامل کو قرار دیتے ہیں اور صفاتِ الٰہیہ کے کامل شہود سے اُن کے دل میں حق الیقین کے طور پر بھر جاتا ہے کہ ہم کچھ چیز نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے وجود اور ارادہ اور خواہش سے بکلّی کھوئے جاتے ہیں۔ اور عظمت الٰہی کا پُرجوش دریا اُن کے دلوں پر ایسا محیط ہو جاتا ہے کہ ہزارہا طور کی نیستی اُن پر وارد ہو جاتی ہے اور شرکِ خفی کے ہر یک رگ و ریشہ سے بکلّی پاک اور منزہ ہو جاتے ہیں۔

اور منجملہ ان عطیات کے ایک یہ ہے کہ اُن کی معرفت اور خداشناسی بذریعہ **کشوف صادقہ** اور علومِ لدنیہ و الہاماتِ صریحہ و مکالمات و مخاطبات حضرتِ احدیت و دیگر خوارق عادت بدرجہ اکمل و اتم پہنچائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اُن میں اور عالمِ ثانی میں ایک نہایت رقیق اور شفّاف حجاب باقی رہ جاتا ہے جس میں سے ان کی نظر عبور کر کے واقعاتِ اُخروی کو اسی عالم میں دیکھ لیتی ہے برخلاف دوسرے لوگوں کے کہ جو بباعث پُرظلمت ہونے اپنی کتابوں کے اس مرتبۂ کاملہ تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے بلکہ اُن کی کج تعلیم کتابیں اُن کے حجابوں پر اَور بھی صدہا حجاب ڈالتے ہیں اور بیماری کو آگے سے آگے بڑھا کر موت تک پہنچاتے ہیں اور فلسفی جن کے قدموں پر آجکل برہمو سماج والے چلتے ہیں اور جن کے مذہب کا سارا مدار عقلی خیالات پر ہے وہ خود اپنے طریق میں ناقص ہیں اور اُن کے نقصان پر یہی دلیل کافی ہے کہ اُن کی معرفت باوجود صدہا طرح کی غلطیوں کی نظری وجوہ سے تجاوز نہیں کرتی اور قیاسی اٹکلوں سے آگے نہیں بڑھتی اور ظاہر ہے کہ جس شخص کی معرفت صرف نظری طور پر محدود ہے اور وہ بھی کئی طرح کی خطا کی آلودگیوں سے ملوّث۔ وہ شخص بمقابلہ اُس شخص کے جس کا عرفان بداہت کے مرتبہ تک

پہنچ گیا ہے اپنی علمی حالت میں بغایت درجہ پست اور متنزل ہے۔ ظاہر ہے کہ نظر اور فکر کے مرتبہ کے آگے ایک مرتبہ بداہت اور شہود کا باقی ہے۔ یعنی جو امور نظری اور فکری طور پر معلوم ہوتے ہیں وہ ممکن ہیں کہ کسی اور ذریعہ سے بدیہی اور شہود طور پر معلوم ہوں۔ سو یہ مرتبہ بداہت کا عندالعقل ممکن الوجود ہے اور گو برہمو سماج والے اس مرتبہ کے وجود فی الخارج سے انکار ہی کریں پر اس بات سے انہیں انکار نہیں کہ وہ مرتبہ اگر خارج میں پایا جاوے تو بلاشبہ اعلیٰ و اکمل ہے اور جو نظر اور فکر میں خفایا باقی رہ جاتے ہیں ان کا ظہور اور بروز اسی مرتبہ پر موقوف ہے۔ اور خود اس بات کو کون نہیں سمجھ سکتا کہ ایک امر کا بدیہی طور پر کھل جانا نظری طور سے اعلیٰ اور اکمل ہے مثلاً اگرچہ مصنوعات کو دیکھکر دانا اور سلیم الطبع انسان کا اس طرف خیال آسکتا ہے کہ ان چیزوں کا کوئی صانع ہوگا۔ مگر نہایت بدیہی اور روشن طریق معرفت الٰہی کا جو اُس کے وجود پر بڑی ہی مضبوط دلیل ہے یہ ہے کہ اُس کے بندوں کو الہام ملتا ہے اور قبل اس کے جو حقائق اشیاء کا انجام کھلے اُن پر کھولا جاتا ہے اور وہ اپنے معروضات میں حضرتِ احدیت سے جوابات پاتے ہیں۔ اور اُن سے مکالمات اور مخاطبات ہوتے ہیں اور بنظر کشفی اُن کو عالم ثانی کے واقعات دکھلائے جاتے ہیں اور جزا سزا کی حقیقت پر مطلع کیا جاتا ہے اور دوسرے کئی طور کے اسرارِ اخروی اُن پر کھولے جاتے ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہ تمام امور علم الیقین کو اتم اور اکمل مرتبہ تک پہنچاتے ہیں اور نظری ہونے کے عمیق نشیب سے بداہت کے بلند مینار تک لے جاتے ہیں بالخصوص مکالمات اور مخاطبات حضرتِ احدیت ان سب اقسام سے اعلیٰ ہیں کیونکہ اُن کے ذریعہ سے صرف اخبارِ غیبیہ ہی معلوم نہیں ہوتے بلکہ عاجز بندہ پر جو جو مولیٰ کریم کی عنایتیں ہیں اُن سے بھی اطلاع دی جاتی ہے اور ایک لذیذ اور مبارک کلام سے ایسی تسلّی اور تشفی اس کو عطا ہوتی ہے اور خوشنودی حضرت باری تعالیٰ سے مطلع کیا جاتا ہے جس سے بندہ مکروہاتِ دنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی قوت پاتا ہے۔ گویا صبر اور استقامت کے پہاڑ اس کو عطا کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح بذریعہ کلام اعلیٰ درجہ کے علوم اور معارف بھی بندہ کو سکھلائے جاتے ہیں اور اسرارِ خفیہ و دقائق عمیقہ بتلائے جاتے ہیں کہ جو بغیر تعلیم خاص ربّانی کے کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتے اور اگر کوئی یہ شبہ پیش کرے کہ یہ تمام امور جن کی نسبت یہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآن شریف کے کامل اتباع سے حاصل ہوتے ہیں کیونکر اسلام میں اُن کا متحقّق فی الخارج ہونا بہ پایۂ ثبوت پہنچ سکتا ہے تو اس وہم کا جواب یہ ہے کہ صُحبت سے۔ اور اگرچہ ہم کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں

لیکن بغیر اندیشہ طول کے پھر مکرر ہر یک مخالف پر ظاہر کرتے ہیں کہ فی الحقیقت یہ دولتِ عظمیٰ اسلام میں پائی جاتی ہے کسی دوسرے مذہب میں ہرگز پائی نہیں جاتی اور طالب حق کے لئے اِس کے ثبوت کے بارے میں ہم آپ ہی ذمہ دار ہیں۔ بشرطِ صحبت و حُسن ارادت و تحقق مناسبت اور صبر اور ثبات کے یہ امور ہر ایک طالب پر بقدر استعداد اور لیاقتِ ذاتی اُس کی کے کُھل سکتے ہیں۔

(براہین احمدیہ ص ۵۱۰-۵۲۳ حاشیہ در حاشیہ ۳)

قرآن شریف جو آنحضرتؐ کے اتباع کا مدار علیہ ہے ایک ایسی کتاب ہے جس کی متابعت سے اِسی جہان میں آثار نجات کے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہی کتاب ہے کہ جو دونوں طریق ظاہری اور باطنی کے ذریعہ سے نفوسِ ناقصہ کو مرتبہ تکمیل پہنچاتی ہے اور شکوک اور شبہات سے خلاصی بخشتی ہے۔ ظاہری طریق سے اس طرح پر کہ بیان اس کا ایسا جامع دقائق و حقائق ہے کہ جسقدر دنیا میں ایسے شبہات پائے جاتے ہیں کہ جو خدا تک پہنچنے سے روکتے ہیں جن میں مبتلا ہو کر صدہا جھوٹے فرقے پھیل رہے ہیں اور صدہا طرح کے خیالاتِ باطلہ گمراہ لوگوں کے دلوں میں جم رہے ہیں سب کا ردّ معقولی طور پر اس میں موجود ہے۔ اور جو جو تعلیم حقّہ اور کاملہ کی روشنی ظلمت موجودہ زمانہ کے لئے درکار ہے وہ سب آفتاب کی طرح اس میں چمک رہی ہے اور تمام امراض نفسانی کا علاج اس میں مندرج ہے اور تمام معارف حقّہ کا بیان اِس میں بھرا ہوا ہے اور کوئی دقیقہ علم الٰہی نہیں کہ جو آئندہ کسی وقت ظاہر ہو سکتا ہے اور اس سے باہر رہ گیا ہو۔ اور باطنی طریق سے اس طور پر کہ اس کی کامل متابعت دل کو ایسا صاف کر دیتی ہے کہ انسان اندرونی آلودگیوں سے بالکل پاک ہو کر حضرتِ اعلیٰ سے اتصال پکڑ لیتا ہے اور انوارِ قبولیت اُس پہ وارد ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور عنایاتِ الٰہیہ اس قدر اُس پر احاطہ کر لیتی ہیں کہ وہ مشکلات کے وقت دُعا کرتا ہے تو کمال رحمت اور عطوفت سے خداوند کریم اس کا جواب دیتا ہے اور بعض اوقات ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ اگر وہ ہزار مرتبہ ہی اپنی مشکلات اور ہجوم غموں کے وقت میں سوال کرے تو ہزار ہا مرتبہ ہی اپنے مولیٰ کریم کی طرف سے نہایت فصیح اور لذیذ اور متبرک کلام میں محبت آمیز جواب پاتا ہے۔ اور الہام الٰہی بارش کی طرح اس پر برستا ہے اور وہ اپنے دل میں محبتِ الٰہیہ کو ایسا بھرا ہوا پاتا ہے جیسا ایک نہایت صاف شیشہ ایک لطیف عطر سے بھرا ہوتا ہے۔ اور انس اور شوق کی ایک ایسی پاک لذت اس کو عطا کی جاتی ہے کہ

جو اُس کے سخت سخت نفسانی زنجیروں کو توڑ کر اور اِس دُخانستان سے باہر نکال کر محبوبِ حقیقی کی ٹھنڈی اور دل آرام ہوا سے اس کو ہر دم اور ہر لحظہ تازہ زندگی بخشتی رہتی ہے۔ پس وہ اپنی وفات سے پہلے ہی اُن عنایاتِ الٰہیہ کو بچشمِ خود دیکھ لیتا ہے جن کے دیکھنے کے لئے دوسرے لوگ بعد مرنے کے اُمیدیں باندھتے ہیں۔ اور یہ سب نعمتیں کسی راہبانہ محنت اور ریاضت پر موقوف نہیں بلکہ صرف قرآن شریف کے اتباع سے دی جاتی ہیں اور ہر ایک طالب صادق انکو پا سکتا ہے۔ ہاں اُن کے حصول میں خاتم الرسلؐ اور فخر الرسلؐ کی بدرجہ کامل محبت بھی شرط ہے۔ تب بعد محبت نبی اللہ کے انسان ان نوروں میں سے بقدر استعدادِ خود حصّہ پالیتا ہے کہ جو کامل طور پر نبی اللہ کو دی گئی ہیں۔ پس طالب حق کے لئے اِس سے بہتر اور کوئی طریق نہیں کہ وہ کسی صاحب بصیرت اور معرفت کے ذریعہ سے خود اس دین متین میں داخل ہو کر اور اتباعِ کلام الٰہی اور محبت رسولِ مقبول اختیار کر کے ہمارے اِن بیانات کی حقیقت کو بچشم خود دیکھ لے۔ اور اگر وہ اس غرض کے حصول کے لئے ہماری طرف بصدق دل رجوع کرے تو ہم خدا کے فضل اور کرم پر بھروسہ کر کے اُسکو طریق اتباع بتلانے کو تیار ہیں پر خدا کا فضل اور استعداد ذاتی درکار ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سچّی نجات سچی تندرستی کی مانند ہے۔ پس جیسی سچی تندرستی وہ ہے کہ جس میں تمام آثار تندرستی کے ظاہر ہوں اور کوئی عارضہ منافی اور مغائرِ تندرستی کا لاحق نہ ہو۔ اِسی طرح سچی نجات بھی وہی ہے کہ جس میں حصول نجات کے آثار بھی پائے جائیں کیونکہ جس چیز کا واقعی طور پر وجود متحقق ہو۔ اُس وجود متحقق کے لئے آثار و علامات کا پائے جانا لازم پڑا ہوا ہے اور بغیر تحقق وجود ان آثار و علامات کے وجود اس چیز کا متحقق نہیں ہو سکتا۔ اور جیسا کہ ہم بارہا لکھ چکے ہیں تحقق نجات کے لئے یہ علامات خاص ہیں کہ انقطاع الی اللہ اور غلبہ حبِّ الٰہی اس قدر کمال کے درجہ تک پہنچ جائے کہ اس شخص کی صحبت اور توجہ اور دُعا سے بھی یہ امور دوسرے ذی استعداد لوگوں میں پیدا ہو سکیں اور خود وہ اپنی ذاتی حالت میں ایسا منور الباطن ہو کہ اس کی برکات طالب حق کی نظر میں بدیہی الظہور ہوں اور اس میں وہ تمام خصوصیات اور مخاطبات حضرت احدیت پائی جائیں کہ جو مقربین میں پائی جاتی ہیں۔ اِس جگہ کوئی شخص نجومیوں اور جوتشیوں وغیرہ غیب گویوں کی پیشگوئیوں پر دھوکہ نہ کھاوے اور بخوبی یاد رکھے کہ ان لوگوں کو اہل اللہ کے انوار اور برکات سے کچھ بھی مناسبت نہیں۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے کہ قادرانہ پیشگوئیاں اور کریمانہ مواعید

کہ جو حق محض ہیں اور جن میں سراسر فتح اور نصرت کی بشارتیں اور اقبال اور عزت کی خبریں بھری ہوئی ہیں۔ ان سے انسانی آلات کو کچھ بھی نسبت نہیں۔ خدا تعالیٰ نے اہل اللہ کو ایسی فطرت بخشی ہے کہ ان کی نظر اور صحبت اور توجہ اور دُعا اکسیر کا حکم رکھتی ہے بشرطیکہ شخص مستفیض میں قابلیت موجود ہو۔ اور ایسے لوگ صرف پیشگوئیوں سے نہیں بلکہ اپنے خزائن معرفت سے اپنی توکل خارق عادت سے اپنی کامل محبت سے اپنے انقطاع تام سے اپنے صدق اور ثبات سے اپنے اُنس باللہ اور شوق اور ذوق سے اور اپنے غلبہ خشوع اور خضوع سے اور اپنے تزکیہ نفس سے اور اپنی ترکِ محبت دنیا سے اور اپنی کثیر الوجود برکتوں سے کہ جو بارش کی طرح برستی ہیں۔ اور اپنے مؤید من اللہ ہونے سے اور اپنی بے مثل استقامت اور اعلیٰ درجہ کی وفاداری اور لاثانی تقویٰ اور طہارت اور عظیم الشان ہمت اور انشراح صدر سے شناخت کئے جاتے ہیں اور پیشگوئیاں ان کا اصل منصب نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس غرض سے ہے کہ تا وہ ان برکتوں کو جو اُن پر اور اُن کے متعلقین پر وارد ہونے کو ہیں قبل از وقوع بیان کرکے توجہ خاص حضرتِ احدیت پر یقین دلائیں۔ اور نیز وہ مخاطبات اور مکالمات جو حضرت احدیت کی طرف سے اُن کو ہوتے ہیں اُن کی صحت اور منجانب اللہ ہونے پر ایک قطعی اور یقینی حجّت پیش کریں۔ اور ایسے انسان جن کو یہ سب برکات قدسیہ بکثرت عطا ہوتی ہیں اُن کی نسبت خدا کی قدرت اور حکمتِ قدیمہ کے قانون میں یہی قرار پایا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے سچے اور پاک عقائد ہوں اور جو سچے مذہب پر ثابت اور مستقیم ہوں اور حضرت احدیت سے غایت درجہ کا اتصال اور دنیا و مافیہا سے غایت درجہ کا انقطاع رکھتے ہوں۔ ایسے لوگ کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں اور اُن کی فطرت کو ربانی انوار اور حقانی مذہب لازم ہے اور ان کی ذات ستودہ صفات کو کہ جو جامع البرکات ہے بدبخت نجومیوں اور جوتشیوں سے نسبت دینا کمال درجہ کی کج فہمی اور غایت درجہ کی بدنصیبی ہے کیونکہ وہ دنیا کے ذلیل جیفہ خواروں کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتے بلکہ وہ آفتاب اور چاند کی طرح آسمانی نور ہیں اور حکمتِ الٰہیہ کے قانونِ قدیم نے اسی غرض سے ان کو پیدا کیا ہے کہ تا دنیا میں آکر دنیا کو منور کریں۔ یہ بات بتوجہ تمام یاد رکھنی چاہیئے کہ جیسے خدا نے امراض بدنی کیلئے بعض ادویہ پیدا کی ہیں اور عمدہ عمدہ چیزیں جیسے تریاق وغیرہ انواع و اقسام کے آلام اسقام کے لئے دنیا میں موجود کی ہیں اور ان ادویہ میں ابتداء سے یہ خاصیت رکھی ہے کہ جب کوئی بیمار بشرطیکہ اس کی بیماری درجہ شفا یابی سے تجاوز نہ کر گئی ہو ان دواؤں کو برعایت پرہیز وغیرہ

شرائط استعمال کرتا ہے تو اس حکیم مطلق کی اسی طرح پر عادت جاری ہے کہ اس بیمار کو حسب استعداد اور قابلیت کسی قدر صحت اور تندرستی سے حصہ بخشتا ہے یا بکلّی شفا عنایت کرتا ہے۔ اِسی طرح خداوند کریم نے نفوسِ طیبہ ان مقربین میں بھی روز ازل سے یہ خاصیت ڈال رکھی ہے کہ اُن کی توجہ اور دُعا اور صحبت اور عقد ہمت بشرطِ قابلیت امراض رُوحانی کی دوا ہے۔ اور اُن کے نفوس حضرت احدیت سے بذریعہ مکالمات و مخاطبات و مکاشفات انواع و اقسام کے فیض پاتے رہتے ہیں اور پھر وہ تمام فیوض خلق اللہ کی ہدایت کے لئے ایک عظیم الشان اثر دکھلاتے ہیں۔ غرض اہل اللہ کا وجود خلق اللہ کے لئے ایک رحمت ہوتا ہے۔ اور جس طرح اِس جائے اسباب میں قانونِ قدرت حضرت احدیت کا یہی ہے کہ جو شخص پانی پیتا ہے وہی پیاس کی درد سے نجات پاتا ہے۔ اور جو شخص روٹی کھاتا ہے وہی بھوک کے دُکھ سے خلاصی حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح عادت الٰہیہ جاری ہے کہ امراضِ روحانی دُور کرنے کے لئے انبیاء اور اُن کے کامل تابعین کو ذریعہ اور وسیلہ ٹھہرا رکھا ہے۔ اُنہی کی صحبت میں دل تسلّی پکڑتے ہیں۔ اور بشریت کی آلائشیں دُور ہوتی ہیں اور نفسانی ظلمتیں اُٹھتی ہیں۔ اور محبّت الٰہی کا شوق جوش مارتا ہے اور آسمانی برکات اپنا جلوہ دکھاتی ہیں اور بغیر ان کے ہرگز یہ باتیں حاصل نہیں ہوتیں۔ پس یہی باتیں اُن کی شناخت کی علاماتِ خاصہ ہیں۔ فتدبّر ولا تغفل۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۳۲۳-۳۲۴ حاشیہ در حاشیہ ۲)

اب ہم اسجگہ بغرض فائدہ عام یہ بات بطور قاعدہ کلیّہ بیان کرتے ہیں کہ کلام کا وہ کونسا مرتبہ ہے جس مرتبہ پر کوئی کلام واقعہ ہونے سے اس صفت سے متّصف ہو جاتا ہے کہ اس کو بے نظیر اور منجانب اللہ کہا جائے اور پھر بطور نمونہ کوئی سُورۃ قرآن شریف کی لکھ کر اس میں ثابت کر کے دکھلائیں گے کہ وہ تمام وجوہ بے نظیری جو قاعدہ کلیّہ میں قرار دی گئی ہیں اس سورۃ میں بہ تمام و کمال پائی جاتی ہیں۔ اور اگر کسی کو اِن وجوہ بے نظیری کے قبول کرنے میں پھر بھی انکار ہوگا تو یہ بارِ ثبوت اُسی کے ذمہ ہوگا کہ کوئی دوسرا کلام پیش کر کے دکھلاوے جس میں وہ تمام وجوہ بے نظیری پائے جاویں۔ سو واضح ہو کہ اگر کوئی کلام ان تمام چیزوں میں سے کہ جو خدائے تعالیٰ کی طرف سے صادر اور اُس کے دستِ قدرت کی صنعت ہیں کسی چیز سے مشابہت کلّی رکھتا ہو یعنی اُس میں عجائباتِ ظاہری و باطنی ایسے طور پر جمع ہوں کہ جو مصنوعات الٰہیہ میں سے کسی شے میں جمع ہیں تو اس صورت میں کہا جائیگا کہ وہ کلام ایسے مرتبہ پر واقع ہے کہ جس کی

مثل بنانے سے انسانی طاقتیں عاجز ہیں۔ کیونکہ جس چیز کی نسبت بے نظیر اور صادر من اللہ ہونا عند الخواص والعوام ایک مسلّم اور مقبول امر ہے جس میں کسی کو اختلاف اور نزاع نہیں اُس کی وجوہ بے نظیری میں کسی شے کی شراکت تامہ ثابت ہونا بلاشبہ اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ وہ شے بھی بے نظیر ہی ہے۔ مثلاً اگر کوئی چیز اُس چیز سے بکلّی مطابق آ جائے جو اپنے مقدار میں دس گز ہے تو اس کی نسبت بھی یہ علم صحیح قطعی مفید یقین جازم حاصل ہوگا کہ وہ بھی دس گز ہے۔

اب ہم ان مصنوعاتِ الٰہیہ میں سے ایک لطیف مصنوع کو مثلاً گلاب کے پھول کو بطور مثال قرار دیکر اس کے وہ عجائبات ظاہری و باطنی لکھتے ہیں جن کی رُو سے وہ ایسی اعلیٰ حالت پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اُس کی نظیر بنانے سے انسانی طاقتیں عاجز ہیں۔ اور پھر اس بات کو ثابت کر کے دکھلائیں گے کہ ان سب عجائبات سے سورۃ فاتحہ کے عجائبات اور کمالات ہموزن ہیں بلکہ ان عجائبات کا پلّہ بھاری ہے۔ اور اس مثال کے اختیار کرنے کا موجب یہ ہوا کہ ایک مرتبہ اس عاجز نے اپنی نظر کشفی میں سورۃ فاتحہ کو دیکھا کہ ایک ورق پر لکھی ہوئی اس عاجز کے ہاتھ میں ہے اور ایک ایسی خوبصورت اور دلکش شکل میں ہے کہ گویا وہ کاغذ جس پر سورۃ فاتحہ لکھی ہوئی ہے سُرخ سُرخ اور ملائم گلاب کے پھولوں سے اسقدر لدا ہوا ہے کہ جس کا کچھ انتہا نہیں۔ اور جب یہ عاجز اس سورت کی کوئی آیت پڑھتا ہے تو اُس میں سے بہت سے گلاب کے پھول ایک خوش آواز کے ساتھ پرواز کر کے اوپر کی طرف اُڑتے ہیں اور وہ پھول نہایت لطیف اور بڑے بڑے اور سندر اور تر و تازہ اور خوشبودار ہیں جن کے اوپر چڑھنے کے وقت دل و دماغ نہایت معطر ہو جاتا ہے اور ایک ایسا عالم مستی کا پیدا کرتے ہیں کہ جو اپنی بے مثل لذّتوں کی کشش سے دنیا و مافیہا سے نہایت درجہ کی نفرت دلاتے ہیں۔ اِس مکاشفہ سے معلوم ہوا کہ گلاب کے پھول کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ ایک رُوحانی مناسبت ہے سو ایسی مناسبت کے لحاظ سے اس مثال کو اختیار کیا گیا اور مناسب معلوم ہوا کہ اوّل بطور مثال گلاب کے پھول کے عجائبات کو کہ جو اس کے ظاہر و باطن میں پائے جاتے ہیں لکھا جائے اور پھر بمقابلہ اس کے عجائبات کے **سورۃ فاتحہ کے عجائبات** ظاہری و باطنی قلمبند ہوں تا ناظرین باانصاف کو معلوم ہو کہ جو خوبیاں گلاب کے **پھول میں ظاہراً و باطناً** پائی جاتی ہیں جن کے رُو سے اُس کی نظیر بنانا عادتاً محال سمجھا گیا ہے۔ اُسی طور پر اور اس سے بہتر خوبیاں سورۃ فاتحہ میں موجود ہیں اور تا اس مثال کے لکھنے سے اشارہ کشفی پر بھی عمل ہو جائے۔ پس جاننا چاہیئے کہ یہ امر ہر ایک

عاقل کے نزدیک بغیر کسی تردّد اور توقف کے مسلّم الثبوت ہے کہ گلاب کا پھول بھی مثل اور مصنوعاتِ الٰہیہ کے ایسی عمدہ خوبیاں اپنی ذات میں جمع رکھتا ہے جن کی مثل بنانے پر انسان قادر نہیں اور وہ دو طور کی خوبیاں ہیں۔ ایک وہ کہ جو اس کی ظاہری صورت میں پائی جاتی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اس کا رنگ نہایت خوشنما اور خوب ہے۔ اور اسکی خوشبو نہایت دل آرام اور دلکش ہے۔ اور اُس کے ظاہر بدن میں نہایت درجہ کی ملائمت اور تر و تازگی اور نرمی اور نزاکت اور صفائی ہے۔ اور دوسری وہ خوبیاں ہیں کہ جو باطنی طور پر حکیم مطلق نے اُس میں ڈال رکھی ہیں۔ یعنی وہ خواص کہ جو اُس کے جوہر میں پوشیدہ ہیں اور وہ یہ ہیں کہ وہ مفرّح اور مقوّی قلب اور مسکّن صفراء ہے اور تمام قویٰ اور ارواح کو تقویت بخشتا ہے اور صفرا اور بلغم رقیق کا مسہل بھی ہے اور اسی طرح معدہ اور جگر اور گردہ اور امعاء اور رحم اور پھیپھڑہ کو بھی قوت بخشتا ہے اور خفقانِ حار اور غشی اور ضعف قلب کے لئے نہایت مفید ہے اور اسی طرح اور کئی امراض بدنی کو فائدہ مند ہے۔ پس انہیں دونوں طور کی خوبیوں کی وجہ سے اُسکی نسبت اعتقاد کیا گیا ہے کہ وہ ایسے مرتبۂ کمال پر واقع ہے کہ ہرگز کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی ایسا پھول بناوے کہ جو اس پھول کی طرح رنگ میں خوشنما اور خوشبو میں دل کش اور بدن میں نہایت تر و تازہ اور نرم اور نازک اور مصفّا ہو اور باوجود اِسکے باطنی طور پر تمام وہ خواص بھی رکھتا ہو جو گلاب کے پھول میں پائے جاتے ہیں۔ اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیوں گلاب کے پھول کی نسبت ایسا اعتقاد کیا گیا کہ انسانی قوتیں اس کی نظیر بنانے سے عاجز ہیں اور کیوں جائز نہیں کہ کوئی انسان اس کی نظیر بنا سکے اور جو خوبیاں اسکی ظاہر و باطن میں پائی جاتی ہیں وہ مصنوعی پھول میں پیدا کر سکے تو اس سوال کا جواب یہی ہے کہ ایسا پھول بنانا عادتاً ممتنع ہے۔ اور آجتک کوئی حکیم اور فیلسوف کسی ایسی ترکیب سے کسی قسم کی ادویہ کو بہم نہیں پہنچا سکا کہ جن کے باہم مخلوط اور ممزوج کرنے سے ظاہر و باطن میں گلاب کے پھول کی سی صورت اور سیرت پیدا ہو جائے۔ اب سمجھنا چاہیئے کہ یہی وجوہ بے نظیری کی سورۃ فاتحہ میں بلکہ قرآن شریف کے ہر ایک حصّہ اقلّ و قلیل میں کہ جو چار آیت سے بھی کم ہو پائی جاتی ہیں۔ پہلے ظاہری صورت پر نظر ڈال کر دیکھو کہ کیسی رنگینیٔ عبارت اور خوش بیانی اور جودتِ الفاظ اور کلام میں کمال سلاست اور نرمی اور روانگی اور آب و تاب اور لطافت وغیرہ لوازم حُسنِ کلام اپنا کامل جلوہ دکھا رہے ہیں۔ ایسا جلوہ کہ جس پر زیادت متصوّر نہیں اور وحشتِ کلمات اور تعقید ترکیبات سے بکلّی سالم اور بری ہے۔ ہر ایک فقرہ اس کا نہایت فصیح اور بلیغ ہے

اور ہر ایک ترکیب اس کی اپنے اپنے موقعہ پر واقعہ ہے اور ہر ایک قسم کا التزام جس سے حُسنِ کلام بڑھتا ہے اور لطافت عبارت کھلتی ہے سب اُس میں پایا جاتا ہے اور جس قدر حسن تقریر کے لئے بلاغت اور خوش بیانی کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ ذہن میں آسکتا ہے وہ کامل طور پر اس میں موجود اور مشہود ہے اور جسقدر مطلب کے دلنشین کرنے کے لئے حُسنِ بیان درکار ہے وہ سب اِس میں مہیّا اور موجود ہے اور باوجود اس بلاغتِ معانی اور التزام کمالیّتِ حُسنِ بیان کے صدق اور راستی کی خوشبو سے بھرا ہوا ہے کوئی مبالغہ ایسا نہیں جس میں جھوٹ کی ذرہ آمیزش ہو۔ کوئی رنگینیٔ عبارت اس قسم کی نہیں جس میں شاعروں کی طرح جھوٹ اور ہزل اور فضول گوئی کی نجاست اور بدبُو سے مدد لی گئی ہو۔ پس جیسے شاعروں کا کلام جھوٹ اور ہزل اور فضول گوئی کی بدبُو سے بھرا ہوا ہوتا ہے یہ کلام صداقت اور راستی کی لطیف خوشبو سے بھرا ہوا ہے اور پھر اس خوشبو کے ساتھ خوش بیانی اور جودتِ الفاظ اور رنگینی اور صفائی عبارت کو ایسا جمع کیا گیا ہے کہ جیسے گلاب کے پھول میں خوشبو کے ساتھ اُس کی خوش رنگی اور صفائی بھی جمع ہوتی ہے۔ یہ خوبیاں تو باعتبار ظاہر کے ہیں اور باعتبار باطن کے اس میں یعنی سورۃ فاتحہ میں یہ خواص ہیں کہ وہ بڑی بڑی امراض روحانی کے علاج پر مشتمل ہے اور تکمیل قوت علمی اور عملی کے لئے بہت سا سامان اس میں موجود ہے اور بڑے بڑے بگاڑوں کی اصلاح کرتی ہے اور بڑے بڑے معارف اور دقائق اور لطائف کہ جو حکیموں اور فلسفیوں کی نظر سے چھپے رہے اس میں مذکور ہیں۔ سالک کے دل کو اس کے پڑھنے سے یقینی قوت بڑھتی ہے اور شک و شبہ اور ضلالت کی بیماری سے شفا حاصل ہوتی ہے اور بہت ہی اعلیٰ درجہ کی صداقتیں اور نہایت باریک حقیقتیں کہ جو تکمیل نفسِ ناطقہ کے لئے ضروری ہیں اس کے مبارک مضمون میں بھری ہوئی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کمالات بھی ایسے ہیں کہ گلاب کے پھول کے کمالات کی طرح ان میں بھی عادتاً ممتنع معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کے کلام میں مجتمع ہوسکیں اور یہ امتناع نہ نظری بلکہ بدیہی ہے کیونکہ جن دقائق و معارفِ عالیہ کو خدائے تعالیٰ نے عین ضرورتِ حقّہ کے وقت اپنے بلیغ اور فصیح کلام میں بیان فرما کر ظاہری اور باطنی خوبی کا کمال دکھلایا ہے اور بڑی نازک شرطوں کے ساتھ دونوں پہلوؤں ظاہر و باطن کو کمالیت کے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچایا ہے یعنی اول تو ایسے معارفِ عالیہ ضروریہ لکھے ہیں کہ جن کے آثار پہلی تعلیموں سے مندرس اور محو ہو گئے تھے اور کسی حکیم یا فیلسوف نے بھی اُن معارفِ عالیہ پر قدم نہیں مارا تھا اور پھر اُن معارف کو غیر ضروری اور فضول طور پر نہیں لکھا بلکہ ٹھیک ٹھیک اُس وقت

اور اُس زمانہ میں ان کو بیان فرمایا جس وقت حالت موجودہ زمانہ کی اصلاح کے لئے اُنکا بیان کرنا ازبس ضروری تھا ۔ اور بغیر ان کے بیان کرنے کے زمانہ کی ہلاکت اور تباہی متصوّر تھی اور پھر وہ معارفِ عالیہ ناقص اور ناتمام طور پر نہیں لکھے گئے بلکہ کمّاً و کیفاً کامل درجہ پر واقع ہیں اور کسی عاقل کی عقل کوئی ایسی دینی صداقت پیش نہیں کر سکتی جو ان سے باہر رہ گئی ہو ۔ اور کسی باطل پرست کا کوئی ایسا وسوسہ نہیں جس کا ازالہ اس کلام میں موجود نہ ہو ۔ ان تمام حقائق و دقائق کے التزام سے کہ جو دوسری طرف ضروراتِ حقّہ کے التزام کے ساتھ وابستہ ہیں فصاحت بلاغت کے اُن اعلیٰ کمالات کو ادا کرنا جن پر زیادت متصور نہ ہو یہ تو نہایت بڑا کام ہے کہ جو بشری طاقتوں سے بہ بداہت نظر بلند تر ہے ۔ مگر انسان تو ایسا بے ہنر ہے کہ اگر ادنیٰ اور ناکارہ معاملات کو کہ جو حقائق عالیہ سے کچھ تعلّق نہیں رکھتے کسی رنگین اور فصیح عبارت میں بہ التزام راست بیانی اور حق گوئی کے لکھنا چاہے تو یہ بھی اس کے لئے ممکن نہیں جیسا کہ یہ بات ہر عاقل کے نزدیک نہایت بدیہی ہے کہ اگر مثلاً ایک دوکاندار جو کامل درجہ کا شاعر اور انشاپرداز ہو یہ چاہے کہ جو اپنی اس گفتگو کو جو ہر روز اُسے رنگا رنگ کے خریداروں اور معاملہ داروں کے ساتھ کرنی پڑتی ہے کمال بلاغت اور رنگینی عبارت کے ساتھ کیا کرے اور پھر یہ بھی التزام رکھے کہ ہر محل اور ہر موقعہ میں جس قسم کی گفتگو کرنا ضروری ہے وہی کرے ۔ مثلاً جہاں کم بولنا مناسب ہے وہاں کم بولے اور جہاں بہت مغز زنی مصلحت ہے وہاں بہت گفتگو کرے ۔ اور جب اس میں اور اس کے خریدار میں کوئی بحث آ پڑے تو وہ طرز تقریر اختیار کرے جس سے اس بحث کو اپنے مفید مطلب طے کر سکے یا مثلاً ایک حاکم جس کا یہ کام ہے کہ فریقین اور گواہوں کے بیان کو ٹھیک ٹھیک قلمبند کرے اور ہر ایک بیان پر جو جو واقعی اور ضروری طور پر جرح قدح کرنا چاہیئے وہی کرے اور جیسا کہ تنقیح مقدمہ کے لئے شرط ہے اور تفتیش امر متنازعہ فیہ کے لئے قرین مصلحت ہے سوال کے موقعہ پر سوال اور جواب کے موقعہ پر جواب لکھے اور جہاں قانونی وجوہ کا بیان کرنا لازم ہو اُن کو درست طور پر حسب منشاء قانون بیان کرے اور جہاں واقعات کا بہ ترتیب تمام کھولنا واجب ہو اُن کو بہ پابندیٔ ترتیب و صحت کھولدے اور پھر جو کچھ فی الواقعہ اپنی رائے اور بنائے اُس رائے کے وجوہات ہیں اُن کو بصحت تمام بیان کرے اور باوصف التزامات کے فصاحت بلاغت کے اس اعلیٰ درجہ پر اس کا کلام ہو کہ اس سے بہتر کسی بشر کے لئے ممکن نہ ہو تو اس قسم کی بلاغت کو

بانجام پہنچانا بہ بداہت اُن کے لئے محال ہے۔ سو انسانی فصاحتوں کا یہی حال ہے کہ بجز فضول اور غیر ضروری اور واہیات باتوں کے قدم ہی نہیں اُٹھ سکتا اور بغیر جھوٹ اور ہزل کے اختیار کرنے کے کچھ بول ہی نہیں سکتے اور اگر کچھ بولے بھی تو ادھورا۔ ناک ہے تو کان نہیں۔ کان ہیں تو آنکھ ندارد۔ سچ بولے تو فصاحت گئی۔ فصاحت کے پیچھے پڑے تو جھوٹ اور فضول گوئی کے انبار کے انبار جمع کر لیئے۔ پیاز کی طرح سب پوست ہی پوست اور بیچ میں کچھ بھی نہیں۔ پس جس صورت میں عقل سلیم صریح حکم دیتی ہے کہ ناکارہ اور خفیف معاملات اور سیدھے سادے واقعات کو بھی ضرورت حقّہ اور راستی کے التزام سے رنگین اور بلیغ عبارت میں ادا کرنا ممکن نہیں تو پھر اس بات کا سمجھنا کس قدر آسان ہے کہ معارفِ عالیہ کو ضرورتِ حقّہ کے التزام کے ساتھ نہایت رنگین اور فصیح عبارت میں جس سے اعلیٰ اور اصفیٰ متصوّر نہ ہو بیان کرنا بالکل خارق عادت اور بشری طاقتوں سے بعید ہے اور جیسا کہ گلاب کے پھول کی طرح کوئی پھول کہ جو بظاہر و باطن میں اس سے مشابہ ہو بنانا عادتاً محال ہے ایسا ہی یہ بھی محال ہے۔ کیونکہ جب ادنیٰ ادنیٰ امور میں تجربہ صحیحہ شہادت دیتا ہے اور فطرت سلیمہ قبول کرتی ہے کہ انسان اپنی کسی ضروری اور راست راست بات کو خواہ وہ بات کسی معاملہ خرید و فروخت سے متعلق ہو یا تحقیقاتِ عدالت وغیرہ سے تعلق رکھتی ہو جب اس کو اصلح اور انسب طور پر بجا لانا چاہے تو یہ بات غیر ممکن ہو جاتی ہے کہ اس کی عبارت خواہ نخواہ ہر محل میں موزون اور مقفّیٰ اور فصیح اور بلیغ بلکہ اعلیٰ درجہ کی فصاحت اور بلاغت پر ہو۔ تو پھر ایسی تقریر کہ جو علاوہ التزام راستی اور صدق کے معارف اور حقائق عالیہ سے بھی بھری ہوئی اور ضرورت حقّہ کے رُو سے صادر ہو اور تمام حقّانی صداقتوں پر محیط ہو اور اپنے منصبِ اصلاح حالتِ موجودہ اور اتمام حجّت اور الزام منکرین میں یک ذرہ فرو گذاشت نہ کرتی ہو اور مناظرہ اور مباحثہ کے تمام پہلوؤں کی کما حقّہٗ رعایت رکھتی ہو اور تمام ضروری دلائل اور ضروری براہین اور ضروری تعلیم اور ضروری سوال اور ضروری جواب پر مشتمل ہو کیونکر باوجود ان مشکلات پیچ در پیچ کے کہ جو پہلی صورت سے صدہا درجہ زیادہ ہیں ایسی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ کسی بشر کی تحریر میں جمع ہو سکتی ہے کہ وہ بلاغت بھی بے مثل و مانند ہو اور اس مضمون کو اس سے زیادہ فصیح عبارت میں بیان کرنا ممکن نہ ہو۔

یہ تو وہ وجوہ ہیں کہ جو سورۃ فاتحہ اور قرآن شریف میں ایسے طور سے پائی جاتی ہیں جنکو

گلاب کے پھول کی وجوہ بے نظیری سے بکلّی مطابقت ہے۔ لیکن سورۃ فاتحہ اور قرآن شریف میں ایک اَور خاصۂ بزرگ پایا جاتا ہے کہ وہ اُسی کلام پاک سے خاص ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو توجہ اور اخلاص سے پڑھنا دل کو صاف کرتا ہے اور ظلمانی پردوں کو اٹھاتا ہے اور سینے کو منشرح کرتا ہے اور طالبِ حق کو حضرتِ احدیت کی طرف کھینچ کر ایسے انوار اور آثار کا مورد کرتا ہے کہ جو مقربانِ حضرت احدیت میں ہونی چاہیئے اور جن کو انسان کسی دوسرے حیلہ یا تدبّر سے ہرگز حاصل نہیں کرسکتا اور اس رُوحانی تاثیر کا ثبوت بھی ہم اس کتاب میں دے چکے ہیں۔ اور اگر کوئی طالبِ حق ہو تو بالمواجہ ہم اُس کی تسلّی کر سکتے ہیں اور ہر وقت تازہ بتازہ ثبوت دینے کو تیار ہیں۔ اور نیز اس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف کا اپنی کلام میں بے مثل و مانند ہونا صرف عقلی دلائل میں محصور نہیں بلکہ زمانہ دراز کا تجربۂ صحیحہ بھی اس کا مؤید اور مصدّق ہے کیونکہ باوجود اِس کے کہ قرآن شریف برابر تیرہ۱۳ سو برس سے اپنی تمام خوبیاں پیش کر کے ھل من معارض کا نقارہ بجا رہا ہے اور تمام دنیا کو بآواز بلند کہہ رہا ہے کہ وہ اپنی ظاہری صورت اور باطنی خواص میں بے مثل و مانند ہے اور کسی جنّ یا انس کو اس کے مقابلہ یا معارضہ کی طاقت نہیں مگر پھر بھی کسی متنفس نے اِس کے مقابلہ پر دم نہیں مارا بلکہ اس کی کم سے کم کسی سورۃ مثلاً سورۃ فاتحہ کی ظاہری و باطنی خوبیوں کا بھی مقابلہ نہیں کرسکا۔ تو دیکھو اِس سے زیادہ بدیہی اور کھلا معجزہ اَور کیا ہوگا کہ عقلی طور پر بھی اس پاک کلام کا بشری طاقتوں سے بلند تر ہونا ثابت ہوتا ہے اور زمانہ دراز کا تجربہ بھی اس کے مرتبۂ اعجاز پر گواہی دیتا ہے۔ اور اگر کسی کو یہ دونوں طور کی گواہی کہ جو عقل اور تجربہ زمانہ دراز کے رو سے بہ پایۂ ثبوت پہنچ چکی ہے نامنظور ہو اور اپنے علم اور ہنر پر نازاں ہو یا دنیا میں کسی ایسے بشر کی انشا پردازی کا قائل ہو کہ جو قرآن شریف کی طرح کوئی کلام بنا سکتا ہے تو ہم جیسا کہ وعدہ کر چکے ہیں کچھ بطور نمونہ حقائق و دقائق سورۃ فاتحہ کے لکھتے ہیں۔ اُس کو چاہیئے کہ بمقابلہ ان ظاہری و باطنی سورۃ فاتحہ کی خوبیوں کے کوئی اپنا کلام پیش کرے۔

(براہین احمدیہ ص۳۶۲ - ۳۸۱ حاشیہ ۱۱)

سورۃ فاتحہ میں تمام قرآن شریف کی طرح دو۲ قسم کی خوبیاں کہ جو بے مثل و مانند ہیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ایک ظاہری صورت میں خوبی اور ایک باطنی خوبی۔ ظاہری خوبی یہ کہ جیسا کہ بارہا ذکر کیا گیا ہے اس کی عبارت میں ایسی رنگینی اور آب و تاب اور نزاکت و لطافت و ملائمت اور

بلاغت اور شیرینی اور روانگی اور حسنِ بیان اور حسنِ ترتیب پایا جاتا ہے کہ ان معانی کو اس سے بہتر یا اس سے مساوی کسی دوسری فصیح عبارت میں ادا کرنا ممکن نہیں ۔ اور اگر تمام دنیا کے انشا پرداز اور شاعر متفق ہوکر یہ چاہیں کہ اسی مضمون کو لے کر اپنے طور سے کسی دوسری فصیح عبارت میں لکھیں کہ جو سورۃ فاتحہ کی عبارت سے مساوی یا اس سے بہتر ہو تو یہ بات بالکل محال اور ممتنع ہے کہ ایسی عبارت لکھ سکیں ۔ کیونکہ تیرہ سو برس سے قرآن شریف تمام دنیا کے سامنے اپنی بےنظیری کا دعویٰ پیش کر رہا ہے .... مخالفین کی سینکڑوں برسوں کی خاموشی اور لاجواب رہنے نے اس کو وہ کامل مرتبہ ثبوت کا بخشا ہے کہ جو گلاب کے پھول وغیرہ کو وہ ثبوت بے نظیری کا حاصل نہیں ۔ کیونکہ دنیا کے حکیموں اور صنعت کاروں کو کسی دوسری چیز میں اس طور پر معارضہ کے لئے کبھی ترغیب نہیں دی گئی ۔ اور نہ اس کی مثل بنانے سے عاجز رہنے کی حالت میں کبھی ان کو یہ خوف دلایا گیا کہ وہ طرح طرح کی تباہی اور ہلاکت میں ڈالے جائیں گے ....

اب ہم باطنی خوبیوں کو بھی دہرا کر ذکر کرتے ہیں تا اچھی طرح غور کرنے والوں کے ذہن میں آجائیں ۔ سو جاننا چاہیئے کہ جیسا خداوند حکیم مطلق نے گلاب کے پھول میں بدن انسان کے لئے طرح طرح کے منافع رکھے ہیں کہ وہ دل کو قوت دیتا ہے اور قویٰ و ارواح کو تقویت بخشتا ہے اور کئی مرضوں کو مفید ہے ایسا ہی خداوند کریم نے سورۃ فاتحہ میں تمام قرآن شریف کی طرح روحانی مرضوں کی شفا رکھی ہے اور باطنی بیماریوں کا اس میں وہ علاج موجود ہے کہ جو اس کے غیر میں ہرگز نہیں پایا گیا ۔ کیونکہ اس میں وہ کامل صداقتیں بھری ہوئی ہیں کہ جو روئے زمین سے نابود ہوگئی تھیں اور دنیا میں ان کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا ۔ .... اور حقیقت میں وہ بارانِ رحمت ہی تھا کہ سخت پیاسوں کی جان رکھنے کے لئے آسمان سے اترا ۔ اور دنیا کی روحانی حیات اس بات پر موقوف تھی کہ وہ آبِ حیات نازل ہو اور کوئی قطرہ اس کا ایسا نہ تھا کہ کسی موجود الوقت بیماری کی دوا نہ ہو اور حالتِ موجود زمانہ نے صدہا سال تک اپنی معمولی گمراہی پر رہ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ان بیماریوں کے علاج کو خود بخود بغیر اترنے اس نور کے حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اپنی ظلمت کو آپ اٹھا سکتا ہے بلکہ ایک آسمانی نور کا محتاج ہے کہ جو اپنی سچائی کی شعاعوں سے دنیا کو روشن کرے اور انکو دکھاوے جنہوں نے کبھی نہیں دیکھا اور انکو سمجھا دے جنہوں نے کبھی نہیں سمجھا ۔ اس آسمانی نور نے

دنیا میں آ کر صرف یہی کام نہیں کیا کہ ایسے معارفِ حقّہ ضروریہ پیش کئے جن کا صفحۂ زمین پر نشان باقی نہیں رہا تھا بلکہ اپنے روحانی خاصہ کے زور سے ان جواہر حق اور حکمت کو بہت سے سینوں میں بھر دیا اور بہت سے دلوں کو اپنے دلربا چہرہ کی طرف کھینچ لایا اور اپنی قوی تاثیر سے بہتوں کو علم اور عمل کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔ اب یہ دونوں قسم کی خوبیاں کہ جو سورۃ فاتحہ اور تمام قرآن شریف میں پائی جاتی ہیں کلام الٰہی کی بے نظیری ثابت کرنے کے لئے ایسے روشن دلائل ہیں کہ جیسی وہ خوبیاں جو گلاب کے پھول میں سب کے نزدیک انسانی طاقتوں سے اعلیٰ تسلیم کئے گئے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس قدر یہ خوبیاں بدیہی طور پر عادت سے خارج اور طاقت انسانی سے باہر ہیں اس شان کی خوبیاں گلاب کے پھول میں ہرگز نہیں پائی جاتیں اِن خوبیوں کی عظمت اور شوکت اور بے نظیری اُس وقت کھلتی ہے کہ جب انسان سب کو مِنْ حیث الاجتماع اپنے خیال میں لاوے اور اس اجتماعی ہیئت پر غور اور تدبّر سے نظر ڈالے مثلاً اوّل اس بات کے تصوّر کرنے سے کہ ایک کلام کی عبارت ایسے اعلیٰ درجہ کی فصیح اور بلیغ اور ملائم اور شیریں اور سلیس اور خوش طرز اور رنگین ہو کہ اگر کوئی انسان کوئی ایسی عبارت اپنی طرف سے بنانا چاہے کہ جو بتمام و کمال انہیں معانی پر مشتمل ہو کہ جو اس بلیغ کلام میں پائی جاتی ہیں تو ہرگز ممکن نہ ہو کہ وہ انسانی عبارت اس پایۂ بلاغت اور رنگینی کو پہنچ سکے۔ پھر ساتھ ہی یہ دوسرا تصور کرنے سے کہ اس عبارت کا مضمون ایسے حقائق اور دقائق پر مشتمل ہو کہ جو فی الحقیقت اعلیٰ درجہ کی صداقتیں ہوں اور کوئی فقرہ اور کوئی لفظ اور کوئی حرف ایسا نہ ہو کہ جو حکیمانہ بیان پر مبنی نہ ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ تیسرا تصوّر کرنے سے کہ وہ صداقتیں ایسی ہوں کہ حالتِ موجودہ زمانہ کو اُن کی نہایت ضرورت ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ چوتھا تصوّر کرنے سے کہ وہ صداقتیں ایسی بے مثل و مانند ہوں کہ کسی حکیم یا فیلسوف کا پتہ نہ مل سکتا ہو کہ اِن صداقتوں کو اپنی نظر اور فکر سے دریافت کرنے والا ہو چکا ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ پانچواں تصوّر کرنے سے کہ جس زمانہ میں وہ صداقتیں ظاہر ہوئی ہوں ایک تازہ نعمت کی طرح ظاہر ہوئی ہوں اور اس زمانہ کے لوگ اُن کے ظہور سے پہلے اس راہ راست سے بکلّی بے خبر ہوں۔ پھر ساتھ ہی یہ چھٹا تصوّر کرنے سے کہ اس کلام میں ایک آسمانی برکت بھی ثابت ہو کہ جو اس کی متابعت سے طالب حق کو خداوند کریم کے ساتھ ایک سچا پیوند اور ایک حقیقی اُنس پیدا ہو جائے اور وہ انوار اُس میں چمکنے لگیں کہ جو مردانِ خدا میں چمکنے چاہئیں۔ یہ کل مجموعی ایک ایسی حالت میں معلوم ہوتا ہے

کہ عقل سلیم بلا توقف و تردّد حکم دیتی ہے کہ بشری کلام کا ان تمام مراتب کاملہ پر مشتمل ہونا ممتنع اور محال اور خارق عادت ہے ۔ اور بلاشبہ ان تمام فضائل ظاہری و باطنی کو بنظر یکجائی دیکھنے سے ایک رُعب ناک حالت ان میں پائی جاتی ہے ۔ کہ جو عقلمند کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ اس کلّ مجموعی کا انسانی طاقتوں سے انجام پذیر ہونا عقل اور قیاس سے باہر ہے اور ایسی رُعبناک حالت گلاب کے پھول میں ہرگز پائی نہیں جاتی ۔ کیونکہ قرآن شریف میں یہ خصوصیت زیادہ ہے کہ اس کی صفات مذکورہ کہ جو بے نظیری کا مدار ہیں نہایت بدیہی الثبوت ہیں اور اسی وجہ سے جب معارض کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک حرف بھی ایسے موقعہ پر نہیں رکھا گیا کہ جو حکمت اور مصلحت سے دُور ہو اور اس کا ایک فقرہ بھی ایسا نہیں کہ جو زمانہ کی اصلاح کے لئے اشد ضروری نہ ہو ۔ اور پھر بلاغت کا یہ کمال کہ ہرگز ممکن ہی نہیں کہ اس کی ایک سطر کی عبارت تبدیل کر کے بجائے اس کے کوئی دوسری عبارت لکھ سکیں ۔ تو ان بدیہی کمالات کے مشاہدہ کرنے سے معارض کے دل پر ایک بزرگ رُعب پڑ جاتا ہے ۔ ہاں کوئی نادان جس نے ان باتوں پر کبھی غور نہیں کی شاید بباعث نادانی سوال کرے کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ یہ ساری خوبیاں سورۃ فاتحہ اور تمام قرآن شریف میں متحقق اور ثابت ہیں ۔ سو واضح ہو کہ اس بات کا یہی ثبوت ہے کہ جنہوں نے قرآن شریف کے بے مثل کمالات پر غور کی اور اس کی عبارت کو ایسے اعلیٰ درجہ کی فصاحت اور بلاغت پر پایا کہ اس کی نظیر بنانے سے عاجز رہ گئے اور پھر اس کے دقائق و حقائق کو ایسے مرتبہ عالیہ پر دیکھا کہ تمام زمانہ میں اس کی نظیر نظر نہ آئی اور اس میں وہ تاثیراتِ عجیبہ مشاہدہ کیں کہ جو انسانی کلمات میں ہرگز نہیں ہوا کرتیں اور پھر اس میں یہ صفت پاک دیکھی کہ وہ بطور ہزل اور فضول گوئی کے نازل نہیں ہوا بلکہ عین ضرورتِ حقّہ کے وقت نازل ہوا تو انہوں نے ان تمام کمالات کے مشاہدہ کرنے سے بے اختیار اس کی بے مثل عظمت کو تسلیم کر لیا اور ان میں سے جو لوگ بباعث شقاوتِ ازلی نعمتِ ایمان سے محروم رہے اُن کے دلوں پر بھی اس قدر ہیبت اور رُعب اس بے مثل کلام کا پڑا کہ انہوں نے بھی مبہوت اور سراسیمہ ہو کر یہ کہا کہ یہ تو سحر مبین ہے ۔ اور پھر منصف کو اس بات سے بھی قرآن شریف کے بے مثل و مانند ہونے پر ایک قوی دلیل ملتی ہے اور روشن ثبوت ہاتھ میں آتا ہے کہ باوجود اس کے کہ مخالفین کو تیرہ سو برس سے خود قرآن شریف مقابلہ کرنے کی سخت غیرت دلاتا ہے اور لاجواب رہ کر مخالفت اور انکار کرنے والوں کا نام شریر اور پلید اور لعنتی اور جہنمی رکھتا ہے مگر پھر بھی مخالفین نے نامردوں اور مخنثوں

کی طرح کمال بے شرمی اور بے حیائی سے اس تمام ذلّت اور بے آبروئی اور بے عزتی کو اپنے لئے منظور کیا اور یہ روا رکھا کہ اُن کا نام جھوٹا اور ذلیل اور بے حیا اور خبیث اور پلید اور شریر اور بے ایمان اور جہنمی رکھا جاوے۔ مگر ایک قلیل المقدار سورۃ کا مقابلہ نہ کرسکے۔ اور نہ ان خوبیوں اور صفتوں اور عظمتوں اور صداقتوں میں کچھ نقص نکال سکے کہ جن کو کلامِ الٰہی نے پیش کیا ہے۔ حالانکہ ہمارے مخالفین پر درحالتِ انکار لازم تھا اور اب بھی لازم ہے کہ اگر وہ اپنے کفر اور بے ایمانی کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو وہ قرآن شریف کی کسی سورۃ کی نظیر پیش کریں اور کوئی ایسا کلام بطور معارضہ ہمارے سامنے لاویں کہ جس میں یہ تمام ظاہری و باطنی خوبیاں پائی جاتی ہوں کہ جو قرآن شریف کی ہر ایک اقل قلیل سورۃ میں پائی جاتی ہیں۔

(براہین احمدیہ ص۳۸۱-۳۸۸ حاشیہ ۱۱)

اب اتمام حجت کے لئے کچھ دقائق وحقائق سورۃ فاتحہ کے ذیل میں لکھے جاتے ہیں مگر اوّل سورۃ فاتحہ کو لکھ کر پھر اس کے معارفِ عالیہ کا لکھنا شروع کریں گے اور سورۃ فاتحہ یہ ہے:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ
الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ
الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۔

اس سورۃ کی تفسیر جس میں کسی قدر بطور نمونہ اس سورۃ کے معارف وحقائق مذکور ہیں ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ یہ آیت سورۂ ممدوحہ کی آیتوں میں سے پہلی آیت ہے اور قرآن شریف کی دوسری سورتوں پر بھی لکھی گئی ہے اور ایک اَور جگہ بھی قرآن شریف میں یہ آیت آئی ہے اور جس قدر تکرار اس آیت کا قرآن شریف میں بکثرت پایا جاتا ہے اور کسی آیت میں اس قدر تکرار نہیں پایا جاتا اور چونکہ اسلام میں یہ سنّت ٹھہر گئی ہے کہ ہر ایک کام کے ابتداء میں جس میں خیر اور برکت مطلوب ہو بطریق تبرک اور استمداد اس آیت کو پڑھ لیتے ہیں۔ اس لئے یہ آیت دشمنوں اور دوستوں اور چھوٹوں اور بڑوں میں شہرت پا گئی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص تمام قرآنی آیات سے بے خبر مطلق ہو تب بھی اُمید قوی ہے کہ اس آیت سے ہرگز اُس کو بے خبری نہیں ہوگی۔

اب یہ آیت جن کامل صداقتوں پر مشتمل ہے اُن کو بھی سُن لینا چاہیئے۔ سو منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ اصل مطلب اس آیت کے نزول سے یہ ہے کہ تا عاجز اور بے خبر بندوں کو اس نکتۂ معرفت کی

تعلیم کی جائے کہ ذات واجب الوجود کا اسم اعظم جو اللّٰہ ہے کہ جو اصطلاح قرآنی ربّانی کی رُو سے ذات مستجمع جمیع صفات کاملہ اور منزہ عن جمیع رذائل اور معبود برحق اور واحد لاشریک اور مبدءِ جمیع فیوض پر بولا جاتا ہے۔ اس اسم اعظم کی بہت سی صفات میں سے جو دُو صفتیں بسم اللہ میں بیان کی گئی ہیں یعنی صفتِ رحمانیت و رحیمیت انہی دو صفتوں کے تقاضا سے کلام الٰہی کا نزول اور اس کے انوار و برکات کا صدور ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خدا کے پاک کلام کا دنیا میں اُترنا اور بندوں کو اس سے مطلع کیا جانا یہ صفت رحمانیت کا تقاضا ہے کیونکہ صفت رحمانیت کی کیفیت (جیساکہ آگے بھی تفصیل سے لکھا جائیگا) یہ ہے کہ وہ صفت بغیر سبقت عمل کسی عامل کے محض جود اور بخشش الٰہی کے جوش سے ظہور میں آتی ہے۔ جیسا خدا نے سورج اور چاند اور پانی اور ہوا وغیرہ کو بندوں کی بھلائی کے لئے پیدا کیا ہے یہ تمام جود اور بخشش صفتِ رحمانیت کے رُو سے ہے اور کوئی شخص دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ چیزیں میرے کسی عمل کی پاداش میں بنائی گئی ہیں۔ اسی طرح خدا کا کلام بھی کہ جو بندوں کی اصلاح اور رہنمائی کے لئے اُترا وہ بھی اسی صفت کی رُو سے اُترا ہے اور کوئی ایسا متنفس نہیں کہ یہ دعویٰ کرسکے کہ میرے کسی عمل یا مجاہدہ یا کسی پاک باطنی کے اجر میں خدا کا پاک کلام کہ جو اُس کی شریعت پر مشتمل ہے نازل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ طہارت اور پاک باطنی کا دم مارنے والے اور زہد اور عبادت میں زندگی بسر کرنے والے اب تک ہزاروں لوگ گذرے ہیں لیکن خدا کا پاک اور کامل کلام کہ جو اس کے فرائض اور احکام کو دنیا میں لایا اور اس کے ارادوں سے خلق اللہ کو مطلع کیا اُنہیں خاص وقتوں میں نازل ہوا ہے کہ جب اس کے نازل ہونے کی ضرورت تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خدا کا پاک کلام اُنہیں لوگوں پر نازل ہو کہ جو تقدس اور پاک باطنی میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہوں کیونکہ پاک کو پلید سے کچھ میل اور مناسبت نہیں۔ لیکن یہ ہرگز ضرور نہیں کہ ہر جگہ تقدس اور پاک باطنی کلام الٰہی کے نازل ہونے کو مستلزم ہو بلکہ خدائے تعالیٰ کی حقانی شریعت اور تعلیم کا نازل ہونا ضروراتِ حقّہ سے وابستہ ہے۔ پس جس جگہ ضرورات حقّہ پیدا ہوگئیں اور زمانہ کی اصلاح کے لئے واجب معلوم ہوا کہ کلام الٰہی نازل ہو اُسی زمانہ میں خدائے تعالیٰ نے جو حکیم مطلق ہے اپنے کلام کو نازل کیا اور کسی دوسرے زمانہ میں گو لاکھوں آدمی تقویٰ اور طہارت کی صفت سے متصف ہوں اور گو کیسی ہی تقدس اور پاک باطنی رکھتے ہوں ان پر خدا کا وہ کامل کلام ہرگز نازل نہیں ہوتا کہ جو شریعت حقّانی پر مشتمل ہو۔ ہاں مکالمات و مخاطبات حضرت احدیت کے بعض پاک باطنوں سے ہو جاتے ہیں۔

اور وہ بھی اُس وقت کہ جب حکمتِ الٰہیہ کے نزدیک ان مکالمات اور مخاطبات کے لئے کوئی ضرورتِ حقّہ پیدا ہو اور اِن دونوں طور کی ضرورتوں میں فرق یہ ہے کہ شریعتِ حقانی کا نازل ہونا اس ضرورت کے وقت پیش آتا ہے کہ جب دنیا کے لوگ بباعثِ ضلالت اور گمراہی کے جادۂ استقامت سے منحرف ہو گئے ہوں اور اُن کے راہ راست پر لانے کے لئے ایک نئی شریعت کی حاجت ہو کہ جو ان کی آفاتِ موجودہ کا بخوبی تدارک کر سکے اور ان کی تاریکی اور ظلمت کو اپنے کامل اور شافی بیان کے نور سے بکلّی اٹھا سکے۔ اور جس طور کا علاج حالتِ فاسدہ زمانہ کے لئے درکار ہے وہ علاج اپنے پرزور بیان سے کر سکے لیکن جو مکالمات و مخاطبات اولیاء اللہ کے ساتھ ہوتے ہیں اُن کے لئے غالباً اس ضرورتِ عظمیٰ کا پیش آنا ضروری نہیں بلکہ بسا اوقات صرف اُسی قدر ان مکالمات سے مطلب ہوتا ہے کہ تا ولی کے نفس کو کسی مصیبت اور محنت کے وقت صبر اور استقامت کے لباس سے متحلّی کیا جائے یا کسی غم اور حزن کے غلبہ میں کوئی بشارت اس کو دی جائے۔ مگر وہ کامل اور پاک کلام خدائے تعالیٰ کا کہ جو نبیوں اور رسولوں پر نازل ہوتا ہے وہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس ضرورتِ حقّہ کے پیش آنے پر نزول فرماتا ہے کہ جب خلق اللہ کو اُس کے نزول کی بشدّت حاجت ہو۔ غرض کلام الٰہی کے نازل ہونے کا اصل موجب ضرورتِ حقّہ ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ جب تمام رات کا اندھیرا ہو جاتا ہے اور کچھ نور باقی نہیں رہتا کہ اُسی وقت تم سمجھ جاتے ہو کہ اَب ماہِ نو کی آمد نزدیک ہے اِسی طرح جب گمراہی کی ظلمت سخت طور پر دنیا پر غالب آ جاتی ہے تو عقلِ سلیم اس رُوحانی چاند کے نکلنے کو بہت نزدیک سمجھتی ہے۔ ایسا ہی جب امساکِ باراں سے لوگوں کا حال تباہ ہو جاتا ہے تو اس وقت عقلمند لوگ بارانِ رحمت کا نازل ہونا بہت قریب خیال کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ خدا نے اپنے جسمانی قانون میں بھی بعض مہینے برسات کے لئے مقرر کر رکھے ہیں یعنی وہ مہینے جن میں فی الحقیقت مخلوق اللہ کو بارش کی ضرورت ہوتی ہے اور ان مہینوں میں جو مینھ برستا ہے اُس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاتا کہ خاص ان مہینوں میں لوگ زیادہ نیکی کرتے ہیں اور دوسرے مہینوں میں فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ وہ مہینے ہیں جن میں زمینداروں کو بارش کی ضرورت ہے اور جن میں بارش کا ہو جانا تمام سال کی سبزی کا موجب ہے۔ ایسا ہی کلام الٰہی کا نزول فرمانا کسی شخص کی طہارت اور تقویٰ کی جہت سے نہیں ہے۔ یعنی علّتِ موجبہ اس کلام کے نزول کی یہ نہیں ہو سکتی کہ کوئی شخص غایت درجہ کا مقدس اور پاک باطن تھا یا راستی کا بھوکا اور پیاسا تھا بلکہ جیسا کہ ہم کئی دفعہ لکھ چکے ہیں کُتبِ آسمانی کے نزول کا اصلی موجب ضرورتِ حقّہ

ہے یعنی وہ ظلمت اور تاریکی کہ جو دنیا پر طاری ہو کر ایک آسمانی نور کو چاہتی ہے کہ تا وہ نور نازل ہو کر اس تاریکی کو دُور کرے۔ اور اسی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ جو خدا تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں فرمایا ہے۔ انّا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر۔ یہ لیلۃ القدر اگرچہ اپنے مشہور معنوں کی رُو سے ایک بزرگ رات ہے لیکن قرآنی آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ظلمانی حالت بھی اپنی پوشیدہ خوبیوں میں لیلۃ القدر کا ہی حکم رکھتی ہے اور اس ظلمانی حالت کے دنوں میں صدق اور صبر اور زہد اور عبادت خدا کے نزدیک بڑا قدر رکھتا ہے۔ اور وہی ظلمانی حالت تھی کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت کے وقت تک اپنے کمال کو پہنچکر ایک عظیم الشان نور کے نزول کو چاہتی تھی اور اسی ظلمانی حالت کو دیکھ کر اور ظلمت زدہ بندوں پر رحم کر کے صفت رحمانیت نے جوش مارا اور آسمانی برکتیں زمین کی طرف متوجہ ہوئیں سو وہ ظلمانی حالت دنیا کے لئے مبارک ہو گئی اور دنیا نے اس سے ایک عظیم الشان رحمت کا حصّہ پایا کہ ایک کامل انسان اور سیدالرسل کہ جس سا کوئی پیدا نہ ہُوا اور نہ ہو گا دنیا کی ہدایت کے لئے آیا اور دنیا کے لئے اس روشن کتاب کو لایا جس کی نظیر کسی آنکھ نے نہیں دیکھی۔ پس یہ خدا کی کمال رحمانیت کی ایک بزرگ تجلی تھی کہ جو اس نے ظلمت اور تاریکی کے وقت ایسا عظیم الشان نور نازل کیا جس کا نام فرقان ہے، جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے جس نے حق کو موجود اور باطل کو نابود کر کے دکھلا دیا۔ وہ اس وقت زمین پر نازل ہُوا جب زمین ایک موت روحانی کے ساتھ مر چکی تھی اور برّ اور بحر میں ایک بھاری فساد واقع ہو چکا تھا۔ پس اُس نے نزول فرما کر وہ کام کر دکھایا جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے آپ اشارہ فرما کر کہا ہے اِعلموا ان اللّٰہ یحیی الارض بعد موتھا۔ یعنی زمین مر گئی تھی اب خدا اُس کو نئے سرے زندہ کرتا ہے۔ اب اس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ نزول قرآن شریف کا کہ جو زمین کے زندہ کرنے کے لئے ہُوا یہ صفت رحمانیت کے جوش سے ہُوا۔ وہی صفت ہے کہ جو کبھی جسمانی طور پر جوش مار کر قحط زدوں کی خبر لیتی ہے اور بارانِ رحمت خشک زمین پر برساتی ہے اور وہی صفت کبھی رُوحانی طور پر جوش مار کر ان بھوکوں اور پیاسوں کی حالت پر رحم کرتی ہے کہ جو ضلالت اور گمراہی کی موت تک پہنچ جاتے ہیں اور حق اور صداقت کی غذا کہ جو روحانی زندگی کا موجب ہے ان کے پاس نہیں رہتی پس رحمانِ مطلق جیسا جسم کی غذا کو اس کی حاجت کے وقت عطا فرماتا ہے ایسا ہی وہ اپنی رحمتِ کاملہ کے تقاضا سے روحانی غذا کو بھی ضرورتِ حقّہ کے وقت مہیّا کر دیتا ہے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ خدا کا کلام اُنہیں برگزیدہ لوگوں پر نازل ہوتا ہے جن سے خدا راضی ہے اور اُنہیں سے وہ

مکالمات اور مخاطبات کرتا ہے جن سے وہ خوش ہے۔ مگر یہ بات ہرگز درست نہیں کہ جس سے خدا راضی اور خوش ہو اُس پر خواہ نخواہ بغیر کسی ضرورتِ حقّہ کے کتاب آسمانی نازل ہو جایا کرے یا خدائے تعالیٰ یونہی بلا ضرورتِ حقّہ کسی کی طہارت لازمی کی وجہ سے لازمی اور دائمی طور پر اس سے ہر وقت باتیں کرتا رہے بلکہ خدا کی کتاب اُسی وقت نازل ہوتی ہے کہ جب فی الحقیقت اس کے نزول کی ضرورت پیش آجائے۔ اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ وحی اللہ کے نزول کا اصل موجب خدائے تعالیٰ کی رحمانیت ہے کسی عامل کا عمل نہیں۔ اور یہ ایک بزرگ صداقت ہے کہ جس سے ہمارے مخالف برہمو وغیرہ بے خبر ہیں۔

پھر بعد اس کے سمجھنا چاہیئے کہ کسی فردِ انسانی کا کلامِ الٰہی کے فیض سے فی الحقیقت مستفیض ہو جانا اور اس کی برکات اور انوار سے متمتع ہو کر منزلِ مقصود تک پہنچنا اور اپنی سعی و کوشش کے ثمرہ کو حاصل کرنا یہ صفت رحیمیت کی تائید سے وقوع میں آتا ہے اور اسی جہت سے خدائے تعالیٰ نے بعد ذکر صفت رحمانیت کے صفت رحیمیّت کو بیان فرمایا۔ تا معلوم ہو کہ کلام الٰہی کی تاثیریں جو نفوسِ انسانیہ میں ہوتی ہیں یہ صفت رحیمیت کا اثر ہے جس قدر کوئی اعراض صوری و معنوی سے پاک ہو جاتا ہے جسقدر کسی کے دل میں خلوص اور صدق پیدا ہو جاتا ہے جسقدر کوئی جد و جہد سے متابعت اختیار کرتا ہے اُسی قدر کلامِ الٰہی کی تاثیر اس کے دل پر ہوتی ہے اور اُسی قدر وہ اس کے انوار سے متمتع ہوتا ہے اور علامات خاصہ مقبولانِ الٰہی کی اُس میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دوسری صداقت کہ جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں مودع ہے یہ ہے کہ یہ آیت قرآن شریف کے شروع کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے اور اس کے پڑھنے سے مدعا یہ ہے کہ تا اس ذات مستجمع جمیع صفات کاملہ سے مدد طلب کی جائے جس کی صفتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ رحمان ہے اور طالب حق کے لئے محض تفضّل اور احسان سے اسباب خیر و برکت اور رشد کے پیدا کر دیتا ہے اور دوسری صفت یہ ہے کہ وہ رحیم ہے یعنی سعی اور کوشش کرنے والوں کی کوشش کو ضائع نہیں کرتا بلکہ اُن کی جد و جہد پر ثمراتِ حسنہ مترتب کرتا ہے اور ان کی محنت کا پھل اُن کو عطا فرماتا ہے اور یہ دونوں صفتیں یعنی رحمانیت اور رحیمیت ایسی ہیں کہ بغیر ان کے کوئی کام دنیا کا ہو یا دین کا انجام کو پہنچ نہیں سکتا اور اگر غور کر کے دیکھو تو ظاہر ہوگا کہ دنیا کی تمام مہمات کے انجام دینے کیلئے

یہ دونوں صفتیں ہر وقت اور ہر لحظہ کام میں لگی ہوئی ہیں۔ خدا کی رحمانیت اس وقت سے ظاہر ہو رہی ہے کہ جب انسان ابھی پیدا بھی نہیں ہؤا تھا۔ سو وہ رحمانیت انسان کے لئے ایسے ایسے اسباب بہم پہنچاتی ہے کہ جو اس کی طاقت سے باہر ہیں اور جن کو وہ کسی حیلہ یا تدبیر سے ہرگز حاصل نہیں کر سکتا اور وہ اسباب کسی عمل کی پاداش میں نہیں دیئے جاتے بلکہ تفضّل اور احسان کی راہ سے عطا ہوتے ہیں۔ جیسے نبیوں کا آنا۔ کتابوں کا نازل ہونا۔ بارشوں کا ہونا۔ سورج اور چاند اور ہوا اور بادل وغیرہ کا اپنے اپنے کاموں میں لگے رہنا اور خود انسان کی طرح طرح کی قوتوں اور طاقتوں کے ساتھ مشرف ہو کر اس دنیا میں آنا اور تندرستی اور امن اور فرصت اور ایک کافی مدت تک عمر پانا۔ یہ وہ سب امور ہیں کہ جو صفت رحمانیت کے تقاضا سے ظہور میں آتے ہیں۔ اِسی طرح خدا کی رحیمیت تب ظہور کرتی ہے کہ جب انسان سب توفیقوں کو پا کر خداداد قوتوں کو کسی فعل کے انجام کے لئے حرکت دیتا ہے اور جہاں تک اپنا زور اور طاقت اور قوت ہے خرچ کرتا ہے تو اس وقت عادتِ الٰہیہ اسی طرح پر جاری ہے کہ وہ اس کی کوششوں کو ضائع ہونے نہیں دیتا بلکہ اُن کوششوں پر ثمراتِ حسنہ مرتب کرتا ہے۔ پس یہ اس کی سراسر رحیمیت ہے کہ جو انسان کی مردہ محنتوں میں جان ڈالتی ہے۔ اب جاننا چاہیئے کہ آیاتِ ممدوحہ کی تعلیم سے مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف کے شروع کرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی ذات جامع صفاتِ کاملہ کی رحمانیت اور رحیمیت سے استمداد اور برکت طلب کی جائے۔ صفت رحمانیت سے برکت طلب کرنا اس غرض سے ہے کہ تا وہ ذات کاملہ اپنی رحمانیت کی وجہ سے اُن سب اسباب کو محض لطف اور احسان سے میسر کر دے کہ جو کلامِ الٰہی کی متابعت میں جدوجہد کرنے سے پہلے درکار ہیں۔ جیسے عمر کا وفا کرنا۔ فرصت اور فراغت کا حاصل ہونا۔ وقتِ صفا میسّر آ جانا طاقتوں اور قوتوں کا قائم ہونا۔ کوئی ایسا امر پیش نہ آ جانا کہ جو آسائش اور امن میں خلل ڈالے۔ کوئی ایسا مانع نہ آ پڑنا کہ جو دل کو متوجہ ہونے سے روک دے۔ غرض ہر طرح سے توفیق عطا کئے جانا۔ یہ سب امور صفت رحمانیت سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور صفت رحیمیت سے برکت طلب کرنا اس غرض سے ہے کہ تا وہ ذاتِ کامل اپنی رحیمیت کی وجہ سے انسان کی کوششوں پر ثمراتِ حسنہ مرتب کرے۔ اور انسان کی محنتوں کو ضائع ہونے سے بچاوے اور اس کی سعی اور جدوجہد کے بعد اس کے کام میں برکت ڈالے۔ پس اِس طور پر

خدائے تعالیٰ کی دونوں صفتوں رحمانیت اور رحیمیت سے کلام الٰہی کے شروع کرنے کے وقت بلکہ ہر ایک ذیشان کام کے ابتداء میں تبرک اور استمداد چاہنا یہ نہایت اعلیٰ درجہ کی صداقت ہے جس سے انسان کو حقیقتِ توحید کی حاصل ہوتی ہے اور اپنے جہل اور بے خبری اور نادانی اور گمراہی اور عاجزی اور خواری پر یقین کامل ہو کر مبداءِ فیض کی عظمت اور جلال پر نظر جا ٹھہرتی ہے اور اپنے تئیں بکلّی مفلس اور مسکین اور ہیچ اور ناچیز سمجھ کر خداوند قادرِ مطلق سے اُس کی رحمانیت اور رحیمیت کی برکتیں طلب کرتا ہے اور اگرچہ خدائے تعالیٰ کی یہ صفتیں خود بخود اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ مگر اس حکیم مطلق نے قدیم سے انسان کے لئے یہ قانون قدرت مقرر کر دیا ہے کہ اس کی دُعا اور استمداد کو کامیابی میں بہت سا دخل ہے۔ جو لوگ اپنی مہمات میں دلی صدق سے دعا مانگتے ہیں اور ان کی دُعا پورے پورے اخلاص تک پہنچ جاتی ہے۔ تو ضرور فیضانِ الٰہی اُن کی مشکل کشائی کی طرف توجہ کرتا ہے اور ہر ایک انسان جو اپنی کمزوریوں پر نگاہ کرتا ہے اور اپنے قصوروں کو دیکھتا ہے وہ کسی کام پر آزادی اور خوش بینی سے ہاتھ نہیں ڈالتا بلکہ سچی عبودیت اس کو یہ سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کہ جو متصرف مطلق ہے اُس سے مدد طلب کرنی چاہیئے۔ یہ سچی عبودیت کا جوش ہر ایک ایسے دل میں پایا جاتا ہے کہ جو اپنی فطرتی سادگی پر قائم ہے اور اپنی کمزوری پر اطلاع رکھتا ہے۔ پس صادق آدمی جس کے رُوح میں کسی قسم کے غرور اور عُجب نے جگہ نہیں پکڑی اور جو اپنے کمزور اور ہیچ اور بے حقیقت وجود پر خوب واقف ہے اور اپنے تئیں کسی کام کے انجام دینے کے لائق نہیں پاتا اور اپنے نفس میں کچھ قوت اور طاقت نہیں دیکھتا جب کسی کام کو شروع کرتا ہے تو بلا تصنع اُسکی کمزور رُوح آسمانی قوت کی خواستگار ہوتی ہے اور ہر وقت اس کو خدا کی مقتدر ہستی اپنے سارے کمال و جلال کے ساتھ نظر آتی ہے اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت ہر ایک کام کے انجام کے لئے مدار دکھلائی دیتی ہے پس وہ بلا ساختہ اپنا ناقص اور ناکارہ زور ظاہر کرنے سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی دُعا سے امدادِ الٰہی چاہتا ہے پس اس انکسار اور فروتنی کی وجہ سے اس لائق ہو جاتا ہے کہ خدا کی قوت سے قوت اور طاقت سے طاقت اور خدا کے علم سے علم پاوے اور اپنی مرادات میں کامیابی حاصل کرے۔ اس بات کے ثبوت کے واسطے کسی منطق یا فلسفہ کے دلائل پُر از تکلّف درکار نہیں ہیں بلکہ ہر ایک انسان کے رُوح میں اس کے سمجھنے کی استعداد موجود ہے اور عارفِ صادق کے

اپنے ذاتی تجارب اس کی صحت پر بہ تواتر شہادت دیتے ہیں۔ بندہ کا خدا سے امداد چاہنا کوئی ایسا امر نہیں ہے جو صرف بے ہودہ اور بناوٹ ہو یا جو صرف بے اصل خیالات پر مبنی ہو اور کوئی معقول نتیجہ اس پر مترتب نہ ہو بلکہ خداوند کریم کہ جو فی الحقیقت قیوم عالم ہے اور جس کے سہارے پر سچ مچ اس عالم کی کشتی چل رہی ہے اس کی عادتِ قدیمہ کے رو سے یہ صداقت قدیم سے چلی آتی ہے کہ جو لوگ اپنے تئیں حقیر اور ذلیل سمجھ کر اپنے کاموں میں اُس کا سہارا طلب کرتے ہیں اور اس کے نام سے اپنے کاموں کو شروع کرتے ہیں تو وہ اُن کو اپنا سہارا دیتا ہے جب وہ ٹھیک اپنی عاجزی اور عبودیت سے رو بخدا ہو جاتے ہیں تو اُس کی تائیدیں اُن کے شامل حال ہو جاتی ہیں۔ غرض ہر ایک شاندار کام کے شروع میں اُس مبدءِ فیوض کے نام سے مدد چاہنا کہ جو رحمان و رحیم ہے ایک نہایت ادب اور عبودیت اور نیستی اور فقر کا طریقہ ہے اور ایسا ضروری طریقہ ہے کہ جس سے توحید فی الاعمال کا پہلا زینہ شروع ہوتا ہے جسکے التزام سے انسان بچوں کی سی عاجزی اختیار کر کے اِن نخوتوں سے پاک ہو جاتا ہے کہ جو دنیا کے مغرور دانشمندوں کے دلوں میں بھری ہوتی ہیں۔ اور پھر اپنی کمزوری اور امداد الٰہی پر یقین کامل کر کے اس معرفت سے حصہ پا لیتا ہے کہ جو خاص اہل اللہ کو دی جاتی ہے اور بلاشبہ جسقدر انسان اس طریقہ کو لازم پکڑتا ہے جس قدر اس پر عمل کرنا اپنا فرض ٹھیرا لیتا ہے جس قدر اس کے چھوڑنے میں اپنی ہلاکت دیکھتا ہے اُسی قدر اس کی توحید صاف ہوتی ہے اور اُسی قدر عُجب اور خود بینی کی آلائشوں سے پاک ہوتا جاتا ہے اور اُسی قدر تکلف اور بناوٹ کی سیاہی اس کے چہرہ پر سے اُٹھ جاتی ہے اور سادگی اور بھولا پن کا نور اس کے مُنہ پر چمکنے لگتا ہے۔ پس یہ وہ صداقت ہے کہ جو رفتہ رفتہ انسان کو فنا فی اللہ کے مرتبہ تک پہنچاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ دیکھتا ہے کہ میرا کچھ بھی اپنا نہیں بلکہ سب کچھ میں خدا سے پاتا ہوں۔ جہاں کہیں یہ طریق کسی نے اختیار کیا وہیں توحید کی خوشبو پہلی دفعہ میں ہی اس کو پہنچنے لگتی ہے اور دل اور دماغ کا معطّر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ قوتِ شامہ میں کچھ فساد نہ ہو۔ غرض اس صداقت کے التزام میں طالب صادق کو اپنے ہیچ اور بے حقیقت ہونے کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور اللہ جلّ شانہ کے متصرف مطلق اور مبدءِ فیوض ہونے پر شہادت دینی پڑتی ہے۔ اور یہ دونوں ایسے امر ہیں کہ جو حق کے طالبوں کا مقصود ہے اور مرتبۂ فنا کے حاصل ہونے کے لئے ایک ضروری شرط ہے۔ اس ضروری شرط کے سمجھنے کے لئے یہی مثال کافی ہے کہ بارش اگرچہ عالمگیر ہو مگر تاہم اس پر پڑتی ہے کہ جو بارش کے

موقعہ پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ طلب کرتے ہیں وہی پاتے ہیں اور جو ڈھونڈتے ہیں اُنہیں کو ملتا ہے۔ جو لوگ کسی کام کے شروع کرنے کے وقت اپنے ہنر یا عقل یا طاقت پر بھروسہ رکھتے ہیں اور خدائے تعالیٰ پر بھروسہ نہیں رکھتے وہ اس ذاتِ قادر مطلق کا کہ جو اپنی قیّومی کے ساتھ تمام عالم پر محیط ہے کچھ قدر شناخت نہیں کرتے۔ اور ان کا ایمان اُس خشک ٹہنی کی طرح ہوتا ہے کہ جس کو اپنے شاداب اور سرسبز درخت سے کچھ علاقہ نہیں رہا۔ اور جو ایسی خشک ہو گئی ہے کہ اپنے درخت کی تازگی اور پھول اور پھل سے کچھ بھی حصّہ حاصل نہیں کر سکتے۔ صرف ظاہری جوڑ ہے جو ذرا سی جنبش ہوا سے یا کسی اَور شخص کے ہلانے سے ٹوٹ سکتا ہے۔ پس ایسا ہی خشک فلسفیوں کا ایمان ہے کہ جو قیّوم عالم کے سہارے پر نظر نہیں رکھتے اور اس مبدء فیوض کو جس کا نام اللہ ہے ہر ایک طرفۃ العین کے لئے اور ہر حال میں اپنا محتاج الیہ قرار نہیں دیتے پس یہ لوگ حقیقی توحید سے ایسے دُور پڑے ہوئے ہیں جیسے نُور سے ظلمت دُور ہے۔ انہیں یہ سمجھ ہی نہیں کہ اپنے تئیں ہیچ اور لاشئ سمجھ کر قادر مطلق کی طاقتِ عظمیٰ کے نیچے آ پڑنا عبودیت کے مراتب کی آخری حد ہے اور توحید کا انتہائی مقام ہے جس سے فناء اتم چشمہ کا جوش مارتا ہے اور انسان اپنے نفس اور اُس کے ارادوں سے بالکل کھویا جاتا ہے اور سچے دل سے خدا کے تصرف پر ایمان لاتا ہے۔ اس جگہ اُن خشک فلسفیوں کے اس مقولہ کو بھی کچھ چیز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جو کہتے ہیں کہ کسی کام کے شروع کرنے میں استمداد الٰہی کی کیا حاجت ہے۔ خدا نے ہماری فطرت میں پہلے سے طاقتیں ڈال رکھی ہیں۔ پس ان طاقتوں کے ہوتے ہوئے پھر دوبارہ خدا سے طاقت مانگنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ بے شک یہ بات سچ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے بعض افعال کے بجا لانے کیلئے کچھ کچھ ہم کو طاقتیں بھی دی ہیں مگر پھر بھی اس قیّوم عالم کی حکومت ہمارے سر پر سے دُور نہیں ہوئی اور وہ ہم سے الگ نہیں ہوا اور اپنے سہارے سے ہم کو جُدا کرنا نہیں چاہا۔ اور اپنے فیوض غیر متناہی سے ہم کو محروم کرنا روا نہیں رکھا۔ جو کچھ ہم کو اُس نے دیا ہے وہ ایک امر محدود ہے اور جو کچھ اس سے مانگا جاتا ہے اُس کی نہایت نہیں۔ علاوہ اس کے جو کام ہماری طاقت سے باہر ہیں ان کے حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی ہم کو طاقت نہیں دی گئی۔ اب اگر غور کر کے دیکھو اور ذرا پوری فلسفیت کو کام میں لاؤ تو ظاہر ہوگا کہ کامل طور پر کوئی بھی طاقت ہم کو حاصل نہیں مثلاً ہماری بدنی طاقتیں ہماری تندرستی پر موقوف ہیں اور ہماری تندرستی بہت سے ایسے اسباب پر موقوف ہے کہ کچھ ان میں سے سماوی اور کچھ ارضی ہیں۔ اور وہ سب کی سب ہماری طاقت سے

بالکل باہر ہیں۔ اور یہ تو ہم نے ایک موٹی سی بات عام لوگوں کی سمجھ کے موافق کہی ہے لیکن جسقدر درحقیقت وہ قیّوم عالم اپنے علّت العلل ہونے کی وجہ سے ہمارے ظاہر اور ہمارے باطن اور ہمارے اول اور ہمارے آخر اور ہمارے فوق اور ہمارے تحت اور ہمارے یمین اور ہمارے یسار اور ہمارے دل اور ہماری جان اور ہمارے رُوح کی تمام طاقتوں پر احاطہ کر رہا ہے وہ ایک ایسا مسئلہ دقیق ہے جس کے کُنہ تک عقول بشریہ پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ اور اُس کے سمجھانے کی اس جگہ ضرورت بھی نہیں کیونکہ جس قدر ہم نے اوپر لکھا ہے وہی مخالف کے الزام اور افہام کیلئے کافی ہے۔ غرض قیّوم عالم کے فیوض حاصل کرنے کا یہی طریق ہے کہ اپنی ساری قوت اور زور اور طاقت سے اپنا بچاؤ طلب کیا جائے۔ اور یہ طریق کچھ نیا طریق نہیں بلکہ یہ وہی طریق ہے جو قدیم سے بنی آدم کی فطرت کے ساتھ لگا چلا آتا ہے۔ جو شخص عبودیت کے طریقہ پر چلنا چاہتا ہے وہ اسی طریق کو اختیار کرتا ہے اور جو شخص خدا کے فیوض کا طالب ہے وہ اسی راستے پر قدم مارتا ہے اور جو شخص موردِ رحمت ہونا چاہتا ہے وہ انہی قوانینِ قدیمہ کی تعمیل کرتا ہے۔ یہ قوانین کچھ نئے نہیں ہیں۔ یہ عیسائیوں کے خدا کی طرح کچھ مستحدث بات نہیں بلکہ خدا کا یہ ایک قانونِ محکم ہے کہ جو قدیم سے بندھا ہوا چلا آتا ہے اور سُنت اللہ ہے کہ جو ہمیشہ سے جاری ہے۔ جس کی سچائی کثرت تجارب سے ہر ایک طالب صادق پر روشن ہے .... فی الحقیقت ہر ایک برکت اسی راہ سے آتی ہے کہ وہ ذات جو متصرّف مطلق اور علّت العلل اور تمام فیوض کا مبدء ہے جسکا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں اللہ ہے خود متوجہ ہو کر اوّل اپنی صفت رحمانیت کو ظاہر کرے اور جو کچھ قبل از سعی درکار ہے اُس کو محض اپنے تفضّل اور احسان سے بغیر توسط عمل کے ظہور میں لاوے پھر جب وہ صفت رحمانیت کی اپنے کام کو بہ تمام و کمال کر چکی اور انسان توفیق پا کر اپنی قوتوں کے ذریعہ سے محنت اور کوشش کا حق بجا لاوے تو پھر دوسرا کام اللہ تعالےٰ کا یہ ہے کہ اپنی صفت رحیمیت کو ظاہر کرے اور جو کچھ بندہ نے محنت اور کوشش کی ہے اُس پر نیک ثمرہ مترتب کرے۔ اور اُس کی محنتوں کو ضائع ہونے سے بچا کر گوہر مراد عطا فرماوے۔ اسی صفت ثانی کی رُو سے کہا گیا ہے کہ جو ڈھونڈتا ہے پاتا ہے اور جو مانگتا ہے اسکو دیا جاتا ہے جو کھٹکھٹاتا ہے اُس کے واسطے کھولا جاتا ہے .... یہ شبہ کرنا کہ یہ استعانت بعض اوقات کیوں بے فائدہ اور غیر مفید ہوتی ہے اور کیوں خدا کی رحمانیت و رحیمیت ہر ایک وقت استعانت میں تجلی نہیں فرماتی۔ پس یہ شبہ صرف ایک صداقت کی غلط فہمی ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ ان

دعاؤں کو کہ جو خلوص کے ساتھ کی جائیں ضرور سنتا ہے اور جس طرح مناسب ہو مدد چاہنے والوں کے لئے مدد بھی کرتا ہے۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کی استمداد اور دُعا میں خلوص نہیں ہوتا نہ انسان دلی عاجزی کے ساتھ امدادِ الٰہی چاہتا ہے اور نہ اس کی روحانی حالت درست ہوتی ہے۔ بلکہ اُس کے ہونٹوں میں دعا اور اُس کے دل میں غفلت یا ریا ہوتی ہے۔ یا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا اس کی دُعا کو تو سُن لیتا ہے اور اس کے لئے جو کچھ اپنی حکمت کاملہ کے رُو سے مناسب اور اصلح دیکھتا ہے عطا بھی فرماتا ہے لیکن نادان انسان خدا کی ان الطافِ خفیہ کو شناخت نہیں کرتا اور بباعث اپنے جہل اور بے خبری کے شکوہ اور شکایت شروع کر دیتا ہے اور اس آیت کے مضمون کو نہیں سمجھتا عسٰی ان تکرھوا شیئًا وھو خیرٌ لکم وعسٰی ان تحبّوا شیئًا و ھو شرٌّ لکم واللّٰہ یعلم وانتم لا تعلمون۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو بُری سمجھو اور وہ اصل میں تمہارے لئے اچھی ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو دوست رکھو اور وہ اصل میں تمہارے لئے بُری ہو۔ اور خدا چیزوں کی اصل حقیقت کو جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اب ہماری اس تمام تقریر سے واضح ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کس قدر عالیشان صداقت ہے جس میں حقیقی توحید اور عبودیت اور خلوص میں ترقی کرنے کا نہایت عمدہ سامان موجود ہے جس کی نظیر کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ اور اگر کسی کے زعم میں پائی جاتی ہے تو وہ اِس صداقت کو معہ تمام دوسری صداقتوں کے جو ہم نیچے لکھتے ہیں نکال کر پیش کرے۔

اس جگہ بعض کوتہ اندیش اور نادان دشمنوں نے ایک اعتراض بھی بسم اللّٰہ کی بلاغت پر کیا ہے۔ ان معترضین میں سے ایک صاحب تو پادری عماد الدین نام ہیں جس نے اپنی کتاب ہدایت المسلمین میں اعتراض مندرجہ ذیل لکھا ہے۔ دوسرے صاحب باوا نرائن سنگھ نام وکیل امرتسری ہیں جنہوں نے پادری کے اعتراض کو سچ سمجھ کر اپنے دلی عناد کے تقاضا کی وجہ سے وہی پوچ اعتراض اپنے رسالہ ودیا پرکاشک میں درج کر دیا ہے۔ سو ہم اس اعتراض کو معہ اس کے جواب کے لکھنا مناسب سمجھتے ہیں تا منصفین کو معلوم ہو کہ فرطِ تعصب نے ہمارے مخالفین کو کس درجہ کی کور باطنی اور نابینائی تک پہنچا دیا ہے کہ جو نہایت درجہ کی روشنی ہے وہ انکو تاریکی دکھائی دیتی ہے اور جو اعلیٰ درجہ کی خوشبو ہے وہ اُس کو بدبُو تصوّر کرتے ہیں۔ سو اب جاننا چاہیئے کہ جو اعتراض بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم کی بلاغت پر مذکورہ بالا لوگوں نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ الرحمٰن الرحیم جو بسم اللّٰہ میں واقع ہے یہ فصیح طرز پر نہیں۔ اگر رحیم الرحمٰن ہوتا تو یہ فصیح اور صحیح طرز تھی کیونکہ خدا کا نام رحمٰن

باعتبار اس رحمت کے ہے کہ جو اکثر اور عام ہے اور رحیم کا لفظ بہ نسبت رحمٰن کے اس رحمت کے لئے آتا ہے کہ جو قلیل اور خاص ہے۔ اور بلاغت کا یہ کام ہے کہ قلّت سے کثرت کی طرف انتقال ہو نہ یہ کہ کثرت سے قلّت کی طرف۔

یہ اعتراض ہے کہ جو ان دونوں صاحبوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے اس کلام پر کیا ہے جس کلام کی بلاغت کو عرب کے تمام اہل زبان جن میں بڑے بڑے شاعر بھی تھے باوجود سخت مخالفت کے تسلیم کر چکے ہیں بلکہ بڑے بڑے معاند اس کلام کی شانِ عظیم سے نہایت درجہ تعجب میں پڑ گئے اور اکثر اُن میں سے کہ جو فصیح اور بلیغ کلام کے اسلوب کو بخوبی جاننے پہچاننے والے اور مذاقِ سخن سے عارف اور باانصاف تھے وہ طرزِ قرآنی کو طاقتِ انسانی سے باہر دیکھ کر ایک معجزہ عظیم یقین کر کے ایمان لے آئے۔ جن کی شہادتیں جا بجا قرآن شریف میں درج ہیں .... افسوس یہ کہ اس نادان عیسائی کو اب تک یہ بھی خبر نہیں کہ بلاغت حقیقی اس امر میں محدود نہیں کہ قلیل کو کثیر پر ہر جگہ اور ہر محل میں خواہ نخواہ مقدم رکھا جائے بلکہ اصل قاعدہ بلاغت کا یہ ہے کہ اپنے کلام کو واقعی صورت اور مناسب وقت کا آئینہ بنایا جاوے۔ سو اس جگہ بھی رحمان کو رحیم پر مقدّم کرنے میں کلام کو واقعی صورت اور ترتیب کا آئینہ بنایا گیا ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب طبعی کا مفصّل ذکر ابھی سورۃ فاتحہ کی آئندہ آیتوں میں آویگا۔

(براہین احمدیہ ص ۳۹۲-۴۱۳ حاشیہ ع ۱۱)

ایک خاصہ روحانی سورۃ فاتحہ میں یہ ہے کہ دلی حضور سے اپنی نماز میں اس کو ورد کر لینا اور اُس کی تعلیم کو فی الحقیقت سچ سمجھ کر اپنے دل میں قائم کر لینا تنویرِ باطن میں نہایت دخل رکھتا ہے یعنی اس سے انشراحِ خاطر ہوتا ہے اور بشریت کی ظلمت دُور ہوتی ہے اور حضرت مبدءِ فیوض کے فیوض انسان پر وارد ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور قبولیتِ الٰہی کے انوار اس پر احاطہ کر لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ ترقی کرتا کرتا مخاطباتِ الٰہیہ سے سرفراز ہو جاتا ہے اور کشوف صادقہ اور الہامات واضحہ سے تمتّع تام حاصل کرتا ہے اور حضرت الوہیت کے مقربین میں دخل پا لیتا ہے اور وہ وہ عجائبات القائے غیبی اور کلام لاریبی اور استجابتِ ادعیہ اور کشفِ مغیبات اور تائیدِ حضرت قاضی الحاجات اس سے ظہور میں آتی ہیں کہ جس کی نظیر اس کے غیر میں نہیں پائی جاتی۔ اگر مخالفین اس سے انکار کریں اور غالبًا انکار ہی کرینگے تو اس کا ثبوت اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ اور یہ احقر ہر ایک

طالب حق کی تسلّی کرنے کو تیار ہے اور نہ صرف مخالفین کو بلکہ اسمی اور رسمی موافقین کو بھی کہ جو بظاہر مسلمان ہیں مگر محجوب مسلمان اور قالب بے جان ہیں جنکو اس پُر ظلمت زمانہ میں آیاتِ سماویہ پر یقین نہیں رہا۔ اور الہاماتِ حضرتِ احدیت کو محال خیال کرتے ہیں۔ اور از قبیل اوہام اور وساوس قرار دیتے ہیں۔ جنہوں نے انسان کی ترقیات کا نہایت تنگ اور منقبض دائرہ بنا رکھا ہے کہ جو صرف عقلی اٹکلوں اور قیاسی ڈھکوسلوں پر ختم ہوتا ہے اور دوسری طرف خدائے تعالیٰ کو بھی نہایت درجہ کا کمزور اور ضعیف سا خیال کر رہے ہیں۔ سو یہ عاجز ان سب صاحبوں کی خدمت میں بادب تمام عرض کرتا ہے کہ اگر اب تک تاثیرات قرآنی سے انکار ہے اور اپنے جہل قدیم پر اصرار ہے تو اب نہایت نیک موقعہ ہے کہ یہ احقر خادمین اپنے ذاتی تجارب سے ہر ایک منکر کی پوری پوری اطمینان کر سکتا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ طالبِ حق بن کر اِس احقر کی طرف رجوع کریں اور جو جو خواص کلامِ الٰہی کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کو بچشم خود دیکھ لیں اور تاریکی اور ظلمت میں سے نکل کر نورِ حقیقی میں داخل ہو جائیں۔ اب تک تو یہ عاجز زندہ ہے مگر وجود خاکی کی کیا بنیاد اور جسم فانی کا کیا اعتماد۔ پس مناسب ہے کہ اس عام اعلان کو سُنتے ہی احقاقِ حق اور ابطال باطل کی طرف توجہ کریں۔ تا اگر دعویٰ اس احقر کا بہ پایۂ ثبوت نہ پہنچ سکے تو منکر اور روگردان رہنے کے لئے ایک وجہ موجّہ پیدا ہو جائے لیکن اگر اس عاجز کے قول کی صداقت جیسا کہ چاہیئے بہ پایۂ ثبوت پہنچ جائے تو خدا سے ڈر کر اپنے باطل خیالات سے باز آئیں اور طریقۂ حقّہ اسلام پر قدم جماویں تا اس جہان میں ذلت اور رسوائی سے اور دوسرے جہان میں عذاب اور عقوبت سے نجات پاویں۔ سو دیکھو اے بھائیو! اے عزیزو! اے فلاسفرو! اے پنڈتو! اے پادریو! اے آریو! اے نیچریو! اے براہم دھرم والو! کہ میں اِسوقت صاف صاف اور اعلانیہ کہہ رہا ہوں کہ اگر کسی کو شک ہو اور خاصہ مذکورہ بالا کے ماننے میں کچھ تامل ہو تو وہ بلا توقف اِس عاجز کی طرف رجوع کریں۔ اور صبوری اور صدق دلی سے کچھ عرصہ تک صحبت میں رہ کر بیاناتِ مذکورہ بالا کی حقیقت کو بچشم خود دیکھ لے ایسا نہ ہو کہ اس ناچیز کے گذرنے کے بعد کوئی نامنصف کہے کہ کب مجھ کو کھول کر کہا گیا کہ تا میں اس جستجو میں پڑتا۔ کب کسی نے اپنی ذمہ داری سے دعویٰ کیا تا میں ایسے دعویٰ کا ثبوت اس سے مانگتا۔ سو اے بھائیو! اے حق کے طالبو! اِدھر دیکھو کہ یہ عاجز کھول کر کہتا ہے اور اپنے خدا پر توکّل کر کے جس کے انوار دن رات

دیکھ رہا ہے اس بات کا ذمہ وار بنتا ہے کہ اگر تم دلی صدق اور صفائی سے حق کے جویاں اور خواہاں ہوکر صبر اور ارادت سے کچھ مدت تک اِس احقر کی صحبت میں زندگی بسر کرو گے تو یہ بات تم پر بدیہی طور پر کھل جائے گی کہ فی الحقیقت وہ خواصِ رُوحانی جنکا اسجگہ ذکر کیا گیا ہے سورۃ فاتحہ اور قرآن شریف میں پائے جاتے ہیں۔ سو کیا مبارک وہ شخص ہے کہ جو اپنے دل کو تعصب اور عناد سے خالی کر کے اور اسلام کے قبول کرنے پر مستعد ہوکر اس مطلب کے حصول کے لئے بصدق وارادت توجہ کرے۔ اور کیا بدقسمت وہ آدمی ہے کہ اِس قدر واشگاف باتیں سُنکر پھر بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھے اور دیدہ ودانستہ خدائے تعالیٰ کی لعنت اور غضب کا مورد بن جاوے۔ مرگ نہایت نزدیک ہے اور بازیٔ اجل سر پر ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۶۰۴-۶۱۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

سورۃ فاتحہ مجمل طور پر تمام مقاصد قرآن شریف پر مشتمل ہے گویا یہ سورۃ مقاصد قرآنیہ کا ایک ایجاز لطیف ہے۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ۔ یعنی ہم نے تجھے اے رسول سات آیتیں سورۃ فاتحہ کی عطا کی ہیں جو مجمل طور پر تمام مقاصد قرآنیہ پر مشتمل ہیں اور ان کے مقابلہ پر قرآن عظیم بھی عطا فرمایا ہے جو مفصل طور پر مقاصدِ دینیہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اِسی جہت سے اس سورۃ کا نام اُمّ الکتاب اور سورۃ الجامع ہے، اُمّ الکتاب اس جہت سے کہ جمیع مقاصدِ قرآنیہ اس سے مستخرج ہوتے ہیں اور سورۃ الجامع اس جہت سے کہ علومِ قرآنیہ کے جمیع انواع پر بصورت اجمالی مشتمل ہے۔ اسی جہت سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ جس نے سورۃ فاتحہ کو پڑھا گویا اُس نے سارے قرآن کو پڑھ لیا۔ غرض قرآن شریف اور احادیث نبوی سے ثابت ہے کہ سورۃ فاتحہ ممدوحہ ایک آئینہ قرآن نما ہے۔ اس کی تصریح یہ ہے کہ قرآن شریف کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تمام محامدِ کاملہ باری تعالیٰ کو بیان کرتا ہے۔ اور اس کی ذات کے لئے جو کمال تام حاصل ہے اس کو بوضاحت بیان فرماتا ہے۔ سو یہ مقصد اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں بطور اجمال آگیا۔ کیونکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ تمام محامدِ کاملہ اللہ کے لئے ثابت ہیں جو مستجمع جمیع کمالات اور مستحق جمیع عبادات ہے۔

دوسرا مقصد قرآن شریف کا یہ ہے کہ وہ خدا کا صانع کامل ہونا اور خالق العالمین ہونا ظاہر کرتا ہے اور عالم کے ابتداء کا حال بیان فرماتا ہے اور جو دائرہ عالم میں داخل ہو چکا اسکو مخلوق ٹھہراتا ہے۔ اور ان امور کے جو لوگ مخالف ہیں اُن کا کذب ثابت کرتا ہے۔ سو یہ مقصد

رَبِّ الْعَالَمِیْن میں بطور اجمال آگیا۔

تیسرا مقصد قرآن شریف کا خدا کا فیضان بلا استحقاق ثابت کرنا اور اُس کی رحمتِ عامہ کا بیان کرنا ہے۔ سو یہ مقصد لفظ رحمٰن میں بطور اجمال آگیا۔

چوتھا مقصد قرآن شریف کا خدا کا وہ فیضان ثابت کرنا ہے جو محنت اور کوشش پر مترتب ہوتا ہے۔ سو یہ مقصد لفظ رحیم میں آگیا۔

پانچواں مقصد قرآن شریف کا عالمِ معاد کی حقیقت بیان کرنا ہے۔ سو یہ مقصد مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں آگیا۔

چھٹا مقصد قرآن شریف کا اخلاص اور عبودیت اور تزکیہ نفس عن غیر اللہ اور علاج امراض روحانی اور اصلاح اخلاق ردّیہ اور توحید فی العبادت کا بیان کرنا ہے۔ سو یہ مقصد اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں بطور اجمال آگیا۔

ساتواں مقصد قرآن شریف کا ہر ایک کام میں فاعلِ حقیقی خدا کو ٹھہرانا اور تمام توفیق اور لطف اور نصرت اور ثبات علی الطاعت اور عصمت عن العصیان اور حصولِ جمیع اسبابِ خیر اور صلاحیت دنیا و دین اُسی طرف اُسے قرار دینا اور ان تمام امور میں اُسی سے مدد چاہنے کے لئے تاکید کرنا۔ سو یہ مقصد اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں بطور اجمال آگیا۔

آٹھواں مقصد قرآن شریف کا صراطِ مستقیم کے دقائق کو بیان کرنا ہے اور پھر اس کی طلب کے لئے تاکید کرنا کہ دُعا اور تضرع سے اُس کو طلب کریں۔ سو یہ مقصد اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں بطور اجمال کے آگیا۔

نواں مقصد قرآن شریف کا ان لوگوں کا طریق و خلق بیان کرنا ہے جن پر خدا کا انعام و فضل ہوا تا طالبینِ حق کے دل جمعیت پکڑیں۔ سو یہ مقصد صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں آگیا۔

دسواں مقصد قرآن شریف کا اُن لوگوں کا خلق و طریق بیان کرنا ہے جن پر خدا کا غضب ہوا یا جو راستہ بھول کر انواع و اقسام کی بدعتوں میں پڑ گئے۔ تا حق کے طالب ان کی راہوں سے ڈریں۔ سو یہ مقصد غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں بطور اجمال آگیا ہے۔

یہ مقاصدِ عشرہ ہیں جو قرآن شریف میں مندرج ہیں جو تمام صداقتوں کا اصل الاصول ہیں۔ سو یہ تمام مقاصد سورۃ فاتحہ میں بطور اجمال آگئے۔

(براہین احمدیہ ص ۵۵۸-۵۶۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

یاد رہے کہ اکیلی عقل کو ماننے والے جیسے علم اور معرفت اور یقین میں ناقص ہیں ویسا ہی عمل اور وفاداری اور صدقِ قدم میں بھی ناقص اور قاصر ہیں۔ اور ان کی جماعت نے کوئی ایسا نمونہ قائم نہیں کیا جس سے یہ ثبوت مل سکے کہ وہ بھی ان کروڑہا مقدس لوگوں کی طرح خدا کے وفادار اور مقبول بندے ہیں کہ جن کی برکتیں ایسی دنیا میں ظاہر ہوئیں کہ ان کے وعظ اور نصیحت اور دعا اور توجہ اور تاثیرِ صحبت سے صدہا لوگ پاک روش اور باخدا ہوکر ایسے اپنے مولیٰ کی طرف جھک گئے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ پروا نہ رکھ کر اور اس جہان کی لذتوں اور راحتوں اور خوشیوں اور شہرتوں اور فخروں اور مالوں اور ملکوں سے بالکل قطع نظر کرکے اس سچائی کے راستہ پر قدم مارا جس پر قدم مارنے سے اُن میں سے سینکڑوں کی جانیں تلف ہوئیں ہزارہا سر کاٹے گئے۔ لاکھوں مقدسوں کے خون سے زمین تر ہوگئی۔ پر باوجود ان سب آفتوں کے انہوں نے ایسا صدق دکھلایا کہ عاشق دلدادہ کی طرح پابزنجیر ہوکر ہنستے رہے اور دُکھ اُٹھا کر خوش ہوتے رہے اور بلاؤں میں پڑ کر شکر کرتے رہے اور اُسی ایک کی محبت میں وطنوں سے بے وطن ہوگئے اور عزت سے ذلّت اختیار کی۔ اور آرام سے مصیبت کو سر پر لے لیا۔ اور تونگری سے مفلسی قبول کرلی اور ہر ایک پیوند و رابطہ اور خوشی سے غریبی اور تنہائی اور بے کسی پر قناعت کی۔ اور اپنے خون کے بہانے سے اور اپنے سروں کے کٹانے سے اور اپنی جانوں کے دینے سے خدا کی ہستی پر مہریں لگادیں اور کلام الٰہی کی سچی متابعت کی برکت سے وہ انوارِ خاصہ اُن میں پیدا ہوگئے کہ جو ان کے غیر میں کبھی نہیں پائے گئے۔ اور ایسے لوگ نہ صرف پہلے زمانوں میں موجود تھے بلکہ یہ برگزیدہ جماعت ہمیشہ اہلِ اسلام میں پیدا ہوتی رہتی ہے اور ہمیشہ اپنے نورانی وجود سے اپنے مخالفین کو ملزم و لاجواب کرتی آئی ہے۔ لہٰذا منکرین پر ہماری یہ حجت بھی تمام ہے کہ قرآن شریف جیسے مراتبِ علمیّہ میں اعلیٰ درجہ کمال تک پہنچاتا ہے ویسا ہی مراتب عملیّہ کے کمالات بھی اسی کے ذریعہ سے ملتے ہیں اور آثار و انوار قبولیت حضرتِ احدیت اُنہیں لوگوں میں ظاہر ہوتے رہے ہیں اور اب بھی ظاہر ہوتے ہیں جنہوں نے اِس پاک کلام کی متابعت اختیار کی ہے دوسروں میں ہرگز ظاہر نہیں ہوتے۔ پس طالبِ حق کے لئے یہی دلیل جس کو وہ بچشم خود معائنہ کرسکتا ہے کافی ہے۔ یعنی یہ کہ آسمانی برکتیں اور ربّانی نشان صرف قرآن شریف کے کامل تابعین میں پائے جاتے ہیں اور دوسرے تمام فرقے کہ جو حقیقی اور پاک الہام سے روگردان ہیں کیا برہمو اور کیا آریہ اور کیا عیسائی وہ اس نورِ صداقت سے بے نصیب اور بے بہرہ ہیں۔ چنانچہ ہر ایک منکر کی تسلّی کرنے کے لئے ہم ہی ذمہ اُٹھاتے ہیں بشرطیکہ وہ

سچے دل سے اسلام قبول کرنے پر مستعد ہو کر پوری پوری ارادت اور استقامت اور صبر اور صداقت سے طلب حق کے لئے اس طرف تکلیف کش ہو۔

(براہین احمدیہ ص ۳۲۸-۳۳۰ حاشیہ ۱۱)

اور جسقدر قرآن شریف میں قصے ہیں وہ بھی درحقیقت قصے نہیں بلکہ وہ پیشگوئیاں ہیں جو قصوں کے رنگ میں لکھی گئی ہیں۔ ہاں وہ توریت میں تو ضرور صرف قصے پائے جاتے ہیں مگر قرآن شریف نے ہر ایک قصہ کو رسول کریمؐ کے لئے اور اسلام کے لئے ایک پیشگوئی قرار دیدیا ہے اور یہ قصوں کی پیشگوئیاں بھی کمال صفائی سے پوری ہوئی ہیں۔ غرض قرآن شریف معارف و حقائق کا ایک دریا ہے۔ اور پیشگوئیوں کا ایک سمندر ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی انسان بجز ذریعہ قرآن شریف کے پورے طور پر خدا تعالیٰ پر یقین لاسکے کیونکہ یہ خاصیت خاص طور پر قرآن شریف میں ہی ہے کہ اس کی کامل پیروی سے وہ پردے جو خدا میں اور انسان میں حائل ہیں سب دور ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک مذہب والا محض قصہ کے طور پر خدا کا نام لیتا ہے مگر قرآن شریف اس محبوب حقیقی کا چہرہ دکھلا دیتا ہے اور یقین کا نور انسان کے دل میں داخل کر دیتا ہے۔ اور وہ خدا جو تمام دنیا پر پوشیدہ ہے وہ محض قرآن شریف کے ذریعہ سے دکھائی دیتا ہے۔

(چشمۂ معرفت ص ۲۵۹-۲۶۰)

قرآن کریم صرف اپنی بلاغت و فصاحت ہی کے رو سے بے نظیر نہیں بلکہ اپنی ان تمام خوبیوں کی رو سے بے نظیر ہے جن خوبیوں کا جامع وہ خود اپنے تئیں قرار دیتا ہے اور یہی صحیح بات بھی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ صادر ہے اُس کی صرف ایک خوبی ہی بے مثل نہیں ہونی چاہیئے بلکہ ہر یک خوبی بے مثل ہوگی۔ بلاشبہ جو لوگ قرآن کریم کو غیر محدود حقائق اور معارف کا جامع نہیں سمجھتے وہ ما قدروا القرآن حق قدرہٖ میں داخل ہیں۔ خدا تعالیٰ کی پاک اور سچی کلام کو شناخت کرنے کے لئے یہ ایک ضروری نشانی ہے کہ وہ اپنی جمیع صفات میں بے مثل ہو کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیز خدا تعالیٰ سے صادر ہوئی ہے اگر مثلاً ایک جَو کا دانہ ہے وہ بھی بے نظیر ہے۔ اور انسانی طاقتیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اور بے مثل ہونا غیر محدود ہونے کو مستلزم ہے یعنی ہر یک چیز اسی حالت میں بے نظیر ٹھہر سکتی ہے جبکہ اس کی عجائبات اور خواص کی کوئی حد اور کنارہ نظر نہ آوے اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہی خاصیت خدا تعالیٰ کی ہر یک مخلوق میں پائی جاتی ہے مثلاً اگر ایک درخت کے پتّے کی عجائبات کی ہزار برس تک بھی تحقیقات کی جائے۔ تو وہ

ہزار برس ختم ہو جائیگا مگر اس پتّہ کے عجائبات ختم نہیں ہونگے ۔ اور اِس میں سرّ یہ ہے کہ جو چیز غیر محدود قدرت سے وجود پذیر ہوئی ہے اُس میں غیر محدود عجائبات اور خواص کا پیدا ہونا ایک لازمی اور ضروری امر ہے اور یہ آیت کہ قل لو کان البحر مدادًا لکلمات ربّی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربّی ولو جئنا بمثلہ مددًا اپنے ایک معنے کے رُو سے اِسی امر کی مؤید ہے کیونکہ مخلوقات اپنے مجازی معنوں کی رُو سے تمام کلمات اللہ ہی ہیں . . . .

. . . . سو ان معنوں کے رو سے اس آیت کا یہی مطلب ہوا کہ خواص مخلوقات بے حد اور بے نہایت ہیں ۔ اور جبکہ ہر یک چیز اور ہر یک مخلوق کے خواص بے حد اور بے نہایت ہیں اور ہر یک چیز غیر محدود عجائبات پر مشتمل ہے تو پھر کیونکر قرآن کریم جو خدا تعالیٰ کا پاک کلام ہے صرف اِن چند معانی میں محدود ہو گا کہ جو چالیس پچاس یا مثلاً ہزار جزو کی کسی تفسیر میں لکھے ہوں یا جس قدر ہمارے سید و مولیٰ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک زمانہ محدود میں بیان کئے ہوں نہیں بلکہ ایسا کلمہ مُنہ پر لانا میرے نزدیک قریب قریب کفر کے ہے اگر عمدًا اس پر اصرار کیا جائے تو اندیشہ کفر ہے ۔ یہ سچ ہے کہ جو کچھ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے معنے بیان فرمائے ہیں وہی صحیح اور حق ہیں ۔ مگر یہ ہرگز سچ نہیں کہ جو کچھ قرآن کریم کے معارف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے اُن سے زیادہ قرآن کریم میں کچھ بھی نہیں ۔ یہ اقوال ہمارے مخالفوں کے صاف دلالت کر رہے ہیں کہ وہ قرآن کریم کے غیر محدود عظمتوں اور خوبیوں پر ایمان نہیں لاتے ۔ اور ان کا یہ کہنا کہ قرآن کریم ایسوں کے لئے اُترا ہے جو اُمّی تھے اور بھی اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ وہ قرآن شناسی کی بصیرت سے بکلی بے بہرہ ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم محض اُمیوں کے لئے نہیں بھیجے گئے بلکہ ہر یک رتبہ اور طبقہ کے انسان اُن کی امت میں داخل ہیں ۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے ۔ قل یاایھا الناس انّی رسول اللہ الیکم جمیعًا ۔ پس اس آیت سے ثابت ہے کہ قرآن کریم ہر یک استعداد کی تکمیل کے لئے نازل ہوا ہے ۔ اور درحقیقت آیت ولکن رسول اللہ و خاتم النّبیّین میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے ۔ پس یہ خیال کہ گویا جو کچھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے بارہ میں بیان فرمایا اس سے بڑھ کر ممکن نہیں بدیہی البطلان ہے ۔ ہم نہایت قطعی اور یقینی دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی کلام کے لئے ضروری ہے کہ اس کے عجائبات غیر محدود اور نیز بے مثل ہوں ۔ اور اگر یہ اعتراض ہو کہ اگر قرآن کریم میں ایسے عجائبات

اور خواص مخفیہ تھے تو پہلوں کا کیا گناہ تھا کہ اُن کو اِن اسرار سے محروم رکھا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بکلّی اسرار قرآنی سے محروم تو نہیں رہے بلکہ جسقدر معلومات عرفانیہ خدا تعالےٰ کے ارادہ میں اُن کے لئے بہتر تھے وہ ان کو عطا کئے گئے۔ اور جس قدر اس زمانہ کی ضرورتوں کے موافق اس زمانہ میں اسرار ظاہر ہونے ضروری تھے وہ اس زمانہ میں ظاہر کئے گئے۔ مگر وہ باتیں جو مدارِ ایمان ہیں اور جن کے قبول کرنے اور جاننے سے ایک شخص مسلمان کہلا سکتا ہے وہ ہر زمانہ میں برابر طور پر شائع ہوتی رہیں۔ مَیں متعجب ہوں کہ ان ناقص الفہم مولویوں نے کہاں سے اور کس سے سُن لیا کہ خدا تعالیٰ پر یہ حق واجب ہے کہ جو کچھ آئندہ زمانہ میں بعض آلاء و نعماء حضرت باری عزّ اسمہٗ ظاہر ہوں پہلے زمانہ میں بھی اُن کا ظہور ثابت ہو۔

(کرامات الصادقین صـ۱۸-۲۰)

جاننا چاہیئے کہ سب سے اوّل ۱معیار تفسیر صحیح کا شواہد قرآنی ہیں۔ یہ بات نہایت توجہ سے یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن کریم اور معمولی کتابوں کی طرح نہیں جو اپنی صداقتوں کے ثبوت یا انکشاف کے لئے دوسرے کا محتاج ہو۔ وہ ایک ایسی متناسب عمارت کی طرح ہے جس کی ایک اینٹ ہلانے سے تمام عمارت کی شکل بگڑ جاتی ہے۔ اس کی کوئی صداقت ایسی نہیں ہے جو کم سے کم دس یا بیس شاہد اُس کے خود اُسی میں موجود نہ ہو۔ سو اگر ہم قرآن کریم کی ایک آیت کے ایک معنے کریں تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اِن معنوں کی تصدیق کے لئے دوسرے شواہد قرآن کریم سے ملتے ہیں یا نہیں۔ اگر دوسرے شواہد دستیاب نہ ہوں بلکہ ان معنوں کی دوسری آیتوں سے صریح معارض پائے جائیں تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ معنی باطل ہیں کیونکہ ممکن نہیں کہ قرآن کریم میں اختلاف ہو۔ اور سچّے معنوں کی یہی نشانی ہے کہ قرآن کریم میں سے ایک لشکر شواہدِ بیّنہ کا اس کا مصدق ہو۔

دوسرا ۲معیار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تفسیر ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ سب سے زیادہ قرآن کے معنے سمجھنے والے ہمارے پیارے اور بزرگ نبی حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تفسیر ثابت ہو جائے تو مسلمان کا فرض ہے کہ بلا توقف اور بلا دغدغہ قبول کرے۔ نہیں تو اس میں الحاد اور فلسفیت کی رگ ہو گی۔

تیسرا ۳معیار صحابہ کی تفسیر ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرتؐ کے نوروں کو حاصل کرنے والے اور علم نبوت کے پہلے وارث تھے اور خدا تعالیٰ کا اُن پر بڑا فضل تھا۔ اور نصرتِ الٰہی اُن کی قوت مدرکہ کے ساتھ تھی کیونکہ اُن کا نہ صرف قال بلکہ حال تھا۔

۴ چوتھا معیار خود اپنا نفسِ مطہّر ہے کہ قرآن کریم میں غور کرتا ہے۔ کیونکہ نفس مطہرہ سے قرآن کریم کو مناسبت ہے اللہ جلّشانہٗ فرماتا ہے لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ یعنی قرآن کریم کے حقائق صرف اُن پر کھلتے ہیں جو پاک دل ہوں۔ کیونکہ مطہّر القلب انسان پر قرآن کریم کے پاک معارف بوجہ مناسبت کھل جاتے ہیں اور وہ اُن کو شناخت کر لیتا ہے۔ اور سونگھ لیتا ہے۔ اور اُس کا دل بول اُٹھتا ہے کہ ہاں یہی راہ سچی ہے اور اُس کا نور قلب سچائی کی پرکھ کے لئے ایک عمدہ معیار ہوتا ہے۔ پس جب تک انسان صاحب حال نہ ہو اور اس تنگ راہ سے گذرنے والا نہ ہو جس میں انبیاء علیہم السّلام گذرے ہیں تب تک مناسب ہے کہ گستاخی اور تکبّر کی جہت سے مفسّر قرآن نہ بن بیٹھے ورنہ وہ تفسیر بالرائے ہوگی جس سے نبی علیہ السلام نے منع فرمایا ہے۔ اور کہا ہے کہ من فسّر القرآن برأیه فاصاب فقد اخطأ یعنی جس نے صرف اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کی اور اپنے خیال میں اچھی کی تب بھی اُس نے بُری تفسیر کی۔

۵ پانچواں معیار لُغت عرب بھی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اپنے وسائل آپ اسقدر قائم کر دیئے ہیں کہ چنداں لغات عرب کی تفتیش کی حاجت نہیں۔ ہاں موجب زیادتِ بصیرت بے شک ہے۔ بلکہ بعض اوقات قرآن کریم کے اسرار مخفیہ کی طرف لُغت کھودنے سے توجہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ایک بھید کی بات نکل آتی ہے۔

۶ چھٹا معیار روحانی سِلسلہ کے سمجھنے کے لئے سلسلہ جسمانی ہے کیونکہ خداوند تعالےٰ کے دونوں سِلسلوں میں بکلّی تطابق ہے۔

۷ ساتواں معیار وحیٔ ولایت اور مکاشفات محدثین ہیں۔ اور یہ معیار گویا تمام معیاروں پر حاوی ہے۔ کیونکہ صاحبِ وحیٔ محدثیت اپنے نبیٔ متبوع کا پورا ہمرنگ ہوتا ہے۔ اور بغیر نبوت اور تجدید احکام کے وہ سب باتیں اس کو دی جاتی ہیں جو نبی کو دی جاتی ہیں اور اس پر یقینی طور پر سچی تعلیم ظاہر کی جاتی ہے۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ اُس پر وہ سب امور بطور انعام و اکرام کے وارد ہو جاتے ہیں جو نبیٔ متبوع پر وارد ہوتے ہیں۔ سو اس کا بیان محض اٹکلیں نہیں ہوتیں بلکہ وہ دیکھ کر کہتا ہے اور سُن کر بولتا ہے۔ اور یہ راہ اس اُمت کے لئے کھلی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وارث حقیقی کوئی نہ رہے۔

(برکات الدعا صـ ۱۷-۲۱)

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہم الٰہی کلام کی کسی آیت میں تغییر اور تبدیل اور تقدیم اور

تاخیر اور فقرات تراشی کے مجاز نہیں ہیں مگر صرف اس صورت میں کہ جب خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہو اور یہ ثابت ہو جائے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ بذات خود ایسی تغییر اور تبدیل کی ہے اور جب تک ایسا ثابت نہ ہو تو ہم قرآن کی ترصیع اور ترتیب کو زیر و زبر نہیں کر سکتے اور نہ اس میں اپنی طرف سے بعض فقرات ملا سکتے ہیں اور اگر ایسا کریں تو عند اللہ مجرم اور قابل مؤاخذہ ہیں۔

(اتمام الحجۃ صـ ۱۹)

اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم دس۱۰ قسم کے نظامِ مفردات پر مشتمل ہے۔

(۱) ایسے مفردات کا نظام جن میں بیان وجودِ باریؔ اور دلائل وجود باریؔ اور نیز خدا تعالے کی ایسی صفات اور اسماء اور افعال اور سنن اور عادات کا بیان ہے کہ جو باہمی امتیازوں کے ساتھ اللہ جلّشانہٗ کی ذات سے مخصوص ہیں۔ اور نیز وہ کلمات جو اس کی اس کامل مدح اور ثنا کے متعلق ہیں جو بیان جلال اور جمال اور عظمت اور کبریائی کے بارے میں ہیں۔

(۲) اُن مفردات کا نظام جو توحید باری اور دلائل توحید باری پر مشتمل ہیں۔

(۳) اُن مفردات کا نظام جن میں وہ صفات اور افعال اور اعمال اور عادات اور کیفیاتِ روحانیہ یا نفسانیہ بیان کی گئی ہیں جو باہمی امتیازوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کے سامنے اس کی مرضی کے موافق یا خلاف مرضی بندوں سے صادر ہوتی ہیں یا ظہور و بروز میں آتی ہیں۔

(۴) ان مفردات کا نظام جو وصایا اور تعلیم اخلاق اور عقائد اور حقوق اللہ اور حقوق العباد اور علومِ حکمیہ اور حدود اور احکام اور اوامر و نہی اور حقائق و معارف کے رنگ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامل ہدایتیں ہیں۔

(۵) ان مفردات کا نظام جن میں بیان کیا گیا ہے کہ نجات حقیقی کیا شے ہے اور اُس کے حصول کے لئے حقیقی وسائل اور ذرائع کیا کیا ہیں۔ اور نجات یافتہ مومنوں اور مقربوں کے آثار اور علامات کیا ہیں۔

(۶) اُن مفردات کا نظام جن میں بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کیا شے ہے اور کفر اور شرک کیا شے ہے۔ اور اسلام کی حقیقت پر دلائل اور نیز اعتراضات کی مدافعت ہے۔

(۷) ایسے مفردات کا نظام جو مخالفین کے تمام عقائد باطلہ کا ردّ کرتے ہیں۔

(۸) ایسے مفردات کا نظام جو انذار اور تبشیر اور وعد اور وعید اور عالم معاد کے بیان کے

رنگ میں یا معجزات کی صورت میں یا مثالوں کے طور پر یا ایسی پیشگوئیوں کی صورت میں جو موجب زیادتِ ایمان یا اور مصالح پر مشتمل ہوں یا ایسے قصوں کی طرز میں جو تنبیہ یا ڈرانے یا خوشخبری دینے کی غرض سے ہی مرتب کیا گیا ہے۔

(۹) ایسے مفردات کا نظام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح اور پاک صفات اور آنجناب کی پاک زندگی کے اعلیٰ نمونہ پر مشتمل ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل کاملہ بھی ہیں۔

(۱۰) ایسے مفردات کا نظام جو قرآن کریم کے صفات اور تاثیرات اور اس کے ذاتی خواص کو بیان کرتے ہیں۔

یہ دس نظام وہ ہیں جو اپنے کمال تام کی وجہ سے دس دائروں کی طرح قرآن میں پائے جاتے ہیں جن کو دوائرہ عشرہ سے موسوم کر سکتے ہیں۔ ان دس دائروں میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایسے پاکیزہ اور باہمی امتیاز رکھنے والے مفردات سے کام لیا ہے جو عقل سلیم فی الفور گواہی دیتی ہے کہ یہ اکمل اور اتم سلسلہ مفردات کا اسی لئے عربی میں مقرر کیا گیا تھا کہ تا قرآن کا خادم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سلسلہ مفردات کا قرآن کریم کے تعلیمی نظام سے جو اکمل اور اتم ہے بالکل مطابق آگیا۔ لیکن دوسری زبانوں کے مفردات کا سلسلہ ان کتابوں کے تعلیمی نظام سے ہرگز مطابق نہیں آتا جو الٰہی کتابیں کہلاتی ہیں۔ اور جن کا ان زبانوں میں نازل ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اور نہ دوائر عشرہ مذکورہ ان کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ پس ان کتابوں کے ناقص ہونے کی وجوہ سے یہ بھی ایک بھاری وجہ ہے کہ وہ دوائر ضروریہ سے بے بہرہ اور نیز زبان کے مفردات ان کتابوں کی تعلیم سے وفا نہیں کر سکے۔ اور اس میں بھید یہی ہے کہ وہ کتابیں حقیقی کتابیں نہیں تھیں بلکہ وہ صرف چند روزہ کارروائی تھی حقیقی کتاب دنیا میں ایک ہی آئی جو ہمیشہ کے لئے انسانوں کی بھلائی کے لئے تھی۔ لہٰذا دوائر عشرہ کاملہ کے ساتھ نازل ہوئی اور اس کے مفردات کا نظام تعلیمی نظام کا بالکل ہم وزن اور ہم پلّہ تھا۔ اور ہر یک دائرہ اس کا دوائر عشرہ میں سے اپنے طبعی نظام کے اندازہ اور قدر پر مفردات کا نظام ساتھ رکھتا تھا جس میں الٰہی صفات کے اظہار کے لئے اور اقسام اربعہ مذکورہ کے مدارج بیان کرنے کی غرض سے الگ الگ الفاظ مفردہ مقرر تھے۔ اور ہر یک تعلیم کے دائرہ کے موافق مفردات کا کامل دائرہ موجود تھا۔

(منن الرحمٰن ص۲۵-۲۷ حاشیہ)

ہر چند میرا مذہب یہی ہے کہ قرآن اپنی تعلیم میں کامل ہے اور کوئی صداقت اس سے باہر نہیں۔

کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ و نزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکلّ شیءٍ۔ یعنی ہم نے تیرے پر وہ کتاب اتاری ہے جس میں ہر ایک چیز کا بیان ہے اور پھر فرماتا ہے ما فرطنا فی الکتاب من شیءٍ یعنی ہم نے اس کتاب سے کوئی چیز باہر نہیں رکھی۔ لیکن ساتھ اس کے یہ بھی میرا اعتقاد ہے کہ قرآن کریم سے تمام مسائل دینیہ کا استخراج و استنباط کرنا اس کی مجملات کی تفاصیلِ صحیحہ پر حسب منشاءِ الٰہی قادر ہر ایک مجتہد اور مولوی کا کام نہیں بلکہ یہ خاص طور پر ان کا کام ہے جو وحیٔ الٰہی سے بطور نبوت یا بطور ولایتِ عظمیٰ مدد دیئے گئے ہوں۔ سو ایسے لوگوں کے لئے جو استخراج و استنباط معارف قرآنی پر بعلت غیر ملہم ہونے کے قادر نہیں ہو سکتے یہی سیدھی راہ ہے کہ وہ بغیر قصد استخراج و استنباط قرآن کے ان تمام تعلیمات کو جو سُنن متوارثہ متعاملہ کے ذریعہ سے ملی ہیں بلا تأمل و توقف قبول کر لیں۔ اور جو لوگ وحیٔ ولایتِ عظمیٰ کی روشنی سے منوّر ہیں وہ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کے گروہ میں داخل ہیں۔ اُن سے بلا شبہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً دقائقِ مخفیہ قرآن کے اُن پر کھولتا رہتا ہے اور یہ بات اُن پر ثابت کر دیتا ہے کہ کوئی زائد تعلیم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہرگز نہیں دی بلکہ احادیث صحیحہ میں مجملات و اشاراتِ قرآن کریم کی تفصیل ہے۔ سو اس معرفت کے پانے سے اعجاز قرآن کریم اُن پر کھل جاتا ہے اور نیز ان آیات بیّنات کی سچائی اُن پر روشن ہو جاتی ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے جو قرآن کریم سے کوئی چیز باہر نہیں۔

(الحق مباحثہ لدھیانہ ص ۸۰-۷۹)

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے بڑے فائدے دو ہیں جن کے پہنچانے کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ ایک حکمتِ فرقان یعنی معارف و دقائق قرآن۔ دوسری تاثیر قرآن جو موجب تزکیہ نفوس ہے۔ اور قرآن کی حفاظت صرف اسی قدر نہیں جو اس کے صحف مکتوبہ کو خوب نگہبانی سے رکھیں کیونکہ ایسے کام تو اوائل حال میں یہود اور نصاریٰ نے بھی کئے۔ یہاں تک کہ توریت کے نقطے بھی گن رکھے تھے بلکہ اس جگہ مع حفاظت ظاہری حفاظت فوائد و تاثیر قرآنی مراد ہے اور وہ موافق سنّت اللہ کے تبھی ہو سکتی ہے کہ جب وقتاً فوقتاً نائب رسول آویں جن میں ظلّی طور پر رسالت کی تمام نعمتیں موجود ہوں اور جن کو وہ تمام برکات دی گئی ہوں جو نبیوں کو دی جاتی ہوں۔ جیسا کہ ان آیات میں اسی امر عظیم کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ ہے۔ وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا

الصالحات لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکّننّ لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدّ لنّھم من بعد خوفھم امنًا۔ یعبدوننی ولا یشرکون بی شیئًا ومن کفر بعد ذالک فاولٰئک ھم الفاسقون۔ پس یہ آیت درحقیقت اِس دوسری آیت انّا نحن نزلنا الذکر وانّا لہ لحافظون کے لئے بطور تفسیر کے واقع ہے۔ اور اس سوال کا جواب دے رہی ہے کہ حفاظتِ قرآن کیونکر اور کس طور سے ہوگی۔ سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اِس نبیؐ کریم کے خلیفے وقتًا فوقتًا بھیجتا رہوں گا۔

(شہادت القرآن ص۴۲-۴۳)

وہ یقینی اور کامل اور آسان ذریعہ کہ جس سے بغیر تکلیف اور مشقت اور مزاحمت شکوک اور شبہات اور خطا اور سہو کے اصول صحیحہ معہ اُن کے دلائل عقلیہ کے معلوم ہو جائیں اور یقین کامل سے معلوم ہوں وہ قرآن شریف ہے اور بجز اس کے دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں اور نہ کوئی ایسا دوسرا ذریعہ کہ جس سے یہ مقصد اعظم ہمارا پورا ہو سکے۔

(براہین احمدیہ ص۷۷)

اب اے صاحبو! میں یہ بیان کرتا ہوں کہ وہ امتیازی نشان کہ جو الہامی کتاب کی شناخت کے لئے عقل سلیم نے قرار دیا ہے وہ صرف خدا تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن شریف میں پایا جاتا ہے۔ اور اس زمانے میں وہ تمام خوبیاں جو خدا کی کتاب میں امتیازی نشان کے طور ہونی چاہئیں دوسری کتابوں میں قطعًا مفقود ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں وہ خوبیاں پہلے زمانہ میں ہونگی مگر اب نہیں ہیں اور گو ہم ایک دلیل سے جو ہم پہلے لکھ چکے ہیں ان کو الہامی کتابیں سمجھتے ہیں مگر وہ گو الہامی ہوں لیکن اپنی موجودہ حالت کے لحاظ سے بالکل بے سود ہیں اور اس شاہی قلعہ کی طرح ہیں جو خالی اور ویران پڑا ہے اور دولت اور فوجی طاقت سب اس میں سے کوچ کر گئی ہے۔

(مضمون جلسہ لاہور منسلکہ چشمۂ معرفت ص۳۲)

اگر کوئی مخالفین اسلام میں سے یہ اعتراض کرے کہ قرآن شریف کو سب الہامی کتابوں سے افضل اور اعلیٰ قرار دینے میں یہ لازم آتا ہے کہ دوسری الہامی کتابیں ادنیٰ درجہ کی ہوں حالانکہ وہ سب ایک خدا کی کلام ہے۔ اُس میں ادنیٰ اور اعلیٰ کیونکر تجویز ہو سکتا ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ بے شک بہ اعتبار نفس الہام کے سب کتابیں مساوی ہیں مگر باعتبار زیادت بیان اور مکملات دین کے بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔ پس اس جہت سے قرآن شریف کو سب کتابوں پہ

فضیلت حاصل ہے کیونکہ جسقدر قرآن شریف میں امور تکمیل دین کے جیسے مسائل توحید اور ممانعت انواع و اقسام شرک اور معالجات امراض روحانی اور دلائل ابطال مذاہب باطلہ اور براہین اثبات عقائد حقہ وغیرہ بکمال شد و مد بیان فرمائے گئے ہیں وہ دوسری کتابوں میں درج نہیں۔

(براہین احمدیہ ص۴ حاشیہ ۲)

یہ دعویٰ پادریوں کا سراسر غلط ہے کہ قرآن توحید اور احکام میں نئی چیز کونسی لایا جو توریت میں نہ تھی۔ بظاہر ایک نادان توریت کو دیکھ کر دھوکا میں پڑے گا کہ توریت میں توحید بھی موجود ہے اور احکام عبادت اور حقوق عباد کا بھی ذکر ہے۔ پھر کونسی نئی چیز ہے جو قرآن کے ذریعہ سے بیان کی گئی۔ مگر یہ دھوکا اُسی کو لگے گا جس نے کلام الٰہی میں کبھی تدبّر نہیں کیا۔ واضح ہو کہ الٰہیات کا بہت سا حصہ ایسا ہے کہ توریت میں اس کا نام و نشان نہیں۔ چنانچہ توریت میں توحید کے باریک مراتب کا کہیں ذکر نہیں۔ قرآن ہم پر ظاہر فرماتا ہے کہ توحید صرف اس بات کا نام نہیں کہ ہم بتوں اور انسانوں اور حیوانوں اور عناصر اور اجرام فلکی اور شیاطین کی پرستش سے باز رہیں بلکہ توحید تین درجہ پر منقسم ہے۔

درجہ اوّل عوام کیلئے یعنی اُن کے لئے جو خدا تعالیٰ کے غضب سے نجات پانا چاہتے ہیں۔

دوسرا درجہ خواص کیلئے یعنی اُن کے لئے جو عوام کی نسبت زیادہ تر قرب الٰہی کے ساتھ خصوصیت پیدا کرنی چاہتے ہیں۔

اور تیسرا درجہ خواص الخواص کے لئے جو قرب کے کمال تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

اوّل مرتبہ توحید کا تو یہی ہے کہ غیر اللہ کی پرستش نہ کی جائے اور ہر ایک چیز جو محدود اور مخلوق معلوم ہوتی ہے خواہ زمین پر ہے خواہ آسمان پر اس کی پرستش سے کنارہ کیا جائے۔

دوسرا مرتبہ توحید کا یہ ہے کہ اپنے اور دوسروں کے تمام کاروبار میں مؤثر حقیقی خدا تعالےٰ کو سمجھا جائے اور اسباب پر اتنا زور نہ دیا جائے جس سے وہ خدا تعالےٰ کے شریک ٹھہر جائیں مثلاً یہ کہنا کہ زید نہ ہوتا تو میرا یہ نقصان ہوتا اور بکر نہ ہوتا تو مَیں تباہ ہو جاتا۔ اگر یہ کلمات اس نیت سے کہے جائیں کہ جس سے حقیقی طور پر زید و بکر کو کچھ چیز سمجھا جائے تو یہ بھی شرک ہے۔

تیسری قسم توحید کی یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کی محبت میں اپنے نفس کے اغراض کو بھی درمیان سے اُٹھانا اور اپنے وجود کو اس کی عظمت میں محو کرنا۔

یہ توحید توریت میں کہاں ہے۔ ایسا ہی توریت میں بہشت اور دوزخ کا کچھ ذکر نہیں پایا جاتا

اور شاید کہیں کہیں اشارات ہوں۔ ایسا ہی توریت میں خدا تعالیٰ کی صفات کاملہ کا کہیں پورے طور پر ذکر نہیں۔ اگر توریت میں کوئی ایسی سورۃ ہوتی جیسا کہ قرآن شریف میں قل ھو اللّٰہ احد اللّٰہ الصمد۔ لم یلد ولم یولد۔ ولم یکن لہ کفوًا احد ہے تو شاید عیسائی اس مخلوق پرستی کی بلا سے رُک جاتے۔ ایسا ہی توریت نے حقوق کے مدارج کو پورے طور پر بیان نہیں کیا۔ لیکن قرآن نے اس تعلیم کو بھی کمال تک پہنچایا۔ مثلاً وہ فرماتا ہے۔ انّ اللّٰہ یأمر بالعدل و الاحسان وایتاءِ ذی القربیٰ۔ یعنی خدا حکم کرتا ہے کہ تم عدل کرو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم احسان کرو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم لوگوں کی ایسے طور سے خدمت کرو کہ جیسے کوئی قرابت کے جوش سے خدمت کرتا ہے یعنی بنی نوع سے تمہاری ہمدردی جوش طبعی سے ہو کوئی ارادہ احسان رکھنے کا نہ ہو جیسا کہ ماں اپنے بچہ سے ہمدردی رکھتی ہے۔ ایسا ہی توریت میں خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت اور اس کی صفات کاملہ کو دلائل عقلیہ سے ثابت کرکے نہیں دکھلایا۔ لیکن قرآن شریف نے ان تمام عقائد اور نیز ضرورتِ الہام اور نبوت کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا ہے۔ اور ہر ایک بحث کو فلسفہ کے رنگ میں بیان کرکے حق کے طالبوں پر اس کا سمجھنا آسان کر دیا ہے اور یہ تمام دلائل ایسے کمال سے قرآن شریف میں پائے جاتے ہیں کہ کسی کی مقدور میں نہیں کہ مثلاً ہستی باری پر کوئی ایسی دلیل پیدا کر سکے کہ جو قرآن شریف میں موجود نہ ہو۔

ماسوا اس کے قرآن شریف کے وجود کی ضرورت پر ایک اور بڑی دلیل یہ ہے کہ پہلی تمام کتابیں موسیٰ کی کتاب توریت سے انجیل تک ایک خاص قوم یعنی بنی اسرائیل کو اپنا مخاطب ٹھیراتی ہیں۔ اور صاف اور صریح لفظوں میں کہتے ہیں کہ ان کی ہدایتیں عام فائدہ کے لئے نہیں بلکہ صرف بنی اسرائیل کے وجود تک محدود ہیں۔ مگر قرآن شریف کے مدّنظر تمام دنیا کی اصلاح ہے اور اُس کی مخاطب کوئی خاص قوم نہیں بلکہ کھلے کھلے طور پر بیان فرماتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لئے نازل ہوا ہے اور ہر ایک کی اصلاح اس کا مقصود ہے۔

(کتاب البریّہ ص۸۳-۸۵)

آؤ عیسائیو! اِدھر آؤ ٭ نورِ حق دیکھو! راہ حق پاؤ
جس قدر خوبیاں ہیں قرآں میں ٭ کہیں انجیل میں تو دکھلاؤ
سر پہ خالق ہے اُس کو یاد کرو ٭ یونہی مخلوق کو نہ بہکاؤ
کب تلک جھوٹ سے کروگے پیار ٭ کچھ تو سچ کو بھی کام فرماؤ

کچھ تو خوف خدا کرو لوگو! ؎ کچھ تو لوگو خدا سے شرماؤ
عیشِ دنیا سدا نہیں پیارو ؎ اِس جہاں کو بقا نہیں پیارو
یہ تو رہنے کی جا نہیں پیارو ؎ کوئی اِس میں رہا نہیں پیارو

اے عزیزو! سنو کہ بے قرآں ؎ حق کو پاتا نہیں کبھی انساں
جن کو اس نور کی خبر ہی نہیں ؎ اُن کی اس یار پہ نظر ہی نہیں
ہے یہ فرقاں میں اک عجیب اثر ؎ کہ بناتا ہے عاشقِ دلبر

مجھ سے اُس دِلستاں کا حال سُنیں ؎ مجھ سے وہ صورتِ جمال سُنیں
آنکھ پھوٹی تو خیر کان سہی ؎ نہ سہی یونہی امتحان سہی

(درثمین ص ۴-۵)

قرآن عمیق حکمتوں سے پُر ہے اور ہر ایک تعلیم میں انجیل کی نسبت حقیقی نیکی کے سکھلانے کے لئے آگے قدم رکھتا ہے بالخصوص سچے اور غیر متغیّر خدا کے دیکھنے کا چراغ تو قرآن ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ دنیا میں نہ آیا ہوتا تو خدا جانے دنیا میں مخلوق پرستی کا عدد کس نمبر تک پہنچ جاتا۔ سو شکر کا مقام ہے کہ خدا کی وحدانیت جو زمین سے گم ہو گئی تھی دوبارہ قائم ہو گئی۔

(تحفہ قیصریہ ص ۲۶)

قرآن شریف ایک ایسی پُرحکمت کتاب ہے جس نے طب روحانی کے قواعد کلیہ کو یعنی دین کے اصول کو جو دراصل طب روحانی ہے طبّ جسمانی کے قواعد کلیہ کے ساتھ تطبیق دی ہے۔ اور یہ تطبیق ایک ایسی لطیف ہے جو صدہا معارف اور حقائق کے کھلنے کا دروازہ ہے۔ اور سچّی اور کامل تفسیر قرآن شریف کی وہی شخص کر سکتا ہے جو طبّ جسمانی کے قواعد کلیہ پیش نظر رکھ کر قرآن شریف کے بیان کردہ قواعد میں نظر ڈالتا ہے۔ ایک دفعہ مجھے بعض محقق اور حاذق طبیبوں کی بعض کتابیں کشفی رنگ میں دکھلائی گئیں جو طبّ جسمانی کے قواعد کلیہ اور اصول علمیہ اور ستۂ ضروریہ وغیرہ کی بحث پر مشتمل اور متضمن تھیں جن میں طبیب حاذق قرشی کی کتاب بھی تھی اور اشارہ کیا گیا کہ یہی تفسیر قرآن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم الابدان اور علم الادیان میں نہایت گہرے اور عمیق تعلقات ہیں اور ایک دوسرے کے مصدق ہیں۔ اور جب میں نے ان کتابوں کو پیش نظر رکھ کر جو طبّ جسمانی کی کتابیں تھیں قرآن شریف پر نظر ڈالی تو وہ عمیق در عمیق طبّ جسمانی کے قواعدِ کلیہ کی باتیں نہایت بلیغ پیرایہ میں قرآن شریف میں موجود پائیں۔

(چشمہ معرفت ص ۹۴-۹۵)

جو کتاب ابتدائے آفرینش کے وقت آئی ہوگی اس کی نسبت عقل قطعی طور پر تجویز کرتی ہے کہ وہ کامل کتاب نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ صرف اس استاد کی طرح ہوگی جو ابجد خوان بچوں کو تعلیم دیتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی ابتدائی تعلیم میں بہت لیاقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں جس زمانے میں انسانی تجربہ نے ترقی کی اور نیز نوع انسان کئی قسم کی غلطیوں میں پڑ گئی۔ تب باریک تعلیم کی حاجت پڑی۔ بالخصوص جب گمراہی کی تاریکی دنیا میں بہت پھیل گئی اور انسانی نفوس کئی قسم کی علمی اور عملی ضلالت میں مبتلا ہو گئے تب ایک اعلیٰ اور اکمل تعلیم کی حاجت پڑی اور وہ قرآن شریف ہے۔ لیکن ابتدائے زمانہ کی کتاب کے لئے اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ابھی انسانی نفوس سادہ تھے اور ہنوز اُن میں کوئی ظلمت اور ضلالت جاگزین نہیں ہوئی تھی۔ ہاں اُس کتاب کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت تھی جو انتہائی درجہ کی ضلالت کے وقت ظاہر ہوئی اور ان لوگوں کی اصلاح کے لئے آئی جن کے دلوں میں عقائد فاسدہ راسخ ہو چکے تھے اور اعمال قبیحہ ایک عادت کے حکم میں ہو گئے تھے۔

(چشمہ معرفت ص۶۲ حاشیہ)

ہم پھر اصل مدعا کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ یہ بات فی الواقعہ صحیح اور درست ہے کہ ابتدائے آفرینش میں بھی ایک الہامی کتاب نوع انسان کو ملی تھی۔ مگر وہ وید ہرگز نہیں ہے اور موجودہ وید کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا اس پاک ذات کی توہین ہے۔ اسجگہ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ ابتدائے زمانہ میں صرف ایک الہامی کتاب انسانوں کو کیوں دی گئی۔ ہر ایک قوم کے لئے جُدا جُدا کتابیں کیوں نہ دی گئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ابتدائے زمانہ میں انسان تھوڑے تھے اور اس تعداد سے بھی کم تر تھے جو ان کو ایک قوم کہا جائے۔ اس لئے اُن کیلئے صرف ایک کتاب کافی تھی۔ پھر بعد اس کے جب دنیا میں انسان پھیل گئے اور ہر ایک حصہ زمین کے باشندوں کا ایک قوم بن گئی اور بباعث دُور و دراز مسافتوں کے ایک قوم دوسری قوم کے حالات سے بالکل بے خبر ہو گئی ایسے زمانوں میں خدا تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت نے تقاضا فرمایا کہ ہر ایک قوم کے لئے جُدا جُدا رسول اور الہامی کتابیں دی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ اور پھر جب نوع انسان نے دنیا کی آبادی میں ترقی کی اور ملاقات کرنے کے لئے راہ کھل گئی اور ایک ملک کے لوگوں کو دوسرے ملک کے لوگوں کے ساتھ ملاقات کرنے کے لئے سامان میسّر آگئے اور اس بات کا علم ہو گیا کہ فلاں فلاں حصّہ زمین پر نوع انسان رہتے ہیں اور خدا تعالیٰ کا ارادہ ہُوا کہ ان سب کو پھر دوبارہ ایک قوم کی طرح بنا دیا جائے اور بعد تفرقہ کے پھر اُن کو جمع کیا جاوے تب خدا نے تمام ملکوں

کے لئے ایک کتاب بھیجی اور اس کتاب میں حکم فرمایا کہ جس جس زمانہ میں یہ کتاب مختلف ممالک میں پہنچے ان کا فرض ہوگا کہ اُس کو قبول کریں اور اُس پر ایمان لاویں اور وہ کتاب قرآن شریف ہے جو تمام ملکوں کا باہمی رشتہ قائم کرنے کے لئے آئی ہے۔ قرآن سے پہلی سب کتابیں مختص القوم کہلاتی تھیں یعنی صرف ایک قوم کے لئے ہی آئی تھیں۔ چنانچہ شامی فارسی ہندی چینی مصری رومی یہ سب قومیں تھیں جن کے لئے جو کتابیں یا رسول آئے وہ صرف اپنی قوم تک محدود تھے دوسری قوم سے اُنکو کچھ تعلق اور واسطہ نہ تھا۔ مگر سب کے بعد قرآن شریف آیا جو ایک عالمگیر کتاب ہے۔ اور کسی خاص قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام قوموں کے لئے ہے۔ ایسا ہی قرآن شریف ایک ایسی اُمت کے لئے آیا جو آہستہ آہستہ ایک ہی قوم بننا چاہتی تھی۔ سو اب زمانہ کے لئے ایسے سامان میسّر آ گئے ہیں جو مختلف قوموں کو وحدت کا رنگ بخشتے جاتے ہیں۔ باہمی ملاقات جو اصل جڑ ایک قوم بننے کی ہے ایسی سہل ہو گئی ہے کہ برسوں کی راہ چند دنوں میں طے ہو سکتی ہے اور پیغام رسانی کے لئے وہ سبیلیں پیدا ہو گئی ہیں کہ جو ایک برس میں بھی کسی دُور دراز ملک کی خبر نہیں آ سکتی تھی وہ اب ایک ساعت میں آ سکتی ہے۔ زمانہ میں ایک ایسا انقلابِ عظیم پیدا ہو رہا ہے اور تمدنی دریا کی دھار نے ایک ایسی طرف رُخ کر لیا ہے جس سے صریح معلوم ہوتا ہے کہ اب خدا تعالیٰ کا یہی ارادہ ہے کہ تمام قوموں کو جو دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں ایک قوم بنا دے۔ اور ہزارہا برسوں کے بچھڑے ہوؤں کو پھر باہم ملا دے۔ اور یہ خبر قرآن شریف میں موجود ہے اور قرآن شریف نے ہی کھلے طور پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کے لئے آیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا یعنی تمام لوگوں کو کہدے کہ مَیں تم سب کے لئے رسول ہو کر آیا ہوں۔ اور پھر فرماتا ہے وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ یعنی مَیں نے تمام عالموں کے لئے تجھے رحمت کر کے بھیجا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا یعنی ہم نے اس لئے بھیجا ہے کہ تمام دنیا کو ڈراوے لیکن ہم بڑے زور سے کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے پہلے دنیا کی کسی الہامی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہر ایک نے اپنی رسالت کو اپنی قوم تک ہی محدود رکھا۔ یہاں تک کہ جس نبی کو عیسائیوں نے خدا قرار دیا اُسکے مُنہ سے بھی یہی نکلا کہ مَیں اسرائیل کی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا اور زمانہ کے حالات نے بھی گواہی دی کہ قرآن شریف کا یہ دعویٰ تبلیغ عام کا عین موقعہ پر ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت تبلیغ عام کا دروازہ کھل گیا تھا۔

(چشمۂ معرفت ص ۶۶ - ۶۹)

قرآن شریف میں یہ وعدہ تھا کہ خدا تعالیٰ فتنوں اور خطرات کے وقت میں دین اسلام کی حفاظت کریگا جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون سو خدا تعالیٰ نے بموجب اس وعدہ کے چار قسم کی حفاظت اپنے کلام کی کی۔ اوّل حافظوں کے ذریعہ سے اس کے الفاظ اور ترتیب کو محفوظ رکھا اور ہر ایک صدی میں لاکھوں ایسے انسان پیدا کئے جو اس کی پاک کلام کو اپنے سینوں میں حفظ رکھتے ہیں۔ ایسا حفظ کہ اگر ایک لفظ پوچھا جائے تو اس کا سب اگلا پچھلا بتا سکتے ہیں۔ اور اس طرح پر قرآن کو تحریف لفظی سے ہر ایک زمانہ میں بچایا۔ دوسرے ایسے ائمہ اور اکابر کے ذریعہ سے جن کو ہر ایک صدی میں فہم قرآن عطا ہوا ہے۔ جنہوں نے قرآن شریف کے اجمالی مقامات کی احادیث نبویہ کی مدد سے تفسیر کرکے خدا کی پاک کلام اور پاک تعلیم کو ہر ایک زمانہ میں تحریف معنوی سے محفوظ رکھا تیسرے متکلمین کے ذریعہ سے جنہوں نے قرآنی تعلیمات کو عقل کے ساتھ تطبیق دے کر خدا کی پاک کلام کو کوتہ اندیش فلسفیوں کے استخفاف سے بچایا ہے۔ چوتھے رُوحانی انعام پانے والوں کے ذریعہ سے جنہوں نے خدا کی پاک کلام کو ہر ایک زمانہ میں معجزات اور معارف کے منکروں کے حملہ سے بچایا ہے۔

(ایّام الصلح ص۵۵)

شاید اس جگہ کسی کے دل میں یہ وسوسہ اُٹھے کہ مسلمانوں کا بھی یہی اعتقاد ہے کہ وحی حضرت آدم سے شروع ہوئی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی۔ سو اس عقیدہ کے رو سے بھی بعد زمانہ خاتم الانبیاء کے انقطاع وحی کا ہمیشہ کے لئے لازم آیا۔ سو اس کے جواب میں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا ہندوؤں کی طرح ہرگز یہ اعتقاد نہیں جو خدا کے پاس اتنی ہی کلام تھی جتنی وہ ظاہر کر چکا۔ بلکہ بموجب اعتقاد اسلام کے خدا کی کلام اور خدا کا علم اور حکمت مثل ذات اس کی کے غیر محدود ہے، چنانچہ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ فرمایا ہے قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمَاتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔ (سورۃ کہف الجزو ۱۶) یعنی اگر خدا کی کلام کے لکھنے کے لئے سمندر کو سیاہی بنایا جائے تو لکھتے لکھتے سمندر ختم ہو جائے اور کلام میں کچھ کمی نہ ہو۔ گو ویسے ہی اور سمندر بطور مدد کے کام میں لائے جائیں۔ رہی یہ بات کہ ہم لوگ ختم ہونا وحی کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر کن معنوں سے مانتے ہیں۔ سو اس میں اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ گو کلام الٰہی اپنی ذات میں غیر محدود ہے۔ لیکن چونکہ وہ مفاسد کہ جن کی اصلاح کے لئے کلام الٰہی نازل ہوتی رہی یا وہ ضرورتیں کہ جن کو الہام ربّانی پورا کرتا رہا ہے وہ قدر محدود سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لئے کلام الٰہی بھی اسی قدر نازل ہوئی کہ جس قدر بنی آدم کو اس کی ضرورت تھی اور قرآن شریف

ایسے زمانہ میں آیا تھا کہ جس میں ہر ایک طرح کی ضرورتیں کہ جن کا پیش آنا ممکن ہے پیش آگئی تھیں۔ یعنی تمام امور اخلاقی اور اعتقادی اور قولی اور فعلی بگڑ گئے تھے۔ اور ہر ایک قسم کا افراط تفریط اور ہر ایک نوع کا فساد اپنے انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اس لئے قرآن شریف کی تعلیم بھی انتہائی درجہ پر نازل ہوئی۔ پس انہی معنوں سے شریعتِ فرقانی مختتم اور مکمل ٹھہری اور پہلی شریعتیں ناقص رہیں کیونکہ پہلے زمانوں میں وہ مفاسد کہ جنکی اصلاح کے لئے الہامی کتابیں آئیں وہ بھی انتہائی درجہ پر نہیں پہنچے تھے اور قرآن شریف کے وقت میں وہ سب اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ پس اب قرآن شریف اور دوسری الہامی کتابوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی کتابیں اگر ہر ایک طرح کے خلل سے محفوظ بھی رہتیں۔ پھر بھی بوجہ ناقص ہونے تعلیم کے ضرور تھا کہ کسی وقت کامل تعلیم یعنی فرقانِ مجید ظہور پذیر ہوتا مگر قرآن شریف کے لئے اب یہ ضرورت درپیش نہیں کہ اس کے بعد کوئی اور کتاب بھی آوے کیونکہ کمال کے بعد اور کوئی درجہ باقی نہیں۔ ہاں اگر یہ فرض کیا جائے کہ کسی وقت اصول حقہ قرآن شریف کے وید اور انجیل کی طرح مشرکانہ اصول بنائے جائیں گے اور تعلیم توحید میں تبدیل اور تحریف عمل میں آوے گی یا اگر ساتھ اس کے یہ بھی فرض کیا جائے جو کسی زمانہ میں کروڑہا مسلمان جو توحید پر قائم ہیں وہ بھی پھر طریق شرک اور مخلوق پرستی کا اختیار کریں گے۔ تو بیشک ایسی صورتوں میں دوسری شریعت اور دوسرے رسول کا آنا ضروری ہوگا مگر دونوں قسم کے فرض محال ہیں قرآن شریف کی تعلیم کا محرف و مبدّل ہونا اس لئے محال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (سورۃ الحجر الجزو نمبر ۱۴) یعنی اس کتاب کو ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ رہیں گے۔ سو تیرہ سو برس سے اس پیشگوئی کی صداقت ثابت ہو رہی ہے۔ اب تک قرآن شریف میں پہلی کتابوں کی طرح کوئی مشرکانہ تعلیم ملنے نہیں پائی اور آئندہ بھی عقل تجویز نہیں کر سکتی کہ اس میں کسی نوع کی مشرکانہ تعلیم مخلوط ہو سکے۔ کیونکہ لاکھوں مسلمان اس کے حافظ ہیں۔ ہزارہا اس کی تفسیریں ہیں۔ پانچ وقت اس کی آیات نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ ہر روز اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اسی طرح تمام ملکوں میں اس کا پھیل جانا کروڑہا نسخے اس کے دنیا میں موجود ہونا۔ ہر یک قوم کا اس کی تعلیم سے مطلع ہو جانا یہ سب امور ایسے ہیں کہ جن کے لحاظ سے عقل اس بات پر قطع واجب کرتی ہے کہ آئندہ بھی کسی نوع کا تغیر اور تبدل قرآن شریف میں واقع ہونا ممتنع اور محال ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۱۰۰ تا ۱۰۲ حاشیہ ۹)

وسوسۂ ہفتم۔ کسی کتاب پر علم الٰہی کی ساری صداقتیں ختم نہیں ہو سکتیں۔ پھر کیونکر امید

کی جائے کہ ناقص کتابیں کامل معرفت تک پہنچا دینگی ۔

جواب ۔ یہ وسوسہ اس وقت قابلِ التفات ہوتا کہ جب برہمو سماج والوں میں سے کوئی صاحب اپنی عقل کے زور سے خداشناسی یا کسی دوسرے امر معاد کے متعلق کوئی ایسی جدید صداقت نکالتا جس کا قرآن شریف میں کہیں ذکر نہ ہوتا ۔ اور ایسی حالت میں بلاشبہ حضرات برہمو بڑے ناز سے کہہ سکتے تھے کہ علمِ معاد اور خداشناسی کی ساری صداقتیں کتاب الہامی میں مندرج نہیں بلکہ فلاں فلاں صداقت باہر رہ گئی ہے جس کو ہم نے دریافت کیا ہے ۔ اگر ایسا کر کے دکھلاتے تب تو شاید کسی نادان کو کوئی دھوکا بھی دے سکتے ۔ پر جس حالت میں قرآن شریف کھلا کھلا دعویٰ کر رہا ہے ۔ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ الجزو نمبر ۷ ۔ یعنی کوئی صداقت علمِ الٰہی کے متعلق جو انسان کے لئے ضروری ہے اس کتاب سے باہر نہیں ۔ اور پھر فرمایا یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَةٌ الجزو نمبر ۳۰ یعنی خدا کا رسول پاک صحیفے پڑھتا ہے جن میں تمام کامل صداقتیں اور علوم اوّلین و آخرین درج ہیں ۔ اور پھر فرمایا ۔ کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ الجزو نمبر ۱۱ ۔ یعنی اس کتاب میں دو خوبیاں ہیں ۔ ایک تو یہ کہ حکیم مطلق نے محکم اور مدلل طور پر یعنی علوم حکمیہ کی طرح اس کو بیان کیا ہے بطور کتھا یا قصہ نہیں ۔ دوسری یہ خوبی کہ اس میں تمام ضروریات علم معاد کی تفصیل کی گئی ہے ۔ اور پھر فرمایا ۔ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۔ یعنی علم معاد میں جس قدر تنازعات اٹھیں سب کا فیصلہ یہ کتاب کرتی ہے بے سود اور بیکار نہیں ہے ۔ اور پھر فرمایا ۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْکِتَابَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ وَهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ الجزو نمبر ۱۴ یعنی ہم نے اس لئے کتاب کو نازل کیا ہے تا جو اختلافات عقولِ ناقصہ کے باعث پیدا ہو گئے ہیں یا کسی عمدًا افراط و تفریط کرنے سے ظہور میں آئے ہیں ان سب کو دُور کیا جائے اور ایمانداروں کے لئے راستہ سیدھا بتلایا جاوے اس جگہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو فساد بنی آدم کے مختلف کلاموں سے پھیلا ہے اس کی اصلاح بھی کلام ہی پر موقوف ہے ۔ یعنی اس بگاڑ کے درست کرنے کے لئے جو بے ہودہ اور غلط کلاموں سے پیدا ہوا ہے ایسے کلام کی ضرورت ہے جو تمام عیوب سے پاک ہو کیونکہ یہ نہایت بدیہی بات ہے کہ کلام کا رہزدہ کلام ہی کے ذریعہ سے راہ راست پر آ سکتا ہے صرف اشاراتِ قانونِ قدرت تنازعاتِ کلامیہ کا فیصلہ نہیں کر سکتے اور نہ گمراہ کو اس کی گمراہی پر بصفائی تمام ملزم کر سکتے ہیں ۔ جیسے اگر جج نہ مدعی کی

وجوہات بہ تصریح قلمبند کرے نہ مدعا علیہ کے عذرات کو بدلائل قاطعہ توڑے تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ صرف اس کے اشارات سے فریقین اپنے اپنے سوالات و اعتراضات و وجوہات کا جواب پا لیں اور کیونکر ایسے مبہم اشارات پر جن سے کسی فریق کا باطمینان کامل رفع عذر نہیں ہوا حکم آخیر مترتب ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خدا کی حجّت بھی بندوں پر تب ہی پوری ہوتی ہے کہ جب اس کی طرف سے یہ التزام ہو کہ جو لوگ غلط تقریروں کے اثر سے طرح طرح کی بدعقیدگی میں پڑ گئے ہیں ان کو بذریعہ اپنی کامل و صحیح تقریر کے غلطی پر مطلع کرے۔ اور مدلّل اور واضح بیان سے اُنکا گمراہ ہونا ان کو جتلا دے تا اگر اطلاع پا کر پھر بھی وہ باز نہ آویں اور غلطی کو نہ چھوڑیں تو سزا کے لائق ہوں۔ خدا تعالیٰ ایک کو مجرم ٹھہرا کر پکڑے اور سزا دینے کو تیار ہو جائے مگر بیان واضح سے اس کے دلائل بریّت کا غلط ہونا ثابت نہ کرے۔ اور اس کے دلی شبہات کو اپنی کھلی کلام سے نہ مٹا دے۔ کیا یہ اس کا منصفانہ حکم ہو گا؟ پھر اسی کی طرف دوسری آیت میں بھی اشارہ فرمایا۔ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ الجزو نمبر ۲۔ یعنی قرآن میں تین صفتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ جو علومِ دین لوگوں کو معلوم نہیں رہے تھے اُن کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔ دوسرے جن علوم میں پہلے کچھ اجمال چلا آتا تھا اُن کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ تیسرے جن امور میں اختلاف اور تنازعہ پیدا ہو گیا تھا اُن میں قولِ فیصل بیان کر کے حق اور باطل میں فرق ظاہر کرتا ہے۔ اور پھر اُسی جامعیت کے بارہ میں فرمایا۔ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا الجزو نمبر ۱۵ یعنی اس کتاب میں ہر ایک علم دین کو بہ تفصیل تمام کھول دیا ہے اور اس کے ذریعہ سے انسان کی جزئی ترقی نہیں بلکہ یہ وہ وسائل بتلاتا ہے اور ایسے علوم کاملہ تعلیم فرماتا ہے جن سے کلی طور پر ترقی ہو۔ اور پھر فرمایا۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ الجزو نمبر ۱۴۔ یعنی یہ کتاب ہم نے اس لئے تجھ پر نازل کی کہ تا ہر ایک دینی صداقت کو کھول کر بیان کر دے۔ اور تا یہ بیان کامل ہمارا ان کے لئے جو اطاعتِ الٰہی اختیار کرتے ہیں موجب ہدایت و رحمت ہو۔ اور پھر فرمایا۔ الٓرٰ۔ كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ الجزو نمبر ۱۳۔ یعنی یہ عالی شان کتاب ہم نے تجھ پر نازل کی۔ تاکہ تو لوگوں کو ہر ایک قسم کی تاریکی سے نکال کر نور میں داخل کرے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جس قدر انسان کے نفس میں طرح طرح کے وساوس گذرتے ہیں۔ اور شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اُن سب کو قرآن شریف دُور کرتا ہے اور ہر ایک طور کے

خیالات فاسدہ کو مٹاتا ہے اور معرفت کامل کا نور بخشتا ہے۔ یعنی جو کچھ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے اور اس پر یقین لانے کے لئے معارف و حقائق درکار ہیں سب عطا فرماتا ہے۔ اور پھر فرمایا۔ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ الجزو نمبر ۱۳۔ یعنی قرآن ایسی کتاب نہیں کہ انسان اسکو بنا سکے بلکہ اس کے آثارِ صدق ظاہر ہیں کیونکہ وہ پہلی کتابوں کو سچا کرتا ہے یعنی کتب سابقہ انبیاء میں جو اس کے بارے میں پیشینگوئیں موجود تھیں وہ اس کے ظہور سے بہ پایۂ صداقت پہنچ گئیں۔ اور جن عقائد حقّہ کے بارے میں ان کتابوں میں دلائل واضح موجود نہ تھیں اُن کے قرآن نے دلائل بتلائے۔ اور ان کی تعلیم کو مرتبۂ کمال تک پہنچایا۔ اس طور پر ان کتابوں کو سچا کیا جس سے خود سچائی اُس کی ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے نشانِ صدق یہ کہ ہر ایک صداقت دینی کو وہ بیان کرتا ہے اور تمام وہ امور بتلاتا ہے کہ جو ہدایت کامل پانے کے لئے ضروری ہیں۔ اور یہ اس لئے نشان صدق ٹھہرا کہ انسان کی طاقت سے یہ بات باہر ہے کہ اس کا علم ایسا وسیع و محیط ہو جس سے کوئی دینی صداقت و حقائق دقیقہ باہر نہ رہیں۔

غرض ان تمام آیات میں خدا تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ قرآن شریف ساری صداقتوں کا جامع ہے۔ اور یہی بزرگ دلیل اس کی حقانیت پر ہے۔ اور اس دعویٰ پر صدہا برس بھی گذر گئے پر آجتک کسی برہمو وغیرہ نے اِس کے مقابلہ پر دم بھی نہ مارا تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ بغیر پیش کرنے کسی ایسی جدید صداقت کے کہ جو قرآن شریف سے باہر رہ گئی ہو۔ یوُنہی دیوانوں اور سودائیوں کی طرح اوہامِ باطلہ پیش کرنا جن کی کچھ بھی اصلیت نہیں اس بات پر پختہ دلیل ہے کہ ایسے لوگوں کو راستبازوں کی طرح حق کا تلاش کرنا منظور ہی نہیں۔ بلکہ نفس امّارہ کو خوش رکھنے کے لئے اس فکر میں پڑے ہوئے ہیں کہ کسی طرح خدا کے پاک احکام سے بلکہ خدا ہی سے آزادگی حاصل کریں۔ اِسی آزادگی کے حصول کی غرض سے خدا کی سچی کتاب سے جس کی حقانیت اظہر من الشمس ہے ایسے منحرف ہو رہے ہیں کہ نہ متکلّم بن کر شائستہ طریق پر کلام کرتے ہیں نہ سامع ہونے کی حالت میں کسی دوسرے کی بات سنتے ہیں۔ بھلا کوئی اُن سے پوچھے کہ کب کسی نے کوئی صداقت دینی قرآن کے مقابلہ پر پیش کی جس کا قرآن نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور خالی ہاتھ بھیج دیا۔ جس حالت میں تیرہ سو برس سے قرآن شریف بآواز بلند دعویٰ کر رہا ہے کہ تمام دینی صداقتیں اُس میں بھری پڑی ہیں تو پھر یہ کیسا خبث طینت ہے

کہ امتحان کے بغیر ایسی عالی شان کتاب کو ناقص خیال کیا جائے۔ اور یہ کس قسم کا مکابرہ ہے کہ نہ قرآن شریف کے بیان کو قبول کریں اور نہ اُس کے دعویٰ کو توڑ کر دکھلائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے لبوں پر تو ضرور کبھی کبھی خدا کا ذکر آجاتا ہے مگر اُن کے دل دنیا کی گندگی سے بھرے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی دینی بحث شروع بھی کریں تو اس کو مکمل طور پر ختم کرنا نہیں چاہتے بلکہ ناتمام گفتگو کا ہی جلدی سے گلا گھونٹ دیتے ہیں تا ایسا نہ ہو کہ کوئی صداقت ظاہر ہو جائے اور پھر بے شرمی یہ کہ گھر میں بیٹھ کر اس کامل کتاب کو ناقص بیان کرتے ہیں۔ جس نے بوضاحت تمام فرما دیا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ الجزو نمبر ۶۔ یعنی آج میں نے اِس کتاب کے نازل کرنے سے علم دین کو مرتبہ کمال تک پہنچا دیا اور اپنی تمام نعمتیں ایمان داروں پر پوری کر دیں۔ اے حضرات! کیا تمہیں کچھ بھی خدا کا خوف نہیں؟ کیا تم ہمیشہ اسی طرح جیتے رہو گے؟ کیا ایک دن خدا کے حضور میں اِس جھوٹے مُنہ پر لعنتیں نہیں پڑیں گی؟ اگر آپ لوگ کوئی بھاری صداقت لئے بیٹھے ہیں جس کی نسبت تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے کمال جانفشانی اور عرق ریزی اور موشگافی سے اس کو پیدا کیا ہے اور جو تمہارے گمان باطل میں قرآن شریف اس صداقت کے بیان کرنے سے قاصر ہے تو تمہیں قسم ہے کہ سب کاروبار چھوڑ کر وہ صداقت ہمارے رُوبرو پیش کرو۔ تا ہم تم کو قرآن شریف میں سے نکال کر دکھلا دیں۔

(براہین احمدیہ ص ۲۱۳-۲۱۷ حاشیہ ۱۱)

جمال و حسنِ قرآں نورِ جانِ ہر مسلماں ہے ؛ قمر ہے چاند اَوروں کا ہمارا چاند قرآں ہے
نظیر اُس کی نہیں جمتی نظر میں فکر کر دیکھا ؛ بھلا کیونکر نہ ہو یکتا کلامِ پاکِ رحماں ہے
بہارِ جاوداں پیدا ہے اُس کی ہر عبارت میں ؛ نہ وہ خوبی چمن میں ہے نہ اُس سا کوئی بستاں ہے
کلامِ پاکِ یزداں کا کوئی ثانی نہیں ہرگز ؛ اگر لولوئے عمّاں ہے وگر لعلِ بدخشاں ہے
خدا کے قول سے قولِ بشر کیونکر برابر ہو ؛ وہاں قدرت یہاں درماندگی فرقِ نمایاں ہے
ملائک جس کی حضرت میں کریں اقرار لاعلمی ؛ سخن میں اس کے ہمتائی کہاں مقدورِ انساں ہے
بنا سکتا نہیں اک پاؤں کیڑے کا بشر ہرگز ؛ تو پھر کیونکر بنانا نورِ حق کا اُس پہ آساں ہے
ارے لوگو کرو کچھ پاس شانِ کبریائی کا ؛ زباں کو تھام لو اب بھی اگر کچھ بوئے ایماں ہے
خدا سے غیر کو ہمتا بنانا سخت کفراں ہے ؛ خدا سے کچھ ڈرو یارو یہ کیسا کذب و بہتاں ہے

اگر اقرار ہے تم کو خدا کی ذاتِ واحد کا ؎ تو پھر کیوں اس قدر دل میں تمہارے شرک پنہاں ہے
یہ کیسے پڑ گئے دل پر تمہارے جہل کے پردے ؎ خطا کرتے ہو باز آؤ اگر کچھ خوفِ یزداں ہے
ہمیں کچھ کیں نہیں بھائیو نصیحت ہے غریبانہ ؎ کوئی جو پاک دل ہووے دل و جاں اُس پہ قرباں ہے
(براہین احمدیہ ص۱۹۸)

نورِ فرقاں ہے جو سب نوروں سے اجلیٰ نکلا ؎ پاک وہ جس سے یہ انوار کا دریا نکلا
حق کی توحید کا مُرجھا ہی چلا تھا پودا ؎ ناگہاں غیب سے یہ چشمۂ اصفیٰ نکلا
یا الٰہی! تیرا فرقاں ہے کہ اِک عالم ہے ؎ جو ضروری تھا وہ سب اس میں مہیّا نکلا
سب جہاں چھان چکے ساری دُکانیں دیکھیں ؎ مئے عرفاں کا یہی ایک ہی شیشا نکلا
کس سے اِس نُور کی ممکن ہو جہاں میں تشبیہ ؎ وہ تو ہر بات میں ہر وصف میں یکتا نکلا
پہلے سمجھے تھے کہ موسیٰ کا عصا ہے فرقاں ؎ پھر جو سوچا تو ہر اِک لفظ مسیحا نکلا
ہے قصور اپنا ہی اندھوں کا وگرنہ وہ نور ؎ ایسا چمکا ہے کہ صد نیّرِ بیضا نکلا
زندگی ایسوں کی کیا خاک ہے اس دنیا میں ؎ جن کا اِس نُور کے ہوتے بھی دل اعمیٰ نکلا
(براہین احمدیہ ص۲۹۵ حاشیہ در حاشیہ ص۲)

از نور پاک قرآں صبح صفا دمیدہ ؎ بر غنچہائے دلہا بادِ صبا وزیدہ
ایں روشنی و لمعاں شمس الضحیٰ ندارد ؎ ویں دلبری و خوبی کس در قمر ندیدہ
یوسف بقعرِ چاہے محبوس ماند تنہا ؎ ویں یوسفے کہ تن ہا از چاہ برکشیدہ
از مشرقِ معانی صدہا دقائق آورد ؎ قدِّ ہلال نازک زاں نازکی خمیدہ
کیفیت علومش دانی چہ شان دارد ؎ شہدیست آسمانی از وحیٔ حق چکیدہ
آں نیّرِ صداقت چوں رُو بعالم آورد ؎ ہر بوم شب پرستی در کُنج خود خزیدہ
روئے یقیں نہ بیند ہرگز کسے بدنیا ؎ اِلّا کسے کہ باشد بارُویش آرمیدہ
آنکس کہ عالمش شد شد مخزنِ معارف ؎ واں بے خبر ز عالم کیں عالمے ندیدہ
بارانِ فضلِ رحماں آمد بمقدمِ او ؎ بدقسمت آنکہ از وے سوئے دگر دویدہ
میلِ بدی نباشد اِلّا رگے ز شیطاں ؎ آں را بشر بدانم کز ہر شرے رہیدہ
اے کانِ دلبرائی دانم کہ از کجائی ؎ تو نورِ آں خدائی کیں خلق آفریدہ
میلم نماند باکس محبوبِ من توئی بس ؎ زیرا کہ زاں فغاں رس نورت بما رسیدہ
(براہین احمدیہ ص۲۹۴ حاشیہ در حاشیہ ص۲)

از وحیِ خدا صبحِ صداقت بدمیدہ ؎ چشمے کہ ندید آں صُحفِ پاک چہ دیدہ
کاخِ دلِ ما شد زِ ہماں نافہ معطر ؎ و آں یار بیامد کہ زِ ما بود رمیدہ
آں دیدہ کہ نورے نگرفت ست زِ فرقاں ؎ حقّا کہ ہمہ عمر زِ کوری نہ رہیدہ
آں دل کہ جز لذّے گُلِ گلزارِ خدا جست ؎ سوگند تواں خورد کہ بُویش نشمیدہ
با خور ندہیم نسبتِ آں نور کہ بینیم ؎ صد خور کہ بہ پیراہنِ او حلقہ کشیدہ
بے دولت بدبخت کسانیکہ ازاں نور
سرتافتہ از نخوت و پیوند بریدہ

(براہین احمدیہ صـ۳۱۳ حاشیہ ۱۱)

حدیث و سنّت نبویؐ

مسلمانوں کے ہاتھ میں اسلامی ہدایتوں پر قائم ہونے کے لئے تین چیزیں ہیں۔

(۱) **قرآن شریف** جو کتاب اللہ ہے جس سے بڑھ کر ہمارے ہاتھ میں کوئی کلام قطعی اور یقینی نہیں۔ وہ خدا کا کلام ہے وہ شک و ظن کی آلائشوں سے پاک ہے۔

(۲) دوسری **سُنّت**۔ اور اس جگہ ہم اہلحدیث کی اصطلاحات سے الگ ہو کر بات کرتے ہیں۔ یعنی ہم حدیث اور سنّت کو ایک چیز قرار نہیں دیتے جیسا کہ رسمی محدثین کا طریق ہے بلکہ حدیث الگ چیز ہے اور سُنّت الگ چیز۔ سنّت سے مراد ہماری صرف آنحضرتؐ کی فعلی روش ہے جو اپنے اندر تواتر رکھتی ہے اور ابتدا سے قرآن شریف کے ساتھ ہی ظاہر ہوئی اور ہمیشہ ساتھ ہی رہیگی۔ یا بہ تبدیل الفاظ یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن شریف خدا تعالیٰ کا قول ہے اور سنّت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فعل۔ اور قدیم سے عادت اللہ یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام خدا کا قول لوگوں کی ہدایت کے لئے لاتے ہیں تو اپنے فعل سے یعنی عملی طور پر اس قول کی تفسیر کر دیتے ہیں تا اس قول کا سمجھنا لوگوں پر مشتبہ نہ رہے اور اس قول پر آپ بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی عمل کرواتے ہیں۔

(۳) تیسرا ذریعہ ہدایت کا **حدیث** ہے۔ اور حدیث سے مراد ہماری وہ آثار ہیں کہ جو قصوں کے رنگ میں آنحضرتؐ سے ڈیڑھ سو برس بعد مختلف راویوں کے ذریعوں سے جمع کئے گئے ہیں۔ پس سنّت اور حدیث میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ سنّت ایک عملی طریق ہے جو اپنے ساتھ تواتر رکھتا ہے جس کو آنحضرتؐ نے اپنے ہاتھ سے جاری کیا۔ اور وہ یقینی مراتب میں قرآن شریف سے دوسرے درجہ پر ہے۔ اور جس طرح آنحضرتؐ قرآن کی اشاعت کے لئے مامور تھے۔ ایسا ہی سنّت کی اقامت کے لئے بھی مامور تھے۔ پس جیسا کہ قرآن شریف یقینی ہے ایسا ہی سنّت معمولہ متواترہ بھی یقینی ہے۔ یہ دونوں خدمات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ سے بجا لائے۔ اور دونوں کو اپنا فرض سمجھا۔ مثلاً جب نماز کیلئے حکم ہوا۔ تو آنحضرتؐ نے خدا تعالیٰ کے اس قول کو اپنے فعل سے کھول کر دکھلا دیا اور عملی رنگ میں ظاہر کر دیا کہ فجر کی نماز کی یہ رکعات ہیں اور مغرب کی یہ۔ اور باقی نمازوں کیلئے یہ یہ رکعات ہیں۔ ایسا ہی حج کر کے دکھلا دیا

اور پھر اپنے ہاتھ سے ہزارہا صحابہ کو اس فعل کا پابند کر کے سلسلہ تعامل بڑے زور سے قائم کر دیا۔ پس عملی نمونہ جو اب تک اُمّت میں تعامل کے رنگ میں مشہود و محسوس ہے اسی کا نام سنّت ہے۔ لیکن حدیث کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے روبرو نہیں لکھوایا اور نہ اس کے جمع کرنے کیلئے کوئی اہتمام کیا۔ کچھ حدیثیں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع کی تھیں۔ لیکن پھر تقویٰ کے خیال سے انہوں نے وہ سب حدیثیں جلا دیں۔ کہ یہ میرا سماع بلا واسطہ نہیں ہے خدا جانے اصل حقیقت کیا ہے پھر جب وہ دَور صحابہ رضی اللہ عنہم کا گذر گیا تو بعض تبع تابعین کی طبیعت کو خدا نے اس طرف پھیر دیا کہ حدیثوں کو بھی جمع کر لینا چاہیئے۔ تب حدیثیں جمع ہوئیں۔ اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ اکثر حدیثوں کے جمع کرنے والے بڑے متّقی اور پرہیزگار تھے۔ انہوں نے جہاں تک ان کی طاقت میں تھا حدیثوں کی تنقید کی اور ایسی حدیثوں سے بچنا چاہا جو اُن کی رائے میں موضوعات میں سے تھیں۔ اور ہر ایک مشتبہ الحال راوی کی حدیث نہیں لی۔ مگر تاہم چونکہ وہ ساری کارروائی بعد از وقت تھی اسلئے وہ سب ظن کے مرتبہ پر رہی۔ بایں ہمہ یہ سخت ناانصافی ہوگی کہ یہ کہا جائے کہ وہ سب حدیثیں لغو اور نکمّی اور بے فائدہ اور جھوٹی ہیں۔ بلکہ ان حدیثوں کے لکھنے میں اسقدر احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور اس قدر تحقیق اور تنقید کی گئی ہے جو اس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی۔ یہودیوں میں بھی حدیثیں ہیں اور حضرت مسیح کے مقابل پر بھی وہی فرقہ یہودیوں کا تھا جو عامل بالحدیث تھا۔ لیکن ثابت نہیں کیا گیا کہ یہودیوں کے محدثین نے ایسی احتیاط سے وہ حدیثیں جمع کی تھیں جیسا کہ اسلام کے محدثین نے۔ تاہم یہ غلطی ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ جب تک حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں اس وقت تک لوگ نمازوں کی رکعات سے بے خبر تھے یا حج کرنے کے طریق سے ناآشنا تھے کیونکہ سلسلہ تعامل نے جو سنّت کے ذریعہ سے اُن میں پیدا ہو گیا تھا تمام حدود اور فرائض اسلام ان کو سکھلا دیئے تھے۔ اس لئے یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ان حدیثوں کا دنیا میں اگر وجود بھی نہ ہوتا جو مدت دراز کے بعد جمع کی گئیں تو اسلام کی اصل تعلیم کا کچھ بھی حرج نہ تھا۔ کیونکہ قرآن اور سلسلہ تعامل نے ان ضرورتوں کو پورا کر دیا تھا۔ تاہم حدیثوں نے اُس نور کو زیادہ کیا۔ گویا اسلام نورٌ علیٰ نور ہو گیا۔ اور حدیثیں قرآن اور سنّت کے لئے گواہ کی طرح کھڑی ہو گئیں۔ اور اسلام کے بہت سے فرقے جو بعد میں پیدا ہو گئے اُن میں سچّے فرقہ کو احادیث صحیحہ سے بہت فائدہ پہنچا۔ پس مذہب اسلم یہی ہے کہ نہ تو اس زمانہ کے اہل حدیث کی طرح حدیثوں کی نسبت یہ اعتقاد رکھا جائے کہ قرآن پر وہ مقدم ہیں اور نیز اگر اُن کے قصّے صریح قرآن کے بیانات سے مخالف پڑیں

تو ایسا نہ کریں کہ حدیثوں کے قصوں کو قرآن پر ترجیح دی جاوے اور قرآن کو چھوڑ دیا جائے۔ اور نہ حدیثوں کو مولوی عبداللہ چکڑالوی کے عقیدے کی طرح محض لغو اور باطل ٹھیرایا جائے بلکہ چاہیئے کہ قرآن اور سنّت کو حدیثوں پر قاضی سمجھا جائے۔ اور جو حدیث قرآن اور سنّت کے مخالف نہ ہو اسکو بسروچشم قبول کیا جاوے۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ مبارک وہ جو اس کے پابند ہوتے ہیں۔ نہایت بدقسمت اور نادان وہ شخص ہے جو بغیر لحاظ اس قاعدے کے حدیثوں کا انکار کرتا ہے۔

ہماری جماعت کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی حدیث معارض اور مخالف قرآن اور سنّت نہ ہو تو خواہ کیسے ہی ادنیٰ درجہ کی حدیث ہو اس پر وہ عمل کریں۔ اور انسان کی بنائی ہوئی فقہ پر اس کو ترجیح دیں۔

(ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی صـ۶)

ہماری کتب مسلّمہ و مقبولہ جن پر ہم عقیدہ رکھتے ہیں اور جنکو ہم معتبر سمجھتے ہیں بہ تفصیل ذیل ہیں۔

اوّل قرآن شریف ہے۔ مگر یاد رہے کہ کسی قرآنی آیت کے معنے ہمارے نزدیک وہی معتبر اور صحیح ہیں جس پر قرآن کے دوسرے مقامات بھی شہادت دیتے ہوں۔ کیونکہ قرآن کی بعض آیات بعض کی تفسیر ہیں۔ اور نیز قرآن کے کامل اور یقینی معنوں کے لئے اگر وہ یقینی مرتبہ قرآن کے دوسرے مقامات سے میسّر نہ آسکے یہ بھی شرط ہے کہ کوئی حدیث صحیح مرفوع متصل بھی اس کی مفسّر ہو۔ غرض ہمارے مذہب میں تفسیر بالرائے ہرگز جائز نہیں۔ پس ہر یک معترض پر لازم ہوگا کہ کسی اعتراض کے وقت اس طریق سے باہر نہ جائے۔

دوم دوسری کتابیں جو ہماری مسلّم کتابیں ہیں ان میں سے اوّل درجہ پر صحیح بخاری ہے اور اس کی وہ تمام احادیث ہمارے نزدیک حجّت ہیں جو قرآن شریف سے مخالف نہیں۔ اور ان میں سے دوسری کتاب صحیح مسلم ہے۔ اور اس کو ہم اس شرط سے مانتے ہیں کہ قرآن اور صحیح بخاری سے مخالف نہ ہو۔ اور تیسرے درجہ پر صحیح ترمذی۔ ابن ماجہ۔ مؤطا۔ نسائی۔ ابوداؤد۔ دارقطنی کتب حدیث ہیں جنکی حدیثوں کو ہم اس شرط سے مانتے ہیں کہ قرآن اور صحیحین سے مخالف نہ ہوں۔ یہ کتابیں ہمارے دین کی کتابیں ہیں اور یہ شرائط ہیں جن کی رُو سے ہمارا عمل ہے .... پس ہر ایک معترض پر واجب ہوگا کہ کسی اعتراض کے وقت ان کتابوں اور ان شرائط سے باہر نہ جائے۔

(آریہ دھرم صـ۸۶)

کتاب اور سنّت کے حجج شرعیہ ہونے میں میرا یہ مذہب ہے کہ کتاب اللہ مقدم اور

امام ہے ۔ جس امر میں احادیث نبویّہ کے معانی جو کئے جاتے ہیں کتاب اللہ کے مخالف واقع نہ ہوں تو وہ معانی بطور حجۃ شرعیہ کے قبول کئے جائینگے لیکن جو معانی نصوص بیّنہ قرآنیہ سے مخالف واقع ہونگے ان معنوں کو ہم ہرگز قبول نہیں کرینگے ۔ بلکہ جہاں تک ہمارے لئے ممکن ہوگا ہم اس حدیث کے ایسے معنے کرینگے جو کتاب اللہ کی نصِّ بیّن سے موافق و مطابق ہوں ۔ اور اگر ہم کوئی ایسی حدیث پائیں گے جو مخالف نصّ قرآن کریم ہوگی اور کسی صورت سے ہم اس کی تاویل کرنے پر قادر نہیں ہوسکیں گے تو ایسی حدیث کو ہم موضوع قرار دینگے کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰہِ وَاٰیَاتِہٖ یُؤْمِنُوْنَ ۔ یعنی تم بعد اللہ اور اس کی آیات کے کس حدیث پر ایمان لاؤ گے ۔ اس آیت میں صریح اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر قرآن کریم کسی امر کی نسبت قطعی اور یقینی فیصلہ دیوے یہاں تک کہ اس فیصلہ میں کسی طور سے شک باقی نہ رہ جائے اور منشاء اچھی طرح سے کھل جائے تو پھر بعد اسکے کسی ایسی حدیث پر ایمان لانا جو صریح اس کے مخالف پڑی ہو مومن کا کام نہیں ہے ۔ پھر فرماتا ہے فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ۔ ان دونوں آیتوں کے ایک ہی معنے ہیں ۔ اس لئے اسجگہ تصریح کی ضرورت نہیں ۔ سو آیات متذکرہ بالا کی رو سے ہر ایک مومن کا یہی مذہب ہونا چاہیئے کہ وہ کتاب اللہ کو بلا شرط اور حدیث کو شرطی طور پر حجّت شرعی قرار دیوے اور یہی میرا مذہب ہے ۔

(الحق مباحثہ لدھیانہ ص۹-۱۰)

جس کو خدا تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے فہم قرآن عطا کرے اور تفہیم الٰہی سے وہ مشرف ہو جاوے اور اُس پر ظاہر کر دیا جائے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت سے فلاں حدیث مخالف ہے اور یہ علم اس کا کمال یقین اور قطعیت تک پہنچ جائے تو اس کے لئے یہی لازم ہوگا کہ حتّی الوسع اوّل ادب کی راہ سے اس حدیث کی تاویل کر کے قرآن شریف سے مطابق کرے اور اگر مطابقت محالات میں سے ہو اور کسی صورت سے نہ ہو سکے تو بدرجہ ناچاری اس حدیث کے غیر صحیح ہونے کا قائل ہو کیونکہ ہمارے لئے یہ بہتر ہے کہ ہم بحالتِ مخالفتِ قرآن شریف حدیث کی تاویل کی طرف رجوع کریں ۔ لیکن یہ سراسر الحاد اور کفر ہوگا کہ ہم ایسی حدیثوں کی خاطر سے کہ جو انسان کے ہاتھوں سے ہم کو ملی ہیں اور انسانوں کی باتوں کا اُن میں ملنا نہ صرف احتمالی امر ہے بلکہ یقینی طور پر پایا جاتا ہے قرآن کو چھوڑ دیں ۔

(الحق مباحثہ لدھیانہ ص۱۹)

واضح ہو کہ احادیث کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ حصہ جو سلسلۂ تعامل کی پناہ میں کامل طور پر آگیا ہے۔ یعنی وہ حدیثیں جن کو تعامل کے محکم اور قوی اور لاریب سلسلہ نے قوت دی ہے اور مرتبہ یقین تک پہنچا دیا ہے جس میں تمام ضروریاتِ دین اور عبادات اور عقود اور معاملات اور احکام شرع متین داخل ہیں۔ سو ایسی حدیثیں تو بلاشبہ یقین اور کامل ثبوت کی حد تک پہنچ گئے ہیں اور جو کچھ ان حدیثوں کو قوت حاصل ہے وہ قوت فنِ حدیث کے ذریعہ حاصل نہیں ہوئی اور نہ وہ احادیث منقولہ کی ذاتی قوت ہے اور نہ وہ راویوں کے وثاقت اور اعتبار کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ قوت بہ برکت وطفیل سلسلہ تعامل پیدا ہوئی ہے۔ سو میں ایسی حدیثوں کو جہاں تک اُن کو سلسلۂ تعامل سے قوت ملی ہے ایک مرتبہ یقین تک تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن دوسرا حصّہ حدیثوں کا جن کو سلسلہ تعامل سے کچھ تعلّق اور رشتہ نہیں ہے اور صرف راویوں کے سہارے سے اور اُن کی راستگوئی کے اعتبار پر قبول کی گئی ہیں ان کو میں مرتبہ ظن سے بڑھکر خیال نہیں کرتا اور غایت کار مفید ظن ہو سکتی ہیں کیونکہ جس طریق سے وہ حاصل کی گئی ہیں وہ یقینی اور قطعی الثبوت طریق نہیں ہے بلکہ بہت سی آویزش کی جگہ ہے۔

(الحق مباحثہ لدھیانہ ص۳۳)

پس ایسا ہی صاحب معترض نے کسی سے سُن لیا ہے کہ احادیث اکثر آحاد کے مرتبہ پر ہیں۔ اور اِس سے بلا توقف یہ نتیجہ پیدا کیا کہ بجز قرآن کریم کے اور جس قدر مسلّماتِ اسلام ہیں وہ سب کے سب بے بنیاد اور مشکوک ہیں جن کو یقین اور قطعیت میں سے کچھ حصّہ نہیں۔ لیکن درحقیقت یہ ایک بڑا بھاری دھوکہ ہے جس کا پہلا اثر دین اور ایمان کا تباہ ہونا ہے۔ کیونکہ اگر یہی بات سچ ہے کہ اہل اسلام کے پاس بجز قرآن کریم کے جس قدر اور منقولات ہیں وہ تمام ذخیرہ کذب اور جھوٹ اور افترا اور ظنون اور اوہام کا ہے تو پھر شائرِ اسلام میں سے کچھ تھوڑا ہی حصّہ باقی رہ جائیگا۔ وجہ یہ کہ ہمیں اپنے دین کی تمام تفصیلات احادیث نبویہ کے ذریعہ سے ملی ہیں۔ مثلاً یہ نماز جو پنجوقت ہم پڑھتے ہیں گو قرآن مجید سے اس کی فرضیت ثابت ہوتی ہے مگر یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ صبح کی دو رکعت فرض اور دو رکعت سنّت اور پھر ظہر کی چار رکعت فرض اور چار اور دو سنت اور مغرب کی تین رکعت فرض اور پھر عشاء کی چار۔ ایسا ہی زکوٰۃ کی تفاصیل معلوم کرنے کے لئے ہم بالکل احادیث کے محتاج ہیں اسی طرح ہزارہا جزئیات ہیں جو عبادات اور معاملات اور عقود وغیرہ کے متعلق ہیں اور ایسی مشہور ہیں کہ ان کا لکھنا صرف وقت ضائع کرنا اور بات کو طول دینا ہے۔ علاوہ اس کے اسلامی تاریخ کا مبدء اور منبع یہی احادیث ہی ہیں۔ اگر احادیث کے بیان پر بھروسہ نہ کیا جائے تو پھر ہمیں اِس

بات کو بھی یقینی طور پر نہیں ماننا چاہیئے کہ درحقیقت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے جنکو بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسی ترتیب سے خلافت ملی اور اسی ترتیب سے ان کی موت بھی ہوئی۔ کیونکہ اگر احادیث کے بیان پر اعتبار نہ کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان بزرگوں کے وجود کو یقینی کہہ سکیں۔ اور اس صورت میں ممکن ہوگا کہ تمام نام فرضی ہوں۔ اور دراصل نہ کوئی ابوبکر گذرا ہو نہ عمر نہ عثمان نہ علی۔ .... ایسا ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام آمنہ اور دادا کا نام عبدالمطلب ہونا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے ایک کا خدیجہ اور ایک کا نام عائشہ اور ایک کا نام حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن ہونا اور دایہ کا نام حلیمہ ہونا۔ اور غارِ حرا میں جاکر آنحضرتؐ کا عبادت کرنا اور بعض صحابہ کا حبشہ کی طرف ہجرت کرنا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا بعد بعثت دس سال تک مکہ میں رہنا اور پھر وہ تمام لڑائیاں ہونا جن کا قرآن کریم میں نام ونشان نہیں اور صرف احادیث سے یہ امور ثابت ہوتے ہیں۔ تو کیا ان تمام واقعات سے اس بنا پر انکار کر دیا جائے کہ احادیث کچھ چیز نہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر مسلمانوں کے لئے ممکن نہ ہوگا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاک سوانح میں سے کچھ بھی بیان کر سکیں۔ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے مولیٰ و آقا کی سوانح کا وہ سلسلہ کہ کیونکر قبل از بعثت مکہ میں زندگی بسر کی اور پھر کس سال دعوت نبوت کی اور کس ترتیب سے لوگ داخلِ اسلام ہوئے اور کفار نے مکہ کے دس سال میں کیں کیں قسم کی تکلیفیں پہنچائیں اور پھر کیونکر اور کس وجہ سے لڑائیاں شروع ہوئیں اور کس قدر لڑائیوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس حاضر ہوئے اور آنجنابؐ کے زمانہ زندگی تک کن کن ممالک تک حکومتِ اسلام پھیل چکی تھی۔ اور شاہانِ وقت کی طرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کے خط لکھے تھے یا نہیں اور اگر لکھے تھے تو ان کا کیا نتیجہ ہوا تھا؟ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وقت کیا کیا فتوحات اسلام ہوئیں اور کیا کیا مشکلات پیش آئیں؟ اور حضرت فاروقؓ کے زمانہ میں کن کن ممالک تک فتوحات اسلام ہوئیں۔ یہ تمام امور صرف احادیث اور اقوالِ صحابہ کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر اگر احادیث کچھ بھی چیز نہیں تو پھر اُس زمانہ کے حالات دریافت کرنا نہ صرف ایک امر مشکل بلکہ محالات میں سے ہوگا۔ اور اس صورت میں واقعاتِ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت مخالفین کو ہر یک افترا کی گنجائش ہوگی اور ہم دشمنوں کو بے جا حملہ کرنیکا بہت سا موقعہ

دینگے۔ اور ہمیں ماننا پڑے گا کہ جو کچھ ان احادیث کے ذریعہ سے واقعات اور سوانح دریافت ہوتے ہیں وہ سب ہیچ اور کالعدم ہیں۔ یہاں تک کہ صحابہ کے نام بھی یقینی طور پر ثابت نہیں۔ غرض ایسا خیال کرنا کہ احادیث کے ذریعہ سے کوئی یقینی اور قطعی صداقت ہمیں مل ہی نہیں سکتی۔ گویا اسلام کا بہت سا حصہ اپنے ہاتھ سے نابود کرنا ہے بلکہ اصل اور صحیح امر یہ ہے کہ جو کچھ احادیث کے ذریعہ سے بیان ہوا ہے جب تک صحیح اور صاف لفظوں میں قرآن اس کا معارض نہ ہو تب تک اس کو قبول کرنا لازم ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ طبعی امر انسان کے لئے راستگوئی ہے اور انسان جھوٹ کو محض کسی مجبوری کی وجہ سے اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے لئے ایک غیر طبعی ہے۔ پھر ایسی احادیث جو تعامل اعتقادی یا عملی میں آکر اسلام کے مختلف گروہوں کا ایک شعار ٹھہر گئی تھیں اُن کی قطعیت اور تواتر کی نسبت کلام کرنا تو درحقیقت جنون اور دیوانگی کا ایک شعبہ ہے۔ مثلاً آج اگر کوئی شخص یہ بحث کرے کہ یہ پنج نمازیں جو مسلمان پنجوقت ادا کرتے ہیں ان کی رکعات کی تعداد ایک شکی امر ہے۔ کیونکہ مثلاً قرآن کریم کی کسی آیت میں یہ مذکور نہیں کہ تم صبح کی دو رکعت پڑھا کرو۔ اور پھر جمعہ کی دو اور عیدین کی بھی دو دو۔ رہی احادیث تو وہ اکثر احاد ہیں جو مفید یقین نہیں۔ تو کیا ایسی بحث کرنیوالا حق پر ہوگا۔ اگر احادیث کی نسبت ایسی ہی رائیں قبول کی جائیں تو سب سے پہلے نماز ہی ہاتھ سے جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن نے تو نماز پڑھنے کا کوئی نقشہ کھینچ کر نہیں دکھلایا صرف یہ نمازیں احادیث کی صحت کے بھروسہ پر پڑھی جاتی ہیں ....

درحقیقت یہی ایک بھاری غلطی ہے جس نے اس زمانہ کے نیچریوں کو صداقتِ اسلام سے بہت ہی دُور ڈال دیا۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ گویا اسلام کی وہ تمام سُنن اور رسوم اور عبادات اور سوانح اور تواریخ جن پر حدیثوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ وہ صرف چند حدیثوں کی بنا پر ہی قائم ہیں حالانکہ یہ اُن کی فاش غلطی ہے۔ بلکہ جس تعامل کے سلسلہ کو ہمارے نبی صلعم نے اپنے ہاتھ سے قائم کیا تھا وہ ایسا کروڑہا انسانوں میں پھیل گیا تھا کہ اگر محدثین کا دنیا میں نام و نشان بھی نہ ہوتا تب بھی اس کو کچھ نقصان نہ تھا یہ بات ہر ایک کو ماننی پڑتی ہے کہ اس مقدس معلّم اور مقدس رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کی باتوں کو ایسا محدود نہیں رکھا تھا کہ صرف دو چار آدمیوں کو سکھلائی جائیں اور باقی سب اس سے بے خبر ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اسلام ایسا بگڑتا کہ کسی محدث وغیرہ کے ہاتھ سے ہرگز درست نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ ائمہ حدیث نے دینی تعلیم کی نسبت ہزارہا حدیثیں

لکھیں مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ کونسی حدیث ہے کہ جو اُن کے لکھنے سے پہلے اُس پر عمل نہ تھا اور دنیا اس مضمون سے غافل تھی۔ اگر کوئی ایسی تعلیم اور ایسا واقعہ یا ایسا عقیدہ ہے جو اس کی بنیادی اینٹ صرف ائمہ حدیث نے ہی کسی روایت کی بنا پر رکھی ہے اور تعامل کے سلسلہ میں جس کے کروڑہا افراد انسانی قائل ہوں اس کا کوئی اثر و نشان دکھائی نہیں دیتا اور نہ قرآن کریم میں اس کا کچھ ذکر پایا جاتا ہے تو بلاشبہ ایسی خبر واحد کا جس کا پتہ بھی سو ڈیڑھ سو برس کے بعد لگا یقین کے درجہ سے بہت ہی نیچے گری ہوئی ہوگی اور جو کچھ اس کی ناقابلِ تسلّی ہونے کی نسبت کہو وہ بجا ہے۔ لیکن ایسی حدیثیں درحقیقت دین اور سوانح اسلام سے کچھ بڑا تعلق نہیں رکھتیں بلکہ اگر سوچ کر دیکھو تو ائمہ حدیث نے ایسی حدیثوں کا بہت ہی کم ذکر کیا ہے جن کا تعامل کے سلسلہ میں نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ پس جیسا کہ بعض جاہل خیال کرتے ہیں کہ یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے کہ دنیا نے دین کے صدہا ضروری مسائل یہاں تک کہ صوم و صلوٰۃ بھی صرف امام بخاری اور مسلم وغیرہ کی احادیث سے سیکھے ہیں۔ کیا سو ڈیڑھ سو برس تک لوگ بے دین ہی چلے آتے تھے؟ کیا وہ لوگ نماز نہیں پڑھتے تھے؟ زکوٰۃ نہیں دیتے تھے؟ حج نہیں کرتے تھے؟ اور ان تمام اسلامی عقائد کے امور کے جو حدیثوں میں لکھے ہیں بے خبر تھے؟ حاشا و کلّا ہرگز نہیں۔

(شہادت القرآن صـ ۲-۶)

ملائکۃ اللہ

افسوس ان لوگوں کی حالت پر جو فلسفۂ باطلہ کی ظلمت سے متاثر ہو کر ملائک اور شیاطین کے وجود سے انکار کر بیٹھے ہیں اور بیّنات اور نصوص صریحہ قرآن کریم سے انکار کر دیا اور نادانی سے بھرے ہوئے الحاد کے گڑھے میں گر پڑے۔ اور اس جگہ واضح رہے کہ یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن کے اثبات کے لئے خدا تعالےٰ نے قرآن کریم کے استنباط حقائق میں اس عاجز کو متفرد کیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

(آئینہ کمالات اسلام ص ۸۹)

خدا تعالیٰ جو اپنے تنزہ اور تقدس میں ہر یک برتر سے برتر ہے اپنی تدلّیات اور تجلّیات میں مظاہر مناسبہ سے کام لیتا ہے۔ اور چونکہ جسم اور جسمانی چیزیں اپنے ذاتی خواص اور اپنی ہستی کی کامل تقیدات سے مقید ہو کر اور بمقابل ہستی اور وجود باری اپنا نام ہست اور موجود رکھا کر اور اپنے ارادوں اور اپنے طبعی افعال سے اختصاص پا کر اور ایک مستقل وجود جامع ہویتِ نفس اور مانع ہویتِ غیر بن کر ذاتِ علت العلل اور فیاض مطلق سے دُور جا پڑے ہیں اور ان کے وجود کے گرداگرد اپنی ہستی اور انانیت اور مخلوقیت کا ایک بہت ہی موٹا حجاب ہے اس لئے وہ اس لائق نہیں رہیں کہ ذات احدیت کے وہ فیضان براہ راست اُن پر نازل ہو سکیں جو صرف اس صورت میں نازل ہو سکتے ہیں کہ جب حجب مذکورہ بالا درمیان نہ ہوں اور ایک ایسی ہستی ہو جو بکلّی نیستی کے مشابہ ہو۔ کیونکہ ان تمام چیزوں کی ہستی نیستی کے مشابہ نہیں۔ ہر ایک چیز اس قسم کی مخلوقات میں سے بزبان حال اپنی ہستی کا بڑے زور شور سے اقرار کر رہی ہے۔ آفتاب کہہ رہا ہے کہ مَیں وہ ہوں جس پر تمام گرمی و سردی کا مدار ہے۔ جو تین سو پینسٹھ ۳۶۵ صورتوں میں تین سو پینسٹھ قسم کی تاثیر دنیا میں ڈالتا ہے اور اپنی شعاعوں کے مقابلہ سے گرمی اور اپنی انحرافِ شعاعوں سے سردی پیدا کرتا ہے اور اجسام اور اجسام کے مواد اور اجسام کی شکلوں اور حواس پر اپنی حکومت رکھتا ہے۔ زمین کہہ رہی ہے کہ مَیں وہ ہوں کہ جس پر ہزارہا ملک آباد ہیں اور جو طرح طرح کی نباتات پیدا کرتی اور طرح طرح کے جواہر اپنے اندر تیار کرتی اور آسمانی تاثیرات کو عورت کی طرح قبول کرتی ہے۔ آگ بزبانِ حال کہہ رہی ہے کہ مَیں ایک جلانے والی چیز ہوں

اور بالخاصیت قوتِ احراق میرے اندر ہے اور اندھیرے میں قائم مقام آفتاب ہوں۔ اِسی طرح زمین کی ہر ایک چیز بزبانِ حال اپنی ثنا کر رہی ہے۔ . . . .

غرض یہ تمام چیزیں بزبان حال اپنی اپنی تعریف کر رہی ہیں اور محجوب بانفسہا ہیں۔ یعنی اپنے خواص کے پردے میں محجوب ہیں۔ اس لئے مبدءِ فیض سے دور پڑ گئی ہیں اور بغیر ایسی چیزوں کے توسط کے جو اِن حجابوں سے منزہ ہوں مبدءِ فیض کا کوئی ارادہ اُن سے تعلق نہیں پکڑ سکتا کیونکہ حجاب اس فیض سے مانع ہے۔ اِس لئے خدا تعالیٰ کی حکمت نے تقاضا کیا کہ اُس کی ارادت کا مظہرِ اوّل بننے کے لئے ایک ایسی مخلوق ہو جو محجوب بنفسہٖ نہ ہو بلکہ اس کی ایک ایسی نرالی خلقت ہو جو برخلاف اور چیزوں کے اپنی فطرت سے ہی ایسی واقع ہو کہ نفسِ حاجب سے خالی اور خدا تعالیٰ کے لئے اس کی جوارح کی طرح ہو اور خدا تعالیٰ کے جمیع ارادت کے موافق جو مخلوق اور مخلوق کے کل عوارض سے تعلق رکھتے ہیں اس کی تعداد ہو اور وہ نرالی پیدائش کی چیزیں مرایا صافیہ کی طرح اپنی فطرت رکھ کر ہر وقت خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں اور اپنے وجود میں ذو جہتین ہوں۔ ایک جہت تجرّد اور تنزہ کی جو اپنے وجود میں وہ نہایت الطف اور منزہ عن الحجب ہوں جس کی وجہ سے وہ دوسری مخلوق سے نرالی اور خدا تعالیٰ کے وجود سے ظلّی طور پر مشابہت تامہ رکھتے ہوں اور محجوب بانفسہا نہ ہوں۔ دوسری جہت مخلوقیت کی جس کی وجہ سے وہ دوسری مخلوقات سے مناسبت رکھیں اور اپنی تاثیرات کے ساتھ اُن سے نزدیک ہو سکیں۔ سو خدا تعالیٰ کے اس ارادہ سے **اس عجیب مخلوق کا وجود ہو گیا جس کو ملائک کہتے ہیں**۔ یہ ملائک ایسے **فنا فی طاعت اللہ** ہیں کہ اپنا ارادہ اور نفیش اور توجہ اور اپنے ذاتی قویٰ یعنی یہ کہ اپنے نفس سے کسی پر مہربان ہونا یا اس سے ناراض ہو جانا اور اپنے نفس سے ایک بات کو چاہنا یا اس سے کراہت کرنا کچھ بھی نہیں رکھتے بلکہ بکلّی جوارح الحق کی طرح ہیں۔ خدا تعالیٰ کے تمام ارادے اوّل انہی کے مرایا صافیہ میں منعکس ہوتے ہیں اور پھر اُن کے توسط سے کل مخلوقات میں پھیلتے ہیں۔ چونکہ خدا تعالیٰ بوجہ اپنے تقدسِ تام کے نہایت تجرّد اور تنزہ میں ہے اس لئے وہ چیزیں جو انانیت اور ہستی محجوبہ کی کثافت سے خالی نہیں اور محجوب بانفسہا ہیں اس مبدءِ فیض سے کچھ مناسبت نہیں رکھتیں اور اس وجہ سے ایسی چیزوں کی ضرورت پڑی جو من وجہٍ خدا تعالیٰ سے مناسبت رکھتی ہوں اور من وجہٍ اس کی مخلوق سے۔ تا اس طرف سے فیضان حاصل کریں اور اس طرف پہنچا دیں۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۱۶۹ - ۱۷۰ حاشیہ)

فرشتوں کا وجود ماننے کے لئے نہایت سہل اور قریب راہ یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کی توجہ اس طرف

مبذول کریں کہ یہ بات طے شدہ اور فیصل شدہ ہے کہ ہمارے اجسام کی ظاہری تربیت اور تکمیل کے لئے اور نیز اس کام کے لئے کہ تا ہمارے ظاہری حواس کے افعال مطلوبہ کما ینبغی صادر ہو سکیں خدا تعالیٰ نے یہ قانون قدرت رکھا ہے کہ عناصر اور شمس و قمر اور تمام ستاروں کو اس خدمت میں لگا دیا ہے کہ وہ ہمارے اجسام اور قویٰ کو مدد پہنچا کر اُن سے بوجہ احسن ان کے تمام کام صادر کرا دیں۔ اور ہم ان صداقتوں کے ماننے سے کسی طرف بھاگ نہیں سکتے کہ مثلاً ہماری آنکھ اپنی ذاتی روشنی سے کسی کام کو بھی انجام نہیں دے سکتی جب تک آفتاب کی روشنی اُس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ اور ہمارے کان محض اپنی قوت شنوائی سے کچھ بھی سُن نہیں سکتے جب تک ہوا متکیّف بصورت ان کی ممد و معاون نہ ہو۔ پس کیا اس سے یہ ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ کے قانون نے ہمارے قویٰ کی تکمیل اسباب خارجیہ میں رکھی ہے اور ہماری فطرت ایسی نہیں ہے کہ اسباب خارجیہ کی مدد سے مستغنی ہو۔ اگر غور سے دیکھو تو نہ صرف ایک دو بات میں بلکہ ہم اپنے تمام حواس تمام قویٰ تمام طاقتوں کی تکمیل کے لئے خارجی امدادات کے محتاج ہیں۔ پھر جبکہ یہ قانون اور انتظام خدائے واحد لاشریک کا جس کے کاموں میں وحدت اور تناسب ہے ہمارے خارجی قویٰ اور حواس اور اغراض جسمانی کی نسبت نہایت شدت اور استحکام اور کمال التزام سے پایا جاتا ہے تو پھر کیا یہ بات ضروری اور لازمی نہیں کہ ہماری رُوحانی تکمیل اور روحانی اغراض کے لئے بھی یہی انتظام ہو۔ تا دونوں انتظام ایک ہی طرز پر واقع ہو کر صانع واحد پر دلالت کریں۔ اور خود ظاہر ہے کہ جس حکیم مطلق نے ظاہری انتظام کی یہ بنا ڈالی ہے اور اسی کو پسند کیا ہے کہ اجرام سماوی اور عناصر وغیرہ اسباب خارجیہ کے اثر سے ہمارے ظاہر اجسام اور قویٰ اور حواس کی تکمیل ہو۔ اس حکیم قادر نے ہماری روحانیت کے لئے بھی یہی انتظام پسند کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ واحد لاشریک ہے اور اس کی حکمتوں اور کاموں میں وحدت اور تناسب ہے اور دلائل انّیہ بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔ سو وہ اشیاء خارجیہ جو ہماری روحانیت پر اثر ڈال کر شمس اور قمر اور عناصر کی طرح جو اغراض جسمانی کے لئے ممد ہیں ہماری اغراض رُوحانی کو پورا کرتی ہیں انہی کا نام ہم **ملائک** رکھتے ہیں۔ پس اس تقریر سے وجود ملائک کا بوجہ احسن ثابت ہوتا ہے اور گو ہم پر اُن کی کُنہ کھل نہ سکے اور کھلنا کچھ ضرور بھی نہیں لیکن اجمالی طور پر قانون قدرت کے توافق اور اتحاد پر نظر کر کے اُن کا وجود ہمیں ماننا پڑتا ہے کیونکہ جس حالت میں ہم نے بطیب خاطر ظاہری قانون کو مان لیا ہے تو پھر کیا وجہ کہ ہم اس طرز اور طریق پر باطنی قانون کو تسلیم نہ کریں۔ بے شک ہمیں باطنی قانون بھی اسی طرح قبول کرنا پڑے گا کہ جس طرح

ہم نے ظاہری قانون کو مان لیا یہی سِرّ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں بعض جگہ ان دونوں قانونوں کو مشترک الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا۔ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا۔ یعنی ان ہواؤں کی قسم ہے جو سمندروں اور دوسرے پانیوں سے بخارات کو ایسے جُدا کرتی ہیں جو حق جُدا کرنے کا ہے۔ پھر اُن ہواؤں کی قسم ہے جو ان گراں بار بخارات کو حملدار عورتوں کی طرح اپنے اندر لے لیتی ہیں۔ پھر اُن ہواؤں کی قسم ہے جو بادلوں کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے چلتی ہیں۔ پھر اُن فرشتوں کی قسم ہے جو در پردہ ان تمام امور کے منصرف اور انجام دہ ہیں۔ یعنی ہوائیں کیا چیز ہیں اور کیا حقیقت رکھتی ہیں جو خود بخود بخارات کو سمندروں میں سے اٹھاویں اور بادلوں کی صورت بنا دیں اور عین محل ضرورت پر جا کر برسا دیں۔ اور مقسّم امور نہیں یہ تو در پردہ ملائک کا کام ہے۔ سو خدا تعالیٰ نے ان آیات میں اوّل حکماء ظاہر کے طور پر بادلوں کے برسنے کا سبب بتلایا اور بیان فرمایا کہ کیونکر پانی بخار ہو کر بادل اور ابر ہو جاتا ہے اور پھر آخری فقرہ میں یعنی فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا میں حقیقت کو کھول دیا اور ظاہر کر دیا کہ کوئی ظاہر بین یہ خیال نہ کرے کہ صرف جسمانی علل اور معلولات کا سلسلہ نظام ربّانی کے لئے کافی ہے بلکہ ایک اور سلسلہ علل روحانیہ کا اس جسمانی سلسلہ کے نیچے ہے جس کے سہارے سے یہ ظاہری سلسلہ جاری ہے۔ اور پھر ایک دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا۔ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا۔ وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا۔ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا۔ فَالْمُلْقِیٰتِ ذِکْرًا۔ یعنی قسم ہے اُن ہواؤں کی اور اُن فرشتوں کی جو نرمی سے چھوڑے گئے ہیں اور قسم ہے اُن ہواؤں کی اور اُن فرشتوں کی جو زور اور شدت کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور قسم ہے ان ہواؤں کی جو بادلوں کو اٹھاتی ہیں اور اُن فرشتوں کی جو ان بادلوں پر موکّل ہیں۔ اور قسم ہے اُن ہواؤں کی جو ہر یک چیز کو جو معرض ذکر میں آ جائے کانوں تک پہنچاتی ہیں۔ اور قسم ہے اُن فرشتوں کی جو الٰہی کلام کو دلوں تک پہنچاتے ہیں۔ اِس طرح اللہ تعالےٰ نے آیت فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا میں فرشتوں اور ستاروں کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے۔ یعنی اس آیت میں کواکب سبعہ کو ظاہری طور پر مدبّر ما فی الارض ٹھہرایا ہے اور ملائک کو باطنی طور پر ان چیزوں کا مدبّر قرار دیا ہے۔ چنانچہ تفسیر فتح البیان میں معاذ بن جبل اور قشیری سے یہ دونوں روائتیں موجود ہیں۔ اور ابن کثیر نے حسن سے یہ روایت ملائک کی نسبت کی ہے کہ تدبّر الامر من السماء الی الارض یعنی آسمان سے زمین تک جس قدر امور کی تدبیر ہوتی ہے وہ سب ملائک کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اور ابن کثیر لکھتا ہے کہ یہ متفق علیہ

قول ہے کہ مدبّراتِ امر ملائک ہیں - اور ابن جریر نے بھی آیات فالمدبّرات امرًا کے نیچے یہ شرح کی ہے کہ اس سے مراد ملائک ہیں جو مدبّر عالم ہیں - یعنی گو بظاہر نجوم اور شمس و قمر و عناصر وغیرہ اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں مگر درحقیقت مدبّر ملائک ہی ہیں -

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۱۳۳-۱۳۷ حاشیہ)

جہاں تک ہم نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور جس قدر ہم اپنے فکر اور ذہن اور سوچ سے کام لیتے ہیں صریح اور صاف اور بدیہی طور پر ہمیں نظر آتا ہے کہ ہر یک فیضان کے لئے ہم میں اور ہمارے خداوند کریم میں عللِ متوسطہ ہیں جن کے توسط سے ہر یک قوّت اپنی حاجت کے موافق فیضان پاتی ہے - پس اسی دلیل سے ملائک اور جنّات کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے - کیونکہ ہم نے صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ خیر اور شر کے اکتساب میں صرف ہمارے ہی قُویٰ کافی نہیں بلکہ خارجی ممدّات اور معاونات کی ضرورت ہے جو خارق عادت اثر رکھتے ہیں - مگر وہ ممدّ اور معاون خدا تعالےٰ براہِ راست اور بلا توسط نہیں بلکہ بتوسط بعض اسباب ہے - سو قانون قدرت کے ملاحظہ نے قطعی اور یقینی طور پر ہم پر کھول دیا کہ وہ ممدّات اور معاونات خارج میں موجود ہیں - گو اُن کی کُنہ اور کیفیت ہم کو معلوم ہو یا نہ ہو مگر یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ نہ براہِ راست خدا تعالےٰ ہے اور نہ ہماری ہی قوتیں اور ہمارے ہی ملکے ہیں - بلکہ وہ ان دونوں قسموں سے الگ ایسی مخلوق چیزیں ہیں جو ایک مستقل وجود اپنا رکھتی ہیں - اور جب ہم ان میں سے کسی کا نام داعی الخیر رکھیں گے تو اُسی کو ہم رُوح القدس یا جبرائیل کہیں گے اور جب ہم اُن میں سے کسی کا نام داعی الشر رکھیں گے تو اُسی کو ہم شیطان اور ابلیس کے نام سے بھی موسوم کریں گے - یہ تو ضرور نہیں کہ ہم رُوح القدس یا شیطان ہر یک تاریک دل کو دکھلا دیں اگرچہ عارف اُن کو دیکھ بھی لیتے ہیں اور کشفی مشاہدات سے وہ دونوں نظر بھی آجاتی ہیں -

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۸۶-۹۸)

خدا آپ لوگوں کو ہدایت دے قرآن شریف میں کہیں نہیں لکھا کہ خدا متغیّر ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ انسان متغیر ہے - اِسی لئے اس کے مناسب حال خدا اس کے لئے تبدیلیاں کرتا ہے - جب بچّہ پیٹ میں ہوتا ہے تو صرف اُس کو خون سے غذا ملتی ہے اور جب پیدا ہوتا ہے تو ایک مدت تک صرف دودھ پیتا ہے اور پھر بعد اس کے اناج کھاتا ہے اور خدا تعالیٰ تینوں سامان اس کے لئے وقتًا فوقتًا پیدا کر دیتا ہے - پیٹ میں ہونے کی حالت میں پیٹ کے فرشتوں کو

جو اندرونی ذرّات ہیں حکم کر دیتا ہے کہ اُس کی غذا کے لئے خون بناویں۔ اور پھر جب بچّہ ہوتا ہے تو اس حکم کو منسوخ کر دیتا ہے۔ تو پھر پستان کے فرشتوں کو جو اس کے ذرات ہیں حکم کرتا ہے کہ اُس کیلئے دودھ بناویں۔ اور جب وہ دودھ سے پرورش پا چکتا ہے تو اس حکم کو بھی منسوخ کر دیتا ہے تو پھر زمین کے فرشتوں کو جو اس کے ذرات ہیں حکم کرتا ہے کہ اُس کے لئے آخیر مدّت تک اناج اور پانی پیدا کرتے رہیں۔ پس ہم مانتے ہیں کہ ایسے تغیّر خدا کے احکام میں ہیں......
...... خدا نے تو قرآن شریف میں ہمیں یہ سکھلایا ہے کہ یہ طبعی سلسلہ خود بخود نہیں بلکہ ان چیزوں کے تمام ذرّات خدا کی آواز سُنتے ہیں اور اُس کے فرشتے ہیں یعنی اس کی طرف سے ایک کام کے لئے مقرر شدہ ہیں۔ پس وہ کام اُس کی مرضی کے موافق وہ کرتے رہتے ہیں۔ سونے کے ذرّات سونا بناتے رہتے ہیں اور چاندی کے ذرات چاندی بناتے رہتے ہیں اور موتی کے ذرات موتی بناتے ہیں اور انسانی وجود کے ذرات ماؤں کے پیٹ میں انسانی بچہ تیار کرتے ہیں۔ اور یہ ذرات خود بخود کچھ بھی کام نہیں کرتے بلکہ خدا کی آواز سنتے ہیں اور اس کی مرضی کے موافق کام کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اس کے فرشتے کہلاتے ہیں۔ اور کئی قسم کے فرشتے ہوتے ہیں۔ یہ تو زمین کے فرشتے ہیں۔ مگر آسمان کے فرشتے آسمان سے اپنا اثر ڈالتے ہیں جیسا کہ سورج کی گرمی بھی خدا کا ایک فرشتہ ہے جو پھلوں کو پکانا اور دوسرے کا کام کرتا ہے اور ہوائیں بھی خدا کے فرشتے ہیں جو بادلوں کو اکٹھے کرتے اور کھیتوں کو مختلف اثر اپنے پہنچاتے ہیں۔ اور پھر ان کے اوپر اور بھی فرشتے ہیں جو اُن میں تاثیر ڈالتے ہیں۔ علوم طبعی اس بات کے گواہ ہیں کہ فرشتوں کا وجود ضروری ہے اور ان فرشتوں کو ہم بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔

(نسیم دعوت صـ ۹۴-۹۵)

قرآن شریف میں تین قسم کے فرشتے لکھے ہیں:—

(۱) ذرات اجسام ارضی اور رُوحوں کی قوتیں۔

(۲) اکاش۔ سورج۔ چاند۔ زمین کی قوتیں جو کام کر رہی ہیں۔

(۳) ان سب پر اعلیٰ طاقتیں جو جبرائیل و میکائیل و عزرائیل وغیرہ نام رکھتی ہیں جن کو وید میں جم لکھا ہے.......... اور فرشتہ کا لفظ قرآن شریف میں عام ہے۔ ہر ایک چیز جو اس کی آواز سنتی ہے وہ اس کا فرشتہ ہے۔ پس دنیا کا ذرّہ ذرّہ خدا کا فرشتہ ہے کیونکہ وہ اُس کی آواز سنتے ہیں اور اُس کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔

(نسیم دعوت صـ ۸۹-۹۰)

محققین اہل اسلام ہرگز اس بات کے قائل نہیں کہ ملائک اپنے شخصی وجود کے ساتھ انسانوں کی طرح پیروں پر چل کر زمین پر اترتے ہیں۔ اور یہ خیال بداہت باطل بھی ہے کیونکہ اگر یہی ضرور ہوتا کہ ملائک اپنی اپنی خدمات کی بجا آوری کے لئے اپنے اصل وجود کے ساتھ زمین پر اُترا کرتے تو پھر اُن سے کوئی کام انجام پذیر ہونا بغایت درجہ محال تھا۔ مثلاً فرشتہ ملک الموت جو ایک سیکنڈ میں ہزارہا ایسے لوگوں کی جانیں نکالتا ہے جو مختلف بلاد و امصار میں ایک دوسرے سے ہزاروں کوسوں کے فاصلہ پر رہتے ہیں اگر ہریک کے لئے اس بات کا محتاج ہو کہ اول پیروں پر چل کر اس ملک اور شہر اور گھر میں جاوے اور پھر اتنی مشقت کے بعد جان نکالنے کا اس کو موقع ملے تو ایک سیکنڈ کیا اتنی بڑی کارگذاری کے لئے تو کئی مہینے کی مہلت بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص انسانوں کی طرح حرکت کر کے ایک طرفۃ العین کے یا اس سے کم عرصہ میں تمام جہان گھوم کر چلا آوے ہرگز نہیں۔ بلکہ فرشتے اپنے اصلی مقامات سے جو اُن کے لئے خدائے تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں ایک ذرہ کے برابر بھی آگے پیچھے نہیں ہوتے جیسا کہ خدائے تعالیٰ ان کی طرف سے قرآن شریف میں فرماتا ہے وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ (سورۃ صافات جزو ۲۳) پس اصل بات یہ ہے کہ جس طرح آفتاب اپنے مقام پر ہے اور اُس کی گرمی اور روشنی زمین پر پھیل کر اپنے خواص کے موافق زمین کی ہر ایک چیز کو فائدہ پہنچاتی ہے اسی طرح روحانیاتِ سماویہ خواہ ان کو یونانیوں کے خیال کے موافق نفوسِ فلکیہ کہیں یا دساتیر اور وید کی اصطلاحات کے موافق ارواح کواکب سے ان کو نامزد کریں یا نہایت سیدھے اور موحدانہ طریق سے ملائك اللہ کا ان کو لقب دیں درحقیقت یہ عجیب مخلوقات اپنے اپنے مقام میں مستقر اور قرار گیر ہے اور بحکمت کاملہ خداوند تعالےٰ زمین کی ہریک مستعد چیز کو اپنی کے کمال مطلوب تک پہنچانے کے لئے یہ روحانیات خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ ظاہری خدمات بھی بجا لاتے ہیں اور باطنی بھی۔ جیسے ہمارے اجسام اور ہماری تمام ظاہری قوتوں پر آفتاب اور ماہتاب اور دیگر سیاروں کا اثر ہے۔ ایسا ہی ہمارے دل اور دماغ اور ہماری تمام روحانی قوتوں پر یہ سب ملائک ہماری مختلف استعدادوں کے موافق اپنا اپنا اثر ڈال رہے ہیں۔ جو چیز کسی عمدہ جوہر بننے کی اپنے اندر قابلیت رکھتی ہے وہ اگرچہ خاک کا ایک ٹکڑا ہے یا پانی کا وہ قطرہ جو صدف میں داخل ہوتا ہے۔ یا پانی کا وہ قطرہ جو رحم میں پڑتا ہے وہ ان ملائک اللہ کی روحانی تربیت سے لعل اور الماس اور یاقوت اور نیلم وغیرہ یا نہایت درجہ کا

آبدار اور وزنی موتی یا اعلیٰ درجہ کے دل اور دماغ کا انسان بن جاتا ہے ....

قرآن شریف نے جس طرز سے ملائک کا حال بیان کیا ہے وہ نہایت سیدھی اور قرین قیاس راہ ہے اور بجز اس کے ماننے کے انسان کو کچھ بن نہیں پڑتا ۔ قرآن شریف پر بدیدۂ تعمق غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان بلکہ جمیع کائنات الارض کی تربیت ظاہری و باطنی کے لئے بعض وسائط کا ہونا ضروری ہے ۔ اور بعض بعض اشارات قرآنیہ سے نہایت صفائی سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض وہ نفوس طیبہ جو ملائک سے موسوم ہیں ان کے تعلقات طبقات سماویہ سے الگ الگ ہیں ۔ بعض اپنی تاثیرات خاصہ سے ہوا کے چلانے والے اور بعض مینہ کے برسانے والے اور بعض بعض اور تاثیرات کو زمین پر اتارنے والے ہیں ۔ پس اس میں کچھ شک نہیں کہ بوجہ مناسبت نوری وہ نفوس طیبہ ان روشن اور نورانی ستاروں سے تعلق رکھتے ہونگے کہ جو آسمان میں پائے جاتے ہیں ۔ مگر اس تعلق کو ایسا نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جیسے زمین کا ہر یک جاندار اپنے اندر جان رکھتا ہے بلکہ اُن نفوس طیبہ کو بوجہ مناسبت اپنی نورانیت اور روشنی کے جو روحانی طور پر انہیں حاصل ہے روشن ستاروں کے ساتھ ایک مجہول الکنہ تعلق ہے اور ایسا شدید تعلق ہے کہ اگر ان نفوس طیبہ کا اُن ستاروں سے الگ ہونا فرض کر لیا جائے تو پھر اُن کے تمام قویٰ میں فرق پڑ جائیگا ۔ انہیں نفوس کے پوشیدہ ہاتھ کے زور سے تمام ستارے اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں ۔ اور جیسے خدائے تعالیٰ تمام عالم کے لئے بطور جان کے ہے ایسا ہی (مگر اسجگہ تشبیہ کامل مراد نہیں) وہ نفوس نورانیہ کواکب اور سیارات کیلئے جان کا ہی حکم رکھتے ہیں ۔ اور ان کے جُدا ہو جانے سے ان کی حالت وجودیہ میں بکلّی فساد راہ پا جانا لازمی و ضروری امر ہے ۔ اور آجتک کسی نے اس امر میں اختلاف نہیں کیا کہ جس قدر آسمانوں میں سیّارات اور کواکب پائے جاتے ہیں وہ کائنات الارض کی تربیت و تکمیل کے لئے ہمیشہ کام میں مشغول ہیں ۔ غرض یہ نہایت سچی ہوئی اور ثبوت کے چرخ پر چڑھی ہوئی صداقت ہے کہ تمام نباتات اور جمادات اور حیوانات پر آسمانی کواکب کا دن رات اثر پڑ رہا ہے اور جاہل سے جاہل ایک دہقان بھی اس قدر تو ضرور یقین رکھتا ہو گا کہ چاند کی روشنی پھلوں کے موٹا کرنے کے لئے اور سورج کی دھوپ ان کو پکانے اور شیریں کرنے کے لئے اور بعض ہوائیں بکثرت پھل آنے کے لئے بلاشبہ مؤثر ہیں ۔ اب جبکہ ظاہری سلسلہ کائنات کا ان چیزوں کی تاثیرات مختلفہ سے تربیت پا رہا ہے تو اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ باطنی سلسلہ پر بھی باذنہٖ تعالیٰ وہ نفوس نورانیہ اثر کر رہی ہیں جن کا اجرام نورانیہ سے ایسا شدید تعلق ہے کہ جیسے جان کو جسم سے ہوتا ہے ۔

اب اِس کے بعد یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اگرچہ بظاہر یہ بات نہایت دور از ادب معلوم ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ اور اُس کے مقدس نبیوں میں افاضہ انوار وحی کے لیئے کوئی اور واسطہ تجویز کیا جائے لیکن ذرا غور کرنے سے بخوبی سمجھ آجائیگا کہ اس میں کوئی سوءِ ادب کی بات نہیں بلکہ سراسر خدا تعالےٰ کے اس عام قانون کے مطابق ہے جو دنیا کی ہر یک چیز کے متعلق کھلے کھلے طور پر مشہود و محسوس ہو رہا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بھی اپنے ظاہری جسم اور ظاہری قویٰ کے لحاظ سے انہی وسائط کے محتاج ہیں۔ اور نبی کی آنکھ بھی گو کیسی ہی نورانی اور بابرکت آنکھ ہے مگر پھر بھی عوام کی آنکھوں کی طرح آفتاب یا اس کے کسی دوسرے قائم مقام کے بغیر کچھ دیکھ نہیں سکتے۔ اور بغیر توسط ہوا کے کچھ سُن نہیں سکتے لہذا یہ بات بھی ضروری طور پر ماننی پڑتی ہے کہ نبی کی روحانیت پر بھی اِن سیّارات کے نفوسِ نورانیہ کا ضرور اثر پڑتا ہوگا۔ بلکہ سب سے زیادہ اثر پڑتا ہوگا کیونکہ جس قدر استعداد صافی اور کامل ہوتی ہے اسی قدر اثر بھی صافی اور کامل طور پر پڑتا ہے۔ قرآن شریف سے ثابت ہے کہ یہ سیارات اور کواکب اپنے اپنے قالبوں کے متعلق ایک ایک رُوح رکھتے ہیں جن کو نفوس کواکب سے بھی نامزد کر سکتے ہیں۔ اور جیسے کواکب اور سیاروں میں باعتبار ان کے قالبوں کے طرح طرح کے خواص پائے جاتے ہیں جو زمین کی ہر ایک چیز پر حسب استعداد اثر ڈال رہے ہیں ایسا ہی اُن کے نفوس نورانیہ میں بھی انواع اقسام کے خواص ہیں۔ جو باذنِ حکیم مطلق کائنات الارض کے باطن پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ اور یہی نفوسِ نورانیہ کامل بندوں پر بشکل جسمانی متشکل ہو کر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور بشری صورت سے متمثل ہو کر دکھائی دیتے ہیں اور یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تقریر از قبیل خطابیات نہیں بلکہ یہ وہ صداقت ہے جو طالب حق اور حکمت کو ضرور ماننی پڑے گی۔

(توضیح مرام صـــ ۱۸-۲۴)

واضح رہے کہ فرشتوں کے نزول سے بھی ہمیں انکار نہیں۔ اگر کوئی ثابت کر دے کہ فرشتوں کا نزول اسی طرح ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود کو آسمان سے خالی کر دیں تو ہم بشوق اس ثبوت کو سنینگے۔ اور اگر درحقیقت ثبوت ہوگا تو ہم اس کو قبول کر لیں گے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے فرشتوں کا وجود ایمانیات میں داخل ہے۔ خدا تعالیٰ کا نزول سماء الدنیا کی طرف اور فرشتوں کا نزول دونوں ایسی حقیقتیں ہیں جو ہم سمجھ نہیں سکتے۔ ہاں کتاب اللہ سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ خلق جدید کے طور پر زمین پر فرشتوں کا ظہور ہو جاتا ہے۔ دحیہ کلبی کی شکل میں جبرائیل کا ظاہر ہونا خلق جدید تھا یا کچھ اور تھا۔ پھر کیا یہ ضرور ہے کہ پہلی خلق کو نابود کریں۔ پھر خلق جدید کے قائل ہوں۔ بلکہ پہلا خلق

بجائے خود آسمان پر ثابت اور قائم ہے اور دوسرا خلق خدا تعالیٰ کی وسیع قدرت کا ایک نتیجہ ہے کیا خدا تعالیٰ کی قدرت سے بعید ہے کہ ایک وجود دو جگہ دو جسموں سے دکھا دے۔ حاشا وکلّا ہرگز نہیں اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

(سرّالخلافہ ص ۱۰۰-۱۰۱)

واعتقد أن للہ ملائکتہ مقربین۔ لکلّ واحدٍ منہم مقام معلوم لا ینزل احدٌ من مقامہٖ ولا یرقٰی ونزولہم الذی قد جاء فی القرآن لیس کنزول الانسان من الاعلیٰ الی الاسفل ولا صعودہم کصعود الناس من الاسفل الی الاعلیٰ۔ لان فی نزول الانسان تحول من المکان وراحتہٗ من شق الانفس واللغوب ولا یمسہم لغب ولا شق ولا یتطرق الیہم تغیر فلا تقیسوا نزولہم وصعودہم باشیاءٍ اخریٰ بل نزولہم وصعودہم بصبغ نزول اللّٰہ وصعودہ من العرش الی سماء الدنیا۔ لان اللّٰہ ادخل وجودہم فی الایمانیات۔ وقال لا یعلم جنود ربّک الّا ھو۔ فآمنوا بنزولہم وصعودہم ولا تدخلوا فی کنہہا۔ ذالک خیر واقرب للتقوٰی۔ وقد وصفہم اللّٰہ بالقآئمین والساجدین والصافّین والمسبّحین والثابتین فی مقامات معلومۃ وجعل ھٰذہ الصفات لہم دائمۃ غیرُ منفکۃ وخصہم بہا۔ فکیف یجوز ان یترک الملائکۃ سجودہم وقیامہم ویقصروا صفوفہم ویذروا تسبیحہم وتقدیسہم وینزلوا من مقاماتہم ویہبطوا الارض ویخلوا السمٰوٰت العلی بل ھم یتحرکون حال کونہم مستقرین فی مقاماتہم کالملک الذی علی العرش استوٰی۔ وتعلمون ان اللّٰہ ینزل الی السماء فی اٰخر کل لیل ولا یقال أنہ یترک العرش ثم یصعد الیہ فی اوقات اخریٰ فکذالک الملائکۃ الذین کانوا فی صبغۃ صفات ربہم کمثل انصباغ الظل بصبغۃ اصلہ لا نعرف حقیقتہا ونؤمن بہا۔ کیف نشبہ احوالہم باحوال انسانٍ نعرف حقیقۃ صفاتہ وحدود خواصہٖ وسکناتہ وحرکاتہ وقد منعنا اللّٰہ من ھٰذا وقال لا یعلم جنود ربک الّا ھو فاتقوا اللّٰہ یا ارباب النہٰی ۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۳۸۲-۳۸۷)

اب جبکہ خدا تعالیٰ کے قانون قدرت کے رو سے یہ بات نہایت صفائی سے ثابت ہو گئی کہ نظام روحانی کے لئے بھی نظام ظاہری کی طرح مؤثرات خارجیہ ہیں جن کا نام کلام الٰہی میں ملائک رکھا ہے

تو اس بات کا ثابت کرنا باقی رہا کہ نظام ظاہری میں بھی جو کچھ ہو رہا ہے ان تمام افعال اور تغیرات کا بھی انجام اور انصرام بغیر فرشتوں کی شمولیت کے نہیں ہوتا۔ سو منقولی طور پر اس کا ثبوت ظاہر ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کا نام مدبّرات اور مقسّمات امر رکھا ہے۔ اور ہر یک عرض اور جوہر کے حدوث اور قیام کا وہی موجب ہیں۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کے عرش کو بھی وہی اٹھائے ہوئے ہیں۔ جیساکہ آیت اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ سے کلّی طور پر فرشتوں کا تقرر ہر یک چیز پر ثابت ہوتا ہے۔ اور نیز قرآن کریم کی آیت مندرجہ ذیل بھی اس پر دلالت کرتی ہے اور وہ یہ ہے۔ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ۔ یعنی جب قیامت واقع ہوگی تو آسمان پھٹ جائے گا اور ڈھیلا اور سُست ہو جائیگا اور اس کی قوتیں جاتی رہیں گی۔ کیونکہ فرشتے جو آسمان اور آسمانی اجرام کے لئے جان کی طرح تھے وہ سب تعلقات کو چھوڑ کر کناروں پر چلے جائینگے اور اس دن خدا تعالیٰ کے عرش کو آٹھ فرشتے اپنے سر پر اور کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہونگے۔ اس آیت کی تفسیر میں شاہ عبد العزیز صاحب لکھتے ہیں کہ درحقیقت آسمان کی بقا باعث ارواح کے ہے یعنی ملائک کے جو آسمان اور آسمانی اجرام کے لئے بطور روحوں کے ہیں۔ اور جیسے رُوح بدن کی محافظ ہوتی ہے اور بدن پر تصرف رکھتی ہے اسی طرح بعض ملائک آسمان اور آسمانی اجرام پر تصرف رکھتے ہیں اور تمام اجرام سماوی اُن کے ساتھ ہی زندہ ہیں اور انہی کے ذریعہ سے صدور افعالِ کواکب ہے۔ پھر جب وہ ملائک جان کی طرح اس قالب سے نکل جائینگے تو آسمان کا نظام اُن کے نکلنے سے درہم برہم ہو جائیگا جیسے جان کے نکل جانے سے قالب کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک اور آیت قرآن کریم کی بھی اِسی مضمون پر دلالت کرتی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (سورۃ الملک الجزو نمبر ۲۹) یعنی ہم نے سماء الدنیا کو ستاروں کے ساتھ زینت دی ہے اور ستاروں کو ہم نے رجم شیاطین کے لئے ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ اور پہلے اس سے نصّ قرآنی سے ثابت ہو چکا ہے کہ آسمان سے زمین تک ہر یک امر کے مقسّم اور مدبّر فرشتے ہیں اور اب یہ قول اللہ جلّ شانہٗ کا کہ شہب ثاقبہ کو چلانے والے وہ ستارے ہیں جو سماء الدنیا میں ہیں بظاہر منافی اور مبائن ان آیات سے دکھائی دیتا ہے جو فرشتوں کے بارہ میں آئی ہیں لیکن اگر بنظر غور دیکھا جائے تو کچھ منافی نہیں کیونکہ ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم سے یہی ثابت ہے کہ فرشتے آسمان اور آسمانی اجرام کے لئے بطور جان کے ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی شے کی جان

اس شئے سے جُدا نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کے بعض مقامات میں رمیِ شُہُب کا فاعل فرشتوں کو ٹھہرایا۔ اور بعض دوسرے مقامات میں اس رمی کا فاعل ستاروں کو ٹھہرایا کیونکہ فرشتے ستاروں میں اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ جان بدن میں اپنا اثر ڈالتی ہے۔ تب وہ اثر ستاروں سے نکل کر ان ارضی بخارات پر پڑتا ہے جو شہاب بننے کے لائق ہوتے ہیں تو وہ فی الفور قدرت خدا تعالیٰ سے مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اور فرشتے ایک دوسرے رنگ میں شہب ثاقبہ سے تعلق پکڑ کر اپنے نور کے ساتھ یمین اور یسار کی طرف ان کو چلاتے ہیں۔ اور اس بات میں تو کسی فلسفی کو تو کلام نہیں کہ جو کچھ کائنات الجوّ یا زمین میں ہوتا ہے علل ابتدائیہ ان کے نجوم اور تاثیرات سماوی ہی ہوتی ہیں۔ ہاں اس دوسرے دقیق بھید کو ہر یک شخص نہیں سمجھ سکتا کہ نجوم کے قویٰ فرشتوں سے فیضیاب ہیں۔ اس بھید کو اوّل قرآن کریم نے ظاہر فرمایا اور پھر عارفوں کو اس طرف توجہ پیدا ہوئی۔

(آئینہ کمالات اسلام حاشیہ ص ۱۳۷-۱۴۳)

ہریک چیز جس پر نفس کا نام اطلاق پا سکتا ہے اس کی فرشتے حفاظت کرتے ہیں۔ پس بموجب اس آیت کے نفوس کواکب کی نسبت بھی یہ عقیدہ رکھنا پڑا کہ کل ستارے کیا سورج کیا چاند کیا زحل کیا مشتری ملائک کی زیر حفاظت ہیں۔ یعنی ہر یک کے لئے سورج اور چاند وغیرہ میں سے ایک ایک فرشتہ مقرر ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے کاموں کو احسن طور پر چلاتا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۷۷ حاشیہ)

اگرچہ ملائک جسمانی آفات سے بھی بچاتے ہیں لیکن اُن کا بچانا روحانی طور پر ہی ہے۔ مثلاً ایک شخص ایک گرنے والی دیوار کے نیچے کھڑا ہے تو یہ تو نہیں کہ فرشتہ اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر اُس کو دُور لے جائیگا بلکہ اگر اس شخص کا اس دیوار سے بچنا مقدر ہے تو فرشتہ اس کے دل میں الہام کر دے گا۔ کہ یہاں سے جلد کھسکنا چاہیئے لیکن ستاروں اور عناصر وغیرہ کی حفاظت جسمانی ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۹۹ حاشیہ نوٹ)

قادر مطلق نے دنیا کے حوادث کو صرف ایسی ظاہری سلسلہ تک محصور اور محدود نہیں کیا بلکہ ایک باطنی سلسلہ ساتھ ساتھ جاری ہے۔ اگر آفتاب ہے یا ماہتاب یا زمین یا وہ بخارات جن سے پانی برستا ہے یا وہ آندھیاں جو زور سے آتی ہیں یا وہ اولے جو زمین پر گرتے ہیں یا وہ شہب ثاقبہ جو ٹوٹتے ہیں اگرچہ یہ تمام چیزیں اپنے کاموں اور تمام تغیّرات اور تحوّلات اور حدوثات میں ظاہری اسباب بھی رکھتی ہیں جن کے بیان میں ہیئت اور طبعی کے دفتر بھرے پڑے ہیں لیکن بایں ہمہ عارف لوگ

جانتے ہیں کہ ان اسباب کے نیچے اور اسباب بھی ہیں۔ جو مدبّر بالارادہ ہیں جن کا دوسرے لفظوں میں نام ملائک ہے۔ وہ جس چیز سے تعلّق رکھتے ہیں اس کے تمام کاروبار کو انجام تک پہنچاتے ہیں اور اپنے کاموں میں اکثر اُن رُوحانی اغراض کو مدّنظر رکھتے ہیں جو مولیٰ کریم نے انکو سپرد کی ہیں اور اُن کے کام بے ہودہ نہیں بلکہ ہر ایک کام میں بڑے بڑے مقاصد انکو مدّنظر رہتے ہیں۔

اب جبکہ یہ بات ایک ثابت شدہ صداقت ہے کہ جس کو ہم اس سے پہلے بھی کسی قدر تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور ہمارے رسالہ **توضیح مرام** میں بھی یہ تمام بحث نہایت لطافتِ بیان سے مندرج ہے کہ حکیم مطلق نے اس عالم کے احسن طور پر کاروبار کے چلانے کے لئے دو نظام رکھے ہوئے ہیں اور باطنی نظام فرشتوں کے متعلق ہے اور کوئی جُز ظاہری نظام کی ایسی نہیں جس کے ساتھ درپردہ باطنی نظام نہ ہو تو اس صورت میں ایک مسترشد بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ شہب ثاقبہ کے تساقط کا ظاہری نظام جن علل اور اسباب پر مبنی ہے وہ علل اور اسباب رُوحانی نظام کے کچھ مزاحم اور سدّراہ نہیں اور روحانی نظام یہ ہے کہ ہر یک شہاب جو ٹوٹتا ہے دراصل اُس پر ایک **فرشتہ موکّل** ہوتا ہے جو اس کو جس طرف چاہتا ہے حرکت دیتا ہے۔ چنانچہ شہب کی طرز حرکات ہی اس پر شاہد ہے۔ اور یہ بات صاف ظاہر ہے کہ فرشتہ کا کام عبث نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحت میں ضرور کوئی نہ کوئی غرض ہوگی جو مصالح دین اور دنیا کے لئے مفید ہو لیکن ملائک کے کاموں کے اغراض کو سمجھنا بجز توسط ملائک ممکن نہیں۔ سو بتوسط ملائک یعنی جبرائیل علیہ السلام آخر الرسل صلے اللہ علیہ وسلم پر یہی ظاہر ہوا کہ ملائک کے اس فعل رمی شہب سے علّت غائی رجم شیاطین ہے

اور یہ بھید کہ شہب کے ٹوٹنے سے کیونکر شیاطین بھاگ جاتے ہیں اس کا سرّ روحانی سلسلہ پر نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین اور ملائک کی عداوت ذاتی ہے۔ پس ملائک ان شہب کے چھوڑنے کے وقت جن پر وہ ستاروں کی حرارت کا اثر بھی ڈالتے ہیں اپنی ایک نورانی طاقت جوّ میں پھیلاتے ہیں اور ہر یک شہاب جو حرکت کرتا ہے وہ اپنے ساتھ ایک ملکی نور رکھتا ہے کیونکہ فرشتوں کے ہاتھ سے برکت پاکر آتا ہے۔ اور شیطان سوزی کا اس میں ایک مادّہ ہوتا ہے پس یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ جنّات تو آگ سے مخلوق ہیں وہ آگ سے کیا ضرر اٹھائیں گے کیونکہ درحقیقت جسقدر رمی شہب سے جنات کو ضرر پہنچتا ہے اس کا یہ ظاہری موجب آگ نہیں بلکہ وہ روشنی موجب ہے جو فرشتہ کے نور سے شہب کے ساتھ شامل ہوتی ہے جو بالخاصیت محرق شیاطین ہے۔

جب تک کوئی انسان پابند اعتقاد وجود ہستی باری ہے اور دہریہ نہیں اُسکو ضرور یہ بات ماننی پڑیگی کہ یہ تمام کاروبار عبث نہیں بلکہ ہریک حدوث اور ظہور پر خدا تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت بالارادہ کا ہاتھ ہے اور وہ ارادہ تمام انتظام کے موافق بتوسط اسباب ظہور پذیر ہوتا ہے چونکہ خدا تعالیٰ نے اجرام اور اجسام کو علم اور شعور نہیں دیا اس لئے ان باتوں کے پورا کرنے کے لئے جن میں علم اور شعور درکار ہے ایسے اسباب یعنی ایسی چیزوں کے توسط کی حاجت ہوئی جن کو علم اور شعور دیا گیا ہے اور وہ ملائک ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جب ملائک کی یہی شان ہے کہ وہ عبث اور بے ہودہ طور پر کوئی کام نہیں کرتے بلکہ اپنی تمام خدمات میں اغراض اور مقاصد رکھتے ہیں اس لئے اُن کی نسبت یہ بات ضروری طور پر ماننی پڑیگی کہ رجم کی خدمت میں بھی ان کا کوئی اصل مقصد ہے اور چونکہ عقل اس بات کے درک سے قاصر ہے کہ وہ کونسا مقصد ہے اس لئے اس عقدہ کے حل کے لئے عقل سے سوال کرنا بے محل سوال ہے . . . . پس وہ بوجہ اس کے کہ ادراک تفصیلی سے عاجز ہے اس تفصیل کے لئے کسی اَور ذریعہ کی محتاج ہوگی جو حدود عقل سے بڑھ کر ہے اور وہ ذریعہ وحی اور الہام ہے جو اس غرض سے انسان کو دیا گیا ہے تا انسان کو ان معارف اور حقائق تک پہنچا دے کہ جن تک مجرّد عقل پہنچ نہیں سکتی اور وہ اسرار دقیقہ اس پر کھولے جو عقل کے ذریعہ سے کھل نہیں سکتے اور وحی سے مراد ہماری وحی قرآن ہے جس نے ہم پر یہ عقدہ کھول دیا کہ اسقاط شہب سے ملائکہ کی غرض رجم شیاطین ہے۔ یعنی یہ ایک قسم کا انتشار نورانیت ملائک کے ہاتھ سے اور ان کے نور کی آمیزش سے ہے جن کا جنّات کی ظلمت پر اثر پڑتا ہے۔ اور جنّات کے افعال مخصوصہ اس سے ردّ بکلّی ہو جاتے ہیں اور اگر اس انتشارِ نورانیت کی کثرت ہو تو بوجہ نور کے مقناطیسی جذب کے مظہر کاملہ نورانیت کے انسانوں میں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ انتشار نورانیت بوجہ اپنی ملکی خاصیت کے کسی قدر دلوں کو نور اور حقانیت کی طرف کھینچتا ہے اور یہ ایک خاصیت ہے جو ہمیشہ دنیا میں اِنّی طور پر اس کا ثبوت ملتا رہا ہے . . . . درحقیقت خدا تعالیٰ کا انتظام یہی ہے کہ جو کچھ اجرام اور اجسام اور کائنات الجوّ میں ہو رہا ہے یا کبھی کبھی ظہور میں آتا ہے وہ صرف اجرام اور اجسام کے افعال شتر بے مہار کی طرح نہیں بلکہ انکے تمام واقعات کی زمامِ اختیار حکیم و تدبیر نے ملائک کے ہاتھ میں دے رکھی ہے جو ہر دم اور ہر طرفۃ العین میں اس قادرِ مطلق سے اِذن پاکر انواع و اقسام کے تصرفات میں مشغول ہیں۔ اور نہ عبث طور پر بلکہ سراسر حکیمانہ طرز سے بڑے بڑے مقاصد کیلئے اس کرّہ ارض و سما کو طرح طرح کی جنبشیں دے رہے ہیں۔ اور کوئی فعل بھی اُن کا بے کار اور بے معنی نہیں۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۱۲۲-۱۳۳ حاشیہ)

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی شریعت کی رو سے خواص ملائک کا درجہ خواص بشر سے کچھ زیادہ نہیں بلکہ خواص الناس خواص الملائک سے افضل ہیں۔ اور نظام جسمانی یا نظام روحانی میں اُنکا وسائط قرار پانا ان کی افضلیت پر دلالت نہیں کرتا بلکہ قرآن شریف کی ہدایت کی رُو سے وہ خدّام کی طرح اس کام میں لگائے گئے ہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے و سخّر لکم الشمس والقمر یعنی وہ خدا جس نے سورج اور چاند کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے۔ مثلاً دیکھنا چاہیئے کہ ایک چٹھی رسان ایک شاہ وقت کی طرف سے اس کے کسی ملک کے صوبیدار یا گورنر کی خدمت میں چٹھیاں پہنچا دیتا ہے تو کیا اس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ چٹھی رسان جو اس بادشاہ اور گورنر جنرل میں واسطہ ہے گورنر جنرل سے افضل ہے۔ سو خوب سمجھ لو یہی مثال ان وسائط کی ہے جو نظام جسمانی اور رُوحانی میں قادرِ مطلق کے ارادوں کو زمین پر پہنچاتے اور ان کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ اللہ جلّ شانہٗ قرآن شریف کے کئی مقامات میں بتصریح ظاہر فرماتا ہے کہ جو کچھ زمین و آسمان میں پیدا کیا گیا ہے وہ تمام چیزیں اپنے وجود میں انسان کی طفیلی ہیں۔ یعنی محض انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور انسان اپنے مرتبہ میں سب سے اعلیٰ و ارفع اور سب کا مخدوم ہے جس کی خدمت میں یہ چیزیں لگا دی گئی ہیں۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ و سخّر لکم الشمس والقمر دائبین ……

پھر ایک اَور جگہ فرمایا۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ۔ یعنی یاد کرو وہ وقت جب کہ تیرے خدا نے (جس کا تو مظہر اتم ہے) فرشتوں کو کہا کہ مَیں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں۔ سو جب مَیں اس کو کمال اعتدال پر پیدا کر لوں اور اپنی رُوح میں سے اس میں پھونک دوں تو تم اس کے لئے سجدہ میں گرو۔ یعنی کمال انکسار سے اس کی خدمت میں مشغول ہو جاؤ۔ اور ایسی خدمت گذاری میں جھک جاؤ کہ گویا تم اسے سجدہ کر رہے ہو۔ پس سارے کے سارے فرشتے انسان کامل کے آگے سجدہ میں گر پڑے مگر شیطان جو اس سعادت سے محروم رہ گیا۔

جاننا چاہیئے کہ یہ سجدہ کا حکم اس وقت سے متعلق نہیں ہے کہ جب حضرت آدم پیدا کئے گئے۔ بلکہ یہ علیحدہ ملائک کو حکم کیا گیا کہ جب کوئی انسان اپنی حقیقی انسانیت کے مرتبہ تک پہنچے اور اعتدال انسانی اس کو حاصل ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی رُوح اُس میں سکونت اختیار کرے تو تم اس کامل کے آگے سجدہ میں گرا کرو۔ یعنی آسمانی انوار کے ساتھ اُس پر اُترو اور اُس پر

صلوٰۃ بھیجو۔ سو یہ اس قدیم قانون کی طرف اشارہ ہے جو خدائے تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کے ساتھ ہمیشہ جاری رکھتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی زمانہ میں اعتدال رُوحانی حاصل کر لیتا ہے اور خدائے تعالیٰ کی رُوح اس کے اندر آباد ہوتی ہے۔ یعنی اپنے نفس سے فانی ہو کر بقا باللہ کا درجہ حاصل کرتا ہے تو ایک خاص طور پر نزول ملائکہ کا اس پر شروع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ سلوک کے ابتدائی حالات میں بھی ملائک اس کی نصرت اور خدمت میں لگے ہوئے ہوتے ہیں لیکن یہ نزول ایسا اتم اور اکمل ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم رکھتا ہے۔ اور سجدہ کے لفظ سے خدا تعالیٰ نے یہ ظاہر کر دیا کہ ملائکہ انسانِ کامل سے افضل نہیں ہیں بلکہ وہ شاہی خادموں کی طرح سجداتِ تعظیم انسان کامل کے آگے بجا لا رہے ہیں۔

(توضیح مرام ص ۲۶-۲۹)

ملائک اللہ (جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں) ایک ہی درجہ کی عظمت اور بزرگی نہیں رکھتے۔ نہ ایک ہی قسم کا کام انہیں سپرد ہے بلکہ ہر یک فرشتہ علیحدہ علیحدہ کاموں کے انجام دینے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ دنیا میں جسقدر تم تغیرات و انقلابات دیکھتے ہو یا جو کچھ مکمن قوّۃ سے حیّز فعل میں آتا ہے یا جسقدر ارواح و اجسام اپنے کمالات مطلوبہ تک پہنچتے ہیں ان سب پر تاثیراتِ سماویہ کام کر رہی ہیں اور کبھی ایک ہی فرشتہ مختلف طور کی استعدادوں پر مختلف طور کے اثر ڈالتا ہے۔ مثلاً جبرائیل جو ایک عظیم الشان فرشتہ ہے اور آسمان کے ایک نہایت روشن نیّر سے تعلّق رکھتا ہے اس کو کئی قسم کی خدمات سپرد ہیں۔ اُنہی خدمات کے موافق جو اس کے نیّر سے لئے جاتے ہیں۔ سو وہ فرشتہ اگرچہ ہر یک ایسے شخص پر نازل ہوتا ہے جو وحی الٰہی سے مشرف کیا گیا ہو (نزول کی اصل کیفیت جو صرف اثر اندازی کے طور پر ہے نہ واقعی طور پر یاد رکھنی چاہیئے) لیکن اس کے نزول کی تاثیرات کا دائرہ مختلف استعدادوں اور مختلف ظروف کے لحاظ سے چھوٹی چھوٹی یا بڑی بڑی شکلوں پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ نہایت بڑا دائرہ اس کی روحانی تاثیروں کا وہ دائرہ ہے جو حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی سے متعلق ہے۔ اسی وجہ سے جو معارف و حقائق و کمالات حکمت و بلاغت قرآن شریف میں اتم اور اکمل طور پر پائے جاتے ہیں۔ یہ عظیم الشان مرتبہ اور کسی کتاب کو حاصل نہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے (جیسا کہ پہلے بھی ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں) کہ ہر یک فرشتہ کی تاثیر انسان کے نفس پر دو قسم کی ہوتی ہے۔ اوّل وہ تاثیر جو رحم میں ہونے کی حالت میں باذنہٖ تعالیٰ مختلف طور کے تخم پر مختلف طور کا اثر ڈالتی ہے۔ پھر دوسری وہ تاثیر جو بعد تیاری وجود کے اس وجود کی مخفی استعدادوں کو اپنے کمالات ممکنہ تک پہنچانے کے لئے کام کرتی ہے۔ اس دوسری تاثیر کو جب وہ نبی یا کامل ولی

کے متعلق ہو وحی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک مستعد نفس اپنے نور ایمان اور نور محبت کے کمال سے مبداء فیوض کے ساتھ دوستانہ تعلق پکڑ لیتا ہے اور خدا تعالیٰ کی زندگی بخش محبت اس محبت پر پرتوہ انداز ہو جاتی ہے تو اس حد اور اس وقت تک جو کچھ انسان کو آگے قدم رکھنے کے لئے مقدور حاصل ہوتا ہے یہ دراصل اس پنہانی تاثیر کا اثر ظاہر ہوتا ہے جو کہ خدا تعالیٰ کے فرشتہ نے انسان کے رحم میں ہونے کی حالت میں کی ہوتی ہے۔ پھر بعد اس کے جب انسان اس پہلی تاثیر کی کشش سے یہ مرتبہ حاصل کر لیتا ہے تو پھر وہی فرشتہ از سر نو اپنا اثر نور سے بھرا ہوا اس پر ڈالتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہ اپنی طرف سے بلکہ وہ درمیانی خادم ہونے کی وجہ سے اس نالی کی طرح جو ایک طرف سے پانی کو کھینچتی اور دوسری طرف اس پانی کو پہنچا دیتی ہے خدا تعالیٰ کا نور فیض اپنے اندر کھینچ لیتا ہے۔ پھر عین اس وقت میں جب انسان بوجہ اقتران محبتین روح القدس کی نالی کے قریب اپنے تئیں رکھ دیتا ہے معاً اس نالی میں سے فیض وحی اس کے اندر گر جاتا ہے یا یوں کہو کہ اس وقت جبرائیل اپنا نورانی سایہ اس مستعد دل پر ڈال کر ایک عکسی تصویر اپنی اس کے اندر لکھ دیتا ہے تب جیسے ایک فرشتہ کا جو آسمان پر مستقر ہے جبرائیل نام ہے اس عکسی تصویر کا نام بھی جبرائیل ہی ہوتا ہے۔ یا مثلاً اس فرشتہ کا نام روح القدس ہے تو عکسی تصویر کا نام بھی روح القدس ہی رکھا جاتا ہے۔ سو یہ نہیں کہ فرشتہ انسان کے اندر گھس آتا ہے بلکہ اس کا عکس انسان کے آئینہ قلب میں نمودار ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب تم نہایت مصفی آئینہ اپنے منہ کے سامنے رکھو گے تو موافق دائرہ مقدار اس آئینہ کے تمہاری شکل کا عکس بلا توقف اس میں پڑے گا یہ نہیں کہ تمہارا منہ اور تمہارا سر گردن سے ٹوٹ کر اور الگ ہو کر آئینہ میں رکھ دیا جائیگا بلکہ اسی جگہ رہیگا جہاں رہنا چاہیئے اور صرف اس کا عکس پڑے گا اور عکس بھی ہر یک جگہ ایک ہی مقدار پر نہیں پڑے گا بلکہ جیسی جیسی وسعت آئینہ قلب کی ہوگی اسی مقدار کے موافق اثر پڑے گا۔ مثلاً اگر تم اپنا چہرہ آرسی کے شیشہ میں دیکھنا چاہو کہ جو ایک چھوٹا سا شیشہ ایک قسم کی انگشتری میں لگا ہوتا ہے تو اگرچہ اس میں بھی تمام چہرہ نظر آئیگا مگر ہر ایک عضو اپنی اصلی مقدار سے نہایت چھوٹا ہو کر نظر آئیگا۔ لیکن تم اپنے چہرہ کو ایک بڑے آئینہ میں دیکھنا چاہو جو تمہاری شکل کے پورے انعکاس کے لئے کافی ہے تو تمہارے تمام نقوش اور اعضاء چہرہ کے اپنے اصلی مقدار پر نظر آجائیں گے۔ پس یہی مثال جبرئیل کے تاثیرات کی ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مرتبہ کے ولی پر بھی جبرئیل ہی تاثیر وحی کی ڈالتا ہے۔ اور حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے دل پر بھی وہی جبرئیل

تاثیر وحی کی ڈالتا رہا ہے۔ لیکن ان دونوں وحیوں میں وہی فرق مذکورہ بالا آرسی کے شیشے اور بڑے آئینہ کا ہے۔ یعنی اگرچہ بظاہر صورت جبریلی وہی ہے اور اُس کی تاثیرات بھی وہی مگر ہر یک جگہ مادہ قابلہ ایک ہی وسعت اور صفائی کی حالت پر نہیں۔ اور یہ جو اسجگہ مَیں نے صفائی کا لفظ بھی لکھ دیا تو یہ اس بات کے اظہار کے لئے ہے کہ جبریلی تاثیرات کا اختلاف صرف کمیت کے ہی متعلق نہیں بلکہ کیفیت کے متعلق بھی ہے۔ یعنی صفائی قلب جو شرط انعکاس ہے۔ تمام افراد ملہمین کے ایک ہی مرتبہ پر کبھی نہیں ہوتے جیسے کہ تم دیکھتے ہو سارے آئینے ایک ہی درجہ کی صفائی ہرگز نہیں رکھتے۔ بعض آئینے ایسے اعلیٰ درجہ کے آبدار اور مصفّٰی ہوتے ہیں کہ پورے طور پر جیسا کہ چاہیئے دیکھنے والے کی شکل اُن میں ظاہر ہو جاتی ہے اور بعض ایسے کثیف اور مکدّر اور پُرغبار اور دُود آمیز جیسے ہوتے ہیں کہ صاف طور پر اُن میں شکل نظر نہیں آتی بلکہ بعض ایسے بگڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اگر مثلاً اُن میں دونوں لب نظر آویں تو ناک دکھائی نہیں دیتا اور اگر ناک نظر آگیا تو آنکھیں نظر نہیں آتیں۔ سو یہی حالت دلوں کے آئینہ کی ہے۔ جو نہایت درجہ کا مصفّٰی دل ہے اُس میں مصفّٰی طور پر انعکاس ہوتا ہے اور جو کسی قدر مکدّر ہے اُس میں اُسی قدر مکدّر دکھائی دیتا ہے اور اکمل اور اتم طور پر یہ صفائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو حاصل ہے۔ ایسی صفائی کسی دوسرے کے دل کو ہرگز حاصل نہیں۔

(توضیح مرام ص ۳۷-۴۰)

ان لوگوں کی سمجھ پر سخت تعجب ہے کہ وہ ظاہری بارش ہونے کے لئے جو بادلوں کے ذریعہ سے زمین پر ہوتی ہے بخاراتِ مائیہ کا توسط ضروری خیال کرتے ہیں اور خود بخود قدرت سے بغیر بادل کے بارش ہو جانا محال سمجھتے ہیں لیکن الہام کی بارش کے لئے جو صاف دلوں پر ہوتی ہے ملائک کے بادلوں کا توسط جو عند الشرع ضروری ہے اس پر جہالت کی نظر سے ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا خدائے تعالیٰ بغیر ملائک کے توسط کے خود بخود الہام نہیں کر سکتا تھا؟ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ بغیر توسط ہوا کے آواز کا سن لینا خلاف قانونِ قدرت ہے۔ مگر وہ ہوا جو رُوحانی طور پر خدا تعالیٰ کی آواز کو ملہموں کے دلوں تک پہنچاتی ہے اس قانونِ قدرت سے غافل ہیں۔ وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ ظاہری آنکھوں کی بصارت کے لئے آفتاب کی روشنی کی ضرورت ہے مگر وہ رُوحانی آنکھوں کے لئے کسی آسمانی روشنی کی ضرورت یقین نہیں رکھتے۔

اب جبکہ یہ قانونِ الٰہی معلوم ہو چکا کہ یہ عالم اپنے جمیع قویٰ ظاہری و باطنی کے ساتھ حضرت

واجب الوجود کے لئے بطور اعضاء کے واقعہ ہے۔ اور ہریک چیز اپنے محل اور موقع پر اعضاء ہی کا کام دے رہی ہیں اور ہریک ارادہ خدا تعالیٰ کا انہی اعضاء ہی کے ذریعہ سے ظہور میں آتا ہے۔ کوئی ارادہ بغیر ان کے توسط کے ظہور میں نہیں آتا۔ تو اب جاننا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی وحی میں جو پاک دلوں پر نازل ہوتی ہے جبریل کا تعلق جو شریعت اسلام میں ایک ضروری مسئلہ سمجھا گیا اور قبول کیا گیا ہے یہ تعلق بھی اسی فلسفہ حقہ پر ہی مبنی ہے جس کا ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حسب قانون قدرت مذکورہ بالا یہ امر ضروری ہے کہ وحی کے القاء یا ملکۂ وحی کے عطا کرنے کے لئے بھی کوئی مخلوق خدا تعالیٰ کے الہامی اور رُوحانی ارادہ کو منصّۂ ظہور لانے کے لئے ایک عضو کی طرح بنکر خدمت بجا لاوے جیسا کہ جسمانی ارادوں کو پورا کرنے کے لئے بجا لا رہے ہیں۔ سو وہ وہی عضو ہے جس کو دوسرے لفظوں میں جبرَیل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو بہ تبعیت حرکت اس وجود اعظم کے سچ مچ ایک عضو کی طرح بلا توقف حرکت میں آجاتا ہے یعنی جب خدائے تعالیٰ محبت کرنے والے کے دل کی طرف محبت کے ساتھ رجوع کرتا ہے تو حسب قاعدہ مذکورہ بالا جس کا ابھی بیان ہو چکا ہے جبرَیل کو بھی جو سانس کی ہوا یا آنکھ کے نور کی طرح خدائے تعالیٰ سے نسبت رکھتا ہے اس طرف ساتھ ہی حرکت کرنی پڑتی ہے۔ یا یوں کہو کہ خدا تعالیٰ کی جنبش کے ساتھ وہ بھی بلا اختیار و بلا ارادہ اسی طور سے جنبش میں آجاتا ہے کہ جیسا کہ اصل کی جنبش سے سایہ کا ہلنا طبعی طور پر ضروری امر ہے۔ پس جب جبریلی نور خدائے تعالیٰ کی کشش اور تحریک اور نفخ نورانیہ سے جنبش میں آجاتا ہے تو معاً اس کی ایک عکسی تصویر جس کو رُوح القدس کے ہی نام سے موسوم کرنا چاہیئے محب صادق کے دل میں منقش ہو جاتی ہے اور اس کی محبتِ صادقہ کا ایک عرضِ لازم ٹھہر جاتی ہے۔ تب یہ قوت خدا تعالیٰ کی آواز سُننے کے لئے کان کا فائدہ بخشتی ہے اور اس کے عجائبات کے دیکھنے کے لئے آنکھوں کی قائم مقام ہو جاتی ہے اور اس کے الہامات زبان پر جاری ہونے کے لئے ایک ایسی محرکِ حرارت کا کام دیتی ہے جو زبان کے پہیّہ کو زور کے ساتھ الہامی خط پر چلاتی ہے۔ اور جب تک یہ قوت پیدا نہ ہو اس وقت تک انسان کا دل اندھے کی طرح ہوتا ہے اور زبان اس ریل کی گاڑی کی طرح ہوتی ہے جو چلنے والے انجن سے الگ پڑی ہو۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ قوت جو رُوح القُدس سے موسوم ہے ہریک دل میں یکساں اور برابر پیدا نہیں ہوتی بلکہ جیسے انسان کی محبت کامل یا ناقص طور پر ہوتی ہے اسی اندازہ کے موافق یہ جبریلی نور اس پر اثر ڈالتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ رُوح القدس کی قوت جو دونوں محبتوں کے ملنے سے انسان کے دل میں جبرئیلی نور کے پرتوہ سے پیدا ہو جاتی ہے اِس کے وجود کے لئے یہ امر لازم نہیں کہ ہر وقت انسان خدا تعالیٰ کا پاک کلام سُنتا ہی رہے یا کشفی طور پر کچھ دیکھتا ہی رہے بلکہ یہ تو انوارِ سماویہ کے پانے کے لئے اسبابِ قریبہ کی طرح ہے۔ یا یوں کہو کہ یہ ایک رُوحانی روشنی رُوحانی آنکھوں کے دیکھنے کے لئے یا ایک روحانی ہوا رُوحانی کانوں تک آواز پہنچانے کے لئے منجانب اللہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک کوئی چیز سامنے موجود نہ ہو مجرد روشنی کچھ دکھا نہیں سکتی۔ اور جب تک متکلّم کے مُنہ سے کلام نہ نکلے مجرّد ہوا کانوں تک کوئی خبر نہیں پہنچا سکتی۔ سو یہ روشنی یا ہوا روحانی حواس کیلئے محض ایک آسمانی مؤید عطا کیا جاتا ہے جیسا کہ ظاہری آنکھوں کے لئے آفتاب کی روشنی اور ظاہری کانوں کے لئے ہوا کا ذریعہ مقرر کیا گیا ہے۔ اور جب باری تعالیٰ کا ارادہ اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اپنا کلام اپنے کسی ملہم کے دل تک پہنچاوے تو اس کی اس متکلّمانہ حرکت سے معًا جبرئیلی نور میں القاء کے لئے ایک روشنی کی موج یا ہوا کی موج یا ملہم کی تحریکِ لسان کے لئے ایک حرارت کی موج پیدا ہو جاتی ہے اور اس تموج یا اس حرارت سے بلا توقف وہ کلام ملہم کی آنکھوں کے سامنے لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے یا کانوں تک اس کی آواز پہنچتی ہے یا زبان پر وہ الہامی الفاظ جاری ہوتے ہیں اور روحانی حواس اور روحانی روشنی جو قبل از الہام ایک قوت کی طرح ملتی ہے یہ دونوں قوتیں اِس لئے عطا کی جاتی ہیں کہ تا قبل از نزولِ الہام الہام کے قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ کیونکہ اگر الہام ایسی حالت میں نازل کیا جاتا کہ ملہم کا دل حواسِ روحانی سے محروم ہوتا یا رُوح القدس کی روشنی دل کی آنکھ کو پہنچی نہ ہوتی تو وہ الہامِ الٰہی کو کن آنکھوں کی پاک روشنی سے دیکھ سکتا۔ سو اِسی ضرورت کی وجہ سے یہ دونوں پہلے ہی سے ملہمین کو عطا کی گئیں۔ اور اِس تحقیق سے یہ بھی ناظرین سمجھ لیں گے کہ وحی کے متعلق جبرئیل کے تین کام ہیں:—

اوّل یہ کہ جب رحم میں ایسے شخص کے وجود کے لئے نطفہ پڑتا ہے جس کی فطرت کو اللہ جلّ شانہٗ اپنی رحمانیت کے تقاضا سے جس میں انسان کے عمل کو کچھ دخل نہیں ملہمانہ فطرت بنانا چاہتا ہے تو اس پر اُسی نطفہ ہونے کی حالت میں جبرئیلی نور کا سایہ ڈال دیتا ہے۔ تب ایسے شخص کی فطرت منجانب اللہ الہامی خاصیت پیدا کر لیتی ہے اور الہامی حواس اس کو مل جاتے ہیں۔

پھر دوسرا کام جبرئیل کا یہ ہے کہ جب بندہ کی محبت خدائے تعالیٰ کی محبت کے زیرِ سایہ آ پڑتی ہے تو خدا تعالیٰ کی مربیانہ حرکت کی وجہ سے جبرئیلی نور میں بھی ایک حرکت پیدا ہو کر محبِّ صادق

کے طرف وہ نور جا پڑتا ہے۔ یعنی اس نور کا عکس محبِ صادق کے دل پر پڑ کر ایک عکسی تصویر جبرئیل کی اُس میں پیدا ہو جاتی ہے جو ایک روشنی یا ہوا یا گرمی کا کام دیتی ہے اور بطور ملکۂ الہامیہ کے ملہم کے اندر رہتی ہے۔ ایک سرا اس کا جبرئیل کے نور میں غرق ہوتا ہے اور دوسرا ملہم کے دل کے اندر داخل ہوتا ہے جس کو دوسرے لفظوں میں رُوح القدس یا اس کی تصویر کہہ سکتے ہیں۔

تیسرا کام جبرئیل کا یہ ہے کہ جب خدائے تعالیٰ کی طرف سے کسی کلام کا ظہور ہو تو ہوا کی طرح موج میں آکر اس کلام کو دل کے کانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ یا روشنی کے پیرایہ میں افروختہ ہو کر اس کو نظر کے سامنے کر دیتا ہے۔ یا حرارتِ محرکہ کے پیرایہ میں تیزی پیدا کر کے زبان کو الہامی الفاظ کی طرف چلا جاتا ہے۔

(توضیح مرام صفحہ ٤٣ - ٤٦)

جب محبتِ الٰہی بندہ کی محبت پر نازل ہوتی ہے تب دونوں محبتوں کے ملنے سے رُوح القدس کا ایک روشن اور کامل سایہ انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے اور لقا کے مرتبہ پر اس رُوح القدس کی روشنی نہایت ہی نمایاں ہوتی ہے اور اقتداری خوارق جن کا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں اسی وجہ سے ایسے لوگوں سے صادر ہوتے ہیں کہ یہ روح القدس کی روشنی ہر وقت اور ہر حال میں اُن کے شاملِ حال ہوتی ہے اور ان کے اندر سکونت رکھتی ہے اور وہ اس روشنی سے کبھی اور کسی حال میں جُدا نہیں ہوتے اور نہ وہ روشنی اُن سے جُدا ہوتی ہے۔ اور وہ روشنی ہر دم اُن کے تنفس کے ساتھ نکلتی ہے۔ اور اُن کی نظر کے ساتھ ہر یک چیز پر پڑتی ہے اور ان کی کلام کے ساتھ اپنی نورانیت لوگوں کو دکھلاتی ہے۔ اس روشنی کا نام روح القدس ہے۔ مگر یہ حقیقی رُوح القدس نہیں۔ حقیقی روح القدس وہ ہے جو آسمان پر ہے۔ یہ روح القدس اس کا ظلّ ہے جو پاک سینوں اور دلوں اور دماغوں میں ہمیشہ کے لئے آباد ہو جاتا ہے اور ایک طرفۃ العین کے لئے بھی اُن سے جُدا نہیں ہوتا اور جو شخص تجویز کرتا ہے کہ یہ رُوح القدس کسی وقت اپنی تمام تاثیرات کے ساتھ اُن سے جُدا ہو جاتا وہ شخص سراسر باطل پر ہے اور اپنے پرظلمتِ خیال سے خدا تعالیٰ کے مقدس برگزیدوں کی توہین کرتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ حقیقی رُوح القدس تو اپنے مقام پر ہی رہتا ہے لیکن رُوح القدس کا سایہ جس کا نام مجازاً رُوح القدس ہی رکھا جاتا ہے ان سینوں اور دلوں اور دماغوں اور تمام اعضاء میں داخل ہوتا ہے جو مرتبہ بقاء اور لقاء کا پاکر اس لائق ٹھہر جاتے ہیں کہ ان کی نہایت اصفیٰ اور اجلیٰ محبت پر خدا تعالیٰ کی کامل محبت اپنی برکات کے ساتھ نازل ہو۔ اور جب وہ رُوح القدس نازل ہوتا ہے تو اس انسان کے وجود سے ایسا تعلق پکڑ جاتا ہے

کہ جیسے جان کا تعلق جسم سے ہوتا ہے۔ وہ قوتِ بینائی بن کر آنکھوں میں کام دیتا ہے اور قوتِ شنوائی کا جامہ پہن کر کانوں کو روحانی حس بخشتا ہے۔ وہ زبان کی گویائی اور دل کے تقویٰ اور دماغ کی ہوشیاری بن جاتا ہے اور ہاتھوں میں بھی سرائت کرتا ہے اور پیروں میں بھی اپنا اثر پہنچاتا ہے۔ غرض تمام ظلمت کو وجود میں سے اُٹھا دیتا ہے اور سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک منور کر دیتا ہے۔ اور اگر ایک طرفۃ العین کے لئے بھی علیحدہ ہو جائے تو فی الفور اس کی جگہ ظلمت آجاتی ہے۔ مگر وہ کاملوں کو ایسا **نعم القرین** عطا کیا گیا ہے کہ ایک دم کے لئے بھی اُن سے علیحدہ نہیں ہوتا اور یہ گمان کرنا کہ اُن سے علیحدہ بھی ہو جاتا ہے یہ دوسرے لفظوں میں اس بات کا اقرار ہے کہ وہ بعد اس کے جو روشنی میں آگئے پھر تاریکی میں پڑ جاتے ہیں اور بعد اس کے جو معصوم یا محفوظ کئے گئے پھر نفس امّارہ اُن کی طرف عود کرتا ہے اور بعد اس کے جو روحانی حواس ان پر کھولے گئے پھر وہ تمام حواس بے کار اور معطل کئے جاتے ہیں ....

ہریک نور اور سکینت اور اطمینان اور برکت اور استقامت اور ہریک روحانی نعمت برگزیدوں کو رُوح القدس ہی سے ملتی ہے اور جیسے اشرار اور کفار کے لئے دائمی طور پر شیطان کو بئس القرین قرار دیا گیا ہے تا ہر وقت وہ اُن پر ظلمت پھیلاتا رہے اور ان کے قیام اور قعود اور حرکت اور سکون اور نیند اور بیداری میں ان کا پیچھا نہ چھوڑے ایسا ہی مقربین کے لئے دائمی طور پر رُوح القدس کو نعم القرین عطا کیا گیا ہے تا ہر وقت وہ اُن پر نور برساتا رہے اور ہر دم اُن کی تائید میں لگا رہے اور کسی دم اُن سے جدا نہ ہو۔

اب ظاہر ہے کہ جبکہ بمقابل بئس القرین کے جو ہمیشہ اشد شریروں کا ملازم اور رفیق ہے۔ مقربوں کے لئے نعم القرین کا ہر وقت رفیق اور انیس ہونا نہایت ضروری ہے اور قرآن کریم اس کی خبر دیتا ہے تو پھر اگر اس نعم القرین کی علیحدگی مقربوں سے تجویز کی جائے جیسا کہ ہمارے اندرونی مخالف قومی بھائی گمان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رُوح القدس جبرئیل کا نام ہے کبھی تو وہ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور مقربوں سے نہایت درجہ اتصال کر لیتا ہے یہاں تک کہ اُن کے دل میں دھنس جاتا ہے اور کبھی ان کو اکیلا چھوڑ ان سے جدائی اختیار کر لیتا ہے اور کروڑہا بلکہ بے شمار کوسوں کی دُوری اختیار کر کے آسمان پر چڑھ جاتا ہے اور ان مقربوں سے بالکل قطع تعلقات کر کے اپنے قرارگاہ میں جا چھپتا ہے۔ تب وہ اس روشنی اور اس برکت سے بکلی محروم رہ جاتے ہیں جو اس کے نزول کے وقت ان کے دل اور دماغ اور بال بال میں پیدا ہوتی ہے۔ تو کیا اس عقیدہ سے لازم نہیں آتا کہ رُوح القدس کے جُدا ہونے سے پھر اُن برگزیدوں کو ظلمت گھیر لیتی ہے اور نعوذ باللہ نعم القرین کی جدائی کی وجہ سے

جنس القرین کا اثر اُن میں شروع ہو جاتا ہے۔ اب ذرا خوفِ الٰہی کو اپنے دل میں جگہ دیکر سوچنا چاہیئے کہ کیا یہی ادب اور یہی ایمان اور عرفان ہے اور یہی محبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس نقص اور تنزل کی حالت کو روا رکھا جائے کہ گویا رُوح القدس آنجناب صلے اللہ علیہ وسلم سے مدتوں تک علیحدہ رہتا تھا۔ اور نعوذ باللہ ان مدتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انوارِ قدسیّہ سے جو رُوح القدس کا پرتوہ ہے محروم ہوتے تھے۔ غضب کی بات ہے کہ عیسائی لوگ تو حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت یقینی اور قطعی طور پر یہ اعتقاد رکھیں کہ رُوح القدس جب سے حضرت مسیحؑ پر نازل ہُوا کبھی اُن سے جُدا نہیں ہُوا اور وہ ہمیشہ اور ہر دم رُوح القدس سے تائید یافتہ تھے یہاں تک کہ خواب میں بھی رُوح القدس اُن سے جُدا نہیں ہوتا تھا۔ اور ان کا روح القدس کبھی آسمان پر اُن کو اکیلا اور مہجور چھوڑ کر نہیں گیا اور نہ رُوح القدس کی روشنی ایک دم کے لئے بھی کبھی ان سے جُدا ہوئی لیکن مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رُوح القدس آنجناب صلے اللہ علیہ وسلم سے جُدا بھی ہو جاتا تھا۔

(آئینہ کمالات اسلام ص۷۲-۷۵)

شائد کوئی بے خبر اس حیرت میں پڑے کہ فرشتوں کا اُترنا کیا معنے رکھتا ہے؟ سو واضح ہو کہ عادت اللہ اس طرح پر جاری ہے کہ جب کوئی رسول یا نبی یا محدث اصلاح خلق اللہ کے لئے آسمان سے اُترتا ہے تو ضرور اس کے ساتھ اور اس کے ہمرکاب ایسے فرشتے اترا کرتے ہیں کہ جو مستعد دلوں میں ہدایت ڈالتے ہیں اور نیکی کی رغبت دلاتے ہیں اور برابر اُترتے رہتے ہیں جب تک کفر و ضلالت کی ظلمت دُور ہو کر ایمان اور راستبازی کی صبح صادق نمودار ہو۔ جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے :-

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

سو ملائکہ اور روح القدس کا تنزل یعنی آسمان سے اُترنا اُسی وقت ہوتا ہے جب ایک عظیم الشان آدمی خلعت خلافت پہن کر اور کلام الٰہی سے شرف پاکر زمین پر نزول فرماتا ہے۔ رُوح القدس خاص طور پر اس خلیفہ کو ملتی ہے اور جو اس کے ساتھ ملائکہ ہیں وہ تمام دنیا کے مستعد دلوں پر نازل کئے جاتے ہیں۔ تب دنیا میں جہاں جہاں جوہر قابل پائے جاتے ہیں سب پر اُس نور کا پرتوہ پڑتا ہے اور تمام عالم میں ایک نورانیت پھیل جاتی ہے اور فرشتوں کی پاک تاثیر سے خودبخود دلوں میں نیک خیال پیدا ہونے لگتے ہیں اور توحید پیاری معلوم ہونے لگتی ہے اور سیدھے دلوں میں راست پسندی اور حق جوئی کی ایک رُوح پھونک دی جاتی ہے اور کمزوروں کو طاقت عطا کی جاتی ہے اور ہر طرف ایسی ہوا چلنی شروع ہو جاتی ہے کہ جو اس مصلح کے مدعا اور مقصد کو مدد دیتی ہے۔ ایک پوشیدہ ہاتھ کی تحریک سے خودبخود لوگ صلاحیت کی طرف کھسکتے چلے آتے ہیں اور قوموں میں ایک جنبش سی

شروع ہو جاتی ہے۔ تب ناسمجھ لوگ گمان کرتے ہیں کہ دنیا کے خیالات نے خود بخود راستی کی طرف پلٹا کھایا ہے لیکن درحقیقت یہ کام ان فرشتوں کا ہوتا ہے جو خلیفۃ اللہ کے ساتھ آسمان سے اُترتے ہیں اور حق کے قبول کرنے اور سمجھنے کے لئے غیر معمولی طاقتیں بخشتے ہیں۔ سوئے ہوئے لوگوں کو جگا دیتے ہیں اور مستوں کو ہشیار کرتے ہیں۔ اور بہروں کے کان کھولتے ہیں اور مُردوں میں زندگی کی رُوح پھونکتے ہیں۔ اور ان کو جو قبروں میں ہیں باہر نکال لاتے ہیں۔ تب لوگ یکدفعہ آنکھیں کھولنے لگتے ہیں اور اُن کے دلوں پر وہ باتیں کھلنے لگتی ہیں جو پہلے مخفی تھیں۔ اور درحقیقت یہ فرشتے اس خلیفۃ اللہ سے الگ نہیں ہوتے۔ اسی کے چہرہ کا نور اور اُسی کی ہمت کے آثار جلیہ ہوتے ہیں جو اپنی قوت مقناطیسی سے ہر ایک مناسبت رکھنے والے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں خواہ وہ جسمانی طور پر نزدیک ہو یا دُور ہو اور خواہ آشنا ہو یا بکلی بے گانہ اور نام تک سے بے خبر ہو۔ غرض اس زمانہ میں جو کچھ نیکی کی طرف حرکتیں ہوتی ہیں اور راستی کے قبول کرنے کے لئے جوش پیدا ہوتے ہیں خواہ وہ جوش ایشیائی لوگوں میں پیدا ہوں یا یورپ کے باشندوں میں یا امریکہ کے رہنے والوں میں وہ درحقیقت انہی فرشتوں کی تحریک سے جو اس خلیفۃ اللہ کے ساتھ اُترتے ہیں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ الٰہی قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ اور بہت صاف اور سریع الفہم ہے۔

(فتح اسلام ص ۱۲-۱۳ حاشیہ)

اس عاجز کو اپنے **ذاتی تجربہ** سے معلوم ہے کہ **رُوح القدس کی قدسیت** ہر وقت اور ہر دم اور ہر لحظہ بلافصل ملہم کے تمام قویٰ میں کام کرتی رہتی ہے اور وہ بغیر روح القدس اور اُس کی تاثیر **قدسیت** کے ایک دم بھی اپنے تئیں ناپاکی سے بچا نہیں سکتا اور انوار دائمی اور استقامت دائمی اور محبت دائمی اور عصمت دائمی اور برکات دائمی کا بھی سبب ہوتا ہے کہ رُوح القدس ہمیشہ اور ہر وقت ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر امام المعصومین اور امام المتبرکین اور سید المقربین کی نسبت کیونکر خیال کیا جائے کہ نعوذ باللہ کسی وقت ان تمام برکتوں اور پاکیزگیوں اور روشنیوں سے خالی رہ جاتے تھے۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۹۳-۹۴ حاشیہ)

ناظرین کی **توجہ کے لائق** یہ ہے کہ ان مولویوں نے بات بات میں حضرت عیسیٰؑ کو بڑھایا اور ہمارے سید مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی توہین کی۔ غضب کی بات ہے کہ ان کا عقیدہ حضرت مسیحؑ کی نسبت تو یہ ہو کہ کبھی رُوح القدس اُن سے جدا نہیں ہوتا تھا اور مسّ شیطان سے وہ بری تھے۔

اور یہ دونوں باتیں اُنہیں کی خصوصیت تھی۔ لیکن ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت ان کا یہ اعتقاد ہو کہ نہ رُوح القدس ہمیشہ اور ہر وقت اُن کے پاس رہا اور نہ وہ نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد مسّ شیطان سے بَری تھے باوجود ان باتوں کے یہ لوگ مسلمان کہلاویں۔ اُن کی نظر میں ہمارے سیّد و مولےٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم مُردہ مگر حضرت عیسیٰؑ اب تک زندہ۔ اور عیسیٰ کے لئے رُوح القدس دائمی رفیق مگر ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ اس نعمت سے بے بہرہ۔ اور حضرت عیسیٰ مسّ شیطان سے محفوظ مگر ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم محفوظ نہیں۔ جن لوگوں کے یہ عقائد ہوں اُن کے ہاتھ سے جس قدر دین اسلام کو اس زمانہ میں نقصان پہنچ رہا ہے کون اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ لوگ چھپے ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں۔ چاہیئے کہ ہر یک مسلمان اور سچا عاشق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان سے پرہیز کرے۔

(آئینہ کمالات اسلام ص۱۱۰-۱۱۱)

یہی حال انبیاء کی اجتہادی غلطی کا ہے کہ رُوح القدس تو کبھی اُن سے علیحدہ نہیں ہوتا مگر بعض اوقات خدا تعالیٰ بعض مصالح کے لئے انبیاء کے فہم اور ادراک کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے تب کوئی قول یا فعل سہو یا غلطی کی شکل پر اُن سے صادر ہو جاتا ہے اور وہ حکمت جو ارادہ کی گئی ہے ظاہر ہو جاتی ہے۔ تب پھر وحی کا دریا زور سے چلنے لگتا ہے اور غلطی کو درمیان سے اُٹھا دیا جاتا ہے گویا اس کا کبھی وجود نہیں تھا۔ حضرت مسیحؑ ایک انجیر کی طرف دوڑے گئے کہ تا اُس کا پھل کھائیں اور رُوح القدس ساتھ ہی تھا مگر رُوح القدس نے یہ اطلاع نہ دی کہ اِسوقت انجیر پر کوئی پھل نہیں۔ بایں ہمہ یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ شاذ و نادر معدوم کے حکم میں ہوتا ہے۔ پس جس حالت میں ہمارے سیّد و مولیٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے دس لاکھ کے قریب قول و فعل میں سراسر خدائی کا ہی جلوہ نظر آتا ہے اور ہر بات میں حرکات میں سکنات میں اقوال میں افعال میں رُوح القدس کے چمکتے ہوئے انوار نظر آتے ہیں تو پھر اگر ایک آدھ بات میں بشریت کی بھی بُو آوے تو اِس سے کیا نقصان۔ بلکہ ضرور تھا کہ بشریت کے تحقق کے لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تا لوگ شرک کی بلا میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

(آئینہ کمالات اسلام ص۱۱۵-۱۱۶)

اسجگہ کئی اعتراض پیدا ہوتے ہیں جن کا دفع کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ از انجملہ ایک یہ کہ جس حالت میں رُوح القدس صرف اُن مقربوں کو ملتا ہے کہ جو بقاء اور لقاء کے مرتبہ تک پہنچتے ہیں

تو پھر ہر ایک کا نگہبان کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رُوح القدس کا کامل طور پر نزول مقربوں پر ہی ہوتا ہے مگر اس کی فی الجملہ تائید حسب مراتب محبت و اخلاص دوسروں کو بھی ہوتی ہے ہماری تقریر مندرجہ بالا کا صرف یہ مطلب ہے کہ رُوح القدس کی اعلیٰ تجلّی کی یہ کیفیت ہے کہ جب بقاء اور لقاء کے مرتبہ پر محبت الٰہی انسان کی محبت پر نازل ہوتی ہے تو یہ اعلیٰ تجلّی رُوح القدس کی اُن دونوں محبتوں کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے جس کے مقابل پر دوسری تجلیات کالعدم ہیں مگر یہ تو نہیں کہ دوسری تجلیات کا وجود ہی نہیں۔ خدا تعالیٰ ایک ذرہ محبّت خالصہ کو بھی ضائع نہیں کرتا انسان کی محبت پر اس کی محبت نازل ہوتی ہے اور اُسی مقدار پر رُوح القدس کی چمک پیدا ہوتی ہے یہ خدا تعالیٰ کا ایک بندھا ہُوا قانون ہے کہ ہر یک محبت کے اندازہ پر الٰہی محبت نزول کرتی رہتی ہے۔ اور جب انسانی محبت کا ایک دریا بہہ نکلتا ہے تو اس طرف سے بھی ایک دریا نازل ہوتا ہے اور جب وہ دونوں دریا ملتے ہیں تو ایک عظیم الشان نور اُن میں سے پیدا ہوتا ہے جو ہماری اصطلاح میں رُوح القدس سے موسوم ہے۔ لیکن جیسے تم دیکھتے ہو کہ اگر بیس سیر پانی میں ایک ماشہ مصری ڈال دی جائے تو کچھ بھی مصری کا ذائقہ معلوم نہیں ہوگا اور پانی پھیکے کا پھیکا ہی ہوگا مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مصری اس میں نہیں ڈالی گئی اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پانی میٹھا ہے۔ یہی حال اُس رُوح القدس کا ہے جو ناقص طور پر ناقص لوگوں پر اُترتا ہے۔ اُس کے اُترنے میں تو شک نہیں ہو سکتا کیونکہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بھی نیکی کا خیال رُوح القدس سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی فاسق اور فاجر اور بدکار بھی سچی خواب دیکھ لیتا ہے اور یہ سب رُوح القدس کا اثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ نبویّہ سے ثابت ہے۔ مگر وہ تعلّق عظیم جو مقدسوں اور مقربوں کے ساتھ ہے اُس کے مقابل پر یہ کچھ چیز نہیں گویا کالعدم ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۸۰ حاشیہ)

واضح ہو کہ یہ خیال کہ فرشتے کیوں نظر نہیں آتے بالکل عبث ہے۔ فرشتے خدا تعالیٰ کے وجود کی طرح نہایت لطیف وجود رکھتے ہیں۔ پس کس طرح اِن آنکھوں سے نظر آویں۔ کیا خدا تعالیٰ جس کا وجود جو ان فلسفیوں کے نزدیک بھی مسلم ہے اِن فانی آنکھوں سے نظر آتا ہے؟ ماسوا اس کے یہ بات بھی درست نہیں کہ کسی طرح نظر ہی نہیں آسکتے۔ کیونکہ عارف لوگ اپنے مکاشفات کے ذریعہ سے جو اکثر بیداری میں ہوتے ہیں فرشتوں کو رُوحانی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور ان سے باتیں کرتے ہیں اور کئی علوم اُن سے اخذ کرتے ہیں۔ اور مجھے قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں

میری جان ہے اور جو مفتری اور کذّاب کو بغیر ذلیل اور معذّب کرنے کے نہیں چھوڑتا کہ مَیں اس بیان میں صادق ہوں کہ بارہا عالم کشف مَیں نے ملائک کو دیکھا ہے اور اُن سے بعض علوم اخذ کئے ہیں۔ اور اُن سے گذشتہ یا آنے والی خبریں معلوم کی ہیں جو مطابق واقعہ تھیں۔ پھر میں کیونکر کہوں کہ فرشتے کسی کو نظر نہیں آ سکتے۔ بلاشبہ نظر آ سکتے ہیں مگر اَور آنکھوں سے۔ اور جیسے یہ لوگ اِن باتوں پر ہنستے ہیں عارف ان کی حالتوں پر روتے ہیں۔ اگر صحبت میں رہیں تو کشفی طریقوں سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ لیکن مشکل تو یہی ہے کہ ایسے لوگوں کی کھوپری میں ایک قسم کا تکبّر ہوتا ہے۔ وہ تکبّر انہیں اس قدر بھی اجازت نہیں دیتا کہ انکسار اور تذلّل اختیار کر کے طالبِ حق بنکر حاضر ہو جائیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صـ۱۸۱-۱۸۲ حاشیہ)

ازانجملہ ایک یہ اعتراض ہے کہ خدا تعالیٰ کو فرشتوں سے کام لینے کی کیا حاجت ہے؟ کیا اسکی بادشاہی بھی انسانی سلطنتوں کی طرح عملہ کی محتاج ہے اور اُسکو بھی فوجوں کی حاجت تھی؟ جیسے انسان کو حاجت ہے۔

اما الجواب ۔ پس واضح ہو کہ خدا تعالیٰ کو کسی چیز کی حاجت نہیں۔ نہ فرشتوں کی نہ آفتاب کی نہ ماہتاب کی نہ ستاروں کی۔ لیکن اسی طرح اس نے چاہا کہ تا اس کی قدرتیں اسباب کے توسط سے ظاہر ہوں اور تا اس طرز سے انسانوں میں حکمت اور علم پھیلے۔ اگر اسباب کا توسط درمیان نہ ہوتا تو نہ دنیا میں علم ہیئت ہوتا نہ نجوم۔ نہ طبعی نہ طبابت نہ علم نباتات۔ یہ اسباب ہی ہیں جن سے علم پیدا ہوئے۔ تم سوچکر دیکھو کہ اگر فرشتوں سے خدمت لینے سے کچھ اعتراض ہے تو وہی اعتراض سورج اور چاند اور کواکب اور نباتات اور جمادات اور عناصر سے خدمت لینے میں پیدا ہوتا ہے جو شخص معرفت کا کچھ حصہ رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ہر یک ذرّہ خدا تعالیٰ کے ارادہ کے موافق کام کر رہا ہے اور ایک قطرہ پانی کا جو ہمارے اندر جاتا ہے وہ بھی بغیر اذن الٰہی کے کوئی تاثیر موافق یا مخالف ہمارے بدن پر ڈال نہیں سکتا۔ پس تمام ذرات اور سیارات وغیرہ درحقیقت ایک قسم کے فرشتے ہیں جو دن رات خدمت میں مشغول ہیں۔ کوئی انسان کے جسم کی خدمت میں مشغول ہے اَور کوئی رُوح کی خدمت میں۔ اور جس حکیم مطلق نے انسان کی جسمانی تربیت کے لئے بہت سے اسباب کا توسط پسند کیا اور اپنی طرف سے بہت سے جسمانی مؤثرات پیدا کئے تا انسان کے جسم پر انواع و اقسام کے طریقوں سے تاثیر ڈالیں۔ اُسی وحدہٗ لاشریک نے جس کے کاموں میں وحدت اور تناسب ہے یہ بھی پسند کیا کہ انسان کی رُوحانی تربیت بھی اسی نظام اور طریق سے ہو

کہ جو جسم کی تربیت میں اختیار کیا گیا تا وہ دونوں نظام ظاہری و باطنی اور روحانی اور جسمانی اپنے تناسب اور یکرنگی کی وجہ سے صانع واحد مدبّر بالارادہ پر دلالت کریں۔

پس یہی وجہ ہے کہ انسان کی روحانی تربیت بلکہ جسمانی تربیت کے لئے بھی فرشتے وسائط مقرر کئے گئے۔ مگر یہ تمام وسائط خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں مجبور اور ایک کل کی طرح ہیں جس کو اس کا پاک ہاتھ چلا رہا ہے۔ اپنی طرف سے نہ کوئی ارادہ رکھتے ہیں نہ کوئی تصرف۔ جس طرح ہوا خدا تعالیٰ کے حکم سے ہمارے اندر چلی جاتی ہے اور اسی کے حکم سے باہر آتی ہے اور اُسی کے حکم سے تاثیر کرتی ہے یہی صورت اور بتمامہ یہی حال فرشتوں کا ہے۔ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔

پنڈت دیانند نے جو فرشتوں کے نظام پر اعتراض کیا ہے کاش پنڈت صاحب کو خدا تعالیٰ کے نظام جسمانی اور روحانی کا علم ہوتا تا بجائے اعتراض کرنے کے کمالاتِ تعلیمِ قرآنی کے قائل ہو جاتے کہ کیسی قانونِ قدرت کی صحیح اور سچی تصویر اس میں موجود ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام ص۸۵-۸۸ حاشیہ)

اور یہ خیال کہ اگر مدبّرات اور مقسّمات امر فرشتے ہیں تو پھر ہماری تدبیریں کیوں پیش جاتی ہیں۔ اور کیوں اکثر امور ہمارے معالجات اور تدبیرات سے ہماری مرضی کے موافق ہو جاتے ہیں؟ تو اس کا یہ جواب ہے کہ وہ ہمارے معالجات اور تدبیرات بھی فرشتوں کے دخل اور القاء اور الہام سے خالی نہیں ہیں۔ جس کام کو فرشتے باذنہٖ تعالیٰ کرتے ہیں وہ کام اُس شخص یا اس چیز سے لیتے ہیں جس میں فرشتوں کی تحریکات کے اثر کو قبول کرنے کا فطرتی مادہ ہے۔ مثلاً فرشتے جو ایک کھیت یا ایک گاؤں یا ایک ملک میں باذنہٖ تعالیٰ پانی برسانا چاہتے ہیں تو وہ آپ تو پانی نہیں بن سکتے اور نہ آگ سے پانی کا کام لے سکتے ہیں بلکہ بادل کو اپنی تحریکاتِ جاذبہ سے محلِ مقصود پر پہنچا دیتے ہیں۔ اور مدبّراتِ امر جس کم اور کیف اور حد اور اندازہ تک ارادہ کیا گیا ہے برسا دیتے ہیں۔ بادل میں وہ تمام قوتیں موجود ہوتی ہیں جو ایک بے جان اور بے ارادہ اور بے شعور چیز میں باعتبار اس کے جمادی حالت اور عنصری خاصیت کے ہو سکتے ہیں اور فرشتوں کی منصبی خدمت دراصل تقسیم اور تدبیر ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ مقسّمات اور مدبّرات کہلاتے ہیں اور القاء اور الہام بھی جو فرشتے کرتے ہیں وہ بھی برعایت فطرت ہی ہوتا ہے۔ مثلاً وہ الہام جو خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر وہ نازل کرتے ہیں دوسروں پر نہیں کر سکتے بلکہ اُس طرف توجّہ ہی نہیں کرتے اور اسی قاعدہ کے موافق ہر یک شخص اپنے اندازہ استعداد پر فرشتوں کے القاء سے فیضیاب ہوتا ہے۔ اور جس فن یا علم کی طرف کسی کا روئے خیال ہے اُسی میں

فرشتہ سے مدد پاتا ہے۔ مثلاً جب اللہ جلّ شانہٗ کا ارادہ ہوتا ہے کہ کسی دوا سے کسی کو دست آویں تو طبیب کے دل میں فرشتہ ڈال دیتا ہے کہ فلاں مسہل کی دوا اس کو کھلا دو۔ تب وہ تربد یا خیارشنبر یا شیرخشت یا سقمونیا یا سنا یا کسٹرائل یا کوئی اور چیز جیسے دل میں ڈالا گیا ہو اس بیمار کو بتلا دیتا ہے اور پھر فرشتوں کی تائید سے اس دوا کو طبیعت قبول کر لیتی ہے۔ قے نہیں آتی۔ تب فرشتے اس دوا پر اپنا اثر ڈال کر بدن میں اس کی تاثیرات پہنچاتے ہیں اور مادہٗ موذیہ کا اخراج باذنہٖ تعالیٰ شروع ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے نہایت حکمت اور قدرت کاملہ سے سلسلہ ظاہری علوم و فنون کو بھی ضائع ہونے نہیں دیا اور اپنی خدائی کے تصرفات اور دائمی قبضہ کو بھی معطل نہیں رکھا اور اگر خدا تعالیٰ کا اس قدر دقیق در دقیق تصرف اپنی مخلوق کے عوارض اور اس کی بقا اور فنا پر نہ ہوتا تو وہ ہرگز خدا نہ ٹھہر سکتا اور نہ توحید درست ہو سکتی۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس عالم میں نہیں چاہا کہ یہ تمام اسرار عالم نظروں میں بدیہی ٹھہر جاویں کیونکہ اگر یہ بدیہی ہوتے تو پھر اُن پر ایمان لانے کا کچھ بھی ثواب نہ ہوتا۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۱۸۵ - ۱۸۸ حاشیہ)

ازانجملہ ایک یہ سوال ہے کہ جس حالت میں رُوح القدس انسان کو بدیوں سے روکنے کے لئے مقرر ہے تو پھر اُس سے گناہ کیوں سرزد ہوتا ہے اور انسان کفر اور فسق اور فجور میں کیوں مبتلا ہو جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے ابتلاء کے طور پر دو روحانی داعی مقرر کر رکھے ہیں۔ ایک داعیٔ خیر جس کا نام رُوح القدس ہے اور ایک داعیٔ شر جس کا نام ابلیس اور شیطان ہے۔ یہ دونوں داعی صرف خیر یا شر کی طرف بلاتے رہتے ہیں مگر کسی چیز پہ جبر نہیں کرتے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ یعنی خدا بدی کا بھی الہام کرتا ہے اور نیکی کا بھی۔ بدی کے الہام کا ذریعہ شیطان ہے جو شرارتوں کے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے۔ اور نیکی کے الہام کا ذریعہ رُوح القدس ہے جو پاک خیالات دل میں ڈالتا ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ علّت العلل ہے اس لئے یہ دونوں الہام خدا تعالےٰ نے اپنی طرف منسوب کر لئے کیونکہ اُسی کی طرف سے یہ سارا انتظام ہے ورنہ شیطان کیا حقیقت رکھتا ہے جو کسی کے دل میں وسوسہ ڈالے اور روح القدس کیا چیز جو کسی کو تقویٰ کی راہوں کی ہدایت کرے۔ ہمارے مخالف آریہ اور برہمو اور عیسائی اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے قرآن کریم کی تعلیم پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس تعلیم کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے دانستہ انسان کے پیچھے شیطان کو لگا رکھا ہے۔ گویا اس کو آپ ہی خلق اللہ کا گمراہ کرنا منظور ہے

مگر یہ ہمارے شتاب باز مخالفوں کی غلطی ہے انکو معلوم کرنا چاہیئے کہ قرآن کریم کی یہ تعلیم نہیں ہے کہ شیطان گمراہ کرنے کے لئے جبر کرسکتا ہے۔ اور نہ یہ تعلیم ہے کہ صرف بدی کی طرف بلانے کے لئے شیطان کو مقرر کر رکھا ہے بلکہ یہ تعلیم ہے کہ آزمائش اور امتحان کی غرض سے۔ **لمّہ ملک** اور **لمّہ ابلیس** برابر طور پر انسان کو دیئے گئے ہیں۔ یعنی ایک **داعیٔ خیر** اور ایک **داعیٔ شر**۔ تا انسان اس ابتلاء میں پڑ کر مستحق ثواب یا عقاب کا ٹھہر سکے۔ کیونکہ اگر اُس کے لئے ایک ہی طور کے اسباب پیدا کئے جاتے مثلاً اگر اس کے بیرونی اور اندرونی اسباب جذبات فقط نیکی کی طرف ہی اسکو کھینچتے یا اس کی فطرت ہی ایسے واقع ہوتی کہ وہ بجز نیکی کے کاموں کے اور کچھ کر ہی نہ سکتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ نیک کاموں کے کرنے سے اس کو کوئی مرتبہ قرب کا مل سکے کیونکہ اس کے لئے تو تمام اسباب و جذبات نیک کام کرنے کے ہی موجود ہیں یا یہ کہ بدی کی خواہش تو ابتداء سے ہی اس کی فطرت سے مسلوب ہے تو پھر بدی سے بچنے کا اُسکو ثواب کس استحقاق سے ملے۔ مثلاً ایک شخص ابتداء سے ہی نامرد ہے جو عورت کی کچھ خواہش نہیں رکھتا اب اگر وہ ایک مجلس میں یہ بیان کرے کہ میں فلاں وقت جوان عورتوں کے ایک گروہ میں رہا جو خوبصورت بھی تھیں مگر میں ایسا پرہیزگار ہوں کہ میں نے اُن کو شہوت کی نظر سے ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا اور خدائے تعالیٰ سے ڈرتا رہا تو کچھ شک نہیں کہ سب لوگ اُس کے اس بیان پر ہنسیں گے اور طنز سے کہیں گے کہ اے نادان! کب اور کس وقت تجھ میں یہ قوت موجود تھی تا اُس کے روکنے پر تو فخر کرسکتا یا کسی ثواب کی امید رکھتا۔ پس جاننا چاہیئے کہ سالک کو اپنی ابتدائی اور درمیانی حالات میں تمام اُمیدیں ثواب کی مخالفانہ جذبات سے پیدا ہوتی ہیں اور ان منازلِ سلوک میں جن امور میں فطرت ہی سالک کی ایسی واقع ہو کہ اُس قسم کی بدی وہ کر ہی نہیں سکتا تو اس قسم کے ثواب کا بھی وہ مستحق نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہم بچھو اور سانپ کی طرح اپنے وجود میں ایک ایسی زہر نہیں رکھتے جس کے ذریعہ سے ہم کسی کو اس قسم کی ایذا پہنچا سکیں جو کہ سانپ اور بچھو پہنچاتے ہیں۔ سو ہم اس قسم کی ترکِ بدی میں عنداللہ کسی ثواب کے مستحق بھی نہیں۔

اب اس تحقیق سے ظاہر ہوا کہ مخالفانہ جذبات جو انسان میں پیدا ہو کر انسان کو بدی کی طرف کھینچتے ہیں درحقیقت وہی انسان کے ثواب کا بھی موجب ہیں کیونکہ جب وہ خدا تعالیٰ سے ڈر کر اُن مخالفانہ جذبات کو چھوڑ دیتا ہے تو عنداللہ بلاشبہ تعریف کے لائق ٹھہر جاتا ہے اور اپنے ربّ کو راضی کرلیتا ہے لیکن جو شخص انتہائی مقام کو پہنچ گیا اُس میں مخالفانہ جذبات نہیں رہتے۔ گویا اُس کا جنّ مسلمان ہو جاتا ہے مگر ثواب باقی رہ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ابتلاء کے منازل کو بڑی مردانگی کے ساتھ طے کر چکا ہے۔ جیسے ایک صالح آدمی جس نے بڑے بڑے نیک کام اپنی جوانی میں کئے ہیں

اپنی پیرانہ سالی میں بھی اُن کا ثواب پاتا ہے۔

(آئینۂ کمالات اسلام ص ۸۰-۸۵ حاشیہ)

اسی طرح شیطان کے وجود پر بعض ناسمجھ اعتراض کرتے ہیں کہ گویا خدا نے خود لوگوں کو گمراہ کرنا چاہا۔ مگر یہ بات نہیں ہے بلکہ ہر ایک دانا اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ ہر ایک انسان میں دو قوتیں ضرور پائی جاتی ہیں جن میں سے ایک قوت کو عربی میں لمّۂ شیطان کہتے ہیں اور دوسری کو لمّۂ ملک۔ یعنی انسانی فطرت میں یہ بات مشہود ہے کہ کبھی نامعلوم اسباب سے نیک خیال اس میں پیدا ہوتا ہے اور نیک کاموں کی طرف دل رغبت کرتا ہے۔ اور پھر کبھی بدخیال اس کے دل میں اٹھتا ہے اور بدی اور بدکاری اور ظلم اور شر کی طرف اس کی طبیعت مائل ہو جاتی ہے۔ پس وہ قوت جو بدخیالی کا منبع ہے قرآنی تعلیم کی رو سے وہ شیطان ہے اور وہ قوت جو نیک خیال کا منبع ہے وہ فرشتہ ہے۔

(مضمون جلسہ لاہور منسلکہ چشمہ معرفت ص ۶۸)

اگر کوئی کہے کہ جس حالت میں شیطان کو خدا تعالیٰ کی ہستی اور وحدانیت پر یقین ہے تو پھر وہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی کیوں کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی نافرمانی انسان کی نافرمانی کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ اسی عادت پر انسان کی آزمائش کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ ایک راز ہے جس کی تفصیل انسان کو نہیں دی گئی۔ اور انسان کی خاصیت اکثر اور اغلب طور پر یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نسبت علم کامل حاصل کرنے سے ہدایت پا لیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ انّما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلمٰؤا۔ ہاں جو لوگ شیطانی سرشت رکھتے ہیں وہ اس قاعدہ سے باہر ہیں۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۱۹ حاشیہ)

اوّل ہم بیان کر چکے ہیں کہ صاحب انتہائی کمال کا جس کا وجود سلسلہ خطِ خالقیت میں انتہائی نقطۂ ارتفاع پر واقعہ ہے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اُن کے مقابل پر وہ خسیس وجود جو انتہائی نقطۂ انخفاض پر واقعہ ہے اس کو ہم لوگ شیطان سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر شیطان کا وجود مشہود و محسوس نہیں لیکن اس سلسلہ خطِ خالقیت پر نظر ڈال کر اس قدر تو عقلی طور پر ضرور ماننا پڑتا ہے کہ جیسے سلسلہ ارتفاع کے انتہائی نقطہ میں ایک وجود خیر مجسّم ہے جو دنیا میں خیر کی طرف ہادی ہو کر آیا اسی طرح اس کے مقابل پر ذوی العقول میں انتہائی نقطۂ انخفاض میں ایک وجود شر انگیز بھی جو شر کی طرف جاذب ہو ضرور چاہیئے۔

اسی وجہ سے ہریک انسان کے دل میں باطنی طور پر بھی دونوں وجودوں کا اثر عام طور پر پایا جاتا ہے پاک وجود جو رُوح الحق اور نور بھی کہلاتا ہے یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا پاک اثر بجذباتِ قدسیہ و توجہاتِ باطنیہ ہر ایک دل کو خیر اور نیکی کی طرف بلاتا ہے۔ جس قدر کوئی اس سے محبت اور مناسبت پیدا کرتا ہے اُسی قدر وہ ایمانی قوت پاتا ہے اور نورانیت اس کے دل میں پھیلتی ہے یاں تک کہ وہ اس کے رنگ میں آجاتا ہے اور ظلّی طور پر ان سب کمالات کو پا لیتا ہے جو اس کو حاصل ہیں۔ اور جو وجود شر انگیز ہے یعنی وجودِ شیطان جسکا مقام ذوی العقول کی قسم میں انتہائی نقطۂ انخفاض میں واقع ہے اُس کا اثر ہریک دل کو جو اس سے کچھ نسبت رکھتا ہے شرک کی طرف کھینچتا ہے۔ جس قدر کوئی اس سے مناسبت پیدا کرتا ہے اسی قدر بے ایمانی اور خباثت کے خیال اس کو سوجھتے ہیں یاں تک کہ جس کو مناسبت تام ہو جاتی ہے وہ اُسی کے رنگ و روپ میں آکر پورا پورا شیطان ہو جاتا ہے اور ظلّی طور پر ان سب کمالاتِ خباثت کو حاصل کر لیتا ہے جو اصلی شیطان کو حاصل ہیں۔ اسی طرح اولیاء الرحمٰن اور اولیاء الشیطان اپنی اپنی مناسبت کی وجہ سے الگ الگ طرف کھینچے چلے جاتے ہیں۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۰۰-۲۰۳ حاشیہ)

دُعا

مَیں سچ کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالٰے کے حضور ہماری چلاہٹ ایسی ہی اضطراری ہو تو وہ اس کے فضل اور رحمت کو جوش دلاتی ہے اور اس کو کھینچ لاتی ہے۔ اور مَیں اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ خدا کے فضل اور رحمت کو جو قبولیتِ دعا کی صورت میں آتا ہے مَیں نے اپنی طرف کھینچتے ہوئے محسوس کیا ہے بلکہ مَیں تو یہ کہونگا کہ دیکھا ہے۔ ہاں آجکل کے زمانہ کے تاریک دماغ فلاسفر اس کو محسوس نہ کر سکیں یا نہ دیکھ سکیں تو یہ صداقت دنیا سے اُٹھ نہیں سکتی اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ مَیں قبولیتِ دعا کا نمونہ دکھانے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔

(ملفوظات جلد اول صفہ ۱۹۰)

سیّد احمد خانصاحب کے سی۔ ایس۔ آئی کے رسالہ

الدعا والاستجابت اور رسالہ تحریر فی اصول التفسیر پر ایک نظر۔

اے اسیرِ عقلِ خود برہستیٔ خود کم بناز ⁂ کیں سپہر بوالعجائب چوں تو بسیار آورد
غیر را ہرگز نمے باشد گذر در کوئے حق ⁂ ہر کہ آید زآسماں او رازِ آں یار آورد
خود بخود فہمیدنِ قرآں گمانِ باطل است ⁂ ہر کہ از خود آورد او نجس و مردار آورد

سیّد صاحب اپنے رسالہ مندرجہ عنوان میں دعا کی نسبت اپنا یہ عقیدہ ظاہر کرتے ہیں کہ استجابت دُعا کے یہ معنے نہیں کہ جو کچھ دعا میں مانگا گیا ہے وہ دیا جائے۔ کیونکہ اگر استجابت دُعا کے یہی معنے ہوں کہ وہ سوال بہر حال پورا کر دیا جائے تو دو مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ہزاروں دُعائیں نہایت عاجزی اور اضطراری سے کی جاتی ہیں مگر سوال پورا نہیں ہوتا جس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ دُعا قبول نہیں ہوئی حالانکہ خدا نے استجابت دعا کا وعدہ کیا ہے۔ دوسری یہ کہ جو امور ہونے والے ہیں وہ مقدّر ہیں اور جو نہیں ہونے والے وہ بھی مقدر ہیں۔ ان مقدرات کے برخلاف ہرگز نہیں ہو سکتا پس اگر استجابت دعا کے معنے سوال کا پورا کرنا قرار دیئے جائیں تو خدا کا یہ وعدہ کہ ادعونی استجب لکم ان سوالوں پر جن کا ہونا مقدر نہیں ہے صادق نہیں آسکتا۔ یعنی ان معنوں کی رو سے یہ عام وعدہ استجابت دعا کا باطل ٹھہریگا کیونکہ سوالوں کا وہی حصہ پورا کیا جاتا ہے جس کا

پورا کیا جانا مقدر ہے۔ لیکن استجابت دُعا کا وعدہ عام ہے۔ جس میں کوئی بھی استثناء نہیں۔ پھر جس حالت میں بعض آیتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ جن چیزوں کا دیا جانا مقدر نہیں وہ ہرگز دی نہیں جائیں اور بعض آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی دُعا ردّ نہیں ہوتی اور سب کی سب قبول کی جاتی ہیں اور نہ صرف اسی قدر بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے تمام دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ کر لیا ہے جیسا کہ آیت ادعونی استجب لکم سے ظاہر ہے۔ پھر اس تناقض اور تعارض آیات سے بجز اس کے کیونکر مخلصی حاصل ہو کہ استجابت دُعا سے عبادت کا قبول کرنا مراد لیا جائے یعنی یہ معنے کئے جائیں کہ دُعا ایک عبادت ہے اور جب وہ دل سے اور خشوع سے اور خضوع سے کی جائے تو اس کے قبول کرنے کا خدا تعالےٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ پس استجابت دُعا کی حقیقت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ دُعا ایک عبادت متصوّر ہو کر اُس پر ثواب مترتب ہوتا ہے۔ ہاں اگر مقدر میں ایک چیز کا ملنا ہے اور اتفاقاً اس کے لئے دُعا بھی کی گئی تو وہ چیز مل جاتی ہے مگر نہ دعا سے بلکہ اس کا ملنا مقدّر تھا۔ اور دعا میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب دعا کرنے کے وقت خدا کی عظمت اور بے انتہا قدرت کا خیال اپنے دل میں جمایا جاتا ہے تو وہ خیال حرکت میں آکر ان تمام خیالات پر جن سے اضطرار پیدا ہُوا ہے غالب ہو جاتا ہے اور انسان کو صبر اور استقلال پیدا ہو جاتا ہے اور ایسی کیفیت کا دل میں پیدا ہو جانا لازمۂ عبادت ہے اور یہی دُعا کا مستجاب ہونا ہے۔ پھر سید صاحب اپنے رسالہ کے آخیر میں لکھتے ہیں کہ جو لوگ حقیقت دُعا سے ناواقف اور جو حکمت اس میں ہے اس سے بے خبر ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ امر مسلم ہے کہ جو مقدر نہیں وہ نہیں ہونے کا۔ تو دُعا سے کیا فائدہ ہے یعنی جبکہ مقدّر بہر حال مل رہیگا خواہ دعا کرو یا نہ کرو۔ اور جس کا ملنا مقدر نہیں اُس کے لئے ہزاروں دعائیں کئے جاؤ کچھ فائدہ نہیں تو پھر دُعا کرنا ایک امر عبث ہے۔ اس کے جواب میں سید صاحب فرماتے ہیں کہ اضطرار کے وقت استمداد کی خواہش رکھنا انسان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ سو انسان اپنے فطرتی خاصہ سے دُعا کرتا ہے بلا خیال اس کے کہ وہ ہوگا یا نہیں اور بمقتضائے اس کی فطرت کے اس کو کہا گیا ہے کہ خدا ہی سے مانگو جو مانگو۔

اس تمام تحریر سے جس کو ہم نے بطور خلاصہ اوپر لکھ دیا ہے ثابت ہُوا کہ سید صاحب کا یہ مذہب ہے کہ دُعا ذریعۂ حصول مقصود نہیں ہو سکتی اور نہ تحصیل مقاصد کے لئے اس کا کچھ اثر ہے اور اگر دُعا کرنے سے کسی داعی کا فقط یہی مقصد ہو کہ بذریعہ دعا کوئی سوال پورا ہو جائے تو یہ خیال عبث ہے۔ کیونکہ جس امر کا ہونا مقدّر ہے اس کے لئے دُعا کی حاجت نہیں اور جس کا ہونا مقدّر نہیں

اِس کے لئے تضرع و ابتہال بے فائدہ ہے۔ غرض اِس تقریر سے بتمامتر صفائی کھل گیا کہ سیّد صاحب کا یہی عقیدہ ہے کہ دُعا صرف عبادت کے لئے موضوع ہے اور اس کو کسی دنیوی مطلب کے حصول کا ذریعہ قرار دینا طمع خام ہے۔

اب واضح ہو کہ سیّد صاحب کو قرآنی آیات کے سمجھنے میں سخت دھوکا لگا ہؤا ہے مگر ہم انشاءاللہ تعالےٰ اس دھوکے کی کیفیت کو اس مضمون کے آخر میں بیان کرینگے۔ اِسوقت ہم نہایت افسوس سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر سیّد صاحب قرآن کریم کے سمجھنے میں فہم رسا نہیں رکھتے تھے تو کیا وہ قانونِ قدرت بھی جس کی پیروی کا وہ دم مارتے ہیں اور جس کو وہ خدا تعالیٰ کی فعلی ہدایات اور قرآن کریم کے اسرارِ غامضہ کا مفسّر قرار دیتے ہیں اِس مضمون کے لکھنے کے وقت اُن کی نظر دل سے غائب تھا؟ کیا سیّد صاحب کو معلوم نہیں کہ اگرچہ دنیا کی کوئی خیر و شر مقدّر سے خالی نہیں تاہم قدرت نے اُس کے حصول کے لئے ایسے اسباب مقرر کر رکھے ہیں جن کے صحیح اور سچّے اثر میں کسی عقلمند کو کلام نہیں۔ مثلاً اگرچہ مقدر پر لحاظ کر کے دوا کا کرنا نہ کرنا درحقیقت ایسا ہی ہے جیسا کہ دُعا یا ترکِ دُعا۔ مگر کیا سیّد صاحب یہ رائے ظاہر کر سکتے ہیں کہ مثلاً علم طبّ سراسر باطل ہے۔ اور حکیم حقیقی نے دواؤں میں کچھ بھی اثر نہیں رکھا۔ پھر اگر سیّد صاحب باوجود ایمان بالتقدیر کے اِس بات کے بھی قائل ہیں کہ دوائیں بھی اثر سے خالی نہیں تو پھر کیوں خدا تعالیٰ کے یکساں اور متشابہ قانون میں فتنہ اور تفرقہ ڈالتے ہیں؟ کیا سیّد صاحب کا یہ مذہب ہے کہ خدا تعالیٰ اس بات پر تو قادر تھا کہ تربد اور سقمونیا اور سنا اور حبّ الملوک میں تو ایسا قوی اثر رکھدے کہ اُن کی پوری خوراک کھانے کے ساتھ ہی دست چھوٹ جائیں یا مثلاً سم الفار اور بیش اور دوسری ہلاہل زہروں میں وہ غضب کی تاثیر ڈال دی کہ اُن کا کامل قدر شربت چند منٹوں میں ہی اس جہان سے رخصت کر دے لیکن اپنے برگزیدوں کی توجہ اور عقدِ ہمت اور تضرع کی بھری ہوئی دعاؤں کو فقط مُردہ کی طرح رہنے دے جن میں ایک ذرّہ بھی اثر نہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ نظام الٰہی میں اختلاف ہو اور وہ ارادہ جو خدا تعالیٰ نے دواؤں میں اپنے بندوں کی بھلائی کے لئے کیا تھا وہ دواؤں میں مرعی نہ ہو؟ نہیں نہیں! ہرگز نہیں!! بلکہ خود سیّد صاحب دعاؤں کی حقیقی فلاسفی سے بے خبر ہیں۔ اور اُن کی اعلیٰ تاثیروں پر ذاتی تجربہ نہیں رکھتے اور ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی ایک مدت ایک پُرانی اور سال خوردہ اور مسلوب القوٰی دوا کو استعمال کرے اور پھر اس کو بے اثر پاکر اس دوا پر عام حکم لگادے کہ اِس میں کچھ بھی تاثیر نہیں۔ افسوس! صد افسوس کہ سید صاحب باوجودیکہ پیرانہ سالی

تک پہنچ گئے مگر اب تک اُن پر یہ سلسلۂ نظام قدرت مخفی رہا کہ کیونکر قضاء و قدر کو اسباب سے وابستہ کر دیا گیا ہے اور کس قدر یہ سلسلہ اسباب اور مسبّبات کا باہم گہرے اور لازمی تعلقات رکھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس دھوکے میں پھنس گئے کہ انہوں نے خیال کر لیا کہ گویا بغیر ان اسباب کے جو قدرت نے روحانی اور جسمانی طور پر مقرر کر رکھے ہیں کوئی چیز ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔ یوں تو دنیا میں کوئی چیز بھی مقدّر سے خالی نہیں۔ مثلاً جو انسان آگ اور پانی اور ہوا اور مٹی اور اناج اور نباتات اور حیوانات اور جمادات وغیرہ سے فائدہ اُٹھاتا ہے وہ سب مقدرات ہی ہیں لیکن اگر کوئی نادان ایسا خیال کرے کہ بغیر ان تمام اسباب کے جو خدا تعالیٰ نے مقرر کر رکھے ہیں اور بغیر ان راہوں کے جو قدرت نے معین کر رکھی ہیں ایک چیز بغیر توسط جسمانی یا رُوحانی وسائل کے حاصل ہو سکتی ہے تو ایسا شخص گویا خدا تعالیٰ کی حکمت کو باطل کرنا چاہتا ہے۔ مَیں نہیں دیکھتا کہ سیّد صاحب کی تقریر کا بجز اس کے اَور کچھ بھی ماحصل ہے کہ وہ دُعا کو منجملہ اُن اسباب مؤثرہ کے نہیں سمجھتے جن کو انہوں نے بڑی مضبوطی سے تسلیم کیا ہوا ہے بلکہ اس راہ میں حد سے زیادہ آگے قدم رکھ دیا ہے مثلاً اگر سیّد صاحب کے پاس آگ کی تاثیر کا ذکر کیا جائے تو وہ ہرگز اس سے منکر نہیں ہونگے اور ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ اگر کسی کا جلنا مقدر ہے تو بغیر آگ کے بھی جل رہے گا۔ تو پھر مَیں حیران ہوں کہ وہ باوجود مسلمان ہونے کے دُعا کی تاثیروں سے جو آگ کی طرح کبھی اندھیرے کو روشن کر دیتی ہیں اور کبھی گستاخ دست انداز کا ہاتھ جلا دیتی ہیں کیوں منکر ہیں۔ کیا ان کو دعاؤں کے وقت تقدیر یاد آجاتی ہے اور جب آگ وغیرہ کا ذکر کریں تو پھر تقدیر بھول جاتی ہے؟ کیا ان دونوں چیزوں پر ایک ہی تقدیر حاوی نہیں ہے؟ پھر جس حالت میں باوجود تقدیر ماننے کے وہ اسبابِ مؤثرہ کو اس شدّت سے مانتے ہیں کہ اس کے غلوّ میں وہ بدنام بھی ہو گئے تو پھر اس کا کیا موجب ہے کہ وہ نظام قدرت جس کو وہ تسلیم کر چکے ہیں دعا میں اُن کو یاد نہیں رہا۔ یہاں تک کہ مکھی میں تو کچھ تاثیر ہے مگر دُعا میں اتنی بھی نہیں۔ پس اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کوچے سے بے خبر ہیں اور نہ ذاتی تجربہ اور نہ تجربہ والوں کی اُن کو صحبت ہے

اب ہم فائدہ عام کیلئے کچھ استجابت دعا کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سو واضح ہو کہ استجابت دعا کا مسئلہ درحقیقت دُعا کے مسئلہ کی ایک فرع ہے۔ اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس شخص نے اصل کو سمجھا ہُوا نہیں ہوتا اس کو فرع کے سمجھنے میں پیچیدگیاں واقع ہوتی ہیں۔ اور دھوکے لگتے ہیں۔ بس یہی سبب سیّد صاحب کی غلط فہمی کا ہے۔ اور دعا کی ماہیت یہ ہے کہ

ایک سعید بندہ اور اُس کے ربّ میں ایک تعلق جاذبہ ہے۔ یعنی پہلے خدا تعالیٰ کی رحمانیت بندہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ پھر بندہ کے صدق کی کششوں سے خدا تعالیٰ اُس سے نزدیک ہو جاتا ہے اور دُعا کی حالت میں وہ تعلق ایک خاص مقام پر پہنچکر اپنے خواص عجیبہ پیدا کرتا ہے۔ سو جس وقت بندہ کسی سخت مشکل میں مبتلا ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف کامل یقین اور کامل اُمید اور کامل محبت اور کامل وفاداری اور کامل ہمت کے ساتھ جھکتا ہے اور نہایت درجہ کا بیدار ہو کر غفلت کے پردوں کو چیرتا ہُوا فنا کے میدانوں میں آگے سے آگے نکل جاتا ہے پھر آگے کیا دیکھتا ہے کہ بارگاہِ الوہیت ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ تب اس کی رُوح اس آستانہ پر سر رکھ دیتی ہے اور قوتِ جذب جو اُسکے اندر رکھی گئی ہے وہ خدا تعالیٰ کی عنایات کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ تب اللہ جلّشانہ اس کام کے پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس دُعا کا اثر اُن تمام مبادی اسباب پر ڈالتا ہے جن سے ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں جو اس مطلب کے حاصل ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً اگر بارش کے لئے دعا ہے تو بعد استجابت دُعا کے وہ اسباب طبعیہ جو بارش کے لئے ضروری ہوتے ہیں اس دعا کے اثر سے پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور اگر قحط کے لئے بار دعا ہے تو قادرِ مطلق مخالفانہ اسباب کو پیدا کر دیتا ہے۔ اِسی وجہ سے یہ بات اربابِ کشف اور کمال کے نزدیک بڑے بڑے تجارب سے ثابت ہو چکی ہے کہ کامل کی دُعا میں ایک قوتِ تکوین پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی باذنہٖ تعالیٰ وہ دعا عالمِ سفلی اور علوی میں تصرف کرتی ہے اور عناصر اور اجرامِ فلکی اور انسانوں کے دلوں کو اس طرف لے آتی ہے جو طرف مؤید مطلوب ہے۔

خدا تعالیٰ کی پاک کتابوں میں اس کی نظیریں کچھ کم نہیں ہیں۔ بلکہ اعجاز کی بعض اقسام کی حقیقت بھی دراصل استجابت دعا ہی ہے اور جسقدر ہزاروں معجزات انبیاء سے ظہور میں آئے ہیں یا جو کچھ کہ اولیاء اِن دنوں تک عجائب کرامات دکھلاتے رہے اس کا اصل اور منبع یہی دعا ہے اور اکثر دعاؤں کے اثر سے ہی طرح طرح کے خوارق قدرتِ قادر کا تماشا دکھلا رہے ہیں۔ وہ جو عرب کے بیابانی ملک میں ایک عجیب ماجرا گذرا کہ لاکھوں مُردے تھوڑے دنوں میں زندہ ہو گئے اور پشتوں کے بگڑے ہوئے الٰہی رنگ پکڑ گئے اور آنکھوں کے اندھے بینا ہوئے اور گونگوں کی زبان پر الٰہی معارف جاری ہوئے اور دنیا میں ایک دفعہ ایک ایسا انقلاب پیدا ہُوا کہ نہ پہلے اس سے کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سُنا۔ کچھ جانتے ہو کہ وہ کیا تھا؟ **وہ ایک فانی فی اللہ** کی اندھیری راتوں کی دُعائیں ہی تھیں جنہوں نے دنیا میں شور مچا دیا اور وہ عجائب

باتیں دکھلائیں کہ جو اس اُمّی بے کس سے محالات کی طرح نظر آتی تھیں۔ اللّٰھم صلّ وسلّم وبارک علیہ وآلہ بعدد ھمّہ وغمّہ وحزنہ لِھٰذہ الامّۃ وأنزِلْ علیہ انوار رحمتک الی الابد۔ اور مَیں اپنے ذاتی تجربہ سے بھی دیکھ رہا ہوں کہ دعاؤں کی تاثیر آب و آتش کی تاثیر سے بڑھ کر ہے بلکہ اسباب طبعیہ کے سلسلہ میں کوئی چیز ایسی عظیم التاثیر نہیں جیسی کہ دُعا ہے۔

اور اگر یہ شبہ ہو کہ بعض دعائیں خطا جاتی ہیں اور اُن کا کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا تو مَیں کہتا ہوں کہ یہی حال دواؤں کا بھی ہے۔ کیا دواؤں نے موت کا دروازہ بند کر دیا ہے؟ یا اُن کا خطا جانا غیر ممکن ہے؟ مگر کیا باوجود اسبات کے کوئی اُن کی تاثیر سے انکار کر سکتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ ہر ایک امر پہ تقدیر محیط ہو رہی ہے۔ مگر تقدیر نے علوم کو ضائع اور بے حرمت نہیں کیا اور نہ اسباب کو بے اعتبار کر کے دکھلایا۔ بلکہ اگر غور کر کے دیکھو تو یہ جسمانی اور رُوحانی اسباب بھی تقدیر سے باہر نہیں ہیں۔ مثلاً اگر ایک بیمار کی تقدیر نیک ہو تو اسباب تقدیر علاج پورے طور پر میسّر آ جاتے ہیں اور جسم کی حالت بھی ایسے درجے پر ہوتی ہے کہ وہ اُن سے نفع اٹھانے پر مستعد ہوتا ہے۔ تب دوا نشانہ کی طرح جا کر اثر کرتی ہے۔ یہی قاعدہ دُعا کا بھی ہے۔ یعنی دعا کے لئے بھی تمام اسباب و شرائط قبولیت اسی جگہ جمع ہوتے ہیں جہاں ارادۂ الٰہی اس کے قبول کرنے کا ہے۔ خدا تعالےٰ نے اپنے نظام جسمانی اور روحانی کو ایک ہی سلسلۂ مؤثرات اور متاثرات میں باندھ رکھا ہے۔ پس سیّد صاحب کی سخت غلطی ہے کہ وہ نظام جسمانی کا تو اقرار کرتے ہیں مگر نظام روحانی سے منکر ہو بیٹھے ہیں۔

بالآخر مَیں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر سیّد صاحب اپنے اس غلط خیال سے توبہ نہ کریں اور یہ کہیں کہ دعاؤں کے اثر کا ثبوت کیا ہے تو مَیں ایسی غلطیوں کے نکالنے کے لئے مامور ہوں۔ مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی بعض دعاؤں کی قبولیت سے پیش از وقت سیّد صاحب کو اطلاع دوں گا اور نہ صرف اطلاع بلکہ چھپوا دونگا۔ مگر سیّد صاحب ساتھ ہی یہ بھی اقرار کریں کہ وہ بعد ثابت ہو جانے میرے دعویٰ کے اپنے اس غلط خیال سے رجوع کریں گے۔

سیّد صاحب کا یہ قول ہے کہ گویا قرآن کریم میں خدا تعالیٰ نے تمام دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے حالانکہ تمام دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ یہ اُن کی سخت غلط فہمی ہے اور یہ آیت اُدعونی استجب لکم ان کے مدعا کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ کیونکہ یہ دُعا جو آیت ادعونی استجب لکم میں بطور امر کے بجا لانے کے لئے فرمائی گئی ہے اس سے مراد معمولی دُعائیں نہیں ہیں بلکہ وہ عبادت ہے جو انسان پر فرض کی گئی ہے۔ کیونکہ امر کا صیغہ یہاں فرضیت پر

دلالت کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کل دُعائیں فرض میں داخل نہیں ہیں۔ بلکہ بعض جگہ اللہ جلّشانہٗ نے صابرین کی تعریف کی ہے جو اِنَّا لِلّٰہِ پر کفایت کرتے ہیں۔ اور اس دُعا کی فرضیت پر بڑا قرینہ یہ ہے کہ صرف امر پر ہی کفایت نہیں کی گئی بلکہ اُس کو عبادت کے لفظ سے یاد کر کے بحالت نافرمانی عذابِ جہنم کی وعید اس کے ساتھ لگا دی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ دوسری دعاؤں میں یہ وعید نہیں بلکہ بعض اوقات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دُعا مانگنے پر زجر و توبیخ کی گئی ہے۔ چنانچہ اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ اسپر شاہد ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہر دعا عبادت ہوتی تو حضرت نوح علیہ السلام کو لَا تَسْئَلْنِ کا تازیانہ کیوں لگایا جاتا اور بعض اوقات اولیاء اور انبیاء دُعا کرنے کو سوءِ ادب سمجھتے رہے ہیں اور صلحاء نے ایسی دعاؤں میں استفتاءِ قلب پر عمل کیا ہے یعنی اگر مصیبت کے وقت دل نے دعا کرنے کا فتویٰ دیا تو دُعا کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اگر صبر کے لئے فتویٰ دیا تو پھر صبر کیا اور دُعا سے مُنہ پھیر لیا۔ ماسوا اس کے اللہ تعالیٰ نے دوسری دعاؤں میں قبول کرنے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ صاف فرما دیا ہے کہ چاہوں تو قبول کروں اور چاہوں تو ردّ کروں۔ جیسا کہ یہ آیت قرآن کی صاف بتلا رہی ہے اور وہ یہ ہے۔ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (سورۃ انعام الجزو نمبر ۷) اور اگر ہم تنزلاً مان بھی لیں کہ اس مقام میں لفظ اُدْعُوْا سے عام طور پر دُعا ہی مراد ہے تو ہم اس بات کے ماننے سے چارہ نہیں دیکھتے کہ یہاں دُعا سے وہ دُعا مراد ہے جو بجمیع شرائط ہو۔ اور تمام شرائط کو جمع کر لینا انسان کے اختیار میں نہیں جب تک توفیق ازلی یاور نہ ہو۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ دعا کرنے میں صرف تضرع کافی نہیں ہے بلکہ تقویٰ اور طہارت اور راست گوئی اور کامل یقین اور کامل محبت اور کامل توجہ اور یہ کہ جو شخص اپنے لئے دعا کرتا ہے یا جس کے لئے دُعا کی گئی ہے اُس کی دنیا اور آخرت کے لئے اسبات کا حاصل ہونا خلاف مصلحت الٰہی بھی نہ ہو۔ کیونکہ بسا اوقات دعا میں اور شرائط تو سب جمع ہو جاتے ہیں مگر جس چیز کو مانگا گیا ہے وہ عنداللہ سائل کے لئے خلاف مصلحت الٰہی ہوتی ہے اور اس کے پورا کرنے میں خیر نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کسی ماں کا پیارا بچہ بہت الحاح اور رونے سے یہ چاہے کہ وہ آگ کا ٹکڑا یا سانپ کا بچہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دے یا ایک زہر جو بظاہر خوبصورت معلوم ہوتی ہے اس کو کھلا دے تو یہ سوال اس بچہ کا ہرگز اس کی ماں پورا نہ کرے گی۔ اور اگر پورا کر دیوے اور اتفاقاً بچہ کی جان بچ جاوے لیکن کوئی عضو اس کا بے کار ہو جاوے تو بلوغ کے بعد وہ بچہ اپنی اس احمق والدہ کا سخت شاکی ہوگا۔

اور بجز اس کے اور بھی کئی شرائط ہیں کہ جب تک وہ تمام جمع نہ ہوں اس وقت تک دعا کو دعا نہیں کہہ سکتے۔ اور جب تک کسی دُعا میں پوری روحانیت داخل نہ ہو اور جس کے لئے دعا کی گئی ہے اور جو دُعا کرتا ہے اُن میں استعدادِ قریبہ پیدا نہ ہو تب تک توقع اثرِ دُعا اُمیدِ موہوم ہے۔ اور جب تک ارادۂ الٰہی قبولیتِ دُعا کے متعلق نہیں ہوتا تب تک یہ تمام شرائط جمع نہیں ہوتیں اور ہمتیں پُوری توجہ سے قاصر رہتی ہیں۔ سیّد صاحب اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ دارِ آخرت کی سعادتیں اور نعمتیں اور لذتیں اور راحتیں جن کی نجات سے تعبیر کی گئی ہے ایمان اور ایمانی دعاؤں کا نتیجہ ہیں۔ پھر جبکہ یہ حال ہے تو سیّد صاحب کو ماننا پڑا کہ بلاشبہ ایک مومن کی دعائیں اپنے اندر اثر رکھتی ہیں اور آفات کے دُور ہونے اور مرادات کے حاصل ہونے کا موجب ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اگر موجب نہیں ہو سکتیں تو پھر کیا وجہ کہ قیامت میں موجب ہو جائیں گی۔

سوچو اور خوب سوچو کہ اگر درحقیقت دُعا ایک بے تاثیر چیز ہے اور دنیا میں کسی آفت کے دُور ہونے کا موجب نہیں ہو سکتی تو کیا وجہ کہ قیامت کو موجب ہو جائیگی یہ بات تو نہایت صاف ہے کہ اگر ہماری دعاؤں میں آفات سے بچنے کے لئے درحقیقت کوئی تاثیر ہے تو وہ تاثیر اس دنیا میں بھی ظاہر ہونی چاہیئے تا ہمارا یقین بڑھے اور اُمید بڑھے اور تا آخرت کی نجات کے لئے ہم زیادہ سرگرمی سے دعائیں کریں۔ اور اگر درحقیقت دعا کچھ چیز نہیں صرف پیشانی کا نوشتہ پیش آتا ہے۔ تو جیسا دنیا کی آفات کے لئے بقول سیّد صاحب کے دُعا عبث ہے اسی طرح آخرت کے لئے بھی عبث ہوگی اور اس پر امید رکھنا طمعِ خام۔

(برکات الدعاء ص ۵-۱۴)

ایک بچہ جب بھوک سے بیتاب ہو کر دودھ کے لئے چلّاتا اور چیختا ہے تو ماں کے پستان میں دودھ جوش مار کر آجاتا ہے۔ بچہّ دُعا کا نام بھی نہیں جانتا۔ لیکن اُس کی چیخیں دودھ کو کیونکر کھینچ لاتی ہیں؟ اس کا ہر ایک کو تجربہ ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ مائیں دودھ کو محسوس بھی نہیں کرتیں مگر بچہّ کی چلّاہٹ ہے کہ دودھ کو کھینچ لاتی ہے۔ تو کیا ہماری چیخیں جب اللہ تعالیٰ کے حضور ہوں تو وہ کچھ نہیں کھینچ کر لا سکتیں! آتا ہے اور سب کچھ آتا ہے مگر آنکھوں کے اندھے جو فاضل اور فلاسفر بنے بیٹھے ہیں وہ دیکھ نہیں سکتے۔ بچہ کو جو مناسبت ماں سے ہے اس تعلّق اور رشتہ کو انسان اپنے ذہن میں رکھ کر اگر دُعا کی فلاسفی پر غور کرے تو بہت آسان اور سہل معلوم ہوتی ہے۔

دوسری قسم کا رحم یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایک رحم مانگنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ مانگتے جاؤ ملتا جائیگا اُدعونی استجب لکم کوئی لفّاظی نہیں بلکہ یہ انسانی سرشت کا ایک لازمہ ہے۔ مانگنا انسان کا

خاصہ ہے اور استجابت اللہ تعالیٰ کا۔ جو نہیں سمجھتا اور نہیں مانتا وہ جھوٹا ہے۔ بچّہ کی مثال جو مَیں نے بیان کی ہے وہ دُعا کی فلاسفی خوب حل کر کے دکھاتی ہے۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۱۲۳)

ابتلاؤں میں ہی دعاؤں کے عجیب و غریب خواص اور اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارا خدا تو دُعاؤں ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۲۰۱)

دُعا بڑی عجیب چیز ہے مگر افسوس یہ ہے کہ نہ دعا کرنے والے آداب دعا سے واقف ہیں۔ اور نہ اس زمانہ میں دعا کرنے والے ان طریقوں سے واقف ہیں جو قبولیتِ دعا کے ہوتے ہیں۔ بلکہ اصل تو یہ ہے کہ دُعا کی حقیقت ہی سے بالکل اجنبیت ہوگئی ہے۔ بعض ایسے ہیں جو سرے سے دُعا کے منکر ہیں اور جو دعا کے منکر تو نہیں مگر اُن کی حالت ایسی ہوگئی ہے کہ چونکہ اُن کی دُعائیں بوجہ آدابِ دُعا سے ناواقفیت کے قبول نہیں ہوتی ہیں کیونکہ دُعا اپنے اصل معنوں میں دُعا ہوتی ہی نہیں اسلئے وہ منکرین دُعا سے بھی گری ہوئی حالت میں ہیں۔ اُن کی عملی حالت نے دوسروں کو دہریت کے قریب پہنچا دیا ہے۔ دُعا کے لئے سب سے اوّل اس امر کی ضرورت ہے کہ دُعا کرنیوالا کبھی تھک کر مایوس نہ ہو جاوے اور اللہ تعالیٰ پر یہ سوءِ ظن نہ کر بیٹھے کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ اس قدر دُعا کی گئی کہ جب مقصد کا شگوفہ سرسبز ہونے کے قریب ہوتا ہے دُعا کرنے والے تھک گئے ہیں جس کا نتیجہ ناکامی اور نامرادی ہوگیا ہے اور اس نامرادی نے یہاں تک بُرا اثر پہنچایا کہ دُعا کی تاثیرات کا انکار شروع ہؤا اور رفتہ رفتہ اس درجہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ پھر خدا کا بھی انکار کر بیٹھتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ اگر خدا ہوتا اور وہ دعاؤں کو قبول کرنے والا ہوتا تو اسقدر عرصہ دراز تک جو دعائیں کی گئیں کیوں قبول نہ ہوئیں؟ مگر ایسا خیال کرنے والا اور ٹھوکر کھانے والا انسان اگر اپنے عدمِ استقلال اور تلون کو سوچے تو اُسے معلوم ہوجائے کہ ساری نامرادیاں اُس کی اپنی ہی جلد بازی اور شتاب کاری کا نتیجہ ہیں جن پر خدا کی قوتوں اور طاقتوں کے متعلق بدظنّی اور نامراد کرنیوالی مایوسی بڑھ گئی۔ پس کبھی تھکنا نہیں چاہیئے۔

دُعا کی ایسی ہی حالت ہے جیسے ایک زمیندار باہر جا کر اپنے کھیت میں ایک بیج بو آتا ہے اب بظاہر تو یہ حالت ہے کہ اُس نے اچھے بھلے اناج کو مٹی کے نیچے دبا دیا۔ اسوقت کوئی کیا سمجھ سکتا ہے کہ یہ دانہ ایک عمدہ درخت کی صورت میں نشو و نما پا کر پھل لائے گا۔ باہر کی دنیا اور

خود زمیندار بھی نہیں دیکھ سکتا کہ یہ دانہ اندر ہی اندر زمین میں ایک پودہ کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ تھوڑے دنوں کے بعد وہ دانہ گل کر اندر ہی اندر پودا بننے لگتا ہے اور تیار ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا سبزہ اوپر نکل آتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ اب دیکھو وہ دانہ جس وقت سے زمین کے نیچے ڈالا گیا تھا۔ دراصل اُسی ساعت سے وہ پودا بننے کی تیاری کرنے لگ گیا تھا مگر ظاہر بین نگاہ اس سے کوئی خبر نہیں رکھتی۔ اور اب جبکہ اس کا سبزہ باہر نکل آیا تو سب نے دیکھ لیا۔ لیکن ایک نادان بچہ اُسوقت یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس کو اپنے وقت پر پھل لگیگا۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ کیوں اُسی وقت اُس کو پھل نہیں لگتا مگر عقلمند زمیندار خوب سمجھتا ہے کہ اس کے پھل کا کونسا موقعہ ہے۔ وہ صبر سے اس کی نگرانی کرتا ہے اور غور و پرداخت کرتا رہتا ہے اور اِس طرح پر وہ وقت آجاتا ہے کہ جب اُس کو پھل لگتا ہے اور وہ پک بھی جاتا ہے۔

یہی حال دُعا کا ہے اور بعینہٖ اِسی طرح دُعا نشو و نما پاتی اور مثمر بثمرات ہوتی ہے۔ جلد باز پہلے ہی تھک کر رہ جاتے ہیں اور صبر کرنے والے مآل اندیش استقلال کے ساتھ لگے رہتے ہیں اور اپنے مقصد کو پا لیتے ہیں۔ یہ سچی بات ہے کہ دُعا میں بڑے بڑے مراحل اور مراتب ہیں جن کی ناواقفیت کی وجہ سے دُعا کرنے والے اپنے ہاتھ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کو ایک جلدی لگ جاتی ہے اور وہ صبر نہیں کر سکتے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کے کاموں میں ایک تدریج ہوتی ہے۔ دیکھو یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آج انسان شادی کرے تو کل اُس کے گھر بچہ پیدا ہو جاوے۔ حالانکہ وہ قادر ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ مگر جو قانون اور نظام اس نے مقرر کر دیا ہے وہ ضروری ہے۔ پہلے نباتات کی نشو و نما کی طرح کچھ پتہ ہی نہیں لگتا۔ چار مہینے تک کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتا۔ پھر کچھ حرکت محسوس ہونے لگتی ہے اور پوری میعاد گذرنے پر بہت بڑی تکالیف برداشت کرنے کے بعد بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بچہ کا پیدا ہونا ماں کا بھی ساتھ ہی پیدا ہونا ہوتا ہے۔ مرد شائد ان تکالیف اور مصائب کا اندازہ نہ کر سکیں جو اس مدت حمل کے درمیان عورت کو برداشت کرنی پڑتی ہیں مگر یہ سچی بات ہے کہ عورت کی بھی ایک نئی زندگی ہوتی ہے۔ اب غور کرو کہ اولاد کیلئے پہلے ایک موت خود اس کو قبول کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر اس خوشی کو دیکھتی ہے۔ اِسی طرح پر دعا کرنے والے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ تلون اور عجلت کو چھوڑ کر ساری تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے۔ اور کبھی بھی یہ وہم نہ کرے کہ دُعا قبول نہیں ہوئی آخر آنیوالا زمانہ آجاتا ہے۔ دُعا کے نتیجہ کے پیدا ہونے کا وقت پہنچ جاتا ہے۔ جبکہ گویا مراد کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ دعا کو پہلے ضروری ہے کہ اس مقام اور حد تک پہنچایا جاوے

جہاں پہنچکر وہ نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ جس طرح پر آتشی شیشے کے نیچے کپڑا رکھدیتے ہیں اور سورج کی شعاعیں اس شیشے پر آکر جمع ہوتی ہیں اور ان کی حرارت اور حدّت اس مقام تک پہنچ جاتی ہے جو اس کپڑے کو جلا دے پھر یکایک وہ کپڑا جل اُٹھتا ہے۔ اسی طرح پر ضروری ہے کہ دعا اس مقام تک پہنچے جہاں اس میں وہ قوت پیدا ہو جاوے کہ نامرادیوں کو جلا دے اور مقصد مراد کو پورا کرنیوالی ثابت ہو جاوے ؎ پیدا است ندا را کہ بلند است جنابت

مدت دراز تک انسان کو دعاؤں میں لگے رہنا پڑتا ہے۔ آخر خدا تعالیٰ ظاہر کر دیتا ہے۔ مَیں نے اپنے تجربہ سے دیکھا ہے اور گذشتہ راستبازوں کا تجربہ بھی اسپر شہادت دیتا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں دیر تک خاموشی کرے تو کامیابی کی امید ہوتی ہے لیکن جس امر میں جلد جواب مل جاتا ہے وہ ہونیوالا نہیں ہوتا۔ عام طور پر ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ایک سائل جب کسی کے دروازہ پر مانگنے کے لئے جاتا ہے اور نہایت اضطراب اور عاجزی سے مانگتا ہے اور کچھ دیر تک جھڑکیاں کھا کر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا اور سوال کئے ہی جاتا ہے تو آخر اس کو بھی کچھ شرم آ ہی جاتی ہے خواہ کتنا ہی بخیل کیوں نہ ہو پھر بھی کچھ نہ کچھ سائل کو دے ہی دیتا ہے۔ تو کیا دُعا کرنے والے کا ایک معمولی سائل جتنا بھی استقلال نہیں ہونا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ جو کریم ہے اور حیا رکھتا ہے جب دیکھتا ہے کہ اس کا عاجز بندہ ایک عرصہ سے اس کے آستانہ پر گرا ہُوا ہے تو کبھی اس کا انجام بد نہیں کرتا۔ جیسے ایک حاملہ عورت چار یا پانچ ماہ کے بعد کہے کہ اب بچہ پیدا کیوں نہیں ہوتا۔ اور اس خواہش میں کوئی مسقط دوائی کھا لے تو اس وقت کیا بچہ پیدا ہوگا یا ایک مایوسی بخش حالت میں خود مبتلا ہوگی؟ اسی طرح جو شخص قبل از وقت جلدی کرتا ہے وہ نقصان ہی اُٹھاتا ہے۔ اور نہ نِرا نقصان بلکہ ایمان کو بھی صدمہ پہنچ جاتا ہے۔ بعض ایسی حالت میں دہریہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں ایک نجّار تھا اس کی عورت بیمار ہوئی۔ آخر وہ مر گئی اور اُس نے کہا۔ اگر خدا ہوتا تو مَیں نے اتنی دعائیں کی تھیں وہ قبول ہو جاتیں اور میری عورت نہ مرتی۔ اس طرح پر وہ دہریہ ہو گیا۔ لیکن سعید اگر اپنے صدق اور اخلاص سے کام لے تو اُسکا ایمان بڑھتا اور سب کچھ ہو بھی جاتا ہے۔ زمین کی دولتیں خدا تعالےٰ کے آگے کیا چیز ہیں۔ وہ ایک دم میں سب کچھ کر سکتا ہے۔ کیا دیکھا نہیں کہ اس نے اس قوم کو جس کو کوئی جانتا بھی نہ تھا بادشاہ بنا دیا اور بڑی بڑی سلطنتوں کو ان کا تابع فرمان بنا دیا اور غلاموں کو بادشاہ بنا دیا۔ انسان اگر تقویٰ اختیار کرے خدا تعالیٰ کا ہو جاوے تو دنیا میں اعلیٰ درجہ کی زندگی ہو۔ مگر شرط یہی ہے کہ صادق اور جوانمرد ہو کر دکھائے دل متزلزل نہ ہو اور اس میں کوئی آمیزش ریاء کاری و شرک کی نہ ہو۔ ابراہیم علیہ السلام

میں وہ کیا بات تھی جس نے اس کو ابوالملّت اور ابوالحنفاء قرار دیا اور خدا تعالیٰ نے اس کو اس قدر عظیم الشان برکتیں دیں کہ شمار میں نہیں آسکتیں یہی صدق اور اخلاص تھا۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام نے ایک دُعا کی تھی کہ اُس کی اولاد میں سے عرب میں ایک نبی ہو۔ پھر کیا وہ اُسی وقت قبول ہو گئی؟ ابراہیمؑ کے بعد ایک عرصہ دراز تک کسی کو خیال بھی نہیں آیا کہ اُس دُعا کا کیا اثر ہُوا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی صورت میں وہ دُعا پوری ہوئی۔ اور پھر کس شان کے ساتھ پوری ہوئی۔

(ملفوظات جلد چہارم ص۴۱۵-۴۲۰)

یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ دُعا کا قبول ہونا دو طور سے ہوتا ہے ایک بطور ابتلاء۔ اور ایک بطور اصطفاء۔ بطور ابتلاء تو کبھی کبھی گنہگاروں اور نافرمانوں اور بلکہ کافروں کی دُعا بھی قبول ہو جاتی ہے مگر ایسا قبول ہونا حقیقی قبولیت پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ از قبیل استدراج و امتحان ہوتا ہے۔ لیکن جو بطور اصطفاء دعا قبول ہوتی ہے اُس میں یہ شرط ہے کہ دعا کرنے والا خدا تعالےٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہو اور چاروں طرف سے برگزیدگی کے انوار و آثار اُس میں ظاہر ہوں کیونکہ خدا تعالےٰ حقیقی قبولیت کے طور پر نافرمانوں کی دُعا ہرگز نہیں سُنتا ہے کہ جو اس کی نظر میں راستباز اور اس کے حکم پر چلنے والے ہیں۔ سو ابتلاء اور اصطفاء کی قبولیت ادعیہ میں مابہ الامتیاز ہے کہ جو ابتلاء کے طور پر قبول ہوتی ہے اس میں متقی اور خدا دوست ہونا شرط نہیں۔ اور نہ اس میں یہ ضرورت ہے کہ خدا تعالیٰ دعا کو قبول کر کے بذریعہ اپنے مکالمۂ خاص کے اُس کی قبولیت سے اطلاع بھی دیوے۔ اور نہ وہ دُعائیں ایسی اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہیں جن کا قبول ہونا ایک امر عجیب اور خارق عادت متصوّر ہو سکے لیکن جو دعائیں اصطفاء کی وجہ سے قبول ہوتی ہیں اُن میں یہ نشان ہوتے ہیں:-

اوّل یہ کہ دُعا کرنے والا متقی اور راستباز اور کامل فرد ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ بذریعہ مکالماتِ الٰہیہ اس دُعا کی قبولیت سے اُس کو اطلاع دی جاتی ہے۔

تیسری یہ کہ اکثر وہ دعائیں جو قبول کی جاتی ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کی اور پیچیدہ کاموں کے متعلق ہوتی ہیں جن کی قبولیت سے کھل جاتا ہے کہ یہ انسان کا کام اور تدبیر نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کا ایک خاص نمونہ قدرت ہے جو خاص بندوں پر ظاہر ہوتا ہے۔

چوتھی یہ کہ ابتلائی دعائیں تو کبھی کبھی شاذ و نادر کے طور پر قبول ہوتی ہیں لیکن اصطفائی دعائیں کثرت سے قبول ہوتی ہیں۔ بسا اوقات صاحب اصطفائی دُعا کا ایسی بڑی بڑی مشکلات میں پھنس جاتا ہے اور اگر اور شخص اُن میں مبتلاء ہو جاتا تو بجز خودکشی کے اور کوئی حیلہ اپنی جان بچانے

کیلئے ہرگز اُسے نظر نہ آتا۔ چنانچہ ایسا ہوتا بھی ہے کہ جب کبھی دنیا پرست لوگ جو خدا تعالیٰ سے مہجور و دُور ہیں بعض بڑی بڑی ہموم و غموم و امراض و اسقام و بلیّات لاینحل میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو آخر وہ بباعثِ ضعفِ ایمان خدائے تعالیٰ سے نا امید ہو کر کسی قسم کی زہر کھا لیتے ہیں یا کنوئیں میں گرتے ہیں یا بندوق وغیرہ سے خودکشی کر لیتے ہیں۔ لیکن ایسے نازک وقتوں میں صاحب اصطفاء کا بوجہ اپنی قوت ایمانی اور تعلقِ خاص کے خدا تعالیٰ کی طرف سے نہایت عجیب در عجیب مدد دیا جاتا ہے اور عنایتِ الٰہی ایک عجیب طور سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک محرم راز کا دل بے اختیار بول اٹھتا ہے کہ یہ شخص مؤید الٰہی ہے۔

پانچویں یہ کہ صاحب اصطفائی دعا کا مورد عنایتِ الٰہیہ کا ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اُس کے تمام کاموں میں اُس کا متولّی ہو جاتا ہے اور عشق الٰہی کا نور اور مقبولانہ کبریائی کی مستی اور رُوحانی لذّت یابی اور تنعّم کے آثار اس کے چہرہ میں نمایاں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ جلّشانہ فرماتا ہے۔ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (۸۳ تطفیف) اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

(تصدیق النّبی ص۴۳-۴۵)

غرض جبکہ ہماری رُوح ایک چیز کے طلب کرنے میں بڑی سرگرمی اور سوز و گداز کے ساتھ مبدءِ فیض کی طرف ہاتھ پھیلاتی ہے اور اپنے تئیں عاجز پا کر فکر کے ذریعہ سے کسی اَور جگہ سے روشنی ڈھونڈتی ہے تو درحقیقت ہماری وہ حالت بھی دعا کی ایک حالت ہوتی ہے۔ اِسی دُعا کے ذریعہ سے دنیا کی کل حکمتیں ظاہر ہوئی ہیں اور ہر ایک بیت العلم کی کنجی دعا ہی ہے اور کوئی علم اور معرفت کا دقیقہ نہیں جو بغیر اس کے ظہور میں آیا ہو۔ ہمارا سوچنا ہمارا فکر کرنا اور ہمارا طلب امرِ مخفی کے لئے خیال کو دوڑانا یہ سب امور دُعا ہی میں داخل ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ عارفوں کی دُعا آدابِ معرفت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور ان کی رُوح مبدءِ فیض کو شناخت کر کے بصیرت کے ساتھ اُس کی طرف ہاتھ پھیلاتی ہے اور محجوبوں کی دُعا صرف ایک سرگردانی ہے جو فکر اور غور اور طلبِ اسباب کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ سے ربطِ معرفت نہیں اور نہ اس پر یقین ہے وہ بھی فکر اور غور کے وسیلہ سے یہی چاہتے ہیں کہ غیب سے کوئی کامیابی کی بات اُن کے دل میں پڑ جائے۔ اور ایک عارف دعا کرنے والا بھی اپنے خدا سے یہی چاہتا ہے کہ کامیابی کی راہ اُس پر کھلے لیکن محجوب جو خدا تعالیٰ سے ربط نہیں رکھتا وہ مبدءِ فیض کو نہیں جانتا اور عارف کی طرح

اس کی طبیعت بھی سرگردانی کے وقت ایک اور جگہ سے مدد چاہتی ہے اور اسی مدد کے پانے کیلئے وہ فکر کرتا ہے۔ مگر عارف اس مبدء کو دیکھتا ہے۔ اور یہ تاریکی میں چلتا ہے اور نہیں جانتا کہ جو کچھ فکر اور خوض کے بعد دل میں پڑتا ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ متفکر کے فکر کو بطور دعا قرار دیکر بطور قبول دعا اس علم کو فکر کرنے والے کے دل میں ڈالتا ہے۔ غرض جو حکمت اور معرفت کا نکتہ فکر کے ذریعہ سے دل میں پڑتا ہے وہ بھی خدا سے ہی آتا ہے اور فکر کرنے والا اگرچہ نہ سمجھے مگر خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ مجھ سے ہی مانگ رہا ہے۔ سو آخر وہ خدا سے اس مطلب کو پاتا ہے۔ اور جیساکہ میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ یہ طریق طلب روشنی اگر علی وجہ البصیرت اور ہادیِ حقیقی کی شناخت کے ساتھ ہو تو یہ عارفانہ دعا ہے۔ اور اگر صرف فکر اور خوض کے ذریعہ سے یہ روشنی لامعلوم مبدء سے طلب کی جائے اور منوّرِ حقیقی کی ذات پر کامل نظر نہ ہو تو وہ محجوبانہ دعا ہے ......

....علاوہ اس کے جیساکہ تدبیر اور دعا کا باہمی رشتہ قانون قدرت کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے ایسا ہی صحیفۂ فطرت کی گواہی سے بھی یہی ثبوت ملتا ہے۔ جیساکہ دیکھا جاتا ہے کہ انسانی طبائع کسی مصیبت کے وقت جس طرح تدبیر اور علاج کی طرف مشغول ہوتی ہیں ایسا ہی طبعی جوش سے دعا اور صدقہ اور خیرات کی طرف جھک جاتی ہیں .... پس یہی ایک روحانی دلیل اس بات پر ہے کہ انسان کی شریعت باطنی نے بھی قدیم سے تمام قوموں کو یہی فتویٰ دیا ہے کہ وہ دُعا کو اسباب اور تدابیر سے الگ نہ کریں بلکہ دعا کے ذریعہ سے تدابیر کو تلاش کریں۔ غرض دعا اور تدبیر انسانی طبیعت کے دو طبعی تقاضے ہیں کہ جو قدیم سے اور جب سے کہ انسان پیدا ہوا ہے دو حقیقی بھائیوں کی طرح انسانی فطرت کے خادم چلے آئے ہیں۔ اور تدبیر دُعا کے لئے بطور نتیجۂ ضروریہ کے اور دُعا تدبیر کے لئے بطور محرک اور جاذب کے ہے اور انسان کی سعادت اِسی میں ہے کہ وہ تدبیر کرنے سے پہلے دعا کے ساتھ مبدءِ فیض سے مدد طلب کرے تا اس چشمۂ لازوال سے روشنی پا کر عمدہ تدبیریں میسّر آ سکیں

(ایّام الصلح صـ ۲-۳)

جو شخص مشکل اور مصیبت کے وقت خدا سے دعا کرتا اور اس سے حلِّ مشکلات چاہتا ہے۔ وہ بشرطیکہ دعا کو کمال تک پہنچا دے خدا تعالےٰ سے اطمینان اور حقیقی خوشحالی پاتا ہے۔ اور اگر بالفرض وہ مطلب اس کو نہ ملے تب بھی کسی اور قسم کی تسلّی اور سکینت خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کو عنایت ہوتی ہے اور وہ ہرگز ہرگز نامراد نہیں رہتا اور علاوہ کامیابی کے ایمانی قوت اس کی ترقی پکڑتی ہے اور یقین بڑھتا ہے۔ لیکن جو شخص دعا کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف مُنہ نہیں کرتا وہ ہمیشہ اندھا رہتا

ہے اور اندھا مرتا ہے۔ . . . . جو شخص روح کی سچائی سے دُعا کرتا ہے وہ ممکن نہیں کہ حقیقی طور پر نامراد رہ سکے۔ بلکہ وہ خوشحالی جو نہ صرف دولت سے مل سکتی ہے اور نہ حکومت اور نہ صحت سے بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے جس پیرایہ میں چاہے وہ عنایت کر سکتا ہے۔ ہاں وہ کامل دعاؤں سے عنایت کی جاتی ہے۔ اگر خدا تعالیٰ چاہتا ہے تو ایک مخلص صادق کو عین مصیبت کے وقت میں دُعا کے بعد وہ لذت حاصل ہو جاتی ہے جو ایک شہنشاہ کو تخت شاہی پر حاصل نہیں ہو سکتی۔ سو اسی کا نام حقیقی مرادیابی ہے جو آخر دُعا کرنے والوں کو ملتی ہے۔

(ایام الصلح ص۷-۸)

کیا یہ تسلی بخش ثبوت نہیں ہے کہ قدیم سے خدا تعالیٰ کا ایک روحانی قانونِ قدرت ہے کہ دُعا پر حضرت احدیت کی توجہ جوش مارتی ہے اور سکینت اور اطمینان اور حقیقی خوشحالی ملتی ہے۔ اگر ہم ایک مقصد کی طلب میں غلطی پر نہ ہوں تو وہی مقصد مل جاتا ہے اور اگر ہم اس خطا کار بچہ کی طرح جو اپنی ماں سے سانپ یا آگ کا ٹکڑہ مانگتا ہے اپنی دُعا اور سوال میں غلطی پر ہوں تو خدا تعالیٰ وہ چیز جو ہمارے لئے بہتر ہو عطا کرتا ہے اور باں ہمہ دونوں صورتوں میں ہمارے ایمان کو بھی ترقی دیتا ہے کیونکہ ہم دُعا کے ذریعہ سے پیش از وقت خدا تعالیٰ سے علم پاتے ہیں اور ایسا یقین بڑھتا ہے کہ گویا ہم اپنے خدا کو دیکھ لیتے ہیں اور دعا اور استجابت میں ایک رشتہ ہے کہ ابتدا سے اور جب سے کہ انسان پیدا ہوا برابر چلا آتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کا ارادہ کسی بات کے کرنے کے لئے توجہ فرماتا ہے تو سنت اللہ یہ ہے کہ اس کا کوئی مخلص بندہ اضطرار اور کرب اور قلق کے ساتھ دُعا کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنی تمام ہمت اور تمام توجہ اس امر کے ہو جانے کیلئے مصروف کرتا ہے۔ تب اس مردِ فانی کی دعائیں فیوضِ الٰہی کو آسمان سے کھینچتی ہیں اور خدا تعالیٰ ایسے نئے اسباب پیدا کر دیتا ہے جن سے کام بن جائے۔

یہ دُعا اگرچہ بعالم ظاہر انسان کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ مگر درحقیقت وہ انسان خدا میں فانی ہوتا ہے۔ اور دُعا کرنے کے وقت میں حضرت احدیت و جلال میں ایسے فنا کے قدم سے آتا ہے کہ اس وقت وہ ہاتھ اس کا ہاتھ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی دعا ہے جس سے خدا پہچانا جاتا ہے اور اس ذوالجلال کی ہستی کا پتہ لگتا ہے جو ہزاروں پردوں میں مخفی ہے۔

(ایام الصلح ص۹-۱۰)

نادان خیال کرتا ہے کہ دُعا ایک لغو اور بیہودہ امر ہے مگر اسے معلوم نہیں کہ صرف ایک

دُعا ہی ہے جس سے خداوندِ ذوالجلال ڈھونڈنے والوں پر تجلّی کرتا ہے اور اَنَا القَادِر کا الہام ان کے دلوں پر ڈالتا ہے ہر ایک یقین کا بھوکا اور پیاسا یاد رکھے کہ اِس زندگی میں روحانی روشنی کے طالب کیلئے صرف دُعا ہی ایک ذریعہ ہے جو خدا تعالیٰ کی ہستی پر یقین بخشتا اور تمام شکوک و شبہات دُور کر دیتا ہے۔

(ایّام الصلح ص۱۰)

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دُعا جو خدا تعالیٰ کے پاک کلام نے مسلمانوں پر فرض کی ہے اس کی فرضیت کے چار سبب ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ تا ہر ایک وقت اور ہر ایک حالت میں خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر توحید پر پختگی حاصل ہو۔ کیونکہ خدا سے مانگنا اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ مرادوں کا دینے والا صرف خدا ہے (۲) دوسرے یہ کہ تا دُعا کے قبول ہونے اور مراد کے ملنے پر ایمان قوی ہو (۳) تیسرے یہ کہ اگر کسی اور رنگ میں عنایتِ الٰہی شاملِ حال ہو تو علم اور حکمت زیادت پکڑے (۴) چوتھے یہ کہ اگر دُعا کی قبولیت کا الہام اور رؤیا کے ساتھ وعدہ دیا جائے اور اُسی طرح ظہور میں آوے تو معرفتِ الٰہی ترقی کرے اور معرفت سے یقین اور یقین سے محبت اور محبت سے ہر ایک گناہ اور غیر اللہ سے انقطاع حاصل ہو جو حقیقی نجات کا ثمرہ ہے۔

(ایّام الصلح ص۱۲-۱۳)

سورۃ فاتحہ میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ دُعا میں مشغول رہیں۔ بلکہ دُعا اھدنا الصراط المستقیم سکھلائی گئی ہے اور فرض کیا گیا ہے کہ پنجوقت یہ دعا کریں۔ پھر کس قدر غلطی ہے کہ کوئی شخص دعا کی روحانیت سے انکار کرے۔ قرآن شریف نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ دعا اپنے اندر ایک روحانیت رکھتی ہے اور دُعا سے ایک فیض نازل ہوتا ہے جو طرح طرح کے پیرایوں میں کامیابی کا ثمرہ بخشتا ہے۔

ہماری تقریر مذکورہ بالا سے ہر ایک منصف سمجھ سکتا ہے کہ جس طرح باوجود تسلیم مسئلہ قضاء و قدر کے صدہا امور میں یہی سنّت اللہ ہے کہ جد و جہد سے ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔ اسی طرح دُعا میں بھی جو جد و جہد کی جائے وہ ہرگز ضائع نہیں جاتی۔ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں ایک جگہ پر اپنی شناخت کی یہ علامت ٹھہرائی ہے کہ تمہارا خدا وہ خدا ہے جو بیقراروں کی دعا سنتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے مَنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ ۔ پھر جبکہ خدا تعالےٰ نے دُعا کی قبولیت کو اپنی ہستی کی علامت ٹھہرائی ہے تو پھر کس طرح کوئی عقل اور حیا والا گمان کر سکتا ہے کہ دعا کرنے پر کوئی آثارِ صریحہ اجابت کے مترتب نہیں ہوتے اور محض ایک رسمی امر ہے جس میں کچھ بھی روحانیت نہیں؟

میرے خیال میں ہے کہ ایسی بے ادبی کوئی سچّے ایمان والا ہرگز نہیں کرے گا جبکہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے کہ جس طرح زمین و آسمان کی صنعت پر غور کرنے سے سچا خدا پہچانا جاتا ہے اسی طرح دُعا کی قبولیت کو دیکھنے سے خدا تعالیٰ پر یقین آتا ہے۔ پھر اگر دُعا میں کوئی روحانیت نہیں اور حقیقی اور واقعی طور پر دُعا پر کوئی نمایاں فیض نازل نہیں ہوتا تو کیونکر دُعا خدا تعالیٰ کی شناخت کا ایسا ذریعہ ہو سکتی ہے جیسا کہ زمین و آسمان کے اجرام و اجسام ذریعہ ہیں؟ بلکہ قرآن شریف سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اعلیٰ ذریعہ خداشناسی کا دُعا ہی ہے۔ اور خدا کی ہستی اور صفت کاملہ کی معرفت تامہ یقینیہ کاملہ صرف دعا سے ہی حاصل ہوتی ہے اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ وہ امر جو ایک بجلی کی چمک کی طرح ایک دفعہ انسان کو تاریکی کے گڑھے سے کھینچکر روشنی کی کھلی فضا میں لاتا اور خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے وہ دُعا ہی ہے۔ دُعا کے ذریعہ ہزاروں بدمعاش صلاحیت پر آجاتے ہیں اور ہزاروں بگڑے ہوئے درست ہو جاتے ہیں۔

(ایام الصلح ص ۲۸-۲۹)

جب اللہ تعالیٰ کا فضل قریب آتا ہے تو وہ دعا کی قبولیت کے اسباب بہم پہنچا دیتا ہے۔ دل میں ایک رقت اور سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب دعا کی قبولیت کا وقت نہیں ہوتا تو دل میں اطمینان اور رجوع پیدا نہیں ہوتا۔ طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالو مگر طبیعت متوجہ نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی خدا تعالیٰ اپنی قضا و قدر منوانا چاہتا ہے اور کبھی دعا قبول کرتا ہے اِس لئے مَیں تو جب تک اذنِ الٰہی کے آثار نہ پالوں قبولیت کی کم امید کرتا ہوں اور اُس کی قضاء و قدر پر اس سے زیادہ خوشی کے ساتھ جو قبولیت دُعا میں ہوتی ہے راضی ہو جاتا ہوں کیونکہ اس رضا بالقضاء کے ثمرات اور برکات اس سے بہت زیادہ ہیں۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۴۲)

یہ سچی بات ہے کہ جو شخص اعمال سے کام نہیں لیتا وہ دعا نہیں کرتا بلکہ خدا تعالیٰ کی آزمائش کرتا ہے۔ اس لئے دُعا کرنے سے پہلے اپنی تمام طاقتوں کو خرچ کرنا ضروری ہے اور یہی معنی اس دعا کے ہیں۔ پہلے لازم ہے کہ انسان اپنے اعتقاد اعمال میں نظر کرے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کی عادت ہے کہ اصلاح اسباب کے پیرایہ میں ہوتی ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسا سبب پیدا کر دیتا ہے کہ جو اصلاح کا موجب ہو جاتا ہے۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۱۱۸)

پنجابی میں ایک مثل ہے " جو منگے سو مر رہے مرے سو منگن جا " ۔ لوگ کہتے ہیں کہ دُعا کرو دُعا کرنا مرنا ہوتا ہے ۔ اِس پنجابی مصرعہ کے یہی معنے ہیں کہ جس پر نہایت درجہ کا اضطراب ہوتا ہے وہ دُعا کرتا ہے دُعا میں ایک موت ہے اور اُس کا بڑا اثر یہی ہوتا ہے کہ انسان ایک طرح سے مرجاتا ہے ۔ مثلاً ایک انسان ایک قطرہ پانی کا پی کر اگر دعوٰی کرے کہ میری پیاس بُجھ گئی ہے یا یہ کہ اُسے بڑی پیاس تھی تو وہ جھوٹا ہے ۔ ہاں اگر پیالہ بھر کر پیوے تو اس بات کی تصدیق ہوگی ۔ پوری سوزش اور گدازش کے ساتھ جب دعا کی جاتی ہے حتّٰی کہ رُوح گداز ہو کر آستانۂ الٰہی پر گر جاتی ہے اور اسی کا نام دُعا ہے اور الٰہی سنّت یہی ہے کہ جب ایسی دعا ہوتی ہے تو خداوند تعالیٰ یا تو اُسے قبول کرتا ہے اور یا اُسے جواب دیتا ہے ۔

(ملفوظات جلد چہارم صـ۳۴۰)

جب تو دُعا کے لئے کھڑا ہو تو تجھے لازم ہے کہ یہ یقین رکھے کہ تیرا خدا ہر ایک چیز پر قادر ہے تب تیری دعا منظور ہوگی اور تو خدا کی قدرت کے عجائبات دیکھیگا جو ہم نے دیکھے ہیں اور ہماری گواہی رؤیت سے ہے نہ بطور قصہ کے اُس شخص کی دُعا کیونکر منظور ہو اور خود کیونکر اس کو بڑی مشکلات کے وقت جو اس کے نزدیک قانون قدرت کے مخالف ہیں دُعا کرنے کا حوصلہ پڑے جو خدا کو ہر ایک چیز پر قادر نہیں سمجھتا ۔ مگر اے سعید انسان تو ایسا مت کر ۔ تیرا خدا وہ ہے جس نے بے شمار ستاروں کو بغیر ستون کے لٹکا دیا اور جس نے زمین و آسمان کو محض عدم سے پیدا کیا ۔ کیا تو اُس پر بدظنّی رکھتا ہے ۔ کہ وہ تیرے کام میں عاجز آجائیگا ۔ بلکہ تیری ہی بدظنی تجھے محروم رکھے گی ۔ ہمارے خدا میں بے شمار عجائبات ہیں مگر وہی دیکھتے ہیں جو صدق اور وفا سے اُس کے ہو گئے ہیں ۔ وہ غیروں کو جو اُس کی قدرتوں پر یقین نہیں رکھتے اور اس کے صادق وفادار نہیں ہیں وہ عجائبات ظاہر نہیں کرتا ۔

(کشتی نوح صـ۲۹)

جہاں تک مجھے خدا تعالیٰ نے دعاؤں کے بارے میں علم دیا ہے وہ یہ ہے کہ دُعا کے قبول ہونے کیلئے تین شرطیں ہیں : —

اوّل دعا کرنے والا کامل درجہ پر متقی ہو کیونکہ خدا تعالیٰ کا مقبول وہی بندہ ہوتا ہے جسکا شعار تقوٰی ہو اور جس نے تقوٰی کی باریک راہوں کو مضبوط پکڑا ہو ۔ اور جو امین متّقی اور صادق العہد ہونے کی وجہ سے منظور نظرِ الٰہی ہو ۔ اور محبّت ذاتیہ الٰہیہ سے معمور اور پُر ہو ۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کی عقدِ ہمت اور توجہ اس قدر ہو کہ گویا ایک شخص کے زندہ کرنے کے لئے ہلاک ہو جائے اور ایک شخص کو قبر سے باہر نکالنے کے لئے آپ گور میں داخل ہو ۔ اِس میں

راز یہ ہے کہ خدا تعالٰے کو اپنے مقبول بندے اس سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں* جیسا کہ ایک خوبصورت بچّہ جو ایک ہی ہو اس کی ماں کو پیارا ہوتا ہے۔ پس جبکہ خدائے رحیم و کریم دیکھتا ہے کہ ایک مقبول و محبوب اس کا ایک شخص کی جان بچانے کے لئے روحانی مشقتوں اور تضرعات اور مجاہدات کی وجہ سے اِس حد تک پہنچ گیا ہے کہ قریب ہے کہ اس کی جان نکل جائے تو اس کو علاقہ محبت کی وجہ سے ناگوار گذرتا ہے کہ اسی حال میں اُس کو ہلاک کر دے۔ تب اس کے لئے اس دوسرے شخص کا گناہ بخش دیتا ہے۔ جس کیلئے وہ پکڑا گیا تھا۔ پس اگر وہ کسی مہلک بیماری میں گرفتار ہے یا کسی اور بلا میں اسیر و لاچار ہے تو اپنی قدرت سے ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جس سے رہائی ہو جائے۔ اور بسا اوقات اُسکا ارادہ ایک شخص کے قطعی طور پر ہلاک کرنے یا برباد کرنے پر قرار یافتہ ہوتا ہے لیکن جب ایک مصیبت زدہ کی خوش قسمتی سے ایسا شخص پُردرد تضرعات کے ساتھ درمیان میں آپڑتا ہے جس کو حضرتِ عزّت میں وجاہت ہے تو وہ مسل مقدمہ جو سزا دینے کے لئے مکمل اور مرتب ہو چکی ہے چاک کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ اب بات اغیار سے یار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اور یہ کیونکر ہو سکے کہ خدا اپنے سچّے دوستوں کو عذاب دے۔

تیسری شرط استجابت دُعا کے لئے ایک ایسی شرط ہے جو تمام شرطوں سے مشکل تر ہے کیونکہ اس کا پورا کرنا خدا کے مقبول بندوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس شخص کے ہاتھ میں ہے جو دُعا کرانا چاہتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نہایت صدق اور کامل اعتقاد اور کامل یقین اور کامل ارادت اور کامل غلامی کے ساتھ دعا کا خواہاں ہو۔ اور یہ دل میں فیصلہ کرے کہ اگر دعا قبول بھی نہ ہو تاہم اس کے اعتقاد اور ارادت میں فرق نہیں آئیگا۔ اور دُعا کرانا آزمائش کے طور پر نہ ہو بلکہ سچے اعتقاد کے طور پر ہو اور نہایت نیازمندی سے اس کے دروازے پر گرے اور جہاں تک اس کے لئے ممکن ہے مال سے خدمت سے ہر ایک طور پر کی اطاعت سے ایسا قرب پیدا کرے کہ اس کے دل کے اندر داخل ہو جائے اور بایں ہمہ نہایت درجہ پر نیک ظن ہو اور اس کو نہایت درجہ کا متّقی سمجھے اور اس کے مقدس شان کے برخلاف ایک خیال بھی دل میں لانا کفر خیال کرے اور اس قسم کی طرح طرح کی جاں نثاری دکھا کر سچّے اعتقاد کو اس پر ثابت اور روشن کر دے اور اس کی مثل دنیا میں کسی کو بھی نہ سمجھے اور جان سے مال سے آبرو سے اُس پر فدا ہو جائے۔ اور کوئی کلمہ کسر شان کا کسی پہلو سے اس کی نسبت زبان پر نہ لائے اور نہ دل میں۔ اور اس بات کو اُس کی نظر میں بپایۂ ثبوت پہنچا دے کہ درحقیقت وہ ایسا ہی معتقد اور مرید ہے اور بایں ہمہ صبر سے انتظار کرے۔ اور اگر بیچاس دفعہ بھی اپنے کام میں نامراد

رہے تو پھر بھی اعتقاد اور یقین میں سُستی نہ ہو۔ کیونکہ یہ قوم سخت نازک دل ہوتی ہے اور اُن کی فراست چہرہ کو دیکھ کر پہچان سکتی ہے کہ یہ شخص کس درجہ کا اخلاص رکھتا ہے۔ اور یہ قوم باوجود نرم دل ہونے کے نہایت بے نیاز ہوتی ہے۔ اُن کے دل خدا نے ایسے بے نیاز پیدا کئے ہیں کہ متکبّر اور خودغرض اور منافق طبع انسان کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اس قوم سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اس قدر غلامانہ اطاعت اُن کی اختیار کرتے ہیں کہ گویا مر ہی جاتے ہیں۔ مگر وہ شخص جو قدم قدم پر بدظنّی کرتا ہے اور دل میں کوئی اعتراض رکھتا ہے اور پوری محبت اور ارادت نہیں رکھتا وہ بجائے فائدہ کے ہلاک ہوتا ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶۶-۶۸)

یہ بالکل سچ ہے کہ مقبولین کی اکثر دُعائیں منظور ہوتی ہیں بلکہ بڑا معجزہ اُن کا استجابتِ دُعا ہی ہے۔ جب ان کے دلوں میں کسی مصیبت کے وقت شدت سے بے قراری ہوتی ہے اور اس شدید بیقراری کی حالت میں وہ اپنے خدا کی طرف توجہ کرتے ہیں تو خدا اُن کی سُنتا ہے اور اس وقت ان کا ہاتھ گویا خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ خدا ایک مخفی خزانہ کی طرح ہے۔ کامل مقبولوں کے ذریعہ سے وہ اپنا چہرہ دکھلاتا ہے۔ خدا کے نشان تبھی ظاہر ہوتے ہیں جب اس کے مقبول ستائے جاتے ہیں۔ اور جب حد سے زیادہ اُن کو دکھ دیا جاتا ہے تو سمجھو کہ خدا کا نشان نزدیک ہے بلکہ دروازہ پر کیونکہ یہ وہ قوم ہے کہ کوئی اپنے پیارے بیٹے سے ایسی محبت نہیں کرے گا جیسا کہ خدا ان لوگوں سے کرتا ہے جو دل و جان سے اس کے ہو جاتے ہیں۔ وہ اُن کے لئے عجائب کام دکھلاتا ہے اور ایسی اپنی قوت دکھلاتا ہے کہ جیسا ایک سوتا ہوا شیر جاگ اٹھتا ہے۔ خدا مخفی ہے اور اس کے ظاہر کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ وہ ہزاروں پردوں کے اندر ہے اور اس کا چہرہ دکھلانے والی یہی قوم ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ خیال کہ مقبولین کی ہر ایک دعا قبول ہو جاتی ہے یہ سراسر غلط ہے۔ بلکہ حق بات یہ ہے کہ مقبولین کے ساتھ خدا تعالیٰ کا دوستانہ معاملہ ہے کبھی وہ اُن کی دعائیں قبول کر لیتا ہے اور کبھی وہ اپنی مشیئت اُن سے منوانا چاہتا ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ دوستی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بعض وقت ایک دوست اپنے دوست کی بات کو مانتا ہے اور اُس کی مرضی کے موافق کام کرتا ہے اور پھر دوسرا وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اپنی بات اس سے منوانا چاہتا ہے۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ ایک جگہ قرآن شریف میں مومنوں کی استجابتِ دُعا کا وعدہ کرتا ہے اور فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ یعنی تم

مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دُعا قبول کروں گا۔ اور دوسری جگہ اپنی نازل کردہ قضاء و قدر پر خوش اور راضی رہنے کی تعلیم کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ۔ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ پس ان دونوں آیتوں کو ایک جگہ پڑھنے سے صاف معلوم ہو جائیگا کہ دعاؤں کے بارے میں کیا سنّت اللہ ہے اور ربّ اور عبد کا کیا باہمی تعلق ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۸-۱۹)

بعض جاہل کہتے ہیں کہ کیوں کامل لوگوں کی بعض دُعائیں منظور نہیں ہوتیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کی تجلّیٔ حُسن کو خدا تعالیٰ نے اپنے اختیار میں رکھا ہُوا ہے۔ پس جس جگہ یہ تجلّی عظیم ظاہر ہو جاتی ہے اور کسی معاملہ میں اُن کا حسن جوش میں آتا ہے اور اپنی چمک دکھلاتا ہے تب اس چمک کی طرف ذرّاتِ عالم کھینچے جاتے ہیں اور غیر ممکن باتیں وقوع میں آتی ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں معجزہ کہتے ہیں۔ مگر یہ جوشِ روحانی ہمیشہ اور ہر جگہ ظہور میں نہیں آتا۔ اور تحریکات خارجیہ کا محتاج ہوتا ہے یہ اس لئے کہ جیسا کہ خدائے کریم بے نیاز ہے اس نے اپنے برگزیدوں میں بھی بے نیازی کی صفت رکھ دی ہے سو وہ خدا کی طرح سخت بے نیاز ہوتے ہیں اور جب تک کوئی پوری خاکساری اور اخلاص کے ساتھ ان کے رحم کے لئے ایک تحریک پیدا نہ کرے وہ قوت اُن کی جوش نہیں مارتی اور عجیب تر یہ کہ وہ لوگ تمام دنیا سے زیادہ تر رحم کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں مگر اس کی تحریک اُن کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ گو وہ بارہا چاہتے بھی ہیں کہ وہ قوت ظہور میں آوے مگر بجز ارادۂ الٰہیہ کے ظاہر نہیں ہوتی۔ بالخصوص وہ منکروں اور منافقوں اور سست اعتقاد لوگوں کی کچھ بھی پروا نہیں رکھتے اور ایک مرے ہوئے کیڑے کی طرح اُن کو سمجھتے ہیں۔ اور وہ بے نیازی اُن کی ایسی شان رکھتی ہے جیسا کہ ایک معشوق نہایت خوبصورت برقعہ میں اپنا چہرہ چھپائے رکھے اور اسی بے نیازی کا ایک شعبہ یہ ہے کہ جب کوئی شریر انسان ان پر بدظنی کرے تو بسا اوقات بے نیازی کے جوش سے اس بدظنی کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں کیونکہ تخلّق باخلاق اللہ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ کوئی معجزہ ان سے ظاہر ہو تو اُن کے دلوں میں ایک جوش پیدا کر دیتا ہے۔ اور ایک امر کے حصول کے لئے سخت کرب اور قلق اُن کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے تب وہ بے نیازی کا برقع اپنے

مُنہ پر سے اتار لیتے ہیں اور وہ حسن اُن کا جو بجز خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں دیکھتا وہ آسمان کے فرشتوں پر اور ذرّہ ذرّہ پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اور ان کا مُنہ پر سے برقع اٹھانا یہ ہے کہ وہ اپنے کامل صدق اور صفا کے ساتھ اور اس روحانی حسن کے ساتھ جس کی وجہ سے خدا کے محبوب ہو گئے ہیں اُس خدا کی طرف ایک ایسا خارق عادت رجوع کرتے ہیں اور ایک ایسے اقبال علی اللہ کی ان میں حالت پیدا ہو جاتی ہے جو خدا تعالیٰ کی فوق العادت رحمت کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ساتھ ہی ذرہ ذرہ اس عالم کا کھنچا چلا آتا ہے اور اُن کی عاشقانہ حرارت کی گرمی آسمان پر جمع ہوتی اور بادلوں کی طرح فرشتوں کو بھی اپنا چہرہ دکھا دیتی ہے۔ اور ان کی دردیں جو رعد کی خاصیت اپنے اندر رکھتی ہیں ایک سخت شور ملاء اعلیٰ میں ڈال دیتی ہیں۔ تب خدا تعالیٰ کی قدرت سے وہ بادل پیدا ہو جاتے ہیں جن سے رحمتِ الٰہی کا وہ مینہ برستا ہے۔ جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔ اُن کی روحانیت جب اپنے پورے سوز و گداز کے ساتھ کسی عقدہ کشائی کے لئے توجہ کرتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ بباعث اس کے جو خدا سے ذاتی محبت رکھتے ہیں محبوبانِ الٰہی میں داخل ہوتے ہیں تب ہر ایک چیز جو خدا تعالیٰ کے زیر حکم ہے اُن کی مدد کے لئے جوش مارتی ہے اور رحمتِ الٰہی محض اُن کی مراد پوری کرنے کے لئے ایک خلقِ جدید کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور وہ امور ظاہر ہوتے ہیں جو اہل دنیا کی نظر میں غیر ممکن معلوم ہوتے ہیں اور جن سے سفلی علوم محض ناآشنا ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا تو نہیں کہہ سکتے مگر قرب اور علاقہ محبت ان کا کچھ ایسا صدق و صفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے گویا خدا اُن میں اُتر آتا ہے اور آدم کی طرح خدائی رُوح اُن میں پھونکی جاتی ہے۔ مگر یہ نہیں کہ وہ خدا ہیں۔ لیکن درمیان میں کچھ ایسا تعلق ہے کہ جیسا کہ لوہے کو جبکہ سخت طور پر آگ سے افروختہ ہو جائے اور آگ کا رنگ اس میں پیدا ہو جائے آگ سے تعلّق ہوتا ہے۔ اس صورت میں تمام چیزیں جو خدا تعالیٰ کے زیر حکم ہیں ان کے زیر حکم ہو جاتی ہیں اور آسمان کے ستارے اور سورج اور چاند سے لیکر زمین کے سمندروں اور ہوا اور آگ تک اُنکی آواز کو سُنتے اور اُن کو شناخت کرتے ہیں اور ان کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ اور ہر ایک چیز طبعًا اُن سے پیار کرتی ہے اور عاشقِ صادق کی طرح ان کی طرف کھنچی جاتی ہے بجز شریر انسانوں کے جو شیطان کا اوتار ہیں۔ عشقِ مجازی تو ایک منحوس عشق ہے کہ ایک طرف پیدا ہوتا اور ایک طرف مر جاتا ہے۔ نیز اس کی بناء اس حُسن پر ہے جو قابلِ زوال ہے۔ اور نیز اس کے حسن کے اثر کے نیچے آنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ مگر یہ کیا حیرت انگیز نظارہ ہے کہ وہ حسنِ رُوحانی

جو حسن معاملہ اور صدق و صفا اور محبت الٰہیہ کی تجلّی کے بعد انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ایک عالمگیر کشش پائی جاتی ہے اور وہ مستعد دلوں کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے کہ جیسے شہد چیونٹیوں کو۔ اور نہ صرف انسان بلکہ عالم کا ذرّہ ذرّہ اس کی کشش سے متاثر ہوتا ہے۔ صادق المحبت انسان جو سچی محبت خدا تعالیٰ سے رکھتا ہے وہ یوسف ہے جس کے لئے ذرّہ ذرّہ اس عالم کا زلیخا صفت ہے اور ابھی حسن اس کا اِس عالم میں ظاہر نہیں کیونکہ یہ عالم اسکی برداشت نہیں کرتا۔ خدا تعالیٰ اپنی پاک کتاب میں جو قرآن مجید ہے فرماتا ہے کہ مومنوں کا نور اُن کے چہروں پر دوڑتا ہے۔ اور مومن اس حُسن سے شناخت کیا جاتا ہے جس کا نام دوسرے لفظوں میں نور ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم ص ۶۲-۶۴)

کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک طالب نہایت رقت اور درد کے ساتھ دعائیں کرتا ہے مگر وہ دیکھتا ہے کہ ان دعاؤں کے نتائج میں ایک تاخیر اور توقف واقع ہوتا ہے اس کا سرّ کیا ہے؟ اس میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اوّل تو جس قدر امور دنیا میں ہوتے ہیں اُن میں ایک قسم کی تدریج پائی جاتی ہے۔ دیکھو ایک بچہ کو انسان بننے کے لئے کسقدر مرحلے اور منازل طے کرنے پڑتے ہیں۔ ایک بیج کا درخت بننے کے لئے کس قدر توقف ہوتا ہے۔ اسی طرح پر اللہ تعالےٰ کے امور کا نفاذ بھی تدریجاً ہوتا ہے۔ دوسرے اس توقف میں یہ مصلحت الٰہی ہوتی ہے کہ انسان اپنے عزم اور عقد ہمت میں پختہ ہو جائے اور معرفت میں استحکام اور رسوخ ہو۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جسقدر انسان اعلیٰ مراتب اور مدارج کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسی قدر اس کو زیادہ محنت اور دقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس استقلال اور ہمت ایک ایسی عمدہ چیز ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان کامیابی کی منزلوں کو طے نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ پہلے مشکلات میں ڈالا جائے۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اسی لئے فرمایا ہے۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۲۰۲-۲۰۳)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک امر کے لئے دُعا کرتا ہے۔ مگر وہ دُعا اس کی اپنی ناواقفی اور نادانی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یعنی ایسا امر خدا تعالیٰ سے چاہتا ہے جو اس کے لئے کسی صورت سے مفید اور نافع نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُس کی دعا کو تو ردّ نہیں کرتا لیکن کسی اور صورت میں پورا کر دیتا ہے۔ مثلاً ایک زمیندار جس کو ہل چلانے کے لئے بیل کی ضرورت ہے

وہ بادشاہ سے جاکر ایک اونٹ کا سوال کرے اور بادشاہ جانتا ہے کہ اس کو دراصل بیل دینا مفید ہوگا اور وہ حکم دیدے کہ اس کو ایک بیل دیدو۔ وہ زمیندار اپنی بیوقوفی سے کہدے کہ میری درخواست منظور نہیں ہوئی تو اُس کی حماقت اور نادانی ہے۔ لیکن اگر وہ غور کرے تو اس کے لئے یہی بہتر تھا۔ اسی طرح پر اگر ایک بچہ آگ کے سُرخ انگارے دیکھ کر ماں سے مانگے تو کیا مہربان اور شفیق ماں یہ پسند کرے گی کہ اُس کو آگ کے انگارے دیدے۔ غرض بعض اوقات دعا کی قبولیت کے متعلق ایسے امور بھی پیش آتے ہیں۔ جو لوگ بے صبری اور بدظنی سے کام لیتے ہیں وہ اپنی دعا کو ردّ کرالیتے ہیں۔

(ملفوظات جلد چہارم ص۴۳۵)

دعا اور اس کی قبولیت کے زمانہ کے درمیانی اوقات میں بسا اوقات ابتلاء پر ابتلاء آتے ہیں اور ایسے ایسے ابتلاء بھی آجاتے ہیں جو کمر توڑ دیتے ہیں۔ مگر مستقل مزاج سعید الفطرت ان ابتلاؤں اور مشکلات میں بھی اپنے رب کی عنایتوں کی خوشبو سونگھتا ہے اور فراست کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کے بعد نصرت آتی ہے۔ اِن ابتلاؤں کے آنے میں ایک سرّ یہ بھی ہوتا ہے کہ دُعا کے لئے جوش بڑھتا ہے۔ کیونکہ جس جس قدر اضطرار اور اضطراب بڑھتا جاوے گا اُسی قدر رُوح میں گدازش ہوتی جائیگی۔ اور یہ دعا کی قبولیت کے اسباب میں سے ہیں۔ پس کبھی گھبرانا نہیں چاہیئے اور بے صبری اور بے قراری سے اپنے اللہ پر بدظن نہیں ہونا چاہیئے یہ کبھی بھی خیال کرنا نہیں چاہیئے کہ میری دُعا قبول نہ ہوگی یا نہیں ہوتی۔ ایسا وہم اللہ تعالیٰ کی اس صفت سے انکار ہوجاتا ہے کہ وہ دعائیں قبول فرمانے والا ہے۔

(ملفوظات جلد چہارم ص۴۳۴)

دُعائیں حقیقت میں بہت ہی قابلِ قدر ہوتی ہیں اور دعاؤں والا آخرکار کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ نادانی اور سوءِ ادب ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے ارادہ کے ساتھ لڑنا چاہے مثلاً یہ دُعا کرے کہ رات کے پہلے حصّہ میں سورج نکل آوے۔ اِس قسم کی دُعائیں گستاخی میں داخل ہوتی ہیں۔ وہ شخص نقصان اٹھاتا ہے اور ناکام رہتا ہے جو گھبرانے والا اور قبل از وقت چاہنے والا ہو۔ مثلاً اگر بیاہ کے دس دن بعد مرد و عورت یہ خواہش کریں کہ اب بچہ پیدا ہو جاوے تو یہ کیسی حماقت ہوگی۔ اس وقت تو اسقاط کے خون اور تھپیڑوں سے بھی بے نصیب رہے گی۔ اسی طرح جو سبزہ کو نمو نہیں دینے دیتا وہ دانہ پڑنے کی نوبت ہی نہیں آنے دیتا۔

.... مسلمان دُعا سے بالکل ناواقف ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ جن کو بدقسمتی سے ایسا موقعہ ملا کہ دعا کریں مگر انہوں نے صبر و استقلال سے چونکہ کام نہ لیا اس لئے نامراد رہ کر سید احمد خانی مذہب اختیار کر لیا کہ دعا کوئی چیز نہیں ۔ یہ دھوکا اور غلطی اس لئے لگتی ہے کہ وہ حقیقتِ دعا سے ناواقف محض ہوتے ہیں ۔ اور اس کے اثر سے بے خبر اور اپنی مالی امیدوں کو پورا ہوتے نہ دیکھ کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ دعا کوئی چیز نہیں اور اس سے برگشتہ ہو جاتے ہیں ۔

دعا ربوبیت اور عبودیت کا ایک کامل رشتہ ہے ۔ اگر دُعاؤں کا اثر نہ ہوتا تو پھر اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۲۰۳ - ۲۰۴)

پس دعاؤں سے کام لینا چاہیئے اور خدا تعالیٰ کے حضور استغفار کرنا چاہیئے کیونکہ خدا تعالیٰ غنی اور بے نیاز ہے اس پر کسی کی حکومت نہیں ہے ۔ ایک شخص اگر عاجزی اور فروتنی سے اس کے حضور نہیں آتا وہ اس کی کیا پروا کر سکتا ہے ۔ دیکھو اگر ایک سائل کسی کے پاس آ جاوے تو اپنا عجز اور غربت ظاہر کرے تو ضرور ہے کہ اُس کے ساتھ کچھ نہ کچھ سلوک ہو لیکن ایک شخص جو گھوڑی پر سوار ہو کر آوے اور سوال کرے اور یہ بھی کہے کہ اگر نہ دو گے تو ڈنڈے ماروں گا تو بجز اسکے کہ خود اس کو ڈنڈے پڑیں اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا ؟ ۔ خدا تعالیٰ سے اَڑ کر مانگنا اور اپنے ایمان کو مشروط کرنا بڑی بھاری غلطی اور ٹھوکر کا موجب ہے ۔ دعاؤں میں استقلال اور صبر ایک الگ چیز ہے اور اڑ کر مانگنا اور بات ہے ۔ یہ کہنا کہ میرا فلاں کام اگر نہ ہُوا تو میں انکار کر دونگا یا یہ کہدونگا ۔ یہ بڑی نادانی اور شرک ہے اور آداب الدعا سے ناواقفیت ہے ایسے لوگ دعا کی فلاسفی سے ناواقف ہیں ۔ قرآن شریف میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ ہر ایک دعا تمہاری مرضی کے موافق میں قبول کروں گا ۔ بیشک یہ ہم مانتے ہیں کہ قرآن شریف میں لکھا ہُوا ہے اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ لیکن ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ اسی قرآن شریف میں یہ بھی لکھا ہُوا ہے :- وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ۔

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں اگر تمہاری مانتا ہے تو لَنَبْلُوَنَّکُمْ میں اپنی منوانی چاہتا ہے ۔ یہ خدا تعالیٰ کا احسان اور اس کا کرم ہے کہ وہ اپنے بندہ کی بھی مان لیتا ہے ورنہ اس کی الوہیت اور ربوبیت کی شان کے یہ ہرگز خلاف نہیں کہ اپنی ہی منوائے ولنبلونکم بشیء من الخوف جو فرمایا تو اس مقام پر وہ اپنی منوانا چاہتا ہے ۔ کبھی کسی قسم کا خوف

آتا ہے اور کبھی بھوک آتی ہے اور کبھی مالوں پر کمی واقع ہو جاتی ہے۔ تجارتوں میں خسارہ ہوتا ہے۔ اور کبھی ثمرات میں کمی ہوتی ہے اولاد ضائع ہوتی ہے اور ثمرات برباد ہو جاتے ہیں اور نتائجِ نقصان دہ ہوتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں خدا تعالیٰ کی آزمائش ہوتی ہے۔ اُس وقت خدا اپنی شان حکومت دکھانا چاہتا ہے اور اپنی منوانا چاہتا ہے۔ اُسوقت صادق اور مومن کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ نہایت اخلاص اور انشراح صدر کے ساتھ خدا کی رضا کو مقدم کر لیتا ہے اور اُس پر خوش ہو جاتا ہے کوئی شکوہ اور بدظنی نہیں کرتا اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ۔ پس صبر کرنے والوں کو بشارت دو۔ یہ نہیں فرمایا کہ دعا کرنے والوں کو بشارت دو۔ بلکہ صبر کرنے والوں کو۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اگر بظاہر اپنی دعاؤں میں ناکامی دیکھے تو گھبرا نہ جاوے بلکہ صبر اور استقلال سے خدا تعالیٰ کی رضا کو مقدم کرے۔ اہل اللہ کو نظر آ جاتا ہے کہ یہ کام ہونہار ہے۔ پس جب وہ یہ دیکھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں ورنہ قضاء و قدر پر راضی رہتے ہیں۔ اہل اللہ کے دو ہی کام ہوتے ہیں۔ جب کسی بلا کے آثار دیکھتے ہیں تو دُعا کرتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ قضاء و قدر اس طرح پر ہے تو صبر کرتے ہیں جیسے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بچوں کی وفات پر صبر کیا۔ جن میں سے ایک بچہ ابراہیم بھی تھا۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۲۸۵-۲۸۶)

میرا صدہا مرتبہ کا تجربہ ہے کہ خدا ایسا کریم و رحیم ہے کہ جب اپنی مصلحت سے ایک دعا کو منظور نہیں کرتا تو اس کے عوض میں کوئی اور دعا منظور کر لیتا ہے جو اس کے مثل ہوتی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے مَا ننسخ من اٰیةٍ او ننسها نأت بخیرٍ مّنها او مثلها الم تعلم ان اللّٰه علٰی کلّ شیءٍ قدیر۔

(حقیقة الوحی ص ۳۲۷)

یہ خیال مت کرو کہ ہم بھی ہر روز دعا کرتے ہیں اور تمام نماز دعا ہی ہے جو ہم پڑھتے ہیں کیونکہ وہ دعا جو معرفت کے بعد اور فضل کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے وہ اور رنگ اور کیفیت رکھتی ہے۔ وہ فنا کرنے والی چیز ہے۔ وہ گداز کرنے والی آگ ہے۔ وہ رحمت کو کھینچنے والی ایک مقناطیسی کشش ہے۔ وہ موت ہے پر آخر کو زندہ کرتی ہے۔ وہ ایک تند سیل ہے پر آخر کو کشتی بن جاتی ہے ہر ایک بگڑی ہوئی بات اس سے بن جاتی ہے اور ہر ایک زہر اس سے آخر تریاق ہو جاتا ہے۔

مبارک وہ قیدی جو دعا کرتے ہیں تھکتے نہیں۔ کیونکہ ایک دن رہائی پائیں گے۔ مبارک

وہ اندھے جو دعاؤں میں سُست نہیں ہوتے کیونکہ ایک دن دیکھنے لگیں گے۔ مبارک وہ جو قبروں میں پڑے ہوئے دعاؤں کے ساتھ خدا کی مدد چاہتے ہیں کیونکہ ایک دن قبروں سے باہر نکالے جائینگے۔

مبارک تم جب کہ دعا کرنے میں کبھی ماندہ نہیں ہوتے اور تمہاری رُوح دعا کے لئے پگھلتی اور تمہاری آنکھ آنسو بہاتی اور تمہارے سینہ میں ایک آگ پیدا کر دیتی ہے اور تمہیں تنہائی کا ذوق اُٹھانے کے لئے اندھیری کوٹھڑیوں اور سنسان جنگلوں میں لے جاتی ہے اور تمہیں بیتاب اور دیوانہ اور از خود رفتہ بنا دیتی ہے کیونکہ آخر تم پر فضل کیا جائیگا۔ وہ خدا جس کی طرف ہم بلاتے ہیں نہایت کریم و رحیم۔ حیا والا۔ صادق۔ وفادار۔ عاجزوں پر رحم کرنے والا ہے۔ پس تم بھی وفادار بن جاؤ اور پورے صدق اور وفا سے دُعا کرو کہ تم پر رحم فرمائیگا۔ دنیا کے شور و غوغا سے الگ ہو جاؤ اور نفسانی جھگڑوں کا دین کو رنگ مت دو۔ خدا کے لئے ہار اختیار کر لو اور شکست کو قبول کر لو تا بڑی بڑی فتحوں کے تم وارث بن جاؤ۔ دُعا کرنے والوں کو خدا معجزہ دکھائیگا اور مانگنے والوں کو ایک خارق عادت نعمت دی جائیگی۔ دُعا خدا سے آتی ہے اور خدا کی طرف ہی جاتی ہے۔ دُعا سے خدا ایسا نزدیک ہو جاتا ہے جیسا کہ تمہاری جان تم سے نزدیک ہے۔ دعا کی پہلی نعمت یہ ہے کہ انسان میں پاک تبدیلی پیدا ہوتی ہے پھر اس تبدیلی سے خدا بھی اپنی صفات میں تبدیلی کرتا ہے اور اس کے صفات غیر متبدل ہیں مگر تبدیلی یافتہ کے لئے اس کی ایک الگ تجلّی ہے جس کو دنیا نہیں جانتی گویا وہ اَور خدا ہے حالانکہ اَور کوئی خدا نہیں مگر نئی تجلّی نئے رنگ میں اس کو ظاہر کرتی ہے۔ تب اس خاص تجلّی کی شان میں اس تبدیلی یافتہ کے لئے وہ کام کرتا ہے جو دوسروں کے لئے نہیں کرتا۔ یہی وہ خوارق ہے۔ غرض دُعا وہ اکسیر ہے جو ایک مشتِ خاک کو کیمیا کر دیتی ہے۔ اور وہ ایک پانی ہے جو اندرونی غلاظتوں کو دھو دیتا ہے۔ اس دُعا کے ساتھ رُوح پگھلتی ہے اور پانی کی طرح بہہ کر آستانۂ حضرت احدیت پر گرتی ہے۔ وہ خدا کے حضور میں کھڑی بھی ہوتی ہے اور رکوع بھی کرتی ہے اور سجدہ بھی کرتی ہے اور اسی کی ظل وہ نماز ہے جو اسلام نے سکھائی ہے۔ اور رُوح کا کھڑا ہونا یہ ہے کہ وہ خدا کے لئے ہر ایک مصیبت کی برداشت اور حکم ماننے کے بارے میں مستعدی ظاہر کرتی ہے اور اس کا رکوع یعنی جھکنا یہ ہے کہ وہ تمام محبتوں اور تعلقوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف جھک آتی ہے اور خدا کے لئے ہو جاتی ہے۔ اور اس کا سجدہ یہ ہے کہ وہ خدا کے آستانہ پر گر کر اپنے تئیں بکلّی کھو دیتی ہے اور اپنے نقشِ وجود کو مٹا دیتی ہے۔ یہی نماز ہے جو خدا کو ملاتی ہے۔ اور شریعت اسلامی نے اس کی تصویر معمولی نماز میں کھینچکر دکھلائی ہے تا وہ جسمانی نماز روحانی نماز کی طرف

محرک ہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے انسان کے وجود کی ایسی بناوٹ پیدا کی ہے کہ رُوح کا اثر جسم پر اور جسم کا اثر رُوح پر ضرور ہوتا ہے۔ جب تمہاری رُوح غمگین ہو تو آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اور جب رُوح میں خوشی پیدا ہو تو چہرہ پر بشاشت ظاہر ہو جاتی ہے یہاں تک کہ انسان بسا اوقات ہنسنے لگتا ہے۔ ایسا ہی جب جسم کو کوئی تکلیف اور درد پہنچے تو اس درد میں رُوح بھی شریک ہوتی ہے۔ اور جب جسم کسی ٹھنڈی ہوا سے خوش ہو تو روح بھی اس سے کچھ حصہ لیتی ہے، پس جسمانی عبادات کی غرض یہ ہے کہ رُوح اور جسم کے باہمی تعلقات کی وجہ سے رُوح میں بھی حضرت احدیت کی طرف حرکت پیدا ہو۔ اور وہ روحانی قیام اور سجود میں مشغول ہو جائے۔

(لیکچر سیالکوٹ ص ۲۶-۲۸)

یہ شبہ کرنا کہ یہ استعانت بعض اوقات کیوں بے فائدہ اور غیر مفید ہوتی ہے اور کیوں خدا کی رحمانیت و رحیمیت ہر ایک وقت استعانت میں تجلّی نہیں فرماتی! پس یہ شبہ صرف ایک صداقت کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ ان دعاؤں کو کہ جو خلوص کے ساتھ کی جائیں ضرور سُنتا ہے اور جس طرح مناسب ہو مدد چاہنے والوں کے لئے مدد بھی کرتا ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کی استمداد اور دُعا میں خلوص نہیں ہوتا۔ نہ انسان دلی عاجزی کے ساتھ امداد الٰہی چاہتا ہے اور نہ اس کی رُوحانی حالت درست ہوتی ہے بلکہ اس کے ہونٹوں میں دعا اور اُس کے دل میں غفلت یا ریاء ہوتی ہے یا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا اُس کی دعا کو سُن تو لیتا ہے اور اس کے لئے جو کچھ اپنی حکمت کاملہ کے رُو سے مناسب اور اصلح دیکھتا ہے عطا بھی فرماتا ہے لیکن نادان انسان خدا کی اُن الطافِ خفیہ کو شناخت نہیں کرتا اور بباعث اپنے جہل بے خبری کے شکوہ اور شکایت شروع کر دیتا ہے اور اس آیت کے مضمون کو نہیں سمجھتا۔ عَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو بُری سمجھو اور وہ اصل میں تمہارے لئے اچھی ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو دوست رکھو اور وہ اصل میں تمہارے لئے بُری ہو اور خدا چیزوں کی اصل حقیقت کو جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

(براہین احمدیہ ص ۴۰۸-۴۰۹ حاشیہ ۱۱)

خدا تعالیٰ نے اس سورۃ فاتحہ میں دعا کرنے کا ایک ایسا طریقہ حسنہ بتلایا ہے جس سے خوب تر طریقہ پیدا ہونا ممکن نہیں اور جس میں وہ تمام امور جمع ہیں جو دُعا میں دلی جوش پیدا کرنے کے لئے

نہایت ضروری ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ قبولیت دُعا کے لئے ضرور ہے کہ اُس میں ایک جوش ہو۔ کیونکہ جس دُعا میں جوش نہ ہو وہ صرف لفظی بڑبڑ ہے حقیقی دعا نہیں۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ دعا میں جوش پیدا ہونا ہر ایک وقت انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ انسان کے لئے اشد ضرورت ہے کہ دُعا کرنے کے وقت جو امور دلی جوش کے محرک ہیں وہ اس کے خیال میں حاضر ہوں اور یہ بات ہر ایک عاقل پر روشن ہے کہ دلی جوش پیدا کرنے والی صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک خدا کو کامل اور قادر اور جامع صفات کاملہ خیال کرکے اس کی رحمتوں اور کرموں کو ابتدا سے انتہا تک اپنے وجود اور بقا کے لئے ضروری دیکھنا اور تمام فیوض کا مبدا اُسی کو خیال کرنا۔ دوسرے اپنے تئیں اور اپنے تمام ہم جنسوں کو عاجز اور مفلس اور خدا کی مدد کا محتاج یقین کرنا یہی دو امر ہیں جن سے دعاؤں میں جوش پیدا ہوتا ہے اور جو جوش دلانے کے لئے کامل ذریعہ ہیں۔ وجہ یہ کہ انسان کی دُعا میں تب ہی جوش پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے تئیں سراسر ضعیف اور ناتوان اور مدد الٰہی کا محتاج دیکھتا ہے۔ اور خدا کی نسبت نہایت قوی اعتقاد سے یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ بغایت درجہ کامل القدرت اور ربّ العالمین اور رحمٰن اور رحیم اور مالک امر مجازات ہے۔ اور جو کچھ انسانی حاجتیں ہیں سب کا پورا کرنا اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ سو سورہ فاتحہ کے ابتدا میں جو اللہ تعالیٰ کی نسبت بیان فرمایا گیا ہے کہ وہی ایک ذات ہے کہ جو تمام محامد کاملہ سے متصف اور تمام خوبیوں کی جامع ہے اور وہی ایک ذات ہے جو تمام عالموں کی رب اور تمام رحمتوں کا چشمہ اور سب کو ان کے عملوں کا بدلہ دینے والی ہے پس ان صفات کے بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ نے بخوبی ظاہر فرما دیا کہ سب قدرت اُسی کے ہاتھ میں ہے اور ہر ایک فیض اس کی طرف سے ہے اور اپنی اس قدر عظمت بیان کی کہ دنیا اور آخرت کے کاموں کا قاضی الحاجات اور ہر ایک چیز کا علّت العلل اور ہر ایک فیض کا مبدء اپنی ذات کو ٹھہرایا جس میں یہ بھی اشارہ فرما دیا ہے کہ اس کی ذات کے بغیر اور اُس کی رحمت کے بدوں کسی زندہ کی زندگی اور آرام اور راحت ممکن نہیں۔ اور پھر بندہ کو تذلّل کی تعلیم دی اور فرمایا ایّاك نعبد و ایّاك نستعین۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ اے مبدء تمام فیوض ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ یعنی ہم عاجز ہیں آپ سے کچھ بھی نہیں کر سکتے جب تک تیری توفیق اور تائید شامل حال نہ ہو۔ پس خدائے تعالیٰ نے دُعا میں جوش دلانے کے لئے دو محرک بیان فرمائے۔ ایک اپنی عظمت اور رحمت شاملہ۔ دوسرے بندوں کا عاجز اور ذلیل ہونا۔ اب جاننا چاہیئے کہ یہی دو محرک ہیں جن کا دُعا کے وقت خیال میں لانا

دعا کرنے والوں کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جو لوگ دُعا کی کیفیت سے کسی قدر چاشنی حاصل رکھتے ہیں انہیں خوب معلوم ہے کہ بغیر پیش ہونے ان دونوں محرکوں کی دُعا ہو ہی نہیں سکتی اور بجز ان کے آتش شوقِ الٰہی دُعا میں اپنے شعلوں کو بلند نہیں کرتے۔ یہ بات نہایت ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کی عظمت اور رحمت اور قدرت کاملہ کو یاد نہیں رکھتا وہ کسی طرح سے خدا کی طرف رجوع نہیں کر سکتا اور جو شخص اپنی عاجزی اور درماندگی اور مسکینی کا اقراری نہیں اُس کی روح اس مولیٰ کریم کی طرف ہرگز جھک نہیں سکتی غرض یہ ایسی صداقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے کوئی عمیق فلسفہ درکار نہیں بلکہ جب خدا کی عظمت اور اپنی ذلت اور عاجزی متحقق طور پر دل میں منقّش ہو تو وہ حالتِ خاصہ خود انسان کو سمجھا دیتی ہے کہ خالص دعا کرنے کا وہی ذریعہ ہے۔ سچے پرستار خوب سمجھتے ہیں کہ حقیقت میں انہی دو چیزوں کا تصوّر دعا کے لئے ضروری ہے۔ یعنی اوّل اس بات کا تصوّر کہ خدائے تعالےٰ ہر ایک قسم کی ربوبیت اور پرورش اور رحمت اور بدلہ دینے پر قادر ہے اور اس کی یہ صفات کاملہ ہمیشہ اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ دوسرے اِس بات کا تصوّر کہ انسان بغیر توفیق اور تائیدِ الٰہی کے کسی چیز کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اور بلاشبہ یہ دونوں تصوّر ایسے ہیں کہ جب دُعا کرنے کے وقت دل میں جم جاتے ہیں تو یکایک انسان کی حالت کو ایسا تبدیل کر دیتے ہیں کہ ایک متکبّر اُن سے متاثر ہو کر روتا ہؤا زمین پر گر پڑتا ہے۔ اور ایک گردن کش سخت دل کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ یہی کل جس سے ایک غافل مُردہ میں جان پڑ جاتی ہے انہی دو باتوں کے تصوّر سے ہر ایک دل دعا کرنے کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ غرض یہی وہ رُوحانی وسیلہ ہے جس سے انسان کی رُوح رُو بخدا ہوتی ہے اور اپنی کمزوری اور امدادِ ربّانی پر نظر پڑتی ہے۔ اِسی کے ذریعہ سے انسان ایک ایسے عالمِ بےخودی میں پہنچ جاتا ہے جہاں اپنی مکدّر ہستی کا نشان باقی نہیں رہتا اور صرف ایک ذاتِ عظمیٰ کا جلال چمکتا ہؤا نظر آتا ہے اور وہی ذات رحمت کل اور ہر ایک ہستی کا ستون اور ہر ایک درد کا چارہ اور ہر ایک فیض کا مبدء دکھائی دیتی ہے۔ آخر اس سے ایک صورت فنا فی اللہ کے ظہور پذیر ہو جاتی ہے جس کے ظہور سے نہ انسان مخلوق کی طرف مائل رہتا ہے نہ اپنے نفس کی طرف نہ اپنے ارادہ کی طرف اور بالکل خدا کی محبت میں کھویا جاتا ہے۔ اور اُس ہستئ حقیقی کی شہود سے اپنی اور دوسری مخلوق چیزوں کی ہستی کالعدم معلوم ہوتی ہے۔ اس حالت کا نام خدا نے صراط مستقیم رکھا ہے جس کی طلب کے لئے بندہ کو تعلیم فرمایا اور کہا اھدنا الصراط المستقیم یعنی وہ راستہ

فنا اور توحید اور محبتِ الٰہی کا جو آیات مذکورہ بالا سے مفہوم ہو رہا ہے وہ ہمیں عطا فرما اور اپنے غیر سے بکلی منقطع کر۔ خلاصہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے دُعا میں جوش پیدا کرنے کے لئے وہ اسباب حقّہ انسان کو عطا فرمائے کہ جو اسقدر دلی جوش پیدا کرتے ہیں کہ دُعا کرنے والے کو خودی کے عالم سے بیخودی اور نیستی کے عالم میں پہنچا دیتے ہیں۔ اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بات ہرگز نہیں کہ سورۃ فاتحہ دُعا کے کئی طریقوں میں سے ہدایت مانگنے کا ایک طریقہ ہے بلکہ جیسا کہ دلائل مذکورہ بالا سے ثابت ہو چکا ہے درحقیقت صرف یہی ایک طریقہ ہے جس پر جوش دل سے دعا کا صادر ہونا موقوف ہے اور جس پر طبیعت انسانی بمقتضا اپنے فطرتی تقاضا کے چلنا چاہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسے خدا نے دوسرے امور میں قواعد مقررہ ٹھہرا رکھے ہیں ایسا ہی دعا کے لئے بھی ایک قاعدہ خاص ہے اور وہ قاعدہ وہی محرک ہیں جو سورۃ فاتحہ میں لکھے گئے ہیں اور ممکن نہیں کہ جب تک وہ دونوں محرک کسی کے خیال میں نہ ہوں تب تک اس کی دعا میں جوش پیدا ہو سکے۔ سو طبعی راستہ دعا مانگنے کا وہی ہے جو سورۃ فاتحہ میں ذکر ہو چکا ہے۔ پس سورۂ ممدوحہ کے لطائف میں سے یہ ایک نہایت عمدہ لطیفہ ہے کہ دعا کو معہ محرکات اُس کے کے بیان کیا ہے۔ فتدبّر

(براہین احمدیہ ص ۵۴۶ - ۵۵۳ حاشیہ ۱۱)

اے ارحم الراحمین! ایک تیرا بندہ عاجز اور ناکارہ پُرخطا اور نالائق غلام احمد جو تیری زمین ہند میں ہے اس کی یہ عرض ہے کہ اے ارحم الراحمین تو مجھ سے راضی ہو اور میری خطیات اور گناہوں کو بخش کہ تو غفور الرحیم ہے اور مجھ سے وہ کام کرا جس سے تو بہت ہی راضی ہو جائے۔ مجھ میں اور میرے نفس میں مشرق اور مغرب کی دوری ڈال۔ اور میری زندگی اور میری موت اور میری ہر ایک قوت جو مجھے حاصل ہے اپنی ہی راہ میں کر۔ اور اپنی ہی محبت میں مجھے زندہ رکھ۔ اور اپنی ہی محبت میں مجھے مار۔ اور اپنے ہی کامل محبین میں مجھے اٹھا۔

اے ارحم الراحمین! جس کام کی اشاعت کے لئے تو نے مجھے مامور کیا ہے اور جس خدمت کے لئے تو نے میرے دل میں جوش ڈالا ہے اُس کو اپنے ہی فضل سے انجام تک پہنچا۔ اور اس عاجز کے ہاتھ سے حجّۃ الاسلام مخالفین پر اور ان سب پر جو اسلام کی خوبیوں سے بے خبر ہیں پوری کر۔ اور اس عاجز اور اس کے محبوں اور مخلصوں اور ہم مشربوں کو مغفرت

اور مہربانی کی ظلّ اور حمایت میں رکھ ۔ دین و دنیا میں آپ ان کا متکفل بن اور سب کو دار الرضا میں پہنچا اور اپنے رسول مقبولؐ اور اس کے آل اور اصحاب پر زیادہ سے زیادہ درود و سلام و برکات نازل کر ۔ آمین ثم آمین *

(الفضل ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۲ء)

اے میرے قادر خدا ! میری عاجزانہ دعائیں سُن لے اور اس قوم کے کان اور دل کھول دے ۔ اور ہمیں وہ وقت دکھا کہ باطل معبودوں کی پرستش دنیا سے اُٹھ جائے اور زمین پر تیری پرستش اخلاص سے کی جائے ۔ اور زمین تیرے راستباز اور مُوحّد بندوں سے ایسی بھر جائے جیسا کہ سمندر پانی سے بھرا ہُوا ہے ۔ اور تیرے رسول کریم **محمد مصطفٰے** صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور سچائی دلوں میں بیٹھ جائے ۔ آمین

اے میرے قادر خدا ! مجھے یہ تبدیلی دنیا میں دکھا ۔ اور میری دُعائیں قبول کر جو ہر یک طاقت اور قوت تجھ کو ہے ۔ اے قادر خدا ! ایسا ہی کر ۔ آمین ثم آمین ۔ و اٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ ربّ العالمین ۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۱۶۴)

---

* **نوٹ** : ۔ یہ دعا آپؑ نے حضرت صوفی احمد جان صاحبؓ لدھیانوی کو بذریعہ خط لکھی کہ " آپ پر فرض ہے اِنہی الفاظ میں بلا تغیر و تبدل بیت اللہ میں حضرتِ ارحم الراحمین میں اِس عاجز کی طرف سے کریں ۔ خط بطور یادداشت اپنے پاس رکھیں ۔ " چنانچہ صوفی صاحب نے حسب الحکم ۱۳۰۲ھ حج اکبر کے دن بیت اللہ میں اِس دعا کو بلند آواز سے پڑھا اور ساتھ کی جماعت آمین کہتی گئی ۔

توبہ و استغفار

ظاہر ہے کہ انسان اپنی فطرت میں نہایت کمزور ہے اور خدا تعالیٰ کے صدہا احکام کا اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے۔ پس اس کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے بعض احکام کے ادا کرنے سے قاصر رہ سکتا ہے اور کبھی نفس امّارہ کی بعض خواہشیں اس پر غالب آجاتی ہیں۔ پس وہ اپنی کمزور فطرت کی رُو سے حق رکھتا ہے کہ کسی لغزش کے وقت اگر وہ توبہ اور استغفار کرے تو خدا کی رحمت اس کو ہلاک کرنے سے بچا لے۔ اس لئے یہ یقینی امر ہے کہ اگر خدا توبہ قبول کرنیوالا نہ ہوتا تو انسان پر یہ بوجھ صدہا احکام کا ہرگز نہ ڈالا جاتا۔ اس سے بلاشبہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا توّاب اور غفور ہے۔ اور توبہ کے یہ معنے ہیں کہ انسان ایک بدی کو اس اقرار کے ساتھ چھوڑ دے کہ بعد اس کے اگر وہ آگ میں بھی ڈالا جائے تب بھی وہ بدی ہرگز نہیں کریگا۔ پس جب انسان اس صدق اور عزم محکم کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو خدا جو اپنی ذات میں کریم اور رحیم ہے وہ اس گناہ کی سزا معاف کر دیتا ہے۔ اور یہ خدا کی اعلیٰ صفات میں سے ہے کہ توبہ قبول کر کے ہلاکت سے بچا لیتا ہے۔ اور اگر انسان کو توبہ قبول کرنے کی امید نہ ہو تو پھر وہ گناہ سے باز نہیں آئیگا۔ عیسائی مذہب بھی توبہ قبول کرنے کا قائل ہے مگر اس شرط سے کہ توبہ قبول کرنیوالا عیسائی ہو۔ لیکن اسلام میں توبہ کے لئے کسی مذہب کی شرط نہیں ہے۔ ہر ایک مذہب کی پابندی کے ساتھ توبہ قبول ہو سکتی ہے اور صرف وہ گناہ باقی رہ جاتا ہے جو کوئی شخص خدا کی کتاب اور خدا کے رسول سے منکر رہے۔ اور یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ انسان محض اپنے عمل سے نجات پا سکے بلکہ یہ خدا کا احسان ہے کہ کسی کی وہ توبہ قبول کرتا ہے اور کسی کو اپنے فضل سے ایسی قوت عطا کرتا ہے کہ وہ گناہ کرنے سے محفوظ رہتا ہے۔

(چشمۂ معرفت ص۱۸۱)

یاد رہے کہ توبہ اور مغفرت سے انکار کرنا درحقیقت انسانی ترقیات کے دروازہ کو بند کرنا ہے کیونکہ یہ بات تو ہر ایک کے نزدیک واضح اور بدیہات سے ہے کہ انسانِ کامل

بالذّات نہیں بلکہ تکمیل کا محتاج ہے۔ اور جیسا کہ وہ اپنی ظاہری حالت میں پیدا ہو کر آہستہ آہستہ اپنے معلومات وسیع کرتا ہے۔ پہلے ہی عالم فاضل پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ پیدا ہو کر جب ہوش پکڑتا ہے تو اخلاقی حالت اس کی نہایت گری ہوئی ہوتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی نوعمر بچوں کے حالات پر غور کرے تو صاف طور پر اس کو معلوم ہوگا کہ اکثر بچے اس بات پر حریص ہوتے ہیں کہ ادنیٰ ادنیٰ نزاع کے وقت دوسرے بچہ کو ماریں اور اکثر اُن سے بات بات میں جھوٹ بولنے اور دوسرے بچوں کو گالیاں دینے کی خصلت مترشح ہوتی ہے اور بعض کو چوری اور چغلخوری اور حسد اور بخل کی بھی عادت ہوتی ہے اور پھر جب جوانی کی مستی جوش میں آتی ہے تو نفس امّارہ ان پر سوار ہو جاتا ہے اور اکثر ایسے نالائق اور ناگفتنی کام اُن سے ظہور میں آتے ہیں جو صریح فسق و فجور میں داخل ہوتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اکثر انسانوں کے لئے اوّل مرحلہ گندی زندگی کا ہے۔ اور پھر جب سعید انسان اوائل عمر کے تند سیلاب سے باہر آ جاتا ہے تو پھر وہ اپنے خدا کی طرف توجہ کرتا ہے اور سچی توبہ کر کے ناکردنی باتوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور اپنی فطرت کے جامہ کو پاک کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ یہ عام طور پر انسانی زندگی کے سوانح ہیں جو نوع انسان کو طے کرنے پڑتے ہیں۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ اگر یہی بات سچ ہے کہ توبہ قبول نہیں ہوتی تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ خدا کا ارادہ ہی نہیں کہ کسی کو نجات دے۔

(چشمۂ معرفت ص۱۸۴)

اگرچہ خدا تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ تخم توحید ہر ایک نفس میں موجود ہے لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی کئی مقامات میں کھول کر بتلا دیا ہے کہ وہ تخم سب میں مساوی نہیں بلکہ بعض کی فطرتوں پر جذبات نفسانی اُن کے ایسے غالب آ گئے ہیں کہ وہ نور کالمفقود ہو گیا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ قویٰ بہیمیہ یا غضبیہ کا فطرتی ہونا وحدانیتِ الٰہی کے فطرتی ہونے کو منافی نہیں ہے۔ خواہ کوئی کیسا ہی ہوا پرست اور نفس امّارہ کا مغلوب ہو پھر بھی کسی نہ کسی قدر نورِ فطرتی اُس میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً جو شخص بوجہ غلبہ قویٰ شہویہ یا غضبیہ چوری کرتا ہے یا خون کرتا ہے یا حرامکاری میں مبتلا ہوتا ہے تو اگرچہ یہ فعل اس کی فطرت کا مقتضا ہے لیکن بمقابلہ اس کے نورِ صلاحیت جو اس کی فطرت میں رکھا گیا ہے وہ اس کو اُسی وقت جب اُس سے کوئی حرکتِ بے جا صادر ہو جائے ملزم کرتا ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا الجزو نمبر ۳۰۔ یعنی ہر ایک انسان کو ایک قسم کا خدا نے الہام عطا کر رکھا ہے جس کو نورِ قلب کہتے ہیں اور وہ یہ کہ نیک اور بد کام میں فرق کر لینا۔ جیسے کوئی چور یا

خونی چوری یا خون کرتا ہے۔ تو خدا اس کے دل میں اسی وقت ڈال دیتا ہے کہ تو نے یہ کام برا کیا اچھا نہیں کیا۔ لیکن وہ ایسے القاء کی کچھ پروا نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کا نور قلب نہایت ضعیف ہوتا ہے۔ اور عقل بھی ضعیف اور قوت بہیمیہ غالب اور نفس طالب۔ سو اس طور کی طبیعتیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں جن کا وجود روزمرہ کے مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے۔ ان کے نفس کا شورش اور اشتعال جو فطرتی ہے کم نہیں ہو سکتا کیونکہ جو خدا نے لگا دیا اس کو کون دور کرے۔ ہاں خدا نے ان کا ایک علاج بھی رکھا ہے۔ وہ کیا ہے۔ **توبہ و استغفار اور ندامت**۔ یعنی جبکہ برا فعل جو ان کے نفس کا تقاضا ہے ان سے صادر ہو یا حسب خاصۂ فطرتی کوئی برا خیال دل میں آوے تو اگر وہ توبہ اور استغفار سے اس کا تدارک چاہیں تو خدا اس گناہ کو معاف کر دیتا ہے جب وہ بار بار ٹھوکر کھانے سے بار بار نادم اور تائب ہوں تو وہ ندامت اور توبہ اس آلودگی کو دھو ڈالتی ہے۔ یہی حقیقی کفارہ ہے جو اس فطرتی گناہ کا علاج ہے۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا الجزو نمبر ۵۔ جس سے کوئی بدعملی ہو جائے یا اپنے نفس پر کسی نوع کا ظلم کرے اور پھر پشیمان ہو کر خدا سے معافی چاہے تو وہ خدا کو غفور و رحیم پائیگا۔ اس لطیف اور پرحکمت عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے لغزش اور گناہ نفوس ناقصہ کا خاصہ ہے جو ان سے سرزد ہوتا ہے اس کے مقابلہ پر خدا کا ازلی اور ابدی خاصہ مغفرت و رحم ہے اور اپنی ذات میں وہ غفور و رحیم ہے۔ یعنی اس کی مغفرت سرسری اور اتفاقی نہیں بلکہ وہ اسکی ذات قدیم کی صفت قدیم ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے اور جوہر قابل پر اس کا فیضان چاہتا ہے۔ یعنی جب کبھی کوئی بشر بروقت صدور لغزش و گناہ بہ ندامت و توبہ خدا کی طرف رجوع کرے تو وہ خدا کے نزدیک اس قابل ہو جاتا ہے کہ رحمت اور مغفرت کے ساتھ خدا اس کی طرف رجوع کرے اور یہ رجوع الٰہی بندۂ نادم اور تائب کی طرف ایک یا دو مرتبہ میں محدود نہیں بلکہ یہ خدائے تعالیٰ کی ذات میں خاصۂ دائمی ہے اور جب تک کوئی گنہگار توبہ کی حالت میں اس کی طرف رجوع کرتا ہے وہ خاصہ اس کا ضرور اس پر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ پس خدا کا قانون قدرت یہ نہیں ہے کہ جو ٹھوکر کھانے والی طبیعتیں ہیں وہ ٹھوکر نہ کھاویں یا جو لوگ قویٰ بہیمیہ یا غضبیہ کے مغلوب ہیں ان کی فطرت بدل جاوے۔ بلکہ اس کا قانون جو قدیم سے بندھا چلا آتا ہے یہی ہے کہ ناقص لوگ جو بمقتضائے اپنے ذاتی نقصان کے گناہ کریں وہ توبہ اور استغفار کر کے بخشے جائیں۔

(براہین احمدیہ ص ۱۷۵-۱۷۷ حاشیہ ۱۱)

واضح ہو کہ توبہ لغتِ عرب میں رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن شریف میں خدا کا نام بھی توّاب ہے یعنی بہت رجوع کرنے والا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب انسان گناہوں سے دست بردار ہو کر صدقِ دل سے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس سے بڑھ کر اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور یہ امر سراسر قانونِ قدرت کے مطابق ہے۔ کیونکہ جب کہ خدا تعالیٰ نے نوعِ انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ جب ایک انسان سچے دل سے دوسرے انسان کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کا دل بھی اس کے لئے نرم ہو جاتا ہے۔ تو پھر عقل کیونکر اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ بندہ تو سچے دل سے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے مگر خدا اس کی طرف رجوع نہ کرے بلکہ خدا جس کی ذات نہایت کریم و رحیم واقع ہوئی ہے وہ بندہ سے بہت زیادہ اُس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن شریف میں خدا تعالیٰ کا نام جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے توّاب ہے یعنی بہت رجوع کرنے والا۔ سو بندہ کا رجوع تو پشیمانی اور ندامت اور تذلّل اور انکسار کے ساتھ ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کا رجوع رحمت اور مغفرت کے ساتھ۔ اگر رحمت خدا تعالیٰ کی صفات میں سے نہ ہو تو کوئی مخلصی نہیں پا سکتا۔ افسوس کہ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی صفات پر غور نہیں کی۔ اور تمام مدار اپنے فعل اور عمل پر رکھا ہے۔ مگر وہ خدا جس نے بغیر کسی کے عمل کے ہزاروں نعمتیں انسان کے لئے زمین پر پیدا کیں کیا اُس کا یہ خلق ہو سکتا ہے کہ انسان ضعیف البنیان جب اپنی غفلت سے متنبہ ہو کر اس کی طرف رجوع کرے اور رجوع بھی ایسا کرے کہ گویا مر جائے اور پہلا ناکام چولا اپنے بدن پر سے اُتار دے اور اُس کی آتشِ محبت میں جل جائے تو پھر بھی خدا اس طرف رحمت کے ساتھ توجہ نہ کرے کیا اِس کا نام قانونِ قدرت ہے؟ لعنة اللّٰہ علی الکاذبین۔

(چشمۂ معرفت ص ۱۲۵-۱۲۶)

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ توبہ کے لئے تین شرائط ہیں۔ بدوں ان کی تکمیل کے سچی توبہ جسے توبۃ النصوح کہتے ہیں حاصل نہیں ہوتی۔ اِن ہر سہ شرائط میں سے پہلی شرط جسے عربی زبان میں اقلاع کہتے ہیں۔ یعنی ان خیالاتِ فاسدہ کو دُور کر دیا جاوے جو ان خصائلِ ردّیہ کے محرک ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ تصوّرات کا بڑا بھاری اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ حیطۂ عمل میں آنے سے پیشتر ہر ایک فعل ایک تصوّری صورت رکھتا ہے۔ پس توبہ کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ان خیالاتِ فاسدہ و تصوّراتِ بد کو چھوڑ دے۔ مثلاً اگر ایک شخص کسی عورت سے کوئی ناجائز تعلق رکھتا ہو تو اُسے توبہ کرنے کے لئے پہلے ضروری ہے کہ اس کی شکل کو بدصورت قرار دے اور اس کی تمام خصائل

رذیلہ کو اپنے دل میں مستحضر کرے۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے تصوّرات کا اثر بہت زبردست اثر ہے۔ اور میں نے صوفیوں کے تذکروں میں پڑھا ہے کہ انہوں نے تصوّر کو یہاں تک پہنچایا کہ انسان کو بندر یا خنزیر کی صورت میں دیکھا۔ غرض یہ ہے کہ جیسا کوئی تصوّر کرتا ہے ویسا ہی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ پس جو خیالات بد لذّات کا موجب سمجھے جاتے تھے ان کا قلع قمع کرے۔ یہ پہلی شرط ہے۔

دوسری شرط ندم ہے۔ یعنی پشیمانی اور ندامت ظاہر کرنا۔ ہر ایک انسان کا کانشنس اپنے اندر یہ قوت رکھتا ہے کہ وہ اس کو ہر بُرائی پر متنبہ کرتا ہے مگر بدبخت انسان اُس کو معطل چھوڑ دیتا ہے۔ پس گناہ اور بدی کے ارتکاب پر پشیمانی ظاہر کرے اور یہ خیال کرے کہ یہ لذّات عارضی اور چند روزہ ہیں۔ اور پھر یہ بھی سوچے کہ ہر مرتبہ اس لذّت اور حظّ میں کمی ہوتی جاتی ہے یہانتک کہ بڑھاپے میں آکر جبکہ قویٰ بے کار اور کمزور ہو جائیں گے آخر ان سب لذّاتِ دنیا کو چھوڑنا ہوگا پس جبکہ خود زندگی ہی میں یہ سب لذّات چھوٹ جانے والی ہیں تو پھر ان کے ارتکاب سے کیا حاصل؟ بڑا ہی خوش قسمت ہے وہ انسان جو توبہ کی طرف رجوع کرے اور جس میں اوّل اقلاع کا خیال پیدا ہو یعنی خیالات فاسدہ و تصوّرات بیہودہ کا قلع قمع کرے۔ جب یہ نجاست اور ناپاکی نکل جائے تو پھر نادم ہو اور اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

تیسری شرط عزم ہے۔ یعنی آئندہ کے لیے مصمم ارادہ کر لے کہ پھر ان برائیوں کی طرف رجوع نہ کرے گا۔ اور جب وہ مداومت کریگا تو خدا تعالیٰ اُسے سچی توبہ کی توفیق عطا کریگا یہاں تک کہ وہ سیئات اس سے قطعاً زائل ہو کر اخلاقِ حسنہ اور افعالِ حمیدہ اُن کی جگہ لے لینگے۔ اور یہ فتح ہے اخلاق پر۔ اِس پر قوت اور طاقت بخشنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے کیونکہ تمام طاقتوں اور قوتوں کا مالک وہی ہے جیسے فرمایا۔ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۱۳۲-۱۳۴)

استغفار کے حقیقی اور اصلی معنے یہ ہیں کہ خدا سے درخواست کرنا کہ بشریت کی کوئی کمزوری ظاہر نہ ہو اور خدا فطرت کو اپنی طاقت کا سہارا دے اور اپنی حمایت اور نصرت کے حلقہ کے اندر لے لے۔ یہ لفظ غفر سے لیا گیا ہے جو ڈھانکنے کو کہتے ہیں۔ سو اس کے یہ معنے ہیں کہ خدا اپنی قوت کے ساتھ شخصِ مستغفر کی فطرتی کمزوری کو ڈھانک لے۔ لیکن بعد اس کے عام لوگوں کے لیے اِس لفظ کے معنے اَور بھی وسیع کیے گئے ہیں۔ اور یہ بھی مراد کہ خدا گناہ کو جو صادر ہو چکا ہو ڈھانک لے۔ لیکن اصل اور حقیقی معنے یہی ہیں کہ خدا اپنی خدائی کی طاقت کے ساتھ

مستغفر کو جو استغفار کرتا ہے فطرتی کمزوری سے بچاوے۔ اور اپنی طاقت سے طاقت بخشے۔ اور اپنے علم سے علم عطا کرے۔ اور اپنی روشنی سے روشنی دے۔ کیونکہ خدا انسان کو پیدا کرکے اُس سے الگ نہیں ہوا بلکہ وہ جیسا کہ انسان کا خالق ہے اور اُس کے تمام قویٰ اندرونی اور بیرونی کا پیدا کرنیوالا ہے ویسا ہی وہ انسان کا قیوم بھی ہے یعنی جو کچھ بنایا ہے اُس کو خاص اپنے سہارے سے محفوظ رکھنے والا ہے۔ پس جبکہ خدا کا نام قیوم بھی ہے یعنی اپنے سہارے سے مخلوق کو قائم رکھنے والا اِس لئے انسان کے لئے لازم ہے کہ جیسا کہ وہ خدا کی خالقیت سے پیدا ہوا ہے ایسا ہی وہ اپنی پیدائش کے نقش کو خدا کی قیومیت کے ذریعہ بگڑنے سے بچاوے ....

پس انسان کے لئے یہ ایک طبعی ضرورت تھی جس کے لئے استغفار کی ہدایت ہے۔ اِسی کی طرف قرآن شریف میں یہ اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ......
...... سو وہ خالق بھی ہے اور قیوم بھی۔ اور جب انسان پیدا ہو گیا تو خالقیت کا کام تو پورا ہو گیا مگر قیومیت کا کام ہمیشہ کے لئے ہے اس لئے دائمی استغفار کی ضرورت پیش آئی۔ غرض خدا کی ہر ایک صفت کے لئے ایک فیض ہے اور استغفار صفت قیومیت کا فیض حاصل کرنے کے لئے ہے۔ اِسی کی طرف اشارہ سورۂ فاتحہ کی اس آیت میں ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی اس بات کی مدد چاہتے ہیں کہ تیری قیومیّت اور ربوبیت ہمیں مدد دے اور ہمیں ٹھوکر سے بچاوے تا ایسا نہ ہو کہ کمزوری ظہور میں آوے اور ہم عبادت نہ کرسکیں۔

اس تمام تفصیل سے ظاہر ہے کہ استغفار کی درخواست کے اصل معنے یہی ہیں کہ وہ اس لئے نہیں ہوتی کہ کوئی حق فوت ہو گیا ہے بلکہ اس خواہش سے ہوتی ہے کہ کوئی حق فوت نہ ہو۔ اور انسانی فطرت اپنے تئیں کمزور دیکھ کر طبعاً خدا سے طاقت طلب کرتی ہے جیسا کہ بچّہ ماں سے دودھ طلب کرتا ہے۔ پس جیسا کہ خدا نے ابتداء سے انسان کو زبان آنکھ دل کان وغیرہ عطا کئے ہیں ایسا ہی استغفار کی خواہش بھی ابتداء سے ہی عطا کی ہے اور اس کو محسوس کرایا ہے کہ وہ اپنے وجود کے ساتھ خدا سے مدد پانے کا محتاج ہے۔ اس کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا۔ و استغفر لذنبك وللمؤمنین والمؤمنات۔ یعنی خدا سے درخواست کر کہ تیری فطرت کو بشریت کی کمزوری سے محفوظ رکھے اور اپنی طرف سے فطرت کو ایسی قوت دے کہ وہ کمزوری ظاہر نہ ہونے پاوے اور ایسا ہی ان مردوں اور عورتوں کے لئے جو

تیرے پر ایمان لاتے ہیں بطور شفاعت کے دعا کرتا رہ کہ تا جو فطرتی کمزوری سے اُن سے خطائیں ہوتی ہیں اُن کی سزا سے وہ محفوظ رہیں اور آئندہ زندگی اُن کی گناہوں سے بھی محفوظ ہو جائے یہ آیت معصومیت اور شفاعت کے اعلیٰ درجہ کی فلاسفی پر مشتمل ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انسان اعلیٰ درجہ کے مقامِ عصمت پر اور مرتبۂ شفاعت پر تب ہی پہنچ سکتا ہے کہ جب اپنی کمزوری کے روکنے کے لئے اور نیز دوسروں کو گناہ کی زہر سے نجات دینے کے لئے ہر دم اور ہر آن دعا مانگتا رہتا ہے اور تضرعات سے خدا تعالیٰ کی طاقت کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور پھر چاہتا ہے کہ اس طاقت سے دوسروں کو بھی حصہ ملے جو بوسیلہ ایمان اس سے پیوند پیدا کرتے ہیں۔ معصوم انسان کو خدا سے طاقت طلب کرنے کی اس لئے ضرورت ہے کہ انسانی فطرت اپنی ذات میں تو کوئی کمال نہیں رکھتی بلکہ ہر دم خدا سے کمال پاتی ہے۔ اور اپنی ذات میں کوئی قوت نہیں رکھتی بلکہ ہر دم خدا سے قوت پاتی ہے۔ اور اپنی ذات میں کوئی کامل روشنی نہیں رکھتی بلکہ خدا سے روشنی اُترتی ہے اس میں اصل راز یہ ہے کہ کامل فطرت کو صرف ایک کشش دی جاتی ہے تا وہ طاقت بالا کو اپنی طرف کھینچ لے مگر طاقت کا خزانہ محض خدا کی ذات ہے اس خزانہ سے فرشتے بھی اپنے لئے طاقت کھینچتے ہیں۔ اور ایسا ہی انسان کامل بھی اس سرچشمہ طاقت سے عبودیت کی نالی کے ذریعہ سے عصمت اور فضل کی طاقت کھینچتا ہے۔ لہذا انسانوں میں سے وہی معصوم کامل ہے جو استغفار سے الٰہی طاقت کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور اس کشش کے لئے تضرع اور خشوع کا ہر دم سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ تا اس پر روشنی اُترتی رہے .... پس استغفار کیا چیز ہے؟ یہ اس آلہ کی مانند ہے جس کی راہ سے طاقت اُترتی ہے۔ تمام راز توحید کا اسی اصول سے وابستہ ہے کہ صفت عصمت کو انسان کی ایک مستقل جائیداد قرار نہ دیا جائے بلکہ اس کے حصول کے لئے محض خدا کو سرچشمہ سمجھا جائے۔ ذات باری تعالیٰ کو تمثیل کے طور پر دل سے مشابہت ہے جس میں مصفیٰ خون کا ذخیرہ جمع رہتا ہے اور انسان کامل کا استغفار ان شرائین اور عروق کی مانند ہے جو دل کے ساتھ پیوستہ ہیں اور خون صافی ان میں سے کھینچتی ہیں اور تمام اعضاء پر تقسیم کرتی ہیں جو خون کی محتاج ہیں۔

(ریویو آف ریلیجنز اردو جلد اوّل ص ۱۹۲-۱۹۵)

استغفار اور توبہ دو چیزیں ہیں۔ ایک وجہ سے استغفار کو توبہ پر تقدم حاصل ہے کیونکہ استغفار مدد اور قوت ہے جو خدا سے حاصل کی جاتی ہے۔ اور توبہ اپنے قدموں پر

کھڑا ہونا ہے۔ عادت اللہ یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے مدد چاہے گا تو خدا تعالےٰ ایک قوت دیدیگا۔ اور پھر اس قوت کے بعد انسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائیگا اور نیکیوں کو کرنے کے لئے اس میں ایک قوت پیدا ہو جائیگی۔ جس کا نام تُوْبُوْا اِلَيْهِ ہے۔ اس لئے طبعی طور پر بھی یہی ترتیب ہے۔ غرض اس میں ایک طریق ہے جو سالکوں کے لئے رکھا ہے کہ سالک ہر حالت میں خدا سے استمداد چاہے۔ سالک جب تک اللہ تعالیٰ سے قوت نہ پائے گا کیا کر سکیگا۔ توبہ کی توفیق استغفار کے بعد ملتی ہے۔ اگر استغفار نہ ہو تو یقیناً یاد رکھو کہ توبہ کی قوت مر جاتی ہے۔ پھر اگر اس طرح پر استغفار کرو گے اور پھر توبہ کرو گے تو نتیجہ یہ ہو گا يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ سُنت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ اگر استغفار اور توبہ کرو گے تو اپنے مراتب پالو گے۔ ہر ایک حِسّ کے لئے ایک دائرہ ہے جس میں وہ مدارج ترقی کو حاصل کرتا ہے۔ ہر ایک آدمی نبی۔ رسول صدیق اور شہید نہیں ہو سکتا۔

(ملفوظات جلد دوم ص ٦٨ - ٦٩)

وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ۔ یاد رکھو کہ دو چیزیں اس امت کو عطا فرمائی گئی ہیں۔ ایک قوت حاصل کرنے کے واسطے۔ دوسری حاصل کردہ قوت کو عملی طور پر دکھانے کے لئے۔ قوت حاصل کرنے کے واسطے استغفار ہے جس کو دوسرے لفظوں میں استمداد اور استعانت بھی کہتے ہیں۔ صوفیوں نے لکھا ہے کہ جیسے ورزش کرنے سے مثلاً مگدروں اور موگریوں کے اُٹھانے اور پھیرنے سے جسمانی قوت اور طاقت بڑھتی ہے۔ اسی طرح پر روحانی مگدر استغفار ہے۔ اس کے ساتھ رُوح کو ایک قوت ملتی ہے اور دل میں استقامت پیدا ہوتی ہے۔ جسے قوت یعنی مطلوب ہو وہ استغفار کرے

(ملفوظات جلد دوم ص ٦٧)

خدا تعالےٰ کے فضل و کرم کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ انسان اگر سچے دل سے اور اخلاص لے کر رجوع کرے تو وہ غفور رحیم ہے۔ اور توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔ یہ سمجھنا کہ کس کس گنہگار کو بخشیگا خدا تعالیٰ کے حضور سخت گستاخی اور بے ادبی ہے۔ اس کی رحمت کے خزانے وسیع اور لا انتہا ہیں۔ اس کے حضور کوئی کمی نہیں اس کے دروازے کسی پر بند نہیں ہوتے۔ انگریزوں کی نوکریوں کی طرح نہیں کہ اتنے تعلیم یافتہ کو کہاں سے نوکریاں ملیں

خدا کے حضور جس قدر پہنچیں گے سب اعلیٰ مدارج پائیں گے۔ یہ یقینی وعدہ ہے۔ وہ انسان بڑا ہی بدقسمت اور بدبخت ہے جو خدا تعالیٰ سے مایوس ہو اور اس کی نزع کا وقت غفلت کی حالت میں اُس پر آجاوے۔ بیشک اُس وقت دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

(ملفوظات جلد سوم ص۲۹۶)

بعض آدمی ایسے ہیں کہ ان کو گناہ کی خبر ہوتی ہے اور بعض ایسے کہ ان کو گناہ کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے استغفار کا التزام کرایا ہے کہ انسان ہر ایک گناہ کے لئے خواہ وہ ظاہر کا ہو خواہ باطن کا خواہ اسے علم ہو یا نہ ہو۔ اور ہاتھ اور پاؤں اور زبان اور ناک اور کان اور آنکھ اور سب قسم کے گناہوں سے استغفار کرتا رہے۔ آجکل آدم علیہ السلام کی دُعا پڑھنی چاہیئے۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ یہ دُعا اوّل ہی قبول ہو چکی ہے۔ غفلت سے زندگی بسر مت کرو۔ جو شخص غفلت سے زندگی نہیں گذارتا ہرگز اُمید نہیں کہ وہ کسی فوق الطاقت بلا میں مبتلا ہو۔ کوئی بلا بغیر اذن کے نہیں آتی۔ جیسے مجھے یہ دعا الہام ہوئی۔

رَبِّ كُلُّ شَيْءٍ خَادِمُكَ رَبِّ فَاحْفَظْنِيْ وَانْصُرْنِيْ وَارْحَمْنِيْ

(ملفوظات جلد چہارم ص۲۷۵)

غفلت غیر معلوم اسباب سے ہے۔ بعض وقت انسان نہیں جانتا اور ایک دفعہ ہی زنگ اور تیرگی اس کے قلب پر آجاتی ہے۔ اس لئے استغفار ہے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ زنگ اور تیرگی نہ آوے۔ عیسائی لوگ اپنی بیوقوفی سے اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے سابقہ گناہوں کا ثبوت ملتا ہے۔ اصل معنے اس کے یہ ہیں کہ گناہ صادر ہی نہ ہو ورنہ اگر استغفار سابقہ صادر شدہ گناہوں کی بخشش کے معنے رکھتا ہے تو وہ بتلادیں کہ آئندہ گناہوں کے نہ صادر ہونے کے معنوں میں کونسا لفظ ہے۔ غَفر اور کَفر کے ایک ہی معنے ہیں۔ تمام انبیاء اس کے محتاج تھے۔ جتنا کوئی استغفار کرتا ہے اُتنا ہی معصوم ہوتا ہے۔ اصل معنے یہ ہیں کہ خدا نے اُسے بچایا۔ معصوم کہنے کے معنے مستغفر کے ہیں۔

(ملفوظات جلد چہارم ص۲۵۵)

پس اُٹھو! اور توبہ کرو اور اپنے مالک کو نیک کاموں سے راضی کرو۔ اور

یاد رکھو کہ اعتقادی غلطیوں کی سزا تو مرنے کے بعد ہے اور ہندو یا عیسائی یا مسلمان ہونے کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہو گا۔ لیکن جو شخص ظلم اور تعدی اور فسق و فجور میں حد سے بڑھتا ہے اس کو اسی جگہ سزا دی جاتی ہے۔ تب وہ خدا کی سزا سے کسی طرح بھاگ نہیں سکتا۔ سو اپنے خدا کو جلدی راضی کر لو اور قبل اس کے کہ وہ دن آوے جو خوفناک دن ہے یعنی طاعون کے زور کا دن جس کی نبیوں نے خبر دی ہے تم خدا سے صلح کر لو۔ وہ نہایت درجہ کریم ہے۔ ایک دم کے گداز کرنے والی توبہ سے ستّر برس کے گناہ بخش سکتا ہے۔ اور یہ مت کہو کہ توبہ منظور نہیں ہوتی۔ یاد رکھو کہ تم اپنے اعمال سے کبھی بچ نہیں سکتے۔ ہمیشہ فضل بچاتا ہے نہ اعمال۔ اے خدائے کریم و رحیم! ہم سب پر فضل کر کہ ہم تیرے بندے اور تیرے آستانہ پر گرے ہیں۔ آمین

(لیکچر لاہور ص۳۹)

نجات

انسان اس دار الظلمات میں آکر کبھی نجات نہیں پا سکتا بجز اس کے کہ خود خدا تعالےٰ کے مکالمات سے مشرف ہو کر یا کسی اہلِ مکالمہ یقینیہ اور اہلِ آیاتِ بیّنہ کی صحبت میں رہ کر اس ضروری اور قطعی علم تک پہنچ جائے کہ اس کا ایک خدا ہے جو قادر اور کریم اور رحیم ہے۔ اور یہ دین یعنی اسلام جس پر یہ قائم ہے درحقیقت یہ سچا ہے اور روزِ جزا اور بہشت اور دوزخ سب سچ ہے کیونکہ اگرچہ قصّہ اور نقل کے طور پر تمام اہلِ اسلام اس بات کو مانتے ہیں کہ خدا موجود ہے اور اسکا رسول برحق۔ مگر یہ ایمان کوئی یقینی بنیاد نہیں رکھتا۔ اس لئے ایسے ضعیف ایمان کے ذریعہ سے یقینی زنگ کے آثار ہونا اور گناہ سے سچی نفرت کرنا غیر ممکن ہے۔

(نزول المسیح ص ١٠٧)

افسوس کہ اکثر لوگ نجات کے حقیقی معنوں سے بے خبر اور غافل ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک نجات کے یہ معنے ہیں کہ گناہ کے مؤاخذہ سے رہائی ہو جائے۔ لیکن دراصل نجات کے یہ معنے نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ ایک شخص نہ زنا کرے نہ چوری کرے نہ جھوٹی گواہی دے نہ خون کرے اور نہ کسی اور گناہ کا جہاں تک اس کو علم ہے ارتکاب کرے اور بایں ہمہ نجات کی کیفیت سے بے نصیب اور محروم ہو کیونکہ دراصل نجات اس دائمی خوشحالی کے حصول کا نام ہے جس کی بھوک اور پیاس انسانی فطرت کو لگا دی گئی ہے جو محض خدا تعالیٰ کی ذاتی محبت اور اس کی پوری معرفت اور اس کے پورے تعلق کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جس میں شرط ہے کہ دونوں طرف سے محبت جوش مارے . . . . طالبِ حق کیلئے جو قابل غور سوال ہے وہ یہی سوال ہے کہ سچی خوشحالی کیونکر حاصل ہو جو دائمی مسرت اور خوشی کا موجب ہو۔ اور درحقیقت سچے مذہب کی یہی نشانی ہے کہ وہ اس خوشحالی تک پہنچا دے۔ سو ہم قرآن شریف کی ہدایت سے اس دقیق در دقیق نکتہ تک پہنچتے ہیں کہ وہ ابدی خوشحالی خدا تعالیٰ کی صحیح معرفت اور پھر اس یگانہ کی پاک اور کامل اور ذاتی محبت اور کامل ایمان میں ہے جو دل میں عاشقانہ بیقراری پیدا کرے۔ یہ چند لفظ کہنے تو بہت تھوڑے ہیں لیکن انکی کیفیت کو بیان کرنے کیلئے ایک دفتر بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔

(چشمہ مسیحی ص ٣٢)

قرآن شریف جو خدا نے یہ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اے بندو! مجھ سے نا امید مت ہو۔ میں رحیم و کریم اور ستّار و غفار ہوں اور سب سے زیادہ تم پر رحم کرنے والا ہوں اور اس طرح کوئی بھی تم پر رحم نہیں کرے گا جو میں کرتا ہوں۔ اپنے باپوں سے زیادہ میرے ساتھ محبت کرو کہ درحقیقت میں محبت میں اُن سے زیادہ ہوں۔ اگر تم میری طرف آؤ تو میں سارے گناہ بخش دونگا اور اگر تم توبہ کرو تو میں قبول کرونگا۔ اور اگر تم میری طرف آہستہ قدم سے بھی آؤ تو میں دوڑ کر آؤں گا۔ جو شخص مجھے ڈھونڈے گا وہ مجھے پائیگا اور جو شخص میری طرف رجوع کرے گا وہ میرے دروازہ کو کھلا پائیگا۔ میں توبہ کرنے والے کے گناہ بخشتا ہوں خواہ پہاڑوں سے زیادہ گناہ ہوں۔ میرا رحم تم پر بہت زیادہ ہے اور غضب کم ہے کیونکہ تم میری مخلوق ہو۔ میں نے تمہیں پیدا کیا اس لئے میرا رحم تم سب پر محیط ہے۔

(چشمۂ معرفت ص۴۸)

اے معزز صاحبان! مجھے بہت سے غور کے بعد اور نیز خدا کی متواتر وحی کے بعد معلوم ہوا ہے کہ اگرچہ اس ملک میں مختلف فرقے بکثرت پائے جاتے ہیں اور مذہبی اختلاف ایک سیلاب کی طرح حرکت کر رہے ہیں تاہم وہ امر جو اس کثرت اختلاف کا موجب ہے وہ درحقیقت ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اکثر انسانوں کے اندر سے قوت روحانیت اور خدا ترسی کی کم ہو گئی ہے اور وہ آسمانی نور جس کے ذریعے سے انسان حق اور باطل میں فرق کر سکتا ہے وہ قریباً بہت سے دلوں میں سے جاتا رہا ہے۔ اور دنیا ایک دہریت کا رنگ پکڑتی جاتی ہے۔ یعنی زبانوں پر تو خدا اور پرمیشر ہے اور دلوں میں ناستک مت کے خیالات بڑھتے جاتے ہیں اس بات پر یہ امر گواہ ہے کہ عملی حالتیں جیسا کہ چاہیئے درست نہیں ہیں۔ سب کچھ زبان سے کہا جاتا ہے مگر عمل کے رنگ میں دکھلایا نہیں جاتا۔ اگر کوئی پوشیدہ راستباز ہے تو میں اُس پر کوئی حملہ نہیں کرتا مگر عام حالتیں جو ثابت ہو رہی ہیں وہ یہی ہیں کہ جس غرض کے لئے مذہب کو انسان کے لازم حال کیا گیا ہے وہ غرض مفقود ہے۔ دل کی حقیقی پاکیزگی اور خدا تعالیٰ کی سچی محبت اور اس کی مخلوق کی سچی ہمدردی اور حلم اور رحم اور انصاف اور فروتنی اور دوسر تمام پاک اخلاق اور تقویٰ اور طہارت اور راستی جو ایک رُوح مذہب کی ہے اس کی طرف اکثر انسانوں کی توجہ نہیں۔ مقامِ افسوس ہے کہ دنیا میں مذہبی رنگ میں تو جنگ و جدل روز بروز بڑھتے جاتے ہیں مگر روحانیت کم ہوتی جاتی ہے۔ مذہب کی اصل غرض اُسی سچے

خدا کو پہچاننا ہے جس نے اس تمام عالم کو پیدا کیا۔ اور اس کی محبت میں اس مقام تک پہنچنا ہے جو غیر کی محبت کو جلا دیتا ہے۔ اور اُس کی مخلوق سے ہمدردی کرنا ہے اور حقیقی پاکیزگی کا جامہ پہننا ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہ غرض اس زمانہ میں بالائے طاق ہے اور اکثر لوگ دہریہ مذہب کی کسی شاخ کو اپنے ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں اور خدا تعالےٰ کی شناخت بہت کم ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے زمین پر دن بدن گناہ کرنے کی دلیری بڑھتی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ بدیہی بات ہے کہ جس چیز کی شناخت نہ ہو نہ اس کا قدر دل میں ہوتا ہے اور نہ اس کی محبّت ہوتی ہے اور نہ اس کا خوف ہوتا ہے۔ تمام اقسام خوف و محبت اور قدر دانی کے شناخت کے بعد ہوتے ہیں۔

پس اس سے ظاہر ہے کہ آجکل دنیا میں گناہ کی کثرت بوجہ کمیٔ معرفت ہے اور سچّے مذہب کی نشانیوں میں سے یہ ایک عظیم الشان نشانی ہے کہ خدا تعالیٰ کی معرفت اور اس کی پہچان کے وسائل بہت سے اس میں موجود ہوں۔ تا انسان گناہ سے رُک سکے اور تا وہ خدا تعالیٰ کے حسن و جمال پر اطلاع پا کر کامل محبت اور عشق کا حصہ لیوے۔ اور تا وہ قطع تعلق کی حالت کو جہنم سے زیادہ سمجھے۔ یہ سچی بات ہے کہ گناہ سے بچنا اور خدا تعالےٰ کی محبت میں محو ہو جانا انسان کے لئے ایک عظیم الشان مقصود ہے اور یہی وہ راحتِ حقیقی ہے جس کو ہم بہشتی زندگی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تمام خواہشیں جو خدا کی رضامندی کے مخالف ہیں دوزخ کی آگ ہیں اور ان خواہشوں کی پیروی میں عمر بسر کرنا ایک جہنمی زندگی ہے۔ مگر اس جگہ سوال یہ ہے کہ اس جہنمی زندگی سے نجات کیونکر حاصل ہو؟ اس کے جواب میں جو علم خدا نے مجھے دیا ہے وہ یہی ہے کہ اس آتش خانہ سے نجات ایسی معرفتِ الٰہی پر موقوف ہے جو حقیقی اور کامل ہو۔ کیونکہ نفسانی جذبات جو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں وہ ایک کامل درجہ کا سیلاب ہے جو ایمان کو تباہ کرنے کے لئے بڑے زور سے بہ رہا ہے اور کامل کا تدارک بجز کامل کے غیر ممکن ہے۔ پس اسی وجہ سے نجات حاصل کرنے کیلئے ایک کامل معرفت کی ضرورت ہے۔

(لیکچر لاہور ص۳-۵)

اے پیارو! یہ نہایت سچا آزمودہ فلسفہ ہے کہ انسان گناہ سے بچنے کے لئے معرفت تامہ کا محتاج ہے نہ کسی کفارہ کا۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر نوح کی قوم کو وہ معرفت تامہ حاصل ہوتی جو کامل خوف کو پیدا کرتی ہے تو وہ کبھی غرق نہ ہوتی۔ اور اگر لوط کی قوم کو وہ پہچان بخشی جاتی تو اُن پر پتھر نہ برستے اور اگر اس ملک کو ذاتِ الٰہی کی وہ شناخت عطا کی جاتی جو بدن پر خوف سے

لرزہ ڈالتی ہے تو اِس پر طاعون سے وہ تباہی نہ آتی جو آگئی۔ مگر ناقص معرفت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ اس کا نتیجہ جو خوف اور محبت ہے کامل ہو سکتا ہے۔ ایمان جو کامل نہیں وہ بے سود ہے اور محبت جو کامل نہیں وہ بے سود ہے اور خوف جو کامل نہیں وہ بے سود ہے اور معرفت جو کامل نہیں وہ بے سود ہے۔ اور ہر ایک غذا اور شربت جو کامل نہیں وہ بے سود ہے۔ کیا تم بھوک کی حالت میں صرف ایک دانہ سے سیر ہو سکتے ہو یا پیاس کی حالت میں صرف ایک قطرہ سے سیراب ہو سکتے ہو۔ پس اے سُست ہمتو! اور طلب حق میں کاہلو! تم تھوڑی معرفت سے۔ تھوڑی محبت سے اور تھوڑے خوف سے کیونکر خدا کے بڑے فضل کے اُمیدوار ہو سکتے ہو۔ گناہ سے پاک کرنا اور اپنی محبت سے دل کو پُر کر دینا اُسی قادرِ توانا کا فعل ہے اور عظمت کا خوف کسی دل میں قائم کرنا اسی جناب کے ارادہ سے وابستہ ہے اور قانونِ قدرت قدیم سے ایسا ہی ہے کہ یہ سب کچھ معرفتِ کاملہ کے بعد ملتا ہے۔ خوف اور محبت اور قدر دانی کی جڑ معرفتِ کاملہ ہے۔ پس جسکو معرفتِ کاملہ دی گئی۔ اُس کو خوف اور محبت بھی کامل دی گئی اور جس کو خوف اور محبت کامل دی گئی اس کو ہر ایک گناہ سے جو بیباکی سے پیدا ہوتا ہے نجات دی گئی۔ پس ہم اِس نجات کے لئے نہ کسی خون کے محتاج ہیں اور نہ کسی صلیب کے حاجتمند اور نہ کسی کفارہ کی ہمیں ضرورت ہے بلکہ ہم صرف ایک قربانی کے محتاج ہیں جو اپنے نفس کی قربانی ہے جس کی ضرورت کو ہماری فطرت محسوس کر رہی ہے۔ ایسی قربانی کا دوسرے لفظوں میں نام اسلام ہے۔ اسلام کے معنے ہیں ذبح ہونے کے لئے گردن آگے رکھ دینا۔ یعنی کامل رضا کے ساتھ اپنی رُوح کو خدا کے آستانہ پر رکھ دینا۔ یہ پیارا نام تمام شریعت کی رُوح اور تمام احکام کی جان ہے۔ ذبح ہونے کے لئے اپنی دلی خوشی اور رضا سے گردن آگے رکھ دینا کامل محبت اور کامل عشق کو چاہتا ہے اور کامل محبت کامل معرفت کو چاہتی ہے۔ پس اسلام کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حقیقی قربانی کے لئے کامل معرفت اور کامل محبت کی ضرورت ہے نہ کسی اور چیز کی ضرورت۔ اسی کی طرف خدا تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے۔ لن ینال اللّٰہ لحومها ولا دماؤها ولٰکن ینالہ التقوٰی منکم یعنی تمہاری قربانیوں کے نہ تو گوشت پہنچ سکتے ہیں اور نہ خون بلکہ صرف یہ قربانی میرے تک پہنچتی ہے کہ تم مجھ سے ڈرو اور میرے لئے تقوٰی اختیار کرو۔

(لیکچر لاہور ص ۹)

اگر یہ سوال پیش ہے کہ اگر خونِ مسیح گناہوں سے پاک نہیں کر سکتا جیسا کہ وہ واقعی طور

پاک نہیں کر سکا تو پھر گناہوں سے پاک ہونے کا کوئی علاج بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ گندی زندگی درحقیقت مرنے سے بدتر ہے۔ تو میں اس سوال کے جواب میں نہ صرف پُرزور دعویٰ سے بلکہ اپنے ذاتی تجربہ سے اور اپنی حقیقت اِس آزمائشوں سے دیتا ہوں کہ درحقیقت گناہوں سے پاک ہونے کے لئے اُسوقت سے جو انسان پیدا ہوا آج تک جو آخری دن ہے صرف ایک ہی ذریعہ گناہ اور نافرمانی سے بچنے کا ثابت ہوا ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان یقینی دلائل اور چمکتے ہوئے نشانوں کے ذریعہ سے اس معرفت تک پہنچ جائے کہ جو درحقیقت خدا کو دکھا دیتی ہے اور کھل جاتا ہے کہ خدا کا غضب ایک کھا جانے والی آگ ہے اور پھر تجلّی حُسنِ الٰہی ہو کر ثابت ہو جاتا ہے کہ ہریک کامل لذّت خدا میں ہے یعنی جلالی اور جمالی طور پر تمام پردے اُٹھائے جاتے ہیں۔ یہی ایک طریق ہے جس سے جذبات نفسانی رکتے ہیں اور جس سے چار ناچار ایک تبدیلی انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس جواب کے وقت کتنے لوگ بول اٹھیں گے کیا ہم خدا پر ایمان نہیں رکھتے؟ کیا ہم خدا سے نہیں ڈرتے اور اس سے محبت نہیں رکھتے؟ اور کیا تمام دنیا بجز تھوڑے افراد کے خدا کو نہیں مانتی؟ اور پھر وہ طرح طرح کے گناہ بھی کرتے ہیں اور انواع و اقسام کے فسق و فجور میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان اَور چیز ہے اور عرفان اَور چیز ہے اور ہماری تقریر کا یہ مدعا نہیں ہے کہ مومن گناہ سے بچتا ہے بلکہ یہ مدعا ہے کہ عارف کامل گناہ سے بچتا ہے۔ یعنی وہ کہ جس نے خوفِ الٰہی کا مزا بھی چکھا اور محبّت الٰہی کا بھی۔ شائد کوئی کہے کہ شیطان کو معرفت کامل حاصل ہے پھر وہ کیوں نافرمان ہے؟ اِس کا یہی جواب ہے کہ اُس کو وہ معرفت کامل ہرگز حاصل نہیں ہے جو سعیدوں کو بخشی جاتی ہے۔ انسان کی یہ فطرت میں ہے کہ کامل درجہ کے علم سے ضرور وہ متاثر ہوتا ہے اور جب ہلاکت کی راہ اپنا ہیبتناک مُنّہ دکھا دے تو اس کے سامنے نہیں آتا۔ مگر ایمان کی حقیقت صرف یہ ہے کہ حُسن ظن سے مان لے۔ لیکن عرفان کی حقیقت یہ ہے کہ اُس مانی ہوئی بات کو دیکھ بھی لے پس عرفان اور عصیان دونوں کا ایک ہی دل میں جمع ہونا محال ہے جیسا کہ دن اور رات کا ایک ہی وقت میں جمع ہو جانا محال ہے۔

تمہارا روزمرّہ کا تجربہ ہے کہ ایک چیز کا مفید ہونا جب ثابت ہو جائے تو فی الفور اُس کی طرف ایک رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور جب مضر ہونا ثابت ہو جائے تو فی الفور دل اس سے ڈرنے لگتا ہے۔ مثلاً جس کو یہ معلوم نہیں کہ یہ چیز جو میرے ہاتھ میں ہے یہ

سم الفار ہے وہ اس کو طباشیر یا کوئی مفید دوا سمجھ کر ایک ہی وقت میں تولہ یا دو تولے تک بھی کھا سکتا ہے۔ لیکن جس کو اس بات کا تجربہ ہو چکا ہے کہ یہ تو زہر قاتل ہے وہ بقدر ایک ماشہ بھی اس کو استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے کھانے کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو جائیگا۔ اسی طرح جب انسان کو واقعی طور پر علم ہو جاتا ہے کہ بلاشبہ خدا موجود ہے اور درحقیقت تمام قسم کے گناہ اس کی نظر میں قابلِ سزا ہیں جیسے چوری۔ خونریزی۔ بدکاری۔ ظلم خیانت۔ شرک۔ جھوٹ۔ جھوٹی گواہی دینا۔ تکبّر۔ ریاکاری۔ حرامخوری۔ دغا۔ دشنام دہی دھوکا دینا۔ بدعہدی۔ غفلت اور بدمستی میں زندگی گذارنا۔ خدا کا شکر نہ کرنا۔ خدا سے نہ ڈرنا اُس کے بندوں کی ہمدردی نہ کرنا۔ خدا کو پُرخوف دل کے ساتھ یاد نہ کرنا۔ عیاشی اور دنیا کی لذّات میں بکلّی محو ہو جانا اور منعم حقیقی کو فراموش کر دینا۔ دُعا اور عاجزی سے کچھ غرض اور واسطہ نہ رکھنا فروختنی چیزوں میں کھوٹ ملانا یا کم وزن کرنا یا نرخ بازار سے کم بیچنا۔ ماں باپ کی خدمت نہ کرنا بیویوں سے نیک معاشرت نہ رکھنا۔ خاوند کی پوری طرح اطاعت نہ کرنا۔ نامحرم مردوں یا عورتوں کو نظر بد سے دیکھنا۔ یتیموں ضعیفوں کمزوروں درماندوں کی کچھ پروا نہ رکھنا۔ ہمسایہ کے حقوق کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھنا اور اس کو دُکھ دینا۔ اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لئے دوسرے کی توہین کرنا۔ کسی کو دل آزار لفظوں کے ساتھ ٹھٹھا کرنا یا توہین کے طور پر کوئی بدنی نقص اس کا بیان کرنا یا کوئی بُرا لقب اس کا رکھنا یا کوئی بے جا تہمت اس پر لگانا یا خدا پر افترا کرنا اور نعوذ باللہ کوئی جھوٹا دعویٰ نبوت یا رسالت یا منجانب اللہ ہونے کا کر دینا۔ یا خدا تعالیٰ کے وجود سے منکر ہو جانا۔ یا ایک عادل بادشاہ سے بغاوت کرنا اور شرارت سے ملک میں فساد برپا کرنا تو یہ تمام گناہ اس علم کے بعد کہ ہریک کے ارتکاب سے سزا کا ہونا ایک ضروری امر ہے خود بخود ترک ہو جاتے ہیں۔

شائد پھر کوئی دھوکا کھا کر یہ سوال پیش کر دے کہ ہم باوجود اس کے کہ جانتے بھی ہیں کہ خدا موجود ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ گناہوں کی سزا ہو گی پھر بھی ہم سے گناہ ہوتا ہے اسلئے ہم کسی اَور ذریعہ کے محتاج ہیں۔ تو ہم اس کا وہی جواب دینگے جو پہلے دے چکے ہیں کہ ہرگز ممکن نہیں اور کسی طرح ممکن نہیں کہ تم اس بات کی پوری بصیرت حاصل کر کے کہ گناہ کرنے کے ساتھ ہی ایک بجلی کی طرح تم پر سزا کی آگ برسے گی۔ پھر بھی تم گناہ پر دلیر ہو سکو گے۔ یہ ایسی فلاسفی ہے جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتی۔ سوچو اور خوب سوچو کہ جہاں جہاں سزا پانیکا پورا یقین نہیں

حاصل ہے وہاں تم ہرگز اس یقین کے برخلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتے۔ بھلا بتلاؤ کیا تم آگ میں اپنا ہاتھ ڈال سکتے ہو۔ کیا تم پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اپنے تئیں گرا سکتے ہو؟ کیا تم کنوئیں میں گر سکتے ہو؟ کیا تم چلتی ہوئی ریل کے آگے لیٹ سکتے ہو؟ کیا تم شیر کے مُنّہ میں اپنا ہاتھ دے سکتے ہو؟ کیا تم دیوانہ کتّے کے آگے اپنا پَیر کر سکتے ہو؟ کیا تم ایسی جگہ ٹھہر سکتے ہو جہاں بڑی خوفناک صورت سے بجلی گر رہی ہے؟ کیا تم ایسے گھر سے جلد باہر نہیں نکلتے جہاں شہتیر ٹوٹنے لگا ہے یا زلزلہ سے زمین نیچے کو دھنسنے لگی ہے؟ بھلا تم میں سے کون ہے جو ایک زہریلے سانپ کو اپنے پلنگ پر دیکھے اور جلد کود کر نیچے نہ آجائے۔ بھلا ایک ایسے شخص کا نام تو لو کہ جب اس کے کوٹھے کو جس کے اندر وہ سوتا تھا آگ لگ جائے تو وہ سب کچھ چھوڑ کر باہر کو نہ بھاگے؟ تو اب بتلاؤ کہ ایسا تم کیوں کرتے ہو اور کیوں ان تمام موذی چیزوں سے علیحدہ ہو جاتے ہو؟ مگر وہ گناہ کی باتیں جو ابھی مَیں نے لکھی ہیں ان سے تم علیحدہ نہیں ہوتے؟ اس کا کیا سبب ہے؟ پس یاد رکھو کہ وہ جواب جو ایک عقلمند پوری سوچ اور عقل کے بعد دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ ان دونوں صورتوں میں علم کا فرق ہے۔ یعنی خدا کے گناہوں میں اکثر انسانوں کا علم ناقص ہے اور وہ گناہوں کو بُرا تو جانتے ہیں مگر شیر اور سانپ کی طرح نہیں سمجھتے۔ اور پوشیدہ طور پر ان کے دلوں میں یہ خیالات ہیں کہ یہ سزائیں یقینی نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ خدا کے وجود میں بھی اُن کو شک ہے کہ وہ ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو پھر کیا خبر کہ رُوح کو بعد مرنے کے بقا ہے یا نہیں۔ اور اگر بقا بھی ہے تو پھر کیا معلوم کہ ان جرائم کی کچھ سزا بھی ہے یا نہیں۔ بلاشبہ بہتوں کے دلوں کے اندر یہی خیال چھپا ہُوا موجود ہے جس پر انہیں اطلاع نہیں لیکن وہ خوف کے تمام مقامات جن سے وہ پرہیز کرتے ہیں جن کی چند نظیریں میں لکھ چکا ہوں ان کی نسبت سب کو یقین ہے کہ ان چیزوں کے نزدیک جا کر ہم ہلاک ہو جائیں گے اس لئے ان کے نزدیک نہیں جاتے۔ بلکہ ایسی مہلک چیزیں اگر اتفاقاً سامنے بھی آجائیں تو چیخیں مار کر اُن سے دُور بھاگتے ہیں سو اصل حقیقت یہی ہے کہ ان چیزوں کے دیکھنے کے وقت انسان کو علم یقینی ہے کہ ان کا استعمال موجب ہلاکت ہے۔ مگر مذہبی احکام میں علم یقینی نہیں ہے۔ بلکہ محض ظن ہے۔ اور اس جگہ رؤیت ہے اور اُس جگہ محض کہانی ہے۔ سو مجرّد کہانیوں سے گناہ ہرگز دُور نہیں ہو سکتے۔ مَیں اس لئے تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر ایک مسیح نہیں ہزار مسیح بھی مصلوب ہو جائیں تو وہ تمہیں حقیقی نجات ہرگز نہیں دے سکتے کیونکہ

گناہ سے یا کامل خوف چھڑاتا ہے یا کامل محبت۔ اور مسیح کا صلیب پر مرنا اوّل خود جھوٹ اور پھر اس کو گناہ کا جوش بند کرنے سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ سوچ لو کہ یہ کیا دعویٰ تاریکی میں پڑا ہوا ہے جس پر نہ تجربہ شہادت دے سکتا ہے اور نہ مسیح کی خودکشی کی حرکت کو دوسروں کے گناہ بخشے جانے سے کوئی تعلّق پایا جاتا ہے۔ حقیقی نجات کی فلاسفی یہ ہے کہ اسی دُنیا میں انسان گناہ کے دوزخ سے نجات پا جائے۔ مگر تم سوچ لو کہ کیا تم ایسی کہانیوں سے گناہ کے دوزخ سے نجات پا گئے؟ یا کبھی کسی نے اِن بیہودہ قصّوں سے جن میں کچھ بھی سچائی نہیں اور جن کو حقیقی نجات کے ساتھ کوئی بھی رشتہ نہیں نجات پائی ہے؟ مشرق و مغرب میں تلاش کرو کبھی تمہیں ایسے لوگ نہیں ملینگے جو ان قصوں سے اس حقیقی پاکیزگی تک پہنچ گئے ہوں جس سے خدا نظر آجاتا ہے۔ اور جس سے نہ صرف گناہ سے بیزاری ہوتی ہے بلکہ بہشت کی صورت پر سچائی کی لذتیں شروع ہو جاتی ہیں اور انسان کی رُوح پانی کی طرح بہہ کر خدا کے آستانہ پر جا گرتی ہے اور آسمان سے ایک روشنی اُترتی اور تمام نفسانی ظلمت کو دُور کر دیتی ہے اسی طرح جب کہ تم روز روشن میں چاروں طرف کھڑکیاں کھول دو تو یہ طبعی قانون تمہیں نظر آجائے گا کہ فی الفور سورج کی روشنی تمہارے اندر آجائیگی۔ لیکن اگر تم اپنی کھڑکیاں بند رکھو گے تو محض کسی قصہ یا کہانی سے وہ روشنی تمہارے اندر نہیں آسکتی۔ تمہیں روشنی لینے کے لئے یہ ضرور کرنا پڑے گا کہ اپنے مقام سے اُٹھو اور کھڑکیاں کھول دو۔ تب خود بخود روشنی تمہارے اندر آجائے گی اور تمہارے گھر کو روشن کر دے گی۔ کیا کوئی صرف پانی کے خیال سے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے؟ نہیں۔ بلکہ اس کو چاہیئے کہ افتاں و خیزاں پانی کے چشمے پر پہنچے اور اس زلال پر اپنی لبیں رکھدے۔ تب اس آب شیریں سے سیراب ہو جائے گا۔ سو وہ پانی جس سے تم سیراب ہو جاؤ گے اور گناہ کی سوزش اور جلن جاتی رہیگی وہ یقین ہے۔ آسمان کے نیچے گناہ سے پاک ہونے کے لئے بجز اس کے کوئی بھی حیلہ نہیں۔ کوئی صلیب نہیں جو تمہیں گناہ سے چھڑا سکے کوئی خون نہیں جو تمہیں نفسانی جذبات سے روک سکے۔ اِن باتوں کو حقیقی نجات سے کوئی رشتہ اور تعلق نہیں۔ حقیقتوں کو سمجھو۔ سچائیوں پر غور کرو اور جس طرح دنیا کی چیزوں کو آزماتے ہو اِس کو بھی آزماؤ تب جلد سمجھ آجائیگی کہ بغیر سچّے یقین کے کوئی روشنی نہیں جو تمہیں نفسانی ظلمت سے چھڑا سکے اور بغیر کامل بصیرت کے مصفا پانی کے تمہاری اندرونی غلاظتوں کو کوئی بھی دھو نہیں سکتا اور بغیر رؤیت حق کی زلال کے تمہاری جلن اور سوزش کبھی دُور نہیں ہو سکتی

جھوٹا ہے وہ شخص جو اَور اَور تدبیریں تمہیں بتلاتا ہے اور جاہل ہے وہ انسان جو اَور قسم کا علاج کرنا چاہتا ہے۔ وہ لوگ تمہیں روشنی نہیں دے سکتے بلکہ اَور بھی ظلمت کے گڑھے میں ڈالتے ہیں۔ اور تمہیں آبِ شیریں نہیں دیتے بلکہ اَور بھی جلن اور سوزش زیادہ کرتے ہیں۔ کوئی خون تمہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتا مگر وہ خون جو یقین کی غذا سے خود تمہارے اندر پیدا ہو اور کوئی صلیب تمہیں چھڑا نہیں سکتی مگر راہ راست کی صلیب یعنی سچائی پر صبر کرنا۔ سو تم آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ کیا یہ سچ نہیں کہ تم روشنی سے ہی دیکھ سکتے ہو نہ کسی اَور چیز سے۔ اور صرف سیدھی راہ سے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہو نہ کسی اَور راہ سے۔ دنیا کی چیزیں تم سے نزدیک ہیں اور دین کی چیزیں دُور۔ پس جو نزدیک ہیں اُنہی پر غور کرو۔ اور ان کا قانون سمجھ لو اور پھر دُور کو اس پر قیاس کر لو کیونکہ وہی ایک ہے جس نے یہ دونوں قانون بنائے ہیں۔ ......

یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ تم بغیر روشنی حاصل کرنے کے محض اندھے رہ کر پھر کسی کے خون سے نجات پا جاؤ۔ نجات کوئی ایسی شے نہیں ہے جو اس دنیا کے بعد ملیگی۔ سچی اور حقیقی نجات اِسی دنیا میں ملتی ہے۔ وہ ایک روشنی ہے جو دلوں پر اُترتی ہے اور دکھا دیتی ہے کہ کون سے ہلاکت کے گڑھے ہیں۔ حق اور حکمت کی راہ پر چلو کہ اُس سے خدا کو پاؤ گے۔ اور اپنے دلوں میں گرمی پیدا کرو تا سچائی کی طرف حرکت کر سکو۔ بدنصیب ہے وہ دل جو ٹھنڈا پڑا ہے۔ اور بدبخت ہے وہ طبیعت جو افسردہ ہے۔ اور مُردہ ہے وہ کانشنس جس میں چمک نہیں۔ پس تم اُس ڈول سے کم نہ رہو جو کنوئیں میں خالی گرتا اور بھر کر نکلتا ہے اور اُس چھاننی کی صفت مت اختیار کرو جس میں کچھ بھی پانی نہیں ٹھہر سکتا اور ایک راہ سے آتا اور دوسری راہ سے چلا جاتا ہے۔ کوشش کرو کہ تندرست ہو جاؤ۔ اور وہ دنیا طلبی کے تپ کی زہریلی گرمی دُور ہو جائے جس کی وجہ سے نہ آنکھوں میں روشنی ہے نہ کان اچھی طرح سُن سکتے ہیں نہ زبان کا مزہ درست ہے اور نہ ہاتھوں میں زور اور نہ پیروں میں طاقت ہے۔ ایک تعلق کو قطع کرو تا دوسرا تعلق پیدا ہو۔ ایک طرف سے دل کو روکو تا دوسری طرف دل کو راہ مل جائے۔ زمین کا نجس کیڑا پھینک دو تا آسمان کا چمکیلا ہیرا تمہیں عطا ہو۔ اور اپنے مبدء کی طرف رجوع کرو وہی مبارک جبکہ آدم اِس خدائی رُوح سے زندہ کیا گیا تھا تا تمہیں تمام چیزوں پر بادشاہت ملے جیسا کہ تمہارے باپ کو ملی۔

(ریویو آف ریلیجنز اردو جلد اول ص ۲۳-۲۹)

پھر معرفت کے بعد ضروری نجات کے لئے محبتِ الٰہی ہے۔ یہ بات نہایت واضح اور بدیہی ہے کہ کوئی شخص اپنے محبت کرنے والے کو عذاب دینا نہیں چاہتا۔ بلکہ محبت محبّت کو جذب کرتی اور اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جس شخص سے کوئی سچے دل سے محبت کرتا ہے اُسکو یقین کرنا چاہیئے کہ وہ دوسرا شخص بھی جس سے محبت کی گئی ہے اس سے دشمنی نہیں کرسکتا بلکہ اگر ایک شخص ایک شخص کو جس سے وہ اپنے دل سے محبت رکھتا ہے اپنی اس محبت سے اطلاع بھی نہ دے تب بھی اس قدر اثر تو ضرور ہوتا ہے کہ وہ شخص اس سے دشمنی نہیں کرسکتا۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتا ہے۔ اور خدا کے نبیوں اور رسولوں میں جو ایک قوتِ جذب اور کشش پائی جاتی ہے اور ہزارہا لوگ اُن کی طرف کھینچے جاتے اور ان سے محبت کرتے ہیں یہاں تک کہ اپنی جان بھی ان پر فدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ بنی نوع کی بھلائی اور ہمدردی انکے دل میں ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ ماں سے بھی زیادہ انسانوں سے پیار کرتے ہیں اور اپنے تئیں دُکھ اور درد میں ڈالکر بھی اُن کے آرام کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ آخر ان کی سچی کشش سعید دلوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیتی ہے۔ پھر جبکہ انسان باوجودیکہ وہ عالم الغیب نہیں دوسرے شخص کی مخفی محبت پر اطلاع پالیتا ہے تو پھر کیونکر خدا تعالیٰ جو عالم الغیب ہے کسی کی خالص محبت سے بے خبر رہ سکتا ہے محبت عجیب چیز ہے اس کی آگ گناہوں کی آگ کو جلاتی اور معصیت کے شعلہ کو بھسم کر دیتی ہے۔ سچی اور ذاتی اور کامل محبت کے ساتھ عذاب جمع ہو ہی نہیں سکتا اور سچی محبت کے علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُسکی فطرت میں یہ بات منقوش ہوتی ہے کہ اپنے محبوب کے قطع تعلق کا اس کو نہایت خوف ہوتا ہے اور ایک ادنیٰ سے ادنیٰ قصور کے ساتھ اپنے تئیں ہلاک شدہ سمجھتا ہے اور اپنے محبوب کی مخالفت کو اپنے لئے ایک زہر خیال کرتا ہے اور نیز اپنے محبوب کے وصال کے پانے کے لئے نہایت بے تاب رہتا ہے اور بُعد اور دوری کے صدمہ سے ایسا گداز ہوتا ہے کہ بس مر ہی جاتا ہے۔ اس لئے وہ صرف ان باتوں کو گناہ نہیں سمجھتا کہ جو عوام سمجھتے ہیں کہ قتل نہ کر۔ خون نہ کر۔ زنا نہ کر۔ چوری نہ کر۔ جھوٹی گواہی نہ دے بلکہ وہ ایک ادنیٰ غفلت کو اور ادنیٰ التفات کو جو خدا کو چھوڑ کر غیر کی طرف کی جائے ایک کبیرہ گناہ خیال کرتا ہے۔ اس لئے اپنے محبوب ازلی کی جناب میں دوام استغفار اس کا ورد ہوتا ہے اور چونکہ اس بات پر اس کی فطرت راضی نہیں ہوتی کہ وہ کسی وقت بھی خدا تعالیٰ سے الگ رہے۔ اس لئے بشریت کے تقاضا سے ایک ذرہ غفلت بھی اگر صادر ہو تو اُس کو ایک پہاڑ کی طرح گناہ سمجھتا ہے۔ یہی بھید ہے کہ خدا تعالیٰ سے پاک اور کامل تعلق

رکھنے والے ہمیشہ استغفار میں مشغول رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ محبت کا تقاضا ہے کہ ایک محبّ صادق کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے کہ اس کا محبوب اُس پر ناراض نہ ہو جائے اور چونکہ اس کے دل میں ایک پیاس لگا دی جاتی ہے کہ خدا کامل طور پر اُس سے راضی ہو۔ اس لئے اگر خدا تعالیٰ یہ بھی کہے کہ مَیں تجھ سے راضی ہوں تب بھی وہ اسقدر پر صبر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جیسا کہ شراب کے دَور کے وقت ایک شراب پینے والا ہر دم ایک مرتبہ پی کر پھر دوسری مرتبہ مانگتا ہے اِسی طرح جب انسان کے اندر محبت کا چشمہ جوش مارتا ہے تو وہ محبت طبعًا یہ تقاضا کرتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔ پس محبت کی کثرت کی وجہ سے استغفار کی بھی کثرت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے کامل طور پر پیار کرنے والے ہر دم اور ہر لحظہ استغفار کو اپنا وِرد رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر معصوم کی یہی نشانی ہے کہ وہ سب سے زیادہ استغفار میں مشغول رہے۔ اور استغفار کے حقیقی معنے یہ ہیں کہ ہر ایک لغزش اور قصور جو بوجہ ضعفِ بشریت انسان سے صادر ہو سکتی ہے اس امکانی کمزوری کو دُور کرنے کے لئے خدا سے مدد مانگی جائے تا خدا کے فضل سے وہ کمزوری ظہور میں نہ آوے اور مستور و مخفی رہے۔ پھر بعد اس کے استغفار کے معنے عام لوگوں کے لئے وسیع کئے گئے اور یہ امر بھی استغفار میں داخل ہُوا کہ جو کچھ لغزش اور قصور صادر ہو چکا خدا تعالیٰ اس کے بدنتائج اور زہریلی تاثیروں سے دنیا اور آخرت میں محفوظ رکھے۔

پس نجاتِ حقیقی کا سرچشمہ محبّت ذاتی خدائے عزّ و جلّ کی ہے جو عجز و نیاز اور دائمی استغفار کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی محبت کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور جب انسان کمال درجے تک اپنی محبت کو پہنچاتا ہے اور محبت کی آگ سے اپنے جذباتِ نفسیات کو جلا دیتا ہے تب یکدفعہ ایک شعلہ کی طرح خدا تعالیٰ کی محبت جو خدا تعالیٰ اُس سے کرتا ہے اُس کے دل پر گرتی ہے اور اس کو سفلی زندگی کے گندوں سے باہر لے آتی ہے۔ اور خدائے حیّ و قیّوم کی پاکیزگی کا رنگ اُس کے نفس پر چڑھ جاتا ہے بلکہ تمام صفاتِ الٰہیہ سے ظلّی طور پر اس کو حصہ ملتا ہے۔ تب وہ تجلّیاتِ الٰہیہ کا مظہر ہو جاتا ہے اور جو کچھ ربوبیت کے ازلی خزانہ میں مکتوم و مستور ہے اس کے ذریعہ سے وہ اسرار دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

(چشمۂ مسیحی ص۶۱-۶۵)

یہ امید مت رکھو کہ کوئی اَور منصوبہ انسانی نفس کو پاک کر سکے۔ جس طرح تاریکی کو صرف روشنی ہی دُور کرتی ہے اِسی طرح گناہ کی تاریکی کا علاج فقط وہ تجلّیاتِ الٰہیہ قولی و فعلی ہیں جو معجزانہ رنگ میں پُر زور شعاعوں کے ساتھ خدا کی طرف سے کسی سعید دل پر نازل ہوتی ہیں۔ اور اس کو دکھا دیتی ہیں کہ خدا ہے۔ اور تمام شکوک کی غلاظت کو دُور کر دیتی ہیں اور تسلّی اور اطمینان بخشتی ہیں۔ پس اس طاقتِ بالا کی زبردست کشش سے وہ سعید آسمان کی طرف اٹھایا جاتا ہے۔ اس کے سوا جس قدر اور علاج پیش کئے جاتے ہیں سب فضول بناوٹ ہے۔ ہاں کامل طور پر پاک ہونے کیلئے صرف معرفت ہی کافی نہیں بلکہ اُس کے ساتھ پُردرد دعاؤں کا سِلسلہ جاری رہنا بھی ضروری ہے کیونکہ خدا تعالیٰ غنی بے نیاز ہے۔ اس کے فیوض کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے ایسی دعاؤں کی سخت ضرورت ہے جو گریہ اور بکا اور صدق و صفا اور دردِ دل سے پُر ہوں۔ تم دیکھتے ہو کہ بچہ شیر خوار اگرچہ اپنی ماں کو خوب شناخت کرتا ہے اور اس سے محبت بھی رکھتا ہے اور ماں بھی اُس سے محبت رکھتی ہے مگر پھر بھی ماں کا دودھ اُترنے کے لئے شیرخوار بچوں کا رونا بہت کچھ دخل رکھتا ہے ایک طرف بچہ دردناک طور پر بھوک سے روتا ہے اور دوسری طرف اُس کے رونے کا ماں کے دِل پر اثر پڑتا ہے اور دودھ اُترتا ہے۔ پس اس طرح خدا تعالیٰ کے سامنے ہر ایک طالب کو اپنی گریہ وزاری سے اپنی روحانی بھوک پیاس کا ثبوت دینا چاہیئے تا وہ رُوحانی دودھ اُترے اُسے سیراب کرے۔

غرض پاک و صاف ہونے کے لئے صرف معرفت کافی نہیں بلکہ بچوں کی طرح دردناک گریہ وزاری بھی ضروری ہے۔ اور نومید مت ہو اور یہ خیال مت کرو کہ ہمارا نفس گناہوں سے بہت آلودہ ہے۔ ہماری دعائیں کیا چیز ہیں اور کیا اثر رکھتی ہیں۔ کیونکہ انسانی نفس جو دراصل محبتِ الٰہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہ اگرچہ گناہ کی آگ سے سخت مشتعل ہو جائے پھر بھی اس میں ایک ایسی قوت توبہ ہے کہ وہ اس آگ کو بُجھا سکتی ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ ایک پانی کو کیسا ہی آگ سے گرم کیا جائے مگر تاہم جب آگ پر اس کو ڈالا جائے تو وہ آگ کو بُجھا دے گا۔ یہی ایک طریق ہے کہ جب سے خدا تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اسی طریق سے ان کے دل پاک و صاف ہوتے رہے ہیں۔ یعنی بغیر اس کے جو زندہ خدا خود اپنی تجلّی قولی و فعلی سے اپنی ہستی اور اپنی طاقت اور اپنی خدائی ظاہر کرے اور اپنا رُعب چمکتا ہُوا دکھاوے اَور کسی طریق سے انسان گناہ سے پاک نہیں ہو سکتا۔

(براہین احمدیہ حصّہ پنجم ص ۲۳-۲۵)

خدا کے ساتھ جو روحانی اور کامل تعلّق پیدا ہونے کا ذریعہ جو قرآن شریف نے ہمیں سکھلایا ہے **اسلام اور دعاء فاتحہ** ہے۔ یعنی اول اپنی تمام زندگی خدا کی راہ میں وقف کر دینا اور پھر اس دُعا میں لگے رہنا جو سورۃ فاتحہ میں مسلمانوں کو سکھائی گئی ہے۔ تمام اسلام کا مغز یہ دونوں چیزیں ہیں اسلام اور دُعاء فاتحہ دنیا میں خدا تک پہنچنے اور حقیقی نجات کا پانی پینے کے لئے ایک ہی اعلیٰ ذریعہ ہے۔ بلکہ یہی ایک ذریعہ ہے جو قانونِ قدرت نے انسان کی اعلیٰ ترقی اور وصالِ الٰہی کے لئے مقرر کیا ہے اور وہی خدا کو پاتے ہیں کہ جو اسلام کے مفہوم کی روحانی آگ میں داخل ہوں اور دعائے فاتحہ میں لگے رہیں۔ اسلام کیا چیز ہے وہی جلتی ہوئی آگ ہے جو ہماری سفلی زندگی کو بھسم کر کے اور ہمارے باطل معبودوں کو جلا کر سچے اور پاک معبود کے آگے ہماری جان ہمارا مال اور ہماری آبرو کی قربانی پیش کرتی ہے۔ ایسے چشمے میں داخل ہو کر ہم ایک نئی زندگی کا پانی پیتے ہیں اور ہماری تمام روحانی قوتیں خدا سے یوں پیوند پکڑتی ہیں جیسا کہ ایک رشتہ دوسرے رشتہ سے پیوند کیا جاتا ہے۔ بجلی کی آگ کی طرح ایک آگ ہمارے اندر سے نکلتی ہے اور ایک آگ اوپر سے ہم پر اُترتی ہے۔ اِن دونوں شعلوں کے ملنے سے ہماری تمام ہوا و ہوس اور غیر اللہ کی محبّت بھسم ہو جاتی ہے۔ اور ہم اپنی پہلی زندگی سے مرجاتے ہیں۔ اس حالت کا نام قرآن شریف کی رُو سے اسلام ہے۔ اسلام سے ہمارے نفسانی جذبات کو موت آتی ہے اور پھر دعا سے ہم از سر نو زندہ ہوتے ہیں۔ اس دوسری زندگی کے لئے الہام الٰہی ہونا ضروری ہے۔ اِسی مرتبہ پر پہنچنے کا نام لقاء الٰہی ہے۔ یعنی خدا کا دیدار اور خدا کا درشن ہے۔ اِس درجہ پر پہنچ کر انسان کو خدا سے وہ اتصال ہوتا ہے کہ گویا وہ اس کو آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اور اس کو قوت دی جاتی ہے اور اُس کے تمام حواس اور تمام اندرونی قوتیں روشن کی جاتی ہیں اور پاک زندگی کی کشش بڑے زور سے شروع ہو جاتی ہے۔ اس درجہ پر آکر خدا انسان کی آنکھ ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے اور زبان ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ بولتا ہے اور ہاتھ ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ حملہ کرتا ہے اور کان ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ سُنتا ہے اور پیر ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ چلتا ہے۔ اِسی درجہ کی طرف اشارہ ہے جو خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ - یہ اسکا ہاتھ خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہے جو ان کے ہاتھوں پر ہے۔ اور ایسا ہی فرماتا ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى - یعنی جو تو نے چلایا تو نے نہیں بلکہ خدا نے چلایا۔ غرض اس درجہ پر خدا تعالیٰ کے ساتھ کمال اتحاد ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی پاک مرضی

رُوح کے رگ و ریشہ میں سرائت کر جاتی ہے اور اخلاقی طاقتیں جو کمزور تھیں اس درجہ میں محکم پہاڑوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ عقل اور فراست نہایت لطافت پر آجاتی ہے۔ یہ معنے اس آیت کے ہیں جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ۔ اس مرتبہ میں محبت اور عشق کی نہریں ایسے طور سے جوش مارتی ہیں جو خدا تعالیٰ کے لئے مرنا اور خدا تعالیٰ کے لئے ہزاروں دکھ اُٹھانا اور بے آبرو ہونا ایسا آسان ہو جاتا ہے کہ گویا ایک ہلکا سا تنکا توڑنا ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ کون کھینچ رہا ہے۔ ایک غیبی ہاتھ اُس کو اٹھائے پھرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی مرضیوں کو پورا کرنا اُس کی زندگی کا اصل الاصول ٹھہر جاتا ہے۔ اس مرتبہ میں خدا تعالیٰ بہت ہی قریب دکھائی دیتا ہے۔ جیسا کہ اُس نے فرمایا۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ یعنی ہم اُس کی رگِ جان سے زیادہ نزدیک ہیں۔ ایسی حالت میں اِس مرتبہ کا آدمی ایسا ہوتا ہے کہ جس طرح پھل پختہ ہو کر خود بخود درخت پر سے گر جاتا ہے اِسی طرح اس مرتبہ کے آدمی کے تمام تعلقاتِ سفلی کالعدم ہو جاتے ہیں۔ اس کا اپنے خدا تعالیٰ سے ایسا گہرا تعلق ہو جاتا ہے کہ وہ مخلوق سے دُور چلا جاتا اور خدا تعالیٰ کے مکالمات اور مخاطبات سے شرف پاتا ہے۔ اِس مرتبہ کے حاصل کرنے کے لئے اب بھی دروازے کھلے ہیں جیسے کہ پہلے کھلے ہوئے تھے۔ اور اب بھی خدا تعالیٰ کا فضل یہ نعمت ڈھونڈنے والوں کو دیتا ہے جیسا کہ پہلے دیتا تھا۔ مگر یہ راہ محض زبان کی فضولیوں کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی اور فقط بے حقیقت باتوں اور لافوں سے یہ دروازہ نہیں کھلتا۔ چاہنے والے بہت ہیں مگر پانے والے کم۔ اس کا کیا سبب ہے؟ یہی کہ یہ مرتبہ سچی سرگرمی سچی جانفشانی پر موقوف ہے۔ باتیں قیامت تک کرو کیا ہو سکتا ہے۔ صدق سے اس آگ پر قدم رکھنا جس کے خوف سے لوگ بھاگتے ہیں اس راہ کی پہلی شرط ہے۔ اگر عملی سرگرمی نہیں تو لاف زنی ہیچ ہے اس بارہ میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ۔ یعنی اگر میرے بندے میری نسبت سوال کریں کہ وہ کہاں ہے تو ان کو کہہ کہ وہ تم سے بہت ہی قریب ہے۔ مَیں دعا کرنے والے کی دُعا سُنتا ہوں۔ پس چاہیئے کہ وہ دعاؤں سے میرا وصل ڈھونڈیں اور مجھ پر ایمان لاویں تا کامیاب ہوویں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۸۰-۸۲)

غرض نجات کی فلاسفی یہی ہے کہ خدا سے پاک اور کامل تعلق پیدا کرنے والے اُس لازوال نُور کا مظہر ہو جاتے ہیں اور اُس کی محبت کی آگ میں پڑ کر ایسے اپنی ہستی سے دُور ہو جاتے ہیں کہ جیسا کہ لوہا آگ میں پڑ کر آگ کی صورت ہی اختیار کر لیتا ہے مگر درحقیقت وہ آگ نہیں ہے لوہا ہے اور جیسا کہ خدا کی تجلّیات سے اس کے عاشقوں میں ایک حیرت نما تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے ایسا ہی خدا بھی ان کے لئے ایک تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ خدا غیر متبدل اور ہر ایک تبدیلی سے پاک ہے مگر ان کے لئے وہ ایسے عجائب کام دکھلاتا ہے کہ گویا وہ ایک نیا خدا ہے۔ وہ خدا نہیں ہے جو عام لوگوں کا خدا ہے کیونکہ جسقدر خدا کے راستباز بندے اپنے پاک اعمال اور صدق و وفا کے ساتھ اس کی طرف حرکت کرتے ہیں یہاں تک کہ اپنی پہلی ہستی سے مر جاتے ہیں خدا بھی ان کی طرف اکرام اور نصرت کے ساتھ حرکت کرتا ہے یہاں تک کہ اپنی نصرت اور حمایت اور غیرت کو اُن کے لئے ایسے طور سے دکھاتا ہے کہ وہ معمولی طور پر نہیں بلکہ وہ نصرت خارق عادت طور پر ہوتی ہے۔

یہ بالکل غیر ممکن اور خدا کی کریمانہ عادت کے برخلاف ہے کہ خدا تعالٰے ایسے بندہ کو جہنم میں ڈالے کہ جو اپنے سارے دل اور ساری جان اور کامل اخلاص سے اُس کی محبت میں محو ہے اور ایسا محو ہے کہ جیسا کہ سچی محبت کا تقاضا ہونا چاہیئے۔ کسی کو اس کے برابر نہیں جانتا بلکہ ہر ایک کو اس کے مقابل پر کالعدم سمجھتا ہے اور اپنے وجود کو اس کی راہ میں فنا کرنے کو تیار ہے پھر ایسا شخص کیونکر موردِ عذاب ہو سکتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کامل محبت ہی نجات ہے۔ بھلا تم سچ کہو کہ کیا تم اپنے ایک بچہ کو جس سے تم بہت ہی محبت رکھتے ہو دانستہ آگ میں ڈال سکتے ہو؟ پھر خدا جو سراسر محبت ہے ان لوگوں کو جو اس سے پیار کرتے ہیں اور ذرّہ ذرّہ اُن کا اُس کی محبت میں مستغرق ہے کیونکر آگ میں ڈالے گا۔ پس کوئی قربانی اس سے بہتر قربانی نہیں ہے کہ انسان اس محبوبِ حقیقی سے اسقدر محبت کرے کہ خود وہ اس بات کو محسوس کرے کہ درحقیقت اس کے سوا کوئی اس کا محبوب اور پیارا نہیں۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ اس کے لئے خود اپنے نفس کی محبت کو چھوڑ دے اور اس کے لئے تلخ زندگی اختیار کرے۔ جب اس نکتۂ کمال تک پہنچ جائے گا تو بلا شبہ وہ نجات یافتہ ہے اور اس مرتبۂ محبت پر نہ کسی تناسخ کے چکر کی اس کو حاجت ہے اور نہ اس کو اپنے لئے کسی کو صلیب دینے کی ضرورت ہے اور اس مرتبۂ محبت پر انسان صرف خیالی طور پر اپنے تئیں نجات یافتہ قرار نہیں دیتا بلکہ اندر ہی اندر وہ محبت اس کو

تعلیم دیتی ہے کہ خدا کی محبت تیرے ساتھ ہے اور پھر خدا کی محبت اس کے شامل حال ہو کر ایک سکینت اور شانتی اس کے دل پر نازل کرتی ہے اور خدا وہ معاملات اس سے شروع کر دیتا ہے جو خاص اپنے پیاروں اور مقبولوں سے کرتا آیا ہے۔ یعنی اس کی اکثر دُعائیں قبول کر لیتا ہے اور معرفت کی باریک باتیں اس کو سکھلاتا ہے اور بہت سی غیب کی باتوں پر اس کو اطلاع دیتا ہے اور اس کے منشاء کے مطابق دنیا میں تصرفات کرتا ہے۔ اور عزّت اور قبولیت کے ساتھ دنیا میں اُس کو شہرت دیتا ہے اور جو شخص اس کی دشمنی سے باز نہ آوے اور اس کے ذلیل کرنے کے درپے رہے آخر اس کو ذلیل کر دیتا ہے اور اُس کی خارق عادت طور پر تائید کرتا ہے اور لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اُس کی اُلفت ڈال دیتا ہے اور عجیب و غریب کرامتیں اُس سے ظہور میں لاتا ہے اور محض خدا کے الہام سے لوگوں کے دلوں کو اس کی طرف کشش ہو جاتی ہے۔ تب وہ انواع و اقسام کے تحائف اور نقد اور جنس کے ساتھ اس کی خدمت کے لئے دوڑتے ہیں۔ اور خدا اس سے نہایت لذیذ اور پُر شوکت کلام کے ساتھ مکالمہ و مخاطبہ کرتا ہے جیسا کہ ایک دوست ایک دوست سے کرتا ہے۔ وہ خدا جو دنیا کی آنکھ سے مخفی ہے اُس پر ظاہر ہو جاتا ہے اور ہر ایک غم کے وقت اپنی کلام سے اس کو تسلّی دیتا ہے۔ وہ اُس سے سوال و جواب کے طور پر اپنے فصیح اور لذیذ اور پُر شوکت کلام کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور سوال کا جواب دیتا ہے اور جو باتیں انسان کے علم اور طاقت سے باہر ہیں وہ اس کو بتلا دیتا ہے۔ مگر نہ نجومیوں کی طرح بلکہ ان مقتدر بادشاہوں کی طرح جن کی ہر ایک بات میں شاہانہ قدرت بھری ہوئی ہوتی ہے۔ وہ ایسی پیشگوئیاں اس پر ظاہر کرتا ہے جن میں اس کی عزّت اور اُس کے دشمن کی ذلّت ہو اور اُس کی فتح اور دشمن کی شکست ہو۔ غرض اِسی طرح وہ اپنے کلام اور کام کے ساتھ اپنا وجود اس پر ظاہر کر دیتا ہے۔ تب وہ ہر ایک گناہ سے پاک ہو کر اس کمال تک پہنچ جاتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

(مضمون جلسہ لاہور منسلکہ چشمۂ معرفت ص ۵۰-۵۲)

نجات کے بارہ میں قرآن شریف نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ نجات ایک ایسا امر ہے جو اسی دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اس نے فرمایا مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ یعنی جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ یعنی خدا کے دیکھنے کے حواس اور نجات ابدی کا سامان اِسی دنیا سے انسان ساتھ لے جاتا ہے۔

اور بار بار اُس نے ظاہر فرمایا ہے کہ جس ذریعہ سے انسان نجات پا سکتا ہے وہ ذریعہ بھی جیسا کہ خدا قدیم ہے قدیم سے چلا آتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک مدت کے بعد اُس کو یاد آیا کہ اگر اور کسی طرح بنی آدم نجات نہیں پا سکتے تو مَیں خود ہی ہلاک ہو کر انکو نجات دوں۔ انسان کو حقیقی طور پر اسوقت نجات یافتہ کہہ سکتے ہیں کہ جب اس کے تمام نفسانی جذبات جل جائیں اور اس کی رضا خدا کی رضا ہو جائے اور خدا کی محبت میں ایسا محو ہو جائے کہ اس کا کچھ بھی نہ رہے سب خدا کا ہو جائے اور تمام قول اور فعل اور حرکات اور سکنات اور ارادات اس کے خدا کے لئے ہو جائیں۔ اور وہ دل میں محسوس کرے کہ اب تمام لذّات اس کی خدا میں ہیں۔ اور خدا سے ایک لمحہ علیحدہ ہونا اس کے لئے موت ہے اور ایک نشہ اور سُکر محبتِ الٰہی کا ایسے طور سے اس میں پیدا ہو جائے کہ جس قدر چیزیں اسکے ماسوا ہیں سب اس کی نظر میں معدوم نظر آئیں۔ اور اگر تمام دنیا تلوار پکڑ کر اُس پر حملہ کرے اور اس کو ڈرا کر حق سے علیحدہ کرنا چاہے تو وہ ایک مستحکم پہاڑ کی طرح اسی استقامت پر قائم رہے اور کامل محبت کی ایک آگ اس میں بھڑک اُٹھے اور گناہ سے نفرت پیدا ہو جائے اور جس طور سے اور لوگ اپنے بچوں اور اپنی بیویوں سے اور اپنے عزیز دوستوں سے محبت رکھتے ہیں اور وہ محبت اُن کے دلوں میں دھنس جاتی ہے کہ اُن کے مرنے کے ساتھ ایسے بیقرار ہو جاتے ہیں کہ گویا آپ ہی مر جاتے ہیں یہی محبت بلکہ اس سے بڑھ کر اپنے خدا سے پیدا ہو جائے۔ یہاں تک کہ اس محبت کے غلبہ میں دیوانہ کی طرح ہو جائے۔ اور کامل محبت کی سخت تحریک سے ہر ایک دکھ اور ہر ایک زخم اپنے لئے گوارا کرے تا کسی طرح خدا تعالیٰ راضی ہو جائے۔

جب انسان پر اس مرتبہ تک محبتِ الٰہی غلبہ کرتی ہے تب تمام نفسانی آلائشیں اُس آتش محبت سے خس و خاشاک کی طرح جل جاتی ہیں۔ اور انسان کی فطرت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے اور اُس کو وہ دل عطا ہوتا ہے جو پہلے نہیں تھا اور وہ آنکھیں عطا ہوتی ہیں جو پہلے نہیں تھیں اور اس قدر یقین اس پر غالب آجاتا ہے کہ اسی دنیا میں وہ خدا کو دیکھنے لگتا ہے اور وہ جلن اور وہ سوزش جو دنیا داروں کی فطرت کو دنیا کے لئے جہنم کی طرح لگی ہوئی ہوتی ہے وہ سب دُور ہو کر ایک آرام اور راحت اور لذّت کی زندگی اس کو مل جاتی ہے۔ تب اس کیفیت کا نام جو اس کو ملتی ہے نجات رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی رُوح خدا کے آستانہ پر نہایت محبّت اور عاشقانہ تپش کے ساتھ گر کر لازوال آرام پا لیتی ہے اور اس کی محبت کے ساتھ خدا کی محبت تعلق پکڑ کر اُسکو اس مقامِ محویت پر پہنچا دیتی ہے کہ جو بیان کرنے سے بلند و برتر ہے۔

(مضمون جلسہ لاہور منسلکہ چشمۂ معرفت صـ ۴۷-۴۸)

نجات اپنی کوشش سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہؤا کرتی ہے۔ اس فضل کے حصول کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنا جو قانون ٹھہرایا ہؤا ہے وہ اُسے کبھی باطل نہیں کرتا۔ وہ قانون یہ ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اور وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ اگر اس پر دلیل پوچھو تو یہ ہے کہ نجات ایسی شے نہیں ہے کہ اُس کے برکات اور ثمرات کا پتہ انسان کو مرنے کے بعد ملے بلکہ نجات تو وہ امر ہے کہ جس کے آثار اسی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں کہ نجات یافتہ آدمی کو ایک بہشتی زندگی اسی دنیا میں مل جاتی ہے دوسرے مذاہب کے پابند بکلّی اس سے محروم ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ اہل اسلام کی بھی یہی حالت ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ اس لئے اس سے بے نصیب ہیں کہ کتاب کی پابندی نہیں کرتے۔ اگر ایک شخص کے پاس دوا ہو اور وہ اُسے استعمال نہ کرے اور لاپروائی دکھائے تو وہ بہرحال اُس کے فوائد سے محروم رہیگا۔ یہی حال مسلمانوں کا ہے کہ اُن کے پاس قرآن مجید جیسی پاک کتاب موجود ہے مگر وہ اس کے پابند نہیں ہیں۔ مگر جو لوگ خدا تعالیٰ کے کلام سے اعراض کرتے ہیں وہ ہمیشہ انوار و برکات سے محروم رہتے ہیں۔ پھر اعراض بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک صوری۔ ایک معنوی۔ یعنی ایک تو یہ ہے کہ ظاہری اعمال میں اعراض ہو اور دوسرے یہ کہ اعتقاد میں اعراض ہو۔ اور انسان کو انوار و برکات سے حصّہ نہیں مل سکتا جب تک وہ اسی طرح عمل نہ کرے جس طرح خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔

(ملفوظات جلد چہارم ص ۲۰۶ - ۲۰۷)

یہ بات بالکل سچ ہے کہ جس نے خدا کے رسولوں کو شناخت نہیں کیا اُس نے خدا کو بھی شناخت نہیں کیا۔ خدا کے چہرے کا آئینہ اس کے رسول ہیں۔ ہر ایک جو خدا کو دیکھتا ہے اسی آئینہ کے ذریعہ سے دیکھتا ہے۔ پس یہ کس قسم کی نجات ہے کہ ایک شخص دنیا میں تمام عمر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا مکذب اور منکر رہا اور قرآن شریف سے انکاری رہا۔ اور خدا تعالیٰ نے اس کو آنکھیں نہ بخشیں۔ اور دل نہ دیا اور وہ اندھا ہی رہا اور اندھا مر گیا اور پھر نجات بھی پا گیا۔ یہ عجیب نجات ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ جس شخص پر رحمت کرنا چاہتا ہے۔ پہلے اس کو آنکھیں بخشتا ہے اور اپنی طرف سے اس کو علم عطا کرتا ہے۔ صدہا آدمی ہمارے سلسلہ میں ایسے ہونگے کہ وہ محض خواب یا الہام کے ذریعہ سے ہماری جماعت میں داخل ہوئے ہیں اور خدا تعالیٰ کی ذات وسیع الرحمۃ ہے۔ اگر کوئی ایک قدم اس کی طرف آتا ہے تو وہ دو قدم آتا ہے اور

جو شخص اس کی طرف جلدی سے چلتا ہے تو وہ اس کی طرف دوڑتا آتا ہے اور نابینا کی آنکھیں کھولتا ہے۔ پھر کیونکر قبول کیا جائے کہ ایک شخص اس کی ذات پر ایمان لایا اور سچے دل سے اُس کو وحدہٗ لاشریک سمجھا اور اس سے محبت کی اور اُس کے اولیاء میں داخل ہُوا۔ پھر خدا نے اُس کو نابینا رکھا اور ایسا اندھا رہا کہ خدا کے نبی کو شناخت نہ کر سکا۔ اسی کی مؤید یہ حدیث ہے کہ وَمَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ فَقَدْ مَاتَ مِيْتَةَ الْجَاهِلِيَّةِ۔ جس شخص نے اپنے زمانے کے امام کو شناخت نہ کیا وہ جاہلیت کی موت مر گیا۔ اور صراطِ مستقیم سے بے نصیب رہا۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۴۷)

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں سے صرف وید ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے پرمیشر کو پُر غضب اور کینہ ور قرار دیتا ہے اور اِس بات کا سخت مخالف ہے کہ خدا تعالیٰ توبہ و استغفار سے اپنے بندوں کا گناہ بخش دیتا ہے۔ اور عجیب تر یہ کہ اِس مذہب میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ پرمیشر تمام مخلوقات کا مالک ہے اور تمام مخلوق جانداروں کی قسمت اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہی ایک ہے جس کے سامنے تمام گنہگار پیش کئے جاتے ہیں لیکن انسانوں کی بدقسمتی کی وجہ سے اس میں یہ صفت غضب تو موجود ہے جو گناہ کو دیکھ کر اس کی سخت سے سخت سزا دیتا ہے لیکن اس میں یہ دوسری صفت موجود نہیں کہ کسی گنہگار کی توبہ اور تضرع سے اس کا گناہ بھی بخش سکتا ہے۔ بلکہ جس سے ایک ذرہ بھی قصور ہو گیا پھر نہ اس کی توبہ قبول نہ تضرع عاجزی قابلِ التفات۔ حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ انسان ضعیف البنیان بوجہ اپنی فطرتی کمزوریوں کے گناہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور قدم قدم پر ٹھوکر کھانا اُس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ مگر وید کے انسان کی حالت پر رحم کر کے کوئی نجات کا طریق پیش نہیں کیا۔ بلکہ وید کو صرف ایک ہی نسخہ یاد ہے جو سراسر غضب اور کینہ سے بھرا ہوا ہے اور وہ یہ کہ ایک ذرہ سے گناہ کے لئے بھی ایک لمبا اور ناپیدا کنار سلسلہ جونوں کا تیار کر رکھا ہے۔ حالانکہ گنہگار اس وجہ سے بھی قابلِ رحم ہے کہ اس کی کمزور قوتیں جن سے گناہ صادر ہوتا ہے اس کی طرف سے نہیں بلکہ اُسی خدا نے پیدا کی ہیں۔ پس اِس حالت میں عاجز بندے اسبات کے مستحق تھے کہ اس مجبوری کا بھی ان کو فائدہ دیا جاتا مگر بقول آریہ صاحبان پرمیشر نے ایسا نہیں کیا اور سزا دینے کے وقت یہ امر ملحوظ

نہیں رکھا کہ آخر گناہ کے ارتکاب میں اس کا بھی تو کچھ دخل ہے اور وید نے مکتی دینے کے بارہ میں یہ شرط رکھی ہے کہ تب مکتی ملے گی کہ جب انسان گناہ سے بالکل پاک ہو جائے۔ مگر اس شرط کو جب قانونِ قدرت کے معیار کے ساتھ آزمایا جاوے تو ثابت ہوگا کہ اس شرط سے عہدہ برآ ہونا بالکل انسان کے لئے غیر ممکن ہے کیونکہ جب تک انسان خدا تعالیٰ کے تمام حقوق ادا نہ کرلے تب تک نہیں کہہ سکتا کہ اس نے فرمانبرداری کے تمام دقائق کو ادا کر دیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ قانون قدرت صاف یہ شہادت دے رہا ہے اور انسان کا صحیفۂ فطرت اس شہادت پر اپنے دستخط کر رہا ہے اور بزبان حال بیان کر رہا ہے کہ انسان کسی مرتبہ ترقی اور کمال میں اس قصور سے مبرّا نہیں ہو سکتا کہ وہ بمقابل خدا کی نعمتوں اور اس کے حقوق کے شکر نہیں کر سکا اور اس کے احکام کی کامل پیروی اور پوری بجا آوری میں بہت قاصر رہا۔ پس اگر انسان کی نجات صرف اسی صورت میں ہے کہ جیسا کہ چاہیئے تمام حقوق خدا تعالیٰ کے اس سے ادا ہو جاویں۔ اور کسی پہلو سے ایک ذرہ قصور باقی نہ رہے اور اطاعت کی راہ میں ایک ذرّہ بھی لغزش اس سے صادر نہ ہو تو یہ طریق نجات تعلیق بالمحال ہے۔ نہ اس درجہ کی عہدہ برآئی کسی کو حاصل ہوگی اور نہ وہ نجات پائے گا۔ پس ایسا حکم خدا کا حکم نہیں ہو سکتا جو محال سے وابستہ اور صریح قانونِ قدرت کے برخلاف اور صحیفۂ فطرت کے منافی ہے بھلا تم تمام مشرق و مغرب میں تلاش کر کے کوئی آدمی پیش تو کرو جو صغائر و کبائر اور کسی قسم کی غفلت سے بکلّی پاک اور مبرّا ہو۔ اور جس نے تمام حقوق بندہ پروری ادا کر دیئے ہیں اور جس کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ تمام دقائق فرمانبرداری اور شکر گذاری کے بجا لا چکا ہے۔ اور جب اس زمانہ میں کوئی موجود نہیں تو یقیناً سمجھو کہ ایسا آدمی کبھی دنیا میں ظہور پذیر نہیں ہوا اور نہ آئندہ اس کے پیدا ہونے کی اُمید ہے اور جبکہ اپنے زور بازو سے تمام حقوق خدا تعالیٰ کے ادا کرنا اور ہر ایک نہج سے شکر گذاری کے طریقوں میں عہدہ برآ ہونا قانونِ قدرت اور صحیفۂ فطرت کی رو سے غیر ممکن ہے اور خود تجربہ ہر ایک انسان کا اس پر گواہ ہے تو پھر مکتی کی بنا ایسے امر پر رکھنا کہ خود وہ محال اور ناشدنی ہے کسی ایسی کتاب کے شان کے مناسب نہیں ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو۔ مگر ممکن ہے کہ جیسا کہ اور کئی باتوں میں وید میں خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں یہ خرابی بھی کسی زمانہ میں پیدا ہو گئی ہو۔ اور ممکن ہے کہ دراصل یہ وید کی تعلیم نہ ہو بلکہ محرّف مبدّل ہو۔

(چشمۂ معرفت صـ۴۲-۴۴)

مسیحی صاحبوں کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ مسیح کے زمانہ کے بعد الہام اور وحی پر مہر لگ گئی ہے۔ اور اب یہ نعمت آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گئی ہے۔ اور اب اس کے پانے کی کوئی بھی راہ نہیں اور قیامت تک نومیدی ہے اور فیض کا دروازہ بند ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہوگی کہ نجات پانے کے لئے ایک نئی تجویز نکالی گئی ہے اور نیا نسخہ تجویز کیا گیا ہے جو تمام جہان کے اصول سے نرالا اور سراسر عقل اور انصاف اور رحم سے مخالف ہے اور وہ یہ ہے کہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے تمام جہان کے گناہ اپنے ذمہ لے کر صلیب پر مرنا منظور کیا تا ان کی اس موت سے دوسروں کی رہائی ہو۔ اور اپنے بے گناہ بیٹے کو مارا تا گنہگاروں کو بچاوے۔ لیکن ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کی مظلومانہ موت سے دوسروں کے دل گناہ کی پلید خصلت سے کیونکر پاک اور صاف ہو سکتے ہیں۔ اور کیونکر ایک بے گناہ کے قتل ہونے سے دوسروں کو گذشتہ گناہوں کی معافی کی سند مل سکتی ہے۔ بلکہ اس طریق میں انصاف اور رحم دونوں کا خون ہے کیونکہ گنہگار کے عوض میں بے گناہ کو پکڑنا خلاف انصاف ہے اور نیز بیٹے کو اس طرح ناحق سخت دلی سے قتل کرنا خلاف رحم ہے اور اس حرکت فائدہ خاک نہیں ہوا۔

(لیکچر لاہور ص ۲۴-۲۵)

وہ مسئلہ جو انجیل میں نجات کے بارہ میں بیان کیا گیا ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا اور کفارہ۔ اس تعلیم کو قرآن شریف نے قبول نہیں کیا۔ اور اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کو قرآن شریف ایک برگزیدہ نبی مانتا ہے اور خدا کا پیارا اور مقرب اور وجیہہ قرار دیتا ہے لیکن اس کو محض انسان بیان فرماتا ہے۔ اور نجات کے لئے اس امر کو ضروری نہیں جانتا کہ ایک گنہگار کا بوجھ کسی بے گناہ پر ڈال دیا جائے۔ اور عقل بھی تسلیم نہیں کرتی کہ گناہ تو زید کرے اور بکر پکڑا جائے۔ اس مسئلہ پر تو انسانی گورنمنٹوں نے بھی عمل نہیں کیا۔ افسوس کہ نجات کے بارہ میں جیسا کہ عیسائی صاحبوں نے غلطی کی ہے ایسا ہی آریہ صاحبوں نے بھی اس غلطی سے حصّہ لیا ہے اور اصل حقیقت کو بھول گئے ہیں۔ کیونکہ آریہ صاحبان کے عقیدہ کی رو سے توبہ اور استغفار کچھ بھی چیز نہیں اور جب تک انسان ایک گناہ کے عوض وہ تمام جونیں نہ بھگت لے جو اس گناہ کی سزا مقررہ ہے تب تک نجات غیر ممکن ہے اور پھر بھی محدود اور پرمیشر اس بات پر قادر ہی نہیں کہ گناہ بخش دے اور سچی توبہ جو درحقیقت ایک روحانی موت ہے اور ایک آگ ہے جس میں انسان پرمیشر کو خوش کرنے کے لئے جلنا قبول کرتا ہے وہ کچھ چیز ہی نہیں۔

اِس سے نعوذ باللہ پرمیشر کی تنگ ظرفی ثابت ہوتی ہے۔ اور جبکہ وہ اپنے بندوں کو ہدایت دیتا ہے کہ تم اپنے قصورواروں کو بخشو اور اپنے نافرمانوں کو معافی دو اور آپ اس بات کا پابند نہیں ہے تو گویا وہ اپنے بندوں کو وہ خلق سکھلانا چاہتا ہے جو خود اس میں موجود نہیں۔ اس صورت میں ایسے مذہب کے پابند جو لوگ ہیں ضرور اُن کے دل میں یہ خیال آئیگا کہ جبکہ پرمیشر کسی اپنے قصوروار کے گناہ نہیں بخشتا تو ہم کیونکر وہ کام کر سکتے ہیں جو پرمیشر کے اخلاق کے برخلاف ہے اور اگر رعایا ایسے راجوں اور بادشاہوں کے ماتحت ہو جو پرمیشر کی طرح اپنے قصورواروں کی نسبت معافی کا نام نہیں لیتے تو اس بدقسمت رعیت کا کیا حال ہوگا۔ اور پھر تناسخ ثابت کہاں ہے جس طرح ہم کسی شخص کی جان نکلتی دیکھتے ہیں کب ہمارے مشاہدہ میں یہ بات آتی ہے کہ وہی جان دوبارہ کسی اور جسم میں پڑ گئی ہے۔ اور اس طرح پر یہ سزا بھی بیکار ہے کیونکہ اگر دوبارہ آنے والی رُوح اِس بات سے متنبہ نہیں اور اس کو علم نہیں دیا گیا کہ فلاں گناہ کی پاداش میں کسی ناکارہ جون میں ڈالی گئی تو پھر وہ کیونکر اس گناہ سے دستکش رہے گی۔

یاد رہے کہ انسان کی فطرت میں اور بہت سی خوبیوں کے ساتھ یہ عیب بھی ہے کہ اُس سے بوجہ اپنی کمزوری کے گناہ اور قصور صادر ہو جاتا ہے۔ اور وہ قادرِ مطلق جس نے انسانی فطرت کو بنایا ہے اُس نے اس غرض سے گناہ کا مادہ اس میں نہیں رکھا کہ تا ہمیشہ کے عذاب میں اس کو ڈالے بلکہ اس لئے رکھا ہے کہ جو گناہ بخشنے کا خلق اس میں موجود ہے اس کے ظاہر کرنے کے لئے ایک موقعہ نکالا جائے۔ گناہ بے شک ایک زہر ہے۔ مگر توبہ اور استغفار کی آگ اس کو تریاق بنا دیتی ہے۔ پس یہی گناہ توبہ اور پشیمانی کے بعد ترقیات کا موجب ہو جاتا ہے اور اس جُز کو انسان کے اندر سے کھو دیتا ہے کہ وہ کچھ چیز ہے اور عجب اور تکبّر اور خود نمائی کی عادتوں کا استیصال کرتا ہے۔

اے دوستو! یاد رکھو کہ صرف اپنے اعمال سے کوئی نجات نہیں پا سکتا محض فضل سے نجات ملتی ہے اور وہ خدا جس پر ہم ایمان لاتے ہیں وہ نہایت رحیم و کریم خدا ہے وہ قادرِ مطلق اور سرب شکتی مان ہے جس میں کسی طرح کی کمزوری اور نقص نہیں۔ وہ مبدء ہے تمام ظہورات کا اور سرچشمہ ہے تمام فیضوں کا اور خالق ہے تمام مخلوقات کا اور مالک ہے تمام جود و فضل کا اور جامع ہے تمام اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ کاملہ کا اور منبع ہے تمام نوروں کا اور جان ہے تمام جانوں کی اور قیوّم ہے ہر ایک چیز کا۔ سب چیزوں سے نزدیک ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ وہ

عین اشیاء ہے۔ اور سب سے بلند تر ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ اُس میں اور ہم میں کوئی اَور چیز بھی حائل ہے اُس کی ذات دقیق در دقیق اور نہاں در نہاں ہے مگر پھر بھی سب چیزوں سے زیادہ ظاہر ہے۔ سچی لذّت اور سچی راحت اُسی میں ہے اور یہی نجات کی حقیقی فلاسفی ہے۔

(مضمون جلسہ لاہور منسلکہ چشمۂ معرفت صـ ۴۴-۴۷)

واضح ہو کہ عیسائیوں کا یہ اصول کہ خدا نے دنیا سے پیار کر کے دنیا کو نجات دینے کے لئے یہ انتظام کیا کہ نافرمانوں اور کافروں اور بدکاروں کا گناہ اپنے پیارے بیٹے یسوع پر ڈال دیا اور دنیا کو گناہ سے چھڑانے کے لئے اس کو لعنتی بنایا اور لعنت کی لکڑی سے لٹکایا۔ یہ اصول ہر ایک پہلو سے فاسد اور قابل شرم ہے۔ اگر میزانِ عدل کے لحاظ سے اس کو جانچا جائے تو صریحًا یہ بات ظلم کی صورت میں ہے کہ زَید کا گناہ بَکر پر ڈال دیا جائے۔ انسانی کانشنس اِس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ ایک مجرم کو چھوڑ کر اس مجرم کی سزا غیر مجرم کو دی جائے اور اگر روحانی فلاسفی کی رو سے گناہ کی حقیقت پر غور کی جائے تو اس تحقیق کے رو سے بھی یہ عقیدہ فاسد ٹھہرتا ہے کیونکہ گناہ درحقیقت ایک ایسا زہر ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان خدا کی اطاعت اور خدا کی پُرجوش محبت اور محبانہ یاد الٰہی سے محروم اور بے نصیب ہو۔ اور جیسا کہ ایک درخت جب زمین سے اکھڑ جائے اور پانی چُوسنے کے قابل نہ رہے تو وہ دن بدن خشک ہونے لگتا ہے اور اس کی تمام سرسبزی برباد ہو جاتی ہے۔ یہی حال اس انسان کا ہوتا ہے جس کا دل خدا کی محبت سے اکھڑا ہُوا ہوتا ہے۔ پس خشکی کی طرح گناہ کا اُس پر غلبہ ہوتا ہے۔ سو اس خشکی کا علاج خدا کے قانونِ قدرت میں تین طور سے ہے۔ (۱) ایک محبت (۲) استغفار جس کے معنے ہیں دبانے اور ڈھانکنے کی خواہش کیونکہ جب تک مٹی میں درخت کی جڑ جمی رہے تب تک وہ سبزی کا اُمیدوار ہوتا ہے (۳) تیسرا علاج توبہ ہے۔ یعنی زندگی کا پانی کھینچنے کے لئے تذلل کے ساتھ خدا کی طرف پھرنا اور اُس سے اپنے تئیں نزدیک کرنا اور معصیت کے حجاب سے اعمال صالحہ کے ساتھ اپنے تئیں باہر نکالنا اور توبہ صرف زبان سے نہیں ہے بلکہ توبہ کا کمال اعمال صالحہ کے ساتھ ہے۔ تمام نیکیاں توبہ کی تکمیل کے لئے ہیں۔ کیونکہ سب سے مطلب یہ ہے کہ خدا سے نزدیک ہو جائیں۔ دُعا بھی توبہ ہے۔ کیونکہ اس سے بھی ہم خدا کا قرب ڈھونڈتے ہیں۔ اس لئے خدا نے انسان کی جان کو پیدا کر کے اس کا نام رُوح رکھا کیونکہ اس کی حقیقی راحت اور آرام خدا کے اقرار اور اس کی محبت اور اس کی اطاعت میں ہے اور اس کا نام نفس رکھا کیونکہ وہ خدا سے اتحاد پیدا کرنے والا ہے

خدا سے دل لگانا ایسا ہوتا ہے جیسا کہ باغ میں وہ درخت ہوتا ہے جو باغ کی زمین سے خوب پیوستہ ہوتا ہے یہی انسان کا جنّت ہے۔ اور جس طرح درخت زمین کے پانی کو چوستا اور اپنے اندر کھینچتا اور اس سے اپنے زہریلے بخارات باہر نکالتا ہے اسی طرح انسان کے دل کی حالت ہوتی ہے کہ وہ خدا کی محبت کا پانی چوس کر زہریلے مواد کے نکالنے پر قوت پاتا ہے اور بڑی آسانی سے ان مواد کو دفع کرتا ہے۔ اور خدا میں ہو کر پاک نشوونما پاتا جاتا ہے اور بہت پھیلتا اور خوشنما سرسبزی دکھلاتا ہے۔ اور اچھے پھل لاتا ہے۔ مگر جو خدا میں پیوستہ نہیں وہ نشوونما دینے والے پانی کو چوس نہیں سکتا۔ اس لئے دمبدم خشک ہوتا چلا جاتا ہے۔ آخر پتے بھی گر جاتے ہیں اور خشک اور بدشکل ٹہنیاں رہ جاتی ہیں۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص ۲-۳)

خدا کا قدیم سے قانون قدرت ہے کہ وہ توبہ اور استغفار سے گناہ معاف کرتا ہے اور نیک لوگوں کی شفاعت کے طور پر دعا بھی قبول کرتا ہے۔ مگر یہ ہم نے خدا کے قانون قدرت میں کبھی نہیں دیکھا کہ زید اپنے سر پر پتھر مارے اور اس سے بکر کی دردِ سر جاتی رہے۔ پھر ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ مسیح کی خودکشی سے دوسروں کی اندرونی بیماری کا دُور ہونا کس قانون پر مبنی ہے اور وہ کونسا فلسفہ ہے جس سے ہم معلوم کر سکیں کہ مسیح کا خون کسی دوسرے کی اندرونی ناپاکی کو دُور کر سکتا ہے بلکہ مشاہدہ اس کے برخلاف گواہی دیتا ہے۔ کیونکہ جب تک مسیح نے خودکشی کا ارادہ نہیں کیا تھا تب تک عیسائیوں میں نیک چلنی اور خدا پرستی کا مادہ تھا مگر صلیب کے بعد تو جیسے ایک بند ٹوٹ کر ہر ایک طرف دریا کا پانی پھیل جاتا ہے یہی عیسائیوں کے نفسانی جوشوں کا حال ہوا۔ کچھ شک نہیں کہ اگر یہ خودکشی مسیح سے بالارادہ ظہور میں آئی تھی تو بہت بے جا کام کیا اگر وہی زندگی وعظ و نصیحت میں صرف کرتا تو مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچتا۔ اس بے جا حرکت سے دوسروں کو کیا فائدہ ہوا۔ ہاں اگر مسیح خودکشی کے بعد زندہ ہو کر یہودیوں کے روبرو آسمان پر چڑھ جاتا تو اس سے یہودی ایمان لے آتے۔ مگر اب تو یہودیوں اور تمام عقلمندوں کے نزدیک مسیح کا آسمان پر چڑھنا محض ایک فسانہ اور گپ ہے۔

(چشمۂ مسیحی ص ۱۳-۱۴)

مجھے خود اندیشہ تھا کہ آخر کوئی جھوٹا مقدمہ میرے پر بنایا جائیگا کیونکہ دشمن جب لاجواب ہو جاتا ہے تو پھر جان اور آبرو پر حملہ کرتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آخر یہ خون کا مقدمہ میرے پر

بنایا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پادری صاحبوں کو سب سے زیادہ بڑھکر جوش تھا۔ کیونکہ میری کارروائی میں ان کے کروڑہا روپیہ کا نقصان ہے اور علاوہ آسمانی نشانوں کے میرے اعتراضات نے بھی اُن کے مذہب کے تار پود کو توڑ دیا ہے۔ چنانچہ وہ اعتراض جو ان کے اس عقیدے پر کیا گیا تھا کہ تمام گنہگاروں کی لعنت مسیح پر آپڑی جس کا ماحصل یہ تھا کہ مسیح کا دل خدا تعالیٰ کی معرفت اور محبت سے بالکل خالی ہوگیا تھا اور درحقیقت وہ خدا کا دشمن ہو گیا تھا۔ یہ ایسا اعتراض تھا کہ عقیدہ کفارہ کو باطل کرتا تھا۔ کیونکہ جب کہ لعنت اپنے مفہوم کے رو سے مسیح جیسے راستباز انسان پر ہرگز جائز نہیں تو پھر کفارہ کی چھت جس کا شہتیر لعنت ہے کیونکر ٹھہر سکتی ہے۔

ایسا ہی وہ اعتراض کہ خدا کا کوئی فعل اس کی قدیم عادت سے مخالف نہیں اور عادت کثرت اور کلیت کو چاہتی ہے۔ پس اگر درحقیقت بیٹے کو بھیجنا خدا کی عادت میں داخل ہے تو خدا کے بہت سے بیٹے چاہئیں تا عادت کا مفہوم جو کثرت کو چاہتا ہے ثابت ہو اور تا بعض بیٹے جنات کے لئے مصلوب ہوں اور بعض انسانوں کے لئے اور بعض ان مخلوقات کے لئے جو دوسرے اجرام میں آباد ہیں۔ یہ اعتراض بھی ایسا تھا کہ ایک لحظہ کے لئے بھی اس میں غور کرنا فی الفور عیسائیت کی تاریکی سے انسان کو چھڑا دیتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایسا ہی یہ اعتراض کہ کفارہ اس وجہ سے بھی باطل ہے کہ اس سے یا تو یہ مقصود ہوگا کہ گناہ بکلی سرزد نہ ہوں اور یا یہ مقصود ہوگا کہ ہر ایک قسم کے گناہ خواہ حق اللہ کی قسم میں سے اور حق العباد کی قسم میں سے ہوں کفارہ کے ماننے سے ہمیشہ معاف ہوتے رہتے ہیں۔ سو پہلی شق تو صریح البطلان ہے کیونکہ یورپ کے مردوں اور عورتوں پر نظر ڈال کر دیکھا جاتا ہے کہ وہ کفارہ کے بعد ہرگز گناہ سے بچ نہیں سکے۔ اور ہر ایک قسم کے گناہ یورپ کے خواص اور عوام میں موجود ہیں۔ بھلا یہ بھی جانے دو۔ نبیوں کے وجود کو دیکھو جن کا ایمان اوروں سے زیادہ مضبوط تھا۔ وہ بھی گناہ سے بچ نہ سکے۔ حواری بھی اس بلا میں گرفتار ہوگئے۔ پس اس میں کچھ شک نہیں کہ کفارہ ایسا بند نہیں ٹھہر سکتا کہ جو گناہ سیلاب سے روک سکے۔ رہی یہ دوسری بات کہ کفارہ پر ایمان لانے والے گناہ کی سزا سے مستثنیٰ رکھے جائیں گے خواہ وہ چوری کریں یا ڈاکہ ماریں۔ خون کریں یا بدکاری کی مکروہ حالتوں میں مبتلا رہیں تو خدا ان سے مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ یہ خیال بھی سراسر غلط ہے جس سے شریعت کی پاکیزگی سب اُٹھ جاتی ہے اور خدا کے ابدی احکام منسوخ ہو جاتے ہیں۔

(کتاب البریہ ص ۵۹-۶۰)

افسوس کہ عیسائیوں کو یہ دکھانا چاہیئے تھا کہ یہ یقین ہستی باری جو انسان کو خدا ترسی کی آنکھ بخشتا ہے اور گند کے خس وخاشاک کو جلاتا ہے اس کا سامان انجیل نے اُن کو کیا بخشا ہے؟ بیہودہ طریقوں سے گناہ کیونکر دُور ہوسکتا ہے؟ افسوس کہ یہ لوگ نہیں سمجھے کہ یہ کیسا ایک بے حقیقت امر اور ایک فرضی نقشہ کھینچا ہے کہ تمام دنیا کے گناہ ایک شخص پر ڈالے گئے اور گنہگاروں کی لعنت اُن سے لی گئی اور یسوع کے دل پر رکھی گئی۔ اِس سے تو لازم آتا ہے کہ اس کارروائی کے بعد بجز یسوع کے ہر ایک کو پاک زندگی اور خدا کی معرفت حاصل ہوگئی ہے۔ مگر نعوذ باللہ یسوع ایک ایسی لعنت کے نیچے دبایا گیا جو کروڑ ہا لعنتوں کا مجموعہ تھی لیکن جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک انسان کے گناہ اس کے ساتھ ہیں اور فطرت نے جس قدر کسی کو کسی جذبہ نفسانی یا افراط اور تفریط کا حصّہ دیا ہے وہ اس کے وجود میں محسوس ہو رہا ہے گو وہ یسوع کو مانتا ہے یا نہیں تو اس سے ثابت ہے کہ جیسا کہ لعنتی زندگی والوں کی لعنتی زندگی ان سے علیحدہ نہیں ہوسکی۔ ایسا ہی وہ یسوع پر بھی پڑ نہیں سکی۔ کیونکہ جبکہ لعنت اپنے محل پر خوب چسپاں ہے تو وہ یسوع کی طرف کیونکر منتقل ہوسکیگی۔ اور یہ عجیب ظلم ہے کہ ہر ایک خبیث اور ملعون اور جو یسوع پر ایمان لادے تو اس کی لعنت یسوع پر پڑے اور اس شخص کو بری اور پاکدامن سمجھا جائے۔ پس ایسا غیر منقطع سلسلہ لعنتوں کا جو قیامت تک ممتد رہے گا۔ اگر وہ ہمیشہ تازہ طور پر غریب یسوع پر ڈالا جائے تو کس زمانے میں اس کو لعنتوں سے سبکدوشی ہوگی.......... اس سے تو ماننا پڑتا ہے کہ یسوع کے لئے وہ دن پھر کبھی نہیں آئیں گے جو اس کو خدا کی محبت اور معرفت کے نور کے سایہ میں رکھنے والی ہوں پس ایسے عقیدہ سے اگر کچھ حاصل ہؤا تو وہ یہی ہے کہ ان لوگوں نے ایک خدا کے مقدس کو ایک غیر منقطع ناپاکی میں ڈالنے کا ارادہ کیا ہے۔

(کتاب البریہ صفحہ ٦٣-٦٤)

عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ خدا تعالیٰ کا عدل بغیر کفارہ کے کیونکر پورا ہو بالکل مہمل ہے کیونکہ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ یسوع باعتبار اپنی انسانیت کے بے گناہ تھا۔ مگر پھر بھی ان کے خدا نے یسوع پر ناحق تمام جہان کی لعنت ڈال کر اپنے عدل کا کچھ بھی لحاظ نہ کیا۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے خدا کو عدل کی کچھ بھی پروا نہیں۔ یہ خوب انتظام ہے کہ جس بات سے گریز تھا اسی کو بہ اقبح طریق اختیار کر لیا گیا۔ واویلا تو یہ تھا کہ کسی طرح عدل میں فرق نہ آوے

اور رحم بھی وقوع میں آجائے۔ مگر ایک بے گناہ کے گلے پر ناحق چھری پھیر کر نہ عدل قائم رہ سکا اور نہ رحم۔ لیکن یہ وسوسہ کہ عدل اور رحم دونوں خدا تعالیٰ کی ذات میں جمع نہیں ہو سکتے کیونکہ عدل کا تقاضا ہے کہ سزا دی جائے اور رحم کا تقاضا ہے کہ درگذر کی جائے۔ یہ ایک ایسا دھوکا ہے کہ جس میں قلت تدبر سے کوتہ اندیش عیسائی گرفتار ہیں۔ وہ غور نہیں کرتے کہ خدا تعالیٰ کا **عدل بھی تو ایک رحم ہے** .... یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی اصل صفت رحم ہے اور عدل عقل اور قانون عطا کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور حقیقت میں وہ بھی ایک رحم ہے جو اور رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب کسی انسان کو عقل عطا ہوتی ہے اور بذریعہ عقل وہ خدا تعالیٰ کے حدود اور قوانین سے واقف ہوتا ہے تب اس حالت میں وہ عدل کے مؤاخذہ کے نیچے آتا ہے۔ لیکن رحم کے لئے عقل اور قانون کی شرط نہیں اور چونکہ خدا تعالیٰ نے رحم کر کے انسانوں کو سب سے زیادہ فضیلت دینی چاہی اس لئے اس نے انسانوں کیلئے عدل کے قواعد اور حدود مرتب کئے سو عدل اور رحم میں تناقض سمجھنا جہالت ہے۔

ایک اعتراض جو میں نے پادریوں کے اصول پر کیا تھا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ انسان اور تمام حیوانات کی موت آدم کے گناہ کا پھل ہے۔ حالانکہ یہ خیال دو طور سے صحیح نہیں ہے اول یہ کہ کوئی محقق اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ آدم کے وجود سے پہلے بھی ایک مخلوقات دنیا میں رہ چکی ہے۔ اور وہ مرتے بھی تھے۔ اور اس وقت نہ آدم موجود تھا اور نہ آدم کا گناہ۔ پس یہ موت کیونکر پیدا ہو گئی۔ دوسرے یہ کہ اس میں شک نہیں کہ آدم بہشت میں بغیر ایک منع کئے ہوئے پھل کے اور سب چیزیں کھاتا تھا پس کچھ شک نہیں ہو سکتا کہ وہ گوشت بھی کھاتا ہوگا۔ اس صورت میں بھی آدم کے گناہ سے پہلے حیوانات کی موت ثابت ہوتی ہے اور اگر اس سے بھی درگذر کریں تو کیا ہم دوسرے امر سے بھی انکار کر سکتے ہیں کہ آدم بہشت میں ضرور پانی پیتا تھا۔ کیونکہ کھانا اور پینا ہمیشہ سے ایک دوسرے سے لازم پڑے ہوئے ہیں اور طبعی تحقیقات سے ثابت ہے کہ ہر ایک قطرہ میں کئی ہزار کیڑے ہوتے ہیں۔ پس کچھ شک نہیں کہ آدم کے گناہ سے پہلے کروڑہا کیڑے مرتے تھے۔ پس اس سے بہر حال ماننا پڑتا ہے کہ موت گناہ کا پھل نہیں اور یہ امر عیسائیوں کے اصول کو باطل کرتا ہے۔

(کتاب البریہ ص ۷۲-۷۴)

عیسائی اپنے اصول کے موافق اعمال صالحہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے اور ان کی نظر میں یسوع کا

کفارہ نجات پانے کے لئے ایک کافی تدبیر ہے۔ لیکن علاوہ اس بات کے کہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یسوع کا کفارہ نہ تو عیسائیوں کو بدی سے بچا سکا اور نہ یہ بات صحیح ہے کہ کفارہ کی وجہ سے ہر ایک بدی اُن کو حلال ہوگئی۔ ایک اور امر منصفوں کے لئے قابل غور ہے۔ اور وہ یہ کہ عقلی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ نیک کام بلاشبہ اپنے اندر ایک ایسی تاثیر رکھتے ہیں جو نیکوکار کو وہ تاثیر نجات کا پھل بخشتی ہے۔ کیونکہ عیسائیوں کو بھی اس بات کا اقرار ہے کہ بدی اپنے اندر ایک ایسی تاثیر رکھتی ہے کہ اس کا مرتکب ہمیشہ کے جہنم میں جاتا ہے تو اس صورت میں قانون قدرت کے اس پہلو پر نظر ڈال کر یہ دوسرا پہلو بھی ماننا پڑتا ہے کہ علیٰ ہذا القیاس نیکی بھی اپنے اندر ایک تاثیر رکھتی ہے کہ اس کا بجا لانے والا وارث نجات بن سکتا ہے۔

اور منجملہ ہمارے اعتراضات کے ایک یہ اعتراض بھی تھا کہ جس فدیہ کو عیسائی پیش کرتے ہیں وہ خدا کے قدیم قانونِ قدرت کے بالکل مخالف ہے۔ کیونکہ قانون قدرت میں کوئی اس بات کی نظیر نہیں کہ ادنیٰ بچانے کے لئے اعلیٰ کو مارا جائے۔ ہمارے سامنے خدا کا قانون قدرت ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمیشہ ادنیٰ اعلیٰ کی حفاظت کے لئے مارے جاتے ہیں چنانچہ جسقدر دنیا میں جانور ہیں یہاں تک کہ پانی کے کیڑے وہ سب انسان کے بچانے کے لئے جو اشرف المخلوقات ہے کام میں آ رہے ہیں۔ پھر یسوع کے خون کا فدیہ کس قدر اس قانون کے مخالف ہے جو صاف صاف نظر آ رہا ہے اور ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ جو زیادہ قابل قدر اور پیارا ہے اُس کے بچانے کے لئے ادنیٰ کو اس اعلیٰ پر قربان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے انسان کی جان بچانے کے لئے کروڑہا حیوانوں کو بطور فدیہ کے دیا ہے اور ہم تمام انسان بھی فطرتاً ایسا ہی کرنے کی طرف راغب ہیں تو پھر خود سوچ لو کہ عیسائیوں کا فدیہ خدا کے قانونِ قدرت سے کس قدر دُور پڑا ہوا ہے۔

ایک اور اعتراض ہے جو ہم نے کیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ یسوع کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ موروثی اور کسبی گناہ سے پاک ہے۔ حالانکہ یہ صریح غلط ہے۔ عیسائی خود مانتے ہیں کہ یسوع نے اپنا تمام گوشت و پوست اپنی والدہ سے پایا تھا اور وہ گناہ سے پاک نہ تھی اور نیز عیسائیوں کا یہ بھی اقرار ہے کہ ہر ایک درد اور دکھ گناہ کا پھل ہے اور کچھ شک نہیں کہ یسوع بھوکا بھی ہوتا تھا اور پیاسا بھی اور بچپن میں قانون قدرت کے موافق خسرہ بھی اُسکو نکلا ہوگا اور چیچک بھی اور دانتوں کے نکلنے کے دُکھ بھی اٹھائے ہونگے اور

موسموں کے تپوں میں بھی گرفتار ہوتا ہوگا۔ اور بموجب اصول عیسائیوں کے یہ سب گناہ کے پھل ہیں پھر کیونکر اس کو پاک فدیہ سمجھا گیا۔ علاوہ اس کے جبکہ رُوح القدس کا تعلق صرف اسی حالت میں بموجب اصول عیسائیوں کے ہوسکتا تھا جبکہ کوئی شخص ہر ایک طرح سے گناہ سے پاک ہو تو پھر یسوع جو بقول ان کے موروثی گناہ سے پاک نہیں تھا اور نہ گناہوں کے پھل سے بچ سکا اس سے کیونکر رُوح القدس نے تعلق کر لیا بظاہر اس سے زیادہ تر ملک صدق سالم کا حق تھا کیونکہ بقول عیسائیوں کے وہ ہر طرح کے گناہ سے پاک تھا۔

اور عیسائیوں کے اصول پر ایک ہمارا یہ اعتراض تھا کہ وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ نجات کا اصل ذریعہ گناہوں سے پاک ہونا ہے اور پھر باوجود تسلیم اس بات کے گناہوں سے پاک ہونے کا حقیقی طریقہ بیان نہیں کرتے بلکہ ایک قابل شرم بناوٹ کو پیش کرتے ہیں جس کو گناہوں سے پاک ہونے کے ساتھ کوئی حقیقی رشتہ نہیں۔ یہ بات نہایت صاف اور ظاہر ہے کہ چونکہ انسان خدا کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس کا تمام آرام اور ساری خوشحالی صرف اسی میں ہے کہ وہ سارا خدا کا ہی ہو جائے۔ اور حقیقی راحت کبھی ظاہر نہیں ہوسکتی جب تک انسان اس حقیقی رشتہ کو جو اس کو خدا سے ہے ممکن قوت سے حیز فعل میں نہ لاوے۔ لیکن جب انسان خدا سے مُنہ پھیر لیوے تو اس کی مثال ایسی ہو جاتی ہے جیسا کہ کوئی شخص اُن کھڑکیوں کو بند کر دیوے جو آفتاب کی طرف تھیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ اُن کے بند کرنے کے ساتھ ہی ساری کوٹھڑی میں اندھیرا پھیل جائے گا اور وہ روشنی جو محض آفتاب سے ملتی ہے یکلخت دُور ہو کر ظلمت پیدا ہو جائیگی۔ اور وہی ظلمت ہے جو ضلالت اور جہنم سے تعبیر کی جاتی ہے کیونکہ دکھوں کی وہی جڑ ہے۔ اور اس ظلمت کا دُور ہونا اور اس جہنم سے نجات پانا اگر قانون قدرت کے طریق پر تلاش کی جائے تو کسی کے مصلوب کرنے کی حاجت نہیں۔ بلکہ وہی کھڑکیاں کھول دینی چاہئیں جو ظلمت کا باعث ہوئی تھیں۔ کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ہم درحالیکہ نور پانے کی کھڑکیوں کے بند رکھنے پر اصرار کریں کسی روشنی کو پا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ سو گناہ کا معاف ہونا کوئی قصہ کہانی نہیں جس کا ظہور کسی آئندہ زندگی پر موقوف ہو۔ اور یہ بھی نہیں کہ یہ امور محض بے حقیقت اور مجازی گورنمنٹوں کی نافرمانیوں اور قصور بخشی کے رنگ میں ہیں بلکہ اس وقت انسان کو مجرم یا گنہگار کہا جاتا ہے کہ جب وہ خدا سے اعراض کرکے اس روشنی کے مقابلہ سے پرے ہٹ جاتا اور اس چمک سے اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے جو خدا سے اُترتی اور دِلوں پر

نازل ہوتی ہے۔ اس حالت موجودہ کا نام خدا کی کلام میں جُنَاح ہے جس کو پارسیوں نے مبدّل کرکے گناہ بنا لیا ہے۔ اور جَنَحَ جو اس مصدر ہے اس کے معنے ہیں میل کرنا اور اصلی مرکز سے ہٹ جانا۔ پس اس کا نام جُنَاح یعنی گناہ اس لئے ہؤا کہ انسان اعراض کرکے اس مقام کو چھوڑ دیتا ہے جو الٰہی روشنی پڑنے کا مقام ہے اور اس خاص مقام سے دوسری طرف میل کرکے اُن نوروں سے اپنے تئیں دُور ڈالتا ہے جو اس سمت مقابل میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہی جرم کا لفظ جس کے معنے بھی گناہ ہیں جَرَم سے مشتق ہے اور جَرَمَ عربی زبان میں کاٹنے کو کہتے ہیں۔ پس جُرم کا نام اس لئے جَرَم ہؤا کہ جرم کا مرتکب اپنے تمام تعلقات خدا تعالےٰ سے کاٹتا ہے۔ اور باعتبار مفہوم کے جرم کا لفظ جناح کے لفظ سے سخت تر ہے۔ کیونکہ جناح صرف میل کا نام ہے جس میں کسی طرح کا ظلم ہو۔ مگر جرم کا لفظ کسی گناہ پر اس وقت صادق آئیگا کہ جب ایک شخص عمدًا خدا کے قانون کو توڑ کر اور اس کے تعلقات کی پروا نہ رکھ کر کسی ناکردنی امر کا دیدہ دانستہ ارتکاب کرتا ہے۔

اب جبکہ حقیقی پاکیزگی کی حقیقت یہ ہوئی جو ہم نے بیان کی ہے تو اب اس جگہ طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ گم شدہ انوار جن کو انسان تاریکی سے محبت کرکے کھو دیتا ہے کیا وہ صرف کسی شخص کو مصلوب ماننے سے مل سکتے ہیں؟ سو جواب یہ ہے کہ یہ خیال بالکل غلط اور فاسد ہے۔ بلکہ اصل حقیقت یہی ہے کہ ان نوروں کے حاصل کرنے کے لئے قدیم سے قانون قدرت یہی ہے جو ہم اُن کھڑکیوں کو کھول دیں جو اس آفتاب حقیقی کے سامنے ہیں۔ تب وہ کرنیں اور شعاعیں جو بند کرنے سے گم ہو گئی تھیں یکدفعہ پھر پیدا ہو جائیں گی۔ دیکھو خدا کا جسمانی قانون قدرت بھی یہی گواہی دے رہا ہے۔ اور کسی ظلمت کو ہم دُور نہیں کر سکتے جب تک ایسی کھڑکیاں نہ کھول دیں جن سے سیدھی شعاعیں ہمارے گھر میں پڑ سکتی ہیں۔ سو اس میں کچھ شک نہیں کہ عقل سلیم کے نزدیک یہی صحیح ہے جو ان کھڑکیوں کو کھولا جائے۔ تب ہم نہ صرف نور کو پائیں گے بلکہ اس مبدء انوار کو بھی دیکھ لیں گے۔

غرض گناہ اور غفلت کی تاریکی کو دُور کرنے کے لئے نور کا پانا ضروری ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہ ارشاد فرماتا ہے۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔ یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا ہو وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اندھوں سے بدتر۔ یعنی خدا کے دیکھنے کی آنکھیں اور اس کے دریافت کرنے کے حواس

اسی جہان سے ملتے ہیں۔ جس کو اِس جہان میں نہیں ملے اُس کو دوسرے جہان میں بھی نہیں ملیں گے۔ راستباز جو قیامت کے دن خدا کو دیکھیں گے وہ اسی جگہ سے دیکھنے والے حواس ساتھ لے جائیں گے۔ اور جو شخص اس جگہ خدا کی آواز نہیں سُنیگا وہ اس جگہ بھی نہیں سُنیگا۔ خدا کو جیسا کہ خدا ہے بغیر کسی غلطی کے پہچاننا اور اس عالم میں سچے اور صحیح طور اس کی ذات اور صفات کی معرفت حاصل کرنا یہی تمام روشنی کا مبدء ہے۔ اس مقام سے ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا یہ مذہب ہے کہ خدا پر بھی موت اور دُکھ اور مصیبت اور جہالت وارد ہو جاتی ہے اور وہ بھی ملعون ہوکر سچی پاکیزگی اور رحمت اور علوم حقّہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ گمراہی کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور سچے علوم اور حقیقی معارف جو درحقیقت مدار نجات ہیں اُن سے وہ لوگ درحقیقت بے خبر ہیں۔ نجات کا مفت ملنا اور اعمال کو غیر ضروری ٹھہرانا جو عیسائیوں کا خیال ہے یہ اُن کی سراسر غلطی ہے۔ اُن کے فرضی خدا نے بھی چالیس روزے رکھے تھے۔ اور موسیٰؑ نے کوہ سینا پر روزے رکھے۔ پس اگر اعمال کچھ چیز نہیں ہیں تو یہ دونوں بزرگ اِس بیہودہ کام میں کیوں پڑے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالےٰ بدی سے سخت بیزار ہے تو ہمیں اس سے سمجھ آتا ہے کہ وہ نیکی کرنے سے نہایت درجہ خوش ہوتا ہے۔ پس اس صورت میں نیکی بدی کا کفارہ ٹھہرتی ہے۔ اور جب ایک انسان بدی کرنے کے بعد ایسی نیکی بجا لایا جس سے خدا تعالےٰ خوش ہوا تو ضرور ہے کہ پہلی بات موقوف ہوکر دوسری بات قائم ہو جائے۔ ورنہ خلاف ادب ہوگا۔ اِسی کے مطابق اللہ جل شانہ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ یعنی نیکیاں بدیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بدی میں ایک زہریلی خاصیت ہے کہ وہ ہلاکت تک پہنچاتی ہے۔ اِسی طرح ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ نیکی میں ایک تریاقی خاصیت ہے کہ وہ موت سے بچاتی ہے مثلاً گھر کے تمام دروازوں کو بند کر دینا یہ ایک بدی ہے جس کی لازمی تاثیر یہ ہے کہ اندھیرا ہو جائے۔ پھر اس کے مقابل پر یہ ہے کہ گھر کا دروازہ جو آفتاب کی طرف ہے کھولا جائے۔ اور یہ ایک نیکی ہے جس کی لازمی خاصیت یہ ہے کہ گھر کے اندر گم شدہ روشنی واپس آجائے۔

(کتاب البریہ ص ۷۶-۸۱)

آپ کا یہ کہنا کہ حضرت مقدس نبوی کی تعلیم یہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنے سے گناہ دُور ہو جاتے ہیں۔ یہ بالکل سچ ہے اور یہی واقعی حقیقت ہے کہ جو محض خدا کو

واحد لاشریک جانتا ہے اور ایمان لاتا ہے کہ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو اُسی قادرِ یکتا نے بھیجا ہے تو بے شک اگر اس کلمہ پر اس کا خاتمہ ہو تو نجات پا جائیگا۔ آسمانوں کے نیچے کسی کی خودکشی سے نجات نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اور اس سے زیادہ کون پاگل ہوگا کہ ایسا خیال بھی کرے۔ مگر خدا کو واحد لاشریک سمجھنا اور ایسا مہربان خیال کرنا کہ اس نے نہایت رحم کرکے دنیا کو ضلالت سے چھڑانے کیلئے اپنا رسول بھیجا جس کا نام محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہے یہ ایک ایسا اعتقاد ہے کہ اس پر یقین کرنے سے رُوح کی تاریکی دُور ہوتی ہے اور نفسانیت دُور ہوکر اس کی جگہ توحید لے لیتی ہے۔ آخر توحید کا زبردست جوش تمام دل پر محیط ہوکر اسی جہان میں بہشتی زندگی شروع ہو جاتی ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ نُور کے آنے سے ظلمت قائم نہیں رہ سکتی ایسا ہی جب لا الٰہ الاّ اللہ کا نورانی پرتوہ دل پر پڑتا ہے تو نفسانی ظلمت کے جذبات کالمعدوم ہو جاتے ہیں۔ گناہ کی حقیقت بجز اس کے اَور کچھ نہیں کہ سرکشی کی ملونی سے نفسانی جذبات شور و غوغا ہو جس کی متابعت کی حالت میں ایک شخص کا نام گنہگار رکھا جاتا ہے اور لا الٰہ الاّ اللہ کے معنے جو لغتِ عرب کے مواردِ استعمال سے معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ لَا مَطْلُوْبَ لِیْ وَ لَا مَحْبُوْبَ لِیْ وَلَا مَعْبُوْدَ لِیْ وَ لَا مُطَاعَ لِیْ اِلَّا اللہُ یعنی بجز اللہ کے اَور کوئی میرا مطلوب نہیں اور محبوب نہیں اور معبود نہیں اور مُطاع نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ معنے گناہ کی حقیقت اور گناہ کے اصل منبع سے بالکل مخالف پڑے ہیں۔ پس جو شخص ان معنی کو خلوص دل کے ساتھ اپنی جان میں جگہ دیگا تو بالضرورت مفہوم مخالف اس کے دل سے نکل جائیگا۔ کیونکہ ضدّین ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ پس جب نفسانی جذبات نکل گئے تو یہی وہ حالت ہے جس کو سچی پاکیزگی اور حقیقی راستبازی کہتے ہیں۔ اور خدا کے بھیجے ہوئے پر ایمان لانا جو دوسرے جز کلمہ کا مفہوم ہے اس کی ضرورت یہ ہے کہ تا خدا کے کلام پر بھی ایمان حاصل ہو جائے۔ کیونکہ جو شخص یہ اقرار کرتا ہے میں خدا کا فرمانبردار بننا چاہتا ہوں اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے فرمانوں پر ایمان بھی لاوے۔ اور فرمان پر ایمان لانا بجز اس کے ممکن نہیں کہ اُس پر ایمان لاوے جس کے ذریعہ سے دنیا میں فرمان آیا۔ پس یہ حقیقت کلمہ کی ہے۔

(نورالقرآن ۲ ص ۴۳-۴۵)

بعث بعد الموت

شیطان کے وساوس بہت ہیں اور سب سے زیادہ خطرناک وسوسہ اور شبہ جو انسانی دل میں پیدا ہو کر اُسے خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃ کر دیتا ہے آخرت کے متعلق ہے کیونکہ تمام نیکیوں اور راستبازیوں کا بڑا بھاری ذریعہ منجملہ دیگر اسباب اور وسائل کے آخرت پر ایمان بھی ہے۔ اور جب انسان آخرت اور اس کی باتوں کو قصّہ اور داستان سمجھے تو سمجھ لو کہ وہ ردّ ہو گیا۔ اور دونوں جہانوں سے گیا گذرا ہوا۔ اس لئے کہ آخرت کا ڈر بھی تو انسان کو خائف اور ترساں بنا کر معرفت کے سچے چشمہ کی طرف کشاں کشاں لے آتا ہے۔ اور سچی معرفت بغیر حقیقی خشیت اور خدا ترسی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس یاد رکھو! کہ آخرت کے متعلق وساوس کا پیدا ہونا ایمان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے اور خاتمہ بالخیر میں فتور پڑ جاتا ہے۔

(ملفوظات جلد اوّل صفحہ ۵۱-۵۲)

واضح رہے کہ قرآنی تعلیم کی رو سے تین عالم ثابت ہوتے ہیں۔

اوّل دنیا جس کا نام عالم کسب اور نشاۃ اولیٰ ہے۔ اِسی دنیا میں انسان اکتساب نیکی کا یا بدی کا کرتا ہے۔ اور اگرچہ عالم بعث میں نیکیوں کے واسطے ترقیات ہیں مگر وہ محض خدا کے فضل سے ہیں۔ انسان کے کسب کا اُن میں دخل نہیں۔

(۲) اور دوسرے عالم کا نام **برزخ** ہے۔ اصل میں لفظ برزخ لغتِ عرب میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو۔ سو چونکہ یہ زمانہ عالم بعث اور عالم نشاۃ اولیٰ میں واقع ہے اس لئے اس کا نام برزخ ہے۔ لیکن یہ لفظ قدیم سے اور جب سے کہ دنیا کی بنا پڑی عالم درمیانی پر بولا گیا ہے اس لئے اس لفظ میں عالم درمیانی کے وجود پر ایک عظیم الشان شہادت مخفی ہے ....

برزخ کی حالت وہ حالت ہے کہ جب یہ ناپائیدار ترکیب انسانی تفرق پذیر ہو جاتی ہے اور روح الگ اور جسم الگ ہو جاتا ہے۔ .... گو موت کے بعد

یہ فانی جسم رُوح سے الگ ہو جاتا ہے مگر عالم برزخ میں مستعار طور پر ہر ایک رُوح کو کسی قدر اپنے اعمال کا مزہ چکھنے کے لئے جسم ملتا ہے۔ وہ جسم اس جسم کی قسم میں سے نہیں ہوتا بلکہ ایک نور سے یا ایک تاریکی سے جیساکہ اعمال کی صورت ہو جسم تیار ہوتا ہے گویا کہ اس عالم میں انسان کی عملی حالتیں جسم کا کام دیتی ہیں۔ ایسا ہی خدا کے کلام میں بار بار ذکر آیا ہے اور بعض جسم نورانی اور بعض ظلمانی قرار دیئے ہیں جو اعمال کی روشنی یا اعمال کی ظلمت سے تیار ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ راز ایک نہایت دقیق راز ہے مگر غیر معقول نہیں۔ انسانِ کامل اسی زندگی میں ایک نورانی وجود اس کیفیتِ جسم کے علاوہ پا سکتا ہے۔ اور عالمِ مکاشفات میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ اگرچہ ایسے شخص کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے جو صرف ایک موٹی عقل کی حد تک ٹھہرا ہوا ہے لیکن جن کو عالم مکاشفات میں سے کچھ حصہ ہے وہ اس قسم کے جسم کو جو اعمال سے تیار ہوتا ہے تعجب اور استبعاد کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے بلکہ اِس مضمون سے لذّت اُٹھائیں گے۔

غرض یہ جسم جو اعمال کی کیفیت سے ملتا ہے یہی عالم برزخ میں نیک و بد کی جزا کا موجب ہو جاتا ہے۔ مَیں اس میں صاحب تجربہ ہوں۔ مجھے کشفی طور پر عین بیداری میں بارہا بعض مردوں کی ملاقات کا اتفاق ہوا ہے اور مَیں نے بعض فاسقوں اور گمراہی اختیار کرنے والوں کا جسم ایسا سیاہ دیکھا ہے کہ گویا وہ دھوئیں سے بنایا گیا ہے۔ غرض میں اس کوچہ سے ذاتی واقفیت رکھتا ہوں۔ اور مَیں زور سے کہتا ہوں کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے ایسا ہی ضرور مرنے کے بعد ہر ایک کو ایک جسم ملتا ہے خواہ نورانی خواہ ظلمانی۔ انسان کی یہ غلطی ہوگی اگر وہ ان نہایت باریک معارف کو صرف عقل کے ذریعہ سے ثابت کرنا چاہے۔ بلکہ جاننا چاہیئے کہ جیسا کہ آنکھ شیریں چیز کا مزہ نہیں بتلا سکتی اور نہ زبان کسی چیز کو دیکھ سکتی ہے۔ ایسا ہی وہ علوم معاد جو پاک مکاشفات سے حاصل ہو سکتے ہیں صرف عقل کے ذریعہ سے ان کا عقدہ حل نہیں ہو سکتا۔ خدائے تعالیٰ نے اِس دنیا میں مجہولات کے جاننے کے لئے علیحدہ علیحدہ وسائل رکھے ہیں۔ پس ہر ایک چیز کو اس کے وسیلہ کے ذریعہ ڈھونڈو تب اُسے پالو گے

ایک اَور بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ خدا نے ان لوگوں کو جو بدکاری اور گمراہی میں پڑ گئے اپنے کلام میں مردہ کے نام سے موسوم کیا ہے اور نیکوکاروں کو زندہ قرار دیا ہے۔ اس میں بھید یہ ہے کہ جو لوگ خدا تعالےٰ سے غافل ہوئے ان کی زندگی کے اسباب جو کھانا پینا

اور شہوتوں کی پیروی بھی منقطع ہو گئے۔ اور رُوحانی غذا سے ان کو کچھ حصّہ نہ تھا۔ پس وہ درحقیقت مر گئے اور وہ صرف عذاب اُٹھانے کے لئے زندہ ہونگے۔ اسی بھید کی طرف اللہ جلّ شانہ نے اشارہ فرمایا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے۔ مَنْ يَّأْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى۔ یعنی جو شخص مجرم بن کر خدا کے پاس آئے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے وہ اس میں نہ مرے گا اور نہ زندہ رہیگا۔ مگر جو لوگ خدا تعالیٰ کے محبّ ہیں وہ موت سے نہیں مرتے کیونکہ ان کا پانی اور ان کی روٹی ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

پھر برزخ کے بعد وہ زمانہ ہے جس کا نام عالم بعث ہے۔ اس زمانہ میں ہر ایک رُوح نیک ہو یا بد۔ صالح ہو یا فاسق ایک کھلا کھلا جسم حاصل کریگی اور یہ دن خدا کی اُن پوری تجلیات کے لئے مقرر کیا گیا ہے جس میں ہر ایک انسان اپنے رب کی ہستی سے پورے طور پر واقف ہو جائے گا۔ اور ہر ایک شخص اپنے جزا کے انتہائی نقطہ تک پہنچیگا۔ یہ تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ خدا سے یہ کیونکر ہوسکیگا۔ کیونکہ وہ ہر ایک قدرت کا مالک ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ۔ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ...... اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۸۸-۹۳)

اسلام میں یہ نہایت اعلیٰ درجہ کی فلاسفی ہے کہ ہر ایک کو قبر میں ہی ایسا جسم مل جاتا ہے کہ جو لذّت اور عذاب کے ادراک کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ ہم ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ وہ جسم کس مادہ سے تیار ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ فانی جسم تو کالعدم ہو جاتا ہے اور نہ کوئی مشاہدہ کرتا ہے کہ درحقیقت یہی جسم قبر میں زندہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بسا اوقات یہ جسم جلایا بھی جاتا ہے اور عجائب گھروں میں لاشیں بھی رکھی جاتی ہیں اور مدتوں تک قبر سے باہر بھی رکھا جاتا ہے۔ اگر یہی جسم زندہ ہو جایا کرتا تو البتہ لوگ اس کو دیکھتے مگر

بایں ہمہ قرآن سے زندہ ہو جانا ثابت ہے۔ لہٰذا یہ ماننا پڑتا ہے کہ کسی اور جسم کے ذریعہ سے جس کو ہم نہیں دیکھتے انسان کو زندہ کیا جاتا ہے اور غالباً وہ جسم اسی جسم کے لطائف جوہر سے بنتا ہے۔ تب جسم ملنے کے بعد انسانی قویٰ بحال ہوتے ہیں۔ اور یہ دوسرا جسم چونکہ پہلے جسم کی نسبت نہایت لطیف ہوتا ہے اس لئے اس پر مکاشفات کا دروازہ نہایت وسیع طور پر کھلتا ہے اور معاد کی تمام حقیقتیں جیسی کہ وہ ہیں کَمَا ھِیَ ہی نظر آجاتی ہیں۔ تب خطا کرنے والوں کو علاوہ جسمانی عذاب کے ایک حسرت کا عذاب بھی ہوتا ہے۔ غرض یہ اصول متفق علیہ اسلام میں ہے کہ قبر کا عذاب یا آرام بھی جسم کے ذریعہ سے ہی ہوتا ہے اور اس بات کو دلائل عقلیہ بھی چاہتے ہیں۔ کیونکہ متواتر تجربہ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انسان کے روحانی قویٰ بغیر جسم کے جوڑ کے ہرگز ظہور پذیر نہیں ہوتے۔

(کتاب البریہ صـ ۷۰-۷۱)

جاننا چاہیئے کہ عالم آخرت درحقیقت دنیوی عالم کا ایک عکس ہے۔ اور جو کچھ دنیا میں روحانی طور پر ایمان اور ایمان کے نتائج اور کفر اور کفر کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ عالم آخرت میں جسمانی طور پر ظاہر ہو جائیں گے۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی۔ یعنی جو اس جہان میں اندھا ہے وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہوگا۔ ہمیں اس تمثیلی وجود سے کچھ تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ اور ذرا سوچنا چاہیئے کہ کیونکر روحانی امور عالم رؤیا میں متمثل ہو کر نظر آجاتے ہیں اور عالم کشف میں تو اس سے بھی عجیب تر ہے کہ وجود عدم غیبتِ حسّ اور بیداری کے روحانی امور طرح طرح کے جسمانی اشکال میں انہیں آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ بسا اوقات عین بیداری میں ان رُوحوں سے ملاقات ہوتی ہے جو اس دنیا سے گذر چکے ہیں اور وہ اس دنیوی زندگی کے طور پر اپنے اصلی جسم میں اسی دنیا کے کپڑوں میں سے ایک پوشاک پہنے ہوئے نظر آتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں اور بسا اوقات اُن میں سے مقدس لوگ باذنہٖ تعالےٰ آئندہ کی خبریں دیتے ہیں اور وہ خبریں مطابق واقعہ نکلتی ہیں۔ بسا اوقات عین بیداری میں ایک شربت یا کسی قسم کا میوہ عالم کشف سے ہاتھ میں آتا ہے اور وہ کھانے میں نہایت لذیذ ہوتا ہے۔ اور ان سب امور میں یہ عاجز خود صاحب تجربہ ہے۔ کشف کی اعلیٰ قسموں میں سے یہ ایک قسم ہے کہ بالکل بیداری میں واقع ہوتی ہے۔ اور یہاں تک اپنے ذاتی تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ ایک شیریں طعام یا کسی قسم کا میوہ یا شربت غیب سے

نظر کے سامنے آگیا ہے۔ اور وہ ایک غیبی ہاتھ سے مُنہ میں پڑتا جاتا ہے۔ اور زبان کی قوتِ ذائقہ اس کے لذیذ طعم سے لذّت اٹھاتی جاتی ہے اور دوسرے لوگوں سے باتوں کا سلسلہ بھی جاری ہے اور حواسِ ظاہری بخوبی اپنا اپنا کام دے رہے ہیں۔ اور یہ شربت یا میوہ بھی کھایا جا رہا ہے اور اس کی لذّت اور حلاوت بھی ایسی ہی کھلے کھلے طور پر معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ وہ لذت اس لذّت سے نہایت الطف ہوتی ہے اور یہ ہرگز نہیں کہ وہ وہم ہوتا ہے یا صرف بے بنیاد تخیّلات ہوتے ہیں۔ بلکہ واقعی طور پر وہ خدا جس کی شان بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ہے ایک قسم کے خلق اور پیدائش کا دنیا میں ہی نمونہ دکھا دیتا ہے۔ اور ہر ایک زمانہ کے عارف اس کے بارے میں گواہی دیتے چلے آئے ہیں۔ تو پھر وہ تمثّلی خلق اور پیدائش جو آخرت میں ہوگی اور میزانِ اعمال نظر آئیگی اور پلصراط نظر آئیگا۔ اور ایسا ہی بہت سے امور روحانی جسمانی تشکّل کے ساتھ نظر آئیں گے۔ اس سے کیوں عقلمند تعجب کرے۔ کیا جس نے یہ سلسلہ تمثّلی خلق اور پیدائش کا دنیا میں ہی عارفوں کو دکھا دیا ہے اس کی قدرت سے یہ بعید ہے کہ وہ آخرت میں بھی دکھا دے؟ بلکہ اِن تمثلات کو عالمِ آخرت سے نہایت مناسبت ہے کیونکہ جس حالت میں اس عالم میں جو کمال انقطاع کا تجلّی گاہ نہیں یہ تمثّلی پیدائش تزکیہ یافتہ لوگوں پر ظاہر ہو جاتی ہے تو پھر عالمِ آخرت میں جو اکمل اور اتمّ انقطاع کا مقام ہے کیوں نظر نہ آوے۔

یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیئے کہ انسان عارف پر اسی دنیا میں وہ تمام عجائبات کشفی رنگ میں کھل جاتے ہیں جو ایک محجوب آدمی قصّہ کے طور پر قرآن کریم کی اُن آیات میں پڑھتا ہے جو معاد کے بارے میں خبر دیتی ہیں۔ سو جس کی نظرِ حقیقت تک نہیں پہنچتی وہ ان بیانات سے تعجب میں پڑ جاتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات اس کے دل میں اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کا عدالت کے دن تخت پر بیٹھنا اور ملائک کا صف باندھے کھڑے ہونا اور ترازو میں عملوں کا تُلنا اور لوگوں کا پلصراط پر سے چلنا اور سزا جزا کے بعد موت کو بکرے کی طرح ذبح کر دینا اور ایسا ہی اعمال کا خوش شکل اور یا بدشکل انسانوں کی طرح لوگوں پر ظاہر ہونا اور بہشت میں دودھ اور شہد کی نہریں چلنا وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں صداقت اور معقولیت سے دُور معلوم ہوتی ہیں۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۶۱-۶۲)

موت کے بعد جو کچھ انسان کی حالت ہوتی ہے درحقیقت وہ کوئی نئی حالت نہیں ہوتی۔

بلکہ وہی دنیا کی زندگی کی حالتیں زیادہ صفائی سے کھل جاتی ہیں۔ جو کچھ انسان کے عقائد اور اعمال کی کیفیت صالحہ یا غیر صالحہ ہوتی ہے وہ اس جہان میں مخفی طور پر اس کے اندر ہوتی ہے اور اس کا تریاق یا زہر ایک چھپی ہوئی تاثیر انسانی وجود پر ڈالتا ہے۔ مگر آنے والے جہان میں ایسا نہیں رہیگا۔ بلکہ وہ تمام کیفیات کھلا کھلا اپنا چہرہ دکھلائیں گی۔ اُس کا نمونہ عالم خواب میں پایا جاتا ہے کہ انسان کے بدن پر جس قسم کے مواد غالب ہوتے ہیں عالم خواب میں اسی قسم کی جسمانی حالتیں نظر آتی ہیں۔ جب کوئی تیز تپ چڑھنے کو ہوتا ہے تو خواب میں اکثر آگ اور آگ کے شعلے نظر آتے ہیں۔ اور بلغمی تپوں اور ریزش اور زکام کے غلبہ میں انسان اپنے تئیں پانی میں دیکھتا ہے غرض جس طرح کی بیماریوں کے لئے بدن نے تیاری کی ہو وہ کیفیتیں تمثّل کے طور پر خواب میں نظر آجاتی ہیں۔ پس خواب کے سلسلہ پر غور کرنے سے ہر ایک انسان سمجھ سکتا ہے کہ عالم ثانی میں بھی یہی سنّت اللہ ہے۔ کیونکہ جس طرح خواب ہم میں ایک خاص تبدیلی پیدا کر کے روحانیت کو جسمانی طور پر تبدیل کر کے دکھلاتا ہے۔ اُس عالم میں بھی یہی ہوگا۔ اور اس دن ہمارے اعمال اور اعمال کے نتائج جسمانی طور پر ظاہر ہونگے۔ اور جو کچھ ہم اس عالم سے مخفی طور ساتھ لے جائیں گے۔ وہ سب اس دن ہمارے چہرہ پر نمودار نظر آئیگا اور جیسا کہ انسان جو کچھ خواب میں طرح طرح کے تمثلات دیکھتا ہے اور کبھی گمان نہیں کرتا کہ یہ تمثلات ہیں۔ بلکہ انہیں واقعی چیزیں یقین کرتا ہے۔ ایسا ہی اس عالم میں ہوگا۔ بلکہ خدا تعالیٰ تمثلات کے ذریعہ سے اپنی نئی قدرت دکھلائے گا۔ چونکہ وہ قدرت کامل ہے پس اگر ہم تمثلات کا نام بھی نہ لیں اور یہ کہیں کہ وہ خدا کی قدرت سے ایک نئی پیدائش ہے تو یہ تقریر بہت درست اور واقعی اور صحیح ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ۔ یعنی کوئی نفس نیکی کرنے والا نہیں جانتا کہ وہ کیا کیا نعمتیں ہیں جو اس کے لئے مخفی ہیں۔ سو خدا تعالیٰ نے اُن تمام نعمتوں کو مخفی قرار دیا جن کا دنیا کی نعمتوں میں نمونہ نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کی نعمتیں ہم پر مخفی نہیں ہیں۔ اور دودھ اور انار اور انگور وغیرہ کو ہم جانتے ہیں اور ہمیشہ یہ چیزیں کھاتے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ چیزیں اَور ہیں اور ان کو ان چیزوں سے صرف نام کا اشتراک ہے۔ پس جس نے بہشت کو دنیا کی چیزوں کا مجموعہ سمجھا اُس نے قرآن شریف کا ایک حرف بھی نہیں سمجھا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۸۲-۸۴)

قاعدہ کلی کے طور پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ موت کے بعد جو حالتیں پیش آتی ہیں قرآن شریف نے انہیں تین قسم پر منقسم کیا ہے اور عالم معاد کے متعلق یہ تین قرآنی معارف ہیں جن کا ہم جدا جدا اسجگہ ذکر کرتے ہیں۔

اوّل یہ دقیقہ معرفت ہے کہ قرآن شریف باربار یہی فرماتا ہے کہ عالم آخرت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے تمام نظارے اِس دنیوی زندگی کے اظلال و آثار ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا۔ یعنی ہم نے اسی دنیا میں ہر ایک شخص کے اعمال کا اثر اس کی گردن سے باندھ رکھا ہے اور انہیں پوشیدہ اثروں کو ہم قیامت کے دن ظاہر کرینگے اور ایک کھلے کھلے اعمال نامہ کی شکل پر دکھلائیں گے۔ اس آیت میں جو طائر کا لفظ ہے تو واضح ہو کہ طائر اصل میں پرندہ کو کہتے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور پر اس سے مراد عمل بھی لیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک عمل نیک ہو یا بد ہو وہ وقوع کے بعد پرندہ کی طرح پرواز کر جاتا ہے اور مشقت یا لذت اُس کی کالعدم ہو جاتی ہے اور دل پر اس کی کثافت یا لطافت باقی رہ جاتی ہے۔

یہ قرآنی اصول ہے کہ ہر ایک عمل پوشیدہ طور پر اپنے نقوش جماتا رہتا ہے جس طور کا انسان کا فعل ہوتا ہے اس کے مناسب حال ایک خدا تعالیٰ کا فعل صادر ہوتا ہے۔ اور وہ فعل اس گناہ کو یا اس نیکی کو ضائع ہونے نہیں دیتا بلکہ اس کے نقوش دل پر مُنہ پر آنکھوں پر ہاتھوں پر پیروں پر لکھے جاتے ہیں اور یہی پوشیدہ طور پر ایک اعمال نامہ ہے جو دوسری زندگی میں کھلے طور پر ظاہر ہو جائیگا۔

اور دوسری جگہ بہشتیوں کے بارے میں فرماتا ہے۔ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ۔ یعنی اس دن بھی ایمانی نور جو پوشیدہ طور پر مومنوں کو حاصل ہے کھلے کھلے طور پر اُن کے آگے اور اُن کے داہنے ہاتھ پر دوڑتا نظر آئے گا۔ پھر ایک اور جگہ بدکاروں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ۔ یعنی دنیا کی کثرت حرص و ہوا نے تمہیں آخرت کی تلاش سے روک رکھا یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پڑے۔ دنیا سے دل مت لگاؤ

تم عنقریب جان لوگے کہ دنیا سے دل لگانا اچھا نہیں۔ پھر میں کہتا ہوں کہ عنقریب تم جان لوگے کہ دنیا سے دل لگانا اچھا نہیں۔ اگر تمہیں یقینی علم حاصل ہو تو تم دوزخ کو اسی دنیا میں دیکھ لوگے پھر برزخ کے عالم میں یقین کی آنکھوں کے ساتھ دیکھوگے۔ پھر عالم حشر اجساد پورے مؤاخذہ میں آجاؤگے اور وہ عذاب تم پر کامل وارد ہو جائیگا۔ اور صرف قال سے نہیں بلکہ حال سے تمہیں دوزخ کا علم حاصل ہو جائیگا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۸۶ - ۸۸)

دوسرا دقیقہ معرفت جس کو عالم معاد کے متعلق قرآن شریف نے ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ عالم معاد میں وہ تمام امور جو دنیا میں روحانی تھے جسمانی طور پر متمثل ہونگے۔ خواہ عالم معاد میں برزخ کا درجہ ہو یا عالم بعث کا درجہ۔ اس بارہ میں جو کچھ خدا تعالیٰ نے فرمایا اس میں سے ایک یہ آیت ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا ہوگا وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہوگا۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ اس جہان کی رُوحانی نابینائی اس جہان میں جسمانی طور پر مشہود اور محسوس ہوگی۔ ایسا ہی دوسری آیت میں فرماتا ہے: خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ۔ یعنی اس جہنمی کو پکڑو۔ اس کی گردن میں طوق ڈالو۔ پھر دوزخ میں اس کو جلاؤ۔ پھر ایسی زنجیر میں جو پیمائش میں ستّر گز ہے اس کو داخل کرو۔ جاننا چاہیئے کہ ان آیات میں ظاہر فرمایا کہ دنیا کا روحانی عذاب عالم معاد میں جسمانی طور پر نمودار ہوگا۔ چنانچہ طوق گردن دنیا کی خواہشوں کا جس نے انسان کے سر کو زمین کی طرف جھکا رکھا تھا وہ عالم ثانی میں ظاہری صورت میں نظر آجائیگا۔ اور ایسا ہی دنیا کی گرفتاریوں کی زنجیر پیروں میں پڑی ہوئی دکھائی دیگی اور دنیا کی خواہشوں کی سوزشوں کی آگ ظاہر ظاہر بھڑکتی ہوئی نظر آئیگی۔ فاسق انسان دنیا کی زندگی میں ہوا و ہوس کا ایک جہنم اپنے اندر رکھتا ہے اور ناکامیوں میں اس جہنم کی سوزشوں کا احساس کرتا ہے۔ پس جبکہ اپنی فانی شہوات سے دُور ڈالا جائیگا اور ہمیشہ کی ناامیدی طاری ہوگی تو خدا تعالیٰ ان حسرتوں کو جسمانی آگ کے طور پر اس پر ظاہر کرے گا جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ۔ یعنی ان میں اور ان کی خواہشوں کی چیزوں میں جدائی ڈالی جائیگی۔ اور یہی عذاب کی جڑ ہوگی۔ اور پھر جو فرمایا کہ ستّر گز کی زنجیر میں اس کو داخل کرو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک فاسق بسا اوقات ستّر برس کی عمر پالیتا ہے۔ بلکہ کئی دفعہ اس دنیا میں اسکو ایسے برس بھی ملتے ہیں کہ خورد سالی کی عمر اور پیرِ فرتوت ہونے کی عمر الگ کرکے پھر اس قدر صاف اور خالص حصّہ عمر کا اس کو ملتا ہے جو عقلمندی اور محنت اور کام کے لائق ہوتا ہے لیکن وہ بدبخت

اپنی عمدہ زندگی کے ستر برس دنیا کی گرفتاریوں میں گذارتا ہے اور اس زنجیر سے آزاد ہونا نہیں چاہتا۔ سو خدائے تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ وہی ستر برس جو اس نے گرفتاریِ دنیا میں گذارے تھے عالمِ معاد میں زنجیر کی طرح متمثل ہو جائیں گے جو ستر گز کی ہوگی۔ ہر ایک گز بجائے ایک سال کے ہے۔ اس جگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ اپنی طرف سے بندہ پر کوئی مصیبت نہیں ڈالتا بلکہ وہ انسان کے اپنے ہی بُرے کام اُس کے آگے رکھ دیتا ہے۔ پھر اپنی اسی سنت کے اظہار میں خدا تعالیٰ ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۔ یعنی اے بدکارو۔ گمراہو! سہ گوشہ سایہ کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں جو سایہ کا کام نہیں دے سکتیں اور نہ گرمی سے بچا سکتی ہیں۔ اس آیت میں تین شاخوں سے مراد قوت سبعی اور بہیمی اور وہمی ہے۔ جو لوگ ان تینوں قوتوں کو اخلاقی رنگ میں نہیں لاتے اور ان کی تعدیل نہیں کرتے ان کی یہ قوتیں قیامت میں اس طرح پر نمودار کی جائیں گی کہ گویا تین شاخیں بغیر پتوں کے کھڑی ہیں اور گرمی سے بچا نہیں سکتیں اور وہ گرمی سے جلیں گے۔ پھر ایسا ہی خدا تعالیٰ اپنی اسی سنّت کے ظہار کے لئے بہشتیوں کے حق میں فرماتا ہے۔ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ۔ یعنی اس روز تو دیکھے گا کہ مومنوں کا یہ نور جو دنیا میں پوشیدہ طور پر ہے ظاہر ظاہر ان کے آگے اور داہنی طرف دوڑتا ہوگا۔

اور پھر ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۔ یعنی اُس دن بعض مُنہ سیاہ ہو جائیں گے اور بعض سفید اور نورانی ہو جائیں گے۔ اور پھر ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۔ یعنی وہ بہشت جو پرہیزگاروں کو دیا جائیگا اُس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک باغ ہے اس میں پانی کی نہریں ہیں جو کبھی متعفّن نہیں ہوتا۔ اور نیز اس میں اس دودھ کی نہریں ہیں جس کا کبھی مزہ نہیں بدلتا۔ نیز اس میں شراب کی نہریں ہیں جو سراسر سُرور بخش ہے جس کے ساتھ خمار نہیں نیز اس میں اس شہد کی نہریں ہیں جو نہایت صاف ہے جس کے ساتھ کوئی کثافت نہیں۔ اس جگہ صاف طور پر فرمایا کہ اس بہشت کو مثالی طور پر یوں سمجھ لو کہ ان تمام چیزوں کی اس میں ناپیدا کنار نہریں ہیں۔ وہ زندگی کا پانی جو عارف دنیا میں روحانی طور پر

پیتا ہے اس میں ظاہری طور پر موجود ہے۔ اور وہ رُوحانی دودھ جس سے وہ شیرخوار بچہ کی طرح رُوحانی طور پر دنیا میں پرورش پاتا ہے بہشت میں ظاہر ظاہر دکھائی دیگا۔ اور وہ خدا کی محبت کی شراب جس سے وہ دنیا میں روحانی طور پر ہمیشہ مست رہتا تھا اور اب بہشت میں ظاہر ظاہر اُس کی نہریں نظر آئیں گی۔ اور وہ حلاوتِ ایمانی کا شہد جو دنیا میں روحانی طور پر عارف کے مُنہ میں جاتا تھا وہ بہشت میں محسوس اور نمایاں نہروں کی طرح دکھائی دیگا اور ہر ایک بہشتی اپنی نہروں اور اپنے باغوں کے ساتھ اپنی روحانی حالت کا اندازہ برہنہ کرکے دکھلا دے گا۔ اور خدا بھی اس دن بہشتیوں کے لئے حجابوں سے باہر آجائیگا۔ غرض روحانی حالتیں مخفی نہیں رہینگی بلکہ جسمانی طور پر نظر آئیں گی۔

تیسرا دقیقہ معرفت کا یہ ہے کہ عالمِ معاد میں ترقیات غیر متناہی ہونگی۔ اِس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ یعنی جو لوگ دنیا میں ایمان کا نور رکھتے ہیں اُن کا نور قیامت کے دن اُن کے آگے اور اُن کی داہنی طرف دوڑتا ہوگا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہیں گے کہ اے خدا ہمارے نور کو کمال تک پہنچا اور اپنی مغفرت کے اندر ہمیں لے لے تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اِس آیت میں یہ جو فرمایا کہ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہیں گے کہ ہمارے نور کو کمال تک پہنچا یہ ترقیاتِ غیر متناہیہ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ایک کمال نورانیت کا انہیں حاصل ہوگا۔ پھر دوسرا کمال نظر آئے گا۔ اس کو دیکھ کر پہلے کمال کو ناقص پائیں گے۔ پس کمالِ ثانی کے حصول کے لئے التجاء کریں گے اور جب وہ حاصل ہوگا تو ایک تیسرا مرتبہ کمال کا اُن پر ظاہر ہوگا پھر اس کو دیکھ کر پہلے کمالات کو ہیچ سمجھیں گے اور اس کی خواہش کرینگے۔ یہی ترقیات کی خواہش ہے جو اَتْمِمْ کے لفظ سے سمجھی جاتی ہے۔

غرض اِسی طرح غیر متناہی سلسلہ ترقیات کا چلا جائیگا۔ تنزّل کبھی نہیں ہوگا اور نہ کبھی بہشت سے نکالے جائیں گے بلکہ ہر روز آگے بڑھیں گے اور پیچھے نہ ہٹیں گے۔ اور یہ جو فرمایا کہ وہ ہمیشہ اپنی مغفرت چاہیں گے۔ اس جگہ سوال یہ ہے کہ جب بہشت میں داخل ہوگئے تو پھر مغفرت میں کیا کسر رہ گئی۔ اور جب گناہ بخشے گئے تو پھر استغفار میں کونسی حاجت رہی؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ مغفرت کے اصل معنے یہ ہیں نا ملائم اور ناقص

حالت کو نیچے دبانا اور ڈھانکنا۔ سو بہشتی اس بات کی خواہش کریں گے کہ کمالِ تام حاصل کریں اور سراسر نور میں غرق ہو جائیں۔ وہ دوسری حالت کو دیکھکر پہلی حالت کو ناقص پائینگے پس چاہیں گے کہ پہلی حالت نیچے دبائی جائے۔ پھر تیسرے کمال کو دیکھکر یہ آرزو کریں گے کہ دوسرے کمال کی نسبت مغفرت ہو یعنی وہ حالتِ ناقصہ نیچے دبائی جائے اور مخفی کی جائے۔ اسی طرح غیر متناہی مغفرت کے خواہشمند رہیں گے۔

یہ وہی لفظ مغفرت اور استغفار کا ہے جو بعض نادان بطور اعتراض ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پیش کیا کرتے ہیں۔ سو ناظرین نے اس جگہ سے سمجھ لیا ہوگا کہ یہی خواہش استغفار فخرِ انسان ہے۔ جو شخص کسی عورت کے پیٹ سے پیدا ہو اور پھر ہمیشہ کے لئے استغفار اپنی عادت نہیں پکڑتا وہ کیڑا ہے نہ انسان اور اندھا ہے نہ سوجاکھا۔ اور ناپاک ہے نہ طیّب۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۹۴-۹۹)

بہشت و دوزخ

مذہب سے غرض کیا ہے؟ بس یہی کہ خدا تعالےٰ کے وجود اور اس کی صفات کاملہ پر یقینی طور پر ایمان حاصل ہو کر نفسانی جذبات سے انسان نجات پا جاوے اور خدا تعالیٰ سے ذاتی محبت پیدا ہو۔ کیونکہ درحقیقت وہی بہشت ہے جو عالم آخرت میں طرح طرح کے پیرایوں میں ظاہر ہو گا۔ اور حقیقی خدا سے بے خبر رہنا اور اس سے دُور رہنا اور سچی محبت اُس سے نہ رکھنا درحقیقت یہی جہنّم ہے جو عالمِ آخرت میں انواع و اقسام کے رنگوں میں ظاہر ہو گا۔

(چشمۂ مسیحی ص ۲۵-۲۶)

قرآن شریف نے بہشت اور دوزخ کی جو حقیقت بیان کی ہے کسی دوسری کتاب نے بیان نہیں کی۔ اُس نے صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ اس دنیا سے یہ سلسلہ جاری ہوتا ہے چنانچہ فرمایا۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ۔ یعنی جو شخص خدا تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے واسطے دو بہشت ہیں۔ یعنی ایک بہشت تو اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا خوف اس کو برائیوں سے روکتا ہے۔ اور بدیوں کی طرف دوڑنا دل میں ایک اضطراب اور قلق پیدا کرتا ہے جو بجائے خود ایک خطرناک جہنّم ہے لیکن جو شخص خدا کا خوف کھاتا ہے تو وہ بدیوں سے پرہیز کر کے اس عذاب اور درد سے تو دم نقد بچ جاتا ہے اور جو شہوات اور جذبات نفسانی کی غلامی اور اسیری سے پیدا ہوتا ہے اور وہ وفاداری اور خدا کی طرف جھکنے میں ترقی کرتا ہے جس سے ایک لذّت اور سرور اُسے دیا جاتا ہے اور یوں بہشتی زندگی اسی دنیا سے اس کے لئے شروع ہو جاتی ہے۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۱۵۵-۱۵۶)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ یعنی انسانوں میں سے وہ اعلیٰ درجہ کے انسان ہیں جو خدا کی رضا میں کھوئے جاتے

ہیں وہ اپنی جان بیچتے ہیں اور خدا کی مرضی کو مول لیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا کی رحمت ہے۔ ایسا ہی وہ شخص جو روحانی حالت کے مرتبہ تک پہنچ گیا ہے خدا کی راہ میں فدا ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ تمام دکھوں سے وہ شخص نجات پاتا ہے جو میری راہ میں اور میری رضا کی راہ میں جان کو بیچ دیتا ہے۔ اور جانفشانی کے ساتھ اپنی اس حالت کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ خدا کا ہے اور اپنے تمام وجود کو ایک ایسی چیز سمجھتا ہے جو طاعتِ خالق اور خدمتِ مخلوق کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور پھر حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوت سے متعلق ہیں ایسے ذوق اور شوق و حضورِ دل سے بجا لاتا ہے کہ گویا وہ اپنی فرمانبرداری کے آئینہ میں اپنے محبوبِ حقیقی کو دیکھ رہا ہے۔ اور ارادہ اس کا خدا تعالےٰ کے ارادہ سے ہمرنگ ہو جاتا ہے اور تمام لذت اس کی فرمانبرداری میں ٹھہر جاتی ہے اور تمام اعمال صالحہ نہ مشقت کی راہ سے بلکہ تلذّذ اور احظاظ کی کشش سے ظاہر ہونے لگتے۔ وہ نقد بہشت جو روحانی انسان کو ملتا ہے۔ اور وہ بہشت جو آئندہ ملے گا وہ درحقیقت اسی کی اظلال و آثار ہے جس کو دوسرے عالم میں قدرتِ خداوندی جسمانی طور پر متمثل کرکے دکھلائیگی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے:۔

وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۔ وَ سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا۔
اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا۔ عَيْنًا يَّشْرَبُ
بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا۔ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا
زَنْجَبِيْلًا۔ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا۔ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا۔ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ
فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔

یعنی جو شخص خدا تعالیٰ سے خائف ہے اور اُس کی عظمت و جلال کے مرتبہ سے ہراساں ہے اس کے لئے دو بہشت ہیں۔ ایک یہی دنیا اور دوسری آخرت۔ اور ایسے لوگ جو خدا میں محو ہیں خدا نے انکو وہ شربت پلایا ہے جس نے اُن کے دل اور خیالات اور ارادات کو پاک کر دیا۔ نیک بندے وہ شربت پی رہے ہیں جس کی ملونی کافور ہے۔ وہ اس چشمہ سے پیتے ہیں جس کو وہ آپ ہی چیرتے ہیں۔

اور مَیں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ کافور کا لفظ اس واسطے اس آیت میں اختیار

فرمایا گیا ہے کہ لغتِ عرب میں کَفر دبانے کو اور ڈھانکنے کو کہتے ہیں۔ سو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے ایسے خلوص سے انقطاع اور رجوع الی اللہ کا پیالہ پیا ہے کہ دنیا کی محبت بالکل ٹھنڈی ہوگئی ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ تمام جذباتِ دل کے خیالات سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب دل نالائق خیالات سے بہت ہی دُور چلا جائے اور کچھ تعلقات ان سے باقی نہ رہیں تو وہ جذبات بھی آہستہ آہستہ کم ہونے لگتے ہیں یہانتک کہ نابود ہو جاتے ہیں۔ سو اسجگہ خدا تعالیٰ کی یہی غرض ہے اور وہ اس آیت میں یہی سمجھاتا ہے کہ جو اس کی طرف کامل طور سے جُھک گئے وہ نفسانی جذبات سے بہت ہی دُور نکل گئے اور ایسے خدا کی طرف جُھک گئے کہ دنیا کی سرگرمیوں سے اُن کے دل ٹھنڈے ہو گئے اور اُنکے جذبات ایسے دب گئے جیسا کہ کافور زہریلے مادوں کو دبا دیتا ہے۔

اور پھر فرمایا کہ وہ لوگ اس کافوری پیالے کے بعد وہ پیالے پیتے ہیں جنکی ملونی زنجبیل ہے۔ اب جاننا چاہیئے کہ زنجبیل دو لفظ سے مرکب ہے یعنی زنَا اور جبَل سے زَنَا لغتِ عرب میں اوپر چڑھنے کو کہتے ہیں اور جبل پہاڑ کو۔ اس کے ترکیبی معنے یہ ہیں کہ پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اب جاننا چاہیئے کہ انسان پر ایک زہریلی بیماری کے فرو ہونے کے بعد اعلیٰ درجہ کی صحت تک دو حالتیں آتی ہیں۔ ایک وہ حالت جبکہ زہریلے مواد کا جوش بکلّی جاتا رہتا ہے اور خطرناک مادوں کا جوش رُو باصلاح ہو جاتا ہے اور سمّی کیفیات کا حملہ بخیر و عافیت گذر جاتا ہے اور ایک مہلک طوفان جو اُٹھا تھا نیچے دب جاتا ہے لیکن ہنوز اعضاء میں کمزوری باقی ہوتی ہے۔ کوئی طاقت کا کام نہیں ہو سکتا۔ ابھی مُردوں کی طرح افتاں وخیزاں چلتا ہے اور دوسری وہ حالت ہے کہ جب اصل صحت عود کر آتی ہے اور بدن میں طاقت بھر جاتی ہے اور قوت کے بحال ہونے سے یہ حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بلا تکلّف پہاڑ کے اوپر چڑھ جائے اور نشاطِ خاطر سے اونچی گھاٹیوں پر دوڑتا چلا جائے۔ سو سلوک کے تیسرے مرتبہ میں یہ طاقت میسّر آتی ہے ایسی حالت کی نسبت اللہ تعالیٰ آیت موصوفہ میں اشارہ فرماتا ہے کہ انتہائی درجہ کے باخدا لوگ وہ پیالے پیتے ہیں جن میں زنجبیل ملی ہوئی ہے۔ یعنی وہ رُوحانی حالت کی پوری قوت پاکر بڑی بڑی گھاٹیوں پر چڑھ جاتے ہیں اور بڑے مشکل کام اُن کے ہاتھ سے انجام پذیر ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی راہ میں حیرت ناک جانفشانیاں دکھلاتے ہیں۔

اسجگہ یہ بھی واضح رہے کہ علم طبّ کی رُو سے زنجبیل وہ دوا ہے جس کو ہندی میں سونٹھ

کہتے ہیں۔ وہ حرارتِ غریزی کو بہت قوت دیتی ہے۔ دستوں کو بند کرتی ہے۔ اور اس کا زنجبیل اسی واسطے نام رکھا گیا ہے کہ گویا وہ کمزور کو ایسا قوی کرتی ہے اور ایسی گرمی پہنچاتی ہے جس سے وہ پہاڑوں پر چڑھ سکے۔ ان متقابل آیتوں کے پیش کرنے سے جن میں ایک جگہ کافور کا ذکر ہے اور ایک جگہ زنجبیل کا خدائے تعالیٰ کی یہ غرض ہے کہ تا اپنے بندوں کو سمجھائے کہ جب انسان جذبات نفسانی سے نیکی کی طرف حرکت کرتا ہے تو پہلے پہل اس حرکت کے بعد یہ حالت پیدا ہوتی ہے کہ اُس کے زہریلے مواد نیچے دبائے جاتے ہیں اور نفسانی جذبات رُو بکمی ہونے لگتے ہیں۔ جیسا کہ کافور زہریلے مواد کو دبا لیتا ہے۔ اسی لئے وہ ہیضہ اور محرقہ تپوں میں مفید ہے۔ اور پھر جب زہریلے مواد کا جوش بالکل جاتا رہے اور ایک کمزور صحت جو ضعف کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے حاصل ہو جائے تو پھر دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف بیمار زنجبیل کے شربت سے قوت پاتا ہے۔ اور زنجبیلی شربت خدا تعالیٰ کے حسن و جمال کی تجلّی ہے جو رُوح کی غذا ہے۔ جب اس تجلّی سے انسان قوت پکڑتا ہے تو پھر بلند اور اونچی گھاٹیوں پر چڑھنے کے لائق ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں ایسی حیرت ناک سختی کے کام دکھلاتا ہے کہ جب تک یہ عاشقانہ گرمی کسی کے دل میں نہ ہو ہرگز ایسے کام دکھلا نہیں سکتا سو خدا تعالیٰ نے اسجگہ ان دونوں حالتوں کے سمجھانے کے لئے عربی زبان کے دو لفظوں سے کام لیا ہے ایک کافور ہے جو نیچے دبانے والے کو کہتے ہیں اور دوسرے زنجبیل ہے جو اوپر چڑھنے والے کو کہتے ہیں۔ اور اس راہ میں بھی دو حالتیں سالکوں کے لئے واقع ہیں۔

باقی حصہ آیت کا یہ ہے۔ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاْ وَاَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا یعنی ہم نے منکروں کے لئے جو سچائی کو قبول کرنا نہیں چاہتے زنجیریں تیار کر دی ہیں اور طوقِ گردن اور ایک افروختہ آگ کی سوزش۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ سچّے دل سے خدائے تعالیٰ کو نہیں ڈھونڈتے اُن پر خدا کی طرف سے رجعت پڑتی ہے۔ وہ دنیا کی گرفتاریوں میں ایسے مبتلا رہتے ہیں کہ گویا پابہ زنجیر ہیں اور زمینی کاموں میں ایسے نگونسار ہوتے ہیں کہ گویا اُن کی گردن میں ایک طوق ہے جو انکو آسمان کی طرف سر نہیں اُٹھانے دیتا اور اُن کے دلوں میں حرص و ہوا کی ایک سوزش لگی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ مال حاصل ہو جائے اور یہ جائیداد مل جائے اور فلاں ملک ہمارے قبضہ میں آ جائے۔ اور فلاں دشمن پر ہم فتح پائیں۔ اسقدر روپیہ ہو۔ اتنی دولت ہو۔ سو چونکہ خدا تعالیٰ اُن کو

نالائق دیکھتا ہے اور بُرے کاموں میں مشغول پاتا ہے اس لئے یہ تینوں بلائیں ان کو لگا دیتا ہے۔ اور اس جگہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب انسان سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے تو اُس کے مطابق خدا تعالیٰ بھی اپنی طرف سے ایک فعل صادر کرتا ہے۔ مثلاً انسان جس وقت اپنی کوٹھڑی کے تمام دروازوں کو بند کر دے تو انسان کے اِس فعل کے بعد خدا تعالیٰ کا یہ فعل ہوگا کہ وہ اس کوٹھڑی میں اندھیرا پیدا کر دے گا کیونکہ جو امور خدائے تعالیٰ کے قانونِ قدرت میں ہمارے کاموں کے لئے بطور ایک نتیجہ لازمی کے مقرر ہو چکے ہیں وہ سب خدا تعالیٰ کے فعل ہیں۔ وجہ یہ کہ وہی علّت العلل ہے۔ ایسا ہی اگر مثلاً کوئی شخص زہر قاتل کھا لے۔ تو اُس کے اِس فعل کے بعد خدا تعالیٰ کا یہ فعل صادر ہوگا کہ اُسے ہلاک کر دیگا۔ ایسا ہی اگر کوئی ایسا بے جا فعل کرے جو کسی متعدی بیماری کا موجب ہو تو اس کے اس فعل کے بعد خدائے تعالیٰ کا یہ فعل ہوگا کہ وہ متعدی بیماری اس کو پکڑ لے گی۔ پس جس طرح ہماری دنیوی زندگی میں صریح نظر آتا ہے کہ ہمارے ہر ایک فعل کے لئے ایک ضروری نتیجہ ہے اور وہ نتیجہ خدا تعالیٰ کا فعل ہے۔ ایسا دین کے متعلق بھی یہی قانون ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ ان دو مثالوں میں صاف فرماتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ۔ یعنی جو لوگ اس فعل کو بجا لائے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی جستجو میں پوری پوری کوشش کی تو اس فعل کے لئے لازمی طور پر ہمارا یہ فعل ہوگا کہ ہم ان کو اپنی راہ دکھا دیں گے۔ اور جن لوگوں نے کجی اختیار کی اور سیدھی راہ پر چلنا نہ چاہا تو ہمارا فعل ان کی نسبت یہ ہوگا کہ ہم اُن کے دلوں کو کج کر دینگے اور پھر اس حالت کو زیادہ توضیح دینے کے لئے فرمایا۔ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا۔ یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا رہا وہ آنے والے جہان میں اندھا ہی ہوگا بلکہ اندھوں سے بدتر۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نیک بندوں کو خدا کا دیدار اسی جہان میں ہو جاتا ہے اور وہ اسی جگ میں اپنے اس پیارے کا درشن پا لیتے ہیں جس کے لئے وہ سب کچھ کھوتے ہیں۔ غرض مفہوم اس آیت کا یہی ہے کہ بہشتی زندگی کی بنیاد اسی جہان سے پڑتی ہے اور جہنمی نابینائی کی جڑھ بھی اسی جہان کی گندی اور کورانہ زیست ہے۔ اور پھر فرمایا۔ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ۔ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل

بجا لاتے ہیں وہ اُن باغوں کے وارث ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ اس آیت میں خدائے تعالیٰ نے ایمان کو باغ کے ساتھ مشابہت دی جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

پس واضح رہے کہ اسجگہ ایک اعلیٰ درجہ کی فلاسفی کے رنگ میں بتایا گیا ہے کہ جو رشتہ نہروں کا باغ کے ساتھ ہے وہی رشتہ اعمال کا ایمان کے ساتھ ہے۔ پس جیسا کہ کوئی باغ بغیر پانی کے سرسبز نہیں رہ سکتا ایسا ہی کوئی ایمان بغیر نیک کاموں کے زندہ ایمان نہیں کہلا سکتا۔ اگر ایمان ہو اور اعمال نہ ہوں وہ ایمان ہیچ ہے۔ اور اگر اعمال ہوں اور ایمان نہ ہو تو وہ اعمال ریاکاری ہیں۔ اسلامی بہشت کی یہی حقیقت ہے کہ وہ اِس دنیا کے ایمان اور عمل کا ایک ظلّ ہے وہ کوئی نُئی چیز نہیں جو باہر سے آکر انسان کو ملیگی بلکہ انسان کی بہشت انسان کے اندر ہی سے نکلتی ہے اور ہر ایک کی بہشت اُسی کا ایمان اور اُسی کے اعمال صالحہ ہیں جن کی اِسی دُنیا میں لذّت شروع ہو جاتی ہے اور پوشیدہ طور پر ایمان اور اعمال کے باغ نظر آتے ہیں اور نہریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن عالم آخرت میں یہی باغ کھلے طور پر محسوس ہوں گے۔ خدا تعالیٰ کی پاک تعلیم ہمیں یہی بتلاتی ہے کہ سچا اور پاک اور مستحکم اور کامل ایمان جو خدا اور اس کی صفات اور اس کے ارادوں کے متعلق ہو وہ بہشت خوش نما اور بار آور درخت ہے اور اعمال صالحہ اس بہشت کی نہریں ہیں۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے:۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ
فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ ۔

یعنی وہ ایمانی کلمہ جو ہر ایک افراط تفریط اور نقص اور خلل اور کذب اور ہزل سے پاک اور من کل الوجوہ کامل ہو اس درخت کے مشابہ ہے جو ہر ایک عیب سے پاک ہو جس کی جڑ زمین میں قائم اور شاخیں آسمان میں ہوں اور اپنے پھل کو ہمیشہ دیتا ہو۔ اور کوئی وقت اس پر نہیں آتا کہ اس کی شاخوں میں پھل نہ ہوں۔ اس بیان میں خدا تعالیٰ نے ایمانی کلمہ کو ہمیشہ پھلدار درخت سے مشابہت دیکر تین علامتیں اس کی بیان فرمائیں۔

(۱) اوّل یہ کہ جڑ اس کی جو اصل مفہوم مُراد ہے انسان کے دل کی زمین میں ثابت ہو۔ یعنی انسانی فطرت اور انسانی کانشنس نے اس کی حقانیت اور اصلیت کو قبول کر لیا ہو۔

(۲) دوسری علامت یہ ہے کہ اس کلمہ کی شاخیں آسمان میں ہوں۔ یعنی معقولیت اپنے ساتھ رکھتا ہو اور آسمانی قانونِ قدرت جو خدا کا فعل ہے اس کے مطابق ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اُسکی صحت اور اصلیت کے دلائل قانونِ قدرت سے مستنبط ہو سکتے ہیں اور نیز یہ کہ وہ دلائل ایسے

اعلیٰ ہوں کہ گویا آسمان میں ہیں جن تک اعتراض کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔

(۳) تیسری علامت یہ ہے کہ وہ پھل جو کھانے کے لائق ہے دائمی اور غیر منقطع ہو۔ یعنی عملی مزاولت کے بعد اُس کی برکات اور تاثیرات ہمیشہ اور ہر زمانہ میں مشہود و محسوس ہوتی ہوں یہ نہیں کہ کسی خاص زمانہ تک ظاہر ہو کر پھر آگے بند ہو جائیں۔

اور پھر فرمایا۔ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اِجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ۔ یعنی پلید کلمہ اس درخت کے ساتھ مشابہ ہے جو زمین میں سے اُکھڑا ہُوا ہو۔ یعنی فطرت انسانی اس کو قبول نہیں کرتی اور کسی طور سے وہ قرار نہیں پکڑتا۔ نہ دلائل عقلیہ کے رو سے نہ کچھ قانون قدرت کی رُو سے اور نہ کانشنس کی رُو سے صرف قصہ اور کہانی کے رنگ میں ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ قرآن شریف نے عالم آخرت میں ایمان کے پاک درختوں کو انگور اور انار اور عمدہ عمدہ میووں سے مشابہت دی ہے اور بیان فرمایا ہے کہ اس روز وہ ان میووں کی صورت میں متمثل ہوں گے اور دکھائی دینگے ایسا ہی بے ایمانی کے خبیث درخت کا نام عالم آخرت میں زقّوم رکھا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے:۔

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ۔
اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ۔
اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ
كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ...... ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ۔

یعنی تم بتلاؤ کہ بہشت کے باغ اچھے ہیں یا زقوم کا درخت جو ظالموں کے لئے ایک بَلا ہے۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی جڑ میں سے نکلتا ہے یعنی تکبّر اور خود بینی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی دوزخ کی جڑ ہے۔ اس کا شگوفہ ایسا ہے جیسا کہ شیطان کا سر۔ شیطان کے معنے ہیں ہلاک ہونے والا۔ یہ لفظ شَیْط سے نکلا ہے۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ اس کا کھانا ہلاک ہونا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ زقوم کا درخت اُن دوزخیوں کا کھانا ہے جو عمدًا گناہ کو اختیار کرلیتے ہیں۔ وہ کھانا ایسا ہے جیسا کہ تانبا گلا ہُوا کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیٹ میں جوش مارنے والا۔ پھر دوزخی کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ اس درخت کو چکھ تو عزت والا اور بزرگ ہے یہ کلمہ نہایت غضب کا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر تو تکبّر نہ کرتا اور اپنی بزرگی اور عزّت کا پاس کرکے حق سے مُنہ نہ پھیرتا تو آج یہ تلخیاں تجھے اٹھانی نہ پڑتیں۔ یہ آیت

اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ دراصل یہ لفظ زقّوم کا ذُقْ اور اَمْ سے مرکب ہے۔ ذُق اور اَمْ ۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ کا ملخّص ہے جس میں ایک حرف پہلے کا اور ایک حرف آخر کا موجود ہے۔ اور کثرتِ استعمال نے ذال کو زا کے ساتھ بدل دیا ہے۔

اب حاصل کلام یہ ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اِسی دنیا کے ایمانی کلمات کو بہشت کے ساتھ مشابہت دی ہے ایسا ہی اِسی دنیا کے بے ایمانی کے کلمات کو زقوم کے ساتھ مشابہت دی اور اس کو دوزخ کا درخت ٹھہرایا اور ظاہر فرما دیا کہ بہشت اور دوزخ کی جڑ اِسی دنیا سے شروع ہوتی ہے۔ جیسا کہ دوزخ کے باب میں ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ ۔ یعنی دوزخ وہ آگ ہے جو خدا کا غضب اس کا منبع ہے اور گناہ سے بھڑکتی ہے اور پہلے دل پر غالب ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس آگ کی اصل جڑ وہ غم اور حسرتیں اور درد ہیں جو دل کو پکڑتے ہیں کیونکہ تمام روحانی عذاب پہلے دل سے ہی شروع ہوتے ہیں اور پھر تمام بدن پر محیط ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ایک جگہ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ یعنی جہنم کی آگ کا ایندھن جس سے وہ آگ ہمیشہ افروختہ رہتی ہے دو چیزیں ہیں۔ ایکؔ وہ انسان جو حقیقی خدا کو چھوڑ کر اَور اَور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں یا اُن کی مرضی سے اُن کی پرستش کی جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ یعنی تم اور تمہارے معبود باطل جو انسان ہو کر خدا کہلاتے رہے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ (۲) دوسرا ایندھن جہنم کا بُت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اِن چیزوں کا وجود نہ ہوتا تو جہنّم بھی نہ ہوتا۔ سو ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ خدائے تعالیٰ کے پاک کلام میں بہشت اور دوزخ اس جسمانی دنیا کی طرح نہیں ہے بلکہ ان دونوں کا مبدء اور منبع روحانی امور ہیں۔ ہاں وہ چیزیں دوسرے عالم میں جسمانی شکل پر نظر آئیں گی مگر اس جسمانی عالم سے نہیں ہوں گی۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۷۷-۷۹)

جنّت میں داخل ہونے کے لئے جسم ضروری ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ جسم عنصری ہو بلکہ ایسا جسم چاہیئے جو عنصری نہ ہو کیونکہ جنت کے پھل وغیرہ بھی عنصری نہیں بلکہ وہ خلق جدید ہے اس لئے جسم بھی خلقِ جدید ہو گا جو پہلے جسم کے مغائر ہو گا۔ مگر مومنوں کے لئے مرنے کے بعد جسم کا ملنا ضروری ہے اور اِس پر نہ صرف جنّتی کا لفظ دلالت کرتا ہے بلکہ معراج کی رات میں

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کی صرف روحیں نہیں دیکھیں بلکہ سب کے جسم دیکھے او۔ اور حضرت عیسیٰ کا جسم اُن سے الگ طور کا نہ تھا۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صـ۲۱۳ حاشیہ)

ہم نے عیسائیوں کی یہ غلطی بھی ظاہر کردی ہے کہ ان کا یہ خیال کہ بہشت صرف ایک امر روحانی ہوگا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ انسان کی ایک ایسی فطرت ہے کہ اس کے رُوحانی قوٰی بوجہ اکمل و اتم صادر ہونے کے لئے ایک جسم کے محتاج ہیں۔ مثلاً ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ سر کے کسی حصّہ پر چوٹ لگنے سے قوت حافظہ جاتی رہتی ہے۔ اور کسی حصہ کے صدمہ سے قوت متفکّرہ رخصت ہوتی ہے اور منبت اعصاب میں خلل پیدا ہونے سے بہت سے روحانی قوٰی میں خلل پیدا ہو جاتا ہے پھر جبکہ رُوح کی یہ حالت ہے کہ وہ جسم کے ادنٰی خلل سے اپنے کمال سے فی الفور نقصان کی طرف عود کرتی ہے تو ہم کس طرح امید رکھیں کہ جسم کی پوری پوری جدائی سے وہ اپنی حالت پر قائم رہ سکیگی۔ اسی لئے اسلام میں یہ نہایت اعلیٰ درجے کی فلاسفی ہے کہ ہر ایک کو قبر میں ہی ایک ایسا جسم مِل جاتا ہے جو لذّت اور عذاب کے ادراک کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ ہم ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ وہ جسم کس مادہ سے تیار ہوتا ہے کیونکہ یہ فانی جسم تو کالعدم ہو جاتا ہے اور نہ کوئی مشاہدہ کرتا ہے کہ درحقیقت یہی جسم قبر میں زندہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بسا اوقات یہ جسم جلایا بھی جاتا ہے اور عجائب گھروں میں لاشیں بھی رکھی جاتی ہیں اور مدتوں تک قبر سے باہر بھی رکھا جاتا ہے۔ اگر یہی جسم زندہ ہو جایا کرتا تو البتہ لوگ اُس کو دیکھتے مگر بایں ہمہ قرآن سے زندہ ہو جانا ثابت ہے لہذا یہ ماننا پڑتا ہے کہ کسی اَور جسم کے ذریعہ سے جس کو ہم نہیں دیکھتے انسان کو زندہ کیا جاتا ہے۔ اور غالبًا وہ جسم اسی جسم کے لطائف جوہر سے بنتا ہے۔ تب جسم ملنے کے بعد انسانی قوٰی بحال ہوتے ہیں۔ اور یہ دوسرا جسم چونکہ اس جسم کی نسبت نہایت لطیف ہوتا ہے۔ اسی لئے اس پر مکاشفات کا دروازہ نہایت وسیع طور پر کھلتا ہے اور معاد کی تمام حقیقتیں جیسی کہ وہ ہیں کَمَا ھِیَ ہی نظر آجاتی ہیں تب خطا کرنے والوں کے علاوہ جسمانی عذاب کے ایک حسرت کا عذاب بھی ہوتا ہے۔ غرض یہ اصول متفق علیہ اسلام میں ہے کہ قبر کا عذاب یا آرام بھی جسم کے ذریعہ سے ہی ہوتا ہے۔ اور اسی بات کو دلائل عقلیہ بھی چاہتے ہیں کیونکہ متواتر تجربہ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انسان کے رُوحانی قوٰی بغیر جسم کے جوڑ کے ہرگز ظہور پذیر نہیں ہوتے۔

(کتاب البریہ صـ۷۰-۷۱)

عاقبت کی سزا اپنے اندر ایک فلسفانہ حقیقت رکھتی ہے جسکو کوئی مذہب بجز اسلام کے کامل طور پر بیان نہیں کر سکا - قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے - مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا - یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا ہے وہ اُس دوسرے جہان میں بھی اندھا ہوگا بلکہ اندھوں سے بھی بدتر - اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو دیکھنے کی آنکھیں اور اس کو دریافت کرنے کے حواس اسی جہان سے انسان اپنے ساتھ لے جاتا ہے - جو یہاں ان حواس کو نہیں پاتا وہاں وہ ان حواس سے بہرہ ور نہیں ہوگا - یہ ایک دقیق راز ہے جس کو عام لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے - اگر اس کے یہ معنے نہیں تو یہ تو پھر بالکل غلط ہے کہ اندھے اس جہان میں بھی اندھے ہونگے - اصل بات یہی ہے کہ خدا تعالےٰ کو بغیر کسی غلطی کے پہچاننا اور اسی دُنیا میں صحیح طور پر اس کی صفات اور اسماء کی معرفت حاصل کرنا آئندہ کی تمام راحتوں اور روشنیوں کی کلید ہے اور یہ آیت اس امر کی طرف صاف اشارہ کر رہی ہے کہ اسی دنیا سے ہم عذاب اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اس دنیا کی کورانہ زیست اور ناپاک افعال ہی اُس دوسرے عالم میں عذاب جہنم کی صورت میں نمودار ہو جائیں گے اور وہ کوئی نئی بات نہ ہونگے - جیسے ایک گھر کے دروازے بند کر لینے سے روشنی سے محروم ہو جاتا ہے اور تازہ اور زندگی بخش ہوا اُسے نہیں مل سکتی یا کسی زہر کے کھا لینے سے اس کی زندگی باقی نہیں رہ سکتی اسی طرح پر جب آدمی خدا کی طرف سے ہٹتا ہے اور گناہ کرتا ہے تو وہ ایک ظلمت کے نیچے آکر عذاب میں مبتلا ہوتا ہے -

گناہ اصل میں جُنَاحٌ تھا جس کے معنے میل کرنے اور اصل مرکز سے ہٹ جانے کے ہیں پس جب انسان خدا سے اعراض کرتا ہے اور اس کے نور کے مقابل سے ہٹ جاتا ہے (جو صرف خدا کی طرف سے اُترتا ہے اور دلوں پر نازل ہوتا ہے) تو وہ ایک تاریکی میں مبتلا ہوتا ہے جو اس کے لئے عذاب کا موجب ہو جاتی ہے - پھر جس قسم کا یہ اعتراض ہو اُسی قسم کا عذاب اُسے دُکھ دیتا ہے - لیکن اگر انسان پھر اسی مرکز کی طرف آنا چاہے اور اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچا دے جو ایسی روشنی کے پڑنے کا مقام ہے تو وہ پھر اس گمشدہ نور کو پا لیتا ہے - کیونکہ جیسے دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے کمرہ میں روشنی کو ایسے وقت پا سکتے ہیں جب اس کی کھڑکیاں کھول دیں - ویسے ہی روحانی نظام میں مرکز اصلی کی طرف بازگشت کرنا ہی راحت کا موجب ہو سکتا ہے اور اس دکھ درد سے بچاتا ہے جو اس مرکز کو چھوڑنے سے پیدا ہوا تھا - اس کا نام توبہ ہے - اور یہی ظلمت جو اس طرح پر پیدا ہوتی

ہے ضلالت جہنم کہلاتی ہے اور مرکز اصلی کی طرف رجوع کرنا جو راحت پیدا کرتا ہے جنت سے تعبیر ہوتا ہے۔ اور گناہ سے ہٹ کر پھر نیکی کی طرف آنا جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو جاوے اس بدی کا کفارہ ہو کر اُسے دُور کر دیتا ہے اور اس کے نتائج کو بھی سلب کر دیتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ یعنی نیکیاں بدیوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ چونکہ بدی میں ہلاکت کی زہر ہے اور نیکی میں زندگی کا تریاق اس لئے بدی کے زہر کو دُور کرنے کا ذریعہ نیکی ہی ہے۔ یا اس کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عذاب اور راحت کی نفی کا نام ہے اور نجات راحت اور خوشی ہی کے حصول کا نام ہے۔

اس طرح پر جیسے بیماری اس حالت کا نام ہے جب حالتِ بدن مجری طبیعت پر نہ رہے۔ اور صحت وہ حالت ہے کہ امورِ طبعیہ اپنی اصلی حالت پر قائم ہوں اور جیسے کسی ہاتھ پاؤں یا کسی عضو کے اپنے مقامِ خاص سے ذرا اِدھر اُدھر کھسک جانے سے درد شروع ہو جاتا ہے اور اگر چندے اس حالت پر قائم رہے تو پھر نہ خود بالکل بے کار ہو جاتا ہے بلکہ دوسرے اعضاء پر بھی اپنا بُرا اثر ڈالنے لگتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت روحانی ہے کہ جب انسان اللہ کے سامنے سے جو اس کی زندگی کا اصل موجب سرمایۂ حیات ہے ہٹ جاتا ہے اور فطرت کے دین کو چھوڑ بیٹھتا ہے تو عذاب شروع ہو جاتا ہے۔ اور اگر قلب مردہ نہ ہو گیا ہو۔ اور اس میں احساس کا مادہ باقی ہو تو وہ اُس عذاب کو خوب محسوس کرتا ہے۔ اور اگر اس بگڑی ہوئی حالت کی اصلاح نہ کی جاوے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ پھر ساری روحانی قوتیں رفتہ رفتہ نکمی اور بیکار ہو جائیں اور ایک شدید عذاب شروع ہو جاوے۔ پس اب کیسی صفائی کے ساتھ یہ امر سمجھ میں آجاتا ہے کہ کوئی عذاب باہر سے نہیں آتا بلکہ خود انسان کے اندر ہی سے نکلتا ہے۔ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ عذاب خدا کا فعل ہے۔ بیشک اس کا فعل ہے مگر اسی طرح جیسے کوئی زہر کھائے تو خدا اُسے ہلاک کر دے پس خدا کا فعل انسان کے اپنے فعل کے بعد ہوتا ہے۔ اسی کی طرف اللہ جل شانہٗ اشارہ فرماتا ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ۔ یعنی خدا کا عذاب وہ آگ ہے۔ جس کو خدا بھڑکاتا ہے۔ اور اس کا شعلہ انسان کے دل سے ہی اٹھتا ہے۔ اس کا مطلب صاف لفظوں میں یہی ہے کہ عذاب کا اصل بیج اپنے وجود ہی کی ناپاکی ہے جو عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اسی طرح بہشت کی راحت کا اصل سرچشمہ بھی انسان کے اپنے ہی افعال ہیں۔ اگر وہ

فطرتی دین کو نہیں چھوڑتا ۔ اگر وہ مرکزِ اعتدال سے ادھر اُدھر نہیں ہٹتا اور عبودیت الوہیت کے محاذ میں پڑی ہوئی اُس کے انوار سے حصّہ لے رہی ہے تو پھر یہ اس عضوِ صحیح کی طرح ہے جو مقام سے ہٹ نہیں گیا اور برابر اس کام کو دے رہا ہے جس کے لئے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے اور اسے کچھ بھی درد نہیں بلکہ راحت ہے ۔

قرآن شریف میں فرماتا ہے ۔ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۔ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں اُنکو خوشخبری دے دو کہ وہ اُن باغوں کے وارث ہیں جن کے نیچے ندیاں بہ رہی ہیں ۔ اس آیت میں ایمان کو اللہ تعالیٰ نے باغ سے مثال دی ہے اور اعمال صالحہ کو نہروں سے ۔ جو رشتہ اور تعلّق اعمال صالحہ کو ایمان سے ہے ۔ پس جیسے کوئی باغ ممکن ہی نہیں کہ پانی کے بدوں سرسبز اور ثمردار ہو سکے اسی طرح پر کوئی ایمان جس کے ساتھ اعمال صالحہ نہ ہوں مفید اور کارگر نہیں ہو سکتا پس بہشت کیا ہے وہ ایمان اور اعمال ہی کے مجسّم نظارے ہیں وہ بھی دوزخ کی طرح کوئی خارجی چیز نہیں ہے بلکہ انسان کا بہشت بھی اس کے اندر ہی سے نکلتا ہے ۔

یاد رکھو اُسجگہ پر جو راحتیں ملتی ہیں وہ وہی پاک نفس ہوتا ہے جو دنیا میں بنایا جاتا ہے پاک ایمان پودا سے مماثلت رکھتا ہے اور اچھے اچھے اعمال اخلاقِ فاضلہ یہ اُس پودا کی آبپاشی کے لئے بطور نہروں کے ہیں جو اس کی سرسبزی اور شادابی کو بحال رکھتے ہیں ۔ اس دنیا میں تو یہ ایسے ہیں جیسے خواب میں دیکھے جاتے ہیں مگر اس عالم میں محسوس اور مشاہدہ ہونگے ۔ یہی وجہ ہے کہ لکھا ہے کہ جب بہشتی اِن انعامات سے بہرہ ور ہونگے تو کہیں گے هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ دنیا میں جو دودھ یا شہد یا انگور انار وغیرہ چیزیں ہم کھاتے پیتے ہیں وہی وہاں ملیں گی ۔ نہیں ! وہ چیزیں اپنی نوعیت اور حالت کے لحاظ سے بالکل اور کی اور ہوں گی ۔ ہاں صرف نام کا اشتراک پایا جاتا ہے اور اگرچہ ان تمام نعمتوں کا نقشہ جسمانی طور پر دکھایا گیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ وہ چیزیں رُوح کو روشن کرتی ہیں اور خدا کی معرفت پیدا کرنے والی ہیں ان کا سرچشمہ رُوح اور راستی ہے ۔ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ سے یہ مراد نہیں کہ وہ دنیا کی جسمانی نعمتیں ہیں ۔ بالکل غلط ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا منشاء اس آیت میں یہ ہے کہ جن مومنوں نے اعمال صالحہ کئے انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک بہشت بنایا جس کا پھل وہ اُس دوسری زندگی میں بھی کھائیں گے ۔ اور وہ پھل

چونکہ روحانی طور پر بھی دنیا میں کھا چکے ہونگے۔ اس لئے اُس عالم میں اس کو پہچان لیں گے اور کہیں گے یہ تو وہی پھل معلوم ہوتے ہیں اور یہ وہی روحانی ترقیاں معلوم ہوتی ہیں جو دنیا میں کی ہوتی ہیں اس لئے وہ عابد و عارف اُن کو پہچان لیں گے۔

مَیں صاف کر کے کہنا چاہتا ہوں کہ جہنم اور بہشت میں ایک فلسفہ ہے جس کا ربط باہم اسی طرح پر قائم ہوتا ہے جو مَیں نے ابھی بتایا ہے مگر اس بات کو کبھی بھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ دنیا کی سزائیں تنبیہ اور عبرت کے لئے انتظامی رنگ کی حیثیت سے ہیں۔ سیاست اور رحمت دونوں باہم ایک رشتہ رکھتی ہیں اور اسی رشتہ کے اظلال یہ سزائیں اور جزائیں ہیں۔ انسانی افعال اور اعمال اسی طرح محفوظ اور بند ہوتے جاتے ہیں جیسے فونوگراف میں آواز بند کی جاتی ہے۔ جب تک انسان عارف نہ ہو اس سلسلہ پر غور کر کے کوئی لذّت اور فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

(ملفوظات جلد سوم صـ ۲۵-۳۰)

عذاب ایک سلبی چیز ہے۔ کیونکہ راحت کی نفی کا نام عذاب ہے۔ اور نجات ایک ایجابی چیز ہے یعنی راحت اور خوشحالی کے دوبارہ حاصل ہو جانے کا نام نجات ہے۔ پس جیسا کہ ظلمت عدم وجود روشنی کا نام ہے ایسا ہی عذاب عدم وجود خوشحالی کا نام ہے۔ مثلاً بیماری اس حالت کا نام ہے کہ جب حالتِ بدن مجری طبیعت پر نہ رہے اور صحت اس حالت کا نام ہے کہ جب امور طبعیہ اپنے اصلی حالات کی طرف عود کریں۔ موجب انسان کی روحانی حالت مجری طبیعی سے اِدھر اُدھر کھسک جائے اسی اختلال کا نام عذاب ہے اور جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی عضو مثلاً ہاتھ یا پَیر اپنے محل سے اُتر جائے تو اسی وقت درد شروع ہو جاتا ہے اور وہ عضو اپنی خدمات مفوضہ کو بجا نہیں لا سکتا۔ اور اگر اسی حالت پر چھوڑا جائے تو رفتہ رفتہ بے کار یا متعفّن ہو کر گر جاتا ہے اور بسا اوقات اُس کی ہمسائگی سے دوسرے اعضاء کے بگڑنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ اور یہ درد جو اس عضو میں پیدا ہوتا ہے یہ باہر سے نہیں آتا بلکہ فطرتاً اس کی اس خراب حالت کو لازم پڑا ہوا ہے۔ ایسا ہی عذاب کی حالت ہے کہ جب فطرتی دین سے انسان الگ ہو جائے اور حالت استقامت سے گر جائے تو عذاب شروع ہو جاتا ہے گو ایک جاہل جو غفلت کی بیہوشی میں پڑا ہوا ہے اس عذاب کا احساس نہ کرے اور ایسی حالت میں ایسا بگڑا ہوا نفس روحانی خدمات کے لائق نہیں رہتا۔ اور اگر اسی حالت میں ایک مدت تک رہے تو بالکل بے کار ہو جاتا ہے اور اس کی ہمسائگی دوسروں کو بھی معرض خطر

میں ڈالتی ہے اور وہ عذاب جو اس پر وارد ہوتا ہے باہر سے نہیں آتا بلکہ وہی حالت اُس کی اس عذاب کو پیدا کرتی ہے۔ بیشک عذاب خدا کا فعل ہے مگر اس طرح کا مثلاً جبکہ ایک انسان سمّ الفار کو وزن کافی تک کھالے تو خدا تعالیٰ اس کو مار دیتا ہے۔ یا مثلاً جب ایک انسان اپنی کوٹھڑی کے تمام دروازے بند کردے تو خدا تعالیٰ اس گھر میں اندھیرا پیدا کردیتا ہے یا اگر مثلاً ایک انسان اپنی زبان کو کاٹ ڈالے تو خدا تعالیٰ قوتِ گویائی اس سے چھین لیتا ہے۔ یہ سب خدا تعالیٰ کے فعل ہیں جو انسان کے فعل کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا ہی عذاب دینا خدا تعالیٰ کا فعل ہے جو انسان کے اپنے ہی فعل سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس میں جوش مارتا ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرماتا ہے۔ نار اللّٰہ الموقدۃ التی تطّلع علی الافئدۃ۔ یعنی خدا کا عذاب ایک عذاب ہے جس کو خدا بھڑکاتا ہے اور پہلا شعلہ اس کا انسان کے اپنے دل پر سے ہی اٹھتا ہے یعنی جڑ اُس کی انسان کا اپنا ہی دل ہے اور دل کے ناپاک خیالات اس جہنم کے ہیزم ہیں۔ پس جبکہ عذاب کا اصل تخم اپنے وجود ہی کی ناپاکی ہے جو عذاب کی صورت پر ہی متمثل ہوتی ہے تو اسے ماننا پڑتا ہے کہ وہ چیز جو اس عذاب کو دُور کرتی ہے وہ راستبازی اور پاکیزگی ہے۔

(کتاب البریہ ص ۸۱-۸۲)

انسان کی عملی اور اعتقادی غلطیاں ہی عذاب کی جڑھ ہیں۔ وہی درحقیقت خدا تعالیٰ کے غضب سے آگ کی صورت پر متمثل ہونگی۔ اور جس طرح پتھر پر سخت ضرب لگانے سے آگ نکلتی ہے۔ اسی طرح غضب الٰہی کی ضرب انہی بداعتقادیوں اور بدعملیوں سے آگ کے شعلے نکالیگی۔ اور وہی آگ بداعتقادوں اور بدکاروں کو کھا جائیگی۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کی بجلی کی آگ کے ساتھ خود انسان کی اندرونی آگ شامل ہوجاتی ہے تب دونوں مل کر اس کو بھسم کردیتی ہیں۔ اسی طرح غضب الٰہی کی آگ بداعتقادی اور بداعمالی کی آگ کے ساتھ ترکیب پاکر انسان کو جلا دیگی۔ اسی طرف اشارہ کرکے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے نار اللّٰہ الموقدۃ التی تطّلع علی الافئدۃ۔ یعنی جہنم کیا چیز ہے۔ وہ خدا کے غضب کی آگ ہے جو دلوں پر بھڑکے گی یعنی وہ دل جو بداعمالی اور بداعتقادی کی آگ اپنے اندر رکھتے ہیں وہ غضب الٰہی کی آگ سے اپنے آگ کے شعلوں کو مشتعل کرینگے۔ تب یہ دونوں قسم کی آگ باہم ملکر ایسا ہی اُن کو بھسم کرے گی جیسا کہ صاعقہ گرنے سے انسان بھسم ہو جاتا ہے۔

(تبلیغ رسالت جلد چہارم ص ۵۵)

قولہ:۔ مرزا صاحب اپنا اعتقاد یاد کریں کہ انہوں نے مانا ہوا ہے کہ انسان بعد مرنے کے

نجات پاکر ایک مکان بہشت میں رہیگا۔ جہاں عمدہ باغ خدا نے لگایا ہؤا ہے اچھی اچھی عورتیں یا حوریں موجود ہیں۔ نہریں شراب وغیرہ کی جاری ہیں۔ غرض نجات کی حالت میں بھی دنیاوی سامان موجود ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں بلکہ واں وہ باتیں بھی موجود ہونگی جو یہاں ممنوع ہیں مثلاً شراب اور بہت سی عورتیں۔ مگر ایسا نہیں بلکہ نجات شدہ لوگ بڑے انند اور خود مختاری کی حالت میں رہیں گے۔

اقول :۔ .... بھلا جب حسب اصول آپ کے نجات یافتہ لوگ ایک مدت مقررہ کے بعد مکتی خانہ سے کان پکڑ کر باہر نکال دیئے جائیں گے اور اُن کے رونے اور چلانے پر کچھ رحم نہیں کیا جائیگا بلکہ بڑی سختی سے خلاف مرضی اُن کے حکم اخراج عمل میں آئیگا اور بڑی ذلت و رسوائی سے بقول شخصے کہ (پا بدست دگرے دست بدست دگرے) مکتی خانہ سے باہر پھینکے جائیں گے تو کیا اس وقت اُن کے لیے وہ مرگ زگ کا نمونہ بلکہ اس سے بدتر نہیں ہو جائیگا؟ تو پھر اس مجبورانہ مصیبت کے وقت خود مختاری کہاں رہیگی۔ اور انند کیسا ہوگا! آپ کہتے ہیں کہ نجات شدہ لوگ بڑی خوشی اور انند میں رہیں گے۔ افسوس ہے آپ کی سمجھ پر کیا ایسے مقام میں بھی کوئی کامل خوشی میسّر آ سکتی ہے جس میں نکالے جانے اور پھر دوہری مرتبہ کروڑہا برسوں کی مصیبتوں کا دغدغہ درپیش ہے اور ہر دم یہی فکر جان کو کھا رہا ہے کہ اب تھوڑے عرصہ کے بعد بے شمار ذلّتوں اور رسوائیوں کا منہ دیکھنا ہوگا۔ پھر کیڑے مکوڑے کتّے بلّے بننا ہوگا۔ .... آپ کے مکتی خانہ سے خدا کی پناہ۔ اگر ایسا ہی پرمیشر اور ایسا ہی اس کا مکتی خانہ ہے تو پھر بدقسمت زاہدوں عابدوں کے لئے اسجگہ بھی رونا اور اُسجگہ بھی رونا ہی ہوگا۔

رہا آپ کا یہ اعتراض کہ مسلمانوں کی بہشت میں دنیوی نعمتیں بھی موجود ہونگی تو یہ کچھ اعتراض کی بات نہیں بلکہ اس سے تو آپ کو اور آپ کے پرمیشر کو بہت شرمندہ ہونا چاہیئے کیونکہ مسلمانوں کے خداوند قادر اور غنی مطلق نے تو دائمی اور جاودانی طور پر سب کچھ اپنے بے انتہا خزانوں سے عالم آخرت میں قرآن شریف پر ایمان لانے والوں کو عطا کیا اور روحانی اور جسمانی دونوں طور کی نعمتیں مرحمت فرمائیں کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے سچے پرستار اس دنیا میں صرف رُوح ہی سے اس کی بندگی اور اطاعت نہیں کرتے بلکہ رُوح اور جسم دونوں سے کرتے ہیں۔ اور خلقت انسانی کا کمال صرف روح ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ رُوح اور جسم دونوں کے امتزاج و اختلاط سے

پیدا ہوتا ہے۔ سو اس نے فرماں برداروں کو سعادت نامہ پہنچانے کے لئے اور اُن کو پورا پورا اجر دینے کے لئے نجاتِ جاودانی کی لذّت کو دو قسم پر مشتمل کیا۔ اپنے محبوبانہ دیدار کی لذتیں بھی دیں اور اپنی دوسری نعمتیں بھی بارش کی طرح ان پر برسائیں۔ غرض وہ کام کر دکھلایا جو اس قادر عظیم الشان کی قدرتوں اور عظمتوں اور بے انتہا رحمتوں کے لائق ہے۔ لیکن آپ کا پرمیشر تو مفلس اور دیوالیہ ہی نکلا اور اپنی عاجزی اور درویشی اور مفلسی اور ناطاقتی اور بے اختیاری کے باعث سے آپ لوگوں کو کسی ٹھکانہ نہ لگا سکا اور نہ کوئی مستقل خوشی پہنچا سکا۔ غرض کچھ بھی نہ کر سکا۔ نہ روحانی نعمتیں ہمیشہ کے لئے دے سکا نہ جسمانی اور دونوں طور سے آپ کو ناکام اور نامراد اور محروم اور بے نصیب رکھا۔ اور جس کے لئے مرتے تھے اور جاں نثاری کرتے تھے وہ ایسا نامنصف اور بے سمجھ اور مورکھ اور بے خبر نکلا کہ اُس نے تمہاری رُوحانی اور بدنی مشقتوں کا کچھ بھی قدر نہ کیا اور اپنی الٹی سمجھ سے عاشقانہ وفاداریوں اور جاں نثاریوں کو چند روزہ مزدوری خیال کر لیا۔ کیا ایسے بخیل اور ناطاقت اور بے سمجھ پرمیشر سے محبتیں بڑھ سکتی ہیں؟ اور صفائی کامل سے کوئی دل رجوع ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کی قدرت اور سخاوت اور قدرشناسی کی حقیقت کھلنے سے جپ تپ کرنے والوں کی روحیں بہت ہی افسوسناک اور نادم ہونگی کہ اگر یہی پرمیشر اور یہی اس کی مکتی تھی تو ہم نے خواہ مخواہ کی ٹکریں کیوں ماریں............

رہا یہ اعتراض کہ شراب جو دنیا میں بھی ممنوعات اور محرمات میں سے ہے وہ کیونکر بہشت میں روا ہو جائیگی۔ اس کا جواب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ فرمایا ہے کہ بہشتی شراب کو اس دنیا کی فساد انگیز شرابوں سے کچھ مناسبت نہیں۔ جیسے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا۔ یعنی جو لوگ بہشت میں داخل ہونگے اُن کا خدا اُن کو ایک ایسی شراب پلائے گا جو ان کو کامل طور پر پاک کر دے گی۔ نیک لوگ وہ جام پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہے۔ یعنی ان کے دل وہ شراب پی کر غیر کی محبت سے بکلی ٹھنڈے ہو جاویں گے۔ وہ کافوری شراب ایک چشمہ ہے جس کو اسی دنیا میں خدا کے بندے پینا شروع کرتے ہیں وہ اس چشمہ کو ایسا رواں کر دیتے ہیں کہ نہایت آسانی سے بہنے لگتا ہے اور وسیع اور فراخ نہریں ہو جاتی ہیں۔ یعنی ریاضت عشقیہ سے سب روکیں اُن کی دُور ہو جاتی ہیں اور نشیب و فراز بشریت کا صاف اور ہموار ہو جاتا ہے۔ اور جنابِ الٰہی کی طرف انقطاع کلّی میسّر آ کر

معارفِ الٰہیہ میں وسعت تامہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۔ وَلَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِيْمًا اِلَّا قِيْلًا سَلَامًا سَلَامًا ۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۔ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۔ اور شراب صافی کے پیالے جو آب زلال کی طرح مصفیٰ ہونگے بہشتیوں کو دیئے جائیں گے۔ وہ شراب ان سب عیبوں سے پاک ہوگی کہ دردسر پیدا کرے یا بیہوشی اور بدمستی اس سے طاری ہو۔ بہشت میں کوئی لغو اور بیہودہ بات سُننے میں نہیں آئیگی اور نہ کوئی گناہ کی بات سُنی جائیگی بلکہ ہر طرف سلام سلام جو رحمت اور محبت اور خوشی کی نشانی ہے سُننے میں آئیگا۔ اس دن مومنوں کے مُنہ تروتازہ اور خوبصورت ہونگے اور وہ اپنے رب کو دیکھیں گے۔ اور جو شخص اس جہان میں اندھا ہے وہ اس جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اندھوں سے بھی گیا گذرا۔ اب ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ وہ بہشتی شراب دنیا کی شرابوں سے کچھ مناسبت اور مشابہت نہیں رکھتی بلکہ وہ اپنی تمام صفات میں ان شرابوں سے مبائن اور مخالف ہے۔ اور کسی جگہ قرآن شریف میں یہ نہیں بتلایا گیا کہ وہ دنیوی شرابوں کی طرح انگور سے یا قند سیاہ اور کیکر کے چھلکوں سے یا ایسا ہی کسی اور دنیوی مادہ سے بنائی جائیگی۔ بلکہ بار بار کلام الٰہی میں یہی بیان ہوا ہے کہ اصل تخم اس شراب کا محبت اور معرفت الٰہی ہے جس کو دنیا سے ہی بندہ مومن ساتھ لے جاتا ہے۔ اور یہ بات کہ وہ روحانی امر کیونکر شراب کے طور پر نظر آجائے گا۔ یہ خدائے تعالیٰ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے جو عارفوں پر مکاشفات کے ذریعہ سے کُھلتا ہے اور عقلمند لوگ دوسری علامات و آثار سے اس کی حقیقت تک پہنچتے ہیں۔ روحانی امور کا جسمانی طور پر متمثل ہو جانا کئی مقامات قرآن شریف میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ یہ بھی لکھا ہے کہ تسبیح اور تقدیس الٰہی کی باتیں پھلدار درختوں کی طرح متمثل ہونگی اور نیک اعمال پاک اور صاف نہروں کی طرح دکھلائی دیں گے۔

(سرمہ چشم آریہ صہ ۱۰۲ - ۱۰۹)

قرآن شریف نے خدا تعالیٰ کے غضب کو اس طور سے بیان نہیں کیا جو وید بیان کرتا ہے۔ بلکہ وہ غضب ایک رُوحانی فلسفہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ سزا دہی کی کیفیت کے بارہ میں ایک جگہ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ یعنی دوزخ کیا چیز ہے؟ دوزخ وہ آگ ہے جو دلوں پر بھڑکائی جاتی ہے۔ یعنی انسان جب

فاسد خیال اپنے دل میں پیدا کرتا ہے اور وہ ایسا خیال ہوتا ہے کہ جس کمال کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ اس کے مخالف ہوتا ہے تو جیسا کہ ایک بھوکا یا پیاسا بوجہ نہ ملنے غذا اور پانی کے آخر مر جاتا ہے ایسا ہی وہ شخص بھی جو فساد میں مشغول رہا اور خدا تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کی غذا اور پانی کو نہ پایا وہ بھی مر جاتا ہے۔ پس بموجب تعلیم قرآن شریف کے بندہ ہلاکت کا سامان اپنے لئے آپ تیار کرتا ہے خدا اس پر کوئی جبر نہیں کرتا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی اپنے حجرہ کے تمام دروازے بند کردے اور روشنی داخل ہونے کے لئے کوئی کھڑکی کھلی نہ رکھے تو اس میں شک نہیں کہ اس حجرے کے اندر اندھیرا ہو جائے گا۔ سو کھڑکیوں کا بند کرنا تو اُس شخص کا فعل ہے مگر اندھیرا کر دینا یہ خدا تعالیٰ کا فعل اس کے قانون قدرت کے موافق ہے۔ پس اسی طرح جب کوئی شخص خرابی اور گناہ کا کام کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اپنے قانون قدرت کی رُو سے اس کے اس فعل کے بعد کوئی اپنا فعل ظاہر کر دیتا ہے جو اس کی سزا ہو جاتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ توبہ کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ مثلاً جب ایک شخص نے اپنے ایسے حجرہ کی کھڑکی کھول دی جسکو اس نے بند کر دیا تھا تو معاً خدا تعالیٰ اس گھر میں روشنی داخل کرے گا۔ پس قرآن شریف کی رو سے خدا کے غضب کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ انسان کی طرح اپنی حالت میں ایک مکروہ تغیّر پیدا کر کے خشمناک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسان تو غضب کے وقت میں ایک رنج میں پڑ جاتا ہے اور اپنی حالت میں ایک دُکھ محسوس کرتا ہے اور اس کا سرور جاتا رہتا ہے مگر خدا ہمیشہ سرور میں ہے اس کی ذات پر کوئی رنج نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے غضب کے یہ معنے ہیں کہ وہ چونکہ پاک اور قدوس ہے اس لئے نہیں چاہتا کہ لوگ اس کے بندے ہو کر ناپاکی کی راہیں اختیار کریں۔ اور تقاضا فرماتا ہے کہ ناپاکی کو درمیان سے اٹھا دیا جاوے۔ پس جو شخص ناپاکی پر اصرار کرتا ہے آخرکار وہ خدائے قدوس اپنے فیض کو جو مدارِ حیات اور راحت اور آرام ہے اُس سے منقطع کر لیتا ہے اور یہی حالت اس نافرمان کے لئے موجبِ عذاب ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک باغ ہے جو ایک نہر کے پانی سے سرسبز اور شاداب ہوتا تھا اور جب باغ والوں نے نہر کے مالک کی اطاعت چھوڑ دی تو مالکِ نہر نے اس باغ کو اپنے نہر کے پانی سے محروم کر دیا اور بند لگا دیا۔ تب باغ خشک ہو گیا۔

(چشمۂ معرفت ص۵۴-۵۵)

یہ بات نہایت نامعقول اور خدائے عزّ وجلّ کی صفاتِ کاملہ کے برخلاف ہے، کہ دوزخ

میں ڈالنے کے بعد ہمیشہ اس کی صفاتِ قہریہ ہی جلوہ گر ہوتی رہیں اور کبھی صفت رحم اور عفو کی جوش نہ مارے اور صفات کرم اور رحم ہمیشہ کے لئے معطل کی طرح رہیں بلکہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت دراز تک جس کو انسانی کمزوری کے مناسب حال استعارہ کے رنگ میں ابد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے دوزخی دوزخ میں رہینگے اور پھر صفت رحم اور کرم تجلی فرمائیگی اور خدا اپنا ہاتھ دوزخ میں ڈالے گا اور جس قدر خدا کی مٹھی میں آجائیں گے سب دوزخ سے نکالے جائینگے۔ پس اس حدیث میں بھی آخر کار سب کی نجات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ خدا کی مٹھی خدا کی طرح غیر محدود ہے جس سے کوئی بھی باہر نہیں رہ سکتا۔

(چشمہ مسیحی ص ۴۷-۴۸)

بہت سے مقامات ہیں جن کا لکھنا تطویل ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ارواح طیبین مطہرین کے بمجرد فوت ہونے کے بہشت میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی بہت سی احادیث سے یہی مطلب ثابت ہوتا ہے اور ارواح شہداء کا بہشت کے میوے کھانا یہ تو ایسی حدیثیں ہیں کہ کسی پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ اور خدا تعالیٰ بھی فرماتا ہے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ یعنی جو لوگ خدا تعالیٰ کی راہ میں مارے جاتے ہیں اُن کی نسبت یہ گمان مت کرو کہ وہ مُردہ ہیں۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ خدا تعالیٰ سے انکو رزق ملتا ہے۔ اور کتب سابقہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ پس جب کہ ارواح طیبین مطہرین کا بہشت میں داخل ہونا ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ بہشت وہ مقام ہے جس میں انواع اقسام کی جسمانی نعماء بھی ہونگی اور طرح طرح کے میوے ہونگے اور بہشت میں داخل ہونے کے یہی معنے ہیں کہ وہ نعمتیں کھاوے اس صورت میں صرف رُوح کا بہشت میں داخل ہونا بے معنی اور بے سود ہے۔ کیا وہ بہشت میں داخل ہو کر ایک محروم کی طرح بیٹھی رہے گی اور بہشت کی نعمتوں سے فائدہ نہیں اُٹھائیگی؟ پس آیت وادخلی جنّتی صاف تبلا رہی ہے کہ مومن کو مرنے کے بعد ایک جسم ملتا ہے۔ اسی وجہ سے تمام ائمۂ اکابر متصوفین اس بات کے قائل ہیں کہ مومن جو طیّب اور مطہر ہوتے ہیں وہ بمجرد فوت ہونے کے ایک پاک اور نورانی جسم پاتے ہیں جس کے ذریعہ سے وہ نعماء جنّت سے لذت اُٹھاتے ہیں۔ اور بہشت کو صرف شہیدوں کے لئے مخصوص کرنا ایک ظلم ہے بلکہ ایک کفر ہے۔ کیا کوئی سچا مومن یہ گستاخی کا کلمہ زبان پر لا سکتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تو ابھی تک بہشت سے باہر ہیں جن کے روضہ کے نیچے بہشت ہے مگر وہ لوگ جنہوں نے آپ کے ذریعہ سے

ایمان اور تقوٰی کا مرتبہ حاصل کیا وہ شہید ہونے کی وجہ سے بہشت میں داخل ہیں اور بہشتی میوے کھا رہے ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ جس نے خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان کو وقف کر دیا وہ شہید ہو چکا۔ پس اس صورت میں ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اوّل الشھداء ہیں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۲۱۴)

اسجگہ بظاہر یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ جب کہ ہر ایک مومن طیّب اور طاہر جنکی گردن پر کوئی بوجھ گناہ اور معاصی کا نہیں بلا توقف بہشت میں داخل ہو جاتے ہیں تو اس صورت میں حشر اجساد اور اس کے تمام لوازم متعلقہ سے انکار لازم آتا ہے۔ کیونکہ جبکہ بہشت میں داخل ہو چکے تو پھر بموجب آیت وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ان کا بہشت سے نکلنا ممتنع ہے۔ پس اس سے تمام کارخانہ حشر اجساد و واقعات معاد کا باطل ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا عقیدہ جو مومنین مطہرین بلا توقف بہشت میں داخل ہو جاتے ہیں یہ میری طرف سے نہیں بلکہ یہی عقیدہ ہے جس کی قرآن شریف نے تعلیم دی۔ اور دوسری تعلیم جو قرآن شریف میں ہے جو حشر اجساد ہوگا اور مردے زندہ ہونگے وہ بھی حق ہے اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں صرف فرق یہ ہے کہ یہ بہشت میں داخل ہونا صرف اجمالی رنگ میں ہے اور اس صورت میں جو مومنوں کو مرنے کے بعد بلا توقف اجسام دیئے جاتے ہیں وہ اجسام بھی ناقص ہیں۔ مگر حشر اجساد کا دن تجلّی اعظم کا دن ہے۔ اس دن کامل اجسام ملیں گے اور بہشتیوں کا تعلّق کسی حالت میں بہشت سے الگ نہیں ہوگا۔ من وجہٍ وہ بہشت میں ہونگے اور من وجہٍ خدا تعالےٰ کے سامنے آئیں گے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۲۱۳ حاشیہ)

جنت اور جہنم تین درجوں پر منقسم ہے۔

پہلا درجہ جو ایک ادنیٰ درجہ ہے اس وقت سے شروع ہوتا ہے کہ جب انسان اس عالم سے رخصت ہو کر اپنی خواب گاہ قبر میں جا لیٹتا ہے۔ اور اس درجۂ ضعیفہ کو استعارہ کے طور پر احادیث نبویہ میں کئی پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی پیرایہ ہے کہ میت عبد صالح کے لئے قبر میں جنت کی طرف ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے جس کی راہ سے وہ جنت کی باغ و بہار دیکھتا ہے اور اس کی دلربا ہوا سے متمتع ہوتا ہے۔ اور اس کھڑکی کی کشادگی بحسب مرتبہ ایمان و عمل اس میت کے ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ اس کے یہ بھی لکھا ہے

کہ جو ایسے فنا فی اللہ ہونے کی حالت میں دنیا سے جُدا ہوتے ہیں کہ اپنی جان عزیز کو محبوب حقیقی کی راہ میں فدا کر دیتے ہیں جیسے شہداء یا وہ صدیق لوگ جو شہداء سے بھی بڑھ کر آگے قدم رکھتے ہیں اُن کے لئے اُن کی موت کے بعد صرف بہشت کی طرف کھڑکی ہی نہیں کھولی جاتی بلکہ وہ اپنے سارے وجود اور تمام قویٰ کے ساتھ بہشت میں داخل ہو جاتے ہیں مگر پھر بھی قیامت کے دن سے پہلے اکمل اور اتم طور پر لذات جنت حاصل نہیں کر سکتے ۔

ایسا ہی اس درجہ میں میّت خبیث کے لئے دوزخ کی طرف قبر میں ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے جس کی راہ سے دوزخ کی ایک جلانے والی بھاپ آتی رہتی ہے اور اس کے شعلوں سے ہر وقت وہ خبیث رُوح جلتی رہتی ہے۔ لیکن ساتھ اس کے یہ بھی ہے کہ جو لوگ اپنی کثرت نافرمانی کی وجہ سے ایسے فنا فی الشیطان ہونے کی حالت میں دنیا سے جدا ہوتے ہیں کہ شیطان کی فرمانبرداری کی وجہ سے بکلّی تعلقات اپنے مولیٰ حقیقی سے توڑ دیتے ہیں اُن کے لئے اُن کی موت کے بعد صرف دوزخ کی طرف کھڑکی ہی نہیں کھولی جاتی بلکہ وہ اپنے سارے وجود اور تمام قویٰ کے ساتھ خاص دوزخ میں ڈال دیئے جاتے ہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۔ مگر پھر بھی وہ لوگ قیامت کے دن سے پہلے اکمل اور اتم طور پر عقوبات جہنم کا مزہ نہیں چکھتے ۔

دوسرا درجہ ۔ پھر اس درجہ سے اوپر جو ابھی ہم نے بہشتیوں اور دوزخیوں کے لئے بیان کیا ہے ایک اور درجہ دخول جنّت دخول جہنم ہے جس کو درمیانی درجہ کہنا چاہیئے اور حشر اجساد کے بعد اور جنّت عظمیٰ یا جہنم کبریٰ میں داخل ہونے سے پہلے حاصل ہوتا ہے اور بوجہ تعلّق جسد کامل قویٰ میں ایک اعلیٰ درجہ کی تیزی پیدا ہو کر اور خدا تعالیٰ کی تجلّی رحم یا تجلّی قہر کا حسب حالت اپنے کامل طور پر مشاہدہ ہو کر اور جنّت عظمیٰ کو بہت قریب پا کر یا جہنم کبریٰ کو بہت ہی قریب دیکھ کر وہ لذات یا عقوبات ترقی پذیر ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ آپ فرماتا ہے۔ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغَاوِيْنَ ۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۔ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۔ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۔ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۔ اس دوسرے درجہ میں بھی لوگ مساوی نہیں ہوتے بلکہ اعلیٰ درجہ کے بھی ہوتے ہیں جو بہشتی ہونے کی حالت میں بہشتی انوار اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ انہیں کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرماتا ہے۔ نورھم یسعٰی بین ایدیھم و بایمانھم ۔ ایسا ہی دوزخی ہونے کی حالت میں اعلیٰ درجہ کے کفار ہوتے ہیں کہ قبل اس کے جو کامل طور پر دوزخ میں

پڑیں اُن کے دلوں پر دوزخ کی آگ بھڑکائی جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ نار اللہ الموقدۃ التی تطّلع علی الافئدۃ۔

پھر اس درجہ کے اوپر جو آخری درجہ ہے تیسرا درجہ ہے جو منتہیٰ مدارج ہے۔ جس میں یوم حساب کے بعد لوگ داخل ہونگے۔ اور اکمل اور اتم طور پر سعادت یا شقاوت کا مزہ چکھیں گے۔

اب حاصل کلام یہ ہے کہ ان تینوں مدارج میں انسان ایک قسم کے بہشت یا ایک قسم کے دوزخ میں ہوتا ہے۔ اور جبکہ یہ حال ہے تو اس صورت میں صاف ظاہر ہے کہ ان مدارج میں سے کسی درجہ پر ہونے کی حالت میں انسان بہشت یا دوزخ سے نکالا نہیں جاتا۔ ہاں جب اس درجہ سے ترقی کرتا ہے تو ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ میں آجاتا ہے۔

اس ترقی کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ جب مثلاً ایک شخص ایمان اور عمل کی ادنیٰ حالت میں فوت ہوتا ہے تو تھوڑی سی سوراخ بہشت کی طرف اس کے لئے نکالی جاتی ہے کیونکہ بہشتی تجلّی کی اسی قدر اس میں استعداد موجود ہوتی ہے۔ پھر بعد اس کے اگر وہ اولاد صالح چھوڑ کر مرا ہے جو جد وجہد سے اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور صدقات وخیرات اس کی مغفرت کی نیت سے مساکین کو دیتے ہیں یا ایسے کسی اہل اللہ سے اس کی محبت تھی جو تضرعات سے جناب الٰہی سے اس کی بخشش چاہتا ہے یا کوئی ایسا خلق اللہ کے فائدہ کا کام وہ دنیا میں کر گیا ہے جس سے بندگانِ خدا کو کسی قسم کی مدد یا آرام پہنچتا ہے تو اس خیر جاری کی برکت سے وہ کھڑکی اس کی جو بہشت کی طرف کھولی گئی دن بدن اپنی کشادگی میں زیادہ ہوتی جاتی ہے اور سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ کا منشاء اور بھی اس کو زیادہ کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کھڑکی ایک بڑا وسیع دروازہ ہو کر آخر یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ شہیدوں اور صدیقوں کی طرح وہ بہشت میں ہی داخل ہو جاتا ہے۔ ....

یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالےٰ نے اس کھڑکی کے کھولنے کے لئے پہلے سے اس قدر سامان کر رکھے ہیں جن سے بتصریح معلوم ہوتا ہے کہ اس کریم کا دراصل منشاء ہی یہی ہے کہ اگر ایک ذرہ ایمان وعمل لے کر بھی اس کی طرف کوئی سفر کرے تو وہ ذرّہ بھی نشوونما کرتا رہے گا۔ اور اگر کسی اتفاق سے تمام سامان اس خیر کے جو میّت کو اس عالم کی طرف سے پہنچتی ہے ناپیدا رہیں تاہم یہ سامان کسی طرح ناپیدا اور گم نہیں ہو سکتا کہ جو تمام مومنوں اور نیک بختوں اور شہیدوں اور صدیقوں کے لئے تاکیدی طور پر یہ حکم فرمایا گیا کہ وہ اپنے ان بھائیوں کے لئے

بدل و جان دُعائے مغفرت کرتے رہیں جو اُن سے پہلے اس عالم میں گذر چکے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے لئے ایک لشکر مومنوں کا دعا کر رہا ہے وہ دعا ہرگز ہرگز خالی نہیں جائیگی بلکہ وہ ہر روز کام کر رہی ہے اور گنہگار ایمان دار جو فوت ہو چکے ہیں ان کی اس کھڑکی کو جو بہشت کی طرف تھی بڑے زور سے کھول رہی ہے۔ ان دعاؤں نے اب تک بے شمار کھڑکیوں کو اِس حد تک کشادہ کر دیا ہے کہ بے انتہا ایسے لوگ بہشت میں پہنچ چکے ہیں جن کو اوّل دنوں میں صرف ایک چھوٹی سی کھڑکی بہشت کے دیکھنے کے لئے عطا کی گئی تھی۔

اِس زمانہ کے ان تمام مسلمانوں کو جو موحّد کہلاتے ہیں یہ دھوکا بھی لگا ہوا ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد بہشت میں داخل ہونے والے صرف شہید لوگ ہیں۔ اور باقی تمام مومنین یہاں تک کہ انبیاء اور رسول بھی یوم الحساب تک بہشت سے باہر رکھے جائینگے صرف ایک کھڑکی ان کے لئے بہشت کی طرف سے کھولی جائیگی۔ مگر اب تک انہوں نے اِس بات کی طرف توجہ نہیں کی کہ کیا انبیاء اور تمام صدیق روحانی طور پر شہیدوں سے بڑھکر نہیں ہیں۔ اور کیا بہشت سے دُور رہنا ایک قسم کا عذاب نہیں جو مغفورین کے حق میں تجویز نہیں ہو سکتا۔ جس کے حق میں خدا تعالےٰ یہ کہے کہ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ کیا ایسا شخص سعادت اور فوز مرام میں شہیدوں کے پیچھے رہ سکتا ہے؟ افسوس کہ ان لوگوں نے اپنی نافہمی سے شریعتِ غرّا کو الٹا دیا ہے۔ اور اُن کے زعم میں سب سے پہلے بہشت میں داخل ہونے والے شہید ہیں۔ اور شائد کہیں بے شمار برسوں کے بعد نبیوں اور صدیقوں کی بھی نوبت آوے۔ اِس کسرِ شان کا الزام ان لوگوں پر بڑا بھاری ہے جو بودے عذروں سے دُور نہیں ہو سکتا۔ بیشک یہ بات سب کے فہم میں آسکتی ہے کہ جو لوگ ایمان اور عمل میں سابقین ہیں وہی لوگ دخول فی الجنّت میں بھی سابقین چاہئیں نہ یہ کہ ان کے لئے صرف ضعیف الایمان لوگوں کی طرح کھڑکی کھولی جائے۔ اور شہید لوگ دنیا سے رخصت ہوتے ہی ہر ایک پھل بہشت کا چُن چُن کر کھانے لگیں۔ اگر بہشت میں داخل ہونا کامل ایمان کامل اخلاص کامل جانفشانی پر موقوف ہے تو بلاشبہ نبیوں اور صدیقوں سے اَور کوئی بڑھ کر نہیں جن کی تمام زندگی خدا تعالےٰ کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ اور جو خدا تعالیٰ کی راہ میں ایسے فدا ہوتے ہیں کہ بس مر ہی رہتے ہیں اور تمنّا رکھتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کی راہ میں شہید کئے جائیں اور پھر زندہ ہوں اور پھر شہید کئے جائیں اور پھر زندہ ہوں اور پھر شہید کئے جائیں۔

اب ہماری اس تمام تقریر سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ بہشت میں داخل ہونے کے لئے ایسے زبردست اسباب موجود ہیں کہ قریبًا تمام مومنین یوم الحساب سے پہلے اس میں پورے طور پر داخل ہو جائیں گے اور یوم الحساب ان کو بہشت سے خارج نہیں کرے گا۔ بلکہ اس وقت اور بھی بہشت نزدیک ہو جائے گا۔ کھڑکی کی مثال سے سمجھ لینا چاہیئے کہ کیونکر بہشت قبر سے نزدیک کیا جاتا ہے۔ کیا قبر کے متصل جو زمین پڑی ہے اُس میں بہشت آجاتا ہے؟ نہیں بلکہ روحانی طور پر نزدیک کیا جاتا ہے۔ اسی طرح روحانی طور پر بہشتی لوگ میدانِ حساب میں بھی ہونگے اور بہشت میں بھی ہونگے۔ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری قبر کے نیچے روضۂ بہشت ہے۔ اسپر خوب غور کرد کہ یہ کس بات کی طرف اشارہ ہے؟

(ازالہ اوہام ص ۱۸۳-۱۸۷)

مقصدِ پیدائش

اگرچہ مختلف الطبائع انسان اپنی کوتاہ فہمی یا پست ہمتی سے مختلف طور کے مدّعا اپنی زندگی کے لئے ٹھہراتے ہیں اور فقط دنیا کے مقاصد اور آرزوؤں تک چل کر آگے ٹھہر جاتے ہیں مگر وہ مدّعا جو خدائے تعالیٰ اپنے پاک کلام میں بیان فرماتا ہے یہ ہے :- وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۝ یعنی مَیں نے جن اور انسان کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ مجھے پہچانیں اور میری پرستش کریں۔ پس اس آیت کی رُو سے اصل مدعا انسان کی زندگی کا خدا تعالیٰ کی پرستش اور خدا تعالیٰ کی معرفت اور خدا تعالیٰ کے لئے ہو جانا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان کو تو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے کہ اپنی زندگی کا مدعا اپنے اختیار سے آپ مقرر کرے۔ کیونکہ انسان نہ اپنی مرضی سے آتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے واپس جائیگا۔ بلکہ وہ ایک مخلوق ہے اور جس نے پیدا کیا اور تمام حیوانات کی نسبت عمدہ اور اعلیٰ قویٰ اس کو عنایت کئے اُسی نے اس کی زندگی کا ایک مدّعا ٹھہرا رکھا ہے خواہ کوئی انسان اس مدعا کو سمجھے یا نہ سمجھے مگر انسان کی پیدائش کا مدعا بلاشبہ خدا کی پرستش اور خدا تعالیٰ کی معرفت اور خدا تعالیٰ میں فانی ہو جانا ہی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صـــ۱۰۰)

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ یعنی ہم نے اپنی امانت کو جس سے مراد عشق اور محبت الٰہی اور موردِ ابتلاء ہو کر پھر پوری اطاعت کرنا ہے آسمان کے تمام فرشتوں اور زمین کی تمام مخلوقات اور پہاڑوں پر پیش کیا جو بظاہر قوی ہیکل چیزیں تھیں سو اُن سب چیزوں نے اس امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اُس کی عظمت کو دیکھ کر ڈر گئیں مگر انسان نے اس کو اُٹھا لیا۔ کیونکہ انسان میں یہ دو خوبیاں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے نفس پر ظلم کر سکتا تھا۔ دوسری یہ خوبی کہ وہ خدا تعالیٰ کی محبت میں اس درجہ تک پہنچ سکتا تھا جو غیر اللہ کو بکلی فراموش کر دے۔

(توضیح مرام صـــ۲۷-۲۸)

انسان کو جو کچھ اندرونی اور بیرونی اعضاء دیئے گئے ہیں یا جو کچھ قوتیں عنایت ہوئی ہیں اصل مقصود اُن سے خدا کی معرفت اور خدا کی پرستش اور خدا تعالیٰ کی محبت ہے۔ اسی وجہ سے انسان دنیا میں ہزاروں شغلوں کو اختیار کر کے پھر بھی بجز خدا تعالیٰ کے اپنی سچی خوشحالی کسی میں نہیں پاتا بڑا دولتمند ہو کر بڑا عہدہ پا کر بڑا تاجر بن کر بڑی بادشاہی تک پہنچکر بڑا فلاسفر کہلا کر آخر ان دنیوی گرفتاریوں سے بڑی حسرتوں کے ساتھ جاتا ہے۔ اور ہمیشہ دل اس کا دنیا کے استغراق سے اس کو ملزم کرتا رہتا ہے۔ اور اس کے مکروں اور فریبوں اور ناجائز کاموں میں کبھی اس کا کانشنس اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ ایک دانا انسان اس مسئلہ کو اس طرح بھی سمجھ سکتا ہے کہ جس چیز کے قویٰ ایک اعلیٰ سے اعلیٰ کام کر سکتے ہیں اور پھر آگے جا کر ٹھہر جاتے ہیں وہ اعلیٰ کام اس کی پیدائش کی علّتِ غائی سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً بیل کا کام اعلیٰ سے اعلیٰ قلبہ رانی یا آب پاشی یا باربرداری ہے اس سے زیادہ اس کی قوتوں میں کچھ ثابت نہیں ہوا۔ سو بیل کی زندگی کا مدعا یہی تین چیزیں ہیں اس سے زیادہ کوئی قوت اس میں پائی نہیں جاتی۔ مگر جب ہم انسان کی قوتوں کو ٹٹولتے ہیں کہ اُن میں اعلیٰ سے اعلیٰ کونسی قوت ہے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ خدائے اعلیٰ و برتر کی اُس میں تلاش پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ چاہتا ہے کہ خدا کی محبت میں ایسا گداز اور محو ہو کہ اُسکا اپنا کچھ بھی نہ رہے سب خدا کا ہو جائے۔ وہ کھانے اور سونے وغیرہ طبعی امور میں دوسرے حیوانات کو اپنا شریک غالب رکھتا ہے۔ صنعت کاری میں بعض حیوانات اس سے بہت بڑھے ہوئے ہیں بلکہ شہد کی مکھیاں بھی ہر ایک پھول کا عطر نکال کر ایسا شہد نفیس پیدا کرتی ہیں کہ اب تک اس صنعت میں انسان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ پس ظاہر ہے کہ انسان کا اعلیٰ کمال خدا تعالیٰ کا وصال ہے لہٰذا اس کی زندگی کا اصل مدعا یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف اس کے دل کی کھڑکی کھلے۔

ہاں اگر یہ سوال ہو کہ یہ مدّعا کیونکر اور کس طرح حاصل ہو سکتا ہے اور کن وسائل سے انسان اس کو پا سکتا ہے؟ پس واضح ہو کہ سب سے بڑا وسیلہ جو اس مدّعا کے پانے کیلئے شرط ہے وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو صحیح طور پر پہچانا جائے اور سچّے خدا پر ایمان لایا جائے۔ کیونکہ اگر پہلا قدم ہی غلط ہے اور کوئی شخص مثلاً پرند یا چرند یا عناصر یا انسان کے بچّہ کو خدا بنا بیٹھا ہے تو پھر دوسرے قدموں میں اُس کے راہ راست پر چلنے کی کیا امید ہے۔ سچا خدا اس کے ڈھونڈنے والوں کو مدد دیتا ہے۔ مگر مُردہ مُردے کو کیونکر مدد دے سکتا ہے۔ اِس میں اللہ جلّ شانہٗ نے خوب تمثیل فرمائی ہے اور وہ یہ ہے۔ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ

كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ یعنی دُعا کرنے کے لائق وہی سچّا خدا ہے جو ہر ایک بات پر قادر ہے۔ اور جو لوگ اس کے سوا اَوروں کو پکارتے ہیں وہ کچھ بھی انکو جواب نہیں دے سکتے۔ اُن کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کوئی پانی کی طرف ہاتھ پھیلا وے کہ اے پانی میرے مُنہ میں آجا۔ تو کیا وہ اس کے مُنہ آجائیگا؟ ہرگز نہیں سو جو لوگ سچّے خدا سے بے خبر ہیں اُن کی تمام دُعائیں باطل ہیں۔

دوسرا وسیلہ۔ خدائے تعالیٰ کے اُس حُسن و جمال پر اطلاع پانا ہے جو باعتبار کمالِ تام کے اُس میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ حُسن ایک ایسی چیز ہے جو بالطبع دل کی طرف کھنچا جاتا ہے اور اُس کے مشاہدہ سے طبعاً محبت پیدا ہوتی ہے۔ تو حُسن باری تعالیٰ اس کی وحدانیت اور اُس کی عظمت اور بزرگی اور صفات ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف نے فرمایا ہے۔ قل ھو اللّٰہ احد۔ اللّٰہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوًا احد۔ یعنی خدا اپنی ذات اور صفات اور جلال میں ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ سب اس کے حاجت مند ہیں۔ ذرہ ذرہ اس سے زندگی پاتا ہے۔ وہ کل چیزوں کیلئے مبدءِ فیض ہے اور آپ کسی سے فیضیاب نہیں۔ وہ نہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ کسی کا باپ۔ اور کیونکر ہو کہ اس کا کوئی ہم ذات نہیں۔ قرآن نے بار بار خدا کا کمال پیش کرکے اور اس کی عظمت دکھلا کے لوگوں کو توجہ دلائی ہے کہ دیکھو ایسا خدا دلوں کا مرغوب ہے نہ کہ مُردہ اور کمزور اور کم رحم اور قدرت۔

تیسرا وسیلہ جو مقصود حقیقی تک پہنچنے کے لئے دوسرے درجہ کا زینہ ہے خدا تعالیٰ کے احسان پر اطلاع پانا ہے۔ کیونکہ محبت کی محرک دو ہی چیزیں ہیں حُسن یا احسان۔ اور خدائے تعالیٰ کی احسانی صفات کا خلاصہ سورۃ فاتحہ میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ احسان کامل اس میں ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنے بندوں کو محض نابود سے پیدا کرے اور پھر ہمیشہ اُسکی ربوبیت ان کے شامل حال ہو۔ اور وہی ہر ایک چیز کا آپ سہارا ہو۔ اس کی تمام قسم کی رحمتیں اس کے بندوں کے لئے ظہور میں آئی ہوں۔ اور اس کا احسان بے انتہا ہو جس کا کوئی شمار نہ کر سکے۔ سو ایسے احسانوں کو خدا تعالےٰ نے بار بار جتلایا ہے۔ جیسا کہ ایک اور جگہ فرماتا ہے:۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ یعنی اگر خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو۔ تو ہرگز گن نہ سکو گے۔

چوتھا وسیلہ خدائے تعالیٰ نے اصل مقصود کو پانے کیلئے **دُعا** کو ٹھہرایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ یعنی تم دعا کرو میں قبول کرونگا۔ اور بار بار دعا کے لئے رغبت دلائی ہے تا انسان اپنی طاقت سے نہیں بلکہ خدا کی طاقت سے پاوے۔

پانچواں وسیلہ اصل مقصود کے پانے کے لئے خدائے تعالیٰ نے مجاہدہ ٹھہرایا ہے۔ یعنی اپنا مال خدائے تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی طاقتوں کو خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی جانوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی عقل کو خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اسکو ڈھونڈا جائے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ یعنی اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور اپنے نفسوں کو مع ان کی تمام طاقتوں کے خدا کی راہ میں خرچ کرو اور جو کچھ ہم نے عقل اور علم اور فہم اور ہنر وغیرہ تم کو دیا ہے وہ سب کچھ خدا کی راہ میں لگاؤ۔ جو لوگ ہماری راہ میں ہر ایک طور سے کوشش بجا لاتے ہیں ہم ان کو اپنی راہیں دکھا دیا کرتے ہیں۔

چھٹا وسیلہ اصل مقصود پانے کے لئے استقامت کو بیان فرمایا ہے۔ یعنی اس راہ میں درماندہ اور عاجز نہ ہو اور تھک نہ جائے اور امتحان سے ڈر نہ جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور باطل خداؤں سے الگ ہو گئے پھر استقامت اختیار کی یعنی طرح طرح کی آزمائشوں اور بلا کے وقت ثابت قدم رہے اُن پر فرشتے اُترتے ہیں کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو بلکہ خوش ہو اور خوشی میں بھر جاؤ کہ تم اس خوشی کے وارث ہو گئے جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ ہم اس دنیوی زندگی میں اور آخرت میں تمہارے دوست ہیں۔ اس جگہ ان کلمات سے یہ اشارہ فرمایا کہ اس استقامت سے خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ یہ سچ بات ہے کہ استقامت فوق الکرامت ہے۔ کمال استقامت یہ ہے کہ چاروں طرف بلاؤں کو محیط دیکھیں اور خدا کی راہ میں جان اور عزّت اور آبرو کو معرضِ خطر میں پاویں۔ اور کوئی تسلّی دینے والی بات موجود نہ ہو یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بھی امتحان کے طور پر تسلّی دینے والے کشف

یا خواب یا الہام کو بند کر دے اور ہولناک خوفوں میں چھوڑ دے اُس وقت نامردی نہ دکھلاویں۔ اور بُزدلوں کی طرح پیچھے نہ ہٹیں اور وفاداری کی صفت میں کوئی خلل پیدا نہ کریں۔ صدق اور ثبات میں کوئی رخنہ نہ ڈالیں۔ ذلّت پر خوش ہو جائیں۔ موت پر راضی ہو جائیں اور ثابت قدمی کیلئے کسی دوست کا انتظار نہ کریں کہ وہ سہارا دے۔ نہ اس وقت خدا کی بشارتوں کے طالب ہوں کہ وقت نازک ہے اور باوجود سراسر بے کس اور کمزور ہونے کے اور کسی تسلّی کے نہ پانے کے سیدھے کھڑے ہو جائیں اور ہرچہ بادا باد کہہ کر گردن کو آگے رکھدیں۔ اور قضاء و قدر کے آگے دم نہ ماریں اور ہرگز بے قراری اور جزع فزع نہ دکھلاویں۔ جب تک کہ آزمائش کا حق پورا ہو جائے۔ یہی استقامت ہے جس سے خدا ملتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی رسولوں اور نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کی خاک سے اب تک خوشبو آرہی ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اِس دُعا میں اشارہ فرماتا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ یعنی اے ہمارے خدا ہمیں استقامت کی راہ دکھلا وہی راہ جس پر تیرا انعام و اکرام مترتب ہوتا ہے اور تو راضی ہو جاتا ہے۔ اور اسی کی طرف دوسری آیت میں ارشاد فرمایا۔ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۔ اے خدا! اس مصیبت میں ہمارے دل پر وہ سکینت نازل کر جس سے صبر آجائے اور ایسا کر کہ ہماری موت اسلام پر ہو۔ جاننا چاہیئے کہ دکھوں اور مصیبتوں کے وقت میں خدا تعالےٰ اپنے پیارے بندوں کے دل پر ایک نُور اُتارتا ہے جس سے وہ قوت پاکر نہایت اطمینان سے مصیبت کا مقابلہ کرتے ہیں اور حلاوتِ ایمانی سے اُن زنجیروں کو بوسہ دیتے ہیں جو اس کی راہ میں ان کے پَیروں پر پڑیں۔ جب باخدا آدمی پر بلائیں نازل ہوتی ہیں اور موت کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے ربّ کریم سے خواہ نخواہ کا جھگڑا شروع نہیں کرتا کہ مجھے اِن بلاؤں سے بچا۔ کیونکہ اُس وقت عافیت کی دُعا میں اصرار کرنا خدا تعالیٰ سے لڑائی اور موافقتِ تامہ کے مخالف ہے۔ بلکہ سچا محبّ بلا کے اُترنے سے اور آگے قدم رکھتا ہے۔ اور ایسے وقت میں جان کو ناچیز سمجھ کر اور جان کی محبّت کو الوداع کہہ کر اپنے مولیٰ کی مرضی کا بکلّی تابع ہو جاتا ہے اور اس کی رضا چاہتا ہے۔ اسی کے حق میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۔ یعنی خدا کا پیارا بندہ اپنی جان خدا کی راہ میں دیتا ہے اور اس کے عوض میں خدا کی مرضی خرید لیتا ہے۔ وہی لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کی رحمت خاص کے مورد ہیں

غرض وہ استقامت جس سے خدا ملتا ہے اُسکی یہی رُوح ہے جو بیان کی گئی ہے جسکو سمجھنا ہو سمجھ لے۔

ساتواں وسیلہ اصل مقصود کے پانے کے لئے راستبازوں کی صحبت اور اُن کے کامل نمونوں کو دیکھنا ہے۔ پس جاننا چاہیئے کہ انبیاء کی ضرورتوں میں سے ایک یہ بھی ضرورت ہے کہ انسان طبعًا کامل نمونہ کا محتاج ہے اور کامل نمونہ شوق کو زیادہ کرتا ہے اور ہمت کو بڑھاتا ہے۔ اور جو نمونے کا پیرو نہیں وہ سُست ہو جاتا ہے اور بہک جاتا ہے۔ اِسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے۔ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ. یعنی تم ان لوگوں کی صحبت اختیار کرو جو راستباز ہیں اور ان لوگوں کی راہیں سیکھو جن پر تم سے پہلے فضل ہو چکا ہے۔

آٹھواں وسیلہ خدا تعالیٰ کی طرف سے پاک کشف اور پاک الہام اور پاک خوابیں ہیں۔ چونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سفر کرنا ایک نہایت دقیق در دقیق راہ ہے اس کے ساتھ طرح طرح کے مصائب اور دُکھ لگے ہوئے ہیں اور ممکن ہے کہ انسان اس نادیدہ راہ میں بھول جائے یا نا امیدی طاری ہو اور آگے قدم بڑھانا چھوڑ دے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کی رحمت نے چاہا کہ اپنی طرف سے اس سفر میں ساتھ ساتھ اس کو تسلّی دیتی رہے اور اس کی دلدہی کرتی رہے۔ اور اس کی کمرہمت باندھتی رہے۔ اور اس کے شوق کو زیادہ کرے سو اس کی سنت اس راہ کے مسافروں کے ساتھ اس طرح پر واقع ہے کہ وہ وقتًا فوقتًا اپنے کلام اور الہام سے اُن کو تسلّی دیتا اور اُن پر ظاہر کرتا ہے کہ مَیں تمہارے ساتھ ہوں۔ تب وہ قوت پاکر بڑے زور سے اس سفر کو طے کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں وہ فرماتا ہے۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ۔ اِسی طرح اور بھی کئی وسائل ہیں جو قرآن شریف نے بیان فرمائے ہیں مگر افسوس ہم اندیشہ طول کی وجہ سے اُن کو بیان نہیں کر سکتے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صـ ۱۰۱-۱۰۸)

قولہٗ ۔ سوائے اس کے خداوند کریم نہایت دیا لو کرپالو ہے اُس کی یہ ہدایت کہ پرستش کرنی چاہیئے انسان کی بہتری کے لئے ہے نہ کہ خود خدا کی اِس میں کوئی عزت بڑھتی ہے۔

اقول ۔ مَیں کہتا ہوں کہ گو بندگی و عبادت کرنے سے انسان کی اپنی ہی بہتری منصور ہے۔ مگر پھر بھی خدا تعالیٰ کی ربوبیت تقاضا کرتی ہے اور جوش مارتی ہے کہ لوگ اس کی سیدھی راہ پر قدم مار کر اور ناکردنی کاموں سے بچکر اور اُس کی پرستش و اطاعت میں محو ہو کر اپنی سعادت مطلوبہ

کو پائیں اور اگر اس راہ پر چلنا نہ چاہیں تو پھر نہ اپنے لئے بلکہ انہیں کے لئے اس کا غضب بھڑکتا ہے اور طرح طرح کی تنبیہوں میں انہیں مبتلا کرتا ہے۔ اور جو لوگ پھر بھی نہ سمجھیں وہ بعد اور حرمان کی آگ میں جلتے ہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص اس کو یہ کہہ سکے کہ تجھے میرے نفع اور نقصان کی کیا فکر پڑی ہے اور کیوں بار بار ہم کو نصیحتیں کرتا ہے اور الہامی کتابیں بھیجتا ہے اور سزائیں دیتا ہے۔ اگر ہم عبادت کرینگے تو اپنے لئے اور اگر نہیں کرینگے تو آپ نقصان اُٹھائیں گے تجھے کیوں ناحق کا جوش وخروش ہے۔ اور اگر کوئی شخص ایسا کہے بھی بلکہ اگر سب دنیا اور تمام آدم زاد متفق ہو کر اُس کی خدمت میں گذارش کریں کہ ہم کو آپ اپنی نصیحتوں اور حکموں اور الہٰی کتابوں سے معاف رکھیں ہم آپ کا بہشت یا یوں کہو کہ مکتی خانہ لینا نہیں چاہتے ہم اسی دنیا میں گذارہ کر لینگے آپ مہربانی فرما کر اسی جگہ ہمیشہ کیلئے ہمیں رہنے دیں آخرت کی ہم بڑی بڑی نعمتوں سے باز آئے آپ ہمارے اعمال میں ذرا دخل دیا نہ کریں اور جزا سزا وغیرہ تجویزیں جو ہمارے واسطے آپ کرتے رہتے ہیں ان سب سے آپ دست بردار رہیں ہمارے نفع یا نقصان سے آپ کچھ تعلق نہ رکھیں تو یہ عرض اُن کی ہرگز قبول نہیں ہو سکتی اگرچہ اس کے قبول کرانے کیلئے تمام عمر روتے پیٹتے رہیں۔ پس اس سے صاف ثابت ہے کہ صرف یہی بات نہیں کہ بندہ اپنی حالت میں آزاد ہے اور اپنے لئے بندگی کرتا ہے اور پرمیشر کو اس سے کچھ تعلق نہیں بلکہ جلال اور عظمت الٰہی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بندہ شرط بندگی بجا لاوے۔ اور نیک راہوں کو اختیار کرے اور اس کی الوہیت بالطبع تقاضا کرتی ہے کہ اس کے آگے عبودیت کے آثار ظاہر ہوں اور اس کی کاملیت ذاتی جوش سے یہ چاہتی ہے کہ جو نقصان سے خالی نہیں ہے اس کے آگے تذلل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ نافرمانوں اور سرکشوں اور ان سب کو جو شرارتوں پر ضد کرتے ہیں انجام کار اس کا عذاب پکڑتا ہے۔ ورنہ اس بات پر کوئی وجہ قابل اطمینان پیدا نہیں ہوتی کہ بغیر پائے جانے کسی ذاتی قوت کے جو سزا جزا دینے کیلئے اس کی ذات بابرکات ازل سے رکھتی ہو کیوں خواہ نخواہ وہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ نیکی کرنے والوں کو نیک پاداش اور بدی کرنے والوں کو بد پاداش پہنچا دے بلکہ اگر کوئی قوت ذاتی جو جزا سزا دینے کیلئے محرک ہو اُس میں نہ پائی جائے تو یہ چاہیئے تھا کہ خاموشی اختیار رکھتا اور جزا سزا کی چھیڑ چھاڑ سے بکلّی دستکش رہتا۔ سو اگرچہ یہ بات تو صحیح ہے کہ انسان کے اعمال کا نفع نقصان اسی کی طرف عائد ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کی عظمت وسلطنت نہ اس سے کچھ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے مگر یہ بات بھی نہایت صحیح اور محکم صداقت ہے کہ ربوبیت کا تقاضا بندوں کو انکی حیثیت بندگی پر قائم رکھنا چاہتا ہے اور جو شخص ذرا تکبّر سے سر اونچا کرے تو اُس کا سر فی الفور کچلا جاتا ہے۔ غرض خدائے تعالیٰ کی ذات

میں اپنی عظمت اپنی خدائی اپنی کبریائی اپنا جلال اپنی بادشاہی ظاہر کرنیکا ایک تقاضا پایا جاتا ہے اور سزا و جزا اور مطالبہ اطاعت و عبودیت و پرستش اسی تقاضا کی فرع پڑا ہوا ہے۔ اسی اظہار ربوبیت اور خدائی کی غرض سے یہ انواع و اقسام کا عالم اُس نے پیدا کر رکھا ہے ورنہ اگر اُسکی ذات میں یہ جوش اظہار نہ پایا جاتا تو پھر وہ کیوں پیدا کرنیکی طرف ناحق متوجہ ہوتا۔ اور کس نے اُس کے سر پہ بوجھ ڈالا تھا کہ ضرور یہ عالم پیدا کرے اور ارواح کو اجسام کے ساتھ تعلّق دیکر اِس مسافرخانہ کو جو دنیا کے نام سے موسوم ہے اپنی عجائب قدرتوں کی جگہ بناوے۔ آخر اس میں کوئی قوتِ اقتضا تھی جو اس بنا ڈالنے کی محرک ہوئی۔ اسی کی طرف اُسکے پاک کلام میں جو قرآن شریف ہے اشارات پائے جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے کل عالم کو اس غرض سے پیدا کیا کہ تا وہ اپنی خالقیت کی صفت سے شناخت کیا جائے اور پھر پیدا کرنیکے بعد اپنی مخلوقات پر رحم اور کرم کی بارشیں کیں تا وہ رحیمی اور کریمی کی صفت سے شناخت کیا جائے۔ ایسا ہی اس نے سزا اور جزا دی تا اس کا منتقم اور منعم ہونا شناخت کیا جائے۔ اسی طرح وہ مرنے کے بعد پھر اٹھائیگا تا اُس کا قادر ہونا شناخت کیا جائے۔ غرض وہ اپنے سب عجیب کاموں سے یہی مدعا رکھتا ہے کہ تا وہ پہچانا جائے اور شناخت کیا جائے۔ سو جبکہ دنیا کے پیدا کرنے اور جزا سزا وغیرہ سے اصل غرض معرفت الٰہی ہے جو لب لباب پرستش اور عبادت ہے، تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ خود تقاضا فرماتا ہے کہ تا اُسکی معرفت جس کی حقیقتِ کاملہ پرستش و عبادت کے ذریعہ سے کھلتی ہے اُسکے بندوں سے حاصل ہو جائے۔ جیسا کہ ایک خوبصورت اپنے کمال خوبصورتی کی وجہ سے اپنے حسن کو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ سو خدائیتعالیٰ جس پر حسنِ حقیقی کے کمالات ختم ہیں وہ بھی اپنے ذاتی جوش سے چاہتا ہے کہ وہ کمالات لوگوں پر کھل جائیں۔ پس اس تحقیق سے ثابت ہے، کہ خدائے تعالیٰ اپنی عبادت جو مدار و ذریعہ شناخت ہے ضرور اپنے بندوں سے چاہتا ہے اور جو شخص اُسکی اس خواہش کا مقابلہ کرے اور اس کی پرستش سے منکر اور منحرف ہو تو ایسے شخص کو نابود کرنے کیلئے اُسکی کبریائی متوجہ ہوتی ہے۔ اگر تم صفحۂ دنیا پر غور کرکے دیکھو اور جو کچھ خدائے تعالیٰ نے اب تک سرکشوں اور بے ایمانوں سے کیا ہے اور جو کچھ وہ قدیم سے جفاکاروں اور ستمکاروں سے کرتا چلا آیا ہے اسپر عمیق نگاہ سے نظر ڈالو تو تم پر نہایت صفائی سے کھل جائیگا کہ بلاشبہ یہ ثابت شدہ صداقت ہے، کہ بالضرور خدائے تعالیٰ اپنے ذاتی تقاضا سے نیکی سے دوستی اور بدی سے نفرت اور عداوت رکھتا ہے اور یہی چاہتا ہے کہ لوگ بدی کو چھوڑ دیں اور نیکی کو اختیار کریں۔ گو نیکی اور بدی کو جو انسان سے ظہور میں آتی ہے اس کے کارخانۂ سلطنت میں کوئی مفید یا مضر دخل نہیں ہے لیکن ذاتی تقاضا اس کا یہی ہے۔ اب ظاہر ہے، کہ اگر خدائیتعالیٰ نے روحوں کو پیدا نہیں کیا تو وہ کسی رُوح سے اس مطالبہ کرنیکا مستحق نہیں ہے، کہ وہ کمال درجہ کی پرستش جو اپنے پیدا کنندہ کیلئے چاہیئے کیوں اُس سے صادر نہیں ہوتی۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۱۵-۲۲۰)

انسان کی طبعی اخلاقی اور رُوحانی حالتیں

یہ قرآن نے ہی دنیا پر احسان کیا کہ طبعی حالتوں اور اخلاق فاضلہ میں فرق کرکے دکھلایا اور جب طبعی حالتوں سے نکال کر اخلاق فاضلہ کے محل عالی تک پہنچایا۔ تو فقط اسی پر کفایت نہ کی بلکہ اور مرحلہ جو باقی تھا یعنی روحانی حالتوں کا مقام اس تک پہنچنے کے لئے پاک معرفت کے دروازے کھول دیئے اور نہ صرف کھول دیئے بلکہ لاکھوں انسانوں کو اس تک پہنچا بھی دیا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صـ۵۳-۵۴)

واضح ہو کہ پہلا سوال انسان کی طبعی اور اخلاقی اور روحانی حالتوں کے بارے میں ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ کے پاک کلام قرآن شریف نے اِن تینوں حالتوں کی اِس طرح پر تقسیم کی ہے کہ ان تینوں کے علیحدہ علیحدہ تین مبدا ٹھہرائے ہیں یا یوں کہو کہ تین سرچشمے قرار دیئے ہیں جن میں سے جُدا جُدا یہ حالتیں نکلتی ہیں۔

پہلا سرچشمہ جو تمام طبعی حالتوں کا مورد اور مصدر ہے اُس کا نام قرآن شریف نے نفسِ امّارہ رکھا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ یعنی نفسِ امّارہ میں یہ خاصیّت ہے کہ وہ انسان کو بدی کی طرف جو اُس کے کمال کے مخالف اور اس کی اخلاقی حالتوں کے برعکس ہے جھکاتا ہے اور ناپسندیدہ اور بد راہوں پر چلانا چاہتا ہے۔ غرض بے اعتدالیوں اور بدیوں کی طرف جانا انسان کی ایک حالت ہے جو اخلاقی حالت سے پہلے اُس پر طبعًا غالب ہوتی ہے اور یہ حالت اس وقت تک طبعی حالت کہلاتی ہے جب تک کہ انسان عقل اور معرفت کے زیر سایہ نہیں چلتا بلکہ چارپایوں

کی طرح کھانے پینے سونے جاگنے یا غصہ اور جوش دکھانے وغیرہ امور میں طبعی جذبات کا پیرو رہتا ہے اور جب انسان عقل اور معرفت کے مشورہ سے طبعی حالتوں میں تصرف کرتا اور اعتدال مطلوب کی رعایت رکھتا ہے اُس وقت ان تینوں حالتوں کا نام طبعی حالتیں نہیں رہتا بلکہ اُس وقت یہ حالتیں اخلاقی حالتیں کہلاتی ہیں جیسا کہ آگے بھی کچھ ذکر اس کا آئیگا۔

اور اخلاقی حالتوں کے سرچشمہ کا نام قرآن شریف میں نفسِ لوّامہ ہے۔ جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ یعنی میں اس نفس کی قسم کھاتا ہوں جو بدی کے کام اور ہر ایک بے اعتدالی پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے۔ یہ نفس لوّامہ انسانی حالتوں کا دوسرا سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی حالتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس مرتبہ پر انسان دوسرے حیوانات کی مشابہت سے نجات پاتا ہے۔ اور اس جگہ نفسِ لوّامہ کی قسم کھانا اس کو عزت دینے کے لئے ہے۔ گویا وہ نفسِ امّارہ سے نفسِ لوّامہ بن کر بوجہ اس ترقی کے جناب الٰہی میں عزت پانے کے لائق ہوگیا۔ اور اس کا نام لوّامہ اس لئے رکھا کہ وہ انسان کو بدی پر ملامت کرتا ہے اور اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ انسان اپنے طبعی لوازم میں شتر بے مہار کی طرح چلے اور چارپایوں کی زندگی بسر کرے بلکہ یہ چاہتا ہے کہ اس سے اچھی حالتیں اور اچھے اخلاق صادر ہوں اور انسانی زندگی کے تمام لوازم میں کوئی بے اعتدالی ظہور میں نہ آوے اور طبعی جذبات اور طبعی خواہشیں عقل کے مشورہ سے ظہور پذیر ہوں۔ پس چونکہ وہ بُری حرکت پر ملامت کرتا ہے اس لئے اس کا نام نفسِ لوّامہ ہے یعنی بہت ملامت کرنے والا۔ اور نفسِ لوّامہ اگرچہ طبعی جذبات پسند نہیں کرتا بلکہ اپنے تئیں ملامت کرتا رہتا ہے لیکن نیکیوں کے بجا لانے پر پورے طور سے قادر بھی نہیں ہو سکتا اور کبھی نہ کبھی طبعی جذبات اُس پر غلبہ کر جاتے ہیں۔ تب گر جاتا ہے اور ٹھوکر کھاتا ہے۔ گویا وہ ایک کمزور بچہ کی طرح ہوتا ہے جو گرنا نہیں چاہتا ہے مگر کمزوری کی وجہ سے گرتا ہے۔ پھر اپنی کمزوری پر نادم ہوتا ہے۔ غرض یہ نفس کی وہ اخلاقی حالت ہے جب نفس اخلاقِ فاضلہ کو اپنے اندر جمع کرتا ہے۔ اور سرکشی سے بیزار ہوتا ہے۔ مگر پورے طور پر غالب نہیں آسکتا۔

پھر ایک تیسرا سرچشمہ ہے جس کو روحانی حالتوں کا مبداء کہنا چاہیئے اس سرچشمہ کا نام قرآن شریف نے نفسِ مطمئنہ رکھا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے:۔ یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ یعنی

اے نفس آرام یافتہ جو خدا سے آرام پا گیا۔ اپنے خدا کی طرف واپس چلا آ۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں مل جا اور میرے بہشت کے اندر آجا۔

یہ وہ مرتبہ ہے جس میں نفس تمام کمزوریوں سے نجات پا کر رُوحانی قوتوں سے بھر جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ سے ایسا پیوند کر لیتا ہے کہ بغیر اس کے جی بھی نہیں سکتا اور جس طرح پانی اوپر سے نیچے کی طرف بہتا ہے اور بسبب اپنی کثرت اور نیز روکوں کے دُور ہونے سے بڑے زور سے چلتا ہے اسی طرح وہ خدا کی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔ اِسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے وہ نفس جو خدا سے آرام پا گیا اُس کی طرف واپس چلا آ۔ پس وہ اِسی زندگی میں نہ موت کے بعد ایک عظیم الشان تبدیلی پیدا کرتا ہے اور اِسی دنیا میں نہ دوسری جگہ ایک بہشت اُس کو ملتا ہے۔ اور جیسا کہ اِس آیت میں لکھا ہے کہ اپنے رب کی طرف یعنی پرورش کرنے والے کی طرف واپس آ۔ ایسا ہی اُس وقت یہ خدا سے پرورش پاتا ہے اور خدا کی محبت اس کی غذا ہوتی ہے اور اِسی زندگی بخش چشمہ سے پانی پیتا ہے اس لئے موت سے نجات پاتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔ یعنی جس نے اَرضی جذبات سے اپنے نفس کو پاک کیا وہ بچ گیا۔ اور نہیں ہلاک ہو گا۔ مگر جس نے اَرضی جذبات میں جو طبعی جذبات ہیں اپنے تئیں چھپا دیا۔ وہ زندگی سے نا امید ہو گیا۔

غرض یہ تین حالتیں ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں طبعی اور اخلاقی اور رُوحانی حالتیں کہہ سکتے ہیں۔ اور چونکہ طبعی تقاضے افراط کے وقت بہت خطرناک ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات اخلاق اور رُوحانیت کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ کی پاک کتاب میں اُن کو نفس اَمّارہ کی حالتوں سے موسوم کیا گیا ہے۔ اگر یہ سوال ہو کہ انسان کی طبعی حالتوں پر قرآن شریف کا کیا اثر ہے اور وہ اُن کی نسبت کیا ہدایت دیتا ہے اور عملی طور پر کس حد تک اُن کو رکھنا چاہتا ہے تو واضح ہو کہ قرآن شریف کی رُو سے انسان کی طبعی حالتوں کو اُس کی اخلاقی اور رُوحانی حالتوں سے نہایت ہی شدید تعلّقات واقع ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کے کھانے پینے کے طریقے بھی انسان کی اخلاقی اور رُوحانی حالتوں پر اثر کرتے ہیں۔ اور اگر ان طبعی حالتوں سے شریعت کی ہدایتوں کے موافق کام لیا جاوے۔ تو جیسا کہ نمک کی کان میں پڑ کر ہر ایک چیز نمک ہی ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ تمام حالتیں اخلاقی ہی ہو جاتی ہیں اور رُوحانیت پر

نہایت گہرا اثر کرتی ہیں۔ اِسی واسطے قرآن شریف نے تمام عبادات اور اندرونی پاکیزگی کی اغراض کو خشوع خضوع کے مقاصد میں جسمانی طہارتوں اور جسمانی آداب اور جسمانی تعدیل کو بہت ملحوظ رکھا ہے۔ اور غور کرنے کے وقت یہی فلاسفی نہایت صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جسمانی اوضاع کا رُوح پر بہت قوی اثر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے طبعی افعال گو بظاہر جسمانی ہیں مگر ہماری رُوحانی حالتوں پر ضرور اُن کا اثر ہے۔ مثلاً جب ہماری آنکھیں رونا شروع کر دیں اور گو تکلّف سے ہی روئیں مگر فی الفور اُن آنسوؤں کا ایک شعلہ اُٹھ کر دل پر جا پڑتا ہے۔ تب دل بھی آنکھوں کی پیروی کر کے غمگین ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی جب ہم تکلّف سے ہنسنا شروع کریں تو دِل میں بھی ایک انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جسمانی سجدہ بھی رُوح میں خشوع اور عاجزی کی حالت پیدا کرتا ہے۔ اِس کے مقابل پر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب ہم گردن اونچی کھینچ کر اور چھاتی کو اُبھار کر چلیں تو یہ وضع رفتار ہم میں ایک قسم کا تکبّر اور خود بینی پیدا کرتی ہے تو اِن نمونوں سے پورے انکشاف کے ساتھ کھل جاتا ہے کہ بے شک جسمانی اوضاع کا رُوحانی حالتوں پر اثر ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۲ تا ۶)

طبعی حالتیں جن کا سرچشمہ اور مبدء نفسِ امّارہ ہے خدا تعالیٰ کے پاک کلام کے اشارات کے موافق اخلاقی حالتوں سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ کیونکہ خدا کے پاک کلام نے تمام نیچرل قویٰ اور جسمانی خواہشوں اور تقاضوں کو طبعی حالات کی مدّ میں رکھا ہے اور وہی طبعی حالتیں ہیں جو بالارادہ ترتیب اور تعدیل اور موقع بینی اور محل پر استعمال کرنے کے بعد اخلاق کا رنگ پکڑ لیتی ہیں۔ ایسا ہی اخلاقی حالتیں رُوحانی حالتوں سے کوئی الگ باتیں نہیں ہیں بلکہ وہی اخلاقی حالتیں ہیں جو پورے فنا فی اللہ اور تزکیّہ نفس اور پورے انقطاع الی اللہ اور پوری محبت اور پوری محویت اور پوری سکینت اور اطمینان اور پوری موافقت باللہ سے رُوحانیت کا رنگ پکڑ لیتی ہیں۔ طبعی حالتیں جب تک اخلاقی رنگ میں نہ آئیں کسی طرح انسان کو قابلِ تعریف نہیں بناتیں کیونکہ وہ دوسرے حیوانات بلکہ جمادات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایسا ہی مجرّد اخلاق کا حاصل کرنا بھی انسان کو رُوحانی زندگی نہیں بخشتا بلکہ ایک شخص خدا تعالیٰ کے وجود سے ہی منکر رہ کر اچھے اخلاق دکھلا سکتا ہے۔ دل کا غریب ہونا یا دل کا حلیم ہونا یا صلحکار ہونا یا ترکِ شر کرنا اور شریر کے مقابلہ پر نہ آنا یہ تمام طبعی حالتیں ہیں اور ایسی باتیں

ہیں جو ایک نااہل کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں جو اصل سرچشمہ نجات سے بے نصیب اور ناآشنا محض ہے اور بہت سے چارپائے غریب بھی ہوتے ہیں اور ہلنے اور خوپذیر ہونے سے صلحکاری بھی دکھلاتے ہیں۔ سونٹے پر سونٹا مارنے سے کوئی مقابلہ نہیں کرتے مگر پھر بھی ان کو انسان نہیں کہہ سکتے چہ جائیکہ ان خصلتوں سے وہ اعلیٰ درجہ کے انسان بن سکیں۔ ایسا ہی بد سے بدعقیدہ والا بلکہ بعض بدکاریوں کا مرتکب ان باتوں کا پابند ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ انسان رحم میں اس حد تک پہنچ جاوے کہ اگر اُس کے اپنے ہی زخم میں کیڑے پڑیں اُن کو بھی قتل کرنا روا نہ رکھے اور جانداروں کی پاسداری اسقدر کرے کہ جوئیں جو سر میں پڑتی ہیں یا وہ کیڑے جو پیٹ اور انتڑیوں میں اور دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اُن کو بھی آزار دینا نہ چاہے بلکہ مَیں قبول کر سکتا ہوں کہ کسی کا رحم اس حد تک پہنچے کہ وہ شہد کھانا ترک کردے کیونکہ وہ بہت سی جانوں کے تلف ہونے اور غریب مکھیوں کو اُن کے استھان سے پراگندہ کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اور مَیں مانتا ہوں کہ کوئی مُشک سے بھی پرہیز کرے کیونکہ وہ غریب ہرن کا خون ہے اور اس غریب کو قتل کرنے اور بچوں سے جُدا کرنے کے بعد میسّر آسکتا ہے۔ ایسا ہی مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ کوئی موتیوں کے استعمال کو بھی چھوڑ دے اور ابریشم کو پہننا بھی ترک کرے کیونکہ یہ دونوں غریب کیڑوں کے ہلاک کرنے سے ملتے ہیں۔ بلکہ میں یہاں تک مانتا ہوں کہ کوئی شخص دُکھ کے وقت جونکوں کے لگانے سے بھی پرہیز کرے اور آپ دکھ اُٹھالے اور غریب جونک کی موت کا خواہاں نہ ہو۔ بالآخر اگر کوئی مانے یا نہ مانے مگر مَیں مانتا ہوں کہ کوئی شخص اِسقدر رحم کو کمال کے نقطہ تک پہنچا دے کہ پانی کے کیڑوں کو بچانے کے لئے اپنے تئیں ہلاک کرے۔ مَیں یہ سب کچھ قبول کرتا ہوں۔ لیکن مَیں ہرگز قبول نہیں کر سکتا کہ یہ تمام طبعی حالتیں اخلاق کہلا سکتی ہیں۔ یا صرف انہی سے وہ اندرونی گند دھوئے جا سکتے ہیں جنکا وجود خدا تعالےٰ کے ملنے کی روک ہے۔ مَیں کبھی باور نہیں کرونگا کہ اِس طرح کا غریب اور بے آزار بننا جس میں بعض چارپایوں اور پرندوں کا کچھ نمبر بڑھا ہوا ہے اعلیٰ انسانیت کے حصول کا موجب ہو سکتا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک یہ قانون قدرت سے لڑائی ہے اور رضا کے بھاری خلق کے برخلاف اور اس نعمت کو ردّ کرنا ہے جو قدرت نے ہم کو عطا کی ہے بلکہ وہ روحانیت ہر ایک خلق کو محل اور موقعہ پر استعمال کرنے کے بعد اور پھر خدا کی راہوں میں وفاداری کے ساتھ قدم مارنے سے اور اسی کا ہو جانے سے ملتی ہے۔ جو اُس کا ہو جاتا ہے اُس کی

یہی نشانی ہے کہ وہ اُس کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔ عارف ایک مچھلی ہے جو خدا کے ہاتھ سے ذبح کی گئی اور اُس کا پانی خدا کی محبت ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صـــ ۱۱ تا ۱۲)

مَیں ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ انسانی حالتوں کے سرچشمے تین ہیں یعنی نفس امّارہ، نفسِ لوّامہ نفس مطمئنّہ۔ اور طریق اصلاح کے بھی تین ہیں۔

اوّل یہ کہ بے تمیز وحشیوں کو اس ادنیٰ خلق پر قائم کیا جائے کہ وہ کھانے پینے اور شادی وغیرہ تمدنی امور میں انسانیت کے طریقے پر چلیں۔ نہ ننگے پھریں اور نہ کتّوں کی طرح مُردار خوار ہوں اور نہ کوئی اور بے تمیزی ظاہر کریں۔ یہ طبعی حالتوں کی اصلاحوں میں سے ادنیٰ درجہ کی اصلاح ہے یہ اس قسم کی اصلاح ہے کہ اگر مثلاً پورٹ بلیر کے جنگلی آدمیوں میں سے کسی آدمی کو انسانیت کے لوازم سکھانا ہو تو پہلے ادنیٰ ادنیٰ اخلاق انسانیت اور طریق ادب کی ان کو تعلیم دی جائے۔

دوسرا طریق اصلاح کا یہ ہے کہ جب کوئی ظاہری آداب انسانیت کے حاصل کر لیوے تو اس کو بڑے بڑے اخلاق انسانیت کے سکھلائے جائیں اور انسانی قویٰ میں جو کچھ بھرا پڑا ہے اُن سب کو محل اور موقعہ پر استعمال کرنے کی تعلیم دی جائے۔

تیسرا طریق اصلاح کا یہ ہے کہ جو لوگ اخلاق فاضلہ سے متصف ہو گئے ہیں ایسے خشک زاہدوں کو شربتِ محبت اور وصل کا مزہ چکھایا جائے۔ یہ تین اصلاحیں ہیں جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صـــ ۱۳ تا ۱۴)

عوام الناس خیال کرتے ہیں کہ خلق صرف حلیمی اور نرمی اور انکساری کا نام ہے۔ یہ انکی غلطی ہے بلکہ جو کچھ بمقابلہ ظاہری اعضاء کے باطن میں انسانی کمالات کی کیفیتیں رکھی گئی ہیں ان سب کیفیتوں کا نام خلق ہے۔ مثلاً انسان آنکھ سے روتا ہے اور اُس کے مقابل پر دل میں ایک قوتِ رقت ہے وہ جب بذریعہ عقلِ خداداد کے اپنے محل پر مستعمل ہو تو وہ ایک خلق ہے ایسا ہی انسان ہاتھوں سے دشمن کا مقابلہ کرتا ہے اور اِس حرکت کے مقابلہ میں دل میں ایک قوت ہے جس کو شجاعت کہتے ہیں۔ پس جب انسان محل پر اور موقعہ کے لحاظ سے اِس قوت کو استعمال میں لاتا ہے تو اس کا نام بھی خلق ہے۔ اور ایسا ہی انسان کبھی ہاتھوں کے ذریعہ سے مظلوموں کو ظالموں سے بچانا چاہتا ہے یا ناداروں اور بھوکوں کو کچھ دینا چاہتا ہے

یا کسی اَور طرح سے بنی نوع کی خدمت کرنا چاہتا ہے ۔ اور اس حرکت کے مقابل پر دل میں ایک قوت ہے جس کو رحم بولتے ہیں ۔ اور کبھی انسان اپنے ہاتھوں کے ذریعہ سے ظالم کو سزا دیتا ہے اور ۔ اس حرکت کے مقابل پر دل میں ایک قوت ہے جس کو انتقام کہتے ہیں ۔ اور کبھی انسان حملہ کے مقابلہ پر حملہ کرنا نہیں چاہتا اور ظالم کے ظلم سے درگذر کرتا ہے ۔ اور اس حرکت کے مقابلہ پر دل میں ایک قوت ہے جس کو عفو اور صبر کہتے ہیں اور کبھی انسان بنی نوع کو فائدہ پہنچانے کے لئے اپنے ہاتھوں سے کام لیتا ہے یا پیروں سے یا دل اور دماغ سے اور ان کی بہبودی کے لئے اپنا سرمایہ خرچ کرتا ہے تو اس حرکت کے مقابلہ پر دل میں ایک قوت ہے جس کو سخاوت کہتے ہیں ۔ پس جب انسان ان تمام قوتوں کو موقع اور محل کے لحاظ سے استعمال کرتا ہے تو اُس وقت اس کا نام خُلق رکھا جاتا ہے ۔ اللہ جلّ شانہٗ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے ۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ یعنی تُو ایک بزرگ خلق پر قائم ہے ۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۸-۱۹)

طبعی حالات اخلاقی حالات سے کچھ الگ چیز نہیں بلکہ وہی حالات ہیں جو تعدیل اور موقع اور محل پر استعمال کرنے سے اور عقل کی تجویز اور مشورہ سے کام میں لانے سے اخلاقی حالات کا رنگ پکڑ لیتے ہیں ۔ اور قبل اس کے کہ وہ عقل اور معرفت کی اصلاح اور مشورہ سے صادر ہوں گو وہ کیسے ہی اخلاق سے مشابہ ہوں درحقیقت اخلاق نہیں ہوتے بلکہ طبیعت کی ایک بے اختیار رفتار ہوتی ہے ۔ جیسا کہ اگر ایک کتے یا ایک بکری سے اپنے مالک کے ساتھ محبت یا انکسار ظاہر ہو تو اس کتے کو خلیق نہیں کہیں گے اور نہ اس بکری کا نام مہذب الاخلاق رکھیں گے ۔ اسی طرح ہم ایک بھیڑیئے یا شیر کو اُن کی درندگی کی وجہ سے بدخلق نہیں کہیں گے بلکہ جیسا کہ ذکر کیا گیا اخلاقی حالت محل اور سوچ اور وقت شناسی کے بعد شروع ہوتی ہے اور ایک ایسا انسان جو عقل اور تدبیر سے کام نہیں لیتا وہ اُن شیر خوار بچوں کی طرح ہے جن کے دل اور دماغ پر ہنوز قوتِ عقلیہ کا سایہ نہیں پڑا یا ان دیوانوں کی طرح جو جوہرِ عقل اور دانش کو کھو بیٹھتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جو شخص بچہ شیر خوار اور دیوانہ ہو وہ ایسی حرکات بعض اوقات ظاہر کرتا ہے کہ جو اخلاق کے ساتھ مشابہ ہوتی ہیں مگر کوئی عقلمند ان کا نام اخلاق نہیں رکھ سکتا کیونکہ وہ حرکتیں تمیز اور موقعہ بینی کے چشمے سے نہیں نکلتیں

بلکہ وہ طبعی طور پر تحریکوں کے پیش آنے کے وقت صادر ہو جاتی ہیں جیسا کہ انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتیوں کی طرف رُخ کرتا ہے اور ایک مرغ کا بچہ پیدا ہوتے ہی دانہ چگنے کیلئے دوڑتا ہے۔ جونک کا بچہ جونک کی عادتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور سانپ کا بچہ سانپ کی عادتیں ظاہر کرتا ہے اور شیر کا بچہ شیر کی عادتیں دکھلاتا ہے۔ بالخصوص انسان کے بچہ کو غور سے دیکھنا چاہیئے کہ وہ کیسے پیدا ہوتے ہی انسانی عادتیں دکھلانا شروع کر دیتا ہے اور پھر جب برس ڈیڑھ برس کا ہوا تو وہ عاداتِ طبعیہ بہت نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً پہلے جس طور سے روتا تھا اب رونا بہ نسبت پہلے کے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہنسنا قہقہہ کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور آنکھوں میں بھی عمداً دیکھنے کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس عمر میں یہ ایک اور امر طبعی پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی رضامندی یا نارضامندی حرکات سے ظاہر کرتا ہے اور کسی کو مارنا اور کسی کو کچھ دینا چاہتا ہے۔ مگر یہ تمام حرکات دراصل طبعی ہوتی ہیں۔ پس ایسے بچہ کی مانند ایک وحشی آدمی بھی ہے جسکو انسانی تمیز سے بہت ہی کم حصہ ملا ہے۔ وہ بھی اپنے ہر ایک قول اور فعل اور حرکت اور سکون میں طبعی حرکات ہی دکھلاتا ہے اور اپنی طبیعت کے جذبات کا تابع رہتا ہے کوئی بات اس کے اندرونی قویٰ کے تدبّر اور تفکّر سے نہیں نکلتی بلکہ جو کچھ طبعی طور پر اس کے اندر پیدا ہوا ہے وہ خارجی تحریکوں کے مناسب حال نکلتا چلا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس کے طبعی جذبات جو اس کے اندر سے کسی تحریک سے باہر آتے ہیں وہ سب کے سب بُرے نہ ہوں۔ بلکہ بعض اُن کے نیک اخلاق سے مشابہ ہوں لیکن عاقلانہ تدبّر اور موشگافی کو اُن میں دخل نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی قدر ہو بھی تو وہ بوجہ غلبۂ جذبات طبعی کے قابلِ اعتبار نہیں ہوتا بلکہ جس طرف کثرت ہے اسی طرف کو معتبر سمجھا جاوے گا۔

غرض ایسے شخص کی طرف حقیقی اخلاق منسوب نہیں کر سکتے جس پر اسبابِ طبعیہ حیوانوں اور بچوں اور دیوانوں کی طرح غالب ہیں اور جو اپنی زندگی کو قریب قریب وحشیوں کے بسر کرتا ہے بلکہ حقیقی طور پر نیک یا بد اخلاق کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے کہ جب انسان کی عقل خداداد پختہ ہو کر اس کے ذریعہ سے نیکی اور بدی یا دو بدیوں یا دو نیکیوں کے درجہ میں فرق کر سکے۔ پھر اچھے راہ کے ترک کرنے سے اپنے دل میں ایک حسرت پاوے اور بُرے کام کے ارتکاب سے اپنے تئیں مُتندم اور پشیمان دیکھے اور یہ انسان کی زندگی کا دوسرا زمانہ ہے جس کو خدا کے پاک کلام قرآن شریف میں نفسِ لوّامہ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ ایک وحشی کو نفسِ لوّامہ کی حالت تک پہنچانے کے لئے صرف سرسری نصائح کافی نہیں ہوتیں بلکہ ضروری

ہوتا ہے کہ اس کو خدا شناسی کا اس قدر حصّہ ملے جس سے وہ اپنی پیدائش بیہودہ اور لغو خیال نہ کرے تا معرفت الٰہی سے سچے اخلاق اُس میں پیدا ہوں۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ساتھ ساتھ سچے خدا کی معرفت کیلئے توجہ دلائی ہے اور یقین دلایا ہے کہ ہر ایک عمل اور خلق ایک نتیجہ رکھتا ہے جو اُس کی زندگی میں روحانی راحت یا روحانی عذاب کا موجب ہوتا ہے اور دوسری زندگی میں کھلے کھلے طور پر اپنا اثر دکھائیگا۔ غرض نفس لوّامہ کے درجہ پر انسان کو عقل اور معرفت اور پاک کانشنس سے اِس قدر حصّہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ بُرے کام پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے اور نیک کام کا خواہشمند اور حریص رہتا ہے۔ یہ وہی درجہ ہے کہ جس میں انسان اخلاق فاضلہ حاصل کرتا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۱۶-۱۸)

اللہ جلّ شانہٗ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے:- اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ یعنی تو ایک بزرگ خلق پر قائم ہے۔ سو اسی تشریح کے مطابق اس کے معنے ہیں۔ یعنی یہ کہ تمام قسمیں اخلاق کی سخاوت۔ شجاعت۔ عدل۔ رحم۔ احسان۔ صدق۔ حوصلہ وغیرہ تجھ میں جمع ہیں۔ غرض جسقدر انسان کے دل میں قوتیں پائی جاتی ہیں جیسا کہ ادب۔ حیا۔ دیانت۔ مروّت۔ غیرت۔ استقامت۔ عفت۔ زہادت۔ اعتدال۔ مواسات یعنی ہمدردی ایسا ہی شجاعت۔ سخاوت۔ عفو۔ صبر۔ احسان۔ صدق۔ وفا وغیرہ جب یہ تمام طبعی حالتیں عقل اور تدبّر کے مشورہ سے اپنے اپنے محل اور موقعہ پر ظاہر کی جائیں گی تو سب کا نام اخلاق ہوگا اور یہ تمام اخلاق درحقیقت انسان کی طبعی حالتیں اور طبعی جذبات ہیں اور صرف اس وقت اخلاق کے نام سے موسوم ہوتے ہیں کہ جب محل اور موقعہ کے لحاظ سے بالارادہ اُنکو استعمال کیا جائے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۱۹)

جاننا چاہیئے کہ اخلاق دو قسم کے ہیں۔ اوّل وہ اخلاق جن کے ذریعہ سے انسان ترکِ شر پر قادر ہوتا ہے۔ دوسرے وہ اخلاق جن کے ذریعہ سے انسان ایصالِ خیر پر قادر ہوتا ہے اور ترکِ شر کے مفہوم میں وہ اخلاق داخل ہیں جن کے ذریعہ سے انسان کوشش کرتا ہے کہ تا اپنی زبان یا اپنے ہاتھ یا اپنی آنکھ یا اپنے کسی اور عضو سے دوسرے کے مال یا عزّت یا جان کو نقصان نہ پہنچاوے یا نقصان رسانی اور کسرِ شان کا ارادہ نہ کرے اور ایصالِ خیر کے مفہوم میں تمام وہ اخلاق داخل ہیں جن کے ذریعے سے انسان کوشش کرتا ہے کہ اپنی زبان یا اپنے ہاتھ یا اپنے مال یا اپنے علم یا کسی اور ذریعہ سے دوسرے کے مال یا عزّت کو فائدہ پہنچا سکے۔ یا

اس کے جلال یا عزت ظاہر کرنے کا ارادہ کر سکے یا اگر کسی نے اس پر کوئی ظلم کیا تھا تو جس سزا کا وہ ظالم مستحق تھا اُس سے درگذر کر سکے اور اِس طرح اُس کو دُکھ اور عذاب بدنی اور تاوان مالی سے محفوظ رہنے کا فائدہ پہنچا سکے یا اس کو ایسی سزا دے سکے جو حقیقت میں اس کے لئے سراسر رحمت ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۵-۲۶)

واضح ہو کہ وہ اخلاق جو ترکِ شر کے لئے صانع حقیقی نے مقرر فرمائے وہ زبانِ عربی میں جو تمام انسانی خیالات اور اوضاع اور اخلاق کے اظہار کے لئے ایک ایک مفرد لفظ اپنے اندر رکھتی ہے چار ناموں سے موسوم ہیں۔ چنانچہ

پہلا خلق اِحْصَان کے نام سے موسوم ہے اور اس لفظ سے مراد خاص وہ پاکدامنی ہے جو مرد اور عورت کی قوتِ تناسل سے علاقہ رکھتی ہے اور مُحْصِنْ یا مُحْصِنَہ اس مرد یا عورت کو کہا جائے گا جو حرامکاری یا اس کے مقدمات سے مجتنب رہ کر اس ناپاک بدکاری سے اپنے تئیں روکیں جس کا نتیجہ دونوں کے لئے اس عالم میں ذلت اور لعنت اور دوسرے جہان میں عذابِ آخرت اور متعلقین کے لئے علاوہ بے آبروئی نقصانِ شدید ہے ......

...... اسجگہ یاد رہے کہ یہ خلق جس کا نام احصان یا عفت ہے یعنی پاکدامنی یہ اُسی حالت میں خُلق کہلائیگا جبکہ ایسا شخص جو بدنظری یا بدکاری کی استعداد اپنے اندر رکھتا ہے۔ یعنی قدرت نے وہ قویٰ اس کو دے رکھے ہیں جن کے ذریعہ سے اس جرم کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ اس فعل شنیع سے اپنے تئیں بچائے اور اگر بباعث بچہ ہونے یا نامرد ہونے یا خوجہ ہونے یا پیرفرتوت ہونے کے یہ قوت اس میں موجود نہ ہو تو اس صورت میں ہم اس کو اس خلق سے جسکا نام اِحصان یا عفت ہے موصوف نہیں کر سکتے ....

خداتعالےٰ نے خلق احصان یعنی عفت کے حاصل کرنے کیلئے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی۔ بلکہ انسان کو پاکدامن رہنے کے لئے پانچ علاج بھی بتلا دیئے ہیں۔ یعنی یہ کہ اپنی آنکھوں کو نامحرم پر نظر ڈالنے سے بچانا۔ کانوں کو نامحرموں کی آواز سُننے سے بچانا۔ نامحرموں کے قصے نہ سُننا۔ اور ایسی تمام تقریبوں سے جن میں اس بدفعل کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اپنے تئیں بچانا۔ اگر نکاح نہ ہو تو روزہ رکھنا وغیرہ۔ اسجگہ ہم بڑے دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان سب تدبیروں کے ساتھ جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں صرف اسلام ہی سے خاص ہے۔

دوسری قسم ترک شر کے اقسام میں سے وہ خُلق ہے جس کو امانت و دیانت کہتے ہیں یعنی دوسرے کے مال پر شرارت اور بدنیتی سے قبضہ کر کے اس کو ایذا پہنچانے پر راضی نہ ہونا۔ سو واضح ہو کہ دیانت اور امانت انسان کی طبعی حالتوں میں سے ایک حالت ہے۔ اسی واسطے ایک بچہ شیرخوار بھی جو بوجہ اپنی کمسنی اپنی طبعی سادگی پر ہوتا ہے اور نیز بباعث صغرسنی ابھی بُری عادتوں کا عادی نہیں ہوتا اس قدر غیر کی چیز سے نفرت رکھتا ہے کہ غیر عورت کا دودھ بھی مشکل سے پیتا ہے۔ اگر بیہوشی کے زمانہ میں کوئی اور دایہ مقرر نہ ہو تو ہوش کے زمانہ میں اس کو دوسرے کا دودھ پلانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے اور اپنی جان پر بہت تکلیف اٹھاتا ہے اور ممکن ہے اس تکلیف سے مرنے کے قریب ہو جائے مگر دوسری عورت کے دودھ سے طبعاً بیزار ہوتا ہے اسقدر نفرت کا کیا بھید ہے؟ بس یہی کہ وہ والدہ کو چھوڑ کر غیر کی چیز کی طرف رجوع کرنے سے طبعاً متنفّر ہے۔ اب ہم جب ایک گہری نظر سے بچّہ کی اس عادت کو دیکھتے اور اس پر غور کرتے ہیں اور فکر کرتے کرتے اس کی اس عادت کی تہ تک چلے جاتے ہیں تو ہم پر صاف کھل جاتا ہے کہ یہ عادت جو غیر کی چیز سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ اپنے اوپر مصیبت ڈال لیتا ہے یہی جڑھ دیانت اور امانت کی ہے۔ اور دیانت کے خلق میں کوئی شخص راستباز نہیں ٹھہر سکتا جب تک بچہ کی طرح وہ غیر کے مال کے بارے میں بھی سچی نفرت اور کراہت اس کے دل میں پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن بچہ اس عادت کو اپنے محل پر استعمال نہیں کرتا اور اپنی بیوقوفی کے سبب سے بہت کچھ تکلیفیں اٹھا لیتا ہے۔ لہذا اس کی یہ عادت صرف ایک حالت طبعی ہے جس کو وہ بے اختیار ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے وہ حرکت اُس کے خلق میں داخل نہیں ہو سکتی گو انسانی سرشت میں اصل جڑھ خلق دیانت و امانت کی وہی ہے جیسا کہ بچہ اس غیر معقول حرکت سے متدیّن اور امین نہیں کہلا سکتا۔ ایسا ہی وہ شخص بھی اس خلق سے متصف نہیں ہو سکتا جو اس طبعی حالت کو محل پر استعمال نہیں کرتا امین اور دیانت دار بننا بہت نازک امر ہے جبتک انسان تمام پہلو بجا نہ لاوے امین اور دیانت دار نہیں ہو سکتا۔ اس میں اللہ تعالٰے نے نمونہ کے طور پر آیات مفصّلہ ذیل میں امانت کا طریق سمجھایا ہے اور وہ طریق امانت یہ ہے۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ

وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۔ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا .....

ان تمام آیات میں خدائے تعالیٰ نے تمام طریقے بددیانتی کے بیان فرما دیئے اور ایسا کلام کلی کے طور پر فرمایا جس میں کسی بددیانتی کا ذکر باہر نہ رہ جائے۔ صرف یہ نہیں کہا کہ تو چوری نہ کرتا ایک نادان یہ نہ سمجھ لے کہ چوری تو میرے لئے حرام ہے مگر دوسرے ناجائز طریقے سب حلال ہیں۔ اس کلمہ جامع کے ساتھ تمام ناجائز طریقوں کو حرام ٹھہرانا یہی حکمت بیانی ہے۔ غرض اگر کوئی اس بصیرت سے دیانت اور امانت کا خُلق اپنے اندر نہیں رکھتا اور ایسے تمام پہلوؤں کی رعایت نہیں کرتا وہ اگر دیانت و امانت کو بعض اُمور میں دکھلاوے بھی تو یہ حرکت اس کی خُلق دیانت میں داخل نہیں سمجھی جاویگی بلکہ ایک طبعی حالت ہوگی جو عقلی تمیز اور بصیرت سے خالی ہے۔

تیسری قسم ترکِ شر کی اخلاق میں سے وہ قسم ہے جس کو عربی میں ھُدْنَہ اور ھَوْن کہتے ہیں یعنی دوسرے کو ظلم کی راہ سے بدنی آزار نہ پہنچانا اور بے شر انسان ہونا اور صلحکاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا۔ پس بلاشبہ صلحکاری اعلیٰ درجہ کا خُلق ہے اور انسانیت کے لئے ازبس ضروری ہے اور اس خُلق کے مناسب حال طبعی قوت جو بچہ میں ہوتی ہے جس کی تعدیل سے یہ خلق بنتا ہے الفت ہے یعنی خوگرفتگی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان صرف طبعی حالت میں یعنی اس حالت میں کہ جب انسان عقل سے بے بہرہ ہو صلح کے مضمون کو سمجھ نہیں سکتا اور نہ جنگ جوئی کے مفہوم کو سمجھ سکتا ہے پس اُس وقت ایک عادت موافقت کی اس میں پائی جاتی ہے وہی صلحکاری کی عادت کی جڑ ہے۔ لیکن چونکہ وہ عقل اور تدبّر اور خاص ارادہ سے اختیار نہیں کی جاتی اس لئے خلق میں داخل نہیں۔ بلکہ خلق میں تب داخل ہوگی کہ جب انسان بالارادہ اپنے تئیں بے شر بنا کر صلحکاری کے خلق کو اپنے محل پر استعمال کرے اور بے محل استعمال کرنے سے مجتنب رہے۔ اس میں اللہ جلّ شانہ یہ تعلیم فرماتا ہے۔ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۔ اَلصُّلْحُ خَيْرٌ ۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا ۔ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۔ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ ......

چوتھی قسم ترکِ شر کے اخلاق میں سے رفق اور قولِ حسن ہے اور یہ خلق جس حالتِ طبعی سے پیدا ہوتا ہے اُس کا نام **طلاقت** یعنی کشادہ روئی ہے۔ بچہ جب تک کلام کرنے پر قادر نہیں ہوتا بجائے رفق اور قولِ حسن کے طلاقت دکھلاتا ہے۔ یہی دلیل اس بات پر ہے کہ رفق کی جڑ جہاں سے یہ شاخ پیدا ہوتی ہے طلاقت ہے۔ طلاقت ایک قوت ہے اور رفق ایک خلق ہے جو اس قوت کو محل پر استعمال کرنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں خدا تعالیٰ کی تعلیم یہ ہے:۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ۔ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ۔ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا .... وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ....

اب ترکِ شر کے اقسام ختم ہو چکے اور اب ہم **ایصالِ خیر** کے اقسام بیان کرتے ہیں۔

دوسری قسم اُن اخلاق کی جو ایصالِ خیر سے تعلق رکھتے ہیں **پہلا خلق** اُن میں سے **عفو** ہے یعنی کسی کے گناہ کو بخش دینا۔ اس میں ایصالِ خیر یہ ہے کہ جو گناہ کرتا ہے وہ ایک ضرر پہنچاتا ہے اور اس لائق ہوتا ہے کہ اُس کو بھی ضرر پہنچایا جائے۔ سزا دلائی جائے۔ قید کرایا جائے۔ جرمانہ کرایا جائے یا آپ ہی اس پر ہاتھ اٹھایا جائے۔ پس اُسکو بخش دینا اگر بخش دینا مناسب ہو تو اس کے حق میں ایصالِ خیر ہے۔ اس میں قرآن شریف کی تعلیم یہ ہے:۔ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ۔ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ

یعنی نیک آدمی وہ ہے جو غصّہ کھانے کے محل پر اپنا غصہ کھا جاتے ہیں اور بخشنے کے محل پر گناہ کو بخشتے ہیں۔ بدی کی جزا اُسی قدر بدی ہے جو کی گئی ہو۔ لیکن جو شخص گناہ کو بخش دے اور ایسے موقعہ پر بخش دے کہ اُس سے کوئی اصلاح ہوتی ہو کوئی شر پیدا نہ ہوتا ہو یعنی عین عفو کے محل پر ہو نہ غیر محل پر تو اس کا وہ بدلہ پائے گا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم یہ نہیں کہ خواہ نخواہ اور ہر جگہ شر کا مقابلہ نہ کیا جائے اور شریروں اور ظالموں کو سزا نہ دی جائے بلکہ یہ تعلیم ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ محل اور موقعہ گناہ بخشنے کا ہے یا سزا دینے کا۔ پس مجرم کے حق میں اور نیز عامہ خلائق کے حق میں

جو کچھ فی الواقعہ بہتر ہو وہی صورت اختیار کی جائے۔ بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے توبہ کرتا ہے اور بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے اور بھی دلیر ہو جاتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اندھوں کی طرح گناہ بخشنے کی عادت مت ڈالو بلکہ غور سے دیکھ لیا کرو کہ حقیقی نیکی کس بات میں ہے آیا بخشنے میں یا سزا دینے میں۔ پس جو امر محل اور موقعہ کے مناسب ہو وہی کرو۔

افرادِ انسانی کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ جیسے بعض لوگ کینہ کشی پر بہت حریص ہوتے ہیں یہاں تک کہ دادوں پردادوں کے کینوں کو یاد رکھتے ہیں ایسا ہی بعض لوگ عفو اور درگذر کی عادت کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور بسا اوقات اس عادت کی افراط سے دیّوثی تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور ایسے قابلِ شرم حلم اور عفو اور درگذر اُن سے صادر ہوتے ہیں جو سراسر حمیّت اور غیرت اور عفّت کے برخلاف ہوتے ہیں بلکہ نیک چلنی پر داغ لگاتے ہیں اور ایسے عفو اور درگذر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ توبہ توبہ کر اُٹھتے ہیں۔ انہی خرابیوں کے لحاظ سے قرآن کریم میں ہر ایک خلق کیلئے محل اور موقعہ کی شرط لگا دی ہے۔ اور ایسے خُلق کو منظور نہیں رکھا جو بے محل صادر ہو ۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ حقیقی خلق اور طبعی حالتوں میں یہ فرق ہے کہ خُلق ہمیشہ محل اور موقعہ کی پابندی اپنے ساتھ رکھتا ہے اور طبعی قوت بے محل بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۲۶-۳۸)

تمام محققین کا اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے کہ اخلاق کا کامل مرتبہ صرف اِس میں منحصر نہیں ہو سکتا کہ ہر جگہ و ہر محل میں عفو اور درگذر کو اختیار کیا جائے۔ اگر انسان کو صرف عفو اور درگذر کا ہی حکم دیا جاتا تو صدہا کام کہ جو غضب اور انتقام پر موقوف ہیں فوت ہو جاتے۔ انسان کی صورتِ فطرت کہ جس پر قائم ہو جانے سے وہ انسان کہلاتا ہے یہ ہے کہ خدا نے اس کی سرشت میں جیسا عفو اور درگذر کی استعداد رکھی ہے ایسا ہی غضب اور انتقام کی خواہش بھی رکھی ہے۔ اور اِن تمام قوتوں پر عقل کو بطور افسر کے مقرر کیا ہے۔ پس انسان اپنی حقیقی انسانیت تک تب پہنچتا ہے کہ جب فطرتی صورت کے موافق یہ دونوں طور کی قوتیں عقل کے تابع ہو کر چلتی رہیں یعنی یہ قوتیں مثل رعایا کے ہوں اور عقل مثل بادشاہِ عادل اُن کی پرورش اور فیض رسانی اور رفعِ تنازعہ اور مشکل کشائی میں مشغول رہے۔ مثلاً ایک وقت غضب نمودار ہوتا ہے اور حقیقت میں اُس وقت حلم کے ظاہر ہونے کا موقعہ ہوتا ہے۔ پس ایسے وقت میں عقل اپنی فہمائش سے غضب کو فرو کرتی ہے اور حلم کو حرکت دیتی ہے۔ اور بعض وقت غضب کرنے کا وقت ہوتا ہے اور حلم پیدا

ہو جاتا ہے۔ اور ایسے وقت میں عقل غضب کو مشتعل کرتی ہے۔ اور حلم کو درمیان سے اٹھا لیتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ تحقیق عمیق سے ثابت ہوا ہے کہ انسان اِس دنیا میں بہت سی مختلف قوتوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے اور اس کا کمال فطرتی یہ ہے کہ ہر ایک قوت کو اپنے اپنے موقعہ پر استعمال میں لاوے۔ غضب کی جگہ پر غضب۔ رحم کی جگہ پر رحم۔ یہ نہیں کہ نرا حلم ہی حلم ہو اور دوسری تمام قوتوں کو معطّل اور بے کار چھوڑ دے۔ ہاں منجملہ تمام اندرونی قوتوں کے قوّتِ حلم کو بھی اپنے موقعہ اور محل پر ظاہر کرنا ایک انسان کی خوبی ہے مگر انسان کی فطرت کا درخت جس کو خدا نے کئی شاخوں پر جو اُس کی مختلف قوتیں ہیں منقسم کیا ہے۔ صرف ایک شاخ کے سرسبز ہونے سے کامل نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ وہ اُسی حالت میں کامل کہلائے گا کہ جب ساری شاخیں اس کی سرسبز و شاداب ہوں اور کوئی شاخ حدِّ موزونیت سے کم یا زیادہ نہ ہو۔ یہ بات بہ بداہتِ عقل ثابت ہے کہ ہمیشہ اور ہر جگہ یہی خُلق اچھا نہیں ہو سکتا کہ شریر کی شرارت سے درگذر کی جائے۔ بلکہ خود قانونِ فطرت ہی اس خیال کا ناقص ہونا ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مدبّرِ حقیقی نے انتظامِ عالم اسی میں رکھا ہے جو کبھی نرمی اور کبھی درشتی کی جائے اور کبھی عفو اور کبھی سزا دی جائے۔ اور اگر صرف نرمی ہی ہو یا صرف درشتی ہی ہو تو پھر نظامِ عالم کی کل ہی بگڑ جاتی ہے۔ پس اس سے ثابت ہے کہ ہمیشہ اور اور ہر محل میں عفو کرنا حقیقی نیکی نہیں ہے بلکہ ایسی تعلیم کو کامل تعلیم سمجھنا ایک غلطی ہے۔ جو اُن لوگوں کو لگی ہوئی ہے جن کی نگاہیں انسان کی فطرت کے پورے گہراؤ تک نہیں پہنچیں۔ اور جن کی نظر ان تمام قوتوں کے دیکھنے سے بند رہتی ہے جو انسان کو اپنے اپنے محل پر استعمال کرنے کے لئے عطا کی گئی ہیں۔ جو شخص لگاتار جا بجا ایک ہی قوت کو استعمال کیا جاتا ہے اور دوسری تمام اخلاقی قوتوں کو بیکار چھوڑ دیتا ہے وہ گویا اس فطرت کو جو خدا نے عطا کی ہے منقلب کرنا چاہتا ہے اور فعلِ حکیم مطلق کو اپنی کوتاہ فہمی سے قابلِ اعتراض ٹھہراتا ہے۔ کیا یہ کچھ خوبی کی بات ہے کہ ہم ہر ایک وقت بغیر لحاظ موقعہ و مصلحت اپنے گناہگاروں کے گناہوں سے درگذر کیا کریں اور کبھی اس قسم کی ہمدردی نہ کریں جس میں شریر کی شرارت کا علاج ہو کر آئندہ اُس کی طبیعت سُدھر جائے۔ ظاہر ہے کہ جیسے بات بات میں سزا دینا اور انتقام لینا مذموم و خلافِ اخلاق ہے اسی طرح یہ بھی خیر خواہی حقیقی کے برخلاف ہے کہ ہمیشہ یہی اصول ٹھہرایا جاوے کہ جب کبھی کسی سے کوئی مجرمانہ حرکت صادر ہو تو جھٹ پٹ اس کے جرم کو معاف کیا جائے۔

جو شخص ہمیشہ مجرم کو سزا کے بغیر چھوڑ دیتا ہے وہ ایسا ہی نظام عالم کا دشمن ہے جیسے وہ شخص کہ ہمیشہ اور ہر حالت میں انتقام اور کینہ کشی پر مستعد رہتا ہے۔ نادان لوگ ہر محل میں عفو اور درگذر کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ہمیشہ درگذر کرنے سے نظام عالم میں ابتری پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ فعل خود مجرم کے حق میں بھی مضر ہے کیونکہ اس سے اُس کی بدی کی عادت پکتی جاتی ہے اور شرارت کا ملکہ راسخ ہوتا جاتا ہے۔ ایک چور کو سزا کے بغیر چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ دوسری مرتبہ کیا رنگ دکھاتا ہے۔ اسی جہت سے خدا تعالیٰ نے اپنی اس کتاب میں جو حکمت سے بھری ہوئی ہے فرمایا۔ وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ یعنی اے دانشمندو! قاتل کے قتل کرنے اور موذی کی اُسی قدر ایذاء دینے میں تمہاری زندگی ہے جس نے ایک انسان کو ناحق بے موجب قتل کر دیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا۔ اور ایسا ہی فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى۔ یعنی خدا حکم فرماتا ہے کہ تم عدل اور احسان اور ایتائے ذی القربیٰ اپنے اپنے محل پر کرو۔ سو جاننا چاہیئے کہ انجیل کی تعلیم اس کمال کے مرتبہ سے جس سے نظام عالم مربوط و مضبوط ہے متنزل و فروتر ہے اور اس تعلیم کو کامل خیال کرنا بھی بھاری غلطی ہے۔ ایسی تعلیم ہرگز کامل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ ان ایام کی تدبیر ہے کہ جب قوم بنی اسرائیل کا اندرونی رحم بہت کم ہو گیا تھا اور بے رحمی اور بے مروّتی اور سنگدلی اور قساوتِ قلبی اور کینہ کشی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی اور خدا کو منظور تھا کہ جیسا وہ لوگ مبالغہ سے کینہ کشی کی طرف مائل تھے ایسے ہی بمبالغہ تمام رحم اور درگذر کی طرف مائل کیا جاوے لیکن یہ رحم اور درگذر کی تعلیم ایسی تعلیم نہ تھی کہ جو ہمیشہ کیلئے قائم رہ سکتی کیونکہ حقیقی مرکز پر اُس کی بنیاد نہ تھی۔ بلکہ اس قانون کی طرح جو مختص المقام ہوتا ہے صرف سرکش یہودیوں کی اصلاح کے لئے ایک خاص مصلحت تھی اور صرف چند روزہ انتظام تھا اور مسیح کو خوب معلوم تھا کہ خدا جلد تر اس عارضی تعلیم کو نیست و نابود کر کے اس کامل کتاب کو دنیا کی تعلیم کے لئے بھیجیگا کہ جو حقیقی نیکی کی طرف تمام دنیا کو بلائے گی اور بندگانِ خدا پر حق اور حکمت کا دروازہ کھول دیگی اس لئے اس کو کہنا پڑا کہ ابھی بہت سی باتیں قابلِ تعلیم باقی ہیں جن کی تم ہنوز برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر میرے بعد ایک دوسرا آنے والا ہے وہ سب باتیں کھول دیگا اور علمِ دین کو بمرتبہ کمال پہنچائیگا۔ سو حضرت مسیح تو انجیل کو ناقص کی ناقص ہی چھوڑ کر آسمانوں پر جا بیٹھے

اور ایک عرصہ تک وہی ناقص کتاب لوگوں کے ہاتھ میں رہی ۔ اور پھر اُسی نبیٔ معصوم کی پیشگوئی کے بموجب قرآن شریف کو خدا نے نازل کیا اور ایسی جامع شریعت عطا فرمائی جس میں نہ توریت کی طرح خواہ نخواہ ہر جگہ اور ہر محل میں دانت کے عوض دانت نکالنا ضروری لکھا اور نہ انجیل کی طرح یہ حکم دیا کہ ہمیشہ اور ہر حالت میں دست دراز لوگوں کے طمانچے کھانے چاہئیں بلکہ وہ کامل کلام عارضی خیالات سے ہٹا کر حقیقی نیکی کی طرف ترغیب دیتا ہے اور جس بات میں واقعی طور پر بھلائی پیدا ہو خواہ وہ بات درشت ہو خواہ نرم اُسی کے کرنے کے لئے تاکید فرماتا ہے ۔ جیسا فرمایا ہے :- وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ (الجزو نمبر ۲۵) یعنی بدی کی پاداش میں اصولِ انصاف تو یہی ہے کہ بدکن آدمی اُسی قدر بدی کا سزاوار ہے جس قدر اس نے بدی کی ہے پر جو شخص عفو کر کے کوئی اصلاح کا کام بجا لائے یعنی ایسا عفو نہ ہو جس کا نتیجہ کوئی خرابی ہو سو اس کا اجر خدا پر ہے ۔

(براہین احمدیہ ص ۳۸۷ - ۴۱۲ حاشیہ درحاشیہ ۳)

دوسرا خلق ایصال خیر میں سے **عدل** ہے اور تیسرا **احسان** اور چوتھا **ایتاء ذی القربیٰ** جیسا کہ اللہ جلّشانہٗ فرماتا ہے :- اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ ۔ یعنی اللہ تعالےٰ کا یہ حکم ہے کہ نیکی کے مقابل پر نیکی کرو ۔ اور اگر عدل سے بڑھ کر احسان کا موقعہ اور محل ہو تو وہاں احسان کرو اور اگر احسان سے بڑھ کر قریبیوں کی طرح طبعی جوش سے نیکی کرنے کا محل ہو تو وہاں طبعی ہمدردی سے نیکی کرو ۔ اور اس سے خدا تعالیٰ منع فرماتا ہے کہ تم حدود اعتدال سے آگے گذر جاؤ یا احسان کے بارے میں منکرانہ حالت تم سے صادر ہو جس سے عقل انکار کرے یعنی یہ کہ تم بے محل احسان کرو یا برمحل احسان کرنے سے دریغ کرو ۔ یا یہ کہ تم محل پر ایتاء ذی القربیٰ کے خلق میں کچھ کمی اختیار کرو ۔ یا حد سے زیادہ رحم کی بارش کرو ۔ اس آیت کریمہ میں ایصالِ خیر کے تین درجوں کا بیان ہے ۔

اوّل یہ درجہ کہ نیکی کے مقابل پر نیکی کی جائے ۔ یہ تو کم درجہ ہے اور ادنیٰ درجہ کا بھلا مانس آدمی بھی یہ خلق حاصل کر سکتا ہے کہ اپنے نیکی کرنے والوں کے ساتھ نیکی کرتا رہے ۔

دوسرا درجہ اس سے مشکل ہے اور وہ یہ کہ ابتداءً آپ ہی نیکی کرنا اور بغیر کسی کے حق کے احسان کے طور پر اس کو فائدہ پہنچانا ۔ اور یہ خلق اوسط درجہ کا ہے ۔ اکثر لوگ غریبوں پر احسان

کرتے ہیں۔ اور احسان میں ایک یہ مخفی عیب ہے کہ احسان کرنے والا خیال کرتا ہے کہ میں نے احسان کیا ہے اور کم سے کم وہ اپنے احسان کے عوض میں شکریہ یا دُعا چاہتا ہے اور اگر کوئی ممنونِ منّت اس کا مخالف ہو جائے تو اس کا نام احسان فراموش رکھتا ہے بعض وقت اپنے احسان کی وجہ سے اس پر فوق الطاقت بوجھ ڈال دیتا ہے اور اپنا احسان اس کو یاد دلاتا ہے۔ جیسا کہ احسان کرنے والوں کو خدا تعالیٰ نے متنبہ کرنے کے لئے فرمایا ہے۔ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی۔ یعنی اے احسان کرنے والو! اپنے صدقات کو جن کی صدق پر بنا چاہیئے احسان یاد دلانے اور دُکھ دینے کے ساتھ برباد مت کرو۔ یعنی صدقہ کا لفظ صدق سے مشتق ہے پس اگر دل میں صدق اور اخلاص نہ رہے تو وہ صدقہ صدقہ نہیں رہتا بلکہ ایک ریاکاری کی حرکت ہوتی ہے۔ ....

تیسرا درجہ ایصالِ خیر کا خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بالکل احسان کا خیال نہ ہو۔ اور نہ شکر گذاری پر نظر ہو بلکہ ایک ایسی ہمدردی کے جوش سے نیکی صادر ہو جیسا کہ ایک نہایت قریبی مثلاً والدہ محض ہمدردی کے جوش سے اپنے بیٹے سے نیکی کرتی ہے۔ یہ وہ آخری درجہ ایصالِ خیر کا ہے جس سے آگے ترقی کرنا ممکن نہیں۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے ان تمام ایصالِ خیر کی قسموں کو محل اور موقعہ سے وابستہ کر دیا ہے اور آیت موصوفہ میں صاف فرما دیا ہے کہ اگر یہ نیکیاں اپنے اپنے محل پر مستعمل نہیں ہونگی تو پھر یہ بدیاں ہو جاویں گی۔ بجائے عدل فحشاء بن جائیگا۔ یعنی حد سے اتنا تجاوز کرنا کہ ناپاک صورت ہو جائے۔ اور ایسا ہی بجائے احسان کے منکر کی صورت نکل آئیگی۔ یعنی وہ صورت جس سے عقل اور کانشنس انکار کرتا ہے۔ اور بجائے ایتاء ذی القربیٰ کے بغی بن جائیگا۔ یعنی وہ بے محل ہمدردی کا جوش ایک بُری صورت پیدا کرے گا۔ اصل میں بغی اس بارش کو کہتے ہیں جو حد سے زیادہ برس جائے اور کھیتوں کو تباہ کر دے اور یا حق واجب سے افزونی کرنا بھی بغی ہے۔ غرض ان تینوں میں سے جو محل پر صادر نہیں ہوگا وہی خراب سیرت ہو جائیگی۔ اسی لئے اِن تینوں کے ساتھ موقعہ اور محل کی شرط لگا دی ہے۔ اسجگہ یاد رہے کہ مجرّد عدل یا احسان یا ہمدردی ذی القربیٰ کو خُلق نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ انسان میں یہ سب طبعی حالتیں اور طبعی قوتیں ہیں کہ جو بچوں میں بھی وجودِ عقل سے پہلے پائی جاتی ہیں مگر خُلق کے لئے عقل شرط ہے اور نیز یہ شرط ہے کہ ہر ایک طبعی قوت محل اور موقع پر استعمال ہو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۹-۴۰)

منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے وہ حالت ہے جو **شجاعت** سے مشابہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ شیرخوار بچّہ بھی اسی قوت کی وجہ سے کبھی آگ میں ہاتھ ڈالنے لگتا ہے۔ کیونکہ انسان کا بچہ بباعث فطرتی جوہر غلبہ انسانیت کے ڈرانے والے نمونوں سے پہلے کسی چیز سے بھی نہیں ڈرتا۔ اس حالت میں انسان نہایت بے باکی سے شیروں اور دوسرے جنگلی درندوں کا بھی مقابلہ کرتا ہے اور تن تنہا مقابلہ کیلئے کئی آدمیوں سے لڑنے کیلئے نکلتا ہے۔ اور لوگ جانتے ہیں کہ بڑا بہادر ہے۔ لیکن یہ صرف ایک طبعی حالت ہے کہ اور درندوں میں بھی پیدا ہوتی ہے بلکہ کتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور حقیقی شجاعت جو محل اور موقعہ کے ساتھ خاص ہے اور جو اخلاق فاضلہ میں سے ایک خُلق ہے وہ ان محل اور موقعہ کے امور کا نام ہے جن کا نام خدا تعالیٰ کے پاک کلام میں اس طرح پر آیا ہے۔ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ۔ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ۔ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ۔ یعنی بہادر وہ ہیں کہ جب لڑائی کا موقعہ آپڑے یا اُن پر کوئی مصیبت آپڑے تو بھاگتے نہیں اُن کا صبر لڑائی اور سختیوں کے وقت میں خدا کی رضامندی کے لئے ہوتا ہے۔ اور اس کے چہرہ کے طالب ہوتے ہیں نہ کہ بہادری دکھانے کے۔ اُن کو ڈرایا جاتا ہے کہ لوگ تمہیں سزا دینے کے لئے اتفاق کر گئے ہیں سو تم لوگوں سے ڈرو۔ پس ڈرانے سے اور بھی اُنکا ایمان بڑھتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ خدا ہمیں کافی ہے۔ یعنی اُن کی شجاعت کُتّوں اور درندوں کی طرح نہیں ہوتی جو صرف طبعی جوش پر مبنی ہو جس کا ایک ہی پہلو پر میل ہو بلکہ اُن کی شجاعت دو پہلو رکھتی ہے۔ کبھی تو وہ اپنی ذاتی شجاعت سے اپنے نفس کے جذبات کا مقابلہ کرتے ہیں اور اُس پر غالب آتے ہیں۔ اور کبھی جب دیکھتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ قرینِ مصلحت ہے تو نہ صرف جوشِ نفس سے بلکہ سچائی کی مدد کیلئے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں مگر نہ اپنے نفس پر بھروسہ کر کے بلکہ خدا پر بھروسہ کر کے بہادری دکھاتے ہیں۔ اور اُن کی شجاعت میں ریاکاری اور خود بینی نہیں ہوتی۔ اور نہ نفس کی پیروی بلکہ ہر ایک پہلو سے خدا کی رضا مقدّم ہوتی ہے۔

اِن آیات میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ حقیقی شجاعت کی جڑ صبر اور ثابت قدمی ہے اور ہر ایک جذبہ نفسانی یا بَلا جو دشمنوں کی طرح حملہ کرے۔ اس کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا اور بُزدل ہو کر بھاگ نہ جانا یہی شجاعت ہے۔ سو انسان اور درندہ کی شجاعت میں بڑا فرق ہے۔ درندہ

ایک ہی پہلو پر جوش اور غضب سے کام لیتا ہے اور انسان جو حقیقی شجاعت رکھتا ہے وہ مقابلہ اور ترکِ مقابلہ میں جو کچھ قرینِ مصلحت ہو وہ اختیار کر لیتا ہے ۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صـــ ۴۴ - ۴۶)

منجملہ انسان کے طبعی امور کے ایک صبر جو اس کو ان مصیبتوں اور بیماریوں اور دکھوں پر پر کرنا پڑتا ہے جو اس پر ہمیشہ پڑتے رہتے ہیں اور انسان بہت سے سیاپے اور جزع فزع کے بعد صبر اختیار کرتا ہے۔ لیکن جاننا چاہیئے کہ خدا کی پاک کتاب کے رُو سے وہ صبر اخلاق میں داخل نہیں ہے بلکہ وہ ایک حالت ہے جو تھک جانے کے بعد ضرورتاً ظاہر ہو جاتی ہے۔ یعنی انسان کی طبعی حالتوں میں سے یہ بھی ایک حالت ہے کہ وہ مصیبت کے ظاہر ہونے کے وقت پہلے روتا چیختا سر پیٹتا ہے۔ آخر بہت سا بخار نکال کر جوش تھم جاتا ہے اور انتہا تک پہنچ کر پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ پس یہ دونوں حرکتیں طبعی حالتیں ہیں۔ ان کو خُلق سے کچھ تعلق نہیں بلکہ اس کے متعلق خلق یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے ہاتھ سے جاتی رہے تو اس چیز کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھ کر کوئی شکایت مُنہ پر نہ لاوے اور یہ کہہ کر کہ خدا کا تھا خدا نے لے لیا اور ہم اُس کی رضا کے ساتھ راضی ہیں۔ اس خُلق کے متعلق خدا تعالیٰ کا پاک کلام قرآن شریف ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے:۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۔ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۔ یعنی اے مومنو! ہم تمہیں اس طرح پر آزماتے رہیں گے کہ کبھی کوئی خوفناک حالت تم پر طاری ہو گی اور کبھی فقر و فاقہ تمہارے شاملِ حال ہو گا اور کبھی تمہارا مالی نقصان ہو گا اور کبھی جانوں پر آفت آئیگی۔ اور کبھی اپنی محنتوں میں ناکام رہوگے اور حسب المراد نتیجے کوششوں کے نہیں نکلیں گے۔ اور کبھی تمہاری پیاری اولاد مریگی۔ پس اُن لوگوں کو خوشخبری ہو کہ جب اُن کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کی چیزیں اور اس کی امانتیں اور اس کے مملوک ہیں۔ پس حق یہی ہے کہ جس کی امانت ہے اُس کی طرف رجوع کرے۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا کی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو خدا کی راہ کو پا گئے۔

غرض اس خُلق کا نام صبر اور رضاء برضائے الٰہی ہے اور ایک طور سے اس خُلق کا نام عدل بھی ہے۔ کیونکہ جبکہ خدا تعالیٰ انسان کی تمام زندگی میں اس کی مرضی سے مومن کام کرتا ہے

اور نیز ہزارہا باتیں اُس کی مرضی کے موافق ظہور میں لاتا ہے اور انسان کی خواہش کے مطابق اِس قدر نعمتیں اس کو دے رکھی ہیں کہ انسان شمار نہیں کر سکتا تو پھر یہ شرط انصاف نہیں کہ اگر وہ کبھی اپنی مرضی بھی منوانا چاہے تو انسان منحرف ہو اور اس کی رضا کے ساتھ راضی نہ ہو۔ اور چون وچرا کرے یا بے دین اور بے راہ ہو جائے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۴۷-۴۸)

نماز اور استغفار دل کی غفلت کے عمدہ علاج ہیں۔ نماز میں دعا کرنی چاہیئے کہ اے اللہ! مجھ میں اور میرے گناہوں میں دُوری ڈال۔ صدق سے انسان دُعا کرتا رہے تو یہ یقینی بات ہے کہ کسی وقت منظور ہو جائے۔ جلدی کرنا اچھی نہیں ہوتی۔ زمیندار ایک کھیت بوتا ہے تو اُسی وقت نہیں کاٹ لیتا۔ بے صبری کرنے والا بے نصیب ہوتا ہے۔ نیک انسان کی یہ علامت ہے کہ وہ بے صبری نہیں کرتا۔ بے صبری کرنے والے بڑے بڑے بے نصیب دیکھے گئے ہیں۔ اگر ایک انسان کنوآں کھودے اور بیس ہاتھ کھودے اور ایک ہاتھ رہ جائے تو اس وقت بے صبری سے چھوڑ دے تو اپنی ساری محنت کو برباد کرتا ہے۔ اور اگر صبر سے ایک ہاتھ اَور بھی کھود لے تو گوہرِ مقصود پالے۔ یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ ذوق اور شوق اور معرفت کی نعمت ہمیشہ دُکھ کے بعد دیا کرتا ہے۔ اگر ہر ایک نعمت آسانی سے مل جائے تو اُس کی قدر نہیں ہُوا کرتی۔ سعدیؒ نے کیا عمدہ کہا ہے۔

گر نہ باشد بدوست راہ بردن ٭ شرطِ عشق است در طلب مُردن

(ملفوظات جلد چہارم ص ۲۲۵)

منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے جو اس کی فطرت کا خاصہ ہے سچّائی ہے انسان جبتک کوئی غرض نفسانی اسکی محرک نہ ہو جھوٹ بولنا نہیں چاہتا۔ اور جھوٹ کے اختیار کرنے میں ایک طرح کی نفرت اور قبض اپنے دل میں پاتا ہے۔ اِسی وجہ سے جس شخص کا صریح جھوٹ ثابت ہو جائے اس سے ناخوش ہوتا ہے اور اس کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ لیکن صرف یہی طبعی حالت اخلاق میں داخل نہیں ہو سکتی بلکہ بچّے اور دیوانے بھی اس کے پابند رہ سکتے ہیں۔ سو اصل حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان ان نفسانی اغراض سے علیحدہ نہ ہو جو راستگوئی سے روک دیتے ہیں تب تک حقیقی طور پر راستگو نہیں ٹھہر سکتا۔ کیونکہ اگر انسان صرف ایسی باتوں میں سچ بولے جن میں اس کا چنداں حرج نہیں اور اپنی عزّت یا مال یا جان کے نقصان کے وقت

جھوٹ بول جائے اور سچ بولنے سے خاموش رہے تو اس کو دیوانوں اور بچوں پر کیا فوقیت ہے؟ کیا پاگل اور نابالغ لڑکے بھی ایسا سچ نہیں بولتے؟ دنیا میں ایسا کوئی بھی نہیں ہوگا کہ جو بغیر کسی تحریک کے خواہ نخواہ جھوٹ بولے۔ پس ایسا سچ جو کسی نقصان کے وقت چھوڑا جائے حقیقی اخلاق میں ہرگز داخل نہیں ہوگا سچ کے بولنے کا بڑا بھاری محل اور موقعہ وہی ہے جس میں اپنی جان یا مال یا آبرو کا اندیشہ ہو۔ اس میں خدا کی تعلیم یہ ہے:-

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ - وَلَا
يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا - وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا
فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ - وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى -
كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ
الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ - وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا -
وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ - وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ -
لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ -

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۴۶-۴۷)

حکماء کے تبدیل اخلاق پر دو مذہب ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ انسان تبدیل اخلاق پر قادر ہے۔ اور دوسرے وہ ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ وہ قادر نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسل اور سُستی نہ ہو اور ہاتھ پیر ہلا دے تو تبدیل ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس مقام پر ایک حکایت یاد آئی ہے اور وہ یہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یونانیوں کے مشہور فلاسفر افلاطون کے پاس ایک آدمی آیا اور دروازہ پر کھڑے ہوکر اندر اطلاع کرائی۔ افلاطون کا قاعدہ تھا کہ جب تک آنے والے کا حلیہ اور نقوش چہرہ کو معلوم نہ کر لیتا تھا اندر نہیں آنے دیتا تھا اور وہ قیافہ سے استنباط کر لیتا تھا کہ شخص مذکور کیسا ہے۔ کس قسم کا ہے۔ نوکر نے آکر اس شخص کا حلیہ حسب معمول بتلایا۔ افلاطون نے جواب دیا کہ اس شخص کو کہدو کہ چونکہ تم میں اخلاق رذیلہ بہت ہیں میں ملنا نہیں چاہتا۔ اس آدمی نے جب افلاطون کا یہ جواب سُنا تو نوکر سے کہا کہ تم جا کر کہدو کہ جو کچھ آپ نے فرمایا وہ ٹھیک ہے مگر میں نے اپنی عادت رذیلہ کا قلع قمع کرکے اصلاح کر لی ہے۔ اس پر افلاطون نے کہا ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کو اندر بلایا اور نہایت عزت واحترام کے ساتھ اس سے ملاقات کی۔

جن حکماء کا یہ خیال ہے کہ تبدیل اخلاق ممکن نہیں وہ غلطی پر ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ملازمت پیشہ لوگ جو رشوت لیتے ہیں جب وہ سچی توبہ کر لیتے ہیں پھر اگر اُن کو کوئی سونے کا پہاڑ بھی دے تو اُس پر نگاہ بھی نہیں کرتے۔

توبہ دراصل حصولِ اخلاق کے لئے بڑی محرک اور مؤید چیز ہے اور انسان کو کامل بنا دیتی ہے۔ یعنی جو شخص اپنے اخلاقِ سیّئہ کی تبدیلی چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ سچے دل اور پکّے ارادے کے ساتھ توبہ کرے۔

(ملفوظات جلد اوّل صفحہ ۱۳۱-۱۳۲)

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ اسلامی تعلیم میں غیر مذہب والوں سے محبت کرنا کسی جگہ حکم نہیں آیا بلکہ حکم ہے کہ بجز مسلمان کے کسی سے محبت نہ کرو۔

امّا الجواب:۔ پس واضح ہو کہ یہ تمام ناقص اور ادھوری انجیل کی نحوستیں ہیں کہ عیسائی لوگ حق اور حقیقت سے دُور جا پڑے۔ ورنہ اگر ایک گہری نظر سے دیکھا جائے کہ **محبّت** کیا چیز ہے اور کس کس محل پر اس کو استعمال کرنا چاہیئے۔ اور **بُغض** کیا چیز ہے اور کِن کن مقامات میں برتنا چاہیئے تو **قرآن کریم کا سچّا فلسفہ** نہ صرف سمجھ میں ہی آتا ہے بلکہ رُوح کو اُس سے معارفِ حقّہ کی ایک کامل روشنی ملتی ہے۔

اب جاننا چاہیئے کہ **محبّت** کوئی تصنّع اور تکلّف کا کام نہیں بلکہ انسانی قویٰ میں سے یہ بھی ایک قوت ہے اور اس کی **حقیقت** یہ ہے کہ دل کا ایک چیز کو پسند کرکے اُس کی طرف کھنچے جانا اور جیسا کہ ہر یک چیز کے اصل خواص اس کے کمال کے وقت بدیہی طور پر محسوس ہوتے ہیں یہی محبت کا حال ہے کہ اس کے جوہر بھی اس وقت کھلے کھلے ظاہر ہوتے ہیں کہ جب اتم اور اکمل درجہ پر پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ۔ یعنی انہوں نے گوسالہ سے ایسی محبت کی کہ گویا اُن کو گوسالہ شربت کی طرح پلا دیا گیا درحقیقت جو شخص کسی سے کامل محبت کرتا ہے تو گویا اُسے پی لیتا ہے یا کھا لیتا ہے اور اس کے اخلاق اور اس کے چال چلن کے ساتھ رنگین ہو جاتا ہے۔ اور جس قدر زیادہ محبت ہوتی ہے اُسی قدر انسان بالطبع اپنے محبوب کی صفات کی طرف کھینچا جاتا ہے یہاں تک کہ اُسی کا رُوپ ہو جاتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ یہی بھید ہے کہ جو شخص خدا سے محبّت کرتا ہے وہ ظلّی طور پر بقدر اپنی استعداد کے اس نور کو حاصل کر لیتا ہے جو خدا تعالیٰ کی ذات

میں ہے اور شیطان سے محبت کرنے والے وہ تاریکی حاصل کر لیتے ہیں جو شیطان میں ہے۔ پس جبکہ محبت کی حقیقت یہ ہے تو پھر کیونکر ایک سچی کتاب جو **منجانب اللہ** ہے اجازت دے سکتی ہے کہ تم شیطان سے وہ محبت کرو جو خدا سے کرنی چاہیئے اور شیطان کے جانشینوں سے وہ پیار کرو جو رحمٰن کے جانشینوں سے کرنا چاہیئے۔ افسوس کہ پہلے تو انجیل کے باطل ہونے پر ہمارے پاس یہی ایک دلیل تھی کہ وہ ایک عاجز **مُشتِ خاک کو خدا** بناتی ہے۔ اَب یہ دلائل بھی پیدا ہوگئیں کہ اُس کی دوسری تعلیمیں بھی گندی ہیں۔ کیا یہ پاک تعلیم ہو سکتی ہے کہ شیطان سے ایسی ہی محبت کرو جیسا کہ خدا سے۔ اور اگر یہ عذر کیا جائے کہ یسوع کے مُنہ سے سہوًا یہ باتیں نکل گئیں کیونکہ وہ **الٰہیات کے فلسفہ سے ناواقف تھا تو یہ عذر نکمّا اور فضول** ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا ہی ناواقف تھا تو کیوں اس نے قوم کے مصلح ہونیکا دعویٰ کیا؟ کیا وہ بچہ تھا؟ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ محبّت کی حقیقت بالالتزام اس بات کو چاہتی ہے کہ انسان سچے دل سے اپنے محبوب کے تمام شمائل اور اخلاق اور عبادات پسند کرے اور ان میں فنا ہونے کے لئے بدل و جان ساعی ہو تا اپنے محبوب میں ہو کر وہ زندگی پاوے جو محبوب کو حاصل ہے۔ سچی محبت کرنے والا اپنے محبوب میں فنا ہو جاتا ہے اپنے محبوب کے گریبان سے ظاہر ہوتا ہے اور ایسی تصویر اس کی اپنے اندر کھینچتا ہے کہ گویا اُسے پی جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اس میں ہو کر اور اس کے رنگ میں رنگین ہو کر اور اُسکے ساتھ ہو کر لوگوں پر ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ درحقیقت اُس کی محبت میں کھویا گیا ہے۔ محبّت ایک عربی لفظ ہے اور اصل معنے اِس کے پُر ہو جانا ہے۔ چنانچہ عرب میں یہ مَثل مشہور ہے تَحَبَّبَ الْحِمَارُ یعنی جب عربوں کو یہ کہنا منظور ہوتا ہے کہ گدھے کا پیٹ پانی سے بھر گیا تو کہتے ہیں کہ تَحَبَّبَ الْحِمَارُ۔ اور جب یہ کہنا منظور ہوتا ہے کہ اونٹ نے اتنا پانی پیا کہ وہ پانی سے پُر ہو گیا تو کہتے ہیں شَرِبَتِ الْاِبِلُ حَتّٰی تَحَبَّبَتْ اور حبّ جو دانہ کو کہتے ہیں وہ بھی اِسی سے نکلا ہے جس سے یہ مطلب ہے کہ وہ پہلے دانہ کی تمام کیفیت سے بھر گیا۔ اور اِسی بنا پر اِحباب سونے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ جو دوسرے سے بھر جائیگا وہ اپنے وجود کو کھو دے گا۔ گویا سو جائیگا اور اپنے وجود کی کچھ حِسّ اس کو باقی نہیں رہیگی۔ پھر جب کہ محبّت کی یہ حقیقت ہے تو ایسی انجیل جس کی تعلیم یہ ہے کہ شیطان سے بھی محبت کرو اور شیطانی گروہ سے بھی پیار کرو دوسرے لفظوں میں

اس کا ماحصل یہ نکلا کہ اُن کی بدکاری میں تم بھی شریک ہو جاؤ۔ **خوب تعلیم** ہے۔ ایسی تعلیم کیونکر خدا تعالےٰ کی طرف سے ہو سکتی ہے بلکہ وہ تو **انسان کو شیطان بنانا چاہتی** ہے۔ خدا انجیل کی اِس تعلیم سے ہر ایک کو بچاوے۔

اگر یہ **سوال** ہو کہ جس حالت میں شیطان اور شیطانی رنگ و روپ والوں سے محبت کرنا حرام ہے تو کس قسم کا خُلق اُن سے برتنا چاہیئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کا پاک کلام **قرآن شریف** یہ ہدایت کرتا ہے کہ اُن پر کمال درجہ کی **شفقت** چاہیئے جیسا کہ ایک رحیم دل آدمی جذامیوں اور اندھوں اور لُولوں اور لنگڑوں وغیرہ دُکھ والوں پر شفقت کرتا ہے اور شفقت اور محبت میں یہ فرق ہے کہ محبّ اپنے محبوب کے تمام قول اور فعل کو بنظرِ استحسان دیکھتا ہے اور رغبت رکھتا ہے کہ ایسے حالات اُس میں بھی پیدا ہو جائیں۔ مگر مُشفق شخص مُشفق علیہ کے حالات بنظرِ خوف و عبرت دیکھتا ہے اور اندیشہ کرتا ہے کہ شاید وہ شخص اس تباہ حال میں ہلاک نہ ہو جائے۔ اور **حقیقی مشفق** کی یہ علامت ہے کہ وہ شخص مشفق علیہ سے ہمیشہ نرمی سے پیش نہیں آتا بلکہ اُس کی نسبت محل اور موقعہ کے مناسب حال کارروائی کرتا ہے اور کبھی نرمی اور کبھی درشتی سے پیش آتا ہے۔ بعض وقت اس کو شربت پلاتا ہے اور بعض وقت ایک صادق ڈاکٹر کی طرح اس کا ہاتھ یا پَیر کاٹنے میں اس کی زندگی دیکھتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کے کسی عضو کو چیرتا ہے اور بعض اوقات مرہم لگاتا ہے۔ اگر تم ایک دن ایک بڑے شفاخانہ میں جہاں صدہا بیمار اور ہر یک قسم کے مریض آتے ہوں بیٹھ کر ایک حاذق تجربہ کار ڈاکٹر کی کارروائیوں کو مشاہدہ کرو تو اُمید ہے کہ **مشفق** کے معنے تمہاری سمجھ میں آجائیں گے سو **تعلیم قرآنی** ہمیں یہی **سبق** دیتی ہے کہ نیکوں اور ابرار اخیار سے محبت کرو اور فاسقوں اور کافروں پر شفقت کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ یعنی اے کافرو! یہ نبی ایسا مشفق ہے جو تمہارے رنج کو دیکھ نہیں سکتا اور نہایت درجہ خواہشمند ہے کہ تم ان بلاؤں سے نجات پا جاؤ۔ پھر فرماتا ہے۔ لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۔ یعنی کیا تو اس غم سے ہلاک ہو جائیگا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے مطلب یہ ہے کہ تیری شفقت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ تو ان کے غم میں ہلاک ہونے کے قریب ہے اور پھر ایک مقام میں فرماتا ہے۔ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَۃِ۔ یعنی

مومن وہی ہیں جو ایک دوسرے کو صبر اور مرحمت کی نصیحت کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہتے ہیں کہ شدائد پر صبر کرو اور خدا کے بندوں پر شفقت کرو۔ اسجگہ بھی مرحمت سے مراد شفقت ہے۔ کیونکہ مرحمت کا لفظ زبان عرب میں شفقت کے معنوں پر مستعمل ہے۔ پس قرآنی تعلیم کا اصل مطلب یہ ہے کہ محبت جس کی حقیقت محبوب کے رنگ سے رنگین ہو جانا ہے بجز خدا تعالیٰ اور صلحاء کے اور کسی سے جائز نہیں بلکہ سخت حرام ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ اور فرماتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ۔ اور پھر دوسرے مقام میں فرماتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ یعنی یہود اور نصاریٰ سے محبت مت کرو۔ اور ہر ایک شخص جو صالح نہیں اُس سے محبت مت کرو۔ اِن آیتوں کو پڑھ کر نادان عیسائی دھوکا کھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ عیسائی وغیرہ بے دین فرقوں سے محبت نہ کریں۔ لیکن نہیں سوچتے کہ ہریک لفظ اپنے محل پر استعمال ہوتا ہے۔ جس چیز کا نام محبت ہے وہ فاسقوں اور کافروں سے اُسی صورت میں بجا لانا متصور ہے کہ جب ان کے کفر اور فسق سے کچھ حصہ لے لیوے۔ نہایت سخت جاہل وہ شخص ہوگا جس نے یہ تعلیم دی کہ اپنے دین کے دشمنوں سے پیار کرو۔ ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ پیار اور محبت اسی کا نام ہے کہ اس شخص کے قول اور فعل اور عادت اور خُلق اور مذہب کو رضا کے رنگ میں دیکھیں اور اس پر خوش ہوں اور اُس کا اثر اپنے دل پر ڈالیں اور ایسا ہونا مومن سے کافر کی نسبت ہرگز ممکن نہیں۔ ہاں مومن کافر پر شفقت کریگا۔ اور تمام دقائق ہمدردی بجا لائیگا اور اُس کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کا غمگسار ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے کہ بغیر لحاظ مذہب ملّت کے تم لوگوں سے ہمدردی کرو۔ بھوکوں کو کھلاؤ۔ غلاموں کو آزاد کرو۔ قرضداروں کے قرض دو۔ اور زیر باروں کے بار اُٹھاؤ۔ اور بنی نوع سے سچی ہمدردی کا حق ادا کرو۔ اور فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى۔ یعنی خدا تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ عدل کرو۔ اور عدل سے بڑھ کر یہ کہ احسان کرو۔ جیسے بچہ سے اس کی والدہ یا کوئی اور شخص محض قرابت کے جوش سے کسی کی ہمدردی کرتا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے۔ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ یعنی نصاریٰ وغیرہ سے جو خدا نے

محبت کرنے سے ممانعت فرمائی تو اس سے یہ نہ سمجھو کہ وہ نیکی اور احسان اور ہمدردی کرنے سے تمہیں منع کرتا ہے۔ نہیں بلکہ جن لوگوں نے تمہارے قتل کرنے کیلئے لڑائیاں نہیں کیں اور تمہیں تمہارے وطنوں سے نہیں نکالا وہ اگرچہ عیسائی ہوں یا یہودی ہوں بے شک اُن پر احسان کرو۔ اُن سے ہمدردی کرو انصاف کرو کہ خدا ایسے لوگوں سے پیار کرتا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے۔
اِنَّمَا یَنۡھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ قَاتَلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَاَخۡرَجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ وَظَاھَرُوۡا عَلٰۤی اِخۡرَاجِکُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡھُمۡ وَمَنۡ یَّتَوَلَّھُمۡ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوۡنَ۔
یعنی خدا نے جو تمہیں ہمدردی اور دوستی سے منع کیا ہے تو صرف ان لوگوں کی نسبت جنہوں نے دینی لڑائیاں تم سے کیں اور تمہیں تمہارے وطنوں سے نکالا۔ اور بس نہ کیا جب تک باہم مل کر تمہیں نکال نہ دیا۔ سو ان کی دوستی حرام ہے۔ کیونکہ یہ دین کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اسجگہ یاد رکھنے کے لائق ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ **تولّی** عربی زبان میں **دوستی** کو کہتے ہیں جس کا دوسرا نام **مودّت** ہے۔ اور اصل حقیقت **دوستی** اور مودت کی **خیر خواہی** اور ہمدردی ہے سو مومن نصاریٰ اور یہود اور ہنود سے دوستی اور ہمدردی اور خیر خواہی کر سکتا ہے۔ **احسان** کر سکتا ہے۔ مگر اُن سے محبّت نہیں کر سکتا۔ یہ ایک باریک فرق ہے اس کو خوب یاد رکھو۔

(نور القرآن ۲ ص ۵۴ - ۶۱)

ایمان یقین اور معرفت

جاننا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ اور عالم مجازات اور دیگر امور مبدء اور معاد کے ماننے میں فلسفیوں کا طریقہ انبیاء علیہم السلام کے طریقہ سے بہت مختلف ہے۔ نبیوں کے طریق کا اصل اعظم یہ ہے کہ ایمان کا ثواب تب مترتب اور بارور ہوگا کہ جب غیب کی باتوں کو غیب ہی کی صورت میں قبول کیا جائے اور ظاہری حواس کی کھلی کھلی شہادتیں یا دلائل ہندسیہ کے یقینی اور قطعی ثبوت طلب نہ کئے جائیں۔ کیونکہ تمام و کمال مدارِ ثواب اور استحقاق قرب و توصّل الٰہی کا تقویٰ پر ہے اور تقویٰ کی حقیقت وہی شخص اپنے اندر رکھتا ہے جو افراط آمیز تفتیشوں اور لمبے چوڑے انکاروں اور ہر ہر جزئی کی موشگافی سے اپنے تئیں بچاتا ہے اور صرف دُور اندیشی کے طور سے ایک راہ کی سچائی کا دوسری راہوں پر غلبہ اور رجحان دیکھ کر بحُسن ظن قبول کر لیتا ہے۔ اِسی بات کا نام **ایمان** ہے۔ اور اِسی ایمان پر فیوض الٰہی کا دروازہ کھلتا ہے اور دنیا و آخرت میں سعادتیں حاصل ہوتی ہیں جب کوئی نیک بندہ ایمان پر محکم قدم مارتا ہے۔ اور پھر دُعا اور نماز اور فکر اور نظر سے اپنی حالت علمی میں ترقی چاہتا ہے تو خدائے تعالیٰ خود اس کا متولی ہو کر اور آپ اس کا ہاتھ پکڑ کر درجۂ ایمان سے درجۂ **عین الیقین** تک اس کو پہنچا دیتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ بعد استقامت و مجاہدات و ریاضات و تزکیہ و تصفیہ نفس ملتا ہے پہلے نہیں۔ اور جو شخص پہلے ہی تمام جزئیات کی بکلّی صفائی کرنا چاہتا ہے اور قبل از صفائی اپنے بدعقائد اور بداعمال کو کسی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتا وہ اس ثواب اور اس رہ کے پانے سے محروم ہے۔ کیونکہ ایمان اسی حد تک ایمان ہے جب تک وہ امور جن کو مانا گیا ہے کسی قدر پردۂ غیب میں ہیں یعنی ایسی حالت پر واقع ہیں جو ابھی تک عقلی ثبوت نے اُن پر احاطۂ تام نہیں کیا اور نہ کسی کشفی طور پر وہ نظر آئی بلکہ اُن کا ثبوت صرف غلبۂ ظن تک پہنچا ہے و بس۔

یہ تو انبیاء کا سچا فلسفہ ہے جس پر قدم مارنے سے کروڑہا بندگانِ خدا آسمانی برکتیں پا چکے ہیں اور جس پر ٹھیک چلنے سے بے شمار خلق اللہ معرفت تامہ کے درجہ تک پہنچ

چکی ہیں اور ہمیشہ پہنچتی ہیں۔ اور جن اعلیٰ درجہ کی نعمتوں کو شوخی اور جلدی سے فلسفی لوگوں نے ڈھونڈا اور نہ پایا وہ سب مراتب ان ایماندار بندوں کو بڑی آسانی سے مل گئے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر اُس میں معرفت تامہ کے درجہ تک پہنچ گئے کہ جو کسی فلسفی کے کانوں نے اُس کو نہیں سُنا اور نہ اس کی آنکھ نے دیکھا اور نہ کبھی اس کے دل میں گذرا۔ لیکن اس کے مقابلہ پر خشک فلاسفروں کا جھوٹا اور مغشوش فلسفہ جس پر آجکل کے نو تعلیم یافتہ لوگ فریفتہ ہو رہے ہیں اور جس کے بد نتائج کی بے خبری نے بہت سے سادہ لوحوں کو برباد کر دیا ہے۔ یہ ہے کہ جب تک کسی اصل یا فرع کا قطعی طور پر فیصلہ نہ ہو جائے اور بکلی اس کا انکشاف نہ ہو جائے تب تک اس کو ہرگز ماننا نہیں چاہیئے گو خدا ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ ان میں سے اعلیٰ درجہ کے اور کامل فلاسفر جنہوں نے ان اصولوں کی سخت پابندی اختیار کی تھی انہوں نے اپنا نام محققین رکھا جن کا دوسرا نام دہریہ بھی ہے۔ ان کامل فلاسفروں کا بہ پابندی اپنے اصول قدیمہ کے یہ مذہب رہا ہے کہ چونکہ خدا تعالےٰ کا وجود قطعی طور پر بذریعہ عقل ثابت نہیں ہو سکتا اور نہ ہم نے اس کو بچشم خود دیکھا اِس لئے ایسے خدا کا ماننا ایک امر مظنون اور مشتبہ کا مان لینا ہے جو اصول متقررہ فلسفہ سے بکلّی بعید ہے۔ سو انہوں نے پہلے ہی خدائے تعالیٰ کو درمیان سے اُٹھایا۔ پھر فرشتوں کا یوں فیصلہ کیا کہ یہ بھی خدائے تعالےٰ کی طرح نظر نہیں آتے چلو یہ بھی درمیان سے اٹھاؤ۔ پھر روحوں کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ رائے ظاہر کی کہ ہم کوئی ثبوت قابل اطمینان اس بات پر نہیں دیکھتے کہ بعد مرنے کے رُوح باقی رہ جاتی ہے نہ کوئی رُوح نظر آتی ہے اور نہ واپس آکر کچھ اپنا قصّہ سُناتی ہے بلکہ سب روحیں مفارقت بدن کے بعد خدا اور فرشتوں کی طرح بے اثر اور بے نشان ہیں سو اُن کا بھی وجود ماننا خلاف دلیل و برہان ہے۔ ان سب فیصلوں کے بعد ان کی نظر عمیق نے تکالیف شرعیہ کی مشقت اور حلال حرام کا فرق اصول فلسفہ کا سخت مخالف سمجھا اس لئے انہوں نے صاف صاف اپنی رائے ظاہر کر دی کہ ماں اور بہن اور جورو میں فرق کرنا یا اور چیزوں میں سے بلا ثبوت ضرر طبعی بعض چیزوں کو حرام سمجھ لینا یہ سب بناوٹی باتیں ہیں جن پر کوئی فلسفی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ ننگا رہنے میں کوئی شناعت عقلی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس میں طبّی قواعد کی رو سے فوائد ہیں۔ اسی طرح ان فلاسفروں کے اور بھی مسائل ہیں اور خلاصہ ان کے مذہب کا یہی ہے کہ وہ بجز

دلائل قطعیہ عقلیہ کے کسی چیز کو نہیں مانتے۔ اور ان کی فلسفیانہ نگاہ میں گو کیسی کوئی بدعملی ہو جب تک براہین قطعیہ فلسفیہ سے اس کا بد ہونا ثابت نہ ہولے یعنی جب تک اس میں کوئی طبّی ضرر یا دنیوی بدانتظامی متصور نہ ہو تب تک اس کا ترک کرنا بے جا ہے مگر جو دوسرے درجہ کے فلاسفر ہیں انہوں نے لوگوں کے لعن طعن سے اندیشہ کرکے اپنے فلاسفری اصولوں کو کچھ نرم کر دیا ہے اور قوم کے خوف اور ہم جنسوں کی شرم سے خدا اور عالم جزا اور دوسری کئی باتوں کو ظنّی طور پر تسلیم کر بیٹھے ہیں لیکن یہ اعلیٰ درجہ کے فلاسفر اُنکو سخت نالائق اور بدفہم اور غبی الطبع اور بُزدل اور اپنی سوسائٹی کے بدنام کنندہ خیال کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے فلاسفر ہونے کا دعویٰ تو کیا لیکن اصول فلسفہ پر جیسا کہ حق چلنے کا تھا نہیں چلے۔ اس لئے اوّل درجہ کے فلاسفر اس بات سے عار رکھتے ہیں کہ اِن ناقصوں کو فلاسفر کے باعزت لفظ سے مخاطب یا موسوم کیا جائے۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۳۵-۴۰ حاشیہ)

مَیں ان خشک فلسفیوں کو جو عشق الٰہی اور اسکی بزرگ ذات کی قدرشناسی سے غافل ہیں جہاں تک مجھے طاقت عقلی دی گئی ہے بدلائل شافیہ راہ راست کی طرف پھیرنا چاہتا ہوں کیونکہ مَیں دیکھتا ہوں کہ اُن کی رُوحانی زندگی بہت ہی کمزور ہو گئی ہے اور ان کی بے جا آزادی اور ضعفِ ایمان نے بہت ہی بُرا اثر اُن کے ارادت باطنی اور ان کی دینی اولوالعزمی اور ان کی اندرونی حالت پر ڈالا ہے اور عجیب طور پر انہوں نے ضلالت کو صداقت کے ساتھ ملا دیا ہے۔ مذہب وہ چیز ہے جس کی برکات کی اصل جڑھ ایمان و اعتبار و حسن اعتقاد و حسن ظنّ و اطاعت و اتباع مخبرِ صادق و کلام الٰہی ہے۔ لیکن وہ لوگ اپنے غلط فلسفہ کی وجہ سے مذہب کی حقیقت کچھ اَور ہی سمجھ رہے ہیں۔ سو انہیں لازم ہے کہ تعصّب اور خودپسندی کے شور و غوغا سے اپنے تئیں الگ کر کے سیدھی نظر اور سیدھے خیال سے اس سوال پر غور کریں کہ ایمان کیا شئے ہے اور اس پر ثواب مترتب ہونے کی کیوں امید کی جاتی ہے؟ سو جاننا چاہیئے کہ **ایمان** اس اقرارِ لسانی و تصدیق قلبی سے مراد ہے جو تبلیغ و پیغام کسی نبی کی نسبت محض تقویٰ اور دُور اندیشی کے لحاظ سے صرف نیک ظنّی کی بنیاد پر یعنی بعض وجوہ کو معتبر سمجھ کر اور اس طرف غلبہ اور رجحان پا کر بغیر انتظارِ کامل اور قطعی اور واشگاف ثبوت کے دلی انشراح سے قبولیت و تسلیم ظاہر کی جائے۔ لیکن جب ایک خبر کی صحت پر

وجوہِ کاملہ قیاسیہ اور دلائل کافیہ عقلیہ مل جائیں تو اِس بات کا نام **ایقان** ہے جس کو دوسرے لفظوں میں **علم الیقین** بھی کہتے ہیں۔ اور جب خدائے تعالیٰ خود اپنے خاص جذبہ اور موہبت سے خارق عادت کے طور پر انوارِ ہدایت کھولے اور اپنے آلاء و نعماء سے آشنا کرے۔ اور لدنّی طور پر عقل اور علم عطا فرماوے اور ساتھ اس کے ابوابِ کشف اور الہام بھی منکشف کرکے عجائباتِ الوہیت کا سیر کرادے اور اپنے محبوبانہ حسن و جمال پر اطلاع بخشے تو اِس مرتبہ کا نام **عرفان** ہے جس کو دوسرے لفظوں میں **عین الیقین** اور **ہدایت** اور **بصیرت** کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ اور جب اِن تمام مراتب کی شدّتِ اثر سے عارف کے دل میں ایک ایسی کیفیت حالی عشق اور محبت کے باذنہٖ تعالیٰ پیدا ہو جائے کہ تمام وجود عارف کا ں کی لذّت سے بھر جائے اور آسمانی انوار اس کے دل پر بکلّی احاطہ کرکے ہریک ظلمت و قبض و تنگی کو درمیان سے اُٹھا دیں یہاں تک کہ بوجہ کمال رابطۂ عشق و محبت و بباعث انتہائی جوشِ صدق و صفا کے بلاء اور مصیبت بھی محسوس اللذّت اور مدرک الحلاوت ہو تو اس درجہ کا نام **اطمینان** ہے جس کو دوسرے لفظوں میں **حق الیقین** اور **فلاح** اور **نجات** سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ مگر یہ سب مراتب ایمانی مرتبہ کے بعد ملتے ہیں اور اس پر مترتب ہوتے ہیں۔ جو شخص اپنے ایمان میں قوی ہوتا ہے وہ رفتہ رفتہ اِن سب مراتب کو پالیتا ہے۔ لیکن جو شخص ایمانی طریق کو اختیار نہیں کرتا اور ہریک صداقت کے قبول کرنے سے اوّل قطعی اور یقینی اور نہایت واشگاف ثبوت مانگتا ہے اس کی طبیعت کو اس راہ سے کچھ مناسبت نہیں اور وہ اِس لائق ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس قادر غنی بے نیاز کے فیوض حاصل کرے۔ عادت اللہ قدیم سے اِسی طرح پر جاری ہے اور یہ اس فنِ علمِ الٰہی کا نہایت باریک نکتہ ہے جس پر سعادتمندوں کو غور کرنی چاہیئے کہ ہمیشہ ثواب اور فیضانِ سماوی ایمان پر ہی مترتب ہوتا ہے۔ اس راہ کا سچّا فلسفہ یہی ہے کہ انسان دین قبول کرنے کی ابتدائی حالت میں اس بے نیازِ مطلق اور اسکی قدرت اور اس کے وعد و وعید اور اس کے اخبار و اسرار کے ماننے میں لمبے لمبے انکاروں سے مجتنب رہے۔ کیونکہ ایمانی صورت کے قائم رکھنے کیلئے (جس پر تمام ثواب وابستہ ہے) ضرور تھا کہ خدائے تعالیٰ امور ایمانیہ کو ایسا منکشف نہ کرتا کہ وہ دوسرے بدیہات کی طرح ہریک عام اور خاص کی نظر میں مسلّم الوجود ہو جاتی۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۲۲-۳۲)

ایمان اس بات کو کہتے ہیں کہ اُس حالت میں مان لینا کہ جبکہ ابھی علم کمال تک نہیں پہنچا اور شکوک وشبہات سے ہنوز لڑائی ہے۔ پس جو شخص ایمان لاتا ہے یعنی باوجود کمزوری اور نہ مہیّا ہونے کے کل اسباب یقین کے اس بات کو اغلب احتمال کی وجہ سے قبول کر لیتا ہے وہ حضرت احدیت میں صادق اور راستباز شمار کیا جاتا ہے اور پھر اس کو موہبت کے طور پر معرفتِ تامہ حاصل ہوتی ہے اور ایمان کے بعد عرفان کا جام اُس کو پلایا جاتا ہے۔ اسی لئے ایک مردِ متقی رسولوں اور نبیوں اور مامورین من اللہ کی دعوت کو سُنکر ہر ایک پہلو پر ابتداء امر میں ہی حملہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ حصہ جو کسی مامور من اللہ کے منجانب اللہ ہونے پر بعض صاف اور کھلے کھلے دلائل سے سمجھ آجاتا ہے اُسی کو اپنے اقرار اور ایمان کا ذریعہ ٹھہرا لیتا ہے اور وہ حصہ جو سمجھ نہیں آتا اُس میں سنتِ صالحین کے طور پر استعارات اور مجازات قرار دیتا ہے اور اس طرح تناقض کو درمیان سے اٹھا کر صفائی اور اخلاص کے ساتھ ایمان لے آتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ اُس کی حالت پر رحم کر کے اور اس کے ایمان پر راضی ہو کر اور اس کی دُعاؤں کو سُنکر معرفتِ تامہ کا دروازہ اس پر کھولتا ہے اور الہام اور کشوف کے ذریعہ سے اور دوسرے آسمانی نشانوں کے وسیلہ سے یقین کامل تک اُس کو پہنچاتا ہے۔

(ایام الصلح صہ ۳۰)

خدا تعالیٰ کا کلام ہمیں یہی سکھلاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ تب نجات پاؤ گے۔ یہ ہمیں ہدایت نہیں دیتا کہ تم ان عقائد پر جو نبی علیہ السلام نے پیش کئے دلائل فلسفیہ اور براہین یقینیہ کا مطالبہ کرو۔ اور جب تک علومِ ہندسہ اور حساب کی طرح وہ صداقتیں کھل نہ جائیں تب تک ان کو مت مانو۔ ظاہر ہے کہ اگر نبی کی باتوں کو علومِ حسّیہ کے ساتھ وزن کر کے ہی ماننا ہے تو وہ نبی کی متابعت نہیں بلکہ ہر یک صداقت جب کامل طور پر کھل جائے خود واجب التسلیم ٹھہرتی ہے خواہ اس کو ایک نبی بیان کرے خواہ غیر نبی۔ بلکہ اگر ایک فاسق بھی بیان کرے تب بھی ماننا ہی پڑتا ہے۔ جس خبر کو نبی کے اعتبار پر اور اس کی صداقت کو مسلّم رکھ کر ہم قبول کرینگے کہ وہ چیز ضرور ایسی ہونی چاہیئے کہ گو عند العقل صدق کا بہت زیادہ احتمال رکھتی ہو مگر کذب کی طرف بھی کسی قدر نادانوں کا وہم جا سکتا ہو تاہم صدق کی شق کو اختیار کر کے اور نبی کو صادق قرار دے کر اپنی نیک ظنّی اور اپنی فراستِ دقیقہ اور اپنے ادب اور اپنے ایمان کا اجر پا لیویں۔ یہی لبّ لباب قرآن کریم کی تعلیم کا ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ لیکن

حکماء اور فلاسفر اس پہلو پر چلے ہی نہیں اور وہ ہمیشہ ایمان سے لاپروا رہے اور ایسے علم کو ڈھونڈتے رہے جس کا فی الفور قطعی اور یقینی ہونا اُن پر کھل جائے۔ مگر یاد رہے کہ خدا تعالیٰ نے ایمان بالغیب کا حکم فرما کر مومنوں کو یقینی معرفت سے محروم رکھنا نہیں چاہا بلکہ یقینی معرفت کے حاصل کرنے کے لئے ایمان ایک زینہ ہے جس زینہ پر چڑھنے کے بغیر سچی معرفت کو طلب کرنا ایک سخت غلطی ہے۔ لیکن اس زینہ پر چڑھنے والے معارف صافیہ اور مشاہدات شافیہ کا ضرور چہرہ دیکھ لیتے ہیں۔ جب ایک ایمان دار بحیثیت ایک صادق مومن کے احکام اور اخبارِ الٰہی کو محض اس جہت سے قبول کر لیتا ہے کہ وہ اخبار اور احکام ایک مخبر صادق کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائے ہیں تو عرفان کا انعام پانے کے لئے مستحق ٹھہر جاتا ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے یہی قانون ٹھہرا رکھا ہے کہ پہلے وہ امور غیبیہ پر ایمان لا کر فرمانبرداروں میں داخل ہوں اور پھر عرفان کا مرتبہ عطا کر کے سب عقدے اُن کے کھولے جائیں لیکن افسوس کہ جلد باز انسان ان راہوں کو اختیار نہیں کرتا۔ خدا تعالیٰ کا قرآن کریم میں یہ وعدہ ہے کہ جو شخص ایمانی طور پر نبی کریم کی دعوت کو مان لیوے تو وہ اگر مجاہدات کے ذریعہ سے اُنکی حقیقت دریافت کرنا چاہے وہ اس پر بذریعہ کشف اور الہام کے کھولے جائیں گے اور اس کے ایمان کو عرفان کے درجہ تک پہنچایا جائے گا۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۲۵۱-۲۵۳ حاشیہ)

مَیں بار بار کہتا ہوں اور زور سے کہتا ہوں کہ اگر عقائد دینیہ فلسفہ کے رنگ پر اور ہندسہ لود حساب کی طرح عام طور پر بدیہی الثبوت ہوتے تو وہ ہرگز نجات کا ذریعہ نہ ٹھہر سکتے۔ بھائیو! یقیناً سمجھو کہ نجات ایمان سے وابستہ ہے۔ اور ایمان امور مخفیہ سے وابستہ ہے۔ اگر حقائق اشیاء مستور نہ ہوتیں تو ایمان نہ ہوتا۔ اور اگر ایمان نہ ہوتا تو نجات کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔ ایمان ہی ہے جو رضائے الٰہی کا وسیلہ اور مراتب قرب کا زینہ اور گناہوں کا زنگ دھونے کیلئے ایک چشمہ ہے۔ اور ہمیں خدائے تعالےٰ کی طرف حاجت ہے۔ اِس کا ثبوت ایمان ہی کے ذریعہ سے ملتا ہے کیونکہ ہم اپنی نجات کے لئے اور ہر ایک دُکھ سے راحت پانے کیلئے خدا تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ اور وہ نجات صرف ایمان سے ہی ملتی ہے۔ کیا دنیا کا عذاب اور کیا آخرت کا دونوں کا علاج ایمان ہے۔ جب ہم ایمان کی قوت سے ایک مشکل کا حل ہو جانا غیر ممکن نہیں دیکھتے تو وہ مشکل ہمارے لئے حل کی جاتی ہے۔ ہم ایمان ہی کی

قوت سے خلافِ قیاس اور بعید از عقل مقاصد کو بھی پا لیتے ہیں۔ ایمان ہی کی قوت سے کرامات ظاہر ہوتی ہیں اور خوارق ظہور میں آتے ہیں۔ اور اَنہونی باتیں ہو جاتی ہیں۔ پس ایمان ہی سے پتہ لگتا ہے کہ خدا ہے۔ خدا فلسفیوں سے پوشیدہ رہا اور حکیموں کو اس کا کچھ پتہ نہ لگا۔ مگر ایمان ایک عاجز دلق پوش کو خدا تعالےٰ سے ملا دیتا ہے اور اس سے باتیں کرا دیتا ہے۔ مومن اور محبوبِ حقیقی میں قوتِ ایمانی دلّالہ ہے۔ یہ قوت ایک مسکین۔ ذلیل۔ خوار۔ مردودِ خلائق کو قصرِ مقدس تک جو عرش اللہ ہے پہنچا دیتی ہے۔ اور تمام پردوں کو اُٹھاتی اُٹھاتی دلآرام ازلی کا چہرہ دکھا دیتی ہے۔ سو اُٹھو! ایمان کو ڈھونڈو اور فلسفہ کے خشک اور بیہودہ ورقوں کو جلاؤ کہ ایمان سے تم کو برکتیں ملیں گی۔ ایمان کا ایک ذرہ فلسفہ کے ہزار دفتر سے بہتر ہے اور ایمان سے صرف آخری نجات نہیں بلکہ ایمان دنیا کے عذابوں اور لعنتوں سے بھی چھڑا دیتا ہے اور رُوح کے تحلیل کرنے والے غموں سے ہم ایمان ہی کی برکت سے نجات پاتے ہیں۔ وہ چیز ایمان ہی ہے جس سے مومن کامل سخت گھبراہٹ اور قلق اور کرب اور غموں کے طوفان کے وقت اور اس وقت کہ جب ناکامی کے چاروں طرف سے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں اور اسباب عادیہ کے تمام دروازے مقفل اور مسدود نظر آتے ہیں مطمئن اور خوش ہوتا ہے۔ ایمان کامل سے سارے استبعاد جاتے رہتے ہیں اور ایمان کو کوئی چیز ایسا نقصان نہیں پہنچاتی جیسا کہ استبعاد اور کوئی ایسی دولت نہیں جیسا کہ ایمان۔ دنیا میں ہر یک ماتم زدہ ہے مگر ایماندار۔ دنیا میں ہر یک سوزش اور فرقت اور جلن میں گرفتار ہے مگر مومن۔ اے ایمان کیا ہی تیرے ثمرات شیریں ہیں۔ کیا ہی تیرے پھول خوشبودار ہیں۔ سبحان اللہ! کیا عجیب تجھ میں برکتیں ہیں کیا ہی خوش نور تجھ میں چمک رہے ہیں۔ کوئی ثریّا تک پہنچ نہیں سکتا مگر وہی جس میں تیری کششیں ہیں خدا تعالیٰ کو یہی پسند آیا کہ اب تو آوے اور فلسفہ جاوے۔ وَلَا رَادَّ لِفَضْلِہٖ۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۲۷۰-۲۷۳ حاشیہ)

ظاہر ہے کہ امر مقدم اور ایک بھاری مرحلہ جو ہمیں طے کرنا چاہیئے وہ **خدا شناسی** ہے اور اگر ہماری خدا شناسی ہی ناقص اور مشتبہ اور دھندلی ہو تو ہمارا ایمان ہرگز منوّر اور چمکیلا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ خدا شناسی جب تک کہ رحیمیت کی صفت کے ذریعہ سے ہمارا چشم دید واقعہ نہ بن جائے تب تک ہم کسی طرح سے اپنے ربّ کریم کی **حقیقی معرفت** کے چشمہ سے آبِ زلال نہیں پی سکتے۔ اگر ہم اپنے تئیں دھوکہ نہ دیں تو ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ ہم تکمیل معرفت

کیلئے اس بات کے محتاج ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفت رحیمیت کے ذریعہ سے تمام شکوک وشبہات ہمارے دُور ہو جاویں اور خدا تعالیٰ کی رحمت اور فضل اور قدرت کی صفات تجربہ میں آکر ہمارے دل پر ایسا قوی اثر پڑے کہ ہمیں ان نفسانی جذبات سے چھڑائے جو محض کمزوریٔ ایمان اور یقین کی وجہ سے ہمارے پر غالب آتے اور دوسری طرف رُخ کر دیتے ہیں کیا یہ سچ نہیں کہ انسان اس چند روزہ دنیا میں آکر بوجہ اس کے کہ خداشناسی کی پُر زور کرنیں اُس کے دل پر نہیں پڑتیں ایک خوفناک تاریکی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور جسقدر دنیا اور دنیا کی املاک اور دنیا کی ریاستیں اور حکومتیں اور دولتیں اس کو پیاری معلوم ہوتی ہیں اسقدر عالم معاد کی لذّات اور خوشحالی حقیقی کی جستجو اُسکو نہیں ہوتی۔ اور اگر کوئی نسخہ دنیا میں ہمیشہ رہنے کا نکلے تو اپنے منہ سے اس بات کے کہنے کیلئے تیار ہے کہ میں بہشت اور عالم آخرت کی نعمتوں کی خواہش سے باز آیا۔ پس اس کا کیا سبب ہے یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اُسکی قدرت اور رحمت اور وعدوں پر **حقیقی ایمان** نہیں۔

پس حق کے طالب کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اس حقیقی ایمان کی تلاش میں لگا رہے اور اپنے تئیں یہ دھوکا نہ دے کہ میں **مسلمان** ہوں اور اور خدا اور رسول پر ایمان لاتا ہوں قرآن شریف پڑھتا ہوں۔ شرک سے بیزار ہوں۔ نماز کا پابند ہوں اور ناجائز اور بد باتوں سے اجتناب کرتا ہوں۔ کیونکہ مرنے کے بعد کامل نجات اور سچی خوشحالی اور حقیقی سرور کا وہ شخص مالک ہوگا جس نے وہ زندہ اور حقیقی نور اس دنیا میں حاصل کر لیا ہے جو انسان کے مُنہ کو اس کے تمام قوتوں اور طاقتوں اور ارادوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف پھیر دیتا ہے اور جس سے اس سفلی زندگی پر ایک موت طاری ہو کر انسانی رُوح میں ایک سچی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ زندہ اور حقیقی نور کیا چیز ہے؟ وہی خداداد طاقت ہے جس کا نام **یقین** **اور معرفت تامہ** ہے۔ یہ وہی طاقت ہے جو اپنے زور آور ہاتھ سے ایک خوفناک اور تاریک گڑھے سے انسان کو باہر لاتی اور نہایت روشن اور پُر امن فضا میں بٹھا دیتی ہے اور قبل اس کے جو یہ روشنی حاصل ہو تمام اعمالِ صالحہ رسم اور عادت کے رنگ میں ہوتے ہیں اور اس صورت میں ادنیٰ ادنیٰ ابتلاؤں کے وقت انسان ٹھوکر کھا سکتا ہے بجز اِس مرتبہ یقین کے خدا سے معاملہ صافی کس کا ہو سکتا ہے؟ جس کو یقین دیا گیا ہے وہ پانی کی طرح خدا کی طرف بہتا ہے اور ہوا کی طرح اس کی طرف جاتا ہے اور آگ کی طرح غیر کو جلا دیتا ہے اور مصائب میں زمین کی طرح ثابت قدمی دکھلاتا ہے۔ خدا کی معرفت دیوانہ

بنا دیتی ہے مگر لوگوں کی نظر میں دیوانہ اور خدا کی نظر میں عقلمند اور فرزانہ۔ یہ شربت کیا ہی شیریں ہے کہ حلق سے اُترتے ہی تمام بدن کو شیریں کر دیتا ہے۔ اور یہ دودھ کیا ہی لذیذ ہے کہ ایک دم میں تمام نعمتوں سے فارغ اور لاپروا کر دیتا ہے۔ مگر اُن دُعاؤں سے حاصل ہوتا ہے جو **جان کو ہتھیلی** پر رکھ کر کی جاتی ہیں۔ اور کسی دوسرے کے خون سے نہیں بلکہ اپنی سچی قربانی سے حاصل ہوتا ہے۔ **کیسا مشکل کام ہے** آہ صد آہ۔

(ایام الصلح ص ۱۴-۱۹)

جو لوگ سچے دل سے خدا کے طالب ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ خدا کی معرفت خدا کے ذریعہ سے ہی میسّر آ سکتی ہے اور خدا کو خدا کے ساتھ ہی شناخت کر سکتے ہیں اور خدا اپنی حجّت آپ ہی پوری کر سکتا ہے۔ انسان کے اختیار میں نہیں۔ اور انسان کبھی کسی حیلہ سے گناہ سے بیزار ہو کر اس کا قرب حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ معرفت کاملہ حاصل نہ ہو اور اس جگہ کوئی کفارہ مفید نہیں اور کوئی طریق ایسا نہیں جو گناہ سے پاک کر سکے بجز اس کامل معرفت کے جو کامل محبت اور کامل خوف کو پیدا کرتی ہے۔ اور کامل محبت اور کامل خوف یہی دونوں چیزیں ہیں جو گناہ سے روکتی ہیں۔ کیونکہ محبت اور خوف کی آگ جب بھڑکتی ہے تو گناہ کے خس و خاشاک کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ اور یہ پاک آگ اور گناہ کی گندی آگ دونوں جمع ہو ہی نہیں سکتیں۔ غرض انسان نہ بدی سے رُک سکتا ہے اور نہ محبت میں ترقی کر سکتا ہے جب تک کہ کامل معرفت اس کو نصیب نہ ہو اور کامل معرفت نہیں ملتی جب تک کہ انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے زندہ برکات اور معجزات نہ دیئے جائیں۔

(دیباچہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۶)

ایمان کے لئے خشوع کی حالت مثل بیج کے ہے۔ اور پھر لغو باتوں کے چھوڑنے سے ایمان اپنا نرم نرم سبزہ نکالتا ہے اور پھر اپنا مال بطور زکوٰۃ دینے سے ایمانی درخت کی ٹہنیاں نکل آتی ہیں جو اس کو کسی قدر مضبوط کرتی ہیں۔ اور پھر شہواتِ نفسانیہ کا مقابلہ کرنے سے اُن ٹہنیوں میں خوب مضبوطی اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اپنے عہد اور امانتوں کی تمام شاخوں کی محافظت کرنے سے درخت ایمان کا اپنے مضبوط تنہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر پھل لانے کے وقت ایک اور طاقت کا فیضان اس پر ہوتا ہے کیونکہ اس طاقت سے پہلے نہ درخت کو پھل لگ سکتا ہے نہ پھول۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۱۵۱ حاشیہ)

یاد رکھو کہ گناہ سے پاک ہونا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ فرشتوں کی سی زندگی بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں دنیا کی بے جا عیاشیوں کو ترک کرنا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ ایک پاک تبدیلی اپنے اندر پیدا کر لینا اور خدا کی طرف ایک خارق عادت کشش سے کھینچے جانا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ زمین کو چھوڑنا اور آسمان پر چڑھ جانا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ خدا سے پورے طور پر ڈرنا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ **تقویٰ** کی باریک راہوں پر قدم مارنا اور اپنے عمل کو ریاکاری کی ملونی سے پاک کر دینا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ ایسا ہی دنیا کی دولت اور حشمت اور اس کی کیمیا پر لعنت بھیجنا اور بادشاہوں کے قرب سے بے پروا ہو جانا اور صرف خدا کو اپنا ایک خزانہ سمجھنا بجز یقین کے ہرگز ممکن نہیں۔

(نزول المسیح ص91)

خدا تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے درحقیقت **تین قسم** پر منقسم ہیں۔ **اوّل** وہ لوگ جو بباعث محجوبیت اور رویت اسباب کے احسانِ الٰہی کا اچھی طرح ملاحظہ نہیں کرتے اور نہ وہ جوش اُن میں پیدا ہوتا ہے جو احسان کی عظمتوں پر نظر ڈال کر پیدا ہوا کرتا ہے اور نہ وہ محبت اُن میں حرکت کرتی ہے جو محسن کی عنایاتِ عظیمہ کا تصور کر کے جنبش میں آیا کرتی ہے بلکہ صرف ایک اجمالی نظر سے خدا تعالیٰ کے حقوق خالقیت وغیرہ کو تسلیم کر لیتے ہیں اور احسانِ الٰہی کی اُن تفصیلات کو جن پر ایک باریک نظر ڈالنا اس حقیقی محسن کو نظر کے سامنے لے آتا ہے ہرگز مشاہدہ نہیں کرتے۔ کیونکہ اسباب پرستی کا گرد و غبار مسبّب حقیقی کا پورا چہرہ دیکھنے سے روک دیتا ہے۔ اس لئے انکو وہ صاف نظر میسّر نہیں آتی جس سے کامل طور پر معطی حقیقی کا جمال مشاہدہ کر سکتے۔ سو ان کی ناقص معرفت رعایتِ اسباب کی کدورت سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور بوجہ اس کے جو وہ خدا کے احسانات کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتے۔ خود بھی اس کی طرف وہ التفات نہیں کرتے جو احسانات کے مشاہدہ کے وقت کرنی پڑتی ہے جس سے محسن کی شکل نظر کے سامنے آ جاتی ہے بلکہ اُن کی معرفت ایک دھندلی سی ہوتی ہے۔ وجہ یہ کہ وہ کچھ تو اپنی محنتوں اور اپنے اسباب پر بھروسہ رکھتے ہیں اور کچھ تکلّف کے طور پر یہ بھی مانتے ہیں کہ خدا کا حق خالقیت اور رزّاقیت ہمارے سر پر واجب ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ انسان کو اس کے وسعتِ فہم سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اس لئے اُن سے جب تک کہ وہ اس حالت میں ہیں یہی چاہتا ہے کہ اس کے حقوق کا شکر ادا کریں۔ اور آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ میں عدل سے مراد یہی اطاعت برعایت عدل ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر ایک اور مرتبہ انسان کی معرفت کا ہے اور وہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں انسان کی نظر رویت اسباب

سے بالکل پاک اور منزہ ہو کر خدا تعالیٰ کے فضل اور احسان کے ہاتھ کو دیکھ لیتی ہے۔ اور اس مرتبہ پر انسان اسباب کے حجابوں سے بالکل باہر آجاتا ہے۔ اور یہ مقولہ کہ مثلاً میری اپنی ہی آبپاشی سے میری کھیتی ہوئی۔ اور یا میرے اپنے ہی بازو سے یہ کامیابی مجھے ہوئی یا زید کی مہربانی سے فلاں مطلب میرا پورا ہوا۔ اور بکر کی خبرگیری سے مَیں تباہی سے بچ گیا۔ یہ تمام باتیں ہیچ اور باطل معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور ایک ہی ہستی اور ایک ہی قدرت اور ایک ہی مُحسن اور ایک ہی ہاتھ نظر آتا ہے۔ تب انسان ایک صاف نظر سے جس کے ساتھ ایک ذرہ شرک فی الاسباب کی گرد و غبار نہیں خدا تعالیٰ کے احسانوں کو دیکھتا ہے۔ اور یہ رویت اس قسم کی صاف اور یقینی ہوتی ہے کہ وہ ایسے محسن کی عبادت کرنے کے وقت اُس کو غائب نہیں سمجھتا بلکہ یقیناً اس کو حاضر خیال کرکے اُس کی عبادت کرتا ہے۔ اور اس عبادت کا نام **قرآن شریف میں احسان ہے**۔ اور صحیح بخاری اور مسلم میں خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے احسان کے یہی معنے بیان فرمائے ہیں۔ اور اس درجہ کے بعد ایک اور درجہ ہے جس کا نام اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی ہے اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب انسان ایک مدت تک احساناتِ الٰہی کو بلا شرکت اسباب دیکھتا رہے اور اس کو حاضر اور بلا واسطہ محسن سمجھ کر اس کی عبادت کرتا رہے تو اس تصوّر اور تخیل کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ذاتی محبت اس کو جناب الٰہی کی نسبت پیدا ہو جائیگی۔ کیونکہ متواتر احسانات کا دائمی ملاحظہ بالضرورت شخص ممنون کے دل میں یہ اثر پیدا کرتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اس شخص کی ذاتی محبت سے بھر جاتا ہے جس کے غیر محدود احسانات اس پر محیط ہوگئے۔ پس اس صورت میں وہ صرف احسانات کے تصوّر سے اُس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ اُس کی ذاتی محبت اس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ جیساکہ بچہ کو ایک ذاتی محبّت اپنی ماں سے ہوتی ہے۔ پس اِس مرتبہ پر وہ عبادت کے وقت صرف خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہی نہیں بلکہ دیکھ کر **سچے عشاق کی طرح لذت بھی اُٹھاتا ہے**۔ اور تمام اغراض نفسانی معدوم ہو کر ذاتی محبت اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ وہ مرتبہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے لفظ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی سے تعبیر کیا ہے اور اسی کی طرف خدا تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔ غرض آیت اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى کی یہ تفسیر ہے اور اس میں خدا تعالےٰ نے **تینوں مرتبے** انسانی معرفت کے بیان کر دیئے اور **تیسرے مرتبہ** کو محبت ذاتی کا مرتبہ قرار دیا اور یہ وہ مرتبہ ہے جس میں

تمام اغراض نفسانی جل جاتے ہیں۔ اور دل ایسا محبت سے بھر جاتا ہے جیسا کہ **ایک شیشہ عطر** سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اسی مرتبہ کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۔ یعنی بعض مومن لوگوں میں سے وہ بھی ہیں کہ اپنی جانیں رضاء الٰہی کے عوض میں بیچ دیتے ہیں۔ اور خدا ایسوں ہی پر مہربان ہے۔ اور پھر فرمایا بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ یعنی وہ لوگ نجات یافتہ ہیں جو خدا کو اپنا وجود حوالے کر دیں اور اس کی نعمتوں کے تصور سے اس طور سے اس کی عبادت کریں کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہیں۔ سو ایسے لوگ خدا کے پاس سے اجر پاتے ہیں۔ اور نہ اُن کو کچھ خوف ہے اور نہ وے کچھ غم کرتے ہیں۔ یعنی اُن کا مدّعا خدا اور خدا کی محبت ہو جاتی ہے۔ اور خدا کے پاس کی نعمتیں اُن کا اجر ہوتا ہے۔ اور پھر ایک جگہ فرمایا يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۔ یعنی مومن وہ ہیں جو خدا کی محبت سے مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو روٹی کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس روٹی کھلانے سے تم سے کوئی بدلہ اور شکر گذاری نہیں چاہتے اور نہ ہماری کچھ غرض ہے۔ ان تمام خدمات سے صرف خدا کا چہرہ ہمارا مطلب ہے۔ اب سوچنا چاہیئے کہ اِن تمام آیات سے کس قدر صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ **قرآن شریف نے اعلیٰ طبقہ** عبادتِ الٰہی اور اعمال صالحہ کا یہی رکھا ہے کہ محبتِ الٰہی اور رضائے الٰہی کی طلب سچے دل سے ظہور میں آوے۔ مگر اس جگہ **سوال** یہ ہے کہ کیا یہ عمدہ تعلیم جو نہایت صفائی سے بیان کی گئی ہے **انجیل** میں بھی موجود ہے؟ ہم ہر یک کو یقین دلاتے ہیں کہ اس صفائی اور تفصیل سے **انجیل** نے ہرگز بیان نہیں کیا۔ خدا تعالیٰ نے تو اس **دین** کا نام **اسلام** اس غرض سے رکھا ہے کہ تا انسان خدا تعالیٰ کی عبادت نفسانی اغراض سے نہیں بلکہ طبعی جوش سے کرے۔ کیونکہ اسلام تمام اغراض کے چھوڑ دینے کے بعد **رضاء بقضاء** کا نام ہے۔ دنیا میں بجز اسلام ایسا کوئی مذہب نہیں جس کے یہ مقاصد ہوں بے شک خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت کے جتلانے کے لئے مومنوں کو انواع اقسام کی نعمتوں کے وعدے دیئے ہیں مگر مومنوں کو جو اعلیٰ مقام کے خواہشمند ہیں یہی تعلیم دی ہے کہ وہ محبت ذاتی سے خدا تعالیٰ کی عبادت کریں۔

(نور القرآن ۲ ص ۶۳-۶۶)

اِس جگہ یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ آیت موصوفہ بالا یعنی بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ

فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ سعادت تامہ کے تینوں فردی درجوں یعنی **فنا** اور **بقا** اور **لقا** کی طرف اشارت کرتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کا فقرہ یہ تعلیم کر رہا ہے کہ تمام قویٰ اور اعضاء اور جو کچھ اپنا ہے خدا تعالیٰ کو سونپ دینا چاہیئے اور اس کی راہ میں وقف کر دینا چاہیئے۔ اور یہ وہی کیفیت ہے جس کا نام دوسرے لفظوں میں **فنا** ہے۔ وجہ یہ کہ جب انسان نے حسب مفہوم اس آیت ممدوحہ کے اپنا تمام وجود معہ اُسکی تمام قوتوں کے خدا تعالیٰ کو سونپ دیا اور اس کی راہ میں وقف کر دیا اور اپنی نفسانی جنبشوں اور سکونوں سے بکلّی باز آگیا تو بلاشبہ ایک قسم کی موت اس پر طاری ہو گئی اور اسی موت کو اہل تصوّف **فنا** کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

پھر بعد اس کے وَهُوَ مُحْسِنٌ کا فقرہ مرتبہ **بقا** کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ جب انسان بعد فنائے اکمل واتم وسلب جذبات نفسانی الٰہی جذبہ اور تحریک سے پھر جنبش میں آیا اور بعد منقطع ہو جانے تمام نفسانی حرکات کے پھر ربانی تحریکوں سے پُر ہو کر حرکت کرنے لگا تو یہ وہ **حیات ثانی** ہے جس کا نام **بقا** رکھنا چاہیئے۔

پھر بعد اس کے یہ فقرات فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ جو اثبات اور ایجاب اجر ونفی وسلب خوف وحزن پر دلالت کرتی ہیں یہ حالتِ **لقا** کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ جس وقت انسان کے عرفان اور یقین اور توکل اور محبت میں ایسا مرتبہ عالیہ پیدا ہو جائے کہ اس کے خلوص اور ایمان اور وفا کا اجر اس کی نظر میں وہمی اور خیالی اور ظنی نہ رہے بلکہ ایسا یقینی اور قطعی اور مشہود اور مرئی اور محسوس ہو کہ گویا وہ اس کو مل چکا ہے اور خدا تعالیٰ کے وجود پر ایسا یقین ہو جائے کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے اور ہر یک آئندہ کا خوف اُس کی نظر سے اُٹھ جاوے اور ہر یک گذشتہ اور موجودہ غم کا نام ونشان نہ رہے۔ اور ہر یک روحانی تنعم موجود الوقت نظر آوے تو یہی حالت جو ہر یک قبض اور کدورت سے پاک اور ہر یک دغدغہ اور شک سے محفوظ اور ہر یک درد انتظار سے منزہ ہے **لقا** کے نام سے موسوم ہے۔ اور اِس مرتبہ لقا پر محسن کا لفظ جو آیت میں موجود ہے نہایت صراحت سے دلالت کر رہا ہے کیونکہ **احسان** حسب تشریح نبی صلے اللہ علیہ وسلم اسی حالتِ کاملہ کا نام ہے کہ جب انسان اپنی پرستش کی حالت میں خدا تعالےٰ سے ایسا تعلق پیدا کرے کہ گویا اُس کو دیکھ رہا ہے۔

اور یہ **لقا** کا مرتبہ تب سالک کے لئے کامل طور پر متحقق ہوتا ہے کہ جب ربّانی رنگ

بشریت کے رنگ و بو کو بتمام و کمال اپنے رنگ کے نیچے متواری اور پوشیدہ کر دیوے جس طرح آگ لوہے کے رنگ کو اپنے نیچے ایسا چھپا لیتی ہے کہ نظرِ ظاہر میں بجز آگ کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ وہی مقام ہے جس پر پہنچکر بعض سالکین نے لغزشیں کھائی ہیں اور شہودی پیوند کو وجودی پیوند کے رنگ میں سمجھ لیا ہے۔ اس مقام میں جو اولیاء اللہ پہنچے ہیں یا جن کو اس میں سے کوئی گھونٹ میسّر آ گیا ہے بعض اہل تصوف نے اُن کا نام **اطفال اللہ** رکھ دیا ہے اس مناسبت سے کہ وہ لوگ صفاتِ الٰہی کے کنارِ عاطفت میں بکلّی جا پڑے ہیں۔ اور جیسے ایک شخص کا لڑکا اپنے حلیہ اور خط و خال میں کچھ اپنے باپ سے مناسبت رکھتا ہے ویسا ہی ان کو بھی ظلّی طور پر بوجہ تخلّق باخلاق اللہ خدا تعالیٰ کی صفاتِ جمیلہ سے کچھ مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے نام اگرچہ کھلے کھلے طور پر بزبانِ شرع مستعمل نہیں ہیں مگر درحقیقت عارفوں نے قرآن کریم سے ہی اس کو استنباط کیا ہے۔ کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ فاذکروا اللّٰہ کذکرکم اٰباءکم او اشدّ ذکرًا یعنی اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو کہ جیسے تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اگر مجازی طور پر ان الفاظ کا بولنا منہیاتِ شرع سے ہوتا تو خدا تعالیٰ ایسی طرز سے اپنی کلام کو منزہ رکھتا جس سے اس اطلاق کا جواز مستنبط ہو سکتا ہے۔

اور اس درجہ **لقا** میں بعض اوقات انسان سے ایسے امور صادر ہوتے ہیں کہ جو **بشریت کی طاقتوں سے بڑھے** ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور الٰہی طاقت کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ جیسے ہمارے سیّد مولیٰ **سیّدالرسل حضرت خاتم الانبیاء** صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں ایک سنگریزوں کی مٹھی کفار پر چلائی اور وہ مٹھی کسی دُعا کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خود اپنی **روحانی طاقت** سے چلائی مگر اس مٹھی نے **خدائی طاقت** دکھلائی اور مخالف کی فوج پر ایسا خارق عادت اُس کا اثر پڑا کہ کوئی اُن میں سے ایسا نہ رہا کہ جس کی آنکھ پر اس کا اثر نہ پہنچا ہو ....
..... ایسا ہی دوسرا **معجزہ** آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا جو **شق القمر** ہے اسی الٰہی طاقت سے ظہور میں آیا تھا۔ کوئی دُعا اس کے ساتھ شامل نہ تھی۔ کیونکہ وہ صرف انگلی کے اشارہ سے جو **الٰہی طاقت** سے بھری ہوئی تھی وقوع میں آ گیا تھا۔ اور اس قسم کے اَور بھی بہت سے معجزات ہیں جو صرف ذاتی اقتدار کے طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دکھلائے جن کے ساتھ کوئی دُعا نہ تھی .... اب ان **تحریرات** سے ہماری غرض اس قدر ہے کہ **لقا** کا مرتبہ جب کسی انسان کو میسّر آتا ہے تو اس مرتبہ کی **تموّج** کے اوقات

یں الٰہی کام ضرور اس سے صادر ہوتے ہیں۔ اور ایسے شخص کی گہری صحبت میں جو شخص ایک حصّہ عمر کا بسر کرے تو ضرور کچھ نہ کچھ یہ اقتداری خوارق مشاہدہ کرے گا کیونکہ اس **تموّج** کی حالت میں کچھ الٰہی صفات کا رنگ ظلی طور پر انسان میں آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا رحم خدا تعالیٰ کا رحم اور اس کا غضب خدا تعالیٰ کا غضب ہو جاتا ہے۔ اور بسا اوقات وہ بغیر کسی دُعا کے کہتا ہے کہ فلاں چیز پیدا ہو جائے تو وہ پیدا ہو جاتی ہے اور کسی پر غضب کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس پر کوئی وبال نازل ہو جاتا ہے۔ اور کسی کو رحمت کی نظر سے دیکھتا ہے تو وہ خدا تعالٰے کے نزدیک موردِ رحم ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ خدا تعالٰے کا **کُنْ** دائمی طور پر نتیجہ مقصودہ کو بلا تخلّف پیدا کرتا ہے ایسا ہی اُس کا **کُنْ** بھی اس **تموّج** اور **مدّ** کی حالت میں خطا نہیں جاتا۔ اور جیسا کہ مَیں بیان کر چکا ہوں ان اقتداری خوارق کی اصل وجہ یہی ہوتی ہے کہ یہ شخص شدّت اتصال کی وجہ سے خدائے عزّوجلّ کے رنگ سے ظلّی طور پر رنگین ہو جاتا ہے اور تجلّیات الٰہیہ اس پر دائمی قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور محبوبِ حقیقی حُجب حائلہ کو درمیان سے اٹھا کر نہایت شدید قرب کی وجہ سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ وہ خود **مبارک** ہے ایسا ہی اس کے اقوال و افعال و حرکات اور سکنات اور خوراک اور پوشاک اور مکان اور زمان اور اُس کے جمیع لوازم میں **برکت** رکھ دیتا ہے۔ تب ہریک چیز جو اس سے مسّ کرتی ہے بغیر اس کے جو یہ دُعا کرے برکت پاتی ہے۔ اس کے مکان میں برکت ہوتی ہے۔ اُس کے دروازوں کے آستانے برکت سے بھرے ہوتے ہیں۔ اس کے گھر کے دروازوں پر برکت برستی ہے جو ہر دم اُسکو مشاہدہ ہوتی ہے۔ اور اس کی خوشبو اس کو آتی ہے۔ جب یہ سفر کرے تو خدا تعالیٰ معہ اپنی تمام برکتوں کے اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جب یہ گھر میں آوے تو ایک دریا نور کا ساتھ لاتا ہے۔ غرض یہ عجیب انسان ہوتا ہے جس کی کُنہ بجز خدا تعالٰے کے اَور کوئی نہیں جانتا۔

اسجگہ یہ بھی واضح رہے کہ **فنا فی اللہ** کے درجہ کی تحقّق کے بعد یعنی اس درجہ کے بعد جو اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کے مفہوم کو لازم ہے جس کو صوفی **فنا** کے نام سے اور قرآن کریم **استقامت** کے اسم سے موسوم کرتا ہے درجہ **بقا** اور **لقا** کا بلا توقف پیچھے آنے والا ہے یعنی جب کہ انسان خلق اور ہوا اور ارادہ سے بکلّی خالی ہو کر فنا کی حالت کو پہنچ گیا۔ تو اس حالت کے راسخ ہونے کے ساتھ ہی بقا کا درجہ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر جب تک یہ حالت راسخ نہ ہو اور خدا تعالیٰ کی طرف بکلّی جُھک جانا ایک طبعی امر نہ ٹھہر جائے تب تک مرتبہ بقا کا پیدا

نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ مرتبہ صرف اسی وقت پیدا ہوگا کہ جب ہر یک اطاعت کا تصنع درمیان سے اُٹھ جائے اور ایک طبعی روئیدگی کی طرح فرمانبرداری کی سرسبز اور لہراتی ہوئی شاخیں دل سے جوش مار کر نکلیں اور واقعی طور پر سب کچھ جو اپنا سمجھا جاتا ہے خدا تعالیٰ کا ہو جائے اور جیسے دوسرے لوگ ہوا پرستی میں لذّت اٹھاتے ہیں اس شخص کی تمام کامل لذتیں پرستش اور یادِ الٰہی میں ہوں اور بجائے نفسانی ارادوں کے خدا تعالیٰ کی مرضیات جگہ پکڑ لیں۔

پھر جب یہ **بقا** کی حالت بخوبی استحکام پکڑ جائے اور سالک کے رگ و ریشہ میں داخل ہو جائے اور اس کا جزو وجود بن جائے اور **ایک نور آسمان سے اُترتا ہُوا دکھائی دے** جس کے نازل ہونے کے ساتھ ہی تمام پردے دُور ہو جائیں اور نہایت لطیف اور شیریں اور حلاوت سے ملی ہوئی ایک محبت دل میں پیدا ہو جو پہلے نہیں تھی اور ایک ایسی خنکی اور اطمینان اور سکینت اور سرور دل کو محسوس ہو کہ جیسے ایک نہایت پیارے دوست مدّت کے بچھڑے ہوئے کی یک دفعہ ملنے اور بغلگیر ہونے سے محسوس ہوتی ہے اور خدا تعالےٰ کے روشن اور لذیذ اور مبارک اور سرور بخش اور فصیح اور معطّر اور مبشرانہ کلمات اُٹھتے اور بیٹھتے اور سوتے اور جاگتے اِس طرح پر نازل ہونے شروع ہو جائیں کہ جیسے ایک ٹھنڈی اور دلکش اور پُر خوشبو ہوا ایک گلزار پر گذر کر آتی اور صبح کے وقت چلنی شروع ہوتی اور اپنے ساتھ ایک سُکر اور سرور لاتی ہے اور انسان خدا تعالیٰ کی طرف ایسا کھینچا جائے کہ بغیر اس کی محبت اور عاشقانہ تصور کے جی نہ سکے اور نہ یہ کہ مال اور جان اور عزت اور اولاد اور جو کچھ اس کا ہے قربان کرنے کے لئے تیار ہو بلکہ اپنے دل میں قربان کر ہی چکا ہو اور ایسی ایک زبردست کشش سے کھینچا گیا ہو جو نہیں جانتا کہ اُسے کیا ہو گیا اور نورانیت کا بشدّت اپنے اندر انتشار پاوے جیسا کہ دن چڑھا ہُوا ہوتا ہے اور صدق اور محبت اور وفا کی نہریں بڑے زور سے چلتی ہوئی اپنے اندر مشاہدہ کرے اور لمحہ بلمحہ ایسا احساس کرتا ہو کہ گویا **خدا تعالےٰ اُس کے قلب پر اترا ہُوا ہے** جب یہ حالت اپنی تمام علامتوں کے ساتھ محسوس ہو تب خوشی کرو اور محبوب حقیقی کا شکر بجا لاؤ۔ کہ یہی وہ انتہائی مقام ہے جس کا نام **لقا** رکھا گیا ہے۔

اس آخری مقام میں انسان ایسا احساس کرتا ہے کہ گویا بہت سے پاک پانیوں سے اسکو دھو کر اور نفسانیت کا بکلّی رگ و ریشہ اس سے الگ کر کے نئے سرے اس کو پیدا کیا گیا۔ اور پھر **ربّ العالمین کا تخت** اس کے اندر بچھایا گیا اور خدائے پاک و قدوس کا چمکتا ہُوا چہرہ

اپنے تمام دلکش حسن وجمال کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اُس کے سامنے موجود ہوگیا ہے۔ مگر ساتھ اِس کے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ دونوں آخری درجہ بقا اور لقا کے کسبی نہیں ہیں بلکہ وہبی ہیں اور کسب اور جدوجہد کی حد صرف فنا کے درجہ تک ہے اور اسی حد تک تمام راستباز سالکوں کا سیر و سلوک ختم ہوتا ہے اور دائرہ کمالاتِ انسانیہ کا اپنے استعدادتِ تامہ کو پہنچتا ہے۔ اور جب اس درجہ فنا کو پاک باطن لوگ جیسا کہ چاہیئے طے کر چکتے ہیں تو عادت الٰہیہ اسی طرح پر جاری ہے کہ بیک دفعہ عنایت الٰہی کی نسیم چل کر بقا اور لقا کے درجہ تک انہیں پہنچا دیتی ہے۔

اب اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ اس سفر کی تمام صعوبتیں اور مشقتیں فنا کی حد تک ہی ہیں اور پھر اس سے آگے گذر کر انسان کی سعی اور کوشش اور مشقت اور محنت کو دخل نہیں بلکہ وہ محبتِ صافیہ جو فنا کی حالت میں خداوند کریم وجلیل سے پیدا ہوتی ہے الٰہی محبت کا خود بخود اُس پر ایک نمایاں شعلہ پڑتا ہے جس کو مرتبہ بقا اور لقا سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جب محبت الٰہی بندہ کی محبت پر نازل ہوتی ہے تب دونوں محبتوں کے ملنے سے **رُوح القدس** کا ایک روشن اور کامل سایہ انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے اور لقا کے مرتبہ پر اس رُوح القدس کی روشنی نہایت ہی نمایاں ہوتی ہے اور اقتداری خوارق جن کا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں اسی وجہ سے ایسے لوگوں سے صادر ہوتے ہیں کہ یہ **رُوح القدس کی روشنی** ہر وقت اور ہر حال میں اُن کے شامل حال ہوتی ہے۔ اور ان کے اندر سکونت رکھتی ہے اور وہ اس روشنی سے کبھی اور کسی حال میں جُدا نہیں ہوتے اور نہ وہ روشنی ان سے جدا ہوتی ہے۔ وہ روشنی ہر دم ان کے تنفس کے ساتھ نکلتی ہے اور اُن کی نظر کے ساتھ ہر یک چیز پر پڑتی ہے اور ان کے کلام کے ساتھ اپنی نورانیت لوگوں کو دکھلاتی ہے۔ اسی روشنی کا نام رُوح القدس ہے مگر یہ حقیقی رُوح القدس نہیں حقیقی رُوح القدس وہ ہے جو آسمان پر ہے۔ یہ رُوح القدس اس کا ظلّ ہے جو پاک سینوں اور دلوں اور دماغوں میں ہمیشہ کے لئے آباد ہو جاتا ہے اور ایک طرفۃ العین کیلئے بھی اُن سے جدا نہیں ہوتا۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۶۲-۶۳)

اسجگہ ہر یک سچے طالب کے دل میں بالطبع یہ سوال پیدا ہوگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے کہ تا یہ مرتبہ عالیہ مکالمہ الٰہیہ حاصل کر سکوں۔ پس اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک نئی ہستی ہے جس میں نئی قوتیں نئی طاقتیں نئی زندگی عطا کی جاتی ہے اور نئی ہستی پہلی ہستی کی فنا کے بغیر

حاصل نہیں ہو سکتی اور جب پہلی ہستی ایک سچی اور حقیقی قربانی کے ذریعہ سے جو فدائے نفس اور فدائے عزت و مال و دیگر لوازم نفسانیہ سے مراد ہے بکلّی جاتی رہے تو یہ دوسری ہستی فی الفور اُس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ پہلی ہستی کے دُور ہونے کے نشان کیا ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب پہلے خواص اور جذبات دُور ہو کر نئے خواص اور نئے جذبات پیدا ہوں اور اپنی فطرت میں ایک انقلاب عظیم نظر آوے۔ اور تمام حالتیں کیا اخلاقی اور کیا ایمانی اور کیا تعبدی ایسی ہی بدلی ہوئی نظر آویں کہ گویا اُن پر اب رنگ ہی اَور ہے۔

غرض جب اپنے نفس پر نظر ڈالے تو اپنے تئیں ایک نیا آدمی پاوے۔ اور ایسا ہی خدا تعالیٰ بھی نیا ہی دکھائی دے اور شکر اور صبر اور یاد الٰہی میں نئی لذّتیں پیدا ہو جائیں جنکی پہلے کچھ بھی خبر نہیں تھی اور بدیہی طور پر محسوس ہو کہ اب اپنا نفس اپنے ربّ پر بکلّی متوکّل اور غیر سے بکلّی لاپروا ہے اور تصوّر وجود حضرتِ باری اسقدر اس کے دل پر استیلاء پکڑ گیا ہے کہ اب اُس کی نظر شہود میں وجود غیر بکلّی معدوم ہے اور تمام اسباب ہیچ اور ذلیل اور بیقدر نظر آتے ہیں اور صدق اور وفا کا مادہ اس قدر جوش میں آگیا ہے کہ ہر یک مصیبت کا تصوّر کرنے سے وہ مصیبت آسان معلوم ہوتی ہے اور نہ صرف تصوّر بلکہ مصائب کے وارد ہونے سے بھی ہر یک درد برنگ لذّت نظر آتا ہے تو جب یہ تمام علامات پیدا ہو جائیں۔ تو سمجھنا چاہیئے کہ اب پہلی ہستی پر بکلّی موت آگئی۔

اِس موت کے پیدا ہو جانے سے عجیب طور کی قوتیں خدا تعالیٰ کی راہ میں پیدا ہو جاتی ہیں وہ باتیں جو دوسرے کہتے ہیں پر کرتے نہیں۔ اور وہ راہیں جو دوسرے دیکھتے ہیں پر چلتے نہیں اور وہ بوجھ جو دوسرے جانچتے ہیں پر اٹھاتے نہیں ان سب امورِ شاقہ کی اُسکو توفیق دی جاتی ہے کیونکہ وہ اپنی قوت سے نہیں بلکہ ایک زبردست الٰہی طاقت اس کی اعانت اور امداد میں ہوتی ہے جو پہاڑوں سے زیادہ اس کو استحکام کی رُو سے کر دیتی ہے۔ اور ایک وفادار دل اسکو بخشتی ہے تب خدا تعالیٰ کے جلال کے لئے وہ کام اس سے صادر ہوتے ہیں اور وہ صدق کی باتیں ظہور میں آتی ہیں کہ انسان کیا چیز ہے اور آدم زاد کیا حقیقت ہے کہ خود بخود ان کو انجام دے سکے وہ بکلّی غیر سے منقطع ہو جاتا ہے۔ ماسویٰ اللہ سے دونوں ہاتھ اُٹھا لیتا ہے اور سب تفاوتوں اور فرقوں کو درمیان سے دُور کر دیتا ہے اور وہ آزمایا جاتا ہے اور دُکھ دیا جاتا ہے اور طرح طرح کے امتحانات اس کو پیش آتے ہیں اور ایسی مصائب اور تکالیف اس پر پڑتی ہیں کہ اگر وہ پہاڑوں پر پڑتیں تو

نہیں نابود کر دیتیں ۔ اور اگر وہ آفتاب و ماہتاب پر وارد ہوتیں تو وہ بھی تاریک ہو جاتے ۔ لیکن وہ ثابت قدم رہتا ہے ۔ اور وہ تمام سختیوں کو بڑی انشراحِ صدر سے برداشت کر لیتا ہے اور اگر وہ ہاونِ حوادث میں پیسا بھی جائے اور غبار سا کیا جائے تب بھی بغیر اِنِّیْ مَعَ اللّٰہِ کے اور کوئی آواز اس کے اندر سے نہیں آتی ۔ جب کسی کی حالت اس نوبت تک پہنچ جائے تو اُس کا معاملہ اس عالم سے وراء الوراء ہو جاتا ہے ۔ اور ان تمام ہدایتوں اور مقاماتِ عالیہ کو ظلّی طور پر پا لیتا ہے جو اس سے پہلے نبیوں اور رسولوں کو ملے تھے ۔ اور انبیاء اور رُسل کا وارث اور نائب ہو جاتا ہے ۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۲۳۳ - ۲۳۷)

تیسرا سوال یعنی یہ کہ **رُوحانی حالتیں کیا ہیں؟** واضح رہے کہ ہم پہلے اس سے بیان کر چکے ہیں کہ بموجب ہدایت قرآن شریف کے روحانی حالتوں کا منبع اور سرچشمہ **نفسِ مطمئنہ** ہے جو انسان کو باخلاق ہونے کے مرتبہ سے باخدا ہونے کے مرتبہ تک پہنچاتا ہے ۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے ۔ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۔ یعنی اے نفس خدا کے ساتھ آرام یافتہ اپنے رب کی طرف واپس چلا آ ۔ وہ تجھ سے راضی اور تو اس سے راضی ۔ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میرے بہشت کے اندر آ جا ۔

اسجگہ بہتر ہے کہ ہم روحانی حالتوں کے بیان کرنے کے لئے اس آیت کریمہ کی تفسیر کسی قدر توضیح سے بیان کریں ۔ پس یاد رکھنا چاہیئے کہ اعلیٰ درجہ کی رُوحانی حالت انسان کی اس دنیوی زندگی میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ آرام پا جائے اور تمام اطمینان اور سرور اور لذّت اسکی خدا میں ہی ہو جائے ۔ یہی وہ حالت ہے جس کو دوسرے لفظوں میں **بہشتی زندگی** کہا جاتا ہے اس حالت میں انسان اپنے کامل صدق اور صفا اور وفا کے بدلہ میں ایک نقد بہشت پا لیتا ہے اور دوسرے لوگوں کی بہشت موعود پر نظر ہوتی ہے ۔ اور یہ بہشت موجود میں داخل ہوتا ہے ۔ اِسی درجہ پر پہنچ کر انسان سمجھتا ہے کہ وہ عبادت جس کا بوجھ اُس کے سر پر ڈالا گیا ہے درحقیقت وہی ایک ایسی غذا ہے جس سے اس کی رُوح نشو و نما پاتی ہے اور جس پر اُس کی رُوحانی زندگی کا بڑا بھاری مدار ہے اور اس کے نتیجہ کا حصول کسی دوسرے جہان پر موقوف نہیں ہے ۔ اِسی مقام پر یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ وہ ساری ملامتیں جو نفس لوامہ انسان کا اس کی ناپاک زندگی پر کرتا ہے اور

پھر بھی نیک خواہشوں کو اچھی طرح اُبھار نہیں سکتا اور بُری خواہشوں سے حقیقی نفرت نہیں دلا سکتا اور نہ نیکی پر ٹھہرنے کی پوری قوت بخش سکتا ہے اس پاک تحریک سے بدل جاتی ہیں جو نفس مطمئنہ کے نشو و نما کا آغاز ہوتی ہے اور اس درجہ پر پہنچ کر وقت آ جاتا ہے کہ انسان پوری فلاح حاصل کرے۔ اور اب تمام نفسانی جذبات خود بخود افسردہ ہونے لگتے ہیں اور رُوح پر ایک ایسی طاقت افزا ہوا چلنے لگتی ہے جس سے انسان پہلی کمزوریوں کو ندامت کی نظر سے دیکھتا ہے اس وقت انسانی سرشت پر ایک بھاری انقلاب آتا ہے اور عادت میں ایک تبدل عظیم پیدا ہوتا ہے اور انسان اپنی پہلی حالتوں سے بہت ہی دُور جا پڑتا ہے۔ دھویا جاتا ہے اور صاف کیا جاتا ہے اور خدا نیکی کی محبت کو اپنے ہاتھ سے اس کے دل میں لکھ دیتا ہے اور بدی کا گند اپنے ہاتھ سے اس کے دل سے باہر پھینک دیتا ہے۔ سچائی کی فوج سب کی سب دل کے شہرستان میں آ جاتی ہے اور فطرت کے تمام برجوں پر راستبازی کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اور حق کی فتح ہوتی ہے اور باطل بھاگ جاتا ہے اور اپنے ہتھیار پھینک دیتا ہے۔ اس شخص کے دل پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اور ہر ایک قدم خدا کے زیر سایہ چلتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ آیات ذیل میں انہی امور کی طرف اشارہ فرماتا ہے: ـ أُولٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ ـ وَزَيَّنَهٗ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ـ أُولٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ـ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ـ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ـ ....

یہ تمام اشارات اس رُوحانی حالت کی طرف ہیں جو تیسرے درجہ پر انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اور سچی بینائی انسان کو کبھی نہیں مل سکتی جب تک یہ حالت اس کو حاصل نہ ہو اور یہ جو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں نے ایمان اُن کے دل میں اپنے ہاتھ سے لکھا اور رُوح القدس سے اُن کی مدد کی یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو سچی طہارت اور پاکیزگی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک آسمانی مدد اس کے شامل حال نہ ہو۔ نفسِ لوّامہ کے مرتبہ پر انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ بار بار توبہ کرتا اور بار بار گرتا ہے بلکہ بسا اوقات اپنی صلاحیت سے نا امید ہو جاتا ہے اور اپنے مرض کو ناقابلِ علاج سمجھ لیتا ہے اور ایک مدت تک ایسا ہی رہتا ہے اور پھر جب وقت مقدّر پورا ہو جاتا ہے تو رات یا دن کو یکدفعہ ایک نور اس پر نازل ہوتا ہے اور اس نور میں الٰہی قوت ہوتی ہے۔ اُس نور کے نازل ہونے کے ساتھ ہی ایک

عجیب تبدیلی اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور غیبی ہاتھ کا ایک قوی تصرّف محسوس ہوتا ہے اور ایک عجیب عالم سامنے آجاتا ہے۔ اس وقت انسان کو پتہ لگتا ہے کہ خدا ہے۔ اور آنکھوں میں وہ نور آجاتا ہے جو پہلے نہیں تھا۔ لیکن اس راہ کو کیونکر حاصل کریں اور اس روشنی کو کیونکر پاویں۔ سو جاننا چاہیئے کہ اس دنیا میں جو دارالاسباب ہے ہر ایک معلول کیلئے ایک علّت اور ہر ایک حرکت کے لئے ایک محرک ہے اور ہر ایک علم حاصل کرنے کے لئے ایک راہ ہے جس کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو بغیر پابندی ان قواعد کے مل سکے جو قدرت نے ابتدا سے اس کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ قانون قدرت بتلا رہا ہے کہ ہر ایک چیز کے حصول کے لئے ایک صراطِ مستقیم ہے۔ اور اس کا حصول اسی پر قدرتاً موقوف ہے مثلاً اگر ہم ایک اندھیری کوٹھڑی میں بیٹھے ہوں اور آفتاب کی روشنی کی ضرورت ہو تو ہمارے لئے یہ صراطِ مستقیم ہے کہ ہم اس کھڑکی کو کھول دیں جو آفتاب کی طرف ہے تب یکدفعہ آفتاب کی روشنی اندر آکر ہمیں منور کر دیگی۔ سو ظاہر ہے کہ اسی طرح خدا کے سچّے اور واقعی فیوض پانے کے لئے کوئی کھڑکی ہوگی۔ اور پاک روحانیت کے حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص طریق ہوگا اور وہ یہ ہے کہ رُوحانی امور کے لئے صراط مستقیم کی تلاش کریں جیسا کہ ہم اپنی زندگی کے تمام امور میں اپنی کامیابیوں کے لئے صراط مستقیم کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مگر کیا وہ یہ طریق ہے کہ ہم صرف اپنی ہی عقل کے زور سے اور اپنی ہی خود تراشیدہ باتوں سے خدا کے وصال کو ڈھونڈیں۔ کیا محض ہماری ہی اپنی منطق اور فلسفہ سے اس کے وہ دروازے ہم پر کھلتے ہیں جن کا کھلنا اُس کے قوی ہاتھ پر موقوف ہے۔ یقیناً سمجھو کہ بالکل صحیح نہیں ہے ہم اس حیّ و قیّوم کو محض اپنی ہی تدبیروں سے ہرگز نہیں پا سکتے بلکہ اس راہ میں صراط مستقیم صرف یہ ہے کہ پہلے ہم اپنی زندگی معہ اپنی تمام قوتوں کے خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر کے پھر خدا کے وصال کے لئے دُعا میں لگے رہیں تا خدا کو خدا ہی کے ذریعہ سے پاویں۔

اور سب سے پیاری دُعا جو عین محل اور موقع سوال کا ہمیں سکھاتی ہے اور فطرت کے روحانی جوش کا نقشہ ہمارے سامنے رکھتی ہے وہ دُعا ہے جو خدائے کریم نے اپنی پاک کتاب قرآن شریف میں یعنی سورۂ فاتحہ میں ہمیں سکھائی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ تمام پاک تعریفیں جو ہو سکتی ہیں اس اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وہی خدا جو ہمارے

اعمال سے پہلے ہمارے لئے رحمت کا سامان میسر کرنے والا ہے۔ اور ہمارے اعمال کے بعد رحمت کے ساتھ جزا دینے والا ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ وہ خدا جو جزا کے دن کا وہی ایک مالک ہے کسی اَور کو وہ دن نہیں سونپا گیا۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ اے وہ جو ان تعریفوں کا جامع ہے ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور ہم ہر ایک کام میں توفیق تجھ ہی سے چاہتے ہیں۔ اسجگہ ہم کے لفظ سے پرستش کا اقرار کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہمارے تمام قویٰ تیری پرستش میں لگے ہوئے ہیں اور تیرے آستانہ پر جھکے ہوئے ہیں کیونکہ انسان باعتبار اپنے اندرونی قویٰ کے ایک جماعت اور ایک اُمت ہے اور اس طرح پر تمام قویٰ کا خدا کو سجدہ کرنا یہی وہ حالت ہے جس کو اسلام کہتے ہیں۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ ہمیں اپنی سیدھی راہ دکھلا اور اس پر ثابت قدم کرکے اُن لوگوں کی راہ دکھلا جن پر تیرا انعام و اکرام ہے اور تیرے مورد فضل و کرم ہو گئے ہیں۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔ اور ہمیں ان لوگوں کی راہوں سے بچا جن پر تیرا غضب ہے اور جو تجھ تک نہیں پہنچ سکے اور راہ کو بھول گئے۔ آمین۔ اے خدا ایسا ہی کر۔

یہ آیات سمجھا رہی ہیں کہ خدا تعالیٰ کے انعامات جو دوسرے لفظوں میں فیوض کہلاتے ہیں انہی پر نازل ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کی خدا کی راہ میں قربانی دیکر اپنا تمام وجود اس کی راہ میں وقف کرکے اور اُس کی رضا میں محو ہو کر پھر اس وجہ سے دُعا میں لگے رہتے ہیں کہ تا جو کچھ انسان کو روحانی نعمتوں اور خدا کے قرب اور وصال اور اس کے مکالمات اور مخاطبات میں سے مل سکتا ہے وہ سب اُن کو ملے۔ اور اس دُعا کے ساتھ اپنے تمام قویٰ سے عبادت بجا لاتے ہیں اور گناہ سے پرہیز کرتے اور آستانۂ الٰہی پر پڑے رہتے ہیں اور جہاں تک ان کیلئے ممکن ہے اپنے تئیں بدی سے بچاتے ہیں اور غضب الٰہی کی راہوں سے دُور رہتے ہیں۔ سو چونکہ وہ ایک اعلیٰ ہمت اور صدق کے ساتھ خدا کو ڈھونڈتے ہیں اس لئے اُس کو پا لیتے ہیں اور خدائے تعالیٰ کی پاک معرفت کے پیالوں سے سیراب کئے جاتے ہیں۔ اس آیت میں جو استقامت کا ذکر فرمایا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچّا اور کامل فیض جو رُوحانی عالم تک پہنچاتا ہے کامل استقامت سے وابستہ ہے اور کامل استقامت سے مراد ایک ایسی حالت صدق و وفا ہے جس کو کوئی امتحان ضرر نہ پہنچا سکے۔ یعنی ایسا پیوند ہو جس کو نہ تلوار کاٹ سکے نہ آگ جلا سکے اور نہ کوئی دوسری آفت نقصان پہنچا سکے۔ عزیزوں کی موتیں اس سے علیحدہ نہ کر سکیں

پیاروں کی جدائی اس میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ بے آبروئی کا خوف کچھ رعب نہ ڈال سکے۔ ہولناک دکھوں سے مارا جانا ایک ذرّہ دل کو نہ ڈرا سکے۔ سو یہ دروازہ نہایت تنگ ہے اور یہ راہ نہایت دشوار گذار ہے۔ کسقدر مشکل ہے آہ! صد آہ!!

اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ ان آیات میں اشارہ فرماتا ہے کہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اِن آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کی مرضی کو چھوڑ کر اپنے عزیزوں اور مالوں سے پیار کرتے ہیں وہ خدا کی نظر میں بدکار ہیں وہ ضرور ہلاک ہونگے کیونکہ انہوں نے غیر کو خدا پر مقدم رکھا۔ یہی وہ تیسرا مرتبہ ہے جس میں وہ شخص باخدا بنتا ہے جو اس کیلئے ہزاروں بلائیں خریدے اور خدا کی طرف ایسے صدق اور اخلاص سے جُھک جائے کہ خدا کے سوا کوئی اُس کا نہ رہے گویا سب مر گئے۔ پس سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم خود نہ مریں زندہ خدا نظر نہیں آ سکتا خدا کے ظہور کا وہی دن ہوتا ہے کہ جب ہماری جسمانی زندگی پر موت آوے۔ ہم اندھے ہیں جب تک غیر کے دیکھنے سے اندھے نہ ہو جائیں۔ ہم مُردہ ہیں جب تک خدا کے ہاتھ میں مُردہ کی طرح نہ ہو جائیں۔ جب ہمارا مُنہ ٹھیک ٹھیک اس کے محاذات میں پڑیگا تب وہ واقعی استقامت جو تمام نفسانی جذبات پر غالب آتی ہے ہمیں حاصل ہوگی۔ اس سے پہلے نہیں۔ اور یہی وہ استقامت ہے جس سے نفسانی زندگی پر موت آ جاتی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۶۳ - ۶۹)

آسمانی نشانوں سے حصّہ لینے والے تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ اوّل وہ جو کوئی ہنر اپنے اندر نہیں رکھتے اور کوئی تعلّق خدا تعالیٰ سے ان کا نہیں ہوتا۔ صرف دماغی مناسبت کی وجہ سے ان کو بعض سچی خوابیں آ جاتی ہیں اور سچے کشف ظاہر ہو جاتے ہیں جن میں کوئی مقبولیت اور محبوبیت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے اور اُن سے کوئی فائدہ ان کی ذات کو نہیں ہوتا۔ اور ہزاروں شریر اور بدچلن اور فاسق و فاجر ایسی بدبودار خوابوں اور الہاموں میں اُن کے شریک ہوتے ہیں۔ اور اکثر دیکھا جاتا ہے کہ باوجود ان خوابوں اور کشفوں کے انکا چال چلن قابلِ تعریف

نہیں ہوتا۔ کم سے کم یہ کہ اُن کی ایمانی حالت نہایت کمزور ہوتی ہے۔ اِس قدر کہ ایک سچی گواہی بھی نہیں دے سکتے۔ اور جس قدر دنیا سے ڈرتے ہیں خدا سے نہیں ڈرتے۔ اور شریر آدمیوں سے قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ اور کوئی ایسی سچی گواہی نہیں دے سکتے جس سے بڑے آدمی کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہو اور دینی امور میں نہایت درجہ کسل اور سُستی ان میں پائی جاتی ہے۔ اور دنیا کے ہموم و غموم میں دن رات غرق رہتے ہیں اور دانستہ جھوٹ کی حمایت کرتے اور سچ کو چھوڑتے ہیں۔ اور ہر ایک قدم میں خیانت پائی جاتی ہے اور بعض میں اس سے بڑھ کر یہ عادت بھی پائی گئی ہے کہ وہ فسق و فجور سے بھی پرہیز نہیں کرتے اور دنیا کمانے کیلئے ہر ایک ناجائز کام کر لیتے ہیں۔ اور بعض کی اخلاقی حالت بھی نہایت خراب ہوتی ہے۔ اور حسد اور بخل اور عجب اور تکبّر اور غرور کے پتلے ہوتے ہیں اور ہر ایک کمینگی کے کام اُن سے صادر ہوتے ہیں اور طرح طرح کی قابل شرم خباثتیں ان میں پائی جاتی ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ بعض اُن میں ایسے ہیں کہ ہمیشہ بد خوابیں ہی اُن کو آتی ہیں اور وہ سچی بھی ہو جاتی ہیں۔ گویا اُنکے دماغ کی بناوٹ صرف بد اور منحوس خوابوں کے لئے مخلوق ہے۔ نہ اپنے لئے کوئی بہتری کے خواب دیکھ سکتے ہیں جس سے اُن کی دنیا درست ہو اور اُن کی مرادیں حاصل ہوں اور نہ اَوروں کے لئے کوئی بشارت کی خواب دیکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے خوابوں کی حالت اقسام ثلاثہ میں سے اس جسمانی نظارہ سے مشابہ ہے جبکہ ایک شخص دُور سے صرف ایک دھوآں آگ کا دیکھتا ہے مگر آگ کی روشنی نہیں دیکھتا اور نہ آگ کی گرمی محسوس کرتا ہے کیونکہ یہ لوگ خدا سے بالکل بے تعلق ہیں اور روحانی امور سے صرف ایک دھوآں ان کی قسمت میں ہے جس سے کوئی روشنی حاصل نہیں ہوتی۔

پھر دوسری قسم کے خواب بین یا ملہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا تعالیٰ سے کسی قدر تعلّق ہے۔ مگر کامل تعلق نہیں۔ اِن لوگوں کے خوابوں یا الہاموں کی حالت اس جسمانی نظارہ سے مشابہ ہے جبکہ ایک شخص اندھیری رات اور شدید البرد رات میں دُور سے ایک آگ کی روشنی دیکھتا ہے۔ اس دیکھنے سے اتنا فائدہ تو اُسے حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی راہ پر چلنے سے پرہیز کرتا ہے جس میں بہت سے گڑھے اور کانٹے اور پتھر اور سانپ اور درندے ہیں۔ مگر اس قدر روشنی اس کو سردی اور ہلاکت سے بچا نہیں سکتی۔ پس اگر وہ آگ کے گرم حلقہ تک پہنچ نہ سکے تو وہ بھی ایسا ہی ہلاک ہو جاتا ہے جیساکہ اندھیرے میں

چلنے والا ہلاک ہو جاتا ہے۔

پھر تیسری قسم کے ملہم اور خواب بین وہ لوگ ہیں جن کے خوابوں اور الہاموں کی حالت اُس جسمانی نظارہ سے مشابہ ہے جب کہ ایک شخص اندھیری اور شدید البرد رات میں نہ صرف آگ کی کامل روشنی ہی پاتا ہے اور اُس میں چلتا ہے بلکہ اس کے گرم حلقہ میں داخل ہو کر بکلّی سردی کے ضرر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ تک وہ لوگ پہنچتے ہیں جو شہوات نفسانیہ کا چولہ آتشِ محبتِ الٰہی میں جلا دیتے ہیں۔ اور خدا کے لئے تلخی کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں جو آگے موت ہے اور دوڑ کر اس موت کو اپنے لئے پسند کر لیتے ہیں۔ وہ ہر ایک درد کو خدا کی راہ میں قبول کرتے ہیں اور خدا کے لئے اپنے نفس کے دشمن ہو کر اور اس کے برخلاف قدم رکھ کر ایسی طاقت ایمانی دکھلاتے ہیں کہ فرشتے بھی ان کے اس ایمان سے حیرت اور تعجب میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ روحانی پہلوان ہوتے ہیں اور شیطان کے تمام حملے اُنکی روحانی قوت کے آگے ہیچ ٹھیرتے ہیں۔ وہ سچے وفادار اور صادق مرد ہوتے ہیں کہ نہ دنیا کے لذات کے نظارے انہیں گمراہ کر سکتے ہیں اور نہ اولاد کی محبت اور نہ بیوی کا تعلّق اُن کو اپنے محبوبِ حقیقی سے برگشتہ کر سکتا ہے۔ غرض کوئی تلخی ان کو ڈرا نہیں سکتی اور کوئی نفسانی لذّت ان کو خدا سے روک نہیں سکتی۔ اور کوئی تعلق خدا کے تعلق میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتا

یہ تین روحانی مراتب کی حالتیں ہیں۔ جن میں سے پہلی حالت **علم الیقین** کے نام سے موسوم ہے اور دوسری حالت **عین الیقین** کے نام سے نامزد ہے۔ اور تیسری مبارک اور کامل حالت **حق الیقین** کہلاتی ہے۔ اور انسانی معرفت کامل نہیں ہو سکتی اور نہ کدورتوں سے پاک ہو سکتی ہے جب تک **حق الیقین** تک نہیں پہنچتی کیونکہ حق الیقین کی حالت صرف مشاہدات پر موقوف نہیں بلکہ یہ بطور حال کے انسان کے دل پر وارد ہو جاتی ہے اور انسان محبتِ الٰہی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑ کر اپنے نفسانی وجود سے بالکل نیست ہو جاتا ہے اور اس مرتبہ پر انسانی معرفت پہنچ کر قال سے حال کی طرف انتقال کرتی ہے اور سفلی زندگی بالکل جل کر خاک ہو جاتی ہے۔ اور ایسا انسان خدا تعالیٰ کی گود میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور جیسا کہ ایک لوہا آگ میں پڑ کر بالکل آگ کی رنگ میں آ جاتا ہے اور آگ کی صفات اس سے ظاہر ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی اس درجہ کا آدمی صفاتِ الٰہیہ سے ظلّی طور پر منصبغ ہو جاتا ہے اور اس قدر طبعاً مرضاتِ الٰہیہ میں فنا ہو جاتا ہے کہ خدا میں ہو کر بولتا ہے

اور خدا میں ہو کر دیکھتا ہے اور خدا میں ہو کر سنتا ہے اور خدا میں ہو کر چلتا ہے۔ گویا اس کے جبّہ میں خدا ہی ہوتا ہے اور انسانیت اُس کی تجلّیات الٰہیہ کے نیچے مغلوب ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ مضمون نازک ہے اور عام فہم نہیں اس لئے ہم اس کو اسی جگہ چھوڑتے ہیں۔

(حقیقۃ الوحی ص۲۰-۲۳)

اِن آیات میں چھ جگہ اَفْلَحَ کا لفظ ہے۔ پہلی آیت میں صریح طور پر جیسا کہ فرمایا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ۔ اور بعد کی آیتوں میں عطف کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اَفْلَحَ کے لُغت میں یہ معنے ہیں کہ اُصِیْرَ اِلَی الْفَلَاحِ یعنی فوزِ مرام کی طرف پھیرا گیا اور حرکت دیا گیا۔ پس ان معنوں کی رُو سے مومن کا نماز میں خشوع اختیار کرنا فوزِ مرام کے لئے پہلی حرکت ہے جس کے ساتھ تکبّر اور عجب وغیرہ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اور اس میں فوزِ مرام یہ ہے کہ انسان کا نفس خشوع کی سیرت اختیار کر کے خدا تعالیٰ سے تعلّق پکڑنے کے لئے مستعد اور تیار ہو جاتا ہے۔

دوسرا کام مومن کا یعنی وہ کام جس سے دوسرے مرتبہ تک قوتِ ایمانی پہنچتی ہے اور پہلے کی نسبت ایمان کچھ قوی ہو جاتا ہے عقلِ سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ مومن اپنے دل کو جو خشوع کے مرتبہ تک پہنچ چکا ہے لغو خیالات اور لغو شغلوں سے پاک کرے۔ کیونکہ جب تک مومن یہ ادنیٰ قوت حاصل نہ کر لے کہ خدا کے لئے لغو باتوں اور لغو کاموں کو ترک کر سکے جو کچھ بھی مشکل نہیں اور صرف گناہ بے لذّت ہے۔ اسوقت تک یہ طمع خام ہے کہ مومن ایسے کاموں سے دست بردار ہو سکے جن سے دست بردار ہونا نفس پر بہت بھاری ہے اور جن کے ارتکاب میں نفس کو کوئی فائدہ یا لذّت ہے۔ پس اس سے ثابت ہے کہ پہلے درجہ کے بعد کہ ترکِ تکبّر ہے دوسرا درجہ ترکِ لغویات ہے۔ اور اس درجہ پر وعدہ جو لفظ اَفْلَحَ سے کیا گیا ہے یعنی فوزِ مرام اِس طرح پر پورا ہوتا ہے کہ مومن کا تعلق جب لغو کاموں اور لغو شغلوں سے ٹوٹ جاتا ہے تو ایک خفیف سا تعلق خدا تعالیٰ سے اسکو ہو جاتا ہے اور قوتِ ایمانی بھی پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور خفیف تعلق اس لئے ہم نے کہا کہ لغویات سے تعلّق بھی خفیف ہی ہوتا ہے۔ پس خفیف تعلق چھوڑنے سے خفیف تعلق ہی ملتا ہے۔

پھر **تیسرا کام** مومن کا جس سے تیسرے درجے تک قوتِ ایمانی پہنچ جاتی ہے عقلِ سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ وہ صرف لغو کاموں اور لغو باتوں کو ہی خدا تعالیٰ کے لئے نہیں چھوڑتا بلکہ اپنا

عزیز مال بھی خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ لغو کاموں کو چھوڑنے کی نسبت مال کو چھوڑنا نفس پر زیادہ بھاری ہے۔ کیونکہ وہ محنت سے کمایا ہوا اور ایک کارآمد چیز ہوتی ہے جس پر خوش زندگی اور آرام کا مدار ہے۔ اس لئے مال کا خدا کے لئے چھوڑنا بہ نسبت لغو کاموں کے چھوڑنے کے قوتِ ایمانی کو زیادہ چاہتا ہے اور لفظ اَفْلَحَ کا جو آیات میں وعدہ ہے اس کے اس جگہ یہ معنے ہونگے کہ دوسرے درجہ کی نسبت اس مرتبہ میں قوتِ ایمانی اور تعلق بھی خدا تعالیٰ سے زیادہ ہو جاتی ہے اور نفس کی پاکیزگی اس سے پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اپنے ہاتھ سے اپنا محنت سے کمایا ہوا مال محض خدا کے خوف سے نکالنا بجز نفس کی پاکیزگی کے ممکن نہیں۔

پھر **چوتھا کام** مومن کا جس سے چوتھے درجے تک قوتِ ایمانی پہنچ جاتی ہے عقلِ سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ وہ صرف مال کو خدا تعالیٰ کی راہ میں ترک نہیں کرتا بلکہ وہ چیز جس سے وہ مال سے بھی بڑھ کر پیار کرتا ہے یعنی شہواتِ نفسانیہ ان کا وہ حصہ جو حرام کے طور پر ہے چھوڑ دیتا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر ایک انسان اپنی شہواتِ نفسانیہ کو طبعاً مال سے عزیز سمجھتا ہے اور مال کو ان کی راہ میں فدا کرتا ہے۔ پس بلاشبہ مال کے چھوڑنے سے خدا کے لئے شہوات کو چھوڑنا بہت بھاری ہے۔ اور لفظ اَفْلَحَ جو اس آیت سے بھی تعلق رکھتا ہے اس کے اس جگہ یہ معنے ہیں کہ جیسے شہواتِ نفسانیہ سے انسان کو طبعاً شدید تعلق ہوتا ہے ایسا ہی ان کے چھوڑنے کے بعد وہی شدید تعلق خدا تعالیٰ سے ہو جاتا ہے کیونکہ جو شخص کوئی چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں کھوتا ہے اس سے بہتر پا لیتا ہے ؎

لطف او ترک طالباں نہ کند — کس بہ کار رہش زیاں نہ کند
ہر کہ آں راہ جست یافتہ است — تافت آں رو کہ سر نتافتہ است

پھر **پانچواں کام** مومن کا جس سے پانچویں درجہ تک قوتِ ایمانی پہنچ جاتی ہے عند العقل یہ ہے کہ صرف ترکِ شہواتِ نفس ہی نہ کرے بلکہ خدا کی راہ میں خود نفس کو ہی ترک کر دے۔ اور اس کے فدا کرنے پر تیار رہے یعنی نفس جو خدا کی امانت ہے اسی مالک کو واپس دے دے اور نفس سے صرف اس قدر تعلق رکھے جیسا کہ ایک امانت سے تعلق ہوتا ہے۔ اور دقائقِ تقویٰ ایسے طور پر پورے کرے کہ گویا اپنے نفس اور مال اور تمام چیزوں کو خدا کی راہ میں وقف کر چکا ہے۔ اسی طرف یہ آیات اشارہ فرماتی ہیں۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ۔ پس جبکہ انسان کے جان و مال اور تمام قسم کے آرام خدا کی امانت ہے جس کو واپس دینا امین ہونے کے لئے شرط ہے

لہذا ترکِ نفس وغیرہ کے یہی معنے ہیں کہ یہ امانت خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کرکے اس طور سے یہ قربانی ادا کر دے۔ اور دوسرے یہ کہ جو خدا تعالیٰ کے ساتھ ایمان کے وقت اس کا عہد تھا اور جو عہد اور امانتیں مخلوق کی اس کی گردن پر ہیں ان سب کو ایسے طور سے تقویٰ کی رعایت سے بجا لاوے کہ وہ بھی ایک سچی قربانی ہو جاوے۔ کیونکہ دقائق تقویٰ کو انتہا تک پہنچانا یہ بھی ایک قسم کی موت ہے۔ اور لفظ اَفْلَحَ کا جو اس آیت سے بھی تعلق رکھتا ہے اس کے اسجگہ یہ معنے ہیں کہ جب اس درجہ کا مومن خدا تعالیٰ کی راہ میں بذلِ نفس کرتا ہے اور تمام دقائق تقویٰ بجا لاتا ہے تب حضرتِ احدیت سے انوارِ الٰہیہ اس کے وجود پر محیط ہو کر رُوحانی خوبصورتی اُس کو بخشتے ہیں جیسے کہ گوشت ہڈیوں پر چڑھ کر اُن کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں ان دونوں حالتوں کا نام خدا تعالیٰ نے لباس ہی رکھا ہے۔ تقویٰ کا نام بھی لباس ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِبَاسُ التَّقْوٰى اور جو گوشت ہڈیوں پر چڑھتا ہے وہ بھی لباس ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا کیونکہ کسوت جس سے کَسَوْنَا کا لفظ نکلا ہے لباس کو ہی کہتے ہیں۔

اَب یاد رہے کہ منتہیٰ سلوک کا پنجم درجہ ہے اور جب پنجم درجہ کی حالت اپنی کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس کے بعد چھٹا درجہ ہے جو محض ایک موہبت کے طور پر ہے جو بغیر کسب اور کوشش کے مومن کو عطا ہوتا ہے اور کسب کا اس میں ذرہ دخل نہیں اور وہ یہ ہے کہ جیسے مومن خدا کی راہ میں اپنی رُوح کھوتا ہے تو ایک رُوح اس کو عطا کی جاتی ہے کیونکہ ابتدا سے یہ وعدہ ہے کہ جو کوئی خدا تعالیٰ کی راہ میں کچھ کھوئے گا وہ اُسے پائیگا۔ اس لئے رُوح کو کھونے والے رُوح کو پاتے ہیں پس چونکہ مومن اپنی محبتِ ذاتیہ سے خدا کی راہ میں اپنی جان وقف کرتا ہے اس لئے خدا کی محبتِ ذاتیہ کی رُوح کو پاتا ہے جس کے ساتھ رُوح القدس شامل ہوتا ہے۔ خدا کی محبت ذاتیہ ایک رُوح ہے اور رُوح اپنا کام مومن کے اندر کرتی ہے۔ اس لئے وہ خود رُوح ہے اور رُوح القدس اس سے جُدا نہیں کیونکہ اس محبت اور رُوح القدس میں کبھی انفکاک ہو ہی نہیں سکتا۔ اِسی وجہ سے ہم نے اکثر جگہ صرف محبتِ ذاتیہ الٰہیہ کا ذکر کیا ہے اور رُوح القدس کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ ان کا باہم تلازم ہے۔ اور جب رُوح کسی مومن پر نازل ہوتی ہے تو تمام بوجھ عبادات کا اس کے سر پر سے ساقط ہو جاتا ہے اور اُس میں ایک ایسی قوت اور لذّت آجاتی ہے جو وہ قوت تکلّف سے نہیں بلکہ طبعی جوش سے یادِ الٰہی اس سے کراتی ہے اور عاشقانہ جوش اس کو بخشتی ہے۔ پس ایسا مومن جبرائیل علیہ السلام کی طرح ہر وقت آستانۂ الٰہی کے آگے حاضر رہتا ہے اور حضرت عزّت کی دائمی ہمسائیگی اس کو

نصیب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اس درجہ کے بارے میں فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ۔ یعنی مومن کامل وہ لوگ ہیں کہ ایسا دائمی حضور اُن کو میسّر آتا ہے کہ ہمیشہ وہ اپنی نماز کے آپ نگہبان رہتے ہیں۔ یہ اس حالت کی طرف اشارہ ہے کہ اس درجہ کا مومن اپنی رُوحانی بقا کے لئے نماز کو ایک ضروری چیز سمجھتا ہے اور اس کو اپنی غذا قرار دیتا ہے جس کے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتا۔ یہ درجہ بغیر اس رُوح کے حاصل نہیں ہو سکتا جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مومن پر نازل ہوتی ہے کیونکہ جب کہ مومن خدا تعالیٰ کے لئے اپنی جان کو ترک کر دیتا ہے تو ایک دوسری جان پانے کا مستحق ہوتا ہے۔

اس تمام تقریر سے ثابت ہے کہ یہ **مراتب ستّہ** عقل سلیم کے نزدیک اس مومن کی راہ میں پڑے ہیں جو اپنے وجود روحانی کو کمال تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اور ہر ایک انسان تھوڑے سے غور کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ ضرور مومن پر اس کے سلوک کے وقت چھ حالتیں آتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک انسان خدا تعالیٰ سے کامل تعلق نہیں پکڑتا تب تک اُس کا نفس ناقص پانچ خراب حالتوں سے پیار کرتا ہے۔ اور ہر ایک حالت کا پیار دُور کرنے کے لئے ایک ایسے سبب کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس پیار پر غالب آجائے اور نیا پیار پہلے پیار کا علاقہ توڑ دے۔

چنانچہ پہلی حالت جس سے وہ پیار کرتا ہے یہ ہے کہ وہ ایک غفلت میں پڑا ہوتا ہے اور اس کو بالکل خدا تعالیٰ سے بُعد اور دوری ہوتی ہے اور نفس ایک کفر کے رنگ میں ہوتا ہے اور غفلت کے پردے تکبّر اور لاپرواہی اور سنگدلی کی طرف اس کو کھینچتے ہیں اور خشوع اور خضوع اور تواضع اور فروتنی اور انکسار کا نام و نشان اُس میں نہیں ہوتا۔ اور اسی اپنی حالت سے وہ محبت کرتا ہے اور اس کو اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے۔ اور پھر جب عنایت الٰہیہ اس کی اصلاح کی طرف توجّہ کرتی ہے تو کسی واقعہ کے پیدا ہونے سے یا کسی آفت کے نازل ہونے سے خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت اور جبروت کا اس کے دل پر اثر پڑتا ہے اور اس اثر سے اس پر ایک حالت خشوع پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے تکبّر اور گردن کشی اور غفلت کی عادت کو کالعدم کر دیتی ہے اور اس سے علاقۂ محبت توڑ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر وقت دنیا میں مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔ اور دیکھا جاتا ہے کہ جب ہیبتِ الٰہی کا تازیانہ کسی خوفناک لباس میں نازل ہوتا ہے تو بڑے بڑے شریروں کی گردن جُھکا دیتا ہے اور خواب غفلت سے جگا کر خشوع اور خضوع کی حالت بنا دیتا ہے۔ یہ وہ پہلا مرتبہ رجوع الی اللہ کا ہے جو عظمت اور ہیبت الٰہی کے مشاہدہ کے بعد یا

کسی اَور طور سے ایک سعید الفطرت کو حاصل ہو جاتا ہے اور گو وہ پہلے اپنی غافلانہ اور بے قید زندگی سے محبت ہی رکھتا تھا مگر جب مخالف اثر اس پہلے اثر سے قوی تر پیدا ہوتا ہے تو اس حالت کو بہرحال چھوڑنا پڑتا ہے۔

پھر اس کے بعد دوسری حالت یہ ہے کہ ایسے مومن کو خدا تعالیٰ کی طرف کچھ رجوع تو ہو جاتا ہے مگر اس رجوع کے ساتھ لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو شغلوں کی پلیدی رہتی ہے جن سے وہ اُنس اور محبت رکھتا ہے۔ ہاں کبھی نماز میں خشوع کے حالات بھی اس سے ظہور میں آتے ہیں لیکن دوسری طرف لغو حرکات بھی اس کے لازم حال رہتی ہیں اور لغو تعلّقات اور لغو مجلسیں اور لغو ہنسی ٹھٹھا اس کے گلے کا ہار رہتا ہے۔ گویا وہ دو رنگ رکھتا ہے کبھی کچھ کبھی کچھ ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر مے کنند ٭ چوں بخلوت مے روند آں کار دیگر مے کنند

پھر جب عنایتِ الٰہیہ اُس کو ضائع کرنا نہیں چاہتی تو پھر ایک اور جلوہ عظمت اور ہیبت اور جبروتِ الٰہی کا اُس کے دل پر نازل ہوتا ہے جو پہلے جذبہ سے زیادہ تیز ہوتا ہے اور قوتِ ایمانی اُس سے تیز ہو جاتی ہے اور ایک آگ کی طرح مومن کے دل پر پڑ کر تمام خیالاتِ لغو اُسکے ایک دم میں بھسم کر دیتی ہے۔ اور یہ جلوہ عظمت اور جبروتِ الٰہی کا اس قدر حضرتِ عزّت کی محبت اُس کے دل میں پیدا کرتا ہے کہ لغو کاموں اور لغو شغلوں کی محبت پر غالب آجاتا ہے اور ان کو دفع اور دُور کر کے اُن کی جگہ لے لیتا ہے اور تمام بے ہودہ شغلوں سے دل کو سرد کر دیتا ہے۔ تب لغو کاموں سے دل کو ایک کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر لغو شغلوں اور لغو کاموں کے دُور ہونے کے بعد ایک تیسری خراب حالت مومن میں باقی رہ جاتی ہے جس سے وہ دوسری حالت کی نسبت بہت محبت رکھتا ہے یعنی طبعاً مال کی محبت اُس کے دل میں ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی اور آرام کا مدار مال کو ہی سمجھتا ہے اور نیز اسکے حاصل ہونے کا ذریعہ صرف اپنی محنت اور مشقت خیال کرتا ہے۔ پس اس وجہ سے اس پر خدا تعالیٰ کی راہ میں مال کا چھوڑنا بہت بھاری اور تلخ ہوتا ہے۔

پھر جب عنایتِ الٰہیہ اس ورطۂ عظیمہ سے اس کو نکالنا چاہتی ہے تو رازقیتِ الٰہیہ کا علم اس کو عطا کیا جاتا ہے اور توکّل کا بیج اس میں بویا جاتا ہے اور ساتھ اس کے ہیبتِ الٰہیہ بھی کام کرتی ہے اور دونوں تجلیاتِ جمالی اور جلالی اس کے دل کو اپنے قابو میں لے آتی ہیں تب مال کی محبت بھی دل میں سے بھاگ جاتی ہے اور مال دینے والے کی محبت کا تخم دل میں بویا جاتا ہے

اور ایمان قوی کیا جاتا ہے اور یہ قوتِ ایمانی درجہ سوم کی قوت سے بڑھ کر ہوتی ہے کیونکہ اِس جگہ مومن صرف لغو باتوں کو ہی ترک نہیں کرتا بلکہ اس مال کو ترک کرتا ہے جس پر اپنی خوش زندگی کا سارا مدار سمجھتا ہے۔ اور اگر اس کی ایمان کو قوتِ توکّل عطا نہ کی جاتی اور رازقِ حقیقی کی طرف آنکھ کا دروازہ نہ کھولا جاتا تو ہرگز ممکن نہ تھا کہ بخل کی بیماری دُور ہو سکتی۔ پس یہ قوتِ ایمانی نہ صرف لغو کاموں سے چھڑاتی ہے بلکہ خدا تعالیٰ کے رازق ہونے پر ایک قوی ایمان پیدا کر دیتی ہے اور نورِ توکّل دل میں ڈال دیتی ہے۔ تب مال جو ایک پارۂ جگر سمجھا جاتا ہے بہت آسانی اور شرح صدر سے مومن اسکو خدا تعالیٰ کی راہ میں دیتا ہے اور وہ ضعف جو بخل کی حالت میں نو امیدی سے پیدا ہوتا ہے اب خدا تعالیٰ پر بہت سی امیدیں ہو کر وہ تمام ضعف جاتا رہتا ہے اور مال دینے والے کی محبت مال کی محبت سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

پھر بعد اس کے **چوتھی حالت** ہے جس سے نفسِ امّارہ بہت ہی پیار کرتا ہے اور جو تیسری حالت سے بدتر ہے۔ کیونکہ تیسری حالت میں تو صرف مال کا اپنے ہاتھ سے چھوڑنا ہے مگر چوتھی میں نفسِ امارہ کی شہوات محرمہ کو چھوڑنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مال کا چھوڑنا بہ نسبت شہوات کے کے چھوڑنے سے انسان پر طبعاً سہل ہوتا ہے اس لئے یہ حالت بہ نسبت حالات گذشتہ کے بہت شدید اور خطرناک ہے اور فطرتاً انسان کو شہواتِ نفسانیہ کا تعلّق بہ نسبت مال کے تعلّق کے بہت پیارا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مال کو جو اس کے نزدیک مدارِ آسائش ہے بڑی خوشی سے شہوات نفسانیہ کی راہ میں فدا کر دیتا ہے اور اس حالت کے خوفناک جوش کی شہادت میں یہ آیت کافی ہے۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ۔ یعنی یہ ایسا مُنّہ زور جوش ہے کہ اس کا فرد ہونا کسی برہانِ قوی کا محتاج ہے۔ پس ظاہر ہے کہ درجہ چہارم پر قوتِ ایمانی بہ نسبت درجہ سوم کے بہت قوی اور زبردست ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت اور جبروت کا مشاہدہ بھی پہلے کی نسبت اس میں زیادہ ہوتا ہے اور نہ صرف اسقدر بلکہ یہ بھی اس میں نہایت ضروری ہے کہ جس لذّتِ ممنوعہ کو دُور کیا گیا ہے اسکے عوض میں روحانی طور پر کوئی لذّت بھی حاصل ہو۔ اور جیسا کہ بخل کے دُور کرنے کے لئے خدا تعالےٰ کی رازقیّت پر قوی ایمان درکار ہے اور خالی جیب ہونے کی حالت میں ایک قوی توکّل کی ضرورت ہے تا بخل بھی دُور ہو اور غیبی فتوح پر امید بھی پیدا ہو جائے ایسا ہی شہواتِ ناپاک نفسانیہ کے دُور کرنے کے لئے اور آتشِ شہوت سے مخلصی پانے کے لئے اُس آگ کے وجود پر قوی ایمان

ضروری ہے جو جسم اور رُوح دونوں کو عذاب شدید میں ڈالتی ہے اور نیز ساتھ اس کے اُس رُوحانی لذّت کی ضرورت ہے جو ان کثیف لذّتوں سے بے نیاز اور مستغنی کر دیتی ہے ۔ جو شخص شہواتِ نفسانیہ محرّمہ کے پنجہ میں اسیر ہے وہ ایک اژدہا کے مُنہ میں ہے جو نہایت خطرناک زہر رکھتا ہے پس اِس سے ظاہر ہے کہ جیسا کہ لغو حرکات کی بیماری سے بخل کی بیماری بڑھ کر ہے ۔ اسی طرح بخل کی بیماری کے مقابل پر شہواتِ نفسانیہ محرمہ کے پنجہ میں اسیر ہونا سب بلاؤں سے زیادہ بلا ہے جو خدا تعالیٰ کے ایک خاص رحم کی محتاج ہے ۔ اور جب خدا تعالیٰ کسی کو اس بلاء سے نجات دینا چاہتا ہے تو اپنی عظمت اور ہیبت اور جبروت کی ایسی تجلّی اس پر کرتا ہے جس سے شہواتِ نفسانیہ محرمہ پارہ پارہ ہو جاتی ہیں اور پھر جمالی رنگ میں اپنی لطیف محبت کا ذوق اُس کے دل میں ڈالتا ہے اور جس طرح شیر خوار بچہ دودھ چھوڑنے کے بعد صرف ایک رات تلخی میں گذارتا ہے بعد اس کے اس دودھ کو ایسا فراموش کر دیتا ہے کہ چھاتیوں کے سامنے بھی اگر اس کے مُنہ کو رکھا جائے تب بھی دودھ پینے سے نفرت کرتا ہے ۔ یہی نفرت شہواتِ محرّمہ نفسانیہ سے اس راستباز کو ہو جاتی ہے جس کو نفسانی دودھ چھڑا کر ایک رُوحانی غذا اس کے عوض میں دی جاتی ہے ۔

پھر چوتھی حالت کے بعد **پانچویں حالت** ہے جس کے مفاسد سے نہایت سخت اور شدید محبّت نفسِ امّارہ کو ہے ۔ کیونکہ اس مرتبہ پر صرف ایک لڑائی باقی رہ جاتی ہے اور وہ وقت قریب آجاتا ہے کہ حضرتِ عزّت جلّ شانہٗ کے فرشتے اس وجود کی تمام آبادی کو فتح کر لیں اور اس پر اپنا پورا تصرف اور دخل کر لیں اور تمام نفسانی سلسلہ کو درہم برہم کر دیں اور نفسانی قویٰ کے قریہ کو ویران کر دیں اور اُس کے نمبرداروں کو ذلیل اور پست کر کے دکھلا دیں اور پہلی سلطنت پر ایک تباہی ڈال دیں ۔ اور انقلاب سلطنت پر ایسا ہی ہُوا کرتا ہے ۔ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۔ اور یہ مومن کیلئے ایک آخری امتحان اور آخری جنگ ہے جس پر اس کے تمام مراتب سلوک ختم ہو جاتے ہیں اور اس کا سلسلہ ترقیات جو کسب اور کوشش سے ہے انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور انسانی کوششیں اپنے اخیر نقطہ تک منزل طے کر لیتی ہیں ۔ پھر بعد اس کے صرف موہبت اور فضل کا کام باقی رہ جاتا ہے جو خلق آخر کے متعلق ہے ۔ اور یہ پانچویں حالت چوتھی حالت سے مشکل تر ہے کیونکہ چوتھی حالت میں تو صرف مومن کا کام یہ ہے کہ شہوات محرّمہ نفسانیہ کو ترک کرے ۔ مگر پانچویں حالت کے مومن کا کام یہ ہے کہ نفس کو بھی ترک کر دے اور اس کو خدا تعالےٰ کی امانت سمجھ کر خدا تعالیٰ

کی طرف واپس کرے اور خدا کے کاموں میں اپنے نفس کو وقف کرکے اُس سے خدمت لے اور خدا کی راہ میں بذلِ نفس کرنے کا ارادہ رکھے اور اپنے نفس کی نفی وجود کے لئے کوشش کرے۔ کیونکہ جب تک نفس کا وجود باقی ہے گناہ کرنے کے لئے جذبات بھی باقی ہیں جو تقویٰ کے برخلاف ہیں اور نیز جب تک وجودِ نفس باقی ہے ممکن نہیں کہ انسان تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مار سکے یا پورے طور پر خدا کی امانتوں اور عہدوں یا مخلوق کی امانتوں اور عہدوں کو ادا کر سکے۔ لیکن جیسا کہ بخل بغیر توکّل اور خدا کی رازقیت پر ایمان لانے کے ترک نہیں ہو سکتا اور شہواتِ نفسانیہ محرّمہ بغیر استیلاءِ ہیبت اور عظمتِ الٰہی اور لذاتِ روحانیہ کے چھوٹ نہیں سکتیں ایسا ہی یہ مرتبہ عظمیٰ کہ ترکِ نفس کرکے تمام امانتیں خدا تعالیٰ کی اس کو واپس دی جائیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک تیز آندھی عشقِ الٰہی کی چل کر کسی کو اس کی راہ میں دیوانہ نہ بناوے یہ تو درحقیقت عشقِ الٰہی کے مستوں اور دیوانوں کے کام ہیں۔ دنیا کے عقلمندوں کے کام نہیں۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید ؎ قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اسی کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ ہم نے اپنی امانت کو جو امانت کی طرح واپس دینی چاہیئے تمام زمین و آسمان کی مخلوق پر پیش کیا۔ پس سب نے اس امانت کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرے کہ امانت کے لینے سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔ مگر انسان نے اس امانت کو اپنے سر پر اٹھا لیا کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا۔ یہ دونوں لفظ انسان کے لئے محلِّ مدح میں ہیں نہ محلِ مذمت میں۔ اور ان کے معنے یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں ایک صفت تھی کہ وہ خدا کے لئے اپنے نفس پر ظلم اور سختی کر سکتا تھا۔ اور ایسا خدا تعالیٰ کی طرف جُھک سکتا تھا کہ اپنے نفس کو فراموش کر دے۔ اس لئے اُس نے منظور کیا کہ اپنے تمام وجود کو امانت کی طرح پاوے۔ اور پھر خدا کی راہ میں خرچ کر دے۔

اور اس پانچویں مرتبہ کے لئے یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ۔ یعنی مومن وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہدوں کی رعایت رکھتے ہیں۔ یعنی ادائے امانت اور ایفائے عہد کے بارے میں کوئی دقیقہ تقویٰ اور احتیاط کا باقی نہیں چھوڑتے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا نفس اور اُس کے تمام قویٰ اور آنکھ کی بینائی اور کانوں کی

شنوائی اور زبان کی گویائی اور ہاتھوں پیروں کی قوت یہ سب خدا تعالیٰ کی امانتیں ہیں جو اُس نے دی ہیں۔ اور جس وقت وہ چاہے اپنی امانتوں کو واپس لے سکتا ہے۔ پس ان تمام امانتوں کی رعایت رکھنا یہ ہے کہ باریک در باریک تقویٰ کی پابندی سے خدا تعالیٰ کی خدمت میں نفس اور اسکے تمام قویٰ اور جسم اور اس کے تمام قویٰ اور جوارح کو لگایا جائے اس طرح پر کہ گویا یہ تمام چیزیں اس کی نہیں بلکہ خدا کی ہو جائیں اور اس کی مرضی سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی کے موافق ان تمام قویٰ اور اعضاء کا حرکت اور سکون ہو اور اس کا ارادہ کچھ بھی نہ رہے بلکہ خدا کا ارادہ ان میں کام کرے اور خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں اس کا نفس ایسا ہو جیسا کہ مُردہ زندہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہ خود رائی سے بے دخل ہو۔ اور خدا تعالیٰ کا پورا تصرف اس کے وجود پر ہو جائے۔ یہاں تک کہ اُسی سے دیکھے اور اُسی سے سُنے اور اُسی سے بولے اور اُسی سے حرکت یا سکون کرے اور نفس کی دقیق در دقیق آلائشیں جو کسی خوردبین سے بھی نظر نہیں آسکتیں دُور ہو کر فقط روح رہ جائے۔ غرض مہیمنت خدا کی اس پر احاطہ کرے اور اپنے وجود سے اُس کو کھو دے اور اُسکی حکومت اپنے وجود پر کچھ نہ رہے اور سب حکومت خدا کی ہو جائے اور نفسانی جوش سب مفقود ہو جائیں اور الوہیت کے ارادے اس کے وجود میں جوش زن ہو جائیں۔ پہلی حکومت بالکل اُٹھ جائے اور دوسری حکومت دل میں قائم ہو اور نفسانیت کا گھر ویران ہو اور اسجگہ پر حضرتِ عزت کے خیمے لگائے جائیں اور ہیبت اور جبروت الٰہی تمام ان پودوں کو جن کی آبپاشی گندے چشمہ نفس سے ہوتی تھی اس پلید جگہ سے اکھیڑ کر رضا جوئی حضرت عزّت کی پاک زمین لگا دیئے جائیں اور تمام آرزوئیں اور تمام ارادے اور تمام خواہشیں خدا میں ہو جائیں اور نفس امّارہ کی تمام عمارتیں منہدم کر کے خاک میں ملا دی جائیں۔ اور ایک ایسا پاک محل تقدس اور تطہّر کا دل میں تیار کیا جاوے جس میں حضرتِ عزّت نازل ہو سکے اور اس کی رُوح اس میں آباد ہو سکے اس قدر تکمیل کے بعد کہا جائیگا کہ وہ امانتیں جو منعم حقیقی نے انسان کو دی تھیں وہ واپس کی گئیں۔ تب ایسے شخص پر یہ آیت صادق آئیگی وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ اس درجہ پر صرف ایک قالب تیار ہوتا ہے۔ اور تجلّی الٰہی کی رُوح جس سے مراد محبتِ ذاتیہ حضرت عزت ہے بعد اس کے مع رُوح القدس ایسے مومن کے اندر داخل ہوتی اور نئی حیات اس کو بخشتی ہے اور ایک نئی قوت اس کو عطا کی جاتی ہے اور اگرچہ سب کچھ رُوح کے اثر سے ہی ہوتا ہے لیکن ہنوز رُوح مومن سے صرف ایک تعلق رکھتی ہے اور ابھی مومن کے دل کے اندر آباد نہیں ہوتی

پھر بعد اس کے وجود روحانی کا مرتبہ **ششم** ہے۔ یہ وہی مرتبہ ہے جس میں مومن کی محبت ذاتیہ اپنے کمال کو پہنچ کر اللہ جلّ شانہ کی محبتِ ذاتیہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ تب خدا تعالیٰ کی وہ محبت ذاتی مومن کے اندر داخل ہوتی اور اس پر احاطہ کرتی ہے جس سے ایک نئی اور فوق العادت طاقت مومن کو ملتی ہے۔ اور وہ ایمانی طاقت ایمان میں ایک ایسی زندگی پیدا کرتی ہے جیسے ایک قالب بے جان میں رُوح داخل ہو جاتی ہے بلکہ وہ مومن میں داخل ہو کر درحقیقت ایک رُوح کا کام کرتی ہے۔ تمام قویٰ میں اس سے ایک نور پیدا ہوتا ہے اور رُوح القدس کی تائید ایسے مومن کے شامل حال ہوتی ہے کہ وہ باتیں اور وہ علوم جو انسانی طاقت سے برتر ہیں وہ اس درجہ کے مومن پر کھولے جاتے ہیں۔ اور اس درجہ کا مومن ایمانی ترقیات کے تمام مراتب طے کر کے ان ظلّی کمالات کی وجہ سے جو حضرت عزّت کے کمالات سے اس کو ملتے ہیں آسمان پر خلیفۃ اللہ کا لقب پاتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ایک شخص جب آئینہ کے مقابل پر کھڑا ہوتا ہے تو تمام نقوش اُس کے مُنّہ کے نہایت صفائی سے آئینہ میں منعکس ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی اس درجہ کا مومن جو نہ صرف ترکِ نفس کرتا ہے بلکہ نفیٔ وجود اور ترک نفس کے کام کو اس درجہ کے کمال تک پہنچاتا ہے کہ اس کے وجود میں سے کچھ بھی نہیں رہتا۔ اور صرف آئینہ کے رنگ میں ہو جاتا ہے تب ذات الٰہی کے تمام نقوش اور تمام اخلاق اس میں مندرج ہو جاتے ہیں۔ اور جیسا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ آئینہ جو ایک سامنے کھڑے ہونے والے منہ کے تمام نقوش اپنے اندر لے کر اُس مُنّہ کا خلیفہ ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مومن بھی ظلّی طور پر اخلاق اور صفات الٰہیہ کو اپنے اندر لے کر خلافت کا درجہ اپنے اندر حاصل کرتا ہے اور ظلّی طور پر الٰہی صورت کا مظہر ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ خدا غیب الغیب ہے اور اپنی ذات میں وراء الوراء ہے ایسا ہی یہ مومنِ کامل اپنی ذات میں غیب الغیب اور وراء الوراء ہوتا ہے۔ دنیا اس کی حقیقت تک پہنچ نہیں سکتی کیونکہ وہ دنیا کے دائرہ سے بہت ہی دُور چلا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خدا جو غیر متبدل اور حیّ و قیّوم ہے وہ مومنِ کامل کی اس پاک تبدیلی کے بعد جبکہ مومن خدا کے لئے اپنا وجود بالکل کھو دیتا ہے اور ایک نیا چولہ پاک تبدیلی کا پہن کر اس میں سے اپنا سر نکالتا ہے تب خدا بھی اس کے لئے اپنی ذات میں ایک تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہ خدا کی ازلی ابدی صفات میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ نہیں بلکہ وہ قدیم سے اور ازل سے غیر متبدل ہے۔ لیکن یہ صرف مومن کامل کے لئے جلوۂ قدرت ہوتا ہے اور ایک تبدیلی جس کی ہم کنہہ

نہیں سمجھ سکتے مومن کی تبدیلی کے ساتھ خدا میں بھی ظہور میں آجاتی ہے۔ مگر اس طرح پر کہ اس کی غیر متبدل ذات پر کوئی گرد و غبار حدوث کا نہیں بیٹھتا۔ وہ اسی طرح غیر متبدل ہوتا ہے جس طرح وہ قدیم سے ہے لیکن یہ تبدیلی جو مومن کی تبدیلی کے وقت ہوتی ہے یہ اس قسم کی ہے جیسا کہ لکھا ہے کہ جب مومن خدا تعالیٰ کی طرف حرکت کرتا ہے تو خدا اس کی نسبت تیز حرکت کے ساتھ اس کی طرف آتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ تبدیلیوں سے پاک ہے ایسا ہی وہ حرکتوں سے بھی پاک ہے لیکن یہ تمام الفاظ استعارہ کے رنگ میں بولے جاتے ہیں اور بولنے کی اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ تجربہ شہادت دیتا ہے کہ جیسے ایک مومن خدا تعالیٰ کی راہ میں نیستی اور فنا اور استہلاک کر کے اپنے تئیں ایک نیا وجود بناتا ہے اُس کی ان تبدیلیوں کے مقابل پر خدا بھی اُس کے لئے ایک نیا ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہ معاملات کرتا ہے جو دوسرے کے ساتھ کبھی نہیں کرتا اور اس کو اپنے ملکوت اور اسرار کا وہ سیر کراتا ہے جو دوسرے کو ہرگز نہیں دکھلاتا۔ اور اس کے لئے وہ اپنے کام ظاہر کرتا ہے جو دوسروں کے لئے ایسے کام کبھی ظاہر نہیں کرتا اور اسقدر اس کی نصرت اور مدد کرتا ہے کہ لوگوں کو تعجب میں ڈالتا ہے۔ اس کیلئے خوارق دکھلاتا ہے اور معجزات ظاہر کرتا اور ہر ایک پہلو سے اس کو غالب کر دیتا ہے۔ اور اس کی ذات میں ایک قوتِ کشش رکھ دیتا ہے جس سے ایک جہان اس کی طرف کھچا چلا جاتا ہے اور وہی باقی رہ جاتے ہیں جن پر شقاوت ازلی غالب ہے۔

پس ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ مومن کامل کی پاک تبدیلی کے ساتھ خدا تعالیٰ بھی ایک نئی صورت کی تجلّی سے اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے انسان کو اپنے لئے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ جب انسان خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا شروع کرے تو اُسی دن سے بلکہ اُسی گھڑی سے بلکہ اُسی دم سے خدا تعالیٰ کا رجوع اُس کی طرف شروع ہو جاتا ہے اور وہ اس کا متولّی اور متکفّل اور حامی اور ناصر بن جاتا ہے اور اگر ایک طرف تمام دنیا ہو اور ایک طرف مومن کامل تو آخر غلبہ اُسی کو ہوتا ہے کیونکہ خدا اپنی محبت میں صادق ہے اور اپنے وعدوں میں پورا۔ وہ اس کو جو درحقیقت اس کا ہو جاتا ہے ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ ایسا مومن آگ میں ڈالا جاتا ہے اور گلزار میں سے نکلتا ہے۔ وہ ایک گرداب میں دھکیل دیا جاتا اور ایک خوشنما باغ میں سے نمودار ہو جاتا ہے۔ دشمن اس کے لئے بہت منصوبے کرتے اور اس کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں لیکن خدا ان کے تمام مکروں اور منصوبوں کو پاش پاش کر دیتا ہے کیونکہ وہ اس کے ہر قدم کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے آخر اس کی ذلّت چاہنے والے ذلّت کی مار سے مرتے ہیں اور نامرادی ان کا انجام ہوتا ہے۔ لیکن وہ جو اپنے

تمام دل اور تمام جان اور تمام ہمت کے ساتھ خدا کا ہو گیا ہے وہ نامراد ہرگز نہیں مرتا۔ اور اُس کی عمر میں برکت دی جاتی ہے۔ اور ضرور ہے کہ وہ جیتا رہے جب تک اپنے کاموں کو پورا نہ کر لے۔ تمام برکتیں اخلاص میں ہیں۔ اور تمام اخلاص خدا کی رضا جوئی میں اور تمام خدا کی رضا جوئی اپنی رضا کے چھوڑنے میں۔ یہی موت ہے جس کے بعد زندگی ہے۔ **مبارک** وہ جو اس زندگی میں سے حصّہ لے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۸۲ تا ۸۳)

مردانِ خدا جو خدا تعالیٰ سے محبّت اور مودّت کا تعلّق رکھتے ہیں وہ صرف پیشگوئیوں تک اپنے کمالات کو محدود نہیں رکھتے اُن پر حقائق اور معارف کھلتے ہیں اور دقائق و اسرارِ شریعت اور دلائل لطیفہ حقانیت ملّت ان کو عطا ہوتے ہیں اور اعجازی طور پر ان کے دل پر دقیق در دقیق علومِ قرآنی اور لطائف کتاب ربّانی اتارے جاتے ہیں اور وہ اِن فوق العادت اسرار اور سماوی علوم کے وارث کئے جاتے ہیں جو بلا واسطہ موہبت کے طور پر محبوبین کو ملتے ہیں اور خاص محبت اُن کو عطا کی جاتی ہے اور ابراہیمی صدق و صفا انکو دیا جاتا ہے اور رُوح القدس کا سایہ اُن کے دلوں پر ہوتا ہے۔ وہ خدا کے ہو جاتے ہیں اور خدا اُن کا ہو جاتا ہے۔ اُنکی دُعائیں خارق عادت طور پر آثار دکھاتی ہیں۔ اُن کے لئے خدا غیرت رکھتا ہے۔ وہ ہر میدان میں اپنے مخالفوں پر فتح پاتے ہیں۔ اُن کے چہروں پر محبت الٰہی کا نور چمکتا ہے۔ اُن کے در و دیوار پر خدا کی رحمت برستی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ پیارے بچے کی طرح خدا کی گود میں ہوتے ہیں۔ خدا ان کے لئے اُس شیر مادہ سے زیادہ غصّہ ظاہر کرتا ہے جس کے بچّے کو کوئی لینے کا ارادہ کرے۔ وہ گناہ سے معصوم۔ وہ دشمنوں کے حملوں سے معصوم وہ تعلیم کی غلطیوں سے بھی معصوم ہوتے ہیں۔ وہ آسمان کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ خدا عجیب طور پر ان کی دعائیں سُنتا ہے اور عجیب طور پر ان کی قبولیت ظاہر کرتا ہے یہاں تک کہ وقت کے بادشاہ ان کے دروازوں پر آتے ہیں۔ ذوالجلال کا خیمہ اُن کے دلوں میں ہوتا ہے اور ایک رُعب خدائی ان کو عطا کیا جاتا ہے اور شاہانہ استغنا اُن کے چہروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ دنیا اور اہل دنیا کو ایک مرے ہوئے کیڑے سے بھی کمتر سمجھتے ہیں۔ فقط ایک کو جانتے ہیں اور اس ایک کے خوف کے نیچے ہر دم گداز ہوتے رہتے ہیں۔ دنیا اُن کے قدموں پر گری جاتی ہے گویا خدا انسان کا جامہ پہن کر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ دنیا کا نور اور اس ناپائیدار عالم کا ستون ہوتے ہیں۔ وہی سچا امن قائم کرنے کے شہزادے اور ظلمتوں کے دُور کرنے کے آفتاب ہوتے ہیں۔ وہ نہاں در نہاں اور غیب الغیب ہوتے ہیں۔ کوئی انکو پہچانتا نہیں مگر خدا۔ اُن

کوئی خدا کو پہچانتا نہیں مگر وہ۔ وہ خدا نہیں ہیں مگر نہیں کہہ سکتے کہ خدا سے الگ ہیں۔ وہ ابدی نہیں ہیں مگر نہیں کہہ سکتے کہ کبھی مرتے ہیں۔ پس کیا ایک ناپاک اور خبیث آدمی جس کا دن گندہ خیالات گندے زندگی گندی ہے اُن سے مشابہت پیدا کر سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ مگر وہی مشابہت جو کبھی ایک چمکیلے پتھر کو ہیرے کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

مردانِ خدا جب دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں تو ان کی عام برکات کی وجہ سے آسمان سے ایک قسم کا انتشارِ روحانیت ہوتا ہے اور طبائع میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور جن کے دل اور دماغ سچی خوابوں سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں اُن کو سچی خوابیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن دربردہ یہ تمام انہی کے وجودِ باجود کی تاثیر ہوتی ہے۔ جیسا کہ مثلاً جب برسات کے دنوں میں پانی برستا ہے تو کنوؤں کا پانی بھی بڑھ جاتا ہے اور ہر ایک قسم کا سبزہ نکلتا ہے۔ لیکن اگر آسمان کا پانی چند سال تک نہ برسے تو کنوؤں کا پانی بھی خشک ہو جاتا ہے۔ سو وہ لوگ درحقیقت آسمان کا پانی ہوتے ہیں اور ان کے آنے سے زمین کے پانی بھی اپنا سیلاب دکھلاتے ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ ص۷۹-۸۱)

پانچواں لطیفہ سورۃ فاتحہ میں یہ ہے کہ وہ اس اتم اور اکمل تعلیم پر مشتمل ہے کہ جو طالب حق کے لئے ضروری ہے اور جو ترقیات قربت اور معرفت کے لئے کامل دستور العمل ہے کیونکہ ترقیاتِ قربت کا شروع اس نقطۂ سیر سے ہے کہ جب سالک اپنے نفس پر ایک موت قبول کر کے اور سختی اور آزارکشی کو روا رکھ کر ان تمام نفسانی خواہشوں سے خالصاً لِلّٰہ دست کش ہو جائے کہ جو اس میں اور اُسکے مولیٰ کریم میں جدائی ڈالتے ہیں اور اس کے مُنہ کو خدا کی طرف سے پھیر کر اپنی نفسانی لذات اور جذبات اور عادات اور خیالات اور ارادات اور نیز مخلوق کی طرف پھیرتے ہیں اور ان کے خوفوں اور امیدوں میں گرفتار کرتے ہیں۔ اور ترقیات کا اوسط درجہ وہ ہے کہ جو جو ابتدائی درجہ میں نفس کشی کے لئے تکالیف اُٹھائی جاتی ہیں اور حالت معتادہ کو چھوڑ کر طرح طرح کے دُکھ سہنے پڑتے ہیں وہ سب آلام صورت انعام میں ظاہر ہو جائیں اور بجائے مشقت کے لذّت اور بجائے رنج کے راحت اور بجائے تنگی کے انشراح اور بشاشت نمودار ہو۔ اور ترقیات کا اعلیٰ درجہ وہ ہے کہ سالک اس قدر خدا اور اس کے ارادوں اور خواہشوں سے اتحاد اور محبت اور یکجہتی پیدا کر لے کہ اس کا تمام اپنا عین واثر جاتا رہے اور ذات اور صفاتِ الٰہیہ بلا شائبہ ظلمت اور بلا توہم حائلیّت ومحلّیت اس کے وجود آئینہ صفت میں منعکس ہو جائیں۔ اور فنا اتم کے

آئینہ کے ذریعہ سے جس نے سالک میں اور اس کی نفسانی خواہشوں میں غایت درجہ کا بُعد ڈال دیا ہے انعکاس ربّانی ذات اور صفات کا نہایت صفائی سے دکھائی دے۔ اس تقریر میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس میں وجودیوں یا ویدانتیوں کے باطل خیال کی تائید ہو کیونکہ انہوں نے خالق اور مخلوق میں جو ابدی امتیاز ہے شناخت نہیں کیا۔ اور اپنے کشوف مشتبہ کے دھوکا سے کہ جو سلوکِ ناتمام کی حالت میں اکثر پیش آجاتے ہیں یا جو سودا انگیز ریاضتوں کا ایک نتیجہ ہوتا ہے سخت مغالطات کے بیچ میں پڑ گئے یا کسی نے سکر اور بے خودی کی حالت میں جو ایک قسم کا جنون ہے اس فرق کو نظر سے ساقط کر دیا کہ جو خدا کی رُوح اور انسان کی رُوح میں باعتبار طاقتوں اور قوتوں اور کمالات اور تقدسات کے ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ قادر مطلق کہ جس کے علم قدیم سے ایک ذرّہ مخفی نہیں اور جس کی طرف کوئی نقصان اور خسران عائد نہیں ہو سکتا اور جو ہر ایک قسم کے جہل اور آلودگی اور ناتوانی اور غم اور حزن اور درد اور رنج اور گرفتاری سے پاک ہے وہ کیونکر اس چیز کا عین ہو سکتا ہے کہ جو ان سب بلاؤں میں مبتلا ہے۔ کیا انسان جس کی روحانی ترقیات کے لئے اس قدر حالات منتظرہ ہیں جن کا کوئی کنارہ نظر نہیں آتا وہ اس ذات صاحب کمال تام سے مشابہ یا اس کا عین ہو سکتا ہے جس کے لئے کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں؟ کیا جس کی ہستی فانی اور جس کی رُوح میں صریح مخلوقیت کے نقصان پائے جاتے ہیں وہ باوجود اپنی تمام آلائشوں اور کمزوریوں اور ناپاکیوں اور عیبوں اور نقصانوں کے اس ذات جلیل الصفات سے برابر ہو سکتا ہے جو اپنی خوبیوں اور پاک صفتوں میں ازلی ابدی طور پر اتم اور اکمل ہے۔ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ بلکہ اس تیسرے قسم کی ترقی سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ سالک خدا کی محبت میں ایسا فانی اور مستہلک ہو جاتا ہے اور اس قدر ذات بے چون و بے چگون اپنی تمام صفات کاملہ کے ساتھ اس سے قریب ہو جاتی ہے کہ الوہیت کے تجلیات اس کے نفسانی جذبات پر ایسے غالب آجاتے ہیں اور ایسے اس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں جو اس کو اپنے نفسانی جذبات سے بلکہ ہر ایک سے جو نفسانی جذبات کا تابع ہو مغائرت کلّی اور عداوت ذاتی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس میں اور قسم دوئم کی ترقی میں فرق یہ ہے کہ گو قسم دوئم میں بھی اپنے رب کی مرضی سے موافقت تامہ پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا ایلام بصورت انعام نظر آتا ہے مگر ہنوز اس میں ایسا تعلق باللہ نہیں ہوتا کہ جو ماسوی اللہ کے ساتھ عداوت ذاتی پیدا ہو جانے کا موجب ہو اور جس سے محبت الٰہی صرف دل کا مقصد ہی نہ رہے بلکہ دل کی سرشت

بھی ہو جائے۔ غرض قسم دوم کی ترقی میں خدا سے موافقت تامہ کرنا اور اس کے غیر سے عداوت رکھنا سالک کا مقصد ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول سے وہ لذّت پاتا ہے لیکن قسم سوم کی ترقی میں خدا سے موافقت تامہ اور اس کے غیر سے عداوت خود سالک کی سرشت ہو جاتی ہے جس سرشت کو وہ کسی حالت میں چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ انفکاک الشیٔ عن نفسہٖ محال ہے برخلاف قسم دوم کے کہ اس میں انفکاک جائز ہے اور جب تک ولایت کسی ولی کی قسم سوم تک نہیں پہنچتی عارضی ہے اور خطرات سے امن میں نہیں۔ وجہ یہ کہ جب تک انسان کی سرشت میں خدا کی محبت اور اس کے غیر کی عداوت داخل نہیں تب تک کچھ رگ وریشہ ظلم کا اُس میں باقی ہے کیونکہ اس نے حق ربوبیت کو جیسا کہ چاہیئے تھا ادا نہیں کیا۔ اور لقائے تام حاصل کرنے سے ہنوز قاصر ہے۔ لیکن جب اس کی سرشت میں محبت الٰہی اور موافقت باللہ بخوبی داخل ہوگئی یہاں تک کہ خدا اس کے کان ہوگیا جن سے وہ سُنتا ہے اور اس کی آنکھیں ہو گیا جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوگیا جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو گیا جس سے وہ چلتا ہے تو پھر کوئی ظلم اُس میں باقی نہ رہا اور ہر ایک خطرہ سے امن میں آگیا۔ اسی درجہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔

اب سمجھنا چاہیئے کہ یہ ترقیات ثلاثہ کہ جو تمام علوم و معارف کا اصل الاصول بلکہ تمام دین کا لبّ لباب ہے سورۃ فاتحہ میں بتمامتر خوبی و رعایت ایجاز و خوش اسلوبی بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ پہلی ترقی کہ جو قربت کے میدانوں میں چلنے کے لئے اوّل قدم ہے اس آیت میں تعلیم کی گئی ہے جو فرمایا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کیونکہ ہر ایک قسم کی کجی اور بے راہی سے باز آکر اور بالکل رُو بخدا ہو کر راہ راست کو اختیار کرنا یہ وہی سخت گھاٹی ہے جس کو دوسرے لفظوں میں **فنا** سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ امور مالوفہ اور معتادہ کو یک لخت چھوڑ دینا اور نفسانی خواہشوں کو جو ایک عمر سے عادت ہو چکی ہے یک دفعہ ترک کرنا۔ اور ہر ایک ننگ اور ناموس اور عجب اور ریا سے منہ پھیر کر اور تمام ماسوا اللہ کو کالعدم سمجھ کر سیدھا خدا کی طرف رُخ کر لینا حقیقت میں ایک ایسا کام ہے جو موت کے برابر ہے۔ اور یہ موت رُوحانی پیدائش کا مدار ہے۔ اور جیسے دانہ جب تک خاک میں نہیں ملتا اور اپنی صورت کو نہیں چھوڑتا تب تک نیا دانہ وجود میں آنا غیر ممکن ہے۔ اسی طرح روحانی پیدائش کا جسم

اس فنا سے تیار ہوتا ہے۔ جوں جوں بندہ کا نفس شکست پکڑتا جاتا ہے اور اس کا فعل اور ارادت اور رُو بخلق ہونا فنا ہوتا جاتا ہے توں توں پیدائش روحانی کے اعضاء بنتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب فناء اتم حاصل ہو جاتی ہے تو وجود ثانی کی خلعت عطا کی جاتی ہے اور ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کا وقت آجاتا ہے اور چونکہ یہ فناء اتم بغیر نصرت و توفیق و توجہ خاص قادر مطلق کے ممکن نہیں اس لئے یہ دُعا تعلیم کی یعنی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ جس کے یہ معنے ہیں کہ اے خدا ہم کو راہ راست پر قائم کر اور ہر ایک طور کی کجی اور بے راہی سے نجات بخش اور یہ کامل استقامت اور راست روی جس کو طلب کرنے کا حکم ہے نہایت سخت کام ہے اور اوّل دفعہ میں اس کا حملہ سالک پر ایک شیر ببر کی طرح ہے جس کے سامنے موت نظر آتی ہے پس اگر سالک ٹھہر گیا اور اس موت کو قبول کر لیا تو پھر بعد اس کے کوئی اُسے سخت موت نہیں اور خدا اس سے زیادہ تر کریم ہے کہ پھر اُس کو یہ جلتا ہوا دوزخ دکھا دے۔ غرض یہ کامل استقامت وہ فنا ہے کہ جس سے کارخانہ وجود بندہ کو بکلی شکست پہنچتی ہے اور ہوا اور شہوت اور ارادت اور ہر ایک خود روی کے فعل سے بیکبارگی دست کش ہونا پڑتا ہے اور یہ مرتبہ سیر و سلوک کے مراتب میں سے وہ مرتبہ ہے جس میں انسانی کوششوں کا بہت کچھ دخل ہے اور بشری مجاہدات کی بخوبی پیش رفت ہے اور اسی حد تک اولیاء اللہ کی کوششیں اور سالکین کی محنتیں ختم ہو جاتی ہیں اور پھر بعد اس کے خاص مواہب سماوی ہیں جن میں بشری کوششوں کو کچھ دخل نہیں بلکہ خود خدا تعالیٰ کی طرف سے عجائبات سماوی کی سیر کرانے کے لئے غیبی سواری اور آسمانی براق عطا ہوتا ہے۔

اور **دوسری ترقی** کہ جو قربت کے میدانوں میں چلنے کے لئے دوسرا قدم ہے اس آیت میں تعلیم کی گئی ہے جو فرمایا ہے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی ہم کو اُن لوگوں کا راہ دکھلا جن پر تیرا انعام و اکرام ہے۔ اسجگہ واضح رہے کہ جو لوگ منعم علیہم ہیں اور خدا سے ظاہری و باطنی نعمتیں پاتے ہیں شدائد سے خالی نہیں ہیں بلکہ اس دار الابتلاء میں ایسی ایسی شدّتیں اور صعوبتیں اُن کو پہنچتی ہیں کہ اگر وہ کسی دوسرے کو پہنچتیں تو مدد ایمانی اس کی منقطع ہو جاتی لیکن اس جہت سے اُن کا نام منعم علیہم رکھا گیا ہے کہ وہ بباعث غلبہ محبت آلام کو برنگ انعام دیکھتے ہیں اور ہر ایک رنج یا راحت جو دوست حقیقی کی طرف سے ان کو پہنچتی ہے بوجہ مستیٔ عشق اس سے لذّت اٹھاتے ہیں۔ پس یہ ترقی فی القرب کی دوسری قسم ہے جس میں اپنے محبوب کے جمیع افعال سے لذّت آتی ہے اور جو کچھ اُس کی طرف سے پہنچے انعام ہی انعام نظر آتا ہے۔ اور اصل موجب اس حالت کا ایک محبت کامل

اور تعلق صادق ہوتا ہے جو اپنے محبوب سے ہو جاتا ہے اور یہ ایک موہبت خاص ہوتی ہے جس میں حیلہ اور تدبیر کو کچھ دخل نہیں بلکہ خدا ہی کی طرف سے آتی ہے۔ اور جب آتی ہے تو پھر سالک ایک دوسرا رنگ پکڑ لیتا ہے اور تمام بوجھ اس کے سر سے اتارے جاتے ہیں اور ہر ایک ایلام انعام ہی معلوم ہوتا ہے اور شکوہ اور شکایت کا نشان نہیں ہوتا۔ پس یہ حالت ایسی ہوتی ہے کہ گویا انسان بعد موت کے زندہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اُن تلخیوں سے بکلی نکل آتا ہے جو پہلے درجہ میں تھیں جن سے ہر ایک وقت موت کا سامنا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب چاروں طرف سے انعام ہی انعام پاتا ہے اور اسی جہت سے اس کی حالت کے مناسب حال یہی تھا کہ اس کا نام منعم علیہ رکھا جاتا اور دوسرے لفظوں میں اس حالت کا نام **بقا** ہے کیونکہ سالک اس حالت میں اپنے تئیں ایسا پاتا ہے کہ گویا وہ مرا ہوا تھا اور زندہ ہو گیا اور اپنے نفس میں بڑی خوشحالی اور انشراح صدر دیکھتا ہے اور بشریت کے انقباض سب دُور ہو جاتے ہیں اور الوہیت کے مربیانہ انوار نعمت کی طرح برستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی مرتبہ میں سالک پر ہر ایک نعمت کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور عنایاتِ الٰہیہ کامل طور پر متوجہ ہوتی ہیں اور اس مرتبہ کا نام **سیر فی اللّٰہ** ہے کیونکہ اس مرتبہ میں ربوبیت کے عجائبات سالک پر کھولے جاتے ہیں۔ اور جو ربّانی نعمتیں دوسروں سے مخفی ہیں اُن کا اس کو سیر کرایا جاتا ہے۔ کشوف صادقہ سے متمتع ہوتا ہے اور مخاطباتِ حضرتِ احدیت سے سرفرازی پاتا ہے اور عالم ثانی کے باریک بھیدوں سے مطلع کیا جاتا ہے اور علوم اور معارف سے وافر حصہ دیا جاتا ہے۔ غرض ظاہری اور باطنی نعمتوں سے بہت کچھ اس کو عطا کیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس درجہ یقین کامل تک پہنچتا ہے کہ گویا مدبّر حقیقی کو بچشم خود دیکھتا ہے سو اس طور کی اطلاع کامل جو اسرار سماوی ہیں اس کو بخشے جاتے ہیں اس کا نام **سیر فی اللّٰہ** ہے۔ لیکن یہ وہ مرتبہ ہے جس میں محبت الٰہی انسان کو دی تو جاتی ہے لیکن بطریق طبعیت اس میں قائم نہیں کی جاتی یعنی اس کی سرشت میں داخل نہیں ہوتی بلکہ اس میں محفوظ ہوتی ہے۔

اور **تیسری ترقی** جو قربت کے میدانوں میں چلنے کے لئے انتہائی قدم ہے اس آیت میں تعلیم کی گئی ہے جو فرمایا ہے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں انسان کو خدا کی محبّت اور اس کے غیر کی عداوت سرشت میں داخل ہو جاتی ہے اور بطریق طبعیت اس میں قیام پکڑتی ہے۔ اور صاحب اس مرتبہ کا اخلاق الٰہیہ سے ایسا ہی بالطبع پیار کرتا ہے کہ جیسے وہ اخلاق حضرتِ احدیت میں محبوب ہیں اور محبت ذاتی حضرت خداوند کریم کی اس قدر

اُس کے دل میں آمیزش کر جاتی ہے کہ اس کے دل سے محبت الٰہی کا منفک ہونا مستحیل اور ممتنع ہوتا ہے اور اگر اس کے دل کو اور اس کی جان کو بڑے بڑے امتحانوں اور ابتلاؤں کے سخت صدمات کے بیچ میں دے کر کوفتہ کیا جائے اور نچوڑا جائے تو بجز محبت الٰہیہ کے اور کچھ اس کے دل اور جان سے نہیں نکلتا۔ اسی کے درد سے لذت پاتا ہے اور اُسی کو واقعی اور حقیقی طور پر اپنا دلآرام سمجھتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس میں تمام ترقیات قرب ختم ہو جاتی ہیں اور انسان اپنے اُس انتہائی کمال کو پہنچ جاتا ہے کہ جو فطرت بشری کے لئے مقدر ہے۔

(براہین احمدیہ ص۵۶۴-۶۰۲ حاشیہ ۱۱)

جاننا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نہایت کریم و رحیم ہے۔ جو شخص اس کی طرف صدق اور صفا سے رجوع کرتا ہے وہ اس سے بڑھ کر اپنا صدق و صفا اس سے ظاہر کرتا ہے۔ اس کی طرف صدق دل سے قدم اٹھانے والا ہرگز ضائع نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ میں بڑے بڑے محبت اور وفاداری اور فیض اور احسان اور کرشمۂ خدائی دکھلانے کے اخلاق ہیں مگر وہی ان کو پورے طور پر مشاہدہ کرتا ہے جو پورے طور پر اُس کی محبت میں محو ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ بڑا کریم و رحیم ہے مگر غنی اور بے نیاز ہے۔ اس لئے جو شخص اُس کی راہ میں مرتا ہے وہی اس سے زندگی پاتا ہے۔ اور جو اس کے لئے سب کچھ کھوتا ہے اُسی کو آسمانی انعام ملتا ہے۔

خدا تعالیٰ سے کامل تعلق پیدا کرنے والے اس شخص سے مشابہت رکھتے ہیں جو اوّل دُور سے آگ کی روشنی دیکھے اور پھر اس سے نزدیک ہو جائے یہاں تک کہ اس آگ میں اپنے تئیں داخل کر دے اور تمام جسم جل جائے اور صرف آگ ہی باقی رہ جائے۔ اسی طرح کامل تعلق والا دن بدن خدا تعالیٰ کے نزدیک ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ محبتِ الٰہی کی آگ میں تمام وجود اس کا پڑ جاتا ہے اور شعلۂ نور سے قالب نفسانی جل کر خاک ہو جاتا ہے اور اُس کی جگہ آگ لے لیتی ہے۔ یہ انتہا اس مبارک محبت کا ہے جو خدا سے ہوتی ہے۔ یہ امر کہ خدا تعالیٰ سے کسی کا کامل تعلق اس کی بڑی علامت یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ اُس میں پیدا ہو جاتی ہیں اور بشریت کے رذائل شعلۂ نور سے جل کر ایک نئی ہستی پیدا ہوتی ہے اور ایک نئی زندگی نمودار ہوتی ہے جو پہلی زندگی سے بالکل مغائر ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ لوہا جب آگ میں ڈالا جائے اور آگ اس کے تمام رگ و ریشہ میں پورا غلبہ کر لے تو وہ لوہا بالکل آگ کی شکل پیدا کر لیتا ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ آگ ہے گو خواص آگ کے ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح جس کو شعلۂ محبتِ الٰہی سر سے پیر تک اپنے اندر

لیتا ہے وہ بھی مظہر تجلیات الٰہیہ ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں کہہ سکتے کہ وہ خدا ہے بلکہ ایک بندہ ہے جس کو اُس آگ نے اپنے اندر لے لیا ہے۔ اور اُس آگ کے غلبہ کے بعد ہزاروں علامتیں کامل محبت کی پیدا ہو جاتی ہیں۔ کوئی ایک علامت نہیں ہے تا وہ ایک زیرک اور طالب حق پر مشتبہ ہو سکے بلکہ وہ تعلق صدہا علامتوں کے ساتھ شناخت کیا جاتا ہے۔ منجملہ ان علامات کے یہ بھی ہے کہ خدائے کریم اپنا فصیح اور لذیذ کلام وقتاً فوقتاً اس کی زبان پر جاری کرتا رہتا ہے جو الٰہی شوکت اور برکت اور غیب گوئی کی کامل طاقت اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک نور اس کے ساتھ ہوتا ہے جو بتلاتا ہے کہ یہ یقینی امر ہے ظنّی نہیں ہے اور ایک ربّانی چمک اس کے اندر ہوتی ہے۔ اور کدورتوں سے پاک ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات اور اکثر اور اغلب طور پر وہ کلام کسی زبردست پیشگوئی پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کی پیشگوئیوں کا حلقہ نہایت وسیع اور عالمگیر ہوتا ہے۔ اور وہ پیشگوئیاں کیا باعتبار کمیّت اور کیا باعتبار کیفیت بے نظیر ہوتی ہیں۔ کوئی اُن کی نظیر پیش نہیں کر سکتا اور ہیبت الٰہی اُن میں بھری ہوئی ہوتی ہے اور قدرتِ تامہ کی وجہ سے خدا کا چہرہ اُن میں نظر آتا ہے۔ اور اس کی پیشگوئیاں نجومیوں کی طرح نہیں ہوتیں بلکہ اُن میں محبوبیت اور قبولیت کے آثار ہوتے ہیں اور ربّانی تائید اور نصرت سے بھری ہوئی ہوتی ہیں اور بعض پیشگوئیاں اُس کے اپنے نفس کے متعلق ہوتی ہیں اور بعض اپنی اولاد کے متعلق اور بعض اس کے دوستوں کے متعلق اور بعض اس کے دشمنوں کے متعلق اور بعض عام طور پر تمام دنیا کے لئے۔ اور بعض اس کی بیویوں اور خویشوں کے متعلق ہوتی ہیں اور وہ امور اس پر ظاہر ہوتے ہیں جو دوسروں پر ظاہر نہیں ہوتے اور وہ غیب کے دروازے اس کی پیشگوئیوں پر کھولے جاتے ہیں جو دوسروں پر نہیں کھولے جاتے۔ خدا کا کلام اس پر اسی طرح نازل ہوتا ہے جیسا کہ خدا کے پاک نبیوں اور رسولوں پر نازل ہوتا ہے اور وہ ظن سے پاک اور یقینی ہوتا ہے یہ شرف تو اس کی زبان کو دیا جاتا ہے کہ کیا باعتبار کمیت اور کیا باعتبار کیفیت ایسا بے مثل کلام اس کی زبان پر جاری کیا جاتا ہے کہ دنیا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اس کی آنکھ کو کشفی قوت عطا کی جاتی ہے جس سے وہ مخفی در مخفی خبروں کو دیکھ لیتا ہے اور بسا اوقات لکھی ہوئی تحریریں اس کی نظر کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ اور مُردوں سے زندوں کی طرح ملاقات کر لیتا ہے اور بسا اوقات ہزاروں کوس کی چیزیں اس کی نظر کے سامنے ایسی آجاتی ہیں گویا وہ پَیروں کے نیچے پڑی ہیں۔

ایسا ہی اس کے کان کو بھی مغیبات کے سننے کی قوت دی جاتی ہے۔ اور اکثر اوقات

وہ فرشتوں کی آواز کو سُن لیتا ہے اور بے قراریوں کے وقت ان کی آواز سے تسلی پاتا ہے ۔ اور عجیب تر یہ کہ بعض اوقات جمادات اور نباتات اور حیوانات کی آواز بھی اُسکو پہنچ جاتی ہے ؎

فلسفی کُو منکرِ حنّانہ است ؛ از حواسِ انبیاء بیگانہ است

اسی طرح اُس کی ناک کو بھی غیبی خوشبو سونگھنے کی قوت دی جاتی ہے اور بسا اوقات وہ بشارت کے امور کو سونگھ لیتا ہے اور مکروہات کی بدبو اس کو آجاتی ہے علیٰ ہذا القیاس اس کے دل کو قوتِ فراست عطا کی جاتی ہے اور بہت سی باتیں اس کے دل میں پڑ جاتی ہیں اور وہ صحیح ہوتی ہیں ۔ علیٰ ہذا القیاس شیطان اس پر تصرّف کرنے سے محروم ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ اس میں شیطان کا کوئی حصّہ نہیں رہتا اور بباعث نہایت درجہ فنا فی اللہ ہونے کے اُس کی زبان ہر وقت خدا کی زبان ہوتی ہے اور اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ اور اگرچہ اسکو خاص طور پر الہام بھی نہ ہو تب بھی جو کچھ اس کی زبان پر جاری ہوتا ہے وہ اس کی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے کیونکہ نفسانی ہستی اُس کی بکلی جل جاتی ہے ۔ اور سفلی ہستی پر ایک موت طاری ہو کر ایک نئی اور پاک زندگی اس کو ملتی ہے جس پر ہر وقت انوارِ الٰہیہ منعکس ہوتے رہتے ہیں ۔

اسی طرح اُس کی پیشانی کو ایک نور عطا کیا جاتا ہے جو بجز عشاقِ الٰہی کے اَور کسی کو نہیں دیا جاتا اور بعض خاص وقتوں میں وہ نور ایسا چمکتا ہے کہ ایک کافر بھی اُس کو محسوس کرسکتا ہے بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ وہ لوگ ستائے جاتے اور نصرتِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتے ہیں ۔ پس وہ اقبال علی اللہ کا وقت اُن کے لئے ایک خاص وقت ہوتا ہے اور خدا کا نور ان کی پیشانی میں اپنا جلوہ ظاہر کرتا ہے ۔

ایسا ہی ان کے ہاتھوں میں اور پَیروں میں اور تمام بدن میں ایک برکت دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کا پہنا ہوا کپڑا بھی متبرک ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات کسی شخص کو چُھونا یا اس کو ہاتھ لگانا اس کے امراض روحانی یا جسمانی کے ازالہ کا موجب ٹھہرتا ہے ۔

اسی طرح اُن کے رہنے کے مکانات میں بھی خدائے عزّ وجلّ ایک برکت رکھ دیتا ہے ۔ وہ مکان بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے ۔ خدا کے فرشتے اس کی حفاظت کرتے ہیں ۔

اسی طرح اُن کے شہر یا گاؤں میں بھی ایک برکت اور خصوصیت دی جاتی ہے ۔

اسی طرح اس خاک کو بھی کچھ برکت دی جاتی ہے جس پر ان کا قدم پڑتا ہے ۔

اسی طرح اس درجہ کے لوگوں کی تمام خواہشیں بھی اکثر اوقات پیشگوئی کا رنگ پیدا کر لیتی ہیں یعنی جب کسی چیز کے کھانے یا پینے یا پہننے یا دیکھنے کی بشدت ان کے اندر خواہش پیدا ہوتی ہے تو وہ خواہش ہی پیشگوئی کی صورت پکڑ لیتی ہے اور جب قبل از وقت اضطرار کے ساتھ انکے دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی ہے تو وہ چیز میسر آجاتی ہے۔

اسی طرح اُن کی رضامندی اور ناراضگی بھی پیشگوئی کا رنگ اپنے اندر رکھتی ہے پس جس شخص پر وہ شدّت سے راضی اور خوش ہوتے ہیں اس کے آئندہ اقبال کے لئے یہ بشارت ہوتی ہے۔ اور جس پر وہ بشدت ناراض ہوتے ہیں اس کے آئندہ ادبار اور تباہی پر دلیل ہوتی ہے کیونکہ بباعث فنافی اللہ ہونے کے وہ سرائے حق میں ہوتے ہیں اور انکی رضا اور غضب خدا کا رضا اور غضب ہوتا ہے اور نفس کی تحریک سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے یہ حالات اُن میں پیدا ہوتے ہیں۔

اسی طرح اُن کی دُعا اور اُن کی توجہ بھی معمولی دُعاؤں اور توجہات کی طرح نہیں ہوتی بلکہ اپنے اندر ایک شدید اثر رکھتی ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ اگر قضاء مبرم اور اٹل نہ ہو اور انکی توجہ اپنی تمام شرائط کے ساتھ اس بلا کے دُور کرنے کیلئے مصروف ہوجائے تو خدا تعالیٰ اس بلا کو دُور کر دیتا ہے گو ایک فرد واحد یا چند کس پر وہ بلا نازل ہو یا ایک ملک پر وہ بلا نازل ہو۔ یا ایک بادشاہِ وقت پر وہ بلا نازل ہو۔ اس میں اصل یہ ہے کہ وہ اپنے وجود سے فانی ہوتے ہیں۔ اس لئے اکثر اوقات اُن کے ارادہ کا خدا تعالیٰ کے ارادہ سے توارد ہوجاتا ہے۔ پس جب شدت سے انکی توجہ کسی بلا کے دُور کرنے کے لئے مبذول ہو جاتی ہے اور جیسا کہ درد دل کے ساتھ اقبال علی اللہ چاہیئے میسّر آجاتا ہے تو سنت الٰہیہ اسی طرح پر واقع ہے کہ خدا اُنکی سُنتا ہے اور ایسا ہی ہوتا ہے کہ خدا ان کی دُعا کو ردّ نہیں کرتا اور کبھی اُن کی عبودیت ثابت کرنے کے لئے دُعا سُنی نہیں جاتی تا جاہلوں کی نظر میں خدا کے شریک نہ ٹھیر جائیں۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۴-۱۸)

جذب و سلوک

بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے مدارج میں کسب اور سلوک اور مجاہدہ کو کچھ دخل نہیں بلکہ اُن کی شکم مادر میں ہی ایک ایسی بناوٹ ہوتی ہے کہ فطرتاً بغیر ذریعہ کسب اور سعی اور مجاہدہ کے وہ خدا سے محبت کرتے ہیں اور اس کے رسول یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسا ان کو رُوحانی تعلق ہو جاتا ہے جس سے بڑھ کر ممکن نہیں اور پھر جیسا جیسا اُن پر زمانہ گذرتا ہے وہ اندرونی آگ عشق اور محبت الٰہی کی بڑھتی جاتی ہے اور ساتھ ہی محبت رسول کی آگ ترقی پکڑتی ہے اور ان تمام امور میں خدا ان کا متولّی اور متکفل ہوتا ہے۔ اور جب وہ محبت اور عشق کی آگ انتہا تک پہنچ جاتی ہے۔ تب وہ نہایت بیقراری اور دردمندی سے چاہتے ہیں کہ خدا کا جلال زمین پر ظاہر ہو اور اُسی میں اُن کی لذّت اور یہی ان کا آخری مقصد ہوتا ہے۔ تب اُن کے لئے زمین پر خدا تعالےٰ کے نشان ظاہر ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کسی کیلئے اپنے عظیم الشان نشان ظاہر نہیں کرتا اور کسی کو آئندہ زمانہ کی عظیم الشان خبریں نہیں دیتا مگر انہیں جو اس کے عشق اور محبت میں محو ہوتے ہیں اور اس کی توحید اور جلال کے ظاہر ہونے کے ایسے خواہاں ہوتے ہیں جیسا کہ وہ خود ہوتا ہے۔ یہ بات انہیں سے مخصوص ہے کہ حضرت الوہیت کے خاص اسرار اُن پر ظاہر ہوتے ہیں اور غیب کی باتیں کمال صفائی سے اُن پر منکشف کی جاتی ہیں اور یہ خاص عزت دوسرے کو نہیں دی جاتی۔

(حقیقۃ الوحی ص ۶۵-۶۶)

صوفیوں نے ترقیات کی دو راہیں لکھی ہیں ایک **سلوک** دوسرا **جذب**۔ سلوک وہ ہے جو لوگ آپ عقلمندی سے سوچ کر اللہ و رسول کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (پارہ ۳) یعنی اگر تم اللہ کے پیارے بننا چاہتے ہو تو رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرو۔ وہ ہادیٔ کامل وہی رسول ہیں جنہوں نے وہ مصائب اٹھائیں کہ دنیا اپنے اندر نظیر نہیں رکھتی۔ ایک دن بھی آرام نہ پایا۔ اب پیروی کرنے والے بھی

حقیقی طور سے وہی ہونگے جو اپنے متبوع کے ہر قول و فعل کی پیروی پوری جد وجہد سے کریں۔ متّبع وہی ہے جو سب طرح پیروی کریگا۔ سہل انگار اور سخت گذار کو اللہ تعالےٰ پسند نہیں کرتا بلکہ وہ تو اللہ تعالےٰ کے غضب میں آوے گا۔ یہاں جو اللہ تعالےٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تو سالک کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اوّل رسول اکرم کی مکمل تاریخ دیکھے اور پھر پیروی کرے۔ اسی کا نام **سلوک** ہے۔ اس راہ میں بہت مصائب و شدائد ہوتے ہیں۔ اُن سب کو اٹھانے کے بعد ہی انسان سالک ہو جاتا ہے۔

اہل جذب کا درجہ سالکوں سے بڑھا ہُوا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلوک کے درجہ پر ہی نہیں رکھتا بلکہ خود ان کو مصائب میں ڈالتا اور جاذبۂ ازلی سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کل انبیاء مجذوب ہی تھے۔ جس وقت انسانی رُوح کو مصائب کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اُن سے فرمودہ کار اور تجربہ کار ہو کر رُوح چمک اٹھتی ہے۔ جیسے کہ لوہا یا شیشہ اگرچہ چمک کا مادہ اپنے اندر رکھتا ہے لیکن صیقلوں کے بعد ہی مجلّٰی ہوتا ہے حتّٰی کہ اس میں مُنہ دیکھنے والے کا مُنّہ نظر آ جاتا ہے۔ مجاہدات بھی صیقل کا ہی کام کرتے ہیں۔ دل کا صیقل یہاں تک ہونا چاہیئے کہ اس میں سے بھی مُنہ نظر آ جاوے۔ مُنّہ کا نظر آنا کیا ہے؟ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کا مصداق ہونا۔ سالک کا دل آئینہ ہے جس کو مصائب شدائد اس قدر صیقل کر دیتے ہیں کہ اخلاق اللّٰہی اس میں منعکس ہو جاتے ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب بہت مجاہدات اور تزکیوں کے بعد اُس کے اندر کسی قسم کی کدورت یا کثافت نہ رہے تب یہ درجہ نصیب ہوتا ہے۔ ہر ایک مومن کو ایک حد تک ایسی صفائی کی ضرورت ہے۔ کوئی مومن بلا آئینہ ہونے کے نجات نہ پائے گا۔ سلوک والا خود یہ صیقل کرتا ہے اپنے کام سے مصائب اٹھاتا ہے لیکن جذب والا مصائب میں ڈالا جاتا ہے۔ خدا خود اس کا مُصقّل ہوتا ہے اور طرح طرح کے مصائب و شدائد سے صیقل کر کے اس کو آئینہ کا درجہ عطا کر دیتا ہے۔ دراصل سالک و مجذوب دونوں کا ایک ہی نتیجہ ہے۔ سو متقی کے دو حصّہ ہیں **سلوک و جذب**۔

(ملفوظات جلد اوّل صـ ۲۶-۲۷)

انبیاء کی ضرورت

خدا نے اپنی ذات پر ایمان لانا رسولوں پر ایمان لانے سے وابستہ کیا ہے۔ اس میں راز یہ ہے کہ انسان میں توحید قبول کرنے کی استعداد اس آگ کی طرح رکھی گئی ہے جو پتھر میں مخفی ہوتی ہے اور رسول کا وجود چقماق کی طرح ہے جو اس پتھر پر ضرب توجہ لگا کر اس آگ کو باہر نکالتا ہے پس ہرگز ممکن نہیں کہ بغیر رسول کی چقماق کے توحید کی آگ کسی دل میں پیدا ہو سکے۔ توحید کو صرف رسول زمین پر لاتا ہے اور اسی کی معرفت یہ حاصل ہوتی ہے۔ خدا مخفی ہے اور وہ اپنا چہرہ رسول کے ذریعہ دکھلاتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۲۸)

بعض نادانوں کو جو یہ وہم گذرتا ہے کہ گویا نجات کے لئے صرف توحید کافی ہے۔ نبی پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ گویا وہ رُوح کو جسم سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہم سراسر دلی کوری پر مبنی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جبکہ توحید حقیقی کا وجود ہی نبی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور بغیر اس کے ممتنع اور محال ہے تو وہ بغیر نبی پر ایمان لانے کے میسّر کیونکر آسکتی ہے اور اگر نبی کو جو جڑ توحید کی ہے ایمان لانے میں علیحدہ کر دیا جائے تو توحید کیونکر قائم رہیگی۔ توحید کا موجب اور توحید کا پیدا کرنے والا اور توحید کا باپ اور توحید کا سرچشمہ اور توحید کا مظہر اتم صرف نبی ہی ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے خدا کا مخفی چہرہ نظر آتا ہے اور پتہ لگتا ہے کہ **خدا ہے**۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو حضرتِ احدیت جلّ شانہٗ کی ذات نہایت درجہ استغنا اور بے نیازی میں پڑی ہے۔ اس کو کسی کی ہدایت اور ضلالت کی پروا نہیں۔ اور دوسری طرف وہ بالطبع یہ بھی تقاضا فرماتا ہے کہ وہ شناخت کیا جائے اور اُس کی رحمتِ ازلی سے لوگ فائدہ اٹھاویں۔ پس وہ ایسے دل پر جو اہل زمین کے تمام دلوں میں سے محبت اور قرب اس سبحانہٗ کا حاصل کرنے کیلئے کمال درجہ پر فطرتی طاقت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور نیز کمال درجہ کی ہمدردی بنی نوع کی اسکی فطرت میں ہے تجلّی فرماتا ہے۔ اور اس پر اپنی ہستی اور

صفات ازلیہ ابدیہ کے انوار ظاہر کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ خاص اور اعلیٰ فطرت کا آدمی جسکو دوسرے لفظوں میں نبی کہتے ہیں اس کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ پھر وہ نبی بوجہ اس کے کہ ہمدردی بنی نوع کا اس کے دل میں کمال درجہ پر جوش ہوتا ہے اپنی روحانی توجہات اور تضرع اور انکسار سے یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا جو اس پر ظاہر ہوا ہے جو دوسرے لوگ بھی اس کو شناخت کریں اور نجات پاویں۔ اور وہ دلی خواہش سے اپنے وجود کی قربانی خدا تعالےٰ کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس تمنا سے کہ لوگ زندہ ہو جائیں کئی موتیں اپنے لئے قبول کر لیتا ہے اور بڑے مجاہدات میں اپنے تئیں ڈالتا ہے جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ تب اگرچہ خدا مخلوق سے بے نیاز اور مستغنی ہے مگر اس کے دائمی غم اور حزن اور کرب و قلق اور تذلل اور نیستی اور نہایت درجہ کے صدق اور صفا پر نظر کر کے مخلوق کے مستعد دلوں پر اپنے نشانوں کے ساتھ اپنا چہرہ ظاہر کر دیتا ہے اور اس کی پُرجوش دعاؤں کی تحریک سے جو آسمان پر ایک صعبناک شور ڈالتی ہیں خدا تعالےٰ کے نشان زمین پر بارش کی طرح برستے ہیں اور عظیم الشان خوارق دنیا کے لوگوں کو دکھلائے جاتے ہیں جن سے دنیا دیکھ لیتی ہے کہ خدا ہے اور خدا کا چہرہ نظر آ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ پاک نبی اس قدر دعا اور تضرع اور ابتہال سے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہ کرتا اور خدا کے چہرہ کی چمک دنیا پر ظاہر کرنے کیلئے اپنی قربانی نہ دیتا اور ہر ایک قدم میں صدہا موتیں قبول نہ کرتا تو خدا کا چہرہ دنیا پر ہرگز ظاہر نہ ہوتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ بوجہ استغناء ذاتی کے بے نیاز ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔ اور وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ یعنی خدا تو تمام دنیا سے بے نیاز ہے اور جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور ہماری طلب میں کوشش کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں انہیں کے لئے ہمارا یہ قانون قدرت ہے کہ ہم اُن کو اپنی راہ دکھلا دیا کرتے ہیں۔ سو خدا کی راہ میں سب سے اوّل قربانی دینے والے نبی ہیں۔ ہر ایک اپنے لئے کوشش کرتا ہے مگر انبیاء علیہم السلام دوسروں کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ لوگ سوتے ہیں اور وہ اُن کے لئے جاگتے ہیں۔ اور لوگ ہنستے ہیں اور وہ ان کے لئے روتے ہیں اور دنیا کی رہائی کے لئے ہر ایک مصیبت کو بخوشی اپنے پر وارد کر لیتے ہیں۔ یہ سب اس لئے کرتے ہیں کہ تا خدا تعالیٰ کچھ ایسی تجلّی فرماوے کہ لوگوں پر ثابت ہو جاوے کہ خدا موجود ہے اور مستعد لوگوں پر اس کی ہستی اور اُس کی توحید منکشف ہو جاوے تاکہ وہ نجات پاویں۔ پس وہ جانی دشمنوں کی ہمدردی میں مرتے رہتے ہیں

اور جب انتہا درجہ پر اُن کا درد پہنچتا ہے اور اُن کی دردناک آہوں سے (جو مخلوق کی رہائی کے لئے ہوتی ہیں) آسمان پُر ہو جاتا ہے تب خدا تعالیٰ اپنے چہرہ کی چمک دکھلاتا ہے اور زبردست نشانوں کے ساتھ اپنی ہستی اور اپنی توحید لوگوں پر ظاہر کرتا ہے۔ پس اس میں شک نہیں کہ توحید اور خدا دانی کے متاع رسول کے دامن سے ہی دنیا کو ملتی ہے بغیر اس کے ہرگز نہیں مل سکتی اور اس امر میں سب سے اعلیٰ نمونہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے دکھایا کہ ایک قوم جو نجاست پر بیٹھی ہوئی تھی اُن کو نجاست سے اٹھا کر گلزار میں پہنچا دیا۔ اور وہ جو روحانی بھوک اور پیاس سے مرنے لگے تھے اُن کے آگے روحانی اعلیٰ درجہ کی غذائیں اور شیریں شربت رکھ دیئے۔ ان کو وحشیانہ حالت سے انسان بنایا پھر معمولی انسان سے مہذب انسان بنایا۔ پھر مہذب انسان سے کامل انسان بنایا اور اس قدر اُن کے لئے نشان ظاہر کئے کہ ان کو خدا دکھلا دیا اور ان میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ انہوں نے فرشتوں سے ہاتھ ملائے۔ یہ تاثیر کسی اور نبی سے اپنی امت کی نسبت ظہور میں نہ آئی۔ کیونکہ اُن کے صحبت یاب ناقص رہے۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۱۳ - ۱۱۵)

یاد رہے کہ خدا کے وجود کا پتہ دینے والے اور اس کے واحد لاشریک کا علم لوگوں کو سکھلانے والے صرف انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور اگر یہ مقدس لوگ دنیا میں نہ آتے تو صراط مستقیم کا یقینی طور پر پانا ایک ممتنع اور محال امر تھا۔ اگرچہ زمین و آسمان پر غور کر کے اور اُن کی ترتیب ابلغ اور محکم پر نظر ڈال کر ایک صحیح الفطرت اور سلیم العقل انسان دریافت کر سکتا ہے کہ اس کارخانۂ پُر حکمت کا بنانے والا کوئی ضرور ہونا چاہیئے لیکن اس فقرہ میں کہ ضرور ہونا چاہیئے اور اس فقرہ میں کہ واقعی وہ موجود ہے بہت فرق ہے۔ واقعی وجود پر اطلاع دینے والے صرف انبیاء علیہم السلام ہیں جنہوں نے ہزارہا نشانوں اور معجزات سے دنیا پر ثابت کر دکھایا کہ وہ ذات جو مخفی در مخفی اور تمام طاقتوں کی جامع ہے درحقیقت موجود ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس قدر عقل بھی کہ نظامِ عالم کو دیکھ کر صانع حقیقی کی ضرورت محسوس ہو یہ مرتبۂ عقل بھی نبوت کی شعاعوں سے ہی مستفیض ہے۔ اگر انبیاء علیہم السلام کا وجود نہ ہوتا تو اس قدر عقل بھی کسی کو حاصل نہ ہوتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگرچہ زمین کے نیچے پانی بھی ہے مگر اس پانی کا بقا اور وجود آسمانی پانی سے وابستہ ہے۔ جب کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ آسمان سے پانی نہیں برستا تو زمینی پانی بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ اور جب آسمان سے پانی برستا ہے تو زمین میں بھی پانی

جوش مارتا ہے اِسی طرح انبیاء علیہم السلام کے آنے سے عقلیں تیز ہو جاتی ہیں۔ اور عقل جو زمینی پانی ہے اپنی حالت میں ترقی کرتی ہے۔ اور پھر جب ایک مدت دراز اس بات پر گذرتی ہے کہ کوئی نبی مبعوث نہیں ہوتا تو عقلوں کا زمینی پانی گندہ اور کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور دنیا میں بُت پرستی اور شرک اور ہر ایک قسم کی بدی پھیل جاتی ہے۔ پس جس طرح آنکھ میں ایک روشنی ہے اور وہ باوجود اس روشنی کے پھر بھی آفتاب کی محتاج ہے۔ اِسی طرح دنیا کی عقلیں جو آنکھ سے مشابہ ہیں ہمیشہ آفتاب نبوت کی محتاج رہتی ہیں اور جبھی کہ وہ آفتاب پوشیدہ ہو جائے اُن میں فی الفور کدورت اور تاریکی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا تم صرف آنکھ سے کچھ دیکھ سکتے ہو؟ ہرگز نہیں۔ اِسی طرح تم بغیر نبوت کی روشنی کے بھی کچھ نہیں دیکھ سکتے۔

پس چونکہ قدیم سے اور جب سے کہ دنیا پیدا ہوئی ہے خدا کا شناخت کرنا نبی کے شناخت کرنے سے وابستہ ہے۔ اس لئے یہ خود غیر ممکن اور محال ہے کہ بجز ذریعہ نبی کے توحید مل سکے۔ نبی خدا کی صورت دیکھنے کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسی آئینہ کے ذریعہ سے خدا کا چہرہ نظر آتا ہے جب خدا تعالیٰ اپنے تئیں دنیا پر ظاہر کرنا چاہتا ہے تو نبی کو جو اس کی قدرتوں کا مظہر ہے دنیا میں بھیجتا ہے اور اپنی وحی اس پر نازل کرتا ہے اور اپنی ربوبیت کی طاقتیں اس کے ذریعہ سے دکھلاتا ہے تب دنیا کو پتہ لگتا ہے کہ خدا موجود ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۱۱-۱۱۳)

یاد رکھو نبیوں کا وجود اس لئے دنیا میں نہیں آتا کہ وہ محض ریاء کاری اور نمود کے طور پر ہو۔ اگر اُن سے کوئی فیض جاری نہیں ہوتا اور مخلوق کو رُوحانی فائدہ نہیں پہنچتا تو پھر یہی ماننا پڑے گا کہ وہ صرف نمائش کے لئے ہیں اور ان کا عدم وجود معاذ اللہ برابر ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ وہ دنیا کے لئے بہت سی برکات اور فیوض کا باعث بنتے ہیں اور اُن سے ایک خیر جاری ہوتی ہے جس طرح پر آفتاب سے ساری دنیا فائدہ اٹھاتی ہے اور اسکا فائدہ کسی خاص حد تک جاکر بند نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے اسی طرح پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیوض اور برکات کا آفتاب ہمیشہ چمکتا ہے اور سعادتمندوں کو فائدہ پہنچاتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ یعنی انکو کہدو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ تو میری اطاعت کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ آپ کی سچی اطاعت اور اتباع انسان کو خدا تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے اور گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہوتی ہے۔ (ملفوظات جلد سوم ص ۵۵)

سوال (۸) اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ نری خشک توحید مدارِ نجات نہیں ہو سکتی۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے علیحدہ ہو کر کوئی عمل کرنا انسان کو ناجی نہیں بنا سکتا لیکن طمانیت قلب کے لئے عرض پرداز ہیں کہ عبدالحکیم خان نے جو آیات لکھی ہیں اُن کا کیا مطلب ہے؟ مثلاً اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اور جیسا کہ یہ آیت بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اور جیسا کہ یہ آیت تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

الجواب۔ واضح ہو کہ قرآن شریف میں ان آیات کے ذکر کرنے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ بغیر اس کے جو رسول پر ایمان لایا جائے نجات ہو سکتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بغیر اس کے کہ خدائے واحد لاشریک اور یوم آخرت پر ایمان لایا جائے نجات نہیں ہو سکتی اور اللہ پر پورا ایمان تبھی ہو سکتا ہے کہ اس کے رسولوں پر ایمان لاوے۔ وجہ یہ کہ وہ اس کی صفات کے مظہر ہیں۔ اور کسی چیز کا وجود بغیر وجود اس کی صفات کے بپایۂ ثبوت نہیں پہنچتا۔ لہذا بغیر علم صفات باری تعالےٰ کے معرفت باری تعالیٰ ناقص رہ جاتی ہے۔ کیونکہ مثلاً یہ صفات اللہ تعالیٰ کے کہ وہ بولتا ہے سُنتا ہے پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ رحمت یا عذاب کرنے پر قدرت رکھتا ہے بغیر اس کے کہ رسول کے ذریعہ سے ان کا پتہ لگے کیونکر ان پر یقین آ سکتا ہے۔ اور اگر یہ صفات مشاہدہ کے رنگ میں ثابت نہ ہوں تو خدا تعالیٰ کا وجود ہی ثابت نہیں ہوتا تو اس صورت میں اس پر ایمان لانے کے کیا معنے ہونگے؟ اور جو شخص خدا پر ایمان لاوے ضرور ہے کہ اس کے صفات پر بھی ایمان لاوے اور یہ ایمان اس کو نبیوں پر ایمان لانے کیلئے مجبور کریگا۔ کیونکہ مثلاً خدا کا کلام کرنا اور بولنا بغیر ثبوت خدا کی کلام کے کیونکر سمجھ آ سکتا ہے اور اس کلام کو پیش کرنے والے مع اسکے ثبوت کے صرف نبی ہیں۔

پھر یہ بھی واضح ہو کہ قرآن شریف میں دو قسم کی آیات ہیں۔ ایک محکمات اور بیّنات جیسا کہ یہ آیت اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا۔ یعنی جو لوگ ایسا ایمان لانا نہیں چاہتے جو خدا پر بھی ایمان لاویں اور اس کے رسولوں پر بھی اور چاہتے ہیں کہ خدا کو

اس کے رسولوں سے علیحدہ کردیں اور کہتے ہیں کہ بعض پر ہم ایمان لاتے ہیں اور بعض پر نہیں - یعنی خدا پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں پر نہیں یا بعض رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض پر نہیں اور ارادہ کرتے ہیں کہ بین بین راہ اختیار کریں یہی لوگ واقعی طور پر کافر اور پکے کافر ہیں- اور ہم نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب مہیّا کر رکھا ہے - یہ تو آیات محکمات ہیں جن کی ہم ایک بڑی تفصیل بھی لکھ چکے ہیں -

دوسری قسم کی آیات متشابہات ہیں جن کے معنے باریک ہوتے ہیں اور جو لوگ راسخ فی العلم ہیں ان لوگوں کو ان کا علم دیا جاتا ہے اور جن لوگوں کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے وہ آیات محکمات کی کچھ پروا نہیں رکھتے اور متشابہات کی پیروی کرتے ہیں اور محکمات کی علامت یہ ہے کہ محکمات آیات خدا تعالیٰ کے کلام میں بکثرت موجود ہیں اور خدا تعالیٰ کا کلام ان سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور اُن کے معنے کھلے کھلے ہوتے ہیں اور ان کے نہ ماننے سے فساد لازم آتا ہے - مثلاً اسی جگہ دیکھ لو کہ جو شخص محض اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور اس کے رسولوں پر ایمان نہیں لاتا اس کو خدا تعالیٰ کی صفات سے منکر ہونا پڑتا ہے- مثلاً ہمارے زمانہ میں برہمو جو ایک نیا فرقہ ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کو مانتے ہیں مگر نبیوں کو نہیں مانتے وہ خدا تعالےٰ کے کلام سے منکر ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر خدا تعالیٰ سُنتا ہے تو بولتا بھی ہے - پس اگر اس کا بولنا ثابت نہیں تو سننا بھی ثابت نہیں - اس طرح پر ایسے لوگ صفات باری سے انکار کرکے دہریوں کے رنگ میں ہو جاتے ہیں - اور صفات باری جیسے ازلی ہیں ویسے ہی ابدی بھی ہیں اور ان کو مشاہدہ کے طور پر دکھلانے والے محض انبیاء علیہم السلام ہیں - اور نفی صفاتِ باری نفی وجود باری کو مستلزم ہے - اس تحقیق سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے لئے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا کس قدر ضروری ہے کہ بغیر ان کے خدا پر ایمان لانا ناقص اور ناتمام رہ جاتا ہے اور نیز آیات محکمات کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ اُن کی شہادت نہ محض کثرت آیات سے بلکہ عملی طور پر بھی ملتی ہے یعنی خدا کے نبیوں کی متواتر شہادت ان کے بارہ میں پائی جاتی ہے جیسا کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے کلام قرآن شریف اور دوسرے نبیوں کی کتابوں کو دیکھیگا اُس کو معلوم ہوگا کہ نبیوں کی کتابوں میں جس طرح خدا پر ایمان لانے کی تاکید ہے ایسا ہی اس کے رسولوں پر بھی ایمان لانے کی تاکید ہے - اور متشابہات کی یہ علامت ہے کہ اُنکے ایسے معنے ماننے سے جو مخالف محکمات ہیں فساد لازم آتا ہے- اور نیز دوسری آیات سے جو

کثرت کے ساتھ ہیں مخالف پڑتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کے کلام میں تناقض ممکن نہیں اس لئے جو قلیل ہے بہرحال کثیر کے تابع کرنا پڑتا ہے .... خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اوّل سے آخر تک اللّٰہ کے لفظ کو انہی معنوں کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ وہ رسولوں اور نبیوں اور کتابوں کا بھیجنے والا اور زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اور فلاں فلاں صفت سے متصف اور واحد لاشریک ہے ہاں جن لوگوں کو خدا تعالیٰ کا کلام نہیں پہنچا اور وہ بالکل بے خبر ہیں اُن سے اُن کے علم اور عقل اور فہم کے مطابق مواخذہ ہوگا لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ وہ ان مدارج اور مراتب کو پالیں جو رسول کریم کی پیروی سے لوگوں کو ملیں گے۔ کیونکہ جن منازل تک بباعث پیروی نور رسالت پیروی کرنے والے پہنچ سکتے ہیں محض اندھے نہیں پہنچ سکتے اور یہ خدا کا فضل ہے جس پر چاہے کرے۔

پھر اس ظلم کو تو دیکھو کہ باوجود اس کے کہ قرآن شریف کی صدہا آیتیں بلند آواز سے کہہ رہی ہیں کہ نری توحید موجب نجات نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ رسول کریم پر ایمان لانا شرط ہے پھر بھی میاں عبدالحکیم خان ان آیات کی کچھ بھی پروا نہیں کرتے اور یہودیوں کی طرح ایک دو آیت جو مجمل طور پر واقع ہیں اُن کے اُلٹے معنے کرکے بار بار پیش کرتے ہیں۔ ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اگر ان آیات کے یہی معنے ہیں جو عبدالحکیم پیش کرتا ہے تب اسلام دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور جو کچھ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے احکام مثل نماز روزہ وغیرہ کے سکھلائے ہیں وہ سب کچھ بیہودہ اور لغو اور عبث ٹھیرتا ہے کیونکہ اگر یہی بات ہے کہ ہر ایک شخص اپنی خیالی توحید سے نجات پا سکتا ہے تو پھر نبی کی تکذیب کچھ بھی گناہ نہیں اور نہ مرتد ہونا کسی کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ پس یاد رہے کہ قرآن شریف میں کوئی بھی ایسی آیت نہیں کہ جو نبی کریم کی اطاعت سے لاپروا کرتی ہو۔ اور اگر بالفرض وہ دو تین آیتیں اُن صدہا آیتوں کے مخالف ہوتیں تب بھی چاہیئے تھا کہ قلیل کو کثیر کے تابع کیا جاتا۔ نہ کہ کثیر کو بالکل نظر انداز کرکے ارتداد کا جامہ پہن لیں۔ اور اسجگہ آیات کلام اللہ میں کوئی تناقض بھی نہیں صرف اپنے فہم کا فرق اور اپنی طبیعت کی تاریکی ہے ہمیں چاہیئے کہ اللّٰہ کے لفظ کے وہ معنے کریں جو خدا تعالےٰ نے خود کئے ہیں نہ کہ اپنی طرف سے یہودیوں کی طرح اور معنے بنا دیں۔

ماسوا اس کے خدا تعالےٰ کے کلام اور اس کے رسولوں کی قدیم سے یہ سنت ہے کہ وہ ہر یک سرکش اور سخت منکر کو اس پیرایہ سے بھی ہدایت کیا کرتے ہیں کہ تم صحیح اور خالص طور پر

خدا پر ایمان لاؤ اور اس سے محبت کرو اور اس کو واحد لاشریک سمجھو تک تمہاری نجات ہو جائیگی اور اس کلام سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ پورے طور سے خدا پر ایمان لائیں گے تو خدا ان کو اسلام قبول کرنے کی توفیق دیدیگا۔ قرآن شریف کو یہ لوگ نہیں پڑھتے اُس میں صاف لکھا ہے کہ خدا پر سچا ایمان لانا اس کے رسول پر ایمان لانے کیلئے موجب ہو جاتا ہے اور ایسے شخص کا سینہ اسلام کو قبول کرنے کیلئے کھولا جاتا ہے۔ اس لئے میرا بھی یہی دستور ہے کہ جب کوئی آریہ یا برہمو یا عیسائی یا یہودی یا سکھ یا اور منکر اسلام کج بحثی کرتا ہے اور کسی طرح باز نہیں آتا تو آخر کہہ دیا کرتا ہوں کہ تمہاری اس بحث سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا تم خدا پر پورے اخلاص سے ایمان لاؤ۔ اس سے وہ تمہیں نجات دیگا۔ مگر اس کلمہ سے میرا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بغیر متابعت نبی کریم کے نجات مل سکتی ہے بلکہ میرا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جو شخص پورے صدق سے خدا پر ایمان لائیگا خدا اس کو توفیق دے گا اور اپنے رسول پر ایمان لانے کیلئے اسکا سینہ کھول دیگا ......

یاد رہے کہ اوّل تو توحید بغیر پیروی نبی کریم کے کامل طور پر حاصل نہیں ہو سکتی جیسا کہ ابھی ہم بیان کر آئے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفات جو اس کی ذات سے الگ نہیں ہو سکتیں بغیر آئینۂ وحیٔ نبوت کے مشاہدہ میں آ نہیں سکتیں۔ ان صفات کو مشاہدہ کے رنگ میں دکھلانیوالا محض نبی ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے اگر بفرض محال حصول ان کا ناقص طور پر ہو جائے تو وہ شرک کی آلائش سے خالی نہیں جب تک کہ خدا اسی مغشوش مطاع کو قبول کر کے اسلام میں داخل نہ کرے۔ کیونکہ جو کچھ انسان کو خدا تعالیٰ سے اس کے رسول کی معرفت ملتا ہے وہ ایک آسمانی پانی ہے۔ اس میں اپنے فخر اور عجب کو کچھ دخل نہیں۔ لیکن انسان اپنی کوشش سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اس میں ضرور کوئی شرک کی آلائش پیدا ہو جاتی ہے۔ پس یہی حکمت تھی کہ توحید کو سکھلانے کے لئے رسول بھیجے گئے اور انسانوں کی محض عقل پر نہیں چھوڑا گیا تا توحید خالص رہے۔ اور انسانی عجب کا شرک اس میں مخلوط نہ ہو جائے۔ اور اسی وجہ سے فلاسفہ ضالہ کو توحید خالص نصیب نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ رعونت اور تکبّر اور عجب میں گرفتار رہے اور توحید خالص نیستی کو چاہتی ہے اور وہ نیستی جب تک انسان سچّے دل سے یہ نہ سمجھے کہ میری کوشش کا کچھ دخل نہیں یہ محض انعام الٰہی ہے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ایک شخص تمام رات جاگ کر اور اپنے نفس کو مصیبت میں ڈال کر اپنے کھیت کی آبپاشی کر رہا ہے اور دوسرا شخص تمام رات سوتا رہا اور ایک بادل آیا اور اس کے کھیت کو پانی سے بھر دیا۔ اب میں پوچھتا ہوں

کہ کیا وہ دونوں خدا کا شکر کرنے میں برابر ہونگے ؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ زیادہ شکر کریگا جس کے کھیت کو بغیر اس کی محنت کے پانی دیا گیا۔ اِسی لئے خدا تعالےٰ کے کلام میں بار بار آیا ہے کہ اس خدا کا شکر کرو جس نے رسول بھیجے اور تمہیں توحید سکھائی۔

(حقیقۃ الوحی ص ۱۶۸ - ۱۷۴)

مَیں یہاں ایک ضروری امر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کو ضرورتیں کیوں لاحق ہوتی ہیں ؟ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ان کو کوئی ضرورت پیش نہ آوے مگر یہ ضرورتیں اس لئے لاحق ہوتی ہیں "تاکہ لِلّٰہی وقف کے نمونے مثال کے طور پر قائم ہوں۔ اور ابوبکرؓ کی زندگی کا وقف ثابت ہو۔ اور دنیا میں خدائے مقتدر کی ہستی پر ایمان پیدا ہو۔ اور ایسے لِلّٰہی وقف کرنے والے دنیا کے لئے بطور آیت اللہ کے ٹھیریں۔ اور اس مخفی لذّت اور محبت پر دنیا کو اطلاع ملے جس کے سامنے مال و دولت جیسی محبوب اور مرغوب شے بھی آسانی اور خوشی کے ساتھ قربان ہو سکتی ہے اور پھر مال و دولت کے خرچ کے بعد لِلّٰہی وقف کو مکمل کرنے کے واسطے وہ قوت اور شجاعت ملے کہ انسان جان جیسی شئے کو بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں دینے سے دریغ نہ کرے۔

غرض انبیاء علیہم السلام کی ضرورتوں کی اصل غرض دنیا کی جھوٹی محبتوں اور فانی چیزوں سے مُنّہ موڑنے کی تعلیم دینے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر لذیذ ایمان پیدا کرنے اور ابنائے جنس کی بہتری اور خیر خواہی کے لئے ایثار کی قوت پیدا کرنے کے واسطے ہوتا ہے۔ ورنہ یہ پاک گروہ خزائن السماوات والارض کے مالک کی نظر میں پلتا ہے ان کو کسی چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے ؟ وہ ضرورتیں تعلیم کو کامل اور انسان کے اخلاق اور ایمان کے رسوخ کے لئے پیش آتی ہیں۔

(ملفوظات جلد دوم ص ۹۶-۹۷)

اسلام میں نبوّت

اسلام میں اس نبوّت کا دروازہ تو بند ہے جو اپنا سکّہ جماتی ہو۔

(ایام الصلح ص۷۴)

خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ نبوت تشریعی کا دروازہ بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بالکل مسدود ہے اور قرآن مجید کے بعد اور کوئی کتاب نہیں جو نئے احکام سکھائے یا قرآن شریف کا حکم منسوخ کرے یا اسکی پیروی معطّل کرے۔ بلکہ اس کا عمل قیامت تک ہے۔

(الوصیت ص۱۸ حاشیہ)

میرے پر یہی کھولا گیا ہے کہ حقیقی نبوت کے دروازے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بکلی بند ہیں اب نہ کوئی جدید نبی حقیقی معنوں کے رُو سے آسکتا ہے اور نہ کوئی قدیم نبی۔ مگر ہمارے ظالم مخالف ختم نبوت کے دروازوں کو پورے طور پر بند نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک مسیح اسرائیلی نبی کے واپس آنے کے لئے ابھی ایک کھڑکی کھلی ہے۔

(سراج منیر ص۳)

نبی کے معنے صرف یہ ہیں کہ خدا سے بذریعہ وحی خبر پانے والا ہو۔ اور شرف مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ سے مشرف ہو۔ شریعت کا لانا اس کے لئے ضروری نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ صاحب شریعت رسول کا متبع نہ ہو۔ پس ایک امتی کو ایسا نبی قرار دینے سے کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ بالخصوص اس حالت میں کہ وہ امتی اپنے اسی نبی متبوع سے فیض پانیوالا ہو۔ بلکہ فساد اس حالت میں لازم آتا ہے کہ اس امت کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک مکالماتِ الٰہیہ سے بے نصیب قرار دیا جائے۔ وہ دین دین نہیں ہے۔ اور نہ وہ نبی نبی ہے جس کی متابعت سے انسان خدا تعالے سے اس قدر نزدیک نہیں ہو سکتا کہ مکالماتِ الٰہیہ سے مشرف ہو سکے۔ وہ دین لعنتی اور قابلِ نفرت ہے جو یہ سکھلاتا ہے کہ صرف چند منقولی باتوں پر انسانی ترقیات کا انحصار ہے اور وحی الٰہی آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گئی ہے۔

اور خدائے حیّ و قیوم کی آواز سُننے اور اُس کے مکالمات سے قطعی نا امیدی ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۱۳۸ - ۱۳۹)

عربی اور عبرانی زبان میں نبی کے معنے صرف پیشگوئی کرنے والے کے ہیں جو خدا تعالےٰ سے الہام پاکر پیشگوئی کرے۔ پس جبکہ قرآن شریف کی رو سے ایسی نبوت کا دروازہ بند نہیں ہے جو بتوسط فیض و اتباع آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کسی انسان کو خدا تعالےٰ سے شرف مکالمہ اور مخاطبہ حاصل ہو اور وہ بذریعہ وحی الہٰی کے مخفی امور پر اطلاع پاوے تو پھر ایسے نبی اس اُمت میں کیوں نہیں ہونگے اس پر کیا دلیل ہے؟ ہمارا مذہب نہیں ہے کہ ایسی نبوت پر مہر لگ گئی ہے۔ صرف اس نبوت کا دروازہ بند ہے جو احکام شریعت جدیدہ ساتھ رکھتی ہو۔ یا ایسا دعویٰ ہو جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے الگ ہو کر دعویٰ کیا جائے۔ لیکن ایسا شخص جو ایک طرف اس کو خدا تعالےٰ اس کی وحی میں امتی بھی قرار دیتا ہے پھر دوسری طرف اس کا نام نبی بھی رکھتا ہے یہ دعویٰ قرآن شریف کے احکام کے مخالف نہیں ہے۔ کیونکہ یہ نبوت بباعث امتی ہونے کے دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ظلّ ہے کوئی مستقل نبوت نہیں ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۱۸۱ - ۱۸۲)

یاد رکھنا چاہیئے کہ مجھ پر اور میری جماعت پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النّبیّین نہیں مانتے یہ ہم پر افترائے عظیم ہے۔ ہم جس قوت یقین معرفت اور بصیرت کے ساتھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء مانتے اور یقین کرتے ہیں اس کا لاکھواں حصّہ بھی دوسرے لوگ نہیں مانتے۔ اور ان کا ایسا ظرف ہی نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت اور راز کو جو خاتم الانبیاء کی ختمِ نبوت میں ہے سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ انہوں نے صرف باپ دادا سے ایک لفظ سُنا ہوا ہے مگر اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ ختم نبوت کیا ہوتا ہے اور اس پر ایمان لانے کا مفہوم کیا ہے؟ مگر ہم بصیرت تام سے (جسکو اللہ تعالےٰ بہتر جانتا ہے) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء یقین کرتے ہیں اور خدا تعالےٰ نے ہم پر ختم نبوت کی حقیقت کو ایسے طور پر کھول دیا ہے کہ اس عرفان کے شربت سے جو ہمیں پلایا گیا ہے ایک خاص لذّت پاتے ہیں جسکا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا بجز ان لوگوں کے جو اس چشمہ سے سیراب ہوں۔ دنیا کی مثالوں میں سے ہم ختم نبوت کی مثال اس طرح پر دے

سکتے ہیں کہ جیسے چاند ہلال سے شروع ہوتا ہے اور چودھویں تاریخ پر آکر اُس کا کمال ہو جاتا ہے جبکہ اُسے بدر کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر آکر کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے۔ جو لوگ یہ مذہب رکھتے ہیں کہ نبوت زبردستی ختم ہو گئی اور آنحضرتؐ کو یونس بن متی پر بھی ترجیح نہیں دینی چاہیئے۔ انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہی نہیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور کمالات کا کوئی علم ہی اُن کو نہیں ہے۔ باوجود اس کمزوریٔ فہم اور کمیٔ علم کے ہم کو کہتے ہیں کہ ہم ختم نبوت کے منکر ہیں۔ مَیں ایسے مریضوں کو کیا کہوں اور اُن پر کیا افسوس کروں

(ملفوظات جلد اوّل ص ۳۲۸)

ختم نبوت کے متعلق میں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ خاتم النّبیین کے بڑے معنے یہی ہیں کہ نبوت کے امور کو آدم علیہ السلام سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کیا۔ یہ موٹے اور ظاہر معنے ہیں۔ دوسرے یہ معنے ہیں کہ کمالاتِ نبوت کا دائرہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ قرآن نے ناقص باتوں کا کمال کیا اور نبوت ختم ہو گئی اس لئے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا مصداق اسلام ہو گیا۔ غرض یہ نشاناتِ نبوت ہیں۔ ان کی کیفیت اور کنہ پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اصول صاف اور روشن ہیں اور وہ ثابت شدہ صداقتیں کہلاتی ہیں۔ ان باتوں میں پڑنا مومن کو ضروری نہیں ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر کوئی مخالف اعتراض کرے تو ہم اس کو روک سکتے ہیں۔ اگر وہ بند نہ ہو تو ہم اس کو کہہ سکتے ہیں کہ پہلے اپنے جزوی مسائل کا ثبوت دے۔ الغرض مہر نبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نشان نبوت میں سے ایک نشان ہے جس پر ایمان لانا ہر مسلمان مومن کو ضروری ہے۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۲۷۶)

جس کامل انسان پر قرآن شریف نازل ہوا اس کی نظر محدود نہ تھی اور اس کی عام غمخواری اور ہمدردی میں کچھ قصور نہ تھا۔ بلکہ کیا باعتبار زمان اور کیا باعتبار مکان اس کے نفس کے اندر کامل ہمدردی موجود تھی اس لئے قدرت کی تجلیات کا پورا اور کامل حصہ اس کو ملا۔ اور وہ خاتم الانبیاء بنے مگر ان معنوں سے نہیں کہ آئندہ اس سے کوئی رُوحانی فیض نہیں ملے گا بلکہ ان معنوں سے کہ وہ صاحبِ خاتم ہے بجز اس کی مُہر کے کوئی فیض کسی کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور اس کی اُمت کے لئے قیامت تک مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ کا دروازہ کبھی بند نہ ہو گا اور بجز اس کے کوئی نبی صاحب خاتم نہیں ایک وہی ہے جس کی مُہر سے ایسی نبوت بھی مل سکتی ہے،

جس کے لئے امتی ہونا لازمی ہے ۔ اور اس کی ہمت اور ہمدردی نے امت کو ناقص حالت پر چھوڑنا نہیں چاہا اور اُن پر وحی کا دروازہ جو حصول معرفت کی اصل جڑ ہے بند رہنا گوارا نہیں کیا ۔ ہاں اپنی ختم رسالت کا نشان قائم رکھنے کے لئے یہ چاہا کہ فیضِ وحی آپ کی پیروی کے وسیلہ سے ملے اور جو شخص امتی نہ ہو اس پر وحی الٰہی کا دروازہ بند ہو ۔ سو خدا نے اِن معنوں سے آپ کو خاتم الانبیاء ٹھہرایا ۔ لہٰذا قیامت تک یہ بات قائم ہوئی کہ جو شخص سچی پیروی سے اپنا امتی ہونا ثابت نہ کرے اور آپ کی متابعت میں اپنا تمام وجود محو نہ کرے ایسا انسان قیامت تک نہ کوئی کامل وحی پا سکتا ہے اور نہ کامل ملہم ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ مستقل نبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی ہے ۔ مگر ظلّی نبوت جس کے معنے ہیں کہ محض فیض محمدی سے وحی پانا وہ قیامت تک باقی رہے گی تا انسانوں کی تکمیل کا دروازہ بند نہ ہو اور تا یہ نشان دنیا سے مٹ نہ جاوے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہمت نے قیامت تک یہی چاہا ہے کہ مکالمات اور مخاطبات الٰہیہ کے دروازے کھلے رہیں اور معرفتِ الٰہیہ جو مدارِ نجات ہے مفقود نہ ہو جائے ۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۷-۲۸)

اِسجگہ یہ سوال طبعًا ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی اُمت میں بہت سے نبی گذرے ہیں پس اِس حالت میں موسیٰ کا افضل ہونا لازم آتا ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس قدر نبی گذرے ہیں ان سب کو خدا نے براہ راست نبی چن لیا تھا ۔ حضرت موسیٰ کا اس میں کچھ بھی دخل نہیں تھا لیکن اس امت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی برکت سے ہزارہا اولیا ہوئے اور **ایک وہ بھی ہوا جو امتی بھی اور نبی بھی** ۔ اس کثرتِ فیضان کی کسی نبی میں نظیر نہیں مل سکتی ۔ اسرائیلی نبیوں کو الگ کر کے باقی تمام لوگ اکثر موسوی امت میں ناقص پائے جاتے ہیں ۔ رہے انبیاء ۔ سو ہم بیان کر چکے ہیں کہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے کچھ نہیں پایا ۔ بلکہ وہ براہ راست نبی کئے گئے مگر اُمت محمدیہ میں سے ہزارہا لوگ محض پیروی کی وجہ سے ولی کئے گئے ۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۹ حاشیہ)

مولوی صاحبزادہ عبداللطیف صاحب جب قادیان میں آئے تو صرف ان کو یہی فائدہ نہ ہوا کہ انہوں نے مفصّل طور پر میرے دعوےٰ کے دلائل سُنے بلکہ ان چند مہینوں کے عرصہ میں جو وہ قادیان میں میرے پاس رہے اور ایک سفر جہلم تک بھی میرے ساتھ کیا آسمانی نشان بھی

میری تائید میں انہوں نے مشاہدہ کئے۔ ان تمام براہین اور انوار اور خوارق کے دیکھنے کی وجہ سے وہ فوق العادت یقین سے بھر گئے اور طاقت بالا ان کو کھینچ کر لے گئی۔ میں نے ایک موقعہ پر ایک اعتراض کا جواب بھی ان کو سمجھایا تھا جس سے وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ اور وہ یہ کہ جس حالت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰ ہیں اور آپ کے خلفاء مثیل انبیاء بنی اسرائیل ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ مسیح موعود کا نام احادیث میں نبی کر کے پکارا گیا ہے مگر دوسرے تمام خلفاء کو یہ نام نہیں دیا گیا؟ سو میں نے انکو یہ جواب دیا کہ جبکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے آپ کے بعد کوئی نبی نہیں تھا۔ اس لئے اگر تمام خلفاء کو نبی کے نام سے پکارا جاتا تو امر ختم نبوت مشتبہ ہو جاتا۔ اور اگر کسی ایک فرد کو بھی نبی کے نام سے نہ پکارا جاتا تو عدم مشابہت کا اعتراض باقی رہ جاتا کیونکہ موسیٰ کے خلفاء نبی ہیں۔ اس لئے حکمت الٰہی نے یہ تقاضا کیا کہ پہلے بہت سے خلفاء کو برعایت ختم نبوت بھیجا جائے اور اُن کا نام نبی نہ رکھا جائے۔ اور یہ مرتبہ اُن کو نہ دیا جائے تا ختم نبوت پر یہ نشان ہو۔ پھر آخری خلیفہ یعنی مسیح موعود کو نبی کے نام سے پکارا جائے تا خلافت کے امر میں دونوں سلسلوں کی مشابہت ثابت ہو جائے اور ہم کئی دفعہ بیان کر چکے ہیں کہ مسیح موعود کی نبوت ظلّی طور پر ہے کیونکہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا بروز کامل ہونے کی وجہ سے نفس نبی سے مستفیض ہو کر نبی کہلانے کا مستحق ہو گیا ہے جیسا کہ ایک وحی میں خدا تعالیٰ نے مجھ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ یَا اَحْمَدُ جُعِلْتَ مُرْسَلًا۔ اے احمد تو مرسل بنایا گیا۔ یعنی جیسے کہ تو بروزی رنگ میں **احمد** کے نام کا مستحق ہوا۔ حالانکہ تیرا نام **غلام احمد** تھا سو اسی طرح بروز کے رنگ میں **نبی کے نام** کا مستحق ہے کیونکہ **احمد** نبی ہے۔ نبوت اس سے منفک نہیں ہو سکتی۔

(تذکرۃ الشہادتین ص۴۳)

وان قال قائل کیف یکون نبیّ من ھٰذہ الامّۃ وقد ختم اللہ علی النبوّۃ۔

فالجواب انّہ عزّوجلّ ما سمّٰی ھٰذا الرجل نبیًّا الّا لاثبات کمال النبوّۃ سیّدنا خیر البریّۃ۔ فان ثبوت کمال النبیّ لا یتحقّق الا بثبوت کمال الامّۃ و من دون ذالک ادّعاء محض لا دلیل علیہ عند اھل الفطنۃ۔ ولا معنی لختم النبوّۃ علی فرد من غیر ان تختتم کمالات النبوّۃ علی ذالک الفرد۔ ومن الکمالات العظمٰی کمال النبیّ فی الافاضۃ وھو لا یثبت من غیر نموذج

یوجد فی الامّۃ۔ ثم مع ذالک ذکرت غیر مرّۃٍ ان اللّٰہ ما اراد من نبوّتی الا کثرۃ المکالمۃ والمخاطبۃ وھو مسلّم عند اکابر اھل السنّۃ۔ فالنّزاع لیس الا نزاعًا لفظیًّا فلا تستعجلوا یا اھل العقل والفطنۃ ولعنۃ اللّٰہ علیٰ من ادّعٰی خلاف ذالک مثقال ذرّۃٍ ومعھا لعنۃ النّاس والملٰئکۃ۔

(الاستفتاء صـ١٦ حاشیہ)

یہ وحی الٰہی کہ **خدا کی فیلنگ** اور **خدا کی مُہر نے کتنا بڑا کام کیا** اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے اس زمانہ میں محسوس کیا کہ یہ ایسا فاسد زمانہ آگیا ہے جس میں ایک عظیم الشان مصلح کی ضرورت ہے۔ اور خدا کی مہر نے یہ کام کیا کہ آنحضرت صلے اللّٰہ علیہ وسلم کی پیروی کرنیوالا اِس درجہ کو پہنچا کہ **ایک پہلو سے وہ امتی ہے** اور **ایک پہلو سے نبی**۔ کیونکہ اللّٰہ جلّ شانہٗ نے آنحضرت صلے اللّٰہ علیہ وسلم کو **صاحب خاتم** بنایا۔ یعنی آپ کو افاضہ کمال کے لئے مُہر دی جو کسی اور نبی کو ہرگز نہیں دی گئی۔ اسی وجہ سے آپ کا نام **خاتم النّبیّین** ٹھہرا یعنی آپ کی پیروی کمالاتِ نبوت بخشتی ہے اور آپ کی توجہ رُوحانی **نبی تراش** ہے۔ اور یہ قوتِ قدسیہ کسی اَور نبی کو نہیں ملی۔ یہی معنے اس حدیث کے ہیں کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہونگے اور بنی اسرائیل میں اگرچہ بہت نبی آئے مگر ان کی نبوت موسٰی کی پیروی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ وہ نبوتیں براہِ راست خدا کی ایک موہبت تھیں۔ حضرت موسٰی کی پیروی کا اس میں ایک ذرّہ کچھ دخل نہ تھا۔ اسی وجہ سے میری طرح ان کا یہ نام نہ ہوا کہ **ایک پہلو سے نبی** اور **ایک پہلو سے امتی** بلکہ وہ انبیاء مستقل نبی کہلائے اور براہ راست ان کو منصب نبوت ملا۔ اور ان کو چھوڑ کر جب اور بنی اسرائیل کا حال دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کو رشد اور صلاح اور تقوٰی سے بہت ہی کم حصّہ ملا تھا۔ اور حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰے کی امت اولیاء اللّٰہ کے وجود سے عموماً محروم رہی تھی اور کوئی شاذ و نادر اُن میں ہُوا تو وہ حکم معدوم کا رکھتا ہے بلکہ اکثر اُن میں سرکش فاسق فاجر دنیا پرست ہوتے رہے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اُن کی نسبت حضرت موسٰی یا حضرت عیسٰی کی قوّتِ تاثیر کا توریت اور انجیل میں اشارہ تک نہیں ہے۔ توریت میں جا بجا حضرت موسٰی کے صحابہ کا نام ایک سرکش اور سخت دل اور مرتکب معاصی اور مفسد قوم لکھا ہے جن کی نافرمانیوں کی نسبت قرآن شریف

میں بھی یہ بیان ہے کہ ایک لڑائی کے موقع کے وقت میں انہوں نے حضرت موسیٰ کو یہ جواب دیا تھا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ یعنی تو اور تیرا رب دونوں جا کر دشمنوں سے لڑائی کرو ہم تو اسی جگہ بیٹھیں گے ۔ یہ حال تھا ان کی نافرمانبرداری کا ۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے دلوں میں وہ جوش عشق الہٰی پیدا ہوا ۔ اور توجہ قدسی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ تاثیر ان کے دلوں میں ظاہر ہوئی کہ انہوں نے خدا کی راہ میں بھیڑوں اور بکریوں کی طرح سر کٹائے ۔ کیا کوئی پہلی امت میں ہمیں دکھا سکتا ہے یا نشان دے سکتا ہے کہ انہوں نے بھی صدق اور صفا دکھلایا ۔ یہ تو حضرت موسیٰ کے صحابہ کا حال تھا ۔ اب حضرت مسیح کے صحابہ کا حال سنو ۔ کہ ایک نے تو جس کا نام یہودا اسکریوطی تھا تیس روپے لیکر حضرت مسیح کو گرفتار کرا دیا ۔ اور پطرس حواری جس کو بہشت کی کنجیاں دی گئی تھیں اُس نے حضرت مسیح کے روبرو اُن پر لعنت بھیجی اور باقی جس قدر حواری تھے وہ مصیبت کا وقت دیکھکر بھاگ گئے ۔ اور ایک نے بھی استقامت نہ دکھلائی اور ثابت قدم نہ رہے اور بزدلی اُن پر غالب آگئی ۔ اور ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے تلواروں کے سایہ کے نیچے وہ استقامتیں دکھلائیں اور اس طرح مرنے پر راضی ہوئے جن کی سوانح پڑھنے سے رونا آتا ہے ۔ پس وہ کیا چیز تھی جس نے ایسی عاشقانہ رُوح اُن میں پھونک دی ۔ اور وہ کونسا ہاتھ تھا جس نے اُن میں اس قدر تبدیلی پیدا کر دی ۔ یا تو جاہلیت کے زمانہ میں وہ حالت اُن کی تھی کہ وہ دنیا کے کیڑے تھے ۔ اور کوئی معصیت اور ظلم کی قسم نہیں تھی جو ان سے ظہور میں نہیں آئی تھی ۔ اور یا اس نبی کی پیروی کے بعد ایسے خدا کی طرف کھینچے گئے کہ گویا خدا ان کے اندر سکونت پذیر ہو گیا ۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ یہ وہی توجہ اس پاک نبی کی تھی جو ان لوگوں کو سفلی زندگی سے ایک پاک زندگی کی طرف کھینچ کر لے آئی اور جو لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے اس کا سبب تلوار نہیں تھی بلکہ وہ اس تیرہ سال کی آہ وزاری اور دعا اور تضرع کا اثر تھا جو مکہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کرتے رہے اور مکہ کی زمین بول اٹھی کہ میں اس مبارک قدم کے نیچے ہوں جس کے دل نے اسقدر توحید کا شور ڈالا جو آسمان اس کی آہ وزاری سے بھر گیا ۔ خدا بے نیاز ہے اسکو کسی ہدایت یا ضلالت کی پروا نہیں ۔ پس یہ نور ہدایت جو خارق عادت طور پر عرب کے جزیرہ میں ظہور میں آیا اور پھر دنیا میں پھیل گیا یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دلی سوزش کی تاثیر تھی ۔ ہر ایک قوم توحید سے دور اور مہجور ہو گئی مگر اسلام میں چشمۂ توحید جاری رہا ۔ یہ تمام برکتیں

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اس غم میں اپنے تئیں ہلاک کر دیگا جو یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ پس پہلے نبیوں کی امت میں جو اس درجہ کی صلاح و تقویٰ پیدا نہ ہوئی اسکی یہی وجہ تھی کہ اس درجہ کی توجہ اور دلسوزی امت کیلئے اُن نبیوں میں نہیں تھی۔ افسوس کہ حال کے نادان مسلمانوں نے اپنے اس نبیٔ مکرم کا کچھ قدر نہیں کیا۔ اور ہر ایک بات میں ٹھوکر کھائی وہ **ختم نبوت** کے ایسے معنے کرتے ہیں جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجو نکلتی ہے نہ تعریف گویا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نفس پاک میں افاضہ اور تکمیل نفوس کے لئے کوئی قوت نہ تھی۔ اور وہ صرف خشک شریعت کو سکھلانے آئے تھے حالانکہ اللہ تعالےٰ اس امت کو یہ دعا سکھلاتا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم۔ پس اگر یہ امت پہلے نبیوں کی وارث نہیں اور اس انعام میں سے ان کو کچھ حصّہ نہیں تو یہ دعا کیوں سکھلائی گئی۔ افسوس کہ تعصب اور نادانی کے جوش سے کوئی اس آیت میں غور نہیں کرتا۔ بڑا شوق رکھتے ہیں کہ حضرت عیسٰے آسمان سے نازل ہوں مگر خدا کا کلام قرآن شریف گواہی دیتا ہے کہ وہ مرگیا اور اس کی قبر سری نگر کشمیر میں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ یعنی ہم نے عیسٰی اور اُس کی ماں کو یہودیوں کے ہاتھ سے بچا کر ایک ایسے پہاڑ میں پہنچا دیا جو آرام اور خوشحالی کی جگہ تھی اور مصفّی پانی کے چشمے اس میں جاری تھے سو وہی کشمیر ہے۔ اسی وجہ سے حضرت مریم کی قبر زمین شام میں کسی کو معلوم نہیں۔ اور کہتے ہیں وہ بھی حضرت عیسٰی کی طرح مفقود ہے۔ یہ کس قدر ظلم ہے جو نادان مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ سے بے نصیب ہے اور خود حدیثیں پڑھتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں بنی اسرائیلی نبیوں کے مشابہ لوگ پیدا ہونگے اور ایک ایسا ہوگا کہ **ایک پہلو سے نبی ہوگا اور ایک پہلو سے اُمتی۔ وہی مسیح موعود کہلائے گا۔**

(حقیقۃ الوحی ص ۹۶-۱۰۱ حاشیہ)

مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اسلام ایسے بدیہی طور پر سچا ہے کہ اگر تمام کفار روئے زمین دُعا کرنے کے لئے ایک طرف کھڑے ہوں اور ایک طرف صرف مَیں اکیلا اپنے خدا کے جناب میں کسی امر کے لئے رجوع کروں تو خدا میری ہی تائید کرے گا مگر نہ اس لئے کہ سب سے مَیں ہی

بہتر ہوں بلکہ اس لئے کہ میں اس کے رسول پر دلی صدق سے ایمان لایا ہوں۔ اور جانتا ہوں کہ **تمام نبوتیں** اس پر ختم ہیں اور اس کی شریعت **خاتم الشرائع** ہے۔ مگر ایک قسم کی نبوت ختم نہیں۔ یعنی وہ نبوت جو اُس کی کامل پیروی سے ملتی ہے اور جو اُسکے چراغ میں سے نور لیتی ہے۔ وہ ختم نہیں کیونکہ وہ محمدی نبوت ہے یعنی اس کا ظلّ ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہے اور اسی کا مظہر ہے اور اسی سے فیض یاب ہے۔ خدا اس شخص کا دشمن ہے جو قرآن شریف کو منسوخ کی طرح قرار دیتا ہے اور محمدی شریعت کے برخلاف چلتا ہے اور اپنی شریعت چلانا چاہتا ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہیں کرتا بلکہ آپ کچھ بننا چاہتا ہے۔ مگر خدا اس شخص سے پیار کرتا ہے جو اس کی کتاب قرآن شریف کو اپنا دستور العمل قرار دیتا ہے اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو درحقیقت خاتم الانبیاء سمجھتا ہے اور اس کے فیض کا اپنے تئیں محتاج جانتا ہے۔ پس ایسا شخص خدا تعالےٰ کی جناب میں پیارا ہو جاتا ہے اور خدا کا پیار یہ ہے کہ اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اُس کو اپنے مکالمہ مخاطبہ سے مشرف کرتا ہے اور اس کی حمایت میں اپنے نشان ظاہر کرتا ہے۔ اور جب اس کی پیروی کمال کو پہنچتی ہے تو ایک **ظلّی نبوت** اس کو عطا کرتا ہے جو **نبوتِ محمدیہ** کا ظلّ ہے۔ یہ اس لئے کہ تا اسلام ایسے لوگوں کے وجود سے تازہ رہے اور تا اسلام ہمیشہ مخالفوں پر غالب رہے۔ نادان آدمی جو دراصل دشمن دین ہے اس بات کو نہیں چاہتا کہ اسلام میں سلسلہ مکالمات مخاطبات الٰہیہ کا جاری رہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اسلام بھی اور مردہ مذہبوں کی طرح ایک مردہ مذہب ہو جائے مگر خدا نہیں چاہتا **نبوت** اور **رسالت** کا لفظ خدا تعالےٰ نے اپنی وحی میں میری نسبت صدہا مرتبہ استعمال کیا ہے مگر اس لفظ سے صرف وہ مکالمات مخاطبات الٰہیہ مراد ہیں جو بکثرت ہیں اور غیب پر مشتمل ہیں اس سے بڑھکر کچھ نہیں۔ ہر ایک شخص اپنی گفتگو میں ایک اصطلاح اختیار کر سکتا ہے لِکُلٍّ اَنْ یَّصْطَلِحَ سو خدا کی یہ اصطلاح ہے جو کثرت مکالمات و مخاطبات کا نام اُس نے نبوت رکھا ہے یعنی ایسے مکالمات جن میں اکثر غیب کی خبریں دی گئی ہیں۔ اور لعنت ہے اس شخص پر جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیض سے علیحدہ ہو کر **نبوت کا دعویٰ کرے۔** مگر یہ **نبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہے نہ کوئی نئی نبوت۔** اور اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اسلام کی حقانیت دنیا پر ظاہر کی جائے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم

کی سچائی دکھلائی جائے ۔

(چشمۂ معرفت ص۳۲۴ - ۳۲۵)

ہم اس آیت پر سچا اور کامل ایمان رکھتے ہیں جو فرمایا کہ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اور اس آیت میں ایک پیشگوئی ہے جس کی ہمارے مخالفوں کو خبر نہیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد پیشگوئیوں کے دروازے قیامت تک بند کر دیئے گئے ۔ اور ممکن نہیں کہ اب کوئی ہندو یا یہودی یا عیسائی یا کوئی رسمی مسلمان نبی کے لفظ کو اپنی نسبت ثابت کر سکے ۔ نبوت کی تمام کھڑکیاں بند کی گئیں مگر ایک کھڑکی سیرت صدیقی کی کھلی ہے یعنی فنا فی الرسول کی ۔ پس جو شخص اس کھڑکی کی راہ سے خدا کے پاس آتا ہے اُس پر ظلّی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے جو نبوت محمدی کی چادر ہے ۔ اس لئے اس کا نبی ہونا غیرت کی جگہ نہیں کیونکہ وہ اپنی ذات سے نہیں بلکہ اپنے نبی کے چشمہ سے لیتا ہے ۔ اور نہ اپنے لئے بلکہ اُسی کے جلال کے لئے اسی کا نام آسمان پر محمد اور احمد ہے ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ محمد کی نبوت آخر محمد ہی کو ملی گو بروزی طور پر مگر نہ کسی اور کو ۔ پس یہ آیت کہ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اس کے معنے یہ ہیں کہ لَیْسَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِجَالِ الدُّنْیَا وَلٰکِنْ ھُوَ اَبٌ لِرِجَالِ الْاٰخِرَۃِ لِاَنَّہٗ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَلَا سَبِیْلَ اِلٰی فُیُوْضِ اللّٰہِ مِنْ غَیْرِ تَوَسُّطِہٖ ۔ غرض میری نبوت اور رسالت باعتبار محمد اور احمد ہونے کے ہے نہ میرے نفس کے رو سے ۔ اور یہ نام بحیثیت فنا فی الرسول مجھے ملا ہے لہذا خاتم النبیین کے مفہوم میں فرق نہ آیا ۔ لیکن عیسٰی کے اُترنے سے ضرور فرق آئیگا ۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ نبی کے معنے لغت کی رو سے یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے اطلاع پا کر غیب کی خبر دینے والا ۔ پس جہاں یہ معنے صادق آئیں گے نبی کا لفظ بھی صادق آئے گا ۔ اور نبی کا رسول ہونا شرط ہے کیونکہ اگر وہ رسول نہ ہو تو پھر غیب مصفّٰی کی خبر اس کو مل نہیں سکتی اور یہ آیت روکتی ہے لَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ ۔ اب اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ان معنوں کی رُو سے نبی سے انکار کیا جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ امت مکالمات و مخاطبات الٰہیہ سے بے نصیب ہے کیونکہ جس کے ہاتھ پر اخبارِ غیبیہ منجانب اللہ ظاہر ہونگے بالضرور اُس پر مطابق آیت لَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ کے مفہوم نبی کا صادق آئے گا ۔ اِسی طرح جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا جائیگا اُسی کو ہم رسول کہیں گے ۔ فرق

درمیان یہ ہے کہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک ایسا نبی کوئی نہیں جس پر جدید شریعت نازل ہو یا جس کو بغیر توسط آنجناب ایسی فنا فی الرسول کی حالت کے جو آسمان پر اسکا نام محمد اور احمد رکھا جائے یونہی نبوت کا لقب عنایت کیا جائے۔ وَمَنْ ادَّعٰی فَقَدْ کَفَرَ۔ اس میں اصل بھید یہی ہے کہ خَاتَمَ النَّبِیّیْنَ کا مفہوم تقاضا کرتا ہے کہ جب تک کوئی پردہ مغائرت باقی ہے اس وقت تک اگر کوئی نبی کہلائے گا تو گویا اس مہر کو توڑنے والا ہوگا جو خاتم النّبیین پر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اسی خاتم النّبیین میں ایسا گم ہو کہ بباعث نہایت اتحاد اور نفیٔ غیریت کے اُسی کا نام پالیا ہو اور صاف آئینہ کی طرح محمدی چہرہ کا اس میں انعکاس ہوگیا ہو تو وہ بغیر مہر توڑنے کے نبی کہلائیگا۔ کیونکہ وہ محمد ہے گو ظلّی طور پر۔ پس باوجود اُس شخص کے دعویٰ نبوت کے جسکا نام ظلّی طور پر محمد اور احمد رکھا گیا۔ پھر بھی سیّدنا محمّد خاتم النّبیین ہی رہا کیونکہ یہ محمد ثانی اُسی محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی تصویر۔ اور اُسی کا نام ہے۔ مگر عیسٰی بغیر مہر توڑنے کے نہیں آسکتا کیونکہ اس کی نبوت ایک الگ نبوت ہے اور اگر بروزی معنوں کے رُو سے بھی کوئی شخص نبی اور رسول نہیں ہوسکتا تو پھر اس کے کیا معنے ہیں کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ المستقیم صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اِن معنوں کے رُو سے مجھے نبوت اور رسالت سے انکار نہیں ہے اِسی لحاظ سے صحیح مسلم میں بھی مسیح موعود کا نام نبی رکھا گیا۔ اگر خدا تعالیٰ سے غیب کی خبریں پانے والا نبی کا نام نہیں رکھتا تو پھر بتلاؤ کس نام سے اس کو پکارا جائے؟ اگر کہو اس کا نام محدث رکھنا چاہیئے تو مَیں کہتا ہوں تحدیث کے معنے کسی لغت کی کتاب میں اظہارِ غیب نہیں ہے۔ مگر نبوت کے معنے اظہارِ امرِ غیب ہے۔ اور نبی ایک لفظ ہے جو عربی اور عبرانی میں مشترک ہے۔ یعنی عبرانی میں اس لفظ کو نابی کہتے ہیں اور یہ لفظ نابا سے مشتق ہے جس کے یہ معنے ہیں خدا سے خبر پاکر پیشگوئی کرنا۔ اور نبی کے لئے شارع ہونا شرط نہیں ہے یہ صرف موہبت ہے جس کے ذریعہ سے امورِ غیبیہ کھلتے ہیں۔

(ایک غلطی کا ازالہ ص ۴–۷)

تمام دروازے بند ہیں مگر ایک دروازہ جو فرقان مجید نے کھولا ہے اور تمام نبوتیں اور تمام کتابیں جو پہلے گذر چکیں ان کی الگ طور پر پیروی کی حاجت نہیں رہی۔ کیونکہ نبوت محمدیہ ان سب پر مشتمل اور حاوی ہے اور بجز اس کے سب راہیں بند ہیں۔ تمام

سچائیاں جو خدا تک پہنچاتی ہیں اسی کے اندر ہیں۔ نہ اس کے بعد کوئی نئی سچائی آئے گی اور نہ اِس سے پہلے کوئی ایسی سچائی تھی جو اس میں موجود نہیں۔ اس لئے اس نبوت پر تمام نبوتوں کا خاتمہ ہے۔ اور ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ جس چیز کے لئے ایک آغاز ہے اس کے لئے ایک انجام بھی ہے لیکن یہ نبوت محمدیہ اپنی ذاتی فیض رسانی سے قاصر نہیں بلکہ سب نبوتوں سے زیادہ اس میں فیض ہے۔ اس نبوت کی پیروی خدا تک بہت سہل طریق سے پہنچا دیتی ہے اور اس کی پیروی سے خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کے مکالمہ مخاطبہ کا اِس سے بڑھ کر انعام مل سکتا ہے جو پہلے ملتا تھا مگر اس کا کامل پیرو صرف نبی نہیں کہلا سکتا کیونکہ نبوت کاملہ تامہ محمدیہ کی اِس میں ہتک ہے۔ ہاں امّتی اور نبی دونوں لفظ اجتماعی حالت میں اُس پر صادق آسکتے ہیں۔ کیونکہ اِس میں نبوت تامہ کاملہ محمدیہ کی ہتک نہیں بلکہ اس نبوت کی چمک اس فیضان سے زیادہ تر ہوتی ہے اور جبکہ وہ مکالمہ مخاطبہ اپنی کیفیت اور کمیت کی رُو سے کمال درجہ تک پہنچ جائے اور اُس میں کوئی کثافت اور کمی باقی نہ ہو اور کھلے طور پر امور غیبیہ پر مشتمل ہو تو وہی دوسرے لفظوں میں نبوت کے نام سے موسوم ہوتا ہے جس پر تمام نبیوں کا اتفاق ہے۔ پس یہ ممکن نہ تھا کہ وہ قوم جس کے لئے فرمایا گیا کہ کُنتم خیر اُمّۃٍ اُخرجت للنّاس اور جن کے لئے یہ دُعا سکھائی گئی کہ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم ان کے تمام افراد اِس مرتبہ عالیہ سے محروم رہتے اور کوئی ایک فرد بھی اس مرتبہ کو نہ پاتا۔ اور ایسی صورت میں صرف یہی خرابی نہیں تھی کہ امتِ محمدیہ ناقص اور ناتمام رہتی اور سب کے سب اندھوں کی طرح رہتے بلکہ یہ بھی نقص تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی قوتِ فیضان پر داغ لگتا تھا اور آپ کی قوتِ قدسیہ ناقص ٹھہرتی تھی۔ اور ساتھ ہی اس کے وہ دعا جس کا پانچ وقت نماز میں پڑھنا تعلیم کیا گیا تھا اس کا سکھلانا بھی عبث ٹھہرتا تھا۔ مگر اس کے دوسری طرف یہ خرابی بھی تھی کہ اگر یہ کمال کسی فردِ امت کو براہِ راست بغیر پیروی نورِ نبوت محمدیہ کے مل سکتا تو ختم نبوت کے معنے باطل ہوتے تھے۔ پس ان دونوں خرابیوں سے محفوظ رکھنے کیلئے خدا تعالیٰ نے مکالمہ مخاطبہ کاملہ تامّہ مطہّرہ مقدسہ کا شرف ایسے بعض افراد کو عطا کیا جو فنا فی الرسول کی حالت تک اتم درجہ تک پہنچ گئے اور کوئی حجاب درمیان نہ رہا اور امتی ہونے کا مفہوم اور پیروی کے معنے اتم اور اکمل درجہ پر اُن میں پائے گئے۔ ایسے طور پر کہ اُن کا وجود اپنا وجود نہ رہا بلکہ اُن کے محویت کے آئینہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود منعکس ہو گیا

اور دوسری طرف اتم اور اکمل طور پر مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ نبیوں کی طرح اُن کو نصیب ہُوا۔ پس اس طرح پر بعض افراد نے باوجود امتّی ہونے کے نبی ہونے کا خطاب پایا۔ کیونکہ ایسی صورت کی نبوت نبوتِ محمدیہ سے الگ نہیں۔ بلکہ اگر غور سے دیکھو تو خود وہ نبوت محمدیہ ہی ہے جو ایک پیرایۂ جدید میں جلوہ گر ہوئی۔ یہی معنے اس فقرہ کے ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مسیح موعود کے حق میں فرمایا کہ نبی اللہ وامامکم منکم یعنی وہ نبی بھی ہے اور امتی بھی ہے۔ ورنہ غیر کو اسجگہ قدم رکھنے کی جگہ نہیں۔ مبارک وہ جو اس نکتہ کو سمجھے تا ہلاک ہونے سے بچ جائے۔

(الوصیت ص ۱۷-۲۰)

عقیدہ کی رُو سے جو خدا تم سے چاہتا ہے وہ یہی ہے کہ خدا ایک اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُسکا نبی ہے اور وہ خاتم الانبیاء ہے اور سب سے بڑھ کر ہے۔ اب بعد اس کے کوئی نبی نہیں مگر وہی جس پر بروزی طور سے محمدیت کی چادر پہنائی گئی کیونکہ خادم اپنے مخدوم سے جدا نہیں اور نہ شاخ اپنی بیخ سے جُدا ہے۔ پس جو کامل طور پر مخدوم میں فنا ہو کر خدا سے نبی کا لقب پاتا ہے وہ ختم نبوت کا خلل انداز نہیں جیسا کہ تم جب آئینہ میں اپنی شکل دیکھو تو تم دو نہیں ہو سکتے بلکہ ایک ہی ہو اگرچہ بظاہر دو نظر آتے ہیں۔ صرف ظل اور اصل کا فرق ہے۔ سو ایسا ہی خدا نے مسیح موعود میں چاہا۔ یہی بھید ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مسیح موعود میری قبر میں دفن ہو گا۔ یعنی وہ مَیں ہی ہوں اور اس میں دورنگی نہیں آئی۔

(کشتی نوح ص ۲۲-۲۳)

اِس نکتہ کو یاد رکھو کہ مَیں رسول اور نبی نہیں ہوں یعنی باعتبار نئی شریعت اور نئے دعویٰ اور نئے نام کے۔ اور مَیں رسول اور نبی ہوں یعنی باعتبار ظلیت کاملہ کے۔ مَیں وہ آئینہ ہوں جس میں محمدی شکل اور محمدی نبوت کا **کامل انعکاس** ہے۔ اگر مَیں کوئی علیحدہ شخص نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہوتا تو خدا تعالیٰ میرا نام محمد اور احمد اور مصطفےٰ اور مجتبےٰ نہ رکھتا اور نہ خاتم الانبیاء کی طرح خاتم الاولیاء کا مجھ کو خطاب دیا جاتا بلکہ میں کسی علیحدہ نام سے آتا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ہر ایک بات میں وجودِ محمدی میں مجھے داخل کر دیا یہاں تک کہ یہ بھی نہ چاہا کہ یہ کہا جائے کہ میرا کوئی الگ نام ہو یا کوئی الگ قبر ہو کیونکہ ظلّ اپنے اصل سے الگ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ایسا کیوں کہا گیا؟ اِس میں راز یہ ہے کہ خدا تعالےٰ

جانتا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اُس نے خاتم الانبیاء ٹھہرایا ہے۔ اور پھر دونوں سلسلوں کا تقابل پورا کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ موسوی مسیح کے مقابل پر محمدی مسیح بھی شانِ نبوت کے ساتھ آوے تا اس نبوتِ عالیہ کی کسرِ شان نہ ہو۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے میرے وجود کو ایک کامل ظلیّت کے ساتھ پیدا کیا اور ظلّی طور پر نبوت محمّدی اس میں رکھ دی تا ایک معنے سے مجھ پر نبی اللہ کا لفظ صادق آوے اور دوسرے معنوں سے ختم نبوت محفوظ رہے۔

(نزول المسیح ص۳-۴ حاشیہ)

جاہل لوگوں کو بھڑکانے کے لئے کہتے ہیں کہ اس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ حالانکہ یہ اُن کا سراسر افترا ہے بلکہ جس نبوت کا دعویٰ کرنا قرآن شریف کے رُو سے منع معلوم ہوتا ہے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا گیا۔ صرف یہ دعویٰ ہے کہ ایک پہلو سے میں اُمتی ہوں اور ایک پہلو سے مَیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیض نبوت کی وجہ سے نبی ہوں۔ اور نبی سے مراد صرف اسقدر ہے کہ خدا تعالےٰ سے بکثرت شرفِ مکالمہ و مخاطبہ پاتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جیسا کہ مجدد صاحب سرہندی نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ اگرچہ اس امت کے بعض افراد مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ سے مخصوص ہیں اور قیامت تک مخصوص رہیں گے لیکن جس شخص کو بکثرت اس مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ سے مشرف کیا جائے اور بکثرت امورِ غیبیہ اس پر ظاہر کئے جائیں وہ نبی کہلاتا ہے۔

اب واضح ہو کہ احادیث نبویہ میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ایک شخص پیدا ہو گا جو عیسیٰ اور ابن مریم کہلائیگا اور نبی کے نام سے موسوم کیا جائیگا۔ یعنی اس کثرت سے مکالمہ و مخاطبہ کا شرف اس کو حاصل ہو گا۔ اور اس کثرت سے امورِ غیبیہ اُس پر ظاہر ہونگے کہ بجز نبی کے کسی پر ظاہر نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ یعنی خدا اپنے غیب پر کسی کو پوری قدرت اور غلبہ نہیں بخشتا جو کثرت اور صفائی سے حاصل ہو سکتا ہے بجز اس شخص کے جو اس کا برگزیدہ رسول ہو۔ اور یہ بات ایک ثابت شدہ امر ہے کہ جس قدر خدا تعالےٰ نے مجھ سے مکالمہ و مخاطبہ کیا ہے اور جس قدر امورِ غیبیہ مجھ پر ظاہر فرمائے ہیں تیرہ سو ۱۳۰۰ برس ہجری میں کسی شخص کو آج تک بجز میرے یہ نعمت عطا نہیں کی گئی۔ اگر کوئی منکر ہو تو بارِ ثبوت اس کی گردن پر ہے۔

غرض اس حصۂ کثیر وحیٔ الٰہی اور امورِ غیبیہ میں اس وقت سے میں ہی ایک فردِ مخصوص ہوں اور جس قدر مجھ سے پہلے اولیاو اور ابدال اور اقطاب اس امت میں گذر چکے ہیں اُن کو یہ حصہ کثیر اس نعمت کا نہیں دیا گیا۔ پس اس وجہ سے نبی کا نام پانے کے لئے مَیں ہی مخصوص کیا گیا۔ اور دوسرے تمام لوگ اس نام کے مستحق نہیں۔ کیونکہ کثرتِ وحی اور کثرتِ امورِ غیبیہ اس میں شرط ہے۔ اور وہ شرط ان میں پائی نہیں جاتی۔

(حقیقۃ الوحی ص۳۹۰-۳۹۱)

معترض صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی اور پھر اعتراض کیا ہے کہ جبکہ دین کمال کو پہنچ چکا ہے اور نعمت پوری ہو چکی تو پھر نہ کسی مجدد کی ضرورت ہے نہ کسی نبی کی۔ مگر افسوس کہ معترض نے ایسا خیال کرکے خود قرآن کریم پر اعتراض کیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے اس امت میں خلیفوں کے پیدا ہونے کا وعدہ کیا ہے۔ جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے اور فرمایا ہے کہ ان کے وقتوں میں دین استحکام پکڑے گا اور تزلزل اور تذبذب دُور ہوگا اور خوف کے بعد امن پیدا ہوگا۔ پھر اگر تکمیل دین کے بعد کوئی بھی کارروائی درست نہیں تو بقول معترض کے جو تیس سال کی خلافت ہے وہ بھی باطل ٹھہرتی ہے۔ کیونکہ جب دین کامل ہو چکا تو پھر کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔ لیکن افسوس کہ معترض بے خبر نے ناحق آیت الیوم اکملت لکم دینکم کو پیش کر دیا۔ ہم کب کہتے ہیں کہ مجدّد اور محدث دنیا میں آکر دین میں سے کچھ کم کرتے ہیں یا زیادہ کرتے ہیں بلکہ ہمارا تو یہ قول ہے کہ ایک زمانہ گذرنے کے بعد جب پاک تعلیم پر خیالات فاسدہ کا ایک غبار پڑ جاتا ہے اور حق خالص کا چہرہ چھپ جاتا ہے تب اس خوبصورت چہرہ کو دکھلانے کے لئے مجدد اور محدث اور رُوحانی خلیفے آتے ہیں۔ نہ معلوم کہ بے چارے معترض نے کہاں سے اور کس سے سُن لیا کہ مجدّد اور رُوحانی خلیفے دنیا میں آکر دین کی کچھ ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں۔ نہیں وہ دین کو منسوخ کرنے نہیں آتے بلکہ دین کی چمک اور روشنی دکھانے کو آتے ہیں اور معترض کا یہ خیال کہ ان کی ضرورت ہی کیا ہے صرف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ معترض کو اپنے دین کی پروا نہیں۔ اور کبھی اس نے غور نہیں کی کہ اسلام کیا چیز ہے اور اسلام کی ترقی کس کو کہتے ہیں۔ اور حقیقی ترقی کیونکر اور کن راہوں سے ہو سکتی ہے اور کس حالت میں کسی کو کہا جاتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر مسلمان ہے یہی وجہ ہے

کہ معترض صاحب اس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ قرآن موجود ہے اور علماء موجود ہیں اور خود بخود اکثر لوگوں کے دلوں کو اسلام کی طرف حرکت ہے پھر کسی مجدّد کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن افسوس کہ معترض کو یہ سمجھ نہیں کہ مجددوں اور رُوحانی خلیفوں کی اس امت میں ایسے ہی طور سے ضرورت ہے جیسا کہ قدیم سے انبیاء کی ضرورت پیش آتی رہی ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی مرسل تھے اور اُن کی توریت بنی اسرائیل کی تعلیم کے لئے کامل تھی اور جس طرح قرآن کریم میں یہ آیت الیوم اکملت لکم ہے اسی طرح توریت میں بھی آیات ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ایک کامل اور جلالی کتاب دی گئی ہے جس کا نام **توریت** ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی توریت کی یہی تعریف ہے۔ لیکن باوجود اس کے بعد توریت کے صدہا ایسے نبی بنی اسرائیل میں سے آئے کہ کوئی نئی کتاب ان کے ساتھ نہیں تھی بلکہ ان انبیاء کے ظہور کے مطالب یہ ہوتے تھے کہ تا اُن کے موجودہ زمانہ میں جو لوگ تعلیم توریت سے دُور پڑ گئے ہوں پھر ان کو توریت کے اصلی منشا کی طرف کھینچیں اور جن کے دلوں میں کچھ شکوک اور دہریت اور بے ایمانی ہو گئی ہو اُن کو پھر زندہ ایمان بخشیں چنانچہ اللہ جلشانہٗ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتَابَ وَقَفَّیْنَا مِنْ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ۔ یعنی موسیٰ کو ہم نے توریت دی اور پھر اس کتاب کے بعد ہم نے کئی پیغمبر بھیجے تا توریت کی تائید اور تصدیق کریں۔ اسی طرح دوسری جگہ فرماتا ہے۔ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا۔ یعنی پھر پیچھے سے ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے۔ پس ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ اپنی کتاب بھیج کر پھر اس کی تائید اور تصدیق کے لئے ضرور انبیاء کو بھیجا کرتا ہے۔ چنانچہ توریت کی تائید کے لئے ایک ایک وقت میں چار چار سو نبی بھی آیا جن کے آنے پر اب تک بائیبل بشارت دے رہی ہے۔

اس کثرت ارسال رسل میں اصل بھید یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ عہدِ مؤکد ہو چکا ہے کہ جو اس کی سچی کتاب کا انکار کرے تو اس کی سزا دائمی جہنم ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ یعنی جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی وہ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہینگے۔ اب جبکہ سزا انکار کتاب الہٰی میں ایسی سخت تھی اور دوسری طرف یہ مسئلہ نبوت اور

وحی الٰہی کا نہایت دقیق تھا بلکہ خود خدا تعالیٰ کا وجود بھی ایسا دقیق در دقیق تھا کہ جب تک انسان کی آنکھ خداداد نور سے منور نہ ہو ہرگز ممکن نہ تھا کہ سچی اور پاک معرفت اس کی حاصل ہو سکے چہ جائیکہ اس کے رسولوں کی معرفت اور اس کی کتاب کی معرفت حاصل ہو۔ اس لئے رحمانیت الٰہی نے تقاضا کیا کہ اندھی اور نابینا مخلوق کی بہت ہی مدد کی جائے اور صرف اس پر اکتفاء نہ کیا جائے کہ ایک مرتبہ رسول اور کتاب بھیجکر پھر باوجود امتداد ازمنہ طویلہ کے ان عقائد کے انکار کی وجہ سے جن کو بعد میں آنے والے زیادہ اس سے سمجھ نہیں سکتے کہ وہ ایک پاک اور عمدہ منقولات ہیں ہمیشہ کی جہنم میں منکروں کو ڈال دیا جائے۔ اور درحقیقت سوچنے والے کے لئے یہ بات نہایت صاف اور روشن ہے کہ وہ خدا جس کا نام رحمٰن اور رحیم ہے اتنی بڑی سزا دینے کے لئے کیونکر یہ قانون اختیار کر سکتا ہے کہ بغیر پورے طور پر اتمام حجت کے مختلف بلاد کے ایسے لوگوں کو جنہوں نے صدہا برسوں کے بعد قرآن اور رسول کا نام سُنا اور پھر وہ عربی سمجھ نہیں سکتے۔ قرآن کی خوبیوں کو دیکھ نہیں سکتے دائمی جہنم میں ڈال دے اور کس انسان کی کانشنس اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ بغیر اس کے کہ قرآن کریم کا منجانب اللہ ہونا اس پر ثابت کیا جائے یونہی اس پر چھری پھیر دی جائے۔ پس یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے دائمی خلیفوں کا وعدہ دیا تا وہ ظلّی طور پر انوارِ نبوت پاکر دنیا کو ملزم کریں اور قرآن کریم کی خوبیاں اور اس کی پاک برکات لوگوں کو دکھلا دیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہر ایک زمانہ کیلئے اتمام حجت بھی مختلف رنگوں سے ہُوا کرتا ہے۔ اور مجددِ وقت ان قوتوں اور ملکوں اور کمالات کے ساتھ آتا ہے جو موجودہ مفاسد کا اصلاح پانا ان کمالات پر موقوف ہوتا ہے۔ سو ہمیشہ خدا تعالیٰ اسی طرح کرتا رہیگا جب تک کہ اس کو منظور ہے کہ آثار رشد اور اصلاح کے دنیا میں باقی رہیں۔ اور یہ باتیں بے ثبوت نہیں بلکہ نظائر متواترہ اس کے شاہد ہیں اور مختلف بلاد کے نبیوں اور مرسلوں اور محدثوں کو چھوڑ کر اگر صرف بنی اسرائیل کے نبیوں اور مرسلوں اور محدثوں پر ہی نظر ڈالی جائے تو ان کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چودہ سو برس کے عرصہ میں یعنی حضرت موسیٰ سے حضرت مسیح تک ہزارہا نبی اور محدث ان میں پیدا ہوئے جو خادموں کی طرح کمربستہ ہو کر توریت کی خدمت میں مصروف رہے۔ چنانچہ ان تمام بیانات پر قرآن شاہد ہے اور بائیبل شہادت دے رہی ہے۔ اور وہ نبی کوئی نئی کتاب نہیں لاتے تھے کوئی نیا دین نہیں سکھاتے تھے صرف توریت کے خادم تھے۔ اور جب بنی اسرائیل میں دہریت

اور بے ایمانی اور بدچلنی اور سنگدلی پھیل جاتی تھی تو ایسے وقتوں میں وہ ظہور کرتے تھے۔ اب کوئی سوچنے والا سوچے کہ جس حالت میں موسیٰ کی ایک محدود شریعت کے لئے جو زمین کی تمام قوموں کے لئے نہیں تھی اور نہ قیامت تک اس کا دامن پھیلا ہوا تھا خدا تعالیٰ نے یہ احتیاطیں کیں کہ ہزارہا نبی اس شریعت کی تجدید کے لئے بھیجے اور بارہا آنے والے نبیوں نے ایسے نشان دکھلائے کہ گویا بنی اسرائیل نے نئے سرے خدا کو دیکھ لیا تو پھر یہ امت جو خیر الامم کہلاتی ہے اور خیر الرسل صلے اللہ علیہ وسلم کے دامن سے لٹک رہی ہے کیونکر ایسی بدبخت سمجھی جائے کہ خدا تعالٰے نے صرف تیس برس اس کی طرف نظر رحمت کرکے اور آسمانی انوار دکھلا کر پھر اس سے منہ پھیر لیا۔ اور پھر اس امت پر اپنے نبی کریمؐ کی مفارقت میں صدہا برس گذرے اور ہزارہا طور کے فتنے پڑے اور بڑے بڑے زلزلے آئے اور انواع و اقسام کی دجّالیت پھیلی اور ایک جہان نے دین متین پر حملے کئے اور تمام برکات اور معجزات سے انکار کیا گیا اور مقبول کو نامقبول ٹھہرایا گیا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے پھر کبھی نظر اٹھا کر اس اُمت کی طرف نہ دیکھا اور اس کو کبھی اس اُمت پر رحم نہ آیا اور کبھی اس کو یہ خیال نہ آیا کہ یہ لوگ بھی تو بنی اسرائیل کی طرح انسان ضعیف البنیان ہیں اور یہودیوں کی طرح ان کے پودے بھی آسمانی آبپاشی کے ہمیشہ محتاج ہیں۔ کیا اس کریم خدا سے ایسا ہو سکتا ہے جس نے اس نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ کے مفاسد کے دُور کرنے کے لئے بھیجا تھا کیا ہم یہ گمان کر سکتے ہیں کہ پہلی اُمتوں پر تو خدا تعالیٰ کا رحم تھا اس لئے اس نے توریت کو بھیجکر پھر ہزارہا رسول اور محدث توریت کی تائید کے لئے اور دلوں کو بار بار زندہ کرنے کے لئے بھیجے۔ لیکن یہ امت مورد غضب تھی اس لئے اس نے قرآن کریم کو نازل کرکے ان سب باتوں کو بھلا دیا اور ہمیشہ کے لئے علماء کو اُن کی عقل اور اجتہاد پر چھوڑ دیا۔ اور حضرت موسیٰ کی نسبت تو صاف فرمایا۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا یعنی خدا موسیٰ سے ہمکلام ہوا اور اس کی تائید اور تصدیق کے لئے رسول بھیجے جو مبشر اور منذر تھے تاکہ لوگوں کے لئے کوئی حجت باقی نہ رہے اور نبیوں کا مسلسل گروہ دیکھکر توریت پر دلی صدق سے ایمان لاویں۔ اور فرمایا۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ۔ یعنی ہم نے بہت سے رسول بھیجے اور بعض کا تو

ہم نے ذکر کیا اور بعض کا ذکر بھی نہیں کیا۔ لیکن دین اسلام کے طالبوں کے لئے وہ انتظام نہ کیا گویا جو رحمت اور عنایت باری حضرت موسیٰ کی قوم پر تھی وہ اس امت پر نہیں ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمیشہ امتداد زمانہ کے بعد پہلے معجزات اور کرامات قصّہ کے رنگ میں ہو جاتے ہیں اور پھر آنے والی نسلیں اپنے گروہ کو ہر یک امر خارق عادت سے بے بہرہ دیکھکر آخر گذشتہ معجزات کی نسبت شک پیدا کرتی ہیں۔ پھر جس حالت میں بنی اسرائیل کے ہزارہا انبیاء کا نمونہ آنکھوں کے سامنے ہے تو اس سے اور بھی بے دلی اس اُمت کو پیدا ہوگی اور اپنے تئیں بدقسمت پاکر بنی اسرائیل کو رشک کی نگاہ سے دیکھیں گے یا بدخیالات میں گرفتار ہو کر ان کے قصّوں کو بھی صرف افسانہ جات خیال کرینگے۔ اور یہ قول کہ پہلے اس سے ہزارہا انبیاء ہو چکے اور معجزات بھی بکثرت ہوئے اس لئے اِس امت کو خوارق اور کرامات اور برکات کی کچھ ضرورت نہیں تھی لہٰذا خدا تعالےٰ نے ان کو سب باتوں سے محروم رکھا یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں جنہیں وہ لوگ مُنہ پر لاتے ہیں جن کو ایمان کی کچھ پروا نہیں۔ ورنہ انسان نہایت ضعیف اور ہمیشہ تقویت ایمان کا محتاج ہے اور اس راہ میں اپنے خودساختہ دلائل کبھی کام نہیں آسکتے جب تک تازہ طور پر معلوم نہ ہو کہ خدا موجود ہے۔ ہاں جھوٹا ایمان جو بدکاریوں کو روک نہیں سکتا نقلی اور عقلی طور پر قائم رہ سکتا ہے۔ اور اسجگہ یہ بھی یاد رہے کہ دین کی تکمیل اس بات کو مستلزم نہیں جو اس کی مناسب حفاظت سے بکلّی دست بردار ہو جائے۔ مثلاً اگر کوئی گھر بنا دے اور اس کے تمام کمرے سلیقے سے تیار کرے اور اس کی تمام ضرورتیں جو عمارت کے متعلق ہیں باحسن وجہ پوری کر دیوے اور پھر مدت کے بعد اندھیریاں چلیں اور بارشیں ہوں اور اس گھر کے نقش و نگار پر گرد و غبار بیٹھ جاوے اور اُسکی خوبصورتی چھپ جاوے اور پھر اس کا کوئی وارث اس گھر کو صاف اور سفید کرنا چاہے۔ مگر اس کو منع کر دیا جاوے کہ گھر تو مکمل ہو چکا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ منع کرنا سراسر حماقت ہے افسوس کہ ایسے اعتراضات کرنے والے نہیں سوچتے کہ تکمیل شئے دیگر ہے اور وقتاً فوقتاً ایک مکمل عمارت کی صفائی کرنا یہ اَور بات ہے۔ یہ یاد رہے کہ مجدد لوگ دین میں کچھ کمی بیشی نہیں کرتے۔ ہاں گمشدہ دین کو پھر دلوں میں قائم کرتے ہیں۔ اور یہ کہنا کہ مجدّدوں پر ایمان لانا کچھ فرض نہیں خدا تعالیٰ کے حکم سے انحراف ہے۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے۔ وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذَالِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ یعنی بعد اس کے جو خلیفے بھیجے جائیں پھر جو شخص اُن کا منکر رہے وہ فاسقوں میں سے ہے۔

اب خلاصہ اس تمام تقریر کا کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم ذیل میں لکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ دلائل مندرجہ ذیل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امت میں فساد اور فتنوں کے وقتوں میں ایسے مصلح آتے رہیں جنکو انبیاء کے کئی کاموں میں سے یہ ایک کام سپرد ہو کہ وہ دین حق کی طرف دعوت کریں اور ہریک بدعت جو دین سے مل گئی ہو۔ اُس کو دُور کریں۔ اور آسمانی روشنی پاکر دین کی صداقت ہریک پہلو سے لوگوں کو دکھلاویں اور اپنے پاک نمونہ سے لوگوں کو سچائی اور محبت اور پاکیزگی کی طرف کھینچیں اور وہ دلائل یہ ہیں:-

اوّل یہ کہ اس بات کو عقل ضروری تجویز کرتی ہے کہ چونکہ الٰہیات اور امور معاد کے مسائل نہایت باریک اور نظری ہیں گویا تمام امور غیر مرئی اور فوق العقل پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ نہ خدا تعالےٰ کبھی کسی کو نظر آیا۔ نہ کبھی کسی نے بہشت دیکھی اور نہ دوزخ کا ملاحظہ کیا اور نہ ملائک سے ملاقات ہوئی۔ اور علاوہ اس کے احکامِ الٰہی مخالف جذباتِ نفس ہیں اور نفس امّارہ جن باتوں میں لذّت پاتا ہے احکام الٰہی ان سے منع کرتے ہیں لہذا عند العقل یہ بات نہ صرف احسن بلکہ واجب ہے کہ خدا تعالےٰ کے پاک نبی جو شریعت اور کتاب لے کر آتے ہیں اور اپنے نفس میں تاثیر اور قوت قدسیہ رکھتے ہیں یا تو وہ ایک لمبی عمر لیکر آویں اور ہمیشہ اور ہر صدی میں ہریک اپنی نئی امت کو اپنی ملاقات اور صحبت سے شرف بخشیں اور اپنے زیر سایہ رکھ کر اور اپنے پُرفیض پَروں کے نیچے ان کو لے کر وہ برکت اور نور اور روحانی معرفت پہنچاویں جو انہوں نے ابتدائے زمانہ میں پہنچائی تھی۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر اُن کے وارث جو انہیں کے کمالات اپنے اندر رکھتے ہوں۔ اور کتاب الٰہی کے دقائق اور معارف کو وحی اور الہام سے بیان کر سکتے ہیں اور منقولات کو مشہودات کے پیرایہ میں دکھلا سکتے ہوں اور طالب حق کو یقین تک پہنچا سکتے ہوں ہمیشہ فتنہ اور فساد کے وقتوں میں ضرور پیدا ہونے چاہئیں تا انسان جو مغلوب شبہات و نسیان ہے اُن کے فیض حقیقی سے محروم نہ رہے کیونکہ یہ بات نہایت صاف اور بدیہی ہے کہ جب زمانہ ایک نبی کا اپنے خاتمہ کو پہنچتا ہے اور اس کی برکات کے دیکھنے والے فوت ہو جاتے ہیں تو وہ تمام مشہودات منقولات کے رنگ میں آجاتے ہیں۔ پھر دوسری صدی کے لوگوں کی نظر میں اس نبی کے اخلاق اور اس نبی کی عبادات اور اس نبی کا صبر اور استقامت اور صدق اور صفا اور وفا اور تمام تائیدات الٰہیہ اور خوارق اور معجزات جن سے اس کی صحتِ نبوت اور صداقت دعویٰ پر استدلال ہوتے تھے نئی صدی کے لوگوں کو کچھ قصّے سے معلوم ہوتے ہیں اور اس وجہ سے وہ انشراح ایمانی اور جوش اطاعت جو نبی کے

دیکھنے والوں میں ہوتا ہے دوسروں میں وہ بات پائی نہیں جاتی۔ اور صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ صحابہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایمانی صدق دکھلایا اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور اپنی آبروؤں کو اسلام کی راہوں میں نہایت اخلاص سے قربان کیا اس کا نمونہ اور صدیوں میں تو کُجا خود دوسری صدی کے لوگوں یعنی تابعین میں بھی نہیں پایا گیا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ یہی تو تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس مرد صادق کا منہ دیکھا تھا جس کے عاشق اللہ ہونے کی گواہی کفارِ قریش کے مُنہ سے بھی بے ساختہ نکل گئی۔ اور روز کی مناجاتوں اور پیار کے سجدوں کو دیکھ کر اور فنا فی الاطاعت کی حالت اور کمال محبت اور دلدادگی کی منہ پر روشن نشانیاں اور اس پاک منہ پر نورالٰہی برستا مشاہدہ کرکے کہتے تھے عَشِقَ مُحَمَّدٌ عَلٰی رَبِّہٖ۔ کہ محمدؐ اپنے رب پر عاشق ہو گیا ہے۔ اور پھر صحابہ نے صرف وہ صدق اور محبت اور اخلاص ہی نہیں دیکھا بلکہ اس پیار کے مقابل پر جو ہمارے سیّد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے ایک دریا کی طرح جوش مارتا تھا خدا تعالیٰ کے پیار کو بھی تائیدات خارق عادت کے رنگ میں مشاہدہ کیا۔ تب ان کو پتہ لگ گیا کہ خدا ہے اور اُن کے دل بول اُٹھے کہ وہ خدا اس مرد کے ساتھ ہے۔ انہوں نے اس قدر عجائبات الٰہیہ دیکھے اور اس قدر نشان آسمانی مشاہدہ کئے کہ ان کو کچھ بھی اس بات میں شک نہ رہا کہ فی الحقیقت ایک اعلیٰ ذات موجود ہے جس کا نام خدا ہے اور جس کے قبضۂ قدرت میں ہر یک امر ہے اور جس کے آگے کوئی بات بھی انہونی نہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے وہ کام صدق و صفا کے دکھلائے اور وہ جانفشانیاں کیں کہ انسان کبھی کر نہیں سکتا جب تک اس کے تمام شک و شبہ دُور نہ ہو جائیں اور انہوں نے بچشم خود دیکھ لیا کہ وہ ذات پاک اسی میں راضی ہے کہ انسان اسلام میں داخل ہو اور اس کے رسول کریم کی بدل و جان متابعت اختیار کرے تب اس حق الیقین کے بعد جو کچھ انہوں نے متابعت دکھلائی اور جو کچھ انہوں نے متابعت کے جوش سے کام کئے اور جس طرح پر اپنی جانوں کو اپنے برگزیدہ ہادی کے آگے پھینک دیا یہ وہ باتیں ہیں کہ کبھی ممکن ہی نہیں کہ انسان کو حاصل ہو سکیں جب تک کہ وہی بہار اس کی نظر کے سامنے نہ ہو جو صحابہ پر آئی تھی اور جبکہ ان کمالات کو پیدا کرنا بغیر وجود ان وسائل کے محالات میں سے ہے اور نجات کا یقینی طور پر حاصل ہونا بھی بغیر ذریعہ ان کمالات کے از قبیل محال تو ضروری ہوا کہ وہ خداوند کریم جس نے ہر ایک کو نجات کے لئے بلایا ہے ایسا ہی انتظام ہر یک صدی

کے لئے رکھے تا اس کے بندے کسی زمانہ میں حق الیقین کے مراتب سے محروم نہ رہیں۔

اور یہ کہنا کہ ہمارے لئے قرآن اور احادیث کافی ہیں اور صحبت صادقین کی ضرورت نہیں یہ خود مخالفت تعلیم قرآن ہے۔ کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ۔ اور صادق وہ ہیں جنہوں نے صدق کو علیٰ وجہ البصیرت شناخت کیا اور پھر اس پر دل وجان سے قائم ہو گئے۔ اور یہ اعلیٰ درجہ بصیرت کا بجز اس کے ممکن نہیں کہ سماوی تائید شامل حال ہو کر اعلیٰ مرتبہ حق الیقین تک پہنچا دیوے۔ پس ان معنوں کر کے صادق حقیقی انبیاء اور رسل اور محدّث اور اولیاء کاملین مکملین ہیں جن پر آسمانی روشنی پڑی اور جنہوں نے خدا تعالیٰ کو اسی جہان میں یقین کی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور آیت موصوفہ بالا بطور اشارات ظاہر کر رہی ہے کہ دنیا صادقوں کے وجود سے کبھی خالی نہیں ہوتی کیونکہ دوام حکم کونوا مع الصادقین دوام وجود صادقین کو مستلزم ہے۔

علاوہ اس کے مشاہدہ صاف بتلا رہا ہے کہ جو لوگ صادقوں کی صحبت سے لاپروا ہو کر عمر گذارتے ہیں اُن کے علوم وفنون جسمانی جذبات سے ان کو ہرگز صاف نہیں کر سکتے اور کم سے کم اتنا ہی مرتبہ اسلام کا کہ دلی یقین اس بات پر ہو کہ خدا ہے ان کو ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جس طرح وہ اپنی اس دولت پر یقین رکھتے ہیں جو اُن کے صندوقوں میں بند ہو یا اپنے اُن مکانات پر جو اُن کے قبضہ میں ہوں ہرگز ان کو ایسا یقین خدا تعالیٰ پر نہیں ہوتا وہ سم الفار کھانے سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ وہ ایک زہر مہلک ہے لیکن گناہوں کی زہر سے نہیں ڈرتے۔ حالانکہ ہر روز قرآن میں پڑھتے ہیں اِنَّهٗ مَنْ يَّأْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰي۔ پس سچ تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتا وہ قرآن کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ ہاں یہ بات بھی درست ہے کہ قرآن ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے مگر قرآن کی ہدایتیں اس شخص کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں جس پر قرآن نازل ہوا۔ یا وہ شخص جو منجانب اللہ اس کا قائم مقام ٹھہرایا گیا۔ اگر قرآن اکیلا ہی کافی ہوتا تو خدا تعالیٰ قادر تھا کہ قدرتی طور پر درختوں کے پتّوں پر قرآن لکھا جاتا یا لکھا لکھایا آسمان سے نازل ہو جاتا۔ مگر خدا تعالےٰ نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ قرآن کو دنیا میں نہیں بھیجا جبتک معلّم القرآن دنیا میں نہیں بھیجا گیا۔ قرآن کریم کو کھول کر دیکھو کتنے مقام میں اس مضمون کی آیتیں ہیں کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ یعنی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور قرآنی حکمت لوگوں کو سکھلاتا ہے

اور پھر ایک جگہ اور فرماتا ہے۔ لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ ۔ یعنی قرآن کے حقائق و دقائق اُنہی پر کھلتے ہیں جو پاک کئے گئے ہیں۔ پس ان آیات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کے لئے ایک ایسے معلّم کی ضرورت ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پاک کیا ہو۔ اگر قرآن کے سیکھنے کے لئے معلّم کی حاجت نہ ہوتی تو ابتداء زمانہ میں بھی نہ ہوتی۔ اور یہ کہنا کہ ابتداء میں تو حل مشکلات قرآن کے لئے ایک معلّم کی ضرورت تھی لیکن جب حل ہوگئیں تو اب کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حل شدہ بھی ایک مدت کے بعد پھر قابل حل ہو جاتی ہیں۔ ماسوا اس کے امت کو ہر ایک زمانہ میں نئی مشکلات بھی تو پیش آتی ہیں اور قرآن جامع جمیع علوم تو ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی زمانہ میں اس کے تمام علوم ظاہر ہو جائیں بلکہ جیسی جیسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ویسے ویسے قرآنی علوم کھلتے ہیں اور ہر ایک زمانہ کی مشکلات کے مناسب حال ان مشکلات کو حل کرنے والے روحانی معلّم بھیجے جاتے ہیں جو وارث رسل ہوتے ہیں اور ظلّی طور پر رسولوں کے کمالات کو پاتے ہیں اور جس مجدد کی کارروائیاں کسی ایک رسول کی منصبی کارروائیوں سے شدید مشابہت رکھتی ہیں وہ عنداللہ اُسی رسول کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اب نئے معلّموں کی اس وجہ سے بھی ضرورت پڑتی ہے کہ بعض حصّے تعلیم قرآن شریف کے ازقبیل حال ہیں نہ ازقبیل قال۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جو پہلے معلّم اور اصل وارث اس تخت کے ہیں حالی طور پر ان دقائق کو اپنے صحابہ کو سمجھایا ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ کا یہ کہنا کہ مَیں عالم الغیب ہوں اور مَیں مجیب الدعوات ہوں اور مَیں قادر ہوں اور مَیں دعاؤں کو قبول کرتا ہوں اور طالبوں کو حقیقی روشنی تک پہنچاتا ہوں اور مَیں اپنے صادق بندوں کو الہام دیتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اپنے بندوں میں سے اپنی رُوح ڈالتا ہوں۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں کہ جب تک معلّم خود ان کا نمونہ بن کر نہ دکھلاوے تب تک یہ کسی طرح سمجھ ہی نہیں آسکتیں۔ پس ظاہر ہے کہ صرف ظاہری علماء خود اندھے ہیں ان تعلیمات کو سمجھا نہیں سکتے بلکہ وہ تو اپنے شاگردوں کو ہر وقت اسلام کی عظمت سے بدظن کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ باتیں آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گئی ہیں اور اُن کے ایسے بیانات سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گویا اسلام اب زندہ مذہب نہیں اور اس کی حقیقی تعلیم پانے کے لئے اب کوئی بھی راہ نہیں لیکن ظاہر ہے کہ اگر خدا تعالےٰ کا اپنی مخلوق کے لئے یہ ارادہ ہے کہ وہ ہمیشہ قرآن کریم سے چشمہ سے اُنکو

پانی پلا دے تو بے شک وہ اپنے ان قوانین قدیمہ کی رعایت کرے گا جو قدیم سے کرتا آیا ہے۔ اور اگر قرآن کی تعلیم صرف اسی حد تک محدود ہے جس حد تک ایک تجربہ کار اور لطیف الفکر فلاسفر کی تعلیم محدود ہو سکتی ہے اور آسمانی تعلیم جو محض حال کے نمونہ سے سمجھائی جاتی ہے اس میں نہیں تو پھر نعوذ باللہ قرآن کا آنا لاحاصل ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اگر کوئی ایک دم کے واسطے بھی اس مسئلہ میں فکر کرے کہ انبیاء کی تعلیم اور حکیموں کی تعلیم میں بصورت فرض کرنے صحت ہر دو تعلیم کے مابہ الامتیاز کیا ہے تو بجز اس کے اور کوئی مابہ الامتیاز قرار نہیں دے سکتا کہ انبیاء کی تعلیم کا بہت سا حصّہ فوق العقل ہے جو بجز حالی تفہیم اور تعلیم کے اور کسی راہ سے سمجھ ہی نہیں آسکتا۔ اور اس حصہ کو وہی لوگ دلنشین کرا سکتے ہیں جو صاحب حال ہوں .... اگر اللہ جلّ شانہٗ نے اپنے بندوں کے لئے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ اس کی کتاب کا یہ حصّہ تعلیم ابتدائی زمانہ تک محدود نہ رہے تو بے شک اس نے یہ بھی انتظام کیا ہو گا کہ اس حصّہ تعلیم کے معلّم بھی ہمیشہ آتے رہیں کیونکہ حصّہ حالی تعلیم کا بغیر توسط اُن معلّموں کے جو مرتبۂ حال پر پہنچ گئے ہوں ہرگز سمجھ نہیں آسکتا۔ اور دنیا ذری ذری بات پر ٹھوکریں کھاتی ہے۔ پس اگر اسلام میں بعد آنحضرت صلعم ایسے معلّم نہیں آئے جن میں ظلی طور پر نورِ نبوت تھا تو گویا خدا تعالےٰ نے عمداً قرآن کو ضائع کیا کہ اس کے حقیقی اور واقعی طور پر سمجھنے والے بہت جلد دنیا سے اُٹھا لئے۔ مگر یہ بات اس کے وعدہ کے برخلاف ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ یعنی ہم نے ہی قرآن اتارا۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ اب میں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر قرآن کے سمجھنے والے ہی باقی نہ رہے اور اس پر یقینی اور حالی طور پر ایمان لانے والے زاویہ عدم میں مختفی ہو گئے تو پھر قرآن کی حفاظت کیا ہوئی؟ کیا حفاظت سے یہ حفاظت مراد ہے کہ قرآن بہت سے خوشخط نسخوں میں تحریر ہو کر قیامت تک صندوقوں میں بند رہیگا جیسے بعض مدفون خزانے گو کسی کے کام نہیں آتے مگر زمین کے نیچے محفوظ پڑے رہتے ہیں کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اس آیت سے خدا تعالیٰ کا یہی منشا ہے اگر یہی منشا ہے تو ایسی حفاظت کوئی کمال کی بات نہیں بلکہ یہ تو ہنسی کی بات ہے اور ایسی حفاظت کا منہ پر لانا دشمنوں سے ٹھٹھا کرانا ہے کیونکہ جبکہ علّت غائی مفقود ہو تو ظاہری حفاظت سے کیا فائدہ۔ ممکن ہے کہ کسی گڑھے میں کوئی نسخہ انجیل یا توریت کا بھی ایسا ہی محفوظ پڑا ہو اور دنیا میں تو ہزارہا کتابیں اس قسم کی پائی جاتی ہیں کہ جو یقینی طور پر بغیر کسی کمی بیشی کے کسی مؤلف کی تالیف سمجھی گئی ہیں تو اس میں کمال کیا ہوا۔ اور اُمت کو خصوصیت کے ساتھ فائدہ کیا پہنچا؟

گو اس سے انکار نہیں کہ قرآن کی حفاظت ظاہری بھی دنیا کی تمام کتابوں سے بڑھکر ہے اور خارق عادت بھی لیکن خدا تعالےٰ جس کی روحانی امور پر نظر ہے ہرگز اس کی ذات کی نسبت یہ گمان نہیں کر سکتے کہ اتنی حفاظت سے مراد صرف الفاظ اور حروف کا محفوظ رکھنا ہی مراد لیا ہے حالانکہ ذکر کا لفظ بھی صریح گواہی دے رہا ہے کہ قرآن بحیثیت ذکر ہونے کے قیامت تک محفوظ رہیگا اور اس کے حقیقی ذاکر ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے اور اس پر ایک اور آیت بھی بیّن قرینہ ہے اور وہ یہ ہے۔ بَلْ هُوَ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی قرآن آیات بیّنات ہیں جو اہلِ علم کے سینوں میں ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہی معنے ہیں کہ مومنوں کو قرآن کریم کا علم اور نیز اُس پر عمل عطا کیا گیا ہے اور جبکہ قرآن کی جگہ مومنوں کے سینے ٹھہرے تو پھر ہمیشہ یہ آیت کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ بجز اس کے اور کیا معنے رکھتی ہے کہ قرآن سینوں سے محو نہیں کیا جائیگا ....

دوم جس طرح پر کہ عقل اس بات کو واجب اور متحتم ٹھہراتی ہے کہ کُتب الٰہی کی دائمی تعلیم اور تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ ہمیشہ انبیاء کی طرح وقتاً فوقتاً ملہم اور مکلّم اور صاحب علم لدنّی پیدا ہوتے رہیں۔ اسی طرح جب قرآن پر نظر ڈالتے ہیں اور غور کی نگہ سے اس کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی باٰواز بلند یہی فرما رہا ہے کہ رُوحانی معلّموں کا ہمیشہ کے لئے ہونا اس کے ارادۂ قدیم میں مقرر ہو چکا ہے۔ دیکھو اللہ جلّ شانہ فرماتا ہے۔ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ الجزو ۱۳ یعنی جو چیز انسانوں کو نفع پہنچاتی ہے وہ زمین پر باقی رہتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ دنیا میں زیادہ تر انسانوں کو نفع پہنچانے والے گروہ انبیاء ہیں کہ جو خوارق سے معجزات سے پیشگوئیوں سے حقائق سے معارف سے اپنی راستبازی کے نمونہ سے انسانوں کے ایمان کو قوی کرتے ہیں اور حق کے طالبوں کو دینی نفع پہنچاتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دنیا میں کچھ بہت مدت تک نہیں رہتے بلکہ تھوڑی سی زندگی بسر کر کے اِس عالم سے اُٹھائے جاتے ہیں لیکن آیت کے مضمون میں خلاف نہیں اور ممکن نہیں کہ خدا تعالیٰ کا کلام خلاف واقعہ ہو۔ پس انبیاء کی طرف نسبت دیکر معنے آیت کے یوں ہونگے کہ انبیاء من حیث الظل باقی رکھے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ ظلّی طور پر ہر یک ضرورت کے وقت میں کسی اپنے بندہ کو ان کی نظیر اور مثیل پیدا کر دیتا ہے جو انہی کے رنگ میں ہو کر اُن کی دائمی زندگی کا موجب ہو جاتا ہے اور اسی ظلّی وجود قائم رکھنے کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ دُعا سکھائی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ....

...... اور نہ صرف دعا کے لئے حکم کیا بلکہ ایک آیت میں وعدہ بھی فرمایا ہے اور وہ یہ ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری راہ میں جو صراط مستقیم ہے مجاہدہ کرینگے تو ہم اُن کو اپنی راہیں بتلا دینگے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ کی راہیں وہی ہیں جو انبیاء کو دکھلائی گئی تھیں۔

پھر بعض اور آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ضرور خداوند کریم نے یہی ارادہ فرمایا ہے کہ روحانی معلّم جو انبیاء کے وارث ہیں ہمیشہ ہوتے رہیں۔ اور وہ یہ ہیں :- وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ - وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ الجزو نمبر ۱۳ - وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ....

اِن آیات کو اگر کوئی شخص تأمل اور غور کی نظر سے دیکھے تو مَیں کیونکر کہوں کہ وہ اس بات کو سمجھ نہ جائے کہ خدا تعالےٰ اس اُمت کے لئے خلافت دائمی کا صاف وعدہ فرماتا ہے۔ اگر خلافت دائمی نہیں تھی تو شریعت موسوی کے خلیفوں سے تشبیہ دینا کیا معنے رکھتا تھا؟......

خلیفہ درحقیقت رسول کا ظلّ ہوتا ہے۔ اور چونکہ کسی انسان کے لئے دائمی طور پر بقا نہیں لہٰذا خدا تعالےٰ نے ارادہ کیا کہ رسولوں کے وجود کو جو تمام دنیا کے وجودوں سے اشرف و اولیٰ ہیں ظلّی طور پر ہمیشہ کے لئے تا قیامت قائم رکھے۔ سو اسی غرض سے خدا تعالےٰ نے خلافت کو تجویز کیا تا دنیا کبھی اور کسی زمانہ میں برکاتِ رسالت سے محروم نہ رہے۔ پس جو شخص خلافت کو صرف تیس برس تک مانتا ہے وہ اپنی نادانی سے خلافت کی علّت غائی کو نظر انداز کرتا ہے ۳۰ اور نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ کا یہ ارادہ تو ہرگز نہیں تھا کہ رسول کریم کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک رسالت کی برکتوں کو خلیفوں کے لباس میں قائم رکھنا ضروری ہے۔ پھر بعد اس کے دنیا تباہ ہو جائے تو ہو جائے کچھ پروا نہیں ....

اب یاد رہے کہ اگرچہ قرآن کریم میں اِس قسم کی بہت سی آیتیں ایسی ہیں جو اس اُمت میں خلافت دائمی کی بشارت دیتی ہیں اور احادیث بھی اس بارہ میں بہت سی بھری پڑی ہیں لیکن بالفعل اس قدر لکھنا ان لوگوں کے لئے کافی ہے جو حقائق ثابت شدہ کو دولتِ عظمیٰ سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں اور اسلام کی نسبت اس سے بڑھ کر اور کوئی بد اندیشی نہیں کہ اسکو مُردہ مذہب

خیال کیا جائے اور اس کی برکات کو صرف قرن اوّل تک محدود رکھا جاوے۔ کیا وہ کتاب جو ہمیشہ کی سعادتوں کا دروازہ کھولتی ہے وہ ایسی پست ہمتی کا سبق دیتی ہے کہ کوئی برکت اور خلافت آگے نہیں بلکہ سب کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ نبی تو اس اُمت میں آنے کو رہے۔ اب اگر خلفائے نبی بھی نہ آویں اور وقتاً فوقتاً رُوحانی زندگی کے کرشمے نہ دکھلاویں تو پھر اسلام کی روحانیت کا خاتمہ ہے ....

درحقیقت فقط ایسے سوال سے ہی کہ کیا اسلام اب ہمیشہ کے لئے ایک مذہب مُردہ ہے جس میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوتے جن کی کرامات معجزات کے قائم مقام اور جن کے الہامات وحی کے قائم مقام ہوں بدن کانپ اٹھتا ہے چہ جائیکہ کسی مسلمان کا نعوذ باللہ ایسا عقیدہ بھی ہو۔ خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت کرے جو ان ملحدانہ خیالات میں اسیر ہیں۔

(شہادت القرآن ص ۴۳-۶۰)

حضرت مسیح ناصری علیہ السلام
اور
نزولِ مسیح

مَیں حضرت مسیح علیہ السلام کو فوت شدہ اور داخل موتیٰ ایماناً ویقیناً جانتا ہوں اور ان کے مرجانے پر یقین رکھتا ہوں اور کیوں یقین نہ رکھوں جبکہ میرا مولیٰ میرا آقا اپنی کتاب عزیز اور قرآن کریم میں ان کو متوفیوں کی جماعت میں داخل کرچکا ہے اور سارے قرآن میں ایک دفعہ بھی اُن کی خارق عادت زندگی اور اُن کے دوبارہ آنے کا ذکر نہیں بلکہ ان کو صرف فوت شدہ کہہ کر پھر چپ ہو گیا۔ لہذا ان کا زندہ بجسدہٖ العنصری ہونا اور پھر دوبارہ کسی وقت دنیا میں آنا نہ صرف اپنے ہی الہام کی رو سے خلاف واقعہ سمجھتا ہوں بلکہ اس خیال حیاتِ مسیح کو نصوصِ بیّنہ قطعیہ یقینیہ قرآن کریم کی رو سے لغو اور باطل جانتا ہوں۔

(آسمانی فیصلہ صہ ۵)

واضح ہو کہ اکثر مسلمانوں اور عیسائیوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ چلے گئے ہیں اور یہ دونوں فرقے ایک مدت سے یہی گمان کرتے چلے آئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب تک آسمان پر زندہ موجود ہیں اور کسی وقت آخری زمانہ میں پھر زمین پر نازل ہونگے اور ان دونوں فریق یعنی اہل اسلام اور مسیحیوں کے بیان میں فرق صرف اتنا ہے کہ عیسائی تو اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صلیب پر جان دی اور پھر زندہ ہو کر آسمان پر مع جسم عنصری چڑھ گئے اور اپنے باپ کے دائیں ہاتھ جا بیٹھے اور پھر آخری زمانہ میں دنیا کی عدالت کے لئے زمین پر آئینگے اور کہتے ہیں کہ دنیا کا خدا اور خالق اور مالک وہی یسوع مسیح ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں وہی ہے جو دنیا کے اخیر میں سزا جزا دینے کے لئے جلالی طور پر نازل ہو گا۔ تب ہر ایک آدمی جس نے اس کو یا اسکی ماں کو بھی خدا کر کے نہیں مانا پکڑا جائیگا اور جہنم میں ڈالا جائیگا جہاں رونا اور دانت پیسنا ہو گا۔ مگر مسلمانوں کے مذکورہ بالا فرقے کہتے ہیں کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے

اور نہ صلیب پر مرے بلکہ اس وقت جبکہ یہودیوں نے ان کو مصلوب کرنے کیلئے گرفتار کیا خدا کا فرشتہ ان کو مع جسم عنصری آسمان پر لے گیا اور اب تک آسمان پر زندہ موجود ہیں اور مقام اُن کا دوسرا آسمان ہے جہاں حضرت یحیٰ نبی یعنی یوحنا ہیں۔ اور نیز مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بزرگ نبی ہے مگر نہ خدا ہے اور نہ خدا کا بیٹا۔ اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ آخری زمانہ میں دو فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے دمشق کے منارہ کے قریب یا کسی اَور جگہ اُتریں گے اور امام محمد مہدی کے ساتھ مل کر جو پہلے سے بنی فاطمہ میں سے دنیا میں آیا ہُوا ہوگا دنیا کی تمام غیر قوموں کو قتل کر ڈالینگے اور بجز ایسے شخص کے جو بلا توقف مسلمان ہو جائے اَور کسی اور زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ غرض مسلمانوں کا وہ فرقہ جو اپنے تئیں اہل سنت یا اہل حدیث کہتے ہیں جن کو عوام وہابی کے نام سے پکارتے ہیں حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے دوبارہ زمین پر نازل ہونے سے اصل مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ تا وہ ہندوؤں کے مہادیو کی طرح تمام دنیا کو فنا کر ڈالیں۔ اوّل یہ دھمکی دیں کہ مسلمان ہو جائیں اور اگر پھر بھی لوگ کفر پر قائم رہیں تو سب کو تہ تیغ کر دیں........... بالخصوص عیسائیوں کی نسبت بڑے زور سے فرقہ مذکورہ کے عالم یہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اُتریں گے تو وہ دنیا کی تمام صلیبوں کو توڑ دیں گے اور تلوار کے ساتھ سخت بے رحمی کی کاروائیاں کرینگے اور دنیا کو خون میں غرق کر دینگے .... اور گو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بجائے خود ایک مہدی ہیں بلکہ بڑے مہدی وہی ہیں لیکن اس سبب سے کہ خلیفۂ وقت قریش میں سے ہونا چاہیئے اس لئے حضرت عیسےٰ علیہ السلام خلیفۂ وقت نہیں ہونگے بلکہ خلیفۂ وقت وہی محمد مہدی ہوگا۔ اور کہتے ہیں کہ یہ دونوں مل کر زمین کو انسانوں کے خون سے بھر دیں گے اور اسقدر خونریزی کرینگے جس کی نظیر ابتدائے دنیا سے اخیر تک کسی جگہ نہیں پائی جائیگی۔ اور آتے ہی خون ریزی ہی شروع کر دیں گے اور کوئی وعظ وغیرہ نہیں کرینگے اور نہ کوئی نشان دکھائیں گے۔ اور کہتے ہیں کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امام محمد مہدی کے لئے بطور مشیر یا وزیر کے ہونگے اور عنانِ حکومت صرف مہدی کے ہاتھ میں ہوگی لیکن حضرت مسیح تمام دنیا کے قتل کرنے کے لئے حضرت امام محمد مہدی کو ہر وقت اکسائیں گے اور تیز مشورے دیتے رہینگے گویا اس اخلاقی زمانہ کی کسر نکالیں گے جبکہ آپ نے یہ تعلیم دی تھی کہ "کسی شر کا مقابلہ مت کرو اور ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری گال بھی پھیر دو"۔

(مسیح ہندوستان میں صـ ۳-۵)

میرا اور میری جماعت کا عقیدہ مہدی کی نسبت

مہدی اور مسیح موعود کے بارے میں جو میرا عقیدہ اور میری جماعت کا عقیدہ ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کی تمام حدیثیں جو مہدی کے آنے کے بارے میں ہیں ہرگز قابل وثوق اور قابل اعتبار نہیں ہیں۔ میرے نزدیک اُن پر تین قسم کا جرح ہوتا ہے یا یوں کہو کہ وہ تین قسم سے باہر نہیں۔

(۱) اوّل وہ حدیثیں کہ موضوع اور غیر صحیح اور غلط ہیں۔ اور اُن کے راوی خیانت اور کذب سے متہم ہیں اور کوئی دیندار مسلمان اُن پر اعتماد نہیں پکڑ سکتا۔

(۲) دوسری وہ حدیثیں ہیں جو ضعیف اور مجروح ہیں اور باہم تناقض اور اختلاف کی وجہ سے پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ اور حدیث کے نامی اماموں نے یا تو ان کا قطعاً ذکر ہی نہیں کیا اور یا جرح اور بے اعتباری کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے اور توثیق روایت نہیں کی۔ یعنی راویوں کے صدق اور دیانت پر شہادت نہیں دی۔

(۳) تیسری وہ حدیثیں ہیں جو درحقیقت صحیح تو ہیں اور طرق متعددہ سے ان کی صحّت کا پتہ ملتا ہے۔ لیکن یا تو وہ کسی پہلے زمانہ میں پوری ہو چکی ہیں اور مدّت ہوئی کہ اُن لڑائیوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اب کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں اور یا یہ بات ہے کہ اُن میں ظاہری خلافت اور ظاہری لڑائیوں کا کچھ بھی ذکر نہیں صرف ایک مہدی یعنی ہدایت یافتہ انسان کے آنے کی خوشخبری دی گئی ہے اور اشارات سے بلکہ صاف لفظوں میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کی ظاہری بادشاہت اور خلافت نہیں ہوگی اور نہ وہ لڑے گا اور نہ خون ریزی کریگا اور نہ اس کی کوئی فوج ہوگی اور روحانیت اور دلی توجہ کے زور سے دلوں میں دوبارہ ایمان قائم کردیگا۔ جیسا کہ حدیث لا مھدی الّا عیسٰی جو ابن ماجہ کی کتاب میں جو اسی نام سے مشہور ہے اور حاکم کی کتاب مستدرک میں انس بن مالک سے روایت کی گئی ہے۔ اور یہ روایت محمد بن خالد جُندی نے ابان بن صالح سے اور ابان بن صالح نے حسن بصری سے اور حسن بصری نے انس بن مالک سے اور انس بن مالک نے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔ اور اس حدیث کے معنے یہ ہیں کہ بجز اس شخص کے جو عیسٰی کی خو اور طبیعت پر آئیگا اور کوئی بھی مہدی نہیں آئیگا۔ یعنی وہی مسیح موعود ہوگا اور وہی مہدی ہوگا جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی خُو اور طبیعت اور طریق تعلیم

پر آئیگا۔ یعنی بدی کا مقابلہ نہ کرے گا اور نہ لڑے گا اور پاک نمونہ اور آسمانی نشانوں سے ہدایت کو پھیلائیگا۔ اور اسی حدیث کی تائید میں وہ حدیث ہے جو امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری میں لکھی ہے جس کے لفظ یہ ہیں کہ یضع الحرب یعنی وہ مہدی جس کا دوسرا نام مسیح موعود ہے دینی لڑائیوں کو قطعاً موقوف کر دیگا اور اس کی یہ ہدایت ہوگی کہ دین کے لئے لڑائی مت کرو بلکہ دین کو بذریعہ سچائی کے نوروں اور اخلاقی معجزات اور خدا کے قرب کے نشانوں سے پھیلاؤ سو میں سچ سچ کہتا ہوں کہ جو شخص اس وقت دین کے لئے لڑائی کرتا ہے یا کسی لڑنے والے کی تائید کرتا ہے یا ظاہر یا پوشیدہ طور پر ایسا مشورہ دیتا ہے یا دل میں ایسی آرزوئیں رکھتا ہے وہ خدا اور رسول کا نافرمان ہے۔ اُن کی وصیتوں اور حدود اور فرائض سے باہر چلا گیا ہے۔

اور میں اس وقت اپنی محسن گورنمنٹ کو اطلاع دیتا ہوں کہ وہ مسیح موعود خدا سے ہدایت یافتہ اور مسیح علیہ السلام کے اخلاق پر چلنے والا میں ہی ہوں۔ ہر ایک کو چاہیئے کہ ان اخلاق میں مجھے آزماوے اور خراب ظن اپنے دل سے دُور کرے۔ میری بیس برس کی تعلیم جو براہین احمدیہ سے شروع ہو کر رازِ حقیقت تک پہنچ چکی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس سے بڑھکر میری باطنی صفائی کا کوئی اور گواہ نہیں۔ میں اپنے پاس ثبوت رکھتا ہوں کہ میں نے ان کتابوں کو عرب اور روم اور شام اور کابل وغیرہ میں پھیلا دیا ہے اور اس امر سے قطعاً منکر ہوں کہ آسمان سے اسلامی لڑائیوں کیلئے مسیح نازل ہوگا اور کوئی شخص مہدی کے نام سے جو بنی فاطمہ سے ہوگا بادشاہ وقت ہوگا اور دونوں مل کر خونریزیاں شروع کر دیں گے۔ خدا نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ یہ باتیں ہرگز صحیح نہیں ہیں۔ مدت ہوئی کہ حضرت مسیح علیہ السلام وفات پا چکے۔ کشمیر میں محلہ خانیار میں آپ کا مزار موجود ہے۔ سو جیسا کہ مسیح کا آسمان سے اُترنا باطل ثابت ہُوا ایسا ہی کسی مہدی غازی کا آنا باطل ہے۔ اب جو شخص سچائی کا بھوکا ہے وہ اس کو قبول کرے۔ فقط

راقم خاکسار مرزا غلام احمد از قادیان

(حقیقۃ المہدی ص ۳ تا ۷)

میرا بیان مسیح موعود کی نسبت جس کی آسمان سے اُترنے اور دوبارہ دنیا میں آنے کی انتظار کی جاتی ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے میرے پر کھول دیا ہے یہ ہے کہ مسیح کے دوبارہ دنیا میں آنے کا قرآن شریف میں تو کہیں ذکر نہیں۔ قرآن شریف تو ہمیشہ کیلئے اس کو دنیا سے رخصت کرتا ہے۔ البتہ بعض حدیثوں میں جو استعارات سے پُر ہیں مسیح کے

دوبارہ دنیا میں آنے کے لئے بطور پیشگوئی بیان کیا گیا ہے۔ سو ان حدیثوں کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ اسجگہ درحقیقت مسیح ابن مریم کا ہی دوبارہ آجانا ہرگز مراد نہیں ہے بلکہ یہ ایک لطیف استعارہ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ کسی ایسے زمانہ میں جو مسیح ابن مریم کے زمانہ کا ہمرنگ ہوگا۔ ایک شخص اصلاح خلائق کے لئے دنیا میں آئیگا جو طبع اور قوت اور اپنے منصبی کام میں مسیح بن مریم کا ہمرنگ ہوگا اور جیسا کہ مسیح بن مریم نے حضرت موسیٰ کے دین کی تجدید کی اور وہ حقیقت اور مغز توریت کا جس کو یہودی لوگ بھول گئے تھے اُن پر دوبارہ کھول دیا ایسا ہی وہ مسیح ثانی مثیل موسیٰ کے دین کی جو جناب ختم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم ہیں تجدید کریگا اور یہ مثیل موسیٰ کا مسیح اپنی سوانح میں اور دوسرے تمام نتائج میں جو قوم پر ان کی اطاعت یا ان کی سرکشی کی حالت میں مؤثر ہونگے اُس مسیح سے بالکل مشابہ ہوگا جو موسیٰ کو دیا گیا تھا۔ اب جو امر کہ خدا تعالیٰ نے میرے پر منکشف کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ **مسیح موعود میں ہی ہوں**۔

مسلمانوں کا پرانے خیالات کے موافق جو اُن کے دلوں میں جمے ہوئے چلے آتے ہیں یہ دعویٰ ہے کہ مسیح بن مریم سچ مچ دو فرشتوں کے کندھوں پہ ہاتھ دھرے ہوئے آسمان سے اُتریگا اور منارہ مشرقی دمشق کے پاس آٹھہریگا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ منارہ پر اُترے گا۔ اور وہاں سے مسلمان لوگ زینہ کے ذریعہ سے اس کو نیچے اتاریں گے اور فرشتے اُسی جگہ سے رخصت ہو جائیں گے اور عمدہ پوشاک پہنے ہوئے اُتریگا یہ نہیں کہ ننگا ہو اور پھر مہدی کے ساتھ ملاقات اور مزاج پرسی ہوگی اور باوجود اس قدر مدت گذرنے کے وہی پہلی عمر بتیس یا تینتیس برس کی ہوگی اس قدر گردش ماہ و سال سے اس کے جسم و عمر پر کچھ اثر نہ کیا ہوگا۔ اس کے ناخن اور بال وغیرہ اس قدر سے نہ بڑھے ہونگے جو آسمان پر اٹھائے جانے کے وقت موجود تھے اور کسی قسم کا تغیر اس کے وجود میں نہ آیا ہوگا۔ لیکن زمین پر اُتر کر پھر سلسلۂ تغیرات کا شروع ہوگا۔ وہ کسی قسم کا جنگ و جدل نہیں کریگا بلکہ اس کی منہ کی ہوا میں ایسی تاثیر ہوگی کہ جہاں تک اس کی نظر پہنچے گی کافر مرتے جائیں گے۔ یعنی اس کے دم میں ہی یہ خاصیت ہوگی کہ زندوں کو مارے جیسی پہلے یہ خاصیت بھی کہ مُردوں کو زندہ کرے۔ پھر ہمارے علماء اپنے اس پہلے قول کو فراموش کرکے یہ دوسرا قول جو اس کا نقیض ہے پیش کرتے ہیں کہ وہ جنگ اور جدل بھی کریگا اور دجّال یک چشم اس کے ہاتھ سے قتل ہوگا۔ یہودی بھی اس کے حکم سے مارے جائیں گے۔ پھر ایک طرف تو یہ اقرار ہے کہ مسیح موعود وہی مسیح بن مریم نبی اللہ ہے جس پر

انجیل نازل ہوئی تھی۔ جس پر حضرت جبریل اُترا کرتا تھا۔ جو خدا تعالیٰ کے بزرگ پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ دوبارہ زمین پر آکر اپنی نبوت کا نام بھی نہیں لے گا بلکہ منصب نبوت سے معزول ہو کر آئیگا اور ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں داخل ہو کر عام مسلمانوں کی طرح شریعت قرآنی کا پابند ہوگا۔ نماز اوروں کے پیچھے پڑھے گا۔ جیسے عام مسلمان پڑھا کرتے ہیں۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حنفی ہوگا امام اعظم صاحب کو اپنا امام سمجھیگا مگر اب تک اس بارہ میں تصریح سے بیان نہیں کیا گیا کہ چار سلسلوں میں سے کس سلسلہ میں داخل ہوگا۔ آیا وہ قادری ہوگا یا چشتی یا سہروردی یا حضرت مجدّد سرہندی کی طرح نقشبندی۔ غرض ان لوگوں نے عنوان میں نبوت کا خطاب جما کر جس درجہ پر پھر اسکا تنزل کیا ہے کوئی قائم الحواس ایسا کام کبھی نہیں کر سکتا۔ پھر بعد اس کے اسکے خاص کام استعارات کو حقیقت پر حمل کر کے یہ بیان کئے گئے ہیں کہ وہ صلیب کو توڑے گا۔ خنزیروں کو قتل کرے گا۔ اب جائے تعجب ہے کہ صلیب کو توڑنے سے اس کا کونسا فائدہ ہے؟ اور اگر اس نے مثلاً دس بیس لاکھ صلیب توڑ بھی دی تو کیا عیسائی لوگ جن کو صلیب پرستی کی دھن لگی ہوئی ہے اور صلیبیں بنوا نہیں سکتے؟ اور دوسرا فقرہ جو کہا گیا ہے کہ خنزیروں کو قتل کریگا یہ بھی اگر حقیقت پر محمول ہے تو عجیب فقرہ ہے۔ کیا حضرت مسیح کا زمین پر اترنے کے بعد عمدہ کام یہی ہوگا کہ وہ خنزیروں کا شکار کھیلتے پھریں گے اور بہت سے کُتّے ساتھ ہوں گے اگر یہی سچ ہے تو پھر سکھّوں اور چماروں اور سانسیوں اور گنڈیلوں وغیرہ کو جو خنزیر کے شکار کو دوست رکھتے ہیں خوشخبری کی جگہ ہے کہ اُن کی خوب بن آئیگی مگر شاید عیسائیوں کو اُن کی اِس خنزیر کشی سے کچھ چنداں فائدہ نہ پہنچ سکے کیونکہ عیسائی قوم نے خنزیر کے شکار کو پہلے ہی کمال تک پہنچا رکھا ہے۔ بالفعل خاص لنڈن میں خنزیر کا گوشت فروخت کرنے کیلئے ہزار دوکان موجود ہے اور بذریعہ معتبر خبروں کے ثابت ہُوا ہے کہ صرف یہی ہزار دوکان نہیں بلکہ پچیس ہزار اور خنزیر ہر روز لنڈن میں سے مفصّلات کے لوگوں کے لئے باہر بھیجا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا نبی اللہ کی یہی شان ہونی چاہیئے؟ کہ وہ دنیا میں اصلاح خلق کے لئے تو آوے۔ مگر پھر اپنی اوقاتِ عزیز ایک مکروہ جانور خنزیر کے شکار میں ضائع کرے۔ حالانکہ توریت کے رو سے خنزیر کو چھونا بھی سخت معصیت میں داخل ہے۔ پھر مَیں یہ بھی کہتا ہوں کہ اوّل تو شکار کھیلنا ہی کارِ بیکاراں ہے اور اگر حضرت مسیح کو شکار ہی کی طرف رغبت ہوگی اور دن رات

یہی کام پسند آئیگا تو پھر کیا یہ پاک جانور جیسے ہرن اور گورخر اور خرگوش دنیا میں کیا کچھ کم ہیں تا ایک ناپاک جانور کے خون سے ہاتھ آلودہ کریں۔

اب مَیں نے وہ تمام خاکہ جو میری قوم نے مسیح کے ان سوانح کا کھینچ رکھا ہے جو دوبارہ زمین پر اترنے کے بعد ان پر گذریں گے پیش کر دیا ہے۔ عقلمند اس پر غور کریں کہ کہاں تک اس میں خلاف قانون قدرت باتیں ہیں۔ کہاں تک اس میں اجتماعِ نقیضین موجود ہے کہاں تک یہ شانِ نبوت سے بعید ہے لیکن اسجگہ یہ بھی یاد رہے کہ یہ تمام ذخیرہ رطب و یابس کا صحیحین میں نہیں ہے۔ امام محمد اسمٰعیل بخاری رحمہ اللہ نے اس بارہ میں اشارہ تک بھی نہیں کیا کہ یہ مسیح آنے والا درحقیقت اور سچ مچ وہی پہلا مسیح ہوگا بلکہ انہوں نے دو حدیثیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایسی لکھی ہیں جنہوں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ مسیح اوّل اَور ہے اور مسیح ثانی اَور۔ کیونکہ ایک حدیث کا مضمون یہ ہے کہ ابن مریم تم میں اترے گا اور پھر بیان کے طور پر کھول دیا ہے کہ وہ ایک تمہارا امام ہوگا جو تم میں سے ہی ہوگا۔ پس ان لفظوں پر خوب غور کرنی چاہیئے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم لفظ ابن مریم کی تصریح میں فرماتے ہیں کہ وہ ایک تمہارا امام ہوگا جو تم میں سے ہی ہوگا۔ اور تم میں سے ہی پیدا ہوگا۔ گویا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس وہم کو دفع کرنے کے لئے جو ابن مریم کے لفظ سے دلوں میں گذر سکتا تھا مابعد کے لفظوں میں بطور تشریح فرما دیا کہ اُسکو سچ مچ ابن مریم ہی نہ سمجھ لو بَلْ ھُوَ اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ۔ اور دوسری حدیث جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مسیح اوّل کا حلیہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اَور طرح کا فرمایا ہے اور مسیح ثانی کا حلیہ اَور طور کا ذکر کیا ہے جو اِس عاجز کے حُلیہ سے بالکل مطابق ہے۔ اب سوچنا چاہیئے کہ ان دونوں حلیوں میں تناقض صریح ہونا کیا اس بات پر پختہ دلیل نہیں ہے کہ درحقیقت مسیح اوّل اَور ہے اور مسیح ثانی اَور۔

(ازالہ اوہام ص ۲۱-۲۵)

اسجگہ اس بات کا لکھنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ میرا یہ دعویٰ کہ **مَیں مسیح موعود ہوں** ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے ظہور کی طرف مسلمانوں کے تمام فرقوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور احادیثِ نبویہ کی متواتر پیشگوئیوں کو پڑھ کر ہر ایک شخص اس بات کا منتظر تھا کہ کب وہ بشارتیں ظہور میں آتی ہیں۔ بہت سے اہل کشف نے خدا تعالےٰ سے الہام پاکر خبر دی تھی کہ وہ مسیح موعود چودھویں صدی کے سر پر ظہور کرے گا۔ اور یہ پیشگوئی اگرچہ قرآن شریف میں صرف اجمالی طور پر

پائی جاتی ہے مگر احادیث کے رو سے اس قدر تواتر تک پہنچی ہے کہ جس کا کذب عند العقل ممتنع ہے۔ اگر تواتر کچھ چیز ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی پیشگوئیوں میں سے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلیں کوئی ایسی پیشگوئی نہیں جو اس درجہ تواتر پر ہو جیسا کہ اس پیشگوئی میں پایا جاتا ہے .... لیکن افسوس ہے کہ باوجود اس تواتر کے ہمارے زمانہ فیج اعوج کے علماء نے اس پیشگوئی کے صحیح صحیح معنے سمجھنے میں بڑا دھوکا کھایا ہے۔ اور بباعث سخت غلط فہمی کے اپنے عقیدہ میں قابل شرم تناقضات جمع کر لئے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو قرآن شریف پر ایمان لاکر اور احادیث صحیحہ کو تسلیم کر کے ان کو یہ ماننا پڑا کہ حضرت عیسیٰ درحقیقت فوت ہو گئے ہیں۔ اور دوسری طرف یہ عقیدہ بھی انہوں نے رکھا کہ کسی زمانہ میں خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں نازل ہونگے اور وہ آسمان پر زندہ موجود ہیں فوت نہیں ہوئے۔ اور پھر ایک طرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء قرار دیا۔ اور دوسری طرف یہ عقیدہ بھی رکھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی ایک نبی آنے والا ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو کہ نبی ہیں۔ اور ایک طرف یہ عقیدہ رکھا کہ مسیح موعود دجّال کے وقت آئیگا۔ اور دجّال کا تمام روئے زمین پر بجز حرمین شریفین تسلّط ہو جائیگا اور دوسری طرف بموجب حدیث صحیح مرفوع متصل صحیح بخاری اس بات کو بھی انہیں ماننا پڑا کہ مسیح موعود صلیب کے غلبہ کے وقت آئیگا یعنی اس وقت جبکہ عیسائی مذہب دنیا میں زور کے ساتھ پھیلا ہوا ہوگا اور عیسائی طاقت اور دولت سب طاقتوں اور دولتوں سے بڑھی ہوئی ہوگی۔ اور پھر ایک طرف یہ عقیدہ رکھنا پڑا کہ مسیح اپنے وقت کا حاکم اور امام اور مہدی ہوگا اور پھر دوسری طرف یہ عقیدہ رکھا کہ مسیح مہدی اور امام نہیں بلکہ مہدی کوئی اَور ہوگا جو بنی فاطمہ میں سے ہوگا۔ غرض اس قسم کے بہت سے تناقضات جمع کر کے اس پیشگوئی کی صحت کی نسبت لوگوں کو تذبذب اور شک میں ڈال دیا۔ کیونکہ جو امر کئی تناقضات کا مجموعہ ہو ممکن نہیں کہ وہ صحیح ہو۔ پھر اہل عقل لوگ کیونکر اس کو قبول کر سکیں اور کیونکر اپنے جوہر عقل کو پیروں کے نیچے کچل کر اس ٹیڑھے طریق پر قدم ماریں۔ اسی وجہ سے حال کے ان نو تعلیم یافتہ لوگوں کو جو نیچر اور قانونِ قدرت اور عقلی نظام کو واقعات کی صحت یا عدم صحت کے لئے ایک معیار قرار دیتے ہیں اس پیشگوئی سے باوجود اعلیٰ درجہ کے تواتر کے جو اس میں ہے انکار کرنا پڑا۔ اور درحقیقت اگر اس پیشگوئی کے یہی معنے کئے جائیں کہ جو اس قدر تناقضات کو اپنے اندر رکھتے ہیں تو انسانی عقل ان تناقضات کی تطبیق سے عاجز آ کر آخر اس پریشانی سے رہائی اس میں دیکھتی ہے کہ اس پیشگوئی کی صحت سے

بھی انکار کرے۔ سو یہی **سبب تھا** کہ نیچر اور عقل کے دلدادہ باوجود پیشگوئی کے اسقدر تواتر کے اِس عظیم الشان پیشگوئی سے انکاری ہو گئے۔ لیکن افسوس کہ ان لوگوں نے بھی انکار کرنے میں بڑی شتابکاری سے کام لیا ہے۔ کیونکہ اخبار متواترہ سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ اور جو خبر تواتر کے درجہ پر پہنچ جائے ممکن نہیں کہ اس میں کذب کا شائبہ ہو۔ پس طریق انصاف اور حق پرستی یہ تھا کہ خبر متواتر کو ردّ نہ کرتے۔ ہاں **ان معنوں کو** ردّ کر دیتے جو نادان مولویوں نے کئے جن سے کئی قسم کے تناقض لازم آئے اور کئی تناقض جمع بھی کر لئے۔ اور درحقیقت یہ ناقص الفہم مولویوں کا قصور ہے جو انہوں نے ایک سیدھی اور صاف پیشگوئی کے ایسے معنے کر کے جو تناقضات کا مجموعہ تھے محقق طبع لوگوں کو بڑی پریشانی اور سرگردانی میں ڈال دیا۔ **اب خدا تعالیٰ نے** اس کے سچے اور صحیح **معنے** کھول کر جو تناقضات اور نامعقولیت سے بالکل پاک ہیں ہر ایک انصاف پسند محقق کو یہ موقعہ دیا ہے کہ وہ اس خبر متواتر کو مان کر اس کے مصداق کی تلاش میں لگ جائے اور خدا تعالیٰ کی صریح پیشگوئی سے انکار کر کے مکذبین میں داخل نہ ہو۔

(کتاب البریہ ص ۲۰۵ - ۲۱۱ حاشیہ)

اِس پیشگوئی کو صرف ظاہری الفاظ تک محدود رکھنے میں بڑی بڑی مشکلات ہیں قبل اس کے جو مسیح آسمان سے اُترے صدہا اعتراض پہلے ہی سے اتر رہے ہیں۔ اِن مشکلات میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور ہمیں اِس بات کی کیا حاجت کہ ابن مریم کو آسمان سے اتارا جائے اور ان کا نبوت سے الگ ہونا تجویز کیا جائے اور ان کی اس طرح پر تحقیر کی جائے کہ دوسرا شخص امامت کرے اور وہ پیچھے مقتدی بنیں اور دوسرا شخص اُن کے روبرو لوگوں سے بیعت امامت اور خلافت لے اور وہ بدیدۂ حسرت دیکھتے رہیں اور احد المسلمین بن کر اپنی نبوت کا دم نہ مار سکیں۔

(ازالہ اوہام ص ۴۷)

اِس پیشگوئی کے سمجھنے میں اہل عقل اور تدبر کرنے والوں کے لئے کچھ بھی دِقّت نہ تھی۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مقدسہ ایسے صاف تھے کہ خود اس مطلب کی طرف رہبری کرتے تھے کہ ہرگز اس پیشگوئی میں نبی بنی اسرائیل کا دوبارہ آنا مراد نہیں ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرما دیا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا اور حدیث لا نبی بعدی ایسی مشہور تھی کہ کسی کو اس کی صحت میں کلام نہ تھا اور قرآن شریف جس کا لفظ لفظ قطعی ہے اپنی آیت کریمہ ولکن رسول اللہ و خاتم النّبیین سے بھی اس بات کی تصدیق کرتا تھا کہ فی الحقیقت ہمارے

نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی ہے۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ کوئی نبی نبوت کے حقیقی معنوں کی رُو سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد تشریف لاوے۔ اس سے تو تمام تار و پود اسلام درہم برہم ہو جاتا تھا۔ اور یہ کہنا کہ "حضرت عیسیٰ نبوت سے معطل ہو کر آئیگا" نہایت بیحیائی اور گستاخی کا کلمہ ہے۔ کیا خدا تعالےٰ کے مقبول اور مقرب نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے اپنی نبوت سے معطّل ہو سکتے ہیں۔

(کتاب البریہ صـ ۲۱۷-۲۱۸ حاشیہ)

نزول سے مراد در حقیقت مسیح بن مریم کا نزول نہیں بلکہ استعارہ کے طور پر ایک مثیل مسیح کے آنے کی خبر دی گئی ہے جس کا مصداق حسب اعلام و الہام الٰہی یہی عاجز ہے اور مجھے یقیناً معلوم ہے کہ میری اس رائے کے شائع ہونے کے بعد جس پر مَیں بیّنات الہام سے قائم کیا گیا ہوں بہت سی قلمیں مخالفانہ طور پر اٹھیں گی اور ایک تعجب اور انکار سے بھرا ہوا شور عوام میں پیدا ہوگا ....

...... بائیبل اور ہماری احادیث اور اخبار کی کتابوں کے رُو سے جن نبیوں کا اسی وجود عنصری کے ساتھ آسمان پر جانا تصوّر کیا گیا ہے وہ دو نبی ہیں۔ ایک یوحنا جس کا نام ایلیا اور الیاس بھی ہے۔ دوسرے مسیح ابن مریم جن کو عیسیٰ اور یسوع بھی کہتے ہیں۔ ان دونوں نبیوں کی نسبت عہد قدیم اور جدید کے بعض صحیفے بیان کر رہے ہیں کہ وہ دونوں آسمان کی طرف اٹھائے گئے اور پھر کسی زمانہ میں زمین پر اُتریں گے اور تم اُن کو آسمان سے آتے دیکھو گے۔ ان ہی کتابوں سے کسی قدر ملتے جلتے الفاظ احادیث نبویہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن حضرت الیاس کی نسبت جو بائیبل میں یوحنا یا ایلیا کے نام سے پکارے گئے ہیں انجیل میں یہ فیصلہ دیا گیا ہے کہ یحیٰ بن زکریا کے پیدا ہونے سے اُن کا آسمان سے اُترنا وقوع میں آگیا ہے چنانچہ حضرت مسیح صاف صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ "یوحنّا جو آنے والا تھا یہی ہے چاہو تو قبول کرو" سو ایک نبی کے محکمہ سے ایک آسمان پر جانے والے اور پھر کسی وقت اُترنے والے یعنی یوحنا کا مقدمہ تو انفصال پا گیا اور دوبارہ اُترنے کی حقیقت اور کیفیت معلوم ہو گئی۔ چنانچہ تمام عیسائیوں کا متفق علیہ عقیدہ جو انجیل کے رو سے ہونا چاہیئے یہی ہے کہ یوحنا جس کے آسمان سے اُترنے کا انتظار تھا وہ حضرت مسیح کے وقت میں آسمان سے اس طرح پر اُتر آیا کہ زکریّا کے گھر میں اُسی طبع اور خاصیت کا بیٹا ہوا جس کا نام یحییٰ تھا۔ البتہ یہودی اس کے اُترنے کے اب تک منتظر ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ وہ سچ مچ آسمان سے اُترے گا .... بہر حال آسمان سے اُترنے کا لفظ جو تاویل رکھتا ہے مسیح کے بیان سے اُس کی حقیقت ظاہر ہوئی اور انہی کے بیان سے یوحنّا کے آسمان سے اُترنے کا جھگڑا طے ہوا اور یہ بات کھل گئی کہ آخر اُترے تو کس طرح اُترے مگر مسیح کے اُترنے کے

بارے میں اب تک بڑے جوش سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عمدہ اور شاہانہ پوشاک قیمتی پارچات کی پہنے ہوئے فرشتوں کے ساتھ آسمان سے اُتریں گے۔ مگر ان دو قوموں کا اس پر اتفاق نہیں کہ کہاں اُتریں گے۔ آیا مکّہ معظمہ میں یا لندن کے گرجا میں یا ماسکو کے شاہی کلیسیا میں۔ اگر عیسائیوں کو پرانے خیالات کی تقلید رہزن نہ ہو تو وہ مسلمانوں کی نسبت بہت جلد سمجھ سکتے ہیں کہ مسیح کا اُترنا اسی تشریح کے موافق چاہیئے جو خود حضرت مسیح کے بیان سے صاف لفظوں میں معلوم ہو چکی ہے .... عیسائی لوگ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ حضرت مسیح اُٹھائے جانے کے بعد بہشت میں داخل ہو گئے۔ لوکا کی انجیل میں خود حضرت مسیح ایک چور کو تسلّی دیکر کہتے ہیں کہ "آج تو میرے ساتھ بہشت میں داخل ہوگا۔ اور عیسائیوں کا یہ عقیدہ بھی متفق علیہ ہے۔ کوئی شخص بہشت میں داخل ہو کر پھر اس سے نکالا نہیں جائیگا گو کیسا ہی ادنیٰ درجہ کا آدمی ہو۔ چنانچہ یہی عقیدہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ یعنی جو لوگ بہشت میں داخل کئے جائیں گے پھر اس سے نکالے نہیں جائیں گے۔ اور قرآن شریف میں اگرچہ حضرت مسیح کے بہشت میں داخل ہونے کا بہ تصریح کہیں ذکر نہیں لیکن اُن کے وفات پا جانے کا تین جگہ ذکر ہے۔ اور مقدس بندوں کے لئے وفات پانا اور بہشت میں داخل ہونا ایک ہی حکم میں ہے کیونکہ برطبق آیت قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۔ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ وہ بلا توقف بہشت میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اب مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں گروہ پر واجب ہے کہ اس امر کو غور سے جانچیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک مسیح جیسا مقرب بندہ بہشت میں داخل کر کے پھر اس سے باہر نکال دیا جائے؟ کیا اس میں خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کا تخلّف نہیں جو اس کی تمام پاک کتابوں میں بتواتر و تصریح موجود ہے .... میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ یہی معجزہ کفّار مکّہ نے ہمارے سیّد و مولیٰ حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم سے مانگا تھا کہ آسمان پر ہمارے روبرو چڑھیں اور روبرو ہی اُتریں۔ اور انہیں جواب ملا تھا کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ یعنی خدا تعالیٰ کی حکیمانہ شان اس سے پاک ہے کہ ایسے کھلے کھلے خوارق اس دارالابتلاء میں دکھاوے اور ایمان بالغیب کی حکمت کو تلف کرے۔

اب میں کہتا ہوں کہ جو امر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے جو افضل الانبیا تھے جائز نہیں اور سنّت اللہ سے باہر سمجھا گیا وہ حضرت مسیح کے لئے کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ یہ کمال بے ادبی ہوگی کہ ہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایک کمال کو مستبعد خیال کریں اور پھر وہی کمال حضرت مسیح کی نسبت قرین قیاس مان لیں۔ کیا کسی سچے مسلمان سے ایسی گستاخی ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں

...... اب ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہادی اور سیّد مولیٰ جناب ختم المرسلین نے مسیح اوّل اور مسیح ثانی میں مابہ الامتیاز قائم کرنے کے لئے صرف یہی نہیں فرمایا کہ مسیح ثانی ایک مرد مسلمان ہوگا اور شریعت قرآنی کے موافق عمل کرے گا اور مسلمانوں کی طرح صوم وصلوٰۃ وغیرہ احکام فرقانی کا پابند ہوگا اور مسلمانوں میں پیدا ہوگا اور ان کا امام ہوگا اور کوئی جداگانہ دین نہ لائیگا اور کسی جداگانہ نبوت کا دعویٰ نہیں کرے گا بلکہ یہ بھی ظاہر فرمایا ہے کہ مسیح اوّل اور مسیح ثانی کے حُلیہ میں بھی فرق بیّن ہوگا۔ چنانچہ مسیح اوّل کا حلیہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات میں نظر آیا وہ یہ ہے کہ درمیانہ قد اور سُرخ رنگ اور گھنگھر والے بال اور سینہ کشادہ ہے (دیکھو صحیح بخاری ص ۴۸۹) لیکن اسی کتاب میں مسیح ثانی کا حلیہ جناب ممدوح نے یہ فرمایا ہے کہ وہ گندم گوں ہے اور اس کے بال گھنگھر والے نہیں ہیں اور کانوں تک لٹکتے ہیں۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ کیا یہ دونوں ممیّز علامتیں جو مسیح اوّل اور ثانی میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں کافی طور پر یقین نہیں دلاتیں کہ مسیح اوّل اَور ہے اور مسیح ثانی اَور۔ ان دونوں کو ابن مریم کے نام سے پکارنا ایک لطیف استعارہ ہے جو باعتبار مشابہت طبع اور روحانی خاصیت کے استعمال کیا گیا ہے۔

(توضیح مرام ص ۱-۱۰)

واقعات موجودہ کو نظر انداز مت کرو تا تم پر کھل جائے کہ یہ عام ضلالت وہی سخت دجّالیت ہے جس سے ہریک نبی ڈراتا آیا ہے جس کی بنیاد اس دنیا میں عیسائی مذہب اور عیسائی قوم نے ڈالی۔ جس کے لئے ضرور تھا کہ مجدد وقت مسیح کے نام پر آوے کیونکہ بنیاد فساد مسیح کی ہی امت ہے۔ اور میرے پر کشفاً یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ زہرناک ہوا جو عیسائی قوم سے دنیا میں پھیل گئی حضرت عیسیٰ کو اس کی خبر دی گئی۔ تب اُن کی رُوح رُوحانی نزول کے لئے حرکت میں آئی اور اُس نے جوش میں آکر اور اپنی امت کو ہلاکت کا مفسدہ پرداز پاکر زمین پر اپنا قائم مقام اور شبیہہ چاہا جو اس کا ایسا ہم طبع ہو کہ گویا وہی ہو۔ سو اس کو خدائے تعالیٰ نے وعدہ کے موافق ایک شبیہہ عطا کیا۔ اور اس میں مسیح کی ہمت اور سیرت اور روحانیت نازل ہوئی۔ اور اس میں اور مسیح میں بشدّت اتصال کیا گیا گویا وہ ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے بنائے گئے اور مسیح کی توجّہات نے اس کے دل کو اپنا قرارگاہ بنایا اور اس میں ہو کر اپنا تقاضا پورا کرنا چاہا۔ پس ان معنوں سے اس کا وجود مسیح کا وجود ٹھہرا۔ اور مسیح کے پُرجوش ارادات اس میں نازل ہوئے جن کا نزول الہامی استعارات میں مسیح کا نزول قرار دیا گیا۔ یاد رہے کہ یہ ایک عرفانی بھید ہے کہ بعض گذشتہ کاملوں کا ان

بعض پر جو زمین پر زندہ موجود ہوں عکسِ توجہ پڑ کر اور اتحادِ خیالات ہو کر ایسا تعلق ہو جاتا ہے کہ وہ اُن کے ظہور کو اپنا ظہور سمجھ لیتے ہیں اور ان کے ارادات جیسے آسمان پر اُن کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ویسا ہی باذنہٖ تعالیٰ اس کے دل میں جو زمین پر ہے پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسی رُوح جس کی حقیقت کو اس آدمی سے جو زمین پر ہے متحد کیا جاتا ہے ایک ایسا ملکہ رکھتی ہے کہ جب چاہے پورے طور پر اپنے ارادات اس میں ڈالتی رہے اور ان ارادات کو خدا تعالیٰ اُس دل سے اِس دل میں رکھ دیتا ہے ۔ غرض یہ سنّت اللہ ہے کہ کبھی گذشتہ انبیاء و اولیاء اس طور سے نزول فرماتے ہیں ۔ اور **ایلیا** نبی نے **یحییٰ** نبی میں ہو کر اسی طور سے نزول کیا تھا ۔ سو مسیح کے نزول کی سچی **حقیقت** یہی ہے جو اس عاجز پر ظاہر کی گئی ۔ اور اگر اب بھی کوئی باز نہ آوے تو میں مباہلہ کے لئے تیار ہوں ۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۲۵۴-۲۵۶)

"اگر یہ کہا جائے کہ احادیث صاف اور صریح لفظوں میں بتلا رہی ہیں کہ مسیح ابن مریم آسمان سے اُترے گا اور دمشق کے منارہ شرقی کے پاس اس کا اُترنا ہو گا اور دو فرشتوں کے کندھوں پر اس کے ہاتھ ہونگے تو اس مصرّح اور واضح بیان سے کیونکر انکار کیا جائے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آسمان سے اُترنا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ سچ مچ خاکی وجود آسمان سے اُترے بلکہ صحیح حدیثوں میں تو آسمان کا لفظ بھی نہیں ہے ۔ اور یوں تو نزول کا لفظ عام ہے جو شخص ایک جگہ سے چل کر دوسری جگہ ٹھیرتا ہے اس کو بھی یہی کہتے ہیں کہ اس جگہ اُترا ہے ۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں جگہ لشکر اُترا ہے یا ڈیرہ اترا ہے ۔ کیا اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ لشکر یا وہ ڈیرہ آسمان سے اُترا ہے ؟ ماسوائے اس کے خدا تعالےٰ نے تو قرآن شریف میں صاف فرما دیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی آسمان سے ہی اُترے ہیں بلکہ ایک جگہ فرمایا ہے کہ لوہا بھی ہم نے آسمان سے اتارا ہے ۔ پس صاف ظاہر ہے کہ یہ آسمان سے اُترنا اس صورت اور رنگ کا نہیں ہے جس صورت پر لوگ خیال کر رہے ہیں ۔

(ازالہ اوہام ص۳۲-۳۳)

ناحق نزول کے لفظ کے اُلٹے معنے کرتے ہیں ۔ خدا کی کتابوں کا یہ قدیم محاورہ ہے کہ جو خدا کی طرف سے آتا ہے اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ آسمان سے نازل ہوا ۔ دیکھو انجیل یوحنا باب ۱ آیت ۳۸ ۔ اور اسی راز کی طرف اشارہ ہے سورۃ اِنَّآ اَنْزَلْنَاہُ

فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ اور نیز آیت ذِکْرًا رَّسُوْلًا میں - لیکن عوام جو جسمانی خیال کے ہوتے ہیں وہ ہر ایک بات کو جسمانی طور پر سمجھ لیتے ہیں - یہ لوگ خیال نہیں کرتے کہ جیسے حضرت مسیح ان کے زعم میں فرشتوں کے ساتھ آسمان سے اُتریں گے ایسا ہی ان کا یہ بھی تو عقیدہ ہے کہ آنحضرتؐ صلے اللہ علیہ وسلم بھی فرشتوں کے ساتھ آسمان پر گئے تھے بلکہ اسجگہ تو ایک براق بھی ساتھ تھا مگر کس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا چڑھنا اور اُترنا دیکھا اور نیز فرشتوں اور براق کو دیکھا؟ ظاہر ہے کہ منکر لوگ معراج کی رات میں نہ دیکھ سکے کہ فرشتے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر لے گئے اور نہ اُترتے دیکھ سکے اسی لئے انہوں نے شور مچا دیا کہ معراج جھوٹ ہے اب یہ لوگ جو ایسے مسیح کے منتظر ہیں جو آسمان سے فرشتوں کے ساتھ اُترتا نظر آئے گا ۔ یہ کس قدر خلاف سنّت اللہ ہے ۔ سیّد الرسل تو آسمان پر چڑھتا یا اُترتا نظر نہ آیا تو کیا مسیح اُترتا نظر آجائیگا ۔ لعنۃ اللہ علی الکاذبین - کیا ابوبکر صدیقؓ نے سید المرسلین محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کو مع فرشتوں کے معراج کی رات میں آسمان پر چڑھتے یا اُترتے دیکھا؟ یا عمر فاروقؓ نے اس مشاہدہ کا فخر حاصل کیا؟ یا علی مرتضیٰؓ نے اس نظارہ سے کچھ حصہ لیا؟ پھر تم کون اور تمہاری حیثیت کیا کہ مسیح موعود کو آسمان سے مع فرشتوں کے اُترتے دیکھو گے! خود قرآن ایسی رؤیت کا مکذب ہے -

(تبلیغ رسالت جلد نہم ص۶۶)

مسلمانوں کو حضرت عیسےٰ کے نزول کے بارے میں اسی خطرناک انجام سے ڈرنا چاہیئے کہ جو یہودیوں کو ایلیا کے بارے میں ظاہر نص پر زور دینے سے پیش آیا ۔ جس بات کی پہلے زمانوں میں کوئی بھی نظیر نہ ہو بلکہ اس کے باطل ہونے پر نظیریں موجود ہوں اس بات کے پیچھے پڑ جانا نہایت درجہ کے بیوقوف کا کام ہے - اللہ تعالےٰ فرماتا ہے - فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی خدا کی سُنتوں اور عادات کا نمونہ یہود اور نصاریٰ سے پوچھ لو اگر تمہیں معلوم نہیں -

(کتاب البریہ ص۲۴۳)

جاننا چاہیئے کہ دمشق کا لفظ جو مسلم کی حدیث میں وارد ہے یعنی صحیح مسلم میں یہ جو لکھا ہے کہ حضرت مسیح دمشق کے منارہ سفید شرقی کے پاس اُتریں گے یہ لفظ ابتداء سے محقق لوگوں کو حیران کرتا چلا آیا ہے ۔ کیونکہ بظاہر کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مسیح کو دمشق سے کیا مناسبت ہے

اور دمشق کو مسیح سے کیا خصوصیت؟ .... صرف تھوڑی سی توجہ کرنے سے ایک لفظ کی تشریح یعنی دمشق کے لفظ کی حقیقت میرے پر کھولی گئی اور نیز ایک صاف اور صریح کشف میں مجھ پر ظاہر کیا گیا کہ ایک شخص **حارث** نام یعنی حرّاث آنے والا جو ابوداؤد کی کتاب میں لکھا ہے یہ خبر صحیح ہے اور یہ پیشگوئی اور مسیح کے آنے کی پیشگوئی درحقیقت یہ دونوں اپنے **مصداق** کی رو سے **ایک ہی ہیں** یعنی ان دونوں کا مصداق ایک ہی شخص ہے جو یہ **عاجز** ہے۔

سو اوّل میں دمشق کے لفظ کی تعبیر جو الہام کے ذریعہ سے مجھ پر کھولی گئی بیان کرتا ہوں۔ پھر بعد اس کے ابوداؤد والی پیشگوئی جس طور سے مجھے سمجھائی گئی ہے بیان کرونگا۔

پس واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر منجانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اسجگہ ایسے قصبہ کا نام دمشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کی عادات اور خیالات کے پیرو ہیں۔ جن کے دلوں میں اللہ اور رسول کی کچھ محبت نہیں اور احکام الٰہی کی کچھ عظمت نہیں جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اپنے نفس امّارہ کے حکموں کے ایسے مطیع ہیں کہ مقدسوں اور پاکوں کا خون بھی ان کی نظر میں سہل اور آسان امر ہے اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور خدائے تعالیٰ کا موجود ہونا اُن کی نگاہ میں ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جو انہیں سمجھ نہیں آتا اور چونکہ طبیب کو بیماروں ہی کی طرف آنا چاہیئے اس لئے ضرور تھا کہ مسیح ایسے لوگوں میں ہی نازل ہو۔ غرض مجھ پر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دمشق کے لفظ سے دراصل وہ مقام مراد ہے جس میں یہ دمشق والی مشہور خاصیت پائی جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ نے مسیح کے اُترنے کی جگہ جو دمشق کو بیان کیا تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسیح سے مراد وہ اصلی مسیح نہیں ہے جس پر انجیل نازل ہوئی تھی بلکہ مسلمانوں میں سے کوئی ایسا شخص مراد ہے جو اپنی روحانی حالت کی رو سے مسیح سے اور نیز امام حسین سے بھی مشابہت رکھتا ہے ...... دمشق کا لفظ صاف طور پر بیان کر رہا ہے کہ مسیح جو اترنے والا ہے وہ بھی دراصل مسیح نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ یزیدی لوگ مثیل یہود ہیں ایسا ہی مسیح جو اُترنے والا ہے وہ بھی مثیل مسیح ہے اور حسینی الفطرت ہے۔ یہ نکتہ ایک نہایت لطیف نکتہ ہے جس پر غور کرنے سے صاف طور پر کھل جاتا ہے کہ **دمشق کا لفظ محض استعارہ کے طور پر** استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ **امام حسین کا مظلومانہ واقعہ** خدا تعالےٰ کی نظر میں بہت عظمت اور وقعت رکھتا ہے

اور یہ واقعہ حضرت مسیح کے واقعہ سے ایسا ہمرنگ ہے کہ عیسائیوں کو بھی اس میں کلام نہیں ہوگی۔ اس لئے خدائے تعالیٰ نے چاہا کہ آنے والے زمانہ کو بھی اس کی عظمت سے اور مسیحی مشابہت سے متنبہ کرے اس وجہ سے دمشق کا لفظ بطور استعارہ لیا گیا تا پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے وہ زمانہ آ جائے جس میں لختِ جگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت مسیح کی طرح کمال درجہ کے ظلم اور جور وجفا کی راہ سے دمشقی اشقیاء کے محاصرہ میں آکر قتل کئے گئے۔ سو خدا تعالےٰ نے اس دمشق کو جس سے ایسے پُرظلم احکام نکلتے تھے اور جس میں ایسے سنگدل اور سیاہ دروں لوگ پیدا ہو گئے تھے اس غرض سے نشانہ بنا کر لکھا کہ اب مثیل دمشق عدل اور ایمان پھیلانے کا ہیڈ کوارٹر ہوگا۔

(ازالہ اوہام ص ۳۴-۳۷ حاشیہ)

اب میں وہ حدیث جو ابوداؤد نے اپنی صحیح میں لکھی ہے ناظرین کے سامنے پیش کرکے اس کے مصداق کی طرف ان کو توجہ دلاتا ہوں۔ سو واضح ہو کہ یہ پیشگوئی جو ابوداؤد کی صحیح میں درج ہے کہ ایک شخص حارث نام یعنی حرّاث ماوراء النہر سے یعنی سمرقند کی طرف سے نکلے گا جو آلِ رسول کو تقویت دے گا۔ جس کی امداد اور نصرت ہر ایک مومن پر واجب ہوگی۔ الہامی طور پر مجھ پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ پیشگوئی اور مسیح کے آنے کی پیشگوئی جو مسلمانوں کا امام اور مسلمانوں میں سے ہوگا دراصل یہ دونوں پیشگوئیاں متحد المضمون ہیں **اور دونوں کا مصداق یہی عاجز ہے۔** مسیح کے نام پر جو پیشگوئی ہے اس کی علاماتِ خاصہ درحقیقت دو ہی ہیں۔ ایک یہ کہ جب وہ مسیح آئیگا تو مسلمانوں کی اندرونی حالت کو جو اس وقت بغایت درجہ بگڑی ہوئی ہوگی اپنی صحیح تعلیم سے درست کردیگا اور اُن کے رُوحانی افلاس اور باطنی ناداری کو بکلّی دُور فرما کر جواہراتِ علوم وحقائق و معارف اُن کے سامنے رکھ دیگا یہاں تک کہ وہ لوگ اس دولت کو لیتے لیتے تھک جائیں گے اور ان میں سے کوئی طالب حق روحانی طور پر مفلس اور نادار نہیں رہیگا بلکہ جس قدر سچائی کے بھوکے اور پیاسے ہیں ان کو بکثرت طیّب غذا صداقت کی اور شربت شیریں معرفت کا پلایا جائیگا اور علوم حقّہ کے موتیوں سے اُن کی جھولیاں پُر کردی جائینگی اور جو مغز اور لب لباب قرآن شریف کا ہے اس عطر کے بھرے ہوئے شیشے ان کو دیئے جائیں گے۔

دوسری علامتِ خاصہ یہ ہے کہ جب وہ مسیح موعود آئیگا تو صلیب کو توڑے گا۔ اور خنزیروں کو قتل کریگا اور دجّال یک چشم کو قتل کر ڈالیگا۔ اور جس کافر تک اُس کے دم کی ہوا پہنچیگی وہ فی الفور مر جائیگا۔ سو اس علامت کی اصل حقیقت جو روحانی طور پر مراد رکھی گئی ہے یہ ہے

کہ مسیح دنیا میں آکر صلیبی مذہب کی شان و شوکت کو اپنے پیروں کے نیچے کچل ڈالے گا۔ اور ان لوگوں کو جن میں خنزیروں کی بے حیائی اور خوکوں کی بے شرمی اور نجاست خوری ہے اُن پر دلائل قاطعہ کا ہتھیار چلا کر اُن سب کا کام تمام کرے گا۔ اور وہ لوگ جو صرف دنیا کی آنکھ رکھتے ہیں مگر دین کی آنکھ بکلّی ندارد بلکہ ایک بدنما ٹینٹ اُس میں نکلا ہوا ہے ان کو بین حجتوں کی سیف قاطعہ سے ملزم کر کے ان کی منکرانہ ہستی کا خاتمہ کر دیگا۔ اور نہ صرف ایسے یک چشم لوگ بلکہ ہر ایک کافر جو دین محمدی کو بنظر استحقار دیکھتا ہے مسیحی دلائل کے جلالی دم سے رُوحانی طور پر مارا جائے گا۔ غرض یہ سب عبارتیں استعارہ کے طور پر واقع ہیں جو اس عاجز پر بخوبی کھولی گئی ہیں اب چاہے کوئی اس کو سمجھے یا نہ سمجھے لیکن آخر کچھ مدت اور انتظار کر کے اور اپنی بے بنیاد امیدوں سے یاس کلّی کی حالت میں ہو کر ایک دن سب لوگ اِس طرف رجوع کرینگے۔

(ازالہ اوہام ص ۴۱-۴۳ حاشیہ)

صحیح مسلم کی حدیث میں جو یہ لفظ موجود ہے کہ مسیح جب آسمان سے اُتریگے تو ان کا لباس زرد رنگ کا ہوگا۔ اس لفظ کو ظاہری لباس پر حمل کرنا کیسا لغو خیال ہے۔ زرد رنگ پہننے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی لیکن اگر اس لفظ کو ایک کشفی استعارہ قرار دے کر معبّرین کے مذاق اور تجارب کے موافق اس کی تعبیر کرنا چاہیں تو یہ معقول تعبیر ہوگی کہ حضرت مسیح اپنے ظہور کے وقت یعنی اس وقت میں کہ جب وہ مسیح ہونے کا دعویٰ کرینگے کسی قدر بیمار ہونگے اور حالت صحت اچھی نہیں رکھتے ہونگے۔ کیونکہ کتبِ تعبیر کی رو سے زرد رنگ پوشاک پہننے کی یہی تاویل ہے۔

(ازالہ اوہام ص ۴۲-۴۳)

حضرت بخاری صاحب نے اپنی صحیح میں معراج کی حدیث میں جو ہمارے سیّد و مولیٰ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا حال دوسرے انبیاء سے آسمانوں پر لکھا ہے تو اسجگہ حضرت عیسیٰ کا کوئی خاص طور پر مجسّم ہونا ہرگز بیان نہیں کیا بلکہ جیسے حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کی رُوح سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا ذکر کیا ہے ایسا ہی بغیر ایک ذرّہ فرق کے حضرت عیسےٰ کی روح سے ملاقات ہونا بیان کیا ہے۔ بلکہ حضرت موسیٰ کی رُوح کا کھلے کھلے طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنا مفصّل طور پر لکھا ہے۔ پس اس حدیث کو پڑھکر کچھ شک نہیں ہو سکتا کہ اگر حضرت مسیح جسم کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں تو پھر ایسا ہی حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ وغیرہ انبیاء بھی اس جسم کے ساتھ اٹھائے گئے ہونگے۔ کیونکہ معراج

کی رات میں وہ نبی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک ہی رنگ میں آسمانوں پر نظر آئے ہیں۔ یہ نہیں کہ کوئی خاص وردی یا کوئی خاص علامت مجسّم اٹھائے جانے کی حضرت مسیح میں دیکھی ہو اور دوسرے نبیوں میں وہ علامت نہ پائی گئی ہو۔

(ازالہ اوہام ص ۵۳-۵۴)

قرآن شریف کے کسی مقام سے ثابت نہیں کہ حضرت مسیح اسی خاکی جسم کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھائے گئے بلکہ قرآن شریف کے کئی مقامات میں مسیح کے فوت ہو جانے کا صریح ذکر ہے۔ اور ایک جگہ خود مسیح کی طرف سے فوت ہو جانے کا اقرار موجود ہے اور وہ یہ ہے۔ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔ اب جبکہ فوت ہو جانا ثابت ہوا تو اس سے ظاہر ہے کہ اُنکا جسم ان سب لوگوں کی طرح جو مر جاتے ہیں زمین میں دفن کیا گیا ہو گا۔ کیونکہ قرآن شریف بصراحت ناطق ہے کہ فقط اُن کی رُوح آسمان پر گئی نہ کہ جسم۔ تب ہی تو حضرت مسیح نے آیت موصوفہ بالا میں اپنی موت کا صاف اقرار کر دیا۔ اگر وہ زندوں کی شکل پر خاکی جسم کے ساتھ آسمان کی طرف پرواز کرتے تو اپنے مر جانے کا ہرگز ذکر نہ کرتے اور ایسا ہرگز نہ کہتے کہ مَیں وفات پا کر اس جہان سے رخصت کیا گیا ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ جبکہ آسمان پر اُن کی رُوح ہی گئی تو پھر نازل ہونے کے وقت جسم کہاں سے ساتھ آئیگا .... اگر ہم فرض محال کے طور پر قبول کر لیں کہ حضرت مسیح اپنے جسم خاکی کے سمیت آسمان پر پہنچ گئے تو اس بات کے اقرار سے ہمیں چارہ نہیں کہ وہ جسم جیسا کہ تمام حیوانی و انسانی اجسام کے ضروری ہے آسمان پر بھی تاثیر زمانہ سے ضرور متاثر ہو گا اور بمرور زمانہ لابدی اور لازمی طور پر ایک دن ضرور اس کے لئے موت واجب ہو گی۔ پس اس صورت میں اول تو حضرت مسیح کی نسبت یہ ماننا پڑتا ہے کہ اپنی عمر کا دورہ پورا کر کے آسمان پر ہی فوت ہو گئے ہوں۔ اور کواکب کی آبادی جو آجکل تسلیم کی جاتی ہے اسی کے کسی قبرستان میں دفن کئے گئے ہوں۔ اور اگر پھر فرض کے طور پر اب تک زندہ رہنا اُن کا تسلیم کر لیں تو کچھ شک نہیں کہ اتنی مدت گذرنے پر پیر فرتوت ہو گئے ہونگے۔ اور اس کام کے ہرگز لائق نہیں ہونگے کہ کوئی خدمتِ دینی ادا کر سکیں پھر ایسی حالت میں ان کا دنیا میں تشریف لانا بجز ناحق کی تکلیف کے اور کچھ فائدہ بخش معلوم نہیں ہوتا۔ (ازالہ اوہام ص ۲۵-۲۷)

مسیح ابن مریم کے فوت ہوجانے کے بارہ میں ہمارے پاس اسقدر یقینی اور قطعی ثبوت ہیں کہ ان کے مفصّل لکھنے کے لئے اس مختصر رسالہ میں گنجائش نہیں۔ پہلے قرآن شریف پر نظر غور ڈالو اور ذرا آنکھ کھول کر دیکھو کہ کیونکر وہ صاف اور بیّن طور پر عیسٰی بن مریم کے مرجانے کی خبر دے رہا ہے جس کی ہم کوئی بھی تاویل نہیں کر سکتے۔ مثلاً یہ جو خدا تعالیٰ قرآن کریم میں حضرت عیسٰی کی طرف سے فرماتا ہے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ کیا ہم اسجگہ توفی سے نیند مراد لے سکتے ہیں؟ کیا یہ معنے اسجگہ موزون ہونگے کہ جب تُونے مجھے سُلادیا اور میرے پر نیند غالب کردی تو میرے سونے کے بعد تو اُن کا نگہبان تھا، ہرگز نہیں۔ بلکہ توفی کے سیدھے اور صاف معنے جو موت ہے وہی اسجگہ چسپاں ہیں۔ لیکن موت سے مراد وہ موت نہیں جو آسمان سے اُترنے کے بعد پھر وارد ہو کیونکہ جو سوال اُن سے کیا گیا ہے یعنی اُن کی اُمت کا بگڑجانا۔ اس وقت کی موت سے اس سوال کا کچھ علاقہ نہیں۔ کیا نصاریٰ اب صراطِ مستقیم پر ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں کہ جس امر کے بارے میں خدا تعالیٰ نے عیسٰی بن مریم سے سوال کیا ہے وہ امر تو خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ہی کمال کو پہنچ چکا ہے۔

ماسوا اس کے حدیث کی رو سے بھی حضرت عیسٰی علیہ السلام کا فوت ہو جانا ثابت ہے چنانچہ تفسیر معالم کے صفحہ ۱۶۲ میں زیر تفسیر آیت یٰعیسیٰ انی متوفّیك ورافعك الیّ لکھا ہے کہ علی بن طلحہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ اِنِّیْ مُمِیْتُكَ یعنی میں تجھ کو مارنے والا ہوں۔ اس پر دوسرے اقوال اللہ تعالےٰ کے دلالت کرتے ہیں۔ قل یتوفّٰکم ملك الموت ۔ الذین تتوفّٰھم الملٰئکۃ طیبین ۔ الذین تتوفّٰھم الملٰئکۃ ظالمی انفسھم ۔ غرض حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اعتقاد یہی تھا کہ حضرت عیسٰی فوت ہو چکے ہیں۔ اور ناظرین پر واضح ہوگا کہ حضرت ابن عباس قرآن کریم کے سمجھنے میں اوّل نمبر والوں میں سے ہیں۔ اور اس بارہ میں اُن کے حق میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک دُعا بھی ہے۔

(ازالہ اوہام ص۱۲۴-۱۲۵)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اِسی غرض سے آیت کریمہ فلمّا توفّیتنی کنت انت الرقیب علیھم کو کتاب التفسیر میں لایا ہے۔ اور اس ایراد سے اس کا منشاء یہ ہے کہ تا لوگوں پر ظاہر کرے کہ توفّیتنی کے لفظ کی صحیح تفسیر وہی ہے جسکی طرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم

اشارہ فرماتے ہیں یعنی مار دیا اور **وفات دیدی**۔ اور حدیث یہ ہے۔ عن ابن عباس
انّہ یُجاءُ برجالٍ من امّتی فیؤخذُ بھم ذاتَ الشّمال فاقولُ یا ربِّ اُصیحابی
فیُقالُ انّکَ لا تدری ما احدثوا بعدکَ فاقولُ کما قالَ العبدُ الصّالحُ
وکنتُ علیھم شھیدًا مّا دُمتُ فیھم فلمّا توفّیتنی کنتَ انتَ الرّقیبَ
علیھم صفحہ ٦٦٥ بخاری ٦٩٣ بخاری۔ یعنی قیامت کے دن میں بعض لوگ میری امت میں
سے آگ کی طرف لائے جائینگے۔ تب میں کہونگا کہ اے میرے ربّ! یہ تو میرے اصحاب
ہیں۔ تب کہا جائیگا کہ تجھے ان کاموں کی خبر نہیں جو تیرے پیچھے ان لوگوں نے کئے۔ سو اس وقت
میں وہی بات کہونگا جو ایک نیک بندہ نے کہی تھی یعنی مسیح ابن مریم نے جب کہ اسکو پوچھا
گیا تھا کہ کیا یہ تُو نے تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے ماننا۔ اور وہ بات
(جو میں ابن مریم کی طرح کہوں گا) یہ ہے کہ میں جب اُن میں تھا ان پر گواہ تھا پھر جب
تو نے مجھے وفات دے دی تو اس وقت تو ہی ان کا نگہبان اور محافظ اور نگران تھا۔ اس
حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے قصّہ اور مسیح ابن مریم کے قصّہ کو ایک ہی رنگ
کا قصّہ قرار دیکر وہی لفظ فلمّا توفّیتنی کا اپنے حق میں استعمال کیا ہے جس سے صاف
سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فلمّا توفّیتنی سے وفات ہی مراد لی ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۴۸۵-۴۸۶)

ہم نے اپنے مخالف الرائے مولوی صاحبوں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات ممات کے بارے میں صرف ایک ہی سوال کیا تھا۔ اگر ایمانداری سے اس سوال میں غور کرتے تو ان کی ہدایت کے لئے ایک ہی سوال کافی تھا مگر کسی کو ہدایت پانے کی خواہش ہوتی تو غور بھی کرتا۔ سوال یہ تھا کہ اللہ جلّ شانہٗ نے قرآن کریم میں حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت دو جگہ توفّی کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ لفظ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی قرآن کریم میں آیا ہے اور ایسا ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی دُعا میں بھی یہ لفظ اللہ جلّ شانہٗ نے ذکر فرمایا ہے اور کتنے اَور مقامات میں بھی موجود ہے اور ان تمام مقامات پر نظر ڈالنے سے ایک منصف مزاج آدمی پورے اطمینان سے سمجھ سکتا ہے کہ توفّی کے معنے ہر جگہ قبض رُوح اور مارنے کے ہیں نہ اَور کچھ۔ کتُب حدیث میں بھی یہی محاورہ بھرا ہُوا ہے۔ کتب حدیث میں توفّی کے لفظ کو صدہا جگہ پاؤ گے۔ مگر کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ بجز مارنے کے کسی اَور

معنے پر بھی استعمال ہوا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اگر ایک اُمّی آدمی عرب کو کہا جائے کہ تُوُفِّیَ زَیْدٌ تو وہ اس فقرہ سے یہی سمجھیگا کہ زید وفات پاگیا۔ خیر عربوں کا عام محاورہ بھی جانے دو۔ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات مبارکہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جب کوئی صحابی یا آپ کے عزیزوں میں سے فوت ہوتا تو آپ توفّی کے لفظ سے ہی اس کی وفات ظاہر کرتے تھے۔ اور جب آنجناب صلے اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو صحابہ نے بھی توفّی کے لفظ سے ہی آپ کی وفات ظاہر کی۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کی وفات حضرت عمرؓ کی وفات غرض تمام صحابہ کی وفات توفّی کے لفظ سے ہی تقریرًا تحریرًا بیان ہوئی اور مسلمانوں کی وفات کے لئے یہ لفظ ایک عزّت کا قرار پایا تو پھر جب مسیح پر یہی وارد ہوا تو کیوں اس کے خود تراشیدہ معنے لئے جاتے ہیں۔

(اتمام الحجۃ ص۲۰)

عمومًا محاورہ قرآن شریف کا توفّی کے لفظ کے استعمال میں یہی واقعہ ہوا ہے کہ وہ تمام مقامات میں اول سے آخر تک ہر ایک جگہ جو توفّی کا لفظ آیا ہے اس کو موت اور قبض روح کے معنے میں لاتا ہے۔ اور جب عرب کے قدیم وجدید اشعار وقصائد ونظم ونثر کا جہاں تک ممکن تھا تتبع کیا گیا اور عمیق تحقیقات سے دیکھا گیا تو یہ ثابت ہوا کہ جہاں جہاں توفّی کے لفظ کا ذوی الروح سے یعنی انسانوں سے علاقہ ہے اور فاعل اللہ جلّ شانہٗ کو ٹھیرایا گیا ہے ان تمام مقامات میں توفّی کے معنے موت اور قبض رُوح کے کئے گئے ہیں اور اشعار قدیمہ اور جدیدہ عرب میں اور ایسا ہی ان کی نثر میں ایک لفظ توفّی کا ایسا نہیں ملے گا جو ذوی الروح میں مستعمل ہو اور جس کا فاعل لفظًا یا معنًا خدا تعالیٰ ٹھیرایا گیا ہو یعنی فعل عبد کا قرار نہ دیا گیا ہو اور محض خدا تعالیٰ کا فعل سمجھا گیا ہو اور پھر اس کے معنے بجز قبض روح کے اور مراد رکھے گئے ہوں۔ لغات کی کتابوں قاموس۔ صحاح۔ صراح وغیرہ پر نظر ڈالنے والے بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ ضرب المثل کے طور پر بھی کوئی فقرہ عرب کے محاورات کا ایسا نہیں ملا جس میں توفّی کے لفظ کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے اور ذوی الروح کے بارے استعمال میں لاکر پھر اس کے اَور بھی معنے کئے ہوں بلکہ برابر ہر جگہ یہی معنے موت اور قبض رُوح کے کئے گئے ہیں اور کسی دوسرے احتمال کا ایک ذرّہ راہ کھلا نہیں رکھا پھر بعد اس کے اس عاجز نے حدیثوں کی طرف رجوع کیا تا معلوم ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے زمانہ میں صحابہ اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس لفظ توفّی کو ذوی الروح کی طرف منسوب کرکے کن کن معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ آیا یہ لفظ اس وقت ان کے روزمرّہ محاورات میں کئی معنوں پر استعمال ہوتا تھا یا صرف ایک ہی معنے قبض رُوح اور موت کے لئے مستعمل تھا۔ سو اس تحقیقات کے لئے مجھے بڑی محنت کرنی پڑی اور ان تمام کتابوں صحیح بخاری۔ صحیح مسلم۔ ترمذی ابن ماجہ۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ دارمی۔ مؤطا۔ شرح السنہ وغیرہ کا صفحہ صفحہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان تمام کتابوں میں جو داخل مشکوٰۃ ہیں تین سو چھیالیس مرتبہ مختلف مقامات میں توفی کا لفظ آیا ہے اور ممکن ہے کہ میرے شمار کرنے میں بعض توفی کے لفظ رہ بھی گئے ہوں لیکن پڑھنے اور زیر نظر آجانے سے ایک بھی لفظ باہر نہیں رہا۔ اور جس قدر وہ الفاظ توفی کے ان کتابوں میں آئے ہیں خواہ وہ ایسا لفظ ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے نکلا ہے یا ایسا ہے جو کسی صحابی نے منہ سے نکالا ہے تمام جگہ وہ الفاظ موت اور قبض رُوح کے معنے میں ہی آئے ہیں۔ اور چونکہ مَیں نے ان کتابوں کو بڑی کوشش اور جانکاہی سے سطر سطر پر نظر ڈال کر دیکھ لیا ہے اس لئے میں دعوٰی سے اور شرط کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہریک جگہ جو توفی کا لفظ ان کتابوں کی احادیث میں آیا ہے اس کے بجز موت اور قبض روح کے اور کوئی معنے نہیں۔ اور ان کتابوں سے بطور استقراء کے ثابت ہوتا ہے کہ بعد بعثت اخیر عمر تک جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم زندہ رہے کبھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے توفی کا لفظ بغیر معنی موت اور قبض رُوح کے کسی دوسرے معنی کے لئے ہرگز استعمال نہیں کیا اور نہ کبھی دوسرے معنی کا لفظ زبان مبارک پر جاری ہوا ....

...... امام **محمد اسمٰعیل بخاری** نے اسجگہ اپنی صحیح میں ایک لطیف نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے جس سے معلوم ہوا کہ کم سے کم **سات ہزار مرتبہ** توفی کا لفظ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے بعثت کے بعد اخیر عمر تک نکلا ہے اور ہریک لفظ توفی کے معنے قبض رُوح اور موت تھی۔ سو یہ نکتہ بخاری کا منجملہ ان نکات کے ہے جن سے حق کے طالبوں کو امام بخاری کا مشکور و ممنون ہونا چاہیئے۔

(ازالہ اوہام ص ۴۸۳-۴۸۵)

اگر کوئی شخص قرآن کریم سے یا کسی حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یا اشعار و قصائد و نظم و نثر قدیم و جدید عرب سے یہ ثبوت پیش کرے کہ کسی جگہ توفّی کا لفظ

خدا تعالیٰ کا فعل ہونے کی حالت میں جو ذوی الروح کی نسبت استعمال کیا گیا ہو وہ بجز قبض روح اور وفات دینے کے کسی اور معنوں پر بھی اطلاق پا گیا ہے یعنی قبض جسم کے معنوں میں بھی مستعمل ہوا ہے تو میں اللہ جلّ شانہٗ کی قسم کھا کر اقرار صحیح شرعی کرتا ہوں کہ ایسے شخص کو اپنا کوئی حصہ ملکیت کا فروخت کرکے مبلغ ہزار روپیہ نقد دونگا اور آئندہ اس کی کمالات حدیث دانی اور قرآن دانی کا اقرار کرونگا۔

(ازالہ اوہام ص ۵۰۳)

قرآن شریف ہی تصریح ذکر کر چکا ہے جبکہ اُس نے صاف لفظوں میں فرما دیا کہ کوئی نبی نہیں آیا جو فوت نہ ہوا ہو۔

مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَإِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ
انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ۔ وَمَا
جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خَالِدِيْنَ۔

اب ظاہر ہے کہ باوجود ان تمام آیات کے جو باآواز بلند مسیح کی موت پر شہادت دے رہی ہیں پھر بھی مسیح کو زندہ خیال کرنا اور یہ اعتقاد رکھنا کہ برخلاف مفہوم آیت وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ مسیح جسم خاکی کے ساتھ دوسرے آسمان میں بغیر حاجتِ طعام کے یونہی فرشتوں کی طرح زندہ ہے درحقیقت خدا تعالیٰ کے پاک کلام سے روگردانی ہے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ اگر مسیح اسی جسم خاکی کے ساتھ آسمان پر زندہ ہے تو خدا تعالیٰ کا آیت ممدوحہ بالا میں یہ دلیل پیش کرنا کہ یہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اگر **فوت** ہو گیا تو اس کی نبوت پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ ابتدا سے سارے نبی مرتے ہی آئے ہیں بالکل نکمّی اور لغو بلکہ خلاف واقعہ ٹھہر جائیگی اور خدا تعالیٰ کی شان اس سے بلند ہے کہ جھوٹ بولے اور خلاف واقعہ کہے۔

(ازالہ اوہام ص ۱۷۷-۱۷۸)

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ۔
اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (سورۃ النحل الجزو ۱۴)

یعنی جو لوگ بغیر اللہ کے پرستش کئے جاتے اور پکارے جاتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے بلکہ آپ پیدا شدہ ہیں۔ مر چکے ہیں زندہ بھی تو نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ کب اُٹھائے جائیں گے۔

دیکھو یہ آیتیں کسقدر صراحت سے مسیح اور ان سب انسانوں کی وفات پر دلالت کر رہی ہیں

جن کو یہود اور نصاریٰ اور بعض فرقے عرب کے اپنا معبود ٹھہراتے تھے اور اُن سے دُعائیں مانگتے تھے ۔ اگر اب بھی آپ لوگ مسیح ابن مریم کی وفات کے قائل نہیں ہوتے تو سیدھے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہمیں قرآن کریم کے ماننے میں کلام ہے ۔

(ازالہ اوہام ص۳۳۱)

سوال :۔ قرآن شریف سے اگرچہ مسیح کی موت ثابت ہوتی ہے مگر اس موت کا کوئی وقت خاص تو ثابت نہیں ہوتا ۔ پس تعارض حدیث اور قرآن کا دُور کرنے کے لئے بجز اس کے اور کیا راہ ہے کہ اس موت کا زمانہ وہ قرار دیا جائے کہ جب پھر حضرت مسیح نازل ہونگے ۔

اما الجواب ۔ پس واضح ہو کہ قرآن شریف کی نصوصِ بیّنہ اسی بات پر بصراحت دلالت کر رہی ہیں کہ مسیح اپنے اسی زمانہ میں فوت ہو گیا ہے جس زمانہ میں وہ بنی اسرائیل کے مفسد فرقوں کی اصلاح کے لئے آیا تھا ۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے ۔ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ۔ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اب اسجگہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ پہلے لکھا ہے اور رَافِعُکَ بعد اس کے بیان فرمایا ہے ۔ جس سے ثابت ہوا کہ وفات پہلے ہوئی اور رفع بعد از وفات ہوا ۔ اور پھر اور ثبوت یہ ہے کہ اس پیشگوئی میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے کہ میں تیری وفات کے بعد تیرے متبعین کو تیرے مخالفوں پر جو یہودی ہیں قیامت کے دن تک غالب رکھوں گا ۔ اب ظاہر ہے اور تمام عیسائی اور مسلمان اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ یہ پیشگوئی حضرت مسیح کے بعد اسلام کے ظہور تک بخوبی پوری ہو گئی کیونکہ خدا تعالیٰ نے یہودیوں کو ان لوگوں کی رعیت اور ماتحت کر دیا جو عیسائی یا مسلمان ہیں اور آج تک صدہا برسوں سے وہ ماتحت چلے آتے ہیں ۔ یہ تو نہیں کہ حضرت مسیح کے نزول کے بعد پھر ماتحت ہونگے ۔ ایسے معنے تو بہ بداہت فاسد ہیں ۔

دیکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف میں یہ بھی آیت ہے جو حضرت مسیح کی زبان سے اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے ۔ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّ بَرًّاۢ بِوَالِدَتِیْ ۔ یعنی حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے فرمایا ہے نماز پڑھتا رہ اور زکوٰۃ دیتا رہ اور اپنی والدہ پر احسان کرتا رہ جب تک تُو زندہ ہے ۔ اب ظاہر ہے کہ ان تمام تکلیفاتِ شرعیہ کا آسمان پر بجا لانا محال ہے ۔ جو شخص مسیح کی نسبت یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ زندہ مع جسدہٖ آسمان کی طرف اُٹھایا گیا اسکو اس آیت موصوفہ بالا کے منشا کے موافق یہ بھی ماننا پڑے گا کہ تمام احکام شرعی جو انجیل اور توریت

کی رُو سے انسان پر واجب العمل ہوتے ہیں وہ حضرت مسیح پر اب بھی واجب ہیں۔ حالانکہ یہ تکلیف مالایطاق ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو خدا تعالےٰ یہ حکم دیوے کہ اے عیسیٰ جب تک تو زندہ ہے تیرے پر واجب ہے کہ تو اپنی والدہ کی خدمت کرتا رہے اور پھر آپ ہی اس کے زندہ ہونے کی حالت میں ہی اس کو والدہ سے جدا کر دیوے۔ اور تا بحیات زکوٰۃ کا حکم دیوے اور پھر زندہ ہونے کی حالت میں ہی ایسی جگہ پہنچا دے جس جگہ نہ وہ آپ زکوٰۃ دے سکتے ہیں اور نہ زکوٰۃ کیلئے کسی دوسرے کو نصیحت کر سکتے ہیں اور صلوٰۃ کے لئے تاکید کرے اور جماعت مومنین سے دُور پھینک دیوے جن کی رفاقت صلوٰۃ کی تکمیل کے لئے ضروری تھی۔ کیا ایسے اٹھائے جانے سے بجز بہت سے نقصان عمل اور ضائع ہونے حقوق عباد اور فوت ہونے خدمت امر معروف اور نہی منکر کے کچھ اور بھی فائدہ ہوا؟ اگر یہی اٹھارہ سو اکانوے برس زمین پر زندہ رہتے تو ان کی ذات جامع البرکات سے کیا کیا نفع خلق اللہ کو پہنچتا۔ لیکن ان کے اوپر تشریف لے جانے سے بجز اس کے اور کونسا نتیجہ نکلا کہ ان کی اُمت بگڑ گئی اور وہ خدمات نبوت کے بجالانے سے بکلّی محروم رہ گئے۔

(ازالہ اوہام ص ۲۳۰-۲۳۲)

ہم بخوبی ثابت کر چکے ہیں کہ یہ عقیدہ کہ مسیح جسم کے ساتھ آسمان پر چلا گیا تھا قرآن شریف اور احادیث صحیحہ سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ صرف بیہودہ اور بے اصل اور متناقض روایات پر اسکی بنیاد معلوم ہوتی ہے مگر اس فلسفی الطبع زمانہ میں جو عقلی شائستگی اور ذہنی تیزی اپنے ساتھ رکھتا ہے ایسے عقیدوں کے ساتھ دینی کامیابی کی اُمید رکھنا ایک بڑی بھاری غلطی ہے۔ اگر افریقہ کے ریگستان یا عرب کے صحرانشین اُمیوں اور بدوؤں میں یا سمندر کے جزیروں کے اور وحشی لوگوں کی جماعتوں میں یہ بے سروپا باتیں پھیلائیں تو شائد آسانی سے پھیل سکیں لیکن ہم ایسی تعلیمات کو جو عقل اور تجربہ اور طبعی اور فلسفہ سے بکلّی مخالف اور نیز ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ثابت نہیں ہو سکتیں بلکہ اُن کے مخالف حدیثیں ثابت ہو رہی ہیں تعلیمیافتہ لوگوں میں ہرگز پھیلا نہیں سکتے اور نہ یوروپ امریکہ کے محقق طبع لوگوں کی طرف جو اپنے دین کے لغویات سے دست بردار ہو رہے ہیں بطور ہدیہ و تحفہ بھیج سکتے ہیں۔ جن لوگوں کے دل و دماغ کو نئے علوم کی روشنی نے انسانی قوتوں میں ترقی دیدی ہے وہ ایسی باتوں کو کیونکر تسلیم کر لیں گے جن میں سراسر خدائے تعالیٰ کی توہین اور اس کی توحید کی اہانت اور اس کے قانون قدرت کا ابطال اور اس کے کتابی اصول کی تنسیخ پائی جاتی ہے۔

اسجگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیح کا جسم کے ساتھ آسمان سے اُترنا اس کے جسم کے ساتھ

چڑھنے کی فرع ہے لہذا یہ بحث بھی (کہ مسیح اسی جسم کے ساتھ آسمان سے اُتریگا جو دنیا میں اسے حاصل تھا) اس دوسری بحث کی فرع ہوگی جو مسیح جسم کے ساتھ آسمان پر اُٹھایا گیا تھا جبکہ یہ بات قرار پائی تو اوّل ہمیں اس عقیدہ پر نظر ڈالنی چاہیئے جو اصل قرار دیا گیا ہے کہ کہاں تک وہ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے۔ کیونکہ اگر اصل کا کماحقّہٗ تصفیہ ہو جائیگا تو پھر اس کی فرع ماننے میں کچھ تامل نہیں ہوگا اور کم سے کم امکانی طور پر ہم قبول کر سکیں گے کہ جبکہ ایک شخص کا جسم خاکی کے ساتھ آسمان پر چلے جانا ثابت ہوگیا ہے تو پھر اسی جسم کے ساتھ واپس آنا اس کا کیا مشکل ہے۔ لیکن اگر اصل بحث قرآن اور حدیث سے ثابت نہ ہو سکے بلکہ حقیقت امر اس کے مخالف ثابت ہو تو ہم فرع کو کسی طرح سے تسلیم نہیں کر سکتے۔ اگر فرع کی تائید میں بعض حدیثیں بھی ہونگی تو ہم پر فرض ہوگا کہ ان کو اصل سے تطبیق دینے کے لئے کوشش کریں۔

(ازالہ اوہام صـ۱۳۵-۱۳۶)

زمانہ حال کے مسلمان ایک طرف تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور زمین میں مدفون ہونے کا اقرار کر کے پھر اس بات کے بھی اقراری ہو کر کہ **مسیح** اب تک زندہ ہے عیسائیوں کے ہاتھ میں ایک تحریری اقرار اپنا دے دیتے ہیں کہ مسیح اپنے خواص میں عام انسانوں کے خواص بلکہ تمام انبیاء کے خواص سے **مستثنٰے** اور نرالا ہے۔ کیونکہ جب کہ ایک **افضل البشر** جو مسیح سے چھ سو برس پیچھے آیا تھوڑی سی عمر پا کر فوت ہو گیا اور تیرہ سو برس اس نبی کریم کے فوت ہونے پر گذر بھی گئے مگر مسیح اب تک فوت ہونے میں نہیں آیا تو کیا اس سے یہی ثابت ہوا یا کچھ اور کہ مسیح کی حالت لوازم بشریت سے بڑھی ہوئی ہے۔ پس حال کے علماء اگرچہ بظاہر صورت شرک سے **بیزاری** ظاہر کرتے ہیں مگر مشرکوں کو مدد دینے میں کوئی دقیقہ انہوں نے اُٹھا نہیں رکھا۔ غضب کی بات ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ تو اپنی پاک کلام میں حضرت مسیح کی وفات ظاہر کرے اور یہ لوگ اب تک اس کو زندہ سمجھ کر ہزارہا اور بے شمار فتنے اسلام کے لئے برپا کر دیں اور مسیح کو آسمان کا حیّ و قیّوم اور سیّد الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کو زمین کا مردہ ٹھہراویں۔ حالانکہ مسیح کی گواہی قرآن کریم میں اس طرح پر لکھی ہے کہ مُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ یعنی میں ایک رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد یعنی میرے مرنے کے بعد آئیگا اور نام اس کا احمد ہوگا۔ پس اگر مسیح اب تک اس عالم جسمانی سے گذر نہیں گیا تو اس سے لازم آتا ہے کہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم بھی اب تک اس عالم میں

تشریف فرما نہیں ہوئے ۔

(آئینہ کمالات اسلام صـ ۴۱-۴۲)

یہ بات بالکل غیر ممکن ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں کیونکہ اس کا ثبوت نہ تو قرآن شریف سے ملتا ہے اور نہ حدیث سے اور نہ عقل اس کو باور کر سکتی ہے بلکہ قرآن اور حدیث اور عقل تینوں اس کے مکذب ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف نے کھول کر بیان فرما دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں اور معراج کی حدیث نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ وہ فوت شدہ انبیاء علیہم السلام کی رُوحوں میں جا ملے ہیں اور اس عالم سے بکلّی انقطاع کر گئے۔ اور عقل ہمیں بتلا رہی ہے کہ اس جسم فانی کے لئے یہ سنّت اللہ نہیں کہ آسمان پر چلا جائے اور باوجود زندہ مع الجسم ہونے کے کھانے پینے اور تمام لوازمات حیات سے الگ ہو کر اُن رُوحوں میں جا ملے جو موت کا پیالہ پی کر دوسرے جہان میں پہنچ گئے ہیں عقل کے پاس اس کا کوئی نمونہ نہیں۔ پھر ماسوا اسکے جیسا کہ یہ عقیدہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے آسمان پر چڑھنے کا قرآن شریف کے بیان کے مخالف ہے ایسا ہی اُن کے آسمان سے اُترنے کا عقیدہ بھی قرآن کے بیان سے منافات کلّی رکھتا ہے کیونکہ قرآن شریف جیسا کہ آیت فلمّا توفیتنی اور آیت قد خلت من قبله الرسل میں حضرت عیسیٰ کو مار چکا ہے ایسا ہی آیت الیوم اکملت لکم دینکم اور آیت ولکن رسول الله وخاتم النبیین میں صریح نبوت کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم کر چکا ہے اور صریح لفظوں میں فرما چکا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں جیسا کہ فرمایا ہے ولکن رسول الله وخاتم النبیین۔ لیکن وہ لوگ جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو دوبارہ دنیا میں واپس لاتے ہیں اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ بدستور اپنی نبوت کے ساتھ دنیا میں آئیں گے اور برابر پینتالیس برس تک اُن پر جبرائیل علیہ السلام وحی نبوت لیکر نازل ہوتا رہے گا۔ اب بتلاؤ کہ اُن کے عقیدہ کے موافق ختم نبوت اور ختم وحی نبوت کہاں باقی رہا بلکہ ماننا پڑا کہ خاتم الانبیاء حضرت عیسیٰ ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ صـ ۸۲-۸۳)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اس آیت سے استدلال کرنا کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ صاف دلالت کرتا ہے کہ اُن کے نزدیک حضرت عیسےٰ علیہ السلام فوت ہو چکے تھے کیونکہ اگر اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ پہلے نبیوں میں سے بعض نبی تو

جناب خاتم الانبیاء کے عہد سے پیشتر فوت ہو گئے ہیں۔ مگر بعض اُن میں سے زمانہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تک فوت نہیں ہوئے تو اس صورت میں یہ آیت قابل استدلال نہیں رہتی کیونکہ ایک ناتمام دلیل جو ایک قاعدہ کلیّہ کی طرح نہیں اور تمام افراد گذشتہ پر ایک دائرہ کی طرح محیط نہیں وہ دلیل کے نام سے موسوم نہیں ہو سکتی پھر اس سے حضرت ابوبکر کا استدلال لغو ٹھہرتا ہے۔ اور یاد رہے کہ یہ دلیل جو حضرت ابوبکر نے تمام گذشتہ نبیوں کی وفات پر پیش کی کسی صحابی سے اس کا انکار مروی نہیں۔ حالانکہ اس وقت سب صحابی موجود تھے اور سب سُنکر خاموش ہو گئے۔ اس سے ثابت ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا تھا اور صحابہ کا اجماع حجت ہے جو کبھی ضلالت پر نہیں ہوتا۔ سو حضرت ابوبکر کے احسانات میں سے جو اس امت پر ہیں ایک یہ بھی احسان ہے کہ انہوں نے اس غلطی سے بچنے کیلئے جو آئندہ زمانہ کے لئے پیش آنے والی تھی اپنی خلافت حقّہ کے زمانہ میں سچائی اور حق کا دروازہ کھول دیا۔ اور ضلالت کے سیلاب پر ایک ایسا مضبوط بند لگا دیا کہ اگر اس زمانہ کے مولویوں کے ساتھ تمام جنیات بھی شامل ہو جائیں تب بھی وہ اس بند کو توڑ نہیں سکتے۔ سو ہم دُعا کرتے ہیں کہ خدا تعالٰے حضرت ابوبکر کی جان پر ہزاروں رحمتیں نازل کرے جنہوں نے خدا تعالیٰ سے پاک الہام پاکر اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ مسیح فوت ہو گیا ہے۔

(تریاق القلوب ص ۲۸۳-۲۸۵ حاشیہ)

قرآن شریف نے صاف صاف لفظوں میں فرما دیا ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں دیکھو آیت فلما توفّیتنی صاف ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے ہیں اور صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور نیز حدیث نبوی سے اس بات کا ثبوت دیدیا ہے کہ اسجگہ توفّی کے معنے مار دینے کے ہیں اور یہ کہنا بے جا ہے کہ "یہ لفظ توفیتنی جو ماضی کے صیغہ میں آیا ہے دراصل اسجگہ مضارع کے معنے دیتا ہے۔ یعنی ابھی نہیں مرے بلکہ آخری زمانہ میں جا کر مریں گے"۔ کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جناب الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ میری امت کے لوگ میری زندگی میں نہیں بگڑے بلکہ میری موت کے بعد بگڑے ہیں۔ پس اگر فرض کیا جائے کہ اب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اب تک نصاریٰ بھی نہیں بگڑے۔ کیونکہ آیت میں صاف طور پر بتلایا گیا نصاریٰ کا بگڑنا حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی موت کے بعد ہے۔ اور اس سے زیادہ اور کوئی سخت بے ایمانی نہیں ہو گی کہ ایسی نصّ صریح سے انکار کیا جائے۔

اب جس حالت میں قرآن شریف کے صاف لفظوں سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی موت ہی ثابت ہوتی ہے اور دوسری طرف قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا نام خاتم النبیین رکھتا ہے اور حدیث ان دونوں باتوں کی مصدق ہے اور ساتھ ہی حدیث نبوی یہ بھی بتلا رہی ہے کہ آنیوالا مسیح اِس امت میں سے ہوگا گو کسی قوم کا ہو تو اسجگہ طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ باوجود نصوص صریح کے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے وفات اور آنے والے مسیح کے اُمتی ہونے پر دلالت کرتی تھیں پھر کیوں اس بات پر **اجماع** ہو گیا کہ درحقیقت حضرت عیسٰی علیہ السلام آخری زمانہ میں آسمان سے اُتر آئیں گے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس امر میں جو شخص اجماع کا دعوٰی کرتا ہے وہ سخت نادان یا سخت خیانت پیشہ اور دروغگو ہے۔ کیونکہ صحابہ کو اس پیشگوئی کی تفاصیل کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بلا شبہ بموجب آیت فلمّا توفّیتنی اس بات پر ایمان لاتے تھے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں۔ تبھی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اس بات کا احساس کر کے کہ بعض لوگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات میں شک رکھتے ہیں زور سے یہ بیان کیا کہ کوئی بھی نبی زندہ نہیں ہے سب فوت ہو گئے۔ اور یہ آیت پڑھی کہ قد خلت من قبلہ الرسل اور کسی نے اُن کے اس بیان پر انکار نہ کیا پھر ماسوا اس کے امام مالک جیسا امام عالم حدیث و قرآن و متّقی اس بات کا قائل ہے کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام فوت ہو گئے۔ ایسا ہی امام ابن حزم جن کی جلالت شان محتاج بیان نہیں قائل وفاتِ مسیح ہیں۔ اسی طرح امام بخاری جن کی کتاب بعد کتاب اللہ اصح الکتب ہے وفاتِ مسیح علیہ السلام کے قائل ہیں۔ ایسا ہی فاضل و محدّث و مفسّر ابن تیمیہ و ابن قیّم جو اپنے اپنے وقت کے امام ہیں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات کے قائل ہیں۔ ایسا ہی رئیس المتصوّفین شیخ محی الدین ابن العربی صریح اور صاف لفظوں سے اپنی تفسیر میں وفات حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تصریح فرماتے ہیں۔ اسی طرح اور بڑے بڑے فاضل اور محدّث اور مفسّر برابر یہی گواہی دیتے آئے ہیں اور فرقہ معتزلہ کے تمام اکابر اور امام یہی مذہب رکھتے ہیں۔ پھر کسقدر افتراء ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا زندہ آسمان پر جانا اور پھر واپس آنا اجماعی عقیدہ قرار دیا جائے بلکہ یہ اس زمانہ کے عوام الناس کے خیالات ہیں جبکہ ہزارہا بدعات دین میں پیدا ہو گئی تھیں اور یہ وسط کا زمانہ تھا جس کا نام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فیج اعوج رکھا ہے اور فیج اعوج کے لوگوں کی نسبت فرمایا کہ لیسوا منی ولست منھم .... ان لوگوں نے یہ عقیدہ اختیار کر کے

چار طور سے قرآن شریف کی مخالفت کی ہے اور پھر اگر پوچھا جائے کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام اپنے جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر چڑھ گئے تھے؟ تو نہ کوئی آیت پیش کر سکتے ہیں اور نہ کوئی حدیث دکھلا سکتے ہیں صرف **نزول** کے لفظ کے ساتھ اپنی طرف سے **آسمان** کا لفظ ملا کر عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ کسی حدیث مرفوع متصل میں آسمان کا لفظ پایا نہیں جاتا۔ اور نزول کا لفظ محاورات عرب میں مسافر کے لئے آتا ہے اور نزیل مسافر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ملک کا بھی یہی محاورہ ہے کہ ادب کے طور پر کسی وارد شہر کو پوچھا کرتے ہیں کہ آپ کہاں اُترے ہیں اور اس بول چال میں کوئی بھی یہ خیال نہیں کرتا کہ یہ شخص آسمان سے اُترا ہے۔ اگر اسلام کے تمام فرقوں کی حدیث کی کتابیں تلاش کرو تو صحیح حدیث تو کیا وضعی حدیث بھی ایسی نہیں پاؤ گے جس میں یہ لکھا ہو کہ حضرت عیسیٰ جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر چلے گئے تھے اور پھر کسی زمانہ میں زمین کی طرف واپس آئینگے اگر کوئی حدیث پیش کرے تو ہم ایسے شخص کو بیس ہزار روپیہ تک تاوان دے سکتے ہیں اور توبہ کرنا اور تمام اپنی کتابوں کا جلا دینا اس کے علاوہ ہوگا۔ جس طرح چاہیں تسلّی کر لیں۔

(کتاب البریہ ص ۲۱۹-۲۲۶ حاشیہ)

یہ خیال کہ تناسخ کے طور پر حضرت مسیح ابن مریم دنیا میں آئیں گے سب سے زیادہ ردّی اور شرم کے لائق ہے۔ تناسخ کے ماننے والے تو ایسے شخص کا دنیا میں دوبارہ آنا تجویز کرتے ہیں جس کے تزکیہ نفس میں کچھ کسر رہ گئی ہو۔ لیکن جو لوگ بکلّی مراحل کمالات طے کر کے اس دنیا سے سفر کرتے ہیں وہ بزعم ان کے ایک مدّت دراز کے لئے مکتی خانہ میں داخل کئے جاتے ہیں۔ ماسوائے اس کے ہمارے عقیدہ کے موافق خدائے تعالیٰ کا بہشتیوں کے لئے یہ وعدہ ہے کہ وہ کبھی اُس سے نکالے نہیں جائیں گے۔ پھر تعجب کہ ہمارے علماء کیوں حضرت مسیح کو اس فردوس بریں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ آپ ہی یہ قصّے سُناتے ہیں کہ حضرت ادریس جب فرشتہ ملک الموت سے اجازت لیکر بہشت میں داخل ہوئے تو ملک الموت نے چاہا کہ پھر باہر آویں لیکن حضرت ادریس نے باہر آنے سے انکار کیا اور یہ آیت سُنادی وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ۔ اب میں پُوچھتا ہوں کہ کیا حضرت مسیح اس آیت سے فائدہ حاصل کرنے کے مستحق نہیں ہیں؟ کیا یہ آیت اُنکے کے حق میں منسوخ کا حکم رکھتی ہے؟

(ازالہ اوہام ص ۴۷-۴۸)

میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان کا منکر نہیں گو خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ **مسیح محمدی مسیح موسوی سے**

افضل ہے لیکن تاہم مَیں مسیح ابن مریم کی بہت عزّت کرتا ہوں کیونکہ مَیں روحانیت کی رُو سے اسلام میں **خاتم الخلفاء** ہوں جیسا کہ مسیح ابن مریم اسرائیلی سلسلہ کے لئے خاتم الخلفاء تھا۔ موسیٰ کے سلسلہ میں ابن مریم مسیح موعود تھا اور محمدی سلسلہ میں مَیں مسیح موعود ہوں۔ سو مَیں اس کی بہت عزّت کرتا ہوں جس کا ہمنام ہوں۔ اور مفسد اور مفتری ہے وہ شخص جو مجھے کہتا ہے کہ مَیں مسیح ابن مریم کی عزّت نہیں کرتا بلکہ مسیح تو مسیح مَیں تو اس کے چاروں بھائیوں کی بھی عزّت کرتا ہوں کیونکہ پانچوں ایک ہی ماں کے بیٹے ہیں۔ نہ صرف اسی قدر بلکہ مَیں تو حضرت مسیح کی دونوں حقیقی ہمشیروں کو بھی مقدسہ سمجھتا ہوں کیونکہ یہ سب بزرگ مریم بتول کے پیٹ سے ہیں۔

(کشتی نوح ص۲۵)

اس بات کو ناظرین یاد رکھیں کہ عیسائی مذہب کے ذکر میں ہمیں اسی طرز سے کلام کرنا ضروری تھا جیسا کہ وہ ہمارے مقابل پر کرتے ہیں۔ عیسائی لوگ درحقیقت ہمارے اس **عیسیٰ علیہ السلام** کو نہیں مانتے جو اپنے تئیں صرف بندہ اور نبی کہتے تھے اور پہلے نبیوں کو راستباز جانتے تھے اور آنے والے نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر سچے دل سے ایمان رکھتے تھے۔ اور آنحضرتؐ کے بارے میں پیشگوئی کی تھی بلکہ ایک شخص **یسوع** نام کو مانتے ہیں جسکا **قرآن** میں ذکر نہیں اور کہتے ہیں کہ اس شخص نے خدائی کا دعویٰ کیا اور پہلے نبیوں کو بٹ مار وغیرہ ناموں سے یاد کرتا تھا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ شخص ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا سخت مکذّب تھا اور اُس نے یہ بھی پیشگوئی کی تھی کہ میرے بعد سب جھوٹے ہی آئیں گے۔ سو آپ لوگ خوب جانتے ہیں کہ قرآن شریف نے ایسے شخص پر ایمان لانے کے لئے ہمیں تعلیم نہیں دی بلکہ ایسے لوگوں کے حق میں صاف فرما دیا ہے کہ اگر کوئی انسان ہو کر خدائی کا دعویٰ کرے تو ہم اس کو جہنم میں ڈالیں گے اسی سبب سے ہم نے عیسائیوں کے یسوع کے ذکر کرنے کے وقت اس ادب کا لحاظ نہیں رکھا جو سچّے آدمی کی نسبت رکھنا چاہیئے۔ ایسا آدمی اگر نابینا نہ ہوتا تو یہ نہ کہتا کہ میرے بعد سب جھوٹے ہی آئیں گے۔ اور اگر نیک اور ایماندار ہوتا تو خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔ پڑھنے والوں کو چاہیئے کہ ہمارے بعض سخت الفاظ کا مصداق حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو نہ سمجھ لیں بلکہ وہ کلمات اس یسوع کی نسبت لکھے گئے ہیں جس کا قرآن و حدیث میں نام و نشان نہیں۔

(تبلیغ رسالت جلد پنجم ص۸)

ہم اس بات کو افسوس سے ظاہر کرتے ہیں کہ ایک ایسے شخص کے مقابل پر یہ نمبر نور القرآن کا جاری ہوا ہے جس نے بجائے مہذبانہ کلام کے ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت گالیوں سے کام لیا ہے اور اور اپنی ذاتی خباثت سے اس امام الطیبین و سید المطہرین پر سراسر افترا سے ایسی تہمتیں لگائی ہیں کہ ایک پاک دل انسان کا ان کے سننے سے بدن کانپ جاتا ہے۔ لہٰذا محض ایسے یا وہ لوگوں کے علاج کے لئے جواب ترکی بہ ترکی دینا پڑا۔

ہم ناظرین پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ حضرت مسیح علیہ السلام پر نہایت نیک عقیدہ ہے اور ہم دل سے یقین رکھتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے سچے نبی اور اس کے پیارے تھے اور ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ وہ جیسا کہ قرآن شریف میں ہمیں خبر دیتا ہے اپنی نجات کے ہمارے سید و مولیٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پر دل و جان سے ایمان لائے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے صدہا خادموں میں سے ایک مخلص خادم وہ بھی تھے۔ پس ہم اُن کی حیثیت کے موافق ہر طرح اُن کا ادب ملحوظ رکھتے ہیں لیکن عیسائیوں نے جو ایک ایسا یسوع پیش کیا ہے جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور بجز اپنے نفس کے تمام اوّلین آخرین کو لعنتی سمجھتا تھا۔ یعنی ان بدکاریوں کا مرتکب خیال کرتا تھا جن کی سزا لعنت ہے ایسے شخص کو ہم بھی رحمت الٰہی سے بے نصیب سمجھتے ہیں۔ قرآن نے ہمیں اس گستاخ اور بدزبان یسوع کی خبر نہیں دی۔ اُس شخص کی چال چلن پر ہمیں نہایت حیرت جس نے خدا پر مرنا جائز رکھا اور آپ خدائی کا دعویٰ کیا اور ایسے پاکوں کو جو ہزارہا درجہ اس سے بہتر تھے گالیاں دیں۔ سو ہم نے اپنی کلام میں ہر جگہ عیسائیوں کا فرضی یسوع مراد لیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کا ایک عاجز بندہ عیسیٰ ابن مریم جو نبی تھا جس کا ذکر قرآن میں ہے وہ ہمارے درشت مخاطبات میں ہرگز مراد نہیں۔ اور یہ طریق ہم نے برابر چالیس برس تک پادری صاحبوں کی گالیاں سُنکر اختیار کیا ہے۔ بعض نادان مولوی جن کو اندھے اور نابینا کہنا چاہیئے عیسائیوں کو معذور رکھتے ہیں کہ وہ بیچارے کچھ بھی مُنہ سے نہیں بولتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ بے ادبی نہیں کرتے لیکن یاد رہے کہ درحقیقت پادری صاحبان تحقیر اور توہین اور گالیاں دینے میں اوّل نمبر پر ہیں۔ ہمارے پاس ایسے پادریوں کی کتابوں کا ایک ذخیرہ ہے جنہوں نے اپنی عبارت کو صدہا گالیوں سے بھر دیا ہے جس مولوی کی خواہش ہو وہ آکر دیکھ لیوے۔ اور یاد رہے کہ آئندہ جو پادری صاحب گالی دینے کے طریق کو چھوڑ کر ادب سے کلام کرینگے ہم بھی ان کے ساتھ ادب سے پیش آویں گے اب تو وہ اپنے یسوع پر آپ حملہ کر رہے ہیں کہ کسی طرح سبّ و شتم سے باز ہی نہیں آتے۔ ہم

سُنتے سُنتے تھک گئے۔ اگر کوئی کسی کے باپ کو گالی دے تو کیا اس مظلوم کا حق نہیں کہ اُس کے باپ کو بھی گالی دے اور ہم نے تو جو کچھ کہا واقعی کہا۔ وَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔

خاکسار غلام احمد ۲۰ دسمبر ۱۸۹۵ء

(نور القرآن ۲ ٹائیٹل)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں بدبخت یہودیوں نے یہ چاہا کہ اُن کو ہلاک کریں۔ اور نہ صرف ہلاک بلکہ اُن کی پاک رُوح پر صلیبی موت سے لعنت کا داغ لگادیں کیونکہ توریت میں لکھا تھا کہ جو شخص لکڑی پر یعنی صلیب پر مارا جائے وہ لعنتی ہے۔ یعنی اس کا دل پلید اور ناپاک اور خدا کے قرب سے دُور جا پڑتا ہے۔ اور راندۂ درگاہِ الٰہی اور شیطان کی مانند ہو جاتا ہے اسلئے لعین شیطان کا نام ہے۔ اور یہ نہایت بدمنصوبہ تھا کہ جو حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت سوچا گیا تھا تا اس سے وہ نالائق قوم یہ نتیجہ نکالے کہ یہ شخص پاک دل اور سچا نبی اور خدا کا پیارا نہیں ہے بلکہ نعوذ باللہ لعنتی ہے جس کا دل پاک نہیں ہے۔ اور جیسا کہ مفہوم لعنت کا ہے وہ خدا سے بجان و دل بیزار اور خدا اس سے بیزار ہے۔ لیکن خدائے قادر و قیوم نے بدنیت یہودیوں کو اس ارادہ سے ناکام اور نامراد رکھا اور اپنے پاک نبی علیہ السلام کو نہ صرف صلیبی موت سے بچایا بلکہ اس کو ایک سو بیس برس تک زندہ رکھ کر تمام دشمن یہودیوں کو اس کے سامنے ہلاک کیا ہاں خدا تعالیٰ کی اس قدیم سنّت کے موافق کہ کوئی اولوالعزم نبی ایسا نہیں گذرا جس نے قوم کی ایذا کی وجہ سے ہجرت نہ کی ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی تین برس کی تبلیغ کے بعد صلیبی فتنہ سے نجات پاکر ہندوستان کی طرف ہجرت کی اور یہودیوں کی دوسری قوموں کو جو بابل کے تفرقہ کے زمانہ سے ہندوستان اور کشمیر اور تبّت میں آئے ہوئے تھے خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچا کر آخر کار خاکِ کشمیر جنّت نظیر میں انتقال فرمایا اور سری نگر خانیار کے محلہ میں باعزاز تمام دفن کئے گئے۔ آپ کی قبر بہت مشہور ہے۔

(رازِ حقیقت ص ۲-۳)

یہود تو حضرت عیسیٰ کے معاملہ میں اور اُن کی پیشگوئیوں کے بارے میں ایسے قوی اعتراض رکھتے ہیں کہ ہم بھی اُن کا جواب دینے میں حیران ہیں۔ بغیر اس کے کہ یہ کہدیں کہ ضرور عیسیٰ نبی ہے کیونکہ قرآن نے اُس کو نبی قرار دیا ہے اور کوئی دلیل اُن کی نبوت پر قائم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ابطال نبوت پر کئی دلائل قائم ہیں۔ یہ احسان قرآن کا اُن پر ہے کہ اُن کو بھی نبیوں کے

دفتر میں لکھدیا۔ اسی وجہ سے ہم اُن پر ایمان لائے کہ وہ سچے نبی ہیں اور برگزیدہ ہیں اور اُن تہمتوں سے معصوم ہیں جو اُن پر اور اُن کی ماں پر لگائی گئی ہیں۔ قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ بڑی تہمتیں اُن پر دو تھیں۔

(۱) ایک یہ کہ ان کی پیدائش نعوذ باللہ لعنتی ہے یعنی وہ ناجائز طور پر پیدا ہوئے۔

(۲) دوسرے یہ کہ ان کی موت بھی لعنتی ہے کیونکہ وہ صلیب کے ذریعہ سے مرے ہیں اور توریت میں لکھا تھا کہ جو ولد الزنا ہو وہ ملعون ہے وہ ہرگز بہشت میں داخل نہیں ہوگا اور اس کا خدا کی طرف رفع نہیں ہوگا اور ایسا ہی یہ بھی لکھا تھا کہ جو لکڑی پر لٹکایا جائے یعنی جس کی صلیب کے ذریعہ سے موت ہو وہ بھی لعنتی ہے اور اس کا بھی خدا کی طرف رفع نہیں ہوگا۔ یہ دونوں اعتراض بڑے سخت تھے۔ خدا نے قرآن شریف میں ان دونوں اعتراضات کا ایک ہی جگہ جواب دیا ہے اور وہ یہ ہے۔ وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (الجزو ٦ سورۃ نساء) اس آیت میں دونوں حملوں کا جواب ہے اور خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ نہ تو عیسیٰ کی ناجائز ولادت ہے اور نہ وہ صلیب پر مرا۔ بلکہ وہ دھوکے سے سمجھ لیا گیا کہ مر گیا ہے اس لئے وہ مقبول ہے اور اس کا اور نبیوں کی طرح خدا کی طرف رفع ہوگیا ہے۔ ابتہ کہاں ہیں وہ مولوی جو آسمان پر حضرت عیسیٰ کا جسم پہنچاتے ہیں۔ یہاں تو سب جھگڑا اُن کی رُوح کے متعلق تھا جسم سے اس کو کچھ علاقہ نہیں۔

غرض قرآن شریف نے حضرت مسیح کو سچا قرار دیا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُنکی پیشگوئیوں پر یہود کے سخت اعتراض ہیں جو ہم کسی طرح ان کو دفع نہیں کر سکتے صرف قرآن کے سہارے سے ہم نے مان لیا ہے اور سچے دل سے قبول کیا ہے اور بجز اس کے اُن کی نبوت پر ہمارے پاس کوئی بھی دلیل نہیں۔ عیسائی تو اُن کی خدائی کو روتے ہیں مگر یہاں نبوت بھی اُن کی ثابت نہیں ہو سکتی۔

(اعجاز احمدی صفحہ ۱۳-۱۴)

اگر ظاہر پر فیصلہ کریں تو بے شک حضرت مسیح کی نبوت ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ کذب اور افترا ثابت ہوتا ہے اور کذب بھی ایسا کذب کہ جس کو ایلیا نبی قرار دیا گیا وہ خود ایلیا ہونا منظور نہیں کرتا اور مدعی سُست اور گواہ چُست کا معاملہ نظر آتا ہے۔ مگر چونکہ

قرآن کریم نے حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کر دی ہے اس لئے ہم بہرحال حضرت مسیح کو سچا نبی کہتے اور مانتے ہیں۔ اور اُن کی نبوت سے انکار کرنا کفر صریح قرار دیتے ہیں۔

(ضیاءالحق ص۵۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو عجیب طور پر جاہلوں کا نشانہ ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی کے زمانہ میں تو یہود بے دین نے ان کا نام کافر اور کذاب اور مکّار اور مفتری رکھا اور ان کے رفع روحانی سے انکار کیا۔ اور پھر جب وہ فوت ہو گئے تو ان لوگوں نے جن پر انسان پرستی کی سیرت غالب تھی ان کو خدا بنا دیا۔ اور یہودی تو رفع روحانی سے ہی انکار کرتے تھے اب بمقابل ان کے رفع جسمانی کا اعتقاد ہُوا اور یہ بات مشہور کی گئی کہ وہ مع جسم آسمان پر چڑھ گئے ہیں۔ گویا پہلے نبی تو روحانی طور پر بعد موت آسمان پر چڑھتے تھے مگر حضرت عیسیٰ زندہ ہونے کی حالت میں ہی مع جسم مع لباس مع تمام لوازم جسمانی آسمان پر جا بیٹھے۔ گویا یہ یہودیوں کی ضد اور انکار کا جو رفع روحانی سے منکر تھے نہایت مبالغہ کے ساتھ ایک جواب تراشا گیا اور یہ جواب سراسر نامعقول تھا۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۴۴)

ایک صاحب ہدایت اللہ نام جنہوں نے انکار معجزاتِ عیسوی کا الزام اس عاجز کو دیکر ایک رسالہ میں شائع کیا ہے۔ وہ اپنے زعم میں ہماری کتاب ازالہ اوہام کی بعض عبارتوں سے یہ نکالتے ہیں کہ گویا ہم نعوذ باللہ سرے سے حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات سے منکر ہیں۔ مگر واضح رہے کہ ایسے لوگوں کی اپنی نظر اور فہم کی غلطی ہے۔ ہمیں حضرت مسیح علیہ السلام کے صاحبِ معجزات ہونے سے انکار نہیں۔ بے شک اُن سے بھی بعض معجزات ظہور میں آئے ہیں۔ اور گو انجیل کے دیکھنے سے اُن کے معجزات پر بہت کچھ دھبّہ لگتا ہے جیسا کہ تالاب کے قصّہ اور خود اُنکے بار بار کے انکار سے کہ مَیں صاحبِ معجزات نہیں۔ مگر ہمیں انجیل سے کیا کام قرآن کریم سے بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ بعض نشان ان کو دیئے گئے تھے۔ ہاں ہمارے کم توجہ علماء کی یہ غلطی ہے کہ اُن کی نسبت وہ گمان کرتے ہیں کہ گویا وہ بھی خالق العالمین کی طرح کسی جانور کا قالب تیار کر کے پھر اُس میں پھونک مارتے تھے اور وہ زندہ ہو کر اُڑ جاتا اور مُردہ پر ہاتھ رکھتے تھے اور وہ زندہ ہو کر چلنے پھرنے لگتا تھا۔ اور غیب دانی کی بھی اُن میں طاقت تھی اور اب تک مَرے بھی نہیں مع جسم آسمان پر موجود ہیں۔ اور اگر یہ باتیں جو ان کی طرف نسبت دی گئی ہیں صحیح ہوں تو پھر اُن کے خالق العالم اور عالم الغیب اور محی اموات ہونے میں کیا شک رہا؟ پس اگر اس صورت

میں کوئی عیسائی اُن کی الوہیت پر استدلال کرے اس بنا پر کہ لوازم شئے کا پایا جانا وجودِ شئے کو مستلزم ہے تو ہمارے بھائی مسلمانوں کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ اگر کہیں کہ دُعا سے ایسے معجزات ظہور میں آئے تھے تو یہ کلام الٰہی پر زیادت ہے کیونکہ قرآن کریم سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مثلاً پھونک مارنے سے وہ چیز جو ہیئتِ طیر کی طرح بنائی جاتی تھی اُڑنے لگتی تھی۔ دُعا کا تو قرآن کریم میں کہیں بھی ذکر نہیں اور نہ یہ ذکر ہے کہ اس ہیئتِ طیر میں درحقیقت جان پڑجاتی تھی۔ یہ تو نہیں چاہیئے کہ اپنی طرف سے کلام الٰہی پر کچھ زیادت کریں۔ یہی تو تحریف ہے جسکی وجہ سے یہودیوں پر لعنت ہوئی۔ پھر جس حالت میں جان پڑنا ثابت نہیں ہوتا بلکہ معالم التنزیل اور بہت سی اَور تفسیروں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہیئتِ طیر تھوڑی دیر اُڑ کر پھر مٹی کی طرح زمین پر گر پڑتی تھی۔ تو بجز اس کے اَور کیا سمجھا جائے کہ وہ دراصل مٹی کی مٹی ہی تھی اور جس طرح مٹی کے کھلونے انسانی کلوں سے چلتے پھرتے ہیں وہ ایک نبی کی رُوح کی سرایت سے پرواز کرتے تھے۔ ورنہ حقیقی خالقیت کے ماننے سے عظیم الشان فساد اور شرک لازم آتا ہے غرض تو معجزہ سے ہے اور بے جان کا باوجود بے جان ہونے کے پرواز یہ بڑا معجزہ ہے۔ ہاں اگر قرآن کریم کی کسی قرأت میں اس موقعہ پر فَيَكُوْنُ حَيًّا کا لفظ موجود ہے یا تاریخی طور پر ثابت ہے کہ درحقیقت وہ زندہ ہو جاتے تھے اور انڈے بھی دیتے تھے اور اب تک اُن کی نسل سے بھی بہت سے پرندے موجود ہیں تو پھر ان کا ثبوت دینا چاہیئے۔ اللہ تعالےٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ اگر تمام دنیا چاہے کہ ایک مکھی بنا سکے تو نہیں بن سکتی کیونکہ اس سے تشابہ فی خلق اللہ لازم آتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ نے آپ انکو خالق ہونے کا اِذن دے رکھا تھا۔ یہ خدا تعالیٰ پر افتراء ہے کلام الٰہی میں تناقض نہیں۔ خدا تعالیٰ کسی کو ایسے اِذن نہیں دیا کرتا۔ اللہ تعالےٰ نے سید الرسل صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک مکھی بنانے کا بھی اِذن نہ دیا۔ پھر مریم کے بیٹے کو یہ اذن کیونکر حاصل ہوا؟ خدا تعالیٰ سے ڈرو اور مجاز کو حقیقت پر حمل نہ کرو۔

(شہادت القرآن ص۷۶-۷۷ حاشیہ)

بعض لوگ موحدین کے فرقہ میں سے بحوالہ آیاتِ قرآنی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت مسیح ابن مریم انواع واقسام کے پرندے بنا کر اور اُن میں پھونک مار کر زندہ کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر اس عاجز پر اعتراض کیا ہے کہ جس حالت میں مثیل مسیح ہونے کا دعوٰی ہے تو پھر آپ بھی کوئی مٹی کا پرندہ بنا کر پھر اس کو زندہ کر کے دکھلایئے کیونکہ جس حالت میں

حضرت مسیح کے کردہ یا پرندے بنائے ہوئے اب تک موجود ہیں جو ہر طرف پرواز کرتے نظر آتے ہیں تو پھر مثیل مسیح بھی کسی پرندہ کا خالق ہونا چاہیئے۔

ان تمام اوہام باطلہ کا جواب یہ ہے کہ وہ آیات جن میں ایسا لکھا ہے متشابہات میں سے ہیں۔ اور اُن کے یہ معنے کرنا کہ گویا خدا تعالےٰ نے اپنے ارادہ اور اذن سے حضرت عیسیٰ کو صفات خالقیت میں شریک کر رکھا تھا صریح الحاد اور سخت بے ایمانی ہے کیونکہ اگر خدا تعالیٰ اپنی صفات خاصہ والوہیت بھی دوسرے کو دے سکتا ہے تو اس سے اس کی خدائی باطل ہوتی ہے۔ اور موحد صاحب کا یہ عذر کہ ہم ایسا اعتقاد نہیں رکھتے کہ اپنی ذاتی طاقت سے حضرت عیسیٰ خالق طیور تھے بلکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ طاقت خدا تعالیٰ نے اپنے اذن اور ارادہ سے ان کو دے رکھی تھی اور اپنی مرضی سے انکو اپنی خالقیت کا حصّہ دار بنا دیا تھا اور یہ اسکو اختیار ہے کہ جس کو چاہے اپنا مثیل بنا دیوے قادر مطلق جو ہوا۔ یہ سراسر مشرکانہ باتیں ہیں اور کفر سے بدتر۔ اس موحد کو یہ بھی کہا گیا کہ کیا تم اب شناخت کر سکتے ہو کہ ان پرندوں میں سے کونسے ایسے پرندے ہیں جو خدا تعالےٰ کے بنائے ہوئے ہیں اور کون سے ایسے پرندے ہیں جو ان پرندوں کی نسل ہیں جن کے حضرت عیسیٰ خالق ہیں تو اس نے اپنے ساکت رہنے سے یہی جواب دیا کہ میں شناخت نہیں کر سکتا۔

اب واضح رہے کہ اس زمانہ کے بعض موحدین کا یہ اعتقاد کہ پرندوں کے نوع میں سے کچھ تو خدا تعالیٰ کی مخلوق اور کچھ حضرت عیسیٰ کی مخلوق ہے سراسر فاسد اور مشرکانہ خیال ہے اور ایسا خیال رکھنے والا بلاشبہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔.........

سو واضح ہو کہ انبیاء کے معجزات دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) ایک وہ جو محض سماوی امور ہوتے ہیں جن میں انسان کی تدبیر اور عقل کو دخل نہیں ہوتا۔ جیسے شق القمر جو ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا اور خدا تعالےٰ کی غیر محدود قدرت نے ایک راستباز اور کامل نبی کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اس کو دکھایا تھا۔ (۲) دوسرے عقلی معجزات ہیں جو اس خارق عادت عقل کے ذریعہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں جو الہام الٰہی سے ملتی ہے جیسے حضرت سلیمان کا وہ معجزہ جو صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ہے جس کو دیکھ کر بلقیس کو ایمان نصیب ہوا

اب جاننا چاہیئے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت مسیح کا معجزہ حضرت سلیمان کے معجزے کی طرح صرف عقلی تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ان دنوں میں ایسے امور کی طرف

لوگوں کے خیالات جھکے ہوئے تھے کہ جو شعبدہ بازی کی قسم میں سے اور دراصل بے سود اور عوام کو فریفتہ کرنے والے تھے۔ وہ لوگ جو فرعون کے وقت میں مصر میں ایسے ایسے کام کرتے تھے جو سانپ بنا کر دکھلا دیتے تھے۔ اور کئی قسم کے جانور تیار کر کے ان کو زندہ جانوروں کی طرح چلا دیتے تھے وہ حضرت مسیح کے وقت میں عام طور پر یہودیوں کے ملکوں میں پھیل گئے تھے اور یہودیوں نے اُن کے بہت سے ساحرانہ کام سیکھ لئے تھے۔ جیسا کہ قرآن کریم بھی اس بات کا شاہد ہے۔ سو کچھ تعجب کی جگہ نہیں کہ خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح کو عقلی طور سے ایسے طریق پر اطلاع دیدی ہو جو ایک مٹی کا کھلونا کسی کل کے دبانے یا کسی پھونک مارنے کے طور پر ایسا پرواز کرتا ہو جیسے پرندہ پرواز کرتا ہے۔ یا اگر پرواز نہیں تو پیروں سے چلتا ہو۔ کیونکہ حضرت مسیح ابن مریم اپنے باپ یوسف کے ساتھ بائیس برس کی مدت تک نجاری کا کام بھی کرتے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ بڑھئی کا کام درحقیقت ایک ایسا کام ہے جس میں کلوں کی ایجاد کرنے اور طرح طرح کی صنعتوں کے بنانے میں عقل تیز ہو جاتی ہے اور جیسے انسان میں قویٰ موجود ہوں انہی کے موافق اعجاز کے طور پر بھی مدد ملتی ہے۔ جیسے ہمارے سید و مولیٰ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے روحانی قویٰ جو دقائق اور معارف تک پہنچنے میں نہایت تیز و قوی تھے۔ سو انہی کے موافق قرآن شریف کا معجزہ دیا گیا جو جامع جمیع دقائق و معارف الٰہیہ ہے۔ پس اس سے کچھ تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ حضرت مسیح نے اپنے دادا سلیمان کی طرح اس وقت کے مخالفین کو یہ عقلی معجزہ دکھلایا ہو۔ اور ایسا معجزہ دکھلانا عقل سے بعید بھی نہیں۔ کیونکہ حال کے زمانہ میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ اکثر صنّاع ایسی چڑیاں بنا لیتے ہیں کہ وہ بولتی بھی ہیں اور ہلتی بھی ہیں اور دُم بھی ہلاتی ہیں۔ اور مَیں نے سُنا ہے کہ بعض چڑیاں کل کے ذریعہ سے پرواز بھی کرتی ہیں۔ بمبئی اور کلکتہ میں ایسے کھلونے بہت بنتے ہیں اور یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں بکثرت ہیں اور ہر سال نئے نئے نکلتے آتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن شریف اکثر استعارات سے بھرا ہوا ہے۔ اس لئے ان آیات کے روحانی طور پر معنی بھی کر سکتے ہیں کہ مٹی کی چڑیوں سے مراد وہ اُمّی اور نادان لوگ ہیں جن کو حضرت عیسٰی نے اپنا رفیق بنایا گویا اپنی صحبت میں لے کر پرندوں کی صورت کا خاکہ کھینچا۔ پھر ہدایت کی رُوح اُن میں پھونک دی جس سے وہ پرواز کرنے لگے۔

ماسوا اس کے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ایسے ایسے اعجاز طریق عمل الترب یا یعنی مسمریزمی طریق سے بطور لہو و لعب نہ بطور حقیقت ظہور میں آسکیں کیونکہ عمل الترب میں جس کو زمانہ حال

میں مسمریزم کہتے ہیں ایسے ایسے عجائبات ہیں کہ اس میں پوری پوری مشق کرنے والے اپنے روح کی گرمی دوسری چیزوں پر ڈال کر اُن چیزوں کو زندہ کے موافق کر دکھاتے ہیں۔ انسان کی رُوح میں کچھ ایسی خاصیت ہے کہ وہ اپنی زندگی کی گرمی ایک جماد پر جو بالکل بے جان ہے ڈال سکتی ہے تب جماد سے وہ بعض حرکات صادر ہوتی ہیں جو زندوں سے صادر ہوا کرتی ہیں۔ راقم رسالہ ہذا نے اس علم کے بعض مشق کرنے والوں کو دیکھا ہے جو انہوں نے ایک لکڑی کی تپائی پر ہاتھ رکھ کر ایسا اپنی حیوانی روح سے اسے گرم کیا کہ اس نے چارپایوں کی طرح حرکت کرنا شروع کر دیا۔ اور کتنے آدمی گھوڑے کی طرح اس پر سوار ہوئے اور اس کی تیزی اور حرکت میں کچھ کمی نہ ہوئی .... مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسا جانور جو مٹی یا لکڑی وغیرہ سے بنایا جاوے اور عمل الترب سے اپنی رُوح کی گرمی اس کو پہنچائی جاوے وہ درحقیقت زندہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بدستور بے جان اور جماد ہوتا ہے صرف عامل کے رُوح کی گرمی بارود کی طرح اس کو جنبش میں لاتی ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان پرندوں کا پرواز کرنا قرآن شریف سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان کا ہلنا اور جنبش کرنا بھی بپایۂ ثبوت نہیں پہنچتا اور نہ درحقیقت ان کا زندہ ہو جانا ثابت ہوتا ہے۔ اِس جگہ یہ بھی جاننا چاہیئے کہ سلب امراض کرنا یا اپنی رُوح کی گرمی جماد میں ڈال دینا درحقیقت یہ سب علم الترب کی شاخیں ہیں۔ ہریک زمانہ میں ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں اور اب بھی ہیں جو اس روحانی عمل کے ذریعہ سے سلب امراض کرتے رہے ہیں اور مفلوج مبروص۔ مدقوق وغیرہ ان کی توجہ سے اچھے ہوتے رہتے ہیں .... اور اب یہ بات قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم باذن وحکم الٰہی الیسع نبی کی طرح اس عمل الترب میں کمال رکھتے تھے گو الیسع کے درجہ کاملہ سے کم رہے ہوئے تھے کیونکہ الیسع کی لاش نے بھی معجزہ دکھلایا کہ اُسکی ہڈیوں کے لگنے سے ایک مُردہ زندہ ہو گیا۔ مگر چوروں کی لاشیں مسیح کے جسم کے ساتھ لگنے سے ہرگز زندہ نہ ہو سکیں یعنی وہ دو چور جو مسیح کے ساتھ مصلوب ہوئے تھے۔ بہرحال مسیح کی یہ تربی کارروائیاں زمانہ کے مناسب حال بطور خاص مصلحت کے تھیں مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ عمل ایسا قدر کے لائق نہیں جیسا کہ عوام الناس اسکو خیال کرتے ہیں۔ اگر یہ عاجز اس عمل کو مکروہ اور قابلِ نفرت نہ سمجھتا تو خدا تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اُمید قوی رکھتا تھا کہ ان عجوبہ نمائیوں میں حضرت مسیح ابن مریم سے کم نہ رہتا۔ لیکن مجھے وہ روحانی طریق پسند ہے

جس پر ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے قدم مارا ہے اور حضرت مسیح نے بھی اس عمل جسمانی کو یہودیوں کے جسمانی اور پست خیالات کی وجہ سے جو ان کی فطرت میں مرکوز تھے باذن و حکم الٰہی اختیار کیا تھا ورنہ دراصل مسیح کو بھی یہ امر پسند نہ تھا۔

واضح ہو کہ اس عمل جسمانی کا ایک نہایت بُرا خاصہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے تئیں اس مشغولی میں ڈالے اور جسمانی مرضوں کے رفع دفع کرنے کیلئے اپنی دلی و دماغی طاقتوں کو خرچ کرتا رہے وہ اپنی ان روحانی تاثیروں میں جو رُوح پر اثر ڈال کر رُوحانی بیماریوں کو دُور کرتی ہیں بہت ضعیف اور نکمّا ہو جاتا ہے اور امر تنویر باطن اور تزکیہ نفس کا جو اصل مقصد ہے اس کے ہاتھ بہت کم انجام پذیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گو حضرت مسیح جسمانی بیماروں کو اس عمل کے ذریعہ سے اچھا کرتے رہے مگر ہدایت اور توحید اور دینی استقامتوں کے کامل طور پر دلوں میں قائم کرنے کے بارے میں اُن کی کارروائیوں کا نمبر ایسا کم درجہ کا رہا کہ قریب قریب ناکام کے رہے۔ لیکن ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے چونکہ ان جسمانی امور کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور تمام زور اپنی رُوح کا دلوں میں ہدایت پیدا ہونے کے لئے ڈالا اسی وجہ سے تکمیل نفوس میں سب سے بڑھکر رہے اور ہزارہا بندگانِ خدا کو کمال کے درجہ تک پہنچا دیا اور اصلاح خلق اور اندرونی تبدیلیوں میں وہ یدِ بیضاء دکھلایا کہ جس کی ابتدائے دنیا سے آج تک نظیر نہیں پائی جاتی۔ حضرت مسیح کے **عمل الترب** سے وہ مُردے جو زندہ ہوتے تھے یعنی وہ قریب الموت آدمی جو گویا نئے سرے زندہ ہو جاتے تھے وہ بلا توقف چند منٹ میں مر جاتے تھے کیونکہ بذریعہ عمل الترب رُوح کی گرمی اور زندگی صرف عارضی طور پر اُن میں پیدا ہو جاتی تھی مگر جن کو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے زندہ کیا وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اور یہ جو مَیں نے مسمریزمی طریق کا **عمل الترب** نام رکھا جس میں حضرت مسیح بھی کسی درجہ تک مشق رکھتے تھے یہ الہامی نام ہے اور خدا تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا کہ یہ عمل الترب ہے اور اس عمل کے عجائبات کی نسبت یہ بھی الہام ہوا ھٰذَا ھُوَ التِّرْبُ الَّذِیْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ یعنی یہ وہ عمل الترب ہے جس کی اصل حقیقت کی زمانہ حال کے لوگوں کو کچھ خبر نہیں ورنہ خدا تعالیٰ اپنی ہریک صفت میں واحد لاشریک ہے اپنی صفات الوہیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ فرقان کریم کی آیات بیّنات میں اس قدر اس مضمون کی تاکید پائی جاتی ہے جو کسی پر مخفی نہیں جیسا کہ وہ عزّاسمہٗ فرماتا ہے۔ اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا۔ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ۔ وَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا

وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا .... اب دیکھو خدائے تعالیٰ صاف صاف طور پر فرما رہا ہے کہ بجز میرے کوئی اور خالق نہیں۔ بلکہ ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے کہ تمام جہان ملکر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ اور صاف فرماتا ہے کہ کوئی شخص موت اور حیات اور ضرر اور نفع کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اسجگہ ظاہر ہے کہ اگر کسی مخلوق کو موت اور حیات کا مالک بنا دینا اور اپنی صفات میں شریک کر دینا اس کی عادت میں داخل ہوتا تو وہ بطور استثنا ایسے لوگوں کو ضرور باہر رکھ لیتا اور ایسی اعلیٰ توحید کی ہمیں ہرگز تعلیم نہ دیتا۔ اگر یہ وسواس کسی کے دل میں گذرے کہ پھر اللہ جلّ شانہٗ نے مسیح ابن مریم کی نسبت اس قصّہ میں جہاں پرندہ بنانے کا ذکر ہے تَخْلُقُ کا لفظ کیوں استعمال کیا جس کے بظاہر یہ معنے ہیں کہ تُو پیدا کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسجگہ حضرت عیسٰے کو خالق قرار دینا بطور استعارہ ہے جیسا کہ اس دوسری آیت میں فرمایا ہے فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ بلاشبہ حقیقی اور سچّا خالق خدا تعالیٰ ہے اور جو لوگ مٹی یا لکڑی کے کھلونے بناتے ہیں وہ بھی خالق ہیں مگر جھوٹے خالق جن کے فعل کی اصلیت کچھ بھی نہیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ کیوں بطور معجزہ جائز نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام اذن اور ارادۂ الٰہی سے حقیقت میں پرندے بنا لیتے ہوں اور وہ پرندے ان کی اعجازی پھونک سے پرواز کر جاتے ہوں تو اسکا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے اذن اور ارادہ سے کسی شخص کو موت اور حیات اور ضرر اور نفع کا مالک نہیں بناتا۔ نبی لوگ دُعا اور تضرع سے معجزہ مانگتے ہیں۔ معجزہ نمائی کی ایسی قدرت نہیں رکھتے جیسا کہ انسان کو ہاتھ پیر ہلانے کی قدرت ہوتی ہے۔ غرض معجزہ کی حقیقت اور مرتبہ سے یہ امر بالاتر اور اُن صفاتِ خاصّہ خدا تعالیٰ میں سے ہے جو کسی حالت میں بشر کو مل نہیں سکتیں۔ معجزہ کی حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ایک امر خارق عادت یا ایک امر خیال اور گمان سے باہر اور امید سے بڑھ کر ایک اپنے رسول کی عزت اور صداقت ظاہر کرنے کے لئے اور اُس کے مخالفین کی عجز اور مغلوبیت جتلانے کی غرض سے اپنے ارادۂ خاص یا اس رسول کی دُعا اور درخواست سے آپ ظاہر فرماتا ہے مگر ایسے طور سے جو اس کی صفات وحدانیت و تقدس و کمال کے منافی و مغائر نہ ہو اور کسی دوسرے کی وکالت یا کارسازی کا اس میں کچھ دخل نہ ہو۔

اب ہریک دانشمند سوچ سکتا ہے کہ یہ صورت ہرگز معجزہ کی صورت نہیں کہ خدائے تعالیٰ دائمی طور پر ایک شخص کو اجازت اور اذن دیدے کہ تُو مٹی کے پرندے بنا کر پھونک مارا کر وہ حقیقت میں جانور بن جایا کرینگے اور اُن میں گوشت اور ہڈی اور خون اور تمام اعضاء جانوروں کے بن جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر خدا تعالیٰ پرندوں کے بنانے میں اپنی خالقیت کا کسی کو وکیل ٹھہرا سکتا ہے تو

تمام امور خالقیت میں وکالت تامہ کا عہدہ بھی کسی کو دے سکتا ہے۔ اِس صورت میں خدائے تعالیٰ کی صفات میں شریک ہونا جائز ہوگا گو اُس کے حکم اور اذن سے ہی سہی اور نیز ایسے خالقوں کے سامنے اور فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ کی مجبوری سے خالقِ حقیقی کی معرفت مشتبہ ہوجائے گی۔ غرض یہ اعجاز کی صورت نہیں یہ تو خدائی کا حصّہ دار بنانا ہے۔

بعض دانشمند شرک سے بچنے کے لئے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ حضرت مسیح جو پرندے بناتے تھے وہ بہت دیر تک جیتے نہیں تھے اُن کی عمر چھوٹی ہوتی تھی۔ تھوڑی مسافت تک پرواز کرکے پھر گِر کر مر جاتے تھے۔ لیکن یہ عذر بالکل فضول ہے اور صرف اس حالت میں ماننے کے لائق ہے کہ جب یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اُن پرندوں میں واقعی اور حقیقی حیات پیدا نہیں ہوتی تھی بلکہ صرف ظلّی اور مجازی اور جھوٹی حیات جو عمل الترب کے ذریعہ پیدا ہوسکتی ہے۔ ایک جھوٹی جھلک کی طرح اُن میں نمودار ہوجاتی تھی ....

قرآن شریف کی آیات بھی بآواز بلند یہی پکار رہی ہیں کہ مسیح کے ایسے عجائب کاموں میں اس کو طاقت بخشی گئی تھی اور خدا تعالیٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ وہ ایک فطرتی طاقت تھی جو ہریک فرد بشر کی فطرت میں مودَع ہے مسیح سے اُس کی کچھ خصوصیت نہیں۔ چنانچہ اس بات کا تجربہ اسی زمانہ میں ہو رہا ہے مسیح کے معجزات تو اس تالاب کی وجہ سے بے رونق اور بے قدر تھے جو مسیح کی ولادت سے بھی پہلے مظہر عجائبات تھا جس میں ہر قسم کے بیمار اور تمام مجذوم مفلوج مبروص وغیرہ ایک ہی غوطہ مار کر اچھے ہوجاتے تھے۔ لیکن بعد کے زمانوں میں جو لوگوں نے اس قسم کے خوارق دکھلائے اُس وقت تو کوئی تالاب بھی موجود نہیں تھا۔

غرض یہ اعتقاد بالکل غلط اور فاسد اور مشرکانہ خیال ہے کہ مسیح مٹی کے پرندے بناکر اور اُن میں پھونک مار کر انہیں سچ مچ کے جانور بنا دیتا تھا۔ نہیں بلکہ صرف عمل الترب تھا جو رُوح کی قوت سے ترقی پذیر ہوگیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسیح ایسے کام کے لئے اس تالاب کی مٹی لاتا تھا جس میں رُوح القدس کی تاثیر رکھی گئی تھی۔ بہرحال یہ معجزہ صرف ایک کھیل کی قسم میں سے تھا۔ اور وہ مٹی درحقیقت ایک مٹی ہی رہتی تھی جیسے سامری کا گوسالہ۔ فَتَدَبَّرْ فَإِنَّهَا نُكْتَةٌ جَلِيْلَةٌ مَا يُلَقّٰهَآ إِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ۔

(ازالہ اوہام ص ۱۵۱ - ۱۶۳ حاشیہ)

فرضی معجزات کے ساتھ جس قدر حضرت عیسٰے علیہ السلام متہم کئے گئے ہیں اس کی نظیر کسی اور نبی میں

نہیں پائی جاتی۔ یہاں تک کہ بعض جاہل خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہزاروں بلکہ لاکھوں مُردے زندہ کر ڈالے تھے۔ یہاں تک کہ انجیلوں میں بھی یہ مبالغہ آمیز باتیں لکھی ہیں کہ ایک مرتبہ تمام گورستان جو ہزاروں برسوں کا چلا آتا تھا سب کا سب زندہ ہو گیا تھا اور تمام مردے زندہ ہو کر شہر میں آ گئے تھے۔

اب عقلمند قیاس کر سکتا ہے کہ باوجودیکہ کروڑہا انسان زندہ ہو کر شہر میں آ گئے اور اپنے بیٹوں پوتوں کو آکر تمام قصے سُنائے اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی سچائی کی تصدیق کی مگر پھر بھی یہودی ایمان نہ لائے۔ اس درجہ کی سنگدلی کو کون باور کرے گا؟ اور درحقیقت اگر ہزاروں مُردے زندہ کرنا حضرت عیسےٰ کا پیشہ تھا تو جیسا کہ عقل کی رُو سے سمجھا جاتا ہے وہ تمام مردے بہرے اور گونگے تو نہیں ہونگے۔ اور جن لوگوں کو ایسے معجزات دکھلائے جاتے تھے کوئی اُن مُردوں میں سے اُن کا بھائی ہو گا اور کوئی باپ اور کوئی بیٹا اور کوئی ماں۔ کوئی دادی اور کوئی دادا اور کوئی دوسرا قریبی اور عزیز رشتہ دار۔ اس لئے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے لئے تو کافروں کو مومن بنانے کی ایک وسیع راہ کھل گئی تھی۔ کئی مُردے یہودیوں کے رشتہ دار ان کے ساتھ ساتھ پھرتے ہونگے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کئی شہروں میں اُن کے لیکچر دلائے ہونگے۔ ایسے لیکچر نہایت پُر بہار اور شوق انگیز ہوتے ہونگے۔ جب ایک مُردہ کھڑا ہو کر حاضرین کو سُناتا ہو گا کہ اے حاضرین آپ لوگوں میں بہت ایسے اِسوقت موجود ہیں جو مجھے شناخت کرتے ہیں۔ جنہوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے دفن کیا تھا۔ اب مَیں خدا کے مُنہ سے سُنکر آیا ہوں کہ عیسیٰ مسیح سچّا ہے اور اسی نے مجھے زندہ کیا تو عجب لطف ہوتا ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے مُردوں کے لیکچروں سے یہودی قوم کے لوگوں کے دلوں پر بڑے بڑے اثر ہوتے ہونگے۔ اور ہزاروں لاکھوں یہودی ایمان لاتے ہونگے۔ پر قرآن شریف اور انجیل سے ثابت ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ردّ کر دیا تھا اور اصلاحِ مخلوق میں تمام نبیوں سے ان کا گرا ہؤا نمبر تھا اور تقریبًا تمام یہودی ان کو ایک مکّار اور کاذب خیال کرتے تھے۔

اب عقلمند سوچے کہ کیا ایسے بزرگ اور فوق العادت معجزات کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے تھا؟ جبکہ ہزاروں مُردوں نے زندہ ہو کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سچّائی کی گواہی بھی دے دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ ہم بہشت کو دیکھ آئے ہیں۔ اُس میں صرف عیسائی ہیں جو حضرت عیسیٰ کے ماننے والے ہیں اور دوزخ کو دیکھا تو اس میں یہودی ہیں جو حضرت عیسےٰ سے منکر ہیں تو ان سب باتوں کے بعد کس کی مجال تھی کہ حضرت عیسیٰ کی سچائی میں ذرّہ بھی شک کرتا۔ اور اگر کوئی شک کرتا تو اُن کے باپ دادا

جو زندہ ہو کر آئے تھے اُن کو جان سے مارتے کہ اے ناپاک لوگو! ہماری گواہی اور پھر بھی شک۔ پس یقیناً سمجھو کہ ایسے معجزات محض بناوٹ ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۳۷-۳۸)

اور خدا کی **عجیب باتوں** میں سے جو مجھے ملی ہیں ایک یہ بھی ہے جو میں نے عین بیداری میں جو کشفی بیداری کہلاتی ہے یسوع مسیح سے کئی دفعہ ملاقات کی ہے اور اس سے باتیں کر کے اُس کے اصل دعوٰی اور تعلیم کا حال دریافت کیا ہے۔ یہ ایک بڑی بات ہے جو توجہ کے لائق ہے کہ حضرت یسوع مسیح ان چند عقائد سے جو کفارہ اور تثلیث اور ابنیت ہے ایسے متنفّر پائے جاتے ہیں کہ گویا ایک بھاری افترا جو اُن پر کیا گیا ہے وہ یہی ہے۔ یہ مکاشفہ کی شہادت بے دلیل نہیں ہے بلکہ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر کوئی طالب حق نیت کی صفائی سے ایک مدت تک میرے پاس رہے اور وہ حضرت مسیح کو کشفی حالت میں دیکھنا چاہے تو میری توجہ اور دُعا کی برکت سے وہ ان کو دیکھ سکتا ہے اُن سے باتیں بھی کر سکتا ہے اور ان کی نسبت اُن سے گواہی بھی لے سکتا ہے کیونکہ میں وہ شخص ہوں جس کی رُوح میں بروز کے طور پر یسوع مسیح کی رُوح سکونت رکھتی ہے۔

(تحفہ قیصریہ ص ۲۰)

میں نے بارہا عیسٰی علیہ السلام کو خواب میں دیکھا اور کشفی حالت میں ملاقات ہوئی۔ اور ایک ہی خوان میں میرے ساتھ اُس نے کھایا۔ اور ایک دفعہ میں نے اس کو دیکھا اور اس فتنہ کے بارہ میں پوچھا جس میں اس کی قوم مبتلا ہو گئی ہے۔ پس اس پر دہشت غالب ہو گئی۔ اور خدا تعالےٰ کی عظمت کا اس نے ذکر کیا اور اس کی تسبیح اور تقدیس میں لگ گیا اور زمین کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ میں تو صرف خاکی ہوں اور اُن تہمتوں سے بری ہوں جو مجھ پر لگائی جاتی ہیں پس میں نے اس کو ایک متواضع اور کسر نفسی کرنے والا آدمی پایا۔

(نور الحق اوّل ص ۵۶)

جب میں دیکھتا ہوں کہ عیسائی مذہب میں خدا شناسی کے تینوں ذریعے مفقود ہیں تو مجھے تعجب آتا ہے کہ کس بات کے سہارے سے یہ لوگ یسوع پرستی پر زور مار رہے ہیں کیسی بدنصیبی ہے کہ آسمانی دروازے ان پر بند ہیں معقولی دلائل ان کو اپنے دروازے سے دھکّے دیتے ہیں اور منقولی دستاویزیں جو گذشتہ نبیوں کی مسلسل تعلیموں سے پیش کرنی چاہیئے تھیں وہ انکے پاس

موجود نہیں مگر پھر بھی اِن لوگوں کے دلوں میں خدا تعالیٰ کا خوف نہیں۔ انسان کی عقلمندی یہ ہے کہ ایسا مذہب اختیار کرے کہ جس کے اصول خدا شناسی پر سب کا اتفاق ہو اور عقل بھی شہادت دے اور آسمانی دروازے بھی اس مذہب پر بند نہ ہوں۔ سو غور کرکے معلوم ہوتا ہے کہ اِن تینوں صفتوں سے عیسائی مذہب بے نصیب ہے۔ اس کا خدا شناسی کا طریق ایسا نرالا ہے کہ نہ اس پر یہودیوں نے قدم مارا اور نہ دنیا کی اَور کسی آسمانی کتاب نے وہ ہدایت کی۔ اور عقل کی شہادت کا یہ حال ہے کہ خود یورپ میں جس قدر لوگ علوم عقلیہ میں ماہر ہوتے جاتے ہیں وہ عیسائیوں کے اس عقیدے پر ٹھٹھا اور ہنسی کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عقلی عقیدے سب کلّیت کے رنگ میں ہوتے ہیں کیونکہ قواعدِ کلّیہ سے اُن کا استخراج ہوتا ہے۔ لہذا ایک فلاسفر اگر اس بات کو مان جائے کہ یسوع خدا ہے تو چونکہ دلائل کا حکم کلیت کا فائدہ بخشتا ہے اُس کو ماننا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ایسے کروڑ ہا خدا گذرے ہیں اور آگے بھی ہوسکتے ہیں۔ اور یہ باطل ہے۔

اور آسمانی نشانوں کی شہادت کا یہ حال ہے کہ اگر تمام پادری مسیح مسیح کرتے مر بھی جائیں تاہم ان کو آسمان سے کوئی نشان مل نہیں سکتا کیونکہ مسیح خدا ہو تو ان کو نشان دے وہ تو بیچارہ اور عاجز اور ان کی فریاد سے بے خبر ہے۔ اور اگر خبر بھی ہو تو کیا کرسکتا ہے .... اگر قیامت کے دن حضرت مسیح نے کہہ دیا کہ مَیں تو خدا نہیں تھا تم نے کیوں خواہ نخواہ میرے ذمہ خدائی لگا دی تو پھر کہاں جائینگے اور کس کے پاس جاکر روئیں گے !!

خدا تعالیٰ نے عیسائیوں کو ملزم کرنے کے لئے چار گواہ ان کے ابطال پر کھڑے کئے ہیں۔

اوّل یہودی کہ جو تخمیناً ساڑھے تین ہزار برس سے گواہی دے رہے ہیں کہ ہمیں ہرگز ہرگز تثلیث کی تعلیم نہیں ملی اور نہ کوئی ایسی پیشگوئی کسی نبی نے کی کہ کوئی خدا یا حقیقی طور پر ابن اللہ زمین پر ظاہر ہونے والا ہے۔

دوم حضرت یحیٰؑ کی اُمت یعنی یوحنا کی امت جو اب تک بلادِ شام میں موجود ہے جو حضرت مسیح کو اپنی قدیم تعلیم کے رو سے صرف انسان اور نبی اور حضرت یحیٰؑ کا شاگرد جانتے ہیں۔

تیسرے فرقہ موحدہ عیسائیوں کا جن کا بار بار قرآن شریف میں بھی ذکر ہے جنکی بحث روم کے تیسری صدی کے قیصر نے تثلیث والوں سے کرائی تھی اور فرقہ موحدہ غالب رہا تھا اور اسی وجہ سے قیصر نے فرقہ موحد کا مذہب اختیار کرلیا تھا۔

چوتھے: ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف جنہوں نے گواہی دی کہ مسیح ابن مریم ہرگز خدا نہیں ہے اور نہ خدا کا بیٹا ہے بلکہ خدا کا نبی ہے۔

اور علاوہ اس کے ہزاروں راستباز خدا تعالیٰ کا الہام پا کر اب تک گواہی دیتے چلے آئے ہیں کہ مسیح ابن مریم ایک عاجز بندہ ہے اور خدا کا نبی۔ چنانچہ اس زمانہ کے عیسائیوں پر گواہی دینے کے لئے خدا تعالیٰ نے **مجھے کھڑا کیا ہے** اور مجھے حکم دیا ہے کہ تا میں لوگوں پر ظاہر کروں کہ ابن مریم کو خدا ٹھہرانا ایک باطل اور کفر کی راہ ہے اور مجھے اس نے اپنے مکالمات اور مخاطبات سے مشرف فرمایا ہے ....

اے عیسائیو! یاد رکھو کہ مسیح ابن مریم ہرگز ہرگز خدا نہیں ہے۔ تم اپنے نفسوں پر ظلم مت کرو۔ خدا کی عظمت مخلوق کو مت دو۔ ان باتوں کے سننے سے ہمارا دل کانپتا ہے کہ تم ایک **مخلوق ضعیف درماندہ** کو خدا کر کے پکارتے ہو۔ **سچے خدا** کی طرف آجاؤ۔ تا تمہارا بھلا ہو اور تمہاری عاقبت بخیر ہو۔

(کتاب البریہ ص ۵۳-۵۵)

یہ سخت ظلم کیا گیا ہے جو ابن مریم کو خدا بنایا گیا۔ وہ صرف ایک انسان ہے اور **موسوی شریعت** کے خادموں میں سے ایک نبی۔ تم نے اس کو نہیں دیکھا۔ مگر میں نے بارہا اسکو دیکھا ہے۔ تم میں سے کوئی بھی اُس کو نہیں جانتا مگر میں جانتا ہوں۔ وہ ایک سعادت مند انسان ہے جو موسیٰ کی عظمت کا قائل اور ہمارے سید و مولیٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی بزرگیوں پر بدل و جان ایمان لایا ہے اور ہماری طرح اس راہ میں فدا ہے۔ اگر وہ اس وقت دنیا میں آتا اور دیکھتا کہ مجھے خدا بنایا گیا اور میرا کفارہ گھڑا گیا تو وہ اپنی ناچیز ہستی اور اس بے جا تعریف کو خیال میں لا کر مارے شرم کے مرنے کو قبول کرتا اور خدا سے اپنی مغفرت چاہتا۔ پھر بتلاؤ اس کی خدائی پر کونسی دلیل تمہارے پاس ہے؟ کیا اسی کی باتوں یا حواریوں کی باتوں سے اُس کی خدائی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر ہم مان بھی لیں کہ اس کی یا اس کے دوستوں کی باتوں سے خدائی کا دعویٰ پایا جاتا ہے تو یہ نرا دعویٰ ہوگا جو بغیر ثبوت **ایک کوڑی کی قیمت** نہیں رکھتا۔ حالانکہ انجیل کی رو سے یہ دعویٰ بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ انجیل یہ کہیں بیان نہیں کرتی کہ مریم کے **صاحبزادہ نے کبھی مردِ میدان بن کر** خدائی کا دعویٰ کیا تھا بلکہ جب یہودیوں نے ایک دفعہ اسے ڈانٹا تو یسوع نے اپنی خدائی سے انکار کیا۔

(تبلیغ رسالت جلد ششم ص ۱۱)

حضرت مسیح یوحنا باب ۱۰/۳۰ میں ۳۷ تک صاف طور پر فرما رہے ہیں کہ مجھ میں اور دوسرے مقربوں مقدسوں میں ان الفاظ کے اطلاق میں جو بائیبل میں اکثر انبیاء وغیرہ کی نسبت بولے گئے ہیں جو ابن اللہ ہیں یا خدا ہیں کوئی امتیاز اور خصوصیت نہیں ذرہ سوچ کر دیکھنا چاہیئے کہ حضرت مسیح پر یہودیوں نے یہ بات سُن کر کہ وہ اپنے تئیں ابن اللہ کہتے ہیں یہ الزام لگایا تھا کہ تو کفر کہتا ہے۔ یعنی کافر ہے۔ اور پھر انہوں نے اس الزام کے لحاظ سے ان کو پتھراؤ کرنا چاہا۔ اور بڑے افروختہ ہوئے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر کہ جب حضرت مسیح یہودیوں کی نظر میں اپنے ابن اللہ کہلانے کی وجہ سے کافر معلوم ہوتے تھے اور انہوں نے اس کو سنگسار کرنا چاہا تو ایسے موقعہ پر کہ اپنی بریت یا اثبات دعوٰی کا موقعہ تھا مسیح کا فرض کیا تھا؟ ہر ایک عقلمند سوچ سکتا ہے کہ اس موقع پر کہ کافر بنایا گیا حملہ کیا گیا سنگسار کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنا مسیح کا کام تھا۔ اوّل یہ کہ اگر حقیقت میں حضرت مسیح خدا تعالیٰ کے بیٹے ہی تھے تو یوں جواب دیتے کہ یہ میرا دعوٰی حقیقت میں سچا ہے اور مَیں واقعی طور پر خدا تعالیٰ کا بیٹا ہوں۔ اور اس دعوٰی کے ثابت کرنے کے لئے میرے پاس دو ثبوت ہیں ایک یہ کہ تمہاری کتابوں میں میری نسبت لکھا ہے کہ مسیح درحقیقت خدا تعالےٰ کا بیٹا ہے بلکہ خود خدا ہے قادر مطلق ہے عالم الغیب ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے اگر تم کو شبہ ہے تو لاؤ کتابیں پیش کرو۔ مَیں ان کتابوں سے اپنی خدائی کا ثبوت تمہیں دکھلا دونگا۔ یہ تمہاری غلط فہمی اور کم توجہی اپنی کتابوں کی نسبت ہے کہ تم مجھے کافر ٹھہراتے ہو۔ تمہاری کتابیں ہی تو مجھے خدا بنا رہی ہیں اور قادر مطلق بتلا رہی ہیں۔ پھر مَیں کافر کیونکر ہُوا؟ بلکہ تمہیں تو چاہیئے کہ اب میری پرستش اور پوجا شروع کر دو کہ مَیں خدا ہوں۔

پھر دوسرا ثبوت یہ دینا چاہیئے تھا کہ آؤ خدائی کی علامتیں مجھ میں دیکھ لو۔ جیسے خدا تعالیٰ نے آفتاب ماہتاب سیّارے زمین وغیرہ پیدا کیا ہے ایک قطعہ زمین کا یا کوئی ستارہ یا کوئی اور چیز مَیں نے بھی پیدا کی ہے اور اب بھی پیدا کر کے دکھلا سکتا ہوں اور نبیوں کے معمولی معجزات سے بڑھ کر مجھ میں قوت اور قدرت حاصل ہے۔ اور مناسب تھا کہ اپنے خدائی کے کاموں کی ایک مفصل فہرست انکو دیتے کہ دیکھو آج تک یہ یہ کام مَیں نے خدائی کے کئے ہیں۔ کیا حضرت موسٰی سے لے کر تمہارے کسی آخری نبی تک ایسے کام کسی اور نے بھی کئے ہیں؟ اگر ایسا ثبوت دیتے تو یہودیوں کا منہ بند ہو جاتا اور اسی وقت تمام فقیہی اور فریسی آپکے سامنے سجدہ میں

کرتے کہ ہاں حضرت! ضرور آپ خدا ہی ہیں۔ ہم بھولے ہوئے تھے۔ آپ نے اس آفتاب کے مقابل پر جو ابتدا سے چمکتا ہوا چلا آتا ہے اور دن کو روشن کرتا ہے اور اس ماہتاب کے مقابل پر جو ایک خوبصورت روشنی کے ساتھ رات کو طلوع کرتا ہے اور رات کو منور کر دیتا ہے آپ نے ایک آفتاب اور ایک ماہتاب اپنی طرف سے بنا کر ہم کو دکھا دیا ہے اور کتابیں کھولکر اپنی خدائی کا ثبوت ہماری مقبولہ مسلّمہ کتابوں سے پیش کر دیا ہے۔ اب ہماری کیا مجال ہے کہ بھلا آپ کو خدا نہ کہیں۔ جہاں خدا نے اپنی قدرتوں کے ساتھ تجلّی کی وہاں عاجز بندہ کیا کر سکتا ہے۔ لیکن حضرت مسیح نے ان دونوں ثبوتوں میں سے کسی ثبوت کو بھی پیش نہ کیا۔ اور پیش کیا تو ان **عبارتوں** کو پیش کیا سُن لیجیئے۔

"تب یہودیوں نے پھر پتھر اٹھائے کہ اس پر پتھراؤ کریں۔ یسوع نے انہیں جواب دیا۔ کہ مَیں نے اپنے باپ کے بہت سے اچھے کام تمہیں دکھائے ہیں۔ اُن میں سے کس کام کے لئے تم مجھے پتھراؤ کرتے ہو؟ یہودیوں نے اُسے جواب دیا کہ ہم تجھے اچھے کام کے لئے نہیں بلکہ اس لئے تجھے پتھراؤ کرتے ہیں کہ تو کفر کہتا ہے اور انسان ہو کے اپنے تئیں خدا بناتا ہے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو۔ جبکہ اُس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا۔ اور ممکن نہیں کہ کتاب باطل ہو تم اسے جسے خدا نے مخصوص کیا اور جہان میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے کہ مَیں نے کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں۔"

اب منصفین سوچ لیں کہ کیا الزام کفر کا دُور کرنے کے لئے اپنے آپ کو حقیقی طور پر بیٹا اللہ تعالےٰ کا ثابت کرنے کے لئے یہی جواب تھا کہ اگر مَیں نے خدا کا بیٹا کہلایا تو کیا حرج ہو گیا تمہارے بزرگ بھی خدا کہلاتے رہے ہیں۔

ڈپٹی عبداللہ آتھم اس جگہ فرماتے ہیں کہ گویا حضرت مسیح اُن کے بلوے سے خوفناک ہو کر ڈر گئے اور اصلی جواب کو چھپا لیا اور تقیہ اختیار کیا۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ کیا یہ اُن نبیوں کا کام ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ کی راہ میں ہر وقت جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔ **قرآن کریم** میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَ یَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ یعنی اللہ تعالےٰ کے سچے پیغمبر جو اسکے پیغام پہنچاتے ہیں وہ پیغام رسانی میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ پس حضرت مسیح قادر مطلق کہلا کر کمزور یہودیوں

سے کیونکر ڈر گئے۔

اب اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے حقیقی طور پر ابن اللہ ہونیکا یا خدا ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ اور اس دعویٰ میں اپنے تئیں ان تمام لوگوں کا ہمرنگ قرار دیا اور اس بات کا اقرار کیا کہ انہی کے موافق یہ دعویٰ بھی ہے ....

پھر حضرت مسیح نے صرف اسی پر بس نہیں کی بلکہ آپ نے کئی مقاماتِ انجیل میں اپنی انسانی کمزوریوں کا اقرار کیا۔ جیسا کہ جب قیامت کا پتہ ان سے پوچھا گیا تو آپ نے اپنی لاعلمی ظاہر فرمائی اور کہا کہ بجز اللہ تعالیٰ کے قیامت کے وقت کو کوئی نہیں جانتا۔

اب صاف ظاہر ہے کہ علم روح کی صفات میں سے ہے نہ جسم کی صفات میں سے۔ اگر ان میں اللہ تعالیٰ کی روح تھی اور یہ خود اللہ تعالیٰ ہی تھے تو لاعلمی کے اقرار کی کیا وجہ ؟ کیا خدا تعالیٰ بعد علم کے نادان بھی ہو جایا کرتا ہے ! پھر متی ۱۹ باب ۱۶ — میں لکھا ہے۔ "دیکھو ایک نے آکے اُسے (یعنی مسیح سے) کہا۔ اے نیک اُستاد میں کونسا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔ اُس نے اسے کہا تو کیوں نیک مجھے کہتا ہے۔ نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔"

پھر متی ۲۰/۲۰ میں لکھا ہے کہ زبدی کے بیٹوں کی ماں نے اپنے بیٹوں کے حضرت مسیح کے دائیں بائیں بیٹھنے کی درخواست کی تو فرمایا اس میں میرا اختیار نہیں۔ اب فرمائیے قادر مطلق ہونا کہاں گیا۔ قادر مطلق بھی کبھی بے اختیار ہو جایا کرتا ہے ؟ اور جبکہ اسقدر تعارض صفات میں واقع ہو گیا کہ حضرات حواری تو آپ کو قادر مطلق خیال کرتے ہیں اور آپ قادر مطلق ہونے سے انکار کر رہے ہیں تو ان پیشگوئیوں کی کیا عزت اور کیا وقعت باقی رہی جس کے لئے یہ پیش کی جاتی ہیں۔ وہی انکار کرتا ہے کہ میں قادر مطلق نہیں۔ یہ خوب بات ہے۔

پھر متی ۲۶/۳۸ میں لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ مسیح نے تمام رات اپنے بچنے کیلئے دُعا کی اور نہایت غمگین اور دلگیر ہو کر اور رو رو کر اللہ جلّ شانہٗ سے التماس کی کہ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے گزر جائے اور نہ صرف آپ بلکہ اپنے حواریوں سے بھی اپنے لئے دُعا کرائی ....

... مگر پھر بھی وہ دعا منظور نہ ہوئی اور جو تقدیر میں لکھا تھا وہ ہو ہی گیا۔ اب دیکھو اگر وہ قادر مطلق ہوتے تو چاہیئے تھا کہ یہ اقتدار اور یہ قدرتِ کاملہ پہلے اُن کو اپنے نفس کے لئے کام آتا۔ جب اپنے نفس کے لئے کام نہ آیا تو غیروں کو اُن سے توقع رکھنا ایک طمع خام ہے۔

(جنگ مقدس ص ۵۱-۵۴)

پہلی کتابوں میں جو کامل راستبازوں کو خدا کے بیٹے کر کے بیان کیا گیا ہے اس کے بھی یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ درحقیقت خدا کے بیٹے ہیں۔ کیونکہ یہ تو کفر ہے اور خدا بیٹوں اور بیٹیوں سے پاک ہے بلکہ یہ معنے ہیں کہ ان کامل راستبازوں کے آئینہ صافی میں عکسی طور پر خدا نازل ہوا تھا۔ اور ایک شخص کا عکس جو آئینہ میں ظاہر ہوتا ہے استعارہ کے رنگ میں گویا وہ اس کا بیٹا ہوتا ہے کیونکہ جیسا کہ بیٹا باپ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسا ہی عکس اپنے اصل سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جبکہ ایسے دل میں جو نہایت صافی ہے اور کوئی کدورت اس میں باقی نہیں رہی تجلّیات الٰہیہ کا انعکاس ہوتا ہے تو وہ عکسی تصویر استعارہ کے رنگ میں اصل کیلئے بطور بیٹے کے ہو جاتی ہے۔ اِسی بنا پر توریت میں کہا گیا ہے کہ یعقوب میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا بیٹا ہے اور عیسیٰ ابن مریم کو جو انجیلوں میں بیٹا کہا گیا اگر عیسائی لوگ اسی حد تک کھڑے رہتے کہ جیسے ابراہیم اور اسحاق اور اسمٰعیل اور یعقوب اور یوسف اور موسیٰ اور داؤد اور سلیمان وغیرہ خدا کی کتابوں میں استعارہ کے رنگ میں خدا کے بیٹے کہلائے ہیں۔ ایسا ہی عیسیٰ بھی ہے تو اُن پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کیونکہ جیسا کہ استعارہ کے رنگ میں ان نبیوں کو پہلے نبیوں کی کتابوں میں بیٹا کر کے پکارا گیا ہے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو بعض پیشگوئیوں میں خدا کر کے پکارا گیا ہے اور اصل بات یہ ہے کہ نہ وہ تمام نبی خدا تعالےٰ کے بیٹے ہیں اور نہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خدا ہیں بلکہ یہ تمام استعارات ہیں۔ محبت کے پیرایہ میں ایسے الفاظ خدا تعالیٰ کی کلام میں بہت ہیں۔

جب انسان خدا تعالیٰ کی محبت میں ایسا محو ہوتا ہے جو کچھ بھی نہیں رہتا تب اسی فنا کی حالت میں ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں کیونکہ اس حالت میں ان کا وجود درمیان نہیں ہوتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔ یعنی ان لوگوں کو کہہ کہ اے میرے بندو! خدا کی رحمت سے نومید مت ہو۔ خدا تمام گناہ بخش دیگا۔ اب دیکھو اس جگہ یَا عِبَادَ اللّٰہِ کی جگہ یَا عِبَادِی کہہ دیا گیا ہے حالانکہ لوگ خدا کے بندے ہیں نہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بندے۔ مگر یہ استعارہ کے رنگ میں بولا گیا۔

(حقیقۃ الوحی صـ ۶۳-۶۴)

عیسائیوں کے خدا کا حُلیہ یہ ہے کہ وہ ایک اسرائیلی آدمی مریم بنت یعقوب کا بیٹا ہے

جو ۳۲ برس کی عمر پا کر اس دار الفناء سے گذر گیا۔ جب ہم سوچتے ہیں کہ کیونکر وہ گرفتار ہونے کے وقت **ساری رات دعا کر کے پھر بھی اپنے مطلب سے نامراد رہا** اور ذلّت کے ساتھ پکڑا گیا اور بقول عیسائیوں کے سولی پر کھینچا گیا اور ایلی ایلی کرتا مرگیا تو ہمیں یکدفعہ بدن پر لرزہ پڑتا ہے کہ کیا ایسے انسان کو جس کی دُعا بھی جناب الٰہی میں قبول نہ ہو سکی اور نہایت ناکامی اور نامرادی سے **ماریں کھاتا کھاتا** مرگیا قادر خدا کہہ سکتے ہیں۔ ذرا اس وقت کے نظارہ کو آنکھوں کے سامنے لاؤ جبکہ یسوع مسیح **حوالات** میں ہو کر پلاطوس کی عدالت سے ہیرودیس کی طرف بھیجا گیا۔ کیا یہ **خدائی کی شان** ہے کہ حوالات میں ہو کر **ہتھکڑی** ہاتھ میں **زنجیر** پیروں میں چند سپاہیوں کی **حراست** میں چالان ہو کر **جھڑکیاں** کھاتا ہوا **گلیل** کی طرف روانہ ہوا اور اس حالت پُر **ملامت** میں ایک حوالات سے دوسری حوالات میں پہنچا۔ پلاطوس نے کرامت دیکھنے پر چھوڑنا چاہا اس وقت کوئی **کرامت دکھلا نہ سکا**۔ ناچار پھر حراست میں واپس کر کے یہودیوں کے حوالے کیا گیا اور انہوں نے ایک دم میں اس کی جان کا قصہ تمام کر دیا۔

اب ناظرین خود سوچ لیں کہ کیا **اصلی** اور **حقیقی** خدا کی یہی علامتیں ہوا کرتی ہیں؟ کیا کوئی پاک کانشنس اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ وہ جو زمین و آسمان **کا خالق** اور بے انتہا قدرتوں اور طاقتوں **کا مالک** ہے وہ اخیر پر ایسا بدنصیب اور کمزور اور ذلیل حالت میں ہو جائے کہ شریر انسان اس کو اپنے ہاتھوں میں مَل ڈالیں۔ اگر کوئی ایسے خدا کو **پُوجے** اور اُس پر بھروسہ کرے **تو اُسے اختیار ہے** لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر آریوں کے پرمیشر کے مقابل پر بھی عیسائیوں کے خدا کو کھڑا کر کے اس کی طاقت اور قدرت کو **وزن** کیا جائے تب بھی اس کے مقابل پر **ہیچ محض** ہے کیونکہ آریوں کا فرضی پرمیشر اگرچہ پیدا کرنے کی کچھ بھی طاقت نہیں رکھتا لیکن کہتے ہیں کہ پیدا شدہ چیزوں کو کسی قدر جوڑ سکتا ہے مگر عیسائیوں کے یسوع میں تو اتنی بھی طاقت ثابت نہ ہوئی۔ جس وقت یہودیوں نے صلیب پر کھینچ کر کہا تھا کہ **اگر تو اب اپنے آپ کو بچائے تو ہم تیرے پر ایمان لاویں گے** تو وہ ان کے سامنے **اپنے تئیں بچا نہ سکا**۔ ورنہ اپنے تئیں بچانا کیا کچھ بڑا کام تھا؟ صرف **اپنی رُوح کو اپنے جسم کے ساتھ جوڑنا تھا**۔ سو اس **کمزور** کو جوڑنے کی بھی طاقت نہ ہوئی۔ پیچھے سے پردہ داروں نے باتیں بنالیں کہ وہ قبر میں زندہ ہو گیا تھا۔ مگر افسوس کہ

انہوں نے نہ سوچا کہ یہودیوں کا تو یہ سوال تھا کہ ہمارے روبرو ہمیں زندہ ہو کر دکھلاوے پھر جبکہ اُن کے روبرو زندہ نہ ہو سکا اور نہ قبر میں زندہ ہو کر اُن سے آکر ملاقات کی تو یہودیوں کے نزدیک بلکہ ہریک محقق کے نزدیک اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ حقیقت میں زندہ ہو گیا تھا۔

(معیار المذاہب ص ۱۰ - ۱۲)

ظاہر ہے کہ اگر ابن مریم کے واقعات کو فضول اور بیہودہ تعریفوں سے الگ کر لیا جائے تو انجیلوں سے اس کے واقعی حالات کا یہی خلاصہ نکلتا ہے کہ وہ ایک عاجز اور ضعیف اور ناقص بندہ یعنی جیسے کہ بندے ہُوا کرتے ہیں اور حضرت موسٰی کے ماتحت نبیوں میں سے ایک نبی تھا اور اس بزرگ اور عظیم الشان رسول کا ایک تابع اور پس رَو تھا اور خود اس بزرگی کو ہرگز نہیں پہنچا تھا۔ یعنی اس کی تعلیم ایک اعلیٰ تعلیم کی فرع تھی مستقل تعلیم نہ تھی اور وہ خود انجیلوں میں اقرار کرتا ہے کہ مَیں نہ نیک ہوں اور نہ عالم الغیب ہوں نہ قادر ہوں بلکہ ایک بندہ عاجز ہوں۔ اور انجیل کے بیان سے ظاہر ہے کہ اُس نے گرفتار ہونے سے پہلے کئی دفعہ رات کے وقت اپنے بچاؤ کے لئے دُعا کی اور چاہتا تھا کہ دُعا اس کی قبول ہو جائے۔ مگر اس کی وہ دُعا قبول نہ ہوئی اور نیز جیسے عاجز بندے آزمائے جاتے ہیں وہ شیطان سے آزمایا گیا۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہر طرح عاجز ہی عاجز تھا۔ مخرج معلوم کی راہ سے جو پلیدی اور ناپاکی کا مبرز ہے تولّد پا کر مدت تک بھوک اور پیاس اور درد اور بیماری کا دُکھ اُٹھاتا رہا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ بھوک کے دُکھ سے ایک انجیر کے نیچے گیا۔ مگر چونکہ انجیر پھلوں سے خالی پڑی ہوئی تھی اس لئے محروم رہا اور یہ بھی نہ ہو سکا کہ دو چار انجیریں اپنے کھانے کیلئے پیدا کر لیتا۔ غرض ایک مدت تک ایسی ایسی آلودگیوں میں رہ کر اور ایسے ایسے دُکھ اٹھا کر باقرار عیسائیوں کے مرگیا اور اس جہان سے اُٹھایا گیا۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ کیا خداوند قادر مطلق کی ذات میں ایسی ہی صفات ناقصہ ہونی چاہئیں کہ وہ اُسی سے قدوس اور ذوالجلال کہلاتا ہے کہ وہ ایسے عیبوں اور نقصانوں سے بھرا ہُوا ہے۔ اور کیا ممکن ہے کہ ایک ہی ماں یعنی مریم کے پیٹ میں سے پانچ بچے پیدا ہو کر ایک بچہ خدا کا بیٹا بلکہ خدا بن گیا اور چار باقی جو رہے ان بیچاروں کو خدائی سے کچھ بھی حصہ نہ ملا۔ بلکہ قیاس یہ چاہتا تھا کہ جبکہ کسی مخلوق کے پیٹ سے خدا بھی پیدا ہو سکتا ہے

یہ نہیں کہ ہمیشہ آدمی سے آدمی اور گدھی سے گدھا پیدا ہو تو جہاں کہیں کسی عورت کے پیٹ سے خدا پیدا ہو تو پھر اس پیٹ سے کوئی مخلوق پیدا نہ ہو۔ بلکہ جسقدر بچے پیدا ہوتے جائیں وہ سب خدا ہی ہوں تا وہ پاک رحم مخلوق کے شرکت سے منزّہ رہے اور فقط خداؤں ہی کے پیدا ہونے کی ایک کان ہو۔ پس قیاس متذکرہ بالا کے رو سے لازم تھا کہ حضرت مسیح کے دوسرے بھائی اور بہن بھی کچھ نہ کچھ خدائی میں سے بخرہ پاتے اور ان پانچوں حضرات کی والدہ تو رب الارباب ہی کہلاتی کیونکہ یہ پانچوں حضرات روحانی اور جسمانی قوتوں میں اسی سے فیضیاب ہیں عیسائیوں نے ابن مریم کی بیجا تعریفوں میں بہت سا افترا بھی کیا مگر پھر بھی اس کے نقصانوں کو چھپا نہ سکے اور اس کی آلودگیوں کا آپ اقرار کر کے پھر خواہ نخواہ اس کو خدائے تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا۔ یوں تو عیسائی اور یہودی اپنی عجیب کتابوں کے رو سے سب خدا کے بیٹے ہی ہیں بلکہ ایک آیت کے رو سے آپ ہی خدا ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بدھ مت والے اپنے افترا اور اختراع میں ان سے اچھے رہے کیونکہ انہوں نے بدھ کو خدا ٹھہرا کر پھر ہرگز اس کے لئے یہ تجویز نہیں کیا کہ اس نے پلیدی اور ناپاکی کی راہ سے تولّد پایا تھا یا کسی قسم کی نجاست کھائی تھی بلکہ ان کا بدھ کی نسبت یہ اعتقاد ہے کہ وہ مونہہ کے راستہ سے پیدا ہوا تھا پر افسوس عیسائیوں نے بہت سی جعلسازیاں تو کیں مگر یہ جعلسازی نہ سوجھی کہ مسیح کو بھی مونہہ کے راستہ سے ہی پیدا کرتے اور اپنے خدا کو پیشاب اور پلیدی سے بچاتے اور نہ یہ سوجھی کہ موت جو حقیقت الوہیت سے بکلّی منافی ہے اس پر وارد نہ کرتے۔ اور نہ یہ خیال آیا کہ جہاں مریم کے بیٹے نے انجیلوں میں اقرار کیا ہے کہ میں نہ نیک ہوں اور نہ دانا مطلق ہوں۔ نہ عالم الغیب ہوں۔ نہ خود بخود آیا ہوں نہ قادر ہوں نہ دعا کی قبولیت میرے ہاتھ میں ہے میں صرف ایک عاجز بندہ اور مسکین آدم زاد ہوں کہ جو ایک مالک رب العالمین کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ ان سب مقاموں کو انجیل سے نکال ڈالنا چاہیئے۔

(براہین احمدیہ ص ۴۱۹-۴۲۱ حاشیہ ۱۱)

ہم نے بار بار سمجھایا کہ عیسیٰ پرستی بت پرستی اور رام پرستی سے کم نہیں۔ اور مریم کا بیٹا کشلیا کے بیٹے سے کچھ زیادت نہیں رکھتا مگر کیا کبھی آپ لوگوں نے توجہ کی؟ یوں تو آپ لوگ تمام دنیا کے مذہبوں پر حملہ کر رہے مگر کبھی اپنے اس مثلث خدا کی نسبت بھی کبھی غور کی۔ کبھی یہ خیال آیا کہ وہ جو تمام عظمتوں کا مالک ہے اس پر انسان کی طرح کیونکر دکھ کی مار پڑ گئی؟

کبھی یہ بھی سوچا کہ خالق نے اپنی ہی مخلوق سے کیونکر مار کھالی ؟ کیا یہ سمجھ آسکتا ہے کہ بندے ناچیز اپنے خدا کو کوڑے ماریں ۔ اُس کے مُنہ پر تھوکیں ۔ اس کو پکڑیں ۔ اس کو سولی دیں اور وہ مقابلہ سے عاجز رہ جائے ۔ بلکہ خدا کہلا کر پھر اُس پر موت بھی آجائے ؟ کیا یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ تین مجسّم خدا ہوں ایک وہ مجسم جس کی شکل پر آدم ہُوا ۔ دوسرا یسوع ۔ تیسرا کبوتر ۔ اور تینوں میں سے ایک بچّہ والا اور دو لاولد ؟ کیا یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ خدا شیطان کے پیچھے پیچھے چلے اور شیطان اُس سے سجدہ چاہے اور اس کو دنیا کی طمع دے ؟ کیا یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ شخص جس کی ہڈیوں میں خدا گھُسا ہُوا تھا ساری رات رو رو کر دُعا کرتا رہا اور پھر بھی استجابتِ دُعا سے محروم اور بے نصیب ہی رہا ؟ کیا یہ بات تعجب میں نہیں ڈالتی کہ خدائی کے ثبوت کے لئے یہود کی کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے حالانکہ یہود اس عقیدہ پر ہزار لعنت بھیجتے ہیں ۔ اور سخت انکاری ہیں اور کوئی ان میں ایسا فرقہ نہیں جو تثلیث کا قائل ہو ؟ اگر یہود کو موسیٰ سے آخری نبیوں تک یہی تعلیم دی جاتی تو کیونکر ممکن تھا کہ وہ لاکھوں آدمی جو بہت سے فرقوں میں منقسم تھے اس تعلیم کو سب کے سب بھول جاتے ؟ کیا یہ بات سوچنے کے لائق نہیں کہ عیسائیوں میں قدیم سے ایک فرقہ موحد بھی ہے جو قرآن شریف کے وقت میں بھی موجود تھا ۔ اور وہ فرقہ بڑے زور سے اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ تثلیث کا گندہ مسئلہ صرف تیسری صدی کے بعد نکالا گیا ہے اور اب بھی اس فرقہ کے لاکھوں انسان یورپ اور امریکہ میں موجود ہیں ۔ اور ہزارہا کتابیں انکی شائع ہو رہی ہیں ۔ پس جبکہ اس قدر ملزم ہو کر پھر بھی پادری صاحبان اپنی بدزبانیوں سے باز نہیں آتے تو کیا اس وقت خدا کے فیصلہ کی حاجت نہیں ؟ ضرور حاجت ہے ۔ تا وہ جو جھوٹا ہے ہلاک ہو جائے ۔ جو گروہ جھوٹا ہو گا اب بلاشبہ بھاگ جائیگا ۔ اور جھوٹے بہانوں سے کام لے گا ۔

(انجام آتھم ص ۴۱)

سچے نبی کی سچائی پر بھاری دلیل ہوتی ہے کہ وہ کامل اصلاح کا ایک بھاری نمونہ دکھلا وے ۔ پس جب ہم اس نمونہ کو حضرت مسیح کی زندگی میں غور کرتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے کونسی اصلاح کی اور کتنے لاکھ یا ہزار آدمی نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی تو یہ خانہ بھی خالی پڑا ہُوا نظر آتا ہے ۔ ہاں بارہؔ حواری ہیں ۔ مگر جب ان کا اعمال نامہ دیکھتے ہیں تو دل کانپ اٹھتا ہے اور افسوس آتا ہے کہ یہ لوگ کیسے تھے کہ اِسقدر اخلاص کا دعویٰ کر کے

پھر ایسی ناپاکی دکھلا دیں جس کی نظیر دنیا میں نہیں۔ کیا تیس ۳۰ روپے لیکر ایک سچے نبی اور پیارے رہنما کو خونیوں کے حوالے کرنا حواری کہلانے کی یہی حقیقت تھی؟ کیا لازم تھا کہ پطرس جیسا حواریوں کا سردار حضرت مسیح کے سامنے کھڑے ہو کر ان پر لعنت بھیجے اور چند روزہ زندگی کے لئے اپنے مقتدا کو اس کے مُنہ پر گالیاں دے؟ کیا مناسب تھا کہ حضرت مسیح کے پکڑے جانے کے وقت میں تمام حواری اپنا اپنا راہ لیں اور ایک دم کے لئے بھی صبر نہ کریں؟ جن کا پیارا نبی قتل کرنے کے لئے پکڑا جائے۔ ایسے لوگوں کے صدق وصفا کے یہی نشان ہُوا کرتے ہیں جو حواریوں نے اس وقت دکھلائے؟ اُن کے گذر جانے کے بعد مخلوق پرستوں نے باتیں بنائیں اور آسمان پر چڑھا دیا۔ مگر جو کچھ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنا ایمان دکھلایا وہ باتیں تو اب تک انجیلوں میں موجود ہیں۔ غرض وہ دلیل جو نبوت اور رسالت کے مفہوم سے ایک سچے نبی کے لئے قائم ہوتی ہے وہ حضرت مسیح کے لئے قائم نہیں ہو سکی۔ اگر قرآن ان کی نبوت کا بیان نہ کرتا تو ہمارے لئے کوئی بھی راہ کھلی نہیں تھی کہ ہم اُنکو سچے نبیوں کے سلسلہ میں داخل کر سکیں۔ کیا جس کی یہ تعلیم ہو کہ مَیں ہی خدا ہوں اور خدا کا بیٹا اور بندگی اور فرمانبرداری سے آزاد اور جس کی عقل اور معرفت صرف اس قدر ہو کہ میری خودکشی سے لوگ گناہ سے نجات پا جائینگے ایسے آدمی کو ایک دم کے لئے بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ دانا اور راہِ راست پر ہے۔ مگر الحمدللہ کہ قرآنی تعلیم نے ہم پر یہ کھول دیا کہ **ابن مریم** پر یہ سب جھوٹے الزام ہیں۔ **انجیل میں تثلیث کا نام ونشان نہیں** ایک عام محاورہ لفظ ابن اللہ کا جو پہلی کتابوں میں آدم سے لیکر اخیر تک ہزارہا لوگوں پر بولا گیا تھا وہی عام لفظ حضرت مسیح کے حق میں انجیل میں آگیا۔ پھر بات کا بتنگڑ بنایا گیا یہاں تک کہ حضرت مسیح اِسی لفظ کی بنیاد پر خدا بھی بن گئے۔ حالانکہ نہ کبھی مسیح نے خدائی کا دعویٰ کیا اور نہ کبھی خودکشی کی خواہش ظاہر کی جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ایسا کرتا تو راستبازوں کے دفتر سے اُن کا نام کاٹا جاتا۔ یہ بھی مشکل سے یقین ہوتا ہے کہ ایسے شرمناک جھوٹ کی بنیاد حواریوں کے خیالات کی برگشتگی نے پیدا کی ہو کیونکہ گو انکی نسبت جیسا کہ انجیل میں بیان کیا گیا ہے یہ صحیح بھی ہو کہ وہ موٹی عقل کے آدمی اور جلد تر غلطی کھانے والے تھے لیکن ہم اس بات کو قبول نہیں کر سکتے کہ وہ ایک نبی کے صحبت یافتہ ہو کر ایسے بیہودہ خیالات کی جنس کو اپنی ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے۔ مگر انجیل کے حواشی پر نظر غور کرنے سے اصل حقیقت یہ

معلوم ہوتی ہے کہ یہ ساری چالبازی حضرت پولس کی ہے جس نے پولٹیکل چالبازوں کی طرح عمیق مکروں سے کام لیا ہے۔

غرض جس ابن مریم کی قرآن نے ہم کو خبر دی ہے وہ اُسی ازلی ابدی ہدایت کا پابند تھا جو ابتداء سے بنی آدم کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ لہذا اس کی نبوت کے لئے قرآنی ثبوت کافی ہے گو انجیل کی رُو سے کتنے ہی شکوک و شبہات اس کی نبوت کے بارے میں پیدا ہوں

والسلام علی من اتبع الھدٰی راقم خاکسار غلام احمد

(نور القرآن ۲ ص ۴۱-۴۳)

تثلیث کا عقیدہ بھی ایک عجیب عقیدہ ہے۔ کیا کسی نے سُنا ہے کہ مستقل طور پر اور کامل طور پر تین بھی ہوں اور ایک بھی ہو۔ اور ایک بھی کامل خدا اور تین بھی کامل خدا ہو۔ عیسائی مذہب بھی عجیب مذہب ہے کہ ہر ایک بات میں غلطی اور ہر ایک امر میں لغزش ہے اور پھر باوجود ان تمام تاریکیوں کے آئندہ زمانہ کے لئے وحی اور الہام پر مہر لگ گئی ہے اور اب ان تمام اناجیل کی غلطیوں کا فیصلہ حسب اعتقاد عیسائیوں کے وحیٔ جدید کی رُو سے تو غیر ممکن ہے کیونکہ ان کے عقیدہ کے موافق اب وحی آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گئی ہے۔ اب تمام مدار صرف اپنی اپنی رائے پر ہے جو جہالت اور تاریکی سے مبرّا نہیں اور انکی انجیلیں اس قدر بیہودگیوں کا مجموعہ ہیں جو ان کا شمار کرنا غیر ممکن ہے۔ مثلاً ایک عاجز انسان کو خدا بنانا اور دوسروں کے گناہوں کی سزا میں اس کے لئے صلیب تجویز کرنا اور تین دن تک اس کو دوزخ میں بھیجنا۔ اور پھر ایک طرف خدا بنانا اور ایک طرف کمزوری اور دروغگوئی کی عادت کو اس کی طرف منسوب کرنا۔ چنانچہ انجیلوں میں بہت سے ایسے کلمات پائے جاتے ہیں جن سے نعوذ باللہ حضرت مسیح کا دروغگو ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً وہ ایک چور کو وعدہ دیتے ہیں کہ آج بہشت میں تو میرے ساتھ روزہ کھولے گا۔ اور ایک طرف وہ خلافِ وعدہ اُسی دن دوزخ میں جاتے ہیں اور تین دن دوزخ میں ہی رہتے ہیں۔ ایسا ہی انجیلوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ شیطان آزمائش کے لئے مسیح کو کئی جگہ لئے پھرا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسیح خدا بن کر بھی شیطان کی آزمائش سے بچ نہ سکا اور شیطان کو خدا کی آزمائش کی جرأت ہو گئی یہ انجیل کا فلسفہ تمام دنیا سے نرالا ہے اگر درحقیقت شیطان مسیح کے پاس آیا تھا تو مسیح کے لئے بڑا عمدہ موقع تھا کہ یہودیوں کو شیطان دکھلا دیتا۔ کیونکہ یہودی حضرت مسیح کی نبوت کے سخت انکاری تھے۔

(چشمہ مسیحی ص ۱۴-۱۵)

یقیناً سمجھو کہ سچّا خدا وہی خدا ہے جس کی طرف قرآن شریف بُلاتا ہے۔ اس کے سوا سب انسان پرستیاں یا سنگ پرستیاں ہیں۔ بیشک مسیح ابن مریم نے بھی اسی چشمہ سے پانی پیا ہے جس سے ہم پیتے ہیں اور بلاشبہ اُس نے بھی اس پھل میں سے کھایا ہے جس سے ہم کھاتے ہیں لیکن اِن باتوں کو خدائی سے کیا تعلق اور ابنیت سے کیا علاقہ ہے۔ عیسائیوں نے مسیح کو ایک مقید خدا بنانے کا ذریعہ بھی خوب نکالا ہے یعنی لعنت۔ اگر لعنت نہ ہو تو خدائی بے کار اور ابنیت لغو۔ لیکن باتفاق تمام اہل لُغت ملعون ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا سے دل برگشتہ ہو جائے۔ بے ایمان ہو جائے۔ مرتد ہو جائے۔ خدا کا دشمن ہو جائے۔ سیاہ دل ہو جائے۔ کتّوں اور سوٗروں اور بندروں سے بدتر ہو جائے جیسا کہ توریت بھی گواہی دے رہی ہے۔ پس کیا یہ مفہوم بھی ایک سیکنڈ کے لئے مسیح کے حق میں تجویز کر سکتے ہیں۔ کیا اُس پر ایسا زمانہ آیا تھا کہ وہ خدا کا پیارا نہیں رہا تھا؟ کیا اُس پر وہ وقت آیا تھا کہ اُس کا دل خدا سے برگشتہ ہو گیا تھا؟ کیا کبھی اُس نے بے ایمانی کا ارادہ کیا تھا۔ کیا کبھی ایسا ہوٗا کہ وہ خدا کا دشمن اور خدا اس کا دشمن تھا؟ پس اگر ایسا نہیں ہوٗا تو اُس نے اس لعنت میں سے کیا حصّہ لیا جس پر نجات کا تمام مدار ٹھہرایا گیا ہے۔ کیا توریت گواہی نہیں دیتی کہ مصلوب لعنتی ہے؟ پس اگر مصلوب لعنتی ہوتا ہے تو بے شک وہ لعنت جو عام طور پر مصلوب ہونے کا نتیجہ ہے مسیح پر پڑی ہوگی۔ لیکن لعنت کا مفہوم دنیا کے اتفاق کی رُو سے خدا سے دُور ہونا اور خدا سے برگشتہ ہونا ہے۔ فقط کسی پر مصیبت پڑنا یہ لعنت نہیں بلکہ لعنت خدا سے دُوری اور خدا سے نفرت اور خدا سے دشمنی ہے۔ اور لعین لغت کی رُو سے شیطان کا نام ہے۔ اب خدا کے لئے سوچو کہ کیا روا ہے کہ ایک راستباز کو خدا کا دشمن اور خدا سے برگشتہ بلکہ شیطان نام رکھا جائے۔ اور خدا کو اس کا دشمن ٹھہرایا جائے۔ بہتر ہوتا کہ عیسائی اپنے لئے دوزخ قبول کر لیتے مگر اس برگزیدہ انسان کو ملعون اور شیطان نہ ٹھہراتے۔ ایسی نجات پر لعنت ہے جو بغیر اس کے جو راستبازوں کو بے ایمان اور شیطان قرار دیا جائے مل نہیں سکتی۔ قرآن شریف نے یہ خوب سچائی ظاہر کی کہ مسیح کو صلیبی موت سے بچا کر لعنت کی پلیدی سے بری رکھا۔ اور انجیل بھی یہی گواہی دیتی ہے کیونکہ مسیح نے یونس کے ساتھ اپنی تشبیہ پیش کی ہے اور کوئی عیسائی اس سے بے خبر نہیں کہ یونس مچھلی کے پیٹ میں نہیں مرا تھا۔ پھر اگر یسوع قبر میں مُردہ پڑا رہا تو مُردہ کو زندہ سے کیا مناسبت اور زندہ کو مُردہ سے کونسی مشابہت؟ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ یسوع نے صلیب سے نجات پا کر شاگردوں کو اپنے زخم دکھائے پس اگر اس کو دوبارہ زندگی جلالی طور پر حاصل ہوئی تھی تو اس پہلی زندگی کے زخم

کیوں باقی رہ گئے۔ کیا جلال میں کچھ کسر باقی رہ گئی تھی؟ اور اگر کسر رہ گئی تھی تو کیونکر اُمید رکھیں کہ وہ زخم پھر کبھی قیامت تک مل سکیں گے۔ یہ بیہودہ قصّے ہیں جن پر خدائی کا شہتیر رکھا گیا ہے مگر وقت آتا ہے بلکہ آ گیا کہ جس طرح رُوئی کو دھنکا جاتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ اِن تمام قصّوں کو ذرّہ ذرّہ کرکے اُڑا دیگا۔

(سراج منیر ص ۵۵-۵۶)

عیسائیوں کا یہ ایک متفق علیہ عقیدہ ہے کہ **یسوع مصلوب ہوکر تین دن کے لئے لعنتی ہوگیا** تھا۔ اور تمام مدارِ نجات کا اُن کے نزدیک اِسی لعنت پر ہے۔ تو اس لعنت کے مفہوم کی رُو سے ایک ایسا سخت اعتراض وارد ہوتا ہے جس سے تمام عقیدہ تثلیث کا اور کفارہ اور نیز گناہوں کی معافی کا مسئلہ کالعدم ہوکر اس کا باطل ہونا بدیہی طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کو اس مذہب کی حمایت منظور ہے تو جلد جواب دے۔ ورنہ دیکھو یہ ساری عمارت گر گئی اور اسکا گرنا ایسا سخت ہؤا کہ سب عیسائی عقیدے اس کے نیچے کُچلے گئے۔ نہ تثلیث رہی نہ کفارہ نہ گناہوں کی معافی۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ کیسا کسرِ صلیب ہؤا!!!

اب ہم صفائی اعتراض کے لئے پہلے لُغت کی رو سے لعنت کے لفظ کے معنے کرتے ہیں اور پھر اعتراض کو بیان کر دینگے۔ سو جاننا چاہیئے کہ لسان العرب میں کہ جو لُغت کی ایک پُرانی کتاب اسلامی تالیفات میں سے ہے اور ایسا ہی قطر المحیط اور محیط اور اقرب الموارد میں جو دو عیسائیوں کی تالیفات ہیں جو حال میں بمقام بیروت چھپکر شائع ہوئی ہیں اور ایسا ہی کُتبِ لُغت کی تمام کتابوں میں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں لعنت کے معنے یہ لکھے ہیں:—

اللّعن: الإبعادُ والطَّردُ من الخیر ومن اللّٰہ ومن الخلق ومن أُبعدہ اللّٰہ لَمْ تَلحقْہ رحمتہ وخُلِّد فی العَذَاب - واللّعینُ الشیطانُ والممسُوخ - وقال الشّمّاخ مقام الذئب کالرّجل اللّعین۔

یعنی لعنت کا مفہوم یہ ہے کہ لعنتی اس کو کہتے ہیں جو ہر یک خیر و خوبی اور ہر قسم کی ذاتی صلاحیت اور خدا کی رحمت اور خدا کی معرفت سے بکلّی بے بہرہ اور بے نصیب ہو جائے اور ہمیشہ کے عذاب میں پڑے۔ یعنی اس کا دل بکلّی سیاہ ہو جائے اور بڑی نیکی سے لے کر چھوٹی نیکی تک کوئی خیر کی بات اس کے نفس میں باقی نہ رہے اور شیطان بن جائے اور اس کا اندر مسخ ہو جائے یعنی کتوں اور سؤروں اور بندروں کی خاصیت اس کے نفس میں پیدا ہو جائے۔

اور شماخ نے ایک شعر میں لعنتی انسان کا نام بھیڑیا رکھا ہے۔ اس مشابہت سے کہ لعنتی کا باطن مسخ ہو جاتا ہے۔ تم کلامہم۔ ایسا ہی عرف عام میں بھی جب یہ بولا جاتا ہے کہ فلاں شخص پر خدا کی لعنت ہے تو ہر یک ادنیٰ اعلیٰ یہی سمجھتا ہے کہ وہ شخص خدا کی نظر میں واقعی طور پر پلید باطن اور بے ایمان اور شیطان ہے اور خدا اس سے بیزار اور وہ خدا سے روگردان ہے ....

.... اس وقت ہم حضرات پادری صاحبوں سے بکمال ادب یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ درحقیقت یہ لعنت اپنے تمام لوازم کے ساتھ جیسا کہ ذکر کیا گیا یسوع پر خداتعالیٰ کی طرف سے پڑ گئی تھی۔ اور وہ خدا کی لعنت اور غضب کے نیچے آکر سیاہ دل اور خدا سے روگردان ہو گیا تھا؟ میرے نزدیک تو ایسا شخص خود لعنتی ہے کہ ایسے برگزیدہ کا نام لعنتی رکھتا ہے جو دوسرے لفظوں میں سیاہ دل اور خدا سے برگشتہ اور شیطان سیرت کہنا چاہیئے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسا پیارا درحقیقت اس لعنت کے نیچے آگیا تھا جو پوری پوری خدا کی دشمنی کے بغیر متحقق نہیں ہو سکتی .... خدا کے کسی پیارے کو ایک دم کے لئے بھی شیطان کہنا کسی شیطان کا کام ہے نہ انسان کا۔ پس میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شریف آدمی ایک سیکنڈ کے لئے بھی یسوع کے لئے یہ تمام نام جائز رکھے جو لعنت کی حقیقت اور روح ہیں۔ پس اگر جائز نہیں تو دیکھو کہ کفارہ کی تمام عمارت گر گئی اور تثلیثی مذہب ہلاک ہو گیا اور صلیب ٹوٹ گیا۔ **کیا کوئی دنیا میں ہے جو اس کا جواب دے؟**

(تبلیغ رسالت جلد ششم ص ۳۳ - ۳۵)

جاننا چاہیئے کہ اگرچہ عیسائیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودا اسکریوطی کی شرارت سے گرفتار ہو کر مصلوب ہو گئے اور پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے لیکن **انجیل شریف** پر غور کرنے سے یہ اعتقاد سراسر باطل ثابت ہوتا ہے۔ متی باب ۱۲ آیت ۴۰ میں لکھا ہے کہ جیسا کہ یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسا ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہیگا۔ اب ظاہر ہے کہ یونس مچھلی کے پیٹ میں مرا نہیں تھا۔ اور اگر زیادہ سے زیادہ کچھ ہوا تھا تو صرف بیہوشی اور غشی تھی۔ اور خدا کی پاک کتابیں یہ گواہی دیتی ہیں کہ یونس خدا کے فضل سے مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا اور زندہ نکلا۔ اور آخر قوم نے اس کو قبول کیا پھر اگر حضرت مسیح علیہ السلام زمین کے پیٹ میں مر گئے تھے تو مُردہ کو زندہ سے کیا مشابہت اور زندہ کو مُردہ سے کیا مناسبت؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ مسیح ایک نبی صادق تھا اور جانتا تھا کہ وہ خدا جس کا وہ پیارا تھا لعنتی موت سے

اُس کو بچائیگا اسلئے اُس نے خدا سے الہام پاکر پیشگوئی کے طور پر یہ مثال بیان کی تھی۔ اور اس مثال میں جتلا دیا تھا کہ وہ صلیب پر نہ مرے گا اور نہ لعنت کی لکڑی پر اس کی جان نکلے گی بلکہ یونس نبی کی طرح صرف غشی کی حالت ہوگی۔ اور مسیح نے اس مثال میں یہ بھی اشارہ کیا تھا کہ وہ زمین کے پیٹ سے نکل کر پھر قوم سے ملیگا۔ اور یونس کی طرح قوم میں عزّت پائیگا۔ سو یہ پیشگوئی بھی پوری ہوئی۔ کیونکہ مسیح زمین کے پیٹ میں سے نکل کر اپنی ان قوموں کی طرف گیا جو کشمیر اور تبت وغیرہ مشرقی ممالک میں سکونت رکھتی تھیں۔ یعنی بنی اسرائیل کے وہ دس فرقے جن کو شالمنذر شاہ اسور سامریہ سے ۷۲۱ برس پیشتر اسیر کرکے لے گیا۔ آخر وہ ہندوستان کی طرف آکر اس ملک کے متفرق مقامات میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اور ضرور تھا کہ مسیح اس سفر کو اختیار کرتا کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہی اس کی نبوت کی علّت غائی تھی کہ وہ اُن گمشدہ یہودیوں کو ملتا جو ہندوستان کے مختلف مقامات میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ وجہ یہ کہ درحقیقت وہی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑیں تھیں جنہوں نے ان ملکوں میں آکر اپنے باپ دادے کا مذہب بھی ترک کر دیا تھا۔ اور اکثر اُن کے بدھ مذہب میں داخل ہو گئے تھے اور پھر رفتہ رفتہ بُت پرستی تک نوبت پہنچی تھی ....

ماسوا اس کے صلیب کی موت سے نجات پانا اس کو اسی لئے بھی ضروری تھا کہ مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے اور لعنت کا ایک ایسا مفہوم ہے کہ جو عیسیٰ مسیح جیسے برگزیدہ پر ایک دم کے لئے بھی تجویز کرنا سخت ظلم ہے اور ناانصافی ہے کیونکہ باتفاق تمام اہل زبان لعنت کا مفہوم دل سے تعلق رکھتا ہے اور اس حالت میں کسی کو ملعون کہا جائیگا جبکہ حقیقت میں اُس کا دل خدا سے برگشتہ ہو کر سیاہ ہو جائے اور خدا کی رحمت سے بے نصیب اور خدا کی محبت سے بے بہرہ اور خدا کی معرفت سے بکلّی تہیدست اور خالی اور شیطان کی طرح اندھا اور بے بہرہ ہو کر گمراہی کے زہر سے بھرا ہوا ہو۔ اور خدا کی محبت اور معرفت کا نور ایک ذرّہ اُس میں باقی نہ رہے اور تمام تعلّق مہر و وفا کا ٹوٹ جائے اور اس میں اور خدا میں باہم بغض اور نفرت اور کراہت اور عداوت پیدا ہو جائے۔ یہاں تک کہ خدا اس کا دشمن اور وہ خدا کا دشمن ہو جائے اور خدا اس سے بیزار اور وہ خدا سے بیزار ہو جائے۔ غرض ہر ایک صفت میں شیطان کا وارث ہو جائے اور اسی وجہ سے لعین شیطان کا نام ہے .... کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسیح پر کبھی ایسا زمانہ آیا تھا کہ اُس کا دل درحقیقت خدا سے برگشتہ اور خدا کا

منکر اور خدا سے بیزار اور خدا اس کا دشمن ہو گیا تھا۔ کیا ہم گمان کر سکتے ہیں کہ مسیح کے دل نے کبھی یہ محسوس کیا تھا کہ وہ اب خدا سے برگشتہ اور خدا کا دشمن اور کفر اور انکار کی تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے؟ پھر اگر مسیح کے دل پر کبھی ایسی حالت نہیں آئی بلکہ وہ ہمیشہ محبت اور معرفت کے نور سے بھرا رہا تو اے دانشمندو! یہ سوچنے کا مقام ہے کہ کیونکر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسیح کے دل پر نہ ایک لعنت بلکہ ہزاروں خدا کی لعنتیں اپنی کیفیت کے ساتھ نازل ہوئی تھیں۔ معاذ اللہ ہرگز نہیں تو پھر ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ نعوذ باللہ وہ لعنتی ہوا؟ ....

یہ بھی یاد رہے کہ ایسا خیال صرف حضرت مسیح علیہ السلام کی شانِ نبوت اور مرتبہ رسالت کے ہی مخالف نہیں بلکہ اُن کے اس دعویٰ کمال اور پاکیزگی اور محبت اور معرفت کے بھی مخالف ہے جو انہوں نے جا بجا انجیل میں ظاہر کیا ہے۔ انجیل کو پڑھکر دیکھو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صاف دعویٰ کرتے ہیں کہ میں جہان کا نور ہوں۔ میں ہادی ہوں اور میں خدا سے اعلیٰ درجہ کی محبت کا تعلق رکھتا ہوں اور میں نے اس سے پاک پیدائش پائی ہے اور میں خدا کا پیارا بیٹا ہوں۔ پھر باوجود ان غیر منفک اور پاک تعلقات کے لعنت کا ناپاک مفہوم کیونکر مسیح کے دل پر صادق آسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس بلاشبہ یہ بات ثابت ہے کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا یعنی صلیب پر نہیں مرا کیونکہ اُس کی ذات صلیب کے نتیجہ سے پاک ہے۔ اور جبکہ مصلوب نہیں ہوا تو لعنت کی ناپاک کیفیت سے بے شک اس کے دل کو بچایا گیا اور بلاشبہ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ وہ آسمان پر ہرگز نہیں گیا۔ کیونکہ آسمان پر جانا اس منصوبہ کی ایک جز تھی اور مصلوب ہونے کی ایک فرع تھی۔ پس جبکہ ثابت ہوا کہ وہ نہ لعنتی ہوا اور نہ تین دن کے لئے دوزخ میں گیا اور نہ مرا تو پھر یہ دوسری جز آسمان پر جانے کی بھی باطل ثابت ہوئی۔ اور اس پر اور بھی دلائل ہیں جو انجیل سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ ہم ذیل میں لکھتے ہیں۔

چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ قول ہے جو مسیح کے مُنہ سے نکلا۔ "لیکن میں اپنے جی اُٹھنے کے بعد تم سے آگے جلیل کو جاؤنگا۔" دیکھو متی باب ۲۶ آیت ۳۲۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسیح قبر سے نکلنے کے بعد جلیل کی طرف گیا تھا نہ آسمان کی طرف۔ اور مسیح کا یہ کلمہ کہ "اپنے جی اٹھنے کے بعد" اس سے مرنے کے بعد جینا مراد نہیں ہو سکتا بلکہ چونکہ یہودیوں اور عام لوگوں کی نظر میں وہ صلیب پر مر چکا تھا اس لئے مسیح نے پہلے سے اُن کے آئندہ خیالات کے موافق یہ کلمہ استعمال کیا۔ اور درحقیقت جس شخص کو صلیب پر کھینچا گیا اور اُس کے

پیروں اور ہاتھوں میں کیل ٹھونکے گئے یہاں تک کہ وہ اس تکلیف سے غشی میں ہو کر مُردہ کی سی حالت میں ہو گیا اگر وہ ایسے صدمہ سے نجات پر پھر ہوش کی حالت میں آجائے تو اس کا یہ کہنا مبالغہ نہیں ہو گا کہ مَیں پھر زندہ ہو گیا ....

غرض یہ آیت جس کو ہم نے ابھی لکھا ہے اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح قبر سے نکل کر گلیل کی طرف گیا۔ اور مرقس کی انجیل میں لکھا ہے کہ وہ قبر سے نکل کر جلیل کی سڑک پر جاتا ہُوا دکھائی دیا۔ اور آخر ان گیاراں حواریوں کو ملا جبکہ وہ کھانا کھا رہے تھے اور اپنے ہاتھ اور پاؤں جو زخمی تھے دکھائے اور انہوں نے گمان کیا کہ شائد یہ رُوح ہے۔ تب اس نے کہا کہ مجھے چُھوؤ اور دیکھو کیونکہ روح کو جسم اور ہڈی نہیں جیسا کہ مجھ میں دیکھتے ہو۔ اور اُن سے ایک بھُنی ہوئی مچھلی کا ٹکڑا اور شہد کا ایک چھتّہ لیا اور ان کے سامنے کھایا۔ دیکھو مرقس باب ۱۶ آیت ۱۴ اور لوقا باب ۲۴ آیت ۳۹ اور ۴۰ اور ۴۱ اور ۴۲۔ ان آیات سے یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ مسیح ہرگز آسمان پر نہیں گیا بلکہ قبر سے نکل کر جلیل کی طرف گیا اور معمولی جسم اور معمولی کپڑوں میں انسانوں کی طرح تھا اگر وہ مر کر زندہ ہوتا تو کیونکر ممکن تھا کہ جلالی جسم میں صلیب کے زخم باقی رہ جاتے۔ اور اس کو روٹی کھانے کی کیا حاجت تھی؛ اور اگر تھی تو پھر اب بھی روٹی کھانے کا محتاج ہو گا۔

ناظرین کو اس دھوکا میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ **یہودیوں کی صلیب** اس زمانہ کی پھانسی کی طرح ہو گی جس سے نجات پانا قریبًا محال ہے۔ کیونکہ اس زمانہ کی صلیب میں کوئی رسّہ گلے میں نہیں ڈالا جاتا تھا اور نہ تختہ پر سے گرا کر لٹکایا جاتا تھا۔ بلکہ صرف صلیب پر کھینچ کر ہاتھوں اور پیروں پر کیل ٹھونکے جاتے تھے اور یہ بات ممکن ہوتی تھی کہ اگر صلیب پر کھینچنے اور کیل ٹھونکنے کے بعد ایک دو دن تک کسی کی جان بخشی کا ارادہ ہو تو اسی قدر عذاب پر کفایت کر کے ہڈیاں توڑنے سے پہلے اس کو زندہ اتار لیا جائے اور اگر مارنا ہی منظور ہوتا تھا تو کم سے کم تین دن تک صلیب پر کھینچا ہُوا رہنے دیتے تھے۔ اور پانی اور روٹی نزدیک نہ آنے دیتے تھے اور اسی طرح دھوپ میں تین دن یا اس سے زیادہ چھوڑ دیتے تھے اور پھر اس کے بعد اسکی ہڈیاں توڑتے تھے اور پھر آخر ان تمام عذابوں کے بعد وہ مر جاتا تھا۔ لیکن خدا تعالیٰ کے فضل و کرم نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اس درجہ کے عذاب سے بچا لیا جس سے زندگی کا خاتمہ ہو جاتا انجیلوں کو ذرہ غور کی نظر سے پڑھنے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نہ تین دن تک صلیب پر رہے اور نہ تین دن کی بھوک اور پیاس اُٹھائی اور نہ ان کی ہڈیاں توڑی گئیں۔

بلکہ قریباً دو گھنٹہ تک صلیب پر رہے اور خدا کے رحم اور فضل نے اُن کے لئے یہ تقریب قائم کر دی کہ دن کے اخیر حصے میں صلیب دینے کی تجویز ہوئی اور وہ جمعہ کا دن تھا اور صرف تھوڑا سا دن باقی تھا اور اگلے دن سبت اور یہودیوں کی عید فسح تھی اور یہودیوں کیلئے یہ حرام اور قابل سزا جرم تھا کہ کسی کو سبت یا سبت کی رات میں صلیب پر رہنے دیں اور مسلمانوں کی طرح یہودی بھی قمری حساب رکھتے تھے اور رات دن پر مقدم سمجھی جاتی تھی۔ پس ایک طرف تو یہ تقریب تھی کہ جو زمینی اسباب سے پیدا ہوئی اور دوسری طرف آسمانی اسباب خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ پیدا ہوئے کہ جب چھٹا گھنٹہ ہُوا تو ایک ایسی آندھی آئی کہ جس سے ساری زمین پر اندھیرا چھا گیا اور وہ اندھیرا تین گھنٹے برابر رہا۔ دیکھو مرقس باب ۱۵ آیت ۳۳ ۔ یہ چھٹا گھنٹہ بارہ بجے کے بعد تھا یعنی وہ وقت جو شام کے قریب ہوتا ہے۔ اب یہودیوں کو اس شدّت اندھیرے میں یہ فکر پڑی کہ مبادا سبت کی رات آجائے اور وہ سبت کے مجرم ہو کر تاوان کے لائق ٹھہریں اس لئے انہوں نے جلدی سے مسیح کو اور اس کے ساتھ کے دو چوروں کو بھی صلیب پر سے اتار لیا۔ اور اس کے ساتھ ایک اور آسمانی سبب یہ پیدا ہُوا کہ جب پلاطوس کچہری کی مسند پر بیٹھا تھا اُس کی جورو نے اُسے کہلا بھیجا کہ تو اس راستباز سے کچھ کام نہ رکھ (یعنی اس کے قتل کرنے کے لئے سعی نہ کر) کیونکہ میں نے آج رات خواب میں اس کے سبب سے بہت تکلیف پائی۔ دیکھو متی باب ۲۷ آیت ۱۹ ۔ سو یہ فرشتہ جو خواب میں پلاطس کی جورو کو دکھایا گیا اس سے ہم اور ایک منصف یقینی طور پر یہ سمجھیگا کہ خدا کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ مسیح صلیب پر وفات پاوے ....

اور **منجملہ اُن شہادتوں کے** جو انجیل سے ہمیں مسیح ابن مریم کی صلیبی موت سے محفوظ رہنے پر ملتی ہیں اُس کا وہ سفر دور دراز ہے جو قبر سے نکل کر جلیل کی طرف اس نے کیا۔ چنانچہ اتوار کی صبح کو پہلے وہ مریم مگدلینی کو ملا۔ مریم نے فی الفور حواریوں کو خبر کی کہ مسیح تو جیتا ہے لیکن وہ یقین نہ لائے۔ پھر وہ حواریوں سے دو کو جبکہ وہ دیہات کی طرف جاتے تھے دکھائی دیا۔ آخر وہ گیاروں کو جبکہ وہ کھانے بیٹھے تھے دکھائی دیا اور اُن کی بے ایمانی اور سخت دلی پر ملامت کی دیکھو انجیل مرقس باب ۱۶ آیت ۹ سے آیت ۱۴ تک۔ اور جب مسیح کے حواری سفر کرتے ہوئے اس بستی کی طرف جارہے تھے جس کا نام املوس ہے جو یروشلم سے پونے چار کوس کے فاصلہ پر ہے۔ تب مسیح اُن کو ملا۔ اور جب وہ اس بستی کے نزدیک پہنچے تو مسیح نے آگے بڑھ کر چاہا کہ اُن سے الگ ہو جائے تب انہوں نے اُس کو جانے سے روک لیا کہ آج رات ہم اکٹھے رہیں گے

اور اُس نے اُن کے ساتھ بیٹھکر روٹی کھائی اور وہ سب مع مسیح کے اموّس نام ایک گاؤں میں رات رہے۔ دیکھو لوقا باب ۲۴ آیت ۱۳ سے ۳۱ تک۔ اب ظاہر ہے کہ ایک جلالی جسم کے ساتھ جو موت کے بعد خیال کیا گیا ہے مسیح سے فانی جسم کے عادات صادر ہونا اور کھانا اور پینا اور سونا اور جلیل کی طرف ایک لمبا سفر کرنا جو یروشلم سے قریبًا ستّر کوس کے فاصلہ پر تھا بالکل غیر ممکن اور نامعقول بات ہے۔ اور باوجود اس کے کہ خیالات کے میلان کی وجہ سے انجیلوں کے اِن قصّوں میں بہت کچھ تغیر ہوگیا ہے تاہم جسقدر الفاظ پائے جاتے ہیں اُن سے صریح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مسیح اسی فانی اور معمولی جسم سے اپنے حواریوں کو ملا اور پیادہ پا جلیل کی طرف ایک لمبا سفر کیا۔ اور حواریوں کو اپنے زخم دکھلائے اور رات اُن کے پاس روٹی کھائی اور سویا اور آگے چل کر ہم ثابت کرینگے کہ اُس نے اپنے زخموں کا ایک مرہم کے استعمال سے علاج کیا۔

اب یہ مقام ایک سوچنے کا مقام ہے کہ کیا ایک جلالی اور ابدی جسم پانے کے بعد یعنی اس غیر فانی جسم کے بعد جو اس لائق تھا کہ کھانے پینے سے پاک ہو کر ہمیشہ خدا تعالےٰ کے دائیں ہاتھ بیٹھے اور ہریک داغ اور درد اور نقصان سے منزہ ہو۔ اور ازلی ابدی خدا کے جلال کا اپنے اندر رنگ رکھتا ہو ابھی اس میں یہ نقص باقی رہ گیا کہ اُس پر صلیب اور کیلوں کے تازہ زخم موجود تھے جن سے خون بہتا تھا اور درد اور تکلیف اُن کے ساتھ تھی جن کے واسطے ایک مرہم بھی تیار کی گئی تھی اور جلالی اور غیر فانی جسم کے بعد بھی جو ابد تک سلامت اور بے عیب اور کامل اور غیر متغیّر چاہیئے تھا کئی قسم کے نقصانوں سے بھرا رہا اور خود مسیح نے حواریوں کو اپنا گوشت اور ہڈیاں دکھلائیں ....

پس بلاشبہ یہ بات سچ ہے کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا اور نہ کوئی نیا جلالی جسم پایا بلکہ ایک غشی کی حالت ہوگئی تھی جو مرنے سے مشابہ تھی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ اتفاق ہؤا کہ جس قبر میں وہ رکھا گیا وہ اس ملک کی قبروں کی طرح نہ تھی بلکہ ایک ہوادار کوٹھہ تھا جس میں ایک کھڑکی تھی۔ اور اس زمانہ میں یہودیوں میں یہ رسم تھی کہ قبر کو ایک ہوادار اور کشادہ کوٹھہ کی طرح بناتے تھے اور اس میں ایک کھڑکی رکھتے تھے اور ایسی قبریں پہلے سے موجود رہتی تھیں اور پھر وقت پر میت اس میں رکھی جاتی تھیں۔ ....

اور منجملہ ان شہادتوں کے جو انجیل سے ہم کو ملی ہیں پلاطوس کا وہ قول ہے جو انجیل مرقس میں لکھا ہے اور وہ یہ ہے۔ " اور جبکہ شام ہوئی اس لئے کہ تیاری کا دن تھا جو

سبت سے پہلے ہوتا ہے یوسف آرمتیہ جو ناموَر مشیر اور وہ خود خدا کی بادشاہت کا منتظر تھا آیا اور دلیری سے پلاطس کے پاس جا کے یسوع کی لاش مانگی اور پلاطس نے متعجب ہو کر شبہ کیا کہ وہ یعنی مسیح ایسا جلد مر گیا۔" دیکھو مرقس باب ۱۵ آیت ۴۲ سے ۴۴ تک۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ عین صلیب کی گھڑی میں ہی یسوع کے مرنے پر شبہ ہوا اور شبہ بھی ایسے شخص نے کیا جس کو اس بات کا تجربہ تھا کہ اس قدر مدت میں صلیب پر جان نکلتی ہے۔

اور **منجملہ اُن شہادتوں** کے جو انجیل سے ہم کو ملی ہیں انجیل کی وہ عبارت ہے جو ذیل میں لکھتا ہوں:- "پھر یہودیوں نے اس لحاظ سے کہ لاشیں سبت کے دن صلیب پر نہ رہ جائیں کیونکہ وہ دن تیاری کا تھا بلکہ بڑا ہی سبت تھا پلاطوس سے عرض کی کہ ان کی ٹانگیں توڑی اور لاشیں اتاری جائیں۔ تب سپاہیوں نے آکر پہلے اور دوسرے کی ٹانگیں جو اس کے ساتھ صلیب پر کھینچے گئے تھے توڑیں۔ لیکن جب انہوں نے یسوع کی طرف آکے دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ تو اس کی ٹانگیں نہ توڑیں۔ پر سپاہیوں میں سے ایک نے بھالے سے اسکی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے لہو اور پانی نکلا۔" دیکھو یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۱ سے آیت ۳۴ تک۔ ان آیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت کسی مصلوب کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لئے یہ دستور تھا کہ جو صلیب پر کھینچا گیا ہو اُس کو کئی دن صلیب پر رکھتے تھے اور پھر اس کی ہڈیاں توڑتے تھے۔ لیکن مسیح کی ہڈیاں دانستہ نہیں توڑی گئیں اور وہ ضرور صلیب پر سے ان دو چوروں کی طرح زندہ اتارا گیا۔ اسی وجہ سے پسلی چھیدنے سے خون بھی نکلا۔ مُردہ کا خون جم جاتا ہے اور اسجگہ یہ بھی صریح معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی طور پر یہ کوئی سازش کی بات تھی۔ پلاطوس ایک خدا ترس اور نیک دل آدمی تھا۔ کھلی کھلی رعایت سے قیصر سے ڈرتا تھا۔ کیونکہ یہودی مسیح کو باغی ٹھہراتے تھے۔ مگر وہ خوش قسمت تھا کہ اُس نے مسیح کو دیکھا۔ لیکن قیصر نے اس نعمت کو نہ پایا۔ اُس نے نہ صرف دیکھا بلکہ بہت رعایت کی اور اُس کا ہرگز منشا نہ تھا کہ مسیح صلیب پاوے۔ چنانچہ انجیلوں کے دیکھنے سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ پلاطوس نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ مسیح کو چھوڑ دے لیکن یہودیوں نے کہا کہ اگر تو اس مرد کو چھوڑ دیتا ہے تو تُو قیصر کا خیر خواہ نہیں ....

اور **منجملہ اُن شہادتوں** کے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے صلیب سے محفوظ رہنے کے بارے میں ہمیں انجیل سے ملتی ہیں وہ شہادت ہے جو انجیل متی باب ۲۶ میں یعنی آیت ۳۶ سے آیت ۴۶

تک مرقوم ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام گرفتار کئے جانے کا الہام پاکر تمام رات جناب الٰہی میں رو رو کر اور سجدے کرتے ہوئے دُعا کرتے رہے اور ضرور تھا کہ ایسی تضرع کی دُعا جس کے لئے مسیح کو بہت لمبا وقت دیا گیا تھا قبول کی جاتی کیونکہ مقبول کا سوال جو بیقراری کے وقت کا سوال ہو ہرگز ردّ نہیں ہوتا۔ پھر کیوں مسیح کی ساری رات کی دُعا اور دردمند دل کی دُعا اور مظلومانہ حالت کی دُعا ردّ ہو گئی۔ حالانکہ مسیح دعوٰی کرتا ہے کہ باپ جو آسمان پر ہے میری سُنتا ہے۔ پس کیونکر باور کیا جاوے کہ خدا اُس کی سُنتا تھا۔ جب کہ ایسی بیقراری کی دُعا سُنی نہ گئی اور انجیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو دلی یقین تھا کہ اس کی وہ دُعا ضرور قبول ہو گئی اور اس دُعا پر اس کو بہت بھروسہ تھا۔ اِسی وجہ سے جب وہ پکڑا گیا اور صلیب پر کھینچا گیا اور ظاہری علامات کو اُس نے اپنی اُمید کے موافق نہ پایا تو بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا کہ ” ایلی ایلی لما سبقتانی “ اے میرے خدا! اے میرے خدا! تُو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا۔ یعنی مجھے یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ میرا انجام یہ ہو گا اور میں صلیب پر مروں گا۔ اور مَیں یقین رکھتا تھا کہ تو میری دُعا سُنے گا ۔ . . . .

بلاشبہ خدائے تعالیٰ دُعاؤں کو سُنتا ہے بالخصوص جبکہ اُس پر بھروسہ کرنے والے مظلوم ہونے کی حالت میں اُس کے آستانہ پر گرتے ہیں تو وہ اُن کی فریاد کو پہنچتا ہے اور ایک عجیب طور پر اُن کی مدد کرتا ہے اور ہم اس بات کے گواہ ہیں تو پھر کیا باعث اور کیا سبب کہ مسیح کی ایسی بیقراری کی دُعا منظور نہ ہوئی؟ نہیں بلکہ منظور ہوئی اور خدا نے اسکو بچا لیا۔ خدا نے اُس کے بچانے کے لئے زمین سے بھی اسباب پیدا کئے اور آسمان سے بھی۔ یوحنا یعنی یحیٰ نبی کو خدا نے دُعا کرنے کے لئے مہلت نہ دی کیونکہ اس کا وقت آچکا تھا مگر مسیح کو دُعا کرنے کیلئے تمام رات مہلت دی گئی۔ اور وہ ساری رات سجدہ میں اور قیام میں خدا کے آگے کھڑا رہا کیونکہ خدا نے چاہا کہ وہ بیقراری ظاہر کرے اور اس خدا سے جس کے آگے کوئی بات انہونی نہیں اپنی مخلصی چاہے۔ سو خدا نے اپنی قدیم سنت کے موافق اُس کی دُعا کو سُنا۔ یہودی اس بات میں جھوٹے تھے جنہوں نے صلیب دے کر یہ طعنہ مارا کہ اُس نے خدا پر توکّل کیا تھا کیوں خدا نے اُس کو نہ چھڑایا۔ کیونکہ خدا نے یہودیوں کے تمام منصوبے باطل کئے اور اپنے پیارے مسیح کو صلیب اور اس کی لعنت سے بچا لیا اور یہودی نامراد رہے۔

اور منجملہ انجیلی شہادتوں کے جو ہم کو ملی ہیں انجیل متی کی وہ آیت ہے جو ذیل میں

لکھتا ہوں۔ "ہابل راستباز کے خون سے برخیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے ہیکل اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانہ کے لوگوں پر آوے گا۔" دیکھو متی باب ۲۳ آیت ۳۵ و ۳۶۔ اب ان آیات پر اگر نظر غور کرو تو واضح ہوگا کہ ان میں حضرت مسیح علیہ السلام نے صاف طور پر کہدیا ہے کہ یہودیوں نے جس قدر نبیوں کے خون کئے ان کا سلسلہ زکریا نبی تک ختم ہوگیا۔ اور بعد اس کے یہودی لوگ کسی نبی کے قتل کرنے کے لئے قدرت نہیں پائیں گے۔ یہ ایک بڑی پیشگوئی ہے اور اس سے نہایت صفائی کے ساتھ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب کے ذریعہ سے قتل نہیں ہوئے۔ بلکہ صلیب سے بچکر نکل گئے اور آخر طبعی موت سے فوت ہوئے۔ کیونکہ اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی زکریا کی طرح یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہونے والے تھے تو ان آیات میں حضرت مسیح علیہ السلام ضرور اپنے قتل کئے جانے کی طرف بھی اشارہ کرتے۔
(مسیح ہندوستان میں ص۱۴-۲۲)

کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ یہودی اس بات کا جواب دینے سے قاصر رہے کہ کیونکر حضرت مسیح علیہ السلام کی جان بغیر ہڈیاں توڑنے کے صرف دو تین گھنٹہ میں نکل گئی؟ اسی وجہ سے بعض یہودیوں نے ایک اور بات بنائی ہے کہ ہم نے مسیح کو تلوار سے قتل کردیا تھا حالانکہ یہودیوں کی پرانی تاریخ کے رو سے مسیح کو تلوار کے ذریعہ سے قتل کرنا ثابت نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ مسیح کے بچانے کے لئے اندھیرا ہوا۔ بھونچال آیا۔ پلاطوس کی بیوی کو خواب آئی۔ سبت کے دن کی رات قریب آگئی جس میں مصلوبوں کو صلیب پر رکھنا روا نہ تھا۔ حاکم کا دل بوجہ ہولناک خواب کے مسیح کے چھڑانے کیلئے متوجہ ہوا۔ یہ تمام واقعات خدا نے اس لئے ایک ہی دفعہ پیدا کردیئے کہ تا مسیح کی جان بچ جائے اسکے علاوہ مسیح کو غشی کی حالت میں کردیا کہ تا ہر ایک کو مردہ معلوم ہو۔ اور یہودیوں پر اُس وقت ہیبت ناک نشان بھونچال وغیرہ کے دکھلا کر بزدلی اور خوف اور عذاب کا اندیشہ طاری کردیا اور یہ دھڑکا اس کے علاوہ تھا کہ سبت کی رات میں لاشیں صلیب پر نہ رہ جائیں پھر یہ بھی ہوا کہ یہودیوں نے مسیح کو غشی میں دیکھکر سمجھ لیا کہ فوت ہوگیا ہے۔ اندھیرے اور بھونچال اور گھبراہٹ کا وقت تھا۔ گھروں کا بھی ان کو فکر پڑا کہ شائد اس بھونچال اور اندھیرے سے بچوں پر کیا گذرتی ہوگی اور یہ دہشت بھی دلوں پر غالب ہوئی کہ اگر

یہ شخص کاذب اور کافر تھا جیسا کہ ہم نے دل میں سمجھا ہے تو اُس کے اِس دُکھ دینے کے وقت ایسے ہولناک آثار کیوں ظاہر ہوئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ لہذا اُن کے دل بے قرار ہو کر اس لائق نہ رہے کہ وہ مسیح کو اچھی طرح دیکھتے کہ آیا مر گیا ہے یا کیا حال ہے، مگر درحقیقت یہ سب امور مسیح کے بچانے کے لئے خدائی تدبیریں تھیں۔ اِسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ یعنی یہود نے مسیح کو جان سے مارا نہیں ہے لیکن خدا نے انکو شبہ میں ڈال دیا کہ گویا جان سے مار دیا ہے ـــ اِس سے راستبازوں کو خدائے تعالیٰ کے فضل پر بڑی امید بڑھتی ہے کہ جس طرح اپنے بندوں کو چاہے بچا لے۔

(مسیح ہندوستان میں ص۴۹-۵۰)

ممکن ہے کہ بعض دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہو کہ انجیلوں میں یہ بھی تو بار بار ذکر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر فوت ہو گئے اور پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے۔ ایسے اعتراضات کا جواب میں پہلے بطور اختصار دے چکا ہوں اور اب بھی اس قدر بیان کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں کہ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیبی واقعہ کے بعد حواریوں کو ملے اور گلیل تک سفر کیا اور روٹی کھائی اور کباب کھائے اور اپنے زخم دکھلائے اور ایک رات بمقام املوس حواریوں کے ساتھ رہے اور خفیہ طور پر پلاطوس کے علاقہ سے بھاگے اور نبیوں کی سنّت کے موافق اس ملک سے ہجرت کی اور ڈرتے ہوئے سفر کیا تو یہ تمام واقعات اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ صلیب پر فوت نہیں ہوئے تھے اور فانی جسم کے تمام لوازم ان کے ساتھ تھے اور کوئی نئی تبدیلی اُن میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اور آسمان پر چڑھنے کی کوئی عینی شہادت انجیل سے نہیں ملتی۔ اور اگر ایسی شہادت ہوتی بھی تب بھی لائق اعتبار نہ تھی۔ کیونکہ انجیل نویسوں کی یہ عادت معلوم ہوتی ہے کہ وہ بات کا تبنگڑ بنا لیتے ہیں اور ایک ذرہ سی بات پر حاشیے چڑھاتے چڑھاتے ایک پہاڑ اُس کو کر دیتے ہیں۔ مثلاً کسی انجیل نویس کے مُنہ سے نکل گیا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ اب دوسرا انجیل نویس اِس فکر میں پڑتا ہے کہ اُس کو پورا خدا بنا دے اور تیسرا تمام زمین و آسمان کے اختیار اسکو دیتا ہے اور چوتھا واشگاف کہدیتا ہے کہ وہی ہے جو کچھ ہے اور کوئی دوسرا خدا نہیں۔ غرض اِس طرح پر کھینچے کھینچے کہیں کا کہیں لے جاتے ہیں۔ دیکھو وہ رؤیا جس میں نظر آیا تھا کہ گویا مُردے قبروں میں سے اُٹھکر شہر میں چلے گئے۔ اب ظاہری معنوں پر زور دے کر یہ جتلایا گیا کہ

حقیقت میں مردے قبروں میں سے باہر نکل آئے تھے اور یروشلم شہر میں آکر اور لوگوں سے ملاقاتیں کی تھیں۔ اسجگہ غور کرو کہ کیسے ایک پَر کا کوّا بنایا گیا۔ پھر وہ ایک کوّا نہ رہا بلکہ لاکھوں کوّے اُڑائے گئے۔ جس جگہ مبالغہ کا یہ حال ہو اسجگہ حقیقتوں کا کیونکر پتہ لگے۔ غور کے لائق ہے کہ ان انجیلوں میں جو خدا کی کتابیں کہلاتی ہیں ایسے ایسے مبالغات بھی لکھے گئے کہ مسیح نے وہ کام کئے کہ اگر وہ سب کے سب لکھے جاتے تو وہ کتابیں جن میں وہ لکھے جاتے دنیا میں سما نہ سکتیں کیا اتنا مبالغہ طریقِ دیانت و امانت ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اگر مسیح کے کام ایسے ہی غیر محدود اور حد بندی سے باہر تھے تو تین برس کی حد میں کیونکر آگئے؟ ....

پھر اسی انجیل متی باب ۲۸ آیت ۱۲ اور ۱۳ میں ہے۔ ”تب انہوں نے یعنی یہودیوں نے بزرگوں کے ساتھ اکٹھے ہو کر صلاح کی اور اُن پہرہ والوں کو بہت روپے دیئے اور کہا کہ تم کہو کہ رات کو جب ہم سوتے تھے اُس کے شاگرد یعنی مسیح کے شاگرد آکر اُسے چُرا کر لے گئے۔“ دیکھو یہ کیسی کچّی اور نامعقول باتیں ہیں اگر اس سے مطلب یہ ہے کہ یہودی اس بات کو پوشیدہ کرنا چاہتے تھے کہ یسوع مُردوں میں سے جی اٹھا ہے اِس لئے انہوں نے پہرہ والوں کو رشوت دی تھی کہ تا عظیم الشان معجزہ ان کی قوم میں مشہور نہ ہو تو کیوں یسوع نے جس کا یہ فرض تھا کہ اپنے اس معجزہ کی یہودیوں میں اشاعت کرتا اس کو مخفی رکھا بلکہ دوسروں کو بھی اُس کے ظاہر کرنے سے منع کیا۔ اگر یہ کہو کہ اس کو پکڑے جانے کا خوف تھا تو میں کہتا ہوں کہ جب ایک دفعہ خدا تعالیٰ کی تقدیر اُس پر وارد ہو چکی اور وہ مر کر پھر جلالی جسم کے ساتھ زندہ ہو چکا تو اب اس کو یہودیوں کا کیا خوف تھا؟ کیونکہ اب یہودی کسی طرح اس پر قدرت نہیں پا سکتے تھے۔ اب تو وہ فانی زندگی سے ترقی پا چکا تھا۔ افسوس کہ ایک طرف تو اُس کا جلالی جسم سے زندہ ہونا اور حواریوں کو ملنا اور جلیل کی طرف جانا اور پھر آسمان پر اٹھائے جانا بیان کیا گیا ہے اور پھر بات بات میں اُس جلالی جسم کے ساتھ بھی یہودیوں کا خوف ہے اس ملک سے پوشیدہ طور بھاگتا ہے کہ تا کوئی یہودی دیکھ نہ لے اور جان بچانے کے لئے ستّر کوس کا سفر جلیل کی طرف کرتا ہے۔ بار بار منع کرتا ہے کہ یہ واقعہ کسی کے پاس بیان نہ کرو۔ کیا یہ جلالی جسم کے لچھن اور علامتیں ہیں؟ نہیں بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی جلالی اور نیا جسم نہ تھا وہی زخم آلودہ جسم تھا جو جان نکلنے سے بچایا گیا اور چونکہ یہودیوں کا پھر بھی اندیشہ تھا اس لئے برعایت ظاہری اسباب مسیح نے اس ملک کو چھوڑ دیا۔ اور اسکے مخالف جسقدر باتیں بیان کی جاتی ہیں وہ سب کی سب بیہودہ اور خام خیال ہیں۔

(مسیح ہندوستان میں صفحہ ۲۴-۲۷)

ایک اعلیٰ درجہ کی شہادت جو حضرت مسیح کے صلیب سے بچنے پر ہم کو ملی ہے اور جو ایسی شہادت ہے کہ بجز ماننے کے کچھ بن نہیں پڑتا وہ ایک نسخہ ہے جس کا نام **مرہم عیسیٰ** ہے جو طبّ کی صدہا کتابوں میں لکھا ہُوا پایا جاتا ہے۔ ان کتابوں میں سے بعض ایسی ہیں جو عیسائیوں کی تالیف ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ جن کے مؤلف مجوسی یا یہودی ہیں اور بعض کے بنانے والے مسلمان ہیں۔ اور اکثر اُن میں بہت قدیم زمانہ کی ہیں۔ تحقیق سے ایسا معلوم ہوا ہے کہ اوّل زبانی طور پر اس نسخہ کا لاکھوں انسانوں میں شہرہ ہو گیا۔ اور پھر لوگوں نے اس نسخہ کو قلمبند کر لیا۔ پہلے رومی زبان میں حضرت مسیح کے زمانہ میں ہی کچھ تھوڑا عرصہ واقعہ صلیب کے بعد ایک قرابادین تالیف ہوئی جس میں یہ نسخہ تھا اور جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی چوٹوں کے لئے یہ نسخہ بنایا گیا تھا۔ پھر وہ قرابادین کئی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئی یہاں تک کہ مامون رشید کے زمانہ میں عربی زبان میں اس کا ترجمہ ہُوا۔ اور یہ خدا کی عجیب قدرت ہے کہ ہر ایک مذہب کے فاضل طبیب نے کیا عیسائی۔ کیا یہودی اور کیا مجوسی اور کیا مسلمان سب نے اس نسخہ کو اپنی کتابوں میں لکھا ہے اور سب نے اس نسخہ کے بارے میں یہی بیان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ان کے حواریوں نے طیار کیا تھا۔ اور جن کتابوں میں ادویہ مفردہ کے خواص لکھے ہیں انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ان چوٹوں کے لئے نہایت مفید ہے جو کسی ضربہ یا سقطہ سے لگ جاتی ہیں اور چوٹوں سے جو خون رواں ہوتا ہے وہ فی الفور اس سے خشک ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ اُس میں مُر بھی داخل ہے اِس لئے زخم کیڑا پڑنے سے بھی محفوظ رہتا ہے اور یہ دوا طاعون کے لئے بھی مفید ہے اور ہر قسم کے پھوڑے پھنسی کو اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ دوا صلیب کے زخموں کے بعد خود ہی حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے الہام کے ذریعہ سے تجویز فرمائی تھی یا کسی طبیب کے مشورہ سے تیار کی گئی تھی۔ اِس میں بعض دوائیں اکسیر کی طرح ہیں خاصکر مُر جس کا ذکر توریت میں بھی آیا ہے۔ بہرحال اس دوا کے استعمال سے حضرت مسیح علیہ السلام کے زخم چند روز میں ہی اچھے ہو گئے اور اس قدر طاقت آگئی کہ آپ تین روز میں یروشلم سے جلیل کی طرف ستّر کوس تک پیادہ پا گئے۔ پس اس دوا کی تعریف میں اسقدر کافی ہے کہ مسیح تو اَوروں کو اچھا کرتا تھا مگر اس دوا نے مسیح کو اچھا کیا۔ اور جن طبّ کی کتابوں میں یہ نسخہ لکھا گیا وہ ہزار کتاب سے بھی زیادہ ہیں جنکی فہرست لکھنے سے بہت طول ہو گا .... غرض مرہم عیسیٰ حق کے طالبوں کیلئے ایک عظیم الشان شہادت ہے، اگر اس شہادت کو قبول نہ کیا جائے تو پھر دنیا کے تمام تاریخی ثبوت اعتبار سے گر جاویں گے۔

(مسیح ہندوستان میں صـــ ۵۴ - ۵۹)

واضح ہو کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو اُن کے فرضِ رسالت کے رو سے ملک **پنجاب** اور اس کے نواح کی طرف **سفر** کرنا نہایت ضروری تھا۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے دس فرقے جن کا نام انجیل میں اسرائیل کی گمشدہ بھیڑیں رکھا گیا ہے ان ملکوں میں آگئے تھے۔ جن کے آنے سے کسی مؤرخ کو انکار نہیں ہے اس لئے ضروری تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اس ملک کی طرف سفر کرتے اور ان گم شدہ بھیڑوں کا پتہ لگا کر خدا تعالیٰ کا پیغام ان کو پہنچاتے۔ اور جب تک وہ ایسا نہ کرتے تب تک اُن کی رسالت کی غرض بے نتیجہ اور ناممکمل تھی کیونکہ جس حالت میں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اُن گمشدہ بھیڑوں کی طرف بھیجے گئے تھے تو پھر بغیر اس کے کہ وہ اُن بھیڑوں کے پیچھے جاتے اور ان کو تلاش کرتے اور ان کو طریقِ نجات بتلاتے یونہی دنیا سے کوچ کر جانا ایسا تھا کہ جیسا کہ ایک شخص ایک بادشاہ کی طرف سے مامور ہو کہ وہ فلاں بیابانی قوم میں جا کر ایک کنواں کھودے اور اس کنوئیں سے اُن کو پانی پلاوے۔ لیکن یہ شخص کسی دوسرے مقام میں تین چار برس رہ کر واپس چلا جائے اور اس قوم کی تلاش میں ایک قدم بھی نہ اٹھائے تو کیا اُس نے بادشاہ کے حکم کے موافق تعمیل کی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اُس نے محض اپنی آرام طلبی کی وجہ سے اس قوم کی کچھ پروا نہ کی۔

(مسیح ہندوستان میں ص ۹۱-۹۲)

قرآن شریف میں ایک آیت میں صریح **کشمیر** کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسیح اور اس کی والدہ صلیب کے واقعہ کے بعد کشمیر کی طرف چلے گئے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ وَاٰوَیْنٰهُمَآ اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ۔ یعنی ہم نے عیسیٰ اور اس کی والدہ کو ایک ایسے ٹیلے پر جگہ دی جو آرام کی جگہ تھی اور پانی صاف یعنی چشموں کا پانی وہاں تھا۔ سو اس میں خدا تعالیٰ نے کشمیر کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اور اٰوٰی کا لفظ لغتِ عرب میں کسی مصیبت یا تکلیف سے پناہ دینے کے لئے آتا ہے اور صلیب سے پہلے عیسیٰ اور اُس کی والدہ پر کوئی زمانہ مصیبت کا نہیں گذرا جس سے پناہ دی جاتی پس متعین ہوا کہ خدا تعالیٰ نے عیسیٰ اور اس کی والدہ کو واقعہ صلیب کے بعد اس ٹیلے پر پہنچایا تھا۔

(کشتی نوح ص ۲۴ حاشیہ)

یہ عاجز خدا کے اُس پاک اور مقدس بندہ کی طرز پر دلوں میں حقیقی پاکیزگی کی تخم ریزی کیلئے کھڑا کیا گیا ہے جو آج سے قریباً انیس سو برس پہلے رومی سلطنت کے زمانہ میں گلیل کی بستیوں

میں حقیقی نجات پیش کرنے کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ اور پھر پیلاطوس کی حکومت میں یہودیوں کی بہت سی ایذاء کے بعد اس کو خدا کی قدیم سنت کے موافق ان ملکوں سے ہجرت کرنی پڑی اور وہ ہندوستان میں تشریف لائے تا ان یہودیوں کو خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچاویں جو بابل کے تفرقہ کے وقت ان ملکوں میں آئے تھے۔ اور آخر ایک سو بیس برس کی عمر میں اس ناپائیدار دنیا کو چھوڑ کر اپنے محبوب حقیقی کو جا ملے اور کشمیر کے خطّے کو اپنے پاک مزار سے ہمیشہ کے لئے فخر بخشا۔ **کیا ہی خوش قسمت ہے سری نگر** اور انموزہ اور خان یار کا محلہ جس کی خاک پاک میں اس ابدی شہزادہ خدا کے مقدس نبی نے اپنا مطہّر جسم ودیعت کیا۔ اور بہت سے کشمیر کے رہنے والوں کو حیاتِ جاودانی اور حقیقی نجات سے حصہ دیا۔ ہمیشہ خدا کا جلال اسکے ساتھ ہو آمین

(کشف الغطاء ص۱۱)

واقعی اور سچی بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس بدبخت قوم کے ہاتھ سے نجات پا کر جب ملک پنجاب کو اپنی تشریف آوری سے فخر بخشا تو اس ملک میں خدا تعالیٰ نے اُن کو بہت عزت دی اور بنی اسرائیل کی وہ دس قومیں جو گم تھیں اسجگہ آکر اُن کو مل گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اس ملک میں آکر اکثر اُن میں سے بدھ مذہب میں داخل ہو گئے تھے۔ اور بعض ذلیل قسم کی بُت پرستی میں پھنس گئے تھے۔ سو اکثر ان کے حضرت مسیح کے اس ملک میں آنے سے راہ راست پر آگئے۔ اور چونکہ حضرت مسیح کی دعوت میں آنے والے نبی کے قبول کرنے کیلئے وصیت تھی اس لئے وہ دس فرقے جو اس ملک میں آکر افغان اور کشمیری کہلائے آخر کار سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ غرض اس ملک میں حضرت مسیح کو بڑی وجاہت پیدا ہوئی۔ اور حال میں ایک سکّہ ملا ہے جو اسی ملک پنجاب میں سے برآمد ہوا ہے۔ اُس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام پالی تحریر میں درج ہے اور اُسی زمانہ کا سکّہ ہے جو حضرت مسیح کا زمانہ تھا۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس ملک میں آکر شاہانہ عزت پائی۔ اور غالباً یہ سکّہ ایسے بادشاہ کی طرف سے جاری ہوا ہے جو حضرت مسیح پر ایمان لے آیا تھا۔ ایک اور سکّہ برآمد ہوا ہے اُس پر ایک اسرائیلی مرد کی تصویر ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی حضرت مسیح کی تصویر ہے۔ قرآن شریف میں ایک یہ بھی آیت ہے کہ مسیح کو خدا نے ایسی برکت دی ہے کہ جہاں جائیگا وہ مبارک ہوگا۔ سو ان سکّوں سے ثابت ہے کہ اُس نے خدا سے بڑی برکت پائی۔ اور وہ فوت نہ ہوا جب تک اُسکو ایک شاہانہ عزت نہ دی گئی۔

(مسیح ہندوستان میں ص۵۱-۵۲)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام افغانستان سے ہوتے ہوئے پنجاب کی طرف آئے اس ارادہ سے کہ پنجاب اور ہندوستان دیکھتے ہوئے پھر کشمیر کی طرف قدم اٹھاویں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ افغانستان اور کشمیر کی حد فاصل چترال کا علاقہ اور کچھ حصہ پنجاب کا ہے۔ اگر افغانستان سے کشمیر میں پنجاب کے رستے سے آویں تو تقریباً اسّی کوس یعنی ۱۲۰ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اور چترال کی راہ سے سو کوس کا فاصلہ ہے۔ لیکن حضرت مسیح نے بڑی عقلمندی سے افغانستان کا راستہ اختیار کیا تا اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑیں جو افغان تھے فیضیاب ہو جائیں اور کشمیر کی مشرقی حد ملک تبّت سے متصل ہے۔ اس لئے کشمیر میں آکر بآسانی تبت میں جا سکتے تھے اور پنجاب میں داخل ہو کر ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ قبل اس کے جو کشمیر اور تبت کی طرف آویں ہندوستان کے مختلف مقامات کا سیر کریں۔ سو جیسا کہ اس ملک کی پرانی تاریخیں بتلاتی ہیں یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ حضرت مسیح نے نیپال اور بنارس وغیرہ مقامات کا سیر کیا ہوگا اور پھر جموں سے یا راولپنڈی کی راہ سے کشمیر کی طرف گئے ہونگے۔ چونکہ وہ ایک سرد ملک کے آدمی تھے اس لئے یہ یقینی امر ہے کہ ان ملکوں میں غالباً وہ صرف جاڑے تک ٹھہرے ہونگے اور اخیر مارچ یا اپریل کے ابتدا میں کشمیر کی طرف کوچ کیا ہوگا۔ اور چونکہ وہ ملک بلاد شام سے بالکل مشابہ ہے اس لئے یہ بھی یقینی ہے کہ اس ملک میں سکونت مستقل اختیار کر لی ہوگی۔ اور ساتھ اس کے یہ بھی خیال ہے کہ کچھ عرصہ اپنی عمر کا افغانستان میں بھی رہے ہونگے اور کچھ بعید نہیں کہ وہاں شادی بھی کی ہو۔ افغانوں میں ایک قوم عیسیٰ خیل کہلاتی ہے کیا تعجب ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کی ہی اولاد ہوں مگر افسوس کہ افغانوں کی قوم کا تاریخی شیرازہ نہایت درہم برہم ہے اس لئے اُن کے قومی تذکرون کے ذریعہ سے کوئی اصلیت پیدا کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ بہرحال اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ افغان بنی اسرائیل میں سے ہیں جیسا کہ کشمیری بھی بنی اسرائیل میں سے ہیں۔

(مسیح ہندوستان میں ص ۶۷-۶۸)

"تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے صلیبی واقعہ سے نجات پا کر ضرور ہندوستان کا سفر کیا اور نیپال سے ہوتے ہوئے آخر تبّت تک پہنچے اور پھر کشمیر میں ایک مدت تک ٹھہرے اور وہ بنی اسرائیل جو کشمیر میں بابل کے تفرقہ کے وقت میں سکونت پذیر ہوئے تھے انکو ہدایت کی اور آخر ایک سو بیس برس کی عمر میں سرینگر میں انتقال فرمایا اور محلہ خانیار میں مدفون ہوئے اور عوام کی غلط بیانی سے یوز آسف نبی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

(راز حقیقت ص ۹ حاشیہ)

اور جو مزار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کشمیر میں ہے جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قریباً انیس سو برس سے ہے یہ اس امر کیلئے نہایت اعلیٰ درجہ کا ثبوت ہے۔ غالباً اس مزار کے ساتھ کچھ کتبے ہونگے جو اب مخفی ہیں۔

(راز حقیقت ص۱۱ حاشیہ)

واضح ہو کہ بدھ مذہب کی کتابوں میں سے **انواع اقسام کی شہادتیں** ہم کو دستیاب ہوئی ہیں جن کو یکجائی نظر کے ساتھ دیکھنے سے قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ضرور اس ملک پنجاب و کشمیر وغیرہ میں آئے تھے۔ ان شہادتوں کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔ ……

اوّل وہ خطاب جو بدھ کو دیئے گئے مسیح کے خطابوں سے مشابہ ہیں۔ اور ایسا ہی وہ واقعات جو بدھ کو پیش آئے مسیح کی زندگی کے واقعات سے ملتے ہیں۔ مگر بدھ مذہب سے مراد اُن مقامات کا مذہب ہے جو تبّت کے حدود یعنی لیہ اور لاسہ اور گلگت اور ہمس وغیرہ میں پایا جاتا ہے جن کی نسبت ثابت ہوا ہے کہ حضرت مسیح ان مقامات میں گئے تھے۔ خطابوں کی مشابہت میں یہ ثبوت کافی ہے کہ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی تعلیموں میں اپنا نام **نور** رکھا ہے۔ ایسا ہی گوتم کا نام **بُدھ** رکھا گیا ہے۔ جو سنسکرت میں نور کے معنوں پر آتا ہے۔ اور انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام **استاد** بھی ہے۔ ایسا ہی بدھ کا نام **ساستا** یعنی استاد ہے۔ ایسا ہی حضرت مسیح کا نام انجیل میں **مبارک** رکھا گیا ہے اسی طرح بُدھ کا نام بھی **سگیت** ہے یعنی مبارک ہے۔ ایسا ہی حضرت مسیح کا نام **شہزادہ** رکھا گیا ہے اور بُدھ کا نام بھی **شہزادہ** ہے اور ایک نام مسیح کا انجیل میں یہ بھی ہے کہ **وہ اپنے آنے کے مدّعا کو پورا کرنے والا ہے**۔ ایسا ہی بدھ کا نام بھی بدھ کی کتابوں میں **سدارتھا** رکھا گیا ہے یعنی اپنے آنیکا مدّعا پورا کرنیوالا۔ اور انجیل میں حضرت مسیح کا ایک نام یہ بھی ہے کہ وہ **تھکوں ماندوں کو پناہ دینے والا** ہے۔ ایسا ہی بدھ کی کتابوں میں بدھ کا نام ہے **اسرن سرن** یعنی بے پناہوں کو پناہ دینے والا۔ اور انجیل میں حضرت مسیح **بادشاہ** بھی کہلائے ہیں گو آسمان کی بادشاہت مراد لے لی۔ ایسا ہی بدھ بھی بادشاہ کہلایا ہے۔ اور واقعات کی مشابہت کا یہ ثبوت ہے کہ مثلاً جیسا کہ انجیل میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام شیطان سے آزمائے گئے اور شیطان نے انکو کہا کہ اگر تو مجھے سجدہ کرے تو تمام دنیا کی دولتیں اور بادشاہتیں تیرے لئے ہونگی۔ یہی آزمائش بدھ کی بھی کی گئی اور شیطان نے اس کو کہا کہ اگر تو میرا یہ حکم مان لے کہ ان فقیری کاموں سے باز آجائے اور گھر کی طرف چلا جائے تو میں تجھکو بادشاہت

کی شان و شوکت عطا کرونگا لیکن جیسا کہ مسیح نے شیطان کی اطاعت نہ کی ایسا ہی لکھا ہے کہ بُدھ نے بھی نہ کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ایک اور مشابہت بُدھ کی حضرت مسیح سے پائی جاتی ہے کہ بُدھ ازم میں لکھا ہے کہ بُدھ اُن ایّام میں جو شیطان سے آزمایا گیا روزے رکھتا تھا اور اُس نے چالیس روزے رکھے ۔ اور انجیل پڑھنے والے جانتے ہیں کہ حضرت مسیح نے بھی چالیس روزے رکھے تھے ۔ اور جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا ہے بدھ اور مسیح کی اخلاقی تعلیم میں اس قدر مشابہت اور مناسبت ہے کہ ہر ایک ایسا شخص تعجب کی نظر سے دیکھیگا جو دونوں تعلیموں پر اطلاع رکھتا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر جیسا کہ حضرت مسیح نے مختلف ملکوں کی طرف اپنے شاگردوں کو روانہ کیا اور آپ بھی ایک ملک کی طرف سفر اختیار کیا یہ باتیں بُدھ کے سوانح میں بھی پائی جاتی ہیں ۔ چنانچہ بدھ ازم مصنّفہ سر مونیر ولیم میں لکھا ہے کہ بُدھ نے اپنے شاگردوں کو دنیا میں تبلیغ کے لئے بھیجا اور انکو اس طرح پر خطاب کیا ۔ " باہر جاؤ اور ہر طرف پھر نکلو ۔ اور دنیا کی غمخواری اور دیوتاؤں اور آدمیوں کی بہتری کے لئے ایک ایک ہو کر مختلف صورتوں میں نکل جاؤ اور یہ منادی کرو کہ کامل پرہیزگار ہو ۔ پاک دل ہو ۔ برہم چاری یعنی تنہا اور مجرد رہنے کی خصلت اختیار کرو ۔ " اور کہا کہ " مَیں بھی اس مسئلہ کی منادی کیلئے جاتا ہوں ۔ " اور بدھ بنارس کی طرف گیا اور اس طرف اس نے بہت معجزات دکھائے اور اس نے ایک نہایت مؤثر وعظ ایک پہاڑی پر کیا ۔ جیسا کہ مسیح نے پہاڑی پر وعظ کیا تھا ۔ اور پھر اسی کتاب میں لکھا ہے کہ بُدھ اکثر مثالوں میں وعظ کیا کرتا تھا اور ظاہری چیزوں کو لیکر رُوحانی امور کو اُن میں پیش کیا کرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدھ کا بعینہٖ حضرت مسیح کی طرح مثالوں میں اپنے شاگردوں کو سمجھانا خاصکر وہ مثالیں جو انجیل میں آچکی ہیں نہایت حیرت انگیز واقعہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بدھ مذہب کی کتابوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ گوتم بدھ نے ایک اَور آنے والے بدھ کی نسبت پیشگوئی کی تھی جس کا نام **متیّا** بیان کیا تھا ۔ یہ پیشگوئی بُدھ کی کتاب **لگاوتی سُتّا** میں ہے جس کا حوالہ کتاب اولڈن برگ صفحہ ۱۴۲ میں دیا گیا ہے ۔ اِس پیشگوئی کی عبارت یہ ہے کہ " متیّا لاکھوں مریدوں کا پیشوا ہوگا جیسا کہ مَیں اب سینکڑوں کا ہوں ۔ " اسجگہ یاد رہے کہ جو لفظ عبرانی میں مشیحا ہے وہی پالی زبان میں متیّا کر کے بولا گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ آنے والا متیّا جس کی بُدھ نے پیشگوئی کی تھی وہ درحقیقت **مسیح** ہے اَور کوئی نہیں ۔ اس بات پر بڑا پختہ قرینہ یہ ہے کہ بُدھ نے یہ پیشگوئی بھی کی تھی کہ جس مذہب کی اُس نے

بنیاد رکھی ہے وہ زمین پر پانچ سو برس سے زیادہ قائم نہیں رہیگا۔ اور جس وقت ان تعلیموں اور اصولوں کا زوال ہوگا تب متیّا اس ملک میں آکر دوبارہ ان اخلاقی تعلیموں کو دنیا میں قائم کریگا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح پانچ سو برس بعد بُدھ کے ہوئے ہیں۔ اور جیسا کہ بدھ نے اپنے مذہب کے زوال کی مدت مقرر کی تھی ایسا ہی اس وقت بدھ کا مذہب زوال کی حالت میں تھا۔ تب حضرت مسیح نے صلیب کے واقعہ سے نجات پاکر اس ملک کی طرف سفر کیا اور بدھ مذہب والے انکو شناخت کرکے بڑی تعظیم سے پیش آئے ....

یاد رکھنا چاہیئے کہ متیّا کا نام جو بدھ کی کتابوں میں جابجا مذکور ہے بلاشبہ وہ مسیحا ہے۔ کتاب تبت تاتار منگولیا بائی ایچ۔ ٹی پرنسب کے صفحہ ۱۴ میں متیّا بدھ کی نسبت جو دراصل مسیحا ہے یہ لکھا ہے کہ جو حالات ان پہلے مشنریوں (عیسائی واعظوں) نے تبت میں جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور کانوں سے سُنے اُن حالات پر غور کرنے سے وہ اس نتیجہ تک پہنچ گئے کہ لاموں کی قدیم کتب میں عیسائی مذہب کے آثار موجود ہیں اور پھر اسی صفحہ میں لکھا ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ متقدمین یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت مسیح کے حواری ابھی زندہ ہی تھے کہ جب کہ عیسائی دین کی تبلیغ اسجگہ پہنچ گئی تھی۔ اور پھر ۱۷ صفحہ میں لکھا ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس وقت عام انتظار ایک بڑے منجی کی پیدا ہونے لگ رہی تھی جس کا ذکر ٹے سے ٹس نے اس طرح پر کیا ہے کہ اس انتظار کا مدار نہ صرف یہودی تھے بلکہ خود بدھ مذہب نے ہی اس انتظار کی بنیاد ڈالی تھی۔ یعنی اس ملک میں متیّا کے آنے کی پیشگوئی کی تھی۔ اور پھر اس کتاب انگریزی پر مصنف نے ایک نوٹ لکھا ہے اس کی یہ عبارت ہے۔ کتاب پتاکتیان اور انھا کنتھا میں ایک اور بدھ کے نزول کی پیشگوئی بڑی واضح طور پر درج ہے جس کا ظہور گوتم یا ساکھی منی سے ایک ہزار سال بعد لکھا گیا ہے۔ گوتما بیان کرتا ہے کہ میں پچیسواں بدھ ہوں اور بگوا متیّا نے ابھی آنا ہے یعنی میرے بعد اس ملک میں وہ آئیگا جس کا نام متیّا ہوگا اور وہ سفید رنگ ہوگا ....

...... یہی وجہ تھی کہ اس کے مذہب کے لوگ ہمیشہ اس انتظار میں تھے کہ ان کے ملک میں مسیحا آئیگا۔ اور بدھ نے اپنی پیشگوئی میں اس آنے والے بُدھ کا نام بگوا متیّا اس لئے رکھا کہ بگوا سنسکرت زبان میں سفید کو کہتے ہیں اور حضرت مسیح چونکہ بلادِ شام کے رہنے والے تھے اس لئے وہ بگوا یعنی سفید رنگ تھے۔ جس ملک میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی یعنی مگدھ کا ملک جہاں راجہ گرِیہا واقعہ تھا اس ملک کے لوگ سیاہ رنگ تھے اور گوتم بدھ خود سیاہ رنگ تھا اس لئے

بُدھ نے آنے والے بدھ کی قطعی علامت ظاہر کرنے کے لئے دو باتیں اپنے مریدوں کو بتلائی تھیں ایک یہ کہ وہ بگوا ہوگا دوسرے یہ کہ وہ متبا ہوگا یعنی سیر کرنیوالا ہوگا اور باہر سے آئیگا ....

ہم یورپ کے محققوں کی اس طرز تحقیق کو ہرگز پسند نہیں کرسکتے کہ وہ اس بات کی تفتیش میں ہیں کہ کسی طرح یہ پتہ لگ جائے کہ بدھ مذہب مسیح کے زمانہ میں فلسطین تک پہنچ گیا تھا۔ مجھے افسوس آتا ہے کہ جس حالت میں بدھ مذہب کی پُرانی کتابوں میں حضرت مسیح کا نام اور ذکر موجود ہے تو کیوں یہ محقق ایسی ٹیڑھی راہ اختیار کرتے ہیں کہ فلسطین میں بدھ مذہب کا نشان ڈھونڈتے ہیں اور کیوں وہ **حضرت مسیح کے قدم مبارک** کو نیپال اور تبت اور کشمیر کے پہاڑوں میں تلاش نہیں کرتے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اتنی بڑی سچائی کو ہزاروں تاریک پردوں میں سے پیدا کرنا ان کا کام نہیں تھا بلکہ یہ اُس خدا کا کام تھا جس نے آسمان سے دیکھا کہ مخلوق پرستی حد سے زیادہ زمین پر پھیل گئی اور صلیب پرستی اور انسان کے ایک فرضی خون کی پرستش نے کروڑہا دلوں کو سچے خدا سے دُور کر دیا۔ تب اس کی غیرت نے اُن عقائد کے توڑنے کے لئے جو صلیب پر مبنی تھے ایک کو اپنے بندوں میں سے دنیا میں مسیح ناصری کے نام پر بھیجا اور وہ جیسا کہ قدیم سے وعدہ تھا **مسیح موعود ہو کر ظاہر ہوا۔ تب کسرِ صلیب** کا وقت آگیا۔ یعنی وہ وقت کہ صلیبی عقائد کی غلطی کو ایسی صفائی سے ظاہر کر دینا جیسا کہ ایک لکڑی کو دو ٹکڑے کر دیا جائے سو اب آسمان نے کسرِ صلیب کی ساری راہ کھول دی تا وہ شخص جو سچائی کا طالب ہے اب اُٹھے اور تلاش کرے۔ مسیح کا جسم کے ساتھ آسمان پر جانا گو ایک غلطی تھی تب بھی اس میں راز تھا اور وہ یہ کہ جو مسیحی سوانح کی حقیقت گُم ہوگئی تھی اور ایسی نابود ہوگئی تھی جیسا کہ قبر میں مٹی ایک جسم کو کھا لیتی ہے وہ حقیقت آسمان پر ایک وجود رکھتی تھی اور ایک مجسم انسان کی طرح آسمان میں موجود تھی اور ضرور تھا کہ آخری زمانہ میں وہ حقیقت پھر نازل ہو۔ سو وہ **حقیقت مسیحیہ ایک مجسّم انسان کی طرح اب نازل** ہوئی اور اُس نے صلیب کو توڑا اور دروغگوئی اور ناحق پرستی کی بُری خصلتیں جن کو ہمارے پاک نبی نے صلیب کی حدیث میں خنزیر سے تشبیہہ دی ہے صلیب کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی ایسی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں جیسا کہ ایک خنزیر تلوار سے کاٹا جاتا ہے۔ اس حدیث کے یہ معنے صحیح نہیں ہیں کہ مسیح موعود کافروں کو قتل کرے گا اور صلیبوں کو توڑے گا بلکہ صلیب توڑنے سے مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں آسمان اور زمین کا خدا ایک ایسی پوشیدہ حقیقت ظاہر کر دیگا کہ جس سے تمام صلیبی عمارت

یکدفعہ ٹوٹ جائیگی۔ اور خنزیروں کے قتل کرنے سے نہ انسان مراد ہیں نہ خنزیر بلکہ خنزیروں کی عادتیں مراد ہیں یعنی جھوٹ پر ضد کرنا اور بار بار اس کو پیش کرنا جو ایک قسم کی نجاست خوری ہے۔ پس جس طرح مرا ہُوا خنزیر نجاست نہیں کھا سکتا اِسی طرح وہ زمانہ آتا ہے بلکہ آ گیا کہ بُری خصلتیں اس قسم کی نجاست خوری سے رو کی جائیں گی۔ . . . .

پس یہ خیال مت کرو کہ میں تلوار چلانے آیا ہوں۔ نہیں بلکہ تمام **تلواروں کو میان میں کرنے** کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ دنیا نے بہت کچھ اندھیرے میں کشتی کی۔ بہتوں نے اپنے سچے خیرخواہوں پر حربے چلائے اور اپنے دردمند دوستوں کے دلوں کو دُکھایا اور عزیزوں کو زخمی کیا۔ مگر اب اندھیرا نہیں رہیگا۔ **رات گذری۔ دن چڑھا۔ اور مبارک وہ جو اب محروم نہ رہے !!**

(مسیح ہندوستان میں صـ ٨٦-٨٧)

یہ ایک سِرّ اسرارِ الٰہیہ میں سے ہے کہ جب کسی رسول یا نبی کی شریعت اس کے فوت ہونے کے بعد بگڑ جاتی ہے اور اس کی اصل تعلیموں اور ہدایتوں کو بدلا کر بیہودہ اور بے جا باتیں اُسکی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور ناحق کا جھوٹ افترا کرکے یہ دعوٰی کیا جاتا ہے کہ وہ تمام کفر اور بدکاری کی باتیں اس نبی نے ہی سکھلائی تھیں تو اس نبی کے دل میں ان فسادوں اور تہمتوں کے دُور کرنے کے لئے ایک اشد توجہ اور اعلیٰ درجہ کا جوش پیدا ہو جاتا ہے تب اُس نبی کی رُوحانیت تقاضا کرتی ہے کہ کوئی **قائم مقام** اس کا زمین پر پیدا ہو۔

اب غور سے اس معرفت کے دقیقہ کو سُنو کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو **دو مرتبہ** یہ موقعہ پیش آیا کہ اُن کی رُوحانیت نے قائم مقام طلب کیا۔ **اوّل** جبکہ اُن کے فوت ہونے پر چھ سو برس گذر گیا۔ اور یہودیوں نے اس بات پر حد سے زیادہ اصرار کیا کہ وہ نعوذ باللہ مکّار اور کاذب تھا اور اس کا ناجائز طور پر تولّد تھا اور اسی لئے وہ مصلوب ہُوا۔ اور عیسائیوں نے اس بات پر غلوّ کیا کہ وہ خدا تھا اور خدا کا بیٹا تھا اور دنیا کو نجات دینے کے لئے اُس نے صلیب پر جان دی۔ پس جبکہ مسیح علیہ السلام کی بابرکت شان میں نابکار یہودیوں نے نہایت خلافِ تہذیب جرح کی اور بموجب توریت کی اس آیت کے جو کتاب استثنا میں ہے کہ جو شخص صلیب پر کھینچا جائے وہ لعنتی ہوتا ہے نعوذ باللہ حضرت مسیح علیہ السلام کو لعنتی قرار دیا اور مفتری اور کاذب اور ناپاک پیدائش والا ٹھہرایا اور عیسائیوں نے اُن کی مدح میں

اطراء کرکے انکو خدا ہی بنادیا اور اُن پر یہ تہمت لگائی کہ یہ تعلیم اُنہی کی ہے تب بہ اعلام الٰہی مسیح کی روحانیت جوش میں آئی اور اس نے اُن تمام الزاموں سے اپنی بریّت چاہی اور خدا تعالےٰ سے اپنا قائم مقام چاہا۔ تب ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے جن کی بعثت کی اغراض کثیرہ میں سے ایک یہ بھی غرض تھی کہ ان تمام بے جا الزاموں سے مسیح کا دامن پاک ثابت کریں اور اس کے حق میں صداقت کی گواہی دیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود مسیح نے یوحنّا کی انجیل کے ۱۶ باب میں کہا ہے کہ "میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لئے میرا جانا ہی فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو تسلّی دینے والا (یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم) تم پاس نہ آئیگا۔ پھر اگر میں جاؤں تو اُسے تم پاس بھیجدونگا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ سے اور راستی سے اور عدالت سے تقصیروار ٹھہرائیگا۔ گناہ سے اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے۔ راستی سے اسلئے کہ میں اپنے باپ پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت سے اس لئے کہ اس جہان کے سردار پر حکم کیا گیا ہے۔ جب وہ رُوح حق آئیگی تو تمہیں ساری سچائی کی راہ بتادیگی۔ وہ رُوح حق میری بزرگی کرے گی اس لئے کہ وہ میری چیزوں سے پائے گی۔ وہ تسلّی دینے والا جسے باپ میرے نام سے بھیجیگا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائیگا (لوقا: ۱۴) میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ مجھ کو نہ دیکھو گے اسوقت تک کہ تم کہو گے مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام پر (یعنی مسیح علیہ السلام کے نام پر) آتا ہے۔" ان آیات میں مسیح کا یہ فقرہ کہ میں اُسے تم پاس بھیجدونگا اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ مسیح کی روحانیت اس کے آنے کے لئے تقاضا کریگی اور یہ فقرہ کہ باپ اُس کو میرے نام سے بھیجیگا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ آنے والا مسیح کی تمام روحانیت پائیگا۔ اور اپنے کمالات کی ایک شاخ کی رُو سے وہ مسیح ہوگا جیسا کہ ایک شاخ کی رو سے وہ موسیٰ ہے ....

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میری مسیح سے بشدت مناسبت ہے اور اُس کے وجود سے میرا وجود ملا ہوا ہے۔" پس اس حدیث میں حضرت مسیح کے اس فقرہ کی تصدیق ہے کہ وہ نبی میرے نام پر آئیگا۔ سو ایسا ہی ہوا کہ ہمارا مسیح صلے اللہ علیہ وسلم جب آیا تو اُس نے مسیح ناصری کے ناتمام کاموں کو پورا کیا اور اس کی صداقت کیلئے گواہی دی اور اُن تہمتوں سے اُس کو بری قرار دیا جو یہود اور نصاریٰ نے اس پر لگائی تھیں۔ اور مسیح کی رُوح کو خوشی پہنچائی۔ یہ مسیح ناصری کی رُوحانیت کا پہلا جوش تھا جو ہمارے سیّد ہمارے مسیح خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم

کے ظہور سے اپنی مراد کو پہنچا۔ فالحمد للہ

پھر دوسری مرتبہ مسیح کی روحانیت اس وقت جوش میں آئی کہ جب نصاریٰ میں دجّالیت کی صفت اتم اور اکمل طور پر آگئی اور جیسا کہ لکھا ہے کہ دجّال نبوت کا دعوے بھی کرے گا اور خدائی کا بھی۔ ایسا ہی انہوں نے کیا۔ نبوت کا دعویٰ اس طرح پر کیا کہ کلامِ الٰہی میں اپنی طرف سے وہ دخل دیئے وہ قواعد مرتب کئے اور وہ تنسیخ ترمیم کی جو ایک نبی کا کام تھا۔ جس حکم کو چاہا قائم کر دیا اور اپنی طرف سے عقائد نامے اور عبادت کے طریقے گھڑ لئے اور ایسی آزادی سے مداخلت بے جا کی کہ گویا ان باتوں کے لئے وحیٔ الٰہی ان پر نازل ہوگئی۔ سو الٰہی کتابوں میں اس قدر بے جا دخل دوسرے رنگ میں نبوت کا دعوےٰ ہے۔ اور خدائی کا دعویٰ اس طرح پر کہ ان کے فلسفہ دانوں نے یہ ارادہ کیا کہ کسی طرح تمام کام خدائی کے ہمارے قبضہ میں آجائیں جیسا کہ اُن کے خیالات اس ارادہ پر شاہد ہیں کہ وہ دن رات ان فکروں میں پڑے ہوئے ہیں کہ کسی طرح ہم ہی مینہ برسائیں اور نطفہ کو کسی آلہ میں ڈال کر اور رحم عورت میں پہنچا کر بچے بھی پیدا کر لیں۔ اور ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کی تقدیر کچھ چیز نہیں۔ بلکہ ناکامی ہماری بوجہ غلطی تدبیر تقدیر ہو جاتی ہے۔ اور جو کچھ دنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ پہلے زمانہ کے لوگوں کو ہر ایک چیز کے طبعی اسباب معلوم نہیں تھے اور اپنے تھک جانے کی حدِ انتہا کا نام خدا اور خدا کی تقدیر رکھا تھا۔ اب عللِ طبعیہ کا سلسلہ جب بکلّی لوگوں کو معلوم ہو جائیگا تو یہ خام خیالات خود بخود دُور ہو جائیں گے ....

پس اس زمانہ میں دوسری مرتبہ حضرت مسیح کی روحانیت کو جوش آیا اور انہوں نے دوبارہ مثالی طور پر دنیا میں اپنا نزول چاہا۔ اور جب ان میں مثالی نزول کے لئے اشد درجہ کی توجہ اور خواہش پیدا ہوئی تو خدا تعالیٰ نے اس خواہش کے موافق دجّالِ موجودہ کے نابود کرنے کے لئے ایسا شخص بھیجا جو ان کی رُوحانیت کا نمونہ تھا۔ وہ نمونہ مسیح علیہ السلام کا روپ بن کر مسیح موعود کہلایا۔ کیونکہ حقیقت عیسویہ کا اُس میں حلول تھا۔ یعنی حقیقت عیسویہ اس سے متحد ہوگئی تھی اور مسیح کی روحانیت کے تقاضا سے وہ پیدا ہوا تھا۔ پس حقیقت عیسویہ اُس میں ایسی منعکس ہوگئی جیسا کہ آئینہ میں اشکال۔ اور چونکہ وہ نمونہ حضرت مسیح کی رُوحانیت کے تقاضا سے ظہور پذیر ہوا تھا۔ اس لئے وہ

عیسیٰ کے نام سے موسوم کیا گیا کیونکہ حضرت عیسیٰ کی روحانیت نے قادر مطلق عزّ اسمہٗ سے بوجہ اپنے جوش کے اپنی ایک شبیہ چاہی اور چاہا کہ حقیقتِ عیسویہ اس شبیہ میں رکھی جائے تا اس شبیہ کا نزول ہو۔ پس ایسا ہی ہو گیا۔ اس تقریر میں اس وہم کا بھی جواب ہے کہ نزول کے لئے مسیح کو کیوں مخصوص کیا گیا۔ یہ کیوں نہ کہا گیا کہ موسیٰ نازل ہو گا یا ابراہیم نازل ہو گا یا داؤد نازل ہو گا۔ کیونکہ اسجگہ صاف طور پر کھل گیا کہ موجودہ فتنوں کے لحاظ سے مسیح کا نازل ہونا ہی ضروری تھا کیونکہ مسیح کی ہی قوم بگڑی تھی اور مسیح کی قوم میں ہی دجّالیت پھیلی تھی۔ اس لئے مسیح کی روحانیت کو ہی جوش آنا لائق تھا۔ یہ وہ دقیق معرفت ہے کہ جو کشف کے ذریعہ سے اس عاجز پر کھلی ہے اور یہ بھی کھلا کہ یوں مقدّر ہے کہ ایک زمانہ کے گذرنے کے بعد کہ خیر اور صلاح اور غلبۂ توحید کا زمانہ ہو گا۔ پھر دنیا میں فساد اور شرک اور ظلم عود کرے گا۔ اور بعض بعض کو کیڑوں کی طرح کھائیں گے اور جاہلیت غلبہ کرے گی اور دوبارہ مسیح کی پرستش شروع ہو جائے گی اور مخلوق کو خدا بنانے کی جہالت بڑے زور سے پھیلے گی۔ اور یہ سب فساد عیسائی مذہب سے اس آخری زمانہ کے آخری حصہ میں دنیا میں پھیلیں گے۔ تب پھر مسیح کی روحانیت سخت جوش میں آکر **جلالی طور پر اپنا نزول چاہے گی** تب ایک **قہری شبیہ** میں اس کا نزول ہو کر اس زمانہ کا خاتمہ ہو جائیگا۔ تب آخر ہو گا اور دنیا کی صف لپیٹ دی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسیح کی امت کی نالائق کرتوتوں کی وجہ سے مسیح کی روحانیت کے لئے یہی مقدّر تھا کہ **تین مرتبہ دنیا میں نازل ہو۔**

(آئینہ کمالات اسلام ص ۳۴۱-۳۴۶)

المسیح الدّجال

واضح ہو کہ دجّال کے لفظ کی دو تعبیر کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ دجّال اُس گروہ کو کہتے ہیں جو جھوٹ کا حامی ہو اور مکر اور فریب سے کام چلاوے۔ دوسری یہ کہ دجّال شیطان کا نام ہے جو ہر ایک جھوٹ اور فساد کا باپ ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص۳۱۳)

قرآن شریف اُس شخص کو جس کا نام حدیثوں میں دجّال ہے شیطان قرار دیتا ہے جیسا کہ وہ شیطان کی طرف سے حکایت کر کے فرماتا ہے۔ قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ۔ یعنی شیطان نے جناب الٰہی میں عرض کی کہ مَیں اس وقت تک ہلاک نہ کیا جاؤں جب تک کہ وہ مُردے جن کے دل مرگئے ہیں دوبارہ زندہ ہوں خدا نے کہا کہ مَیں نے تجھے اس وقت تک مہلت دی۔ سو وہ دجال جس کا حدیثوں میں ذکر ہے وہ شیطان ہی ہے جو آخر زمانہ میں قتل کیا جائیگا۔ جیسا کہ دانیال نے بھی یہی لکھا ہے اور بعض حدیثیں بھی یہی کہتی ہیں۔ اور چونکہ مظہر اتم شیطان کا نصرانیت ہے اس لئے سورۃ فاتحہ میں دجال کا تو کہیں ذکر نہیں مگر نصاریٰ کے شر سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ اگر دجّال کوئی الگ مفسد ہوتا تو قرآن شریف میں بجائے اِس کے کہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا وَلَا الضَّآلِّیْنَ یہ فرمانا چاہیئے تھا کہ وَلَا الدَّجَّالَ۔ اور آیت اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ سے مُراد جسمانی بعث نہیں کیونکہ شیطان صرف اس وقت تک زندہ ہے جب تک کہ بنی آدم زندہ ہیں۔ ہاں شیطان اپنے طور سے کوئی کام نہیں کرتا بلکہ بذریعہ اپنے مظاہر کے کرتا ہے۔ سو وہ مظاہر یہی انسان کو خدا بنانے والے ہیں۔ اور چونکہ وہ گروہ ہے اس لئے اُس کا نام دجال رکھا گیا ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں دجّال گروہ کو بھی کہتے ہیں۔ اور اگر دجّال کو نصرانیت کے گمراہ واعظوں سے الگ سمجھا جائے تو ایک محذور لازم آتا ہے وہ یہ کہ جن حدیثوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ آخری دنوں میں دجّال تمام زمین پر محیط ہو جائیگا اُنہی حدیثوں سے

یہ پتہ بھی لگتا ہے کہ آخری دنوں میں کلیسیا کی طاقت تمام مذاہب پر غالب آجائیگی۔ پس یہ تناقض بجز اس کے کیونکر دُور ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

(حقیقۃ الوحی ص۳۸)

دجّال ایک شخص کا نام نہیں ہے۔ لغتِ عرب کے رو سے **دجّال اُس گروہ** کو کہتے ہیں جو اپنے تئیں امین اور متدیّن ظاہر کرے مگر دراصل نہ امین ہو نہ متدیّن ہو بلکہ اس کی ہر ایک بات میں دھوکا دہی اور فریب دہی ہو۔ سو یہ صفت عیسائیوں کے اس گروہ میں ہے جو پادری کہلاتے ہیں۔ اور وہ گروہ جو طرح طرح کی کلوں اور صنعتوں اور خدائی کاموں کو اپنے ہاتھ میں لینے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں جو یورپ کے فلاسفر ہیں وہ اس وجہ سے دجّال ہیں کہ خدا کے بندوں کو اپنے کاموں سے اور نیز اپنے بلند دعووں سے اس دھوکا میں ڈالتے ہیں کہ گویا کارخانۂ خدائی میں ان کو دخل ہے۔ اور پادریوں کا گروہ اس وجہ سے نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ لوگ اصل آسمانی انجیل کو گم کر کے محرّف اور مغشوش مضمون بنام نہاد ترجمہ انجیل کے دنیا میں پھیلاتے ہیں۔

(کتاب البریہ ص۲۴۳ حاشیہ)

دراصل یہی لوگ دجّال ہیں جن کو **پادری یا یورپین فلاسفر** کہا جاتا ہے۔ یہ پادری اور یورپین فلاسفر دجّال معہود کے دو جبڑے ہیں جن سے وہ ایک اژدہا کی طرح لوگوں کے ایمانوں کو کھاتا جاتا ہے۔ اوّل تو احمق اور نادان لوگ پادریوں کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص اُن کے ذلیل اور جھوٹے خیالات سے کراہت کر کے اُن پنجے سے بچا رہتا ہے تو وہ یورپین فلاسفروں کے پنجے میں ضرور آجاتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ عوام کو پادریوں کے دجل کا زیادہ خطرہ ہے اور خواص کو فلاسفروں کے دجل کا زیادہ خطرہ۔

(کتاب البریہ ص۲۵۲ حاشیہ)

دجّال بہت گذرے ہیں اور شائد آگے بھی ہوں۔ مگر وہ **دجّال اکبر** جن کا دجل خدا کے نزدیک ایسا مکروہ ہے کہ قریب ہے جو اس سے آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ یہی گروہ مُشتِ خاک کو خدا بنانے والا ہے۔ خدا نے یہودیوں اور مشرکوں اور دوسری قوموں کے طرح طرح کے دجل قرآن شریف میں بیان فرمائے مگر یہ عظمت کسی کے دجل کو نہیں دی کہ اس دجل سے آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ پس جس گروہ کو خدا نے اپنے پاک کلام میں دجّال اکبر ٹھہرایا ہے۔ ہمیں نہیں چاہیئے کہ اس کے سوا کسی اور کا نام دجّال اکبر رکھیں۔ نہایت ظلم ہو گا کہ اس کو چھوڑ کر

کوئی اور دجّال اکبر تلاش کیا جائے۔

یہ بات کسی پہلو سے درست نہیں ٹھہر سکتی کہ حال کے پادریوں کے سوا کوئی اَور بھی دجّال ہے جو ان سے بڑا ہے۔ کیونکہ جب کہ خدا نے اپنی پاک کلام میں سب سے بڑا یہی دجّال بیان فرمایا ہے تو نہایت بے ایمانی ہوگی کہ خدا کے کلام کی مخالفت کر کے کسی اَور کو بڑا دجّال ٹھہرایا جائے۔ اگر کسی ایسے دجّال کا کسی وقت وجود ہو سکتا تو خدا تعالیٰ جس کا علم ماضی اور حال اور مستقبل پر محیط ہے اسی کا نام دجّال اکبر رکھتا نہ ان کا نام۔ پھر یہ نشان دجّال اکبر کا جو حدیث بخاری کے صریح اس اشارہ سے نکلتا ہے کہ یَکْسِرُ الصَّلِیْبَ صاف بتلا رہا ہے کہ اس دجّالِ اکبر کی شان میں سے یہ ہوگا کہ وہ مسیح کو خدا ٹھہرائے گا اور مدار نجات صلیب پر رکھے گا۔ یہ بات عارفوں کے لئے نہایت خوشی کا موجب ہے کہ اسجگہ نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ کا تظاہر ہوگیا ہے جس سے تمام حقیقت اس متنازعہ فیہ مسئلہ کی کھل گئی۔ کیونکہ قرآن نے تو اپنے صریح لفظوں میں دجّال اکبر پادریوں کو ٹھہرایا اور ان کے دجل کو ایسا عظیم الشان دجل قرار دیا کہ قریب ہے جو اس سے زمین و آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور حدیث نے مسیح موعود کی حقیقی علامت یہ تبلائی کہ اس کے ہاتھ پر کسرِ صلیب ہوگا اور وہ دجّال اکبر کو قتل کرے گا۔ ہمارے نادان مولوی نہیں سوچتے کہ جب کہ مسیح موعود کا خاص کام کسرِ صلیب اور قتلِ دجّال اکبر ہے اور قرآن نے خبر دی ہے کہ وہ بڑا دجل اور بڑا فتنہ جس سے قریب ہے کہ نظام اس عالم کا درہم برہم ہو جائے۔ اور خاتمہ اس دنیا کا ہو جائے وہ **پادریوں کا فتنہ** ہے تو اس سے صاف طور پر کھل گیا کہ پادریوں کے سوا اَور کوئی دجّال اکبر نہیں ہے۔ اور جو شخص اب اِس فتنہ کے ظہور کے بعد اَور کی انتظار کرے وہ قرآن کا مکذّب ہے۔

اور نیز جبکہ لُغت کی رُو سے بھی دجّال ایک گروہ کا نام ہے جو اپنے دجل سے زمین کو پلید کرتا ہے۔ اور حدیث کی رُو سے نشان دجّال اکبر کا حمایتِ صلیب ٹھہرا تو باوجود اس کھلی کھلی تحقیق کے وہ شخص نہایت درجہ کور باطن ہے کہ جو اب بھی حال کے پادریوں کو دجّال اکبر نہیں سمجھتا۔

(انجام آتھم صـــ ۴۶-۴۸)

...... پھر ذکر کیا کہ آخری زمانہ میں **غلبہ نصاریٰ** کا ہوگا اور اُن کے ہاتھ سے طرح طرح کے فساد پھیلیں گے اور ہر طرف سے امواج فتن اُٹھیں گی اور وہ ہر ایک بلندی سے

دوڑیں گی یعنی ہریک طور سے وہ اپنی قوت اور اپنا عروج اور اپنی بلندی دکھلائیں گی۔ ظاہری طاقت اور سلطنت میں بھی اُن کی بلندی ہوگی کہ اور حکومتیں اور ریاستیں اُن کے مقابل پر کمزور ہو جائیں گی اور علوم و فنون میں بھی اُن کو بلندی حاصل ہوگی کہ طرح طرح کے علوم و فنون ایجاد کریں گے اور نادر اور عجیب صنعتیں نکالینگے اور مکائد اور تدابیر اور حسنِ انتظام میں بھی بلندی ہوگی اور دنیوی مہمّات میں اور ان کے حصول کے لئے اُن کی ہمّتیں بھی بلند ہونگی اور اشاعت مذہب کی جدوجہد اور کوشش میں بھی وہ سب سے فائق اور بلند ہونگے۔ اور ایسا ہی تدابیرِ معاشرت اور تجارت اور ترقی کاشتکاری غرض ہریک بات میں ہریک قوم پر فائق اور بلند ہو جائیں گی۔ یہی معنی ہیں مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ کے۔ کیونکہ حَدَب بالتحریک زمین بلند کو کہتے ہیں اور نَسَل کے معنے ہیں سبقت لے جانا اور دوڑنا یعنی ہر قوم سے ہر ایک بات میں جو شرف اور بلندی کی طرف منسوب ہو سکتی ہے سبقت لے جائیں گے اور یہی بھاری علامت اس آخری قوم کی ہے جس کا نام یاجوج ماجوج ہے اور یہی علامت پادریوں کے اِس گروہ پُرفتن کی ہے جسکا نام دجال معہود ہے۔ اور چونکہ حدب زمین بلند کو کہتے ہیں۔ اس سے یہ اشارہ ہے کہ تمام زمینی بلندیاں ان کو نصیب ہونگی مگر آسمانی بلندی سے بے نصیب ہونگے۔ اور اس مقام سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی قوم یاجوج ماجوج باعتبار اپنے ملکی عروج کے یاجوج ماجوج سے موسوم ہے اور اسی قوم میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے ضلالت کے پھیلانے میں اپنی کوششیں انتہا کو پہنچائی ہیں اور دجال اکبر سے موسوم ہو گئے اور خدا تعالیٰ نے ضلالت کے عروج کے ذکر کے وقت فرمایا کہ اس وقت **نفخ صور** ہوگا اور تمام فرقے ایک ہی جگہ پر اکٹھے کئے جائیں گے۔

(شہادت القرآن ص۶۵)

یاد رہے کہ نبی کریمؐ نے جن بد باتوں کے پھیلنے کی آخری زمانہ میں خبر دی ہے اسی مجموعہ کا نام دجالیت ہے جس کی تاریں یا یوں کہو کہ جس کی شاخیں صدہا قسم کی آنحضرتؐ نے بیان فرمائی ہیں چنانچہ اُن میں سے **وہ مولوی بھی دجّالیت کے درخت کی شاخیں ہیں** جنہوں نے لکیر کو اختیار کیا اور قرآن کو چھوڑ دیا۔ قرآن کریم کو پڑھتے تو ہیں مگر ان کے حلقوں کے نیچے نہیں اُترتا۔ غرض دجّالیت اس زمانہ میں عنکبوت کی طرح بہت سی تاریں پھیلا رہی ہے۔ کافر اپنے کفر سے اور منافق اپنے نفاق سے اور میخوار میخواری اور مولوی اپنے شیوۂ گفتن و ناکردن اور سیہ دلی سے دجّالیت کی تاریں بن رہے ہیں۔ ان تاروں کو اب کوئی کاٹ نہیں سکتا بجز اس حربہ کے جو آسمان سے اُترے اور کوئی

اِس حربہ کو چلا نہیں سکتا بجز اُس عیسٰی کے جو اسی آسمان سے نازل ہو۔ سو عیسٰی نازل ہو گیا۔ وَ کَانَ وَعْدَ اللّٰہِ مَفْعُوْلاً۔

(نشان آسمانی صـ۹)

دراصل **مسیح اُس صدیق کو کہتے ہیں** جس کے مسح یعنی چھُونے میں خدا نے برکت رکھی ہو اور اُس کے انفاس اور وعظ اور کلام زندگی بخش ہوں اور پھر یہ لفظ خصوصیت کے ساتھ اُس نبی پر اطلاق پا گیا جس نے جنگ نہ کیا اور محض رُوحانی برکت سے اصلاح خلائق کی۔ اور اس کے مقابل پر **مسیح اُس معہود دجّال کو** بھی کہتے ہیں جس کی خبیث طاقت اور تاثیر سے آفات اور دہریت اور بے ایمانی پیدا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ سچائی کے نابود کرنے کے لئے کوئی اور جابرانہ وسائل استعمال کرے صرف اس کی توجّہ باطنی یا تقریر یا تحریر یا مخالفت سے محض شیطانی رُوح کی تاثیر سے نیکی اور محبت اِلٰہی ٹھنڈی ہوتی چلی جائے۔ اور بدکاری شراب خوری دروغگوئی اباحت دنیا پرستی مکر ظلم تعدی قحط اور وباء پھیلے۔ یہی معنے ہیں جو لسان العرب وغیرہ اعلٰی درجہ کی لغت کی کتابوں سے اُن کے بیان کو یکجائی نظر سے دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہی معنے ہیں جو خدا تعالٰے نے **میرے دل میں القاء کئے** ہیں۔

(ایام الصلح صـ۶۰)

یاد رہے کہ جس **مسیح** یعنی رُوحانی برکات والے کی مسلمانوں کو آخری زمانہ میں بشارت دی گئی ہے اسی کی نسبت یہ بھی لکھا ہے کہ وہ دجّال معہود کو قتل کرے گا لیکن یہ قتل تلوار یا بندوق سے نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دجالی بدعات اس کے زمانہ میں نابود ہو جائینگی۔

حدیثوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل دجّال **شیطان** کا نام ہے پھر جس گروہ سے شیطان اپنا کام لے گا اس گروہ کا نام بھی استعارہ کے طور پر دجّال رکھا گیا کیونکہ وہ اُس کے اعضاء کی طرح ہے۔ قرآن شریف میں جو یہ آیت ہے لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ یعنی انسانوں کی صنعتوں سے خدا کی صنعتیں بہت بڑی ہیں۔ یہ اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جن کی نسبت لکھا گیا تھا کہ وہ آخری زمانہ میں بڑی بڑی صنعتیں ایجاد کریں گے اور خدائی کاموں میں ہاتھ ڈالیں گے۔ اور مفسّرین نے لکھا ہے کہ اس جگہ انسانوں سے مراد دجّال ہے۔ اور یہ قول دلیل اس بات پر ہے کہ دجال معہود ایک شخص نہیں ہے ورنہ ناس کا نام اس پر اطلاق نہ پاتا اور اس میں کیا شک ہے کہ ناس کا لفظ

صرف گروہ پر بولا جاتا ہے ۔ سو جو گروہ شیطان کے وساوس کے نیچے چلتا ہے وہ دجال کے نام سے موسوم ہوتا ہے ۔ اسی کی طرف قرآن شریف کی اس ترتیب کا اشارہ ہے کہ وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے شروع کیا گیا اور اس آیت پر ختم کیا گیا ہے اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۔ پس لفظ ناس سے مراد اسجگہ بھی دجّال ہے .... اور اخیر میں اس گروہ کے ذکر سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آخری زمانے میں اس گروہ کا غلبہ ہوگا جن کے ساتھ نَفَّاثَاتِ فِی الْعُقَدِ ہونگی یعنی ایسی عیسائی عورتیں جو گھروں میں پھر کر کوشش کریں گی کہ عورتوں کو خاوندوں سے علیحدہ کریں اور عقدِ نکاح کو توڑیں ۔ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تینوں سورتیں قرآن شریف کی دجّالی زمانہ کی خبر دے رہی ہیں اور حکم ہے کہ اس زمانہ سے خدا کی پناہ مانگو تا اس شر سے محفوظ رہو ۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بشرور صرف آسمانی انوار اور برکات سے دور ہونگے جن کو آسمانی مسیح اپنے ساتھ لائیگا ۔

(ایام الصلح ص ٦٢-٦٣)

ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے عالم کشف میں دجّال کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا اور طواف چوروں کی طرح اس نیت سے تھا کہ تا موقع پاکر خانہ کعبہ کو منہدم کرے ....

کون کہہ سکتا ہے کہ دجّال فی الحقیقت مسلمان ہو جائیگا اور خانہ کعبہ کا طواف کرے گا بلکہ ہر ایک دانا اس وحی کے یہی معنے لیگا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر عالم کشف میں دجال کی روحانیت منکشف ہوئی اور یہ تمثیل کشفی نظر میں آنکھوں کے سامنے آئی کہ گویا دجّال ایک شخص کی صورت میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہے ۔ اور اس کی تاویل یہ تھی کہ دجّال دین اسلام کا سخت دشمن ہوگا اور اس کی نظر بدنیتی سے خانہ کعبہ کے گرد پھرتی رہیگی جیسا کہ کوئی اس کا طواف کرتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جیسا کہ رات کے وقت چوکیدار گھروں کا طواف کرتا ہے ویسا ہی چور بھی کرتا ہے ۔ لیکن چوکیدار کی نیّت گھر کی حفاظت اور چوروں کا گرفتار کرنا ہوتا ہے ۔ ایسا ہی چور کی نیّت نقب زنی اور نقصان رسانی ہوتی ہے ۔ سو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کشف میں دجّال کی روحانیت جو طواف کعبہ میں پائی گئی اس سے یہی مطلب تھا کہ دجّال اس فکر میں لگا رہے گا کہ خانہ کعبہ کی عزّت کو دُور کرے اور **مسیح موعود** جو خانہ کعبہ کا طواف کرتا دیکھا گیا ہے اس سے یہ مطلب ہے کہ مسیح موعود کی روحانیت **بیت اللہ** کی حفاظت اور دجّال کی گرفتاری میں مصروف پائی گئی ۔

(ایام الصلح ص ٤٢-٤٣)

یہ امر کہ مسیح موعود دجّال کے مقابل پر خانہ کعبہ کا طواف کرے گا یعنی دجّال بھی خانہ کعبہ کا طواف کرے گا اور مسیح موعود بھی اس کے معنے خود ظاہر ہیں کہ اِس طواف سے **ظاہری طواف** مراد نہیں ورنہ یہ ماننا پڑیگا کہ دجّال خانہ کعبہ میں داخل ہوجائے گا یا یہ کہ مسلمان ہوجائے گا۔ یہ دونوں باتیں خلاف نصوص حدیثیہ ہیں۔ پس بہرحال یہ حدیث قابلِ تاویل ہے اور اسکی وہ تاویل جو خدانے میرے پر ظاہر فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ آخری زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہوگا جس کا نام دجّال ہے۔ وہ اسلام کا سخت دشمن ہوگا۔ اور وہ اسلام کو نابود کرنے کے لئے جس کا مرکز خانہ کعبہ ہے چور کی طرح اس کے گرد طواف کرے گا۔ تا اسلام کی عمارت کو بیخ و بُن سے اکھاڑ دے۔ اور اس کے مقابل پر مسیح موعود بھی مرکزِ اسلام کا طواف کرے گا جس کی تمثیلی صورت خانہ کعبہ ہے۔ اور اس طواف سے مسیح موعود کی غرض یہ ہوگی کہ اُس چور کو پکڑے جس کا نام دجّال ہے اور اس کی دست درازیوں سے مرکز اسلام کو محفوظ رکھے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ رات کے وقت چور بھی گھروں کا طواف کرتا ہے اور چوکیدار بھی۔ چور کی غرض طواف سے یہ ہوتی ہے کہ نقب لگاوے اور گھر والوں کو تباہ کرے اور چوکیدار کی غرض طواف سے یہ ہوتی ہے کہ چور کو پکڑے اور اس کو سخت عقوبت کے زندان میں داخل کرادے تا اُسکی بدی سے لوگ امن میں آجائیں

پس اس حدیث میں اِسی مقابلہ کی طرف اشارہ ہے کہ آخری زمانہ میں وہ چور جس کو دجّال کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ناخنوں تک زور لگائے گا کہ اسلام کی عمارت کو منہدم کردے۔ اور مسیح موعود بھی اسلام کی ہمدردی میں اپنے نعرے آسمان تک پہنچائے گا اور تمام فرشتے اس کے ساتھ ہوجائینگے تا اس آخری جنگ میں اس کی فتح ہو۔ وہ نہ تھکے گا اور نہ درماندہ ہوگا۔ اور نہ سُست ہوگا اور ناخنوں تک زور لگائیگا کہ تا اس چور کو پکڑے۔ اور جب اس کی تضرعات انتہا تک پہنچ جائیں گی۔ تب خدا اُس کے دل کو دیکھے گا کہ کہاں تک وہ اسلام کے لئے پگھل گیا۔ تب وہ کام جو زمین نہیں کرسکتی آسمان کرے گا۔ اور وہ فتح جو انسانی ہاتھوں سے نہیں ہوسکتی وہ فرشتوں کے ہاتھوں سے میسّر آجائیگی۔

(حقیقۃ الوحی صـ ۳۱۰)

اگر خدانخواستہ سچ مچ قرآن کریم میں لکھا ہوتا کہ مسیح برخلاف اس سنت اللہ کے جو تمام بنی آدم کے لئے جاری ہے زندہ آسمان کی طرف اٹھایا گیا اور قیامت کے قریب تک زندہ ہی رہیگا تو عیسائیوں کو بڑے بڑے سامان بہکانے کے لئے ہاتھ آجاتے۔ سو بہت ہی خوب **ہؤا کہ عیسائیوں کا خدا فوت ہوگیا اور یہ حملہ ایک برچھی کے حملہ سے کم نہیں**

جو اس عاجز نے خدا تعالیٰ کی طرف سے مسیح ابن مریم کے رنگ میں ہو کر اُن دجّالی سیرت لوگوں پر کیا ہے جن کو پاک چیزیں دی گئی تھیں مگر انہوں نے ساتھ اسکے پلید چیزیں ملا دیں اور وہ کام کیا جو دجّال کو کرنا چاہیئے تھا۔

اب یہ سوال بھی قابل حل ہے کہ مسیح ابن مریم تو دجّال کے لئے آئے گا آپ اگر مسیح ابن مریم کے رنگ میں ہو کر آئے ہیں تو آپ کے مقابل پر دجّال کون ہے؟ اس سوال کا جواب میری طرف سے یہ ہے کہ گو میں اس بات کو تو مانتا ہوں کہ ممکن ہے کہ میرے بعد کوئی اَور مسیح ابن مریم بھی آوے اور بعض احادیث کی رو سے وہ موعود بھی ہو اور کوئی ایسا دجّال بھی آوے جو مسلمانوں میں فتنہ ڈالے مگر میرا مذہب یہ ہے کہ اس زمانہ کے پادریوں کی مانند کوئی اب تک دجّال پیدا نہیں ہُوا۔ اور نہ قیامت تک پیدا ہوگا۔ مسلم کی حدیث میں ہے۔ وعن عمران بن حصین قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول مابین خلق اٰدم الیٰ قیام الساعۃ امر اکبر من الدّجال ....

مَیں دعوٰی کے ساتھ کہتا ہوں کہ مطابق منشاء مسلم کی حدیث کے جو ابھی میں بیان کر آیا ہوں اگر ہم حضرت آدم کی پیدائش سے آج تک بذریعہ ان تمام تحریری وسائل کے جو ہمیں ملے ہیں دنیا کے تمام ایسے لوگوں کی حالت پر نظر ڈالیں جنہوں نے دجالیت کا اپنے ذمہ کام لیا تھا تو اس زمانہ کے پادریوں کی دجّالیت کی نظیر ہرگز ہم کو نہیں ملے گی۔ انہوں نے ایک موہومی اور فرضی مسیح اپنی نظر کے سامنے رکھا ہُوا ہے جو بقول ان کے زندہ ہے اور خدائی کا دعوٰی کر رہا ہے۔ سو حضرت مسیح ابن مریم نے خدائی کا دعوٰی ہرگز نہیں کیا۔ یہ لوگ خود اس کی طرف سے وکیل بن کر خدائی کا دعوٰی کر رہے ہیں۔ اور اس دعوے کے سرسبز کرنے کے لئے کیا کچھ انہوں نے تحریفیں نہیں کیں اور کیا کچھ تلبیس کے کام استعمال میں نہیں لائے۔ اور مکّہ اور مدینہ چھوڑ کر اور کونسی جگہ ہے جہاں یہ لوگ نہیں پہنچے۔ کیا کوئی دھوکا دینے کا کام یا گمراہ کرنے کا منصوبہ یا بہکانے کا کوئی طریقہ ایسا بھی ہے جو ان سے ظہور میں نہیں آیا۔ کیا یہ سچ نہیں کہ یہ لوگ اپنے دجّالانہ منصوبوں کی وجہ سے ایک عالم پر دائرہ کی طرح محیط ہو گئے ہیں۔ جہاں یہ لوگ جائیں اور جہاں اپنا مشن قائم کریں ایک عالم کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ دولتمند اسقدر ہیں کہ گویا دنیا کے تمام خزانے ان کے ساتھ ساتھ پھرتے ہیں۔ اگرچہ گورنمنٹ انگریزی کو مذاہب سے کچھ سروکار نہیں اپنے شاہانہ انتظام سے مطلب ہے مگر درحقیقت پادری صاحبوں کی بھی ایک الگ گورنمنٹ ہے جو بے شمار

روپے کی مالک اور گویا تمام دنیا میں اپنا تار و پود پھیلا رہی ہے اور ہر ایک قسم کا جنت اور جہنم اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ جو شخص ان کے مذہب میں آنا چاہتا ہے اس کو وہ جنّت دکھلایا جاتا ہے اور جو شخص ان کا اشد مخالف ہو جائے اس کے لئے جہنم کی دھمکی ہے۔ ان کے گھر میں روٹیاں بہت ہیں گویا ایک پہاڑ روٹیوں کا جس جگہ رہیں ساتھ رہتا ہے۔ اور اکثر شکم بندہ لوگ اُن کی سفید سفید روٹیوں پر مفتون ہو کر رَبّنَا الْمَسِیْح کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسیح دجّال کی کوئی بھی ایسی علامت نہیں جو ان میں نہ پائی جائے۔ ایک وجہ سے یہ مُردوں کو بھی زندہ کرتے ہیں اور زندوں کو مارتے ہیں۔ (سمجھنے والا سمجھ لے) اور اس میں تو شک نہیں کہ اِن کی آنکھ ایک ہی ہے جو بائیں ہے۔ اگر انکی دائیں آنکھ موجود ہوتی تو یہ لوگ خدا تعالےٰ سے ڈرتے اور خدائی کے دعوے سے باز آتے بیشک یہ بھی سچ ہے کہ پہلی کتابوں میں اس قوم دجّال کا ذکر ہے۔ حضرت مسیح ابن مریم نے بھی انجیل میں بہت ذکر کیا ہے اور پہلے صحیفوں میں بھی جا بجا ان کا ذکر پایا جاتا ہے۔ بلاشبہ ایسا ہی چاہیئے تھا کہ ہر یک نبی اس مسیح دجّال کے آنے کی پہلے سے خبر دیتا۔ سو ہر یک نے تصریحًا یا اجمالاً۔ اشارۃً یا کنایۃً خبر دی ہے حضرت نوح سے لیکر ہمارے سیّد و مولیٰ خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک اس مسیح دجال کی خبر موجود ہے جس کو میں دلائل کے ساتھ ثابت کر سکتا ہوں۔ اور جس قدر اسلام کو ان لوگوں کے ہاتھ سے ضرر پہنچا ہے اور جس قدر انہوں نے سچائی اور انصاف کا خون کیا ہے ان تمام خرابیوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ہجرت مقدسہ کی تیرھویں صدی سے پہلے ان تمام فتنوں کا نام و نشان نہ تھا۔ اور جب تیرھویں صدی کچھ نصف سے زیادہ گذر گئی تو یکدفعہ اس دجالی گروہ کا خروج ہوا اور پھر ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ اس صدی کے اواخر میں بقول پادری ہیکر صاحب پانچ لاکھ تک صرف ہندوستان میں ہی کرسٹان شدہ لوگوں کی نوبت پہنچ گئی۔ اور اندازہ کیا گیا کہ قریبًا بارہ سال میں ایک لاکھ آدمی عیسائی مذہب میں داخل ہو جاتا ہے جو ایک عاجز بندہ کو خدا خدا کر کے پکارتا ہے۔ اس بات سے کوئی دانا بے خبر نہیں کہ ایک جماعت کثیر اسلام کی یا یوں کہو کہ اسلام کے بھوکوں ننگوں کا ایک گروہ پادری صاحبوں نے صرف روٹیاں اور کپڑے دکھلا کر اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اور جو روٹیوں کے ذریعہ سے قابو نہ آئے وہ عورتوں کے ذریعہ سے اپنے پنجہ میں کئے گئے اور جو اس طرح بھی دام میں نہ پھنس سکے اُن کے لئے ملحد اور بے دین کرنے والا فلسفہ پھیلایا گیا جس میں آج لاکھوں نوخیز بچے مسلمانوں کے گرفتار اور مبتلا پائے جاتے ہیں جو نماز پڑھنے اور روزہ کو

ٹھٹھے سے یاد کرتے اور وحی الٰہی کو ایک خواب پریشان خیال کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اس لائق بھی نہیں تھے کہ انگریزی فلسفہ کی تعلیم پادیں ان کے لئے بہت سے بناوٹی قصّے جو محض پادری صاحبوں کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا جن میں کسی تاریخ یا کہانی کے پیرایہ میں ہجو اسلام درج تھی عام طور پر شائع کر دیئے گئے اور پھر اسلام کے ردّ میں اور ہمارے سید و مولیٰ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب میں بے شمار کتابیں تالیف کر کے ان لوگوں نے ایک دنیا میں مفت تقسیم کیں اور اکثر کتابوں کے بہت سی زبانوں میں ترجمے کر کے شائع کئے ....

اللہ اکبر! اگر اب بھی ہماری قوم کی نظر میں یہ لوگ اوّل درجہ کے دجّال نہیں اور ان کے الزام کے لئے ایک سچے مسیح کی ضرورت نہیں تو پھر اس قوم کا کیا حال ہوگا؟

دیکھو! اے غافلو دیکھو! کہ اسلامی عمارت کے مسمار کرنے کیلئے کس درجہ کی یہ کوشش کر رہے ہیں۔ اور کس کثرت سے ایسے وسائل مہیّا کئے گئے ہیں اور ان کے پھیلانے میں اپنی جانوں کو بھی خطرہ میں ڈال کر اور اپنے مال کو پانی کی طرح بہا کر وہ کوششیں کی ہیں کہ انسانی طاقتوں کا خاتمہ کر دیا ہے یہاں تک کہ نہایت شرمناک ذریعے اور پاکیزگی کے برخلاف منصوبے اس راہ میں ختم کئے گئے اور سچائی اور ایمانداری کے اُڑانے کے لئے طرح طرح کی سرنگیں تیار کی گئیں۔ اور اسلام کے مٹا دینے کے لئے جھوٹ اور بناوٹ کی تمام باریک باتیں نہایت درجہ کی جانکاہی سے پیدا کی گئیں۔ ہزار ہا قصّے اور مباحثات کی کتابیں محض افتراء کے طور پر اور محض اس غرض سے بنائی گئیں تا اگر اور طریق سے نہیں تو اسی طریق سے دلوں پر بد اثر پڑے۔ کیا کوئی ایسا رہزنی کا طریق ہے جو ایجاد نہیں کیا گیا؟ کیا کوئی ایسی سبیل گمراہ کرنے کی باقی ہے جس کے یہ موجد نہیں؟ پس ظاہر ہے کہ یہ کرسچن قوموں اور تثلیث کے حامیوں کی جانب سے وہ ساحرانہ کارروائیاں ہیں اور سحر کے اس کامل درجہ کا نمونہ ہے جو بجز اوّل درجہ کے دجّال کے جو **دجّال معہود** ہے اور کسی سے ظہور پذیر نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا انہی لوگوں کو جو پادری صاحبوں کا گروہ ہے۔ دجّال معہود ماننا پڑا۔ اور جبکہ ہم دنیا کے اکثر حصہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں جو گذر چکا تو ہماری نظر اس استقرائی شہادت کو ساتھ لے کر عود کرتی ہے کہ زمانہ کے سلسلہ گذشتہ میں جہاں تک پتہ مل سکتا ہے دجالیت کی صفت اور اس کی کامیابیوں میں کوئی ان لوگوں کا نظیر نہیں اور ان کے ان ساحرانہ کاموں میں کوئی ان کے مساوی نہیں۔ اور چونکہ احادیث صحیحہ میں دجال معہود کی یہی علامت لکھی ہے

کہ وہ ایسے فتنے برپا کریگا کہ جہاں تک اس وقت سے ابتدائے دنیا کے وقت تک نظر ڈالیں اس کا نظیر نہیں ملے گا۔ لہذا اس بات پر قطع اور یقین کرنا چاہیئے کہ وہ **مسیح دجال جو گرجا سے نکلنے والا ہے یہی لوگ ہیں** جن کے سحر کے مقابل پر معجزہ کی ضرورت تھی اور اگر انکار ہے تو پھر زمانہ گذشتہ کے دجّالین میں سے ان کی نظیر پیش کرو۔

(ازالہ اوہام ص۲۶۱-۲۶۶)

ذوالقرنین

جو کچھ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کی اُن آیتوں کی نسبت جو سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے قصہ کے بارے میں ہیں میرے پر پیشگوئی کے رنگ میں معنے کھولے ہیں مَیں ذیل میں ان کو بیان کرتا ہوں مگر یاد رہے کہ پہلے معنوں سے انکار نہیں ہے وہ گذشتہ سے متعلق ہیں اور یہ آئندہ کے متعلق اور قرآن شریف صرف قصہ گو کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کے ہر ایک قصہ کے نیچے ایک پیشگوئی ہے اور ذوالقرنین کا قصہ مسیح موعود کے زمانہ کے لئے ایک پیشگوئی اپنے اندر رکھتا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف کی عبارت یہ ہے۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَاَتْلُوْ عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا۔ یعنی یہ لوگ تجھ سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں۔ انکو کہو کہ مَیں ابھی تھوڑا سا تذکرہ ذوالقرنین کا تم کو سناؤں گا۔ اور بعد اس کے فرمایا۔ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا۔ یعنی ہم اُس کو یعنی مسیح موعود کو جو ذوالقرنین بھی کہلائیگا روئے زمین پر ایسا مستحکم کرینگے کہ کوئی اس کو نقصان نہ پہنچا سکیگا۔ اور ہم ہر طرح سے سازوسامان اس کو دینگے اور اس کی کارروائیوں کو سہل اور آسان کر دینگے۔ یاد رہے کہ یہ وحی براہین احمدیہ حصص سابقہ میں بھی میری نسبت ہوئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّكَ سُهُوْلَةً فِيْ كُلِّ اَمْرٍ یعنی کیا ہم نے ہر ایک امر میں تیرے لئے آسانی نہیں کر دی یعنی کیا ہم نے تمام وہ سامان تیرے لئے میسر نہیں کر دیئے جو تبلیغ اور اشاعت حق کے لئے ضروری تھے جیسا کہ ظاہر ہے کہ اُس نے میرے لئے وہ سامان تبلیغ اور اشاعتِ حق کے میسر کر دیئے جو کسی نبی کے وقت میں موجود نہ تھے۔ تمام قوموں کی آمدورفت کی راہیں کھولی گئیں طے مسافرت کے لئے وہ آسانیاں کر دی گئیں کہ برسوں کی راہیں دنوں میں طے ہونے لگیں اور خبر رسانی کے وہ ذریعے پیدا ہوئے کہ ہزارہا کوس کی خبریں چند منٹوں میں آنے لگیں ہر ایک قوم کی وہ کتابیں شائع ہوئیں جو مخفی اور مستور تھیں۔ اور ہر ایک چیز کے بہم پہنچانے کے لئے ایک سبب پیدا کیا گیا۔ کتابوں کے لکھنے میں جو جو دقتیں تھیں وہ چھاپہ خانوں سے دفع اور دُور ہو گئیں۔ یہاں تک کہ ایسی ایسی مشینیں نکلی ہیں کہ ان کے ذریعے سے دس دن میں کسی مضمون کو اس کثرت سے چھاپ سکتے ہیں کہ پہلے زمانوں میں دس سال میں بھی وہ مضمون قیدِ تحریر

میں نہیں آسکتا تھا اور پھر اُن کے شائع کرنے کے اس قدر حیرت انگیز سامان نکل آئے ہیں کہ ایک تحریر صرف چالیس دن میں تمام دنیا کی آبادی میں شائع ہو سکتی ہے اور اس زمانہ سے پہلے ایک شخص بشرطیکہ اس کی عمر بھی لمبی ہو سو برس تک بھی اس وسیع اشاعت پر قادر نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بعد اس کے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے :-

> فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ
> حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۘ قُلْنَا یَا ذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ
> اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ
> یُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا
> فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا یُسْرًا ۔

یعنی جب ذوالقرنین کو جو مسیح موعود ہے ہر ایک طرح کے سامان دیئے جائیں گے۔ پس وہ ایک سامان کے پیچھے پڑے گا۔ یعنی وہ مغربی ممالک کی اصلاح کے لئے کمر باندھے گا اور وہ دیکھے گا کہ آفتاب صداقت اور حقانیت ایک کیچڑ کے چشمہ میں غروب ہو گیا اور اس غلیظ چشمہ اور تاریکی کے پاس ایک قوم کو پائے گا جو مغربی قوم کہلائیگی۔ یعنی مغربی ممالک میں عیسائیت کے مذہب والوں کو نہایت تاریکی میں مشاہدہ کرے گا۔ نہ اُن کے مقابل پر آفتاب ہو گا جس سے وہ روشنی پا سکیں اور نہ ان کے پاس پانی صاف ہو گا جس کو وہ پیویں۔ یعنی ان کی علمی اور عملی حالت نہایت خراب ہو گی۔ اور وہ روحانی روشنی اور رُوحانی پانی سے بے نصیب ہونگے۔ تب ہم ذوالقرنین یعنی مسیح موعود کو کہیں گے کہ تیرے اختیار میں ہے چاہے تو ان کو عذاب دے یعنی عذاب نازل ہونے کے لئے بد دُعا کرے (جیسا کہ احادیث صحیحہ میں مروی ہے) یا اُن کے ساتھ حسن سلوک کا شیوہ اختیار کرے۔ تب ذوالقرنین یعنی مسیح موعود جواب دیگا کہ ہم اُسی کو سزا دلانا چاہتے ہیں جو ظالم ہو وہ دنیا میں بھی ہماری بد دعا سے سزایاب ہو گا اور پھر آخرت میں سخت عذاب دیکھیگا۔ لیکن جو شخص سچائی سے مُنہ نہیں پھیرے گا اور نیک عمل کرے گا اس کو نیک بدلا دیا جائیگا۔ اور اس کو انہیں کاموں کی بجا آوری کا حکم ہو گا جو سہل ہیں اور آسانی سے ہو سکتے ہیں۔ غرض یہ مسیح موعود کے حق میں پیشگوئی ہے کہ وہ ایسے وقت میں آئیگا جبکہ مغربی ممالک کے لوگ نہایت تاریکی میں پڑے ہوں گے۔ اور آفتاب صداقت اُن کے سامنے سے بالکل ڈوب جائیگا اور ایک گندے اور بدبودار چشمہ میں ڈوبے گا۔ یعنی بجائے سچائی کے بدبودار عقائد اور اعمال اُن میں پھیلے ہوئے ہونگے۔ اور وہی اُن کا

پانی ہوگا جس کو وہ پیتے ہونگے اور روشنی کا نام و نشان نہ ہوگا۔ تاریکی میں پڑے ہونگے اور ظاہر ہے کہ یہی حالت عیسائی مذہب کی آجکل ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف نے ظاہر فرمایا ہے۔ اور عیسائیت کا بھاری مرکز ممالک مغربیہ ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ كَذٰلِكَ ۝ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۔

یعنی پھر ذوالقرنین جو مسیح موعود ہے جس کو ہر ایک سامان عطا کیا جائیگا ایک اور سامان کے پیچھے پڑے گا۔ یعنی ممالک مشرقیہ کے لوگوں کی حالت پر نظر ڈالے گا۔ اور وہ جگہ جس سے سچائی کا آفتاب نکلتا ہے اس کو ایسا پائے گا کہ ایک ایسی نادان قوم پر آفتاب نکلا ہے جن کے پاس دھوپ سے بچنے کیلئے کوئی بھی سامان نہیں۔ یعنی وہ لوگ ظاہر پرستی اور افراط کی دھوپ سے جلتے ہونگے اور حقیقت سے بے خبر ہونگے اور ذوالقرنین یعنی مسیح موعود کے پاس حقیقی راحت کا سامان سب کچھ ہوگا جس کو ہم خوب جانتے ہیں۔ مگر وہ لوگ قبول نہیں کرینگے اور وہ لوگ افراط کی دھوپ سے بچنے کے لئے کچھ بھی پناہ نہیں رکھتے ہونگے۔ نہ گھر نہ سایہ دار درخت نہ کپڑے جو گرمی سے بچا سکیں۔ اس لئے آفتاب صداقت جو طلوع کرے گا ان کی ہلاکت کا موجب ہو جائیگا۔ یہ ان لوگوں کے لئے ایک مثال ہے جو آفتاب ہدایت کی روشنی تو ان کے سامنے موجود ہے اور اس گروہ کی طرح نہیں ہیں جنکا آفتاب غروب ہو چکا ہے لیکن ان لوگوں کو اس آفتاب ہدایت سے بجز اس کے کوئی فائدہ نہیں کہ دھوپ سے چمڑا ان کا جل جائے اور رنگ سیاہ ہو جائے اور آنکھوں کی روشنی جاتی رہے۔ اس تقسیم سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسیح موعود کا اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے کے لئے تین قسم کا دورہ ہوگا۔ (۱) اوّل اس قوم پر نظر ڈالے گا جو آفتاب ہدایت کو کھو بیٹھے ہیں اور ایک تاریکی اور کیچڑ کے چشمہ میں بیٹھے ہیں۔ (۲) دوسرا دورہ اس کا ان لوگوں پر ہوگا جو ننگ دھڑنگ آفتاب کے سامنے بیٹھے ہیں یعنی ادب سے اور حیا سے اور تواضع سے اور نیک ظن سے کام نہیں لیتے۔ نرے ظاہر پرست ہیں۔ گویا آفتاب کے ساتھ لڑنا چاہتے ہیں سو وہ بھی فیض آفتاب سے بے نصیب ہیں اور ان کو آفتاب سے بجز جلنے کے اور کوئی حصہ نہیں۔ یہ اُن مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے جن میں مسیح موعود ظاہر تو ہوا۔ مگر وہ انکار اور مقابلہ سے پیش آئے اور حیا اور ادب اور حسن ظن سے کام نہ لیا اس لئے سعادت سے محروم رہ گئے۔ بعد اس کے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ
لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ
مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا
وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ
بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِىْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ
الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِىْٓ اُفْرِغْ
عَلَيْهِ قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝
قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّىْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ
كَانَ وَعْدُ رَبِّىْ حَقًّا ۝ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِىْ بَعْضٍ وَّ
نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۝ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ
عَرْضَا ۝ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِىْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِىْ وَكَانُوْا لَا
يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۝ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِىْ مِنْ
دُوْنِىْٓ اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ۔

پھر ذوالقرنین یعنی مسیح موعود ایک اور سامان کے پیچھے پڑے گا اور جب وہ ایک ایسے موقع پر پہنچے گا یعنی جب وہ ایک ایسا نازک زمانہ پائے گا جس کو بَیْنَ السَّدَّیْن کہنا چاہیئے یعنی پہاڑوں کے بیچ ۔ مطلب یہ کہ ایسا وقت پائے گا جبکہ دوطرفہ خوف میں لوگ پڑے ہونگے اور ضلالت کی طاقت حکومت کی طاقت کے ساتھ مل کر خوفناک نظارہ دکھائیگی تو ان دونوں طاقتوں کے ماتحت ایک قوم کو پائے گا جو اس کی بات کو مشکل سے سمجھیں گے ۔ یعنی غلط خیالات میں مبتلا ہونگے ۔ اور بباعث غلط عقائد مشکل سے اس ہدایت کو سمجھیں گے جو وہ پیش کریگا لیکن آخر کار سمجھ لیں گے ۔ اور ہدایت پالیں گے ۔ اور یہ تیسری قوم ہے جو مسیح موعود کی ہدایات سے فیضیاب ہونگے ۔ تب وہ اُس کو کہیں گے کہ اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج نے زمین پر فساد مچا رکھا ہے ۔ پس اگر آپ کی مرضی ہو تو ہم آپ کے لئے چندہ جمع کر دیں تا آپ ہم میں اور ان میں کوئی روک بنا دیں ۔ وہ جواب میں کہے گا کہ جس بات پر خدا نے مجھے قدرت بخشی ہے وہ تمہارے چندوں سے بہتر ہے ۔ ہاں اگر تم نے کچھ مدد کرنی ہو تو اپنی طاقت کے موافق کرو تا میں تم میں اور ان میں ایک دیوار کھینچ دوں ۔ یعنی ایسے طور پر ان پر حجّت پوری کردوں کہ وہ کوئی طعن تشنیع اور اعتراض کا تم پر حملہ نہ کرسکیں ۔ لوہے کی سلیں

مجھے لادو تا آمد و رفت کی راہوں کو بند کیا جائے۔ یعنی اپنے تئیں میری تعلیم اور دلائل پر مضبوطی سے قائم کرو اور پوری استقامت اختیار کرو اور اِس طرح پر خود لوہے کی سِل بن کر مخالفانہ حملوں کو روکو اور پھر سِلوں میں آگ پھونکو جب تک کہ وہ خود آگ بن جائیں۔ یعنی محبّت الٰہی اس قدر اپنے اندر بھڑکاؤ کہ خود الٰہی رنگ اختیار کرو۔ ....

پھر آیات متذکرہ بالا کے بعد اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ذوالقرنین یعنی مسیح موعود اس قوم کو جو یاجوج ماجوج سے ڈرتی ہے کہیگا کہ مجھے تانبا لادو کہ مَیں اس کو پگھلا کر اس دیوار پر انڈیل دوں گا۔ پھر بعد اس کے یاجوج ماجوج طاقت نہیں رکھیں گے کہ ایسی دیوار پر چڑھ سکیں۔ اور اس میں سوراخ کر سکیں۔

یاد رہے کہ لوہا اگرچہ بہت دیر تک آگ میں رہ کر آگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے مگر مشکل سے پگھلتا ہے۔ مگر تانبا جلد پگھل جاتا ہے اور سالک کے لئے خدا تعالےٰ کی راہ میں پگھلنا بھی ضروری ہے، پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے مستعد دل اور نرم طبیعتیں لاؤ جو خدا تعالیٰ کے نشانوں کو دیکھ کر پگھل جائیں۔ کیونکہ سخت دلوں پر خدا تعالیٰ کے نشان کچھ اثر نہیں کرتے لیکن انسان شیطانی حملے سے تب محفوظ ہوتا ہے کہ اوّل استقامت میں لوہے کی طرح ہو اور پھر وہ لوہا خدا تعالےٰ کی محبت کی آگ سے آگ کی صورت پکڑ لے اور پھر دل پگھل کر اُس لوہے پر پڑے اور اس کو منتشر اور پراگندہ ہونے سے تھام لے۔ سلوک تمام ہونے کے لئے یہ تین ہی شرطیں ہیں جو شیطانی حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے سدِ سکندری ہیں اور شیطانی رُوح اس دیوار پر چڑھ نہیں سکتی اور نہ اس میں سوراخ کر سکتی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ یہ خدا کی رحمت سے ہوگا۔ اور اس کا ہاتھ یہ سب کچھ کریگا۔ انسانی منصوبوں کا اُس میں دخل نہیں ہوگا۔ اور جب قیامت کے دن نزدیک آجائیں گے تو پھر دوبارہ فتنہ برپا ہو جائے گا۔ یہ خدا کا وعدہ ہے۔ اور پھر فرمایا کہ ذوالقرنین کے زمانہ میں جو مسیح موعود ہے ہر ایک قوم اپنے مذہب کی حمایت میں اُٹھیگی۔ اور جس طرح ایک موج دوسری موج پر پڑتی ہے ایک دوسرے پر حملہ کرینگے۔ اتنے میں آسمان پر کرنا پھونکی جائے گی۔ یعنی آسمان کا خدا مسیح موعود کو مبعوث فرما کر ایک تیسری قوم پیدا کر دے گا اور اُن کی مدد کے لئے بڑے بڑے نشان دکھلائیگا۔ یہاں تک کہ تمام سعید لوگوں کو ایک مذہب پر یعنی اسلام پر جمع کر دے گا اور وہ مسیح موعود کی آواز سُنیں گے اور اس کی طرف دوڑیں گے۔ **تب ایک ہی چوپان اور ایک ہی گلّہ ہوگا۔** اور وہ دن بڑے ہی سخت ہونگے اور خدا ہیبت ناک نشانوں کے ساتھ اپنا چہرہ ظاہر کر دے گا۔ اور جو لوگ

کفر پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ اسی دنیا میں بباعث طرح طرح کی بلاؤں کے دوزخ کا مُنہ دیکھ لیں گے خدا فرماتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کی آنکھیں میری کلام سے پردہ میں تھیں اور جن کے کان میرے حکم کو سُن نہیں سکتے تھے۔ کیا ان منکروں نے یہ گمان کیا تھا کہ یہ امر سہل ہے کہ عاجز بندوں کو خدا بنا دیا جائے اور میں معطل ہو جاؤں اس لئے ہم اُن کی ضیافت کے لئے اِسی دنیا میں جہنم کو نمودار کر دیں گے یعنی بڑے بڑے ہولناک نشان ظاہر ہونگے۔ اور یہ سب نشان اُس کے مسیح موعود کی سچائی پر گواہی دیں گے۔ اُس کریم کے فضل کو دیکھو کہ یہ انعامات اِس مُشتِ خاک پر ہیں جس کو مخالف کافر اور دجّال کہتے ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صـــ ۹۱-۹۶)

مجھ سے ایک صاحب حکیم مرزا محمود ایرانی نام نے آج ۳ ستمبر ۱۹۰۲ء کو بذریعہ ایک خط کے دریافت کیا ہے کہ اس آیت کے کیا معنے ہیں۔ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ پس واضح ہو کہ آیت قرآنی بہت سے اسرار اپنے اندر رکھتی ہے جس کا احاطہ نہیں ہو سکتا اور جس کے ظاہر کے نیچے ایک باطن بھی ہے لیکن وہ معنے جو خدا نے میرے پر ظاہر فرمائے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ آیت مع اپنے سابق اور لاحق کے مسیح موعود کے لئے ایک پیشگوئی ہے اور اسکے وقت ظہور کو مشخص کرتی ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ مسیح موعود بھی ذوالقرنین ہے کیونکہ قرن عربی زبان میں صدی کو کہتے ہیں اور آیت قرآنی میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ وعدہ کا مسیح جو کسی وقت ظاہر ہوگا۔ اس کی پیدائش اور اس کا ظاہر ہونا دو صدیوں پر مشتمل ہوگا۔ چنانچہ میرا وجود اسی طرح پر ہے۔ میرے وجود نے مشہور و معروف صدیوں میں خواہ ہجری ہیں خواہ مسیحی خواہ بکرماجیتی اس طور پر اپنا ظہور کیا ہے کہ ہر جگہ دو صدیوں پر مشتمل ہے صرف کسی ایک صدی تک میری پیدائش اور ظہور ختم نہیں ہوئے۔ غرض جہاں تک مجھے علم ہے میری پیدائش اور میرا ظہور ہر ایک مذہب کی صدی میں صرف ایک صدی پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ دو صدیوں میں اپنا قدم رکھتا ہے۔ پس ان معنوں سے میں ذوالقرنین ہوں۔

چنانچہ بعض احادیث میں بھی مسیح موعود کا نام ذوالقرنین آیا ہے ان حدیثوں میں بھی ذوالقرنین کے یہی معنے ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں۔ اب باقی آیت کے معنے پیشگوئی کے لحاظ سے یہ ہیں کہ دنیا میں دو قومیں بڑی ہیں جن کو مسیح موعود کی بشارت دی گئی ہے اور مسیحی دعوت کے لئے پہلے اُنہی کا حق ٹھہرایا گیا ہے۔ سو خدا تعالیٰ ایک استعارہ کے رنگ میں اسجگہ

فرماتا ہے کہ مسیح موعود جو ذوالقرنین ہے اپنی سیر میں دو قوموں کو پائے گا۔ ایک قوم کو دیکھیگا کہ وہ تاریکی میں ایک ایسے بدبودار چشمہ پر بیٹھی ہے کہ جس کا پانی پینے کے لائق نہیں اور اس میں سخت بدبودار کیچڑ ہے اور اس قدر ہے کہ اب اس کو پانی نہیں کہہ سکتے۔ یہ عیسائی قوم ہے جو تاریکی میں ہے جنہوں نے مسیحی چشمہ کو اپنی غلطیوں سے بدبودار کیچڑ میں ملا دیا ہے۔

دوسری سیر میں مسیح موعود نے جو ذوالقرنین ہے ان لوگوں کو دیکھا جو آفتاب کی جلتی ہوئی دھوپ میں بیٹھے ہیں اور آفتاب کی دھوپ اور ان میں کوئی اوٹ نہیں اور آفتاب سے انہوں نے کوئی روشنی تو حاصل نہیں کی اور صرف یہ حصہ ملا ہے کہ اس سے بدن ان کے جل رہے ہیں اور اوپر کی جلد سیاہ ہو گئی ہے۔ اس قوم سے مراد مسلمان ہیں جو آفتاب کے سامنے تو ہیں مگر بجز جلنے کے اور کچھ ان کو فائدہ نہیں ہوا۔ یعنی ان کو توحید کا آفتاب دیا گیا مگر بجز جلنے کے آفتاب سے انہوں نے کوئی حقیقی روشنی حاصل نہیں کی یعنی دینداری کی سچی خوبصورتی اور اچھے اخلاق وہ کھو بیٹھے۔ اور تعصب اور کینہ اور اشتعال طبع اور درندگی کے چلن ان کے حصہ میں آ گئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پیرایہ میں فرماتا ہے کہ ایسے وقت میں مسیح موعود جو ذوالقرنین ہے آئے گا جبکہ عیسائی تاریکی میں ہونگے اور ان کے حصہ میں صرف ایک بدبودار کیچڑ ہوگا جس کو عربی زبان میں حَمَأٍ کہتے ہیں اور مسلمانوں کے ہاتھ صرف خشک توحید ہوگی جو تعصب اور درندگی کی دھوپ سے جلے ہونگے اور کوئی روحانیت صاف نہیں ہوگی۔ اور پھر مسیح جو ذوالقرنین ہے ایک تیسری قوم کو پائیں گے جو یاجوج ماجوج کے ہاتھ سے بہت تنگ ہوگی اور وہ لوگ بہت دیندار ہونگے اور ان کی طبیعتیں سعادت مند ہونگی۔ اور وہ ذوالقرنین سے جو مسیح موعود ہے مدد طلب کرینگے تا یاجوج ماجوج کے حملوں سے بچ جائیں اور تا وہ ان کیلئے سدِّ روشن بنا دے گا یعنی ایسے پختہ دلائل اسلام کی تائید میں ان کو تعلیم دے گا جو یاجوج ماجوج کے حملوں کو قطعی طور پر روک دیگا اور ان کے آنسو پونچھے گا اور ہر ایک طور سے ان کی مدد کرے گا اور ان کے ساتھ ہوگا۔ یہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو مجھے قبول کرتے ہیں۔

یہ عظیم الشان پیشگوئی ہے۔ اور اس میں صریح طور پر میرے ظہور اور **میرے وقت** اور **میری جماعت** کی خبر دی گئی ہے۔ پس مبارک وہ جو ان پیشگوئیوں کو غور سے پڑھے۔ قرآن شریف کی یہ سنّت ہے کہ اس قسم کی پیشگوئیاں بھی کیا کرتا ہے کہ ذکر کسی اور کا ہوتا ہے

اور اصل منشاء آئندہ زمانہ کے لئے ایک پیشگوئی ہوتی ہے۔ جیساکہ سورۃ یوسف میں بھی اسی قسم کی پیشگوئی کی گئی ہے۔ یعنی بظاہر تو ایک قصہ بیان کیا گیا ہے مگر اس میں یہ مخفی پیشگوئی ہے کہ جس طرح یوسف کو اوّل بھائیوں نے حقارت کی نظر سے دیکھا مگر آخر وہی یوسف اُن کا سردار بنایا گیا۔ اس جگہ بھی قریش کے لئے ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ان لوگوں نے **آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم** کو ردّ کرکے مکّہ سے نکال دیا۔ مگر وہی جو ردّ کیا گیا تھا ان کا پیشوا اور سردار بنایا گیا۔

(لیکچر لاہور صـ۷۵-۷۸)

یاجوج ماجوج

یاجوج ماجوج دو قومیں ہیں جن کا پہلی کتابوں میں ذکر ہے اور اس نام کی یہ وجہ ہے کہ وہ اجیج سے یعنی آگ سے بہت کام لینگی اور زمین پر ان کا بہت غلبہ ہو جائیگا اور ہر ایک بلندی کی مالک ہو جائینگی۔ تب اسی زمانہ میں آسمان سے ایک بڑی تبدیلی کا انتظام ہوگا اور صلح اور آشتی کے دن ظاہر ہونگے۔

(لیکچر سیالکوٹ ص۱۴)

مَیں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مسیح موعود کا یاجوج ماجوج کے وقت میں آنا ضروری ہے اور چونکہ اجیج آگ کو کہتے ہیں جس سے یاجوج ماجوج کا لفظ مشتق ہے۔ اس لئے جیسا کہ خدا نے مجھے سمجھایا ہے یاجوج ماجوج وہ قوم ہے جو تمام قوموں سے زیادہ دنیا میں آگ سے کام لینے میں استاد بلکہ اس کام کی موجد ہے اور ان ناموں میں یہ اشارہ ہے کہ ان کے جہاز ان کی ریلیں ان کی کلیں آگ کے ذریعہ سے چلیں گی۔ اور ان کی لڑائیاں آگ کے ذریعہ سے ہونگی۔ اور وہ آگ سے خدمت لینے کے فن میں تمام دنیا کی قوموں سے فائق ہونگے۔ اور اسی وجہ سے وہ یاجوج ماجوج کہلائینگے۔ سو وہ یورپ کی قومیں ہیں جو آگ کے فنون میں ایسے ماہر اور چابک اور یکتائے روزگار ہیں کہ کچھ بھی ضرور نہیں کہ اس میں زیادہ بیان کیا جائے۔ پہلی کتابوں میں بھی جو بنی اسرائیل کے نبیوں کو دی گئیں یورپ کے لوگوں کو ہی یاجوج ماجوج ٹھہرایا گیا ہے بلکہ ماسکو کا نام بھی لکھا ہے جو قدیم پایۂ تخت روس تھا۔ سو مقرر ہو چکا تھا کہ مسیح موعود یاجوج ماجوج کے وقت میں ظاہر ہوگا۔

(ایام الصلح ص۱۸۲-۱۸۳)

قرآن شریف میں ایک اور بھی پیشگوئی ہے جو جسمانی اجتماع کے بعد روحانی اجتماع پر دلالت کرتی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا یعنی ان آخری دنوں میں جو یاجوج ماجوج کا زمانہ ہوگا دنیا کے لوگ مذہبی جھگڑوں اور لڑائیوں میں مشغول ہو جائیں گے اور ایک قوم دوسری قوم پر مذہبی

رنگ میں ایسے حملے کریگی جیسے ایک موج دریا دوسری موج پر پڑتی ہے اور دوسری لڑائیاں بھی ہوں گی۔ اور اس طرح پر دنیا میں بڑا تفرقہ پھیل جائیگا اور بڑی پھوٹ اور بغض اور کینہ لوگوں میں پیدا ہو جائیگا اور جب یہ باتیں کمال کو پہنچ جائینگی تب خدا آسمان سے اپنی **قرنا** میں آواز پھونک دیگا یعنی مسیح موعود کے ذریعہ سے جو اس کی **قرنا** ہے ایک ایسی آواز **دنیا** کو پہنچائیگا جو اس آواز کے سُننے سے سعادتمند لوگ ایک ہی مذہب پر اکٹھے ہو جائیں گے اور تفرقہ دُور ہو جائیگا۔ اور مختلف قومیں دنیا کی ایک ہی قوم بن جائیں گی۔ اور پھر دوسری آیت میں فرمایا وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ عَرْضًا۔ اور اُس دن جو لوگ مسیح موعود کی دعوت کو قبول نہیں کرینگے ان کے سامنے ہم جہنم کو پیش کرینگے یعنی طرح طرح کے عذاب نازل کرینگے جو جہنم کا نمونہ ہونگے۔ اور پھر فرمایا۔ اَلَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا یعنی وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ مسیح موعود کی دعوت اور تبلیغ سے اُن کی آنکھیں پردہ میں رہیں گی اور وہ اس کی باتوں کو سُن بھی نہیں سکیں گے اور سخت بیزار ہونگے۔ اس لئے عذاب نازل ہوگا۔ اسجگہ **صور** کے لفظ سے مُراد **مسیح موعود** ہے کیونکہ خدا کے نبی اُس کی صور ہوتے ہیں یعنی قرنا۔ جن کے دلوں میں وہ اپنی آواز پھونکتا ہے۔ یہی محاورہ پہلی کتابوں میں بھی آیا ہے کہ خدا کے نبیوں کو خدا کے قرنا قرار دیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح قرنا بجانے والا قرنا میں اپنی آواز پھونکتا ہے۔ اسی طرح خدا ان کے دلوں میں آواز پھونکتا ہے اور یاجوج ماجوج کے قرینہ سے قطعی طور سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ قرنا مسیح موعود ہے۔ کیونکہ احادیث صحیحہ سے یہ امر ثابت شدہ ہے کہ یاجوج ماجوج کے زمانہ میں ظاہر ہونے والا مسیح موعود ہی ہوگا۔

اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ جبکہ ایک طرف بائیبل سے یہ امر ثابت شدہ ہے کہ یورپ کے عیسائی فرقے ہی یاجوج ماجوج ہیں اور دوسری طرف قرآن شریف نے یاجوج ماجوج کی وہ علامتیں مقرر کی ہیں جو صرف یورپ کی سلطنتوں پر ہی صادق آتی ہیں۔ جیسا کہ یہ لکھا ہے کہ وہ ہر ایک بلندی پر سے دوڑیں گے یعنی سب طاقتوں پر غالب ہو جائیں گے اور ہر ایک پہلو سے دنیا کا عروج اُن کو مل جائیگا۔ اور حدیثوں میں بھی یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ کسی سلطنت کو اُن کے ساتھ تاب مقابلہ نہیں ہوگی۔ پس یہ تو **قطعی فیصلہ** ہو چکا ہے کہ یہی قومیں یاجوج ماجوج ہیں اور اس سے انکار کرنا سراسر تحکم اور خدا تعالیٰ کے فرمودہ کی مخالفت ہے۔ اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے قول کے مطابق اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ کے موافق یہی قومیں ہیں جو اپنی دنیوی طاقت

میں تمام قوموں پر فوقیت لے گئی ہیں۔ جنگ اور لڑائی کے داؤ پیچ اور ملکی تدابیر کے امور میں دنیا میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا اور انہیں کی کلوں اور ایجادوں نے کیا لڑائیوں میں اور کیا کئی قسم کے دنیا کے آرام کے سامانوں میں ایک نیا نقشہ دنیا کا ظاہر کر دیا ہے اور انسان کی تمدنی حالت کو ایک حیرت انگیز انقلاب میں ڈال دیا ہے اور تدبیر امور سیاست اور درستی سامان رزم بزم میں وہ یدِ طولیٰ دکھلایا ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے کسی زمانہ میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔

پس خدا کے بزرگ نبی کی پیشگوئی سے صدہا سال بعد جو واقعہ اس پیشگوئی کی مقرر کردہ علامتوں کے موافق ظہور میں آیا ہے وہ یہی واقعہ یورپین طاقتوں کا ہے۔ سو جس طور سے خدا نے یاجوج ماجوج کے معنے ظاہر کر دیئے اور جس قوم کو موجودہ واقعہ نے ان علامات کا مصداق ٹھہرا دیا اس کو قبول نہ کرنا ایک کھلے کھلے حق سے انکار کرنا ہے۔ یوں تو انسان جب انکار پر اصرار کرے تو اس کا مُنہ کون بند کر سکتا ہے لیکن ایک منصف مزاج آدمی جو طالب حق ہے وہ ان تمام امور پر اطلاع پا کر پورے اطمینان اور ثلج صدر سے گواہی دیگا کہ بلاشبہ یہی قومیں یاجوج ماجوج ہیں۔

(چشمہ معرفت ص۷۵-۸۰)

حدیثوں میں بظاہر یہ تناقض پایا جاتا ہے کہ مسیح موعود کے مبعوث ہونے کے وقت ایک طرف تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج تمام دنیا میں پھیل جائیں گے اور دوسری طرف یہ بیان ہے کہ تمام دنیا میں عیسائی قوم کا غلبہ ہوگا۔ جیسا کہ حدیث یکسر الصّلیب سے بھی سمجھا جاتا ہے کہ صلیبی قوم کا اس زمانہ میں بڑا عروج اور اقبال ہوگا۔ ایسا ہی ایک دوسری حدیث سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ اس زمانہ میں رومیوں کی کثرت اور قوت ہوگی یعنی عیسائیوں کی۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رومی سلطنت عیسائی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ بھی قرآن شریف میں فرماتا ہے غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ۔ اسجگہ بھی روم سے مراد عیسائی سلطنت ہے۔ اور پھر بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعود کے ظہور کے وقت دجّال کا تمام زمین پر غلبہ ہوگا اور تمام زمین پر بغیر مکّہ معظمہ کے دجال محیط ہو جائیگا۔

اب کوئی مولوی صاحب بتلاویں کہ یہ تناقض کیونکر دُور ہو سکتا ہے۔ اگر دجّال تمام زمین پر محیط ہو جائیگا تو عیسائی سلطنت کہاں ہوگی۔ ایسا ہی یاجوج ماجوج جن کی عام سلطنت کی قرآن شریف خبر دیتا ہے وہ کہاں جائیں گے۔ سو یہ غلطیاں ہیں جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں۔ جو ہمارے مکفّر اور مکذّب ہیں۔ واقعات ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ دونوں صفات یاجوج ماجوج اور دجّال ہونے کے یورپین قوموں میں

موجود ہیں کیونکہ یاجوج ماجوج کی تعریف حدیثوں میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اُن کے ساتھ لڑائی میں کسی کو طاقت مقابلہ نہیں ہوگی اور **مسیح موعود بھی صرف دُعا سے کام لیگا**۔ اور یہ صفت کھلے کھلے طور پر یورپ کی سلطنتوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن شریف بھی اس کا مصدّق ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔ اور دجّال کی نسبت حدیثوں میں یہ بیان ہے کہ وہ دجل سے کام لے گا اور مذہبی رنگ میں دنیا میں فتنہ ڈالیگا۔ سو قرآن شریف میں یہ صفت عیسائی پادریوں کی بیان کی گئی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ یہ تینوں ایک ہی ہیں۔ اسی وجہ سے سورۃ الفاتحہ میں دائمی طور پر یہ دعا سکھلائی گئی کہ تم عیسائیوں کے فتنہ سے پناہ مانگو۔ یہ نہیں کہا کہ تم دجّال سے پناہ مانگو۔ پس اگر کوئی اور دجّال ہوتا جس کا فتنہ پادریوں سے زیادہ ہوتا تو خدا کی کلام میں بڑا فتنہ چھوڑ کر قیامت تک یہ دُعا نہ سکھلائی جاتی کہ تم عیسائیوں کے فتنہ سے پناہ مانگو۔ اور یہ نہ فرمایا جاتا کہ عیسائی فتنہ ایسا ہے کہ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں۔ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں بلکہ یہ کہا جاتا کہ دجّالی فتنہ ایسا ہے جس سے قریب ہے کہ زمین و آسمان پھٹ جائیں۔ بڑے فتنہ کو چھوڑ کر چھوٹے فتنہ سے ڈرانا بالکل غیر معقول ہے۔

(چشمۂ معرفت ص٧٧-٧٩ حاشیہ)

اُمُّ الْاَلْسِنَہ

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ ہر ایک بولی انسان کی ہی ایجاد ہے بلکہ بکمال تحقیق ثابت ہے کہ **موجد** اور **خالق** انسان کی بولیوں کا **وہی خدائے قادرِ مطلق** ہے جس نے اپنی قدرت کاملہ سے انسان کو پیدا کیا اور اُس کو اِسی غرض سے زبان عطا فرمائی کہ تا وہ کلام کرنے پر قادر ہو سکے۔ اگر بولی انسان کی ایجاد ہوتی تو اس صورت میں کسی بچۂ نوزاد کو تعلیم کی کچھ بھی حاجت نہ ہوتی بلکہ بالغ ہو کر آپ ہی کوئی بولی ایجاد کر لیتا لیکن بہ بداہت عقل ظاہر ہے کہ اگر کسی بچّہ کو بولی نہ سکھائی جائے تو وہ کچھ بول نہیں سکتا۔ اور خواہ تم اس بچہ کو یونان کے کسی جنگل میں پرورش کرو یا انگلینڈ کے جزیرہ میں چھوڑ دو۔ خواہ تم اس کو خطِ استوا کے نیچے لے جاؤ تب بھی وہ بولی سیکھنے میں تعلیم کا محتاج ہو گا۔ اور بغیر سکھانے کے بے زبان رہیگا۔

اور اس خیال کی تائید میں یہ وہم پیش کرنا کہ ہم بچشم خود دیکھتے ہیں کہ بولیوں میں ہمیشہ صدہا طرح کے تغیّر و تبدّل خود بخود ہوتے رہتے ہیں جن سے بولیوں میں انسانی تصرف کا ثبوت ملتا ہے سو واضح ہو کہ یہ وہم سراسر دھوکا ہے۔ تغیّرات کہ جو ہمیشہ بولیوں کو لگے ہوئے ہیں یہ انسان کے ارادہ اور اختیار سے ظہور میں نہیں آتے اور نہ یہ کچھ قاعدہ مقرر ہو سکتا ہے کہ خود انسان کی طبیعت کسی خاص خاص وقتوں میں بولیوں میں تغیّر تبدّل کرتی رہتی ہے بلکہ عمیق نظر سے معلوم ہو گا کہ یہ تغیّرات بھی اس علّت العلل کے ارادہ اور اختیار سے وقوع میں آتے رہتے ہیں جیسے تمام تغیّرات سماوی و ارضی اس کے خاص ارادہ سے ظہور پذیر ہیں۔

یہ امر کبھی ثابت نہیں ہو سکتا کہ کبھی انسانوں نے متفق ہو کر یا الگ الگ ان تمام بولیوں کو ایجاد کیا تھا جو دنیا میں بولی جاتی ہیں۔ اور اگر کوئی یہ وہم پیش کرے کہ جس طرح طبعی طور پر خدا تعالیٰ بولیوں میں ہمیشہ تغیّر تبدّل کرتا رہتا ہے کیوں جائز نہیں کہ ابتداء میں بھی اسی طور پر بولیاں ایجاد ہو گئی ہوں اور کوئی خاص الہام نہ ہُوا ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابتداء زمانہ کے لئے عام قانونِ قدرت یہی ہے کہ خدا نے ہر ایک چیز کو اپنی قدرتِ محض سے پیدا کیا تھا۔ آسمان اور زمین اور سورج اور چاند اور خود انسان کی فطرت پر نظر کرنے سے معلوم ہو گا کہ وہ ابتدائی زمانہ محض قدرت نمائی کا زمانہ تھا جس میں اسباب معتادہ کی ذرّہ آمیزش نہ تھی اور اس زمانہ میں جو کچھ خدا نے پیدا کیا

وہ ایسی اعلیٰ قدرت سے کیا جس میں عقل انسان حیران ہے ۔ . . . . اُس زمانہ کی نظیر میں اِس زمانہ کے حالات پیش کرنا درست نہیں ہے ۔ مثلاً اب کوئی بچہ انسان کا بغیر ذریعہ ماں اور باپ کے پیدا نہیں ہوتا ۔ لیکن اگر اس ابتدائی زمانہ میں بھی انسان کا پیدا ہونا والدین کے وجود پر ہی موقوف ہوتا تو پھر کیونکر یہ دنیا پیدا ہو سکتی ؟ علاوہ اس کے جو تغیرات بولیوں میں طبعی طور پر ہوتے رہتے ہیں ان تغیرات میں اور اس دوسری صورت میں کہ جب بولی عدم محض سے پیدا کی جائے بڑا فرق ہے ۔ کسی موجودہ بولی میں کچھ تغیر ہونا شئے دیگر ہے اور عدمِ محض سے ایک بولی کا من کل الوجوہ پیدا ہو جانا یہ اَور بات ہے ۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۳۳۶ ۔ ۳۸۲)

بعض نادان آریہ ایک **سنسکرت کو پرمیشر کی بولی** ٹھہرا کر دوسری تمام بولیاں جو صدہا عجائب اور غرائب صنع باری سے بھری ہوئی ہیں انسان کا ایجاد قرار دیتے ہیں ۔ گویا انسان کے ہاتھ میں بھی ایک قسم کی خدائی ہے کہ پرمیشر نے تو صرف ایک بولی ظاہر کی مگر آدمیوں نے وہ قوت دکھلائی کہ بیسیوں بولیاں اس سے بہتر ایجاد کریں ۔ بھلا ہم آریہ لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ اگر یہی سچ ہے کہ سنسکرت ہی پرمیشر کے منہ سے نکلی ہے اور دوسری زبانیں انسانوں کی صنعت ہیں اور پرمیشر کے مُنہ سے دُور رہی ہوئی ہیں تو ذرا بتلاؤ تو سہی کہ وہ کونسے کمالات خاصہ ہیں جو سنسکرت میں پائے جاتے ہیں اور دوسری زبانیں اُن سے عاری ہیں ۔ کیونکہ پرمیشر کی کلام کو انسان کے مصنوع پر ضرور فضیلت ہونی چاہیئے ۔ کیونکہ وہ اسی سے خدا کہلاتا ہے کہ اپنی ذات میں اپنی صفات میں اپنے کاموں میں سب سے افضل اور بے مثل و مانند ہے ۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ سنسکرت پرمیشر کا کلام ہے جو ہندوؤں کے باپ دادوں پر نازل ہوا ہے اور دوسری زبانیں دوسرے لوگوں کے باپ دادوں نے بوجہ اس کے کہ وہ ہندوؤں کے باپ دادوں سے زیادہ زیرک اور دانا تھے آپ بنائی ہیں مگر کیا ہم یہ بھی فرض کر سکتے ہیں کہ وہ لوگ ہندوؤں کے پرمیشر سے بھی کچھ بڑھ کر تھے جن کی قدرت کاملہ نے صدہا عمدہ زبانیں بنا کر دکھلا دیں اور پرمیشر صرف ایک ہی بولی بنا کر رہ گیا ۔ جن لوگوں کی تار و پود میں شرک گھُسا ہوا ہے انہوں نے اپنے پرمیشر کو بہت سی باتوں میں ایک برابر درجہ کا شخص سمجھ رکھا ہے ۔ کیوں نہ ہو انادی جو ہوئے ۔ خدا کے شریک جو ٹھہرے ۔ اور اگر کسی کے دل میں یہ وہم پیدا ہو کہ خدا نے ایک بولی پر کفایت کیوں نہ کی یہ وہم بھی قلّتِ تدبّر سے ناشی ہے ۔ اگر کوئی دانا اقالیم مختلفہ کے اوضاع متفاوتہ اور طبائع متفرقہ پر نظر کرے تو بہ یقین کامل اس کو معلوم ہو گا کہ ایک ہی بولی ان سب کے مناسب حال نہیں تھی ۔ بعض ملکوں کے لوگ بعض طور کے حروف اور الفاظ کے بولنے پر بہ آسانی

قادر ہیں۔ اور بعض ملکوں کے لوگوں کو ان حروف اور الفاظ کا بولنا ایک مصیبت ہے۔ پس کیونکر ممکن تھا کہ حکیم مطلق صرف ایک ہی بولی سے پیار کر کے قاعدہ وضع الشیء فی موضعہٖ کی رعایت نہ کرتا اور طبائع مختلفہ کے لئے جو مصلحت عامہ تھی اس کو ترک کر دیتا۔ کیا مناسب تھا کہ وہ جدا جدا طبیعتوں کے لوگوں کو ایک ہی بولی کے تنگ پنجرہ میں قید کر دیتا۔ علاوہ اس کے انواع و اقسام کی بولیوں کے بنانے میں خداوند تعالیٰ کی زیادت قدرت ثابت ہوتی اور عاجز بندوں کا مختلف زبانوں میں اُس کی تعریف کرنا **عبودیت کے بازار کی ایک رونق ہے۔**

(براہین احمدیہ ص ۴۲۵ - ۴۳۴)

اشتہار کتاب منن الرحمٰن

یہ ایک نہایت عجیب و غریب کتاب ہے جس کی طرف قرآن شریف کی بعض پُر حکمت آیات نے ہمیں توجہ دلائی۔ سو قرآن عظیم نے یہ بھی دنیا پر ایک بھاری احسان کیا ہے جو اختلافِ لُغات کا اصل فلسفہ بیان کر دیا۔ اور ہمیں اس دقیق حکمت پر مطلع فرمایا کہ انسانی بولیاں کس منبع اور معدن سے نکلی ہیں۔ اور کیسے وہ لوگ دھوکا میں رہے جنہوں نے اس بات کو قبول نہ کیا جو انسانی بولی کی جڑ **خدا تعالیٰ کی تعلیم** ہے۔ اور واضح ہو کہ اس کتاب میں تحقیق الالسنہ کی رُو سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا میں صرف قرآن شریف ایک ایسی کتاب ہے جو اس زبان میں نازل ہوا ہے جو **اُمّ الالسنہ** اور الہامی اور تمام بولیوں کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ الٰہی کتاب کی تمام تر زینت اور فضیلت اسی میں ہے جو ایسی زبان میں ہو جو خدا تعالیٰ کے مُنہ سے نکلی اور اپنی خوبیوں میں تمام زبانوں سے بڑھی ہوئی اور اپنے نظام میں کامل ہو۔ اور جب ہم کسی زبان میں وہ کمال پاویں جس کے پیدا کرنے سے انسانی طاقتیں اور بشری بناوٹیں عاجز ہوں اور وہ خوبیاں دیکھیں جو دوسری زبانیں ان سے قاصر اور محروم ہوں اور وہ خواص مشاہدہ کریں جو بجز خدا تعالیٰ کے قدیم اور صحیح علم کے کسی مخلوق کا ذہن ان کا موجد نہ ہو سکے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ وہ زبان خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ سو کامل اور عمیق تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ وہ **زبان عربی ہے۔** اگرچہ بہت سے لوگوں نے ان باتوں کی تحقیقات میں اپنی عمریں گذاری ہیں اور بہت کوشش کی ہے جو اس بات کا پتہ لگا دیں کہ اُمُّ الْالسنہ کونسی زبان ہے مگر چونکہ اُن کی کوششیں خطِ مستقیم پر نہیں تھیں اور نیز خدا تعالیٰ سے توفیق یافتہ نہ تھے اس لئے وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اور یہ بھی وجہ تھی کہ عربی زبان کی طرف اُن کی پوری توجہ نہیں تھی بلکہ ایک بخل تھا۔ لہذا وہ حقیقت شناسی سے محروم رہ گئے۔ اب ہمیں

خدا تعالیٰ کے مقدس اور پاک کلام قرآن شریف سے اس بات کی ہدایت ہوئی کہ وہ الہامی زبان اور اُم الالسنہ جس کے لئے پارسیوں نے اپنی جگہ اور عبرانی والوں نے اپنی جگہ اور آریہ قوم نے اپنی جگہ دعوے کئے کہ انہیں کی وہ زبان ہے وہ **عربی مبین** ہے اور دوسرے تمام دعویدار غلطی پر اور خطا پر ہیں ....

عربی کے الفاظ کے مقابل پر ان زبانوں کے الفاظ لنگڑوں لولوں اندھوں بہروں مبروصوں مجذوموں کے مشابہ ہیں۔ جو فطری نظام کو بکلی کھو بیٹھے ہیں۔ اور کافی ذخیرہ مفردات کا جو کامل زبان کے لئے شرط ضروری ہے اپنے ساتھ نہیں رکھتے ....

اگر کسی آریہ صاحب یا کسی اور مخالف کو یہ تحقیقات ہماری منظور نہیں تو اُن کو ہم بذریعہ اس اشتہار کے اطلاع دیتے ہیں کہ ہم نے زبان عربی کی فضیلت اور کمال اور فوق الالسنہ ہونے کے دلائل اپنی اس کتاب میں مبسوط طور پر لکھدیئے ہیں جو بتفصیل ذیل ہیں :-

(۱) عربی کی مفردات کا نظام کامل ہے۔
(۲) عربی اعلیٰ درجہ کی علمی وجوہ تسمیہ پر مشتمل ہے جو فوق العادت ہے۔
(۳) عربی کا سلسلہ اطراد مواد اتم و اکمل ہے۔
(۴) عربی کی ترکیب میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہیں۔
(۵) عربی زبان انسانی ضمائر کا پورا نقشہ کھینچنے کیلئے پوری پوری طاقت اپنے اندر رکھتی ہے۔

اب ہر ایک کو اختیار ہے کہ ہماری کتاب کے چھپنے کے بعد اگر ممکن ہو تو یہ کمالات سنسکرت یا کسی اور زبان میں ثابت کرے۔

(ضیاء الحق صـ۲)

چونکہ **قرآن مجید** ایک ایسا **لعلِ تاباں** اور **مہرِ درخشاں** ہے کہ اس کی سچائی کی کرنیں اور اس کے منجانب اللہ ہونے کی چمکیں نہ کسی ایک یا دو پہلو سے بلکہ ہزارہا پہلوؤں سے ظاہر ہو رہی ہیں اور جسقدر مخالف دین متین کوشش کر رہے ہیں کہ اس ربّانی نور کو بجھا دیں اُسی قدر وہ زور سے ظاہر ہوتا اور اپنے حسن اور جمال سے ہر یک اہل بصیرت کے دل کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اس لئے اس تاریک زمانہ میں بھی جبکہ پادریوں اور آریوں نے توہین اور تحقیر کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑا اور اپنی نابینائی کی وجہ سے اس نور پر وہ تمام حملے کئے جو ایک سخت جاہل اور سخت متعصب کر سکتا ہے اس ازلی نور نے آپ اپنے منجانب اللہ ہونے کا ہر یک پہلو سے ثبوت دیا ہے۔ اس میں یہ ایک عظیم الشان خاصیت ہے کہ وہ اپنی تمام ہدایات اور کمالات کی نسبت آپ ہی دعویٰ

کرتا اور آپ ہی اس دعویٰ کا ثبوت دیتا ہے۔ اور یہ عظمت کسی اور کتاب کو نصیب نہیں اور منجملہ اُن دلائل اور براہین کے جو اُس نے اپنے منجانب اللہ ہونے پر اور اپنے اعلیٰ درجہ کی فضیلت پر پیش کئے ہیں ایک بزرگ دلیل وہ ہے جس کی بسط اور تفصیل کے لئے ہم نے اِس کتاب کو تالیف کیا ہے جو اُمُّ الالسنہ کے پاک چشمے سے پیدا ہوتی ہے جسکا آب زلال ستاروں کی طرح چمکتا اور ہریک معرفت کے پیاسے کو یقین کے پانی سے سیراب کرتا اور شکوک وشبہات کی میلوں سے صاف کر دیتا ہے۔ یہ دلیل کسی پہلی کتاب نے اپنی سچائی کی تائید میں پیش نہیں کی۔ اور اگر وید یا کسی اور کتاب نے پیش کی ہے تو واجب ہے کہ اُس کے پیرو مقابلہ کے وقت پہلے اس وید کے مقام کو پیش کریں اور خلاصہ مطلب اس دلیل کا یہ ہے کہ **زبانوں پر** نظر ڈالنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کا باہم اشتراک ہے۔ پھر ایک دوسری عمیق اور گہری نظر سے یہ بات بپایۂ ثبوت پہنچتی ہے جو ان تمام **مشترک زبانوں کی ماں زبان عربی ہے** جس سے یہ تمام زبانیں نکلی ہیں اور پھر ایک کامل اور نہایت محیط تحقیقات سے یعنی جبکہ عربی کی فوق العادت کمالات پر اطلاع ہو یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ یہ زبان نہ صرف **اُمّ الالسنہ** ہے بلکہ **الٰہی زبان** ہے جو خدا تعالےٰ کے خاص ارادہ اور الہام سے پہلے انسان کو سکھائی گئی۔ اور کسی انسان کی ایجاد نہیں۔ اور پھر اس بات کا نتیجہ کہ تمام زبانوں میں سے **الہامی زبان** صرف عربی ہی ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی اکمل اور اتم وحی نازل ہونے کے لئے صرف عربی زبان ہی **مناسبت** رکھتی ہے کیونکہ یہ نہایت ضروری ہے کہ کتاب الٰہی جو تمام قوموں کی **ہدایت** کے لئے آئی ہے وہ **الہامی زبان** میں ہی نازل ہو اور ایسی زبان میں ہو جو اُمّ الالسنہ ہو تا اس کو ہریک زبان اور اہل زبان سے ایک فطری مناسبت ہو اور تا وہ الہامی زبان ہونے کی وجہ سے وہ برکات اپنے اندر رکھتی ہو جو ان چیزوں میں ہوتی ہیں جو خدا تعالےٰ کے مبارک ہاتھ سے نکلتی ہیں۔ لیکن چونکہ دوسری زبانیں بھی انسانوں نے عمداً نہیں بنائیں بلکہ وہ تمام اسی پاک زبان سے بحکم ربّ قدیر نکل کر بگڑ گئی ہیں اور اسی کے ذرّیات ہیں اس لئے یہ کچھ نامناسب نہیں تھا کہ ان زبانوں میں بھی خاص خاص قوموں کے لئے الہامی کتابیں نازل ہوں۔ ہاں یہ ضروری تھا کہ اقویٰ اور اعلیٰ کتاب عربی زبان میں ہی نازل ہو کیونکہ وہ اُمّ الالسنہ اور اصل الہامی زبان اور خدا تعالےٰ کے مُنہ سے نکلی ہے اور چونکہ یہ دلیل **قرآن** نے ہی بتلائی اور قرآن نے ہی دعویٰ کیا۔ اور عربی زبان میں کوئی دوسری کتاب مدعی بھی نہیں اسلئے

بہ بداہت قرآن کا منجانب اللہ ہونا اور سب کتابوں پر **مہیمن** ہونا ماننا پڑا ورنہ دوسری کتابیں بھی باطل ٹھہریں گی۔ لہٰذا مَیں نے اسی غرض سے اس کتاب کو لکھا ہے کہ تا اوّل بعونہ تعالیٰ تمام زبانوں کا **اشتراک** ثابت کروں اور پھر بعد ازاں زبان عربی کے **اُمّ الالسنہ** اور اصل الہامی ہونے کے **دلائل** سناؤں اور پھر عربی کی اس خصوصیت کی بنا پر کہ کامل اور خالص اور **الہامی زبان** صرف وہی ہے اس آخری نتیجہ کا قطعی اور یقینی ثبوت دوں کہ الٰہی کتابوں میں سے اعلیٰ اور ارفع اور اتم اور اکمل اور **خاتم الکتب** صرف **قرآن** کریم ہی ہے اور وہی **اُمّ الکتب** ہے جیسا کہ عربی **اُمّ الالسنہ** ہے۔ اور اِس سلسلۂ تحقیقات میں ہمارے ذمہ تین مرحلوں کا طے کرنا ضروری ہوگا۔

پہلا مرحلہ زبانوں کا اشتراک ثابت کرنا۔
دوسرا مرحلہ عربی کا اُمّ الالسنہ ہونا بپایۂ ثبوت پہنچانا۔
تیسرا مرحلہ عربی کا بوجہ کمالات فوق العادت کے الہامی ثابت کرنا........

تنقیح کے تین امروں سے پہلا امر جو **اشتراک السنہ** ہے اس کا فیصلہ ہماری اس کتاب میں ایسی صفائی سے ہوگیا ہے جو اس سے بڑھکر کسی اعلیٰ تحقیقات کے لئے کوئی کارروائی متصوّر نہیں ...... **دوسرا امر تنقیح** کے امروں میں سے یہ ہے کہ مشترکہ زبانوں میں سے صرف عربی ہی **اُمّ الالسنہ** ہے۔ چنانچہ اس کی وجوہ بجائے خود مفصّل لکھی گئی ہیں۔ اور ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ عربی کے کمالات خاصہ میں سے یہ ہے کہ وہ فطری نظام اپنے ساتھ رکھتی ہے اور الٰہی صنعت کی خوبصورتی اسی رنگ سے دکھلاتی ہے جس رنگ سے خدا تعالےٰ کے اور کام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ باقی تمام زبانیں عربی کا ایک ممسوخ شدہ خاکہ ہے جس قدر یہ مبارک زبان ان زبانوں میں اپنی ہیئت میں قائم رہی ہے وہ حصّہ تو لعل کی طرح چمکتا ہے اور اپنے حسنِ دلربا کے ساتھ دلوں پر اثر کرتا ہے۔ اور جسقدر کوئی زبان بگڑ گئی ہے اسی قدر اس کی نزاکت اور دلکش صورت میں فرق آگیا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہریک چیز جو خدا تعالےٰ کے ہاتھ سے نکلی ہے جب تک وہ اپنی اصلی صورت میں ہے تب تک اس میں خارق عادت شمائل ضرور ہوتے ہیں اور اُس کی نظیر بنانے پر انسان قادر نہیں ہوتا۔ اور جونہی وہ چیز اپنی اصلی حالت سے گر جاتی ہے تو معاً اُسکی شکل اور حسن میں فرق ظاہر ہو جاتا ہے.....

زبان عربی اس لطیف طبع اور زیرک انسان کی طرح کام دیتی ہے جو مختلف ذرائع سے

اپنے مدعا کو سمجھا سکتا ہے۔ مثلاً ایک نہایت ہوشیار اور زیرک انسان کبھی ابرو یا ناک یا ہاتھ سے وہ کام لے لیتا ہے جو زبان نے کرنا تھا۔ یعنی اس بات پر قادر ہوتا ہے کہ باریک باریک اشارات سے مخاطب کو سمجھاوے۔ یہی طریق زبان عربی کے عادات میں سے ہے۔ یعنی یہ زبان کبھی **الف لام** تعریف سے وہ کام نکالتی ہے جس میں دوسری زبانیں چند لفظوں کی محتاج ہوتی ہیں۔ اور کبھی صرف **تنوین** سے ایسا کام لیتی ہے جو دوسری زبانیں طولانی فقروں سے بھی پورا نہیں کر سکتیں۔ ایسا ہی **زیر و زبر و پیش** بھی الفاظ کا ایسا کام دے جاتے ہیں کہ ممکن نہیں کہ کوئی دوسری زبان بغیر چند فضول فقروں کے ان کا مقابلہ کر سکے۔ اس کے بعض لفظ بھی باوجود بہت چھوٹے ہونے کے ایسے لمبے معنے رکھتے ہیں کہ نہایت حیرت ہوتی ہے کہ یہ معنے کہاں سے نکلے۔ مثلاً **عَرَّضْتُ** کے یہ معنے ہیں کہ میں مکّہ اور مدینہ اور جو ان کے گرد دیہات ہیں سب دیکھ آیا۔ اور **طَهْفَلْتُ** کے یہ معنے ہیں کہ میں چینے کی روٹی کھاتا ہوں اور ہمیشہ چینے کی روٹی کھانے کا عہد کر چکا ہوں.....

اور عربی کے عجائبات میں سے ایک یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اور متفرق زبانوں میں جسقدر خواص ہیں اس میں وہ سب جمع ہیں...........

پس جبکہ غور کرنے اور پوری پوری خوض اور عمیق تحقیقات کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت زبان عربی تمام زبانوں کے خواص متفرقہ کی جامع ہے تو اس سے بالضرورت ماننا پڑتا ہے کہ **تمام زبانیں عربی کی ہی فروعات ہیں۔**

بعض لوگ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اگر تمام زبانوں کی جڑ اور اصل ایک ہی زبان کو تسلیم کیا جائے تو عقل اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ صرف تین چار ہزار برس تک ایسی زبانوں میں جو ایک ہی اصل سے نکلی تھیں اس قدر فرق ظاہر ہو گیا ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض درحقیقت از قبیل بنیاد فاسد بر فاسد ہے ورنہ یہ بات قطعی طور پر طے شدہ نہیں کہ عمر دنیا کی صرف چار یا پانچ ہزار برس تک گذری ہے اور پہلے اس سے زمین و آسمان کا نام و نشان نہ تھا۔ بلکہ نظر عمیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا ایک مدّت دراز سے آباد ہے۔ ماسوا اس کے اختلاف السنہ کے لئے صرف باہمی بُعد زماں یا مکاں سبب نہیں بلکہ اس کا ایک قوی سبب یہ بھی ہے کہ خط استوا کے قُرب یا بُعد اور ستاروں کی ایک خاص وضع کی تاثیر اور دوسرے نامعلوم اسباب سے ہر یک قسم کی زمین اپنے باشندوں کی فطرت کو ایک خاص حلق اور لہجہ اور صورتِ تلفظ کی طرف میلان دیتی ہے اور وہی محرک رفتہ رفتہ ایک خاص وضع کلام کی طرف لے آتا ہے۔ اسی وجہ سے دیکھا جاتا ہے

کہ بعض ملک کے لوگ حرف زآ بولنے پر قادر نہیں ہو سکتے اور بعض رآ بولنے پر قادر نہیں ہو سکتے جیسے انسانوں میں ملکوں کے اختلاف سے رنگوں کا اختلاف۔ عمروں کا اختلاف۔ اخلاق کا اختلاف امراض کا اختلاف ایک ضروری امر ہے ایسا ہی یہ اختلاف بھی ضرور ہے۔ کیونکہ انہیں مؤثرات کے نیچے زبانوں کا بھی اختلاف ہے۔ پس یہ خیال ایک دھوکا ہے کہ یہ اختلاف کیوں ہزارہا برس سے ایک ہی حد تک رہا۔ اس سے آگے نہ بڑھا۔ کیونکہ مؤثرات نے جسقدر اختلاف کو چاہا اسی قدر ہوا اس سے زیادہ کیونکر ہو سکتا۔ یہ ایسا ہی سوال ہے جیساکہ کوئی کہے کہ اختلاف امکنہ میں رنگوں اور عمروں اور مرضوں اور اخلاق کا اختلاف ہو گیا۔ یہ کیوں نہ ہوا کہ کسی جگہ ایک آنکھ کی جگہ دس آنکھیں ہو جاتیں۔ سو ایسے وہم کا بجز اس کے ہم کیا جواب دے سکتے ہیں کہ یہ اختلاف یوں ہی بے قاعدہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک طبیعی قاعدہ کے نیچے تھا۔ سو جسقدر قاعدہ نے تقاضا کیا اُسی قدر اختلاف بھی ہوا۔ غرض جو کچھ مؤثرات سماوی ارضی کی وجہ سے انسان کی بناوٹ خلق یا خیالات کی طبیعی رفتار میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے وہ تبدیلی بالضرورت سلسلہ کلمات میں تبدیلی ڈالتی ہے۔ لہذا وہ طبعًا اختلاف پیدا کرنے کے لئے مجبور ہوتی ہیں۔ اور اگر کوئی دوسری زبان کا لفظ ان کے زبان میں پہنچے تو وہ عمدًا اس میں بہت کچھ تبدیلی کر دیتے ہیں۔ پس یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی دلیل اس بات پر ہے کہ وہ اپنی خلقت کے لحاظ سے جو مؤثرات ارضی سماوی سے متاثر ہے فطرتًا تبدیل کے محتاج ہیں۔

ماسوا اس کے عیسائیوں اور یہودیوں کو تو ضرور یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ اُم الالسنہ عربی ہے کیونکہ **توریت** کی نص صریح سے یہ ثابت ہے کہ ابتداء میں بولی ایک ہی تھی ....

اگر یہ اعتراض پیش ہو کہ زبان عربی جو اُم الالسنہ قرار دی گئی ہے اس کی نسبت تمام زبانوں کی نسبت مساوی نہیں ہے بلکہ بعض سے کم اور بعض سے زیادہ ہے۔ مثلاً عبری زبان پر ادنیٰ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھوڑے سے تغیّر کے بعد عربی زبان ہی ہے۔ لیکن سنسکرت یا یورپ کی زبانوں کے ساتھ وہ تعلق پایا نہیں جاتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گو **عبری** اور دوسری شاخیں اس کی درحقیقت **عربی** کے تھوڑے سے تغیّر سے پیدا ہوئی ہیں اور **سنسکرت** وغیرہ دنیا کی کل زبانیں تغیرات بعیدہ سے نکلی ہیں تاہم کامل غور کرنے اور قواعد پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان زبانوں کے کلمات اور الفاظ مفردہ عربی سے ہی بدلا کر طرح طرح کے قالبوں میں لائے گئے ہیں اور عربی کے فضائل خاصہ سے جو اسی زبان سے خصوصیت رکھتے ہیں جنکی ہم انشاء اللہ

اپنے اپنے محل پر تشریح کرینگے۔ اور جو اس کے اُمّ الالسنہ اور کامل اور **الہامی زبان** ہونے پر قطعی دلیل ہے **پانچ خوبیاں** ہیں۔ جو مفصلہ ذیل ہیں:—

پہلی خوبی۔ عربی کے مفردات کا نظام کامل ہے۔ یعنی انسانی ضرورتوں کو وہ مفردات پوری مدد دیتے ہیں۔ دوسرے لغات اس سے بے بہرہ ہیں۔

دوسری خوبی عربی میں اسماء باری و اسماء ارکان عالم و نباتات و حیوانات و جمادات و اعضائے انسان اپنی اپنی وجہ تسمیہ میں بڑے بڑے علوم حکمیہ پر مشتمل ہیں۔ دوسری زبانیں ہرگز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

تیسری خوبی عربی کا اطراد مواد الفاظ بھی پورا نظام رکھتا ہے اور اس نظام کا دائرہ تمام افعال اور اسماء کو جو ایک ہی مادہ کے ہیں۔ ایک سلسلہ حکمیہ میں داخل کر کے اُن کے باہمی تعلقات دکھلاتا ہے اور یہ بات اس کمال کے ساتھ دوسری زبانوں میں پائی نہیں جاتی۔

چوتھی خوبی عربی کے تراکیب میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہیں۔ یعنی زبان عربی الف لام اور تنوینوں اور تقدیم تاخیر سے وہ کام نکالتی ہے جس میں دوسری زبانیں کئی فقروں کے جوڑنے کی محتاج ہوتی ہیں۔

پانچویں خوبی عربی زبان ایسے مفردات اور تراکیب اپنے ساتھ رکھتی ہے جو انسان کے تمام باریک در باریک ضمائر اور خیالات کا نقشہ کھینچنے کے لئے کامل وسائل ہیں۔

اب چونکہ یہ بھاری ثبوت ہمارے ذمہ ہے کہ ہم عربی کے مفردات کا ایسا نظام کامل ثابت کریں جو دوسری کتابیں اس کے مقابلہ سے عاجز رہیں اور نیز اس کی باقی چار خوبیوں کو بھی اسی طرح بپایۂ ثبوت پہنچاویں۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہوا کہ ہم ان مباحث کو عربی زبان میں ہی لکھیں۔ کیونکہ ہمارا یہ فرض ہے کہ یہ تمام خوبیاں مخالف کو دکھلاویں اور اگر وہ کسی اور زبان کو الہامی اور اُمّ الالسنہ قرار دیتا ہے تو اس سے ان خوبیوں کا مطالبہ کریں۔ ....

اگر ہم اس دعوے میں کاذب ہیں کہ عربی میں وہ پانچ فضائل خصوصیت کے ساتھ موجود ہیں جو ہم لکھ چکے ہیں اور کوئی سنسکرت دان وغیرہ اس بات کو ثابت کر سکتا ہے کہ ان کی زبان بھی ان فضائل میں عربی کی شریک و مساوی ہے یا اس پر غالب ہے تو ہم اس کو **پانچہزار روپیہ** بلا توقف دینے کیلئے **قطعی** اور **حتمی وعدہ** کرتے ہیں ....

اس وقت ہم غیر زبان والوں سے کیا مانگتے ہیں۔ صرف یہی کہ وہ یہ خوبیاں جو ہم نے عربی زبان

میں ثابت کی ہیں اپنی زبان میں ثابت کرکے دکھلاویں۔ مثلاً یہ بات ظاہر ہے کہ کامل زبان کے لئے مفردات کا کامل نظام ضروری ہے یعنی یہ واجبات سے ہے کہ کامل زبان جو الہامی اور ام الالسنہ کہلاتی ہے انسانی خیالات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کے وقت پورا ذخیرہ مفردات کا اپنے اندر رکھتی ہو ایسے طور سے کہ جب انسان مثلاً ایک توحید کے مضمون کے متعلق یا شرک کے مضمون کے متعلق یا حقوق اللہ کے متعلق یا حقوق العباد کے متعلق یا عقائد دینیہ کے متعلق یا ان کے دلائل کے متعلق یا محبت اور مخالطت کے متعلق یا بغض اور نفرت کے متعلق یا خدا تعالیٰ کی مدح اور ثناء اور اس کے اسماء مطہرہ کے متعلق یا مذاہب باطلہ کے ردّ کے متعلق یا قصص اور سوانح کے متعلق یا احکام اور حدود کے متعلق یا علم معاد کے متعلق یا تجارت اور زراعت اور نوکری کے متعلق یا نجوم اور ہیئت کے متعلق یا طبعی اور طبابت اور منطق وغیرہ کے متعلق کوئی مبسوط کلام کرنا چاہے تو اس زبان کے مفردات اس کو ایسے طور سے مدد دے سکیں کہ ہر یک خیال کے مقابل پر جو دل میں پیدا ہو ایک لفظ مفرد موجود ہو تا یہ امر اس بات پر دلیل ہو کہ جس ذات کامل نے انسان اور اس کے خیالات کو پیدا کیا اُسی نے ان خیالات کے ادا کرنے کے لئے قدیم سے وہ مفردات بھی پیدا کر دیئے۔ اور ہمارا دلی انصاف اس بات کے قبول کرنے کے لئے ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اگر یہ خصوصیت کسی زبان میں پائی جائے کہ وہ زبان انسانی خیالات کے قدوقامت کے موافق مفردات کا خوبصورت پیرایہ اپنے اندر تیار رکھتی ہے اور ہر یک باریک فرق جو افعال میں پایا جاتا ہے وہی باریک فرق اقوال کے ذریعہ سے دکھاتی ہے اور اس کے مفردات خیالات کے تمام حاجتوں کے متکفل ہیں تو وہ زبان بلاشبہ الہامی ہے کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کا فعل ہے جو اس نے انسان کو ہزارہا طور کے خیالات ظاہر کرنے کیلئے مستعد پیدا کیا ہے۔ پس ضرور تھا کہ انہیں خیالات کے اندازہ کے موافق اس کو ذخیرہ قولی مفردات بھی دیا جاتا تا خدا تعالیٰ کا قول اور فعل ایک ہی مرتبہ پر ہو۔ لیکن حاجت کے وقت ترکیب سے کام لینا یہ بات کسی خاص زبان سے خصوصیت نہیں رکھتی۔ ہزارہا زبانوں پر یہ عام آفت اور نقص درپیش ہے کہ وہ مفردات کی جگہ مرکبات سے کام لیتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ ضرورتوں کے وقت وہ مرکبات انسانوں نے خود بنا لئے ہیں۔ پس جو زبان ان آفتوں سے محفوظ ہوگی اور اپنی ذات میں مفردات سے کام نکالنے کی خصوصیت رکھے گی اور اپنے اقوال کو خدا تعالیٰ کے فعل کے مطابق یعنی خیالات کے جوشوں کے مطابق اور ان کے ہموزن دکھلائے گی بلاشبہ وہ ایک

خارق العادات مرتبہ پر ہو کر اور تمام زبانوں کی نسبت ایک خصوصیت پیدا کر کے اس لائق ہو جائیگی کہ اس کو اصل **الہامی زبان** اور **فطرت اللہ** کہا جائے۔ اور جو زبان اس مرتبہ عالیہ سے مخصوص ہو کہ وہ **خدا تعالٰے کے مُنہ سے نکلی** اور فوق العادات کمالات سے مختص اور اُم الالسنہ ہے اس کی نسبت یہ کہنا ایمانداری کا فرض ہوگا کہ وہی ایک زبان ہے جو حقیقی طور پر اس لائق ٹھہرائی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ کا اعلیٰ اور اکمل الہام اسی میں نازل ہو اور دوسرے الہام اس الہام کی ایسی ہی فرع ہیں جیسا کہ دوسری بولیاں اس بولی کی فرع ہیں۔ لہذا ہم اس بحث کے بعد اس بحث کو لکھینگے کہ وہ حقیقی اور کامل اور اتم اور اکمل وحی جو دنیا میں آنے والی تھی وہ **صرف قرآن شریف ہے**۔ اور انہیں مقدمات سے اس نتیجہ کو بہ تفصیل ظاہر کریں گے کہ عربی کو ام الالسنہ اور الہامی ماننے سے نہ صرف یہی ماننا پڑتا ہے کہ قرآن خدا تعالیٰ کا کلام ہے بلکہ یہ بھی ضروری طور پر ماننا پڑتا ہے کہ صرف قرآن ہی ہے جس کو حقیقی وحی اور اکمل اور اتم اور خاتم الکتب کہنا چاہیئے اور اب ہم مفردات کا نظام دکھلانے کے لئے اور نیز دوسری خوبیوں کے لحاظ سے اس کتاب کا عربی حصّہ شروع کرینگے۔ ولا حول و لا قوّۃ الّا باللہ وھو العلی العظیم۔ . . . .

(منن الرحمٰن ص۳-۱۰)

اس نہایت مفید قاعدہ کا لکھنا واجبات سے ہے کہ صحیفہ قدرت پر نظر ڈالنے سے یہ بات ضروری طور پر ماننی پڑتی ہے کہ جو چیزیں خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے پیدا ہوئیں یا اس سے صادر ہوئیں ان کی اوّل علامت یہی ہے کہ اپنے اپنے مرتبہ کے موافق خدا شناسی کی راہوں کے خادم ہوں۔ اور اپنے وجود کی اصلی غرض بزبانِ قال، یا حال یہی ظاہر کریں کہ وہ معرفت باری کا ذریعہ اور اسی کے راہ کے خادم ہیں۔ کیونکہ تمام مخلوقات کی افراد پر نظر غور ڈالنے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا تمام سلسلہ انواع و اقسام کے پیرائیوں میں اسی کام میں لگا ہؤا ہے کہ تا وہ خدا تعالٰے کے پہچاننے اور اس کی راہوں کے جاننے میں ایک ذریعہ ہو۔ پس چونکہ عربی زبان خدا تعالیٰ سے صادر ہوئی ہے اور اس کے مُنہ سے نکلی ہے لہذا ضرور تھا کہ اس میں بھی یہ علامت موجود ہو تا یقینی طور پر شناخت کیا جائے کہ وہ فی الواقعہ ان چیزوں میں سے ہے کہ جو بغیر ذریعہ انسانی کوششوں کے محض خدا تعالٰے سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ سو الحمد للہ والمنہ کہ عربی زبان میں یہ علامت نہایت بدیہی اور صاف طور پر پائی جاتی ہے۔ اور جیسا کہ انسان کی اور قوٰی کی نسبت مضمون

آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ثابت و متحقق ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں جو انسان کی اصلی زبان اور اُس کی جزو خلقت ہے یہی حقیقت ثابت ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ انسان کی خلقت اُسی حالت میں اتم اور اکمل ٹھہر سکتی ہے کہ جب کلام کی خلقت بھی اس میں داخل ہو کیونکہ وہ چیز جو انسانیت کے جوہر کی چہرہ نما ہے وہ کلام ہی ہے اور کچھ مبالغہ نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ انسانیت سے مراد یہی نطق اپنے تمام لوازم کے ساتھ ہے۔ پس خدا تعالے کا یہ فرمانا کہ مَیں نے انسان کو اپنی عبادت اور معرفت کے لئے پیدا کیا ہے درحقیقت دوسرے لفظوں میں یہ بیان ہے کہ مَیں نے انسانی حقیقت کو جو نطق اور کلام ہے مع اس کے تمام قویٰ اور افعال کے جو اُس کے زیر حکم چلتے ہیں اپنے لئے بنایا ہے۔ کیونکہ جب ہم سوچتے ہیں کہ انسان کیا چیز ہے تو صریح یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جاندار ہے کہ جو اپنی کلام سے دوسرے جانوروں سے تمیز کلّی رکھتا ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ کلام انسان کی اصل حقیقت ہے اور باقی قویٰ اس حقیقت کی تابع اور خادم ہیں۔ پس اگر یہ کہیں کہ انسان کا کلام خدا تعالے کی طرف سے نہیں تو یہ کہنا پڑے گا کہ انسان کی انسانیت خدا تعالیٰ کی طرف نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا انسان کا خالق ہے اس لئے زبان کا معلّم بھی وہی ہے۔ اور اس جھگڑے کے فیصلہ کے لئے کہ وہ کس زبان کا معلّم ہے ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ اُس کی طرف سے وہی زبان ہے کہ جو بموجب منطوق وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ اُسی طرح معرفتِ الٰہی کی خادم ہو سکتی ہے جیسا کہ انسان کے وجود کی دوسری بناوٹ اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان صفات سے موصوف **صرف عربی** ہی ہے۔ اور اس کی خدمت یہ ہے کہ وہ معرفتِ باری تک پہنچانے کے لئے اپنے اندر ایک ایسی طاقت رکھتی ہے جو الٰہیات کے ایک معنوی تقسیم کو جو قانون قدرت میں پائی جاتی ہے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے مفردات میں دکھاتی ہے۔ اور **صفاتِ الٰہیہ کے نازک اور باریک فرقوں** کو جو صحیفۂ قدرت میں نمودار ہیں اور ایسا ہی **توحید کے دلائل** کو جو اسی صحیفہ سے مترشح ہیں اور خدا تعالیٰ کے انواع و اقسام کے **ارادوں** کو جو اس کے بندوں سے متعلق اور صحیفۂ قدرت میں نمایاں ہیں ایسے طور سے ظاہر کر دیتی ہے کہ گویا اُن کا ایک نہایت لطیف نقشہ کھینچ کر آگے رکھ دیتی ہے اور ان دقیق امتیازوں کو جو خدا تعالیٰ کے اسماء اور صفات اور افعال اور ارادوں میں واقع ہیں جن کی شہادت اس کا قانونِ قدرت دے رہا ہے۔ ایسی صفائی سے دکھا

دیتی ہے کہ گویا ان کی تصویر کو آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے۔ چنانچہ یہ بات بداہت معلوم ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے صفات اور افعال اور ارادوں کی چہرہ نمائی اور نیز اپنے فعل اور قول کے تطبیق کے لئے زبان عربی کو ایک متکفل خادم پیدا کیا ہے اور ازل سے یہی چاہا ہے کہ الٰہیات کے سِرِّ **مکتوم** اور مقفل کے لئے یہی زبان **کنجی** ہو۔ اور جب ہم اس نکتہ تک پہنچتے ہیں اور یہ عجیب عظمت اور خصوصیت عربی کی ہم پر کھلتی ہے تو دوسری تمام زبانیں سخت تاریکی اور نقصان میں پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں کیونکہ جس طرح زبان عربی صفاتِ الٰہیہ اور اس کی تمام تعلیموں کے لئے **مرایا متقابلہ** کی طرح واقع ہے۔ اور الٰہیات کے قدرتی نقشہ کا ایک سیدھا انعکاسی خط عربی میں پڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ صورت کسی دوسری زبان میں ہرگز موجود نہیں اور جب ہم عقل سلیم اور فہم مستقیم سے صفاتِ الٰہیہ کی اس تقسیم پر نظر ڈالتے ہیں جو قدیم سے اور ازل سے صحیفۂ عالم میں قدرتی طور پر پائی جاتی ہے تو وہی تقسیم عربی کے مفردات میں ہمیں ملتی ہے۔ مثلاً جب ہم غور کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کا رحم عقلی تحقیق کی رو سے اپنی ابتدائی تقسیم میں کتنے حصوں پر مشتمل ہو سکتا ہے تو اس قانون قدرت کو دیکھ کر جو ہماری نظر کے سامنے ہے صاف طور پر ہمیں سمجھ آجاتا ہے کہ وہ رحمؔ **دو قسم** پر ہے یعنی قبل از عمل وبعد از عمل۔ کیونکہ بندہ پروری کا **نظام** بآواز بلند گواہی دے رہا ہے کہ **رحمت الٰہی** نے دو قسم سے اپنی ابتدائی تقسیم کے لحاظ سے بنی آدم پر ظہور وبروز فرمایا ہے

اوّل وہ رحمت جو بغیر وجود عمل کسی عامل کے بندوں کے ساتھ شامل ہوئی۔ جیساکہ زمین اور آسمان اور شمس وقمر اور ستارے اور پانی اور ہوا اور آگ اور وہ تمام نعمتیں جن پر انسان کی بقا اور حیات موقوف ہے کیونکہ بلاشبہ یہ تمام چیزیں انسان کے لئے رحمت ہیں جو بغیر کسی استحقاق کے محض فضل اور احسان کے طور سے اس کو عطا ہوئے ہیں اور یہ ایسا فیض خاص ہے جو انسان کے سوال کو بھی اس میں دخل نہیں بلکہ اس کے وجود سے بھی پہلے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوسری قسم رحمت کی وہ ہے جو انسان کے اعمال حسنہ پر مترتب ہوتی ہے کہ جب وہ تضرع سے دعا کرتا ہے تو قبول کی جاتی ہے اور جب وہ محنت سے تخم ریزی کرتا ہے۔ تو رحمتِ الٰہی اس تخم کو بڑھاتی ہے یہاں تک کہ ایک بڑا ذخیرہ اناج کا اس سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر غور سے دیکھو تو ہمارے ہر یک عمل صالح کے ساتھ خواہ وہ دین سے متعلق ہے یا دنیا سے رحمت الٰہی لگی ہوئی ہے اور جب ہم ان قوانین کے لحاظ سے جو الٰہی سُنتوں میں

داخل ہیں۔ کوئی محنت دنیا یا دین کے متعلق کرتے ہیں تو فی الفور **رحمتِ الٰہی** ہمارے شامل حال ہو جاتی ہے اور ہماری محنتوں کو سرسبز کر دیتی ہے۔ یہ **دونوں رحمتیں** اس قسم کی ہیں کہ ہم اُن کے بغیر جی ہی نہیں سکتے کیا ان کے وجود میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ تو اجلیٰ بدیہیات میں سے ہیں جنکے ساتھ ہماری زندگی کا تمام نظام چل رہا ہے پس جبکہ ثابت ہو گیا کہ ہماری تربیت اور تکمیل کے لئے دو رحمتوں کے **دو چشمے** قادر کریم نے جاری کر رکھے ہیں اور وہ اس کی **دو صفتیں** ہیں جو ہمارے درختِ وجود کی آبپاشی کے لئے دو رنگوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ تو اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ دو چشمے زبان عربی میں منعکس ہو کر کس کس نام سے پکارے گئے ہیں۔ پس واضح ہو کہ پہلی قسم کی رحمت کے لحاظ سے زبان عربی میں خدا تعالیٰ کو **رحمٰن** کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم کی رحمت کے لحاظ سے زبان موصوف میں اس کا نام **رحیم** ہے۔ اسی خوبی کے دکھلانے کے لئے ہم عربی **خطبہ** کے پہلی ہی سطر میں رحمٰن کا لفظ لائے ہیں۔ اب اس نمونہ کو دیکھ لو۔ چونکہ یہ رحم کی صفت اپنی ابتدائے تقسیم کے لحاظ سے الٰہی قانون قدرت کے دو قسم پر مشتمل تھی لہٰذا اس کے لئے زبان عربی میں دو مفرد لفظ موجود ہیں۔ اور یہ قاعدہ طالب حق کے لئے نہایت مفید ہوگا کہ ہمیشہ عربی کے باریک فرقوں کے پہچاننے کے لئے صفات اور افعال الٰہیہ کو جو صحیفہ قدرت میں نمایاں ہیں **معیار** قرار دیا جائے۔ اور ان کے اقسام کو جو قانون قدرت سے ظاہر ہوں عربی کے مفردات میں ڈھونڈا جائے۔ اور جہاں کہیں عربی کے ایسے مترادف لفظوں کا باہمی فرق ظاہر کرنا مقصود ہو جو صفات یا افعال الٰہی کے متعلق ہیں تو صفات یا افعال الٰہی کی اس تقسیم کی طرف متوجہ ہوں جو نظام قانون قدرت دکھلا رہا ہے۔ کیونکہ **عربی کی اصل غرض الٰہیات کی خدمت ہے**۔ جیسا کہ انسان کے وجود کی اصل غرض **معرفت باری تعالیٰ** ہے اور ہریک چیز جس غرض کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اُسی غرض کو سامنے رکھ کر اس کے عقدے کھل سکتے ہیں اور اس کے جوہر معلوم ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بیل صرف کلبہ رانی اور بارکشی کے لئے پیدا کیا گیا ہے پس اگر اس غرض کو نظر انداز کر کے اس سے وہ کام لینا چاہیں جو شکاری کُتّوں سے لیا جاتا ہے تو بے شک وہ ایسے کام سے عاجز آجائیگا اور نہایت نکمّا اور ذلیل ثابت ہوگا۔ لیکن اگر اصلی کام کے ساتھ اُسکی آزمائش کریں تو وہ بہت جلد اپنے وجود کی نسبت ثابت کریگا کہ سلسلہ وسائل معیشتِ دنیوی کا ایک بھاری بوجھ اس کے سر پر ہے۔ غرض ہریک چیز کا ہنر اسی وقت ثابت ہوتا ہے جب اس کا اصلی کام اس سے لیا جائے۔ سو عربی کے ظہور اور بروز کا اصلی مقصود الٰہیات کا روشن چہرہ دکھلانا ہے۔ مگر چونکہ اس نہایت باریک اور دقیق کام کا ٹھیک ٹھیک انجام دینا اور غلطی سے

محفوظ رہنا انسانی طاقتوں سے بڑھ کر تھا۔ لہذا خداوند کریم اور رحیم نے قرآن کریم کو عربی زبان کی بلاغت و فصاحت دکھلانے کے لئے اور مفردات کی نازک فرق اور مرکبات کا خارق عادت اعجاز ظاہر کرنے کیلئے بطور ایسے اعجاز کے بھیجا کہ تمام گردنیں اس کی طرف جھک گئیں اور عربی کی بلاغت کو اس کے مفردات اور مرکبات کی نسبت جو کچھ قرآن نے ظاہر کیا اس کو اس وقت کے اعلیٰ درجہ کے زبان دانوں نے نہ صرف قبول ہی کیا بلکہ مقابلہ سے عاجز آ کر یہ بھی ثابت کر دیا کہ انسانی قوتیں ان حقائق اور معارف کے بیان کرنے اور زبان کا سچا اور حقیقی حسن دکھلانے سے عاجز ہیں۔ اسی مقدس کلام سے **رحمان اور رحیم** کا بھی فرق معلوم ہوا۔ جس کو ہم نے بطور نمونہ خطبہ مذکورہ میں لکھا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ ہر یک زبان میں بہت سے مترادف الفاظ پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب تک آنکھ کھول کر اُن کے باہمی فرقوں پر اطلاع نہ پاویں اور وہ الفاظ علم الٰہی اور دینی تعلیم میں سے نہ ہوں تب تک ان کو علمی مدّ میں شمار نہیں کر سکتے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ انسان اپنی طرف سے ایسے مفردات پیدا نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر قدرت قادر سے پیدا شدہ ہوں تو ان میں غور کر کے اُن کے باریک فرق اور محل استعمال معلوم کر سکتا ہے۔ مثلاً صرف اور نحو کے بانیوں کو دیکھو کہ انہوں نے کوئی نئی بات نہیں نکالی اور نہ نئے قواعد بنا کر کسی کو اُن پر چلنے کے لئے مجبور کیا بلکہ اسی طبیعی بولی کو ایک بیدار نظر کے ساتھ دیکھ کر تاڑ گئے کہ یہ بول چال قواعد کے اندر آ سکتی ہے۔ تب مشکلات کے سہل کرنے کے لئے قواعد کی بنا ڈالی۔ سو قرآن کریم نے ہر یک لفظ کو اپنے محل پر رکھ کر دنیا کو دکھلا دیا کہ عربی کے مفردات کس کس محل پر استعمال پاتے ہیں۔ اور کیسے وہ الٰہیات کے خادم ہیں اور نہایت دقیق امتیاز باہمی رکھتے ہیں ....

اب ہم اسی پر اکتفا کر کے ایک اور لفظ کی چند خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ سو وہ لفظ ربّ کا ہے جو قرآنی الفاظ میں سے ہم نے لیا ہے۔ یہ لفظ قرآن شریف کی پہلی ہی سورۃ اور پہلی ہی آیت میں آتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ **لسان العرب** اور **تاج العروس** میں جو لغت کی نہایت معتبر کتابیں ہیں لکھا ہے کہ زبان عرب میں ربّ کا لفظ **سات معنوں** پر مشتمل ہے۔ اور وہ یہ ہیں:۔ **مالک**[۱]۔ **سیّد**[۲]۔ **مدبّر**[۳]۔ **مربّی**[۴]۔ **قیّم**[۵]۔ **منعم**[۶]۔ **متمّم**[۷]۔ چنانچہ ان سات معنوں میں سے تین معنے خدا تعالیٰ کی ذاتی عظمت پر دلالت کرتے ہیں منجملہ ان کے **مالک** ہے۔ اور

مالک لغت عرب میں اس کو کہتے ہیں جس کا اپنے مملوک پر قبضہ تامہ ہو اور جس طرح چاہے اپنے تصرّف میں اُس کو لا سکتا ہو اور بلا اشتراک غیر اس پر حق رکھتا ہو۔ اور یہ لفظ حقیقی طور پر یعنی بلحاظ اس کے معنوں کے بجز خدا تعالےٰ کے کسی دوسرے پر اطلاق نہیں پا سکتا۔ کیونکہ قبضۂ تامہ اور تصرّف تام اور حقوق تامہ بجز خدا تعالےٰ کے اور کسی کے لئے مسلّم نہیں۔

اور **سیّد** لغت عرب میں اس کو کہتے ہیں جس کے تابع ایک ایسا سوادِ اعظم ہو جو اپنے دِلی جوش اور اپنی طبعی اطاعت سے اس کے حلقہ بگوش ہوں۔ سو بادشاہ اور سیّد میں یہ فرق ہے کہ بادشاہ سیاستِ قہری اور اپنے قوانین کی سختی سے لوگوں کو مطیع بناتا ہے اور سیّد کے تابعین اپنے دلی محبت اور دلی جوش اور دلی تحریک سے خود بخود متابعت کرتے ہیں اور سچی محبت سے اسکو **سیّدنا** کر کے پکارتے ہیں اور ایسی متابعت بادشاہ کی اس وقت کی جاتی ہے جب وہ بھی لوگوں کی نظر میں سیّد قرار پاوے۔ غرض سیّد کا لفظ بھی حقیقی طور پر بلحاظ اس کے معنوں کے بجز خدا تعالےٰ کے کسی دوسرے پر بولا نہیں جاتا۔ کیونکہ حقیقی اور واقعی جوش سے اطاعت جس کے ساتھ کوئی شائبہ اغراضِ نفسانیہ کا نہ ہو بجز خدا تعالیٰ کے کسی کے لئے ممکن نہیں۔ وہی ایک ہے جس کی سچّی اطاعت رُوحیں کرتی ہیں کیونکہ وہ ان کی پیدائش کا حقیقی مبدا ہے اس لئے طبعاً ہر ایک رُوح اس کو سجدہ کرتی ہے۔ بُت پرست اور انسان پرست بھی اس کی اطاعت کے لئے ایسا ہی جوش رکھتے ہیں جیسا کہ ایک موحّد راستباز۔ مگر انہوں نے اپنی غلطی سے اور قصورِ طلب سے اس زندگی کے سچے چشمے کو شناخت نہیں کیا۔ بلکہ نابینائی کی وجہ سے اس اندرونی جوش کو غیر محل پر وضع کر دیا۔ تب کسی نے پتھروں کو اور کسی نے رامچندر کو اور کسی نے کرشن کو اور کسی نے نعوذ باللہ ابن مریم کو خدا بنا لیا لیکن اس دھوکا سے بنایا کہ شائد وہ جو مطلوب ہے یہ وہی ہے۔ سو یہ لوگ مخلوق کو حق اللہ دے کر ہلاک ہو گئے۔ ایسا ہی اس **حقیقی محبوب** اور **سیّد** کی روحانی طلب میں ہوا پرستوں نے دھوکے کھائے ہیں کیونکہ ان کے دلوں میں بھی ایک محبوب اور ایک حقیقی سیّد کی طلب تھی مگر انہوں نے اپنے دلی خیالات کو اچھی طرح شناخت نہ کر کے یہ خیال کیا کہ وہ حقیقی محبوب اور سیّد جس کو رُوحیں طلب کر رہی ہیں اور جس کی اطاعت کے لئے جانیں اچھل رہی ہیں وہ دنیا کے مال اور دنیا کے املاک اور دنیا کی لذّات ہی ہیں۔ مگر یہ اُن کی غلطی تھی بلکہ رُوحانی خواہشوں کا محرک اور پاک جذبات کا باعث وہی ایک ذات ہے جس نے فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ یعنی جنّ اور انس کی پیدائش اور ان کی تمام قویٰ کا مَیں ہی مقصود ہوں۔ وہ

اسی لئے میں نے پیدا کئے کہ تا مجھے پہچانیں اور میری عبادت کریں۔ سو اُس نے اس آیت میں اشارہ کیا کہ جنّ و انس کی خلقت میں اُس کی طلب و معرفت اور اطاعت کا مادہ رکھا گیا ہے۔ اگر انسان میں یہ مادہ نہ ہوتا تو نہ دنیا میں ہوا پرستی ہوتی نہ بت پرستی نہ انسان پرستی کیونکہ ہر یک خطا صواب کی تلاش میں پیدا ہوا ہے۔ غرض **سیادت حقیقی** اسی ذات کے لئے مسلّم ہے اور وہی واقعی طور پر سیّد ہے۔

اور منجملہ ان تین ناموں کے جو خدا تعالیٰ کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں **مدبّر** بھی ہے اور تدبیر کے معنے ہیں کہ کسی کام کے کرنے کے وقت تمام ایسا سلسلہ نظر کے سامنے حاضر ہو جو گذشتہ واقعات کے متعلق یا آئندہ نتائج کے متعلق ہے۔ اور اس سلسلہ کے لحاظ سے وضع شیٔ فی محلّہ ہو اور کوئی کارروائی حکمت عملی سے باہر نہ ہو۔ اور یہ نام بھی اپنے حقیقی معنوں کی رُو سے بجز خدا تعالیٰ کے کسی غیر پر اطلاق نہیں پا سکتا۔ کیونکہ کامل تدبیر غیب دانی پر موقوف ہے اور وہ بجز خدا تعالیٰ کے کسی کے لئے مسلّم نہیں۔

اور چار باقی نام یعنی مربّی۔ قیّم۔ منعم۔ متمّم خدا تعالیٰ کے ان فیوض پر دلالت کرتے ہیں جو بلحاظ اس کی کامل ملکیت اور کامل سیادت اور کامل تدبیر کے اس کے بندوں پر جاری ہیں۔ چنانچہ **مربّی** کا لفظ بظاہر معنے پرورش کرنے والے کو کہتے ہیں۔ اور کامل طور پر تربیت کی حقیقت یہ ہے کہ جس قدر خلقتِ انسان کے شعبے باعتبار جسم اور رُوح اور تمام طاقتوں اور قوتوں کے پائے جاتے ہیں ان تمام شاخوں کی پرورش ہو اور جہاں تک بشریت کی جسمانی اور رُوحانی ترقیات اس پرورش کے کمال کو چاہتے ہیں ان تمام مراتب تک پرورش کا سلسلہ ممتد ہو۔ ایسا ہی جس نقطہ سے بشریت کا نام اور اسم یا اس کے مبادی شروع ہوتے ہیں اور جہاں سے بشری نقش یا کسی دوسری مخلوق کا نقش وجود عدم سے ہستی کی طرف حرکت کرتا ہے اس اظہار اور ابراز کا نام بھی پرورش ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ لُغت عرب کی رُو سے **ربوبیت** کے معنے نہایت ہی وسیع ہیں اور عدم کے نقطہ سے مخلوق کے کمال تام کے نقطہ تک ربوبیت کا لفظ ہی اطلاق پاتا ہے۔ اور خالق وغیرہ الفاظ ربّ کے اسم کی فرع ہیں۔

اور قیّم کے معنے ہیں نظام کو محفوظ رکھنے والا۔ اور منعم کے یہ معنے ہیں کہ ہر یک قسم کا انعام اکرام جو انسان یا کوئی دوسری مخلوق اپنی استعداد کی رو سے پا سکتی ہے اور بالطبع اس نعمت کے خواہاں ہیں وہ انعام اس کو عطا کرے تا ہر یک مخلوق اپنے کمال تام کو پہنچ جائے

جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ ایک جگہ فرماتا ہے۔ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔ یعنی وہ خدا جس نے ہر یک چیز کو اس کے مناسب حال کمال خلقت بخشا اور پھر اس کو دوسرے کمالات مطلوبہ کیلئے رہنمائی کی۔ پس یہ انعام ہے کہ ہر یک چیز کو اول اس کے وجود کی رو سے وہ تمام قوٰی وغیرہ عنایت ہوں جن کی وہ چیز محتاج ہے پھر اس کے حالات مترقبہ کے حصول کے لئے اس کو راہیں دکھائی جائیں۔ اور **منعّم** کے یہ معنی ہیں کہ سلسلہ فیض کو کسی پہلو سے بھی ناقص نہ چھوڑا جائے اور ہر یک پہلو سے اس کو کمال تک پہنچایا جائے۔

سوم **ربّ** کا اسم جو قرآن کریم میں آیا ہے جس کو ہم اقتباس کے طور پر اس خطبہ کے اوّل میں لائے ہیں ان وسیع معنوں پر مشتمل ہے جن کو ہم نے بطور اختصار اس مضمون میں ذکر کیا ہے۔

اب ہم نہایت افسوس سے لکھتے ہیں کہ ایک ناسمجھ انگریز **عیسائی** نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اسلام پر عیسائی مذہب کو یہ فضیلت ہے کہ اس میں خدا تعالیٰ کا نام **باپ** بھی آیا ہے اور یہ نام نہایت پیارا اور دلکش ہے اور **قرآن** میں یہ نام نہیں آیا۔ مگر ہمیں تعجب ہے کہ اس معترض نے اس تحریر کے وقت پر یہ خیال نہیں کیا کہ لُغت نے کہاں تک اس لفظ کی عزّت اور عظمت ظاہر کی ہے۔ کیونکہ ہر یک لفظ کو حقیقی عزّت اور بزرگی لغت سے ہی ملتی ہے اور کسی انسان کو یہ اختیار نہیں کہ اپنی طرف سے کسی لفظ کو وہ عزّت دے جو لغت اس کو دے نہیں سکی۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ کا کلام بھی لغت کے التزام سے باہر نہیں جاتا اور تمام اہل عقل اور نقل کے اتفاق سے کسی لفظ کی عزت اور عظمت ظاہر کرنے کے وقت اوّل لغت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے کہ اس زبان نے جس زبان کا وہ لفظ ہے یہ خلعت کہاں تک اس کو عطا کی ہے۔ اب اس قاعدہ کو اپنی نظر کے سامنے رکھ کر جب سوچیں کہ **آبْ** یعنی باپ کا لفظ لُغت کی رُو سے کس پایہ کا لفظ ہے تو بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ جب مثلاً ایک انسان فی الحقیقت دوسرے انسان کے نطفہ سے پیدا ہو مگر پیدا کرنے میں اس نطفہ انداز انسان کا کچھ بھی دخل نہ ہو تب اس حالت میں کہیں گے کہ یہ انسان فلاں انسان کا **آبْ** یعنی **باپ** ہے اور اگر ایسی صورت ہو کہ خدائے قادرِ مطلق کی یہ تعریف کرنی منظور ہو جو مخلوق کو اپنے خاص ارادہ سے خود پیدا کرنے والا خود کمالات تک پہنچانے والا اور خود رحم عظیم سے مناسب حال اُس کے انعام کرنے والا اور خود **حافظ** اور **قیّوم** ہے تو لُغت ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ اس مفہوم کو آبْ یعنی باپ کے لفظ سے ادا کیا جائے بلکہ لُغت نے اس کے لئے ایک دوسرا لفظ

رکھا ہے جس کو **ربّ** کہتے ہیں۔ جس کی اصل تعریف ابھی ہم لُغت کی رُو سے بیان کر چکے ہیں اور ہم ہرگز مجاز نہیں کہ اپنی طرف سے لُغت تراشیں بلکہ ہمیں انہیں الفاظ کی پیروی لازم ہے جو قدیم سے خدا کی طرف سے چلے آتے ہیں۔

پس اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ **اَبْ** یعنی باپ کا لفظ خدا تعالیٰ کی نسبت استعمال کرنا ایک **سوءِ ادب اور ہجو** میں داخل ہے اور جن لوگوں نے **حضرت مسیح** کی نسبت یہ الزام گھڑا ہے کہ گویا وہ خدا تعالیٰ کو **اَبْ** کرکے پکارتے تھے۔ اور درحقیقت جناب الٰہی کو اپنا باپ ہی یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے نہایت مکروہ اور جھوٹا الزام **ابن مریم** پر لگایا ہے۔ کیا کوئی عقل تجویز کر سکتی ہے کہ نعوذ باللہ حضرت مسیح ایسی نادانی کے مرتکب ہوئے کہ جو لفظ اپنے لغوی معنوں کی رُو سے ایسا حقیر اور ذلیل ہو جس میں ناطاقتی اور کمزوری اور بے اختیاری ہر یک پہلو سے پائی جائے وہی لفظ حضرت مسیح اللہ جلّ شانہٗ کی نسبت اختیار کریں ....

اَبْ کا لفظ ایک ایسا حقیر اور ذلیل لفظ ہے کہ اِس میں کوئی حصّہ پرورش یا ارادہ یا محبت کا شرط نہیں۔ مثلاً ایک بکرا جو بکری پر جست کرکے نطفہ ڈال دیتا ہے یا ایک سانڈ بیل جو گائے پر جست کرکے اور اپنی شہوات کا کام پورا کرکے پھر اُس سے علیحدہ بھاگ جاتا ہے جس کے یہ خیال میں بھی نہیں ہوتا ہے کہ کوئی بچہ پیدا ہو۔ یا ایک سؤر جسکو شہوات کا نہایت زور ہوتا ہے اور بار بار وہ اِسی کام میں لگا رہتا ہے اور کبھی اُس کے خیال میں بھی نہیں ہوتا کہ اس بار بار کے شہوانی جوش سے یہ مطلب ہے کہ بہت سے بچّے پیدا ہوں اور خنزیر زادے زمین پر کثرت سے پھیل جائیں اور نہ اس کو فطرتی طور پر یہ شعور دیا گیا ہے تاہم اگر بچّے پیدا ہو جائیں تو بلاشبہ سؤر وغیرہ اپنے اپنے بچوں کے باپ کہلائینگے۔ اب جبکہ اَبْ کے لفظ یعنی باپ کے لفظ میں دنیا کی تمام لُغتوں کی رُو سے یہ معنے ہرگز مراد نہیں کہ وہ باپ نطفہ ڈالنے کے بعد پھر بھی نطفہ کے متعلق کچھ کارگذاری کرتا ہے تا بچہ پیدا ہو جائے یا ایسے کام کے وقت میں یہ ارادہ بھی اس کے دل میں ہو اور نہ کسی مخلوق کو ایسا اختیار دیا گیا ہے۔ بلکہ باپ کے لفظ میں بچہ پیدا ہونے کا خیال بھی شرط نہیں اور اس کے مفہوم میں اس سے زیادہ کوئی امر ماخوذ نہیں کہ وہ نطفہ ڈال دے بلکہ وہ اسی ایک ہی لحاظ سے جو نطفہ ڈالتا ہے لُغت کی رُو سے اَبْ یعنی باپ کہلاتا ہے تو کیونکر جائز ہو کہ ایسا ناکارہ لفظ جس کو تمام زبانوں کا اتفاق ناکارہ ٹھہراتا ہے اس **قادرِ مطلق** پر بولا جائے جس کے تمام کام کامل ارادوں اور کامل علم اور قدرتِ کاملہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ اور کیونکر درست ہو کہ وہی ایک لفظ

جو بکرا پر بولا گیا۔ بیل پر بولا گیا۔ سؤر پر بولا گیا وہ خدا تعالیٰ پر بھی بولا جائے۔ یہ کیسی بے ادبی ہے جس سے **ناداں عیسائی** باز نہیں آتے۔ نہ ان کو شرم باقی رہی نہ حیا باقی رہی نہ انسانیت کی سمجھ باقی رہی **کفارہ** کا مسئلہ کچھ ایسا اُن کی انسانی قوتوں پر فالج کی طرح گرا کہ بالکل نکما اور بے حس کر دیا ....

اِس جگہ ہم میکسملر کے بعض شبہات اور وساوس کو بھی دُور کرنا قرینِ مصلحت سمجھتے ہیں جو اُس نے اپنی کتاب لیکچر جلد اوّل علم اللسان کی بحث کے نیچے لکھے ہیں۔ چنانچہ بطرز قولہ و اقول کے ذیل میں تحریر ہیں:—

قولہ - ترقیٔ علم کے موانعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بعض قوموں نے دوسری قوموں کو استخفاف اور تحقیر کی نگاہ سے دیکھنے کے لئے اُن کی نسبت حقارت آمیز القاب تراشے۔ اسلئے وہ ان محقر قوموں کی لغات کے سیکھنے سے قاصر رہے اور جب تک یہ الفاظ جنگلی اور عجمی کہنے کے انسانیت کی لغات اور فرہنگ سے نہ نکالے گئے اور بجائے اس کے لفظ برادر قائم نہ ہوا۔ ایسا ہی جبتک تمام قوموں کا یہ استحقاق تسلیم نہ کیا گیا کہ وہ ایک ہی نوع یا جنس کے ہیں اس وقت تک ہمارے علم اللسان کا آغاز نہ ہوا۔

اقول - صاحب راقم کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل اُن کو اہل عرب پر اعتراض ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ عرب کے لوگ جو دوسری زبان والوں کو **عجمی** بولتے ہیں یہ لفظ محض بخل اور تعصب کے راہ سے دوسری قوموں کی تحقیر کی غرض سے تراشا گیا ہے۔ لیکن یہ غلطی محض اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ اُن کی عیسائیت کا بخل ان کو اس بات کی دریافت سے مانع ہوا کہ آیا عَجم اور عرَب کا لفظ انسان کی طرف سے یا خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے۔ حالانکہ وہ اپنی کتاب میں خود اقرار کر چکے ہیں کہ مفردات زبان کا اپنی طرف سے بنا لینا کسی انسان کا کام نہیں۔ اب ہم ان پر اور اُن کے ہمخیالوں پر واضح کرتے ہیں کہ زبانِ عرب میں دو لفظ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل پر واقع ہیں۔ ایک تو **عرب** جس کے معنے فصیح اور بلیغ کے ہیں۔ اور دوسرا **عجم** جو اس کے مقابل پر واقع ہے جس کے معنے غیر فصیح اور بستہ زبان ہے۔ اگر میکسملر صاحب کے خیال میں یہ دو لفظ قدیم نہیں ہیں اور اسلام نے ہی بخل کے راہ سے ان کو ایجاد کیا ہے تو ان کو ان لفظوں کا نشان دینا چاہیئے جو ان کی رائے میں اصلی لفظ تھے کیونکہ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی قوم کا قدیم سے کوئی بھی نام نہ ہو۔ اور جب قدیم ماننا پڑا تو ثابت ہوا کہ

یہ انسانی بناوٹ نہیں بلکہ وہ قادر عالم الغیب جس نے مختلف استعدادوں کے ساتھ انسانوں کو پیدا کیا ہے اُس نے مختلف لیاقتوں کے لحاظ سے یہ دو نام آپ مقرر کر دیئے ہیں ۔

پھر دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ اگر یہ دو نام **عرب** اور **عجم** کسی انسان نے محض تعصب اور تحقیر کے لحاظ سے آپ ہی گھڑ لیئے ہیں تو بلاشبہ یہ واقعات کے برخلاف ہونگے اور محض دروغ بے فروغ ہوگا ۔ لیکن ہم اس کتاب میں ثابت کر چکے ہیں کہ عرب کا لفظ درحقیقت **اسم با مسمّٰی** ہے اور واقعی طور پر یہ بات سچ ہے کہ زبان عربی اپنے نظام مفردات اور لطافتِ ترکیب اور دیگر عجائب وغرائب کے لحاظ سے ایسے اعلیٰ مقام کے مرتبہ پر ہے کہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ دوسری زبانیں اس کے مقابل پر گونگے کی طرح ہیں ۔ اور نہ صرف یہی بلکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری تمام زبانیں جمادات کی طرح بے حس و حرکت پڑی ہیں اور اطراد مواد کی حرکت ایسی اُن سے مفقود ہے کہ گویا وہ بالکل بے جان ہیں تو ہمیں بمجبوری یہ ماننا پڑتا ہے کہ درحقیقت وہ زبانیں نہایت تنزل کی حالت میں ہیں ۔ اور عربی زبان میں یہ بات نہایت نرم لفظوں میں کہی گئی ہے کہ عرب کے مقابل کے لوگوں کا نام عجم ہے ورنہ اس نام کا استحقاق بھی ان زبانوں اور ان لوگوں کو حاصل نہ تھا ۔ اور اگر ٹھیک ٹھیک ان کے تنزل کا حال ظاہر کیا جاتا تو یہ لفظ نہایت موزون تھا کہ ان زبانوں کا نام **مُردہ زبانیں** رکھا جاتا ۔

(منن الرحمٰن صـ۲۰-۳۶ حاشیہ)

فَواهًا لِلعَرَبِیةِ مَا اَحْسَنَ وَجْهَهَا فی الحلل المنیرۃ الکاملۃ ۔ أشرقتِ الارض بانوارها التامّۃ ۔ و تحقّق بها کمال الهویّۃ البشریّۃ ۔ توجد فیها عجائب الصانع الحکیم القدیر ۔ کما توجد فی کلّ شیءٍ صدر من البدیع الکبیر ۔ واکمل الله جمیع اعضائها ۔ و ما غادَرَ شیئًا من حسنها وبهائها ۔ فلاجَرَمَ

تجدها كاملة فی البیان محیطة علی اغراض
نوع الانسان۔ فما من عمل یبدوا الی
انقراض الزمان ولا من صفةٍ من صفات
اللہ الدیان۔ و ما من عقیدةٍ من عقاید
البریة۔ الّا و لها لفظ مفرد فی العربیة
فاختبر ان کنت من المرتابین۔

(منن الرحمٰن صفحہ ۶۸۔۶۹)

ارکانِ اسلام

مَیں کئی بار ظاہر کر چکا ہوں کہ ہمیں صرف اتنے پر خوش نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم مسلمان کہلاتے ہیں اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کے قائل ہیں۔ قرآن شریف کے پڑھنے والے اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صرف زبان پر راضی نہیں ہوتا۔ قرآن شریف میں یہودیوں کے قصے درج ہیں۔ اُن پر خدا تعالے کے بڑے بڑے فضل پہلے ہوئے لیکن جب اُن پر ایسا زمانہ آیا کہ اُن کی باتیں صرف زبان تک محدود رہ گئیں اور اُن کے دل دغا اور خیانت اور خیالاتِ بد سے پُر ہو گئے تو اللہ تعالے نے طرح طرح کے عذاب اُن پر وارد کئے اور یہاں تک کہ اُن میں سے بعض کو بندر اور سؤر لکھا گیا ہے حالانکہ توریت اور زبور اُن کے پاس تھی اور وہ اس پر اپنا ایمان ظاہر کرتے تھے اور سارے نبیوں کو مانتے تھے۔ لیکن خدا نے اُن کو پسند نہ کیا کیونکہ انکی باتیں صرف زبان پر تھیں اور ان کے دلوں میں کچھ نہ تھا۔ ....

کلمہ کے معنے کی طرف غور کرو۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه انسان زبان سے اقرار کرتا ہے اور دل سے تصدیق کرتا ہے کہ میرا معبود بجز خدا کے اور کوئی نہیں۔ اِلٰہ ایک عربی لفظ ہے اور اس کے معنے معبود اور محبوب اور اصل مقصود کے ہیں۔ یہ کلمہ قرآن شریف کا خلاصہ ہے جو مسلمانوں کو سکھلایا گیا ہے۔ اکثر لمبی کتابوں کا یاد کرنا ہر ایک کے واسطے مشکل ہے اور اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ اُس نے ایک مختصر سا کلمہ سُنا دیا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب تک خدا کو مقدّم نہ کیا جاوے۔ جب تک خدا کو معبود نہ بنایا جاوے۔ جب تک خدا کو مقصود نہ ٹھہرایا جاوے انسان کو نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ حدیث شریف میں آیا ہے مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ بہشت میں داخل ہوا۔ لوگوں نے اس حدیث کا مفہوم سمجھنے میں دھوکا کھایا ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف زبان سے یہ کلمہ پڑھ لینا کافی ہے اور صرف اتنے سے انسان بہشت میں داخل ہو سکیگا۔ خدا تعالیٰ الفاظ سے تعلق نہیں رکھتا وہ دلوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ درحقیقت اس کلمہ کے مفہوم کو اپنے دل میں داخل کر لیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی عظمت پورے رنگ کے ساتھ

اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے وہ جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص سچے طور پر کلمہ کا قائل ہو جاتا ہے تو بجز خدا کے اور کوئی اس کا پیارا نہیں رہتا۔ بجز خدا کے کوئی اس کا معبود نہیں رہتا اور بجز خدا کے کوئی اس کا مطلوب باقی نہیں رہتا۔ وہ مقام جو ابدال کا مقام ہے اور وہ جو قطب کا مقام ہے اور وہ جو غوث کا مقام ہے وہ یہی ہے کہ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر دل سے ایمان ہو ....

یہ کلمہ شریف ایک اللہ کے سوا تمام الٰہوں کی نفی کرتا ہے۔ تمام انفسی اور آفاقی الٰہ باہر نکال کر اپنے دل کو ایک اللہ کے واسطے پاک صاف کرنا چاہیئے۔ بعض بُت ظاہر ہیں مگر بعض بُت باریک ہیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ کے سوائے اسباب پر توکّل کرنا بھی ایک بُت ہے مگر یہ ایک باریک بُت ہے .... وہ باریک بُت جو لوگ اپنی بغلوں کے اندر دبائے پھرتے ہیں ان کا نکالنا ایک مشکل امر ہے۔ بڑے بڑے فلسفی اور حکیم ان کو اپنے اندر سے نکال نہیں سکتے۔ وہ نہایت باریک کیڑے ہیں جو کہ خدا تعالےٰ کے بڑے فضل کی خوردبین کے سوائے نظر نہیں آ سکتے۔ وہ بڑا ضرر انسان کو پہنچاتے ہیں۔ وہ بُت جذباتِ نفسانی کے ہیں جو کہ انسان کو خدا تعالیٰ اور اپنے ہم جنسوں کی حقوق تلفی میں حد سے باہر لے جاتے ہیں۔ بہت سے پڑھے لکھے جو کہ عالم کہلاتے ہیں اور فاضل کہلاتے ہیں اور مولوی کہلاتے ہیں اور حدیثیں پڑھتے ہیں اپنے آپ میں ان بتوں کی شناخت نہیں کر سکتے اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔ ان بتوں سے بچنا بڑے بہادر آدمی کا کام ہے۔ جو لوگ ان بتوں کے پیچھے لگتے ہیں وہ آپس میں نفاق رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے حقوق تلف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایک شکار مارا ہے۔ حد سے زیادہ اسباب پر زور مارتے ہیں اور ان کا تمام بھروسہ ان اسباب ہی پر ہوتا ہے۔ جب تک ان باتوں کا قلع قمع نہ کیا جاوے توحید قائم نہیں ہو سکتی۔

(تقاریر جلسہ سالانہ ۱۹۰۶ء صـ۱-۵)

مفہوم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے سُننے کے بعد نماز کی طرف توجہ کرو جس کی پابندی کے واسطے بار بار قرآن شریف میں تاکید کی گئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ فرمایا گیا ہے کہ وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ۔ ویل ہے ان نمازیوں کے واسطے جو کہ نماز کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ سو سمجھنا چاہیئے کہ نماز ایک سوال ہے جو کہ انسان جدائی کے وقت درد اور رقت کے ساتھ اپنے خدا کے حضور میں کرتا ہے کہ اس کو

لقا اور وصال ہو کیونکہ جب تک خدا کسی کو پاک نہ کرے کوئی پاک نہیں ہو سکتا اور جب تک وہ خود وصال عطا نہ کرے کوئی وصال کو حاصل نہیں کر سکتا۔ طرح طرح کے طوق اور قسما قسم کے زنجیر انسان کی گردن میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور وہ بہتیرا چاہتا ہے کہ یہ دُور ہو جاویں پر وہ دُور نہیں ہوتے۔ باوجود انسان کی خواہش کے کہ وہ پاک ہو جاوے نفس لوّامہ کی لغزشیں ہو ہی جاتی ہیں۔ گناہوں سے پاک کرنا خدا کا کام ہے۔ اُس کے سوائے کوئی طاقت نہیں جو زور کے ساتھ تمہیں پاک کر دے۔ پس پاک جذبات کے پیدا کرنے کے واسطے خدا تعالیٰ نے **نماز** رکھی ہے۔ نماز کیا ہے ایک **دُعا** جو درد سوزش اور حرقت کے ساتھ خدا تعالیٰ سے طلب کی جاتی ہے تاکہ یہ بدخیالات اور بُرے ارادے دفع ہو جاویں۔ اور پاک محبت اور پاک تعلق حاصل ہو جاوے۔ اور خدا تعالیٰ کے احکام کے ماتحت چلنا نصیب ہو۔ صلوٰۃ کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دُعا صرف زبان سے نہیں بلکہ اس کے ساتھ سوزش اور جلن اور حرقت کا ہونا ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ دُعا کو قبول نہیں کرتا جب تک انسان حالتِ دُعا میں ایک موت تک نہیں پہنچتا۔ ....

نماز بڑے بھارے درجے کی دعا ہے مگر لوگ اس کی قدر نہیں کرتے۔ اِس زمانہ میں مسلمان ورد وظائف کی طرف متوجہ ہیں۔ کئی ایک فرقے ہیں جیسا کہ نوشاہی اور نقشبندی وغیرہ افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی بدعات کی آمیزش سے خالی نہیں۔ یہ لوگ نماز کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ احکام الٰہی کی ہجو کرتے ہیں۔ طالب کے واسطے نماز کے ہوتے ہوئے اِن بدعات میں کسی کی ضرورت نہیں۔ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا یہی طریق تھا کہ مشکلات کے وقت میں وضو کر کے نماز میں کھڑے ہو جاتے تھے اور نماز میں دُعا کرتے تھے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ **خدا کے قریب لے جانے والی کوئی چیز نماز سے زیادہ نہیں**۔ نماز کے اجزاء اپنے اندر ادب خاکساری اور انکساری کا اظہار رکھتے ہیں۔ قیام میں نمازی دست بستہ کھڑا ہوتا ہے جیسا کہ ایک غلام اپنے آقا اور بادشاہ کے سامنے طریق ادب سے کھڑا ہوتا ہے۔ رکوع میں انسان انکسار کے ساتھ جھک جاتا ہے۔ سب سے بڑا انکسار سجدہ میں ہے جو بہت ہی عاجزی کی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔

(تقاریر جلسہ سالانہ ۱۹۰۶ء ص ۶-۸)

نمازوں کو باقاعدہ التزام سے پڑھو۔ بعض لوگ صرف ایک ہی وقت کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ وہ یاد رکھیں کہ نمازیں معاف نہیں ہوتیں یہاں تک کہ پیغمبروں تک کو معاف نہیں ہوئیں

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نئی جماعت آئی۔ انہوں نے نماز کی معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا کہ جس مذہب میں عمل نہیں وہ مذہب کچھ نہیں۔

(ملفوظات جلد اول صـ۲۵۴)

میں پھر تمہیں بتلاتا ہوں کہ اگر خدا تعالیٰ سے سچّا تعلّق حقیقی ارتباط قائم کرنا چاہتے ہو تو نماز پر کاربند ہو جاؤ اور ایسے کاربند بنو کہ تمہارا جسم نہ تمہاری زبان بلکہ تمہاری رُوح کے ارادے اور **جذبے سب کے سب ہمہ تن نماز ہو جائیں۔**

(ملفوظات جلد اوّل صـ۱۶۳)

نماز کیا چیز ہے۔ **نماز اصل میں ربّ العزّة سے دُعا ہے جس کے بغیر انسان زندہ** نہیں رہ سکتا۔ اور نہ عافیت اور خوشی کا سامان مل سکتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ اس پر اپنا فضل کرے گا اُسوقت اُسے حقیقی سرور اور راحت ملے گی۔ اسوقت سے اس کو نمازوں میں لذّت اور ذوق آنے لگے گا۔ جس طرح لذیذ غذاؤں کے کھانے سے مزہ آتا ہے۔ اسی طرح پھر گریہ اور بکار کی لذّت آئیگی۔ اور یہ حالت جو نماز کی ہے پیدا ہو جائیگی۔ اس سے پہلے جیسے کڑوی دوا کو کھاتا ہے تاکہ صحت حاصل ہو اسی طرح اس بے ذوقی نماز کو پڑھنا اور دُعائیں مانگنا ضروری ہے۔ اِس بے ذوقی کی حالت میں یہ فرض کرکے کہ اس سے لذّت اور ذوق پیدا ہو یہ دُعا کرے کہ :-

> "اے اللہ! تو مجھے دیکھتا ہے کہ میں کیسا اندھا اور نابینا ہوں اور میں اس وقت بالکل مُردہ حالت میں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے بعد مجھے آواز آئیگی تو میں تیری طرف آجاؤنگا اُسوقت مجھے کوئی روک نہ سکیگا۔ لیکن میرا دل اندھا اور ناشناسا ہے۔ تُو ایسا شعلہ نُور اِس پر نازل کر کہ تیرا اُنس اور شوق اِس میں پیدا ہو جائے۔ تُو ایسا فضل کر کہ میں نابینا نہ اُٹھوں اور اندھوں میں نہ جا ملوں۔"

جب اِس قسم کی دُعا مانگے گا اور اس پر دوام اختیار کریگا وہ دیکھے گا کہ ایک وقت اُس پر ایسا آئیگا کہ اِس بے ذوقی کی نماز میں ایک چیز آسمان سے اُس پر گرے گی جو رقّت پیدا کر دیگی۔

(ملفوظات جلد چہارم صـ۳۲۱)

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلوٰاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ۔ یعنی چھٹے درجہ کے مومن جو پانچویں درجہ سے بڑھ گئے ہیں وہ ہیں جو اپنی نمازوں پر آپ محافظ اور نگہبان ہیں یعنی وہ کسی دوسرے کی تذکیر اور

یاد دہانی کے محتاج نہیں رہے بلکہ کچھ ایسا تعلق ان کو خدا سے پیدا ہو گیا ہے اور خدا کی یاد کچھ اس قسم کی محبوب طبع اور مدارِ آرام اور مدارِ زندگی ان کے لئے ہو گئی ہے کہ وہ ہر وقت اُس کی نگہبانی میں لگے رہتے ہیں اور ہر دم ان کا یاد الٰہی میں گذرتا ہے اور نہیں چاہتے کہ ایک دم بھی خدا کے ذکر سے الگ ہوں ۔

اب ظاہر ہے کہ انسان اُسی چیز کی محافظت اور نگہبانی میں تمام تر کوشش کر کے ہر دم لگا رہتا ہے جس کے گم ہونے میں اپنی ہلاکت اور تباہی دیکھتا ہے ۔ جیسا کہ ایک مسافر جو ایک بیابان بے آب و دانہ میں سفر کر رہا ہے جس کے صدہا کوس تک پانی اور روٹی ملنے کی کوئی امید نہیں وہ اپنے پانی اور روٹی کی جو ساتھ رکھتا ہے بہت محافظت کرتا ہے اور اپنی جان کے برابر اسکو سمجھتا ہے کیونکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے ضائع ہونے میں اس کی موت ہے ۔ پس وہ لوگ جو اس مسافر کیطرح اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں اور گو مال کا نقصان ہو یا عزت کا نقصان ہو یا نماز کی وجہ سے کوئی ناراض ہو جائے نماز کو نہیں چھوڑتے ۔ اور اس کے ضائع ہونے کے اندیشہ میں سخت بے تاب ہوتے اور پیچ و تاب کھاتے گویا مر ہی جاتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ایک دم بھی یاد الٰہی سے الگ ہوں وہ درحقیقت نماز اور یاد الٰہی کو اپنی ایک ضروری غذا سمجھتے ہیں جس پر ان کی زندگی کا مدار ہے اور یہ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب خدا تعالیٰ اُن سے محبت کرتا ہے اور اُس کی محبتِ ذاتیہ کا ایک افروختہ شعلہ جس کو روحانی وجود کے لئے ایک رُوح کہنا چاہیئے اُن کے دل پر نازل ہوتا ہے اور ان کو **حیاتِ ثانی** بخش دیتا ہے ۔ اور وہ رُوح اُن کے تمام وجود روحانی کو روشنی اور زندگی بخشتی ہے ۔ تب وہ نہ کسی تکلّف اور بناوٹ سے خدا کی یاد میں لگے رہتے ہیں بلکہ وہ خدا جس نے جسمانی طور پر انسان کی زندگی روٹی اور پانی پر موقوف رکھی ہے وہ ان کی روحانی زندگی کو جس سے وہ پیار کرتے ہیں اپنی یاد کی غذا سے وابستہ کر دیتا ہے ۔ اس لئے وہ اس روٹی اور پانی کو جسمانی روٹی اور پانی سے زیادہ چاہتے ہیں اور اُس کے ضائع ہونے سے ڈرتے ہیں ۔ اور یہ اس رُوح کا اثر ہوتا ہے جو ایک شعلہ کی طرح اُن میں ڈالی جاتی ہے ۔ جس سے عشق الٰہی کی کامل مستی اُن میں پیدا ہو جاتی ہے اِس لئے وہ یاد الٰہی سے ایک دم الگ ہونا نہیں چاہتے وہ اس کے لئے دُکھ اُٹھاتے اور مصائب دیکھتے ہیں مگر اس سے ایک لحظہ بھی جُدا ہونا نہیں چاہتے ۔ اور پاس انفاس کرتے ہیں اور اپنی نمازوں کے محافظ اور نگہبان رہتے ہیں ۔ اور یہ امر اُن کے لئے طبعی ہے کیونکہ درحقیقت خدا نے اپنی محبت سے بھری ہوئی یاد کو جس کو دوسرے لفظوں میں نماز کہتے ہیں ان کیلئے ایک

ضروری غذا مقرر کر دیا ہے اور اپنی محبت ذاتیہ سے اُن پر تجلّی فرما کر یاد الٰہی کی ایک دلکش لذّت انکو عطا کی ہے۔ پس اس وجہ سے یاد الٰہی جان کی طرح بلکہ جان سے بڑھ کر ان کو عزیز ہو گئی ہے اور خدا کی ذاتی محبت ایک نئی رُوح ہے جو شعلہ کی طرح اُن کے دلوں پر پڑتی اور اُن کی نماز اور یاد الٰہی کو ایک غذا کی طرح اُن کے لئے بنا دیتی ہے۔ پس وہ یقین رکھتے ہیں کہ اُن کی زندگی روٹی اور پانی سے نہیں بلکہ نماز اور یاد الٰہی سے جیتے ہیں۔

غرض محبّت سے بھری ہوئی یاد الٰہی جس کا نام نماز ہے وہ درحقیقت ان کی غذا ہو جاتی ہے جس کے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتے۔ اور جس کی محافظت اور نگہبانی بعینہٖ اس مسافر کی طرح وہ کرتے رہتے ہیں جو ایک دشت بے آب و دانہ میں اپنی چند روٹیوں کی محافظت کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں اور اپنے کسی قدر پانی کو جان کے ساتھ رکھتا ہے جو اس کی مشک میں ہے۔ واہبِ مطلق نے انسان کی روحانی ترقیات کے لئے یہ بھی ایک مرتبہ رکھا ہؤا ہے جو محبتِ ذاتی اور عشق کے غلبہ اور استیلاء کا آخری مرتبہ ہے اور درحقیقت اس مرتبہ پر انسان کے لئے محبت سے بھری ہوئی یاد الٰہی جس کا شرعی اصطلاح میں **نماز** نام ہے غذا کے قائم مقام ہو جاتی ہے بلکہ وہ بار بار جسمانی رُوح کو بھی اس غذا پر فدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جیساکہ مچھلی بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور خدا سے علیحدہ ایک دم بھی بسر کرنا اپنی موت سمجھتا ہے۔ اور اس کی رُوح آستانہ الٰہی پر ہر وقت سجدہ میں رہتی ہے۔ اور تمام آرام اُس کا خدا ہی میں ہو جاتا ہے۔ اور اس کو یقین ہوتا ہے کہ مَیں اگر ایک طرفۃ العین بھی یاد الٰہی سے الگ ہؤا تو بس میں مرا۔ اور جس طرح روٹی سے جسم میں تازگی اور آنکھ اور کان وغیرہ اعضاء کی قوتوں میں توانائی آجاتی ہے۔ اِسی طرح اس مرتبہ پر یاد الٰہی جو عشق اور محبت کے جوش سے ہوتی ہے مومن کی روحانی قوتوں کو ترقی دیتی ہے۔ یعنی آنکھ میں قوتِ کشف نہایت صاف اور لطیف طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور کان خدا تعالیٰ کے کلام کو سُنتے ہیں۔ اور زبان پر وہ کلام نہایت لذیذ اور اجلیٰ اور اصفیٰ طور پر جاری ہو جاتا ہے۔ اور رؤیا صادقہ بکثرت ہوتے ہیں جو فلقِ صبح کی طرح ظہور میں آجاتے ہیں۔ اور بباعث علاقہ صافیہ محبت جو حضرت عزّت سے ہوتا ہے مبشّر خوابوں سے بہت سا حصّہ ان کو ملتا ہے۔ یہی وہ مرتبہ ہے جس مرتبہ پر مومن کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی محبّت اس کے لئے روٹی اور پانی کا کام دیتی ہے۔ یہ نئی پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب پہلے رُوحانی قالب تمام تیار ہو چکتا ہے۔ اور پھر وہ رُوح جو محبتِ ذاتیہ الٰہیہ کا

ایک شعلہ ہے ایسے مومن کے دل پر آپڑتا ہے اور یک دفعہ طاقت بالانشیمن بشریت سے بلندتر اسکو لے جاتی ہے ۔ اور یہ مرتبہ وہ ہے جس کو روحانی طور پر **خلق آخر** کہتے ہیں ۔ اس مرتبہ پر خدا تعالیٰ اپنی ذاتی محبت کا ایک افروختہ شعلہ جس کو دوسرے لفظوں میں روح کہتے ہیں مومن کے دل پر نازل کرتا ہے اور اس سے تمام تاریکیوں اور آلائشوں اور کمزوریوں کو دُور کر دیتا ہے ۔ اور اس روح کے پھونکنے کے ساتھ ہی وہ حسن جو ادنیٰ مرتبہ پر تھا کمال کو پہنچ جاتا ہے اور ایک رُوحانی آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے اور گندی زندگی کی کبودگی بکلّی دُور ہو جاتی ہے ۔ اور مومن اپنے اندر محسوس کر لیتا ہے کہ ایک نئی رُوح اس کے اندر داخل ہو گئی ہے جو پہلے نہیں تھی ۔ اس رُوح کے ملنے سے ایک عجیب سکینت اور اطمینان مومن کو حاصل ہو جاتی ہے ۔ اور محبت ذاتیہ ایک فوّارہ کی طرح جوش مارتی اور عبودیت کے پودہ کی آبپاشی کرتی ہے اور وہ آگ جو پہلے ایک معمولی گرمی کی حد تک تھی اس درجہ پر وہ تمام و کمال افروختہ ہو جاتی ہے اور انسانی وجود کے تمام خس و خاشاک کو جلا کر الوہیت کا قبضہ اسپر کر دیتی ہے اور وہ آگ تمام اعضاء پر احاطہ کر لیتی ہے ۔ تب اس لوہے کی مانند جو نہایت درجہ آگ میں تپایا جائے یہاں تک کہ سُرخ ہو جائے اور آگ کے رنگ پر ہو جائے اس مومن سے الوہیت کے آثار اور افعال ظاہر ہوتے ہیں جیسا کہ لوہا بھی اس درجہ پر آگ کے آثار اور افعال ظاہر کرتا ہے ۔ مگر یہ نہیں کہ وہ مومن خدا ہو گیا ہے بلکہ محبت الٰہیہ کا کچھ ایسا ہی خاصہ ہے جو اپنے رنگ میں ظاہر وجود کو لے آتی ہے ۔ اور باطن میں عبودیت اور اس کا ضعف موجود ہوتا ہے ۔ اس درجہ پر مومن کی روٹی خدا ہوتا ہے جس کے کھانے پر اس کی زندگی موقوف ہے اور مومن کا پانی بھی خدا ہوتا ہے جس کے پینے سے وہ موت سے بچ جاتا ہے اور اس کی ٹھنڈی ہوا بھی خدا ہی ہوتا ہے جس سے اس کے دل کو راحت پہنچتی ہے اور اس مقام پر استعارہ کے رنگ میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ خدا اس مرتبہ کے مومن کے اندر داخل ہوتا اور اسکے رگ و ریشہ میں سرایت کرتا اور اس کے دل کو اپنا تخت گاہ بنا لیتا ہے ۔ تب وہ اپنی روح سے نہیں بلکہ خدا کی رُوح سے دیکھتا اور خدا کی رُوح سے سُنتا اور خدا کی رُوح سے بولتا اور خدا کی رُوح سے چلتا اور خدا کی رُوح سے دشمنوں پر حملہ کرتا ہے کیونکہ وہ اس مرتبہ پر نیستی اور استہلاک کے مقام میں ہوتا ہے اور خدا کی رُوح اس پر اپنی محبت ذاتیہ کے ساتھ تجلّی فرما کر حیاتِ ثانی اس کو بخشتی ہے ۔ پس اسوقت روحانی طور پر اس پر یہ آیت صادق آتی ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۵۴ - ۵۸)

نماز کی ظاہری صورت پر اکتفا کرنا نادانی ہے۔ اکثر لوگ رسمی نماز ادا کرتے ہیں اور بہت جلدی کرتے ہیں جیسے ایک **ناداجب ٹیکس** لگا ہوا ہے جلدی گلے سے اُتر جاوے بعض لوگ نماز تو جلدی پڑھ لیتے ہیں لیکن اس کے بعد دُعا اس قدر لمبی مانگتے ہیں کہ نماز کے وقت سے دُگنا تگنا وقت لے لیتے ہیں حالانکہ نماز تو خود دُعا ہے جس کو یہ نصیب نہیں ہے کہ نماز میں دُعا کرے اس کی نماز ہی نہیں۔ چاہیئے کہ اپنی نماز کو دُعا سے مثل کھانے اور سرد پانی کے لذیذ اور مزیدار کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ اس پر ویل ہو۔ **نماز خدا کا حق ہے اُسے خوب ادا کرو۔**

(ملفوظات جلد ششم ص ۳۷)

انسان کی زاہدانہ زندگی کا بڑا بھاری معیار نماز ہے۔ وہ شخص جو خدا کے حضور نماز میں گریاں رہتا ہے امن میں رہتا ہے۔ جیسے ایک بچہ اپنی ماں کی گود میں چیخ چیخ کر روتا ہے اور اپنی ماں کی محبت اور شفقت کو محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح پر نماز میں تضرع اور ابتہال کے ساتھ خدا کے حضور گڑگڑانے والا اپنے آپ کو ربوبیت کی عطوفت کی گود میں ڈال دیتا ہے **یاد رکھو اُس نے ایمان کا حظ نہیں اٹھایا جس نے نماز میں لذت نہیں پائی۔** نماز صرف ٹکروں کا نام نہیں ہے۔ بعض لوگ نماز کو تو دو چار چونچیں لگا کر جیسے مرغی ٹھونگیں مارتی ہے ختم کرتے ہیں اور پھر لمبی چوڑی دُعا شروع کرتے ہیں حالانکہ وہ وقت جو اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کرنے کے لئے ملا تھا اس کو صرف ایک رسم اور عادت کے طور پر جلد جلد ختم کرنے میں گذار دیتے ہیں۔ اور حضور الٰہی سے نکل کر دُعا مانگتے ہیں۔ نماز میں دُعا مانگو۔ نماز کو دُعا کا ایک وسیلہ اور ذریعہ سمجھو۔

(ملفوظات جلد دوم ص ۱۲۵)

نماز کا اصل مغز اور روح تو دُعا ہی ہے۔ نماز سے نکل کر دُعا کرنے سے وہ اصل مطلب کہاں حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک شخص بادشاہ کے دربار میں جائے اور اس کو اپنا عرض حال کرنے کا موقعہ بھی ہو لیکن وہ اس وقت تو کچھ نہ کہے لیکن جب دربار سے باہر جاوے تو اپنی درخواست پیش کرے اس سے اسے کیا فائدہ۔ ایسا ہی حال ان لوگوں کا ہے جو نماز میں خشوع و خضوع کے ساتھ دعائیں نہیں مانگتے۔ تم کو جو دعائیں کرنی ہوں نماز میں کر لیا کرو۔ اور پورے آداب دُعا کو ملحوظ رکھو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کے شروع ہی میں دُعا سکھائی ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی

دُعا کے آداب بھی بتا دیئے ہیں۔ سورۃ فاتحہ کا نماز میں پڑھنا لازمی ہے اور یہ دُعا ہی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل دُعا نماز ہی میں ہوتی ہے۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۳۵۵)

نماز اپنی زبان میں نہیں پڑھنی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ نے جس زبان میں قرآن شریف رکھا ہے اسکو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ ہاں اپنی حاجتوں کو اپنی زبان میں خدا تعالیٰ کے سامنے بعد مسنون طریق اور اذکار کے بیان کر سکتے ہیں **مگر اصل زبان کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیئے۔** عیسائیوں نے اصل زبان کو چھوڑ کر کیا پھل پایا۔ کچھ بھی باقی نہ رہا۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۲۸۸)

نماز کیا چیز ہے؟ وہ **دُعا** ہے جو تسبیح تحمید تقدیس اور استغفار اور درود کے ساتھ تضرع سے مانگی جاتی ہے۔ سو جب تم نماز پڑھو تو بے خبر لوگوں کی طرح اپنی دعاؤں میں صرف عربی الفاظ کے پابند نہ رہو۔ کیونکہ ان کی نماز اور ان کا استغفار سب رسمیں ہیں جن کے ساتھ کوئی حقیقت نہیں لیکن تم جب نماز پڑھو تو بجز قرآن کے جو خدا کا کلام ہے اور بجز بعض ادعیہ ماثورہ کے کہ وہ رسول کا کلام ہے باقی اپنی تمام عام دعاؤں میں اپنی زبان میں ہی الفاظ متضرعانہ ادا کر لیا کرو تا ہو کہ تمہارے دلوں پر اس عجز و نیاز کا کچھ اثر ہو۔

(کشتی نوح ص ۸)

پانچ وقت اپنی نمازوں میں دُعا کرو۔ اپنی زبان میں بھی دُعا کرنی منع نہیں ہے۔ نماز کا مزہ نہیں آتا جب تک **حضور** نہ ہو۔ اور حضور قلب نہیں ہوتا ہے جبتک **عاجزی** نہ ہو عاجزی جب پیدا ہوتی ہے جب یہ سمجھ آجائے کہ کیا پڑھتا ہے۔ اس لئے اپنی زبان میں اپنے مطالب پیش کرنے کے لئے جوش اور اضطراب پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ نماز کو اپنی زبان ہی میں پڑھو۔ نہیں۔ میرا یہ مطلب ہے کہ مسنون ادعیہ اور اذکار کے بعد اپنی زبان میں بھی دعا کیا کرو۔ ورنہ نماز کے ان الفاظ میں خدا نے ایک برکت رکھی ہوئی ہے۔ نماز دُعا ہی کا نام ہے اس لئے اس میں دُعا کرو کہ وہ تم کو دنیا اور آخرت کی آفتوں سے بچا دے اور خاتمہ بالخیر ہو۔ اپنے بیوی بچوں کے لئے بھی دُعا کرو۔ نیک انسان بنو اور ہر قسم کی بدی سے بچتے رہو۔

(ملفوظات جلد ششم ص ۱۲۶)

پنجگانہ نمازیں کیا چیز ہیں؛ وہ تمہارے مختلف حالات کا فوٹو ہے۔ تمہاری زندگی کے لازم حال پانچ تغیّر ہیں جو بلا کے وقت تم پر وارد ہوتے ہیں اور تمہاری فطرت کے لئے ان کا وارد ہونا ضروری ہے۔

پہلے جبکہ تم مطلع کئے جاتے ہو کہ تم پر ایک بلا آنے والی ہے مثلاً جیسے تمہارے نام عدالت سے ایک وارنٹ جاری ہوا۔ یہ پہلی حالت ہے جس نے تمہاری تسلّی اور خوش حالی میں خلل ڈالا۔ سو یہ حالت زوال کے وقت سے مشابہ ہے کیونکہ اس سے تمہاری خوشحالی میں زوال آنا شروع ہوا۔ اِس کے مقابل پر **نماز ظہر** متعین ہوئی جس کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔

دوسرا تغیر اس وقت تم پر آتا ہے جبکہ تم بلا کے محل سے بہت نزدیک کئے جاتے ہو۔ مثلاً جبکہ تم بذریعہ وارنٹ گرفتار ہو کر حاکم کے سامنے پیش ہوتے ہو۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب تمہارا خوف سے خون خشک ہو جاتا ہے اور تسلّی کا نور تم سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے۔ سو یہ حالت تمہاری اس وقت سے مشابہ ہے جبکہ آفتاب سے نور کم ہو جاتا ہے اور نظر اُس پر جم سکتی ہے اور صریح نظر آتا ہے کہ اب اس کا غروب نزدیک ہے۔ اس رُوحانی حالت کے مقابل پر **نماز عصر** مقرر ہوئی۔

تیسرا تغیّر تم پر اُس وقت آتا ہے جو اس بلا سے رہائی پانے کی بکلّی اُمید منقطع ہو جاتی ہے مثلاً جیسے تمہارے نام فرد قرار دار جرم لکھی جاتی ہے اور مخالفانہ گواہ تمہاری ہلاکت کیلئے گذر جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب تمہارے حواس خطا ہو جاتے ہیں اور تم اپنے تئیں ایک قیدی سمجھنے لگتے ہو۔ سو یہ حالت اس وقت سے مشابہ ہے جبکہ آفتاب غروب ہو جاتا ہے اور تمام اُمیدیں دن کی روشنی کی ختم ہو جاتی ہیں۔ اس رُوحانی حالت کے مقابل پر **نماز مغرب** مقرر ہے۔

چوتھا تغیّر اس وقت تم پر آتا ہے کہ جب بلا تم پر وارد ہی ہو جاتی ہے اور اُس کی سخت تاریکی تم پر احاطہ کر لیتی ہے۔ مثلاً جبکہ فرد قرار دار جرم اور شہادتوں کے بعد حکم سزا تم کو سُنایا جاتا ہے اور قید کے لئے ایک پولیس مین کے تم حوالے کئے جاتے ہو۔ سو یہ حالت اس وقت سے مشابہ ہے جبکہ رات پڑ جاتی ہے اور ایک سخت اندھیرا پڑ جاتا ہے۔ اس روحانی حالت کے مقابل پر **نماز عشاء** مقرر ہے۔

پھر جبکہ تم ایک مدّت تک اس مصیبت کی تاریکی میں بسر کرتے ہو تو پھر **آخر خدا کا رحم تم پر جوش مارتا** ہے اور تمہیں اس تاریکی سے نجات دیتا ہے۔ مثلاً جیسے تاریکی کے بعد پھر آخر کار صبح نکلتی ہے اور پھر وہی روشنی دن کی اپنی چمک کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہے۔ سو اِس رُوحانی حالت کے مقابل پر **نماز فجر** مقرر ہے۔ اور خدا نے تمہارے فطرتی تغیّرات میں پانچ

حالتیں دیکھکر پانچ نمازیں تمہارے لئے مقرر کیں اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ نمازیں خاص تمہارے نفس کے فائدہ کے لئے ہیں۔ پس اگر تم چاہتے ہو کہ ان بلاؤں سے بچے رہو تو تم پنجگانہ نمازوں کو ترک نہ کرو کہ وہ تمہاری اندرونی اور رُوحانی تغیرات کا ظل ہیں۔ نماز میں آنے والی بلاؤں کا علاج ہے۔ تم نہیں جانتے کہ نیا دن چڑھنے والا کس قسم کے قضاء و قدر تمہارے لئے لائیگا۔ پس قبل اس کے جو دن چڑھے تم اپنے مولیٰ کی جناب میں تضرع کرو کہ تمہارے لئے خیر و برکت کا دن چڑھے۔

(کشتی نوح ص ۸۸-۸۹)

نماز بھی گناہوں سے بچنے کا ایک آلہ ہے۔ نماز کی یہ صفت ہے کہ انسان کو گناہ اور بدکاری سے ہٹا دیتی ہے۔ سو تم ویسی نماز کی تلاش کرو۔ اور اپنی نماز کو ایسی بنانے کی کوشش کرو۔ نماز نعمتوں کی جان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فیض اسی نماز کے ذریعہ سے آتے ہیں۔ سو اِس کو سنوار کر ادا کرو۔ تاکہ تم اللہ تعالےٰ کی نعمت کے وارث بنو۔

(ملفوظات جلد پنجم ص ۱۲۶)

نماز کیا ہے! یہی کہ اپنے عجز و نیاز اور کمزوریوں کو خدا کے سامنے پیش کرنا۔ اور اسی سے اپنی حاجت روائی چاہنا۔ کبھی اس کی عظمت اور اس کے احکام کی بجا آوری کے واسطے دست بستہ کھڑا ہونا اور کبھی کمال مذلت اور فروتنی سے اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔ اس سے اپنی حاجات کا مانگنا یہی نماز ہے۔ ایک سائل کی طرح کبھی اس مسئول کی تعریف کرنا کہ تُو ایسا ہے تو ایسا ہے اسکی عظمت اور جلال کا اظہار کر کے اس کی رحمت کو جنبش دلانا پھر اُس سے مانگنا۔ پس جس دین میں یہ نہیں وہ دین ہی کیا ہے .... خدا تعالیٰ کی محبت اسی کا خوف اُسی کی یاد میں دل لگا رہنے کا نام نماز ہے۔ اور یہی دین ہے۔ پھر جو شخص نماز ہی سے فراغت حاصل کرنا چاہتا ہے اُس نے حیوانوں سے بڑھ کر کیا کیا؟ وہی کھانا پینا اور حیوانوں کی طرح سو رہنا یہ تو دین ہرگز نہیں یہ سیرت کفار ہے .... جو شخص خدا تعالےٰ سے ملنا چاہتا ہے اور اس کے دربار میں پہنچنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس کے واسطے نماز ایک گاڑی ہے جس پر سوار ہو کر وہ جلد تر پہنچ سکتا ہے جس نے نماز ترک کر دی وہ کیا پہنچیگا۔

اصل میں مسلمانوں نے جب سے نماز کو ترک کیا یا اُسے دل کی تسکین آرام اور محبت سے اس کی حقیقت سے غافل ہو کر پڑھنا ترک کیا ہے۔ تب ہی سے اسلام کی حالت بھی معرضِ زوال

میں آئی ہے۔ وہ زمانہ جس میں نمازیں سنوار کر پڑھی جاتی تھیں غور سے دیکھ لو کہ اسلام کے واسطے کیسا تھا۔ ایک دفعہ تو اسلام نے تمام دنیا کو زیر پا کر دیا تھا۔ جب سے اُسے ترک کیا وہ خود متروک ہو گئے ہیں۔ دردِ دل سے پڑھی ہوئی نماز ہی ہے کہ تمام مشکلات سے انسان کو نکال لیتی ہے۔ ہمارا بارہا کا تجربہ ہے کہ اکثر کسی مشکل کے وقت دعا کی جاتی ہے ابھی نماز میں ہی ہوتے ہیں کہ خدا نے اس امر کو حل اور آسان کر دیا ہُوا ہوتا ہے۔

نماز میں کیا ہوتا ہے یہی کہ عرض کرتا ہے التجا کے ہاتھ بڑھاتا ہے اور دوسرا اسکی عرض کو اچھی طرح سُنتا ہے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی ہوتا ہے کہ جو سُنتا تھا وہ بولتا ہے گذارش کرنے والے کو جواب دیتا ہے۔ نمازی کا یہی حال ہے۔ خدا کے آگے سربسجود رہتا ہے اور خدا تعالےٰ کو اپنے مصائب اور حوائج سُناتا ہے۔ پھر آخر سچی اور حقیقی نماز کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک وقت جلد آجاتا ہے کہ خدا تعالےٰ اس کے جواب کے واسطے بولتا اور اس کو جواب دیکر تسلّی دیتا ہے۔ بھلا یہ بجز حقیقی نماز کے ممکن ہے؟

(ملفوظات جلد پنجم ص۲۵۳-۲۵۵)

نماز اس وقت **حقیقی نماز** کہلاتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ سے سچّا اور پاک تعلق ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اطاعت میں اس حد تک فنا ہو اور یہاں تک دین کو دنیا پر مقدّم کر لے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں جان تک دیدینے اور مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ جب یہ حالت انسان میں پیدا ہو جائے اس وقت کہا جائیگا کہ اس کی نماز نماز ہے۔ مگر جب تک یہ حقیقت انسان کے اندر پیدا نہیں ہوتی اور سچّے اخلاص اور وفاداری کا نمونہ نہیں دکھلاتا اس وقت تک اس کی نمازیں اور دوسرے اعمال بے اثر ہیں۔

(ملفوظات جلد ششم ص۲۴۰)

نماز ایسے ادا نہ کرو جیسے مرغی دانے کے لئے ٹھونگ مارتی ہے بلکہ سوز و گداز سے ادا کرو۔ اور دعائیں بہت کیا کرو۔ **نماز مشکلات کی کنجی ہے**۔ ماثورہ دعاؤں اور کلمات کے سوا اپنی مادری زبان میں بہت دُعا کیا کرو تا اس سے سوز و گداز کی تحریک ہو اور جب تک سوز و گداز نہ ہو اسے ترک مت کرو کیونکہ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے اور سب کچھ ملتا ہے۔ چاہیئے کہ نماز کی جس قدر جسمانی صورتیں ہیں ان سب کے ساتھ دل بھی ویسے ہی تابع ہو۔ اگر جسمانی طور پر کھڑے ہو تو دل بھی خدا کی اطاعت کے لئے ویسے ہی کھڑا ہو۔ اگر جھکو تو دل بھی ویسے ہی جھکے۔ اگر

سجدہ کرو تو دل بھی ویسے ہی سجدہ کرے۔ دل کا سجدہ یہ ہے کہ کسی حال میں خدا کو نہ چھوڑے جب یہ حالت ہو گی تو گناہ دُور ہونے شروع ہو جاویں گے۔

(ملفوظات جلد ششم ص ۳۶۷-۳۶۸)

قرآن شریف میں دو جنتوں کا ذکر ہے۔ ایک ان میں سے دنیا کی جنّت ہے اور وہ نماز کی لذت ہے۔ نماز نخواہ کا ٹیکس نہیں ہے بلکہ عبودیت کو ربوبیت سے ایک ابدی تعلق اور کشش ہے۔ اس رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے خدا تعالیٰ نے نماز بنائی ہے اور اس میں ایک لذت رکھ دی ہے۔ جس سے یہ تعلق قائم رہتا ہے جیسے لڑکے اور لڑکی کی جب شادی ہوتی ہے اگر اُن کے ملاپ میں ایک لذّت نہ ہو تو فساد ہوتا ہے۔ ایسے ہی اگر نماز میں لذت نہ ہو تو وہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ دروازہ بند کرکے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ رشتہ قائم رہے اور لذّت پیدا ہو۔ جو تعلق عبودیت کا ربوبیت سے ہے وہ بہت گہرا اور انوار سے پُر ہے جس کی تفصیل نہیں ہو سکتی جب وہ نہیں ہے تب تک انسان بہائم ہے۔ اگر دو چار دفعہ بھی لذت محسوس ہو جائے تو اس چاشنی کا حصہ مل گیا۔ لیکن جسے دو چار دفعہ بھی نہ ملی وہ اندھا ہے۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔

(ملفوت جلد ششم ص ۳۷۱)

استغفار کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ موجودہ نور جو خدا تعالیٰ سے حاصل ہوا ہے وہ محفوظ رہے اور زیادہ اور ملے اسی کی تحصیل کے لئے **پنجگانہ نماز** بھی ہے تاکہ ہر روز دل کھول کھول کر اس روشنی کو خدا سے مانگ لیوے۔ جسے بصیرت ہے وہ جانتا ہے کہ **نماز ایک معراج ہے** اور وہ نماز ہی کی تضرع اور ابتہال سے بھری ہوئی دُعا ہے جس سے یہ امراض سے رہائی پا سکتا ہے۔

(ملفوظات جلد ہفتم ص ۱۲۴)

جب کبھی ایسی حالت ہو کہ اُنس اور ذوق جو نماز میں آتا تھا وہ جاتا رہا ہے تو **چاہیئے کہ تھک نہ جاوے** اور بے حوصلہ ہو کر **ہمّت نہ ہارے** بلکہ بڑی مستعدی کے ساتھ اس گمشدہ متاع کو حاصل کرنے کی فکر کرے۔ اور اس کا علاج ہے توبہ۔ استغفار۔ تضرع۔ بے ذوقی سے ترک نماز نہ کرے بلکہ نماز کی اور کثرت کرے۔ جیسے ایک نشہ باز کو جب نشہ نہیں آتا تو وہ نشہ کو چھوڑ نہیں دیتا بلکہ جام پر جام پیتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر اس کو لذت اور سرور آجاتا ہے۔ پس جس کو نماز میں بے ذوقی پیدا ہو۔ اس کو کثرت کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیئے اور

تھکنا مناسب نہیں۔ آخر اسی بے ذوقی میں ایک ذوق پیدا ہو جاویگا۔ دیکھو پانی کے لئے کس قدر زمین کو کھودنا پڑتا ہے۔ جو لوگ تھک جاتے ہیں وہ محروم رہ جاتے ہیں جو تھکتے نہیں وہ آخر نکال ہی لیتے ہیں۔ اس لئے اس ذوق کو حاصل کرنے کے لئے استغفار۔ کثرت نماز و دُعا مستعدی اور صبر کی ضرورت ہے۔

(ملفوظات جلد پنجم صـ۴۳۲)

ہمارے غالب آنے کے **ہتھیار** استغفار۔ توبہ۔ دینی علوم کی واقفیت۔ خدا تعالیٰ کی عظمت کو مدنظر رکھنا اور پانچوں وقت کی نمازوں کو ادا کرنا ہیں۔ **نماز دعا کی قبولیت کی کنجی ہے** جب نماز پڑھو تو اس میں دعا کرو اور غفلت نہ کرو۔ اور ہر ایک بدی سے خواہ وہ حقوق الہٰی کے متعلق ہو خواہ حقوق العباد کے متعلق ہو بچو۔

(ملفوظات جلد پنجم صـ۳۰۳)

انسان کی خدا ترسی کا اندازہ کرنے کیلئے اس کے التزام نماز کو دیکھنا کافی ہے کہ کس قدر ہے اور مجھے یقین ہے کہ جو شخص پورے پورے اہتمام سے نماز ادا کرتا ہے اور خوف اور بیماری اور فتنہ کی حالتیں اس کو نماز سے روک نہیں سکتیں وہ بے شک خدا تعالیٰ پر ایک سچا ایمان رکھتا ہے۔ مگر یہ ایمان غریبوں کو دیا گیا۔ دولتمند اس نعمت کو پانے والے بہت ہی تھوڑے ہیں۔

(ازالہ اوہام صـ۴۴۰)

روزہ اور نماز ہر دو عبادتیں ہیں۔ روزے کا زور جسم پر ہے اور نماز کا زور رُوح پر ہے۔ نماز سے ایک سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ افضل ہے۔ روزے سے کشوف پیدا ہوتے ہیں۔

(ملفوظات جلد ہفتم صـ۳۷۹)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ سے ماہ رمضان کی عظمت معلوم ہوتی ہے صوفیاء نے لکھا ہے کہ یہ ماہ **تنویر قلب** کے لئے عمدہ مہینہ ہے۔ کثرت سے اس میں مکاشفات ہوتے ہیں۔ صلوٰۃ تزکیۂ نفس کرتی ہے اور **صوم** تجلّی قلب کرتا ہے۔ تزکیۂ نفس سے مراد یہ ہے کہ نفس امّارہ کی شہوات سے بُعد حاصل ہو جائے۔ اور تجلّی قلب سے مراد یہ ہے کہ کشف کا دروازہ اُس پر کھلے کہ خدا کو دیکھ لے۔

(ملفوظات جلد چہارم صـ۲۵۶)

ایک دفعہ میرے دل میں خیال آیا کہ فدیہ کس لئے مقرر کیا گیا ہے تو معلوم ہُوا کہ توفیق کے واسطے ہے تاکہ روزہ کی توفیق اس سے حاصل ہو ۔ خدا تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو توفیق عطا کرتی ہے اور ہر شے خدا تعالیٰ ہی سے طلب کرنی چاہیئے ۔ خدا تعالیٰ تو قادر مطلق ہے ۔ وہ اگر چاہے تو ایک مدقوق کو بھی روزہ کی طاقت عطا کر سکتا ہے ۔ تو فدیہ سے یہی مقصود ہے کہ وہ طاقت حاصل ہو جائے اور یہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہوتا ہے ۔ پس میرے نزدیک خوب ہے کہ انسان دُعا کرے کہ الٰہی یہ تیرا ایک مبارک مہینہ ہے اور مَیں اس سے محروم رہا جاتا ہوں اور کیا معلوم کہ آئندہ سال زندہ رہوں یا نہ یا ان فوت شدہ روزوں کو ادا کر سکوں یا نہ ور اس سے توفیق طلب کرے تو مجھے یقین ہے کہ ایسے دل کو خدا تعالیٰ طاقت بخش دیگا ۔

اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو دوسری اُمتوں کی طرح اس اُمت میں کوئی قید نہ رکھتا ۔ مگر اُس نے قیدیں بھلائی کے واسطے رکھی ہیں ۔ میرے نزدیک اصل یہی ہے کہ جب انسان صدق اور بکمال اخلاص سے باری تعالیٰ میں عرض کرتا ہے کہ اس مہینہ میں مجھے محروم نہ رکھ تو خدا تعالیٰ اُسے محروم نہیں رکھتا اور ایسی حالت میں اگر انسان ماہ رمضان میں بیمار ہو جائے تو یہ بیماری اُس کے حق میں رحمت ہوتی ہے ۔ کیونکہ ہر ایک عمل کا مدار نیت پر ہے ۔ مومن کو چاہیئے کہ وہ اپنے وجود سے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی راہ میں دلاور ثابت کر دے ۔ جو شخص کہ روزے سے محروم رہتا ہے مگر اس کے دل میں یہ نیت دردِ دل سے تھی کہ کاش میں تندرست ہوتا اور روزہ رکھتا اور اس کا دل اس بات کے لئے گریاں ہے تو فرشتے اس کے لئے روزے رکھیں گے بشرطیکہ وہ بہانہ جُو نہ ہو تو خدا تعالیٰ اُسے ہرگز ثواب سے محروم نہ رکھیگا ۔ یہ ایک باریک امر ہے کہ اگر کسی شخص پر (اپنے نفس کے کسل کی وجہ سے) روزہ گراں ہے اور وہ اپنے خیال میں گمان کرتا ہے، کہ مَیں بیمار ہوں اور میری صحت ایسی ہے کہ اگر ایک وقت نہ کھاؤں تو فلاں فلاں عوارض لاحق ہو نگے اور یہ ہوگا اور وہ ہوگا ۔ تو ایسا شخص جو خدا تعالیٰ کی نعمت کو خود اپنے اوپر گراں گمان کرتا ہے کب اس ثواب کا مستحق ہوگا ۔ ہاں وہ شخص جس کا دل اس بات سے خوش ہے کہ رمضان آگیا اور مَیں اس کا منتظر تھا کہ آوے اور روزہ رکھوں اور پھر وہ بوجہ بیماری کے روزہ نہیں رکھ سکا تو وہ آسمان پر روزہ سے محروم نہیں ہے ۔ اس دنیا میں بہت لوگ بہانہ جُو ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم جس طرح اہل دنیا کو دھوکا دے لیتے ہیں ویسے ہی خدا کو فریب دیتے ہیں ۔ بہانہ جو اپنے وجود سے آپ مسئلہ تراش کرتے ہیں اور تکلّفات شامل کر کے

اُن مسائل کو صحیح گردانتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ صحیح نہیں تکلّفات کا باب بہت وسیع ہے اگر انسان چاہے تو اس (تکلّف) کی رُوح سے ساری عمر بیٹھ کر نماز پڑھتا رہے اور رمضان کے روزے بالکل نہ رکھے مگر خدا اس کی نیت اور ارادہ کو جانتا ہے جو صدق اور اخلاص رکھتا ہے۔ خدا تعالےٰ جانتا ہے کہ اس کے دل میں درد ہے اور خدا تعالےٰ اُسے ثواب سے زیادہ بھی دیتا ہے۔ کیونکہ دردِ دل ایک قابلِ قدر شے ہے ۔

حیلہ جُو انسان تاویلوں پر تکیہ کرتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ تکیہ کوئی شے نہیں جب مَیں نے چھ ماہ روزے رکھے تھے تو ایک دفعہ ایک طائفہ انبیاء کا مجھے کشف میں ملا اور انہوں نے کہا کہ تُو نے کیوں اپنے نفس کو اس قدر مشقّت میں ڈالا ہُوا ہے اس سے باہر نکل۔ اِسی طرح جب انسان اپنے آپ کو خدا کے واسطے مشقّت میں ڈالتا ہے تو وہ خود ماں باپ کی طرح رحم کر کے اُسے کہتا ہے کہ تُو کیوں مشقّت میں پڑا ہُوا ہے ۔

(ملفوظات جلد چہارم صفحہ ۲۵۸-۲۶۰)

صلوٰۃ کا مَیں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس کے بعد **روزے کی عبادت** ہے۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں بعض مسلمان کہلانے والے ایسے بھی ہیں جو کہ ان عبادات میں ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اندھے ہیں اور خدا تعالیٰ کی حکمت کاملہ سے آگاہ نہیں ہیں۔ تزکیہ نفس کے واسطے یہ عبادات لازمی پڑی ہوئی ہیں ۔ یہ لوگ جس عالم میں داخل نہیں ہوئے اس کے معاملات میں بیہودہ دخل دیتے ہیں اور جس ملک کی انہوں نے سیر نہیں کی اس کی اصلاح کے واسطے جھوٹی تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی عمریں دنیوی دھندوں میں گذرتی ہیں ۔ دینی معاملات کی ان کو کچھ خبر ہی نہیں۔ کم کھانا اور بھوک برداشت کرنا بھی تزکیہ نفس کے واسطے ضروری ہے اس سے کشفی طاقت بڑھتی ہے انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بالکل ابدی زندگی کا خیال چھوڑ دینا اپنے اوپر قہرِ الٰہی کا نازل کرنا ہے مگر روزہ دار کو خیال رکھنا چاہیئے کہ روزے سے صرف یہ مطلب نہیں کہ انسان بھوکا رہے بلکہ خدا کے ذکر میں بہت مشغول رہنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم رمضان شریف میں بہت عبادت کرتے تھے۔ ان ایام میں کھانے پینے کے خیالات سے فارغ ہو کر اور ان ضرورتوں سے انقطاع کر کے تبتّل الی اللہ حاصل کرنا چاہیئے ۔ بد نصیب ہے وہ شخص جس کو جسمانی روٹی ملی مگر اُس نے روحانی روٹی کی پروا نہیں کی۔ جسمانی روٹی سے جسم کو قوت ملتی ہے ایسا ہی روحانی روٹی رُوح کو قائم رکھتی ہے اور اس سے روحانی قویٰ تیز ہوتے ہیں۔

خدا سے فیضیاب ہونا چاہو کہ تمام دروازے اس کی توفیق سے کھلتے ہیں۔

ایسا ہی ایک عبادت **حج** کی ہے مگر حج ایسا نہیں چاہیئے کہ حرام حلال کا جو روپیہ جمع ہؤا ہو اس کو لے کر انسان سمندر کو چیرتا ہؤا رسمی طور پر حج کو پورا کر آوے۔ اور اس جگہ کے کہلانیوالے جو کچھ منہ سے کہلاتے جاویں وہ کہکر واپس آجاوے اور ناز کرے کہ مَیں حج کر آیا ہوں۔ خدا تعالیٰ کا جو مطلب حج سے ہے وہ اس طرح پورا نہیں ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ سالک کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ وہ انقطاع نفس کر کے تعشّق باللہ اور محبت الٰہی میں غرق ہو جاوے۔ عاشق اور محبّ جو سچّا ہوتا ہے وہ اپنی جان اور دل قربان کر دیتا ہے اور بیت اللہ کا طواف اس قربانی کے واسطے ایک ظاہری نشان ہے۔ جیسا کہ ایک بیت اللہ نیچے زمین پر ہے ایسا ہی ایک آسمان پر بھی ہے۔ جبتک آدمی اُس کا طواف نہ کرے اِس کا طواف بھی نہیں ہوتا۔ اس کا طواف کرنے والا تو تمام کپڑے اتار کر ایک کپڑا بدن پر رکھ لیتا ہے لیکن اُس کا طواف کرنیوالا بالکل نزع ثیاب کر کے خدا کے واسطے ننگا ہو جاتا ہے۔ طواف عشاق الٰہی کی ایک نشانی ہے۔ عاشق اس کے گرد گھومتے ہیں گویا ان کی اپنی مرضی باقی نہیں رہی۔ وہ اس کے گرداگرد قربان ہو رہے ہیں۔

ایسا ہی **زکوٰۃ** ہے۔ بعض لوگ زکوٰۃ تو دیتے ہیں مگر اس بات کا کچھ خیال نہیں رکھتے کہ یہ روپیہ حلال کی کمائی سے ہے یا حرام کی کمائی سے ہے۔ دیکھو اگر ایک کُتّا ذبح کیا جاوے اور اُسکے ذبح کرنے کے وقت اللہ اکبر بھی کہا جاوے۔ ایسا ہی ایک سؤر لوازمات ذبح کے ساتھ مارا جائے تو وہ کیا کتّا یا سؤر حلال ہو جاویگا؟ وہ تو بہرحال حرام ہی ہے۔ **زکوٰۃ تو تزکیہ سے نکلی ہے۔** اس کے ذریعہ سے مال پاک ہو جاتا ہے کہ انسان حلال کی روزی حاصل کرتا ہے اور پھر اُس کو دین کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ انسانوں میں اس قسم کی غلطیاں ہیں کہ اصل حقیقت کو نہیں پہچانتے۔ ایسی باتوں سے دست بردار ہونا چاہیئے۔ **ارکانِ اسلام نجات دینے کے واسطے ہیں۔** مگر اپنی غلطیوں سے لوگ کہیں کے کہیں چلے جاتے ہیں۔ انسان کو اپنے اعمال پر فخر نہیں کرنا چاہیئے اور نہ خوش ہونا چاہیئے۔ جب تک ایسا ایمان خالص حاصل نہ ہو جاوے کہ انسان کی عبادت میں خدا تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو اور اس کو اعمال صالح حاصل نہ ہو جائے۔ (تقاریر جلسہ سالانہ ۱۹۰۶ء صفحہ ۲۰-۲۱)

جہاد بالسّیف

جہاد کے مسئلہ کی فلاسفی اور اس کی اصل حقیقت ایسا ایک پیچیدہ امر اور دقیق نکتہ ہے کہ جس کے نہ سمجھنے کے باعث سے اس زمانہ اور ایسا ہی درمیانی زمانہ کے لوگوں نے بڑی بڑی غلطیاں کھائی ہیں۔ اور ہمیں نہایت شرم زدہ ہو کر قبول کرنا پڑتا ہے کہ ان خطرناک غلطیوں کی وجہ سے اسلام کے مخالفوں کو موقع ملا کہ وہ اسلام جیسے پاک اور مقدس مذہب کو جو سراسر قانون قدرت کا آئینہ اور زندہ خدا کا جلال ظاہر کرنے والا ہے موردِ اعتراض ٹھہراتے ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ **جہاد** کا لفظ جہد کے لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں **کوشش کرنا**۔ اور پھر مجاز کے طور پر دینی لڑائیوں کے لئے بولا گیا ....

اب ہم اس سوال کا جواب لکھنا چاہتے ہیں کہ **اسلام کو جہاد کی کیوں ضرورت پڑی** اور **جہاد** کیا چیز ہے؟ سو واضح ہو کہ اسلام کو پیدا ہوتے ہی بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور تمام قومیں اس کی دشمن ہو گئی تھیں۔ جیسا کہ یہ ایک معمولی بات ہے کہ جب ایک نبی یا رسول خدا کی طرف سے مبعوث ہوتا ہے اور اس کا فرقہ لوگوں کو ایک گروہِ ہونہار اور راستباز اور باہمّت اور ترقی کرنیوالا دکھائی دیتا ہے تو اس کی نسبت موجودہ قوموں اور فرقوں کے دلوں میں ضرور ایک قسم کا بغض اور حسد پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ بالخصوص ہر ایک مذہب کے علماء اور گدی نشین تو بہت ہی بغض ظاہر کرتے ہیں .... اور سراسر نفس کے تابع ہو کر ضرر رسانی کے منصوبے سوچتے ہیں بلکہ بسا اوقات وہ اپنے دلوں میں محسوس بھی کرتے ہیں کہ وہ خدا کے ایک پاک دل بندہ کو ناحق ایذار پہنچا کر خدا کے غضب کے نیچے آگئے ہیں اور اُن کے اعمال بھی جو مخالف کارستانیوں کے لئے ہر وقت اُن سے سرزد ہوتے رہتے ہیں ان کے دل کی قصور وار حالت کو اُن پر ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی حسد کی آگ کا تیز انجن عداوت کے گڑھوں کی طرف اُن کو کھینچے لئے جاتا ہے۔ یہی اسباب تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں مشرکوں اور یہودیوں اور عیسائیوں کے عالموں کو نہ محض حق کے قبول کرنے سے محروم رکھا بلکہ سخت عداوت پر آمادہ کر دیا۔ لہٰذا وہ اس فکر میں لگ گئے کہ کسی طرح اسلام کو صفحۂ دنیا سے

مٹا دیں۔ اور چونکہ مسلمان اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھوڑے تھے اس لیے اُن کے مخالفوں نے بباعث اس تکبّر کے جو فطرتاً ایسے فرقوں کے دل اور دماغ میں جاگزیں ہوتا ہے جو اپنے تئیں دولت میں۔ مال میں۔ کثرتِ جماعت میں۔ عزت میں۔ مرتبہ میں دوسرے فرقے سے برتر خیال کرتے ہیں اُسوقت کے مسلمانوں یعنی صحابہ سے سخت دشمنی کا برتاؤ کیا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ آسمانی پودہ زمین پر قائم ہو۔ بلکہ وہ ان راستبازوں کے ہلاک کرنے کے لیے اپنے ناخنوں تک زور لگا رہے تھے اور کوئی دقیقہ آزار رسانی کا اٹھا نہیں رکھا تھا۔ اور ان کو خوف یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ اس مذہب کے پیر جم جائیں اور پھر اس کی ترقی ہمارے مذہب اور قوم کی بربادی کا موجب ہو جائے۔ سو اسی خوف سے جو اُن کے دلوں میں ایک رعبناک صورت میں بیٹھ گیا تھا۔ نہایت جابرانہ اور ظالمانہ کارروائیاں اُن سے ظہور میں آئیں۔ اور انہوں نے دردناک طریقوں سے اکثر مسلمانوں کو ہلاک کیا۔ اور ایک زمانہ دراز تک جو تیرہ برس کی مدّت تھی ان کی طرف سے یہی کارروائی رہی اور نہایت بے رحمی کی طرز سے خدا کے وفادار بندے اور نوع انسان کے فخر ان شریر درندوں کی تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کیئے گئے اور یتیم بچے اور عاجز اور مسکین عورتیں کوچوں اور گلیوں میں ذبح کیئے گئے۔ اس پر بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے قطعی طور پر یہ تاکید تھی کہ شر کا ہرگز مقابلہ نہ کرو۔ چنانچہ ان برگزیدہ راستبازوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کے خونوں سے کوچے سُرخ ہو گئے پر انہوں نے دم نہ مارا۔ وہ قربانیوں کی طرح ذبح کیئے گئے پر انہوں نے آہ نہ کی۔ خدا کے پاک اور مقدس رسول کو جس پر زمین اور آسمان سے بے شمار سلام ہیں بارہا پتھر مار مار کر خون سے آلودہ کیا گیا۔ مگر اس صدق اور استقامت کے پہاڑ نے ان تمام آزاروں کی دلی انشراح اور محبت سے برداشت کی اور ان صابرانہ اور عاجزانہ روشوں سے مخالفوں کی شوخی دن بدن بڑھتی گئی اور انہوں نے اس مقدس جماعت کو اپنا ایک شکار سمجھ لیا۔ تب اس خدا نے جو نہیں چاہتا کہ زمین پر ظلم اور بے رحمی حد سے گذر جائے اپنے مظلوم بندوں کو یاد کیا اور اس کا غضب شریروں پر بھڑکا اور اُس نے اپنی پاک کلام قرآن شریف کے ذریعہ سے اپنے مظلوم بندوں کو اطلاع دی کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ میں تمہیں آج سے مقابلہ کی اجازت دیتا ہوں اور میں خدائے قادر ہوں ظالموں کو بے سزا نہیں چھوڑونگا۔ یہ حکم تھا جس کا دوسرے لفظوں میں **جہاد نام رکھا گیا**۔ اور اس حکم کی اصل عبارت جو قرآن شریف میں اب تک موجود ہے یہ ہے:۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۨ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ص ۱-۴)

دوسری نصیحت اگر پادری صاحبان سُنیں تو یہ ہے کہ وہ ایسے اعتراض سے پرہیز کریں جو خود اُن کی کتب مقدسہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک بڑا اعتراض جس سے بڑھکر شاید اُن کی نظر میں اور کوئی اعتراض ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر نہیں ہے وہ لڑائیاں ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو باذن اللہ ان کفار سے کرنی پڑیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مکّہ میں تیرہ برس تک انواع اقسام کے ظلم کئے اور ہریک طریق سے ستایا اور دُکھ دیا اور پھر قتل کا ارادہ کیا جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو معہ اپنے اصحاب کے مکہ چھوڑنا پڑا اور پھر بھی باز نہ آئے۔ اور تعاقب کیا اور ہریک بے ادبی اور تکذیب کا حصہ لیا اور جو مکّہ میں ضعفاء مسلمانوں میں سے رہ گئے تھے ان کو غایت درجہ دکھ دینا شروع کیا۔ لہٰذا وہ لوگ خدا تعالے کی نظر میں اپنے ظالمانہ کاموں کی وجہ سے اس لائق ٹھہر گئے کہ اُن پر موافق سنّت قدیمہ الٰہیہ کے کوئی عذاب نازل ہو اور اس عذاب کی وہ قومیں بھی سزاوار تھیں جنہوں نے مکّہ والوں کو مدد دی اور نیز وہ قومیں بھی جنہوں نے اپنے طور سے ایذا اور تکذیب کو انتہا تک پہنچایا۔ اور اپنی طاقتوں سے اسلام کی اشاعت سے مانع آئے۔ سو جنہوں نے اسلام پر تلواریں اٹھائیں وہ اپنی شوخیوں کی وجہ سے تلواروں سے ہی ہلاک کئے گئے۔ اب اس صورت کی لڑائیوں پر اعتراض کرنا اور حضرت موسیٰ اور دوسرے اسرائیلی نبیوں کی اُن لڑائیوں کو بھلا دینا جن میں لاکھوں شیر خوار بچے قتل کئے گئے کیا یہ دیانت کا طریق ہے یا ناحق کی شرارت اور خیانت اور فساد انگیزی ہے۔ اس کے جواب میں حضرات عیسائی یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی لڑائیوں میں بہت ہی نرمی پائی جاتی ہے کہ اسلام لانے پر چھوڑا جاتا تھا۔ اور شیر خوار بچوں کو قتل نہیں کیا اور نہ عورتوں کو نہ بڈھوں کو اور نہ فقیروں اور مسافروں کو مارا۔ اور نہ عیسائیوں اور یہودیوں کے گرجاؤں کو مسمار کیا۔ لیکن اسرائیلی نبیوں نے ان سب باتوں کو کیا۔ یہاں تک کہ تین لاکھ سے بھی کچھ زیادہ شیر خوار بچے قتل کئے گئے۔ گویا حضرات پادریوں کی نظر میں اس نرمی کی وجہ سے اسلام کی لڑائیاں قابلِ اعتراض ٹھہریں کہ اُن میں وہ سختی نہیں جو حضرت موسیٰ اور دوسرے اسرائیلی نبیوں کی لڑائیوں میں تھی۔ اگر اس درجہ کی سختی پر یہ لڑائیاں بھی ہوتیں تو قبول کر لیتے کہ درحقیقت یہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اب ہریک عقلمند کے سوچنے کے لائق ہے کہ کیا یہ جواب ایمانداری کا جواب ہے؟ حالانکہ آپ ہی کہتے ہیں کہ خدا رحم ہے اور اس کی سزا رحم سے خالی نہیں۔ پھر جب موسیٰ کی لڑائیاں باوجود اس سختی کے قبول کی گئیں اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ٹھہریں تو کیوں اور کیا وجہ کہ یہ لڑائیاں جو الٰہی رحم

کی **خوشبو** ساتھ رکھتی ہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوئیں؟ اور ایسے لوگ کہ اِن باتوں کو بھی خدا تعالیٰ کے احکام سمجھتے ہیں کہ شیرخوار بچے اُن کی ماؤں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کیا جائیں اور ماؤں کو اُن کے بچوں کے سامنے بے رحمی سے مارا جائے وہ کیوں ان لڑائیوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ سمجھیں جن میں یہ شرط ہے کہ پہلے مظلوم ہو کر پھر ظالم کا مقابلہ کرو۔

(آریہ دھرم ص۸۱-۸۳ حاشیہ)

اگر تلوار کے ذریعہ سے خدا کا عذاب نازل ہونا خدا کی صفات کے مخالف ہے تو کیوں نہ یہ اعتراض اوّل موسیٰ سے ہی شروع کیا جائے جس نے قوموں کو قتل کر کے خون کی نہریں بہادیں اور کسی کی توبہ کو بھی قبول نہ کیا۔ قرآنی جنگوں نے تو توبہ کا دروازہ کھلا رکھا۔ جو عین قانونِ قدرت اور خدا کے رحم کے موافق ہے کیونکہ اب بھی جب خدا تعالیٰ طاعون اور ہیضہ وغیرہ سے اپنا عذاب دنیا پر نازل کرتا ہے تو ساتھ ہی طبیبوں کو ایسی ایسی بوٹیاں اور تدبیروں کا بھی علم دے دیتا ہے جس سے اِس آتش وبار کا انسداد ہو سکے۔ سو یہ موسیٰ کے طریق جنگ پر اعتراض ہے کہ اس میں قانونِ قدرت کے موافق کوئی طریق بچاؤ قائم نہیں کیا گیا۔ ہاں بعض بعض جگہ قائم بھی کیا گیا ہے مگر کلّی طور پر نہیں۔ الغرض جبکہ یہ سنت اللہ یعنی تلوار سے ظالم منکروں کو ہلاک کرنا قدیم سے چلی آتی ہے تو قرآن شریف پر کیوں خصوصیت کے ساتھ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کیا موسیٰ کے زمانہ میں خدا کوئی اور تھا؟ اور اسلام کے زمانہ میں کوئی اور ہو گیا؟ یا خدا کو اُس وقت لڑائیاں پیاری لگتی تھیں اور اب بُری دکھائی دیتی ہیں؟

اور یہ بھی فرق یاد رہے کہ اسلام نے صرف ان لوگوں کے مقابل پر تلوار اُٹھانا حکم فرمایا ہے کہ جو اوّل آپ تلوار اُٹھائیں۔ اور انہیں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے جو اوّل آپ قتل کریں۔ یہ حکم ہرگز نہیں دیا کہ تم ایک کافر بادشاہ کے تحت میں ہو کر اور اس کے عدل اور انصاف سے فائدہ اٹھا کر پھر اسی پر باغیانہ حملہ کرو۔ قرآن کے رو سے یہ بدمعاشوں کا طریق ہے نہ نیکوں کا لیکن توریت نے یہ فرق کسی جگہ نہیں کھول کر بیان فرمایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن شریف اپنے جلالی اور جمالی احکام میں اس خطِ مستقیم عدل اور انصاف اور رحم اور احسان پر چلتا ہے۔ جس کی نظیر دنیا میں کسی کتاب میں موجود نہیں۔

(انجام آتھم ص۳۷)

یاد رہے کہ ہمارے **مخالفین کی یہ بڑی زبردستی** ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں

کہ الہامی ہدایت ایسی ہونی چاہیئے جس کے کسی مقام اور کسی محل میں دشمنوں کے مقابلہ کی تعلیم نہ ہو اور ہمیشہ حلم اور نرمی کے پیرایہ میں اپنی محبت اور رحمت کو ظاہر کرے۔ ایسے لوگ اپنی دانست میں خدائے عزّوجلّ کی بڑی تعظیم کر رہے ہیں کہ جو اس کی تمام صفاتِ کاملہ کو صرف نرمی اور ملائمت پر ہی ختم کرتے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں فکر اور غور کرنے والوں پر بآسانی کھل سکتا ہے کہ یہ لوگ بڑی موٹی اور فاش غلطی میں مبتلا ہیں۔ خدا کے قانونِ قدرت پر نظر ڈالنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کے لئے وہ رحمتِ محض تو ضرور ہے مگر وہ رحمت ہمیشہ اور ہر حال میں نرمی اور ملائمت کے رنگ میں ظہور پذیر نہیں ہوتی بلکہ وہ سراسر رحمت کے تقاضا سے طبیب حاذق کی طرح کبھی شربتِ شیریں ہمیں پلاتا ہے اور کبھی دوائی تلخ دیتا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۱۳۷)

تمام سچے مسلمان جو دنیا میں گذرے کبھی ان کا یہ عقیدہ نہیں ہوا کہ اسلام کو تلوار سے پھیلانا چاہیئے بلکہ **ہمیشہ اسلام اپنی ذاتی خوبیوں** کی وجہ سے دنیا میں پھیلا ہے پس جو لوگ مسلمان کہلا کر صرف یہی بات جانتے ہیں کہ اسلام کو تلوار سے پھیلانا چاہیئے وہ اسلام کی ذاتی خوبیوں کے معترف نہیں ہیں اور ان کی کارروائی درندوں کی کارروائی سے مشابہ ہے۔

(تریاق القلوب ص۳۵ حاشیہ)

قرآن میں صاف حکم ہے کہ **دین کے پھیلانے کیلئے تلوار مت اٹھاؤ** اور دین کی ذاتی خوبیوں کو پیش کرو۔ اور نیک نمونوں سے اپنی طرف کھینچو۔ اور یہ مت خیال کرو کہ ابتداء میں اسلام میں تلوار کا حکم ہوا۔ کیونکہ وہ تلوار دین کو پھیلانے کے لئے نہیں کھینچی گئی تھی بلکہ دشمنوں کے حملوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اور یا امن قائم کرنے کے لئے کھینچی گئی تھی۔ مگر دین کیلئے جبر کرنا کبھی مقصد نہ تھا۔

(ستارہ قیصریہ ص۱۶)

میں نہیں جانتا کہ ہمارے مخالفوں نے کہاں سے اور کس سے سُن لیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ خدا تو قرآن شریف میں فرماتا ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ یعنی دینِ اسلام میں جبر نہیں۔ تو پھر کس نے جبر کا حکم دیا۔ اور جبر کے کونسے سامان تھے؟ اور کیا وہ لوگ جو جبر سے مسلمان کئے جاتے ہیں ان کا یہی صدق اور یہی ایمان ہوتا ہے کہ بغیر کسی تنخواہ پانے کے باوجود دو تین سو آدمی ہونے کے ہزاروں آدمیوں کا مقابلہ کریں اور جب ہزار تک پہنچ جاویں

تو کئی لاکھ دشمن کو شکست دیدیں اور دین کو دشمن کے حملے سے بچانے کیلئے بھیڑوں بکریوں کی طرح سر کٹا دیں اور اسلام کی سچائی پر اپنے خون سے مہریں کر دیں - اور خدا کی توحید کے پھیلانے کے لئے ایسے عاشق ہوں کہ درویشانہ طور پر سختی اٹھا کر **افریقہ** کے ریگستان تک پہنچیں اور اس ملک میں اسلام کو پھیلا دیں اور پھر ہر یک قسم کی صعوبت اٹھا کر **چین** تک پہنچیں نہ جنگ کے طور پر بلکہ درویشانہ طور پر اور اس ملک میں پہنچ کر دعوتِ اسلام کریں - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بابرکت وعظ سے کئی کروڑ مسلمان اس زمین میں پیدا ہو جاویں - اور پھر ٹاٹ پوش درویشوں کے رنگ میں **ہندوستان** میں آئیں اور بہت سے حصہ **آریہ ورت** کو اسلام سے مشرف کر دیں اور **یورپ** کی حدود تک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی آواز پہنچا دیں - تم ایماناً کہو کہ کیا یہ کام ان لوگوں کا ہے جو جبراً مسلمان کئے جاتے ہیں - جن کا دل کافر اور زبان مومن ہوتی ہے - نہیں بلکہ یہ ان لوگوں کے کام ہیں جن کے دل نور ایمان سے بھر جاتے ہیں اور جن کے دلوں میں خدا ہی خدا ہوتا ہے -

(پیغام صلح ص ۵۱-۵۳)

مسیح موعود دنیا میں آیا ہے تاکہ دین کے نام سے تلوار اٹھانے کے خیال کو دور کرے - اور اپنے حجج اور براہین سے ثابت کر دکھائے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی اشاعت میں تلوار کی مدد کا ہرگز محتاج نہیں بلکہ اس کی تعلیم کی ذاتی خوبیاں اور اس کے حقائق و معارف و حجج و براہین اور خدا تعالیٰ کی زندہ تائیدات اور نشانات اور اس کا ذاتی جذب ایسی چیزیں ہیں جو ہمیشہ اس کی ترقی اور اشاعت کا موجب ہوئی ہیں - اس لئے وہ تمام لوگ آگاہ رہیں جو اسلام کے بزور شمشیر پھیلائے جانے کا اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں - اسلام کی تاثیرات اپنی اشاعت کے لئے کسی جبر کی محتاج نہیں ہیں - اگر کسی کو شک ہے تو وہ میرے پاس رہ کر دیکھ لے کہ اسلام اپنی زندگی کا ثبوت براہین اور نشانات سے دیتا ہے -

اب خدا تعالیٰ چاہتا ہے اور اس نے ارادہ فرمایا ہے کہ ان تمام اعتراضوں کو اسلام کے پاک وجود سے دور کر دے جو خبیث آدمیوں نے اس پر کئے ہیں - تلوار کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کا اعتراض کرنے والے اب **سخت شرمندہ** ہونگے -

(ملفوظات جلد سوم ص ۱۷۶)

امّا العقيدة المشهورةُ اعنى قول بعض العلماء اَنّ المسيح الموعود ينزل من السماء ويقاتل الكفّار ولا يقبل الجزية بل امّا القتل واما الاسلام

فاعلموا انّها باطلةٌ و مملوّةٌ من انواع الخطاء والزلّة ومن امور تخالف نصوص القرآن وما هي الّا تلبيسات المفترين -

(نورالحق حصہ اوّل ص۶۶)

اسلام میں جبر کو دخل نہیں ۔ اسلام کی لڑائیاں تین قسم سے باہر نہیں : —

(۱) دفاعی طور پر یعنی بہ طریق حفاظت خود اختیاری -

(۲) بطور سزا یعنی خون کے عوض میں خون -

(۳) بطور آزادی قائم کرنے کے ۔ یعنی بغرض مزاحموں کی قوت توڑنے کے جو مسلمان ہونے پر قتل کرتے تھے -

پس جس حالت میں اسلام میں یہ ہدایت ہی نہیں کہ کسی شخص کو جبر اور قتل کی دھمکی سے دین میں داخل کیا جائے تو پھر کسی **خونی مہدی یا خونی مسیح** کی انتظار کرنا سراسر لغو اور بیہودہ ہے ۔ کیونکہ ممکن نہیں کہ قرآنی تعلیم کے برخلاف کوئی ایسا انسان بھی دنیا میں آوے جو تلوار کے ساتھ لوگوں کو مسلمان کرے -

(مسیح ہندوستان میں ص۱۱)

سوچنا چاہیئے کہ اگر مثلاً ایک شخص ایک سچے مذہب کو اس وجہ سے قبول نہیں کرتا کہ وہ اسکی سچائی اور اسکی پاک تعلیم اور اس کی خوبیوں سے ہنوز ناواقف اور بے خبر ہے تو کیا ایسے شخص کے ساتھ یہ برتاؤ مناسب ہے کہ بلاتوقف اس کو قتل کر دیا جائے بلکہ ایسا شخص **قابل رحم** ہے اور اس لائق ہے کہ نرمی اور خلق سے اس مذہب کی سچائی اور خوبی اور روحانی منفعت اُس پر ظاہر کی جائے ۔ نہ یہ کہ اس کے انکار کا تلوار یا بندوق سے جواب دیا جائے ۔ لہذا اس زمانے کے ان اسلامی فرقوں کا مسئلہ جہاد اور پھر اس کے ساتھ یہ تعلیم کہ عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ جب ایک **خونی مہدی** پیدا ہوگا جس کا نام **امام محمد** ہوگا اور مسیح اس کی مدد کے لئے آسمان سے اُترے گا اور وہ دونوں مل کر دنیا کی تمام غیر قوموں کو اسلام کے انکار پر قتل کر دینگے نہایت درجہ اخلاقی مسئلہ کے مخالف ہے ۔ کیا یہ وہ عقیدہ نہیں ہے کہ جو انسانیت کے تمام پاک قوی کو معطّل کرتا اور درندوں کی طرح جذبات پیدا کر دیتا ہے - اور ایسے عقائد والوں کو ہر ایک قوم سے منافقانہ زندگی بسر کرنی پڑتی ہے -

(مسیح ہندوستان میں ص۶-۷)

یاد رہے کہ **مسئلہ جہاد** کو جس طرح پر حال کے اسلامی علماء نے جو مولوی کہلاتے ہیں سمجھ رکھا ہے اور جس طرح وہ عوام کے آگے اس مسئلہ کی صورت بیان کرتے ہیں ہرگز وہ صحیح نہیں ہے۔ اور اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ لوگ اپنے پُرجوش وعظوں سے عوام وحشی صفات کو ایک درندہ صفت بنادیں اور انسانیت کی تمام پاک خوبیوں سے بے نصیب کردیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ اور مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ جس قدر ایسے ناحق کے خون ان نادان اور نفسانی انسانوں سے ہوتے ہیں کہ جو اس راز سے بے خبر ہیں کہ کیوں اور کس وجہ سے اسلام کو اپنے ابتدائی زمانہ میں لڑائیوں کی ضرورت پڑی تھی ان سب کا گناہ ان مولویوں کی گردن پر ہے کہ جو پوشیدہ طور پر ایسے مسئلے سکھاتے رہتے ہیں۔ جنکا نتیجہ دردناک خونریزیاں ہیں۔ یہ لوگ جب حکام وقت کو ملتے ہیں تو اس قدر سلام کے لئے جھکتے ہیں کہ گویا سجدہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور جب اپنے ہم جنسوں کی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں تو بار بار اصرار ان کا اسی بات پر ہوتا ہے کہ **یہ ملک دارالحرب ہے** اور اپنے دلوں میں جہاد کرنا فرض سمجھتے ہیں۔ اور تھوڑے ہیں جو اس خیال کے انسان نہیں ہیں۔ یہ لوگ اپنے اس عقیدہ جہاد پر جو سراسر غلط اور قرآن اور حدیث کے برخلاف ہے اس قدر جمے ہوئے ہیں کہ جو شخص اس عقیدہ کو نہ مانتا ہو اور اس کے برخلاف ہو اس کا نام دجّال رکھتے ہیں اور واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی مدت سے اسی فتوے کے نیچے ہوں .... مگر وہ یاد رکھیں کہ درحقیقت یہ جہاد کا مسئلہ جیسا کہ ان کے دلوں میں ہے صحیح نہیں ہے۔ اور اس کا پہلا قدم انسانی ہمدردی کا خون کرنا ہے۔ یہ خیال ان کا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ جب پہلے زمانہ میں جہاد روا رکھا گیا ہے تو پھر کیا وجہ کہ اب حرام ہو جائے۔ اس کے ہمارے پاس **دو جواب** ہیں ایک یہ کہ یہ خیال قیاس مع الفارق ہے اور ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ہرگز کسی پر تلوار نہیں اٹھائی بجز اُن لوگوں کے جنہوں نے پہلے تلوار اٹھائی اور سخت بے رحمی سے بے گناہ اور پرہیزگار مردوں اور عورتوں اور بچوں کو قتل کیا۔ اور ایسے دردانگیز طریقوں سے مارا کہ اب بھی اُن قصوں کو پڑھ کر رونا آتا ہے۔ **دوسرے** یہ کہ اگر فرض بھی کرلیں کہ اسلام میں ایسا ہی جہاد تھا جیسا کہ ان مولویوں کا خیال ہے تاہم اس زمانہ میں وہ حکم قائم نہیں رہا کیونکہ لکھا ہے کہ جب مسیح موعود ظاہر ہو جائیگا تو سیفی جہاد اور مذہبی جنگوں کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ مسیح نہ تلوار اٹھائیگا اور نہ کوئی اور زمینی ہتھیار ہاتھ میں پکڑے گا بلکہ **اُس کی دُعا اُسکا**

حربہ ہوگا اور **اُس عقدِ ہمت اُس کی تلوار ہوگی**۔ وہ صلح کی بنیاد ڈالے گا اور بکری اور شیر کو ایک ہی گھاٹ پر اکٹھے کرے گا۔ اور اس کا زمانہ صلح اور نرمی اور انسانی ہمدردی کا زمانہ ہوگا۔ ہائے افسوس کیوں یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ تیرہ سو برس ہوئے کہ مسیح موعود کی شان میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مونہہ سے کلمہ یضع الحرب جاری ہو چکا ہے ......

اے اسلام کے عالمو اور مولویو! میری بات سنو! میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اب جہاد کا وقت نہیں ہے۔ خدا کے پاک نبی کے نافرمان مت بنو۔ مسیح موعود جو آنے والا تھا آچکا اور اس نے حکم بھی دیا کہ آئندہ مذہبی جنگوں سے جو تلوار اور کُشت و خون کے ساتھ ہوتی ہیں باز آجاؤ۔ تو اب بھی خونریزی سے باز نہ آنا اور ایسے وعظوں سے مُنہ بند نہ کرنا طریق اسلام نہیں ہے۔ جس نے مجھے قبول کیا ہے وہ نہ صرف ان وعظوں سے مُنہ بند کرے گا بلکہ اس طریق کو نہایت بُرا اور موجب غضب الٰہی جانے گا ....

غرض اب جب مسیح موعود آگیا تو ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جہاد سے باز آوے۔ اگر میں نہ آیا ہوتا تو شائد اس غلط فہمی کا کسی قدر عذر بھی ہوتا۔ مگر اب تو میں آگیا اور تم نے وعدہ کا دن دیکھ لیا۔ اس لیے اب مذہبی طور پر تلوار اٹھانے والوں کا خدا تعالےٰ کے سامنے کوئی عذر نہیں۔ جو شخص آنکھیں رکھتا ہے اور حدیثوں کو پڑھتا اور قرآن کو دیکھتا ہے وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہ طریق جہاد جس پر اس زمانہ کے اکثر وحشی کاربند ہو رہے ہیں **یہ اسلامی جہاد نہیں ہے**۔ بلکہ یہ نفس امّارہ کے جوشوں سے یا بہشت کی طمع خام سے ناجائز حرکات ہیں جو مسلمانوں میں پھیل گئے ہیں۔ ....

جاہل مولویوں نے خدا ان کو ہدایت دے عوام کالانعام کو بڑے دھوکے دیئے ہیں۔ اور بہشت کی کنجی **اسی عمل کو** قرار دے دیا ہے۔ جو صریح ظلم اور بے رحمی اور انسانی اخلاق کے برخلاف ہے۔ کیا یہ نیک کام ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مثلاً اپنے خیال میں بازار میں چلا جاتا ہے۔ اور ہم اس قدر اس سے بے تعلق ہیں کہ نام تک بھی نہیں جانتے اور نہ وہ ہمیں جانتا ہے مگر تاہم ہم نے اس کے قتل کرنے کے ارادہ سے ایک پستول اس پر چھوڑ دیا ہے۔ **کیا یہی دینداری ہے؟** **اگر یہ کچھ نیکی کا کام ہے** تو پھر درندے ایسی نیکی کے بجا لانے میں انسانوں سے بڑھ کر ہیں۔ سبحان اللہ وہ لوگ کیسے راستباز اور نبیوں کی رُوح اپنے اندر رکھتے تھے کہ جب خدا نے مکّہ میں اُن کو یہ حکم دیا کہ بدی کا مقابلہ مت کرو اگرچہ ٹکڑے ٹکڑے کئے جاؤ۔ پس وہ اس حکم کو پا کر

شیرخوار بچوں کی طرح عاجز اور کمزور بن گئے۔ گویا نہ ان کے ہاتھوں میں زور ہے نہ انکے بازوؤں میں طاقت ....

افسوس کا مقام ہے اور شرم کی جگہ ہے کہ ایک شخص جس سے ہماری کچھ سابق دشمنی بھی نہیں بلکہ روشناسی بھی نہیں وہ کسی دکان پر اپنے بچوں کے لئے کوئی چیز خرید رہا ہے یا اپنے کسی اور جائز کام میں مشغول ہے۔ اور ہم نے بے وجہ بے تعلق اس پر پستول چلا کر ایک دم میں اس کی بیوی کو بیوہ اور اس کے بچوں کو یتیم اور اس کے گھر کو ماتم کدہ بنا دیا۔ یہ طریق کس حدیث میں لکھا ہے یا کس آیت میں مرقوم ہے؟ **کوئی مولوی ہے جو اس کا جواب دے؟** نادانوں نے جہاد کا نام سن لیا ہے اور پھر اس بہانہ سے اپنی نفسانی اغراض کو پورا کرنا چاہا ہے۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ص۱۲)

دیکھو میں ایک حکم لے کر آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ **اب سے تلوار کے جہاد کا خاتمہ ہے۔ مگر اپنے نفسوں کے پاک کرنے کا جہاد باقی ہے۔** اور یہ بات میں نے اپنی طرف سے نہیں کہی بلکہ خدا کا یہی ارادہ ہے۔ صحیح بخاری کی اس حدیث کو سوچو۔ جہاں مسیح موعود کی تعریف میں لکھا ہے کہ یضع الحرب یعنی مسیح جب آئیگا تو دینی جنگوں کا خاتمہ کر دیگا۔ سو **میں حکم دیتا ہوں** کہ جو میری فوج میں داخل ہیں وہ ان خیالات کے مقام سے پیچھے ہٹ جائیں۔ دلوں کو پاک کریں اور اپنے انسانی رحم کو ترقی دیں اور دردمندوں کے ہمدرد بنیں۔ زمین پر صلح پھیلا دیں کہ اس سے ان کا دین پھیلیگا اور اس سے تعجب مت کریں کہ ایسا کیونکر ہوگا۔ کیونکہ جیسا کہ خدا نے بغیر توسط معمولی اسباب کے جسمانی ضرورتوں کے لئے حال کی نئی ایجادوں میں زمین کے عناصر اور زمین کی تمام چیزوں سے کام لیا ہے اور ریل گاڑیوں کو گھوڑوں سے بھی بہت زیادہ دوڑا کر دکھلا دیا ہے ایسا ہی اب وہ روحانی ضرورتوں کے لئے بغیر توسط انسانی ہاتھوں کے آسمان کے فرشتوں سے کام لے گا۔ بڑے بڑے آسمانی نشان ظاہر ہونگے اور بہت سی چمکیں پیدا ہونگی جن سے بہت سی آنکھیں کھل جائیں گی۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ص۱۴-۱۵)

قضاء و قدر

یاد رہے کہ اگرچہ قضاء و قدر میں سب کچھ مقرر ہو چکا ہے مگر قضاء و قدر نے علوم کو ضائع نہیں کیا سو جیسا کہ باوجود تسلیم مسئلہ قضاء و قدر کے ہر ایک کو علمی تجارب کے ذریعہ سے ماننا پڑتا ہے کہ بیشک دواؤں میں خواص پوشیدہ ہیں اور اگر مرض کے مناسب حال کوئی دوا استعمال ہو تو خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے بیشک مریض کو فائدہ ہوتا ہے۔ سو ایسا ہی علمی تجارب کے ذریعہ سے ہر ایک **عارف** کو ماننا پڑا ہے کہ دُعا کا قبولیت کے ساتھ ایک رشتہ ہے۔ ہم اس راز کو معقولی طور پر دوسروں کے دلوں میں بٹھا سکیں یا نہ بٹھا سکیں مگر کروڑہا راستبازوں کے **تجارب** نے اور خود ہمارے تجربہ نے اس **مخفی حقیقت** کو ہمیں دکھلا دیا ہے کہ ہمارا دُعا کرنا ایک قوّت مقناطیسی رکھتا ہے۔ اور فضل اور رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

(ایّام الصلح ص۱۱)

قضاء و قدر درحقیقت ایک ایسی چیز ہے جس کے احاطہ سے باہر نکل جانا انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔

(براہین احمدیہ حصّہ پنجم ص۱)

انسان تقدیر الٰہی کے ماتحت ہے۔ اگر خدا کا ارادہ انسان کے ارادے کے مطابق نہ ہو تو انسان ہزار جدوجہد کرے اپنے ارادہ کو پورا نہیں کر سکتا۔ لیکن جب خدا کے ارادہ کا وقت آجاتا ہے تو وہی امور جو بہت مشکل نظر آتے تھے نہایت آسانی سے میسّر آجاتے ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۲)

تقدیر دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک کا نام **معلّق** ہے اور دوسری کو **مبرم** کہتے ہیں۔ اور کوئی تقدیر معلّق ہو تو دُعا اور صدقات اس کو ٹلا دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے اس تقدیر کو بدل دیتا ہے۔ مبرم ہونے کی صورت میں وہ صدقات اور دعا اس تقدیر کے متعلق کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ ہاں وہ عبث اور فضول بھی نہیں رہتی۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اُس دُعا اور صدقات کا اثر اور نتیجہ کسی دوسرے پیرائے میں اس کو پہنچا دیتا ہے بعض صورتوں میں

ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی تقدیر میں ایک وقت تک توقف اور تاخیر ڈال دیتا ہے۔
قضائے معلّق اور مبرم کا ماخذ اور پتہ قرآن کریم سے ملتا ہے۔

(ملفوظات جلد اوّل ص۱۵۱)

قرآن شریف نے اِن امور کو جن سے احمق معترضوں نے جبر کی تعلیم نکالی ہے محض اس عظیم الشان اصول کو قائم کرنے کیلئے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور ہر ایک امر کا مبدء اور مرجع وہی ہے۔ وہی علّت العلل اور مُسبّبُ الاسباب ہے۔ یہ غرض ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بعض درمیانی وسائط اُٹھا کر اپنے علّت العلل ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ ورنہ قرآن شریف کو پڑھو اس میں بڑی صراحت کے ساتھ ان اسباب کو بھی بیان فرمایا جس کی وجہ سے انسان مکلّف ہو سکتا ہے۔

علاوہ بریں قرآن شریف جس حال میں اعمال بد کی سزا ٹھہراتا ہے اور حدود قائم کرتا ہے اگر قضاء و قدر میں کوئی تبدیلی ہونے والی نہ تھی اور انسان مجبور مطلق تھا تو ان حدود و شرائع کی ضرورت ہی کیا تھی۔

پس یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف دہریوں کی طرح تمام امور کو اسباب طبعیہ تک محدود رکھنا نہیں چاہتا بلکہ خالص توحید پر پہنچانا چاہتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے دعا کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور نہ قضاء قدر کے تعلقات کو جو دعا کے ساتھ ہیں تدبّر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ جو لوگ دُعا سے کام لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے راہ کھول دیتا ہے۔ وہ دعا کو ردّ نہیں کرتا۔ ایک طرف دُعا ہے دوسری طرف قضاء و قدر۔ خدا نے ہر ایک کیلئے اپنے رنگ میں اوقات مقرر کر دیئے ہیں اور ربوبیت کے حصہ کو عبودیت میں دیا گیا ہے اور فرمایا ہے اُدعونی استجب لکم۔ مجھے پکارو میں جواب دونگا۔ مَیں اسی لئے ہی کہا کرتا ہوں کہ ناطق خدا مسلمانوں کا ہے۔ لیکن جس خدا نے کوئی ذرہ پیدا نہیں کیا یا جو خود یہودیوں سے طمانچے کھا کر مرگیا وہ کیا جواب دے گا ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی ؂ کہ با آسماں نیز پرداختی

جبر اور قدر کے مسئلہ کو اپنی خیالی اور فرضی منطق کے معیار پر کسنا دانشمندی نہیں ہے اِس سرّ کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنا بے ہودہ ہے۔ الوہیت اور ربوبیت کا کچھ تو ادب بھی چاہیے اور یہ راہ تو ادب کے خلاف ہے کہ الوہیت کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کی جاوے۔ الطریقۃ کلّھا اَدبٌ۔

قضاء قدر کا دُعا کے ساتھ بہت بڑا تعلق ہے۔ دُعا کے ساتھ معلّق تقدیر ٹل جاتی ہے۔ جب مشکلات پیدا ہوتی ہیں تو دُعا ضرور اثر کرتی ہے۔ جو لوگ دُعا سے منکر ہیں اُنکو ایک دھوکا لگا ہُوا ہے۔ قرآن شریف نے دعا کے دو پہلو بیان کئے ہیں۔ ایک پہلو میں اللہ تعالیٰ اپنی منوانا چاہتا ہے اور دوسرے پہلو میں بندے کی مان لیتا ہے وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ میں تو اپنا حق رکھکر منوانا چاہتا ہے۔ نون ثقیلہ سے جو اظہارِ تاکید کیا ہے اِس سے اللہ تعالےٰ کا یہ منشا ہے کہ قضاء مبرم کو ظاہر کریں گے تو اس کا علاج اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ہی ہے۔ اور دوسرا وقت خدا تعالےٰ کے فضل و کرم کی امواج کے جوش کا ہے وہ اُدعونی استجب لکم میں ظاہر کیا ہے۔

پس مؤمن کو ان دونوں مقامات کا پورا علم ہونا چاہیئے۔ صوفی کہتے ہیں کہ فقر کامل نہیں ہوتا جب تک محل اور موقعہ کی شناخت حاصل نہ ہو۔ بلکہ کہتے ہیں صوفی دعا نہیں کرتا جبتک کہ وقت کو شناخت نہ کرے۔

سیّد عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دُعا کے ساتھ شقّی سعید کیا جاتا ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ شدید الاختفاء امور مشبہ بالمبرم بھی دُور کئے جاتے ہیں الغرض دُعا کی اس تقسیم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنی منوانا چاہتا ہے اور کبھی وہ مان لیتا ہے۔ یہ معاملہ گویا دوستانہ معاملہ ہے۔ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جیسی عظیم الشان قبولیت دُعاؤں کی ہے اس کے مقابل رضا اور تسلیم کے بھی آپ اعلیٰ درجہ کے مقام پر ہیں۔ چنانچہ آپ کے گیارہ بچے مرگئے۔ مگر آپ نے کبھی سوال نہ کیا کہ کیوں؟

(ملفوظات جلد سوم صفحہ ۲۲۴-۲۲۶)

عادۃ اللہ یہ ہے کہ جب ایک فعل یا عمل انسان سے صادر ہوتا ہے تو جو کچھ اس میں اثر مخفی یا کوئی خاصیت چھپی ہوئی ہوتی ہے خدا تعالیٰ ضرور اس کو ظاہر کر دیتا ہے۔ مثلاً جس وقت ہم کسی کوٹھڑی کے چاروں طرف سے دروازے بند کر دینگے تو یہ ہمارا فعل ہے جو ہم نے کیا۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر اثر یہ مترتب ہوگا کہ ہماری کوٹھڑی میں اندھیرا ہو جائے گا۔ اور اندھیرا کرنا خدا کا فعل ہے جو قدیم سے اس کے قانون قدرت میں مندرج ہے۔ ایسا ہی جب ہم ایک وزن کافی تک زہر کھا لیں گے تو کچھ شک نہیں کہ یہ ہمارا فعل ہوگا۔ پھر بعد اس کے ہمیں مار دینا یہ خدا کا فعل ہے جو قدیم سے اس کے قانونِ قدرت میں مندرج ہے۔ غرض ہمارے فعل کے ساتھ

ایک فعل خدا کا ضرور ہوتا ہے جو ہمارے فعل کے بعد ظہور میں آتا اور اس کا نتیجہ لازمی ہوتا ہے۔ سو یہ انتظام جیسا کہ ظاہر سے متعلق ہے ایسا ہی باطن سے بھی متعلق ہے۔ ہر ایک ہمارا نیک یا بد کام ضرور اپنے ساتھ ایک اثر رکھتا ہے جو ہمارے فعل کے بعد ظہور میں آتا ہے اور قرآن شریف میں جو خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ آیا ہے اُس میں خدا کے مہر لگانے کے یہی معنے ہیں کہ جب انسان بدی کرتا ہے تو بدی کا نتیجہ اثر کے طور پر اس کے دل پر اور مُنہ پر خدا تعالیٰ ظاہر کر دیتا ہے۔ اور یہی معنے اس آیت کے ہیں کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ۔ یعنی جبکہ وہ حق سے پھر گئے تو خدا تعالےٰ نے اُن کے دل کو حق کی مناسبت سے دُور ڈال دیا۔ اور آخر کو معاندانہ جوش کے اثروں سے ایک عجیب کایا پلٹ اُن میں ظہور میں آئی۔ اور ایسے بگڑے کہ گویا وہ نہ رہے اور رفتہ رفتہ نفسانی مخالفت کے زہر نے اُن کے انوار فطرت کو دبا لیا۔

(کتاب البریہ ص۴۷)

آپ نے **جبر قدر** کا اعتراض پیش کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ قرآن سے جبر ثابت ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں واضح ہو کہ شاید آپ کی نظر سے یہ آیات نہیں گذریں جو انسان کے کسب و اختیار پر صریح دلالت کرتی ہیں اور یہ ہیں۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (س۲۷ - ر۷) کہ انسان کو وہی ملتا ہے جو سعی کرتا ہے۔ جو اُس نے کوشش کی ہو۔ یعنی عمل کرنا اجر پانے کے لئے ضروری ہے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (س۲۲ - ر) یعنی خدا اگر لوگوں کے اعمال پر جو اپنے اختیار سے کرتے ہیں اُن کو پکڑتا تو کوئی زمین پر چلنے والا نہ چھوڑتا۔

اور پھر فرماتا ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (س۳ - ر۳) اس کے لئے جو اس نے کام اچھے کئے۔ اور اُس پر جو اُس نے بُرے کام کئے۔

پھر فرماتا ہے۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ (س۲۴ - ر۶) جو شخص اچھا کام کرے سو اُس کے لیے اور جو بُرا کرے وہ اس کے لئے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَكَيْفَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (س۹ - ر۶) یعنی کس طرح جس وقت پہنچے ان کو مصیبت بوجہ ان اعمال کے جو انکے ہاتھ کر چکے ہیں۔

اب دیکھیئے ان تمام آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے کاموں میں اختیار بھی

رکھتا ہے۔ اور اسجگہ ڈپٹی صاحب نے جو یہ آیت پیش کی ہے يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اور اس سے اُن کا مدّعا یہ ہے کہ اِس سے جبر ثابت ہوتا ہے یہ اُن کی غلط فہمی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اَمر کے معنے حکم اور حکومت کے ہیں اور یہ بعض ان لوگوں کا خیال تھا جنہوں نے کہا کہ کاش اگر حکومت میں ہمارا دخل ہوتا تو ہم ایسی تدابیر کرتے جس سے یہ تکلیف جو جنگ اُحد میں ہوئی ہے پیش نہ آتی۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ یعنی تمام امر خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ تمہیں اپنے رسول کریم کا تابع رہنا چاہیئے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اس آیت کو تقدیر سے کیا تعلق ہے۔ سوال تو صرف بعض آدمیوں کا اتنا تھا کہ اگر ہماری صلاح اور مشورہ لیا جاوے تو ہم اس کے مخالف صلاح دیں۔ تو اللہ تعالےٰ نے اُن کو منع فرمایا کہ اس امر کی اجتہاد پر بنا نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ پھر بعد اس کے واضح رہے کہ **تقدیر کے معنے صرف اندازہ کرنا ہے** جیسے کہ اللہ جلشانہٗ فرماتا ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (س۱۸ - ر۱) یعنی ہر ایک چیز کو پیدا کیا تو پھر اس کے لئے ایک مقرر اندازہ ٹھہرا دیا۔ اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے اختیارات سے روکا گیا ہے۔ بلکہ وہ اختیارات بھی اُسی اندازہ میں آگئے۔ جب خدا تعالیٰ نے انسانی فطرت اور انسانی خوئے کا اندازہ کیا تو اس کا نام تقدیر رکھا اور اِسی میں یہ مقرر کیا کہ فلاں حد تک انسان اپنے اختیارات برت سکتا ہے۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ تقدیر کے لفظ کو ایسے طور پر سمجھا جائے کہ گویا انسان اپنے خدا داد قویٰ سے محروم رہنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اسجگہ تو ایک گھڑی کی مثال ٹھیک آتی ہے کہ گھڑی کا بنانے والا جس حد تک اس کا دور مقرر کرتا ہے اس حد سے وہ زیادہ چل سکتی ہے۔ یہی انسان کی مثال ہے کہ جو قویٰ اس کو دیئے گئے ہیں اُن سے زیادہ وہ کچھ کر نہیں سکتا۔ اور جو عمر دی گئی ہے اس سے زیادہ جی نہیں سکتا۔ اور یہ سوال کہ خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں جبر کے طور پر بعضوں کو جہنمی ٹھہرا دیا ہے اور خواہ نخواہ شیطان کا تسلط اُن پر لازمی طور پر رکھا گیا ہے۔ یہ ایک شرمناک غلطی ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ کہ اے شیطان! میرے بندوں پر تیرا کچھ بھی تسلط نہیں۔ دیکھیئے کس طرح پر اللہ تعالیٰ انسان کی آزادی ظاہر کرتا ہے۔ منصف کے لئے اگر کچھ دل میں انصاف رکھتا ہو تو یہی آیت کافی ہے۔ لیکن انجیل متی سے تو اِسکے برخلاف

ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ انجیل متی سے یہ بات پایۂ ثبوت پہنچتی ہے کہ شیطان حضرت مسیح کو آزمائش کے لئے لے گیا تو یہ ایک قسم کی حکومت شیطان کی ٹھہری کہ ایک مقدس نبی پر اُس نے اس قدر جبر کیا کہ وہ کئی جگہ اس کو لئے پھرا۔ یہاں تک کہ بے ادبی کی راہ سے اُسے یہ بھی کہا کہ تو مجھے سجدہ کر۔ اور ایک بڑے اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی ساری بادشاہتیں اور اُن کی شان و شوکت اُسے دکھلائیں۔ دیکھو متی ۴/۱۸۔ اور پھر غور کر کے دیکھو کہ اس جگہ پر شیطان کیا بلکہ خدائی جلوہ دکھلایا گیا ہے کہ اوّل وہ بھی اپنی مرضی سے مسیح کی خلاف مرضی ایک پہاڑ پر اس کو لے گیا۔ اور دنیا کی بادشاہتیں دکھا دینا خدا تعالیٰ کی طرح اس کی قوت میں ٹھہرا۔

اور بعد اس کے واضح ہو کہ یہ بات جو آپ کے خیال میں جم گئی ہے کہ گویا قرآن کریم نے خواہ نخواہ بعض لوگوں کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے یا خواہ نخواہ دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے یہ اس بات پر دلیل ہے کہ آپ لوگ کبھی انصاف کی پاک نظر کے ساتھ قرآن کریم کو نہیں دیکھتے دیکھو اللہ جلّ شانہٗ کیا فرماتا ہے۔ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (ص ۲۳ - ر ۵) یعنی شیطان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان لوگوں سے جو تیری پیروی کریں بھر دونگا۔ دیکھیئے اس آیت سے صاف طور پر کھل گیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ منشا نہیں ہے کہ خواہ نخواہ لوگوں کو جبر کے طور پر جہنم میں ڈالے۔ بلکہ جو لوگ اپنی بداعمالیوں سے جہنم کے لائق ٹھہریں اُن کو جہنم میں گرایا جاویگا۔ اور پھر فرماتا ہے۔ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ۔ یعنی بہتوں کو اس کلام سے گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو یہ ہدایت دیتا ہے۔ مگر گمراہ اُن کو کرتا ہے جو گمراہ ہونے کے کام کرتے ہیں اور فاسقانہ چالیں چلتے ہیں۔ یعنی انسان اپنے ہی افعال کا نتیجہ خدا تعالیٰ سے پا لیتا ہے۔ جیسے کہ ایک شخص آفتاب کے سامنے کی کھڑکی جب کھول دیتا ہے تو ایک قدرتی اور فطرتی امر ہے کہ آفتاب کی روشنی اور اُسکی کرنیں اس کے مُنہ پر پڑتی ہیں۔ لیکن جب وہ اس کھڑکی کو بند کر دیتا ہے تو اپنے ہی فعل سے اپنے لئے اندھیرا پیدا کر لیتا ہے۔

چونکہ خدا تعالیٰ علّت العلل ہے بوجہ اپنے علّت العلل ہونے کے ان دونوں فعلوں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے لیکن اپنے پاک کلام میں اس نے بارہا تصریح سے فرما دیا ہے کہ ضلالت کے اثر کسی کے دل میں پڑتے وہ اُسی کی بداعمالی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (ص ۲۸ - ر ۹) پس جبکہ وہ کج ہوگئی

تو اللہ تعالےٰ نے اُن کے دلوں کو کج کر دیا۔ پھر دوسرے مقام میں فرماتا ہے۔ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَہُمُ اللّٰہُ مَرَضًا۔ اُن کے دلوں میں مرض تھی۔ خدا تعالیٰ نے اس مرض کو زیادہ کیا یعنی امتحان میں ڈال کر اس کی حقیقت ظاہر کر دی۔ پھر فرماتا ہے۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْہَا بِکُفْرِہِمْ یعنی خدا تعالیٰ نے بباعث اُن کی بے ایمانیوں کے اُن کے دلوں پر مُہریں لگا دیں۔ لیکن یہ جبر کا اعتراض اگر ہو سکتا ہے تو آپ کی کُتب مقدسہ پر ہو گا۔ دیکھو خروج ۴/۲۱۔ خدا نے موسیٰ کو کہا۔ مَیں فرعون کا دل سخت کرونگا۔ اور جب سخت ہُوا تو اس کا نتیجہ جہنم ہے یا کچھ اور ہے۔ دیکھو خروج ۷/۳۔ امثال باب ۱۶/۴۔ پھر خروج ۱۰/۳۔ استثنا ۲۹/۴۔ خدا نے تم کو وہ دل جو سمجھے اور آنکھیں جو دیکھیں اور وہ کان جو سُنیں آج تک نہ دیئے۔ اب دیکھیئے کیسے جبر کی صاف مثال ہے۔ پھر دیکھو زبور ۱۴۸/۶۔ اُس نے ایک تقدیر مقدّر کی جو ٹل نہیں سکتی۔ رومیاں ۹/۱۸۔ کاریگری کا کاریگر پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ اب ان تمام آیات سے آپ کا اعتراض اُلٹ کر آپ ہی پر پڑا۔

(جنگ مقدس ص ۱۴۹-۱۵۲)

تقویٰ

قرآن شریف میں تمام احکام کی نسبت **تقویٰ** اور پرہیزگاری کے لئے بڑی تاکید ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تقویٰ ہر ایک بدی سے بچنے کے لئے قوّت بخشتی ہے اور ہر ایک نیکی کی طرف دوڑنے کے لئے حرکت دیتی ہے۔ اور اس قدر تاکید فرمانے میں بھید یہ ہے کہ تقویٰ ہر ایک باب میں انسان کے لئے سلامتی کا تعویذ ہے اور ہر ایک قسم کے فتنہ سے محفوظ رہنے کیلئے **حصنِ حصین** ہے۔ ایک متقی انسان بہت سے ایسے فضول اور خطرناک جھگڑوں سے بچ سکتا ہے جن میں دوسرے لوگ گرفتار ہو کر بسا اوقات ہلاکت تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اپنی جلد بازیوں اور بدگمانیوں سے قوم میں تفرقہ ڈالتے اور مخالفین کو اعتراض کا موقع دیتے ہیں۔

(ایّام الصلح ص۱۰۵)

تقویٰ کے بہت سے اجزاء ہیں۔ عُجب۔ خودپسندی، مالِ حرام سے پرہیز اور بداخلاقی سے بچنا بھی تقویٰ ہے۔ جو شخص اچھے اخلاق ظاہر کرتا ہے اُس کے دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں۔

(ملفوظات جلد اوّل ص۲۲)

مبارک وہ ہے جو کامیابی اور خوشی کے وقت تقویٰ اختیار کرے۔ اور بدقسمت وہ ہے جو ٹھوکر کھا کر اس کی طرف نہ جھکے۔

(ملفوظات جلد اوّل)

انسان کی تمام روحانی خوبصورتی تقویٰ کی تمام باریک راہوں پر قدم مارنا ہے۔ تقویٰ کی باریک راہیں روحانی خوبصورتی کے لطیف نقوش اور خوشنما خط و خال ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی امانتوں اور ایمانی عہدوں کی حتّی الوسع رعایت کرنا اور سر سے پَیر تک جتنے قویٰ اور اعضاء ہیں جن میں ظاہری طور پر آنکھیں اور کان اور ہاتھ اور پَیر اور دوسرے اعضاء ہیں اور باطنی طور پر دل اور دوسری قوتیں اور اخلاق ہیں۔ ان کو جہاں تک طاقت ہو ٹھیک ٹھیک محلِ ضرورت پر استعمال کرنا اور ناجائز مواضع سے روکنا اور ان کے پوشیدہ حملوں سے متنبہ رہنا اور اسی کے مقابل پر حقوقِ عباد کا بھی لحاظ رکھنا یہ وہ طریق ہے کہ انسان کی تمام

روحانی خوبصورتی اس سے وابستہ ہے اور خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں تقویٰ کو لباس کے نام سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ لِبَاسُ التَّقْوٰی قرآن شریف کا لفظ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رُوحانی خوبصورتی اور روحانی زینت تقویٰ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان خدا کی تمام امانتوں اور ایمانی عہد اور ایسا ہی مخلوق کی تمام امانتوں اور عہد کی حتّی الوسع رعایت رکھے۔ یعنی اُن کے دقیق در دقیق پہلوؤں پر تا بمقدور کاربند ہو جائے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۵۱-۵۲)

حقیقی تقویٰ کے ساتھ جاہلیت جمع نہیں ہو سکتی۔ حقیقی تقویٰ اپنے ساتھ ایک **نور** رکھتی ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ **یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ** ۔ یعنی اے ایمان والو! اگر تم متّقی ہونے پر ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے اِتّقَاء کی صفت میں قیام اور استحکام اختیار کرو تو خدا تعالیٰ تم میں اور تمہارے غیروں میں فرق رکھ دے گا۔ وہ فرق یہ ہے کہ تم کو ایک نُور دیا جائیگا جس نور کے ساتھ تم اپنی تمام راہوں میں چلوگے۔ یعنی وہ نور تمہارے تمام افعال اور اقوال اور قویٰ اور حواس میں آ جائے گا۔ تمہاری عقل میں بھی نُور ہو گا۔ اور تمہاری ایک اٹکل کی بات میں بھی نور ہو گا۔ اور تمہاری آنکھوں میں بھی نور ہو گا اور تمہارے کانوں اور تمہاری زبانوں اور تمہارے بیانوں اور تمہاری ہر ایک حرکت اور سکون میں نور ہو گا اور جن راہوں میں تم چلو گے وہ راہ نورانی ہو جائیں گی۔ غرض جتنی تمہاری راہیں تمہارے قویٰ کی راہیں تمہارے حواس کی راہیں ہیں وہ سب نور سے بھر جائینگی اور تم سراپا نور میں ہی چلو گے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۱۷۷-۱۷۸)

علوم ظاہری اور علوم قرآنی کے حصول کے درمیان ایک **عظیم الشان فرق** ہے۔ دنیوی اور رسمی علوم کے حاصل کرنے کے واسطے **تقویٰ** شرط نہیں ہے۔ صرف و نحو۔ طبعی۔ فلسفہ۔ ہیئت و طبابت پڑھنے کے واسطے یہ ضروری امر نہیں ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو اور امر الٰہی اور نواہی کو ہر وقت مدّنظر رکھتا ہو۔ اپنے ہر فعل و قول کو اللہ تعالےٰ کے احکام کی حکومت کے نیچے رکھے۔ بلکہ بسا اوقات عموماً دیکھا گیا ہے کہ دنیوی علوم کے ماہر اور طلبگار دہریہ منش ہو کر ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آج دنیا کے سامنے ایک زبردست تجربہ موجود ہے۔ یورپ اور امریکہ باوجودیکہ وہ لوگ ارضی علوم میں بڑی بڑی ترقیاں کر رہے ہیں اور

آئے دن نئی ایجادات کرتے رہتے ہیں لیکن اُن کی رُوحانی اور اخلاقی حالت بہت ہی قابلِ شرم ہے۔ لندن کے پارکوں اور پیرس کے ہوٹلوں کے حالات جو کچھ شائع ہوئے ہیں ہم تو ان کا ذکر بھی نہیں کر سکتے مگر علومِ آسمانی اور اسرارِ قرآنی کی واقفیت کے لئے **تقویٰ پہلی شرط ہے**۔ اس میں توبۃ النصوح کی ضرورت ہے۔ جب تک انسان پوری فروتنی اور انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ اٹھائے اور اس کے جلال اور جبروت سے لرزاں ہو کر نیاز مندی کے ساتھ رجوع نہ کرے قرآنی علوم کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ اور رُوح کے ان خواص اور قویٰ کی پرورش کا سامان اسکو قرآن شریف سے نہیں مل سکتا جس کو پا کر رُوح میں ایک لذّت اور تسلّی پیدا ہوتی ہے قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اس کے علوم خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ پس اس کے لئے تقویٰ بطور نردبان کے ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ بے ایمان شریر خبیث النفس ارضی خواہشوں کے اسیر اُن سے بہرہ ور ہوں۔ اسواسطے اگر ایک مسلمان مسلمان کہلا کر خواہ وہ صرف ونحو، معانی وبدیع وغیرہ علوم کا کتنا ہی بڑا فاضل کیوں نہ ہو دنیا کی نظر میں شیخ الکلّ فی الکلّ بنا بیٹھا ہو لیکن اگر تزکیہ نفس نہیں کرتا تو قرآن شریف کے علوم سے اس کو حصّہ نہیں دیا جاتا۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ اس وقت دنیا کی توجہ ارضی علوم کی طرف بہت جھکی ہوئی ہے اور مغربی روشنی نے تمام عالم کو اپنی نئی ایجادوں اور صنعتوں سے حیران کر رکھا ہے۔ مسلمانوں نے بھی اگر اپنی فلاح اور بہتری کی کوئی راہ سوچی تو بدقسمتی سے یہ سوچی ہے کہ وہ مغرب کے رہنے والوں کو اپنا امام بنالیں اور یورپ کی تقلید پر فخر کریں۔ یہ تو نئی روشنی کے مسلمانوں کا حال ہے جو لوگ پُرانے فیشن کے مسلمان کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو حامئ دینِ متین سمجھتے ہیں اُن کی ساری عمر کی تحصیل کا خلاصہ اور لبّ لباب یہ ہے کہ صرف ونحو کے جھگڑوں اور بکھیڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ضَآلِّیْنَ کے تلفّظ پر مرمٹے ہیں۔ قرآن شریف کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں۔ اور ہو کیونکر جبکہ وہ تزکیہ نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۴۰۷ - ۴۰۸)

متقی بننے کے واسطے یہ ضروری ہے کہ بعد اس کے کہ موٹی باتوں جیسے زنا۔ چوری۔ تلفِ حقوق۔ ریاء۔ عجب۔ حقارت۔ بخل کے ترک میں پکّا ہو تو اخلاقِ رذیلہ سے پرہیز کر کے اُنکے بالمقابل اخلاقِ فاضلہ میں ترقی کرے۔ لوگوں سے مروّت خوش خلقی ہمدردی سے پیش آئے خدا تعالیٰ کے ساتھ سچّی وفا اور صدق دکھلاوے۔ خدمات کے مقامِ محمود تلاش کرے۔ ان باتوں سے انسان متقی کہلاتا ہے اور جو لوگ ان باتوں کے جامع ہوتے ہیں وہی اصل متقی ہوتے ہیں۔ یعنی

اگر ایک ایک خُلق فرداً فرداً کسی میں ہوں تو اُسے متقی نہ کہیں گے جب تک بحیثیت مجموعی اخلاق فاضلہ اس میں نہ ہوں۔ اور ایسے ہی شخصوں کیلئے لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ہے۔ اور اس کے بعد اُن کو کیا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ایسوں کا متولّی ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ فرماتا ہے وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ہاتھ ہو جاتا ہے جس سے وہ پکڑتے ہیں۔ اُن کی آنکھ ہو جاتا ہے جس سے وہ دیکھتے ہیں۔ ان کے کان ہو جاتا ہے جن سے وہ سنتے ہیں اُن کے پاؤں ہو جاتا ہے جن سے وہ چلتے ہیں۔ اور ایک اَور حدیث میں ہے کہ جو میرے ولی کی دشمنی کرتا ہے مَیں اس سے کہتا ہوں کہ میرے مقابلہ کیلئے تیار رہو۔ ایک جگہ فرمایا ہے کہ جب کوئی خدا کے ولی پر حملہ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اُس پر ایسے جھپٹ کر آتا ہے جیسے ایک شیرنی سے کوئی اس کا بچہ چھینے تو وہ غضب سے جھپٹتی ہے۔

(ملفوظات جلد چہارم صفحہ ۴۰۰-۴۰۱)

ہمیں اُس یار سے تقویٰ عطا ہے   نہ یہ ہم سے کہ احسانِ خدا ہے
کرو کوشش اگر صدق و صفا ہے   کہ یہ حاصل ہو جو شرطِ بقا ہے
یہی آئینۂ خالق نما ہے   یہی اک جوہر سیفِ دُعا ہے
ہر اک نیکی کی جڑھ یہ اتقا ہے
اگر یہ جڑھ رہی سب کچھ رہا ہے (الہامی مصرع)
یہی اک فخر شانِ اولیا ہے   بجز تقویٰ زیادت اُن میں کیا ہے
ڈرو یارو کہ وہ بینا خدا ہے   اگر سوچو یہی دارالجزا ہے
مجھے تقویٰ سے اُس نے یہ جزا دی
فسبحان الّذی اخزی الاعادی
عجب گوہر ہے جس کا نام تقویٰ   مبارک وہ ہے جس کا کام تقویٰ
سُنو! ہے حاصلِ اسلام تقویٰ   خدا کا عشق مے اور جام تقویٰ
مسلمانو! بناؤ تام تقویٰ   کہاں ایماں اگر ہے خام تقویٰ
یہ دولت تُو نے مجھ کو اے خدا دی
فسبحان الّذی اخزی الاعادی

(درثمین)

زندہ وہی ہیں جو کہ خدا کے قریب ہیں
مقبول بن کے اُس کے عزیز و حبیب ہیں
وہ دُور ہیں خدا سے جو تقویٰ سے دُور ہیں
ہر دم اسیرِ نخوت و کبر و غرور ہیں
تقویٰ یہی ہے یارو کہ نخوت کو چھوڑ دو
کبر و غرور و بخل کی عادت کو چھوڑ دو
اِس بے ثبات گھر کی محبت کو چھوڑ دو
اُس یار کیلئے رہِ عشرت کو چھوڑ دو
لعنت کی ہے یہ راہ سو لعنت کو چھوڑ دو
ورنہ خیالِ حضرتِ عزّت کو چھوڑ دو
تلخی کی زندگی کو کرو صدق سے قبول
تا تم پہ ہو ملائکۂ عرش کا نزول

(براہین احمدیہ حصہ پنجم)

تکبّر

مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ قیامت کے دن شرک کے بعد تکبّر جیسی اَور کوئی بلا نہیں یہ ایک ایسی بلا ہے جو دونوں جہان میں انسان کو رسوا کرتی ہے۔ خدا تعالیٰ کا رحم ہر ایک موحّد کا تدارک کرتا ہے مگر متکبّر کا نہیں۔ شیطان بھی موحّد ہونے کا دم مارتا تھا مگر چونکہ اس کے سر میں تکبّر تھا اور آدم کو جو خدا تعالےٰ کی نظر میں پیارا تھا جب اُس نے توہین کی نظر سے دیکھا اور اُس کی نکتہ چینی کی اس لئے وہ مارا گیا اور طوق لعنت اس کی گردن میں ڈالا گیا۔ سو پہلا گناہ جس سے ایک شخص ہمیشہ کے لئے ہلاک ہوا تکبّر ہی تھا۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۹۸)

مَیں اپنی جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ تکبّر سے بچو کیونکہ تکبّر ہمارے خداوند ذوالجلال کی آنکھوں میں سخت مکروہ ہے۔ مگر تم شاید نہیں سمجھو گے کہ تکبّر کیا چیز ہے پس مجھ سے سمجھ لو کہ میں خدا کی رُوح سے بولتا ہوں۔

ہر ایک شخص جو اپنے بھائی کو اس لئے حقیر جانتا ہے کہ وہ اِس سے زیادہ **عالم** یا زیادہ **عقلمند** یا زیادہ **ہنرمند** ہے وہ **متکبّر** ہے کیونکہ وہ خدا کو سرچشمۂ عقل اور علم کا نہیں سمجھتا اور اپنے تئیں کچھ چیز قرار دیتا ہے۔ کیا خدا قادر نہیں کہ اس کو دیوانہ کر دے اور اس کے اس بھائی کو جس کو وہ چھوٹا سمجھتا ہے اس سے بہتر عقل اور علم اور ہنر دے دے۔ ایسا ہی وہ شخص جو اپنے کسی **مال** یا **جاہ وحشمت** کا تصوّر کر کے اپنے بھائی کو حقیر سمجھتا ہے وہ بھی **متکبّر** ہے کیونکہ وہ اس بات کو بھول گیا ہے کہ یہ جاہ وحشمت خدا نے ہی اس کو دی تھی۔ اور وہ اندھا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ وہ خدا قادر ہے کہ اُس پر ایک ایسی گردش نازل کرے کہ وہ ایکدم میں اَسْفَلُ السَّافِلِیْن میں جا پڑے اور اس کے اُس بھائی کو جس کو وہ حقیر سمجھتا ہے اس سے بہتر مال و دولت عطا کر دے۔ ایسا ہی وہ شخص جو اپنی **صحت** بدنی پر غرور کرتا ہے یا اپنے **حسن** اور **جمال** اور **قوت** اور **طاقت** پر نازاں ہے اور اپنے بھائی کا **ٹھٹھے** اور استہزاء سے **حقارت آمیز نام** رکھتا ہے اور اس کے بدنی عیوب لوگوں کو سناتا ہے وہ بھی **متکبّر** ہے۔ اور وہ اس خدا سے بے خبر ہے کہ ایکدم میں

اس پر ایسے بدنی عیوب نازل کرے کہ اس بھائی سے اُسکو بدتر کر دے اور وہ جس کی تحقیر کی گئی ہے ایک مدتِ دراز تک اُس کے قویٰ میں برکت دے کہ وہ کم نہ ہوں اور نہ باطل ہوں کیونکہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ایسا ہی وہ شخص بھی جو **اپنی طاقتوں پر بھروسہ** کر کے دُعا مانگنے میں سُست ہے وہ بھی متکبّر ہے کیونکہ قوتوں اور قدرتوں کے سرچشمہ کو اُس نے شناخت نہیں کیا اور اپنے تئیں کچھ چیز سمجھا ہے۔ سو تم اے عزیزو! ان تمام باتوں کو یاد رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی پہلو سے خدا تعالیٰ کی نظر میں متکبّر ٹھہر جاؤ اور تم کو خبر نہ ہو۔ ایک شخص جو اپنے ایک بھائی کے ایک غلط لفظ کی تکبّر کے ساتھ تصحیح کرتا ہے اس نے بھی تکبّر سے حصہ لیا ہے۔ ایک شخص جو اپنے بھائی کی بات کو تواضع سے سُننا نہیں چاہتا اور مُنہ پھیر لیتا ہے اُس نے بھی **تکبّر سے حصہ لیا** ہے۔ ایک غریب بھائی جو اس کے پاس بیٹھا ہے اور وہ کراہت کرتا ہے اُس نے بھی تکبّر سے حصہ لیا ہے۔ ایک شخص جو دعا کرنے والے کو ٹھٹھے اور ہنسی سے دیکھتا ہے اُس نے بھی تکبّر سے ایک حصّہ لیا ہے۔ اور وہ جو خدا کے **مامور اور مرسل** کی پورے طور پر اطاعت کرنا نہیں چاہتا اُس نے بھی تکبّر سے ایک حصّہ لیا ہے۔ اور وہ جو خدا کے مامور اور مرسل کی باتوں کو غور سے **نہیں سُنتا** اور اس کی تحریروں کو غور سے نہیں پڑھتا اُس نے بھی تکبّر سے ایک حصّہ لیا ہے۔ سو کوشش کرو کہ کوئی حصہ تکبّر کا تم میں نہ ہو تاکہ ہلاک نہ ہو جاؤ۔ اور تا تم اپنے اہل و عیال سمیت نجات پاؤ۔ خدا کی طرف جھکو اور جس قدر دنیا میں کسی سے محبت ممکن ہے تم اس سے کرو اور جس قدر دنیا میں کسی سے انسان ڈر سکتا ہے تم اپنے خدا سے ڈرو۔ **پاک دل** ہو جاؤ اور **پاک** ارادہ اور **غریب** اور **مسکین** اور بے شر تا تم پر رحم ہو۔

(نزول المسیح ص ۲۴-۲۵)

میرا مسلک نہیں کہ میں ایسا تند خُو اور بھیانک بن کر بیٹھوں کہ لوگ مجھ سے ایسے ڈریں جیسے درندہ سے ڈرتے ہیں اور میں بُت بننے سے سخت نفرت رکھتا ہوں۔ میں تو بُت پرستی کے ردّ کرنے کو آیا ہوں نہ یہ کہ میں خود بُت بنوں اور لوگ میری پُوجا کریں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ میں اپنے نفس کو دوسروں پر ذرا بھی ترجیح نہیں دیتا۔ میرے نزدیک متکبّر سے زیادہ کوئی بُت پرست اور خبیث نہیں متکبّر کسی خدا کی پرستش نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی پرستش کرتا ہے۔

(ملفوظات جلد دوم ص ۶-۷)

یاد رہے کہ تکبّر کو جھوٹ لازم پڑا ہُوا ہے بلکہ نہایت پلید جھوٹ وہ ہے جو تکبّر کے ساتھ مل کر ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ جلّشانہٗ متکبّر کا سب سے پہلے سر توڑتا ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام ص ۵۹۹)

انسان موٹی موٹی بدیوں کو تو بآسانی چھوڑ بھی دیتا ہے مگر بعض بدیاں ایسی باریک اور مخفی ہوتی ہیں کہ اوّل تو انسان کو ان کا علم ہی مشکل سے ہو سکتا ہے۔ پھر اگر علم ہو بھی جاوے تو اُن کا چھوڑنا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ تپ محرقہ اگرچہ سخت تپ ہے مگر اس کا علاج کھلا کھلا ہو سکتا ہے۔ مگر تپ دق جو اندر ہی اندر کھا رہا ہے اس کا علاج بہت مشکل ہے۔ اسی طرح پر یہ باریک اور مخفی بدیاں ہوتی ہیں جو انسان کو بڑے بڑے فضائل کے حاصل کرنے سے محروم کر دیتی ہیں۔ یہ اخلاقی بدیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ اور معاملات میں پیش آتی ہیں اور ذرا ذرا سی بات اور اختلاف رائے پر دلوں میں بغض۔ کینہ۔ حسد۔ ریا تکبّر پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے بھائی کو حقیر سمجھنے لگ جاتا ہے۔ یا اگر چند روز نماز سنوار کر پڑھی ہے اور لوگوں نے اُس کی تعریف شروع کی تو ریا اور عُجب خودپسندی اور نمود پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اصلی غرض جو اخلاص تھی جاتی رہتی ہے۔ اور اگر اللہ جلّ شانہ نے اس کو دولت یا علم دیا ہے یا کوئی خاندانی وجاہت یا عزّت حاصل ہے تو اس کی وجہ سے اپنے دوسرے بھائی کو (جسکو یہ باتیں میسّر نہیں) حقیر اور ذلیل سمجھتا ہے۔ اور اپنے کسی بھائی سے ضِد یا عداوت ہو گئی ہے تو اس کی عیب جوئی پر حریص ہو جاتا ہے۔ پھر تو رات دن اس کی عیب چینی میں گذرتی ہے یا کسی کے قرب حاصل کرنے کیلئے اپنے بھائی کے عیب اس کے آگے بیان کرتا ہے تاکہ اس کو نکال کر وہ منصب ضرور حاصل کرے۔ حالانکہ وہ عیب خود اس میں موجود ہوتے ہیں۔ یہی وہ باریک بدیاں ہیں جن کا ترک کرنا مشکل ہے۔ ایسے ہی تکبّر بھی ہے اور وہ مختلف رنگوں میں ہوتا ہے۔ کسی میں کسی رنگ میں اور کسی میں کسی طرح۔ علماء علم کے رنگ میں اس میں گرفتار ہیں۔ علمی طور پر دوسرے عالم کی نکتہ چینی کر کے اُس کو نقصان پہنچانا۔ ذلیل کرنا اور لوگوں کی نظر سے اس کو گرانا چاہتے ہیں۔ رات دن اس کے عیبوں کی جستجو میں رہتے ہیں۔ اِس قسم کی باریک بدیوں کا دُور کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ مگر شریعت ان باتوں کو جائز نہیں رکھتی۔ اِن بدیوں میں صرف عوام ہی مبتلا نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ بھی مبتلا پائے جاتے ہیں جو متعارف اور موٹی موٹی بدیاں نہیں کرتے بلکہ عالم فاضل اور خواص سمجھے جاتے ہیں۔ اِن سے خلاصی پانا اور مرنا ایک بات ہے۔ جب تک اِن بدیوں کی ظلمت سے نجات حاصل نہ کرے تزکیہ نفس کامل طور پر حاصل نہیں ہوتا۔ اور انسان ان انعامات اور کمالات کا وارث نہیں بن سکتا جو تزکیہ نفس کے بعد خدا تعالےٰ کے حضور سے ملا کرتے ہیں بعض لوگ اپنی جگہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ انہوں نے ان اخلاقی بدیوں سے خلاصی پالی ہے۔ لیکن جب کبھی کوئی موقعہ آجاتا ہے اور کسی آدمی سے مقابلہ ہو جاتا ہے تو اس وقت اس کو بڑا جوش آجاتا ہے۔ اپنے تعلّی اور کبر

کے خیال کو دبا نہیں سکتا۔ پھر وہ گند اس سے ظاہر ہوتے ہیں جن کا وہم و گمان بھی اس پر ظاہر نہیں ہوتا۔ اس وقت پتہ لگتا ہے کہ ابھی اس نے خلاصی نہیں پائی اور ابھی کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ اور وہ تزکیہ نفس جو صلحاء کو حاصل ہوتا ہے جو اصل کمال کی علامت ہے میسّر نہیں آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تزکیہ جس کو **اخلاقی تزکیہ** کہتے ہیں بہت ہی **مشکل** ہے اور اللہ جلّ شانہٗ کے فضل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس فضل کے جذب کرنے کے لیے بھی وہی تین پہلو ہیں جو ابھی ذکر ہوئے۔ یعنی اوّل **مجاہدہ** اور **تدبیر**۔ دوم **دُعا**۔ سوم **صحبتِ صادقین**۔

(تقریرین ص ۱۷-۱۸)

تکبر ایسی بلا ہے کہ انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یاد رکھو تکبّر شیطان سے آتا ہے اور تکبر کرنے والے کو شیطان بنا دیتا ہے۔ جب تک انسان اس راہ سے قطعاً دُور نہ ہو قبول حق و فیضان الوہیت ہرگز نہیں پا سکتا کیونکہ یہ تکبر اس کی راہ میں روک ہو جاتا ہے۔ پس کسی طرح سے بھی تکبّر نہیں کرنا چاہیئے۔ علم کے لحاظ سے نہ دولت کے لحاظ سے نہ وجاہت کے لحاظ سے نہ ذات اور خاندان اور حسب نسب کی وجہ سے۔ کیونکہ زیادہ تر تکبّر انہی باتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو اِن گھمنڈوں سے پاک و صاف نہ کرے گا اس وقت تک وہ اللہ جل شانہٗ کے نزدیک پسندیدہ و برگزیدہ نہیں ہو سکتا۔ اور وہ معرفتِ الٰہی جو جذبات نفسانی کے مواد ردّیہ کو جلا دیتی ہے اس کو عطا نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ گھمنڈ شیطان کا حصّہ ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ شیطان نے بھی یہی گھمنڈ کیا اور اپنے آپ کو آدم علیہ السلام سے بڑا سمجھا۔ اور کہہ دیا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ۔ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بارگاہِ الٰہی سے مردود ہو گیا۔

(تقریرین ص ۱۹)

تکبّر اور شرارت بُری بات ہے۔ ایک ذرہ سی بات سے ستّر برس کے عمل ضائع جاتے ہیں لکھا ہے کہ ایک شخص عابد تھا۔ وہ پہاڑ پر رہا کرتا تھا۔ اور مدت سے وہاں بارش نہ ہوئی تھی۔ ایک روز بارش ہوئی تو پتھروں پر اور روڑیوں پر بھی ہوئی تو اس کے دل میں اعتراض پیدا ہوا کہ ضرورت تو بارش کی کھیتوں اور باغات کے واسطے ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ پتھروں پر ہوئی۔ یہی بارش کھیتوں پر ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ اِس پر خدا تعالیٰ نے اُس کا سارا ولی پنا چھین کیا۔ آخر وہ بہت سا غمگین ہوا اور کسی اَور بزرگ سے استمداد کی تو آخر اس کو پیغام آیا کہ تُو نے اعتراض کیوں کیا تھا تیری اس خطا پر عتاب ہوا ہے۔

(ملفوظات جلد ششم ص ۵۷)

تکبّر کئی قسم کا ہوتا ہے۔ کبھی یہ آنکھ سے نکلتا ہے جبکہ دوسرے کو گھور کر دیکھتا ہے۔ تو اس کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ کبھی زبان سے نکلتا ہے اور کبھی اس کا اظہار سر سے ہوتا ہے۔ اور کبھی ہاتھ اور پاؤں سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ غرضیکہ تکبر کے کئی چشمے ہیں اور مومن کو چاہیئے کہ ان تمام چشموں سے بچتا رہے اور اس کا کوئی عضو ایسا نہ ہو جس سے تکبّر کی بو آوے اور وہ تکبّر ظاہر کرنے والا ہو۔

صوفی کہتے ہیں کہ انسان کے اندر اخلاقِ رذیلہ کے بہت سے جنّ ہیں۔ اور جب یہ نکلنے لگتے ہیں تو نکلتے رہتے ہیں۔ مگر سب سے آخری جنّ تکبّر کا ہوتا ہے جو اُس میں رہتا ہے اور خدا تعالےٰ کے فضل اور انسان کے سچّے مجاہدہ اور دعاؤں سے نکلتا ہے۔

بہت سے آدمی اپنے آپ کو خاکسار سمجھتے ہیں لیکن ان میں بھی کسی نہ کسی نوع کا تکبّر ہوتا ہے اس لئے تکبّر کی باریک در باریک قسموں سے بچنا چاہیئے۔ بعض وقت یہ تکبّر دولت سے پیدا ہوتا ہے۔ دولتمند متکبّر دوسروں کو کنگال سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کون ہے جو میرا مقابلہ کرے۔ بعض اوقات خاندان اور ذات کا تکبّر ہوتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ میری ذات بڑی ہے اور یہ چھوٹی ذات کا ہے ....

..... بعض وقت تکبر علم سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص غلط بولتا ہے تو یہ جھٹ اُس کا عیب پکڑتا ہے اور شور مچاتا ہے کہ اس کو تو ایک لفظ بھی صحیح بولنا نہیں آتا۔ غرض مختلف قسمیں تکبّر کی ہوتی ہیں اور یہ سب کی سب انسان کو نیکیوں سے محروم کر دیتی ہیں اور لوگوں کو نفع پہنچانے سے روک دیتی ہیں۔ ان سب سے بچنا چاہیئے۔ مگر ان سب سے بچنا ایک موت کو چاہتا ہے۔ جبتک انسان اس موت کو قبول نہیں کرتا خدا تعالیٰ کی برکت اُس پر نازل نہیں ہو سکتی اور نہ خدا تعالیٰ اس کا متکفل ہو سکتا ہے۔

(ملفوظات جلد ششم ص۴۰۱-۴۰۳)

اسلام چیز کیا ہے خدا کے لئے فنا : ترکِ رضائے خویش پئے مرضئ خدا
جو مر گئے اُنہی کے نصیبوں میں ہے حیات : اِس رہ میں زندگی نہیں ملتی بجز ممات
شوخی و کبر دیوِ لعیں کا شعار ہے : آدم کی نسل وہ ہے جو وہ خاکسار ہے
اے کرمِ خاک چھوڑ دے کبر و غرور کو : زیبا ہے کبر حضرتِ ربِّ غیوّر کو
بدتر بنو ہر ایک سے اپنے خیال میں : شاید اِسی سے دخل ہو دارالوصال میں
چھوڑو غرور و کبر کہ تقویٰ اِسی میں ہے : ہو جاؤ خاک مرضئ مولیٰ اِسی میں ہے
تقویٰ کی جڑ خدا کے لئے خاکساری ہے : عفّت جو شرطِ دین ہے وہ تقویٰ میں ساری ہے

(براہین احمدیہ حصہ پنجم)

بدظنّی

بدظنّی ایک ایسا مرض ہے اور ایسی بُری بلا ہے جو انسان کو اندھا کر کے ہلاکت کے تاریک کنوئیں میں گرا دیتی ہے۔ بدظنّی ہی ہے جس نے ایک مُردہ انسان کی پرستش کرائی۔ بدظنی ہی تو ہے جو لوگوں کو خدا تعالیٰ کی صفات خلق۔ رحم۔ رازقیت وغیرہ سے معطّل کر کے نعوذ باللہ ایک فرد معطّل اور شئے بے کار بنا دیتی ہے۔ الغرض اسی بدظنّی کے باعث جہنم کا بہت بڑا حصہ اگر کہوں کہ سارا حصہ بھر جائیگا تو مبالغہ نہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ماموروں سے بدظنّی کرتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں اور اسکے فضل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

(ملفوظات جلد اوّل ص ۹۵-۹۶)

بدظنّی ایک سخت بلا ہے جو ایمان کو ایسی جلدی جلا دیتی ہے جیسا کہ آتش سوزاں خس وخاشاک کو اور وہ جو خدا کے مرسلوں پر بدظنّی کرتا ہے خدا اس کا خود دشمن ہو جاتا ہے اور اس کی جنگ کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے برگزیدوں کے لئے اس قدر غیرت رکھتا ہے جو کسی میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔ میرے پر جب طرح طرح کے حملے ہوئے تو وہی خدا کی غیرت میرے لئے برافروختہ ہوئی۔

(الوصیت ص ۲۶ حاشیہ)

مَیں سچ کہتا ہوں کہ بدظنّی بہت ہی بُری بلا ہے جو انسان کے ایمان کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور صدق اور راستی سے دُور پھینک دیتی ہے اور دوستوں کو دشمن بنا دیتی ہے۔ **صدیقوں کے کمال حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان بدظنی سے بہت ہی بچے** اور اگر کسی کی نسبت کوئی سوءِ ظن پیدا ہو تو کثرت کے ساتھ استغفار کرے اور خدا تعالیٰ سے دعائیں کرے تاکہ اس معصیّت اور اس کے بُرے نتیجہ سے بچ جاوے جو اس بدظنّی کے پیچھے آنے والا ہے اس کو کبھی معمولی چیز نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ **بہت ہی خطرناک بیماری** ہے جس سے انسان بہت جلد ہلاک ہو جاتا ہے۔

غرض بدظنی انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ یہاں تک لکھا ہے کہ جسوقت دوزخی لوگ جہنم میں ڈالے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ اُن سے یہی فرمائیگا کہ تم نے اللہ تعالیٰ پر بدظنّی کی۔ (ملفوظات جلد اوّل ص ۳۵۶)

فساد اس سے شروع ہوتا ہے کہ انسان ظنونِ فاسدہ اور شکوک سے کام لینا شروع کرے۔ اگر نیک ظنّ کرے تو پھر کچھ دینے کی توفیق بھی مل جاتی ہے۔ جب پہلی ہی منزل پر خطا کی تو پھر منزلِ مقصود پر پہنچنا مشکل ہے۔ بدظنّی بہت بُری چیز ہے۔ انسان کو بہت سی نیکیوں سے محروم کر دیتی ہے، اور پھر چڑھتے چڑھتے یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ انسان خدا پر بدظنی شروع کر دیتا ہے۔

(ملفوظات جلد دوم صـ ١٠)

جو لوگ بدگمانی کو شیوہ بناتے ہیں ؎ تقویٰ کی راہ سے وہ بہت دُور جاتے ہیں
بے احتیاط اُن کی زباں وار کرتی ہے ؎ اِک دم میں اس علیم کو بیزار کرتی ہے
اِک بات کہہ کے اپنے عمل سارے کھوتے ہیں ؎ پھر شوخیوں کا بیج ہر اِک وقت بوتے ہیں
کچھ ایسے سو گئے ہیں ہمارے یہ ہم وطن ؎ اُٹھتے نہیں ہیں ہم نے تو سو سو کیے جتن
سب عضو سُست ہو گئے غفلت ہی چھا گئی ؎ قوت تمام نوکِ زباں میں ہی آ گئی!
یا بد زباں دکھاتے ہیں یا ہیں وہ بدگماں ؎ باقی خبر نہیں ہے کہ اسلام ہے کہاں
تم دیکھ کر بھی بد کو بچو بدگمان سے ؎ ڈرتے رہو عقابِ خدائے جہان سے
شاید تمہاری آنکھ ہی کر جائے کچھ خطا ؎ شاید وہ بد نہ ہو جو تمہیں ہے بدنما
شاید تمہاری فہم کا ہی کچھ قصور ہو ؎ شاید وہ آزمائشِ ربِّ غفور ہو
پھر تم تو بدگمانی سے اپنی ہوئے ہلاک ؎ خود سر پہ اپنے لے لیا خشمِ خدائے پاک
گر ایسے تم دلیریوں میں بے حیا ہوئے ؎ پھر اتقاء کے سوچو کہ معنے ہی کیا ہوئے
موسیٰ بھی بدگمانی سے شرمندہ ہو گیا ؎ قرآں میں خضر نے جو کیا تھا پڑھو ذرا
بندوں میں اپنے بھید خدا کے ہیں صد ہزار
تم کو نہ علم ہے نہ حقیقت ہے آشکار

(براہین احمدیہ حصّہ پنجم)

اس دنیا میں عذاب

قدیم سے الٰہی سنّت اسی طرح پر ہے کہ جب تک کوئی کافر اور منکر نہایت درجہ کا بے باک اور شوخ ہو کر اپنے ہاتھ سے اپنے لئے اسباب ہلاکت پیدا نہ کرے تب تک خدا تعالےٰ تعذیب کے طور پر اسکو ہلاک نہیں کرتا۔ اور جب کسی منکر پر عذاب نازل ہونے کا وقت آتا ہے تو اس میں وہ اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس پر حکم ہلاکت لکھا جاتا ہے۔ عذاب الٰہی کے لئے یہی قانونِ قدیم ہے اور یہی سنّت مستمرہ اور یہی غیر متبدل قاعدہ کتاب الٰہی نے بیان کیا ہے۔

(انوار الاسلام صـ۳)

قرآن کریم اور دوسری الٰہی کتابوں میں معلوم ہوتا ہے کہ جسقدر لوگوں پر اسی دنیا میں عذاب کے طور پر موت اور ہلاکت وارد ہوئی وہ صرف اس لئے نہیں وارد ہوئی کہ وہ لوگ حیثیت مذہبی کی وجہ سے ناحق پر تھے۔ مثلاً بُت پرست تھے یا ستارہ پرست یا آتش پرست یا کسی اور مخلوق کی پرستش کرتے تھے۔ کیونکہ مذہبی ضلالت کا محاسبہ قیامت پر ڈالا گیا ہے اور صرف ناحق پر ہونے کا اور کافر ٹھہرانے سے اس دنیا میں کسی پر عذاب وارد نہیں ہو سکتا۔ اس عذاب کے لئے جہنم اور دارِ آخرت بنایا گیا ہے۔ بلکہ کافروں کے لئے یہ دنیا بطور بہشت کے ہے۔ اور مومن ہی اکثر اس میں دُکھ اور درد اُٹھاتے ہیں۔ اَلدُّنْیَا جَنَّۃُ الْکَافِرِ وَسِجْنُ الْمُؤْمِنِ۔ پس اسجگہ بالطبع یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس حالت میں دنیا جَنَّۃُ الْکَافِرِ ہے۔ اور مشاہدہ بھی اس پر شہادت دے رہا ہے کہ کفار ہر یک دنیوی نعمت اور دولت میں سبقت لے گئے ہیں اور قرآن کریم میں جابجا اسی بات کا اظہار ہے کہ کافروں پر ہر یک دنیوی نعمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں تو پھر بعض کافر قوموں پر عذاب کیوں نازل ہوئے اور خدا تعالیٰ نے ان کو پتھر اور آندھی اور طوفان اور وبا سے کیوں ہلاک کیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام عذاب محض کفر کی وجہ سے نہیں ہوئے بلکہ جن پر یہ عذاب نازل ہوئے وہ تکذیب مرسل اور استہزاء اور ٹھٹھے اور ایذاء میں حد سے بڑھ گئے تھے اور خدا تعالیٰ کی نظر میں ان کا فساد اور فسق اور ظلم اور آزار نہایت کو پہنچ گیا تھا اور انہوں نے

اپنی ہلاکت کے لئے آپ سامان پیدا کئے۔ تب غضب الٰہی جوش میں آیا اور طرح طرح کے عذابوں سے اُن کو ہلاک کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی عذاب کا موجب کفر نہیں ہے بلکہ شرارت ہے اور تکبّر میں حد سے زیادہ بڑھ جانا موجب ہے۔ اور ایسا آدمی خواہ مومن ہی کیوں نہ ہو۔ جب ظلم اور ایذاء اور تکبر میں حد سے بڑھے گا اور **عظمت الٰہی** کو بھلا دیگا تو عذاب الٰہی ضرور اس کی طرف متوجہ ہوگا اور جب ایک کافر مسکین صورت رہیگا اور اس کو خوف دامن گیر ہوگا تو گو وہ اپنی مذہبی ضلالت کی وجہ سے جہنم کے لائق ہے مگر عذاب دنیوی اس پر نازل نہیں ہوگا۔ پس دنیوی عذاب کیلئے یہی ایک قدیم اور مستحکم فلاسفی ہے اور یہی وہ سنّت اللہ ہے جس کا ثبوت خدا کی تمام کتابوں سے ملتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ
عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۔

یعنی جب ہمارا ارادہ اس بات کی طرف متعلق ہوتا ہے کہ کسی بستی کے لوگوں ہلاک کریں تو ہم بستی کے منعم اور عیاش لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی بدکاریوں میں حدِ اعتدال سے نکل جاتے ہیں پس اُن پر سنّت اللہ کا قول ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ظلموں میں انتہا تک پہنچ جاتے ہیں۔ تب ہم اُن کو ایک سخت ہلاکت کے ساتھ ہلاک کر دیتے ہیں۔ اور پھر ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے۔ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ۔ یعنی ہم نے کبھی کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر صرف ایسی حالت میں کہ جب اس کے رہنے والے ظلم پر کمربستہ ہوں۔

یاد رہے کہ اگرچہ شرک بھی ایک ظلم بلکہ ظلمِ عظیم ہے۔ مگر اسجگہ ظلم سے مراد وہ سرکشی ہے جو حد سے گذر جائے اور مفسدانہ حرکات انتہا تک پہنچ جائیں۔ ورنہ اگر مجرد شرک ہو جس کے ساتھ ایذاء اور تکبر اور فساد منضم نہ ہو اور ایسا تجاوز از حد نہ ہو جو واعظوں پر حملہ کریں اور ان کے قتل کرنے پر آمادہ ہوں یا معصیت پر پورے طور پر سرنگوں ہو کر بالکل خوف خدا دل سے اٹھا دیں۔ تو ایسے شرک یا کسی اور گناہ کے لئے وعدہ عذاب آخرت ہے۔ اور دنیوی عذاب صرف اعتداء اور سرکشی اور حد سے زیادہ بڑھنے کے وقت نازل ہوتا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرماتا ہے۔ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۔ یعنی پہلے بھی رسولوں پر ٹھٹھا کیا گیا۔ پس ہم نے ان کافروں جو ٹھٹھا کرتے میں مہلت دی۔ پھر جب وہ اپنے ٹھٹھے میں کمال تک پہنچ گئے تب ہم نے اُن کو پکڑ لیا

اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ کیونکر ہمارا عقاب اُن پر وارد ہوا۔ اور پھر فرماتا ہے۔ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ یعنی کافروں نے اسلام کے مٹانے کے لئے ایک مکر کیا۔ اور ہم نے بھی ایک مکر کیا۔ یعنی یہ کہ اُن کو اپنی مکاریوں میں بڑھنے دیا تا وہ ایسے درجہ شرارت پر پہنچ جائیں کہ جو سنت اللہ کے موافق عذاب نازل ہونے کا درجہ ہے .... ان تمام آیات سے ثابت ہوا کہ عذاب الٰہی جو دنیا میں نازل ہوتا ہے وہ تبھی کسی پر نازل ہوتا ہے کہ جب وہ شرارت اور ظلم اور تکبّر اور غلوّ اور علوّ میں نہایت کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک کافر خوف سے مرا جاتا ہے اور پھر بھی عذاب الٰہی کے لئے اُس پر صاعقہ پڑے اور ایک مشرک اندیشۂ عذاب سے جاں بلب ہو اور پھر بھی اس پر پتھر برسیں۔ خداوند تعالیٰ نہایت درجہ کا رحیم اور حلیم ہے۔ عذاب کے طور پر صرف اسی کو اس دنیا میں پکڑتا ہے جو اپنے ہاتھ سے عذاب کا سامان تیار کرے۔

(انوارالاسلام ص۱۴-۱۶ حاشیہ ص۱)

خداتعالیٰ کا اپنے مجرموں سے دو قسم کا معاملہ ہے۔ اور مجرم دو قسم کے ہیں :-

(۱) ایک وہ مجرم ہیں جو حد سے زیادہ نہیں بڑھتے۔ اور گو نہایت درجہ کے تعصب سے ضلالت کو نہیں چھوڑتے۔ مگر وہ ظلم اور ایذار کے طریقوں میں ایک معمولی درجہ تک رہتے ہیں۔ اپنے جور و ستم اور بے باکی کو انتہا تک نہیں پہنچاتے۔ پس وہ تو اپنی سزا قیامت کو پائیں گے اور خدائے علیم انکو اِسجگہ نہیں پکڑتا کیونکہ ان کی روش میں حد سے زیادہ سختی نہیں۔ لہٰذا گناہوں کی سزا کے لئے صرف ایک ہی دن مقرر ہے جو یوم المجازات اور یوم الدین اور یوم الفصل کہلاتا ہے۔

(۲) دوسری قسم کے وہ مجرم ہیں جو ظلم اور ستم اور شوخی اور بے باکی میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ خدا کے ماموروں اور رسولوں اور راستبازوں کو درندوں کی طرح پھاڑ ڈالیں۔ اور دنیا پر سے ان کا نام ونشان مٹا دیں اور ان کو آگ کی طرح بھسم کر ڈالیں۔ ایسے مجرموں کے لئے جنکا غضب انتہا تک پہنچ جاتا ہے سنتِ اللہ یہی ہے کہ اِسی دنیا میں خدا تعالیٰ کا غضب اُن پر بھڑکتا ہے اور اسی دنیا میں وہ سزا پاتے ہیں علاوہ اس سزا کے جو قیامت کو ملیگی۔ اسلئے قرآنی اصطلاح میں اُن کا نام مغضوب علیہم ہے۔

(تحفہ گولڑویہ ص۱۱۹-۱۲۰)

یہ نکتہ یاد رہے کہ بلاؤں کے ٹلنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لوگ مسلمان ہو جائیں کیونکہ مذہبی غلطیوں کے مواخذہ کے لئے قیامت کا دن مقرر ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ لوگ ہر ایک قسم کی بدچلنی

سے باز آویں اور خدا کے پاک نبیوں کی نسبت بدزبانی سے پیش نہ آویں اور غریبوں پر ظلم نہ کریں۔ اور صدقہ و خیرات بہت کریں اور خدا کے ساتھ کسی کو برابر نہ کریں۔ نہ پتھر کو نہ آگ کو نہ انسان کو۔ نہ پانی کو نہ سورج کو نہ چاند کو اور تکبّر اور شرارت کی راہوں کو چھوڑ دیں۔

(مضمون جلسہ لاہور منسلکہ چشمہ معرفت ص۳۴)

یہ بات مسلمانوں کو بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ گو ایک شخص کا انجام خدائے تعالیٰ کے علم میں کفر ہو مگر عادت اللہ قدیم سے یہی ہے کہ اس کی تضرع اور خوف کے وقت عذاب کو دوسرے وقت پر ٹال دیا جاتا ہے۔ اِسی وجہ سے اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ وعید میں خدا کے ارادہ عذاب کا تخلّف جائز ہے مگر بشارت میں جائز نہیں۔ جیسا کہ قوم یونس کی وعید میں نزولِ عذاب کی قطعی تاریخ بغیر کسی شرط کے بتلا کر پھر اس قوم کی تضرع پر وہ عذاب موقوف رکھا گیا۔ اور قرآن شریف اور توریت کے اتفاق سے یہ بھی ثابت ہے کہ فرعون کے ایمان کے وعدہ پر خدا تعالیٰ بار بار عذاب کو اُس سے ٹالتا رہا۔ حالانکہ جانتا تھا کہ فرعون کا خاتمہ کفر پر ہے۔ مگر اس بات کا سرّ کیا ہے کہ وعید میں تخلف ارادہ عذاب کا کیوں اور کس وجہ سے بعض اوقات میں ہو جاتا ہے حالانکہ بظاہر تخلّف وعید میں بھی رائحہ کذب ہے؟

اِس کا **جواب** یہ ہے کہ کسی کو سزا دینا دراصل خدا تعالیٰ کے ذاتی ارادہ میں داخل نہیں ہے۔ اسکے صفاتی نام جو اصل الاصول تمام صفاتی ناموں کے ہیں چار ہیں۔ اور چاروں جُود اور کرم پر مشتمل ہیں یعنی وہی نام جو سورۃ فاتحہ کی پہلی تین آیتوں میں مذکور ہیں۔ یعنی ربّ العالمین اور رحمٰن اور رحیم اور مالکِ یوم الدین یعنی مالک یوم جزا۔ اِن ہر چہار صفات میں خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لئے سراسر نیکی کا ارادہ کیا گیا ہے یعنی پیدا کرنا۔ پرورش کرنا جس کا نام **ربوبیت** ہے۔ اور بے استحقاق آرام کے اسباب مہیّا کرنا جس کا نام **رحمانیت** ہے اور تقویٰ اور خدا ترسی اور ایمان پر انسان کیلئے وہ اسباب مہیّا کرنا جو آئندہ دُکھ اور مصیبت سے محفوظ رکھیں جسکا نام **رحیمیت** ہے۔ اور اعمال صالحہ کے بجا لانے پر جو عبادت اور صوم اور صلوٰۃ اور بنی نوع کی ہمدردی اور صدقہ اور ایثار وغیرہ ہے وہ مقام صالح عطا کرنا جو دائمی سرور اور راحت اور خوشحالی کا مقام ہے جس کا نام جزاءِ خیر از طرف **مالک یوم الجزاء** ہے۔ سو خدا نے ان ہر چہار صفات میں کسی صفت میں بھی انسان کے لئے بدی کا ارادہ نہیں کیا۔ سراسر خیر اور بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔ لیکن جو شخص اپنی بدکاریوں اور بے اعتدالیوں سے اِن صفات کے پرتوہ کے نیچے سے اپنے تئیں باہر کرے۔ اور

فطرت کو بدل ڈالے اُس کے حق میں اس کے شامت اعمال کی وجہ سے وہ صفات بجائے خیر کے شر کا حکم پیدا کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ربوبیّت کا ارادہ فنا اور اعدام کے ارادہ کے ساتھ مبدّل ہو جاتا ہے۔ اور رحمانیت کا ارادہ غضب اور سخط کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور رحیمیت کا ارادہ انتقام اور سخت گیری کے رنگ میں جوش مارتا ہے اور جزاء خیر کا ارادہ سزا اور تعذیب کی صورت میں اپنا ہولناک چہرہ دکھاتا ہے۔ سو یہ تبدیلی خدا کی صفات میں انسان کی اپنی حالت کی تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ غرض چونکہ سزا دینا یا سزا کا وعدہ کرنا خدا تعالیٰ کی ان صفات میں داخل نہیں جو اُمّ الصفات ہیں کیونکہ دراصل اس نے انسان کے لئے نیکی کا ارادہ کیا ہے۔ اس لئے خدا کا وعید بھی جبتک انسان زندہ ہے اور اپنی تبدیلی کرنے پر قادر ہے فیصلہ ناطقہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے برخلاف کرنا کذب یا عہد شکنی میں داخل نہیں۔ اور گو بظاہر کوئی وعید شروط سے خالی ہو مگر اس کے ساتھ پوشیدہ طور پر ارادہ الٰہی میں شرط ہوتی ہیں بجز ایسے الہام کے جس میں ظاہر کیا جائے کہ اس کے ساتھ شروط نہیں ہیں۔ پس ایسی صورت میں وہ قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے اور تقدیر مبرم قرار پا جاتا ہے۔ یہ نکتہ معارف الٰہیہ میں سے نہایت قابل قدر اور جلیل الشان نکتہ ہے جو سورۃ فاتحہ میں مخفی رکھا گیا ہے۔

(انجام آتھم ص ۱۰ حاشیہ)

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مکّہ والوں نے آپ کی نری تکذیب نہیں کی تھی۔ نری تکذیب سے جو محض سادگی کی بنا پر ہوتی ہے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ سزائیں نہیں دیتا ہے لیکن جب مکذّب شرافت اور انسانیت کی حدود سے نکل کر بے حیائی اور دریدہ دہنی سے اعتراض کرتا ہے اور اعتراضوں کی ہی حد تک نہیں رہتا بلکہ ہر قسم کی ایذاء دہی اور تکلیف رسانی کے منصوبے کرتا ہے اور پھر اس کو حد تک پہنچاتا ہے تو اللہ تعالےٰ کی غیرت جوش میں آتی ہے اور اپنے مامور و مرسل کے لئے وہ ان ظالموں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ جیسے نوح کی قوم کو ہلاک کیا یا لوط کی قوم کو۔ اس قسم کے عذاب ہمیشہ ان شرارتوں اور مظالم کی وجہ سے آتے ہیں جو خدا کے ماموروں اور ان کی جماعت پر کئے جاتے ہیں۔ ورنہ نری تکذیب کی سزا اس عالم میں نہیں دی جاتی اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے اور اس نے ایک اور عالم عذاب کے لئے رکھا ہے۔ عذاب جو آتے ہیں وہ تکذیب کو ایذاء کے درجہ تک پہنچانے سے آتے ہیں اور تکذیب کو استہزاء اور ٹھٹھے کے رنگ میں کر دینے سے آتے ہیں۔ اگر نرمی اور شرافت سے یہ کہا جاوے کہ میں نے اس معاملہ کو سمجھا نہیں اس لئے مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے تو یہ انکار عذاب کو کھینچ لانے والا نہیں ہے کیونکہ یہ تو صرف سادگی اور کمئ علم کی وجہ سے ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر نوح کی قوم کا

اعتراض شریفانہ رنگ میں ہوتا تو اللہ تعالےٰ نہ پکڑتا۔ ساری قومیں اپنی کرتوتوں کی پاداش میں سزا پاتی ہیں خدا تعالیٰ نے تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ جو لوگ قرآن سُننے کے لئے آتے ہیں اُن کو امن کی جگہ تک پہنچا دیا جاوے خواہ وہ مخالف اور منکر ہی ہوں۔ اور اس لئے اسلام میں جبر اور اکراہ نہیں جیسے فرمایا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ لیکن اگر کوئی قتل کرے گا یا قتل کے منصوبے کریگا اور شرارتیں اور ایذا رسانی کی سعی کرتا ہے تو ضرور ہے کہ وہ سزا پاوے۔

(ملفوظات جلد سوم صـ۱۶۲-۱۶۳)

قرآن شریف میں صدہا جگہ اس بات کو پاؤگے کہ خدا تعالیٰ مفتری علی اللہ کو ہرگز سلامت نہیں چھوڑتا اور اسی دنیا میں اس کو سزا دیتا ہے اور ہلاک کرتا ہے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ ایک موقع میں فرماتا ہے کہ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى یعنی مفتری نامراد مریگا۔ اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ۔ یعنی اس سے ظالم تر کون ہے جو خدا پر افتراء کرتا ہے یا خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے خدا کے نبیوں کے ظاہر ہونے کے وقت خدا کی کلام کی تکذیب کی خدا نے اس کو زندہ نہیں چھوڑا اور بُرے بُرے عذابوں سے ہلاک کر دیا۔ دیکھو نوح کی قوم اور عاد و ثمود اور لوط کی قوم اور فرعون اور ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمن مکہ والے ان کا کیا انجام ہُوا۔

پس جبکہ تکذیب کرنے والے اسی دنیا میں سزا پا چکے تو پھر جو شخص خدا پر افترٰی کرتا ہے جس کا نام اس آیت میں پہلے نمبر پر ذکر کیا گیا ہے وہ کیونکر بچ سکتا ہے۔ کیا خدا کا صادقوں اور کاذبوں سے معاملہ ایک ہو سکتا ہے اور کیا افتراء کرنے والوں کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے اِس دنیا میں کوئی سزا نہیں مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ۔ اور پھر ایک جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ۔ یعنی اگر یہ نبی جھوٹا ہے تو اپنے جھوٹ سے ہلاک ہو جائیگا اور اگر سچا ہے تو ضرور ہے کہ کچھ عذاب تم بھی چکھو کیونکہ زیادتی کرنے والے خواہ افترا کریں خواہ تکذیب کریں خدا سے مدد نہیں پائیں گے۔ اب دیکھو اس سے زیادہ تصریح کیا ہوتی ہے کہ خدا تعالےٰ قرآن شریف میں بار بار فرماتا ہے کہ مفتری اسی دنیا میں ہلاک ہوگا۔

(اربعین ۴ صـ۴)

ہمارے مخالف مولوی اس بات کو جانتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں ایسے شخص سے

کس قدر بیزاری ظاہر کی ہے جو خدا تعالیٰ پر افترار باندھے یہاں تک کہ اپنے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے کہ اگر وہ بعض قول میرے پر افترا کرتا تو میں فی الفور پکڑ لیتا اور رگ جان کاٹ دیتا۔ غرض خدا تعالیٰ پر افترا کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں فلاں الہام مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے۔ حالانکہ کچھ بھی نہیں ہوا ایک ایسا سخت گناہ ہے کہ اس کی سزا میں صرف جہنم کی ہی وعید نہیں بلکہ قرآن شریف کے نصوص قطعیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ **ایسا مفتری اسی دنیا میں دست بدست سزا پا لیتا ہے** اور خدائے قادر وغیور کبھی اس کو امن میں نہیں چھوڑتا اور اس کی غیرت اس کو کچل ڈالتی ہے اور جلد ہلاک کرتی ہے۔

اگر ان مولویوں کا دل تقویٰ کے رنگ سے کچھ بھی رنگین ہوتا اور خدا تعالیٰ کی عادتوں اور سنتوں سے ایک ذرہ بھی واقف ہوتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ ایک مفتری کا اس قدر دراز عرصہ تک افترا میں مشغول رہنا بلکہ روز بروز اس میں ترقی کرنا اور خدا تعالیٰ کا اس کے افترار پر اس کو نہ پکڑنا بلکہ لوگوں میں اس کو عزت دینا دلوں میں اس کی قبولیت ڈالنا۔ اور اس کی زبان کو چشمۂ حقائق و معارف بنانا ایک ایسا امر ہے کہ جب سے خدائے تعالیٰ نے دنیا کی بنیاد ڈالی ہے اس کی نظیر ہرگز نہیں پائی جاتی۔ افسوس کہ کیوں یہ منافق مولوی خدا تعالےٰ کے احکام اور مواعید کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے کیا ان کے پاس حدیث یا قرآن شریف سے کوئی نظیر موجود ہے کہ ایسے خبیث طبع مفتری کو خدا تعالےٰ نہ پکڑے جو اس پر افترا باندھے اور جھوٹے الہام بنا کر اپنے تئیں خدا کا نہایت ہی پیارا ظاہر کرے اور محض اپنے دل سے شیطانی باتیں تراش کر اس کو عمداً خدا کی وحی قرار دیوے اور کہے کہ خدا کا حکم ہے کہ لوگ میری پیروی کریں۔ اور کہے کہ خدا مجھے اپنے الہام میں فرماتا ہے کہ تو اس زمانہ میں تمام مومنوں کا سردار ہے حالانکہ اس کو کبھی الہام نہ ہوا ہو اور نہ کبھی خدا نے اس کو مومنوں کا سردار ٹھہرایا ہو۔ اور کہے کہ مجھے خدا مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تو ہی **مسیح موعود** ہے جس کو میں کسرِ صلیب کے لئے بھیجتا ہوں حالانکہ خدا نے کوئی ایسا حکم اس کو نہیں دیا۔ اور نہ اس کا نام عیسیٰ رکھا۔ اور کہے کہ خدائے تعالیٰ نے مجھے مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ مجھ سے تو ایسا ہے جیسا کہ میری توحید تیرا مقامِ قرب مجھ سے وہ ہے جس سے لوگ بے خبر ہیں حالانکہ خدا اس کو مفتری جانتا ہے اس پر لعنت بھیجتا ہے اور مردودوں اور مخذولوں کے ساتھ اس کا حصہ قرار دیتا ہے۔ پھر کیا یہی خدا تعالےٰ کی عادت ہے کہ ایسے کذاب اور بے باک مفتری کو جلد نہ پکڑے یہاں تک کہ اس افترا پر بیس برس سے زیادہ عرصہ گذر جائے۔

کون اس کو قبول کر سکتا ہے کہ وہ پاک ذات جس کے غضب کی آگ وہ صاعقہ ہے کہ ہمیشہ جھوٹے ملہموں کو بہت جلد کھاتی رہی ہے اس لئے عرصہ تک اِس جھوٹے کو چھوڑ دے جس کی نظیر دنیا کے صفحہ میں مل ہی نہیں سکتی۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا۔ یعنی اُس سے زیادہ تر ظالم اور کون ہے جو خدائے تعالیٰ پر جھوٹ باندھے۔ بیشک مفتری خدا تعالیٰ کی لعنت کے نیچے ہوتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ پر افترا کرنے والا جلد مارا جاتا ہے۔ سو ایک تقویٰ شعار آدمی کے لئے یہ کافی تھا کہ خدا نے مجھے مفتریوں کی طرح ہلاک نہیں کیا۔ بلکہ میرے ظاہر اور باطن اور میرے جسم اور میری رُوح پر وہ احسان کئے جن کو میں شمار نہیں کر سکتا۔ **میں جوان تھا جب خدا کی وحی اور الہام کا دعویٰ کیا۔ اور اب مَیں بوڑھا ہو گیا** اور ابتدائے دعویٰ پر بیس برس سے بھی زیادہ عرصہ گذر گیا۔ بہت سے میرے دوست اور عزیز جو مجھ سے چھوٹے تھے فوت ہو گئے اور مجھے اُس نے عمر دراز بخشی اور ہر یک مشکل میں میرا متکفّل اور متولّی رہا۔ پس کیا ان لوگوں کے یہی نشان ہوا کرتے ہیں کہ جو خدا تعالیٰ پر افترٰی باندھتے ہیں۔

(انجام آتھم ص ۴۹-۵۱)

یہی قانون خدا تعالیٰ کی سنت میں داخل ہے کہ وہ نبوت کے جھوٹا دعویٰ کرنے والے کو مہلت نہیں دیتا۔ بلکہ ایسا شخص جلد پکڑا جاتا اور اپنی سزا کو پہنچ جاتا ہے۔ اس قاعدہ کے لحاظ سے ہمیں چاہیئے کہ ہم ان تمام لوگوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کو سچا سمجھیں جنہوں نے کسی زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا اور پھر وہ دعویٰ ان کا جڑ پکڑ گیا اور اُن کا مذہب دنیا میں پھیل گیا اور استحکام پکڑ گیا اور ایک عمر پا گیا۔ اور اگر ہم اُن کے مذہب کی کتابوں میں غلطیاں پائیں یا اس مذہب کے پابندوں کو بدچلنیوں میں گرفتار مشاہدہ کریں تو ہمیں نہیں چاہیئے کہ وہ سب داغ ملامت اُن کے مذہب کے بانیوں پر لگا دیں۔ کیونکہ کتابوں کا محرّف ہو جانا ممکن ہے۔ اجتہادی غلطیوں کا تفسیروں میں داخل ہو جانا ممکن ہے۔ لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ کوئی شخص کھلا کھلا خدا پر افترا کرے اور کہے کہ مَیں اس کا نبی ہوں اور اپنا کلام پیش کرے اور کہے کہ یہ خدا کا کلام ہے حالانکہ وہ نبی نہ ہو اور نہ اس کا کلام خدا کا کلام ہو اور پھر خدا اس کو سچوں کی طرح مہلت دے اور سچوں کی طرح اس کی قبولیت پھیلائے۔

(تحفہ قیصریہ ص ۹-۱۰)

کیا کبھی خدا پر افترا کرنے والے کو مفتریات کے پھیلانے کے لئے وہ مہلت ملی جو سچے

ملہموں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی؟ کیا خدا نے نہیں کہا کہ الہام کا افترا کے طور پر دعویٰ کرنے والے ہلاک کئے جائیں گے اور خدا پر جھوٹ باندھنے والے پکڑے جائیں گے؟ یہ توریت میں بھی ہے کہ **جھوٹا نبی قتل کیا جائیگا** اور انجیل میں بھی ہے کہ جھوٹا جلد فنا ہو گا اور اس کی جماعت متفرق ہو جائیگی۔ کیا کوئی ایک نظیر بھی ہے کہ جھوٹے ملہم نے جو خدا پر افترا کرنے والا تھا ایام افترا میں وہ عمر پائی ہو جو اس عاجز کو ایّام دعوتِ الہام الٰہی میں ملی؟ بھلا اگر کوئی نظیر ہے تو پیش تو کرو۔ مَیں نہایت پُرزور دعوے سے کہتا ہوں کہ دنیا کی ابتدا سے آجتک ایک نظیر بھی نہیں ملے گی۔ **پس کیا کوئی ایسا ہے کہ** اِس محکم اور قطعی دلیل سے فائدہ اٹھاوے اور خدا تعالےٰ سے ڈرے؟ مَیں نہیں کہتا کہ بُت پرست عمر نہیں پاتے یا دہریہ اور انا الحق کہنے والے جلد پکڑے جاتے ہیں کیونکہ ان غلطیوں اور ان ضلالتوں کی سزا دینے کے لئے دوسرا عالم ہے۔ لیکن مَیں یہ کہتا ہوں کہ جو شخص خدا تعالیٰ پر الہام کا افترا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ الہام مجھ کو ہوا حالانکہ جانتا ہے کہ وہ الہام اس کو نہیں ہوا وہ جلد پکڑا جاتا ہے۔ اور اُس کی عمر کے دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ قرآن اور انجیل اور توریت نے یہی گواہی دی ہے۔ عقل بھی یہی گواہی دیتی ہے۔ اور اس کے مخالف کوئی منکر کسی تاریخ کے حوالہ سے **ایک نظیر** بھی پیش نہیں کر سکتا۔

(ایّام الصلح ص ۳۵-۳۶)

عورت

عورتوں اور بچوں کے ساتھ تعلقات اور معاشرت میں لوگوں نے غلطیاں کھائی ہیں اور جادۂ مستقیم سے بہک گئے ہیں۔ قرآن شریف میں لکھا ہے۔ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ مگر اب اس کے خلاف عمل ہو رہا ہے۔

دو قسم کے لوگ اس کے متعلق بھی پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ تو ایسا ہے کہ انہوں نے عورتوں کو بالکل خلیع الرَّسَن کر دیا ہے۔ دین کا کوئی اثر ہی اُن پر نہیں ہوتا اور وہ کھلے طور پر اسلام کے خلاف کرتی ہیں اور کوئی اُن سے نہیں پوچھتا۔ بعض ایسے ہیں کہ انہوں نے خلیع الرسن تو نہیں کیا مگر اسکے بالمقابل ایسی سختی اور پابندی کی ہے کہ ان میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا اور کنیزکوں اور بہائم سے بھی بدتر اُن سے سلوک ہوتا ہے۔ مارتے ہیں تو ایسے بے درد ہو کر کہ کچھ پتہ ہی نہیں کہ آگے کوئی جاندار ہستی ہے یا نہیں۔ غرض بہت ہی بُری طرح سلوک کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پنجاب میں مثل مشہور ہے کہ عورت کو پاؤں کی جوتی کے ساتھ تشبیہہ دیتے ہیں کہ ایک اتار دی دوسری پہن لی۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے اور اسلام کے شعائر کے خلاف ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری باتوں کے کامل نمونہ ہیں۔ آپ کی زندگی میں دیکھو کہ آپ عورتوں کے ساتھ کیسی معاشرت کرتے تھے۔ میرے نزدیک وہ شخص بُزدل اور نامرد ہے جو عورت کے مقابلہ میں کھڑا ہوتا ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کا مطالعہ کرو تا تمہیں معلوم ہو کہ آپ ایسے خلیق تھے باوجودیکہ آپ بڑے بارعب تھے لیکن اگر کوئی ضعیفہ عورت بھی آپ کو کھڑا کرتی تو آپ اس وقت تک کھڑے رہتے جبتک کہ وہ اجازت نہ دے۔

(ملفوظات جلد چہارم ص۴۴)

یہ مت سمجھو کہ پھر عورتیں ایسی چیز ہیں کہ ان کو بہت ذلیل اور حقیر قرار دیا جاوے۔ **نہیں نہیں!** ہمارے ہادیٔ کامل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جس کا اپنے اہل کے ساتھ عمدہ سلوک ہو۔ بیوی کے ساتھ جس کا عمدہ چال چلن اور معاشرت اچھی نہیں وہ نیک کہاں! دوسروں کے ساتھ نیکی

اور بھلائی تب کر سکتا ہے جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ عمدہ سلوک کرتا ہو اور عمدہ معاشرت رکھتا ہو نہ یہ کہ ہر ادنیٰ بات پر زد و کوب کرے۔ ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک غصّہ سے بھرا ہُوا انسان بیوی سے ادنیٰ سی بات پر ناراض ہو کر اس کو مارتا ہے اور کسی نازک مقام پر چوٹ لگی ہے اور بیوی مرگئی ہے۔ اس لئے ان کے واسطے اللہ تعالےٰ نے یہ فرمایا ہے کہ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ ہاں اگر وہ بے جا کام کرے تو تنبیہہ ضروری چیز ہے انسان کو چاہیئے کہ عورتوں کے دل میں یہ بات جما دے کہ وہ کوئی ایسا کام جو دین کے خلاف ہو کبھی بھی پسند نہیں کر سکتا اور ساتھ ہی وہ ایسا جابر اور ستم شعار نہیں کہ اس کی کسی غلطی پر بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

خاوند عورت کے لئے اللہ تعالےٰ کا مظہر ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اپنے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ پس مرد میں جلالی اور جمالی رنگ دونوں موجود ہونے چاہئیں۔

(ملفوظات جلد دوم ص۱۴۷)

فحشاء کے سوا باقی تمام کج خُلقیاں اور تلخیاں عورتوں کی برداشت کرنی چاہئیں۔ ہمیں تو کمال بے شرمی معلوم ہوتی ہے کہ مرد ہو کر عورت سے جنگ کریں۔ ہم کو خدا نے مرد بنایا ہے۔ درحقیقت ہم پر اتمام نعمت ہے اس کا شکریہ یہ ہے کہ ہم عورتوں سے لطف اور نرمی کا برتاؤ کریں۔

(ملفوظات جلد دوم ص۱)

میرا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ مَیں نے اپنی بیوی پر آوازہ کسا تھا اور مَیں محسوس کرتا تھا کہ وہ بانگ بلند دل کے رنج سے ملی ہوئی ہے اور بایں ہمہ کوئی دلآزار اور درشت کلمہ مُنہ سے نہیں نکالا تھا۔ اس کے بعد میں بہت دیر تک استغفار کرتا رہا اور بڑے خشوع اور خضوع سے نفلیں پڑھیں اور کچھ صدقہ بھی دیا کہ یہ درشتی زوجہ پر کسی پنہانی معصیتِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔

(ملفوظات جلد دوم ص۲)

"یہ طریق اچھا نہیں اِس سے روک دیا جائے مسلمانوں کے لیڈر عبد الکریم کو"

.... اِس الہام میں تمام جماعت کے لئے تعلیم ہے کہ اپنی بیویوں سے رفق اور نرمی کے ساتھ پیش آویں۔ وہ اُن کی کنیزکیں نہیں ہیں۔ درحقیقت نکاح مرد اور عورت کا باہم ایک معاہدہ ہے۔ پس کوشش کرو کہ اپنے معاہدہ میں دغا باز نہ ٹھہرو۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی اپنی بیویوں کے ساتھ نیک سلوک کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ لو

حدیث میں ہے خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ یعنی تم میں سے اچھا وہی ہے جو اپنی بیوی سے اچھا ہے۔ سو روحانی اور جسمانی طور پر اپنی بیویوں سے نیکی کرو۔ اُن کے لئے دعا کرتے رہو اور طلاق سے پرہیز کرو۔ کیونکہ نہایت بد خدا کے نزدیک وہ شخص ہے جو طلاق دینے میں جلدی کرتا ہے جسکو خدا نے جوڑا ہے اس کو ایک گندے برتن کی طرح جلد مت توڑو۔

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص۳۷ حاشیہ)

مضمون پڑھنے والے نے ایک یہ اعتراض قرآن شریف پر پیش کیا کہ خاوند کی مرضی پر طلاق رکھی ہے۔ اس سے شاید اس کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ عقل کی رو سے مرد اور عورت درجہ میں برابر ہیں۔ تو پھر اس صورت میں طلاق کا اختیار محض مرد کے ہاتھ میں رکھنا بلاشبہ قابل اعتراض ہوگا۔ پس اس اعتراض کا یہی جواب ہے کہ مرد اور عورت درجہ میں ہرگز برابر نہیں۔ دنیا کے قدیم تجربہ نے یہی ثابت کیا ہے کہ مرد اپنی جسمانی اور علمی طاقتوں میں عورتوں سے بڑھ کر ہیں اور شاذ و نادر حکم معدوم کا رکھتا ہے۔ پس جب مرد کا درجہ باعتبار اپنے ظاہری اور باطنی قوتوں کے عورت سے بڑھ کر ہے تو پھر یہی قرین انصاف ہے کہ مرد اور عورت کے علیحدہ ہونے کی حالت میں عنان اختیار مرد کے ہی ہاتھ میں رکھی جائے مگر تعجب ہے کہ یہ اعتراض ایک آریہ نے کیوں پیش کیا؟ کیونکہ آریوں کے اصول کی رو سے تو مرد کا درجہ عورت سے اس قدر بڑھ کر ہے کہ بغیر لڑکا پیدا ہونے کے نجات ہی نہیں .....

..... یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ اگر ایک آریہ کی چالیس لڑکیاں بھی ہوں یا فرض کرو کہ سَو لڑکی ہو تب بھی وہ اپنی نجات کے لئے فرزند نرینہ کا خواہشمند ہوتا ہے اور اس کے مذہب کی رو سے سو لڑکیاں بھی ایک لڑکے کے برابر نہیں ہوسکتیں ....

ماسوا اس کے منو شاستر کو پڑھ کر دیکھ لو کہ اس میں بھی صاف لکھا ہے کہ اگر عورت مرد کی دشمن ہو جائے یا زہر دینا چاہے یا اور کوئی ایسا سبب ہو تو مرد کو طلاق دینے کا اختیار ہے۔ اور عملی طور پر تمام شریف ہندوؤں کا یہی طریق ہے کہ اگر عورت کو بدکار اور بدچلن پاویں تو اس کو طلاق دے دیتے ہیں۔ اور تمام دنیا میں انسانی فطرت نے یہی پسند کیا ہے کہ ضرورتوں کے وقت میں مرد عورتوں کو طلاق دیتے ہیں اور مرد کا عورت پر ایک حق زائد بھی ہے کہ مرد عورت کی تمام زندگی کے تمام اقسام آسائش کا متکفّل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ یعنی یہ بات مردوں کے ذمہ ہے کہ جو عورتوں کو کھانے کے لئے ضرورتیں ہوں یا پہننے کے لئے ضرورتیں ہوں وہ سب اُن کے لئے مہیّا کریں۔ اس سے

ظاہر ہے کہ مرد عورت کا مربّی اور محسن اور ذمہ دار آسائش کا ٹھہرایا گیا ہے اور وہ عورت کے لئے بطور آقا اور خداوند نعمت کے ہے۔ اسی طرح مرد کو بہ نسبت عورت کے فطرتی قویٰ زبردست دیئے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے مرد عورت پر حکومت کرتا چلا آیا ہے اور مرد کی فطرت کو جس قدر باعتبار کمال قوتوں کے انعام عطا کیا گیا ہے وہ عورت کی قوتوں کو عطا نہیں کیا گیا اور قرآن شریف میں یہ حکم ہے کہ اگر مرد اپنی عورت کو مروّت اور احسان کی رُو سے ایک پہاڑ سونے کا بھی دے تو طلاق کی حالت میں واپس نہ لے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں عورتوں کی کس قدر عزت کی گئی ہے۔ ایک طور سے تو مردوں کو عورتوں کا نوکر ٹھہرایا گیا ہے۔ اور بہر حال مردوں کے لئے قرآن شریف میں یہ حکم ہے کہ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی تم اپنی عورتوں سے ایسے حسن سلوک سے معاشرت کرو کہ ہر ایک عقلمند معلوم کر سکے کہ تم اپنی بیوی سے احسان اور مروّت سے پیش آتے ہو۔

علاوہ اس کے شریعتِ اسلام نے صرف مرد کے ہاتھ میں ہی اختیار نہیں رکھا کہ جب کوئی خرابی دیکھے یا ناموافقت پاوے تو عورت کو طلاق دیدے بلکہ عورت کو بھی یہ اختیار دیا ہے کہ وہ بذریعہ حاکم وقت کے طلاق لے لے۔ اور جب عورت بذریعہ حاکم کے طلاق لیتی ہے تو اسلامی اصطلاح میں اس کا نام **خلع** ہے۔ جب عورت مرد کو ظالم پاوے یا وہ اس کو ناحق مارتا ہو یا اَور طرح سے ناقابل برداشت بدسلوکی کرتا ہو یا کسی اَور وجہ سے ناموافقت ہو یا وہ مرد دراصل نامرد ہو یا تبدیل مذہب کرے یا ایسا ہی کوئی اَور سبب پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے عورت کو اس کے گھر میں آباد رہنا ناگوار ہو تو ان تمام حالتوں میں عورت یا اس کے کسی ولی کو چاہیئے کہ حاکم وقت کے پاس یہ شکایت کرے اور حاکم وقت پر یہ لازم ہوگا کہ اگر عورت کی شکایت واقعی درست سمجھے تو اس عورت کو اس مرد سے اپنے حکم سے علیحدہ کر دے اور نکاح کو توڑ دے۔ لیکن اس حالت میں اس مرد کو بھی عدالت میں بلانا ضروری ہوگا کہ کیوں نہ اس کی عورت کو اس سے علیحدہ کیا جائے۔

اب دیکھو یہ کس قدر انصاف کی بات ہے کہ جیسا کہ اسلام نے یہ پسند نہیں کیا کہ کوئی عورت بغیر ولی کے جو اس کا باپ یا بھائی یا اور کوئی عزیز ہو خود بخود اپنا نکاح کسی سے کر لے ایسا ہی یہ بھی پسند نہیں کیا کہ عورت خود بخود مرد کی طرح اپنے شوہر سے علیحدہ ہو جائے بلکہ جدا ہونے کی حالت میں نکاح سے بھی زیادہ احتیاط کی ہے کہ حاکم وقت کا ذریعہ بھی فرض قرار دیا ہے تا عورت اپنے نقصان عقل کی وجہ سے اپنے تئیں کوئی ضرر نہ پہنچا سکے۔

(چشمہ معرفت ص ۲۷۳-۲۷۶)

پھر مضمون پڑھنے والے نے بیان کیا کہ قرآن میں لکھا ہے کہ **عورتیں کھیتوں** کی مانند صرف شہوت رانی کا ذریعہ ہیں۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ یہ ناپاک طبع ہندو افترا میں کہاں تک بڑھتا جاتا ہے اور کیسے اپنی طرف سے الفاظ تراش کر قرآن شریف کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ایسے مفتری کے مقابل پر بجز اس کے ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ قرآن شریف میں صرف یہ آیت ہے۔ نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ یعنی تمہاری عورتیں تمہاری اولاد پیدا ہونے کے لئے ایک کھیتی ہیں۔ پس تم اپنی کھیتی کی طرف جس طور سے چاہو آؤ۔ صرف کھیتی ہونے کا لحاظ رکھو۔ یعنی اس طور سے صحبت نہ کرو جو اولاد کی مانع ہو .... ہاں اگر عورت بیمار ہو اور یقین ہو کہ حمل ہونے سے اس کی موت کا خطرہ ہوگا ایسا ہی صحت نیت سے کوئی اور مانع ہو تو یہ صورتیں مستثنیٰ ہیں۔ ورنہ عند الشرع ہرگز جائز نہیں کہ اولاد ہونے سے روکا جائے۔

غرض جبکہ خدا تعالےٰ نے عورت کا نام کھیتی رکھا تو ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اسی واسطے اس کا نام کھیتی رکھا کہ اولاد پیدا ہونے کی جگہ اس کو قرار دیا۔ اور نکاح کے اغراض میں سے **ایک یہ** بھی غرض رکھی کہ تا اس نکاح سے خدا کے بندے پیدا ہوں جو اس کو یاد کریں۔ **دوسری** غرض اللہ تعالےٰ نے یہ بھی قرار دی ہے کہ تا مرد اپنی بیوی کے ذریعہ اور بیوی اپنے خاوند کے ذریعہ سے بدنظری اور بدعملی سے محفوظ رہے۔ **تیسری غرض** یہ بھی قرار دی کہ تا باہم انس پیدا ہو کر تنہائی کے رنج سے محفوظ رہیں۔ یہ سب آیتیں قرآن شریف میں موجود ہیں ہم کہاں تک کتاب کو طول دیتے جائیں۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۷۹-۲۸۰)

مخالفوں کی طرف سے یہ اعتراض ہُوا کرتا ہے کہ تعدد ازدواج میں یہ ظلم ہے کہ اعتدال نہیں رہتا۔ اعتدال اسی میں ہے کہ ایک مرد کے لئے ایک ہی بیوی ہو۔ مگر مجھے تعجب ہے کہ وہ دوسروں کے حالات[۴] میں کیوں خواہ نخواہ مداخلت کرتے ہیں۔ جبکہ یہ مسئلہ اسلام میں شائع متعارف ہے کہ چار تک بیویاں کرنا جائز ہے **مگر جبر کسی پر نہیں**۔ اور ہر ایک مرد اور عورت کو اس مسئلہ کی بخوبی خبر ہے تو یہ ان عورتوں کا حق ہے کہ جب کسی مسلمان سے نکاح کرنا چاہیں تو اوّل شرط کرا لیں کہ ان کا خاوند کسی حالت میں دوسری بیوی نہیں کرے گا۔ اور اگر نکاح سے پہلے ایسی شرط لکھی جائے تو بیشک ایسی بیوی کا خاوند اگر دوسری بیوی کرے تو جرم نقضِ عہد کا مرتکب ہوگا۔ لیکن اگر کوئی عورت ایسی شرط نہ لکھا دے اور حکمِ شرع پر راضی ہووے تو اس حالت میں دوسرے کا

دخل دینا بے جا ہوگا۔ اور اسجگہ یہ مثل صادق آئیگی کہ "میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی" ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ خدا نے تو تعدّد ازواج فرض واجب نہیں کیا ہے۔ خدا کے حکم کی رُو سے صرف جائز ہے۔ پس اگر کوئی مرد اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے اس جائز حکم سے فائدہ اٹھانا چاہے جو خدا کے جاری کردہ قانون کی رو سے ہے اور اس کی پہلی بیوی اس پر راضی نہ ہو تو اس بیوی کے لئے یہ راہ کشادہ ہے کہ وہ طلاق لے لے اور اس غم سے نجات پاوے۔ اور اگر دوسری عورت جس سے نکاح کرنے کا ارادہ ہے اس نکاح پر راضی نہ ہو تو اس کے لئے بھی یہ سہل طریق ہے کہ ایسی درخواست کرنے والے کو انکاری جواب دے دے کسی پر جبر تو نہیں۔ لیکن اگر وہ دونوں عورتیں اس نکاح پر راضی ہو جاویں تو اس صورت میں کسی آریہ کو خواہ نخواہ دخل دینے کا کیا حق ہے؟ کیا اس مرد نے اُن عورتوں سے نکاح کرنا ہے یا اس آریہ سے جس حالت میں خدا نے تعدّد ازواج کو کسی موقعہ پر انسانی ضرورتوں میں جائز رکھا ہے اور ایک عورت اپنے خاوند کے دوسرے نکاح میں رضامندی ظاہر کرتی ہے اور دوسری عورت بھی اس نکاح پر خوش ہے تو کسی کا حق نہیں ہے کہ اُن کے اس باہمی فیصلہ کو منسوخ کردے۔ اور اسجگہ یہ بحث پیش کرنا کہ ایک سے زیادہ بیوی کرنا پہلی بیوی کے حق میں ظلم ہے اور طریق اعتدال کے برخلاف ہے یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کی تعصّب سے عقل ماری گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ حقوق عباد کے متعلق ہے۔ اور جو شخص دو بیویاں کرتا ہے۔ اس میں خدا تعالیٰ کا حرج نہیں۔ اگر حرج ہے تو اس بیوی کا جو پہلی بیوی ہے یا دوسری بیوی کا۔ پس اگر پہلی بیوی اس نکاح میں اپنی حق تلفی سمجھتی ہے تو وہ طلاق لے کر اس جھگڑے سے خلاصی پا سکتی ہے۔ اور اگر خاوند طلاق نہ دے تو بذریعہ حاکم وقت وہ خلع کرا سکتی ہے۔ اور اگر دوسری بیوی اپنا کچھ حرج سمجھتی ہے تو وہ اپنے نفع نقصان کو خود سمجھتی ہے۔ پس یہ اعتراض کرنا کہ اس طور سے اعتدال ہاتھ سے جاتا ہے خواہ نخواہ کا دخل ہے۔ اور بااینہمہ خدا تعالےٰ نے مردوں کو وصیت فرمائی ہے کہ اگر ان کی چند بیویاں ہوں تو ان میں اعتدال رکھیں ورنہ ایک ہی بیوی پر قناعت کریں۔ اور یہ کہنا کہ تعدّد ازدواج شہوت پرستی سے ہوتا ہے یہ بھی سراسر جاہلانہ اور متعصبانہ خیال ہے۔ ہم نے تو اپنی آنکھوں کے تجربہ سے دیکھا ہے کہ جن لوگوں پر شہوت پرستی غالب ہے۔ اگر وہ تعدّد ازدواج کی مبارک رسم کے پابند ہو جائیں تب تو وہ فسق و فجور اور زنا کاری اور بدکاری سے رُک جاتے ہیں اور یہ طریق اُن کو متقی اور پرہیزگار بنا دیتا ہے۔ ورنہ نفسانی شہوات کا تُند اور تیز سیلاب بازاری عورتوں کے دروازہ تک انکو پہنچا دیتا ہے۔ آخر آتشک اور سوزاک

خریدتے اور کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور وہ کام فسق و فجور کے چھپے چھپے اور کھلے کھلے ان سے صادر ہوتے ہیں جن کی نظیر ان لوگوں میں ہرگز نہیں پائی جاتی جن کی دو دو تین تین دلپسند بیویاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ تھوڑی مدت تک تو اپنے تئیں روکتے ہیں آخر اس قدر یکدفعہ ان کی ناجائز شہوات جوش میں آتی ہیں کہ جیسے ایک دریا کا بند ٹوٹ کر وہ دریا دن کو یا رات کو تمام اردگرد کے دیہات کو تباہ کر دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام کام نیت پر موقوف ہیں۔ جو لوگ اپنے اندر یہ محسوس کرتے ہیں کہ دوسری بیوی کرنے سے اُن کے تقویٰ کا سامان پورا ہوجائیگا اور وہ فسق و فجور سے بچ جائیں گے یا یہ کہ وہ اس ذریعہ سے اپنی صالح اولاد چھوڑ جائیں گے تو ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ضرور اس بابرکت کام سے حصہ لیں۔ خدا کی جناب میں بدکاری اور بدنظری ایسے ناپاک گناہ ہیں جن سے نیکیاں باطل ہو جاتی ہیں۔ اور آخر اسی دنیا میں جسمانی عذاب نازل ہو جاتے ہیں۔ پس اگر کوئی تقویٰ کے محکم قلعہ میں داخل ہونے کی نیت سے ایک سے زیادہ بیویاں کرتا ہے اس کے لئے صرف جائز ہی نہیں بلکہ یہ عمل اس کے لئے موجب ثواب ہے جو شخص اپنے تئیں بدکاری سے روکنے کے لئے تعدّد ازدواج کا پابند ہوتا ہے وہ گویا اپنے تئیں فرشتوں کی طرح بنانا چاہتا ہے۔ مَیں خوب جانتا ہوں کہ یہ اندھی دنیا صرف جھوٹی منطقوں اور جھوٹی شیخیوں میں گرفتار ہے۔ وہ لوگ جو تقویٰ کی تلاش میں لگے نہیں رہتے کہ کیونکر حاصل ہو اور تقویٰ کے حصول کے لئے کوئی تدبیر نہیں کرتے اور نہ دُعا کرتے ہیں اُن کی حالتیں اُس پھوڑے کی مانند ہیں جو اُوپر سے بہت چمکتا ہے مگر اس کے اندر بجز پیپ کے اور کچھ نہیں۔ اور خدا کی طرف جھکنے والے جو کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کرتے وہ تقویٰ کی راہوں کو یوں ڈھونڈتے پھرتے ہیں جیسا کہ ایک گدا روٹی کو اور جو لوگ خدا کی راہ میں مصیبتوں کی آگ میں پڑتے ہیں جنکا دل ہر وقت مغموم رہتا ہے اور خدا کی راہ میں بڑے مقاصد مگر دشوار گذار ان کی رُوح کو تحلیل کرتے اور کمر کو توڑتے رہتے ہیں اُن کے لئے خدا خود بخود تجویز کرتا ہے کہ وہ اپنے دن یا رات میں سے چند منٹ اپنی مانوس بیویوں کے ساتھ بسر کریں اور اس طرح پر اپنے کوفتہ اور شکستہ نفس کو آرام پہنچاویں اور پھر سرگرمی سے اپنے دینی کام میں مشغول ہو جاویں۔ ان باتوں کو کوئی نہیں سمجھتا مگر وہ جو اس راہ میں مذاق رکھتے ہیں۔

(چشمۂ معرفت ص ۲۳۶ - ۲۳۹)

محبت کو بالائے طاق رکھ کر عملی طور پر سب بیویوں کو برابر رکھنا چاہیئے مثلاً پارچہ جات

خرچ خوراک۔ معاشرت حتّٰی کہ مباشرت میں بھی مساوات برتے۔ یہ حقوق اس قسم کے ہیں کہ اگر انسان کو پورے طور پر معلوم ہوں تو بجائے بیاہ کے وہ ہمیشہ رنڈوا رہنا پسند کرے۔ خدا تعالیٰ کی تہدید کے نیچے رہ کر جو شخص زندگی بسر کرتا ہے وہی ان کی بجا آوری کا دم بھر سکتا ہے۔ ایسے لذّات کی نسبت جن سے خدا تعالیٰ کا تازیانہ ہمیشہ سر پر رہے تلخ زندگی بسر کر لینی ہزار ہا درجہ بہتر ہے تعدد ازدواج کی نسبت اگر ہم تعلیم دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ معصیت میں پڑنے سے انسان بچا رہے اور شریعت نے اسے بطور علاج کے ہی رکھا ہے کہ اگر انسان اپنے نفس کا میلان اور غلبہ شہوات کی طرف دیکھے اور اس کی نظر بار بار خراب ہوتی ہو تو زنا سے بچنے کے لئے دوسری شادی کر لے۔ لیکن پہلی بیوی کے حقوق تلف نہ کرے۔ تورات سے بھی یہی ثابت ہے کہ اس کی دلداری زیادہ کرے کیونکہ جوانی کا بہت سا حصہ اُس نے اس کے ساتھ گذارا ہوا ہوتا ہے اور ایک گہرا تعلق خاوند کا اُسکے ساتھ ہوتا ہے۔ پہلی بیوی کی رعایت اور دلداری یہاں تک کرنی چاہیئے کہ اگر کوئی ضرورت مرد کو ازدواج ثانی کی محسوس ہو لیکن وہ دیکھتا ہے کہ دوسری بیوی کے کرنے سے اس کی پہلی بیوی کو سخت صدمہ ہوتا ہے اور حد درجہ کی اس کی دل شکنی ہوتی ہے تو اگر وہ صبر کر سکے اور کسی معصیت میں مبتلا نہ ہوتا ہو اور نہ کسی شرعی ضرورت کا اس سے خون ہوتا ہو تو ایسی صورت میں اگر ان اپنی ضرورتوں کی قربانی سابقہ بیوی کی دلداری کے لئے کر دے اور ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرے تو کوئی حرج نہیں ہے اور اسے مناسب ہے کہ دوسری شادی نہ کرے۔

ہمیں جو کچھ خدا تعالیٰ سے معلوم ہوا ہے وہ بلا کسی رعایت کے بیان کرتے ہیں۔ قرآن شریف کا منشا زیادہ بیویوں کی اجازت سے یہ ہے کہ تم کو اپنے نفوس کو تقویٰ پر قائم رکھنے اور دوسرے اغراض مثلاً اولاد صالحہ کے حاصل کرنے اور خویش و اقارب کی نگہداشت اور انکے حقوق کی بجا آوری سے ثواب حاصل ہو اور اپنی اغراض کے لحاظ سے اختیار دیا گیا ہے کہ ایک دو تین چار عورتوں تک نکاح کر لو۔ لیکن اگر ان میں عدل نہ کر سکو تو پھر یہ فسق ہو گا۔ اور بجائے ثواب کے عذاب حاصل کرو گے کہ ایک گناہ سے نفرت کی وجہ سے دوسرے گناہوں پر آمادہ ہوئے۔ دل دکھانا بڑا گناہ ہے۔ اور لڑکیوں کے تعلقات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ جب والدین اُن کو اپنے سے جدا اور دوسرے کے حوالہ کرتے ہیں تو خیال کرو کہ کیا اُمیدیں اُن کے دلوں میں ہوتی ہیں اور جن کا اندازہ انسان عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کے حکم سے ہی کر سکتا ہے۔ ....

خدا تعالےٰ کے قانون کو اُس کے منشا کے برخلاف ہرگز نہ برتنا چاہیئے اور نہ اس سے ایسا

فائدہ اٹھانا چاہیئے جس سے وہ صرف نفسانی جذبات کی ایک سپر بن جاوے۔ یاد رکھو کہ ایسا کرنا معصیت ہے۔ خدا تعالیٰ بار بار فرماتا ہے کہ شہوات کا تم پر غلبہ نہ ہو بلکہ تمہاری غرض ہر ایک امر میں تقویٰ ہو۔

(ملفوظات جلد ہفتم ص ۶۳ - ۶۵)

عورتوں کے حقوق کی جیسی حفاظت اسلام نے کی ہے ویسی کسی دوسرے مذہب نے قطعاً نہیں کی۔ مختصر الفاظ میں فرما دیا ہے۔ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَيْهِنَّ کہ جیسے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں ویسے ہی عورتوں کے مردوں پر ہیں۔ بعض لوگوں کا حال سُنا جاتا ہے کہ ان بیچاریوں کو پاؤں کی جوتی کی طرح جانتے ہیں اور ذلیل ترین خدمات ان سے لیتے ہیں۔ گالیاں دیتے ہیں۔ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور پردہ کے حکم ایسے ناجائز طریق سے برتتے ہیں کہ ان کو زندہ درگور کر دیتے ہیں چاہیئے کہ بیویوں سے خاوند کا ایسا تعلق ہو جیسے دو سچے اور حقیقی دوستوں کا ہوتا ہے۔ انسان کے اخلاق فاضلہ اور خدا تعالیٰ سے تعلق کی پہلی گواہ تو یہی عورتیں ہوتی ہیں۔ اگر انہی سے اس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ سے صلح ہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل کے لئے اچھا ہے۔

(ملفوظات جلد پنجم ص ۴۱۷ - ۴۱۸)

ہماری جماعت کے لئے ضروری ہے کہ اپنی پرہیزگاری کے لئے عورتوں کو پرہیزگاری سکھاویں ورنہ وہ گنہگار ہونگے۔ اور جبکہ اس کی عورت سامنے ہو کر بتلا سکتی ہے کہ تجھ میں فلاں فلاں عیب ہیں تو پھر عورت خدا سے کیا ڈرے گی۔ جب تقویٰ نہ ہو تو ایسی حالت میں اولاد بھی پلید پیدا ہوتی ہے اولاد کا طیب ہونا تو طیبات کا سلسلہ چاہتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر اولاد خراب ہوتی ہے اسلئے چاہیئے کہ سب توبہ کریں اور عورتوں کو اپنا اچھا نمونہ دکھلاویں۔ **عورت خاوند کی جاسوس ہوتی ہے**۔ وہ اپنی بدیاں اس سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ نیز عورتیں چھپی ہوئی دانا ہوتی ہیں۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ وہ احمق ہیں۔ وہ اندر ہی اندر تمہارے سب اثروں کو حاصل کرتی ہیں۔ جب خاوند سیدھے راستہ پر ہوگا تو وہ اس سے ڈرے گی اور خدا سے بھی ....

سب انبیاء اولیاء کی عورتیں نیک تھیں۔ اس لئے کہ اُن پر نیک اثر پڑتے تھے۔ جب مرد بدکار اور فاسق ہوتے ہیں تو اُن کی عورتیں بھی ویسی ہی ہوتی ہیں۔ ایک چور کی بیوی کو یہ خیال کب ہو سکتا ہے کہ میں تہجد پڑھوں۔ خاوند تو چوری کرنے جاتا ہے تو کیا وہ پیچھے تہجد پڑھتی ہے؟

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ اسی لئے کہا ہے کہ عورتیں خاوندوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ جس حد تک خاوند صلاحیت اور تقویٰ بڑھاویگا کچھ حصہ اس سے عورتیں ضرور لیں گی۔ ویسے ہی اگر وہ بدمعاش ہوگا تو بدمعاشی سے وہ حصہ لیں گی۔

(ملفوظات جلد پنجم ص ۲۱۷-۲۱۸)

اگر تم اپنی اصلاح چاہتے ہو تو یہ بھی لازمی امر ہے کہ گھر کی عورتوں کی اصلاح کرو۔ عورتوں میں بُت پرستی کی جڑ ہے۔ کیونکہ اُن کی طبائع کا میلان زینت پرستی کی طرف ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بُت پرستی کی ابتداء انہی سے ہوئی ہے۔ بُزدلی کا مادہ بھی ان میں زیادہ ہوتا ہے کہ ذرا سی سختی پر اپنے جیسی مخلوق کے آگے ہاتھ جوڑنے لگ جاتی ہیں۔ اس لئے جو لوگ زن پرست ہوتے ہیں رفتہ رفتہ اُن میں بھی یہ عادتیں سرایت کرتی جاتی ہیں۔ پس بہت ضروری ہے کہ ان کی اصلاح کی طرف متوجہ رہو۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ۔ اور اسی لئے مرد کو عورتوں کی نسبت قویٰ زیادہ دیئے گئے ہیں۔ اس وقت جو نئی روشنی کے لوگ مساوات پر زور دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہیں اُن کی عقلوں پر تعجب آتا ہے وہ ذرا مردوں کی جگہ عورتوں کی فوجیں بنا کر جنگوں میں بھیج کر دیکھیں تو سہی کہ کیا نتیجہ مساوی نکلتا ہے یا مختلف؟ ایک طرف تو اُسے حمل ہے اور ایک طرف جنگ ہے وہ کیا کر سکے گی؟ غرضیکہ عورتوں میں مردوں کی نسبت قویٰ کمزور ہیں اور کم بھی ہیں اس لئے مرد کو چاہیئے کہ عورت کو اپنے ماتحت رکھے۔

(ملفوظات جلد ہفتم ص ۱۳۳-۱۳۴)

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر تاہم آپکی بیویاں سب کام کر لیا کرتی تھیں۔ جھاڑو بھی دے لیا کرتی تھیں۔ اور ساتھ اس کے عبادت بھی کرتی تھیں چنانچہ ایک بیوی نے اپنی حفاظت کے واسطے ایک رسا لٹکا رکھا تھا کہ عبادت میں اونگھ نہ آئے عورتوں کے لئے ایک ٹکڑا عبادت کا خاوندوں کا حق ادا کرنا ہے اور ایک ٹکڑا عبادت کا خدا کا شکر بجا لانا ہے۔

(ملفوظات جلد ششم ص ۵۳)

پردہ

آجکل پردہ پر حملے کئے جاتے ہیں لیکن یہ لوگ نہیں جانتے کہ اسلامی پردہ سے مراد زندان نہیں بلکہ ایک قسم کی روک ہے کہ غیر مرد اور عورت ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔ جب پردہ ہوگا ٹھوکر سے بچیں گے۔ ایک منصف مزاج کہہ سکتا ہے کہ ایسے لوگوں میں جہاں غیر مرد و عورت اکٹھے بلا تامل اور بے محابا مل سکیں۔ سیریں کریں کیونکر جذباتِ نفس سے اضطراراً ٹھوکر نہ کھائیں گے۔ بسا اوقات سُننے اور دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسی قومیں غیر مرد اور عورت کے ایک مکان میں تنہا رہنے کو حالانکہ دروازہ بھی بند ہو کوئی عیب نہیں سمجھتیں یہ گویا تہذیب ہے۔ انہی بدنتائج کو روکنے کیلئے شارع اسلام نے وہ باتیں کرنے کی اجازت ہی نہ دی جو کسی کی ٹھوکر کا باعث ہوں۔ ایسے موقعہ پر یہ کہہ دیا کہ جہاں اس طرح غیر محرم مرد و عورت ہر دو جمع ہوں تیسرا اُن میں شیطان ہوتا ہے۔ ان ناپاک نتائج پر غور کرو جو یورپ اس خلیع الرسن تعلیم سے بھگت رہا ہے۔ بعض جگہ بالکل قابلِ شرم طوائفانہ زندگی بسر کی جا رہی ہے۔ یہ انہی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی چیز کو خیانت سے بچانا چاہتے ہو تو حفاظت کرو۔ لیکن اگر حفاظت نہ کرو اور یہ سمجھ رکھو کہ بھلے مانس لوگ ہیں تو یاد رکھو کہ ضرور وہ چیز تباہ ہوگی۔ اسلامی تعلیم کیسی پاکیزہ تعلیم ہے کہ جس نے مرد و عورت کو الگ رکھ کر ٹھوکر سے بچایا اور انسان کی زندگی حرام اور تلخ نہیں کی جس کے باعث یورپ نے آئے دن کی خانہ جنگیاں اور خودکُشیاں دیکھیں۔ بعض شریف عورتوں کا طوائفانہ زندگی بسر کرنا ایک عملی نتیجہ اس اجازت کا ہے جو غیر عورت کو دیکھنے کے لئے دی گئی۔

(ملفوظات جلد اوّل صـ۴۳)

اسلامی پردہ سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ عورت جیلخانہ کی طرح بند رکھی جائے۔ قرآن شریف کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں ستر کریں۔ وہ غیر مرد کو نہ دیکھیں جن عورتوں کو باہر جانے کی ضرورت تمدّنی امور کے لئے پڑے انکو گھر سے باہر نکلنا منع نہیں ہے وہ بیشک جائیں لیکن نظر کا پردہ ضروری ہے۔

(ملفوظات جلد اول صـ۴۳)

...... ساتھ ہی میں ایک اور عرض کیلئے جرأت کرتا ہوں کہ گو آریہ صاحبوں کو اِس زمانہ میں

مسلمانوں سے کیسی ہی نفرت ہے اور اسلام کے عقائد سے کیسی ہی بیزاری ہے مگر برائے خدا پردہ کی رسم کو بالکل الوداع نہ کہہ دیں کہ اس میں بہت سی خرابیاں ہیں جو بعد میں معلوم ہونگی۔ یہ بات ہر ایک فہیم انسان سمجھ سکتا ہے کہ بہت سا حصہ انسانوں کا نفسِ امّارہ کے ماتحت چل رہا ہے۔ اور وہ اپنے نفس کے ایسے قابو میں ہیں کہ اُس کے جوشوں کے وقت کچھ بھی خدا تعالیٰ کی سزا کا دھیان نہیں رکھتے۔ جوان اور خوبصورت عورتوں کو دیکھ کر بدنظری سے باز نہیں آتے۔ اور ایسے ہی بہت سی عورتیں ہیں کہ خراب دلی سے بیگانہ مردوں کی طرف نگاہیں کرتی ہیں اور جب فریقین کو باوجود اُنکی اس خراب حالت میں ہونے کے پوری آزادی دی جائے تو یقیناً اس کا وہی انجام ہوگا جیسا کہ یورپ کے بعض حصوں سے ظاہر ہے۔ ہاں جب یہ لوگ درحقیقت پاک دل ہو جائیں گے اور ان کی امّارگی جاتی رہیگی اور شیطانی رُوح نکل جائیگی اور ان کی آنکھوں میں خدا کا خوف پیدا ہو جائیگا اور ان کے دلوں میں خدا کی عظمت قائم ہو جائیگی اور وہ ایک پاک تبدیلی کر لینگے اور خدا ترسی کا ایک پاک چولا پہن لیں گے۔ تب جو چاہیں سو کریں۔ کیونکہ اس وقت وہ خدا کے ہاتھ کے کھوجے ہونگے گویا وہ مرد نہیں ہیں اور اُن کی آنکھیں اس بات سے اندھی ہونگی کہ نامحرم عورت کو بدنظری سے دیکھ سکیں یا ایسا بدخیال دل میں لا سکیں۔ مگر اے پیارو! خدا آپ تمہارے دلوں میں الہام کرے ابھی وہ وقت نہیں کہ تم ایسا کرو۔ اور اگر ایسا کروگے تو ایک زہرناک بیج قوم میں پھیلاؤگے۔ یہ زمانہ ایک ایسا نازک زمانہ ہے کہ اگر کسی زمانہ میں پردہ کی رسم نہ ہوتی تو اس زمانہ میں ضرور ہونی چاہیئے تھی کیونکہ **کلجگ ہے** اور زمین پر بدی اور فسق و فجور اور شراب خوری کا زور ہے اور دلوں میں دہریہ پن کے خیالات پھیل رہے ہیں اور خدا تعالیٰ کے احکام کی دلوں سے عظمت اُٹھ گئی ہے۔ زبانوں پر سب کچھ ہے اور لیکچر بھی منطق اور فلسفہ سے بھرے ہوئے ہیں مگر دل روحانیت سے خالی ہیں۔ ایسے وقت میں کب مناسب ہے کہ اپنی غریب بکریوں کو بھیڑیوں کے بنوں میں چھوڑ دیا جائے۔

(لیکچر لاہور ص ۳۷)

یورپ کی طرح بے پردگی پر بھی لوگ زور دے رہے ہیں۔ لیکن یہ ہرگز مناسب نہیں۔ یہی عورتوں کی آزادی فسق و فجور کی جڑ ہے جن ممالک نے اس قسم کی آزادی کو روا رکھا ہے۔ ذرا اُن کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرو۔ اگر اس کی آزادی اور بے پردگی سے اُن کی عفت اور پاکدامنی بڑھ گئی ہے تو ہم مان لینگے کہ ہم غلطی پر ہیں لیکن یہ بات بہت ہی صاف ہے کہ جب مرد

اور عورت جوان ہوں اور آزادی اور بے پردگی بھی ہو تو اُن کے تعلقات کس قدر خطرناک ہونگے بدنظر ڈالنی اور نفس کے جذبات سے اکثر مغلوب ہو جانا انسان کا خاصہ ہے۔ پھر جس حالت میں کہ پردہ میں بے اعتدالیاں ہوتی ہیں اور فسق و فجور کے مرتکب ہو جاتے ہیں تو آزادی میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ مردوں کی حالت کا اندازہ کرو کہ وہ کس طرح بے لگام گھوڑے کی طرح ہوگئے ہیں نہ خدا کا خوف رہا ہے نہ آخرت کا یقین ہے۔ دنیاوی لذّات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ پس سب سے اوّل ضروری ہے کہ اس آزادی اور بے پردگی سے پہلے مردوں کی اخلاقی حالت درست کرو۔ اگر یہ درست ہو جاوے اور مردوں میں کم از کم اس قدر قوت ہو کہ وہ اپنے نفسانی جذبات کے مغلوب نہ ہو سکیں تو اُس وقت اِس بحث کو چھیڑو کہ آیا پردہ ضروری ہے کہ نہیں ورنہ موجودہ حالت میں اِس بات پر زور دینا کہ آزادی اور بے پردگی ہو گویا بکریوں کو شیروں کے آگے رکھ دینا ہے۔ اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کسی بات کے نتیجے پر غور نہیں کرتے۔ کم از کم اپنے کانشنس سے ہی کام لیں کہ آیا مَردوں کی حالت ایسی اصلاح شدہ ہے کہ عورتوں کو بے پردہ اُن کے سامنے رکھا جاوے۔ قرآن شریف نے (جوکہ انسان کی فطرت کے تقاضوں اور کمزوریوں کو مدنظر رکھ کر حسب حال تعلیم دیتا ہے) کیا عمدہ مسلک اختیار کیا ہے۔ قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذَالِكَ اَزْكٰى لَهُمْ کہ تُو ایمان والوں کو کہدے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنے سوراخوں کی حفاظت کریں۔ یہ وہ عمل ہے جس سے اُنکے نفوس کا تزکیہ ہوگا ....

اسلام نے جو یہ حکم دیا ہے کہ مرد عورت سے اور عورت مرد سے پردہ کرے۔ اِس سے غرض یہ ہے کہ نفسِ انسان پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کی حد سے بچا رہے کیونکہ ابتدا میں اسکی یہی حالت ہوتی ہے کہ وہ بدیوں کی طرف جھکا پڑتا ہے اور ذرا سی بھی تحریک ہو تو بدی پر ایسے گِرتا ہے جیسے کئی دنوں کا بھوکا آدمی کسی لذیذ کھانے پر۔ یہ انسان کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کرے۔

(ملفوظات جلد ہفتم ص ۱۳۴-۱۳۶)

خدا تعالیٰ نے خُلق احصان یعنی عفت کے حاصل کرنے کے لئے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی بلکہ انسان کو پاکدامن رہنے کے لئے پانچ علاج بھی بتلا دیئے ہیں۔ یعنی یہ کہ اپنی آنکھوں کو نامحرم پر نظر ڈالنے سے بچانا۔ کانوں کو نامحرموں کی آواز سُننے سے بچانا۔ نامحرموں کے قصّے نہ سُننا

اور ایسی تمام تقریبوں سے جن میں اس بدفعل کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اپنے تئیں بچانا۔ اگر نکاح نہ ہو تو روزہ رکھنا وغیرہ۔ اسجگہ ہم بڑے دعوی کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان سب تدبیروں کے ساتھ جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں صرف اسلام ہی سے خاص ہے۔ اور اسجگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ انسان کی وہ طبعی حالت جو شہوات کا منبع ہے جس سے انسان بغیر کسی کامل تغیر کے الگ نہیں ہوسکتا یہی ہے کہ اس کے جذبات شہوت محل اور موقعہ پاکر جوش مارنے سے رہ نہیں سکتے۔ یا یوں کہو کہ سخت خطرہ میں پڑ جاتے ہیں اس لئے خدائے تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم نامحرم عورتوں کو بلا تکلف دیکھ تو لیا کریں اور اُن کی تمام زینتوں پر نظر ڈال لیں اور ان کے تمام انداز ناچنا وغیرہ مشاہدہ کریں لیکن پاک نظر سے دیکھیں۔ اور نہ یہ تعلیم ہمیں دی ہے کہ ہم ان بیگانہ جوان عورتوں کا گانا بجانا سُن لیں اور اُن کے حُسن کے قصّے بھی سُنا کریں لیکن پاک خیال سے سُنیں بلکہ ہمیں تاکید ہے کہ ہم نامحرم عورتوں کو اور اُن کی زینت کی جگہ کو ہرگز نہ دیکھیں نہ پاک نظر سے اور نہ ناپاک نظر سے۔ اور اُن کی خوش الحانی کی آوازیں اور اُن کے حسن کے قصے نہ سُنیں۔ نہ پاک خیال سے اور نہ ناپاک خیال سے۔ بلکہ ہمیں چاہیئے کہ اُن کے سُننے اور دیکھنے سے نفرت رکھیں۔ جیسا کہ مُردار سے تا ٹھوکر نہ کھاویں کیونکہ ضرور ہے کہ بے قیدی کی نظروں سے کسی وقت ٹھوکریں پیش آویں۔ سو چونکہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہماری آنکھیں اور دل اور ہمارے خطرات سب پاک رہیں اسلئے اُس نے یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم فرمائی۔ اس میں کیا شک ہے کہ بے قیدی ٹھوکر کا موجب ہو جاتی ہے۔ اگر ہم ایک بھوکے کتّے کے آگے نرم نرم روٹیاں رکھدیں اور پھر ہم اُمید رکھیں کہ اُس کتّے کے دل میں خیال تک اُن روٹیوں کا نہ آوے تو ہم اپنے اس خیال میں غلطی پر ہیں۔ سو خدائے تعالیٰ نے چاہا کہ نفسانی قویٰ کو پوشیدہ کارروائیوں کا موقعہ بھی نہ ملے اور ایسی کوئی بھی تقریب پیش نہ آئے جس سے بدخطرات جنبش کرسکیں۔

اسلامی پردہ کی یہی فلاسفی ہے اور یہی ہدایت شرعی ہے۔ **خدا کی کتاب** میں پردہ سے یہ مراد نہیں کہ فقط عورتوں کو قیدیوں کی طرح حراست میں رکھا جائے۔ یہ اُن نادانوں کا خیال ہے جنکو اسلامی طریقوں کی خبر نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ عورت مرد دونوں کو آزاد نظر اندازی اور اپنی زینتوں کے دکھانے سے روکا جائے کیونکہ اس میں دونوں مرد اور عورت کی بھلائی ہے۔ بالآخر یہ بھی یاد رہے کہ خوابیدہ نگاہ سے غیر محل پر نظر ڈالنے سے اپنے تئیں بچا لینا اور دوسری جائز النظر چیزوں کو

دیکھنا اس طریق کو عربی میں غضّ بصر کہتے ہیں۔ اور ہر ایک پرہیزگار جو اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے اُس کو نہیں چاہیئے کہ حیوانوں کی طرح جس طرف چاہے بے محابا نظر اٹھا کر دیکھ لیا کرے بلکہ اُس کے لئے اس تمدّنی زندگی میں **غضّ** بصر کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ اور یہ وہ مبارک عادت ہے جس سے اس کی یہ طبعی حالت ایک بھاری خلق کے رنگ میں آجائیگی اور اس کی تمدنی ضرورت میں بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہی وہ خلق ہے جس کو **احصان** اور **عفت** کہتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۲۹-۳۰)

پردہ کے متعلق بڑی افراط اور تفریط ہوئی ہے۔ یورپ والوں نے تفریط کی ہے اور اب ان کی تقلید سے بعض نیچری بھی اسی طرح چاہتے ہیں۔ حالانکہ اس بے پردگی نے یورپ میں فسق و فجور کا دریا بہا دیا ہے۔ اور اس کے بالمقابل بعض مسلمان افراط کرتے ہیں کہ کبھی عورت گھر سے باہر نکلتی ہی نہیں۔ حالانکہ ریل پر سفر کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ غرض ہم دونوں قسم کے لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں جو افراط اور تفریط کر رہے ہیں۔

(ملفوظات جلد ششم ص۳۲۲)

تربیتِ اولاد

میرے نزدیک بچوں کو یوں مارنا شرک میں داخل ہے۔ گویا بدمزاج مارنیوالا ہدایت اور ربوبیت میں اپنے تئیں حصہ دار بنانا چاہتا ہے۔ ایک جوش والا آدمی جب کسی بات پر سزا دیتا ہے تو اشتعال میں بڑھتے بڑھتے ایک دشمن کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور جرم کی حد سے سزا میں کوسوں تجاوز کر جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص خود دار اور اپنے نفس کی باگ کو قابو سے نہ دینے والا اور پورا متحمل اور بُردبار اور باسکون اور باوقار ہو تو اُسے البتہ حق پہنچتا ہے کہ کسی وقتِ مناسب پر کسی حد تک بچّہ کو سزا دے یا چشم نمائی کرے۔ مگر مغلوب الغضب اور سُبک سر اور طائش العقل ہرگز سزاوار نہیں کہ بچوں کی تربیت کا متکفّل ہو۔ جس طرح اور جسقدر سزا دینے میں کوشش کی جاتی ہے کاش دُعا میں لگ جائیں اور بچوں کے لئے سوزِ دل سے دُعا کرنے کو ایک حزب مقرر کر لیں اسلئے کہ والدین کی دُعا کو بچوں کے حق میں خاص قبول بخشا گیا ہے۔

(ملفوظات جلد دوم ص۴)

ہدایت اور تربیت حقیقی خدا تعالیٰ کا فعل ہے۔ سخت پیچھا کرنا اور ایک امر پہ اصرار کو حد سے گذار دینا یعنی بات بات پر بچوں کو روکنا اور ٹوکنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ گویا ہم ہی ہدایت کے مالک ہیں اور ہم اس کو اپنی مرضی کے مطابق ایک راہ پر لے آئیں گے یہ ایک قسم کا شرکِ خفی ہے اس سے ہماری جماعت کو پرہیز کرنا چاہیئے۔ ہم تو اپنے بچوں کے لئے دُعا کرتے ہیں اور سرسری طور پر قواعد اور آداب تعلیم کی پابندی کراتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ نہیں اور پھر اپنا پُورا بھروسہ اللہ تعالےٰ پر رکھتے ہیں۔ جیسا کسی میں سعادت کا تخم ہو گا وقت پر سرسبز ہو جائے گا۔

(ملفوظات جلد دوم ص۵)

رُوح

آریہ صاحبوں کا اعتقاد ہے کہ پرمیشر نے کوئی رُوح پیدا نہیں کی بلکہ کل ارواح انادی اور قدیم اور غیر مخلوق ہیں۔ ایسا ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مکتی یعنی نجات ہمیشہ کے لئے انسان کو نہیں مل سکتی بلکہ ایک مدت مقررہ تک مکتی خانہ میں رکھ کر پھر اس سے باہر نکالا جاتا ہے۔ اب ہمارا اعتراض یہ ہے کہ یہ دونوں اعتقاد ایسے ہیں کہ ایک کے قائم ہونے سے تو خدائے تعالیٰ کی توحید بلکہ اُس کی خدائی ہی دُور ہوتی ہے اور دوسرا اعتقاد ایسا ہے کہ بندہ وفادار پر ناحق کی سختی ہوتی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اگر تمام ارواح کو اور ایسا ہی اجزا صغار اجسام کو قدیم اور انادی مانا جائے تو اس میں کئی قباحتیں ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک تو یہ کہ اس صورت میں خدا تعالیٰ کے وجود پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جس حالت میں بقول آریہ صاحبان ارواح یعنی جیو خود بخود موجود ہیں۔ اور ایسا ہی اجزا صغار اجسام بھی خود بخود ہیں تو پھر جوڑنے جاڑنے کیلئے ضرورت صانع کی ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ ایک دہریہ جو خدا تعالیٰ کا منکر ہے عذر پیش کر سکتا ہے کہ جس حالت میں تم نے کل چیزوں کا وجود خود بخود بغیر ایجاد پرمیشر کے آپ ہی مان لیا ہے تو پھر اس بات پر کیا دلیل ہے کہ ان چیزوں کے باہم جوڑنے جاڑنے کے لئے پرمیشر کی حاجت ہے؟ دوسری یہ قباحت کہ ایسا اعتقاد خود خدائے تعالیٰ کو اُس کی خدائی سے جواب دے رہا ہے۔ کیونکہ جو لوگ علم نفس اور خواص ارواح سے واقف ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ جس قدر ارواح میں عجائب و غرائب خواص بھرے ہوئے ہیں وہ صرف جوڑنے جاڑنے سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً رُوحوں میں ایک قوت کشفی ہے جس سے وہ پوشیدہ باتوں کو بعد مجاہدات دریافت کر سکتے ہیں۔ اور ایک قوت ان میں عقلی ہے جس سے وہ امور عقلیہ کو معلوم کر سکتے ہیں۔ ایسا ہی ایک قوت محبّت بھی ان میں پائی جاتی ہے جس سے وہ خدا تعالیٰ کی طرف جھکتے ہیں۔ اگر ان تمام قوتوں کو خود بخود بغیر ایجاد کسی موجد کی مان لیا جائے تو پرمیشر کی اِس میں بڑی ہتک عزت ہے گویا یہ کہنا پڑے گا کہ جو عمدہ اور اعلیٰ کام تھا وہ خود بخود ہے اور جو ادنیٰ اور ناقص کام تھا وہ پرمیشر کے ہاتھ سے ہوا ہے۔ اور اس بات کا اقرار کرنا ہوگا کہ جو خود بخود عجائب حکمتیں پائی جاتی ہیں وہ پرمیشر کے کاموں سے کہیں بڑھ کر ہیں ایسا کہ پرمیشر بھی اُن سے حیران ہے۔ غرض

اِس اعتقاد سے آریہ صاحبوں کے خدا کی خدائی پر بڑا صدمہ پہنچیگا۔ یہاں تک کہ اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا اور اس کے وجود پر کوئی عقلی دلیل قائم نہ ہوسکیگی۔ اور نیز وہ مبدأ کل فیوض کا نہیں ہوسکیگا بلکہ اس کا صرف ایک ناقص کام ہوگا اور جو اعلیٰ درجہ کے عجائب کام ہیں اُن کی نسبت یہی کہنا پڑیگا کہ وہ سب خود بخود ہیں۔ لیکن ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو اس سے اگر فرضی طور پر پرمیشر کا وجود مان بھی لیا جائے تب بھی وہ نہایت ضعیف اور نکمّا سا وجود ہوگا جس کا عدم وجود مساوی ہوگا یہاں تک کہ اگر اُس کا مرنا بھی فرض کیا جائے تو روحوں کا کچھ بھی حرج نہ ہوگا اور وہ اس لائق ہرگز نہیں ہوگا کہ کوئی رُوح اُس کی بندگی کرنے کے لئے مجبور کی جائے کیونکہ ہر یک رُوح اس کو جواب دے سکتی ہے کہ جس حالت میں تم نے مجھے پیدا ہی نہیں کیا اور یہ میری طاقتوں اور قوتوں اور استعدادوں کو تم نے بنایا تو پھر آپ کس استحقاق سے مجھ سے اپنی پرستش چاہتے ہیں؟ اور نیز جب کہ پرمیشر رُوحوں کا خالق ہی نہیں تو اُن پر **محیط** بھی نہیں ہوسکتا۔ اور جب احاطہ نہ ہوسکا تو پرمیشر اور روحوں میں حجاب ہوگیا۔ اور جب حجاب ہوا تو پرمیشر سرب گیانی نہ ہوسکا یعنی علم غیب پر قادر نہ ہوا۔ اور جب قادر نہ رہا تو اس کی سب خدائی **درہم برہم** ہوگئی تو گویا پرمیشری ہاتھ سے گیا۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ **علم کامل** کسی شئے کا اس کے بنانے پر قادر کردیتا ہے۔ اِسی لئے حکماء کا مقولہ ہے کہ جب علم اپنے کمال تک پہنچ جائے تو وہ عین عمل ہوجاتا ہے۔ اس حالت میں بالطبع سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پرمیشر کو رُوحوں کی کیفیت اور کنہ کا پورا پورا علم بھی ہے یا نہیں؟ اگر اس کو پورا پورا علم ہے تو پھر کیا وجہ باوجود پورا پورا علم ہونے کے پھر ایسی ہی رُوح بنا نہیں سکتا۔ سو اس سوال پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ پرمیشر رُوحوں کے پیدا کرنے پر قادر نہیں بلکہ اُن کی نسبت پورا پورا علم بھی نہیں رکھتا۔

(سرمہ چشم آریہ ص۹۱-۹۳)

آریہ صاحبوں کا وید ایک ایسا خدا بتا رہا ہے جس سے حق جُو آدمی ضرور ہے کہ نفرت کرے وہ اپنے پرمیشر کو اپنی بادشاہی کا خود موجب نہیں سمجھتے بلکہ ایسا خیال کرتے ہیں کہ وہ بادشاہت کسی بخت و اتفاق سے اُسے ملی ہے یعنی اس کی خوش قسمتی سے چند ارواح اور اجسام بنے بنائے اُس کو مل گئے ہیں اور شاید ابھی ارواح اور اجسام کا کوئی اور دفینہ بھی کسی جگہ پوشیدہ ہو جس کی ہنوز پرمیشر کو اطلاع نہیں ہوئی۔ مگر کیا یہ ایسا اعتقاد ہے جس کو عظمت و قدرت و شان کبریائی حضرت اللہ جلّ شانہٗ کے مطابق کہہ سکتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ وہ کامل ذات ہے جس کو تمام فیوض کا مبدءُ

اور تمام انوار کا سرچشمہ اور تمام چیزوں کا قیّوم اور تمام خوبیوں کا جامع اور تمام کمالات کا مستجمع اور عجز اور نقص اور احتیاج الی الغیر سے پاک ہے۔ لیکن تم سوچ کر دیکھو کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ارواح اور اجسام کے غیر مخلوق اور خود بخود ماننے سے ان تمام صفات کاملہ الٰہیہ میں سے کوئی بات بھی قائم نہیں رہ سکتی اور ایک ایسا سخت صدمہ اس کی شان خدائی پر پہنچتا ہے کہ اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

ایک ادنیٰ درجہ کی عقل بھی سمجھ سکتی ہے کہ خدائے تعالیٰ کے **ایک** ہونے کے یہی معنے ہیں کہ **درحقیقت وجود اسی کا وجود ہے** اور باقی سب چیزیں اُس سے نکلی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ قائم اور اسی کے رشحاتِ فیض سے اپنے کمالات مطلوبہ تک پہنچتی ہیں۔ مگر افسوس کہ آریوں کا علمِ الٰہی اِس کے برخلاف بتلا رہا ہے۔ ان کی کتابیں انہی واویلوں سے پُر ہیں کہ ہم بھی پرمیشر کی طرح قدیم اور غیر مخلوق اور انادی اور اس کی مشابہ اور اپنے اپنے وجود کے آپ خدا ہیں۔ نہیں سوچتے کہ اگر وہ بھی قدیم الذات اور قائم بذاتہٖ اور واجب الوجود ہیں تو پھر خدا جیسے ہو کر اس کی ماتحت کیوں ہو گئے؟ اور کس نے درمیان میں ہو کر دونوں میں تعلّق پیدا کر دیا ....

یہ بات ایک لڑکا بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر سب ارواح اور اجسام خود بخود پرمیشر کی طرح قدیم اور انادی ہیں اور اپنے اپنے وجود کے آپ ہی خدا ہیں تو پرمیشر اس دعویٰ کا ہرگز مجاز نہیں رہا کہ مَیں ان چیزوں کا رب اور پیدا کنندہ ہوں کیونکہ جبکہ ان چیزوں نے پرمیشر کے ہاتھ سے وجود ہی نہیں لیا تو پھر ایسا پرمیشر ان کا ربّ اور مالک کیونکر ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی بچہ بنا بنایا آسمان سے گرے یا زمین کے خمیر سے خود پیدا ہو جائے تو کسی عورت کو یہ دعویٰ ہرگز نہیں پہنچتا کہ یہ میرا بچہ ہے بلکہ اس کا بچہ وہی ہوگا جو اس کے پیٹ سے نکلا ہے **سو جو خدا کے ہاتھ سے نکلا ہے وہی خدا کا ہے**۔ اور جو اس کے ہاتھ سے نہیں نکلا وہ اس کا کسی طور سے نہیں ہو سکتا۔ کوئی صالح اور بھلا مانس ایسی چیزوں پر ہرگز قبضہ نہیں کرتا جو اس کے نہ ہوں تو پھر کیونکر آریوں کے پرمیشر نے ایسی چیزوں پر قبضہ کر لیا جن پر قبضہ کرنے کا اس کو کوئی استحقاق نہیں۔ سو سوچنا چاہیئے یہ بات کس قدر مکروہ اور دُور از حقانیت ہے کہ مالک الخلق اور رب العالمین کو اُس کی مخلوقات سے جواب دیا جاتا ہے۔ اور جو اصل حقیقت خدائی کی ہے اُس سے اسکو الگ کیا جاتا ہے۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۹۶-۹۸)

بعض آریہ سماج والے ارواح کے غیر مخلوق اور اپنے وجود کے آپ خدا ہونے کے بارے میں یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ اگر ارواح کسی وقت معدوم تھیں اور پھر خدائے تعالیٰ کے پیدا کرنے سے

موجود ہوئی تو گویا **نیست سے ہست ہوگیا** اور نیستی سے ہستی ہونا ایسی دُور از فہم بات ہے کہ کوئی عقلمند اس کو نہیں مانے گا۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ یوں تو فاسد اور ناقص عقل کے مارے ہوئے خدا تعالیٰ کو بھی نہیں مانتے۔ لیکن جس شخص کی عقل سلیم ہے اس کو تو خدا تعالےٰ کے ماننے کے ساتھ ہی اس کی وہ تمام صفات بھی ماننے پڑیں گے جو مدار اس کی خدائی اور الوہیت کے ہیں۔ اور جو شخص خدائے تعالیٰ کی اس نہایت ضروری صفت کو مان لیگا کہ وہ قادرِ مطلق اور بے انتہا طاقتوں کا مالک ہے تو پھر ہرگز اس کی قدرتوں کو اپنی عقل ناقص کے ساتھ موازنہ نہیں کرے گا۔ اور خدائے غیر محدود کی قادرانہ قوتوں کو کسی حدّ خاص میں محدود نہیں جانے گا۔ اور نیز جب ایک عقلمند دیکھیگا کہ خدائے تعالیٰ ایسا اپنی ذات میں مظہر العجائب و بلند تر از احاطۂ فکر و قیاس ہے جو بغیر اسباب آنکھوں کے دیکھتا ہے اور بغیر اسباب کانوں کے سُنتا ہے اور بغیر اسباب زبان کے بولتا ہے اور بغیر حاجت معماروں و مزدوروں و نجاروں و آلات عمارت سازی و فراہمی اینٹوں و پتھروں وغیرہ کے صرف اپنے ارادہ اور حکم کے اشارہ سے ایک طرفۃ العین میں زمین و آسمان بنا سکتا ہے تو بے شک اس بات کا یقین بھی کرے گا کہ وہ قادر خدا نیستی سے ہستی بھی کر سکتا ہے۔ یہی تو خدائی ہے اسی وجہ سے تو وہ سربشکتی مان اور قادرِ مطلق اور غیر متناہی قدرتوں کا مالک کہلاتا ہے۔ اگر اس کے کام بھی انسانی کاموں کی طرح محتاج باسباب و مواد و اوقات ضروریہ ہوں تو پھر وہ کاہے کا خدا ہُوا۔ اور اس کی خدائی کیونکر چل سکے؟ کیا اس کے تمام کام بالاتر از عقل نہیں ہیں؟ کیا اس کی عجائب قدرتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان پر نظر ڈال کر عقل ناقص انسانی خیرہ رہ جاتی ہے؟ تو پھر کیسی جہالت ہے کہ جو بات اس کی خدائی کا مدار اور اُس کی الوہیت کی حقیقت ہے اسی پر اعتراض کیا جائے ....

ایسا پرمیشر کس بات کا پرمیشر ہے کہ اگر وہ کسی اپنے امر متخیل کو کہے کہ ہو جا تو کچھ بھی نہ ہو۔ خدا تو اس ذات عجیب القدرت کا نام ہے کہ جو اس کے ارادہ سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنے کسی امر مقصود کو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ فی الفور اس کی قدرت کاملہ سے نقش وجود پکڑ جاتا ہے۔ یہ راز نہایت دقیق معرفت کا نکتہ ہے کہ **سب مخلوقات کلمات الٰہیہ ہیں**۔ عیسائیوں نے جب اپنی نادانی سے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کلمۃ اللہ ہیں یعنی ان کی رُوح کلمہ الٰہی ہے جو متشکل بروح ہوگئی ہے تو خدائے تعالیٰ نے اس کا یہ حقانی جواب دیا کہ کوئی بھی ایسی رُوح نہیں جو کلمۃ اللہ نہ ہو اور مجردِ الٰہی حکم سے نہ نکلی ہو قل الرّوح من امر ربّی

اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بات جو کلمات اللہ بصورت ارواح و دیگر مخلوق جلوہ گر ہو جاتی ہیں یہ خالقیت کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے اور اسرار الٰہیہ میں سے ایک باریک نکتہ ہے جس کی طرف کسی انسانی عقل کو خیال نہیں آیا اور خدائے تعالیٰ کے پاک اور کامل کلام نے اس کو اپنے الٰہی نور سے منکشف کیا ہے۔ اور اگر ایسا نہ مانا جائے کہ خدائے تعالیٰ اپنے ہی کلمہ اور امر سے ارواح و اجسام کو ظہور پذیر کر لیتا ہے تو پھر آخر یہ ماننا پڑے گا کہ جب تک باہر سے اجسام اور رُوحیں نہ آویں پرمیشر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مگر کیا ایسا کمبخت پرمیشر ہو سکتا ہے کہ جو درحقیقت اپنے گھر سے تو دیوالیہ اور مفلس اور تہیدست ہے لیکن کسی عارضی اتفاق سے اس کی خدائی کا دھندا چل رہا ہو۔ اگر پرمیشر ایسا ہی ہے تو سب اُمیدیں خاک میں مل گئیں اور ایسے پرمیشر پر بھروسہ کرنا بھی بڑا معرض خطر ہو گا۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۱۵ - ۱۱۷)

قرآن شریف کہتا ہے کہ روحیں انادی اور غیر مخلوق نہیں اور دو نطفوں کی ایک خاص ترکیب سے وہ پیدا ہوتی ہیں اور یا دوسرے کیڑے مکوڑوں میں ایک ہی مادہ سے پیدا ہو جاتی ہیں اور یہی سچ ہے۔ کیونکہ مشاہدہ اس پر گواہی دیتا ہے جس کے ماننے کے بغیر چارہ نہیں اور امور محسوسہ مشہودہ سے انکار کرنا سراسر جہالت ہے۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ روح نیست سے ہست ہوتا ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اوّل وہ کچھ بھی نہیں تھا بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کے لئے کوئی ایسا مادہ نہیں تھا کہ انسان اپنی قوت سے اس میں سے رُوح نکال سکتا اور اس کی پیدائش صرف اس طور سے ہے کہ محض الٰہی قوت اور حکمت اور قدرت کسی مادہ میں سے اس کو پیدا کر دیتی ہے۔ اسی واسطے جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ رُوح کیا چیز ہے تو خدا نے فرمایا کہ تو ان کو جواب دے کہ رُوح میرے رب کے امر میں سے ہے۔ اس بارے میں آیت قرآنی یہ ہے کہ:۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ؁ یعنی یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ رُوح کیا چیز ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ ان کو جواب دے کہ رُوح میرے ربّ کے امر سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی وہ ایک رازِ قدرت ہے اور تم لوگ رُوح کے بارے میں کچھ علم نہیں رکھتے مگر تھوڑا سا۔ یعنی صرف اس قدر کہ تم رُوح کو پیدا ہوتے دیکھ سکتے ہو اس سے زیادہ نہیں جیسا کہ ہم بچشم خود دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری آنکھ کے سامنے کسی مادہ میں سے کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور انسانی رُوح کے پیدا ہونے کے لئے خدا تعالیٰ کا قانون قدرت یہ ہے کہ دو نطفوں کے

ملنے کے بعد جب آہستہ آہستہ قالب تیار ہو جاتا ہے تو جیسے چند ادویہ کے ملنے سے اُس مجموعہ میں ایک خاص مزاج پیدا ہو جاتی ہے کہ جو اُن دواؤں میں فرد فرد کے طور پر پیدا نہیں ہوتی۔ اِسی طرح اس قالب میں جو خون اور دو نطفوں کا مجموعہ ہے ایک خاص جوہر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک فاسفرس کے رنگ میں ہوتا ہے۔ اور جب تجلّی الٰہی کی ہوا کُنْ کے امر کے ساتھ اُس پر چلتی ہے تو یکدفعہ وہ افروختہ ہو کر اپنی تاثیر اس قالب کے تمام حصّوں میں پھیلا دیتا ہے تب وہ جنین زندہ ہو جاتا ہے۔ پس یہی افروختہ چیز جو جنین کے اندر تجلّی ربّی سے پیدا ہو جاتی ہے اُسی کا نام **رُوح** ہے اور وہی کلمۃ اللّٰہ ہے۔ اور اس کو امرِ ربّی سے اسلئے کہا جاتا ہے کہ جیسے ایک حاملہ عورت کی طبیعت مدبرہ بحکم قادرِ مطلق تمام اعضاء کو پیدا کرتی ہے۔ اور عنکبوت کے جالے کی طرح قالب کو بناتی ہے۔ اس رُوح میں اس طبیعت مدبرہ کو کچھ دخل نہیں۔ بلکہ رُوح محض خاص تجلّی الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور گو رُوح کا فاسفرس اس مادہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ مگر وہ روحانی آگ جس کا نام رُوح ہے وہ بجز مسّ نسیم آسمانی کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ سچا علم ہے جو قرآن شریف نے ہمیں بتلایا ہے۔ تمام فلاسفروں کی عقلیں اس علم تک پہنچنے سے بیکار ہیں۔

(چشمۂ معرفت ص ۱۵۰-۱۵۲)

نجات کا تمام مدار **خدا تعالیٰ کی محبتِ ذاتیہ** پر ہے۔ اور محبتِ ذاتیہ اُس محبت کا نام ہے جو رُوحوں کی فطرت میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مخلوق ہے پھر جس حالت میں ارواح پرمیشر کی مخلوق ہی نہیں ہیں تو پھر ان کی فطرتی محبت پرمیشر سے کیونکر ہو سکتی ہے۔ اور کب اور کس وقت پرمیشر نے ان کی فطرت کے اندر ہاتھ ڈال کر یہ محبت اس میں رکھدی۔ یہ تو غیر ممکن ہے۔ وجہ یہ کہ فطرتی محبت اس محبّت کا نام ہے جو فطرت کے ساتھ ہمیشہ سے لگی ہوئی ہو۔ اور پیچھے سے لاحق نہ ہو۔ جیسا کہ اسی کی طرف اللّٰہ تعالیٰ قرآن شریف میں یہ اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ اس کا یہ قول ہے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى۔ یعنی میں نے روحوں سے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا پیدا کنندہ نہیں ہوں تو رُوحوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔

اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ انسانی رُوح کی فطرت میں یہ شہادت موجود ہے کہ **اُس کا خدا پیدا کنندہ** ہے۔ پس رُوح کو اپنے پیدا کنندہ سے طبعًا و فطرتًا محبت ہے اس لئے کہ وہ اُسی کی پیدائش ہے۔ اور اسی کی طرف اس دوسری آیت میں اشارہ ہے جیسا کہ اللّٰہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا یعنی رُوح کا خدائے واحد لاشریک کا طلبگار ہونا اور بغیر خدا کے وصال کے کسی چیز سے تسلّی نہ پانا یہ انسانی فطرت میں داخل ہے۔ یعنی خدا نے اس خواہش کو انسانی رُوح میں پیدا کر رکھا ہے جو انسانی رُوح کسی چیز سے تسلّی اور سکینت بجز وصال الٰہی کے نہیں پا سکتی پس اگر انسانی رُوح

میں یہ خواہش موجود ہے تو ضرور ماننا پڑتا ہے کہ رُوح خدا کی پیدا کردہ ہے جس نے اس میں یہ خواہش ڈال دی۔ مگر یہ خواہش تو درحقیقت انسانی روح میں موجود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسانی رُوح درحقیقت خدا کی پیدا کردہ ہے۔

(چشمۂ مسیحی ص۳۹-۴۰)

واضح رہے کہ ارواح کا حادث اور مخلوق ہونا قرآن شریف میں بڑی بڑی اور قطعی دلائل سے بیان کیا گیا ہے چنانچہ برعایت ایجاز و اجمال چند دلائل ان میں سے نمونہ کے طور پر اس جگہ لکھے جاتے ہیں:-

اول یہ بات بہ بداہت ثابت ہے کہ تمام روحیں ہمیشہ اور ہر حال میں خدائے تعالیٰ کی ماتحت اور زیرِ حکم ہیں اور بجز مخلوق ہونے کے اَور کوئی وجہ موجود نہیں جس نے روحوں کو ایسے کامل طور پر خدائے تعالیٰ کے ماتحت اور زیرِ حکم کر دیا ہو۔ سو یہ رُوحوں کے حادث اور مخلوق ہونے پر اوّل دلیل ہے۔

دوم یہ بات بھی بہ بداہت ثابت ہے کہ تمام روحیں خاص خاص استعدادوں اور طاقتوں میں محدود اور محصور ہیں۔ جیسا کہ بنی آدم کے اختلاف روحانی حالات و استعدادات پر نظر کر کے ثابت ہوتا ہے اور یہ تحدید ایک محدِّد کو چاہتی ہے جس سے ضرورت محدث کی ثابت ہو کر (جو محدّد ہے) حدوث روحوں کا بپایۂ ثبوت پہنچتا ہے۔

سوم یہ بات بھی کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ تمام روحیں عجز و احتیاج کے داغ سے آلودہ ہیں اور اپنی تکمیل اور بقا کے لئے ایک ایسی ذات کی محتاج ہیں جو کامل اور قادر اور عالم اور فیاض مطلق ہو۔ اور یہ امر ان کی مخلوقیت کو ثابت کرنے والا ہے۔

چہارم یہ بات بھی ایک ادنیٰ غور کرنے سے ظاہر ہوتی ہے کہ ہماری روحیں اجمالی طور پر ان سب متفرق الٰہی حکمتوں اور صنعتوں پر مشتمل ہیں جو اجرام علوی و سفلی میں پائے جاتے ہیں اسی وجہ سے دنیا باعتبار اپنے جزئیات مختلفہ کے عالم تفصیلی ہے اور انسان عالم اجمالی کہلاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ یہ عالم صغیر اور وہ عالم کبیر ہے۔ پس جبکہ ایک جزئی عالم کے بوجہ پائے جانے پُر حکمت کاموں کے ایک صانع حکیم کی صنعت کہلاتی ہے تو خیال کرنا چاہیئے کہ وہ چیز کیونکر صنعت الٰہی نہ ہو گی جس کا وجود اپنے عجائبات ذاتی کے رو سے گویا تمام جزئیات عالم کی عکسی تصویر ہے۔ اور ہر یک جزئی کے خواص عجیبہ اپنے اندر رکھتی ہے اور حکمت بالغہ ایزدی پر بوجہ اتم مشتمل ہے۔

ایسی چیز جو مظہر جمیع عجائبات صنعت الٰہی ہے مصنوع اور مخلوق ہونے سے باہر نہیں رہ سکتی بلکہ وہ سب چیزوں سے اوّل درجہ پر مصنوعیت کی مُہر اپنے وجود پر رکھتی ہے اور سب سے زیادہ تر اور کامل تر صانع قدیم کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ سو اس دلیل سے روحوں کی مخلوقیت صرف نظری طور پر ثابت نہیں بلکہ درحقیقت اجلی بدیہات ہے۔ ماسوا اس کے دوسری چیزوں کو اپنی مخلوقیت کا

علم نہیں مگر رُوحیں فطرتی طور پر اپنی مخلوقیت کا علم رکھتی ہیں۔ ایک جنگلی آدمی کی رُوح بھی اس بات پر راضی نہیں ہو سکتی کہ وہ خود بخود ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے الست بربکم قالوا بلیٰ۔ یعنی روحوں سے مَیں نے سوال کیا کہ کیا مَیں تمہارا رب (پیدا کنندہ) نہیں ہوں تو انہوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ یہ سوال وجواب حقیقت میں اس پیوند کی طرف اشارہ ہے جو مخلوق کو اپنے خالق سے قدرتی طور پر متحقق ہے جس کی شہادت رُوحوں کی فطرت میں نقش کی گئی ہے۔

تتمہ جس طرح بیٹے میں باپ اور ماں کا کچھ کچھ حلیہ اور خُوبُو پائی جاتی ہے اسی طرح روحیں جو خدائے تعالیٰ کے ہاتھ سے نکلی ہیں اپنے صانع کی سیرت وخصلت سے اجمالی طور پر کچھ حصہ رکھتی ہیں۔ اگرچہ مخلوقیت کی ظلمت وغفلت غالب ہو جانے کی وجہ سے بعض نفوس میں وہ رنگ الٰہی کچھ پھیکا سا ہو جاتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر یک رُوح کسی قدر وہ رنگ اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور پھر بعض نفوس میں وہ رنگ بد استعمالی کی وجہ سے بدنما معلوم ہوتا ہے مگر یہ اس رنگ کا قصور نہیں بلکہ طریقۂ استعمال کا قصور ہے۔ انسان کی اصلی قوتوں اور طاقتوں میں سے کوئی بھی بُری قوت نہیں صرف بد استعمالی سے ایک نیک قوت بُری معلوم ہونے لگتی ہے۔ اگر وہی قوت اپنے موقعہ پر استعمال کی جائے تو وہ سراسر نفع رساں اور خیر محض ہے اور حقیقت میں انسان کو جسقدر قوتیں دی گئی ہیں وہ سب الٰہی قوتوں کے اظلال وآثار ہیں۔ جیسے بیٹے کی صورت میں کچھ کچھ باپ کے نقوش آجاتے ہیں ایسا ہی ہماری رُوحوں میں اپنے رب کے نقوش اور اس کی صفات کے آثار آگئے ہیں جن کو عارف لوگ خوب شناخت کرتے ہیں۔ اور جیسے بیٹا جو باپ سے نکلا ہے اس سے ایک طبعی محبت رکھتا ہے نہ بناوٹی۔ اسی طرح ہم بھی جو اپنے رب سے نکلے ہیں اس سے فی الحقیقت طبعی محبت رکھتے ہیں نہ بناوٹی اور اگر ہماری روحوں کو اپنے رب سے یہ طبعی وفطرتی تعلق نہ ہوتا تو پھر سالکین کو اس تک پہنچنے کے لئے کوئی صورت اور سبیل نہ تھی۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۱۱۹-۱۲۱)

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى۔ یعنی مَیں نے روحوں کو پوچھا کہ کیا مَیں تمہارے پیدا کرنے والا نہیں تو تمام رُوحوں نے یہی جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ روحوں کی فطرت میں یہی منقش اور مرکوز ہے کہ وہ اپنے پیدا کنندہ کی قائل ہیں اور پھر بعض انسان غفلت کی تاریکی میں پڑ کر اور پلید تعلیموں سے متاثر ہو کر کوئی دہریہ بن جاتا ہے اور کوئی آریہ اور اپنی فطرت کے مخالف اپنے پیدا کنندہ سے انکار کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص

اپنے باپ اور ماں کی محبت رکھتا ہے یہاں تک کہ بعض بچے ماں کے مرنے کے بعد مر جاتے ہیں۔ پھر اگر انسانی روحیں خدا کے ہاتھ سے نہیں نکلیں اور اس کی پیدا کردہ نہیں تو خدا کی محبّت کا نمک کس نے ان کی فطرت پر چھڑک دیا ہے اور کیوں انسان جب اس کی آنکھ کھلتی ہے اور پردہ غفلت دُور ہوتا ہے تو دل اس کا خدا کی طرف کھنچا جاتا ہے اور محبت الٰہی کا دریا اس کے صحن سینہ میں بہنے لگتا ہے۔ آخر ان رُوحوں کا خدا سے کوئی رشتہ تو ہوتا ہے جو اُن کو محبت الٰہی میں دیوانہ کی طرح بنا دیتا ہے۔ وہ خدا کی محبت میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ تمام چیزیں اس کی راہ میں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ عجیب تعلق ہے۔ ایسا تعلق نہ ماں کا ہوتا ہے نہ باپ کا۔ پس اگر بقول آریوں کے روحیں خود بخود ہیں تو یہ تعلق کیوں پیدا ہو گیا اور کس نے یہ محبت اور عشق کی قوتیں خدا تعالیٰ کے ساتھ روحوں میں رکھ دیں۔ یہ مقام سوچنے کا مقام ہے۔ اور یہی مقام ایک سچی معرفت کی کنجی ہے۔

(چشمۂ معرفت ص۱۵۸-۱۵۹)

خدا نے جو انسان کو اپنی طرف بلایا ہے تو اسی لئے اس نے پہلے سے پرستش اور عشق کے مناسب حال قوتیں اس میں رکھ دی ہیں۔ پس وہ قوتیں جو خدا کی طرف سے ہیں۔ خدا کی آواز کو سُن لیتی ہیں۔ اسی طرح جب خدا نے چاہا کہ انسان خدا کی معرفت میں ترقی کرے تو اُس نے پہلے سے ہی انسانی رُوح میں معرفت کے حواس پیدا کر رکھے اور اگر وہ پیدا نہ کرتا تو پھر کیونکر انسان اس کی معرفت حاصل کر سکتا تھا۔ انسان کی رُوح میں جو کچھ ہے دراصل خدا سے ہے اور وہ خدا کی صفات ہیں جو انسانی آئینہ میں ظاہر ہیں۔ ان میں سے کوئی صفت بُری نہیں بلکہ ان کی بد استعمالی اور اُن میں افراط تفریط کرنا بُرا ہے۔ شاید کوئی جلدی سے یہ اعتراض کر دے کہ انسان میں حسد ہے بُغض ہے اور دوسری صفاتِ ذمیمہ ہوتی ہیں پھر وہ کیونکر خدا کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ پس واضح رہے کہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں دراصل تمام انسانی اخلاق الٰہی اخلاق کا ظلّ ہیں کیونکہ انسانی رُوح خدا سے ہے لیکن کمی یا زیادتی یا بد استعمالی کی وجہ سے وہ صفات ناقص انسانوں میں مکروہ صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً حسد انسان میں ایک بہت بُرا خلق ہے۔ جو چاہتا ہے کہ ایک شخص سے ایک نعمت زائل ہو کر اس کو مل جائے لیکن اصل کیفیت حسد کی صرف اس قدر ہے کہ انسان اپنے کسی کمال کے حصول میں یہ روا نہیں رکھتا کہ اس کمال میں اس کا کوئی شریک بھی ہو۔

پس درحقیقت یہ صفت خدا تعالیٰ کی ہے جو اپنے تئیں ہمیشہ وحدہٗ لاشریک دیکھنا چاہتا ہے پس ایک قسم کی بد استعمالی سے یہ عمدہ صفت قابلِ نفرت ہو گئی ہے۔ ورنہ اس طرح پر یہ صفت مذموم نہیں

کہ کمال میں سب سے زیادہ سبقت چاہے اور روحانیت میں تفرد اور یکتائی کے درجہ پر اپنے تئیں دیکھنا چاہے۔

(نسیم دعوت صـــ۲۷-۲۸)

اور یہ کہنا کہ اگر رُوح مخلوق ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ فنا بھی ہو جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ رُوح **بیشک فنا پذیر** ہے۔ اِس پر دلیل یہ ہے کہ جو چیز اپنی صفات کو چھوڑتی ہے اس حالت میں اس کو فانی کہا جاتا ہے۔ اگر کسی دوا کی تاثیر بالکل باطل ہو جائے تو اس حالت میں ہم کہیں گے کہ وہ دوا مر گئی۔ ایسا ہی رُوح میں یہ امر ثابت ہے کہ بعض حالات میں وہ اپنی صفات کو چھوڑ دیتی ہے بلکہ اُس پر جسم سے بھی زیادہ تغیّرات وارد ہوتے ہیں۔ انہی تغیرات کے وقت کہ جب وہ رُوح کو اُسکی صفات سے دُور ڈال دیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ رُوح مر گئی۔ کیونکہ موت اسی بات کا نام ہے کہ ایک چیز اپنی لازمی صفات کو چھوڑ دیتی ہے تب کہا جاتا ہے کہ وہ چیز مر گئی۔ اور یہی بھید ہے کہ خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں فقط اُنہیں انسانی روحوں کو بعد مفارقت دنیا زندہ قرار دیا ہے جن میں وہ صفات موجود تھے جو اصل غرض اور علّت غائی ان کی پیدائش کی تھی یعنی خدا تعالیٰ کی کامل محبت اور اُس کی کامل اطاعت جو انسانی رُوح کی جان ہے۔ اور جب کوئی رُوح خدا تعالیٰ کی محبت سے پُر ہو کر اور اس کی راہ میں قربان ہو کر دنیا سے جاتی ہے تو اُسی کو زندہ رُوح کہا جاتا ہے باقی سب مُردہ روحیں ہوتی ہیں۔ غرض رُوح کا اپنی صفات سے الگ ہونا یہی اُس کی **موت** ہے۔ چنانچہ حالتِ خواب میں بھی جب جسم انسانی مرتا ہے تو رُوح بھی ساتھ ہی مر جاتی ہے۔ یعنی اپنی صفاتِ موجودہ کو جو بیداری کی حالت میں تھیں چھوڑ دیتی ہے اور ایک قسم کی موت اُس پر وارد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خواب میں وہ صفات اس میں باقی نہیں رہتیں جو بیداری میں اس کو حاصل ہوتی ہیں۔ سو یہ بھی ایک قسم موت کی ہے۔ کیونکہ جو چیز اپنی صفات سے الگ ہو جائے اس کو زندہ نہیں کہہ سکتے۔ اکثر لوگ موت کے لفظ پر بہت دھوکا کھاتے ہیں **موت صرف معدوم ہونے کا نام نہیں بلکہ اپنی صفات سے معطّل ہونے کا نام بھی موت ہے** ورنہ جسم جو مر جاتا ہے بہرحال مٹی اس کی تو موجود رہتی ہے۔ اسی طرح رُوح کی موت سے بھی یہی مراد ہے کہ وہ اپنی صفات سے معطّل کی جاتی ہے۔ جیسا کہ عالمِ خواب میں دیکھا جاتا ہے کہ جیسے جسم اپنے کاموں سے بیکار ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی رُوح بھی اپنی ان صفات سے جو بیداری میں رکھتے تھے بکلّی معطّل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک زندہ کی رُوح کسی میت سے خواب میں ملاقات کرتی ہے اور نہیں جانتی کہ وہ میت ہے اور سونے کے ساتھ ہی بکلّی اس دنیا کو بھول جاتی ہے اور پہلا چولا اُتار کر نیا چولا پہن لیتی ہے۔ اور تمام علوم جو رکھتی تھی سب کے سب

بہ یکبارگی فراموش کردیتی ہے اور کچھ بھی اس دنیا کا یاد نہیں رکھتی بجز اس صورت کے خدا یاد دلادے۔ اور اپنے تصرفات سے بکلّی معطّل ہوجاتی ہے اور سچ مچ خدا کے گھر میں جا پہنچتی ہے۔ اور اس وقت تمام حرکات اور کلمات اور جذبات اسکے خدا تعالےٰ کے تصرفات کے نیچے ہوتے ہیں۔ اور اس طور سے خدا تعالےٰ کے تصرّفات کے نیچے وہ مغلوب ہوتی ہے کہ نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ عالم خواب میں کرتی یا کہتی یا سنتی یا حرکت کرتی ہے وہ اپنے اختیار سے کرتی ہے بلکہ تمام اختیاری قوت اس کی مسلوب ہوجاتی ہے۔ اور کامل طور پر موت کے آثار اس پر ظاہر ہوتے ہیں۔ سو جسقدر جسم پر موت آتی ہے اس سے بڑھ کر رُوح پر موت وارد ہوجاتی ہے۔ مجھے ایسے لوگوں سے سخت تعجب آتا ہے کہ وہ اپنی حالتِ خواب پر کبھی غور نہیں کرتے اور نہیں سوچتے کہ اگر رُوح موت سے مستثنٰی رکھی جاتی تو وہ ضرور عالمِ خواب میں بھی مستثنٰی رہتی۔ ہمارے لئے خواب کا عالم موت کے عالم کی کیفیت سمجھنے کے لئے ایک آئینہ کے حکم میں ہے۔ جو شخص رُوح کے بارے میں سچی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اسکو چاہیئے کہ خواب کے عالم پر بہت غور کرے کہ ہر ایک پوشیدہ راز موت کا خواب کے ذریعہ سے کھل سکتا ہے۔ اگر تم عالم خواب کے اسرار پر جیسا کہ چاہیئے توجہ کروگے اور جس طور سے عالم خواب میں رُوح پر ایک موت وارد ہوتی ہے اور اپنے علوم اور صفات سے وہ الگ ہوجاتی ہے اس طور پر نظر تدبّر ڈالو گے تو تمہیں یقین ہوجائے گا کہ موت کا معاملہ خواب کے معاملہ سے ملتا جُلتا ہے۔ پس یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ رُوح مفارقت بدن کے بعد اسی حالت پر قائم رہتی ہے جو حالت دنیا میں وہ رکھتی تھی بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ایسی ہی موت اس پر وارد ہوجاتی ہے جیسا کہ خواب کی حالت میں وارد ہوئی تھی۔ بلکہ وہ حالت اس سے بہت زیادہ ہوتی ہے اور ہر ایک صفت اسکی نیستی کی چکّی کے اندر پیسی جاتی ہے اور وہی رُوح کی موت ہوتی ہے۔ اور پھر جو لوگ زندہ ہونے کے کام کرتے تھے وہی زندہ کئے جاتے ہیں۔ کسی رُوح کی مجال نہیں کہ آپ زندہ رہ سکے۔ کیا تم اختیار رکھتے ہو کہ نیند کی حالت میں تم اپنی ان صفات اور حالات اور علوم کو اپنے قبضہ میں رکھ سکو جو بیداری میں تم کو حاصل ہیں؟ نہیں بلکہ آنکھ بند کرنے کے ساتھ ہی رُوح کی حالت بدل جاتی ہے اور ایک ایسی نیستی اس پر وارد ہوتی ہے کہ تمام کارخانہ اس کی ہستی کا اُلٹ پلٹ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالےٰ رُوح کی موت کے بارے میں قرآن شریف میں فرماتا ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا۔ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔

(الجزو ۲۴ سورۃ الزمر) (ترجمہ) خدا جانوں کو جب انکی موت کا وقت آجاتا ہے اپنے قبضہ میں کرلیتا ہے۔

یعنی وہ جانیں بے خود ہو کر الٰہی تصرّف اور قبضہ میں اپنی موت کے وقت آجاتی ہیں اور زندگی کی خود اختیاری اور خودشناسی ان سے جاتی رہتی ہے اور موت اُن پر وارد ہو جاتی ہے یعنی بکلّی وہ روحیں نیست کی طرح ہو جاتی ہیں اور صفاتِ حیات زائل ہو جاتی ہیں اور ایسی رُوح جو دراصل مرتی نہیں مگر مرنے کے مشابہ ہوتی ہے وہ رُوح کی وہ حالت ہوتی ہے کہ جب انسان سوتا ہے تب وہ حالت پیدا ہوتی ہے اور ایسی حالت میں بھی رُوح خدا تعالیٰ کے قبضہ اور تصرّف میں آجاتی ہے۔ اور ایسا تغیر اس پر وارد ہو جاتا ہے کہ کچھ بھی اس کی دنیوی شعور اور ادراک کی حالت اس کے اندر باقی نہیں رہتی۔ غرض موت اور خواب دونوں حالتوں میں خدا کا قبضہ اور تصرف رُوح پر ایسا ہو جاتا ہے کہ زندگی کی علامت جو خود اختیاری اور خود شناسی ہے بکلّی جاتی رہتی ہے۔ پھر خدا ایسی رُوح کو جس پر درحقیقت موت وارد کر دی ہے واپس جانے سے روک رکھتا ہے اور وہ رُوح جس پر اُس نے درحقیقت موت وارد نہیں کی اسکو پھر ایک مقررہ وقت تک دنیا میں واپس کر دیتا ہے۔ اس ہمارے کاروبار میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو فکر اور سوچ کرنے والے ہیں۔

یہ ہے ترجمہ مع شرح آیت ممدوحہ بالا کا اور یہ آیت موصوفہ بالا دلالت کر رہی ہے کہ جیسی جسم پر موت ہے۔ روحوں پر بھی موت ہے لیکن قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ ابرار اور اخیار اور برگزیدوں لوگوں کی رُوحیں چند روز کے بعد پھر زندہ کی جاتی ہیں کوئی تین دن کے بعد کوئی ہفتہ کے بعد کوئی چالیس دن کے بعد اور یہ حیات ثانی نہایت آرام اور آسائش اور لذت کی اُن کو ملتی ہے۔

یہی حیات ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے نیک بندے اپنی پوری قوت اور پوری کوشش اور پورے صدق و صفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف جھکتے ہیں اور نفسانی تاریکیوں سے باہر آنے کیلئے پورا زور لگاتے ہیں اور خدا کی رضاجوئی کے لئے تلخ زندگی اختیار کرتے ہیں گویا مر ہی جاتے ہیں۔ غرض جیسا کہ آیت موصوفہ بالا بیان فرما رہی ہے۔ رُوح کو بھی موت ہے جیسا جسم کو اگرچہ اس عالم کی نہایت مخفی کیفیتیں اس تاریک دنیا میں ظاہر نہیں ہوتیں لیکن بلاشبہ عالمِ رویا یعنی خواب کا عالم اس عالم کے لئے ایک نمونہ ہے۔ اور جو موت اِس عالم میں رُوح پر وارد ہوتی ہے اس موت کا نمونہ عالمِ خواب میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ معاً آنکھ بند ہونے کے ساتھ ہی ہماری رُوح کی تمام صفات اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہیں۔ اور اس بیداری کا تمام سلسلہ فراموش ہو جاتا ہے اور تمام روحانی صفات اور تمام علوم جو ہماری رُوح میں تھے کالعدم ہو جاتے ہیں اور حالت خواب میں وہ نظارے رُوح کے ہمارے پیش نظر آجاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب وہ ہماری رُوح کچھ اَور ہی ہے اور تمام صفات اس کی جو بیداری میں تھے کھوئے گئے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی حالت ہے جو موت سے

مشابہ بلکہ ایک قسم کی موت ہے اور یہ قطعی اور یقینی دلیل اس بات پر ہے کہ وہ موت جو جسم کی موت کے ساتھ رُوح پر وارد ہوتی ہے وہ ایسی موت کے ساتھ مشابہ ہے جو نیند کی حالت میں رُوح پر وارد ہوتی ہے مگر وہ موت اس موت کی نسبت بہت بھاری ہے۔

(چشمۂ معرفت ص۱۵۲-۱۵۶)

وہ اعتقاد جو قرآن شریف نے سکھایا ہے یہ ہے کہ جیسا کہ خدا نے ارواح کو پیدا کیا ہے ایسا ہی **وہ ان کے معدوم کرنے پر بھی قادر ہے** اور انسانی رُوح اُس کی موہبت اور فضل سے ابدی حیات پاتی ہے نہ اپنی ذاتی قوت سے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنے خدا کی پوری محبت اور پوری اطاعت اختیار کرتے ہیں اور پورے صدق اور وفاداری سے اس کے آستانہ پر جھکتے ہیں ان کو خاص طور پر ایک کامل زندگی بخشی جاتی ہے اور ان کے فطرتی حواس میں بھی بہت تیزی عطا کی جاتی ہے اور اُن کی فطرت کو ایک نور بخشا جاتا ہے جس نور کی وجہ سے ایک فوق العادت روحانیت ان میں جوش مارتی ہے اور تمام رُوحانی طاقتیں جو دنیا میں رکھتے تھے موت کے بعد بہت وسیع کی جاتی ہیں اور نیز مرنے کے بعد وہ اپنی خداداد مناسبت کی وجہ سے جو حضرت عزّت سے رکھتے ہیں آسمان پر اُٹھائے جاتے ہیں جس کو شریعت کی اصطلاح میں رفع کہتے ہیں۔ لیکن جو مومن نہیں ہیں اور خدا تعالیٰ سے صاف تعلقات نہیں رکھتے یہ زندگی اُن کو نہیں ملتی اور نہ یہ صفات اُن کو حاصل ہوتی ہیں اس لئے وہ لوگ مُردہ کے حکم میں ہوتے ہیں۔ پس اگر خدا تعالیٰ رُوحوں کا پیدا کرنے والا نہ ہوتا تو وہ اپنے قادرانہ تصرف سے مومن اور غیر مومن میں یہ فرق دکھلا نہ سکتا۔

(چشمۂ مسیحی ص۵۳ حاشیہ)

قولہ۔ مرزا صاحب اور سب اہل اسلام کا یہی اعتقاد ہے اور قرآن میں آیا ہے کہ جب آنحضرت (محمد صاحب) سے لوگوں نے پوچھا کہ رُوح کیا چیز ہے تو آپ کچھ نہ بتلا سکے اور اس وقت آیت نازل ہوئی کہ اے محمد کہدے کہ رُوح ایک امر ربّی ہے۔ سو مسلمانوں نے تو رُوح کو کیا سمجھا ہوگا خدا نے اُن کے ہادی پر بھی رُوح کی کیفیت ظاہر نہیں کی اور خدا کا بھی کیا جواب عمدہ ہے کہ رُوح امر ربّی ہے کیا اور چیزیں امر ربّی نہیں؟

اقول۔ .... لالہ صاحب! مَیں آپ کی غلطیوں کی کہاں تک اصلاح کرتا جاؤں۔ آپ نے یہ کس سے سُن لیا کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے علم رُوح نہیں دیا گیا تھا اور آپ نے قرآن شریف میں کس جگہ اور کہاں

دیکھ لیا کہ حضرت ممدوح رُوح کے علم سے بے خبر تھے۔ مَیں جانتا ہوں کہ آپ کو اپنی عقل ناتمام کی شامت سے اس آیت کے سمجھنے میں دھوکا لگا ہے جو قرآن شریف میں وارد ہے اور وہ یہ ہے:-

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (الجزء ۱۵ سورۃ بنی اسرائیل) اور کفار تجھ سے (اے محمد) پوچھتے ہیں کہ رُوح کیا ہے - اور کس چیز سے اور کیونکر پیدا ہوئی ہے ان کو کہدے کہ رُوح میرے رب کے امر میں سے اور تم کو اے کافرو علم رُوح اور اسرار الٰہی نہیں دیا گیا مگر کچھ تھوڑا سا۔ سو اسجگہ اے ماسٹر صاحب آپ کو اپنے نقصان فہم سے یہ غلطی لگی کہ آپ نے اس عبارت کا مخاطب (کہ تم کو علم روح نہیں دیا گیا) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو سمجھ لیا۔ حالانکہ لفظ مَآ اُوْتِيْتُمْ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تم کو نہیں دیا گیا جمع کا صیغہ ہے جو صاف دلالت کر رہا ہے جو اس آیت کے مخاطب کفّار ہیں ....

.... کفار کی ایک جماعت نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے رُوح کے بارے میں سوال کیا کہ رُوح کیا چیز ہے۔ تب ایسی جماعت کو جیساکہ صورت موجودہ تھی بصیغہ جمع مخاطب کرکے جواب دیا گیا کہ **رُوح عالمِ امر میں سے ہے** یعنی **کلمۃ اللہ یا ظلّ کلمہ** ہے جو بحکمت وقدرت الٰہی رُوح کی شکل پر وجود پذیر ہو گیا ہے اور اس کو خدائی سے کچھ حصّہ نہیں بلکہ وہ درحقیقت حادث اور بندۂ خدا ہے۔ اور یہ قدرت ربّانی کا ایک بھید دقیق ہے جس کو تم اے کافرو سمجھ نہیں سکتے مگر کچھ تھوڑا سا جس کی وجہ سے تم مکلّف بایمان ہو تمہاری عقلیں بھی دریافت کر سکتی ہیں ....

یہ جو خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ رُوح عالم امر میں سے ہے جس پر ماسٹر صاحب نے اپنی خوش فہمی سے جھٹ پٹ اعتراض بھی کر دیا - یہ ایک بڑی بھاری صداقت کا بیان ہے - اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ **ربوبیت الٰہی دو طور سے** ناپیدا چیزوں کو پیدا کرتی ہے اور دونوں طور کے پیدا کرنے میں پیدا شدہ چیزوں کے الگ الگ نام رکھے جاتے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ کسی چیز کو اس طور سے پیدا کرے کہ اس چیز کا کچھ بھی وجود نہ ہو تو ایسے پیدا کرنے کا نام اصطلاح قرآنی میں **اَمر** ہے۔ اور اگر ایسے طور سے کسی چیز کو پیدا کرے کہ پہلے وہ چیز کسی اور صورت میں اپنا وجود رکھتی ہو تو اس طرز کی پیدائش کا نام **خلق** ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ بسیط چیز کا عدم محض سے پیدا کرنا **عالمِ امر** میں سے ہے اور مرکب چیز کو کسی شکل یا ہیئت خاص سے متشکل کرنا **عالمِ خلق** سے ہے۔ جیسے اللہ تعالےٰ دوسرے مقام میں قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ یعنی بسائط کا عدم محض سے پیدا کرنا اور مرکبات کو ظہور خاص میں لانا دونوں خدا کا فعل ہیں اور بسیط

اور مرکب دونوں خدائے تعالیٰ کی پیدائش ہے۔ اب ماسٹر صاحب! دیکھا کہ یہ کیسی اعلیٰ اور عمدہ صداقت ہے جس کو ایک مختصر آیت اور چند محدود لفظوں میں خدائے تعالیٰ نے ادا کر دیا۔ اس کے مقابلہ پر اگر آپ وید کے عقیدہ کو سوچیں تو جتنا شرمندہ ہوں اتنا ہی تھوڑا ہے۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۱۲۳-۱۲۹)

مَیں سچ سچ کہتا ہوں بالکل سچ جس میں ذرا مبالغہ کی آمیزش نہیں کہ قرآن شریف نے جس قدر خوبی اور عمدگی اور صفائی اور سچائی سے رُوحوں کے خواص اور اُن کی قوتیں اور طاقتیں اور استعدادیں اور ان کے دیگر کوائف عجیبہ بیان کئے ہیں اور پھر ان سب بیانات کا ثبوت دیا ہے وہ ایسا عالی اور باریک اور پُرحکمت بیان ہے اور ایسے کامل درجہ کی وہ صداقتیں ہیں کہ اگر وید کے چاروں رشی دوبارہ جنم لے کر بھی دنیا میں آویں اور جہاں تک ممکن ہو خوض اور فکر سے زور لگادیں تب بھی یہ مقام وسعت علمی اور یہ معارف عالیہ انہیں میسّر نہیں آسکتے اگرچہ فکر کرتے کرتے مر ہی جاویں۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۱۸۶)

رُوحوں میں بہت سے خواص اور عجیب طاقتیں اور استعدادیں پائی جاتی ہیں جن کو قرآن شریف نے استیفاء سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً اُن میں چند قوتیں اور استعدادیں یہ ہیں جو ہم ذیل میں لکھتے ہیں:-

(۱) علوم اور معارف کی طرف مشائق ہونے کی ایک قوت
(۲) علوم کو حاصل کرنے کی ایک قوت
(۳) علوم حاصل کردہ کے محفوظ رکھنے کی ایک قوت
(۴) محبت الٰہی کی ایک قوت
(۵) لذت وصال الٰہی اٹھانے کی ایک قوت
(۶) مکاشفات کی ایک قوت
(۷) مؤثر اور متاثر ہونے کے یا یوں کہو کہ باہم عامل اور معمول ہونے کی ایک قوت
(۸) تعلق اجسام قبول کرنے کی ایک قوت
(۹) تخلق باخلاق اللہ کی ایک قوت
(۱۰) مورد الہام الٰہی ہونے کی ایک قوت
(۱۱) بسطی اور قبضی حالت پیدا ہونے کی ایک قوت
(۱۲) معارف غیر متناہیہ کے قبول کرنے کی ایک قوت

(۱۳) رنگین برنگ تجلیٔ الوہیت ہونے کی ایک قوت
(۱۴) عقلی قوت جس سے امتیاز حسن و قبح اُن پر ظاہر ہوتا ہے
(۱۵) ابقائے اثر و قبول اثر کی ایک قوت بمقابلہ اپنے اجسام متعلقہ کے
(۱۶) اقرار بوجود خالق حقیقی کی ایک قوت
(۱۷) اجسام کے ساتھ اور ان کے اشکال خاصہ کے ساتھ مل کر بعض نئے خواص کے ظاہر کرنے کی قوت
(۱۸) ایک قوت کشش باہمی جسکو مقناطیسی قوت کہنا چاہیئے۔
(۱۹) ابدی طور پر قائم رہنے کی ایک قوت۔
(۲۰) جسم مفارق کی خاک سے ایک خاص تعلق رکھنے کی قوت جو کشفی طور پر ارباب کشفِ قبور پر ظاہر ہوتی ہے۔

ایسا ہی اور بھی بہت سی ایسی قوتیں ہیں جن کا مفصل بیان نہایت لطافت اور خوبی سے قرآن شریف میں مندرج ہے۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۱۹۷-۱۹۹)

تناسخ کے مسئلہ جیسا اور کوئی جھوٹا مسئلہ نہیں کیونکہ اس کی **بنیاد** بھی غلط ہے اور **آزمائش** کے طور پر بھی یہ غلط ثابت ہوتا ہے اور **انسانی پاکیزگی** کے لحاظ سے بھی غلط ٹھہرتا ہے اور خدا کی **قدرت میں رخنہ انداز** ہونے کی وجہ سے بھی ہر ایک عارف کا فرض ہے کہ اسکو غلط سمجھے۔

اِس کی **بنیاد** اس طرح پر غلط ہے کہ ستیارتھ پرکاش میں بتلایا گیا ہے کہ رُوح عورت کے پیٹ میں اِس طرح آتی ہے کہ شبنم کے ساتھ کسی ساگ پات پر پڑتی ہے اور اس ساگ پات کے کھانے سے رُوح بھی ساتھ ہی کھائی جاتی ہے۔ پس اِس سے تو لازم آتا ہے کہ رُوح دو ٹکڑے ہو کر زمین پر پڑتی ہے ایک ٹکڑے کو اتفاقاً مرد کھا لیتا ہے اور دوسرے ٹکڑے کو عورت کھاتی ہے۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ مسئلہ ہے کہ بچہ کو رُوحانی قوتیں اور روحانی اخلاق مرد اور عورت دونوں سے ملتے ہیں نہ کہ صرف ایک سے پس دونوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے ساگ پات کو کھاویں جس میں رُوح ہو اور صرف ایک کا کھانا کافی نہیں۔ پس بہ بداہت یہ امر مستلزم تقسیم رُوح ہے اور تقسیم رُوح باطل ہے۔ اس لئے تناسخ باطل ہے۔

اور **آزمائش** کے طور پر یہ مسئلہ اس طرح پر غلط ٹھہرتا ہے کہ جس طرح ہر قسم کی روحیں پیدا ہوتی رہی ہیں ان تمام صورتوں میں ممکن ہی نہیں کہ شبنم کے ساتھ وہ روحیں پیدا ہوتی ہوں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بالوں میں جوئیں پڑ جاتی ہیں۔ وہ رُوحیں کس شبنم کے ساتھ کھائی جاتی ہیں؟ ایسا ہی

کنک کے کھاتوں میں سُسری پڑ جاتی ہے۔ وہ کروڑ ہا رُوحیں جو کھاتے کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ کس شبنم کے ساتھ کھاتے میں اُترتی ہیں؟ اور کون ان کو کھاتا ہے؟ ایسا ہی ہم دیکھتے ہیں کہ پیٹ میں کدّو دانے پیدا ہوتے ہیں اور کبھی کبھی دماغ میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور طبعی علم کے تجربہ سے پانی کے ہر ایک قطرہ میں ہزارہا کیڑے ثابت ہوتے ہیں۔ یہ کس شبنم سے پڑتے ہیں؟ تجربہ بتلا رہا ہے کہ ہر ایک چیز میں ایک قسم کے کیڑے کا مادہ موجود ہے۔ پشمینہ میں بھی ایک قسم کا کیڑا لگ جاتا ہے۔ لکڑی میں بھی اناج میں بھی اور بعض پھلوں میں پھل کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہی کیڑا پیدا ہوتا ہے جیسا کہ گولر کا درخت وہ کس شبنم سے کیڑے آتے ہیں ....

دیکھو! **پاکیزگی** کے لحاظ سے بھی تناسخ کا مسئلہ کیسا خراب ہے۔ کیا جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے اس کے ساتھ کوئی فہرست بھی اندر سے نکلتی ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ لڑکی فلاں مرد کی ماں یا دادی یا ہمشیرہ ہے اس سے وہ شادی کرنے سے پرہیز کرے۔

اور یہ تناسخ کا مسئلہ پرمیشر کی **قدرت** میں بھی سخت **رخنہ انداز** ہے۔ خدا وہ خدا ہے کہ چاہے تو ایک لکڑی میں جان ڈال دے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ کا عصا ایک دم میں لکڑی اور ایک دم میں سانپ بن جاتا تھا۔ مگر رُوحوں کے انادی ہونے کی حالت میں ہندوؤں کا پرمیشر ہرگز پرمیشر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ جو محض دوسروں کے سہارے سے اپنی خدائی چلا رہا ہے اس کی خدائی کی خیر نہیں وہ آج بھی نہیں اور کل بھی نہیں۔ اور یہ کہنا کہ تناسخ کا چکّر جو کئی ارب سال سے بموجب آریہ صاحبوں کے عقیدہ کے جاری ہے اس کا باعث گذشتہ پیدائشوں کے گناہ ہیں۔ یہ خیال طبعی علم کے تجربہ کے ذریعہ سے نہایت فضول اور لچر اور باطل ثابت ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ رُوحوں کی پیدائش میں بھی خدا تعالیٰ کا ایک نظام ہے جو کبھی بیش و کم نہیں ہوتا۔ مثلاً برسات کے دنوں میں ہزارہا کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور گرمی کے دنوں میں بکثرت مکھیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو کیا انہی دنوں میں ہمیشہ دنیا میں پاپ زیادہ ہوتے ہیں اور نہایت سخت گناہ کی وجہ سے انسانوں کو مکھیاں اور برسات کے کیڑے بنایا جاتا ہے؟ اسی طرح کے ہزارہا دلائل ہیں جن سے تناسخ باطل ہوتا ہے۔

(نسیم دعوت ص۷۵-۷۸ حاشیہ)

یہ بات نہایت درست اور صحیح ہے کہ **رُوح ایک لطیف نور** ہے جو اس جسم کے اندر ہی سے پیدا ہو جاتا ہے جو رحم میں پرورش پاتا ہے۔ پیدا ہونے سے مراد یہ ہے کہ اوّل مخفی اور غیر محسوس ہوتا ہے اور پھر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور ابتداءً اس کا خمیر نطفہ میں موجود ہوتا ہے

بیشک وہ آسمانی خدا کے ارادہ سے اور اس کے اذن اور اُس کی مشیت سے ایک مجہول الکنہ علاقہ کے ساتھ نطفہ سے تعلّق رکھتا ہے اور نطفہ کا وہ ایک روشن اور نورانی جوہر ہے۔ نہیں کہہ سکتے کہ وہ نطفہ کی ایسی جزو ہے جیسا کہ جسم جسم کی جزو ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ باہر سے آتا ہے۔ یا زمین پر گر کر نطفہ کے مادہ سے آمیزش پاتا ہے۔ بلکہ وہ ایسا نطفہ میں مخفی ہوتا ہے جیسا کہ آگ پتھر کے اندر ہوتی ہے۔ خدا کی کتاب کا یہ منشا نہیں ہے کہ رُوح الگ طور پر آسمان سے نازل ہوتی ہے یا فضا سے زمین پر گرتی ہے اور پھر کسی اتفاق سے نطفہ کے ساتھ مل کر رحم کے اندر چلی جاتی ہے بلکہ یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر ہم ایسا خیال کریں تو قانون قدرت ہمیں باطل پر ٹھہراتا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص ۸-۹)

"ثابت شدہ واقعات یقینی اور قطعی طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ خود نطفہ مرد اور عورت کا بغیر اس کے کہ اُس پر شبنم کی طرح آسمان کی فضا سے رُوح گرے رُوح پیدا ہونے کی اپنے اندر استعداد رکھتا ہے۔ پھر جب مرد اور عورت کا نطفہ باہم مل جاتا ہے تو وہ استعداد بہت قوی ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ استعداد بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب بچّہ کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ کی قدرت اور امر سے اُسی قالب میں سے رُوح پیدا ہو جاتی ہے یہ وہ واقعات ہیں جو مشہود اور محسوس ہیں۔ اِسی کو ہم کہتے ہیں کہ نیستی سے ہستی ہوئی۔ کیونکہ ہم رُوح کو جسم اور جسمانی نہیں کہہ سکتے۔ اور یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ رُوح اسی مادہ میں سے پیدا ہوتی ہے جو بعد اجتماع دونوں نطفوں کے رحمِ مادر میں آہستہ آہستہ قالب کی صورت پیدا کرتا ہے اور اس مادہ کے لئے ضروری نہیں کہ ساگ پات کی کسی قسم پر رُوح شبنم کی طرح گرے اور اس سے رُوح کا نطفہ پیدا ہو بلکہ وہ مادہ گوشت سے بھی پیدا ہو سکتا ہے خواہ وہ گوشت بکرے کا ہو یا مچھلی کا یا ایسی مٹی ہو جو زمین کی عمیق تہ کے نیچے ہوتی ہے جس سے مینڈکیں وغیرہ کیڑے مکوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں بلاشبہ یہ خدا کی قدرت کا ایک راز ہے کہ وہ جسم میں سے ایک ایسی چیز پیدا کرتا ہے کہ وہ نہ جسم ہے اور نہ جسمانی۔ پس واقعاتِ موجودہ مشہودہ محسوسہ ظاہر کر رہے ہیں کہ **آسمان سے رُوح نہیں گرتی** بلکہ یہ ایک نئی رُوح ہوتی ہے جو ایک مرکب نطفہ میں سے بقدرتِ قادر پیدا ہو جاتی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ ثُمَّ اَنْشَاْنَاہُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ؕ یعنی جب رحم میں قالبِ انسانی تیار ہو جاتا ہے تو پھر ہم ایک نئی پیدائش

سے اُس کو مکمل کرتے ہیں۔ یعنی ہم اس مادہ کے اندر سے جس سے قالب تیار ہُوا ہے رُوح پیدا کر دیتے ہیں

(چشمۂ معرفت صـ ۱۱۵-۱۱۶)

یہ بھی طبعی تحقیقاتوں سے ثابت ہے کہ تین سال تک انسان کا پہلا جسم تحلیل پا جاتا ہے اور اسکے قائم مقام دوسرا جسم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ یقینی امر ہے۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ جب انسان کسی بیماری کی وجہ سے نہایت درجہ لاغر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ایک مشتِ استخوان رہ جاتا ہے تو صحت یابی کے بعد آہستہ آہستہ پھر وہ ویسا ہی جسم تیار ہو جاتا ہے۔ سو اسی طرح ہمیشہ پہلے اجزاء جسم کے تحلیل پاتے جاتے ہیں اور دوسرے اجزاء اُن کی جگہ لیتے ہیں۔ پس جسم پر گویا ہر آن ایک موت ہے اور ایک حیات ہے۔ ایسا ہی جسم کی طرح رُوح پر بھی تغیرات وارد ہوتے رہتے ہیں اور اُس پر بھی ہر آن ایک موت اور ایک حیات ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ جسم کے تغیّرات ظاہر اور کھلے کھلے ہیں مگر جیسا کہ رُوح مخفی ہے ایسا ہی اُس کے تغیرات بھی مخفی ہیں **اور رُوح کے تغیرات غیر متناہی ہیں**۔ جیسا کہ قرآن شریف سے ظاہر ہے کہ رُوح کے تغیرات غیر محدود ہیں یہاں تک کہ بہشت میں بھی وہ تغیرات ہونگے۔ مگر وہ تغیرات رو بہ ترقی ہونگے اور رُوحیں اپنی روحانی صفات میں آگے سے آگے بڑھتی جائیں گی اور پہلی حالت سے دوسری حالت ایسی دُور اور بلند تر ہو جائیگی گویا پہلی حالت بہ نسبت دوسری حالت کے موت کے مشابہ ہو گی۔

(چشمۂ معرفت صـ ۱۵۹-۱۶۰)

جسمانی صدمات بھی عجیب نظارہ دکھاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رُوح اور جسم کا ایسا تعلق ہے کہ اس راز کو کھولنا انسان کا کام نہیں اس سے زیادہ اس تعلّق کے ثبوت پر یہ دلیل ہے کہ غور سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوح کی ماں جسم ہی ہے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ میں رُوح کبھی اوپر سے نہیں گرتی بلکہ وہ ایک نور ہے جو نطفہ میں ہی پوشیدہ طور پر مخفی ہوتا ہے اور جسم کی نشو و نما کے ساتھ چمکتا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا پاک کلام ہمیں سمجھاتا ہے کہ رُوح اس قالب میں سے ہی ظہور پذیر ہو جاتی ہے جو نطفہ سے رحم میں تیار ہوتا ہے جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ یعنی پھر ہم اس جسم کو جو رحم میں تیار ہُوا تھا ایک اَور پیدائش کے رنگ میں لاتے ہیں اور ایک اَور خلقت اُس کی ظاہر کرتے ہیں جو رُوح کے نام سے موسوم ہے۔ اور خدا بہت برکتوں والا ہے اور ایسا خالق ہے جو کوئی اس کے برابر نہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ ہم اسی جسم میں سے ایک اَور

پیدائش ظاہر کرتے ہیں یہ ایک گہرا راز ہے جو رُوح کی حقیقت دکھلا رہا ہے اور ان نہایت مستحکم تعلّقات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو رُوح اور جسم کے درمیان واقعہ ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صـــ)

سوال۔ رُوح کا تعلّق جو قبور سے بتلایا گیا ہے اس کی اصلّیت کیا ہے؟

فرمایا:۔ اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ ارواح کے تعلّق قبور کے متعلق احادیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں آیا ہے وہ بالکل سچ اور درست ہے۔ ہاں یہ دوسرا امر ہے کہ اس تعلق کی کیفیت اور کنہ کیا ہے؟ جس کے معلوم کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ البتہ یہ ہمارا فرض ہو سکتا ہے کہ ہم یہ ثابت کر دیں کہ اس قسم کا تعلق قبور کے ساتھ ارواح کا ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی محال عقلی لازم نہیں آتا۔ اور اس کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کے قانون قدرت میں ایک نظیر پاتے ہیں۔ درحقیقت یہ امر اس قسم کا ہے جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض امور کی سچائی اور حقیقت صرف زبان ہی سے معلوم ہوتی ہے اور اس کو ذرا وسیع کر کے ہم یوں کہتے ہیں کہ **حقائق الاشیاء** کے معلوم کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے مختلف طریقے رکھے ہیں بعض خواص آنکھ کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں اور بعض صداقتوں کا پتہ صرف کان لگاتا ہے اور بعض ایسی ہیں کہ حسّ مشترک سے اُن کا سُراغ چلتا ہے اور کتنی ہی سچّائیاں ہیں کہ وہ مرکز قویٰ یعنی دل سے معلوم ہوتی ہیں۔ غرض اللہ تعالےٰ نے صداقت کے معلوم کرنے کے لئے مختلف طریق اور ذریعے رکھے ہیں .... انسان بڑے قویٰ لے کر آیا ہے اور طرح طرح کی خدمتیں اس کی تکمیل کے لئے ہر ایک قوّت کے سپرد ہیں۔ **نادان فلسفی** ہر بات کا فیصلہ اپنی عقل خام سے چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط محض ہے۔ تاریخی امور تو تاریخ ہی سے ثابت ہونگے۔ اور خواص الاشیاء کا تجربہ بدوں تجربہ صحیحہ کے کیونکر لگ سکیگا۔ امور قیاسیہ کا پتہ عقل دے گی۔ اسی طرح پر متفرق طور پر الگ الگ ذرائع ہیں انسان دھوکہ میں مبتلا ہو کر حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے سے تب ہی محروم ہو جاتا ہے جب کہ وہ ایک ہی چیز کو مختلف امور کی تکمیل کا ذریعہ قرار دے لیتا ہے۔ مَیں اس اصول کی صداقت پر زیادہ کہنا ضروری نہیں سمجھتا۔ کیونکہ ذرا سی فکر سے یہ بات خوب سمجھ میں آجاتی ہے اور روزمرّہ ہم ان باتوں کی سچائی کو دیکھتے ہیں۔ پس جب رُوح جسم سے مفارقت کرتی ہے یا تعلق پکڑتی ہے تو ان باتوں کا فیصلہ عقل سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو فلسفی اور حکماء ضلالت میں مبتلا نہ ہوتے۔ اسی طرح پر قبور کے ساتھ جو تعلق ارواح کا ہوتا ہے یہ ایک صداقت تو ہے

مگر اس کا پتہ دینا اس آنکھ کا کام نہیں یہ **کشفی آنکھ** کا کام ہے کہ وہ دکھلاتی ہے۔ اگر محض عقل سے اس کا پتہ لگانا چاہو تو کوئی عقل کا پُتلا اتنا ہی بتلائے کہ رُوح کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ ہزار اختلاف اس مسئلہ پر موجود ہیں اور ہزارہا فلاسفر دہریہ مزاج موجود ہیں جو منکر ہیں۔ اگر نری عقل کا یہ کام تھا تو پھر اختلاف کا کیا کام؟ کیونکہ جب آنکھ کا کام دیکھنا ہے تو مَیں نہیں کہہ سکتا کہ زید کی آنکھ تو سفید چیز کو دیکھے اور بکر کی ویسی ہی آنکھ اس سفید چیز کا ذائقہ بتلائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نری عقل رُوح کا وجود بھی یقینی طور پر نہیں بتلا سکتی۔ چہ جائیکہ اس کی کیفیت اور تعلقات کا علم پیدا کر سکے۔ فلاسفر تو رُوح کو ایک سبز لکڑی کی طرح مانتے ہیں اور روح فی الخارج اُن کے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں۔ یہ تفاصیر رُوح کے وجود اور اس کے تعلق وغیرہ کی **چشمۂ نبوت** سے ملی ہیں اور نرے عقل والے تو دعویٰ ہی نہیں کر سکتے۔ اگر کہو کہ بعض فلاسفروں نے کچھ لکھا ہے۔ تو یاد رکھو کہ انہوں نے منقولی طور پر چشمۂ نبوت سے کچھ لے کر کہا ہے۔ پس جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ رُوح کے متعلق علوم چشمۂ نبوت سے ملتے ہیں تو یہ امر کہ ارواح کا قبور کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اسی چشم سے دیکھنا چاہیئے اور کشفی آنکھ نے بتلایا ہے کہ اس تودۂ خاک سے رُوح کا ایک تعلق ہوتا ہے۔ اور السلام علیکم یا اھل القبور کہنے سے جواب ملتا ہے۔ پس جو آدمی ان قویٰ سے کام لے جن سے کشف قبور ہو سکتا ہے وہ ان تعلقات کو دیکھ سکتا ہے۔ ....

قبور کے ساتھ تعلق ارواح کے دیکھنے کے لئے **کشفی قوت اور حسّ** کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی کہے یہ ٹھیک نہیں ہے تو وہ غلط کہتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی ایک کثیر تعداد کروڑہا اولیاء و صلحاء کا سلسلہ دنیا میں گذرا ہے اور مجاہدات کرنے والے بے شمار لوگ ہو گذرے ہیں۔ اور وہ سب اس امر کی زندہ شہادت ہیں۔ گو اس کی اصلیت اور تعلقات کی وجہ عقلی طور پر ہم معلوم کر سکیں یا نہ مگر نفس تعلّق سے انکار نہیں ہو سکتا۔ غرض کشفی دلائل ان ساری باتوں کا فیصلہ کئے دیتے ہیں۔ کان اگر نہ دیکھ سکیں تو ان کا کیا قصور؟ وہ اور قوت کا کام ہے۔ **ہم اپنے ذاتی تجربہ سے گواہ ہیں** کہ رُوح کا تعلّق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ انسان میت سے کلام کر سکتا ہے۔

رُوح کا تعلق آسمان سے بھی ہوتا ہے جہاں اس کے لئے ایک مقام ملتا ہے۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ یہ ایک ثابت شدہ صداقت ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اسکی گواہی موجود ہے۔

یہ مسئلہ عام طور پر مسلّمہ مسئلہ ہے بجز اس فرقہ کے جو نفی بقائے رُوح کرتا ہے۔ اور یہ امر کہ کس جگہ تعلق ہے کشفی قوت خود ہی بتلا دیگی۔

(ملفوظات جلد اوّل صـــ ۲۷۶-۲۸۰)

رُوح کوئی مکانی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے تعلقات مجہول الکنہ ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد ایک تعلّق رُوح کا قبر کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور **کشف قبور** کے وقت ارباب مکاشفات پر وہ تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب قبور اپنی اپنی قبروں میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ ان سے صاحب کشف کے مخاطبات و مکالمات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ بات احادیث صحیحہ سے بھی بخوبی ثابت ہے۔ صلوٰۃ فی القبر کی حدیث مشہور ہے اور احادیث سے ثابت ہے کہ مُردے جوتی کی آواز بھی سُن لیتے ہیں اور السّلام علیکم کا جواب دیتے ہیں۔ باوجود اس کے ایک تعلّق اُن کا آسمان سے بھی ہوتا ہے۔ اور اپنے نفسی نقطہ کے مکان پر اُن کا تمثّل مشاہدہ میں آتا ہے۔ اور انکا رفع مختلف درجات سے ہوتا ہے۔ بعض پہلے آسمان تک رہ جاتے ہیں۔ بعض دوسرے تک بعض تیسرے تک لیکن موت کے بعد رفع رُوح بھی ضرور ہوتا ہے جیسا کہ حدیث صحیح اور آیت ولا تفتح لهم ابواب السماء۔ ۸/۱۲ - صریح اشارہ کر رہی ہے۔ لیکن ان کا آسمان پر ہونا یا قبروں میں ہونا ایک مجہول الکنہ امر ہے۔

(الحق مباحثہ دہلی صـــ ۸۵)

"کوئی زمین پر مر نہیں سکتا جب تک آسمان پر نہ مارا جائے"

باب چہارم

بار بار دعوت مقابلہ

"میں یقین رکھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کسی مخالف کے مقابل پر
مجھے مغلوب نہیں کرے گا کیونکہ میں اُس کی طرف سے ہوں
اور اُس کے دین کی تجدید کے لئے اُسی کے حکم سے آیا ہوں"

خدا تعالیٰ نے اس عاجز کو ان نوروں سے خاص کیا ہے جو برگزیدہ بندوں کو ملتے ہیں جن کا دوسرے لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پس اگر تم کو شک ہو تو مقابلہ کے لئے آؤ اور یقیناً سمجھو کہ تم ہرگز مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ تمہارے پاس زبانیں ہیں مگر دل نہیں۔ جسم ہے مگر جان نہیں۔ آنکھوں کی پُتلی ہے مگر اس میں نُور نہیں۔ خدا تعالیٰ تمہیں نُور بخشے تا تم دیکھو لو۔

(فتح اسلام ص۱۱ حاشیہ)

خدا تعالیٰ اس زمانہ میں بھی اسلام کی تائید میں بڑے بڑے نشان ظاہر کرتا ہے اور جیسا کہ اس بارہ میں مَیں خود صاحب تجربہ ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ اگر میرے مقابل پر تمام دُنیا کی قومیں جمع ہو جائیں اور اس بات کا بالمقابل امتحان ہو کہ کس کو خدا غیب کی خبریں دیتا ہے اور کس کی دعائیں قبول کرتا ہے اور کس کی مدد کرتا ہے اور کس کے لئے بڑے بڑے نشان دکھاتا ہے تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مَیں ہی غالب رہوں گا۔ کیا کوئی ہے؟ کہ اس امتحان میں میرے مقابل پر آوے ہزارہا نشان خدا نے محض اس لئے مجھے دیئے ہیں کہ تا دشمن معلوم کرے کہ دینِ اسلام سچّا ہے۔ میں اپنی کوئی عزّت نہیں چاہتا بلکہ اس کی عزّت چاہتا ہوں جس کے لئے میں بھیجا گیا ہوں۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۷۶)

جاننا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن کریم میں چار عظیم الشان آسمانی تائیدوں کا کامل متقیوں اور کامل مومنوں کے لئے وعدہ دیا ہے اور وہی کامل مومن کی شناخت کے لئے کامل علامتیں ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔ **اوّل** یہ کہ مومنِ کامل کو خدا تعالیٰ سے اکثر بشارتیں ملتی ہیں یعنی پیش از وقوع خوش خبریاں جو اس کی مرادات یا اس کے دوستوں کے مطلوبات ہیں اس کو بتلائی جاتی ہیں۔ **دوم** یہ کہ مومنِ کامل پر ایسے امور غیبیہ کھُلتے ہیں جو نہ صرف اس کی ذات یا اس کے واسطے داروں سے متعلق ہوں۔ بلکہ جو کچھ دُنیا میں قضا و قدر نازل ہونے والی ہے یا بعض دنیا کے افرادِ مشہورہ پر کچھ تغیّرات آنے والے ہیں ان سے برگزیدہ مومن کو اکثر اوقات خبر دی جاتی ہے۔ **سیوم** یہ کہ مومنِ کامل کی اکثر دعائیں قبول کی جاتی ہیں اور اکثر ان دُعاؤں کی قبولیت کی پیش از وقت اطلاع بھی دی جاتی ہے۔ **چہارم** یہ کہ مومنِ کامل پر قرآن کریم کے دقائق و معارف جدیدہ و لطائف و خواص عجیبہ سب

سے زیادہ کھولے جاتے ہیں۔ ان چاروں علامتوں میں مومنِ کامل نسبتی طور پر دوسروں پر غالب رہتا ہے۔ اور اگرچہ دائمی طور پر یہ قاعدہ کلّیہ نہیں ہے کہ ہمیشہ مومنِ کامل کو منجانب اللہ بشارتیں ہی ملتی رہیں یا ہمیشہ بلاتخلف ہر ایک دُعا اس کی منظور ہی ہو جایا کرے اور نہ یہ کہ ہمیشہ ہر ایک حادثۂ زمانہ سے اس کو اطلاع دی جائے اور نہ یہ کہ ہر وقت معارف قرآنی اس پر کھُلتے رہیں لیکن غیر کے مقابلہ کے وقت ان چاروں علامتوں میں کثرت مومن ہی کی طرف رہتی ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ غیر کو بھی مثلاً جو مومن ناقص ہے شاذونادر کے طور پر ان نعمتوں سے کچھ حصہ دیا جاوے مگر اصلی وارث ان نعمتوں کا مومنِ کامل ہی ہوتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ یہ مرتبہ کاملہ مومن کا بغیر مقابلہ کے ہر ایک پلید و غبی اور کوتاہ نظر پر کھُل نہیں سکتا۔ لہٰذا نہایت صاف اور سہل طریق حقیقی اور کامل مومن کی شناخت کے لئے مقابلہ ہی ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ تمام علامات بطور خود بھی مومنِ کامل سے صادر ہوتی رہتی ہیں لیکن یکطرفہ طور پر بعض دقتیں بھی ہیں مثلاً بسا اوقات مومنِ کامل کی خدمت میں دُعا کرانے کے لئے ایسے لوگ بھی آجاتے ہیں جن کی تقدیر میں قطعاً کامیابی نہیں ہوتی اور قلمِ ازل مبرم طور پر اُن کے مخالف ہی چلی ہوئی ہوتی ہے۔ سو وہ لوگ اپنی ناکامی کی وجہ سے مومنِ کامل کی اس علامتِ قبولیت کو شناخت نہیں کر سکتے بلکہ اَور بھی شک میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے محروم رہنے کی وجہ سے مومنِ کامل کے کمالاتِ قبولیت پر مطلع نہیں ہو سکتے۔ اور اگرچہ مومنِ کامل کا خدائے تعالیٰ کے نزدیک بڑا درجہ اور مرتبہ ہوتا ہے اور اس کی خاطر سے اور اس کی تضرّع اور دُعا سے بڑے بڑے پیچیدہ کام درست کئے جاتے ہیں اور بعض ایسی تقدیریں جو تقدیر مبرم کے مشابہ ہوں بدلائی بھی جاتی ہیں۔ مگر جو تقدیر حقیقی اور واقعی طور پر مبرم ہے وہ مومنِ کامل کی دعاؤں سے ہرگز بدلائی نہیں جاتی اگرچہ وہ مومنِ کامل نبی یا رسُول کا ہی درجہ رکھتا ہو۔ غرض نسبتی طور پر مومنِ کامل ان چاروں علامتوں میں اپنے غیر سے بداہت ممیّز ہوتا ہے اگرچہ دائمی طور پر قادر اور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پس جبکہ یہ امر ثابت ہو چکا کہ نسبتی طور پر حقیقی اور کامل مومن کو کثرتِ بشارات اور کثرتِ استجابتِ دُعا اور کثرتِ انکشافِ مغیبات اور کثرتِ انکشافِ معارفِ قرآنی سے وافر حصّہ ہے تو مومنِ کامل اور اس کے غیر کے آزمانے کے لئے اس سے بہتر اَور کوئی طریق نہ ہوگا کہ بذریعہ مقابلہ ان دونو کو جانچا اور پرکھا جاوے۔ یعنی اگر یہ اَمر لوگوں کی نظر میں مشتبہ ہو کہ دو شخصوں میں سے کون عنداللہ مومنِ کامل اور کون اس درجہ سے گرا ہوا ہے تو انہی چاروں علامتوں کے ساتھ مقابلہ ہونا چاہیئے یعنی ان چاروں علامتوں کو محک اور معیار ٹھہرا کر مقابلہ کے وقت دیکھا جاوے کہ اس معیار اور ترازو کی رُو سے کون شخص پورا اُترا

ہے اور کس کی حالت میں کمی اور نقصان ہے۔

اب خلق اللہ گواہ رہے کہ میں خالصاً للہ اور اظہاراً للحق اس مقابلہ کو بدل و جان منظور کرتا ہوں۔ اور مقابلہ کے لئے جو صاحب میرے سامنے آنا چاہیں اُن میں سے سب سے اوّل نمبر میاں نذیر حسین دہلوی جنہوں نے پچاس سال سے زیادہ قرآن اور حدیث پڑھا کر پھر اپنے علم اور عمل کا یہ نمونہ دکھایا کہ بلا تفتیش و تحقیق اس عاجز کے کُفر پر فتویٰ لکھ دیا اور ہزارہا وحشی طبع لوگوں کو بدظن کر کے اُن سے گندی گالیاں دلائیں اور بٹالوی کو ایک مجنون درندہ کی طرح تکفیر اور لعنت کی جھاگ مُنہ سے نکالنے کے لئے چھوڑ دیا اور آپ مومنِ کامل اور شیخ الکل اور شیخ العرب والعجم بن بیٹھے۔ لہذا مقابلہ کے لئے سب سے اوّل انہی کو دعوت دی جاتی ہے۔ ہاں ان کو اختیار ہے کہ وہ اپنے ساتھ بٹالوی کو بھی کہ اب تو خواب بینی کا بھی دعویٰ رکھتا ہے ملا لیں۔ بلکہ ان کو میری طرف سے اختیار ہے کہ وہ مولوی عبدالجبار صاحب خلف عبدِ صالح مولوی عبداللہ صاحب مرحوم اور نیز مولوی عبدالرحمٰن صاحب لکھو کے والے کو جو میری نسبت ابدی گمراہ ہونے کا الہام مشتہر کر چکے ہیں اور کُفر کا فتویٰ دے چکے ہیں اور نیز مولوی محمد بشیر صاحب بھوپالوی کو جو ان کے متبعین میں سے ہیں اس مقابلہ میں اپنے ساتھ ملا لیں اور اگر میاں صاحب موصوف اپنی عادت کے موافق گریز کر جائیں تو یہی حضرات مذکورہ بالا میرے سامنے آویں اور اگر یہ سب گریز اختیار کریں تو پھر مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اس کام کے لئے ہمت کریں کیونکہ مقلدوں کی پارٹی کے تو وہی رُکن اوّل ہیں اور ان کے ساتھ ہر ایک ایسا شخص بھی شامل ہو سکتا ہے جو نامی اور مشاہیر صُوفیوں اور پیرزادوں اور سجادہ نشینوں میں سے ہو اور انہی حضرات علماء کی طرح اس عاجز کو کافر اور مفتری اور کذّاب اور مکّار سمجھتا ہو۔ اور اگر یہ سب کے سب مقابلہ سے مُنہ پھیر لیں اور کچے عذروں اور نامعقول بہانوں سے میری اس دعوت کے قبول کرنے سے منحرف ہو جائیں تو خدا تعالےٰ کی حجت ان پر تمام ہے۔ میں مامُور ہوں اور فتح کی مجھے بشارت دی گئی ہے لہذا میں حضرات مذکورہ بالا کو مقابلے کے لئے بُلاتا ہوں۔ کوئی ہے جو میرے سامنے آوے؟ . . . .

یہ ہر چہار محک امتحان جو میں نے لکھی ہیں اور یہ ایسی سیدھی اور صاف ہیں کہ جو شخص غور کے ساتھ ان کو زیرِ نظر لائے گا وہ بلاشُبہ اس بات کو قبول کر لے گا کہ متخاصمین کے فیصلے کے لئے اس سے صاف اور سہل تر اَور کوئی رُوحانی طریق نہیں۔ اور میں اقرار کرتا ہوں اور اللہ جلّشانہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں اس مقابلہ میں مغلوب ہو گیا تو اپنے ناحق پر ہونے کا خود اقرار شائع کر دوں گا اور پھر میاں نذیر حسین صاحب اور شیخ بٹالوی کی تکفیر اور مفتری کہنے کی حاجت نہیں رہے گی اور اس صورت میں

ہر ایک ذلّت اور توہین اور تحقیر کا مستوجب و سزاوار ٹھہروں گا اور اس جلسہ میں اقرار بھی کروں گا کہ میں خدا تعالےٰ کی طرف سے نہیں ہوں اور میرے تمام دعاوی باطل ہیں اور بخدا میں یقین رکھتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ میرا خدا ہرگز ایسا نہیں کرے گا اور کبھی مجھے ضائع نہیں ہونے دے گا۔

(آسمانی فیصلہ ص۱۳-۲۰)

نشانوں کا سلسلہ تو ابتداء سے جاری ہے اور ہر یک صحبت میں رہنے والا بشرطیکہ صدق اور استقامت سے رہے کچھ نہ کچھ دیکھ سکتا ہے اور آئندہ بھی خدائے تعالیٰ اس سلسلہ کو بے نشان نہیں چھوڑے گا اور نہ اپنی تائید سے دستکش ہوگا بلکہ جیسا کہ اس کے پاک وعدے ہیں وہ ضرور اپنے وقتوں پر نشان تازہ بتازہ دکھاتا رہے گا جب تک کہ وہ اپنی حجت کو پوری کرے اور خبیث اور طیب میں فرق کر کے دکھلا دے۔ اُس نے آپ اپنے مکالمہ میں اس عاجز کی نسبت فرمایا کہ دُنیا میں ایک نذیر آیا پر دُنیا نے اُس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچّائی ظاہر کر دے گا۔ اور میں کبھی امید نہیں کر سکتا کہ وہ حملے بغیر ہونے کے رہیں گے گو اُن کا ظہور میرے اختیار میں نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں سچّا ہوں۔ پیارو! یقیناً سمجھو کہ جب تک آسمان کا خدا کسی کے ساتھ نہ ہو ایسی شجاعت کبھی نہیں دکھاتا کہ ایک دُنیا کے مقابل پر استقامت کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور ان باتوں کا دعویٰ کرے جو اُس کے اختیار سے باہر ہیں۔ جو شخص قوت اور استقامت کے ساتھ ایک دُنیا کے مقابل پر کھڑا ہو جاتا ہے کیا وہ آپ سے کھڑا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ اس ذاتِ قدیر کی پناہ سے اور ایک غیبی ہاتھ کے سہارے کھڑا ہوتا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں تمام زمین و آسمان اور ہر ایک رُوح اور جسم ہے سو آنکھیں کھولو اور سمجھ لو کہ اس خدا نے مجھ عاجز کو یہ قوت اور استقامت دی ہے جس کے مکالمہ سے مجھے عزّت حاصل ہے۔ اسی کی طرف سے اور اسی کے کھلے کھلے ارشاد سے مجھے یہ جرأت ہوئی ہے کہ مَیں ان لوگوں کے مقابل پر بڑی دلیری اور دلی استقامت سے کھڑا ہو گیا۔ جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم مقتدیٰ اور شیخ العرب والعجم اور مقرب اللہ ہیں جن میں وہ جماعت بھی موجود ہے جو ملہم کہلاتی ہے۔ اور الٰہی مکالمہ کا دعویٰ کرتی ہے اور اپنے زعم میں الہامی طور پر مجھے کافر اور جہنّمی ٹھہرا چکے ہیں۔ سو میں ان سب کے مقابل پر باذنہٖ تعالےٰ میدان میں آیا ہوں تا خدائے تعالیٰ صادق اور کاذب میں فرق کر کے دکھا دے اور تا اس کا ہاتھ جھوٹے کو تحت الثریٰ تک پہنچا دے اور تا وہ اس شخص کی نصرت اور تائید کرے جس پر اس کا فضل و کرم ہے۔ سو بھائیو۔ دیکھو کہ یہ دعوت جس کی طرف میاں نذیر حسین صاحب اور

اُن کی جماعت کو بُلاتا ہوں یہ درحقیقت مجھ میں اور اُن میں کھلا کھلا فیصلہ کرنے والا طریق ہے۔ سو میں اس راہ پر کھڑا ہوں۔ اب اگر علماء کی نظر میں ایسا ہی کافر اور دجّال اور مفتری اور شیطان کا رہ زدہ ہوں تو میرے مقابل پر انہیں کیوں تامّل کرنا چاہیئے۔ کیا انہوں نے قرآن کریم میں نہیں پڑھا کہ عند المقابلہ نصرت الٰہی مومنوں کے ہی شامل حال ہوتی ہے۔ اللہ جلّشانہ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ اے مومنو مقابلہ سے ہمت مت ہارو اور کچھ اندیشہ مت کرو اور انجام کار غلبہ تمہیں کا ہے اگر تم واقعی طور پر مومن ہو۔ اور فرماتا ہے لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا۔ یعنی خدا تعالیٰ ہرگز کافروں کو مومنوں پر راہ نہیں دیگا۔

(آسمانی فیصلہ ص۲۲-۲۴)

مسیح موعود جو آنے والا ہے اس کی علامت یہ لکھی ہے کہ وہ نبی اللہ ہوگا یعنی خدا تعالیٰ سے وحی پانے والا۔ لیکن اس جگہ نبوت تامّہ کاملہ مراد نہیں ہے کیونکہ نبوت تامہ کاملہ پر مُہر لگ چکی ہے۔ بلکہ وہ نبوت مراد ہے جو محدثیت کے مفہوم تک محدود ہے جو مشکوٰۃ نبوت محمدیہ سے نور حاصل کرتی ہے سو یہ نعمت خاص طور پر اس عاجز کو دی گئی ہے۔ اور اگرچہ ہریک کو رؤیا صحیحہ اور مکاشفات میں سے کسی قدر حصّہ ہے مگر مخالفین کے دل میں اگر گمان اور شک ہو تو وہ مقابلہ کرکے آزما سکتے ہیں کہ جو کچھ اس عاجز کو رویاء صالحہ اور مکاشفہ اور استجابتِ دُعا اور الہامات صحیحہ صادقہ سے حصّہ وافرہ نبیوں کے قریب قریب دیا گیا ہے وہ دوسروں کو تمام حال کے مسلمانوں میں سے ہرگز نہیں دیا گیا اور یہ ایک بڑا محکِ آزمائش ہے کیونکہ آسمانی تائید کی مانند صادق کے صدق پر اَور کوئی گواہ نہیں۔ جو شخص خدا تعالےٰ کی طرف سے آتا ہے۔ بیشک خدا تعالیٰ اس کے ساتھ ہوتا ہے اور ایک خاص طور پر مقابلہ کے میدانوں میں اس کی دستگیری فرماتا ہے۔ چونکہ میں حق پر ہوں اور دیکھتا ہوں کہ خدا میرے ساتھ ہے جس نے مجھے بھیجا ہے اس لئے میں بڑے اطمینان اور یقینِ کامل سے کہتا ہوں کہ اگر میری ساری قوم کیا پنجاب کے رہنے والے اور کیا ہندوستان کے باشندے اور کیا عرب کے مسلمان اور کیا رُوم اور فارس کے کلمہ گو اور کیا افریقہ اور دیگر بلاد کے اہلِ اسلام اور اُن کے علماء اور اُن کے فقراء اور اُن کے مشائخ اور اُن کے صُلحاء اور اُن کے مرد اور اُن کی عورتیں مجھے کاذب خیال کرکے پھر میرے مقابل پر دیکھنا چاہیں کہ قبولیت کے نشان مجھ میں ہیں یا اُن میں۔ اور آسمانی دروازے مجھ پر کھُلتے ہیں یا اُن پر۔ اور وہ محبوب حقیقی اپنی خاص عنایات اور اپنے علومِ لدنیہ اور معارفِ رُوحانیہ کے القاء کی وجہ سے میرے ساتھ ہے یا اُن کے ساتھ۔ تو بہت جلد اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ خاص فضل اور خاص

رحمت جس سے دل موردِ فیوض کیا جاتا ہے اسی عاجز پر اس کی قوم سے زیادہ ہے۔ کوئی شخص اس بیان کو تکبر کے رنگ میں نہ سمجھے بلکہ یہ تحدیث نعمت کی قسم میں سے ہے وَ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔ اسی کی طرف اشارہ ان الہامات میں ہے۔ قُلْ اِنِّیْ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّیَ الْحُزْنَ وَ اٰتَانِیْ مَا لَمْ یُؤْتَ اَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِیْنَ۔ اَحَدًا من العلمین سے مراد زمانہ حال کے لوگ یا آئندہ زمانہ کے ہیں۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۴۷۸ - ۴۷۹)

میں کمال دعویٰ سے کہتا ہوں کہ جس قدر خدا تعالیٰ نے میری ہمت اور توجہ اور دُعا سے لوگوں پر برکات ظاہر کی ہیں اس کی نظیر دوسروں میں ہرگز نہیں ملے گی اور عنقریب خدا تعالیٰ اَور بھی بہت سے نمونے ظاہر کرے گا یہاں تک کہ دشمن کو بھی سخت ناچار ہو کر ماننا پڑے گا۔ میں بار بار یہی کہتا ہوں کہ یہ دو قسم کی برکتیں جن کا نام عیسوی برکتیں اور محمدی برکتیں ہیں مجھ کو عطا کی گئی ہیں۔ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے علم پا کر اس بات کو جانتا ہوں کہ جو دُنیا کی مشکلات کے لئے میری دُعائیں قبول ہو سکتی ہیں دوسروں کی ہرگز نہیں ہو سکتیں اور جو دینی اور قرآنی معارف حقائق اور اسرار مع لوازم بلاغت اور فصاحت کے میں لکھ سکتا ہوں دوسرا ہرگز نہیں لکھ سکتا۔ اگر ایک دُنیا جمع ہو کر میرے اس امتحان کے لئے آوے تو مجھے غالب پائے گی اور اگر تمام لوگ میرے مقابل پر اُٹھیں تو خدا تعالیٰ کے فضل سے میرا ہی پلّہ بھاری ہوگا۔ دیکھو میں صاف صاف کہتا ہوں اور کھول کر کہتا ہوں کہ اس وقت اے مسلمانو! تم میں وہ لوگ بھی موجود ہیں جو مفسّر اور محدّث کہلاتے ہیں اور قرآن کے معارف اور حقائق جاننے کے مدعی ہیں اور بلاغت اور فصاحت کا دم مارتے ہیں اور وہ لوگ بھی موجود ہیں جو فقراء کہلاتے ہیں اور چشتی اور قادری اور نقشبندی اور سہروردی وغیرہ کے ناموں سے اپنے تئیں موسوم کرتے ہیں۔ اُٹھو! اور اس وقت اُن کو میرے مقابل پر لاؤ۔ پس اگر میں اس دعویٰ میں جھوٹا ہوں کہ یہ دونوں شانیں یعنی شانِ عیسوی اور شانِ محمدی مجھ میں جمع ہیں اور اگر میں وہ نہیں ہوں جس میں یہ دونوں شانیں جمع ہوں گی اور ذوالبروزین ہوگا تو مَیں اس مقابلہ میں مغلوب ہو جاؤں گا ورنہ غالب آ جاؤں گا۔ مجھے خدا کے فضل سے توفیق دی گئی ہے کہ مَیں شانِ عیسوی کی طرز سے دُنیوی برکات کے متعلق کوئی نشان دکھاؤں یا شانِ محمدی کی طرز سے حقائق معارف اور نکات اور اسرارِ شریعت بیان کروں اور میدانِ بلاغت میں قوتِ ناطقہ کا گھوڑا دوڑاؤں اور مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اب خدا کے فضل سے اور محض اسی کے ارادے سے زمین پر بجُز میرے ان دونوں شانوں کا جامع اَور کوئی نہیں ہے اور پہلے سے لکھا گیا تھا کہ ان دونوں شانوں کا جامع ایک ہی

شخص ہوگا جو آخری زمانہ میں پیدا ہوگا اور اس کے وجود کا آدھا حصہ عیسوی شان کا ہوگا اور آدھا حصہ محمدی شان کا **سو وہی میں ہوں** جس نے دیکھنا ہو دیکھے۔ جس نے پرکھنا ہو پرکھے۔ مبارک وہ جو اب بُخل نہ کرے اور نہایت بدبخت وہ جو روشنی پاکر تاریکی اختیار کرے۔

(ایام الصلح صـ ۱٦۵ - ۱٦٦)

میں نصیحتاً للہ مخالف علماء اور اُن کے ہم خیال لوگوں کو کہتا ہوں کہ گالیاں دینا اور بدزبانی کرنا طریق شرافت نہیں ہے۔ اگر آپ لوگوں کی یہی طینت ہے تو خیر آپ کی مرضی۔ لیکن اگر مجھے آپ لوگ کاذب سمجھتے ہیں تو آپ کو یہ بھی تو اختیار ہے کہ مساجد میں اکٹھے ہو کر یا الگ الگ میرے پر بددعائیں کریں اور رو رو کر میرا استیصال چاہیں۔ پھر اگر میں کاذب ہوں گا تو ضرور وہ دُعائیں قبول ہوں گی۔ اور آپ لوگ ہمیشہ دُعائیں کرتے بھی ہیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ اگر آپ اس قدر دُعائیں کریں کہ زبانوں میں زخم پڑ جائیں اور اس قدر رو رو کر سجدوں میں گریں کہ ناک گھِس جائیں اور آنسوؤں سے آنکھوں کے حلقے گل جائیں اور پلکیں جھڑ جائیں اور کثرت گریہ وزاری سے بینائی کم ہو جائے اور آخر دماغ خالی ہو کر مرگی پڑنے لگے یا مالیخولیا ہو جائے تب بھی وہ دُعائیں سُنی نہیں جائیں گی۔ کیونکہ میں خدا سے آیا ہوں۔ جو شخص میرے پر بددُعا کرے گا وہ بددُعا اُسی پر پڑے گی۔ جو شخص میری نسبت یہ کہتا ہے کہ اس پر لعنت ہو وہ لعنت اسی کے دِل پر پڑتی ہے مگر اس کو خبر نہیں اور جو شخص میرے ساتھ اپنی کشتی قرار دے کر یہ دُعائیں کرتا ہے کہ ہم میں سے جو جھُوٹا ہے وہ پہلے مَرے اس کا نتیجہ وہی ہے جو مولوی غلام دستگیر قصوری نے دیکھ لیا . . . .

کوئی زمین پر مَر نہیں سکتا جب تک آسمان پر نہ مارا جائے۔ میری رُوح میں وہی سچائی ہے جو ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ مجھے خدا سے ابراہیمی نسبت ہے۔ کوئی میرے بھید کو نہیں جانتا مگر میرا خدا۔ مخالف لوگ عبث اپنے تئیں تباہ کر رہے ہیں۔ مَیں وُہ پودا نہیں ہوں کہ اُن کے ہاتھ سے اُکھڑ سکوں۔ اگر ان کے پہلے اور ان کے پچھلے اور ان کے زندے اور ان کے مُردے تمام جمع ہو جائیں اور میرے مارنے کے لئے دُعائیں کریں تو میرا خدا ان تمام دعاؤں کو لعنت کی شکل بنا کر ان کے مُنہ پر مارے گا دیکھو! صدہا دانشمند آدمی آپ لوگوں کی جماعت سے نکل کر ہماری جماعت میں ملتے جاتے ہیں۔ آسمان پر ایک شور برپا ہے اور فرشتے پاک دلوں کو کھینچ کر اس طرف لا رہے ہیں۔ اب اس آسمانی کارروائی کو کیا انسان روک سکتا ہے۔ بھلا اگر کچھ طاقت ہے تو روکو۔ وہ تمام مکر و فریب جو نبیوں کے مخالف کرتے رہے ہیں وہ سب کرو اور کوئی تدبیر اُٹھا نہ رکھو۔ ناخنوں تک زور لگاؤ۔ اتنی بددُعائیں کرو کہ موت

تک پہنچ جاؤ۔ پھر دیکھو کہ کیا بگاڑ سکتے ہو۔ خدا کے آسمانی نشان بارش کی طرح برس رہے ہیں مگر بدقسمت انسان دُور سے اعتراض کرتے ہیں۔ جن دلوں پر مُہریں ہیں اُن کا ہم کیا علاج کریں۔ اے خدا تو اس اُمت پر رحم کر۔ آمین !

المشتہر خاکسار مرزا غلام احمد از قادیان ۲۹ر دسمبر ۱۹۰۰ء

(ضمیمہ اربعین ص۳۔۴، ص۳)

اس عاجز غلام احمد قادیانی کی آسمانی گواہی طلب کرنے کے لئے ایک دُعا اور حضرت عزّت سے اپنی نسبت آسمانی فیصلہ کی درخواست

اے میرے حضرت اعلیٰ ذوالجلال قادر قدوس حیّ و قیوّم جو ہمیشہ راستبازوں کی مدد کرتا ہے۔ تیرا نام ابدالآباد مبارک ہے۔ تیرے قدرت کے کام کبھی رُک نہیں سکتے۔ تیرا قوی ہاتھ ہمیشہ عجیب کام دکھلاتا ہے۔ تو نے ہی اس چودھویں صدی کے سر پر مجھے مبعوث کیا اور فرمایا کہ "اُٹھ کہ میں نے تجھے اس زمانہ میں اسلام کی حجت پُوری کرنے کے لئے اور اسلامی سچائیوں کو دُنیا میں پھیلانے کے لئے اور ایمان کو زندہ اور قوی کرنے کے لئے چُنا" اور تو نے ہی مجھے کہا کہ "تو میری نظر میں منظور ہے میں اپنے عرش پر تیری تعریف کرتا ہوں" اور تو نے مجھے فرمایا کہ "تو وہ مسیح موعود ہے جس کے وقت کو ضائع نہیں کیا جائے گا" اور تو نے ہی مجھے مخاطب کر کے کہا کہ "تو مجھ سے ایسا ہے جیسا کہ میری توحید اور تفرید" اور تو نے ہی مجھے فرمایا کہ "میں نے لوگوں کی دعوت کے لئے تجھے منتخب کیا۔ اُن کو کہدے کہ میں تم سب کی طرف بھیجا گیا ہوں اور سب سے پہلا مومن ہوں" اور تو نے ہی مجھے کہا کہ "میں نے تجھے اس لئے بھیجا ہے کہ تا اسلام کو تمام قوموں کے آگے روشن کر کے دکھلاؤں اور کوئی مذہب ان تمام مذہبوں میں سے جو زمین پر ہیں برکات میں۔ معارف میں۔ تعلیم کی عمدگی میں۔ خدا کی تائیدوں میں۔ خدا کے عجائب غرائب نشانوں میں اسلام سے ہمسری نہ کر سکے" اور تو نے ہی مجھے فرمایا کہ "تو میری درگاہ میں وجیہہ ہے۔ مَیں نے اپنے لئے تجھے اختیار کیا" مگر اے میرے قادر خدا۔ تو جانتا ہے کہ اکثر لوگوں نے مجھے منظور نہیں کیا اور مجھے مفتری سمجھا اور میرا نام کافر اور کذّاب اور دجّال رکھا گیا۔ مجھے گالیاں دی گئیں اور طرح طرح کی دل آزار باتوں سے مجھے ستایا گیا اور میری نسبت یہ بھی کہا گیا کہ "حرام خور۔ لوگوں کا مال کھانے والا۔ وعدوں کا تخلف کرنے والا۔ حقوق کو تلف کرنے والا۔ لوگوں کو گالیاں دینے والا۔ عہدوں

کو توڑنے والا۔ اپنے نفس کے لئے مال جمع کرنے والا اور شریر اور خونی ہے" یہ وہ باتیں ہیں جو خود ان لوگوں نے میری نسبت کہیں جو مسلمان کہلاتے اور اپنے تئیں اچھے اور اہلِ عقل اور پرہیزگار جانتے ہیں۔ اور ان کا نفس اس بات کی طرف مائل ہے کہ درحقیقت جو کچھ وہ میری نسبت کہتے ہیں سچ کہتے ہیں۔ اور انہوں نے صدہا آسمانی نشان تیری طرف سے دیکھے مگر پھر بھی قبول نہیں کیا۔ وہ میری جماعت کو نہایت تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہر ایک اُن میں سے جو بدزبانی کرتا ہے وہ خیال کرتا ہے کہ بڑے ثواب کا کام کر رہا ہے۔ سو اے میرے مولا قادر خدا! اب مجھے راہ بتلا اور کوئی ایسا نشان ظاہر فرما۔ جس سے تیرے سلیم الفطرت بندے نہایت قوی طور پر یقین کریں کہ میں تیرا مقبول ہوں اور جس سے اُن کا ایمان قوی ہو اور وہ تجھے پہچانیں اور تجھ سے ڈریں اور تیرے اس بندے کی ہدایتوں کے موافق ایک پاک تبدیلی اُن کے اندر پیدا ہو اور زمین پر پاکی اور پرہیزگاری کا اعلیٰ نمونہ دکھلاویں اور ہر ایک طالبِ حق کو نیکی کی طرف کھینچیں اور اس طرح پر تمام قومیں جو زمین پر ہیں تیری قدرت اور تیرے جلال کو دیکھیں اور سمجھیں کہ تو اپنے اس بندے کے ساتھ ہے اور دُنیا میں تیرا جلال چمکے اور تیرے نام کی روشنی اس بجلی کی طرح دکھلائی دے کہ جو ایک لمحہ میں مشرق سے مغرب تک اپنے تئیں پہنچاتی اور شمال و جنوب میں اپنی چمکیں دکھلاتی ہے۔ لیکن اگر اے پیارے مولا میری رفتار تیری نظر میں اچھی نہیں ہے تو مجھ کو اس صفحۂ دُنیا سے مٹا دے تا میں بدعت اور گمراہی کا موجب نہ ٹھہروں۔ مَیں اس درخواست کے لئے جلدی نہیں کرتا تا میں خدا کے امتحان کرنے والوں میں شمار نہ کیا جاؤں۔ لیکن میں عاجزی سے اور حضرت رُبوبیت کے ادب سے یہ التماس کرتا ہوں کہ اگر میں اس عالی جناب کا منظور نظر ہوں تو تین سال کے اندر کسی وقت میری اس دُعا کے موافق میری تائید میں کوئی ایسا آسمانی نشان ظاہر ہو جس کو انسانی ہاتھوں اور انسانی تدبیروں سے کچھ بھی تعلق نہ ہو جیسا کہ آفتاب کے طلوع اور غروب کو انسانی تدبیروں سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ اگرچہ اے میرے خداوند یہ سچ ہے کہ تیرے نشان انسانی ہاتھوں سے بھی ظہور میں آتے ہیں لیکن اس وقت میں اسی بات کو اپنی سچائی کا معیار قرار دیتا ہوں کہ وہ نشان انسانوں کے تصرفات سے بالکل بعید ہو تا کوئی دشمن اس کو انسانی منصوبہ قرار نہ دے سکے سو اے میرے خدا! تیرے آگے کوئی بات اَنہونی نہیں۔ اگر تُو چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ تُو میرا ہے جیسا کہ مَیں تیرا ہوں۔ تیری جناب میں الحاح سے دُعا کرتا ہوں کہ اگر یہ سچ ہے کہ میں تیری طرف سے ہوں اور اگر یہ سچ ہے کہ تو نے ہی مجھے بھیجا ہے تو تُو میری تائید میں اپنا کوئی ایسا نشان دکھلا کہ جو پبلک کی نظر میں انسانوں کے ہاتھوں اور انسانی منصوبوں سے برتر یقین کیا جائے تا لوگ سمجھیں کہ میں تیری

طرف سے ہوں۔ اے میرے قادر خدا! اے توانا اور سب قوتوں کے مالک خداوند! تیرے ہاتھ کے برابر کوئی ہاتھ نہیں اور کسی جِنّ اور بھُوت کو تیری سلطنت میں شرکت نہیں۔ دُنیا میں ہر ایک فریب ہوتا ہے اور انسانوں کو شیاطین بھی اپنے جھُوٹے الہامات سے دھوکہ دیتے ہیں مگر کسی شیطان کو یہ قوت نہیں دی گئی کہ وہ تیرے نشانوں اور تیرے ہیبت ناک ہاتھ کے آگے ٹھہر سکے یا تیری قدرت کی مانند کوئی قدرت دکھلا سکے کیونکہ تُو وہ ہے جس کی شان لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے اور جو العلی العظیم ہے۔ جو لوگ شیطان سے الہام پاتے ہیں اُن کے الہاموں کے ساتھ کوئی قادرانہ غیب گوئی کی روشنی نہیں ہوتی جس میں اُلوہیت کی قدرت اور عظمت اور ہیبت بھری ہوئی ہو۔ وہ تُو ہی ہے جس کی قوت سے تمام تیرے نبی تحدی کے طور پر اپنے معجزانہ نشان دکھلاتے رہے ہیں اور بڑی بڑی پیشگوئیاں کرتے رہے ہیں جن میں اپنا غلبہ اور مخالفوں کی درماندگی پہلے سے ظاہر کی جاتی تھی۔ تیری پیشگوئیوں میں تیرے جلال کی چمک ہوتی ہے اور تیری اُلوہیت کی قدرت اور عظمت اور حکومت کی خوشبو آتی ہے اور تیرے مُرسلوں کے آگے فرشتہ چلتا ہے تا اُن کی راہ میں کوئی شیطان مقابلہ کے لئے ٹھہر نہ سکے۔ مجھے تیری عزّت اور جلال کی قسم ہے کہ مجھے تیرا فیصلہ منظور ہے۔ پس اگر تُو تین برس کے اندر جو جنوری ۱۹۰۰؁ عیسوی سے شروع ہو کر دسمبر ۱۹۰۲؁ عیسوی تک پُورے ہو جائیں گے میری تائید میں اور میری تصدیق میں کوئی آسمانی نشان نہ دکھلاوے اور اپنے اس بندہ کو اُن لوگوں کی طرح ردّ کر دے جو تیری نظر میں شریر اور پلید اور بیدین اور کذّاب اور دجّال اور خائن اور مفسد ہیں تو میں تجھے گواہ کرتا ہوں کہ میں اپنے تئیں صادق نہیں سمجھوں گا اور ان تمام تہمتوں اور الزاموں اور بہتانوں کا اپنے تئیں مصداق سمجھ لوں گا جو میرے پر لگائے جاتے ہیں۔ دیکھ! میری رُوح نہایت توکّل کے ساتھ تیری طرف ایسی پرواز کر رہی ہے جیسا کہ پرندہ اپنے آشیانہ کی طرف آتا ہے۔ سو میں تیری قدرت کے نشان کا خواہشمند ہوں لیکن نہ اپنے لئے اور نہ اپنی عزّت کے لئے بلکہ اس لئے کہ لوگ تجھے پہچانیں اور تیری پاک راہوں کو اختیار کریں۔ اور جس کو تُو نے بھیجا ہے اس کی تکذیب کر کے ہدایت سے دُور نہ پڑ جائیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تُو نے مجھے بھیجا ہے اور میری تائید میں بڑے بڑے نشان ظاہر کئے ہیں۔

(ضمیمہ تریاق القلوب نمبر ۵ ص۳۲۴)

اے قدیر و خالقِ ارض و سما ؞ اے رحیم و مہربان و رہنما
اے کہ میداری تو بر دلہا نظر ؞ اے کہ از تو نیست چیزے مُستتر
گر تو مے بینی مرا پُر فسق و شر ؞ گر تو دیداستی کہ ہستم بدگہُر

پارہ پارہ کُن منِ بدکار را ؎ شاد کُن ایں زمرۂ اغیار را
بر دلِ شاں ابرِ رحمت ہا ببار ؎ ہر مرادِ شاں بفضلِ خود برآر
آتش افشاں بر در و دیوارِ من ؎ دشمنم باش و تبہ کن کارِ من
در مرا از بندگانت یافتی ؎ قبلۂ من آستانت یافتی
در دلِ من آں محبت دیدۂ ؎ کز جہاں آں راز را پوشیدۂ
با من از رُوئے محبت کار کُن ؎ اندکے افشائے آں اسرار کُن
اے کہ آئی سُوئے ہر جوئندۂ ؎ واقفی از سوزِ ہر سوزندۂ
زاں تعلق ہا کہ با تو داشتم ؎ زاں محبت ہا کہ در دل کاشتم
خود بروں آ از پئے ابراءِ من ؎ اے تو کہف و ملجا و ماوائے من
آتشے کاندر دِلم افروختی ؎ وز دم آں غیرِ خود را سوختی
ہم ازاں آتش رُخِ من برفروز ؎ ویں شب تارم مبدل کن بروز

(حقیقۃ المہدی)

قوتِ ایمانی کے انوار جو تائیداتِ غیبیہ کے پیرایہ میں بطور خارق عادت ظاہر ہوئے ہیں جو خدائے تعالیٰ کے فضل ورحم اور قُرب پر دلالت کرتے ہیں اُن کے بارہ میں بھی انہی اشتہارات میں لکھا گیا ہے جو بباعثِ قوتِ ایمانی و قدم بر صراطِ مستقیم یہ سب نعمتیں اس عاجز کو خاص طور پر عطا کی گئی ہیں۔ کسی مخالف مذہب کو یہ مرتبہ ہرگز حاصل نہیں۔ اگر ہے تو وہ مقابلہ پر کھڑا ہووے اور اپنی رُوحانی برکات کا جو اپنے مذہب کی اتباع سے اس کو حاصل ہوں اس عاجز سے موازنہ کرے لیکن آج تک کوئی مقابلہ پر نہیں اُٹھا اور نہ انسان ضعیف اور ہیچ کی یہ طاقت ہے کہ صرف اپنی مکّاری اور شرارتوں کے منصوبہ سے یا منعصبانہ ہٹ سے اس سلسلہ کے سامنے کھڑا ہو سکے جس کو خدائے تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے قائم کیا ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ اگر کوئی اس سلسلہ کے سامنے اپنی برکات نمائی کی رو سے کھڑا ہو تو نہایت درجہ کی ذلّت سے گرا دیا جائے گا کیونکہ یہ کام اور یہ سلسلہ انسان کی طرف سے نہیں بلکہ اس ذاتِ زبردست اور قوی کی طرف سے ہے جس کے ہاتھوں نے آسمانوں کو اُن کے تمام اجرام کے ساتھ بنایا اور زمین کو اس کے باشندوں کے لئے بچھا دیا۔ افسوس کہ ہماری قوم کے مولوی اور علماء یُوں تو تکفیر کے لئے بہت جلد کاغذ اور قلم اور دوات لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن ذرہ سوچتے نہیں کہ کیا یہ ہیبت اور رُعب باطل میں ہوا کرتا ہے کہ تمام دُنیا کو مقابلہ کے لئے بُلایا جائے اور کوئی سامنے

نہ آسکے۔ کیا وہ شجاعت اور استقامت جھوٹوں میں بھی کسی نے دیکھی ہے جو ایک عالم کے سامنے اس جگہ ظاہر کی گئی۔ اگر انہیں شک ہے تو مخالفین اسلام کے جس قدر پیشوا اور واعظ اور معلم ہیں ان کے دروازہ پر جائیں اور اپنے ظنون فاسدہ کا سہارا دے کر انہیں میرے مقابلہ پر رُوحانی امور کے موازنہ کے لئے کھڑا کریں۔ پھر دیکھیں کہ خدا تعالےٰ میری حمایت کرتا ہے یا نہیں۔

(ازالہ اوہام ص۵۶-۵۷ حاشیہ)

اے شک کرنے والو!

آسمانی فیصلہ کی طرف آجاؤ!

اے بزرگو! اے مولویو! اے قوم کے منتخب لوگو! خدا تعالیٰ آپ لوگوں کی آنکھیں کھولے۔ غیظ اور غضب میں آکر حد سے مت بڑھو۔ میری اس کتاب کے دونوں حصوں کو غور سے پڑھو کہ اُن میں نُور اور ہدایت ہے۔ خدا تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی زبانوں کو تکفیر سے تھام لو۔ خدا تعالےٰ خوب جانتا ہے کہ میں ایک مسلمان ہوں۔ اٰمنت باللہ وملٰئکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ والبعث بعد الموت۔ واشھد ان لآ الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ واشھد انّ محمّداً عبدہٗ ورسُولہٗ۔ فاتقوا اللہ ولا تقولوا لست مسلمًا واتقوا الملک الّذی الیہ ترجعون۔

اور اگر اب ابھی اس کتاب کے پڑھنے کے بعد شک ہے تو آؤ آزما لو۔ خدا کس کے ساتھ ہے۔ اے مخالف الرائے مولویو! اور صُوفیو! اور سجادہ نشینو! جو مکفّر اور مکذّب ہو۔ مجھے یقین دلایا گیا ہے کہ اگر آپ لوگ مل جُل کر یا ایک ایک آپ میں سے ان آسمانی نشانوں میں میرا مقابلہ کرنا چاہیں جو اولیاء الرحمٰن کے لازم حال ہوا کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ تمہیں شرمندہ کرے گا اور تمہارے پردوں کو پھاڑ دے گا اور اس وقت تم دیکھو گے کہ وہ میرے ساتھ ہے کیا کوئی تم میں ہے؟ کہ اس آزمائش کے لئے میدان میں آوے اور عام اعلان اخباروں کے ذریعے سے دے کر ان تعلقات قبولیت میں جو میرا رب میرے ساتھ رکھتا ہے اپنے تعلقات کا موازنہ کرے۔ یاد رکھو کہ خدا صادقوں کا مددگار ہے وہ اس کی مدد کرے گا جس کو وہ سچّا جانتا ہے۔ چالاکیوں سے باز آجاؤ کہ وہ میرے نزدیک ہے۔ کیا تم اس سے لڑو گے؟ کیا کوئی متکبرانہ اچھلنے سے درحقیقت اُونچا ہو سکتا ہے۔ کیا صرف زبان کی تیزیوں سے سچائی کو کاٹ دو گے؟ اس ذات سے ڈرو جس کا غضب سب غضبوں سے بڑھ کر ہے۔ اِنَّہٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّہٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَھَنَّمَ

لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْییٰ۔

النّاصح

خاکسار مرزا غلام احمد قادیانی از لدھیانہ محلہ اقبال گنج

(ازالہ اوہام صـ۲)

قرآن شریف حکمتوں اور معارف کا جامع ہے اور وہ رطب و یابس فضولیات کا کوئی ذخیرہ اپنے اندر نہیں رکھتا۔ ہر ایک امر کی تفسیر وہ خود کرتا ہے اور ہر ایک قسم کی ضرورتوں کا سامان اس کے اندر موجود ہے وہ ہر ایک پہلو سے نشان اور آیت ہے۔ اگر کوئی اس امر کا انکار کرے تو ہم ہر پہلو سے اس کا اعجاز ثابت کرنے اور دکھلانے کو تیار ہیں۔

(ملفوظات جلد اوّل صـ۹۳)

میرے معجزات اور دیگر دلائل نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ کے طلب ثبوت کے لئے بعض منتخب علماء ندوہ کے قادیان آویں اور مجھ سے معجزات اور دلائل یعنی نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ کا ثبوت لیں۔ پھر اگر سُنّتِ انبیاء علیہم السّلام کے مطابق میں نے پُورا ثبوت نہ دیا تو میں راضی ہوں کہ میری کتابیں جلائی جلا دیں لیکن اس قدر محنت اُٹھانا بڑے باخدا کا کام ہے۔ ندوہ کو کیا ضرورت ہے جو اس قدر سر درد اُٹھا دے اور کونسا فکرِ آخرت ہے تا خدا سے ڈرے؟ مگر ندوہ کے علماء ایک ایک کرکے یاد رکھیں کہ وہ ہمیشہ اس دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ موتیں پکار رہی ہیں اور جس لہو و لعب میں وہ مشغول ہو رہے ہیں جس کا نام وہ دین رکھتے ہیں خدا آسمان پر دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے کہ وہ دین نہیں ہے۔ وہ ایک چھلکے پر راضی ہیں اور مغز سے بیخبر ہیں یہ اسلام کی خیر خواہی نہیں بلکہ بدخواہی ہے۔ کاش اگر اُن کی آنکھیں ہوتیں تو وہ سمجھتے کہ دُنیا میں بڑا گناہ کیا گیا کہ خدا کے مسیح کو ردّ کر دیا گیا۔ اس بات کا ہر ایک کو مرنے کے بعد پتہ لگے گا۔

(تحفۃ الندوہ ص۳ طبع اوّل)

اور مکالمہ الٰہیہ کی حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے نبیوں کی طرح اس شخص کو جو فنا فی النبی ہے اپنے کامل مکالمہ کا شرف بخشے۔ اس مکالمہ میں وہ بندہ جو کلیم اللہ ہو خدا سے گویا آمنے سامنے باتیں کرتا ہے وہ سوال کرتا ہے خدا اس کا جواب دیتا ہے گو ایسا سوال و جواب پچاسؔ دفعہ واقع ہو یا اس سے زیادہ بھی خدا تعالیٰ اپنے مکالمہ کے ذریعہ سے تین نعمتیں اپنے کامل بندہ کو عطا فرماتا ہے۔ اول ان کی اکثر دعائیں قبول ہوتی ہیں اور قبولیت سے اطلاع دی جاتی ہے۔ دوم اس کو خدا تعالےٰ بہت سے امور غیبیہ پر اطلاع دیتا ہے سوم اس پر قرآن شریف کے بہت سے علوم حکمیہ بذریعہ الہام کھولے جاتے ہیں۔ پس جو شخص اس عاجز کا مکذّب ہو کر پھر

یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ہُنر مجھ میں پایا جاتا ہے میں اس کو خدا تعالےٰ کی قسم دیتا ہوں کہ ان تینوں باتوں میں میرے ساتھ مقابلہ کرے اور فریقین میں قرآن شریف کے کسی مقام کی سات آیتیں تفسیر کے لئے بالاتفاق منظور ہو کر ان کی تفسیر دونوں فریق لکھیں یعنی فریقِ مخالف اپنے الہام سے اس کے معارف لکھے اور میں اپنے الہام سے لکھوں اور چند ایسے الہام قبل از وقت وہ پیش کرے جن میں قبولیت دعا کی بشارت ہو اور وہ دُعا فوق الطاقت ہو۔ ایسا ہی میں بھی پیش کروں اور چند امورِ غیبیہ جو آنے والے زمانہ سے متعلق ہیں وہ قبل از وقت ظاہر کرے اور ایسا ہی میں بھی ظاہر کروں اور دونوں فریقین کے یہ بیانات اشتہارات کے ذریعہ سے شائع ہو جائیں۔ تب ہر ایک کا صدق و کذب کھل جائے گا مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے۔ مکذبین کے دلوں پر خدا کی لعنت ہے۔ خدا اُن کو نہ قرآن کا نُور دکھائے گا نہ بالمقابل دُعا کی استجابت جو اعلام قبل از وقت کے ساتھ ہو اور نہ امورِ غیبیہ پر اطلاع کرے گا۔ لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ۔ پس اب میں نے یہ اشتہار دے دیا ہے جو شخص اس کے بعد سیدھے طریق سے میرے ساتھ مقابلہ نہ کرے اور نہ تکذیب سے باز آوے وہ خدا کی لعنت فرشتوں کی لعنت اور تمام صلحاء کی لعنت کے نیچے ہے۔ وما علی الرسول الّا البلاغ۔

(انجام آتھم صـ۳۰۳ حاشیہ)

ناظرین کو معلوم ہوگا کہ میں نے مخالف مولویوں اور سجادہ نشینوں کی ہر روز کی تکذیب اور زبان درازیاں دیکھ کر اور بہت سی گالیاں سُنکر اُن کی اس درخواست کے بعد کہ ہمیں کوئی نشان دکھلایا جائے۔ ایک اشتہار شائع کیا تھا جس میں ان لوگوں میں سے مخاطب خاص پیر مہر علی شاہ صاحب تھے۔ اس اشتہار کا خلاصۂ مضمون یہ تھا کہ ابتک مباحثات مذہبی بہت ہو چکے جن سے مخالف مولویوں نے کچھ بھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اور چونکہ وہ ہمیشہ آسمانی نشانوں کی درخواست کرتے رہتے ہیں کچھ تعجب نہیں کہ کسی وقت ان سے فائدہ اُٹھالیں۔ اس بناء پر وہ پیش کیا گیا تھا کہ پیر مہر علیشاہ صاحب جو علاوہ کمالاتِ پیری کے علمی توغّل کا بھی دم مارتے ہیں اور اپنے علم کے بھروسہ پر جوش میں آکر انہوں نے میری نسبت فتوٰی تکفیر کو تازہ کیا اور عوام کو بھڑکانے کے لئے میری تکذیب کے متعلق ایک کتاب لکھی . . . . . اور چونکہ مجھے خدا تعالیٰ نے اس الہام سے مشرف فرمایا ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ کہ خدا نے تجھے قرآن سکھلایا۔ اس لئے میرے لئے صدق و کذب کے پرکھنے کے لئے یہ نشان کافی ہوگا کہ پیر مہر علیشاہ صاحب میرے مقابل پر کسی سُورت قرآن شریف کی عربی فصیح بلیغ تفسیر لکھیں اگر وہ فائق اور غالب رہے تو پھر ان کی بزرگی ماننے میں مجھ کو کلام نہیں ہوگا۔ پس میں نے اس امر کو قرار دے کر ان کی دعوت

میں اشتہار شائع کیا جس میں سراسر نیک نیتی سے کام لیا گیا تھا لیکن اس کے جواب میں . . . . انہوں نے صاف گریز کی راہ اختیار کی . . . . . لہذا آج میرے دل میں ایک تجویز خدا تعالےٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے جس کو میں اتمام حجت کے لئے پیش کرتا ہوں اور یقین ہے کہ پیر مہرعلیشاہ صاحب کی حقیقت اس سے کھل جائے گی کیونکہ تمام دُنیا اندھی نہیں ہے۔ انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو کچھ انصاف رکھتے اور وہ تدبیر یہ ہے کہ آج میں ان متواتر اشتہارات کا جو پیر مہرعلی شاہ صاحب کی تائید میں نکل رہے ہیں یہ جواب دیتا ہوں کہ اگر درحقیقت پیر مہرعلی شاہ صاحب علم معارف قرآن اور زبان عربی کی ادب اور فصاحت وبلاغت میں یگانۂ روزگار ہیں تو یقین ہے کہ اب تک وہ طاقتیں ان میں موجود ہونگی کیونکہ لاہور آنے پر ابھی کچھ بہت زمانہ نہیں گزرا۔ اس لئے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ میں اسی جگہ بجائے خود سورۃ فاتحہ کی عربی تفسیر لکھ کر اس سے اپنے دعویٰ کو ثابت کروں اور اس کے متعلق معارف اور حقائق سورۂ ممدوحہ کے بھی بیان کروں اور حضرت پیر صاحب میرے مخالف آسمان سے آنے والے مسیح اور خونی مہدی کا ثبوت اس سے ثابت کریں اور جس طرح چاہیں سورۃ فاتحہ سے استنباط کرکے میرے مخالف عربی فصیح بلیغ میں براہین قاطعہ اور معارف ساطعہ تحریر فرماویں۔ یہ دونوں کتابیں دسمبر ۱۹۰۰ء کی پندرہ تاریخ سے ستّر دن تک چھپ کر شائع ہو جانی چاہئیں۔ تب اہلِ علم لوگ خود مقابلہ اور موازنہ کرلیں گے اور اگر اہلِ علم میں سے تین کس جو ادیب اور اہلِ زبان ہوں اور فریقین سے کچھ تعلق نہ رکھتے ہوں قسم کھا کر کہدیں کہ پیر صاحب کی کتاب کیا بلاغت اور فصاحت کے رو سے اور کیا معارفِ قرآن کے رو سے فائق ہے تو میں عہدِ صحیح شرعی کرتا ہوں کہ پانسو روپیہ نقد بلا توقف پیر صاحب کی نذر کردوں گا . . . .

. . . . ہم ان کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ بے شک اپنی مدد کے لئے مولوی محمد حسین بٹالوی اور مولوی عبد الجبار غزنوی اور محمد حسن بھیین وغیرہ کو بُلا لیں بلکہ اختیار دیتے ہیں کہ کچھ طمع دے کر دو چار عرب کے ادیب بھی طلب کرلیں۔ فریقین کی تفسیر چار جُزء سے کم نہیں ہونی چاہیئے اور اگر میعاد مجوزہ تک یعنی ۱۵ر دسمبر ۱۹۰۰ء سے ۲۵ر فروری ۱۹۰۱ء تک جو ستّر دن ہیں فریقین میں کوئی تفسیرِ فاتحہ چھاپ کر شائع نہ کرے اور یہ دن گذر جائیں تو وہ جھُوٹا سمجھا جائے گا اور اس کے کاذب ہونے کے لئے کسی اور دلیل کی حاجت نہیں رہے گی۔ والسّلام علیٰ من اتبع الھُدیٰ۔

المشتہر میرزا غلام احمد از قادیان ۱۵ر دسمبر ۱۹۰۰ء

(ضمیمہ اربعین نمبر ۳ و ۴ ص ۱ تا ۴)

مجھے ایک دفعہ یہ الہام ہوا۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰن۔ یا اَحْمَدُ فَاضَتِ الرَّحْمَةُ عَلٰی

شَفَتَیْکَ۔ یعنی خدا نے تجھے اے احمد قرآن سکھلایا اور تیرے لبوں پر رحمت جاری کی گئی۔ اور اس الہام کی تفہیم مجھے اس طرح پر ہوئی کہ کرامت اور نشان کے طور پر قرآن اور زبانِ قرآن کی نسبت دو طرح کی نعمتیں مجھ کو عطا کی گئی ہیں (۱) ایک یہ کہ معارف عالیہ فرقان حمید بطور خارق عادت مجھ کو سکھلائے گئے جن میں دوسرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (۲) دوسرے یہ کہ زبان قرآن یعنی عربی میں وہ بلاغت اور فصاحت مجھے دی گئی کہ اگر تمام علماء مخالفین باہم اتفاق کر کے بھی اس میں میرا مقابلہ کرنا چاہیں تو ناکام اور نامراد رہیں گے اور وہ دیکھ لیں گے کہ جو حلاوت اور بلاغت اور فصاحت لسان عربی مع التزام حقائقؔ معارف و نکات میری کلام میں ہے وہ ان کو اور ان کے دوستوں اور ان کے اُستادوں اور اُن کے بزرگوں کو ہرگز حاصل نہیں۔ اس الہام کے بعد میں نے قرآن شریف کے بعض مقامات اور بعض سورتوں کی تفسیریں لکھیں اور نیز عربی زبان میں کئی کتابیں نہایت بلیغ و فصیح تالیف کیں اور مخالفوں کو اُن کے مقابلہ کے لئے بُلایا بلکہ بڑے بڑے انعام ان کے مقرر کئے اگر وہ مقابلہ کر سکیں اور ان میں سے جو نامی آدمی تھے جیسا کہ میاں نذیر حسین دہلوی اور ابُو سعید محمد حسین بٹالوی ایڈیٹر اشاعت السنۃ ان لوگوں کو بار بار اس امر کی طرف دعوت کی گئی کہ اگر کچھ بھی ان کو علمِ قرآن میں دخل ہے یا زبانِ عربی میں مہارت ہے یا مجھے میرے دعویٰ مسیحیت میں کاذب سمجھتے ہیں تو ان حقائق و معارف پُر از بلاغت کی نظیر پیش کریں جو میں نے کتابوں میں اس دعویٰ کے ساتھ لکھے ہیں کہ وہ انسانی طاقتوں سے بالاتر اور خدا تعالیٰ کے نشان ہیں مگر وہ لوگ مقابلہ سے عاجز آ گئے نہ تو وہ ان حقائق و معارف کی نظیر پیش کر سکے جن کو میں نے بعض قرآنی آیات اور سورتوں کی تفسیر لکھتے وقت اپنی کتابوں میں تحریر کیا تھا اور نہ ان بلیغ اور فصیح کتابوں کی طرح دو سطر بھی لکھ سکے جو میں نے عربی میں تالیف کر کے شائع کی تھیں۔ چنانچہ جس شخص نے میری کتاب نور الحق اور کرامات الصادقین اور سر الخلافۃ اور اتمام الحجۃ وغیرہ رسائل عربیہ پڑھے ہوں گے اور نیز میرے رسالہ انجام آتھم اور نجم الہدیٰ کی عربی عبارت کو دیکھا ہوگا وہ اس بات کو بخوبی سمجھ لے گا کہ ان کتابوں میں کس زور شور سے بلاغت فصاحت کے لوازم کو نظم و نثر میں بجا لایا گیا ہے۔ اور پھر کس زور شور سے تمام مخالف مولویوں سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ علم قرآن اور بلاغت سے کچھ حصہ رکھتے ہیں تو ان کتابوں کی نظیر پیش کریں ورنہ میرے اس کاروبار کو خدا تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر میری حقیت کا نشان اس کو قرار دیں۔ لیکن افسوس کہ ان مولویوں نے نہ تو انکار کو چھوڑا اور نہ میری کتابوں کی نظیر بنانے پر قادر ہو سکے۔ بہرحال ان پر خدا تعالیٰ کی حجت پوری ہو گئی اور وہ اس الزام کے نیچے آ گئے جس کے نیچے تمام وہ منکرین

ہیں جنہوں نے خدا کے مامورین سے سرکشی کی۔

(تریاق القلوب ص۹۱-۹۲)

عوام کا یہ خیال غلط دُور کرنے کے لئے کہ گویا میاں محمد حسین بٹالوی یا دوسرے مخالف مولوی جو اس بزرگ کے ہم مشرب ہیں علم ادب اور حقائق تفسیر کلام الٰہی میں ید طُولیٰ رکھتے ہیں قرینِ مصلحت سمجھا گیا ہے کہ اب آخری دفعہ اتمام حجت کے طور پر بٹالوی صاحب اور ان کے ہم مشرب دوسرے علماء کی عربی دانی اور حقائق شناسی کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے یہ رسالہ شائع کیا جائے۔ اور واضح رہے کہ اس رسالہ میں چہار قصائد اور ایک تفسیر سُورۃ فاتحہ کی ہے۔ اور اگرچہ یہ قصائد صرف ایک ہفتہ کے اندر بنائے گئے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ چند ساعت میں لیکن بٹالوی صاحب اور اُن کے ہم مشرب مخالفوں کے لئے محض اتمام حجت کی غرض سے پورے ایک ماہ کی مہلت دے کر یہ اقرار شرعی قانونی شائع کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اس رسالہ کی اشاعت سے ایک ماہ کے عرصہ تک اس کے مقابل پر اپنا فصیح وبلیغ رسالہ شائع کردیں جس میں اسی تعداد کے مطابق اشعار عربیہ ہوں جو ہمارے اس رسالہ میں ہیں۔ اور ایسے ہی حقائق اور معارف اور بلاغت کے التزام سے سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہو جو اس رسالہ میں لکھی گئی ہے تو ان کو ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ . . . . . . اور نیز یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ بعد بالمقابل قصائد اور تفسیر شائع کرنے کے اگر اِن کے قصائد اور اِن کی تفسیر نحوی و صرفی اور علم بلاغت کی غلطیوں سے مبرّا نکلے اور میرے قصائد اور تفسیر سے بڑھ کر نکلے تو پھر باوصف اپنے اس کمال کے اگر میرے قصائد اور تفسیر بالمقابل کے کوئی غلطی نکالیں گے تو فی غلطی پانچ روپیہ انعام بھی دوں گا۔ مگر یاد رہے نکتہ چینی آسان ہے ایک جاہل بھی کرسکتا ہے مگر نکتہ نمائی مشکل۔ تفسیر لکھنے کے وقت یہ یاد رہے کہ کسی دوسرے شخص کی تفسیر کی نقل منظور نہیں ہوگی بلکہ وہی تفسیر لائق منظوری ہوگی جس میں حقائق و معارف جدیدہ ہوں بشرطیکہ کتاب اللہ اور فرمودہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مخالف نہ ہوں۔

(کرامات الصادقین ص۵-۶)

بعض اسلام کے مخالف یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ عقلی طور پر یہی واجب معلوم ہوتا ہے کہ کلام خدا بے مثل چاہیئے لیکن ایسا کلام کہاں ہے جس کا بے مثل ہونا کسی صریح دلیل سے ثابت ہو۔ اگر قرآن بے نظیر ہے تو اس کی بے نظیری کسی واضح دلیل سے ثابت کرنی چاہیئے کیونکہ اس کی بے مثل بلاغت پر صرف وہی شخص مطلع ہو سکتا ہے جس کی اصل زبان عربی ہو اور لوگوں پر اس کی

بے نظیری حجت نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اس سے منتفع ہو سکتے ہیں۔ **اما الجواب** واضح ہو کہ یہ عذر خام انہی لوگوں کا ہے جنہوں نے دلی صدق سے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی کہ قرآن کی بے نظیری کو کسی صاحبِ علم سے معلوم کریں بلکہ فرقانی نوروں کو دیکھ کر دوسری طرف مُنہ پھیر لیتے ہیں تا ایسا نہ ہو کہ کسی قدر پرتوہ اس نور کا ان پر پڑ جائے ورنہ قرآن شریف کی بے نظیری حق کے طالبوں کے لئے ایسی ظاہر اور روشن ہے کہ جو آفتاب کی طرح اپنی شعاعوں کو ہر طرف پھیلا رہی ہے۔ جس کے سمجھنے اور جاننے کے لئے کوئی دقت اور اشتباہ نہیں اور اگر تعصب اور عناد کی تاریکی درمیان میں نہ ہو تو وہ کامل روشنی ادنیٰ التفات سے معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ فرقان مجید کی بے نظیری کی بعض وجوہ ایسی ہیں کہ ان کے جاننے کے لئے کسی قدر علم عربی درکار ہے۔ مگر یہ بڑی غلطی اور جہالت ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ اعجاز قرآن کی تمام وجوہ عربی دانی پر ہی موقوف ہیں یا تمام عجائبات قرآنیہ اور جمیع خواص عظمیٰ فرقانیہ صرف عربوں پر ہی کھُل سکتے ہیں اور دوسروں کے لئے تمام راہیں ان کے دریافت کرنے کی مسدود ہیں۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ یہ بات ہر ایک اہل علم پر واضح ہے کہ اکثر وجوہِ بے نظیری فرقان کی ایسی سہل اور سریع الفہم ہیں کہ جن کے جاننے اور معلوم کرنے کے لئے کچھ بھی لیاقت عربی درکار نہیں بلکہ اس درجہ پر بدیہی اور واضح ہیں کہ ادنےٰ عقل جو انسانیت کے لئے ضروری ہے ان کے سمجھنے کے لئے کفایت کرتی ہے۔ مثلاً ایک یہ وجہ بے نظیری کہ وہ باوجود اس قدر ایجاز کلام کے کہ اگر اس کو متوسط قلم سے لکھیں تو پانچ چار جز میں آ سکتا ہے۔ پھر تمام دینی صداقتوں پر کہ جو بطور متفرق پہلی کتابوں میں اور انبیائے سلف کے صحیفوں میں پراگندہ اور منتشر تھیں مشتمل ہے اور نیز اس میں یہ کمال ہے کہ جس قدر انسان محنت اور کوشش اور جانفشانی کر کے علمِ دین کے متعلق اپنے فکر اور ادراک سے کچھ صداقتیں نکالے یا کوئی باریک دقیقہ پیدا کرے یا اسی علم کے متعلق کسی قسم کے اور حقائق اور معارف یا کسی نوع کے دلائل اور براہین اپنے قوتِ عقلیہ سے پیدا کر کے دکھلا دے یا ایسا ہی کوئی نہایت دقیق صداقت جس کو حکمائے سابقین نے مدت دراز کی محنت اور جانفشانی سے نکالا ہو معرض مقابلہ میں لا دے یا جس قدر مفاسد باطنی اور امراض رُوحانی ہیں جن میں اکثر افراد مبتلا ہوتے ہیں ان میں سے کسی کا ذکر یا علاج قرآن شریف سے دریافت کرنا چاہے تو وہ جس طور سے اور جس باب میں آزمائش کرنا چاہتا ہے آزما کر دیکھ لے کہ ہر ایک دینی صداقت اور حکمت کے بیان میں قرآن شریف ایک دائرہ کی طرح محیط ہے جس سے کوئی صداقت دینی باہر نہیں بلکہ جن صداقتوں کو حکیموں نے بباعثِ نقصانِ علم و عقل غلط طور پر بیان کیا ہے

قرآن شریف ان کی تکمیل و اصلاح فرماتا ہے اور جن دقائق کا بیان کرنا کسی حکیم اور فلاسفر کو میسّر نہیں آیا۔ اور کوئی ذہن ان کی طرف سبقت نہیں لے گیا۔ ان کو قرآن شریف بکمال صحت و راستی بیان اور ظاہر فرماتا ہے اور ان دقائق علم الٰہی کو کہ جو صدہا دفتروں اور طول طویل کتابوں میں لکھے گئے تھے۔ اور پھر بھی ناقص اور ناتمام تھے باستیفا تمام لکھتا ہے اور آئندہ کسی عاقل کے لئے کسی نئے دقیقہ کے پیدا کرنے کی جگہ نہیں چھوڑتا حالانکہ وہ اس قدر قلیل الحجم کتاب ہے کہ جو بتحریر میانہ چالیس ورق سے زیادہ نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی وجہ بے نظیری ہے جس کی صداقت میں ایک ادنیٰ عقل کے آدمی کو بھی شک نہیں رہ سکتا کیونکہ ہر ایک عقل سلیم پر روشن ہے کہ ہر ایک نوع کی دینی سچائیاں اور الٰہیات کے تمام حقائق اور معارف اور اصول حقہ کے جمیع دلائل اور وسائل اور تمام اولین آخرین کا مغز ایک ایک قلیل المقدار کتاب میں اس احاطۂ تام سے درج کرنا جس کے مقابلہ پر کسی ایسی صداقت کا نشان نہ مل سکے کہ جو اس سے باہر رہ گئی ہو یہ انسان کا کام نہیں اور کسی مخلوق کی حد قدرت میں داخل نہیں۔ اور اس کے آزمانے کے لئے بھی ہر ایک خواندہ اور ناخواندہ پر صاف اور سیدھا راستہ کھلا ہے کیونکہ اگر اس امر میں شک ہو کہ قرآن شریف کیونکر تمام حقائق الٰہیات پر حاوی ہے تو اس بات کا ہم ہی ذمہ اُٹھاتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب طالب حق بن کر یعنی اسلام قبول کرنے کا تحریری وعدہ کر کے کسی کتاب عبرانی یونانی لاطینی انگریزی سنسکرت وغیرہ سے کسی قدر دینی صداقتیں نکال کر پیش کریں یا اپنی ہی عقل کے زور سے کوئی الٰہیات کا نہایت باریک دقیقہ پیدا کر کے دکھلاویں تو ہم اس کو قرآن شریف میں سے نکال دیں گے۔

(براہین احمدیہ ص۲۳۷-۲۶۷)

میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر کوئی مولوی اس ملک کے تمام مولویوں میں سے معارف قرآنی میں مجھ سے مقابلہ کرنا چاہے اور کسی سُورت کی ایک تفسیر میں لکھوں اور ایک کوئی اَور مخالف لکھے تو وہ نہایت ذلیل ہوگا اور مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اصرار کے مولویوں نے اس طرف رُخ نہیں کیا۔ پس یہ ایک عظیم الشان نشان ہے مگر اُن کے لئے جو انصاف اور ایمان رکھتے ہیں۔

(انجام آتھم ص۲۹۲)

میں عربوں کے دعویٰ ادب و فصاحت و بلاغت کو بالکل توڑنا چاہتا ہوں یہ لوگ جو اخبار نویس ہیں اور چند سطریں لکھ کر اپنے آپ کو اہل زبان اور ادیب قرار دیتے ہیں وہ اس اعجاز کے مقابلہ میں قلم اُٹھا کر دیکھ لیں اُن کے قلم توڑ دیئے جائیں گے اور اگر ان میں کچھ طاقت ہے اور قوت ہے تو وہ اکیلے اکیلے

یا سب کے سب مل کر اس کا مقابلہ کریں۔ پھر انہیں معلوم ہو جائے گا اور یہ راز بھی کھل جائے گا جو یہ ناواقف کہا کرتے ہیں کہ عربوں کو ہزارہا روپے کے نوٹ دے کر کتابیں لکھائی جاتی ہیں۔ اب معلوم ہو جائے گا۔ کہ کون عرب ہے جو ایسی فصیح و بلیغ کتاب اور ایسے حقائق و معارف سے پُر لکھ سکتا ہے۔ جو کتابیں یہ ادب و انشاء کا دعویٰ کرنے والے لکھتے ہیں ان کی مثال پتھروں کی سی ہے کہ سخت، نرم، سیاہ، سفید پتھر جمع کر کے رکھے جائیں مگر یہ تو ایک لذیذ اور شیریں چیز ہے جس میں حقائق اور معارف قرآنی کے اجزاء ترکیب دیئے گئے ہیں۔ غرض جو بات رُوح القدس کی تائید سے لکھی جاوے اور جو الفاظ اس کے القاء سے آتے ہیں وہ اپنے ساتھ ایک حلاوت رکھتے ہیں اور اس حلاوت میں ملی ہوئی شوکت اور قوت ہوتی ہے جو دوسروں کو اس پر قادر نہیں ہونے دیتی۔ غرض یہ بہت بڑا نشان ہوگا۔

(ملفوظات جلد دوم ص ۳۷۵)

یاد رہے کہ اگرچہ میں اب تک عربی میں ستر کے قریب بے مثل کتابیں شائع کر چکا ہوں جن کے مقابل میں اس دس برس کے عرصہ میں ایک کتاب بھی مخالفوں نے شائع نہیں کی۔ مگر آج مجھے خیال آیا کہ چونکہ وہ کتابیں صرف عربی فصیح و بلیغ میں ہی نہیں بلکہ ان میں بہت سے قرآنی حقائق و معارف ہیں۔ اس ممکن ہے کہ وہ لوگ یہ جواب دیں کہ ہم حقائق و معارف سے ناآشنا ہیں اگر صرف عربی فصیح میں نظم ہوتی۔ جیسے عام قصائد ہوتے ہیں تو ہم بلاشبہ اس کی نظیر بنا سکتے اور نیز یہ بھی خیال آیا کہ مولوی ثناء اللہ صاحب سے اگر صرف کتاب اعجاز المسیح کی نظیر طلب کی جائے تو وہ ضرور اس میں کہیں گے کہ کیونکر ثابت ہو کہ ستر دن کے اندر اندر یہ کتاب تالیف کی گئی ہے اور اگر وہ یہ حجت پیش کریں کہ یہ کتاب دو برس میں بنائی گئی ہے اور ہمیں بھی دو برس کی مہلت ملے تو مشکل ہوگا کہ ہم صفائی سے ان کو ستر دن کا ثبوت دے سکیں۔ ان وجوہات سے مناسب سمجھا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ سے یہ درخواست کی جائے کہ ایک سادہ قصیدہ بنانے کے لئے رُوح القدس سے مجھ کو تائید فرماوے جس میں مباحثہ مدّ کا ذکر ہو تا اس بات کے سمجھنے کے لئے وقت نہ ہو کہ وہ قصیدہ کتنے دن میں تیار کیا گیا ہے۔ سو میں نے دعا کی کہ اے خدائے قدیر مجھے نشان کے طور پر توفیق دے کہ ایسا قصیدہ بناؤں۔ اور وہ دُعا میری منظور ہو گئی اور روح القدس سے ایک خارق عادت مجھے تائید ملی اور وہ قصیدہ پانچ دن میں ہی میں نے ختم کر لیا۔ کاش اگر کوئی اَور شغل مجبور نہ کرتا تو وہ قصیدہ ایک دن میں ہی ختم ہو جاتا۔ کاش اگر چھپنے میں کسی قدر دیر نہ لگتی تو ۹ نومبر ۱۹۰۲ء تک وہ قصیدہ شائع ہو سکتا تھا۔

یہ ایک عظیم الشان نشان ہے جس کے گواہ خود مولوی ثناء اللہ صاحب ہیں کیونکہ قصیدہ سے خود

ثابت ہے کہ یہ ان کے مباحثہ کے بعد بنایا گیا ہے اور مباحثہ ۲۹-۳۰؍ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ہوا تھا اور ہمارے دوستوں کے واپس آنے پر ۸؍ نومبر ۱۹۰۲ء کو اس قصیدہ کا بنانا شروع کیا گیا اور ۱۲؍ نومبر ۱۹۰۲ء کو مع اس اردو عبارت کے ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ میں یقینِ دل سے جانتا ہوں کہ خدا کی تائید کا یہ ایک بڑا نشان ہے تا وہ مخالف کو شرمندہ اور لاجواب کرے۔ اس لئے میں اس نشان کو **دس ہزار روپیہ کے انعام** کے ساتھ **مولوی ثناء اللہ** اور اس کے مددگاروں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اگر وہ اس میعاد میں یعنی پانچ دن میں ایسا قصیدہ مع اس قدر اردو مضمون کے جواب کے جو وہ بھی ایک نشان ہے بنا کر شائع کر دیں تو میں بلا توقف دس ہزار روپیہ ان کو دے دوں گا۔ چھپوانے کے لئے ایک ہفتہ کی اُن کو اَور مہلت دیتا ہوں۔ یہ کُل بارہ دن ہیں اور دو دن ڈاک کے لئے بھی ان کا حق ہے۔ پس اگر اس تاریخ سے کہ یہ قصیدہ اور اردو عبارت ان کے پاس پہنچے جو ۱۲؍ دن تک اسی قدر اشعار بلیغ فصیح جو اس مقدار اور تعداد سے کم نہ ہو شائع کر دیں تو مَیں دس ہزار روپیہ ان کو انعام دے دوں گا۔ اُن کو اختیار ہوگا کہ مولوی محمد حسین صاحب سے مدد لیں یا کسی اور صاحب سے مدد لیں اور نیز اس وجہ سے بھی ان کو کوشش کرنی چاہیئے کہ میرے ایک اشتہار میں پیشگوئی کے طور پر خبر دی گئی ہے کہ آخیر دسمبر ۱۹۰۲ء تک **کوئی خارق عادت نشان** ظاہر ہوگا گو وہ نشان اور صُورتوں میں بھی ظاہر ہو گیا ہے لیکن اگر مولوی ثناء اللہ اور دوسرے مخاطبین نے اس میعاد کے اندر اس قصیدہ اور اس اردو مضمون کا جواب نہ لکھا یا نہ لکھوایا تو یہ نشان اُن کے ذریعہ سے پُورا ہو جائے گا۔ سو انہیں لازم ہے کہ اگر وہ میرے کاروبار کو انسان کا منصوبہ خیال کرتے ہیں تو مقابلہ کرکے اس نشان کو کسی طرح روک لیں۔ اور دیکھو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر وہ اکیلے یا دوسروں کی مدد سے میعاد معیّنہ کے اندر میرے قصیدہ اور اردو عبارت کے مطابق اور اُن کی تعداد کے مطابق قصیدہ چھپوا کر شائع کرینگے اور تاریخ وصولی سے بارہ دن کے اندر بذریعہ ڈاک میرے پاس بھیجدیں گے تو صرف میں یہی نہیں کروں گا کہ دس ہزار روپیہ اُن کو انعام دوں گا بلکہ اس غلبہ سے میرا جھوٹا ہونا ثابت ہوگا۔ اس صورت میں مولوی ثناء اللہ صاحب اور اُن کے رفیقوں کو ناحق کے افتراؤں کی حاجت نہیں رہے گی۔ اور مُفت میں اُن کی فتح ہو جائے گی ورنہ اُن کا حق نہیں ہوگا کہ پھر کبھی مجھے جھُوٹا کہیں یا میرے نشانوں کی تکذیب کریں۔ دیکھو میں آسمان اور زمین کو گواہ رکھ کر کہتا ہوں کہ آج کی تاریخ سے اس نشان پر حصر رکھتا ہوں۔ اگر میں صادق ہوں اور خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ میں صادق ہوں تو کبھی ممکن نہیں ہوگا کہ مولوی ثناء اللہ اور ان کے تمام مولوی پانچ دن میں ایسا قصیدہ بنا سکیں اور اُردو مضمون کا

لکھ سکیں کیونکہ خدا تعالیٰ اُن کی قلموں کو توڑ دے گا اور اُن کے دلوں کو غبی کر دے گا اور مولوی ثناء اللہ کو اس بدگمانی کی طرف راہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ قصیدہ پہلے سے بنا رکھا تھا کیونکہ وہ ذرا آنکھ کھول کر دیکھے کہ مباحثہ مد کا اس میں ذکر ہے۔ پس اگر میں نے پہلے بنایا تھا تب تو انہیں ماننا چاہیئے کہ میں عالم الغیب ہوں۔ بہر صورت یہ بھی ایک نشان ہوا۔ اس لئے اب ان کو کسی طرف فرار کی راہ نہیں اور آج وہ الہام پورا ہوا جو خدا نے فرمایا تھا

قادر کے کاروبار نمودار ہو گئے
کافر جو کہتے تھے وہ گرفتار ہو گئے

(اعجاز احمدی صـــ ۳۵-۳۷)

کیا یہ خدا تعالےٰ کا نشان نہیں کہ وہی شخص جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ جاہل ہے اور ایک صیغہ تک اس کو معلوم نہیں وہ ان تمام مکفروں کو جو اپنا نام مولوی رکھتے ہیں بلند آواز سے کہتا ہے کہ میری تفسیر کے مقابل پر تفسیر بناؤ تو ہزار روپے انعام لو اور نور الحق کے مقابل پہ بناؤ تو پانچ ہزار روپیہ پہلے دکھا لو اور کوئی مولوی دم نہیں مارتا . . . . خیال کرنا چاہیئے کہ ہم نے کس قدر تاکید سے اُن کو میدان میں بُلایا اور کن کن الفاظ سے اُن کو غیرت دلانا چاہا مگر انہوں نے اس طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ہم نے صرف اس خیال سے کہ شیخ صاحب کی عربی دانی کا دعویٰ بھی فیصلہ پا جائے۔ رسالہ نور الحق میں یہ اشتہار دے دیا کہ اگر شیخ صاحب عرصہ تین ماہ میں اسی قدر کتاب تحریر کر کے شائع کر دیں اور وہ کتاب درحقیقت جمیع لوازم بلاغت و فصاحت و التزام حق اور حکمت میں نور الحق کے ثانی ہو تو تین ہزار روپیہ نقد بطور انعام شیخ صاحب کو دیا جائے گا اور نیز الہام کے جھوٹا ٹھہرانے کے لئے بھی ایک سہل اور صاف راستہ ان کو مل جائے گا اور ہزار لعنت کے داغ سے بھی بچ جائیں گے ورنہ وہ نہ صرف مغلوب بلکہ الہام کے مصدق ٹھیریں گے مگر شیخ صاحب نے ان باتوں میں سے کسی کی بھی پرواہ نہ کی اور کچھ بھی غیرت مندی نہ دکھلائی۔ اس کا کیا سبب تھا؟ بس یہی کہ یہ مقابلہ شیخ صاحب کی طاقت سے باہر ہے . . . . خدا تعالیٰ نے چاہا کہ اس متکبر کا غرور توڑے اور اس گردن کش کی گردن کو مروڑے اور اس کو دکھلا دے کہ کیونکر وہ اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے سو اس کی توفیق اور مدد اور خاص اس کی تعلیم اور تفہیم سے یہ کتابیں تالیف ہوئیں اور ہم نے کرامات الصادقین اور نور الحق کیلئے آخری تاریخ درخواست مقابلہ کی اس مولوی اور تمام مخالفوں کے لئے آخر جون ۱۸۹۴ء مقرر کی تھی جو گذر گئی۔

(سر الخلافہ صـــ ۸۴-۸۶)

اگر حضرت سیّد مولوی محمد نذیر حسین صاحب یا جناب مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب مسئلہ وفات مسیح میں مجھے مخطی خیال کرتے ہیں یا ملحد اور مادل تصور فرماتے ہیں اور میرے قول کو خلاف قال اللہ اور قال الرسُول گمان کرتے ہیں تو حضرات موصوفہ پر فرض ہے کہ عامہ خلائق کو فتنہ سے بچانے کے لئے اس مسئلہ میں اس شہر دہلی میں میرے ساتھ بحث کر لیں۔ بحث میں صرف تین شرطیں ہوں گی۔

(۱) اوّل یہ کہ امن قائم رہنے کے لئے وہ خود سرکاری انتظام کرا دیں۔ . . . . کیونکہ میں مسافر ہوں اور اپنی عزیز قوم کا مورد عتاب اور ہر طرف سے اپنے بھائیوں مسلمانوں کی زبان سے سب اور لعن وطعن اپنی نسبت سُنتا ہوں۔ . . . .

(۲) دوسرے یہ کہ فریقین کی بحث تحریری ہو۔ ہر ایک فریق مجلس بحث میں اپنے ہاتھ سے سوال لکھ کر اور اس پر اپنے دستخط کر کے پیش کرے اور ایسا ہی فریق ثانی لکھ کر جواب دیوے کیونکہ زبانی بیانات محفوظ نہیں رہ سکتے . . . .

(۳) تیسری شرط یہ کہ بحث وفات حیات مسیح میں ہو اور کوئی شخص قرآن کریم اور کتب حدیث سے باہر نہ جائے۔ مگر صحیحین کو تمام کتب حدیث پر مقدم رکھا جائے اور بخاری کو مسلم پر کیونکہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مسیح ابن مریم کی حیاۃ طریقہ مذکورہ بالا سے جو واقعات صحیحہ کے معلوم کرنے کے لئے خیر الطّرق ہے ثابت ہو جائے تو میں اپنے الہام سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ قرآن کریم سے مخالف ہو کر کوئی الہام صحیح نہیں ٹھہر سکتا۔

(تبلیغ رسالت جلد دوم صفحہ ۲۴-۲۵)

اللہ جلّشانہٗ کی قسم دے کر مولوی سید نذیر حسین کی خدمت میں بحث حیات و ممات مسیح ابن مریم کیلئے درخواست

ندارد کسے با تو ناگفتہ کار ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

اے مولوی سید محمد نذیر حسین صاحب آپ نے اور آپ کے شاگردوں نے دنیا میں شور ڈال دیا ہے کہ یہ شخص یعنی یہ عاجز دعویٰ مسیح موعود ہونے میں مخالف قرآن و حدیث بیان کر رہا ہے اور ایک نیا مذہب اور نیا عقیدہ نکالا ہے جو سراسر مغائر تعلیم اللہ و رسول اور بہ بداہت باطل ہے کیونکہ قرآن اور حدیث

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ بجسدہ العنصری آسمان پر اُٹھائے گئے اور پھر کسی وقت آسمان پر سے زمین پر تشریف لاویں گے اور ان کا فوت ہوجانا مخالف نصوصِ قرآنیہ و احادیث صحیحہ ہے۔ سو چونکہ آپ نے مجھے اس دعویٰ میں مخالف قرآن و حدیث قرار دے دیا ہے جس کی وجہ سے ہزارہا مسلمانوں میں بدظنی کا فتنہ برپا ہوگیا ہے لہٰذا آپ پر فرض ہے کہ مجھ سے اس بات کا تصفیہ کر لیں کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے میں میں نے قرآن اور حدیث کو چھوڑ دیا ہے یا آپ ہی چھوڑ بیٹھے ہیں

. . . . . . اگر آپ یا حضرت!! ایک جلسۂ بحث مقرر کرکے میرے دلائل پیش کردہ جو صرف قرآن اور حدیث صحیحہ کی رُو سے بیان کروں گا توڑ دیں اور ان سے بہتر دلائل حیات مسیح ابن مریم پر پیش کریں اور آیات صریحیہ بیّنہ قطعیۃ الدلالۃ اور احادیث صحیحہ مرفوعہ متصلہ کے منطوق سے حضرت مسیح ابن مریم کا بجسدہ العنصری زندہ ہونا ثابت کر دیں تو میں آپ کے ہاتھ پر توبہ کروں گا۔ اور تمام کتابیں جو اس مسئلہ کے متعلق تالیف کی ہیں جس قدر میرے گھر میں موجود ہیں سب جلا دوں گا اور بذریعہ اخبارات اپنی توبہ اور رجُوع کے بارے میں عام اطلاع دے دوں گا ولعنۃ اللہ علیٰ کاذب یخفیٰ فی قلبہٖ ما یخالف بیان لسانہٖ۔ مگر یہ بھی یاد رکھئے کہ اگر آپ ہی مغلوب ہوگئے اور کوئی صریحۃ الدلالۃ آیت اور حدیث صحیح مرفوع متصل پیش نہ کرسکے تو آپ کو بھی اپنے اس انکار شدید سے توبہ کرنی پڑے گی۔ واللہ یحب التوابین۔

اب میں یا حضرت!! آپ کو اس رب جلیل تعالٰے و تقدس کی قسم دیتا ہوں جس نے آپ کو پیدا کرکے اپنی بے شمار نعمتوں سے ممنون فرمایا کہ اگر آپ کا یہی مذہب ہے کہ قرآن کریم میں مسیح ابن مریم کی زندگی کے بارے میں آیات صریحیہ بیّنہ قطعیۃ الدلالت موجود ہیں اور اُن کی تائید میں احادیث صحیحہ مرفوعہ متصلہ اپنے منطوق سے شہادت دیتی ہیں جن کی وجہ سے آپ کو میرے الہامی دعویٰ کی نسبت مومنانہ حسنِ ظن کو الوداع کہکر سخت انکار کرنا پڑا تو اس خداوند کریم سے ڈر کر جس کی میں نے ابھی آپ کو قسم دی ہے میرے ساتھ اظہاراً للحق بحث کیجئے . . . .

اب میں یا حضرت!! پھر اللہ جلشانہ کی آپ کو قسم دے کر اس بحث کے لئے بُلاتا ہوں۔ جس جگہ چاہیں حاضر ہوجاؤں . . . .

اگر آپ اس مسئلہ میں بحث کرنے کے لئے نہ آئے اور مفسد طبع ملانوں پر بھروسہ رکھ کر کوٹھری میں چھپ گئے تو یاد رکھو کہ تمام ہندوستان و پنجاب میں ذلّت اور بدنامی کے ساتھ آپ مشہور ہوجائیں گے اور شیخ الکل ہونے کی تمام رونق جاتی رہے گی۔ . . . . . .

بالآخر یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کسی طرح سے بحث کرنا نہیں چاہتے تو ایک مجلس میں میرے تمام دلائل وفات مسیح سُنکر اللہ جلّشانہٗ کی تین مرتبہ قسم کھا کر یہ کہدیجئے کہ یہ دلائل صحیح نہیں ہیں اور صحیح اور یقینی امر یہی ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم زندہ بجسدہ العنصری آسمان کی طرف اُٹھائے گئے ہیں اور آیات قرآنی اپنی صریح دلالت سے اور احادیث صحیحہ متصلہ مرفوعہ اپنے کھُلے کھُلے منطوق سے اس پر شہادت دیتی ہیں اور میرا عقیدہ یہی ہے۔ تب مَیں آپ کی اس گستاخی، حق پوشی اور بددیانتی اور جھوٹی گواہی کے فیصلہ کے لئے جناب الٰہی میں تضرع اور ابتہال کروں گا اور چونکہ میری توجہ پر مجھے ارشاد ہو چکا ہے کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اور مجھے یقین دلایا گیا ہے کہ اگر آپ تقویٰ کا طریق چھوڑ کر ایسی گستاخی کریں گے اور آیت لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ کو نظر انداز کر دیں گے تو ایک سال تک اس گستاخی کا آپ پر ایسا کھُلا کھُلا اثر پڑے گا جو دوسروں کے لئے بطور نشان کے ہو جائے گا۔ لہٰذا منتظر ہوں کہ اگر بحث سے کنارہ ہے تو اس طور سے فیصلہ کر لیجئے تا وہ لوگ جو نشان نشان کرتے ہیں ان کو خدا تعالیٰ کوئی نشان دکھا دیوے وھو علٰی کل شیئٍ قدیر و اٰخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

(تبلیغ رسالت جلد دوم ص۳۰-۳۸)

میں نے ان کی طرف (یعنی مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی ناقل) کئی دفعہ لکھا کہ میں کسی اور عقیدہ میں آپ کا مخالف نہیں۔ صرف اس بات میں مخالف ہوں کہ میں آپ کی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی جسمانی حیات کا قائل نہیں بلکہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کو فوت شدہ اور داخل موتیٰ ایماناً اور یقیناً جانتا ہوں۔ اور اُن کے مرجانے پر یقین رکھتا ہوں اور کیوں یقین نہ رکھوں جبکہ میرا مولیٰ میرا آقا اپنی کتاب عزیز اور قرآن کریم میں ان کو متوفیوں کی جماعت میں داخل کر چکا ہے۔ اور سارے قرآن میں ایک دفعہ بھی ان کی خارق عادت زندگی اور ان کے دوبارہ آنے کا ذکر نہیں بلکہ ان کو صرف فوت شدہ کہکر پھر چُپ ہو گیا لہٰذا ان کا زندہ بجسدہ العنصری ہونا اور پھر دوبارہ کسی وقت دُنیا میں آنا نہ صرف اپنے ہی الہام کی رُو سے خلافِ واقعہ سمجھتا ہوں بلکہ اس خیال حیاتِ مسیح کو نصوص بیّنہ قطعیہ یقینیہ قرآن کریم کی رو سے لغو اور باطل جانتا ہوں۔ اگر یہ میرا بیان کلمہ کُفر ہے یا جھوٹ ہے تو آئیے اس امر میں مجھ سے بحث کیجئے۔ پھر اگر آپ نے قرآن اور حدیث سے حیات جسمانی حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ثابت کرکے دکھلا دی تو میں اس قول سے رجُوع کروں گا بلکہ وہ اپنی کتابیں جن میں یہ مضمون ہے جلا دوں گا۔ اگر بحث نہیں کر سکتے تو آؤ اس بارہ میں اس مضمون ہی کی قسم کھاؤ کہ قرآن کریم میں مسیح کی وفات کا کچھ ذکر نہیں بلکہ حیات کا ذکر ہے۔ یا کوئی اور حدیث صحیح مرفوع متصل موجود ہے جس نے توفّی کے لفظ کی کوئی مخالفانہ تفسیر کرکے

مسیح کی حیات جسمانی پر گواہی دی ہے۔ پھر اگر ایک سال تک خدائے تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا کوئی کھُلا نشان ظاہر نہ ہوا کہ آپ نے جھوٹی قسم کھائی ہے یعنی کسی وبالِ عظیم میں آپ مبتلا نہ ہوئے تب بلا توقف میں آپ کے ہاتھ پر توبہ کروں گا۔ مگر افسوس کہ ہر چند بار بار میاں صاحب سے یہ درخواست کی گئی لیکن نہ انہوں نے بحث کی اور نہ قسم کھائی اور نہ کافر کہنے سے باز آئے . . . . . . اور اسی مطلب کے لئے میں حرج اور خرچ اُٹھا کر ایک ماہ برابر دہلی میں رہا تو پھر ایک حقیقت رس آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اگر میاں صاحب بحث کے لئے سیدھے دل سے مستعد ہوتے تو میں کیوں ان سے بحث نہ کرتا۔ مثل مشہور ہے کہ سانچ کو آنچ نہیں۔ میں اسی طرح بحث وفات مسیح کے لئے اب پھر حاضر ہوں جیسا کہ پہلے حاضر تھا۔ اگر میاں صاحب لاہور میں آکر بحث منظور کریں تو میں ان کی خاص ذات کا کرایہ آنے جانے کا خود دے دُوں گا اگر آنے پر راضی ہوں تو میں ان کی تحریر پر بلا توقف کرایہ پہلے روانہ کر سکتا ہوں . . . . اگر وہ حاضر ہونے سے روگردان ہیں تو میں یہ بھی اجازت دیتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ پر ہی بذریعہ تحریرات اظہار حق کے لئے بحث کر لیں۔ غرض میں ہر طرح سے حاضر ہوں اور میاں صاحب کے جواب باصواب کا منتظر ہوں . . . . . مگر یہ پیشگوئی بھی یاد رکھو کہ **وہ ہرگز بحث نہیں کریں گے** اور اگر کریں گے تو ایسے رُسوا ہوں گے کہ منہ دکھانے کی جگہ نہیں رہے گی۔

(آسمانی فیصلہ صـ۵-۶)

تمام مسلمانوں پر واضح ہو کہ کمال صفائی سے قرآن کریم اور حدیث رسُول اللہ صلعم سے ثابت ہو گیا ہے کہ درحقیقت حضرت مسیح ابن مریم علیہ السّلام بر طبق آیت فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ زمین پر ہی اپنی جسمانی زندگی کے دن بسر کر کے فوت ہو چکے ہیں اور قرآن کریم کی سولہ آیتوں اور بہت سی حدیثوں بخاری اور مُسلم اور دیگر صحاح سے ثابت ہے کہ فوت شدہ لوگ پھر آباد ہونے اور بسنے کے لئے دُنیا میں بھیجے نہیں جاتے اور نہ حقیقی اور واقعی طور پر دو موتیں کسی پر واقع ہوتی ہیں اور نہ قرآن کریم میں واپس آنیوالوں کے لئے کوئی قانون وراثت موجود ہے۔ بایں ہمہ بعض علماء وقت کو اس بات پر سخت غلو ہے کہ مسیح ابن مریم فوت نہیں ہوا۔ بلکہ زندہ ہی آسمان کی طرف اُٹھایا گیا اور حیات جسمانی دنیوی کے ساتھ آسمان پر موجود ہے اور نہایت بے باکی اور شوخی کی راہ سے کہتے ہیں کہ توفّی کا لفظ جو قرآن کریم میں حضرت مسیح کی نسبت آیا ہے۔ اس کے معنے وفات دینا نہیں بلکہ پُورا لینا ہے یعنی یہ کہ رُوح کے ساتھ جسم کو بھی لے لینا۔ مگر ایسے معنے کرنا ان کا سراسر افتراء ہے۔ قرآن کریم کا عموماً

التزام کے ساتھ اِس لفظ کے بارے میں یہ محاورہ ہے کہ وہ لفظ قبضِ رُوح اور وفات دے دینے کے معنوں پر ہر ایک جگہ اس کو استعمال کرتا ہے۔ یہی محاورہ تمام حدیثوں اور جمیع اقوال رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں پایا جاتا ہے۔ جب سے دنیا میں عرب کا جزیرہ آباد ہوا ہے اور زبان عربی جاری ہوئی ہے۔ کسی قولِ قدیم یا جدید سے ثابت نہیں ہوتا کہ توفّی کا لفظ کبھی قبضِ جسم کی نسبت استعمال کیا گیا ہو بلکہ جہاں کہیں توفّی کے لفظ کو خدائے تعالےٰ کا فعل ٹھہرا کر انسان کی نسبت استعمال کیا گیا ہے وہ صرف وفات دینے اور قبضِ رُوح کے معنے پر آیا ہے نہ قبض جسم کے معنوں میں۔ کوئی کتاب لُغت کی اس کے مخالف نہیں۔ کوئی مثل اور قول اہلِ زبان کا اس کے مغائر نہیں۔ غرض ایک ذرہ احتمال مخالف کے گنجائش نہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن کریم سے یا کسی حدیث رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یا اشعار و قصائد و نظم و نثر قدیم و جدید عرب سے یہ ثبوت پیش کرے کہ کسی جگہ توفّی کا لفظ خدائے تعالےٰ کا فعل ہونے کی حالت میں جو ذوی الروح کی نسبت استعمال کیا گیا ہو وہ بجُز قبضِ رُوح اور وفات دینے کے کسی اور معنے پر بھی اطلاق پا گیا ہے یعنی قبض جسم کے معنوں میں بھی مستعمل ہوا ہے تو میں اللہ جلّشانہٗ کی قسم کھا کر اقرار صحیح شرعی کرتا ہوں کہ ایسے شخص کو اپنا کوئی حصہ ملکیت کا فروخت کر کے مبلغ ہزار روپیہ نقد دُوں گا اور آئندہ اس کے کمالاتِ حدیث دانی اور قرآن دانی کا اقرار کر لوں گا۔

(ازالہ اوہام ص ۵۰۲ - ۵۰۳

واضح ہو کہ حافظ محمد یوسف صاحب ضلعدار نہر نے اپنے نافہم اور غلط کار مولویوں کی تعلیم سے ایک مجلس میں بمقام لاہور . . . . . . بڑے اصرار سے یہ بیان کیا کہ اگر کوئی نبی یا رسُول یا اور کوئی مامور من اللہ ہونے کا جھُوٹا دعویٰ کرے اور اس طرح پر لوگوں کو گمراہ کرنا چاہے تو وہ ایسے افتراء کے ساتھ تئیس برس تک یا اس سے زیادہ زندہ رہ سکتا ہے۔ یعنی افتراء علی اللہ کے بعد اس قدر عمر پانا اس کی سچائی کی دلیل نہیں ہو سکتی اور بیان کیا کہ ایسے کئی لوگوں کے نام میں نظیراً پیش کر سکتا ہوں جنہوں نے نبی یا رسُول یا مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور تئیس برس تک یا اس سے زیادہ عرصہ تک لوگوں کو سُناتے رہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہمارے پر نازل ہوتا ہے حالانکہ وہ کاذب تھے . . . . . .

. . . . . . سو ہم اس اشتہار میں حافظ محمد یوسف صاحب سے وہ نظیر طلب کرتے ہیں جس کے پیش کرنے کا انہوں نے اپنی دستخطی تحریر میں وعدہ کیا ہے۔ ہم یقیناً جانتے ہیں کہ قرآنی دلیل کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ یہ خدا کی پیشکردہ دلیل ہے نہ کسی انسانوں کی . . . . . . اسی جہت سے میں نے اس اشتہار کو پانچ سو روپے کے انعام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اور اگر تسلّی نہ ہو تو میں یہ روپیہ کسی

سرکاری بنک میں جمع کرا سکتا ہوں۔ اگر حافظ محمد یُوسف صاحب اور اُن کے دوسرے ہم مشرب جن کے نام میں نے اس اشتہار میں لکھے ہیں اپنے اس دعویٰ میں صادق ہیں یعنی اگر یہ بات صحیح ہے کہ کوئی شخص نبی یا رسُول اور مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کرکے اور کھُلے طور پر خدا کے نام پر کلمات لوگوں کو سُنا کر پھر باوجود مفتری ہونے کے برابر تئیس برس تک جو زمانہ وحی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہے زندہ رہا ہے تو میں ایسی نظیر پیش کرنے والے کو بعد اس کے جو مجھے میرے ثبوت کے موافق یا قرآن کے ثبوت کے موافق ثبوت دے دے، پانسو روپیہ نقد دے دوں گا اور اگر ایسے لوگ کئی ہوں تو اُن کو اختیار ہوگا کہ وہ روپیہ باہم تقسیم کرلیں۔ اس اشتہار کے نکلنے کی تاریخ سے پندرہ روز تک اُن کو مہلت ہے کہ دُنیا میں تلاش کرکے ایسی نظیر پیش کریں۔

(اربعین نمبر ۳ ص ۱ تا ۱۸)

اے حضرات مولوی صاحبان! آپ لوگوں کا یہ خیال کہ ہم مومن ہیں اور یہ شخص کافر اور ہم صادق ہیں اور یہ شخص کاذب اور ہم متبع اسلام ہیں اور یہ شخص ملحد اور ہم مقبول الٰہی ہیں اور یہ شخص مردود اور ہم جنتی ہیں اور یہ شخص جہنمی۔ اگرچہ غور کرنے والوں کی نظر میں قرآن کریم کی رُو سے بخوبی فیصلہ پاچکا ہے اور اس رسالہ کے پڑھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔ لیکن ایک اور بھی طریق فیصلہ ہے جس کی رُو سے صادقوں اور کاذبوں اور مقبولوں اور مردُودوں میں فرق ہو سکتا ہے۔

عادت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ اگر مقبول اور مردُود اپنی اپنی جگہ پر خدائے تعالیٰ سے کوئی آسمانی مدد چاہیں تو وہ مقبول کی ضرور مدد کرتا ہے اور کسی ایسے امر سے جو انسان کی طاقت سے بالاتر ہے اس مقبول کی قبولیت ظاہر کر دیتا ہے۔ سو چونکہ آپ لوگ اہلِ حق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور آپ کی جماعت میں وہ لوگ بھی ہیں جو ملہم ہونے کے مدعی ہیں جیسے کہ مولوی محی الدین وعبدالرحمٰن صاحب لکھوکے والے اور میاں عبدالحق غزنوی جو اس عاجز کو کافر اور جہنمی ٹھہراتے ہیں لہذا آپ پر واجب ہے کہ اس آسمانی ذریعہ سے بھی دیکھ لیں کہ آسمان پر مقبول کس کا نام ہے اور مردود کس کا نام۔ میں اس بات کو منظور کرتا ہوں کہ آپ دس ہفتہ تک اس بات کے فیصلہ کے لئے احکم الحاکمین کی طرف توجہ کریں تا اگر آپ سچے ہیں تو آپ کی سچائی کا کوئی نشان یا کوئی اعلیٰ درجہ کی پیشگوئی جو راستبازوں کو ملتی ہے آپ کو دی جائے۔ ایسا ہی دوسری طرف میں بھی توجہ کروں گا۔ اور مجھے خداوند کریم و قدیر کی طرف سے یقین دلایا گیا ہے کہ اگر آپ نے اس طور سے میرا مقابلہ کیا تو میری فتح ہوگی ....

جو ہمارا تھا وہ اب دلبر کا سارا ہو گیا　　آج ہم دلبر کے اور دلبر ہمارا ہو گیا
شکر للہ مل گیا ہم کو وہ لعل بے بدل　　کیا ہوا گر قوم کا دل سنگ خارا ہو گیا

(ازالہ اوہام ص ۳۵۷-۳۵۸

جو لوگ مسلمانوں میں سے فقراء کہلاتے ہیں اور مشائخ اور صُوفی بنے بیٹھے ہیں اگر وہ اب بھی اس باطل عقیدہ سے باز نہ آویں اور ہمارے دعویٰ مسیحیت کے مصدق نہ ہو جاویں تو طریق سہل یہ ہے کہ ایک مجمع مقرر کر کے کوئی ایسا شخص جو میرے دعویٰ مسیحیت کو نہیں مانتا اور اپنے تئیں ملہم اور صاحب الہام جانتا ہے مجھے مقام بٹالہ یا امرتسر یا لاہور میں طلب کرے اور ہم دونو جناب الٰہی میں دُعا کریں کہ جو شخص ہم دونوں میں سے جناب الٰہی میں سچا ہے ایک سال میں کوئی عظیم الشان نشان جو انسانی طاقتوں سے بالاتر اور معمولی انسانوں کے دسترس سے بلند تر ہو اس سے ظہور میں آوے۔ ایسا نشان کہ جو اپنی شوکت اور طاقت اور چمک میں عام انسانوں اور مختلف طبائع پر اثر ڈالنے والا ہو خواہ وہ پیشگوئی ہو یا اور کسی قسم کا اعجاز ہو جو انبیاء کے معجزات سے مشابہ ہو۔ پھر اس دعا کے بعد ایسا شخص جس کی کوئی خارق عادت پیشگوئی یا کوئی اور عظیم الشان نشان ایک برس کے اندر ظہور میں آجائے اور اس عظمت کے ساتھ ظہور میں آئے جو اس مرتبہ کا نشان حریف مقابل سے ظہور میں نہ آسکے تو وہ شخص سچا سمجھا جائیگا جس سے ایسا نشان ظہور میں آیا اور پھر اسلام میں سے تفرقہ دُور کرنے کے لئے شخصِ مغلوب پر لازم ہوگا کہ اس شخص کی مخالفت چھوڑ دے اور بلا توقف اور بلا تأمّل اس کی بیعت کرلے اور اس خدا سے جس کا غضب کھا جانے والی آگ ہے ڈرے۔

(تریاق القلوب ص ۳۸-۳۹)

مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ مَیں ان مسلمانوں پر بھی اپنے کشفی اور الہامی علوم میں غالب ہوں ان کے ملہموں کو چاہیئے کہ میرے مقابل پر آویں۔ پھر اگر تائید الٰہی میں اور فیض سماوی میں اور آسمانی نشانوں میں مجھ پر غالب ہو جائیں تو جس کارد سے چاہیں مجھ کو ذبح کر دیں مجھے منظور ہے۔ اور اگر مقابلہ کی طاقت نہ ہو تو کفر کے فتوے دینے والے جو الہاماً میرے مخاطب ہیں یعنی جن کو مخاطب ہونے کے لئے الہام الٰہی مجھ کو ہو گیا ہے پہلے لکھ دیں اور شائع کرا دیں کہ اگر کوئی خارق عادت امر دیکھیں تو بلا چُون وچرا دعویٰ کو منظور کر لیں۔ میں اس کام کے لئے بھی حاضر ہوں اور میرا خداوند کریم میرے ساتھ ہے۔ لیکن مجھے یہ حکم ہے کہ میں ایسا مقابلہ صرف ائمۃ الکفر سے کروں۔ اُنہیں سے مباہلہ کروں۔ اور انہی سے اگر وہ چاہیں یہ مقابلہ کروں۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ ہرگز مقابلہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ حقانیت

کے ان کے دلوں پر رُعب ہیں اور وہ اپنے ظلم اور زیادتی کو خوب جانتے ہیں وہ ہرگز مباہلہ بھی نہیں کرینگے

(آئینہ کمالات اسلام صـ ۳۴۸)

اشتہار قطعی فیصلہ کے لئے

یہ خدا کی قدرت ہے کہ جس قدر مخالف مولویوں نے چاہا کہ ہماری **جماعت** کو کم کریں وہ اور بھی زیادہ ہوئی۔ اور جس قدر لوگوں کو ہمارے سلسلہ میں داخل ہونے سے روکنا چاہا وہ اور بھی داخل ہوئے یہاں تک کہ ہزارہا تک نوبت پہنچ گئی۔ اب ہر روز سرگرمی سے یہ کاروائی ہو رہی ہے اور خدا تعالٰے اچھے پودوں کو اس طرف سے اُکھاڑتا اور ہمارے باغ میں لگاتا جاتا ہے کیا **منقول** کی رُو سے اور کیا **معقول** کی رو سے اور کیا **آسمانی شہادتوں** کی رو سے دن بدن خدا تعالٰے ہماری تائید میں ہے۔ اب بھی اگر مخالف مولوی یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور یہ لوگ باطل پر اور خدا ہمارے ساتھ ہے اور ان لوگوں پر لعنت اور غضب الٰہی ہے تو باوجود اس کے کہ ہماری حجت ان پر پوری ہو چکی ہے پھر دوبارہ اُن کو **حق اور باطل** پرکھنے کے لئے موقع دیتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقع اپنے تئیں حق پر سمجھتے ہیں اور ہمیں باطل پر اور چاہتے ہیں کہ حق کھُل جائے اور باطل معدوم ہو جائے تو اس طریق کو اختیار کرلیں۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ پر اور میں اپنی جگہ پر خدا تعالٰے کی جناب میں **دُعا** کریں۔ اُن کی طرف سے یہ دُعا ہو کہ یا الٰہی اگر یہ **شخص** جو مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تیرے نزدیک جھُوٹا اور کاذب اور مفتری ہے اور ہم اپنی رائے میں سچے اور حق پر اور تیرے مقبول بندے ہیں تو ایک سال تک کوئی فوق العادت امر غیب بطور نشان ہم پر ظاہر فرما اور ایک سال کے اندر ہی اس کو پُورا کردے اور میں اس کے مقابل پر یہ دُعا کروں گا کہ **یا الٰہی** اگر تُو جانتا ہے کہ میں تیری طرف سے ہوں اور درحقیقت مسیح موعود ہوں تو ایک اور نشان پیشگوئی کے ذریعہ سے میرے لئے ظاہر فرما اور اس کو ایک سال کے اندر پُورا کر۔ پھر اگر ایک سال کے اندر ان کی تائید میں کوئی نشان ظاہر ہوا اور میری تائید میں کچھ ظاہر نہ ہوا تو میں جھُوٹا ٹھہروں گا اور اگر میری تائید میں کچھ ظاہر ہوا مگر اس کے مقابل پر اُن کی تائید میں بھی ویسا ہی کوئی نشان ظاہر ہو گیا تب بھی میں جھُوٹا ٹھیروں گا۔ لیکن اگر میری تائید میں ایک سال کے عرصہ تک کھُلا کھُلا نشان ظاہر ہو گیا اور ان کی تائید میں نہ ہوا تو اس صورت میں مَیں سچا ٹھہروں گا اور شرط یہ ہو گی کہ اگر تصریحات متذکرہ بالا کی رُو سے فریق مخالف سچا نکلا تو میں اُن کے ہاتھ پر توبہ کروں گا اور جہاں تک ممکن ہو گا میں اپنی وہ کتابیں جلا دوں گا جن میں ایسے دعوٰی

یا الہامات ہیں۔ کیونکہ اگر خدا نے مجھے جھوٹا کیا تو پھر میں ایسی کتابوں کو پاک اور مقدس خیال نہیں کر سکتا۔ . . . . . اگر خدا کی مرضی مجھے عزّت دینے کی نہیں تو میرے پر لعنت ہے اگر میں اس کے برخلاف کروں لیکن اگر تصریحات بالا کی رُو سے خدا نے مجھے سچا کر دیا تو چاہیئے کہ محمد حسین بٹالوی اور عبدالحق غزنوی اور عبدالجبار غزنوی اور رشید احمد گنگوہی میرے ہاتھ پہ توبہ کریں اور میرے دعویٰ کی تصدیق کر کے میری جماعت میں داخل ہوں تا یہ تفرقہ دُور ہو جائے۔ **اندرونی تفرقہ نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا ہے** ۔ یہ خدا کا سیدھا سادھا فیصلہ ہوگا۔ جس میں کسی فریق کی چون و چرا پیش نہیں جائے گی۔

(تبلیغ رسالت جلد ششم صفحہ ۱۰۹-۱۱۲)

بنام مسلمانان ہند یعنی ان سب کی طرف جو مختلف مذاہب کے اسلامی فرقے ملک ہند میں موجود ہیں۔

اے اخوان دین و متبعین خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم اگرچہ میں نے علماء اور فقراء کی خدمت میں بہت کچھ لکھا اور اتمام حجت کا حق ادا کر دیا۔ مگر آج میرے دل پہ ڈالا گیا کہ ایک اشتہار عام طور پر آپ لوگوں پر حجت پوری کرنے کے لئے شائع کروں تا میں اس امر تبلیغ میں ہر یک پہلو سے سرخرو ہو جاؤں۔ سو بھائیو! میں آپ لوگوں پہ ظاہر کرتا ہوں کہ وہ جو چودھویں صدی کے سر پہ ایک مجدد موعود آنے والا تھا جس کی نسبت بہت سے راستباز ملہموں نے پیشگوئی کی تھی کہ وہ مسیح موعود ہوگا۔ وہ میں ہی ہوں . . . . . . اور اگر اس عاجز کے بارے میں شک ہو تو ایک فیصلہ نہایت آسان ہے کہ ہر ایک شخص آپ لوگوں میں سے جس کا مُرید ہے اس کو اس عاجز کے مقابل پر کھڑا کرے تا صداقت کے نشان دکھلانے میں وہ میرے ساتھ مقابلہ کر سکے اور یقیناً سمجھو کہ اگر وہ مقابل پر آیا تو اس سے زیادہ اس کی رُسوائی ہوگی جو حضرت موسیٰ کے مقابل پر بلعم کی ہوئی اور اگر وہ مقابلہ منظور نہ کرے اور حق کا طالب ہو تو خدا تعالیٰ اس کی درخواست پہ اور اس کے حاضر ہونے سے نشان دکھلائے گا۔ بشرطیکہ وہ اس جماعت میں داخل ہونے کے لئے مستعد ہو اور اگر اس اشتہار کے جاری ہونے کے بعد آپ لوگوں کے پیر اور مشائخ اور مجتہد بدگوئی اور تکفیر سے باز نہ آویں اور اس عاجز کی صداقت کو قبول نہ کریں۔ اور مقابلہ سے روپوش رہیں تو دیکھو میں خدا تعالیٰ کو گواہ رکھ کر کہتا ہوں کہ خدا انہیں رسوا کرے گا۔

(تبلیغ رسالت جلد سوم صفحہ ۶۳-۶۵)

اے حاضرین اس وقت اپنے کانوں کو میری طرف متوجہ کرو کہ میں اللہ جلّشانہٗ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر حضرت مولوی محمد حسین صاحب چالیس دن تک میرے مقابل پر خدا تعالےٰ کی طرف توجہ کرکے وہ آسمانی نشان یا اسرارِ غیب دکھلا سکیں جو مَیں دکھلا سکوں تو مَیں قبول کرتا ہوں کہ جس ہتھیار سے چاہیں مجھے ذبح کریں اور جو تاوان چاہیں میرے پر لگا دیں۔ دُنیا میں ایک نذیر آیا اور دُنیا نے اس کو قبول نہ کیا۔ لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی کو ظاہر کر دے گا۔

(الحق مباحثہ لدھیانہ صـــــ۱۲۲)

مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر آپ لوگ اپنے دلوں کو صاف کرکے کوئی اَور نشان خدا کا دیکھنا چاہیں تو وہ خداوند قدیر بغیر اس کے کہ آپ لوگوں کے کسی اقتراح کا تابع ہو اپنی مرضی اور اختیار سے نشان دکھلانے پر قادر ہے اور میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر آپ لوگ سچے دل سے توبہ کی نیت کرکے مجھ سے مطالبہ کریں اور خدا کے سامنے یہ عہد کرلیں کہ اگر فوق العادت امر جو انسانی طاقتوں سے بالاتر ہے ظہور میں آجائے تو ہم یہ تمام بغض اور شحنا چھوڑ کر محض خدا کو راضی کرنے کے لئے سلسلہ بعیت میں داخل ہو جائیں گے تو ضرور خدا تعالیٰ کوئی نشان دکھائے گا کیونکہ وہ رحیم و کریم ہے لیکن میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں نشان دکھلانے کے لئے دو تین دن مقرر کر دوں یا آپ لوگوں کی مرضی پر چلوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ جو چاہے تاریخ مقرر کرے . . . . اور اس طریق میں یہ ضروری ہوگا کہ کم سے کم چالیس نامی مولوی جیسے مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اور مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی اور مولوی عبد الجبار صاحب غزنوی ثم امرتسری اور مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولوی پیر مہر علیشاہ صاحب گولڑوی ایک تحریری اقرار نامہ بہ ثبت شہادت پچاس معزز مسلمانان کے اخبار کے ذریعہ سے شائع کر دیں کہ اگر ایسا نشان جو درحقیقت فوق العادت ہو۔ ظاہر ہو گیا تو ہم حضرت ذو الجلال سے ڈر کر مخالفت چھوڑ دیں گے اور بیعت میں داخل ہو جائیں گے اور اگر یہ طریق آپ کو منظور نہ ہو . . . . . . تو ایک اَور سہل طریق ہے جس سے بڑھ کر اَور کوئی سہل طریق نہیں. . . . اور وہ یہ کہ آپ لوگ محض خدا تعالیٰ سے خوف کرکے اور اس امت محمدیہ پر رحم فرما کر بٹالہ یا امرتسر یا لاہور میں ایک جلسہ کریں. اس جلسہ میں جہاں تک ممکن ہو اور جس قدر ہوسکے معزز علماء اور دنیا دار جمع ہوں اور میں بھی اپنی جماعت کے ساتھ حاضر ہو جاؤں تب وہ سب یہ دعا کریں کہ یا الٰہی اگر تُو جانتا ہے کہ یہ شخص مفتری ہے اور تیری طرف سے نہیں ہے اور نہ مسیح موعود ہے اور نہ مہدی ہے تو اس فتنہ کو مسلمانوں میں سے دُور کر اور اس کے شر سے اسلام اور اہلِ اسلام کو بچا

لے جس طرح تو نے مُسیلمہ کذّاب اور اسود عنسی کو دُنیا سے اُٹھا کر مسلمانوں کو اُن کے شرّ سے بچا لیا اور اگر یہ تیری طرف سے ہے اور ہماری ہی عقلوں اور فہموں کا قصور ہے تو اے قادر ہمیں سمجھ عطا فرما۔ تا ہم ہلاک نہ ہو جائیں اور اس کی تائید میں کوئی ایسے امور اور نشان ظاہر فرما کہ ہماری طبیعتیں قبول کر جائیں کہ یہ تیری طرف سے ہے اور جب یہ تمام دُعا ہو چکے تو میں اور میری جماعت بلند آواز سے آمین کہیں اور پھر بعد اس کے میں دعا کروں گا اور اس وقت میرے ہاتھ میں وہ تمام الہامات ہوں گے جو ابھی لکھے گئے ہیں۔ . . . . اور دُعا کا یہ مضمون ہوگا کہ یا الٰہی! اگر یہ الہامات جو اس رسالہ میں درج ہیں جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے جن کی رو سے میں اپنے تئیں مسیح موعود اور مہدی معہود سمجھتا ہوں اور حضرت مسیح کو فوت شدہ قرار دیتا ہوں تیرا کلام نہیں ہے اور میں تیرے نزدیک کاذب اور مفتری اور دجّال ہوں جس نے امت محمدیہ میں فتنہ ڈالا ہے اور تیرا غضب میرے پر ہے تو مَیں تیری جناب میں تضرع سے دعا کرتا ہوں کہ آج کی تاریخ سے ایک سال کے اندر زندوں میں سے میرا نام کاٹ ڈال اور میرا تمام کاروبار درہم برہم کر دے اور دنیا میں سے میرا نشان مٹا ڈال اور اگر میں تیری طرف سے ہوں اور یہ الہامات جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہیں تیری طرف سے ہیں اور میں تیرے فضل کا مورد ہوں۔ تو اے قادر کریم اس آئندہ سال میں میری جماعت کو ایک فوق العادت ترقی دے اور فوق العادت برکات شامل حال فرما اور میری عمر میں برکت بخش اور آسمانی تائیدات نازل کر اور جب یہ دعا ہو چکے تو تمام مخالف جو حاضر ہوں آمین کہیں۔

اور مناسب ہے کہ اس دعا کے لئے تمام صاحبان اپنے دلوں کو صاف کر کے آویں کوئی نفسانی جوش و غضب نہ ہو اور ہار و جیت کا معاملہ نہ سمجھیں اور نہ اس دُعا کو مُباہلہ قرار دیں کیونکہ اس دُعا کا نفع نقصان کُل میری ذات تک محدود ہے . . . . . . اور کوشش کریں کہ حضور دل سے دعائیں ہوں اور گریہ و بکا کے ساتھ ہوں۔ خدا مخلص کی دُعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔ پس اگر یہ کاروبار اس کی طرف سے نہیں ہے اور انسانی افترا اور بناوٹ ہے تو امت مرحومہ کی دُعا جلد عرش تک پونہچے گی۔ اور اگر میرا سلسلہ آسمانی ہے اور خدا کے ہاتھ سے برپا ہے تو میری دُعا سُنی جائے گی۔ پس اے بزرگو! برائے خدا اس بات کو تو قبول کر لو۔ زیادہ مجمع کی ضرورت نہیں۔ علماء میں سے چالیس آدمی جمع ہو جائیں۔ اس سے کم بھی نہیں چاہیئے کہ چالیس کے عدد کو قبولیت دعا کے لئے ایک بابرکت دخل ہے۔

(اربعین ۲ ص ۲۶۔ ۳۱)

بالآخر اس قدر لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ان نشانوں سے کسی کا دل تسلی پذیر نہ ہو۔ اور ایسا شخص ان لوگوں میں سے ہو جو الہام اور وحی کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے لئے یہ دوسری راہ کھُلی ہے کہ وہ میرے مقابل پر اپنے الہام اپنی قوم کے دو اخباروں میں ایک سال تک شائع کرتا رہے اور دوسری طرف وہ تمام امورِ غیبیہ جو مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے معلوم ہوں اپنی جماعت کے دو اخباروں میں شائع کروں اور دونوں فریقوں کے لئے شرط یہ ہے کہ جو الہام الٰہی اخباروں میں درج کرائے جائیں وہ ایسے ہوں کہ ہر ایک اُن میں سے امورِ غیبیہ پر مشتمل ہو اور ایسے امورِ غیب ہوں جو انسانی طاقتوں سے بالاتر ہوں۔ اور پھر ایک سال کے بعد چند منصفوں کے ذریعہ سے دیکھا جائے گا کہ کس طرف غلبہ اور کثرت ہے اور کس فریق کی پیشگوئیاں پُوری ہو گئی ہیں اور اس امتحان کے بعد اگر فریق مخالف کا غلبہ رہا اور میرا غلبہ نہ ہوا تو میں کاذب ٹھہروں گا۔ ورنہ ہر قدم پر لازم ہو گا کہ خدا تعالیٰ سے ڈر کر آئندہ طریق تکذیب اور انکار کو چھوڑ دیں اور خدا کے مرسل کا مقابلہ کر کے اپنی عاقبت خراب نہ کریں۔

(حقیقۃ الوحی ص ۳۸۶)

میں پھر ہر یک طالبِ حق کو یاد دلاتا ہوں کہ وہ دینِ حق کے نشان اور اسلام کی سچائی کے آسمانی گواہ جس سے ہمارے نابینا علماء بے خبر ہیں وہ مجھ کو عطا کئے گئے ہیں۔ مجھے بھیجا گیا ہے تا میں ثابت کروں کہ ایک اسلام ہی ہے جو زندہ مذہب ہے اور وہ کرامات مجھے عطا کئے گئے ہیں جن کے مقابلہ سے تمام غیر مذاہب والے اور ہمارے اندرونی اندھے مخالف بھی عاجز ہیں۔ میں ہر یک مخالف کو دکھلا سکتا ہوں کہ

قرآن شریف

اپنی تعلیموں اور اپنے علوم حکمیہ اور اپنے معارف دقیقہ اور بلاغت کاملہ کی رُو سے معجزہ ہے موسیٰ کے معجزہ سے بڑھ کر اور عیسیٰ کے معجزات سے صدہا درجہ زیادہ۔

میں بار بار کہتا ہوں اور بلند آواز سے کہتا ہوں کہ قرآن اور رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت رکھنا اور سچی تابعداری اختیار کرنا انسان کو صاحب کرامات بنا دیتا ہے اور اسی کامل انسان پر علوم غیبیہ کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دنیا میں کسی مذہب والا رُوحانی برکات میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ میں اس میں صاحب تجربہ ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بجُز اسلام تمام مذہب مُردے اُن کے خدا مُردے اور خود وہ تمام پیرو مُردے ہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق ہو جانا بجُز اسلام قبول کرنے کے ہرگز ممکن نہیں۔ ہرگز ممکن نہیں۔

اے نادانو۔ تمہیں مُردہ پرستی میں کیا مزہ ہے اور مُردار کھانے میں کیا لذّت!!! آؤ میں تمہیں بتلاؤں کہ زندہ خدا کہاں ہے اور کس قوم کے ساتھ ہے۔ وہ اسلام کے ساتھ ہے۔ اسلام اس وقت موسیٰ کا طُور ہے جہاں خدا بول رہا ہے۔ وہ خدا جو نبیوں کے ساتھ کلام کرتا تھا اور پھر چُپ ہو گیا آج وہ **ایک مسلمان** کے دل میں کلام کر رہا ہے۔ کیا تم میں سے کسی کو شوق نہیں؟ کہ اس بات کو پرکھے۔ پھر اگر حق کو پاوے تو قبول کر لیوے۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ کیا ایک مُردہ کفن میں لپٹا ہوا۔ پھر کیا ہے؟ کیا ایک مُشتِ خاک۔ کیا یہ مُردہ خدا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ تمہیں کچھ جواب دے سکتا ہے؟ ذرہ آؤ! ہاں! لعنت ہے تم پر اگر نہ آؤ اور اس سڑے گلے مُردہ کا میرے خدا کے ساتھ مقابلہ نہ کرو۔

دیکھو مَیں تمہیں کہتا ہوں کہ چالیس دن نہیں گذریں گے کہ وہ بعض آسمانی نشانوں سے تمہیں شرمندہ کرے گا۔ ناپاک ہیں وہ دل جو سچے ارادہ سے نہیں آزماتے اور پھر انکار کرتے ہیں اور پلید ہیں وہ طبیعتیں جو شرارت کی طرف جاتی ہیں نہ طلبِ حق کی طرف۔

او میرے مخالف مولویو! اگر تم شک میں ہو تو آؤ۔ چند روز میری صحبت میں رہو۔ اگر خدا کے نشان نہ دیکھو تو مجھے پکڑو اور جس طرح چاہو تکذیب سے پیش آؤ۔ میں اتمام حجت کر چکا۔ اب جب تک تم اس حجت کو نہ توڑ لو تمہارے پاس کوئی جواب نہیں۔ خدا کے نشان بارش کی طرح برس رہے ہیں۔ کیا تم میں سے کوئی نہیں جو سچا دل لے کر میرے پاس آوے۔ کیا ایک بھی نہیں؟

دُنیا میں ایک نذیر آیا پر دُنیا نے اُس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دے گا

والسّلام علٰی من اتبع الھدٰی

(انجام آتھم ص۳۴۵-۳۴۷)

بعد ما وجب گذارش ضروری یہ ہے کہ عاجز مؤلف براہین احمدیہ حضرت قادر مطلق جلّ شانہٗ کی طرف سے مامور ہوا ہے کہ نبیٔ ناصری اسرائیلی (مسیح) کی طرز پر کمال مسکینی فروتنی و غربت و تذلّل و تواضع سے واصلاح خلق کے لئے کوشش کرے اور ان لوگوں کو جو راہ راست سے بے خبر ہیں صراط مستقیم (جس پر چلنے سے حقیقی نجات حاصل ہوتی ہے اور اسی عالم میں بہشتی زندگی کے آثار اور قبولیت اور محبوبیت کے انوار دکھائی دیتے ہیں) دکھا دے۔ اسی غرض سے کتاب براہین احمدیہ تالیف پائی ہے۔ . . . چونکہ

پُوری کتاب کا شائع ہونا ایک طویل مدت پر موقوف ہے اس لئے یہ قرار پایا ہے کہ بالفعل بغرض اتمام حجت یہ خط . . . . . شائع کیا جائے اور اس کی ایک ایک کاپی بخدمت معزز پادری صاحبان پنجاب و ہندوستان و انگلستان وغیرہ بلاد جہاں تک ارسالِ خط ممکن ہو۔ جو اپنی قوم میں خاص طور پر مشہور اور معزز ہوں اور بخدمت برہموں صاحبان و آریہ صاحبان و نیچری صاحبان و حضرات مولوی صاحبان (جو وجود خوارق و کرامات سے منکر ہیں اور اس وجہ سے اس عاجز پر بدظن ہیں) ارسال کی جاوے۔

یہ تجویز نہ اپنے فکر و اجتہاد سے قرار پائی ہے بلکہ حضرت مولیٰ کریم کی طرف سے اس کی اجازت ہوئی ہے اور بطور پیشگوئی یہ بشارت ملی ہے کہ اس خط کے مخاطب (جو خط پہنچنے پر رجوع بحق نہ کریں گے) ملزم و لاجواب و مغلوب ہو جائیں گے۔ بناء علیہ یہ خط چھپوا کر آپ کی خدمت میں اس نظر سے کہ آپ اپنی قوم میں معزز اور مشہور اور مقتدا ہیں۔ ارسال کیا جاتا ہے اور آپ کے کمال علم اور بزرگی کی نظر سے امید ہے کہ آپ حسبۃً للہ اس خط کے مضمون کی طرف توجہ فرما کر طلبِ حق میں کوشش کریں گے۔ آپ نے اس کی طرف توجہ نہ کی تو آپ پر حجت تمام ہو گی اور اس کارروائی کی (کہ آپ کو رجسٹری شدہ خط مِلا۔ پھر آپ نے اس کی طرف توجہ کو مبذول نہ فرمایا) حصہ پنجم کتاب میں پوری تفصیل سے اشاعت کی جائے گی۔ اصل مدعا خط جس کے ابلاغ سے میں مامور ہوا ہوں یہ ہے دینِ حق جو خدا کی مرضی کے موافق ہے صرف اسلام ہے اور کتاب حقانی جو منجانب اللہ محفوظ اور واجب العمل ہے صرف قرآن ہے۔ اس دین کی حقانیت اور قرآن کی سچائی پر عقلی دلائل کے سوا آسمانی نشانوں (خوارق و پیشگوئیوں) کی شہادت بھی پائی جاتی ہے جس کو طالبِ صادق اس خاکسار (مؤلف براہین احمدیہ) کی صحبت اور صبر اختیار کرنے سے بمعائینہ چشم تصدیق کر سکتا ہے۔ آپ کو اس دین کی حقانیت یا ان آسمانی نشانوں کی صداقت میں شک ہو۔ تو آپ طالبِ صادق بن کر **قادیان** میں تشریف لاویں اور ایک سال تک اس عاجز کی صحبت میں رہ کر ان آسمانی نشانوں کا بچشم خود مشاہدہ کر لیں ولیکن اس شرطِ نیت سے (جو طلب صدق کی نشانی ہے) کہ بمجردِ معاینہ آسمانی نشانوں کے اسی جگہ (قادیان میں) شرف اظہارِ اسلام یا تصدیقِ خوارق سے مشرف ہو جائیں گے۔ اس شرطِ نیت سے آپ آویں گے تو ضرور انشاء اللہ تعالےٰ آسمانی نشان مشاہدہ کریں گے اس امر کا خدا کی طرف سے وعدہ ہو چکا ہے جس میں تخلف کا امکان نہیں۔ اب آپ تشریف نہ لائیں تو آپ پر خدا کا مؤاخذہ رہا اور بعد انتظار تین ماہ کے آپ کی عدم توجہی کا حال درج حصہ پنجم کتاب ہو گا اور اگر آپ آویں اور ایک سال رہ کر کوئی آسمانی نشان مشاہدہ نہ کریں تو دو سو روپیہ ماہوار کے حساب سے آپ کو ہرجانہ یا جرمانہ دیا جائے گا۔ اس دو سو روپیہ ماہوار کو آپ اپنے شایانِ شان نہ سمجھیں تو

اپنے حرج اوقات کا عوض یا ہماری وعدہ خلافی کا جرمانہ جو آپ اپنی شان کے لائق قرار دیں گے ہم اس کو بشرط استطاعت قبول کریں گے۔ طالبانِ حرجانہ یا جرمانہ کے لئے ضروری ہے کہ تشریف آوری سے پہلے بذریعہ رجسٹری ہم سے اجازت طلب کریں اور جو لوگ حرجانہ یا جرمانہ کے طالب نہیں ان کو اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ بذات خود تشریف نہ لا سکیں تو آپ اپنا وکیل جس کے مشاہدہ کو آپ معتبر اور اپنا مشاہدہ سمجھیں روانہ فرماویں مگر اس شرط سے کہ بعد مشاہدہ اس شخص کے آپ اظہار اسلام یا تصدیق خوارق میں توقف نہ فرمائیں۔ آپ اپنی شرط اظہارِ اسلام یا (تصدیق خوارق) ایک سادہ کاغذ پر جس پر چند ثقات مختلف مذاہب کی شہادتیں ہوں تحریر کر دیں جس کو متعدد اردو انگریزی اخباروں میں شائع کیا جائے گا۔ ہم سے اپنی شرط دو سو روپیہ ماہوار جرمانہ یا حرجانہ (یا جو آپ پسند کریں اور ہم اس کی ادائیگی کی طاقت بھی رکھیں) عدالت میں رجسٹری کرا لیں اور اس کے ساتھ ایک حصہ جائداد بھی بقدر شرط رجسٹری کرا لیں۔

(تبلیغ رسالت جلد اول صـــ ۱۱-۱۳)

میں جو مصنّف اس کتاب براہین احمدیہ کا ہوں یہ اشتہار اپنی طرف سے بوعدۂ انعام دس ہزار ۱۰۰۰۰ روپیہ بمقابلہ جمیع ارباب مذہب اور ملّت کے جو حقانیت فرقان مجید اور نبوّتِ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مُنکر ہیں اتماماً للحجۃ شائع کر کے اقرار صحیح قانونی اور عہد جائز شرعی کرتا ہوں کہ اگر کوئی صاحب مُنکرین میں سے مشارکت اپنی کتاب کی فرقان مجید سے ان سب براہین اور دلائل میں جو ہم نے دربارہ حقیّتِ فرقان مجید اور صدق رسالتِ حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم اسی کتاب مقدس سے اخذ کر کے تحریر کی ہیں اپنی الہامی کتاب میں سے ثابت کر کے دکھلاوے یا اگر تعداد میں ان کے برابر پیش نہ کر سکے تو نصف ان سے یا ثُلث ان سے یا رُبع ان سے یا خُمس ان سے نکال کر پیش کرے یا اگر بکلّی پیش کرنے سے عاجز ہو تو ہمارے ہی دلائل کو نمبروار توڑ دے تو ان سب صورتوں میں بشرطیکہ تین منصف مقبولہ فریقین بالاتفاق یہ رائے ظاہر کر دیں کہ ایفائے شرط جیسا کہ چاہیئے تھا ظہور میں آگیا ہے میں مشتہر ایسے مجیب کو بلا عذرے وحیلتے اپنی جائداد قیمتی دس ہزار روپیہ پر قبض و دخل دیدوں گا۔ مگر واضح رہے کہ اگر اپنی کتاب کی دلائل معقولہ پیش کرنے سے عاجز اور قاصر رہیں

یا بر طبق شرط اشتہار کی خمس تک پیش نہ کر سکیں تو اس حالت میں بصراحت تمام تحریر کرنا ہوگا جو بوجہ ناکامل یا غیر معقول ہونے کتاب کے اس شق کے پورا کرنے سے مجبور اور معذور ہے اور اگر دلائل مطلوبہ پیش کریں تو اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم نے جو خمس دلائل تک پیش کرنے کی اجازت اور رخصت دی ہے اس سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ اس تمام مجموعہ دلائل کا بغیر کسی تفریق اور امتیاز کے نصف یا ثلث یا رُبع یا خمس پیش کر دیا جائے بلکہ یہ شرط ہر یک صنف کی دلائل سے متعلق ہے اور ہر صنف کے براہین میں سے نصف یا ثلث یا ربع یا خمس پیش کرنا ہوگا . . . .

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۴-۳۱)

آج کی تاریخ تک جو گیارہ ربیع الاول ۱۳۱۱ھ بمطابق بائیس ستمبر ۱۸۹۳ء اور نیز مطابق ہشتم اسوج سمت ۱۹۵۰ اور روز جمعہ ہے۔ اس عاجز سے تین ہزار سے کچھ زیادہ ایسے نشانات ظاہر ہو چکے ہیں کہ جن کے صدہا آدمی گواہ بلکہ بعض پیشگوئیوں کے پورا ہونے کے تو ہزارہا ہندو اور عیسائی اور دوسرے مخالف مذہب گواہ ہیں . . . . . اور ایسے بھی سولہ ہزار کے قریب لوگ ہندوستان اور انگلستان اور جرمنی اور فرانس اور روس اور روم میں پنڈتوں اور یہودیوں کے فقیہوں اور مجوسیوں کے پیشرووں اور عیسائیوں کے پادریوں اور قسیسوں اور بشپوں میں سے موجود ہیں جن کو رجسٹری کرا کر اس مضمون کے خط بھیجے گئے۔ کہ درحقیقت دنیا میں دین اسلام ہی سچا ہے اور دوسرے تمام دین اصلیت اور حقانیت سے دُور جا پڑے ہیں کسی کو مخالفوں میں سے اگر شک ہو تو ہمارے مقابل پر آوے اور ایک سال تک رہ کر دین اسلام کے نشان ہم سے ملاحظہ کرے اور اگر ہم خطا پر نکلیں تو ہم سے بحساب دو سو روپیہ ماہواری ہرجانہ اپنے ایک برس کا لے لے ورنہ ہم اس سے کچھ نہیں مانگتے صرف دین اسلام قبول کر لے۔ اور اگر چاہے تو اپنی تسلّی کے لئے وہ روپیہ کسی بنک میں جمع کرا لے لیکن کسی نے اس طرف رُخ نہ کیا . . . . . . امتحان کے طور پر اس زمانہ کے کسی پادری صاحب وغیرہ کو پوچھ کر دیکھو کہ کیا دعوتِ اسلام کے لئے رجسٹری شدہ خط اُن کے پاس نہیں پونہچا . . . . . . نہ صرف اس قدر بلکہ پارلیمنٹ لنڈن اور شہزادہ ولیعہد ملکہ معظمہ اور شہزادہ بسمارک کی خدمت میں بھی دعوتِ اسلام کے اشتہار اور خطوط بھیجے گئے جن کی رسیدیں ابتک موجود ہیں۔

(شہادۃ القرآن صفحہ ۷۳-۷۵)

مجھے یہ قطعی طور پر بشارت دی گئی ہے کہ اگر کوئی مخالف دین میرے سامنے مقابلہ کے لئے آئیگا تو میں اس پر غالب ہوں گا اور وہ ذلیل ہو گا۔ پھر یہ لوگ جو مسلمان کہلاتے ہیں اور میری نسبت شک رکھتے ہیں کیوں اس زمانہ کے کسی پادری سے میرا مقابلہ نہیں کراتے۔ کسی پادری یا پنڈت کو کہدیں کہ یہ شخص درحقیقت مفتری ہے۔ اس کے ساتھ مقابلہ کرنے میں کچھ نقصان نہیں ہم ذمہ دار ہیں۔ پھر خدا تعالےٰ خود فیصلہ کر دے گا۔ میں اس بات پر راضی ہوں کہ جس قدر دنیا کی جائداد یعنی اراضی وغیرہ بطور وراثت میرے قبضہ میں آئی ہے بحالت دروغگو نکلنے کے وہ سب اس پادری یا پنڈت کو دے دوں گا۔ اگر وہ دروغگو نکلا تو بجز اس کے اسلام لانے کے میں اس سے کچھ نہیں مانگتا۔ یہ بات میں نے اپنے جی میں جزماً ٹھہرائی ہے اور تہِ دل سے بیان کی ہے اور اللہ جلّشانہٗ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس مقابلہ کے لئے تیار ہوں اور اشتہارِ دینے کے لئے مستعد بلکہ میں نے تو بارہ ہزار اشتہار شائع کر دیا ہے۔ بلکہ میں بُلاتا بلاتا تھک گیا۔ کوئی پنڈت۔ پادری نیک نیتی سے سامنے نہیں آیا۔ میری سچائی کے لئے اس سے بڑھ کر اَور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ میں اس مقابلہ کے لئے ہر وقت حاضر ہوں اور اگر کوئی مقابلہ پر کچھ نشان دکھلانے کا دعویٰ نہ کرے تو ایسا پنڈت یا پادری صرف اخبار کے ذریعے سے یہ شائع کر دے کہ میں صرف یک طرفہ کوئی امر خارق عادت دیکھنے کو تیار ہوں اور اگر امر خارق عادت ظاہر ہو جائے اور میں اس کا مقابلہ نہ کر سکوں تو فی الفور اسلام قبول کر دوں گا تو یہ تجویز بھی مجھے منظور ہے۔ کوئی مسلمانوں میں سے ہمت کرے اور جس شخص کو کافر بیدین کہتے ہیں اور دجّال نام رکھتے ہیں بمقابل کسی پادری کے اس کا امتحان کرلیں اور آپ صرف تماشہ دیکھیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۳۴۸)

قرآن شریف کی زبردست طاقتوں میں سے ایک یہ طاقت ہے کہ اس کی پیروی کرنے والے کو معجزات اور خوارق دیئے جاتے ہیں اور وہ اس کثرت سے برتے ہیں کہ دنیا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ میں یہی دعویٰ رکھتا ہوں اور بلند آواز سے کہتا ہوں کہ اگر دنیا کے تمام مخالف کیا مشرق کے اور کیا مغرب کے ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور نشانوں اور خوارق میں مجھ سے مقابلہ کرنا چاہیں تو میں خدا تعالیٰ کے فضل سے اور توفیق سے سب پر غالب رہوں گا اور یہ غلبہ اس وجہ سے نہیں ہوگا کہ میری رُوح میں کچھ زیادہ طاقت ہے بلکہ اس وجہ سے ہو گا کہ خدا نے چاہا ہے کہ اس کے کلام قرآن شریف کی زبردست طاقت اور اس کے رسُول حضرت محمد مصطفٰےؐ صلے اللہ علیہ وسلم کی رُوحانی قوت اور اعلیٰ مرتبت کا یہ ثبوت دوں اور اس نے محض اپنے فضل سے نہ میرے کسی ہُنر سے مجھے یہ توفیق دی ہے کہ میں

اس کے عظیم الشان نبی اور اس کے قوی الطاقت کلام کی پیروی کرتا ہوں اور اس سے محبت رکھتا ہوں اور وہ خدا کا کلام جس کا نام قرآن شریف ہے جو ربّانی طاقتوں کا مظہر ہے میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔ اور قرآن شریف کا وعدہ یہ ہے کہ لهم البشرٰی فی الحیٰوۃ الدنیا اور یہ وعدہ ہے کہ ایّدھم بروح منه اور یہ وعدہ ہے کہ ویجعل لکم فرقاناً۔ اس وعدہ کے موافق خدا نے یہ سب مجھے عنایت کیا ہے۔

(مضمون جلسہ لاہور منسلکہ چشمہ معرفت ص۱۲)

اگر میرے مقابل پر تمام دُنیا کی قومیں جمع ہو جائیں اور اس بات کا بالمقابل امتحان ہو کہ کس کو خدا غیب کی خبریں دیتا ہے اور کس کی دعائیں قبول کرتا ہے اور کس کی مدد کرتا ہے اور کس کے لئے بڑے بڑے نشان دکھاتا ہے تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ہی غالب رہوں گا۔ کیا کوئی ہے؟ کہ اس امتحان میں میرے مقابل پر آوے۔ ہزارہا نشان خدا نے محض اس لئے مجھے دیئے ہیں تاکہ دشمن معلوم کرے کہ دین اسلام سچّا ہے۔ میں اپنی کوئی عزّت نہیں چاہتا بلکہ اس کی عزّت چاہتا ہوں جس کے لئے میں بھیجا گیا ہوں۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۷۶)

زندہ مذہب وہ ہے جس کے ذریعہ سے زندہ خدا ملے۔ زندہ خدا وہ ہے جو ہمیں بلا واسطہ ملہم کر سکے اور کم سے کم یہ کہ ہم بلا واسطہ ملہم کو دیکھ سکیں۔ سو میں تمام دُنیا کو خوشخبری دیتا ہوں کہ یہ زندہ خدا اسلام کا خدا ہے۔ وہ مُردے ہیں نہ خدا جن سے اب کوئی ہمکلام نہیں ہو سکتا۔ اس کے نشان نہیں دیکھ سکتا . . . . . . سچا مذہب کبھی خشک قصّہ نہیں بن سکتا۔ سو اسلام سچّا ہے میں ہر ایک کو کیا عیسائی کیا آریہ کیا یہودی اور کیا برہمو اس سچائی کے دکھلانے کے لئے بُلاتا ہوں کیا کوئی ہے جو زندہ خدا کا طالب ہے۔ ہم مُردوں کی پرستش نہیں کرتے۔ ہمارا زندہ خدا ہے۔ وہ ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ اپنے الہام اور کلام اور آسمانی نشانوں سے ہمیں مدد دیتا ہے۔ اگر دُنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک کوئی عیسائی طالبِ حق ہے تو ہمارے زندہ خدا اور اپنے مُردہ خدا کا مقابلہ کر کے دیکھ لے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اس باہم امتحان کے لئے چالیس دن کافی ہیں . . . . . اگر میں جھُوٹا نکلوں تو ہر ایک سزا کا مستوجب ہوں۔ لیکن دعا کے ذریعہ مقابلہ ہوگا۔ جس کا سچا خدا ہے بلاشُبہ وہ سچا رہے گا۔ اس باہمی مقابلہ میں بے شک خدا مجھے غالب کریگا . . . . جو معقول شرط چاہیں مجھ سے کر لیں کہ مَیں میدان میں کھڑا ہوں اور صاف صاف کہتا

ہوں کہ زندہ خُدا اسلام کا خدا ہے۔ عیسائیوں کے ہاتھ میں ایک مُردہ ہے۔ جس کو امتحان کرنا ہو میرے مقابلہ میں آوے۔

(تبلیغ رسالت جلد ششم صـ۱۵-۱۶)

ایک مشترک کاروائی جس سے تمام مخالف مذہبوں پر حجت پُوری ہو گئی ہے۔ میری طرف سے یہ ہے کہ میں نے عام اعلان دیا ہے کہ آسمانی نشان اور برکات پرمیشر کے شکتی کے کام صرف اسلام میں ہی پائے جاتے ہیں اور دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں کہ ان نشانوں میں اسلام کا مقابلہ کرسکے۔ اس بات کے لئے خدا تعالیٰ نے تمام مخالفین کو ملزم اور لاجواب کرنے کے لئے مجھے پیش کیا ہے اور میں یقیناً جانتا ہوں کہ ہندوؤں اور عیسائیوں اور سکھوں میں ایک بھی نہیں جو آسمانی نشانوں اور قبولیتوں اور برکتوں میں میرا مقابلہ کرسکے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ زندہ مذہب وہی مذہب ہے جو آسمانی نشان ساتھ رکھتا ہو اور کامل امتیاز کا نُور اس کے سر پر چمکتا ہو۔ سو وہ اسلام ہے۔ کیا عیسائیوں میں اور سکھوں میں یا ہندوؤں میں کوئی ایسا ہے کہ اس میں میرا مقابلہ کرسکے۔ سو میری سچائی کے لئے یہ کافی حجت ہے کہ **میرے مقابل پر کسی قدم کو قرار نہیں**۔ اب جس طرح چاہو اپنی تسلی کرو۔

(تریاق القلوب صـ۱۰۶-۱۰۷)

یہ کتاب یعنی سُرمہ چشم آریہ بتقریب مباحثہ لالہ مُرلی دھر صاحب ڈرائینگ ماسٹر ہوشیارپور جو عقائد باطلہ وید کی بکلی بیخ کنی کرتی ہے اس دعویٰ اور یقین سے لکھی گئی ہے کہ کوئی آریہ اس کتاب کا رد نہیں کرسکتا کیونکہ سچ کے مقابل جھوٹ کی کچھ پیش نہیں جاتی اور اگر کوئی آریہ صاحب ان تمام وید کے اصولوں اور اعتقادوں کو جو اس کتاب میں رد کئے گئے ہیں سچ سمجھتا ہے اور اب بھی وید اور اس کے ایسے اصولوں کو ایشر کرت ہی خیال کرتا ہے تو اس کو اس ایشر کی قسم ہے کہ اس کتاب کا ردّ لکھ کر دکھلاوے اور پانسو روپیہ انعام پاوے۔ یہ پانسو روپیہ بعد تصدیق کسی ثالث کے جو کوئی پادری یا برہمو صاحب ہوں گے دیا جائے گا اور ہمیں یاں تک منظور ہے کہ اگر منشی جیون داس صاحب سکرٹری آریہ سماج لاہور جو اس گرد و نواح کے آریہ صاحبوں کی نسبت سلیم الطبع اور معزز اور شریف آدمی ہیں بعد رد چھپ جانے اور عام طور پر شائع ہو جانے مجمع عام علماء مسلمانوں اور آریوں اور معزز عیسائیوں وغیرہ میں مع اپنے عزیز فرزندوں کے حاضر ہوں اور پھر اُٹھ کر قسم کھالیں کہ ہاں میرے دل نے بہ یقین کامل قبول کر لیا ہے کہ سب اعتراضات رسالہ سُرمہ چشم آریہ جن کو میں نے اوّل سے آخر تک بغور دیکھ لیا ہے اور خوب توجہ کر کے سمجھ لیا ہے اس تحریر سے ردّ ہو گئے ہیں۔ اور اگر میں دلی اطمینان اور پُوری سچائی سے یہ بات نہیں کہتا تو اس

کا ضرر اور وبال اسی دُنیا میں مجھ پر اور میری اس اولاد پر جو اس وقت حاضر ہے پڑے۔ تو بعد ایسی قسم کھا لینے کے صرف منشی صاحب موصوف کی شہادت سے پانسو روپیہ نقد رد کنندہ کو اسی مجمع میں بطور انعام دیا جائے گا اور اگر منشی صاحب موصوف عرصہ ایک سال تک ایسی قسم کے بداثر سے محفوظ رہے تو آریوں کے لئے بلاشبہ یہ حجت ہوگی کہ صاحب موصوف نے اپنی دلی صداقت سے اپنے علم اور فہم کے مطابق قسم کھائی تھی۔ والسّلام علےٰ من اتبع الھدیٰ

المشتھر خاکسار مرزا غلام احمدؐ از قادیان ضلع گورداسپور پنجاب

(سرمہ چشم آریہ ٹائٹل پیج آخری ورق)

اشتہار صداقت انوار

بغرض دعوتِ مقابلہ چہل روزہ

گرچہ ہرکس زرہِ لاف بیانے دارد   صادق آنست کہ ازصدق نشانے دارد

ہمارے اشتہارات گذشتہ کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ہم نے اس سے پہلے یہ اشتہار دیا تھا کہ جو معزز آریہ صاحب یا پادری صاحب یا کوئی اور صاحب مخالف اسلام ہیں اگر ان میں سے کوئی صاحب ایک سال تک قادیان میں ہمارے پاس آکر ٹھہرے تو درصورت نہ دیکھنے کسی آسمانی نشان کے چوبیس سو روپیہ انعام پانے کا مستحق ہوگا۔ ہرچند ہم نے تمام ہندوستان و پنجاب کے پادری صاحبان و آریہ صاحبان کی خدمت میں اسی مضمون کے خط رجسٹری کرا کر بھیجے مگر کوئی صاحب قادیان میں تشریف نہ لائے بلکہ منشی اندرمن صاحب کے لئے تو مبلغ چوبیس سو روپیہ نقد لاہور میں بھیجا گیا تو وہ کنارہ کرکے فرید کوٹ کی طرف چلے گئے۔ ہاں ایک صاحب پنڈت لیکھرام نام پشاوری قادیان میں ضرور آئے تھے اور ان کو بار بار کہا گیا کہ وہ اپنی حیثیت کے موافق بلکہ اس تنخواہ سے دوچند جو پشاور میں نوکری کی حالت میں پاتے تھے ہم سے بحساب ماہواری لینا کرکے ایک سال تک ٹھہرو اور اخیر پر یہ بھی کہا گیا کہ اگر ایک سال تک منظور نہیں تو چالیس دن تک ہی ٹھہرو تو انہوں نے ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت کو منظور نہیں کیا اور خلاف واقعہ سراسر دروغ بے فروغ اشتہارات چھپوائے سو اُن کے لئے تو رسالہ سُرمہ چشم آریہ میں دوبارہ یہی چالیس دن تک اس جگہ رہنے کا پیغام تحریر کیا گیا ہے۔ ناظرین اس کو پڑھ لیں لیکن یہ اشتہار اتمام حجت کی غرض سے بمقابل منشی جیونداس

صاحب جو سب آریوں کی نسبت شریف اور سلیم الطبع معلوم ہوتے ہیں اور لالہ مُرلی دھر صاحب ڈرائنگ ماسٹر ہوشیارپور جو وہ بھی میری دانست میں آریوں میں سے غنیمت ہیں اور منشی اندرمن صاحب مرادآبادی جو گویا دوسرا مصرع سوورستی صاحب کا ہیں اور مسٹر عبداللہ آتھم صاحب سابق اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رئیس امرتسر جو حضرات عیسائیوں میں سے شریف اور سلیم المزاج آدمی ہیں اور پادری عمادالدین لاہز صاحب امرتسری اور پادری ٹھاکرداس صاحب مؤلف کتاب اظہار عیسوی شائع کیا جاتا ہے کہ اب ہم بجائے ایک سال کے صرف چالیس روز اس شرط سے مقرر کرتے ہیں کہ جو صاحب آزمائش و مقابلہ کرنا چاہیں وہ برابر چالیس دن تک ہمارے پاس قادیان میں یا جس جگہ اپنی مرضی سے ہمیں رہنے کا اتفاق ہو رہیں اور برابر حاضر رہیں۔ پس اس عرصہ میں اگر ہم کوئی امر پیشگوئی جو خارق عادت ہو پیش نہ کریں یا پیش تو کریں مگر بوقت ظہور وہ جھوٹا نکلے یا وہ جھوٹا تو نہ ہو مگر اسی طرح صاحب ممتحن اس کا مقابلہ کر کے دکھلا دیں تو مبلغ پانسو روپیہ نقد بحالت مغلوب ہونے کے اسی وقت بلا توقف ان کو دیا جائے گا لیکن اگر وہ پیشگوئی وغیرہ بپایۂ صداقت پہنچ گئی تو صاحب مقابل کو بشرفِ اسلام مشرف ہونا پڑیگا . . . . . . اگر وہ پیشگوئی صاحب مقابل کی رائے میں کچھ ضعف یا شک رکھتی ہے یا ان کی نظر میں قیافہ وغیرہ سے مشابہ ہے تو اسی عرصہ چالیس روز میں وہ بھی ایسی پیشگوئی ایسے ہی ثبوت سے ظاہر کر کے دکھلا دیں اور اگر مقابلہ سے عاجز رہیں تو پھر حجت ان پر تمام ہو گی اور بحالت سچے نکلنے پیشگوئی کے بہرحال انہیں مسلمان ہونا پڑے گا اور یہ تحریریں پہلے سے جانبین میں تحریر ہو کر انعقاد پا جائیں گی۔ چنانچہ اس رسالہ کے شائع ہونے کے وقت سے یعنی ۲۰ ستمبر ۱۸۸۶ء سے ٹھیک تین ماہ کی مہلت صاحبان موصوف کو دی جاتی ہے اگر اس عرصہ میں ان کی طرف سے اس مقابلہ کے لئے کوئی منصفانہ تحریک نہ ہوئی تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ گریز کر گئے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

المشتہر خاکسار غلام احمد از قادیان ضلع گورداسپور پنجاب

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۵۹-۲۶۰)

محال است سعدی کہ راہ صفا
تواں یافت جز در پئے مصطفیٰ

سردار راج اندر سنگھ صاحب متوجہ ہو کر سُنیں

آپ کا رسالہ جس کا نام آپ نے خبط قادیانی کا علاج رکھا ہے میرے پاس پہنچا۔ اس میں جس قدر آپ نے ہمارے سیّد و مولیٰ جناب **محمد مصطفےٰ** و **احمد مجتبےٰ** صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو گالیاں دیں اور نہایت

بے باکی سے بے ادبیاں کیں اور بے اصل تہمتیں لگائیں۔ اس کا ہم کیا جواب دیں اور کیا لکھیں۔ سو ہم اس معاملہ کو اس **قادر و توانا** کے سپرد کرتے ہیں جو اپنے پیاروں کے لئے **غیرت** رکھتا ہے۔ ہمارا افسوس اور بھی آپ کی نسبت ہوتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کس ادب اور تہذیب سے ہم نے ست بچن کو تالیف کیا تھا اور کیسے نیک الفاظ سے آپ کے باباصاحب کو یاد کیا تھا اور اس کا عوض آپ نے یہ دیا . . . . خدا کا وہ مقدس پیارا جس نے اس کی عزت اور جلال کے لئے اپنی جان کو ایک کیڑے کی جان کے برابر عزت نہیں دی اور اس کے لئے ہزاروں موتوں کو قبول کیا۔ اس کو آپ نے گندی گالیاں دیں اور اس کی پاک شان میں طرح طرح کی بے باکیاں اور شوخیاں کیں۔ میرا خیال اب تک نہ تھا کہ سکھ صاحبوں میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ آفتاب آپ کی نظر میں ایک ناچیز خس و خاشاک دکھائی دیا۔ اے غافل! وہی ایک نُور ہے جس نے دنیا کو تاریکی میں پایا اور روشن کیا اور مُردہ پایا اور جان بخشی۔ تمام نبوتیں اس سے ثابت ہوئیں . . . . . . **دیکھو!** میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ روشن مذہب اسلام ہے جس کے ساتھ خدا کی تائیدیں ہر وقت شامل ہیں۔ کیا ہی بزرگ قدر وہ رسُول ہے جس سے ہم ہمیشہ تازہ بتازہ روشنی پاتے ہیں اور کیا ہی برگزیدہ وہ نبی ہے جس کی محبت سے رُوح القدس ہمارے اندر سکونت کرتی ہے۔ تب ہماری دعائیں قبول ہوتی ہیں اور عجائب کام ہم سے صادر ہوتے ہیں۔ **زندہ** خدا کا مزا ہم اسی راہ میں دیکھتے ہیں۔ باقی سب مُردہ پرستیاں ہیں

کہاں ہیں مردہ پرست کیا وہ بول سکتے ہیں؟ کہاں ہیں مخلوق پرست کیا وہ ہمارے آگے ٹھہر سکتے ہیں؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو شرارت سے کہتے تھے جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی اور نہ کوئی نشان ظاہر ہوا؟ دیکھو! میں کہتا ہوں وہ شرمندہ ہوں گے اور عنقریب وہ چُھپتے پھریں گے! اور وہ وقت آتا ہے بلکہ آگیا ہے کہ اسلام کی سچائی کا نور منکروں کے مُنہ پر طمانچے مار یگا! اور انہیں نہیں دکھائی دے گا کہ کہاں چھپیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ مَیں نے دو دفعہ باوا نانک صاحب کو کشفی حالت میں دیکھا ہے اور اُن کو اس بات کا اقراری پایا ہے کہ انہوں نے اسی نور سے روشنی حاصل کی ہے۔ فضولیاں اور جھوٹ بولنا مردار خواروں کا کام ہے۔ بس وہی کہتا ہوں کہ جو میں نے دیکھا ہے اسی وجہ سے میں باوا نانک صاحب کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ اس چشمہ سے پانی پیتے تھے جس سے ہم پیتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ میں اس معرفت سے بات کر رہا ہوں کہ جو مجھے عطا کی گئی ہے۔

اب اگر آپ کو اس بات سے انکار ہے کہ باوا صاحب **مسلمان** تھے اور نیز آپ کو اس بات

پر اصرار ہے کہ بقول آپ کے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ بدکار آدمی تھے تو میں آپ پر صرف منقولی استدلال سے اتمام حجت کرنا نہیں چاہتا بلکہ ایک اور طریق سے آپ پر خدا کی حجت پوری کرنا چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فیصلہ اس طرح پر ہو سکتا ہے کہ آپ اگر اپنے اس عقیدے پر یقین رکھتے ہیں تو ایک مجلس عام میں اس مضمون کی قسم کھا دیں کہ درحقیقت باوا نانک دین اسلام سے بیزار تھے اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کو بُرا سمجھتے تھے اور نیز درحقیقت پیغمبر اسلام نعوذ باللہ فاسق اور بدکار تھے اور خدا کے سچے نبی نہیں تھے اور اگر یہ دونوں باتیں خلاف واقعہ ہیں تو اے قادر کرتار مجھے ایک سال تک اس گستاخی کی سخت سزا دے اور ہم آپ کے اس قسم پر پانسو روپیہ ایک جگہ پر جہاں آپ کی اطمینان جمع کروا دیتے ہیں۔ پس اگر آپ درحقیقت سچے ہوں گے تو سال کے عرصہ تک آپ کے ایک بال کا نقصان بھی نہیں ہوگا بلکہ مفت پانسو روپیہ آپ کو ملے گا اور ہماری ذلّت اور روسیاہی ہوگی اور اگر آپ پر کوئی عذاب نازل ہو گیا تو تمام سکھ صاحبان درست ہو جاویں گے ۔

(تبلیغ رسالت جلد ششم۔ صـــ ۹۲ - ۹۷)

میں حلفاً کہتا ہوں اور سچ کہتا ہوں کہ مجھے کسی قوم سے دشمنی نہیں۔ ہاں جہاں تک ممکن ہے۔ ان کے عقائد کی اصلاح چاہتا ہوں اور اگر کوئی گالیاں دے تو ہمارا شکوہ خدا کی جناب میں ہے نہ کسی اور عدالت میں۔ اور بایں ہمہ نوع انسان کی ہمدردی ہمارا حق ہے۔ ہم اس وقت کیونکر اور کن الفاظ سے آریہ صاحبوں کے دلوں کو تسلّی دیں کہ بدمعاشی کی چالیں ہمارا طریق نہیں ہیں۔ ایک انسان کی جان جانے سے تو ہم دردمند ہیں اور خدا کی ایک پیشگوئی پوری ہونے سے ہم خوش بھی ہیں۔ کیوں خوش ہیں ؟ صرف قوموں کی بھلائی کے لئے۔ کاش وہ سوچیں اور سمجھیں کہ اس اعلیٰ درجہ کی صفائی کے ساتھ کئی برس پہلے خبر دینا یہ انسان کا کام نہیں ہے۔ ہمارے دل کی اس وقت عجیب حالت ہے درد بھی ہے اور خوشی بھی۔ درد اس لئے کہ اگر لیکھرام رجوع کرتا زیادہ نہیں تو اتنا ہی کرتا کہ وہ بدزبانیوں سے باز آجاتا تو مجھے اللہ تعالےٰ کی قسم ہے کہ میں اس کے لئے دُعا کرتا اور میں امید رکھتا تھا کہ اگر وہ ٹکڑے ٹکڑے بھی کیا جاتا تب بھی زندہ ہو جاتا۔ وہ خدا جس کو میں جانتا ہوں۔ اس سے کوئی بات انہونی نہیں اور خوشی اس بات کی ہے کہ پیشگوئی نہایت صفائی سے پُوری ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور اگر اب بھی کسی شک کرنے والے کا شک دور نہیں ہو سکتا اور مجھے اس قتل کی سازش میں شریک سمجھتا ہے جیسا کہ ہندو اخباروں نے ظاہر کیا ہے تو میں ایک نیک صلاح دیتا ہوں کہ جس سے سارا قصہ فیصلہ ہو جائے اور وہ یہ ہے کہ ایسا شخص میرے سامنے قسم کھا دے جس کے الفاظ یہ ہوں کہ

"میں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ شخص سازش قتل میں شریک یا اس کے حکم سے واقعہ قتل ہوا ہے پس اگر یہ صحیح نہیں ہے تو اے قادر خدا ایک برس کے اندر مجھ پر وہ عذاب نازل کر جو ہیبت ناک عذاب ہو مگر کسی انسان کے ہاتھوں سے نہ ہو اور نہ انسان کے منصوبوں کا اس میں کچھ دخل متصور ہو سکے" پس اگر یہ شخص ایک برس تک میری بد دعا سے بچ گیا تو میں مجرم ہوں اور اس سزا کے لائق ہوں کہ ایک قاتل کو ہونی چاہیئے۔ اب اگر کوئی بہادر کلیجہ والا آریہ ہے جو اس طور سے تمام دنیا کو شبہات سے چھڑا دے تو اس طریق کو اختیار کرے۔ یہ طریق نہایت سادہ اور راستی کا فیصلہ ہے۔

(سراج منیر ص۲۴-۲۵)

عیسائیوں کو بھی ایمان اور پاک زندگی کا دعویٰ ہے اور مسلمانوں کو بھی۔ اب تنقیح طلب یہ امر ہے کہ ان دونوں گروہوں میں سے خدا کے نزدیک کس کا ایمان مقبول اور کس کی واقعی پاک زندگی ہے اور کس کا ایمان صرف شیطانی خیالات اور پاک زندگی کا دعویٰ صرف نابینائی کا دھوکہ ہے۔ پس میرے نزدیک جو ایمان اپنے ساتھ آسمانی گواہیاں رکھتا ہے اور قبولیت کے آثار اس میں پائے جاتے ہیں۔ وہی ایمان صحیح اور مقبول ہے اور ایسا ہی پاک زندگی وہی واقعی طور پر ہے جو اپنے ساتھ آسمانی نشان رکھتی ہے وجہ یہ کہ اگر صرف دعویٰ ہی قبول کرنا ہے تو دُنیا کی تمام قومیں یہی دعویٰ کر رہی ہیں کہ ہم میں بڑے بڑے لوگ پاک زندگی والے گذرے ہیں اور موجود ہیں بلکہ ان کے اعمال اور افعال بھی پیش کرتے ہیں جن کی اندرونی حقیقت کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ سو اگر عیسائیوں کا یہ خیال ہے کہ کفارہ سے پاک ایمان اور پاک زندگی ملتی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ اب میدان میں آئیں اور دُعا کے قبول ہونے اور نشانوں کے ظہور میں میرے ساتھ مقابلہ کرلیں۔ اگر آسمانی نشانوں کے ساتھ ان کی زندگی پاک ثابت ہو جائے۔ تو میں ہر ایک سزا کا مستوجب ہوں اور ہر ایک ذلّت کا سزاوار ہوں۔ میں بڑے زور سے کہتا ہوں کہ رُوحانیت کے رو سے عیسائیوں کی نہایت گندی زندگی ہے اور وہ پاک خدا جو آسمان اور زمین کا خدا ہے ان کی اعتقادی حالتوں سے ایسا متنفر ہے جیسا کہ ہم نہایت گندے اور سڑے ہوئے مُردار سے متنفر ہوتے ہیں۔ اگر میں اس بات میں جھوٹا ہوں اور اگر اس قول میں میرے ساتھ خدا نہیں ہے۔ تو نرمی اور آہستگی سے مجھ سے فیصلہ کرلیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہرگز پاک زندگی عیسائیوں میں موجود نہیں ہے جو آسمانوں سے اُترتی اور دلوں کو روشن کرتی ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں بیان کر آیا ہوں بعضوں میں فطرتی بھلامانس ہونا اور عام قوموں کی طرح پایا جاتا ہے۔ سو فطرتی شرافت سے میری بحث نہیں۔ اس غربت اور شرافت کے لوگ ہر ایک قوم میں کم و بیش پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ بھنگی اور چمار بھی اس سے باہر نہیں۔

لیکن میرا کلام آسمانی پاک زندگی میں ہے جو خدا کی زندہ کلام سے حاصل ہوتی ہے اور آسمان سے اُترتی اور اپنے ساتھ آسمانی نشان رکھتی ہے۔ سو یہ عیسائیوں میں موجود نہیں۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص ۱۶-۱۸)

دیکھو۔ ہم حضرات پادری صاحبوں کو نہ تلوار سے بلکہ ملائم الفاظ سے بار بار اس طرف بُلاتے ہیں کہ آؤ ہم سے مقابلہ کرو کہ دونوں شخص یعنی حضرت مسیح اور حضرت سیدنا محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے روحانی برکات اور افاضات کے رو سے زندہ کون ہے اور جس طرح خدا کے نبی پاک نے قرآن شریف میں کہا ہے کہ اگر یہ ثابت ہو کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے تو مَیں سب سے پہلے اس کی پرستش کروں گا۔ ایسا ہی میں کہتا ہوں کہ اے یورپ اور امریکہ کے پادریو! کیوں خواہ نخواہ شور ڈال رکھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ایک انسان ہوں جو کروڑہا انسانوں میں مشہور ہوں۔ آؤ میرے ساتھ مقابلہ کرو مجھ میں اور تم میں ایک برس کی مہلت ہو۔ اگر اس مدت میں خدا کے نشان اور خدا کی قدرت نما پیشگوئیاں تمہارے ہاتھ سے ظاہر ہوئیں اور میں تم سے کمتر رہا تو میں مان لوں گا کہ مسیح ابن مریم خدا ہے۔ لیکن اگر سچے خدا نے جس کو میں جانتا ہوں اور آپ لوگ نہیں جانتے مجھے غالب کیا اور آپ لوگوں کا مذہب آسمانی نشانوں سے محروم ثابت ہوا۔ تو تم پر لازم ہوگا کہ اس دین کو قبول کرو۔

(تریاق القلوب ص ۲۹-۳۰)

مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں اور خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ مَیں اس میں سچا ہوں اور تجربہ اور نشانات کی ایک کثیر تعداد نے میری سچائی کو روشن کر دیا ہے کہ اگر یسوع مسیح ہی زندہ خدا ہے اور وہ اپنے صلیب برداروں کی نجات کا باعث ہوا ہے اور ان کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے باوجودیکہ اس کی خود دعا قبول نہیں ہوئی تو کسی **پادری یا راہب** کو میرے مقابل پر پیش کرو کہ وہ یسوع مسیح سے مدد اور توفیق پا کر کوئی خارق عادت نشان دکھائے۔ **میں اب میدان میں کھڑا ہوں** اور مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ میں اپنے خدا کو دیکھتا ہوں۔ وہ ہر وقت میرے سامنے میرے ساتھ ہے۔ میں پکار کر کہتا ہوں۔ مسیح کو مجھ پر زیادت نہیں کیونکہ میں **نور محمدی** کا قائمقام ہوں جو ہمیشہ اپنی روشنائی سے زندگی کے نشان قائم کرتا ہے اس سے بڑھ کر اور کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

(ملفوظات جلد سوم ص ۱۲۴-۱۲۵)

جس قدر ان پادری صاحبان نے اہلِ اسلام پر مختلف قسم کے اعتراضات کر کے اور بار بار ٹھوکریں کھا کر اپنے خیالات میں پلٹے کھائے ہیں اور طرح طرح کی ندامتیں اُٹھا کر پھر اپنے اقوال سے رجُوع کیا ہے

یہ بات اس شخص کو بخوبی معلوم ہوگی کہ جو اُن کے اور فضلاء اسلام کے باہمی مباحثات کی کتابوں پر ایک محیط نظر ڈالے۔ ان کے اعتراضات تین قسم سے باہر نہیں۔ یا[۱] تو ایسے ہیں کہ جو سراسر افتراء اور بہتان ہیں جن کی اصلیت کسی جگہ پائی نہیں جاتی اور یا[۲] ایسے ہیں کہ فی الحقیقت وہ باتیں ثابت تو ہیں لیکن محل اعتراض نہیں۔ محض سادہ لوحی اور کور باطنی اور قلّت تدبّر کی وجہ سے ان کو جائے اعتراض سمجھ لیا ہے۔ اور یا بعض ایسے امور ہیں کہ کسی قدر تو سچے ہیں جو ایک ذرہ جائے اعتراضات نہیں ہو سکتی اور باقی سب بہتان اور افتراء ہیں جو ان کے ساتھ ملائے گئے ہیں . . . .

بعض آریہ ایسے بھی ہیں کہ وہ قرآن شریف کا ترجمہ کسی جگہ سے ادھورا سا دیکھ کر یا کوئی قصّہ بے سروپا کسی جاہل یا مخالف سے سُنکر جھٹ پٹ اس کو بنائے اعتراض قرار دے دیتے ہیں .

. . . سو اسی خیال سے یہ اشتہار جاری کیا جاتا ہے اور ظاہر کیا جاتا ہے کہ جس قدر اصول اور تعلیمیں قرآن شریف کی ہیں وہ سراسر حکمت اور معرفت اور سچائی سے بھری ہوئی ہیں اور کوئی بات ان میں ایک ذرہ مؤاخذہ کے لائق نہیں اور چونکہ ہر ایک مذہب کے اصولوں اور تعلیموں میں صدہا جزئیات ہوتی ہیں اور ان سب کی کیفیت کا معرضِ بحث میں لانا ایک بڑی جہلت کو چاہتا ہے اس لئے ہم اس بارہ میں قرآن شریف کے اصولوں کے منکرین کو ایک نیک صلاح دیتے ہیں کہ اگر ان کو اصول اور تعلیمات قرآنی پر اعتراض ہو تو مناسب ہے کہ وہ اول بطور خود خوب سوچ کر دو تین ایسے بڑے سے بڑے اعتراض بحوالہ آیات قرآنی پیش کریں جو ان کی دانست میں سب اعتراضات سے ایسی نسبت رکھتے ہوں جو ایک پہاڑ کو ذرہ سے نسبت ہوتی ہے یعنی ان کے سب اعتراضوں سے ان کی نظر میں اقویٰ و اشد اور انتہائی درجہ کے ہوں جن پر اُن کی نکتہ چینی کی پُرزور نگاہیں ختم ہو گئی ہوں اور نہایت شدت سے دوڑ دوڑ کر انہی پر جا ٹھہری ہوں سو ایسے دو یا تین اعتراض بطور نمونہ پیش کر کے حقیقت حال کو آزما لینا چاہیئے کہ اس سے تمام اعتراضات کا بآسانی فیصلہ ہو جائے گا کیونکہ اگر بڑے اعتراض بعد تحقیق ناچیز نکلے تو پھر چھوٹے اعتراضات ساتھ ہی نابود ہو جائیں گے۔ اور اگر ہم ان کا کافی و شافی جواب دینے سے قاصر رہے اور کم سے کم یہ ثابت نہ کر دکھایا کہ جن اصولوں اور تعلیموں کو فریق مخالف نے بمقابلہ ان اصولوں اور تعلیموں کے اختیار کر رکھا ہے وہ ان کے مقابل پر نہایت درجہ رذیل اور ناقص اور دور از صداقت خیالات ہیں۔ تو ایسی حالت میں فریق مخالف کو درحالت مغلوب ہونے کے فی اعتراض پچاس روپیہ بطور تاوان دیا جائے گا۔ لیکن اگر فریق مخالف انجام کار جھوٹا نکلا اور وہ تمام خوبیاں جو ہم اپنے ان اصولوں یا تعلیموں میں ثابت کر کے دکھلادیں

بمقابل ان کے وہ اپنے اصولوں میں ثابت نہ کر سکا تو پھر یاد رکھنا چاہیئے کہ اسے بلا توقف مسلمان ہونا پڑیگا اور اسلام لانے کے لئے اوّل حلف اُٹھا کر اسی عہد کا اقرار کرنا ہوگا اور پھر بعد میں ہم اس کے اعتراضات کا جواب ایک رسالہ مستقلہ میں شائع کرا دینگے اور جو اس کے بالمقابل اصولوں پر ہماری طرف سے حملہ ہوگا اس حملہ کی مدافعت میں اس پر لازم ہوگا کہ وہ بھی ایک مستقل رسالہ شائع کرے اور پھر دونوں رسالوں کے چھپنے کے بعد کسی ثالث کی رائے پر یا خود فریق مخالف کے حلف اُٹھانے پر فیصلہ ہوگا۔ جس طرح وہ راضی ہو جائے لیکن شرط یہ ہے کہ فریق مخالف نامی علماء میں سے ہو اور اپنے مذہب کی کتاب میں مادہ علمی بھی رکھتا ہو اور بمقابل ہمارے حوالہ اور بیان کے اپنا بیان بھی بحوالہ اپنی کتاب کے تحریر کر سکتا ہو تا ناحق ہمارے اوقات کو ضائع نہ کرے . . . .

بالآخر واضح رہے کہ اس اشتہار کے جواب میں ۲۰؍ ستمبر ۱۸۸۶ء سے تین ماہ تک کسی پنڈت یا پادری جواب دہندہ کا انتظار کیا جائے گا اور اگر اس عرصہ میں علماء آریہ وغیرہ خاموش رہے تو انہیں کی خاموشی ان پر حجت ہوگی۔

(اشتہار مفید الاخیار منسلکہ سرمہ چشم آریہ صـ ۲ - ۴)

اس اشتہار کی تحریر سے یہ غرض ہے کہ ہم نے بڑے لمبے تجربہ سے آزما لیا ہے کہ یہ لوگ بار بار ملزم اور لاجواب ہو کر پھر بھی نیش زنی سے باز نہیں آتے . . . . . . اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں نہایت ناپاک اور رنجدہ تھیسٹر نکالتے ہیں اور نہایت بُری تصویروں میں اس پاک وجود کو دکھلاتے ہیں اب ایسے کذابوں سے زبانی مباحثات سے کیونکر فیصلہ ہو۔ ہم جھوٹے کو دندان شکن جواب سے ملزم تو کر سکتے ہیں مگر اس کا مُنہ کیونکر بند کریں۔ اس کی پلید زبان پر کونسی تھیلی چڑھا دیں؟ اس کے گالیاں دینے والے منہ پر کونسا قفل لگا دیں؟ کیا کریں؟ . . . . ان ظالم پادریوں نے لاکھوں گالیاں ہمارے نبی کریمؐ کو دے کر ہمارے دلوں کو زخمی کر دیا . . . . . . پس یہ روز افزوں جھگڑے کیونکر فیصلہ پاویں۔ مباحثات کے نیک نتیجہ سے تو نومیدی ہو چکی بلکہ جیسے جیسے مباحثات بڑھتے جاتے ہیں۔ ویسے ہی کینے بھی ساتھ ترقی پکڑتے جاتے ہیں سو اس نومیدی کے وقت میں میرے نزدیک ایک نہایت سہل و آسان طریق فیصلہ ہے۔ اگر پادری صاحبان قبول کر لیں اور وہ یہ ہے کہ اس بحث کا جو حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ خدا تعالیٰ سے فیصلہ کرایا جائے۔

اوّل مجھے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ایسا خدائی فیصلہ کرانے کے لئے سب سے زیادہ مجھے جوش ہے اور میری دلی مراد ہے کہ اس طریق سے یہ روز کا جھگڑا انفصال پا جائے۔ اگر میری تائید میں خدا کا فیصلہ

نہ ہو تو میں اپنی کُل املاک منقولہ وغیر منقولہ جو دس ہزار روپیہ کی قیمت سے کم نہیں ہوں گی عیسائیوں کو دے دوں گا اور بطور پیشگی تین ہزار روپیہ تک اُن کے پاس جمع بھی کرا سکتا ہوں۔ اس قدر مال کا میرے ہاتھ سے نکل جانا میرے لئے کافی سزا ہوگی۔ علاوہ اس کے یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ میں اپنے دستخطی اشتہار سے شائع کر دوں گا کہ عیسائی فتحیاب ہوئے اور مَیں مغلوب ہوا۔ اور یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ اس اشتہار میں کوئی بھی شرط نہ ہوگی۔ لفظاً نہ معناً۔

اور ربّانی فیصلہ کے لئے طریق یہ ہوگا کہ میرے مقابل پر ایک معزز پادری صاحب جو پادری صاحبان مندرجہ ذیل میں سے منتخب کئے جائیں میدان مقابلہ کے لئے جو تراضئ طرفین سے مقرر کیا جائے طیار ہوں پھر بعد اس کے ہم دونوں مع اپنی اپنی جماعتوں کے میدان مقررہ میں حاضر ہو جائیں اور خدا تعالیٰ سے دُعا کے ساتھ یہ فیصلہ چاہیں کہ ہم دونوں میں سے جو شخص درحقیقت خدا تعالےٰ کی نظر میں کاذب اور موردِ غضب ہے۔ خدا تعالیٰ ایک سال میں اس کاذب پر وہ قہر نازل کرے جو اپنی غیرت کے رو سے ہمیشہ کاذب اور مکذّب قوموں پر کیا کرتا ہے جیسا کہ اس نے فرعون پر کیا۔ نمرود پر کیا اور نوح کی قوم پر کیا اور یہود پر کیا حضرات پادری صاحبان یہ بات یاد رکھیں کہ اس باہمی دعا میں کسی خاص فریق پر نہ لعنت ہے نہ بد دعا ہے بلکہ اس جھوٹے کو سزا دلانے کی غرض سے ہے جو اپنے جھوٹ کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ایک جہان کے زندہ ہونے کے لئے ایک کا مرنا بہتر ہے۔

(انجام آتھم صفحہ ۳۸ - ۴۱)

پادری وائٹ بریخٹ صاحب پر اتمام حجت

. . . . اس اشتہار کے جاری کرنے سے یہ مطلب ہے کہ اگر کوئی معزز یورپین عیسائی صاحب ملہم ہونے کا دعویٰ کرتے ہوں تو انہیں بعد رغبت ہماری طرف سے اجازت ہے کہ بمقام بٹالہ جہاں آخر رمضان تک انشاء اللہ ہم رہیں گے کوئی جلسہ مقرر کرکے ہمارے مقابل پر اپنی الہامی پیشگوئیاں پیش کریں بشرطیکہ فتح مسیح[۱] کی طرح اپنی دروغگوئی کا اقرار کرکے میدان مقابلہ سے بھاگنا نہ چاہیں اور نیز اس اشتہار

---

[۱] میاں فتح مسیح عیسائی واعظ نے دعویٰ کیا تھا کہ مجھے بھی الہام ہوتا ہے اور مَیں بھی پیش از وقوع الہامی پیشگوئیاں بالمقابل بتلا سکتا ہوں۔ چنانچہ اس دعویٰ کو پرکھنے کے لئے ۲۱ مئی ۱۸۸۸ء کو روز دوشنبہ اس عاجز کے مکان فرودگاہ پر ایک بھارا جلسہ ہوا۔ اور بہت سے مسلمان اور ہندو معزز اور رئیس شہر کے رونق افروز جلسہ ہوئے اور سب کو اس بات کے دیکھنے کا شوق تھا کہ کونسی پیشگوئیاں بالمقابل پیش کی جاتی ہیں۔ آخر دس بجے کے بعد میاں فتح مسیح مع چند

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں پادری وائٹ بریخٹ صاحب کہ جو اس علاقہ کے ایک معزز یورپین پادری ہیں ہمارے بالتخصیص مخاطب ہیں۔ اور ہم پادری صاحب کو یہ بھی اجازت دیتے ہیں کہ اگر وہ صاف طور پر جلسہ عام میں اقرار کر دیں کہ یہ الہامی طاقت عیسائی گروہ سے مسلوب ہے تو ہم اُن سے کوئی پیشگوئی بالمقابل طلب نہیں کریں گے۔ بلکہ حسب درخواست ان کی ایک جلسہ مقرر کر کے فقط اپنی طرف سے ایسی الہامی پیشگوئیاں پیش از وقوع پیش کریں گے جن کی نسبت ان کو کسی طور کا شک و شبہ کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اور اگر ہماری طرف سے اس جلسہ میں کوئی ایسی قطعی و یقینی پیشگوئی پیش نہ ہوئی کہ جو عام ہندوؤں اور مسلمانوں اور عیسائیوں کی نظر میں انسانی طاقتوں سے بالا متصور ہو تو ہم اسی جلسہ میں دو سو روپیہ نقد پادری صاحب موصوف کو بطور ہرجانہ یا تاوان تکلیف دہی کے دیدیں گے۔ چاہیں تو وہ دو سو روپیہ کسی معزز ہندو صاحب کے پاس پہلے ہی جمع کرا کر اپنی تسلی کرالیں۔ لیکن اگر پادری صاحب نے خود تسلیم کر لیا کہ حقیقت میں یہ پیشگوئی انسانی طاقتوں سے بالاتر ہے تو پھر ان پر واجب و لازم ہوگا کہ اس کا جھوٹ یا سچ پرکھنے کے لئے سیدھے کھڑے ہو جائیں اور اخبار نور افشاں میں جو ان کی مذہبی اخبار ہے اس پیشگوئی کو درج کرا کر ساتھ اس کے اپنا اقرار بھی چھپوائیں کہ میں نے اس پیشگوئی کو من کل الوجوہ گو انسانی طاقتوں سے بالاتر قبول کر لیا اسی وجہ سے تسلیم کر لیا ہے کہ اگر یہ پیشگوئی سچی ہے تو بلاشبہ قبولیت اور محبوبیت الٰہی کے چشمہ سے نکلی ہے نہ کسی اَور گندے چشمہ سے جو اٹکل اور اندازہ وغیرہ ہے اور اگر بالآخر اس پیشگوئی کا مضمون صحیح اور سچ نکلا تو میں بلا توقف مسلمان ہو جاؤں گا کیونکہ جو پیشگوئی محبوبیت کے چشمہ سے نکلی ہے وہ اس دین کی سچائی کو ثابت کرنے والی ہے جس دین کی پیروی سے یہ مرتبہ محبوبیت کا ملتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ محبوبیت کو نجات یافتہ ہونا ایک امر لازمی ہے۔ اور اگر پیشگوئی کا مضمون صحیح نہ نکلا یعنی بالآخر جھوٹی نکلے تو وہ دو سو روپیہ جو جمع کرایا گیا ہے پادری صاحب کو دیا جائے گا۔

(تبلیغ رسالت جلد اول ص ۱۰۶-۱۰۸)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

دوسرے عیسائیوں کے جلسہ میں تشریف لائے اور بجائے اس کے کہ پیشگوئیاں کرتے . . . . کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ میری طرف سے دعویٰ الہام نہیں ہے اور جو کچھ میرے مُنہ سے نکلا تھا میں نے یُونہی فریق ثانی کے دعوے کے مقابل پر ایک دعویٰ کر دیا تھا۔

(تبلیغ رسالت جلد اوّل ص ۱۰۵)

اعلان

پادری وائٹ بریخٹ صاحب پر اتمام حجت

. . . . میاں فتح مسیح نے ۷ر جون ۱۸۸۸ء کے اخبار نور افشاں میں چھپوا دیا ہے کہ ہم اس طور پر تحقیق الہامات کے لئے جلسہ کر سکتے ہیں کہ ایک جلسہ منعقد ہو کر چار سوال بند کاغذ میں حاضرین جلسہ میں سے کسی کے ہاتھ میں دیدیں گے۔ وہ ہمیں الہاماً بتلائے جائیں۔ اس کے جواب میں اوّل تو یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ جیسا کہ ہم اپنے اشتہار ۲۴ر مئی ۱۸۸۸ء میں لکھ چکے ہیں۔ فتح مسیح جس کی طینت میں دروغ ہی دروغ ہے۔ ہرگز مخاطب ہونے کے لائق نہیں اور اس کو مخاطب بنانا اور اس کے مقابل پر جلسہ کرنا ہر ایک راستباز کے لئے عار و ننگ ہے۔ ہاں اگر پادری وائٹ بریخٹ صاحب ایسی درخواست کریں کہ جو نور افشاں ۷ر جون ۱۸۸۸ء کے صفحہ ، میں درج ہے تو ہمیں بسر و چشم منظور ہے۔ ہمارے ساتھ وہ خدائے قادر و علیم ہے جس سے عیسائی لوگ ناواقف ہیں۔ وہ پوشیدہ بھیدوں کو جانتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے جو اس کے خالص بندے ہیں لیکن لہو و لعب کے طور پر اپنا نام لینا پسند نہیں کرتا۔ پس اگر پادری وائٹ بریخٹ صاحب ایک عام جلسہ بٹالہ منعقد کر کے اس جلسہ میں حلفاً اقرار کریں کہ اگر مضمون کسی بند لفافہ کا جو میری طرف سے پیش ہو۔ دس ہفتہ تک مجھ کو بتلایا جاوے تو میں بلا توقف دینِ مسیحی سے بیزار ہو کر مسلمان ہو جاؤں گا۔ اور اگر ایسا نہ کروں تو ہزار روپیہ جو پہلے سے کسی ثالث منظور کردہ کے پاس جمع کرا دوں گا بطور تاوان انجمن حمایت اسلام لاہور میں داخل کیا جاویگا۔ اس تحریری اقرار کے پیش ہونے کے اور نیز نور افشاں میں چھپنے کے بعد اگر دس ہفتہ تک ہم نے لفافہ بند کا مضمون بتلا دیا تو ایفاء شرط کا پادری صاحب پر لازم ہوگا ورنہ ان کے روپیہ کی ضبطی ہوگی۔ اور اگر ہم بتلا نہ سکے تو ہم دعوئے الہام سے دستبردار ہو جائینگے اور نیز جو سزا زیادہ سے زیادہ ہمارے لئے تجویز ہو وہ بخوشیِ خاطر اُٹھا لیں گے۔ فقط۔

المعلن

خاکسار غلام احمد قادیانی ۹ر جون ۱۸۸۸ء

(تبلیغ رسالت جلد اوّل ص۱۱۰ - ۱۱۱)

کیا کسی پادری میں یہ پاک رُوح یا یُوں کہو کہ رُوح القدس پائی جاتی ہے۔ ہم تمام دُنیا کے پادریوں کو بُلاتے بُلاتے تھک بھی گئے۔ کسی نے آواز تک نہیں دی۔ نور افشاں میں بعض پادریوں نے

چھپوایا تھا کہ ہم ایک جلسہ میں ایک لفافہ بند پیش کریں گے۔ اس کا مضمون الہام کے ذریعے سے ہمیں بتلایا جائے۔ لیکن جب ہماری طرف سے مسلمان ہونے کی شرط سے یہ درخواست منظور ہوئی۔ تو پھر پادریوں نے اس طرف رُخ بھی نہ کیا۔ پادری لوگ مدت سے الہام پر مُہر لگا بیٹھے تھے۔ اب جب مُہر ٹوٹی اور فیض روح القدس مسلمانوں پر ثابت ہوا تو پادریوں کے اعتقاد کی قلعی کھُل گئی۔

(تبلیغ رسالت جلد اول ص۱۱۴)

اب میں اس مجلس میں ڈپٹی عبداللہ آتھم صاحب کی خدمت میں اور دوسرے تمام حضرات عیسائی صاحبوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ . . . . . ایک سیدھا اور آسان فیصلہ ہے جو میں زندہ اور کامل خدا سے کسی نشان کے لئے دُعا کرتا ہوں اور آپ حضرت مسیح سے دُعا کریں۔ آپ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ پھر اگر وہ قادرِ مطلق ہے تو ضرور آپ کامیاب ہو جاویں گے۔ اور مَیں اس وقت اللہ تعالےٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر مَیں بالمقابل نشان بتانے میں قاصر رہا تو ہر ایک سزا اپنے پر اُٹھا لُوں گا اور اگر آپ نے مقابل پر کچھ دکھلایا تب بھی سزا اُٹھا لوں گا

(جنگ مقدس ص۵۶)

توریت اور انجیل قرآن کا کیا مقابلہ کریں گی اگر صرف قرآن شریف کی پہلی سورۃ کے ساتھ ہی مقابلہ کرنا چاہیں۔ یعنی سورۃ فاتحہ کے ساتھ جو فقط سات آیتیں ہیں اور جس ترتیب انسب اور ترکیب محکم اور نظام فطرتی سے اس سُورۃ میں صدہا حقائق اور معارف دینیہ اور رُوحانی حکمتیں درج ہیں۔ اُن کو موسیٰ کی کتاب یا یسُوع کے چند ورق انجیل سے نکالنا چاہیں تو گو ساری عمر کوشش کریں تب بھی یہ کوشش لاحاصل ہو گی۔ . . . . . بھلا وہ اگر اپنی توریت یا انجیل کو معارف اور حقائق کے بیان کرنے اور خواص کلام الوہیت ظاہر کرنے میں کامل سمجھتے ہیں تو ہم بطور انعام پانسو روپیہ نقد اُن کو دینے کے لئے تیار ہیں۔ اگر وہ اپنی کُل ضخیم کتابوں میں سے جو ستّر کے قریب ہوں گی۔ وہ حقائق اور معارفِ شریعت اور مرتب اور منتظم درِ حکمت و جواہر معرفت و خواص کلام الوہیت دکھلا سکیں جو سورۃ فاتحہ میں سے ہم پیش کریں اور اگر یہ روپیہ تھوڑا ہو تو جس قدر ہمارے لئے ممکن ہوگا۔ ہم اُن کی درخواست پر بڑھا دیں گے اور ہم صفائی فیصلہ کے لئے پہلے سُورہ فاتحہ کی ایک تفسیر تیار کر کے اور چھاپ کر پیش کریں گے اور اس میں وہ تمام حقائق و معارف و خواص کلام الوہیت بہ تفصیل بیان کریں جو سُورہ فاتحہ میں مندرج ہیں اور پادری صاحبوں کا یہ فرض ہوگا کہ توریت اور انجیل اور اپنی تمام کتابوں میں سے سُورہ فاتحہ کے مقابل پر حقائق اور معارف اور خواصِ

کلام الوہیت جس سے مراد فوق العادت عجائبات ہیں جن کا بشری کلام میں پایا جانا ممکن نہیں پیش کر کے دکھلائیں اور اگر وہ ایسا مقابلہ کریں اور تین منصف غیر قوموں میں سے کہدیں کہ وہ لطائف اور معارف اور خواص کلام الوہیت جو سورۃ فاتحہ میں ثابت ہوئے ہیں وہ ان کی پیش کردہ عبارتوں میں بھی ثابت ہیں تو ہم پانسو جو پہلے سے اُن کے لئے ان کی اطمینان کی جگہ پر جمع کرایا جائیگا دیدیں گے اب کیا کسی پادری کا حوصلہ ہے جو ایسا مقابلہ کرے ؟

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صـ ۳۴-۳۵)

انجیل کے کلمات سے یسُوع کی خدائی ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ایسے کلمات سے خدائی ثابت ہوسکتی ہے تو یہ میرے الہامات یسوع کے الہامات سے بہت زیادہ میری خدائی پر دلالت کرتے ہیں اور اگر خود پادری صاحبان سوچ نہیں سکتے تو کسی دوسری قوم کے تین منصف مقرر کر کے میرے الہامات اور انجیل میں سے یسوع کے وہ کلمات جن سے اس کی خدائی سمجھی جاتی ہے۔ ان منصفوں کے حوالہ کریں۔ پھر اگر منصف لوگ پادریوں کے حق میں ڈگری دیں اور حلفاً یہ بیان کر دیں کہ یسُوع کے کلمات میں سے یسُوع کی خدائی زیادہ تر صفائی سے ثابت ہوسکتی ہے تو میں تاوان کے طور پر ہزار روپیہ ان کو دے سکتا ہوں اور میں منصفوں سے یہ چاہتا ہوں کہ اپنی شہادت سے پہلے یہ قسم کھا لیویں کہ ہمیں خدا تعالےٰ کی قسم ہے کہ ہمارا یہ بیان صحیح ہے اور اگر صحیح نہیں ہے تو خدا تعالےٰ ایک سال تک ہم پر وہ عذاب نازل کرے جس سے ہماری تباہی اور ذلت اور بربادی ہو جائے اور میں خوب جانتا ہوں کہ پادری صاحبان ہرگز اس طریق فیصلہ کو قبول نہیں کریں گے۔

(کتاب البریہ صـ ۱۰۶)

میرا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یسُوع کی پیشگوئیوں کی نسبت میری پیشگوئیاں اور میرے نشان زیادہ ثابت ہیں۔ اگر کوئی پادری میری پیشگوئیوں اور میرے نشانوں کی نسبت یسوع کی پیشگوئیاں اور نشان ثبوت کے رُو قوی تر دکھلا سکے تو میں اس کو ایک ہزار روپیہ نقد دوں گا۔

میرزا غلام احمد

(تبلیغ رسالت جلد ششم صـ ۱۷)

یہ بھی مناسب دیکھتا ہوں کہ چونکہ عیسائیوں کا مذہبی عناد بہت بڑھ گیا ہے اس لئے نہایت ضروری ہے کہ روز کا جھگڑا طے کرنے کے لئے ساتھ ہی اسلام اور عیسائیت کا مُباہلہ بھی میرے ساتھ کر لیں۔ اگر عیسائی لعنت کے لفظ سے متنفّر ہیں تو اس لفظ کو جانے دیں بلکہ دونوں فریق یہ دُعا کریں

کہ یا الٰہ العالمین اسلام تو یہ تعلیم دیتا ہے کہ تثلیث کی تعلیم سراسر جھوٹی اور شیطانی طریق ہے اور مریم کا بیٹا ہرگز خدا نہیں تھا بلکہ ایک انسان تھا اور نبی اور حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے پیغمبر اور رسُول اور خاتم الانبیاء تھے اور قرآن خدا کا پاک کلام ہے جو ہر ایک غلطی اور ضلالت سے پاک ہے اور عیسائی اس تعلیم کو پیش کرتے ہیں کہ مریم کا بیٹا یسُوع درحقیقت خدا تھا وہی تھا جس نے زمین و آسمان پیدا کیا۔ اسی کے خون سے دُنیا کی نجات ہو گئی اور خدا تین اقنوم ہیں۔ باپ، بیٹا، رُوح القدس۔ اور یسُوع تینوں کا مجموعہ کامل خدا ہے۔ اب اے قادر ان دونوں گروہ میں اس طرح فیصلہ کر کہ جو ہم دو فریق میں سے جو اس وقت مباہلہ کے میدان میں حاضر ہیں۔ جو فریق جھوٹے اعتقاد کا پابند ہے اس کو ایک سال کے اندر بڑے عذاب سے ہلاک کر کیونکہ تمام دُنیا کی نجات کے لئے چند آدمی کا مرنا بہتر ہے۔

غرض ہر ایک فریق ہم میں سے اور عیسائیوں میں سے دُعا کرے اس طرح پر کہ اوّل ایک فریق یہ دُعا کرے اور دوسرا فریق آمین کہے اور پھر دوسرا فریق دُعا کرے اور پہلا فریق آمین کہے۔ اور پھر ایک سال تک خدا کے حکم کے منتظر رہیں اور میں اس وقت اقرار صالح شرعی کرتا ہوں کہ ان دونوں مُباہلوں میں دو ہزار روپیہ ان عیسائیوں کے لئے جمع کرا دوں گا جو میرے مقابل پر مباہلہ کے میدان میں آویں گے۔ یہ کام نہایت ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ زندہ اور قادر خدا ہمارے ساتھ ہے۔ عیسائی بھی کہتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہے۔

اب اس مباہلہ سے بڑا فائدہ ہوگا کہ پبلک کو معلوم ہو جائے گا کہ کس قوم کے ساتھ خدا ہے اور اگر عیسائی قبول نہ کریں تو لعنت کا ذخیرہ اُن کے لئے آسمان پر جمع ہوگا اور لوگ سمجھ جائیں گے کہ وہ جھُوٹے ہیں۔ ہمارے مخاطب ڈاکٹر کلارک۔ پادری عماد الدین۔ حسام الدین ایڈیٹر کشف الحقائق۔ منشی صفدر علی بھنڈارہ۔ پادری فتح مسیح اور ہر ایک ایسا شخص جو پادری اور معاند اسلام ہو درخواست کرے۔ یہ طریق فیصلہ بہتر ہے۔ تا دُنیا روز کے جھگڑوں سے نجات پاوے تا سیاہ رُوئے شود ہر کہ دروغش باشد۔ والسّلام علےٰ من اتبع الھدیٰ

المشتھر مرزا غلام احمد از قادیان

(انجام آتھم صـ۳۳ـ)

اللہ جلّ شانہ کی قسم ہے کہ مجھے صاف طور پر اللہ جلّ شانہٗ نے اپنے الہام سے فرما دیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السّلام بلاتفاوت ایسا ہی انسان تھا جس طرح اور انسان ہیں مگر خدا تعالیٰ کا

سچا نبی اور اس کا مُرسل اور برگزیدہ ہے اور مجھ کو یہ بھی فرمایا کہ جو مسیح کو دیا گیا وہ بمتابعت نبی علیہ السلام تجھ کو دیا گیا ہے اور تو مسیح موعود ہے اور تیرے ساتھ ایک نُورانی حربہ ہے جو ظلمت کو پاش پاش کرے گا اور یکسر الصلیب کا مصداق ہوگا۔ پس جبکہ یہ بات ہے تو میری سچائی کے لئے یہ ضروری ہے کہ میری طرف سے بعد مباہلہ ایک سال کے اندر ضرور نشان ظاہر ہو اور اگر نشان ظاہر نہ ہو تو پھر میں خدا تعالےٰ کی طرف سے نہیں ہوں اور نہ صرف وہی سزا بلکہ موت کی سزا کے لائق ہوں۔ سو آج مَیں ان تمام باتوں کو قبول کرکے اشتہار دیتا ہوں۔ اب بعد شائع ہونے اس اشتہار کے مناسب اور واجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب بھی اس قدر اشتہار دے دیں کہ اگر بعد مباہلہ مرزا غلام احمد کی تائید میں ایک سال کے اندر کوئی نشان ظاہر ہو جائے جس کے مقابل پر اسی سال کے اندر ہم نشان دکھلانے سے عاجز آجائیں تو بلا توقف دین اسلام قبول کر لیں گے ورنہ اپنی تمام جائیداد کا نصف حصہ دینِ اسلام کی امداد کی غرض سے فریق غالب کو دیدیں گے اور آئندہ اسلام کے مقابل پر کبھی کھڑے نہیں ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت سوچ لیویں کہ مَیں نے اپنی نسبت بہت زیادہ سخت شرائط رکھی ہیں اور اُن کی نسبت شرطیں نرم رکھی گئی ہیں یعنی اگر میرے مقابل پر وہ نشان دکھلائیں اور مَیں بھی دکھلاؤں تب بھی بموجب اس شرط کے وہی سچے قرار پائیں گے اور اگر نہ میں نشان دکھلا سکوں اور نہ وہ ایک سال تک نشان دکھلا سکیں تب بھی وہی سچے قرار پائیں گے اور میں صرف اس حالت میں سچا قرار پاؤں گا کہ میری طرف سے ایک سال کے اندر ایسا نشان ظاہر ہو جس کے مقابلہ سے ڈاکٹر صاحب عاجز رہیں اور اگر ڈاکٹر صاحب بعد اشاعت اس اشتہار کے ایسے مضمون کا اشتہار بالمقابل شائع نہ کریں تو پھر صریح ان کی گریز متصور ہوگی اور ہم پھر بھی ان کی منقولی معقولی بحث کے لئے حاضر ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس بارے میں یعنی نشان نمائی کے امر میں اپنا اور اپنی قوم کا اسلام کے مقابل پر عاجز ہونا شائع کر دیں یعنی یہ لکھ دیں کہ یہ اسلام ہی کی شان ہے کہ اس سے آسمانی نشان ظاہر ہوں۔ اور عیسائی مذہب ان برکات سے خالی ہے۔

(حجۃ الاسلام صـ ۹-۱۰)

واضح ہو کہ وہ پیشگوئی جو امرتسر کے عیسائیوں کے ساتھ مباحثہ ہو کر ۵؍جون ۱۸۹۳ء میں کی گئی تھی جس کی آخری تاریخ ۵؍ستمبر ۱۸۹۴ء تھی وہ خدا تعالیٰ کے ارادہ اور حکم کے موافق ایسے طور سے اور ایسی صفائی سے میعاد کے اندر پُوری ہو گئی کہ ایک منصف اور دانا کو بجُز اس کے ماننے اور قبول کرنے کے بن نہیں پڑتا . . . .

اگر عیسائی صاحبان اب بھی جھگڑیں اور اپنی مکارانہ کارروائیوں کو کچھ چیز سمجھیں یا کوئی اَور شخص

اس میں شک کرے تو اس بات کے تصفیہ کے لئے کہ فتح کس کو ہوئی۔ آیا اہلِ اسلام کو جیسا کہ درحقیقت ہے یا عیسائیوں کو جیسا کہ وہ ظلم کے راہ سے خیال کرتے ہیں تو میں ان کی پردہ دری کے لئے مباہلہ کے لئے طیار ہوں۔ اگر وہ دروغگوئی اور چالاکی سے باز نہ آئیں تو مباہلہ اس طور پر ہوگا کہ ایک تاریخ مقرر ہو کر ہم فریقین ایک میدان میں حاضر ہوں اور مسٹر عبداللہ آتھم صاحب کھڑے ہو کر تین مرتبہ ان الفاظ کا اقرار کریں کہ اس پیشگوئی کے عرصہ میں اسلامی رُعب ایک طرفۃ العین کے لئے بھی میرے دل پر نہیں آیا اور میں اسلام اور نبیٔ اسلام (صلے اللہ علیہ وسلم) کو ناحق پر سمجھتا رہا اور سمجھتا ہوں اور صداقت کا خیال تک نہیں آیا اور حضرت عیسٰی کی ابنیت اور الوہیت پر یقین رکھتا رہا اور رکھتا ہوں۔ اور ایسا ہی یقین جو فرقہ پروٹسٹنٹ کے عیسائی رکھتے ہیں اور اگر میں نے خلاف واقعہ کہا ہے اور حقیقت کو چھپایا ہے تو اے خدائے قادر مجھ پر ایک برس میں عذاب موت نازل کر۔ اس دعا پر ہم آمین کہیں گے اور اگر دعا کا ایک سال تک اثر نہ ہوا اور وہ عذاب نازل نہ ہوا جو جھوٹوں پر نازل ہوتا ہے تو ہم ہزار روپیہ مسٹر عبداللہ آتھم صاحب کو بطور تاوان کے دیں گے۔

(تبلیغ رسالت جلد سوم ص۹۶ - ۱۰۲)

ہم مسٹر عبداللہ آتھم صاحب کو یہ تکلیف نہیں دیتے ہیں کہ وہ امرتسر میں ہمارے مکان پر آویں۔ بلکہ ہم ان کے بُلانے کے بعد مع ہزار روپیہ کے ان کے مکان پر آویں گے . . . . . اور اُن کو کسی قدم رنجہ کی تکلیف نہ دیں گے۔ ہم ان کو اتنی بھی تکلیف نہیں دیں گے کہ اس اقرار کے لئے کھڑے ہو جائیں یا بیٹھ جائیں بلکہ وہ بخوشی اپنے بستر پر ہی لیٹے رہیں اور تین مرتبہ وہ اقرار کر دیں جو لکھ دیا گیا ہے۔

(تبلیغ رسالت جلد سوم ص۱۲۴ - ۱۲۵)

اگر اب بھی بعض متعصب ناقص الفہم لوگ شک رکھتے ہیں تو اب ہم یہ دوسرا اشتہار دو ہزار روپیہ کے انعام کے شرط سے نکالتے ہیں۔ اگر آتھم صاحب جلسہ عام میں تین مرتبہ قسم کھا کر کہہ دیں۔ کہ مَیں نے پیشگوئی کی مدت کے اندر عظمت اسلامی کو اپنے دل پر جگہ ہونے نہیں دی اور برابر دشمنِ اسلام رہا اور حضرت عیسٰی کی ابنیّت اور الوہیت اور کفارہ پر مضبوط ایمان رکھا تو اسی وقت نقد دو ہزار روپیہ ان کو بہ شرائط قرارداده اشتہار ۹ ستمبر ۱۸۹۴ء بلا توقف دیا جائے گا . . . . .

اگر اب بھی آتھم صاحب باوجود اس قدر انعام کثیر کے قسم کھانے سے منہ پھیر لیں تو تمام دشمن و دوست یاد رکھیں کہ انہوں نے محض عیسائیوں سے خوف کھا کر حق کو چھُپایا ہے اور اسلام غالب اور

فتحیاب ہے . . . .

ہمارے مخالف یاد رکھیں کہ اب بھی آتھم صاحب ہرگز قسم نہیں کھائیں گے۔ کیوں نہیں کھائیں گے اپنے جھوٹا ہونے کی وجہ سے۔ اور یہ کہنا کہ شاید ان کو یہ دھڑکا ہو کہ ایک برس میں مرنا ممکن ہے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ کون مارے گا؟ کیا اُن کا خداوند مسیح یا اَور کوئی؟ پس جبکہ یہ دو خداؤں کی لڑائی ہے ایک سچّا خدا جو ہمارا خدا ہے اور ایک مصنوعی خدا جو عیسائیوں نے بنا لیا ہے تو پھر اگر آتھم صاحب حضرت مسیح کی خدائی اور اقتدار پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ آزما بھی چکے ہیں تو پھر اُن کی خدمت میں عرض کر دیں کہ اب اس قطعی فیصلہ کے وقت میں مجھ کو ضرور زندہ رکھیو۔ یوں تو موت کی گرفت سے کوئی بھی باہر نہیں۔ اگر آتھم صاحب چونسٹھ برس کے ہیں تو عاجز قریباً ساٹھ برس کا ہے: اور ہم دونوں پر قانون قدرت یکساں مؤثر ہے۔ لیکن اگر اسی طرح قسم کسی راستی کی آزمائش کے لئے ہم کو دی جائے تو ہم ایک برس کیا دس برس تک اپنے زندہ رہنے کی قسم کھا سکتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ دینی بحث کے وقت میں ضرور خدا تعالےٰ ہماری مدد کرے گا . . . . . . حضرت یہ تو دو خداؤں کی لڑائی ہے۔ اب وہی غالب ہوگا جو سچا خدا ہے۔ جبکہ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے خدا کی ضرور یہ قدرت ظاہر ہوگی کہ اس قسم والے برس میں ہم نہیں مریں گے۔ لیکن اگر آتھم صاحب نے جھوٹی قسم کھا لی تو ضرور فوت ہو جائیں گے تو جائے انصاف ہے کہ آتھم صاحب کے خدا پر کیا حادثہ نازل ہوگا کہ وہ اُن کو بچا نہیں سکے گا اور منجی ہونے سے استعفیٰ دے دیگا۔ غرض اب گریز کی کوئی وجہ نہیں۔ یا تو مسیح کو قادر خدا کہنا چھوڑ دیں اور یا قسم کھا لیں۔ ہاں اگر عام مجلس میں یہ اقرار کر دیں کہ ان کے مسیح ابن اللہ کو برس تک زندہ رکھنے کی تو قدرت نہیں مگر برس کے تیسرے حصہ یا تین دن تک البتہ قدرت ہے اور اس مدت تک اپنے پرستار کو زندہ رکھ سکتا ہے تو ہم اس اقرار کے بعد چار مہینہ یا تین ہی دن تسلیم کر لیں گے۔

(تبلیغ رسالت جلد سوم صـ ۱۳۰-۱۳۶)

از طرف عبد اللہ الاحد احمد عافاہ اللہ و ایّد۔ آتھم صاحب کو معلوم ہو کہ مَیں نے آپ کا وہ خط پڑھا جو آپ نے نور افشاں ۲۱ ستمبر ۱۸۹۴ء کے صفحہ ۵ میں چھپوایا ہے۔ مگر افسوس کہ آپ اس خط میں دونوں ہاتھ سے کوشش کر رہے ہیں کہ حق ظاہر نہ ہو۔ مَیں نے خدا تعالیٰ سے سچا اور پاک الہام پا کر یقینی اور قطعی طور پر جیسا کہ آفتاب نظر آجاتا ہے معلوم کر لیا ہے کہ آپ نے میعاد پیشگوئی کے اندر اسلامی عظمت اور صداقت کا سخت اثر اپنے دل پر ڈالا اور اسی بنا پر پیشگوئی کے وقوع

کا ہم و غم کمال درجہ پر آپ کے دل پر غالب ہوا۔ میں اللہ جلّشانہٗ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ بالکل صحیح ہے اور خدا تعالیٰ کے مکالمہ سے مجھ کو یہ اطلاع ملی ہے اور اس پاک ذات نے مجھے یہ اطلاع دی ہے کہ جو انسان کے دل کے تصورات کو جانتا اور اس کے پوشیدہ خیالات کو دیکھتا ہے۔ اور اگر میں اس بیان میں حق پر نہیں تو خدا مجھ کو آپ سے پہلے موت دے۔ پس اسی وجہ سے میں نے چاہا کہ آپ مجلسِ عام میں قسمِ غلیظ مؤکد بعذاب موت کھاویں ایسے طریق سے جو مَیں بیان کر چکا ہوں تا میرا اور آپ کا فیصلہ ہو جائے اور دُنیا تاریکی میں نہ رہے۔ اور اگر آپ چاہیں گے تو مَیں بھی ایک برس یا دو برس یا تین برس کے لئے قسم کھا لوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ سچا ہرگز برباد نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہلاک ہوگا جس کو جھوٹ نے پہلے سے ہلاک کر دیا ہے۔ اگر صدقِ الہام اور صدقِ اسلام پر مجھے قسم دی جائے تو میں آپ سے ایک پیسہ نہیں لیتا لیکن آپ کی قسم کھانے کے وقت تین ہزار کے بدرے پہلے پیش کئے جائیں گے۔

(تبلیغ رسالت جلد سوم ص ۱۵۸)

یہ بوجھ آتھم صاحب کی گردن پر ہے کہ اپنے اقرار کو بے ثبوت نہ چھوڑیں بلکہ قسم کے طریق سے جو ایک سہل طریق ہے اور جو ہمارے نزدیک قطعی اور یقینی ہے ہمیں مطمئن کر دیں کہ وہ پیشگوئی کی عظمت سے نہیں ڈرے بلکہ وہ فی الحقیقت ہمیں ایک خونی انسان یقین کرتے اور ہماری تلواروں کی چمک دیکھتے تھے اور ہم انہیں کچھ بھی تکلیف نہیں دیتے بلکہ اس قسم پر چار ہزار روپیہ بشرائط اشتہار ۹ ستمبر ۱۸۹۴ء و ۲۰ ستمبر ۱۸۹۴ء ان کی نذر کریں گے اور ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کا یہ عذر کہ مسیحیوں کو قسم کھانے کی ممانعت ہے۔ سخت ہٹ دھرمی اور بے ایمانی ہے کیا پطرس اور پولس اور بہت سے عیسائی راستباز جو اوّل زمانہ میں گذر چکے ۔۔۔ مسیحی نہیں تھے یا وہ بے ایمان تھے . . . .

اب اگر آتھم صاحب قسم کھا لیویں تو وعدہ ایک سال قطعی اور یقینی ہے جس کے ساتھ کوئی بھی شرط نہیں اور تقدیر مبرم ہے اور اگر قسم نہ کھاویں تو پھر بھی خدا تعالیٰ ایسے مجرم کو بے سزا نہیں چھوڑے گا۔ جس نے حق کا اخفا کر کے دنیا کو دھوکہ دینا چاہا۔

(تبلیغِ رسالت جلد سوم ص ۱۷۵-۱۷۷)

جاننا چاہیئے کہ اللہ جلّشانہٗ نے نجات کے بارہ میں قرآن کریم میں یہ فرمایا ہے۔ وقالوا لن یدخل الجنّة الّا من کان ھوداً او نصاریٰ تلك امانیھم قل ھاتوا برھانکم

ان کنتم صادقین۔ بلیٰ من اسلم وجہہٗ للہ وھو محسن فلہٗ اجرہٗ عند ربّہ ولا خوف علیھم ولاھم یحزنون۔ اور کہا انھوں نے کہ ہرگز بہشت میں داخل نہیں ہوگا یعنی نجات نہیں پائے گا مگر وہی شخص جو یہودی ہوگا یا نصرانی ہوگا۔ یہ ان کی بے حقیقت آرزوئیں ہیں۔ کہو لاؤ برہان اپنی اگر تم سچے ہو۔ یعنی تم دکھلاؤ کہ تمہیں کیا نجات حاصل ہوگئی ہے۔ بلکہ نجات اس کو ملتی ہے جس نے اپنا سارا وجود اللہ کی راہ میں سونپ دیا۔ یعنی اپنی زندگی کو خدا تعالےٰ کی راہ میں وقف کردیا اور اس کی راہ میں لگا دیا اور وہ بعد وقف کرنے اپنی زندگی کے نیک کاموں میں مشغول ہوگیا۔ اور ہر ایک قسم کے اعمالِ حسنہ بجا لانے لگا۔ پس وہی شخص ہے جس کو اس کا اجر اس کے رب کے پاس سے ملے گا اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ ڈر ہے اور نہ وہ کبھی غمگین ہوں گے۔ یعنی وہ پورے اور کامل طور پر نجات پا جائیں گے۔ اس مقام میں اللہ جلّشانہٗ نے عیسائیوں اور یہودیوں کی نسبت فرما دیا کہ جو وہ اپنی اپنی نجات یابی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں اور اُن آرزوؤں کی حقیقت جو زندگی کی رُوح ہے اُن میں ہرگز پائی نہیں جاتی بلکہ اصلی اور حقیقی نجات وہ ہے جو اسی دُنیا میں اس کی حقیقت نجات یابندہ کو محسوس ہو جائے اور وہ اس طرح پر ہے کہ نجات یابندہ کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ توفیق عطا ہو جائے کہ وہ اپنا تمام وجود خدا تعالےٰ کی راہ میں وقف کردے اس طرح پر کہ اس کا مرنا اور جینا اور اس کے تمام اعمال خدا تعالیٰ کے لئے ہو جائیں اور اپنے نفس سے وہ بالکل کھویا جائے اور اس کی مرضی خدا تعالےٰ کی مرضی ہو جائے اور پھر نہ صرف دل کے عزم تک یہ بات محدود رہے بلکہ اس کی تمام جوارح اور اس کے تمام قویٰ اور اس کی عقل اور اس کا فکر اور اس کی تمام طاقتیں اسی راہ میں لگ جائیں تب اس کو کہا جائے گا کہ وہ محسن ہے یعنی خدمت گاری کا اور فرماں برداری کا حق بجا لایا۔ جہانتک اس کی بشریّت سے ہو سکتا تھا سو ایسا شخص نجات یاب ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام میں اللہ فرماتا ہے۔ قل انّ صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ ربّ العالمین۔ لاشریک لہٗ وبذٰلک امرتُ وانا اوّل المسلمین (پ۸ سورہ انعام رکوع ۲) کہ نماز میری اور عبادتیں میری اور زندگی میری اور موت میری تمام اس اللہ تعالیٰ کے واسطے ہیں جو رب ہے عالموں کا جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی درجہ کے حاصل کرنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں اوّل مسلمانوں کا ہوں۔

پھر بعد اس کے اللہ جلّشانہٗ اس نجات کی علامات اپنی کتاب کریم میں لکھتا ہے کیونکہ گو جو کچھ فرمایا گیا وہ بھی ایک حقیقی ناجی کے لئے مابہ الامتیاز ہے۔ لیکن چونکہ دُنیا کی آنکھیں اس باطنی نجات اور وصول

الی اللہ کو دیکھ نہیں سکتیں اور دُنیا پر واصل اور غیر واصل کا امر مشتبہ ہو جاتا ہے اس لئے اس کی نشانیاں بھی بتلا دیں کیونکہ یُوں تو دُنیا میں کوئی بھی فرقہ نہیں کہ اپنے تئیں غیر ناجی اور جہنمی قرار دیتا ہے کسی سے پوچھ کر دیکھ لیں۔ بلکہ ہر ایک قوم کا آدمی جس کو پوچھو اپنی قوم کو اور اپنے مذہب کے لوگوں کو اوّل درجہ کا نجات یافتہ قرار دے گا۔ اس صورت میں فیصلہ کیونکر ہو تو اس فیصلہ کے لئے خدا تعالےٰ نے حقیقی اور کامل ایمانداروں اور حقیقی اور کامل نجات یافتہ لوگوں کے لئے علامتیں مقرر کر دی ہیں اور نشانیاں قرار دے دی ہیں تا دُنیا شبہات میں مبتلا نہ رہے۔ چنانچہ منجملہ ان نشانیوں کے بعض نشانیوں کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔ الآ انّ اولیاء اللہ لاخوف علیھم و لاھم یحزنون الذین اٰمنوا وکانوا یتقون۔ لھم البُشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ لاتبدیل لکلمات اللہ ذالك ھو الفوز العظیم (س۱۱ رکوع ۱۲ سورہ یونس) یعنی خبردار ہو تحقیق وہ لوگ جو خدا تعالےٰ کے دوست ہیں ان پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے یعنی اللہ رسُول کے تابع ہو گئے اور پھر پرہیزگاری اختیار کی۔ ان کے لئے خدا تعالےٰ کی طرف سے اس دُنیا کی زندگی اور نیز آخرت میں بُشریٰ ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ خواب اور الہام کے ذریعہ سے اور نیز مکاشفات سے اُن کو بشارتیں دیتا رہے گا۔ خدا تعالیٰ کے وعدوں میں تخلف نہیں اور یہ بڑی کامیابی ہے جو اُن کے لئے مقرر ہو گئی۔ یعنی اس کامیابی کے ذریعہ سے ان میں اور غیروں میں فرق ہو جائے گا اور جو سچے نجات یافتہ نہیں ان کے مقابل میں دم نہیں مار سکیں گے۔ پھر دوسری جگہ فرماتا ہے انّ الّذین قالوا ربّنا اللہ ثمّ استقاموا تتنزّل علیھم الملائکۃ الّا تخافوا ولا تحزنوا و ابشروا بالجنّۃ الّتی کنتم توعدون۔ نحن اولیٰؤکم فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ و لکم فیھا ما تشتھی انفسکم و لکم فیھا ما تدعون نزلًا من غفور رحیم (س۲۴ رکوع ۱۸) یعنی جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر استقامت اختیار کی۔ ان کی یہ نشانی ہے کہ ان پر فرشتے اُترتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ تم مت ڈرو اور کچھ غم نہ کرو اور خوشخبری سنو اس بہشت کی جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا تھا۔ ہم تمہارے دوست اور متولّی اِس دُنیا کی زندگی میں ہیں۔ اور نیز آخرت میں اور تمہارے لئے اس بہشت میں وہ سب کچھ دیا گیا جو تم مانگو۔ یہ مہمانی ہے غفور رحیم سے۔

اب دیکھئے اس آیت میں مکالمہ الٰہیہ اور قبولیت اور خدا تعالیٰ کا متولّی اور متکفل ہونا اور اسی دُنیا میں بہشتی زندگی کی بنا ڈالنا اور ان کا حامی اور ناصر ہونا بطور نشان کے بیان فرمایا گیا۔

اور پھر اس آیت میں جس کا کل ہم ذکر کر چکے ہیں یعنی یہ کہ تؤتی اکلھا کلّ حین اسی نشانی

کی طرف اشارہ ہے کہ سچی نجات کا پانے والا ہمیشہ اچھے پھل لاتا ہے اور آسمانی برکات کے پھل اس کو ہمیشہ ملتے رہتے ہیں اور پھر ایک اَور مقام میں فرماتا ہے واذا سألك عبادی عنی فانّی قریب اجیب دعوة الداع اذا دعان فلیستجیبوالی ولیومنوا بی لعلھم یرشدون (س۲ ع۷) اور جب میرے بندے میرے بارہ میں سوال کریں تو ان کو کہدے کہ میں نزدیک ہوں۔ یعنی جب وہ لوگ جو اللہ رسُول پر ایمان لائے ہیں یہ پتہ پوچھنا چاہیں کہ خدا تعالیٰ ہم سے کیا عنایات رکھتا ہے جو ہم سے مخصوص ہوں اور غیروں میں نہ پائی جاویں۔ تو اُن کو کہدے کہ میں نزدیک ہوں یعنی تم میں اور تمہارے غیروں میں یہ فرق ہے کہ تم میرے مخصوص اور قریب ہو اور دوسرے مہجور اور دُور ہیں۔ جب کوئی دعا کرنے والوں میں سے جو تم میں سے دُعا کرتے ہیں دُعا کرے تو مَیں اس کا جواب دیتا ہوں۔ یعنی مَیں اس کا ہمکلام ہوجاتا ہوں اور اس سے باتیں کرتا ہوں اور اس کی دُعا کو پایۂ قبولیت میں جگہ دیتا ہوں۔ پس چاہیئے کہ قبول کریں حکم میرے کو اور ایمان لاویں تاکہ بھلائی پاویں۔ ایسا ہی اَور کئی مقامات میں اللہ جلّشانہٗ نجات یافتہ لوگوں کے نشان بیان فرماتا ہے اگر وہ تمام لکھے جاویں تو طول ہوجائے گا جیسا کہ اُن میں سے ایک یہ بھی آیت ہے یاایھا الّذین اٰمنوا ان تتقوا اللّٰہ یجعل لکم فرقاناً (س۹ ع۱۸ سورۂ انفال) کہ اے ایمان والو اگر تم خدا تعالیٰ سے ڈرو تو خدا تعالیٰ تم میں اور تمہارے غیروں میں مابہ الامتیاز رکھ دے گا۔

اب میں ڈپٹی عبداللہ آتھم صاحب سے بادب دریافت کرتا ہوں کہ اگر عیسائی مذہب میں طَریق نجات کا کوئی لکھا ہے اور وہ طریق آپ کی نظر میں صحیح اور درست ہے اور اس طریق پر چلنے والے نجات پاجاتے ہیں تو ضرور اس نجات یابی کی علامات بھی اس کتاب میں لکھی ہوں گی اور سچے ایماندار جو نجات پاکر اس دنیا کی ظلمت سے مخلصی پاجاتے ہیں۔ ان کی نشانیاں ضرور انجیل میں کچھ لکھی ہوں گی۔ آپ براہ مہربانی مجھ کو مختصر جواب دیں کہ کیا وہ نشانیاں آپ صاحبوں کے گروہ میں یا بعض ایسے صاحبوں میں جو بڑے بڑے مقدس اور اس گروہ کے سردار اور پیشوا اور اوّل درجہ پر ہیں پائی جاتی ہیں۔ اگر پائی جاتی ہیں تو ان کا ثبوت عنایت ہو اور اگر نہیں پائی جاتیں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس چیز کی صحت اور درستی کی نشانی نہ پائی جائے تو کیا وہ چیز اپنے اصل پر محفوظ اور قائم سمجھی جائے گی۔ مثلاً اگر تربد یا سقمونیا یا سنا میں خاصہ اسہال کا نہ پایا جائے کہ وہ دست آور ثابت نہ ہو تو کیا اس تربد کو تربد موصوف یا سقمونیا خالص کہہ سکتے ہیں۔ اور ماسوا اس کے جو آپ صاحبوں نے طریقِ نجات شمار کیا ہے۔ جس وقت ہم اس طریق کو اس دوسرے طریق کے ساتھ جو

قرآن کریم نے پیش کیا ہے مقابل کر کے دیکھتے ہیں تو صاف طور پر آپ کے طریق کا تصنع اور غیر طبعی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بات بپایۂ ثبوت پہنچتی ہے کہ آپ کے طریق میں کوئی صحیح راہ نجات کا قائم نہیں کیا گیا۔ مثلاً دیکھئے کہ اللہ جلشانہ **قرآن کریم** میں جو طریق پیش کرتا ہے وہ تو یہ ہے کہ انسان جب اپنے تمام وجود کو اور اپنی تمام زندگی کو خدا تعالےٰ کی راہ میں وقف کر دیتا ہے تو اس صورت میں ایک سچّی اور پاک قربانی اپنے نفس کے قربان کرنے سے وہ ادا کر چکتا ہے اور اس لائق ہو جاتا ہے کہ **موت** کے عوض میں **حیات** پاوے . . . .

اب مختصر بیان یہ ہے کہ آپ کے نزدیک یہ طریق نجات کا جو قرآن شریف نے پیش کیا ہے، صحیح نہیں ہے۔ تو اوّل آپ کو چاہیئے کہ اس طریق کے مقابل پر جو حضرت **مسیح** کی زبان سے ثابت ہوتا ہے اس کو ایسا ہی مدلّل اور معقول طور پر ان کی تقریر کے حوالہ سے پیش کریں۔ پھر بعد اس کے انہیں کے قول مبارک سے اس کی نشانیاں بھی پیش کریں تاکہ تمام حاضرین جو اس وقت موجود ہیں، ابھی فیصلہ کر لیں۔ ڈپٹی صاحب! کوئی حقیقت بغیر نشانوں کے ثابت نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں بھی ایک معیار حقائق شناسی کا ہے کہ اُن کو اُن کی نشانیوں سے پرکھا جائے۔ سو ہم نے تو وہ نشانیاں پیش کر دیں اور ان کا دعویٰ بھی اپنی نسبت پیش کر دیا۔ اب یہ **قرضہ** ہمارا آپ کے ذمہ ہے۔ اگر آپ پیش نہیں کریں گے اور ثابت کر کے نہیں دکھلائیں گے کہ یہ طریق نجات جو حضرت **مسیح** کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کس وجہ سے سچا اور صحیح اور کامل ہے تو اس وقت تک آپ کا یہ دعویٰ ہرگز صحیح نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ **قرآن کریم** نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صحیح اور سچا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے صرف بیان ہی نہیں کیا بلکہ کر کے بھی دکھا دیا۔ اور اس کا ثبوت میں پیش کر چکا ہوں۔ آپ براہ مہربانی اب اس نجات کے قصّہ کو بے دلیل اور بے وجہ صرف دعویٰ کے طور پر پیش نہ کریں۔ کوئی صاحب آپ میں سے کھڑے ہو کر اس وقت بولیں کہ میں بموجب فرمودہ حضرت **مسیح** کے نجات پا گیا ہوں اور وہ نشانیاں نجات کی اور کامل ایمانداری کی جو حضرت مسیح نے مقرر کی تھیں وہ مجھ میں موجود ہیں۔ پس ہمیں کیا انکار ہے۔ ہم تو نجات ہی چاہتے ہیں۔ لیکن زبان کی لسّانی کو کوئی قبول نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ **قرآن** کا نجات دینا میں نے بچشم خود دیکھ لیا ہے۔ اور مَیں پھر اللہ تعالےٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مَیں بالمقابل اس بات کو دکھلانے کو حاضر ہوں۔ لیکن اوّل آپ دو حرفی مجھے جواب دیں کہ آپ کے مذہب میں سچی نجات معہ اس کی علامات کے پائی جاتی ہے یا نہیں۔ اگر پائی جاتی ہے تو دکھلاؤ۔ پھر اس کا مقابلہ کرو۔ اگر نہیں پائی جاتی تو آپ صرف اتنا کہہ دو کہ ہمارے مذہب میں

نجات نہیں پائی جاتی۔ پھر میں یک طرفہ ثبوت دینے کے لئے مستعد ہوں۔

(جنگ مقدس ص ۶۱-۶۷)

آتھم صاحب ہرگز قسم نہیں کھائیں گے۔ اگر پادری صاحبان ملامت کرتے کرتے اُن کو ذبح بھی کر ڈالیں تب بھی وہ میرے مقابل پر قسم کھانے کے لئے ہرگز نہیں آئیں گے کیونکہ وہ دل میں جانتے ہیں کہ پیشگوئی پُوری ہو گئی۔ میری سچائی کے لئے یہ نمایاں دلیل کافی ہے کہ آتھم صاحب میرے مقابل پر میرے مواجہ میں ہرگز قسم نہیں اٹھائیں گے۔ اگرچہ عیسائی لوگ اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور اگر وہ قسم کھالیں تو یہ پیشگوئی بلاشبہ دوسرے پہلو پر پُوری ہو جائے گی۔ خدا کی باتیں ٹل نہیں سکتیں۔

(تبلیغ رسالت جلد چہارم ص ۸)

۲ مئی ۱۹۰۶ء کی ڈاک میں مجھے دہلی کے اندھے عیسائی احمد مسیح کا وہ اشتہار ملا تھا جس میں عیسائی مذکور نے اسلام اور عیسائیت کے درمیان آخری فیصلہ کرنے کے واسطے مجھے مباہلہ کے واسطے طلب کیا۔ اس کے جواب میں پانچ مئی کے اشتہار میں مَیں نے اس دعوت کو قبول کیا بدیں شرط کہ لاہور، کلکتہ، مدراس اور بمبئی چار مقامات کے بشپ صاحبان اس مباہلہ میں شامل ہوں اور اس شمولیت کے واسطے ان کے لئے تکلیف سفر برداشت کرنے اور کسی ایک جگہ جمع ہونے کی بھی شرط قرار نہیں دی کیونکہ میرے نزدیک مباہلہ تحریری بھی ہو سکتا ہے۔ . . . . آج مجھے خیال آیا ہے کہ اس مباہلہ میں عیسائی صاحبان کو اَور بھی سہولت دی جاوے تاکہ اُن کا کوئی جھوٹا عذر بھی باقی نہ رہے۔ اس واسطے میں اعلان کرتا ہوں کہ میں مباہلہ کے واسطے خود احمد مسیح نابینا کے بالمقابل ہی طیار ہوں۔ بشپ صاحبان اگر پسند نہیں کرتے تو وہ بالمقابل اپنا نام پیش نہ کریں بلکہ اپنی تحریری سند دے کر بذریعہ چھپے ہوئے اشتہار کے اخبار پایونیر یا سول میں صرف یہ شائع کر دیں کہ احمد مسیح کا مغلوب ہونا ہر چہار بشپ صاحبان کا مغلوب ہونا سمجھا جاوے گا۔ یہ بات بھی ہم اس واسطے کہتے ہیں کہ احمد مسیح ایک گمنام آدمی ہے اور جب تک بشپ صاحبان اس کو اپنا قائم مقام نہ بناویں قوم پر کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب معاملہ بہت صاف کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ بشپ صاحبان پورے غور و فکر کے بعد اس مباہلہ کو منظور کر لیں گے۔

مکرراً یہ کہ اگر ہر چہار بشپ منظور نہ کریں تو صرف لاہور کے بشپ صاحب کی ہی تحریر کافی سمجھی جائے گی۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔ خاکسار

مرزا غلام احمد مسیح موعود۔ قادیان ۱۱ مئی ۱۹۰۶ء

(تبلیغ رسالت جلد دہم صـ ۱۱۲-۱۱۳)

میرے سچے ہونے کی یہی نشانی ہے جو مجھ سے وہ نشان ظاہر ہوتے ہیں جو انسانی طاقتوں سے برتر ہیں۔ اگر حضور ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند و انگلستان توجہ کریں تو میرا خدا قادر ہے کہ ان کی تسلّی کے لئے بھی کوئی نشان دکھا دے جو بشارت اور خوشی کا نشان ہو بشرطیکہ نشان دیکھنے کے بعد میرے پیغام کو قبول کرلیں اور میری سفارت جو یسوع مسیح کی طرف سے ہے اس کے موافق ملک میں عملدرآمد کرایا جائے۔ مگر نشان خدا کے ارادہ کے موافق ہوگا نہ انسان کے ارادہ کے موافق۔ ہاں فوق العادت ہوگا اور عظمت الٰہی اپنے اندر رکھتا ہوگا۔

(تحفہ قیصریہ صـ ۲۴)

اگر حضور ملکہ معظّمہ میرے تصدیق دعویٰ کے لئے مجھ سے نشان دیکھنا چاہیں تو میں یقین رکھتا ہوں کہ ابھی ایک سال پورا نہ ہو کہ وہ ظاہر ہو جائے اور نہ صرف یہی بلکہ دعا کر سکتا ہوں کہ یہ تمام زمانہ عافیت اور صحت سے بسر ہو لیکن اگر کوئی نشان ظاہر نہ ہو اور میں جھوٹا نکلوں تو میں اس سزا میں راضی ہوں کہ حضور ملکہ معظّمہ کے پایۂ تخت کے آگے پھانسی دیا جاؤں۔ یہ سب الحاح اس لئے ہے۔ کہ کاش ہماری محسنہ ملکۂ معظّمہ کو اس آسمان کے خدا کی طرف خیال آجائے جس سے اس زمانہ میں عیسائی مذہب بے خبر ہے۔

(تحفہ قیصریہ صـ ۲۴ حاشیہ)

اگر کوئی سچ کا طالب ہے خواہ وہ ہندو ہے یا عیسائی یا آریہ یا یہودی یا برہمو یا کوئی اور ہے اس کے لئے یہ خوب موقع ہے جو میرے مقابل پر کھڑا ہو جائے۔ اگر وہ امورِ غیبیہ کے ظاہر ہونے اور دعاؤں کے قبول ہونے میں میرا مقابلہ کر سکا تو مَیں اللہ جلّشانہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اپنی تمام جائیداد غیر منقولہ جو دس ہزار روپیہ کے قریب ہوگی اس کے حوالے کر دوں گا جس طور سے اس کی تسلّی ہو سکے اسی طور سے تاوان ادا کرنے میں اس کو تسلّی دوں گا۔ میرا خدا واحد شاہد ہے کہ میں ہرگز فرق نہیں کروں گا اور اگر سزائے موت بھی ہو تو بدل و جان روا رکھتا ہوں۔ مَیں دل سے یہ کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں سچ کہتا ہوں۔ اور اگر کسی کو شک ہو اور میری اس تجویز پر اعتبار نہ ہو تو وہ آپ ہی کوئی ایسی احسن تجویز تاوان کی پیش کرے مَیں اس کو قبول کر لوں گا۔ مَیں ہرگز عذر نہیں کروں گا۔ اگر مَیں جھوٹا

ہوں تو بہتر ہے کہ کسی سخت سزا سے ہلاک ہو جاؤں اور اگر میں سچا ہوں تو چاہتا ہوں کہ کوئی ہلاک شدہ میرے ہاتھ سے بچ جائے۔

اے حضرات پادری صاحبان جو اپنی قوم میں معزز اور ممتاز ہو۔ آپ لوگوں کو اللہ جلّشانہ کی قسم ہے جو اس طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اگر آپ لوگوں کے دلوں میں ایک ذرّہ اس صادق انسان کی محبت ہے جس کا نام عیسیٰ مسیح ہے تو میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ ضرور میرے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ آپ کو اس خدا کی قسم ہے جس نے مسیح کو مریم صدیقہ کے پیٹ سے پیدا کیا۔ جس نے انجیل نازل کی۔ جس نے مسیح کو وفات دے کر پھر مُردوں میں نہیں رکھا بلکہ اپنی زندہ جماعت ابراہیم اور موسیٰ اور یحییٰ اور دوسرے نبیوں کے ساتھ شامل کیا اور زندہ کر کے انہی کے پاس آسمان پر بُلا لیا۔ جو پہلے اس سے زندہ کئے گئے تھے کہ آپ لوگ میرے مقابلہ کے لئے ضرور کھڑے ہو جائیں۔ اگر حق تمہارے ہی ساتھ ہے اور سچ مچ مسیح خدا ہی ہے تو پھر تمہاری فتح ہے اور اگر وہ خدا نہیں ہے اور ایک عاجز اور ناتوان انسان ہے۔ اور حق اسلام میں ہے تو خدا تعالےٰ میری سُنے گا اور میرے ہاتھ پر وہ امر ظاہر کر دے گا جس پر آپ لوگ قادر نہیں ہو سکیں گے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۲۷۶ - ۲۷۷)

ایک وہ زمانہ تھا کہ پادری لوگ محض اپنے تعصب سے یہ بکواس کرتے تھے کہ قرآن شریف میں کوئی پیشگوئی نہیں اور علماء اسلام جواب تو دیتے تھے مگر سچ بات تو یہ ہے کہ پیشگوئیوں اور خوارق کے منکر کا جواب دینا اسی شخص کا کام ہے جو پیشگوئی دکھلا بھی سکے۔ ورنہ محض باتوں سے یہ تنازعہ فیصلہ پاتا نہیں پس جبکہ پادریوں کی تکذیب انتہا تک پہنچ گئی تو خدا نے حجت محمدیہ پوری کرنے کے لئے مجھے بھیجا۔ اب کہاں ہیں پادری تا میرے مقابل پر آویں۔ میں بے وقت نہیں آیا۔ میں اس وقت آیا کہ جب اسلام عیسائیوں کے پیروں کے نیچے کچلا گیا۔ اے آنکھوں کے اندھو! تمہیں سچائی کا مخالف بننا کس نے سکھلایا؟ دین تباہ ہو گیا اور بیرونی حملوں اور اندرونی بدعات نے تمام اعضاء دین کے زخمی کر دیئے اور صدی میں سے بھی تیئیس۲۳ برس گذر گئے اور کئی لاکھ مسلمان مُرتد ہو کر خدا اور رسُول کے دشمن ہو گئے۔ مگر تم کہتے ہو کہ اس وقت کوئی خدا کی طرف سے تو نہیں مگر دجّال آیا۔ بھلا اب کوئی پادری تو میرے سامنے لاؤ جو یہ کہتا ہو کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی پیشگوئی نہیں کی۔ یاد رکھو کہ وہ زمانہ مجھ سے پہلے ہی گذر گیا۔ اب وہ زمانہ آگیا جس میں خدا یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ رسُول **محمد عربی** جس کو گالیاں دی گئی تھیں۔ جس کے نام کی بے عزتی کی گئی جس کی تکذیب میں بدقسمت پادریوں نے کئی لاکھ کتابیں اس زمانہ میں

لکھ کر شائع کر دیں۔ وہی سچا اور سچوں کا سردار ہے۔ اس کے قبول میں حد سے زیادہ انکار کیا گیا مگر آخر اسی رسُول کو تاجِ عزت پہنایا گیا۔ اس کے غلاموں اور خادموں میں سے ایک میں ہوں جس سے خدا مکالمہ و مخاطبہ کرتا ہے اور جس پر خدا کے غیبوں اور نشانوں کا دروازہ کھولا گیا ہے۔ اے نادانو! تم کفر کہو یا کچھ کہو، تمہاری تکفیر کی اس شخص کو کیا پروا ہے جو خدا کے حکم کے موافق دین کی خدمت میں مشغول ہے اور اپنے پر خدا کی عنایات کو بارش کی طرح دیکھتا ہے۔ وہ خدا جو مریم کے بیٹے کے دل پر اُترا تھا وہی میرے دل پر بھی اُترا ہے مگر اپنی تجلّی میں اس سے زیادہ۔ وہ بھی بشر تھا اور میں بھی بشر ہوں اور جس طرح دھوپ دیوار پر پڑتی ہے اور دیوار نہیں کہہ سکتی کہ مَیں سُورج ہوں اس لئے ہم دونوں ان تجلّیات سے اپنے نفس کی کوئی ذاتی عزّت نہیں نکال سکتے کیونکہ وہ حقیقی آفتاب کہہ سکتا ہے کہ مجھ سے الگ ہو کر پھر دیکھ کہ تجھ میں کونسی عزت ہے۔

(حقیقۃ الوحی صـ ۲۷۳-۲۷۴)

مجھے خدا نے اپنی طرف سے قوت دی ہے کہ میرے مقابل پر مباحثہ کے وقت کوئی پادری ٹھہر نہیں سکتا اور میرا رُعب عیسائی علماء پر خدا نے ایسا ڈال دیا ہے کہ ان کو طاقت نہیں رہی کہ میرے مقابلہ پر آ سکیں۔ چونکہ خدا نے مجھے رُوح القدس سے تائید بخشی ہے اور اپنا فرشتہ میرے ساتھ کیا ہے اس لئے کوئی پادری میرے مقابل پر آ ہی نہیں سکتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی معجزہ نہیں ہوا، کوئی پیشگوئی ظہور میں نہیں آئی۔ اور اب بُلائے جاتے ہیں پر نہیں آتے۔ اس کا یہی سبب ہے کہ ان کے دلوں میں خدا نے ڈال دیا ہے کہ اس شخص کے مقابل پر ہمیں بجز شکست کے اَور کچھ نہیں۔

(تحفہ گولڑویہ صـ ۶)

اور مجھے اس خدا کی قسم ہے جس نے مجھے بھیجا ہے کہ اگر کوئی سخت دل عیسائی یا ہندو یا آریہ میرے ان گذشتہ نشانوں سے جو روزِ روشن کی طرح نمایاں ہیں انکار بھی کر دے اور مسلمان ہونے کے لئے کوئی نشان چاہے اور اس بارے میں بغیر کسی بے ہودہ حجت بازی کے جس میں بدطبیعتی کی بُو پائی جائے، سادہ طور پر یہ اقرار بذریعہ کسی اخبار کے شائع کر دے کہ وہ کسی نشان کے دیکھنے سے گو کوئی نشان ہو لیکن انسانی طاقتوں سے باہر ہو اسلام کو قبول کرے گا تو میں امید رکھتا ہوں کہ ابھی ایک سال پورا نہ ہوگا کہ وہ نشان کو دیکھ لے گا۔ کیونکہ مَیں اس زندگی میں سے نُور لیتا ہوں جو میرے نبی مُتبوع کو ملی ہے۔ کوئی نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکے۔ اب اگر عیسائیوں میں کوئی طالبِ حق ہے یا ہندوؤں اور آریوں میں سے سچائی کا متلاشی ہے تو میدان میں نکلے اور اگر اپنے مذہب کو سچا سمجھتا ہے تو بالمقابل

نشان دکھلانے کے لئے کھڑا ہو جائے لیکن میں پیشگوئی کرتا ہوں کہ ہرگز ایسا نہ ہوگا بلکہ بدنیتی سے پیچ در پیچ شرطیں لگا کر بات کو ٹال دیں گے کیونکہ اُن کا مذہب مُردہ ہے اور کوئی اُن کے لئے زندہ فیض رساں موجود نہیں جس سے وہ رُوحانی فیض پا سکیں اور نشانوں کے ساتھ چمکتی ہوئی زندگی حاصل کر سکیں۔

(تریاق القلوب صـ۱۱)

اوّل دنوں میں میرا یہ بھی خیال تھا کہ مسلمانوں سے کیونکر مباہلہ کیا جائے کیونکہ مباہلہ کہتے ہیں ایک دوسرے پر لعنت بھیجنا اور مسلمان پر لعنت بھیجنا جائز نہیں۔ مگر اب چونکہ وہ لوگ بڑے اصرار سے مجھ کو کافر ٹھہراتے ہیں اور حکم شرع یہ ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو کافر ٹھہرا دے اگر وہ شخص درحقیقت کافر نہ ہو تو وہ کُفر اُلٹ کر اسی پر پڑتا ہے جو کافر ٹھہراتا ہے۔ اسی بناء پر مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ جو لوگ تجھ کو کافر ٹھہراتے ہیں اور ابناء اور نساء رکھتے ہیں اور فتویٰ کفر کے پیشوا ہیں، اُن سے مباہلہ کی درخواست کر۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صـ۲۳۲)

پہلے صرف اس وجہ سے میں نے مباہلہ سے اعراض کیا تھا کہ مَیں جانتا تھا کہ مسلمانوں سے ملاعنہ جائز نہیں۔ مگر اب مجھ کو بتلایا گیا کہ جو مسلمان کو کافر کہتا ہے اور اس کو اہلِ قبلہ اور کلمہ گو اور عقائدِ اسلام کا معتقد پا کر پھر بھی کافر کہنے سے باز نہیں آتا وہ خود دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ سو مَیں مامور ہوں کہ ایسے لوگوں سے جو آئمۃ التکفیر ہیں اور مفتی اور مولوی اور محدّث کہلاتے ہیں اور ابناء اور نِساء بھی رکھتے ہیں، مباہلہ کروں اور پہلے ایک عام مجلس میں ایک مفصّل تقریر کے ذریعہ سے اُن کو دلائل سمجھا دوں اور اسی مجلس میں اُن کے تمام الزامات اور شبہات کا جو اُن کے دل میں خلجان کرتے ہیں جواب بھی دے دوں اور پھر اگر کافر کہنے سے باز نہ آویں تو اُن سے مباہلہ کروں۔

(آئینہ کمالات اسلام صـ۲۵۶ - ۲۵۷)

ان تمام مولویوں اور مفتیوں کی خدمت میں جو اس عاجز کو جزئی اختلافات کی وجہ سے یا اپنی نافہمی کے باعث سے کافر ٹھہراتے ہیں۔ عرض کیا جاتا ہے کہ اب مَیں خدا تعالیٰ سے مامور ہو گیا ہوں کہ تا مَیں آپ لوگوں سے مباہلہ کرنے کی درخواست کروں۔ اس طرح پر کہ اوّل آپ کو مجلسِ مباہلہ میں اپنے عقائد کے دلائل از روئے قرآن اور حدیث کے سُناؤں۔ اگر پھر بھی آپ لوگ تکفیر سے باز نہ آویں تو اسی مجلس میں مباہلہ کروں۔ سو میرے پہلے مخاطب میاں نذیر حسین دہلوی ہیں اور اگر وہ انکار کریں تو پھر شیخ محمد حسین بٹالوی اور اگر وہ انکار کریں تو پھر بعد اس کے تمام مولوی صاحبان جو مجھ

کو کافر ٹھہراتے اور مسلمانوں میں سرگروہ سمجھے جاتے ہیں اور میں ان تمام بزرگوں کو آج کی تاریخ سے جو دہم دسمبر ۱۸۹۲ء ہے، چار ماہ تک مہلت دیتا ہوں۔ اگر چار ماہ تک ان لوگوں نے مجھ سے بشرائط متذکرہ بالا مباہلہ نہ کیا اور نہ کافر کہنے سے باز آئے تو پھر اللہ تعالےٰ کی حجت ان پر پوری ہوگی۔ میں اول یہ چاہتا تھا کہ وہ تمام بے جا الزامات جو میری نسبت ان لوگوں نے قائم کرکے موجبِ کُفر قرار دیئے ہیں اس رسالہ میں ان کا جواب شائع کروں۔ لیکن بباعث بیمار ہو جانے کاتب اور حرج واقعہ ہونے کے ابھی تک وہ حصہ طبع نہیں ہو سکا۔ سو میں مباہلہ کی مجلس میں وہ مضمون بہرحال سُنا دوں گا۔ اگر اس وقت طبع ہوگیا ہو یا نہ ہوا ہو۔ لیکن یاد رہے کہ ہماری طرف سے یہ شرط ضروری ہے کہ تکفیر کا فتویٰ لکھنے والوں نے جو کچھ سمجھا ہے اوّل اس تحریر کی غلطی ظاہر کی جائے اور اپنی طرف سے دلائلِ شافیہ کے ساتھ اتمامِ حجت کیا جائے اور پھر اگر باز نہ آویں تو اسی مجلس میں مباہلہ کیا جاوے۔ اور مباہلہ کی اجازت کے بارے میں جو کلام الٰہی میرے پر نازل ہوا وہ یہ ہے :۔

نَظَرَ اللّٰهُ اِلَیْکَ مُعَطَّرًا ۔ وَ قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا قَالَ اِنِّیْٓ
اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ قَالُوْا کِتَابٌ مُّمْتَلِیْ مِنَ الْکُفْرِ وَالْکِذْبِ۔ قُلْ تَعَالَوْا
نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَکُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَکُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ ثُمَّ
نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ ۔

یعنی خدا تعالیٰ نے ایک معطّر نظر سے تجھ کو دیکھا اور بعض لوگوں نے اپنے دلوں میں کہا کہ اے خدا کیا تو زمین پر ایسے شخص کو قائم کردے گا کہ جو دنیا میں فساد پھیلا دے۔ تو خدا تعالیٰ نے اُنکو جواب دیا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اور ان لوگوں نے کہا کہ اس شخص کی کتاب ایک ایسی کتاب ہے جو کذب اور کُفر سے بھری ہوئی ہے سو اُن کو کہدے کہ آؤ ہم اور تم معہ اپنی عورتوں اور بیٹوں اور عزیزوں کے مباہلہ کریں۔ پھر ان پر لعنت کریں جو کاذب ہیں۔

یہ وہ اجازت مباہلہ ہے جو اس عاجز کو دی گئی۔

(آئینۂ کمالات اسلام ص۲۶۱ - ۲۶۶)

اب اے مخالف مولویو! اور سجادہ نشینو!! یہ نزاع ہم میں اور تم میں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور اگرچہ یہ جماعت بہ نسبت تمہاری جماعتوں کے تھوڑی سی اور فئہ قلیلہ ہے اور شاید اس وقت چار ہزار یا پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ تاہم یقیناً سمجھو کہ یہ خدا کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے خدا اس کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ وہ راضی نہیں ہوگا جب تک اس کو کمال تک نہ پہنچاوے اور وہ اس

کی آبپاشی کرے گا اور اس کے گرد احاطہ بنائے گا اور تعجب انگیز ترقیات دے گا۔ کیا تم نے کچھ کم زور لگایا۔ پس اگر یہ انسان کا کام ہوتا تو کبھی کا یہ درخت کاٹا جاتا اور اس کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔

اسی نے مجھے حکم دیا ہے کہ تا میں آپ لوگوں کے سامنے مباہلہ کی درخواست پیش کروں۔ تا جو راستی کا دشمن ہے وہ تباہ ہو جائے اور جو اندھیرے کو پسند کرتا ہے وہ عذاب کے اندھیرے میں پڑے۔ پہلے میں نے کبھی ایسے مباہلہ کی نیت نہیں کی اور نہ چاہا کہ کسی پر بد دُعا کروں۔ عبدالحق غزنوی ثم امرتسری نے مجھ سے مباہلہ چاہا مگر میں مدت تک اعراض کرتا رہا۔ آخر اس کے نہایت اصرار سے مباہلہ ہوا۔ مگر مَیں نے اس کے حق میں کوئی بد دعا نہیں کی لیکن اب مَیں بہت ستایا گیا اور دُکھ دیا گیا۔ مجھے کافر ٹھہرایا گیا۔ مجھے دجّال کہا گیا۔ میرا نام شیطان رکھا گیا۔ مجھے کذّاب اور مفتری سمجھا گیا۔ مَیں ان کے اشتہاروں میں لعنت کے ساتھ یاد کیا گیا۔ مَیں ان کی مجلسوں میں نفرین کے ساتھ پکارا گیا۔ میری تکفیر پر آپ لوگوں نے ایسی کمر باندھی کہ گویا آپ کو کچھ بھی شک میرے کُفر میں نہیں۔ ہر یک نے مجھے گالی دینا اجرِ عظیم کا موجب سمجھا اور میرے پر لعنت بھیجنا اسلام کا طریق قرار دیا۔ پر ان سب تلخیوں اور دُکھوں کے وقت خدا میرے ساتھ تھا۔ ہاں وہی تھا جو ہر یک وقت مجھ کو تسلّی اور اطمینان دیتا رہا۔ کیا ایک کیڑا ایک جہان کے مقابل کھڑا ہو سکتا ہے؟ کیا ایک ذرّہ تمام دنیا کا مقابلہ کرے گا؟ کیا ایک دروغگو کی ناپاک رُوح یہ استقامت رکھتی ہے؟ کیا ایک ناچیز مفتری کو یہ طاقتیں حاصل ہو سکتی ہیں؟

سو یقیناً سمجھو کہ تم مجھ سے نہیں بلکہ خدا سے لڑ رہے ہو۔ کیا تم خوشبو اور بدبُو میں فرق نہیں کر سکتے۔ کیا تم سچائی کی شوکت کو نہیں دیکھتے۔ بہتر تھا کہ تم خدا تعالیٰ کے سامنے روتے اور ایک ترساں اور ہراساں دل کے ساتھ اس سے میری نسبت ہدایت طلب کرتے اور پھر یقین کی پیروی کرتے نہ شک اور وہم کی۔

سو اب اُٹھو اور مباہلہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تم سُن چکے ہو کہ میرا دعویٰ دو باتوں پر مبنی تھا۔ اوّل نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ پر۔ دوسرے الہاماتِ الٰہیہ پر۔ سو تم نے نصوص قرآنیہ و حدیثیہ کو قبول نہ کیا اور خدا کی کلام کو یُوں ٹال دیا جیسا کہ کوئی تنکا توڑ کر پھینک دے۔ اب میرے بناءِ دعویٰ کا دوسرا شق باقی رہا۔ سو میں اس ذات قادر غیور کی آپ کو قسم دیتا ہوں جس کی قسم کو کوئی ایمان دار ردّ نہیں کر سکتا، کہ اب اس دوسری بناء کی تصفیہ کے لئے مجھ سے مباہلہ کر لو۔

اور یوں ہوگا کہ تاریخ اور مقام مباہلہ کے مقرر ہونے کے بعد میں ان تمام الہامات کے پرچہ کو جو لکھ چکا ہوں، اپنے ہاتھ میں لے کر میدانِ مباہلہ میں حاضر ہوں گا اور دعا کروں گا کہ یا الٰہی! اگر یہ

الہامات جو میرے ہاتھ میں ہیں میرا ہی افترا ہے اور تو جانتا ہے کہ میں نے ان کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے یا اگر یہ شیطانی وساوس ہیں اور تیرے الہام نہیں تو آج کی تاریخ سے ایک برس گذرنے سے پہلے مجھے وفات دے یا کسی ایسے عذاب میں مبتلا کر جو موت سے بدتر ہو اور اس سے رہائی عطا نہ کر جب تک کہ موت آجائے تا میری ذلّت ظاہر ہو اور لوگ جو میرے فتنہ سے بچ جائیں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میرے سبب سے تیرے بندے فتنہ اور ضلالت میں پڑیں اور ایسے مفتری کا مرنا ہی بہتر ہے۔ لیکن اے خدائے علیم وخبیر اگر تو جانتا ہے کہ یہ تمام الہامات جو میرے ہاتھ میں ہیں تیرے ہی الہام ہیں اور تیرے مُنہ کی باتیں ہیں تو ان مخالفوں کو جو اس وقت حاضر ہیں۔ ایک سال کے عرصہ تک نہایت سخت دُکھ کی مار میں مبتلا کر، کسی کو اندھا کر دے اور کسی کو مجذوم اور کسی کو مفلوج اور کسی کو مجنون اور کسی کو مصروع اور کسی کو سانپ یا سگِ دیوانہ کا شکار بنا اور کسی کے مال پر آفت نازل کر اور کسی کی جان پر اور کسی کی عزّت پر اور جب میں یہ دُعا کر چکوں تو دونوں فریق کہیں کہ آمین۔ ایسا ہی فریق ثانی کی جماعت میں سے ہر ایک شخص جو مباہلہ کے لئے حاضر ہو جناب الٰہی میں یہ دعا کرے کہ اے خدائے علیم وخبیر ہم اس شخص کو جس کا نام غلام احمد ہے، در حقیقت کذاب اور مفتری ہے اور کافر جانتے ہیں۔ پس اگر یہ شخص درحقیقت کذاب اور مفتری اور کافر اور بے دین ہے اور اس کے یہ الہام تیری طرف سے نہیں بلکہ اپنا ہی افترا ہے تو اس امت مرحومہ پر یہ احسان کر کے اس مفتری کو ایک سال کے اندر ہلاک کر دے تا لوگ اس کے فتنہ سے امن میں آجائیں؛ اور اگر یہ مفتری نہیں اور تیری طرف سے ہے اور یہ تمام الہام تیرے ہی مُنہ کی پاک باتیں ہیں تو ہم پر جو اس کو کافر اور کذّاب سمجھتے ہیں، دُکھ اور ذلّت سے بھرا ہوا عذاب ایک برس کے اندر نازل کر اور کسی کو اندھا کر دے اور کسی کو مجذوم اور کسی کو مفلوج اور کسی کو مجنون اور کسی کو مصروع اور کسی کو سانپ یا سگِ دیوانہ کا شکار بنا اور کسی کے مال پر آفت نازل کر اور کسی کی جان پر اور کسی کی عزت پر۔ اور جب یہ دعا فریق ثانی کر چکے تو دونوں فریق کہیں کہ آمین۔ اور یاد رہے کہ اگر کوئی شخص مجھے کذّاب اور مفتری تو جانتا ہے مگر کافر کہنے سے پرہیز رکھتا ہے تو اس کو اختیار ہوگا کہ اپنی دعائے مباہلہ میں صرف کذاب اور مفتری کا لفظ استعمال کرے جس پر اس کو یقین دلی ہے۔

اور اس مباہلہ کے بعد اگر میں ایک سال کے اندر مر گیا یا کسی ایسے عذاب میں مبتلا ہو گیا جس میں جاں بری کے آثار نہ پائے جائیں تو لوگ میرے فتنہ سے بچ جائیں گے۔ اور میں ہمیشہ کی لعنت

کے ساتھ ذکر کیا جاؤں گا اور میں ابھی لکھ دیتا ہوں کہ اس صورت میں مجھے کاذب اور مورد لعنت الٰہی یقین کرنا چاہیئے اور پھر اس کے بعد میں دجّال یا ملعون یا شیطان کہنے سے ناراض نہیں اور اس لائق ہوں گا کہ ہمیشہ کے لئے لعنت کے ساتھ ذکر کیا جاؤں اور اپنے مولا کے فیصلہ کو فیصلہ ناطق سمجھوں گا اور میری پیروی کرنے والا یا مجھے اچھا اور صادق سمجھنے والا خدا کے قہر کے نیچے ہوگا۔ پس اس صورت میں میرا انجام نہایت ہی بد ہوگا جیسا کہ بدذات کاذبوں کا انجام ہوتا ہے۔

لیکن اگر خدا نے ایک سال تک مجھے موت اور آفات بدنی سے بچا لیا اور میرے مخالفوں پر قہر اور غضب الٰہی کے آثار ظاہر ہو گئے اور ہر ایک ان میں سے کسی نہ کسی بلا میں مبتلا ہو گیا۔ اور میری بد دعا نہایت چمک کے ساتھ ظاہر ہو گئی تو دُنیا پر حق ظاہر ہو جائے گا اور یہ روز کا جھگڑا درمیان سے اُٹھ جائے گا۔ میں دوبارہ کہتا ہوں کہ میں نے پہلے اس سے کبھی کلمہ گو کے حق میں بد دعا نہیں کی اور صبر کرتا رہا۔ مگر اس روز خدا سے فیصلہ چاہوں گا اور اسی کی عصمت اور عزّت کا دامن پکڑوں گا کہ تا ہم میں سے فریقِ ظالم اور دروغگو کو تباہ کر کے اس دینِ متین کو شریروں کے فتنہ سے بچائے۔

میں یہ بھی شرط کرتا ہوں کہ میری دُعا کا اثر صرف اس صورت میں سمجھا جائے کہ جب تمام وہ لوگ جو مباہلہ کے میدان میں بالمقابل آویں، ایک سال تک ان بلاؤں میں سے کسی بلا میں گرفتار ہو جائیں اگر ایک بھی باقی رہا تو مَیں اپنے تئیں کاذب سمجھوں گا اگرچہ وہ ہزار ہوں یا دو ہزار اور پھر ان کے ہاتھ پر توبہ کروں گا اور اگر میں مَر گیا تو ایک خبیث کے مرنے سے دُنیا میں ٹھنڈ اور آرام ہو جائے گا۔ میرے مباہلہ میں یہ شرط ہے کہ اشخاص مندرجہ ذیل میں سے کم سے کم دس آدمی حاضر ہوں۔ اس سے کم نہ ہوں اور جس قدر زیادہ ہوں میری خوشی اور مراد ہے۔ کیونکہ بہتوں پر عذابِ الٰہی کا محیط ہو جانا ایک ایسا کھُلا کھُلا نشان ہے جو کسی پر مشتبہ نہیں رہ سکتا۔

گواہ رہ اے زمین اور اے آسمان کہ خدا کی لعنت اس شخص پر کہ اس رسالہ کے پہنچنے کے بعد نہ مباہلہ میں حاضر ہو اور نہ تکفیر اور توہین کو چھوڑے اور نہ ٹھٹھا کرنے والوں کی مجلسوں سے الگ ہو۔ اور اے مومنو! برائے خدا تم سب کہو کہ آمین۔ مجھے افسوس سے یہ بھی لکھنا پڑا کہ آج تک ان ظالم مولویوں نے اس صاف اور سیدھے فیصلے کی طرف رُخ ہی نہیں کیا تا اگر میں اُن کے خیال میں کاذب تھا تو احکم الحاکمین کے حکم سے اپنی سزا کو پہنچ جاتا۔

(انجام آتھم صہ ۶۴ - ۶۷)

میں کافی مقدار دیکھنے کے بعد مباہلہ کی رسم کو اپنی طرف سے ختم کر چکا ہوں۔ لیکن ہر ایک جو مجھے کذّاب سمجھتا ہے اور ہر ایک جو مکّار اور مفتری خیال کرتا ہے اور میرے دعویٰ مسیح موعود کے بارہ میں میرا مکذّب ہے اور جو کچھ مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوئی اس کو میرا افترا خیال کرتا ہے وہ خواہ مسلمان کہلاتا ہو یا ہندو یا آریہ یا کسی اَور مذہب کا پابند ہو اس کو بہرحال اختیار ہے کہ اپنے طور پر مجھے مقابل پر رکھ کر تحریری مباہلہ شائع کرے یعنی خدا تعالیٰ کے سامنے یہ اقرار چند اخباروں میں شائع کرے کہ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے یہ بصیرت کامل طور پر حاصل ہے کہ یہ شخص (اس جگہ تصریح سے میرا نام لکھے) جو مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرتا ہے درحقیقت کذّاب ہے اور یہ الہام جن میں سے بعض اس نے اس کتاب میں لکھے ہیں یہ خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ سب اس کا افترا ہے اور مَیں اس کو درحقیقت اپنی کامل بصیرت اور کامل غور کے بعد اور یقین کامل کے ساتھ مفتری اور کذّاب اور دجّال سمجھتا ہوں۔ پس اے خدائے قادر اگر تیرے نزدیک یہ شخص صادق ہے اور کذّاب اور مفتری اور کافر اور بے دین نہیں ہے تو میرے پر اس کی تکذیب اور توہین کی وجہ سے کوئی عذاب شدید نازل کر ورنہ اس کو عذاب میں مبتلا کر۔ آمین۔

ہر ایک کے لئے کوئی تازہ نشان طلب کرنے کے لئے یہ دروازہ کھلا ہے اور میں اقرار کرتا ہوں کہ اگر اس دعائے مباہلہ کے بعد جس کو عام طور پر مشتہر کرنا ہوگا اور کم سے کم تین نامی اخباروں میں درج کرنا ہوگا۔ ایسا شخص جو اس تصریح کے ساتھ قسم کھا کر مباہلہ کرے اور آسمانی عذاب سے محفوظ رہے تو پھر میں خدا کی طرف سے نہیں ہوں۔ اس مباہلہ میں کسی میعاد کی ضرورت نہیں۔ یہ شرط ہے کہ کوئی ایسا امر نازل ہو جس کو دل محسوس کرلیں۔

(حقیقۃ الوحی ص۶۸-۶۹)

جب سے خدا نے مجھے مسیح موعود اور مہدی معہود کا خطاب دیا ہے میری نسبت جوش اور غضب ان لوگوں کا جو اپنے تئیں مسلمان قرار دیتے ہیں اور مجھے کافر کہتے ہیں انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ پہلے میں نے صاف صاف ادلّہ کتاب اللہ اور حدیث سے اپنے دعویٰ کو ثابت کیا۔ مگر قوم نے دانستہ ان دلائل سے مُنہ پھیر لیا اور پھر میرے خدا نے بہت سے آسمانی نشان میری تائید میں دکھلائے مگر قوم نے ان سے بھی کچھ فائدہ نہ اُٹھایا اور پھر اُن میں سے کئی لوگ مباہلہ کے لئے اُٹھے اور بعض نے علاوہ مباہلہ کے الہام کا دعویٰ کرکے یہ پیشگوئی کی کہ فلاں سال یا کچھ مدت تک ان کی زندگی میں ہی یہ عاجز ہلاک ہوجائے گا مگر آخرکار وہ میری زندگی میں خود ہلاک ہوگئے۔ مگر

نہایت افسوس ہے کہ قوم کی پھر بھی آنکھ نہ کھلی اور انہوں نے یہ خیال نہ کیا کہ اگر یہ کاروبار انسان کا ہوتا تو ہر ایک پہلو سے وہ مغلوب نہ ہوتے۔ قرآن شریف اُن کو جھوٹا ٹھہراتا ہے۔ معراج کی حدیث اور حدیث امامکم منکم اُن کو جھوٹا ٹھہراتی ہے۔ مباہلوں کا انجام ان کو جھوٹا ٹھہراتا ہے۔ پھر ان کے ہاتھ میں کیا ہے جو خدا کے اس فرستادہ کی دلیری سے تکذیب کر رہے ہیں جو تقریباً چھبّیس برس سے ان کو حق اور راستی کی طرف بلا رہا ہے۔ کیا اب تک انہوں نے آیۂ کریمہ يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِىْ يَعِدُكُمْ کا مزہ نہیں چکھا۔ کہاں ہے مولوی غلام دستگیر جس نے اپنی کتاب فیض رحمانی میں میری ہلاکت کے لئے بددُعا کی تھی اور مجھے مقابل پر رکھ کر جھوٹے کی موت چاہی تھی؟ کہاں ہے مولوی چراغ دین جموں والا جس نے الہام کے دعوے سے میری موت کی خبر دی تھی اور مجھ سے مباہلہ کیا تھا؟ کہاں ہے فقیر مرزا جو اپنے مریدوں کی ایک بڑی جماعت رکھتا تھا جس نے بڑے زور شور سے میری موت کی خبر دی تھی۔ اور کہا تھا کہ عرش پر سے خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ شخص مفتری ہے آئندہ رمضان تک میری زندگی میں ہلاک ہو جائے گا۔ لیکن جب رمضان آیا تو پھر آپ ہی طاعون سے ہلاک ہو گیا۔ کہاں ہے سعد اللہ لدھیانوی؟ جس نے مجھ سے مباہلہ کیا تھا اور میری موت کی خبر دی تھی۔ آخر میری زندگی میں ہی طاعون سے ہلاک ہو گیا۔ کہاں ہے مولوی محی الدین لکھوکے والا؟ جس نے مجھے فرعون قرار دے کر اپنی زندگی میں ہی میری موت کی خبر دی تھی اور میری تباہی کی نسبت کئی اور الہام شائع کئے تھے۔ آخر وہ بھی میری زندگی میں ہی دنیا سے گذر گیا۔ کہاں ہے بابو الٰہی بخش صاحب مؤلف عصائے موسیٰ اکونٹنٹ لاہور؟ جس نے اپنے تئیں موسیٰ قرار دے کر مجھے فرعون قرار دیا تھا اور میری نسبت اپنی زندگی میں ہی طاعون سے ہلاک ہونے کی پیشگوئی کی تھی اور میری تباہی کی نسبت اور بھی بہت پیشگوئیاں کی تھیں آخر وہ بھی میری زندگی میں ہی اپنی کتاب عصائے موسیٰ پر جھوٹ اور افترا کا داغ لگا کر طاعون کی موت سے بصد حسرت مرا۔ اور ان تمام لوگوں نے چاہا کہ میں اس آیت کا مصداق ہو جاؤں کہ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ لیکن وہ آپ ہی اس آیت ممدوحہ کا مصداق ہو کر ہلاک ہو گئے اور خدا نے اُن کو ہلاک کر کے مجھ کو اس آیت کا مصداق بنایا۔ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِىْ يَعِدُكُمْ۔ کیا ان تمام دلائل سے خدا تعالےٰ کی حُجّت پُوری نہیں ہوئی۔ مگر ضرور تھا کہ مخالف لوگ انکار سے پیش آتے۔ کیونکہ پہلے سے یعنی آج سے چھبیس برس پہلے براہین احمدیہ میں خدا کی یہ پیشگوئی موجود ہے۔ دُنیا میں ایک نذیر آیا پر دُنیا نے اس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔ سو ہم ایمان

رکھتے ہیں کہ خدا اپنے حملوں کو نہیں روکے گا اور نہ بس کرے گا جب تک کہ دُنیا پر میری سچائی ظاہر نہ ہو جائے۔

لیکن آج ۱۵ رمئی ۱۹۰۸ء میرے دل میں ایک خیال آیا ہے کہ ایک اَور طریق فیصلہ کا ہے شاید کوئی خدا ترس اس سے فائدہ اُٹھاوے اور انکار کے خطرناک گرداب سے نکل آوے اور وہ طریق یہ ہے کہ میرے مخالف منکروں میں سے جو شخص اشد مخالف ہو اور مجھ کو کافر اور کذّاب سمجھتا ہو۔ وہ کم سے کم دس نامی مولوی صاحبوں یا دس نامی رئیسوں کی طرف سے منتخب ہو کر اس طور سے مجھ سے مقابلہ کرے جو دو سخت بیماروں پر ہم دونوں اپنے صدق و کذب کی آزمائش کریں۔ یعنی اس طرح پر کہ دو خطرناک بیمار لے کر جو جدا جدا بیماری کی قسم میں مبتلا ہوں قرعہ اندازی کے ذریعے سے دونوں بیماروں کو اپنی اپنی دعا کے لئے تقسیم کر لیں۔ پھر جس فریق کا بیمار بکلّی اچھا ہو جاوے یا دوسرے بیمار کے مقابلہ پر اس کی عمر زیادہ کی جاوے، وہی فریق سچا سمجھا جاوے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اور میں پہلے سے اللہ تعالیٰ کے **وعدہ** پر بھروسہ کر کے یہ خبر دیتا ہوں کہ جو بیمار میرے حصّہ میں آوے گا یا تو خدا اُسے بکلّی صحت دے گا اور یا بہ نسبت دوسرے بیمار کے اس کی عمر بڑھا دے گا اور یہی امر میری سچائی کا گواہ ہوگا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر یہ سمجھو کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں۔ لیکن یہ شرط ہوگی کہ فریق مخالف جو میرے مقابل پر کھڑا ہوگا وہ خود اور ایسا ہی دس اَور مولوی یا دس رئیس جو اس کے ہم عقیدہ ہوں یہ شائع کر دیں کہ درحالت میرے غلبہ کے وہ میرے پر ایمان لائیں گے اور میری جماعت میں داخل ہوں گے اور یہ اقرار تین نامی اخباروں میں شائع کرانا ہوگا۔ ایسا ہی میری طرف سے بھی یہی شرائط ہوں گی۔ اس قسم کے مقابلہ سے فائدہ یہ ہوگا کہ کسی خطرناک بیمار کی جو اپنی زندگی سے نومید ہو چکا ہے۔ خدا تعالیٰ جان بچائے گا اور احیائے موتیٰ کے رنگ میں ایک نشان ظاہر کرے گا اور دوسرے یہ کہ اس طور سے یہ جھگڑا بڑے آرام اور سہولت سے فیصلہ ہو جائے گا۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

المشتہر

مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود ۱۵ رمئی ۱۹۰۸ء

(چشمۂ معرفت ص ابتدائی)

میں نے حضرت شیخ الکل صاحب اور ان کے شاگردوں کی زبان درازیوں پر بہت صبر کیا۔ اور ستایا گیا اور آپ کو روکتا رہا۔ اب مَیں مامور ہونے کی وجہ سے اس دعوت اللہ کی طرف شیخ الکل صاحب

اور ان کی جماعت کو بلاتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ اس نزاع کا آپ فیصلہ کر دے گا۔ وہ دلوں کے خیالات کو جانچتا اور سینوں کے حالات کو پرکھتا ہے اور کسی سے دلآزار زیادتی اور جہر بالسوء پسند نہیں کرتا۔ وہ لاپرواہ ہے۔ متقی وہی ہے جو اس سے ڈرے اور میری اس میں کیا کسرِ شان ہے کہ اگر کوئی مجھے کُتا کہے یا کافر اور دجّال کر کے پکارے۔ درحقیقت حقیقی طور پر انسان کی کیا عزت ہے صرف اس کے نُور کے پرتوہ پڑنے سے عزّت حاصل ہوتی ہے۔ اگر وہ مجھ پر راضی نہیں اور میں اس کی نگاہ میں بُرا ہوں تو پھر کُتّے کی طرح کیا ہزار درجہ کُتّوں سے بدتر ہوں ؎

گر خدا از بندۂ خوشنود نیست ہیچ حیوانے چو او مردود نیست
گر سگِ نفسِ دنی را پروریم از سگانِ کُوچہ ہا ہم کمتریم
اے خدا اے طالبان را رہنما ایکہ مہرِ تو حیاتِ رُوحِ ما
بر رضائے خویش کُن انجامِ ما تا برآید در دو عالم کامِ ما
خلق و عالم جملہ در شور و شر اند طالبانت در مقامِ دیگر اند
آں یکے را نُور می بخشی بدل واں دگر را میگذاری یا بگل
چشم و گوش و دل ز تو گیرد ضیاء
ذاتِ تو سرچشمۂ فیض و ہُدیٰ

غرض خداوند قادر و قدوس میری پناہ ہے اور میں تمام کام اپنا اسی کو سونپتا ہوں اور گالیوں کے عوض میں گالیاں نہیں دینا چاہتا اور نہ کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ایک ہی ہے جو کہیگا۔ افسوس کہ ان لوگوں نے تھوڑی سی بات کو بہت دُور ڈال دیا اور خدا تعالیٰ کو اس بات پر قادر نہ سمجھا کہ جو چاہے کرے اور جس کو چاہے مامور کر کے بھیجے۔ کیا انسان اس سے لڑ سکتا ہے یا آدم زاد کو اس پر اعتراض کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا، ایسا کیوں نہیں کیا

(آسمانی فیصلہ صـ ۲۴-۲۵)

افسوس ان لوگوں کی حالتوں پر ان لوگوں نے خدا اور رسُول کے فرمودہ کی کچھ بھی عزّت نہ کی۔ اور صدی پر بھی سترہ برس گذر گئے۔ مگر ان کا مجدد اب تک کسی غار میں پوشیدہ بیٹھا ہے۔ مجھ سے یہ لوگ کیوں بُخل کرتے ہیں۔ اگر خدا نہ چاہتا تو میں نہ آتا۔ بعض دفعہ پر میرے دل میں یہ بھی خیال آیا کہ میں درخواست کروں کہ خدا مجھے اس عہدہ سے علیحدہ کرے اور میری جگہ کسی اور کو اس خدمت سے ممتاز فرمائے۔ پر ساتھ ہی میرے دل میں یہ ڈالا گیا کہ اس سے زیادہ کوئی اور سخت

گناہ نہیں کہ میں خدمت سپرد کردہ میں بزدلی ظاہر کروں۔ جس قدر میں پیچھے ہٹنا چاہتا ہوں۔ اسی قدر خدا تعالیٰ مجھے کھینچ کر آگے لے آتا ہے۔ میرے پر ایسی رات کوئی کم گذرتی ہے جس میں مجھے یہ تسلّی نہیں دی جاتی کہ میں تیرے ساتھ ہوں اور میری آسمانی فوجیں تیرے ساتھ ہیں اگرچہ جو لوگ دل کے پاک ہیں مرنے کے بعد خدا کو دیکھیں گے لیکن مجھے اسی کے مُنہ کی قسم ہے کہ مَیں اب بھی اس کو دیکھ رہا ہوں۔ دُنیا مجھ کو نہیں پہچانتی لیکن وہ مجھے جانتا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ یہ ان لوگوں کی غلطی ہے اور سراسر بدقسمتی ہے کہ میری تباہی چاہتے ہیں۔ مَیں وہ درخت ہوں جس کو مالک حقیقی نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے۔ جو شخص مجھے کاٹنا چاہتا ہے اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ قارون اور یہودا اسکریوطی اور ابوجہل کے نصیب سے کچھ حصہ لینا چاہتا ہے۔ میں ہر روز اس بات کے لئے چشمِ پُرآب ہوں کہ کوئی میدان میں نکلے اور منہاجِ نبوت پر مجھ سے فیصلہ کرنا چاہے۔ پھر دیکھے کہ خدا کس کے ساتھ ہے مگر میدان میں نکلنا کسی مخنّث کا کام نہیں۔ ہاں غلام دستگیر ہمارے ملک پنجاب میں کفر کے لشکر کا ایک سپاہی تھا جو کام آیا۔ اب ان لوگوں میں سے اس کی مثل بھی کوئی نکلنا محال اور غیر ممکن ہے۔ اے لوگو! تم یقیناً سمجھو کہ میرے ساتھ وہ ہاتھ ہے جو اخیر وقت تک مجھ سے وفا کرے گا۔ اگر تمہارے مرد اور تمہاری عورتیں اور تمہارے جوان اور تمہارے بوڑھے اور تمہارے چھوٹے اور تمہارے بڑے سب مل کر میرے ہلاک کرنے کے لئے دعائیں کریں۔ یہاں تک کہ سجدے کرتے کرتے ناک گل جائیں اور ہاتھ شل ہو جائیں تب بھی خدا ہرگز تمہاری دُعا نہیں سُنے گا اور نہیں رُکے گا جب تک وہ اپنے کام کو پُورا نہ کر لے۔ اور اگر انسانوں میں سے ایک بھی میرے ساتھ نہ ہو تو خدا کے فرشتے میرے ساتھ ہوں گے اور اگر تم گواہی کو چھپاؤ تو قریب ہے کہ پتھر میرے لئے گواہی دیں۔ پس اپنی جانوں پر ظلم مت کرو۔ کاذبوں کے اَور مُنہ ہوتے ہیں اور صادقوں کے اَور۔ خدا کسی امر کو بغیر فیصلہ کے نہیں چھوڑتا۔ میں اس زندگی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ جو جھوٹ اور افتراء کے ساتھ ہو اور نیز اس حالت پر بھی کہ مخلوق سے ڈر کر خالق کے امر سے کنارہ کشی کی جائے۔ وہ خدمت جو عین وقت پر خداوند قدیر نے میرے سپرد کی ہے اور اس کے لئے مجھے پیدا کیا ہے ہرگز ممکن نہیں کہ میں اس میں سُستی کروں اگرچہ آفتاب ایک طرف سے اور زمین ایک طرف سے باہم مل کر کچلنا چاہیں۔ انسان کیا ہے محض ایک کیڑا اور بشر کیا ہے محض ایک مضغہ پس کیونکر میں حیّ و قیّوم کے حکم کو ایک کیڑے یا ایک مضغہ کے لئے ٹال دوں۔ جس طرح خدا نے پہلے مامُورین اور مکذّبین میں آخر ایک دن فیصلہ کر دیا۔ اسی طرح وہ اس وقت بھی فیصلہ کرے گا۔ خدا کے مامورین کے آنے کے لئے بھی ایک موسم ہوتے ہیں اور پھر جانے کے لئے بھی ایک موسم۔ پس یقیناً سمجھو کہ میں نہ بے موسم

آیا ہوں اور نہ بے موسم جاؤں گا۔ خدا سے مت لڑو! یہ تمہارا کام نہیں کہ مجھے تباہ کر دو۔

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صـ۱۲-۱۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

اَلصُّلحُ خَیرٌ

اے علمائے قوم جو میرے مکذب اور مکفر ہیں یا میری نسبت متذبذب ہیں آج پھر میرے دل میں خیال آیا کہ میں ایک مرتبہ پھر آپ صاحبوں کی خدمت میں مصالحت کے لئے درخواست کروں مصالحت سے میری یہ مراد نہیں ہے کہ آپ صاحبوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کے لئے مجبور کروں یا اپنے عقیدہ کی نسبت اس بصیرت کے مخالف کوئی کمی بیشی کروں جو خدا نے مجھ کو عطا فرمائی ہے بلکہ اس جگہ مصالحت سے صرف یہ مراد ہے کہ فریقین ایک پختہ عہد کریں کہ وہ اور تمام وہ لوگ جو اُن کے زیر اثر ہیں، ہر ایک قسم کی سخت زبانی سے باز رہیں اور کسی تحریر یا تقریر یا اشارہ کنایہ سے فریق مخالف کی عزت پر حملہ نہ کریں اور اگر دونوں فریق میں سے کوئی صاحب اپنے فریق مخالف کی مجلس میں جائیں تو جیسا کہ شرطِ تہذیب اور شائستگی ہے، فریق ثانی مدارات سے پیش آئیں . . . . . .

اگر یہ کاروبار خدا کی طرف سے نہیں ہے، تو خود یہ سلسلہ تباہ ہو جائے گا اور اگر خدا کی طرف سے ہے تو کوئی دشمن اس کو تباہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے محض قلیل جماعت خیال کر کے تحقیر کے درپے رہنا طریقِ تقویٰ کے برخلاف ہے۔ یہی تو وقت ہے کہ ہمارے مخالف علماء اپنے اخلاق دکھلائیں۔ ورنہ جب یہ احمدی فرقہ دُنیا میں چند کروڑ انسانوں میں پھیل جائے گا اور ہر ایک طبقہ کے انسان اور بعض ملوک بھی اس میں داخل ہو جائیں گے جیسا کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے تو اس زمانہ میں تو یہ کینہ اور بُغض خود بخود لوگوں کے دلوں سے دُور ہو جائے گا لیکن اس وقت کی مخالطت اور مدارات خدا کے لئے نہیں ہوگی اور اس وقت مخالف علماء کا نرمی اختیار کرنا تقویٰ کی وجہ سے نہیں سمجھا جائے گا۔ تقویٰ دکھلانے کا آج ہی دن ہے جبکہ یہ فرقہ دنیا میں بجز چند ہزار انسان کے زیادہ نہیں ہے . . . . بالفعل اس اندرونی تفرقہ کے مٹانے کے لئے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں۔ آئندہ جس فریق کے ساتھ خدا ہوگا وہ خود غالب ہوتا جائے گا۔ دُنیا میں سچائی اوّل چھوٹے سے تخم کی طرح آتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک عظیم الشان درخت بن جاتا ہے جو پھل اور پھول لاتا ہے اور حق جوئی کے پرندے اس میں آرام کرتے ہیں۔

المشتہر

میرزا غلام احمد از قادیان

۵ر مارچ ۱۹۰۱ء

(تبلیغ رسالت جلد دہم صـ۶ تا ۸)

میں دوبارہ حق کے طالبوں کے لئے عام اعلان دیتا ہوں کہ اگر وہ اب بھی نہیں سمجھے تو نئے سرے اپنی تسلّی کر لیں اور یاد رکھیں کہ خدا تعالیٰ سے چھ طور کے نشان میرے ساتھ ہیں:۔

اوّل۔ اگر کوئی مولوی عربی کی بلاغت فصاحت میں میری کتاب کا مقابلہ کرنا چاہے گا تو وہ ذلیل ہوگا۔ میں ہر ایک متکبّر کو اختیار دیتا ہوں کہ اسی عربی مکتوب کے مقابل پر طبع آزمائی کرے۔ اگر وہ اس عربی کے مکتوب کے مقابل پر کوئی رسالہ بالتزام مقدار نظم و نثر بنا سکے اور ایک مادری زبان والا جو عربی ہو قسم کھا کر اس کی تصدیق کر سکے تو میں کاذب ہوں۔

دوم۔ اور اگر یہ نشان منظور نہ ہو تو میرے مخالف کسی سورۃ قرآنی کی بالمقابل تفسیر بنا دیں یعنی روبرو ایک جگہ بیٹھ کر بطور فال قرآن شریف کھولا جائے اور پہلی سات آیتیں جو نکلیں۔ ان کی تفسیر میں بھی عربی میں لکھوں اور میرا مخالف بھی لکھے۔ پھر اگر میں حقائق و معارف کے بیان کرنے میں صریح غالب نہ رہوں تو پھر بھی میں جھوٹا ہوں۔

سوم۔ اور اگر یہ نشان بھی منظور نہ ہو تو ایک سال تک کوئی مولوی نامی مخالفوں میں سے میرے پاس رہے۔ اگر اس عرصہ میں انسان کی طاقت سے برتر کوئی نشان مجھ سے ظاہر نہ ہوا تو پھر بھی میں جھوٹا ہوں گا

چہارم۔ اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو ایک تجویز یہ ہے کہ بعض نامی مخالف اشتہار دے دیں کہ اس تاریخ کے بعد ایک سال تک اگر کوئی نشان ظاہر ہو تو ہم توبہ کر لیں گے اور مصدق ہو جائیں گے پس اس اشتہار کے بعد اگر ایک سال تک مجھ سے کوئی نشان ظاہر نہ ہوا جو انسانی طاقتوں سے بالا تر ہو خواہ پیشگوئی ہو یا اَور تو میں اقرار کروں گا کہ میں جھوٹا ہوں۔

پنجم۔ اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو شیخ محمد حسین بطالوی اور دوسرے نامی مخالف مجھ سے مباہلہ کر لیں۔ پس اگر مباہلہ کے بعد میری بد دعا کے اثر سے ایک بھی خالی رہا تو میں اقرار کروں گا کہ میں جھوٹا ہوں۔ یہ طریق فیصلہ ہیں جو میں نے پیش کئے ہیں اور میں ہر ایک کو خدا تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کہ اب سچے دل سے ان طریقوں میں سے کسی طریق کو قبول کر لیں یعنی یا تو میعاد دو ماہ میں جو مارچ ۱۸۹۷ء

کی دس تاریخ تک مقرر کرتا ہوں۔ اس عربی رسالہ کا ایسا ہی فصیح و بلیغ جواب چھاپ کر شائع کریں یا بالمقابل ایک جگہ بیٹھ کر زبان عربی میں میرے مقابل میں سات آیات قرآنی کی تفسیر لکھیں اور یا ایک سال تک میرے پاس نشان دیکھنے کے لئے رہیں اور یا اشتہار شائع کر کے اپنے ہی گھر میں میرے نشان کی ایک برس تک انتظار کریں اور یا مباہلہ کر لیں۔

ششم۔ اور اگر ان باتوں میں سے کوئی بھی نہ کریں تو مجھ سے اور میری جماعت سے سات سال تک اس طور سے صلح کر لیں کہ تکفیر و تکذیب اور بد زبانی سے مُنہ بند رکھیں اور ہر ایک کو محبت اور اخلاق سے ملیں اور قہرِ الٰہی سے ڈر کر ملاقاتوں میں مسلمانوں کی عادت کے طور پر پیش آویں۔ ہر ایک قسم کی شرارت اور خباثت کو چھوڑ دیں۔ پس اگر ان سات سال میں میری طرف سے خدا تعالےٰ کی تائید سے اسلام کی خدمت میں نمایاں اثر ظاہر نہ ہوں اور جیسا کہ مسیح کے ہاتھ سے ادیانِ باطلہ کا مَر جانا ضروری ہے یہ موت جھوٹے دینوں پر میرے ذریعہ سے ظہور میں نہ آوے یعنی خدا تعالیٰ میرے ہاتھ سے وہ نشان ظاہر نہ کرے جن سے اسلام کا بول بالا ہو اور جس سے ہر ایک طرف سے اسلام میں داخل ہونا شروع ہو جائے اور عیسائیت کا باطل معبود فنا ہو جائے اور دنیا اَور رنگ نہ پکڑ جائے تو مَیں خدا تعالےٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اپنے تئیں کاذب خیال کر لُوں گا اور خدا جانتا ہے کہ میں ہرگز کاذب نہیں۔ یہ سات برس کچھ زیادہ سال نہیں ہیں اور اس قدر انقلاب اس تھوڑی مدت میں ہو جانا انسان کے اختیار میں ہرگز نہیں۔ پس جبکہ میں سچے دل سے اور خدا تعالےٰ کی قسم کے ساتھ یہ اقرار کرتا ہوں اور تم سب کو اللہ کے نام پر صلح کی طرف بلاتا ہوں۔ تو اب تم خدا سے ڈرو۔ اگر میں خدا تعالےٰ کی طرف سے نہیں ہوں تو میں تباہ ہو جاؤنگا ورنہ خدا کے مامور کو کوئی تباہ نہیں کر سکتا۔

(ضمیمہ انجام آتھم ص۲۰-۲۵)

اب ہمارا اور مخالفوں کا جھگڑا انتہا تک پہنچ گیا ہے اور اب یہ مقدمہ وہ خود فیصلہ کرے گا جس نے مجھے بھیجا ہے۔ اگر مَیں صادق ہوں تو ضرور ہے کہ آسمان میرے لئے ایک زبردست گواہی دے جس سے بدن کانپ جائیں اور اگر میں پچیس سالہ مُجرم ہوں جس نے اس مدت دراز تک خدا پر افترا کیا تو میں کیونکر بچ سکتا ہوں۔ اس صورت میں اگر تم سب میرے دوست بھی بن جاؤ تب بھی میں ہلاک شدہ ہوں کیونکہ خدا کا ہاتھ میرے مخالف ہے۔

اے لوگو! تمہیں یاد رہے کہ میں کاذب نہیں بلکہ مظلوم ہوں اور مفتری نہیں بلکہ صادق ہوں۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۸۳)

میری نسبت جو کچھ ہمدردی قوم نے کی ہے وہ ظاہر ہے اور غیر قوموں کا بُغض ایک طبعی امر ہے ان لوگوں نے کونسا پہلو میرے تباہ کرنے کا اُٹھا رکھا۔ کونسا ایذا کا منصوبہ ہے جو انتہا تک نہیں پہنچایا۔ کیا بددعاؤں میں کچھ کسر رہی یا قتل کے فتوے نامکمل رہے یا ایذا اور توہین کے منصوبے کما حقہٗ ظہور میں نہ آئے۔ پھر وہ کونسا ہاتھ ہے جو مجھے بچاتا ہے۔ اگر میں کاذب ہوتا تو چاہیئے تو یہ تھا کہ خدا خود میرے ہلاک کرنے کے لئے اسباب پیدا کرتا نہ یہ کہ وقتاً فوقتاً لوگ اسباب پیدا کریں اور خدا ان اسباب کو معدوم کرتا رہے۔ کیا یہی کاذب کی نشانیاں ہوا کرتی ہیں کہ قرآن بھی اس کی گواہی دے اور آسمانی نشان بھی اسی کی تائید میں نازل ہوں۔ اور عقل بھی اسی کی مؤید ہو اور جو اس کی موت کے شائق ہوں وہی مرتے جائیں۔ میں ہرگز یقین نہیں کرتا کہ زمانۂ نبوی کے بعد کسی اہل اللہ اور اہل حق کے مقابل پر کبھی کسی مخالف کو ایسی صاف اور صریح شکست اور ذلّت پہنچی ہو جیسا کہ میرے دشمنوں کو میرے مقابل پر پہنچی ہے۔ اگر انہوں نے میری عزت پر حملہ کیا تو آخر آپ ہی بے عزت ہوئے اور اگر میری جان پر حملہ کرکے یہ کہا کہ اس شخص کے صدق اور کذب کا معیار یہ ہے کہ وہ ہم سے پہلے مرے گا تو پھر آپ ہی مر گئے۔

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص۹-۱۰)

وہ خدا جس کا قوی ہاتھ زمینوں اور آسمانوں اور ان سب چیزوں کو جو اُن میں ہیں، تھامے ہوئے ہے وہ کب انسان کے ارادوں سے مغلوب ہو سکتا ہے اور آخر ایک دن آتا ہے جو وہ فیصلہ کرتا ہے۔ پس صادقوں کی یہی نشانی ہے کہ انجام انہی کا ہوتا ہے۔ خدا اپنی تجلّیات کے ساتھ ان کے دل پر نزول کرتا ہے۔ پس کیونکر وہ عمارت منہدم ہو سکے جس میں وہ حقیقی بادشاہ فروکش ہے ٹھٹھا کرو جس قدر چاہو گالیاں دو جس قدر چاہو اور تکلیف دہی کے منصوبے سوچو جس قدر چاہو اور میرے استیصال کے لئے ہر ایک قسم کی تدبیریں اور مکر سوچو جس قدر چاہو۔ پھر یاد رکھو کہ عنقریب خدا تمہیں دکھلا دے گا کہ اس کا ہاتھ غالب ہے۔ نادان کہتا ہے کہ میں اپنے منصوبوں سے غالب ہو جاؤں گا۔ مگر خدا کہتا ہے کہ اے لعنتی دیکھ۔ میں تیرے سارے منصوبے خاک میں ملا دوں گا۔ اگر خدا چاہتا تو ان مخالف مولویوں اور اُن کے پیروؤں کو آنکھیں بخشتا اور وہ ان وقتوں اور موسموں کو پہچان لیتے جن میں خدا کے مسیح کا آنا ضروری تھا۔ لیکن ضرور تھا کہ قرآن شریف اور احادیث کی وہ پیشگوئیاں پُوری ہوتیں جن میں لکھا تھا کہ مسیح موعود جب ظاہر ہوگا تو اسلامی علماء کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھائے گا وہ اس کو کافر قرار دیں گے اور اس کے قتل کے لئے فتوے دیئے جائیں گے۔ اور اس کی سخت توہین کی جائے گی اور اس کو دائرہ اسلام سے خارج اور دین

کا تباہ کرنے والا خیال کیا جائے گا۔

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صـ۱۶)

خدا تعالےٰ اپنی تائیدات اور اپنے نشانوں کو ابھی ختم نہیں کر چکا اور اسی کی ذات کی مجھے قسم ہے کہ وہ بس نہیں کرے گا جب تک میری سچائی دنیا پر ظاہر نہ کر دے۔ پس اے تمام لوگو! جو میری آواز سنتے ہو خدا کا خوف کرو اور حد سے مت بڑھو۔ اگر یہ منصوبہ انسان کا ہوتا تو خدا مجھے ہلاک کر دیتا اور اس تمام کاروبار کا نام و نشان نہ رہتا۔ مگر تم نے دیکھا ہے کہ کیسی خدا تعالےٰ کی نصرت میرے شاملِ حال ہو رہی ہے اور اس قدر نشان نازل ہوئے جو شمار سے خارج ہیں۔ دیکھو کس قدر دشمن ہیں جو میرے ساتھ مباہلہ کر کے ہلاک ہو گئے۔ اے بندگانِ خدا! کچھ تو سوچو کیا خدا تعالیٰ جھوٹوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے؟

(تتمہ حقیقۃ الوحی صـ۱۱۸)

"کرامت گرچہ بے نام و نشان است
بیا بنگر ز غلمانِ محمدؐ"

باب پنجم

معجزات، نشانات اور پیشگوئیاں

"خدا تعالیٰ نے اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ مَیں اُس کی طرف سے ہوں اس قدر نشان دکھلائے ہیں کہ اگر وہ ہزار نبی پر بھی تقسیم کئے جائیں تو ان کی بھی اُن سے نبوت ثابت ہو سکتی ہے۔"

خدا نے اپنے زندہ کلام سے بلا واسطہ مجھے یہ اطلاع دی ہے اور مجھے اس نے کہا ہے کہ اگر تیرے لئے یہ مشکل پیش آوے کہ لوگ کہیں کہ ہم کیونکر سمجھیں کہ تو خدا کی طرف سے ہے تو انہیں کہہ دے کہ اس پہ یہ دلیل کافی ہے کہ اُس کے آسمانی نشان میرے گواہ ہیں۔ دعائیں قبول ہوتی ہیں پیش از وقت غیب کی باتیں بتلائی جاتی ہیں اور وہ اسرار جنکا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں وہ قبل از وقت ظاہر کئے جاتے ہیں۔ اور دوسرا نشان یہ ہے کہ اگر کوئی ان باتوں میں مقابلہ کرنا چاہے مثلاً کسی دعا کا قبول ہونا اور پھر پیش از وقت اس قبولیت کا علم دیئے جانا یا اور غیبی واقعات معلوم ہونا جو انسان کی حد علم سے باہر ہیں تو اس مقابلہ میں وہ مغلوب رہیگا گو وہ مشرقی ہو یا مغربی۔ یہ وہ دو نشان ہیں جو مجھ کو دیئے گئے ہیں۔

(ضمیمہ رسالہ جہاد ص ۸)

مجھے اس خدا کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نشان جو میرے لئے ظاہر کئے گئے اور میری تائید میں ظہور میں آئے اگر ان کے گواہ ایک جگہ کھڑے کئے جائیں تو دنیا میں کوئی بادشاہ ایسا نہ ہوگا جو اس کی فوج ان گواہوں سے زیادہ ہو۔ تاہم اس زمین پر کیسے کیسے گناہ صادر ہو رہے ہیں کہ ان نشانوں کی بھی لوگ تکذیب کر رہے ہیں۔ آسمان نے بھی میرے لئے گواہی دی اور زمین نے بھی۔

(اعجاز احمدی ص ۲)

مَیں زور سے کہتا ہوں کہ اگر کوئی عیسائی میری صحبت میں رہے تو ابھی برس نہیں گذریگا کہ وہ کئی نشان دیکھے گا۔ خدا کے نشانوں کی اس جگہ بارش ہو رہی ہے۔ اور وہ خدا جس کو لوگوں نے بھلا دیا اور اس کی جگہ مخلوق کو دی وہ اس وقت اس عاجز کے دل پر تجلّی کر رہا ہے۔ وہ دکھانا چاہتا ہے۔ کیا کوئی دیکھنے کے لئے راغب ہے!

(کتاب البریہ ص ۱۰۸)

اگر یہ اعتراض ہو کہ اسجگہ وہ معجزات کہاں ہیں تو مَیں صرف یہی جواب نہیں دونگا کہ میں معجزات دکھلا سکتا ہوں بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل اور کرم سے میرا جواب یہ ہے کہ اُس نے میرا

دعویٰ ثابت کرنے کے لئے اس قدر معجزات دکھائے ہیں کہ بہت ہی کم نبی ایسے آئے ہیں جنہوں نے اس قدر معجزات دکھائے ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے اس قدر معجزات کا دریا رواں کر دیا ہے کہ باستثنا ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے باقی تمام انبیاء علیہم السلام میں ان کا ثبوت اس کثرت کے ساتھ قطعی اور یقینی طور پر محال ہے **اور خدا نے اپنی حجت پوری کردی ہے اب چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے ۔**

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۱۳۶)

میری تائید میں اس نے وہ نشان ظاہر فرمائے ہیں کہ آج کی تاریخ سے جو ۱۶ر جولائی ۱۹۰۶ء ہے اگر میں ان کو فرداً فرداً شمار کروں تو مَیں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ **تین لاکھ** سے بھی زیادہ ہیں اور اگر کوئی میری قسم کا اعتبار نہ کرے تو مَیں اس کو ثبوت دے سکتا ہوں۔ بعض نشان اس قسم کے ہیں کہ جن میں خدا تعالیٰ نے ہر ایک محل پر اپنے وعدہ کے موافق مجھ کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا اور بعض نشان اس قسم کے ہیں جن میں ہر محل میں اپنے وعدہ کے موافق میری ضرورتیں اور حاجتیں اس نے پوری کیں۔ اور بعض نشان اس قسم کے ہیں جن میں اس نے بموجب اپنے وعدہ اِنِّیْ مُہِیْنٌ مَنْ اَرَادَ اِہَانَتَکَ کے میرے پر حملہ کرنے والوں کو ذلیل اور رسوا کیا۔ اور بعض نشان اس قسم کے ہیں جو مجھ پر مقدمات دائر کرنے والوں پر اس نے اپنی پیشگوئیوں کے مطابق مجھ کو فتح دی۔ اور بعض نشان اس قسم کے ہیں جو میری مدت بعث سے پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے یہ مدت دراز کسی کاذب کو نصیب نہیں ہوئی اور بعض نشان زمانہ کی حالت دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں یعنی یہ کہ زمانہ کسی امام کے پیدا ہونے کی ضرورت تسلیم کرتا ہے۔ اور بعض نشان اس قسم کے ہیں جن میں دوستوں کے حق میں میری دعائیں منظور ہوئیں۔ اور بعض نشان اس قسم کے ہیں جو شریر دشمنوں پر میری بد دعا کا اثر ہوا۔ اور بعض نشان اس قسم کے ہیں جو میری دعا سے بعض خطرناک بیماروں نے شفا پائی اور اُن کی شفا کی پہلے خبر دی گئی۔ اور بعض نشان اس قسم کے ہیں جو میرے لئے اور میری تصدیق کے لئے عام طور پر خدا نے حوادث ارضی یا سماوی ظاہر کئے۔ اور بعض نشان اس قسم کے ہیں جو میری تصدیق کے لئے بڑے بڑے ممتاز لوگوں کو جو مشاہیر فقراء میں سے تھے خوابیں آئیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ جیسے سجادہ نشین صاحب العلم سندھ جن کے مرید ایک لاکھ کے قریب تھے اور جیسے خواجہ غلام فرید صاحب چاچڑاں والے۔ اور بعض نشان اس قسم کے ہیں کہ ہزارہا انسانو

نے محض اس وجہ سے میری بیعت کی کہ خواب میں اُن کو بتلایا گیا کہ یہ سچّا ہے اور خدا کی طرف سے ہے اور بعض نے اس وجہ سے بیعت کی کہ آنحضرتؐ کو خواب میں دیکھا اور آپ نے فرمایا کہ دنیا ختم ہونے کو ہے اور یہ خدا کا آخری خلیفہ اور مسیح موعود ہے۔ اور بعض نشان اس قسم کے ہیں جو بعض اکابر نے میری پیدائش یا بلوغ سے پہلے میرا نام لیکر میرے مسیح موعود ہونے کی خبر دی۔ جیسے نعمت اللہ ولی اور میاں گلاب شاہ ساکن جمال پور ضلع لدھیانہ۔

(حقیقۃ الوحی ص ۶۷-۶۸)

خدا نے میرے لئے آسمان پر رمضان میں سورج اور چاند کا خسوف کسوف کیا اور ایسا ہی زمین پر بہت سے نشان ظہور میں آئے اور سنت اللہ کے موافق حجّت پوری ہوگئی۔ اور مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر آپ لوگ اپنے دلوں کو صاف کرکے کوئی اَور نشان خدا کا دیکھنا چاہیں تو وہ خداوند قدیر بغیر اس کے کہ آپ لوگوں کے کسی اقتراح کا تابع ہو اپنی مرضی اور اختیار سے نشان دکھلانے پر قادر ہے۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر آپ لوگ سچے دل سے توبہ کی نیت کرکے مجھ سے مطالبہ کریں اور خدا کے سامنے یہ عہد کرلیں کہ اگر فوق العادت امر جو انسانی طاقتوں سے بالاتر ہے ظہور میں آجائے تو ہم یہ تمام بغض اور شحناء چھوڑ کر محض خدا کو راضی کرنے کے لئے سلسلہ بیعت میں داخل ہوجائیں گے تو ضرور خدا تعالیٰ کوئی نشان دکھائیگا کیونکہ وہ رحیم اور کریم ہے لیکن میرے اختیار میں نہیں ہے کہ مَیں نشان دکھلانے کے لئے دو تین دن مقرر کردوں یا آپ لوگوں کی مرضی پر چلوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ جو چاہے تاریخ مقرر کرے۔

(اربعین ۲ ص ۲۷-۲۸)

اگر کوئی تلاش کرتا کرتا مر بھی جائے تو ایسی کوئی پیشگوئی جو میرے منہ سے نکلی ہو اسکو نہیں ملے گی جس کی نسبت وہ کہہ سکتا ہو کہ خالی گئی۔ مگر بے شرمی سے یا بے خبری سے جو چاہے کہے اور مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ہزارہا میری ایسی کھلی کھلی پیشگوئیاں ہیں جو نہایت صفائی سے پوری ہوگئیں جن کے لاکھوں انسان گواہ ہیں۔ ان کی نظیر اگر گذشتہ نبیوں میں تلاش کی جائے تو بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور جگہ ان کی مثل نہیں ملے گی .... مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ اس زمانہ میں جس طرح خدا تعالیٰ قریب ہوکر ظاہر ہو رہا ہے اور صدہا امور غیب اپنے بندہ پر کھول رہا ہے اس زمانہ کی گذشتہ زمانوں میں بہت ہی کم مثال ملے گی۔ لوگ عنقریب دیکھ لیں گے کہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ کا چہرہ ظاہر ہوگا۔ گویا وہ آسمان سے اُترے گا۔ اُس نے بہت

مدت تک اپنے تئیں چھپائے رکھا اور انکار کیا گیا اور چپ رہا لیکن وہ اب نہیں چھپائے گا اور دنیا اسکی قدرت کے وہ نمونے دیکھے گی کہ کبھی ان کے باپ دادوں نے نہیں دیکھے تھے۔ یہ اس لئے ہوگا کہ زمین بگڑ گئی اور آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے پر لوگوں کا ایمان نہیں رہا۔ ہونٹوں پر اس کا ذکر ہے لیکن دل اس سے پھر گئے ہیں۔ اس لئے خدا نے کہا **اب میں نیا آسمان اور نئی زمین بناؤں گا**۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ زمین مر گئی۔ یعنی زمینی لوگوں کے دل سخت ہو گئے گویا مر گئے کیونکہ خدا کا چہرہ اُن سے چھپ گیا اور گذشتہ آسمانی نشان سب بطور قصّوں کے ہو گئے۔ سو خدا نے ارادہ کیا کہ وہ نئی زمین اور نیا آسمان بناوے۔ وہ کیا ہے نیا آسمان اور کیا ہے نئی زمین؟ نئی زمین وہ پاک دل ہیں جن کو خدا اپنے ہاتھ سے تیار کر رہا ہے اور جو خدا سے ظاہر ہوئے اور خدا ان سے ظاہر ہوگا۔ اور نیا آسمان وہ نشان ہیں جو اس کے بندے کے ہاتھ سے اُسی کے اذن سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ دنیا نے خدا کی اس نئی تجلّی سے دشمنی کی۔ ان کے ہاتھ میں بجز قصوں کے اور کچھ نہیں اور ان کا خدا ان کے اپنے ہی تصورات ہیں دل ٹھٹھرے ہیں اور ہمتیں تھکی ہوئی ہیں اور آنکھوں پر پردے ہیں۔

(کشتی نوح ص۱۰-۱۱)

سچ اور واقعی یہی بات ہے کہ میری کوئی ایسی پیشگوئی نہیں کہ جو پوری نہیں ہوگئی۔ اگر کسی کے دل میں شک ہو تو وہ سیدھی نیت سے ہمارے پاس آجائے اور بالمواجہ کوئی اعتراض کرکے اگر شافی کافی جواب نہ سُنے تو ہم ہر ایک تاوان کے سزاوار ٹھہر سکتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ ایسے لوگ بخل سے اعتراض کرتے ہیں نہ انصاف سے۔ اگر یہ لوگ انبیاء علیہم السلام کے وقتوں میں ہوتے تو ان پر بھی ایسے ہی اعتراض کرتے جو مجھ پر کرتے ہیں۔ جو شخص آنکھیں رکھتا ہے اس کو ہم راہ دکھلا سکتے ہیں۔ مگر جو بخل اور خود غرضی اور تکبّر سے اندھا ہو گیا ہو اس کو کیا دکھا سکتے ہیں۔ تین ہزار یا اس سے بھی زیادہ اس عاجز کے الہامات کی مبارک پیشگوئیاں جو امنِ عامہ کے مخالف نہیں پوری ہو چکی ہیں۔ صدہا نیک دل انسان گواہ ہیں۔ بہت سی تحریریں پیش از وقت شائع ہو چکی ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی بخل کی راہ سے خواہ نخواہ شکوک اور اعتراضات پیش کرتا ہے اور سیدھے طور پر صحبت میں رہ کر تجربہ نہیں کرتا اور نہ اہل تجربہ سے دریافت کرتا ہے اور دجل اور خیانت کی راہ سے دھوکا دینے والے اعتراضات مشہور کرتا ہے اور خیانت اور دروغگوئی سے باز نہیں آتا وہ اُن منکرین کا وارث ہے جو اس سے پہلے خدا کے پاک نبیوں

کے مقابل پر گذر چکے ہیں۔ خدا اپنے بندوں کو ایسے منصوبہ باز لوگوں کے بہتانوں سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اس بات کا کیا سبب ہے کہ یہ لوگ چوروں کی طرح دُور دُور سے اعتراض کرتے ہیں اور صاف باطن لوگوں کی طرح بالمقابل آکر اعتراض نہیں کرتے اور نہ جواب سُننا چاہتے ہیں۔ اسکا یہی سبب ہے کہ یہ لوگ اپنے دجل اور بددیانتی سے واقف ہیں اور ان کا دل انکو ہر وقت جتلاتا ہے کہ اگر تم نے ایسے بیہودہ اور جہالت اور خیانت سے بھرے ہوئے اعتراض رُوبرُو پیش کئے تو اس صورت میں تمہاری **سخت پردہ دری ہوگی**۔ اور تمہاری دھوکا دینے والی باتیں یکدفعہ کالعدم ہو جائیں گی۔ تب اس وقت ندامت اور خجالت اور رسوائی رہ جائیگی۔ اور اعتراض کا نام ونشان نہ رہے گا۔

خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ میری پیشگوئیوں میں کوئی بھی امر ایسا نہیں ہے جس کی نظیر پہلے انبیاء علیہم السلام کی پیشگوئیوں میں نہیں ہے۔ یہ جاہل اور بے تمیز لوگ چونکہ دین کے باریک علوم اور معارف سے بے بہرہ ہیں اس لئے قبل اس کے جو عادت اللہ سے واقف ہوں بخل کے جوش سے اعتراض کرنے کے لئے دوڑتے ہیں۔ اور ہمیشہ بموجب آیت يَتَرَبَّصُوْنَ عَلَيْكُمُ الدَّوَائِرَ میری کسی گردش کے منتظر ہیں اور عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ کے مضمون سے بے خبر۔

(حقیقۃ المہدی ص۱۵)

خدا تعالیٰ کا معاملہ ہر ایک شخص سے بقدر تعلق ہوتا ہے اور گو محبوبین الٰہی پر مصائب بھی پڑتی ہیں مگر نصرت الٰہی نمایاں طور پر ان کے شامل حال ہوتی ہے۔ اور غیرت الٰہی ہرگز ہرگز گوارا نہیں کرتی کہ ان کو ذلیل اور رسوا کرے اور اس کی محبت گوارا نہیں کرتی کہ انکا نام دنیا سے مٹا دے۔ اور **کرامات کی اصل** بھی یہی ہے کہ جب انسان اپنے تمام وجود کے ساتھ خدا کا ہو جاتا ہے اور اس میں اور اس کے رب میں کوئی حجاب باقی نہیں رہتا اور وہ وفا اور صدق کے تمام ان مراتب کو پورے کرکے دکھلاتا ہے جو حجاب سوز ہیں تب وہ خدا کا اور اس کی قدرتوں کا وارث ٹھہرایا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ طرح طرح کے نشان اس کے لئے ظاہر کرتا ہے جو بعض بطور دفع شر ہوتے ہیں اور بعض بطور افاضۂ خیر۔ اور بعض اُسکی ذات کے متعلق ہوتے ہیں اور بعض اس کے اہل وعیال کے متعلق اور بعض اس کے دشمنوں کے متعلق اور بعض اس کے دوستوں کے متعلق اور بعض اس کے اہل وطن کے متعلق اور بعض عالمگیر اور بعض زمین سے اور بعض آسمان سے۔ غرض کوئی نشان ایسا نہیں ہوتا جو اس کے لئے

دکھلایا نہیں جاتا اور یہ مرحلہ وقت طلب نہیں اور کسی بحث کی اسجگہ ضرورت نہیں۔ کیونکہ اگر درحقیقت کسی شخص کو یہ تیسرا درجہ نصیب ہو گیا ہے جو بیان ہو چکا ہے تو دنیا ہرگز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہر ایک جو اس پر گرے گا وہ پاش پاش ہو جائیگا۔ اور جس پر وہ گریگا اسکو ریزہ ریزہ کر دیگا کیونکہ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اور اس کا مُنہ خدا کا مُنہ ہے۔ اور اس کا وہ مقام ہے جس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۵۰-۵۱)

جاننا چاہیئے کہ **معجزہ** عاداتِ الٰہیہ میں سے ایک ایسی عادت یا یوں کہو کہ اس قادر مطلق کے افعال میں سے ایک ایسا فعل ہے جس کو اضافی طور پر خارق عادت کہنا چاہیئے۔ پس امر خارق عادت کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جو پاک نفس لوگ عام طریق وطرز انسانی سے **ترقی کر کے** اور معمولی عادات کو پھاڑ کر قرب الٰہی کے میدانوں میں آگے قدم رکھتے ہیں تو خدائے تعالیٰ حسب حالت ان کے ایک ایسا عجیب معاملہ اُن سے کرتا ہے کہ وہ عام حالات انسانی پر خیال کرنے کے بعد ایک امر خارق عادت دکھائی دیتا ہے اور جس قدر انسان اپنی بشریت کے وطن کو چھوڑ کر اور اپنے نفس کے حجابوں کو پھاڑ کر عرصات **عشق و محبت** میں دُور تر چلا جاتا ہے اسی قدر یہ خوارق نہایت صاف اور شفاف اور روشن و تاباں ظہور میں آتے ہیں۔ جب تزکیہ نفس انسانی کمال تام کی حالت پر پہنچتا ہے اور اس کا دل غیر اللہ سے بالکل خالی ہو جاتا ہے اور محبت الٰہی سے بھر جاتا ہے تو اس کے تمام اقوال و افعال و اعمال و حرکات و سکنات و عبادات و معاملات و اخلاق جو انتہائی درجہ پر اس سے صادر ہوتے ہیں وہ سب خارق عادت ہی ہو جاتے ہیں۔ سو بمقابل اس کے ایسا ہی معاملہ باری تعالیٰ کا بھی اس مبدّل تام سے بطور خارق عادت ہی ہوتا ہے۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۰-۲۱ حاشیہ)

معجزہ کی اصل حقیقت یہ ہے، کہ معجزہ ایسے امر خارق عادت کو کہتے ہیں کہ فریق مخالف اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز آ جائے۔ خواہ وہ امر بظاہر نظر انسانی طاقتوں کے اندر ہی معلوم ہو۔ جیسا کہ قرآن شریف کا معجزہ جو ملک عرب کے تمام باشندوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ پس وہ اگرچہ بنظر سرسری انسانی طاقتوں کے اندر معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی نظیر پیش کرنے سے عرب کے تمام باشندے عاجز آ گئے۔ پس معجزہ کی حقیقت سمجھنے کے لئے قرآن شریف کا کلام نہایت روشن مثال ہے کہ بظاہر وہ بھی ایک کلام ہے جیسا کہ انسان کا کلام ہوتا ہے لیکن وہ اپنی

فصیح تقریر کے لحاظ سے اور نہایت لذیذ اور مصفّٰی اور رنگین عبارت کے لحاظ سے جو ہر جگہ حق اور حکمت کی پابندی کا التزام رکھتی ہے اور نیز روشن دلائل کے لحاظ سے جو تمام دنیا کے مخالفانہ دلائل پر غالب آگئیں اور نیز زبردست پیشگوئیوں کے لحاظ سے ایک ایسا **لاجواب معجزہ** ہے جو باوجود گذرنے تیرہ سو برس کے اب تک کوئی مخالف اس کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ اور نہ کسی کو طاقت ہے جو کرے۔ قرآن شریف کو تمام دنیا کی کتابوں سے یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ معجزانہ پیشگوئیوں کو بھی معجزانہ عبارات میں جو اعلیٰ درجہ کی بلاغت اور فصاحت سے پُر اور حق اور حکمت سے بھری ہوئی ہیں بیان فرماتا ہے۔ غرض اصل اور بھاری مقصد معجزہ سے حق اور باطل یا صادق اور کاذب میں ایک امتیاز دکھلانا ہے۔ اور ایسے امتیازی امر کا نام **معجزہ** یا دوسرے لفظوں میں **نشان** ہے۔ نشان ایک ایسا ضروری امر ہے کہ اس کے بغیر خدا تعالیٰ کے وجود پر بھی پورا یقین کرنا ممکن نہیں اور نہ وہ ثمرہ حاصل ہونا ممکن ہے جو پورے یقین سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مذہب کی اصل سچائی خدا تعالیٰ کی ہستی کی شناخت سے وابستہ ہے۔ سچے مذہب کے ضروری اور اہم لوازم میں سے یہ امر ہے کہ اس میں ایسے نشان پائے جائیں جو خدا تعالیٰ کی ہستی پر قطعی اور یقینی دلالت پیش کریں۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۴۶-۴۷)

اس جگہ اس بات کا جواب دینا بھی مناسب ہے کہ اگر سب امور قوانین ازلیہ ابدیہ میں داخل ہیں یعنی پہلے ہی سے بندھے ہوئے چلے آتے ہیں تو پھر **معجزات کیا شئے ہیں**؟ سو جاننا چاہیئے کہ بیشک یہ تو سچ ہے کہ قوانین ازلیہ ابدیہ سے یا یوں کہو کہ خدائے تعالیٰ کے ازلی ارادہ اور اس کے قضاء قدر سے کوئی چیز باہر نہیں گو ہم اس پر اطلاع پاویں یا نہ پاویں جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ مگر اسی عادت الٰہیہ نے جو دوسرے لفظوں میں قانون قدرت سے موسوم ہو سکتی ہے بعض چیزوں کے ظہور کو بعض کے ساتھ مشروط کر رکھا ہے۔ پس جو امور ازلی ابدی ارادہ نے مقدسوں کی دعاؤں اور ان کی برکات انفاس اور ان کی توجہ اور اُن کی عقدِ ہمّت اور ان کے اقبال ایام سے وابستہ کر رکھے ہیں اور ان کے تضرعات اور ابتہالات پر مترتب کی جاتی ہیں اور وہ امور جب انہی شرائط اور دینی وسائل سے ظہور میں آتے ہیں تب ان امور کو اس خاص حالت میں **معجزہ یا کرامت یا نشان یا خارق عادت** کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اسجگہ خارق عادت کے لفظ سے اس شبہ میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ وہ کونسا امر ہے جو عادتِ الٰہیہ سے باہر ہے

کیونکہ اس محل میں خارق عادت کے قول سے ایک مفہوم اضافی مراد ہے یعنی یوں تو عادات ازلیہ ابدیہ خدائے کریم جلّ شانہٗ سے کوئی چیز باہر نہیں مگر اس کی عادات جو بنی آدم سے تعلق رکھتی ہیں دو طور کی ہیں۔ ایک عادات عامہ جو روپوش اسباب سے ہو کر سب پر مؤثر ہوتی ہیں۔ دوسری عاداتِ خاصہ جو بتوسط اسباب اور بلا توسط اسباب خاص ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہیں جو اس کی محبت اور رضا میں کھوئی جاتی ہیں۔ یعنی جب انسان بکلّی خدائے تعالیٰ کی طرف انقطاع کرکے اپنی عادات بشریہ کو استرضاء حق کے لئے تبدیل کر دیتا ہے تو خدائے تعالیٰ اُس کی اِس حالت مبدّلہ کے موافق اس کے ساتھ ایک خاص معاملہ کرتا ہے جو دوسروں سے نہیں کرتا۔ یہ خاص معاملہ نسبتی طور پر گویا خارق عادت ہے جس کی حقیقت انہیں پر کھلتی ہے جو عنایات الٰہی سے اس کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔ جب انسان اپنی بشری عادتوں کو جو اس میں اور اس کے رب میں حائل ہیں شوقِ توصّل الٰہی میں توڑتا ہے تو خدائے تعالیٰ بھی اپنی عام عادتوں کو اس کے لئے توڑ دیتا ہے۔ یہ توڑنا بھی عادات ازلیہ میں سے ہے کوئی مستحدث نہیں ہے جو موردِ اعتراض ہو سکے۔ گویا قدیم قانون حضرت احدیت جلّشانہٗ اسی طور پر چلا آتا ہے کہ جیسے جیسے انسان کا بھروسہ خدائے تعالیٰ پر بڑھتا ہے ایسا ہی اس کی طرف سے الوہیت کی قدرتوں کے چمکار اور اس کی کرنیں زیادہ سے زیادہ اس پر پڑتی ہیں اور جیسے جیسے اس طرف سے ایک پاک اور کامل تعلق ہوتا جاتا ہے ایسا ہی اس کی طرف سے بھی کامل اور طیّب برکتیں ظاہر و باطن پر اُترتی ہیں۔ اور جیسی جیسی محبت الٰہی کی موجیں عاشق صادق کے دل سے اٹھتی ہیں ایسا ہی اس طرف سے بھی ایک نہایت صاف اور شفّاف دریائے محبت کا زور شور سے چھوٹتا ہے اور دائرہ کی طرح اس کو اپنے اندر گھیر لیتا ہے اور اپنے الٰہی زور سے کھینچ کر کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے۔ اور جیسا یہ امر صاف ہے ویسا ہی ہمارے نیچر کے مطابق بھی ہے۔ ہم تم بھی جیسے جیسے دوستی اور محبت اور اخلاص میں بڑھتے ہیں تو اس دو طرفہ صفائی محبت کی یہی نشانی ہُوا کرتی ہے کہ دونوں طرف سے آثار خلوص و اتحاد و یگانگت کے ظاہر ہوں نہ صرف ایک طرف سے ہو۔ ہر یک دوست اپنے دوست کے ساتھ عوام الناس کی نسبت معاملہ خارق عادت رکھتا ہے۔ جب انسان اپنی پہلی زندگی کی نسبت ایک ایسی نئی زندگی حاصل کرتا ہے جس کو نسبتی طور پر خارق عادت کہہ سکتے ہیں تو اسی دم سے وہی قدیم خدا اپنی تجلیاتِ نادرہ کے رُو سے ایک نیا خدا اس کے لئے ہو جاتا ہے۔ اور وہ عادتیں اُسکے ساتھ

ظہور میں لاتا ہے جو پہلی زندگی کی حالت میں کبھی خیال میں بھی نہیں آئی تھیں۔ خوارق کی کل جس سے عجائبات قدرتیہ حرکت میں آتی ہیں انسان کی تبدیلی یافتہ روح ہے اور وہ بھی سچی تبدیلی یہاں تک آثار نمایاں دکھاتی ہے کہ بعض اوقات ایک ایسے طور سے شور محبت دل پر استیلاء پکڑتا ہے کہ عشق الٰہی کے پر زور جذبات اور صدق اور یقین کی سخت کششیں ایسے مقام پر انسان کو پہنچا دیتی ہیں کہ اس عجیب حالت میں اگر وہ آگ میں ڈالا جائے تو آگ اس پر کچھ اثر نہیں کر سکتی۔ اگر وہ شیروں اور بھیڑیوں اور ریچھوں کے آگے پھینک دیا جائے تو وہ اسکو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ اس وقت وہ صدق اور عشق کے کامل اور قوی تجلیات سے بشریت کے خواص کو پھاڑ کر کچھ اور ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح لوہے کے ظاہر و باطن پر آگ مستولی ہو کر اس کو اپنے رنگ میں لے آتی ہے اسی طرح یہ بھی آتشِ محبت الٰہی کے ایک سخت استیلاء سے کچھ کچھ اس طاقتِ عظمٰی کے خواص ظاہر کرنے لگتا ہے جو اس پر محیط ہو گئی ہے۔ سو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ عبودیت پر ربوبیت کا کامل اثر پڑنے سے اس سے ایسے خوارق ظاہر ہوں بلکہ تعجب تو یہ ہے کہ ایسے اثر کے بعد بھی عبودیت کی معمولی حالت میں کچھ فرق پیدا نہ ہو کیونکہ اگر لوہا آگ میں تپانے سے کسی قدر خاصہ آگ کا ظاہر کرنے لگے تو یہ امر سراسر مطابق قانون قدرت ہے۔ لیکن اگر سخت تپانے کے بعد بھی اسی پہلی حالت پر رہے اور کوئی خاصیت جدید اس میں پیدا نہ ہو تو یہ عند العقل صریح باطل ہے۔ سو فلاسفی تجارب بھی ان خوارق کے ضروری ہونے پر شہادت دے رہے ہیں۔ یہ افسانہ نہیں اس پر عارفانہ روح لے کر غور کرو۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۵۷-۵۹)

یاد رہے کہ معجزہ صرف حق اور باطل میں فرق دکھلانے کے لئے اہل حق کو دیا جاتا ہے اور معجزہ کی اصل غرض صرف اس قدر ہے کہ عقلمندوں اور منصفوں کے نزدیک سچے اور جھوٹے میں ایک ما بہ الامتیاز قائم ہو جائے اور اسی حد تک معجزہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو ما بہ الامتیاز قائم کرنے کے لئے کافی ہو اور یہ اندازہ ہر ایک زمانہ کی حاجت کے مناسب حال ہوتا ہے اور نیز نوعیت معجزہ بھی حسب حال زمانہ ہی ہوتی ہے۔ یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ ہر ایک متعصب اور جاہل اور بدطبع گو کیسا ہی مصلحت الٰہیہ کے برخلاف اور قدر ضرورت سے بڑھ کر کوئی معجزہ مانگے تو وہ بہرحال دکھلانا ہی پڑے۔ یہ طریق جیسا کہ حکمت الٰہیہ کے برخلاف ہے ایسا ہی انسان کی ایمانی حالت کو بھی

مضر ہے کیونکہ اگر معجزات کا حلقہ ایسا وسیع کر دیا جائے کہ جو کچھ قیامت کے وقت پر موقوف رکھا گیا ہے وہ سب دنیا میں ہی بذریعہ معجزہ ظاہر ہو سکے تو پھر قیامت اور دنیا میں کوئی فرق نہ ہوگا حالانکہ اسی فرق کی وجہ سے جن اعمال صالحہ اور عقائد صحیحہ کا جو دنیا میں اختیار کئے جائیں ثواب ملتا ہے وہی عقائد اور اعمال اگر قیامت کو اختیار کئے جائیں تو ایک رتی بھی ثواب نہیں ملیگا جیسا کہ تمام نبیوں کی کتابوں اور قرآن شریف میں بھی بیان فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن کسی بات کا قبول کرنا یا کوئی عمل کرنا نفع نہیں دیگا اور اس وقت ایمان لانا محض بے کار ہوگا۔ کیونکہ ایمان اسی حد تک ایمان کہلاتا ہے جبکہ کسی مخفی بات کو ماننا پڑے۔ لیکن جبکہ پردہ ہی کھل گیا اور روحانی عالم کا دن چڑھ گیا اور ایسے امور قطعی طور پر ظاہر ہو گئے کہ خدا پر اور روز جزا پر شک کرنے کی کوئی بھی وجہ نہ رہی تو پھر کسی بات کو اس وقت ماننا جس کو دوسرے لفظوں میں ایمان کہتے ہیں محض تحصیل حاصل ہوگا۔ غرض نشان اس درجہ پر کھلی کھلی چیز نہیں ہے جس کے ماننے کے لئے تمام دنیا بغیر اختلاف اور بغیر عذر اور بغیر چون و چرا کے مجبور ہو جائے اور کسی طبیعت کے انسان کو اس کے نشان ہونے میں کلام نہ رہے۔ اور کسی غبی سے غبی انسان پر بھی وہ امر مشتبہ نہ رہے۔

غرض نشان اور معجزہ ہر ایک طبیعت کے لئے ایک بدیہی امر نہیں جو دیکھتے ہی ضروری التسلیم ہو بلکہ نشانوں سے وہی عقلمند اور منصف اور راستباز اور راست طبع فائدہ اٹھاتے ہیں جو اپنی فراست اور دُوربینی اور باریک نظر اور انصاف پسندی اور خدا ترسی اور تقویٰ شعاری سے دیکھ لیتے ہیں کہ وہ ایسے امور ہیں جو دنیا کی معمولی باتوں میں سے نہیں ہیں۔ اور نہ ایک کاذب اُن کے دکھلانے پر قادر ہو سکتا ہے۔ اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ امور انسانی بناوٹ سے بہت دُور ہیں۔ اور بشری دسترس سے برتر ہیں اور ان میں ایک ایسی خصوصیت اور امتیازی علامت ہے جس پر انسان کی معمولی طاقتیں اور پُر تکلف منصوبے قدرت نہیں پا سکتے۔ اور وہ اپنے لطیف فہم اور نور فراست سے اس تہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے اندر ایک نور ہے اور خدا کے ہاتھ کی ایک خوشبو ہے جس پر مکر اور فریب یا کسی چالاکی کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ پس جس طرح سورج کی روشنی پر یقین لانے کے لئے صرف وہ روشنی ہی کافی نہیں بلکہ آنکھ کے نور کی بھی ضرورت ہے تا اس روشنی کو دیکھ سکے اسی طرح معجزہ کی روشنی پر یقین لانے کے لئے فقط معجزہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ نور فراست کی بھی ضرورت ہے اور جب تک معجزہ دیکھنے والے کی سرشت میں فراست صحیحہ اور عقل سلیم کی روشنی نہ ہو تب تک اس کا قبول کرنا غیر ممکن ہے مگر بدبخت انسان جس کو یہ نور فراست

عطا نہیں ہوا وہ ایسے معجزات سے جو صرف امتیازی حد تک ہیں تسلی نہیں پاتا اور بار بار یہی سوال کرتا ہے کہ بجز ایسے معجزہ کے میں کسی معجزہ کو قبول نہیں کر سکتا کہ جو نمونہ قیامت ہو جائے۔ مثلاً کوئی شخص میرے روبرو آسمان پر چڑھ جائے اور پھر روبرو ہی آسمان سے اُترے اور اپنے ساتھ کوئی ایسی کتاب لائے جو اُترنے کے وقت اس کے ہاتھ میں ہو اور صرف اسی پر کفایت نہیں بلکہ تب مانیں گے کہ ہم اس کتاب کو ہاتھ میں لے کر دیکھ لیں اور پڑھ لیں۔ یا چاند کا ٹکڑا یا سورج کا ٹکڑا اپنے ساتھ لائے جو زمین کو روشن کر سکے یا فرشتے اس کے ساتھ آسمان سے اُتریں۔ جو فرشتوں کی طرح خارق عادت کام کر کے دکھلائیں۔ یا دس بیس مُردے اس کی دعا سے زندہ ہو جائیں اور وہ شناخت کئے جائیں کہ فلاں فلاں شخص کے باپ دادا ہیں جو فلاں تاریخ مر گئے تھے اور صرف اسی قدر کافی نہیں بلکہ ساتھ اس کے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عام شہروں میں مجلسیں منعقد کر کے لیکچر دیں اور بلند آواز سے کہدیں کہ درحقیقت ہم مُردے ہیں جو دوبارہ زندہ ہو کر دنیا میں آئے ہیں اور ہم اس لئے آئے ہیں کہ تا گواہی دیں کہ فلاں مذہب سچا ہے یا فلاں شخص جو دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوں وہ سچ کہتا ہے اور ہم خدا تعالیٰ کے مُنہ سے سُن کر آئے ہیں کہ وہ سچا ہے۔

یہ وہ خود تراشیدہ معجزات ہیں جو اکثر جاہل لوگ جو ایمان کی حقیقت سے بکلی بے خبر ہیں مانگا کرتے ہیں۔ یا ایسے ہی اور بیہودہ خوارق جو خدا تعالےٰ کی اصل منشاء سے بہت دُور ہیں طلب کیا کرتے ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۳۴-۳۵)

درحقیقت معجزات کی مثال ایسی ہے جیسے چاندنی رات کی روشنی جس کے کسی حصہ میں کچھ بادل بھی ہو۔ مگر وہ شخص جو شب کور ہو جو رات کو دیکھ نہیں سکتا اس کے لئے یہ چاندنی کچھ مفید نہیں۔ ایسا تو ہرگز ممکن نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی ہوا کہ اس دنیا کے معجزات اسی رنگ کے ظاہر ہوں جس رنگ میں قیامت میں ظہور ہوگا۔ مثلاً دو تین سو مُردے زندہ ہو جائیں اور بہشتی پھل ان کے پاس ہوں۔ اور دوزخ کی آگ کی چنگاریاں بھی پاس رکھتے ہوں اور شہر بشہر دورہ کریں اور ایک نبی کی سچائی پر جو قوم کے درمیان ہو گواہی دیں اور لوگ ان کو شناخت کر لیں کہ درحقیقت یہ لوگ مر چکے تھے اور اب زندہ ہو گئے ہیں اور وعظوں اور لیکچروں سے شور مچا دیں کہ درحقیقت یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے سچا ہے۔ سو یاد رہے کہ ایسے معجزات

کبھی ظاہر نہیں ہوئے اور نہ آئندہ قیامت سے پہلے کبھی ظاہر ہونگے۔ اور جو شخص دعوٰی کرتا ہے کہ ایسے معجزات کبھی ظاہر ہو چکے ہیں وہ محض بے بنیاد قصوں سے فریب خوردہ ہے اور اس کو سنت اللہ کا علم نہیں۔ اگر ایسے معجزات ظاہر ہوتے تو دنیا دنیا نہ رہتی اور تمام پردے کھل جاتے اور ایمان لانے کا ایک ذرّہ بھی ثواب باقی نہ رہتا۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۳۳)

بیان ڈپٹی مسٹر عبداللہ آتھم صاحب .... جناب کے کل کے مباہلہ کا جواب یہ ہے کہ ہم مسیحی تو پرانی تعلیمات کے لئے نئے معجزات کی کچھ ضرورت نہیں دیکھتے اور نہ ہم اسکی استطاعت اپنے اندر دیکھتے ہیں۔ بجز اس کے کہ ہم کو وعدہ یہ ہوا ہے کہ جو درخواست بمطابق رضاء الٰہی کے تم کروگے وہ تمہارے واسطے حاصل ہو جائے گی۔ اور نشانات کا وعدہ ہم سے نہیں۔ لیکن جناب کو اس کا بہت سا ناز ہے۔ ہم بھی دیکھنے معجزہ سے انکار نہیں کرتے۔ اگر اسی میں مہربانی خلق اللہ کے اوپر ہے کہ نشان دکھلا کر فیصلہ کیا جائے تو ہم نے تو اپنا عجز بیان کیا۔ جناب ہی کوئی معجزہ دکھلا دیں۔ اور اسوقت آپ نے اپنے آخری مضمون دیروزہ میں کہا تھا اور کچھ آج بھی اس پر ایماء ہے۔ اب زیادہ گفتگو کی اس میں کیا ضرورت ہے۔ ہم دونوں عمر رسیدہ ہیں آخر قبر ہمارا ٹھکانہ ہے۔ خلق اللہ پر رحم کرنا چاہیئے کہ آؤ کسی نشان آسمانی سے فیصلہ کریں اور یہ بھی آپ نے کہا کہ مجھے خاص الہام ہوا ہے کہ اس میدان میں **تجھے فتح** ہے اور ضرور خدائے راست ان کے ساتھ ہوگا جو راستی پر ہیں۔ ضرور ضرور ہی ہوگا۔ آپ کی اس تحریر کے خلاصہ کا یہ جواب ہے جیسا کہ ہم آگے بھی لکھ چکے ہیں کہ ہم آپ کو کوئی پیغمبر یا رسول کا شخص ملہم جان کر آپ سے مباحثہ نہیں کرتے۔ آپ کے ذاتی خیالات اور وجوہات اور الہامات سے ہمارا کچھ سروکار نہیں ہم فقط آپ کو ایک **محمدی** شخص فرض کرکے دین عیسوی اور **محمدیت** کے بارہ میں بموجب ان قواعد و اسناد کے جو ان ہر دو میں عام مانی جاتی ہیں آپ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ خیر تاہم چونکہ آپ کو ایک خاص قدرت الٰہی دکھانے پر آمادہ ہو کے ہم کو برائے مقابلہ بلاتے ہیں تو ہمیں دیکھنے سے گریز بھی نہیں یعنی معجزہ یا نشانی پس ہم یہ **تین شخص پیش کرتے ہیں** جن میں ایک اندھا ایک **ٹانگ کٹا** اور ایک **گونگا** ہے۔ ان میں سے جس کسی کو صحیح سالم کرسکو کر دو۔ اور جو اس معجزہ سے ہم پر فرض و واجب ہوگا ہم ادا کرینگے۔ آپ بقول خود ایسے خدا کے قائل ہیں جو گفتہ قادر نہیں لیکن درحقیقت قادر ہے تو وہ ان کو تندرست بھی کرسکیگا۔ پھر اس میں

تامل کی کیا ضرورت ہے اور ضرور بقول آپ کے راستباز کے ساتھ ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ آپ خلق اللہ پر رحم فرمائیے جلد فرمائیے۔ اور آپ کو خبر ہوگی کہ آج یہ معاملہ پڑنا ہے جس خدا نے الہام سے آپ کو خبر دے دی کہ اس جنگ و میدان میں تجھے فتح ہے اس نے ساتھ ہی یہ بھی بتادیا ہوگا کہ اندھے اور دیگر مصیبت زدوں نے بھی پیش ہونا ہے۔ سو سب عیسائی صاحبان اور محمدی صاحبان کے روبرو اسی وقت اپنا چیلنج پورا کیجیئے ....

بیان حضرت مرزا صاحب .... واضح ہو کہ مَیں نے ڈپٹی عبداللہ آتھم صاحب کی خدمت میں یہ تحریر کیا تھا کہ جیسے کہ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ نجات صرف مسیحی مذہب میں ہے۔ ایسا ہی **قرآن** میں لکھا ہے کہ نجات صرف اسلام میں ہے۔ اور آپ کا تو صرف اپنے لفظوں کے ساتھ دعویٰ اور مَیں نے وہ آیات بھی پیش کردی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ دعویٰ بغیر ثبوت کے کچھ عزت اور وقعت نہیں رکھتا۔ سو اس بناء پر دریافت کیا گیا تھا کہ قرآن کریم میں تو نجات یافتہ کی نشانیاں لکھی ہیں جن نشانوں کے مطابق ہم دیکھتے ہیں کہ اس مقدس کتاب کی پیروی کرنے والے نجات کو اسی زندگی میں پا لیتے ہیں۔ مگر آپ کے مذہب میں حضرت عیسٰی نے جو نشانیاں نجات یا بندوں یعنی ایمانداروں کی لکھی ہیں وہ آپ میں کہاں موجود ہیں۔ مثلاً جیسے مرقس ۱۶۔ ۱۷ میں لکھا ہے:۔

> "اور وے جو ایمان لائیں گے ان کے ساتھ یہ علامتیں ہونگی کہ وہ میرے نام سے دیووں کو نکالیں گے اور نئی زبانیں بولیں گے۔ سانپوں کو اٹھالیں گے اور اگر کوئی ہلاک کرنے والی چیز پیئیں گے انہیں کچھ نقصان نہ ہوگا۔ وے بیماروں پر ہاتھ رکھیں گے تو چنگے ہو جائیں گے۔"

تو اب مَیں بادب التماس کرتا ہوں کہ اگر ان الفاظ میں کچھ درشتی یا مرارت ہو تو اس کی معافی چاہتا ہوں کہ یہ تین بیمار جو آپ نے پیش کئے ہیں یہ علامت تو بالخصوصیت مسیحوں کے لئے حضرت عیسٰی قرار دے چکے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر تم سچے **ایماندار** ہو تو تمہاری یہی علامت ہے کہ بیمار پر ہاتھ رکھو گے تو وہ چنگا ہو جائیگا۔ اب گستاخی معاف اگر آپ سچے **ایماندار** ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس وقت تین بیمار آپ ہی کے پیش کردہ موجود ہیں آپ ان پر ہاتھ رکھدیں اگر وہ چنگے ہوگئے تو ہم قبول کریں گے کہ بیشک آپ سچے **ایماندار** اور نجات یافتہ ہیں۔ ورنہ کوئی قبول کرنے کی راہ نہیں کیونکہ حضرت مسیح تو

یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر تم میں رائی کے دانہ برابر بھی ایمان ہوتا تو اگر تم پہاڑ کو کہتے کہ یہاں سے چلا جا تو وہ چلا جاتا۔ مگر خیر میں اس وقت پہاڑ کی نقل مکانی تو آپ سے نہیں چاہتا کیونکہ وہ ہماری اس جگہ سے دُور ہیں۔ لیکن یہ تو بہت اچھی تقریب ہو گئی کہ بیمار تو آپ نے ہی پیش کر دیئے۔ اب آپ ان پر ہاتھ رکھو اور چنگا کر کے دکھلاؤ۔ ورنہ ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہاتھ سے جاتا رہیگا۔

مگر آپ پر یہ واضح رہے کہ یہ الزام ہم پر عائد نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ نے قرآن کریم میں ہماری یہ نشانی نہیں رکھی کہ بالخصوصیت تمہاری یہی نشانی ہے کہ جب تم بیماروں پر ہاتھ رکھو گے تو اچھے ہو جائیں گے۔ ہاں یہ فرمایا ہے کہ مَیں اپنی رضا اور مرضی کے موافق تمہاری دعائیں قبول کرونگا اور کم سے کم یہ کہ اگر ایک دُعا قبول کرنے کے لائق نہ ہو اور مصلحت الٰہی کے مخالف ہو تو اس میں اطلاع دی جائیگی یہ کہیں نہیں فرمایا کہ تم کو یہ اقتدار دیا جائیگا کہ تم اقتداری طور پر جو چاہو وہی کر گذرو گے مگر حضرت مسیح کا تو یہ حکم معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیماروں وغیرہ کے چنگا کرنے میں اپنے تابعین کو اختیار بخشتے ہیں جیسا کہ متی دس باب ایک میں لکھا ہے :۔

> ” پھر اس نے بارہ شاگردوں کو پاس بلا کر انہیں **قدرت بخشی** کہ ناپاک رُوحوں کو نکالیں اور ہر طرح کی بیماری اور دُکھ درد کو دُور کریں۔ “

اب یہ آپ کا فرض اور آپ کی ایمان داری کا ضرور نشان ہو گیا کہ آپ ان بیماروں کو چنگا کر کے دکھلاویں یا یہ اقرار کریں کہ ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ہم میں ایمان نہیں۔ اور آپ کو یاد رہے کہ ہر ایک شخص اپنی کتاب کے موافق مواخذہ کیا جاتا ہے ہمارے قرآن کریم میں کہیں نہیں لکھا کہ تمہیں اقتدار دیا جائیگا بلکہ صاف فرما دیا کہ قُل انّما الاٰیات عند اللّٰہ یعنی ان کو کہدو کہ نشان اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں جس نشان کو چاہتا ہے اسی نشان کو ظاہر کرتا ہے بندہ کا اس پر زور نہیں ہے کہ جبر کے ساتھ اس سے ایک نشان لیوے۔ یہ جبر اور اقتدار تو آپ ہی کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ بقول آپ کے مسیح اقتداری معجزات دکھلاتا تھا اور اُس نے شاگردوں کو بھی اقتدار بخشا اور آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ اب بھی حضرت مسیح زندہ حیّ قیّوم قادر مطلق عالم الغیب دن رات آپ کے ساتھ ہے جو چاہو وہی دے سکتا ہے۔ پس آپ حضرت مسیح سے درخواست کریں کہ ان تینوں بیماروں کو آپ کے ہاتھ رکھنے سے اچھا کر دیویں

تا نشانی ایمانداری کی آپ میں باقی رہ جاوے۔ ورنہ یہ تو مناسب نہیں کہ ایک طرف **اہل حق** کے ساتھ بحیثیت سچے عیسائی ہونے کے مباحثہ کریں اور جب سچے عیسائی کے نشان مانگے جائیں تب کہیں کہ ہم میں استطاعت نہیں۔ اس بیان سے تو آپ اپنے پر ایک اقبالی ڈگری کراتے ہیں کہ آپ کا مذہب اس وقت **زندہ مذہب** نہیں ہے۔ لیکن ہم جس طرح پر خدا تعالیٰ نے ہمارے سچے ایماندار ہونے کے نشان ٹھہرائے ہیں اس التزام سے نشان دکھلانے کو تیار ہیں اگر نشان نہ دکھلا سکیں تو جو سزا چاہیں دیویں اور جس طرح کی چھری چاہیں ہمارے گلے میں پھیر دیں اور وہ طریق نشان نمائی کا جس کے لئے ہم **مامور** ہیں وہ یہ ہے کہ ہم خدا تعالیٰ سے جو ہمارا سچا اور قادر خدا ہے اس مقابلہ کے وقت جو ایک سچے اور **کامل نبی** کا انکار کیا جاتا ہے تضرع سے کوئی نشان مانگیں تو وہ اپنی مرضی سے نہ محکوم اور تابع ہو کر جس طرح سے چاہیگا نشان دکھلائیگا …………… میرا دعویٰ نہ خدائی کا اور نہ اقتدار کا اور میں ایک **مسلمان آدمی** ہوں جو قرآن شریف کی پیروی کرتا ہوں اور قرآن شریف کی تعلیم کے رو سے اس موجودہ نجات کا مدعی ہوں۔ میرا نبوت کا کوئی دعویٰ نہیں یہ آپکی غلطی ہے یا آپ کسی خیال سے کہہ رہے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ جو الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ نبی بھی ہو جائے۔ میں تو **محمدی** اور کامل طور پر اللہ و رسول کا متبع ہوں اور ان نشانوں کا نام **معجزہ** رکھنا نہیں چاہتا بلکہ ہمارے مذہب کے رُو سے ان نشانوں کا نام **کرامات** ہے جو اللہ اور رسول کی پیروی سے دیئے جاتے ہیں۔ تو پھر میں دعوت حق کی غرض سے دوبارہ اتمام حجت کرتا ہوں کہ یہ حقیقی نجات اور حقیقی نجات کے برکات اور ثمرات صرف انہی لوگوں میں موجود ہیں جو حضرت **محمد مصطفٰے** صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنیوالے اور قرآن کریم کے احکام کے سچے تابعدار ہیں۔ اور میرا دعویٰ قرآن کریم کے مطابق صرف اتنا ہے کہ اگر کوئی حضرت عیسائی صاحب اس نجات حقیقی کے منکر ہوں جو قرآن کریم کے وسیلے سے مل سکتی ہے تو انہیں اختیار ہے کہ وہ میرے مقابل پر نجات حقیقی کی آسمانی نشانیاں اپنے مسیح سے مانگ کر پیش کریں …………… اور اس طرف میرے پر لازم ہوگا کہ میں سچا ایماندار ہونے کی نشانیاں قرآن کریم کے رُو سے اپنے وجود میں ثابت کردوں۔ مگر اس جگہ یاد رہے کہ **قرآن کریم ہمیں اقتدار نہیں بخشتا** بلکہ ایسے کلمہ سے ہمارے بدن پر لرزہ آتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کس قسم کا نشان دکھلائیگا۔ وہی خدا ہے۔ سوا اسکے اور کوئی خدا نہیں۔ ہاں یہ ہماری طرف سے اس بات کا عہد پختہ ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہ نے

میرے پر ظاہر کر دیا ہے کہ **ضرور مقابلہ کے وقت میں فتح پاؤنگا** مگر یہ معلوم نہیں کہ خدا تعالے کس طور سے نشان دکھلائے گا۔ اصل مدعا تو یہ ہے کہ نشان ایسا ہو کہ انسانی طاقتوں سے بڑھ کر ہو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ایک بندہ کو خدا ٹھہرا کر اقتدار کے طور پر اس سے نشان مانگا جائے۔ ہمارا یہ مذہب نہیں اور نہ ہمارا یہ عقیدہ ہے۔ اللہ جلشانہٗ ہمیں صرف عموم اور کلّی طور پر نشان دکھلانے کا وعدہ دیتا ہے۔ اگر اس میں مَیں جھوٹا نکلوں تو جو سزا آپ تجویز کریں خواہ سزائے موت ہی کیوں نہ ہو مجھے منظور ہے۔ لیکن اگر آپ حد اعتدال و انصاف کو چھوڑ کر مجھ سے ایسے نشان چاہیں گے جس طرز سے حضور مسیح بھی نہیں دکھلا سکتے بلکہ سوال کرنے والوں کو ایک دو گالیاں سُنا دیں تو ایسے نشان دکھلانے کا دم مارنا بھی میرے نزدیک کفر ہے۔

(جنگ مقدس ص ۶۷-۷۵)

قرآن شریف میں اقتراحی نشان مانگنے والوں کو یہ جواب دیا گیا تھا کہ قل سبحان ربّی ھل کنت الّا بشرا رسولا۔ یعنی خدا تعالیٰ کی شان اس تہمت سے پاک ہے کہ کسی اس کے رسول یا نبی یا ملہم کو یہ قدرت حاصل ہو کہ جو الوہیت کے متعلق خارق عادات کام ہیں ان کو وہ اپنی قدرت سے دکھلائے اور فرمایا کہ انکو کہدے کہ مَیں تو صرف آدمیوں میں سے ایک رسول ہوں جو اپنی طرف سے کسی کام کے کرنے کا مجاز نہیں ہوں محض امر الٰہی کی پیروی کرتا ہوں۔ پھر مجھ سے یہ درخواست کرنا کہ یہ نشان دکھلا اور یہ نہ دکھلا سراسر حماقت ہے۔ جو کچھ خدا نے کہا وہی دکھلا سکتا ہوں نہ اَور کچھ۔

(تحفہ غزنویہ ص ۹-۱۰)

بہت سے معجزات ہیں جو صرف **ذاتی اقتدار** کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھلائے جن کے ساتھ کوئی دُعا نہ تھی۔ کئی دفعہ تھوڑے سے پانی کو جو صرف ایک پیالہ میں تھا اپنی انگلیوں کو اس پانی کے اندر داخل کرنے سے اس قدر زیادہ کر دیا کہ تمام لشکر اور اونٹوں اور گھوڑوں نے وہ پانی پیا اور پھر بھی وہ پانی ویسا ہی اپنی مقدار پر موجود تھا۔ اور کئی دفعہ دو چار روٹیوں پر ہاتھ رکھنے سے ہزار ہا بھوکوں پیاسوں کا ان سے شکم سیر کر دیا۔ اور بعض اوقات تھوڑے دودھ کو اپنی لبوں سے برکت دے کر ایک جماعت کا پیٹ اس سے بھر دیا۔ اور بعض اوقات شور آب کنوئیں میں اپنے مُنہ کا لعاب ڈالکر اسکو نہایت شیریں کر دیا۔ اور بعض اوقات سخت مجروحوں کو اپنا ہاتھ

رکھکر ان کو اچھا کر دیا ۔ اور بعض اوقات آنکھوں کو جن کے ڈیلے لڑائی کے کسی صدمہ سے باہر جا پڑے تھے اپنے ہاتھ کی برکت سے پھر درست کر دیا ۔ ایسا ہی اور بھی بہت سے کام اپنے **ذاتی اقتدار** سے کئے جن کے ساتھ ایک چھپی ہوئی **طاقتِ الٰہی مخلوط** تھی ....

لیکن یہ بات اسجگہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اس قسم کے اقتداری خوارق گو خدا تعالےٰ کی طرف سے ہی ہوتے ہیں ۔ مگر پھر بھی خدا تعالےٰ کے ان خاص افعال سے جو بلا توسط ارادہ غیرے ظہور میں آتے ہیں کسی طور سے برابری نہیں کر سکتے اور نہ برابر ہونا ان کا مناسب ہے ۔ اسی وجہ سے جب کوئی نبی یا ولی اقتداری طور پر بغیر توسط کسی دُعا کے کوئی ایسا امر خارق عادت دکھلا دے جو انسان کو کسی حیلہ اور تدبیر اور علاج سے اس کی قوت نہیں دی گئی تو نبی کا وہ فعل خدا تعالیٰ کے ان افعال سے کم رتبہ پر رہیگا جو خود خدا تعالیٰ علانیہ اور بالجہر اپنی قوت کاملہ سے ظہور میں لاتا ہے ۔ یعنی ایسا اقتداری معجزہ بہ نسبت دوسرے الٰہی کاموں کے جو بلا واسطہ اللہ جلّشانہٗ سے ظہور میں آتے ہیں ضرور کچھ نقص اور کمزوری اپنے اندر موجود رکھتا ہوگا تا سرسری نگاہ والوں کی نظر میں **تشابہ فی الخلق** واقع نہ ہو ۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا باوجود اس کے کہ کئی دفعہ سانپ بنا لیکن آخر عصا کا عصا ہی رہا ۔ اور حضرت مسیح کی چڑیاں باوجودیکہ معجزہ کے طور پر اُن کا پرواز قرآن کریم سے ثابت ہے مگر پھر بھی مٹی کی مٹی ہی تھے اور کہیں خدا تعالےٰ نے یہ نہ فرمایا کہ وہ زندہ بھی ہو گئیں ۔ اور ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے **اقتداری خوارق** میں چونکہ طاقت الٰہی سب سے زیادہ بھری ہوئی تھی کیونکہ وجود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا تجلّیاتِ الٰہیہ کے لئے اتم و اعلیٰ و ارفع و اکمل نمونہ تھا اسلئے ہماری نظریں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقتداری خوارق کو کسی درجہ بشریت پر مقرر کرنے سے قاصر ہیں ۔ مگر تاہم ہمارا اس پر ایمان ہے کہ اسجگہ بھی اللہ جلّشانہٗ اور اس کے رسول کریم کے فعل میں مخفی طور پر کچھ فرق ضرور ہوگا ۔

(آئینہ کمالات اسلام ص ۶۶-۶۸)

یہ سچی بات ہے کہ خدا تعالےٰ غیر معمولی طور پر کوئی کام نہیں کرتا اصل بات یہ ہے کہ وہ خلق اسباب کرتا ہے خواہ ہم کو ان اسباب پر اطلاع ہو یا نہ ہو ۔ الغرض اسباب ضرور ہوتے ہیں اس لئے **شق القمر** یا یانارکونی بردًا وسلامًا کے معجزات بھی خارج از اسباب نہیں بلکہ وہ بھی بعض مخفی در مخفی اسباب کے نتائج ہیں اور سچے اور حقیقی سائنس پر

مبنی ہیں۔ کوتاہ اندیش اور تاریک فلسفہ کے دلدادہ اسے نہیں سمجھ سکتے۔

(ملفوظات جلد اوّل ص۱۰۹)

اس جگہ ایک اور سرّ یاد رکھنے کے لائق ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اولیاء سے جو خوارق کبھی اس قسم کے ظہور میں آتے ہیں کہ پانی ان کو ڈبو نہیں سکتا اور آگ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتی اس میں دراصل یہی بھید ہے کہ حکیم مطلق جس کی بے انتہا اسرار پر انسان حاوی نہیں ہو سکتا اپنے دوستوں اور مقربوں کی توجّہ کے وقت کبھی یہ کرشمہ قدرت دکھلاتا ہے کہ وہ توجہ عالم میں تصرف کرتی ہے اور جن ایسے مخفی اسباب کے جمع ہونے سے مثلاً آگ کی حرارت اپنے اثر سے رک سکتی ہے خواہ وہ اسباب اجرام علوی کی تاثیریں ہوں یا خود مثلاً آگ کی کوئی مخفی خاصیت یا اپنے بدن کی ہی کوئی مخفی خاصیت یا ان تمام خاصیتوں کا مجموعہ ہو وہ اسباب اس توجہ اور اس دعا سے حرکت میں آتی ہیں۔ تب ایک امر خارق عادت ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اس سے حقائق اشیاء کا اعتبار نہیں اٹھتا اور نہ علوم ضائع ہوتے ہیں بلکہ یہ تو علوم الٰہیہ میں سے خود ایک علم ہے اور یہ اپنے مقام پر ہے اور مثلاً آگ کا محرق بالخاصیت ہونا اپنے مقام پر بلکہ یوں سمجھ لیجیئے کہ یہ روحانی مواد ہیں جو آگ پر غالب آکر اپنا اثر دکھاتے ہیں اور اپنے وقت اور اپنے محل سے خاص ہیں۔ اس دقیقہ کو دنیا کی کوئی عقل نہیں سمجھ سکتی کہ انسان کامل خدا تعالیٰ کے رُوح کا جلوہ گاہ ہوتا ہے اور جب کبھی کامل انسان پر ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ وہ اس جلوہ کا عین وقت ہوتا ہے تو اس وقت ہر ایک چیز اس سے ایسی ڈرتی ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ سے اس وقت اس کو درندہ کے آگے ڈال دو۔ آگ میں ڈال دو وہ اس سے کچھ بھی نقصان نہیں اُٹھائیگا۔ کیونکہ اس وقت خدا تعالیٰ کی رُوح اس پر ہوتی ہے اور ہر ایک چیز کا عہد ہے کہ اس سے ڈرے۔ یہ معرفت کا ایک **آخری بھید** ہے جو بغیر صحبت کاملین سمجھ میں نہیں آسکتا۔ چونکہ یہ نہایت دقیق اور پھر نہایت درجہ نادر الوقوع ہے اس لئے ہر ایک فہم اس فلاسفی سے آگاہ نہیں۔ مگر یہ یاد رکھو کہ ہر ایک چیز خدا تعالیٰ کی آواز سُنتی ہے۔ ہر ایک چیز پر خدا تعالیٰ کا تصرف ہے اور ہر ایک چیز کی تمام ڈوریاں خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اسکی حکمت ایک بے انتہا حکمت ہے جو ہر ایک ذرّہ کی جڑھ تک پہنچی ہوئی ہے اور ہر ایک چیز میں اتنی ہی خاصیتیں ہیں جتنی اس کی قدرتیں ہیں۔ جو شخص اس بات پر ایمان نہیں لاتا وہ اس گروہ میں داخل ہے جو ما قدروا اللّٰہ حق قدرہٖ کے مصداق ہیں۔ اور چونکہ انسان کامل مظہر اتم

تمام عالم کا ہوتا ہے۔ اس لئے تمام عالم اُس کی طرف وقتاً فوقتاً کھینچا جاتا ہے۔ وہ روحانی عالم کا ایک عنکبوت ہوتا ہے اور تمام عالم اس کی تاریں ہوتی ہیں۔ اور خوارق کا یہی سر ہے ؎

ہر کاروبارِ ہستی اثری ست عارفاں را ؎ ز جہاں چہ دید آں کس کہ ندید ایں جہاں را

(برکات الدعا ص۲۹-۳۱ حاشیہ)

واضح ہو کہ نشان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) **نشانِ تخویف و تعذیب** جن کو **قہری نشان** بھی کہہ سکتے ہیں۔ (۲) **نشانِ تبشیر و تسکین** جن کو **نشانِ رحمت** سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ تخویف کے نشان سخت کافروں اور کج دلوں اور نافرمانوں اور بے ایمانوں اور فرعونی طبیعت والوں کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں تا وہ ڈریں اور خدا تعالیٰ کی قہری اور جلالی ہیبت ان کے دلوں پر طاری ہو۔ اور تبشیر کے نشان ان حق کے طالبوں اور مخلص مومنوں اور سچائی کے متلاشیوں کے لئے ظہور پذیر ہوتے ہیں جو دلوں کی غربت اور فروتنی سے کامل یقین اور زیادتِ ایمان کے طلبگار ہیں اور تبشیر کے نشانوں سے ڈرانا اور دھمکانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اپنے ان مطیع بندوں کو مطمئن کرنا اور ایمانی اور یقینی حالات میں ترقی دینا اور اُن کے مضطرب سینہ پر دستِ شفقت و تسلّی رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ سو مومن قرآن شریف کے وسیلے سے ہمیشہ تبشیر کے نشان پاتا رہتا ہے اور ایمان اور یقین میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ تبشیر کے نشانوں سے مومن کو تسلّی ملتی ہے اور وہ اضطراب جو فطرتاً انسان میں ہے جاتا رہتا ہے اور سکینت دل پر نازل ہوتی ہے۔ مومن ببرکت اتباع کتاب اللہ اپنی عمر کے آخری دن تک تبشیر کے نشانوں کو پاتا رہتا ہے اور تسکین اور آرام بخشنے والے نشان اس پر نازل ہوتے رہتے ہیں تا وہ یقین اور معرفت میں بے نہایت ترقیاں کرتا جائے اور حق الیقین تک پہنچ جائے۔ اور تبشیر کے نشانوں میں ایک لطف یہ ہوتا ہے کہ جیسے مومن ان کے نزول سے یقین اور معرفت اور قوتِ ایمان میں ترقی کرتا ہے ایسا ہی وہ بوجہ مشاہدہ آلاء و نعماء الٰہی و احسانات ظاہرہ و باطنہ و جلیہ و خفیہ حضرت باری عزّ اسمہٗ جو تبشیر کے نشانوں میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں محبت و عشق میں بھی دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ سو حقیقت میں عظیم الشان اور قوی الاثر اور مبارک اور موصل الی المقصود تبشیر کے نشان ہی ہوتے ہیں جو سالک کو معرفت کاملہ اور محبت ذاتیہ کی اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں جو اولیاء اللہ کے لئے منتہی المقامات ہے۔

(تصدیق النبی ص۱۴)

عقلمند کیلئے یہ ایک نکتہ نہایت ہدایت بخش ہے کہ پیشگوئیوں میں استعارات اور مجازات بھی ہوتے ہیں۔ مگر تعلیم کیلئے تصریح اور تفصیل ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے جہاں کہیں تعلیم اور پیشگوئی کا تناقض معلوم ہو تو یہ لازم ہوتا ہے کہ تعلیم کو مقدم رکھا جائے اور پیشگوئی کو اگر اس کے مخالف ہو ظاہر الفاظ سے پھیر کر تعلیم کے مطابق اور موافق کر دیا جائے تا رفع تناقض ہو۔ بہرحال تعلیمی مضمون کا لحاظ مقدم چاہیئے۔ کیونکہ تعلیم علاوہ تصریح اور تفصیل کے اکثر معارض افادہ اور استفادہ میں آتی رہتی ہے لہٰذا اس کے مقاصد اور مدعا کسی طرح مخفی نہیں رہ سکتے برخلاف پیشگوئیوں کے کہ وہ اکثر گوشۂ گمنامی میں پڑی رہتی ہیں۔

(کتاب البریّہ ص۵۱)

واضح ہو کہ انبیاء کے معجزات دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) ایک وہ جو **محض سماوی امور** ہوتے ہیں جن میں انسان کی تدبیر اور عقل کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ جیسے **شق القمر** جو ہمارے سید و مولیٰ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔ اور خدا تعالیٰ کی غیر محدود قدرت نے ایک راستباز اور کامل نبی کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اس کو دکھایا تھا۔ (۲) دوسرے **عقلی معجزات** ہیں جو اس خارق عادت عقل کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں جو الہام الٰہی سے ملتی ہے۔ جیسے حضرت سلیمان کا وہ معجزہ جو **صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ** ہے جس کو دیکھ کر بلقیس کو ایمان نصیب ہوا۔

(ازالہ اوہام حاشیہ ص۱۵۳-۱۵۴)

جس معجزہ کو عقل شناخت کر کے اس کے منجانب اللہ ہونے پر گواہی دے وہ ان معجزات سے **ہزارہا درجہ افضل** ہوتا ہے کہ جو صرف بطور کتھا یا قصّہ کے مدّ منقولات میں بیان کئے جاتے ہیں۔ اس ترجیح کے دو باعث ہیں۔ ایک تو یہ کہ منقولی معجزات ہمارے لئے جو صد ہا سال اس زمانہ سے پیچھے پیدا ہوئے ہیں جب معجزات دکھلائے گئے تھے مشہود اور محسوس کا حکم نہیں رکھتے اور اخبار منقولہ ہونے کے باعث سے وہ درجہ انکو حاصل بھی نہیں ہو سکتا جو مشاہدات اور مرئیات کو حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے منقولی معجزات کو جو تصرف عقل سے بالاتر ہیں مشاہدہ کیا ہے اُن کیلئے بھی وہ تسلّی تام کا موجب نہیں ٹھہر سکتا کیونکہ بہت سے ایسے عجائبات بھی ہیں کہ ارباب شعبدہ بازی ان کو دکھلاتے پھرتے ہیں گو وہ مکر اور فریب ہی ہیں مگر اب مخالف بد اندیش پر کیونکر ثابت کر کے دکھلاویں کہ انبیاء سے جو عجائبات

اس قسم کے ظاہر ہوتے ہیں کہ کسی نے سانپ بنا کر دکھلا دیا اور کسی نے مردہ کو زندہ کر کے دکھلا دیا۔ یہ اس قسم کی دست بازیوں سے منزہ ہیں جو شعبدہ باز لوگ کیا کرتے ہیں۔ یہ مشکلات کچھ ہمارے ہی زمانہ میں پیدا نہیں ہوئیں بلکہ ممکن ہے کہ انہی زمانوں میں یہ مشکلات پیدا ہو گئی ہوں۔ مثلاً جب ہم یوحنا کی انجیل کے پانچویں باب کی دوسری آیت سے پانچویں آیت تک دیکھتے ہیں تو اس میں یہ لکھا ہوا پاتے ہیں:۔

> ”اور اور شلیم میں باب الضان کے پاس ایک حوض ہے جو عبرانی میں بیت حسدا کہلاتا ہے۔ اس کے پانچ اسارے ہیں۔ ان میں ناتوانوں اور اندھوں اور لنگڑوں اور پژمردوں کی ایک بڑی بھیڑ پڑی تھی جو پانی کے ہلنے کی منتظر تھی کیونکہ ایک فرشتہ بعض وقت اس حوض میں اتر کر پانی کو ہلاتا تھا اور پانی ہلنے کے بعد جو کوئی کہ پہلے اس میں اترتا کیسی ہی بیماری میں کیوں نہ ہو اس سے چنگا ہو جاتا تھا ......“

اب ظاہر ہے کہ وہ شخص جو حضرت عیسیٰ کی نبوت کا منکر ہے اور ان کے معجزات کا انکاری ہے جب یوحنا کی یہ عبارت پڑھیگا اور ایسے حوض کے وجود پر اطلاع پائے گا کہ جو حضرت عیسیٰ کے ملک میں قدیم سے چلا آتا تھا اور جس میں قدیم سے یہ خاصیت تھی کہ اس میں ایک ہی غوطہ لگانا ہر ایک قسم کی بیماری کو گو وہ کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو دور کر دیتا تھا تو خواہ نخواہ اس کے دل میں ایک قوی خیال پیدا ہوگا کہ اگر حضرت مسیح نے جو کچھ خوارق عجیبہ دکھلائے ہیں تو بلا شبہ ان کا یہی موجب ہوگا کہ حضرت ممدوح اسی حوض کے پانی میں کچھ تصرف کر کے ایسے ایسے خوارق دکھلاتے ہونگے کیونکہ اس قسم کے اقتباس کی ہمیشہ دنیا میں بہت سی نظیریں پائی گئی ہیں اور اب بھی ہیں اور عند العقل یہ بات نہایت صحیح اور قرین قیاس ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ کے ہاتھ سے اندھوں لنگڑوں وغیرہ کو شفا حاصل ہوئی ہے تو بالیقین یہ نسخہ حضرت مسیح نے اسی حوض سے اڑایا ہوگا اور پھر نادانوں اور سادہ لوحوں میں کہ جو بات کی تہ تک نہیں پہنچتے اور اصل حقیقت کو نہیں شناخت کر سکتے یہ مشہور کر دیا کہ ایک روح کی مدد سے ایسے ایسے کام کرتا ہوں۔ بالخصوص جبکہ یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت مسیح اسی حوض پر اکثر جایا بھی کرتے تھے تو اس خیال کو اور بھی قوت حاصل ہوتی ہے غرض مخالف کی نظر میں ایسے معجزوں سے کہ جو قدیم سے حوض دکھلاتا رہا ہے حضرت عیسیٰ کی نسبت بہت سے شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں اور اس بات کے ثبوت میں بہت سی مشکلات پڑتی ہیں کہ یہودیوں کی رائے کے موافق مسیح مکار اور شعبدہ باز نہیں تھا اور نیک چلن آدمی تھا۔

جس نے اپنے عجائبات کے دکھلانے میں اس قدیمی حوض سے کچھ مدد نہیں لی اور سچ مچ معجزات ہی دکھائے ہیں۔ اور اگرچہ قرآن شریف پر ایمان لانے کے بعد ان وساوس سے نجات حاصل ہو جاتی ہے مگر جو شخص ابھی قرآن شریف پر ایمان نہیں لایا اور یہودی یا ہندو یا عیسائی ہے وہ کیونکر ایسے وساوس سے نجات پا سکتا ہے اور کیونکر اس کا دل اطمینان پکڑ سکتا ہے ....

.... عوام الناس کو جو اکثر چارپایوں کی طرح ہوتے ہیں اس طرف خیال بھی نہیں ہوتا کہ لمبی چوڑی تفتیش کریں اور بات کی تہ تک پہنچ جائیں۔ اور ایسے تماشوں کے دکھلانے کا عرصہ بھی نہایت ہی تھوڑا ہوتا ہے جس میں غور اور فکر کرنے کے لئے کافی فرصت نہیں مل سکتی اسلئے مکاروں کے لئے دست بازی کی بہت گنجائش رہتی ہے اور ان کے پوشیدہ بھیدوں پر اطلاع پانے کا کم موقعہ ملتا ہے۔ علاوہ اس کے عوام بے چارے علوم طبعی وغیرہ فنونِ فلاسفہ سے کچھ خبر نہیں رکھتے اور جو کائنات میں حکیم مطلق نے طرح طرح کے عجیب خواص رکھے ہیں ان خواص کی انہیں کچھ بھی خبر نہیں ہوتی۔ پس وہ ہر ایک وقت اور ہر زمانہ میں دھوکا کھانے کو تیار ہیں اور کیونکر دھوکا نہ کھاویں خواص اشیاء کے ایسے ہی حیرت افزا ہیں اور بے خبری کی حالت میں موجب زیادت حیرت ہوتے ہیں۔ مثلاً مکھی اور دوسرے بعض جانوروں میں یہ خاصیت ہے کہ اگر ایسے طور پر مر جائیں کہ ان کے اعضاء میں کچھ زیادہ تفرق اتصال واقع نہ ہو اور اعضاء اپنی اصلی ہیئت اور وضع پر سلامت رہیں اور متعفن ہونے بھی نہ پائیں بلکہ ابھی تازہ ہی ہوں اور موت پر دو تین گھنٹے سے زیادہ عرصہ نہ گذرا ہو جیسے پانی میں مری ہوئی مکھیاں ہوتی ہیں تو اس صورت میں اگر نمک باریک پیس کر اس مکھی وغیرہ کو اس کے نیچے دبایا جائے اور پھر اسی قدر خاکستر بھی اس کے اوپر ڈالی جاوے تو وہ مکھی زندہ ہو کر اڑ جاتی ہے اور یہ خاصیت مشہور و معروف ہے جس کو اکثر لڑکے بھی جانتے ہیں لیکن اگر کسی سادہ لوح کو اس نسخے پر اطلاع نہ ہو اور کوئی مکّار اس نادان اور بے خبر کے سامنے مگس مسیح ہونے کا دعویٰ کرے اور اسی حکمت عملی سے مکھیوں کو زندہ کرے اور بظاہر کوئی منتر جنتر پڑھتا رہے جس سے یہ جتلانا منظور ہو کہ گویا وہ اسی منتر کے ذریعہ مکھیوں کو زندہ کرتا ہے تو پھر اس سادہ لوح کو اس قدر عقل اور فرصت کہاں ہے کہ تحقیقاتیں کرتا پھرے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ مکار لوگ اسی زمانہ میں دنیا کو ہلاک کر رہے ہیں۔ کوئی سونا بنا کر دکھلاتا ہے اور اپنی کیمیا گری کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور کوئی آپ ہی زمین کے نیچے پتھر دبا کر پھر ہندوؤں کے سامنے دیوی نکالتا ہے۔ بعض نے ایسا بھی کیا ہے کہ جمال گوٹہ کا روغن اپنی دوات کی سیاہی میں ملایا

اور اس سیاہی سے کسی سادہ لوح کو تعویذ لکھکر دیا تا دست آنے پر تعویز کا اثر ظاہر ہو۔ ایسے ہی ہزاروں اور مکر و فریب ہیں کہ جو اسی زمانہ میں ہو رہے ہیں۔ اور بعض مکر ایسے عمیق ہیں جن سے بڑے بڑے دانشمند دھوکا کھا جاتے ہیں اور علوم طبعی کے دقائق عمیقہ اور جسمی تراکیب اور قوتوں کے خواص عجیبہ جو حال کے زمانہ میں نئے تجارب کے ذریعہ سے روز بروز پھیلتے جاتے ہیں۔ یہ جدید باتیں ہیں جن سے جھوٹے معجزے دکھلانے والے نئے نئے مکر اور فریب دکھا سکتے ہیں۔ سو اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ جو معجزات بظاہر صورت ان مکروں سے تشابہ ہیں گو وہ سچے بھی ہوں تب بھی محجوب الحقیقت ہیں اور ان کے ثبوت کے بارے میں بڑی بڑی دقتیں ہیں۔

(براہین احمدیہ صـ ۵۲۵-۴۸۹)

جو امر خارق عادت کسی **ولی** سے صادر ہوتا ہے وہ حقیقت میں اس **نبی متبوع کا معجزہ ہے جس کی وہ امت ہے**۔ اور یہ بدیہی اور ظاہر ہے۔ کیونکہ جب کسی امر کا ظاہر ہونا کسی شخص اور کسی خاص کتاب کی متابعت سے وابستہ ہے اور بدوں متابعت کے وہ ظہور میں آ ہی نہیں سکتا تو بہ بداہت ثابت ہے کہ اگرچہ وہ امر بظاہر صورت کسی تابع سے ظہور میں آیا ہو لیکن درحقیقت مظہر اس امر کا نبی متبوع ہے جس کی متابعت سے ظہور اس کا مشروط ہے۔ اور سرّ اس بات کا کہ کیوں معجزہ نبی کا دوسرے کے توسط سے ظہور پذیر ہو جاتا ہے یہ ہے کہ جب ایک شخص وہی امر بجا لاتا ہے کہ جو اس کے شارع نے فرمایا ہے اور اس امر سے پرہیز کرتا ہے کہ جو اُس کے شارع نے منع کیا ہے اور اسی کتاب کا پابند رہتا ہے جو اس کے شارع نے دی ہے تو وہ اس صورت میں بالکل اپنے نفس سے محو ہو کر اپنے شارع کی ذمہ داری میں جا پڑتا ہے۔ پس اگر شارع طبیب حاذق کی طرح ٹھیک ٹھیک صراط مستقیم کا رہنما ہے اور وہ مبارک کتاب لایا ہے جس میں شخص پیرو کی امراض روحانی کا علاج ہے اور اس کی علمی اور عملی تکمیل کے لئے پورا سامان موجود ہے اور پھر اس کے پیرو نے بغیر کسی اعراض صوری یا معنوی کے ان تعلیمات کو بصدق دل قبول کر لیا ہے تو جو کچھ انوار و آثار بعد متابعت کامل کے مترتب ہونگے وہ حقیقت میں اس نبی متبوع کے فیوض ہیں۔ سو اسی جہت سے اگر ولی سے کوئی امر خارقِ عادت ظاہر ہو تو اس نبی متبوع کا معجزہ ہو گا۔

(براہین احمدیہ صـ ۵۸۷-۵۷۱)

مَیں نے بارہا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالے نے چار قسم کے نشان مجھے دیئے ہیں۔ اور جن کو

مَیں نے بڑے دعوے کے ساتھ متعدد مرتبہ لکھا اور شائع کیا ہے ۔

اوّل عربی دانی کا نشان ہے اور یہ اس وقت سے مجھے ملا ہے جب سے کہ محمد حسین (بٹالوی صاحب) نے یہ لکھا کہ یہ عاجز عربی کا ایک صیغہ بھی نہیں جانتا ۔ حالانکہ ہم نے کبھی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا کہ عربی کا صیغہ آتا ہے ۔ جو لوگ عربی املاء اور انشا میں پڑھے ہیں وہ اس کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں اور اس کی خوبیوں کا لحاظ رکھ سکتے ہیں ....

...... بڑی مشکل آکر یہ پڑتی ہے جب ٹھیٹھ زبان کا لفظ مناسب موقع پر نہیں ملتا ۔ اُس وقت خدا تعالیٰ وہ الفاظ القا کرتا ہے ۔ نئی اور بناوٹی زبان بنا لینا آسان ہے مگر ٹھیٹھ زبان مشکل ہے ۔ پھر ہم نے ان تصانیف کو بیش قدر انعامات کے ساتھ شائع کیا ہے اور کہا ہے کہ تم جس سے چاہو مدد لے لو ۔ اور خواہ اہلِ زبان بھی ملا لو ۔ مجھے خدا تعالیٰ نے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ وہ ہرگز قادر نہیں ہو سکتے ۔ کیونکہ یہ نشان قرآن کریم کے خوارق میں سے ظلی طور پر مجھے دیا گیا ہے ۔

دوم دعاؤں کا قبول ہونا ۔ مَیں نے عربی تصانیف کے دوران میں تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے کہ کس قدر کثرت سے میری دعائیں قبول ہوتی ہیں ۔ ایک ایک لفظ پر دعا کی ہے ۔ اور مَیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تو مستثنیٰ کرتا ہوں (کیونکہ ان کی طفیل اور اقتدار سے تو یہ سب کچھ ملا ہی ہے) اور مَیں کہہ سکتا ہوں کہ میری دُعائیں اس قدر قبول ہوئی ہیں کہ کسی کی نہیں ہوئی ہونگی ۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ دس ہزار یا دو لاکھ یا کتنی ۔ اور بعض نشانات قبولیت کے تو ایسے ہیں کہ ایک عالم ان کو جانتا ہے ۔

تیسرا نشان پیشگوئیوں کا ہے ۔ یعنی اظہار علی الغیب ۔ یوں تو نجومی اور رمّال لوگ بھی اٹکل بازیوں سے بعض باتیں ایسی کہہ دیتے ہیں کہ اُن کا کچھ نہ کچھ حصہ ٹھیک ہوتا ہے ۔ اور ایسا ہی تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی کاہن لوگ تھے جو غیب کی خبریں بتلاتے تھے ۔ چنانچہ سطیح بھی ایک کاہن تھا ۔ مگر ان اٹکل باز رمّالوں اور کاہنوں کی غیب دانی اور مامور من اللہ اور ملہم کے اظہار غیب میں فرق ہوتا ہے ....

چوتھا نشان قرآن کریم کے دقائق اور معارف کا ہے ۔ کیونکہ معارف قرآن اس شخص کے سوا اور کسی پر نہیں کھل سکتے جس کی تطہیر ہو چکی ہو ۔ لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (پ ۲۷) مَیں نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ میرے مخالف بھی ایک سورۃ کی تفسیر کریں اور مَیں بھی

تفسیر کرتا ہوں پھر مقابلہ کر لیا جائے۔ مگر کسی نے جرأت نہیں کی۔

(ملفوظات جلد اوّل ص۲۶۷-۲۶۸)

یہ پیشگوئیاں ایسی ہیں کہ ایک راستباز کے ان کو سُنکر آنسو جاری ہو جائینگے مگر پھر بھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ یہ خیال نہیں کرتے کہ آخر ہم نے بھی ایک دن مرنا ہے۔ وہ نشان جو ان کو دکھلائے گئے۔ اگر نوح کی قوم کو دکھلائے جاتے تو وہ غرق نہ ہوتی۔ اگر لوط کی قوم ان سے اطلاع پاتی تو ان پر پتھر نہ برستے۔

(اعجاز احمدی ص۴)

شادی اور اولاد صالحہ

قَدْ اَخْبَرَ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انّ المسیح الموعود یَتَزَوَّجُ وَیُوْلَدُ لَہٗ ففی ھٰذا اِشَارَۃٌ اِلٰی اَنَّ اللّٰہ یُعْطِیہِ وَلَدًا صَالِحًا یُشَابِہُ اَبَاہٗ وَلَا یَأْبَاہُ ویکون من عِبَادِ اللّٰہِ المُکرمین والسِرُّ فی ذالک اَنَّ اللّٰہَ لَا یُبَشِّرُ الانبیاءَ والاولیاءَ بِذُرِّیَّۃٍ اِلَّا اِذَا قَدَّرَ تولیدَ الصّالحین۔

(آئینہ کمالات اسلام ص۵۷۸ حاشیہ)

جناب رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم نے بھی پہلے سے ایک پیشگوئی فرمائی ہے کہ یَتَزَوَّجُ وَیُوْلَدُ لَہٗ یعنی وہ مسیح موعود بیوی کرے گا۔ اور نیز وہ صاحب اولاد ہو گا۔ اب ظاہر ہے کہ تزوج اور اولاد کا ذکر کرنا عام طور پر مقصود نہیں کیونکہ عام طور پر ہر ایک شادی کرتا ہے۔ اور اولاد بھی ہوتی ہے اس میں کچھ خوبی نہیں بلکہ تزوج سے مراد وہ خاص تزوج ہے جو بطور نشان ہوگا اور اولاد سے مراد وہ خاص اولاد ہے جس کی نسبت اس عاجز کی پیشگوئی موجود ہے۔ گویا اسجگہ رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم ان سیہ دل منکروں کو ان کے شبہات کا جواب دے رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ باتیں ضرور پوری ہونگی۔

(ضمیمہ انجام آتھم ص۳۳۷)

تخمیناً سولہ برس کا عرصہ گذرا ہے کہ مَیں نے شیخ حامد علی اور لالہ شرمپت کھتری ساکن قادیان اور لالہ ملاوامل کھتری ساکن قادیان اور جان محمد مرحوم ساکن قادیان اور بہت سے اور لوگوں کو

یہ خبر دی تھی کہ خدا نے اپنے الہام سے مجھے اطلاع دی ہے کہ ایک شریف خاندان میں وہ میری شادی کرے گا اور وہ قوم کے سیّد ہونگے اور اس بیوی کو خدا مبارک کرے گا اور اس سے اولاد ہوگی۔ اور یہ خواب ان ایام میں آئی تھی کہ جب مَیں بعض اعراض اور امراض کی وجہ سے بہت ہی ضعیف اور کمزور تھا۔ بلکہ قریب ہی وہ زمانہ گذر چکا تھا جب کہ مجھے دق کی بیماری ہوگئی تھی اور بباعث گوشہ گزینی اور ترک دنیا کے اہتمامات تاہّل سے دل سخت کارہ تھا اور عیالداری کے بوجھ سے طبیعت متنفر تھی تو اس حالت پر ملامت کے تصور کے وقت یہ الہام ہوا تھا **ہرچہ باید نوعروسے را ہمہ ساماں کنم** یعنی اس شادی میں تجھے کچھ فکر نہیں کرنا چاہیئے۔ ان تمام ضروریات کا رفع کرنا میرے ذمہ رہیگا۔ سو قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس نے اپنے وعدہ کے موافق اس شادی کے بعد ہر ایک بارِ شادی سے مجھے سبکدوش رکھا اور مجھے بہت آرام پہنچایا۔ کوئی باپ دنیا میں کسی بیٹے کی پرورش نہیں کرتا جیسا کہ اس نے میری کی۔ اور کوئی والدہ پوری ہشیاری سے دن رات اپنے بچہ کی ایسی خبر نہیں رکھتی جیسا کہ اُس نے میری رکھی اور جیسا کہ اس نے بہت عرصہ پہلے براہین احمدیہ میں یہ وعدہ کیا تھا کہ یا احمد اسکن انت و زوجک الجنّۃ ایسا ہی وہ بجا لایا۔ معاش کا غم کرنے کے لئے کوئی گھڑی اُس نے میرے لئے خالی نہ رکھی۔ اور خانہ داری کی مہمّات کے لئے کوئی اضطراب اس نے میرے نزدیک نہ آنے دیا۔

(تریاق القلوب ص ۶۶-۶۷)

اشکر نعمتی رأیت خدیجتی (براہین احمدیہ ص ۵۵۸) ترجمہ:- میرا شکر کر کہ تو نے میری خدیجہ کو پایا۔ یہ ایک بشارت کئی سال پہلے اس نکاح کی طرف تھی جو سادات کے گھر میں دہلی میں ہوا جس سے بفضلہ تعالیٰ چار لڑکے پیدا ہوئے اور خدیجہ اس لئے میری بیوی کا نام رکھا کہ وہ ایک **مبارک نسل کی ماں ہے**۔ جیسا کہ اس جگہ بھی مبارک نسل کا وعدہ تھا اور نیز یہ اس طرف اشارہ تھا کہ وہ بیوی سادات کی قوم میں سے ہوگی۔

(نزول المسیح ص ۱۴۶-۱۴۷)

تقریبًا اٹھارہ برس سے ایک یہ پیشگوئی ہے۔ الحمد للّٰہ الذی جعل لکم الصھر والنسب۔ ترجمہ:- وہ خدا سچا خدا ہے جس نے تمہارا دامادی کا تعلق ایک شریف قوم سے جو سیّد تھے کیا اور خود تمہاری نسب کو شریف بنایا جو فارسی خاندان اور سادات سے معجون مرکب ہے،

اِس پیشگوئی کو دوسرے الہامات میں اور بھی تصریح سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس شہر کا نام بھی لیا گیا تھا جو **دہلی** ہے اور یہ پیشگوئی بہت سے لوگوں کو سُنائی گئی تھی........ اور جیسا کہ لکھا تھا ایسا ہی ظہور میں آیا۔ کیونکہ بغیر سابق تعلقات قرابت اور رشتہ کے دہلی میں ایک شریف اور مشہور خاندان سیادت میں میری شادی ہوگئی۔ اور یہ خاندان خواجہ میر دؔرد کی لڑکی کی اولاد میں سے ہے جو مشاہیر اکابر سادات دہلی میں سے ہے........

چونکہ خدا تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ میری نسل میں سے ایک بڑی بنیاد حمایت اسلام کی ڈالے گا اور اس میں سے وہ شخص پیدا کرے گا جو آسمانی رُوح اپنے اندر رکھتا ہو گا اس لئے اُس نے پسند کیا کہ اس خاندان کی لڑکی میرے نکاح میں لاوے اور اس سے وہ اولاد پیدا کرے جو ان نوروں کو جن کی میرے ہاتھ سے تخم ریزی ہوئی ہے دنیا میں زیادہ سے زیادہ پھیلاوے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح سادات کی دادی کا نام **شہر بانو** تھا اسی طرح میری یہ بیوی جو آئندہ خاندان کی ماں ہوگی اس کا نام **نصرت جہان بیگم** ہے۔ یہ تفاؤل کے طور پر اس بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے تمام جہان کی مدد کے لئے میرے آئندہ خاندان کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ خدا تعالےٰ کی عادت ہے کہ کبھی ناموں میں بھی اس کی پیشگوئی مخفی ہوتی ہے۔

(تریاق القلوب ص ۱۲۵-۱۲۶)

خدائے رحیم و کریم بزرگ و برتر نے جو ہر یک چیز پر قادر ہے (جلّ شانہٗ و عزّ اسمہٗ) مجھ کو اپنے الہام سے مخاطب کر کے فرمایا کہ

”میں تجھے ایک **رحمت کا نشان** دیتا ہوں اسی کے موافق جو تُو نے مجھ سے مانگا۔ سو میں نے تیری تضرعات کو سُنا اور تیری دعاؤں کو اپنی رحمت سے بپایۂ قبولیت جگہ دی۔ اور تیرے سفر کو (جو ہوشیار پور اور لدھیانہ کا سفر ہے) تیرے لئے مبارک کر دیا سو **قدرت** اور **رحمت** اور **قربت** کا نشان تجھے دیا جاتا ہے۔ **فضل** اور **احسان** کا نشان تجھے عطا ہوتا ہے اور **فتح** اور **ظفر** کی کلید تجھے ملتی ہے اے **مظفر**! **تجھ پر سلام**۔ خدا نے یہ کہا تا وہ جو زندگی کے خواہاں ہیں موت کے پنجہ سے نجات پاویں۔ اور وہ جو قبروں میں دبے پڑے ہیں باہر آویں۔ اور تا **دین اسلام کا شرف** اور **کلام اللہ کا مرتبہ** لوگوں پر ظاہر ہو۔ اور تا **حق** اپنی تمام برکتوں کے ساتھ آجائے اور **باطل** اپنی تمام نحوستوں کے ساتھ بھاگ جائے

اور تا لوگ سمجھیں کہ میں **قادر** ہوں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ اور تا وہ یقین لائیں کہ میں تیرے ساتھ ہوں اور تا انہیں جو خدا کے وجود پر ایمان نہیں لاتے اور خدا کے دین اور اس کی کتاب اور اس کے پاک رسول محمد مصطفیٰ کو انکار اور تکذیب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ایک کھلی نشانی ہے اور **مجرموں کی راہ** ظاہر ہو جائے۔

سو تجھے بشارت ہو کہ ایک وجیہہ اور پاک لڑکا تجھے دیا جائیگا۔ ایک زکی غلام (لڑکا) تجھے ملیگا۔ وہ لڑکا تیرے ہی تخم سے تیری ہی ذریّت و نسل ہوگا۔

خوبصورت پاک لڑکا تمہارا مہمان آتا ہے اس کا نام عمنوائیل اور بشیر بھی ہے اس کو مقدس رُوح دی گئی ہے اور وہ رجس سے پاک ہے۔ وہ نور اللہ ہے مبارک وہ جو آسمان سے آتا ہے۔

اُس کے ساتھ **فضل** ہے جو اس کے آنے کے ساتھ آئیگا وہ صاحب شکوہ اور عظمت اور دولت ہوگا۔ وہ دنیا میں آئے گا اور اپنے مسیحی نفس اور رُوح الحق کی برکتوں سے بہتوں کو بیماریوں سے صاف کرے گا۔ وہ کلمۃ اللہ ہے۔ کیونکہ خدا کی رحمت وغیوری نے اسے کلمۂ تمجید سے بھیجا ہے۔ وہ سخت ذہین و فہیم ہوگا اور دل کا حلیم اور علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائیگا اور وہ تین کو چار کرنے والا ہوگا (اس کے معنے سمجھ میں نہیں آئے) دوشنبہ ہے مبارک دوشنبہ۔ فرزند دلبند گرامی ارجمند۔ مظہر الاول و الآخر۔ مظہر الحق والعلاء۔ کَاَنَّ اللّٰہَ نزل من السّماء۔ جس کا نزول بہت مبارک اور جلالِ الٰہی کے ظہور کا موجب ہوگا نور آتا ہے نور جس کو خدا نے اپنی رضامندی کے عطر سے ممسوح کیا۔ ہم اس میں اپنی رُوح ڈالیں گے اور خدا کا سایہ اس کے سر پر ہوگا۔ وہ جلد جلد بڑھیگا اور اسیروں کی رستگاری کا موجب ہوگا اور زمین کے کناروں تک شہرت پائے گا اور قومیں اس سے برکت پائیں گی۔ تب اپنے نفسی نقطہ آسمان کی طرف اٹھایا جائیگا وکان امرًا مقضیًا۔ "

(اشتہار ۲۰ر فروری ۱۸۸۶ء)

پھر خدائے کریم جلّشانہٗ نے مجھے بشارت دے کہ کہا کہ :-

" تیرا گھر برکت سے بھرے گا اور میں اپنی نعمتیں تجھ پر پوری کرونگا اور خواتین مبارکہ

سے جن میں سے تو بعض کو اس کے بعد پائیگا تیری نسل بہت ہوگی۔ اور میں تیری ذرّیت کو بہت بڑھاؤنگا اور برکت دونگا۔ مگر بعض ان میں سے کم عمری میں فوت بھی ہونگے اور تیری نسل کثرت سے ملکوں میں پھیل جائے گی اور ہر ایک شاخ تیرے جدی بھائیوں کی کاٹی جائیگی اور وہ جلد لاولد رہ کر ختم ہوجائیگی۔ اگر وہ توبہ نہ کرینگے تو خدا ان پر بلا پر بلا نازل کریگا۔ یہاں تک کہ وہ نابود ہو جائینگے۔ اُنکے گھر بیواؤں سے بھر جائینگے اور ان کی دیواروں پر غضب نازل ہوگا۔ لیکن اگر وہ رجوع کریں گے تو خدا رحم کے ساتھ رجوع کریگا۔ خدا تیری برکتیں اردگرد پھیلائیگا اور ایک اجڑا ہوا گھر تجھ سے آباد کرے گا۔ اور ایک ڈراؤنا گھر برکتوں سے بھر دیگا۔ تیری ذرّیت منقطع نہیں ہوگی اور آخری دنوں تک سرسبز رہیگی۔ خدا تیرے نام کو اس روز تک جو دنیا منقطع ہو جائے عزّت کے ساتھ قائم رکھیگا اور تیری دعوت کو دنیا کے کناروں تک پہنچا دیگا۔ میں تجھے اٹھاؤنگا اور اپنی طرف بلاؤں گا پر تیرا نام صفحۂ زمین سے کبھی نہیں اٹھیگا۔ اور ایسا ہوگا کہ سب وہ لوگ جو تیری ذلّت کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اور تیرے ناکام رہنے کے درپے اور تیرے نابود کرنے کے خیال میں ہیں وہ خود ناکام رہیں گے اور ناکامی اور نامرادی میں مرینگے۔ لیکن خدا تجھے بکلّی کامیاب کریگا اور تیری ساری مرادیں تجھے دیگا۔ میں تیرے خالص اور دلی محبّوں کا گروہ بھی بڑھاؤں گا اور ان کے نفوس و اموال میں برکت دونگا اور اُن میں کثرت بخشوں گا اور وہ مسلمانوں کے اس دوسرے گروہ پر تا بروزِ قیامت غالب رہیں گے جو حاسدوں اور معاندوں کا گروہ ہے۔ خدا انہیں نہیں بھولیگا اور فراموش نہیں کرے گا۔ اور وہ علیٰ حسب الاخلاص اپنا اپنا اجر پائیں گے۔ تو مجھ سے ایسا ہے جیسا انبیاء بنی اسرائیل (یعنی ظلّی طور پر اُن سے مشابہت رکھتا ہے) تو مجھ سے ایسا ہے جیسی میری توحید۔ تو مجھ سے اور میں تجھ سے ہوں۔ اور وہ وقت آتا ہے بلکہ قریب ہے کہ خدا بادشاہوں اور امیروں کے دلوں میں تیری محبت ڈالے گا یہاں تک کہ وہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈینگے اے منکرو اور حق کے مخالفو! اگر تم میرے بندے کی نسبت شک میں ہو۔ اگر تمہیں اس کے فضل و احسان سے کچھ انکار ہے جو ہم نے اپنے بندے پر کیا تو اس نشان رحمت کی مانند تم بھی اپنی نسبت کوئی سچا نشان پیش کرو اگر تم سچے ہو

اور اگر تم بھی پیش نہ کر سکو اور یاد رکھو کہ ہرگز پیش نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو کہ جو نافرمانوں اور جھوٹوں اور حد سے بڑھنے والوں کے لئے تیار ہے۔" فقط

الراقم خاکسار غلام احمد مؤلف براہین احمدیہ ہوشیار پور
طویلہ شیخ مہر علی صاحب رئیس۔

(اشتہار ۲۰ رفروری ۱۸۸۶ء)

اس عاجز کے اشتہار مورخہ ۲۰ رفروری ۱۸۸۶ء .... میں ایک پیشگوئی دربارہ تولد ایک **فرزند صالح** ہے جو بصفات مندرجہ اشتہار پیدا ہوگا .... ایسا لڑکا بموجب وعدۂ الٰہی نو برس کے عرصہ تک ضرور پیدا ہوگا۔ خواہ جلد ہو خواہ دیر سے۔ بہر حال اس عرصہ کے اندر پیدا ہو جائیگا ....

یہ صرف پیشگوئی ہی نہیں بلکہ ایک عظیم الشان نشان آسمانی ہے جس کو خدائے کریم جلّشانہٗ نے ہمارے نبی کریم رؤف الرحیم **محمد مصطفٰے** صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت وعظمت ظاہر کرنے کیلئے ظاہر فرمایا ہے اور درحقیقت یہ نشان ایک مردہ کے زندہ کرنے سے صدہا درجہ اعلٰے واولیٰ واکمل وافضل واتم ہے۔

(تبلیغ رسالت جلد اول ص ۷۲-۷۴)

خدائے عزّوجلّ نے جیسا کہ اشتہار دہم جولائی ۱۸۸۸ء و اشتہار یکم دسمبر ۱۸۸۸ء میں مندرج ہے اپنے لطف وکرم سے وعدہ دیا تھا کہ بشیر اوّل کی وفات کے بعد ایک دوسرا بشیر دیا جائیگا جس کا نام **محمود** بھی ہوگا اور اس عاجز کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ وہ اولوالعزم ہوگا اور حسن واحسان میں تیرا نظیر ہوگا وہ قادر ہے جس طور سے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ سو آج ۱۲ ر جنوری ۱۸۸۹ء میں مطابق ۹ رجمادی الاول ۱۳۰۶ھ روز شنبہ میں اس عاجز کے **گھر میں بفضلہ** تعالیٰ ایک لڑکا پیدا ہو گیا ہے جس کا نام بالفعل محض تفاؤل کے طور پر **بشیر** اور **محمود** بھی رکھا گیا ہے۔ اور کامل انکشاف کے بعد پھر اطلاع دی جائیگی مگر ابھی تک مجھ پر یہ نہیں کھلا کہ یہی لڑکا مصلح موعود اور عمر پانے والا ہے یا وہ کوئی اَور ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں اور محکم یقین سے جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ اپنے وعدہ کے موافق مجھ سے معاملہ کرے گا۔ اور اگر ابھی اس موعود لڑکے کے پیدا ہونے کا وقت نہیں آیا تو دوسرے وقت میں وہ ظہور پذیر ہوگا۔ اور اگر مدت مقررہ سے ایک دن بھی باقی رہ جائیگا

تو خدائے عزّوجلّ اس دن کو ختم نہیں کرے گا جب تک اپنے وعدہ کو پورا نہ کرے۔ مجھے ایک خواب میں اس مصلح موعود کی نسبت زبان پر یہ شعر جاری ہُوا تھا ؎

اے فخرِ رُسل قربِ تو معلومم شد ٭ دیر آمدہ ز رہِ دور آمدہ

پس اگر حضرت باری جلّشانہٗ کے ارادہ میں دیر سے مراد اسی قدر دیر ہے جو اس پسر کے پیدا ہونے میں جس کا نام بطور تفاؤل **بشیر الدین محمود** رکھا گیا ہے ظہور میں آئی تو تعجب نہیں کہ یہی لڑکا موعود لڑکا ہو۔ ورنہ وہ بفضلہٖ تعالیٰ دوسرے وقت پر آئے گا اور ہمارے بعض حاسدین کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری کوئی ذاتی غرض اولاد کے متعلق نہیں اور نہ کوئی نفسانی راحت ان کی زندگی سے وابستہ ہے۔ پس یہ ان کی بڑی غلطی ہے کہ جو انہوں نے بشیر احمد کی وفات پر خوشی ظاہر کی اور بغلیں بجائیں۔ انہیں یقیناً یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہماری اتنی اولاد ہو جس قدر درختوں کے تمام دنیا میں پتے ہیں اور وہ سب فوت ہو جائیں۔ تو ان کا مرنا ہماری سچی اور حقیقی لذّت اور راحت میں کچھ خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ عمیت کی محبت میّت کی محبت سے اس قدر ہمارے دل پر زیادہ تر غالب ہے کہ اگر وہ محبوب حقیقی خوش ہو تو ہم خلیل اللہ کی طرح اپنے کسی پیارے بیٹے کو بدست خود ذبح کرنے کو تیار ہیں۔ کیونکہ واقعی طور پر بجز اس ایک کے ہمارا کوئی پیارا نہیں جلّ شانہٗ وعزّ اسمہٗ۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہٖ۔

(تبلیغ رسالت جلد اوّل ص ۱۴۷-۱۴۹ حاشیہ)

مصلح موعود کا نام الہامی عبارت میں **فضل** رکھا گیا اور نیز دوسرا نام اسکا **محمود** اور تیسرا نام اسکا **بشیر ثانی** بھی ہے اور ایک الہام میں اس کا نام **فضل عمر** ظاہر کیا گیا۔

(سبز اشتہار ص ۲۱ حاشیہ)

میرا پہلا لڑکا جو زندہ موجود ہے جس کا نام **محمود** ہے۔ ابھی وہ پیدا نہیں ہُوا تھا جو مجھے کشفی طور پر اس کے پیدا ہونے کی خبر دی گئی اور مَیں نے مسجد کی دیوار پر اس کا نام لکھا ہُوا یہ پایا کہ **محمود**۔ تب مَیں نے اس پیشگوئی کے شائع کرنے کے لئے سبز رنگ کے ورقوں پر ایک اشتہار چھاپا جس کی تاریخ اشاعت یکم دسمبر ۱۸۸۸ء ہے۔

(تریاق القلوب ص ۷۷)

بشارت دی کہ اِک بیٹا ہے تیرا ٭ جو ہوگا ایک دن محبوب میرا

کروں گا دُور اس مہ سے اندھیرا ⁂ دکھاؤں گا کہ اِک عالم کو پھیرا
بشارت کیا ہے اِک دل کی غذا دی ⁂ فسبحان الذی اخزی الاعادی

(درثمین ص۵۵)

میرا دوسرا لڑکا جس کا نام بشیر احمد ہے اُس کے پیدا ہونے کی پیشگوئی .... کے الفاظ یہ ہیں۔ یأتی قمر الانبیاء وأمرک یتأتّی۔ یسرّ اللّٰہ وجھک وینیر برھانک سیولد لک ویُدنی منک الفضل۔ اِنّ نوری قریب۔ یعنی نبیوں کا چاند آئیگا اور تیرا کام بن جائیگا۔ تیرے لئے ایک لڑکا پیدا کیا جائیگا اور فضل تجھ سے نزدیک کیا جائیگا۔ یعنی خدا کے فضل کا موجب ہوگا .... پھر بیس اپریل ۱۸۹۳ء کو جیسا کہ اشتہار ۲۰؍اپریل ۱۸۹۳ء سے ظاہر ہے اس پیشگوئی کے مطابق وہ لڑکا پیدا ہوا جس کا نام **بشیر احمد** رکھا گیا۔

(تریاق القلوب ص۸۲)

میرا تیسرا لڑکا جس کا نام شریف احمد ہے۔ اس کے پیدا ہونے کی پیشگوئی میرے رسالہ انوار الاسلام صفحہ ۳۹ کے حاشیہ پر درج ہے اور یہ رسالہ ستمبر ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا اور ستمبر ۱۸۹۴ء کو یہ پیشگوئی رسالہ مذکورہ کے صفحہ ۳۹ کے حاشیہ پر چھاپی گئی تھی۔ اور پھر جیسا کہ رسالہ ضیاء الحق کے اخیر ورق ٹائیٹل پیج پر شائع کیا گیا ہے یہ لڑکا یعنی **شریف احمد** ۲۴؍مئی ۱۸۹۵ء کو مطابق ۲۷ ذیقعد ۱۳۱۲ھ پیدا ہوا۔

(تریاق القلوب ص۸۲-۸۳)

میرا چوتھا لڑکا جس کا نام مبارک احمد ہے اس کی نسبت پیشگوئی اشتہار ۲۰؍فروری ۱۸۸۶ء میں کی گئی اور پھر انجام آتھم کے صفحہ ۱۸۳ میں بتاریخ ۱۴؍ستمبر ۱۸۹۶ء یہ پیشگوئی کی گئی اور رسالہ انجام آتھم بماہ ستمبر ۱۸۹۶ء بخوبی ملک میں شائع ہو گیا۔ اور پھر یہ پیشگوئی ضمیمہ انجام آتھم کے صفحہ ۵۸ میں اس شرط کے ساتھ کی گئی کہ عبدالحق غزنوی جو امرتسر میں مولوی عبدالجبار غزنوی کی جماعت میں رہتا ہے **نہیں مریگا جبتک یہ چوتھا بیٹا پیدا نہ ہولے** اور اس صفحہ ۵۸ میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اگر عبدالحق غزنوی ہماری مخالفت میں حق پر ہے۔ اور جناب الٰہی میں قبولیت رکھتا ہے تو اس پیشگوئی کو دعا کرکے ٹال دے۔ اور پھر یہ پیشگوئی ضمیمہ انجام آتھم کے صفحہ پندرہ میں کی گئی۔ سو خدا تعالیٰ نے میری تصدیق کے لئے اور تمام مخالفوں کی تکذیب کے لئے اور عبدالحق غزنوی کو متنبہ کرنے کے لئے اس پسر چہارم کی پیشگوئی کو

۱۴ر جون ۱۸۹۹ء میں جو مطابق ۴ر صفر ۱۳۱۷ھ تھی بروز چہار شنبہ پورا کر دیا۔ یعنی وہ مولود مسعود چوتھا لڑکا تاریخ مذکورہ میں پیدا ہو گیا۔

(تریاق القلوب ص۸۳)

خدا تعالیٰ نے حمل کے ایّام میں ایک لڑکی کی بشارت دی اور اُسکی نسبت فرمایا تُنَشَّأُ فِی الْحِلْیَۃِ یعنی زیور میں نشو و نما پائیگی۔ یعنی نہ خورد سالی میں فوت ہوگی اور نہ تنگی دیکھیگی۔ چنانچہ بعد اس کے لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام **مبارکہ بیگم** رکھا گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مجھے وحی الٰہی سے بتلایا گیا کہ ایک اور لڑکی پیدا ہوگی مگر وہ فوت ہو جائیگی۔ چنانچہ وہ الہام قبل از وقت بہتوں کو بتلایا گیا۔ بعد اس کے وہ لڑکی پیدا ہوئی اور چند ماہ بعد فوت ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس لڑکی کے بعد ایک اور لڑکی کی بشارت دی گئی جس کے الفاظ یہ تھے کہ **دخت کرام**۔ چنانچہ وہ الہام الحکم اور البدر اخباروں میں اور شائد ان دونوں میں سے ایک میں شائع کیا گیا اور پھر اس کے بعد لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام **امۃ الحفیظ** رکھا گیا اور وہ ابتک زندہ ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص۲۱۷-۲۱۸)

یہ چار لڑکے ہیں جن کی پیدائش سے پہلے اُن کے پیدا ہونے کے بارے میں خدا تعالیٰ نے ہر ایک دفعہ پر مجھے خبر دی اور یہ ہر چہار پیشگوئی نہ صرف زبانی طور پر لوگوں کو سُنائی گئیں بلکہ پیش از وقت اشتہاروں اور رسالوں کے ذریعہ سے لاکھوں انسانوں میں مشتہر کی گئیں اور پنجاب اور ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں اس عظیم الشان غیب گوئی کی نظیر نہیں ملے گی۔ اور کسی کی کوئی پیشگوئی ایسی نہیں پاؤگے کہ اوّل تو خدا تعالیٰ نے چار لڑکوں کے پیدا ہونے کی اکٹھی خبر دی اور پھر ہر ایک لڑکے کے پیدا ہونے سے پہلے اپنے الہام سے اطلاع کر دی کہ وہ پیدا ہونے والا ہے اور پھر وہ تمام پیشگوئیاں لاکھوں انسانوں میں شائع کی جائیں۔ **تمام دنیا میں پھرو۔ اگر اس کی کہیں نظیر ہے تو پیش کرو** ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انسان کو جراُت نہیں ہو سکتی کہ یہ منصوبہ سوچے کہ اوّل تو مشترک طور پر چار لڑکوں کے پیدا ہونے کی پیشگوئی کرے۔ جیسا کہ اشتہار ۲۰ر فروری ۱۸۸۶ء میں کی گئی۔ اور پھر ہر ایک لڑکے کے پیدا ہونے سے پہلے اُس کے پیدا ہونے کی پیشگوئی کرتا جائے اور اس کے مطابق لڑکے پیدا ہوتے جائیں۔ یہاں تک کہ چار کا عدد جو پہلی پیشگوئیوں میں قرار دیا تھا وہ پورا ہو جائے حالانکہ یہ پیشگوئی اس کی طرف سے ہو جو کہ محض افترا سے اپنے تئیں خدا تعالیٰ کا مامور قرار دیتا ہے۔

کیا ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ مفتری کی ایسی مسلسل طور پر مدد کرتا جائے کہ ۱۸۸۶ء سے لغایت سن ۱۸۹۹ء چودہ سال تک برابر وہ مدد جاری رہے۔ کیا کبھی مفتری کی تائید خدا نے ایسی کی یا صفحۂ دنیا میں اس کی کوئی نظیر بھی ہے ؟

(تریاق القلوب ص ۸۰-۸۴)

خدایا تیرے فضلوں کو کروں یاد ٭ بشارت تو نے دی اور پھر یہ اولاد
کہا ہرگز نہیں ہوں گے یہ برباد ٭ بڑھینگے جیسے باغوں میں ہوں شمشاد
خبر مجھ کو یہ تو نے بارہا دی ٭ فسبحان الذی اخزی الاعادی
میری اولاد سب تیری عطا ہے ٭ ہر اک تیری بشارت سے ہوا ہے
یہ پانچوں جو کہ نسلِ سیّدہ ہے ٭ یہی ہیں پنجتن جن پر بنا ہے
یہ تیرا فضل ہے اے میرے ہادی ٭ فسبحان الذی اخزی الاعادی

(درثمین)

جلسۂ اعظم مذاہب

وہ جلسہ مذاہب جو لاہور میں ہوا تھا اس کی نسبت مجھے پہلے سے خبر دی گئی کہ وہ مضمون جو میری طرف سے پڑھا جائیگا وہ سب مضمونوں پر غالب رہیگا۔ چنانچہ میں نے قبل از وقت اس بارے میں اشتہار دے دیا جو حاشیہ میں لکھا جاتا ہے۔ اور اس الہام کے موافق میرے اس مضمون کی جلسہ مذاہب میں ایسی قبولیت ظاہر ہوئی کہ مخالفوں نے بھی اقرار کیا ہے کہ وہ مضمون سب سے اول رہا۔

(انجام آتھم ص ۲۹۹)

سچائی کے طالبوں کے لئے ایک عظیم الشان خوشخبری

جلسہ اعظم مذاہب جو لاہور ٹاؤن ہال میں ۲۶-۲۷-۲۸ر دسمبر ۱۸۹۶ء کو ہوگا اس میں اس عاجز کا ایک مضمون قرآن شریف کے کمالات اور معجزات کے بارے میں پڑھا جائے گا یہ وہ مضمون ہے جو انسانی طاقتوں سے برتر اور خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان اور خاص اس کی تائید سے لکھا گیا ہے۔ اس میں قرآن شریف کے وہ حقائق اور معارف درج ہیں

جن سے آفتاب کی طرح روشن ہو جائیگا کہ درحقیقت یہ خدا کا کلام اور رب العالمین کی کتاب ہے اور جو شخص اس مضمون کو اوّل سے آخر تک پانچوں سوالوں کے جواب میں سُنیں گا مَیں یقین کرتا ہوں کہ ایک نیا ایمان اس میں پیدا ہو گا اور ایک نیا نور اُس میں چمک اُٹھے گا اور خدا تعالےٰ کے پاک کلام کی ایک **جامع تفسیر** اس کے ہاتھ آ جائیگی - یہ میری تقریر انسانی فضولیوں سے پاک اور لاف و گزاف کے داغ سے منزہ ہے - مجھے اس وقت محض بنی آدم کی ہمدردی نے اِس اشتہار کے لکھنے کیلئے مجبور کیا ہے کہ تا وہ قرآن شریف کے حسن و جمال کا مشاہدہ کریں - اور دیکھیں کہ ہمارے مخالفوں کا کسقدر ظلم ہے کہ وہ تاریکی سے محبت کرتے اور اس نور سے نفرت رکھتے ہیں - مجھے خدائے علیم نے الہام سے مطلع فرمایا ہے کہ یہ وہ مضمون ہے **جو سب پر غالب آئے گا** اور اس میں سچائی اور حکمت اور معرفت کا وہ نور ہے جو دوسری قومیں بشرطیکہ حاضر ہوں اور اس کو اول سے آخر تک سُنیں شرمندہ ہو جائیں گی اور ہرگز قادر نہیں ہونگے کہ اپنی کتابوں کے یہ کمال دکھلا سکیں - خواہ وہ عیسائی ہوں، خواہ آریہ، خواہ سناتن دھرم والے یا کوئی اَور - کیونکہ خدا تعالےٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ اس روز اُس کی پاک کتاب کا جلوہ ظاہر ہو - مَیں نے **عالم کشف** میں اس کے متعلق دیکھا کہ میرے محل پر غیب سے ایک ہاتھ مارا گیا اور اس ہاتھ کے چھونے سے اس محل میں سے ایک نور ساطعہ نکلا جو اردگرد پھیل گیا - اور میرے ہاتھوں پر بھی اس کی روشنی پڑی - تب ایک شخص جو میرے پاس کھڑا تھا وہ بلند آواز سے بولا - اللّٰہ اکبر خَرِبَتْ خیبر - اس کی تعبیر یہ ہے - کہ اس محل سے میرا دل مراد ہے جو جائے نزول و حلول انوار ہے - اور وہ نور قرآنی معارف ہیں اور خیبر سے مراد تمام خراب مذاہب ہیں جن میں شرک اور باطل کی ملونی ہے - اور انسان کو خدا کی جگہ دی گئی یا خدا کی صفات کو اپنے کامل محل سے نیچے گرا دیا ہے - سو مجھے جتلایا گیا کہ اس مضمون کے خوب پھیلنے کے بعد جھوٹے مذہبوں کا جھوٹ کھل جائے گا اور قرآنی سچائی دن بدن زمین پر پھیلتی جائیگی جب تک کہ اپنا دائرہ پورا کرلے - پھر مَیں اس کشفی حالت سے الہام کی طرف منتقل کیا گیا - اور مجھے یہ الہام ہوا :-

إِنَّ اللّٰهَ مَعَكَ - إِنَّ اللّٰهَ يَقُوْمُ أَيْنَمَا قُمْتَ -

یعنی خدا تیرے ساتھ ہے - خدا وہیں کھڑا ہوتا ہے جہاں تو کھڑا ہو - یہ حمایت الٰہی کے لئے ایک استعارہ ہے -

اب مَیں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ ہر ایک کو یہی اطلاع دیتا ہوں کہ اپنا اپنا حرج بھی کر کے ان معارف کے سُننے کے لئے ضرور بمقام لاہور تاریخ جلسہ پر آویں کہ ان کی عقل اور ایمان کو اس سے وہ فائدے حاصل ہونگے کہ وہ گمان نہیں کر سکتے ہونگے۔ والسلام علٰی من اتبع الھدٰی

خاکسار غلام احمد از قادیان۔ ۲۱؍ دسمبر ۱۸۹۶ء

(انجام آتھم ص۲۹۹ حاشیہ)

مَیں نے جناب الٰہی میں دعا کی کہ وہ مجھے ایسے مضمون کا **القاء** کرے جو اس مجمع کی تمام تقریروں پر **غالب** رہے۔ مَیں نے دُعا کے بعد دیکھا کہ ایک قوت میرے اندر پھونک دی گئی ہے مَیں نے اس آسمانی قوت کی ایک حرکت اپنے اندر محسوس کی اور میرے دوست جو اس وقت حاضر تھے جانتے ہیں کہ مَیں نے اس مضمون کا کوئی مسودہ نہیں لکھا جو کچھ لکھا صرف قلم برداشتہ لکھا تھا اور ایسی تیزی اور جلدی سے مَیں لکھتا جاتا تھا کہ نقل کرنے والے کے لئے مشکل ہو گیا کہ اِس قدر جلدی سے اس کی نقل لکھے۔ جب مَیں مضمون ختم کر چکا تو خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ الہام ہُوا کہ **مضمون بالا رہا**۔ خلاصہ کلام یہ کہ جب وہ مضمون اس مجمع میں پڑھا گیا تو اس کے پڑھنے کے وقت سامعین کے لئے ایک عالم وجد تھا اور ہر ایک طرف سے تحسین کی آواز تھی یہاں تک کہ ایک ہندو صاحب جو صدر نشین اس مجمع کے تھے ان کے مُنہ سے بھی بے اختیار نکل گیا کہ یہ مضمون تمام مضامین سے بالا رہا۔ اور سول اینڈ ملٹری گزٹ جو لاہور سے انگریزی میں ایک اخبار نکلتا ہے اس نے بھی شہادت کے طور پر شائع کیا کہ یہ مضمون بالا رہا اور شائد بیس کے قریب ایسے اردو اخبار بھی ہونگے جنہوں نے یہی شہادت دی۔ اور اس مجمع میں بجز بعض متعصب لوگوں کے تمام زبانوں پر یہی تھا کہ یہی مضمون فتحیاب ہُوا اور آج تک صدہا آدمی ایسے موجود ہیں جو یہی گواہی دے رہے ہیں۔ غرض ہر ایک فرقہ کی شہادت اور نیز انگریزی اخباروں کی شہادت سے میری پیشگوئی پوری ہو گئی کہ مضمون بالا رہا۔ یہ مقابلہ اس مقابلہ کی مانند تھا جو موسٰی نبی کو ساحروں کے ساتھ کرنا پڑا تھا کیونکہ اس مجمع میں مختلف خیالات کے آدمیوں نے اپنے اپنے مذہب کے متعلق تقریریں سنائی تھیں جن میں سے بعض عیسائی تھے اور بعض سناتن دھرم کے ہندو اور بعض آریہ سماج کے ہندو اور بعض برہمو اور بعض سکھ اور بعض ہمارے مخالف مسلمان تھے اور سب نے اپنی اپنی لاٹھیوں کے خیالی سانپ بنائے تھے لیکن جب کہ خدا نے میرے ہاتھ اسلامی راستی کا عصا ایک پاک اور پُر معارف تقریر کے پیرایہ میں ان کے مقابل پر چھوڑا تو وہ **اژدہا**

بلکہ سب کو نگل گیا۔ اور آج تک قوم میں میری اس تقریر کا تعریف کے ساتھ چرچا ہے جو میرے مُنہ سے نکلی تھی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۷۸ - ۲۷۹)

عبداللہ آتھم

منجملہ اللہ تعالیٰ کے عظیم الشان نشانوں کے وہ نشان ہے جو اُس خدائے قادر نے ڈپٹی عبداللہ آتھم عیسائی کی نسبت ظاہر فرمایا اور اس کے لئے یہ تقریب پیش آئی کہ مئی اور جون ۱۸۹۳ء میں ڈاکٹر مارٹن کلارک کی تحریک سے اسلام اور عیسائیت میں ایک مباحثہ قرار پایا۔ اس مباحثہ میں عیسائیوں کی طرف سے ڈپٹی عبداللہ آتھم انتخاب کیا گیا اور مسلمانوں کی طرف سے میں پیش ہوا۔ اور عبداللہ آتھم نے مباحثہ سے کچھ دن پہلے اپنی کتاب اندرونہ بائیبل میں ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت دجّال کا لفظ لکھا تھا جیسا کہ کتاب جنگ مقدس کے آخری صفحہ میں اس کا ذکر ہے۔ وہ شرارت اور شوخی اسکی مجھے تمام ایام بحث میں یاد ہے اور میں دل وجان سے چاہتا تھا کہ اس کی سرزنش کی نسبت کوئی پیشگوئی خدائے تعالیٰ سے پاؤں۔ چنانچہ میں نے آتھم سے ایک دستخطی تحریر بھی اسی غرض سے لی تھی تا وہ پیشگوئی کے وقت عام عیسائیوں کی طرح میری آزار دہی کے لئے کسی عدالت کی طرف نہ دوڑے۔ سو میں پندرہ دن تک بحث میں مشغول رہا اور پوشیدہ طور پر آتھم کی سرزنش کے لئے دعا مانگتا رہا۔ جب بحث کے دن ختم ہوگئے تو میں نے خدا تعالیٰ کی طرف سے اطلاع پائی کہ اگر آتھم اس شوخی وگستاخی سے توبہ اور رجوع نہیں کریگا جو اُس نے دجّال کا لفظ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت اپنی کتاب میں لکھا تو وہ ہاویہ میں پندرہ مہینے کے اندر گرایا جائیگا۔ سو یہ امر الٰہی پاکر بحث کے خاتمے کے دن ایک جماعت کثیر کے روبرو جس میں عیسائیوں کی طرف سے ڈاکٹر مارٹن کلارک اور تیس کے قریب اور عیسائی تھے اور میری جماعت کے لوگ بھی تیس یا چالیس کے قریب تھے جن میں سے اخویم مولوی حکیم نور الدین صاحب اور اخویم مولوی عبدالکریم اور اخویم شیخ رحمت اللہ صاحب اور اخویم منشی تاج الدین صاحب اکونٹنٹ دفتر ریلوے لاہور اور اخویم عبدالعزیز خاں صاحب کلرک دفتر اگزیمینر ریلوے لاہور اور اخویم خلیفہ نور الدین صاحب وغیرہ احباب موجود تھے۔ میں نے ڈپٹی عبداللہ آتھم کو کہا کہ آج یہ مباحثہ منقولی اور معقولی رنگ میں تو ختم ہوگیا مگر ایک اور

رنگ کا مقابلہ باقی رہا جو خدا کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی کتاب اندرونہ بائیبل میں ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو دجّال کے نام سے پکارا ہے اور میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو صادق اور سچا رسول جانتا ہوں اور دین اسلام کو منجانب اللہ یقین رکھتا ہوں۔ پس یہ وہ مقابلہ ہے کہ **آسمانی فیصلہ** اس کا تصفیہ کرے گا۔ اور وہ آسمانی فیصلہ یہ ہے کہ ہم دونوں میں سے جو شخص اپنے قول میں جھوٹا ہے اور ناحق رسول صادق کو کاذب اور دجال کہتا ہے اور حق کا دشمن ہے وہ آج کے دن سے پندرہ مہینے تک اس شخص کی زندگی میں ہی جو حق پر ہے ہاویہ میں گرے گا۔ بشرطیکہ حق کی طرف رجوع نہ کرے۔ یعنی راستباز اور صادق نبی کو دجّال کہنے سے باز نہ آوے اور بیباکی اور بدزبانی نہ چھوڑے۔ یہ اسلئے کہا گیا کہ صرف کسی مذہب کا انکار کرنا دنیا میں مستوجب سزا نہیں ٹھہراتا بلکہ بے باکی اور شوخی اور بدزبانی مستوجب سزا ٹھہراتی ہے۔ غرض جب آتھم کو اسی مجلس میں جس میں ستّر سے زیادہ آدمی ہونگے یہ پیشگوئی سُنائی گئی تھی اُس کا رنگ فق ہوگیا اور چہرہ زرد ہوگیا اور ہاتھ کانپنے لگے۔ تب اس نے بلا توقف اپنی زبان مُنہ سے نکالی اور دونوں ہاتھ کانوں پر دھر لئے اور ہاتھوں کو مع سر کے ہلانا شروع کیا جیسا ایک ملزم خائف ایک الزام سے سخت انکار کرکے توبہ اور انکسار کے رنگ میں اپنے تئیں ظاہر کرتا ہے اور بار بار لرزتے ہوئے زبان سے کہتا تھا کہ توبہ توبہ میں نے بے ادبی اور گستاخی نہیں کی اور میں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہرگز ہرگز دجال نہیں کہا۔ اور کانپ رہا تھا۔ اس نظارہ کو نہ صرف مسلمانوں نے دیکھا بلکہ ایک جماعت کثیر عیسائیوں کی بھی اسوقت موجود تھی جو اس عجز و نیاز کو بھی دیکھ رہی تھی۔ اس انکار سے اس کا یہ مطلب معلوم ہوتا تھا کہ میری اس عبارت کے جو میں نے اندرونہ بائیبل میں لکھی ہے اور معنے ہیں۔ بہرحال اس نے اس مجلس میں قریبًا ستّر آدمی کے روبرو دجّال کہنے کے کلمہ سے رجوع کر لیا۔ اور یہی وہ کلمہ تھا جو اصل موجب اس پیشگوئی کا تھا۔ اس لئے وہ پندرہ مہینے کے اندر مرنے سے بچ رہا۔ کیونکہ جس گستاخی کے کلمہ پر پیشگوئی کا مدار تھا وہ کلمہ اس نے چھوڑ دیا اور ممکن نہ تھا کہ خدا اپنی شرط کو یاد نہ کرے اور اگرچہ رجوع کی شرط سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسی قدر کافی تھا۔ مگر آتھم نے صرف یہی نہیں کیا کہ اپنے قول دجّال کہنے سے باز آیا بلکہ اُسی دن سے جو اس نے پیشگوئی کو سُنا اسلام پر حملہ کرنا اس نے بکلّی چھوڑ دیا اور پیشگوئی کا خوف اس کے دل پر روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ مارے ڈر کے سراسیمہ ہوگیا اور اس کا آرام اور قرار جاتا رہا اور یہاں تک اس نے اپنی حالت میں

تبدیلی کی کہ اپنے پہلے طریق کو جو ہمیشہ مسلمانوں سے مذہبی بحث کرتا تھا اور اسلام کے ردّ میں کتابیں لکھتا تھا بالکل چھوڑ دیا اور ہر یک کلمہ توہین اور استخفاف سے اپنا منہ بند کر لیا بلکہ اس کے منہ پر مہر لگ گئی اور خاموش اور غمگین رہنے لگا اور اس کا غم اس درجہ تک پہنچ گیا کہ آخر وہ زندگی سے نومید ہو کر بے قراری کے ساتھ اپنے عزیزوں کی آخری ملاقات کے لئے شہر بشہر دیوانہ پن کی حالت میں پھرتا رہا اور اسی مسافرانہ حالت میں انجام کار فیروز پور میں فوت ہو گیا۔

اور یہ سوال کہ باوجود اس کے کہ اس نے اپنی بے باکی لفظ سے عام مجلس میں رجوع کر لیا اور بار بار عجز و نیاز سے دجّال کہنے کے کلمہ سے بیزاری ظاہر کی تو پھر کیوں وہ پکڑا گیا اور کیوں جلد انہی دنوں میں فوت ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ وہ مباہلہ کا نشانہ ہو چکا تھا لہذا ان پیشگوئیوں کے موافق جو کتاب انجام آتھم کے پہلے صفحہ میں موجود ہیں جو آتھم کی زندگی میں ہی پندرہ مہینے گذرنے کے بعد کی گئی تھیں اس کا مرنا ضروری تھا کیونکہ ان پیشگوئیوں میں صاف لفظوں میں لکھا گیا تھا کہ آتھم انکار قسم اور اخفاء شہادت اور اعادہ بے باکی کے بعد جلد تر فوت ہو جائیگا۔ پس جبکہ اس نے ارتکاب ان جرائم کا کیا تو ہمارے آخری اشتہار سے سات مہینے بعد فوت ہو گیا۔ اور نیز اس لئے اس کا مرنا بہرحال ضروری تھا کہ پیشگوئی کے مضمون میں یہ بات داخل تھی کہ جو جھوٹا ہے وہ صادق سے پہلے مرے گا۔

(نزول المسیح ص۱۶۳-۱۶۷)

اگر اب تک کسی عیسائی کو آتھم کے اس افتراء پر شک ہو تو وہ آسمانی شہادت سے رفع شک کرا لیوے۔ آتھم تو پیشگوئی کے مطابق فوت ہو گیا۔ اب وہ اپنے تئیں اس کا قائم مقام ٹھہرا کر آتھم کے مقدمہ میں قسم کھا لیوے اس مضمون سے کہ آتھم پیشگوئی کی عظمت سے نہیں ڈرا بلکہ اس پر یہ چار حملے ہوئے تھے۔ اگر یہ قسم کھانے والا بھی **ایک سال تک بچ گیا** تو دیکھو مَیں اس وقت اقرار کرتا ہوں کہ مَیں اپنے ہاتھ سے شائع کر دونگا کہ میری پیشگوئی غلط نکلی۔ اس قسم کے ساتھ کوئی شرط نہ ہوگی۔ یہ نہایت صاف فیصلہ ہو جائیگا۔ اور جو شخص خدا کے نزدیک باطل پر ہے اس کا بطلان کھل جائیگا۔

اگر عیسائی لوگ سچے دل سے یقین رکھتے ہیں کہ یہ پیشگوئی جھوٹی نکلی تو اس طریق امتحان سے کونسی ان کو چیز مانع ہے۔

(انجام آتھم ص۱۵-۱۶)

لیکھرام

واضح ہو کہ منجملہ ہیبت ناک اور عظیم الشان نشانوں کے پنڈت لیکھرام کی موت کا نشان ہے جس کی بنیادی پیشگوئی کا سرچشمہ میری کتابیں برکات الدعاء اور کرامات الصادقین اور آئینہ کمالاتِ اسلام ہیں جن میں قبل از وقوع خبر دی گئی تھی کہ لیکھرام قتل کے ذریعہ سے چھ سال کے اندر اس دنیا سے کوچ کر جائیگا۔ اور اس کے قتل کئے جانے کا دن عید سے دوسرا دن ہوگا یعنی شنبہ کا دن۔ اور یہ اس لئے مقرر کیا گیا کہ تا عید کا دن جو جمعہ تھا اس بات پر دلالت کرے کہ جس دن مسلمانوں کے گھر میں دو عیدیں ہونگی اس سے دوسرے دن آریوں کے گھر میں دو ماتم ہونگے۔ اور یہ پیشگوئی نہ صرف میری کتابوں میں درج ہے بلکہ لیکھرام نے خود اپنی کتاب میں نقل کر کے اپنی قوم میں اس پیشگوئی کی قبل از وقوع شہرت دے دی تھی اور اس پیشگوئی کے مقابل پر اس نے اپنی کتاب میں میری نسبت یہ لکھا کہ میرے پرمیشر نے مجھے یہ الہام کیا ہے کہ یہ شخص (یعنی یہ خاکسار) تین سال کے اندر ہیضہ سے مرجائیگا کیونکہ کذّاب ہے۔ . . . .

مَیں نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ لیکھرام گوسالہ سامری کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا جائیگا۔ اور اس میں یہ اشارہ تھا کہ جیسا کہ گوسالہ سامری شنبہ کے دن ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا تھا یہی لیکھرام کا حال ہوگا۔ اور یہ اس کے قتل کی طرف اشارہ تھا۔ چنانچہ لیکھرام شنبہ کے دن قتل کیا گیا اور ان دنوں میں شنبہ سے پہلے جمعہ کے دن مسلمانوں کی عید ہوئی تھی۔ ایسا ہی گوسالہ سامری بھی شنبہ کے دن ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا تھا اور وہ یہود کی عید کا دن تھا اور گوسالہ سامری ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد جلایا گیا تھا، ایسا ہی لیکھرام بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد جلایا گیا۔ کیونکہ اول قاتل نے اس کی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور پھر ڈاکٹر نے اُس کے زخم کو زیادہ کھولا اور بالآخر جلایا گیا۔ اور پھر گوسالہ سامری کی طرح اس کی ہڈیاں دریا میں ڈالی گئیں۔ اور خدا تعالیٰ نے گوسالہ سامری سے اس لئے اس کو تشبیہ دی کہ وہ گوسالہ محض بے جان تھا اور اس زمانہ کے ان کھلونے کی طرح تھا جن کی کل دبانے سے آواز نکلتی ہے۔ اسی طرح اس گوسالہ میں سے ایک آواز نکلتی تھی۔ پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دراصل لیکھرام بے جان تھا اور اس میں روحانی زندگی نہیں آئی تھی۔ اور اس کی آواز محض گوسالہ سامری کی طرح تھی اور

سچا علم اور سچا گیان اور خدا تعالیٰ سے سچا تعلق اور سچی محبت اس کو نصیب نہیں تھی۔ یہ آریوں کا تصور تھا کہ اس بے جان کو جس میں روحانیت کی جان نہ تھی اور محض مُردہ تھا اس مقام پر کھڑا کر دیا جس پر کوئی زندہ کھڑا ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے اس کا گوسالہ سامری کی طرح انجام ہُوا ......

مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ خون ان کی گردن پر ہے۔ وہ باوجود اس قدر جوش کے اپنی طبیعت میں ایک سادگی بھی رکھتا تھا کیونکہ شریر لوگوں کی باتوں سے بغیر تفتیش اور تفحّص کے متاثر ہو جاتا تھا اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اس کو ایک گوسالہ سے مشابہت دی۔ بہرحال ہم اس کی ناگہانی موت سے بغیر افسوس کے نہیں رہ سکتے۔ مگر کیا کیا جائے کہ جو خدا تعالےٰ کی طرف سے مقدر تھا وہ پورا ہونا ضروری تھا۔ ....

اس امر کو خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ مجھے کسی سے بغض نہیں ہے۔ اگرچہ میں لیکھرام کے معاملہ میں اس بات سے تو خوش ہوں کہ خدا تعالیٰ کی پیشگوئی پوری ہوئی مگر دوسرے پہلو سے میں غمگین ہوں کہ وہ عین جوانی کی حالت میں مرا۔ اگر وہ میری طرف رجوع کرتا تو مَیں اس کے لئے دُعا کرتا تا یہ بلا ٹل جاتی۔ اس کے لئے ضروری نہ تھا کہ اس بلا کے ردّ کرانے کیلئے وہ مسلمان ہو جاتا بلکہ صرف اس قدر ضروری تھا کہ گالیوں اور گندہ زبانی سے اپنے مُنہ کو روک لیتا۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۸۱ - ۲۸۹)

اب ہم لیکھرام کی پیشگوئی کو مفصل طور پر مع اصل عبارات ان کتابوں کے اس جگہ درج کرتے ہیں جن میں یہ پیشگوئی موجود ہے۔ اور ناظرین کو توجہ دلاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا خوف کر کے ان مقامات کو غور سے پڑھیں اور پھر سوچیں کہ کیا یہ انسان کا کام ہے یا اس خدا کا جو زمین و آسمان کا مالک ہے۔ اور تمام طاقتوں کا خداوند ہے ....

اسجگہ ایک ضروری بات جو یاد رکھنے کے لائق ہے اور جو ہماری اس کتاب کی رُوح اور علّت غائی ہے وہ یہ ہے کہ یہ پیشگوئی ایک بڑے مقصد کے ظاہر کرنے کیلئے کی گئی تھی۔ یعنی اس بات کا ثبوت دینے کے لئے کہ آریہ مذہب بالکل باطل اور وید خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں اور **ہمارے سیّد و مولیٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم** خدا تعالےٰ کے پاک رسول اور برگزیدہ نبی اور اسلام خدا تعالیٰ کی طرف سے سچا مذہب ہے۔ اور یہی بار بار لکھا گیا تھا۔ اور اسی مقصد کے پورا کرنے کے لئے دعائیں کی گئی تھیں۔ سو اس پیشگوئی کو نری ایک پیشگوئی خیال نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک **آسمانی فیصلہ** ہے۔

کچھ مدت سے ہندوؤں میں تیزی بڑھ گئی تھی۔ خاص کر کے یہ لیکھرام تو گویا اس بات پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا کہ خدا بھی ہے۔ سو خدا نے ان لوگوں کو چمکتا ہوا نمونہ دکھلایا۔ چاہیئے کہ ہر یک شخص اس سے عبرت پکڑے۔ جو شخص خدا کے مقدس نبیوں کی اہانت میں زبان کھولتا ہے کبھی اس کا انجام اچھا نہیں ہو سکتا۔

لیکھرام اپنی موت سے آریوں کو ہمیشہ کی عبرت کا سبق دے گیا ہے۔ چاہیئے کہ ان شرارتوں سے دست بردار ہوں جو دیانند نے ملک میں پھیلائیں۔ اور نرمی اور لطف اور سچی محبت اور تعظیم کے ساتھ اسلام سے برتاؤ کریں۔ آئندہ انہیں اختیار ہے۔ بعض احمق جو مسلمان کہلا کر آریوں کی طرف جھکے تھے اب ان کی توبہ کا وقت ہے۔ انہیں دیکھنا چاہیئے کہ **اسلام کا خدا کیسا غالب ہے**۔ آریوں کو اس پیشگوئی کے وقت بذریعہ چھپے ہوئے اشتہاروں کے اطلاع دی گئی تھی کہ اگر تمہارا دین سچا ہے اور اسلام باطل تو اس کی یہی نشانی ہے کہ اس پیشگوئی کے اثر سے اپنے وکیل لیکھرام کو بچا لو۔ اور جہاں تک ممکن ہے اس کیلئے دعائیں کرو اور دعاؤں کے لئے مہلت بہت تھی۔ لیکن خدا کے قہری ارادہ کو وہ لوگ بدل نہ سکے یقیناً سمجھنا چاہیئے کہ جو چھری لیکھرام پر چلائی گئی **یہ وہی چھری تھی** جو وہ کئی برس تک ہمارے سیّد و مولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی میں چلاتا رہا۔ پس وہی زبان کی تیزی چھری کی شکل پر متمثل ہو کر اس کے پیٹ میں گھس گئی۔ **جب تک آسمان پر چھری نہ چلے زمین پر ہرگز چل نہیں سکتی**۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ یہ لیکھرام اب مارا گیا لیکن میں تو اس وقت سے مقتول سمجھتا تھا جب میرے پاس ایک فرشتہ خونی شکل میں آیا اور اُس نے پوچھا کہ "لیکھرام کہاں ہے؟" چنانچہ یہ سب مضمون ان پیشگوئیوں میں پڑھو گے جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

اوّل (اشتہار ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء میں پنڈت لیکھرام کی نسبت صرف اسقدر صفحہ ۴ میں پیشگوئی ہے) کہ لیکھرام صاحب پشاوری کی قضا و قدر وغیرہ کے متعلق غالباً اس رسالہ میں بقید وقت و تاریخ کچھ تحریر ہو گا۔ اگر کسی صاحب پر کوئی ایسی پیشگوئی شاق گذرے تو وہ مجاز ہیں کہ یکم مارچ ۱۸۸۶ء سے یا اس تاریخ سے جو کسی اخبار میں پہلی دفعہ یہ مضمون شائع ہو ٹھیک ٹھیک دو ہفتہ کے اندر اپنی دستخطی تحریر سے مجھ کو اطلاع دیں تا وہ پیشگوئی جس کے ظہور سے وہ ڈرتے ہیں اندراج رسالہ سے علیحدہ رکھی جائے اور موجب

دل آزاری سمجھ کر کسی کو اس پر مطلع نہ کیا جاوے اور کسی کو اس کے وقت ظہور سے خبر نہ دی جائے۔ پھر بعد اس کے پنڈت لیکھرام کا کارڈ پہنچا کہ میں اجازت دیتا ہوں کہ میری موت کی نسبت پیشگوئی کی جائے مگر میعاد مقرر ہونی چاہیئے ....

دوم الہام مندرجہ رسالہ کرامات الصادقین مطبوعہ صفر ۱۳۱۱ھ۔ وعدنی ربّی واستجاب دعائی فی رجلٍ مفسدٍ عدو اللہ ورسوله المسمّی لیکھرام الفشاوری واخبرنی انه من الھالکین۔ انّه کان یسبّ نبی اللہ ویتکلّم فی شانه بکلماتٍ خبیثةٍ فدعوت علیه فبشّرنی ربّی بموته فی ستة سنة۔ ان فی ذالک لاٰیات للطالبین۔ یعنی خدا تعالیٰ نے ایک دشمن اللہ اور رسول کے بارے میں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو گالیاں نکالتا ہے اور ناپاک کلمے زبان پر لاتا ہے جس کا نام لیکھرام ہے مجھے وعدہ دیا اور میری دعا سنی اور جب میں نے اس پر بد دعا کی تو خدا نے مجھے بشارت دی کہ وہ چھ سال کے اندر ہلاک ہو جائیگا۔ یہ ان کے لئے نشان ہے جو سچے مذہب کو ڈھونڈتے ہیں۔

سوم الہام مندرجہ اشتہار ۲۰ فروری ۱۸۹۳ء مشمولہ کتاب آئینہ کمالات اسلام....

لیکھرام پشاوری کی نسبت ایک پیشگوئی

واضح ہو کہ اس عاجز نے اشتہار ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء میں جو اس کتاب کے ساتھ شامل کیا گیا تھا۔ اندرمن مراد آبادی اور لیکھرام پشاوری کو اس بات کی دعوت کی تھی کہ اگر وہ خواہشمند ہوں تو ان کی قضاء و قدر کی نسبت بعض پیشگوئیاں کی جائیں۔ سو اس اشتہار کے بعد اندرمن نے تو اعراض کیا اور کچھ عرصہ کے بعد فوت ہو گیا۔ لیکن لیکھرام نے بڑی دلیری سے ایک کارڈ اس عاجز کی طرف روانہ کیا کہ میری نسبت جو پیشگوئی چاہو شائع کر دو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ سو اس کی نسبت جب توجہ کی گئی تو اللہ جلّ شانہٗ کی طرف سے یہ الہام ہوا:۔ عجلٌ جسدٌ لهٗ خوارٌ لهٗ نصبٌ وعذابٌ۔ یعنی یہ صرف ایک بے جان گوسالہ ہے جس کے اندر سے ایک مکروہ آواز نکل رہی ہے اور اس کے لئے ان گستاخیوں اور بد زبانیوں کے عوض میں سزا اور رنج اور عذاب مقدر ہے جو ضرور اس کو مل رہے گا۔ اور اور اس کے بعد آج جو ۲۰ فروری ۱۸۹۳ء روز دوشنبہ ہے اس عذاب کا وقت معلوم کرنے کے لئے توجہ کی گئی تو خداوند کریم نے مجھ پر ظاہر کیا کہ آج کی تاریخ سے جو بیس فروری ۱۸۹۳ء ہے چھ برس کے عرصہ تک یہ شخص اپنی بد زبانیوں کی سزا میں یعنی ان **بے ادبیوں کی سزا** میں جو اس شخص نے **رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم** کے حق میں کی ہیں عذاب شدید میں مبتلا ہو جائیگا۔ سو اب میں

اس پیشگوئی کو شائع کر کے تمام مسلمانوں اور آریوں اور عیسائیوں اور دیگر فرقوں پر ظاہر کرتا ہوں کہ اگر اس شخص پر چھ برس کے عرصہ میں آج کی تاریخ سے کوئی ایسا عذاب نازل نہ ہوا جو معمولی تکلیفوں سے نرالا اور خارق عادت اور اپنے اندر الٰہی ہیبت رکھتا ہو تو سمجھو کہ مَیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں. اور نہ اس کی رُوح سے میرا نطق ہے اور اگر مَیں اس پیشگوئی میں کاذب نکلا تو ہر یک سزا کے بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ اور اس بات پر راضی ہوں کہ مجھے گلے میں رسہ ڈال کر کسی سولی پر کھینچا جائے۔ اور باوجود میرے اس اقرار کے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ کسی انسان کا اپنی پیشگوئی میں جھوٹا نکلنا خود تمام رسوائیوں سے بڑھ کر رسوائی ہے۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔

واضح رہے کہ اس شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سخت بے ادبیاں کی ہیں جن کے تصوّر سے بھی بدن کانپتا ہے۔ اس کی کتابیں عجیب طور کی تحقیر اور توہین اور دشنام دہی سے بھری ہوئی ہیں۔ کون مسلمان ہے جو ان کتابوں کو سُنے اور اس کا دل اور جگر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو۔ بایں ہمہ شوخی وخیرگی۔ یہ شخص سخت جاہل ہے۔ عربی سے ذرا مَس نہیں بلکہ دقیق اردو لکھنے کا بھی مادہ نہیں اور یہ پیشگوئی اتفاقی نہیں بلکہ اس عاجز نے خاص اسی مطلب کے لئے دعا کی جس کا یہ جواب ملا۔ اور یہ پیشگوئی مسلمانوں کے لئے بھی نشان ہے۔ کاش وہ حقیقت کو سمجھتے اور اُن کے دل نرم ہوتے۔ اب میں اسی خدائے عزّوجلّ کے نام پر ختم کرتا ہوں جس کے نام سے شروع کیا تھا۔ والحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمدن المصطفیٰ افضل الرسل وخیر الورٰی سیدنا وسید کل ما فی الارض والسماء

خاکسار مرزا غلام احمد از قادیان ضلع گورداسپور ۲۰؍ فروری ۱۸۹۳ء

چہارم۔ جواب اعتراض مندرجہ ٹائیٹل پیج برکات الدعاء معہ خبر مندرجہ حاشیہ صفحہ ۴ ٹائیٹل پیج

نمونہ دعائے مستجاب

انیسؔ ہند میرٹھ اور ہماری پیشگوئی پر اعتراض

اِس اخبار کا پرچہ مطبوعہ ۲۵؍ مارچ ۱۸۹۳ء جس میں میری اس پیشگوئی کی نسبت جو لیکھرام پشاوری کے بارے میں مَیں نے شائع کی تھی کچھ نکتہ چینی ہے مجھکو ملا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض اور اخباروں پر بھی یہ کلمۃ الحق شاق گذرا ہے اور حقیقت میں میرے لئے خوشی کا مقام ہے کہ یوں خود مخالفوں کے ہاتھوں اس کی شہرت اور اشاعت ہو رہی ہے۔ سو میں اس وقت اس نکتہ چینی کے جواب میں صرف اس قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ جس طور اور طریق سے خدا تعالےٰ نے چاہا اسی طور سے کیا میرا اس میں دخل نہیں ہاں یہ سوال کہ ایسی پیشگوئی مفید نہیں ہوگی اور اس میں شبہات باقی رہ جائیں گے۔ اس اعتراض

کی نسبت میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ پیش از وقت ہے۔ میں اس بات کا خود اقراری ہوں اور اب پھر اقرار کرتا ہوں کہ اگر جیسا کہ معترضوں نے خیال فرمایا ہے پیشگوئی کا ماحصل آخر کار یہی نکلا کہ کوئی معمولی تپ آیا یا معمولی طور پر کوئی درد ہوا یا ہیضہ ہوا اور پھر اصل حالت صحت کی قائم ہو گئی تو وہ پیشگوئی منصور نہیں ہوگی۔ اور بلاشبہ ایک مکر اور فریب ہوگا کیونکہ ایسی بیماریوں سے تو کوئی بھی خالی نہیں ہم سب کبھی نہ کبھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ پس اس صورت میں میں بلاشبہ اس سزا کے لائق ٹھہرونگا جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔ لیکن اگر پیشگوئی کا ظہور اس طور سے ہوا کہ جس میں قہر الٰہی کے نشان صاف صاف اور کھلے طور پر دکھائی دیں تو پھر سمجھو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ پیشگوئی کی ذاتی عظمت اور ہیبت دنوں اور وقتوں کے مقرر کرنے کی محتاج نہیں اس بارے میں تو زمانہ نزول عذاب کی ایک حد مقرر کر دینا کافی ہے۔ پھر اگر پیشگوئی فی الواقعہ ایک عظیم الشان ہیبت کے ساتھ ظہور پذیر ہو تو وہ خود دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور یہ سارے خیالات اور یہ تمام نکتہ چینیاں جو پیش از وقت دلوں میں پیدا ہوتی ہیں ایسی معدوم ہو جاتی ہیں کہ منصف مزاج اہل الرائے ایک انفعال کے ساتھ اپنی رایوں سے رجوع کرتے ہیں۔ ماسوا اس کے یہ عاجز بھی تو قانون قدرت کے تحت میں ہے۔ اگر میری طرف سے بنیاد اس پیشگوئی کی صرف اسی قدر ہے کہ میں نے صرف یاوہ گوئی کے طور پر چند احتمالی بیماریوں کو ذہن میں رکھ کر اور اٹکل سے کام لے کر یہ پیشگوئی شائع کی ہے تو جس شخص کی نسبت یہ پیشگوئی ہے وہ بھی تو ایسا کر سکتا ہے کہ انہی اٹکلوں کی بنیاد پر میری نسبت کوئی پیشگوئی کر دے بلکہ میں راضی ہوں کہ بجائے چھ برس کے جو میں نے اس کے حق میں میعاد مقرر کی ہے وہ میرے لئے دس برس لکھدے۔ لیکھرام کی عمر اس وقت شائد زیادہ سے زیادہ تیس برس کی ہوگی۔ اور وہ ایک جوان قوی ہیکل عمدہ صحت کا آدمی ہے۔ اور اس عاجز کی عمر اس وقت پچاس برس سے کچھ زیادہ ہے۔ اور ضعیف اور دائم المرض اور طرح طرح کے عوارض میں مبتلا ہے۔ پھر باوجود اس کے مقابلہ میں خود معلوم ہو جائیگا کہ کونسی بات انسان کی طرف سے اور کونسی بات خدا تعالیٰ کی طرف سے

اور معترض کا یہ کہنا کہ ایسی پیشگوئیوں کا اب زمانہ نہیں ہے ایک معمولی فقرہ ہے جو اکثر لوگ منہ سے بول دیا کرتے ہیں۔ میری دانست میں تو مضبوط اور کامل صداقتوں کے قبول کرنے کے لئے یہ ایک ایسا زمانہ ہے کہ شائد اس کی نظیر پہلے زمانوں میں کوئی بھی نہ مل سکے۔ ہاں اس زمانہ سے کوئی فریب اور مکر مخفی نہیں رہ سکتا۔ مگر یہ تو راستبازوں کے لئے اور بھی خوشی کا

مقام ہے کیونکہ جو شخص فریب اور سچ میں فرق کرنا جانتا ہے وہی سچائی کی دل سے عزّت کرتا ہے۔ اور بخوشی اور دوڑ کر سچائی کو قبول کر لیتا ہے۔ اور سچائی میں کچھ ایسی کشش ہوتی ہے کہ وہ آپ قبول کرا لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ زمانہ صدہا ایسی نئی باتوں کو قبول کرتا جاتا ہے جو لوگوں کے باپ دادوں نے قبول نہیں کی تھیں۔ اگر زمانہ صداقتوں کا پیاسا نہیں تو پھر کیوں ایک عظیم الشان انقلاب اس میں شروع ہے؟ زمانہ بے شک حقیقی صداقتوں کا دوست ہے نہ دشمن۔ اور یہ کہنا کہ زمانہ عقلمند ہے اور سیدھے سادے لوگوں کا وقت گذر گیا ہے یہ دوسرے لفظوں میں زمانہ کی مذمت ہے۔......

آریوں کا اختیار ہے کہ میرے اس مضمون پر بھی اپنی طرف سے جس طرح چاہیں حاشیے چڑھائیں مجھے اس بات پر کچھ بھی نظر نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس وقت اس پیشگوئی کی تعریف کرنا یا مذمت کرنا دونوں برابر ہیں۔ اگر یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ اُسی کی طرف سے ہے **تو ضرور ہیبت ناک نشان کے ساتھ اس کا وقوعہ ہوگا اور دلوں کو ہلا دیگا** اور اگر اس کی طرف سے نہیں تو پھر میری ذلت ظاہر ہوگی۔ اور اگر میں اس وقت رکیک تاویلیں کروں گا تو یہ اَور بھی ذلت کا موجب ہوگا۔ وہ ہستی قدیم اور وہ پاک و قدوس جو تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے وہ کاذب کو کبھی عزت نہیں دیتا۔ یہ بالکل غلط بات ہے کہ لیکھرام سے مجھ کو کوئی ذاتی عداوت ہے۔ مجھ کو ذاتی طور پر کسی سے بھی عداوت نہیں بلکہ اس شخص نے سچائی سے دشمنی کی اور ایک ایسے **کامل** اور **مقدس** کو جو تمام سچائیوں کا چشمہ تھا توہین سے یاد کیا اس لئے خدا تعالیٰ نے چاہا کہ اپنے ایک **پیارے** کی دنیا میں عزت ظاہر کرے والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

لیکھرام پشاوری کی نسبت ایک اَور خبر (مندرجہ حاشیہ ٹائٹل پیج برکات الدعا)

آج جو ۲؍اپریل ۱۸۹۳ء مطابق ۱۴؍ماہ رمضان ۱۳۱۰ھ ہے صبح کے وقت تھوڑی سی غنودگی کی حالت میں مَیں نے دیکھا کہ میں ایک وسیع مکان میں بیٹھا ہوا ہوں اور چند دوست بھی میرے پاس موجود ہیں۔ اتنے میں ایک شخص قوی ہیکل مہیب شکل گویا اس کے چہرہ پر سے خون ٹپکتا ہے میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک نئی خلقت اور شمائل کا شخص ہے گویا انسان نہیں ملائک شداد غلاظ میں سے ہے اور اس کی ہیبت دلوں پر طاری تھی۔ اور مَیں اُس کو دیکھتا ہی تھا کہ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ "**لیکھرام کہاں ہے**؟" اور ایک اَور شخص کا نام

لیا کہ وہ کہاں ہے۔ تب مَیں نے اس وقت سمجھا کہ یہ شخص لیکھرام اور اس دوسرے شخص کی سزا دہی کے لئے مامور کیا گیا ہے۔ مگر مجھے معلوم نہیں رہا کہ وہ دوسرا شخص کون ہے۔ ہاں یہ یقینی طور پر یاد رہا ہے کہ وہ دوسرا شخص انہیں چند آدمیوں میں سے تھا جنکی نسبت میں اشتہار دے چکا ہوں اور یہ یکشنبہ کا دن اور ۴ بجے صبح کا وقت تھا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک ....

اس تمام پیشگوئی کا ماحصل یہ ہے کہ یہ ایک ہیبت ناک واقعہ ہوگا جو چھ سال کے اندر وقوع میں آئیگا۔ اور وہ دن عید کے دن سے ملا ہوا ہوگا۔ یعنی دوسری شوال کی ہوگی۔

اب سوچو کیا یہ انسان کا کام ہے کہ تاریخ بتلائی گئی۔ دن بتلایا گیا سبب موت بتلایا گیا اور اس حادثہ کا وقوعہ ہیبت ناک طرز سے ظہور میں آنا بتلایا گیا۔ اس کا تمام نقشہ برکات الدعاء کے مضمون میں کھینچکر دکھلایا گیا۔ کیا یہ کسی منصوبہ باز کا کام ہو سکتا ہے کہ چھ برس پہلے ایسے صریح نشانوں کے ساتھ خبر دیدے اور وہ خبر پوری ہو جائے۔ توریت گواہی دیتی ہے کہ جھوٹے نبی کی پیشگوئی کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ خدا اس کے مقابل پر کھڑا ہو جاتا ہے تا دنیا تباہ نہ ہو۔ جیسا کہ لیکھرام نے بھی ایک دنیوی چالاکی سے انہیں دنوں میں میری نسبت یہ اشتہار دیا تھا کہ تم تین برس کے عرصہ تک مر جاؤ گے۔ پس کیوں وہ کسی قاتل سے سازش نہ کر سکا تا اس کی بات پوری ہوتی۔

ایک اور بات سوچنے کے لائق ہے کہ یہ بدگمانی کہ اُن کے کسی مرید نے مار دیا ہوگا یہ شیطانی خیال ہے۔ ہر یک دانا سمجھ سکتا ہے کہ مریدوں کا مرشد کے ساتھ ایک نازک تعلق ہوتا ہے اور اعتقاد کی بناء تقویٰ اور طہارت اور نیکوکاری پر ہوتی ہے۔ لوگ جو کسی کے مرید ہوتے ہیں وہ اس نیت سے مرید ہوتے ہیں کہ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ شخص باخدا ہے اس کے دل میں کوئی فریب اور فساد کی بات نہیں۔ پس اگر وہ ایک ایسا بدکار اور لعنتی شخص ہے کہ کسی کی موت کی جھوٹی پیشگوئی اپنی طرف سے بناتا ہے اور پھر جب اس کی میعاد ختم ہونے پر ہوتی ہے تو کسی مرید کے آگے ہاتھ جوڑتا ہے کہ اب میری عزت رکھ لے اور اپنے گلے میں رسہ ڈال اور مجھے سچا کر کے دکھلا۔ اب مَیں منصفوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ایسے پلید اور لعنتی انسان کا یہ چال چلن دیکھ کر اور یہ شیطانی منصوبہ سنکر کوئی مرید اس کا معتقد رہ سکتا ہے؟ کیا وہ مرشد کو ایک بدکار ملعون اور فاسق فاجر خیال نہیں کرے گا؟ اور کیا وہ اُس کو یہ نہیں کہیگا کہ اے بدکار ہمارے ایمان کو خراب کرنے والے کیا تیری پیشگوئیوں کی اصلیت

یہی تھی ! کیا تیرا یہ منشا ہے کہ جھوٹ تو تُو بولے اور رسّہ دوسرے کے گلے میں پڑے ۔ اور اس طرح تیری پیشگوئی پوری ہو ۔ ....

ہم بآواز بلند کہتے ہیں کہ ہماری جماعت نہایت نیک چلن اور مہذب اور پرہیزگار لوگ ہیں ۔ کہاں ہے کوئی ایسا پلید اور لعنتی ہمارا مرید جس کا یہ دعویٰ ہو کہ ہم نے اس کو **لیکھرام** کے قتل کے لئے مامور کیا تھا ؟ ہم ایسے مرشد کو اور ساتھ ہی ایسے مرید کو کتّوں سے بدتر اور نہایت ناپاک زندگی والا خیال کرتے ہیں کہ جو اپنے گھر سے پیشگوئیاں بنا کر پھر اپنے ہاتھ سے اپنے مکر سے اپنے فریب سے اُن کے پورا ہونے کے لئے کوشش کرے اور کراوے ......

اگر اب بھی کسی شک کرنے والے کا شک دُور نہیں ہو سکتا اور مجھے اس قتل کی سازش میں شریک سمجھتا ہے جیسا کہ ہندو اخباروں نے ظاہر کیا ہے تو مَیں ایک نیک صلاح دیتا ہوں کہ جس سے سارا قضیّہ **فیصلہ** ہو جائے ۔ اور وہ یہ ہے کہ ایسا شخص میرے سامنے قسم کھاوے جس کے الفاظ یہ ہوں کہ " مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ شخص سازش قتل میں شریک یا اس کے حکم سے واقعہ قتل ہوُا ہے ۔ پس اگر یہ صحیح نہیں ہے تو اے قادر خدا ! ایک برس کے اندر مجھ پر وہ عذاب نازل کر جو ہیبت ناک عذاب ہو مگر کسی انسان کے ہاتھوں سے نہ ہو اور نہ انسان کے منصوبوں کا اس میں کچھ دخل متصوّر ہو سکے ۔ پس اگر یہ شخص ایک برس تک میری بد دعا سے بچ گیا تو مَیں مجرم ہوں اور اس سزا کے لائق کہ ایک قاتل کے لئے ہونی چاہیئے ۔ اب اگر کوئی بہادر کلیجہ والا آریہ ہے جو اس طور سے تمام دنیا کو شبہات سے چھڑا دے تو اس طریق کو اختیار کرے ۔ یہ طریق نہایت سادہ اور راستی کا فیصلہ ہے شائد اس طریق سے ہمارے مخالف مولویوں کو بھی فائدہ پہنچے ۔ مَیں نے سچے دل سے یہ لکھا ہے ۔ مگر یاد رہے کہ ایسی آزمائش کرنے والا خود قادیان میں آوے ۔ اس کا کرایہ میرے ذمہ ہوگا ۔ جانبین کی تحریرات چھپ جائینگی اگر خدا نے اس کو ایسے عذاب سے ہلاک نہ کیا جس میں انسان کے ہاتھوں کی آمیزش نہ ہو تو مَیں کاذب ٹھہرونگا اور تمام دنیا گواہ رہے کہ اس صورت میں مَیں اسی سزا کے لائق ٹھہروں گا جو مجرم قتل کو دینی چاہیئے ۔

(سراج منیر ص ۲۵-۹)

جب میری پیشگوئی کے مطابق لیکھرام کے قتل ہو جانے پر آریوں میں میری نسبت بہت شور مچا اور میرے قتل یا گرفتار ہونے کیلئے سازشیں کیں ۔ چنانچہ بعض اخبار والوں نے ان باتوں کو

اپنے اخباروں میں بھی درج کیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے الہام ہوا "**سلامت بر تو اے مرد سلامت**" چنانچہ یہ الہام بذریعہ اشتہار کے شائع کیا گیا۔ اور اس وعدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجھے مخالفین کے مکر و فریب اور منصوبوں سے محفوظ رکھا۔

(نزول المسیح صـ۱۹۴).

طاعون

اس مرض نے جسقدر بمبئی اور دوسرے شہروں اور دیہات پر حملے کئے اور کر رہی ہے ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ دو سال کے عرصے میں ہزاروں بچے اس مرض سے یتیم ہو گئے اور ہزارہا گھر ویران ہو گئے۔ دوست اپنے دوستوں سے اور عزیز اپنے عزیزوں سے ہمیشہ کے لئے جدا کئے گئے اور ابھی انتہا نہیں۔ کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ محسنہ نے کمال ہمدردی سے تدبیریں کیں اور اپنی رعایا پر نظر شفقت کر کے لکھوکھا روپیہ کا خرچ اپنے ذمہ ڈال لیا اور قواعد طبیہ کے لحاظ سے جہاں تک ممکن تھا ہدایتیں شائع کیں مگر اس مرض مہلک سے اب تک بکلّی امن حاصل نہیں ہوا بلکہ بمبئی میں ترقی پر ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ ملک پنجاب بھی خطرہ میں ہے۔ ہر ایک کو چاہیئے کہ اس وقت اپنی اپنی سمجھ اور بصیرت کے موافق نوع انسان کی ہمدردی میں مشغول ہو کیونکہ وہ شخص انسان نہیں جس میں ہمدردی کا مادہ نہ ہو....

اور ایک اور ضروری امر ہے جس کے لکھنے پر میرے جوش ہمدردی نے مجھے آمادہ کیا ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ جو لوگ روحانیت سے بے بہرہ ہیں اس کو ہنسی اور ٹھٹھے سے دیکھیں گے مگر میرا فرض ہے، کہ میں اس کو نوعِ انسان کی ہمدردی کے لئے ظاہر کروں اور وہ یہ ہے کہ آج جو چھ فروری ۱۸۹۸ء روز یکشنبہ ہے **میں نے خواب میں دیکھا** کہ خدا تعالیٰ کے ملائک پنجاب کے مختلف مقامات میں سیاہ رنگ کے پودے لگا رہے ہیں۔ اور وہ درخت نہایت بدشکل اور سیاہ رنگ اور خوفناک اور چھوٹے قد کے ہیں۔ میں نے بعض لگانے والوں سے پوچھا کہ یہ کیسے درخت ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ "**یہ طاعون کے درخت ہیں جو عنقریب ملک میں پھیلنے والی ہے**"۔ میرے پر یہ امر مشتبہ رہا کہ اُس نے یہ کہا کہ آئندہ جاڑے میں یہ مرض بہت پھیلیگا یا یہ کہا کہ اس کے بعد جاڑے میں پھیلیگا۔ لیکن نہایت خوفناک نمونہ تھا جو میں نے دیکھا اور مجھے اس سے پہلے طاعون کے بارے میں الہام بھی ہوا اور وہ یہ ہے۔ انّ اللّٰہ لا یغیّر ما بقومٍ حتّٰی یغیّروا ما بانفسھم۔ انّہ اوی القریۃ۔ یعنی

جب تک دلوں کی وباءِ معصیت دُور نہ ہو تب تک ظاہری وباء بھی دُور نہیں ہوگی۔ اور درحقیقت دیکھا جاتا ہے کہ ملک میں بدکاری کثرت سے پھیل گئی ہے اور خدا تعالےٰ کی محبت ٹھنڈی ہو کر ہوا و ہوس کا ایک طوفان برپا ہو رہا ہے۔ اکثر دلوں سے اللہ جلّ شانہٗ کا خوف اٹھ گیا ہے اور وباؤں کو ایک معمولی تکلیف سمجھا گیا ہے جو انسانی تدبیروں سے دُور ہو سکتی ہے۔ ہر ایک قسم کے گناہ بڑی دلیری سے ہو رہے ہیں۔ اَور قوموں کا ہم ذکر نہیں کرتے وہ لوگ جو مسلمان کہلاتے ہیں اور ان میں سے جو غریب اور مفلس ہیں اکثر اُن میں سے چوری اور خیانت اور حرامخوری میں نہایت دلیر پائے جاتے ہیں۔ جھوٹ بہت بولتے ہیں اور کئی قسم کے خسیس اور مکروہ حرکات اُن سے سرزد ہوتے ہیں اور وحشیوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں نماز کا تو ذکر کیا کئی کئی دنوں تک مُنہ بھی نہیں دھوتے اور کپڑے بھی صاف نہیں کرتے۔ اور جو لوگ امیر اور رئیس اور نواب یا بڑے بڑے تاجر اور زمیندار اور ٹھیکیدار اور دولتمند ہیں وہ اکثر عیاشیوں میں مشغول ہیں اور شراب خوری اور زناکاری اور بد اخلاقی اور فضول خرچی ان کی عادت ہے اور صرف نام کے مسلمان ہیں اور دینی امور میں اور دین کی ہمدردی میں سخت لاپرواہ پائے جاتے ہیں۔

اب چونکہ اس الہام سے جو ابھی میں نے لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقدیرِ معلق ہے اور توبہ اور استغفار اور نیک عملوں اور ترکِ معصیت اور صدقات اور خیرات اور پاک تبدیلی سے دُور ہو سکتی ہے لہٰذا تمام بندگانِ خدا کو اطلاع دی جاتی ہے کہ سچے دل سے نیک چلنی اختیار کریں اور بھلائی میں مشغول ہوں اور ظلم اور بدکاری کے تمام طریقوں کو چھوڑ دیں۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ سچے دل سے خدا تعالیٰ کے احکام بجا لاویں۔ نماز کے پابند ہوں۔ ہر ایک فسق و فجور سے پرہیز کریں۔ توبہ کریں اور نیک بختی اور خدا ترسی اور اللہ تعالےٰ کے ذکر میں مشغول ہوں۔ غریبوں اور ہمسائیوں اور یتیموں اور بیواؤں اور مسافروں اور درماندوں کے ساتھ نیک سلوک کریں اور صدقہ و خیرات دیں اور جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھیں اور نماز میں اس بلا سے محفوظ رہنے کے لئے رو رو کر دعا کریں۔ پچھلی رات اٹھیں اور نماز میں دعائیں کریں۔ غرض ہر قسم کے نیک کام بجا لاویں اور ہر قسم کے ظلم سے بچیں اور اس خدا سے ڈریں کہ جو اپنے غضب سے ایک دم میں ہی دنیا کو ہلاک کر سکتا ہے۔ . . . .

یاد رکھو کہ سخت خطرہ کے دن ہیں اور بلا دروازہ پر ہے۔ نیکی اختیار کرو اور نیک کام بجا لاؤ۔ خدا تعالیٰ بہت حلیم ہے لیکن اس کا غضب بھی کھا جانے والی آگ ہے اور نیک کو خدا تعالیٰ ضائع نہیں کرتا۔ ما یفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم واٰمنتم ؎

بترسید از خدائے بے نیاز و سخت قہّارے ⁂ نہ پندارم کہ بد بیند خدا ترسے نکوکارے

مرا باور نمی آید کہ رسوا گردد آں مردے کہ می ترسد ازاں یارے کہ غفّارست و ستّارے
گر آں چیزے کہ می بینم عزیزاں نیز دیدندے ز دنیا توبہ کردندے بچشم زار و خونبارے
خور تاباں سیہ گشت ست از بدکاری مردم زمیں طاعوں ہمی آرد پئے تخویف و انذارے
بہ تشویشِ قیامت ماند ایں تشویش گر بینی علاجے نیست بہرِ دفع آں جز حسن کردارے
نشاید تافتن سر زاں جنابِ عزّت و غیرت کہ گر خواہد کشد در یکدمے چوں کرم بیکارے
من از ہمدردی ات گفتم تو خود ہم فکر کن بارے خرد از بہر ایں روز ست اے دانا و ہشیارے
(تبلیغ رسالت جلد ہفتم ص۲۷)

چو آمد از خدا طاعوں بہ بیں از چشم اکرامش تو خود ملعونی اے فاسق چرا ملعوں نہی نامش
زمانِ توبہ و وقت صلاح و ترکِ خبث ست ایں کسے کو بر بدی چسپد نہ بینم نیک انجامش

اس ہولناک مرض کے بارے میں جو ملک میں پھیلتی جاتی ہے لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔ ڈاکٹر لوگ جن کے خیالات فقط جسمانی تدابیر تک محدود ہیں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زمین میں محض قدرتی اسباب سے ایسے کیڑے پیدا ہو گئے ہیں کہ اوّل چوہوں پر اپنا بد اثر پہنچاتے ہیں اور پھر انسانوں میں سلسلہ موت کا جاری ہو جاتا ہے اور **مذہبی خیالات** سے اس بیماری کو کچھ **تعلق نہیں**۔ بلکہ چاہیئے کہ اپنے گھروں اور نالیوں کو ہر ایک قسم کی گندگی اور عفونت سے بچاویں اور صاف رکھیں اور فینائل وغیرہ کے ساتھ پاک کرتے رہیں۔ اور مکانوں کو آگ سے گرم رکھیں اور ایسا بنا دیں جن میں ہوا بھی پہنچ سکے اور روشنی بھی۔ اور کسی مکان میں اس قدر لوگ نہ رہیں کہ اُن کے منہ کی بھاپ اور پاخانہ پیشاب وغیرہ سے کیڑے بکثرت پیدا ہو جائیں۔ اور ردّی غذائیں نہ کھائیں۔ اور سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ ٹیکا کرا لیں۔ اور اگر مکانوں میں چوہے مُردہ پاویں تو ان مکانوں کو چھوڑ دیں۔ اور بہتر ہے کہ باہر کھلے میدانوں میں رہیں اور میلے کچیلے کپڑوں سے پرہیز۔ اور اگر کوئی شخص کسی متاثر اور آلودہ مکان سے اُن کے شہر یا گاؤں میں آوے تو اس کو اندر نہ آنے دیں اور اگر کوئی ایسے گاؤں یا شہر کا اس مرض سے بیمار ہو جائے تو اس کو باہر نکالیں اور اس کے اختلاط سے پرہیز کریں۔ پس طاعون کا علاج ان کے نزدیک جو کچھ ہے یہی ہے۔ یہ تو دانشمند ڈاکٹروں اور طبیبوں کی رائے ہے جس کو ہم نہ تو ایک کافی اور مستقل علاج کے رنگ میں سمجھتے ہیں اور نہ محض بے فائدہ قرار دیتے ہیں۔ کافی اور مستقل علاج اس لئے نہیں سمجھتے کہ تجربہ بتلا رہا ہے کہ بعض لوگ باہر نکلنے سے بھی مرے ہیں اور بعض صفائی کا التزام رکھتے رکھتے بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اور بعض نے بڑی امید سے ٹیکا لگوایا اور پھر قبر میں جا پڑے۔ پس کون کہہ سکتا ہے یا کون ہمیں تسلّی دے سکتا ہے کہ یہ تمام تدبیریں کافی علاج ہیں۔ بلکہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ گو یہ تمام طریقے کسی حد تک مفید ہیں لیکن یہ ایسی تدبیر نہیں ہے جس کو طاعون کو ملک سے دفع کرنے کے لئے پوری کامیابی کہہ سکیں۔

اسی طرح یہ تدبیریں محض بے فائدہ بھی نہیں ہیں بلکہ جہاں جہاں خدا کی مرضی ہے وہاں وہاں اس کا فائدہ بھی محسوس ہو رہا ہے۔ مگر وہ فائدہ کچھ بہت خوشی کے لائق نہیں۔ مثلاً گو یہ سچ ہے کہ اگر مثلاً سو آدمی نے ٹیکا لگوایا ہے اور دوسرے اسی قدر لوگوں نے ٹیکا نہیں لگوایا۔ تو جنہوں نے ٹیکہ نہیں لگوایا ان میں موتیں زیادہ پائی گئیں اور ٹیکا والوں میں کم۔ لیکن چونکہ ٹیکا کا اثر نہایت کار دو مہینے یا تین مہینے تک ہے اس لئے ٹیکہ والا بھی بار بار خطرہ میں پڑے گا جب تک اس دنیا سے رخصت نہ ہو جائے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ جو لوگ ٹیکہ نہیں لگواتے وہ ایک ایسے مرکب پر سوار ہیں کہ جو مثلاً چوبیس گھنٹہ تک ان کو دارالفنا تک پہنچا سکتا ہے اور جو لوگ ٹیکا لگواتے ہیں وہ گویا ایسے آہستہ رو ٹٹو پر چل رہے ہیں کہ جو چوبیس دن تک اسی مقام میں پہنچا دیگا۔ بہر حال یہ تمام طریقے جو ڈاکٹری طور پر اختیار کئے گئے ہیں نہ تو کافی اور پورے تسلّی بخش ہیں اور نہ محض نکمے اور بے فائدہ ہیں۔ اور چونکہ طاعون جلد جلد ملک کو کھاتی جاتی ہے۔ اس لئے بنی نوع کی ہمدردی اسی میں ہے کہ کسی اور طریق کو سوچا جائے جو اس تباہی سے بچا سکے۔

اور مسلمان لوگ جیسا کہ میاں شمس الدین سیکرٹری انجمن حمایت اسلام لاہور کے اشتہار سے سمجھا جاتا ہے جس کو انہوں نے ماہ حال یعنی اپریل ۱۹۰۲ء میں شائع کیا ہے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تمام فرقے مسلمانوں کے شیعہ سنی مقلد اور غیر مقلد میدانوں میں جا کر اپنے اپنے طریقہ مذہب میں دعائیں کریں اور ایک ہی تاریخ میں اکٹھے ہو کر نماز پڑھیں تو بس یہ ایسا نسخہ ہے کہ معاً اس سے طاعون دُور ہو جائیگی۔ مگر اکٹھے کیونکر ہوں۔ اس کی کوئی تدبیر نہیں بتلائی گئی۔ ظاہر ہے کہ فرقہ وہابیہ کے مذہب کے رو سے تو بغیر فاتحہ خوانی کے نماز درست ہی نہیں۔ پس اس صورت میں ان کے ساتھ حنفیوں کی نماز کیونکر ہو سکتی ہے۔ کیا باہم فساد نہیں ہوگا؟ ماسوا اس کے اس اشتہار کے لکھنے والے نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ ہندو اس مرض کے دفع کے لئے کیا کریں۔ کیا ان کو اجازت ہے یا نہیں کہ وہ بھی اس وقت اپنے بتوں سے مدد مانگیں اور عیسائی کس طریق کو اختیار کریں۔ اور جو فرقے **حضرت حسین یا علی** رضی اللہ عنہ کو قاضی الحاجات

سمجھتے ہیں اور محرّم میں تازیوں پر ہزاروں درخواستیں مرادوں کے لئے گزارا کرتے ہیں۔ اور یا جو مسلمان **سید عبدالقادر جیلانی** کی پوجا کرتے ہیں یا جو **شاہ مدار** یا **سخی سرور** کو پوجتے ہیں وہ کیا کریں؟ اور کیا اب یہ تمام فرقے دعائیں نہیں کرتے؟ بلکہ ہر ایک فرقہ خوف زدہ ہو کر اپنے اپنے معبود کو پکار رہا ہے۔ شیعوں کے محلوں کی سیر کرو۔ کوئی ایسا گھر نہیں ہوگا جسکے دروازہ پر یہ شعر چسپاں نہیں ہوگا

لی خمسة اطفی بھا حرّ الوباء الحاطمة ؛ المصطفیٰ والمرتضیٰ وابناھما و الفاطمة

میرے استاد ایک بزرگ شیعہ تھے ان کا مقولہ تھا کہ وباء کا علاج فقط **تولّا** اور **تبرّی** ہے یعنی ائمہ اہل بیت کی محبت کو پرستش کی حد تک پہنچا دینا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالیاں دیتے رہنا۔ اس سے بہتر کوئی علاج نہیں۔ اور مَیں نے سُنا ہے کہ بمبئی میں جب طاعون شروع ہوئی تو پہلے لوگوں میں یہی خیال پیدا ہؤا تھا کہ یہ امام حسین کی کرامت ہے کیونکہ جن ہندوؤں نے شیعوں سے کچھ تکرار کیا تھا ان میں طاعون شروع ہوگئی تھی۔ پھر جب اسی مرض نے شیعہ میں بھی قدم رنجہ فرمایا تو تب تو یاحسین کے نعرے کم ہوگئے۔

یہ تو مسلمانوں کے خیالات ہیں جو طاعون کے دُور کرنے کیلئے سوچے گئے ہیں۔ اور عیسائیوں کے خیالات کے اظہار کیلئے ابھی ایک اشتہار پادری وائٹ بریخت صاحب اور ان کی انجمن کی طرف سے نکلا ہے اور وہ یہ کہ طاعون سے دور کرنے کے لئے اور کوئی تدبیر کافی نہیں بجز اس کے کہ **حضرت مسیح کو خدا مان لیں** اور ان کے کفارہ پر ایمان لے آئیں۔

اور ہندوؤں میں سے آریہ لوگ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہ بلائے طاعون **وید کے ترک** کرنے کی وجہ سے ہے۔ تمام فرقوں کو چاہیئے کہ ویدوں کی ست وِدّیا پر ایمان لاویں اور تمام نبیوں کو نعوذ باللہ مفتری قرار دیدیں تب اس تدبیر سے طاعون دُور ہوجائے گی۔

اور ہندوؤں میں سے جو سناتن دھرم فرقہ ہے اس فرقہ میں دفع طاعون کے بارے میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے اگر ہم پرچہ اخبار عام نہ پڑھتے تو شائد اس عجیب رائے سے بے خبر رہتے اور وہ رائے یہ ہے کہ **یہ بلائے طاعون گائے کی وجہ سے آئی ہے**۔ اگر گورنمنٹ یہ قانون پاس کردے کہ اس ملک میں گائے ہرگز ہرگز ذبح نہ کی جائے تو پھر دیکھیئے کہ طاعون کیونکر دفع ہو جاتی ہے بلکہ اسی اخبار میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے گائے کو بولتے سُنا کہ وہ کہتی ہے کہ میری وجہ سے ہی اس ملک میں طاعون آیا ہے۔

اب اے ناظرین خود سوچ لو کہ اس قدر **متفرق اقوال** اور دعاوی سے کس قول کو دنیا کے

آگے صریح اور بدیہی طور پر فروغ ہو سکتا ہے؟ یہ تمام اعتقادی امور ہیں اور اس نازک وقت میں جبتک کہ دنیا ان عقائد کا فیصلہ کرے **خود دنیا کا فیصلہ ہو جائیگا**۔ اس لئے وہ بات قبول کے لائق ہے جو جلد تر سمجھ میں آسکتی ہے۔ اور جو اپنے ساتھ کوئی **ثبوت** رکھتی ہے۔ **سو میں وہ بات مع ثبوت پیش کرتا ہوں**۔ چار سال ہوئے کہ میں نے ایک پیشگوئی شائع کی تھی کہ پنجاب میں سخت طاعون آنے والی ہے اور میں نے اس ملک میں طاعون کے سیاہ درخت دیکھے ہیں جو ہر ایک شہر اور گاؤں میں لگائے گئے ہیں۔ اگر لوگ توبہ کریں تو یہ مرض دو جاڑہ سے بڑھ نہیں سکتی خدا اس کو دفع کر دے گا۔ مگر بجائے توبہ کے مجھ کو گالیاں دی گئیں اور سخت بدزبانی کے اشتہار شائع کئے گئے جس کا نتیجہ طاعون کی یہ حالت ہے جو اب دیکھ رہے ہو۔ خدا کی وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوئی اسکی یہ عبارت ہے۔

انّ اللّٰہ لا یغیّر ما بقوم حتّٰی یغیّروا ما بانفسھم ۔ انّہ اوی القریۃ

یعنی خدا نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ اس بلائے طاعون کو ہرگز دُور نہیں کرے گا جب تک لوگ ان خیالات کو دور نہ کر لیں جو ان کے دلوں میں ہیں۔ یعنی جب تک وہ خدا کے مامور اور رسول کو نہ مان لیں تب تک طاعون دُور نہیں ہو گی اور وہ قادر خدا قادیان کو طاعون کی تباہی سے محفوظ رکھیگا تا تم سمجھو کہ قادیان اسی لئے محفوظ رکھی گئی ہے کہ **خدا کا رسول اور فرستادہ** قادیان میں تھا۔ اب دیکھو تین برس سے ثابت ہو رہا ہے کہ وہ **دونوں پہلو پورے** ہو گئے۔ یعنی ایک طرف تمام پنجاب میں طاعون پھیل گئی اور دوسری طرف باوجود اس کے کہ قادیان کے چاروں طرف دو دو میل کے فاصلہ پر طاعون کا زور ہو رہا ہے مگر **قادیان طاعون سے پاک ہے** بلکہ آج تک جو شخص طاعون زدہ باہر سے قادیان میں آیا وہ بھی اچھا ہو گیا۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور ثبوت ہو گا۔ جو باتیں آج سے چار برس پہلے کہی گئی تھیں وہ پوری ہو گئیں۔ بلکہ طاعون کی خبر آج سے بائیس برس پہلے براہین احمدیہ میں دی گئی ہے اور یہ علم بجز خدا کے کسی اور کی طاقت میں نہیں۔ پس **اس بیماری کے دفع کے لئے وہ پیغام جو خدا نے مجھے دیا ہے وہ یہی ہے کہ لوگ مجھے سچے دل سے مسیح موعود مان لیں** اگر میری طرف سے بھی بغیر کسی دلیل کے صرف دعویٰ ہوتا جیسا کہ میاں شمس الدین سیکرٹری حمایت اسلام لاہور نے اپنے اشتہار میں یا پادری وائٹ بریخت صاحب نے اپنے اشتہار میں کیا ہے تو میں بھی اُن کی طرح ایک فضول گو ٹھہرتا لیکن میری وہ باتیں ہیں جن کو میں نے قبل از وقت بیان کیا اور آج وہ پوری ہو گئیں۔ اور پھر اس کے بعد ان دنوں میں بھی خدا نے مجھے خبر دی چنانچہ وہ عزّوجلّ فرماتا ہے۔

مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَاَنْتَ فِیْھِمْ ۔ اِنَّہٗ اٰوَی الْقَرْیَۃَ ۔ لَوْلَا الْاِکْرَامُ لَھَلَکَ الْمَقَامُ۔

اِنّی انا الرحمٰن دافع الاذیٰ - انی لا یخاف لدیّ المرسلون - انّی حفیظٌ - انّی مع الرسول اقوم - اَلُوم من یلوم - اُفطر و اَصُوم - غضبتُ غضبًا شدیدًا - الامراض تُشَاعُ والنفوس تُضَاعُ - الّا الذین اٰمنوا وَلم یلبسوا ایمانھم بظلمٍ اولٰئک لھم الامن وھم مھتدون - انا نأتی الارض نَنْقُصُھَا من اطرافھا - انی اجھز الجیش فاصبحوا فی دارھم جاثمین - سنریھم اٰیاتِنَا فی الاٰفاق وفی انفسھم نصرمن اللّٰہ و فتح مبین - انّی بایعتک بایعنی ربّی - انت منی بمنزلۃ اولادی - انت منی وانا منک - عسٰی ان یبعثک ربّک مَقَامًا محمودًا - الفوق معک والتحت مع اعداءک فاصبر حتّٰی یأتی اللّٰہ بامرہ - یأتی علیٰ جھنم زمان لیس فیھا احد ....

اب اس تمام وحی سے تین باتیں ثابت ہوئی ہیں - (۱) **اوّل** یہ کہ طاعون دنیا میں اِس لئے آئی ہے کہ خدا کے مسیح موعود سے نہ صرف انکار کیا گیا بلکہ اس کو دکھ دیا گیا اور اس کے قتل کرنے کے لئے منصوبے کئے گئے۔ اس کا نام کافر اور دجال رکھا گیا۔ پس خدا نے نہ چاہا کہ اپنے رسول کو بغیر گواہی چھوڑے .... (۲) **دوسری** بات جو اس وحی سے ثابت ہوئی وہ یہ ہے کہ یہ طاعون اس حالت میں فرو ہوگی جبکہ لوگ خدا کے فرستادہ کو قبول کر لیں گے۔ اور کم سے کم یہ کہ شرارت اور ایذا اور بدزبانی سے باز آجائیں گے .... (۳) **تیسری** بات جو اس وحی سے ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ بہرحال جب تک کہ طاعون دنیا میں رہے گو ستّر برس تک رہے قادیان کو اسکی خوفناک تباہی سے محفوظ رکھیگا کیونکہ یہ اس کے **رسول کا تخت گاہ** ہے۔ اور یہ تمام امتوں کے لئے نشان ہے۔

اب اگر خدا تعالیٰ کے اس رسول اور اس نشان سے کسی کو انکار ہو اور خیال ہو کہ فقط رسمی نمازوں اور دعاؤں سے یا مسیح کی پرستش سے یا گائے کے طفیل سے یا ویدوں کے ایمان سے باوجود مخالفت اور دشمنی اور نافرمانی اس رسول کے طاعون دُور ہو سکتی ہے تو یہ خیال بغیر ثبوت کے قابل پذیرائی نہیں۔ پس جو شخص ان تمام فرقوں میں سے اپنے مذہب کی سچائی کا ثبوت دینا چاہتا ہے تو اب بہت **عمدہ موقعہ** ہے۔ گویا خدا کی طرف سے تمام مذاہب کی سچائی یا کذب پہچاننے کے لئے ایک نمائش گاہ مقرر کیا گیا ہے اور خدا نے سبقت کرکے اپنی طرف سے پہلے **قادیان** کا نام لے دیا ہے۔ اب اگر آریہ لوگ وید کو سچا سمجھتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ **بنارس** کی نسبت جو وید کے درس کا اصل مقام ہے ایک پیشگوئی

کردیں کہ اُن کا پرمیشر بنارس کو طاعون سے بچا لیگا۔ اور سناتن دھرم والوں کو چاہیئے کہ کسی ایسے شہر کی نسبت جس میں گائیاں بہت ہوں مثلاً **امرتسر** کی نسبت پیشگوئی کردیں کہ گئو کے طفیل اس میں طاعون نہیں آئیگی۔ اگر اس قدر گئو اپنا معجزہ دکھادے تو کچھ تعجب نہیں کہ اس **معجزہ نما جانور** کی گورنمنٹ جان بخشی کردے۔ اسی طرح عیسائیوں کو چاہیئے کہ **کلکتہ** کی نسبت پیشگوئی کردیں کہ اس میں طاعون نہیں پڑے گی کیونکہ بڑا بشپ برٹش انڈیا کا کلکتہ میں رہتا ہے۔ اسی طرح میاں شمس الدین اور ان کی انجمن حمایت اسلام کے ممبروں کو چاہیئے کہ **لاھور** کی نسبت پیشگوئی کردیں کہ وہ طاعون سے محفوظ رہیگا اور منشی الٰہی بخش اکونٹنٹ جو الہام کا دعویٰ کرتے ہیں اُن کے لئے بھی یہی موقعہ ہے کہ اپنے الہام سے **لاہور** کی نسبت پیشگوئی کرکے انجمن حمایت اسلام کو مدد دیں۔ اور مناسب ہے کہ عبد الجبار اور عبد الحق شہر **امرتسر** کی نسبت پیشگوئی کردیں۔ اور چونکہ **فرقہ وہابیہ** کی اصل جڑ **دلّی** ہے اس لئے مناسب ہے کہ نذیر حسین اور محمد حسین **دلّی** کی نسبت پیشگوئی کریں کہ وہ طاعون سے محفوظ رہے گی۔ پس اس طرح سے گویا تمام پنجاب اس مہلک مرض سے محفوظ ہوجائیگا اور گورنمنٹ کو بھی مفت میں سبکدوشی ہوجائے گی۔ اور اگر ان لوگوں نے ایسا نہ کیا تو پھر یہی سمجھا جائے گا کہ سچا خدا وہی خدا ہے جس نے **قادیان میں اپنا رسول بھیجا**۔

اور بالآخر یاد رہے کہ اگر یہ تمام لوگ جن میں مسلمانوں کے **ملہم** اور آریوں کے **پنڈت** اور عیسائیوں کے **پادری** داخل ہیں چپ رہے تو ثابت ہوجائیگا کہ یہ سب لوگ **جھوٹے** ہیں اور ایک دن آنے والا ہے جو **قادیان** سورج کی طرح چمک کر دکھلائیگی کہ وہ ایک **سچے کا مقام** ہے۔

بالآخر میاں شمس الدین صاحب کو یاد رہے کہ آپنے جو اپنے اشتہار میں آیت امن یجیب المضطر لکھی ہے اور اس سے قبولیت دُعا کی امید کی ہے۔ یہ امید صحیح نہیں ہے کیونکہ کلام الٰہی میں لفظ مضطر سے وہ ضرر یافتہ مراد ہے جو محض ابتلاء کے طور پر ضرر یافتہ ہوں نہ سزا کے طور پر لیکن جو لوگ سزا کے طور پر کسی ضرر کے تختہ مشق ہوں وہ اس آیت کے مصداق نہیں ہیں ورنہ لازم آتا ہے کہ قوم نوح اور قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ کی دعائیں اس اضطرار کے وقت میں قبول کی جاتیں مگر ایسا نہیں ہُوا اور خدا کے ہاتھ نے ان قوموں کو ہلاک کردیا۔ اور اگر میاں شمس الدین کہیں کہ پھر ان کے مناسب حال کونسی آیت ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت مناسب حال ہے۔ مَا دُعٰٓؤُا الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ۔

اور چونکہ احتمال ہے کہ بعض غبی الطبع اس اشتہار کا اصل منشاء سمجھنے میں غلطی کھائیں اس لئے ہم مکررًا اپنے فرض دعوت کا اظہار کردیتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ طاعون جو ملک میں پھیل رہی ہے

کسی اَور سبب سے نہیں بلکہ ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ کہ لوگوں نے خدا کے اس **موعود** کے ماننے سے انکار کیا ہے جو تمام نبیوں کی پیشگوئی کے موافق دُنیا کے ساتویں ہزار میں ظاہر ہوا ہے۔ اور لوگوں نے نہ صرف انکار بلکہ خدا کے اس مسیح کو گالیاں دیں۔ کافر کہا اور **قتل کرنا چاہا** اور جو کچھ چاہا اُس سے کیا اسلئے خدا کی غیرت نے چاہا کہ انکی اس شوخی اور بے ادبی پر اُن پر تنبیہہ نازل کرے۔ اور خدا نے پہلے پاک نوشتوں میں خبر دی تھی کہ لوگوں کے انکار کی وجہ سے ان دنوں میں جب مسیح ظاہر ہوگا ملک میں سخت طاعون پڑیگی۔ سو ضرور تھا کہ طاعون پڑتی۔ اور طاعون کا نام طاعون اس لئے رکھا گیا کہ یہ طعن کرنیوالوں کا جواب ہے۔ اور بنی اسرائیل میں ہمیشہ طعن کے وقت ہی پڑا کرتی تھی۔ اور طاعون کے لغت عرب میں معنے ہیں۔ بہت طعن کرنیوالا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ طاعون طعن و تشنیع کی ابتدائی حالت میں نہیں پڑتی بلکہ جب خدا کے مامور اور مرسل کو حد سے زیادہ ستایا جاتا ہے اور توہین کی جاتی ہے تو اُس وقت پڑتی ہے۔ سو اے عزیزو! اسکا بجز اسکے کوئی بھی علاج نہیں کہ اسکے مسیح کو سچے دل اور اخلاص سے قبول کر لیا جاوے۔ یہ تو **یقینی علاج ہے**۔ اور اس سے کمتر درجہ کا یہ علاج ہے کہ اس کے **انکار سے مُنہ بند** کر لیا جائے اور زبان کو **بدگوئی** سے روکا جائے اور دل میں اس کی **عظمت** بٹھائی جائے۔ اور مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ وقت آتا ہے بلکہ قریب ہے کہ لوگ یہ کہتے ہوئے کہ **یا مسیح الخلق عدوانا** میری طرف دوڑینگے یہ جو مَیں نے ذکر کیا ہے یہ خدا کا کلام ہے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ اے جو خلقت کیلئے مسیح کر کے بھیجا گیا ہے ہماری اس مہلک بیماری کے لئے شفاعت کر۔ تم یقیناً سمجھو کہ آج تمہارے لئے بجز اس مسیح کے اور کوئی **شفیع** نہیں باستثناء **آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم**۔ اور یہ شفیع آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے جدا نہیں ہے بلکہ اسکی شفاعت درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی شفاعت ہے۔ اے عیسائی مشنریو! اب ربنا المسیح مت کہو۔ اور دیکھو کہ آج تم میں ایک ہے جو اس مسیح سے بڑھکر ہے۔ اور اے قوم شیعہ! اس پر اصرار مت کرو کہ حسین تمہارا منجی ہے۔ کیونکہ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ آج تم میں ایک ہے کہ اس حسین سے بڑھ کر ہے۔ اور اگر میں اپنی طرف سے یہ باتیں کہتا ہوں تو مَیں جھوٹا ہوں لیکن اگر مَیں ساتھ اس کے **خدا کی گواہی رکھتا** ہوں تو تم خدا سے مقابلہ مت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اس سے لڑنے والے ٹھہرو۔ اب میری طرف دوڑو کہ وقت ہے جو شخص اس وقت میری طرف دوڑتا ہے مَیں اس کو اس سے تشبیہ دیتا ہوں کہ جو عین طوفان کے وقت جہاز پر بیٹھ گیا۔ لیکن جو شخص مجھے نہیں مانتا میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ طوفان میں اپنے تئیں ڈال رہا ہے اور کوئی بچنے کا سامان اس کے پاس نہیں۔ **سچا شفیع مَیں ہوں**

جو اُس بزرگ شفیع کا سایہ ہوں اور اسکا ظلّ جس کو اس زمانہ کے اندھوں نے قبول نہ کیا اور اس کی بہت ہی تحقیر کی۔ یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم۔ اس لئے خدا نے اس وقت اس گناہ کا ایک ہی نقطہ کے ساتھ پادریوں سے بدلہ لے لیا۔ کیونکہ عیسائی مشنریوں نے عیسیٰ بن مریم کو خدا بنایا اور ہمارے سید و مولیٰ حقیقی شفیع کو گالیاں دیں اور بدزبانی کی کتابوں سے زمین کو نجس کر دیا۔ اس لئے اس مسیح کے مقابل پر جس کا نام خدا رکھا گیا خدا نے اس امت میں سے **مسیح موعود بھیجا جو اس پہلے مسیح سے اپنی تمام شان میں بہت بڑھکر ہے** اور اس نے اس دوسرے مسیح کا نام **غلام احمد** رکھا تا یہ اشارہ ہو کہ عیسائیوں کا مسیح کیسا خدا ہے جو **احمد** کے ادنیٰ غلام سے بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ کیسا مسیح ہے جو اپنے قرب اور شفاعت کے مرتبہ میں **احمد کے غلام سے بھی کمتر ہے۔**

اے عزیزو! یہ بات غصّہ کرنے کی نہیں۔ اگر اس احمد کے غلام کو جو مسیح موعود کر کے بھیجا گیا ہے تم اس پہلے مسیح سے بزرگ تر نہیں سمجھتے اور اسی کو شفیع اور منجی قرار دیتے ہو تو اب اپنے اس دعویٰ کا ثبوت دو۔ اور جیسا کہ اس احمد کے غلام کی نسبت خدا نے فرمایا اِنَّہٗ اٰوَی الْقَرْیَۃَ لَوْلَا الْاِکْرَامُ لَھَلَکَ الْمَقَامُ جس کے یہ معنے ہیں کہ خدا نے اس شفیع کی عزت ظاہر کرنے کے لئے اس گاؤں قادیان کو طاعون سے محفوظ رکھا جیسا کہ دیکھتے ہو کہ وہ پانچ چھ برس سے محفوظ چلی آتی؛ اور نیز فرمایا کہ اگر میں اس احمد کے غلام کی بزرگی اور عزت ظاہر نہ کرنا چاہتا تو آج قادیان میں بھی تباہی ڈال دیتا۔ ایسا ہی آپ بھی اگر مسیح ابن مریم کو درحقیقت سچا شفیع اور منجی قرار دیتے ہیں تو قادیان کے مقابل پر آپ بھی کسی اور شہر کا پنجاب کے شہروں میں سے نام لے دیں کہ فلاں شہر ہمارے خداوند مسیح کی برکت اور شفاعت سے طاعون سے پاک رہیگا۔ اور اگر ایسا نہ کر سکیں تو پھر آپ سوچ لیں کہ جس شخص کی اسی دنیا میں شفاعت ثابت نہیں وہ دوسرے جہان میں کیونکر شفاعت کرے گا۔ . . . .

اس جگہ مولوی احمد حسن صاحب امروہی کو ہمارے مقابلہ کے لئے خوب موقعہ مل گیا ہے۔ ہم نے سُنا ہے کہ وہ بھی دوسرے مولویوں کی طرح اپنے مشرکانہ عقیدہ کی حمایت میں کہ تا کسی طرح حضرت مسیح ابن مریم کو موت سے بچالیں اور دوبارہ اتار کر خاتم الانبیاء بنا دیں بڑی جانکاہی سے کوشش کر رہے ہیں . . . . اگر مولوی احمد حسن صاحب کسی طرح باز نہیں آتے تو اب وقت آگیا ہے کہ آسمانی فیصلہ سے ان کو پتہ لگ جائے۔ یعنی اگر وہ درحقیقت مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں اور میرے

الہامات کو انسان کا افترا خیال کرتے ہیں نہ خدا کا کلام تو سہل طریق یہ ہے کہ جس طرح میں نے خدا تعالیٰ سے الہام پا کر کہا ہے انہ اوی القریۃ۔ لولا الاکرام لھلک المقام وہ اِنّہٗ اٰوَی امروھہ لکھدیں۔ مومنوں کی دعا تو خدا سنتا ہے۔ وہ شخص کیسا مومن ہے کہ ایسے شخص کی دعا اس کے مقابل پر تو سنی جاتی ہے جس کا نام اس نے دجّال اور بے ایمان اور مفتری رکھا ہے مگر اسکی اپنی دعا نہیں سنی جاتی .... اگر انہوں نے اپنے فرضی مسیح کی خاطر دعا قبول کرا کر خدا سے یہ بات منوالی کہ **امروہہ** میں طاعون نہیں پڑے گی تو اس صورت میں نہ صرف ان کو فتح ہوگی بلکہ تمام امروہہ پر ان کا ایسا احسان ہوگا کہ لوگ اس کا شکر نہیں کر سکینگے اور مناسب ہے کہ ایسے مباہلہ کا مضمون اس اشتہار کے شائع ہونے سے پندرہ دن تک بذریعہ چھپے ہوئے اشتہار کے دنیا میں شائع کر دیں جس کا یہ مضمون ہو کہ میں یہ اشتہار مرزا غلام احمد کے مقابل پر شائع کرتا ہوں جنہوں نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس میں جو مومن ہوں دعا کی قبولیت پر بھروسہ کر کے یا الہام پا کر یا خواب دیکھ کر یہ اشتہار دیتا ہوں کہ امروہہ ضرور بالضرور طاعون کی دست برد سے محفوظ رہیگا لیکن قادیان میں تباہی پڑیگی کیونکہ مفتری کے رہنے کی جگہ ہے۔ اس اشتہار سے غالباً آئندہ جاڑے تک فیصلہ ہو جائیگا یا حد دوسرے تیسرے جاڑے تک ....

چونکہ مسیح موعود کی رہائش کے قریب تر پنجاب ہے اور مسیح موعود کی نظر کا پہلا محل پنجابی ہیں اس لئے اوّل یہ کارروائی پنجاب میں شروع ہوئی۔ لیکن امروہہ بھی مسیح موعود کی محیط ہمّت سے دور نہیں ہے اس لئے اس مسیح کا کافرکش دم ضرور امروہہ تک بھی پہنچیگا یہی ہماری طرف سے دعویٰ ہے۔ اگر مولوی احمد حسن اس اشتہار کے شائع ہونے کے بعد جس کو وہ قسم کے ساتھ شائع کریگا امروہہ کو طاعون سے بچا سکا اور کم سے کم تین جاڑے امن سے گذر گئے تو میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں۔ پس اس سے بڑھ کر اور کیا فیصلہ ہوگا اور **میں بھی خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں مسیح موعود ہوں** اور وہی ہوں جسکا نبیوں نے وعدہ دیا ہے اور میری نسبت اور میرے زمانہ کی نسبت توریت اور انجیل اور قرآن شریف میں خبر موجود ہے کہ اس وقت آسمان پر خسوف کسوف ہوگا۔ اور زمین پر سخت طاعون پڑے گی اور **میرا یہی نشان ہے** کہ ہر ایک مخالف خواہ وہ امروہہ میں رہتا ہے اور خواہ امرتسر میں اور خواہ دہلی میں اور خواہ کلکتہ میں اور خواہ لاہور میں اور خواہ گولڑہ میں اور خواہ بٹالہ میں اگر وہ قسم کھا کر کہیگا کہ اس کا

فلاں مقام طاعون سے پاک رہیگا تو ضرور وہ مقام طاعون میں گرفتار ہو جائیگا کیونکہ اُس نے خدا تعالیٰ کے مقابل پر گستاخی کی۔

(دافع البلاء ص ۱۸)

چونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ملک میں عام طاعون پڑے گی اور کسی کم مقدار کی حد تک قادیان بھی اس سے محفوظ نہیں رہے گی۔ اس لئے اس نے آج کے دنوں سے تیئیس برس پہلے فرما دیا کہ جو شخص اس مسجد اور اس گھر میں داخل ہو گا یعنی اخلاص اور اعتقاد سے وہ طاعون سے بچایا جائے گا۔ اسی کے مطابق ان دنوں میں خدا تعالیٰ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا:-

اِنِّیْ اُحَافِظُ کُلَّ مَنْ فِی الدَّارِ۔ اِلَّا الذین عَلَوْا من استکبارٍ۔ وَاُحَافِظُکَ خَاصَّۃً۔ سلامٌ قولاً من ربٍّ رَّحیمٍ۔

یعنی میں ہر ایک ایسے انسان کو طاعون کی موت سے بچاؤنگا جو تیرے گھر میں ہو گا مگر وہ لوگ جو تکبّر سے اپنے تئیں اونچا کریں اور میں تجھے خصوصیت کے ساتھ بچاؤنگا۔ خدائے رحیم کی طرف سے تجھے سلام۔

جاننا چاہیئے کہ خدا کی وحی نے اس ارادہ کو جو قادیان کے متعلق ہے دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے (۱) ایک وہ ارادہ جو عام طور پر گاؤں کے متعلق ہے۔ اور وہ ارادہ یہ ہے کہ یہ گاؤں اس شدت طاعون سے جو افراتفری اور تباہی ڈالنے والی اور ویران کرنے والی اور تمام گاؤں کو منتشر کرنے والی ہو محفوظ رہیگا۔ (۲) دوسرے یہ ارادہ کہ خدائے کریم خاص طور پر اس گھر کی حفاظت کریگا اور اس تمام عذاب سے بچائیگا جو گاؤں کے دوسرے لوگوں کو پہنچیگا۔ اور اس وحی اللہ کا اخیر فقرہ ان لوگوں کے لئے منذر ہے جن کے دلوں میں بے جا تکبر ہے۔

اس لئے میں اپنی جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ تکبّر سے بچو کیونکہ تکبّر ہمارے خداوند ذوالجلال کی آنکھوں میں سخت مکروہ ہے۔ مگر تم شاید نہیں سمجھوگے کہ تکبّر کیا چیز ہے پس مجھ سے سمجھ لو کہ میں خدا کی رُوح سے بولتا ہوں۔

(نزول المسیح ص ۲۳-۲۴)

میں ایک اور رؤیا لکھتا ہوں جو طاعون کی نسبت مجھے ہوئی۔ اور وہ یہ کہ میں نے ایک جانور دیکھا جس کا قد ہاتھی کے قد کے برابر تھا مگر مُنہ آدمی کے مُنہ سے ملتا تھا اور بعض اعضاء دوسرے جانوروں سے مشابہ تھے۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ یونہی قدرت کے ہاتھ سے پیدا ہو گیا

اور مَیں ایک ایسی جگہ پر بیٹھا ہوں جہاں چاروں طرف بن ہیں جن میں بیل گدھے گھوڑے کُتّے سؤر۔ بھیڑیئے اونٹ وغیرہ ہر ایک قسم کے موجود ہیں۔ اور میرے دل میں ڈالا گیا کہ یہ سب انسان ہیں جو بدعملوں سے ان صورتوں میں ہیں۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھی کی ضخامت کا جانور جو مختلف شکلوں کا مجموعہ ہے جو محض قدرت سے زمین میں سے پیدا ہو گیا ہے وُہ میرے پاس آبیٹھا ہے اور قطب کی طرف اس کا مُنہ ہے۔ خاموش صورت ہے۔ آنکھوں میں بہت حیا ہے اور بار بار چند منٹ کے بعد ان بنوں میں سے کسی بن کی طرف دوڑتا ہے اور جب بن میں داخل ہوتا ہے تو اُسکے داخل ہونے کے ساتھ ہی **شورِ قیامت** اُٹھتا ہے، اور ان جانوروں کو کھانا شروع کرتا ہے اور ہڈیوں کے چابنے کی آواز آتی ہے۔ تب وہ فراغت کرکے پھر میرے پاس آبیٹھتا ہے اور شاید دس منٹ کے قریب بیٹھا رہتا ہے اور پھر دوسرے بن کی طرف جاتا ہے اور وہی صورت پیش آتی ہے جو پہلے آئی تھی اور پھر میرے پاس آبیٹھتا ہے۔ آنکھیں اس کی بہت لمبی ہیں اور مَیں اس کو ہر ایک دفعہ جو میرے پاس آتا ہے خوب نظر لگا کر دیکھتا ہوں اور وہ اپنے چہرہ کے انداز سے مجھے یہ بتلاتا ہے کہ میرا اس میں کیا قصور ہے۔ مَیں مامور ہوں اور نہایت شریف اور پرہیزگار جانور معلوم ہوتا ہے۔ اور کچھ اپنی طرف سے نہیں کرتا بلکہ وہی کرتا ہے جو اس کو حکم ہوتا ہے۔ تب میرے دل میں ڈالا گیا کہ یہی طاعون ہے اور یہی وہ **دآبّۃُ الارض** ہے جس کی نسبت قرآن شریف میں **وعدہ** تھا کہ آخری زمانہ میں ہم اس کو نکالیں گے اور وہ لوگوں کو اس لئے کاٹے گا کہ وہ ہمارے **نشانوں** پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ۔ ....

اور پھر آگے فرمایا - وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ - حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ - وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ....

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہی **دابۃ الارض** جو ان آیات میں مذکور ہے جس کا **مسیح موعود کے زمانہ میں ظاہر ہونا ابتداء سے مقرر ہے** یہی وہ مختلف صورتوں کا جانور ہے جو مجھے **عالمِ کشف** میں نظر آیا اور دل میں ڈالا گیا کہ یہ **طاعون کا کیڑا** ہے اور خدا تعالےٰ نے اسکا نام دابۃ الارض رکھا۔ کیونکہ زمین کے کیڑوں میں سے ہی یہ بیماری پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے پہلے چوہوں پر اس کا اثر ہوتا ہے اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ انسان کو ایسا ہی ہر ایک

جانور کو یہ بیماری ہو سکتی ہے۔ اسی لئے کشفی عالم میں اس کی مختلف شکلیں نظر آئیں۔

(نزول المسیح ص۳۷-۳۹)

شکر کا مقام ہے کہ گورنمنٹ عالیہ انگریزی نے اپنی رعایا پر رحم کر کے **دوبارہ طاعون** سے بچانے کے لئے ٹیکا کی تجویز کی اور بندگانِ خدا کی بہبودی کے لئے کئی لاکھ روپیہ کا بوجھ اپنے سر پر ڈال لیا۔ درحقیقت یہ وہ کام ہے جس کا شکر گذاری سے استقبال کرنا دانشمند رعایا کا فرض ہے۔ اور سخت نادان اور اپنے نفس کا وہ شخص دشمن ہے کہ جو ٹیکا کے بارے میں بدظنی کرے۔ کیونکہ یہ بارہا تجربہ میں آ چکا ہے کہ یہ محتاط گورنمنٹ کسی خطرناک علاج پر عملدرآمد کرانا نہیں چاہتی بلکہ بہت سے تجارب کے بعد ایسے امور میں جو تدبیر فی الحقیقت مفید ثابت ہوتی ہے اسی کو پیش کرتی ہے۔ سو یہ بات اہلیت اور انسانیت سے بعید ہے کہ جس سچی خیر خواہی کے لئے لکھوکھا روپیہ گورنمنٹ خرچ کرتی ہے اور کر چکی ہے اُس کی یہ داد دی جائے کہ گویا گورنمنٹ کو اس سر دردی اور صرف زر سے اپنا کوئی خاص مطلب ہے۔ وہ رعایا بدقسمت ہے کہ بدظنی میں اس درجہ تک پہنچ جائے۔ کچھ شک نہیں کہ اس وقت تک جو تدبیر اس عالم اسباب میں اس گورنمنٹ عالیہ کے ہاتھ آئی وہ بڑی سے بڑی اور اعلیٰ سے اعلیٰ یہ تدبیر ہے کہ ٹیکا کرایا جائے۔ اس سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تدبیر مفید پائی گئی ہے اور بہ پابندی رعایت اسباب تمام رعایا کا فرض ہے کہ اس پر کاربند ہو کر وہ غم جو گورنمنٹ کو ان کی جانوں کے لئے ہے اس سے اس کو سبکدوش کریں۔ لیکن ہم بڑے ادب سے اس محسن گورنمنٹ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اگر ہمارے لئے **ایک آسمانی روک نہ ہوتی تو سب سے پہلے** رعایا میں سے ہم ٹیکا کراتے اور آسمانی روک یہ ہے کہ خدا نے چاہا ہے کہ اس زمانے میں انسانوں کے لئے ایک آسمانی رحمت کا نشان دکھاوے۔ سو اس نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تُو اور جو شخص تیرے گھر کی چار دیوار کے اندر ہوگا اور وہ جو کامل پیروی اور اطاعت اور سچے تقویٰ سے تجھ میں محو ہو جائیگا **وہ سب طاعون سے بچائے جائیں گے**۔ اور ان آخری دنوں میں خدا کا یہ نشان ہوگا تا وہ قوموں میں فرق کر کے دکھلاوے لیکن وہ جو کامل طور پر پیروی نہیں کرتا وہ تجھ میں سے نہیں ہے اس کے لئے **مت دلگیر ہو**۔ یہ حکم الٰہی ہے جس کی وجہ سے ہمیں اپنے نفس کے لئے اور ان سب کے لئے جو ہمارے گھر کی چار دیوار میں رہتے ہیں ٹیکا کی کچھ ضرورت نہیں۔ کیونکہ جیسا میں ابھی بیان کر چکا ہوں آج سے ایک مدّت پہلے وہ خدا جو زمین و آسمان کا خدا ہے جس کے علم اور تصرف سے کوئی چیز باہر نہیں اس نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ مَیں ہر یک ایسے شخص کو طاعون کی موت سے بچاؤں گا جو اس گھر کی چار دیوار

میں ہوگا بشرطیکہ وہ اپنے تمام مخالفانہ ارادوں سے دست کش ہو کر پورے اخلاص اور اطاعت اور انکسار سے سلسلہ بیعت میں داخل ہو اور خدا کے احکام اور اس کے مامور کے سامنے کسی طور سے متکبّر اور سرکش اور مغرور اور غافل اور خودسر اور خود پسند نہ ہو اور عملی حالت موافق تعلیم رکھتا ہو۔ اور اس نے مجھے مخاطب کر کے یہ بھی فرما دیا کہ عموماً قادیان میں سخت بربادی افگن طاعون نہیں آئیگی جس سے لوگ کتّوں کی طرح مریں اور مارے غم اور سرگردانی کے دیوانہ ہو جائیں۔ اور عموماً تمام لوگ اس جماعت کے گو وہ کتنے ہی ہوں مخالفوں کی نسبت طاعون سے محفوظ رہیں گے۔ مگر ایسے لوگ ان میں سے جو اپنے عہد پر پورے طور پر قائم نہیں یا ان کی نسبت اور کوئی وجہ مخفی ہو جو خدا کے علم میں ہو ان پر طاعون وارد ہو سکتی ہے۔ مگر انجام کار لوگ تعجب کی نظر سے اقرار کرینگے کہ نسبتاً اور مقابلتاً خدا کی حمایت اس قوم کے ساتھ ہے اور اس نے خاص رحمت سے ان لوگوں کو ایسا بچایا ہے **جس کی نظیر** نہیں۔ اس بات پر بعض نادان چونک پڑیں گے اور بعض ہنسیں گے۔ اور بعض **مجھے** دیوانہ قرار دیں گے اور بعض حیرت میں آئیں گے کہ کیا **ایسا خدا موجود ہے** جو بغیر رعایت اسباب کے بھی رحمت نازل کر سکتا ہے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ **ہاں بلاشبہ ایسا قادر خدا موجود ہے**۔ اور اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو اس سے تعلق رکھنے والے زندہ ہی مر جاتے۔ وہ عجیب قادر ہے اور اس کی پاک قدرتیں عجیب ہیں۔ ایک طرف نادان مخالفوں کو اپنے دوستوں پر کتّوں کی طرح مسلّط کر دیتا ہے۔ اور ایک طرف فرشتوں کو حکم کرتا ہے کہ انکی خدمت کریں۔ ایسا ہی جب دنیا پر اس کا غضب مستولی ہوتا ہے اور اس کا قہر ظالموں پر جوش مارتا ہے تو اس کی آنکھ اس کے خاص لوگوں کی حفاظت کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو **اہل حق** کا کارخانہ درہم برہم ہو جاتا اور کوئی ان کو شناخت نہ کر سکتا۔ اُس کی قدرتیں بے انتہا ہیں مگر بقدر یقین لوگوں پر ظاہر ہوتی ہیں۔ جن کو یقین اور محبت اور اس کی طرف انقطاع عطا کیا گیا ہے اور نفسانی عادتوں سے باہر کئے گئے ہیں انہی کے لئے خارق عادت قدرتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے مگر خارق عادت قدرتوں کے دکھلانے کا انہی کے لئے ارادہ کرتا ہے جو خدا کے لئے اپنی عادتوں کو پھاڑتے ہیں۔ اس زمانہ میں ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جو اس کو جانتے ہیں اور اس کی عجائب قدرتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ بلکہ ایسے لوگ بہت ہیں جن کو ہرگز اس قادر خدا پر ایمان نہیں جس کی آواز کو ہر یک چیز سنتی ہے جس کے آگے کوئی بات انہونی نہیں۔ اس جگہ یاد رہے کہ اگرچہ طاعون وغیرہ امراض میں علاج کرنا گناہ نہیں ہے بلکہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ کوئی ایسی مرض نہیں جس کے لئے خدا نے دوا نہیں

پیدا کی لیکن مَیں اس بات کو معصیت جانتا ہوں کہ خدا کے اِس نشان کو ٹیکا کے ذریعہ سے مشتبہ کر دوں جس نشان کو وہ ہمارے لئے زمین پر صفائی سے ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اور مَیں اس کے سچے نشان اور سچے وعدہ کی ہتک عزت کر کے ٹیکے کی طرف رجوع کرنا نہیں چاہتا اور اگر مَیں ایسا کروں تو یہ گناہ میرا قابلِ مواخذہ ہوگا کہ مَیں خدا کے اس وعدہ پر ایمان نہ لایا جو مجھ سے کیا گیا۔ اور اگر ایسا ہو تو پھر تو مجھے شکرگذار اس طبیب کا ہونا چاہیئے جس نے یہ نسخہ ٹیکے کا نکالا نہ خدا کا شکرگذار جس نے مجھے وعدہ دیا کہ ہر ایک جو اس چار دیوار کے اندر ہے مَیں اُسے بچاؤں گا۔

مَیں بصیرت کی راہ سے کہتا ہوں کہ اس قادر خدا کے وعدے سچے ہیں اور مَیں آنیوالے دنوں کو ایسے دیکھتا ہوں کہ گویا آ چکے ہیں۔

(کشتی نوح صـ ۲-۶)

فتح عظیم

ڈاکٹر جان الیگزنڈر ڈوئی امریکہ کا جھوٹا نبی میری پیشگوئی کے مطابق مر گیا

واضح ہو کہ یہ شخص جس کا نام عنوان میں درج ہے اسلام کا سخت درجہ پر دشمن تھا اور علاوہ اسکے اُس نے جھوٹا پیغمبری کا دعویٰ کیا اور حضرت سیّد النبیین و اصدق الصادقین و خیر المرسلین و امام الطیبین جناب تقدس مآب **محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم** کو کاذب اور مفتری خیال کرتا تھا اور اپنی خباثت سے گندی گالیاں اور فحش کلمات سے آنجناب کو یاد کیا کرتا تھا۔ غرض بغض دین متین کی وجہ سے اس کے اندر سخت ناپاک خصلتیں موجود تھیں۔ اور جیسا کہ خنزیروں کے آگے موتیوں کا کچھ قدر نہیں ایسا ہی وہ توحید اسلام کو بہت ہی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور اس کا استیصال چاہتا تھا۔ اور حضرت عیسٰی کو خدا جانتا تھا اور تثلیث کو تمام دنیا میں پھیلانے کے لئے اتنا جوش رکھتا تھا کہ مَیں نے باوجود اس کے کہ صدہا کتابیں پادریوں کی دیکھیں مگر ایسا جوش کسی میں نہ پایا............ مَیں اس کا پرچہ اخبار لیوز آف ہیلنگ لیتا تھا اور اس کی بدزبانی پر ہمیشہ مجھے اطلاع ملتی تھی۔ جب اس کی شوخی انتہا تک پہنچی تو مَیں نے انگریزی میں ایک چٹھی اس کی طرف روانہ کی اور مباہلہ کے لئے اس سے درخواست کی تا خدا تعالےٰ ہم

دونوں میں سے جو جھوٹا ہے اُس کو سچے کی زندگی میں ہلاک کرے ۔ یہ درخواست دو مرتبہ یعنی ۱۹۰۲ء اور پھر ۱۹۰۳ء میں اس کی طرف بھیجی گئی تھی ۔ اور امریکہ کے چند نامی اخباروں میں بھی شائع کی گئی تھی .... یہ خدا کا فضل ہے کہ باوجودیکہ ایڈیٹران اخبارات امریکہ عیسائی تھے اور اسلام کے مخالف تھے تاہم انہوں نے نہایت مدّ و شدّ سے میرے مضمون مباہلہ کو ایسی کثرت سے شائع کر دیا کہ امریکہ اور یورپ میں اس کی دھوم مچ گئی اور ہندوستان تک اس مباہلہ کی خبر ہو گئی ۔ اور میرے مباہلہ کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ اسلام سچا ہے اور عیسائی مذہب کا عقیدہ جھوٹا ہے ۔ اور مَیں خدا تعالیٰ کی طرف سے وہی مسیح ہوں جو آخری زمانہ میں آنے والا تھا اور نبیوں کے نوشتوں میں اس کا وعدہ تھا ۔ اور نیز میں نے اس میں لکھا تھا کہ ڈاکٹر ڈوئی اپنے دعوٰی رسول ہونے اور تثلیث کے عقیدہ میں جھوٹا ہے اگر وہ مجھ سے مباہلہ کرے تو میری زندگی میں ہی بہت سی حسرت اور دکھ کے ساتھ مرے گا ۔ اور اگر مباہلہ بھی نہ کرے تب بھی وہ خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکتا ۔ اس کے جواب میں بدقسمت ڈوئی نے دسمبر ۱۹۰۳ء کے کسی پرچہ میں اور نیز ۲۶ر ستمبر ۱۹۰۳ء وغیرہ کے اپنے پرچوں میں اپنی طرف سے یہ چند سطریں انگریزی میں شائع کیں جن کا ترجمہ ذیل میں ہے :-

> " ہندوستان میں ایک بیوقوف محمدی مسیح ہے جو مجھے بار بار لکھتا ہے کہ مسیح یسوع کی قبر کشمیر میں ہے ۔ اور لوگ مجھے کہتے ہیں کہ تو اس کا جواب کیوں نہیں دیتا اور کہ تو کیوں اس شخص کا جواب نہیں دیتا ۔ مگر کیا تم خیال کرتے ہو کہ مَیں ان مچھروں اور مکھیوں کا جواب دونگا ۔ اگر مَیں ان پر اپنا پاؤں رکھوں تو مَیں ان کو کچل کر مار ڈالوں گا ۔ "

اور پھر پرچہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۳ء میں لکھتا ہے کہ

> " میرا کام یہ ہے کہ مَیں مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب سے لوگوں کو جمع کروں ۔ اور مسیحیوں کو اس شہر اور دوسرے شہروں میں آباد کروں یہاں تک کہ وہ دن آجائے کہ مذہب محمدی دنیا سے مٹایا جائے ۔ اے خدا ہمیں وہ وقت دکھلا ۔ "

غرض یہ شخص میرے مضمون مباہلہ کے بعد جو یورپ اور امریکہ اور اس ملک میں شائع ہو چکا تھا بلکہ تمام دنیا میں شائع ہو گیا تھا شوخی میں روز بروز بڑھتا گیا ۔ اور اس طرف مجھے یہ انتظار تھی کہ جو کچھ مَیں نے اپنی نسبت اور اس کی نسبت خدا تعالیٰ سے فیصلہ چاہا ہے ۔ ضرور خدا تعالیٰ سچا فیصلہ کرے گا اور خدا تعالیٰ کا فیصلہ کاذب اور صادق میں فرق کر کے دکھلا دے گا اور مَیں ہمیشہ اس بارہ میں خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا تھا اور کاذب کی موت چاہتا تھا ۔ چنانچہ کئی دفعہ

خدا تعالیٰ نے مجھے خبر دی کہ تو غالب ہوگا اور دشمن ہلاک کیا جائے گا۔ اور پھر ڈوئی کے مرنے سے قریباً پندرہ دن پہلے خدا تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعہ سے مجھے میری فتح کی اطلاع بخشی . . . . .

اب ظاہر ہے کہ ایسا نشان (جو فتح عظیم کا موجب ہے) جو تمام دنیا ایشیا اور امریکہ اور یورپ اور ہندوستان کے لئے ایک کھلا کھلا نشان ہو سکتا ہے وہ یہی ڈوئی کے مرنیکا نشان ہے۔ کیونکہ اور نشان جو میری پیشگوئی سے ظاہر ہوئے ہیں وہ تو پنجاب اور ہندوستان تک ہی محدود تھے اور امریکہ اور یورپ کے کسی شخص کو ان کے ظہور کی خبر نہ تھی لیکن یہ نشان پنجاب سے بصورت پیشگوئی ظاہر ہو کر امریکہ میں جاکر ایسے شخص کے حق میں پورا ہوا جس کو امریکہ اور یورپ کا فرد فرد جانتا تھا اور اس کے مرنے کے ساتھ ہی بذریعہ تاروں کے اس ملک کے انگریزی اخباروں کو خبر دی گئی۔ چنانچہ پایونیر نے (جو الہ آباد سے نکلتا ہے) پرچہ ۱۱؍مارچ ۱۹۰۷ء میں اور سول اینڈ ملٹری گزٹ (جو لاہور سے نکلتا ہے) پرچہ ۱۲؍مارچ ۱۹۰۷ء میں اور انڈین ڈیلی ٹیلیگراف نے (جو لکھنؤ سے نکلتا ہے) پرچہ ۱۲؍مارچ ۱۹۰۷ء میں اس خبر کو شائع کیا ہے پس اس طرح پر قریباً تمام دنیا میں یہ خبر شائع کی گئی۔ اور خود یہ شخص اپنی دنیوی حیثیت کے رو سے ایسا تھا کہ عظیم الشان نوابوں اور شہزادوں کی طرح مانا جاتا تھا . . . . اور باوجود اس عزت اور شہرت کے جو امریکہ اور یورپ میں اسکو حاصل تھی خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ ہوا کہ میرے مباہلہ کا مضمون اس کے مقابل پر امریکہ کے بڑے بڑے نامی اخباروں نے جو روزانہ ہیں شائع کر دیا اور تمام امریکہ اور یورپ میں مشہور کر دیا اور پھر عام اشاعت کے بعد جس ہلاکت اور تباہی کی اس کی نسبت پیشگوئی میں خبر دی گئی تھی وہ ایسی صفائی سے پوری ہوئی کہ جس سے بڑھ کر اکمل اور اتم طور پر ظہور میں آنا متصور نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی کے ہر ایک پہلو پر آفت پڑی۔ اس کا خائن ہونا ثابت ہوا۔ اور وہ شراب کو اپنی تعلیم میں حرام قرار دیتا تھا۔ مگر اس کا شراب خوار ہونا ثابت ہو گیا۔ اور وہ اس اپنے آباد کردہ شہر صیہون سے بڑی حسرت کے ساتھ نکالا گیا جس کو اس نے کئی لاکھ روپیہ خرچ کر کے آباد کیا تھا اور نیز سات کروڑ نقد روپیہ سے جو اس کے قبضہ میں تھا اس کو جواب دیا گیا۔ اور اس کی بیوی اور اس کا بیٹا اس کے دشمن ہو گئے اور اس کے باپ نے اشتہار دیا کہ وہ ولد الزنا ہے۔ پس اس طرح پر وہ قوم میں ولد الزنا ثابت ہوا۔ اور یہ دعویٰ کہ میں بیماروں کو معجزہ سے اچھا کرتا ہوں یہ تمام لاف و گزاف اس کی محض جھوٹی ثابت ہوئی اور ہر ایک ذلّت اس کو نصیب ہوئی۔ اور

آخرکار اُس پر فالج گرا۔ اور ایک تختہ کی طرح چند آدمی اس کو اُٹھا کر لے جاتے رہے اور پھر بہت غموں کے باعث پاگل ہو گیا اور حواس بجا نہ رہے اور یہ دعویٰ اس کا کہ میری ابھی بڑی عمر ہے اور مَیں روز بروز جوان ہوتا جاتا ہوں اور لوگ بڈھے ہوتے جاتے ہیں محض فریب ثابت ہُوا۔ آخرکار مارچ ۱۹۰۷ء کے پہلے ہفتہ میں ہی بڑی حسرت اور درد اور دکھ کے ساتھ مر گیا۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا معجزہ ہوگا۔ چونکہ میرا اصل کام کسرِ صلیب ہے سو اس کے مرنے سے ایک بڑا حصہ صلیب کا **ٹوٹ گیا** کیونکہ وہ تمام دنیا سے اوّل درجہ پر حامیٔ صلیب تھا جو پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میری دعا سے تمام مسلمان ہلاک ہو جائیں گے اور اسلام نابود ہو جائیگا اور خانہ کعبہ **ویران** ہو جائیگا۔ سو خدا تعالےٰ نے میرے ہاتھ پر اس کو ہلاک کیا۔ مَیں جانتا ہوں کہ اُس کی موت سے پیشگوئی قتل خنزیر والی بڑی صفائی سے پوری ہو گئی کیونکہ ایسے شخص سے زیادہ خطرناک کون ہو سکتا ہے کہ جس نے جھوٹے طور پر پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ اور خنزیر کی طرح جھوٹ کی نجاست کھائی۔ اور جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے اس کے ساتھ ایک لاکھ کے قریب ایسے لوگ ہو گئے تھے جو بڑے مالدار تھے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ مسیلمہ کذّاب اور اسود عنسی کا وجود اس کے مقابل پر کچھ چیز بھی نہ تھا۔ نہ اس کی طرح شہرت ان کی تھی اور نہ اس کی طرح کروڑہا روپیہ کے وہ مالک تھے۔ پس مَیں قسم کھا سکتا ہوں کہ **یہ وہی خنزیر** تھا جس کے **قتل** کی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ مسیح موعود کے ہاتھ پر مارا جائے گا۔ اگر مَیں اس کو مباہلہ کے لئے نہ بلاتا اور اگر مَیں اس پر بد دعا نہ کرتا اور اسکی ہلاکت کی پیشگوئی شائع نہ کرتا تو اس کا مرنا اسلام کی حقیّت کے لئے کوئی دلیل نہ ٹھہرتا لیکن چونکہ مَیں نے صدہا اخباروں میں پہلے سے شائع کرا دیا تھا کہ وہ میری زندگی میں ہی ہلاک ہوگا۔ مَیں مسیح موعود ہوں اور ڈوئی کذّاب ہے اور بار بار لکھا کہ اس پر یہ دلیل ہے کہ وہ میری زندگی میں ذلّت اور حسرت کے ساتھ ہلاک ہو جائیگا۔ چنانچہ وہ میری زندگی ہی میں ہلاک ہو گیا۔ اس سے زیادہ کھلا کھلا معجزہ جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کو سچا کرتا ہے اور کیا ہوگا؟ اب وہی اس سے انکار کرے گا جو سچائی کا دشمن ہوگا۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

المشتہر مرزا غلام احمد مسیح موعود از مقام قادیان ضلع گورداسپور پنجاب۔ ۷؍ اپریل ۱۹۰۷ء

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۶۹-۸۰)

غیر معمولی نصرت اور شہرت

من در حریمِ قدس چراغِ صداقتم ٭ دستش محافظ است ز ہر بادِ صرصرم

(ازالہ اوہام ص۸۵)

واضح ہو کہ براہین احمدیہ میری تالیفات میں سے وہ کتاب ہے جو ۱۸۸۰ء عیسوی میں یعنی ۱۲۹۷ء ہجری میں چھپکر شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی تالیف کے زمانہ میں جیسا کہ خود کتاب سے ظاہر ہوتا ہے میں ایک ایسی گمنامی کی حالت میں تھا کہ بہت کم لوگ ہونگے جو میرے وجود سے بھی واقف ہوں گے غرض اس زمانے میں میں اکیلا انسان تھا جس کے ساتھ کسی دوسرے کو کچھ تعلق نہ تھا۔ اور میری زندگی ایک گوشۂ تنہائی میں گذرتی تھی اور اسی پر میں راضی اور خوش تھا کہ **ناگہاں عنایت ازلی** سے مجھے یہ واقعہ پیش آیا کہ یکدفعہ شام کے قریب اسی مکان میں اور ٹھیک ٹھیک اسی جگہ کہ جہاں اب ان چند سطروں کے لکھنے کے وقت میرا قدم ہے مجھے خدائے تعالیٰ کی طرف سے کچھ خفیف سی غنودگی ہوکر یہ وحی ہوئی :۔

> يَا اَحْمَدُ بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ ۔ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى
> اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ اٰبَاۤءُهُمْ ۔ وَلِتَسْتَبِيْنَ
> سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۔ قُلْ اِنِّيْ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔

یعنی اے احمد! خدانے تجھ میں برکت رکھدی ۔ جو کچھ تونے چلایا تونے نہیں چلایا بلکہ خدانے چلایا ۔ وہ خدا جس نے تجھے قرآن سکھلایا یعنی اس کے حقیقی معنوں پر تجھے اطلاع دی تاکہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے باپ دادے نہیں ڈرائے گئے اور تاکہ مجرموں کی راہ کھل جائے اور تیرے انکار کی وجہ سے ان پر حجت پوری ہو جائے ۔ ان لوگوں کو کہدے کہ میں خدائے تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوکر آیا ہوں اور میں وہ ہوں جو سب سے پہلے ایمان لایا ۔

اس وحی کے نازل ہونے پر مجھے ایک طرف تو خدا تعالیٰ کی بے نہایت عنایات کا شکر ادا کرنا پڑا کہ ایک میرے جیسے انسان کو جو کوئی بھی لیاقت اپنے اندر نہیں رکھتا اس عظیم الشان خدمت سے سرفراز فرمایا اور دوسری طرف بمجرد اس وحئ الٰہی کے مجھے یہ فکر دامنگیر ہُوا کہ

ہر ایک مامور کے لئے سنت الٰہیہ کے موافق جماعت کا ہونا ضروری ہے تا وہ اس کا ہاتھ بٹائیں اور اس کے مددگار ہوں۔ اور مال کا ہونا ضروری ہے تا دینی ضرورتوں میں جو پیش آتی ہیں خرچ ہو اور سنت اللہ کے موافق اعداد کا ہونا بھی ضروری ہے اور پھر ان پر غلبہ بھی ضروری ہے تا ان کے شر سے محفوظ رہیں۔ اور امر دعوت میں تاثیر بھی ضروری ہے تا سچائی پر دلیل ہو تا اس خدمت مفوضہ میں ناکامی نہ ہو۔

ان امور میں جیسا کہ تصور کیا گیا بڑی مشکلات کا سامنا نظر آیا اور بہت خوفناک حالت دکھائی دی۔ کیونکہ جبکہ مَیں نے اپنے تئیں دیکھا تو نہایت درجہ گمنام اور احدُ من الناس پایا وجہ یہ کہ نہ تو مَیں کوئی خاندانی پیرزادہ اور کسی گدی سے تعلق رکھتا تھا تا میرے پر ان لوگوں کا اعتقاد ہو جاتا اور وہ میرے گرد جمع ہو جاتے جو میرے باپ دادا کے مرید تھے اور کام سہل ہو جاتا اور نہ مَیں کسی مشہور عالم فاضل کی نسل میں سے تھا تا صدہا آبائی شاگردوں کا میرے ساتھ تعلق ہوتا اور نہ مَیں کسی عالم فاضل سے باقاعدہ تعلیم یافتہ اور سند یافتہ تھا تا مجھے اپنے سرمایۂ علمی پر ہی بھروسہ ہوتا اور نہ مَیں کسی جگہ کا بادشاہ یا نواب یا حاکم تھا تا میرے رعب حکومت سے ہزاروں لوگ میرے تابع ہو جاتے بلکہ مَیں ایک غریب ایک ویرانہ گاؤں کا رہنے والا اور بالکل ان ممتاز لوگوں سے الگ تھا جو مرجع عالم ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

غرض کسی قسم کی ایسی عزت اور شہرت اور ناموری مجھے حاصل نہ تھی جس پر میں نظر رکھکر اس بات کو اپنے لئے سہل سمجھتا کہ یہ کام تبلیغ دعوت کا مجھ سے ہو سکیگا۔ پس طبعًا یہ کام مجھے نہایت مشکل اور بظاہر صورت غیر ممکن اور محالات سے معلوم ہوا۔ اور علاوہ اس کے اور مشکلات یہ معلوم ہوئے کہ بعض امور اس دعوت میں ایسے تھے کہ ہرگز امید نہ تھی کہ قوم ان کو قبول کر سکے اور قوم پر تو اسقدر بھی امید نہ تھی کہ وہ اس امر کو بھی تسلیم کر سکیں کہ بعد زمانۂ نبوت وحی غیر تشریعی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا اور قیامت تک باقی ہے بلکہ صریح معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طرف سے وحی کے دعوے پر تکفیر کا انعام ملیگا اور سب علماء متفق ہو کر درپے ایذا و بیخ کنی ہو جائیں گے کیونکہ اُن کے نزدیک بعد سیدنا جناب ختمی پناہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وحیٔ الٰہی پر قیامت تک مہر لگ گئی ہے اور بالکل غیر ممکن ہے کہ اب کسی سے مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ ہو۔ اور اب قیامت تک امت مرحومہ اس قسم کے رحم سے بے نصیب کی گئی ہے کہ خدائے تعالیٰ ان کو اپنا ہمکلام کر کے ان کی معرفت میں ترقی بخشے اور براہ راست اپنی ہستی پر ان کو مطلع فرمائے بلکہ وہ صرف تقلیدی طور پر گلے پڑا ڈھول

بجا رہے ہیں۔ اور شہودی طور پر ایک ذرہ معرفت ان کو حاصل نہیں۔ ہاں اس قدر محض لغو طریق پر بعض کا ان میں سے اعتقاد ہے کہ الہام تو نیک بندوں کو ہوتا ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ وہ الہام رحمانی ہے یا شیطانی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا الہام جو شیطان کی طرف بھی منسوب ہو سکتا ہے خدا کے ان انعامات میں شمار نہیں ہو سکتا جو انسان کے ایمان کو مفید ہو سکتے ہیں۔ بلکہ مشتبہ ہونا اور شیطانی کلام سے مشابہ ہونا اس کے ساتھ ایک ایسا لعنت کا داغ ہے جو جہنم تک پہنچا سکتا ہے۔ اور اگر خدا نے کسی بندہ کے لئے صراط الذین انعمت علیھم کی دعا قبول کی ہے اور اس کو منعمین میں داخل فرمایا ہے تو ضرور اپنے وعدہ کے مطابق اس روحانی انعام سے حصہ دیا ہے جو یقینی طور پر مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ ہے۔

غرض یہی وہ امر تھا کہ اس اندھی دنیا میں قوم کے لئے ایک جوش اور غضب دکھلانے کا محل تھا۔ پس میرے جیسے بیکس تنہا کے لئے ان تمام امور کا جمع ہونا بظاہر ناکامی کی ایک علامت تھی بلکہ ایک سخت ناکامی کا سامنا تھا۔ کیونکہ کوئی پہلو بھی درست نہ تھا۔ اوّل مال کی ضرورت ہوتی ہے سو اس وحی الٰہی کے وقت تمام ملکیت ہماری تباہ ہو چکی تھی اور ایک بھی ایسا آدمی ساتھ نہ تھا جو مالی مدد کر سکتا۔ دوسرے میں کسی ایسے ممتاز خاندان میں سے نہیں تھا جو کسی پر میرا اثر پڑ سکتا۔ ہر ایک طرف سے بال و پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ پس جس قدر مجھے اس وحی الٰہی کے بعد سرگردانی ہوئی وہ میرے لئے ایک طبعی امر تھا اور میں اس بات کا محتاج تھا کہ میری زندگی کو قائم رکھنے کے لئے خدائے تعالےٰ عظیم الشان وعدوں سے مجھے تسلّی دیتا تا میں غموں کے ہجوم سے ہلاک نہ ہو جاتا۔ پس میں کس مُنہ سے خداوند کریم و قدیر کا شکر کروں کہ اس نے ایسا ہی کیا اور میری بے کسی اور نہایت بیقراری کے وقت میں مجھے مبشّرانہ پیشگوئیوں کے ساتھ تھام لیا اور پھر بعد اس کے اپنے تمام وعدوں کو پورا کیا۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کی تائیدیں اور نصرتیں بغیر سبقت پیشگوئیوں کے یونہی ظہور میں آتیں تو بخت اور اتفاق پر حمل کی جاتیں۔ لیکن اب وہ ایسے خارق عادت نشان ہیں کہ ان سے وہی انکار کرے گا جو شیطانی خصلت اپنے اندر رکھتا ہو گا۔

اور پھر اس کے بعد خدا نے اپنے ان تمام وعدوں کو پورا کیا جو ایک زمانہ دراز پہلے پیشگوئی کے طور پر کئے تھے اور طرح طرح کی تائیدیں اور طرح طرح کی نصرتیں کیں اور جن مشکلات کے تصوّر سے قریب تھا کہ میری کمر ٹوٹ جائے اور جن غموں کی وجہ سے مجھے خوف تھا کہ میں ہلاک ہو جاؤں ان تمام مشکلات اور ان تمام غموں کو دُور فرمایا اور جیسا کہ وعدہ کیا تھا ویسا ہی ظہور میں لایا۔ اگرچہ وہ بغیر سبقت پیشگوئیوں کے بھی میری نصرت اور تائید کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہ کیا بلکہ

ایسے زمانے اور ایسی نومیدی کے وقت میں میری تائید اور نصرت کے لئے پیشگوئیاں فرمائیں کہ وہ زمانہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس زمانہ سے مشابہ تھا جبکہ آپ مکّہ معظمہ کی گلیوں میں اکیلے پھرتے تھے اور کوئی آپ کے ساتھ نہ تھا اور کوئی صورت کامیابی کی ظاہر نہیں تھی۔ اسی طرح وہ پیشگوئیاں جو میرے گمنامی کے زمانہ میں کی گئیں اس زمانہ کی نگاہ میں ہنسی کے لائق اور دُور از قیاس تھیں اور ایک دیوانہ کی بڑ سے مشابہ تھیں کسی کو معلوم نہ تھا کہ جیسا کہ ان پیشگوئیوں میں وعدہ فرمایا گیا ہے سچ مچ کسی زمانہ میں ہزارہا انسان میرے پاس قادیان میں آئیں گے اور کئی لاکھ انسان میری بیعت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور میں اکیلا نہیں رہونگا جیسا کہ اس زمانہ میں اکیلا تھا۔ اور خدا نے گمنامی اور تنہائی کے زمانہ میں یہ خبریں دیں تا وہ ایک دانشمند اور طالب حق کی نظر میں عظیم الشان نشان ہوں اور تا سچائی کے ڈھونڈنے والے یقین دل سے سمجھ لیں کہ یہ کاروبار انسان کی طرف سے نہیں ہے اور نہ ممکن ہے کہ انسان کی طرف سے ہو۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۵۰-۵۴)

ہم نے طاعون کے بارے میں جو رسالہ دافع البلاء لکھا تھا اس سے یہ غرض تھی کہ تا لوگ متنبہ ہوں اور اپنے سینوں کو پاک کریں اور اپنی زبانوں اور آنکھوں اور کانوں اور ہاتھوں کو ناگفتنی اور نادیدنی اور ناشنیدنی اور ناکردنی سے روکیں اور خدا سے خوف کریں تا خدا تعالیٰ ان پر رحم کرے۔ اور وہ خوفناک وباء جو ان کے ملک میں داخل ہو گئی ہے دُور فرما دے۔ مگر افسوس کہ شوخیاں اور بھی زیادہ ہو گئیں اور زبانیں اور بھی دراز ہو گئیں۔ انہوں نے ہمارے مقابل پر اپنے اشتہاروں میں کوئی بھی دقیقہ ایذاء اور سبّ شتم کا اٹھا نہیں رکھا اور کسی قسم کی ایذاء سے دستکش نہیں ہوئے مگر اُسی سے جس تک ہاتھ نہیں پہنچ سکا۔ لعنت اور سبّ شتم میں وہ ترقی کی کہ شیعہ مذہب کے لوگوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ کیونکہ شیعہ نے تو اپنے خیال میں لعنت بازی کے فن کو حرف الف سے شروع کر کے حرف یاء تک پہنچا دیا تھا۔ یعنی ابوبکر سے یزید تک مگر یہ لوگ جو اہل حدیث اور حنفی کہلاتے ہیں انہوں نے اس کارروائی کو نامکمل سمجھ کر لعنت بازی کے دائرہ کو اس طرح پر پورا کیا کہ جس شخص کو خدا کے آدم سے لیکر یسوع مسیح تک مظہر جمیع انبیاء قرار دیا تھا یعنی الف سے حرف یاء تک اور پھر تکمیل دائرہ کی غرض سے الف آدم سے لیکر الف احمد تک صفت مظہریت کا خاتم بنایا تھا اسی پر لعنتوں کی مشق کی۔ وسیعلم الذین ظلموا ایّ منقلب ینقلبون۔ لیکن یاد رکھیں کہ یہ گالیاں جو ان کے مُنہ سے نکلتی ہیں اور یہ تحقیر اور یہ توہین کی باتیں جو ان کے ہونٹوں پر چڑھ رہی ہیں اور یہ گندے کاغذ جو حق کے مقابل پر وہ شائع کر رہے ہیں یہ اُن کے لئے ایک روحانی عذاب کا سامان ہے جسکو انہوں نے

اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔ دروغگوئی کی زندگی جیسی کوئی لعنتی زندگی نہیں۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے منصوبوں سے اور اپنے بے بنیاد جھوٹوں سے اور اپنے افتراؤں سے اور اپنی ہنسی ٹھٹھے سے خدا کے ارادے کو روک دینگے یا دنیا کو دھوکا دیکر اس کام کو معرض التوا میں ڈال دینگے جس کا خدا نے آسمان پر ارادہ کیا ہے۔ اگر کبھی پہلے بھی حق کے مخالفوں کو ان طریقوں سے کامیابی ہوئی ہے تو وہ بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اگر یہ ثابت شدہ امر ہے کہ خدا کے مخالف اور اس کے ارادہ کے مخالف جو آسمان پر کیا گیا ہو ہمیشہ ذلت اور شکست اٹھاتے ہیں تو پھر ان لوگوں کے لئے بھی ایک دن ناکامی اور نامرادی اور رسوائی درپیش ہے۔ خدا کا فرمودہ کبھی خطا نہیں گیا اور نہ جائیگا۔ وہ فرماتا ہے:۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۔

یعنی خدا نے ابتدا سے لکھ چھوڑا ہے اور اپنا قانون اور اپنی سنت قرار دیدیا ہے کہ وہ اور اس کے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے۔ پس چونکہ **میں اس کا رسول یعنی فرستادہ ہوں مگر** بغیر کسی **نئی شریعت** اور نئے **دعوے** اور نئے نام کے بلکہ اسی **نبی کریم خاتم الانبیاء** کا نام پاکر اور اسی میں ہو کر اور اسی کا **مظہر** بن کر آیا ہوں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ جیسا کہ قدیم سے یعنی آدم کے زمانہ سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہمیشہ مفہوم اس آیت کا سچا نکلتا آیا ہے۔ ایسا ہی اب بھی میرے حق میں سچا نکلیگا۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ جس زمانہ میں ان مولویوں اور ان کے چیلوں نے میرے پر تکذیب اور بد زبانی کے حملے شروع کئے تھے۔ اس زمانہ میں میری بیعت میں ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ گو چند دوست جو انگلیوں پر شمار ہو سکتے تھے میرے ساتھ تھے اور اس وقت خدا تعالیٰ کے فضل سے ستر ہزار کے قریب بیعت کرنے والوں کا شمار پہنچ گیا ہے کہ جو نہ میری کوشش سے بلکہ اس ہوا کی تحریک سے جو آسمان سے چلی ہے میری طرف دوڑے ہیں۔ اب یہ لوگ خود سوچ لیں کہ اس سلسلہ کے برباد کرنے کے لئے کس قدر انہوں نے زور لگائے اور کیا کچھ ہزار جانکاہی کے ساتھ ہر ایک قسم کے مکر کئے یہاں تک کہ حکام تک جھوٹی مخبریاں بھی کیں خون کے جھوٹے مقدموں کے گواہ بنکر عدالتوں میں گئے اور تمام مسلمانوں کو میرے پر ایک عام جوش دلایا۔ اور ہزارہا اشتہار اور رسالے لکھے اور کفر اور قتل کے فتوے میری نسبت دیئے۔ اور مخالفانہ منصوبوں کے لئے کمیٹیاں کیں۔ مگر ان تمام کوششوں کا نتیجہ بجز نامرادی کے اور کیا ہوا؟ پس اگر یہ کاروبار انسان کا ہوتا تو ضرور ان کی جان توڑ کوششوں سے یہ تمام سلسلہ تباہ ہو جاتا۔ کیا کوئی نظیر دے سکتا ہے کہ اس قدر کوششیں کسی جھوٹے کی نسبت کی گئیں اور پھر وہ تباہ نہ ہوا بلکہ پہلے سے ہزار چند ترقی کر گیا

پس کیا یہ عظیم الشان نشان نہیں کہ کوششیں تو اس غرض سے کی گئیں کہ یہ تخم جو بویا گیا ہے اندر ہی اندر نابود ہو جائے ۔ اور صفحۂ ہستی پر اس کا نام و نشان نہ رہے مگر وہ **تخم بڑھا اور پھولا اور ایک درخت بنا اور اس کی شاخیں دُور دُور چلی گئیں** اور اب وہ درخت اسقدر بڑھ گیا ہے کہ **ہزارہا پرندے** اس پر آرام کر رہے ہیں ۔

(نزول المسیح صـ۱۰۶)

براہین احمدیہ میں یہ پیشگوئی ہے :- یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ ۔ یعنی مخالف لوگ ارادہ کرینگے کہ نورِ خدا کو اپنے مُنّہ کی پھونکوں سے بُجھا دیں مگر خدا اپنے نور کو پورا کرے گا اگرچہ منکر لوگ کراہت ہی کریں ۔

یہ اس وقت کی پیشگوئی ہے جبکہ کوئی مخالف نہ تھا بلکہ کوئی میرے نام سے بھی واقف نہ تھا ۔ پھر بعد اس کے حسب بیان پیشگوئی **دنیا میں عزت کے ساتھ میری شہرت ہوئی** اور ہزاروں نے مجھے قبول کیا ۔ تب اس قدر مخالفت ہوئی کہ **مکّہ معظمہ** سے اہل مکہ کے پاس خلاف واقعہ باتیں بیان کرکے میرے لئے کفر کے فتوے منگوائے گئے اور میری تکفیر کا دنیا میں ایک شور ڈالا گیا ۔ قتل کے فتوے دیئے گئے ۔ حکام کو اکسایا گیا ۔ عام لوگوں کو مجھ سے اور میری جماعت سے بیزار کیا گیا ۔ غرض ہر ایک طرح سے میرے نابود کرنے کے لئے کوشش کی گئی ۔ مگر خدا تعالیٰ کی پیشگوئی کے مطابق یہ تمام مولوی اور ان کے ہم جنس اپنی کوششوں میں نامراد اور ناکام رہے ۔ افسوس کس قدر مخالف اندھے ہیں ۔ ان پیشگوئیوں کی عظمت کو نہیں دیکھتے کہ کس زمانہ کی ہیں اور کس شوکت اور قدرت کے ساتھ پوری ہوئیں ۔ کیا بجز خدا تعالیٰ کے کسی اور کا کام ہے؟ اگر ہے تو اس کی نظیر پیش کرو ۔ نہیں سوچتے کہ اگر یہ انسان کا کاروبار ہوتا اور خدا کی مرضی کے مخالف ہوتا تو وہ اپنی کوششوں میں نامراد نہ رہتے ۔ کس نے ان کو نامراد رکھا؟ **اسی خدا نے جو میرے ساتھ ہے** ۔

(حقیقۃ الوحی صـ۲۳۰)

براہین احمدیہ میں ایک یہ بھی پیشگوئی ہے ۔ یَعْصِمُکَ اللّٰہُ مِنْ عِنْدِہٖ وَلَوْ لَمْ یَعْصِمُکَ النَّاسُ ۔ یعنی خدا تجھے تمام آفات سے بچائیگا اگرچہ لوگ نہیں چاہیں گے کہ تو آفات سے بچ جائے ۔ یہ اس زمانہ کی پیشگوئی ہے جبکہ مَیں ایک زاویۂ گمنامی میں پوشیدہ تھا اور کوئی مجھ سے نہ تعلق بیعت رکھتا تھا نہ عداوت ۔ بعد اس کے جب مسیح موعود ہونے کا دعویٰ مَیں نے کیا تو سب مولوی اور ان کے ہم جنس آگ کی طرح ہو گئے ۔ ان دنوں میں میرے پر ایک پادری ڈاکٹر مارٹن کلارک نام

نے خون کا مقدمہ کیا۔ اس مقدمہ میں مجھے یہ تجربہ ہو گیا کہ پنجاب کے مولوی میرے خون کے پیاسے ہیں اور مجھے ایک عیسائی سے بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہے اور گالیاں نکالتا ہے بدتر سمجھتے ہیں کیونکہ بعض مولویوں نے اس مقدمہ میں میرے مخالف عدالت میں حاضر ہو کر اس پادری کے گواہ بن کر گواہیاں دیں اور بعض اس دعائیں لگے رہے کہ پادری لوگ فتح پا دیں۔ میں نے معتبر ذریعہ سے سُنا ہے کہ وہ مسجدوں میں رو رو کر دعائیں کرتے تھے کہ اے خدا اس پادری کی مدد کر اس کو فتح دے مگر خدائے علیم نے ان کی ایک نہ سُنی۔ نہ گواہی دینے والے اپنی گواہی میں کامیاب ہوئے اور نہ دعا کرنے والوں کی دعائیں قبول ہوئیں۔ یہ علماء ہیں دین کے حامی اور یہ قوم ہے جس کے لئے لوگ قوم قوم پکارتے ہیں۔ ان لوگوں نے میرے پھانسی دلانے کے لئے اپنے تمام منصوبوں سے زور لگایا اور ایک دشمن خدا اور رسول کی مدد کی۔ اور اسجگہ طبعًا دلوں میں گذرتا ہے کہ جب یہ قوم کے تمام مولوی اور ان کے پیرو میرے جانی دشمن ہو گئے تھے پھر کس نے مجھے اس بھڑکتی ہوئی آگ سے بچایا؟ حالانکہ آٹھ نو گواہ میرے مجرم بنانے کیلئے گذر چکے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اُسی نے بچایا جس نے پچیس برس پہلے یہ وعدہ دیا تھا کہ تیری قوم تو تجھے نہیں بچائے گی اور کوشش کرے گی کہ تو ہلاک ہو جائے مگر میں تجھے بچاؤنگا۔ جیسا کہ اس نے پہلے سے فرمایا تھا جو براہین احمدیہ میں آج سے پچیس برس پہلے درج ہے اور وہ یہ ہے۔ فبرّاہ اللّٰہ مما قالوا وکان عند اللّٰہ وجیھا۔ یعنی خدا نے اس الزام سے اس کو بری کیا جو اس پر لگایا گیا تھا۔ اور وہ خدا کے نزدیک وجیہ ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۳۱)

منجملہ میرے نشانوں کے جو میری تائید میں خدا تعالیٰ نے ظاہر فرمائے ایک عظیم الشان نشان جو **سلسلہ نبوت سے مشابہ** ہے یہ ہے کہ براہین احمدیہ میں ایک یہ پیشگوئی تھی یعصمک اللّٰہ وان لم یعصمک الناس۔ وان لم یعصمک الناس یعصمک اللّٰہ۔ اس پیشگوئی میں اس زمانہ بلا اور فتنہ کی طرف اشارہ تھا جبکہ ہر ایک انسان مجھ سے مُنہ پھیرے گا اور تباہ کرنے یا قتل کرنے کے منصوبے سوچیں گے۔ سو میرے دعویٰ مسیح موعود و مہدی موعود کے بعد ایسا ہی ظہور میں آیا۔ تمام لوگ یکدفعہ برسرِ آزار ہو گئے اور انہوں نے اوّل یہ زور لگایا کہ کسی طرح نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ سے مجھے ملزم کر سکیں۔ پھر جبکہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بلکہ برخلاف اس کے نصوص صریحہ اور قویہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ فی الواقعہ حضرت مسیح علیہ السلام

فوت ہو گئے ہیں تو پھر مولویوں نے قتل کے فتوے لکھے اور اپنے رسالوں اور کتابوں میں عام لوگوں کو اکسایا کہ اگر اس شخص کو قتل کر دیں تو بڑا ہی ثواب ہوگا .... ان لوگوں نے جس قدر دشمنی کے جوش میں وہ سب تدبیریں سوچیں جو انسان اپنے مخالف کے تباہ کرنے کے سوچ سکتا ہے اور جس قدر شدت عداوت کے وقت میں دنیا دار لوگ اندر ہی اندر منصوبے بنایا کرتے ہیں وہ سب بنائے اور زور لگانے میں کچھ بھی فرق نہ کیا ۔ اور میرے ذلیل اور ہلاک کرنے کیلئے ناخنوں تک زور لگایا اور مکّہ کے بے دینوں کی طرح کوئی تدبیر اٹھا نہیں رکھی ۔ لیکن خدا تعالےٰ نے اس وقت سے بیس برس پہلے پیشگوئی مذکورہ بالا میں صاف لفظوں میں فرما دیا تھا کہ مَیں تجھے دشمنوں کے شر سے بچاؤں گا لہذا اس نے اپنے سچے وعدہ کے موافق مجھ کو بچایا ۔ سوچنے کے لائق ہے کہ کیونکر انواع اقسام کی تدبیروں سے میرے پر حملے کئے گئے حتیٰ کے قتل کے جھوٹے مقدمات بنائے گئے ....

خدا تعالیٰ کا فضل تھا کہ ان لوگوں نے میرے ہلاک کرنے کے لئے تدبیریں تو ہر ایک قسم کی کیں مگر کچھ بھی پیش نہ گئی اور خدا تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو پورا کیا جو براہین احمدیہ کے صفحہ پانسو دس (۵۱۰) میں درج تھا ۔ یعنی یہ کہ خدا تعالیٰ مجھے دشمنوں کی ہر ایک بد اندیشی سے بچائے گا ۔ اگرچہ لوگ تجھے ہلاک کرنا چاہیں ۔ سو یہ ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے جو منہاج نبوت پر واقع ہوئی کیونکہ مجھ سے پہلے جسقدر رسول اور نبی گذرے ہیں سب کو یہ بلا پیش آئی تھی کہ شریر لوگ کتوں کی طرح اُن کے گرد ہو گئے تھے اور صرف ہنسی اور ٹھٹھے پر ہی کفایت نہیں کی تھی بلکہ چاہا تھا کہ انکو پھاڑ ڈالیں اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیں مگر خدا تعالیٰ کے ہاتھ نے ان کو بچا لیا ۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہُوا کہ اِن مولویوں نے باہم ایسا اتفاق کر لیا کہ میری مخالفت کے جوش میں ان کو باہمی اختلافات بھی بھول گئے اور انہوں نے دوسری قوموں کے پنڈتوں اور پادریوں کو بھی حتی الوسع اپنے ساتھ ملا لیا اور زمین میری دشمنی کے جوش سے یوں بھر گئی جیسا کہ کوئی برتن زہر سے بھرا جائے ۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اِن لوگوں کے حملوں سے میری عزّت کو محفوظ رکھا جیسا کہ وہ ہمیشہ اپنے پاک نبیوں کو محفوظ رکھتا رہا ہے سو یہ ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے کہ جو آج سے بیس برس پہلے براہین احمدیہ میں شائع کی گئی تھی ۔ اور اب بڑے زور شور سے پوری ہوئی ۔ جس کی آنکھیں ہیں دیکھے کہ کیا یہ خدا کے کام ہیں یا انسان کے ؟

(تریاق القلوب ص ۲۷۴-۲۸۷)

براہین احمدیہ میں جو آج سے پچیس برس پہلے تمام ممالک میں شائع ہو چکی ہے یعنی ہر حصہ پنجاب اور ہندوستان اور بلاد عرب اور شام اور کابل اور بخارا غرض تمام بلاد اسلامیہ میں پہنچائی گئی ہے اس میں یہ ایک پیشگوئی ہے رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ ۔ یعنی خدا کی وحی میں میری طرف سے یہ دعا تھی کہ اے میرے خدا! مجھے اکیلا مت چھوڑ جیسا کہ اب میں اکیلا ہوں اور تجھ سے بہتر کون وارث ہے۔ یعنی اگرچہ میں اس وقت اولاد بھی رکھتا ہوں اور والد بھی اور بھائی بھی لیکن روحانی طور پر ابھی میں اکیلا ہی ہوں اور تجھ سے ایسے لوگ چاہتا ہوں جو روحانی طور پر میرے وارث ہوں۔ یہ دعا اس آئندہ امر کے لئے پیشگوئی تھی کہ خدا تعالیٰ روحانی تعلق والوں کی ایک جماعت میرے ساتھ کر دیگا جو میرے ہاتھ پر توبہ کرینگے۔ سو خدا کا شکر ہے کہ یہ پیشگوئی نہایت صفائی سے پوری ہوئی۔ پنجاب اور ہندوستان سے ہزارہا سعید لوگوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور ایسا ہی سرزمین ریاست امیر کابل سے بہت سے لوگ میری بیعت میں داخل ہوئے ہیں اور میرے لئے یہ عمل کافی ہے کہ ہزارہا آدمیوں نے میرے ہاتھ پر اپنے طرح طرح کے گناہوں سے توبہ کی ہے اور ہزارہا لوگوں میں بعد بیعت میں نے ایسی تبدیلی پائی ہے کہ جب تک خدا کا ہاتھ کسی کو صاف نہ کرے ہرگز ایسا صاف نہیں ہو سکتا اور میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ میرے ہزارہا صادق اور وفادار مرید بیعت کے بعد ایسی پاک تبدیلی حاصل کر چکے ہیں کہ ایک ایک فرد اُن میں بجائے ایک ایک نشان کے ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ اُن کی فطرت میں پہلے ہی سے ایک مادہ رشد اور سعادت کا مخفی تھا مگر وہ کھلے طور پر ظاہر نہیں ہوا جب تک انہوں نے بیعت نہیں کی۔ غرض خدا کی شہادت سے ثابت ہے کہ پہلے میں اکیلا تھا اور میرے ساتھ کوئی جماعت نہ تھی۔ اور اب کوئی مخالف اس بات کو چھپا نہیں سکتا کہ اب ہزارہا لوگ میرے ساتھ ہیں۔ پس خدا کی پیشگوئیاں اس قسم کی ہوتی ہیں جن کے ساتھ نصرت اور تائید الٰہی ہوتی ہے۔ کون اس بات میں مجھے جھٹلا سکتا ہے کہ جب یہ پیشگوئی خدا تعالیٰ نے فرمائی اور براہین احمدیہ میں درج کر کے شائع کی گئی اس وقت جیسا کہ خدا نے فرمایا میں اکیلا تھا اور بجز خدا کے میرے کوئی نہ تھا۔ میں اپنے خویشوں کی نگاہ میں بھی حقیر تھا کیونکہ اُن کی راہیں اَور تھیں اور میری راہ اَور تھی۔ اور قادیان کے تمام ہندو بھی باوجود سخت مخالفت کے اس گواہی کے دینے کے لئے مجبور ہونگے کہ میں درحقیقت اس زمانہ میں ایک گمنامی کی حالت میں بسر کرتا تھا۔ اور کوئی نشان اس بات کا موجود نہ تھا کہ اس قدر ارادت اور محبت اور جانفشانی کا تعلق رکھنے والے میرے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ اب کہو کہ کیا یہ پیشگوئی کرامت نہیں ہے! کیا انسان اِس پر قادر ہے؟

اور اگر قادر ہے تو زمانہ حال یا سابق زمانہ میں اس کی کوئی نظیر پیش کرو۔ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکافرین۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۳۵-۲۳۹)

سوواں نشان براہین احمدیہ کی وہ پیشگوئی ہے جو اس کے صفحہ ۲۴۱ میں درج ہے اور پیشگوئی کی عبارت یہ ہے:۔ لَا تَیْئَسْ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ۔ اَلَا اِنَّ رَوْحَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ۔ اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ۔ یَأْتِیْكَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ یَأْتُوْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ یَنْصُرُكَ اللّٰهُ مِنْ عِنْدِهٖ۔ یَنْصُرُكَ رِجَالٌ نُّوْحِیْ اِلَیْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ۔ وَ لَا تُصَعِّرْ لِخَلْقِ اللّٰهِ وَلَا تَسْئَمْ مِنَ النَّاسِ۔ (ترجمہ) خدا کے فضل سے نومید مت ہو۔ اور یہ بات سن رکھ کہ خدا کا فضل قریب ہے۔ خبردار ہو کہ خدا کی مدد قریب ہے۔ وہ مدد ہر ایک راہ سے تجھے پہنچے گی۔ اور ہر ایک راہ سے لوگ تیرے پاس آئینگے اور اس کثرت سے آئیں گے کہ وہ راہیں جن پر وہ چلیں گے عمیق ہو جائیں گی۔ خدا اپنے پاس سے تیری مدد کرے گا۔ تیری مدد وہ لوگ کرینگے جن کے دلوں میں ہم آپ القاء کرینگے۔ مگر چاہیئے کہ تو خدا کے بندوں سے جو تیرے پاس آئیں گے بدخلقی نہ کرے اور چاہیئے کہ تو ان کی کثرت دیکھ کر ملاقاتوں سے تھک نہ جائے۔

اس پیشگوئی کو آج پچیس برس گذر گئے جب یہ براہین احمدیہ میں شائع ہوئی تھی۔ اور یہ اس زمانہ کی پیشگوئی ہے جبکہ میں زاویہ گمنامی میں پوشیدہ تھا اور ان سب میں سے جو آج میرے ساتھ ہیں مجھے کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا جن کا کسی وجاہت کی وجہ سے دنیا میں ذکر کیا جاتا ہے۔ غرض کچھ بھی نہیں تھا۔ اور میں صرف ایک احدٌ من الناس تھا اور **محض گمنام** تھا اور ایک فرد بھی میرے ساتھ تعلق نہیں رکھتا تھا مگر شاذ و نادر ایسے چند آدمی جو میرے خاندان سے پہلے ہی سے تعارف رکھتے تھے۔ اور یہ وہ واقعہ ہے کہ قادیان کے رہنے والوں میں سے کوئی بھی اس کے برخلاف شہادت نہیں دے سکتا۔ بعد اس کے خدا تعالیٰ نے اس پیشگوئی کے پورا کرنے کے لئے اپنے بندوں کو میری طرف رجوع دلایا اور فوج در فوج لوگ قادیان میں آئے اور آ رہے ہیں اور نقد اور جنس اور ہر ایک قسم کے تحائف اس کثرت سے لوگوں نے دیئے اور دے رہے ہیں جن کا میں شمار نہیں کر سکتا۔ اور ہر چند مولویوں کی طرف سے روکیں ہوئیں اور انہوں نے ناخنوں تک زور لگایا کہ رجوع خلائق نہ ہو۔ یہاں تک کہ مکّہ تک سے بھی فتوے منگوائے گئے اور قریباً دو سو مولویوں نے میرے پر کفر کے فتوے دیئے۔ بلکہ

واجب القتل ہونے کے بھی فتوے شائع کئے گئے لیکن وہ اپنی تمام کوششوں میں نامراد رہے اور انجام یہ ہوا کہ میری جماعت پنجاب کے تمام شہروں اور دیہات میں پھیل گئی اور ہندوستان میں بھی جا بجا یہ تخم ریزی ہو گئی بلکہ یورپ اور امریکہ کے بعض انگریز بھی مشرف باسلام ہو کر اس جماعت میں داخل ہوئے اور اسقدر فوج در فوج قادیان میں لوگ آئے کہ یکوں کی کثرت سے کئی جگہ سے قادیان کی سڑک ٹوٹ گئی۔ اس پیشگوئی کو خوب سوچنا چاہیئے اور خوب غور سے سوچنا چاہیئے کہ اگر یہ خدا کی طرف سے پیشگوئی نہ ہوتی تو یہ طوفانِ مخالفت جو اٹھا تھا اور تمام پنجاب اور ہندوستان کے لوگ مجھ سے ایسے بگڑ گئے تھے جو مجھے پیروں کے نیچے کچلنا چاہتے تھے ضرور تھا کہ وہ لوگ اپنی جان توڑ کوششوں میں کامیاب ہو جاتے اور مجھے تباہ کر دیتے لیکن وہ سب کے سب نامراد رہے اور میں جانتا ہوں کہ ان کا اس قدر شور اور میرے تباہ کرنے کے لئے اس قدر کوشش اور یہ پُر زور طوفان جو میری مخالفت میں پیدا ہوا یہ اس لئے نہیں تھا کہ خدا نے میرے تباہ کرنے کا ارادہ کیا تھا بلکہ اس لئے تھا کہ تا خدا تعالےٰ کے نشان ظاہر ہوں اور تا خدائے قادر جو کسی سے مغلوب نہیں ہو سکتا ان لوگوں کے مقابل پر اپنی طاقت اور قوت دکھلاوے اور اپنی قدرت کا نشان ظاہر کرے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ کون جانتا تھا اور کس کے علم میں یہ بات تھی کہ جب میں ایک چھوٹے سے بیج کی طرح بویا گیا۔ اور بعد اس کے ہزاروں پیروں کے نیچے کچلا گیا اور آندھیاں چلیں اور طوفان آئے اور ایک سیلاب کی طرح شور بغاوت میرے اس چھوٹے سے تخم پر پھر گیا پھر بھی میں ان صدمات سے بچ جاؤں گا؟ سو وہ تخم خدا کے فضل سے ضائع نہ ہوا بلکہ بڑھا اور پھولا اور آج وہ ایک بڑا درخت ہے جس کے سایہ کے نیچے تین لاکھ انسان آرام کر رہا ہے۔ یہ خدائی کام ہیں جن کے ادراک سے انسانی طاقتیں عاجز ہیں۔ وہ کسی سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔ اے لوگو! کبھی تو خدا سے شرم کرو! کیا اس کی نظیر کسی مفتری کی سوانح میں پیش کر سکتے ہو۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۴۹ - ۲۵۱)

تم دیکھتے ہو کہ باوجود تمہاری سخت مخالفت اور مخالفانہ دُعاؤں کے **اس نے مجھے نہیں چھوڑا**۔ اور ہر میدان میں وہ میرا حامی رہا۔ ہر ایک پتھر جو میرے پر چلایا گیا اس نے اپنے ہاتھوں پر لے لیا۔ ہر ایک تیر جو مجھے مارا گیا اس نے وہی تیر دشمنوں کی طرف لوٹا دیا۔ میں بے کس تھا اُس نے مجھے پناہ دی۔ میں اکیلا تھا اُس نے مجھے اپنے دامن میں لے لیا۔ میں

کچھ بھی چیز نہ تھا۔ مجھے اُس نے عزت کے ساتھ شہرت دی اور لاکھوں انسانوں کو میرا ارادت مند کر دیا پھر وہ اسی مقدس وحی میں فرماتا ہے کہ جب میری مدد تمہیں پہنچیگی اور میرے مُنہ کی باتیں پوری ہو جائیں گی یعنی خلق اللہ کا رجوع ہو جائیگا اور مالی نصرتیں ظہور میں آئیں گی تب منکروں کو کہا جائے گا کہ دیکھو کیا وہ باتیں پوری نہیں ہو گئیں جن کے بارے میں تم جلدی کرتے تھے۔ چنانچہ **آج وہ سب باتیں پوری ہو گئیں**۔ اس بات کے بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ خدا نے اپنے عہد کو یاد کر کے لاکھوں انسانوں کو میری طرف رجوع دیدیا اور وہ مالی نصرتیں کیں جو کسی کے خواب و خیال میں نہ تھیں۔ پس اے مخالفو! خدا تم پر رحم کرے اور تمہاری آنکھیں کھولے ذرا سوچو کہ کیا یہ انسانی مکر ہو سکتے ہیں؟ یہ وعدے تو براہین احمدیہ کی تصنیف کے زمانے میں کئے گئے تھے جبکہ قوم کے سامنے ان کا ذکر کرنا بھی ہنسی کے لائق تھا اور میری حیثیت کا اس قدر بھی وزن نہ تھا جیسا کہ رائی کے دانہ کا وزن ہوتا ہے۔ تم میں سے کون ہے جو مجھے اس بیان میں ملزم کر سکتا ہے؟ تم میں سے کون ہے کہ یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اس وقت بھی ان ہزارہا لوگوں میں سے کوئی میری طرف رجوع رکھتا تھا۔ میں تو براہین احمدیہ کے چھپنے کے وقت ایسا گمنام شخص تھا کہ امرتسر میں ایک پادری کے مطبع میں جس کا نام رجب علی تھا میری کتاب براہین احمدیہ چھپتی تھی اور میں اس کے پروف دیکھنے کے لئے اور کتاب کے چھپوانے کے لئے اکیلا امرتسر جاتا اور اکیلا واپس آتا تھا اور کوئی مجھے آتے جاتے نہ پوچھتا کہ تو کون ہے اور نہ مجھ سے کسی کو تعارف تھا اور نہ میں کوئی حیثیت قابل تعظیم رکھتا تھا۔ میری اس حالت کے قادیان کے آریہ بھی گواہ ہیں۔ جن میں سے ایک شخص شرمپت نام اب تک قادیان میں موجود ہے۔ جو بعض دفعہ میرے ساتھ امرتسر میں پادری رجب علی کے پاس مطبع میں گیا تھا جس کے مطبع میں میری کتاب براہین احمدیہ چھپتی تھی اور تمام یہ پیشگوئیاں اس کا کاتب لکھتا تھا۔ اور وہ پادری خود حیرانی سے پیشگوئیوں کو پڑھ کر باتیں کرتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ایسے معمولی انسان کی طرف ایک دنیا کا رجوع ہو جائے گا۔ پر چونکہ وہ باتیں خدا کی طرف سے تھیں۔ میری نہیں تھیں اس لئے وہ اپنے وقت میں پوری ہو گئیں اور پوری ہو رہی ہیں ایک وقت میں انسانی آنکھ نے اُن سے **تعجب کیا** اور دوسرے وقت میں دیکھ بھی لیا۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۶۱-۶۲)

دیکھو خدا نے ایک جہاں کو جھکا دیا ؎ گمنام پا کے شہرۂ عالم بنا دیا
جو کچھ مراد تھی سب کچھ دکھا دیا ؎ مَیں اِک غریب تھا مجھے بے انتہا دیا
دنیا کی نعمتوں سے کوئی بھی نہیں رہی
جو اس نے مجھ کو اپنی عنایات سے نہ دی
اِک قطرہ اُس کے فضل نے دریا بنادیا ؎ مَیں خاک تھا اُسی نے ثریّا بنا دیا
مَیں تھا غریب و بیکس و گمنام بے ہنر ؎ کوئی نہ جانتا تھا کہ ہے **قادیاں** کدھر
لوگوں کی اس طرف کو ذرا بھی نظر نہ تھی ؎ میرے وجود کی بھی کسی کو خبر نہ تھی
اب دیکھتے ہو کیسا رجوعِ جہاں ہوا
اِک مرجع خواص یہی قادیاں ہوا

(براہین احمدیہ حصّہ پنجم)

زلازل اور جنگیں

پانچ زلزلوں کے آنے کی نسبت خدا تعالیٰ کی پیشگوئی

جس کے الفاظ یہ ہیں

"چمک دکھلاؤں گا تم کو اس نشاں کی پنج بار"

اس وحیٔ الٰہی کا یہ مطلب ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ محض اس عاجز کی سچائی پر گواہی دینے کے لئے اور محض اس غرض سے کہ تا لوگ سمجھ لیں کہ مَیں اس کی طرف سے ہوں **پانچ دہشتناک زلزلے** ایک دوسرے کے بعد کچھ کچھ فاصلہ سے آئیں گے تا وہ میری سچّائی کی گواہی دیں۔ اور ہر ایک میں اُن میں سے ایک ایسی چمک ہوگی کہ اس کے دیکھنے سے خدا یاد آجائیگا اور دلوں پر ان کا ایک خوفناک اثر پڑے گا اور وہ اپنی قوت اور شدت اور نقصان رسانی میں غیر معمولی ہوں گے جن کے دیکھنے سے انسانوں کے ہوش جاتے رہیں گے۔ یہ سب کچھ خدا کی غیرت کرے گی کیونکہ لوگوں نے وقت کو شناخت نہیں کیا۔ اور خدا فرماتا ہے کہ مَیں پوشیدہ تھا۔ مگر

اب مَیں اپنے تئیں ظاہر کرونگا اور مَیں اپنی چمکار دکھاؤں گا۔ اور اپنے بندوں کو رہائی دونگا اسی طرح جس طرح فرعون کے ہاتھ سے موسیٰ نبی اور اس کی جماعت کو رہائی دی گئی اور یہ معجزات اسی طرح ظاہر ہونگے جس طرح موسیٰ نے فرعون کے سامنے دکھلائے۔ اور **خدا فرماتا ہے** کہ مَیں صادق اور کاذب میں فرق کرکے دکھلاؤنگا اور مَیں اُسے مدد دونگا جو میری طرف سے ہے اور مَیں اس کا مخالف ہو جاؤنگا جو اس کا مخالف ہے۔ سو اے سُننے والو! تم سب یاد رکھو کہ اگر یہ پیشگوئیاں صرف معمولی طور پر ظہور میں آئیں تو تم سمجھ لو کہ مَیں خدا کی طرف سے نہیں ہوں لیکن ان پیشگوئیوں نے اپنے پورے ہونے کے وقت دنیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا اور شدت گھبراہٹ سے دیوانہ سا بنا دیا اور اکثر مقامات میں عمارتوں اور جانوں کو نقصان پہنچایا تو تم **اس خدا سے ڈرو** جس نے میرے لئے یہ سب کچھ کر دکھایا وہ خدا جس کے قبضہ میں ذرّہ ذرّہ ہے اس سے انسان کہاں بھاگ سکتا ہے۔ **وہ فرماتا ہے** کہ مَیں چوروں کی طرح پوشیدہ آؤنگا۔ یعنی کسی جوتشی یا ملہم یا خواب بین کو اس وقت کی خبر نہیں دی جائیگی بجز اس قدر خبر کے کہ جو اُس نے اپنے **مسیح موعود** کو دیدی یا آئندہ اس پر کچھ زیادہ کرے۔ ان نشانوں کے بعد دنیا میں ایک تبدیلی پیدا ہوگی اور اکثر دل خدا کی طرف کھینچے جائیں گے اور اکثر سعید دلوں پر دنیا کی محبت ٹھنڈی ہو جائیگی اور غفلت کے پردے درمیان سے اٹھا دیئے جائیں گے اور حقیقی اسلام کا شربت انہیں پلایا جائے گا۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے:۔

چو دورِ خسروی آغاز کردند ٭ مسلماں را مسلماں باز کردند

دورِ خسروی سے مراد اس عاجز کا **عہدِ دعوت** ہے مگر اسجگہ دنیا کی بادشاہت مراد نہیں بلکہ **آسمانی بادشاہت** مراد ہے جو مجھ کو دی گئی۔ خلاصہ معنیٰ اس الہام کا یہ ہے کہ جب دورِ خسروی یعنی دَورِ مسیحی جو خدا کے نزدیک آسمانی بادشاہت کہلاتی ہے ششم ہزار کے آخر میں شروع ہوا جیسا کہ خدا کے پاک نبیوں نے پیشگوئی کی تھی تو اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ جو صرف ظاہری مسلمان تھے وہ **حقیقی مسلمان** بننے لگے۔ جیسا کہ اب تک چار لاکھ کے قریب بن چکے ہیں اور میرے لئے یہ شکر کی جگہ ہے کہ میرے ہاتھ پر چار لاکھ کے قریب لوگوں نے اپنے معاصی اور گناہوں اور شرک سے توبہ کی اور ایک جماعت ہندوؤں اور انگریزوں کی بھی مشرف باسلام ہوئی۔ چنانچہ کل کے دن ہی ایک ہندو میرے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوا جس کا نام محمد اقبال رکھا گیا۔ اور مَیں کل کے دن چند دفعہ اس الہام الٰہی کو پڑھ رہا تھا

کہ یکدفعہ میری رُوح میں یہ عبارت پھونکی گئی جو پہلے الہام کے بعد میں ہے :-

مقام او مبیں از راہ تحقیر ٭ بدورانش رسولاں ناز کردند

ایسا ہی خدا تعالٰے نے اس وحیٔ الٰہی میں جو لکھی جاتی ہے میرے ہاتھ پر دین اسلام کے پھیلانے کی خوشخبری دی جیسا کہ اس نے فرمایا۔ یا قمر یا شمس انت منی و انا منک۔ یعنی اے چاند اور اے سورج! تو مجھ سے ہے اور مَیں تجھ سے ہوں۔ اس وحی الٰہی میں ایک دفعہ خدا تعالٰے نے مجھے چاند قرار دیا اور اپنا نام سورج رکھا۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ جس طرح چاند کا نور سورج سے فیضیاب اور مستفاد ہوتا ہے اسی طرح میرا نور خدا تعالٰے سے فیضیاب اور مستفاد ہے۔ پھر دوسری دفعہ خدا تعالیٰ نے اپنا نام چاند رکھا اور مجھے سورج کرکے پکارا۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی جلالی روشنی میرے ذریعہ سے ظاہر کریگا وہ پوشیدہ تھا اب میرے ہاتھ سے ظاہر ہو جائیگا اور اس کی چمک سے دنیا بے خبر تھی مگر اب میرے ذریعہ سے اس کی جلالی چمک دنیا کی ہر ایک طرف پھیل جائیگی۔ اور جس طرح تم بجلی کو دیکھتے ہو کہ ایک طرف سے روشن ہو کر ایک دم میں تمام سطح آسمان کا روشن کر دیتی ہے اسی طرح اس زمانہ میں بھی ہو گا۔ **خدا تعالیٰ مجھے مخاطب کرکے فرماتا ہے** کہ تیرے لئے مَیں زمین پر اُترا۔ اور تیرے لئے میرا نام چمکا اور مَیں نے تجھے تمام دنیا میں سے چُن لیا۔ اور **فرماتا ہے** :- قال ربّک انّہ نازل من السّماء ما یُرضیک۔ یعنی تیرا خدا کہتا ہے کہ آسمان سے ایسے زبردست معجزات اُتریںگے جن سے تو راضی ہو جائیگا۔ سو ان میں سے اِس ملک میں ایک طاعون اور دو سخت زلزلے تو آچکے جن کی پہلے سے مَیں نے خدا تعالٰے سے الہام پاکر خبر دی تھی مگر اب خدا تعالٰے فرماتا ہے کہ پانچ زلزلے اور آئیں گے اور دنیا ان کی غیر معمولی چمک کو دیکھے گی۔ اور ان پر ثابت کیا جائیگا کہ یہ خدا تعالیٰ کے نشان ہیں جو اس کے بندے مسیح موعود کے لئے ظاہر ہوئے۔ افسوس اس زمانہ کے منجم اور جوتشی ان پیشگوئیوں میں میرا ایسا ہی مقابلہ کرتے ہیں جیسا کہ ساحروں نے موسیٰ نبی کا مقابلہ کیا تھا۔ اور بعض نادان ملہم جو تاریکی کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں اور بلعم کی طرح میرے مقابلہ کے لئے حق کو چھوڑتے اور گمراہوں کو مدد دیتے ہیں مگر **خدا فرماتا ہے** کہ مَیں سب کو شرمندہ کرونگا اور کسی دوسرے کو یہ اعزاز ہرگز نہیں دونگا۔ ان سب کے لئے اب وقت ہے کہ اپنے نجوم یا الہام سے میرا مقابلہ کریں۔ اور اگر کسی حملہ کو اب اٹھا رکھیں تو وہ نامرد ہیں۔ اور **خدا فرماتا ہے** کہ مَیں ان سب کو شکست دونگا اور مَیں اس کا دشمن بن جاؤں گا

جو تیرا دشمن ہے اور وہ **فرماتا ہے** کہ اپنے اسرار کے اظہار کے لئے مَیں نے تجھے ہی برگزیدہ کیا ہے اور زمین اور آسمان تیرے ساتھ ہے جیسا کہ میرے ساتھ ہے اور تو مجھ سے ایسا ہے جیسا کہ میرا عرش۔ اسی کے مطابق قرآن شریف میں یہ آیت ہے جو خدا کے برگزیدہ رسولوں کو غیروں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ ہے۔ لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ۔ یعنی کھلا کھلا غیب صرف برگزیدہ رسول کو عطا کیا جاتا ہے غیر کو اس میں حصہ نہیں۔ سو ہماری جماعت کو چاہیئے جو ٹھوکر نہ کھاویں اور ان غیروں کو جو میرے مقابل پر ہیں اور میری بیعت کرنے والوں میں داخل نہیں ہیں کچھ بھی چیز نہ سمجھیں ورنہ خدا کے غضب کے نیچے آئیں گے۔ ہر ایک بیہودہ گو جو پیشگوئی کرتا ہے خدا ایسے لوگوں سے سچے ایمانداروں کو آزماتا ہے کہ کیا وہ غیر کو وہ وقعت اور عزّت دیتے ہیں جو خدا اور اس کے رسول کو دینی چاہیئے۔ اور دیکھنا ہے کہ کیا وہ اس سچائی پر قائم ہیں یا نہیں جو ان کو دی گئی۔

اور یاد رہے کہ جب یہ **پانچ زلزلے** آچکیں گے اور جس قدر خدا نے تباہی کا ارادہ کیا ہے وہ پورا ہوچکیگا تب خدا کا رحم پھر جوش مارے گا اور پھر غیر معمولی اور دہشتناک زلزلوں کا **ایک مدت تک خاتمہ** ہوجائیگا اور طاعون بھی ملک میں سے جاتی رہے گی جیسا کہ **خدا تعالیٰ نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا**۔ یَاْتِیْ عَلٰی جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَیْسَ فِیْهَا اَحَدٌ۔ یعنی اس جہنم پر جو طاعون اور زلزلوں کا جہنم ہے ایک دن ایسا زمانہ آئیگا کہ اس جہنم میں کوئی فرد بشر بھی نہیں ہوگا یعنی اس ملک میں۔ اور جیسا کہ نوح کے وقت میں ہوا کہ ایک خلق کثیر کی موت کے بعد امن کا زمانہ بخش گیا۔ ایسا ہی اسجگہ بھی ہوگا۔ اور پھر اس الہام کے بعد **اللہ تعالےٰ فرماتا ہے**۔ ثُمَّ یغاث الناس ویَعْصِرون۔ یعنی پھر لوگوں کی دعائیں سُنی جائینگی اور وقت پر بارشیں ہونگی اور باغ اور کھیت بہت پھل دیں گے اور خوشی کا زمانہ آجائیگا اور غیر معمولی آفتیں دُور ہوجائیں گی تا لوگ یہ خیال نہ کریں کہ خدا صرف قہار ہے رحیم نہیں ہے اور تا اس کے مسیح کو منحوس نہ قرار دیں۔

یاد رہے کہ مسیح موعود کے وقت میں موتوں کی کثرت ضروری تھی اور زلزلوں اور طاعون کا آنا ایک مقدر امر تھا۔ یہی معنے اس حدیث کے ہیں جو کہ لکھا ہے کہ **مسیح موعود کے دم سے لوگ مریں گے** اور جہاں تک مسیح کی نظر جائیگی اس کا قاتلانہ دم اثر کریگا۔ پس یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس حدیث میں مسیح موعود کو ایک ڈائن قرار دیا گیا ہے جو نظر کے ساتھ

ہر ایک کا کلیجہ نکالیگا بلکہ معنے حدیث کے یہ ہیں کہ اس کے نفحات طیبات یعنی کلمات اس کے جہان تک زمین پر شائع ہونگے تو چونکہ لوگ ان کا انکار کرینگے اور تکذیب سے پیش آئیں گے اور گالیاں دیں گے اس لئے وہ انکار موجب عذاب ہو جائیگا۔ یہ حدیث بتلا رہی ہے کہ مسیح موعود کا سخت انکار ہو گا جس کی وجہ سے ملک میں مری پڑے گی۔ اور سخت سخت زلزلے آئیں گے **اور امن اُٹھ جائیگا** ورنہ یہ غیر معقول بات ہے کہ خواہ نخواہ نیکوکار اور نیک چلن آدمیوں پر طرح طرح کے عذاب کی قیامت آوے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانوں میں بھی نادان لوگوں نے ہر ایک نبی کو منحوس قدم سمجھا ہے اور اپنی شامت اعمال ان پر تھاپ دی ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے **کہ نبی عذاب کو نہیں لاتا۔** بلکہ عذاب کا مستحق ہو جانا اتمام حجت کے لئے نبی کو لاتا ہے اور اس کے قائم ہونے کے لئے ضرورت پیدا کرتا ہے اور سخت عذاب بغیر نبی کے قائم ہونے کے آتا ہی نہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وما کنّا معذّبین حتّٰی نبعث رسولًا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ایک طرف تو طاعون ملک کو کھا رہی ہے اور دوسری طرف ہیبت ناک زلزلے پیچھا نہیں چھوڑتے؟ **اے غافلو! تلاش تو کرو شاید تم میں خدا کی طرف سے کوئی نبی قائم ہو گیا ہے جس کی تم تکذیب کر رہے ہو۔** اب ہجری صدی کا بھی چوبیسواں سال ہے۔ بغیر قائم ہونے کسی مرسل الٰہی کے یہ وبال تم پر کیوں آگیا جو ہر سال تمہارے دوستوں کو تم سے جدا کرتا اور تمہارے پیاروں کو تم سے علیحدہ کر کے داغ جدائی تمہارے دلوں پر لگاتا ہے۔ آخر کچھ بات تو ہے کیوں تلاش نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اگر خدا نے مجھے یہ تمام خبریں پہلے سے نہیں دیں تو میں جھوٹا ہوں لیکن اگر یہ خبریں پچیس برس سے میری کتابوں میں مندرج ہیں اور متواتر میں قبل از وقت خبر دیتا رہا ہوں تو تمہیں ڈرنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ تم خدا کے الزام کے نیچے آ جاؤ۔ تم سن چکے ہو کہ ۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کی پیشگوئی ایک برس پہلے میں نے اخباروں میں شائع کی تھی۔ اور اس میں صرف یہی لفظ نہیں تھا کہ **زلزلہ کا دھکا** بلکہ یہ الہام بھی تھا کہ **عفت الدّیار محلّہا ومقامہا** یعنی ملک پنجاب کے بعض حصّوں کی عمارتیں تباہ اور ناپدید ہو جائیں گی۔ سو اب مجھے اس بات کے لکھنے کی ضرورت نہیں کہ کس صفائی سے وہ پیشگوئی پوری ہو گئی۔ پھر بعد اس کے اسی اپریل کے مہینہ میں یہ دوسری پیشگوئی خدا تعالیٰ کی وحی سے میں نے شائع کی تھی کہ جیسا کہ یہ زلزلہ ۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کا موسم بہار میں آیا ایسا ہی ایک دوسرا زلزلہ موسم بہار میں ہی آئیگا اور اس سے پہلے

نہیں آئیگا اور ضروری ہے کہ ۲۵ر فروری ۱۹۰۶ء تک وہ زلزلہ نہ آوے۔ سو گیارہ مہینے تک کوئی زلزلہ نہ آیا اور جب ۲۵ر فروری ۱۹۰۶ء گذر گئے۔ تب ۲۷ر فروری ۱۹۰۶ء کی رات کو عین وسط بہار میں ایک بجے کے وقت ایسا سخت زلزلہ آیا کہ انگریزی اخبارات سول وغیرہ کو بھی اقرار کرنا پڑا کہ یہ زلزلہ ۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کے برابر تھا۔ اور رام پور شہر علاقہ شملہ اور بہت سے اور مقامات میں جانوں اور عمارتوں کا نقصان ہوا۔ یہ وہی زلزلہ تھا جس کی نسبت گیارہ مہینے پہلے خدا تعالیٰ کی وحی نے یہ خبر دی تھی کہ

پھر بہار آئی خدا کی بات پھر پوری ہوئی

سو اس کے مطابق موسم بہار میں یہ زلزلہ آیا۔ اب سوچ کر دیکھ لو کہ بجز خدا کے کس کی طاقت ہے کہ اس تصریح کے ساتھ پیشگوئی کر سکے۔ میرے ہاتھ میں تو زمین کے طبقات نہیں تھے کہ میں گیارہ مہینے تک ان کو تھام رکھتا اور پھر ۲۵ر فروری ۱۹۰۶ء کے بعد ایک زور کا دھکا دیکر زمین کو ہلا دیتا۔

سو اے عزیزو! جبکہ تم نے یہ دونوں زلزلے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے تو اب تمہیں اس بات کا سمجھنا سہل ہے کہ آئندہ پانچ زلزلوں کی خبر بھی کوئی گپ نہیں ہے۔ ....

کوئی علم طبقات الارض کا اس تصریح اور تفصیل کو بتا نہیں سکتا بلکہ وہ خدا جو زمین اور آسمان کا خدا ہے وہ اپنے خاص **رسولوں کو یہ اسرار بتلاتا ہے** نہ ہر ایک کو تا دنیا کے لوگ کفر اور انکار سے بچ جائیں اور تا وہ ایمان لائیں اور جہنم کے عذاب سے نجات پائیں۔ **سو دیکھو میں زمین و آسمان کو گواہ کرتا ہوں کہ آج میں نے وہ پیشگوئی جو پانچ زلزلوں کے بارے میں ہے بتصریح بیان کر دی ہے تا تم پر حجت ہو اور تا تمہاری گمراہی پر موت نہ ہو۔** اے عزیزو! خدا سے مت لڑو کہ اس لڑائی میں تم ہرگز فتحیاب نہیں ہو سکتے۔ خدا کسی قوم پر ایسے سخت عذاب نازل نہیں کرتا اور نہ کبھی اس نے کئے جب تک اس قوم میں اس کی طرف سے کوئی رسول نہ آیا ہو یعنی جب تک اس کا بھیجا ہوا اُن پر ظاہر نہ ہوا ہو۔ سو تم خدا کے قانون قدیم سے فائدہ اٹھاؤ اور تلاش کرو کہ وہ کون ہے جس کے لئے تمہاری آنکھوں کے روبرو آسمان پر رمضان کے مہینہ میں کسوف خسوف ہوا اور زمین پر طاعون پھیلی اور زلزلے آئے اور یہ پیشگوئیاں قبل از وقت کس نے تم کو سنائیں اور کس نے یہ دعویٰ کیا کہ **میں مسیح موعود** ہوں اور اس شخص کو **تلاش** کرو کہ وہ تم میں موجود ہے اور **وہ یہی ہے کہ جو بول رہا ہے**۔ ولا تایئسوا من روح اللّٰہ انہ لا یایئس من روح اللّٰہ الا القوم الکافرون۔

(تجلیات الٰہیہ صـــ ۳-۱۵)

یاد رہے کہ خدا نے مجھے عام طور پر زلزلوں کی خبر دی ہے۔ پس یقیناً سمجھو کہ جیسا کہ پیشگوئی کے مطابق امریکہ میں زلزلے آئے ایسا ہی یورپ میں بھی آئے اور نیز ایشیا کے مختلف مقامات میں آئیں گے اور بعض اُن میں **قیامت کا نمونہ** ہونگے اور اس قدر موت ہوگی کہ خون کی نہریں چلیں گی۔ اس موت سے پرند چرند بھی باہر نہیں ہونگے۔ اور زمین پر اس قدر سخت تباہی آئیگی کہ اس روز سے کہ انسان پیدا ہوُا ایسی تباہی کبھی نہیں آئی ہوگی۔ اور اکثر مقامات زیر و زبر ہو جائیں گے کہ گویا ان میں کبھی آبادی نہ تھی۔ اور اس کے ساتھ اور بھی آفات زمین و آسمان میں ہولناک صورت میں پیدا ہوں گی۔ یہاں تک کہ ہر ایک عقلمند کی نظر میں وہ باتیں غیر معمولی ہو جائیں گی۔ اور ہیئت اور فلسفہ کی کتابوں کے کسی صفحہ میں ان کا پتہ نہیں ملے گا۔ تب انسانوں میں اضطراب پیدا ہوگا کہ یہ کیا ہونے والا ہے۔ اور بہتیرے نجات پائیں گے اور بہتیرے ہلاک ہو جائیں گے۔ وہ دن نزدیک ہیں بلکہ مَیں دیکھتا ہوں کہ دروازے پر ہیں کہ دنیا ایک **قیامت کا نظارہ** دیکھے گی۔ اور نہ صرف زلزلے بلکہ اَور بھی **ڈرانے والی آفتیں** ظاہر ہونگی کچھ آسمان سے اور کچھ زمین سے یہ اس لئے کہ نوع انسان نے اپنے خدا کی پرستش چھوڑ دی اور تمام دل اور تمام ہمت اور تمام خیالات سے دنیا پر ہی گر گئے ہیں۔ اگر مَیں نہ آیا ہوتا تو ان بلاؤں میں کچھ تاخیر ہو جاتی پر میرے آنے کے ساتھ خدا کے غضب کے وہ مخفی ارادے جو ایک بڑی مدت سے مخفی تھے ظاہر ہو گئے جیسا کہ خدا نے فرمایا وما کنا معذّبین حتّٰی نبعث رسولًا۔ اور توبہ کرنے والے امان پائینگے اور وہ جو بلا سے پہلے ڈرتے ہیں ان پر رحم کیا جائیگا۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم ان زلزلوں سے امن میں رہو گے یا تم اپنی تدبیروں سے اپنے تئیں بچا سکتے ہو؟ ہرگز نہیں۔ انسانی کاموں کا اس دن خاتمہ ہوگا۔ یہ مت خیال کرو کہ امریکہ وغیرہ میں سخت زلزلے آئے اور تمہارا ملک ان سے محفوظ ہے۔ مَیں تو دیکھتا ہوں کہ شاید ان سے زیادہ مصیبت کا مُنہ دیکھو گے۔ اے یورپ **تو بھی امن میں نہیں اور اے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں اور اے جزائر کے رہنے والو کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا**۔ مَیں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں۔ وہ واحد یگانہ ایک مدت تک خاموش رہا اور اس کی آنکھوں کے سامنے مکروہ کام کئے گئے اور وہ چپ رہا۔ مگر اب وہ ہیبت کے ساتھ اپنا چہرہ دکھلائیگا جس کے کان سننے کے ہوں سُنے کہ وہ وقت دُور نہیں۔ **مَیں نے کوشش کی کہ خدا کی امان کے نیچے سب کو جمع کروں۔ پر ضرور تھا کہ تقدیر کے نوشتے پورے**

ہوتے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اس ملک کی نوبت بھی قریب آتی جاتی ہے **نوح کا زمانہ** تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائیگا اور **لوط کی زمین** کا واقعہ تم بچشم خود دیکھ لوگے۔ مگر خدا غضب میں دھیما ہے **توبہ کرو** تا تم پر رحم کیا جائے۔ جو خدا کو چھوڑتا ہے وہ ایک کیڑا ہے نہ کہ آدمی۔ اور جو اس سے نہیں ڈرتا وہ مُردہ ہے نہ کہ زندہ۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۵۶ - ۲۵۷)

سونے والو جلد جاگو یہ نہ وقت خواب ہے ؎ جو خبر دی وحیٔ حق نے اُس سے دل بیتاب ہے
زلزلے سے دیکھتا ہوں یہ زمین زیر و زبر ؎ وقت اب نزدیک ہے آیا کھڑا سیلاب ہے
ہے سرِراہ پر کھڑا نیکوں کی وہ مولا کریم ؎ نیک کو کچھ غم نہیں ہے گو بڑا گرداب ہے
کوئی کشتی اب بچا سکتی نہیں اس سیل سے ؎ حیلے سب جاتے رہے اک حضرتِ توّاب ہے

(درِّثمین)

اِک نشاں ہے آنیوالا آج سے کچھ دن کے بعد ؎ جس سے گردش کھائینگے دیہات و شہر و مرغزار
آئیگا قہرِ خدا سے خلق پر اک انقلاب ؎ اِک برہنہ سے نہ ہوگا یہ کہ تا باندھے ازار
یک بیک اِک زلزلے سے سخت جنبش کھائینگے ؎ کیا بشر اور کیا شجر اور کیا حجر اور کیا بحار
اک جھپک میں یہ زمیں ہو جائیگی زیر و زبر ؎ نالیاں خوں کی چلیں گی جیسے آبِ رودبار
رات جو رکھتے تھے پوشاکیں برنگِ یاسمن ؎ صبح کر دیگی انہیں مثلِ درختانِ چنار
ہوش اڑ جائیں گے انساں کے پرندوں کے حواس ؎ بھولینگے نغموں کو اپنے سب کبوتر اور ہزار
ہر مسافر پر وہ ساعت سخت ہے اور وہ گھڑی ؎ راہ کو بھولیں گے ہو کر مست و بیخود راہوار
خون سے مُردوں کے کوہستان کے آبِ رواں ؎ سُرخ ہو جائیں گے جیسے ہو شرابِ انجبار
مضمحل ہو جائینگے اس خوف سے سب جنّ و انس ؎ زار بھی ہوگا تو ہوگا اس گھڑی باحالِ زار
اِک نمونہ قہر کا ہوگا وہ ربّانی نشاں ؎ آسماں حملے کرے گا کھینچکر اپنی کٹار
ہاں نہ کر جلدی سے انکار اے سفیہِ ناشناس ؎ اِس پہ ہے میری سچائی کا سبھی دارومدار
وحیٔ حق کی بات ہے ہو کر رہے گی بے خطا ؎ کچھ دنوں کر صبر ہو کر متّقی اور بُردبار
یہ گماں مت کر کہ یہ سب بدگمانی ہے معاف
قرض ہے واپس ملے گا تجھ کو یہ سارا ادھار

(براہین احمدیہ حصہ پنجم)

یہ نشان زلزلہ جو ہو چکا منگل کے دن　　یہ تو اک لقمہ تھا جو تم کو کھلایا ہے نہار
اِک ضیافت ہے بڑی اے غافلو کچھ دن کے بعد　　جسکی دیتا ہے خبر فرقاں میں رحماں بار بار
خوب کھل جائیگا لوگوں پہ کہ دیں کس کا ہے دیں　　پاک کر دینے کا تیرتھ کعبہ ہے یا ہردوار
وحیٔ حق کے ظاہری لفظوں میں ہے وہ زلزلہ　　لیک ممکن ہے کہ ہو کچھ اَور ہی قسموں کی مار
کچھ ہی ہو پر وہ نہیں رکھتا زمانے میں نظیر　　فوق عادت ہے کہ سمجھا جائے گا روز شمار
وہ تباہی آئیگی شہروں پہ اور دیہات پر　　جس کی دنیا میں نہیں ہے مثل کوئی زینہار
ایک دم میں غمکدے ہو جائیں گے عشرتکدے　　شادیاں کرتے تھے جو پیٹینگے ہو کر سوگ دار
وہ جو تھے اونچے محل اور وہ جو تھے قصرِ بریں　　پست ہو جائینگے جیسے پست ہو اک جائے غار
ایک ہی گردش سے گھر ہو جائینگے مٹی کا ڈھیر　　جسقدر جانیں تلف ہونگی نہیں اُن کا شمار
پر خدا کا رحم ہے کوئی بھی اس سے ڈر نہیں　　اُن کو جو جھکتے ہیں اس درگہ پہ ہو کر خاکسار
یہ خوشی کی بات ہے سب کام اس کے ہاتھ ہے　　وہ جو ہے دھیما غضب میں اور ہے آمرزگار
کب یہ ہوگا یہ خدا کو علم ہے پر اس قدر　　دی خبر مجھ کو کہ وہ دن ہونگے ایّامِ بہار
"پھر بہار آئی خدا کی بات پھر پوری ہوئی"　　یہ خدا کی وحی ہے اب سوچ لو اے ہوشیار
یاد کر فرقاں سے لفظِ زلزلت زلزالھا　　ایک دن ہوگا وہی جو غیب سے پایا قرار
سخت ماتم کے وہ دن ہونگے مصیبت کی گھڑی　　لیک وہ دن ہونگے نیکوں کے لئے شیریں ثمار
آگ ہے پر آگ سے وہ سب بچائے جائینگے　　جو کہ رکھتے ہیں خدائے ذوالعجائب سے پیار
انبیاء سے بغض بھی اے غافلو اچھا نہیں　　دُور تر ہٹ جاؤ اس سے یہ ہے شیروں کی کچھار

(درّثمین)

خداتعالیٰ کی وحی میں زلزلہ کا بار بار لفظ ہے اور فرمایا کہ ایسا زلزلہ ہوگا جو نمونہ قیامت ہوگا بلکہ قیامت کا زلزلہ اس کو کہنا چاہیئے جس کی طرف سورۃ اذا زلزلت الارض زلزالھا اشارہ کرتی ہے۔ لیکن میں ابھی تک اس زلزلے کے لفظ کو قطعی یقین کے ساتھ ظاہر پر جما نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ یہ معمولی زلزلہ نہ ہو بلکہ کوئی اور شدید آفت ہو جو قیامت کا نظارہ دکھلا دے جس کی نظیر کبھی اس زمانہ نے نہ دیکھی ہو اور جانوں اور عمارتوں پر سخت تباہی آوے۔ ہاں اگر ایسا فوق العادت نشان ظاہر نہ ہو اور لوگ کھلے طور پر اپنی اصلاح بھی نہ کریں تو اس صورت میں مَیں کاذب ٹھہروں گا۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۲۰ حاشیہ)

سُلطان القلم

اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کا نام **سُلْطَانُ الْقَلَم** رکھا اور میرے قلم کو **ذوالفقار** فرمایا۔

(تذکرہ ص ۴۲۱)

ید بیضا کہ با او تابندہ ٭ باز با ذوالفقار مے بینم

یعنی اس کا وہ روشن ہاتھ جو اتمام کے حجت کی رو سے تلوار کی طرح چمکتا ہے۔ پھر میں اس کو ذوالفقار کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ یعنی ایک زمانہ ذوالفقار کا تو وہ گذر گیا کہ جب ذوالفقار علی کرّم اللہ وجہہٗ کے ہاتھ میں تھی۔ مگر خدا تعالیٰ پھر ذوالفقار اس امام کو دے دیگا۔ اس طرح پر کہ اس کا چمکنے والا ہاتھ وہ کام کرے گا جو پہلے زمانہ میں ذوالفقار کرتی تھی۔ سو وہ ہاتھ ایسا ہوگا کہ گویا وہ ذوالفقار علی کرم اللہ وجہہٗ ہے جو پھر ظاہر ہوگئی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ امام **سُلْطَانُ الْقَلَم** ہوگا۔ اور اس کی قلم ذوالفقار کا کام دیگی۔ یہ پیشگوئی بعینہٖ اس عاجز کے اس الہام کا ترجمہ ہے جو اس وقت سے دس برس پہلے براہین احمدیہ میں چھپ چکا ہے اور وہ یہ ہے :- **کِتَابُ الْوَلِیِّ ذُوالفقارِ عَلِیٍّ** یعنی کتاب اس ولی کی ذوالفقار علی کی ہے۔ یہ اس عاجز کی طرف اشارہ ہے۔ اسی بناء پر بارہا اس عاجز کا نام مکاشفات میں **غازی** رکھا گیا ہے۔

(نشان آسمانی ص ۱۵)

مَیں خاص طور پر خدا تعالیٰ کی اعجاز نمائی کو انشاپردازی کے وقت بھی اپنی نسبت دیکھتا ہوں۔ کیونکہ جب مَیں عربی یا اردو میں کوئی عبارت لکھتا ہوں تو مَیں محسوس کرتا ہوں کہ کوئی اندر سے مجھے تعلیم دے رہا ہے اور ہمیشہ میری تحریر گو عربی ہو یا اردو یا فارسی دُو حصّہ پر منقسم ہوتی ہے (۱) ایک تو یہ کہ بڑی سہولت سے سِلسلۂ الفاظ اور معانی کا میرے سامنے آتا جاتا ہے اور مَیں اس کو لکھتا جاتا ہوں اور گو اس تحریر میں کوئی مُشقّت اٹھانی نہیں پڑتی۔ مگر دراصل وہ سِلسلہ میری دماغی طاقت سے کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ یعنی الفاظ اور معانی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر خدا تعالیٰ کی ایک خاص رنگ میں تائید نہ ہوتی تب بھی اس کے فضل کے ساتھ ممکن تھا کہ اس کی معمولی تائید کی برکت سے جو لازمہ فطرت خواص انسانی ہے کسی قدر مشقّت اٹھا کر اور بہت سا وقت لے کر ان مضامین کو مَیں لکھ سکتا۔ واللہ اعلم۔

(۲) دوسرا حصہ میری تحریر کا محض خارق عادت کے طور پر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب مَیں مثلاً ایک عربی عبارت لکھتا ہوں اور سلسلہ عبارت میں بعض ایسے الفاظ کی حاجت پڑتی ہے کہ وہ مجھے معلوم نہیں ہیں تب اُن کی نسبت خدا تعالیٰ کی وحی رہنمائی کرتی ہے اور وہ لفظ وحی متلوّ کی طرح **روح القدس** میرے دل میں ڈالتا ہے اور زبان پر جاری کرتا ہے اور اس وقت مَیں اپنی حس سے غائب ہوتا ہوں۔ مثلاً عربی عبارت کے سلسلۂ تحریر میں مجھے ایک لفظ کی ضرورت پڑی جو ٹھیک ٹھیک بسیاریٔ عیال کا ترجمہ ہے اور وہ مجھے معلوم نہیں اور سلسلہ عبارت اسکا محتاج ہے تو فی الفور دل میں وحی متلوّ کی طرح لفظ ضَفَف ڈالا گیا۔ جس کے معنے ہیں بسیاریٔ عیال۔ یا مثلاً سلسلۂ تحریر میں مجھے ایسے لفظ کی ضرورت ہوئی جس کے معنے ہیں غم و غصہ سے چپ ہو جانا اور مجھے وہ لفظ معلوم نہیں تو فی الفور دل پر وحی ہوئی کہ **وُجُوم**۔ ایسا ہی عربی فقرات کا حال ہے۔ عربی تحریروں کے وقت مَیں صدہا بنے بنائے فقرات وحی متلوّ کی طرح دل پر وارد ہوتے ہیں اور یا یہ کہ کوئی فرشتہ ایک کاغذ پر لکھے ہوئے وہ فقرات دکھا دیتا ہے اور بعض فقرات آیات قرآنی ہوتے ہیں یا ان کے مشابہ کچھ تھوڑے تصرف سے اور بعض اوقات کچھ مدت کے بعد پتہ لگتا ہے کہ فلاں عربی فقرہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے برنگ وحی متلو القا ہوا تھا وہ فلاں کتاب میں موجود ہے۔ چونکہ ہر ایک چیز کا خدا مالک ہے اسلئے وہ یہ بھی اختیار رکھتا ہے کہ کوئی عمدہ فقرہ کسی کتاب کا یا کوئی عمدہ شعر کسی دیوان کا بطور وحی میرے دل پر نازل کرے۔ یہ تو زبان عربی کے متعلق بیان ہے۔ مگر اس سے زیادہ تر تعجب کی یہ بات ہے کہ بعض الہامات مجھے ان زبانوں میں بھی ہوتے ہیں جن سے مجھے کچھ بھی واقفیت نہیں۔ جیسے انگریزی یا سنسکرت یا عبرانی وغیرہ۔ جیسا کہ براہین احمدیہ میں کچھ نمونہ ان کا لکھا گیا۔ اور مجھے اس خدا کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ یہی عادت اللہ میرے ساتھ ہے۔ اور یہ نشانوں کی قسم میں سے ایک نشان ہے جو مجھے دیا گیا ہے جو مختلف پیرایوں میں امورِ غیبیہ میرے پر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اور میرے خدا کو اس کی کچھ بھی پرواہ نہیں کہ کوئی کلمہ جو میرے پر بطور وحی القا ہو وہ کسی عربی یا انگریزی یا سنسکرت کی کتاب میں درج ہو۔ کیونکہ میرے لئے وہ غیب محض ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بہت سے توریت کے قصّے بیان کر کے ان کو علم غیب میں داخل کیا ہے کیونکہ وہ قصّے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب تھا گو یہودیوں کے لئے وہ غیب نہ تھا۔ پس یہی راز ہے جس کی وجہ سے مَیں

ایک دنیا کو معجزہ عربی بلیغ کی تفسیر نویسی میں بالمقابل بلاتا ہوں۔ ورنہ انسان کیا چیز اور ابن آدم کیا خفیفت کہ غرور اور تکبّر کی راہ سے ایک دنیا کو اپنے مقابل پر بلا دے۔

(نزول المسیح ص ۵۶-۵۸)

خطبہ الہامیہ

۱۱ اپریل ۱۹۰۰ء کو عید اضحیٰ کے دن صبح کے وقت مجھے الہام ہوا کہ آج تم عربی میں تقریر کرو تمہیں قوت دی گئی۔ اور نیز یہ الہام ہوا۔ **کلام افصحت من لدن رب کریم**۔ یعنی اس کلام میں خدا کی طرف سے فصاحت بخشی گئی ہے۔ چنانچہ اس الہام کو اُسی وقت اخویم مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور اخویم مولوی حکیم نورالدین صاحب اور شیخ رحمت اللہ صاحب اور مفتی محمد صادق صاحب اور مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے اور ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب اور ماسٹر شیر علی صاحب بی۔ اے اور حافظ عبدالعلی صاحب اور بہت سے دوستوں کو اطلاح دی گئی۔ تب مَیں عید کی نماز کے بعد عید کا خطبہ عربی زبان میں پڑھنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اور خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ غیب سے مجھے ایک قوت دی گئی اور وہ فصیح تقریر عربی میں فی البدیہہ میرے مُنہ سے نکل رہی تھی کہ میری طاقت سے بالکل باہر تھی۔ اور مَیں نہیں خیال کر سکتا کہ ایسی تقریر جس کی ضخامت کئی جزو تک تھی ایسی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ بغیر اس کے کہ اوّل کسی کاغذ میں قلمبند کی جائے کوئی شخص دنیا میں بغیر خاص الہام الٰہی کے بیان کر سکے۔ جس وقت یہ عربی تقریر جس کا نام خطبۂ الہامیہ رکھا گیا لوگوں میں سُنائی گئی اس وقت حاضرین کی تعداد دو سو کے قریب ہو گی سبحان اللہ۔ اس وقت ایک غیبی چشمہ کھل رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مَیں بول رہا تھا یا میری زبان سے کوئی فرشتہ کلام کر رہا تھا۔ کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ اس کلام میں میرا دخل نہ تھا خود بخود بنے بنائے فقرے میرے مُنہ سے نکلتے جاتے تھے اور ہر ایک فقرہ میرے لئے ایک نشان تھا۔ چنانچہ تمام فقرات چھپے ہوئے موجود ہیں جن کا نام **خطبات الہامیہ** ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو گا کہ کیا کسی انسان کی طاقت میں ہے کہ اتنی لمبی تقریر بغیر سوچے اور فکر کے عربی زبان میں کھڑے ہو کر محض زبانی طور پر فی البدیہہ بیان کر سکے۔ یہ ایک **علمی معجزہ** ہے جو خدا نے دکھلایا اور کوئی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔

(حقیقۃ الوحی ص ۳۶۲-۳۶۳)

متفرق نشانات

میرے والد صاحب مرزا غلام مرتضیٰ مرحوم اس نواح میں ایک مشہور رئیس تھے۔ گورنمنٹ انگریزی میں وہ پنشن پاتے تھے۔ اور اس کے علاوہ چار سو روپیہ انعام ملتا تھا اور چار گاؤں زمینداری کے تھے۔ پنشن اور انعام ان کی ذات تک وابستہ تھے اور زمینداری کے دیہات کے متعلق شرکاء کے مقدمات شروع ہونے کو تھے۔ اتنے میں وہ قریباً پچاسی برس کی عمر میں بیمار ہو گئے اور پھر بیماری سے شفا بھی ہو گئی۔ کچھ خفیف سی زحیر باقی تھی۔ ہفتہ کا روز تھا اور دوپہر کا وقت تھا کہ مجھے کچھ غنودگی ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ الہام ہوا۔ والسماء والطارق۔ جس کے معنے مجھے یہ سمجھائے گئے کہ قسم ہے آسمان کی اور قسم ہے اس حادثہ کی کہ غروب آفتاب کے بعد پڑیگا۔ اور دل میں ڈالا گیا کہ یہ پیشگوئی میرے والد کے متعلق ہے اور وہ آج ہی غروب آفتاب کے بعد وفات پائیں گے اور یہ قول خدا تعالیٰ کی طرف سے بطور ماتم پرسی کے ہے۔ اس وحی الٰہی کے ساتھ ہی میرے دل میں بمقتضائے بشریت یہ گذرا کہ ان کی وفات سے مجھے بڑا ابتلاء پیش آئیگا۔ کیونکہ جو وجوہ آمدنی ان کی ذات سے وابستہ ہیں وہ سب ضبط ہو جائینگی اور زمینداری کا حصہ کثیرہ شرکاء لے جائینگے اور پھر نہ معلوم ہمارے لئے کیا کیا مقدّر ہے۔ مَیں اس خیال میں ہی تھا کہ پھر یکدفعہ غنودگی آئی اور یہ الہام ہوا۔ الیس اللّٰہ بکافٍ عبدہٗ یعنی کیا خدا اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں۔ پھر اس کے بعد میرے دل میں سکینت نازل کی گئی۔ اور نماز ظہر کے بعد مَیں نیچے اترا اور جون کا مہینہ اور سخت گرمی کے دن تھے۔ اور مَیں نے جا کر دیکھا کہ میرے والد صاحب تندرست کی طرح بیٹھے تھے اور نشست برخاست اور حرکت میں کسی سہارے کے محتاج نہ تھے۔ اور حیرت تھی کہ آج واقعہ وفات کیونکر پیش آئے گا۔ لیکن جب غروب آفتاب کے قریب وہ پاخانہ میں جا کر واپس آئے تو آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ اور پلنگ پر بیٹھتے کے ساتھ ہی غرغرہ نزع شروع ہو گیا۔ شروع غرغرہ میں مجھے انہوں نے کہا۔ دیکھا یہ کیا حالت ہے اور پھر آپ ہی لیٹ گئے اور بعد اس کے کوئی کلام نہ کی اور چند منٹ میں ہی اس ناپائیدار دنیا سے گذر گئے۔ آج تک جو دس اگست ۱۹۰۲ء ہے مرزا صاحب مرحوم کے انتقال کو اٹھائیس برس گذر چکے ہیں۔ بعد اس کے مَیں نے مرزا صاحب کی تجہیز و تکفین سے فراغت کر کے وہ وحی الٰہی جو تکفّل الٰہی کے بارے میں ہوئی تھی یعنی الیس اللّٰہ بکافٍ عبدہٗ اس کو ایک نگینہ پر

کھدوا کر وہ مُہر اپنے پاس رکھی اور **مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے** کہ خارق عادت طور پر یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ اور نہ صرف مَیں بلکہ ہریک شخص جو میرے اس زمانہ کا واقف ہے جبکہ مَیں اپنے والد صاحب کے زیر سایہ زندگی بسر کرتا تھا وہ گواہی دے سکتا ہے کہ مرزا صاحب مرحوم کے وقت میں کہ کوئی مجھے جانتا بھی نہیں تھا۔ ان کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ نے اس طور سے میری دستگیری کی اور ایسا میرا متکفل ہوا کہ کسی شخص کے وہم اور خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ ہریک پہلو سے وہ میرا ناصر اور معاون ہوا۔ مجھے صرف اپنے دستر خوان اور روٹی کی فکر تھی مگر اب تک اس نے کئی لاکھ آدمی کو میرے دستر خوان پر روٹی کھلائی۔ ڈاکخانہ والوں کو خود پوچھ لو کہ کس قدر اُس نے روپیہ بھیجا۔ میری دانست میں دس لاکھ سے کم نہیں۔ اب ایماناً کہو کہ یہ معجزہ ہے یا نہیں؟

(نزول المسیح ص ۱۱۶-۱۱۸)

خدا تعالیٰ نے ایک عام طور پر مجھے مخاطب کرکے فرمایا کہ انّی مھین من اراد اھانتک یعنی مَیں اس کو ذلیل کرونگا جو تیری ذلت کا ارادہ کرے گا۔ صدہا دشمن اس پیشگوئی کے مصداق ہوگئے ہیں۔ اس رسالہ میں مفصل لکھنے کی گنجائش نہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جنہوں نے میری نسبت یہ کہا کہ یہ مفتری ہے طاعون سے ہلاک ہوگا۔ خدا کی قدرت کہ وہ خود طاعون سے ہلاک ہوگئے اور اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اپنا یہ الہام پیش کرتے تھے کہ ہمیں خدا نے بتلایا ہے کہ یہ شخص جلد مر جائیگا۔ خدا کی شان کہ وہ اپنے ایسے الہاموں کے بعد خود جلد مر گئے اور بعض نے میرے پر بددعائیں کی تھیں کہ وہ جلد ہلاک ہو جائے۔ وہ خود جلد ہلاک ہو گئے۔ مولوی محی الدین لکھو کے والے کا الہام لوگوں کو یاد ہوگا۔ جنہوں نے مجھے کافر ٹھہرایا اور فرعون سے تشبیہ دی اور میرے پر عذاب نازل ہونے کی نسبت الہام شائع کئے آخر آپ ہی ہلاک ہو گئے۔ اور کئی سال ہو گئے کہ وہ اس دنیا سے گذر گئے۔ ایسا ہی مولوی غلام دستگیر قصوری بھی مجھے گالیاں دینے میں حد سے بڑھ گیا تھا۔ جس نے مکّہ سے میرے پر کفر کے فتوے منگوائے تھے وہ بھی بیٹھتے اٹھتے میرے پر بددعا کرتا تھا اور لعنۃ اللہ علی الکاذبین اس کا ورد تھا .... لیکن چونکہ میں صادق تھا اسلئے غلام دستگیر خدا تعالیٰ کی وحی انّی مھین من اراد اھانتک کا شکار ہوگیا اور وہ دائمی ذلّت جو میرے لئے اُس نے چاہی تھی اسی پر پڑ گئی۔

(حقیقۃ الوحی ص ۳۴۰-۳۴۱)

واضح ہو کہ مولوی صاحبزادہ عبداللطیف صاحب کی شہادت کے بعد جو کچھ کابل میں ظہور میں آیا وہ بھی میرے لئے خدا کی طرف سے ایک نشان ہے کیونکہ مظلوم شہید مرحوم کے قتل سے میری سخت اہانت کی گئی۔ اس لئے خدا کے قہر نے کابل پر غضب کی تلوار کھینچی۔ اس مظلوم شہید کے قتل کئے جانے کے بعد سخت ہیضہ کابل میں پھوٹا اور وہ لوگ جو مشورۂ شہید مظلوم کے قتل میں شریک تھے اکثر ہیضہ کا شکار ہو گئے اور خود امیر کابل کے گھروں میں بعض موتوں سے ماتم برپا ہو گیا۔ اور کئی ہزار انسان جو اس قتل سے خوش تھے شکار مرگ ہو گئے اور وبائے ہیضہ کا ایسا سخت طوفان آیا کہ کہتے ہیں کہ کابل میں ایسا ہیضہ گذشتہ زمانوں میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اور الہام انّی مھین من اراد اھانتک اس جگہ بھی پورا ہوا ؎

بنگر خون ناحق پروانہ شمع را ٭ چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

(حقیقۃ الوحی ص۳۵۱)

یہ نشان چراغ دین کے **مباہلہ کا نشان** ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جبکہ چراغ دین کو بار بار یہ شیطانی الہام میری نسبت ہوئے کہ یہ شخص دجّال ہے اور اپنی نسبت یہ الہام ہوا کہ وہ اس دجّال تو نابود کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اور حضرت عیسٰی نے اس کو اپنا عصا دیا ہے تا اس عصا سے اس دجّال کو قتل کرے تو اس کا تکبّر بہت بڑھ گیا اور اس نے ایک کتاب بنائی اور اس کا نام منارۃ المسیح رکھا اور اس میں بار بار یہی بات پر زور دیا کہ گویا میں حقیقت میں موعود دجّال ہوں۔ اور پھر جب منارۃ المسیح کی تالیف پر ایک برس گذر گیا تو اس نے مجھے دجّال ثابت کرنے کے لئے ایک اور کتاب بنائی اور بار بار لوگوں کو یاد دلایا کہ یہ وہی دجّال ہے جس نے آنے کی خبر احادیث میں ہے۔ اور چونکہ غضب الٰہی کا وقت اُس کے لئے قریب آ گیا تھا اس لئے اس نے دوسری کتاب میں مباہلہ کی دعا لکھی اور جناب الٰہی میں دعا کر کے میری ہلاکت چاہی اور مجھے ایک فتنہ قرار دیکر خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ تو اس فتنہ کو دنیا سے اٹھا دے۔ یہ عجیب **قدرت حق** اور **عبرت کا مقام** ہے کہ جب مضمون مباہلہ اُس نے کاتب کے حوالے کیا تو وہ کاپیاں ابھی پتھر پر نہیں جمی تھیں کہ دونوں لڑکے اس کے جو صرف دو ہی تھے طاعون میں مبتلا ہو کر مر گئے اور آخر ۴؍ اپریل ۱۹۰۶ء کو لڑکوں کی موت کے دو تین روز بعد طاعون میں مبتلا ہو کر اس جہان کو چھوڑ گیا اور لوگوں پر ظاہر کر گیا کہ صادق کون ہے اور کاذب کون۔ جو لوگ اس وقت حاضر تھے ان کی زبانی سُنا گیا ہے کہ وہ اپنی موت کے قریب کہتا تھا

کہ " اب خدا بھی میرا دشمن ہو گیا ہے ۔"

(حقیقۃ الوحی صـــ۳۷۳)

صحیح دارقطنی میں یہ ایک حدیث ہے کہ امام محمد باقر فرماتے ہیں ۔ اِنّ لِمَھْدِینا اٰیتین لم تکونا منذ خلق السمٰوٰت والارض ینکسف القمر لاوّل لیلۃ من رمضان وتنکسف الشمس فی النّصف منہ ۔ ترجمہ ۔ یعنی ہمارے مہدی کے لئے دو نشان ہیں ۔ اور جب سے زمین و آسمان خدا نے پیدا کیا یہ دو نشان کسی اور مامور اور رسول کے وقت میں ظاہر نہیں ہوئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ مہدی معہود کے زمانہ میں رمضان کے مہینہ میں چاند کا گرہن اُسکی اول رات میں ہو گا ۔ یعنی تیرھویں تاریخ میں اور سورج کا گرہن اس کے دنوں میں سے بیچ کے دن میں ہو گا ۔ یعنی اسی رمضان کے مہینے کی اٹھائیسویں تاریخ کو ۔ اور ایسا واقعہ ابتدائے دنیا سے کسی رسول یا نبی کے وقت میں کبھی ظہور میں نہیں آیا ۔ صرف مہدی معہود کے وقت اس کا ہونا مقدر ہے ۔ اب تمام انگریزی اور اردو اخبار اور جملہ ماہرین ہیئت اس بات کے گواہ ہیں کہ میرے زمانہ میں ہی جس کو عرصہ قریباً بارہ سال کا گذر چکا ہے اسی صفت کا چاند اور سورج کا گرہن رمضان کے مہینہ میں وقوع میں آیا ہے ۔

(حقیقۃ الوحی صـــ۱۹۴)

۱۸۶۸ء یا ۱۸۶۹ء میں بھی ایک عجیب الہام اردو میں ہوا تھا ۔ جس کو اسجگہ لکھنا مناسب ہے ۔ اور تقریب اس الہام کی یہ پیش آگئی تھی کہ مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب بٹالوی کہ جو کسی زمانہ میں اس عاجز کے ہم مکتب بھی تھے جب نئے نئے مولوی ہو کر بٹالہ میں آئے اور بٹالیوں کو اُن کے خیالات گراں گذرے تو تب ایک شخص نے مولوی صاحب ممدوح سے کسی اختلافی مسئلہ میں بحث کرنے کیلئے اس ناچیز کو بہت مجبور کیا چنانچہ اس کے کہنے کہانے سے یہ عاجز شام کے وقت اس شخص کے ہمراہ مولوی صاحب ممدوح کے مکان پر گیا اور مولوی صاحب کو مع اُن کے والد صاحب کے مسجد میں پایا ۔

پھر خلاصہ یہ کہ اس احقر نے مولوی صاحب موصوف کی اس وقت کی تقریر کو سنکر معلوم کر لیا کہ انکی تقریر میں کوئی ایسی زیادتی نہیں کہ قابل اعتراض ہو ۔ اس لئے خاص اللہ کیلئے بحث کو ترک کیا گیا رات کو خداوند کریم نے اپنے الہام اور مخاطبہ میں اِس ترک بحث کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ

" تیرا خدا تیرے اس فعل سے راضی ہوا اور وہ تجھے بہت برکت

دے گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈینگے۔"

پھر بعد اس کے عالم کشف میں وہ بادشاہ دکھلائے گئے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ چونکہ خالصاً خدا اور اس کے رسول کے لئے انکسار اور تذلل اختیار کیا گیا اس لئے اس محسنِ مطلق نے نہ چاہا کہ اس کو بغیر اجر کے چھوڑے۔

(براہین احمدیہ ص ۵۹۹ حاشیہ در حاشیہ ۳)

ایک دفعہ خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر ریاست پٹیالہ نے اپنے کسی اضطراب اور مشکل کے وقت میری طرف خط لکھا کہ میرے لئے دعا کریں۔ چونکہ انہوں نے کئی دفعہ ہمارے سلسلہ میں خدمت کی تھی اس لئے اُن کے لئے دعا کی گئی۔ تب من جانب اللہ الہام ہُوا:۔

چل رہی ہے نسیم رحمت کی ؛ جو دُعا کیجئے قبول ہے آج

اس دُعا کے بعد خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے وہ مشکلات ان کے دُور کر دیئے۔ اور انہوں نے شکر گذاری کا خط لکھا۔

(حقیقۃ الوحی ص ۳۷۹ - ۳۸۰)

بعض نشان اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کے وقوع میں ایک منٹ کی تاخیر بھی نہیں ہوتی کہ فی الفور واقع ہو جاتے ہیں اور ان میں گواہ کا پیدا ہونا کم میسّر آتا ہے اسی قسم کا یہ ایک نشان ہے کہ ایک دن بعد نماز صبح میرے پر کشفی حالت طاری ہوئی اور مَیں نے اس وقت اس کشفی حالت میں دیکھا کہ میرا لڑکا مبارک احمد باہر سے آیا ہے اور میرے قریب جو ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی اس کے ساتھ پَیر پھسل کر گِر پڑا ہے اور اس کو بہت چوٹ لگی ہے اور تمام کُرتہ خون سے بھر گیا ہے۔ مَیں نے اس وقت مبارک احمد کی والدہ کے پاس جو اس وقت میرے پاس کھڑی تھیں یہ کشف بیان کیا تو ابھی مَیں بیان ہی کر چکا تھا کہ مبارک احمد ایک طرف سے دوڑا آیا جب چٹائی کے پاس پہنچا تو چٹائی سے پَیر پھسل کر گِر پڑا اور سخت چوٹ آئی اور تمام کُرتہ خون سے بھر گیا۔ اور ایک منٹ کے اندر ہی یہ پیشگوئی پوری ہو گئی۔ ایک نادان کہے گا کہ اپنی بیوی کی گواہی کا کیا اعتبار ہے اور نہیں جانتا کہ ہر ایک شخص طبعًا اپنے ایمان کی حفاظت کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر پھر جھوٹ بولے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۳۸۴)

شیخ حامد علی ساکن تھہ غلام نبی ضلع گورداسپورہ جو ایک مدت تک میرے پاس رہا ہے

اور بہت سے نشانوں کا گواہ ہے ایک یہ نشان اس کے روبرو ظہور میں آیا۔ کہ ظہر کی نماز کا وقت تھا کہ یکدفعہ مجھے الہام ہوا کہ ترٰی فخذاً الیمًا۔ یعنی تو ایک دردناک ران دیکھیگا۔ تب میں نے یہ الہام اسکو سُنایا۔ اور پھر بعد اس کے بلا توقف میں نماز کیلئے مسجد کی طرف روانہ ہونے لگا اور وہ بھی میرے ساتھ ہی زینہ پر سے اُترا۔ جب ہم زینہ پر سے اُتر آئے۔ تو دو گھوڑوں پر دو لڑکے سوار دکھائی دیئے جن کی عمر بیس برس کے اندر اندر ہو گی۔ ایک کچھ چھوٹا اور ایک بڑا — وہ سوار ہونے کی حالت میں ہی ہمارے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور ایک نے ان میں سے کہا کہ یہ دوسرا سوار میرا بھائی ہے اور اس کی ران میں سخت درد ہو رہا ہے اسکا کوئی علاج پوچھنے آئے ہیں۔ تب میں نے حامد علی کو کہدیا کہ گواہ رہ کہ یہ پیشگوئی دو تین منٹ میں ہی پوری ہو گئی۔

(تریاق القلوب ص۶۲)

جبکہ دلیپ سنگھ کے پنجاب میں آنے کی خبر مشہور تھی تب مجھے دکھلایا گیا کہ دلیپ سنگھ اپنے اس ارادہ میں ناکام رہے گا اور وہ ہرگز ہندوستان میں قدم نہیں رکھیگا۔ چنانچہ میں نے اس کشف کو لالہ شرمپت ساکن قادیان کو جو آریہ ہے اور کئی ہندو مسلمانوں کو بتلا دیا اور ایک اشتہار بھی شائع کر دیا جو فروری ۱۸۸۲ء میں چھپ کر تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ دلیپ سنگھ عدن سے واپس ہوا اور اس کی عزّت و آسائش میں بہت خطرہ پڑا جیسا کہ میں نے صدہا آدمیوں کو خبر دی تھی۔

(نزول المسیح ص۲۲۶)

ہمارے ایک مخلص دوست مرزا محمد یوسف بیگ صاحب ہیں جو سامانہ علاقہ ریاست پٹیالہ کے رہنے والے ہیں اور ایک مدت دراز سے ہمارے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ اسی تعلق میں تمام عمر رہیں گے اور اسی میں اس دنیا سے گذریں گے۔ ایک دفعہ ان کا لڑکا مرزا ابراہیم بیگ مرحوم بیمار ہوا تو انہوں نے میری طرف دعا کے لئے خط لکھا۔ ہم نے دُعا کی تو کشف میں دیکھا کہ ابراہیم ہمارے پاس بیٹھا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے بہشت سے سلام پہنچا دو جس کے معنے یہی دل میں ڈالے گئے کہ اب ان کی زندگی کا خاتمہ ہے۔ اگرچہ دل نہیں چاہتا تھا تاہم بہت سوچنے کے بعد مرزا محمد یوسف بیگ صاحب کو اس حادثہ سے اطلاع دی گئی اور تھوڑے دنوں کے بعد وہ جوان غریب مزاج فرمانبردار بیٹا ان کی آنکھوں کے سامنے

اس جہان فانی سے چل بسا۔

(نزول المسیح ص۲۲۳)

ہماری ایک لڑکی عصمت بی بی نام تھی۔ ایک دفعہ اس کی نسبت الہام ہوا کہ کرمۃ الجنۃ دوحۃ الجنۃ۔ تفہیم یہ تھی کہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ سو ایسا ہی ہوا۔ ہم اس خیال سے کہ مبادا کسی ناعاقبت اندیش کے دل میں ایسے نشانات کی نسبت کچھ اعتراض پیدا ہو کہ عمر بڑھانے کے لئے دُعا کیوں نہ کی گئی اور کی گئی ہو تو وہ قبول کیوں نہ ہوئی۔ یہ امر واضح کر دیتے ہیں کہ ایسے الہامات کے بعد ملہم لوگوں کو فطرتاً دو قسم کی حالتیں پیش آتی ہیں۔ کبھی تو دعا کی طرف غیب سے توجہ اور جوش دیا جاتا ہے اور وہ اس بات کا نشان ہوتا ہے کہ خدا نے ارادہ فرمایا ہے کہ دعا قبول کرے اور کبھی خدا دعا کو قبول نہیں کرنا چاہتا اور اپنی مرضی کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تب دُعا کرنے والے کی طبیعت پر قبض پیدا کر دیتا ہے اور دُعا کے اسباب اور حضور اور جوش کو ظہور میں نہیں آنے دیتا۔

(نزول المسیح ص۲۱۵)

۲۰ فروری ۱۸۸۶ء میں ابتداءً اور ۱۲ مارچ ۱۸۹۷ء میں ثانیاً یعنی بذریعہ اشتہار ایک پیشگوئی شائع کی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سید احمد خان صاحب کے۔سی۔ایس آئی کو کئی قسم کی بلائیں اور مصائب پیش آئیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا کہ اوّل تو اخیر عمر میں سید صاحب کو ایک جوان بیٹے کی موت کا جانکاہ صدمہ پہنچا اور پھر قوم مسلمانان کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ جو ان کی امانت میں تھا ان کا ایک معتمد علیہ شریر ہندو خیانت سے غبن کر کے اُن کو ایسا صدمہ اور ہم و غم پہنچا گیا جس سے ان کی تمام اندرونی طاقتیں اور قوتیں یکدفعہ سلب ہو گئیں اور جلد انہوں نے راہ عدم دیکھا۔

(نزول المسیح ص۱۹۱)

خداوند علیم و خبیر سے خبر پا کر میں نے اپنے اشتہار ۱۲ مارچ ۱۸۹۷ء میں اس امر کو ظاہر کر دیا تھا کہ اب سید احمد خان صاحب کے سی ایس آئی کی موت کا وقت قریب ہے۔ افسوس ہے کہ ایک نظر دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ سید صاحب غور سے پڑھیں کہ اب ملاقات کے عوض میں یہی اشتہار ہے۔ چنانچہ اس اشتہار کے ایک سال بعد سید صاحب وفات پا گئے۔

(نزول المسیح ص۱۹۱)

مرزا اعظم بیگ سابق اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے ہمارے بعض بے دخل شرکاء کی طرف سے ہماری جائیداد

کی ملکیت میں حصہ دار بننے کے لئے ہم پر نالش دائر کی اور ہمارے بھائی مرزا غلام قادر صاحب مرحوم اپنی فتحیابی کا یقین رکھ کر جواب دہی میں مصروف ہوئے۔ مَیں نے جب اس بارہ میں دُعا کی تو خدائے علیم کی طرف سے مجھے الہام ہوا کہ اجیب کلّ دعائك الّا فی شرکائك۔ پس میں نے سب عزیزوں کو جمع کر کے کھول کر سُنا دیا کہ خدائے علیم نے مجھے خبر دی ہے کہ تم اس مقدمہ میں ہرگز فتحیاب نہ ہوگے اس لئے اس سے دستبردار ہو جانا چاہیئے۔ لیکن انہوں نے ظاہری وجوہات اور اسباب پر نظر کر کے اپنی فتحیابی کو متیقّن خیال کر کے میری بات کی قدر نہ کی اور مقدمہ کی پیروی شروع کر دی اور عدالت ماتحت میں میرے بھائی کو فتح بھی ہوگئی۔ لیکن خدائے عالم الغیب کی وحی کے برخلاف کس طرح ہو سکتا تھا۔ بالآخر چیف کورٹ میں میرے بھائی کو شکست ہوئی اور اس طرح اس الہام کی صداقت سب پر ظاہر ہوگئی۔

(نزول المسیح ص ۲۱۲)

ایسا اتفاق دو ہزار مرتبہ سے بھی زیادہ گذرا ہے کہ خدا تعالیٰ نے میری حاجت کے وقت مجھے اپنے الہام یا کشف سے یہ خبر دی کہ عنقریب کچھ روپیہ آنے والا ہے اور بعض وقت آنے والے روپیہ کی تعداد سے بھی خبر دے دی اور بعض وقت یہ خبر دی کہ اس قدر روپیہ فلاں تاریخ میں اور فلاں شخص کے بھیجنے سے آنے والا ہے۔ اور ایسا ہی ظہور میں آیا اور اس بات کے گواہ بھی بعض قادیان کے ہندو اور کئی سو مسلمان ہونگے جو حلفاً بیان کر سکتے ہیں۔ اور اس قسم کے نشان دو ہزار یا اس سے بھی زیادہ ہیں اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کیونکر خدا تعالیٰ حاجات کے وقت میں میرا متولی اور متکفل ہوتا رہا ہے۔ اور اکثر عادت الٰہی مجھ سے یہی ہے کہ وہ پیش از وقت مجھے بتلا دیتا ہے کہ وہ دنیا کے انعامات میں سے کس قسم کا انعام مجھ پر کرنا چاہتا ہے اور اکثر وہ مجھے بتلا دیتا ہے کہ کل تو یہ کھائیگا اور یہ پیئے گا اور یہ تجھے دیا جائیگا اور ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے کہ جو وہ مجھے بتلاتا ہے۔ اور ان باتوں کی تصدیق چند ہفتہ میرے پاس رہنے سے ہر ایک شخص کر سکتا ہے۔

(تریاق القلوب ص ۶۴-۶۵)

ایک دفعہ مجھے قطعی طور پر الہام ہوا کہ آج ۲۱؎ روپے آئیں گے نہ کم نہ زیادہ۔ چنانچہ قادیان کے آریوں کو ملزم کرنے کے لئے اس روپیہ کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ تب تفتیش کے لئے ایک آریہ گیا اور ہنستا ہوا آتا کہ صرف پانچ روپے آئے ہیں۔ پھر الہام ہوا کہ **اکیس روپے آئے ہیں۔** ایک اور آریہ پھر ڈاکخانہ میں گیا اور وہ خبر لایا کہ دراصل ۲۰؎ روپیہ آئے ہیں ڈاکخانہ والے نے غلطی سے

پانچ روپے کہے تھے۔ اور اس موقعہ پر ایک شخص وزیر سنگھ نامی نے علاج کرانے کی غرض سے ایک روپیہ دے دیا۔ اس طرح پر پورے اکیس روپے ہوگئے۔ یہ بیس روپے منشی الٰہی بخش صاحب اکونٹنٹ نے مجھے بھیجے تھے۔ اور جب ایسی صفائی سے یہ پیشگوئی پوری ہوگئی اور آریہ اس کے گواہ ہوگئے تب مَیں نے ایک روپیہ کی شیرینی آریوں کو کھلا دی تا ہمیشہ اس پیشگوئی کو یاد رکھیں۔

(نزول المسیح ص۱۳۴)

ایک دفعہ یہ وحی الٰہی میری زبان پر جاری ہوئی کہ **عبداللہ خان ڈیرہ اسماعیلخان**۔ وہ صبح کا وقت تھا اور اتفاقاً چند ہندو اس وقت موجود تھے۔ ان میں سے ایک ہندو کا نام بشنداس تھا۔ مَیں نے سب کو اطلاع دی کہ خدا نے مجھے یہ سمجھایا ہے کہ آج اس نام کے ایک شخص کی طرف سے کچھ روپیہ آئیگا۔ بشنداس بول اٹھا کہ مَیں اس بات کا امتحان کرونگا اور مَیں ڈاکخانہ میں جاؤنگا چونکہ قادیان میں ڈاک اُن دنوں میں دوپہر کے بعد دو بجے آتی تھی۔ وہ اسی وقت ڈاکخانہ میں گیا اور جواب لایا کہ ڈاک منشی کی زبانی معلوم ہوا کہ درحقیقت ڈیرہ اسماعیلخاں سے ایک شخص عبداللہ خاں نے جو اکسٹرا اسسٹنٹ ہے روپیہ بھیجا ہے۔ اور پھر اس نے بہت متعجب اور حیرت زدہ ہوکر پوچھا کہ یہ کیونکر معلوم ہوگیا۔ مَیں نے جواب دیا کہ وہ خدا جس کو تم لوگ نہیں پہچانتے اُس نے یہ خبر دی ہے۔

(نزول المسیح ص۱۵۹)

ایک دفعہ اتفاقاً ہمیں پچاس ۵۰ روپے کی ضرورت پیش آئی اور جیسا کہ اہل فقر اور توکّل پر کبھی کبھی ایسی حالت گذرتی ہے۔ اس وقت ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔ سو جب ہم صبح کے وقت سیر کے واسطے گئے تو اس ضرورت کے خیال نے ہم کو یہ جوش دیا کہ اس جنگل میں دعا کریں۔ پس ہم نے ایک پوشیدہ جگہ میں جاکر اس نہر کے کنارہ پر دُعا کی جو قادیان سے تین میل کے فاصلہ پر بٹالہ کی طرف واقع ہے۔ جب ہم دعا کر چکے تو دُعا کے ساتھ ہی ایک الہام ہوا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔ **"دیکھ مَیں تیری دعاؤں کو کیسے جلد قبول کرتا ہوں"**۔ تب ہم خوش ہوکر قادیان کی طرف واپس آئے اور بازار کا رُخ کیا تاکہ ڈاکخانہ سے دریافت کریں کہ آج ہمارے نام کچھ روپیہ آیا ہے یا نہیں۔ چنانچہ ہمیں ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ پچاس روپیہ لدھیانہ سے کسی نے روانہ کئے ہیں اور غالباً وہ روپیہ اسی دن یا دوسرے دن ہمیں مل گیا۔

(نزول المسیح ص۲۳۴)

ایک دفعہ فجر کے وقت الہام ہوا کہ آج حاجی ارباب محمد لشکر خان کے قرابتی کا روپیہ آتا ہے۔

چنانچہ میں نے دو آریہ شرمپت اور ملاوامل ساکنانِ قادیان کو صبح کے وقت یعنی ڈاک آنے کے وقت سے بہت پہلے یہ پیشگوئی بتلا دی۔ مگر ان دونوں آریوں نے بوجہ مخالفت مذہبی کے اس بات پر ضد کی کہ ہم تب مانیں گے کہ جب ہم میں سے کوئی ڈاکخانہ میں جاوے اور اتفاقاً ڈاکخانہ کا سب پوسٹماسٹر بھی ہندو ہی تھا۔ تب میں نے ان کی اس درخواست کو منظور کیا۔ اور جب ڈاک آنے کا وقت ہوا تو ان دونوں میں سے ملاوامل آریہ ڈاک لینے کے لئے گیا۔ اور ایک خط لایا جس میں لکھا تھا کہ سرور خاں نے مبلغ عـــہ بھیجے ہیں۔ اب یہ نیا جھگڑا پیش آیا کہ سرور خاں کون ہے۔ کیا وہ محمد لشکر خاں کا کوئی قرابتی ہے یا نہیں۔ اور آریوں کا حق تھا کہ اس کا فیصلہ کیا جاوے تا اصل حقیقت معلوم ہو۔ تب منشی الٰہی بخش صاحب اکونٹنٹ مصنف عصائے موسیٰ کی طرف جو اس وقت ہوتی مردان میں تھے اور ابھی مخالف نہیں تھے خط لکھا گیا کہ اسجگہ یہ بحث در پیش ہے اور دریافت طلب یہ امر ہے کہ سرور خان کی محمد لشکر خان سے کچھ قرابت ہے یا نہیں۔ چند روز کے بعد منشی الٰہی بخش صاحب کا ہوتی مردان سے جواب آیا جس میں لکھا تھا کہ سرور خان ارباب لشکر خان کا بیٹا ہے۔ تب دونوں آریہ لاجواب رہ گئے۔ اب دیکھو یہ اس قسم کا علمِ غیب ہے کہ عقل تجویز نہیں کر سکتی کہ بجز خدا کے کوئی اس پر قادر ہو سکے۔

(حقیقۃ الوحی صـ ۲۴۸)

عرصہ گذرا ہے کہ ایک دفعہ سخت ضرورت روپیہ کی پیش آئی جس ضرورت کا ہمارے اسجگہ کے آریہ ہم نشینوں کو بخوبی علم تھا اور یہ بھی ان کو خوب معلوم تھا کہ بظاہر کوئی ایسی تقریب پیش نہیں ہے جو جائے امید ہو سکے بلکہ اس معاملہ میں ان کو ذاتی طور پر واقفیت تھی جس کی وہ شہادت دے سکتے ہیں۔ پس جبکہ وہ ایسے مشکل اور فقدانِ اسباب حل مشکل سے کامل طور پر مطلع تھے اس لئے بلا اختیار دل میں اس خواہش نے جوش مارا کہ مشکل کشائی کے لئے حضرت احدیت میں دعا کی جائے تا اس دعا کی قبولیت سے ایک تو اپنی مشکل حل ہو جائے اور دوسرے مخالفین کے لئے تائید الٰہی کا نشان پیدا ہو۔ ایسا نشان کہ اس کی سچائی پر وہ لوگ گواہ ہو جائیں۔ سو اسی دن دعا کی گئی اور خدائے تعالےٰ سے یہ مانگا گیا کہ وہ نشان کے طور پر مالی مدد سے اطلاع بخشے۔ تب یہ الہام ہوا:۔

"دس دن کے بعد میں موج دکھاتا ہوں۔ الا ان نصر اللّٰہ قریب
فی شائل مقیاس۔ دن ول یو گو ٹو امرتسر۔"

یعنی دس دن کے بعد روپیہ آئیگا۔ خدا کی مدد نزدیک ہے۔ اور جیسے جب جننے کے لئے اونٹنی دم اُٹھاتی ہے تب اس کا بچہ جننا نزدیک ہوتا ہے۔ ایسا ہی مدد الٰہی بھی قریب۔ اور پھر انگریزی فقرہ میں یہ فرمایا کہ دس دن کے بعد جب روپیہ آئیگا تب تم امرتسر بھی جاؤ گے۔ تو جیسا اس پیشگوئی میں فرمایا تھا ایسا ہی ہندوؤں یعنی آریوں مذکورہ بالا کے روبرو وقوع میں آیا یعنی حسب منشاء پیشگوئی دس دن تک ایک خرمہرہ نہ آیا اور دس دن کے بعد یعنی گیارھویں روز محمد افضل خاں صاحب سپرنٹنڈنٹ بندوبست راولپنڈی نے ایک سَو دس ۱۱۰ روپے بھیجے اور بیست روپیہ ایک اور جگہ سے آئے اور پھر برابر روپیہ آنے کا سلسلہ جاری ہو گیا جس کی امید نہ تھی۔ اور اسی روز کہ جب دس دن کے گذرنے کے بعد محمد افضل خان صاحب وغیرہ کا روپیہ آیا امرتسر بھی جانا پڑا۔ کیونکہ عدالت خفیفہ امرتسر سے ایک شہادت کے ادا کرنے کے لئے اس عاجز کے نام اسی روز ایک سمن آ گیا۔ سو یہ وہ عظیم الشان پیشگوئی ہے جس کی مفصّل حقیقت پراسجگہ کے چند آریوں کو بخوبی اطلاع ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۵۲۷ حاشیہ در حاشیہ ۳)

ایک دفعہ نواب علی محمد خان مرحوم رئیس لودھیانہ نے میری طرف خط لکھا کہ میرے بعض امور معاش بند ہو گئے ہیں آپ دعا کریں کہ تا وہ کھل جائیں۔ جب مَیں نے دُعا کی تو مجھے الہام ہُوا کہ **کھل جائینگے**" مَیں نے بذریعہ خط اُن کو اطلاع دیدی۔ پھر صرف دو چار دن کے بعد وہ وجوہ معاش کھل گئے۔ اور انکو بشدت اعتقاد ہو گیا۔ پھر ایک دفعہ انہوں نے بعض اپنے پوشیدہ مطالب کے متعلق میری طرف ایک خط روانہ کیا۔ اور جس گھڑی انہوں نے خط ڈاک میں ڈالا اسی گھڑی مجھے الہام ہُوا کہ اس مضمون کا خط اُن کی طرف سے آنے والا ہے۔ تب مَیں نے بلا توقف ان کی طرف یہ خط لکھا کہ اس مضمون کا خط آپ روانہ کرینگے۔ دوسرے دن وہ خط آ گیا۔ اور جب میرا خط انکو ملا تو وہ دریائے حیرت میں ڈوب گئے کہ یہ غیب کی خبر کس طرح مل گئی کیونکہ میرے اِس راز کی خبر کسی کو نہ تھی اور ان کا اعتقاد اِس قدر بڑھا کہ وہ محبت اور ارادت میں فنا ہو گئے اور انہوں نے ایک چھوٹی سی یادداشت کی کتاب میں وہ دونوں نشان متذکرہ بالا درج کر دئیے اور ہمیشہ ان کو پاس رکھتے تھے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۴۶)

ایک وکیل صاحب سیالکوٹ میں ہیں جن کا نام لالہ بھیم سین ہے۔ ایک مرتبہ جب انہوں نے اس ضلع میں وکالت کا امتحان دیا تو مَیں نے ایک خواب کے ذریعہ سے انکو بتلایا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسا مقدر ہے کہ اس ضلع کے کل اشخاص جنہوں نے وکالت یا مختاری کا امتحان دیا ہے، فیل ہو جائینگے

مگر سب میں سے صرف تم ایک ہو کہ وکالت میں پاس ہو جاؤ گے۔ اور یہ خبر مَیں نے تیس کے قریب اور لوگوں کو بھی بتلائی۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ اور سیالکوٹ کی تمام جماعت کی جماعت جنہوں نے وکالت یا مختارکاری کا امتحان دیا تھا فیل کئے گئے اور صرف لالہ بھیم سین پاس ہو گئے اور اب تک وہ سیالکوٹ میں زندہ موجود ہیں۔ اور جو کچھ مَیں نے بیان کیا وہ حلفاً اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

(تریاق القلوب صفحہ ۱۱۲-۱۱۳)

اس ملک پنجاب میں جب دیانند بانی مبانی آریہ مذہب نے اپنے خیالات پھیلائے اور سفلہ طبع ہندوؤں کو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی تحقیر اور ایسے ہی دوسرے انبیاء کی توہین پر چالاک کر دیا اور خود بھی قلم پکڑتے ہی اپنی شیطانی کتابوں میں جا بجا خدا کے تمام پاک اور برگزیدہ نبیوں کی تحقیر اور توہین شروع کی اور خاص اپنی کتاب ستیا رتھ پرکاش میں بہت کچھ جھوٹ کی نجاست کو استعمال کیا اور بزرگ پیغمبروں کو گندی گالیاں دیں۔ تب مجھے اس کی نسبت الہام ہُوا کہ:- **خدا تعالیٰ ایسے موذی کو جلد تر دنیا سے اٹھا لیگا** اور یہ بھی الہام ہُوا۔ **سیہزم الجمع ویولّون الدّبر**۔ یعنی آریہ مذہب کا انجام یہ ہو گا کہ خدا ان کو شکست دے گا۔ اور آخر وہ آریہ مذہب سے بھاگیں گے اور پیٹھ پھیر لیں گے اور آخر کالعدم ہو جائیں گے۔ یہ الہام مدت دراز کا ہے جس پر قریباً تیس برس کا عرصہ گذرا ہے۔ جس سے اسجگہ کے ایک آریہ یعنی لالہ شرمپت کو اطلاع دی گئی تھی اور اس کو کھلے طور پر کہا گیا تھا کہ ان کا بدزبان پنڈت دیانند اب جلد تر فوت ہو جائیگا۔ چنانچہ ابھی ایک سال نہیں گذرا تھا کہ خدا تعالیٰ نے اس پنڈت بدزبان سے اپنے دین کو نجات دی۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۷)

مَیں نے اپنے اشتہار مورخہ ۲۴ رمئی ۱۸۹۷ء میں یہ پیشگوئی کی تھی کہ رومی سلطنت کے ارکانِ دولت بکثرت ایسے ہیں جن کا چال چلن سلطنت کو مضر ہے اور جیسا اسی اشتہار میں درج ہے اس امر کی اشاعت کا یہ باعث ہُوا تھا کہ ایک شخص مسمّی **حسین بک کامی** وائس قونصل مقیم کراچی جو سفیر روم کہلاتا تھا قادیان میرے پاس آیا۔ اور وہ خیال رکھتا تھا کہ وہ اور اس کے باپ سلطنت ٹرکی کے بڑے خیر خواہ اور امین اور دیانتدار ہیں۔ مگر جب وہ میرے پاس آیا تو میری فراست نے گواہی دی کہ یہ شخص امین اور پاک باطن نہیں۔ اور ساتھ ہی میرے خدا نے مجھے القا کیا کہ رومی سلطنت انہی لوگوں کے **شامت اعمال** کے سبب **خطرہ** میں ہے۔ سو مَیں اس سے بیزار ہُوا۔ لیکن اُس نے خلوت میں

کچھ باتیں کرنے کے لئے درخواست کی چونکہ وہ مہمان تھا اس لئے اخلاقی حقوق کی وجہ سے اس کی درخواست کو ردّ نہ کیا گیا۔ پس خلوت میں اُس نے دعا کے لئے درخواست کی۔ تب اس کو وہی جواب دیا گیا جو اشتہار ۲۴؍ مئی ۱۸۹۷ء میں درج کیا گیا تھا۔ اور اس تقریر میں دو پیشگوئیاں تھیں۔ (۱) ایک یہ کہ تم لوگوں کا چال چلن اچھا نہیں اور دیانت اور امانت کے نیک صفات سے تم محروم ہو (۲) دوم یہ کہ اگر تیری یہی حالت رہی تو تجھے اچھا پھل نہیں ملیگا اور تیرا انجام بد ہوگا۔ پھر اسی اشتہار میں یہ لکھا تھا کہ بہتر تھا کہ یہ میرے پاس نہ آتا۔ میرے پاس سے ایسی بدگوئی سے واپس جانا اُس کی سخت بدقسمتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میری نصیحت اُس کو بُری لگی۔ اور اس نے جاکر میری بدگوئی کی۔ پھر اشتہار ۲۵؍ جون ۱۸۹۷ء میں یہ لکھا گیا تھا کہ کیا ممکن نہ تھا کہ جو کچھ مَیں نے رومی سلطنت کے اندرونی نظام کی نسبت بیان کیا وہ دراصل صحیح ہو اور ترکی گورنمنٹ کے شیرازہ میں ایسے دھاگے بھی ہوں جو وقت پر ٹوٹنے والے اور غداری سرشت ظاہر کرنے والے ہوں۔ یہ تو میرے الہامات تھے جو لاکھوں انسانوں میں بذریعہ اشتہارات شائع کئے گئے تھے۔ مگر افسوس کہ ہزارہا مسلمان اور اسلامی ایڈیٹر مجھ پر جوش کے ساتھ ٹوٹ پڑے اور حسین کامی کی نسبت لکھا کہ وہ نائب خلیفۃ اللہ سلطان روم ہے اور پاک باطنی سے سراپا نور ہے اور میری نسبت لکھا کہ یہ واجب القتل ہے۔ سو واضح ہو کہ اس واقعہ کے دو سال بعد یہ پیشگوئیاں ظہور میں آئیں اور حسین کامی کی خیانت اور غبن کا ہندوستان میں شور مچ گیا۔ چنانچہ اخبار نیّر آصفی مدراس مؤرخہ ۱۲؍ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں سے تھوڑا سا نقل کرتے ہیں:— ”حسین کامی نے بڑی بے شرمی کے ساتھ (چندہ مظلومان کریٹ جو ہند میں جمع ہوا تھا اس کے تمام) روپیہ کو بغیر ڈکار لینے کے ہضم کر لیا۔ اور کارکن کمیٹی نے بڑی فراست اور عرقریزی سے اگلوایا۔ یہ روپیہ ایک ہزار چھ سو کے قریب تھا جو کہ حسین کامی کی اراضیات مملوکہ کو نیلام کرا کر وصول کیا گیا اور اس غبن کے سبب حسین کامی کو موقوف کیا گیا۔“

(نزول المسیح ص ۱۸۷-۱۸۸)

عرصہ تخمیناً بارہ برس کا ہوا ہے کہ ایک ہندو صاحب کہ جو اب آریہ سماج قادیان کے ممبر اور صحیح و سلامت موجود ہیں حضرت خاتم الرسل صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آنجناب کی پیشگوئیوں سے سخت منکر تھا اور اس کا پادریوں کی طرح شدّت عناد سے یہ خیال تھا کہ یہ سب پیشگوئیاں مسلمانوں نے آپ بنا لی ہیں ورنہ آنحضرت پر خدا نے کوئی امرِ غیب ظاہر نہیں کیا اور ان میں یہ علامت نبوت موجود ہی نہیں تھی۔ مگر سبحان اللہ کیا فضل خدا کا اپنے نبی پر ہے اور کیا بلند شان

اس معصوم اور مقدس نبی کی ہے کہ جس کی صداقت کی شعاعیں اب بھی ایسی ہی چمکتی ہیں کہ جیسی قدیم سے چمکتی آئی ہیں۔ کچھ تھوڑے دنوں کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ اس ہندو صاحب کا ایک عزیز کسی ناگہانی پیچ میں آکر قید ہو گیا۔ اور اس کے ہمراہ ایک اور ہندو بھی قید ہوا۔ اور ان دونوں کا چیف کورٹ میں اپیل گذرا۔ اس حیرانی اور سرگردانی کی حالت میں ایک دن اس آریہ صاحب نے مجھ سے یہ بات کہی کہ غیبی خبر اسے کہتے ہیں کہ آج کوئی یہ بتلا سکے کہ اس ہمارے مقدمہ کا انجام کیا ہے۔ تب میں نے جواب دیا کہ غیب تو خاصّہ خدا کا ہے اور خدا کے پوشیدہ بھیدوں سے نہ کوئی نجومی واقف ہے نہ رمّال نہ فال گیر نہ اور کوئی مخلوق۔ ہاں خدا جو آسمان و زمین کی ہر ایک شدنی سے واقف ہے اپنے کامل اور مقدس رسولوں کو اپنے ارادہ اور اختیار سے بعض اسرارِ غیبیہ پر مطلع کرتا ہے اور نیز کبھی کبھی جب چاہتا ہے تو اپنے سچے رسول کے کامل تابعین پر جو اہلِ اسلام ہیں ان کی تابعداری کی وجہ سے اور نیز اس باعث سے کہ وہ اپنے رسول کے علوم کے وارث ہیں بعض اسرار پوشیدہ ان پر بھی کھولتا ہے تا اُن کے صدقِ مذہب پر ایک نشان ہو۔ لیکن دوسری قومیں جو باطل پر ہیں جیسے ہندو اور ان کے پنڈت اور عیسائی اور ان کے پادری۔ وہ سب ان کامل برکتوں سے بے نصیب ہیں۔ میرا یہ کہنا ہی تھا کہ وہ شخص اس بات پر اصراری ہو گیا کہ اگر اسلام کے متبعین کو دوسری قوموں پر ترجیح ہے تو اسی موقع پر اس ترجیح کو دکھلانا چاہیئے اس کے جواب میں ہر چند کہا گیا کہ اس میں خدا کا اختیار ہے انسان کا اس پر حکم نہیں۔ مگر اس آریہ نے اپنے انکار پر بہت اصرار کیا۔ غرض جب میں نے دیکھا کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں اور دین اسلام کی عظمتوں سے سخت منکر ہے تب میرے دل میں خدا کی طرف سے بھی جوش ڈالا گیا کہ خدا اس کو اسی مقدمہ میں شرمندہ اور لاجواب کرے اور میں نے دُعا کی کہ اے خداوند کریم تیرے نبی کریم کی عزّت اور عظمت سے یہ شخص سخت منکر ہے اور تیرے نشانوں اور پیشگوئیوں سے جو تو نے اپنے رسول پر ظاہر فرمائیں سخت انکاری ہے اور اس مقدمہ کی آخری حقیقت کھلنے سے یہ لاجواب ہو سکتا ہے اور تو ہر بات پر قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور کوئی امر تیرے علم محیط سے مخفی نہیں۔ تب خدا نے جو اپنے سچے دین اسلام کا حامی ہے اور اپنے رسول کی عزت اور عظمت چاہتا ہے رات کے وقت رؤیا میں کل حقیقت مجھ پر کھول دی اور ظاہر کیا کہ تقدیر الٰہی میں یوں مقدّر ہے کہ اس کی مسل چیف کورٹ سے عدالت ماتحت میں پھر واپس آئیگی اور پھر اس عدالت ماتحت میں نصف قید اس کی تخفیف ہو جائے گی مگر بری نہیں ہو گا۔ اور جو اس کا دوسرا

رفیق ہے وہ پوری قید بھگت کر خلاصی پائے گا۔ اور بری وہ بھی نہیں ہو گا۔ پس میں نے اس خواب سے بیدار ہو کر اپنے خدا کریم کا شکر کیا جس نے مخالف کے سامنے مجھکو مجبور ہونے نہ دیا اور اسی وقت میں نے یہ رؤیا ایک جماعت کثیر کو سنا دیا اور اس ہندو صاحب کو بھی اسی دن خبر کر دی۔ اب مولوی صاحب!!! آپ خود یہاں آکر اور خود اسجگہ پہنچکر جس طرح جی چاہے اس ہندو صاحب سے جو اسجگہ قادیان میں موجود اور نیز دوسرے لوگوں سے دریافت کر سکتے ہیں کہ یہ خبر جو میں نے بیان کی ہے یہ ٹھیک درست ہے یا اس میں کچھ کمی بیشی ہے؟

(براہین احمدیہ ص ۲۶۷-۲۶۹)

ایک دفعہ مجھے خواب میں دکھایا گیا کہ شیخ مہر علی صاحب رئیس ہوشیار پور کے فرش کو آگ لگی ہوئی ہے اور اس آگ کو اس عاجز نے بار بار پانی ڈال کر بجھایا ہے۔ اسی وقت میرے دل میں خدا تعالیٰ کی طرف سے بہ یقین کامل یہ تعبیر ڈالی گئی کہ شیخ صاحب پر اور ان کی عزت پر سخت مصیبت آویگی اور وہ مصیبت اور بلا صرف میری دعا سے دُور کی جاویگی۔ میں نے اس خواب سے شیخ صاحب موصوف کو بذریعہ ایک مفصّل خط کے اطلاع دیدی تھی۔ چنانچہ اس کے چھ ماہ بعد شیخ مہر علی صاحب ایک ایسے الزام میں پھنس گئے کہ انہیں پھانسی کا حکم دیا گیا ایسے نازک وقت میں ان کے بیٹے کی درخواست سے دعا کی گئی اور رہائی کی بشارت اُن کے بیٹے کو لکھی گئی چنانچہ اس کے بعد وہ بالکل رہا ہو گئے۔

(نزول المسیح ص ۱-۲)

چند سال ہوئے ہیں کہ سیٹھ عبد الرحمٰن صاحب تاجر مدراس جو اول درجہ کے مخلص جماعت میں سے ہیں قادیان میں آئے تھے۔ اور ان کی تجارت کے امور میں کوئی تفرقہ اور پریشانی واقع ہو گئی تھی۔ انہوں نے دُعا کے لئے درخواست کی تب یہ الہام ہُوا جو ذیل میں درج ہے:۔

”قادر ہے وہ بارگہ ٹوٹا کام بناوے ؎ بنا بنایا توڑ دے کوئی اس کا بھید نہ پاوے“

اس الہامی عبارت کا یہ مطلب تھا کہ خدا تعالیٰ ٹوٹا ہُوا کام بنا دے گا۔ مگر پھر کچھ عرصے کے بعد بنا بنایا توڑ دے گا۔ چنانچہ یہ الہام قادیان میں ہی سیٹھ صاحب کو سُنایا گیا۔ اور تھوڑے دن ہی گذرے تھے کہ خدا تعالیٰ نے ان کے تجارتی امور میں رونق پیدا کر دی اور ایسے اسباب غیب سے پیدا ہوئے کہ فتوحات مالی شروع ہو گئیں اور پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ بنا بنایا کام ٹوٹ گیا۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۴۸)

عرصہ قریباً پچیس برس کا گذر گیا ہے کہ مجھے خواب میں دکھلایا گیا کہ ایک بڑی لمبی نالی ہے کہ جو کئی کوس تک چلی جاتی ہے۔ اور اس نالی پر ہزارہا بھیڑیں لٹائی ہوئی ہیں اس طرح پر کہ بھیڑوں کا سر نالی کے کنارہ پر ہے اس غرض سے کہ تا ذبح کرنے کے وقت ان کا خون نالی میں پڑے۔ اور باقی حصہ اُن کے وجود کا نالی سے باہر ہے اور نالی شرقاً غرباً واقع ہے اور بھیڑوں کے سر نالی پر جنوب کی طرف سے رکھے گئے ہیں۔ اور ہر ایک بھیڑ پر قصاب بیٹھا ہے۔ اور ان تمام قصابوں کے ہاتھ میں ایک ایک چھری ہے جو ہر ایک بھیڑ کی گردن پر رکھی ہوئی ہے۔ اور آسمان کی طرف ان کی نظر ہے گویا خدا تعالیٰ کی اجازت کے منتظر ہیں۔ اور میں اس میدان میں شمالی طرف پھر رہا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جو دراصل فرشتے ہیں بھیڑوں کے ذبح کرنے کے لئے مستعد بیٹھے ہیں محض آسمانی اجازت کی انتظار ہے۔ تب میں ان کے نزدیک گیا اور میں نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی۔ قل ما یعبؤ بکم ربی لولا دعاؤکم۔ یعنی ان کو کہدے کہ میرا خدا تمہاری پروا کیا رکھتا ہے اگر تم اس کی پرستش نہ کرو اور اس کے حکموں کو نہ سنو۔

اور میرا یہ کہنا ہی تھا کہ فرشتوں نے سمجھ لیا کہ ہمیں اجازت ہوگئی۔ گویا میرے منہ کے لفظ خدا کے لفظ تھے۔ تب فرشتوں نے جو قصابوں کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے فی الفور اپنی بھیڑوں پر چھریں پھیر دیں۔ اور چھریوں کے لگنے سے بھیڑوں نے ایک دردناک طور پر تڑپنا شروع کر دیا۔ تب ان فرشتوں نے سختی سے ان بھیڑوں کی گردن کی تمام رگیں کاٹ دیں۔ اور کہا کہ تم چیز کیا ہو۔ گوہ کھانے والی بھیڑیں ہی ہو۔

میں نے اس کی یہ تعبیر کی کہ ایک سخت وبا ہوگی اور اس سے بہت لوگ اپنی شامت اعمال سے مریں گے۔ اور میں نے یہ خواب بہتوں کو سُنا دی جن میں سے اکثر لوگ اب تک زندہ ہیں اور حلفاً بیان کر سکتے ہیں۔ پھر ایسا ہی ظہور میں آیا اور پنجاب اور ہندوستان اور خاصکر امرتسر اور لاہور میں اس قدر ہیضہ پھوٹا کہ لاکھوں جانیں اس سے تلف ہوئیں۔ اور اس قدر موت کا بازار گرم ہوا کہ مُردوں کو گاڑیوں پر لاد کرے جاتے تھے اور مسلمانوں کا جنازہ پڑھنا مشکل ہوگیا۔

(تریاق القلوب ص۱۱۹)

یہ خدا کا قول ہے کہ تیرے ذریعہ سے **مریضوں پر برکت نازل ہوگی** روحانی اور جسمانی دونوں قسم کے مریضوں پر مشتمل ہے۔ روحانی طور پر اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ میرے ہاتھ پر ہزارہا لوگ بیعت کرنے والے ایسے ہیں کہ پہلے ان کی عملی حالتیں خراب تھیں اور پھر بیعت کرنے کے بعد اُن کے

عملی حالات درست ہوگئے اور طرح طرح کے معاصی سے انہوں نے توبہ کی اور نماز کی پابندی اختیار کی اور مَیں صدہا ایسے لوگ اپنی جماعت میں پاتا ہوں کہ جن کے دلوں میں یہ سوزش اور تپش پیدا ہوگئی ہے کہ کس طرح وہ جذبات نفسانیہ سے پاک ہوں۔ اور جسمانی امراض کی نسبت میں نے بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ اکثر خطرناک امراض والے میری دعا اور توجہ سے شفایاب ہوئے ہیں۔ میرا لڑکا **مبارک احمد** قریباً دو برس کی عمر میں ایسا بیمار ہُوا کہ حالت یاس ظاہر ہوگئی۔ اور ابھی میں دعا کر رہا تھا کہ کسی نے کہا کہ لڑکا فوت ہوگیا ہے یعنی اب بس کرو دعا کا وقت نہیں۔ مگر مَیں نے دعا کرنا بس نہ کیا اور جب مَیں نے اسی حالت توجہ الی اللہ میں لڑکے کے بدن پر ہاتھ رکھا تو معاً مجھے اس کا دم آتا محسوس ہُوا۔ اور ابھی مَیں نے ہاتھ اس سے علیحدہ نہیں کیا تھا کہ صریح طور پر لڑکے میں جان محسوس ہوئی اور چند منٹ کے بعد ہوش میں آکر بیٹھ گیا۔

اور پھر طاعون کے دنوں میں جبکہ قادیان میں طاعون زور پر تھا میرا لڑکا **شریف احمد** بیمار ہُوا اور ایک سخت تپ محرقہ کے رنگ میں چڑھا۔ جس سے لڑکا بالکل بے ہوش ہوگیا اور بیہوشی میں دونوں ہاتھ مارتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگرچہ انسان کو موت سے گریز نہیں مگر اگر لڑکا ان دنوں جو طاعون کا زور ہے فوت ہوگیا تو تمام دشمن اس تپ کو طاعون ٹھہرائینگے اور خدا تعالیٰ کی اس پاک وحی کی تکذیب کرینگے جو اُس نے فرمایا ہے اِنِّیْ اُحَافِظُ کُلَّ مَنْ فِی الدَّارِ۔ یعنی مَیں ہر ایک کو جو تیرے گھر کی چار دیوار کے اندر ہے طاعون سے بچاؤں گا۔ اس خیال سے میرے دل میں وہ صدمہ وارد ہُوا کہ مَیں بیان نہیں کرسکتا۔ قریباً رات کے بارہ بجے کا وقت تھا کہ جب لڑکے کی حالت ابتر ہوگئی اور دل میں خوف پیدا ہُوا کہ یہ معمولی تپ نہیں یہ اور ہی بلا ہے۔ تب مَیں کیا بیان کروں کہ میرے دل کی کیا حالت تھی کہ خدانخواستہ اگر لڑکا فوت ہوگیا تو ظالم طبع لوگوں کو حق پوشی کے لئے بہت کچھ سامان ہاتھ آجائیگا۔ اسی حالت میں مَیں نے وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑا ہوگیا۔ اور معاً کھڑا ہونے کے ساتھ ہی مجھے وہ حالت میسّر آگئی جو استجابت دعا کیلئے ایک کھلی کھلی نشانی ہے اور مَیں اُس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ابھی مَیں شائد تین رکعت پڑھ چکا تھا کہ میرے پر کشفی حالت طاری ہوگئی اور مَیں نے کشفی نظر سے دیکھا کہ لڑکا بالکل تندرست ہے۔ تب وہ کشفی حالت جاتی رہی اور مَیں نے دیکھا کہ لڑکا ہوش کے ساتھ چار پائی پر بیٹھا ہے اور پانی مانگتا ہے۔ اور مَیں چار رکعت پوری کرچکا تھا۔ فی الفور اس کو پانی دیا اور بدن پر ہاتھ لگا کر دیکھا کہ تپ کا نام ونشان نہیں اور ہذیان اور بیتابی اور بیہوشی بالکل دُور ہو چکی تھی اور لڑکے کی حالت بالکل تندرستی کی تھی۔ مجھے اس

خدا کی قدرت کے نظّارہ نے الٰہی طاقتوں اور دعا قبول ہونے پر ایک **تازہ ایمان** بخشا۔

پھر ایک مدت کے بعد ایسا اتفاق ہوُا کہ نواب سردار محمد علی خان رئیس مالیر کوٹلہ کا لڑکا قادیان میں سخت بیمار ہوگیا اور آثار یاس اور نومیدی کے ظاہر ہو گئے۔ انہوں نے میری طرف دعا کیلئے التجا کی میں نے اپنے بیت الدعا میں جاکر اُن کے لئے دعا کی۔ اور دعا کے بعد معلوم ہوُا کہ گویا تقدیر مبرم ہے اور اس وقت دعا کرنا عبث ہے۔ تب مَیں نے کہا کہ یا الٰہی اگر دعا قبول نہیں ہوتی تو مَیں شفاعت کرتا ہوں کہ میرے لئے اس کو اچھا کردے۔ یہ لفظ میرے مُنّہ سے نکل گئے مگر بعد میں مَیں بہت نادم ہوُا کہ ایسا مَیں نے کیوں کہا۔ اور ساتھ ہی مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ وحی ہوئی۔ من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ یعنی کس کو مجال ہے کہ بغیر اذنِ الٰہی شفاعت کرے۔ مَیں اس وحی کو سُن کر چپ ہوگیا۔ اور ابھی ایک منٹ نہیں گذرا ہوگا کہ پھر یہ وحی الٰہی ہوئی کہ ”انک انت المجاز“ یعنی تجھے شفاعت کرنے کی اجازت دی گئی۔ بعد میں پھر مَیں نے دعا پر زور دیا اور مجھے محسوس ہوُا کہ اب یہ دعا خالی نہیں جائیگی۔ چنانچہ اسی دن بلکہ اُسی وقت لڑکے کی حالت روبصحت ہوگئی۔ گویا وہ قبر میں سے نکلا۔ مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ معجزات احیاء موتٰی حضرت عیسٰی علیہ السلام اس سے زیادہ نہ تھے۔ مَیں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ اس قسم کے احیائے موتٰی بہت سے میرے ہاتھ سے ظہور میں آچکے ہیں۔ اور ایک دفعہ بشیر احمد میرا لڑکا آنکھوں کی بیماری سے بیمار ہوگیا۔ اور مدت تک علاج ہوتا رہا کچھ فائدہ نہ ہوُا۔ تب اس کی اضطراری حالت دیکھکر مَیں نے جناب الٰہی میں دُعا کی تو یہ الہام ہوُا ”برّق طفلی بشیر“ یعنی میرے لڑکے بشیر نے آنکھیں کھولدیں۔ تب اُسی دن خدا تعالیٰ کے فضل اور کرم سے اُس کی آنکھیں اچھی ہوگئیں۔ اور ایک مرتبہ مَیں خود بیمار ہوگیا۔ یہاں تک کہ قرب اجل سمجھ کر تین مرتبہ مجھے سورۃ یٰسٓ سُنائی گئی۔ مگر خدا تعالےٰ نے میری دُعا کو قبول فرما کر بغیر ذریعہ کسی دوا کے مجھے شفا بخشی۔ اور جب مَیں صبح اٹھا تو بالکل شفا تھی اور ساتھ ہی یہ وحیٔ الٰہی ہوئی وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فأتوا بشفاءٍ من مثلہ یعنی اگر تم اس رحمت کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کی تو اس شفاء کی کوئی نظیر پیش کرو۔ اِسی طرح بہت سی ایسی صورتیں پیش آئیں جو محض دعا اور توجہ سے خدا تعالیٰ نے بیماروں کو اچھا کردیا جن کا شمار کرنا مشکل ہے۔ ابھی ۸؍ جولائی ۱۹۰۶ء کے دن سے جو پہلی رات تھی میرا لڑکا مبارک احمد خسرہ کی بیماری سے سخت گھبراہٹ اور اضطراب میں تھا۔ ایک رات تو شام سے صبح تک تڑپ تڑپ کر اُس نے بسر کی اور ایک دم نیند نہ آئی اور دوسری رات میں اس سے سخت تر آثار ظاہر ہوئے اور

بیہوشی میں اپنی بوٹیاں توڑتا تھا اور ہذیان کرتا تھا اور ایک سخت خارش بدن میں تھی۔ اس وقت میرا دل دردمند ہوا اور الہام ہوا۔ ادعونی استجب لکم۔ تب معاً دُعا کے ساتھ مجھے کشفی حالت میں معلوم ہوا کہ اس کے بستر پر چوہوں کی شکل پر بہت سے جانور پڑے ہیں اور وہ اس کو کاٹ رہے ہیں اور ایک شخص اٹھا اور اُس نے تمام وہ جانور اکٹھے کرکے ایک چادر میں باندھ دیئے اور کہا کہ اس کو باہر پھینک آؤ اور پھر وہ کشفی حالت جاتی رہی اور میں نہیں جانتا کہ پہلے وہ کشفی حالت دُور ہوئی یا پہلے مرض دُور ہوگئی۔ اور لڑکا آرام سے فجر تک سورہا۔ اور چونکہ خدا تعالےٰ نے اپنی طرف سے یہ **خاص معجزہ** مجھ کو عطا فرمایا ہے اس لئے میں یقیناً کہتا ہوں کہ اس معجزہ شفاء الامراض کے بارے میں کوئی شخص روئے زمین پر میرا **مقابلہ** نہیں کرسکتا اور اگر مقابلہ کا ارادہ کرے تو خدا اُسے شرمندہ کریگا۔

(حقیقۃ الوحی ص ۸۳-۸۸ حاشیہ)

میں نے کئی دفعہ ایسی منذر خوابیں دیکھیں جن میں صریح طور پر یہ بتلایا گیا تھا کہ میر ناصر نواب جو میرے خسر ہیں ان کے عیال کے متعلق کوئی مصیبت آنے والی ہے .... غرض جب اسقدر مجھے الہام ہوئے جن سے یقیناً میرے پر کھل گیا کہ میر صاحب کے عیال پر کوئی مصیبت درپیش ہے تو میں دُعا میں لگ گیا۔ اور وہ اتفاقاً مع اپنے بیٹے اسحاق اور اپنے گھر کے لوگوں کے لاہور جانے کو تھے۔ میں نے ان کو یہ خوابیں سُنا دیں اور لاہور جانے سے روک دیا۔ اور انہوں نے کہا کہ میں آپ کی اجازت کے بغیر ہرگز نہیں جاؤنگا۔ جب دوسرے دن کی صبح ہوئی تو میر صاحب کے بیٹے اسحاق کو تیز تپ چڑھ گیا اور سخت گھبراہٹ شروع ہوگئی۔ اور دونوں طرف بن ران میں گلٹیاں نکل آئیں اور یقین ہوگیا کہ طاعون ہے۔ کیونکہ اس ضلع کے بعض مواضع میں طاعون پھوٹ پڑی ہے۔ تب معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا خوابوں کی تعبیر یہی تھی۔ اور دل میں سخت غم پیدا ہوا۔ اور میں نے میر صاحب کے گھر کے لوگوں کو کہدیا کہ میں تو دعا کرتا ہوں آپ توبہ و استغفار بہت کریں کیونکہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ نے دشمن کو اپنے گھر میں بلایا ہے اور یہ کسی لغزش کی طرف اشارہ ہے۔ اور اگرچہ میں جانتا تھا کہ موت فوت قدیم سے ایک قانون قدرت ہے۔ لیکن یہ خیال آیا کہ اگر خدانخواستہ ہمارے گھر میں کوئی طاعون سے مرگیا تو ہماری تکذیب میں ایک شور قیامت برپا ہو جائیگا۔ اور پھر گو میں ہزار نشان بھی پیش کروں تب بھی اس اعتراض کے مقابل پر کچھ بھی ان کا اثر نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں صدہا مرتبہ لکھ چکا ہوں اور شائع کر چکا ہوں اور ہزارہا لوگوں میں بیان کر چکا ہوں کہ ہمارے گھر کے تمام لوگ طاعون کی موت سے بچے رہیں گے۔ غرض اس وقت جو کچھ میرے دل کی حالت تھی میں

بیان نہیں کر سکتا۔ میں فی الفور دعا میں مشغول ہو گیا۔ اور بعد دعا کے عجیب نظارہ قدرت دیکھا کہ دو تین گھنٹہ میں خارق عادت کے طور پر اسحاق کا تپ اتر گیا۔ اور گلٹیوں کا نام و نشان نہ رہا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ پھرنا چلنا کھیلنا دوڑنا شروع کر دیا گویا کبھی کوئی بیماری ہی نہیں ہوئی تھی۔ یہی ہے احیائے موتٰی۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ حضرت عیسٰی کے احیائے موتٰی میں اس سے ایک ذرہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ اب لوگ جو چاہیں ان کے معجزات پر حاشیے چڑھائیں مگر حقیقت یہی تھی۔ جو شخص حقیقی طور پر مر جاتا ہے اور اس دنیا سے گذر جاتا ہے اور ملک الموت اس کی روح کو قبض کر لیتا ہے وہ ہرگز واپس نہیں آتا۔ دیکھو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے فیمسک التی قضیٰ علیہا الموت۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۲۷-۳۲۹)

ایک دفعہ میرے بھائی مرزا غلام قادر صاحب مرحوم کی نسبت مجھے خواب میں دکھلایا گیا کہ ان کی زندگی کے تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ جو زیادہ سے زیادہ پندرہ دن ہیں۔ بعد میں وہ یکدفعہ سخت بیمار ہو گئے یہاں تک کہ صرف استخوان باقی رہ گئیں اور اس قدر دبلے ہو گئے کہ چارپائی پر بیٹھے ہوئے نہیں معلوم ہوتے تھے کہ کوئی اس پر بیٹھا ہوا ہے یا خالی چارپائی ہے۔ پاخانہ پیشاب اوپر ہی نکل جاتا تھا۔ اور بے ہوشی کا عالم رہتا تھا۔ میرے والد صاحب میرزا غلام مرتضیٰ مرحوم بڑے حاذق طبیب تھے۔ انہوں نے کہدیا کہ اب یہ حالت یاس اور نومیدی کی ہے صرف چند روز کی بات ہے۔ مجھ میں اسوقت جوانی کی قوت موجود تھی اور مجاہدات کی طاقت تھی اور میری فطرت ایسی واقع ہے کہ میں ہر ایک بات پر خدا کو قادر جانتا ہوں اور درحقیقت اس کی قدرتوں کا کون انتہا پا سکتا ہے اور اس کے آگے کوئی بات انہونی نہیں بجز ان امور کے جو اس کے وعدہ کے برخلاف یا اس کی پاک شان کے منافی اور اس کی توحید کی ضد ہیں۔ اس لئے میں نے اس حالت میں بھی ان کے لئے دعا کرنی شروع کی۔ اور میں نے دل میں یہ مقرر کر لیا کہ اس دعا میں تین باتوں میں اپنی معرفت زیادہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا میں حضرتِ عزت میں اس لائق ہوں کہ میری دعا قبول ہو جائے۔

دوسری یہ کہ کیا خواب اور الہام جو وعید کے رنگ میں آتے ہیں ان کی تاخیر بھی ہو سکتی ہے یا نہیں؟

تیسری یہ کہ کیا اس درجہ کا بیمار جس کے صرف استخوان باقی ہیں دُعا کے ذریعہ سے اچھا ہو سکتا ہے یا نہیں؟

غرض مَیں نے اس بنا پر دُعا کرنی شروع کی۔ پس قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ دُعا کے ساتھ ہی تغیر شروع ہو گیا۔ اور اس اثنا میں ایک دوسرے خواب میں مَیں نے دیکھا کہ وہ گویا اپنے دالان میں اپنے قدموں سے چل رہے ہیں۔ اور حالت یہ تھی کہ دوسرا شخص کروٹ بدلتا تھا۔ جب دعا کرتے کرتے پندرہ دن گذرے تو ان میں صحت کے ایک ظاہری آثار پیدا ہو گئے اور انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میرا دل چاہتا ہے کہ چند قدم چلوں۔ چنانچہ وہ کسی قدر سہارے سے اٹھے اور سوٹے کے سہارے سے چلنا شروع کیا اور پھر سوٹا بھی چھوڑ دیا۔ چند روز تک پورے تندرست ہو گئے۔

(حقیقۃ الوحی صـ۲۵۳)

پانچواں نشان جو ان دنوں میں ظاہر ہُوا وہ ایک دُعا کا قبول ہونا ہے جو درحقیقت احیائے موتی میں داخل ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عبدالکریم نام ولد عبدالرحمٰن ساکن حیدر آباد دکن ہمارے مدرسہ میں ایک لڑکا طالب العلم ہے۔ قضاء و قدر سے اُسے سگ دیوانہ کاٹ گیا۔ ہم نے اس کو معالجہ کے لئے کسولی بھیجدیا۔ چند روز تک اس کا کسولی میں علاج ہوتا رہا۔ پھر وہ قادیان میں واپس آیا۔ تھوڑے دن گذرنے کے بعد اس میں وہ آثار دیوانگی کے ظاہر ہوئے کہ جو دیوانہ کُتّے کے کاٹنے کے بعد ظاہر ہُوا کرتے ہیں اور پانی سے ڈرنے لگا اور خوفناک حالت پیدا ہو گئی۔ تب اس غریب الوطن عاجز کے لئے میرا دل سخت بیقرار ہُوا اور دُعا کے لئے ایک خاص توجہ پیدا ہو گئی۔ ہر ایک شخص سمجھتا تھا کہ وہ غریب چند گھنٹہ کے بعد مر جائیگا۔ ناچار اس کو بورڈنگ سے باہر نکال کر ایک الگ مکان میں دوسروں سے علیحدہ ہر ایک احتیاط سے رکھا گیا اور کسولی کے انگریز ڈاکٹروں کی طرف تار بھیجدی اور پوچھا گیا کہ اس حالت میں اس کا کوئی علاج بھی ہے؟ اس طرف سے بذریعہ تار جواب آیا کہ اب اس کا کوئی علاج نہیں۔ مگر اس غریب اور بے وطن لڑکے کیلئے میرے دل میں بہت توجہ پیدا ہو گئی اور میرے دوستوں نے بھی اس کے لئے دُعا کرنے کے لئے بہت ہی اصرار کیا۔ کیونکہ اس غربت کی حالت میں وہ لڑکا قابل رحم تھا۔ اور نیز دل میں یہ خوف پیدا ہُوا کہ اگر وہ مر گیا تو ایک بُرے رنگ میں اس کی موت شماتت اعداء کا موجب ہو گی۔ تب میرا دل اس کے لئے سخت درد اور بے قراری میں مبتلا ہُوا اور خارق عادت توجہ

پیدا ہوئی جو اپنے اختیار سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ محض خدا تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر پیدا ہو جائے تو خدا تعالیٰ کے اذن سے وہ اثر دکھاتی ہے کہ قریب ہے کہ اس سے مردہ زندہ ہو جائے۔ غرض اس کے لئے اقبال علی اللہ کی حالت میسّر آ گئی۔ اور جب وہ توجہ انتہا تک پہنچ گئی اور درد نے اپنا پورا تسلط میرے دل پر کر لیا۔ تب اس بیمار پر جو درحقیقت مُردہ تھا اس توجہ کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ اور یا تو وہ پانی سے ڈرتا اور روشنی سے بھاگتا تھا اور یا یک دفعہ طبیعت نے صحت کی طرف رُخ کیا اور اُس نے کہا کہ اب مجھے پانی سے ڈر نہیں آتا۔ تب اس کو پانی دیا گیا تو اُس نے بغیر کسی خوف کے پی لیا۔ بلکہ پانی سے وضو کر کے نماز بھی پڑھ لی اور تمام رات سوتا رہا۔ اور خوفناک اور وحشیانہ حالت جاتی رہی۔ یہاں تک کہ چند روز تک بکلّی صحت یاب ہو گیا۔ میرے دل میں فی الفور ڈالا گیا کہ یہ دیوانگی کی حالت جو اس میں پیدا ہو گئی تھی یہ اس لئے نہیں تھی کہ وہ دیوانگی اس کو ہلاک کرے بلکہ اس لئے تھی کہ تا خدا کا نشان ظاہر ہو۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص۴۶-۴۷)

مجھے دماغی کمزوری اور دوران سر کی وجہ سے بہت سی ناطاقتی ہو گئی تھی یہاں تک کہ مجھے یہ اندیشہ ہُوا کہ اب میری حالت بالکل تالیف و تصنیف کے لائق نہیں رہی اور ایسی کمزوری تھی کہ گویا بدن میں رُوح نہیں تھی۔ اس حالت میں مجھے الہام ہُوا:۔ ”نُرَدُّ اِلَیْکَ اَنْوَارُ الشَّبَابِ“۔ یعنی جوانی کے نور تیری طرف واپس کئے ۔ بعد اس کے چند روز میں ہی مجھے محسوس ہُوا کہ میری گم شدہ قوتیں پھر واپس آتی جاتی ہیں اور تھوڑے دنوں کے بعد مجھ میں اس قدر طاقت ہو گئی کہ مَیں ہر روز دو دو جزو تالیف کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھ سکتا ہوں اور نہ صرف لکھنا بلکہ سوچنا اور فکر کرنا جو نئی تالیف کے لئے ضروری ہے پورے طور پر میسّر آ گیا۔ ہاں دو مرض میرے لاحق حال ہیں۔ ایک بدن کے اوپر کے حصّہ میں اور دوسری بدن کے نیچے کے حصّہ میں۔ اوپر کے حصّہ میں دورانِ سر ہے اور نیچے کے حصّہ میں کثرت پیشاب ہے اور یہ دونوں مرضیں اسی زمانہ سے ہیں جس زمانہ سے میں نے اپنا دعویٰ ماموریت من اللہ ہونے کا شائع کیا ہے۔ مَیں نے ان کے لئے دعائیں بھی کیں مگر منع میں جواب پایا۔ اور میرے دل میں القا کیا گیا کہ ابتداء سے مسیح موعود کے لئے یہ نشان مقرر ہے کہ وہ دو زرد چادروں کے ساتھ دو فرشتوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے اُتریگا۔ سو یہ وہی دو زرد چادریں ہیں جو میری جسمانی حالت کے ساتھ شامل کی گئیں۔ انبیاء علیہم السلام کے اتفاق سے زرد چادر کی تعبیر بیماری ہے اور دو زرد چادریں دو بیماریاں ہیں جو دو حصّہ بدن پر مشتمل ہیں۔ اور میرے پر بھی خدا تعالیٰ

کی طرف سے یہی کھولا گیا ہے کہ دو زرد چادروں سے مراد دو بیماریاں ہیں۔ اور ضرور تھا کہ خداتعالےٰ کا فرمودہ پورا ہوتا۔

(حقیقۃ الوحی ص ۳۰۶-۳۰۷)

ایک مرتبہ میں سخت بیمار ہؤا۔ یہاں تک کہ تین مختلف وقتوں میں میرے وارثوں نے میرا آخری وقت سمجھ کر مسنون طریقہ پر مجھے تین مرتبہ سورۃ یٰسٓ سُنائی۔ جب تیسری مرتبہ سورۃ یٰسٓ سُنائی گئی تو مَیں دیکھتا تھا کہ بعض عزیز میرے جواَب وہ دنیا سے گذر بھی گئے دیواروں کے پیچھے بے اختیار روتے تھے اور مجھے ایک قسم کا سخت قولنج تھا اور بار بار دمبدم حاجت ہو کر خون آتا تھا۔ سولہ دن برابر ایسی حالت رہی اور اسی بیماری میں میرے ساتھ ایک اور شخص بیمار ہؤا تھا۔ وہ آٹھویں دن راہیٔ ملک بقا ہو گیا۔ حالانکہ اس کے مرض کی شدت ایسی نہ تھی جیسی میری۔ جب بیماری کو سولھواں دن چڑھا تو اس دن بکلّی حالات یاس ظاہر ہو کر تیسری مرتبہ مجھے سورۃ یٰسٓ سنائی گئی۔ اور تمام عزیزوں کے دل میں یہ پختہ یقین تھا کہ آج شام تک یہ قبر میں ہوگا۔ تب ایسا ہؤا کہ جس طرح خدا تعالےٰ نے مصائب سے نجات پانے کیلئے بعض اپنے نبیوں کو دعائیں سکھلائی تھیں مجھے بھی خدا نے الہام کر کے ایک دعا سکھلائی اور وہ یہ ہے :-

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

اور میرے دل میں خدا تعالیٰ نے یہ الہام کیا کہ دریا کے پانی میں جس کے ساتھ ریت بھی ہو ہاتھ ڈال اور یہ کلمات طیبہ پڑھ اور اپنے سینہ اور پشت سینہ اور دونوں ہاتھوں اور مُنہ پر اس کو پھیر کہ اس سے تو شفا پائیگا۔ چنانچہ جلدی سے دریا کا پانی مع ریت منگوایا گیا اور مَیں نے اسی طرح عمل کرنا شروع کیا جیسا کہ مجھے تعلیم دی تھی اور اس وقت حالت یہ تھی کہ میرے ایک ایک بال سے آگ نکلتی تھی اور تمام بدن میں دردناک جلن تھی اور بے اختیار طبیعت اس بات کی طرف مائل تھی کہ اگر موت بھی ہو تو بہتر تا اس حالت سے نجات ہو مگر جب وہ عمل شروع کیا تو مجھے اس خدا کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ہر ایک دفعہ ان کلماتِ طیبہ کے پڑھنے اور پانی کو بدن پر پھیرنے سے میں محسوس کرتا تھا کہ وہ آگ اندر سے نکلتی جاتی ہے اور بجائے اس کے ٹھنڈک اور آرام پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ابھی اس پیالہ کا پانی ختم نہ ہؤا تھا کہ مَیں نے دیکھا کہ بیماری بکلّی مجھے چھوڑ گئی اور مَیں سولہ دن کے بعد رات کو تندرستی کے خواب سے سویا۔ جب صبح ہوئی تو مجھے یہ الہام ہؤا :-

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِشِفَآءٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

یعنی اگر تمہیں اس نشان میں شک ہو جو شفاء دیکر ہم نے دکھلایا تو تم اس کی نظیر کوئی اَور شفاء پیش کرو یہ واقعہ ہے جس کی پچاس آدمی سے زیادہ لوگوں کو خبر ہے ۔

(تریاق القلوب ص۴۲)

ایک دفعہ مجھے دانت میں سخت درد ہوئی ایکدم قرار نہ تھا۔ کسی شخص سے مَیں نے دریافت کیا کہ اس کا کوئی علاج بھی ہے اُس نے کہا کہ علاج دنداں اخراج دنداں ۔ اور دانت نکالنے سے میرا دل ڈرا ۔ تب اس وقت مجھے غنودگی آ گئی اور مَیں زمین پر بیتابی کی حالت میں بیٹھا ہُوا تھا اور چارپائی پاس بچھی تھی ۔ مَیں نے بیتابی کی حالت میں اس چارپائی کی پائینتی پر اپنا ہاتھ رکھدیا اور تھوڑی سی نیند آ گئی اور جب میں بیدار ہُوا تو درد کا نام و نشان نہ تھا اور زبان پر یہ الہام جاری تھا۔ اذا مرضت فهو يشفي یعنی جب تو بیمار ہوتا ہے تو وہ تجھے شفا دیتا ہے ۔ فالحمد لله على ذالك

(حقیقۃ الوحی ص۲۳۵)

۲۷؍ جنوری ۱۹۰۵ء کو حضرت اقدس کے دائیں رخسارہ مبارک پر ایک آماس سا نمودار ہُوا جس سے بہت تکلیف ہوئی ۔ حضور نے دعا فرمائی تو ذیل کے فقرات الہام ہوئے ۔ دم کرنے سے فوراً صحت حاصل ہو گئی : —

بِسْمِ اللّٰهِ الْكَافِيْ بِسْمِ اللّٰهِ الشَّافِيْ بِسْمِ اللّٰهِ الْغَفُوْرِ الرَّحِيْمِ ۔
بِسْمِ اللّٰهِ الْبَرِّ الْكَرِيْمِ ۔ يَا حَفِيْظُ يَا عَزِيْزُ يَا رَفِيْقُ يَا وَلِيُّ اِشْفِنِيْ ۔

(تذکرہ ص۵۲۴)

مَیں نے بعض بیماریوں میں آزمایا ہے اور دیکھا ہے کہ محض دعا سے اس کا فضل ہُوا اور مرض جاتا رہا ۔ ابھی دو چار دن ہوئے ہیں کہ کثرت پیشاب اور اسہال کی وجہ سے مَیں مضمحل ہو گیا تھا ۔ مَیں نے دُعا کی تو الہام ہُوا : — دُعَاءُكَ مُسْتَجَابٌ ۔ اس کے بعد ہی دیکھا کہ وہ شکایت جاتی رہی ۔ خدا ایک ایسا نسخہ ہے جو ہمارے نسخوں سے بہتر ہے اور چھپانے کے قابل ہے مگر یہ دیکھتا ہوں کہ یہ بخل ہے اس لئے ظاہر کرنا پڑتا ہے ۔

(تذکرہ ص۴۷۹)

ایک دفعہ قادیان کا ایک آریہ جو سرگرم آریہ ہے ملاوامل نام مرض دق میں مبتلا ہو گیا اور

تپ پیچھا نہیں چھوڑتا تھا اور آثار نومیدی ظاہر ہوتے جاتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک دن میرے پاس آکر علاج کا طلبگار ہوا۔ اور پھر اپنی زندگی سے نومید ہو کر بیقراری سے رویا۔ اور مَیں نے اس کے حق میں دعا کی۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا۔ قلنا یا نار کونی بردًا وسلامًا۔ یعنی ہم نے کہا کہ اے تپ کی آگ سرد اور سلامتی ہو جا۔ چنانچہ بعد اس کے اُسی ہفتہ میں وہ ہندو اچھا ہو گیا اور اب تک زندہ موجود ہے۔

(نزول المسیح ص۱۶۰)

میاں عبداللہ سنوری جو علاقہ پٹیالہ میں پٹواری ہیں ایک مرتبہ ان کو ایک کام پیش آیا جس کے ہونے کے لئے انہوں نے ہر طرح سے کوشش کی اور بعض وجوہ سے ان کو اس کام کے ہو جانے کی امید بھی ہو گئی تھی۔ پھر انہوں نے دُعا کے لئے ہماری طرف التجا کی۔ ہم نے جب دُعا کی تو بلا توقف الہام ہوا:- "**اے بسا آرزو کہ خاک شدہ**"۔ تب میں نے ان کو کہہ دیا کہ یہ کام ہرگز نہیں ہوگا۔ اور وہ الہام سُنا دیا اور آخر کار ایسا ظہور میں آیا اور کچھ ایسے موانع پیش آئے کہ وہ کام ہوتا ہوتا رہ گیا۔

(نزول المسیح ص۲۳۴)

منجملہ خدا تعالیٰ کے نشانوں کے جو میری تائید میں ظاہر ہوئے نواب صدیق حسن خان وزیر ریاست بھوپال کے بارہ میں نشان ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نواب صدیق حسن خان نے بعض اپنی کتابوں میں لکھا تھا کہ جب مہدی معہود پیدا ہوگا تو غیر مذاہب کے سلاطین گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ اور یہ ذکر کرتے کرتے یہ بھی بیان کر دیا کہ چونکہ اس ملک میں سلطنت برطانیہ ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کے ظہور کے وقت اس ملک کا عیسائی بادشاہ اسی طرح مہدی کے روبرو پیش کیا جائیگا۔ یہ الفاظ تھے جو انہوں نے اپنی کتاب میں شائع کئے تھے جو اب تک ان کی کتابوں میں موجود ہیں اور یہی موجب بغاوت سمجھے گئے ....

چونکہ نواب صدیق حسن خان کے دل میں خشک وہابیت کا خمیر تھا اس لئے انہوں نے غیر قوموں کو صرف مہدی کی تلوار سے ڈرایا اور آخر پکڑے گئے۔ اور نواب ہونے سے معطّل کئے گئے۔ اور بڑی انکسار سے میری طرف خط لکھا کہ مَیں اُن کے لئے دعا کروں۔ تب مَیں نے اسکو قابلِ رحم سمجھ کر اس کے لئے دُعا کی تو خدا تعالےٰ نے مجھ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

"**سرکوبی سے اُس کی عزّت بچائی گئی۔**"

مَیں نے یہ اطلاع بذریعہ خط اُن کو دیدی اور کئی اَور لوگوں کو بھی جو ان دنوں میں مخالف تھے یہی اطلاع دی۔ چنانچہ منجملہ ان کے حافظ محمد یوسف ضلعدار نہر حال پنشنر ساکن امرتسر اور مولوی محمد حسین بٹالوی ہیں۔ آخر کچھ مدت کے بعد اُن کی نسبت گورنمنٹ کا حکم آگیا کہ صدیق حسن خان کی نسبت نواب کا خطاب قائم رہے۔ گویا یہ سمجھا گیا کہ جو کچھ اس نے بیان کیا ایک مذہبی پورانا خیال ہے جو ان کے دل میں تھا بغاوت کی نیت نہیں تھی(☆)۔

(☆) (نوٹ برحاشیہ) نواب صدیق حسن خاں پر جو یہ ابتلا پیش آیا وہ بھی میری ایک پیشگوئی کا نتیجہ ہے جو براہین احمدیہ میں مدرج ہے۔ انہوں نے میری کتاب براہین احمدیہ کو چاک کرکے واپس بھیجدیا تھا۔ مَیں نے دعا کی تھی کہ ان کی عزت چاک کردی جائے۔ سو ایسا ہی ظہور میں آیا۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۴-۳۷)

سنہ ۱۹۰۰ء میں ایسا اتفاق ہوُا کہ میرے چچا زاد بھائیوں میں سے امام الدین نام ایک سخت مخالف تھا۔ اُس نے یہ ایک فتنہ برپا کیا کہ ہمارے گھر کے آگے ایک دیوار کھینچ دی اور ایسے موقع پر دیوار کھینچی کہ مسجد میں آنے جانے کا راستہ رک گیا۔ اور جو مہمان میری نشست کی جگہ پر میرے پاس آتے تھے یا مسجد میں آتے تھے وہ بھی آنے سے رُک گئے اور مجھے اور میری جماعت کو سخت تکلیف پہنچی گویا ہم محاصرہ میں آگئے۔ ناچار دیوانی میں منشی خدا بخش صاحب ڈسٹرکٹ جج کے محکمہ میں نالش کی گئی جب نالش ہو چکی تو بعد میں معلوم ہوُا کہ یہ مقدمہ ناقابل فتح ہے اور اس میں یہ مشکلات ہیں کہ جس زمین پر دیوار کھینچی گئی ہے اس کی نسبت کسی پہلے وقت کی مسل کے رو سے ثابت ہوتا ہے کہ مدعا علیہ یعنی امام الدین قدیم سے اس کا قابض ہے اور یہ زمین دراصل کسی اور شریک کی تھی جس کا نام غلام جیلانی تھا اور اس کے قبضہ میں سے نکل گئی تھی۔ تب اس نے امام الدین کو اس زمین کا قابض خیال کرکے گورداسپور میں بصیغہُ دیوانی نالش کی تھی اور بوجہ ثبوت مخالفانہ قبضہ کے وہ نالش خارج ہو گئی تھی تب سے امام الدین کا اُس پر قبضہ چلا آتا ہے۔ اب اسی زمین پر امام الدین نے دیوار کھینچدی ہے کہ یہ میری زمین ہے۔ غرض نالش کے بعد ایک پُرانی مسل کے ملاحظہ سے یہ ایسا عقدہُ لاینحل ہمارے لئے پیش آگیا تھا جس سے صریح معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا دعویٰ خارج کیا جائیگا کیونکہ جیسا کہ مَیں نے ذکر کیا ہے ایک پورانی مسل سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ اس زمین پر قبضہ امام الدین کا ہے۔ اِس سخت مشکل کو دیکھ کر ہمارے وکیل خواجہ کمال الدین نے ہمیں یہ بھی صلاح دی تھی کہ بہتر ہوگا کہ اس مقدمہ میں صلح کی جائے یعنی امام الدین کو بطور خود کچھ روپیہ دے کر راضی

کر لیا جائے۔ لہٰذا مَیں نے مجبورًا اس تجویز کو پسند کر لیا تھا۔ مگر وہ ایسا انسان نہیں تھا جو راضی ہوتا۔ اس کو مجھ سے بلکہ دین اسلام سے ایک ذاتی بغض تھا اور اس کو پتہ لگ گیا تھا کہ مقدمہ چلانے کا اِن پر قطعًا دروازہ بند ہے۔ لہٰذا وہ اپنی شوخی میں اَور بھی بڑھ گیا۔ آخر ہم نے اِس بات کو خدا تعالےٰ پر چھوڑ دیا۔ مگر جہاں تک ہم نے اور ہمارے وکیل نے سوچا کوئی بھی صورت کامیابی کی نہیں تھی کیونکہ پُرانی مسل سے امام الدین کا ہی قبضہ ثابت ہوتا تھا۔ اور امام الدین کی یہاں تک بدنیت تھی کہ ہمارے گھر کے آگے جو صحن تھا جس میں آکر ہماری جماعت کے لوگ ٹھہرتے تھے وہاں ہر وقت مزاحمت کرتا اور گالیاں نکالتا تھا۔ اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اس نے یہ بھی ارادہ کیا تھا کہ ہمارا مقدمہ خارج ہونے کے بعد ایک لمبی دیوار ہمارے گھر کے دروازوں کے آگے کھینچ دے تاکہ ہم قیدیوں کی طرح محاصرہ میں آجائیں اور گھر سے باہر نکل نہ سکیں۔ اور نہ باہر جا سکیں۔ یہ دن بڑی تشویش کے تھے یہاں تک کہ ہم ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ کا مصداق ہو گئے۔ اور بیٹھے بیٹھے ایک مصیبت پیش آگئی۔ اس لئے جناب الٰہی میں دُعا کی گئی اور اس سے مدد مانگی گئی۔ تب بعد دُعا مندرجہ ذیل الہام ہؤا[۱]۔ اور یہ الہام علیحدہ علیحدہ وقت کے نہیں بلکہ ایک ہی دفعہ ایک ہی وقت میں ہؤا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت سیّد فضل شاہ صاحب لاہوری برادر سیّد ناصر شاہ صاحب اوورسیر متعین بارہ مولا کشمیر میرے پَیر دبا رہا تھا اور دوپہر کا وقت تھا کہ یہ سلسلہ الہام دیوار کے مقدمہ کی نسبت شروع ہؤا۔

مَیں نے سیّد صاحب کو کہا کہ یہ دیوار کے مقدمہ کی نسبت الہام ہے آپ جیسا جیسا یہ الہام ہوتا جائے لکھتے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے قلم دوات اور کاغذ لے لیا۔ پس ایسا ہؤا کہ ہر ایک دفعہ غنودگی کی حالت طاری ہو کر ایک ایک فقرہ وحی الٰہی کا جیسا کہ سنت اللہ ہے زبان پر نازل ہوتا تھا اور جب ایک فقرہ ختم ہو جاتا تھا اور لکھا جاتا تھا تو پھر غنودگی آتی تھی اور دوسرا فقرہ وحی الٰہی کا زبان پر جاری ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ کل وحی الٰہی نازل ہو کر سیّد فضل شاہ صاحب لاہوری کی قلم سے لکھی گئی اور اس میں تفہیم ہوئی کہ یہ اس دیوار کے متعلق ہے جو امام الدین نے کھینچی ہے جس کا مقدمہ عدالت میں دائر ہے۔ اور یہ تفہیم ہوئی کہ انجام کار اس مقدمہ میں فتح ہو گی۔ چنانچہ میں نے اپنی ایک کثیر جماعت کو یہ وحیٔ الٰہی سُنا دی اور اس کے معنے اور شانِ نزول سے اطلاع دے دی۔ اور اخبار الحکم میں چھپوا دیا اور سب کو کہہ دیا کہ اگرچہ مقدمہ اب خطرناک اور صورت نومیدی کی ہے مگر آخر خدا تعالےٰ کچھ ایسے اسباب پیدا کر دیگا جس میں

ہماری فتح ہوگی کیونکہ وحی الٰہی کا خلاصہ مضمون یہی تھا۔ اب ہم اس وحیٔ الٰہی کو معہ ترجمہ ذیل میں لکھتے ہیں اور وہ یہ ہے :۔

اَلرَّحٰی تدور و ینزل القضاء۔ اِنَّ فضل اللّٰہ لَاٰتٍ وَّ لَیْسَ لِاَحَدٍ اَنْ یَّرُدَّ مَا اَتٰی۔ قُلْ اِیْ وَ رَبِّیْ اِنَّہٗ لَحَقٌّ لَا یَتَبَدَّلُ وَلَا یَخْفٰی۔ وَیَنْزِلُ مَا تَعْجَبُ مِنْہُ۔ وَحْیٌ مِّنْ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰی۔ اِنَّ رَبِّیْ لَا یَضِلُّ وَلَا یَنْسٰی۔ ظَفَرٌ مُّبِیْنٌ وَ اِنَّمَا یُؤَخِّرُھُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔ اَنْتَ مَعِیْ وَاَنَا مَعَکَ قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْہُ فِیْ غَیِّہٖ یَتَمَطّٰی۔ اِنَّہٗ مَعَکَ وَ اِنَّہٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَمَا اَخْفٰی۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ یَعْلَمُ کُلَّ شَیْءٍ وَّ یَرٰی۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ ھُمْ یُحْسِنُوْنَ الْحُسْنٰی۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا اَحْمَدَ اِلٰی قَوْمِہٖ فَاَعْرَضُوْا وَ قَالُوْا کَذَّابٌ اَشِرٌ۔ وَجَعَلُوْا یَشْھَدُوْنَ عَلَیْہِ وَ یَسِیْلُوْنَ اِلَیْہِ کَمَاءٍ مُّنْھَمِرٍ۔ اِنَّ حِبِّیْ قَرِیْبٌ۔ اِنَّہٗ قَرِیْبٌ مُّسْتَتِرٌ ....

یہ پیشگوئی ہے جو اس وقت کی گئی تھی جبکہ مخالف دعوے سے کہتے تھے کہ بالیقین مقدمہ خارج ہو جائیگا اور میری نسبت کہتے تھے کہ ہم ان کے گھر کے تمام دروازوں کے سامنے دیوار کھینچ کر دکھ دیں گے کہ گویا وہ قید میں پڑ جائیں گے۔ اور جیسا کہ میں ابھی لکھ چکا ہوں خدا نے اِس پیشگوئی میں خبر دی کہ میں ایک ایسا امر ظاہر کروں گا جس سے جو مغلوب ہے وہ غالب اور جو غالب ہے وہ مغلوب ہو جائیگا۔ اور یہ پیشگوئی اس قدر شائع کی گئی تھی کہ بعض ہماری جماعت کے لوگوں نے اس کو حفظ کر لیا تھا۔ اور صدہا آدمی اس سے اطلاع رکھتے تھے اور تعجب کرتے تھے کہ یہ کیونکر ہوگا۔ غرض کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ پیشگوئی قبل از وقت بلکہ کئی مہینے فیصلہ سے پہلے عام طور پر شائع ہو چکی تھی اور الحکم اخبار میں درج ہو کر دور دراز ملک کے لوگوں تک اس کی خبر پہنچ چکی تھی۔ پھر فیصلہ کا دن آیا۔ اس دن ہمارے مخالف بہت خوش تھے کہ آج اخراج مقدمہ کا حکم سُنایا جائے گا اور کہتے تھے کہ آج سے ہمارے لئے ہر ایک قسم کی ایذا کا موقعہ ہاتھ آجائیگا۔ وہی دن تھا جس میں پیشگوئی کے اس بیان کے معنے کھلنے تھے کہ وہ ایک امر مخفی ہے جس سے مقدمہ پلٹا کھائیگا اور آخر میں وہ ظاہر کیا جائیگا۔ سو ایسا اتفاق ہوا کہ اس دن ہمارے وکیل خواجہ کمال الدین کو خیال آیا کہ پُرانی مسل کا انڈکس دیکھنا چاہیئے

یعنی ضمیمہ جس میں ضروری احکام کا خلاصہ ہوتا ہے۔ جب وہ دیکھا گیا تو اس میں وہ بات نکلی جس کے نکلنے کی توقع نہ تھی۔ یعنی حاکم کا تصدیق شدہ یہ حکم نکلا کہ اس زمین پر قابض نہ صرف امام الدین ہے بلکہ میرزا غلام مرتضیٰ یعنی میرے والد صاحب بھی قابض ہیں۔ تب یہ دیکھنے سے میرے وکیل نے سمجھ لیا کہ ہمارا مقدمہ فتح ہو گیا۔ حاکم کے پاس یہ بیان کیا گیا۔ اس نے فی الفور وہ انڈکس طلب کیا۔ اور چونکہ دیکھتے ہی اس پر حقیقت کھل گئی۔ اس لئے اُس نے بلا توقف امام الدین پر ڈگری زمین کی بمعہ خرچہ کر دی۔ اگر وہ کاغذ پیش نہ ہوتا تو حاکم مجوز بجز اس کے کیا کر سکتا تھا کہ مقدمہ کو خارج کرتا اور دشمن بدخواہ کے ہاتھ سے ہمیں تکلیفیں اٹھانی پڑتیں۔ یہ خدا کے کام ہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۲۶۶ - ۲۷۲)

میں نے اپنے رسالہ انجام آتھم میں بہت سے مخالف مولویوں کا نام لے کر مباہلہ کی طرف ان کو بلایا تھا اور صفحہ ۶۶ رسالہ مذکور میں یہ لکھا تھا کہ اگر کوئی ان میں سے مباہلہ کرے تو میں یہ دُعا کرونگا کہ اُن میں سے کوئی اندھا ہو جائے اور کوئی مفلوج اور کوئی دیوانہ اور کسی کی موت سانپ کے کاٹنے سے ہو اور کوئی بے وقت موت سے مر جائے اور کوئی بے عزت ہو اور کسی کو مال کا نقصان پہنچے۔ پھر اگرچہ تمام مخالف مولوی مردِ میدان بنکر مباہلہ کے لئے حاضر نہ ہوئے مگر پس پشت گالیاں دیتے رہے اور تکذیب کرتے رہے۔ چنانچہ ان میں سے رشید احمد گنگوہی نے صرف لعنۃ اللہ علی الکاذبین نہیں کہا بلکہ اپنے ایک اشتہار میں مجھے شیطان کے نام سے پکارا ہے۔ آخر نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ تمام بالمقابل مولویوں میں سے جو باون ۵۲ تھے آج تک صرف بیس ۲۰ زندہ ہیں اور وہ بھی کسی نہ کسی بلا میں گرفتار باقی سب فوت ہو گئے۔ مولوی رشید احمد اندھا ہوا اور پھر سانپ کے کاٹنے سے مر گیا جیسا کہ مباہلہ کی دعا میں تھا۔ مولوی شاہ دین دیوانہ ہو کر مر گیا۔ مولوی غلام دستگیر خود اپنے مباہلہ سے مر گیا اور جو زندہ ہیں اُن میں سے کوئی بھی آفات متذکرہ بالا سے خالی نہیں حالانکہ ابھی انہوں نے مسنون طور پر مباہلہ نہیں کیا تھا۔

(حقیقۃ الوحی ص ۳۰۰)

قادیان کے آریوں نے محض مجھے دکھ دینے اور بدزبانی کرنے کے لئے ایک اخبار قادیان میں نکالا تھا جس کا نام شبھ چنتک رکھا تھا اور ایڈیٹر اور منتظم اس کے تین آدمی تھے۔

ایک کا نام سومراج دوسرے کا نام اچھر چند تیسرے کا نام بھگت رام تھا۔ ان تینوں کی موت سے خدا کے تین نشان ظاہر ہوئے۔ یہ تینوں نہایت درجہ موذی اور ظالم تھے۔

جس شخص نے ان کے اخبار شبھ چنتک کے چند پرچے دیکھے ہونگے وہ اس بات کا اقرار کرے گا کہ یہ تمام پرچے بدزبانی اور گند اور افترا سے بھرے ہوئے ہیں .... میری نسبت لکھا ہے کہ یہ شخص خود پرست ہے نفس پرست ہے فاسق ہے فاجر ہے اس واسطے گندی اور ناپاک خوابیں اس کو آتی ہیں .... مرزا قادیانی بداخلاق شہرت کا خواہاں شکم پرور ہے .... کمبخت کمانے سے عار رکھنے والا مکر اور فریب اور جھوٹ میں مشاق .... ہم ان کی چالاکیوں کو ضرور طشت از بام کرینگے اور ہمیں امید بھی ہے کہ ہم اپنے ارادہ میں ضرور کامیاب ہونگے .... مرزا مکار اور جھوٹ بولنے والا ہے۔ مرزائی جماعت کے لوگ بدچلن اور بدمعاش ہیں۔

غرض ہر ایک پرچہ ان کا ناپاک گالیوں سے بھرا ہوا نکلتا رہا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ جناب الٰہی میں دعائیں کیں کہ خدا اس اخبار کے کارکنوں کو نابود کرکے اس فتنہ کو درمیان سے اٹھا دے۔ چنانچہ کئی مرتبہ مجھے یہ خبر دی گئی کہ خدا تعالیٰ ان کی بیخ کنی کرے گا۔ زیادہ تر میرے پر ناگوار یہ امر تھا کہ چونکہ یہ لوگ قادیان میں رہتے تھے اس لئے ان کے قرب مکانی کی وجہ سے ان کے جھوٹ کو بطور سچ کے دیکھا جاتا تھا .... جب اخبار شبھ چنتک کے ایڈیٹر اور منتظم گالیاں دینے میں حد سے بڑھ گئے اور خدا نے میرے پر ظاہر کیا کہ اب وہ ہلاک ہونے کو ہیں۔ چنانچہ اکثر وہ الہام اخبار بدر اور الحکم میں بھی شائع ہو گئے۔ تب بعد اس کے ان بدقسمتوں کی سزا کا وقت آ گیا۔ اور یہ تین آدمی تھے۔ ایک کا نام سومراج تھا دوسرے کا نام اچھر چند تھا تیسرے کا نام بھگت رام تھا۔ پس خدا کے قہری طمانچہ نے تین دن کے اندر ہی ان کا کام تمام کر دیا اور تینوں طاعون کے شکار ہو گئے اور اُن کی بلا ان کی اولاد اور اہل و عیال پر بھی پڑی۔ چنانچہ سومراج نہ مرا جب تک اُس نے اپنی عزیز اولاد کی موت طاعون سے نہ دیکھ لی۔ یہ ہے پاداش شرارتوں اور شوخیوں کی۔ مگر اب بھی میں باور نہیں کر سکتا کہ باقی ماندہ رفیق ان لوگوں کے جو قادیان میں موجود ہیں شرارتوں سے باز آ جائیں گے۔ برگزیدہ نبیوں کی روحیں ان کی بدزبانی اور توہین کی وجہ سے اپنے خدائے قدیر کے آگے فریاد کر رہی ہیں پس وہ پاک روحیں بلاشبہ یہ عزت رکھتی ہیں کہ خدا کی غیرت اُن کے لئے بھڑکے۔ اس لئے

یقیناً سمجھو کہ یہ قوم اپنے ہاتھ سے فنا کا بیج بو رہی ہے۔ یاد رہے کہ ناپاک طبع لوگ ہرگز سرسبز نہیں ہو سکتے اور جو درخت خشک بھی ہو اور پھر زہریلا وہ کیونکر محفوظ رکھنے کے لائق ٹھہر سکتا ہے بلکہ وہ سب سے پہلے کاٹا جائیگا۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۱۵۲-۱۵۵)

تخمیناً تیرہ برس ہوئے کہ جب مجھے سعد اللہ نومسلم لدھیانوی کی نسبت الہام ہوا تھا اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ دیکھو انوار الاسلام در اشتہار انعامی دو ہزار روپیہ صفحہ ۱۲۔ اُس وقت ایک بیٹا سعد اللہ کا بعمر سولہ ۱۶ یا پندرہ ۱۵ برس کا موجود تھا۔ بعد اس وحی کے باوجود گذرنے تیرہ ۱۳ برس کے ایک بچہ بھی اس کے گھر میں نہیں ہوا اور پہلا لڑکا اس کا بموجب الہام موصوف کے اس قابل نہیں کہ اس سے نسل جاری ہو سکے۔ پس ابتر کی پیشگوئی کا ثبوت ظاہر ہے اور قطع نسل کی علامات موجود ہیں∴۔

∴ (نوٹ برحاشیہ) اگر سعد اللہ کا پہلا لڑکا نامرد نہیں ہے جو الہام اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ سے پہلے پیدا ہو چکا تھا جس کی عمر تخمیناً تیس برس کی ہے تو کیا وجہ کہ باوجود اس قدر عمر گذرنے اور استطاعت کے اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی اور نہ اس کی شادی کا کچھ فکر ہے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ سعد اللہ پر فرض ہے کہ اس پیشگوئی کی تکذیب کیلئے یا تو اپنے گھر میں اولاد پیدا کر کے دکھلاوے اور یا پہلے لڑکے کی شادی کر کے اور اولاد حاصل کرا کر اس کی مردی ثابت کرے اور یاد رکھے کہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات اسکو ہرگز حاصل نہیں ہوگی کیونکہ خدا کے کلام نے اس کا نام ابتر رکھا ہے اور ممکن نہیں کہ خدا کا کلام باطل ہو۔ **یقیناً وہ ابتر ہی مریگا** جیسا کہ آثار نے ظاہر بھی کر دیا ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص ۳۶۴)

صاحبزادہ عبد اللطیف کی شہادت بھی میری سچائی پر ایک نشان ہے۔ کیونکہ جب سے خدا نے دنیا کی بنیاد ڈالی ہے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ کوئی شخص دیدہ دانستہ ایک جھوٹے مکار مفتری کے لئے اپنی جان دے اور اپنی بیوی کو بیوہ ہونے کی مصیبت میں ڈالے اور اپنے بچوں کا یتیم ہونا پسند کرے اور اپنے لئے سنگساری کی موت قبول کرے۔ یوں تو صدہا آدمی ظلم کے طور پر قتل کئے جاتے ہیں مگر میں جو اس جگہ صاحبزادہ مولوی عبد اللطیف صاحب کی شہادت کو ایک عظیم الشان نشان قرار دیتا ہوں وہ اس وجہ سے نہیں کہ ظلم سے قتل کئے گئے۔

اور شہید کئے گئے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ شہید ہونے کے وقت انہوں نے وہ استقامت دکھائی کہ اس سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں ہو سکتی۔ اُن کو تین مرتبہ امیر نے مختلف وقتوں میں نرمی سے سمجھایا کہ جو شخص قادیان میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس کی بیعت توڑ دو تو آپ کو چھوڑ دیا جائیگا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ آپ کی عزت ہوگی ورنہ سنگسار کئے جاؤ گے۔ انہوں نے ہر ایک مرتبہ میں یہی جواب دیا کہ مَیں اہل علم ہوں اور زمانہ دیدہ ہوں۔ مَیں نے بصیرت کی راہ سے بیعت کی ہے۔ مَیں اس کو تمام دنیا سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اور کئی دن انکو حراست میں رکھا گیا اور سخت دکھ دیا گیا اور ایک بھارا زنجیر ڈالا گیا جو سر سے پاؤں تک تھا اور بار بار سمجھایا اور ترک بیعت پر عزت افزائی کا وعدہ کیا کیونکہ ان کو ریاست کابل سے پرانے تعلقات تھے اور ریاست میں اُن کے حقوق خدمات تھے مگر انہوں نے بار بار کہا کہ مَیں دیوانہ نہیں۔ مَیں نے حق پا لیا ہے۔ مَیں نے بخوبی دیکھ لیا ہے کہ مسیح آنے والا یہی ہے جس کے ہاتھ پر مَیں نے بیعت کی ہے۔ تب نومید ہو کر ناک میں اُن کے رسی ڈال کر پابہ زنجیر سنگساری کے میدان میں لے گئے اور سنگسار کرنے سے پہلے پھر امیر نے انکو سمجھایا کہ اب بھی وقت ہے آپ بیعت توڑ دیں اور انکار کر دیں۔ تب انہوں نے کہا کہ یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ اب میرا وقت قریب ہے۔ میں دنیا کی زندگی کو دین پر ہرگز مقدم نہیں کرونگا۔ کہتے ہیں کہ انکی اس استقامت کو دیکھکر صدہا آدمیوں کے بدن پر لرزہ پڑ گیا اور ان کے دل کانپ اُٹھے کہ یہ کیسا مضبوط ایمان ہے ایسا ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ اور بہتوں نے کہا کہ اگر وہ شخص جس سے بیعت کی گئی ہے خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو صاحبزادہ عبداللطیف یہ استقامت ہرگز نہ دکھلاتا۔ تب اس مظلوم کو پتھروں کے ساتھ شہید کیا گیا۔ اور اُس نے آہ نہ کی۔

(حقیقۃ الوحی ص۳۲۶)

اِنّی رأیت فِی مبشّرۃ اُرِیتُھا جماعۃً من المؤمنین المخلصین والملوک العادلین الصالحین بعضھم من ھٰذ الملک وبعضھم من العرب وبعضھم من فارِس وبعضھم من بلاد الشام وبعضھم من ارض الرّوم وبعضھم من بلادٍ لا أَعرفھا ثم قیل لی من حضرۃ الغیب اِنّ ھٰؤلآء یُصَدّقُونک ویؤمنون بک ویُصلّون علیک ویَدعُون لک واُعطِی لک برکاتٍ حتّٰی یتبرک الملوک بثیابک وادخلھم فی المخلصین۔ ھٰذا رأیت فی المنام والھِمتُ من اللّٰہ العلّام۔

(لجّۃ النور ص۴۰۳)

مجھے اللہ جلّ شانہٗ نے یہ خوشخبری بھی دی ہے کہ وہ بعض امراء اور ملوک کو بھی ہمارے گروہ میں داخل کرے گا۔ اور مجھے اُس نے فرمایا کہ میں تجھے برکت پہ برکت دونگا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔

(برکات الدعا ص۳۵)

عالمِ کشف میں مجھے وہ بادشاہ دکھائے گئے جو گھوڑوں پر سوار تھے اور کہا گیا کہ یہ ہیں جو اپنی گردنوں پر تیری اطاعت کا جُوا اٹھائیں گے اور خدا انہیں برکت دیگا۔

(تجلّیاتِ الٰہیہ ص۲۳ حاشیہ)

اِنّیْ معکم یا نجباء العرب بالقلب والروح۔ وإنّ رَبّیْ قَدْ بَشَّرَنِیْ فی العرب والھمنی عن امونھم وارِیھم طریقھم واصلح لھم شئونھم وستجدوننی فی ھٰذا الامر انشاءاللہ من الفائزین۔

(حمامۃ البشریٰ ص۱۶)

یدعون لک ابدال الشام وعبادُ اللہ من العرب۔ یعنی تیرے لئے ابدال شام دُعا کرتے ہیں اور بندے خدا کے عرب میں سے دُعا کرتے ہیں۔

خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے اور کب اور کیونکر اس کا ظہور ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(مکتوبات احمدیہ جلد اوّل ص۸۶)

انّی اریٰ ان اھل مکۃ یدخُلون افواجًا فی حِزبِ اللہِ القادرِ المختارِ وھٰذا من ربِّ السماء وعجیب فی اعین اھل الارضین۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ اہل مکّہ خدائے قادر کے گروہ میں فوج در فوج داخل ہو جائینگے اور یہ آسمان کے خدا کی طرف سے ہے اور زمینی لوگوں کی آنکھوں میں عجیب۔

(نور الحق حصہ دوم ص۱۰)

فرمایا:۔ مَیں نے دیکھا کہ **زار روس کا سونٹا** میرے ہاتھ میں آگیا ہے وہ بڑا لمبا اور خوبصورت ہے۔ پھر مَیں نے غور سے دیکھا تو وہ بندوق ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بندوق ہے بلکہ اُس میں پوشیدہ نالیاں بھی ہیں گویا بظاہر سونٹا معلوم ہوتا ہے اور وہ بندوق بھی ہے۔ اور پھر دیکھا کہ خوارزم بادشاہ جو بوعلی سینا کے وقت میں تھا۔ اس کی تیر کمان میرے ہاتھ میں ہے۔ بوعلی سینا بھی پاس ہی کھڑا ہے۔ اور اس تیر کمان سے مَیں نے ایک شیر کو بھی شکار کیا۔

(تذکرہ ص۴۷)

فرمایا:- میں اپنی جماعت کو رشیاہ کے علاقہ میں ریت کی مانند دیکھتا ہوں۔

(تذکرہ ص۱۱۴)

مجھے یہ بھی صاف لفظوں میں فرمایا گیا ہے کہ **پھر ایک دفعہ ہندو مذہب کا اسلام کی طرف زور کے ساتھ رجوع ہوگا۔**

(تذکرہ ص۳۰۲)

یہ مت خیال کرو کہ آریہ یعنی ہندو دیانندی مذہب والے کچھ چیز ہیں۔ وہ صرف اس زنبور کی طرح ہیں جس میں بجز نیش زنی کے اور کچھ نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ توحید کیا چیز ہے اور روحانیت سے سراسر بے نصیب ہیں عیب چینی کرنا اور خدا کے پاک رسولوں کو گالیاں دینا ان کا کام ہے اور بڑا کمال ان کا یہی ہے کہ شیطانی وساوس سے اعتراضات کے ذخیرے جمع کر رہے ہیں اور تقویٰ اور طہارت کی رُوح ان میں نہیں۔ یاد رکھو کہ بغیر روحانیت کے کوئی مذہب چل نہیں سکتا۔ اور مذہب بغیر رُوحانیت کے کچھ بھی چیز نہیں۔ جس مذہب میں روحانیت نہیں اور جس مذہب میں خدا کے ساتھ مکالمہ کا تعلق نہیں اور صدق و صفا کی رُوح نہیں اور آسمانی کشش اس کے ساتھ نہیں اور فوق العادت تبدیلی کا نمونہ اس کے پاس نہیں **وہ مذہب مُردہ ہے** اس سے مت ڈرو۔ ابھی تم میں سے لاکھوں اور کروڑوں انسان زندہ ہونگے کہ **اس مذہب کو نابود ہوتے دیکھ لوگے** کیونکہ یہ مذہب آریہ کا زمین سے ہے نہ آسمان سے۔ اور زمین کی باتیں پیش کرتا ہے نہ آسمان کی۔ پس تم خوش ہو اور خوشی سے اچھلو کہ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ اگر تم صدق اور ایمان پر قائم رہوگے تو فرشتے تمہیں تعلیم دینگے اور آسمانی سکینت تم پر اُترے گی اور رُوح القدس سے مدد دیئے جاؤ گے۔ اور خدا ہر ایک قدم میں تمہارے ساتھ ہوگا اور کوئی تم پر غالب نہیں ہو سکیگا۔ خدا کے فضل کی صبر سے انتظار کرو گالیاں سُنو اور چُپ رہو۔ ماریں کھاؤ اور صبر کرو۔ اور حتی المقدور بدی کے مقابلہ سے پرہیز کرو تا آسمان پر تمہاری قبولیت لکھی جاوے۔

(تذکرۃ الشہادتین ص۶۵)

رُویا:- صبح کے وقت لکھا ہُوا دکھایا گیا۔ **"آہ نادر شاہ کہاں گیا"۔**

(تذکرہ ص۵۴۳)

الہام ہُوا:- **"پہلے بنگالہ کی نسبت جو کچھ حکم جاری کیا گیا تھا اب اُنکی دلجوئی ہوگی"۔**

(تذکرہ ص۵۸۹)

ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں خدا تعالیٰ نے خبر دی :-

"سلطنت برطانیہ تا ہشت سال ۔ بعد ازاں ضعف و فساد و اختلال"

(تذکرہ ص ۷۶۳)

ہزار ہزار خدائے ذوالجلال کا شکر ہے کہ محض اس نے اپنے فضل و کرم سے میری تائید میں یہ نشان دکھلائے اور مجھے طاقت نہیں تھی کہ ایک ذرّہ بھی زمین سے یا آسمان سے اپنی شہادت میں کچھ پیش کر سکتا مگر اُس نے جو زمین و آسمان کا مالک ہے جس کی اطاعت کا ذرّہ ذرّہ اس عالم کا جُوا اٹھا رہا ہے میری تائید میں ایک دریا نشانوں کا بہا دیا اور وہ تائید دکھلائی جو میرے خیال اور گمان میں بھی نہیں تھی ۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں اس لائق نہ تھا کہ میری یہ عزت کی جائے مگر خدائے عزّ و جلّ نے محض اپنی ناپیدا کنار رحمت سے میرے لئے یہ معجزات ظاہر فرمائے ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی راہ میں وہ طاعت اور تقویٰ کا حق بجا نہیں لا سکا جو میری مراد تھی اور اس کے دین کی وہ خدمت نہیں کر سکا جو میری تمنّا تھی ۔ میں اس درد کو ساتھ لے جاؤں گا کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیئے تھا میں کر نہیں سکا ۔ لیکن اس خدائے کریم نے میرے لئے اور میری تصدیق کے لئے وہ عجائب کام اپنی قدرت کے دکھلائے جو اپنے خاص برگزیدوں کے لئے دکھلاتا ہے ۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ میں اس عزت اور اکرام کے لائق نہ تھا جو میرے خداوند نے میرے ساتھ معاملہ کیا ۔ جب مجھے اپنے نقصانِ حالت کی طرف خیال آتا ہے تو مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ میں کیڑا ہوں نہ آدمی اور مردہ ہوں نہ زندہ مگر اس کی کیا عجیب قدرت ہے کہ میرے جیسا ہیچ اور ناچیز اس کو پسند آ گیا اور پسندیدہ لوگ تو اپنے اعمال سے کسی درجہ تک پہنچتے ہیں مگر میں تو کچھ بھی نہیں تھا یہ کیا شان رحمت ہے کہ میرے جیسے کو اُس نے قبول کیا ۔ میں اس رحمت کا شکر ادا نہیں کر سکتا ۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۵۸)

خدا تعالیٰ اپنی تائیدات اور اپنے نشانوں کو ابھی ختم نہیں کر چکا اور اسی کی ذات کی مجھے قسم ہے کہ وہ بس نہیں کریگا جب تک میری سچائی دنیا پر ظاہر نہ کر دے ۔ پس اے تمام لوگو ! جو میری آواز سنتے ہو خدا کا خوف کرو اور حد سے مت بڑھو ۔ اگر یہ منصوبہ انسان کا ہوتا تو خدا مجھے ہلاک کر دیتا اور اس تمام کاروبار کا نام و نشان نہ رہتا مگر تم نے دیکھا ہے کہ کیسی خدا تعالیٰ کی نصرت میرے شامل حال ہو رہی ہے اور اسقدر نشان نازل ہوئے جو شمار سے خارج ہیں ۔ دیکھو کس قدر دشمن ہیں جو میرے ساتھ مباہلہ کر کے ہلاک ہو گئے اے بندگان خدا ! کچھ تو سوچو کیا خدا تعالیٰ جھوٹوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے ؟

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۱۱۸)

”مَیں بصیرت کی راہ سے کہتا ہوں کہ اُس خدا قادر کے وعدے سچے ہیں
اور مَیں آنے والے دنوں کو ایسے دیکھتا ہوں کہ گویا وہ آچکے ہیں۔“

باب ششم

انجامِ سلسلہ

”مَیں تو ایک تخم ریزی کرنے آیا ہوں۔ سو میرے ہاتھ سے
وہ تخم بویا گیا۔ اور اب وہ بڑھے گا اور پھولے گا
اور کوئی نہیں جو اس کو روک سکے۔“

ہر طرف آواز دینا ہے ہمارا کام آج
جس کی فطرت نیک ہے آئیگا وہ انجام کار

ہم کو تو خدا تعالیٰ کے اس کلام پر جو ہم پر وحی کے ذریعہ نازل ہوتا ہے اسقدر یقین اور علیٰ وجہ البصیرۃ یقین ہے کہ بیت اللہ میں کھڑا کر کے جس قسم کی چاہو قسم دے دو۔ بلکہ میرا تو یقین یہاں تک ہے کہ اگر میں اس بات کا انکار کروں یا وہم بھی کروں کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں تو معًا کافر ہو جاؤں۔
(ملفوظات جلد دوم ص ۱۴۳)

اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ تم نے کیونکر پہچانا اور یقین کیا کہ وہ کلمات جو تمہاری زبان پر جاری کئے جاتے ہیں وہ خدا کا کلام ہے۔ حدیث النفس یا شیطانی القاء نہیں۔ تو میری رُوح اس سوال کا مندرجہ ذیل جواب دیتی ہے :۔

(۱) **اوّل** جو کلام مجھ پر نازل ہوتا ہے اس کے ساتھ ایک **شوکت** اور **لذّت** اور **تاثیر** ہے۔ وہ ایک فولادی میخ کی طرح میرے دل کے اندر دھنس جاتا ہے اور تاریکی کو دُور کرتا ہے اور اس کے ورود سے مجھے ایک نہایت لطیف **لذّت** آتی ہے۔ کاش اگر مَیں قادر ہو سکتا تو میں اس کو بیان کرتا۔ مگر رُوحانی لذتیں ہوں خواہ جسمانی اُن کی کیفیات کا پورا نقشہ کھینچکر دکھلانا انسانی طاقت سے بڑھکر ہے۔ ایک شخص ایک محبوب کو دیکھتا ہے اور اسکی ملاحتِ حُسن سے لذّت اُٹھاتا ہے مگر وہ بیان نہیں کر سکتا کہ وہ لذت کیا چیز ہے۔ اسی طرح وہ خدا جو تمام ہستیوں کا علّت العلل ہے جیسا کہ اس کا **دیدار** اعلیٰ درجہ کی لذت کا سرچشمہ ہے ایسا ہی اسکی گفتار بھی لذّات کا سرچشمہ ہے۔ اگر ایک کلام انسان سُنے یعنی ایک آواز اس کے دل پر پہنچے اور اس کی زبان پر جاری ہو اور اس کو شبہ باقی رہ جاوے کہ شاید یہ شیطانی آواز ہے یا حدیث النفس ہے تو درحقیقت وہ شیطانی آواز ہوگی یا حدیث النفس ہوگی کیونکہ خدا کا کلام جس قوت اور برکت اور روشنی اور تاثیر اور لذّت اور خدائی طاقت اور چمکتے ہوئے چہرہ کے ساتھ دل پر نازل ہوتا ہے خود یقین دلا دیتا ہے کہ مَیں خدا کی طرف سے ہوں اور ہرگز مردہ آوازوں سے مشابہت نہیں رکھتا بلکہ اس کے اندر ایک جان ہوتی ہے اور اس کے اندر ایک طاقت ہوتی ہے اور اس کے اندر ایک کشش ہوتی ہے اور اس کے اندر یقین بخشنے کی ایک خاصیت ہوتی ہے اور اس کے اندر ایک لذّت ہوتی ہے اور اس کے اندر ایک روشنی ہوتی ہے۔ اور

اُس کے اندر ایک خارق عادت تجلّی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ذرّہ ذرّہ وجود پر تصرف کرنے والے **ملائک** ہوتے ہیں اور علاوہ اس کے اس کے ساتھ خدائی صفات کے اور بہت سے **خوارق** ہوتے ہیں اس لئے ممکن ہی نہیں ہوتا کہ ایسی وحی کے مورد کے دل میں شبہ پیدا ہو سکے بلکہ وہ شبہ کو کفر سمجھتا ہے اور اگر اس کو کوئی اور معجزہ نہ دیا جائے تو وہ اس وحی کو جو ان صفات پر مشتمل ہے بجائے خود ایک معجزہ قرار دیتا ہے۔ ایسی وحی جس شخص پر نازل ہوتی ہے اس شخص کو خدا کی راہ میں اور خدا کی محبت میں ایسے عاشق زار کی طرح بنا دیتی ہے جو اپنے تئیں صدق و ثبات کے کمال کی وجہ سے دیوانہ کی طرح بنا دیتا ہے۔ اس کا یقین اس کے دل کو شہنشاہ کر دیتا ہے وہ **میدان کا بہادر** اور **استغناء کے تخت کا مالک** بن جاتا ہے۔

یہی میرا حال ہے جس کو دنیا نہیں جانتی۔ قبل اس کے جو میں معجزات دیکھوں۔ اور آسمانی تائیدوں کا مشاہدہ کروں میں اس کی کلام سے ہی اُس کی طرف ایسا کھینچا گیا کہ کچھ اٹکل نہیں آتی کہ مجھے کیا ہو گیا۔ تیز تلواریں میرے اس پیوند کو چھڑا نہیں سکتیں۔ کوئی آگ مجھے ڈرا نہیں سکتی۔ وہ کشش جس نے میرے دل پر کام کیا وہ دلائل سے باہر ہے اور بیان سے بلند تر اور براہین سے بالاتر۔ ابتداء میں کلام تھا اس کلام نے جو کچھ کیا سو کیا۔ وہ خدا جو نہاں در نہاں ہے اس نے میری رُوح پر ابتداء میں محض کلام کے ساتھ تجلّی کی اور اپنے مکالمات کا دروازہ میرے پر کھولا۔ پس وہی ایک بات تھی جو بالخصوص میرے لئے کافی کشش ہوئی اور حضرۃ احدیّت کی طرف مجھے کھینچ کر لے گئی اور یہ کہ کلام کی طاقت نے میرے دل پر کیا کیا اثر ڈالے اور مجھے کہاں تک پہنچا دیا۔ اور کیا کیا تبدیلیاں کیں اور **کیا میرے دل میں سے لے لیا اور کیا دیدیا** ان باتوں کو میں کن لفظوں میں ادا کروں اور کس پیرایہ میں دلوں پر بٹھا دوں۔ جن خارق عادت عنایات کے ساتھ وہ مجھ سے نزدیک ہوا کوئی نہیں جانتا مگر میں۔ اور جس محبت کے مقام پر میرا قدم ہے کوئی نہیں جانتا مگر وہ۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ ابتداء اس ترقی اور تعلق کا خدا کا کلام ہے جس کی ناگہانی کشش نے مجھے ایسا اٹھا لیا جیسا کہ ایک زبردست بگولا ایک تنکے کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پھینک دیتا ہے ....

خدا کا کلام جو میرے پر نازل ہوا اور ہوتا ہے وہ میری روحانی والدہ ہے جس سے میں پیدا ہوا۔ اُس نے مجھے ایک وجود بخشا ہے جو پہلے نہ تھا اور ایک رُوح عطا کی ہے جو پہلے نہ تھی۔ میں نے ایک بچے کی طرح اس کی گود میں پرورش پائی اور اس نے مجھے ہر ایک ٹھوکر سے سنبھالا۔ اور ہر ایک گرنے کی جگہ

سے بچا لیا۔ وہ کلام ایک شمع کی طرح میرے آگے آگے چلا یہاں تک کہ مَیں **منزلِ مقصود** تک پہنچ گیا۔ اس سے زیادہ کوئی بد ذاتی نہیں ہوگی کہ مَیں یہ کہوں کہ وہ خدا کا کلام نہیں۔ مَیں اُسی طرح اسکو خدا کا کلام جانتا ہوں جس طرح مَیں یقین رکھتا ہوں کہ مَیں **زبان** سے بولتا ہوں اور **کانوں** سے سنتا ہوں اور مَیں کیونکر اس سے انکار کروں۔ اُس نے تو مجھے **خدا دکھلایا** اور **چشمۂ شیریں** کی طرح معارف کا پانی مجھے پلاتا رہا اور ایک ٹھنڈی ہوا کی طرح ہر ایک حبس کے وقت میں مجھے راحت بخش ہُوا۔ وہ اُن زبانوں میں بھی مجھ پر نازل ہُوا جن زبانوں کو مَیں نہیں جانتا تھا۔ جیسا کہ زبان انگریزی اور سنسکرت اور عبرانی۔ اُس نے بڑی بڑی پیشگوئیوں اور عظیم الشان نشانوں سے ثابت کر دیا کہ وہ خدا کا کلام ہے اور اس نے حقائق و معارف کا ایک خزانہ میرے پر کھول دیا جس سے مَیں اَور میری تمام قوم بے خبر تھی . . . .

کیا یہ باتیں پھینک دینے کے لائق ہیں کہ ایک کلام جس نے **معجزہ** کی طاقت دکھلائی۔ اور اپنی قوی کشش ثابت کی اور غیب کے بیان کرنے میں وہ بخیل نہیں نکلا بلکہ ہزارہا امورِ غیبیہ اس نے ظاہر کئے اور ایک باطنی کمند سے مجھے اپنی طرف کھینچا اور ایک کمند دنیا کے سعید دلوں پہ ڈالا اور میری طرف ان کو لایا اور ان کو آنکھیں دیں جن سے وہ دیکھنے لگے اور کان دیئے جن سے وہ سُننے لگے اور صدق و ثبات بخشا جس سے وہ اس راہ میں قربان ہونے کے لئے موجود ہو گئے تو کیا یہ تمام کاروبار شیطانی یا وسوسہ نفسانی ہے۔ کیا شیطان خدا کے برابر ہو سکتا ہے؟ تو پھر کیوں وہ تمہاری مدد نہیں کرتا؟ سنو! وہ جس نے یہ کلام نازل کیا وہ کیا کہتا ہے۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا:— **مَیں اپنی چمکار دکھلاؤنگا اپنی قدرت نمائی سے تجھ کو اٹھاؤنگا۔ دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اسکو قبول نہ کیا لیکن خدا اسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔**

سو ضرور ہے کہ یہ زمانہ گذر نہ جائے اور ہم اس دنیا سے کوچ نہ کریں جب تک خدا کے وہ تمام وعدے پورے نہ ہوں۔

(نزول المسیح ص ۸۵-۸۹)

مَیں بڑے دعوے اور استقلال سے کہتا ہوں کہ مَیں سچ پر ہوں اور خدائے تعالیٰ کے فضل سے اس میدان میں میری ہی فتح ہے اور جہاں تک میں دُوربین نظر سے کام لیتا ہوں تمام دنیا **اپنی سچائی**

کی تحت اقدام دیکھتا ہوں اور قریب ہے کہ مَیں ایک **عظیم الشان فتح** پاؤں کیونکہ میری زبان کی تائید میں ایک اور زبان بول رہی ہے۔ اور میرے ہاتھ کی تقویت کے لئے ایک اور ہاتھ چل رہا ہے جس کو دنیا نہیں دیکھتی مگر مَیں دیکھ رہا ہوں۔ میرے اندر ایک آسمانی رُوح بول رہی ہے جو میرے لفظ لفظ اور حرف حرف کو زندگی بخشتی ہے۔ اور آسمان پر ایک جوش اور اُبال پیدا ہُوا ہے جس نے ایک پُتلی کی طرح اس مُشتِ خاک کو کھڑا کر دیا ہے۔ ہر یک وہ شخص جس پر توبہ کا دروازہ بند نہیں عنقریب دیکھ لیگا کہ مَیں اپنی طرف سے نہیں ہوں۔ کیا وہ آنکھیں بینا ہیں جو صادق کو شناخت نہیں کر سکتیں؟ کیا وہ بھی زندہ ہے جس کو اس آسمانی صدا کا احساس نہیں؟

(ازالہ اوہام صـ۳۰۳)

اس زمانہ میں جو مذہب اور علم کی نہایت سرگرمی سے لڑائی ہو رہی ہے اس کو دیکھ کر اور علم کے مذہب پر حملے مشاہدہ کر کے بے دل نہیں ہونا چاہیئے کہ اب کیا کریں۔ یقیناً سمجھو کہ اس لڑائی میں اسلام کو مغلوب اور عاجز دشمن کی طرح صلح جوئی کی حاجت نہیں بلکہ **اب زمانہ اسلام کی رُوحانی تلوار کا ہے** جیسا کہ وہ پہلے کسی وقت اپنی ظاہری طاقت دکھلا چکا ہے۔ یہ **پیشگوئی یاد رکھو** کہ عنقریب اس لڑائی میں بھی **دشمن ذلّت کے ساتھ پسپا ہو گا** اور **اسلام فتح پائے گا**۔ حال کے علوم جدیدہ کیسے ہی زور آور حملے کریں۔ کیسے ہی نئے نئے ہتھیاروں کے ساتھ چڑھ چڑھ کر آویں مگر انجام کار ان کے لئے ہزیمت ہے۔ مَیں شکرِ نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ اسلام کی اعلیٰ طاقتوں کا مجھ کو علم دیا گیا ہے جس علم کی رو سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام نہ صرف فلسفۂ جدیدہ کے حملہ سے اپنے تئیں بچائیگا بلکہ حال کے علومِ مخالفہ کو جہالتیں ثابت کر دے گا۔ اسلام کی سلطنت کو ان چڑھائیوں سے کچھ بھی اندیشہ نہیں ہے جو فلسفہ اور طبعی کی طرف سے ہو رہے ہیں۔ اس کے اقبال کے دن نزدیک ہیں اور مَیں دیکھتا ہوں کہ آسمان پر اس کی فتح کے نشان نمودار ہیں۔ یہ اقبال رُوحانی ہے اور فتح بھی رُوحانی تا باطل علم کی مخالفانہ طاقتوں کو اس کی الٰہی طاقت ایسا ضعیف کرے کہ کالعدم کر دیوے۔ مَیں متعجب ہوں کہ آپ نے کس سے اور کہاں سے سُن لیا اور کیونکر سمجھ لیا کہ جو باتیں اس زمانہ کے فلسفہ اور سائنس نے پیدا کی ہیں وہ اسلام پر غالب ہیں۔ حضرت خوب یاد رکھو کہ اس فلسفہ کے پاس تو صرف عقلی استدلالی کا ایک ادھورا سا ہتھیار ہے اور اسلام کے پاس یہ بھی کامل طور پر اور دوسرے کئی آسمانی ہتھیار ہیں پھر اسلام کو اس حملے سے کیا خوف؟ پھر نہ معلوم آپ اسقدر فلسفہ سے

کیوں ڈرتے ہیں اور کیوں اس کے قدموں کے نیچے گرے جاتے ہیں اور کیوں قرآنی آیات کو تاویلات کے شکنجہ پر چڑھا رہے ہیں ....

آپ کو یاد رہے کہ قرآن کا ایک نقطہ یا شعشہ بھی اوّلین اور آخرین کے فلسفہ کے مجموعی جملہ کے ذرہ سے نقصان کا اندیشہ نہیں رکھتا۔ وہ ایسا پتھر ہے کہ جس پر گریگا اس کو پاش پاش کرے گا اور جو اس پر گرے گا وہ خود پاش پاش ہو جائیگا۔ پھر آپ کو دب کر صلح کرنے کی کیوں فکر پڑ گئی؟

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۲۵۴ حاشیہ)

الاشتہار مستیقنًا بوحی اللّٰہ القہّار

دوستو اک نظر خدا کے لئے ؎ سیّد الخلق مصطفٰے کے لئے

مَیں ہر دم اس فکر میں ہوں کہ ہمارا اور نصارٰی کا کسی طرح فیصلہ ہو جائے۔ میرا دل مُردہ پرستی کے فتنہ سے خون ہوتا جاتا ہے اور میری جان عجیب تنگی میں ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کونسا دلی درد کا مقام ہوگا کہ ایک عاجز انسان کو خدا بنایا گیا ہے اور ایک **مشتِ خاک** کو ربّ العالمین سمجھا گیا ہے۔ مَیں کبھی کا اس غم سے فنا ہو جاتا اگر میرا مولیٰ اور میرا قادر توانا مجھے تسلّی نہ دیتا کہ **آخر توحید کی فتح ہے**۔ غیر معبود ہلاک ہونگے اور جھوٹے خدا اپنے خدائی کے وجود سے منقطع کئے جائیں گے۔ مریم کی معبودانہ زندگی پر موت آئیگی اور نیز اس کا بیٹا اب ضرور مرے گا۔ خدا قادر فرماتا ہے کہ اگر مَیں چاہوں تو مریم اور اس کے بیٹے عیسٰی اور تمام زمین کے باشندوں کو ہلاک کر دوں۔ سو اب اس نے چاہا ہے کہ ان دونوں کی جھوٹی معبودانہ زندگی کو موت کا مزہ چکھا دے۔ سو اب دونوں مریں گے کوئی ان کو بچا نہیں سکتا اور وہ تمام خراب استعدادیں بھی مریں گی جو جھوٹے خداؤں کو قبول کر لیتی تھیں۔ **نئی زمین ہوگی اور نیا آسمان ہوگا**۔ اب وہ دن نزدیک آتے ہیں کہ جو سچائی کا آفتاب مغرب کی طرف سے چڑھے گا۔ اور یورپ کو سچے خدا کا پتہ لگیگا۔ اور بعد اس کے توبہ کا دروازہ بند ہوگا کیونکہ داخل ہونے والے بڑے زور سے داخل ہو جائیں گے اور وہی باقی رہ جائیں گے جن کے دل بر فطرت سے دروازے بند ہیں۔ اور نور سے نہیں بلکہ تاریکی سے محبت رکھتے ہیں۔ قریب ہے کہ **سب ملتیں ہلاک ہونگی مگر اسلام** اور **سب حربے ٹوٹ جائیں گے** مگر اسلام کا آسمانی حربہ کہ وہ نہ ٹوٹیگا نہ کند ہوگا جب تک **دجّالیت کو پاش پاش** نہ کر دے

وہ وقت قریب ہے کہ خدا کی سچی توحید جس کو بیابانوں کے رہنے والے اور تمام تعلیموں سے غافل بھی اپنے اندر محسوس کرتے ہیں ملکوں میں پھیلے گی۔ اُس دن نہ کوئی مصنوعی کفارہ باقی رہے گا اور نہ کوئی مصنوعی خدا۔ اور خدا کا ایک ہی ہاتھ کفر کی سب تدبیروں کو باطل کر دے گا۔ لیکن نہ کسی تلوار سے اور نہ کسی بندوق سے بلکہ مستعد روحوں کو روشنی عطا کرنے سے اور پاک دلوں پر ایک نور اتارنے سے۔ تب یہ باتیں جو میں کہتا ہوں سمجھ میں آئیں گی۔

(تبلیغ رسالت جلد ششم ص۸)

یہ لوگ یاد رکھیں کہ ان کی عداوت سے اسلام کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ کیڑوں کی طرح خود ہی مر جائیں گے **مگر اسلام کا نور دن بدن ترقی کرے گا**۔ خدا تعالٰے نے چاہا ہے کہ اسلام کا نور دنیا میں پھیلا وے۔ اسلام کی برکتیں اب اِن مگس طینت مولویوں کی بک بک سے رُک نہیں سکتیں۔ خدا تعالٰے نے مجھے مخاطب کر کے صاف لفظوں میں فرمایا ہے،

انا الفتاح افتح لك۔ ترىٰ نصرا عجيبًا ويخرّون على المساجد۔ ربنا اغفر لنا انا كنّا خاطئين۔ جلابيب الصدق۔ فاستقم كمَا اُمِرْتَ۔ الخوارق تحت منتهى صدق الاقدام۔ كُنْ لِلّٰهِ جميعًا و مع الله جميعًا۔ عسٰى ان يبعثك ربّكَ مقامًا محمودًا ……

اور ایک الہام میں چند دفعہ تکرار اور کسی قدر اختلاف الفاظ کے ساتھ فرمایا کہ **مَیں تجھے عزّت دونگا اور بڑھاؤں گا اور تیرے آثار میں برکت رکھ دونگا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈینگے**۔

اب اے مولویو! اے بخل کی سرشت والو! اگر طاقت ہے تو خدا تعالیٰ کی ان پیشگوئیوں کو ٹال کر دکھلاؤ۔ ہر یک قسم کے فریب کام میں لاؤ اور کوئی فریب اٹھا نہ رکھو۔ پھر دیکھو کہ آخر خدا تعالیٰ کا ہاتھ غالب رہتا ہے یا تمہارا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

المنبہ الناصح مرزا غلام احمد قادیانی۔ جنوری ۱۸۹۲ء

(تبلیغ رسالت جلد دوم ص۹۲)

نادان مولوی اگر اپنی آنکھیں دیدہ و دانستہ بند کرتے ہیں تو کریں۔ سچائی کو ان سے کیا نقصان۔ لیکن وہ زمانہ آتا ہے بلکہ قریب ہے کہ بہتیرے فرعون طبع ان پیشگوئیوں پر غور کرنے سے غرق ہونے سے بچ جائیں گے۔ خدا فرماتا ہے کہ میں حملہ پر حملہ کرونگا یہاں تک کہ مَیں تیری سچائی

دلوں میں بٹھا دونگا۔ پس اے مولویو! اگر تمہیں خدا سے لڑنے کی طاقت ہے تو لڑو۔ مجھ سے پہلے ایک غریب انسان مریم کے بیٹے سے یہودیوں نے کیا کچھ نہ کیا اور کس طرح اپنے گمان میں اسکو سولی دے دی۔ مگر خدا نے اس کو سولی کی موت سے بچایا۔ اور یا تو وہ زمانہ تھا کہ اس کو صرف ایک مکّار اور کذّاب خیال کیا جاتا تھا اور یا وہ وقت آیا کہ اس قدر اس کی عظمت دلوں میں پیدا ہو گئی کہ اب چالیس کروڑ انسان اس کو خدا کر کے مانتا ہے۔ اگرچہ ان لوگوں نے کفر کیا کہ ایک عاجز انسان کو خدا بنایا مگر یہ یہودیوں کا جواب ہے کہ جس شخص کو وہ لوگ ایک جھوٹے کی طرح پیروں کے نیچے کچل دینا چاہتے تھے وہی یسوع مریم کا بیٹا اس عظمت کو پہنچا کہ اب چالیس کروڑ انسان اسکو سجدہ کرتے ہیں۔ اور بادشاہوں کی گردنیں اسکے نام کے آگے جھکتی ہیں۔ سو میں نے اگرچہ یہ دُعا کی ہے کہ یسوع ابن مریم کی طرح شرک کی ترقی کا میں ذریعہ نہ ٹھہرایا جاؤں اور میں یقین رکھتا ہوں کہ **خدا تعالےٰ ایسا ہی کریگا**۔ لیکن خدا تعالیٰ نے مجھے بار بار خبر دی ہے کہ وہ مجھے بہت عظمت دیگا اور میری محبت دلوں میں بٹھائیگا اور میرے سلسلہ کو تمام دنیا میں پھیلائیگا اور سب فرقوں پر میرے فرقہ کو غالب کریگا۔ اور میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رُو سے **سب کا منہ بند کر دینگے** اور ہر ایک قوم **اس چشمہ سے پانی پیئے گی**۔ اور یہ سلسلہ زور سے بڑھیگا اور پھولے گا۔ یہاں تک کہ **زمین پر محیط ہو جاوے گا**۔ بہت سی روکیں پیدا ہونگی اور ابتلا آئیں گے مگر خدا سب کو درمیان سے اُٹھا دیگا اور اپنے وعدہ کو پورا کرے گا۔ اور خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ **میں تجھے برکت پر برکت دونگا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے**۔

سو اے سننے والو! ان باتوں کو **یاد رکھو** اور ان پیش خبریوں کو اپنے صندوقوں میں **محفوظ رکھ لو کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ایک دن پورا ہوگا**۔ میں اپنے نفس میں کوئی نیکی نہیں دیکھتا اور میں نے وہ کام نہیں کیا جو مجھے کرنا چاہئیے تھا اور میں اپنے تئیں صرف ایک نالائق مزدور سمجھتا ہوں۔ یہ محض خدا کا فضل ہے جو میرے شامل حال ہوا۔ پس اس خدائے قادر اور کریم کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس مشت خاک کو اس نے باوجود ان تمام بے ہنریوں کے قبول کیا ؎

عجب دارم از لطفت اے کردگار ؎ پذیرفتۂ چوں من خاکسار

پسندیدگانے بجائے رسند ٭ زما کہترانت چہ آمد پسند
چو از قطرۂ خلق پیدا کنی ! ٭ ہمیں عادت اینجا ہویدا کنی

(تجلیاتِ الٰہیہ ص ۲۱-۲۳)

چند روز ہوئے کہ خداوند کریم کی طرف سے ایک اور الہام ہوا تھا :-

قل ان کنتم تحبّون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ - اِنّی مُتَوَفِّیْکَ ورافعک اِلَیَّ - وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الٰی یوم القیامۃ - وقالوا انّٰی لک ھٰذا - قل ھو اللّٰہ عجیب - یجتبی من یّشاء من عبادہٖ وتلک الایّام نداولھا بین الناس -

ترجمہ :- کہہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو آؤ میری پیروی کرو تا خدا بھی تم سے محبت رکھے - مَیں تجھے وفات دونگا اور تجھے اپنی طرف اٹھاؤنگا - اور مَیں تیرے تابعین کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھونگا - لوگ کہیں گے کہ یہ مقام تجھے کہاں سے حاصل ہوا؟ کہہ وہ خدا عجیب ہے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے چن لیتا ہے - اور یہ دن ہم لوگوں میں پھیرتے رہتے ہیں -

اور یہ آیت کہ وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ **بار بار الہام ہوئی اور اسقدر متواتر ہوئی کہ جسکا شمار خدا ہی کو معلوم ہے** - اور اس قدر زور سے ہوئی کہ میخ فولادی کی طرح دل کے اندر داخل ہو گئی - اس سے یقیناً معلوم ہوا کہ خداوند کریم ان سب دوستوں کو جو اس عاجز کے طریق پر قدم مارینگے بہت سی برکتیں دے گا - اور ان کو دوسرے طریقوں کے لوگوں پر غلبہ بخشے گا اور یہ غلبہ **قیامت تک رہیگا** اور اس عاجز کے بعد کوئی مقبول ایسا آنے والا نہیں کہ جو اس طریق کے مخالف قدم مارے - اور جو مخالف قدم مارے گا اُس کو خدا تباہ کرے گا - اور اس کے سلسلہ کو پائیداری نہیں ہو گی - یہ خدا کی طرف سے وعدہ ہے جو ہرگز تخلف نہیں کرے گا -

(تذکرہ ص ۶۲)

ہمارا انجام کیا ہو گا؟

بجز خدا کے انجام کون بتلا سکتا ہے - اور بجز اس غیب دان کے آخری دنوں کی کس کو خبر ہے دشمن کہتا ہے کہ بہتر ہو کہ یہ شخص ذلّت کے ساتھ ہلاک ہو جائے - اور حاسد کی تمنّا ہے کہ

اس پر کوئی ایسا عذاب پڑے کہ اس کا کچھ بھی باقی نہ رہے۔ لیکن یہ سب لوگ اندھے ہیں اور عنقریب ہے کہ اُن کے بدخیالات اور بدارادے اُنہی پر پڑیں۔ اس میں شک نہیں کہ مفتری بہت جلد تباہ ہو جاتا ہے اور جو شخص کہے کہ مَیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوں اور اس کے الہام اور کلام سے مشرف ہوں حالانکہ نہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے نہ اس کے الہام اور کلام سے مشرف ہے، وہ بہت بُری موت سے مرتا ہے اور اسکا انجام نہایت ہی بد اور قابلِ عبرت ہوتا ہے۔ لیکن جو صادق اور اس کی طرف سے ہیں وہ مر کر بھی زندہ ہو جایا کرتے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے فضل کا ہاتھ اُن پر ہوتا ہے اور سچائی کی رُوح ان کے اندر ہوتی ہے۔ اگر وہ آزمائشوں سے کچلے جاویں اور پیسے جائیں اور خاک کے ساتھ ملائے جائیں اور چاروں طرف سے اُن پر لعن طعن کی بارشیں ہوں اور ان کے تباہ کرنے کے لئے سارا زمانہ منصوبے کرے تب بھی وہ ہلاک نہیں ہوتے۔ کیوں نہیں ہوتے؟ اس سچے پیوند کی برکت سے جو ان کو محبوبِ حقیقی کے ساتھ ہوتا ہے۔ خدا ان پر سب سے زیادہ مصیبتیں نازل کرتا ہے مگر اس لئے نہیں کہ تباہ ہو جائیں بلکہ اس لئے کہ تا زیادہ سے زیادہ پھل اور پھول میں ترقی کریں۔ ہر یک جوہر قابل کے لئے یہی قانون قدرت ہے کہ اوّل صدمات کا تختۂ مشق ہوتا ہے۔ مثلاً اس زمین کو دیکھو جب کسان کئی مہینے تک اپنی قلبہ رانی کا تختۂ مشق رکھتا ہے اور ہل چلانے سے اس کا جگر پھاڑتا رہتا ہے ....

اسی طرح وہ حقیقی کسان کبھی اپنے خاص بندوں کو مٹی میں پھینک دیتا ہے اور لوگ اُن کے اوپر چلتے ہیں اور پیروں کے نیچے کچلتے ہیں اور ہر یک طرح سے اُن کی ذلّت ظاہر ہوتی ہے۔ تب تھوڑے دنوں کے بعد وہ دانے سبزہ کی شکل پر ہو کر نکلتے ہیں اور ایک عجیب رنگ اور آب کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں جو ایک دیکھنے والا تعجب کرتا ہے۔ یہی قدیم سے برگزیدہ لوگوں کے ساتھ سنت اللہ ہے کہ وہ ورطۂ عظیمہ میں ڈالے جاتے ہیں لیکن غرق کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ تا ان موتیوں کے وارث ہوں کہ جو دریائے وحدت کے نیچے ہیں اور وہ آگ میں ڈالے جاتے ہیں لیکن اس لئے نہیں کہ جلائے جائیں بلکہ اس لئے کہ تا خدا تعالےٰ کی قدرتیں ظاہر ہوں اور اُن سے ٹھٹھا کیا جاتا ہے اور لعنت کی جاتی ہے اور وہ ہر طرح سے ستائے جاتے اور دُکھ دیئے جاتے اور طرح طرح کی بولیاں ان کی نسبت بولی جاتی ہیں اور بدظنیاں بڑھ جاتی ہیں یہاں تک کہ بہتوں کے خیال و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ وہ سچے ہیں بلکہ جو شخص اُن کو دُکھ دیتا اور لعنتیں بھیجتا ہے وہ اپنے دل میں خیال کرتا ہے کہ بہت ہی ثواب کا کام کر رہا ہے۔ پس ایک مدت تک ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ اور اگر اس برگزیدہ پر بشریت کے تقاضہ سے

کچھ قبض طاری ہو تو خدا تعالیٰ اس کو ان الفاظ سے تسلّی دیتا ہے کہ صبر کر جیسا کہ پہلوں نے صبر کیا اور فرماتا ہے کہ مَیں تیرے ساتھ ہوں سُنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ پس وہ صبر کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ امر مقدّر اپنے مدت مقررہ تک پہنچ جاتا ہے۔ تب غیرت الٰہی اس غریب کے لئے جوش مارتی ہے۔ اور ایک ہی تجلّی میں اعداد کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ سو اوّل نوبت دشمنوں کی ہوتی ہے اور اخیر میں اس کی نوبت آتی ہے۔

اسی طرح خداوند کریم نے بارہا مجھے سمجھایا کہ ہنسی ہوگی اور ٹھٹھا ہوگا اور لعنتیں کرینگے اور بہت ستائیں گے لیکن آخر نصرت الٰہی تیرے شامل حال ہوگی اور خدا دشمنوں کو مغلوب اور شرمندہ کرے گا۔ چنانچہ براہین احمدیہ میں بھی بہت سا حصّہ الہامات کا انہی پیشگوئیوں کو بتلا رہا ہے اور مکاشفات بھی یہی بتلا رہے ہیں۔ چنانچہ ایک کشف میں مَیں نے دیکھا کہ ایک فرشتہ میرے سامنے آیا اور وہ کہتا ہے کہ لوگ پھرتے جاتے ہیں۔ تب مَیں نے اس کو کہا کہ تم کہاں سے آئے تو اس نے عربی زبان میں جواب دیا اور کہا کہ جئتُ من حضرۃ الوتر۔ یعنی مَیں اس کی طرف سے آیا ہوں جو اکیلا ہے۔ تب مَیں اس کو ایک طرف خلوت میں لے گیا۔ اور مَیں نے کہا کہ لوگ پھرتے جاتے ہیں مگر کیا تم بھی پھر گئے تو اس نے کہا کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ تب مَیں اس حالت سے منتقل ہو گیا۔ لیکن یہ سب امور درمیانی ہیں اور جو خاتمہ امر پر منعقد ہو چکا ہے وہ یہی ہے کہ بار بار کے الہامات اور مکاشفات سے جو ہزارہا تک پہنچ گئے ہیں اور آفتاب کی طرح روشن ہیں خدا تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا کہ مَیں آخر کار تجھے فتح دوں گا۔ اور ہر ایک الزام سے تیری بریّت ظاہر کر دونگا اور تجھے غلبہ ہوگا اور تیری جماعت قیامت تک اپنے مخالفوں پر غالب ہوگی اور فرمایا کہ مَیں زور آور حملوں سے تیری سچائی ظاہر کروں گا۔ اور یاد رہے کہ یہ الہامات اس واسطے نہیں لکھے گئے کہ ابھی کوئی ان کو قبول کر لے۔ بلکہ اس واسطے کہ ہر یک چیز کے لئے ایک موسم اور وقت ہے۔ پس جب ان الہامات کے ظہور کا وقت آئیگا تو اس وقت یہ تحریر مستعد دلوں کے لئے زیادہ تر ایمان اور تسلّی اور یقین کا موجب ہوگی۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

(انوار الاسلام ص ۵۲-۵۴)

ہمیشہ یہ امر واقع ہوتا ہے کہ جو خدا کے خاص حبیب اور وفادار بندے ہیں ان کا صدق خدا کے ساتھ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ دنیادار اندھے اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ اس لئے

ہر ایک سجادہ نشینوں اور مولویوں میں سے ان کے مقابلہ کے لئے اٹھتا ہے اور وہ مقابلہ اُس سے نہیں بلکہ خدا سے ہوتا ہے۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکے کہ جس شخص کو خدا نے ایک عظیم الشان غرض کے لئے پیدا کیا ہے اور جس کے ذریعہ سے خدا چاہتا ہے کہ ایک بڑی تبدیلی دنیا میں ظاہر کرے ایسے شخص کو چند جاہل اور بُزدل اور خام اور ناتمام اور بے وفا زاہدوں کی خاطر سے ہلاک کر دے۔ اگر دو کشتیوں کا باہم ٹکراؤ ہو جائے جن میں سے ایک ایسی ہے کہ اس میں بادشاہِ وقت جو عادل اور کریم الطبع اور فیاض اور سعید النفس ہے مع اپنے خاص ارکان کے سوار ہے۔ اور دوسری کشتی ایسی ہے جس میں چند چوہڑے یا چمار یا ساہنسی بدمعاش بدوضع بیٹھے ہیں اور ایسا موقع آ پڑا ہے کہ ایک کشتی کا بچاؤ اس میں ہے کہ دوسری کشتی معہ اس کے سواروں کے تباہ کی جائے تو اب بتاؤ کہ اس وقت کونسی کارروائی بہتر ہو گی۔ کیا اس بادشاہ عادل کی کشتی تباہ کی جائیگی یا ان بدمعاشوں کی کشتی کہ جو حقیر ذلیل ہیں تباہ کر دی جائے گی؟ مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ بادشاہ کی کشتی بڑے زور اور حمایت سے بچائی جائے گی اور ان چوہڑے چماروں کی کشتی تباہ کر دی جائیگی اور وہ بالکل لاپرواہی سے ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ اور ان کے ہلاک ہونے میں خوشی ہو گی۔ کیونکہ دنیا کو بادشاہ عادل کے وجود کی بہت ضرورت ہے اور اس کا مرنا ایک عالم کا مرنا ہے۔ اگر چند چوہڑے اور چمار مر گئے تو ان کی موت سے کوئی خلل دنیا کے انتظام میں نہیں آ سکتا۔ پس خدا تعالیٰ کی یہی سنت ہے کہ جب اس کے مرسلوں کے مقابل پر ایک اور فریق کھڑا ہو جاتا ہے تو گو وہ اپنے خیال میں کیسے ہی اپنے تئیں نیک قرار دیں اُنہی کو خدا تعالیٰ تباہ کرتا ہے اور اُنہی کی ہلاکت کا وقت آ جاتا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ جس غرض کے لئے اپنے کسی مرسل کو مبعوث فرماتا ہے اس کو ضائع کرے۔ کیونکہ اگر ایسا کرے تو پھر وہ خود اپنی غرض کا دشمن ہو گا اور پھر زمین پر اس کی کون عبادت کرے گا۔ دنیا کثرت کو دیکھتی ہے اور خیال کرتی ہے کہ یہ فریق بہت بڑا ہے سو یہ اچھا ہے۔ اور نادان خیال کرتا ہے کہ یہ لوگ ہزاروں لاکھوں مساجد میں جمع ہوتے ہیں کیا یہ بُرے ہیں؟ مگر خدا کثرت کو نہیں دیکھتا۔ وہ دلوں کو دیکھتا ہے۔ خدا کے خاص بندوں میں محبت الٰہی اور صدق اور وفا کا ایک ایسا خاص نور ہوتا ہے کہ اگر مَیں بیان کر سکتا تو بیان کرتا لیکن مَیں کیا بیان کروں جب سے دنیا پیدا ہوئی اس راز کو کوئی نبی یا کوئی رسول بیان نہیں کر سکا۔ خدا کے باوفا بندوں کی اس طور سے آستانۂ الٰہی پر رُوح گرتی ہے کہ کوئی لفظ ہمارے پاس نہیں کہ اس کیفیت کو دکھلا سکے۔ (تذکرۃ الشہادتین صـ ۶۹-۷۰)

مخالف چاہتے ہیں کہ مَیں نابود ہو جاؤں اور ان کا کوئی ایسا داؤ چل جائے کہ میرا نام و نشان نہ رہے مگر وہ ان خواہشوں میں نامراد رہیں گے اور نامرادی سے مریں گے۔ اور بہتیرے اُن میں سے ہمارے دیکھتے دیکھتے مر گئے اور قبروں میں حسرتیں لے گئے مگر خدا تمام میری مرادیں پوری کرے گا یہ نادان نہیں جانتے کہ جب میں اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے اس جنگ میں مشغول ہوں تو مَیں کیوں ضائع ہونے لگا اور کون ہے جو مجھے نقصان پہنچا سکے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کا ہو جاتا ہے تو اس کو بھی اس کا ہونا ہی پڑتا ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۱۳۸)

چونکہ خدائے عزّوجلّ نے متواتر وحی سے مجھے خبر دی ہے کہ میرا زمانہ وفات نزدیک ہے۔ اور اس بارے میں اس کی وحی اسقدر تواتر سے ہوئی کہ میری ہستی کو بنیاد سے ہلا دیا اور اس زندگی کو میرے پر سرد کر دیا اس لئے مَیں نے مناسب سمجھا کہ اپنے دوستوں اور ان تمام لوگوں کے لئے جو میرے کلام سے فائدہ اٹھانا چاہیں چند نصائح لکھوں۔ سو پہلے مَیں اس مقدس وحی سے اطلاع دیتا ہوں جس نے مجھے میری موت کی خبر دے کر میرے لئے یہ تحریک پیدا کی۔ اور وہ یہ ہے جو عربی زبان میں ہوئی اور بعد میں اردو کی وحی بھی لکھی جائیگی۔

قَرُبَ اَجَلُكَ الْمُقَدَّرُ وَلَا نُبْقِيْ لَكَ مِنَ الْمُخْزِيَاتِ ذِكْرًا۔ قَلَّ مِيْعَادُ رَبِّكَ وَلَا نُبْقِيْ لَكَ مِنَ الْمُخْزِيَاتِ شَيْئًا۔ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ۔ تَمُوْتُ وَاَنَا رَاضٍ مِّنْكَ۔ جَآءَ وَقْتُكَ وَنُبْقِيْ لَكَ الْاٰيَاتِ بَاهِرَاتٍ۔ جَآءَ وَقْتُكَ وَنُبْقِيْ لَكَ الْاٰيَاتِ بَيِّنَاتٍ۔ قَرُبَ مَا تُوْعَدُوْنَ۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

(ترجمہ) تیری اجل قریب آگئی ہے اور ہم تیرے متعلق ایسی باتوں کا نام و نشان نہیں چھوڑیں گے جن کا ذکر تیری رسوائی کا موجب ہو۔ تیری نسبت خدا کی میعاد مقررہ تھوڑی رہ گئی ہے اور ہم ایسے تمام اعتراض دُور اور دفع کر دینگے اور کچھ بھی اُن میں سے باقی نہیں رکھیں گے۔ جن کے بیان سے تیری رسوائی مطلوب ہو۔ اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جو کچھ مخالفوں کی نسبت ہماری پیشگوئیاں ہیں ان میں سے تجھے کچھ دکھا دیں یا تجھے وفات دیدیں تو اس حالت میں فوت ہو گا جو مَیں تجھ سے

راضی ہوں گا۔ اور ہم کھلے کھلے نشان تیری تصدیق کے لئے ہمیشہ موجود رکھیں گے۔ جو وعدہ کیا گیا وہ قریب ہے اپنے رب کی نعمت کا جو تیرے پر ہوئی لوگوں کے پاس بیان کر۔ جو شخص تقوٰی اختیار کرے اور صبر کرے تو خدا ایسے نکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

اسجگہ یاد رہے کہ خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم تیری نسبت ایسے ذکر باقی نہیں چھوڑیں گے جو تیری رسوائی اور ہتکِ عزّت کا موجب ہوں اس فقرہ کے دو معنے ہیں (۱) اول یہ کہ ایسے اعتراضات کو جو رسوا کرنے کی نیت سے شائع کئے جاتے ہیں ہم دُور کر دیں گے۔ اور اُن اعتراضات کا نام و نشان نہ رہیگا (۲) دوسرے یہ کہ ایسے شکایت کرنے والوں کو جو اپنی شرارتوں کو نہیں چھوڑتے اور بد ذکر سے باز نہیں آتے دنیا سے اٹھالیں گے اور صفحہ ہستی سے معدوم کر دینگے تب ان کے نابود ہونے کی وجہ سے ان کے بیہودہ اعتراض بھی نابود ہو جائیں گے۔

پھر بعد اس کے خدا تعالیٰ نے میری وفات کی نسبت اردو زبان میں مندرجہ ذیل کلام کے ساتھ مجھے مخاطب کرکے فرمایا:۔

بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ اُس دن سب پر اداسی چھاجائیگی یہ ہوگا۔ یہ ہوگا۔ بعد اس کے تمہارا واقعہ ہوگا۔ تمام حوادث اور عجائبات قدرت دکھلانے کے بعد تمہارا حادثہ آئیگا۔

حوادث کے بارے میں جو مجھے علم دیا گیا وہ یہی ہے کہ ہر ایک طرف دنیا میں موت اپنا دامن پھیلائیگی اور زلزلے آئیں گے اور شدت سے آئیں گے اور قیامت کا نمونہ ہونگے اور زمین کو تہ و بالا کر دینگے اور بہتوں کی زندگی تلخ ہو جائیگی۔ پھر وہ جو توبہ کرینگے اور گناہوں سے دستکش ہو جائینگے خدا ان پر رحم کریگا۔ جیسا کہ ہر ایک نبی نے اس زمانہ کی خبر دی تھی ضرور ہے کہ وہ سب کچھ واقع ہو لیکن وہ جو اپنے دلوں کو درست کرلیں گے اور ان راہوں کو اختیار کرینگے جو خدا کو پسند ہیں۔ ان کو کچھ خوف نہیں اور نہ کچھ غم۔ خدا نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا کہ تُو میری طرف سے نذیر ہے۔ میں نے تجھے بھیجا تا مجرم نیکوکاروں سے الگ کئے جائیں اور فرمایا کہ دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اُسکی سچائی ظاہر کر دے گا۔ میں تجھے اس قدر برکت دونگا کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈینگے اور آئندہ زلزلہ کی نسبت جو ایک سخت زلزلہ ہوگا مجھے خبر دی اور فرمایا۔ **پھر بہار آئی**

خدا کی بات پھر پوری ہوئی۔ اس لئے ایک شدید زلزلہ کا آنا ضروری ہے لیکن راستباز اس سے امن میں ہیں۔ سو راستباز بنو! اور تقویٰ اختیار کرو! تا بچ جاؤ۔ آج خدا سے ڈرو تا اس دن کے ڈر سے امن میں رہو۔ ضرور ہے کہ آسمان کچھ دکھاوے اور زمین کچھ ظاہر کرے لیکن خدا سے ڈرنے والے بچائے جائیں گے۔

خدا کا کلام مجھے فرماتا ہے کہ کئی حوادث ظاہر ہونگے اور کئی آفتیں زمین پر اُتریں گی۔ کچھ تو ان میں سے میری زندگی میں ظہور میں آجائیں گی اور کچھ میرے بعد ظہور میں آئیں گی۔ اور وہ اس سلسلہ کو پوری ترقی دے گا کچھ میرے ہاتھ سے اور کچھ میرے بعد۔

یہ خدا تعالیٰ کی سنت ہے اور جب سے کہ اس نے انسان کو زمین میں پیدا کیا ہمیشہ اس سنت کو وہ ظاہر کرتا رہا ہے کہ وہ (اپنے نبیوں اور رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ اور ان کو غلبہ دیتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِی۔ اور غلبہ سے مراد یہ ہے کہ جیسا کہ رسولوں اور نبیوں کا یہ منشا ہوتا ہے کہ خدا کی حجت زمین پر پوری ہو جائے اور اس کا مقابلہ کوئی نہ کر سکے اسی طرح خدا تعالیٰ قوی نشانوں کے ساتھ ان کی سچائی ظاہر کر دیتا ہے اور جس راستبازی کو وہ دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں اس کی تخم ریزی انہیں کے ہاتھ سے کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی پوری تکمیل اُن کے ہاتھ سے نہیں کرتا۔ بلکہ ایسے وقت میں ان کو وفات دیکر جو بظاہر ایک ناکامی کا خوف اپنے ساتھ رکھتا ہے مخالفوں کو ہنسی اور ٹھٹھے اور طعن اور تشنیع کا موقع دیدیتا ہے اور جب وہ ہنسی ٹھٹھا کر چکتے ہیں تو پھر ایک دوسرا ہاتھ اپنی قدرت کا دکھاتا ہے۔ اور ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جن کے ذریعہ سے وہ مقاصد جو کسی قدر ناتمام رہ گئے تھے اپنے کمال کو پہنچتے ہیں۔ غرض دو قسم کی قدرت ظاہر کرتا ہے (۱) اوّل خود نبیوں کے ہاتھ سے اپنی قدرت کا ہاتھ دکھاتا ہے (۲) دوسرے ایسے وقت میں جب نبی کی وفات کے بعد مشکلات کا سامنا پیدا ہو جاتا ہے اور دشمن زور میں آجاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اب کام بگڑ گیا اور یقین کر لیتے ہیں کہ اب یہ جماعت نابود ہو جائیگی اور خود جماعت کے لوگ بھی تردّد میں پڑ جاتے ہیں اور ان کی کمریں ٹوٹ جاتی ہیں اور کئی بدقسمت مرتد ہونے کی راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ تب خدا تعالیٰ دوسری مرتبہ اپنی زبردست قدرت ظاہر کرتا ہے اور گرتی ہوئی جماعت کو سنبھال لیتا ہے۔ پس وہ جو اخیر تک صبر کرتا ہے خدا تعالےٰ کے اس معجزہ کو دیکھتا ہے جیسا کہ حضرت

ابوبکر صدیقؓ کے وقت میں ہوا جبکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی موت ایک بے وقت موت سمجھی گئی اور بہت سے بادیہ نشین نادان مرتد ہو گئے ۔ اور صحابہ بھی مارے غم کے دیوانہ کی طرح ہو گئے ۔ تب خدا تعالےٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کھڑا کر کے دوبارہ اپنی قدرت کا نمونہ دکھایا اور اسلام کو نابود ہوتے ہوتے تھام لیا ۔ اور اس وعدہ کو پورا کیا جو فرمایا تھا ۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۔ یعنی خوف کے بعد پھر ہم اُن کے پیر جما دینگے ۔ ایسا ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ہوا جبکہ حضرت موسیٰ مصر اور کنعان کی راہ میں پہلے اس سے جو بنی اسرائیل کو وعدہ کے موافق منزل مقصود تک پہنچادیں فوت ہو گئے ۔ اور بنی اسرائیل میں اُن کے مرنے سے ایک بڑا ماتم برپا ہوا ۔ جیسا کہ توریت میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل اس بے وقت موت کے صدمہ سے اور حضرت موسیٰ کی ناگہانی جدائی سے چالیس دن تک روتے رہے ۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ معاملہ ہوا ۔ اور صلیب کے واقعہ کے وقت تمام حواری تتر بتر ہو گئے اور ایک اُن میں سے مرتد بھی ہو گیا ۔

سو اے عزیزو! جبکہ قدیم سے سنت اللہ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ دو قدرتیں دکھلاتا ہے ۔ تا مخالفوں کی دو جھوٹی خوشیوں کو پامال کر کے دکھلاوے ۔ سو اب ممکن نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی قدیم سنّت کو ترک کر دیوے ۔ اس لئے تم میری اس بات سے جو مَیں نے تمہارے پاس بیان کی غمگین مت ہو اور تمہارے دل پریشان نہ ہو جائیں کیونکہ تمہارے لئے دوسری قدرت کا بھی دیکھنا ضروری ہے ۔ اور اس کا آنا تمہارے لئے بہتر ہے کیونکہ وہ دائمی ہے جس کا سلسلہ قیامت تک منقطع نہیں ہوگا ۔ اور وہ **دوسری قدرت نہیں آسکتی جب تک میں نہ جاؤں** لیکن مَیں جب جاؤں گا تو پھر خدا اس دوسری قدرت کو تمہارے لئے بھیج دیگا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی جیسا کہ خدا کا براہین احمدیہ میں وعدہ ہے اور وہ وعدہ میری ذات کی نسبت نہیں ہے بلکہ تمہاری نسبت وعدہ ہے ۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے کہ مَیں اس جماعت کو جو تیرے پیرو ہیں قیامت تک دوسروں پر غلبہ دونگا ۔ سو ضرور ہے کہ تم پر میری جُدائی کا دن آوے تا بعد اس کے وہ دن آوے جو دائمی وعدہ کا دن ہے ۔ وہ ہمارا خدا وعدوں کا سچا اور وفادار اور صادق خدا ہے ۔ وہ سب کچھ تمہیں دکھائیگا جس کا اس نے وعدہ فرمایا ۔ اگرچہ یہ دن دنیا کے آخری دن ہیں اور بہت بلائیں ہیں جن کے نزول کا وقت ہے ۔ پر ضرور ہے کہ یہ دنیا قائم رہے جب تک وہ تمام باتیں پوری نہ ہو جائیں جن کی خدا نے خبر دی ۔ مَیں خدا کی طرف سے

ایک قدرت کے رنگ میں ظاہر ہؤا اور میں **خدا کی ایک مجسّم قدرت ہوں** اور میرے بعد بعض اور وجود ہونگے جو دوسری قدرت کا مظہر ہونگے۔ سو تم خدا کی قدرت ثانی کے انتظار میں اکٹھے ہو کر دُعا کرتے رہو اور چاہیئے کہ ہر ایک صالحین کی جماعت ہر ایک ملک میں اکٹھے ہو کر دُعا میں لگے رہیں تا دوسری قدرت آسمان سے نازل ہو۔ اور تمہیں دکھاوے کہ تمہارا خدا ایسا قادر خدا ہے اپنی موت کو قریب سمجھو۔ تم نہیں جانتے کہ کس وقت وہ گھڑی آجائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ مت خیال کرو کہ خدا تمہیں ضائع کر دے گا۔ تم خدا کے ہاتھ کا ایک بیج ہو جو زمین میں بویا گیا۔ خدا فرماتا ہے کہ یہ بیج بڑھے گا اور پھولے گا۔ اور ہر ایک طرف سے اس کی شاخیں نکلیں گی۔ اور ایک بڑا درخت ہو جائے گا۔ پس مبارک وہ جو خدا کی بات پر ایمان رکھے اور درمیان میں آنے والے ابتلاؤں سے نہ ڈرے کیونکہ ابتلاؤں کا آنا بھی ضروری ہے تا خدا تمہاری آزمائش کرے کہ کون اپنے دعویٔ بیعت میں صادق اور کون کاذب ہے وہ جو کسی ابتلاء سے لغزش کھائے گا وہ کچھ بھی خدا کا نقصان نہیں کرے گا اور بدبختی اس کو جہنم تک پہنچائے گی۔ اگر وہ پیدا نہ ہوتا تو اس کے لئے اچھا تھا۔ مگر وہ سب لوگ جو اخیر تک صبر کریں گے اور ان پر مصائب کے زلزلے آئیں گے اور حوادث کی آندھیاں چلیں گی اور قومیں ہنسی اور ٹھٹھا کریں گی اور دنیا اُن سے سخت کراہت کے ساتھ پیش آئیں گی وہ آخر فتحیاب ہونگے اور برکتوں کے دروازے اُن پر کھولے جائیں گے۔

(الوصیّت صـ ۱۳-۱۴)

میں اُمید رکھتا ہوں کہ قبل اس کے جو میں اس دنیا سے گذر جاؤں میں نے اپنے اس حقیقی آقا کے سوا دوسرے کا محتاج نہیں ہونگا۔ اور وہ ہر ایک دشمن سے مجھے اپنی پناہ میں رکھے گا۔ فالحمد للّٰہ اوّلًا وآخرًا وظاھرًا وباطنًا ھو ولیّ فی الدنیا والاٰخرۃ وھو نعم المولیٰ ونعم النصیر۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ میری مدد کرے گا اور وہ مجھے ہرگز ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ اگر تمام دنیا میری مخالفت میں درندوں سے بدتر ہو جائے تب بھی وہ میری حمایت کرے گا۔ میں نامرادی کے ساتھ ہرگز قبر میں نہیں اتروں گا کیونکہ میرا خدا میرے ہر قدم میں میرے ساتھ ہے اور میں اس کے ساتھ ہوں اور میرے اندرون کا جو اس کو علم ہے کسی کو بھی علم نہیں۔ اگر سب لوگ مجھے چھوڑ دیں تو خدا ایک اور قوم پیدا کرے گا جو میرے رفیق ہونگے۔ نادان مخالف خیال کرتا ہے کہ میرے مکروں اور منصوبوں سے

یہ بات بگڑ جائیگی اور سلسلہ درہم برہم ہو جائیگا۔ مگر یہ نادان نہیں جانتا کہ جو آسمان پر قرار پا چکا ہے زمین کی طاقت میں نہیں کہ اس کو محو کر سکے۔ میرے خدا کے آگے زمین و آسمان کانپتے ہیں۔ خدا وہی ہے جو میرے پر اپنی پاک وحی نازل کرتا ہے اور غیب کے اسرار سے مجھے اطلاع دیتا ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور ضروری ہے کہ وہ اس سلسلہ کو چلا دے اور بڑھا دے اور ترقی دے جب تک وہ پاک اور پلید میں فرق کر کے نہ دکھلا دے۔ ہر ایک مخالف کو چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو اس سلسلہ کے نابود کرنے کے لئے کوشش کرے اور ناخنوں تک زور لگا دے۔ اور پھر دیکھے کہ انجام کار وہ غالب ہوا یا خدا۔ پہلے اس سے ابوجہل اور ابولہب اور ان کے رفیقوں نے حق کے نابود کرنے کے لئے کیا کیا زور لگائے تھے مگر اب وہ کہاں ہیں؟ وہ فرعون جو موسیٰ کو ہلاک کرنا چاہتا تھا اب اسکا کچھ پتہ ہے؟ پس یقیناً سمجھو کہ صادق ضائع نہیں ہو سکتا۔ وہ فرشتوں کی فوج کے اندر پھرتا ہے۔ بدقسمت وہ جو اس کو شناخت نہ کرے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ ص ۱۲۸-۱۲۹)

اے تمام لوگو! سن رکھو کہ یہ اس کی پیشگوئی ہے جس نے زمین و آسمان بنایا۔ وہ اپنی اس جماعت کو تمام ملکوں میں پھیلا دے گا اور حجت اور برہان کی رو سے سب پر ان کو غلبہ بخشیگا وہ دن آتے ہیں بلکہ قریب ہیں کہ دنیا میں صرف یہی ایک مذہب ہوگا جو عزت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ خدا اس مذہب اور اس سلسلہ میں نہایت درجہ اور فوق العادت برکت ڈالیگا اور ہر ایک جو اس کے معدوم کرنے کا فکر رکھتا ہے نامراد رکھیگا۔ اور یہ غلبہ ہمیشہ رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔ اگر اب مجھ سے ٹھٹھا کرتے ہیں تو اس ٹھٹھے سے کیا نقصان کیونکہ کوئی نبی نہیں جس سے ٹھٹھا نہیں کیا گیا۔ پس ضرور تھا کہ مسیح موعود سے بھی ٹھٹھا کیا جاتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ یا حسرةً علی العباد ما یأتیھم من رسولٍ الّا کانوا بہ یستھزءون۔ پس خدا کی طرف سے یہ نشانی ہے کہ ہر ایک نبی سے ٹھٹھا کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا آدمی جو تمام لوگوں کے روبرو آسمان سے اترے اور فرشتے بھی اس کے ساتھ ہوں اس سے کون ٹھٹھا کرے گا۔ پس اس دلیل سے بھی عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ مسیح موعود کا آسمان سے اترنا محض جھوٹا خیال ہے۔ یاد رکھو! کہ کوئی آسمان سے نہیں اترے گا۔ ہمارے سب مخالف جو اب زندہ موجود ہیں وہ تمام مرینگے اور کوئی ان میں سے عیسیٰ بن مریم کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھے گا۔ اور پھر ان کی اولاد جو باقی رہیگی وہ بھی

مرے گی۔ اور ان میں سے بھی کوئی آدمی عیسیٰ بن مریم کو آسمان سے اُترتے نہیں دیکھیگا۔ اور پھر اولاد کی اولاد مرے گی اور وہ بھی مریم کے بیٹے کو آسمان سے اُترتے نہیں دیکھے گی۔ تب خدا اُن کے دلوں میں گھبراہٹ ڈالے گا کہ زمانہ صلیب کے غلبہ کا بھی گذر گیا اور دنیا دوسرے رنگ میں آگئی۔ مگر مریم کا بیٹا عیسیٰ اب تک آسمان سے نہ اُترا۔ تب دانشمند یکدفعہ اس عقیدہ سے بیزار ہو جائیں گے اور ابھی تیسری صدی آج کے دن سے پوری نہیں ہوگی کہ عیسیٰ کا انتظار کرنے والے کیا مسلمان اور کیا عیسائی سخت نومید اور بدظن ہو کر اس جھوٹے عقیدہ کو چھوڑ دینگے اور دنیا میں ایک ہی مذہب ہوگا اور ایک ہی پیشوا۔ مَیں تو ایک تخم ریزی کرنے آیا ہوں سو میرے ہاتھ سے وہ تخم بویا گیا۔ اور اب وہ بڑھے گا اور پھولے گا اور کوئی نہیں جو اس کو روک سکے۔

(تذکرۃ الشہادتین ص ۶۴-۶۵)

تمّت بالخیر

الحمد للّٰہ علیٰ احسانہٖ وتوفیقہٖ جلّ شانہٗ وعزّ اسمہٗ والصلوٰۃ والسلام
علیٰ نبیہ الکریم وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

کتبہٗ قریشی محمد اسمٰعیل کاتب (ضیاء الاسلام پریس ربوہ) طالب دعا خواجہ محمد لطیف مشین مین